پینتالیس ۴۵ سالہ خودنوشتہ فتاوی کا مجموعہ
فتاوی عثمانی
جلدِ چہارم
مفتی محمد تقی عثمانی
ترتیب وتخریج
مولانا محمد زبیر حق نواز
مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi - Pakistan

فتاویٰ عثمانی

جلدِ اوّل

کتاب الایمان والعقائد، کتاب السنۃ والبدعۃ، کتاب العلم والتاریخ،
کتاب التفسیر، کتاب الحدیث، کتاب الدعوۃ والتبلیغ، کتاب التصوف،
کتاب الذکر والدعاء، کتاب حقوق المعاشرۃ، کتاب السیر والمناقب،
کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا محمد زبیر حق نواز

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi - Pakistan

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد اوّل

صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات　　صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الذکر والدعاء والتعویذات﴾ ۲۵۷

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿كتاب الطهارة﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿فصل فی الأذان﴾ ۳۶۵

(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی شروط الصلوٰة وأركانها وواجباتها وسننها وآدابها﴾ ۳۶۸

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾ ۳۸۰

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الجنائز﴾ ۵۶۱

(نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے مسائل)

﴿فصل فی ایصال الثواب﴾ ۵۸۸

(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد دوم　　صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی صدقة الفطر﴾ ۷۷

(صدقہ فطر کے مسائل کا بیان)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿فصل فی العشر والخراج﴾ ۱۲۷

(عشر اور خراج سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی مصارف الزکوٰۃ والعشر وصدقۃ الفطر﴾ ۱۳۱

(زکوٰۃ، عشر اور صدقۂ فطر کے مصارف کے بیان میں)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الحج﴾ ۱۹۹

﴿فصل فی من یفرض علیہ الحج﴾ ۲۰۱

(حج کس پر فرض ہے؟)

﴿فصل فی المواقیت﴾ ۲۰۹

(میقات سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی الإحرام وما ھو محذور فیہ أو مباح﴾ ۲۱۱

(اِحرام اور اس کے مباحات وممنوعات کا بیان)

﴿فصل فی القِران والتمتع﴾ ۲۱۲

(حجِ قِران اور تمتع سے متعلق مسائل کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿فصل فی العمرة﴾ (عمرہ سے متعلق مسائل کا بیان)	۲۱۳

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الطّلاق﴾ ۳۱۳

﴿باب ایقاع الطّلاق﴾ ۳۱۵

(طلاق دینے اور طلاق واقع ہونے کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الطّلاق بالکنایات﴾

(کنایاتِ طلاق کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات — صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿باب العدّة وأحكامها﴾ ۴۷۶

(عدّت اور اُس کے اَحکام)

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات | صفحہ نمبر

کتابُ الوقف ۵۰۳

(وقف کے مسائل)

فصل فی أحکام المساجد وآدابها ۵۱۱

(مسجد کے اَحکام اور آداب کا بیان)

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام المال الحرام والمخلوط﴾

﴿فصل فی بیع الصّرف وأحکام الحلی والأوراق النقدیة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام السّندات المالیّة والصّکوک والأوراق المالیّة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام الأسهم﴾

موضوعات　　صفحہ نمبر

﴿فصل فی القرض والدّین﴾

﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرّقة المتعلّقة بالبیع﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الرّبوٰا والقمار والتّأمین﴾

﴿فصل فی الرّبوٰا وأحکام ربوٰا البنوک والمؤسّسات المالیة الحدیثة﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی أحکام البنوک﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی إجارة الأرض والأشجار والحیوان﴾

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿فصل فی الإجارۃ الجدیدۃ والمتفرّقۃ﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الرّھن﴾

﴿کتاب الھبۃ﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الودیعة والعاریة﴾

﴿کتاب اللّقطة﴾

﴿کتاب الغصب والضمان﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الجہاد﴾

﴿کتاب الامارۃ والسیاسۃ﴾

موضوعات	صفحہ نمبر

﴿کتاب الدّعویٰ والشہادات والقضاء﴾

موضوعات | صفحہ نمبر

﴿کتاب الحدود﴾

﴿فصل فی القصاص والدّیات﴾

﴿فصل فی التّعزیر﴾

موضوعات　　صفحہ نمبر

﴿فصل فی القسامة﴾

﴿کتاب الجنایات﴾

﴿کتاب الصلح﴾

﴿کتاب الوکالة﴾

﴿کتاب القسمة﴾

***

تفصیلی فہرست

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

صفحہ نمبر	عنوان

کتابُ الطبّ والتداوی وتلقیح الدم والاعضاء والاحبال بالألات وضبطِ الولادة وغیرِھا

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

کتاب المتفرقات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ:

جب سے آنکھ کھلی، والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے فیض سے گھر میں فتویٰ اور استفتاء کا چرچا دیکھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے فقہی مسائل گھر کے ان تذکروں کی بنا پر یاد ہوگئے، لیکن کسی کو مسئلہ بتانے یا لکھ کر دینے سے دِل ہمیشہ ڈرتا رہا، اور مدرسہ میں پڑھنے کے زمانے میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ کسی وقت فتویٰ لکھنے کی کوئی ذمہ داری سر پر آنے والی ہے۔ ۱۳۷۷ھ میں جب میں دارالعلوم کراچی میں ہدایہ اَوّلین وغیرہ پڑھتا تھا اور میری عمر (قمری حساب سے) پندرہ سال تھی، شعبان و رمضان کی تعطیلات کے زمانے میں اُستاذِ مکرّم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ روزانہ ہمارے گھر پر تشریف لاکر فتویٰ کا کام کیا کرتے تھے، میں بکثرت اُن کے پاس جا بیٹھتا، اور ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ پڑھتا رہتا۔ ایک روز حضرتؒ نے ایک استفتاء مجھے دے کر فرمایا کہ ''بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟'' مسئلہ طلاق کا تھا اور سیدھا سادا تھا، میں نے صحیح جواب دے دیا، حضرتؒ نے فرمایا ''بس اب یہی جواب اس استفتاء پر لکھ دو۔'' جب لکھنے کا نام آیا تو میرا دِل ڈرنے لگا، لیکن حضرت اُستاذؒ نے ہمت بندھائی، میں نے جواب لکھ دیا، اور دستخط کی جگہ چھوڑ دی، حضرتؒ نے اس تحریری جواب کی تصویب فرمائی اور خود دستخط فرمادیئے۔

اس کے بعد ۱۳۷۹ھ (مطابق ۱۹۵۸ء) میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مشکوٰۃ شریف پڑھنی شروع کی تو حضرتؒ نے ترغیب دی کہ میں اور برادر مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کتابوں سے مسائل کے جوابات نکالنے کی مشق کریں، چنانچہ اسی زمانے میں حضرتؒ کچھ سوالات دے دیتے تھے اور کتبِ فقہ سے ان کے جوابات نکالنے کا حکم دیتے، ہم کتابوں سے جوابات تلاش کر کے اکثر زبانی اور کبھی تحریری طور پر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرتے، اور وہ ان کی تصویب یا اصلاح فرمادیتے۔

اسی سال جب شعبان و رمضان کی تعطیلات میں گھر جانا ہوا تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس رمضان میں جماعتِ تہجد کے جواز و عدمِ جواز سے متعلق ایک استفتاء آیا ہوا تھا، اور حضرت

والد صاحبؒ اس کا جواب تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتبِ فقہ کی مراجعت کر کے متعلقہ عبارتیں جمع کروں۔ میں نے یہ عبارتیں جمع کیں، اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ ”اگر اجازت ہو تو ان عبارتوں کی روشنی میں جو مسئلہ سمجھ میں آرہا ہے، اسے بطورِ تجویز قلم بند کرلوں، پھر آپ ان کی اصلاح فرمادیں۔“ حضرتؒ نے اجازت دے دی، اور میں نے اپنی بساط کے مطابق جواب لکھ کر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضرتؒ نے معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد تصدیق فرمادی، یہ پہلا باقاعدہ فتویٰ تھا جو بندہ نے لکھا اور بعد میں شائع بھی ہوا۔

دورۂ حدیث کے سال میں بھی حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مسائل کے استخراج کی مشق جاری رہی، یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے بعد باقاعدہ تخصّص فی الافتاء میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس فتویٰ نویسی کی مشق شروع کی۔ اُسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ فتویٰ کا کام صرف جزئیات یاد کرنے یا کتابوں کی مراجعت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں اور بھی بہت سے اُصول مدِنظر رکھنے پڑتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لگے بندھے قواعد کے علاوہ مفتی کے اپنے ملکۂ فقہیہ اور اس کے مزاج و مذاق سے تعلق رکھتی ہیں جو صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر مفتی کی طویل صحبت کی بھی ضرورت ہے۔

تخصّص کے بعد بھی دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے ساتھ تقریباً روزانہ کچھ وقت دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کے لئے مخصوص رہا، اور اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی نگرانی و سرپرستی میں ۱۳۹۶ھ تک فتویٰ کی خدمت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ دارالافتاء کی مستقل ذمہ داری تو دُوسرے مفتی حضرات کے سپرد رہی، لیکن کچھ وقت اپنا بھی لگتا رہا، اور جب کبھی ڈاک زیادہ جمع ہوجاتی یا فتویٰ لکھنے والوں کی کمی ہوتی تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ بندے کو کچھ عرصہ کے لئے تدریس کے علاوہ دُوسرے کام چھڑوا کر فتویٰ کی خدمت پر لگادیتے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ مدینہ منوّرہ ہجرت فرماگئے، اور برادر مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم پر دارالعلوم کے انتظامی اُمور کی ذمہ داریاں آپڑیں، اور دارالافتاء کے بعض دیگر رفقاء بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مستعفی ہوگئے، اس لئے عرصۂ دراز تک دارالافتاء اور درجۂ تخصّص کی نگرانی کا کام بندہ کے سپرد رہا، اور خود فتویٰ لکھنے کے علاوہ درجۂ تخصّص کے طلبہ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر نظرِ ثانی اور اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس طرح مختلف زمانوں میں بندے کے لکھے ہوئے فتاویٰ، دارالعلوم کے نقلِ فتاویٰ کے بہت سے رجسٹروں میں بکھرے ہوئے ہیں، مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ میں فتاویٰ کا کوئی مجموعہ مرتب

کر کے شائع کروں۔ خیال یہ تھا کہ دارالعلوم کراچی سے جاری ہونے والے فتاویٰ کا جو مجموعہ زیرِ ترتیب ہے، اسی میں یہ فتاویٰ بھی آجائیں گے۔ لیکن عزیز گرامی مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے - جو دارالعلوم کراچی ہی کے فاضل و متخصص اور اب ماشاء اللہ اُستاذ و رفیق دارالافتاء ہیں- اپنے طور پر میرے لکھے ہوئے فتاویٰ کو مختلف رجسٹروں سے جمع کرنا شروع کردیا، اور اس کام کا ایک معتد بہ حصہ مکمل کرنے کے بعد بندہ کو مطلع کیا، میں نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر کام کی تکمیل کی اجازت دیدی۔

ماشاء اللہ مولانا محمد زبیر صاحب خود ذی استعداد عالم ہیں، اور انہوں نے نہایت عرق ریزی سے دارالعلوم کراچی کے پرانے رجسٹروں سے، جن میں سے بعض بہت بوسیدہ ہوچکے تھے، فتاویٰ ڈھونڈ نکالے، اور نہ صرف ان کا انتخاب کر کے ان کو ابواب میں مرتب کیا، بلکہ ان کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی بڑی جانفشانی اور سلیقے کے ساتھ انجام دیا، جس سے اس مجموعے کی افادیت بہت بڑھ گئی۔ دِل سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور ان کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرما کر انہیں مزید علمی و دینی خدمات کے لئے موفق فرمائیں، آمین۔

مجھے اپنی موجودہ مصروفیات اور اسفار کی کثرت کی بنا پر بہت دقتِ نظر سے تو ان فتاویٰ پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کا اکثر حصہ میں نے سرسری نظر سے دیکھ لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھتا ہوں کہ ان شاء اللہ ان کی اشاعت فائدے سے خالی نہ ہوگی۔

اپنے مشائخ کی ہدایت کے مطابق فتویٰ لکھتے وقت اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی کا احساس رہتا ہے، اور اپنی بساط کے مطابق احتیاط کی بھی کوشش رہتی ہے، لیکن یہ ذمہ داری ہی ایسی ہے کہ ہر وقت ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ کوئی غلطی قابلِ گرفت نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا ہے کہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادیں، اور اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر اسے قارئین کے لئے نافع بنادیں، آمین۔

اہلِ علم سے بھی درخواست ہے کہ اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو بندہ کو متنبہ فرمادیں، ان شاء اللہ حق واضح ہوجانے کے بعد اسے قبول کرنے میں تأمل نہ ہوگا۔ البتہ نصوصِ فقہیہ کی تعبیر و تشریح میں اختلافِ رائے دُوسری چیز ہے، جو ہر دور میں ہوتا رہا ہے، ایسے مواقع پر بھی بفضلہٖ تعالیٰ اپنے ذہن کو قوتِ دلیل کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ پاتا ہوں اور یہ دُعا کرتا رہتا ہوں کہ: "اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ"۔

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۱؍ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ
وأصحابہ أجمعین، وعلیٰ کل من تبعھم بإحسان إلیٰ یوم الدین

امابعد.

فتاویٰ عثمانی کی تیسری جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ جیسا کہ پہلی جلد کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا، اگرچہ بزرگوں کے اِرشاد کی تعمیل میں فتویٰ نویسی کی خدمت عمر کے بالکل ابتدائی دور ہی میں شروع کردی تھی، اور مشاغل کے ہجوم کے باوجود اَب تک جاری ہے، لیکن یہ اِحساس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ یہ بڑی نازک اور پُرخطر ذمہ داری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بزرگوں کی دُعائیں شاملِ حال نہ ہوں، تو اِنسان اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

یہ تیسری جلد بطورِ خاص ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کا تعلق زیادہ تر معاملات سے ہے۔ اور ہمارے دور میں معاملات کی ایسی نئی اور پیچیدہ صورتیں سامنے آگئی ہیں کہ بسااوقات اُن کا صریح حکم فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتا، اس لئے فتویٰ کی ذمہ داری اور زیادہ مشکل اور نازک ہوجاتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں فقہی اُصولوں کو صورتِ مسئلہ پر منطبق کرنے کے لئے فقہی نظائر سے حکم مستنبط کرنا پڑتا ہے۔ اس اِستنباط میں غلطی کا اِمکان بھی ہے، اور آراء کے اِختلاف کی بھی گنجائش رہتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مسئلے کی کئی جہتیں ہوتی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ فتاویٰ لکھتے وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق پوری تحقیق سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بہرصورت! یہ ایک بشری کاوِش ہے، اور کاوِش بھی ایک ایسے شخص کی جسے اپنی کم علمی اور بے مایگی کا اِحساس ہے۔ اس لئے اسے اس توقع پر شائع کرنے کی اجازت دی ہے کہ اِن شاء اللہ وہ اہلِ علم کی نظر سے گذرے گی تو یا اُس کی تصدیق ہوجائے گی، یا کوئی غلطی ہوئی ہو تو اُس

پر متنبہ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر اَدا کروں کم ہے کہ فتاویٰ عثمانی کی پہلی دو جلدوں کو بہت سے اہلِ علم وفتویٰ نے محبت کی نظر سے دیکھا ہے، اور ان میں سے کچھ حضرات نے اُس کی بعض فروگذاشتوں پر بھی متنبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایسے اُمور کی تصحیح نئے ایڈیشنوں میں کردی گئی ہے، اور جہاں ضروری سمجھا گیا، اس کا اِعلان ماہنامہ ''البلاغ'' میں بھی شائع کردیا گیا ہے۔ اس تیسری جلد کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ حضرات اہلِ علم اُس کو بھی اپنی شفقتوں سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

عزیز گرامی قدر مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے اس جلد کی ترتیب وتہذیب اور تیاری میں بطورِ خاص جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اور جس قابلیت اور سلیقے کے ساتھ اُسے پیش کیا ہے، اُس کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ مختلف رجسٹروں، کاپیوں اور فائلوں سے فتاویٰ کا اِنتخاب کرکے اُن کی ترتیب کے ساتھ تخریج اور تعلیق میں انہوں نے غیر معمولی محنت اُٹھائی ہے، جس کا قارئین کو جزوی اندازہ ضرور ہوجائے گا، لیکن وہ اُن کی حقیقی محنت سے یقیناً بہت کم ہوگا۔ اُن کے لئے میں یہ دُعا ہی کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر، اُن کے علم اور عمل میں ظاہری وباطنی ترقیات عطا فرمائیں، اور ان کو صدق واِخلاص کے ساتھ دِین کی خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

اگر اس کتاب کے کسی حصے سے کسی کو فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے، اور اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ اس ناکارہ کو حیاً ومیتاً اپنی دُعاؤں میں یاد فرمالیں۔ **جزاهم الله تعالىٰ خيرًا. وما توفيقي إلّا بالله العليّ العظيم۔**

بندہ
محمد تقی عثمانی عفا اللہ تعالیٰ عنہ
دارالعلوم کراچی

۵ رجمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے جس بلند مقام سے نوازا ہے، عصرِ حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی، جدید وقدیم علوم میں مہارت نے جہاں آپ کو اکابر کے لئے قابلِ صد رشک شخصیت بنادیا ہے، وہاں علم، تواضع اور سادگی کے حسین امتزاج نے آپ کو عوام کے لئے ہر دِل عزیز اور پُرکشش علمی ورُوحانی شخصیت بنادیا ہے۔

آپ تصوّف اور دعوت وارشاد میں حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کے ترجمان، اور علمِ فقہ، تفسیر اور علوم القرآن میں اپنے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے جانشین اور علمِ حدیث میں محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی علمی روایات کے حامل اور امین ہیں۔

دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اور فتویٰ کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت بڑا کام لیا ہے، اس سلسلے میں تکملہ فتح الملہم کی فقہی مباحث، بحوث قضایا فقہیہ معاصرہ، فقہی مقالات، اَحکام الاوراق النقدیۃ، عدالتی فیصلے، ملکیتِ زمین کی تحدید، وغیرہ فقہی میدان میں آپ کی نہایت اہم اور گراں قدر علمی وتحقیقی کتب ہیں، جدید مسائل میں آپ کی رائے کو عالمِ اسلام میں انتہائی مستند سمجھا جاتا ہے اور فقہی مجالس اور محاضرات میں آپ کی رائے کا نہ صرف پاک وہند میں بلکہ دُنیائے عرب میں بھی خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں آپ ان چندگنی چنی شخصیات میں سرِفہرست ہیں جن کی بدولت

آج الحمدللہ دُنیا میں اسلامی بینکنگ کا ایک بلاک وجود میں آرہا ہے، جس میں بفضل اللہ مسلسل ترقی اور پیش رفت ہورہی ہے۔

فقہی میدان میں آپ کی خدمات کا ایک بہت بڑا حصہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے لکھے ہوئے ان ''فتاویٰ'' کا ہے، جو آپ نے پچھلے تقریباً پینتالیس سالوں میں تحریر فرمائے ہیں، مگر حضرتِ والا کی یہ عظیم الشان علمی، تحقیقی اور فقہی خدمت، شائع نہ ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہی اور اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

اگرچہ آپ نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی بناء پر زمانۂ طالب علمی میں ہی فتاویٰ لکھنے شروع کردیئے تھے، (جس میں ''رمضان میں نفل کی جماعت'' سے متعلق ایک مفصل تحقیقی فتویٰ وہ ہے جو آپ نے صرف سولہ سال کی عمر میں لکھا، جبکہ آپ ابھی ضابطہ کے فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ موقوف علیہ میں پڑھتے تھے) مگر درجۂ تخصص اور اس سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد ماجدؒ کی زیرِ نگرانی باقاعدہ فتویٰ لکھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک بحمدہٖ تعالیٰ یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اس پورے عرصے کے تقریباً تمام فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے قدیم و جدید رجسٹروں میں محفوظ ہیں، مگر چونکہ بالکل ابتداء میں دارالافتاء میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا کوئی باقاعدہ اور منظم انتظام نہ تھا، اس لئے دارالافتاء کے بعض دیگر فتاویٰ کی طرح حضرتِ والا دامت برکاتہم کے شروع کے کچھ فتاویٰ بھی محفوظ نہ رہے۔

بہرحال اس کے باوجود حضرت کے ہزاروں خودنوشتہ فتاویٰ، نقلِ فتاویٰ کے مختلف رجسٹروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بندہ کے دِل میں حضرت کے فتاویٰ کو جمع وترتیب دینے کا خیال اس طرح پیدا ہوا کہ چند اہم عنوانات پر مشتمل ایسے فتاویٰ جو مفصل اور مدلل ہیں اور ان کی نشاندہی دارالافتاء کے نئے نظام کے مطابق تبویب کے رجسٹروں میں کی گئی ہے، ایک مرتبہ احقر نے ان چند فتاویٰ کو جمع کرکے حضرت کی خدمت میں پیش کیا کہ اگر انہیں شائع کردیا جائے تو مناسب رہے گا، حضرتِ والا نے ان فتاویٰ کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اگر سب فتاویٰ جمع ہوجاتے تو اچھا تھا'' احقر نے اسی وقت حضرت کے سامنے دِل میں یہ عزم کرلیا کہ ان شاء اللہ بندہ یہ خدمت ضرور سرانجام دے گا۔ چنانچہ آج سے تقریباً چار سال قبل اللہ تعالیٰ کا نام لے کر یہ کام شروع کردیا۔

جب رجسٹروں سے یہ فتاویٰ جمع کرنا شروع کئے تو کئی مشکلات درپیش ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ دِلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان فتاویٰ کو جمع کرنے کا داعیہ بھی مضبوط ہوتا گیا، ابتدائی طور پر

مشکلات تو یہ پیش آئیں کہ پینتیس، چالیس سال پہلے کے بعض رجسٹر اب اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ان کے ایک ایک صفحے کو پلٹنا، دیکھنا اور پھر ان سے فوٹو لینا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ جلدوں کو دیمک لگ چکی تھی، بیچ سے کئی کئی صفحات پھٹے ہوئے اور بعض بالکل غائب تھے، بچا کھچا جو مواد زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہا وہ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ ایسے خستہ رجسٹر بندہ خود فوٹو اسٹیٹ والے کے پاس لے جاتا اور گھنٹوں دُکان پر کھڑے ہوکر انتہائی احتیاط سے ایک ایک صفحے کو پلٹ کر فوٹو اسٹیٹ کرواتا۔

مگر اس مشکل کے ساتھ ساتھ جو حیرت انگیز بات سامنے آئی وہ یہ کہ انہی خستہ اور بوسیدہ رجسٹروں میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایسے مفصل فتاویٰ موجود تھے جو اپنے موضوع پر جامع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی محقق اور مدلل ہیں۔ اور چند ایسے موضوعات پر بھی حضرت کے تحقیقی فتاویٰ سامنے آئے جن پر دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے کئی ساتھیوں کو فتاویٰ لکھتے وقت تحقیق کی ضرورت پیش آئی اور وہ ساتھی ہفتوں بلکہ مہینوں اس سلسلے میں پریشان رہے، جبکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس ذخیرے میں ان موضوعات پر پہلے سے تیار شدہ محقق فتاویٰ موجود تھے، مگر پردۂ خفاء میں ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ ممکن نہ تھا۔

جب اس طرح کے کئی فتاویٰ وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے، تو دِل میں یہ داعیہ شدید تر ہوتا گیا کہ یہ اہم فقہی ذخیرہ فوری طور پر منظرِ عام پر آنا چاہئے، لہٰذا حتی المقدور جلد ہی سن ۱۳۸۲ھ سے اب تک کے فتاویٰ جمع کئے اور صرف وہی فتاویٰ جمع کئے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں، ورنہ وہ فتاویٰ جن پر حضرت کے تصدیقی دستخط ہیں وہ اس مجموعے سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی اقسام

دراصل حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کو درج ذیل چار قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے پہلی تین قسم کے فتاویٰ اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں:

۱:- وہ فتاویٰ جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے باقاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں میں ان فتاویٰ کا اندراج ہے۔

۲:- سن ۱۳۸۷ھ و ۱۳۸۸ھ کے زمانے میں ''البلاغ'' میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا ایک دِلچسپ علمی سلسلہ ''آپ کے سوال'' کے عنوان سے چلا تھا، جس میں بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور حضرت ''البلاغ'' میں ان کے جوابات دیا کرتے تھے، ان میں بعض انتہائی مفصل اور محقق جوابات بھی ہیں۔ ''البلاغ'' سے وہ تمام فتاویٰ بھی اس

مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان فتاویٰ کا دارالافتاء کے رجسٹروں میں باقاعدہ اندراج نہیں ہوا تھا اس لئے ان فتاویٰ کا کوئی نمبر بھی موجود نہیں تھا، جو لکھا جاتا۔ تاہم حاشیہ میں ایسے فتاویٰ کی نشاندہی کردی گئی ہے۔

۳:- حسنِ اتفاق سے ان فتاویٰ کی جمع وترتیب کے دوران حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ایک دن اپنے گھر سے اپنے درجۂ تخصص کے زمانے کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی مل گئی جو حضرت نے احقر کو عنایت فرمائی۔ اس کاپی میں حضرت کے تحریر فرمودہ تمام فتاویٰ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصحیح وتصدیق شدہ ہیں۔ ان میں بعض مفصل اور مدلل فتاویٰ بھی ہیں۔ مثلاً اس پہلی جلد میں ''تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور تفصیل'' کے عنوان پر جو فتویٰ ہے وہ اسی کاپی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح دُوسری جلد میں ''حجِ صرورہ'' سے متعلق ایک تفصیلی فتویٰ آنے والا ہے۔

اس کاپی کے تمام فتاویٰ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

۴:- حضرت نے اپنے کئی متعلقین کو ان کے خطوط کے جوابات میں بھی کئی فقہی سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں مگر حضرت کے ذاتی نوعیت کے خطوط کا چونکہ دارالافتاء میں اندراج نہیں ہوتا لہٰذا ایسے فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے۔

مذکورہ چار قسموں میں سے ظاہر ہے کہ کثیر تعداد پہلی قسم کے فتاویٰ کی ہے جو دارالافتاء سے جاری کئے گئے، ان سب کو اس مجموعے میں شامل کرنے کے بعد بھی یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرتِ والا کے تمام فتاویٰ ہیں، کیونکہ رجسٹروں سے ان فتاویٰ کو جمع کرنے کے دوران ایک افسوس ناک بات یہ سامنے آئی کہ سنہ ۱۳۸۴ھ و ۱۳۸۵ھ کا زمانہ جو حضرت کے فتاویٰ لکھنے کے عروج کا زمانہ تھا اور اس وقت دارالافتاء دارالعلوم میں فتاویٰ کے نقل کا انتظام بھی موجود تھا مگر اس کے باوجود بعض ناقلینِ فتاویٰ نے کئی ضخیم رجسٹروں میں فتاویٰ نقل کرتے وقت فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام ہی نہیں لکھا، عجیب بات یہ ہے کہ ہر سوال کے بعد سائل اور مستفتی کا نام تو بالالتزام لکھا ہے مگر فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام چھوڑ دیا۔

ایسے رجسٹر جب سامنے آئے تو بہت افسوس ہوا کہ ان رجسٹروں میں کئی طویل اور مفصل ومحقق فتاویٰ موجود ہیں، مگر مجیب کی تعیین وتمیز نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس میں کون سا فتویٰ کس شخصیت کا ہے؟ ادھر ان فتاویٰ کے مجیب کی تعیین وتمیز کا اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے لئے اپنی بے پناہ علمی مصروفیات کی بناء پر ان رجسٹروں کے ایک ایک صفحے کو جانچنا تقریباً ناممکن ہے اور فتاویٰ نقل کرنے والے حضرات میں سے بعض کا اب انتقال بھی ہوچکا ہے، وہ ہوں بھی تو اب یہ تعیین مشکل ہے کہ کون سا فتویٰ کس شخصیت کا لکھا ہوا ہے؟ ایسے فتاویٰ کی تبویب کا

کام کرنے والے متخصصین کے مقالوں کو بھی دیکھا، ان حضرات نے بھی مجیب کی تعیین کے بغیر ان پر کام کیا ہے، لہٰذا مجبوراً ایسے رجسٹروں میں موجود حضرت کے کئی نامعلوم فتاویٰ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں کئے جاسکے۔ اب جب کبھی دارالافتاء دارالعلوم کے تمام عمومی فتاویٰ شائع ہوئے تو شاید ان میں یہ فتاویٰ بھی شائع ہوکر سامنے آسکیں۔ لہٰذا بعض فتاویٰ، شروع میں نقل کا انتظام نہ ہونے کی بناء پر، اور بعض مذکورہ صورتِ حال کی بناء پر اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے، اس لئے یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ ہیں۔

طریقۂ کار

پہلے مرحلے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے دستیاب تمام فتاویٰ کو جمع کیا گیا، اور دُوسرے مرحلے میں ان تمام فتاویٰ کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ کرکے فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھا گیا، اور اس میں جس فتویٰ میں صرف ایک سوال اور جواب ہے اسے تو متعلقہ موضوع اور باب میں رکھنا آسان تھا، مگر بہت سارے فتاویٰ ایسے ہیں کہ ان میں مستفتی نے الگ الگ موضوع سے متعلق کئی سوالات کئے ہیں اور ان میں ہر سوال، جواب کا باب اور موضوع الگ ہے، چونکہ ایک ہی کاغذ پر ہونے کی وجہ سے انہیں الگ الگ رکھنا ممکن نہ تھا، لہٰذا ایسے کئی فتاویٰ کو ہاتھ سے الگ لکھا گیا۔

جمع و ترتیب کے بعد تیسرے مرحلے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان فتاویٰ میں موجود حوالوں کی تخریج کی جائے، کیونکہ سن ۱۳۸۷ھ وغیرہ کے زمانے میں فتاویٰ شامیہ کا کوئی استنبولی نسخہ رائج تھا، جبکہ آج کل ''ایچ ایم سعید'' کا نسخہ متداول ہے، لہٰذا اسی نسخے کے مطابق شامی کی عبارات کی تخریج کی گئی ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر ''ایچ ایم سعید'' کا پورا لفظ اور کہیں صرف ''سعید'' کا لفظ لکھا گیا ہے، جس سے یہی مراد ہے۔ اسی طرح تفسیر، حدیث اور فقہ کی دیگر کتب کا بھی یہی معاملہ ہے، لہٰذا ان کتب کے ان نسخوں کے مطابق تخریج کی گئی ہے جو نسخے ہمارے دیار میں رائج اور متداول ہیں۔ چنانچہ ہر عبارت کے شروع یا آخر میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مطبع وغیرہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی علمی فائدے کے پیشِ نظر اس کی تائید میں مزید حوالہ جات بھی لگائے گئے ہیں، کہیں پر عبارات اور کہیں صرف دیگر فقہی کتب کے صفحہ نمبر وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے مرحلے میں یہ کام کیا گیا کہ جہاں فتویٰ میں کوئی حوالہ موجود نہیں تھا، وہاں پر حاشیے میں اس فتویٰ کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں، اور تخریج و تعلیق اور اضافۂ حوالہ جات کا یہ سارا کام متعلقہ فتویٰ کے نیچے حاشیے میں کیا گیا ہے، اور ترتیب یہ رکھی ہے کہ سب سے پہلے سوال، پھر جواب اور جواب میں

جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں حاشیہ نمبر لگایا گیا ہے، پھر اسی فتویٰ کے نیچے لکیر لگا کر حاشیہ میں حوالے اور عبارات درج کی گئی ہیں۔

اور ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے، اور جس فتویٰ پر اکابر میں سے کسی کے دستخط ہیں وہاں ان حضرات کے نام ذکر کر دیئے گئے ہیں، اور مصدق کے دستخط بھی چونکہ عموماً اسی تاریخ یا اس سے ایک آدھ دن بعد میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا مصدق کے نام کے نیچے تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے صرف حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام کے نیچے تاریخ درج کی گئی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب فتاویٰ پُرانے رجسٹروں سے فوٹو اسٹیٹ کرائے گئے تھے اور فوٹو اسٹیٹ کرتے وقت اصل توجہ فتویٰ پر رہی اور تاریخ بعض اوقات صفحہ کے ایک طرف دائیں یا بائیں حصے میں درج ہوتی تھی، اس لئے بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں تاریخ آنے سے رہ گئی، لہٰذا ایسے فتاویٰ میں اندازے سے تاریخ لکھی گئی ہے، لیکن ایسے فتاویٰ کی تعداد بہت کم ہے۔

ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ کے نیچے ''فتویٰ نمبر'' بھی لکھا گیا ہے، اس فتویٰ نمبر سے دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں کا نمبر مراد ہے، اور یہ نمبر لکھنے کی غرض یہ ہے کہ اگر کبھی دارالافتاء کا کوئی ساتھی اصل کی طرف مراجعت کرنا چاہے تو بوقتِ ضرورت یہ مراجعت ممکن ہو۔ تاہم بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں ''فتویٰ نمبر'' نہ آسکنے کی بناء پر ایسے فتاویٰ کے آخر میں فتویٰ کا نمبر نہیں دیا جاسکا، مگر ایسے فتاویٰ کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

خصوصیات

✡ چونکہ حضرتِ والا اپنے مزاج و مذاق کی بناء پر حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی علمی روایات کے امین ہیں، لہٰذا ان حضرات کی طرح حضرت کے فتاویٰ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں الحمدللہ تحقیق اور اعتدال کا وصف نمایاں ہے۔

✡ اس مجموعے میں جدید مسائل پر بھی کئی فتاویٰ ہیں، پہلی جلد میں نسبتاً کم ہیں، جبکہ بعد کی جلدوں میں خصوصاً ''فقہ المعاملات'' جس پر حضرت کو خصوصی دسترس حاصل ہے، سے متعلق کئی جدید فتاویٰ ہیں۔

✡ ویسے تو عوام و خواص کے نزدیک حضرتِ والا کی رائے کو انتہائی محقق و مستند سمجھا جاتا ہے اور کسی فتویٰ کے مستند ہونے کے لئے حضرت کی تصدیق کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے، مگر ان فتاویٰ کی ایک

زائد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے کئی فتاویٰ پر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے تصدیقی دستخط موجود ہیں، جس سے ان فتاویٰ کے درجۂ استناد میں مزید تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔

* فتویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ حوالہ جات اور اس کے ساتھ ساتھ حواشی میں ذکر کردہ عبارات اور حوالوں کی بناء پر عوام کے علاوہ اہلِ علم، خصوصاً اہلِ فتویٰ کے لئے بھی اس ذخیرے سے بھرپور علمی و تحقیقی استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

احقر کی سوچ اور اندازے کے مطابق یہ کام بہت پہلے منظرِ عام پر آجانا چاہئے تھا، اس کی ترتیب، تخریج اور اضافۂ حوالہ جات کا کام بھی بہت پہلے ہوچکا ہوتا، مگر کمپوزنگ میں اغلاط کی کثرت، اور بار بار کی تصحیح وغیرہ کی بناء پر یہ کام مؤخر ہوتا چلا گیا، بالآخر کافی عرصہ خود کمپوزر کے پاس بیٹھ کر تصحیح کرواکر پہلی جلد کا کام مکمل کیا، اس طرح یہ کام احقر کے اندازے سے تقریباً دو سال تأخیر سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

اس کے باوجود اس میں کہیں نفسِ مضمون کی، کہیں حوالے اور عبارت کی، اور کہیں کمپوزنگ کی غلطیوں کا امکان موجود ہے، اس طرح کی تمام تر غلطیوں کی ذمہ داری احقر پر ہے، حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ذات اس سے بَری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ایسی غلطیوں سے احقر کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشنوں میں ان کی تصحیح کی جاسکے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ان کے مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور انہیں بعافیت عمرِ دراز عطا فرماکر ان کا سایہ تادیر ہم سب پر قائم رکھیں، آمین۔

آخر میں قارئین سے احقر، اس کے والدین اور اساتذہ کے لئے بھی دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عافیتِ دارین عطا فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے دربار میں شرفِ قبول سے نواز کر ہمارے لئے اسے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔ انه علی ما یشاء قدیر وبالإجابة جدیر.

احقر
محمد زبیر حق نواز
سابق اُستاذ و رفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۴۲۵/۱۰/۲۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی جلد اوّل آج سے کچھ عرصہ قبل طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی جسے علماء وطلباء کے علاوہ عوام الناس نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا، اور الحمدللہ اہلِ فتویٰ نے اسے فتویٰ کا مأخذ بنا کر اس کی روشنی میں اہم فتاویٰ تحریر کئے، اُمت کے علمی حلقوں میں بلاشبہ اس سے اہم دینی نفع حاصل کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اُستاذِ محترم دامت برکاتہم کو صحت و عافیت کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائیں اور ان کے علم وتفقہ کی روشنی پوری دُنیا میں پھیلائیں اور ان کے علوم و معارف اور فیوض کو تا قیامت جاری وساری رکھیں، آمین۔

اب حضرت اُستاذِ محترم دامت برکاتہم العالیہ کے فتاویٰ کی دُوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس جلد میں زکوٰۃ، صوم، اِعتکاف، حج، نکاح، طلاق، وقف، اَحکام المساجد اور اَیمان و نذور سے متعلق مسائل شامل ہیں۔ جن کی اجمالی اور تفصیلی فہرست کتاب کے شروع میں درج ہے۔ تیسری جلد اِن شاءاللہ ''کتاب الشرکۃ والمضاربۃ'' اور اس سے اگلے اَبواب پر مشتمل ہوگی۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ سے متعلق تفصیل اور اس جلد میں بھی کام کی ترتیب وہی ہے جو جلدِ اوّل میں تھی، جس کی تفصیل جلدِ اوّل میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پیش لفظ اور عرضِ مرتب میں درج ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف مراجعت مناسب ہے، تاہم اس جلد میں درج ذیل نئے اُمور کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

✡ مذکورہ ابواب سے متعلق کئی مکرّر مسائل کو ضخامت وطوالت سے بچنے کے لئے حذف کردیا گیا ہے، مثلاً کتاب الطّلاق کی فصل فی الطلاق الثلاث وأحکامہ میں ''تین طلاقوں'' سے متعلق کئی مسائل کو حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مشورے سے حذف کردیا گیا ہے، تاہم ایک ہی موضوع سے متعلق ایسے مسائل کو باقی رکھا گیا ہے جن میں کوئی نیا علمی فائدہ ہو۔

☆ چونکہ یہ تمام فتاویٰ خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ ہیں، لہٰذا حضرتِ والا دامت برکاتہم کے حکم سے کتاب کی ضخامت سے بچنے کے لئے ہر فتویٰ کے آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا نام نقل کرنے کی بجائے صرف تاریخ اور فتویٰ نمبر لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تاہم جہاں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتویٰ پر اکابر بزرگوں میں سے کسی کے تصدیقی دستخط ہیں وہاں فتویٰ کے آخر میں حضرت کے نام کے ساتھ مصدق کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔

☆ جلدِ اوّل کی طرح جلدِ ثانی میں بھی ضخامت سے بچنے کے لئے سائل کا نام حذف کیا گیا ہے، تاہم سائل اگر خواص اہلِ علم میں سے کوئی ہیں تو ان کا نام ذکر کیا گیا ہے تاکہ سوال و جواب پڑھتے ہوئے سائل کی شخصیت اور ان کا علمی مقام ملحوظ رہے۔

☆ اس جلد کی کتاب الزکوٰۃ میں ''حکومت کا بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا شرعی حکم'' سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تحقیق جو پہلے فقہی مقالات میں شائع ہوئی تھی وہ اب کتابوں کے مروّجہ اور متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ اس مجموعہ میں شامل ہے، اس تحقیق میں ''بینکوں کی رقوم کے اموالِ ظاہرہ میں شامل'' ہونے سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک تازہ وضاحتی نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ یہ اہم نوٹ اس تحقیق کے آخر میں درج ہے۔

☆ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے کئی حضرات کو جوابی خطوط میں کئی فقہی سوالوں کے جوابات دیئے ہیں، اس پر کئی حضرات نے توجہ دِلائی کہ ان خطوط میں موجود فقہی مسائل کو بھی فتاویٰ کے اس مجموعہ میں شامل کرلیا جائے۔ مگر چونکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ذاتی خطوط دارالافتاء میں نہیں آتے اس لئے ایسے فتاویٰ تک رسائی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ چنانچہ جلدِ اوّل میں ان خطوط میں موجود فتاویٰ شاملِ اشاعت نہ ہوسکے، مگر حال ہی میں جب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنے دفتر کی ''سوال و جواب'' اور ''قابلِ حفاظت خطوط'' کی فائلیں بندہ کو عنایت فرمائیں تو اس میں کئی ایسے خطوط نکلے جن میں اہم فقہی تحقیقات اور سوالوں کے جوابات تھے، جن میں بعض تفصیلی جوابات بھی تھے، نمونے کے طور پر اس جلد میں کتاب النکاح کی فصل فی الجھاز والمھر میں ایک تفصیلی فتویٰ ''مہر اعزازیہ ہے یا عوض اور اُجرت؟'' ملاحظہ فرمائیں۔ ان خطوط میں جلدِ اوّل سے متعلق جو مسائل تھے وہ اِن شاء اللہ جلدِ اوّل کے اگلے ایڈیشن میں شامل کئے جائیں گے، جو مسائل جلدِ ثانی سے متعلق تھے وہ متعلقہ ابواب کے تحت اس میں شامل کردیئے گئے ہیں اور حاشیہ میں ایسے مسائل کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اور اگلی جلدوں سے متعلق ایسے مسائل اِن شاء اللہ اگلی جلدوں میں شاملِ اشاعت ہوں گے۔

☆ جلدِ اوّل کی اشاعت اور جلدِ ثانی کے مسوّدہ پر نظرِ ثانی کے بعد حضرتِ والا دامت برکاتہم

نے جس طرح پسندیدگی اور مسرّت کا اظہار فرمایا اور اپنی مشفقانہ دُعاؤں سے نوازا، بلاشبہ بندہ کے لئے وہ دُعائیں دُنیا و آخرت کا حقیقی سرمایہ ہیں۔ اور حلقۂ قارئین میں جلدِ اوّل کی مقبولیت اور نافعیت اور ان کے اصرار و طلب کے پیشِ نظر خواہش اور حتی المقدور کوشش ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد منظرِ عام پر آجائیں۔ قارئین سے دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کی جلد تکمیل فرمادیں اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ساتھ ساتھ بندہ کے لئے بھی اس کام کو ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت بنادیں، آمین ثم آمین۔

اہم اعلان

قارئین سے درخواست ہے کہ اگر کسی کے پاس حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایسے خطوط موجود ہوں جن میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے کسی فقہی سوال کا جواب عنایت فرمایا ہو تو برائے کرم ایسے خطوط احقر کو دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی یا ''مکتبہ معارف القرآن کراچی'' کے پتے پر فوٹو اسٹیٹ اور ڈاک خرچ کی وضاحت کے ساتھ ارسال فرمائیں تاکہ فتاویٰ کے اس مجموعہ میں متعلقہ ابواب کے تحت انہیں بھی شامل کیا جاسکے۔ ایسے فتاویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے علاوہ خط بھیجنے والے حضرات کے لئے بھی اِن شاء اللہ صدقۂ جاریہ ہوں گے۔ والسلام

بندہ
محمد زبیر حق نواز
رفیق دار الافتاء
جامعہ دار العلوم کراچی
۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ:

تقریباً تین سال پہلے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی دو جلدیں منظرِ عام پر آئیں جو "کتاب الإیمان والعقائد" سے "کتاب الطلاق" تک کے ابواب پر مشتمل تھیں۔ اب الحمدللہ "فقہ المعاملات" سے متعلق تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو "کتاب الشرکۃ والمضاربۃ" سے لے کر "کتاب القسمۃ" تک کے ابواب پر مشتمل ہے، اس جلد میں درج ذیل ابواب سے متعلق مسائل ہیں:-

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ، کتاب البیوع، کتاب الربا والقمار والتأمین، کتاب الإجارۃ، کتاب الرھن، کتاب الھبۃ، کتاب الودیعۃ والعاریۃ، کتاب اللقطۃ، کتاب الغصب والضمان، کتاب الجھاد، کتاب الامارۃ والسیاسۃ، کتاب الدعویٰ والشھادات والقضاء، کتاب الحدود، کتاب الجنایات، کتاب الصلح، کتاب الوکالۃ، کتاب القسمۃ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو علمی دُنیا میں جو اِمتیازی شان عطا فرمائی ہے، خصوصاً حدیث، فقہ اور فتویٰ کے میدان میں جو مقامِ بلند عطا فرمایا ہے اس کی بنا پر توقعات سے بڑھ کر بحمداللہ ان فتاویٰ کو اہلِ علم اور اَربابِ فتویٰ میں غیرمعمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور چونکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے قلم میں خداداد کشش اور اَندازِ بیان نہایت آسان و دِلنشیں ہے اس لئے پچھلی دونوں جلدیں اہلِ فتویٰ کے علاوہ عوام الناس میں بھی نہایت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ پچھلی جلدوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان کے کئی ایڈیشنوں کی اشاعت، ان کی مانگ میں مسلسل اِضافہ اور مختلف زبانوں میں ترجمے کی درخواستوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اطلاع کے مطابق انگلش اور بنگلہ زبانوں میں اس کا ترجمہ جاری ہے اور حال ہی میں پشتو میں ترجمہ ہوکر یہ جلدیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ اُردوداں

عوامی طبقے میں بھی اس کتاب نے دیگر کتبِ فتاویٰ کی نسبت اِمتیازی حیثیت حاصل کی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے سامنے جو حضرت کی شخصیت سے واقف ہو ان فتاویٰ کی اِشاعت کا ذِکر ہوتا ہے تو وہ نہایت بے چینی سے کتاب کے حصول کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتبِ تفسیر میں جس طرح حضرت کے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی معرکۃ الآراء تفسیر ''معارف القرآن'' کو بلندی اور مقبولیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح کتبِ فتاویٰ میں ''فتاویٰ عثمانی'' کو بھی عوام وخواص میں ایسی ہی مقبولیتِ عامہ عطا فرمائی ہے، فللّٰہ الحمد و لہ الشکر۔

ایسی صورتِ حال میں بجاطور پر اَحباب کا اِصرار تھا کہ اگلی جلد فوری طور پر منظرِ عام پر آنی چاہئے، ان کا اِصرار اس وجہ سے بھی زیادہ تھا کہ یہ جلد معاملات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی میدان ہے، اور اس کی ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے، نیز بندہ کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ تیسری جلد حتی الامکان جلد تکمیل پذیر ہو، مگر بندہ کی کمزوری کے علاوہ ایک اہم سبب اس کی تاخیر کا یہ بھی تھا کہ یہ جلد فقہ المعاملات پر مشتمل تھی جس پر تحقیق وتخریج کا کام بقیہ حصوں کے مقابلے میں نسبتاً دُشوار اور زیادہ توجہ طلب تھا، خصوصاً جدید فقہی مسائل کی تخریج میں اُصولِ فتویٰ کے مطابق اوّلاً تو اس کا صریح جزئیہ اور حوالہ تلاش کیا جاتا ہے، ورنہ قریب ترین نظیر یا قدیم مثال سے استیناس کرنا پڑتا ہے، اور آخری درجے میں اُصولی عبارات سے مسئلے کا حل نکالا جاتا ہے، نیز محض حوالہ جات کے اِعتبار سے ہی نہیں بلکہ مسئلے کے عنوان، ابواب کی ترتیب، موضوعات کی تقدیم وتاخیر، غرض ہر پہلو سے اس جلد کے کام کا پہلی جلدوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا ناگزیر تھا، تاہم اس کے باوجود بندہ اسے اپنی کمزوری قرار دیتے ہوئے اس تاخیر پر معذرت خواہ ہے، اب اِن شاء اللہ چوتھی جلد توقع سے پہلے منظرِ عام پر لاکر اس تاخیر کے اِزالے کی کوشش کی جائے گی۔

فتاویٰ کی دیگر جلدوں کے مقابلے میں اس جلد کو اس اِعتبار سے اِمتیاز حاصل ہے کہ یہ حصہ فقہ المعاملات سے متعلق ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خصوصی موضوع اور میدان ہے، اور ایک بزرگ کے بقول اس باب میں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کو اپنے وقت کا ''اِمام محمدؒ'' بنایا ہے۔ دُنیا بھر میں معاملات کے متعلق جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے اُمت کی نظریں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف اُٹھتی ہیں اور مشرق ومغرب کے لوگ جدید مسائل کے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس سوالات بھیجتے اور حضرت کی رائے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور عرب وعجم میں ہر بڑے علمی فورم پر جدید مسائل میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے کا خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے، چنانچہ اب تک کتبِ فتاویٰ میں سب سے زیادہ جدید مسائل اس کتاب میں ذِکر کئے گئے ہیں۔

کتاب میں آنے والے فتاویٰ سے متعلق یہاں چند عمومی باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو صرف اس جلد سے متعلق نہیں بلکہ دیگر جلدوں سے بھی متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ بعض سوالات کے جوابات میں قاری کو اِجمال و اِختصار معلوم ہوتا ہے، قاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کا جواب کسی قدر تفصیلی ہونا چاہئے تھا۔ یہاں قارئین پر یہ بات واضح ہو کہ ایسے مقامات پر اِختصار کی کئی وجوہات ہوتی ہیں، ان میں ایک اہم وجہ جو درحقیقت قارئین کے علم میں نہیں ہوتی، یہ ہے کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے پاس بذریعہ ڈاک جو سوالات آتے ہیں، ان میں بسا اوقات مستفتی ایک تفصیلی سوال نامہ بھیجتا ہے، جس میں سائل نے کئی سوالات پوچھے ہوتے ہیں، مگر سائل کا اصل مقصود کوئی ایک سوال ہوتا ہے، جس کی سائل نے مکمل تفصیل طلب کی ہوتی ہے، اور مستفتی کے باقی سوالات جو مختلف نوعیت اور مختلف ابواب سے متعلق ہوتے ہیں ضمنی ہوتے ہیں، جن کے متعلق وہ صرف جواز وعدمِ جواز جاننا چاہتا ہے، زیادہ تفصیل کا وہ طلب گار نہیں ہوتا، چنانچہ حضرتِ والا دامت برکاتہم سائل کے مقصودی اور مرکزی سوال کا تو تفصیلی جواب مرحمت فرماتے ہیں، اور اس کے مختلف النوع ضمنی وجزوی سوالات کا مختصر جواب عنایت فرماتے ہیں۔

اس کے بعد احقر ان مختلف النوع سوالات کو الگ الگ کرکے ہر سوال کو اس کے متعلقہ باب میں منتقل کرتا ہے، قارئین چونکہ سائل کے اصل سوال اور اصل حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں، اس لئے جب وہ کسی سوال کا کوئی مختصر جواب دیکھتے ہیں تو اِجمال محسوس کرتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً وہ کسی تفصیلی سوال نامے کا کوئی ضمنی سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں اس مقام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُصولِ فتویٰ کے مطابق ضروری اِختصار سے کام لیا ہے۔

ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعے میں بہت سے فتاویٰ ایسے ہیں جو کافی عرصہ تقریباً چالیس پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے، اور اس عرصے میں بعض مسائل میں چونکہ تحقیق بدل گئی ہے، اس لئے کئی فتاویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے نظرِ ثانی کے دوران مناسب مقامات پر تبدیلی فرمادی ہے، تاہم اس کے باوجود اگر کہیں نفسِ مضمون یا فتویٰ یا حوالہ وغیرہ میں کوئی غلطی ہو تو اس کی ذمہ داری بندۂ ناچیز پر ہے، حضرتِ والا کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی ذِکر کرنا ضروری ہے جس کی طرف پہلی جلد میں اِشارہ کیا گیا تھا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ والا دامت برکاتہم سے جو علمی وتحقیقی کام لیا ہے، خصوصاً فقہ وفتویٰ کے میدان میں حضرت کی تحقیقات اور فتاویٰ کا کام اتنا ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے کہ اسے منضبط کرنا مشکل ہے، اس لئے اس جلد کے بعد چوتھی جلد بھی بحمداللہ تیاری کے مراحل میں ہے، اور بہت جلد اِن شاء اللہ منصۂ شہود پر

جلوہ گر ہوگی، تاہم چوتھی جلد کی اِشاعت کے بعد بھی یہ کہنا دُرست نہیں ہوگا کہ اس مجموعے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ آگئے ہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے ذِکر کیا گیا تھا کہ ''فتاویٰ عثمانی'' دراصل حضرت کے ان فتاویٰ کے مجموعے کا نام ہے جو دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے رجسٹروں میں محفوظ ہوئے ہیں، جبکہ بعض فتاویٰ اِبتداء میں نقل وحفاظت کا اِنتظام نہ ہونے کی وجہ سے شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے، اور ایک بڑی تعداد ان فتاویٰ کی ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے دُنیا بھر سے اُردو، انگریزی اور عربی میں آنے والے خطوط کے جوابات میں تحریر فرمائے، اور چونکہ خطوط کی نقل محفوظ رکھنے کا کوئی اِنتظام نہیں ہے اس لئے ایسے فتاویٰ بھی شاملِ اِشاعت نہیں ہوسکے۔ کچھ اہم نوعیت کے بعض خطوط محفوظ رکھے گئے ہیں، ان کو اگرچہ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ پر بھی بذریعہ ای میل حضرت جوابات عطا فرماتے ہیں جو عموماً معاملات سے متعلق جدید اور اہم نوعیت کے ہوتے ہیں، وہ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح ''البلاغ'' انگلش میں بھی سوالات کے جوابات کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو حضرتِ والا تحریر فرماتے ہیں، وہ فتاویٰ بھی اس میں شامل نہیں ہیں (البتہ انگریزی فتاویٰ کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے)۔

بہرحال! اس مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ سمجھنا کہ یہ حضرت کے تمام فتاویٰ ہیں، غلط ہوگا، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی مجموعوں کی گنجائش ہے، ہماری دُعا ہے اور قارئین سے بھی اس خصوصی دُعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کو بعافیت عمرِ دراز عطا فرمائیں اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا سایہ تادیر سلامتی کے ساتھ ہم پر قائم رکھیں تاکہ علوم وعرفان کا یہ سلسلہ چلتا رہے اور اُمت اسی طرح حضرتِ والا کی ذات سے اِستفادہ کرتی رہے۔

آخر میں قارئین سے درخواست ہے کہ اگر وہ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ بندہ اور اس کے والدین واساتذہ کو بھی اپنی نیک دُعاؤں میں یاد رکھیں گے تو یہ ان کا اِحسانِ عظیم ہوگا۔

والسلام

محمد زبیر حق نواز

۲ر ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ

عرضِ مرتّب

اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے فتاوی عثمانی کی جلد چہارم مکمل ہو کر قابل اشاعت ہوئی، اوراس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ جلد درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

کتاب الاسترقاق، کتاب الذبائح، کتاب الاضحیه، کتاب احیاء الموات، کتاب الاشربه، کتاب الطب والتداوی، کتاب الحظر والاباحة، کتاب المتفرقات

اس جلد میں بھی کام کی ترتیب وہی ہے جو پچھلی جلدوں میں تھی جسکی تفصیل سابقہ جلدوں میں حضرت والا دامت برکاتہم کے پیش لفظ اورعرض مرتب میں درج ہے، تفصیل جاننے کیلئے جلد اول کا مقدمہ ملاحظہ کرلیا جائے۔

فتاویٰ عثمانی جلد سوم کی جب اشاعت ہوئی تو باقی ماندہ فتاویٰ کو سرسری دیکھ کر خیال یہ تھا کہ چوتھی جلد تک حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے اب تک کے خودنوشتہ فتاوی مکمل ہو جائینگے مگر جب ان فتاویٰ کو جمع وترتیب دینا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ضخامت کے بڑھ جانے کے اندیشہ سے دوابواب ”کتاب الوصیة،، اور ”کتاب الفرائض،، کو جلد چہارم میں شامل نہیں کیا جارہا، نیز اس جلد کی کتاب المتفرقات میں بھی متفرق موضوعات سے تعلق رکھنے والے مختلف نوعیت کے مسائل بھی شامل نہیں کئے جارہے ورنہ اس جلد کا حجم گذشتہ جلدوں سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا، اور جلدوں میں یکسانیت نہیں رہے گی، اس لئے چار جلدوں میں کام سمیٹنا ناممکن اور پانچویں جلد ناگزیر ہے۔

اس جلد سے متعلق ایک اہم وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس جلد میں **کتاب الحظر والاباحة** اور **کتاب المتفرقات** درج ہیں، اور یہ دونوں عنوانات انتہائی وسیع ہیں، عنوانات کی وسعت کی بناء پر کوشش رہی کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مختلف ومتفرق موضوعات کے فتاوی شامل

کرلئے جائیں، چنانچہ ایسے تمام فتاویٰ ان عنوانات کے تحت جمع کرنے کے ساتھ ساتھ بعض وہ فتاوی بھی شامل کرلئے گئے کہ فقہی ترتیب کے لحاظ سے اصولی طور پر انہیں گذشتہ جلدوں میں مقررہ عنوانات کے تحت آنا چاہئے تھا مگر کسی وجہ سے (مثلاً پچھلی جلدوں کی شاعت کے وقت تک وہ لکھے نہیں گئے تھے یا دستیاب نہیں ہوسکے تھے......وغیرہ) وہ ان جلدوں میں شاملِ اشاعت نہیں ہوسکے تھے، مجبوراً ایسے فتاوی بھی مذکورہ دونوں ابواب کے تحت شامل کرلئے گئے ہیں۔

ایک بات جو سابقہ جلدوں میں کہی گئی مکرر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ''فتاویٰ عثمانی'' کے نام سے فتاویٰ کا جو مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ حضرت والا دامت برکاتہم کے کل فتاویٰ ہرگز نہیں، یہ صرف وہ فتاویٰ ہیں جو دار الافتاء دار العلوم کراچی کے نقل فتاویٰ کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں، اور ان سے نقل کرکے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا، اس کے علاوہ بھی حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے ہزاروں خودنوشتہ فتاویٰ ہیں، مثلاً انگریزی میں تحریر کئے گئے فتاویٰ، بذریعہ ای میل بھیجے جانے والے فتاویٰ اور یومیہ ڈاک، جس میں ملک و بیرونِ ملک سے روزانہ بیسیوں خطوط آتے ہیں، ان میں درج سوالات کے جوابات حضرت والا روز کے روز تحریر فرماتے ہیں، ایسے تمام فتاویٰ کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں ہے، مگر چونکہ انکا ریکارڈ دارالافتاء میں محفوظ نہیں ہے، اسلئے ایسے فتاوی بھی اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے۔

نیز خودنوشتہ فتاوی کے علاوہ حضرت والا دامت برکاتہم کے مصدّقہ فتاوی کا بہت بڑا ذخیرہ دارالافتاء کے رجسٹروں میں محفوظ ہے جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، ان میں سے بہت سے فتاوی نہ صرف حضرت والا کی تصدیق سے مزین ہیں بلکہ ان میں بے شمار فتاویٰ ایسے ہیں جو حضرت والا دامت برکاتہم کی خصوصی ہدایات اور رہنمائی میں تحریر کئے گئے ہیں نیز ان فتاوی میں بہت بڑی تعداد ایسے فتاوی کی ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم کے املاء اور خودنوشتہ اضافہ جات پر مشتمل ہیں، ایک اندازے کے مطابق ایسے فتاوی کی جلدوں کی تعداد درجنوں میں ہوگی اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم کے مصدّقہ فتاویٰ کے اس علمی اور تحقیقی ذخیرہ کی تحقیق واشاعت ایک فرد کے بس کی بات نہیں، اس کیلئے ایک مستقل ادارہ اور محققین کی پوری جماعت کی ضرورت ہے۔ ایسے

تمام فتاوی اس مجموعہ ''فتاوی عثمانی،، میں شامل نہیں ہیں۔

نیز الحمدللہ حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاوی تحریر فرمانے اور فتاوی کی تصدیق کا یہ سلسلہ تاحال جاری وساری ہے اور دلی دعاء ہے کہ اللہ تعالی حضرت والا دامت برکاتہم کا سایہ تادیر قائم ودائم رکھیں تاکہ امت کی رہنمائی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ چنانچہ فتاوی عثمانی کی پچھلی تین جلدوں کی اشاعت کے بعد بھی حضرت والا دامت برکاتہم نے سینکڑوں ایسے نئے فتاوی تحریر فرمائے جنکا تعلق کتاب الطهارة سے لے کر جلد سوم کے آخری باب (کتاب القسمة تک) سے ہے ایسے فتاوی کے بارے میں اب تک یہ کوشش رہی کہ انہیں پچھلی جلدوں کے نئے اڈیشنوں میں متعلقہ ابواب کے تحت سمودیا جائے مگر دو باتیں اس میں باعث رکاوٹ ہیں۔

(۱)...... ایک تو اب الحمدللہ ایسے فتاوی کی تعداد سینکڑوں میں ہے، اور روز بروز بڑھ رہی ہے۔

(۲)...... دوسرے ایسے فتاوی کو پچھلی جلدوں کے جدید اڈیشنوں میں شامل کرنے سے وہ تمام قارئین ان سے محروم ہورہے ہیں جنہوں نے قدیم اڈیشن خرید رکھے ہیں، ان قارئین پر مذکورہ نئے فتاویٰ سے استفادہ کیلئے ہمیشہ نئے اڈیشنوں کی خریداری کا بوجھ ڈالنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ ایسے تمام جدید فتاویٰ پانچویں جلد کے آخر میں ''مسائل منثورہ،، اور ''تکملہ،، کے طور پر ترتیب وار شائع کئے جائیں گے۔

اس جلد میں حجم کی طوالت سے بچنے کیلئے حسب سابق مکررات کو حذف کیا گیا ہے مگر جو کوئی فتویٰ کسی زائد فائدہ پر مشتمل تھا اسے شامل اشاعت کیا گیا ہے جیسا کہ اس جلد کی کتاب الذبائح فصل فی الصید میں ''کوے کی حلت پر مفصل تحقیق،، کے عنوان سے شامل کیا گیا حضرت والا دامت برکاتہم کا مفصل فتویٰ اگرچہ پہلے ''فقہی مقالات''میں چھپ چکا ہے مگر اس فصل میں اسی موضوع پر حضرت والا دامت برکاتہم کے کئی دیگر فتاویٰ میں جابجا اسی مفصل تحقیقی فتوی کا حوالہ دیا گیا ہے، نیز اس مفصل فتوی میں حضرت والا دامت برکاتہم نے حال ہی میں ایک تفصیلی اضافہ بھی تحریر فرمایا ہے، جو اس فتویٰ کے حاشیہ میں درج ہے، ان وجوہات کی بناء پر یہ مفصل فتوی

حضرت والا دامت برکاتہم کے اس جدید اضافہ اورمحولہ کتب کے مروجہ اور متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ اس جلد میں شامل کیا گیا ہے۔

بعض فتاوی ایسے ہیں جن کے سوالات بہت طویل تھے یا سائلین نے سوالات کے ساتھ اپنی طویل تحقیقات بھی ہمراہ لف کر کے بھیجی تھیں، حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی ھدایت کے مطابق حجم کی طوالت سے بچنے کیلئے ایسے سوالات اور مرسلہ تحقیقات مکمل شائع کرنے کی بجائے سوال اور اس تحقیق کا صرف متعلقہ حصہ شامل کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب الاضحیہ میں'' غیر کی طرف سے قربانی میں تعدد کی تحقیق،، کے مسئلہ میں سوال کے ساتھ مرسلہ طویل تحقیق کا صرف متعلقہ حصہ شامل کیا گیا ہے۔ تاہم بعض تحقیقات ایسی ہیں جن پر مجموعی حیثیت سے حضرت والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا ایسی تحقیقات مکمل شامل کی گئی ہیں کیونکہ انہیں ادھورا شائع کرنے اور سائل کا پورا سوال اور مرسلہ تحقیق سامنے نہ ہونے کی صورت میں حضرت والا دامت برکاتہم کا مکمل جواب سمجھ آنا ممکن نہیں تھا جیسا کہ کتاب احیاء الموات میں'' خود رو جنگلات کے شرعی حکم،، سے متعلق سائل کی تحقیق (بعنوان جنگلات اور رائلٹی کا مسئلہ) اور کتاب الطب و التداوی میں''ٹیسٹ ٹیوب بے بی،، سے متعلق سوال کے ساتھ مرسلہ تحقیقات وغیرہ۔ایسے مواقع میں سوالات کے ساتھ یہ تحقیقات بھی بے کم وکاست درج کردی گئیں۔

آخر میں قارئین سے خصوصی دعاء کی درخواست ہے کہ اللہ تعالی حضرت والا دامت برکاتہم کو صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطاء فرمائیں اور تادیر سلامتی کے ساتھ حضرت والا دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر قائم رکھیں تا کہ علوم وعرفان کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے اور امت اسی طرح حضرت والا دامت برکاتہم کی ذات سے استفادہ کرتی رہے۔

حضرت والا دامت برکاتہم کے ساتھ قارئین اگر بندہ اور اسکے والدین واساتذہ کو بھی اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں تو یہ ان کا احسانِ عظیم ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

بندہ محمد زبیر حق نواز

۵/شوال ۱۴۳۶ھ

کتاب الإیمان و العقائد

(ایمان وعقائد کا بیان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فصل فی المتفرّقات﴾
(ایمان وعقائد سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے نقش کو چومنے، اس جیسے نعل پہننے اور اس کے احترام کا حکم

سوال:- مکرّم ومحترم جناب مفتی صاحب، دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اما بعد!

۱:- جو چیز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے متصل ہوگئی، اس کی برکات کا انکار تو کوئی جاہل یا ملحد ہی کرے گا، لیکن اس شے کی مثل ہاتھ سے تیار کرلی جائے تو کیا اس میں بھی وہ برکت آجاتی ہے؟ بالفاظ دیگر متبرک شے کی تصویر بھی متبرک ہوتی ہے؟

۲:- آج کل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ بہت عام ہوگیا، لوگ اس کو چومتے ہیں، برکت کے لئے سر پر رکھتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس نقشے کی یہ حیثیت مُسلَّم کہ اس سے آپ صلی علیہ وسلم کے نعل مبارک کی صورت معلوم ہوگئی، روایاتِ حدیث میں مذکور نعل کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

۳:- کیا اس نقشے کے مطابق نعل بنوا کر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا ہمارے لئے نمونہ ہے، آپؐ کی پگڑی جیسی پگڑی، قمیص جیسی قمیص بنوانا، پہننا سب باعثِ سعادت اور محبت کا تقاضا ہے، کیا آپؐ کے جوتے جیسا جوتا پہننا بھی محبت کا تقاضا ہے یا نہیں؟

۴:- نیز یہ بھی قابلِ دریافت ہے کہ یہ نقشہ اس وقت عام مروّج تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا؟ آپؐ کا نعل مبارک صحابہ رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں موجود تھا، دیگر مستعمل کپڑوں، برتنوں کی طرح اس کو سنبھال کر رکھا گیا۔ جن حضرات کے پاس یہ موجود نہیں تھا، کیا کسی روایت سے ثابت ہے کہ وہ لوگ کاغذ پر اس کی صورت بنا کر برکت حاصل کرتے ہوں؟ اگر ثابت نہ ہو تو آج اس کو باعثِ ثواب سمجھنا، سفر میں ساتھ رکھنا، برکت کے لئے دُکانوں، مکانوں پر لگانا کیا بدعت نہیں ہوگا؟

۵:- روضۂ اقدس کی صحیح تصویر یعنی فوٹو، بیت اللہ کی صحیح تصویر بھی باعثِ برکت ہے یا نہیں؟ اب لوگ ان کپڑوں اور قالینوں پر نماز پڑھنا بے ادبی سمجھنے لگ گئے ہیں جن پر روضۂ اقدس کی تصویر ہو، اس کی کیا حیثیت ہے؟

۶:- اب نقشِ خاتم بھی شائع ہوگیا ہے، لوگ اس کے تصوّر کو انوار و برکات کا باعث سمجھنے لگے ہیں، اس کی کیا شرعی حیثیت ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ غالی لوگوں کی طرف سے جلد ہی آپؐ کی اُونٹنی اور بغل اور حمار کی مثل شائع ہوکر ان کا بھی احترام نہ شروع ہوجائے۔ میرے غیر مرتب الفاظ کو اپنے مرتب الفاظ میں منتقل کر کے سوال و جواب اپنے ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع فرمادیں تو میرے جیسے کئی متحیر لوگوں کی رہنمائی ہوجائے گی۔

والسلام

عبدالمجید غفرلہٗ

باب العلوم، کہروڑ پکا

بخدمتِ اقدس جناب مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا مفصل استفتاء نعل مبارک کے نقشے کے بارے میں کافی عرصہ پہلے مل گیا تھا، وہ برابر زیرِ غور رہا، آخر میں مشورے کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کی خدمتِ گرامی میں پیش کیا، ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرتِ والا خود جواب تحریر فرمانے کے لئے تیار ہوگئے، چنانچہ یہ جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کا لکھا ہوا ہے۔

والسلام

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۱۶/۷/۲۰ھ

مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب کے نام آیا تھا، انہوں نے احقر کو مشورے کے لئے بھیجا، احقر نے جو کچھ سمجھ میں آیا، لکھ دیا، اور آنجناب کی خدمت میں اس خیال سے ارسال کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہوگی تو آنجناب اس پر متنبہ فرمائیں گے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

جواب ۱، ۲:- شاید جناب کے علم میں ہوگا کہ حکیم الاُمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "زاد السعید" میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ شائع فرمایا تھا اور اس کو سر پر رکھ کر دُعا کرنے کی بھی فی الجملہ ترغیب دی تھی، اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا، بعد میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر حضرتؒ سے خط و کتابت کی جو کفایت المفتی جلد:۲ صفحہ:۶۱ تا ۶۹[۱] اور امداد الفتاویٰ جلد:۴ صفحہ:۳۲۸ تا ۳۳۲[۲] میں مکمل شائع ہوچکی ہے۔ اس خط و کتابت کے مطالعے سے مسئلے کی شرعی حیثیت بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کا تعلق ہے جو آپؐ کے زیرِ استعمال رہے ہوں یا آپؐ کے جسمِ اطہر سے مس ہوئے ہوں، ان سے تبرک یا انہیں بوسہ دینا یا سر پر رکھنا متعدّد صحابہ کرامؓ اور علمائے متقدمین سے ثابت ہے، اور جیسا کہ خود آنجناب نے ذکر فرمایا ہے وہ محلِ اِشکال نہیں۔ البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کی کوئی تصویر بنائی جائے یا اس کا کوئی نقشہ بنایا جائے تو وہ اگرچہ اصل آثار کے مساوی نہ ہوگا، لیکن چونکہ اصل کے ساتھ مشابہت اور مشاکلت کی وجہ سے اس کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فی الجملہ ایک نسبت حاصل ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اپنے شوقِ طبعی اور محبت کے داعیہ سے اس کا بھی ادب کرے اور اسی محبت کے داعیہ سے اسے بوسہ دے یا آنکھوں سے لگائے تو فی نفسہٖ اس کی ممانعت پر بھی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا فی نفسہٖ ایسا کرنا مباح ہوگا، بلکہ جس محبت کے داعیہ سے ایسا کیا جارہا ہے وہ محبت ان شاء اللہ موجبِ اجر بھی ہوگی بشرطیکہ اس خاص عمل کو بذاتہٖ عبادت نہ سمجھا جائے، کیونکہ عبادت کے لئے ثبوتِ شرعی درکار ہے۔ البتہ جواز کے لئے کسی مستقل دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے ممانعت کی دلیل نہ ہونا بھی کافی ہے۔ اور اس تفصیل میں دونوں صورتیں شامل ہیں، خواہ نقش اصل کے بالکلیہ مطابق ہو یا بالکلیہ مطابق نہ ہو، کیونکہ مشابہت کی وجہ سے فی الجملہ نسبت دونوں کو حاصل ہے۔

یہ تو مسئلے کی اصل حقیقت تھی، لیکن چونکہ ان نازک حدود کو سمجھنا اور ان کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا عوام کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس میں حدود سے تجاوز نہ ہوجائے، مثلاً یہ کہ ان اعمال کو بذاتہٖ عبادت سمجھا جانے لگے یا ادب و تعظیم میں حدود سے تجاوز ہوکر مشرکانہ افعال یا اعتقادات اس کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نقشوں کی عمومی تشہیر اور ان کی طرف ترغیب وغیرہ سے اجتناب ہی کیا جائے، اس لئے حضرت حکیم الاُمت قدس اللہ سرہٗ نے اپنے

---

(۱) کفایت المفتی ج:۲ ص:۹۱ تا ۹۹ (طبع جدید دار الاشاعت)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۷۴ تا ۳۷۹ و ۵۳۳ تا ۵۳۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

رسالہ "نیل الشفاء بنعل المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" سے بعد میں رُجوع فرمالیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ تشہیر کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر کوئی شخص حدود میں رہ کر مذکورہ افعال کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی دُرست نہیں۔

۳:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعل شریف جیسی نعل بنواکر پہننے کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی کوئی تصریح تو نہیں دیکھی، البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ معاملہ ذوق کا ہے، اور مذاق مختلف ہوسکتے ہیں، ایک مذاق یہ ہے کہ جس چیز کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آثارِ متبرکہ میں سے کسی کے ساتھ مشابہت حاصل ہو وہ تو سر اور آنکھوں پر رکھنے کی چیز ہے، نہ یہ کہ اس کو پاؤں میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس مذاق کے تحت اسے پہننے سے احتراز کرے تو یہ اس کے مذاقِ تعظیم ومحبت کا تقاضا ہے جس پر وہ قابلِ ملامت نہیں، جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ سبز رنگ کا جوتا بھی اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ گنبدِ خضراء کا رنگ سبز ہے۔ اور دُوسرا مذاق یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل اور ہر ادا میں حتی الامکان حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی نقل اُتارنے کی کوشش کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس جیسا لباس پہنے، اور اس نقطۂ نظر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسا نعل بنواکر پہنے اور مقصود اِتباع ہو تو بظاہر اس پر بھی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔ چونکہ اس کا مقصود اِتباع ہے، اس لئے بظاہر اس میں اہانت کا بھی کوئی پہلو نہیں۔ چنانچہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ کہیں منقول نہیں کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسے جوتے پہننے سے احتراز کا اہتمام کیا ہو، بالخصوص جبکہ اس دور میں جوتوں کی اوضاع میں اتنا تنوّع بھی نہیں تھا، لہٰذا جیسا عرض کیا گیا یہ ذوق کی بات ہے اور کوئی ذوق قابلِ ملامت نہیں۔

۴:- یہ بات تلاش کے باوجود نہیں مل سکی کہ آیا یہ نقشہ عام مروّج تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔

۵،۶:- روضۂ اقدس یا بیت اللہ کی صحیح تصویر کا حکم بھی قریب، قریب ایسا ہی ہے کہ ان کو اصل کے ساتھ تشابہ کی ایک نسبتِ قویہ حاصل ہے، نیز انہیں دیکھ کر اس کا اِستحضار قوی ہوتا ہے، لہٰذا ان کا احترام کرنا چاہئے، یعنی ان کو کسی موضعِ اہانت میں استعمال کرنا دُرست نہیں، جہاں تک ان کے باعثِ برکت ہونے کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ کسی جگہ ان کے لگانے سے ان شعائر کا بار بار اِستحضار ہوتا ہے، اور یہ اِستحضار یقیناً باعثِ برکت ہے۔

جائے نمازوں پر فی نفسہٖ کسی بھی قسم کے نقش پسندیدہ نہیں، لیکن اگر کسی جائے نماز پر حرمین شریفین

میں سے کسی کی تصویر اس طرح بنی ہوئی ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے نہیں آتی تو اس میں بھی اہانت کا کوئی پہلو نہیں، البتہ موضعِ سجود میں بیت اللہ کے سوا کسی اور چیز کی تصویر بالخصوص روضۂ اقدس کی شبیہ میں چونکہ ایہام خلافِ مقصود کا ہوسکتا ہے اس لئے اس سے احتراز مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۷:- نقشِ خاتم کے بارے میں بھی وہی تفصیل ہے جو نقشِ نعلین کے بارے میں عرض کی گئی، البتہ ظاہر ہے کہ ان غیر ذی رُوح اشیاء کے نقوش پر ذی رُوح کے نقوش کو ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا، کہ ذی رُوح کا نقش یا تصویر بہرصورت ممنوع ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۶/۶/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰/۲۰۳)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۴۱۶/۷/۲۱ھ

کفار کے نابالغ بچوں کا کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک بچہ کافر کے گھر پیدا ہوا اور بچپن ہی میں مرگیا، کیا یہ بچہ جنت میں جائے گا یا نہیں؟

جواب:- کافروں کے گھر پیدا ہونے والا بچہ جس کے ماں باپ دونوں کافر ہوں، دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے کافروں ہی کے حکم میں ہوتا ہے، لیکن آخرت کے اَحکام کے لحاظ سے اس کا کیا ہوگا؟ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے،[۱] صحیح علم اللہ ہی کو ہے، اور اس مسئلے پر دین کا کوئی عملی مسئلہ موقوف نہیں، لہٰذا اس کی کھود کرید میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ "من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ"۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۲۴/۲۷ ه)

سوشلزم کی حمایت کرنے والے کا حکم

سوال:- سوشلزم کی حمایت کرنے والے (سوشلزم معاشرہ جو کہ اسلام کے خلاف ہے) کا شریعت کی رُو سے کیا مقام ہے؟

۲:- نظامِ مصطفیٰ پر قربان ہونے والے اور مخالفینِ نظامِ مصطفیٰ کا کیا مقام ہے؟

جواب ۱:- سوشلزم کی حمایت اگر اس بناء پر کی جائے کہ سوشلزم کا معاشی پروگرام (معاذ اللہ) اسلام کی معاشی تعلیمات سے افضل ہے، تو یہ صریح کفر ہے، اور اگر اس لحاظ سے کی جائے کہ اسلام کے

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ شامیۃ "مطلب فی أطفال المشرکین" ج:۲ ص:۱۹۲ (طبع ایچ ایم سعید)
(۲) جامع الترمذی ابواب الزھد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانہ)

اَحکام صرف عبادات وغیرہ سے متعلق ہیں، اور معیشت میں اسلام کے اَحکام واجب التعمیل نہیں تو یہ بھی صریح کفر ہے۔ اور اگر اس غلط فہمی کی بناء پر کی جائے کہ اسلام کے معاشی اَحکام سوشلزم کے معاشی اَحکام کے (معاذ اللہ) موافق ہیں تو شدید گمراہی ہے، یہ تمام عقائد بہرصورت باطل اور واجب الترک ہیں، اور ان سے توبہ واجب ہے۔

۲:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور اَحکام پر قربان ہونا موجبِ صد اَجر وفضیلت اور بہت بڑی سعادت ہے، اور اس کی مخالفت کفر اور بدترین شقاوت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ

اسمائے حسنیٰ میں سے کون سے اسماء بندوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل عموماً باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ ''عبد'' کے اضافے کے ساتھ نام رکھے جاتے ہیں، مگر عموماً غفلت کی وجہ سے مسمّٰی کو بدون ''عبد'' کے پکارا جاتا ہے، حالانکہ بعض اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً عبدالرزّاق وغیرہ، اندریں احوال اپنی جستجو کے مطابق فیض الباری ج:۴ ص:۴۲۳ سے اسمائے حسنیٰ درج کر رہا ہوں، تحقیق فرمائیں کہ کون سے اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، کہ ان کو بدون ''عبد'' کے مخلوق کے لئے استعمال کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اگر ان کے علاوہ اور کوئی اسماء ہوں تو وہ بھی درج فرمائیں مع تحقیق کے، نیز اسماء کے شروع یا آخر میں ''محمد'' یا ''احمد'' یا ''اللہ'' کا اضافہ کیسا ہے؟ مثلاً محمد متکبر، خالق احمد، محمد اللہ، احمد رزّاق۔

اللہ، الرحمٰن، الرحیم، الملک، القدّوس، السّلام، المؤمن، المهیمن، العزیز، الجبّار، المتکبّر، الخالق، البارئ، المصوّر، الغفّار، القهّار، التّوّاب، الوهّاب، الخلّاق، الرزّاق، الفتّاح، الحلیم، العلیم، العظیم، الواسع، الحکیم، الحیّ، القیّوم، السمیع، البصیر، اللّطیف، الخبیر، العلیّ، الکبیر، المحیط، القدیر، المولٰی، النصیر، الکریم، الرقیب، القریب، المجیب، الحفیظ، المقیت، الودود، المجید، الوارث، الشهید، الولیّ، الحمید، الحقّ، المبین، الغنیّ، المالک، القویّ، المتین، الشدید، القادر، المقتدر، القاهر، الکافی، الشاکر، المستعان، الفاطر، البدیع، الفاخر، الأوّل، الأخر، الظاهر، الباطن، الکفیل، الغالب، الحکم، العالم، الرفیع، الحافظ، المنتقم، القائم، المحیی، الجامع، الملیک، المتعالی، النور، الهادی،

الغفور، الشکور، العفوّ، الرءوف، الاکرام، الأعلٰی، البر، الخفیّ، الرَّبّ، الالٰہ، الأحد، الصّمد، الذی لم یلد، ولم یولد، ولم یکن له کفوا أحد.

جواب:- کسی کتاب میں یہ تفصیل تو نظر سے نہیں گزری کہ کون کون سے اسمائے حسنٰی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، اور کون سے اسماء کا اطلاق دُوسروں پر ہوسکتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل عبارتوں سے اس کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے:-

تفسیر رُوح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: "وذکر غیر واحد من العلماء أن هٰذه الأسماء .... تنقسم قسمة أخرى الى ما لا يجوز اطلاقه على غيره سبحانه وتعالٰى كالله والرحمٰن، وما يجوز كالرحيم، والكريم." (رُوح المعانی ج:۹ ص:۱۲۳ طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)

اور درمختار میں ہے: "وجاز التسمية بعليّ ورشيد من الأسماء المشتركة، ويراد في حقنا غير ما يراد في حق الله تعالٰى. وفي رد المحتار: الذي في التاترخانية عن السراجية التسمية باسم يوجد في كتاب الله تعالٰى كالعليّ والكبير والرشيد والبديع جائزة .... الخ." (شامی ج:۵ ص:۲۶۸)(۱)۔

وفي الفتاوىٰ الهندية: التسمية باسم لم يذكره الله تعالٰى في عباده ولا ذكره رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا استعمله المسلمون تكلموا فيه، والأولٰى أن لا يفعل كذا في المحيط. (فتاویٰ عالمگیریة ص:۳۶۲ حظر و اباحت باب ۲۲)(۲)۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

اسمائے حسنٰی میں بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن و حدیث میں دُوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ تو جن ناموں کا استعمال غیراللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ۔ اور اسمائے حسنٰی میں سے وہ نام جن کا غیراللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، ان کو غیراللہ کے لئے استعمال کرنا اِلحادِ مذکور میں داخل اور ناجائز و حرام ہے۔

(معارف القرآن ج:۴ ص:۱۳۲ سورۂ اعراف:۱۸۰)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار (الحظر والاباحة) ج:۶ ص:۴۱۷ (طبع سعيد).
(۲) ج:۵ ص:۳۶۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

ان عبارتوں سے اس بارے میں یہ اُصول مستنبط ہوتے ہیں:-

نمبرا:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کے اسمِ ذات ہوں یا صرف باری تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ کے معنی ہی میں استعمال ہوتے ہوں، ان کا استعمال غیر اللہ کے لئے کسی حال جائز نہیں، مثلاً: اللہ، الرحمٰن، القدوس، الجبّار، المتکبّر، الخالق، البارئ، المصوّر، الرزّاق، الغفّار، القهّار، التوّاب، الوهّاب، الخلّاق، الفتّاح، القيّوم، الرّبّ، المحيط، المليك، الغفور، الأحد، الصّمد، الحق، القادر المحيي.

۲:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کے علاوہ دُوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہوں اور دُوسرے معنی کے لحاظ سے ان کا اطلاق غیر اللہ پر کیا جاسکتا ہو، ان میں تفصیل یہ ہے کہ اگر قرآن وحدیث، تعاملِ اُمت یا عرفِ عام میں ان اسماء سے غیر اللہ کا نام رکھنا ثابت ہو تو ایسا نام رکھنے میں مضائقہ نہیں، مثلاً: عزیز، علی، کریم، رحیم، عظیم، رشید، کبیر، بدیع، کفیل، ہادی، واسع، حکیم وغیرہ، اور جن اسمائے حسنیٰ سے نام رکھنا نہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو اور نہ مسلمانوں میں معمول رہا ہو، غیر اللہ کو ایسے نام دینے سے پرہیز لازم ہے۔

۳:- مذکورہ دو اُصولوں سے یہ اُصول خود بخود نکل آیا کہ جن اسمائے حسنیٰ کے بارے میں یہ تحقیق نہ ہو کہ قرآن وحدیث، تعاملِ اُمت یا عرف میں وہ غیر اللہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایسے نام رکھنے سے بھی پرہیز لازم ہے، کیونکہ اسمائے حسنیٰ میں اصل یہ ہے کہ ان سے غیر اللہ کا نام رکھنا جائز نہ ہو، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

ان اُصولوں پر تمام اسمائے حسنیٰ کے بارے میں عمل کیا جائے، تاہم یہ جواب چونکہ قواعد سے لکھا ہے اور ہر ہر نام کے بارے میں اسلام کی کوئی تصریح احقر کو نہیں ملی، اس لئے اگر اس میں دُوسرے اہلِ علم سے بھی استصواب کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۴/۲۸ ب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمد'' کے الفاظ لکھنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع اس مسئلے میں کہ ایک مسجد جسے اب سے تقریباً پچیس سال قبل تعمیر کیا گیا تھا، اور وقتِ تعمیر جس میں ''یا اللہ'' اور ''یا محمد'' کے الفاظ بھی کندہ کرائے گئے تھے اور پچیس سال سے مسلسل موجود تھے، لیکن سوءِ اتفاق سے ایک نئے امام صاحب مسجد میں تشریف لائے اور انہوں نے لفظ ''یا'' مسمار کردیا۔ اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد میں کندہ

کسی لفظ کو یا مسجد کے کسی حصے کو منہدم کیا جاسکتا ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر ''یا اللہ''، ''یا محمد'' کے الفاظ کو بعینہٖ برقرار رکھا جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت موجود تھی؟ براہِ کرم مذکورہ بالا استفتاء کا مستند و معتبر جواب عطا فرما کر ممنون فرمایئے، ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں یہ بھی بتائیں کہ اس نازیبا حرکت اور گستاخی کا کفارہ کیا ادا کیا جائے؟

جواب:- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمد'' کے الفاظ لکھنا بے ادبی ہے، اس نام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی سوائے بعض کفار و مشرکین کے کوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارتا تھا، اور کفار بھی اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس بے ادبی کو گوارا نہ کرتے تھے بلکہ کنیت سے پکارتے تھے، اس کے علاوہ اس نداء میں عقیدۂ فاسدہ کا ایہام ہے، اس لئے یہ لفظ اس طرح لکھنا دُرست نہیں۔[1] اگر کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے خیال سے اس کے ساتھ لفظ ''یا'' مٹادیا تو اس کو مسجد کی بے ادبی یا گستاخی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ تعظیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و محبتِ رسول کا تقاضا تھا جو اس نے کیا، البتہ اس کی وجہ سے اگر مسجد میں کوئی بدزیبی پیدا ہوگئی یا مرمت کی ضرورت پڑگئی ہو تو اسی شخص کو چاہئے کہ مسجد کی مرمت کرادے، اور اگر وہ تنگ دست ہو تو دُوسرے مسلمانوں کو اس معاملے میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۸۸/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۸/۳۰ د)

اگر کسی کو چھ کلمے یاد نہ ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:- جب کوئی آدمی کلمۂ توحید پڑھ لے تو وہ مسلمان ہوگیا، پھر عام طور پر جو مشہور ہے اور نماز و وظائف کے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں جو چھ کلمے لکھے ہوئے ہیں اور عام طور سے بچوں کو یاد کرائے جاتے ہیں، کیا یہ کلمے بھی اسلام کی بنیاد شمار کئے جائیں گے یا نہیں؟ اگر یہ کلمے کسی کو یاد نہ ہوں تو اس کے اسلام میں فرق ہوگا یا نہیں؟

اور پانچویں کلمے کے الفاظ میں فرق ہے، بعض رسالوں میں "أستغفر الله ربي من كل ذنب أذنبته .... الخ"، اور بعض رسالوں میں "أستغفر الله أنت ربي وأنا عبدك .... الخ" ہے، دُوسری قسم کے الفاظ عام نہیں ہیں، اس کی وجہ سے دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔

---

(۱) "لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا. الآية (سورة النور:۶۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- اسلام کی بنیاد دراصل ان عقائد پر ہے جو ایمانِ مفصل میں بیان کئے گئے ہیں، لہٰذا ان عقائد پر ایمان رکھنا تو مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔[1] اسی طرح کلمۂ توحید یا کلمۂ شہادت چونکہ اپنے عقائد کا اجمالی اعلان ہے، اس لئے یہ ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہئے، باقی جو کلمات نماز وغیرہ کی کتابوں میں لکھے ہیں، انہیں بچوں کی تعلیم کی آسانی کے لئے لکھ دیا گیا ہے، ورنہ درحقیقت ان کا وہ مقام نہیں جو کلمۂ توحید، کلمۂ شہادت یا ایمانِ مفصل کا ہے۔ اگر یہ کلمات کسی کو یاد نہ ہوں تو اس سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا،[2] البتہ چونکہ ان کلمات کا پڑھنا بہت موجبِ اَجر وثواب ہے اور مسلمانوں کو ان کا ورد رکھنا چاہئے اس لئے بچوں کو یہ تمام کلمات سکھادینے چاہئیں، اور کلمۂ اِستغفار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں اِستغفار کے مختلف صیغے وارد ہوئے ہیں، ان میں سے جو صیغہ بھی پڑھ لیا جائے مقصود حاصل ہے، کیونکہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے دُرود شریف کے مختلف صیغے احادیث سے ثابت ہیں، لہٰذا اس مسئلے پر لڑائی جھگڑا کرنا انتہائی غلط ہے، مسلمانوں کو اس طرح کے نزاعات سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۳/۲۷ و)

کلمۂ طیبہ کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنا

سوال:- کیا کلمۂ طیبہ کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنا جائز ہے یا کلمۂ طیبہ صرف "لا اِلٰـہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ" ہی ہے؟ بندہ کلمہ کے ساتھ زیادتی کی بناء پر "صلی اللہ علیہ وسلم" پڑھنے سے روکتا ہے، صرف اس خدشے سے کہ کلمہ میں اضافہ جائز نہیں ہے، کیا میرا یہ روکنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- کلمہ تو "لا اِلٰـہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ" ہی ہے، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(۱،۲) ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کا مأخذ قرآنِ کریم کی بعض آیات اور احادیث ہیں، جن میں سے ایک حدیث ترمذی ج:۲ ص:۸۵ (طبع مکتبہ فاروقی) میں موجود ہے: قال: أن تؤمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الأخر والقدر خیرہٖ وشرہٖ، الحدیث. وکذا فی حدیث علیؓ فی الترمذی. اور مشہور شش کلموں کا مأخذ درج ذیل کتبِ احادیث ہیں۔ ۱:- کلمۂ طیبہ، کنز العمال فصل الشھادتین، رقم الحدیث: ۱۷۴ ج:۱ ص:۵۵ (طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت) و مشکٰوۃ المصابیح کتاب الایمان، الفصل الأوّل ج:۱ ص:۱۲ حدیث:۲ (طبع قدیمی کتب خانہ)، کلمۂ طیبہ کے الفاظ متفرقاً قرآنِ کریم میں بھی آئے ہیں، تفصیل کے لئے فتاویٰ محمودیہ ج:۶ ص:۴۳ دیکھئے۔ ۲:- کلمۂ شہادت، الصحیح للبخاریؒ، باب ما یتخیر من الدعاء بعد التشھد ج:۱ ص:۱۱۵ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ ۳:- کلمۂ تمجید، الصحیح لمسلمؒ، باب فضل التھلیل والتسلیم والدعاء ج:۲ ص:۳۴۵۔ ۴:- کلمۂ توحید، جامع الترمذی ج:۲ ص:۱۸۰ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ ۵:- سیّد الاستغفار، الصحیح للبخاریؒ، کتاب الدعوات فی باب أفضل الاستغفار ج:۲ ص:۹۳۳ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔ ۶:- رَدِّ کفر، مسند أحمد ج:۵ ص:۴۵۱ (طبع المکتب الاسلامی بیروت)۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے الفاظ متفرقہ دیگر بے شمار احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کی ترتیب، اسماء، تعداد اور نمبر آسانی کے لئے ہیں، درحقیقت ان کلموں کے معانی پر ایمان لانا ضروری اور مطلوب ہے۔ (محمد زبیر)

کا اسم گرامی جب بھی لیا جائے تو اس پر دُرود شریف پڑھنا احادیث سے ثابت ہے، اس لئے اگر کلمہ کے بعد ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس میں یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے وقت لہجہ کچھ بدل لیا جائے تا کہ کلمہ پر اضافے کا شبہ نہ ہو۔

واللہ اعلم

۱۳؍۱؍۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰؍۲۸ الف)

شعراء کا اپنے کلام میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:- ایک جگہ دو شخص آپس میں محوِ گفتگو تھے، اشخاصِ مذکورہ میں سے ایک شخص کا کہنا تھا کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، ان دونوں کا اثر شاعر کے عقائد پر ہوتا ہے، جس طرح سے آج کل عامی شاعر جن کی شاعری بالکل غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے یہاں تک کہ شاعر کا اپنے فرضی محبوب کو خدا کے ہم پلہ قرار دینے، یا موسم یا دُوسرے موضوعات پر مبالغانہ انداز میں اپنے تخیل کو پیش کرنے سے شاعر کے عقائد اس کے زد میں آتے ہیں اور اس پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، یہاں تک کہ شاعر اپنے تخیل کو غلط انداز میں بیان کرنے کی وجہ سے گناہ اور بسا اوقات گناہِ عظیم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ یہ بات کہاں تک دُرست ہے؟

۲:- لیکن اس کے برعکس دُوسرے شخص کا کہنا یہ ہے کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، محض تخیل ہے، اور تخیل کا حقیقت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی ربط نہیں۔

مہربانی فرما کر اس سوال کا جواب دیں کہ اشخاصِ مذکورہ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلطی پر ہے؟ سادہ، عام فہم، مدلل، جامع، مفصل اور اگر کہیں عربی کی عبارت ہو تو اس کے بعد ترجمے کے ساتھ اس طرح جلد سے جلد ارقام فرمائیں کہ حجت تام ہو، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کو موصول ہوئے کئی ماہ گزر گئے، لیکن میں مسلسل سفر اور مصروفیات کی بناء پر جواب نہ دے سکا، اب بمشکل تمام اتنا وقت نکال سکا ہوں کہ جواب لکھوں۔

آپ نے خاص دو صاحبان کی گفتگو نقل کی ہے، ان میں سے کسی کی بات بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ اگر شاعر اپنے کلام میں ایسا مجاز یا استعارہ استعمال کرتا ہے جس کی نظیریں اہلِ زبان میں معروف ومشہور ہوں اور دُوسرے قرائن وشواہد سے یہ بھی معلوم ہو کہ شاعر نے یہ بات مجاز واستعارہ کے طور پر کہی ہے، حقیقت سمجھ کر نہیں کہی، تب تو ایسا مجاز واستعارہ

جائز ہے، اور اس کی بنیاد پر انسان کو بدعقیدہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے برخلاف اگر مجاز و استعارہ اس نوعیت کا ہے کہ اہلِ زبان میں اس کی نظیریں معروف نہیں ہیں یا پھر دُوسرے قرائن و شواہد سے معلوم ہے کہ شاعر نے یہ بات مجاز کے طور پر نہیں کہی بلکہ حقیقت سمجھ کر کہی ہے تو اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ یہی ہے۔

مثلاً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجرِ مکی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں کہ:-
یا رسول اللہ! انظر حالنا، یا رسول اللہ! اسمع قالنا، حالانکہ یہ بات حضرت حاجی صاحبؒ کے حالات اور ان کی کتابوں وغیرہ سے معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے، وہ مجازاً کیا گیا ہے، اور یہ ایک معروف شاعرانہ روایت ہے کہ شاعر بہت سی غیر موجود اشیاء کو تخیل میں موجود فرض کرکے ان سے خطاب کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کو بھی خطاب کرتا ہے۔ گویا حضرت حاجی صاحبؒ کا یہ مجاز ایسا ہے کہ اہلِ زبان کے کلام میں اس کی نظیریں موجود ہیں، لہٰذا اس سے فسادِ عقیدہ لازم نہیں آتا۔ ہاں! اگر کوئی ایسا شخص یہ بات کہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بطورِ مجاز یہ بات نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک حقیقی عقیدہ ہی یہی ہے تو پھر فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔[1]

اس کے برخلاف بعض مبالغے یا مجاز ایسے ہوتے ہیں کہ اہلِ زبان میں اس کی معروف نظیریں نہیں ہوتیں، مثلاً کسی مخلوق کو خالق سے تشبیہ دینا یا کسی مخلوق کے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر اسے خالق کے ساتھ ملا دینا، اس قسم کے مبالغے اور استعارے چونکہ متعارف نہیں ہوتے اور دین و مذہب کا پاس رکھنے والے لوگ ان کو ہمیشہ بے ادبی اور غلط سمجھتے ہیں، اس لئے ایسے مبالغوں اور استعاروں سے فسادِ عقیدہ کا شبہ ہوتا ہے، اور وہ ناجائز ہیں، چونکہ اس میں مجاز و مبالغہ کا احتمال ہوتا ہے اس لئے محض اس کی بناء پر کسی کو کافر کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنے عقیدے کی خود وضاحت نہ کردے۔

هٰذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم
۱۳۸۴/۴/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸۹/۲۹ الف)

(۱) مسئلہ مذکورہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵

کپڑے میں انبیاء علیہم السلام کی تصویر بنانا

سوال:- محترم جناب مفتی جسٹس تقی عثمانی صاحب (دارالعلوم کورنگی کراچی)

جنابِ عالی!

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کورنگی کراچی میں ایک ڈیزائن کپڑے پر چھپائی/ پرنٹنگ کے لئے سپرز ٹاوٗلرز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے آیا، اور سپر ٹاوٗلرز کے ڈیزائن کے عین مطابق چھاپ کر دے دیا گیا۔ عام طور پر ہم ٹیکنیکل اُمور کے علاوہ (مثلاً کلر میچنگ وغیرہ) پارٹیوں کے مطلوبہ ڈیزائنز کے دیگر اُمور سے واسطہ نہیں رکھتے، اور کسی غور وخوض کے بغیر آرڈر کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

نادانستہ طور پر اس ڈیزائن کے چھپ جانے کے بعد شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں، اس ڈیزائن میں چرند پرند، آبی جانور اور کارٹون انسانوں کے انداز میں دو انسانی شبیہیں بھی ہیں، اور اس ڈیزائن پر Noahs ark بھی لکھا ہوا ہے۔

یہ ڈیزائن آپ کے سامنے پیش کرنے کے بعد آپ اس پر فتویٰ صادر فرمادیں تاکہ اگر توہین، گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو جو بھی کفارہ ہے، ادا کردیا جائے۔ اور ہم اعلانیہ طور پر صدقِ دِل سے اپنی نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ ہر ممکن احتیاط سے کام لیں گے۔

تابعدار محمد احمد علی خان
ڈپٹی ملز منیجر

جواب:- کسی جاندار کی تصویر بنانا بذاتِ خود ایک ناجائز کام ہے، بالخصوص کسی پیغمبر کی خیالی تصویر بنانا تو انتہا درجے کی بے ادبی ہے، جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے، اور ایسی بے ادبی پر مشتمل تصویر کو شائع کرکے لوگوں میں پھیلانا مزید وبال کا موجب ہے، لیکن اگر آپ نے واقعۃً نادانستگی میں یہ تصویریں اس طرح چھاپ دیں کہ آپ کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس میں کیا ہے؟ تو آپ پر مندرجہ ذیل اُمور فوری طور پر واجب ہیں:-

۱:- سب سے پہلے صدقِ دِل سے اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کریں، اور آئندہ کے لئے اس قسم کے معاملات میں تیقظ اور بیدار مغزی سے کام کرنے کا عہد واہتمام کریں۔

۲:- اس کپڑے کا جتنا اسٹاک موجود ہو، اس کی سپلائی روک کر ان تصاویر کو مٹائیں، اور اگر مٹ نہ سکیں تو ان کو جلادیں۔

۳:- اگر کپڑا اس کمپنی کے پاس جاچکا ہے جس نے آپ سے چھپوایا تھا تو اس کو ایسے کپڑے کی سپلائی سے روکنے کے لئے اپنا پورا اثر ورُسوخ استعمال کریں، اور اگر وہ اس کی سپلائی سے باز نہ آئیں تو آپ ان سے براءت کا اظہار واعلان کریں۔

۴:- اس کپڑے کی چھپائی کی جو اُجرت آپ نے وصول کی ہے، وہ مکمل طور پر صدقہ کریں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۴/۹/۶ھ

شعر میں غیراللہ کو خطاب کرنا

سوال:-

لے جلد خبر کہ ہاں ابھی تک
سینے میں اِک آگ سی دبی ہے
کشتی یہ بھنور میں آپھنسی ہے
لے جلد خبر مریضِ غم کی
اب اس کا یہ سانس آخری ہے

زید کہتا ہے ایسے کلمات غیراللہ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہئیں جن سے عقائد میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، مذکورہ اشعار ایسے ہی ہیں، لیکن عمر اپنے عقائد کی بناء پر ان اشعار کو دُرست سمجھتا ہے، کیونکہ عمر نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد یہ اشعار کہے۔ اب ان دونوں میں سے کون حق پر ہے، باطل کے لئے شرعی کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- شعر میں بکثرت مجاز واستعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اور شاعر بسااوقات ان اشیاء کو بھی مخاطب کرتا ہے جو سننے اور جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتیں، مثلاً دریا، پہاڑ وغیرہ، یہ خطاب تخیلی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس انداز سے شعر میں غیراللہ کو خطاب کرے اور مقصد حقیقۃً اس کے مشکل کشا یا فریاد رس ہونے کا عقیدہ نہ ہو، بلکہ تخیلی طور پر مجازاً و استعارۃً خطاب کرنا ہو تو ایسے اشعار میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر مشرکانہ عقیدے کے ساتھ ایسے اشعار ان کے حقیقی معنی پر اعتقاد رکھتے ہوئے کہے اور پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ پس مندرجہ بالا اشعار اگر کسی صحیح العقیدہ شخص نے کہے ہیں تو ان میں کچھ حرج نہیں، البتہ اگر فاسد عقیدے کے ساتھ کہے ہیں تو حرام ہیں، اور عوام میں ایسے

اشعار کی تشہیر بہرصورت منع ہے کہ فسادِ عقیدہ کا اندیشہ ہے۔[۱]

سوال نمبر۲:-

اے رسولِ کبریا فریاد ہے
یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

زید ان اشعار کو دُرست مانتا ہے، اور عمر اسے شرک قرار دیتا ہے، قول کس کا دُرست ہے؟ اور شعر کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- ان اشعار میں بھی وہی تفصیل ہے جو اُوپر بیان کی گئی۔[۲] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۴ر رمضان ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۸۶/۳۱ د)

قادیانیوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہنے کی ممانعت

سوال:- قادیانی جماعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور کیا قادیانی اپنی مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ قانوناً و شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ایسے فیصلوں کا قانون بنانا دُرست ہے کہ جس میں قادیانیوں کو اپنی عبادت گاہ مسجد کے نام سے بنانے کی اجازت دی گئی ہو؟　　سائل: امام مسجد سبیل، نیوٹاؤن

جواب:- مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار، خواہ قادیانی ہوں یا لاہوری باجماعِ اُمت دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اور ان کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حقیقتِ واقعی کو ستمبر ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اس غرض کے لئے پاکستان کے دستور میں ایسی ترمیم کردی گئی ہے جس پر ملک کے تمام مسلمان متفق ہیں۔

اس ترمیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مرزائیوں کو شعارِ اسلام و مسلمین کے اختیار کرنے

(۱،۲) حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''بارادۂ استعانت و استغاثہ یا باعتقاد حاضر ناظر ہونے کے منہی عنہ ہے، اور بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً و استلذاذاً ماذون فیہ ہے، چونکہ اشعار پڑھنے کی غرض محض اظہارِ شوق و استلذاذ ہوتا ہے اس لئے نقل میں توسع کیا گیا، لیکن اگر کسی جگہ اس کے خلاف دیکھا جائے گا، منع کردیا جائے گا۔ (دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵)
اور فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴ میں ہے: ''یا رسول اللہ کبریا فریاد ہے .... یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے .... الخ'' ایسے الفاظ محبت وخلوت میں پڑھے بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپؐ کی ذات کو مطلع فرمادیوے یا محض محبت سے بلا کسی خیال کے جائز ہیں، اور بعقیدۂ علم الغیب اور فریاد رس ہونے کے شرک ہیں، اور مجامع میں منع ہیں کہ عوام کے عقیدے کو فاسد کرتے ہیں، لہٰذا مکروہ ہوں گے۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے روکا جائے، خاص طور سے کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ اس مذہب کا ایک امتیازی نشان ہوتی ہے، جس سے اس مذہب اور اہلِ مذہب کی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ''مسجد'' مسلمانوں کی اس عبادت گاہ کا نام ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو، کسی دُوسرے مذہب کے پیروؤں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''مسجد'' کا نام دے کر لوگوں کو مغالطہ دیں اور ان کی گمراہی کا باعث ہوں، بالخصوص مرزائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ مدّت دراز تک اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے ناواقف لوگوں کو فریب دیتے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر انہیں ''مسجد'' کے نام سے اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے یا اسے اس نام پر برقرار رکھنے کی اجازت دی جائے تو اس کا صریح نتیجہ عام مسلمانوں کے لئے سخت فریب میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اور پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں ایسے فریب کو گوارا نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا احقر کی رائے میں وہ تمام فیصلے جن میں قادیانیوں یا لاہوریوں کو ''مسجد'' کے نام سے عبادت گاہ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، قرآن وسنت، شریعتِ اسلامی اور مصالحِ مسلمین کے یکسر خلاف ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۸/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۳/۳۰ د)

احقر اس تحریر کی تصدیق وتائید کرتا ہے

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۸/۱۹/۱۳۹۹ھ

حیاتِ انبیاء علیہم السلام، حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور سماعِ موتی سے متعلق مختلف سوالات

سوال ا:- حیاتِ انبیاء کے بارے میں احادیثِ صحیحہ نے کیا فرمایا ہے؟ کیا انبیاء قبر میں اسی دُنیوی حیات سے زندہ ہیں اور رُوح مقامِ رفیقِ اعلیٰ میں ہے؟ یا جسد کے ساتھ انبیاء کا قبروں میں نماز پڑھنا آیا ہے؟ آیا اسی جسد کے ساتھ پڑھتے ہیں یا جسدِ مثالی کے ساتھ؟ نیز حیاتِ انبیاء کا منکر شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- آپ کے سوالات کے مختصر جوابات[1] درج ذیل ہیں، لیکن ان مسائل پر تدقیقات میں پڑنا دُرست نہیں، ان سوالوں کے جواب پر دین کا کوئی عملی حکم موقوف نہیں ہے، نہ ان کی تحقیق کا ہمیں مکلف کیا گیا ہے، لہٰذا اپنے اوقات کو ان مسائل کو معلوم کرنے میں صَرف کرنا چاہئے جن کا براہِ راست تعلق عملی زندگی سے ہے، حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من حسن اسلام

(۱) یہ مختلف سوالات اور ان کے جوابات آگے آرہے ہیں۔

المرء ترکه ما لا یعنیه"۔[1] اس تمہید کے بعد مختصر جوابات لکھے جاتے ہیں، مگر ان پر بحث وتمحیص کا دروازہ نہ کھولا جائے۔

۱:- انبیاء علیہم السلام کی حیات، حیاتِ برزخی ہے،[2] لیکن یہ حیاتِ برزخی عام مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس میں رُوح کا رشتہ جسد کے ساتھ اتنا زیادہ قوی رہتا ہے کہ اسے حیاتِ دُنیویہ کے ساتھ بہت قرب ہے، اور اس کی بنا پر ان پر مطلقاً احیاء کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی نہ میراث تقسیم ہوتی ہے، نہ ان کی ازواجِ مطہرات سے بعد میں کوئی نکاح کرسکتا ہے، اب یہ قوت کس درجے کی ہے؟ اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے اور اس کی کُنہ جاننے کی کوشش اور فضول تحقیقات کی ضرورت نہیں، اور انبیاء کا قبر میں نماز پڑھنا بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے۔[3]

س۲:- معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور تخفیفِ نماز کے بارے میں گفتگو صرف رُوح سے ہوئی تھی یا رُوح مع الجسد سے؟

ج۲:- احادیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اطلاقات سے ظاہر یہ ہے کہ جسد کے ساتھ ہوئی تھی۔

س۳:- شبِ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا معاملہ جمیع انبیاء کے لئے مسجدِ اقصیٰ میں صرف رُوحوں کے لئے ہوا تھا یا کہ رُوح مع الاجساد تھے؟

ج۳:- اس کی بھی روایات میں تصریح نہیں ہے، بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے، واللہ اعلم۔

س۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بقیدِ حیات ہیں، کیا اس نماز میں مع الجسد شریک ہوئے تھے یا صرف رُوح نے شرکت فرمائی تھی؟

---

(۱) جامع الترمذی ابواب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۲، ۳) وفی شفاء السقام للسبکیؒ ص:۱۸۰ (طبع مکتبه نوریه رضویه): ولحیاة الأنبیاء بعد موتهم شواهد من الأحادیث الصحیحة، وفی الصحیح للامام مسلمؒ ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن انس بن مالکؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: اتیت -وفی روایة هداب- مررت علی موسیٰ لیلة أسری بی عند الکثیب الأحمر وهو قائم یصلی فی قبره. وفی القول البدیع للسخاویؒ: السادسة، رسول الله حی علی الدّوام ص:۱۶۷ (طبع مکتبه علمیه مدینه منوره) یؤخذ من هٰذه الأحادیث أنه صلی الله علیه وسلم حیٌّ علی الدوام، وذٰلک انه محال عادة أن یخلو الوجود کله من واحد یسلم علیه فی لیلٍ ونهارٍ ونحن نؤمن ونتصدق بأنه صلی الله علیه وسلم حیٌّ یرزق فی قبره وأن جسده الشریف لا تأکله الأرض، والإجماع علی هٰذا .... وقد جمع البیهقی جزأً فی حیاة الأنبیاء علیهم السلام فی قبورهمٍ، واستدل بغالب ما تقدم وبحدیث أنس رضی الله عنه: الأنبیاء أحیاء فی قبورهم یصلّون .... الخ. وقال العلامة السبکیؒ فی شفاء السقام ص:۱۹۱ (طبع مکتبه نوریه رضویه) وهی ثابتة للروح بلا اشکال والجسد ... فان الصلوٰة تستدعی جسدًا حیًّا، وکذٰلک الصفات المذکورة فی الأنبیاء لیلة الاسراء کلها صفات الأجسام ولا یلزم من کونها حیاة حقیقیة ان تکون الأبدان معها کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب ..... وغیر ذٰلک من صفات الأجسام التی نشاهدها بل قد یکون لها حکم اٰخر، فلیس فی العقل ما یمنع من اثبات الحیاة الحقیقیة لهم. وکذا فی أحکام القراٰن للعلامة التهانوی رحمه الله تعالیٰ (ج:۳ ص:۱۷۰) و رد المحتار ج:۲ ص:۱۵۱.

ج۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسد و رُوح دونوں کے ساتھ زندہ ہونا قرآنِ کریم میں مصرّح ہے،[۱] اس لئے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مع الجسد والروح ہوئی۔

س۵:- عام مسلمانوں کو جب قبر میں دفنایا جاتا ہے اس کے بعد ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، کیا وہ سنتے ہیں؟ نفی کی صورت میں ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں ثبوت ہے؟

ج۵:- اصل یہ ہے کہ مردوں میں موت کے بعد سننے کی طاقت نہیں ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں تصریح ہے،[۲] لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے انہیں کوئی آواز سنانا چاہے تو سنا دیتا ہے،[۳] حدیث میں جو جوتیوں کی آواز سننے کا ذکر ہے[۴] وہ اسی پر محمول ہے کہ اللہ تعالیٰ عبرت کے لئے اس کو آواز سنا دیتا ہے۔

س۶:- قبر سے کیا مراد ہے؟ آیا وہی لحد یا شق جس میں میّت کو دفنایا گیا ہے یا کوئی اور؟ عذابِ قبر کہاں ہوتا ہے؟ ملکَین کا سوال و جواب کہاں ہوتا ہے؟

ج۶:- قبر سے وہی قبر مراد ہے جس میں مردے کو دفن کیا گیا۔ سوالِ ملکَین کے وقت رُوح کو دوبارہ جسد میں داخل کیا جاتا ہے،[۵] اور پوری حقیقتِ حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

س۷:- سماعِ موتیٰ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہے، جمہور صحابہؓ کی رائے اثبات میں ہے یا نفی میں؟ امام ابوحنیفہؒ کی رائے کیا ہے؟

---

(۱) "اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ". الأیة (آل عمران:۵۵). "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ." الأیة (النساء:۱۵۷). تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۲ ص:۷۶۔

(۲) قال اللہ تعالیٰ: "فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" الأیة. (سورة الروم:۵۲).

(۳، ۴) "اِنَّ اللّٰهَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" (سورة فاطر:۲۲) وفی أحکام القران ج:۳ ص:۱۶۳ فانه تعالٰی بقدرته یسمع الأموات أصوات الأحیاء اذا شاء ویهدی من یشاء ویضل من یشاء .... الخ. وفی الصحیح للبخاریؒ باب المیّت یسمع خفق النعال ج:۱ ص:۱۷۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أنس رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: العبد اذا وضع فی قبره وتولی وذهب أصحابه حتی انه لیسمع قرع نعالهم أتاه ملکان، الحدیث. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع مذکور) قال نافع ان ابن عمرؓ أخبره قال: أطلع النبی صلی اللہ علیه وسلم علی أهل القلیب فقال: وجدتم ما وعد ربکم حقًّا؟ فقیل له: تدعو أمواتا؟ فقال: ما أنتم بأسمع منهم ولٰکن لا یجیبون. وعن عائشة رضی اللہ عنها قالت: انما قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: انهم لیعلمون الأن ان ما کنت أقول لهم حق، وقد قال اللہ تعالٰی: "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی". وفی أحکام القران للعلامة التهانوی رحمة اللہ علیه (ج:۳ ص:۱۶۳) قوله أن مسئلة سماع الموتٰی وعدمه من المسائل التی وقع الخلاف فیها .... وفیه أیضًا ج:۳ ص:۱۶۵ قال العبد الضعیف (المفتی الأعظم باکستان قدس اللہ سرهٗ) والذی ذکره فی الروح من طوائف أهل العلم وذکر ابن عبدالبر ان الأکثرین علٰی ذٰلک یعنی سماعهم فی الجملة هو الحق الحقیق بالقبول، والیه یرشد صیغة القران وشان النزول، وبه تتوافق الروایات من الصحابة والرسول صلی اللہ علیه وسلم وهو مختار مشائخنا دامت برکاتهم ما هبت الدبور والقبول .... الخ.

(۵) وفیه أیضًا ج:۳ ص:۱۸۱ مذهب أهل السنة والجماعة أن أرواح الموتٰی ترد فی بعض الأوقات من العلّیّین أو من سجّین الی أجسادهم فی قبورهم عند ارادة اللہ تعالٰی وخصوصًا لیلة الجمعة ویجلسون ویتحدثون وینعم أهل النعیم ویعذب أهل العذاب. (محمد زبیر حق نواز)

ج ۷:- امام ابوحنیفہؒ کی رائے صحیح قول کے مطابق وہی ہے جو نمبر ۵ میں لکھی گئی۔

س ۸:- عام مسلمانوں کی قبر پر قرآن خوانی بلامعاوضہ جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہونے کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کا کوئی عمل، جس کا ذکر حدیث میں ہو۔

ج ۸:- ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن خوانی جائز ہے بشرطیکہ کسی دن کی تخصیص نہ ہو اور اس پر کوئی معاوضہ طے نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹/۱۹ الف)

’’اسلامی سوشلزم‘‘ سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت

سوال:- اسلامی سوشلزم کیا ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنا ہمارے لئے دُرست ہے؟

قاضی نذیر احمد سونڈا ضلع ٹھٹھہ

جواب:- کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں یہ وبا چل نکلی ہے کہ مغرب سے آئے ہوئے ہر غلط یا صحیح نظریے کے ساتھ صرف ’’اسلامی‘‘ کا نام لگا کر اسے بزعمِ خود ’’مشرف بہ اسلام‘‘ کرلیا جاتا ہے، پھر اس کی تبلیغ شروع کردی جاتی ہے، اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی ایسا ہی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم زندگی کے دو بالکل مختلف نظام ہیں، جن میں مطابقت ممکن نہیں، سوشلزم درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت آفرینیوں کا ایک جذباتی رَدِّ عمل ہے، جو بجائے خود اتنا ہی مضر اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم کی بنیاد انفرادی ملکیت کے انکار پر ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو ظالمانہ کھیل کھیلا گیا، اس سے متأثر ہوکر سوشلزم کے علَم برداروں نے انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کردیا، حالانکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوسکا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا، جو پورے استبداد کے ساتھ دولت کے ایک بڑے ذخیرے سے کھیلتا ہے، رہا بیچارا مزدور سو وہ سوشلزم میں بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا سرمایہ داری میں تھا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایہ داری کی خرابیوں کا علاج انفرادی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ انفرادی ملکیت کی خودغرضی اور بے لگامی کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سود کی حرمت اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر و خراج اور وراثت وغیرہ کے اَحکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو حدود کا پابند بنادیا ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ سوشلزم کی بنیاد جس نظریئے پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے دونوں میں نظریاتی مصالحت کا کوئی امکان نہیں، اسلام سوشلزم نہیں بن سکتا، اور سوشلزم اسلام نہیں کہلاسکتا، لہٰذا ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ ایک مہمل نعرہ ہے، جو دونوں معاشی نظاموں یا کم از کم اسلامی نظامِ معیشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہماری ضرورت ''اسلام'' ہے، ''سوشلزم'' نہیں۔

واللہ اعلم
۲۰ رشوال ۱۳۸۷ھ (۱)

کیا جنت میں کفار داخل ہوسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل بعض لوگوں کا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ صرف مسلمان ہی جنت میں جائیں گے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اگر اچھے کام کرتا ہے تو جنت کا مستحق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خیالات میرے عقیدے میں شامل نہیں ہیں، میں صرف اسلام کو سچا مذہب مانتا ہوں، لیکن بہتر ہو کہ ایسے لوگوں کے شبہات کا ازالہ ''البلاغ'' کے ذریعہ کردیا جائے۔

جواب:- ان لوگوں کا یہ شبہ درحقیقت ایک بنیادی بات کو ذہن میں نہ رکھنے کا نتیجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اور جنت وجہنم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دُنیا ایک ''دار الامتحان'' ہے، جنت اس امتحان کی کامیابی کا صلہ ہے، دوزخ ناکامی کی سزا۔ اور ''ایمان'' اس امتحان میں کامیابی کی بنیادی شرط اور وہ ''لازمی سوال'' ہے، جسے حل کئے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا، اس لئے جنت کا حصول ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

دُنیا میں روزمرّہ جن امتحانات سے ہمارا سابقہ رہتا ہے، ان پر ہی اگر آپ غور فرمائیں تو واضح طور سے نظر آئے گا کہ ہر امتحان میں کچھ سوالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور ممتحن ان سوالات کو کامیابی کا مدار سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جنھیں حل نہ کرنے سے کامیابی کے درجے میں تو کمی ہوجاتی ہے، مگر وہ کامیابی اور ناکامی کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتے، اب اگر کوئی شخص پہلی قسم کے اہم سوالات کو تو بالکل چھوڑ دے یا انہیں بالکل غلط طریقے سے حل کرے، اور دُوسری قسم کے ضمنی سوالات صحیح طریقے سے حل کردے تو آپ خود ہی سوچئے کہ وہ شخص کامیاب ہوگا یا ناکام؟ ظاہر ہے کہ کوئی معقولیت پسند انسان ایسے شخص کو کامیاب قرار نہیں دے سکتا، اس لئے کہ اس نے اصلی بنیادی سوالات کو بالکل حل نہیں کیا۔ جو شخص اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، آخرت

(۱) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا، اور ساتھ ہی کچھ اچھے کام بھی کرتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔

اسی بات کو ایک دُوسرے طریقے سے بھی سمجھ لیجئے، دُنیا میں بہت سی چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے مفید ہوتی ہیں، لیکن کوئی دُوسری خراب چیز ان کے ساتھ مل کر ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دُودھ، گھی، مکھن اپنی ذات کے اعتبار سے کتنی مقوّی غذائیں ہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ سنکھیا ملادیا جائے تو یہی چیزیں مہلک بن جاتی ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال کا بھی یہی حال ہے، کسی غریب کی روپے پیسے کے ذریعہ امداد کرنا کتنا مستحسن کام ہے، لیکن اگر اس سے مقصد محض دِکھاوا اور نام ونمود ہو تو یہ نیکی دُنیوی نقطۂ نظر سے بھی اکارت ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد یہی ہے کہ ''کفر'' وہ زہر ہے جو انسان کے تمام نیک اعمال کو اکارت کردیتا ہے، یہ اعمالِ خیر اگر ایمان کے ساتھ ہوں تو انسان کے درجات میں ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور ان سے اس کی آخرت سنورتی ہے، لیکن اگر ان کے ساتھ کفر مل جائے تو وہ ان کو اسی طرح بیکار کردیتا ہے جیسے سنکھیا، دُودھ اور گھی کو، جو شخص خدا کا یا اس کی وحدانیت کا منکر ہو، اس کے رسولوں کو (معاذ اللہ) جھوٹا کہتا ہو اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو من گھڑت بتاتا ہو، اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کا سرے سے انکار کرتا ہو، اور اس قدر سنگین جرائم کے بعد وہ کوئی اچھا کام بھی کرلے تو اسے مستحقِ انعام قرار دینے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک نہایت خوش اخلاق، محنتی اور ذہین شخص ہے جو اپنی مبنی برانصاف حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرتا ہے، اس کے دُشمنوں سے مل کر ان کی مدد کرتا ہے، اس کے قانون کی کھلم کھلا توہین کرتا ہے، تو کیا محض اس کی خوش اخلاقی اس کو ان سنگین جرائم سے بری کرسکے گی؟ اور اگر حکومت اس کو موت کی سزا دے تو کیا کوئی انصاف پسند انسان حکومت کے اس فیصلے کو ظلم قرار دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کی خوش اخلاقی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جو شخص خدا کا، اس کے رسولوں کا، اس کی کتابوں کا اور اس کے قوانین کا باغی ہو، اسے محض اس کی خوش اخلاقی کی بناء پر جنت کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲رشوال ۱۳۸۷ھ[2]

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۴ ص:۲۳۷۔
(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب

سوال:- وحدت الوجود کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عقیدہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب:- وحدۃ الوجود کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے، اس کے سوا ہر وجود بے ثبات، فانی اور نامکمل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ ایک نہ ایک دن فنا ہوجائے گا، دُوسرے اس لئے کہ ہر شئ اپنے وجود میں ذاتِ باری تعالیٰ کی محتاج ہے، لہٰذا جتنی اشیاء ہمیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں، انہیں اگرچہ وجود حاصل ہے، لیکن اللہ کے وجود کے سامنے اس وجود کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے وہ کالعدم ہے۔

اس کی نظیر یوں سمجھئے جیسے دن کے وقت آسمان پر سورج کے موجود ہونے کی وجہ سے ستارے نظر نہیں آتے، وہ اگرچہ موجود ہیں، لیکن سورج کا وجود ان پر اس طرح غالب ہوجاتا ہے کہ ان کا وجود نظر نہیں آتا۔

اسی طرح جس شخص کو اللہ نے حقیقت شناس نگاہ دی ہو وہ جب اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت حاصل کرتا ہے تو تمام وجود اسے ہیچ، ماند، بلکہ کالعدم نظر آتے ہیں، بقول حضرت مجذوبؒ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

''وحدت الوجود'' کا یہ مطلب صاف، واضح اور دُرست ہے، اس سے آگے اس کی جو فلسفیانہ تعبیرات کی گئی ہیں، وہ بڑی خطرناک ہیں، اور اگر اس میں غلو ہوجائے تو اس عقیدے کی سرحدیں کفر تک سے جاملتی ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کو بس سیدھا سادا یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود اللہ تعالیٰ کا ہے، باقی ہر وجود نامکمل اور فانی ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ(۲)

مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام

سوال ۱:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے ہے یا نہیں؟

۲:- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوّت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: شریعت وطریقت ص:۳۱۰ مؤلفہ حکیم الأمت حضرت تھانوی قدس سرہٗ۔
(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

جدا نہیں ہوتی،[۱] ان کی جن لغزشوں کا ذکر قرآنِ کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اَوْلیٰ باتیں تھیں جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔[۲]

۲:- صحیح یہ ہے کہ نبوّت سے قبل بھی انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔[۳]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

بلا تحقیق مسئلہ بیان کرنا

سوال:- اگر کوئی شخص بدون تحقیق کے مسئلہ بیان کرے اور مسائلِ شرعیہ کو نہ مانے اور اللہ تعالیٰ نے جو حصہ وارثوں کے لئے قرآن مجید میں مقرّر فرمایا ہے نہ مانے، اور کہے یہ دادی کا مسئلہ ہے، اور کسی عالم کو کافر کہے اور اس عالم کی ہر طرح آبروریزی کرے، غیبت کرے اور اس سے دُشمنی و بغض رکھے اور برادری میں تفرقہ ڈالے اور قوم کے درمیان فرقہ بندی اور مسجد میں فساد کرے، فسق و فجور کرے، ایسے شخص کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور وہ مسجد میں داخل ہوسکتا ہے؟ اور جو کسی کی حق تلفی کرے ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایسا شخص فاسق ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اسے نرمی سے سمجھائیں اور اگر نہ مانے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں، فرائض کے بارے میں وہ جو یہ کہتا ہے کہ: ''دادی کا مسئلہ ہے'' تو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور اس کے مسجد میں داخل ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اس جملے کے مطلب پر موقوف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) قال فی شرح الفقه الأكبر ص:۷۲ والمختار(أی) عند جمهور أهل السنة العصمة عنها أی عن الصغائر والكبائر غير المنفردة خطأً أو سهوًا (الٰی) والحاصل ان أحدًا من أهل السنة لم يجوّز ارتكاب المنهی منهم عن قصد، ولٰكن بطريق السهو والنسيان ويسمّی ذٰلک زلّة. وفيه أيضًا ص:۷۱ وفی عصمتهم عن سائر الذنوب تفصيل وهو أنهم معصومون عن الكفر قبل الوحی وبعده بالاجماع. وكذا عن تعمّد الكبائر عند الجمهور. نیز دیکھئے معارف القرآن ج:۱ ص:۱۹۵ ''مسئلہ عصمتِ انبیاء'' اور امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۴۰۷۔ (محمد زبیر)

کسی انجمن کے رُکنیت فارم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا حکم

سوال:- ایک انجمن کے رُکنیت فارم کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، کیا اس میں سے کوئی شق پورا نہ ہونے پر ممبر گناہگار ہوگا یا نہیں؟ اور گناہ کیسا ہوگا؟ کبیرہ یا صغیرہ؟

میں اللہ ربّ العزّت اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بزمِ ہذا کے اغراض و مقاصد سے پورا پورا اتفاق ہے، اور میں بزم کی فیس مستقل ادا کرتا رہوں گا، اور میں دُوسرے کو رُکنیت کی رغبت دینا اور بزمِ ہذا کو مستحکم بنانا اپنا فرضِ عین سمجھوں گا، تبدیلیٔ رہائش سے آگاہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جواب:- پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کوئی عہد کرنا تو صحیح ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر عہد کرنا دُرست نہیں، کیونکہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے،[1] اور کوئی نبی یا ولی اس کا شریک نہیں، لہٰذا معاہدے کے مذکورہ بالا الفاظ میں ترمیم کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد جو شخص یہ معاہدہ کر کے فارم بھر دے گا اس پر اس عہد کی پابندی اس وقت تک لازم ہوگی جب تک وہ اس عہد سے دست بردار ہونے کا واضح اعلان نہ کر دے، اس دوران وہ ان میں سے کسی بات کی خلاف ورزی کرے گا تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، کیونکہ عہد کر کے اس کو پورا نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے، لقولہ تعالیٰ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ"۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵۴/۲۷ ھ)

کیا قیامت کے دن جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟ کیا جنت میں عورتوں کو رُؤیتِ باری ہوگی؟

سوال ۱:- قیامت کے دن جب انسانوں کو حساب و کتاب کے لئے اُٹھایا جائے گا تو کیا جن و اِنس کے علاوہ جانوروں کو بھی اُٹھایا جائے گا یا نہیں؟ حدیث میں سینگ والی بکری سے گنجی بکری کا بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ قیامت کے دن تمام جانوروں کو حساب وغیرہ کے

---

(۱) "وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ" الآیۃ (الحدید:۴)۔ "مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَمَا کَانُوْا" (المجادلۃ:۷)۔

(۲) سورۃ المائدۃ: ۱۔

لئے اُٹھایا جائے گا، ایک صاحب جو عالم اور فاضل ہیں کہتے ہیں کہ ''قرآن وسنت سے صرف انسان کا مکلّف ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کا حساب وکتاب کے لئے اُٹھائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حدیث قابلِ تأویل ہے۔''

جواب ۱:- جانوروں کا ایک دُوسرے سے بدلہ لینا بعض احادیث سے ثابت ہے اور یہ غیر مکلّف ہونے کے منافی نہیں ہے،[۱] صرف مظالم کا حساب لے لیا جائے تو یہ بھی مستبعد نہیں، لیکن حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کے عمل سے نہیں ہے اس لئے اس کی بحث وتدقیق میں پڑنا فضول ہے۔

س ۲:- جنت میں جیسے مردوں کو رُؤیتِ باری ہوگی، کیا اسی طرح عورتوں کو بھی ہوگی؟ اس ضمن میں ایک صاحب کی رائے یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے رُؤیت نصیب ہوگی اور پردہ کا وہاں حکم نہ ہوگا، کیونکہ پردہ صرف دُنیا کے لئے ہے۔ دُوسرے صاحب کی رائے یہ ہے کہ جنت میں بھی پردہ ہوگا، اور عورتوں کو رُؤیتِ باری تعالیٰ نصیب نہ ہوگی، اور اگر ہوئی تو مردوں کے ساتھ نہ ہوگی۔

ج ۲:- اکثر حضراتِ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ رُؤیت عورتوں کو بھی ہوگی،[۲] جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ باقی اس کی تفصیلات اللہ ہی جانتا ہے، اس قسم کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے عملی مسائل معلوم کرنے میں وقت صَرف کیجئے۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی تفسیر رُوح المعانی (ج:۳۰ ص:۵۱) تحت الأیة: "وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ" .... فلاتبعث ولایحضر فی القیامة غیر الثقلین وقیل بعثت للقصاص فیحشر کل شئ حتی الذباب، وروی ذٰلک عن ابن عباسؓ أیضًا وعن قتادةؒ وجماعة وفی روایة عن الحبر تحشر الوحوش حتی یقتص من بعضها لبعض فیقتص للجمّاء من القرناء ثم یقال لها: موتی، فتموت، وقیل اذا قضی بینها ردّت ترابا. وفیه أیضًا بعد أسطر ج:۳۰ ص:۵۱، ۵۲ فقد أخرج مسلم والترمذی عن أبی هریرةؓ فی هٰذه الأیة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لتؤدن الحقوق الی أهلها یوم القیامة حتّی یقاد للشاة الجماء من الشاة القرناء. اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ "وَیَقُوْلُ الْکَافِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا" الآیۃ، کے تحت معارف القرآن ج:۸ ص:۶۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: قیامت کے دن ساری زمین ایک سطحِ مستوی ہوجائے گی، جس میں انسان، جنات، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کردیئے جائیں گے، اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دُوسرے پر ظلم دُنیا میں کیا تھا تو اس سے اس کا انتقام دِلوایا جائے گا، یہاں تک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا تھا تو آج اس کا بھی بدلہ دِلوایا جائے گا، جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہوجاؤ، وہ سب مٹی ہوجائیں گے۔ اس وقت کافر لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی جانور ہوتے اور اس وقت مٹی ہوجاتے، حساب وکتاب اور جہنم کی سزا سے بچ جاتے۔'' وکذا فی رُوح المعانی ج:۳۰ ص:۲۲.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعتقاد أهل السنة والجماعة للامام ابن الحسن بن منصور الطبری اللالکائی ص:۵۰۳ تا ۵۷۸۔

عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سوال:- محترم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے ایک خط آنجناب کو ارسال کیا تھا، لیکن جواب سے محروم رہا، اس خط میں یہ مذکور تھا کہ قرآن کے مطالعے سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مسلمان عام طور سے دینی معاملات میں اَحکامِ قرآن کے خلاف عمل کر رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔

قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کو موت آتی ہے، اور پھر وہ قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر اچھی طرح اس کی وضاحت کردی تھی، لیکن عام مسلمان حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیاتِ اولیاء کے قائل ہیں، اور ان کے تصرفات کے عجیب وغریب واقعات بیان کرتے رہتے ہیں۔

جواب:- مکرمی ومحترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پہلا خط مجھے ملنا یاد نہیں، بہرکیف! آپ کے سوال کا جواب عرض ذیل ہے:-

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سمیت تمام مخلوقات کو موت آتی ہے، البتہ موت کے بعد ہر انسان کو برزخی زندگی سے واسطہ پڑتا ہے، برزخی زندگی کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی رُوح کا اس کے جسم سے کسی قدر تعلق رہتا ہے، یہ تعلق عام انسانوں میں بھی ہوتا ہے، مگر اتنا کم کہ اس کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ شہداء کی ارواح کا تعلق ان کے جسم سے عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے قرآنِ کریم نے انہیں احیاء قرار دیا ہے،(۱) اور انبیائے کرام کا درجہ شہداء سے بھی بلند ہے، اس لئے احادیث کے مطابق ان کی ارواح کا تعلق جسم سے سب سے زیادہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور ان کے ازواج کا نکاح بھی دُوسرا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے،(۲) چونکہ ان کی ارواح کا تعلق سب سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے شہداء کی طرح انہیں بھی احیاء قرار دیا گیا ہے، مگر یہ حیات اس طرح کی نہیں ہے جیسی انہیں موت سے پہلے حاصل تھی، نیز قرآن وسنت میں اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس حالت میں انبیائے کرام علیہم السلام کو دُوسروں پر تصرف کا کوئی اختیار حاصل ہے، اگر کسی نے کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ دیکھا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی صورتِ مثالی ہوسکتی ہے جس کا ان کو علم ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

---

(۱) "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ." (البقرة: ۱۵۴)

(۲) "وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا." (الأحزاب: ۵۳)

شیخ احمد کے مروّجہ وصیت نامہ کا حکم

سوال:- جو اشتہار کبھی کبھار لوگ شائع کرتے ہیں، یعنی وہ معروف وصیت نامہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے خادم کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ دُرست ہے یا نہیں؟ مثلاً جو اس کو پڑھے گا وہ اس کو شائع کرے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو نقصان اُٹھائے گا، انکار کرنے والا سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، جو پڑھ کر شائع نہ کرے مسلمان نہ رہے گا۔

جواب:- منسلکہ وصیت نامہ میں بنیادی طور سے جو بات کہی گئی ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اسلامی اَحکام کے مطابق زندگی گزاریں، وہ بالکل صحیح اور دُرست ہے۔ اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے بہتر ہے، لیکن پڑھنے والے کے ذمہ خاص تعداد میں بعینہٖ اسی وصیت نامہ کو شائع کرنے کو لازمی قرار دینا، اور جو نہ کر سکے اس کو نقصان کی دھمکی دینا شرعاً اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۰/۱۸ الف)

یہ وصیت نامہ سالہا سال سے شائع ہوتا ہے، جس کو تقریباً ۸۰ سال گزر چکے ہیں، کسی شخص نے خود ہی بنالیا ہے، روضۂ اطہر کا کوئی خادم شیخ احمد نہ اب ہے، نہ اُس وقت تھا جب یہ وصیت نامہ نیا نیا شائع ہوا تھا، اُس وقت علماء نے تحقیق کی تھی۔ لہٰذا نقصان کی دھمکی کی کوئی پروانہ کریں۔

محمد عاشق الٰہی بلندشہری عفی عنہ

جب جنت میں شیطان نہیں جاسکتا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا کیسے دیا؟

سوال:- جنت کے اندر تو شیطان نہیں جاسکتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا پھر کیسے دیا؟ اور دھوکا صرف آدم علیہ السلام کو دیا یا آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو دیا؟ اور پہلے کس کو دیا؟

جواب:- قرآنِ کریم میں صراحت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا[1]، اور اس کام کے لئے جنت میں جانا کیا ضروری تھا؟

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۳/۲۸ ب)

---

(۱) "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ" الآية. (سورة الأعراف: ۲۰).

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾

(کفریہ و غیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موسیقی سننے والے کو کافر کہنا

سوال ا:- کیا میراثی، گانا گانے والے کافر ہیں؟

۲:- اگر نہیں تو ہمارے ہاں ایک صاحب انہیں کافر کہتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب ا:- آلاتِ موسیقی میں مشغولیت سخت گناہ ہے، احادیث میں اس پر شدید وعید آئی ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے بچنا لازم ہے،(۱) لیکن اس گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں۔

۲:- جن صاحب نے میراثیوں کو کافر کہا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی، انہیں توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے ویزا فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھنے کا حکم

سوال:- خدا کرے حضرت بعافیتِ کاملہ ہوں، ان دنوں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ بعض مسلمان کسی کافر ملک کا ویزا سہولت سے حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیاوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھ دیتے ہیں۔ اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ یہ انتہائی قبیح حرکت اور بڑا گناہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ یہاں دارالافتاء میں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''اسلام اور موسیقی''۔

(۲) وفی مشکٰوة المصابیح باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحدیث:۴۸۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی جامع الترمذی ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أیما رجل قال لأخیه کافر، فقد باء بها أحدهما. هٰذا حدیث صحیح.

اس سلسلے میں استفتاء بھی آیا ہوا ہے، اس سلسلے میں غور کرنے سے جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ آخر میں چند متعلقہ عبارات بھی ذکر کردی گئی ہیں، جناب سے درخواست ہے کہ اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

۱:- کسی کلمے کے موجبِ کفر ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہو تو احتیاط عدمِ تکفیر میں ہوتی ہے۔

۲:- جو کلمہ فی نفسہٖ موجبِ کفر ہو اس کے تلفظ و تکلم کی کئی صورتیں ہیں۔

۱:- ناسیاً یا خاطئاً تکلم ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر نہیں کی جائے گی۔

۲:- عامداً تکلم ہو، معلوم ہوتا ہے کہ عمد سے مراد یہ ہے کہ تکلم کا قصد بھی ہو، اس کلمے کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی ہو اور کفر کا ارادہ بھی ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر کی جائے گی۔

۳:- جاہلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو، مگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس سے آدمی کافر ہوجاتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، تکفیر و عدمِ تکفیر دونوں قول ہیں۔

۴:- ہازلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو اور اس کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی تھا، مگر ایقاعِ حکم یعنی کفر کا ارادہ نہیں تھا، اس صورت میں تکفیر کی جاتی ہے۔

۵:- لاعباً تکلم ہو، یعنی بطور استہزاء کے کلمۂ کفر کہا جائے، یہ استخفافِ ایمان ہے اور اس کی بھی تکفیر کی جاتی ہے۔

اس تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو قادیانی لکھتے ہوئے اگر علم ہو کہ یہ باعثِ کفر ہے، لیکن اعتقادِ کفر نہ ہو تو یہ لاعباً یا ہازلاً تکلم قرار پائے گا اور اس صورت میں تکفیر ہوگی، اور اگر موجبِ کفر ہونے کا علم نہ ہوتے ہوئے لکھا گیا ہے تو اختلاف کی بناء پر احتیاط اس میں ہے کہ تکفیر نہ کی جائے۔

چند عبارات یہ ہیں:-

فی البحر: وفی فتح القدیر: ومن ھزل بلفظ کفر ارتد وان لم یعتقدہ للاستخفاف، فھو ککفر العناد والألفاظ التی یکفر بھا تعرف فی الفتاویٰ اھـ. (ج:۵ ص:۱۲۰ طبع ایچ ایم سعید).

وفی الفتاویٰ الخیریۃ: وفی الفتاویٰ اذا أطلق الرجل کلمۃ الکفر عمدًا لٰکنہ لم یعتقد الکفر قال بعض أصحابنا: لا یکفر لأن الکفر یتعلق بالضمیر ولم یعقد الضمیر علی الکفر وقال بعضھم: یکفر، وھو الصحیح عندی، لأنہ استخف بذنبہ اھـ. وفی الخلاصۃ: اذا کان فی المسئلۃ وجوہ توجب التکفیر ووجہ واحد یمنع التکفیر، فعلی المفتی أن یمیل الی الوجہ الذی یمنع التکفیر تحسینًا للظن بالمسلم. زاد فی البزازیۃ الا اذا خرج بارادتہ موجب الکفر فلا ینفعہ التأویل حینئذ. وفی التاترخانیۃ: لا یکفر بالمحتمل، لأن الکفر نھایۃ فی

العقوبة، فيستدعى نهاية فى الجناية، ومع الاحتمال لا نهاية اهـ. قال فى البحر: والحاصل أن من تكلم بكلمة الكفر هازلًا أو لاعبًا كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده كما صرح به قاضى خان فى فتاواه. ومن تكلم بها خطأ أو مكرها لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامدا عالما كفر بها عند الكل، ومن تكلم بها اختيارا جاهلًا بأنها كفر ففيه اختلاف، والذى تحرر أنه لا يفتى بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه علىٰ محمل حسن أو كان فى كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة، فعلىٰ هٰذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها، ولقد ألزمت نفسى أن لا أفتى بشئ منها، والله أعلم. (الخيرية علىٰ هامش الفتاویٰ تنقيح الحامدية ج:۱ ص:۱۷۷).[۱]

وفى أحكام القرآن للجصاص: ولأن الفرق بين الجد والهزل أن الجاد قاصد الى اللفظ والى ايقاع حكمه، والهازل قاصد الى اللفظ غير مريد لايقاع حكمه. (ج:۳ ص:۱۹۳).[۲]

وفى التفسيرات الأحمدية: وكذا غير المكره اذا أجرى علىٰ لسانه كلمة الكفر استهزاء أو جهلًا يكون كافرًا، فيكون الأية دليلًا علىٰ أن ركن الايمان التصديق والاقرار جميعًا، ولٰكن التصديق لا يحتمل السقوط بحال، والاقرار يحتمله فى حالة الاكراه. (ص:۵۰۱).[۳]

پھر دو باتیں اور قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ عام لوگوں کی دینی گرفت اس قدر ڈھیلی ہوچکی ہے کہ تکفیر کا فتویٰ معلوم ہونے کے باوجود بھی بہت سے دُنیاوی مفاد کو ترجیح دیں گے اور یہ حرکت نہیں چھوڑیں گے، اور تکفیر کے فتویٰ کا علم ہوجانے کے بعد یہ حرکت بہرحال کفر ہوگی، تو تکفیر کا فتویٰ دینے کی صورت میں بظاہر یہ مضائقہ ہے کہ کفر سے بچنے کا جو ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہوجائے گا..... دُوسری بات یہ کہ اگر تکفیر نہ کی جائے تو خطرہ ہے کہ تکفیر نہ کرنا اس حرکت کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرتے ہوئے تقاضائے مصلحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ بتاتے یا لکھتے ہوئے صاف تکفیر تو نہ کی جائے تاکہ پہلا حرج لازم نہ آئے، البتہ مذمت و وعید کے الفاظ سخت بتائے جائیں، لیکن یہ بھی تب دُرست ہوگا کہ فقہی طور پر اس کی گنجائش ہو۔

جواب:- کسی کافر ملک کا ویزہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا فارم پر مذہب کے خانے میں کسی مسلمان کا دیدہ دانستہ اپنے آپ کو قادیانی لکھنا، صراحۃً کافر مذہب کی طرف اپنی نسبت کرنا ہے، جو سراسر موجبِ کفر ہے، اگر کوئی ایسا کرلے تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ فوراً صدقِ دِل سے توبہ کرلے اور تجدیدِ ایمان کرے، اور آئندہ ایسا کرنے سے مکمل پرہیز کرے۔

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔ (۲) طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔ (۳) مطبع کریمی بمبئی۔

آپ نے خط میں جو عباراتِ فقہاء تحریر کی ہیں، ان کا مذکورہ مسئلہ سے تعلق نہیں، اور کسی دُنیاوی غرض سے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرنے کے بارے میں تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی واضح تصریح بھی نہیں ملی، البتہ درج ذیل جزئیات سے بیان کردہ حکم کی تائید ہوتی ہے:-

في الهندية: مسلم قال: أنا ملحد، يكفر، ولو قال: ما علمت أنه كفر، لا يعزر بهذا.....

وفي اليتيمة: سألت والدي عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس، فحينئذ يكفر كذا في التاتارخانية. [1]

في الهندية: مسلم رأى نصرانية سمينة فتمنى أن يكون هو نصرانيًا حتّى يتزوجها يكفر، كذا في المحيط. (ج:۲ ص:۲۷۷)۔[2]

واللہ اعلم
بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۴۱۴/۶/۲۱ھ

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، دراصل کوئی کلمۂ کفر کہنا اور بات ہے، اور اپنے آپ کو کسی معروف کافر مذہب کی طرف منسوب کرنا اور بات ہے۔ جو عبارات تحریر کی گئی ہیں وہ اوّل الذکر صورت سے متعلق ہیں، ثانی الذکر سے نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں احقر کا رُجحان اسی طرف ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کے خانے میں اپنے آپ کو ''مسلمان'' کے بجائے قادیانی یا کسی اور مذہب کا پیرو لکھوانا جو ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، موجبِ کفر ہے، جس سے توبہ اور تجدیدِ ایمان ضروری ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۴/۶/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۵)

قادیانیت سے براءت اور کسی مسلمان کو قادیانی کہنے کا حکم

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

من مسمّٰی بشیر احمد شاہ ولد سیّد محمد اسماعیل شاہ سکنہ سماروشہر ضلع نوپا کر سندھ مندرجہ ذیل عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سب فرشتوں اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر کی بھلائی اور بُرائی پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتا ہوں، ایمانِ مجمل اور مفصل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں خاتم النبیین

(۱) الفتاویٰ الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ (طبع مكتبه رشيديه).
(۲) الفتاویٰ الهندية ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع مكتبه رشيديه).

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہوں، اور یہ کہ میں کسی ایسے شخص کا پیروکار نہیں ہوں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو، اور نہ ہی ایسے دعویدار کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہوں، نہ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھتا ہوں یا خود کو احمدی کہتا ہوں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص کسی معنی کے لحاظ یا اعتبار سے نبی یا مذہبی مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو اور اس کے ماننے والوں کو مرتد و کافر جانتا ہوں۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے احمدی اور لاہوری گروپ سب کو غیر مسلم اور اسلام سے خارج ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا یہ بیان حلفیہ ہے اور میں کلمۂ طیبہ لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بالکل صحیح اور دُرست تحریر کرتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے مندرجہ بالا عقیدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فتویٰ صادر فرمائیں کہ:-

۱:- عقیدے کے اعتبار سے میں شریعتِ محمدیہ کے مطابق مسلمان ہوں یا نہیں؟

۲:- کیا مجھے قادیانی کہا جانا دُرست ہے؟

۳:- اگر کوئی شخص مجھے قادیانی کہتا ہے تو شریعتِ محمدیہ میں اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اگر آپ کے وہی عقائد ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی فاسد عقیدہ بھی نہیں رکھتے، تو آپ بلاشبہ مسلمان ہیں۔

۲:- مندرجۂ سوال عقائد کا حامل شخص قادیانی نہیں ہوسکتا، اس کو قادیانی کہنا ہرگز دُرست نہیں۔

۳:- کسی مسلمان کو بلاوجہ قادیانی کہنا سخت گناہ ہے،[1] اگر ناواقفیت یا بے احتیاطی سے کہا ہے تو اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے، اور اگر کسی غلط فہمی کی بناء پر کہا ہے تو اس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۳/۸/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۴۴۴ ج)

علماء کو بُرا بھلا کہنے والے کا حکم

سوال:- ایک شخص علمائے دین کو لوطی کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ دین فروشی ان کا پیشہ ہے، اور علمِ دین پڑھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، علمائے دین بدمعاش ہیں، مدارسِ عربیہ گمراہی کے اڈّے

---

(۱) وفي مشكوة المصابيح "باب حفظ اللسان والغيبة والشتم" ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحديث:۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتاله كفر. وفي الهداية ج:۲ ص:۵۳۵ (طبع مكتبه شركت علميه) وكذا اذا قذف مسلمًا بغير الزنا، فقال: يا فاسق أو يا كافر، فوجب التعزير.

ہیں، اور مسجدوں کو اصطبل خانہ قرار دے اور مزید لغویات و بیہودہ باتوں کا کہنا اس وقت مذکورہ شخص کا پیشہ بن گیا ہے، اور موصوف عاقل، بالغ و ذی فہم آدمی ہے۔ اب شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ کلمات سخت گستاخانہ ہیں، اور تحقیق کے بغیر علماء کی پوری جماعت کو اس قسم کے قبیح و شنیع کلمات کہنا نہ صرف بدترین فسق اور گمراہی ہے، بلکہ ان کلمات کے کلماتِ کفریہ ہونے کا اندیشہ ہے۔[۱] مذکورہ شخص پر واجب ہے کہ فوراً ان کلمات سے صدقِ دِل کے ساتھ اعلانیہ توبہ کرے بلکہ اسے احتیاطاً تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح بھی کرلینی چاہئے، اور جب تک وہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرلے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔[۲]

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۳/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۵/۳۱ ب)

حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے اور جہنم کے دائمی نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع مندرجہ ذیل مسئلے میں کہ:-

۱:- ہمارے علاقے کے بعض حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ وقت میں حدیث کا جو ذخیرہ ہے وہ غیر معتبر اور جلانے کے قابل ہے۔ (معاذ اللہ)

۲:- ایک اور عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ جنت دائمی اور غیر فانی ہے، مگر جہنم دائمی و ابدی نہیں ہے، یعنی جہنم ایک مدّت کے بعد فانی اور غیر ابدی ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کی انتہاء ہونے کے بعد انسان سارے کے سارے یعنی مشرک و کافر رحمت (جنت) میں جائیں گے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں "ان رحمتی سبقت علیٰ غضبی" اور ساتھ ساتھ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی چہارم میں دوزخ کی انتہاء کے مبحث لوگوں کو دِکھا دِکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے جارہے ہیں، اب آپ بتائیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ شریعتِ محمدی کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب:- مذکورہ عقائد سخت گمراہانہ عقائد ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سارا ذخیرۂ حدیث (معاذ اللہ)

(۱) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۸۸ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (ألفاظ الکفر) من أبغض عالمًا بغیر سبب ظاھر خیف علیه الکفر. وراجع أیضًا شرح الفقه الأکبر لمُلّا علی القاری ص:۴۷۰ (طبع دار الاشاعت الاسلامیہ بیروت).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۶۸ و امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۹۳ و امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۲۵.

نا قابلِ اعتبار ہے، کفریہ عقیدہ ہے، جس کے بعد انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے،[۱] اور دُوسرے عقیدے پر بھی کفر کا اندیشہ ہے۔ ایسے عقائد کے شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے دوستانہ خصوصی تعلقات نہ رکھنا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۹/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۷۲/۳۱ د)

مسلمان کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ مسمّٰی مولانا ذاکراللہ سواتی حال ساکن لوندخوردہ آدہ نے اس بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے کہ انجمن اشاعت التوحید والسنّت کے افراد سب کافر اور ان کی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے، اور محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اور ابنِ تیمیہؒ اور اسماعیل شہیدؒ اور دیوبندیوں کو بھی کافر کہتے ہیں، کیا مولانا موصوف اس فتویٰ کی رُو سے کافر ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کو کافر کہنا سخت گناہ ہے، اور جو شخص ایسا کہے وہ فاسق ہے،[۲] لیکن اس غلطی کی بناء پر اسے مطلقاً کافر بھی نہیں کہا جاسکتا،[۳] تاوقتیکہ اس کے دُوسرے بنیادی عقائد خراب نہ ہوں، البتہ خطرۂ کفر سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۱/۷/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی البزازیة علٰی هامش الهندیة ج:۶ ص:۳۲۸ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) اذا استخف بسنة أو حدیث من أحادیثه علیه السلام کفر. وفی الهندیة ج:۲ ص:۲۶۵ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) (الباب التاسع، أحکام المرتدین) من أنکر المتواتر فقد کفر، ومن أنکر المشهور یکفر عند البعض. وقال عیسٰی ابن ابان: یضلل ولا یکفر وهو الصحیح، ومن أنکر خبر الواحد لا یکفر غیر أنه یأثم بترک القبول. وفی شرح الفقه الأکبر ص:۴۷۳ (طبع دار البشائر الاسلامیة بیروت، فصل فی العلم والعلماء) من قال لفقیه یذکر شیئًا من العلم أو یروی حدیثًا صحیحًا أی ثابتًا لا موضوعًا: هٰذا لیس بشیء، کفر .... الخ.

(۲) وفی مشکٰوة المصابیح باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱، رقم الحدیث:۴۸۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر.

(۳) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أیما رجل قال لأخیه: کافر، فقد باء بها أحدهما. هٰذا حدیث صحیح، جامع الترمذی ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه). وفی اللمعات والطیبی: انه محمول علی المستحل لذٰلک .... أو لأنه فعل مثل فعل الکافر. (حواله مذکوره) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۲۲۹، ۲۳۰ واعلم أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علٰی محمل حسن أو کان فی کفره خلاف، ولو کان ذٰلک روایة ضعیفة. وقال الشامیؒ تحت مطلب فی حکم من شتم دین مسلم (ج:۴ ص:۲۳۰): ثم ان مقتضی کلامهم أیضًا أنه لا یکفر بشتم دین مسلم أی لا یحکم بکفره لامکان التأویل، ثم رأیته فی جامع الفصولین حیث قال بعد کلام أقول، وعلی هٰذا ینبغی أن یکفر من شتم دین مسلم ولٰکن یمکن التأویل بأن مراده أخلاقه الردیئة ومعاملته القبیحة لا حقیقة دین الاسلام فینبغی أن لا یکفر حینئذ، والله تعالٰی أعلم.

''اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' کہنے کا حکم

سوال:- اگر بیوی نے کئی مرتبہ کہا: اب بھی نماز نہیں پڑھی تو "من ترک الصلاۃ متعمدًا فقد کفر"، یا اگر بیوی نے کہہ دیا کہ: ''فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' اور وہ کام کردیا یا بھول کر کوئی کفریہ فقرہ کہہ دیا (کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہیں) تو کیا ان صورتوں میں وہ کافر ہوجائے گی یا طلاق ہوجائے گی؟

جواب:- جان بوجھ کر نماز چھوڑنا انتہائی شدید گناہ ہے، لیکن اس سے انسان کافر نہیں ہوتا،[1] اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ ''میں اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' تو اتنا کہنے سے بھی کافر نہیں ہوتا، اور اگر وہ کام کرلے تب بھی کافر نہیں ہوتا، اِلَّا یہ کہ وہ سمجھتا ہو کہ یہ کام کرنے سے میں واقعی کافر ہوجاؤں گا اور پھر بھی کفر پر راضی ہوکر وہ کام کرلے۔

لما فی الدر المختار: وان فعل کذا فھو کافر، والأصح أن الحالف لم یکفر علقه بماض أو اٰت ان کان عندہ فی اعتقادہ أنه یمین، وان کان عندہ أنه یکفر فی الحلف یکفر فیھما. (شامی ج:۳ ص:۵۵)۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۶/۲۸ ب)

''میں ہندو ہوں'' کہنے کا حکم

سوال:- اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے کہ جس سے کہا جائے کہ رمضان کا مہینہ ہے، قرآن پاک کی تلاوت کیوں نہیں کرتا؟ تو مسلمان نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دے: ''ہاں! میں مسلمان نہیں ہوں بلکہ ہندو یا سکھ ہوں۔'' کیا وہ مسلمان رہتا ہے اور اس کا نکاح باقی رہتا ہے؟

جواب:- یہ کلمہ کہ ''ہاں میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو یا سکھ ہوں'' کلمۂ کفر ہے، اور اگر اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۳۵ وتارکھا عمدًا مجانةً أی تکاسلاً فاسق .... الخ. وکذا فی شرح المسلم للنوویؒ ج:۱ ص:۶۱.

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۷، ۷۱۸. وفی البزازیة علٰی ھامش الھندیة ج:۶ ص:۳۲۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ان فعل کذا فھو یھودی ثم أتی بالشرط ان کان عندہ من أتی بھٰذا الشرط لا یکفر کانت علیه کفارۃ الحلف، وان حلف بھٰذہ أعنی بقوله ھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی ان کان فعل کذا وقد کان فعله ھو عالم بفعله لا یلزم الکفارۃ لأنه غموس وقد اختلفت الأجوبة فی کفرہ والمختار ما قال السرخسی وبکر انه ان کان کفرا عندہ الحلف بھٰذا فھو کافر لأنه رضی بکفر نفسه، والرضا بکفر نفسه کفر بلا نزاع .... الخ.

وہی مطلب مراد تھا جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو انسان ان کلمات کے کہنے سے کافر ہوجاتا ہے،(۱) ایسے شخص کو توبہ کے بعد ایمان کی تجدید اور نکاح کی تجدید کرنی لازم ہے، اور اگر مقصد کچھ اور تھا تو وہ لکھ کر دوبارہ سوال کرلیں۔ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح ہر صورت میں کرلینی چاہئے، کیونکہ یہ بڑا خطرناک اور سنگین جملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی بات کہنے سے محفوظ رکھیں، آمین۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱۲/۳۲ ج)

اذان کی گستاخی کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مؤذّن کے متعلق جو کہ پانچ وقت جامع مسجد میں اذان دیتا ہے، ۵-۶ دفعہ میرے سامنے کہا کہ: ”یہ مؤذّن صبح کے وقت زیادہ بکواس کرتا ہے، جس سے میری نیند میں خلل آتا ہے، اس کو منع کرو کہ صبح کے وقت اذان نہ دیا کرے۔“ ایک شخص نے اس شخص کو کسی بیمار کو انجکشن لگانے کا کہا تو اس نے کہا کہ: ”جب تک مؤذّن سے اذان بند نہیں کرائیں گے، بیمار کو انجکشن نہیں لگاؤں گا۔“ اس شخص کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- جس شخص نے اذانِ فجر کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات کہے ہوں وہ انتہائی بدعقیدہ معلوم ہوتا ہے، یہ کلمات کفر کے ہیں،(۲) اس شخص کو چاہئے کہ فوراً اپنے ان کلمات سے توبہ کرکے ایمان کی تجدید کرے، اور جب تک وہ ایسا نہ کرے مسلمانوں کو اس سے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۶/۲۸ ج)

”میں کافر ہوجاؤں گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا“ وغیرہ الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چند آدمیوں کے درمیان یہ الفاظ کہے ہیں کہ: ”میں کافر ہوجاؤں

---

(۱) وفی الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ مسلم قال: أنا ملحد، يكفر. ولو قال: ما علمت انه كفر، لا يعزر بهٰذا .... وفي اليتيمة: سألت والدى عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس فحينئذ يكفر، كذا في التاتارخانية. وفي جامع الفصولين ج:۲ ص:۳۰۱ (طبع اسلامی کتب خانه) قال: هو يهودى أو نصراني .... كفر .... لأنه رضاء بالكفر، وهو كفر، وعليه الفتوىٰ. وفي الهندية ج:۲ ص:۲۵۷ (أحكام المرتدين) ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر، وكذا في التاتارخانية ج:۵ ص:۴۶۰.

(۲) وفي الهندية ج:۲ ص:۲۶۹ (مكتبه رشيديه كوئٹه) في التخيير مؤذّن أذّن فقال رجل: أين بانگ غوغا است، يكفر ان قال علىٰ وجه الانكار، وفي الفصول ولو سمع الأذان فقال: هٰذا صوت الجرس، يكفر كذا في التّتارخانية، وراجع أيضًا البحر الرائق ج:۵ ص:۱۲۲ أحكام المرتدين. (محمد زبیر عفی عنہ)

گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا، داڑھی کٹواؤں گا'' جب لوگوں نے گرفت کی تو اس نے چند آدمیوں کے سامنے کلمہ پڑھ کر جھوٹ بولا کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے، جبکہ اس کے اس قول کے پورے محلّہ والے گواہ ہیں، اور بغیر تصدیق کئے اس نے الزام تراشی بھی کی ہے، تصدیق کرنے پر محلّہ کے چند آدمیوں کے سامنے یہ اقرار کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، اب وہ معافی مانگ رہا ہے۔ اس کا شرعی فتویٰ کیا ہے اور وہ اب اپنے ''کافر ہوجاؤں گا .... الخ'' الفاظ سے توبہ کر رہا ہے تو اس توبہ کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص نے یہ الفاظ کہہ کر سنگین گناہ کا ارتکاب کیا، اسے فوراً صدقِ دِل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، توبہ کی صورت یہ ہے کہ صدقِ دِل سے اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ: ''یا اللہ! میں نے مذکورہ کلمات کہہ کر سخت گمراہی کا ارتکاب کیا، میں اس پر بے حد نادم و شرمسار ہوں، آئندہ کے لئے ایسے کلمات سے اور ہر طرح کے کفریہ کلمات و اعمال سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے اپنے فضل سے معاف فرمادیجئے۔'' اس کے ساتھ ہی احتیاطاً ایمانِ مفصل کی شہادت اور اسلام کے سوا ہر دین سے اپنی مکمل براءت کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار و اعلان کرے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۲۸ الف)

قرآنِ کریم میں لفظی تحریف کا عقیدہ رکھنا اور استدلال میں حضرت کشمیریؒ کی عبارت پیش کرنا

سوال:- باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضراتِ علمائے کرام و مفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:-

۱:- ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب اپنے بیان میں کہا کرتا ہے کہ قرآن میں لفظی و معنوی دونوں قسم کی تحریفیں موجود ہیں۔ اور وہ مولوی صاحب اپنے قول کی تائید کے لئے درج ذیل عبارت نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے، کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:-

''واعلم أن فی التحریف ثلاثة مذاهب، ذهب جماعة الی أن التحریف فی الکتب السماویة قد وقع بکل نحو فی اللفظ والمعنی جمیعًا، وهو الذی مال الیه ابن حزم، ....

وذهب جماعة انكار التحريف اللفظی رأسا فالتحريف عندهم كله معنوی، قلت يلزم علی هٰذا المذهب أن يكون القرآن أيضًا محرفًا، فان التحريف المعنوی غير قليل فيه أيضًا، والذی تحقق عندی أن التحريف فيه لفظی أيضًا، أما أنه عن عمد منهم أو لمغلطة۔"

اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

۲:- بیان کرنے والے مولوی صاحب کا شرعی حکم کیا ہے، آیا قابلِ امامت ہے یا نہیں؟ اور اس کا یہ عقیدہ، قرآن مجید کی آیت: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ" الآية، کا مخالف ہے یا نہیں؟ نیز جس مصنف کی کتاب کا حوالہ پیش کر رہا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مسلمان ہے یا مرتد؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ:- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم! ہمارے علاقے کے علماء و عوام آپ ہی کے فتویٰ پر اعتبار کرتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے دست مبارک سے جواب تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا فضل جاوید حنفی باجوڑی

جواب:- قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا عقیدہ رکھنا کفر ہے، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ عبارت میں یہ فرمایا ہے کہ پچھلی کتبِ سماویہ کے بارے میں (یعنی تورات، انجیل، زبور کے بارے میں) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان میں صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے، وہ غلط کہتے ہیں، کیونکہ کرنے والوں نے تو قرآنِ کریم میں بھی تحریفِ معنوی کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پچھلی کتبِ سماویہ میں تحریفِ لفظی بھی ہوئی ہے۔ حضرتؒ کی یہ عبارت[1] پچھلی کتبِ سماویہ سے متعلق ہے،[2] لہٰذا اس عبارت سے قرآنِ کریم کی تحریفِ لفظی کا عقیدہ

(۱،۲) حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مذکورہ عبارت "فیض الباری" ج:۳ ص:۳۹۵ کی ہے۔ حضرت کشمیریؒ نے یہ عبارت حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول بخاری شریف "باب لا يسأل أهل الشرک عن الشهادة وغيرها" ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) کی اس روایت کی تشریح میں ذکر فرمائی ہے: "عن عبدالله بن عباس قال: يا معشر المسلمين! كيف تسألون أهل الكتٰب وكتابكم الذی أنزل علٰى نبيه احدث الأخبار بالله تقرؤنه، لم يشب وقد حدثكم الله أن أهل الكتٰب بدلوا ما كتب الله وغيّروا بأيديهم الكتٰب، فقالوا: هو من عند الله ليشتروا به ثمنًا قليلًا، أفلا ينهاكم ما جاءكم من العلم عن مسألتهم ولا والله ما راينا منهم رجلًا قط يسألكم عن الذی أنزل عليكم۔" اس روایت میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر ہے، اور حضرت کشمیریؒ نے بھی اپنی مذکورہ عبارت میں پچھلی کتبِ سماویہ میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ اس عبارت میں "ان التحريف فی الكتب السماوية" کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس کے بعد آخر میں "ان التحريف فيه لفظی" میں "فيه" کی ضمیر حدیث ابنِ عباسؓ میں "ما كتب الله" کی طرف راجع ہے، قرآن کی طرف نہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ پچھلی کتبِ سماویہ میں ہی اختلافی مذاہب بیان کر رہے ہیں، اور پھر "والذی تحقق عندی" سے پچھلی کتب کی تحریف میں اختلافی مذاہب میں قولِ محقق ذکر فرما رہے ہیں، نیز اس سے اگلی عبارت "اما انه عن عمد منهم" میں "منهم" کی ضمیر غائب کا مرجع بھی حدیثِ ابنِ عباسؓ میں "اهل الكتاب" ہونا واضح ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

نکالنا قطعی گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں، کافر ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز بھی نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۳/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۸/۷۳)

ایک طنزیہ مضمون میں اللہ تعالیٰ کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فتویٰ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنے مضمون میں خدا کی شان میں گستاخی کی ہے، اس کے خلاف مقدمہ چلانا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارات رسالہ ''الف لیلیٰ'' ڈائجسٹ کے صفحات: ۹۰ تا ۹۳ پر لکھی ہوئی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے: ''چند دن ہوئے میں نے خواب میں دیکھا، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سوتے میں جگا رہا ہے، سر اُٹھایا تو ایک فرشتہ تھا، کہنے لگا: اچھے جرنلسٹ ہو، خدا کے دربار میں ہنگامہ ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ میں نے کہا: ''میرا ڈیئر تو کہتا ہے کہ صرف وزیروں اور زراعتی ناخداؤں کے ہاں جایا کرو، مگر تم کہتے ہو تو آج خدا کو بھی دیکھ لیتے ہیں، پتہ نہیں اس کی اسٹوری اخبار والے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ ہماری پارٹی کا نہیں، ابلیس ہوتا تو دُوسری بات تھی۔

بہرحال میں نے اپنی ڈائری اور کیمرہ اُٹھایا اور چل پڑا، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ واقعی ہنگامہ ہے، اللہ میاں تخت پر بیٹھے ہیں، نور کی رُوح پروَر روشنی ہے، چاروں طرف فرشتے سجدے میں پڑے ہیں، پسِ منظر میں حمد و ثنا کی موسیقی ہے، دھیمی دھیمی خوشبو کی لہریں اُٹھ رہی ہیں، مگر درمیان میں چند مغربی سائنسدان کھڑے گستاخانہ طریقے سے شور کر رہے ہیں۔

اس فرشتے نے کان میں کہا کہ: خدا سے بغاوت کرکے اپنی خودمختاری کا نوٹس دینے آئے ہیں، میں نے غور سے سنا تو ایک بڈھا سائنسدان چیخ رہا تھا۔

ہم کیوں مانیں تیری خدائی؟ کیا ہے تیرے پاس جو ہمارے پاس نہیں؟ تیری خدائی کی بنیاد صرف دو چیزوں پر ہے، ایک تخریب جو قہر اور عذاب بن کر آتی ہے اور دُوسری تخلیق۔ ہمارے پاس بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ہمارے ایٹم بم آج تیری دُنیا کا ایسے انداز میں خاتمہ کرسکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر تو نے بھی آج تک تخریب نہ کی ہوگی، تو نے دُنیا کو قیامت کے دن حشر برپا کرنے کی دھمکی دے کر زیر کیا اور انہیں

مذہب کی زنجیروں میں جکڑا، وہی حشر ہم اپنے بموں سے برپا کر سکتے ہیں"۔....(الخ تا ص:۹۳- از ناقل)

تمام صفحات کی عبارات سے اللہ تعالیٰ کی تحقیر، توہین وتذلیل ہوتی ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کے عقیدے میں خلل پڑتا ہے یا نہیں؟

نمبر۲،۳:- کیا اس عبارت سے کفر لازم آتا ہے یا نہیں جو اُوپر (قوسین) میں نقل کی گئی ہے؟

نمبر۴:- "کیا میں غلط کہہ رہا تھا اے خدا! میں نے جرأت کر کے پوچھ لیا، اللہ میاں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی تخلیق پر شرم سے سر جھکالیا، تو عرفی میاں، مغرب کے سائنسدان اپنی صدیوں کی سائنسی ترقی سے خدا کا سر نہ جھکا سکے اور ہم نے اس ملک کی بیس برس کی زندگی میں خدا کا سر جھکادیا ہے، ہم آگے ہیں یا نہیں؟"

نمبر۵، ۶:- کیا ایسے مسلمانوں کو جو پاکستان میں رعایا کی حیثیت سے مقیم ہوں ان کی، عام مسلمانوں کی دِل آزاری اور باری تعالیٰ سے اس درجہ گستاخی کی بناء پر اگر ملکِ پاکستان کے دستور کی بنیاد پر ضربِ کاری لگ رہی ہو تو اس کو دستورِ اساسی کا منکر تصوّر کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور ملک کا اور خدا کا دُشمن اور ملک کا باغی سمجھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ منسلکہ مضمون ایک طنزیہ مضمون ہے، جس میں الفاظ کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، لیکن طنزیہ انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کرنا، اور اس کی طرف ایسی فرضی باتیں منسوب کرنا سنگین گستاخی ہے، جس پر کفر کا بھی خوف ہے۔ لہٰذا ایسے مضمون لکھنے والے کو فوراً صدقِ دِل سے توبہ کرنی چاہئے۔ ایسے مضامین کی نشر واشاعت بالکل ناجائز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق اور اس کے کارخانۂ قدرت کو طنز ومزاح کا موضوع بنانا انتہائی خطرناک گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کو حقیقت سمجھتا ہو تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی العالمگیریة: یکفر اذا وصف الله تعالیٰ بما لا یلیق به أو سخر باسم من أسمائه أو بأمر من أوامره أو أنکر وعده ووعیده أو جعل له شریکًا أو ولدًا أو زوجة أو نسبه الی الجهل أو العجز أو النقص، ویکفر بقوله: یجوز أن یفعل الله تعالیٰ فعلًا لا حکمة فیه.

(عالمگیریة ج:۲ ص:۲۵۸)[1]۔ اور اگر الفاظ کی حقیقت مقصود نہ ہو بلکہ صرف موجودہ دور کے انسانوں پر طنز مقصود ہو تو چونکہ تکفیرِ مسلم ایک سنگین معاملہ ہے، اس لئے تکفیر سے تو کفِ لسان کیا جائے گا،[2] لیکن اس کے سنگین گستاخی اور سخت گناہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس مضمون کے مصنف اور ناشر دونوں کو

---

(۱) الباب التاسع فی أحکام المرتدین (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۲) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۲۲۹ (طبع ایچ ایم سعید) واعلم أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن.

آخرت کے مؤاخذے کی فکر کر کے فوراً اس پر توبہ کرنی چاہئے، اور حکومت کو ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہ دینی چاہئے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۶ھ

قادیانیوں کے ''لاہوری گروپ'' سے تعلق رکھنے والے شخص کے چند کفریہ عقائد کا حکم

سوال:- ایک شخص کئی سال تک لاہوری، احمدیوں کے ایک تبلیغی رسالے کا ایڈیٹر رہتا ہے، اور اس کے عقائد یہ ہیں:-

الف:- ایک غیر عرب مسلمان کو (جو عربی نہیں جانتا) نماز میں اپنی مادری زبان میں قرآن کا ترجمہ جو لفظاً ہو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ب:- امام ابوحنیفہؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ایک غیر عرب مسلمان جو عربی زبان نہیں جانتا نماز میں قرآن کا فارسی ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔

ج:- محنت کش طبقہ (کسان اور مزدور) کے لئے روزہ رکھنا ضروری نہیں، اور یہ کہ رمضان کے روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی بھی لازم نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو مسلمان شمار کیا جانا چاہئے؟ اور کیا اسے کسی اسلامی ادارے کی نگرانی اور ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے جبکہ وہ اپنے عقائد کا تحریری وتقریری اظہار کرتا ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب اب بھی لاہوری، مرزائیوں کے عقائد سے متفق ہیں تب تو ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اگر ان عقائد سے تائب ہوچکے ہیں تب بھی ان کا یہ عقیدہ کہ روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی لازم نہیں ہے، کفریہ عقیدہ ہے،(۲) اور غیر عرب کے لئے اپنی مادری زبان میں نماز کی اجازت بھی گمراہی ہے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے وہ بھی اس اطلاق کے ساتھ دُرست نہیں، امام صاحبؒ کا مطلب کچھ اور تھا،(۳) اور ایسے شخص کو کسی اسلامی ادارے کی ذمہ داری سونپنا ہرگز دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۹۳۔

(۲) "أَيَّامًا مَّعْدُودٰتٍ" (البقرة:۱۸۴)، "فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" الآية (البقرة:۱۸۵).

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار مطلب في حكم القرائة بالفارسية ج:۱ ص:۴۸۵ (طبع سعيد).

﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الإسلامية والباطلة والأشخاص المتعلقين بها﴾

(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اوران سے متعلق شخصیات کے بیان میں)

''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کے افکار وعقائد کا حکم

سوال:- حضرت جناب مفتی صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سائلہ نے اسلام آباد کے ایک ادارے ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس اِن اسلامک اسٹڈیز (One Year Diploma Course in I.S) کیا ہے۔ سائلہ اس ادارے میں طلبِ علم کی جستجو میں گئی تھی اوران کے خفیہ عقائد سے ناواقف تھی، ایک سالہ کورس کے بعد ان کے عقائد کچھ صحیح معلوم نہ ہوئے تو سوچا کہ علمائے کرام سے فتویٰ طلب کیا جائے، تاکہ اُمتِ مسلمہ کی بیٹیوں تک عقائدِ صحیحہ کو پہنچا کر ان کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ ہماری اُستاد اور ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کی نگران محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے نظریات کا نچوڑ پیشِ خدمت ہے۔

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنا۔

۲:- غیر مسلم اور اسلام بیزار طاقتوں کے نظریات کی ہم نوائی۔

۳:- تلبیسِ حق وباطل۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

۵:- آسان دین۔

۶:- آداب ومستحبات کو نظر انداز کرنا۔

اب ان بنیادی نکات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:-

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا:

۱:- قضائے عمری سنت سے ثابت نہیں، صرف توبہ کرلی جائے، قضا ادا کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

۲:-۳ طلاقوں کو ایک شمار کرنا۔

۳:-نفلی نمازوں، صلوٰۃ التسبیح، رمضان میں طاق راتوں خصوصاً ۲۷ویں شب میں اجتماعی عبادت کا اہتمام اور خواتین کے جمع ہونے پر زور دینا۔

۲:- غیر مسلم، اسلام بیزار طاقتوں کے خیالات کی ہم نوائی:

۱:- مولوی (عالم)، مدارس اور عربی زبان سے دُور رہیں۔

۲:- علماء، دین کو مشکل بناتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں، عوام کو فقہی بحثوں میں اُلجھاتے ہیں۔ بلکہ ایک موقع پر تو فرمایا کہ: اگر آپ کو کسی مسئلے میں صحیح حدیث نہ ملے تو ضعیف سے لیں، لیکن علماء کی بات نہ لیں۔

۳:- مدارس میں گرامر، زبان سکھانے، فقہی نظریات پڑھانے میں بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے، قوم کو عربی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ لوگوں کو قرآن صرف ترجمے سے پڑھایا جائے۔

ایک موقع پر کہا (ان مدارس میں جو ۷، ۷، ۸، ۸ سال کے کورس کرائے جاتے ہیں، یہ دین کی رُوح کو پیدا نہیں کرتے، اپنی فقہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اشارہ درسِ نظامی کی طرف ہے۔

۴:- وحیدالدین خان کی کتابیں طالب علموں کی تربیت کے لئے بہترین ہیں، نصاب میں بھی شامل ہیں اور اسٹالز پر بھی رکھی جاتی ہیں، کسی نے احساس دِلایا کہ ان کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے؟ تو کہا کہ: ''حکمت، مؤمن کی گمشدہ میراث ہے''۔

۳:-تلبیسِ حق و باطل:

۱:-تقلید شرک ہے، (لیکن کون سی برحق ہے اور کس وقت غلط ہے؟ یہ کبھی نہیں بتایا)۔

۲:-ضعیف حدیث پر عمل کرنا تقریباً ایک جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے (جب بخاری میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے تو ضعیف کیوں قبول کی جائے؟)۔

۴:-فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا:

۱:- اپنا پیغام، مقصد اور متفق علیہ باتوں سے زیادہ زور دُوسرے مدارس اور علماء پر طعن وتشنیع۔

۲:- ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے بنیادی فرائض، سنتیں، مستحبات، مکروہات سکھانے سے زیادہ اختلافی مسائل میں اُلجھا دیا گیا، (پروپیگنڈا ہے کہ ہم کسی تعصب کا شکار نہیں اور صحیح حدیث کو پھیلا

رہے ہیں)۔

۳:- نماز کے اختلافی مسائل رفعِ یدین، فاتحہ خلف الامام، ایک وتر، عورتوں کو مسجد جانے کی ترغیب، عورتوں کی جماعت، ان سب پر صحیح حدیث کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے۔

۴:- زکوٰۃ میں غلط مسائل بیان کئے جاتے ہیں، خواتین کو تملیک کا کچھ علم نہیں۔

۵:- آسان دین:

۱:- دین مشکل نہیں، مولویوں نے مشکل بنادیا ہے، دین کا کوئی مسئلہ کسی بھی امام سے لے لیں، اس طرح بھی ہم دین کے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔

۲:- حدیث میں آتا ہے کہ آسانی پیدا کرو، تنگی نہ کرو، لہٰذا جس امام کی رائے آسان معلوم ہو وہ لے لیں۔

۳:- روزانہ یٰسین پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نوافل میں اصل صرف چاشت اور تہجد ہے، اِشراق اور اَوّابین کی کوئی حیثیت نہیں۔

۴:- دین آسان ہے، بال کٹوانے کی کوئی ممانعت نہیں، اُمہات المؤمنین میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے۔

۵:- دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پکنک، پارٹیاں، اچھا لباس، زیورات کا شوق، محبت، مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ۔

۶:- خواتین دین کو پھیلانے کے لئے گھر سے ضرور نکلیں۔

۷:- محترم کا اپنا عمل طالب علموں کے لئے حجت ہے، محرَم کے بغیر تبلیغی دوروں پر جانا، قیام اللیل کے لئے راتوں کو نکلنا، میڈیا کے ذریعے تبلیغ (ریڈیو، ٹی وی، آڈیو)۔

۸:- آداب و مستحبات کی رعایت نہیں، خواتین ناپاکی کی حالت میں بھی قرآن چھوتی ہیں، آیات پڑھتی ہیں، قرآن کی کلاس میں قرآن کے اُوپر نیچے ہونے کا احساس نہیں۔

۶:- متفرقات:

۱:- قرآن کا ترجمہ پڑھا کر ہر معاملے میں خود اجتہاد کی ترغیب دینا۔

۲:- قرآن و حدیث کے فہم کے لئے جو اکابر علمائے کرام نے علوم سیکھنے کی شرائط رکھی ہیں، ان کو بیکار، جاہلانہ باتیں اور سازش قرار دینا۔

۳:- کسی فارغ التحصیل طالبہ کے سامنے دین کا کوئی حکم یا مسئلہ رکھا جائے تو اس کا سوال یہ

ہوتا ہے کہ یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ گلی گلی، محلے محلے ''الہدیٰ'' کی برانچز کھلی ہوئی ہیں، اور ہر قسم کی طالبہ خواہ ابھی اس کی تجوید ہی دُرست نہ ہوئی ہو آگے پڑھا رہی ہے، اور لوگوں کو مسائل میں بھی اُلجھایا جارہا ہے۔

گھر کے مردوں کا تعلق عموماً مسجد سے ہے (جہاں نماز کا طریقہ فقہِ حنفی کے مطابق ہے)، گھر کی عورتیں مردوں سے اُلجھتی ہیں کہ ہمیں مساجد کے مولویوں پر اعتماد نہیں۔

مطلوبہ سوالات:

۱:- مذکورہ بالا تمام مسائل کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں۔

۲:- محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے اس طریقۂ کار کی شرعی حیثیت، نیز محترمہ کی گلاسگو یونیورسٹی سے پی.ایچ.ڈی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳:- ان کے اس کورس میں شرکت کرنا، لوگوں کو اس کی دعوت دینا، اور ان سے تعاون کرنے کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمادیجئے، جزاکم اللہ خیرًا اَحسن الجزاء۔

مستفتیہ مسز سیما افتخار
One Year Diploma Holder from
Al-Huda International
Islamabad

جواب:- سوال میں جن نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، خواہ وہ کسی کے بھی نظریات ہوں، ان میں سے اکثر غلط ہیں، بعض واضح طور پر گمراہانہ ہیں، مثلاً: اِجماعِ اُمت کو اہمیت نہ دینا، تقلید کو علی الاطلاق شرک قرار دینا، جس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں اُمتِ مسلمہ کی اکثریت جو ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید کرتی رہی ہے، وہ مشرک تھی، یا یہ کہنا کہ قضائے عمری فوت شدہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہیں،[1] صرف توبہ کافی ہے۔ بعض نظریات جمہور اُمت کے خلاف ہیں، مثلاً: تین طلاقوں کو ایک قرار دینا۔ بعض بدعت ہیں، مثلاً: صلوٰۃ التسبیح کی جماعت یا قیام اللیل کے لئے راتوں کو اہتمام کے ساتھ لوگوں کو نکالنا یا خواتین کو جماعت سے نماز پڑھنے کی ترغیب۔ بعض انتہائی گمراہ کن ہیں، مثلاً: قرآنِ کریم کو صرف ترجمے سے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اجتہاد کی دعوت، یا اس بات پر لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ جس مذہب میں آسانی پائیں، اپنی خواہشات کے مطابق اسے اختیار کرلیں، یا کسی کا اپنے عمل کو حجت قرار دینا۔ اور ان میں سے بعض نظریات فتنہ انگیز ہیں، مثلاً: علماء وفقہاء سے بدظن کرنا، دینی تعلیم کے جو ادارے اسلامی علوم کی وسیع وعمیق تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان کی

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے ''کتاب الصلوٰۃ، باب قضاء الفوائت'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

اہمیت ذہنوں سے کم کر کے مختصر کورس کو علمِ دین کے لئے کافی سمجھنا، نیز جو مسائل کسی امامِ مجتہد نے قرآن و حدیث سے اپنے گہرے علم کی بنیاد پر مستنبط کئے ہیں، ان کو باطل قرار دے کر اسے قرآن و حدیث کے خلاف قرار دینا اور اس پر اصرار کرنا۔

جو شخصیت یا ادارہ مذکورہ بالا نظریات رکھتا ہو، اور اس کی تعلیم و تبلیغ کرتا ہو، وہ نہ صرف یہ کہ بہت سے گمراہانہ، گمراہ کن یا فتنہ انگیز نظریات کا حامل ہے، بلکہ اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور اگر کوئی شخص سہولتوں کی لالچ میں اس قسم کی کوششوں سے دین کے قریب آئے گا بھی، تو مذکورہ بالا فاسد نظریات کے نتیجے میں وہ گمراہی کا شکار ہوگا، لہٰذا جو ادارہ یا شخصیت ان نظریات کی حامل اور مبلغ ہو، اور اپنے دُروس میں اس قسم کی ذہن سازی کرتی ہو، اس کے درس میں شرکت کرنا اور اس کی دعوت دینا، ان نظریات کی تائید ہے جو کسی طرح جائز نہیں، خواہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری ہو، اور گلاسگو یونیورسٹی کی ڈگری بذاتِ خود اسلامی علوم کے لحاظ سے کوئی قیمت نہیں رکھتی، بلکہ غیر مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں میں مستشرقین نے اسلامی تحقیق کے نام پر اسلامی اَحکام میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور دین کی تحریف کا ایک سلسلہ عرصۂ دراز سے شروع کیا ہوا ہے۔

ان غیر مسلم مستشرقین نے، جنھیں ایمان تک کی توفیق نہیں ہوئی، اس قسم کے اکثر ادارے درحقیقت اسلام میں تحریف کرنے والے افراد تیار کرنے کے لئے قائم کئے ہیں، اور ان کے نصاب و نظام کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے - اِلَّا ماشاء اللہ - اکثر و بیشتر دجل و فریب کا شکار ہو کر عالمِ اسلام میں فتنے برپا کرتے ہیں۔ لہٰذا گلاسگو یونیورسٹی سے اسلامی علوم کی کوئی ڈگری نہ صرف یہ کہ کسی شخص کے مستند عالم ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس سے اس کے دینی فہم کے بارے میں شکوک پیدا ہونا بھی بے جا نہیں۔

دُوسری طرف بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کیں، اور عقائدِ فاسدہ کے زہر سے محفوظ رہے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے، لہٰذا یہ ڈگری نہ کسی کے مستند عالم ہونے کی علامت ہے، اور نہ محض اس ڈگری کی وجہ سے کسی کو مطعون کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے عقائد و اعمال دُرست ہوں۔

مذکورہ بالا جواب ان نظریات پر مبنی ہے جو سائلہ نے اپنے استفتاء میں ذکر کئے ہیں، اب کون شخص ان نظریات کا کس حد تک قائل ہے؟ اس کی ذمہ داری جواب دہندہ پر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۲/۴/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸۶/۱)

بریلوی فرقے کا تعارف اور حکم

(عربی فتویٰ)

السؤال:-

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة السلام على رسول الله وآله وصحبه أجمعين.

شيخى الكريم العلامة محمد تقى العثمانى حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

كل عام وأنتم بخير، وتقبل الله منكم الطاعات، وأعاد الله هذا العيد عليكم وعلينا وعلى المسلمين باليمن والبركات. أرجو أن تكون وأسرتک وجميع أحبابک فى خير وعافية، كما أرجو المعذرة فى تأخر المراسلة، فقد انشغلت بالدراسة وأمور الأسرة والله المستعان.

أرسلت اليک رسالة وبطاقة معايدة فى عيد الفطر، فهل وصلاک؟

فهمت اشارتک وأرجو التوفيق، وهو شرف أن أقوم بترجمة كتاب لک، لٰكننى مشغول بالاعداد للدكتوراه فى حقوق التأليف، ومن أهم مراجعى كتابک (قضايا فقهية معاصرة) وسأقوم ان شاء الله بترجمة بعض كلامک، وأرسل اليک ما ترجمته فى حينه.

ما يقول الشيخ أيده الله فى الطريقة البريلوية، اذ لا توجد هٰذه الطريقة فى بلادنا، ولم أجد كتابا بالعربية يتحدث عنها سوى كتاب لأحد علماء نجد، وقد رأيته غير منصف مع غير البريلوية، فلم أثق فى حكمه أو نقله، فالرجاء بيان حالهم، فالناس بين محب غال أو مبغض غال، والله الهادى للصواب. والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد على محمد احداش

الجواب:-

الى فضيلة الأخ الكريم العلامة محمد على محمد احداش، حفظه الله تعالىٰ ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد تسلمت بسرور رسالتک الكريمة، ودعوت لک بالتوفيق والنجاح، وأن يوفقک الله تعالىٰ لاتمام عملک كما يحبه ويرضاه، وقد سألتنى عن أمرين:-[1]

الأوّل: بالنسبة للطريقة البريلوية وان هؤلاء يتميزون عن جمهور المسلمين فى

(۱) والسؤال الثانى يتعلق بعقد الاجارة، وسيجئ فى بابه ان شاء الله. (محمد زبير)

بعض العقائد والأعمال المبتدعة، فمن عقائدهم أن رسول الله صلی الله علیه وسلم عالم للغیب، ومطلع علیٰ جمیع ما کان وما یکون، وأن روحه الشریفة متصرفة فی الناس بالنفع والضرر، وأن امامهم الشیخ أحمد رضا خان البریلوی نشر فتوی التکفیر ضدّ علماء دیوبند، حتی قال: من لم یکفرهم فهو کافر. وذٰلک لأنهم نقدوا هٰذه العقائد، وقالوا: ان علم الغیب صفة الله سبحانه وتعالیٰ لا یشارکه أحد فیها، ولٰکنه سبحانه وتعالیٰ یطلع رسله علیٰ ما یشاء من أنباء الغیب. ومن أعمالهم المبتدعة أنهم یحتفلون بأعیاد لم تثبت من القرآن والسنّة، ومع ذٰلک یعتقدونها مستحبة، بل قد یعاملونها معاملة الواجبات من النکیر الشدید علیٰ من لا یشارکهم فیها، وکذٰلک اخترعوا تقالید عند موت أحد، مثل أن یقوم أهل المیّت بدعوة الناس فی الیوم الثالث والعاشر والأربعین بعد وفاة مورثهم، وأن یصنع لهم طعاما ومن لم یفعل ذٰلک، فانه یلام أشد الملامة، وما الیٰ ذٰلک من البدعات الکثیرة.

والحدیث عن هٰذه الطریقة یطول، ولٰکن ما ذکرته هو تصور جملی عن عقائدهم وأعمالهم، ویوجد فیهم من یفرط فیها ویلغو ویتعصب، ومن هو معتدل بالنسبة للأخرین.

والله سبحانه أعلم

محمد تقی العثمانی عفی عنه

۱۴۲۶/۱/۵ھ

غلام احمد پرویز کے پیروکار کا حکم

سوال:- استفتاء از علمائے شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے میں کہ مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز جس کو جمہور علمائے اُمت نے کافر قرار دیا ہے، اس کا ایک پیروکار، ہم عقیدہ، ہم مسلک بلکہ مسلکِ پرویز کا مبلغ مرگیا ہے، جبکہ جمہور علمائے اُمت نے پرویز کے متبعین کو بھی خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس پرویزی پر اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں کے ایک پیش امام نے نمازِ جنازہ پڑھائی، امامِ مذکور کا کیا حکم ہے؟ غلام احمد پرویز کا کیا حکم ہے؟ اور کس بناء پر اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے؟ اور کیا اس امام کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- غلام احمد پرویز پر کفر کا فتویٰ ان کے عقائد ونظریات کی بنیاد پر لگایا گیا ہے،[1] لہٰذا جو شخص ان کے عقائد ونظریات سے متفق ہو، وہ بھی انہی کے حکم میں ہے۔ اور کافر ہونے کی بناء پر اس

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ "علمائے اُمت کا متفقہ فتویٰ پرویز کافر ہے" ملاحظہ فرمائیں۔

پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، اگر کسی امام صاحب نے غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اِستغفار کریں۔ ایسی صورت میں دُوسرے مسلمان اپنی عام نمازوں میں ان کی اقتداء کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ میّت کو پرویزی تسلیم کرنے کے باوجود اس عمل کی صحت پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۶۳/۱۸ الف)

فکرِ ولی اللّٰہی تحریک کا حکم

بعد از سلام عرض ہے کہ ہم خیریت سے ہیں، اور خداوند کریم سے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔

بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے ایک عرض نامہ پہلے بھی بھیجا ہے، لیکن اس خط کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔ عرض یہ ہے کہ ہم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے جو اس خط کے نیچے ہے، اور ہم نے مولانا شیخ الحدیث معز الحق کو عریضہ لکھا، انہوں نے یہ باتیں ہمیں لکھ کر دی ہیں۔ ہم نے یہاں کے مفتی رشید احمد صاحب کو کہا، انہوں نے کہا کہ علمائے کرام مشاورت عظمیٰ اور مفتیان صاحبان کے مشورے کے بعد بتائیں گے۔ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اس تنظیم کا گڑھ ہمارے نوشہرہ میں مسجد درزیاں ہے اور اس کا امام بھی یہاں مقرّر ہوگیا ہے، ہمیں بتائیں کہ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کیسے لوگ ہیں؟ اور ان سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟

شکریہ
اہل مسجد درزیاں

مزاجِ گرامی!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں ہمارے مدرسے میں ایک عالم مسمّٰی مولوی خالد محمود، جو اپنے آپ کو تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی طرف منسوب کرتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کا ترجمان بتلاتا ہے، حسبِ ذیل نوعیت کی باتیں کرتا رہتا ہے:۔

۱:- مقصودِ اصلی قیامِ خلافت ہے، جب تک خلافت کا قیام نہ ہو اس وقت تک ایمان، اعمال، عبادات سب کچھ بیکار ہیں۔

۲:- مقصودِ اصلی اِتباعِ رسالت میں مقصدِ بعثت خصوصاً "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ" کے بموجب سپر پاورز کے خاتمے کو سمجھنا ہے۔ باقی انفرادی عادات و اطوار، وضع قطع، نشست و برخاست میں اِتباعِ رسالت بے کار ہے، اس کا چنداں فائدہ نہیں۔

۳:- اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے مقصود ہمہ جہتی تربیت فرد و معاشرہ ہے، لیکن زیادہ زور اجتماعی، سیاسی اور حکومتی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی تربیت پر ہے۔ اگر ان اعمال کا صرف رُوحانی حلقۂ اثر تسلیم کیا جائے تو باقی مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادات کا تفوق کیسے ثابت کیا جائے؟ کیونکہ رُوحانی اثرات تو یوگ (Mysticism) اور تصوّف و اِحسان و سلوک کے ایک جیسے ہیں۔

۴:- جزاء و سزا کا یہ تصوّر صرف متوسط اذہان کے لئے قابلِ قبول ہے، اعلیٰ اذہان کے لئے قابلِ فہم اور لائقِ قبول نہیں۔

۵:- قرآن، مولویوں کے سلوک کے نتیجے میں بازیچۂ اطفال بن گیا ہے، ماسوائے تعلیمِ الفاظ و معانی، آگے کوئی تعلیم و تربیت نہیں، ذہن سازی نہیں۔ جب نظامِ قرآنی نہ ہو تو صرف الفاظ کے رٹنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ حفظِ قرآن ضیاعِ وقت ہے۔

۶:- علمائے عصر چونکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا بقول امام محمدؒ (من لم یعرف أحوال زمانہ فھو جاھل) جاہل ہیں۔ مدارس کے اندر تو ان کا حلقۂ اثر و ارادت بڑا وسیع ہے، لیکن مدرسہ سے باہر بینک کے چوکیدار اور بس کے ایک معمولی سے ڈرائیور پر بھی ان کا بس نہیں چلتا۔ چنانچہ ان علماء کا معاشرے میں کوئی قابلِ قدر کردار نہیں، یہ علماء معاشرے کا عضوِ معطل ہیں۔

۷:- جنت کا عام و معروف تصوّر کم فہمی کا نتیجہ ہے، اصل میں جنت دُنیا کا مستقبل ہے، دُنیا اس کی اساس ہے۔ چنانچہ جس پودے کا بیج کمزور ہو وہ پودا طاقت ور نہیں بن سکتا، جو دُنیا میں دُکھ دَرد، تکالیف و مصائب اور غربت و کسمپرسی میں گھرا ہوا ہو وہ آخرت میں کامیاب و خوشحال کیسے کہلا سکتا ہے؟

۸:- جنت سے متعلق عام احادیث محض خوش فہمی ہیں، جب بندہ کچھ نہ کر سکے تو پھر لازماً اسے جنت کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ ''کافر کو ملے حور و قصور اور مؤمن کو فقط وعدۂ حور''۔

۹:- امام مہدی کا تصوّر و عقیدہ بھی محض مردہ قوموں کا تخیل ہے۔

۱۰:- یأجوج و مأجوج چینی اور رُوسی عوام ہیں، ان سے متعلق معروف تصوّر ٹھیک نہیں۔

۱۱:- داڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بشری عادت ہی تو تھی، اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟
۱۲:- علمائے عصر کی پاکستانی تنظیمیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔
۱۳:- تبلیغی جماعت کی محنت کے نتیجے میں جو اسلام دُنیا میں آئے گا، اس پر چھاپ امریکی اور یورپی ہوگی، اور یوں مغربی دُنیا اس کا سہارا لے کر اپنے معاشی، سیاسی، سامراجی اہداف حاصل کرے گی۔
۱۴:- جہادِ افغانستان میں امریکہ نے غریب اور سادہ لوح مولویوں کو جہاد کا پُرفریب اور خوش کن جھانسہ دے کر اسلام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔
۱۵:- موجودہ اسلامی تصوّر امریکی خواہش کے زیرِ اثر پنپ چکا ہے، حالانکہ اگر مسلمان رُوس کا ساتھ دیتے تو رُوس ان کے لئے نسبتاً زیادہ دور رہتا، لیکن مسلمان ہمیشہ جذباتی رہا، مسلم جماعتوں کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہی رہا۔
۱۶:- تقدیر کا موجودہ اور معروف تصوّر بھی غلط ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پُرانی و سابقہ حالت پر رکھے چھوڑا، کیونکہ ابتدائی اسلامیوں (صحابہؓ) میں اسے سمجھنے کی استعداد نہ تھی، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو نہ چھیڑ کر عمل کی طاقت کی بناء پر انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔
۱۷:- تھانوی لائن کے علماء ہمیشہ حکومتی خواہشات کے لئے استعمال ہوتے رہے، نتیجتاً انہیں سرکار کی جانب سے نوازا جاتا رہا، اور مدنی لائن کے علماء کو اپنے حریت پسند جذبات کی بناء پر ہمیشہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔
۱۸:- "اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا" (الآیۃ) اور "من الذنوب ذنوب لا یکفرھا الا الھم فی المعیشۃ" (الحدیث) جیسے استدلالات سے عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب تک معاشی مساوات نہ ہو معاشرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی، قبض و بسط کی تشریح بھی مختلف انداز سے کرتا ہے۔
۱۹:- ذاتی ملکیت کا ایک حد تک جواز ہے، لیکن انقلاب کی راہیں ہموار کرتے وقت ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ابتداءً حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا مال و اسباب اپنی ذات سے زیادہ راہِ انقلاب میں خرچ ہوتا رہا۔
۲۰:- خمینی انقلاب اُمتِ مسلمہ کے لئے خوش آئند ہے۔
۲۱:- طالبانِ افغانستان سادہ لوح لوگ ہیں، یہ حکومتی مزاج سے ناواقف ہیں، حکومت چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ مسائلِ حاضرہ اور موجودہ تعلیم سے یہ ناواقف ہیں۔ فرمایئے ان عقائد کی حامل "تحریکِ فکرِ ولی اللّٰہی" کا کیا حکم ہے؟
جواب:- فکرِ ولی اللّٰہی محض ایک دھوکا ہے، عام طور سے یہ لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے

نام کی آڑ میں اشتراکی نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۹/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵/۴۱۹)

''گروپ آف لبرل مسلمز تحریک'' کے قیام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دُعائے صحت، درازیٔ عمر اور بلندیٔ ایمان کے ساتھ جنابِ والا کی خدمتِ عالیہ میں مؤدبانہ عرض ہے کہ قیامِ وطنِ عزیز کے مقاصد کی تکمیل باون سالوں میں بھی نہ ہونے کا اصل سبب ہماری تعلیماتِ قرآنِ کریم سے عدم توجہی، غفلت اور کوتاہی ہے۔ اگرچہ ہر سابق حکومت نے اسلام کے نام پر قوم کو فریب دیا، لیکن قرآنی تعلیمات سے ناآشنائی اور عدم توجہی ہمارے مذہبی راہنماؤں کی کوتاہی اور غفلت بھی ہے، جو بنیادی حقیقت ہے، یہی ہماری باہمی نفرتوں اور اختلافات کا اصل سبب بھی ہے۔ الحمدللہ نوجوان نسل میں پیار اور اُنسیت اُجاگر کرنے، نفرتوں کو مٹانے، نیز وحدتِ اسلامی کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے ''گروپ آف لبرل مسلمز'' کا قیام وجود میں آیا ہے۔

ہمارا مقصد سوائے اصلاح کے کچھ نہیں، ایک معتدل معاشرہ اور اُخوتِ اسلامی کو اُجاگر کرنے اور فہمِ قرآنِ کریم نوجوان نسل خاص کر حفاظ مسلمان بنات اور شبان کو معانیٔ قرآنِ کریم سیکھنے کی دعوت اور اس پر عمل کی ترغیب ہمارا مقصد ہے، کیونکہ ذہنی انقلاب اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے بغیر نفاذِ اسلام کی عملی صورت نظر نہیں آتی۔ مشن کی کامیابی کے لئے دُعا کی درخواست ہے۔ عقیدت و احترام کے ساتھ! جواب کا انتظار رہے گا۔

جواب:- جس مقصد کے لئے آپ نے یہ تنظیم قائم کی ہے، وہ بڑا مبارک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رضا کے مطابق ملک وملت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

البتہ ایک گزارش یہ ہے کہ آپ نے اپنے نام میں ''لبرل'' (Liberal) کا جو اضافہ کیا ہے، اس کے بارے میں یہ طے کرلینا چاہئے کہ اس کا کیا مقصد ہے؟ اور کن لوگوں کو اس لفظ کے ذریعہ Exclude (خارج) کرنا مقصود ہے، اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنے سے پہلے یورپ کے لبرلزم کی تاریخ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا کہ اس لبرلزم کی تحریک وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ کیا وہ اسباب ہمارے یہاں موجود ہیں؟ دُوسرے اس لبرلزم کے کیا نتائج نکلے؟ اور کیا وہ نتائج ہمیں بھی مطلوب ہیں؟

اُمید ہے کہ ان سوالات پر معروضی مطالعے کے ذریعہ غور وفکر فرمائیں گے۔ والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
از طیارہ براہ لاہور
۱۴۲۰/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۰۰)

(یہ جواب طیارے سے لکھ رہا ہوں، اس لئے الگ کاغذ پر نہیں لکھ سکا، معذرت خواہ ہوں)

روافض کو علی الاطلاق کافر نہ قرار دینے کی وجہ

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ''بینات'' والوں نے دو نمبر روافض کے بارے میں شائع کئے ہیں، ٹائٹل پر لکھا ہے کہ ''علماء کا متفقہ فیصلہ یعنی شیعہ کافر ہے''۔ اس میں ہند و پاک کے بڑے بڑے علماء کے دستخط موجود ہیں۔ آپ کے دستخط نظر سے نہیں گزرے، اور ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ مولانا محمد رفیع صاحب کو شیعہ روافض کی تکفیر کے بارے میں تردّد ہے۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں کہ کیا واقع ایسا ہے کہ آپ شیعوں کو کافر نہیں سمجھتے؟

فقط والسلام
آپ کا مخلص
احقر حافظ مشتاق احمد

جواب:- جو شیعہ کفریہ عقائد رکھتے ہوں، مثلاً قرآنِ کریم میں تحریف کے قائل ہوں یا یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی لانے میں غلطی ہوئی، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتے ہوں، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ بات کہ تمام شیعہ یہ یا اس قسم کے کافرانہ عقائد رکھتے ہیں، تحقیق سے ثابت نہیں ہوئی۔ اور کئی شیعہ یہ کہتے ہیں کہ الکافی یا اُصول الکافی وغیرہ میں جتنی باتیں لکھی ہیں، ہم ان سب کو دُرست نہیں سمجھتے۔ دُوسری طرف کسی کو کافر قرار دینا چونکہ نہایت سنگین معاملہ ہے، اس لئے اس میں بے حد احتیاط ضروری ہے۔ اگر بالفرض کوئی تقیہ بھی کرے تو وہ اپنے باطنی عقائد کی وجہ سے عنداللہ کافر ہوگا، لیکن فتویٰ اس کے ظاہری اقوال پر ہی دیا جائے گا۔ اسی لئے چودہ سو سال میں علمائے اہلِ سنت کی اکثریت شیعوں کو علی الاطلاق کافر کہنے کے بجائے یہ کہتی آئی ہے کہ جو شیعہ ایسے کافرانہ عقائد رکھے، کافر ہے۔ اور یہی طریقہ بیشتر اکابر علمائے دیوبند کا رہا ہے، اور چونکہ جمہور علماء کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی لانے کے لئے کافی دلائل محقق نہیں ہوئے، اس لئے دارالعلوم کراچی، حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے وقت سے اکابر کے اسی طریقے کے مطابق فتویٰ دیتا آیا ہے کہ جو شیعہ ان کافرانہ عقائد کا قائل ہو، وہ کافر ہے، مگر علی الاطلاق ہر شیعہ کو خواہ اس کے عقائد کیسے بھی ہوں، کافر قرار دینے سے جمہور علمائے اُمت کے مسلک کے مطابق

احتیاط کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیعوں کی گمراہی میں کوئی شبہ ہے، جن شیعوں کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی گئی ہے، بلاشبہ وہ بھی سخت ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گمراہیوں سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، آمین۔

والسلام
۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

سرسیّد احمد خان کے نظریات اور تبلیغی جماعت کے بارے میں حکم

سوال:- زید اکثر دوستوں یا عام مجالس میں سرسیّد کی تعریف کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ سرسیّد نے قوم کو بیدار کیا، مسلمانوں کو آزادی ان کی تعلیمات ہی کی بناء پر ہوئی۔ بکر کہتا ہے کہ شعور اور بیداری مسلمانوں کو قرآن وسنتِ نبوی ہی سے ہوسکتی ہے، اور آزادی کی خالص وجہ علمائے حق کی قربانیاں ہیں۔ نیز بکر یہ بھی کہتا ہے کہ سرسیّد نے فرشتوں اور جنات کے وجود کا انکار کیا ہے، اور یہ فعل صریح کفر ہے، سرسیّد کے بجائے علمائے حق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کا زوال اور پستی انگریزی تعلیم سے محروم رہنا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے۔ مگر بکر اس کا قائل نہیں، زوال کی وجہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے۔

نیز زید تبلیغی جماعت کو نہایت سست کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان کا طریقہ سنت کے خلاف ہے، جبکہ بکر کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت صحیح راستے پر گامزن ہے، ان کا ہر قول وفعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ نیز زید ظاہری شکل وصورت کا بھی بالکل قائل نہیں، مسلم داڑھی اور لباس وغیرہ فراڈ ہے، لازمی نہیں۔ آپ ہم کثیر پاکستانیوں کی رہنمائی فرمائیں۔

طالب الحق، ریاض، سعودی عرب

جواب:- بکر کی باتیں دُرست ہیں، سرسیّد احمد خان صاحب کے دینی نظریات جو انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کئے ہیں، انتہائی گمراہانہ ہیں،(۱) اور تبلیغی جماعت ماشاء اللہ اچھی دینی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کے افراد کے کسی عمل یا کام پر تنقید کی جاسکتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی جماعت کو بُرا بھلا کہنا بہت بُرا کام ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۷ ج)

---

(۱) سرسیّد اور ان کے نظریات سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۶۶ تا ۱۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) تبلیغی جماعت سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اسی جلد کی "فصل فی الدعوۃ والتبلیغ" میں ملاحظہ فرمائیں۔
(محمد زبیر عفی عنہ)

﴿کتاب السُّنَّة والبدعة﴾

(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فرض نماز کے بعد ”اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ“ پڑھنا

سوال:- اگر فرض نماز کے بعد ”اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ .... الخ“ والی آیت پڑھے تو شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور کیا بدعت، حسنہ بھی ہوسکتی ہے؟

جواب:- آج کل جس طرح اس آیت کو پڑھنے کا التزام کیا جاتا ہے کہ اس کے تارک پر ایسی نکیر کی جاتی ہے جیسے فرائض کے تارک پر کی جاتی ہے، تو یہ بدعتِ سیئہ ہے، اور ”بدعت“ اصطلاحی معنوں میں صرف سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی، لقولہ علیہ السلام: ”کل بدعۃ ضلالۃ“۔ [1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۵۴ ب)

نیاز فاتحہ کا حکم

سوال:- اگر کسی نے کچھ پکا کر نیاز فاتحہ دیا تو کیا جب تک نیاز فاتحہ نہ دیا جائے، تقسیم کرنا ممکن نہیں؟

جواب:- نیاز فاتحہ کا مروّجہ طریقہ ہی شریعت کی رُو سے دُرست نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی بزرگ کی رُوح کو ایصالِ ثواب کرنا ہے تو کھانا پکا کر کسی کو صدقہ کردیا جائے، اور یہ دُعا کرلی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کا ثواب فلاں کو پہنچادے، یہ جائز ہے، اور اس نیت سے کرنے کے لئے نیاز فاتحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲ھ

---

(۱) رواہ أحمد وأبوداوٗد والترمذی وابن ماجۃ، راجع الٰی مشکٰوۃ المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسُّنۃ ج:۱ ص:۳۰ (طبع قدیمی کتب خانہ) وفی مرعاۃ المفاتیح لابی الحسن المبارکفوری الھندی ج:۱ ص:۲۶۴ (طبع بنارس ھند) والمراد بالبدعۃ ما أحدث فی الدین ما لا أصل لہ فی الشریعۃ یدل علیہ واما ما کان لہ أصل من الشرع یدل علیہ فلیس ببدعۃ شرعًا وان کان بدعۃ لغۃ واما ما وقع فی کلام السلف من استحسان بعض البدع فانما ذٰلک فی البدع اللغویۃ لا الشرعیۃ .... فالبدع الشرعیۃ کلھا مذمومۃ لأنھا موجبۃ للضلال والغوایۃ. وفی التعلیق الصبیح علٰی مشکٰوۃ المصابیح للشیخ محمد ادریس الکاندھلوی ج:۱ ص:۸۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) فالبدعۃ فی عرف الشرع مذمومۃ بخلاف اللغۃ فان کل شیٔ أحدث علٰی غیر مثال یسمّٰی بدعۃ سواء کان محمودًا أو مذمومًا .... الخ. نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۷ (طبع ادارہ اسلامیات)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کسی بزرگ کے مزار پر اجتماعی قرآن خوانی کرنا

سوال:- کسی بزرگ کے مزار شریف پر اجتماعی حیثیت سے بہ نیتِ ایصالِ ثواب قرآن خوانی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- ایصالِ ثواب جائز ہے اور وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوسکتا ہے، مگر کسی کی قبر پر اجتماعی طور سے قرآن خوانی کر کے ایصالِ ثواب کرنے کا صحابہ کرامؓ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا اس طریقے سے اجتناب بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد میں چراغاں کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:- ماہِ رمضان میں ختمِ قرآن پر مسجد کو سجانا، روشنی کرنا اور قراءت کا مقابلہ وغیرہ کرنے کے بعد مٹھائی تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مسجد میں چراغاں کرنا اِسراف ہے، اور کسی حال جائز نہیں[1]، قراءت کا مقابلہ اگر بچوں میں قرآنِ کریم کی ترغیب کی غرض سے ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن آج کل اس طرح نام و نمود اور تفاخر کی غرض سے جو مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں، ان سے احتراز لازم ہے۔ جہاں تک مٹھائی تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے مٹھائی تقسیم کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے مٹھائی تقسیم کرے اور اسے مسنون اور لازم بھی نہ سمجھے تو اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۰ ج)

سفر کر کے بزرگ کے مزار کی زیارت کرنا

سوال:- زید کبھی کبھار اسّی نوّے میل سفر کر کے کسی بزرگ کی قبر پر چلا جاتا ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ دُعا قبول فرماتے ہیں، اس مقبرے پر بعض مشرکانہ افعال بھی کئے جاتے

---

(۱) وقال العلامة الشاطبیؒ فی الاعتصام ج:۲ ص:۲۷۳ (طبع دار المعرفة بیروت) ان النار لیس ایقادها فی المساجد من شأن السلف الصالح ولا کانت مما تزین بها المساجد ألبتة، ثم أحدث التزین بها حتّی صارت من جملة ما یعظم به رمضان واعتقد العامة هٰذا، .... وبعد اسطر .... ومثله ایقاد الشمع بعرفة لیلة الثامن ذکر النوویؒ انها من البدع القبیحة وانها ضلالة فاحشة جمع فیها أنواع من القبائح، منها اضاعة المال فی غیر وجهه، ومنها اظهار شعائر المجوس .... وقد ذکر الطرطوسیؒ فی ایقاد المساجد فی رمضان بعض هٰذه الأمور، وذکر أیضًا فی قبائح سواها. (مرتب عفی عنہ)

ہیں، کیا اس طرح جانا جائز ہے؟

جواب:- اگر زید شرک و بدعات کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہو، اور اسے اعتماد ہو کہ وہاں شرک و بدعات میں مبتلا نہیں ہوگا، تو اس کے لئے جانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

قال ابن حجر فی فتاویه: ولا تترک (أی الزیارة) لما یحصل عندها من منکرات ومفاسد .... لأن القربات لا تترک لمثل ذٰلک بل علی الانسان فعلها وانکار البدع بل وازالتها ان أمکن. اهـ. (شامی ج:۱ ص:۸۴۳)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۰/۲۰ھ[2]

فرض نماز اور عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ کا حکم

سوال:- عموماً عیدین (عید الفطر وعید الاضحیٰ) کی نماز کے بعد نمازی مسجد کے اندر ہی خطبے اور دُعا کے بعد ایک دُوسرے کو عید مبارکباد کہتے ہوئے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، کچھ رسم پوری کرنے کی غرض سے، اور کچھ سنت کی غرض سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ نمازیوں میں کچھ حضرات بزرگ ہوتے ہیں، ان کے متعلق اللہ والا ہونے کا حسنِ ظن لوگ رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایسا کرنے سے فیض حاصل ہوگا اور نیکیوں پر مدد ملے گی، وہ نہ اس کو رسم سمجھ کر کرتے ہیں اور نہ ضروری سمجھ کر بلکہ نیک لوگوں کی عقیدت سے معانقہ کرتے ہیں، آیا یہ فعل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہؓ یا فتاویٰ ائمۂ اربعہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب:- دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں، لیکن اگر سنت سمجھے بغیر اتفاقاً کبھی کرلے تو گناہ بھی نہیں، اور سنت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو تو مباح ہے۔

فی ردّ المحتار قد یقال: ان المواظبة علیها بعد الصلوات خاصة قد یؤدی الجهلة الی اعتقاد سنیتها فی خصوص هٰذه المواضع، وان لها خصوصیة زائدة علٰی غیرها مع أن ظاهر کلامهم أنه لم یفعلها أحد من السلف فی هٰذه المواضع .... ونقل فی تبیین المحارم عن

---

(۱) شامی ج:۲ ص:۲۴۲ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

الملتقط أنه تكره المصافحة بعد اداء الصلوٰة .... ولأنها من سنن الروافض اهـ. ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة، لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أوّلًا ويعزر ثانيًا .... الخ. (رد المحتار، باب الاستبراء وغيره من كتاب الحظر والاباحة،[1] ومثله في عزيز الفتاویٰ)[2]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۷۰/۲۸ الف)

نماز کے بعد یا مہمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا

سوال ۱:- فرض نماز کے بعد خصوصاً اور عصر کی نماز کے بعد دُعا سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا، آپس میں ہاتھ ملانا اور امام صاحب کا مصلّے پر کھڑے ہوکر ہاتھ ملانا لازمی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر کوئی مہمان مسجد میں نماز کے بعد مصافحہ کرنا چاہے تو اس سے مصافحہ کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہرگز لازم نہیں، بلکہ لازم یا ثواب وسنت سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اس کا ترک واجب ہے۔[3]

۲:- مہمان سے پہلی ملاقات میں مصافحہ مسنون ہے،[4] اس نیت سے مصافحہ دُرست ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۴/۲۸ ج)

میّت کے سرہانے بیٹھ کر یا قبرستان لے جاتے وقت کلمہ پڑھنا

سوال:- میّت کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھنا یا میّت کو قبرستان کی طرف لے جاتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- دونوں حالتوں میں کلمۂ طیبہ پڑھنا دُرست ہے، مگر اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۶ ص:۳۸۱. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸۔

(۳) وفي الشامية ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعيد) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوٰة بكل حال لأن الصحابة رضي الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض (الى أن قال) فيزجر فاعله لما أتى به من خلاف السّنة. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۴) وفي الشامية أيضًا وموضع المصافحة في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في ادبار الصلوٰة.

جائے، اور بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔[۱]

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا

سوال:- کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا آپ کے خیال میں کیسا ہے؟

جواب:- جائز تو ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ سے منقول نہیں اس لئے نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔[۲]

فقط والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک جمعہ، مسجد میں یہ اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ کو جلسہ جشنِ عید میلاد ہوگا، اور بعد میں ایک آدمی کے کہنے پر فلاں مولوی اس مسجد میں تقریر کرنے نہ آئے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ناراض ہے، پھر چند آدمی اس کا ساتھ دے کر جلسہ ملتوی کردینے کا اعلان کردیں، باقی عوام کا خیال نہ رکھیں۔ شریعت کی رُو سے مسئلہ حل کرکے ارسال کریں، والسلام۔

جواب:- جشنِ عید میلا کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[۳] البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) فی الدرّ المختار ج:۲ ص:۲۳۳ کره فیها رفع صوت بذکر أو قراءة فتح وفی الشامیة (قوله کما کره) قیل تحریما وقیل تنزیها کما فی البحر عن الغایة، وفیه عنها وینبغی لمن تبع الجنازة أن یطیل الصمت، وفیه عن الظهیریة فان أراد أن یذکر الله تعالیٰ یذکره فی نفسه لقوله تعالیٰ: "اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ" أی الجاهرین بالدعاء، وعن ابراهیم أنه کان یکره أن یقول الرجل وهو یمشی معها: استغفروا له غفر الله لکم. قلت: واذا کان هٰذا فی الدعاء والذکر فما ظنک بالغناء الحادث فی هٰذا الزمان. وفی الفتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ویکره رفع الصوت بالذکر فان أراد أن یذکر الله یذکره فی نفسه وعن ابراهیم کانوا یکرهون أن یقول الرجل وهو یمشی معها: استغفروا له غفر الله لکم .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے عزیز الفتاویٰ ص:۹۹۔

(۳) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۱۲٦ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) قیل أوّل من أحدثها بالقاهرة الخلفاء الفاطمیون فی القرن الرابع فابتدعوا ستة موالد .... ثم اعیدت فی خلافة الحاکم بأمر الله فی سنة أربع وعشرین وخمسمائة بعد ما کاد الناس ینسونها وأول من أحدث المولد النبی بمدینة اربل الملک المظفر أبو سعید فی القرن السابع وقد استمر العمل بالموالد الی یومنا هٰذا وتوسع الناس فیها وابتدعوا بکل ما تهواه أنفسهم ویوحیه الیهم الشیطان.

جشنِ میلاد النبیؐ کی تاریخی وشرعی حیثیت سے متعلق مکمل تفصیلات کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:............ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ذکرِ مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو سننے اور سنانے کے لئے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو دُرست ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرتِ طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں اگر محفل اسی غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی تو ٹھیک تھی، لیکن اگر کسی مصلحت سے اسے ملتوی کردیا گیا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مثلاً: یہ کہ کوئی عالم سیرت بیان کرنے کے لئے موجود نہ ہو یا کسی فتنے فساد کا اندیشہ ہو۔ ہاں! اگر کسی عذر کے بغیر جلسہ ملتوی کردیا گیا تو اس میں حاضرین کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کا گناہ ہوگا۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶ ۷/۴ ۳۱ ج)

شادی کے موقع پر لوگوں کو سفید پگڑیاں دینا
ختنہ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا

سوال ۱:- ہمارے ہاں شادی کے گھر سے جب لوگوں کو رُخصت کیا جاتا ہے تو سفید پگڑیاں عطا کی جاتی ہیں، یہ لوگ یہ پگڑیاں باندھ کر یا ہاتھ میں لے کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی عزّت کی بات سمجھی جاتی ہے، آیا یہ طریقہ جائز ہے یا رسم ہے؟

۲:- اور ختنے کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب ۱:- یہ رسم اگر سنت سمجھ کر کی جاتی ہے تو بدعت اور واجب الترک ہے، اور اگر سنت نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کی ایسی پابندی کی جاتی ہے جیسے فرائض و واجبات کی، کی جاتی ہے، اور اگر نہ کرے تو اسے بُرا سمجھا جاتا ہے تب بھی یہ ناجائز ہے، اور اگر ان باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے محض خوش دِلی سے کسی دباؤ کے بغیر دیا جاتا ہے اور بدلے کی توقع بھی نہیں ہوتی تو جائز ہے۔

۲:- سنت سمجھ کر جمع کرنا یا اس کی سنتوں کی طرح پابندی کرنا اور نہ کرنے والے کو بُرا سمجھنا

(گزشتہ سے پیوستہ)......

۱:- فتاویٰ میلاد شریف — مجموعہ افاضات حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی رحمہم اللہ

۲:- فیصلہ ہفت مسئلہ — حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ

۳:- التحذیر من البدع — عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

۴:- الانصاف فیما قیل فی المولد — ابوبکر جابر الجزائری

۵:- جواہر الفقہ (ج:۱ ص:۲۰۵) — مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

۶:- راہِ سنت (ص:۱۲۵) — حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

۷:- تاریخِ میلاد — حکیم مولانا عبدالشکور صاحب مرزاپوری

(محمد زبیر حق نواز)

بدعت اور واجب الترک ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۱/۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲/۷/۵۸)

نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد لوگ جو مصافحہ کرتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد مصافحہ کو جس طرح لازم اور نماز کا جزء سمجھ لیا گیا ہے، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[۲] ہاں! کسی آدمی سے اسی وقت ملاقات ہوئی تو ملاقات کے مصافحہ کی نیت سے مصافحہ کرلیں،[۳] نماز کے بعد کی نیت سے نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/۳۰)

بزرگ یا پیر کی نیاز اور میّت کی مختلف رُسومات کا حکم

سوال ۱:- اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آج فلاں پیر یا بزرگ کی نیاز ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- میّت اور اس سے متعلق مختلف رُسومات ہمارے یہاں رائج ہیں، اس سلسلے میں شرعی اَحکام کیا ہیں؟

جواب ۱:- آج کل نیاز کے نام سے جو رسمیں رائج ہیں، قرآن وسنت اور شریعتِ مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں، ان بدعات کو ترک کرنا واجب ہے،[۴] البتہ کسی بزرگ کے ایصالِ ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی توفیق ہو نقد روپیہ یا کھانا، کپڑا صدقہ کرکے اس کا ثواب خاموشی سے ان بزرگ کو پہنچا دیا جائے، اس غرض کے لئے یہ دعوتیں اور اجتماعات کرنا شرعاً ناجائز اور بدعت ہے۔

---

(۱) وفی مسند أحمد ج:۴ ص:۲۱۷ (طبع مؤسسة قرطبة مصر) عن الحسن قال: دعی عثمان بن أبی العاص الی ختان فأبی أن یجیب، فقیل له فقال: انا کنا لا نأتی الختان علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا ندعی له. وکذا فی المعجم الکبیر للطبرانی رحمه الله، رقم الحدیث:۸۳۸۲ ج:۹ ص:۵۷ (طبع مکتبة العلوم، موصل). نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۲۰۱

(۲) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید): ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلوٰة بکل حال، لأن الصحابة رضی الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض (الیٰ أن قال) ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السّنة. تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵ دیکھئے۔

(۳) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید) وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۳۹ (طبع سعید) واعلم أن النذر یقع للأموات ومن أکثر العوام وما یؤخذ من الدراهم والشمع والزیت ونحوها الیٰ ضرائح الأولیاء الکرام تقربًا الیهم فهو بالاجماع باطل و حرام ما لم یقصدوا صرفها للفقراء الأنام وقد ابتلی الناس بذٰلک وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۲۹۸ (طبع سعید) (محمد زبیر حق نواز)

۲:- بہشتی زیور اور بہشتی گوہر میں جنازے اور میّت کے اَحکام تفصیل سے موجود ہیں، اس کا مطالعہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۶/۳۸ ه)

عرس اور برسی کی شرعی حیثیت

سوال:- عرس و برسی کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟

جواب:- عرس اور برسی کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ سب انسانوں کی ایجاد کردہ بدعات ہیں جن سے پرہیز لازم ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲/۱۷۱۲/۳۲ ج)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی صحابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی یا نہیں؟ نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ دُوسرے صحابہ کرامؓ سے۔ لہٰذا آج کل جو رواج چل پڑا ہے اور اس طرح ضروری سمجھتے اور اس کے ترک پر نکیر کرتے ہیں، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

---

(۱) فی التفسیر المظھری سورة اٰل عمران ج:۲ ص:۶۵ (طبع بلوچستان بک ڈپو) لا یجوز ما یفعله الجھال بقبور الأولیاء والشھداء من السجود والطواف حولھا، واتخاذ السرج والمساجد علیھا، ومن الاجتماع بعد الحول کالأعیاد، ویسمونه "عرسا". نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۲۵، ۱۲۸۔

(۲) وفی مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰة ج:۴ ص:۶۴ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) ولا یدعو للمیّت بعد صلٰوة الجنازة، لأنه یشبه الزیادة فی صلٰوة الجنازة. وفی البزازیة (علی الھندیة ج:۴ ص:۸۰) لا یقوم بالدعاء بعد صلٰوة الجنائز، لأنه دعا مرة لأن أکثرھا دعاء. وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع امجد اکیڈمی لاهور) ولا یقوم بالدعاء ففی قراءة القراٰن لأجل المیّت بعد صلٰوة الجنازة وقبلھا، وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳ (طبع سعید): لا یدعو بعد التسلیم. وفی فتاویٰ السراجیة علٰی قاضی خان ج:۱ ص:۱۴۵: اذا فرغ من الصلٰوة لا یقوم داعیا له. وفی جامع الرموز فصل فی الجنائز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع ایچ ایم سعید): لا یقوم داعیا له. وفی نفع المفتی والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی): الدعاء بعد الجنازة مکروہ. نیز مزید دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۴ و امداد المفتین ص:۱۷۶۔ (محمد زبیر)

نکاح کے وقت دُولہا کا سہرا باندھنا

سوال:- نکاح سے پہلے دُولہا کے سر پر سہرا باندھنا کسی روایت سے ثابت ہے؟

جواب:- سہرا باندھنا ہندوانہ رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا

سوال:- کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنا کسی حدیث یا روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور فاتحہ کو لازمی سمجھنا کیسا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، مرحوم کی رُوح کو ایصالِ ثواب کس طرح کیا کرتے تھے؟

جواب:- کسی روایت یا حدیث سے ثابت نہیں، اور اس کو لازمی سمجھنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیک عمل صدق و اِخلاص کے ساتھ نام و نمود سے بچتے ہوئے کر کے یہ دُعا کرلی جائے کہ یا اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔ اور اس غرض کے لئے لوگوں کو جمع کرنا یا خاص خاص دنوں میں جمع ہوکر اجتماعی طور پر تلاوت کرنا، کھانا پکانا وغیرہ یہ سب اُمور بدعت ہیں اور ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

عہدنامہ قبر میں رکھنے کا حکم

سوال:- عہدنامہ کا قبر میں رکھنا کیسا ہے؟

جواب:- میّت کے ساتھ قبر میں کسی قسم کا عہدنامہ رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۶/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۶/۱۹ الف)

(۱) دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ) ص:۹۹۔

قبر پر تلقین کا حکم

سوال:- قبر پر تلقین کی کیا کیفیت ہے؟

جواب:- قبر پر تلقین کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱/۱۳۹۷ھ

مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام، نعت اور میلاد منعقد کرنا

سوال:- مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام اور نعت پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ مسجد میں میلاد شریف ہونی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے اوقات میں جب لوگ فرض یا سنن ونوافل پڑھ رہے ہوں، مسجد میں بلند آواز سے ذکر یا وعظ و خطبہ دینا دُرست نہیں،(۲) البتہ جب نماز میں مشغول نہ ہوں تو ذکرِ جہر یا وعظ کہنا جائز ہے، البتہ دُرود شریف کو آج کل جس طرح کھڑے ہوکر اجتماعی شکل میں بلند آواز سے پڑھنا لازم سمجھ لیا گیا ہے وہ بدعت ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا بیان انتہائی سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے، لیکن اس کو کسی خاص دن کے ساتھ مخصوص کرنا دُرست نہیں، نیز اس میں حاضری کا مقصد اتباعِ سنت کا جذبہ ہونا چاہئے، نمود ونمائش نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۶/۶/۱۳۹۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۹/۲۹ ب)

قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص مرگیا، اس کی میّت کو دفنانے کے لئے قبرستان لے جاتے ہیں اور دفنانے کے بعد اس کی قبر پر ایک شخص اذان دیتا ہے، قبر پر اذان دینا دُرست ہے؟

جواب:- قبر پر مذکورہ طریقے سے اذان دینا بالکل بے اصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۱۱، و فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۳۳۔

(۲) وفی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة ج:۶ ص:۳۷۸ وقد صح عن ابن مسعود رضی الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یهللون ویصلون علیه، علیه الصلوٰة والسلام جهرًا، فراح الیهم فقال: ما عهدنا ذٰلک علی عهده علیه السلام وما أراکم الا مبتدعین، فما زال یذکر ذٰلک حتّی أخرجهم عن المسجد. کذا فی ردّ المحتار ج:۶ ص:۳۹۸
وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۴۹ (طبع سعید) وفی الملتقی وعن النبی صلی الله علیه وسلم أنه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذکیر، فما ظنک به عند الغناء الذی یسمّونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا أصل له فی الدین. وفیها ص:۳۹۸ .... فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین .... الخ.

کا کوئی ثبوت نہیں، اس عمل سے اجتناب لازم ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۲/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۶/۲۷ و)

اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جن مسجدوں میں عرصہ تیس سال سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھا جاتا تھا وہاں اب پڑھنے، نہ پڑھنے پر نمازیوں میں شدید اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ حدیث وفقہ کی روشنی میں دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- دُرود شریف پڑھنا بے حد فضیلت کا عمل ہے، جس مسلمان کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، دُرود شریف پڑھ کر اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے بھرنا چاہئے، اس کا کوئی خاص وقت شریعت کی طرف سے مقرّر نہیں، انسان جس وقت چاہے اِخلاص کے ساتھ، نمود ونمائش کے بغیر دُرود شریف پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں بعض مقامات پر اذان سے پہلے جس طرح اجتماعی ہیئت میں بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے اور جس طرح اس کو فرض وواجب یا اذان کا لازمی جزء سمجھا جانے لگا ہے، یہ دُرود شریف نہیں، بلکہ اس کی نمائش ہے، جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت یا صحابہؓ وتابعینؒ کے عہدِ مبارک میں نہیں ملتا، اس بناء پر یہ بدعت ہے۔[۲] مسلمانوں کو چاہئے کہ اس طریقے کے

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۲۳۵ تنبیہ فی الاقتصار علٰی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی أنه لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبرہ کما ھو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجرؒ فی فتاویه بأنه بدعة، وقال: ومن ظن أنه سنة قیاسا علٰی ندبھما للمولود الحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم یصب. وفی حاشیة البحر الرائق باب الأذان ج:۱ ص:۲۵۶ (طبع مکتبه ماجدیه کوئٹه) قیل: وعند انزال المیّت القبر قیاسا علٰی أول خروجه للدنیا لٰکن ردہ ابنؒ حجر فی شرح العباب .... الخ. وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الھند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰ و۱۰۶۔

(۲) وفی الفتاویٰ الکبرٰی لابن حجر الھیتمیؒ ج:۱ ص:۱۲۹، ۱۳۰ (طبع مکتبه اسلامیه) (وسئل) ھل الصلٰوة علی النبی صلی اللہ علیه وسلم مسنونة قبل الأذان کما ھی بعدہ؟ .... وھل ینھی عنه، وعن الصلٰوة علی النبی صلی اللہ علیه وسلم قبل الأذان أو لا؟ (فأجاب) .... بعد اسطر .... أما الصلٰوة والسلام علی النبی صلی اللہ علیه وسلم بعد الأذان والاقامة، فانھما مندوبان کما صرح به أصحابنا وما جاء به ذٰلک خبر مسلم والأربعة الا ابن ماجة. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۱۳۱ فمن أتی .... معتقدا سنیته فی ذٰلک المحل المخصوص نھی عنه ومنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بلا دلیل یزجر عن ذٰلک وینھی عنه. فائدة:- قد أحدث المؤذنون الصلٰوة والسلام علٰی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عقب الأذان، .... وکان ابتداء حدوث ذٰلک فی أیام السلطان الناصر صلاح الدین ابن أیوب، وبأمرہ فی مصر وأعمالھا .... ولقد استفتی مشائخنا وغیرھم فی الصلٰوة والسلام علیه صلی اللہ علیه وسلم .... بعد الأذان علی الکیفیة التی یفعلھا المؤذنون، فأفتوا بأن الأصل سنة والکیفیة بدعة. .... (بقیہ اگلے صفحے پر)

بجائے مسنون طریقے پر اِخلاص اور ادب کے ساتھ دُرود شریف پڑھنے کا طریقہ اختیار کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵۸/۲۹ ب)

نماز کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- نمازوں کے بعد الصلوٰۃ والسلام بلند آواز سے بہ ہیئتِ اجتماعی پڑھنا فرض، واجب یا سنت یا مستحب یا بدعت ہے؟

جواب:- دُرود پڑھنا بہت ثواب ہے، لیکن اس کا جو طریقہ آج کل چل پڑا ہے کہ کھڑے ہوکر اجتماعی طور سے پڑھنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے اسے بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ بدعت ہے۔(۱)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

نماز اور درس کے بعد مصافحہ کرنا

سوال:- ہماری مسجد میں روزانہ بعد نمازِ فجر درسِ قرآن ہوتا ہے، درسِ قرآن کے بعد جب مولوی صاحب کھڑے ہوجاتے ہیں تو مصافحہ کے لئے لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا، کیا اس طرح پابندی بدعت نہیں ہے؟

جواب:- نماز خواہ فجر کی ہو یا ظہر کی، اس کے بعد یا درسِ قرآن کے بعد ثواب سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اگر اس پر اس طرح پابندی کی جائے کہ جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھا

(گزشتہ سے پیوستہ) ....وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) لا کلام فی أن الصلوٰة والسلام علی النبی صلی اللہ علیه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعا لورود الأحادیث الصحیحة .... انما الخلاف فی الجهر بهما علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهٰذه الکیفیة التی جرت بها عادة المؤذنین من رفع الصوت بهما کالأذان والتمطیط والتغنی، فان ذٰلک احداث شعار دینی علیٰ خلاف ما عهد عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمین، ولیس لأحد بعدهم ذٰلک .....
ومن ثم قال العلامة ابن حجر فی فتاویه الکبریٰ: من صلی علی النبی صلی اللہ علیه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول اللہ بعده معتقدا سنیته فی ذٰلک المحل ینهی ویمنع منه، لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر ویمنع انتهٰی. وهٰذا العلامة ابن حجر حکم علیٰ من صلّی علی النبی صلی اللہ علیه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول اللہ بعده بأنه شرع فی دین اللہ تعالیٰ وانه یمنع من ذٰلک ویزجر، وما ذاک الا لقبح ما فعل .... الخ.

(۱) دیکھئے ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبر۱۔

جائے تو بھی بدعت ہے،[۱] لیکن اگر اسے ثواب سمجھے بغیر، اور جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھے بغیر مصافحہ کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۰/۱۹ الف)

امام صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کے بعد سلام پھیر کر امام بطریقِ مروّجہ دُعا نہ مانگتے ہوئے چلا گیا، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ بدون دُعا مانگے نماز مکمل نہیں ہوئی، کچھ لوگوں نے کہا کہ نمازِ جنازہ خود میّت کے حق میں دُعا ہے، نماز مکمل ہوگئی۔ کون سا عمل دُرست ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد الگ سے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا سنت سے ثابت نہیں،[۲] لہٰذا امام صاحب کا عمل دُرست ہے۔ جو لوگ ان کے اس عمل پر اعتراض کر رہے ہیں ان کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲۲/۲۷ د)

دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر جو اذان دی جاتی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟

جواب:- دفن کے بعد اذان دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، اس سے احتراز کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔[۳]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۹/۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۰/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید) ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلٰوة بکل حال لأن الصحابة ما صافحوا بعد أداء الصلٰوة ولأنها من سنن الروافض .... قال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل: انها من البدع، وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات، فحیث وضعها الشارع یضعها، فینهی عن ذٰلک ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السنة، وکذا فی فتاویٰ رشیدیة ص:۲۶۴. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) دیکھئے ص:۱۰۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) دیکھئے ص:۱۱۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- آج کل بعض مساجد میں دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر امام اور مقتدی زور سے دُرود شریف پڑھتے ہیں، اگر امام منع کرے تو فساد ہوتا ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ عمل جس التزام و اہتمام کے ساتھ کیا جارہا ہے، اور جس طرح اس کے تارک پر نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے،[۱] اس سے پرہیز لازم ہے۔ جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں ان کو اہلِ علم کے فتاویٰ دِکھا کر نرمی سے سمجھانا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے فتنہ و فساد برپا کرنا واقعۃً دُرست نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/۲۸ ج)

ما حكم قراءة الصلٰوة والسلام جهرًا بعد صلٰوة الجمعة؟

(جمعہ کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر عربی میں مفصل فتویٰ)

الاستفتاء:-

هل يجوز بكلام الله وسنة الرسول صلى الله عليه وسلم أن تؤدى الصلٰوة والسلام جهرا بعد صلٰوة الجمعة أمام المنصة والمحراب للجامع اهتماما والتزاما؟ شرّفونا بالجواب الصائب، مأجورين عند الله، مشكورين عند الناس.

الجواب:-

ليعلم أولا أن الصحابة رضوان الله عليهم فمن بعدهم من التابعين وأتباعهم كانوا سباقين الى الخير حريصين فى كل ما هو خير فى نظر الشريعة الغراء اذ عملوا بكلما رأوه سنة نبيهم الكريم صلى الله عليه وسلم، وبكلما كان حسنا شرعيا، فدل على أنه لم يبق بعدهم شئ

---

(۱) وفى الفتاوى البزازية على الهندية ج:۶ ص:۳۷۸ (طبع رشيديه كوئٹه) وقد صح عن ابن مسعود رضى الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فى مسجد يهللون ويصلون عليه، عليه الصلٰوة والسلام جهرا فراح اليهم فقال: ما عهدنا ذٰلك علٰى عهده عليه الصلٰوة والسلام وما أراكم الا مبتدعين، فما زال يذكر ذٰلك حتّى أخرجهم عن المسجد. (كذا فى رد المحتار ج:۶ ص:۳۹۸) وفى الشامية ج:۶ ص:۳۴۹ وفى الملتقى وعن النبى صلى الله عليه وسلم أنه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذكير، فما ظنك به عند الغناء الذى يسمونه وجدا ومحبة فانه مكروه لا أصل له فى الدين. وفيها ج:۶ ص:۳۹۸ فالاسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذى المصلين .... الخ. وفى المرقاة شرح مشكوة ج:۲ ص:۳۵۷ قوله تعالٰى: "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ .... الخ." ويسن الاسرار فى سائر الأذكار أيضًا الا فى التلبية، وراجع أيضًا الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۰، ۵۲۳.

واجب ولا مندوب الا ما أوجبه القرآن الكريم وأحاديث رسول الله صلى الله عليه أحسن الصلوٰة والتسليم، وان اخترع بعدهم فكر أحد شيئا، يمكن أن يكون مباحا ولٰكنه لا يجوز أن يهتم به اهتماما بليغا ويدعى اليه الناس، ويلام علىٰ من يتركه.

فاذا بحثنا عن فعل الصحابة وأتباعهم في مسئلتنا هٰذه، رأينا أنهم كانوا يباشرون الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم ويعتبرونه عملا مهمّا مثابا عليه، غير أن طريق مباشرتها عندهم غير الطريق المذكور في السؤال، اذ كانوا يصلون منفردين خاشعين ولم يكونوا يؤدونها زرافات مجتمعين عند المناص والمحاريب، ولم يثبت في شئ من الروايات اجتماعهم لهٰذا المقصد واعلامهم به كما يُعلمون الأذان.

فظهر أن الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم حسن مثاب عليه، والطريق المذكور غير مستحسن، اذ لو كان ذٰلک حسنا لفعله الصحابة بوجه أحسن واهتمام بليغ.

ثم في هٰذا الفعل مفاسد أخرىٰ عديدة:

۱:- ان الصلوٰة دعاء في حضرة الحق جل وعلا مجده، وقد تقرر في موضوعه أن الدعاء بالسر أولىٰ، قال الله تبارک و تعالىٰ: "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً". (۱)

۲:- انه يشبه الرياء، ولا ينبغي دخول مواضع التهم. (۲)

۳:- غاية ما في الباب أنه مباح، وسفهاء زماننا يلتزمون التزاما ولا كالتزامهم الجماعة، ويهتمون به ويلومون علىٰ تاركيه، حتّى أن بعضهم يزعمه فرضا، وقد تقرر في الفقه أن التزام ما لا يلزم لا يجوز، فانه خلاف للاٰية الشريفة: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" الاٰية. (۳)

٤:- بعضهم يباشره قائما ويعتقد أن الرسول صلى الله عليه وسلم "حاضر في كل مكان، ناظر الى كل شئ"، وهٰذه العقيدة نخشى عليها الكفر كما لا يخفى علىٰ مسلم، فان احاطة الأشياء كلها بالعلم ووجوده في كل مكان من أخص صفات الله سبحانه واشراک أحد فيه شرک بالله تعالىٰ، نعوذ بالله منه.

---

(۱) سورة الاعراف:۵۵.

(۲) وفي كشف الخفاء للعجلوني ج:۱ ص:۴۵ رقم:۸۸ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) قول عمر من سلک مسالک الظن اتهم، ورواه الخرائطي في مكارم الاخلاق مرفوعًا بلفظ من أقام نفسه مقام التهم فلا يلومن من اساء الظن به. وراجع أيضًا سنن الكبرىٰ للبيهقي ج:۴ ص:۳۲۴ (طبع مكتبة دار الباز مكة المكرمة) وفتح الباری اجتناب مواضع التهم وكراهة .... الخ. ج:۲ ص:۳۳۶ (طبع دار المعرفة بيروت).

(۳) سورة المائدة: ۳.

وبالجملة فهٰذا الطريق لم يثبت في القرون المشهود لها بالخير، لا سيما اذا ضمت معها مفاسد ذكرناها كان فعلا قبيحا، وحق علٰى كل مسلم أن لا يفعله ويمنع فاعله مهما استطاع.[۱]

والله سبحانه وتعالٰى أعلم

الأحقر محمد تقي العثماني
۱۳۷۹/۶/۱۳ھ[۲]

الجواب صحیح
العبد محمد شفیع عفا الله عنه

نماز کے بعد دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد دُرود شریف اُونچی آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا آہستہ پڑھنا چاہئے؟

جواب:- آہستہ ہی پڑھنا چاہئے۔ ہمارے زمانے میں بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا جو رواج ہوگیا ہے، اور اس کی جس طرح فرائض کی سی پابندی کی جاتی ہے اور جس طرح اس کے خلاف پر ملامت ونکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ ج)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کے لئے اجتماعی اہتمام جیسا کہ آج کل بعض حلقوں میں مروّج ہے، اس کا قرآن وسنت اور بزرگانِ سلف کے تعامل سے کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اس طرح کا اہتمام واصرار بدعت ہے، لہٰذا واجب الترک ہے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

حیلۂ اِسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- حیلۂ اسقاط کا مروّجہ طریقہ شرعاً بے اصل ہے، اس بارے میں اصل حکمِ شرعی یہ

---

(۱) مزید حوالہ جات سابقہ ص:۱۱۴ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۱۴ حاشیہ نمبر۱۔
(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲۔

ہے کہ نماز، روزے جو میّت کے ذمے رہ گئے ہوں، ان کا فدیہ ادا کیا جائے اگر میّت نے وصیت کی ہو، اور اس کے لئے مال بھی چھوڑا ہو تو ورثاء کے لئے ایسا کرنا واجب ہے، ورنہ واجب نہیں بہتر ہے، کذا فی عزیز الفتاویٰ (ج:۱ ص:۳۷۰)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا

سوال:- میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا کیسا ہے؟

جواب:- اس کی کوئی اصل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کا اہتمام کسی حدیث یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عمل سے ثابت نہیں، لہٰذا آج کل بعض حلقوں میں جس اہتمام اور اصرار کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے۔ (کذا فی عزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۸۹)۔[2]

واللہ اعلم
۲۸/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

سوال:- اذان القبر، میّت کو دفن کرنے کے بعد اس کے سر کی جانب کھڑے ہو کر اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۲، وفی الشامیة ج:۲ ص:۷۳ وبه ظهر حال وصایا أهل زماننا، فان الواحد منهم یکون فی ذمته صلوات کثیرة وغیرها من زکاة وأضاح وأیمان ویوصی لذٰلک بدراهم یسیرة ویجعل معظم وصیته لقراءة الختمات والتهالیل التی نص علماؤنا علٰی عدم صحة الوصیة بها. وراجع أیضًا الی الرسالة الثامنة منة الجلیل ص:۲۲۵ من رسائل ابن عابدین رحمه الله، وامداد الأحکام ج:۱ ص:۱۸۳.

(۲) فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۱ ص:۲۸۹، مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۶۴ (مکتبه امدادیه ملتان)، بزازیة مع الهندیة ج:۴ ص:۸۰ (رشیدیه کوئٹه)، خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵ (امجد اکیڈمی لاهور)، البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳، جامع الرموز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع سعید)، نفع المفتی والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی)، امداد الأحکام ج:۱ ص:۱۹۴، امداد المفتین ص:۱۷۶. عبارات سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

جواب:- اس کا صحابہؓ وتابعینؒ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعت ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

مروّجہ حیلۂ اِسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط جو آج کل مشہور ہے اور لوگ کیا کرتے ہیں، شریعت میں کیا اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

جواب:- اسقاطِ مروّجہ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[۲] میّت کے گناہ معاف کرانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے مغفرت کی دُعا کی جائے اور جو نماز، روزے رہ گئے ہیں اس کا فدیہ ادا کیا جائے اور میّت کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

رمضان کی ۲۳ تاریخ کو بعد از تراویح سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم پڑھنا

سوال:- رمضان کی ۲۳ تاریخ کو امامِ مسجد بعد از تراویح سورۂ عنکبوت وسورۂ رُوم پڑھتے ہیں، لوگ سنتے ہیں اور نذرانے پیش کرتے ہیں، یہ طریقہ کیسا ہے؟ فضائلِ قرآن کی روایت کا حوالہ دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: (مولانا) محمد افضل خان
شاہ پور کانا، سوات، صوبہ سرحد

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت باعثِ اجر وثواب ہے، لیکن اس التزام کے ساتھ پڑھنا ہمارے علم میں بے اصل ہے، جس روایت کا وہ صاحب ذکر کرتے ہیں، اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو

---

(۱) تنبیه فی الاقتصار علیٰ ما ذکر من الوارد اشارة الی أنه لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبره کما هو المعتاد الأن، وقد صرح ابن حجر فی فتاویه بأنه بدعة، وقال من ظن أنه سنة قیاسا علیٰ ندبهما للمولود الحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم یصب، (ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۳۵، کتاب الجنائز). وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الهند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، عزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰، ۱۰۶۔

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۷۳ وبه ظهر حال وصایا أهل زماننا، فان الواحد منهم یکون فی ذمته صلوات کثیرة وغیرها من زکاة واضاح وأیمان، ویوصی لذٰلک بدراهم یسیرة ویجعل معظم وصیته لقراءة الختمات والتهالیل التی نص علماؤنا علیٰ عدم صحة الوصیة بها.

اس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۷ الف)

حیلۂ اسقاط اور میّت کے لئے تین دن خیرات کرنے کا حکم

سوال ۱:- مردے کے فدیہ میں پیسے اور قرآن کا دورِ اسقاط پھراتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

۲:- مردے کے لئے اوّل تین رات خیرات کرتے ہیں اور تین صبح تلاوتِ قرآن قبر پر جاکر کرتے ہیں، اس کو پیسے اور روٹی دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: مولانا افضل خان
شاہ پور کانا، ضلع سوات، صوبہ سرحد

جواب ۱:- حیلۂ اسقاط کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اس کے بجائے مشروع طریقہ یہ ہے کہ جتنی نمازیں یا روزے مردے کے قضا ہیں، اتنی نمازوں اور روزوں کا فدیہ غرباء کو دے دیا جائے، اور جتنا ہوسکے مشروع طریقے سے اس کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔ (۱)

۲:- اس قسم کی پابندیاں بدعت ہیں اور ان سے اجتناب لازم ہے۔ ہاں! ان پابندیوں سے بچ کر مردے کو جتنا ایصالِ ثواب اِخلاص کے ساتھ کیا جائے باعثِ خیر و برکت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۷ الف)

قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا

سوال:- قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا جائز ہے؟ اور کیا جواز پر اس حدیث سے استدلال کرنا "نوروا قبور موتاکم بالقرآن" دُرست ہے یا نہیں؟

عبدالسلام چاٹگامی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- قبرستان میں قرآن مجید لے کر پڑھنا جائز ہے، لیکن "نوروا قبور موتاکم بالقرآن" کے الفاظ کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، موضوعات کے مجموعے میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۱۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

اہلِ قبور سے توسل پکڑنا

سوال:- کیا اہلِ قبور سے توسل پکڑنا جائز ہے؟ اور اس کے جواز کے لئے یہ حدیث: ”اذا تحیرتم فی الأمور فاستعینوا بأهل القبور“ استدلال میں پیش کرنا کیسا ہے؟ والسلام

(مفتی) عبدالسلام چاٹگامی
سابق مفتی جامعۃ العلوم
الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- توسل کیا جاسکتا ہے، لیکن خود ان سے حاجت طلب کرنا حرام ہے، ”استعینوا بأهل القبور“ کے الفاظ کی کوئی حدیث نہیں ملی۔ (۱) واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جماعت کے بعد امام سے مصافحہ کرنا

سوال:- جماعت کے بعد دُعا مانگ کر امام سے مصافحہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد امام سے مصافحہ کرنے کو جو بعض لوگ مسنون سمجھتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، خاص طور سے نماز کے بعد مصافحے کو سنت سمجھنا دُرست نہیں، ہاں! واقعۃً امام صاحب سے ملاقات مقصود ہو تو مصافحے میں مضائقہ نہیں۔ (۲) واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۴۸ ہ)

---

(۱) سوال میں سائل موصوف مفتی عبدالسلام چاٹگامی صاحب زید مجدہٗ نے ”فاستعینوا بأهل القبور“ کے الفاظ لکھے ہیں جبکہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ لکھنویؒ کے ایک سوال میں ”فاستفتوا باهل القبور“ کے الفاظ لکھے ہیں، جس کے جواب میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے فرمایا: یہ حدیث نہیں کسی کا مقولہ ہے۔ آگے علامہ لکھنویؒ نے ”فاستفتوا“ کے الفاظ کے ساتھ اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ: ”جب تمہیں کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے میں شبہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کے بجائے ان قدماء کی تقلید کرو جو اس وقت قبروں میں سو رہے ہیں۔“ یا یہ معنی ہے کہ: ”جب تم دُنیاوی اُمور میں پریشان ہو تو اصحابِ قبور پر نظر کرو جنھوں نے دُنیا کو چھوڑ کر آخرت کا سفر اختیار کرلیا اور تمہیں بھی یہ سفر کرنا ہے۔“ اور ”استعینوا“ کے الفاظ ہوں تو پھر مفہوم یہ ہے کہ: ”اصحابِ قبور کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو، نہ یہ کہ ان کو مستقل طور سے حلِ مشکلات اور تدابیرِ عالم میں اللہ کا شریک جانو، یہ کھلا ہوا شرک ہے۔“ دیکھئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب مجموعۃ الفتاویٰ اُردو، کتاب العلم والعلماء ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) دیکھئے سابقہ ص:۱۰۷ کا حاشیہ نمبر ۲،۳۔

درسِ قرآن کے شروع میں دُرود شریف پڑھوانا

سوال:- درسِ قرآن یا حدیث شروع کرنے سے قبل دُرود شریف پڑھوانا کیا بدعت ہے؟

جواب:- اگر اس کو لازم وضروری نہ سمجھا جائے اور واجبات کی طرح التزام نہ کیا جائے تو بدعت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال:- ہماری مسجد عزّت الاسلام میں رمضان کے شروع ہونے سے دو روز پہلے محلے کے دو تین آدمی آئے اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان میں ہم اپنے خرچ سے ایک مہینے تک اپنی جیب سے مسجد کو بجلی کے قمقموں سے سجائیں گے، تقریباً پورے مہینے میں دو ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ زید کہتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے جو اللہ کو ناپسند ہے، اس کا شرعی حکم بتائیں کہ کیا ہے؟

جواب:- مسجد کے چندے سے زائد از ضرورت روشنی کرنا بالکل ناجائز ہے ہی، لیکن اگر کوئی ایک شخص اپنے پاس سے خرچ کر کے روشنی کرے تب بھی اس میں ایک تو اِسراف کا گناہ ہے، دُوسرے تشبہ بالکفار ہے، تیسرے اس کو زیادہ ثواب کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ اس لئے جو لوگ چراغاں کر رہے ہیں انہیں اس سے اجتناب لازم ہے۔[1]

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ بنانا

سوال:- ذکرِ شہادت کے دوران ایک مولانا نے فرمایا کہ: رائج الوقت تمام تعزیے ناجائز ہیں، البتہ اگر سیّد الشہداء کے روضۂ مبارک کی شکل اور نقل بنائی جائے تو جائز ہے، کیا یہ کہنا دُرست ہے یا نہیں؟

(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر۱۔

جواب:- تعزیہ داری کی ہر صورت جو رائج ہے، بدعت ہے، اور اس کا بنانا جائز نہیں[۱]، شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ اگر ثواب سمجھ کر بنائی جائے گی تو بدعت ہوگی۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۰۰/۱۹ الف)

تعزیہ سازی، سبیل لگانا، تعزیہ کو جلانا وغیرہ کا حکم

سوال:- کیا تعزیہ بنانا جائز ہے؟ اس کی کیا وعیدیں ہیں؟

جواب:- تعزیہ بنانا بدعت ہے، اور اس میں کئی قسم کے گناہ ہیں۔[۲]

سوال:- سبیل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- لوگوں کے لئے پانی کا انتظام کرنے کے واسطے راستوں پر سبیل لگانا بڑے ثواب کا کام ہے، لیکن اس ثواب کے کام کو صرف محرّم کے مہینے کے ساتھ خاص کرنا اور اس مہینے کے اندر سبیل لگانے کو زیادہ اَجر و ثواب کا موجب سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے۔

سوال:- لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کو سات محرّم کے بعد پانی نہیں ملا تھا، کیا یہ صحیح ہے، یا انہیں آخر تک پانی میسر تھا؟

جواب:- سات تاریخ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دریائے فرات سے پانی لانے سے روک دیا گیا تھا، یہ بات تاریخی روایات سے ثابت ہے۔[۳]

سوال:- ایک صاحب نے زیرِ تعمیر تعزیہ کو موقع پا کر جلا دیا، اس فعل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- کسی شخص کو بُرائی سے روکنے کا یہ طریقہ دُرست نہیں، نرمی سے سمجھانا چاہئے، اگر وہ نہ مانیں تو ان کے حق میں دُعا کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۷۹/۱۹ الف)

(۲،۱) تعزیہ سازی وغیرہ بدعاتِ محرّم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۷۵، امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۸۶، ۲۸۷، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۸۱، ۱۸۶، فتاویٰ دار العلوم دیوبند امداد المفتین ص:۱۵۴۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''شہیدِ کربلا'' ص:۶۸۔ (محمد زبیر)

بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنے کا حکم

سوال ۱:- کچھ لوگ مسجد میں بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھتے ہیں، اور جمعرات کو شیرینی بھی تقسیم کرتے ہیں، مجوّزین کا اصرار ہے کہ حلقہ بنا کر دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنے کی اجازت ہونی چاہئے، اور وہ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تہواروں کے ایام میں مسجد میں چراغاں بھی کرنا چاہئے۔
کیا یہ مذکورہ بالا مسائل ایسے ہیں جیسے مجوّزین کا خیال ہے؟

جواب ۱:- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر دُرود و سلام بھیجنا بہت اجر و فضیلت کی چیز ہے، لیکن دُرود و سلام کو کسی ہیئت کے ساتھ مخصوص کر دینا یا کسی ایسی ہیئت کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھنا جو صحابہ کرامؓ سے منقول نہیں اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھنا بدعت ہے، جس سے احتراز کرنا چاہئے، کبھی کبھی اجتماعی طور سے حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اصلاً مباح ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ سے یہ طریقہ منقول نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ثواب زیادہ ہے، اور جو شخص اس طریقے سے دُرود شریف نہ پڑھے وہ قابلِ نکیر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس اجتماعی صورت کو زیادہ ثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھا جائے تو یہ بدعت ہوگا، اور چونکہ آج کل اس اجتماعی ہیئت کو اسی نیت سے اختیار کیا جاتا ہے، اور سوال میں بھی اسی کی تصریح ہے، اس لئے اس طریقے کو ترک کرنا چاہئے۔[1]

شیرینی تقسیم کرنے کا بھی یہی حال ہے کہ اصلاً مباح ہے، لیکن اس کو کسی دن کے ساتھ مخصوص کر کے ثواب سمجھنا اور تارک پر نکیر کرنا بدعت ہے۔

سوال ۲:- بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنا کیسا ہے؟

جواب ۲:- مسجد میں چراغاں کرنا بلاشبہ اِسراف ہے، فقہاء نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے سابقہ ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبر ا۔ (۲) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر ا۔

۱:- تعزیہ کے بوسے کو حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنا
۲:- مختلف مقامات میں قمری تقویم مختلف ہونے کی بناء پر لیلۃ القدر ہر مقام پر اپنے مطلع کے لحاظ سے ہوتی ہے

سوال:- ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک شیعہ عالم جناب ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب کا خطاب سننے کا اتفاق ہوا، دورانِ خطاب انہوں نے تعزیہ، علَم، مزار اور اسی طرح دیگر مراسم کے جواز کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:-

نماز اگر چہار دیواری والے کعبہ کی سمت منہ کر کے پڑھی جائے تو یہ بھی غیر خدا کی تعظیم ہوگئی؟ حجرِ اسود کو اگر بوسہ دیا جائے، قرآن مجید کی تعظیم و توقیر ہو تو یہ بھی عینِ خدا نہیں ہیں، مگر ان کا ادب و احترام، بوسہ و تعظیم عین عبادت اور دین کا حصہ ہے، صرف اس لئے کہ ان کی نسبت خدا کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اگر تعزیہ، علَم، ضریح اور اسی قبیل کی دُوسری چیزوں کا ادب و احترام کیا جاتا ہے تو یہ بھی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور ان کے تعلق سے کیا جاتا ہے، تو پھر یہ شرک اور گناہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ بھی عینِ دین ہے اور عبادت ہے۔

ان کی اس توجیہ نے دین میں ایک اِشکال پیدا کر دیا ہے، اس سلسلے میں آپ رہنمائی فرمائیں۔

دُوسری گزارش لیلۃ القدر کے حوالے سے ہے۔ پاکستان میں قمری تقویم کی رُو سے لیلۃ القدر کی رات دُوسری ہوگی، سعودی عرب میں دُوسری ہوگی اور یورپ و امریکہ میں یہ رات مختلف ہوگی، تو کیا سال میں مختلف لیلۃ القدر ہوسکتی ہیں؟ اس حوالے سے بھی اپنا نقطۂ نظر بیان فرمائیں۔

جواب:-

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، لفافے پر میرا پتہ اور نام تھا، لیکن اندر خط جاوید الغامدی صاحب کے نام تھا، شاید آپ نے سوال دونوں کو بھیجا اور خطوط بدل گئے۔

بہرصورت! جواب درج ذیل ہے:-

تعزیہ، علَم اور ضریح کو بیت اللہ اور حجرِ اسود پر قیاس کرنا اس لئے بداہۃً غلط ہے کہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے اور حجرِ اسود کی تقبیل کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً عطا فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ کعبہ کے کسی اور پتھر کو چومنا جائز نہیں۔ تعزیہ، علَم اور ضریح کے بارے میں

کون سی نص ہے؟

بالفاظِ دیگر نماز میں رُخ کرنا یا بوسہ دینا اور کوئی تعظیمی عمل جو عبادت کے مشابہ ہو، انجام دینا اصلاً غیر اللہ کے لئے حرام ہے، البتہ جہاں نصوص سے کسی غیر اللہ کے لئے ثابت ہو، صرف اسی حد تک اجازت ہوگی۔ جہاں نص نہیں وہاں اصل حرمت کا حکم لوٹ آئے گا۔

لیلۃ القدر کی فضیلت ہر مقام پر اس کے اپنے مطلع کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا الگ الگ راتوں میں اس فضیلت کا حصول ممکن ہے۔ (۱)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۰ ؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۴۶/۳۱)

غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز کا حکم

سوال:- قرآن میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر کسی چیز پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام لے لیا جائے تو وہ حرام ہو جائے گی، لیکن مسلمان نذر و نیاز کی مٹھائیاں اور کھانے متبرک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، کیا یہ خلافِ قرآن نہیں؟

جواب:- وہ نذر و نیاز جو غیر اللہ کے نام پر ہو، واقعتاً قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ (۲)

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۸/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال ۱:- پندرہ شعبان کے دوران یا معراج کے موقع پر مساجد پر چراغاں کرنے کا کیا حکم ہے؟

۲:- بعض مساجد میں پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر کمیٹی چراغاں نہیں کرتی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر انفرادی طور پر چراغاں کردے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے، کیا ایسا چراغاں کرنا جائز ہے؟

جواب ۱:- جتنی روشنی کی مسجد میں فی الواقعہ ضرورت ہے، اس سے زائد چراغاں کرنا دُرست نہیں۔

۲:- کوئی شخص اگر اپنے مال سے چراغاں کرادے تو اس سے مسجد کا مال غیر مصرف میں خرچ

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۲۹ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)، وتفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۷۹۴ (سورۃ القدر)۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۷ حاشیہ نمبر۴۔

کرنے کا گناہ تو نہ ہوگا، لیکن اِسراف اور تشبہ بالکفار کا گناہ پھر بھی ہوگا، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۸۶ ج)

ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا حکم

سوال:- ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا کیا حکم ہے؟ اور مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب:- گیارھویں اور کونڈے وغیرہ کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ بدعتیں ہیں جن کا اصل شرع میں وجود نہیں، ان میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ مُردوں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے صدقہ، خیرات ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

■■■

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۲ حاشیہ نمبر۱۔

﴿کتاب العلم والتاریخ والطب﴾

(علم، تاریخ اور طب کے متفرق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المتفرقات﴾
(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

کیا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا؟

سوال:- کنعان نام فرزند حقیقی حضرت نوح بود یا غیر حقیقی؟

جواب:- پسر حضرت نوح کہ در طوفان غرق شدہ بود اسم او بعض مؤرخین کنعان گفتہ اند۔ حافظ ابن کثیرؒ در تاریخ خود می نویسد: وھٰذا الابن ھو یام أخو سام وحام ویافث، وقیل: اسمہ کنعان، وکان کافرا عمل عملا غیر صالح. (البدایة والنھایة جلد اوّل ص:۱۱۳)[۱]۔ واین پسر بود چنانکہ ظاہر آیت دلالت می کند "وَنَادٰی نُوْحُ ۨابْنَهٗ"[۲] البتہ کنعانے دیگر پسرِ حام پسر نوح علیہ السلام بود، ومسکنِ او در شام باسم کنعان مشہور گشت۔ (کما فی الکامل لابن اثیرؒ، ج:۱ ص:۲۸)[۳]۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

"اجماع اور بابِ اجتہاد" نامی کتاب کا حکم، نیز اجماع کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:- اسلام میں اجتہاد کا "دستوری ضابطہ" اور ائمۂ اربعہ کے اجتہاد کی "دستوری پوزیشن"، محترم مفتی محمد شفیع صاحبؒ قرآنی آیت النساء (۱۱۵:۴) اور حدیث: "لا تجتمع ...." کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجماع کا حق بحیثیت مجموعی ساری اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے نہ کہ اُمت کے کسی خاص طبقے یا گروہ کو۔

---

(۱) البدایة والنھایة قصة نوح علیہ السلام ج:۱ ص:۱۷۰ (طبع دار الفکر بیروت).
(۲) سورة هود:۴۲.
(۳) وفی التاریخ الکامل لابن اثیرؒ ج:۱ ص:۲۸ (طبع قدیم) واما الحام فولد له کوش ومصرایم وقوط وکنعان .... وامام الکنعانیون فلحق بعضهم بالشام .... الخ.

استدلال کے طور پر اس اَمر کو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خواہ مسئلہ زیرِ بحث کوئی بھی ہو، اگر اُمت کا سوادِ اعظم فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، لیکن یہ امکان ساری اسلامی تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ عملاً اس کا وقوع ناممکن بھی ہے، کیونکہ اجماع ایک اسلامی فن اور فقہی عمل ہے جس کے لئے اُمتِ مسلمہ کو ہمیشہ ان اہلِ علم پر اعتماد کرنا ہوگا جو اس شعبے میں ضروری قابلیت اور اختصاصی مہارت رکھتے ہیں۔

''اجماع اور بابِ اجتہاد'' (مصنف کمال فاروقی، ترجمہ مظہرالدین صدیقی صفحہ:۱۵) اس تفسیر کے تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱:- اُصولی طور پر اجماع کا حق تمام اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے، نہ کسی خاص طبقہ یا گروہ کو۔

۲:- لیکن چونکہ اجماع ایک فنی (Technical) اور فقہی عمل ہے، لہٰذا اس عمل کو مسلم معاشرے کا صرف فقہی اور عالم طبقہ ہی انجام دے سکتا ہے جو قرآن وسنت اور دیگر مآخذ سے فقہی اور قانونی تعبیرات اخذ کرنے کا ماہر ہے۔

۳:- چونکہ مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی نہ اس فن کا ماہر ہے، نہ یہ عمل انجام دے سکتا ہے، لہٰذا اُمتِ مسلمہ نے قانون سازی کا یہ حق وفرض طبقۂ علماء وفقہاء کو ''تفویض'' کردیا ہے۔

اس ''طبقۂ ماہرین'' کے انتخاب یا نامزدگی کا کوئی خصوصی طریقہ مسلم معاشرے میں متعین اور مروّج نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ کے دور کے نظائر ایک مثال ضرور بن سکتے ہیں، لیکن حجت نہیں۔

۴:- لہٰذا طبقۂ علماء وفقہاء کی تعبیرات اور اجماع پر مسلم معاشرے کا اجماع ناگزیر (منطقی طور پر) اور واجب ہے۔

۵:- لیکن اس کے باوجود بھی اگر بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم، فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

۶:- اسی طرح بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم طبقۂ علماء وفقہاء کے برخلاف (یعنی علماء کے اجماع کے برخلاف) کسی تعبیر یا فیصلے پر متفق ہوجاتا ہے جسے علماء فقہاء کی تائید حاصل نہ ہو تو یہ اجماع بھی منعقد اور مکمل نہیں ہوگا، اور دونوں صورتوں میں نمبر۵ اور ۶ میں چونکہ اجماع منعقد یا مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا حجت نہیں ہوگا۔

۷:- لہٰذا نمبر۵ اور ۶ کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوا کہ طبقۂ علماء وفقہاء اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو ''قوتِ تنفیذ'' حاصل ہے، یعنی انہیں اپنے فیصلے کے نفاذ کا حق بھی حاصل ہونا ضروری ہے۔

(اگرچہ یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ دونوں طبقے علماء اور سوادِ اعظم متفق ہوں)۔

اور دونوں طبقوں کی حیثیت مشاورتی کونسل کی ہرگز نہیں ہے جس کے فیصلے کو قبول یا مسترد کرنے کا اختیار ایک تیسرے اور حکمران طبقے کو حاصل ہو، جسے نہ اُمت نے منتخب کیا ہو، اور نہ نامزد کیا ہو، بلکہ صرف اس کے سیاسی غلبے کی وجہ سے مجبوراً قبول کیا ہو۔

۸:- لہٰذا قرآن وسنت کی دستوری تعبیر اور دستوری اجماع وہ ہوا جو اس وقت منعقد ہو جبکہ:-

۱:- اُمتِ مسلمہ کا منتخب یا نامزد طبقۂ علماء وفقہاء موجود ہو جس کی تعبیر اور رائے کو اُمت کی تائید سے قوتِ نافذہ بھی حاصل ہو (جیسی کہ موجودہ لجسلیٹو کو حاصل ہوتی ہے)۔

۲:- اُمتِ مسلمہ کو طبقۂ علماء وفقہاء کے اجماع کو قبول یا مسترد کرنے اور قبول کرنے کی صورت میں اس قبول شدہ اجماع کو نافذ کرنے کی قوت بھی حاصل ہو۔

۳:- یعنی کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی یا کسی فردِ واحد کی (خواہ وہ امام ہی کیوں نہ ہو) یا کسی گروہِ فقہ کی رائے اور تعبیر کو اُمت کی مرضی کے خلاف اس پر نافذ کردے۔

۴:- لہٰذا دستوری اجماع وہی ہوگا جس میں مندرجہ بالا دونوں شرائط (نمبر۱،۲) پائی جائیں، جس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ کے دور کے فیصلوں اور تعبیرات کی ہیں جن میں مندرجہ بالا دونوں شرائط پائی جاتی ہیں، اب ایک ایسے دور میں (مثلاً بنی اُمیہ اور بنی عباس کا دور اور پاکستان کا موجودہ دور بھی اس سے مختلف نہیں) جبکہ:-

الف ۱:- اُمت کی مرضی کے خلاف اور اسلام کے سیاسی نظام کے قطعی طور پر خلاف، محض غلبہ اور طاقت کی بناء پر ایک فرد، خاندان یا جماعت، ملک کے سیاسی نظام پر مکمل طور پر مسلط ہوچکی ہو۔

(یہاں مستفتی نے ایک حاشیہ بھی تحریر کیا ہے جو نیچے ملاحظہ فرمائیں۔ محمد زبیر عفی عنہ)۔[1]

---

(۱) جیسا کہ امام مالکؒ نے خلیفہ منصور کی اس رائے کو مسترد کردیا تھا کہ تمام عالمِ اسلام کو امام کی کتاب پر جمع کردیا جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ جمع کرنا خلیفہ کی سیاسی قوت کی بناء پر ہوتا جو اُمت کے حق میں قبول ومسترد کو سلب کرتا ہوتا جسے امامؒ نے پسند نہیں کیا۔ امام صاحبؒ نے علماء وفقہاء کی ایک جماعت کے تعاون سے اور دیگر ائمہ نے انفرادی اجتہاد سے قرآن وسنت کی جو فقہی تعبیرات اور فیصلے کئے ہیں ان کی پوزیشن یہی ہے کہ یہ ایک جماعت کا یا فردِ واحد کا ذاتی اجتہاد ہے، اُمت کے منتخب شدہ یا نامزد شدہ طبقۂ علماء کا اجتہاد نہیں اس پر پوری اُمتِ مسلمہ نے بلکہ اُمت کے ایک بڑے گروپ اہلِ سنت والجماعت نے بلکہ اہلِ سنت کے مختصر گروہوں نے اجماع کیا ہے، اس سلسلے میں اہلِ سنت میں حنفی اکثریت میں ہیں اور مالکی، شافعی، حنبلی اقلیت میں۔

(۲) واضح رہے کہ یہاں سوال غلط یا صحیح اجتہاد کا قطعی نہیں ہے، دستوری وغیر دستوری کا ہے۔ یہ اجتہادات وتعبیرات قرآن وسنت اور دیگر اُصولِ فقہیہ کے عین مطابق اور بالکل صحیح ہیں، اور اگر اسلام کا سیاسی نظام قائم ہوتا تب بھی اسی اجتہاد اور اسی تعبیر کو اُمت اسی طرح قبول کرتی جس طرح اب ہے، لیکن کسی چیز کا صحیح یا غلط ہونا اور چیز ہے، اور دستوری وغیر دستوری ہونا دُوسری چیز۔ یہاں بھی سوال دستوری وغیر دستوری کا ہے۔

۲:- طبقۂ فقہاء وعلماء موجود ہی نہ ہو یا اگر موجود ہو بھی تو:-

ا:- امامت کا منتخب شدہ یا نامزد شدہ نہ ہو۔

۲:- اگر اپنی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بناء پر اُمت میں ایک مقام بھی رکھتا ہو تب بھی اس کے فیصلوں اور تعبیرات کو نفاذ کی قوت حاصل نہ ہو۔

۳:- یا حکمران جماعت و خاندان کی حیثیت زیادہ ہو اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی کونسل کی ہو، جس کے فیصلوں اور تعبیرات کو قبول اور مسترد کرنے کا اختیار حکمران، فرد یا خاندان کو حاصل ہو۔

۴:- اور اُمتِ مسلمہ کو کسی فیصلے یا اجماع کے قبول و مسترد کرنے اور نافذ کرنے کی قوت حاصل نہ ہو۔

ب:- مندرجہ بالا صورت میں علماء وفقہاء کی ایک جماعت (جس کی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بلندی مُسلَّم ہونے کے باوجود اُمت کے، غیر منتخب شدہ یا غیر نامزد شدہ ہے) یا فردِ واحد، ذاتی طور پر اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد پر سوادِ اعظم یا سوادِ اعظم کا مختصر گروہ جمع ہوجاتا ہے۔

ج:- تو کیا یہ اجماع، اسلام کے سیاسی نظام کے دستوری ضابطے کے لحاظ سے (جس کی مثال خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یعنی خلافتِ راشدہ ہے) دستوری ہے؟ (یعنی اس میں نکتہ نمبر ۸ کی دونوں شرائط نمبر ا و ۲ پائی جاتی ہیں؟)

د:- اگر یہ دستوری نہیں تو اس کی حیثیت عبوری ہے، اور جب اسلام کا سیاسی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد پر قائم ہوگا (جس میں وہ دونوں شرائط پائی جاتی ہیں جو نکتہ نمبر ۸ میں بیان ہوئے ہیں) تو اس تعبیر اور اجتہاد کو اُمتِ مسلمہ اور طبقۂ علماء وفقہاء باضابطہ طور پر اختیار کرے گا تو ان کی حیثیت دستوری لحاظ سے مُسلَّم ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ

ر:- لیکن اگر نکات الف، ب، ج، د، اور نکتہ نمبر ۸ کے تمام نکات غلط ہیں یا اسلام کے سیاسی نظام کے لئے ضروری نہیں ہیں تو:-

ا:- گویا اسلام میں اجماع اور اجتہاد کا کوئی دستوری ضابطہ متعین نہیں ہے، اور

۲:- ہر وہ اجتہاد، اجماع حاصل کرلیتا ہے جس پر اُمت کا کوئی گروہ جمع ہوجائے۔

۳:- اجماع اور اجتہاد کے لئے علماء فقہاء اور اُمت کی قوتِ تنفیذ ضروری نہیں ہے۔

۴:- مسلم معاشرے میں اجماع اور اجتہاد کی تاریخ اور قرآن وسنت کی فقہی تعبیرات کی تاریخ یہ ہے کہ ہر اجتہاد اور تعبیر علماء وفقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے، جس پر بعد میں اُمت کا ایک گروہ یا طبقہ جمع

ہوجاتا ہے۔ کیا مندرجہ بالا تجزیہ دُرست ہے؟

جواب:۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس مکتوب کے جواب پر تاخیر کے لئے آپ سے تہِ دِل سے معذرت خواہ ہوں، لیکن میں جن مصروفیات میں ہمہ وقت گرفتار رہتا ہوں اگر آپ انہیں بچشمِ خود دیکھتے تو یقیناً معذور قرار دیتے۔

آپ نے جو سوالات اُٹھائے ہیں وہ تشریح کے لئے کافی تفصیل چاہتے ہیں، تاہم چند نکات عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ آپ کے کسی کام آسکیں۔

۱:۔''اجماع اور بابِ اجتہاد'' نامی کتاب جو کمال فاروقی صاحب کی تصنیف ہے، کوئی معتبر کتاب نہیں ہے، اور اس کتاب میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، لہٰذا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات نقل کرنے کے لئے اس کا حوالہ مستند نہیں ہے۔

۲:۔''اجماع'' کے بارے میں اکثر مستند فقہاء کا موقف یہ ہے کہ وہ صرف ''کسی زمانے کے تمام اہلِ اجتہاد علماء کے کسی شرعی مسئلے پر متفق ہوجانے'' کو کہتے ہیں، یعنی اجماع دراصل صرف اہلِ اجتہاد علماء کے اتفاق کا نام ہے، عوام کا اختلاف واتفاق اس میں معتبر نہیں، چنانچہ صدر الشریعہؒ اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:۔

وفی الاصطلاح اتفاق المجتھدین من أمۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام فی عصر علٰی حکم شرعی .... وقید بالمجتھدین، اذ لا عبرۃ باتفاق العوام ۔ (ملاحظہ ہو: **التلویح مع التوضیح** ج:۲ ص:۴۱ طبع مصر)۔[1] ''اجماع اصطلاحی طور پر اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے مجتہدین کے کسی ایک زمانے میں کسی شرعی حکم پر متفق ہوجانے کا نام ہے۔ اور اس تعریف میں مجتہدین کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ عوام کے متفق ہوجانے کا کوئی اعتبار نہیں۔''

البتہ جن حضرات نے اجماع کی تعریف میں ''اہلِ اجتہاد'' کی قید نہیں لگائی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی رائے بھی اجماع میں مؤثر ہے، سو درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا فریضہ بھی یہ ہے کہ وہ مجتہدینِ اُمت کی پیروی کریں، اور عملاً ہوتا بھی یہ ہے کہ جب مجتہدین کا کسی مسئلے پر اتفاق ہوجاتا ہے تو وہ انہی کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخِ اسلام میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عام مسلمانوں نے مجتہدینِ اُمت کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو، لہٰذا جب مجتہدین کسی مسئلے پر

(۱) توضیح تلویح ص:۴۹۴ (طبع نور محمد کتب خانہ کراچی).

اتفاق کرتے ہیں تو اُمت کے تمام افراد کا اتفاق خود بخود ہی ہوجاتا ہے۔ لہٰذا عملی اعتبار سے اسے ''تمام مسلمانوں کا اجماع'' بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد کو مجتہدین کے اجماع کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳:- ''مجتہدینِ اُمت'' کی تعیین تاریخِ اسلام میں کبھی بھی یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی ''انتخاب'' اور ''نامزدگی'' کے مروّجہ طریقوں سے نہیں ہوئی، بلکہ قبولیتِ عام سے اس کا فیصلہ ہوا ہے، جس طرح قدیم زمانے میں طبیب کے طبیب ہونے کے لئے کسی انتخاب یا نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ قبولِ عام کی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوتا تھا، اسی طرح کسی کے مجتہد ہونے کا فیصلہ بھی اسی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی عملی دُشواری نہ تھی۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں کسی بھی عالم کا کوئی اختلاف نہیں تب تو اجماع کا تحقق ثابت ہوگیا، اور اگر کسی کا اختلاف ہے تو صرف اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ یہ شخص اَہلِ اجتہاد ہے یا نہیں؟ اور دُوسرے مجتہدین کی اکثریت کا فیصلہ اس بارے میں کافی تھا۔

مندرجہ بالا نکات ذہن میں آجائیں تو اس سے آپ کے بیشتر سوالات کا جواب خود بخود نکل آتا ہے، کیونکہ وہ اس تصور پر مبنی ہیں کہ اہلِ اجتہاد کے اجماع کے خلاف عام مسلمانوں کی رائے بھی مؤثر اور معتبر ہے، جس کی تردید نکتہ نمبر۲ میں احقر کرچکا ہے۔ ان تین نکات کی بنیاد پر اگر کوئی خلش باقی ہوتو وہ دوبارہ لکھ کر معلوم فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۵/۲۸ ب)

کیا روزے کی حکمت وہی ہے جو نماز کی ہے؟

سوال:- مندرجہ ذیل الفاظ ایک مضمون کے ہیں جو ''سیرت و کردار کے سانچے'' کے عنوان سے روزنامہ حریت مؤرخہ ۲/دسمبر ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر۳ پر شائع ہوا ہے:-

''زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا ''رُکن'' نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رُکن صلوٰۃ کا ہے، اور اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے، اس کا کام انہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز، روزہ کا معمول ''نظامِ تربیت'' ہے، نماز کا معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے،

اور روزہ سال بھر میں ایک مہینے کا غیر معمولی نظامِ تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسا ہوا رکھتا ہے تا کہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات تھے وہ شدید ہو جائیں۔"

اس کے بعد "روزے کے اثرات" کے عنوان سے نیا پیراگراف شروع ہوتا ہے۔

اپنی طرف سے کچھ مفہوم کے متعلق تحریر کرنا بددیانتی سمجھتا ہوں، لیکن چونکہ جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ عبارت کا مفہوم مجمل ہے، لہٰذا کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عبارت کا ابتدائی جملہ "نہیں ہے" کے ساتھ ختم ہوکر روزہ کے مستقل جداگانہ نوعیت کے رُکن کی نفی مطلق کرتا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اس غلط فہمی کا سبب بیان کیا جارہا ہے کہ مستقل رُکن روزہ کو اس لئے سمجھا گیا ہے کہ اس کا مزاج ایک مستقل رُکن کا سا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگادیا گیا ہے۔ لفظ "ہی" روزہ کی حیثیت کو محدود و معین کرتا ہے۔ عبارت کا باقی حصہ اس "محدود حیثیت" کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال ابتداء میں نفی قطعی اور اس کے بعد وضاحت میں "ہی" کا لفظ کم از کم یہی ظاہر کرتا ہے۔

جواب:- مذکورہ عبارت میں نماز اور روزے کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے کی حکمت قریب قریب وہی ہے جو نماز کی تھی، اس کے ذریعہ بھی انسان کو تربیت دینا مقصود ہے، یہ بات اگرچہ فی نفسہٖ محلِ نظر ہے کہ روزے کو حکمت کے لحاظ سے نماز کا تتمہ قرار دیا جائے، حقیقت یہی ہے کہ روزہ بالکل مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حکمتیں بھی مستقل ہیں۔[1] اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نماز اور روزہ دونوں بندگی کے مظاہر ہیں، سو اس اعتبار سے تمام عبادات ایک جیسی ہیں، اس لئے اس عبارت میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی، لیکن چونکہ اس میں تشریعی طور پر روزے کے مستقل رُکن ہونے کا انکار نہیں کیا گیا اس لئے اس پر وہ اَحکام جاری نہ ہوں گے جو مستقل رُکن کے انکار سے جاری ہوسکتے ہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۲/۱۱۸ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب "اَحکامِ اسلام عقل کی نظر میں" ص:۱۴۳ (طبع کتب خانہ جمیلی لاہور)۔

بعض شرعی اَحکام کی مصلحتیں

(غیر مسلموں کی جانب سے چند اعتراضات کا جواب درکار ہے، اُمید ہے کہ آپ جواب ارسال فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے)

سوال ۱:- اسلام میں کثیر الازدواجی (Poly Gamy) کی اجازت کیوں ہے؟ اور Poly Andry کیوں ممنوع ہے؟ اگر اولاد کی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ خون کے ایک سادہ سے ٹیسٹ سے حل ہوجاتا ہے۔ عورتیں چار شادی کا مطالبہ کریں تو کیا دلائل ہیں؟

۲:- اسلام میں خنزیر کیوں حرام ہے؟ اس کی اخلاقی وطبّی وجوہ ارشاد فرمائیں، اور یہ ثابت فرمایئے کہ اس کا گوشت کیوں مضر ہے؟

۳:- اسلام سے پہلے شراب پی جاتی تھی، یہ کیوں ممنوع نہ تھی؟

۴:- اگر کوئی اپنی بیوی کو غصّے، غلط فہمی یا شدید مجبوری کی حالت میں طلاق دے دے اور دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مرد کی اس غلطی کی سزا اس بیچاری بے گناہ مظلومہ عورت کو حلالہ کی صورت میں کیوں دی جاتی ہے؟ کرے کوئی، بھرے کوئی!

۵:- اسلام میں (معاذ اللہ) عورت کو کم تر مخلوق کیوں تصوّر کیا جاتا ہے؟ مثلاً: جائیداد میں آدھا حصہ، آدھی گواہی، عقیقے میں آدھی قربانی، طلاق کا حق نہ ہونا، اگر خلع لینا ہو تو اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے، وغیرہ وغیرہ۔

جواب:- آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے دو اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

غیر مسلموں سے گفتگو

۱:- غیر مسلموں سے جب کبھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی نوبت آئے تو گفتگو ہمیشہ اُصولِ اسلام پر ہونی چاہئے، جزوی اَحکام پر نہیں، کیونکہ تمام جزوی اَحکام دراصل اُصولوں پر مبنی ہیں۔ جب تک انسان ان اُصولوں کا قائل نہ ہو، جزوی اَحکام کی حکمتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتیں، اور ایک کے بعد دُوسرے حکم پر اعتراض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

ہر حکم کی مصلحت سمجھ میں آنا ضروری نہیں

۲:- اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کلی طور انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اگر ہر حکم کی مصلحت انسان کی سمجھ میں آجاتی تو اللہ تعالیٰ کو وحی کے

ذریعے اَحکام عطا فرمانے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ مصلحت اور حکمت کے مطابق عقل سے کام لے کر عمل کرو۔ شریعت کے اَحکام تو آتے ہی عموماً اس جگہ پر ہیں جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاملے کو صرف انسانی عقل کے حوالے کیا گیا تو وہاں ٹھوکر کھائے گا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی پوری مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو اس حکم سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ دیکھئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو، بظاہر اس حکم میں کوئی مصلحت نہ تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصلحت نہیں پوچھی، فوراً عمل کرنے پر تیار ہوگئے۔ جب اللہ تعالیٰ کو حکیمِ مطلق اور اپنا پروردگار مان لیا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو بجالائے اور حکمت و مصلحت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اگر آپ ایک ملازم رکھیں اور جب آپ اسے کسی کام کا حکم دیں تو وہ پہلے آپ سے اس کی مصلحت بتانے کا مطالبہ کرے، تو کیا وہ ملازم وفادار سمجھا جائے گا یا برطرف کرنے کا مستحق ہوگا؟ جب ایک ملازم کا یہ حال ہے تو بندے کا معاملہ اپنے مالک کے ساتھ خود سوچ لیجئے۔

لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ شرعی اَحکام کی مصلحتوں کے زیادہ درپے ہونا نہیں چاہئے، تاہم بہت سے شرعی اَحکام کی کچھ مصلحتیں انسان کو سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب ''اَحکامِ اسلام عقل کی نظر میں'' انہی مصلحتوں کو بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، کبھی اس کا مطالعہ فرمالیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔

۱:- مردوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں؟

یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ اگر ایک مرد چار عورتوں کے پاس جائے تو چاروں کو حاملہ بناسکتا ہے، لیکن ایک عورت چار مردوں کے پاس جائے تو وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کے لحاظ سے عورت یک زوجی کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ مرد، اس کے علاوہ مرد پر ایسا کوئی زمانہ معمولاً نہیں آتا جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہ ہو، لیکن عورت پر حیض و نفاس اور حمل کے ایام میں ایسے دور باقاعدہ آتے ہیں جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہیں ہوتی، لہٰذا مرد کو جنسی تسکین کے لئے زیادہ کی ضرورت ہوسکتی ہے، عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔

۲:- خنزیر کیوں حرام ہے؟

خنزیر کے طبّی نقصانات سینکڑوں اطباء اور ڈاکٹروں نے بیان کئے ہیں، اور اخلاقی نقصان یہ ہے کہ اس سے قوّتِ بہیمیّہ میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آپ دن رات مغرب میں کرتے ہیں۔

۳:- شراب ایک دم سے کیوں حرام نہیں ہوئی؟

اسلام کے اَحکام بتدریج آئے ہیں، ایک دم سارے اَحکام آجاتے تو عمل مشکل ہوتا، اس لئے رفتہ رفتہ کرکے بُری عادتیں چھڑالی گئیں۔

۴:- حلالہ کیوں؟

یہ خیال غلط ہے کہ "حلالہ" کوئی تدبیر ہے جس پر عورت کو مجبور کیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کی مقرّر کی ہوئی تمام حدود کو پامال کرکے تینوں طلاقیں دے دیں، وہ اب اس لائق نہیں کہ ایک شریف عورت اس کے پاس رہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ اب اس سے نکاح نہ کرو، کوئی اور شوہر تلاش کرو۔ ہاں! اگر اس شوہر سے بھی نبھاؤ نہ ہو اور وہ ازخود طلاق دیدے تو اس صورت میں اُمید ہے کہ پہلا شوہر کچھ سبق حاصل کرچکا ہوگا۔ اس لئے اگر اب اس سے نکاح کرنے پر بیوی رضامند ہو تو اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور یہ جو محض حیلے کے طور پر حلالہ کیا جاتا ہے، وہ شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

۵:- کیا عورت کم تر مخلوق ہے؟

عورت ہرگز کم تر مخلوق نہیں، البتہ مرد کے مقابلے میں کمزور ضرور ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے کسبِ معاش کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی گئی۔ اس کی کمزوری اور بعض دُوسری نفسیات کے پیشِ نظر مرد کو اس کے کسبِ معاش کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور جب وہ کسبِ معاش کی ذمہ دار نہیں تو جائیداد میں بھی اس کا حصہ آدھا اور کسبِ معاش کے ذمہ دار کا حصہ پورا ہے، (اسلام کے سوا کسی مذہب میں تو آدھا حصہ بھی نہیں ہے)۔

یہ تمام موضوعات تفصیل طلب ہیں اور ایک خط میں ساری بات کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ "مسلمان عورت" از مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مطالعہ فرمالیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۵/۵/۱۴۱۲ھ (۱)

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "شخص" استعمال کرنے کا حکم اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے؟

سوال ۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ خدا

(۱) یہ فتویٰ "البلاغ" کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)

تعالیٰ کی ذات کو لفظ ''شخص'' سے پکارا جاسکتا ہے؟ کیونکہ پندرہ پارے کی ابتدائی آیات کا ترجمہ چند مترجم حضرات نے اس طرح کیا ہے کہ: ''پاکی ہے اس شخص کو جو لے گیا اپنے بندے کو'' اس جگہ خدا کی پاک ذات کو ''شخص'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے۔ برائے کرم صرفی ونحوی قاعدے کی رُو سے اور شرعی اعتبار سے اُجاگر فرمائیں کہ لفظ ''شخص'' صرف بنی آدم کے لئے ہی ہے یا خدا کی ذات اور ملائکہ وغیرہ کو بھی کہا جاسکتا ہے؟ نیز ''شخص'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی بھی تحریر فرماکر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ ایسی تحریر کا قرآنِ پاک ہمارے پاس موجود ہے، اگر لفظ ''شخص'' حضرت جبریلؑ کی طرف منسوب کیا جائے تو پھر اس میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کے بندے تو نہیں ہیں؟

۲:- زید، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلاتِ مبارکہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پاک نہیں ہیں، نیز یہ بھی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشابِ مبارک آپ کی کسی خادمہ یا خادم نے نہیں پیا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو صحاحِ ستہ کی حدیث پیش کی جائے۔ برائے مہربانی تحریر کریں کہ زید کا قول صحیح ہے یا غلط ہے اور زید کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا صحاحِ ستہ کے علاوہ باقی احادیثِ مبارکہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں؟

جواب ۱:- لفظ ''شخص'' کے لغوی معنی خواہ کچھ ہوں، لیکن عرفاً اس کا اطلاق انسانوں پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا استعمال دُرست نہیں، اس کے بجائے لفظ ''ذات'' استعمال کرنا چاہئے۔

۲:- اس مسئلے میں فقہاء ومحدثین میں اختلاف رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت کے نزدیک راجح یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے، جس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں،[۱] لیکن اس مسئلے کی تحقیق پر نہ ایمان کا کوئی حصہ موقوف ہے اور نہ عملِ صالح کا، اس قسم کی بحثوں میں فضول پڑنا نہیں چاہئے، اس کے بجائے ایسے مسائل معلوم کیجئے جن کا تعلق عمل اور آخرت کی بھلائی سے ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۱۸ د)

---

(۱) اس بارے میں تفصیلی بحث کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:
۱:- الشفاء فی حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۱۶۱ (علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ).
۲:- شرح الشفاء مُلّا علی قاری رحمہ اللہ ج:۱ ص:۱۵۹. ۳:- الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۸ مطلب فی طھارۃ بولہ صلی اللہ علیہ وسلم.

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟

سوال:- گزارش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اور یہ جو آثارِ قدیمہ والے بحث کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر وہ معلوم شدہ ڈھانچے سامنے لاتے ہیں، اس بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ نیز جنات کب سے دُنیا میں قیام پذیر ہیں؟ احادیثِ مبارکہ میں ان کا کوئی ذکر ہے؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قرآنِ کریم یا کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک کتنی مدّت گزر چکی ہے؟ لہٰذا اس کی تحقیق میں پڑنا دینی اعتبار سے نہ ضروری ہے، نہ مفید۔ سائنسی نظریات جو مختلف جمادات ونباتات کی عمر کے بارے میں سامنے آتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت محض اندازے کی ہے، یقین کی نہیں، اور جو ڈھانچے پُرانے ملے ہیں ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اتنی بات بہرحال قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس زمین پر انسان سے پہلے جنات آباد تھے۔[1]
بہرحال! ان تحقیقات پر کوئی دینی مسئلہ موقوف نہیں ہے، لہٰذا زیادہ فکر عملی مسائل کی کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۹۳/۴۰ ج)

اُحد اور حراء سے متعلق دو واقعات کے زمانے کی تعیین اور کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ حافظ مزیؒ کے شاگرد تھے؟

سوال:- اس خط سے پہلے میری آپ سے اگرچہ تحریری یا بالمشافہ ملاقات نہیں، لیکن آپ کی علمی تصانیف اور خصوصاً تکملۂ فتح الملهم اور درسِ ترمذی سے حد درجہ استفادہ کرنے کی بناء پر پہلے ہی سے ذہنی اور فکری طور پر آپ سے بہت قریب رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ انہی بلند پایہ کتابوں کا مطالعہ کرکے میرے اندر حدیث شریف کا وہ ذوق پیدا ہوا جو آج میری اُمنگوں کو مہمیز لگا کر

---

(۱) یہاں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) سے ایک سوال اور اس کا جواب بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:-
سوال (۱۳۶):- حضرت آدمؑ کی پیدائش سے اب تک کتنے برس ہوئے؟ ان کی پوری تاریخ؟
جواب:- حافظِ حدیث ابنِ عساکرؒ نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں، بعض مؤرّخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان چھ ہزار ایک سو چھپن سال کا فاصلہ لکھا ہے۔ (امداد المفتین ص:۲۶۱)۔ مزید تحقیق و تفصیل کے لئے دیکھئے: المعارف لابن قتیبةؒ "مبداء الخلق" ص:۳۳،۳۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)۔ (محمد زبیر حق نواز)

مجھے ابنِ ماجہ پر تحقیقی کام کرنے کا حوصلہ دے چکا ہے۔ اگر مولائے کریم کی توفیق شامل رہی تو ابنِ ماجہ کی یہ شرح وقت کی اہم ضرورت پوری کرے گی۔

۱:- اس وقت جس مقصد کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں، وہ ایک حدیث کے سلسلے میں استفسار کرنا ہے جس میں، میں بُری طرح اُلجھ گیا ہوں۔ بخاری و مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ، مسندِ احمد اور تقریباً تمام ہی کتبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اُحد! ٹھہر جا، "لیس علیک الا نبی أو صدیق أو شهید" آگے راوی تصریح کرتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہاں دو گتھیاں حل طلب ہیں۔ (الف) پہلی تو یہ کہ بخاری و مسلم میں اُحد کے الفاظ ہیں، جبکہ دُوسری کسی حدیث میں غارِ حراء کی تصریح ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا الگ الگ دو واقعے ہیں؟ اس سلسلے میں اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔ (ب) دُوسرے یہ کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سعید بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی تذکرہ ہے، حالانکہ وہ بالاتفاق شہید نہیں، تو اب اس کی کیا تأویل کی جائے؟ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس ذیل میں تمام محدثین کی تصریحات میری نظر سے گزر چکی ہیں، اور اَب میری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو اُحد سے متعلق ہے، کیونکہ مکہ میں نبوّت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حراء جانے کا تذکرہ غالباً نہیں ملتا، یہ محض رائے ہے جس کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں، صرف ذوق و وجدان کی بناء پر ایسا کہہ رہا ہوں، یقینی فیصلہ تو آپ ہی فرمائیں گے۔

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ ابھی ایک ماہ قبل میں نے "جہانِ دیدہ" پڑھا، اس میں آپ نے علامہ مزیؒ مصنف تہذیب الکمال کے تعارف میں لکھا ہے کہ علامہ ابنِ تیمیہؒ ان کے شاگرد ہیں۔

تہذیب الکمال ایک سال پہلے میری نظر سے گزری تھی، اس میں مزی کے ترجمے میں، میں نے پڑھا تھا کہ وہ ابنِ تیمیہؒ سے اگرچہ چھ سال بڑے ہیں اور ان کے بعد بھی چودہ سال تک زندہ رہے ہیں، لیکن وہ شیخ الاسلام کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔

یہ ایک سال قبل کا اجمالی خاکہ ہے، اس وقت نہ میرے پاس تہذیب الکمال ہے اور نہ ہی دُوسری اُمہات الکتب موجود ہیں جن کی طرف مراجعت کرکے میں یقینی طور سے کچھ کہہ سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا حافظہ خطا کر رہا ہو، اس لئے آپ تحقیق کرلیجئے۔ مجھے بہرحال ایسا ہی یاد پڑتا ہے کہ شیخ الاسلام، علامہ مزیؒ کے اُستاذ ہیں، شاگرد نہیں۔

آپ کے پاس اگرچہ مشاغل کا ہجوم ہے، لیکن مجھے آپ کی شفقت وعنایت سے اُمید ہے کہ

آپ اس حدیث کوحل کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ کن کتابوں کے ذریعہ میں اپنے ذوقِ حدیث کوترقی دُوں۔ خصوصی دُعاؤں کی درخواست ہے۔

جواب ا:- (الف):- شراحِ حدیث کی تصریحات وترجیحات کی بناء پر دُرست موقف یہی ہے کہ اُحد اور حراء سے متعلقہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں، جومختلف اوقات میں پیش آئے ہیں، اور وہ تصریحات درج ذیل ہیں:-

فی فتح الباری ج:۷ ص:۴۲ (۱) وأخرج مسلم من حديث أبی هريرةؓ ما يؤيد تعدد القصة، فذكر أنه كان علىٰ حراء ومعه المذكورون، وزاد معهم غيرهم .... الخ.

وفی عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۰ (۲) ولٰكن لا شك فی تعدد القصة، فان أحمد رواه من طريق بريدة بلفظ "حراء" واسناده صحيح، وأبا يعلىٰ رواه من حديث سهل بن سعد بلفظ "أحد" واسناده صحيح، وأخرجه مسلم من حديث أبی هريرةؓ، فذكر أنه كان علىٰ حراء ومعه أبوبكر وعمر وعثمان وغيرهم، فهٰذا كله يدل على تعدد القصة .... الخ.

وفی المرقاة ج:۱۱ ص:۳۳۲ (طبع مكتبة امدادية ملتان) فاختلاف الروايات محمول علىٰ تعدد القضية فی الأوقات اهـ.

ب:- اس بارے میں دوقسم کی تأویل کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی تغلیب پر محمول ہے، چنانچہ ان حضرات میں سے اکثر شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوگئے ہیں، اور دُوسری یہ کہ شہادت عام ہے، یعنی شہادتِ حقیقیہ اور حکمیہ دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا بعض حضرات تو حقیقی شہادت پاگئے اور بعض کو حکمی شہادت ملی، بایں طور کہ انتقال ایسی بیماری سے ہوا جو شہادت کے حکم میں ہے۔

فی حاشية ابن ماجة ص:۱۳ (۳) قال القاری رحمه الله: وفی سعد بن أبی وقاص مشكل، لأن سعدا مات فی قصره بالعقيق، فتوجيه هٰذا أن يكون بالتغليب، أو يقال: كان موته بمرض يكون فی حكم الشهادة اهـ. وأقول: ومثله فی سعيد بن زيد فانه مات بالعقيق أيضًا فحمل الى المدينة سنة احدى وخمسين. (اكمال فی أسماء الرجال)

وفی المرقاة فی هٰذه القصة ج:۱۱ ص:۳۳۲ (۴) واثبات الشهادة لبعضهم حقيقة وللباقين حكمًا، والله أعلم.

---

(۱) فتح الباری كتاب فضائل الصحابة ج:۷ ص:۳۸ (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور)
(۲) عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۱ (طبع دار الفكر بيروت).
(۳) (طبع ایچ ایم سعید).　　(۴) (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

۲:- صحیح بات وہی ہے جو ''جہانِ دیدہ'' میں ہے، یعنی علامہ ابنِ تیمیہؒ، حافظ مزیؒ صاحبِ تہذیب الکمال کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔ چنانچہ خود کتاب ''تہذیب الکمال'' کی فصلِ اوّل میں تصریح ہے:

وقرأ الثلاثة (أی ابن تیمیة وغیرہ) علی المزی، واعترفوا بأستاذیته وافتخروا بها. (ج:۱ ص:۱۸)۔(۱)

واللہ اعلم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

۱۴۱۵/۲/۱۳ھ

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا تھا، احقر نے اسفار و اشغال کی وجہ سے اپنے ایک عزیز دوست کو مأمور کیا تھا کہ وہ ان اُمور کی تحقیق کریں۔ انہوں نے اُوپر جو جواب لکھا ہے، احقر کی رائے میں درست ہے۔ اگر اُحد اور حراء کی احادیث ایک ہی صحابی سے مروی ہوتیں تو تعدّدِ قصہ بعید ہوتا، لیکن یہ مختلف اصحاب سے مروی ہیں، کما حققه الحافظ فی الفتح۔ لہٰذا متعدّد واقعات پر محمول کرنے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵/۴۲)

خواتین کے لئے میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ لڑکیوں کو قرآن اور معمولی خط و کتابت کی تعلیم دینے کے سوا مزید تعلیم دِلانا حرام ہے یا جائز؟ اور اگر حرام ہے تو میڈیکل، حکمت اور ہوم اکنامکس کی تعلیم مسلمان خواتین کے لئے کس زُمرے میں آئے گی؟

جواب:- خواتین اگر میڈیکل سائنس، حکمت یا ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کریں کہ ان علوم کو مشروع طریقے پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہٖ کوئی حرمت و کراہت نہیں، بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر اَحکامِ شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے۔ اگر کوئی خاتون ان تمام اَحکام کی

(۱) (طبع مؤسسة الرسالة بیروت).

رعایت رکھتے ہوئے یہ علوم حاصل کرے تو کوئی کراہت نہیں[1]، لیکن چونکہ آج کل ان میں سے بیشتر علوم کی تحصیل اور استعمال میں اَحکامِ شریعت کی پابندی عنقاء جیسی ہے، اس لئے اس کا عام مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۱۳ د)

خطوط میں بسم اللہ، ابجد اور ہندسوں میں لکھنے کی شرعی حیثیت اور اس طریقے کی ایجاد کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے میں کہ خطوط میں جو ابجد سے بسم اللہ لکھی ہوتی ہے، یہ کس کی ایجاد ہے؟ اور ایسا کب ہوا؟ اور عدد سے پورے بسم اللہ کا ثواب و برکت حاصل ہوگی یا نہیں؟

جواب:- خطوط کی ابتداء میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنا مسنون ہے[2]، اور یہ خود قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی مستند کتاب میں نظر نہیں آئی کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا عدد کب سے لکھا جانا شروع ہوا، لیکن اُس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ بسم اللہ لکھا ہوا کاغذ کسی بے حرمتی کی جگہ استعمال ہوگا تو اس لئے بے ادبی ہوگی، لہٰذا اگر کوئی شخص اس خیال سے زبان سے بسم اللہ پڑھ کر یہ عدد لکھ دے تو سنت تو ادا ہوجائے گی لیکن افضل یہی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ صراحۃً لکھی جائے، اس لئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بھی کفار کے پاس گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر بادشاہوں کو جو خطوط روانہ فرمائے، ان میں بھی بسم اللہ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ کفار کے پاس بے حرمتی کا احتمال مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تھا، مگر اس کی وجہ سے بسم اللہ کو ترک نہیں کیا گیا۔

واللہ اعلم بالصواب
محمد تقی عثمانی غفرلہٗ
۱۳۹۱/۵/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۰۳ ب)

---

(۱) فی البحر ج:۸ ص:۱۹۲ والطبیب انما یجوز له ذلک اذا لم یوجد امرأة طبیبة، فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر، لأن نظر الجنس الی الجنس أخف، وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة ان أمکن. وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۷۱ (قوله وینبغی) کذا أطلقه فی الهدایة والخانیة، وقال فی الجوهرة: اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدّواء، لأنه موضع ضرورة، وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها، فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک .... والظاهر أن ینبغی هنا للوجوب. وکذا فی الهندیة ج:۵ ص:۳۳۰، وفی البدائع ج:۵ ص:۱۲۴.

(۲) دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۸، ۵۷۹۔

جواب صحیح ہے، مگر اس کی شرط یہ ہے کہ ظنِ غالب اس کا ہو کہ اس خط کی بے ادبی نہ کی جائے گی، جہاں یہ شرط نہ ہو جیسے عموماً خطوط میں یہی حال ہے، وہاں بسم اللہ لکھنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرے یا ۷۸۶ کو ایک علامت بسم اللہ کی ہونے کی حیثیت سے لکھ دے۔ مکاتیبِ نبوی اور مکتوبِ سلیمانؑ میں یہ شرط موجود تھی، کیونکہ عام دُنیا میں سلاطین اور بڑوں کے خطوط احتیاط سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جن خطوط کے متعلق آج بھی یہ گمان غالب ہو ان میں بسم اللہ لکھنا چاہئے۔

بندہ محمد شفیع

حدیث "کنت کنزًا مخفیًا" کی تحقیق اور تخلیقِ عالَم کے سلسلے میں کئی وساوس اور شبہات کے جوابات

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ آپ کے تبحرِ علمی، ذکاوتِ فہم اور اعلیٰ استعدادِ فقہ کا قدردان اور دِل سے معترف ہے، اور آپ کے لئے دست بدعا رہتا ہے، اسلام کو آپ جیسے علماء کی سخت ضرورت ہے، آپ کی بہت سی کتابوں سے بندہ نے استفادہ کیا ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، اللہ کرے نورِ فہم اور زیادہ۔

بندہ آج کل چند وسوسوں کی وجہ سے سخت پریشان ہے، ان میں سے تین اِشکال ہر وقت ذہن میں گھومتے ہیں، اور میرے اور خدا کے درمیان ایک قسم کا حجاب بنتے ہیں، کیونکہ نماز و اذکار وغیرہ کے درمیان یہ وسوسے آکر بدمزگی کا سبب بنتے ہیں۔ براہِ کرم فی سبیل اللہ میری مدد فرمائیں، میں سمجھتا ہوں حضرت تھانویؒ کے فہم و فراست سے جناب کو کافی حصہ ملا ہے، ایسے سوالات کے جوابات مولانا تھانویؒ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے سلسلے میں آپ کی مصروفیات ملک و بیرونِ ملک، تصنیف و تألیف، دارالعلوم کے انتظامی اُمور اور دیگر شعبہ جات میں آپ کا انہماک اتنا زیادہ ہے کہ شاید اپنی ذات کے لئے بھی آپ کو وقت کم ملتا ہوگا، مگر آپ جیسے عالم سے پوشیدہ نہیں ہوگا کہ تزکیۂ نفس کا کام بھی کتنا عظیم الشان کام ہے کہ پیغمبر اس کے لئے مبعوث کئے گئے، اور وسوسوں کا ازالہ اور شبہات و اِشکال کا مدلل جواب بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

آپ کی مصروفیت کی بناء پر آپ اس میں آزاد ہیں کہ جواب ایک دن میں، یا ایک مہینے میں دیں، یا ہر اِشکال کا ایک ساتھ دیں، یا الگ الگ دیں، جس طرح آپ کو سہولت ہو، مگر براہِ کرم جواب ضرور دیں، حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

سوال ا:- الف:- "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" مفسرین حضرات نے "لِیَعْبُدُوْنِ" کی تفسیر "لِیَعْرِفُوْنِ" سے کی ہے، یعنی مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے، اور ایک حدیث بھی ہے: "کنت کنزًا مخفیًا" یعنی میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں "فخلقت الخلق" چنانچہ میں نے خلق کو پیدا کردیا۔

وسوسہ یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی صفات الرحمٰن الرحیم بھی ہے، نے محض اپنی شناخت اور تعارف کے لئے کروڑوں، اربوں انسانوں کو پیدا کر کے ایک بلائے عظیم میں مبتلا کردیا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کروڑوں، اربوں ذی رُوح انسان جن کے جثّے ایسے بنائے گئے کہ اگر ایک سوئی بھی بدن میں لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ سسک سسک کر ظالموں کے جبر و بربریت اور اذیت ناک تشدّد کے سبب مرگئے۔ ہزاروں، لاکھوں جنگلی جانوروں، شیر، سانپ، بچھو کی غذا کے لئے، لاکھوں افراد سمندری طوفان، برف باری اور موسم کی خنکی کی نذر ہوگئے۔ لاکھوں لوگ آفاتِ سماوی ارضی، طاعون، چیچک اور دُوسری اذیت ناک بیماریوں کے لقمہ بن گئے۔ لاکھوں بے کس انسان قحط میں بھوک سے مرگئے، آج بھی لاکھوں انسان قلتِ غذائیت کے شکار ہیں۔ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔

دو وقت کی روٹی نہ ملے تو کیسی اذیت ہوتی ہے، کوئی زخم لگ جائے، کوئی بیماری ہوجائے، کسی کی عزّتِ نفس مجروح ہو، کسی بے گناہ کو قید کردیا جائے، کسی کو بے عزّت کردیا جائے، کسی کا گھر لوٹ لیا جائے، کسی کو اغواء کرلیا جائے، یہ اذیتیں برابر جاری ہیں اور زیادہ تر ان کے شکار غریب اور بے وسیلہ لوگ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بنی نوعِ انسان پر ایسی ایسی مصیبتوں اور تکالیف کے پہاڑ ٹوٹے ہیں جن کو سن کر پتھر دِل بھی موم ہوجائیں۔ نوعِ انسانی کا ابتدائی دور دیکھئے، سردی کی شدّت، گرمی کا عذاب، ہواؤں کی تیزی ایسی ہی تھی جیسی آج ہے، مگر انسان کے پاس نہ لحاف، نہ گدّے تھے، بدن پیڑ کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے چھپایا جاتا تھا۔ پتھر کا دور، لوہے کا دور، زندہ رہنے کے لئے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی؟

ب:- پھر جس پہچان اور شناخت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" کی حالت میں پیدا کیا۔ اس شناخت کو بھی ستر ہزار پردوں میں ایسا چھپایا کہ پوری زندگی ریاضت اور مجاہدات کرو، تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا، اِلَّا ماشاء اللہ۔ سلوک کی کتابیں اور صالحین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔

ج:- پھر چلو اگر دُنیا کی زندگی جیسے تیسے گزر گئی، فاقوں میں، بیماری میں، موسم کی سختی میں، مظلومی کی حالت میں تو اَب آخرت کی زندگی کا خوف اس سے بڑھ کر، وہاں کا عذاب دُنیا کے عذاب

سے ہزاروں گنا بڑا ہے، تو گویا ایک رُوح کو جسم دے کر ابد الآباد اور ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا کر دیا اور شناخت کو اتنا مشکل بنادیا کہ کوئی کہتا ہے اللہ کا وجود ہی نہیں، کوئی کہتا ہے سب اللہ ہی اللہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کے اولاد ہے، کوئی کہتا ہے وہ فلاں جسم میں حلول کر گیا۔

۳:- تو پھر ایک ایسی چیز یعنی شناخت (عرفانِ الٰہی) جو اتنی مشکل اور نایاب ہو اس کے لئے اربوں گوشت پوست کے انسانوں کو ایسی بلائے عظیم میں مبتلا کرنا بظاہر خدا کی صفت الرحمٰن الرحیم سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

د:- اگر جواب میں کوئی کہے کہ اسلام نے اللہ کی شناخت کا طریقہ بتادیا ہے تو بے شک یہ صحیح ہے، مگر اس سے شناخت کہاں ہوتی ہے؟ اس سے تو صرف علم حاصل ہوتا ہے، یعنی جاننا اور پہچاننا اور چیز ہے۔

یا کوئی کہے کہ ہم سب اللہ کی مملوک ہیں اور مالک کو اپنی مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا، تو بے شک یہ بھی صحیح ہے مگر خدا نے انسانوں کو منع کیا ہے کہ اپنی مملوک میں بے جا تصرف نہ کرو، اولاد کو بھوکا مارنا، اپنے جانوروں کو بھوکا رکھنا، اپنی دولت کا بے جا اِسراف، یہ سب باتیں خدا نے منع کی ہیں۔ تو جس اَمر کو خدا اپنے بندوں سے پسند نہیں کرتا وہ خود کیونکر کر گیا؟

محترم! یہ سوال میں پوری انسانیت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کر رہا ہوں جس میں ابتدائے خلق سے آج تک کے سارے انسان، کافر، مؤمن سب شامل ہیں۔ لہٰذا جواب میں اس حیثیت کو مدِنظر رکھئے گا۔ بندے کا علم بہت محدود ہے اور یہ معاملات تکوینی اُمور سے تعلق رکھتے ہیں جن کی حکمت کا احاطہ محال ہے اور آخرت میں ہی پورا پورا ہوگا۔ پس جناب سے استدعا ہے کہ ایسا معقول جواب عنایت فرمائیں کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے جو آج کل مجھے بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔ عقیدہ تو الحمدللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شئ باطل پیدا نہیں کی مگر بعض اُمور میں قلب ساتھ نہیں دیتا، خدا مجھے اس منافقت سے محفوظ رکھے۔

اِشکال نمبر۲:- ساری دُنیا میں کروڑوں لوگ انتہائی افلاس اور غربت کا شکار ہیں، افریقہ میں تو ہزاروں لوگ بھوک سے مرجاتے ہیں۔ ہم اپنے صوبہ سرحد کو دیکھیں، چھوٹے چھوٹے بچے کچرا چنتے ہوئے نکل آتے ہیں جن کو مشکل سے دس بیس روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ دُوسری طرف وہ لوگ جن کے یہاں رزق کی اتنی وسعت ہے کہ ان کے کتے بھی وہ غذا کھاتے ہیں جو غریبوں کو میسر نہیں، اگر اس تفاوت کو اَمرِ خدا سمجھا جائے تو یہ قرآن اور خدا کے قول "وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" کے خلاف جاتا ہے۔ غور و فکر کے بعد یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا" مشروط ہے اپنے زمانے کے اسبابِ معیشت اختیار کرنے پر۔ مشاہدہ ہے کہ ایک بھائی نے اس زمانے

کے اسبابِ معیشت اختیار کیئے، پڑھ لکھ گیا، اعلیٰ عہدے کا مالک ہوگیا، خوب رزق میں وسعت ہوئی، دُوسرا بھائی جاہل رہ کر ہر طرح محتاج رہا۔ اس کے خلاف بھی ہے، مگر حکم اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔ خدا کو کسی سے دُشمنی نہیں کہ اس کو محتاج رکھے، قرآن کی آیت "اِنَّ اللهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ ...." بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرمائیں کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ عقیدہ حق ہے یا نہیں؟

اِشکال نمبر۳:- ہمارا عقیدہ ہے کسب بندے کی طرف سے ہے اور خلق اللہ کی طرف سے۔

بندے نے کسی نیک کام کا ارادہ کیا، اللہ نے اس عمل کی تخلیق کردی، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بندے نے کسی بُرائی مثلاً ڈاکا یا قتل کا ارادہ کیا تو اللہ کی طرف سے اس عمل کی تخلیق سے دو اِشکال پیدا ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ اللہ کی تخلیق کا عمل بندے کے ارادے کے تابع ہے، گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تخلیقِ عمل نہیں ہوتا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔

دُوسرا اِشکال یہ کہ بدعمل کی تخلیق بظاہر "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ بندوں کو حکم ہے "لَا تَعَاوَنُوْا ...." کسی نے کسی بے گناہ کو قتل کرکے اس پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی تخلیق کرکے ظالم سے تعاون کیا (نعوذ باللہ)۔ دُنیا کی عدالتیں اعانتِ جرم کو بھی جرم سمجھتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے اس بدعمل کی تخلیق کی کیا توجیہ کریں گے؟ دُوسرے یہ کہ ایمانِ مفصل میں "وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰی" سے مراد یہی تخلیقِ فعل ہے یا کچھ اور؟ کیونکہ شرِ محض کا صدور تو حق تعالیٰ سے محال ہے۔

جواب:- محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل خط ملا، آپ نے احقر کو جو دُعائیں دی ہیں، ان پر تہِ دِل سے شکرگزار ہوں (جزاکم اللہ تعالیٰ)۔ آپ کے اصل سوال کے بارے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ "کنت کنزًا مخفیًا .... الخ" کا جو فقرہ حدیثِ قدسی کے عنوان سے مشہور ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی سند سے ثابت نہیں ہے، علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"کنت کنزًا لا أعرف فأحببت أن أعرف .... قال ابن تیمیةؒ: انه لیس من کلام النبی صلی الله علیه وسلم، ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، وتبعه الزرکشی وشیخنا."

(المقاصد الحسنة للسخاویؒ ص:۳۲۷)

نیز علامہ عجلونی نے بتایا ہے کہ صرف علامہ ابنِ تیمیہؒ ہی نہیں، حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس روایت کی کوئی بھی سند نہیں ہے، نہ صحیح، نہ ضعیف۔

(کشف الخفاء للعجلونیؒ ج:۲ ص:۱۷۳)

اور اسنی المطالب میں لکھا ہے کہ: اس حدیث کو بعض صوفیاء تساہلاً حدیثِ قدسی کے طور پر ذکر کرتے ہیں (ص:۲۴۳) اور بس۔

البتہ آیتِ کریمہ میں ضرور وارد ہوا ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"(۱) یعنی جن و انس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس سے آگے آپ نے تخلیقِ عالم کے سلسلے میں جن وساوس وشبہات کا ذکر فرمایا ہے، ان کا اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ وساوس وشبہات درحقیقت اس دائرے میں قدم رکھنے سے پیدا ہوئے ہیں جو عقلِ انسانی سے ماورا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی کیا حکمتیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا کیسا نظام بنایا ہے؟ اور یہاں ہر چیز اور ہر واقعے کے پیچھے کیا کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اگر یہ سب باتیں انسان کی عقل اور علم میں آجائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان انسان نہ رہا، عالم الغیب ہوگیا۔ یہ بات طے شدہ ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انسان کی عقل محدود ہے، اور وہ کائنات کی تخلیق تو کجا، خود اپنے وجود کے ہر حصے کی حکمتِ تخلیق معلوم کرنے پر بھی قادر نہیں، یہاں تک کہ وہ دماغ جس سے انسان سوچتا ہے، اس کا بھی بڑا حصہ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ جو واقعات انسان کسی کی تکلیف یا صدمے کے دیکھتا ہے، وہ صرف ان کا ظاہری رُخ ہے، ان واقعات کے پیچھے کے حقائق اس کے علم میں نہیں ہوتے۔ ہماری زندگی ہی میں بہت سے حالات و واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ایک عرصے تک ہم ان پر افسوس کرتے رہتے ہیں، لیکن کسی وقت ان کی حقیقت کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ افسوسناک واقعات عین حکمت کے مطابق تھے۔ اگر یہ حقیقت نہ کھلتی تو ہم اسے ظلم ہی سمجھتے۔ اب کسی کسی موقع پر یہ حکمت ظاہر ہوجاتی ہے، لیکن اکثر مواقع پر ظاہر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان معاملات کی کھوج میں پڑنا جو انسان کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔

دُوسری طرف اگر اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان ہے تو اس کے رحمٰن و رحیم ہونے پر بھی ایمان ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی مخلوق کی کوئی تکلیف دیکھ کر آپ کو ترس آرہا ہے تو کیا رحمٰن و رحیم کو نہیں آئے گا؟ اگر اس نے آپ سے کہیں زیادہ رحیم ہونے کے باوجود اسے اس حالت میں چھوڑا ہے تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہے جو آپ کے دائرۂ علم و ادراک سے باہر ہے۔ آپ ایک شخص کو پھانسی پر لٹکا تو دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنے انسانوں کی جان لی ہے؟ آپ ایک ڈاکٹر کو کوئی عضو کاٹتے ہوئے دیکھ کر ترس کھا رہے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ آپریشن نہ ہوتا تو سب اعضاء کا کیا بنتا؟ یہ تو معمولی مثالیں ہیں، پوری کائنات کے نظام میں کسی شخص کے حق میں کیا بہتر

---

(۱) سورة الذّٰريٰت:۵۶.

ہے؟ اس کا علم سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کھوج میں پڑنا ہی خلافِ عقل ہے۔ اگر یہ اجمالی حقیقت ذہن نشین ہوجائے تو ان شاء اللہ اس قسم کے وساوس وشبہات زیادہ پریشان نہیں کریں گے، اور اگر کبھی غیراختیاری طور پر آئیں تو اپنے آپ کو کسی کام میں لگالیں، اور ان کی طرف التفات نہ کریں۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۲۷ھ

(فتویٰ کے حوالوں کی تخریج از مولانا محمد عبداللہ میمن زید مجدہٗ)

۱:- كنت كنزا لا أعرف فأحببت أن أعرف، فخلقت خلقا فعرفتهم بي، فعرفوني. قال ابن تيميةؒ: انه ليس من كلام النبي صلى الله عليه وسلم ولا يعرف له سند صحيح ولا ضعيف، وتبعه الزركشي وشيخنا. (المقاصد الحسنة للسخاوي ص:۳۲۷)

۲:- وفي كشف الخفاء بعد هٰذه العبارة:-

وتبعه الزركشي والحافظ ابن حجرؒ في اللآلي والسيوطيؒ وغيرهم، وقال القارى: ولٰكن معناه صحيح مستفاد من قوله تعالىٰ: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" أي ليعرفوني كما فسره ابن عباسؓ، والمشهور على الألسنة كنت كنزًا مخفيًا، فأحبَبْتُ أن أعرف، فخلقت خلقا فبي عرفوني. وهو واقع كثير في كلام الصوفية، واعتمدوه، وبنوا عليه أصولا لهم. كشف الخفاء للعجلوني ج:۲ ص:۱۷۳.

۳:- وفي الموضوعات الكبير مثل ذٰلك الىٰ: كما فسره ابن عباس رضي الله عنهما. (ص:۹۳)

۴:- وفي "أسنى المطالب": .... وتبعه الزركشي، وابن حجر، وهٰذا يذكره المتصوفة في الأحاديث القدسية تساهلًا منهم. (ص:۲۴۳)

قومِ لوطؑ کی جس بستی کو اُلٹا گیا تھا اس کی تعیین میں رائے کا اختلاف

سوال:- معارف القرآن جلد سوم سورۂ انعام ص:۳۲۰ پر مرقوم ہے:

قومِ لوط کی پوری بستی کو اُلٹ دیا گیا جو آج تک اُردن کے علاقے میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور، مینڈک، مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحرِ میّت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بحرِ لوط کے نام سے بھی۔

اعتراض:۔ پوری بستی کو اُلٹ جانے کا واقعہ جس جگہ پیش آیا ہے وہ بالکل صاف میدان ہے، عذاب والی جگہ کو پانی سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا، تاریخ کے خلاف ہے۔ آج کل لوگ اس جگہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، عذابِ الٰہی کی جگہ کو بحرِ میّت کہنا جھوٹ ہے۔

جواب:- حضرت لوط علیہ السلام کی جن بستیوں کو اُلٹا کیا گیا تھا، ان کی تعیین میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اُردن تشریف لے گئے تو وہاں کے اہلِ علم نے بحرِ میّت کی جگہ کے بارے میں یہی بتایا کہ یہ لوط علیہ السلام کی بستیوں کی جگہ ہے، اور والد صاحبؒ کو وہاں لے بھی گئے، اس کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات لکھی ہے۔ اگر کسی صاحبِ علم کی تحقیق اس کے خلاف ہو، تو ہوسکتی ہے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر شریعت کا دار و مدار ہو، ایک تاریخی یا جغرافیائی مسئلہ ہے، اور بہت سے تاریخی جغرافی مسائل میں اہلِ علم کی رائے یا مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو راجح، کسی مرجوح تو کہہ سکتے ہیں، مگر کسی کو جھوٹ کہنا بڑی زیادتی کی بات ہے، والسلام۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۴/۳۰ ج)

نبوّت اور وحی کی کیا حقیقت ہے؟

سوال:- برائے کرم عقلی اعتبار سے یہ سمجھا دیجئے کہ نبوّت اور وحی کیا چیز ہیں؟ اور نبی اور خدا کے مابین جو رشتہ ہوتا ہے اس کا ہم کس طرح ادراک کرسکتے ہیں؟

جواب:- یہ ایک مفصل اور طویل بحث ہے جو مختصر طور سے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اس موضوع پر احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' میں مفصل بحث موجود ہے۔ یہ کتاب مکتبۂ دار العلوم کراچی ۱۴ نے شائع کی ہے، اس کا مطالعہ فرمالیں، پھر بھی کوئی شبہ رہ جائے تو پوچھ لیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۰۹/۲۷ ه)

کیا موجودہ سائنسی تحقیقات قرآن وحدیث سے متعارض ہیں؟

سوال:- چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں موجودہ سائنس کی جو تحقیق ہے، کیا وہ قرآنِ کریم کی رُو سے دُرست ہے؟ یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ سائنس اور قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا اس کی ہر بات دُرست ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ٹکراتے ہیں، براہ کرم اس معاملے میں اپنی جامع و مانع رائے سے مطلع فرمائیے۔

جواب:- آپ کا سوال اپنے جواب کے لئے درحقیقت ایک مبسوط مقالے کی وسعت چاہتا ہے، تاہم اُصولی طور پر چند ضروری باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ آپ کی اُلجھن دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

۱:- سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ سائنس کا بنیادی مقصد ان قوتوں کا دریافت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں۔ اگر ان قوتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اسلام ان کوششوں کے راستے میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرنے کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان قوتوں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی نظر میں جائز اور مفید ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کی پوشیدہ قوتوں کو دریافت کرے، لیکن ان قوتوں کا صحیح مصرف مذہب بتاتا ہے، وہی ان اکتشافی کوششوں کے لئے صحیح رُخ اور بہتر فضا مہیا کرتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اسی وقت انسانیت کے لئے مفید ہوسکتی ہے جب اسے اسلام کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ورنہ شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ سائنس جس طرح انسانیت کے لئے مادّی فلاح و بہبود کا باعث بن سکتی ہے، اسی طرح اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے تباہ کن بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مثال ہمارے سامنے ہے کہ ماضی میں سائنس نے جہاں انسانیت کو راحت و آسائش کے اسباب مہیا کئے ہیں، وہاں اس کے غلط استعمال نے پوری دُنیا کو بدامنی اور بے چینی کا جہنم بھی بنادیا ہے۔ سائنس ہی نے سفر کے تیز رفتار ذرائع بھی ایجاد کئے اور اسی نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنائے، لہٰذا سائنس کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے۔

۲:- دُوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ سائنس کی تحقیقات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو صریح مشاہدے پر مبنی ہیں، ایسی تحقیقات نہ کبھی قرآن وسنت سے متصادم ہوئی ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایسی تحقیقات نے ہمیشہ قرآن وسنت کی تصدیق ہی کی ہے، اور قرآن وسنت کی بہت سی وہ باتیں جو کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی تھیں، سائنس کی ان تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان بنادیا ہے، مثلاً معراج کے موقع پر بُراق کی جس تیز رفتاری کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے، قدیم زمانے کے نام نہاد عقل پرست اسے بعید از قیاس سمجھتے تھے، لیکن کیا آج سائنس نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

دُوسری قسم کے سائنٹفک نظریات وہ ہیں جو مشاہدہ اور یقین کے بجائے ظن وتخمین پر یا کم علمی

پر مبنی ہیں، اور اس سلسلے میں سائنس داں کسی یقینی نتیجے پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ایسی تحقیقات بعض اوقات قرآن وسنت کی تصریحات سے ٹکراتی ہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریحات میں کوئی تأویل کئے بغیر ان پر ایمان رکھا جائے، اور سائنس کی جو تحقیقات ان سے ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھا جائے کہ سائنس ابھی اپنی کم علمی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی، جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوگا قرآن وسنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے جائیں گے۔

مثلاً بعض سائنسدانوں کا یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال اس بناء پر قائم نہیں ہوا کہ انہیں آسمان کے موجود نہ ہونے پر کوئی دلیلِ قطعی مل گئی ہے، بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں آسمان کے وجود کا علم نہیں ہوسکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ دُوسرے الفاظ میں یہ خیال ''علم عدم'' کے بجائے ''عدمِ علم'' پر مبنی ہے ...... لہٰذا ہم جو قرآن وسنت کی قطعیت پر ایمان رکھتے ہیں، پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان سائنسدانوں کی یہ رائے قطعی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے، مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کرسکی، اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو تسلیم کرلیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کی ذہنیت ختم ہوتی جارہی ہے، جب کسی چیز کی اہمیت ذہن پر سوار ہوتی ہے تو بسا اوقات اس میں حدود سے تجاوز ہونے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہایت مفید اور ضروری فنون ہیں، اور دورِ حاضر میں تو مسلمانوں کے لئے از حد ضروری ہے کہ ان فنون کی طرف بطورِ خاص توجہ دے کر ان میں ترقی کی انتھک کوشش کریں، اس کے بغیر موجودہ دُنیا میں ان کے لئے اپنا جائز مقام حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کوئی سائنسدان اپنے ظن وتخمین سے جس کسی نظریئے کا اعلان کردے اسے وحی کی طرح دُرست تسلیم کرلیا جائے، اور اس کی بناء پر قرآن وسنت میں تأویل وترمیم کا دروازہ کھول دیا جائے، یا اس کی بناء پر قرآن وسنت میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں، خاص طور پر جب یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ سائنس کے اس قسم کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

۳:- یاد رکھئے کہ اسلام کا معاملہ عیسائیت سے بہت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنٹفک معلومات کا مقابلہ کرسکتا،

لہٰذا سائنس اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آئی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کلیسا کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے یا اپنے مذہب میں رَدّ و بدل کرے۔ شروع میں رومن کیتھولک چرچ نے پہلے راستے کو اختیار کیا، اور چونکہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا، اس لئے گلیلیو جیسے سائنسدانوں کو بے شمار رُکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑا تو اَب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں ترمیم کر کے اس کی نئی تشریح و تعبیر کریں۔ چنانچہ اہلِ تجدّد (Modernism) کے مکتبِ فکر نے یہ راستہ اختیار کرلیا۔

لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ عیسائی مذہب کو انتہائی غیر فطری اور غیر معقول بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ دینِ فطرت ہے، اور عقل و خرد کی کوئی دلیل اسے چیلنج نہیں کرسکتی۔ اس میں زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ آنکھیں ملانے کی پوری صلاحیت ہے۔ لہٰذا ہمیں اسلام کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے سائنس کی مخالفت کی ضرورت ہے نہ اسلام کو بدلنے کی، اس لئے کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سائنس جس قدر ترقی کرے گی اور انسان کی سائنسی معلومات میں جتنا اضافہ ہوگا اسلام کی حقانیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی، بشرطیکہ انسان کا نقطۂ نظر صحیح معنوں میں سائنٹفک رہے، اور وہ محض قیاس و تخمین کو یقین اور مشاہدے کا درجہ نہ دے بیٹھے۔

بس یہ ہے وہ بات جو علمائے دین کہتے ہیں، اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے، جذباتی نعروں کی رو میں آکر حدود سے تجاوز کر جانا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ اس معتدل اور سو فیصد معقول بات کی وجہ سے بعض حضرات مسلسل یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ علماء، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخالف ہیں، اور اس میدان میں ترقی کرنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس الزام کے جواب میں ہم یہ دُعا کرنے کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو فکرِ سلیم عطا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ (۱)

اہرام کے فوائد اور اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- اہرام کے اندر کھانے پینے کی اشیاء رکھنے سے وہ سڑتی نہیں بلکہ ٹھوس اور سکڑ جاتی ہیں، مثلاً:-

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

دُودھ رکھا جائے تو وہ دہی یا پنیر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔
گوشت رکھا جائے تو وہ سڑتا نہیں بلکہ خشک ہوجاتا ہے۔
چائے یا تمباکو رکھنے سے ان کی تلخی یا کڑواہٹ ختم ہوجاتی ہے۔
اہرام کے اندر اگر پانی رکھا جائے تو بعد میں وہ اہرامی پانی اگر:-
پودوں میں ڈالا جائے تو ان کی نشو ونما اور جسامت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔
سر کے بالوں میں لگایا جائے تو بال گرنے بند ہوجاتے ہیں اور پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔
سردیوں میں جلد پر لگایا جائے تو پھٹی ہوئی جلد ٹھیک ہوجاتی ہے، اور چہرے پر لگایا جائے تو جھرّیاں ختم ہوجاتی ہیں۔
عادی شرابی کو پلایا جائے تو شراب کی طلب ختم ہوجاتی ہے۔
مچھلی گھر میں ڈالا جائے تو مچھلیوں کی افزائش میں اضافہ ہوجاتا ہے۔
جانوروں کے آگے اگر اہرامی پانی اور عام پانی رکھا جائے تو وہ اہرامی پانی پیتے ہیں۔
اہرام کے اندر اگر دوا رکھی جائے تو اس کی تأثیر بڑھ جاتی ہے۔
اہرام کے اندر اگر پھلوں اور ترکاریوں کے بیج رکھے جائیں تو ان بیجوں سے طاقت ور پھل زیادہ پھل پھول والے درخت اور سبزیاں پیدا ہوں گی۔
اگر گلاب اور دُوسرے درختوں کی قلمیں پانی میں ڈبوکر اہرام کے اندر رکھی جائیں تو ان قلموں سے جڑیں بہت جلد نکلتی ہیں۔
اگر استعمال شدہ بلیڈ اہرام کے اندر رکھا جائے تو اس کی دھار دوبارہ تیز ہوجاتی ہے۔
زخموں اور چوٹوں کے اُوپر جب اہرام رکھا گیا تو وہ بہت جلد اچھے ہوگئے۔
سائنس دانوں نے بیماریوں کے جراثیم اہرام میں رکھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جراثیم یا تو مکمل طور پر ختم ہوگئے یا ان کی پیدائش وافزائش میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔
مختلف بیماروں کو اہرام کے اندر بٹھانے سے پہلے اور بٹھانے کے بعد ان کے خون کا تجزیہ کیا گیا، ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اہرامی قوت نے آدھے گھنٹے کے اندر خون کے اجزاء میں کافی تبدیلیاں کردیں۔ اب آپ فرمایئے کہ:-

۱:- اہرام جسے انگریزی میں پائی رامڈ (Pyramid) کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟
۲:- دُنیا کے مختلف علاقوں میں بسے ہوئے اہرام خصوصاً مصر جن میں سے ایک کے اندر فرعون کی لاش موجود ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بھی پہلے کے ہیں، اس لئے کیا

اہرام کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ملتی ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ قرآن کے اندر بھی اہرام کے متعلق کچھ مضمون بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟

۳:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں کیا اہرام استعمال کرنے یا اہرامی شکل کے مکانات بنانے کا رواج موجود تھا یا نہیں؟

۴:- ''اہرام کے فوائد'' جو پچھلے صفحے پر بیان کئے گئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر اہرام کی پُراسرار قوت کا راز کیا ہے؟ کیا ان فوائد کا حاصل ہونا کسی جادُو وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے یا یہ کسی دُنیاوی علوم کا نتیجہ ہیں؟

۵:- کیا یہ فوائد حاصل کرنے کے لئے اہرام سے استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

۶:- چونکہ اہرام سے دو چیزوں کا خاص تعلق ہے، جن میں سے شمال اور جنوب کا تعین کرنا، کیا ان کی بھی کوئی شرعی حیثیت ہے یا ان کا تعلق کسی دُنیاوی علوم سے ہے؟

۷:- کہا جاتا ہے کہ اکثر اہرام خیالات وخواہشات کو مادّی شکل دیتا ہے، کچھ لوگوں نے قابلِ عمل خواہشات کو لکھ کر اہرام کے اندر رکھا، کچھ عرصے کے بعد ان کی خواہشات خودبخود پوری ہوگئیں، کیا ایسا ہونا شرعاً ممکن ہے؟

۸:- تجربات اور مشاہدات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مکمل چاند اور بعض اوقات سیاروں اور زمین کی گردش کی وجہ سے اہرام کے بعض اثرات میں زیادتی اور بعض میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ موجودہ مغربی طب نے بڑی حد تک سیاروں کے اثرات کے بارے میں واضح ثبوت فراہم کئے ہیں، مثلاً پورے چاند پر، جنون، پاگل پن، مراقی کیفیت، خودکشی، قتل اور جرائم کی واردات میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ عورتوں کے ایامِ حیض بھی چاند کی گردش سے متأثر ہوتے ہیں، اور اس بات کا بھی لوگوں کو عملی تجربہ ہے کہ پورے چاند پر سمندر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

کیا چاند اور سیاروں کے اثرات کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر ان تمام باتوں کے ظہور ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟ اور ان پر یقین رکھنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- ''اہرام'' کی حقیقت اور خواص وآثار کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی، اس کا تعلق خالصۃً تجربے اور مشاہدے سے ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے اگر ''اہرام'' کی شکل کے کچھ خواص یا فوائد ثابت ہوجائیں تو ان کو شریعت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، نہ ان خواص کو ظاہری اسباب کے درجے میں تسلیم کرنے سے کسی اسلامی عقیدے میں نقص واقع ہوتا ہے،

بشرطیکہ ان کو ظاہری سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے، مؤثرِ حقیقی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو سمجھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱/۵۷)

اجتہاد کی شرائط اور موجودہ دور میں کسی کو مجتہد قرار دینا

سوال:- پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں ایک مضمون ''دیوبندی بریلوی اختلاف کا پسِ منظر، اصلاحی تحریک (از صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)'' نظر سے گزرا۔ کچھ اُمور جو حضرت سیّد احمد بریلویؒ اور ان کے رفقاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح اور غلط کا ملغوبہ محسوس ہوتے ہیں، اور ذہنی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ چونکہ یہ ناچیز دیوبند مسلک، تھانوی مشرب کا حامل ہے، اس لئے ان میں سے چند تحریروں کی نشاندہی کر کے حقیقتِ حال سے نقاب کشائی کا طالب ہے۔ اس مضمون کی یہ پہلی قسط رسالے میں شائع ہوئی ہے، لہٰذا مضمون ابھی جاری ہے، اس لئے مجھے اجازت دی جائے اس سوال اور آپ کے جواب کو بھی پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں برائے اشاعت پیش کردوں تاکہ عامۃ المسلمین غلط فہمی سے غلط عقائد کو علمائے حق کی طرف منسوب سمجھ کر اہلِ حق سے مستفید ہونے سے محروم نہ رہیں بفضلہٖ تعالیٰ۔ ان میں سے ایک بات یہ لکھی ہے کہ:-

''اجتہاد'' یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر صاحبِ علم و بصیرت مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ اجتہاد کسی خاص شخصیت اور خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ تا قیامت جاری رہے گا۔ وہابی تحریک کے ہم نوا اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ وہ ائمہ اربعہ امامِ اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کا احترام نہیں کرتے تھے، اور ان کے اجتہاد پر انہیں اعتماد نہیں تھا، کیونکہ اصل وہابی تحریک کے مؤسسِ اوّل شیخ محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی مسلک رکھتے تھے اور مقلد تھے۔

جواب:- ''اجتہاد'' کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بے شک اس لحاظ سے کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ اس کے بعد کسی زمانے میں پایا جانا عقلاً ناممکن ہو بلکہ وہ ایک ملکہ ہے جس کے پائے جانے کے لئے علم کی کچھ خاص شرائط ہیں، جو اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔ یہ شرائط پہلے زمانوں میں بکثرت پائی جاتی تھیں، اب عام طور سے ان شرائط کا آدمی نہیں ملتا، اس لئے اس دور میں کسی کو مجتہدِ مطلق قرار نہیں دیا گیا، البتہ اجتہاد کی کچھ خاص اقسام مثلاً اجتہاد فی المسائل کے لئے شرائط نسبۃً نرم ہیں اور آخری زمانوں میں اس کے حامل علماء ہوتے ہیں۔ مسئلہ تفصیل طلب ہے، ضرورت ہو تو حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رسالہ ''الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد'' اور احقر کا

رسالہ ''تقلید کی شرعی حیثیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعہ کا انکار کرنا

سوال:- مسئلہ مشاجرات میں جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا، جنگِ صفین و جمل میں آپس میں صحابہ کرامؓ مقتول ہوئے۔ زید اس واقعے کی سخت تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' صحابہؓ کی صفت ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپس میں قتل وقتال کریں؟ (نعوذ باللہ) یہ صحابہ کرامؓ پر بہتانِ عظیم ہے۔ زید کا یہ انکار دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا وقوع صرف کسی ایک تاریخی روایت سے ثابت ہوتا تو زید کا استدلال صحیح ہوتا، لیکن ان جنگوں کا وقوع تواتر سے ثابت ہے۔[1] اس لئے اس کا انکار دُرست نہیں۔ ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ''[2] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی ایک دُوسرے سے کوئی اختلاف یا رنجش پیدا نہیں ہوتی تھی، لہٰذا اگر اجتہادی اختلافِ رائے کی بناء پر کوئی مشاجرہ پیدا ہو تو اس کے منافی نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۳/۲۸ ج)

بقدرِ ضرورت علمِ دین سیکھنے کے لئے ایک مطالعاتی نصاب کا خاکہ

سوال:- گزارش ہے کہ حضراتِ علمائے کرام سے سنتے رہتے ہیں کہ دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے: ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة'' لیکن دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کی تعیین ہم جیسے عامی مسلمانوں کو معلوم نہیں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے دینی مدارس میں پڑھنے والے علمائے کرام کے لئے ایک نصاب مقرّر کر رکھا ہے، اس طرح عام مسلمانوں کے لئے بقدرِ ضرورت دین کا علم سیکھنے کے لئے کوئی نصاب مقرّر نہیں۔ اگرچہ حضراتِ علمائے کرام نے دینِ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اُردو زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: تاریخ الطبری ج:۳ ص:۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)، الاستیعاب ج:۳ ص:۱۳۷۵ (طبع دار الجیل بیروت)، الإصابة ج:۶ ص:۲۸.
(۲) سورة الفتح:۲۹.

آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ اُردو زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا ایسا مجموعہ تجویز فرمادیں جو عام مسلمانوں کے لئے علمِ دین سیکھنے کے لئے نصاب کا درجہ رکھتا ہو، اس نصاب کو پڑھ لینے کے بعد آدمی کو دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل ہوجائے، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محولہ بالا حدیثِ پاک کا منشا بھی پورا ہوجائے، بینوا توجروا۔

جواب:- گرامی نامہ ملا، آپ نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا واقعۃً ہر مسلمان پر فرض ہے۔ احقر کی رائے میں اس مطالعے کے دو حصے کرنے چاہئیں۔ پہلا حصہ ابتدائی ضروری معلومات پر مشتمل ہو جن کے بغیر ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنا ممکن نہیں، اور دُوسرا حصہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد ایسے مطالعے پر مشتمل ہو جس سے دینی معلومات میں اتنی وسعت اور استحکام پیدا ہوجائے کہ انسان گمراہ کرنے والوں سے گمراہ نہ ہو، پہلے حصے میں احقر کی نظر میں مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:-

۱:- حیاۃ المسلمین از حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۲:- فروع الایمان از حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۳:- تعلیم الدین از حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۴:- مردوں کے لئے ''بہشتی گوہر'' اور عورتوں کے لئے ''بہشتی زیور'' از حکیم الأمتؒ
۵:- جزاء الاعمال از حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۶:- سیرتِ خاتم الانبیاء از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۷:- حکایاتِ صحابہؓ از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہم
۸:- تاریخِ اسلام کامل از حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۹:- اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم از حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ

دُوسرے حصے میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہونی چاہئیں:-

۱:- معارف القرآن از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
یا تفسیرِ عثمانی از شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۲:- معارف الحدیث کامل از حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم
۳:- بہشتی زیور کے مسائل از حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
یا علم الفقہ از حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ
۴:- عقائدِ اسلام از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ
۵:- شریعت وطریقت از حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ان شاء اللہ ان کتابوں کے مطالعے سے دین کی اتنی ضروری معلومات حاصل ہوجائیں گی کہ ان کے بعد اپنی زندگی بھی سنور جائے اور انسان کسی باطل نظریئے سے گمراہ بھی نہ ہو۔ والسلام

آخر جمادی الثانیہ ۱۴۰۲ھ (۱)

کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' پر رفع، اور اذان میں اس پر نصب کی وجہ

سوال:- کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' میں لفظ ''دؔ'' ضمہ کے ساتھ اور اذان میں فتحہ کے ساتھ کیوں ہے؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب:- یہ عربی زبان کے قواعد کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم اور پوشیدہ انسانی اعضاء کے معائنے سے متعلق متعدّد مسائل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ دینِ متین مندرجہ ذیل مسائل کی بابت:-

(برائے مہربانی جواب لکھنے سے پہلے ایک بار تمام مسائل پڑھ لئے جائیں تاکہ تمام نکات سامنے آجائیں، اس کے بعد فرداً فرداً جواب تحریر فرمائیں، خصوصاً مندرجہ ذیل پیرا پڑھ لیں)

ہم میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، ہماری تعلیم مکمل ہونے میں تقریباً ایک سال باقی ہے، مندرجہ ذیل تمام مسائل پڑھ لیں اور بعد از مکمل تحقیق، مفصل و مدلل جواب تحریر فرمائیں، ہر ایک کے لئے لکھیں کہ ۱:- جواز کی آخری حد کیا ہے؟ ۲:- جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟ ۳:- افضل کیا ہے؟ جزاک اللہ۔ پہلے یہ پڑھ لیں: یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو مولوی کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہو رہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ: ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے کی ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

میڈیکل کالج میں مخلوط نظامِ تعلیم ہے، لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، پڑھانے والے اکثر مرد ہیں، بعض اوقات خواتین اساتذہ بھی پڑھانے آجاتی ہیں اور بے پردہ ہوتی ہیں، ہماری معلومات کے مطابق پورے پاکستان میں مردوں کے لئے علیحدہ کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے، لاہور میں لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح کالج ہے، جہاں مخلوط نظامِ تعلیم نہیں ہے، مگر وہاں اساتذہ میں خواتین کے ساتھ مرد بھی شامل ہوتے ہیں، بہرحال ہمارے میڈیکل کالج میں مکمل بے پردگی ہے، بعض لڑکیاں ایسے کپڑے پہنتی ہیں کہ حدیث کے مطابق کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں، اور کپڑوں کے اندر جلد کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اگر کپڑا باریک نہ ہو تو بھی بعض لڑکیاں تنگ لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے اُبھار واضح ہوجاتے ہیں، تمام لڑکیاں ایسی نہیں ہیں، بعض لڑکیاں چادر سے چہرہ ڈھانپے رکھتی ہیں مگر آنکھیں اور آس پاس کی جلد نظر آتی ہے، لڑکے اکثر تنگ پتلون پہنتے ہیں، جس سے ان کے سرین واضح رہتے ہیں، جو لڑکے شلوار قمیص استعمال کرتے ہیں ان میں سے بھی بعض کالر اور کف استعمال کرتے ہیں، ۹۹ فیصد لڑکوں کے ٹخنے

ڈھکے ہوتے ہیں، جبکہ لڑکیوں میں سے اکثر کے ٹخنے ننگے ہوتے ہیں، لڑکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے، بعض لڑکے لڑکیاں آپس میں کھلم کھلا باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اساتذہ، خواتین ہوں یا مرد، وہ بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں، یہاں مردوں کی کوئی تمیز نہیں، خصوصاً بعض اساتذہ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہے، ہمارے لئے سب طالبِ علم ہیں اور بس۔

خواتین اساتذہ کی آواز بھی سُننی پڑتی ہے، مکمل طور پر احتیاط کے باوجود بھی غیر محرَم کے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے، ورنہ کم از کم ان کی آواز تو مکمل طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں مکمل بے دینی اور بُرائی کا ماحول ہے، آپ جانتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ جانے سے پہلے معلوم ہو کہ وہاں گناہ کا کام ہوگا تو وہاں جانا حرام ہے، اور اگر وہاں جا کر پتہ چلے تو اُٹھ آنا واجب ہے، نیز گناہ کی طرف چل کر جانا بھی گناہ ہے، جو کام حرام میں ابتلاء کا سبب بنے وہ بھی حرام ہے اور اُوپر کی تفصیل میں تقریباً سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں، اس تمام تفصیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

مسئلہ نمبر ۱

۱/۱:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا عورتوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۲:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا مردوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۳:- لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں عورتوں کا علم حاصل کرنا کیسا ہے؟ (وہاں اساتذہ مرد وخواتین دونوں ہوتے ہیں، مگر پڑھنے والی صرف لڑکیاں ہوتی ہیں)۔

۱/۴:- اگر یہ نظامِ تعلیم صحیح نہیں تو کیا مرد وعورت کسی کے لئے علم حاصل کرنا جائز نہیں ہے؟

۱/۵:- حکومت کا کام ہے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج بنائے اور وہ اس کے تمام اختیارات اور سہولیات رکھتی ہے، مگر جب تک حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا اس وقت تک کوئی جواز نہیں کہ ہم لوگ علم حاصل کرسکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ باقی علومِ دُنیا کے مقابلے میں علمِ طب افضل ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں، اگر ہم علم حاصل نہیں کرتے تو مردوں اور عورتوں کا علاج کون کرے گا؟ آخر اس صورت میں کوئی نہ کوئی متبادل صورت تو ہوگی؟

۱/۶:- خواتین اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو مردوں کے لئے کیا حکم ہے؟

۱/۷:- مرد اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو عورتوں کے لئے کیا حکم ہے؟

مسئلہ نمبر ۲

ہمارے ہاں جتنی کتب پڑھنے کا کہا جاتا ہے تمام کی تمام دُوسرے ممالک کی ہوتی ہیں، ان

کتب میں انسانی تصاویر کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر تصاویر عریاں ہوتی ہیں، عریاں صرف وہ حصہ نہیں ہوتا جو دِکھانا مقصود ہے بلکہ پورے پورے انسان کی ننگی تصاویر ہوتی ہیں اور اس میں مردوں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، ان کے بارے میں قاعدہ تو یہ ہوا کہ ''بوقت بقدرِ ضرورت'' دیکھنا جائز ہے، یعنی جب تصویر کے بغیر سمجھنے کی کوئی صورت نہ ہو تو صرف وہی تصویر دیکھ لے اور صرف اتنی ہی دیکھے جتنا ضروری ہے، مگر اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ ہم یہاں پر جوان ہیں بلکہ جوانی کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، اس صورت میں بوقتِ ضرورت کا تعین اور بھی زیادہ مشکل ہے، اگر تصویر دیکھنے کی بجائے صرف پڑھنے کی غرض سے کتاب کھولی تو بھی تصاویر پر نظر پڑتی ہی ہے، ننگی تصاویر دیکھ کر شہوت آمیز خیالات بھی آتے ہیں، بعض مضامین کتاب میں ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے شہوت آتی ہے، اگرچہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن پوچھنا یہ ہے کہ ایسے مضامین یا ایسی کتاب کا پڑھنا، پڑھانا، سیکھنا، دیکھنا اور دُوسرے دوستوں کو سمجھانے کی غرض سے دِکھانا وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟ اس میں بھی لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟

میڈیکل کالج میں پڑھائی کے پانچ سال ہوتے ہیں، سالِ اوّل و دوم میں مردہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کروائی جاتی ہے، اس کا متبادل تو موجود ہے کہ پلاسٹک کے بنے اعضاء سے سیکھا جائے، سالِ سوم سے سالِ پنجم تک ہمیں ہسپتال اور وارڈوں میں بھیجا جاتا ہے، خصوصاً سالِ پنجم میں تو رات کو بھی جانا پڑتا ہے، وہاں پر ہمیں مریضوں پر پڑھایا جاتا ہے، پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد ایک مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے پوچھو کہ اسے کیا تکلیف ہے؟ اور اس کے بعد اس کا معائنہ کرو، نظامِ تعلیم مخلوط ہے، لہٰذا لڑکے، لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں، جب طالبِ علم اپنا کام پورا کر لیتے ہیں تو اُستاد صاحب تشریف لاتے ہیں طلباء و طالبات میں سے کوئی ایک تفصیل کے ساتھ مریض کی تکلیف اور معائنے کے بارے میں بتا دیتا ہے، اُستاد صاحب اس میں سے غلطیاں نکالتے ہیں، سمجھاتے ہیں، وغیرہ۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہر بیماری مرد و عورت دونوں میں نہیں ہوتی، بعض بیماریاں صرف مردوں، اور بعض بیماریاں صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں، نیز کوئی جانور ایسا نہیں جو مکمل طور پر انسان کے مشابہ ہو، نیز معائنے کے دوران مختلف پٹھوں کی حرکت، دِل کی دھڑکن کی مختلف آوازیں، مختلف بیماریوں میں سانس کی مختلف آوازیں وغیرہ صرف انسان کے جسم میں دیکھی جاسکتی ہیں نہ کہ پلاسٹک کے اعضاء میں، اگرچہ بعض چیزیں کمپیوٹر پر ایسی آگئی ہیں کہ ان پر آواز سنی جاسکتی ہے، مگر ہر چیز پاکستان میں نہیں ملتی اور ہر طالبِ علم کمپیوٹر بھی نہیں خرید سکتا، نیز میڈیکل کالج میں بھی یہ سہولت نہیں

ہے۔ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد وعورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

معائنہ کرنے کے چار حصے ہوتے ہیں، ۱:- دیکھنا، ۲:- ہاتھوں سے دبا کر ٹٹول کر چیک کرنا، ۳:- اُنگلی سے ٹھونک کر دیکھنا، ۴:- کانوں کے آلے (Stethoscope) سے اس حصے کی آواز سننا۔

۱:- دیکھنا

اس کے لئے ضروری ہے کہ جو حصہ دیکھنا ہو وہ حصہ اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ ننگا کیا جائے، مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ اگر سینہ دیکھنا ہو تو کم از کم ناف تک قمیص اُتروالی جائے، اور اگر پیٹ دیکھنا ہے تو سینے سے لے کر گھٹنوں تک بشمول شرم گاہ ننگا کیا جائے، اگرچہ کتب کے مطابق صحیح طریقہ یہی ہے، مگر پاکستان میں شرم گاہ سب کے سامنے نہیں کھولی جاتی بلکہ علیحدہ کمرے میں پردے کے ساتھ کھولی جاتی ہے، اس میں مرد کی شرم گاہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا، البتہ عورت کی شرم گاہ کو عورت ہی کھولتی اور دیکھتی ہے، مردوں کو اجازت نہیں، بہرحال مریض مرد ہو یا عورت یہ کرنا پڑتا ہے، مرد میں تو خاص شرم گاہ کے حصے کے علاوہ باقی جسم کو ننگا کرنا بشمول ران گھٹنوں وغیرہ کے کچھ بُرا نہیں سمجھا جاتا، عورت مریض کی صورت میں دوپٹہ اُتروالیا جاتا ہے اور پیٹ کمر وغیرہ سے قمیص بھی ہٹالی جاتی ہے، عام طور پر اس سے زیادہ نہیں کیا جاتا۔

۲:- دبا کر، ہاتھ لگا کر دیکھنا

اس میں مریض کو جس حصے کی تکلیف ہو اس کو ہاتھ لگا کر اور دبا کر دیکھا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی جلد اور جلد کے نیچے دُوسرے اعضاء اور پٹھے عام صحت مند آدمی کی طرح ہیں یا سخت ہیں یا نرم ہیں یا یہ کہ ہاتھ لگانے سے مریض کو درد ہوتا ہے یا نہیں، وغیرہ۔ یہاں بھی مرد وعورت (مریض ہو یا طالبِ علم) کی کوئی تخصیص نہیں۔

۳:- ٹھونک کر دیکھنا

اس میں ہاتھ اور اُنگلی کی مدد سے مریض کے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً سینہ اور پیٹ کو ٹھونک کر دیکھتے ہیں، اور آواز کا موازنہ عام صحت مند انسان سے کیا جاتا ہے۔

۴:- کانوں والے آلے سے سننا

اس میں اگرچہ عموماً مریض کو ہاتھ نہیں لگتا، مگر جس جگہ آلہ لگایا جاتا ہے وہاں سے اکثر کپڑا ہٹالیا جاتا ہے۔

آپریشن تھیٹر

شعبۂ جراحت کی پڑھائی کے دوران طلباء و طالبات کو عملِ جراحی (آپریشن) دِکھایا جاتا ہے، اس میں طالبِ علم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی، مگر اسے دِکھایا جاتا ہے، یہاں پر بھی اُستاد، شاگرد اور مریض میں مرد و عورت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

آؤٹ ڈور O.P.D

اس مین مریضوں کا معائنہ اُستاد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس میں فلاں بیماری کی فلاں فلاں علامتیں ظاہر ہیں، چنانچہ طلباء و طالبات بیماری کی وہ علامتیں اس میں فرداً فرداً دیکھتے ہیں اور معائنہ کرتے ہیں۔

تمام میڈیکل کالجوں میں یہی طریقۂ تعلیم ہے اور اسی کا امتحان لیا جاتا ہے، اس تمام تفصیل کے بعد جواب طلب اُمور مندرجہ ذیل ہیں، اس میں لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی حد کن شرائط کے ساتھ ہے؟ یاد رہے کہ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد و عورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر ۳

۳/۱:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۲:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) سے بات کرنے کا حکم کیا ہے؟

۳/۳:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۴:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد و عورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۵:- اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

۳/۶:- آپ جانتے ہیں کہ عملِ جراحی مہارت کا کام ہے، اور مہارت ہاتھ سے کام کرنے سے آتی ہے، کالج میں عموماً ہاتھ سے کام تو نہیں کرنے دیا جاتا مگر عملِ جراحی دِکھایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

۳/۷:- اگر ہر طرف سے بچ جائے تو دورانِ امتحان تو ہر طالبِ علم کا علیحدہ علیحدہ امتحان لیا جاتا ہے، پس دورانِ امتحان کیا حکم ہے؟ (افضل اور جواز مع شرائط)۔

۸/۳:- دورانِ تعلیم مرد وعورت طلباء و طالبات کو کہا جاتا ہے کہ مریض یا مریضہ کے مقعد یا اندامِ نہانی وغیرہ میں ہاتھ اور اُنگلیاں وغیرہ ڈال کر دیکھیں، اس کا حجم وغیرہ دیکھیں، اندر سے دبا کر دیکھیں، وغیرہ، ایسا کرنا کیسا ہے؟ (مریض اور طالبِ علم مرد یا عورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے) اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ نمبر۴

شعبۂ حادثات یعنی ایمرجنسی وارڈ میں عموماً وہ مریض آتے ہیں جن کی حالت نازک ہوتی ہے، لہٰذا وہاں بعض اوقات ایک ایک مریض پر دو دو، تین تین ڈاکٹر لگے ہوتے ہیں، بعض اوقات ڈاکٹر کم ہوں یا مریض زیادہ ہوں تو طالبِ علم کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاسکے، اس حالت میں بوتل بھی لگائی جاتی ہے، بوتل لگانے کے لئے عام طور پر مریض کے بازو کی خون کی ورید پر سوئی لگائی جاتی ہے، اگر وہاں نہ ملے تو جسم کے دُوسرے حصوں پر ورید تلاش کی جاتی ہے، بعض اوقات سارے جسم میں کہیں نہیں ملتی اور جاکر شرم گاہ کے ساتھ ران پر ملتی ہے، مریض، ڈاکٹر اور طالبِ علم، مرد وعورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے، یہاں پر اگر مریض کی حالت زیادہ نازک ہو تو پردہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی جان بچانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ایسی حالت میں ڈاکٹر اور طالبِ علم (مرد وعورت) کے لئے کیا حکم ہے؟ بعد جواز مع شرائط اور افضل کیا ہے؟ لکھ دیں۔

مسئلہ نمبر۵

کالج میں تعلیم کے دوران تمام طلباء و طالبات کے لئے ضروری ہے کہ کالج و ہسپتال میں کل حاضری میں سے ۷۵ فیصد حاضری کا ہونا اور ۷۵ فیصد اسباق اُستاد سے پڑھنا ضروری ہے، ورنہ اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی، بعض اوقات سال ضائع ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد حاضری کے لئے کالج اور ہسپتال میں جانا مجبوراً ضروری ہے، اس سے زیادہ جانا یا نہ جانا اپنے اختیار میں ہے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتائیں کہ:-

۱/۵:- ایسی حالت میں کیا یہ ضروری ہے کہ ۷۵ فیصد کے بعد طالبِ علم کالج نہ جائیں، اس سلسلے میں لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ اگر جواز ہے تو کیا ہے؟ اور کن شرائط پر ہے؟

۲/۵:- کالج میں زیادہ تر لوگ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ ۷۵ فیصد حاضری ضروری ہے،

اگر یہ ضروری نہ ہوتو اکثر لوگ نہ جائیں، بعض اوقات اگر پڑھنے کا دِل نہ کرے یا سبق سمجھ میں نہ آئے یا خاتون اُستاد آجائے تو بعض طالبِ علم دینی کتب، مواعظ اور بعض ناول وغیرہ دورانِ سبق پڑھتے رہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

۳/۵:- یہاں کالج میں ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت بھی ہے، جن کے نزدیک داڑھی اتنی رکھنا کافی ہے کہ دُور سے نظر آئے، کچھ لڑکے ان کے اثر سے، اور کچھ فیشن کے طور پر چھوٹی سی داڑھی رکھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں واجب پورا ہوگیا، جب ہم انہیں کہتے ہیں کہ داڑھی پوری رکھوتو وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ داڑھی نہیں ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح نہیں تو کیا ہم نے داڑھی جتنی رکھی ہے کٹوادیں؟ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا تھا کہ: انہیں بے شک کہہ دو کہ اس داڑھی کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا بے شک کٹوادیں۔ بتائیں کہ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ (ان کا پوری داڑھی رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں اور وہ اسی کو سنت، واجب سمجھتے ہیں)۔

۴/۵:-طلباء کا کالج جانے کو دِل نہیں کرتا، نیز اس کے لئے صبح صبح اُٹھنا پڑتا ہے، لہٰذا بعض طلباء دُوسروں کو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نہیں جاتے مگر ہماری حاضری لگوادینا، کیا یہ جائز ہے کہ طالبِ علم نہ جائے اور کوئی دُوسرا اس کی حاضری لگادے؟ بعض اساتذہ اجازت دیتے ہیں، مگر اکثر ناراض ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر ۶

یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو ''مولوی'' کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرواتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہورہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۱/۶:- اس پیرے کی روشنی میں دین دار طلباء و طالبات کے لئے جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور کن شرائط سے ہے؟ نیز یہ بھی بتادیں کہ افضل کیا ہے؟ کیا ہمارے لئے کوئی جواز نہیں کہ ہم علم حاصل کرسکیں؟ کیا ہم پڑھائی چھوڑ دیں؟ اگر ہم پڑھائی چھوڑ دیں گے تو ہمارے ماں باپ، دوست، رشتہ دار سخت باتیں کہیں گے، آپ جانتے ہیں کہ آج کل لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کالج چھوڑنے پر بہت سے اپنے پرائے ایسی باتیں کریں گے کہ کافر ہوجائیں گے۔

۲/۶:- کیا ہم طلباء جو یہاں پڑھ رہے ہیں، ہم سب گناہِ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق ہیں یا نہیں؟

مسئلہ نمبر ۷

ہمارے کالج، ہسپتال اور دارالاقامہ کے قریب کم و بیش چھ مساجد ہیں، ہمارے کالج میں ایک ڈاکٹر صاحب پڑھاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب شکل و صورت، لباس کے لحاظ سے ماشاء اللہ دین دار ہیں، ماشاء اللہ تعالیٰ حافظِ قرآن بھی ہیں، آواز بھی اچھی ہے، مگر مخلوط تعلیم میں پڑھاتے ہیں، حالانکہ ڈاکٹر ہیں، اپنا کلینک بھی کھول سکتے ہیں، یہ صاحب ہسپتال کی لیبارٹری میں کام بھی کرتے ہیں، غالباً اپنی ذاتی لیبارٹری بھی ہے، ان اُمور کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ:-

۱/۷:- کیا مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے یہ صاحب فاسق ہیں یا نہیں؟

۲/۷:- ان کی امامت میں فرض نماز کا کیا حکم ہے؟

۳/۷:- ان کی امامت میں تراویح کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ قریب میں اور مساجد بھی ہیں؟

۴/۷:- اگر قریب اور مسجد نہ ہو تو ان کی امامت میں فرض و تراویح کا کیا حکم ہے؟ افضل اور

حدِ جواز اگر ہو تو مع شرائط بیان فرمادیں۔

برائے مہربانی مکمل تحقیق کے بعد جواب عنایت فرمائیں۔ جزاک اللہ

واللہ تعالیٰ ھو الموفق وھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا بہ

سیّد فاتح عظمت اللہ، فرحان شہزاد،
محمد عمران، محمد ہارون محمود،
کمرہ نمبر ۲۹ جوہر ہال
(طلبہ قائداعظم میڈیکل کالج بھاولپور
۲۳ر صفر ۱۴۲۳ ہجری)

جواب:-

مسئلہ نمبر ا

شریعت کا اصل حکم تو یہ ہے کہ نامحرَم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے، خاص طور پر ایسا مستقل مشغلہ اختیار کرنا، جس میں نامحرَم خواتین کے ساتھ مستقل میل جول ہو، بغیر ضرورت کے جائز نہیں، لہٰذا حکومت اور مسلم معاشرے کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کی بجائے لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں، لیکن جب تک ایسا انتظام نہ ہو تو چونکہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا ایک ضرورت ہے اور اس میدان میں متدین افراد کی کمی ہے جسے دُور کرنے کا یہی راستہ ہے کہ متدین افراد میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں[1]، اس لئے اگر اس تعلیم کے حصول کا وہ راستہ نہ ہو جو اُوپر بیان کیا گیا تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کے حصول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرَم خواتین سے دُور رکھیں اور جہاں کہیں ایسی خواتین کا سامنا ہو وہاں نگاہ نیچی رکھیں، اور اپنی نگاہ اور دِل کی حفاظت کریں۔

خواتین کے لئے بھی میڈیکل تعلیم کا حصول اس شرط کے ساتھ جائز ہے[2] کہ وہ پردہ کا مکمل اہتمام کریں، اور مردوں کے قریب نہ بیٹھیں، عورتوں کے لئے تعلیم کی غرض سے مردوں کو دیکھنے کی گنجائش ہے، مگر یہ گنجائش ضرورت کی حد تک ہی محدود رہنی چاہئے۔[3]

مسئلہ نمبر ۲

جب کتاب کا اصل مقصود تعلیم ہے اور اس میں تصویریں ضمنی طور پر آئی ہیں تو ایسی کتاب کو اس شرط کے ساتھ رکھنا اور پڑھنا جائز ہے کہ تصویروں کے جن حصوں کی، تعلیم کے لئے ضرورت نہ ہو ان کو

(۱ تا ۳) وفی مقدمة ردّ المحتار ج:۱ ص:۴۲ (طبع سعید) قال فی تبیین المحارم واما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغنى عنه فی قوام أمور الدنيا كالطبّ والحساب .... الخ. نیز دیکھئے ص:۱۴۳ کا فتویٰ اور ص:۱۴۴ پر اس کا حاشیہ نمبر ا۔

یا تو مٹادیا جائے یا کسی کاغذ وغیرہ سے چھپادیا جائے، خاص طور پر ایسی تصویر جو شہوت کو برانگیختہ کرے اس کو اس طرح تبدیل کردیا جائے کہ صرف وہ حصہ باقی رہے جو تعلیم کی غرض سے ضروری ہے، ضرورت کا تعین اس موضوع سے کیا جاسکتا ہے جس موضوع کی اس تصویر کے ذریعے تعلیم دی جارہی ہے۔

مسئلہ نمبر۳

۱، ۲، ۵، ۶، ۷:- ان تمام کاموں میں جو کام طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، ان کو بقدرِ ضرورت انجام دینے کی گنجائش ہے، لیکن ہر کام میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ مریض کے ستر کا اتنا ہی حصہ کھلے جتنا معائنے کے لئے ضروری ہے، اگر عملے کا کوئی فرد اس میں بے احتیاطی کرے تو اسے تاکید کی جائے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھولے۔[(۱)]

مسئلہ نمبر۴

جب جان بچانے کے لئے بوتل یا انجکشن لگانا ضروری ہو اور جسم کے ظاہری حصوں پر رَگ نہ ملے تو ستر والے حصے میں رَگ تلاش کرنے کی گنجائش ہے، اس میں ڈاکٹر اور طالبِ علم کے درمیان کوئی فرق نہیں، تاہم اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان مرد مریضوں کے ساتھ یہ عمل مرد ڈاکٹر یا طلباء کریں، اور خواتین کے ساتھ یہ عمل لیڈی ڈاکٹر یا طالبات کریں۔[(۲)]

مسئلہ نمبر۵

۱، ۲:- ۷۵ فیصد، حاضری کی کم سے کم مقدار ہے، ورنہ تعلیم کی تکمیل کے لئے سو فیصد حاضری ضروری ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد کے بعد بھی حاضری کا اہتمام کرنا چاہئے اور حاضر ہوکر تعلیم ہی پر متوجہ رہنا چاہئے، تاہم حتی الامکان ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو اُوپر بیان کی گئیں۔

۳:- داڑھی کی شرعی مقدار ایک قبضہ ہے، داڑھی کا ایک قبضہ سے نیچے کٹوانا جائز نہیں،[(۳)] جن لوگوں نے داڑھی ایک قبضہ سے کم رکھی ہوئی ہے، وہ اگر یہ کہیں کہ جتنی رکھی ہوئی ہے کیا وہ ہم کٹوادیں؟

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۷۰ (طبع سعید) ینظر الطبیب الی موضع مرضها بقدر الضرورة اذ الضرورات تتقدر بقدرها وکذا نظر قابلة وختان وینبغی أن یعلّم امرأة تداویها لأن نظر الجنس الی الجنس أخف. وفی الشامیة تحته فی الجوهرة اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدواء لأنه موضع ضرورة وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک أو یصیبها وجع لا تحتمله یستروا منها کل شئ الا موضع العلة ثم یداویها الرجل ویغض بصره ما استطاع الا عن موضع الجرح.

(۳) وفی الدر المختار کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع ج:۶ ص:۴۰۷ (طبع سعید) والسنة فیها القبضة .... ولذا یحرم علی الرجل قطع لحیته .... الخ. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعل بعض المغاربة والمخنثة من الرجال فلم یبحه أحد .... الخ.

تو جواب یہ نہیں ہے کہ ''ہاں کٹوادیں!'' بلکہ جواب یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھیں، اور یہ بات دُرست ہے کہ داڑھی کم رکھنا بالکل منڈوانے سے بہتر ہے۔

۴:- دُوسرے طالبِ علم کی حاضری لگوانا دھوکا ہے اور بالکل ناجائز ہے۔

مسئلہ نمبر۶

اس سوال میں آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، اکثر و بیشتر مبالغہ پر مبنی ہیں، اگر واقعۃً آپ تعلیم میں کورے ہیں تو اس کی وجہ دین دار ہونا نہیں، بلکہ تعلیم کی طرف توجہ نہ دینا ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ جو دین دار لوگ میڈیکل تعلیم حاصل کرکے فارغ ہوچکے ہیں ان کا کلینک نہیں چلتا، ملک کے ہر خطے میں ایسے متدین ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی فنی مہارت میں مشہور ہیں، لہٰذا اس احساسِ کمتری سے نکلئے، اور اپنی بے عملی کو اپنے تدین کے ساتھ وابستہ نہ کیجئے، اگر واقعی آپ ایسا کریں گے تو یقیناً متدین لوگ بدنام ہوں گے۔

جواز کی حدود پیچھے بیان کی جاچکی ہیں، ان حدود میں رہ کر اگر محنت سے تعلیم حاصل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مہارت حاصل نہ ہو۔

مسئلہ نمبر۷

محض مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے ان صاحب کو فاسق نہیں کہا جاسکتا، عین ممکن ہے کہ وہ نگاہ و دِل کی حفاظت کرتے ہوئے پڑھاتے ہوں، لہٰذا ان کی امامت میں نماز بھی جائز ہے، اگر قریب کوئی دُوسری مسجد موجود ہو تو شبہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں چلے جائیں، ورنہ ان کے پیچھے نماز پڑھیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۳/۴/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۵/۱۶)

(بنو ہاشم، بنو اُمیہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ اور یزید سے متعلق متعدّد سوالات اور جوابات)

کیا بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟

سوال ۱:- کیا بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''شہادتِ حسینؓ'' میں تحریر کیا ہے؟

قبولِ اسلام کے بعد بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشوں کی کیفیت

سوال۲:- کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بنو ہاشم اور بنو اُمیہ نے قبلِ اسلام کی خاندانی رنجشوں کو ختم نہیں کیا تھا؟ جیسا کہ واقعہ کربلا کے پسِ منظر میں بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ قرآنِ پاک نے مسلمان ہونے کے بعد خصوصاً صحابہؓ میں مودّتِ قلبی کا ذکر کیا ہے، اثبات کی صورت میں اس تأثر کے حامل کا کامل الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

کیا حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط سے انکار کردیا تھا؟

سوال۳:- کچھ تواریخ میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انتخابی شوریٰ نے حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ کے سامنے اطاعتِ خدا و رسولؐ کے ساتھ اتباعِ خلفائے اوّل و ثانی کی شرط بھی رکھی تھی، جسے حضرت عثمانؓ نے قبول کرلیا، لیکن حضرت علیؓ نے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط کو قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اطاعتِ خدا و رسولؐ کے بعد خلفائے سابقین کا اتباع منتخب خلیفہ کے لئے ایک لازمی اَمر تھا؟

قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والوں کا حقیقی مقصد قصاصِ عثمانؓ تھا یا حضرت علیؓ کو خلافت سے روکنا؟

سوال۴:- عام تاریخوں سے یہ تأثر ملتا ہے کہ قصاصِ عثمانؓ ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل مقصد خلافتِ علیؓ کو مرتب نہ ہونے دینا تھا، اگر یہ تأثر قبول کرلیا جائے تو اس میں حضرت عائشہؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ تک اور حضرت طلحہؓ وزبیرؓ سے لے کر عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ تک سب ملوّث ہیں، اور ان کے علاوہ بہت سارے ایسے صحابہؓ بھی ملوّث ہیں جن کو اکابر میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ دین کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچا ہے، مذہبِ اہل السنۃ کس چیز سے انکار کرے گا؟ فسادِ ایمان سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کرنے کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن اس سکوت کو فرار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے کردار کا تاریخی وشرعی جائزہ

سوال۵:- تاریخوں سے حضرت معاویہؓ کے کردار کا مطالعہ کرنے کے بعد دو باتیں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، یا تاریخیں غلط یا حضرت معاویہؓ کا ایمان مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا، تیسری صورت میں جیسا کہ اہل السنۃ انہیں اکابر صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں، نبی کی تربیت اور ذات محلِ نظر رہ جاتی ہے۔

کیا حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لی تھی؟

سوال۶:- حضرت معاویہؓ کا اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لینا ایک سیاسی مسئلہ ہے یا مذہبی؟ اگر سیاسی مسئلہ ہے اور حضرت معاویہؓ کو خلفائے راشدین میں شمار نہیں کیا جاتا تو اعتراض کس چیز کا رہ جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو ضمنی سوال بھی پیش ہیں:

الف:- کیا نفسِ ولی عہدی کی بیعت لینا صحیح نہیں ہے؟

ب:- لوگوں کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنانے کی وصیت کرنے بلکہ جواب حاصل کرنے اور بیعت لینے میں کیا فرق ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری وقت میں نہ صرف حضرت عمرؓ کو ولی عہد نامزد کیا تھا، بلکہ لوگوں سے ان کی اطاعت کا اقرار بھی کرایا تھا، اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے آخری وقت میں حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

یزید کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینے کا شرعی حکم

سوال۷:- یزید فاسق و فاجر تھا، اور ایسے بیٹے کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینا جائز تھا یا ناجائز؟ ناجائز کام کرنا معصیتِ خداوندی ہے یا نہیں؟

حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید پر شرعی حد کیوں جاری نہیں کی گئی؟

سوال۸:- تاریخوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں شرعی عدالتیں موجود تھیں، جو خدا کی نافرمانیوں اور قابلِ تعزیر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں، کیوں یزید پر حد جاری نہیں کی گئی؟ جبکہ اس کا شرابی، زانی ہونا اس قدر مشہور تھا کہ بیعتِ ولی عہدی کے دوران اس کا بزور اظہار کیا گیا، اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ ریمارکس قائم نہیں کیا جاسکتا: "أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ"؟

یزید کا حکم؟ اور کیا حضرت معاویہؓ کے عہد میں مجالسِ غناء عام تھیں؟

سوال۹:- تاریخوں میں اجمالی حیثیت سے یزید کے فسق و فجور کا ذکر تو آیا ہے، لیکن کسی خاص واقعے کا ذکر کم از کم اُردو ترجموں میں سامنے نہیں آیا، کیا کسی عربی تاریخ نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے؟ شاید ابنِ خلدون نے مجالسِ غناء کا ذکر کیا ہے، کیا اس قسم کی مجالسِ غناء جو خلافِ شرع ہوں حضرت معاویہؓ کے دور میں عام ہوا کرتی تھیں؟

حضرت حسینؓ کے نام کوفیوں کے خطوط میں کیا بات درج تھی؟

سوال ۱۰:- تاریخوں میں حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کے ساتھ کوفیوں کی خط و کتابت کا جو تذکرہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے، اس کے مطابق حضرت معاویہؓ کی وفات پر حضرت حسینؓ کو مبارک باد اور اپنا حق لینے کی ترغیب ہے، اس خط و کتابت میں ایک فاسق و فاجر خلیفہ کو ہٹانے کی جدوجہد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، براہِ کرم اگر عربی تاریخوں میں ایسا کوئی واقعہ ہو تو مطلع کریں، مختلف روایتوں کے مطابق تین سو خطوط یا بروایت دیگر ۳ بوریوں کی مقدار میں خطوط آنے کے بعد اور وفود آنے کے بعد حضرت حسینؓ نے مکہ مکرّمہ چھوڑا۔

فاسق حکمران کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج و جہاد کی شرعی حیثیت

سوال ۱۱:- واقعہ کربلا کا پس منظر بتاتے ہوئے ہر تحریر و تقریر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ آتی ہے کہ ایک فاسق و فاجر حکمران سے جہاد کی خاطر حضرت حسینؓ مکہ مکرّمہ سے نکلے تھے، یہ مقصد واجب تھا یا مستحب؟ اگر واجب تھا تو دُوسروں کو ترغیب دِلانا ضروری تھا، کیا حضرت حسینؓ نے اس سلسلے میں دُوسروں کو ترغیب دِلائی؟ اور اگر مستحب تھا تو نتائج کا اندازہ کر کے حضرت حسینؓ کو ترک کر دینا چاہئے تھا، ہر صورت میں بہتر تھا کہ حضرت حسینؓ اپنے ہم نوا پیدا کرتے، پھر نظریاتی یا عملی دباؤ ڈال کر حالات کو بہتر بناتے، اور اگر یہ خیال تھا کہ تیس ہزار کوفی تیار ہیں جیسا کہ تاریخیں لکھتی ہیں اور مسلم نے اطلاع دی تھی اور بغیر کسی مشورے کے حضرت حسینؓ ان تک پہنچنا چاہتے تھے تو بھی پورے خاندان و اسباب کو لے کر روانہ ہونا مناسب نہ تھا، اکیلے یا ایک دو ساتھی کو لے کر کسی غیر معروف راستے سے جا کر کوفہ والوں سے ملتے، بلکہ تاریخوں میں جیسے آتا ہے کہ کوفہ والوں نے کھلم کھلا یزید کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا اور مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور حکومت کو ان کے رُجحانات کا علم تھا، لہٰذا حکومت کی طرف سے مزاحمت متوقع تھی، چنانچہ حضرت حسینؓ کا ایسے حالات میں خاندان والوں کو لے کر نکلنا اپنے آپ کو اور مشن کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا، اس لحاظ سے حضرت حسینؓ کو اپنے اس مشن میں مخلص ماننے میں تأمل پیدا ہوتا ہے یا پھر یہ مقصد ہی نہ تھا؟

کیا یزید نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور جاری کیا تھا؟

سوال ۱۲:- بتایا جاتا ہے کہ یزید قانونِ شریعت کو بدلنا چاہتا تھا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا چاہتا تھا، کیا تاریخ و سوانح کے ذریعہ کہیں یہ نظر آتا ہے کہ اپنے خلاف ہونے والی جدوجہد کو کچلنے

کے بعد اس نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور رائج کیا تھا؟ حالانکہ اس کے بعد اسے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔

یزید کے خلاف جدوجہد میں دیگر صحابہ کرامؓ کیوں شریک نہیں ہوئے؟

سوال ۱۳:- یزید کے خلاف جدوجہد میں اس دور کے بقیہ صحابہؓ کی عدمِ شرکت کو کس بات پر محمول کیا جائے؟ حالانکہ حضرت حسینؓ کے مقابلے میں کوئی آدمی، درجہ کا صحابی بھی نہیں بلکہ ایک فاسق و فاجر حکمران تھا، کیا آلِ علیؓ کے سوا کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا تھا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ عباسؓ اور دیگر صحابہؓ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

حضرت حسینؓ کی طرف سے جہاد اور مقابلے کے فیصلے کی وجہ

سوال ۱۴:- مرثیہ خواں ذاکروں کی طرح سنی واعظ بھی لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہیں کہ سر داد و نداد دست در دستِ یزید۔ اور بتاتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کسی صورت میں یزید جیسے فاسق و فاجر کی خلافت کو اپنی زندگی میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، جان دے دی لیکن یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، حالانکہ واقعات کے اعتبار سے نہ تو حضرت حسینؓ مکہ مکرّمہ سے یزید کی بیعت کے خوف سے نکلے تھے، نہ ان پر مکہ مکرّمہ میں کسی نے جبر کیا تھا، بلکہ کوفیوں کی خط و کتابت پر نکلے اور راستے میں جب معلوم ہوا کہ کوفی بدعہد ہوگئے ہیں تو لوٹنے کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم کی شہادت پر مشتمل اعزّہ واقارب کی ضد کی وجہ سے ارادے کا ساتھ دیا اور آخر میں تین شرطیں تک پیش کردیں، پھر مقصد کیا تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

تاریخِ اسلام کو روایات کی تحقیق کے ساتھ ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت

سوال ۱۵:- آخر میں ایک اہم سوال پیشِ خدمت ہے، اسلامی تاریخِ قدیم کا ذخیرہ ایک عجوبہ سے کم نہیں، کہیں ایک فرشتہ ہے اور دُوسری جگہ شیطان بن جاتا ہے، بدقسمتی سے تراجم کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کی گئی، علمائے کرام نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قرآن و سنت اور آثارِ سلف کے ماہر علماء کا ایک بورڈ مقرّر کرکے اختلافِ روایات پر تحقیق کرتے اور کم از کم اہلِ سنت کو ابتدائی تاریخ ایسی ملتی جس میں اکابر صحابہؓ اور قرونِ خیر کی ایک اچھی اور متفق علیہ تصویر ہوتی، اب بھی وقت گیا نہیں، کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہیں؟ ورنہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں، دُوسرے مذاہب ہی نہیں بلکہ سیاسی و ملکی رہنماؤں کی تاریخوں کو بے عیب اور متفق علیہ پاکر، اور اسلامی تاریخ کے پورے ذخیرے کو اختلافات اور کشت وخون سے بھرا ہوا پاکر، خلافِ اسلام مشنریز کے پروپیگنڈے میں آکر محمدِ

عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور ان کے خلاف کھلم کھلا زبان درازی پر اُتر آئیں، اعوذ باللہ من شر ذٰلک۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شرمندہ ہوں کہ اب تک آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، دراصل میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی اطمینان کا وقت ملے تو مفصل جواب تحریر کروں، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اطمینان کا وقت ملنا بہت مشکل ہے، اب جو تھوڑی بہت فرصت ملی ہے اس میں اختصار کے ساتھ آپ کے سوالات کا جواب عرض کردینا زیادہ مناسب ہے، اگر کسی جواب میں پھر کوئی اِشکال رہ جائے تو براہِ کرم آپ دوبارہ رُجوع فرمالیں، اپنے ناقص علم کی حد تک میں ان شاء اللہ جواب عرض کردوں گا۔

سب سے پہلے ایک اُصولی بات عرض کردوں، اور وہ یہ کہ ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں ایک ہی واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں، اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح وتنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضراتِ محدثینؒ نے اختیار کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوگئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب ویابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اُصولوں پر پوری اُترتی ہوں، اگر کوئی ایسا عالم جسے جرح وتعدیل کے اُصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو ان ہی اُصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک وشبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہوجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی اس کے دو بڑے مقاصد تھے، ایک صحابہؓ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دُوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا، چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط حکایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضراتِ محدثینؒ نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے جدوجہد کرکے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا، لیکن علمِ تاریخ میں اہتمام نہ ہوسکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں! محتاط مؤرّخین نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیقِ حق کرنے والوں کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علمِ اسماء الرجال کی مدد سے وہ روایتوں کی تحقیق کریں اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ وہ کسی سبائی تحریک کے فرد کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اعتماد نہ کریں، کیونکہ صحابہؓ کے فضائل ومناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء

کے بعد محبوب ترین اُمت ہونا، قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن وسنت کے واضح ارشادات کو دریابُرد نہیں کیا جاسکتا، اہلِ سنت کا جو عقیدہ ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کی تحقیق میں پڑنا دُرست نہیں بلکہ اس معاملے میں سکوت اختیار کیا جائے، یہ کوئی تلخ حقائق سے فرار نہیں بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایات میں سے صحیح اور غلط، اور سچی اور جھوٹی کا امتیاز ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لئے جو شخص جرح وتعدیل کے اُصولوں سے ناواقف رہ کر ان روایات کو پڑھے گا وہ ہرگز کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا، صحیح روایات میں مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق جو مواد آیا ہے اسے سامنے رکھ کر اہلِ سنت کے تمام مرکزی علماء نے متفقہ طور پر یہ عقیدہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ صفین وجمل کی جنگوں میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، لیکن ان کے مقابل حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہم کا موقف بھی سراسر بے بنیاد نہیں تھا، یہ حضرات بھی اپنے ساتھ شرعی دلائل رکھتے تھے اور ان سے جو غلط فہمی صادر ہوئی وہ خالص اجتہادی نوعیت کی تھی۔ اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے۔

۱:- مولانا ابوالکلام مرحوم کی کتاب میں نے نہیں پڑھی، اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت تک بنو ہاشم کے کسی فرد نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، صرف حضرت علیؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے ابتداءً حضرت صدیقِ اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، لیکن خود انہوں نے بعد میں یہ وجہ بیان فرمائی کہ میری رنجیدگی کا اصل سبب یہ تھا کہ ہمیں مشورۂ خلافت میں شریک نہیں کیا گیا، چنانچہ بعد میں انہوں نے برسرِ عام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ صرف حضراتِ شیخینؓ بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا۔

۲:- اسلام کے بعد بلاشبہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشیں ختم ہوگئی تھیں، اس کے بعد جو تھوڑی بہت رنجشیں ظاہر ہوئی ہیں، ان کا سبب خاندانی رقابت نہ تھی بلکہ کچھ دُوسرے اُمور تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان رنجشوں کے باوجود دونوں خاندانوں میں برابر رشتے ناطے ہوتے رہے۔

۳:- یہ غلط ہے کہ حضرت علیؓ نے انتخابی شوریٰ کی اس شرط کو ٹھکرادیا تھا کہ وہ خلفائے سابقین کی اتباع کریں گے۔ علامہ طبریؒ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شوریٰ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ نقل فرمایا اور اس میں صحیح وغلط ہر طرح کی روایت جمع کی ہیں، لیکن اس میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے، جو شوریٰ کے متفقہ نمائندہ تھے، حضرت علیؓ سے پوچھا: "**علیک عهد الله ومیثاقه لتعملن بکتاب الله وسنة رسوله وسیرة الخلیفتین من بعده**"، تم پر اللہ کی طرف سے عہد ہوگا کہ تم

کتاب وسنت اور آپؐ کے بعد آنے والے دو خلفاء کی سیرت پر عمل کروگے، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا: "أرجو أن أفعل وأعمل بمبلغ علمي وطاقتي"، مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے علم اور اپنی طاقت کی حد تک اس پر عمل کروں گا۔ (ملاحظہ ہو تاریخِ طبری ج:۳ ص:۲۹۷، مطبعہ الاستقامہ قاہرہ ۱۳۵۷ھ) اسی طرح کے الفاظ ایک اور روایت میں بھی ہیں جو مذکورہ تاریخ کے صفحہ:۳۰۱ پر منقول ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی طاقت کی حد تک اتباع کا وعدہ کیا تھا۔

۴:- عام تاریخوں میں یہ تأثر پیدا کرنے والے وہی عبداللہ بن سبا کے افراد ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والے صحابہؓ پوری دیانت داری کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص اگر اس مرحلے پر نہ لیا گیا تو ایک طرف دین کا ایک اہم حکم جس پر قرآنِ کریم کی کئی آیات اُتری ہیں مجروح ہوگا۔ دُوسری طرف فتنہ پرور لوگوں کی جرأتیں بڑھ جائیں گی اور وہ جس خلیفہ کے ساتھ چاہیں گے یہی معاملہ کریں گے، جنگِ جمل میں تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ فریقین کے درمیان لڑائی صرف سبائی فتنہ پردازوں نے کرائی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ صلح پر متفق ہوچکے تھے، رات کے وقت سبائی فتنہ پردازوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے: "رأي الناس فينا والله واحد وان يصطلحوا وعليٌّ فعلى دمائنا"[1] (ہمارے بارے میں ان سب لوگوں کی رائے ایک ہے، اب اگر ہم میں اور ان میں صلح ہوگئی تو وہ ہمارے خون پر ہوگی)، عبداللہ بن سبا نے یہ تجویز پیش کی کہ "اذا التقى الناس غدًا فانشبوا القتال ولا تفرغوهم للنظر"[2] (جب کل یہ لوگ ملیں تو لڑائی شروع کردینا اور انہیں سوچنے کی مہلت نہ دینا)، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اس کے نتیجے میں جنگِ جمل پیش آئی۔ (ملاحظہ ہو تاریخِ طبری ج:۳ ص:۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۴، ۵۰۵، ۵۰۷[3]، اور کامل ابنِ اثیر ج:۳ ص:۲۳۳، ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۴۲[4]، اور البدایۃ والنہایۃ ج:۷ ص:۲۳۴ تا ۲۳۷[5])

رہا حضرت معاویہؓ کا معاملہ جس وقت حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابو امامہؓ، حضرت معاویہؓ سے گفتگو کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اسی وقت حضرت معاویہؓ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ حضرت علیؓ مجھ سے بہتر اور افضل ہیں، میرا ان سے اختلاف صرف قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں ہے، وہ اگر حضرت عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا

(۱) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۲) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۸ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۳) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۴) التاريخ الكامل لابن اثيرؒ تحت ذكر مسير عليٌّ الى البصرة والوقعة ج:۳ ص:۹۲، ۹۳.
(۵) ذكر مسير أمير المؤمنين على بن أبى طالبؓ من المدينة الى البصرة (طبع مطبعة السعادة بجوار محافظة، مصر).
نیز دیکھئے: البداية والنهاية (طبع دار الفكر بيروت) ج:۵ ص:۳۳۴. (محمد زبیر)

میں ہوں گا، (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۵۸، ۲۵۹، و ج:۸ ص:۱۲۹) اس کے بعد اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ محض بہانہ بنایا تھا تو اس کے اطمینان کے لئے شاید کوئی اور بات کافی نہ ہوگی۔

۵:- آپ کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں حضرت معاویہؓ پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، وہ غلط سلط اور موضوع روایات پر مبنی ہیں، اگر صرف صحیح روایات پر بھروسہ کرکے حضرت معاویہؓ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوجاتی ہے، میں نے اپنے مضمون ''حضرت معاویہؓ'' میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ مضمون ''سیرتِ معاویہؓ'' کے اضافے کے ساتھ عنقریب کتابی صورت میں آجائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۶:- یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر میں اپنے مقالے میں مفصل گفتگو کرچکا ہوں، اگر آپ نے اس کا مطالعہ فرمالیا ہوگا تو اُمید ہے کہ اس میں آپ کو تمام سوالات کا جواب مل گیا ہوگا۔

۷:- اس مسئلے پر بھی میں اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

۸:- یزید کا شراب پینا یا زنا کرنا کسی بھی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں ہے، زنا کی روایت تو میں نے کسی بھی تاریخ میں نہیں دیکھی، کسی نے جو شیعہ راوی ہے یزید کا شراب پینا وغیرہ بیان کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت میں اس کا ذکر نہیں، اگر یزید کھلم کھلا شرابی ہوتا تو حضراتِ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس کے ساتھ قسطنطنیہ کے جہاد میں نہ جاتی، اس دور کے حالات کو دیکھ کر ظنِ غالب یہی ہے کہ یزید کم از کم حضرت معاویہؓ کے عہد میں شراب نہیں پیتا تھا اور حدِ شرعی اس وقت قائم ہوسکتی ہے جبکہ دو گواہوں نے پیتے وقت دیکھا ہو، ایسا کوئی واقعہ کسی شیعہ روایت میں بھی موجود نہیں ہے۔

۹:- ابنِ خلدون نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کا فسق ظاہر ہوگیا تھا، اس میں غالباً مجلسِ غناء کا تذکرہ بھی ہے۔

۱۰:- اس زمانے میں مکتوب نگاری کا اُسلوب نہایت مختصر ہوتا تھا، آپ اس دور کے کسی بھی ایسے مکتوب کی مثال نہیں پائیں گے جس میں تفصیل و اطناب سے کام لیا گیا ہو، مختصر خطوط میں سب باتوں کی رعایت ممکن نہیں، پھر کوفہ کے باشندے حضرت حسینؓ کو خواہ کس لئے بلا رہے ہوں، حضرت حسینؓ کا اپنا موقف یہ تھا کہ ایک سلطان متغلب جو، ان کی نظر میں نااہل تھا، ابھی پورے عالمِ اسلام پر غلبہ نہیں پاسکا، اس کے غلبے کو روکنا ان کے پیشِ نظر تھا، اور اسی مقصد کے لئے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس پہلو کو بھی میں اپنے مضمون میں واضح کرچکا ہوں۔

۱۱:- حضرت حسینؓ کے خروج کی شرعی حیثیت میرے مضمون میں موجود ہے، اُمید ہے کہ آپ نے دیکھ لی ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے کہ آپؓ نے پورے خاندان کو لے کر جانا کس وجہ سے مناسب سمجھا

تھا؟ لیکن اگر بالفرض حضرت حسینؓ کو معاذ اللہ غیر مخلص قرار دیا جاتا تب بھی تو یہ سوال باقی رہتا ہے، درحقیقت حضرت حسینؓ کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے لئے کیا، اب چودہ سو سال کے بعد ان کے ایک ایک جزوی اقدام کی ٹھیک ٹھیک حکمت و مصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے نہ ممکن ہے، نہ ضروری۔

۱۲:- یزید کے بارے میں صحیح بات وہی ہے جو میں لکھ چکا ہوں، قانونِ الٰہی کو بدلنے کا کوئی ثبوت کم از کم مجھے نہیں ملا۔

۱۳:- جیسا کہ میں اپنے مضمون میں عرض کر چکا ہوں، یزید ایک سلطان متغلب تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ پورا کنٹرول حاصل کر چکا ہو تو اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے گا، اور اگر اس کا غلبہ روکنا ممکن ہو تو روکنے کی کوشش کی جائے، حضرت حسینؓ سمجھتے تھے کہ اس کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے وہ روانہ ہوگئے اور دُوسرے حضرات صحابہؓ کا خیال تھا کہ اب اس کے غلبہ کو روکنا استطاعت میں نہیں اور اس کو روکنے کی کوشش میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے، اس لئے وہ خود بھی خاموش رہے اور حضرت حسینؓ کو بھی اپنے ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔

۱۴:- ''سر داد ونداد دست در دستِ یزید'' کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے، حضرت حسینؓ شروع میں یہ سمجھتے تھے کہ سلطان متغلب کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے روانہ ہوئے اور اہلِ کوفہ پر اعتماد کیا، لیکن جب عبداللہ بن زیاد کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو کوفیوں کی بدعہدی کا اندازہ ہوا، اس وقت آپ کو یقین ہوگیا کہ اہلِ کوفہ نے بالکل غلط تصویر پیش کی تھی، حقیقت میں یزید کا غلبہ روکنا اب استطاعت میں نہیں ہے، اس لئے انہوں نے یزید کے پاس جاکر بیعت تک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر عبداللہ بن زیاد نے انہیں غیر مشروط طور پر گرفتار کرنا چاہا، اس میں انہیں مسلم بن عقیلؓ کی طرح اپنے بے بس ہوکر شہید ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان کے پاس مقابلہ کے سوا چارہ نہ رہا۔

۱۵:- کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو اس طرح چھان پھٹک کر مرتب کرنا بہت ضروری ہے، لیکن آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں کام بے شمار ہیں، آدمی کم۔ کوئی شخص کیا کیا کام انجام دے؟ آج کل ایک مفصل کتاب میرے زیرِ قلم ہے، کسی اور کام میں لگنا مشکل ہے، تاہم کوشش کروں گا کہ احباب کو اس طرف متوجہ کروں۔ میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن ہجومِ مشاغل کا یہ عالم ہے کہ یہ خط بھی کئی روز میں مختلف نشستوں کے اندر پورا کیا ہے، خدا کرے کہ یہ باعثِ اطمینان ہوسکے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اصل عربی تواریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کے زمانے کے واقعات پڑھنے کا موقع ملا ہے، اور شاید تاریخ کی کوئی کتاب جو آج کل

ملتی ہے چھوٹی نہیں، لیکن بحمداللہ میرا دِل و دِماغ صحابہؓ کی طرف سے بالکل مطمئن ہے، پہلے میں اہلِ سنت کے عقائد کا تقلیداً اگر اتباع کرتا تھا، اب بحمداللہ تحقیقاً ان کا متبع ہوں، اور تمام صحیح وسقیم روایات دیکھنے کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ اس عقیدے پر اور زیادہ شرحِ صدر ہوا ہے، اس موضوع پر والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے ایک مقالہ ''مقامِ صحابہؓ'' کے نام سے لکھا ہے جو اِن شاء اللہ ایک دو ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا، موقع ہو تو اس کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۹؍ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۰۴ الف)

کس قسم کی غلطی کو ''اجتہادی غلطی'' قرار دیا جائے گا؟

سوال:- مکرمی ومحترمی مولانا محمد تقی عثمانی ایڈیٹر ''البلاغ'' کراچی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بعد عرض یہ ہے کہ ذوالحجہ کا خصوصی ایڈیشن ماہنامہ ''البلاغ'' نظر سے گزرا، پڑھ کر دِل مطمئن ہوا لیکن ایک عبارت پر چند شکوک ذہن میں پیدا ہوئے۔ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا منشاء اس عبارت سے معلوم کرسکوں، عبارت درج ذیل ہے:-

''لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تأویل کی بنا پر صادر ہوا تھا، اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اُخروی اَحکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے ذبح کر دینا اور پھر اسے کھانا دلائلِ قطعیہ کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائلِ شرعیہ کی رُو سے گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بناء پر صادر ہوا اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔'' (''البلاغ'' ۱۳۹۰ ص:۷۲)

میرا اس عبارت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کی آیتوں کا انکار کرتا چلا جائے تو آپ اس کو دیانت دارانہ اجتہاد کہیں گے؟ اور اس کی نیت کو دیکھیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی دِلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے تو آپ کیسے دعوے کر رہے ہیں؟ اگر مرزائی قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کرتے جائیں اور یہ کہیں کہ ہماری نیت ٹھیک ہے اور ہم دیانت داری سے کرتے ہیں، تو کیا وہ آپ کے نزدیک ٹھیک ہوگا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا مودودی نے یہ اجتہادی غلطی کی تو آپ اس کا کیا

جواب دیں گے؟

یہ شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے اس لئے ان شکوک کو دُور کرنے کے لئے آپ کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں، مہربانی فرما کر آپ میرے شبہات دُور کر کے خدا کے ہاں اَجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں۔

جواب:- محترمی و مکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا، کسی شخص کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دینے کے لئے میں نے جو دو شرطیں عرض کیں، وہ غالباً آپ کی نگاہ سے اوجھل رہ گئیں، اس کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا، میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کا اہل ہے، یعنی اس میں وہ علمی و عملی صلاحیت پائی جاتی ہے جو تمام اُمت نے مجتہد کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور اپنے مسلک کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر رکھتا ہے خواہ وہ دلیل ہمیں کمزور معلوم ہوتی ہے تو اس کا یہ عمل ''اجتہاد'' کہلائے گا، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو وہ ''اجتہادی غلطی'' ہوگی۔ امام شافعیؒ نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کی بناء پر یہ مسلک اختیار کیا کہ بغیر بسم اللہ پڑھے بھی ذبیحہ دُرست ہے۔[1] اور قرآنِ کریم کی آیات کو ''مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ'' پر محمول کیا، ساری اُمت نے اسے اجتہادی غلطی اس لئے قرار دیا کہ ان میں اجتہاد کی شرائط پوری طرح پائی جاتی تھیں، اور یہ مسلک بہرحال ایک شرعی دلیل پر مبنی ہے جو کمزور سہی لیکن اجتہاد کی حدود میں داخل ہے۔

آپ نے یہ سوال بڑا اچھا کیا ہے کہ پھر آج کل دُوسرے لوگ اگر اسی اجتہاد کو بہانہ بنا کر قرآن و سنت میں غلطیاں کرنے لگیں تو ان کو کیا کہا جائے گا؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرائطِ اجتہاد کا حامل ہو تو اس کی غلطی کو اجتہادی غلطی کہیں گے، لیکن جن لوگوں کی آپ نے مثال دی ہے ان میں شرائطِ اجتہاد مفقود ہیں، اس لئے ان کی غلطی کو اجتہادی غلطی نہیں کہہ سکتے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایک غلطی کوئی مجتہد کرے تو باعثِ ثواب اور اگر غیر مجتہد کرے تو باعثِ ملامت، یہ بے انصافی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر ایک سند یافتہ ڈاکٹر کسی مریض کو کسی غلط فہمی کی بناء پر غلط دوا دیدے اور اس سے مریض کا کام تمام ہوجائے تو اگر یہ ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشے کی بجاآوری میں دیانت داری سے وہ دوا دی تھی، تو دُنیا کا کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دیتا، اس کے برخلاف اگر وہی دوا کوئی غیر سند یافتہ عطائی کسی مریض کو دے اور اس سے اس کی موت واقع ہوجائے تو دُنیا کا ہر قانون اس پر گرفت کرتا ہے۔

---

(۱) وفی المجموع شرح المهذب، باب الأضحية ج:۹ ص:۴۵۲ (طبع جديد، دار الكتب العلمية بيروت) فرع فى مذاهب العلماء فى التسمية علىٰ ذبح الأضحية وغيرها من الذبائح .... مذهبنا أنها سنة فى جميع ذٰلك، فان تركها سهوًا أو عمدًا حلّت الذبيحة ولا اثم عليه. نیز دیکھئے: روضة الطالبين ج:۳ ص:۲۰۵۰ (طبع المكتب الاسلامى).

یہ فرق اس لئے ہے کہ غلطی سے دُنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے ذمہ یہ ضروری تھا کہ غلطی سے بچنے کے جتنے اسباب و وسائل ہو سکتے ہیں ان کو پوری طرح اختیار کرے، جو شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب یہ ہیں کہ وہ فنِ طب کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان سے سند لے، اس کے بعد اس سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ ایسی غلطی ہے جس سے کوئی انسان محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک عالم کے لئے ظاہری وسائل یہ ہیں کہ وہ قرآن و سنت کا پورا علم باضابطہ حاصل کرے، ماہر اساتذہ سے اس کی تربیت لے، اس کے بعد وہ غلطی کرے گا تو یہ ایک ماہر ڈاکٹر کی غلطی کی طرح قابلِ ملامت نہ ہوگی، اس کے برخلاف جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس کی مثال عطائی کی سی ہے کہ اس کی غلطی قابلِ ملامت اور موجبِ گرفت ہے۔

یاد آوری کے لئے شکر گزار ہوں اور دُعا کی درخواست ہے۔ والسلام

۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۶ الف)

﴿فصل فی تعلیم القرآن وتعظیمه وتلاوته﴾

(قرآنِ کریم کی تعلیم، تعظیم، تلاوت اور آداب سے متعلق مسائل کے بیان میں)

قصص القرآن کی فلم بندی کا شرعی حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ایک فلم قصص القرآن کے نام سے جاری کی گئی ہے، جس کے اندر مختلف قرآنی واقعات کو فلم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کے ذبح کا واقعہ، فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اور بنی اسرائیل کے خروج کا واقعہ، فلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شبیہ نہیں دِکھائی گئی، بلکہ کسی اور شخص کی زبانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اَحکام بنی اسرائیل تک پہنچائے گئے ہیں۔

ایسی فلم کو دیکھنے اور دِکھلانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ براہِ کرم مدلل بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- قرآنِ کریم کے واقعات کی مصوّر فلم بنانا، دیکھنا اور دِکھانا ہرگز جائز نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کی بناء پر اس عمل میں شدید وبال کا اندیشہ ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱:- قرآنِ کریم کے مضامین جس عظمت و جلال کے حامل ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان مضامین کو قرآنِ کریم ہی کے الفاظ میں پورے ادب و احترام کے ساتھ پڑھا، یا سنا جائے، اس کے برعکس پیشہ ور اداکاروں اور بہروپیوں کو مقدس قرآنی شخصیتوں کی مصنوعی شکل میں پیش کرکے ان سے قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کی مصنوعی نقالی کرانا، آیاتِ قرآنی کو کھیل تماشہ بنانے کے مرادف ہے، جو بنصِ قرآنی حرام ہے، آیت ہے:-

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ .... الخ.

(سورۃ انعام:۷۰)

۲:- کوئی فلم جانداروں کی تصاویر سے خالی نہیں ہوتی، اور جانداروں کی تصاویر بنانا، دیکھنا اور

دِکھلانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرآنی مضامین کو ایسے ذرائع سے پیش کرنا جو درجنوں احادیث کی رُو سے ناجائز ہے، نہ صرف حرام بلکہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۳:- واقعات کی فلم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس میں عورتوں کے کردار نہ ہوں، چنانچہ مذکورہ فلم میں بھی کردار موجود ہیں، اور خواتین کے بے حجاب مردوں کے سامنے آنا یا ان کی تصاویر کا بلاضرورت نامحرَموں کو دِکھلانا قرآن و حدیث کی رُو سے بالکل ناجائز ہے، اور ناجائز کام کو قرآنِ کریم کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی نہ صرف حرام بلکہ معاذ اللہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۴:- کسی سچے سے سچے واقعے کو بھی جب فلم کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں فلم ساز کے فرضی تخیلات کی آمیزش ناگزیر ہے، اس کے بغیر عموماً کوئی فلم تیار نہیں ہوسکتی، فلم ساز کو ایک مربوط فلم بنانے کے لئے لامحالہ واقعات کے خلاء کو اپنے فرضی قیاسات سے پُر کرنا پڑتا ہے، اور کچھ نہیں تو متعلقہ اشخاص کی شکل و شباہت، ان کی تعداد، ان کے انداز نشست و برخاست، ان کے اِردگرد پائے جانے والے ماحول، پسِ منظر اور ان کے عادات و خصائل کو لازماً قیاسی مفروضات کی بنیاد پر پیش کرنا پڑے گا، اور فلم میں ان سب باتوں کو قرآنِ کریم سے ممتاز نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ سارے قیاسات قرآنِ کریم ہی کی طرف منسوب کئے جائیں گے جو قرآنِ کریم کی معنوی تحریف کے مشابہ ہے۔

زیرِ بحث فلم کے بارے میں بھی ذمہ دار فلم دیکھنے والوں نے بتلایا ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کے ساتھ بہت سی اسرائیلی روایات اور فرضی تخیلات کو قرآنی واقعات کے ساتھ شامل کردیا گیا ہے، اور جن ناواقف لوگوں کو قصص القرآن سے واقف کرانے کے موہوم شوق میں یہ فلم دِکھلائی جارہی ہے، ان کے لئے قرآن اور غیرِ قرآن میں امتیاز کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ اس سارے مجموعے ہی کو قرآنی مضامین سمجھیں گے اور ان کو قرآنِ کریم کے بارے میں اس سنگین غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس فلم کو بنانے یا دِکھانے کے ذمہ دار ہیں۔

۵:- قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات میں بہت سے مقامات پر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کی ایک سے زیادہ تشریحات ممکن ہیں، اور ان میں سے کسی ایک تشریح کو یقینی اور قطعی طور پر کسی دُوسرے احتمال کے بغیر قرآنِ کریم کی حقیقی مراد قرار دینا جائز نہیں، مفسرین جب ایسی آیات کی تشریح کرتے ہیں تو عام طور سے ممکنہ احتمالات ذکر کردیتے ہیں، ورنہ کم از کم کسی نہ کسی صورت سے یہ واضح کردیتے ہیں کہ اتنی بات قرآنِ کریم کی ہے اور اتنی تفسیر کی، تاکہ قرآن کا غیرِ قرآن سے ملتبس ہونا

لازم نہ آئے، یہ صورت فلم میں کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ فلم ساز کے ذہن میں مذکورہ آیت یا واقعے کی جو تفسیر ہے صرف اسی کو لازماً قرآنی مضمون کی شکل میں اس طرح پیش کیا جائے گا کہ اس میں کوئی دُوسرا احتمال نہیں ہوگا اور فلم کے زور سے اسی تفسیر کا نقش ذہن پر اس طرح قائم کردیا جائے گا کہ گویا اس فلم میں بیان کردہ تصویر عینِ قرآن ہے، یہ صورت بھی قرآن اور غیرِ قرآن کے درمیان التباس پیدا کرنے کا موجب ہے، اس لئے بھی یہ فلم بالکل ناجائز ہے۔

۶:- فلم کا اصل منشاء تعلیم و تبلیغ نہیں ہوتا، بلکہ تفریحِ طبع اور کھیل تماشوں سے لذّت حاصل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس فلم کو دیکھنے والے دراصل تفریحِ طبع کی غرض سے فلم دیکھیں گے نہ کہ علم، عبرت یا نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اگر یہی مضامین اپنی اصلی صورت میں وعظ و تذکیر کے لئے بیان کئے جاتے تو یہ لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور قرآنی مضامین کو سننے سنانے کا مقصدِ اصلی کھیل تفریح کو بنالینا کسی طرح جائز نہیں، بلکہ اس کا مقصدِ اصلی عبرت اندوزی ہے، اس کے ضمن میں تنشیط و تفریح بھی حاصل ہوجائے تو اور بات ہے، لیکن کھیل تفریح کو اصل قرار دے کر اسی کو مقصدِ اصلی بنالینا ہرگز جائز نہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر، نیز دُوسرے متعدّد مفاسد کے پیشِ نظر ایسی فلم بنانا، دیکھنا، دِکھانا سب ناجائز ہے، مسلمانوں کو اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہئے اور حکومت کا بھی فرض ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایسی فلمیں دِکھانے سے باز رہے بلکہ آئندہ اس قسم کی فلموں کی نمائش کا مکمل طور پر سدِ باب کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۴/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۹۹/۳۵ د)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	اصغر علی ربانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت، کلمہ، دُرود پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا ایامِ حیض میں عورت، سورت یا کلمہ اور دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھنے میں

مضائقہ نہیں۔[1]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

قرآنی آیات والے اخبارات کی بے حرمتی کرنا

سوال:- مولانا احتشام الحق صاحب جو جمعہ کو اخبار میں آیتیں چھپواتے ہیں، وہ دُکاندار، ردّی میں پھینک دیتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ، رسول کا نام یا قرآنی آیات و احادیث لکھی یا چھپی ہوں ان کو بے حرمتی کی جگہ ڈالنا دُرست نہیں ہے۔[2]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی

جن کتابوں میں قرآنی آیات بھی ہوں انہیں حالتِ حیض میں پڑھنا اور چھونا، اور حالتِ حیض میں تلاوت و اذکار جائز ہیں یا نہیں؟

سوال ۱:- عورت کے لئے حالتِ حیض میں ایسی کتابوں کو چھونا اور پڑھنا جن میں چند آیات کلامِ پاک کی لکھی ہوتی ہیں جائز ہے یا نہیں؟ ان آیات کو چھوڑ کر صرف ترجمہ، تفسیر اور مطلب پڑھ لیا جائے؟

۲:- ایسے زمانے میں زبانی کلامِ پاک، کلمہ جات، دُرود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اس معاملے میں اُصول یہ ہے کہ اگر کتاب کا اکثر یا آدھا حصہ قرآنی آیات پر مشتمل ہے تو حالتِ حیض و نفاس اور جنابت میں اس کا چھونا جائز نہیں، اور اگر کتاب کا اکثر حصہ غیرِ قرآن ہے تو اس کو اس مقام سے چھونا جائز ہے جہاں قرآنی آیات لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

قال الشامی: ان کان التفسیر أکثر لا یکرہ، وان کان القرآن أکثر یکرہ، والأولیٰ الحاق المساواۃ بالثانی، وھٰذا التفصیل ربما یشیر الیہ ما ذکرناہ عن النھر، وبہ یحصل

---

(۱) وفی الدر المختار باب الحیض، ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید) ویمنع قراءۃ قرآن .... ولا بأس لحائض وجنب بقراءۃ أدعیۃ ومسھا وحملھا وذکر اللہ تعالیٰ وتسبیح. مزید حوالہ جات اگلے صفحے کے حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے آگے صفحہ نمبر:۱۹۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

التوفیق بین القولیین. (شامی ج:۱ ص:۱۶۴ طبع استنبول)۔[۱]

۲:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل ناجائز ہے، البتہ دُعائیں، اذکار و اوراد اور احادیث وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔[۲]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۵/۱۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۸/۱۸ الف)

شبینہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت، اس پر اُجرت اور سجدۂ تلاوت وغیرہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

چند سال سے سہلٹ کے اطراف میں شبینہ کے نام سے ایک نئی قسم کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں جو عموماً مغرب سے طلوعِ آفتاب کے دو ایک گھنٹہ بعد تک باقی رہتی ہیں ..... حاضرین کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وہاں مائیکروفون کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، لیکن شاید ہی کوئی ایسی مجلس مائیکروفون سے خالی رہتی ہے، حاضرینِ مجلس اکثر سوتے رہتے ہیں، کوئی خراٹے لیتا ہے، کوئی اُونگھتا ہے، کوئی باہر بیڑی سگریٹ پی رہا ہے، اس کی بدبو مجلس تک آتی رہتی ہے ..... گھر کے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمہ تن متوجہ ہوکر تلاوتِ کلامِ پاک سنتے ہیں، اکثر لوگ اپنے خانگی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، گھر کے سونے والوں کے لئے یہ آواز حرجِ عظیم ہوا کرتی ہے، واعظین حضرات تلاوتِ قرآن ہوتے وقت بھی چائے نوش کرتے ہیں، پان کھاتے ہیں، کبھی کبھار آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں، کوئی سوئے ہوئے، تو کوئی بیٹھے ہوئے ہیں، بانیٔ مجلس کی طرف سے ان کو روپے ملتے ہیں، کم ہونے پر برہمی ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پہلے سے روپے کا تصفیہ کرلیتے ہیں۔ اکثر واعظین مدارس کے مدرّس ہوتے ہیں اور ان مجلسوں کا سلسلہ عموماً ماہ کاتک سے ماہ بیساکھ تک جاری رہتا ہے، سو واعظ صاحب اس تقریب کی وجہ سے مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ بھی لیتے ہیں، علاوہ ازیں طویل

---

(۱) شامی ج:۱ ص:۱۷۷ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) فی اعلاء السنن ج:۱ ص:۲۶۶ (طبع ادارة القرآن) عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القرآن. أخرجه الترمذی ج:۱ ص:۱۹ (طبع فاروقی کتب خانه). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۳ یمنع حل (دخول المسجد) الی قوله (وقراءة قرآن) بقصده ومسه الا بغلافه. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شیئًا من القرآن، والأیة وما دونها سواء فی التحریم علی الأصح، الا أن لا یقصد بمادون الأیة القراءة مثل أن یقول: "الحمد للہ" یرید الشکر، أو "بسم اللہ" عند الأکل أو غیره فانه لا بأس به. وفی الدر المختار مع رد المحتار باب الحیض ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع سعید) ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعیة ومسها وحملها وذکر اللہ تعالٰی وتسبیح.

سات مہینے میں وقتاً فوقتاً شب بیداری کی وجہ سے درسی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے، بعض ایک ہی مدرسہ کے تین چار ایسے واعظ اساتذہ باہر رہا کرتے ہیں، اس سے مدرسہ کا جو تعلیمی نقصان ہوتا ہے وہ خارج عن البیان ہے۔

سوال ۱:- ایسی مجلس میں مائیکروفون لاکر اس کا کرایہ دینا بیجا خرچہ کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب:- جب مجلس کے حاضرین تک بغیر لاؤڈ اسپیکر کے آواز پہنچ جاتی ہے تو لاؤڈ اسپیکر لگانا ''غیرضروری'' بلکہ مضر ہے، لہٰذا یہ اِسراف میں داخل ہے۔

سوال ۲:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں کلامِ پاک کی تلاوت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر اس کی آواز ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو مجلس میں حاضر نہیں اور ان کی نیند وغیرہ میں خلل اندازی ہوتی ہے یا اس سے تلاوتِ کلامِ پاک کی بے حرمتی کا امکان ہے تو مائیکروفون میں تلاوت کرنا دُرست نہیں۔

قال فی رد المحتار وعلیٰ ھذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم. (شامی ج:۱ ص:۵۰۹)[1]۔

سوال ۳:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیرِ اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا، اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

سوال ۴:- کہتے ہیں کہ آدابِ تلاوت مجلسِ تلاوت کے لئے محدود ہیں، جب مائیکروفون میں تلاوت ہوگی تو مجلس کی تعریف میں اور توسیع ہوگی یا نہیں؟

جواب:- جی نہیں، مجلسِ تلاوت اسی جگہ کو کہا جائے گا جہاں حقیقتاً تلاوت ہو رہی ہے، لہٰذا بلاضرورت مائیکروفون پر تلاوت کی جائے تو باہر سننے والے عدمِ استماع وغیرہ میں معذور ہوں گے اور اس کا گناہ تلاوت کرنے والوں پر ہوگا۔

یجب علی القاری احترامه بأن لا یقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فیھا کان ھو المضیع لحرمته فیکون الاثم علیه دون أھل الاشتغال. (رد المحتار ج:۱ ص:۵۱۰)[2]۔

سوال ۵:- تلاوتِ قرآنِ پاک کے وقت سامع کو چائے نوش کرنا، پان کھانا یا گفتگو کرنا،

(۱) شامی فروع فی القراءة خارج الصلوٰة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) شامی مطلب الاستماع للقرآن فرض کفایة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع سعید).

مجلس میں لیٹنا کیسا ہے؟

جواب:- اگر تلاوتِ قرآن، شرائط کی رعایت کے ساتھ کی جارہی ہو تو سامعین کا چائے پینا، پان کھانا، لیٹنا یا اور کوئی ایسا کام کرنا جس سے تلاوت کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہو کراہت سے خالی نہیں۔

سوال ۶:- واعظ مدرّس کو صاحبِ مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسہ سے باضابطہ رُخصت لی ہے اور وعظ پر اُجرت لینے کا کوئی معاہدہ منتظمینِ مدرسہ سے نہیں ہوا، تو جائز ہے۔

سوال ۷:- کسی مدرّس صاحب کا ایسی مجلسوں میں ہمیشہ ہمیشہ جاکر مدرسہ سے غیر حاضر رہ کر اور اکثر اوقات بغیر مطالعہ درس دے کر مدرسہ یا طلبہ کو نقصان پہنچانا کیسا ہوگا؟

جواب:- مجلس اگر ان منکرات پر مشتمل نہ ہو جن کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے تو کبھی کبھی اس میں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو اس طرح روزانہ کا معمول بنالینا اور ایسا مشغلہ بنالینا کہ مطالعے کی فرصت نہ ملے جس سے مدرسہ کا نقصان ہو دُرست نہیں، اس صورت میں ان کی تنخواہ حلال طیب نہ رہے گی۔

سوال ۸:- واعظ صاحب کو عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد اُخروی ثواب کی اُمید باقی رہتی ہے یا نہیں؟

جواب:- وعظ اگر اُجرت لینے کے مقصد سے نہیں کیا گیا، تو اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے، خواہ منتظمینِ وعظ کچھ ہدیہ، عطیہ دے دیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۹/۱/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۰/۱۹ الف)

قرآنی آیات والے اخباری تراشوں کی بے حرمتی کرنا

سوال:- جو لوگ قرآنی آیات اخباروں میں درج کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے اور اس سے قرآن کی بے حرمتی نہیں ہوگی؟

جواب:- جس کاغذ پر قرآنی الفاظ لکھے ہوئے ہوں، اس کی بے حرمتی کرنا جائز نہیں،[1] اخبارات میں بہتر یہی ہے کہ صرف ترجمہ لکھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں تلاوت کا حکم

سوال:- آج کل قاریوں کی ایک جماعت ہے جو طرح طرح سے قرآن پڑھا کرتے ہیں، کبھی اعراب والا حرف بغیر اعراب کے پڑھتے ہیں، اور کبھی دو جملوں کو الگ الگ پڑھا کرتے ہیں، بعض لوگوں سے دریافت کیا تو کہا کہ اعراب کی غلطی کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- یہ قاری صاحبان غالباً حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں پڑھتے ہوں گے، لیکن ہمارے ملک میں نمازوں میں اور عوامی محفلوں میں حفص کے علاوہ کسی دُوسری قراءت میں پڑھنے کو فقہاء نے منع کیا ہے تاکہ عوام تشویش میں نہ پڑیں، اس لئے انہیں اسے نہ پڑھنا چاہئے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

سات قراءتوں کے مطابق تلاوتِ قرآن کا حکم

سوال:- قرآن مجید پڑھنے کے کتنے طریقے ہیں؟ رمضان میں ایک قاری صاحب کی قراءت سے مستفید ہوا، قراءت کا طریقہ انتہائی جدا تھا، مثلاً کھڑی زبر کو وہ زیر کے طریقے سے کھینچتے تھے، مثلاً: "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" کو "مَـلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" پڑھتے تھے، اور شاید "مِـلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" بھی پڑھتے ہیں، مثلاً: "مَـغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" کو بھی اسی طرح پڑھتے تھے یعنی "عَلَیْهِمُ" معلوم کرنے پر فرمایا کہ تقریباً ۷ یا ۱۰ طریقے ہیں تلاوتِ کلام اللہ کے، غالباً اس طریقے کی تلاوت حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی مدظلہم بھی اکثر فرماتے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے ص:۱۹۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

جواب:- قرآنِ کریم کا سات حروف پر نازل ہونا بخاری ومسلم وغیرہ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے،[۱] جو معنیً متواتر ہیں، ان سات حروف کے مطابق قرآنِ کریم کی تلاوت کے متعدد طریقے ہیں اور ان سب پر تلاوتِ قرآن جائز ہے۔ "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" میں ایک قراءت "مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْن" بھی ہے، "مِلکِ یَوْمِ الدِّیْن" کوئی قراءت نہیں، اسی طرح "عَلَیْہِمْ" کے بجائے "عَلَیْہُمْ" پڑھنا بھی بعض قراءتوں میں دُرست ہے، اس مسئلے کی مکمل تحقیق کے لئے احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' کی طرف رُجوع فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۶/۲۸ ج)

قرآنِ کریم کو چومنے کا حکم

سوال:- قرآن شریف کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

ٹیپ ریکارڈ پر تلاوتِ قرآن سننے کا حکم

سوال:- حضرت جی! عرض یہ ہے کہ بندہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، اور تمام اعمال میں جڑنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور الحمدللہ علمائے حق دیوبند کا خدمت گزار ہے۔

مؤرخہ ۲۰۰۱/۸/۱۷ء کو علاقائی جوڑ کے سلسلے میں مرکز رائے ونڈ حاضری ہوئی، وہاں ایک مبلغ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ میں قرآن سننا، رنڈی کا گانا سننے جیسا ہے، اور مزید کہا کہ یہ فتویٰ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے دیا ہے۔

عریضہ ہٰذا کے ذریعہ عرض یہ کرنا ہے کہ اگر حضورِ والا نے اس قسم کا فتویٰ دیا ہے تو اس کی فوٹو کاپی ارسال فرمائیں، جوابی لفافہ لف ہے۔

بصورتِ دیگر اس پورے مسئلے میں شرعی نقطۂ نگاہ واضح فرمائیں، جزاکم اللہ خیراً!

---

(۱) وفی صحیح البخاری ج:۲ ص:۷۴۶ باب أنزل القراٰن علٰی سبعة أحرف، ان ابن عباس حدثه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: أقرأنی جبریل علٰی حرف فراجعته فلم أزل أستزیده ویزیدنی حتّٰی انتهٰی الٰی سبعة أحرف. وفیه أیضًا .... قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذٰلک أنزلت أن هٰذا القراٰن أنزل علٰی سبعة أحرف فاقرؤا ما تیسر منه.

(۲) فی الدر المختار ج:۶ ص:۳۸۴ تقبیل المصحف قیل: بدعة، ولٰکن روی عن عمر رضی الله عنه أنه یأخذ المصحف کل غداة ویقبله ویقول: عهد ربی ومنشور ربی عز وجل، وکان عثمان رضی الله عنه یقبل المصحف ویمسحه علٰی وجهه. (مرتب عفی عنه)

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استغفر اللہ! بندہ نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا، نہ یہ بات دُرست ہے، جن صاحب نے بھی یہ بات کہی ہے انہوں نے غیر ذمہ داری سے میری طرف غلط بات منسوب کی ہے، ان کو میرا یہ خط دِکھا کر بتادیں کہ آئندہ کسی کی طرف کوئی بات منسوب کرنے سے پہلے تحقیق کرلیا کریں۔ کیسٹ میں قرآن کریم سننا بالکل جائز ہے، اور اسے معاذ اللہ گانے سے تشبیہ دینا میرے نزدیک سخت گستاخی ہے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۶/۲۸ھ

تلاوت کے موقع پر نیند آنا

سوال:- جب بھی ہم قرآن کی تلاوت کرنے بیٹھتے ہیں تو ہمیں نیند آنے لگتی ہے، اس کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں۔

جواب:- اگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہو تو نیند آنے پر تلاوت چھوڑ دیں، لیکن اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو تو نیند بھگانے کے لئے کسی طبیب سے مشورہ کرکے کوئی تدبیر اختیار کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۰/۲۹ الف)

قرآنی آیات والے اخبارات وکاغذات کی بے حرمتی کا حکم

سوال:- اخبارات واشتہارات میں عباراتِ قرآن واحادیث کا چھاپنا اور ان کی بے حرمتی کرنا کیسا ہے؟ اور اس کی روک تھام کیسے کی جائے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لکھا، یا چھپا ہوا ہو ان کو بے حرمتی کے مقامات پر رکھنا یا پھینکنا بالکل ناجائز ہے[1]، انسان کو چاہئے کہ خود بھی اس سے پرہیز کرے اور جس حد تک ممکن ہو دُوسروں کو بھی اس سے روکے، اگر ہر شخص اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرکے اس بات کا اہتمام کرے تو اس فعلِ ناجائز کا شیوع بڑی حد تک رُک سکتا ہے۔

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ

(۱) دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کا حکم

سوال:- قرآنِ پاک کے ایسے نسخے جو بوسیدہ ہوچکے ہوں اور تلاوت کے لئے استعمال نہ ہوتے ہوں، اور ایسے ہی پُرانے بوسیدہ سپارے اور ان کے منتشر اوراق، اسلامی رسائل اور کتابچے جن میں قرآنِ پاک کی آیات اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں ان کو اس نیت پر کہ ان کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو اور ان کی راکھ کو کسی محفوظ مقام پر دفن یا سمندر بُرد کردیا جائے گا، جلانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری ج:۲ باب فضائلِ قرآن ص:۷۴۶ پر حدیث ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن جلانے کا حکم فرمایا ہے، شرعی حکم قرآن وحدیث اور فقہِ حنفی کی رُو سے عنایت فرمائیں۔

جواب:- فقہائے حنفیہ نے ترجیح اس کو دی ہے کہ قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کو جلانے کے بجائے یا تو کسی محفوظ جگہ پر دفن کردیا جائے یا اگر وہ اوراق دُھل سکتے ہوں تو حروف کو دھوکر ان کا پانی کسی کنویں یا ٹنکی وغیرہ میں شامل کردیا جائے، اور دفن کرنے کے لئے بھی بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان اوراق کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے، اگر یہ دونوں کام مشکل ہوں تو ان اوراق کو کسی دریا، سمندر یا کنویں میں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔

فی الدر المختار الکتب التی لا ینتفع بها یمحی عنها اسم الله وملائكته ورسله ويحرق الباقی، ولا بأس بأن تلقی فی ماء جار كما هی أو تدفن وهو أحسن كما فی الانبياء. وفی الشامية تحته: المصحف اذا صار خلقًا، تعذر القراءة منه لا يحرق بالنار، اليه أشار محمد وبه نأخذ، ولا يكره دفنه، وينبغی أن يلف بخرقة طاهرة ويلحد له، لأنه لو شق ودفن يحتاج الى اهالة التراب عليه. (شامی حظر و اباحت اواخر فصل البیع).[۱]

اور بعض علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل سے استدلال کرکے قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کو نذرِ آتش کرنے کی بھی اجازت دی ہے، لیکن دُوسرے علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے جن مصاحف کو نذرِ آتش کیا تھا وہ تمام تر قرآنِ کریم نہ تھے، بلکہ ان میں تفسیری اضافے وغیرہ بھی درج

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۴۲۲ (طبع ایچ ایم سعید) وفی بریقة محمودية ج:۴ ص:۱۹۸ الكتب التی يستغنی عنها وفيها اسم الله تعالٰی تلقی فی الماء الكثير الجاری أو تدفن فی أرض طيبة ولا تحرق بالنار وفی التاتارخانية المصحف الذی خلق وتعذر الانتفاع به لا يخرق بل يلف بخرقة طاهرة ويحفر حفيرة يلحد بلا شق أو يجعل سقفًا ويدفن أو يوضع بمكان طاهر لا يصل اليه الغبار والأقذار، وفی السراجية يدفن أو يحرق اهـ ملخصًا، وكذا عن منية المفتی وعن المجتبی، الدفن افضل من الإلقاء فی الجاری كالانبياء وكذا جميع الكتب وفی التاتارخانية الأفضل أن يغسلها ويأخذ القراطيس .... وأقول الراجح هو الدفن أو الغسل لا الإحراق .... وكذا فی الهندية.
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۵۴، کفایت المفتی ج:۱ ص:۱۱۷، ۱۱۹، امداد المفتین ص:۲۳۸، و امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۳۷، ۱۵۷. (محمد زبیر عفی عنہ)۔

تھے، اگر وہ خالص قرآن ہوتے تو آپؓ انہیں نذرِ آتش نہ فرماتے، چنانچہ مُلّا علی قاریؒ لکھتے ہیں:-

قال ابن حجر: وفعل عثمانؓ یرجّح الإحراق وحرقه بقصد صیانته بالکلیة لا امتهان فیه بوجه .... والقیاس علٰی فعل عثمان لا یجوز، لأن صنیعه کان بما ثبت أنه لیس من القرآن أو مما اختلط به اختلاطا لا یقبل الانفکاک، وانما اختار الإحراق لأنه یزیل الشک فی کونه ترک بعض القرآن، اذ لو کان قرانا لم یجوز مسلم أن یحرقه ویدل علیه أنه لم یؤمر بحفظ رماده من الوقوع فی النجاسة. (مرقاة المفاتیح ج:۵ ص:۲۹)۔[1]

خلاصہ یہ کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے اوراق کو جلانے کے بجائے دفن کیا جائے، لیکن چونکہ بعض علماء نے جلانے کی بھی اجازت دی ہے اور اس کا مأخذ بھی ہے، اس لئے اگر کوئی نذرِ آتش کرے تو اسے حرام کہنا بھی مشکل ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ

تلاوت سننے میں قاری کی خوش الحانی کی طرف متوجہ ہونا اور ایک ہی سانس میں کئی آیات پڑھنے کو وجہِ فضیلت سمجھنا

سوال:- آج کل کراچی میں محافلِ قراءت ہو رہی ہیں، جن میں بیرونِ ملک سے قاری صاحبان آتے ہیں اور کلامِ پاک سناتے ہیں، اس پر زید اس طرح تبصرہ کرتا ہے: ''یہ جو آج کل کراچی میں قراءت کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں ان کی شکل بالکل مشاعروں کی طرح ہوتی ہے، جس طرح ایک شاعر اپنا کلام سنا کر دادِ تحسین حاصل کرتا ہے، پھر دُوسرا آتا ہے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا ہے، جس شاعر کے کلام پر زیادہ داد ملتی ہے وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا، اور جس کلام پر واہ واہ نہیں ہوتی وہ منہ لٹکائے چلا جاتا ہے اور بہت دِلگیر ہوتا ہے۔ کیا قرآنِ پاک جو اللہ کا کلام ہے وہ اس حد تک نعوذ باللہ اُتار دیا جائے کہ لوگ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور مائک پر آکر گلے بازیاں کریں اور وہ قاری جس کی آواز اچھی ہو اس پر لوگ جھومنے لگیں، اور جو سادہ پڑھے اس پر لوگ منہ بسورتے رہیں اور اس پر توجہ نہ دیں، کیا یہ قرآن کی بے حرمتی نہیں ہے؟ اگر ایسا شوق ہے تو جمعہ کے دن مساجد میں کسی قاری کو موقع دیا جائے اور لوگ سنیں، اس طرح قرآن کا احترام اور قاری کا احترام باقی رہے گا، مگر اس قسم کے مقابلوں میں لوگ مسلمان ہونے کی حیثیت سے براہِ راست قرآن کو تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کے تأثرات سے قرآن کی عظمت کو ٹھیس پہنچتی ہے، جو ایک مسلمان کے حساس قلب کے لئے تکلیف دہ ہے۔''

---

(۱) (طبع مکتبہ امدادیہ، ملتان).

اس قسم کے تبصرے پر مجلس میں بہت سے لوگ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس رائے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ سب جہالت ہے، اس سے محفلِ قراءت کی مخالفت ہوتی ہے وغیرہ، شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کا سننا کارِ ثواب ہے، البتہ اس میں صرف قاری کی خوش الحانی پر نگاہ رکھنا دُرست نہیں، اور نہ ایک سانس میں کئی آیتیں پڑھنے کو وجۂ افضلیت قرار دینا دُرست ہے، اصل نظر قرآن کے مضامین پر ہونی چاہئے، اور جو نہ سمجھ سکیں وہ اس بات کی طرف نظر کریں کہ قرآنِ کریم کا صحیح تلفظ کس طرح ہوتا ہے۔　واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

بلاشبہ داد لینے اور تعریف کرانے کے لئے تلاوت کرنا سخت منع ہے، اس نیت سے تلاوت کرنے والوں اور داد دینے والوں کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان کے قلوب فتنے میں پڑے ہوں گے۔

فقال علیہ الصلٰوۃ والسلام: سیجئ أقوام یقیمونہ کما یقام القدح یتعجلونہ ولا یتأجلونہ. وفی روایۃ: وسیجئ بعدی قوم یرجّعون بالقرآن ترجیع الغناء والنوح لا یجاوز حناجرھم مفتونۃ قلوبھم وقلوب الذین یعجبھم شأنھم. (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان) مشکوٰۃ ص: ۱۹۱ـ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔[1]

اور قرآن شریف کو کانوں کی نمائش کا ذریعہ بنانا ہی بے ادبی ہے، نیتوں کو اللہ خوب جانتا ہے، سب اپنی اپنی نیت کا جائزہ لیں۔　کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الٰہی بلندشہری عفی عنہ
۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

قرآنِ کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال:- کسی عدالت میں مخالف پارٹی اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے آدمی رُوبرو آفیسر قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر باری باری بیان دیں، یہ ہمارے دینِ اسلام میں جائز ہے یا ناجائز، جبکہ ان کا وضو نہ ہو؟ کیا قرآن شریف پر بیان دینا اور بغیر وضو قرآن شریف کو ہاتھ لگانا جائز ہے؟

---

(۱) وفی المرقاۃ شرح المشکوٰۃ ج:۵ ص:۱۲، ۱۳ اقرؤا القرآن بلحون العرب وأصواتھا .... بلا تکلف النغمات من المدات والسکنات فی الحرکات والسکنات بحکم الطبیعۃ الساذجۃ عن التکلفات (وایاکم ولحون أھل العشق) أی أصحاب الفسق (ولحون أھل الکتابین) أی أرباب الکفر من الیھود والنصاریٰ فان من تشبہ بقوم فھو منھم. قال الطیبی: اللحون جمع لحن وھو التطریب وترجیع الصوت، قال صاحب جامع الأصول: ویشبہ أن یکون ما یفعلہ القراء فی زماننا بین یدی الوعاظ من اللحون العجمیۃ فی القرآن ما نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (وسیجئ بعدی قوم یرجّعون بالقرآن ترجیع الغناء والنوح) .... والمراد تردیدًا مخرجًا لھا عن موضوعھا اذ لم یتات تلحینھم علی أصول النغمات .... (لا یجاوز حناجرھم) .... کنایۃ عن عدم القبول .... الخ.

جواب:- قرآن شریف کو بغیر وضو کے چھونا بالکل ناجائز ہے،[۱] اور حلف اُٹھا کر بیان دینے کے بارے میں جو باتیں پوچھی گئی ہیں، جب تک معاملے کی پوری تفصیل معلوم نہ ہو اس کا حکم نہیں بتایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۱/۲۸ الف)

۱:- روزے سے متعلق قرآنی آیتِ مبارکہ
۲:- ماہِ رمضان میں پیش آنے والے اہم واقعات
۳:- حضور ﷺ کا حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور کرنا

سوال ۱:- اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا، جس طرح پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا۔ اس کے متعلق قرآن کی کون سی آیت ہے؟

۲:- ماہِ رمضان المبارک میں بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان میں سے چند واقعات تحریر فرمائیں۔

۳:- رمضان شریف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تشریف آوری حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ ہوا کرتی تھی، اس کا کیا مقصد تھا؟

جواب ۱:- وہ آیت یہ ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"۔ (سورۂ بقرہ پارہ نمبر ۲ آیت: ۱۸۳)

۲:- غزوۂ بدر، فتحِ مکہ، نزولِ قرآنِ کریم کی ابتداء، یہ اہم واقعات رمضان میں ہوئے، دُوسرے بہت سے واقعات کے لئے تاریخ کی کتابیں دیکھیں۔

۳:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآنِ کریم کا دَور کرتے تھے۔[۲] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۳/۲۸ ج)

---

(۱) "لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" (سورة الواقعة: ۷۹) عن ابن عمرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يمس القرآن الا طاهر. اعلاء السنن ج: ۱ ص: ۲۶۸ (طبع ادارة القرآن). نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص: ۲۲۱، وتفسیر معارف القرآن ج: ۸ ص: ۲۸۷۔

(۲) وفی صحيح البخاری ج: ۲ ص: ۷۴۷ (طبع قديمی كتب خانه) باب كان جبريل يعرض القرآن على النبی صلى الله عليه وسلم، وقال مسروق عن عائشة عن فاطمة: أسرّ الى النبی صلى الله عليه وسلم أن جبريل يعارضنی بالقرآن كل سنة وانه عارضنی العام مرتين، ولا أراه الا حضر أجلی. حدثنا يحيیٰ بن قزعة قال: حدثنا ابراهيم بن سعد عن الزهری عن عبيدالله بن عبدالله عن ابن عباس قال: كان النبی صلى الله عليه وسلم أجود الناس بالخير، وأجود ما يكون فی شهر رمضان، لأن جبريل كان يلقاه فی كل ليلة فی شهر رمضان حتى ينسلخ يعرض عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم القرآن، فاذا لقيه جبريل كان أجود بالخير من الريح المرسلة. (محمد زبیر حق نواز)

قرآن نہ پڑھے ہوئے شخص کے لئے الفاظ پر صرف اُنگلی پھیرنے کا حکم

سوال:- ہمارے صوبہ پنجاب کے علاقہ بھاولپور میں ایک مولوی واعظ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ: جو لوگ عدیم الفرصت ہیں جیسے کسان یا عوام الناس دھقان، تاجر یا سوداگر یا مزدور پیشہ لوگ ہوتے ہیں، وہ علی الصبح باوضو ہوکر قرآن مجید کھول کر ایک یا دو پارے اوّل سے آخر تک اُنگلیاں پھیرتے چلے جائیں، اس طرح قرآن مجید ختم کریں، اس کا ثواب جتنا قاری عالم کو ہوگا اس سے دُگنا اس اُمّی جاہل کو ثواب ہوگا، حدیث شریف کی تمام کتابوں میں یہ حدیث درج ہے جس حدیث میں دیکھو یہ حدیث ملے گی۔ اب غضب یہ ہوگیا کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ اکثر عورتوں اور مردوں نے قرآن مجید پڑھنا ترک کردیا ہے، اور اتنی محنتِ شاقہ کون اُٹھائے؟ پہلے لاکھوں میں سے ایک آدھ، سالہا سال کے بعد فضیلتِ تلاوت اور ختم قرآن کا ثواب حاصل کرسکتا تھا، اب تو ماشاء اللہ مولوی واعظ نے اللہ کی رحمت کو فیضِ عام کردیا ہے، کوئی اُجڈ، اَن پڑھ ہے وہ اُنگلیاں رکھ کر قاری عالم سے دُگنا ثواب حاصل کر رہا ہے، ایسا حدیث کی کتاب میں ہے یا نہیں؟

جواب:- ان واعظ صاحب نے یہ بات غلط انداز سے بیان کی ہے، جو لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں ان کے لئے قرآنِ کریم کے حروف پر اُنگلی پھیر لینا کافی نہیں اور نہ ایسی کوئی حدیث ہمارے علم میں ہے، البتہ جو اَن پڑھ قرآنِ کریم نہیں پڑھ سکتے ان پر لازم ہے کہ قرآنِ کریم ناظرہ کی تعلیم حاصل کریں۔ ہاں! جب تک پڑھنا نہ آئے اس وقت تک اگر وہ قرآنِ کریم کھول کر بیٹھ جایا کریں اور حروف پر اُنگلی پھیرلیا کریں تو اِن شاء اللہ تلاوت کے ثواب سے محروم نہ رہیں گے، اس کا نہ یہ مطلب ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کرسکتے ہیں وہ بھی یہی کام شروع کردیں، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ اس عمل کا ثواب تلاوت سے بھی دُگنا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴/۷/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۷۲۸ ب)

دینیات کی کتابوں کو بغیر وضو چھونے کا حکم

قرآنی آیات کی کثرت والی کتاب کو بغیر وضو چھونا جائز نہیں

سوال ۱:- آج کل مدارس میں دینیات و دیگر کتب کو بغیر وضو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

۲:- ان کتب کی موجودگی میں اُستاذ کرسی پر بیٹھ سکتا ہے جبکہ کتب لڑکوں کے پاس نیچے ہوتی ہیں؟

جواب ۱:- اگر کتاب میں لکھے ہوئے الفاظ کی اکثریت قرآنی آیات پر مشتمل ہو تو اسے بغیر وضو کے چھونا نہیں چاہئے، اور اگر قرآنی آیات کم ہیں اور دُوسری عبارتیں زیادہ تو بغیر وضو چھوا جاسکتا ہے۔[1]

۲:- جن کتابوں میں اللہ رسول کا نام یا قرآنی آیات تحریر ہوں ان سے بلند ہوکر کھڑا ہونا یا بیٹھنا ان کے ادب کے خلاف ہے، اس لئے نشست میں اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ یہ بے ادبی نہ ہو، تاہم ضرورت کے موقع پر گنجائش ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۶۲ الف)

قرآنِ کریم حفظ کرنے کے بعد بھول جانے والے کا کیا حکم ہے؟

سوال:- احقر نے قرآن حفظ کیا تھا، مگر ٹی بی کی وجہ سے اس کا ورد جاری نہیں رہ سکا، اب صحت کی صورت نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں اگر موت آئے تو کیا قیامت کے دن اندھا اُٹھایا جاؤں گا؟

جواب:- اس سلسلے میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کے الفاظ میں کہ: "ما من امرئ یقرأ القرآن ثم ینساه إلا لقی الله یوم القیامة أجزم"۔[2] یعنی جو شخص بھی قرآن پڑھے پھر اسے بھلا دے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے جزام کی حالت میں ملے گا۔ مُلّا علی قاریؒ "ثم ینسه" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ان بالنظر عندنا وبالغیب عند الشافعی أو المعنی ثم یترک قراءته نسی أو ما نسی۔" (مرقاۃ المفاتیح ج:۲ ص:۶۱۵ کتاب فضائل القرآن)۔[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ وعید اس شخص پر ہے جو ناظرہ پڑھنے کی اہلیت بھی اپنی لاپرواہی سے ختم کردے، لہٰذا آپ یہ عزم رکھیں کہ صحت ہونے پر قرآن کو مکمل طور پر یاد رکھوں گا اور اس کا ورد جاری رکھنے میں جو کوتاہی ہوئی ہو، اس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ اِستغفار کرتے رہیں، اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اس وعید سے اللہ تعالیٰ بچالے گا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الشامیة ج:۱ ص:۱۷۷ إن کان التفسیر أکثر لا یکره، وان کان القرآن أکثر یکره.

(۲) مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۱۹۱ (طبع قدیمی کتب خانه).

(۳) مرقاة المفاتیح ج:۵ ص:۹ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنا سخت حرام ہے

سوال:- مکرم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعض حضرات جابجا ایسے پمفلٹ تقسیم کررہے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے علاج کی غرض سے پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنے کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور آپ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ براہِ کرم اس بارے میں وضاحت فرمائیں کہ کیا آپ نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہے؟

ابراہیم
۹ررجب ۱۴۲۵ھ

جواب:- میں نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا، پیشاب یا کسی بھی نجاست سے قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھنا بالکل حرام ہے، اور میں معاذ اللہ اسے جائز قرار دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جن لوگوں نے میری طرف یہ فتویٰ منسوب کیا ہے ان کی تردید کرچکا ہوں، جو ''روزنامہ اسلام'' کی ۱۲راگست ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوچکی ہے، میری جس کتاب کا حوالہ میری طرف منسوب کرکے دیا جارہا ہے، اس کی حقیقت بھی میں نے اپنی تردید میں واضح کردی ہے، اس کے باوجود جو لوگ اس فتوے کو میری طرف منسوب کررہے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ سے، اور کسی پر بہتان لگانے سے ڈرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۹ررجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۷۳۰)

■■■

کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن
(قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق مسائل کا بیان)

"أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ" الآية کے مفہوم و معنی کی تحقیق

سوال:- سورۂ آل عمران کی آیت:۲۳ میں ہے: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ"۔

اِشکال یہ ہے کہ یہاں "أوتوا الكتٰب" کے بجائے "أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ" کیوں فرمایا گیا؟ "الكتٰب" اور "كتٰب الله" سے کیا مراد ہے؟ کیا "نصیبا" فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس تحریفات کے بعد کتاب کے بجائے "نصيبا من الكتٰب" ہی بچا تھا؟ یا یہ کہ "الكتٰب" تو صرف قرآن ہے اور باقی اہلِ کتاب کو اس کا کچھ حصہ عطا ہوا تھا۔

حضرت سے بیانِ مفصل کی درخواست ہے، اس ناچیز نے "تسہیل" میں یوں لکھ دیا: "کتابِ الٰہی تو ایک ہے، (الكتٰب پر الف لام جنس ہے)، اس کا ایک حصہ تورات کی شکل میں یہود کو، دُوسرا حصہ انجیل کی شکل میں نصاریٰ کو، اور مکمل کتاب قرآن کی شکل میں مسلمانوں کو عطا کی گئی ہے۔" کیا یہ تعبیر صحیح ہے؟

محتاجِ دُعا: محمد اسلم شیخوپوری

جواب:- مکرمی جناب مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، اس آیتِ کریمہ کی معروف تفسیریں دو ہیں۔ ایک یہ کہ "نصيبا من الكتٰب" میں "من" بیانیہ ہے،[1] جس کا حاصل یہ ہے کہ "أوتوا نصيبا" کے معنی یہ ہیں کہ ان کو نعمتوں کا ایک بڑا حصہ دیا گیا، پھر "کتٰب" اس حصے کا بیان ہے، جس سے مراد توراۃ ہے۔

دُوسری تفسیر یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہے،[2] اور "الكتٰب" سے مراد "توراۃ" ہی ہے، لیکن "ایتاء" سے مراد اس کی فہم عطا کرنا ہے، اور چونکہ کتابِ الٰہی کی مکمل فہم کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، اس لئے اس کو "نصيبا من الكتٰب" سے تعبیر کیا گیا، یعنی فہم کا ایک حصہ عطا کیا گیا ہے، البتہ "من" تبعیضیہ لینے کی صورت میں "الكتٰب" سے مراد بعض حضرات نے لوحِ محفوظ بھی لی ہے، اور بعض

(۱، ۲) وفي تفسير رُوح المعاني ج:۳ ص:۱۱۰ (طبع مكتبه رشيديه لاهور) ومن إما للتبعيض وإما للبيان على معنى (نصيبًا) هو الكتاب أو نصيبًا منه لأن الوصول الى كنه كلامه تعالى متعذر فان جعل بيانا كان المراد انزال الكتاب عليهم وان جعل تبعيضًا كان المراد هدايتهم فهم ما فيه وعلى التقديرين اللام في (الكتٰب) للعهد والمراد به التوراة وهو المروى عن كثير من السلف، والتنوين للتكثير وجوز أن يكون اللام في (الكتٰب) للعهد والمراد به اللوح، وأن يكون للجنس .... الخ. وراجع أيضًا التفسير المظهرى ج:۲ ص:۲۷ (طبع بلوچستان بک ڈپو). (محمد زبیر حق نواز)

حضرات نے جنسِ کتاب، اگر جنسِ کتاب مراد لی جائے تو اگرچہ اس میں تمام دُنیا کی کتابیں شامل ہوں گی، لیکن سیاق اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا ہے۔ اس لئے آپ نے جو تعبیر اختیار کی کہ کتابِ الٰہی تو ایک ہی ہے، اس کا ایک حصہ توراۃ کی شکل میں بنی اسرائیل کو عطا کیا گیا، یہ تعبیر بھی دُرست ہوسکتی ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ چونکہ انہوں نے کتاب میں تحریفات کرلی تھیں، اس لئے کتٰب کے بجائے "نصیبا من الکتٰب" کہا گیا، علاوہ اس کے کہ کہیں منقول نہیں دیکھا، فی نفسہٖ بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ "ایتاء" تو غیر محرف توراۃ کا ہوا تھا، بعد میں تحریف ان کا اپنا عمل ہے، اور آیتِ کریمہ کے پہلے حصے میں بیان اللہ تعالیٰ کے انعام کا ہے، ان کے اپنے فعل کا نہیں۔ ان کا اپنا فعل بعد میں "ثم یتولی" سے مذکور ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

بقلم: عبداللہ میمن

۱۴۲۲/۶/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹۲/۳۵)

عالمِ دین کا تفسیر سنانا

سوال:- عالمِ محقق کا تفسیر سنانا اور سننا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بلاشبہ جائز ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۶/۱۹ الف)

قیامت کے وقت کی تعیین سے متعلق قرآنی آیت پر ایک سوال کا جواب

سوال:- اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: "یہ لوگ (منکر) آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے اس کی خبر تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضورؐ کو قیامت کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قربِ قیامت کی علامات حضورؐ سے مروی ہیں، اور علمائے دین نے بھی قیامت کے متعلق بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جبکہ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں علم نہیں تھا، تو قیامت کی علامات کیسے تحریر

فرمادی گئیں؟

جواب:- مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا صحیح صحیح وقت کہ وہ کب اور کس دن آئے گی، سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، البتہ قربِ قیامت کی علامتیں خود قرآنِ کریم نے بتلائی ہیں اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ باخبر ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتلائی ہیں، چنانچہ صحیحین(۱) کی مشہور حدیث میں مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسان کی شکل میں آکر کچھ سوالات کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے (کہ وہ کب آئے گی)، اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس بارے میں، میں خود سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ: اچھا! مجھے قیامت کی کچھ علامتیں بتایئے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی علامتیں بتادیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۳/۲۸ ج)

پکتھال کے انگریزی ترجمے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل انگریزی ترجمۂ قرآنِ کریم کے مطالعے کے متعلق کہ جسے ادارہ معارفِ اسلامی، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے چھاپا ہے جس کے مترجم ایک انڈونیشیا کے نومسلم ہیں جن کا نام درج ذیل ہے:

Muhammad Marmaduke Pickthall

ان کے انگریزی ترجمے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- پکتھال کے انگریزی ترجمے میں متعدّد مقامات پر غلطیاں بھی ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی اسے استعمال کیا جاسکتا ہے، البتہ اب تک کے شائع شدہ انگریزی تراجم میں لعل محمد چاولہ کا ترجمہ نسبتاً سب سے بہتر ہے جو اسلامک پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ نیز سب سے بہتر ترجمہ وہ ہے جو معارف القرآن انگریزی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، مگر ابھی وہ زیرِ تکمیل ہے۔　واللہ اعلم

۱۴۲۱/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۵/۱۷)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعة .... الخ ج:۱ ص:۱۲ (طبع قدیمی کتب خانہ کراچی).

تفسیر معارف القرآن میں "إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" الآیۃ کے ترجمے کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اس وقت معارف القرآن جلد نمبر۴ پیشِ نظر ہے، سورۂ یونس رُکوع نمبر۷ کی پہلی آیت میں: "إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" کا ترجمہ "کہ ہم نہیں حاضر ہوئے تمہارے پاس" سمجھ میں نہیں آرہا، ناقص فہم میں یہی آتا ہے کہ اگر لفظ "نہیں" نہ ہو تو ترجمہ صاف اور بے غبار ہوجائے گا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں مثبت ترجمہ کیا ہے: "ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔"

چونکہ معارف القرآن کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا ہے تو احقر نے تفسیرِ عثمانی مطبوعہ سعودی عرب کو دیکھا تو اس میں بھی وہی معارف القرآن والا ترجمہ درج ہے۔

از راہِ کرم وضاحت فرمادیں تو عنایت بے نہایت ہوگی۔

جواب:- "وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا" الآیۃ۔

ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ: اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس۔[1]

ترجمہ حضرت تھانویؒ: اور آپ خواہ کسی حال میں ہوں اور آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور تم جو کام بھی کرتے ہو، ہم کو سب کی خبر رہتی ہے۔[2]

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے میں گو موجودہ محاورے کے اعتبار سے کچھ اغلاق ہے، لیکن ترجمہ بہر حال صحیح ہے، اس لئے کہ عربی میں استغراق پر دلالت کرنے کا ایک اُسلوب یہ بھی ہے کہ پہلے نفیٔ عام لائی جائے (جو عموماً نکرہ تحت النفی کی صورت میں ہوتی ہے)، پھر استثناء لایا جائے، جیسے یہ بتانا ہو کہ "ہر نبی معصوم ہے" یوں کہیں گے: "ما من نبی الا وهو معصوم" ایسی تعبیرات کا اُردو میں ترجمہ عموماً دو طرح ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ استغراق والا مثبت جملہ ذکر کردیا جائے جیسے مذکورہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: "جو نبی بھی ہوتا ہے وہ معصوم ہوتا ہے"۔ دُوسرا یہ کہ استثناء سے پہلے والے جملے کا ترجمہ نفی سے کرکے استثناء کے بعد والے جملے کو بصورتِ نفی اس کی صفت بنادیا جائے، جیسے: "کوئی نبی ایسا نہیں جو معصوم نہ ہو"۔ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ پہلے طریقے کے مطابق ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کا

---

(۱) ترجمہ شیخ الہندؒ، تفسیرِ عثمانی (طبع دار الاشاعت) ج:۱ ص:۶۱۰۔ (۲) بیان القرآن ج:۵ ص:۲۰ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)۔

دُوسرے طریقے کے۔ اس میں اغلاق کی وجہ حرفِ نفی نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس ترجمے میں موصوف اور صفت کو لفظ ''کہ'' کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، جبکہ آج کل عموماً یہ ربط ''جو''، ''جس'' وغیرہ کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ ''وَمَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا'' کے ترجمے میں لفظ ''کہ'' کی جگہ ''جس پر'' وغیرہ لفظ رکھ کر دیکھئے، انشاء اللہ بات واضح ہوجائے گی۔

باقی اگر ''ہم نہیں حاضر ہوتے'' سے حرفِ نفی حذف کردیا جائے تو احقر کے ناقص فہم کے مطابق ترجمہ غلط ہوجائے گا، یہ ایسے ہی ہوگا جیسے اُوپر ذکر کردہ مثال کا ترجمہ یوں کیا جائے: ''کوئی نبی ایسا نہیں جو معصوم ہو'' اسی طرح یہاں حرفِ نفی حذف کرنے سے ترجمے کا حاصل یہ نکلے گا کہ تم کوئی عمل ایسا نہیں کرتے جس پر ہم حاضر ہوتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد زاہد فیصل آبادی

حال وارد دارالعلوم کراچی ۱۴

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، اور احقر کی نظر میں دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۴۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱/۱۴۲)

مُعوّذتین کے قرآنِ کریم کا حصہ ہونے سے متعلق حضرت ابنِ مسعودؓ کے عقیدے کی مفصل تحقیق

سوال:- ایک مشہور تفسیرِ قرآن میں مُعوّذتین (سورۂ فلق والناس) کی قرآنیت کے متعلق بحث نے میرے ذہن کو کافی حد تک پریشان و پراگندہ کردیا ہے، اور اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ سرے سے قرآن ہی کے غیرمحرف ہونے کا ایمان نہ متزلزل ہوجائے۔ اس تفسیر میں بے شمار روایات و احادیث کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مُعوّذتین کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اسی لئے انہوں نے ان کو اپنے مصحف سے بھی ساقط کردیا تھا۔ بعض روایات میں اضافہ ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں بھی نہیں پڑھتے تھے۔ مفسرِ محترم نے ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ رائے صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے تھی جو اجتہادی غلطی تھی، لہٰذا ان کی رائے کو باقی صحابہؓ کے اجماع کے مقابلے میں رَدّ کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے کم از کم میں مطمئن نہیں ہوسکا، اس لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات کا طالب ہوں:-

۱:- قرآن کی کسی آیت کا انکار کرکے آیا کوئی شخص مسلمان بھی رہ سکتا ہے؟ درآنحالیکہ یہ انکار

کتنی ہی معصومیت سے کیا جائے؟ اگر نہیں تو حضرت عبداللہؓ کے متعلق آپ کی اور دُوسرے محققین کی کیا رائے ہے؟

۲:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہوسکتا ہے کہ ابنِ مسعودؓ کو ان کی خبر نہ پہنچ سکی ہو، کیونکہ جیسا کہ ابنِ حجرؒ نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ سورتیں دورِ اوّل ہی سے متواتر تھیں اور نازل بھی مکی دور میں ہوئی ہیں، اتنے عرصے تک ابنِ مسعودؓ بے خبر نہیں رہ سکتے، اس دور کے مسلمانوں کا یہ طریقہ بھی تھا کہ ان تک وحی خبرِ متواتر کے ذریعہ پہنچے، اور وہ اس بحث میں اُلجھ پڑیں کہ مجھے تو معلوم نہیں، لہٰذا یہ قرآن نہیں ہے۔ اور پھر یہ اَمر بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ مبارک میں تو ان سورتوں کا خبرِ متواتر ہونا مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور موجودہ قرآن کی صحت پر تو صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہوچکا تھا۔ ان حالات میں حضرت ابنِ مسعودؓ ناواقف نہیں رہ سکتے تھے، پھر انہوں نے ان سورتوں کا کیوں انکار کیا؟

۳:- عاصم، حمزہ، کسائی اور خلف جو مشہور قراء میں سے ہیں ان کی سند پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، ان چاروں نے اسی قرآن کی سند، جسے اب ہم آپ پڑھتے ہیں اور جس میں مُعوّذتین بھی شامل ہیں، ابنِ مسعودؓ تک پہنچائی ہے، لیکن ابنِ مسعودؓ سے منسوب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ اسناد غلط ہے، کیونکہ اس قرآن میں مُعوّذتین شامل ہیں اور وہ ان کے منکر تھے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ قرآن میں یہ سورتیں الحاقی ہیں۔ ابنِ مسعودؓ کے شاگردوں نے کم از کم ایک دفعہ تو ان پر جھوٹ گھڑا ہے، باقی قرآن کے متعلق بھی اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنا حصہ الحاقی ہوگا اور کتنا وہ حصہ ہے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، ان احادیث سے قرآن کی قطعیت متاثر نہیں ہوجاتی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ مجھے دس بارہ دن پہلے مل گیا تھا، جواب میں تأخیر اس لئے ہوئی کہ آپ کا جواب قدرے تفصیل کا طالب تھا، اور مجھے ہجومِ مصروفیات میں اتنا وقت نہ مل سکا کہ فوراً جواب لکھوں۔ بہرکیف! اب آپ کے سوالات کا جواب پیشِ خدمت ہے، خدا کرے کہ یہ جواب آپ کی تشفی کرسکے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح مُعوّذتین کو قرآن کا جزء مانتے تھے، اور جن روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کو قرآن کا جزء نہیں مانتے تھے، وہ دُرست نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآنِ کریم کی جو متواتر قراءتیں منقول ہیں ان میں مُعوّذتین شامل ہیں۔

قراءتِ عشرہ میں سے عاصم کی قراءت حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ، حضرت زر بن حبیشؒ اور

حضرت ابوعمرو الشیبانیؒ سے منقول ہے، اور یہ تینوں اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں، (دیکھئے النشر فی القراءات العشر لابن الجزریؒ ج:۱ ص:۱۵۶)۔[1] اسی طرح حمزہ کی قراءت علقمہؒ، اسودؒ، ابنِ وہبؒ، عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں، (ایضاً ج:۱ ص:۱۶۶)۔[2] اس کے علاوہ قراءت عشرہ میں سے کسائیؒ اور خلفؒ کی قراءتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر منتہی ہوتی ہیں، کیونکہ کسائیؒ، حمزہؒ کے شاگرد ہیں، اور خلفؒ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ قراءاتِ عشرہ کی اسانید ساری دُنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ تواتر کے ساتھ نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، (فیض الباری ج:۴ ص:۲۶۲)۔[3] اس لئے اگر کوئی خبرِ واحد ان متواتر قراءتوں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الردّ ہے اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بناء پر محقق علماء اور محدثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع کم از کم نا قابلِ قبول بتایا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، چند اقوال ذیل میں پیشِ خدمت ہیں:-

۱:- شیخ الاسلام علامہ نوویؒ جو جلیل القدر محدثین میں سے ہیں شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں:-

أجمع المسلمون علٰی أنّ المعوّذتین والفاتحة من القرآن، وان من جحد منها شیئًا کفر، وما نقل عن ابن مسعودؓ باطل لیس بصحیح. (بحوالہ الاتقان ج:۱ ص:۸۱)۔[4]

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ مُعوّذتین اور فاتحہ قرآنِ کریم کا جزء ہیں، اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کا بھی انکار کرے تو وہ کافر ہوجائے گا، اور اس سلسلے میں حضرت ابنِ مسعودؓ سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں۔''[5]

۲:- علامہ ابنِ حزمؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وکل ما روی عن ابن مسعود من أن المعوّذتین وأم القرآن لم تکن فی مصحفه فکذب موضوع، لا یصحّ وانما صحت عنه قراءة عاصم عن زر بن حبیش عن ابن مسعود وفیها أم القرآن والمعوّذتان. (المحلی لابن حزم ج:۱ ص:۱۳، طبع دمشق و مصر)

---

(۱) النشر فی القراءات العشر لابن الجزری ج:۱ ص:۱۵۵ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر).

(۲) ج:۱ ص:۱۶۵ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر).

(۳) وفی فیض الباری قبیل کتاب فضائل القرآن ج:۴ ص:۲۶۲ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) واعلم أن سند الکسائی ینتهی الی ابن مسعود، لأنه قرأ علٰی حمزة ومثله ینتهی سند خلف الذی من العشرة الی ابن مسعود فانه قرأ علٰی سلیم وهو علٰی حمزة واسناد القراء العشرة أصح الأسانید باجماع الأمة وتلقی الأمة له بقبولها.

(۴) دیکھئے: الإتقان فی علوم القرآن ج:۱ ص:۲۷۲ (طبع مکتبه نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) وکذا فی فیض الباری ج:۴ ص:۲۶۲ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۵) دیکھئے: اُردو ترجمہ الاتقان فی علوم القرآن ج:۱ ص:۲۱۲ (طبع ادارۂ اسلامیات ۱۴۰۲ھ بمطابق ۱۹۸۲ء)

''وہ تمام روایات جن میں کہا گیا ہے کہ مُعوّذتین اور سورۂ فاتحہ حضرت ابنِ مسعودؓ کے مصحف میں نہیں تھیں، وہ جھوٹی اور من گھڑت ہیں، بلکہ ان سے قراءتِ عاصم ثابت ہے جو زر بن حبیشؒ سے منقول ہے اور اس میں مُعوّذتین بھی ہیں اور فاتحہ بھی۔''

۳:- امام فخر الدین رازیؒ اور قاضی ابوبکر بن عربیؒ نے بھی اس روایت کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے۔ (المحلی لابن الحزم ج:۱ ص:۱۳ مطبوعہ دمشق سنہ ۱۳۴۷ھ)

۴:- علامہ بحر العلوم تحریر فرماتے ہیں:-

فنسبة إنكار كونها من القرآن اليه غلط فاحش، ومن أسند الانكار الى ابن مسعود فلا يعبأ بسنده عند معارضة هٰذه الأسانيد الصحيحة بالاجماع والملتقاة بالقبول عند العلماء الكرام بل والأمة كلها كافّة، فظهر أن نسبة الانكار الى ابن مسعود باطل.

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مُعوّذتین کے جزءِ قرآن ہونے کا منکر بتانا نہایت فحش غلطی ہے، اور جس شخص نے اس انکار کی نسبت ان کی طرف کی ہے اس کی سند ان اسانید کے مقابلے میں ناقابلِ اعتبار ہے جو اجماعی طور پر صحیح ہیں اور جنھیں علمائے کرام بلکہ پوری اُمت نے قبول کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کی طرف انکار کی نسبت باطل ہے۔''

(بحر العلوم شرح سلم الثبوت ج:۲ ص:۱۲)[1]

۵:- مصر کے علمائے متاخرین کے سرخیل علامہ زاہد الکوثریؒ لکھتے ہیں:-

ومن زعم أنه لم يكن في مصحفه الفاتحة والمعوّذتان أو أنه كان يحك المعوّذتين فكاذب قصدا أو واهم من غير قصد، والمعوّذتان موجودتان في قراءة ابن مسعود المتواترة عنه بطريق أصحابه. وكذٰلك الفاتحة وقراءتهٔ هي قراءة عاصم المتواترة التي يسمعها المسلمون في مشارق الأرض ومغاربها في كل حين وفي كل الطبقات، وأنى يناهض خبر الأحاد الرواية المتواترة .... وقد أجاد ابن حزم الردّ علٰى تقولات المتقولين في هٰذا الصدد في كثير من مؤلفاته.

''اور جس شخص کا یہ خیال ہو کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کے مصحف میں فاتحہ اور مُعوّذتین نہیں تھیں یا وہ مُعوّذتین کو مصحف سے مٹادیا کرتے تھے تو وہ شخص یا تو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے یا غیر شعوری طور پر وہم میں مبتلا ہے، کیونکہ مُعوّذتین اور اسی طرح سورۂ فاتحہ حضرت ابنِ مسعودؓ کی اس قراءت میں موجود ہیں جو ان کے شاگردوں کی سند سے متواتراً منقول ہے، اور ان کی قراءت عاصم کی وہ مشہور قراءت

(۱) فواتح الرحموت ج:۲ ص:۱۳ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان).

ہے جسے مشرق و مغرب کے تمام مسلمان ہر زمانے اور ہر طبقے میں سنتے چلے آئے ہیں، اور یہ اخبارِ آحاد اس متواتر قراءت کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہیں؟ اور علامہ ابنِ حزمؒ نے اپنی متعدّد کتابوں میں اس قسم کے اقوال کی بڑی اچھی تردید کی ہے۔'' (مقالات الکوثری ص:۱۶)(۱)

یہ چند اقوال صرف نمونے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، ورنہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے۔

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حافظ ابنِ حجرؒ اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (فتح الباری ج:۸ ص:۶۰۳(۲)، ومجمع الزوائد ج:۷ ص:۱۴۹(۳))

پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علمِ حدیث سے واقف ہیں، ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے۔ تمام محدثین نے ''حدیثِ صحیح'' کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو۔ چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا۔ حافظ ابن الصلاحؒ اپنے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

فالحديث المعلل هو الحديث الذى اطلع فيه على علة تقدح فى صحّته مع أن الظاهر السلامة منها ويتطرق ذٰلک إلى الإسناد الذى رجاله ثقات لجامع شروط الصحة من حيث الظاهر ويستعان على إدراكها بتفرد الراوى وبمخالفة غيره له مع قرائن تنضم إلى ذٰلک تنبه العارف بهٰذا الشأن. (بحوالہ مقدمة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۴(۴))۔

''پس حدیثِ معلل وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی ''علت'' معلوم ہوئی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو اور یہ ''علت'' اس سند میں بھی واقع ہوجاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں، اور اس علت کا ادراک علمِ حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوجاتا ہے، کبھی راوی کو متفرد دیکھ کر، اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دُوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ کبھی دُوسرے قرائن بھی مل جاتے ہیں۔''

---

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید).
(۲) فتح البارى ج:۸ ص:۷۴۳ (مطبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).
(۳) (مطبع دار الكتاب العربى، بيروت لبنان).
(۴) فتح الملهم ج:۱ ص:۱۴۶ (طبع مكتبة دار العلوم كراچى).

حدیث کی ایک قسم ''شاذ'' ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے ان کی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔

لہٰذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وہ مُعوّذتین کو قرآنِ کریم کا جزء نہیں مانتے تھے، علامہ نوویؒ اور ابنِ حزمؒ وغیرہ نے ان کو، روایوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا:-

۱:- یہ روایتیں معلول ہیں اور ان کی سب سے بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ان قراءتوں کے خلاف ہیں جو ان سے بطریقِ تواتر منقول ہیں۔

۲:- مسندِ احمد کی وہ روایت جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ: "إنهما ليستا من كتاب الله" (مُعوّذتین اللہ کی کتاب کا جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمٰن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے، اور کسی نے صراحۃً ان کا یہ جملہ نقل نہیں کیا۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد للهيثمي ج:۷ ص:۱۴۹،[1] و الفتح الرباني ج:۱۸ ص:۳۵۱، ۳۵۲[2])

اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اُصول کے مطابق ''حدیثِ شاذ'' مقبول نہیں ہوتی۔

۳:- اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی بہرحال یہ اخبارِ آحاد ہیں اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ جو خبرِ واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے، لہٰذا ان کے مقابلے میں یہ اخبارِ آحاد یقیناً واجب الردّ ہیں۔

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کردی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مُعوّذتین کو قرآنِ کریم کا جزء تو مانتے ہوں لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہ لکھا ہو۔ اس واقعے کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے اس طرح روایت کردیا گویا وہ انہیں سرے سے جزءِ قرآن ہی نہیں مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ مُعوّذتین کو جزءِ قرآن ماننے کے باوجود انہوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد الکوثریؒ نے فرمایا ہے کہ: انہوں نے مُعوّذتین کو

---

(۱) (مطبع دار الكتاب العربي، بيروت لبنان).

(۲) ناشر: أحمد عبدالرحمن، البنا الساعاتي.

اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں۔ (مقالات الکوثری ص:۱۶)۔[۱]

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: "لو کتبتها لکتبتها مع کل سورة" (اگر میں سورۂ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا)۔ امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے ہر سورت کا افتتاح فاتحہ سے ہونا چاہئے۔ لہٰذا حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا کہ: میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا اور مسلمانوں کے حفظ پر اعتماد کیا۔[۲]

بہرکیف! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور مُعوّذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت سی معقول توجیہات ہوسکتی ہیں، اور ان سے یہ سمجھنا کسی طرح دُرست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآنِ کریم کا جزء نہیں مانتے تھے، جبکہ ان سے تواتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے۔

اس تحقیق کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ اس قصے کو صحیح قرار دینے پر مبنی ہے۔

یہ مکتوب احقر نے حضرت والد صاحب مدظلہم کو بھی سنادیا تھا، انہوں نے بھی اس کی تائید و تصدیق فرمائی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۳/۷/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱/۷/۲۴ د)

"اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" کی تفسیر

سوال:- محترمی جناب مفتی صاحب! مہربانی فرماکر اس آیت کا خلاصۂ تفسیر تحریر فرمادیں: "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ"۔

جواب:- اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ: "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کو بھی موت آنی ہے اور ان کو بھی۔" آیت کا سیاق وسباق یہ ہے کہ مشرکین کے عقیدۂ شرک کا ابطال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپؐ میں اور ان مشرکین میں جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ دونوں کی وفات

(۱) (مطبع ایچ ایم سعید).
(۲) تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۱۱۴، ۱۱۵ (مطبع دار الکتاب العربی للطباعة والنشر ۱۳۸۷ھ - ۱۹۶۸ء انتشارات ناصر خسرو، ایران).

کے بعد یقینی طور پر ہو جائے گا، جب مؤمن و کافر سب بارگاہِ الٰہی میں جمع ہوں گے تو ان مشرکین کو خود پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنی غلطی پر تھے۔[1]

یہ اس آیت کا خلاصۂ تفسیر ہے، یہ آیت حیاتِ انبیاء کے عقیدے کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ انبیاء کی اور عام انسانوں کی موت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ انبیاء کی ارواح کا تعلق ان کے اجسام کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ باقی رہتا ہے، اس لئے ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور ان کی ازواجِ مطہرات سے ان کے بعد کسی کے لئے نکاح جائز نہیں ہوتا، اور اسی لئے اس آیت میں دونوں کی موت کو الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۹/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

’’تفہیم القرآن‘‘ کا بغیر تنقید کے مطالعہ کرنا

سوال:- مولانا مودودی کی تفسیر ’’تفہیم القرآن‘‘ بغیر کسی تنقید کے پڑھنا پڑھانا کیسا ہے؟

جواب:- ’’تفہیم القرآن‘‘ میں بہت سی باتیں جمہور کے مُسلّمات و اقوال کے خلاف ہیں، اس لئے اسے بقولِ سائل بلاتنقید پڑھنا پڑھوانا دُرست نہیں ہے۔ درسِ قرآن کے لئے حضرت تھانویؒ یا علامہ عثمانیؒ کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۴/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

سب سے پہلی تفسیر کون سی ہے؟

سوال:- کسی صاحب نے ’’البلاغ‘‘ میں لکھا ہے کہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ نے سب سے پہلے قرآنِ پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ علامہ ذہبیؒ کے بیان کے مطابق فنِ تفسیر میں سب سے پہلے حضرت سعید بن جبیرؒ نے کتاب لکھی ہے، اور مؤرّخ ابنِ خلکانؒ کے بیان کے مطابق ابنِ جریجؒ متوفی سنہ ۱۵۰ھ نے سب سے پہلے تفسیر لکھی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ متوفی سنہ ۶۸ھ نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اپنی تحقیق

(۱) دیکھئے: خلاصۂ تفسیر معارف القرآن ج:۷ ص:۵۵۵۔

حوالے کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- جہاں تک ہماری معلومات رہنمائی کرتی ہیں، حضرت اُبیّ بن کعبؓ ہی سب سے پہلے صاحبِ تصنیف مفسر ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں سے بہت سے حضرات تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، لیکن کسی کی تفسیر کا کتابی شکل میں مدوّن ہونا ثابت نہیں ہے، اور حضرت اُبیّ بن کعبؓ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وأما أبی بن كعبؓ فعنهُ نسخة كبيرة يرويها أبو جعفر الرازی عن الربيع بن أنس عن أبی العالية عنه وهٰذا اسناد صحيح، وقد أخرج ابن جرير وابن أبی حاتم منها كثيرا، وكذا الحاكم فی مستدركه وأحمد فی مسنده. (الاتقان ج:۲ ص:۱۸۹، حجازی قاهرة سنة ۱۳۶۸هـ).[۱]

ترجمہ:-"رہے حضرت اُبیّ بن کعبؓ تو ان سے ایک بڑا نسخہ منقول ہے، جسے ابوجعفر رازی، ربیع بن انس عن ابی العالیہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، اور یہ سند صحیح ہے۔ ابنِ جریر اور ابن ابی حاتم نے اس نسخے سے بہت سی روایات لی ہیں، اسی طرح حاکمؒ نے مستدرک میں اور امام احمدؒ نے مسند میں بھی۔"[۲]

رہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سو اگرچہ وہ باتفاق مفسرین کے امام ہیں، لیکن اوّل تو ان کی تفسیر کتابی شکل میں کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، آج کل "تنویر المقباس" کے نام سے جو نسخہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس کی سند نہایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ نسخہ محمد بن مروان السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح کی سند سے ہے، اور اس سلسلۂ سند کو محدثین نے "سلسلۃ الکذب" قرار دیا ہے۔[۳]

اور اگر بالفرض حضرت ابنِ عباسؓ کی تفاسیر کا کوئی کتابی مجموعہ ثابت بھی ہو تب بھی اسے علمِ تفسیر کی پہلی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ ان سے متقدم ہیں، حضرت ابنِ عباسؓ کی وفات طائف میں سنہ ۶۸ھ میں (سنہ ۲۸ھ میں نہیں، جیسا کہ سائل نے لکھا ہے) ہوئی ہے، جبکہ حضرت اُبیّ بن کعبؓ سنہ ۲۰ھ میں وفات پاچکے تھے۔ (مقدمہ تفسیر مراغی ج:۱ ص:۷)[۴]

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن ج:۴ ص:۱۲۱۸ (طبع مكتبه نزار مصطفیٰ الباز، مكة المكرمة).

(۲) اُردو ترجمے کے لئے دیکھئے الاتقان ج:۲ ص:۴۶۵ (طبع ادارۂ اسلامیات لاہور)

(۳) وفی مقدمة تفسير المراغی ج:۱ ص:۶، ۷ (مطبع مصطفیٰ، مصر) طريق أبی النصر محمد بن السائب الكلبی المتوفی سنة ۱۴۶هـ وهی أوهی الطريق، ولا سيما اذا وافقتها طريق محمد بن مروان السدی الصغير المتوفی سنة ۱۸۶هـ وقد طبع تفسير ينسب الی ابن عباسؓ برواية الفيروزآبادی صاحب القاموس سماه "تنوير المقباس من تفسير ابن عباس".

(۴) (مطبع مصطفیٰ، مصر).

علامہ ذہبیؒ اور قاضی ابنِ خلکانؒ کے اقوال ہماری نظر سے نہیں گزرے، یہ اپنی جگہ دُرست ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ اور ابنِ جریجؒ کی تفسیریں بھی کتابی شکل میں مدوّن ہوئی تھیں، لیکن چونکہ یہ حضرات تابعین میں سے ہیں، اور حضرت اُبیّ بن کعبؓ کی تفسیر ان سے بہت پہلے لکھی جاچکی تھی، اس لئے اَوّلیت کا شرف حضرت اُبیّ بن کعبؓ ہی کو حاصل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۴؍محرّم ۱۳۸۷ھ (۱)

جناب مودودی صاحب کا حضرت داوٗد علیہ السلام کے قصے میں اوریاء کی بیوی کا واقعہ ذکر کرنا

سوال:- مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''مگر اس کی اصلیت صرف اس قدر تھی کہ حضرت داوٗد نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متأثر ہوکر اوریاء سے طلاق کی درخواست کی تھی .... الخ'' اس عبارت پر اعتراض یہ ہے کہ کیا خدا کا نبی بڑی سوسائٹی سے متأثر ہوسکتا ہے؟ دُوسری عرض یہ ہے کہ مفسرین حضرات نے اس واقعے کو نقل کیا ہے، لیکن کیا کسی مفسر نے یہ لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک باقی تمام تأویلات سے یہ تأویل ہی مرجح ہے؟

۲:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے ہے یا نہیں؟

۳:- کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوّت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱:- اصل یہ ہے کہ محقق مفسرین نے حضرت داوٗد علیہ السلام کے اس واقعے میں اوریاء کی بیوی کے قصے کو اختیار نہیں کیا، حافظ ابنِ کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: **أکثرها مأخوذ من الاسرائیلیات، ولم یثبت فیها عن المعصوم حدیث یجب اتباعه، لٰکن روی ابن أبی حاتم ههنا حدیثًا لا یصح سنده، لأنه من روایة یزید الرقاشی عن أنسؓ، ویزید وان کان من الصالحین لٰکنه ضعیف الحدیث عند الأئمة۔** (۲)

اوریاء کا یہ قصہ درحقیقت بائبل کی کتاب سموئیل سے مأخوذ ہے، جس کے مصنف کا آج تک پتہ ہی نہیں چل سکا، لہٰذا بہت سے محققین نے صحیح اسے قرار دیا ہے کہ دراصل حضرت داوٗد علیہ السلام نے ظالم کے بجائے مظلوم سے خطاب فرمایا، جس سے طرف داری متوہم ہوتی تھی اور اسے خلافِ عدل سمجھ

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۳۵۷ سورۃ صٓ۔

کر اِستغفار فرمایا۔ (بیان القرآن ج:۱۰ ص:۸)۔[1]

امام رازیؒ نے اسی قسم کی اور توجیہات بھی نقل کی ہیں۔ (تفسیر کبیر ج:۱ ص:۱۸۹)۔[2]

لہٰذا آیت کی بے غبار اور محقق تفاسیر تو وہی ہیں جو امام رازیؒ یا حضرت تھانویؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

البتہ بعض مفسرین نے اس کو بھی اختیار کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں کسی شخص سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کی درخواست کرنا مروّت کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا، اور قانونی قباحت تو اس میں آج بھی نہیں ہے، اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاء سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ **فقیل: انه علیه السلام رأی امرأة رجل .... فسأله أن یطلقها فاستحی أن یرده ففعل فتزوجها وهی أم سلیمان، وکان ذٰلک جائزًا فی شریعته معتادا فیما بین أمته غیر مخل بالمروءة.** (رُوح المعانی ج:۲۳ ص:۱۸۵)۔[3]

لہٰذا یہ تفسیر جو سوال میں نقل کی گئی ہے بے اصل تو نہیں، مگر اوّل تو مرجوح ہے، دُوسرے ''سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہونے'' کا لفظ قدرے خلافِ احتیاط ہے، اس کے بجائے ''سوسائٹی کے عام رواج کے مطابق'' کا لفظ ہوتا تو مناسب تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کسی بُرے کام میں سوسائٹی کے رواج سے متأثر ہوگیا، کیونکہ یہ کام نہ ناجائز تھا اور نہ خلافِ مروّت۔ ہاں! نبوّت کے مقامِ بلند کے پیشِ نظر حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے بُرا سمجھ کر اس پر اِستغفار فرمایا۔

۲:- عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت جدا نہیں ہوتی، ان کی لغزشوں کا ذکر قرآنِ کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اَولیٰ باتیں تھیں، جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔

۳:- صحیح یہ ہے کہ نبوّت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) بیان القرآن ج:۱۰ ص:۶ (طبع سعید) نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن حضرت کاندھلویؒ ج:۶ ص:۲۱ تا ۳۱ (طبع مکتبہ عثمانیہ لاہور)۔

(۲) دیکھئے: تفسیر کبیر ج:۱۶ ص:۱۹۰ تا ۱۹۹۔

(۳) (طبع مکتبہ رشیدیہ لاهور).

"وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ" میں قنوت کا معنیٰ "قراءت" سے کرنا

سوال:- سورۃ الاحزاب میں پارہ۲۲ رُکوع دوم کی آیت اوّل یوں شروع ہوتی ہے: "اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ" یہاں "اَلْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ" کے معنی حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والیاں کیا ہے۔ اس کا ترجمہ شیخ الہندؒ نے عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں کیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ قنوت کا معنی قرآن پڑھنا کیسے ہوگیا؟ دونوں بزرگ مذکورہ بالا چوٹی کے علماء ہیں، لغوی لحاظ سے قنوت، قرآن پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا، سائل ایک طالبِ علم ہے اور چاہتا ہے کہ عقل ونقل سے اس ترجمے کی توجیہ اسے سمجھائی جائے، ابھی تو یہی شک گزرتا ہے کہ کاتب وغیرہ سے غلطی ہوئی ہوگی۔

جواب:- قنوت کے لغت میں بہت سے معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک قراءت بھی ہے، حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ اسی معنی کے مطابق ہے۔[۱] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا

سوال:- لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھانے کے لئے قرآن کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے سوا کسی اور رسم الخط میں لکھنا باجماع ناجائز ہے،[۲] لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھانے کے لئے عربی رسم الخط سکھایا جائے، عجمی رسم الخط میں لکھنا دُرست نہیں،

---

(۱) وفی لسان العرب ج:۱۱ ص:۳۱۳، ۳۱۴ قنت (قنوت) ویرد بمعان متعددة کالطاعة والخشوع والصلاة والدعاء والعبادة والقیام وطول القیام والسکوت، فیصرف فی کل واحد من ھٰذہ المعانی الی ما یحتملہ لفظ الحدیث الوارد فیہ، وفیہ أیضًا بعد أسطر: القانت الذاکر للہ تعالٰی، کما قال اللہ تعالٰی: "اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا" وکذا فی المنجد ص:۴۸۱. نیز قنوت کا ایک معنیٰ "عاجزی کرنا" بھی ہے، دیکھئے: اُردو منجد ص:۴۸۱، ومصباح اللغات ص:۷۰۹۔ (از مرتب)۔

(۲) وفی الاتقان فی علوم القرآن، النوع السادس والسبعون فی مرسوم الخطّ وآداب کتابتہ ج:۴ ص:۱۱۵۳ (طبع مکتبة نزّار مصطفی الباز، مکة المکرمة) قال أشھب: سئل مالک: ھل یکتب المصحف علی ما أحدثہ الناس من الھجاء؟ فقال: لا إلّا علی الکتبة الأولی. رواہ الدانی فی المقنع، ثم قال: ولا مخالف لہ من علماء الأئمة. وبعد أسطر: وقال الامام أحمد: یحرم مخالفة مصحف الامام فی واو أو یاء أو الف أو غیر ذٰلک. وفی خلاصة النصوص الجلیة ص:۲۵ (بحوالہ جواھر الفقہ) أجمع المسلمون قاطبة علٰی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفتہ .... الخ، وکذا فی الفرائد الحسان فی بیان رسم القران ص:۵۸. نیز درج ذیل کتب دیکھئے: مناھل العرفان للزرقانی ص:۳۷۰، دلیل الحیران ص:۴۰، المقنع فی رسم مصاحف الأمصار ص:۳۴، نثر المرجان فی رسم نظر القرآن ج:۱ ص:۴۶۹، لطائف البیان فی رسم القرآن ج:۲ ص:۲۷، الجامع لما یحتاج الیہ من رسم المصحف ص:۵۲.

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۷ مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۰/ ۲۸ ب)

وحی سے متعلق مقدمہ معارف القرآن کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:- حضرت مولانا نے معارف القرآن کے مقدمہ میں جہاں وحی کی حقیقت بیان کی ہے وہاں راقم الحروف کے ایک مقامی دوست نے ایک شبہ کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت مولانا سے مؤدّبانہ درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمادیں۔ وہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے اپنی کوتاہ نظر سے یہ عبارت لکھی ہوئی پائی: ''چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ بالا باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دُوسرے عقل اور تیسرے وحی'' (نیز معارف القرآن کے انگریزی ترجمے میں Has Created پایا)۔ اور دُوسرے صفحہ پر یہ لکھا ہوا پڑھا: ''اسے اپنا پیغمبر قرار دے دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو ''وحی'' کہا جاتا ہے۔'' چنانچہ راقم الحروف کی ناقص فہم میں یہ شبہ سا ہوتا ہے کہ چونکہ یہاں وحی کا لفظ عام ہے، وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو دونوں پر مشتمل ہے، لہٰذا وحیٔ متلو پر اِشکال نظر آتا ہے، لہٰذا رہنمائی فرمائیں۔ عبدالحفیظ خانڈ والا، کینیا

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، ''وحی'' کے معنی ہیں ''اللہ تعالیٰ کا کسی بندے (پیغمبر) پر اپنا کلام نازل فرمانا، یا کسی اور طرح سے اُسے خبر دینا'' اور اس معنی میں وحی مخلوق، حادث اور غیر قدیم ہے۔ جو چیز قدیم اور غیر مخلوق ہے وہ اللہ کا کلامِ نفسی ہے، لیکن وحی کا اس کلامِ نفسی سے متعلق ہونا حادث اور مخلوق ہے، لہٰذا اس عبارت میں کوئی اِشکال نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۲/۴/۱ھ

کتاب الحدیث وما یتعلق به

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

مرسل حدیث کی حجیت سے متعلق احناف کا موقف

سوال:- مرسل روایت کے متعلق محدثین (جمہور) کا جو مسلک ہے وہ تو معلوم ہے، اور علمائے احناف کا مسلک معلوم ہے کہ ان کے ہاں مرسل روایت مقبول و حجت ہے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ مرسل روایت کا مقبول ہونا اکابر علمائے حنفیہ کے نزدیک علی الاطلاق ہے یا اس کی چند صورتیں مستثنیٰ ہیں، یعنی مثلاً ایک مرسل روایت کسی صحیح متصل سند والی مرفوع روایت کے مخالف ہے اور اس کے منافی ہے، حتیٰ کہ ان میں تطبیق کی صورت بھی نہ ہو، یا مثلاً اس مرسل روایت سے کوئی عقیدہ ثابت ہو، یا کسی مُسَلَّم عقیدے کے خلاف ہو مثلاً روایۃ العرنیین، یا پھر اس مرسل روایت سے کسی صحابی کی ناموس وغیرہ پر تردید ظاہر ہو، تو کیا یہ سب صورتیں اور اس قسم کی دُوسری صورتیں بھی مرسل روایت کی مقبول ہیں؟ یا یہ صورتیں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ایسی صورت میں وہ مقبول نہیں ہوتی، اگر اس قسم کی صورتوں میں اکابر علمائے حنفیہ مرسل روایت کو قبول نہیں فرماتے، اور جناب کو ایسے حوالے معلوم ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی اوّلین فرصت میں مجھے اس حوالہ و کتاب وغیرہ سے مطلع فرمائیں، نہایت شدید ضرورت ہے۔ ہاں! متقدمین اکابر حنفیہ کی کوئی قید نہیں لیکن اگر متقدمین میں سے حوالجات ہوں تو اور بھی بہتر ہے، ورنہ متأخرین اکابر حنفیہ کے بھی حوالجات کافی ہوں گے، حتیٰ کہ معاصرین علماء جید کے حوالجات ہوں تو وہ بھی تحریر فرمائیں، والسلام! پیر محبّ اللہ شاہ راشدی (حیدرآباد سندھ)

جواب:- حدیثِ مرسل کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس بارے میں عام طور پر حنفیہ کے مسلک کو دُرست طور پر سمجھا نہیں گیا۔ حنفیہ، محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل کو علی الاطلاق حجت نہیں سمجھتے، بلکہ جو مرسل حنفیہ کے نزدیک حجت ہوتی ہے اس کے لئے تین شرائط ہیں:-

۱:- پہلی شرط یہ ہے کہ مرسل قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں سے کوئی ہو۔ ۲:- دُوسری شرط یہ ہے کہ وہ خود جرح و تعدیل وغیرہ سے باخبر امام اور ثقہ ہو۔ ۳:- تیسری شرط یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کو بصیغۂ جزم مثلاً "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا" روایت کرے، لہٰذا عنعنہ کرے گا تو اس شرط کے مفقود ہونے کی بناء پر حدیث حجت نہ ہوگی، چنانچہ محقق ابنِ ہمامؒ نے "تحریر" میں مرسل کی یہ تعریف فرمائی ہے: "المرسل قول الامام الثقة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مع حذف من السند"۔[1]

(۱) التقرير والتحبير على تحرير الامام الكمال ابن الهمام "مسئلة مرسل" ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

یہ تعریف چونکہ محدثین کی تعریف سے مختلف ہے، اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حنفیہ ہر اس حدیث کو حجت مانتے ہیں جو محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرسل ہو، حالانکہ صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ اس مسئلے پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے مقدمہ فتح الملہم ص:۸۰ تا ۸۲ پر مفصل بحث کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں تو انشاء اللہ حنفیہ کا اصل موقف سامنے آجائے گا۔

ان شرائط کے ساتھ جو حدیث مرسل ہو وہ بعض اوقات مسند سے بھی قوی ہوسکتی ہے، لیکن کم از کم اس کے ہم پلہ تو ضرور ہوگی، لہٰذا اگر کسی مسند موصول حدیث کا ایسی حدیثِ مرسل کے ساتھ تعارض ہو تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو دو موصول حدیثوں میں تعارض کے وقت کیا جاتا ہے، اور اگر مرسل کی مذکورہ تین شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ حنفیہ کے نزدیک حجت ہی نہیں ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ حدیث موصول صحیح اس پر راجح ہوگی، هذا ما فهمت من مذهب الحنفية۔ واللہ اعلم

۱۴۰۴/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹/۳۵ الف)

”من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا .... الخ“ حدیث ہے یا نہیں؟

سوال:- ہماری مسجد میں سیکریٹری اور کارکن جماعتِ اسلامی کے ہیں، مسجد کا چبوترہ ایک شخص کو دیا ہوا تھا، میری دُکان کرایہ پر سامنے تھی، صبح جب میں قرآن شریف کی تلاوت کرتا تو وہ شخص ریڈیو پر فحش ریکارڈ بلند آواز سے چلاتا رہتا، مسجد کے کارکنوں سے شکایت کی، کوئی شنوائی نہ ہوئی، جماعت کے آدمی نے کہا کہ یہ سب تمہاری شہ پر ہورہا ہے۔

محرّم کے مہینے میں ان میں سے بعض ایسے لوگ آتے ہیں جو خود شیعہ ہیں، میں نے ایک حدیث پڑھی غالبًا عربی الفاظ یہ ہیں: ”من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا فهو زائر ليخرج الاسلام“ یہ سن کر اس شخص نے مجھے مارا، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

جواب:- ان الفاظ سے کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں، اور حدیث کی کتابوں میں تلاش سے بھی نہیں ملی، آپ نے جس کتاب میں دیکھی ہو اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو کچھ کہا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

سندِ حدیث میں لفظِ ”نا“ کا مطلب

سوال:- سند میں لفظِ ”نا“ کا استعمال کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- سند میں جو لفظِ ”نا“ ہوتا ہے، وہ ”حدثنا“ کا مخفف ہے، یعنی ہم سے حدیث

بیان کی۔
واللہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱/۱۱۱/۳۲ ج)

ہندوستان سے فرحت بخش ہوا آنے سے متعلق حدیث کی تحقیق

سوال:- کیا کوئی حدیث شریف اس مضمون کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ: ''ہندوستان سے ایسی فرحت بخش ہوا آتی ہے'' یا یہ مضمون ہو کہ ''میرا سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور مجھے فرحت محسوس ہوتی ہے'' یا یہ مضمون ہو کہ ''ہندوستان کے لوگ مجھے عزیز ہیں، کیونکہ وہ مجھے دیکھے بغیر ایمان لائیں گے۔''؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث احقر کے علم میں نہیں ہے، اور کتبِ حدیث میں سرسری تلاش سے ملی بھی نہیں۔
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۰۵/۲۷ و)

مطالعے کے لئے حدیث کی مستند کتب

سوال:- حدیث کی مستند ترین کتب برائے مطالعہ ارشاد ہوں۔

جواب:- ''انوار الباری'' (مکتبہ ناشر العلوم، بخارہ روڈ بجنور، یوپی)، ''الأدب المفرد'' امام بخاریؒ، ''ریاض الصالحین'' از امام نوویؒ اور ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے اُردو ترجمے چھپے ہوئے ہیں، لیکن فقہی اَحکام کے بارے میں صرف ایک آدھی حدیث کو دیکھ کر خود سے کوئی شرعی حکم نہ لگالیں، کیونکہ احادیث سے فقہی اَحکام مستنبط کرنے کے لئے وسیع و عمیق علم کی ضرورت ہے، جب تک تمام احادیث نگاہ کے سامنے نہ ہوں ان سے فقہی اَحکام کا مستنبط کرنا دُرست نہیں ہے۔
واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۷ھ
الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
(فتویٰ نمبر ۲۹۲/۱۹ الف)

طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایک حدیث

سوال:- طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایسی کوئی حدیث موجود ہے یا نہیں؟ اس طرح کہ ''جتنی عمر بڑھتی جائے گی اس دس سال کے معاصی کی مغفرت ہوتی جائے گی''؟

جواب:- اس مضمون کی کوئی حدیث کہیں نظر سے نہیں گزری، البتہ بڑی عمر کی فضیلت میں

یہ حدیث نسائی[1] اور ترمذی[2] وغیرہ میں مروی ہے کہ: "من شاب شیبةً فی الاسلام کانت له نورًا یوم القیامة." (الجامع الصغیر ص:۳۰، ۱۷۳)[3] یعنی جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوگیا ہو تو بڑھاپے کی سفیدی اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی۔ اور ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یہ ہیں: "لا تنتفوا الشیب فانه نور المسلم، من شاب شیبةً فی الاسلام کتب الله له بها حسنة وکفّر عنه بها خطیئة ورفعه بها درجة." رواہ أبوداوٗد. (مشکوٰۃ کتاب اللباس، باب الترجل ص:۳۸۲)[4] یعنی سفید بالوں کو مت نوچو کیونکہ وہ مسلمان کا نور ہے، جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوگیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی بناء پر ایک نیکی لکھے گا اور ایک خطا معاف کرے گا اور ایک درجے میں اضافہ فرمائے گا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ الف)

اثرِ صحابی نقل کرنے کے بعد "أو کما قال رضی الله عنه" کہنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر لمبا دُرود پڑھنا کیا حدیث کے پڑھنے پر بھی "تلاوت" کا لفظ بولا جاسکتا ہے؟

سوال ۱:- حدیث نقل کرنے کے بعد "کما قال علیه السلام" کہا جاتا ہے، اثرِ صحابی میں بھی کیا یہ حکم ہے؟

۲:- حدیث پڑھتے ہوئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آتا ہے تو "صلی اللہ علیہ وسلم" کہا جاتا ہے، کیا یہ بھی دُرست ہے: "صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم"؟

۳:- لفظِ "تلاوت" جیسے عام طور پر قرآن پر بولا جاتا ہے، یعنی جیسے "میں نے تلاوتِ قرآن کی"، تو حدیث پر بھی یہ لفظ بولنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- احادیث و آثار کے نقل کرنے میں جس قدر احتیاط سے کام لیا جائے، بہتر ہے، لہٰذا آثارِ صحابہؓ میں بھی "أو کما قال رضی الله عنه" کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲:- بلاشبہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔

---

(۱) سنن نسائی ج:۶ ص:۲۷ (مکتب المطبوعات الاسلامیة، حلب).

(۲) جامع الترمذی، باب ما جاء فی فضل من شاب شیبة فی .... الخ ج:۴ ص:۱۷۲ (دار احیاء التراث العربی) وکذا فی صحیح ابن حبان ذکر اعطاء الله جل وعلا نورًا فی القیامة، ج:۷ ص:۲۵۱ (مؤسسة الرسالة، بیروت).

(۳) الجامع الصغیر للسیوطیؒ رقم الحدیث:۸۷۶۳ ج:۴ ص:۱۷۵۴ (مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة)، وکذا فی المشکوٰة ص:۳۸۲ باب الترجیل (قدیمی کتب خانه).

(۴) مشکوٰة المصابیح (قدیمی کتب خانه).

۳:- احادیث کے لئے لفظِ ''تلاوت'' کے استعمال میں شرعاً تو کوئی اِشکال نہیں، لیکن عرف و محاورے کے خلاف ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

ایک حدیث یا مقولہ؟

سوال:- از راہِ کرم اس حدیث کے معانی سمجھا دیجئے کہ: ''ألا ان أولیاء اللہ لا یموتون .... الخ''۔

جواب:- یہ الفاظ احادیث کے کسی مجموعے میں ہمیں نہیں ملے، یہاں تک کہ موضوع احادیث کے مجموعے ''اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة'' (للحافظ السیوطیؒ) اور ''الأحادیث الموضوعة للشوکانیؒ'' بھی اس سے خالی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کا مقولہ ہے، حدیث نہیں ہے۔ بہرحال اگر اس جملے کا یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ اپنے کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہوتے ہیں تو دُرست ہے، لیکن اگر یہ مطلب لیا جائے کہ اولیاء اللہ کو موت نہیں آتی تو غلط ہے۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے: ''کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ''[1] یعنی ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۳/۲۳ھ[2]

بظاہر دو متعارض احادیث میں تطبیق (فارسی)

سوال:- تطبیق و مطلبِ احادیث ذیل مطلوب است، اُمید تفصیلا بزبان فارسی عام در قید تحریر برآوردہ بندہ را از موج خلجان رہانمائید، جواب بزبان فارسی ضرور نیست بلکہ ام زبان کہ باشد۔

عاصم ابن کلیب الجرمی عن أبیه قال: حسبته من الأنصار .... انه کان مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی جنازة فلقیه رسول امرأة من قریش یدعوه الی طعام، فجلسنا مجلس الغلمان من اٰبائهم، ففطن اٰباؤنا للنبی صلی اللہ علیه وسلم وفی یده أکلة فقال: ان هٰذه الشاة تخبرنی أنها أخذت بغیر حِلها، فقالت: یا رسول اللہ! لم یزل یعجبنی أن تأکل فی بیتی وانی أرسلت الی النقیع فلم توجد فیه شاة وکان أخی اشتری شاة بالأمس فأرسلت بها الی

(۱) سورة آل عمران: ۱۸۵۔
(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

أهله بالثمن، فقال: أطعموها الأسارى. (مشکل الآثار للطحاویؒ ج:۴ ص:۱۳۲)[1]

غرض اینکہ این حدیث سنداً ومتناً مضطرب است۔

سنداً:- در حدیث مشکل الآثار عاصم عن أبيه عن رجل أحسبه من الأنصار أبوحنيفة عاصم بن كليب عن أبي بردة ابن أبي موسىٰ عن أبي موسى الأشعري أبوحنيفة عاصم عن أبيه عن رجل من أصحاب النبي والحاكم والذي لم يذكرا عاصما بل خالفاه في تمام السند۔

متناً: از حدیث مشکل الآثار معلوم میشود نیز از مشکوٰۃ کہ آنحضرت بجنازہ رفتہ بود و بعد از رُجوع عن الجنازہ داعی زن آمدہ بود، واز حدیث ابوحنیفہ معلوم میشود کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برائے ملاقات یک قوم رفتہ بود ایشاں شاۃ را ذبح کرد، واز بعقل مفہوم میشود کہ کسی از صحابہؓ برائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثان تیار کردہ بود دعوت دادند، واز حاکم معلوم میشود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب بزنی مرور نمودند آن برائے شان شاۃ ذبح نمودند۔

جواب:- در احادیث مذکور ہیچ اضطراب نیست، واقعہ اینست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے جنازہ رفتہ بودند کہ بعد از فراغ زنے از انصار مردے را فرستاد وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را دعوت طعام داد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف بردند، پس در روایت مشکل الآثار ومشکوٰۃ مکمل واقعہ بیان کردہ شدہ است، و در روایتِ ثالثہ کہ از امام ابوحنیفہ مروی است قصہ جنازہ حذف کردہ، ومراد از قوم در "زاد قوما من الأنصار في دارهم" ہماں زن است، واین مراد نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے زیارت قوم انصار رفتہ بود کہ زن ایشاں را مدعو کرد واما در روایتِ رابعہ کہ در آں "صنع رجل من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم" آمدہ است پس بظاہر نسبت صنع طعام بمردم مجاز است کہ مراد از و رسول زن داعی بود نہ کہ داعی، واما روایتِ خامسہ کہ دران مرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بر زن داعی مذکور است، پس بروایاتِ سابقہ متعارض نیست، زیرا کہ ممکن است کہ وقتِ رفتن بجنازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرور بر زن فرمودہ وزن ایشان را دعوت دادہ، پس بعد از فراغ آن زن دوبارہ مردے را فرستاد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بیارد خصوصاً وقتیکہ بموجب روایتِ مشکوٰۃ زن داعی زن متوفی بود۔

اما اختلافیکہ در سند نظر می آید اضطراب نیست بلکہ تعددِ طرق است۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ　　　الجواب صحیح

۱۳۸۸/۱/۱۶ھ　　　محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۶ الف)

---

(۱) مشکل الآثار للطحاویؒ باب بيان مشكل ما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم مما يقضي بين المختلفين من الفقهاء في الشاة المغصوبة اذا ذبحت وشويت .... الخ. رقم الحديث: ۳۰۰۵، ۳۰۰۶ ج:۷ ص:۴۵۵ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت).

رأى الحنفية في قبول الأحاديث الضعيفة في فضائل الأعمال

(فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث قبول کرنے میں حنفیہ کی رائے سے متعلق عربی فتویٰ)

الى فضيلة الشيخ الفقيه البارع والمحدث المتقن مولانا محمد تقى العثمانى

حفظه الله ونفع به

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

أحمد اليكم الله الذى لا اله الا هو، ونصلى ونسلم على المبعوث رحمة للعالمين وعلى اله وصحبه أجمعين، وبعد!

من يمن الايمان والحكمة من صنعاء أبعث اليكم بهذه الرسالة سائلا الله العلى القدير أن يحفظكم وأن يكثر فى الأمة الاسلامية من أمثالكم، ولكم حرصت علىٰ لقائكم عندما زرتُ مدينتكم كراتشي قبل عامين ولٰكن مع الأسف لم أجدكم فيها، فقد كنتم حينها خارج بلادكم الباكستان، وكاتب هٰذه السطور هو محبكم فى الله عادل بن حسين أمين اليمانى الندوى وقد حدثنى عنكم عندما كنت فى الهند مولانا العلم الشامخ الأديب العملاق العالم الربانى سماحة الشيخ أبى الحسن الندوى حفظه الله تعالىٰ وكذٰلك الأستاذ الفاضل سبحان الحسينى الندوى، وصدق القائل "والأذن تعشق قبل العين أحيانا" وأسأل الله أن يسّر لى الاجتماع والاستفادة منكم وهو علىٰ ذٰلك قدير.

فضيلة الشيخ، لقد أردت أن أستفسركم وأوجه اليكم هٰذا السؤال الهام، الا وهو ما ذكره العلامة المحقق محمد عبدالحي اللكنوى رحمه الله تعالىٰ فى كتابه النفيس - الأجوبة الفاضلة فى صفحة: ٤٣ - عندما نقل كلام شمس الدين السخاويؒ فى (القول البديع فى الصلاة على الحبيب الشفيع) وذكر كلام الحافظ ابن حجر العسقلانى رحمه الله فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال وشروطه الثالثة المذكورة هنالك، وقد نقل العلائى الاتفاق على الشرط الأول، وأما الشرط الثانى والثالث فقد نقلا عن العز بن عبدالسلام وعن ابن دقيق العيد.

والسؤال هنا هو: ما هو رأى علماء الحديث من السادة الحنفية فى هٰذه الشروط؟ هل يعتبرونها أصلا هاما فى جواز رواية الحديث الضعيف فى فضائل الأعمال أم لا؟

وهل لهم أقوال فى هٰذه المسئلة؟ نرجو منكم غاية الرجاء البسط الشافى الكافى فى الجواب، ولكم بذٰلك عظيم الأجر والثواب من الله تعالٰى.

وأنتهز هٰذه الفرصة لمعرفة وقتكم المناسب حتّى تتكرموا بزيارة لنا الى اليمن الميمون، وبالأخص الى جامعة الايمان التى يترأسها فضيلة الشيخ عبدالمجيد الزندانى ويدرس فيها مجموعة طيبة من أهل العلم كالشيخ الدكتور عبدالكريم زيدان وغيره، والجامعة تحرص كثيرًا على استقادم علماء من البلاد الاسلامية، وقد زار الجامعة كثير منهم ونتمنى أن تبدوا وتظهروا استعدادكم حتّى يوجه شيخنا الزندانى دعوة الى فضيلتكم، وينفع الله بزيارتكم لهٰذه البلاد ورؤية ما فيها من الأثار والعبر، ولا أنسى أن أقول لكم: ان الأستاذ سلمان الحسنى الندوى قد زار الجامعة قبل ثلاثة أعوام، وحرض على أهمية الاتصال العلمى والثقافى بعلماء شبه القارة الهندية، وأنتم يا فضيلة الشيخ من أعلام علماء هٰذه القارة، ودعوتى هٰذه لكم هى اصالة عن نفسى ونيابة عن الجامعة التى أعمل فيها، ونأمل منكم قبول هٰذه الدعوة الصادقة وعدم ردّها، فهى مفتاح خير وبركة ان شاء الله تعالٰى.

فى الأخير! أرجو المعذرة من الاطالة، وأطلب منكم صالح دعواتكم لكاتب هٰذه السطور المبتلى بالعجز والتقصير - كما يعلم الله ذٰلك - وبلغوا سلامى علٰى محبيكم وتلامذتكم وأنا فى انتظار جواب السؤال وجواب الدعوة.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وكتبه محبّكم فى الله

عادل بن حسن أمين اليمانى الندوى

صنعاء - جامعة الايمان - يمن

الاجابة:-

الى فضيلة الشيخ عادل بن حسن أمين اليمانى المؤقر، حفظه الله تعالٰى ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

فقد تسلمت رسالتكم الكريمة، وقد تشرفت بمطالعتها والتعرف عليكم، فجزاكم الله تعالٰى خيرًا، وأجزل لكم مثوبة.

سألتم عن رأى الحنفية فى قبول الأحاديث الضعيفة فى فضائل الأعمال، وما ذكر الامام اللكنوى رحمه الله تعالٰى من ثلاثة شروط لقبول الحديث الضعيف، فهو المختار عند

جمع كبير من الحنفية، ومن أهم هٰذه الشروط أن الحديث الضعيف لا يثبت به حكم جديد، حتى الاستحباب علىٰ سبيل الحتم، وانما معنى قبوله أن يتأكد به حكم ثبت سابقا بنص صحيح أو حسن، أو أن يعمل به على سبيل الاحتياط والاحتمال، دون الحتم بالقول بسنيته أو استحبابه، وهناك جمع من العلماء الحنفية يقبلون الحديث الضعيف، حتى لاثبات حكم جديد في الفضائل، وان مشائخي الذين شرّفني الله بالتلمذ عليهم، كانوا يختارون الرأي الأوّل، فمثلًا: حديث صوم السابع والعشرين من رجب، لم يثبت في حديث صحيح،[1] ولذٰلك أنكر الشيخ أشرف على التهانوي رحمه الله سنية هٰذا الصوم أو استحبابه، ولٰكن أجاز أن يصوم أحد علىٰ سبيل احتمال الاستحباب.

أما اذا تأيد الحديث الضعيف بتعامل العلماء فانه يمكن عند الحنفية أن يثبت له حكم جديد، وهٰذا مثل فضل صلاة التسبيح واحياء ليلة النصف من شعبان، وأمثلة ذٰلك كثيرة.

واني أشكركم علىٰ ما دعوتموني الى جامعة الايمان باليمن، وكم يسعدني أن أتشرف بزيارة العلماء وطلبة العلم هناك، واني أقبل هٰذه الدعوة بكل اعتزاز وسرور، ولٰكن الأشهر الثلاثة القادمة مرهقة بالأسفار الأخرىٰ، فلعل ذٰلك انما يتيسر بعد الحج، في بداية شهر محرم الحرام ان شاء الله تعالىٰ، وان وصلت الى الدعوة الرسمية في خلال شهر ذي الحجة، فسوف أحدّد التاريخ بالضبط ان شاء الله تعالىٰ.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقي العثماني

من الرياض ٩ من شوال ١٤١٩هـ

وعنواني الدائم: دار العلوم كراتشي ١٤،

الرمز البريدي ٧٥١٨٠ باكستان

(فتویٰ نمبر ۶۴/۳۴۷)

”لن تجتمع أمتي على الضلالة“ کے بعد ”فان أجمعت أمتي على الضلالة .... الخ“ کے الفاظ حدیث میں ہیں یا نہیں؟

سوال:- ”لن تجتمع أمتي على الضلالة“ کے بعد ”فان أجمعت أمتي على الضلالة

(١) وفي عون المعبود ج:٧ ص:٦٠ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولم يثبت في صوم رجب نهي ولا ندب ولا نهي لعينه، ولٰكن أصل الصوم مندوب اليه.

فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ بھی حدیث میں ہیں یا نہیں؟

جواب:- "لن تجتمع أمتی علی الضلالة"(۱) کے بعد "فان أجمعت أمتی علی الضلالة فأنا بریٔ منهم" کے الفاظ کسی مستند کتاب میں ہمیں نہیں ملے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

حدیث "بعثت الی الأسود والأحمر" کی تحقیق؟

سوال:- "بعثت الی الأسود والأحمر" کی حدیث کس کتاب اور کس مقام پر ہے؟

جواب:- ان الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری، اور مراجعتِ کتب کی اس وقت فرصت نہیں، البتہ مضمون صحیح ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔(۲)

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے: مجمع الزوائد للهیثمیؒ ج:۵ ص:۲۱۸ (طبع دار الریان للتراث قاهرة، و دار الکتب العربی بیروت) نیز اس معنی کی اور احادیث دیکھئے: مشکوٰة المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسّنّة ج:۱ ص:۳۰ (طبع قدیمی کتب خانه کراچی).

(۲) سائل نے اپنے سوال میں "بعثت الی الأسود والأحمر" کے الفاظ ذکر کئے ہیں جبکہ ان الفاظ کے بجائے "بعثت الی الأحمر والأسود" کے الفاظ مختلف کتبِ احادیث میں موجود ہیں، چنانچہ مجمع الزوائد للهیثمی ج:۸ ص:۲۵۸ (طبع دار الریان للتراث، دار الکتاب العربی قاهره و بیروت) میں ہے: باب عموم بعثته صلی الله علیه وسلم عن أبی موسیٰ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أعطیت خمسا بعثت الی الأحمر والأسود وجعلت لی الأرض طهورا وأحلت لی الغنائم ولم تحل لمن کان قبلی ونصرت بالرعب شهرا وأعطیت الشفاعة ولیس من نبی الا وقد سأل شفاعة وانی اختبات شفاعتی ثم جعلتها لمن مات لا یشرک بالله شیئا. رواه أحمد متصلا ومرسلا والطبرانی ورجاله رجال الصحیح. وعن ابن عباس أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: أعطیت خمسا لم یعطهن نبی قبلی ولا أقولن فخرًا بعثت الی الأحمر والأسود ونصرت بالرعب .... الخ. اس کے علاوہ بعض دیگر صحابہؓ سے بھی دیگر روایات میں یہ الفاظ ثابت ہیں جن میں سے بعض طرق ضعیف اور بعض صحیح ہیں۔ دیکھئے: صحیح ابن حبان ج:۴ ص:۳۷۵ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) رقم الحدیث: ۲۴۶۲. معجم الأوسط طبرانی ج:۷ ص:۲۵۷ (طبع دار الحرمین قاهرة). موارد الظمآن ج:۱ ص:۷۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت). سنن دارمی ج:۲ ص:۲۹۵ (طبع دار الکتاب العربی بیروت) و مجمع الزوائد ج:۸ ص:۳۶۹ (طبع دار الکتاب العربی بیروت). مصنف ابن ابی شیبة ج:۶ ص:۳۰۳، ۳۰۴ (طبع مکتبة الرشد، ریاض). مسند أحمد ج:۱ ص:۲۵۰ (طبع مؤسسة قرطبة). (محمد زبیر حق نواز)

عمامہ کی فضیلت میں حدیث

سوال:- کسی حدیث میں عمامہ کی خصوصی فضیلت موجود ہے یا نہیں؟

جواب:- عمامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور یہی اس کی فضیلت ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ایک امتیازی علامت یہ ہے کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ پہنتے ہیں۔ ''فرق ما بین المسلمین والمشرکین العمائم علی القلانس''۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۰۸ د)

■■■

(۱) وفی جامع الترمذی باب العمائم علی القلانس رقم الحدیث: ۱۷۸۴ ج:۴ ص:۲۴۷ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) .... قال رکانۃ: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ثم ان فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس. وکذا فی سنن أبی داؤد رقم الحدیث: ۴۰۷۸ ج:۴ ص:۵۵ (طبع دار الفکر).

﴿کتاب ما یتعلق بالدعوة و التبلیغ﴾

(دعوت وتبلیغ کے مسائل)

تبلیغ اور جہاد کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ سے متعلق تحقیق اور مروّجہ تبلیغی جماعت اور اس میں اوقات لگانے کی شرعی حیثیت

سوال:- سیّدی حضرتِ اقدس حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ، مزاجِ گرامی! دِل سے دُعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو ہمیشہ صحت و عافیت کے ساتھ خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حضرت! اس ناکارہ کے دِل میں حضرت کی جو محبت و عظمت ہے، اس کے اظہار میں طوالت ہوجائے گی، مختصراً عرض ہے کہ حضرت کے لئے دِل و جان سے، دِل کی اتھاہ گہرائیوں سے دُعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

حضرت کی مصروفیات تو واقعی ہوتی ہیں، تاہم ایک مسئلہ میں حضرت کی رائے مطلوب ہے، دُوسری کسی جگہ سے حضرت جیسی تسلی متوقع نہیں تھی، اُمید ہے جواب سے بہرمند فرمائیں گے۔

حضرت! اکابر کی کتابوں سے اور حضرت کے ایک مستقل وعظ ''دین کی حقیقت تسلیم و رضا'' سے یہ بات دِل میں بیٹھ گئی ہے کہ دین شوق پورے کرنے کا نام نہیں بلکہ اس وقت جو حکم اور وقت کا تقاضا ہو، اس کے پورے کرنے کا نام دین ہے۔ لیکن دُوسری طرف اپنے اکابر تبلیغی جماعت والوں کے ہاں دین کی حقیقت کو ''قربانی'' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے تردّد ہوتا ہے کہ صحیح طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

مثلاً ہمارے پاکستان کے سابقہ امیر .... صاحب مدظلہم کا جس ہفتے کا سہ روزہ متعین تھا، اسی ہفتے ان کے سسر کا انتقال ہوگیا، اب وہ سوچ میں تھے کہ کیا کریں؟ تسلیم و رضا کے پیشِ نظر تو سہ روزہ کو اس ہفتے مؤخر بھی کیا جاسکتا تھا، تاکہ غمزدہ بیوی کو شوہر کے ساتھ رہنے سے تسلی ہو، لیکن امیر صاحب پاکستان نے سہ روزہ کو مقدّم رکھا اور چلے گئے، واپسی پر فکرمند تھے کہ بیوی ضرور خفا ہوگی، لیکن بیوی خلافِ توقع بہت محبت سے پیش آئی، اور عرض کیا کہ: رات اباجی خواب میں ملے تھے، انہوں نے کہا کہ .... آئے تو اس پر خفا نہ ہونا، اس کے سہ روزہ پر جانے سے اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی ہے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت نہ نکلتے تو یہ مغفرت کا بہانہ کیسے بنتا؟

اکثر اکابر تبلیغ والوں سے سنتے ہیں کہ انتظامی چلّوں اور سالوں سے ثواب تو ہوتا ہے لیکن کفر نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ اس کے لئے ''قربانی'' شرط ہے کہ گھر میں بیوی بیمار ہے، کھیت میں فصل تیار ہے،

جیب میں رقم نہیں، حالات خراب ہیں، تب نکلے گا تو ہدایت عام ہوگی۔ اب تسلیم و رضا کے پیشِ نظر جب بیوی بیمار ہے تو اس کی دِلجوئی ضروری ہے، فصل تیار ہے تو کٹائی ضروری ہے، اب اس میں تسلیم و رضا کو دیکھا جائے یا قربانی کو؟ غالباً غزوۂ تبوک میں کھجور بالکل پکی ہوئی تھیں، لیکن دین کی حقیقت قربانی کے پیشِ نظر صحابہؓ اللہ کے راستے میں نکل گئے۔

ایک صاحب نے ایک عالم سے پوچھا کہ ایک شخص اللہ کے راستے میں نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا بوڑھا والد نابینا ہے، جوان بیوی ہے اور آس پاس ماحول بھی سازگار نہیں، اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔ اس عالم نے کہا کہ صورتِ مسئولہ میں یہ شخص اگر نکلتا ہے تو بڑا ظالم ہے۔ اس عالم کو بتایا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر کی یہی حالت تھی جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تھے۔ اب تسلیم و رضا کے تحت تو نہ نکلنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن بزرگ کہتے ہیں کہ جب اسی حالت میں نکلے گا تو جہاں کفر ٹوٹے گا وہاں اس کا یقین بھی بنے گا اور گھر والوں کا یقین بھی بنے گا کہ حقیقی محافظ اور رازق تو اللہ ہے۔

بعض لوگوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وقت چونکہ بلوغِ اسلام نہیں ہوا تھا، اس لئے ان پر یہ ذمہ داری بڑھی ہوئی تھی، اب تو بلوغِ اسلام ہوگیا ہے، اب ویسی ذمہ داری نہیں، جبکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جب بے دینی اور دین سے دُوری اسی دور کے مثل عود کر آئی ہو تو کیا حکم وہی عود کر نہیں آئے گا؟

اکابر اہلِ علم، تبلیغ میں نکلنے کی شرعی حیثیت کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں، جبکہ تبلیغ کے بزرگ کہتے ہیں کہ کفایہ کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ فرض کی ادائیگی میں کفایت بھی کر جائے، اب اربوں انسان دین سے دُور ہیں، تو کیا سینکڑوں اور ہزاروں کا نکلنا اس فرض کی ادائیگی میں کفایت کر رہا ہے؟

بعض ساتھیوں سے یہ بھی سنتے ہیں کہ ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو اِفطار کروادیئے تھے لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا۔ اسی طرح حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو جب غسلِ جنابت کی حاجت تھی، وقت کا تقاضا تو غسل تھا، لیکن انہوں نے اسی ناپاکی کی حالت میں اللہ کے راستے کو مقدّم رکھا۔

حضرت! اُمید ہے کہ میں نے اپنے اِشکال کی وضاحت کافی حد تک کردی ہے، مزید طوالت مناسب نہیں لگتی۔ حضرت اپنی فقیہانہ بصیرت و خداداد فہم کے تحت اس بات کی کسی قدر تفصیل سے وضاحت فرمادیجئے کہ بعض اوقات جب دین کا تقاضا تبلیغ والے پیش کرتے ہیں تو اس وقت کوئی نہ کوئی شرعی تقاضا بھی درپیش ہوجائے تو تسلیم و رضا کے تحت اس تقاضے کو پورا کیا جائے یا صحابہ کرامؓ کی طرح

قربانی کر کے ان تقاضوں کو مؤخر کر دیا جائے؟

حضرت! مذکورہ اِشکال کے ساتھ ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ بعض اُمور میں اکابر اہلِ علم اور اکابر اہلِ تبلیغ کے زاویۂ نگاہ میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے، مثلاً عام اہلِ علم تبلیغ میں نکلنے کو فرضِ کفایہ اور تبلیغ والے فرضِ عین بتلاتے ہیں، جیسے آج سے نصف صدی قبل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحبتِ اہل اللہ کے فرضِ عین ہونے کا فتویٰ دیا تھا، کیونکہ بدون صحبتِ اہل اللہ اس وقت اصلاحِ ظاہر و باطن قریب قریب ناممکن تھی۔ اب یہ بات بھی مشاہدہ ہے کہ نکلنے سے نہ صرف عوام بلکہ علمائے کرام کی دینی حالت میں جو انقلاب آتا ہے اس کا خود مشاہدہ ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو اگر مقدمۃ الواجب واجبٌ کے تحت نکلنے کو فرضِ عین بتلایا جائے تو اس کی کیا شرعی حیثیت ہوگی؟ والسلام

بندہ محمد راشد

جواب:- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ احقر ناکارہ کے لئے جس طرح دُعائیں کرتے ہیں، اس پر کس زبان سے شکر ادا کروں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین صلہ دُنیا و آخرت میں عطا فرمائیں، آمین۔

آپ نے تبلیغی جماعت کے بارے میں جو باتیں پوچھی ہیں، ان کے بارے میں چند اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ باعثِ اطمینان ہوں۔

۱:- جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت ایک ایمرجنسی کی حالت ہوتی ہے، اس وقت نہ تجارت جائز ہے، نہ بیوی بچوں کے عام حقوق اس طرح باقی رہتے ہیں جیسے امن کی حالت میں ہوتے ہیں، اور نہ جہاد کے سوا کوئی اور ایسا کام جائز ہوتا ہے جو جہاد کے منافی یا اس کی راہ میں رُکاوٹ بننے والا ہو۔[1] آپ نے صحابہ کرامؓ کے عہدِ مبارک کی جتنی مثالیں پیش کی ہیں، وہ سب اسی حالت سے متعلق ہیں، غزوۂ تبوک میں جہاد کے فرضِ عین ہونے کا اعلان خود قرآنِ کریم میں بھی فرمایا گیا تھا،[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوٹوک الفاظ میں واضح فرمادیا تھا، لہٰذا پکی ہوئی کھیتیاں یا گھر والوں کے مسائل اس فرضِ عین کی ادائیگی میں مانع نہیں ہوسکیں۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ جیسے جانباز صحابی کو حکم دیا کہ وہ مدینہ منوّرہ میں رہ کر کمزوروں کی دیکھ بھال کریں۔ حضرت علیؓ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ جہاد کی فضیلت حاصل کریں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے تسلیم و

(۱) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تصنیف "تکملہ فتح الملہم" کتاب الامارة، مسئلة فرضية الجهاد ج:۳ ص:۳۷۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ" الآية. سورة التوبة: ۱۲۰.

رضا کی خاطر مدینہ منورہ میں رہے، اور کمزوروں کی دیکھ بھال کی۔[1] حضرت حنظلہؓ کا واقعہ بھی ایسے ہی وقت کا ہے جب دُشمن حملہ آور ہو چکا تھا اور جہاد فرضِ عین تھا۔[2] حضرت صدیقِ اکبرؓ پر بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت فرض ہو چکی تھی، اور انہوں نے اسی فریضے کو ادا فرمایا، ورنہ عام حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کو جہاد پر مقدّم قرار دیا، اور ایسے صحابہؓ کو لوٹا دیا جو والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر جہاد کے لئے آئے تھے۔[3]

اگر سہ روزہ یا چلّے پر نکلنا اسی درجے میں فرضِ عین قرار دیا جائے جس درجے میں جہاد نفیرِ عام کے وقت فرض ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تجارت، صنعت، زراعت کچھ جائز نہ ہو، بلکہ ہر انسان ہر وقت تبلیغی سفر پر ہی رہے، جیسا کہ جہاد کے فرضِ عین ہونے کے وقت دُوسرا کوئی کام جائز نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر سہ روزہ یا چلّہ لگانا فرضِ عین ہے تو اس کی حد کیا ہے؟ کتنے سہ روزوں اور کتنے چلّوں سے یہ فرضِ عین ادا ہو جائے گا؟ اگر کہیں کہ ہر مہینے سہ روزہ اور ہر سال چلّہ لگانے سے فرضِ عین ادا ہو جائے گا'' تو اوّل تو یہ تعیین کس بنیاد پر کی گئی؟ کیا قرآن وحدیث کا کوئی حکم اس کی تعیین کرتا ہے؟ دُوسرے سہ روزہ لگانے کے بعد جب آدمی پورے مہینے تجارت یا زراعت میں مصروف ہوگا تو کیا اس وقت تبلیغی سفر فرضِ عین نہیں ہوگا؟ اگر نہیں ہوگا تو وہ فرضِ عین کہاں رہا؟ اور ہوگا تو تجارت اور کسبِ معاش کیسے جائز ہوا؟

۲:- آپ نے لکھا ہے کہ: ''ایک سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے تو اِفطار کرادیئے، لیکن تبلیغی سفر موقوف نہیں فرمایا۔'' اوّلاً تو یہ تبلیغی سفر نہیں تھا، فتحِ مکہ کے جہاد کا سفر تھا۔[4] دُوسرے روزے، مشقتِ شدیدہ کی وجہ سے اِفطار کرائے گئے،[5] سفر موقوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، زیادہ سے

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب من حبسه العذر عن الغزو ج:۱ ص:۳۱۸ حدثنا أحمد بن یونس ثنا زهیر ثنا حمید أن أنسا حدثهم قال: رجعنا عن غزوة تبوک مع النبی صلی الله علیه وسلم .... الخ. و ثنا سلیمان بن حرب ثنا حماد هو ابن زید عن حمید عن أنس أن النبی صلی الله علیه وسلم کان فی غزاة فقال: ان أقواما بالمدینة خلفنا ما سلکنا شعبا ولا وادیا الا وهم معنا فیه حبسهم العذر .... الخ. وکذا فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه).

(۲) وفی المغنی لابن قدامة ج:۹ ص:۱۷۴ (طبع دار الفکر بیروت) مسئلة قال وواجب علی الناس اذا جاء العدو أن ینفروا المقل منهم والمکثر ولا یخرجوا الی العدو الا باذن الأمیر الا أن یفجأهم عدو غالب یخافون کلبه فلا یمکنهم أن یستأذنوه .... أن النفیر یعم جمیع الناس ممن کان من أهل القتال حین الحاجة الی نفیرهم لمجیٔ العدو الیهم ولا یجوز لأحد التخلف الا من یحتاج الی تخلفه لحفظ المکان والأهل والمال ومن یمنعه الأمیر .... وذٰلک لقول الله تعالٰی: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا. التوبة. وقول النبی صلی الله علیه وسلم: اذا استنفرتم فانفروا .... وقال بعد أسطر .... وقد نفر من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو جنب یعنی غسیل الملٰئکة حنظلة بن الراهب .... الخ.

(۳) دیکھئے: الصحیح لمسلم ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع قدیمی کتب خانه) و جامع الترمذی ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۴، ۵) وفی الترمذی ج:۱ ص:۸۹ (طبع فاروقی کتب خانه) باب ما جاء فی کراهیة الصوم فی السفر، عن جابر بن عبدالله أن رسول الله صلی الله علیه وسلم خرج الی مکة عام الفتح فصام حتّی بلغ کراع الغمیم وصام الناس معه فقیل له: ان الناس شق علیهم الصیام، وأن الناس ینظرون فیما فعلت، فدعا بقدح من ماء بعد العصر فشرب والناس ینظرون الیه، فأفطر بعضهم وصام بعضهم .... الخ. ....(باقی اگلے صفحے پر)

زیادہ شدید گرمی تھی، صرف اتنی بات سے جہاد کو ترک کرنا ضروری نہ تھا، کیونکہ اس مشقت کا اثر زیادہ سے زیادہ اپنی ذات پر تھا، کسی کا حق یا مال تلف نہیں ہو رہا تھا۔

۳:- آپ نے فرضِ کفایہ کا جو مطلب لکھا ہے، اگر کفایہ کا یہی مطلب ہے تو پوری تاریخِ اسلام میں جہاد کو کبھی ''فرضِ کفایہ'' نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ غیر مسلموں کی تعداد تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کے تین گنے سے بھی ہمیشہ زائد رہی ہے۔ کروڑوں انسان ہر دور میں دین سے دُور رہے ہیں، لہٰذا جب فقہائے اُمت نے جہاد کو فرضِ کفایہ قرار دیا تو کیا اس وقت دُنیا کی اکثریت مسلمان ہوگئی تھی؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے تشریف لے گئے تو صحابہ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے، جو ظاہر ہے کہ اس وقت کی دُنیا کی آبادی کا بہت مختصر حصہ تھا۔ لیکن کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی سفر کو فرضِ عین قرار دے کر کبھی صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ سب اپنے حقوقِ واجبہ ترک کرکے دُوسرے شہروں اور ملکوں میں جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ''فرضِ کفایہ'' کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر مسلمانوں کی معتد بہ جماعت یہ کام کر رہی ہے تو اس کا یہ عمل دُوسروں کے فریضے کی ادائیگی کے لئے بھی کافی ہو جاتا ہے۔

۴:- ''تسلیم و رضا'' اور ''قربانی'' میں کوئی تعارض نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت قربانی چاہتی ہے، کبھی یہ قربانی جان کی ہوتی ہے، کبھی مال کی، کبھی خواہشات کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو تبوک جانے سے روکا اور انہوں نے سرِ تسلیم خم کردیا تو یہ تسلیم و رضا بھی تھی اور خواہش کی قربانی بھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو جنگِ بدر میں شرکت سے روکا اور انہوں نے اطاعت کی تو یہ بھی خواہش کی قربانی تھی۔ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے اس وقت جان، مال اور دُنیوی خواہشات کی قربانی دی جاتی ہے۔ اور جب فرضِ کفایہ ہو، اور انسان کے لئے شرعاً جانا جائز ہو تب بھی وہ انہی چیزوں کی قربانی پیش کرتا ہے، لیکن جب تک فرضِ عین نہ ہو، یہ قربانی اپنی ذات کی حد تک محدود رہتی ہے، دُوسرے اصحابِ حقوق کی قربانی نہیں کی جاتی۔ ہاں! اگر اصحابِ حقوق اپنے حقوق خوشی سے چھوڑ دیں تو ان کے لئے باعثِ اجر ہے، اور اس صورت میں جہاد یا دعوت کے کام میں شرکت باعثِ اجرِ عظیم ہے۔ آپ نے جن بزرگ کی مثال دی کہ ان کے سسر کا انتقال ہوگیا تھا، پھر بھی وہ سہ روزہ پر چلے گئے، ان کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان کی اہلیہ کو ان کے جانے

(گزشتہ سے پیوستہ)............ وفی جامع الترمذی، أبواب فضائل الجهاد، باب فی الفطر عند القتال ج:۱ ص:۲۰۱، ۲۰۲ (طبع مذکور) عن أبی سعید الخدری قال: لمّا بلغ النبی صلی اللہ علیه وسلم عام الفتح مرّ الظهران فآذننا بلقاء العدو فأمرنا بالفطر فأفطرنا أجمعین. هذا حدیث حسن صحیح. مزید احادیث اور تفصیل کے لئے دیکھئے: درسِ ترمذی ج:۲ ص:۵۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے کوئی نا قابلِ برداشت تکلیف نہیں ہوئی تو شرعاً ان کا یہ عمل ناجائز نہیں تھا، البتہ افضل ہونے میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اور خواب کوئی شرعی حجت نہیں ہے جس سے کسی حکمِ شرعی پر استدلال کیا جائے۔

۵:- یہ بات احقر کی فہمِ ناقص سے بالاتر ہے کہ تبلیغ میں نکلنے پر ہمیشہ صحابہ کرامؓ کے جہاد کے واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے، لیکن عملاً جہاد کے بارے میں طرزِ عمل یہ ہے کہ گویا جہاد کوئی شرعی فریضہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسے عملاً منسوخ سمجھا جاتا ہے اور جہاد کی بعض اوقات مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

۶:- مذکورہ بالا گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تبلیغی جماعت کا مخالف ہوں، یا یہ کہ تبلیغ کے کام کو اہمیت نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ کا کام نہایت اہمیت کا حامل ہے، خاص طور پر تبلیغی جماعت نے بفضلہٖ تعالیٰ مجموعی حیثیت سے بڑا قابلِ تعریف کام کیا ہے اور اس سے اُمت کو بہت فائدہ پہنچا ہے، لیکن کسی کام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ہر قیمت پر فرضِ عین قرار دیا جائے۔ دُوسرے، جہاں تبلیغی جماعت کے ساتھ تعاون و تناصر ضروری ہے، وہاں بعض غلو آمیز باتوں کی اصلاح بھی ضروری ہے جو بعض نو وارد یا حدود کی رعایت نہ رکھنے والے حضرات سے سرزد ہوتی رہتی ہیں، اور اب بعض اوقات اَحکامِ شرعیہ میں تصرف کی حد تک پہنچ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی صحیح فہم اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ والسلام

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۸/۳/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵/۲۷۶)

عورتوں کے لئے تبلیغی اجتماع میں شرکت کا حکم

سوال:- جس طرح مرد مسجد میں تبلیغ کرتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی مبلغ ہیں، محلے کی عورتوں کو دعوت دیتی ہیں، ان کی طرف سے مرد، مسجد میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں جگہ عورتوں کا اجتماع ہے، آپ حضرات اپنی ماں، بہنوں کو وہاں بھیجیں۔ عورتوں کا اس قسم کے اجتماع کے لئے غیر محرَم کے گھر جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر عورتیں پردے کے اہتمام کے ساتھ تبلیغی اجتماع میں جائیں تو جائز ہے، بلکہ بحالاتِ موجودہ ایسے اجتماعات میں عورتوں کی شرکت مفید ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲/۲۷ و)

جو خود دین کا پابند نہ ہو، کیا وہ تبلیغ کرسکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص خود تو دین کا پابند نہیں ہے، لیکن وہ تبلیغ کرتا ہے، تو کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟

جواب:- کرسکتا ہے،(۱) لیکن خود بھی دین کی پابندی کی پوری کوشش کرنی واجب ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۵/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

ایک حدیث کی رُو سے تبلیغ کو ترک کرنے کا حکم

سوال:- جب تم دیکھو کہ حرص کی اطاعت کی جارہی ہے، خواہشِ نفس کی پیروی کی جارہی ہے، دُنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھتا ہے تو اپنی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ کیا وہ وقت اس وقت موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو ''عوام کی فکر'' اس میں کون سے اُمور شامل ہیں؟ کیا تبلیغ ترک کردی جائے؟

جواب:- حدیثِ مذکور(۲) میں جس زمانے کا ذکر ہے، بظاہر ابھی وہ دَور نہیں آیا، ابھی تبلیغِ دین کا فریضہ ساقط نہیں ہوا، بحالاتِ موجودہ تبلیغ فائدے سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۸/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۹/۱۹ الف)

والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغ یا کسی اور سفر پر جانے کا حکم

سوال:- بندہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتا ہے، ایک نہایت معتبر عالم نے بیان کیا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغی جماعت کے ساتھ جانا جائز ہے، لیکن معارف القرآن میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں ملا۔ غالبًا ان کو کتاب کے نام

---

(۱) تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۷ ص:۴۲۴، ۴۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی التفسیر للطبریؒ ج:۷ ص:۹۷ (طبع دار الفکر بیروت) عن أبی أمیة الشعبانی قال: سألت أبا ثعلبة الخشنی: کیف نصنع بهٰذه الأیة: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ" فقال أبو ثعلبة: سألت عنها خبیرًا سألت عنها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنکر حتّٰی اذا رأیت شحًا مطاعًا وهوًی متبعًا واعجاب کل ذی رأی برأیه فعلیک بخویصة نفسک وذروهم فان وراءکم أیاما أجر العامل فیها کأجر خمسین منکم .... الخ. اور حدیثِ مذکور کے آخری الفاظ کے ہم معنی الفاظ "علیک بأمر خاصة نفسک ودع أمر العامة" جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن ص:۲۶۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) میں بھی موجود ہیں۔ (مرتب عفی عنہ)

میں مغالطہ ہوا، آپ کی طرف رُجوع فرمانے کا انہوں نے مشورہ دیا، اس بنا پر آنجناب سے درخواست ہے کہ اگر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہو تو اس کا متن معہ استفتاء تحریر فرمادیں اور ساتھ ہی کتاب کا نام اور صفحے کا حوالہ بھی تحریر فرمائیں، کیونکہ تبلیغی حضرات بڑی شدّت کے ساتھ اس چیز کو بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت ان حضرات کا جماعتوں میں جانا تبلیغ کے لئے نہیں ہے بلکہ اس وقت ان کا گھر سے نکلنا اس بات کے لئے ہے کہ مسلمان کو اس کی کھوئی ہوئی دولت، جس کو دعوت الی اللہ کہتے ہیں، دوبارہ مل جائے اور ہر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل کے غم اور جذبے کو اپنا غم اور جذبہ بنائے، اور اسی چیز کو یہ حضرات دین کی اساس کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج سرِعام اللہ کے اَحکام کو توڑا جارہا ہے اور سنتوں کو پامال کیا جارہا ہے۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان حالات کی بناء پر کسی شخص کا والدین اور بیوی بچوں کے حقوق کی وجہ سے گھر میں بیٹھے رہنا ناجائز ہے، اور اپنی بات کے حق میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ کرامؓ جو اپنے والدین کو، اپنے بیوی بچوں کو فاقوں میں چھوڑ کر گھروں سے نکلے، کیا انہوں نے غلط کیا؟ اور اس سلسلے میں بے شمار واقعات پیش کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غلط حکم دیا؟ اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی آیتیں پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر: "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ .... الخ"، "اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ...."، "قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآءُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ" وغیرہ وغیرہ۔

میرے جیسے حضرات ان کے یہ بھاری بھرکم دلائل سن کر خاموش ہوجاتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب نے بیان کیا کہ مسلمان کا دعوت نہ دینا ساری انسانیت پر ظلم ہے، مطلب یہی ہے کہ جن چیزوں کی وجہ سے یہ دعوت دینے سے رُکے گا وہ بھی ظلم کہلائے گا۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں، نیز یہ کہ اگر یہ کام حق ہے تو کس درجے کا حق ہے؟ یعنی نفلی عبادت کے زُمرے میں ہے یا سنت و واجب؟ یا موجودہ حالت میں سارے فرائض سے بڑھ کر سب سے بڑا فرض ہے؟

جواب:- والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کوئی فتویٰ اس اطلاق کے ساتھ احقر کے علم میں نہیں، ویسے مسئلہ یہ ہے کہ اگر والدین تنگ دست ہوں اور بیٹے کے سفر پر جانے کی صورت میں ان کے خرچ کا انتظام نہ ہو، یا ضعیف اور بیمار ہوں اور ان کی خدمت اور خبرگیری کے لئے اور کوئی موجود نہ ہو، تب تو ان کی اجازت اور مرضی کے خلاف کسی بھی سفر میں جانا جائز نہیں، خواہ وہ سفر تبلیغ کا ہو، یا تحصیلِ علم کا، یا حج وعمرہ کا، لیکن اگر ان کے خرچ کا بھی انتظام ہے اور خبرگیری کرنے والے بھی موجود ہیں تو ایسی صورت میں فقہاءؒ نے ایسے سفر کی اجازت دی ہے جس میں ہلاکت کا

گمان غالب نہ ہو، اس حال میں اگر والدین کی اجازت کے بغیر بھی کوئی شخص تبلیغ کے سفر پر چلا جائے تو اِن شاء اللہ گناہ نہ ہوگا۔

قال محمدؒ فی السیر الکبیر: اذا أراد الرجل أن یسافر الی غیر الجھاد لتجارۃ أو حج أو عمرۃ وکرہ ذٰلک أبواہ فان کان یخاف الضیعۃ علیھما بأن کانا معسرین ونفقتھما علیہ، وما لہ لایفی بالزاد والراحلۃ ونفقتھما فانہ لا یخرج بغیر اذنھما .... وان کان لا یخاف الضیعۃ علیھما بأن کانا موسرین لم تکن نفقتھما علیہ.

ان کان سفرا لا یخاف علی الولد الھلاک فیہ کان لہ أن یخرج بغیر اذنھما .... وکذا الجواب فیما اذا خرج للفقہ. (عالمگیریۃ ج:۵ ص:۳۶۵ کتاب الحظر والاباحۃ باب:۲۶).[۱]

البتہ اگر یہ سفر ایسا خطرناک ہو کہ اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، مثلاً جہاد (بشرطیکہ نفیرِ عام نہ ہو) یا شدید گرمی یا سردی میں پیدل صحراؤں، پہاڑوں کا سفر ہو تو اس میں والدین کی اجازت ضروری ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں: لأن بر الوالدین وترک ما یلحق الضرر والمشقۃ بھما فرض علیہ عینا والجھاد فرض علی الکفایۃ اذا لم یقع النفیر عاما فعلیہ أن یقدم الأقویٰ، وفی خروجہ الضرر والمشقۃ بھما فان المجاھد علٰی خطر فی التمکن من الرجوع. (شرح السیر الکبیر ج:۴ ص:۲۸)۔[۲] اس صورت کے لئے علامہ سرخسیؒ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ: ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ”میں آپؐ کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے آیا ہوں اور والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں“، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”واپس جاؤ اور جس طرح انہیں روتا چھوڑ کر آئے ہو اب جا کر انہیں ہنساؤ“ (ایضاً ص:۱۲۸)۔[۳]

اور جو صحابہ کرامؓ والدین کو چھوڑ کر جہاد کے لئے جاتے تھے وہ یا تو نفیرِ عام کی بناء پر یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی حکم سے یا والدین کی اجازت اور رضامندی سے جاتے تھے، اور عام سفروں میں جانا ہوتا تو ان کی خبرگیری کا انتظام کر کے جاتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ علی الاطلاق یہ کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغی سفر کسی بھی حال میں والدین کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر حال میں جائز ہے، بلکہ اس کی تفصیل وہی ہے جو

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲، ۳) شرح السیر الکبیر رقم المسئلۃ: ۲۱۶، ۲۱۷ ج:۱ ص:۱۹۲ (ناشر مولانا نصر اللہ منصورؒ).
وفی الدر المختار کتاب الجھاد ج:۴ ص:۱۲۴، ۱۲۵ (طبع سعید) لا یفرض علٰی صبی وبالغ لہ أبوان أو أحدھما لأن طاعتھما فرض عین وقال علیہ الصلٰوۃ والسلام للعباس بن مرداس لما أراد الجھاد: "الزم أمک فان الجنۃ تحت رجل أمک." سراج، وفیہ لا یحل سفر فیہ خطر الا باذنھما وما لا خطر فیہ یحل بلا اذن. وفی الشامیۃ (قولہ فیہ خطر) کالجھاد وسفر البحر والخطر .... الخ. (قولہ وما لا خطر) کالسفر للتجارۃ والحج والعمرۃ یحل بلا اذن الا ان خیف علیھما الضیعۃ. سرخسی.

اُوپر گزری۔

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے بھی حقوق الوالدین[1] میں یہی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/ ۲۸ الف)

تبلیغ میں وقت لگانے کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا لازم ہے

سوال:- تبلیغی جماعت میں وقت لگانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کا کام کیسا ہے؟ نیز تبلیغِ دین کی شرائط کیا ہیں؟ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- تبلیغی جماعت کا کام مفید ہے، البتہ تبلیغِ دین کی شرائط کسی عالمِ دین سے معلوم کرلی جائیں، ان کے مطابق عمل کیا جائے، اور حقوق العباد کی ادائیگی کا پورا اہتمام کیا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/ ۱۸ الف)

بعض تبلیغی واعظوں کی طرف سے غیر محتاط باتوں کی بناء پر تبلیغی جماعت کو ترک کرنا

سوال:- تبلیغ جو خاکسار کے نزدیک صحیح بھی ہے، اس میں چند لوگ (واعظ) وعظ کے درمیان شرک کی باتیں کہہ دیتے ہیں، چونکہ جماعت میں اکثر اَن پڑھ ہوتے ہیں، ایسی حالت میں ان کے ساتھ جانا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- تبلیغی جماعت سے دین کو مجموعی طور پر بڑا نفع پہنچ رہا ہے، اس میں شریک ہونا بہتر ہی بہتر ہے، البتہ بعض اوقات چونکہ جماعت کے اُمراء عالم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے منہ سے غیر محتاط باتیں نکل جاتی ہیں، ایسے موقع پر اُن کو نرمی اور محبت سے سمجھا دینا چاہئے، اور وہ بات نہ سمجھیں تو جماعت کے اکابر میں سے کسی کی طرف رُجوع کرکے ان کے ذریعہ فہمائش کرادینی چاہئے، لیکن اس بناء پر جماعت کو نہ چھوڑیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/ ۲۷ و)

---

(۱) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

﴿کتاب التصوّف والکشف والالهام والرّؤیاء﴾

(تصوّف، کشف، الہام اور خوابوں سے متعلق مسائل کا بیان)

شیطان کا خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہ آسکنا

سوال:- شیطان، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل مبارک میں نہیں آسکتا، لیکن کیا شیطان کسی اور صورت میں آکر یہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے کہ نعوذ باللہ یوں کہہ دے کہ میں رسول ہوں یا یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب:- شیطان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اور حلیہ مبارکہ میں نہیں آسکتا،[1] لیکن کسی اور کی صورت میں آکر دھوکا دے سکتا ہے، یعنی یہ جھوٹا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں یا فلاں شخص رسول ہوں۔ **ان الشیطان قد یأتی النائم فی صورة ما من معارف الرائی وغیرهم فیشیر له الی رجل آخر: هٰذا فلان النبی وهٰذا الملک الفلانی أو من أشبه هؤلاء ممن لا یمثل الشیطان به فیوقع اللبس علی الرائی بذٰلک.** (الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۱۲)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۸ ب)

بزرگ سے ملاقات کے موقع پر خود اپنے ہاتھ کو چومنا

سوال:- کسی عالمِ دین یا بزرگ سے ملاقات کرنے کے بعد خود اپنے ہاتھ کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- **فی الدر المختار: وکذا ما یفعله الجهال من تقبیل ید نفسه اذا لقی غیره فهو مکروه فلا رخصة فیه۔** (شامی حظر واباحت ج:۵ ص:۳۳۷)۔[3] اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دُوسرے سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ چومنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ کسی بزرگ کے ہاتھ کبھی کبھی

---

(۱) عن ابی هریرة رضی الله عنه أنّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من رانی فی المنام فقد رانی فان الشیطان لا یتمثل بی، وفی روایة: فی صورتی. متفق علیه. مشکوٰة المصابیح ج:۲ ص:۳۹۴. وانظر فی جامع الترمذی، باب ما جاء فی قول النبی صلی الله علیه وسلم: من رانی فی المنام فقد رانی. ج:۲ ص:۵۲ (طبع میر محمد کتب خانه).
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۴۳ تا ۲۴۵۔

(۲) الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۳ (طبع دار المعرفة بیروت).

(۳) الدر المختار، حظر واباحت ج:۶ ص:۳۸۳، وفی مجمع الانهر شرح ملتقی الأبحر ج:۴ ص:۲۰۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) کتاب الکراهیة وتقبیل ید العالم. وفی الدر المنتقی تحته ان لنیل الدنیا کره کتقبیل ید نفسه أو ید صاحبه.

بقصدِ تبرک چوم لئے جائیں تو مضائقہ نہیں۔ کما فی الدر۔[1]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹ الف)

کشفِ قبور اور انوار وتجلیات کے مشاہدے کی شرعی حیثیت

سوال:- ....صاحب نے اپنے خلیفہ ....صاحب کو نوشکی ضلع چاغی بھیجا ہے، یہ ان کے پُرانے مرید ہیں، ....صاحب کا مسلک مختصراً درج ذیل ہے۔ ۱:- تصوّف میں نقشبندی اویسی سلسلہ، ۲:- کشفِ قبور، دعویٰ کے ساتھ فرماتے ہیں چھ مہینے کے اندر ان کو سب کچھ ہم دِکھاتے ہیں اور رُوحانی طور پر براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات وغیرہ، ۳:- کشفِ قبور کو اس وقت ایک سنت مردہ قرار دے دیا گیا ہے، کوئی اس کے احیاء کی کوشش کرے گا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ اس طریق میں شمولیت اختیار کرنا کیسا ہے؟ کیا رُوحانی تربیت حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے شریعتِ مطہرہ میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- کشفِ قبور اور بعض انوار وتجلیات کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے کسی بندے کو کرا دیا جائے تو ممکن بھی ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ شرع بھی نہیں، البتہ یہ چیزیں شریعت وطریقت میں مقصود نہیں،[2] مقصود اِتباعِ سنت وشریعت اور اصلاحِ اعمال واخلاق ہے، اس قسم کے کشف وغیرہ کو مقصود بنانا یا سنت قرار دینا، بدعت ہے، اور جو لوگ اس کو مقصود سمجھ کر کریں ان کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے، ان کے بجائے ایسے شیخ کو اختیار کریں جو متبعِ سنت ہوں اور اعمال واخلاق کی اصلاح کی فکر کرتے ہوں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۱۱/۳۲ ج)

بغیر عمل کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا

سوال:- اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن بلا عمل رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بالخصوص فرائضِ شرعیہ مثل نماز جس کا ہر ایک مکلّف ہے، چھوڑ کر حسنِ ظن رکھنا دُرست ہے یا نہیں؟ ایسا نظریہ رکھنے والے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں، وہ ویسے ہی

(۱) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۳۸۳ (ولا بأس بتقبیل ید) الرجل (العالم) والمتورّع علیٰ سبیل التبرّک .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: شریعت وطریقت ص:۲۷۷، شریعت وتصوف ص:۱۷۱، کشف الحقیقۃ ص:۶۵ تا ۱۱۰، تعلیم الدین ص:۷۰، ۸۵۔

معاف کردے گا۔

جواب:- اللہ کی ذات سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا اچھی بات ہے، لیکن اس کا حق اس شخص کو پہنچتا ہے جو اللہ کے اَحکام کی پابندی کرتا ہو،(۱) اس لئے اس خیال سے فرائضِ شرعیہ کا چھوڑنا گناہِ عظیم ہے۔(۲) اللہ عبادت کا محتاج نہیں، لیکن انسان اپنی نجات اور فائدے کے لئے اس کی عبادت کا محتاج ہے، اگر صرف یہ حسنِ ظن کافی ہوتا تو اللہ کو قرآن اور حدیث کے ذریعہ اتنے اَحکام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تاکید کیوں فرماتے تھے؟ اس شخص کو چاہئے کہ اپنے ان خیالات سے توبہ کرے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۶/۱۰/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸ الف)

شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟

سوال:- شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟ اور مجتہد کی کیا شرائط ہیں؟

جواب:- شیخِ طریقت ہونے کے لئے بہت سی شرائط ہیں، جن کی تفصیل یہاں مشکل ہے، مختصر یہ ہے کہ کسی کامل شیخِ طریقت نے اسے بیعت کرنے کی اجازت دی ہو، تفصیل کے لئے دیکھئے ''قصد السبیل'' از حضرت تھانویؒ و ''آداب الشیخ والمرید'' از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور مجتہد کے لئے بھی بہت سی شرائط ہیں جن کی تفصیل اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

سوال۲:- شریعت، طریقت، حقیقت ومعرفت کی کیا تعریف ہے؟

جواب:- اس کا جواب بھی تفصیل طلب ہے، ''تعلیم الدین'' یا ''قصد السبیل'' یا ''شریعت و

(۱، ۲) وفی جامع الترمذی ج:۴ ص:۶۳۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) باب ۲۴۵۹ عن شداد بن أوس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الکیّس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت، والعاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنّی علی اللہ. قال ھٰذا حدیث حسن ومعنی قولہ من دان نفسہ یقول حاسب نفسہ فی الدنیا قبل أن یحاسب یوم القیامۃ.
وفی الترمذی أیضًا ج:۲ ص:۶۴ (طبع ایچ ایم سعید) باب ما جاء فی حسن الظن باللہ تعالیٰ، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالیٰ یقول: أنا عند ظن عبدی بی، وأنا معہ اذا دعانی. ھٰذا حدیث حسن صحیح. وفی تحفۃ الأحوذی ج:۴ ص:۵۴ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) أی أنا أعاملہ علیٰ حسب ظنہ بی، وأفعل بہ ما یتوقعہ منی من خیر أو شر، والمراد الحث علیٰ تغلیب الرجاء علی الخوف وحسن الظن یحسن الظن باللہ. وقال القرطبی فی المفھم معنی ظن عبد بی ظن الاجابۃ، ثم الدعاء وظن القبول ثم التوبۃ وظن المغفرۃ ثم الاستغفار وظن المجازاۃ، ثم فعل العبادۃ بشروطھا تمسکا بصادق وعدہ، قال: ویؤیدہ قولہ فی الحدیث الأخر: ادعوا اللہ تعالیٰ وأنتم موقنون بالاجابۃ، قال: لذٰلک ینبغی للمرء أن یجتھد فی القیام بما علیہ موقنا بأن اللہ یقبلہ ویغفر لہ، لأنہ وعد بذٰلک وھو لا یخلف المیعاد .... قال وأما ظن المغفرۃ مع الاصرار فذٰلک محض الجھل والغرّۃ وھو یجر الی مذھب المرجئۃ .... الخ. (محمد زبیر)

طریقت" تصانیف حضرت تھانویؒ کا مطالعہ فرمایئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶/۲۷ و)

خواب کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا

سوال:- میری بیٹی جس کا نام عظیمہ عرف "چھوگڑیا" تھا، جس کو لانڈھی مل ایریا کے قبرستان میں دفن کردیا ہے، اس کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی، خیر یہ تو خدا کی مرضی ہے، اس کی عمر ۵ سال تھی، مجھ سے بہت پیار کرتی تھی، ۱۰ دن فوت ہوئے ہوئے ہیں، مگر میرے خواب میں برابر آتی ہے، میرے کانوں میں دن کے وقت یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ: "بابا میں زندہ ہوں، مجھے باہر نکالو۔" آج مؤرخہ ۲۱رشعبان کو میں نے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قبر کے سرہانے کا پتھر نکال کر دیکھا تو وہ ویسے ہی سو رہی تھی، میرے سوا کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، کیا اس کا کچھ کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب:- اس قسم کے خوابوں کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا شرعاً بالکل ناجائز ہے،[1] اور ایسا کرنے سے آپ نے گناہ کا ارتکاب کیا، اب اس کا کفارہ یہی ہے کہ صدقِ دِل کے ساتھ توبہ و اِستغفار کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۶/۲۸ ج)

خواب کی قسمیں اور خواب میں شیطانی خیالات واوہام اور رُؤیائے صادقہ میں فرق کی تدبیر

سوال:- انسان عالمِ خواب میں کچھ نظارے دیکھتے ہیں، دو حال سے خالی نہیں، رُوحانی یا تخیلی، اگر شقِ اوّل ہے تو کسی اجنبی یا جان پہچان بزرگوں کو دیکھنا اور کلام کرنا۔ کسی اجنبی مردہ بمع قبر یا جان پہچان کو لین دین، خوشی یا غمی میں دیکھنا، کلام کرنا کسی اجنبی عورت یا جان پہچان کو اجنبی مقام یا جانی پہچانی جگہ میں دیکھنا، کلام کرنا، صحبت کرنا کیسا ہے؟ نیز بچہ، جوان، بوڑھی میں تو فرق نہیں ہے؟ اور کیا یہ واقعۃً ایسا ہوتا ہے؟

دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ اگر واقعی رُوح کو اپنے جسم سے نکل کر کہیں جانا دُرست ہے تو رُوح کی صحبت سے جسم میں حرارت ولذّت محسوس ہونا کیسا ہے؟

---

(۱) وفی الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۰ (طبع دار المعرفة بیروت) ان الرؤیا من غیر الأنبیاء لا یحکم بها شرعًا علٰی حال الّا أن تعرض علی ما فی أیدینا من الأحکام الشرعیة فان سوغتها عمل بمقتضاها، والّا وجب ترکها والاعراض عنها وانما فائدتها البشارة أو النذارة خاصة، واما استفادة الأحکام فلا .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۴۰۔

اگر شقِ آخر ہے تو انسان جاگتے وقت کتنا ہی اپنا خیال دوڑائے لیکن اسے اجنبی عورت، اجنبی مقام اور اجنبی بزرگوں کا تو خیال آتا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی چیز کھانے سے یا صحبت کرنے سے حرارت و لذّت محسوس ہوتی ہے، اگر خواب نبوّت کے چالیس حصوں میں سے ایک ہے تو بعض خواب شیاطین و جنات کی طرف سے بھی ہوتے ہیں، ان میں فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر تحریر فرمائیں۔

جواب:- بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور رُؤیائے صادقہ ہوتے ہیں، ان کو حدیث میں نبوّت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے،[1] بعض شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں جن میں عموماً فسق و فجور یا گندگیاں نظر آتی ہیں، بعض محض خیالات ہوتے ہیں،[2] اور چونکہ ان تینوں کے درمیان فرق کرنے کی کوئی یقینی صورت موجود نہیں، اس لئے دین میں خواب حجت نہیں ہیں،[3] اور خواب میں رُوح کا تعلق جسم سے باقی رہتا ہے اس لئے رُوحانی لذّت والے خواب کا اثر جسم بھی محسوس کرتا ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

کیا بینک ملازم رہتے ہوئے شیخِ کامل بن سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص کسی شیخِ کامل سے منسلک ہے، وہ کسی بینک یا ازقسم بینک میں ملازمت کرتے ہوئے اللہ کا مقرّب بندہ بن سکتا ہے؟ اور اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رُشد و ہدایت کی کوئی دینی خدمت سپرد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک کی ملازمت ناجائز ہے،[4] دُوسری ملازمت تلاش کی جائے اور جب تک

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب أنّ رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأً من النبوة ج:۲ ص:۵۱ (میر محمد کتب خانہ) عن عبادة بن الصامت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: رؤیا المؤمن جزءٌ من ستة وأربعین جزء من النبوة.

(۲) اور خواب کی ان تینوں قسموں (یعنی رُؤیائے صادقہ اور شیطان کی طرف سے آنے والے خواب اور محض خیالات) کا ذکر اس حدیث شریف میں آیا ہے: عن أبی ہریرةؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا اقترب الزمان لم تکد رؤیا المؤمن تکذب، واصدقہم رؤیا أصدقہم حدیثا، ورؤیا المسلم جزء من ستة وأربعین جزأً من النبوة، والرؤیا ثلاث: فالرؤیا الصالحة بشریٰ من اللہ، والرؤیا من تحزین الشیطان، والرؤیا مما یحدث الرجل نفسه، فاذا رای أحدکم ما یکرہ فلیقم ولیتفل ولا یحدث به الناس. قال وأحب القید فی النوم واکرہ الغلّ. القید ثبات فی الدین. ھذا حدیث صحیح. جامع الترمذی، باب ان رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزأً من النبوة ج:۲ ص:۵۱ (طبع میز محمد کتب خانہ).

(۳) وفی الاعتصام للشاطبیؒ ج:۱ ص:۲۶۰ (طبع دار المعرفة بیروت) انّ الرؤیا من غیر الأنبیاء لا یحکم بها شرعًا علیٰ حال الّا أن تعرض علیٰ ما فی أیدینا من الأحکام الشرعیة فان سوغتها عمل بمقتضاها، والّا وجب ترکها والاعراض عنها وانما فائدتها البشارة أو النذارة خاصة، واما استفادة الأحکام فلا .... الخ. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۴۰ سوال نمبر ۲۶۰۔

(۴) بینک ملازمت کی اقسام اور ان کے حکم سے متعلق فتویٰ ان شاء اللہ "کتاب الاجارۃ" میں اپنے مقام پر آئے گا۔ (محمد زبیر)

دُوسری ملازمت باوجود کوشش کے نہ ملے اس ملازمت کو بُرا سمجھتے ہوئے اس میں لگے رہیں، اور جونہی ملازمت ملے چھوڑ دیں، اس دوران میں عام دینی خدمات انجام دے سکتے ہیں، مگر مرشد و مربی کا منصب اس ملازمت کو باقی رکھتے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتا۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۹/۱۹ الف)

ایک خواب کی حقیقت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ میرے والد کو کثرت سے رُؤیائے صادقہ ہوتے تھے اور میرے والد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت، عشق اور تعلق ہے، جس کی مثال عالم میں کم ملے گی، والد بیمار ہوگئے تو خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ تم بیمار ہوتے ہو تو میں بھی بیمار ہو جاتا ہوں، تمہارے سر میں درد ہوتا ہے تو میرے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے خواب یقین کرنے کے قابل ہیں؟ اور یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟ عنداللہ جواب سے مطلع فرما کر اس ذہنی اُلجھن سے نجات دلائیں۔

جواب:- نہ یقین کرنے کی ضرورت ہے، نہ انکار کرنے کی، اگر کسی مسلمان کو اس قسم کا خواب نظر آئے تو اس میں کوئی بُعد نہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ واقعۃً ایسا خواب کسی کو نظر آیا ہے یا نہیں؟ اس کو معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ بجز دیکھنے والے کے قابلِ اعتماد ہونے کے، کوئی نہیں۔ اگر قابلِ اعتماد ہو تو تصدیق بھی کی جاسکتی ہے اور یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے جس پر ایمان لانا واجب ہو، اس لئے اگر کوئی شخص اس پر یقین نہ کرے تب بھی اس کو ہدفِ ملامت نہیں بنا سکتے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۹/۳۰ د)

قطب اور ابدال کی حقیقت
اور کیا زمین میں چار قطب ہوتے ہیں؟

سوال:- چند لوگ کہتے ہیں کہ زمین کے چار قطب ہیں جو کہ زمین کے چار برابر حصوں میں رہتے ہیں اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ قطب زمین کی حفاظت کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- اقطاب و ابدال تکوینیات کی اصطلاحیں ہیں، جن کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، قرآن و حدیث میں بھی ان کی تفصیلات موجود نہیں ہیں، البتہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مکاشفات و تجربات ہیں،(۱) جن کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی، لیکن دین کے کسی مسئلے پر عمل یا عقیدہ ان اصطلاحات کو جاننے یا تسلیم کرنے پر موقوف نہیں ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ و)

سلسلۂ قادریہ کے افراد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح کے حلول کا عقیدہ

سوال:- کیا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح، سلسلۂ قادریہ کے آدمیوں کے اندر حلول کرکے بات کرسکتی ہے؟ اگر نہیں کرسکتی تو ایسا بولنے اور عقیدہ رکھنے والوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:- حلول کا یہ عقیدہ اسلام کے قطعی طور پر خلاف ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والا گمراہ ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۰/۲۸ ب)

■■■

(۱) قطب اور ابدال وغیرہ القاب سے متعلق تحقیق و تفصیل کے لئے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والأوتاد والنجباء والأبدال"، اور حضرت امامِ ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "معارفِ لدنیہ" ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

کتاب الذکر والدعاء والتعویذات

(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)

دُعا کس قسم کی عبادت ہے؟

سوال:- دُعا عبادت ہے، اگر عبادت ہے تو کس قسم کی ہے؟ دُعا کو تمام عبادتوں کا مغز بتلاتے ہیں، حدیث کی رُو سے تمام عبادتوں کا نچوڑ ہے، کوئی ناسمجھ انسان عبادتوں کا نچوڑ سمجھ کر دُعا کو ہی عبادت نہ تصوّر کرنے لگے؟

جواب:- دُعا عبادت بھی ہے،(۱) اور عبادتوں کا مغز بھی،(۲) لہٰذا اسے عبادت سمجھنا دُرست ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُوسری عبادتیں انجام نہ دی جائیں بلکہ جتنی عبادتیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہیں ان سب پر حسبِ مراتب عمل کرنا چاہئے، انہی میں سے دُعا بھی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰/۲۸ الف)

عزّت حاصل کرنے کے لئے "یا عزیز" کا وظیفہ پڑھنا

سوال:- مجموعۂ وظائف کے صفحہ:۱۵۵ پر درج ہے الاسم الخاص عزیز اس کو ایک لاکھ مرتبہ پڑھے توجہ سے یعنی مطلب اس کا اصطلاحِ تصوّف میں یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ کو اپنی عزّت کے واسطے سے عزّت والوں میں داخل کر، عزّت والوں کا کام مجھے عطا کر، مجھ کو عزّت دے، عزّت والے بندوں میں داخل کر، اگر یا کے ساتھ پڑھے تو یا عزیز بلاتنوین پڑھے۔ مندرجہ بالا وظیفہ پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر میں ایک ہی مرتبہ ایک لاکھ مرتبہ نہ پڑھ سکوں تو کوئی متبادل طریقہ ہوسکتا ہے؟ وظیفہ پڑھنے کے درمیان کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- مذکورہ بالا مقاصد کے لئے "یا عزیز" کا وظیفہ پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اور شرعی اعتبار سے اس کی کوئی خاص مقدار مقرّر نہیں، عملیات کے نقطۂ نظر سے ایک لاکھ مرتبہ

---

(۱) الدعاء هو العبادة، صحيح ابن حبان ج:۲ ص:۱۲۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) و مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۱۹۴ (طبع قديمي كتب خانه).

(۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الدعاء مخ العبادة. رواه الترمذى، مشكوة المصابيح كتاب الدعوات ج:۱ ص:۱۹۴.

پڑھا جائے تو مضائقہ نہیں، اور اس کے طریقے کے بارے میں کسی عامل سے رُجوع کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۹/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۳/۲۸ ب)

ذکر جہراً افضل ہے یا سراً؟

سوال:- تیرہ محرّم الحرام کے رسالہ ''خدام الدین'' (لاہور) میں یہ لکھا ہے کہ ذکرِ جہری مبتدیوں کے لئے ہے اور اس کے کئی فائدے ہیں، مثلاً زبان، دِماغ، دِل متوجہ ہوجاتا ہے اور خیال غیر کی طرف نہیں جاتا، کیونکہ اللہ کھیلنے والوں کا ذکر قبول نہیں فرماتا، اور منتہی دو طرح کے ذکر کرتے ہیں، مگر مبتدیوں کے لئے یہی ایک طریقہ ہے، کیونکہ ابتداء میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، بعد میں تربیت کرنے سے حاصل ہوجاتی ہے۔ اس پر میرے ایک دوست نے کہا کہ یہ بدعت ہے، میں نے بڑے بڑے علماء کا ثبوت دیا مگر اس نے کہا یہ بدعت ہندوستان، پاکستان ہی میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہ تھیں؟ کیا ذکر جہراً و سراً دونوں طرح جائز ہے اور اس میں افضل کون سا ہے؟

جواب:- اس معاملے میں محقق علماء کا مسلک یہ ہے کہ ذکر دونوں طرح جائز ہے، سراً بھی اور جہراً بھی، پھر مختلف حالات و مواقع کے اعتبار سے افضلیت بدلتی رہتی ہے، کہیں آہستہ ذکر کرنا افضل ہے اور کہیں جہراً، لہٰذا کسی پابندِ شریعت شیخِ کامل نے مرید کے حالات کے پیشِ نظر ذکرِ جہر کے لئے کہا ہو تو اسے جہراً ذکر کرنا جائز ہے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ اس کا یہ ذکرِ جہر کسی شخص کی نیند میں خلل یا کسی اور معقول تکلیف کا موجب نہ ہو، دُوسرے یہ کہ جہراً ذکر کو عبادتِ مقصودہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے علاج کے طور پر اختیار کیا جائے۔ آپ کے دوست کا ذکرِ جہر کو بدعت کہنا دُرست نہیں، قرآن و حدیث میں ذکرِ جہر کا بھی ثبوت ملتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ.'' (سورۃ البقرۃ:۱۱۴)

ظاہر ہے کہ ذکر جہر سے منع کرنا، اطلاعِ ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد بلند آواز سے ''لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ''(۱) پڑھا کرتے

(۱) الصحیح للامام مسلمؒ باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ ج:۱ ص:۲۱۸ (طبع قدیمی کتب خانہ).

تھے، اس طرح اور بھی کئی روایات سے ذکرِ جہر کا ثبوت ملتا ہے، تفصیلی دلائل حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۵۹ مطبوعہ کراچی[1] میں کتاب السلوک کے تحت بیان فرمائے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۵/۱۹ الف)

”لا الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ احدًا صمدًا“ والی حدیث صحیح ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا یہ حدیث صحیح ہے: ”لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک له احدًا صمدًا لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوًا احد“؟ اور کون سی کتاب میں ہے؟

جواب:- مندرجہ بالا الفاظ حافظ عبدالعظیم منذری نے الترغیب والترھیب[2] میں بحوالہ طبرانی نقل کئے ہیں، راویٔ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اَوفیٰ ہیں، اور اس روایت میں ہے اس کو گیارہ بار

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۵۱ تا ۱۵۵ اور دونوں طرح ذکر کے جواز اور ذکرِ جہر کی شرائط سے متعلق چند فقہی عبارات یہ ہیں:
وفی رد المحتار ج:٦ ص:۳۹۸ (الحظر والاباحة) وقد حرر المسئلة فی الخیریة وحمل ما فی فتاویٰ القاضی علی الجهر المضر وقال: ان هناک أحادیث اقتضت طلب الجهر وأحادیث طلب الاسرار والجمع بینهما بأن ذٰلک یختلف باختلاف الأشخاص والأحوال فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین أو النیام، والجهر أفضل حیث خلا مما ذکر لأنه أکثر عملا ولتعدی فائدته الی السامعین ویوقظ قلب الذاکر فیجمع همه الی الفکر ویصرف سمعه الیه ویطرد النّوم ویزید النشاط. وکذا فی فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:٦٦٠. وفی الفتاوی الخیریة ج:۲ ص:۱۸۱ (طبع بولاق، مصر) والجمع بینهما بأن ذٰلک یختلف باختلاف الأشخاص والأحوال کما جمع بین الأحادیث الطالبة للجهر بالقراءة والطالبة للاسرار بها ولا یعارض ذٰلک خیر الذکر الخفی لأنه حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین أو النیام والجهر ذکر بعض أهل العلم أنه أفضل حیث خلا مما ذکر لأنه أکثر عملًا ولتعدی فائدته الی السامعین .... الخ.
وفی حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ج:۱ ص:۴۳۱ (طبع مکتبة الأسد، دمشق، وفی طبع ”قدیمی کتب خانه“ ص:۱۷۴) اختلف أهل الاسرار فی الذکر أفضل؟ فقیل نعم لأحادیث کثیرة تدل علیه منها خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی ولأن الاسرار أبلغ فی الاخلاص وأقرب الی الاجابة وقیل الجهر أفضل لأحادیث کثیرة منها ما رواه ابن الزبیر کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سلم من صلاته قال بصوته الأعلیٰ: لا الٰه الا الله وحده لا شریک له. وتقدم وقد کان صلی الله علیه وسلم یأمر من یقرأ القراٰن فی المسجد أن یسمع قراءته وکان ابن عمرؓ یأمر من یقرأ علیه وعلیٰ أصحابه وهم یستمعون، ولأنه أکثر عملًا وأبلغ فی التدبر ونفعه متعد لإیقاظ قلوب الغافلین .... فمتیٰ خاف الریاء أو تأذی به أحد کان الاسرار أفضل اهـ. نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۲۴۵، ۲۴۷، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۵۰۔
(۲) الترغیب والترهیب ج:۲ ص:۴۲۰ (طبع مصطفیٰ البابی، مصر). (محمد زبیر)

پڑھنے پر بیس لاکھ نیکیاں ملیں گی، لیکن حدیث ضعیف ہے۔[۱]

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۲ھ

ایک مہمل وظیفہ

سوال:- وظیفہ ہے: ’’جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو قدرت ہے کمال تو نبی جی کی جھولی بھرے بیچ میں ہے قرآن تو‘‘ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- یہ مہمل قسم کا وظیفہ ہے، اس کے بجائے اندیشے کے موقع پر ’’اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ‘‘[۲] پڑھنا چاہئے۔

وسیلہ اختیار کر کے دُعا کرنا کیسا ہے؟

سوال:- وہابی کسی کے لئے کسی درمیانی واسطے کی شفاعت کے قائل نہیں، خواہ وہ اللہ کا کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، وہ کہتے ہیں جس طرح ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اور کسی کے واسطے کے بغیر بجالائے، اسی طرح وہ اپنی حاجات و مشکلات کو بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرے اور امداد کا طالب ہو۔ کیا درمیانی طور پر وسیلہ اختیار کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بے شک اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ دُعا مانگنا بھی جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس طرح توسل کرے کہ یا اللہ! آپ کا فلاں بندہ آپ کا مقبول بندہ ہے، مجھے اس سے محبت ہے، اور اس محبت کی بناء پر میں اس کا وسیلہ پیش کر کے آپ سے فلاں چیز مانگتا ہوں تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت

---

(۱) عن عبداللہ بن أبی أوفیٰ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من قال احدی عشرۃ مرۃ لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، أحدًا صمدًا لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا أحد، کتب اللہ لہ ألفی ألف حسنۃ. أخرجہ ابن عساکر فی تاریخ دمشق فی ترجمۃ علی بن الحسین ابن عبدالرزاق أبی الحسن الشعرانی ج: ۴۱ ص:۳۵۸ (طبع دار الفکر) وقال فی المجمع ج:۱۰ ص:۸۵ (طبع دار الکتاب بیروت)، رواہ الطبرانی وفیہ فاید الورقاء وھو متروک. وقال البوصیریؒ فی اتحاف الخیر المھرۃ ج:۶ ص:۴۱۲ (طبع دار الوطن، ریاض) رواہ الطبرانی (وعبد بن حمید وأبو یعلیٰ الموصلی) قلت مدار ھٰذہ الطرق علیٰ أبی ورقاء واسمہ فائد العطّار وھو ضعیف، ضعّفہ أحمد بن حنبل وابن معین وأبو حاتم وأبو زرعۃ وابن حبان والبخاری وأبو داؤد والترمذی والنسائی والساجی والعقیلی والدارقطنی وغیرھم وقال الحاکم ابو عبداللہ الحافظ روی عن ابن أبی أوفیٰ أحادیث موضوعۃ.

(۲) دیکھئے: سنن أبی داؤد، باب کیف الرقی ج:۲ ص:۱۸۷ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان) وجامع الترمذی، باب ما جاء فی الرقی اذا اشتکیٰ. (محمد زبیر حق نواز)

نہیں ہے، بلکہ اس کے جواز پر قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں۔[۱]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دُعا کا حکم

سوال:- فرضوں کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر جو "بسم اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم، اللّٰھم اذھب عنی الھم والحزن" پڑھتے ہیں، کیا یہ کسی حدیث میں ہے یا مستحب ہے یا بزرگ پڑھتے آئے ہیں؟ اس پر بعض لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ابن السنی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تھے تو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی پیشانی پر مسح فرماتے اور یہ الفاظ پڑھتے تھے: "أشھد ان لا الٰہ الا اللہ ھو الرحمن الرحیم، اللّٰھم أذھب عنی الھم والحزن".
(کتاب الأذکار للنوویؒ ص:۳۵)۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۹/۱۹ الف)

---

(۱) وفی جامع الترمذی ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع سعید) عن عثمان بن حنیف، ان رجلا ضریر البصر أتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم .... یدعوا بھٰذا الدعاء اللّٰھم انی أسئلک وأتوجه الیک بنبیک محمد نبی الرحمة. وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۹۷ (طبع سعید) یراد بالحق الحرمة والعظمة، فیکون من باب الوسیلة وقد قال تعالیٰ: وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ. وقد عد من اٰداب الدعاء التوسل علیٰ ما فی الحصن .... وقال بعد أسطر: نعم ذکر العلامة المناوی فی حدیث اللّٰھم انی أسئلک وأتوجه الیک بنبیک نبی الرحمة، عن العز بن عبدالسلام أنه ینبغی کونه مقصورًا علی النبی صلی اللہ علیه وسلم .... وقال السبکی یحسن التوسل بالنبی الیٰ ربه ولم ینکره أحد من السلف ولا الخلف الا ابن تیمیة فابتدع ما لم یقله عالم قبله اھ. ونازع العلامة ابن امیر حاج فی دعوی الخصوصیة وأطال الکلام علیٰ ذٰلک.
توسل بالانبیاء والصالحین کی مختلف صورتوں اور شرائط سے متعلق تفصیلی بحث کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تصنیف تکملة فتح الملھم "مسئلة التوسل" ج:۵ ص:۶۲۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) ص:۹۲ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر) وفی مسند البزار والأوسط للطبرانی کان صلی اللہ علیه وسلم اذا صلی وفرغ من صلٰوته مسح بیمینه علیٰ رأسه وقال: بسم اللہ الذی لآ الٰه الا ھو الرحمٰن الرحیم، اللّٰھم أذھب عنی الھم والحزن. بحوالہ حصن حصین مع اُردو ترجمہ ص:۲۲۳ (طبع دارالاشاعت) وفی مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۱۱۰ (طبع دار الکتاب بیروت) وفیه زید العمی وقد وثقه غیر واحد وضعفه الجمھور وبقیة رجال احد اسنادی الطبرانی ثقات وفی بعضھم خلاف. وراجع أیضًا کشف الأستار عن زوائد البزار ج:۴ ص:۲۲ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت). وکذا فی مجمع البحرین ج:۸ ص:۳۴ رقم الحدیث: ۴۶۶۳ و ۴۶۶۴ (طبع مکتبة الرشید، ریاض). (محمد زبیر حق نواز)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟
سجدے کی حالت میں دُعا مانگنے کا حکم

سوال ۱:- اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟ جن آیات میں اسمِ اعظم کا گمان غالب ہے ان کی نشاندہی کردیں تو مہربانی ہوگی۔

۲:- سجدے کی حالت میں دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- اسمِ اعظم عام طور سے اللہ تعالیٰ کے اس مبارک نام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ دُعا کرنا زیادہ اُمیدِ قبولیت رکھتا ہے، اس نام مبارک کی تعیین میں مختلف احادیث و روایات اور علماء کے مختلف اقوال منقول ہیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان الفاظ سے دُعا شروع کی: "اللّٰھم انی أسألک بأن لک الحمد لا الٰہ الا أنت الحنان المنان بدیع السمٰوٰت والأرض یا ذا الجلال والاکرام یا حی یا قیوم أسألک"۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "دعا اللہ باسمہ الأعظم الذی اذا دُعی بہ أجاب واذا سئل بہ أعطی"۔[1] "اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس اسمِ اعظم کے ذریعے دُعا مانگی ہے جس کے ذریعے جب بھی دُعا کی جائے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اس کے ذریعے جب کوئی چیز مانگی جائے وہ دے دیتا ہے۔" نیز بعض روایات میں ہے کہ اسمِ اعظم سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور سورۂ طٰہٰ ہیں، مشکوٰۃ کی ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ اسمِ اعظم ان دو آیتوں میں ہے: "وَاِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ" اور "الٓمّٓ. اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ"۔[2]

بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ "الحی القیوم" اسمِ اعظم ہے، امام رازیؒ اور علامہ نوویؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، علامہ جزریؒ نے فرمایا ہے کہ "میرے نزدیک اسمِ اعظم "لا الٰـہ الا ھو الحی القیوم" ہے۔"[3] بعض حضرات نے لفظِ "ربّ" کو، اور بعض نے لفظِ "اللہ" کو اسمِ اعظم قرار دیا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ "اسمِ اعظم" ایک راز ہے جس سے کوئی واقف نہیں۔ علمائے محققین نے اس سلسلے

---

(۱) رواہ الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجۃ، مشکوۃ المصابیح، باب أسماء اللہ تعالیٰ ج:۱ ص:۱۹۹، ۲۰۰ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۲) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۱ ص:۲۰۰ عن أسماء بنت یزید أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اسم اللہ الأعظم فی ھاتین الأیتین: اِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، و فاتحۃ آل عمران الٓمّٓ. اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. رواہ الترمذی وأبو داؤد وابن ماجۃ والدارمی.

(۳) امام رازی، علامہ نووی، علامہ جزری رحمہم اللہ اور بعض دیگر حضرات کے مذکورہ بالا اقوال کے لئے دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح ج:۵ ص:۱۰۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

میں یہ فرمایا ہے کہ درحقیقت تمام اسمائے باری تعالیٰ عظیم ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، لہٰذا ایسا اسمِ اعظم جس سے زیادہ عظمت کسی اسمِ باری کو حاصل نہ ہو مستند روایات سے ثابت نہیں ہے، اور جن جن اسماء کے بارے میں احادیث میں وارد ہوا ہے کہ وہ اسمِ اعظم ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے عظیم اسماء میں سے ہیں اور ان کے ذریعے خاص طور پر دُعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے اس بارے میں مختلف روایات مروی ہیں۔

اور متفقہ طور پر کسی ایک نام کو علی الاطلاق اسمِ اعظم کہنا مشکل ہے، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کرنے کے بعد امام طبرانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: **وعندی أن الأقوال کلھا صحیحۃ اذ لم یرد فی خبر منھا أنہ الاسم الأعظم ولا شیٔ أعظم منہ۔** (مرقاۃ المفاتیح ج:۵ ص:۱۰۲ باب اسماء اللہ تعالیٰ، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

۲:- فرائض کے رُکوع وسجود میں تو اذکارِ مسنونہ کے سوا کچھ اور نہ پڑھنا چاہئے، البتہ نوافل کے سجدے میں دُعا دُرست ہے، لیکن دُعا ماثورہ ہو یا کم از کم عربی زبان میں ہو اور آخرت سے متعلق ہو۔

لما فی الدر المختار: ودعا بالعربیۃ وحرم بغیرھا(۱) **وفی ردّ المحتار: ینبغی أن یدعو فی صلٰوتہ بدعاء محفوظ وأما فی غیرھا فینبغی أن یدعو بما یحضرہ۔** (شامی ج:۱ ص:۳۵۰، ۳۵۲)۔(۲)

اور نماز کے علاوہ خاص دُعا کے لئے سجدہ کرنا اور اس میں دُعا کرنا کہیں منقول نظر سے نہیں گزرا، لیکن ظاہراً کچھ حرج بھی نہیں، کیونکہ صورت تذلّل کی ہے، مگر اس کو عادت بنانا یا سنت سمجھنا دُرست نہیں، **کذا فی امداد الفتاویٰ** ج:۱ ص:۵۴۰۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۸۱ ج)

مسجد میں بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھنا
دورانِ تلاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال ۱:- تبلیغ والے مسجد میں فرضوں کے بعد بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھتے ہیں یا تقریر کرتے ہیں، اس وقت بہت سے نمازی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، مصلّیوں میں ایسے مسبوق بھی

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۲۱ (طبع سعید).
(۲) رد المحتار تتمۃ تحت مطلب فی خلف الوعید وحکم الدعاء بالمغفرۃ للکافر ولجمیع المؤمنین. ج:۱ ص:۵۲۳ (طبع سعید).
(۳) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۵۶ سجدۂ دُعا۔

ہوتے ہیں جو کہ سنت ونوافل ادا کرتے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ تسبیح وغیرہ میں مشغول مصلّیوں کی طرف سے شکایت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری تسبیحات میں خلل واقع ہوتا ہے، منع کرنے سے وہ نہیں مانتے، بلکہ تبلیغ والے کہتے ہیں کہ جاکر صحن وغیرہ میں تسبیح ونوافل پوری کرو۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:- تلاوتِ قرآن شریف میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم شریف آئے اس وقت دُرود پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا بعد ختم تلاوت کے پڑھے؟

جواب ۱:- مسجد میں فضائل کی کتاب پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مفید ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل نہ پڑے، لہٰذا اگر نمازی نماز میں مشغول ہوں تو ان سے دُور ہٹ کر کتاب پڑھی جائے یا ان کے فارغ ہونے کا انتظار کیا جائے، نمازیوں کو دُوسری جگہ نماز پڑھنے کو کہنا دُرست نہیں۔ كما يفهم من عبارة الشامية تحت قول الدر: ورفع صوت بذكر الا للمتفقه، وفي حاشية الحموى عن الامام الشعرانى أجمع العلماء سلفًا وخلفًا على استحباب ذكر الجماعة فى المساجد وغيرها الا أن يشوش جهرهم علىٰ نائم أو مصل أو قارئ. (شامى ج:۱ ص:۴۴۴ أحكام المساجد من الصلوٰة)۔[۱]

۲:- تلاوت کے بعد پڑھنا چاہئے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲/۲۷ و)

نماز کے بعد "إِنَّ اللهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ" بلند آواز سے پڑھنا

سوال:- ہمارے پیش امام صاحب کچھ دنوں تک یہ آیت نماز کے بعد پڑھتے تھے "إِنَّ اللهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ .... الخ"، چند دن ہوئے انہوں نے اس آیت کو ترک کر دیا، میں نے ایک دن ان سے وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ نماز میں خلل آتا ہے اور تم سمجھ لئے گئے ہو، اور اس کے بعد چل دیئے، میں نے یہی بات سیکریٹری مسجد، جو ایک شریف آدمی ہے، سے ذکر کی، انہوں نے پیش امام صاحب کو ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو، مجھے اس کا علم نہیں، ایک دن نمازِ عشاء کے بعد امام صاحب نے

---

(۱) شامى ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع ایچ ایم سعید). وفى الشامية ج:۶ ص:۳۹۸ وفى الملتقىٰ وعن النبى صلى الله عليه وسلم أنه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذكير. وفيها .... فالاسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تاذى المصلّين .... الخ. وفى المرقاة شرح مشكوٰة ج:۲ ص:۳۵۷ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) قوله تعالىٰ: "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ .... الخ" ويسن الاسرار فى سائر الأذكار أيضًا الّا فى التلبية .... الخ. وراجع أيضًا الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۹، ۵۲۳.

(۲) وفى الهندية ج:۵ ص:۳۱۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ولو قرأ القران فمر علىٰ اسم النبى صلى الله عليه وسلم وأصحابه فقراءة القرآن علىٰ تاليفه ونظمه أفضل من الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم فى ذٰلك الوقت فان فرغ ففعل فهو أفضل .... الخ.

درسِ قرآن میں اسی آیت کو شروع کیا اور جو کچھ ان کے علم میں تھا، بیان کیا، اور شاید مجھ کو چغل خور کہا اور دیگر تنقیدیں کی، اب عرض یہ ہے کہ کیا اس بارے میں میں اس تنقید کا مستحق ہوں جو پیش امام صاحب نے میرے بارے میں بیان کی ہے؟

جواب:- آپ نے جتنی بات لکھی ہے اگر واقعہ صرف اتنا ہی ہے تو آپ کا کوئی قصور نہیں، امام صاحب نے بھی چغل خوری کا صریح الزام آپ پر نہیں لگایا، اگر ان کے دِل میں کسی وجہ سے آپ کی طرف سے کدورت پیدا ہوگئی ہو تو اسے ملاقات اور باہمی افہام وتفہیم سے دُور کردیجئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷/۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(اس جواب کے بعد سائل کی طرف سے اسی بارے میں دوبارہ سوال آیا جو درج ذیل ہے) (مرتب)

سوال:- عرض ہے کہ دوبارہ ارسال ہے، آپ نے جو جواب دیئے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مولانا سے بڑا جھگڑا ہے، جھگڑا کوئی نہیں ہے جو امام صاحب سے ملاقات سے دُور کیا جاسکے، میں تو از روئے شرع چاہتا ہوں کہ:-

۱:- اُوپر والی آیت پڑھنے سے نماز میں خلل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟

۲:- اس آیت کا اگر درس دیا جائے تو اس میں چغل خوری اور ریا کا ذکر ہے؟ جسے ذکر کرنا چاہئے، ان دونوں باتوں میں بھی شرعی جواب چاہتا ہوں۔

جواب ۱:- نماز کے بعد جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں بلند آواز سے تلاوتِ قرآن یا تقریر نہیں کرنا چاہئے،[1] لہٰذا اگر امام صاحب نے اس وجہ سے آیت کو پڑھنا چھوڑ دیا تو انہوں نے ٹھیک کیا ہے، اس پر کسی کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

۲:- اس آیت میں تو چغل خوری اور ریا کاری کا ذکر نہیں ہے، لیکن اگر آیت کے ذیل میں کوئی بات آجائے اور یہ مسئلہ بیان کردیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم
۱۳۸۸/۶/۲۰ھ

---

(۱) دلائل کے لئے پچھلے صفحہ:۲۶۶ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جنات کو قید کرنے یا جلانے کا حکم

سوال:- عاملین لوگ جنات کو آگ میں جلادیتے ہیں، حالانکہ یہ عذاب، اللہ ربّ العزّت کے ساتھ مخصوص ہے، جنات کو آگ میں جلانا شریعتِ مطہرہ کی چار چیزوں یعنی قرآن، سنت، قیاس، اجماع سے ثابت کیا جائے۔ نیز عامل لوگ جنات کو ہانڈی یا بوتل میں مخصوص مدّت تک کے لئے قید کردیتے ہیں، پھر آزاد کرنے کے وقت جنات سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تم نے چونکہ ایک مسلمان کو ایذاء پہنچائی تھی اس بناء پر تمہیں قید کیا گیا، اب آزاد کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا پر زد نہ آئے، اگر تم نے دوبارہ مخلوقِ خدا کو تنگ کیا تو پھر دوبارہ قید کرلئے جاؤگے۔ شریعتِ مطہرہ کیا اس کی اجازت دیتی ہے؟ فرق کرنے کی کوئی معقول تدبیر بیان فرمائیں۔

جواب:- اس بارے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ اگر جنات کا اثر ان کو جلائے بغیر زائل ہوسکتا ہو مثلاً دَم کرنے یا دُعا کرنے سے یا ان کو مار کر یا دھمکا کر، تب تو قتل کرنا یا جلانا جائز نہیں، لیکن اگر وہ مذکورہ طریقوں سے نہ جائے تو قید کرنا یا قتل کرنا یا جلانا جائز ہے، البتہ عامل کو یہ چاہئے کہ پہلے نرم طریقے استعمال کرے اور جب اس بات کا اطمینان ہوجائے کہ یہ جن جلائے بغیر نہیں جائے گا، تب جلانے کا اقدام کرے، علامہ بدرالدین شبلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابوالعباس ابنِ شیبہؒ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ:-

یجوز بل یستحب وقد یجب أن یذب عن المظلوم وأن ینصر فان نصر المظلوم مأمور بہ بحسب الامکان واذا برئ المصاب بالدعاء والذکر وأمر الجن ونھیھم وانتھارھم وسبھم ولعنھم ونحو ذٰلک من الکلام حصل المقصود، وان کان ذٰلک یتضمن مریض طائفة من الجن أو موتھم فھم الظالمون لأنفسھم اذا کان الراقی الداعی المعالج لم یتعد علیھم کما یتعدی علیھم کثیر من أھل العزائم فیأمرون بقتل من لا یجوز قتلہ.

(آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان ص:۱۱۱، باب ۵۳، طبع نور محمد کارخانہ)

آگے علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں: **فحاصل ذٰلک أنہ متی حصل المقصود بالأھون لا یصار الی ما فوقہ ومتی احتیج الی الضرب وما ھو أشد منہ صیر الیہ ومن قتل الصائل من الجن قتل عائشةؓ الجنی الذی کان لا یزال یطلع فی بیتھا۔** (ص:۱۱۴)

اور انہوں نے صفحہ:۲۰ پر باب ۶ کے تحت سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے ایک جن کو قتل کیا تھا، اور حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کو جلانے کے

بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی تدبیر سے پیچھا نہ چھوڑے تو دُرست ہے، بہتر ہے کہ اس تعویذ میں یہ عبارت لکھ دیں کہ اگر نہ جائے تو جل جائے''۔ (۱)

واللہ اعلم
۱۳۷۷/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۴/۲۸ ب)

جنیہ سے انسان کے نکاح کا حکم اور انسانوں پر جنات کے اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- ''البلاغ'' ۱۳۹۷ھ پڑھا تو کچھ نکات ایسے پائے گئے جن کی تشریح مطلوب ہے، مثلاً صفحہ:۱۴ پر ''کیا انسان کا نکاح جنی عورت سے ہوسکتا ہے؟'' کے عنوان کے تحت ساتویں سطر میں مذکور ہے کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ اس میں شک وشبہ کی مطلقاً گنجائش ہی نہیں کہ جنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہ بات نص سے ثابت ہے، مگر جب جنات کو ناری مخلوق کہا گیا ہے اور وہ دیکھنے میں بھی نہیں آتے تو کس طرح انسان سے ان کا تعلق اور پھر میاں بیوی کی حد تک قائم رہ سکتا ہے؟ جنات میں مسلم وغیرمسلم کا مسئلہ واضح ہے، مگر سائنسی نقطۂ نظر سے نہ سہی تو بھی بغیر مدلل تشریح کے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنیہ عورت اگر توالد کی اہل بھی ہے تو کیونکر انسانِ خاکی کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہ سکتی ہے؟ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''جنات کا انسانوں پر اثر'' کے عنوان کی تشریح فرمائیں۔ ہم اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں اور عاملین حضرات کے قصے کو ایجنٹوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ جنات:-

الف:- غیب کی خبریں سناتے ہیں، مثلاً فلاں چیز چوری کرنے والا فلاں فلاں ہے اور فلاں جگہ رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ب:- فلاں عامل نے جنات کو کوزے میں بند کر رکھا ہے، جس طرح سمندر کوزے میں بند کئے جانے کا محاورہ ہے۔

ج:- فلاں پیر نے چلہ کشی کے بعد جنات پر قابو پالیا ہے اور جنات اس کے تابع ہیں (گویا سلیمانِ ثانی ہیں)۔

د:- ڈاکٹروں نے مریض کو لاعلاج قرار دے دیا، مگر فلاں عامل نے مریض کو جنات کے زیرِ اثر بتایا اور علاج کرکے شفا دی۔ کچھ عرصہ قبل اخبارات میں اس مسئلے پر بڑی لے دے شروع ہوگئی تھی، بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مندرجہ بالا چند نکات کا تعلق ہے وہ کچھ یوں ہیں:-

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۸۸، ۸۹۔

الف:- حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصاء کو جب تک کیڑوں نے کھوکھلا نہ کردیا اور وہ نہ گر گئے جنات برابر کام کرتے رہے، لہٰذا غیب جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ انبیاء بھی غیب کا علم نہ جانتے تھے (حوالہ "البلاغ" ہذا ۱۳۱)۔

ب:- انگریز قوم بڑی توہم پرست ہے، انگلینڈ میں ایک بار ٹی وی پر بدرُوحوں کو لایا گیا (آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ محض تصویری خاکے اور کیمرہ ٹرک تھی) اکثر نے یقین کرلیا کہ فی الحقیقت بدرُوحوں سے ملاقات کا شرف نصیب ہوا، شعبدہ بازی کے کئی کھیل دیکھے، انسانی ذہن کی تیزی، مسلسل مشق، لگاتار محنت اور لگن نے وہ وہ کرتب پیش کئے کہ عقل دنگ رہ گئی، مگر یہ سب کچھ شعبدہ باز کی مہارت کا نتیجہ تھا، ابنِ خلدون نے اس پر معرکۃ الاراء بحث کی ہے جو صحیح ہے، اور اس کا لب لباب وہی ہے جو اُوپر لکھ آیا ہوں۔ ایک مسلمان عالم تو کیا ایک دہریہ بھی یہ کچھ کرسکتا ہے جو ہمارے یہاں ڈبہ پیر اور عاملین کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ راسپوتین (دُنیا کا سب سے بڑا بدکار) جو پیشین گوئی کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، ۱۹۳۳ء میں کشمیر کا ایک مسلمان (نام یاد نہیں رہا) نے انگلینڈ میں تین مقامات پر دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چل کر دِکھایا تھا، جبکہ ڈاکٹروں نے اس کے تمام جسم پر ایسی ادویات کا استعمال کیا تھا جس سے جسم پر ملی ہوئی کسی بھی دوائی کا اثر زائل ہوجایا کرتا ہے، مگر وہ کامران رہے، اس کے انٹرویوز لئے گئے تو اس نے بتایا کہ یہ اس کی خدا کی ذات پر کامل اعتماد کی ایک معمولی جھلک ہے اور اس اعتماد نے اس کی قوتِ ارادی کو ناقابلِ شکست بنادیا ہے۔ غرض اس طرح کے واقعات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر عاملین کا جنات کو کوزے میں بند کرلینا کیا شرعی حیثیت رکھتا ہے؟ جبکہ یہ بات بغیر ذہن پر زور دیئے سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالد بن ولیدؓ زہر کھاکر کیوں نہ مرے، جبکہ اس زہر کو اگر کنویں میں حل کردیا جاتا تو ایک لشکر کی موت واقع ہوسکتی تھی، یا حضرت عمرؓ کا خطبہ کے دوران ساریہ کو آواز دے کر جبل کی جانب متوجہ کرنا بغیر تذبذب کے سمجھ میں آسکتا ہے۔

ج:- سائنس تسلیم کرے یا نہ کرے، عقل سمجھے یا نہ سمجھے مگر ہمارا ایمان ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا جنات اور چرند پرند پر غلبہ تھا، اور وہ ان کی زبان سے بھی واقف تھے، واقعۂ ہدہد اس پر دال ہے، مگر یہ عاملین کیونکر سلیمان بن گئے؟ اس کی شرعی حیثیت پر بحث فرمائیے۔

د:- تشنج کی کئی اقسام ہیں، ایک ایسا مریض جس کی عمر کم اور وزن ۶۰/۵۰ پونڈ ہوتا ہے تشنج کی حالت میں اتنے زور کا مظاہرہ کرتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی پہلوان سے واسطہ پڑ رہا ہو، پٹھوں کے تناؤ کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوجاتی ہے، مگر ہمارے یہاں کے عاملین نے اس سے آگے گل سے بلبل کے پَر باندھنے کی سعادت یوں حاصل کی ہے کہ مریض پر جنات کا غلبہ ہے اور یہ سارا زور جنات یا

جن (نر ہو یا مادہ) کا ہے وگرنہ ایسے کم عمر اور کم وزن رکھنے والے مریض میں اتنا زور کہاں سے آسکتا ہے؟ وغیرہ، جہاں تک ڈاکٹری علاج کا تعلق ہے وہ سائنس کا ایک پہلو ہے، اور یہ بات آپ پر عیاں ہے کہ سائنس کافی حد تک ثبوت تو دیتی ہے مگر عقیدہ نہیں دے سکتی، جبکہ فلسفہ نہ ثبوت دیتا ہے اور نہ ہی عقیدہ، جبکہ مذہب ثبوت بھی دیتا ہے اور عقیدہ بھی (مگر اسلام کے لئے لفظِ ''مذہب'' کا استعمال دُرست نہیں سمجھتا، اس لئے کہ اسلام دین ہے، جبکہ مذہب ایک حصہ جیسے آنکھ، کان، ناک وغیرہ ایک جسم کے مختلف حصے ہیں) سائنس کے تابع ڈاکٹری علم نے اگر مریض کو لاعلاج کردیا تو بات سمجھ میں آسکتی ہے، فلسفے نے اگر کچھ مزید گرہیں لگائی ہیں تو بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے، مگر دین نے اگر صرف عاملین کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جنات پر حکمرانی کریں اور چاہیں تو جیب میں ڈالے پھریں، تو یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

قرآن مجید، احادیث دونوں میں سے کوئی بھی ہو، اس کا اثر ظاہر و باہر ہے، خدا کا کلام تو افضل ترین کلام ہے، اس کا اثر ہوتا ہے اور ہوگا بھی، مگر عاملین جس طرح بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں چلہ کشی کے دوران جنات کو قابو کرنے کی صلاحیت ملی اور وہ جنات کو قابو کرسکتے ہیں اور ان کا انسانی جسم پر اثر زائل کرسکتے ہیں، گویا عامل کا چلہ دافعِ بلا ہے نہ کہ کلام اللہ، آپ یہ واضح کریں کہ انسانی جسم پر جن کا اثر کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو کس حد تک؟ اور پھر جنات کو قابو میں لایا جانا کس طرح ثابت ہے؟ جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرآن و حدیث اور دیگر علوم از قسم فقہ، صرف ونحو وغیرہ کے بجائے ہمیں ہماری نانیاں دادیاں جنوں، پریوں کے قصے بچپن میں سناتی رہی ہیں، ان داستانوں کا لازمی نتیجہ و نفسیاتی اثر ہوتا ہے جو بڑے ہوکر لاشعور میں موجود رہتا ہے۔ پھر ہسٹریا کی ایک مریضہ کے اصلی علاج کی بجائے اسے عامل کی بدکرداری کے سامنے لاڈالا جاتا ہے اور وہ بے ضمیر، گندم، کا جوفروش، سلیمانِ ثانی ہونے کا مدعی، چند سکوں کے لالچ میں جنات کا اثر بتاکر ایک انسان کی زندگی کی خوشیاں لوٹ لیتا ہے۔ میرے بیان کردہ ان چار نکات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- جواب میں تاخیر ضرور ہوئی، لیکن آپ کا سوال قدرے تفصیل چاہتا تھا، جس کی فرصت اس سے پہلے نہ مل سکی، اب آپ کے سوال کا جواب پیشِ خدمت ہے۔

۱:- جہاں تک انسان اور جنیہ کے درمیان نکاح کا تعلق ہے، شریعت میں اس کی اجازت تو نہیں ہے لیکن جہاں تک اس کے عقلی امکان کا تعلق ہے اس میں کوئی بات غیر ممکن نہیں ہے، علامہ بدرالدین شبلیؒ معروف محقق عالم ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''آکام المرجان فی غرائب الأخبار وأحکام الجان'' کے باب ۳۰ میں صفحہ:۶۶ پر اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔

اور آپ نے جو اعتراض کیا ہے خاکی انسان کا نکاح ناری جن سے کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان بے شک خاکی اور جن بے شک ناری ہیں، لیکن جس طرح انسانوں میں سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام خاک سے پیدا کئے گئے لیکن ان کے بعد جب توالد و تناسل جاری ہوا تو ہر انسان براہِ راست خاک سے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں تمام عناصر کارفرما رہے، اسی طرح جنات میں سب سے پہلا جن جس کا قرآنی نام ''الجان'' ہے، براہِ راست آگ سے پیدا کیا گیا تھا، اس کے بعد تمام جنات توالد و تناسل سے پیدا ہوتے رہے اور ان میں بھی انسانوں کی طرح دُوسرے عناصر کارفرما رہے ہیں، لہٰذا اب جنات مطلقاً آگ یا حرارت کا پیکرِ مجسم نہیں ہوتے بلکہ ان میں حرارت و برودت کا اعتدال ہوتا ہے، اس بناء پر عقلی طور سے انسان اور جن کے درمیان جنسی اختلاط ممکن ہے۔(۱)

علامہ شبلیؒ نے اس پر یہ استدلال بھی کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے جنت کی حوروں کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ: ''لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ''(۲) یعنی ان کو جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا اور نہ کسی جن نے۔ اگر جن و اِنس کے درمیان اختلاط عقلاً ناممکن ہوتا تو یہاں جن کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ عقلاً نکاح ہونا غیر ممکن نہیں، اور علامہ شبلیؒ نے اس پر سند کے ساتھ کچھ واقعات بھی لکھے ہیں کہ جنات و انسان کے درمیان شادیاں ہوئیں، ان واقعات کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن ان کو عقلاً ناممکن نہیں کہا جاسکتا، اور معارف القرآن میں بھی صرف اتنی ہی بات کہی گئی ہے۔

۲:- دُوسرا مسئلہ آپ نے یہ اُٹھایا ہے کہ جنات کے انسانوں پر چڑھ جانے اور انسانوں کے ان کو تابع بنالینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اتنی بات تو قرآن و حدیث کے قطعی دلائل سے ثابت ہے کہ ''جن'' انسانوں سے الگ ایک مخلوق ہیں، وہ عام نظروں کو نظر نہیں آتے، اور ان میں مؤمن و کافر، صالح و فاسق ہر طرح کے ہوتے ہیں، لہٰذا اتنی بات پر تو ایمان رکھنا ضروری ہے، رہا یہ کہ وہ انسانوں کو پریشان کرنے کے لئے ان پر چڑھ جاتے ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ جو عاملین انہیں اُتارنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں؟ سو یہ کوئی ایمانیات کا مسئلہ نہیں جس پر ایمان رکھنا ضروری ہو، بلکہ واقعات کا مسئلہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں جنات کے انسانوں کو پریشان

---

(۱) جنیہ سے انسان کے نکاح سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۲۔
(۲) سورۃ الرحمٰن: ۵۶ و ۷۴۔

کرنے کے واقعات اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ ان کا انکار مشکل ہے[1]، ایک واقعہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا ہے جو شمائل ترمذی میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بنو عذرہ'' قبیلے کا ایک شخص جس کا نام خرافہ تھا، اسے جنات پکڑ کر لے گئے تھے، وہ ایک عرصے تک جنات کے درمیان مقیم رہا، پھر وہی اسے انسانوں کے پاس چھوڑ گئے، اب وہ واپس آنے کے بعد عجیب عجیب قصے سنایا کرتا تھا، اس لئے لوگ (ہر عجیب بات کو) خرافہ کا قصہ کہنے لگے۔

(شمائل ترمذی ص:۲۱ باب ما جاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السحر)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جن اُتارنے کے واقعات بھی بعض روایات میں موجود ہیں چنانچہ ابوداؤد، مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں یہ حدیث مروی ہے کہ:-

عن أم أبان بنت الوازع عن أبيها أن جدها انطلق الى رسول الله صلى الله عليه وسلم بابن له مجنون أو ابن أخت له فقال: يا رسول الله! ان معي ابنا لي أو ابن أخت لي مجنون أتيتك به لتدعو الله تعالٰى له، قال: ائتني به، قال: فانطلقت به اليه وهو في الركاب فأطلقت عنه وألقيت عليه ثياب السفر وألبسته ثوبين حسنين وأخذت بيده حتّى انتهيت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أدنه مني واجعل ظهره مما يليني، قال: فأخذ بمجامع ثوبه من أعلاه وأسفله فجعل يضرب ظهره حتّى رأيت بياض ابطيه ويقول: أخرج عدو الله فأقبل ينظر نظر الصحيح ليس بنظر الأوّل .... الخ. (آكام المرجان ص:۱۱۳ باب۵۳)

اُمِّ ابانؓ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ ان کے دادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے ایک مجنون (اس کے معنی پاگل بھی ہوسکتے ہیں اور جن زدہ بھی) بیٹے یا بھتیجے کو لے گئے اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! میں اپنے اس بیٹے یا بھتیجے کو جو مجنون ہے دُعا کے لئے لایا ہوں''، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اسے میرے پاس لے آؤ''، .... میں آپؐ کے پاس لے گیا، آپؐ نے فرمایا کہ ''اسے مجھ سے قریب کردو اور اس کی پشت میری طرف کردو''، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کپڑے پکڑ کر اس کی پشت پر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دِکھائی دینے لگی، آپؐ مارتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ: ''او دُشمنِ خدا نکل!'' چنانچہ وہ تھوڑی دیر میں تندرستوں کی طرح دیکھنے لگا....الخ۔

لہٰذا اگر کسی پر جن کا اثر ہوجائے تو اس کا علاج عملیات کے ذریعہ کرنا نہ عقلاً ناممکن ہے، اور

---

(۱) وفي كتاب الروح ص:۴۶۵ ان تداخل الأجسام المحال أن يتداخل جسمان كثيفان احداهما في الأخرة بحيث يكون حيزهما واحدًا وأما أن يدخل لطيف في كثيف يسرى فيه فهٰذا ليس بمحال.

نہ شرعاً ناجائز، بشرطیکہ اس میں کوئی خلافِ شرع طریقہ اختیار نہ کیا جائے[1]، اور اگر کسی شخص کو جن اُتارنے کا طریقہ آتا ہو تو اسے قدرتِ خداوندی میں دخل اندازی نہیں کہا جاسکتا، جس طرح بیماری کے جراثیم مارنے پر انسان کو قدرت دی گئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے جن اُتارنے پر بھی کسی کو قدرت دے دی ہو تو کیا بعید ہے؟ البتہ جنات کو غلام بنالینا اگرچہ عقلاً ممکن ہے لیکن شرعاً جس طرح آزاد انسان کو اسبابِ شرعیہ کے بغیر غلام بنانا جائز نہیں، اسی طرح آزاد جنات کو غلام بنانا بھی دُرست نہیں[2]، البتہ ایک تو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس مسئلے کا تعلق ایمانیات سے نہیں واقعات سے ہے۔ دُوسرے جو عامل یہ دعویٰ کرے کہ جنات اس کو مستقبل کی غیبی خبریں دیتے ہیں وہ باطل ہے۔ تیسرے یہ کہ جنات کو قابو میں کرنے کے لئے بہت سی سفلی اعمال جادُوگر کرتے ہیں جن کا مقصد شیاطین کو خوش کرنا ہوتا ہے، وہ باجماعِ اُمت حرام اور ناجائز ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس مقصد کے لئے ایسے منتر پڑھنا جس کے معنی سمجھ میں نہ آتے ہوں یہ بھی ناجائز ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۴/۳۴ ۲۸ ب)

بے پردہ خاتون سے جھاڑ پھونک کرانے کا حکم

سوال:- مندرجہ ذیل طریقے سے جھاڑ پھونک کرنا یا اس سے استفادہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ ایک غیرشادی شدہ بالغ خاتون جنھوں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ ان کے اعلان کے مطابق کوئی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ہوگیا ہے اور اس ولی یا سائیں بابا نے خاتون کو یہ حکم دیا ہے کہ ان کے حکم سے تم انسانیت کی خدمت کرو، یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ یہ سائیں بابا زندہ ہیں یا مردہ؟ بلکہ خاتون سے جب بھی اس کے متعلق پوچھا گیا تو فرماتی ہیں کہ انہیں یہ بتانے کی اجازت نہیں۔ طریقۂ علاج یہ ہے کہ یہ خاتون بناؤ سنگھار کرکے بے پردہ بیٹھ جاتی ہیں اور ہر آنے والے سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کا حال پوچھتی ہیں، مریض اپنا حال بتاتا ہے، خاتون کے سامنے پھولوں کا ہار ٹنگا ہوا

(۱) وفی مشکوٰة المصابیح کتاب الطب والرقی ص:۳۸۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عوف بن مالک الأشجعی قال: کنا نرقی فی الجاهلیة فقلنا: یا رسول اللہ! کیف تریٰ فی ذٰلک؟ فقال: اعرضوا علی رقاکم لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک. (رواه مسلم). وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۶۳ ولا بأس بالمعوذات اذا کتب فیها القرآن أو أسماء اللہ تعالیٰ (الیٰ قوله) وانما تکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو کفر أو غیر ذٰلک واما ما کان من القرآن أو شیئ من الدعوات فلا بأس به. (تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷ ملاحظہ فرمائیں)۔

(۲) جنات کو تابع بنانے کے شرعی حکم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)

(۳) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

ہوتا ہے جس کے متعلق خاتون کا کہنا ہے کہ وہ ولی یا سائیں بابا اس ہار کے سامنے براجمان ہوتے ہیں جنھیں صرف وہ خاتون ہی دیکھ سکتی ہیں، کوئی دُوسرا شخص اس ولی یا سائیں بابا کی آواز نہیں سن سکتا۔ خاتون، مریض کا حال اس ہار کی طرف رُخ کر کے دُہراتی ہیں اور تھوڑی دیر منتظر رہتی ہیں گویا انہیں کوئی خاموش پیغام مل رہا ہے، پھر مریض کو بتاتی ہیں کہ سائیں بابا نے کہا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔
سائل کو دو باتیں از روئے شرع غلط محسوس ہوئیں:-

۱:- اسلام میں پردہ بنیادی حکم ہے، مگر یہ خاتون صرف بے پردہ ہی نہیں بلکہ پوری طرح میک اَپ کر کے مجلس میں بیٹھتی ہیں اور ہر ایک سے بے حجابانہ گفتگو کرتی ہیں، مزید یہ کہ جب پردے کی طرف توجہ دلائی گئی تو فرماتی ہیں کہ سائیں بابا نے ان کو اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ بلکہ بے پردگی کا یہ عالم ہے کہ ان کی مکمل میک اَپ میں تصویریں اخبارات اور رسائل میں چھپتی ہیں۔

۲:- مریضوں سے سوال و جواب کے درمیان یہ بتانا کہ ''سائیں بابا نے یہ فرمایا ہے کہ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا'' گویا براہِ راست علمِ غیب کا دعویٰ ہے، جبکہ علمِ غیب صرف اللہ کو ہے۔

مجھے فتویٰ کی ضرورت اس لئے بھی پڑی ہے کہ میری بچی کافی دنوں سے بیمار ہے، علاج جاری ہے، مسنون دُعائیں پڑھ کر دَم کرتا ہوں یا کسی کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جائز طریقے سے علاج کرتے ہیں تو ان کے پاس بھی حاضر ہوتا ہوں، مذکورہ خاتون کی شہرت سن کر ارادہ ہوا کہ میں بھی اپنی بچی کو لے کر ان کے پاس جاؤں مگر ان کا طریقہ دیکھ کر مجھے اُلجھن ہوگئی، لہٰذا مذکورہ خاتون کے بارے میں شرعی فتویٰ کیا ہے؟ خاتون کا دعویٰ رُوحانیت اور یہ اعلان کرنا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے کسی ولی یا سائیں بابا کا سایہ ہوگیا ہے اور وہ ان کے حکم سے انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں جبکہ دُوسری طرف طریقہ غیرشرعی ہے، نیز یہ کہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ قوتِ رُوحانی یا سائیں بابا کا سایہ ان پر ان کے کسی خاص عملیات یا ریاضت کی وجہ سے حاصل ہوا؟ تو جواب نفی میں ملا، خاتون کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی عمل یا ریاضت نہیں کی، براہِ کرم جواب دیں کہ اس خاتون کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- مذکورہ خاتون سے علاج کروانا اور اس غرض سے اس کے پاس جانا جائز نہیں، اور جن دو غلط باتوں کا سائل نے ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ غلط اور گناہ ہیں، اور اس کی غیب کی بتلائی ہوئی باتوں پر بحیثیت غیب یقین کرنا کفر ہے، مذکورہ خاتون کا بے پردہ، بناؤ سنگھار کے ساتھ مردوں کے سامنے بیٹھنا شریعت کے بالکل خلاف ہے، اور اس خلافِ شریعت عمل پر سائیں بابا کی طرف سے اجازت کا ذکر، اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو ان کا دعویٰ غلط ہے یا انہیں کوئی شیطان بہکا رہا ہے، ایسی صورت

میں ان کی باتوں کا یقین کر کے ان پر عمل کرنا جائز نہیں اور نہ ایسے لوگوں سے علاج کرانا دُرست ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۵/۵/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۹/۳۶ د)

چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے لئے منتر اور ٹوٹکے معتبر ہیں یا نہیں؟

سوال:- چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے بارے میں بعض ٹوٹکے اور منتر حیلے وغیرہ شرعاً دُرست ہیں یا نہیں؟ اور کیا یہ معتبر ہیں یا نہیں؟

جواب:- اس قسم کے اعمال شرعاً حجت نہیں ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۸ الف)

قبرستان میں قبلہ رُو ہوکر ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا

سوال:- صلوٰۃِ جنازہ کے متصل بعد دُعا ثابت نہیں، مُسلَّم ہے، اور بعد الدفن دُعا مسنون ہے، مگر وضاحت طلب امر یہ ہے کہ بعد الدفن اور بعد پڑھنے سورۂ بقرہ کا اوّل و آخر، جو دُعا کی جاتی ہے آیا اس میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنی چاہئے یا ہاتھ چھوڑ کر؟ قبل ازیں تو دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے کراتے رہے، مگر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مرحوم کی نمازِ حنفی مترجم نظر سے گزری، جس میں درج ہے کہ بغیر ہاتھ اُٹھائے دُعا کرنی چاہئے جبکہ اس کے مقابل حافظ ابنِ حجرؒ نے صحیح ابی عوانہ سے فتح الباری ج:۱۱ ص:۱۲۲ میں حدیث: عن ابن مسعود رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قبر عبداللہ ذی الجبادین. الحدیث. وفیہ فلما فرغ من دفنہ استقبل القبلۃ رافعًا یدیہ، سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا فرمائی ہے، جو بات سنت یا مستحب ہو بحوالہ کتب ارشاد فرمادیں کہ آیا بعد الدفن ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنی چاہئے یا چھوڑ کر؟

جواب:- قبرستان میں قبلہ رُو ہونے کی صورت میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور جائز ہے، صحیح مسلم میں لیلۃ البراءۃ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ

(۱) دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۲۱، والقول الجمیل مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ بحوالۂ مذکورہ، اور امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۸۸۔

فرماتی ہیں:-

حتّی جاء البقیع فقام فاطال القیام ثم رفع یدیه ثلاث مرات. (ج:۱ ص:۳۱۳ قبیل کتاب الزکوٰۃ)۔[۱]

اس کے تحت علامہ نوویؒ لکھتے ہیں: فیه استحباب اطالة الدعاء وتکریرہ ورفع الیدین فیه۔ اور حنفیہ کے اُصول پر بھی مسئلہ یہی ہے، چنانچہ علامہ ابنِ نجیمؒ لکھتے ہیں: ویکرہ عند القبر کل ما لم یعهد من السنّة والمعهود منها لیس الا زیارتها والدعاء عندها قائما کما کان یفعل صلی الله علیه وسلم فی الخروج الی البقیع. (البحر الرائق)۔[۲]

اور اُوپر گزر گیا کہ بقیع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفعِ یدین ثابت ہے، اس کے علاوہ صحیح ابوعوانہ کی جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے وہ فتح الباری کی "کتاب الاستیذان باب الدعاء مستقبل القبلة" کے تحت حافظؒ نے نقل کی ہے، اور اس پر سکوت کیا ہے، وہ بھی اس کی دلیل ہے، حکیم الأمت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: فی ردّ المحتار: اٰداب زیارة القبور "ثم یدعوا قائمًا طویلًا"۔[۳] اس سے دُعا کا جائز ہونا ثابت ہوا، اور ہاتھ اُٹھانا مطلقاً آدابِ دُعا سے ہے، پس یہ بھی دُرست ہوا، (امداد الفتاوی)۔[۴]

لہٰذا اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ رفعِ یدین جائز ہے، البتہ اکابرِ دیوبند کا عام معمول ترکِ رفع کا رہا ہے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہندوستان میں قبر پرستوں کی کثرت تھی جو صاحبِ قبر سے دُعائیں مانگتے تھے، ان کے ساتھ تشبہ سے پرہیز کے لئے وہ ہاتھ اُٹھائے بغیر دُعا کرلیتے تھے، لیکن کسی نے رفعِ یدین کو ناجائز بھی نہیں کہا، بلکہ بعض مستند علمائے دیوبند کو احقر نے خود ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے دیکھا ہے، لہٰذا حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے جو بات لکھی ہے وہ مبنی بر احتیاط ہے، رفعِ یدین کے ناجائز ہونے کی بنا پر نہیں، ھٰذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۶/۲۸ ب)

تعویذ کے ذریعہ علاج کرانے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے میری اہلیہ عرصہ ۱۴ سال سے تکلیف میں ہے، حالت بدلتی رہتی ہے،

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۶ (طبع سعید).
(۳) شامیة ج:۲ ص:۲۴۲.
(۴) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۰۰.

سر کا گھٹنا اور ایسا محسوس کرنا کہ پھٹ جائے گا، ٹانگوں میں ایسا محسوس ہونا کہ کوئی کاٹ رہا ہے، پورے جسم کا ٹھنڈا ہونا یا جلتا ہوا محسوس ہونا، گھر سے بھاگنے کی سعی کرنا، کپڑے پھاڑ لینا، جسم پر ورم ہونا، جسم کا لطیف ہونا، پورے جسم یا کندھوں پر انتہائی بوجھ محسوس ہونا، کچھ ایسی حرکتیں محسوس ہونا جن کا تذکرہ نہیں کیا جاسکتا، اور مدینہ طیبہ کی طرف جاتے وقت ایسی غلط باتیں ذہن میں آتی ہیں کہ آدمی ایمان سے جائے، اور کبھی راستے سے واپس آنے کو کہتی ہے، اس قسم کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں، بعض اوقات بے چینی ایسی ہوتی ہے کہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگتی ہے، اس کا علاج ڈاکٹروں سے بہت کرایا لیکن آرام آنے کے بجائے ان دواؤں کے جسم پر اور اثرات ہوئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ رُوحانی علاج کراؤ، ۱۹۷۸ء سے مختلف لوگوں سے رُوحانی علاج بھی کرائے اس علاج میں وہ تعویذ باندھنے، پینے یا جلانے کے لئے دیتے ہیں، کوئی ہمیں ایسا رُوحانی پیشوا نہیں ملا جو بغیر تعویذات کے علاج کرے، میرے بچوں پر بھی مختلف کیفیات ہوتی ہیں، ان کا علاج بھی رُوحانی کرانے سے کچھ افاقہ ہوتا ہے، یہاں کے انگریزی اخبار میں تعویذوں کے استعمال کے بارے میں استفتاء پر ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے میں انتہائی پریشان ہوگیا ہوں، اس کے مطابق تعویذوں کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری رہبری فرمائیں، کیا میں اپنی بیوی اور بچوں کا علاج تعویذات کے ذریعے کراسکتا ہوں؟ اگر نہیں کراسکتا تو میرے لئے اور کوئی راستہ بتائیں کیونکہ بیوی اور بچوں کے علاج کا میں ذمہ دار ہوں۔ سائل:- عبدالوحید، جدہ سعودی عرب

جواب:- تعویذ کے ذریعے علاج کرانا شرعاً جائز ہے،[1] بشرطیکہ تعویذ میں جو کلمات لکھے جائیں ان کے معنیٰ معلوم ہوں،[2] اور ان میں کوئی بات مشرکانہ نہ ہو، مثلاً آیاتِ قرآنی پر مشتمل تعویذ میں کچھ حرج نہیں ہے۔[3] سعودی عرب کے بعض علماء تعویذوں کی ممانعت کے بارے میں جو احادیث پیش کرتے ہیں ان سے مراد ایسے تعویذ ہیں جن میں مشرکانہ باتیں ہوں،[4] یا جن کو اللہ تعالیٰ کے بجائے بذاتِ خود شافی سمجھا جائے، ورنہ آیاتِ قرآنی کا دَم کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تعویذ لکھ کر

(۱ تا ۴) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۳۸۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عوف بن مالک الأشجعیؓ قال: کنّا نرقی فی الجاھلیة فقلنا: یا رسول اللہ! کیف تری فی ذٰلک؟ فقال: اعرضوا علیّ رقاکم، لا بأس بالرقی ما لم یکن فیه شرک. رواہ مسلم (ج:۲ ص:۲۲۴ طبع قدیمی کتب خانہ). (وکذا فی أبی داوٗد ج:۲ ص:۱۸۶ طبع مکتبہ حقانیہ ملتان). وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۶۳ (طبع ایچ ایم سعید) ولا بأس بالمعوذات اذا کتب فیھا القراٰن، أو أسماء اللہ تعالٰی .... وانّما تکرہ العوذۃ اذا کانت بغیر لسان العرب، ولا یدری ما ھو ولعله یدخله سحر أو غیر ذٰلک، وأما ما کان من القراٰن أو شیٔ من الدعوات فلا بأس به .... الخ.

نیز مکمل تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ہی تصنیف تکملة فتح الملھم ج:۴ ص:۳۱۷ ملاحظہ فرمائیں۔

پلانا یا لٹکانا حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ سے ثابت ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۱/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۱۱۷)

قرآنِ کریم کے نقش کے علاوہ کسی اور تعویذ کا حکم

سوال:- میرے ماموں زاد بھائی کہتے ہیں کہ نقشِ قرآن مجید کے علاوہ باقی نقوش وتعویذ کا احادیث سے ثبوت نہیں، میں نے کہا کہ بزرگوں کے تجربات ہیں ان سے بھی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن وہ تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا کیا حکم ہے؟

جواب:- جن تعویذوں میں کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو وہ جائز ہیں، تعویذ میں صرف قرآنی آیات درج کرنا ہی ضروری نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۹/۲۵ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت اور ذکر کا حکم

سوال:- کیا ایامِ ماہواری میں عورت، سورۃ یا کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ اور دُرود پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

اسم ''بدوح'' کی تحقیق

سوال:- ''یا بدوح'' یہ کیا اللہ کا نام ہے؟ جبکہ تلاش کے بعد بھی معلوم نہ ہوسکا۔

جواب:- ''یا بدوح'' قرآن میں تو یہ نام نہیں ہے، مگر بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ عبرانی

(۱،۲) مسلم شریف بعد کتاب الطب والمرض والرقی ج:۲ ص:۲۲۴ (تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷ طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ فتاویٰ شامیة ج:۶ ص:۳۶۳،۳۶۴۔ عبارات سابقہ فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) فی الهندیة ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئًا من القرآن والآية وما دونها سواء فی التحریم علی الأصح، وفیه أیضًا ج:۱ ص:۳۸ ویجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الأذان ونحو ذٰلک. وکذا فی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۳ ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعیة ومسها وحملها وذکر الله تعالٰی وتسبیح. (و بہشتی زیور ج:۲ ص:۱۸۳)۔

زبان میں اللہ کا نام ہے۔(۱)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

ناچاقی دُور کرنے کے لئے شوہر پر تعویذ کرنے کا حکم

سوال:- زید کی بہن عمر کے نکاح میں عرصہ ۱۰ یا بارہ سال سے ہے، اور ہر طرح فرمانبردار اور اطاعت گزار ہے، لیکن عمر اسے ہمیشہ مارتا پیٹتا ہے، اور تکلیف اور آزار پہنچاتا ہے، زید اور اس کی بہن صبر سے کام لیتے ہیں، مگر اس ظالم پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا، طلاق حاصل کرنا چند وجوہات کی بناء پر مشکل ہے، اس صورت میں عملیات سے عمر کو مطیع کرنا یا سرزنش کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یا اور کوئی صورت ہو تو بتلادیں۔

جواب:- سب سے اچھا راستہ تو یہ ہے کہ عمر کے لئے خوش خلقی کی دُعا کیجئے اور نرمی اور فہمائش سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر یہ چیزیں کارگر نہ ہوں تو کسی دیندار اور پابندِ شرع عامل سے ایسے تعویذ وغیرہ لینے میں کوئی حرج نہیں(۲) جن سے شوہر کے دِل میں بیوی کی محبت پیدا ہوجائے، لیکن تعویذات و عملیات کے ذریعہ اسے نقصان پہنچانا ہرگز جائز نہیں سخت گناہ ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

رمضان میں تراویح کے بعد وعظ کرنے اور چالیس مرتبہ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- چند سالوں سے ہمارے شہر گلوسٹر برطانیہ میں رمضان شریف میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ روزانہ تراویح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے کچھ وعظ و بیان ہوتا ہے، جس کے بعد امام

(۱) لفظِ "بدوح" (بفتح باء وتخفیفِ دال) کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند (امداد المفتین) ص:۲۳۸، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ) ص:۱۴۹۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۷۸ اور اس کا حاشیہ۔

صاحب چالیس صلوٰۃ وسلام کو جہراً پڑھتے ہیں اور باقی حضرات سنتے ہیں، اس کے بعد دُعا ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ دُرود شریف پڑھنے کا یہ طریقہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- یہ طریقہ فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ چالیس صلوٰۃ وسلام جہراً پڑھنے کا ایسا التزام و اہتمام جائز نہیں جس سے ایسا کرنے کے مسنون یا ضروری ہونے کا شبہ ہو، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس کی پابندی نہ کی جائے، کبھی کرلیں، کبھی چھوڑ دیں، نیز بہتر یہ ہے کہ دُرود شریف آہستہ پڑھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۰۰/۵)

کیا ظاہری اسباب نہ ہونے کی صورت میں بھی دُعا کا اثر ہوتا ہے؟

سوال:- اگر آدمی کو اسباب و وسائل میسر نہ ہوں تب بھی دُعا کا اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جی ہاں! دُعا بھی دُوسرے وسائل و اسباب کی طرح ایک وسیلہ ہے، اور دُوسرے مادّی وسائل کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۰ ج)

اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟

سوال:- اسمِ اعظم کی دُعائیں کون سی ہیں؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ کتاب کا حوالہ درج فرمادیں۔

جواب:- اسمِ اعظم بعض حضرات نے "یا حی یا قیوم" کو کہا ہے، بعض نے "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" کو بعض نے "رَبّ رَبّ" کو، بعض نے "اَللہ" کو، بعض نے "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کو اور یہ تمام صیغے[(۱)] دُعا کی قبولیت کے لئے مجرّب ہیں، البتہ اسمِ

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۱ ص:۱۹۹ عن انسؓ قال: کنت جالسًا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد ورجل یصلی فقال: اللّٰھم انی اسئلک بأن لک الحمد لا الٰہ الا أنت الحنان المنان بدیع السمٰوٰت والأرض یا ذا الجلال والاکرام یا حی یا یقوم اسألک، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: دعا اللہ باسمه الأعظم الذی اذا دعی به أجاب واذا سئل به أعطیٰ. رواہ الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۲۰۰ عن أسماء بنت یزید أن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: اسم اللہ الأعظم فی هاتین الأیتین: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، و فاتحة اٰل عمران الٓمّٓ. اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. رواہ الترمذی وأبو داؤد وابن ماجة والدارمی.

اعظم کے بارے میں محققین کی تحقیق یہ ہے کہ کسی ایک اسمِ اعظم باری تعالیٰ کو معین طور سے اسمِ اعظم کہنا مشکل ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۰ ج)

روزہ اِفطار کے وقت دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے

سوال:- دُعا کی مقبولیت کے متعلق سنا ہے کہ روزہ کھولنے کے وقت اور روزہ رکھنے کے وقت زیادہ قبول ہوتی ہے، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- اِفطار کے وقت دُعا کی قبولیت کی اُمید حدیث سے ثابت ہے۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۰ ج)

تعویذ میں اگر کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو تو جائز ہے

سوال:- تعویذ بنانا اگرچہ قرآن شریف کی آیات سے ہو، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- تعویذ میں اگر کوئی بات خلافِ شرع نہ ہو تو اس کا بنانا رکھنا جائز ہے۔ (۳)

واللہ اعلم
۲۸/۱۱/۱۳۸۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۵۵ و)

عمل ''حاضرات'' کی شرعی حیثیت

سوال:- از روئے شریعت عمل حاضرات کی کیا حیثیت ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ ۲:- حاضرات کے ذریعہ کیا ہوا فیصلہ قابلِ قبول ہونا چاہئے یا نہیں؟

---

(۱) وفی المرقاة وقال أبو جعفر الطبرانیؒ اختلفت الأثار فی تعیین الاسم الأعظم وعندی أن الأقوال کلها صحیحة اذ لم یرد فی خبر منها انه الاسم الأعظم ج:۵ ص:۱۰۲.

(۲) عن عبدالله بن عمرو بن العاصؓ یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ان للصائم عند فطره لدعوة ما ترد. کتاب الدعاء ج:۲ ص:۱۲۲۹. فی اسناده اسحاق بن عبدالله مدنی وهو مقبول وبقیة رجاله حسن، وقال ابن حجرؒ هٰذا حدیث حسن الفتوحات الربانیة وأخرجه ابن ماجة عن هشام بن عمار مثلا فی الصیام باب فی الصائم لا ترد دعوته، وفی الزوائد اسناده صحیح.

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۷۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

جواب:- عمل ''حاضرات'' کی مفصل کیفیت اور حقیقت اب تک ہمیں کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکی، البتہ اتنا واضح کردینا ضروری ہے کہ اگر اس عمل کے ذریعے جنات کو اس طرح تابع یا مسخر بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مختار نہ رہیں، بلکہ عامل کی مرضی کے مکمل تابع ہوجائیں تو یہ عمل بالکل ناجائز ہے، کیونکہ جنات حُر ہیں، اور انہیں غیر شرعی طریقے سے غلام بنانا بالکل حرام ہے،[1] اور اگر اس کی حقیقت کچھ اور ہے تو اسے مفصل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے۔ واللہ اعلم

۲۷/۱۱/۱۳۹۸ھ

''بدیع العالم'' نام رکھنے اور صرف ''اِلَّا اللّٰہ'' کا ذکر کرنے کا حکم

سوال:- خدمتِ بابرکت میں عرض ہے کہ بندہ کے دِل میں اپنے نام کے متعلق مدّت سے ایک اِشکال ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندہ کا نام ''بدیع العالم'' رکھا گیا، حالانکہ ''بدیع'' کا لفظ شانِ باری تعالیٰ میں وارد ہوا ہے، اس لئے بندہ کے دِل میں یہ خوف ہے کہ اس نام پر مؤاخذہ ہوجائے، لہٰذا کیا اس لفظ کے کوئی ایسے معنی ہیں جس کی بناء پر اِشکال کا دفعیہ ہوجائے۔

دیگر عرض یہ ہے کہ صرف ''اِلَّا اللّٰہ'' کا ذکر کیسا ہے؟ یہ ذکر جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے بعض حضرات اس کو ناپسند کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ''اِلَّا'' بمعنی غیر ہے، لہٰذا ''اِلَّا اللّٰہ'' کا ذکر درحقیقت غیراللہ کا ذکر ہے۔

عرض گزار احقر بدیع العالم
سابق پرنسپل عالیہ مدرسہ
(لکشام بنگلہ دیش)

جواب:- مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ باعثِ افتخار ہوا۔

''بدیع'' ان اسمائے حسنیٰ میں سے نہیں ہے جن کا استعمال غیراللہ کے لئے جائز نہ ہو، اس لئے یہ نام ناجائز تو نہیں ہے، البتہ ایک دعوے کا پہلو اس میں ضرور ہے، اس کی وجہ سے بدلنا چاہیں تو اختیار ہے۔

---

(۱) فی أحکام القرآن ج:۴ ص:۴۴ نعم یشهد فعله علیه السلام علٰی أن تسخیر الجن کان غیر مرضی عنده لکمال الأدب فی شأن سلیمان علیه السلام فغیره أولٰی به وهو الذی قلنا من جوازه اذا کان الجن یحل استعانته وتسخیره من الکفرة واما المسلم فلا یحل استرقاقه أو تقییده من غیر وجه کما فی الانسان کما لا یخفی.

نیز جنات کو مسخر کرنے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۵، ۲۶۶۔

''اِلَّا اللّٰہ'' کا ذکر دوازدہ تسبیح کا ایک جزو ہوکر اس لئے دُرست ہے کہ اس سے پہلے پورے کلمے ''لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ'' کی تسبیحات پڑھی جاچکی ہوتی ہیں، اس لئے ہر ''اِلَّا اللّٰہ'' کے ساتھ ''لا اِلٰہ'' محذوف و ملحوظ ہوتا ہے، نیز مشائخ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ''لامعبود اِلَّا اللّٰہ''، ''لامحبوب اِلَّا اللّٰہ'' وغیرہ کا تصوّر کریں۔

البتہ دوازدہ تسبیح کے جزء کے بغیر، یا مذکورہ تصوّر کے بغیر ''اِلَّا اللّٰہ'' کا ذکر واقعی نہ منقول ہے نہ معقول۔ دُعا کی درخواست ہے، والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۴/۲/۱۲ھ

■■■

کتاب حقوق المعاشرة وآدابها

(حقوقِ معاشرت اور اس کے آداب)

گھریلو ناچاقی اور والد کی سخت مزاجی کا حل اور طلاق کے معاملے میں والد کی اطاعت واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- محترم جناب مفتی صاحب، دار العلوم کورنگی کراچی　　السلام علیکم

مؤدّبانہ عرض ہے میں مندرجہ ذیل مسئلے کا حل قرآن اور سنت کی روشنی میں چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس مسئلے سے اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی مول لئے بغیر نکلوں۔

میں اپنے والدین کا ایک ہی لڑکا ہوں، نیز یہ کہ میری دو بہنیں بھی ہیں۔ ان بہنوں میں سے ایک بہن شادی شدہ ہے۔ میں اپنی دونوں بہنوں سے بڑا ہوں، میں حتی الامکان اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ میرے والد جن کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے، بہت ہی سخت مزاج آدمی ہیں، نیز یہ کہ وہ حد درجہ اَنا پرست آدمی بھی ہیں، اور وہ اپنی بات کے آگے کسی کی بات سننا یا ماننا پسند نہیں کرتے۔ میری والدہ تقریباً پچاس سال کی ہیں اور وہ مستقل بیمار رہتی ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کا رسولی کا آپریشن ہوا تھا، جس کا انہوں نے ذہن پر اتنا اثر لیا کہ ان کے اعصاب بُری طرح متأثر ہوئے، بہت زیادہ علاج اور گھر والوں (بشمول میرے والد اور میری بیوی) کی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی ذہنی حالت تو بحال ہوگئی، لیکن ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی، جس کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ میرے والد نے میری شادی میرے (مرحوم) ماموں کی لڑکی سے کردی اور اس سے میری تین عدد لڑکیاں ہیں، میری شادی کے بعد سے اب تک میری زندگی اور میری بیوی کی زندگی کے ہر معاملے میں میرے والد صاحب کی مرضی چلتی ہے اور بعض اوقات اس وجہ سے میں اپنی بیوی اور بچوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہوں اور اپنے بہت سارے فرائض اپنی ملازمت میں مصروفیت کی وجہ سے بھی ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میری بیوی کا گو کہ میرے والد بہت خیال بھی رکھتے ہیں مگر بعض مسئلوں میں بُری طرح ناراض بھی ہوتے ہیں اور اکثر بہت نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں، جس کو میں اور میری بیوی والدین کا حق سمجھ کر برداشت بھی کرتے ہیں۔

یوں ہم نے سات سال بڑی مشکل سے اپنے والد کی خوشی کو پورا کرکے گزارے ہیں اور

بہت سے مرحلے ایسے بھی آئے جب میرے والد نے ہم کو گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا، مگر ہم نے اپنی عاقبت خراب ہونے کے ڈر سے معافی تلافی کرکے ان کو منالیا۔

اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ میرے والد بہت ساری باتیں اور ہماری غلطیاں جن کو وہ نظرانداز کرسکتے ہیں یا اس پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرسکتے ہیں، اس پر بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور معاملات کو انتہائی حد تک بگاڑ دیتے ہیں، اور بات بات پر ہم کو نکل جانے کو کہہ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی میری بیوی کو طلاق دِلوانے کی بات بھی کرتے ہیں، جب وہ ہم کو نکالنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی ماں کا آخری دیدار تک نہیں کرنے دُوں گا اگر تم کو گھر سے نکالا، دُوسری طرف میری بیوی جو کہ خود بھی بہت زیادہ اچھے مزاج کی نہیں ہے، مگر میرے سمجھانے پر ساری چیزیں برداشت کرتی ہے، بعض اوقات میرے ماں باپ کی خدمت میں لاپرواہی بھی کرجاتی ہے جس پر میں اسے ٹوکتا ہوں تو سمجھ جاتی ہے۔ زیادہ تر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے، مگر فطرۃً زیادہ خوش مزاج نہیں ہے، میری بہنوں کا حتی الامکان خیال رکھتی ہے، کبھی کبھی معمول کی ناچاقی بھی ہوجاتی ہے، اپنے گھر والوں کی بُرائی سن کر اس کا مزاج خراب ہوجاتا ہے جو کہ میرے والد اکثر ناراضگی کی حالت میں بہت کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری کیفیت ایسی ہے جیسے مجھے کسی نے تلوار سے درمیان سے چیر دیا ہو، یعنی میں اپنے والدین سے بھی بہت محبت کرتا ہوں خاص طور پر اپنی ماں اور بہنوں سے، اور اپنے بیوی بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں، اور اپنے روزگار یعنی دفتری مسائل کے ساتھ ساتھ ان گھریلو مسائل سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کی بھی بہت فکر رہتی ہے کہ اگر میرا گھر خراب ہوا یعنی مجھے اپنی بیوی کو چھوڑنا پڑا اپنے والد کی مرضی کی وجہ سے، تو میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ یا اگر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور گھر والوں یعنی اپنے والد کی ناراضگی مول لینا پڑی تو میرے والدین خاص طور پر والدہ کا خیال کون رکھے گا؟ دُوسرے، اللہ بھی ناراض ہوگا۔

یعنی میں دُنیا اور آخرت دونوں کے کھوجانے کے خوف میں رہتا ہوں، ابھی کچھ دن پہلے بھی اس طرح کا مسئلہ ہوگیا تھا، ہوا یوں تھا کہ میری بیوی اپنی والدہ کے یہاں گئی ہوئی تھی، اس دوران میری والدہ بیت الخلاء میں پھسل گئیں اور مجھے ان کو لے جاکر ٹانکے لگوانا پڑے، کیونکہ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور زخم آیا تھا۔

میری بیوی کو والد صاحب نے دُوسرے دن فون پر بتانے کے لئے کہہ دیا اور کہلوایا کہ تم جتنی

جلدی ہوسکے آجاؤ، میں نے اپنے دفتر سے فون کیا اور اس سے کہا کہ جلدی تو جانا مگر بدحواس مت ہونا، میری بیوی کو گھر پہنچنے میں تاخیر ہوگئی اور والد صاحب حسبِ مزاج بہت برہم ہوئے، اس موقع پر میری بیوی نے بھی کچھ غلط رَدِّعمل کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے، میرے سمجھانے پر میری بیوی نے والد صاحب سے معافی مانگ لی۔

یہاں پر اب میں یہ بتاؤں میری زندگی میں یہ مسئلے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں، اور اب معاملات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک دن یہ خیال آیا کہ میں دبئی جاکر نوکری کرلوں اور بیوی بچوں کو بھی وہاں بلالوں اور والدین کو اکثر وہاں بلالیا کروں، یا میں خود ان سے ملنے آجایا کروں، مگر اس میں بھی والد صاحب کی ناراضگی اور والدہ کی خدمت سے محرومی کا ڈر لگا رہتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کیونکہ کسی بھی فیصلے میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا ڈر رہتا ہے کہ والدین یا بیوی بچوں کے حقوق کے سلسلے میں قیامت کے روز میری پکڑ نہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کے بعد میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسئلے کا قرآن اور سنت کی روشنی میں ممکنہ حل بیان کریں تاکہ میں اپنے دین کی حدود میں رہتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرسکوں اور ذہنی سکون پاسکوں۔

میں اس سلسلے میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اور اللہ پاک سے دُعا کروں گا کہ آپ کو اس کا اجر دے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خوش اُسلوبی کے ساتھ اپنی رہائش علیحدہ کرلیں۔ اور علیحدہ رہ کر والدین کی جتنی خدمت کرسکتے ہوں کریں، آپ کسی وقت اگر ممکن ہو تو اپنے والد صاحب سے نرمی کے ساتھ بات کرلیں کہ مزاجوں کے اختلاف وغیرہ کی وجہ سے ساتھ رہنے میں آپ کی حق تلفیاں ہوجاتی ہیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کوئی ایسی صورت پیدا کرلینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں یہ مسائل پیدا نہ ہوں، اور آپ کی خدمت احسن طریقے سے کرنے کا موقع ملے۔ اگر اس بات چیت کے نتیجے میں کوئی ایسا راستہ پیدا ہوجائے جس سے گھر میں رہتے ہوئے مسائل حل ہوسکیں تو خیر، ورنہ علیحدگی اختیار کرلیں، اس پر بھی اگر والد صاحب ناراض ہوں تو اِن شاء اللہ اس کا گناہ آپ پر نہیں ہوگا، آپ ہر ممکن طریقے سے ان کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کی کوشش ہر حالت میں جاری رکھیں، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر باپ بیوی کو طلاق

دینے کا حکم دے تو اس کی تعمیل شرعاً واجب نہیں ہے، جب تک بیوی واقعۃً طلاق دینے کی لائق نہ ہو۔(۱)

والسلام
۱۴۲۳/۴/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۰/۷۵)

شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا، جائز اَمر میں شوہر کی اطاعت واجب ہے

سوال ۱:- کیا مسلمان عورت خاوند کی بغیر اطلاع یا بغیر اجازت محلے میں قرآن خوانی یا میّت میں یا قریبی رشتہ داروں میں یا مارکیٹ میں کوئی سامان خریدنے جاسکتی ہے، جبکہ وہ دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہو؟

۲:- کیا شریعت نے خاوند کو اس کی منکوحہ مسلمان بیوی پر فوقیت یا افضلیت عطا کی ہے؟ کیا عورت، خاوند کے ہر حکم کی پابند ہے؟ اور کیا رُوگردانی کی صورت میں گناہگار ہوگی؟

جواب ۱:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے خلاف مذکورہ مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کے لئے گھر سے باہر جانا بیوی کے لئے جائز نہیں۔(۲)

۲:- شوہر کی اطاعت بیوی پر واجب ہے،(۳) اِلَّا یہ کہ وہ کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ناجائز ہو تو ایسی صورت میں اس کی مخالفت ضروری ہے،(۴) اور اس لحاظ سے شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل ہے، لقولہ تعالیٰ: "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ"،(۵) ولقولہ تعالیٰ: "وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ"۔(۶)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

---

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ رسالہ "تعدیل حقوق الوالدین" ج:۴ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۴۵ (طبع سعید) فلا تخرج الا لحق لها أو علیها أو لزیارة أبویها کل جمعة مرة أو المحارم کل سنة ولکونها قابلة أو غاسلة لا فیما عدا ذٰلک. وفی الشامیة (قوله فیما عدا ذٰلک) عبارة الفتح، وما عدا ذٰلک من زیارة الأجانب وعیادتهم والولیمة لا یأذن لها ولا تخرج .... الخ.

(۳) وفی مشکٰوة المصابیح باب عشرة النساء ص:۲۸۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لو کنت امرًا أحدًا أن یسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها. رواه الترمذی. وفیه أیضًا ص:۲۸۳ عن أبی هریرةؓ قال: قیل لرسول الله صلی الله علیه وسلم: أی النساء خیر؟ قال: التی تسره اذا نظر وتطیعه اذا أمر ولا تخالفه فی نفسها ولا مالها بما یکره. رواه النسائی والبیهقی فی شعب الایمان. وفی البدائع ومنها وجوب اطاعة الزوج علی الزوجة لقوله تعالٰی: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" .... فیدل علی لزوم طاعتهن الأزواج.

(۴) وفی الصحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث: ۱۸۳۹ ج:۳ ص:۱۴۶۹ (طبع دار احیاء التراث العربی) لا طاعة فی معصیة الله، انما الطاعة فی المعروف. وفی مصنف ابن أبی شیبة رقم الحدیث: ۳۳۷۱۷ ج:۶ ص:۵۴۵ (طبع مکتبة الرشد، ریاض) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

(۵) سورة النساء:۳۴. (۶) سورة البقرة:۲۲۸ (محمد زبیر حق نواز)

گھر میں ٹیلی ویژن لانے کے لئے باپ کو گھر سے نکالنا، عالم کا والد اور بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا

سوال ۱:- کن کن وجوہ سے مسلمان اپنے عزیز و رشتہ دار، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرسکتا ہے؟ اور کن وجوہ سے منع ہے؟

۲:- ایک لڑکا شادی شدہ ہے، صاحبِ ثروت ہے، کراچی میں دو مکان ہیں، ایک کو کرایہ پر دیا ہوا ہے، باپ موجود ہے جس کی عمر ۷۰ سال ہے، بڑھئی کا کام کرتا تھا، باپ کے پاس اس لڑکے کے مکان کے سوا اور کوئی جگہ رہائش نہیں ہے۔ لڑکا کھیل تماشے کا عادی ہے، بیوی ریڈیو پر گانا سنتی رہتی ہے، بیوی نے لڑکے سے شکایت کی، میاں بیوی کی رائے ٹیلی ویژن لانے کی ہوئی تو میاں بیوی نے مشورے سے والد کو تنگ کرنا شروع کیا، آخر باپ تنگ آکر چھوٹی بیٹی کے یہاں چلا گیا، ٹیلی ویژن بھی آگیا اور محلے والوں کو دیکھنے کی دعوت بھی دی جانے لگی، اس طرح کھیل تماشا دیکھنے کے لئے بہانہ بنا کر باپ کو گھر سے نکال دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۳:- ایک شخص نے لڑکے کو علمِ دین کے لئے لگایا، دیوبند خیال کے ہیں، لڑکا دو سال درسِ نظامی حاصل کرتا رہا اور چار سال بعد نیو کراچی میں والد نے مکان بھی خرید دیا اور شادی کردی، یہ مولوی صاحب جب دو سال کے تھے تو والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، باپ نے ہی پرورش کی تھی، لیکن شادی کے بعد مولوی صاحب نے اپنے والد، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرلیا ہے، غیروں سے میل جول ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- اس سوال کے جواب میں بہت تفصیل ہے، کوئی خاص صورت معین کرکے لکھیں تو اس کا حکم بتادیا جائے گا۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں لڑکے کا عمل سراسر خلافِ شرع ہے، گھر میں ٹیلی ویژن رکھنا بذاتِ خود ایک فتنہ ہے، چہ جائیکہ اس کی خاطر باپ کو تنگ کرکے گھر سے نکلنے پر مجبور کرنا، اس میں تو بہت سے گناہ جمع ہوگئے۔[۱]

۳:- صورتِ مسئولہ میں اس لڑکے کا عمل دُرست نہیں، جو صحیح معنی میں عالمِ دین ہو وہ ایسا نہیں کرسکتا، اس کو چاہئے کہ اپنے اس عمل سے توبہ کرکے اپنے والد اور اعزّہ کے حقوق ادا کرے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ

(حاشیہ نمبر۱، ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

غیبت کے چرچوں کی وجہ سے پڑوسیوں کے گھر آمد و رفت سے رُکنا

سوال:- ہر گھر میں آج کل فتنہ اور غیبت کا بہت زور ہے، ہمسایہ وغیرہ کو غیبت کے چرچے سے منع کروں تو عورتیں نہیں رُکتیں، بہرحال فتنہ وغیبت کی وجہ سے بیمار پُرسی اور ماتم پُرسی میں بھی جانا نہیں چاہتی، اگر جاؤں تو غیبت اور دیگر مفاسد میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اگر نہ جاؤں تو پڑوسی ناراض ہوتے ہیں، کیا حکم ہے؟ اور ایسی صورت میں اگر میّت والوں سے یہ کہا جائے کہ میں بہت زیادہ مشغول تھی تو کہیں یہ جھوٹ تو نہیں ہوگا؟

جواب:- حقوقِ شرعیہ مثلاً عیادت وتعزیت میں جانا چاہئے،(۱) البتہ جب یہ اندیشہ ہو کہ غیبت یا کسی اور بُرائی میں مشغول ہوں گی تو اس صورت میں اہلِ میّت سے اپنے آپ کو مشغول کہنے میں جھوٹ بھی اِن شاء اللہ نہ ہوگا، اور نیت اپنی گھریلو مشغولیات یا ذکر اللہ میں مشغول ہونے کی کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۹ ب)

ناجائز اُمور میں باپ کی اطاعت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ یہاں ایک شخص اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے اور مسجد میں جانے اور قرآنِ پاک پڑھنے سے منع کرتا تھا، لوگ اسے کمیونسٹ کہتے، بعض مرزائی کہتے، اس کے پڑوس میں میّت ہوئی وہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہوا، ایک مرزائی کے جنازے میں شریک ہوا اور پوری رسومات میں شریک ہوا، اس کے بعد اس کے بیٹے محمد قاسم نے باپ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا کہ میرا باپ مرزائی ہے، اب محمد قاسم کہتا ہے کہ میرا باپ مرزائی ہے، مجھ کو اس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

جواب:- باپ کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، لہٰذا اگر باپ کسی جائز کام کا حکم دے تو بیٹے کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی خدمت میں

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گزشتہ)...... (۱، ۲) ”وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْآ اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا، اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ“ الاٰیة. (الاسراء:۲۳، ۲۴). ”وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ“ الاٰیة. (الاسراء:۲۶). نیز دیکھئے: جامع الترمذی ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی عقوق الوالدین ج:۲ ص:۱۲ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۱) وفی مشکوٰة المصابیح باب السلام ص:۳۹۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن علیّ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: للمسلم علی المسلم ست بالمعروف یسلم علیه اذا لقیه ویجیبه اذا دعاه ویشمته اذا عطس ویعوده اذا مرض ویتبع جنازته اذا مات ویحب له ما یحب لنفسه. رواه الترمذی والدارمی.

کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر وہ کسی ناجائز کام کا حکم دے یا فرائضِ شرعیہ کی ادائیگی سے روکے تو اس کی اطاعت واجب نہیں، لقوله تعالیٰ: وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" الآیة۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۷۳۹ /۲۷ و)

والدہ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- میری عمر ۳۶ سال ہے، والد صاحب قبلہ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا، اس کے بعد ساری ذمہ داری مجھ پر آئی، ہم تین بھائی بڑے ہیں، پھر دو بہنیں ہیں، میں منجھلا ہوں، جب سے مجھ پر ذمہ داری آئی میں نے اپنی دونوں بہنوں اور بڑے بھائی کی شادی کردی، ان فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میں شادی نہ کرسکا، والدہ ڈھائی تین سال تک رشتے کی تلاش میں رہیں، کہیں لڑکی پسند نہ آئی، کہیں لڑکی والوں نے انکار کردیا، سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرلیا، ایک غریب لڑکی ملی، ہم دونوں ایک دُوسرے سے ملنے لگے، پھر ایک مرتبہ ہم سے غلطی ہوئی اور حمل ہوگیا، ہم نے اسقاط کروادیا، دُوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، میں نے توبہ کی، مگر تعلق میں کمی نہ ہونے کے سبب اور لڑکی کے یہ کہنے کے سبب کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس کی زندگی خراب ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ اس خیال سے ملتا رہا کہ کہیں غلط راہ پر نہ چلی جائے، ہوسکے تو کہیں اس کی شادی کرادوں، اسی دوران ہم سے تیسری غلطی ہوئی اور حمل ٹھہر گیا (اس دوران میں اپنی والدہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا کہ شادی ہوجائے، مگر وہ نہ مانیں، اگر مان جاتیں تو شاید یہ غلطی نہ ہوتی)، تیسری مرتبہ اسقاط کرانے کے حق میں نہ تھا، اگرچہ وہ راضی تھی۔ چنانچہ ایک قاضی صاحب سے بات کی اور باقاعدہ چند دوستوں کے سامنے نکاح کرالیا، دوستوں کو یہی پتہ تھا کہ میرا نکاح ہو رہا ہے، تاریخ میں نے دو ماہ پہلے کی ڈلوائی، اب والدہ، بھائی، بہنوں کو علم ہے کہ کہیں میں نے شادی کرلی ہے، مگر والدہ شدید ناراض ہیں، چونکہ میں ان کے ارمانوں کا مرکز تھا، اب والدہ کہتی ہیں کہ اس لڑکی کو طلاق دے دو، تو میں معاف کردوں گی، دُودھ بھی بخش دوں گی، ورنہ نہیں۔ میں پنج وقتہ نمازی ہوگیا ہوں، اللہ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں، مجھے ماں کی بھی ضرورت ہے، اور اس بدنصیب بیوی کی بھی، لیکن یہ آگ پانی کس طرح ملیں گے، آپ کوئی وظیفہ لکھیں تاکہ دُنیا میں شرمندگی نہ ہو۔

---

(۱) سورۃ لقمٰن: ۱۵. وفی الصحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث: ۱۸۳۹ ج:۳ ص: ۱۴۶۹ (طبع دار احیاء التراث العربی) لا طاعة فی معصیة الله، انما الطاعة فی المعروف .... الخ. وفی مصنف ابن أبی شیبة رقم الحدیث: ۳۳۷۱۷ ج:٦ ص: ۵۴۵ (طبع مکتبة الرشد، ریاض) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

جواب:- آپ سے اور آپ کی بیوی سے جو گناہ سرزد ہوئے ان پر صدقِ دِل سے توبہ اِستغفار کیجئے، اور اپنی زندگی کو اَحکامِ الٰہی کے مطابق بنانے کی فکر میں لگ جائیں، اِن شاء اللہ سچی توبہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ یہ گناہ معاف کردے گا۔ اب اگر آپ اپنی بیوی سے مطمئن ہیں اور کوئی وجہ طلاق دینے کی نہیں پاتے تو آپ پر اس معاملے میں والدہ کے حکم کی تعمیل واجب نہیں،[1] البتہ والدہ کو راضی کرنے کے لئے انہیں اصل حقیقت مناسب طریقے پر بتادیجئے۔ نیز قرآن وحدیث کے وہ اَحکام دِکھایئے جس میں تصریح ہے کہ سچی توبہ سے ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ راضی ہوجائیں فبہا، ورنہ آپ پر اس معاملے میں ان کی تعمیل واجب نہیں،[2] انہیں دُوسرے طریقوں سے خوش کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی بیوی کو بھی ہدایت کیجئے کہ وہ ان کی خدمت سے ان کی رضامندی حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۲/۲۸ ج)

مرزائیوں سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں سے تعلق کا حکم

سوال:- زید کا قریبی رشتہ دار بکر مرزائی ہے، زید کا شرعی قانون کے مطابق بکر کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہیں ہوسکتا، مگر زید کے رشتہ دار ایسے آدمیوں کے گھر خوشی غمی میں جاتے ہیں جہاں بکر کی آمد و رفت ہے، ایسے آدمیوں سے مراد بھی رشتہ دار ہی ہیں کہ جن سے برادری کے تعلقات ہیں، مگر یہ لوگ باوجود مسلمان ہونے کے بکر وغیرہ سے میل جول رکھتے ہیں اب جو اُن تعلق داروں کے گھر، معاملات وغیرہ میں شریک ہو اور بکر کی آمد و رفت وہاں ہو تو کیا شرعاً ایسے گھر جانا جائز ہے؟ جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے ہاں مرزائی کا آنا جانا ہو یا ان کی برادری کے گھر مرزائی کا آنا جانا ہو، ان سے تعلق کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کے لئے اپنے مسلمان رشتہ داروں کے یہاں آنے جانے کی گنجائش ہے، البتہ اسے چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان رشتہ داروں کو مرزائیوں سے قریبی تعلقات رکھنے سے حکمت کے ساتھ روکتا رہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۷۹۲/۲۹ ب)

(۱،۲) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا رسالہ ’’تعدیل حقوق الوالدین‘‘ امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۴۸۰ تا ۴۸۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) وفی تکملة فتح الملهم ج:۵ ص:۳۵۶ قال ابن عبدالبر .... أجمع العلماء علىٰ أن من خاف من مكالمة أحد وصلته ما يفسد عليه دينه أو يدخل مضرة فى دنياه يجوز له مجانبته وبعده ورب صرم جميل خير من مخالطة تؤذيه .... الخ.

اُستاذ کو گالی دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ کوئی شاگرد اُستاذ کو گالیاں دیدے تو اس کا کیا حکم ہے؟ عاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کو گالیاں دینا حرام ہے، سباب المسلم فسوق، الحدیث[1]۔ خاص طور پر اُستاذ کو گالی دینا بڑا گناہ ہے، حدیث میں علماء کی تعظیم کا ذکر ہے، اور جو علماء کی توہین کرے گا فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۴/ ۱۸ الف)

والدین اور اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

سوال:- والدین یا اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- والدین، اُستاذ، اہلِ علم یا دُوسرے قابلِ تعظیم افراد کے لئے کھڑا ہونا بغرضِ تعظیم جائز ہے بلکہ فقہاء نے اسے مستحب لکھا ہے، درمختار میں ہے: وفی الوهبانية يجوز بل يندب القيام تعظيمًا للقادم كما يجوز القيام ولو للقارئ بين يدى العالم وقال الشامیؒ تحته أى ان كان ممن يستحق التعظيم قال فى القنية قيام الجالس فى المسجد لمن دخل عليه تعظيمًا وقيام قارئ القرآن لمن يجئ تعظيمًا لا يكره اذا كان ممن يستحق التعظيم. (شامی ج:۵ ص:۲۴۶ کتاب الحظر والاباحة قبيل فصل البيع)[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/ ۲۷ و)

والدین کے کہنے پر بلاعذرِ شرعی، بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- عام طور پر مشہور ہے کہ صرف والدین کے کہنے پر بلاعذرِ شرعی بھی بیوی کو طلاق دے دینی چاہئے، کیا یہ دُرست ہے؟ گھر میں جھگڑے کی وجہ سے اگر والدین اس پر مجبور کریں تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) وفى صحيح البخارى باب ما ينهى عن السباب واللعن ج:۲ ص:۸۹۳ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. وفيه أيضًا ان النبى صلى الله عليه وسلم يقول: لا يرمى رجل رجلًا بالفسوق ولا يرميه بالكفر الا ارتدت عليه ان لم يكن صاحبه كذٰلك.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۳۸۴ (طبع سعيد) وفى صحيح البخارى ج:۲ ص:۹۲۶ باب قول النبى صلى الله عليه وسلم "قوموا إلٰى سيّدكم" عن أبى سعيد أن أهل قريظة نزلوا علٰى حكم سعد فأرسل النبى صلى الله عليه وسلم اليه، فجاد، فقال: قوموا إلٰى سيّدكم .... الخ. وفى حاشية البخارى وفيه استحباب القيام عند دخول الأفضل وهو غير القيام المنهى، لأن ذٰلك بمعنى الوقوف وهٰذا بمعنى النهوض .... الخ.

جواب:- اگر شوہر طلاق دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں سمجھتا تو اسے اپنے والدین کو نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہئے کہ طلاق بالکل آخری قدم ہے جسے بغیر شدید مجبوری کے اختیار نہ کرنا چاہئے، حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ: "أبغض المباح الی اللہ الطّلاق"،[1] یعنی مباحات میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، اُمید ہے کہ نرمی اور حکمت سے فہمائش کی جائے گی تو والدین سمجھ جائیں گے، اور اگر پھر بھی وہ نہ سمجھیں تو طلاق نہ دے،[2] اور راضی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

والله اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۴/۱۸ الف)

بھائی بہنوں سے بیوی کی ملاقات پر پابندی لگانے کا حکم

سوال:- کیا کسی مسلمان شوہر کو اسلامی شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی ذاتی وجوہات رنجش، عداوت، غرور و تکبر کی وجہ سے اس کے بھائیوں بہنوں سے ملاقات کرنے پر پابندی لگائے؟

جواب:- بھائیوں کے بیوی سے ملنے پر بلاوجہ پابندی لگانا شوہر کے لئے مناسب نہیں ہے، البتہ کوئی معقول وجہ ہو، مثلاً ان سے ملنے سے فساد کا اندیشہ ہو، تو بات دُوسری ہے۔ والله اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۳۹)

■■■

(۱) سنن أبی داؤد ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۴۸۰ تا ۴۸۵، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۵۳۔

(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)

قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی بناء پر یزید کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- عن خالد بن معدان ان عمير بن الأسود العنسى حدثه أنه أتى عبادة بن الصامت وهو نازل فى ساحل حمص وهو فى بناء له ومعه أم حرام قال عمير فحدثتنا أم حرام أنها سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول: أوّل جيش من أمتى يغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله! أنا فيهم؟ قال: أنت فيهم، قالت: ثم قال: أوّل جيش من أمتى يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله؟ قال: لا.

قسطلانی شارحِ بخاری نے لکھا ہے کہ: كان أوّل من غزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو وابن عباس وابن الزبير وأبى الأنصارى وتوفى بها أبو أيوب سنة اثنين وخمسين من الهجرة۔ علامہ ابنِ حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: قال المهلب فى هٰذا الحديث منقبة لمعاويةؓ لأنه أوّل من غزا البحر ومنقبة لولده لأنه أوّل من غزا مدينة قيصر۔ اس پرچہ میں یزید کے متعلق احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہے جیسا کہ بخاری کا حوالہ دیا گیا، حقیقت سے آگاہ کریں۔

جواب:- جو حدیث منسلکہ پرچہ میں نقل کی گئی ہے وہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے، پھر علماء نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس لشکر سے کون سا لشکر مراد ہے؟ جہاں تک پہلے سمندری جہاد کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں انجام پایا، البتہ قسطنطنیہ پر پہلی بار حملہ آور ہونے والا لشکر کون سا تھا؟ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سفیان بن عوفؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، جس میں حضرت ابنِ عباسؓ، ابنِ زبیرؓ اور ابوایوب انصاریؓ موجود تھے، اور اسی میں حضرت ابوایوبؓ کی وفات ہوئی، علامہ عینیؒ نے اس قول کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، قلت الا ظهر ان هؤلاء السادات من الصحابة كانوا مع سفيان هٰذا ولم يكونوا مع يزيد بن معاوية لأنه لم يكن اهلًا أن يكون هؤلاء السادات فى خدمته۔ یہ زیادہ ظاہر ہے کہ یہ اکابر صحابہ سفیانؓ کے ساتھ ہوں گے، یزید

بن معاویہ کے ساتھ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا اہل نہ تھا کہ یہ حضرات صحابہؓ اس کی خدمت میں رہیں۔
(عمدۃ القاری ج:۱۴ ص:۱۹۸، ۱۹۹ ادارۃ الطباعۃ المنیرۃ، وکذا فی طبع دار الفکر)۔

لیکن تاریخی طور پر یہ قول زیادہ مشہور ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں ہوا ہے، اس سے بعض علماء نے یزید بن معاویہ کی فضیلت اخذ کی ہے، لیکن حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ اور دُوسرے علمائے محققین نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ حدیثِ مذکور میں ایک عام حکم دیا گیا ہے کسی فرد کی تخصیص نہیں، لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دُوسرے اسباب کی بناء پر اس عام حکم سے خارج ہو، (فتح الباری ج:۶ ص:۸۷) گویا یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: "من قال لا اِلٰہ اِلَّا اللہ دخل الجنۃ" جو شخص لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہنے کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو، لیکن اگر دُوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے یا بعد میں مرتد ہوجائے تو وہ اس عام حکم سے خارج ہوجائے گا، صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد قسطنطنیہ کے جہاد کی ترغیب دینا اور اس جہاد میں شرکت کی فضیلت کا اظہار ہے، جس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرنا بھی غلط ہے۔

لیکن اس فضیلت کی بناء پر اس کے دُوسرے ناجائز افعال کا جواز تلاش نہیں کیا جاسکتا، یزید بن معاویہ نے اگر اس جہاد میں شرکت یا اس کی سربراہی کی تو بلاشبہ اس کا یہ عمل نیک اور باعثِ اَجر ہے، لیکن اس نیک عمل سے ان ناجائز افعال کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا جو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں انجام دیئے ہوں، چنانچہ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک اس کے بارے میں یہی ہے کہ وہ مسلمان تھا، اسی لئے محقق علماء نے اس پر لعنت کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ قیامت میں اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے عہد میں بلاشبہ بعض ناجائز افعال کئے، ان افعال کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اس کے بعد معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ چاہے تو مغفرت کردے اور چاہے تو سزا دے، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے دُنیا میں اس کے مغفور لہٗ یا معذّب ہونے کا فیصلہ کرسکیں۔ یزید کے بارے میں اہلِ سنت کے مسلک کی بہترین ترجمانی علامہ ابنِ تیمیہؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون أنہ من الصحابۃ أو من الخلفاء الراشدین المھدیین أو من الأنبیاء وھٰذا کلہ باطل، وقوم یعتقدون أنہ کافر منافق فی الباطن .... وکلا القولین باطل یعلم بطلانہ کل عاقل، فان الرجل ملک من ملوک المسلمین وخلیفۃ من الخلفاء الملوک لا ھٰذا ولا ھٰذا. (منھاج السنۃ علامۃ ابن تیمیۃؒ ج:۲ ص:۳۲۱ طبع مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ریاض)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید کو خلفائے راشدین مہدیین میں سے

سمجھنا بھی غلط ہے، اور اسے کافر، منافق قرار دینا بھی صحیح نہیں، اہلِ حق کا مسلک اس افراط وتفریط کے درمیان ہے، اس اعتدال پر قائم رہنا چاہئے اور اس قسم کی فضول بحثوں میں نزاع وجدال یا ان میں اپنی عمر کے اوقات صَرف کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۰/۱/۱۳۹۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۴۳/۲۲ الف)

قبیلۂ ”جون“ کی عورت اُمیمہ بنت شراحبیل سے متعلق شیعوں کا من گھڑت قصہ

سوال:- یہ واقعہ بخاری میں موجود ہے یا نہیں؟ شیعوں کی کتاب سے نقل کردہ یہ واقعہ عدالت میں پیش کرنا ہے۔ میرے سامنے جو کتاب ہے اس کے ص:۶۷ پر یہ واقعہ یوں نقل کیا گیا ہے اور میں اس کو حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔ ”ایک جونیہ عورت کو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) کسی تدبیر سے اس کے گھر سے منگا بھیجا اور شہر کے باہر جا کر درختوں کے پتوں کی آڑ کر کے اس سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہا، اس پر وہ چیخنے اور دُعائیں دینے لگی، جب کسی طرح راضی نہیں ہوئی معاملہ طول کھینچ گیا، پکڑ دھکڑ کا خوف ہوا، راز فاش ہوجانے کی گھڑی پہنچ گئی، انتہائی درجے کی رُسوائی کا اندیشہ ہوگیا، اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بالکل مایوس ہوگئے تو اس کو کچھ دے دِلا کر واپس کر دیا۔“

یہ نہایت درجہ رُسوا کرنے والا واقعہ بھی اس صحیح بخاری کی جلد نمبر۶ ص:۱۶۲ میں موجود ہے۔ اس کو بھی پڑھ کر آج کی دُنیا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت وشرافت کی کتنی دھجیاں اُڑاتی ہوں گی؟

جواب:- آپ کا خط ملا، شیعوں کی جس کتاب سے آپ نے عبارت نقل کی ہے، وہ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق غلط طور پر گھڑ کر بیان کی ہے، اصل واقعہ جو صحیح بخاری میں مروی ہے اس کا خلاصہ دُوسری روایات کی روشنی میں یہ ہے کہ قبیلۂ جون کا ایک سردار مسلمان ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے ذکر کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خاتون اُمیمہ بنت شراحبیل بیوہ ہوگئی ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ نکاح کی رغبت ظاہر کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد نکاح کی رضامندی فرمادی اور نکاح کر بھی لیا اور ان کے وطن سے مدینہ طیبہ بلوالیا، جو صاحب ان کو لے کر آئے تھے انہوں نے ان کو بنوساعدہ کی ایک حویلی میں ٹھہرایا اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی، آپ وہاں تشریف لے گئے اور منکوحہ ہونے کی حیثیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، اور جب ان سے کوئی بات شروع کی تو انہوں نے یہ کلمہ کہا: ”میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ: تم نے ایک ایسی ذات کی پناہ مانگی ہے جو پناہ مانگنے کے لائق ہے، چنانچہ آپ نے اس کے بعد اسے طلاق دے دی اور ان کو جوڑے دے کر واپس ان کے گھر بھجوانے کا حکم دے دیا۔

واقعہ کا یہ خلاصہ صحیح بخاری کتاب الأشربة حدیث نمبر ۵۶۳۴، صحیح مسلم کتاب الأشربة، باب اباحة النبیذ، اور طبقات ابنِ سعد ج:۸ ص:۱۴۳ سے ماخوذ ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ اس خاتون نے پناہ کیوں مانگی؟ اس کے بارے میں بعض ضعیف روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ازواجِ مطہراتؓ نے ان کو یہ سکھادیا تھا کہ ”اعوذ باللہ منک“ کا کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے، اور مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ کلمہ سن کر ان کو طلاق دے دیں۔ لیکن یہ روایات واقدی اور ہشام بن الکلبی کی روایتیں ہیں، جو طبقات ابنِ سعد میں ان کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں، اور یہ دونوں ناقابلِ اعتبار راوی ہیں، جو اپنے جھوٹ اور اپنے رفض میں مشہور ہیں، لہٰذا اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اُمہات المؤمنینؓ سے یہ توقع ہوسکتی ہے۔

احقر نے تمام متعلقہ روایات کو سامنے رکھنے کے بعد تکملة فتح الملهم[2] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ خاتون دماغی اعتبار سے نارمل نہیں تھیں، ان کے کچھ اور جملے بھی صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہیں، جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے واقعہ کی مختصر حقیقت اس کو مذکورہ کتاب کی عبارت سے ملا کر دیکھ لیجئے کہ دونوں میں کتنا تضاد ہے؟ جس کو تحریف اور بددیانتی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

والسلام
۱۴۱۰/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴/۴۱ الف)

بعض تاریخی روایات کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کے حق میں بدگمانی کرنا

سوال:- کیا کوئی ان الفاظ سے صحابہ کرامؓ کی توہین کا کوئی پہلو نقل کرسکتا ہے؟

۱:- عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کو کہا: اب میں ایک ایسی چال چلوں گا یا تو جنگ ختم ہوجائے گی یا حضرت علی کی فوج میں نفاق پڑجائے گا، اس نے اپنی فوج کے متعدّد نیزوں پر قرآن بند چڑھوادیئے۔

---

(۱) صحیح بخاری ج:۲ ص:۸۴۲. صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۶۸، ۱۶۹. وطبقات ابن سعد ج:۸ ص:۱۴۳، ۱۴۴.
(۲) کتاب الأشربة ج:۳ ص:۶۵۰.

۲:- حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ نے ایک گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو اپنے منصب سے معزول کریں، عمرو بن العاص نے فریب کیا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو منبر پر فیصلے کے لئے کھڑا کردیا، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اعلان کیا کہ ہم دونوں کو معزول کرتے ہیں، بعد میں حضرت عمرو بن العاص نے حضرت علی کی معزولی کا اعلان کیا اور حضرت معاویہ کی معزولی کی نفی کی، ابوموسیٰ اشعری اس کے بیان پر ششدر رہ گئے اور فرمایا کہ یہ اعلان صریح غداری اور بے ایمانی ہے۔

۳:- امیر معاویہ نے زبردستی سے یزید کے لئے بیعت لی تھی، لیکن امام حسین متفق نہ ہوئے، خلفائے راشدین کا تو یہ حال تھا کہ خلافت کا معاملہ رائے شماری پر چھوڑتے تھے مگر امیر معاویہ نے قیصر وکسریٰ کی سنت کے مطابق بادشاہت کا سلسلہ جاری کردیا۔

جواب:- عباراتِ مذکورہ میں صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے مشاجراتِ صحابہ کے بیان میں تاریخی روایات اس قدر مختلف، بسااوقات متضاد ہیں کہ ان سے صحیح واقعات کا پتہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہے، لہٰذا ان کی بنیاد پر صحابہؓ کے حق میں بدگمانی کرنا، دانش مندی کے خلاف ہے، ان کا معاملہ انہی پر چھوڑا جائے اور ان کی حرمت وعظمت دِل میں رکھنی چاہئے: "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔[1]

فقط واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۱/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۵/۱۸ الف)

حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کس تاریخ میں ہوا؟ اور مہر کتنا مقرّر ہوا تھا؟

جواب:- حضرت فاطمہؓ کا نکاح رمضان سنہ۲ھ میں ہوا، اور چار سو مثقال چاندی مہر مقرّر کیا گیا، تاریخِ نکاح کے بارے میں رجب سنہ۲ھ کا بھی ایک قول ہے۔ (اصابہ[2]، واستیعاب[3])۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۳/۴/۲۷ھ

---

(۱) سورة البقرة: ۱۳۴ و ۱۴۱۔ (۲) ج:۴ ص:۳۶۶ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر).

(۳) ج:۴ ص:۱۸۹۳، ۱۸۹۴ (طبع دار الجیل بیروت).

جواب صحیح ہے، چار سو مثقال چاندی ہمارے مروّجہ وزن کے اعتبار سے ڈیڑھ سو تولہ تقریباً ہوتے ہیں۔ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کرنے پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی کمیشن مقرّر تھا؟

سوال:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کے لئے جاتے تو ابتداء میں آپ کے لئے کوئی کمیشن مقرّر ہوتا تھا یا نہیں؟

جواب:- علامہ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جن لوگوں کو اپنے مال کی تجارت کے لئے روانہ کرتی تھیں ان سے مضاربت کا معاملہ کرتی تھیں، یعنی منافع میں سے ایک مناسب حصہ ان کو دیا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے عام لوگوں سے دُگنا حصہ مقرّر کیا تھا، وأنا أعطيك ضعف ما أعطي رجلا من قومك .... وكانت تستأجر الرجال وتدفع اليهم المال مضاربة (از زرقانی شرح المواہب ج:۱ ص:۱۹۸)۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۹/۱۸ الف)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کتاب ''شہیدِ کربلا'' اور بعض اکابر کی عبارات کا جواب

سوال:- گزارش یہ ہے کہ آپ کی تصنیف کردہ کتاب ''حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق'' کو پڑھ کر بے حد مسرّت ہوئی۔ کافی لوگ جنھوں نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا تھا حضرت معاویہؓ کو طعن وتشنیع کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی کتاب پڑھ کر کافی حد تک ان کے شبہات کا ازالہ ہوگیا ہے۔ مگر آپ کے والد ماجد مفتیٔ اعظمؒ کی کتاب ''کربلا'' کے صفحہ گیارہ سے لے کر بیس تک کے مطالعے سے مخالفین کے شبہات کو تقویت پہنچتی ہے جو حضرت معاویہؓ کو بغض وعناد سے دیکھتے ہیں۔ ''کربلا'' میں مفتی صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ جب امیر معاویہؓ پر پہنچتا ہے تو حکومت میں خلافتِ راشدہ کا وہ رنگ نہیں رہتا جو خلفائے راشدینؓ کی حکومتوں کو حاصل تھا۔ (ص:۱۱)

جنابِ من! اگر یہ بات مان ہی لی جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ میں

(۱) (طبع دار المعرفة بيروت).

شمار نہ کیا جائے تاہم معاویہؓ کے بعد جو اُمراء اور سلاطین ہوئے ہیں، خود عمر بن عبدالعزیزؒ بھی۔ ان سب سے معاویہؓ کا دور بہتر اور افضل ہے، یہ اقرار اور اعتراف خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی کر رہے ہیں، جس کو آپ کا بھی مؤید کہتے ہیں۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت پر کسی قلم کار نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی حکومت خلافتِ راشدہ کے رنگ کی نہ تھی، بلکہ کچھ نے تو انہیں خلیفۂ راشد ہی مانا ہے، اس کے علاوہ اہلِ سنت کی کتابوں کو دیکھ کر شبہات کچھ پکے ہونے لگتے ہیں۔

ا:- ہدایہ جلد ثالث میں ہے کہ سلطان جائر کی تقلید جائز ہے، جیسا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ۔

۲:- ''مؤمن کے ماہ و سال'' مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص:۳۵ میں ہے: ''اسی سال سنہ ۴۳ھ میں امیر معاویہؓ نے زیاد بن اُمیہ کو اپنا نائب بنایا اور یہی وہ پہلا عمل ہے جس کے ذریعے اَحکامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی گئی، (ثعالبی وغیرہ)۔'' خلافت و ملوکیت کے صفحہ:۱۷۴ میں نظر ڈالیں تو اس نے بھی یہی لکھا ہے کہ معاویہؓ نے کتاب اللہ وسنتِ رسول کی خلاف ورزی کی، برائے کرم آپ صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں۔

جواب:- آپ کا خط ملا، احقر نے اپنی کتاب ''حضرت معاویہؓ'' میں ایک مستقل باب اسی موضوع پر لکھا ہے کہ علمائے اہلِ سنت کے نزدیک حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اسے ملاحظہ فرمالیں، خلاصہ اس کا بھی یہی ہے کہ آپؓ کے عہد کو خلافتِ راشدہ کے برابر تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن آپؓ ایک امامِ عادل تھے۔ لہٰذا اگر حضرت والد صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ آپؓ کے عہد میں خلافتِ راشدہ کا مثالی رنگ باقی نہیں رہا تھا، تو اس میں علمائے اہلِ سنت کے موقف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور اس کا مقابلہ ''خلافت وملوکیت'' کی ان عبارتوں سے نہیں کیا جاسکتا جن پر احقر نے تنقید کی ہے۔

جہاں تک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کا تعلق ہے، اس کو خلافتِ راشدہ قرار دینے پر اتفاق نہیں ہے، اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے صحابیت کی بناء پر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں، لیکن اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ حکومت کو بحیثیت مجموعی کوئی شخص بہتر کہے تو اس سے مُسلَّم اُصول بظاہر متأثر نہیں ہوتا۔

جہاں تک صاحبِ ہدایہ کی عبارت کا تعلق ہے! اس میں سلطانِ جائر ایک فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، فقہ میں جو شخص امامِ برحق کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہو خواہ وہ کتنا متقی ہو اور اپنے اجتہاد سے ایسا کر رہا ہو اس کو اصطلاحاً ''سلطانِ جائر'' ہی کہتے ہیں، لیکن صاحبِ ہدایہ نے احتیاط

فرمائی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو آپ نے سلطانِ جائر نہیں کہا،[1] بلکہ یہ کہا ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے ان سے قضاء کو قبول کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامِ برحق کے مدِ مقابل (جسے اصطلاحاً سلطانِ جائر کہتے ہیں) کی تقلید جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جو عبارت[2] آپ نے نقل فرمائی ہے، وہ درحقیقت بعض ضعیف تاریخی روایات پر مبنی ہے، اور احقر یہ واضح کر چکا ہے کہ وہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں، حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ نے ضمنی طور پر انہیں ذکر کر دیا ہے، شاید تحقیق کا موقع نہ ملا ہو، اور حضرت معاویہؓ کا عذر اگر ان کے سامنے آتا تو شاید ان کی رائے بھی مختلف ہوتی، اس کے ساتھ ہی ان کی عبارت اور خلافت وملوکیت کی عبارت کا موازنہ کر کے دیکھ لیجئے کہ کون سی عبارت توہین آمیز ہے؟ اور اُصولی طور پر یہ بات بھی احقر لکھ چکا ہے کہ ایک صحابیؓ پر کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ بعد کے کسی عالم کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان سے تسامح ہوا ہے۔

والسلام
۱۴۰۸/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸۳/۳۹ ز)

حضرت عباسؓ کی اولاد سادات میں شامل ہے

سوال:- ایک آدمی کہتا ہے کہ سیّدزادیاں اُمتوں پر جائز ہیں، اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ عباسی بھی سیّد ہو سکتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں، آپ بیان فرمادیں۔

جواب:- سوال کا خط کشیدہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا، واضح کر کے لکھیں، اور سادات تمام بنوہاشم ہیں، لہٰذا حضرت عباسؓ کی اولاد بھی سادات میں شامل ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳/۱۸ الف)

---

(۱) ھدایة ثالث، کتاب أدب القاضی ص:۱۳۳ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان).

(۲) دیکھئے: ''مؤمن کے ماہ وسال'' ص:۳۰ (طبع دارالاشاعت)۔

(۳) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۰ (قوله ولا الی بنو هاشم) اعلم أن عبدمناف وهو الأب الرابع للنبی صلی الله علیه وسلم أعقب أربعة وهم: هاشم، والمطلب، ونوفل، وعبدشمس، ثم هاشم أعقب أربعة انقطع نسل الکل الا عبدالمطلب فانه أعقب اثنی عشر، تصرف الزکاة الی أولاد کل اذا کانوا مسلمین فقراء الا أولاد عباس وحارث وأولاد أبی طالب من علی وجعفر وعقیل .... الخ.

یزید کے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ

سوال:- قوم کو اس وقت ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کی طرف فکر کی ضرورت ہے، لیکن کچھ لوگوں نے بخاری شریف کی حدیث سے غلط استدلال کر کے یزید جیسے فاسق و فاجر کو جنتی ہونا ثابت کیا ہے، براہِ کرم آپ اس حدیث کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:- ہر شخص کو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی فکر کرنی چاہئے، یزید کے صالح یا فاسق ہونے کی تحقیق شرعاً کچھ ضروری نہیں، اور نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہوگا، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ: "تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه"۔[2] لہٰذا ان فضول بحثوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶/۲۹ الف)

یزید کے نام کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنا

سوال:- ایک کتاب بنام رشید بن رشید مصنفہ ابو یزید محمد دین بٹ نظر سے گزری، جس میں یزید کو "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا ہے، کتابِ مذکور میں بہت سے علمائے دیوبند کی رائے بھی درج ہے، گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- یزید کو کافر کہنا دُرست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" یا "رضی اللہ عنہ" لگانا ان کلمات کی بے ادبی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے، یہ اُمتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اس سے زائد فضول و لایعنی بحثوں میں پڑنا کسی طرح دُرست نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸۹/۱۹ الف)

کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوگیا تھا؟

سوال:- کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس عورت کا عقدِ نکاح ہوگیا تھا جس نے

---

(۱) سورة البقرة: ۱۳۴ و ۱۴۱۔

(۲) جامع الترمذی أبواب الزهد ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه ملتان).

بُرے ارادے سے مکان کے دروازے بند کردیئے تھے؟

جواب:- بعض تاریخی روایات میں ایسا آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہوگیا تھا،(۱) لیکن قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۸/۲/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

کیا یزید بن معاویہؓ پر لعنت بھیجنا ثواب ہے؟

سوال:- یزید بن معاویہؓ پر ہر روز ایک سو بار لعنت بھیجنا کیا کارِثواب عمل ہے؟

جواب:- ہرگز نہیں،(۲) یزید کے بارے میں یہ عقیدہ کافی ہے کہ اس نے حضرت حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غلط تھا، لیکن اس پر لعنت بھیجنا اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۸/۲/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

پاک رحموں اور پاک صلبوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مطلب

سوال:- نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ میری پیدائش پاک رحموں اور پاک صلبوں سے ہے، حضرت عبداللہ والد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منی رحم مائی آمنہ میں آنا کیسا ہے؟ اگر بذریعہ منی ہے تو کیا حضرت عبداللہ کی منی پاک تھی؟ اگر پاک تھی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منی کے متعلق اَحکامِ غسل دھونا آیا ہے، اگر پلید تھی تو حدیث پر حرف آتا ہے؟

جواب:- پاک رحموں اور پاک صلبوں سے مراد صحیح النسب ہونا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء و اجداد صحیح النسب تھے، اس کا مطلب منی کی طہارت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۶/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے

سوال:- بندۂ ناچیز نے مولوی محمد عمر صاحب کی ایک کتاب پڑھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ

(۱) دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۷۹۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ "تحقیق لعنِ یزید" ج:۵ ص:۴۲۵۔

حضرت شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ کو بڑے بڑے محدثین معاذ اللہ کافر کہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر بندۂ ناچیز کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ جمہور علماء کی کیا رائے ہے؟ یا کوئی کتاب بتائیں جس میں مولوی عمر کو مکمل جواب دیا ہو، بندہ آپ کے جواب کا منتظر رہے گا۔

جواب:- شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ بڑے عالم گزرے ہیں، البتہ انہوں نے بعض مسائل میں جمہور فقہاء و محدثین اور علمائے اُمت سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور اُمت نے ان کے تفردات کو قابلِ عمل نہیں سمجھا، اور اس بناء پر بعض حضرات نے ان کی تردید میں کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کے مفصل حالات علامہ ابوزہرہ کی کتاب ''ابن تیمیہ'' میں مل سکتے ہیں، جس کا اُردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۶۲/۳۰ د)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال ۱:- ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا کیا حکم ہے؟

۲:- سنا ہے ''تقریرِ دِل پذیر'' شائع فرمارہے ہیں، مجھے ضرورت ہے۔

جواب ۱:- اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے، اکثر حنفی علماء اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضلات پاک تھے، مُلّا علی قاریؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: **صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال أبو حنيفة كما نقله فى المواهب اللدنية عن شرح البخارى للعينى وصرح به البيرى فى شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر تظافرت الأدلة علىٰ ذٰلک، وعد الأئمة ذٰلک من خصائصه صلى الله عليه وسلم ونقل بعضهم عن شرح المشكوة لمُلّا على قارى أنه قال: اختاره كثير من أصحابنا، وأطال فى تحقيقه فى شرحه على الشمائل فى باب ما جاء فى تعطره عليه الصلوٰة والسلام۔** (شامی باب الانجاس ج:۱ ص:۲۱۲)۔[۱]

۲:- غالباً دار الاشاعت مقابل مولوی مسافرخانہ بندر روڈ کراچی یہ کتاب شائع کررہا ہے، آپ ان سے خط لکھ کر معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۳/۲۶ھ

---

(۱) رد المحتار مطلب فى طهارة بوله صلى الله عليه وسلم ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعيد).
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۸۰ تا ۸۲۔

کتاب الطهارة
(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء والغسل والتیمّم﴾

(وضو، غسل اور تیمّم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

جنازے کے لئے کئے گئے وضو سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتے ہیں

سوال:- کیا جنازے کی نماز کے لئے کیا گیا وضو فرائضِ پنج گانہ کے لئے بھی کافی ہے؟ یعنی اس سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ظاہر ہے کہ وضو ایک طہارتِ مطلقہ ہے، جب وہ مکمل ہوجائے تو ہر عبادت جو طہارت کے ساتھ مشروط ہو اس سے ادا ہوسکتی ہے،[۱] ہر عمل کے لئے جداگانہ نیت وضو کے ساتھ کرنا کسی کے نزدیک شرط نہیں، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ[۲]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غسل خانے میں بات کرنے کا حکم

سوال:- غسل خانہ اور پائے خانہ میں بات کرنے کو عوام ناجائز سمجھتے ہیں، سو شرعاً اس کی کوئی اصل ہے؟

جواب:- قال ابن عابدینؒ عبارة الغزنوية ولا يتكلم فيه أى فى الخلاء، وفى الضياء عن بستان أبى الليث يكره الكلام فى الخلاء، وظاهره أنه لا يختص بحال قضاء الحاجة وذكر بعض الشافعية أنه المعتمد عندهم، وزاد فى الامداد: ولا يتنحنح أى الا بعذر كما اذا خاف دخول أحد عليه. (رد المحتار ج:۱ ص:۳۱۸)[۳]۔

---

(۱) وفى الهندية ج:۱ ص:۲۶ (طبع مكتبه ماجديه كوئٹه) تيمم لصلوٰة الجنازة أو لسجدة التلاوة أجزاه أن يصلى المكتوبة بلا خلاف. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۷، وکفایت المفتی ج:۲ ص:۳۱۷ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) فتاویٰ شامية "تنبيه" ج:۱ ص:۳۴۴ (طبع ایچ ایم سعید)

عبارتِ مرقومہ سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء میں نہ صرف یہ کہ بوقتِ قضاءِ حاجت بات کرنا مکروہ ہے، بلکہ دُوسرے حالات میں بھی بولنا دُرست نہیں، مثلاً کوئی شخص اگر بیت الخلاء میں وضو کر رہا ہو تو تسمیہ اور دُوسری دُعائیں پڑھنا بھی دُرست نہیں، کما قال الشامیؒ، اسی طرح بے ضرورت کھانسنا بھی مکروہ ہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۴ھ (۱)

دانت میں چاندی بھری ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا حکم

سوال:- دانتوں میں کیڑا لگ جانے کی وجہ سے اور کوئی علاج مستقل مفید نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نے علاجاً چاندی بھر دی ہے، اس صورت میں وضو میں کوئی نقص تو نہیں رہے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وضو میں تو کوئی اِشکال ہی نہیں، غسل میں اِشکال ہوسکتا تھا لیکن فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مواضعِ ضرورت میں نیچے تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔

چنانچہ درمختار میں ہے:-

ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین أسنانه أو فی سنه المجوف به یفتی. وقیل: ان صلبًا منع وهو الأصح، وقال الشامی: قوله وهو الأصح صرح به فی شرح المنیة وقال: لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج. (شامی ج:۱ ص:۱۵۴ مبحث الغسل، طبع ایچ ایم سعید).

وقد تقرر فی موضعه أنه مفاهیم الکتب حجة، فدل علٰی أنه لا یمنع عدم نفوذ الماء فی مواقع الضرورة، وقد صرح به امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۸.

اور عالمگیریہ میں ہے: **قال محمدؒ فی الجامع الصغیر: ولا یشد الأسنان بالذهب ویشدها بالفضة یرید به اذا تحرکت الأسنان وخیف سقوطها فأراد صاحبها أن یشدها یشدها بالفضة ولا یشدها بالذهب، وهذا قول أبی حنیفةؒ، وقال محمدؒ: یشدها بالذهب أیضًا. (عالمگیریة ج:۵ ص:۳۳۶)۔ (۲)**

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۹/۲۸ ج)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) **کتاب الکراهیة باب ۱۰ وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۹.**

برہنہ ہوکر غسل کرنا

سوال:- غسل (فرض، سنت، مستحب) اگر مکان میں پردے کا پورا انتظام ہے تو برہنہ ہوکر کرسکتا ہے؟ اور جو وضو غسل کے لئے کیا ہے، بعد میں نماز کے لئے یہی وضو برقرار ہوگا یا نیا وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- بہتر تو یہی ہے کہ کوئی کپڑا وغیرہ باندھ کر غسل کیا جائے، لیکن برہنہ ہوکر غسل کرنا جبکہ پردے کا پورا انتظام ہے، بھی بلاکراہت جائز ہے۔[1] غسل میں جو وضو کیا جاتا ہے وہ بعد میں نماز پڑھنے کے لئے کافی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۱۹ الف)

گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال:- گردن کا مسح سنت ہے یا بدعت؟ مع الدلیل بیان کیجئے۔

جواب:- قال فی الدر المختار (فی مستحبات الوضوء) ومسح الرقبة بظهر يديه (لا الحلقوم) لأنه بدعة، وقال الشاميؒ تحت قوله لأنه بدعة اذ لم يرد فی السنة،[3] وقال فی البحر قوله ومسح رقبته يعنی بظهر اليدين۔[4] اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسحِ رقبہ تو مستحب ہے، لیکن حلقوم کا مسح بدعت ہے، چونکہ سنت سے ثابت نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۵ھ[5]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مرض کی وجہ سے پانی نقصان دہ ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے

سوال:- زید کی بیوی ایک طویل بیماری میں مبتلا ہے حتیٰ کہ نل کے پانی سے وضو کرنے سے

---

(۱) روی البخاریؒ عن أم هانیؓ بنت أبی طالب أنها ذهبت الٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم عام الفتح فوجدته یغتسل وفاطمة تستره، وعن میمونة قالت: سترت النبی صلی الله علیه وسلم وهو یغتسل من الجنابة فغسل یدیه .... الخ. صحیح البخاری، کتاب الغسل ج:۱ ص:۴۲ (طبع قدیمی کتب خانه کراچی).

(۲) وفی مشکٰوة المصابیح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عائشةؓ قالت: کان النبی صلی الله علیه وسلم لا یتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داوٗد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا یتوضأ بعد الغسل أی اکتفا بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وکذا فی عزیز الفتاویٰ ص:۱۷۵، وامداد المفتین ص:۱۷۵.

(۳) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۱۲۴.

(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۲۸. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۳۔

(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

بھی اس کے پیٹ میں درد ہوجاتا ہے، کیا اس بیماری کی وجہ سے زید کی بیوی کے لئے تیمّم کرنا جائز ہوگا یانہیں؟

جواب:- کسی طبیب سے مشورہ کیا جائے، اگر وہ وضو کو مضر قرار دے تو تیمّم کیا جاسکتا ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

غسل کے بعد دوبارہ وضو کا حکم

سوال:- اگر وضو کرتے وقت ستر کھلا ہوا ہو مثلاً غسل کے دوران جو وضو کیا جاتا ہے تو یہ وضو نماز کے لئے کافی ہوگا یانہیں؟ یا کپڑے پہننے کے بعد دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- غسل کے وقت کیا ہوا وضو نماز کے لئے کافی ہے،[2] بشرطیکہ اس وضو کے بعد کوئی ایسا اَمر نہ پیش آیا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور اس میں ستر کھلے ہونے سے کچھ فرق واقع نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۴۳/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار باب التیمم ج:۱ ص:۲۳۲. من عجز عن استعمال الماء .... لمرض یشتد أو یمتد بغلبة ظن أو قول حاذق مسلم .... تیمم. وکذا فی الهندیة الباب الرابع فی التیمم ج:۱ ص:۲۸.

(۲) وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عائشة رضی الله عنها قالت: کان النبی صلی الله علیه وسلم لا یتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا یتوضأ بعد الغسل أی اکتفا بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وکذا فی عزیز الفتاویٰ ص:۱۷۵.

﴿فصل فی النّجاسات وأحکام التطهیر﴾
(نجاسات کے اَحکام اور پاکی کا طریقہ)

ناپاک رُوئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- رُوئی اگر ناپاک ہوجائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- علامہ شامیؒ نے تطہیر کے جو طریقے ابنِ وہبانؒ سے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ندف بھی ہے، جس کے معنی ہیں ''دُھنا''، (ملاحظہ ہو شامی ج:۱ ص:۲۹۰)[۱] اور یہ طریقہ رُوئی ہی پر چسپاں ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[۲]

تیل کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- گھی اور تیل اگر نجس ہوجائیں تو تطہیر کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- تیل کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی برتن میں ڈال کر اتنا ہی پانی اس میں ڈال دیا جائے اور ہلا کر چھوڑ دیا جائے جب تک کہ تیل اُوپر آجائے، پھر برتن میں سوراخ کرے یا نتھار کر پانی علیحدہ کردیا جائے، تین مرتبہ یہی عمل کرنے سے تیل پاک ہوجائے گا۔ (کذا فی العالمگیریة ج:۱ ص:۴۳)[۳]۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[۴]

---

(۱) واخر دون الفرک والندف والجفاف .... الخ. فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) عالمگیریة، الباب السابع فی النجاسة وأحکامها ج:۱ ص:۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۴ (طبع ایچ ایم سعید) ویطهر لبن وعسل ودبس ودهن یغلی ثلاثًا. وفی الشامیة تحته قال فی الدرر لو تنجس العسل فتطهیره أن یصب فیه ماء بقدره فیغلی حتی یعود الی مکانه والدهن یصب علیه الماء فیغلی فیعلو الدهن الماء فیرفع بشیٔ هکذا ثلاث مرات وهذا عند أبی یوسف خلافا لمحمد وهو أوسع، وعلیه الفتویٰ.

(۴) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور مکمل تفصیل

سوال:- تطہیرِ اشیاء کے کیا کیا طریقے ہیں؟ اور ان میں کیا تفصیل ہے؟

جواب:- تطہیرِ اشیاء کے دس طریقے ہیں:-

۱:- دھونا، جیسے ناپاک کپڑا وغیرہ اسی طریقے سے پاک کیا جاتا ہے۔

۲:- پھیر لینا، یہ طریقہ ان اشیاء کے لئے مخصوص ہے جو شفاف ہوں، جیسے آئینہ، تلوار وغیرہ۔

۳:- (فرک) کھرچنا، یہ طریقہ منی سے تطہیر کے لئے ہے، عالمگیریہ میں اس کو مطلق چھوڑا گیا ہے، لیکن العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طریقے کو قرونِ اُولیٰ کے ساتھ بایں وجہ مخصوص قرار دیا ہے کہ اس زمانے میں منی بہت غلیظ ہوتی تھی، اور آج کل عام طور سے منی کی رقت شائع ہے، اس لئے منیٔ رقیق کے لئے محض فرک کافی نہیں۔

۴:- ملنا اور رگڑنا، (حت و دلک) اور یہ طریقہ اس صورت کے لئے ہے جبکہ نجس چیز ثخین ہو اور نجاست متجسد (یعنی خشک ہونے کے بعد نظر آنے والی) ہو۔

۵:- سوکھ جانا، یہ حکم زمین اور اس میں گڑی ہوئی چیزوں کے لئے ہے، جیسے دیواریں، درخت، اینٹیں وغیرہ، یہ تمام چیزیں صرف سوکھ جانے سے پاک ہوجاتی ہیں۔

۶:- جلانا، گوبر اور نجس کیچڑ اس طریقے سے پاک ہوجاتے ہیں، اسی طرح اگر بکری وغیرہ کا سر جو خون میں لتھڑا ہوا ہو اس قدر جلایا جائے کہ خون بالکل زائل ہوجائے تو وہ طاہر ہوجاتا ہے۔

۷:- ایک حالت سے دُوسری حالت کی طرف تبدیل کردینا استحالہ، مثلاً شراب کو کسی نئے مٹکے میں سرکہ بنادینا، یہ بھی تطہیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۸:- دباغت، خنزیر اور آدمی کے علاوہ تمام جانوروں کی کھالوں کو دُھوپ میں رکھ کر یا نمک لگاکر مدبوغ کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہیں۔

۹:- ذکاۃ یعنی حیوان کا ذبح کردینا اس کی جلد کو پاک کردیتا ہے اور گوشت کو بھی، خواہ وہ حیوان غیر ماکول ہو۔

۱۰:- نزح، یعنی اگر کنویں میں نجاست گرجائے تو اس کی مناسبت سے کنویں کا پانی کھینچ لینا۔

یہ دس طریقے عالمگیریہ میں ص:۴۲ سے ۴۶ تک نقل کئے گئے ہیں، اور ابنِ وہبانؒ اور علامہ حصکفیؒ نے ان کے ساتھ چند چیزیں اور ملاکر انہیں اشعار میں جمع کردیا ہے، ابنِ وہبانؒ کے اشعار علامہ شامیؒ نے نقل فرمائے ہیں:-

واٰخر دون الفرک والندف والجفا	ف والنحت قلب العین والغسل یطور
ولا دبغ تخلیل ذکاء تخلل	ولا المسح والنزح الدخول التغوّر

وزاد شارحها بیتا، فقال:-

وأکل وقسم غسل بعض ونحله	وندف وغلی بیع بعض تقور

(شامی ج:۱ ص:۲۹۰)[۱]

علامہ حصکفیؒ نے انہی اشعار کو ذرا سا بدل کر فرمایا ہے: ؎

وغسل ومسح والجفاف مطهر	ونحت وقلب العین والحفر یذکر
ودبغ وتخلیل ذکاة تخلل	وفرک ودلک والدخول التغور
تصرفه فی البعض ندف ونزحها	ونار وغلی غسل بعض تقور[۲]

جس سے مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تطہیر مزید معلوم ہوئے:-

۱:- کھودنا، اور یہ طریقہ زمین کو پاک کرنے کے لئے ہے۔

۲:- دخول، جس کی تفسیر علامہ ابنِ عابدینؒ نے یہ کی ہے کہ پاک پانی کا ایسے چھوٹے حوض میں داخل ہونا کہ جو ناپاک ہوگیا ہو، جبکہ ایک طرف سے اس کا پانی نکل رہا ہو، اور نیا پاک پانی داخل ہو رہا ہو، تو اگرچہ حوض کا پانی قلیل ہو، لیکن پھر بھی وہ پاک ہوجاتا ہے۔ (کذا فی رد المحتار ج:۱ ص:۲۹۰)[۳]۔

۳:- تغور، یعنی کنویں کا اتنا پانی خشک ہوجائے کہ جتنا نجاست گرنے کی وجہ سے نکالنا واجب تھا تو یہ پانی نکالنے کے قائم مقام ہوجائے گا۔

۴:- تصرف، یعنی ایک نجس چیز میں تصرف کرنا، مثلاً گندم کے ڈھیر میں سے کچھ ناپاک ہوجائے تو اس کے اندر اکل، بیع، ہبہ اور صدقہ وغیرہ کے ذریعہ تصرف کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے۔

۵:- جوش دینا، جیسے کہ اگر تیل یا گوشت نجس ہوجائیں تو ان کو جوش دے کر پاک کیا جاسکتا ہے۔

۶:- تقویر، یعنی جہاں جہاں نجاست ہو، وہاں وہاں سے اس نجس چیز کا علیحدہ کردینا، چنانچہ اگر جما ہوا گھی ناپاک ہوجائے تو اس میں یہی طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ چھ طریقے مزید ملا کر کل سولہ طریقہ ہائے تطہیر معلوم ہوئے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲ھ[۵]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید). (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۱۳۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) شامیة ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) تطہیرِ اشیاء کے مذکورہ طریقے فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۴۱ تا ۴۵ (مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) میں بھی موجود ہیں۔
(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

مٹی کا تیل پاک ہے

سوال:- کروشین تیل پاک ہے یا ناپاک؟ اگر نجس ہے تو نجاست خفیفہ ہے یا غلیظہ؟ بغیر دھوئے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کروشین تیل معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اگر مراد مٹی کا تیل ہے تو وہ پاک ہے، اسی طرح اور کوئی تیل جو معدن سے نکلتا ہو وہ بھی پاک ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱۱/۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

بیت الخلاء کے لوٹے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے

سوال:- مساجد میں بھنگی وغیرہ صفائی کرتے ہیں، مگر وہ پیشاب خانے اور بیت الخلاء دھوتے وقت زور زور سے پانی بہاتے ہیں، استنجا کے لوٹے وہیں رکھے ہوتے ہیں، کیا ایسے برتنوں میں پانی لے کر پھر طہارت کی جاسکتی ہے؟

جواب:- ان برتنوں کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ان کو تین مرتبہ دھولیں، پھر بے کھٹکے ان سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال:- کپڑے جو کہ نجس ہوتے ہیں ان کے بارے میں طہارت کے اُصول کے مطابق پاک پانی سے تین مرتبہ سختی سے نچوڑنے کے اَحکام ہیں، جبکہ آج کل دھوبی گندے نالوں میں یا حوض وغیرہ میں دھوتے دیکھے جاتے ہیں، پھر گندی جگہوں پر وہ کپڑے سکھاتے ہیں، کیا ایسے دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب:- اصل میں تو کسی دھوبی کو مقرّر کرتے وقت اس بات کا اطمینان کرنا چاہئے کہ وہ کپڑوں کو پاک کرکے دھوتا ہے یا نہیں؟ لیکن جب تک ناپاک پانی سے دھونے کا صرف اندیشہ ہو اس

---

(۱) کروشین تیل سے مٹی کا تیل مراد ہے، بنگلہ زبان میں مٹی کے تیل کو کہتے ہیں۔ (محمد زبیر)

وقت تک ابتلائے عام کی بناء پر ان کی طہارت ہی کا حکم کیا جاتا ہے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

کتے کی دباغت شدہ کھال پاک ہے

سوال:- خلاصۂ سوال یہ ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' بابت ماہِ شوال سنہ ۱۳۸۷ھ میں ''آپ کے سوال'' کے عنوان کے تحت کتے کی کھال کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ کتے کی کھال کو اگر شرعی طور پر ذبح کیا جائے اور اس کی کھال کو اس طرح صاف کیا جائے کہ وہ سڑنے سے محفوظ ہوجائے ..... سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ناپاک، نجس، حرام، گندی چیز کو کسی بھی طریقے سے ذبح کریں، اوّل تو لفظِ ذبح وہاں جائز ہی نہیں ہے، پھر اس کی شرعی حیثیت؟

جواب:- حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے: ''أیما أھاب دبغ فقد طھر'' أو کما قال علیه السلام، (أخرجه مسلم فی صحیحه)۔[2] یعنی جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔ دُوسرے دلائل کی روشنی میں اس سے صرف خنزیر اور انسان کی کھال کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس لئے فقہائے کرامؒ لکھتے ہیں: کل أھاب دبغ فقد طھر جازت الصلٰوۃ فیه والوضوء منه الا جلد الخنزیر والآدمی ..... ولیس الکلب نجس العین، ألا تری أنه ینتفع به حراسة واصطیادًا بخلاف الخنزیر. (ھدایة ص:۴۰، ۴۱)۔[3]

ان عبارتوں سے معلوم ہوگیا کہ کتے کی کھال دباغت سے پاک ہوجاتی ہے، اور کتے کا حکم خنزیر کی طرح نہیں ہے جو کسی حال پاک نہیں ہوتا، اور کتے کو ذبح کرنا کھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی کھال وغیرہ استعمال کرنے کے لئے ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۶/۱۸ الف)

---

(۱) جیسا کہ حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، سخت ضرورت ..... میں دُوسرے امام کے قول کو لے لینا جائز ہے، اس لئے جو شخص دُوسرے طریقے سے نہ دُھلوا سکے اس کے لئے پاکی کا حکم کیا جائے گا۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۸۰۔

(۲) وفی الصحیح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عبدالله بن عباسؓ قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: اذا دبغ الاھاب فقد طھر.

(۳) (طبع مکتبه شرکت علمیه). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۰۳، ۲۰۴ (وکل اھاب دبغ وھو یحتملھا طھر) .... (وما) أی أھاب (طھر به) بدباغ (طھر بذکاة)، وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۸۱ (وبعد یباع وینتفع به) وقید بالمیتة، لأن جلد المذکاة یجوز بیعه قبل الدباغ.

ذبح کرنا کوئی فرض واجب نہیں، اگر کوئی شخص کرلے تو اس کا حکم لکھا ہے۔

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

کیا دھوبی سے کپڑے دُھلانے کے بعد دوبارہ دھونا ضروری ہے؟

سوال:- کیا کسی فیکٹری کے دھوبی سے کپڑے دُھلوانے سے کپڑے پاک ہوجاتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- یہ تو فیکٹری کے طریقِ کار پر منحصر ہے۔ اگر وہ کپڑوں کو پاک کرنے کا اہتمام کریں یعنی کپڑوں کا میل کاٹ کر انہیں سکھانے سے پہلے ہر کپڑے کو الگ الگ تین مرتبہ دھولیں تب تو کپڑوں کے پاک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی وضاحت کی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دھوبی سے کپڑا دُھلوانے کے بعد کیا دوبارہ پاک کرنا ضروری ہے؟ اور کیا کپڑا پاک کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:- کپڑوں کی دُھلائی کے بعد اس کو پاک کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس صورت میں؟ اور کیا اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

جواب:- اگر کپڑے دھونے والے نے دھوتے وقت پاک کرنے کا اہتمام کیا ہے تب تو دوبارہ پاک کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر یہ معلوم ہو کہ دھوتے وقت پاکی کا اہتمام نہیں ہوا تو بعد میں پاک کرلیں۔ اور پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اتنا دھویا جائے کہ نجاست کا اثر زائل ہوجائے، تین مرتبہ دھولیں تو بہتر ہے، اور اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۵/۲۸ ج)

ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والے پانی کا حکم
مچھلی کا پتہ پاک ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- ہاتھی کی سونڈ سے جو پانی نکلتا ہے وہ عادۃً گرمی کے سبب اپنے بدن پر چھڑکا کرتا ہے، یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

۲:- مچھلی کا پتہ پاک ہے یا نہیں؟

جواب ا:- ہاتھی کی سونڈ کا پانی دراصل اس کا لعاب ہے، جو فقہاءؒ کی تصریحات کے مطابق ناپاک ہے، درمختار میں ہے: "وسؤر (خنزیر وکلب وسباع بهائم) ومنه الهرة البرية (وشارب خمر فور شربها وهرة فور أكل فارة نجس)" اور سباع بہائم کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامیؒ رقم طراز ہیں: هي ما كان يصطاد بنابه كالأسد والذئب والفهد والنمر والثعلب والفيل .... الخ. (شامي استنبولي "مطلب في السور" ج:۱ ص:۲۰۵)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھی کا جھوٹا نجس ہے، جو لعاب ہی کی فرع ہے، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: عرق كل شئ معتبر بسؤره. (ج:۱ ص:۲۴)۔[2] اور فتاویٰ قاضی خان میں خود سوالِ مذکور کا جواب بایں طور مصرح ہے: لعاب الفيل نجس كلعاب الفهد والأسد اذا أصاب الثوب بخرطومه ينجسه. (خانية ج:۱ ص:۱۷)۔[3] لہٰذا ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والا پانی ناپاک ہے۔

۲:- کوئی جزئیہ تو نہیں مل سکا، البتہ چونکہ مچھلی کا خون ناپاک نہیں ہے جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے درمختار میں تصریح کی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے: لأنه ليس بدم حقيقة، لأنه اذا يبس يبيض والدم يسود. (رد المحتار، باب الأنجاس ج:۱ ص:۲۹۴)۔[4]

یعنی مچھلی کا خون درحقیقت خون نہیں، چونکہ وہ خشک ہونے کے بعد سفید ہوجاتا ہے، حالانکہ خون خشکی کے بعد سیاہ رہتا ہے، اس لئے خون پر قیاس کرکے پتہ کو بھی پاک کہنا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ خون پر پتے کو قیاس کرنا اس لئے دُرست نہیں کہ پتہ حرام ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الذبائح ج:۵ ص:۲۷۱ میں ذکر فرمایا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی حرمت سے اس کی نجاست لازم نہیں، جیسے کہ زہر کا استعمال ناجائز ہے، اس کے باوجود اس وجہ سے وہ نجس نہیں ہوتا، اسی طرح پتہ بھی ایک سمیاتی اثرات کا مجموعہ ہے، جو سمیت کی وجہ سے اگر ناجائز ہو تو اس سے اس کی پاکی پر اثر نہیں پڑتا۔

اس تحریر کے بعد ایک عبارتِ مصرحہ پر نظر پڑی: ومرارة كل شئ كبوله. (عالمگيرية ج:۱ ص:۴۷)۔[5] ہر چیز کا پتہ حکم میں اس کے پیشاب کی طرح ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناپاک ہے،

---

(۱) شامية ج:۱ ص:۲۲۳ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) فتاویٰ عالمگيرية ج:۱ ص:۲۳ (طبع مكتبه رشديه، كوئٹه).
(۳) خانية على هامش الهندية ج:۱ ص:۲۱ (أيضًا).
(۴) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۳۱۹ (طبع ایچ ایم سعید)
(۵) فتاویٰ عالمگيرية ج:۱ ص:۴۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه). وفي الدر المختار ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع سعيد) مرارة كل حيوان كبوله .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۶۔ (محمد زبیر حق نواز)۔

لیکن مچھلی کا پیشاب ہونا خود مشکوک ہے، اس لئے دُوسرے اہلِ علم سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ (۱)

ہاتھ پر نجاست لگنے کی صورت میں کتنی مرتبہ دھونا لازم ہے؟

سوال:- ہاتھ پر پیشاب لگ گیا، پانی سے اتنا دھویا جتنی دیر میں تین بار پانی ڈالا جاتا ہے، تو پاک ہوگیا یا الگ الگ دو مرتبہ اور دھوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہاتھ کو اتنا دھونا ضروری ہے کہ پیشاب کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا غالب گمان ہوجائے، الگ الگ تین مرتبہ پانی ڈالنا ضروری نہیں، لما فی الدر المختار: **ویطهر محل غیرها أی غیر مرئیة بغلبة ظن غاسل طهارة محلها بلا عدد، به یفتی.** (شامی ج:۱ ص:۲۲۰)۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۲۸ الف)

جوتے یا چپل وغیرہ کو وضوخانے میں دھونے کا حکم

سوال:- جوتا اور چپل خراب ہوجائے اور گیلی مٹی لگ جائے یا خراب پانی میں گر جائے تو کیا وضوخانے میں دھویا جاسکتا ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو مسجد کے وضوخانے کے بجائے کسی اور جگہ دھویا جائے، لیکن اگر ضرورت کے وقت وہاں جوتے دھولئے جائیں تو مضائقہ نہیں، البتہ پھر اس جگہ کو صاف کردینا چاہئے تاکہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸۳/۲۷)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۱ (طبع ایچ ایم سعید). (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی أحکام الماء﴾
(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

تالاب سے پانی لیتے وقت اگر گھڑے میں مینگنی آجائے تو کیا کرے؟

سوال:- ہمارے علاقے میں پانی جمع کرنے کی غرض سے تالاب بنے ہوئے ہیں، بارش کا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، کبھی کبھی جب ہم اس سے پانی لیتے ہیں تو اس میں ایک آدھی مینگنی یا گوبر آجاتا ہے، کیا یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

جواب:- تالاب سے پانی لیتے وقت کوئی مینگنی آجائے تو اسے گھڑے سے نکال کر پھینک دے تو پانی پاک ہوگا، اور اگر مینگنی گھڑے میں رہ گئی تو احتیاط اس میں ہے کہ اس سے وضو اور غسل نہ کیا جائے، فی الهداية: فان وقعت فيها بعرة أو بعرتان من بعر الابل أو الغنم لم تفسد الماء الى قوله: ولا يعفى القليل فى الاناء علىٰ ما قيل لعدم الضرورة، وعن أبى حنيفةؒ أنه كالبير فى حق البعرة والبعرتين. (هداية ج:۱ ص:۴۲)۔[1] وفى فتح القدير: فى الشاة تبعر فى المحلب قالوا: ترمى البعرة أى من ساعته فلو أخر .... لا يجوز. (ص:۶۹)۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۵/۱۸ الف)

”دہ در دہ“ حوض میں نجاست گرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا حوض پختہ ”دہ در دہ“ پانی سے بھرا ہوا تھا، اس میں چند ٹین کے لوٹے گر گئے جن کے نکالنے کے لئے بندوبست کیا گیا، ان لوٹوں کے ساتھ تین چپل بھی نکل آئے، یہ معلوم نہیں کہ کب سے گری ہوئی تھیں؟ چونکہ ماءِ کثیر تھا تو زید (امام مسجد) نے تمام پانی نکلوادیا اور حوض خالی ہوگیا، آج کل پانی کی جو قلت ہے وہ ظاہر ہے، اور جواب میں مولانا عبدالحی کا یہ سوال و جواب پیش کیا:-

سوال:- اگر حوض دہ در دہ تھا اور پانی کم ہوجانے پر اس میں نجاست پڑی پھر

(۱) (طبع مكتبه شركت علميه). (۲) فتح القدير ج:۱ ص:۸۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

حوض میں پانی آگیا اور وہ بھر گیا اور کوئی چیز ان میں سے باہر نہیں نکلی تو وہ حوض کا پانی دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بعض کے نزدیک دُرست ہے، اور بعض کے نزدیک دُرست نہیں ہے۔

جواب:- حوض کا پانی اگر کثیر (دہ دردہ) ہو تو اس میں نجاست کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ پانی کا رنگ، بو یا مزہ نہ بدل جائے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر پانی کے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا تھا تو حوض خالی کرنے کی ضرورت نہیں تھی[1]۔ فتاویٰ مولانا عبدالحی کا جو سوال و جواب[2] نقل کیا گیا ہے اس سے استدلال دُرست نہیں ہے، اس کی صورت بالکل مختلف ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کنویں میں سانپ گرنے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک کنویں میں سانپ کا بچہ سوا گز لمبا اور ایک انچ موٹا مر کر سڑ گیا اور جدا نہیں ہوا، آیا اس کے نکالنے سے پانی صاف ہے یا ناپاک؟ اور اگر سارا پانی نکالنا ہے تو اس میں بہت دُشواری ہے، اگر یہ سانپ نہ نکالا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر سانپ خون والا تھا تو مطلقاً پانی ناپاک ہے، اور اس کو نکالنے کے بعد کنویں کا تمام پانی نکالنا واجب ہے۔ رہی دُشواری سو اگر وہ اس وجہ سے ہے کہ کنواں تلی توڑ ہے (یعنی اس میں ہر وقت پانی آتا رہتا ہے) تب تو اس قدر پانی نکالنا کافی ہو جائے گا جتنا کہ نکالنا شروع کرتے وقت ہے، اور اس کا اندازہ دو ایسے عادل شخص لگائیں جن کو کنویں کی مساحت وغیرہ میں مہارتِ تامہ حاصل ہو، اس کے بعد جو پانی آئے گا وہ پاک ہوگا۔ اور اگر دُشواری عام کنووں میں بھی معلوم ہوتی ہے تو وہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۹۰ الی ۱۹۲ وکذا یجوز براکد کثیر کذٰلک أی وقع فیہ نجس لم یر أثرہ .... لٰکن فی النھر وانت خبیر بأن اعتبار العشر اضبط .... الخ. وفی الشامیة قولہ: لم یر أثرہ أی من طعم أو لون أو ریح .... الخ. وفی شرح الوقایة کتاب الطھارات ج:۱ ص:۸۰ (طبع ایچ ایم سعید) ولا بماء راکد وقع فیہ نجس الا اذا کان عشرة أذرع فی عشرة أذرع ولا ینحسر أرضہ بالغرف فحکمہ حکم الماء الجاری. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۱ ص:۱۴۹ سوال نمبر ۱۷۵، ۱۷۷، و ج:۱ ص:۱۴۹۔

(۲) دیکھئے: مجموعۃ الفتاویٰ فارسی ج:۳ ص:۲۸ ومعلّم الفقہ اُردو ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ عبدالحی لکھنویؒ (طبع قدیم) باب الحوض ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع میر محمد کتاب خانہ)۔

شرعاً معتبر نہیں، پورا پانی نکالنا ضروری ہوگا، جس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:-

۱:- تنویر الابصار میں ہے: اذا وقعت نجاسة فی بئر دون القدر الكثير أو مات فيها حيوان دموی وانتفخ أو تفسخ ينزح كل مائها بعد اخراجه. (شامی ج:۱ ص:۱۶۵، ۱۶۶)۔[1]

۲:- درمختار میں ہے: (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (يؤخذ ذلک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى. (شامی ج:۱ ص:۱۹۸)۔[2]

اور اگر سانپ خون والا نہیں تھا تو اس کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہے، اس کو نکالنے کے بعد مزید پانی نکالنے کی حاجت نہیں۔ درمختار میں ہے:-

(ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) أی الماء ولو قليلا (غير دموی كزنبور ومائی مولد كسمک وسرطان) وضفدع الا بريا له دم سائل وهو ما لا سترة له بين أصابعه فيفسد فی الأصح كحية برية ان لها دم والا لا - اور علامہ شامیؒ "والا لا" کے تحت تحریر فرماتے ہیں: أی وان لم يكن للضفدع البرية والحية البرية دم سائل فلا يفسد. (شامی ج:۱ ص:۱۷۱)۔[3]

یہ تفصیل اس صورت میں تھی جبکہ سانپ خشکی کا ہو، اور اگر پانی کا سانپ ہے تو وہ مطلقاً بہر صورت پانی کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ علامہ ابنِ عابدینؒ نے لکھا ہے: أما المائية فلا تفسد مطلقًا كما علم مما مر. (رد المحتار ج:۱ ص:۱۷۱)۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ[5]

کیا ٹینکی سے آنے والا پانی ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے؟

سوال:- آج کل پائپ سسٹم میں یہ رواج ہے کہ مکان کی چھت پر پانی کی ایک ٹینکی ہوتی ہے، اور ہینڈ پمپ کے ذریعہ نیچے سے اس میں پانی جمع کرلیا جاتا ہے، اس ٹینکی سے تمام مکان میں پانی پہنچایا جاتا ہے، تو اگر اُوپر سے پانی ٹینکی میں ڈالا جارہا ہو اور نیچے سے پائپ کے ذریعہ پانی نکل رہا ہو تو کیا یہ پانی ''ماءِ جاری'' ہوگا یا نہیں؟

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۱، ۲۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۲۱۴ (أیضًا)
(۳) شامية ج:۱ ص:۱۸۳ الیٰ ۱۸۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) شامية ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع سعید)
(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

اور اگر ایسی ٹینکی میں نجاست اس وقت گرے جبکہ پانی ٹھہرا ہوا ہو، کسی ایک جانب سے یا دونوں جانبوں سے پانی نہ نکل رہا ہو تو کیا جس وقت پانی جاری ہوگا اس وقت وہ ٹینکی پاک ہوجائے گی یا نہیں؟

جواب:– قال فی منیة المصلی عن أبی یوسفؒ ماء الحمام بمنزلة الماء الجاری ......، (واختلف المتأخرون فی بیان هٰذا القول، قال بعضهم: مراده حالة مخصوصة وهو .... اذا کان الماء یجری من الأنبوب الی حوض الحمام والناس یغترفون منه غرفا متدارکا) وقال تحته العلامة الحلبی نقلا عن فتاویٰ قاضی خان: وان کان الناس یغترفون من الحوض بقصاعهم ولا یدخل من الأنبوب ماء أو علی العکس اختلفوا فیه، وأکثرهم علیٰ أنّه یتنجس ماء الحوض، وان کان الناس یغترفون بقصاعهم ویدخل الماء من الأنبوب اختلفوا فیه وأکثرهم علیٰ أنه لا یتنجس (انتهٰی) فهٰذا هو الذی ینبغی أن یعتمد علیه. (کبیری شرح منیة ص:۱۰۰)۔[۱]

وقال العلامة طاهر البخاریؒ: وفی الفتاویٰ وحوض الماء اذا اغترف رجل منه وبیده نجاسة وکان الماء یدخل من أنبوبه فی الحوض والناس یغترفون من الحوض غرفا متدارکا لم یتنجس. (خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۵، طبع امجد اکیڈمی لاهور)، ومثله فی الدر المختار علی الشامی ج:۱ ص:۹۰۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ وہ حوضِ صغیر جس کے ایک جانب سے پائپ کے ذریعہ پانی آرہا ہو اور دُوسری جانب سے اس میں سے پانی بھر رہے ہوں تو ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے۔ آج کل جو ٹینکوں کی صورت مروّج ہے وہ بھی بظاہر اس میں داخل ہے۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علامہ شامیؒ نے اس حکم کو اس صورت میں خاص کیا ہے کہ جیسے پانی اوپری کی طرف سے نکالا جارہا ہو، اور اگر نیچے سے کسی سوراخ وغیرہ کے ذریعے سے پانی نکل رہا ہو جیسا کہ مروّجہ چھت کی ٹنکیوں سے بذریعہ پائپ نکلتا ہے تو اس صورت میں یہ حکم نہ ہوگا۔

اس کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے یہ حکم حوض کے بارے میں بیان فرمایا[۲] اور اس کی تلی میں اگر سوراخ ہو تو یقیناً وہ اس حکم میں نہ ہوگا، کیونکہ اس وقت حوض سے پانی کا خروج نہایت سست رفتار سے اور بہت کم ہوگا۔ بخلاف اس صورت کے کہ ٹینکی سے پانی پوری قوت و

---

(۱) غنیة المتملی ص:۱۰۲، ۱۰۳ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۲) شامی مطلب لو أدخل الماء من أعلی الحوض وخرج أسفله فلیس بجار ج:۱ ص:۱۹۰.

شدّت کے ساتھ نیچے بہتا ہو، ان دونوں میں فرق ہوگیا۔[1]

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۰/۵/۸ھ[2]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ہندو خاکروب کی دھوئی ہوئی جگہ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- صدرِ مملکت پاکستان نے جیسا کہ حکم صادر کیا ہے کہ تمام سرکاری دفاتر میں نماز ادا کی جائے، ہمارے یہاں ہندو خاکروب ہیں، اس سے ہم وہ جگہ جو ہم نے نماز کے لئے تجویز کی ہے پانی سے دُھلانا چاہتے ہیں، اگر وہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اس جگہ کی دُھلائی کرے تو اس جگہ پر نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- مذکورہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اگر زمین کو دھوئے اور اگر جھاڑو استعمال کرے تو وہ پاک ہو تو اس جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۴/۳۰ الف)

(۱) تفصیل کے لئے "خیر الکلام فی حوض الحمام" مصنفہ حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مطالعہ فرمائیں۔
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی أحکام الجنب والمعذور﴾
(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں

سوال:- کیا غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری ہے؟ اور تکیہ، بستر وغیرہ کا دھونا ضروری ہے؟

جواب:- غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں، تاہم چھڑادیں تو بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولا یمنع الطھارۃ ونیم .... وحناء ولو جرمه، به یفتی ودرن ووسخ ....، وکذا دھن ودسومة، وفی رد المحتار أی کزیت وشیرج بخلاف نحو شحم وسمن جامد. (شامی ج:۱ ص:۱۰۴)[۱]۔

سوال:- تیل لگے ہوئے سر پر کوئی پرندہ بیٹ کردے تو صرف پانی سے بال دھونا کافی ہے یا تیل چھڑانا ضروری ہے؟

جواب:- جانور کی بیٹ چھڑالینی چاہئے، تیل چھڑانے کا حکم اُوپر آگیا، اور جتنی چکناہٹ کا ازالہ ممکن ہو، کرلے اور جس کا ازالہ متعذر ہو وہ معاف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

حالتِ جنابت میں دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- حالتِ جنابت میں دُرود شریف کا معمول پورا کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- حالتِ جنابت میں صرف قرآنِ کریم کی تلاوت ممنوع ہے، لیکن دُعائیں، اذکار و تسبیحات اور دُرود شریف پڑھنا، ناجائز نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ دُرود شریف اور اذکار و دُعا کے لئے

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع سعید). وفی الھندیة الفصل الأول فی فرائضه ج:۱ ص:۱۴ (طبع ماجدیه کوئٹه) واذا ادھن فامر الماء فلم یصل یجزئ .... الخ.

کم از کم وضو کرلے۔ لما فی الدر المختار: ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالىٰ وتسبيح، وقال الشامي: الى أن وضوء الجنب لهٰذه الأشياء مستحب كوضوء المحدث۔ (شامی ج:۱ ص:۱۹۳)۔(۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۲۸ ب)

جنابت کی حالت میں قرآن چھونے کا حکم

سوال:- ایک شخص پر غسل واجب ہے، وضو کرکے قرآن مجید پر ہاتھ لگا کر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جنابت کی حالت میں جب انسان پر غسل واجب ہو اس کے لئے قرآنِ کریم کا چھونا، پڑھنا سب ناجائز ہے،(۲) اور صرف وضو کرنے سے جنابت ختم نہیں ہوتی، اس لئے صرف وضو کرنے سے قرآنِ کریم کا چھونا یا پڑھنا بھی جائز نہیں ہوتا، اس کے لئے غسل ضروری ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۷/۱۸ الف)

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں

سوال:- اپنی بیوی سے صحبت کرنے کے بعد اگر دوبارہ خواہش ہو تو کیا دوبارہ صحبت کے لئے غسلِ جنابت کرنا ضروری ہے؟

(۱، ۲) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید). وفی مشكوٰة المصابيح ج:۱ ص:۴۹ (طبع قديمی كتب خانه) عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئًا من القرآن. (رواه الترمذی). وفی المرقاة تحته ج:۲ ص:۱۶۰ وفی شرح السنة اتفقوا علىٰ ان الجنب لا يجوز له قراءة القران .... والحاصل ان جمهور العلماء على الحرمة، اذ هی اللائقة بتعظيم القران وفی الدلالة عليها الأحاديث الكثيرة المصرحة بها وان كانت كلها ضعيفة، لأن تعدد طرقها يورثها قوة أی قوة وترقيها الى درجة الحسن لغيره وهو حجة فی الأحكام.
وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۷۲ ويحرم به تلاوة قران ولو دون اية على المختار بقصده ومسه.
وفی الهندية ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القران لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئًا من القرآن، والآية وما دونها سواء فی التحريم على الأصح. (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- دوبارہ صحبت کرنے کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں، البتہ بیچ میں وضو کرلینا بہتر ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/۲۸ ب)

کئی مرتبہ ہم بستری کے بعد ایک غسلِ جنابت کافی ہے

سوال:- کیا اپنی بیوی سے ایک شب میں جتنی مرتبہ ہم بستری کی جائے اتنی مرتبہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا؟ یعنی ایک شب میں ایک دفعہ ہم بستری ہوگئی، تو دُوسری دفعہ تب ہم بستری کرے کہ پہلے غسل کرے؟ ورنہ یہ فعل حرام ہے؟

جواب:- ایک شب میں ہم بستری خواہ کتنی مرتبہ کی جائے سب کے لئے آخر میں ایک غسل کافی ہے،[2] البتہ اگر کسی ہم بستری کے بعد غسل کرلیا تو آئندہ ہم بستری کے بعد نیا غسل کرنا ہوگا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۳/۱۸ الف)

لیکن ہر بار غسل کرنا افضل ہے، اور یہ مشکل ہو تو صرف وضو کرے، اور وہ بھی نہ ہوسکے تو کوئی گناہ نہیں، آخر میں غسل کرے۔[3]

محمد عاشق الٰہی

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری سے پہلے اگر غسل نہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عورت کے ساتھ ہم بستری کرنے کے بعد دوبارہ اگر ہم بستری کی ہو تو دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے یا اسی حالت میں ہم بستری کرسکتے ہیں؟

جواب:- دوبارہ ہم بستری کا ارادہ ہو تو پہلے غسل یا وضو کرلینا مستحب ہے، لیکن اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

(۱ تا ۴) وفی مشکوۃ المصابیح ج: ۱ ص: ۴۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی سعید الخدریؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا أتی أحدکم أھلہ ثم أراد أن یعود فلیتوضأ بینھما وضوء. (رواہ مسلم). وفیہ أیضًا بعدہ: عن أنس قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یطوف علٰی نسائہ بغسل واحد. (رواہ مسلم).
وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۱۷۶، ۱۷۷ لا (یکرہ) معاودۃ أھلہ قبل اغتسالہ الا اذا احتلم لم یأت أھلہ. قال الحلبیؒ: ظاھر الحدیث انما یفید الندب لا نفی الجواز المفاد من کلامہ.

پیشاب کے قطروں کی بناء پر کپڑے کی پاکی اور وضو کا حکم

سوال:- مثانے کی کمزوری کی بناء پر اکثر پیشاب سکھانے کے بعد قطرے نکل جاتے ہیں، اکثر وضو کرنے کے بعد ایسا ہوجاتا ہے، وضو اور کپڑے کی پاکی یا ناپاکی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب قطرہ آئے تو کپڑا پاک کرکے وضو دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۸/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۰/۲۸ ج)

''لیکوریا'' کے پانی کا حکم اور اس سے متعلق متعدّد مسائل

سوال:- عورتوں کو لیکوریا کی بیماری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے رحم سے سفید پانی رِستا رہتا ہے۔

۱:- کیا یہ سفید پانی نجاستِ خفیفہ ہے یا کہ نجاستِ غلیظہ؟

۲:- اگر کسی عورت کو یہ بیماری ہو اور وہ نماز بھی پڑھتی ہو، چونکہ پانی رِسنے کا کوئی خاص وقت مقرّر نہیں ہوتا تو کیا اس پانی کی وجہ سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں؟

۳:- باوضو ہونے کی صورت میں یہ پانی نکلے تو کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

۴:- اگر نماز کی ادائیگی کے دوران پانی نکل آئے تو کیا نماز ہوجاتی ہے؟

۵:- اگر نماز نہیں ہوتی تو اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نماز ضائع نہ ہو؟

۶:- شرعاً کیا اس قسم کے مریض کو معذور سمجھا جائے گا؟

جواب ۱:- لیکوریا کی بیماری میں جو پانی خارج ہوتا ہے وہ چونکہ رحم سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ مذی کی طرح نجاستِ غلیظہ ہے، **ولیس ھو فی حکم رطوبة الفرج الداخل کما فی امداد الفتاویٰ** ج:۱ ص:۶۵ و ۶۷۔[۱]

۲:- اس سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں۔[۲]

۳:- اس کے نکلنے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔[۳]

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۳ أی رطوبة الفرج فیکون مفرعا علٰی قولھما بنجاستھا، وقال ابن عابدینؒ تحته: .... ومن وراء باطن الفرج فانه نجس قطعًا ککل خارج من الباطن عابدین کالماء الخارج مع الولد أو قُبَیْلِه.

۴:- نماز نہیں ہوگی، اِلَّا یہ کہ معذوری کی وہ صورت ہو جائے جو نمبر۵ و ۶ کے جواب میں آرہی ہے۔

۵،۶:- اگر یہ پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے اور اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ اس میں چار رکعت نماز ادا کی جاسکے تو پھر یہ عورت ''معذور'' کے حکم میں ہے، ایسی عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت داخل ہونے پر وضو کرلے اور اس سے جتنی چاہے نمازیں نوافل وغیرہ پڑھتی رہے، جب تک اس نماز کا وقت رہے گا، اس کا وضو سیلان کا پانی نکلنے سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسری نماز کا وقت آئے تو اس کے لئے نیا وضو کرے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۲۷ ہ)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۰۵ وصاحب عذر من به سلس بول لا یمکنه امساکه أو استطلاق بطن ریح أو انفلات أو المستحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة بأن لا یجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث .... وحکمه الوضوء .... لکل فرض .... ثم یصلی به فیه فرضا أو نفلا، فاذا خرج الوقت بطل.

﴿فصل فی الاستنجاء﴾
(استنجاء کے مسائل کا بیان)

کیا طہارت کے لئے ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرنا ضروری ہے؟

سوال:- استنجے کے لئے مجھے دو بار ضرور جانا پڑتا ہے، پہلے مٹی استعمال کرتا ہوں، اور اس کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں مجھ کو مکمل طہارت کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے، لیکن اس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے جبکہ جماعت نماز کے لئے کھڑی ہو اور میں سارا وقت استنجے میں صَرف کردوں یا بارش وغیرہ کے وقت طہارت کے لئے مٹی کا ڈھیلا دستیاب نہیں ہوتا، اسی طرح سفر میں بھی مٹی دستیاب نہیں ہوتی۔ نماز اور حج وغیرہ میں اس کا اہتمام کرنے سے ارکان ہی چھوٹ جائیں گے، آخر کیا کروں؟ رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- افضل تو بے شک یہی ہے کہ ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کئے جائیں، لیکن ضرورت کے وقت صرف پانی سے استنجا کرلینا بھی کافی ہے، اور اتنا دھویا جائے کہ نجاست باقی نہ رہے، زیادہ وہم میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ **ثم اعلم أن الجمع بين الماء والحجر أفضل ويليه في الفضل الاقتصار على الماء.** (شامی ج:۱ ص:۲۲۶)[۱]۔ **والغسل بالماء الى أن يقع في قلبه أنه طهر ما لم يكن موسوسا.** (درمختار ج:۱ ص:۲۲۵)[۲]۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۸/۲۸ ب)

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے اور صرف پانی کا استعمال بھی کافی ہے

سوال:- پیشاب کے بعد استعمال کے لئے ڈھیلا اگر میسر نہ آئے تو کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ جبکہ دیوار بھی سنگِ مرمر کی ہو، اور ڈھیلا اور پانی کے استعمال کے بعد بھی کسی شخص کو قطرہ نکل

---

(۱) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۳۳۸ (طبع ايچ ايم سعيد). وفي الهندية ج:۱ ص:۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) والأفضل أن يجمع بينهما كذا في التبيين. (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۷.

آتا ہے تو اس کے لئے پاکی کیا صورت ہوگی؟

جواب:- پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے، تاہم اگر ڈھیلا میسر نہ ہو تو صرف پانی بھی کافی ہے، لیکن صرف ڈھیلے پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے۔ ڈھیلے اور پانی دونوں کے استعمال کے بعد بھی اگر قطرہ آجائے تو استنجاء اور وضو دوبارہ کرلینا چاہئے اور کپڑا پاک کرلینا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۳/۲۲ الف)

﴿فصل فی المسح علی الخفین﴾
(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

مروّجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کن موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے؟

الف:- جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کا تعلق ہے، اس کے جواز پر تقریباً تمام ہی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

البتہ اُونی، سوتی اور نائیلون وغیرہ کے موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے، بیشتر فقہاء اُونی اور سوتی موزوں پر مسح جائز ہونے کے بارے میں کچھ شرائط رکھتے ہیں۔

لیکن دورِ حاضر کے ایک مشہور صاحبِ فکر و بصیرت فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے موزوں پر کسی قید کے بغیر مسح کرنا دُرست ہے۔

ب:- فقہائے کرام نے جو شرائط موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی رکھی ہیں ان کے بارے میں مشہور مفکر فرماتے ہیں کہ:-

''میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شرائط کا مأخذ کیا ہے؟ مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔''

سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتیوں پر مسح فرمایا ہے، نسائی کے سوا کتبِ سنن میں اور مسندِ احمد میں مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور (مسح علی الجوربین والنعلین) اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابواُمامہ، سہیل بن سعد اور عمر بن حریث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، نیز حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے، بلکہ بیہقی نے ابنِ عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے، طحاوی نے اویس بن اویسؓ سے

روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا، اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے، ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر بھی مسح کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے، ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرامؓ نے مسح فرمایا وہ کس چیز کی تھیں؟

اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی مأخذ نہیں، اور فقہاءؒ چونکہ شارع نہیں اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہگار نہ ہوگا۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے موزوں پر اطمینان کے ساتھ مسح کیا جاسکتا ہے چاہے وہ اُونی ہوں یا سوتی، نائیلون کے ہوں یا کسی اور ریشے کے، چمڑے کے ہوں یا آئل کلاتھ کے اور ریگزین کے، حد یہ کہ اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

ان مفکر کے علاوہ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی اپنے فتویٰ کی کتاب جلد دوم میں یہ فتویٰ دیا ہے، اور حافظ ابنِ قیمؒ اور علامہ ابنِ حزمؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ کسی قید کے بغیر ہر قسم کے موزے پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں مستدعی ہوں کہ اپنے مصروف اوقات میں سے اس دینی مسئلے کو حل فرماکر مرسل فرمائیں، فتویٰ مدلل اور مفصل درکار ہے۔

آپ کے فتویٰ کا منتظر رہوں گا تاکہ اس اُلجھن سے نکل کر راہِ راست پاسکوں۔

منتظر الجواب

محمد طاہر غوری

چشتیاں، ضلع بہاول نگر

الجواب وباللہ التوفیق

جس قسم کے سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے آج کل رائج ہیں، ان پر مسح کرنا ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں، آپ کا خیال غلط ہے کہ اس مسئلے میں فقہاءؒ کے درمیان کوئی اختلاف ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے باریک موزوں کے بارے میں ائمۂ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

فان کانا رقیقین یشفان الماء لا یجوز المسح علیھما بالاجماع.

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۰) (۱)

پس اگر موزے اتنے باریک ہوں کہ ان میں سے پانی چھن سکتا ہو تو ان پر باجماع مسح جائز نہیں۔

اور علامہ ابنِ نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا یجوز المسح علی الجورب الرقیق من غزل أو شعر بلا خلاف، ولو کان ثخینًا یمشی معه فرسخًا فصاعدا .... فعلی الخلاف. (البحر الرائق ج:۱ ص:۱۹۲) (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جن موزوں میں "ثخین" کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، یعنی ان میں پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر محض اپنی موٹائی کی بناء پر کھڑے نہ رہ سکتے ہوں، یا ان میں ایک کوس تک بغیر جوتے کے چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح کرنا کسی بھی مجتہد کے مذہب میں جائز نہیں، ہاں! جن موزوں میں یہ تینوں شرائط پائی جاتی ہوں، ان پر مسح کے جواز و عدمِ جواز میں اختلاف ہے۔

جہاں تک جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس میں انہوں نے جمہور فقہاء کی مخالفت کر کے سخت غلطی کی ہے، آپ نے ان کے جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ آپ کے اطمینان کے لئے مسئلے کی حقیقت مختصراً عرض کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۂ مائدہ میں وضو کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں کو دھونے کا حکم دیا ہے، نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں، اور ان پر مسح کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو، یہاں تک کہ جب کسی شخص نے چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہوں اس وقت بھی مسح کی اجازت نہ ہو، لیکن چمڑے کے موزوں پر مسح کی جو اجازت باجماعِ اُمت دی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موزوں پر مسح کرنا اور اس کی اجازت دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں، اگر مسح علی الخفین کے جواز پر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں تب بھی ان کی بناء پر قرآنِ کریم کے مذکورہ صریح حکم میں کوئی تقیید دُرست نہ ہوتی، کیونکہ اخبارِ آحاد سے قرآنِ کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع ایچ ایم سعید).

یا اس کی تقیید جائز نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ مسح علی الخفین کی احادیث معنیً متواتر ہیں، اس لئے ان متواتر احادیث کی روشنی میں تمام اُمت کا اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ قرآنِ کریم کی آیت میں پاؤں دھونے کا حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان نے ''خفین'' (یعنی چمڑے کے موزے) نہ پہن رکھے ہوں، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ما قلت بالمسح حتّٰی جاءنی فیه ضوء النهار. (البحر الرائق ج:۱ ص:۱۷۳)[1]

میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہیں ہوا جب تک میرے پاس روزِ روشن کی طرح اس کے دلائل نہیں پہنچ گئے۔

چنانچہ ''مسح علی الخفین'' کا حکم اسّی (۸۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے روایت کیا ہے، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:-

وقد صرح جمع من الحفاظ بأن المسح على الخفين متواتر وجمع بعضهم رواته فجاوزوا الثمانين منهم العشرة. (نیل الاوطار ج:۲ ص:۱۷۶)[2]

حفاظ کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم متواتر ہے، اور بعض حضرات نے اس کے روایت کرنے والے صحابہؓ کو جمع کیا تو وہ اسّی (۸۰) سے متجاوز تھے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ادرکت سبعین بدریا من الصحابة کلهم کانوا یرون المسح علی الخفین.
(تلخیص الحبیر ج:۱ ص:۱۵۸[3] و بدائع ج:۱ ص۷۲)

اگر مسح علی الخفین کا حکم ایسے تواتر یا استفاضے کے ساتھ ثابت نہ ہوتا تو قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی تخصیص یا تقیید کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے تھے:-

انما یجوز نسخ القراٰن بالسنة اذا وردت کورود المسح علی الخفین فی الاستفاضة. (أحکام القراٰن للجصاص ج:۲ ص:۴۲۵)[4]

---

(۱) البحر الرائق باب المسح على الخفين ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید). وكذا فی فتح القدير ج:۱ ص:۱۲۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) نيل الأوطار للشوكانی أبواب المسح علی الخفين باب فی شرعيته ج:۱ ص:۱۵۵ (طبع مصطفٰی البابی، مصر).

(۳) وفی تلخيص الحبير باب المسح علی الخفين ج:۱ ص:۲۴۸ (طبع مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) عن الحسن البصری قال حدثنی سبعون من أصحاب رسول الله صلی الله عليه وسلم انه کان يمسح علی الخفين. وكذا فی نيل الأوطار للشوكانی أبواب المسح علی الخفين باب فی شرعيته ج:۱ ص:۱۵۵ (طبع قديم، مصر) والبحر الرائق ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۴) أحکام القراٰن للجصاص رحمه الله، ذکر الخلاف فی المسح علی الخفين ج:۲ ص:۳۴۸ (طبع سهيل اکيڈمی لاهور).

سنتِ نبویہ سے قرآنِ کریم کے کسی حکم کو منسوخ (بمعنی مقید) کرنا اسی وقت جائز ہوسکتا ہے جب وہ سنت ایسے تواتر سے ثابت ہو جیسے مسح علی الخفین ثابت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا قرآنی حکم ایسی چیز نہیں ہے جسے دو تین روایتوں کی بنیاد پر کسی خاص بات کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسا تواتر درکار ہے جیسے مسح علی الخفین کی احادیث کو حاصل ہے۔ اب ''خفین'' (چمڑے کے موزوں) کے بارے میں تو یہ تواتر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح خود بھی فرمایا اور دُوسروں کو بھی اس کی اجازت دی، لیکن ''خفین'' کے سوا کسی چیز پر مسح کرنے کے بارے میں ایسا تواتر موجود نہیں ہے۔ اور ''خفین'' چونکہ عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزوں کو کہتے ہیں، کپڑے کو موزوں کو ''خف'' نہیں کہا جاتا، اس لئے یہ اجازت صرف چمڑے ہی کے موزوں کے ساتھ مخصوص رہے گی، دُوسرے موزوں کے بارے میں قرآنِ کریم کے اصلی حکم یعنی پاؤں دھونے پر ہی عمل ہوگا۔ ہاں! اگر کپڑے کے موزے اتنے ثخین (موٹے) ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات اور اوصاف میں چمڑے کے ہم پایہ ہوگئے ہوں، یعنی نہ تو ان میں پانی چھنتا ہو، نہ انہیں کھڑا رکھنے کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت ہو اور ان کو پہن کر تین میل چل سکتے ہوں تو ایسے موزوں کے بارے میں فقہاءؒ کے درمیان اختلاف ہوگیا، بعض فقہاء نے فرمایا کہ چونکہ ایسے موزے چمڑے ہی کے معنی میں آگئے ہیں اس لئے ان پر بھی مسح جائز ہونا چاہئے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چونکہ مسح کرنا تواتر کے ساتھ صرف خفین (چمڑے کے موزوں) پر ہی ثابت ہے، اس لئے ان پر مسح کرنا دُرست نہیں، گویا موزے تین قسم کے ہوگئے:-

۱:- چمڑے کے موزے جنھیں خفین کہا جاتا ہے، ان پر مسح بالاجماع جائز ہے۔

۲:- وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں، اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں، جیسے آج کل سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے، ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں کیونکہ ایسے موزوں پر مسح کرنا ایسے دلائل سے ثابت نہیں جن کی بناء پر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑا جاسکے۔

۳:- وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بناء پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں، ان پر مسح کے جواز میں فقہاءؒ کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں، ان پر مسح کے عدمِ جواز میں مجتہدینِ اُمت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاسکتا ہے جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہوجائے جس تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز

ثابت ہے۔ لہٰذا فقہائے کرامؒ نے کپڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں لگائی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں، بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقق کے لئے لگائی ہیں، اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ان شرائط کے تحقق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟

حقیقتِ مسئلہ کی وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں جوربین (جرابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے، سارے ذخیرۂ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں، ایک حضرت بلالؓ سے مروی ہے، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے، اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے۔ حضرت بلالؓ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے، اور حضرت ابوموسیٰؓ کی ابنِ ماجہؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے، لیکن حافظ زیلعیؒ نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔ (نصب الرایۃ ج:۱ ص:۱۸۳،۱۸۴)[۱]

اور حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیث کے بارے میں تو امام ابوداؤدؒ نے بھی لکھا ہے کہ:-

لیس بالمتصل ولا بالقوی. (بذل المجهود ج:۱ ص:۹۶)[۲]

لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو خارج از بحث ہیں۔

اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث رہ جاتی ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اسے ''حسن صحیح'' کہا ہے، لیکن دُوسرے ائمۂ حدیث نے ان کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو روایت کر کے لکھتے ہیں:-

وکان عبدالرحمٰن بن مهدی لا یحدث بهٰذا الحدیث لأن المعروف عن المغیرة أن النبی صلی الله علیه وسلم مسح علی الخفین. (بذل المجهود ج:۱ ص:۹۶)[۳]

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو معروف روایتیں ہیں وہ مسح علی الخفین کی ہیں (نہ کہ جوربین پر مسح کی)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ سننِ کبریٰ میں لکھتے ہیں:-

لا نعلم أحدا تابع أبا قیس علیٰ هٰذه الروایة، والصحیح عن المغیرة أنه علیه السلام مسح علی الخفین. (نصب الرایة ج:۱ ص:۱۸۳)[۴]

یہ روایت ابوقیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی، اور ہمارے علم میں کوئی اور راوی اس کی

---

(۱) (طبع مؤسسة الریان بیروت).

(۲) دیکھئے: بذل المجهود فی حل أبی داؤد ج:۲ ص:۳۳ (طبع ندوة العلماء لکهنؤ). وکذا فی الکفایة علیٰ هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) حوالہ بالا۔

(۴) نصب الرایة لأحادیث الهدایة ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسة الریان بیروت).

تائید نہیں کرتا، البتہ حضرت مغیرہؓ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی ہے۔

اس کے علاوہ امام مسلمؒ، امام بیہقیؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ، یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ اور دُوسرے محدثین نے اس روایت کو ابوقیس اور ہزیل بن شرجیل دونوں کے ضعف کی بناء پر ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ نوویؒ شارحِ صحیح مسلم لکھتے ہیں:-

کل واحد من هؤلاء لو انفرد قدم على الترمذى مع ان الجرح مقدم على التعديل، واتفق الحفاظ علىٰ تضعيفه، ولا يقبل قول الترمذى أنه حسن صحيح. (نصب الرایۃ بحوالہ بالا)[1]

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے ہر ایک تنہا ہوتا تب بھی وہ امام ترمذیؒ پر مقدم ہوتا، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظِ حدیث اس کی تضعیف پر متفق ہیں، لہٰذا ترمذی کا یہ قول کہ یہ ''حسن صحیح ہے'' قابلِ قبول نہیں۔

یہ ہے اس حدیث کی اسنادی حیثیت جسے مولانا مودودی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ اوّل تو اکثر حفاظِ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔

دُوسرے اگر بالفرض امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اسے صحیح مان لیا جائے تو پورے ذخیرۂ حدیث میں تنہا یہ ایک روایت ہوگی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوربین پر مسح کرنا مذکور ہے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو صریح حکم دیا ہے، اسے صرف اس ایک روایت کی بناء پر کیسے چھوڑ دیا جائے؟ جبکہ ائمۂ حدیث نے اس پر شدید تنقید بھی کی ہے۔ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ مسح علی الخفین کا حکم اس وقت ثابت ہوا کہ جب اس کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچ گئیں، اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسح علی الخفین کی احادیث اتنی کثرت کے ساتھ نہ ہوتیں تو پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن مسح علی الجوربین کی احادیث متواتر تو کیا ہوتیں؟ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس کی صرف تین روایتیں ہیں، ان میں سے دو تو بالاتفاق ضعیف ہیں، اور ایک کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، صرف امام ترمذیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ ایسی روایات کی بناء پر قرآنِ کریم کے کسی حکم میں کوئی تخصیص یا تقیید پیدا نہیں کی جاسکتی، چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:-

والأصل فيه أنه قد ثبت أن مراد الأية الغسل علىٰ ما قدمنا، فلو لم ترد الأثار المتواترة عن النبى صلى الله عليه وسلم فى المسح على الخفين لما جاز لنا المسح ولما لم ترد الأثار فى جواز المسح على الجوربين فى وزن ورودها فى المسح على الخفين أبقينا

---

(۱) نصب الرایة لأحادیث الهدایة ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسة الریان بیروت).

حکم الغسل علیٰ مراد الأیة. (أحکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۴۲۸)[1]

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ آیت کی اصلی مراد پاؤں دھونا ہے، جیسے کہ پیچھے گزر چکا، لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی متواتر احادیث ثابت نہ ہوتیں تو ہم کبھی مسح علی الخفین کو جائز قرار نہ دیتے ..... اور چونکہ جوربین (کپڑے کے موزوں) پر مسح کی احادیث اس وزنی طریقے سے مروی نہیں ہیں جس وزنی طریقے سے مسح علی الخفین کی احادیث مروی ہیں اس لئے ہم نے وہاں آیتِ قرآنی کی اصل مراد یعنی پاؤں دھونے کے حکم کو برقرار رکھا ہے۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضراتِ صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی، تو ان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے، اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:-

ان الجورب یتخذ من الادیم و کذا من الصوف و کذا من القطن ویقال لکل من ھٰذا أنــہ جورب ومن المعلوم ان ھٰذہ الرخصة بھٰذا العموم .... لا تثبت الا بعد ان یثبت ان الجوربین الذین مسح علیھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانا من صوف .... الخ.

(عون المعبود ج:۱ ص:۶۲)[2]

یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اُون کے بھی اور رُوئی کے بھی، اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے، اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتی ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جوربین پر مسح فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ زیادہ تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے، اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں روایت ہے:-

حدثنا ھشیم قال أخبرنا یونس عن الحسن وشعبة عن قتادة عن سعید بن المسیب والحسن انھما قالا: یمسح علی الجوربین اذا کانا صفیقین. (مصنف ابن ابی شیبة ج:۱ ص:۱۸۸)[3]

---

(۱) أحکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ ج:۲ ص:۳۵۰ (طبع سھیل اکیڈمی لاھور).

(۲) عون المعبود باب المسح علی الجوربین ج:۱ ص:۱۸۷ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

(۳) (طبع ادارة القرآن کراچی).

حضرت سعید بن میسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح جائز ہے، بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں۔ واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز ہو، ملاحظہ ہو قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سعید بن المسیّبؒ دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، اور انہوں نے صحابہ کرامؓ کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتویٰ دیا ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے عمل اور فتویٰ سے جو بات ثابت ہوئی وہ اس سے زائد نہیں کہ جو موزے بہت موٹے ہونے کی بناء پر چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوں، ان پر مسح جائز ہے، اور اس موٹائی کی وضاحت کے لئے فقہاءؒ نے وہ تین شرائط ذکر کی ہیں کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے، دُوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں، اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر تین میل چلنا ممکن ہو، ایسے موزے چونکہ چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی اکثر فقہاءؒ نے ''مسح علی الخفین'' کی احادیث کی دلالۃ النص اور مذکورہ آثارِ صحابہ کی بناء پر ''خفین'' کے حکم میں داخل کرلیا، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:-

لا شک ان المسح علی الخف علیٰ خلاف القیاس، فلا یصلح الحاق غیرہ بہ، الا اذا کان بطریق الدلالۃ، وھو أن یکون فی معناہ، ومعناہ الساتر لمحل الفرض الذی ھو بعدد متابعۃ المشی فیہ فی السفر وغیرہ. (فتح القدیر ج:۱ ص:۱۰۹)[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسح علی الخفین کی مشروعیت خلافِ قیاس ہوئی ہے، لہٰذا کسی دُوسری چیز کو ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اِلَّا یہ کہ وہ دلالۃ النص کے طریقے پر خفین کے معنی میں داخل ہو، اور خفین کے معنی ایک ایسے موزے کے ہیں جنھوں نے پاؤں کو بالکل ڈھانپ رکھا ہو، اور ان میں سفر وغیرہ کے دوران مسلسل چلنا ممکن ہو۔

لہٰذا فقہاءؒ نے جوربین پر مسح کے لئے جو شرائط مقرّر کی ہیں، ان کی یہ تعبیر بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ حدیث میں مسح علی الجوربین کی اجازت مطلق تھی، اور انہوں نے اپنی طرف سے شرائط عائد کرکے اسے مقید کردیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُصولی اعتبار سے پاؤں دھونے کے فریضے کو چھوڑ کر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس پر احادیث متواتر موجود نہ ہوں، خفین

(۱) فتح القدیر باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں، اس لئے وہاں مسح کی اجازت دے دی گئی، لیکن جوربین پر مسح کسی ایسی حدیث سے بھی ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو، لہٰذا ان پر مسح کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی، اِلَّا یہ کہ وہ جوربین، خفین کی صفات کی حامل ہوکر خفین کے حکم میں بدلالۃ النص داخل ہوجائیں، اور چونکہ صحابہؓ و تابعینؒ سے ایسے ہی موزوں پر مسح ثابت تھا، اس لئے بیشتر فقہاء نے اس کی اجازت دی، اور ''خفین'' کی بنیادی صفات کو مذکورہ تین شرائط کے ذریعہ بیان کردیا، اور اس پر تمام ائمۂ مجتہدینؒ کا اجماع منعقد ہوگیا۔

جہاں تک علامہ ابنِ حزمؒ یا علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کا تعلق ہے، ان کا مقامِ بلند اپنی جگہ ہے، لیکن انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راہ اختیار کی ہے، جسے اُمت نے بحیثیت مجموعی قبول نہیں کیا، بالخصوص اس مسئلے میں تو انہوں نے اپنے مسلک پر کوئی دلیل بھی نہیں دی، لہٰذا پوری اُمت کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین کے مقابلے میں صرف ان تین حضرات کی رائے پر عمل کرکے پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کردینا ایک سنگین جسارت ہے۔ اور اس ''اجتہاد'' کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے کہ: ''اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو اس پر بھی مسح جائز ہے۔'' ساری اُمت کے تمام فقہاء، تمام محدثین اور تمام مجتہدین کے بارے میں تو یہ الزام ہے کہ ان کے اس قول کا کوئی مأخذ نہیں، حالانکہ ان کے ناقابلِ انکار دلائل آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اور دُوسری طرف اپنا خود ''اجتہاد'' یہ ہے کہ بلاوجہ پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر اس پر بھی مسح کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس لایعنی حرکت کی خاطر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کرنے کا بھی کوئی مأخذ ہے؟

آپ نے جناب مولانا مودودی صاحب کی جو عبارت نقل فرمائی ہے، اس میں چونکہ جوتوں پر مسح کرنے کا بھی ذکر ہے، اس لئے اس کی حقیقت بھی آخر میں مختصراً عرض ہے۔

جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں، لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

لم یذهب أحد من الأئمة الی جواز المسح علی النعلین. (معارف السنن ج:۱ ص:۳۴۷)[1]

ائمہ میں سے کوئی بھی جوتوں پر مسح کرنے کا قائل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جبکہ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے باوضو ہوتے تھے، لیکن نئی نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے، ایسی حالت میں چونکہ وضو پہلے سے ہوتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں دھونے کے بجائے اپنے جوتوں پر ہاتھ پھیر لیتے تھے، چنانچہ صحیح ابنِ خزیمہ میں روایت ہے:-

عن علیؓ أنه دعا بكوز من ماء ثم توضأ وضوأً خفيفًا مسح علىٰ نعليه، ثم قال: هٰكذا وضوء رسول الله صلى الله عليه وسلم للطاهر ما لم يحدث.

(صحیح ابن خزیمة ج:۱ ص:۱۰۰ باب۵۴ حدیث:۲۰۰)[۱]

حضرت علیؓ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا ''طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔''

اس وضاحت کے بعد ''جوتوں پر مسح'' ثابت کرنے والی روایات سے بے وضو آدمی کے لئے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا

اُمت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں، یا ان میں تین میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں، اور نہ جوتوں پر مسح دُرست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اُونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے ان پر مسح کسی حال میں جائز نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے گا تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، بلکہ کسی بھی مجتہد کے مسلک میں اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(از ماہنامہ ''البلاغ''
جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ)

(۱) (طبع المكتب الاسلامی بیروت).

نائیلون کی مروّجہ جرابوں اور سوتی جرابوں پر مسح کا حکم

سوال:- موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، ربڑ کے موزے کے علاوہ واٹر پروف موزے وغیرہ اور نائیلون کی جرابیں، سوتی جرابیں، ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ واضح طور پر صحیح ثبوت کے ساتھ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

جواب:- چمڑے یا ربڑ کے موزے اگر اتنے موٹے ہوں کہ محض اپنی موٹائی اور سختی کی وجہ سے یا لاسٹک باندھے بغیر خود کھڑے رہیں تو ان پر مسح دُرست ہے، نائیلون کی مروّجہ جرابیں پتلی ہوتی ہیں ان پر مسح دُرست نہیں۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۳/۲۲ الف)

■ ■ ■

(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾

(مسائلِ نماز)

﴿فصل فی مواقیت الصلوٰۃ﴾
(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

دارالعلوم کراچی کے نقشۂ اوقاتِ نماز میں صبحِ صادق کے وقت پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال:- محترم و واجب الاحترام مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے تقریباً ایک مہینے سے دارالعلوم کے مفتیوں کے ساتھ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے بارے میں گفت وشنید کی، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس فن کا کوئی علم ہی نہیں سوائے اندھی تقلید کے۔

جناب مولانا اشرف صاحب بیت المکرّم والے سے تین بار فون پر گفت وشنید کی، اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں وقت دے دیں کہ ہم تین آدمی اس بارے میں دلائل سے گفتگو کریں۔ مشاہدات کے لئے میں محمد اشرف جنوبی وزیرستان، علمِ جدید کے لئے احمد نفیس انجینئر، علمِ ہیئتِ قدیم کے لئے مفتی بلال صاحب، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے، بالآخر تیسری بار یہ فرمایا کہ یہ نقشۂ اوقاتِ نماز عباسی صاحب نے مرتب کیا ہے، غرضیکہ سوائے اندھی تقلید کے اور کوئی دلائل زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ہونے کے نہیں تھے۔

آخر میں یہ فرمایا کہ آپ مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے بات کریں۔

جناب محترم! آپ دونوں بھائیوں نے اور علماء حضرات کے ساتھ اندازاً تین بار مشاہدات کئے ہیں، اور آپ صاحب نے اپنے قلم سے زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب ثابت کیا ہے، پھر آپ نے اسی صبحِ کاذب کو صبحِ صادق کیسے ثابت کیا؟ غرضیکہ مشاہدات سے بھی اور حسابات سے بھی آپ دونوں بھائی زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ کاذب کے قائل ہوگئے تھے، پھر بغیر مشاہدات اور حسابات کے زیرِ اُفق پندرہ درجہ صبحِ صادق کی کیوں مخالفت شروع کی ہے؟

جناب محترم! مؤدّبانہ التماس ہے کہ بندوں کو سیدھی راہ دِکھانے کی خاطر آئندہ کے لئے

ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید چھوڑیں اور مسئلے کو صحیح حل فرمانے کی مہربانی فرمائیں، تاکہ عوام کی نمازِ فجر ضائع ہونے سے بچ جائے، اُمیدِ واثق ہے کہ دارالعلوم سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ نماز کی اپنے لکھے ہوئے اُصول کے مطابق شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں گے۔

یعنی انتہاءِ سحر پُرانے نقشوں کے مطابق، اذانِ فجر صبح صادق مفتی رشید احمد دامت برکاتہم کے مرتب کردہ حساب کے مطابق، صبحِ صادق زیرِ اُفق پندرہ درجے پر ہونے کو شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں۔

وفقکم اللہ تعالیٰ

بندہ محمد اشرف عفا اللہ تعالیٰ
جنوبی وزیرستان
۲۲ رشوال ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ تحریر کے بعد سائل کی طرف سے ذیل کا استفتاء بھی آیا)

محترم المقام واجب الاحترام مفتیان حضرات زید مجدکم، ومفتی تقی عثمانی صاحب
دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ، حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یہاں کراچی شہر میں صبح وانتہاءِ سحر و اِفطار کے نقشے چھپتے ہیں، ان نقشوں میں سحر کے وقت اور اَذانِ فجر کے مابین کوئی فرق نہیں لکھا ہے، تعجب کی بات ہے کہ انتہاءِ سحر کے وقت لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں دینا بھی شروع کردیتے ہیں، ساتھ ہی لوگ انفرادی و اجتماعی طور پر فجر کی نماز ادا کرتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے مفتیان و علمائے کرام جن کو معلوم ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں جو صبحِ صادق کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب کا ہے، لیکن پھر بھی وہ غلط نقشوں کی نشر واشاعت کر رہے ہیں۔

اب بندہ اپنے پندرہ سال کے عینی مشاہدات لکھ رہا ہے، وہ یہ کہ زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب کا وقت ہے، اور زیرِ اُفق پندرہ درجے صبحِ صادق کا وقت ہے، نیز پُرانے نقشے جو برِصغیر پاک و ہند میں چھپتے ہیں ان میں صبح وعشاء کا وقت غلط ہے، جو نقشہ صاحبِ احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب نے مرتب کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کراچی شہر میں جتنے اوقات مدارس والے یا کوئی اور چھاپتے ہیں اس میں صبحِ صادق کا وقت غلط ہے، دارالعلوم کراچی کا نقشہ بھی غلط ہے، جو صبح کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب ہے، اب آئندہ کے لئے اگر کراچی شہر کے مفتیوں اور علماء نے اس مروّجہ جنتری کے غلط ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور خود بھی عمل

نہیں کیا تو جن لوگوں کی نمازیں ضائع ہوئی ہیں ان کا وبال ان علماء پر پڑے گا۔

آپ کراچی شہر کے علماء سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع فرمائیں اور اس بارے میں عینی مشاہدات کریں، جس کی صورت یہ ہے کہ کراچی شہر سے باہر جاکر مہینے میں پانچ دن مشاہدات کئے جائیں، اس طرح آپ حضرات پر اپنی غلطی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی۔

مفتیانِ کرام کی پانچ رُکنی کمیٹی نے نقشہ مرتب کرنے کے جو دو اُصول مقرّر فرمائے ہیں:-

ا:- سال بھر عینی مشاہدات کئے جائیں، اس کے بعد نقشہ مرتب کیا جائے۔

۲:- حسابات کے مطابق نقشہ مرتب کیا جائے، لیکن اس کے لئے بھی سال بھر مشاہدات کئے جائیں۔

دارالعلوم کا مرتب کردہ نقشہ ان دونوں اُصولوں کے خلاف ہے، غرضیکہ پورے پاکستان میں شائع کئے جانے والے نقشوں میں صبحِ صادق کی جگہ صبحِ کاذب کا وقت لکھا ہے، جبکہ صبحِ صادق اور کاذب کے مابین بارہ سے بیس منٹ کا فرق ہے۔ دوبارہ التماس ہے کہ کراچی کے علماء اور مفتیان حضرات اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع کریں، میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ دُنیا کا کوئی بھی شخص زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ثابت نہیں کرسکتا اور نہ کرسکے گا، اگر کسی کو دعویٰ ہے تو وہ مشاہدے کے لئے آئے۔

بندہ محمد اشرف عفا اللہ عنہ

(سائل کو جواب میں ٹنڈوآدم کے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب کردہ درج ذیل تحریر بھی بھیجی گئی اور ساتھ ہی حضرتِ والا دامت برکاتہم نے مستقل جواب بھی تحریر فرمایا، جو اس تحریر کے بعد درج ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

صبحِ صادق

حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور وخوض کرنے کے لئے ۱۳رذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو مجلس منعقد ہوئی، جس میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم، حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے شرکت فرمائی، اس تحریر میں یہ تمام حضرات متفق تھے، اور اس میں سب حضرات کے دستخط بھی ثبت تھے، اور مفتیٔ اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اگرچہ اس مجلس میں موجود نہ تھے، مگر بعد میں حضرتؒ نے اس تحریر سے اتفاق کیا اور اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے، یہاں وہ تحریر بعینہٖ نقل کی جارہی ہے۔

الحمدللہ و کفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، اما بعد:

آج بتاریخ ۱۳؍ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ صبحِ صادق اور عشاء کے اوقات کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مجلس منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:-

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب

احقر تقی عثمانی

اس مجلس میں مولانا رشید احمد صاحب کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور کیا گیا، اور متعلقہ کتب کی مراجعت کی گئی، نیز مسئلے کی تحقیق اور مشاہدات کے لئے ٹنڈو آدم کا سفر کیا گیا، اس کے نتائج زیرِ غور آئے، بحث وتمحیص کے بعد مندرجہ ذیل باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچیں:-

۱:- مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق اور عشاء کا جو وقت لکھا ہوا ہے، وہ اس وقت کا ہے جب آفتاب اُفق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے، اس کی تصریح محکمۂ موسمیات نیول ہیڈکوارٹر کے خطوط رسالہ صبحِ صادق ص:۶۵ ج:۲ وص:۶۷ میں موجود ہے، اور ناٹیکل المینک جو گرین وچ سے شائع ہوتی ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲:- اٹھارہ درجے زیرِ اُفق فلکیات کے جدید ماہرین کی تصریحات کے مطابق وہ وقت ہے کہ مشرق کی طرف صبح کو اس سے پہلے، اور مغرب کی طرف رات کو اس کے بعد کوئی ہلکی سی روشنی بھی اُفق پر نہیں ہوتی، آخرِ شب میں جو روشنی سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے اسے اسٹرانومیکل ٹوایلائٹ کہتے ہیں۔

۳:- ہیئت کی قدیم کتابوں سے بھی قولِ راجح ومشہور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ درجہ زیرِ اُفق صبحِ کاذب کا وقت ہے، نہ کہ صبحِ صادق کا، بعض کتب میں سترہ زیرِ اُفق، اور بعض میں انیس زیرِ اُفق کے اقوال بھی بصیغۂ تمریض موجود ہیں، لیکن وہ مرجوح ہیں۔

۴:- اس مسئلے کے زیرِ غور آنے کے بعد متفرق ایام میں جتنے مشاہدات کئے گئے ان میں سے کسی میں بھی مروّجہ جنتریوں کے مطابق صبحِ صادق نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ہوئی، ان سب اُمور سے ثابت ہوتا ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق کے نام سے جو وقت لکھا گیا ہے وہ درحقیقت صبحِ کاذب کا ہے، اور غالباً روزے کے بارے میں احتیاط کے پیشِ نظر لکھا گیا ہوگا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر صبحِ صادق کا صحیح وقت کیا ہے؟ اس کا تعین دو طریقوں سے ممکن تھا، ایک مشاہدات سے، دُوسرے حسابات سے۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر

کوئی جنتری اس وقت بنائی جاسکتی ہے جبکہ سالہا سال مکمل مشاہدات کئے جائیں، اور ظاہر ہے اس کے مواقع میسر نہیں، اور جو تھوڑے بہت مشاہدات کئے گئے ان سے سال بھر کے لئے اوقات کا تعین ممکن نہیں تھا۔ دُوسرا طریقہ حسابات کا تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہٗ نے بعض ہیئت کی کتابوں کی تصریح کے مطابق پندرہ درجے زیرِ اُفق صبحِ صادق کا وقت قرار دے کر حسابات سے اس کا نقشہ بنایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے درمیان تین درجات کا فرق ہے، اور جب مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے ثابت ہوا کہ صبحِ کاذب اٹھارہ درجے زیرِ اُفق پر ہوتی ہے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیرِ اُفق پر ہوگی۔ اس بناء پر حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے صبحِ صادق کے جو اوقات نکالے ہیں ان کا مقابلہ ٹنڈو آدم کے مشاہدات سے کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ تین منٹ کا فرق نکلا، مگر یہ تین منٹ کا فرق صبحِ کاذب میں بھی تھا، اس لئے صبحِ کاذب اور صادق کے درمیان پر کوئی اثر نہیں پڑا، مفتی رشید احمد صاحب نے بارہ جون کو وہاں کے لئے چار بج کر تین منٹ صبحِ کاذب (اٹھارہ زیرِ اُفق) کا اور چار بج کر بیس منٹ صبحِ صادق (پندرہ درجہ زیرِ اُفق) کا وقت لکھا، مگر مشاہدے سے صبحِ کاذب پورے چار بجے اور صبحِ صادق چار بج کر سترہ منٹ پر نظر آئی، یہ تین منٹ کا فرق شبہے کی وجہ بن سکتا تھا، لیکن بقول حضرت مفتی صاحب مدظلہم طول وعرض نصف النہار کے پیشِ نظر اتنا فرق ہوسکتا ہے اس کے لئے مفتی صاحب کی رائے میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط ضروری ہے اور بعد میں مفتی صاحب نے دوبارہ احتیاط کے ساتھ اس تاریخ اور اس طول وعرض کا حساب نکالا تو معلوم ہوا کہ فرق صرف ایک منٹ کا تھا اور پہلے حساب میں کچھ غلطی ہوگئی تھی۔

بہرکیف! مذکورہ بالا تحقیق سے ہمیں بھی یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے جو حسابی طریقے سے اوقات نکالے ہیں اس کے مطابق نقشے بنالینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن معلوم ہوا کہ بعض دُوسرے علماء کا اس پر اطمینان نہیں ہوسکا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیرِ اُفق سے پہلے ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ ہمارے ظن غالب کی بنیاد بھی حسابات ہیں نہ کہ ایسے مسلسل مشاہدات جو کہ دائمی جنتریوں کی بنیاد بن سکیں جبکہ شریعت میں اصل مدار مشاہدات پر ہے، اور حسابی جنتریوں پر اعتماد اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ مشاہدات سے متواتر تائید ہوگئی ہو، اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقشوں میں وقتِ فجر کے لئے دو خانے الگ الگ لکھے جائیں، ایک کا عنوان ہو احتیاطی منتہاءِ سحر اور اس کے تحت قدیم معمول کے مطابق قدیم جنتریوں کے اوقات لکھے جائیں، دُوسرا عنوان ہو وقتِ اذانِ فجر اور اس میں حضرت مفتی رشید احمد کے نکالے ہوئے اوقاتِ صبحِ صادق لکھے

جائیں، دونوں کے درمیانی وقت میں نہ سحری کھائی جائے اور نہ نماز پڑھی جائے۔

احقر محمد تقی عثمانی
۱۴رذیقعدہ ۱۳۹۲ھ

اس سے اتفاق ہے اگرچہ میں حاضرِ مجلس نہ تھا
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۴رذیقعدہ ۱۳۹۲ ہجری
دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴

محمد عاشق الٰہی

رشید احمد

العبد محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

بندہ عبدالرؤف سکھروی
۲۱رشعبان ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ بالا تحریر کے علاوہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل کے استفتاء کے جواب میں باقاعدہ فتویٰ بھی تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، صبحِ صادق کے مسئلے پر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مہینوں تحقیق جاری رہی، جس میں مشاہدات بھی کئے گئے اور حسابی تحقیق بھی کی گئی، آپ نے ٹنڈو آدم کے جس مشاہدے کا ذکر فرمایا ہے وہ متعدّد مشاہدات کا ایک مرحلہ تھا، کوئی حتمی مشاہدہ نہیں تھا، اس وقت یہ بات سب پر واضح تھی کہ مطلع گرد آلود ہونے کی بناء پر اس مشاہدے کو کسی حتمی فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اس کے بعد بھی متعدّد مشاہدات کئے گئے، کتابی تحقیق بھی ہوئی، بالآخر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحبؒ دونوں نے حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق سے اختلاف اور اس پر عدمِ اطمینان کا اعلان فرمایا، اس کے بعد انہی حضرات کے حکم سے خود احقر نے ایک مفصل تحریر حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں بھیجی جس میں ان بزرگوں کے فیصلے کی وجوہ عرض کی تھیں، حضرت مدظلہم کی طرف سے اس تحریر کا کوئی جواب بھی موصول نہیں ہوا، بہرصورت یہ مسئلہ مہینوں کی محنت اور تحقیق ومشاہدے کے بعد کم از کم ہماری حد تک واضح ہوگیا، افسوس ہے کہ اس کے باوجود ہر موقع پر ٹنڈو آدم کے اس نامکمل مشاہدے کی بنیاد پر بزرگوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان حضرات کی بعد کی تحریروں، مشاہدات اور زبانی گفتگو کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا۔

بہرکیف! اگر کسی صاحب کو حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق پر ہی اعتماد ہے تو بے شک اس پر عمل فرمائیں، لیکن مذکورہ بزرگوں کے موقف کو اندھی تقلید پر مبنی قرار دینا اور ان وفات

یافتہ بزرگوں کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

والسلام
۱۴۱۷/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲)

انتہائے زوال اور ابتدائے ظہر میں فاصلے کی مقدار

سوال ۱:- انتہائے زوال اور ابتدائے ظہر میں کتنا فصل ہوتا ہے؟

۲:- زوال کی مدّت کتنے منٹ ہوتی ہے؟

جواب ۱، ۲:- زوال ایک آنی چیز ہے جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پورا ہو جاتا ہے، اور اس کے فوراً بعد ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، لہٰذا استواءِ شمس کے فوراً بعد نمازِ ظہر کا وقت آجاتا ہے، دونوں میں کوئی معتد بہ فاصلہ نہیں ہے، البتہ زوال کے اطمینان کے لئے پانچ منٹ کا احتیاطاً انتظار کر لینا چاہئے۔

وقد وقع فی عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار الٰی أن تزول الشمس ولا يخفی أن زوال الشمس انما هو عقيب انتصاف النهار بلا فصل. (شامی ج:۱ ص:۲۴۸)[۱]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

حنبلی مسلک میں زوال سے پہلے جمعہ کا وقت اور اس کی بناء پر حنفی مقتدی کے لئے حکم

سوال:- کویت میں نماز کے اوقات کا ایک کتابچہ جس کا نام "نتيجة تقويم الهجری"

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۳۷۱ (طبع سعيد). وفی فتح الملهم ج:۵ ص:۳۱۵ (طبع مكتبه دار العلوم كراچی) عن عقبة بن عامر الجهنیؓ يقول ثلٰث ساعات كان رسول الله صلی الله عليه وسلم ينهانا أن نصلی فيهن أو أن نقبر فيهن موتانا، حين تطلع الشمس بازغة حتّی ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتّی تميل الشمس وحين تضيف الشمس للغروب حتّی تغرب. رواه مسلم. وفی فتح الملهم قوله: وحين يقوم قائم الظهيرة .... الخ: هی شدة الحر فی نصف النهار، قال السندی: قال النوویؒ: الظهيرة حال استواء الشمس ومعناه حين لا يبقی للقائم فی الظهيرة ظل فی المشرق ولا فی المغرب وفی المجمع هو من قامت به دابته ووقفت يعنی ان الشمس اذا بلغت وسط السماء ابطأت حركته الٰی أن يزول فيحسب انها قد وقفت وهی سائرة لٰكن لا يظهر الر ظهوره قبل الزوال وبعده انتهٰی.

ہے، یہ کتابچہ حکومت کی طرف سے مفت مہیا کیا جاتا ہے، اوقات کے روزانہ تغیر کے ساتھ ساتھ نماز کے اوقات بھی بدلے جاتے ہیں، دو سال قبل جمعہ کی پہلی اذان ابتدائے ظہر پر کہی جاتی، اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد امام منبر پر تشریف لاتا اور خطبہ کی اذان کہی جاتی، اس مختصر وقفے میں ہم پاکستانی چار رکعت نماز ادا کرلیتے، لیکن دو سال سے حکم جاری ہے جس کی بناء پر جمعہ کی پہلی اذان ظہر سے آدھا گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور ابتدائے ظہر پر خطبہ کی اذان کہی جاتی ہے، کبھی خطیب دو منٹ پہلے ہی منبر پر تشریف لے آتے ہیں اور اذان بھی اسی وقت ہوجاتی ہے، ان حالات میں چار رکعت قبلِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- وہ لوگ حنبلی مسلک کے ہوں گے، ان کے مسلک میں جمعہ کا وقت زوال سے پہلے ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس صورت میں حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ خطیب صاحب سے اپنی مشکل بیان کرکے انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ زوال کے بعد چار رکعات کا وقت دیا کریں، اُمید ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں گے، اور اگر بالفرض وہ قبول نہ کریں تو سنتیں جماعت کے بعد ادا کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

ظہر کا وقت

سوال:- کیا ظہر کی نماز ایک بج کر ۵ منٹ پر ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ ہماری فیکٹری میں مستقل اسی وقت ظہر کی جماعت ادا کی جاتی ہے۔

جواب:- ظہر کا وقت زوالِ آفتاب کے فوراً بعد ہوجاتا ہے، اور زوالِ آفتاب کا وقت موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس کے لئے اوقات کے مفصل نقشے چھپے ہوئے عام ملتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں، چونکہ اکثر موسموں میں ایک بجے سے پہلے ہی ظہر کا وقت ہوجاتا ہے اس لئے آپ ایک بجے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

والسلام
۱۳۹۹/۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷/۳۰ الف)

کینیڈا میں عصر اور عشاء کا وقت

سوال ا:- یہاں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نمازوں کے اوقات کا چارٹ چھپا ہوا

ہے، آپ عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک کے مطابق متعین فرمادیں۔

۲:- یہاں کینیڈا میں غروبِ آفتاب کے بعد شفقِ اَحمر تو غائب ہوجاتا ہے، مگر شفقِ اَبیض رات گیارہ بجے تک یا اس سے بھی دیر تک رہتا ہے، گیارہ بجے تک کا انتظار خاصا مشکل ہے اور نمازِ عشاء اکثر رہ جاتی ہے، یہ انتظار اس لئے بھی مشکل ہے کہ صبح جلدی اُٹھنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیں کہ مغرب کے بعد جلد سے جلد عشاء کی نماز کا وقت کب شروع ہوجاتا ہے؟

جواب ۱:- عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک میں اس وقت ہوتا ہے جب زمین پر ہر چیز کا سایہ (سایۂ اصل کے علاوہ) دُگنا ہوجائے(۱)، یہ وقت مختلف موسموں میں اور مختلف مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور وہاں ماہرین سے رُجوع کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہاں مشکل ہو تو مولانا مفتی رشید احمد صاحب اشرف المدارس ناظم آباد کراچی ۴ کو لکھ کر ان سے پورا نقشہ بنوایا جائے، ان کو اس میں مہارت ہے، احقر کو مہارت نہیں۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں شفقِ اَحمر کے غروب ہوجانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرلینے کی گنجائش ہے، عملًا بقول الصاحبین فی مواقع العذر۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۰/۳۰ د)

۱:- عصر میں اصفرارِ شمس تک تأخیر
۲:- عشاء کا وقت

سوال ۱:- احناف کے مسلک پر نمازِ عصر میں جو تأخیر افضل ہے تو اس افضلیت پر گھنٹوں

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی تأخیر الظهر فی شدة الحر ج:۱ ص:۲۲، ۲۳ (طبع فاروقی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا اشتد الحر فأبردوا عن الصلٰوة فان شدة الحر من فیح جهنم. طریقِ استدلال یہ ہے کہ حجاز کی گرمی کا ابراد مثلِ اوّل پر نہیں ہوتا۔ وفیه أیضًا ج:۱ ص:۲۳ عن أبی ذرؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان فی سفر ومعه بلال فأراد أن یقیم فقال: أبرد! ثم أراد أن یقیم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أبرد فی الظهر. قال: حتّی رأینا فیئَ التلول ثم أقام فصلّی، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان شدة الحر من فیح جهنم فأبردوا عن الصلٰوة. وفی الصحیح للامام البخاریؒ ج:۱ ص:۷۶، ۷۷ (طبع قدیمی کتب خانه) حتّی ساوی الظل التلول. طریقِ استدلال یہ ہے کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے مساوی ہونے کا حاصل یہ ہے کہ عرب کے ٹیلے عموماً منبسط ہوتے ہیں، اس لئے ان کا سایہ کافی دیر میں ظاہر ہوتا ہے، اور ان کا سایہ اس وقت ایک مثل ہوتا ہے جبکہ دُوسری چیزوں کا سایہ ایک مثل سے کافی زائد ہوچکا ہو، دیگر احادیث اور مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الملهم ج:۴ ص:۲۹۷ تا ۳۰۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) و درسِ ترمذی ج:۱ ص:۳۹۵۔

(۲) وفی اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۱ (طبع ادارة القرآن کراچی) وفی البحر الشفق هو البیاض عند الامام الٰی أن قال فثبت أن قول الامام هو الأصح .... ولا یعدل عنه الٰی قولهما أو قول أحدهما أو غیرهما الا لضرورة من ضعف دلیل أو تعامل بخلافه کالمزارعة وأن صرح المشائخ بأن الفتویٰ علٰی قولهما کما فی هٰذه المسئلة وفی السراج الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبی حنیفة أحوط. (محمد زبیر حق نواز)

کے حساب سے عصر اور مغرب کے درمیان کتنا وقت ہونا چاہئے؟

۲:- مغرب کی نماز کے کتنے وقت بعد عشاء کا وقت داخل ہوتا ہے؟

جواب ا:- حنفیہ کے نزدیک عصر کی نماز اصفرارِ شمس یعنی سورج کے زرد ہونے سے پہلے تک تاخیر کرنا افضل ہے، لیکن جماعت میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ نماز ختم کرنے کے بعد اصفرار سے پہلے اتنا وقت باقی رہے کہ اگر نماز کا اعادہ کرنا ہو تو وہ بھی اصفرار سے پہلے کیا جاسکے، یہ وقت موسموں اور شہروں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس لئے گھنٹہ منٹ کے حساب سے اس کی کوئی مقدار دائمی طور پر مقرّر نہیں کی جاسکتی۔[1]

۲:- جب شفقِ اَبیض (یعنی مغربی اُفق پر سفیدی) غائب ہوجائے تو عشاء کا وقت داخل ہوجاتا ہے،[2] اس کا مدار بھی شہر کے محلِ وقوع اور موسم پر ہوتا ہے، اس لئے گھنٹہ اور منٹ کے لحاظ سے اس کی بھی دائمی مقدار نہیں بتائی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲/۱۰/۱۴۰۱ھ

نمازِ فجر میں اِسفار افضل ہے

سوال:- یہاں دیہی علاقے میں لوگ نمازِ فجر کافی دیر کرکے پڑھتے ہیں، مثلاً ۳؍ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ کو جامع مسجد جیمس آباد میں نمازِ فجر ۶:۱۵ (سوا چھ بجے پڑھی گئی) جبکہ کراچی کی نسبت طلوع و غروب میں ۵ منٹ کا فرق ہے، براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب:- نمازِ فجر حنفیہ کے نزدیک اِسفار یعنی اُجالے میں پڑھنا افضل ہے، البتہ نماز طلوعِ آفتاب سے اتنے پہلے ختم ہوجانی چاہئے کہ اگر کسی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنا پڑے تو طوالِ مفصل

---

(۱) وقتِ عصر سے متعلق دلائل گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فی الهداية ج:۱ ص:۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (مواقيت صلوٰة) وأول وقت العشاء اذا غاب الشفق واخر وقتها ما لم يطلع الفجر. وفی الشامية ج:۱ ص:۳۶۱ تحت قوله واليه رجع الامام الخ .... قال فی الاختيار الشفق البياض وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل وعائشة رضی الله عنها وعنهم قلت رواه عبدالرزاق عن أبی هريرةؓ وعن عمر بن عبدالعزيزؒ الی قوله قال العلامة قاسم فثبت أن قول الامام هو الأصح ومشٰی عليه فی البحر .... الخ. وفی اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۱ وفی البحر الشفق هو البياض عند الامام الٰی أن قال فثبت أن قول الامام هو الأصح وبهٰذا ظهر أنه لا يفتی ولا يعمل الا بقول الامام الأعظم ولا يعدل عنه الٰی قولهما أو قول أحدهما أو غيرهما الّا لضرورة من ضعف دليل أو تعامل بخلافه كالمزارعة وانٍ صرح المشائخ بأن الفتویٰ علٰی قولهما كما فی هٰذه المسئلة وفی السراج الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبی حنيفة أحوط. (محمد زبیر)

کی قراءت کے ساتھ اعادہ ہو سکے اور پھر بھی کچھ وقت بچ رہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۰/۲۷ و)

شرعی رات کی تحقیق

سوال:- شامی کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۸ میں ہے کہ النہار الشرعی صبحِ صادق سے غروب تک ہے، باقی رات ہے، بخلاف عرفی نہار کے۔ یہاں رات شرعی مراد ہے یا عرفی؟

جواب:- غروب کے ساتھ ہی شرعی رات شروع ہوجاتی ہے، لقوله تعالیٰ: **أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ**۔[۲] **ولما في رد المحتار والمراد بالغروب زمان غيبوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة في جهة الشرق قال صلى الله عليه وسلم: "اذا أقبل الليل من هٰهُنَا فقد أفطر الصائم" أي اذا وجدت الظلمة حسا في جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر أو صار مفطرًا في الحكم، لأن الليل ليس ظرفًا للصوم۔** (شامي ج:۲ ص:۸۰ اوّل كتاب الصوم)۔[۳]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/ ۲۸ الف)

عشاء میں جلدی کا حکم

سوال:- عشاء کی اذان اور نماز میں اکثر مسجدوں میں اتنی جلدی کرتے ہیں کہ مغرب کی اذان سے عشاء کی جماعت تک ڈیڑھ گھنٹہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا، تو کیا ایسی صورت میں اذان اور نماز ہوجاتی ہے؟

جواب:- ہر موسم میں مغرب اور عشاء کے درمیان فاصلہ الگ ہوتا ہے، اس کام کے لئے نقشے چھپے ہوئے ہیں، حافظ فریدالدین صاحب وکٹوریہ روڈ والے اوقاتِ نماز کا جو نقشہ چھاپتے ہیں اس

---

(۱) في الكبيرى شرح منية المصلى ص:۲۳۲ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور) ويستحب في صلاة الفجر الاسفار بها، بأن تصلى في وقت ظهور النور وانكشاف الظلمة والغلس بحيث يرمي الرامي موقع نبله عندنا خلافا للثلاثة، لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. رواه الترمذى. وفي المراقى في "حاشية الطحطاوى علىٰ مراقى الفلاح" ج:۱ ص:۲۵۲ (طبع مكتبة العلم الحديث دمشق) يستحب الاسفار وهو التأخير للاضاءة بالفجر بحيث لو ظهر فسادها اعادها بقراءة مسنونة قبل طلوع الشمس لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۲۵۴ والاسفار بالفجر مستحب سفرًا وحضرًا. وفي الدر المختار ج:۱ ص:۳۶۶ (طبع سعيد) والمستحب للرجل الابتداء في الفجر باسفار والختم به هو المختار بحيث يرتل أربعين اية ثم يعيده بطهارة لو فسد .... الخ. وفي الهداية ج:۱ ص:۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (باب المواقيت) ويستحب الاسفار بالفجر لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر.

(۲) سورة البقرة:۱۸۷.

(۳) شامية ج:۲ ص:۳۷۱ (طبع ايچ ايم سعيد). (محمد زبیر حق نواز)

کے مطابق عمل کریں۔[1]

واللہ اعلم
۲۰/۹/۱۳۹۷ھ

رمضان میں عشاء اور صبحِ صادق کا وقت

سوال:- رمضان المبارک میں عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت (یعنی اذان کا وقت) کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟ اور صبحِ صادق کا وقت کب تک رہتا ہے؟ اس مسئلے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کئی مساجد میں اوقاتِ نماز کے دو مختلف نقشے آویزاں ہیں، ان میں تقریباً اوقاتِ صبحِ صادق اور وقتِ عشاء میں ۲۰-۲۵ منٹ کا فرق ہے، اور نقشے کے نیچے یہ درج ہے کہ اس میں اوقاتِ صبحِ صادق وعشاء کی تصحیح کی گئی ہے اس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نام ہے، جبکہ عمل عموماً اس کے خلاف ہے، اب ہم کس نقشے کے مطابق اذانوں کا وقت متعین کریں؟ اور سحری کا وقت کس نقشے کے مطابق ہو؟ مفتی صاحب کا جس نقشے میں نام ہے اس میں اختتامِ سحری ۴ بج کر اُنسٹھ منٹ لکھا ہے، دُوسرے نقشے میں وقتِ سحری چار بج کر بیالیس منٹ لکھا ہے۔

جواب:- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو شروع میں اوقاتِ فجر وعشاء کے بارے میں کچھ تردّد ہوگیا تھا، لیکن آخر میں ان کا فتویٰ یہی تھا کہ قدیم نقشے دُرست ہیں، چنانچہ گزشتہ رمضان میں خود انہوں نے جو نقشہ شائع کروایا وہ قدیم نقشوں کے مطابق تھا، اب آپ کو دیکھنا ہو تو دارالعلوم نانک واڑہ سے نقشہ حاصل کرلیجئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۹/۱۲/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۳/۲۸ ج)

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا

سوال:- فجر کی اذان سحری ختم ہوتے ہی دے دی جائے تو جائز ہے؟ اور سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- احتیاط اس میں ہے کہ جب موجودہ نقشوں کے مطابق سحری کا وقت ختم ہوجائے تو فوراً نمازِ فجر نہ پڑھیں، بلکہ دس پندرہ منٹ انتظار کرکے پڑھیں تاکہ صبحِ صادق بلااختلاف ہوجائے، تاہم اگر کسی نے فوراً نماز پڑھ لی تو اس کی نماز ہوجائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/۳۰ د)

(۱،۲) اب اوقاتِ نماز کا ایک نقشہ خود حضرتِ والا دامت برکاتہم اور دیگر اکابر دارالعلوم کی زیرِنگرانی بھی تیار کیا گیا ہے، جسے مکتبہ نعمانیہ کراچی نے شائع کیا ہے، بوقتِ ضرورت اس کی طرف مراجعت بھی مناسب ہے۔ (مرتب)

صبحِ صادق کے وقت پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کی تحقیق (عربی فتویٰ)

سوال :- قال مولانا مفتی رشید أحمد ادام اللہ حیاتہ فی أحسن الفتاویٰ أن الجداول لأوقات الصلوٰت فی عامۃ المساجد لیست بصحیحۃ ونقل جھدہ وجھد علماء عصرہ بھٰذا الصدد وذکر اسمک بین ھٰذہ العلماء ونقل موافقتکم معہ فی رأیہ وذکر فی الأخر رجوعکم عن موافقۃ المذکورۃ وأسف علیٰ ھٰذا شدیدًا وقال رجعوا بغیر دلیل واستدلال وبغیر قیل وقال.

جواب :- قد وقع تحقیق مسئلۃ وقت الصبح الصادق فی زمن والدی الشیخ المفتی محمد شفیع والعلامۃ الشیخ البنوری رحمھما اللہ تعالیٰ، وکانا فی أول الأمر قد مالا الٰی رأی شیخنا المفتی رشید أحمد حفظہ اللہ تعالیٰ ولٰکن بعد المشاھدات المتوالیۃ ومراجعۃ کتب الفقہ والحساب عدلا عن رأیہ.

المشاھدۃ التی ذکرھا شیخنا المفتی رشید أحمد حفظہ اللہ تعالیٰ فھی "مشاھدۃ ٹنڈو آدم" وکانت احدی المشاھدات ما بین عدۃ مشاھدات وکان مطلع الشرق اذ ذاک مغبرا ولم یکن أحد یری أن ھٰذہ المشاھدۃ کافیۃ للوصول الی نتیجۃ حاسمۃ فلا ینبغی التعویل علیھا.

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۵/۵/۴ھ

عصر کی نماز کے لئے ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کرنا

سوال:- مشکوٰۃ شریف اور ترمذی کی ایک حدیث ہے اور اس امامتِ جبرئیل والی حدیث میں زوال کے فوراً بعد ظہر کی نماز ادا کرنے کا ذکر ہے، اور عصر کی نماز جب سایہ ایک مثل ہوگیا تو اس کے بعد عصر کی نماز ادا کرنے کا ذکر موجود ہے۔

ان صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز سایہ کے ایک مثل ہوجانے کے بعد ادا فرمائی۔

اس حدیث کی روشنی میں، نیز چونکہ ہم سب کاروباری لوگ ہیں اور غرض یہ ہے کہ ہم سب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرسکیں، اس کی بناء پر ہم نے مناسب یہ سمجھا کہ ساڑھے چار بجے عصر کی

جماعت کرائی جائے، یہ ٹائم ہم نے عصر کی جماعت کے لئے مقرّر کیا ہے، ہمارا یہ وقت مقرّر کرنا حدودِ جواز میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب:- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ گھڑیاں نہیں تھیں اس لئے اوقات کا تعین جنتری یا گھڑیوں کے حساب سے نہ تھا، بلکہ اوقات کی مختلف علامتیں مقرّر تھیں، ان علامتوں کا بیان مختلف احادیث میں آیا ہے اور اس بارے میں ایک دو نہیں، بہت سی احادیث مروی ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس سے دُگنا ہو جائے۔(۱) یہ وقت موسموں اور مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، کراچی میں عصر کا وقت کم سے کم چار بج کر آٹھ منٹ پر (۷؍دسمبر کو) ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پانچ بج کر تیئس (۱۵؍جولائی کو) ہوتا ہے۔ آج یعنی (۱۴؍مارچ کو) عصر کا وقت پانچ بج کر دو منٹ پر شروع ہوگا، اس سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز پڑھنا دُرست نہیں۔ لہٰذا آپ نے آج کل ساڑھے چار بجے کا جو وقت مقرّر کیا ہوا ہے وہ حنفی مسلک کے لحاظ سے دُرست نہیں ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اوقاتِ نماز کے جو طبع شدہ نسخے ملتے ہیں وہ اپنے پاس رکھیں اور اس میں روزانہ عصر کا وقت دیکھ کر اس کے مطابق جماعت کا وقت مقرّر فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۴/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۷/۲۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۵۹ و ۳۶۰ ووقت الظهر من زواله أی میل ذکاء عن کبد السماء الٰی بلوغ الظل مثلیه. وفیه بعد أسطر ص:۳۶۰ ووقت العصر منه الٰی قبیل الغروب وفی الشامیة تحته (قوله منه) أی من بلوغ الظل مثلیه .... الخ.

﴿فصل فی الأذان﴾
(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

اذان میں تجوید کی غلطی کا حکم

سوال:- ایک شخص اذان دیتے ہوئے بہت غلطیاں کرتا ہے، تلاوتِ قرآن شریف بھی بہت غلط پڑھتا ہے، جا بجا لحنِ جلی کرتا ہے، "حی علی الصلوٰۃ" میں حاء کو ھاء پڑھتا ہے، ایسا شخص اس منصب کے قابل ہے یا نہیں؟ فتاویٰ رشیدیہ کا مسئلہ اس بارے میں دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- مؤذّن کا تقرّر کرتے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مؤذّن صحیح خواں ہو، اور کسی قسم کا لحن نہ کرتا ہو، پھر اگر وہ ایسی غلطی کرے جو معنی بگاڑ دے تو اذان ہی نہیں ہوتی، "حی علی الصلوٰۃ" کو "ھَیَّ علی الصلوٰۃ" پڑھنے سے معنی نہیں بگڑتے، البتہ اس غلطی کی اصلاح کے بغیر مؤذّن کا تقرّر نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر تقرّر کرلیا گیا ہو تو اذان ہوجائے گی، فتاویٰ رشیدیہ[1] کا مسئلہ بالکل دُرست ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۹/۱۸ الف)

اذان سے پہلے دُرود وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ اذان سے پہلے بلند آواز سے دُرود وسلام پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے بتلائیے۔

جواب:- اذان سے پہلے بلند آواز کے ساتھ دُرود وسلام پڑھنا کسی حدیث یا صحابہ کرامؓ

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۹ (ادارۂ اسلامیات، طبع محرم ۱۴۰۸ھ)۔

کے کسی عمل سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھ کر کرنا یا اس کی پابندی کرنا بدعت ہے،(۱) بلکہ اذان کے کلمات میں اپنی طرف سے کچھ کلمات کا اضافہ کرنا ہے جو باتفاقِ اُمت ناجائز ہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۴/۱۹ الف)

جمعہ کی اذانِ ثانی کہاں دی جائے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ ثانی منبر اور خطیب کے سامنے دی جائے یا کہ مسجد کے باہر؟

جواب:- جمعہ کی اذانِ ثانی کا خطیب کے سامنے ہونا مسنون ہے، فی الدر المختار:

ویؤذن ثانیًا بین یدیه أی الخطیب، وقال تحته أی علٰی سبیل السنیة کما یظهر من کلامهم، رملی۔ (شامی ج:۱ ص:۷۷۰)۔(۲)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵۶/۱۸ الف)

---

(۱) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) لا کلام فی ان الصلٰوة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعًا لورود الأحادیث الصحیحة .... انما الخلاف فی الجهر بهما علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهٰذه الکیفیة التی جرت بها عادة المؤذنین من رفع الصوت بهما کالأذان والتمطیط والتغنی فانّ ذٰلک احداث شعار دینی علٰی خلاف ما عهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمین ولیس لأحد بعدهم ذٰلک. وفیه بعد أسطر: ومن ثم قال العلامة ابن حجر فی فتاویه الکبریٰ من صلّی علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو قال محمد رسول الله بعده معتقدًا سنّیته فی ذٰلک المحلّ ینهٰی ویمنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر ویمنع. تفصیل کے لئے "کتاب السنة والبدعة" میں ص:۱۱۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۱۶۱ (طبع ایچ ایم سعید). وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۷۱ (مکتبه شرکت علمیه، ملتان) واذا صعد الامام المنبر جلس وأذن المؤذّنون بین یدی المنبر بذٰلک جری التوارث الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۴۹ (مکتبه رشیدیه، کوئٹه) واذا جلس علی المنبر أذن بین یدیه واقیم بعد تمام الخطبة بذٰلک جری التوارث کذا فی البحر الرّائق. وفی غنیة المتملی ص:۵۶۱ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واذا جلس الامام علی المنبر أذن المؤذن بین یدیه الأذان الثانی للتوارث. (وفی طبع مکة علی الصفحة: ۳۳۱). (محمد زبیر عفی عنہ)

سیاسی مقاصد کے لئے اذان دینے کا حکم

سوال:- آج کل مساجد میں پانچ وقت کی اذانوں کے علاوہ جو اذانیں رات میں دی جارہی ہیں، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات سے اذان کے بعد جو مواقع ثابت ہیں، آج کل پانچ وقت کے علاوہ دی جانے والی اذانیں ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہوتیں،[۱] البتہ مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آئی ہو تو اس کے ازالے کے لئے فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ ثابت ہے،[۲] اور ایسے مواقع پر اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۲/۲۸)

---

(۱) نماز کے علاوہ دیگر مواقعِ اذان کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ شامیة مطلب فی المواضع التی یندب لها الأذان فی غیر الصلوٰة ج:۱ ص:۳۸۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۱۱ وان نزل بالمسلمین نازلة قنت الامام فی صلوٰة الجهر .... قنت فی صلوٰة الفجر الخ. تفصیل کے لئے فتاویٰ شامیة "مطلب فی القنوت للنّازلة" ج:۲ ص:۱۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

﴿فصل فی شروط الصلوٰۃ وأرکانہا وواجباتہا وسننہا وآدابہا﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

سمتِ قبلہ کا مطلب

سوال:- نماز پڑھتے وقت کعبہ کا تعین مغرب کی سمت میں کیا جاتا ہے، جبکہ ضروری نہیں کہ دُنیا کے ہر حصے کے لئے یہ اُصول دُرست ہو۔ اگر یہ اُصول محض اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ تمام مسلمان ایک سمت کو سجدہ کریں تو نماز میں یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ ''میرا رُخ کعبے شریف کی طرف ہے'' جبکہ ہم کو یقین ہے کہ ہمارا منہ مغرب کی طرف ہے؟

جواب:- غالباً آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام دُنیا کے مسلمان خواہ وہ کہیں آباد ہوں، نماز کے وقت مغرب کا رُخ کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں نماز کے اندر کعبہ مشرفہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ کے لحاظ سے چونکہ کعبہ مغرب کی سمت میں ہے، اس لئے یہاں کے باشندے مغرب کا رُخ کرتے ہیں، لیکن جو لوگ مغربی ممالک مثلاً یورپ اور امریکہ وغیرہ میں بستے ہیں وہ نماز کے وقت مغرب کی بجائے مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باشندے جنوب کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور جنوبی افریقہ کے لوگ شمال کی طرف۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز کعبہ ہی کا استقبال ہے، وہ جس خطے کے لحاظ سے جس سمت میں ہو، ادھر ہی کا رُخ کیا جائے گا۔

واللہ اعلم

۲۰ر ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ (۱)

حالتِ اِحرام میں جائے نماز پر سجدہ کا حکم

سوال:- لوگوں کا خیال ہے کہ حالتِ اِحرام میں ناک اور چہرہ جائے نماز سے نہیں لگنا چاہئے، بلکہ اپنے دونوں ہاتھ ملاکر سجدہ اس پر کرنا چاہئے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

جواب:- حالتِ اِحرام میں جائے نماز پر سجدہ کرنا جائز ہے، دونوں ہاتھ ملا کر ان پر سجدہ کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۷۷/۲۷ و)

ٹرین میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سفر کے دوران عصر کی نماز کے لئے خانیوال اسٹیشن تجویز کیا کہ وہاں گاڑی تقریباً ۲۰ منٹ رُکتی ہے، چونکہ گاڑی تأخیر سے چل رہی تھی، اس لئے اس شش و پنج میں رہا کہ کہیں وہاں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت تنگ نہ ہوجائے یا اس وقت تک وضو نہ ٹوٹ جائے، اس لئے گاڑی ہی میں نماز پڑھ لی، لیکن جب گاڑی خانیوال پہنچی تو عصر کا وقت اچھا خاصا تھا، میں نے گاڑی میں نماز بیٹھ کر پڑھی تھی اور خانیوال پہنچ کر اس نماز کو نہیں دُہرایا، کیا میری عصر کی نماز دُرست ہوگئی یا قضا لازم ہوگی؟

جواب:- فرض نماز شدید معذوری کے بغیر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں،(۱) لہٰذا ریل گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بناء پر اب اس نماز کا لوٹانا لازم ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴۰/۲۷ ہ)

سجدے میں پیشانی کے ساتھ ناک رکھنے سے متعلق بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق

سوال:- سجدے میں بہشتی زیور شبیری مکمل مدلل میں صفحہ نمبر ۸۹ پر تحقیقی عنوان سے ہے کہ پیشانی کے ساتھ ناک زمین پر رکھنا واجب نہیں ہے، صرف وضعِ جبہہ علی الارض سے بھی نماز دُرست ہوگی۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم نے اپنے احسن الفتاویٰ میں ناک رکھنا واجب لکھا ہے، اور اگر ناک نہ رکھے تو نماز واجب الاعادہ فرماتے ہیں۔ آپ حضرات اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں اور دلائل بھی تحریر فرمائیں۔ والسلام (حضرت مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)

جواب:- دراصل اس مسئلے میں بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں کتبِ فقہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور سے کتبِ فقہ میں وہی مسئلہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۴۲ و ص:۴۴۴ (طبع سعید) من فرائضها .... ومنها القيام فی فرض لقادر عليه، وفی الشامية تحته، قوله (لقادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر أو حكمًا كما لو حصل له به ألم شيد أو خاف زيادة المرض و كالمسائل الأتية .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۳ و ۳۹۴ سوال نمبر ۵۱۳ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

درج ہے جو بہشتی زیور میں منقول ہے، چنانچہ بدائع، تحفہ اور الاختیار میں اقتصار علی الجبہہ کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے (کما فی البحر ج:۱ ص:۳۳۶)،[۱] اور اکثر کتبِ فقہ میں اس کو مطلق مکروہ لکھا ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے: وان کان من غیر عذر فان وضع جبهته دون أنفه جاز اجماعا، ویکره .... الخ۔ (ج:۱ ص:۷۰)۔[۲]

پھر بعض فقہاء نے اس کو مکروہِ تنزیہی پر محمول کیا، چنانچہ علامہ شامیؒ نے صاحبِ نہر کا قول نقل کیا ہے: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج المستحب أن یضعهما۔ (منحة الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)۔[۳]

اور صاحبِ بحر نے کراہتِ تحریمی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے: وکره أی الاقتصار علیٰ أحدهما سواء کان الجبهة أو الأنف وهی عند الاطلاق منصرفة الی کراهة التحریم، وهٰکذا فی المفید والمزید فالقول بعدم الکراهة ضعیف۔ (ج:۱ ص:۳۳۶)۔[۴]

علامہ شامیؒ نے اسی بنیاد پر صاحبِ حلیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کراہتِ تحریم کا مقابل چونکہ واجب ہوتا ہے اس لئے وضع الانف واجب ہوا، چنانچہ فرماتے ہیں: فالأشبه وجوب وضعهما معًا وکراهة ترک وضع کل تحریما، واذا کان الدلیل ناهضا به فلا بأس بالقول به انتهٰی۔ (شامی ج:۱ ص:۳۳۵)۔[۵]

اسی عبارت کی بناء پر مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے احسن الفتاویٰ میں وجوب کے قول پر اعتماد کیا ہے،[۶] لیکن خود علامہ شامی رحمہ اللہ نے البحر الرائق کے حاشیہ پر جو بحث کی ہے اس سے ان کا رُجحان عدمِ وجوب کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہاں ان کی پوری عبارت یہ ہے:-

قال فی النهر: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج: المستحب أن یضعهما (انتهٰی). لٰکن قال الشیخ اسماعیل: وفی غرر الأذکار أن الاقتصار علی الجبهة یجوز بلا کراهة وان لم یکن علی الأنف عذرا اتفاقا، وکذٰلک فی مجموع المسائل وانه به یفتی، وفی الاختیار: وان اقتصر علیٰ جبهته جاز بالاجماع ولا اساءة بعد أن قال: فان اقتصر علی الأنف جاز وقد أساء، وقالا:

---

(۱) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) عالمگیریة (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۳) منحة الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعید).
(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۵) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۴۹۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۶) احسن الفتاویٰ ج:۳ ص:۲۱.

لا یجوز الا من عذر، انتھٰی کلامہ فلیتأمل. ویبعد ما قالہ فی النھر قول المتن وکرہ علٰی أحدھما، فانہ لا یصح حملہ علی التنزیھیۃ نظرا الی ترک السجود علی الجبھۃ لٰکن سیأتی حمل الکراھۃ علٰی طلب الکف طلبا غیر جازم. (منحۃ الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)۔[1]

اس عبارت کے آخری جملے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بنیاد منہدم کردی ہے جس کی وجہ سے سجود علی الانف کو واجب کہا گیا تھا، اور وہ یہ کہ مطلق کراہت کا اطلاق کراہتِ تحریمی پر ہوتا ہے جس کا مقابل واجب ہے۔ منحۃ الخالق میں ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ کراہت کا اطلاق طلب الکف طلبا غیر جازم پر بھی ہوتا ہے، جو کراہتِ تنزیہی کو بھی شامل ہے۔

علامہ شامیؒ کی اس رائے سے بہشتی زیور کی تائید ہوتی ہے، اور یہ اس لئے بھی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو اس سے فقہاء کے مختلف اقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے، دُوسرے منحۃ الخالق، رد المحتار کے بعد لکھی گئی ہے، لہٰذا یہ ان کا آخری مسلک ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ رد المحتار سے جو وجوب سمجھ میں آتا ہے، اس پر عمل زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۷۳/۲۸ ج)

امام کا تکبیر کے وقت بیٹھے رہنا اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑا ہونا

سوال:- جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب بیٹھے رہتے ہیں، اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صحیح طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کی ابتداء ہی میں تمام مقتدی کھڑے ہوکر صفیں دُرست کرلیں، اور بعض مقامات پر جو رواج ہوگیا ہے کہ امام اور مقتدی باہر سے آکر بیٹھ جانے کا اہتمام کرتے ہیں اور ''حی علی الفلاح'' سے پہلے کھڑا ہونے کو بُرا جانتے ہیں، یہ طرزِ عمل دُرست نہیں۔ فقہاء نے جو لکھا ہے کہ ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوجانا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کہنے کے بعد کوئی بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ پہلے کھڑا ہونا ناجائز ہے۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل جواہر الفقہ[2] مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں موجود ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف رُجوع فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ و)

---

(۱) منحۃ الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴.

تکبیر کے دوران نمازی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- ایک مولوی صاحب نے وسیع طبع شدہ چارٹ لگایا جس میں اقوالِ نبویؐ، اقوالِ صحابہؓ اور مسلکِ بزرگانِ دین سے یہ ثابت کیا ہے کہ تکبیرِ اُولیٰ کے وقت بیٹھنا مستحب ہے، اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- درحقیقت مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا تکبیر کے کسی لفظ کے ساتھ تعلق نہیں ہے، بلکہ جس وقت مقتدی امام کو آتا دیکھیں اس وقت سے لے کر مکبّر کے "حی علی الفلاح" کہنے تک کسی بھی وقت کھڑے ہوسکتے ہیں، ہاں! اس کے بعد کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ "حی علی الفلاح" سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، جو لوگ اس سے پہلے کھڑے ہوتے ہیں وہ کسی مکروہ عمل کا ارتکاب نہیں کرتے۔

مسند عبدالرزاق کی ایک حدیث میں ہے: عن ابن جريج عن ابن شهاب ان الناس كانوا ساعة يقول المؤذن: الله أكبر يقومون الى الصلوٰة فلا يأتي النبي صلى الله عليه وسلم مقامه حتى تعتدل الصفوف (فتح الباری)[1]۔ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فأما اذا كان الامام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذٰلک الصف، واليه مال شمس الأئمة الحلواني والسرخسي وشيخ الاسلام خواهر زاده، وان كان الامام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأوا الامام۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۴۴)[2]۔

اور جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر سب کھڑے ہوجائیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر کوئی شخص بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔[3]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۵۴۷/۲۲ الف)

---

(۱) فتح الباري، كتاب الأذان، باب متى يقوم الناس اذا رأوا الامام عند الاقامة، ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع دار نشر کتب الاسلامیه لاهور).

(۲) فتاویٰ عالمگیرية ج:۱ ص:۵۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۳) تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

تکبیر کے دوران مقتدی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- تکبیر کے وقت مقتدیوں کو "حی علی الصلوٰۃ" تک بیٹھنا ہے یا اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا چاہئے، اور اگر پیش امام بیٹھا ہے اور مقتدی بھی کافی تعداد میں یا ایک دو افراد کھڑے ہوں تو ان کو زبردستی بٹھلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا بہتر ہے، کوئی شخص "حی علی الفلاح" کہنے تک بھی کھڑا ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے کھڑے ہونے کو بُرا سمجھنا اور اہتمام کرکے لوگوں کو بٹھانا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۷۷/۱۹ الف)

نماز کے لئے کیسا لباس پہننا ضروری ہے؟ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال:- لباسِ مسنونہ کون سا لباس ہوسکتا ہے؟ کیا نماز میں امام اور مقتدی کا لباس ایک جیسا ہونا چاہئے؟ کیونکہ دونوں نمازی ہیں، یا الگ الگ ہیں جیسا کہ بعض لوگ امام کے لئے عمامہ ضروری تصوّر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسنون ہے، تو پھر امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ مولانا احتشام الحق صاحب ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- نماز کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص وضع کا لباس شرط نہیں ہے، بلکہ ہر اس لباس میں نماز ہوجاتی ہے جس سے ستر عورت پورا ہوجاتا ہو، البتہ جو پاجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکا ہوا ہو یا ایسا لباس ہو جس میں غیر مسلم قوم کی مشابہت ہے تو اس کے ساتھ نماز مکروہ ہے،[2] فاسد پھر بھی نہیں ہوتی۔ اور عمامہ نہ امام کے لئے شرط ہے، نہ مقتدی کے لئے، کپڑے کی ٹوپی ہو یا کھال کی یا کسی اور چیز کی، ہر قسم کی ٹوپی سے نماز بلاکراہت جائز ہوجاتی ہے۔ جو لوگ عمامے کو امامت کے لئے شرط قرار

---

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی المشکوٰۃ ج:۱ ص:۷۵ قال علیہ السلام: ان اللہ لا یقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ. رواہ الترمذی (فی ج:۱ ص:۸۷). وقال الطحطاوی علی المراقی (فی المکروھات) ص:۱۸۹ وکذا ما ھو عادۃ أھل التکبر.

دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، البتہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت عمامہ زیبِ سر فرماتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع میں عمامہ باندھنا اور عمامے سے نماز پڑھنا افضل اور زیادہ موجبِ ثواب ہے، لیکن اس کے بغیر بھی نماز بلاکراہت صحیح ہوجاتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۰۵ ج)

ایک طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

سوال:- امام کے آخری قعدے میں بیٹھ کر دائیں جانب سلام پھرانے کے بعد ایک مقتدی نے اللہ اکبر کہہ کر امام کو لقمہ دیا، لقمے کی آواز سے امام ٹھٹھک گیا، بائیں طرف سلام نہ پھرا کر کھڑے ہوکر سوال کیا کہ نماز پوری نہیں ہوئی؟ اکثر مقتدیوں نے کہا کہ نماز پوری ہوگئی، لقمہ دینے والے نے غلطی کی۔ کیا بائیں طرف نہ پھرانے سے نماز تمام ہوجائے گی یا اعادہ ضروری ہے؟

جواب:- نماز کے اختتام پر دونوں طرف سلام پھیرنا اصح قول کی بناء پر واجب ہے، (اگرچہ بعض فقہاء نے دُوسرے سلام کو سنت بھی کہا ہے) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں امام نے ترکِ واجب کا ارتکاب کیا، جس کا حکم یہ ہے کہ نماز کی فرضیت تو ساقط ہوگئی لیکن وقت کے اندر اندر نماز کا اعادہ واجب تھا، اب جبکہ وقت بھی گزر چکا اور ان مصلیوں کا اجتماع نہ رہا تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، البتہ امام کو اس غلطی پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے۔

قال فی الدر المختار: ولفظ السلام مرتین، فالثانی واجب،[2] وفی مراقی الفلاح (فی بیان حکم الواجب فی الصلٰوۃ) (واعادتها بترکه عمدا) وسقوط الفرض ناقصا ان لم یسجد ولم یعد، وقال الطحطاوی تحت قوله (واعادتها بترکه عمدا) أی ما دام الوقت باقیا وکذا فی السهو ان لم یسجد له وان لم یعدها حتّی خرج الوقت تسقط مع النقصان وکراهة التحریم، ویکون فاسقًا اٰثمًا، وکذا الحکم فی کل صلٰوۃ أدیت مع کراهة التحریم، والمختار أن المعادة

(۱) وفی عمدة الرعایة علی هامش شرح الوقایة کتاب الصلٰوۃ ج:۱ ص:۱۶۹ (طبع سعید) وقد ذکروا أن المستحب أن یصلی فی قمیص وازار وعمامة ولا یکره الاکتفاء بالقلنسوة ولا عبرة لما اشتهر بین العوام من کراهة ذٰلک وکذا ما اشتهر أن الموتم لو کان معتما بعمامة والامام مکتفیا علی القلنسوة یکره .... الخ.

(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع سعید).

لترک واجب نفل جابر والفرض سقط بالأولیٰ. (الطحطاوی علی المراقی ص:۱۳۴ فی فصل بیان الواجب)۔[۱]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نماز میں ثناء اور دُرود شریف پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

سوال:- نماز میں ثناء، دُرود شریف، دُعا وغیرہ کا پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

جواب:- نماز میں ثناء، دُرود شریف اور اس کے بعد کی دُعا سنن مؤکدہ میں سے ہے۔

لما فی الدر المختار وسننها .... الثناء والتعوّذ .... والصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم والدعاء۔[۲] اور ”وسننها“ کے تحت صاحبِ درمختار لکھتے ہیں: ترک السنة لا یوجب فسادًا ولا سهوا بل اسائة لو عامدًا غیر مستخف .... الخ۔[۳] اور یہ تعریف سنتِ مؤکدہ کی ہے، کما یظهر من کلام الشامیؒ۔ (ج:۱ ص:۳۱۸ و ۳۱۹)۔[۴]

اس کے علاوہ فقہاء جب نماز کی سنت مطلق بولتے ہیں تو اس سے مؤکدہ ہی مراد ہوتی ہے، سنن زوائد یا سننِ غیر مؤکدہ کو عموماً آداب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

والله سبحانه اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه). وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۴ وأما الذی هو عند الخروج من الصلوٰة فلفظ ”السلام“ عندنا، وعند مالک والشافعی فرض، والکلام فی التسلیم یقع فی مواضع فی بیان صفته أنه فرض أم لا وفی بیان قدره .... (وقال بعد أسطر:) ولنا ما روی عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه أنه قال: صلیت خلف رسول الله صلی الله علیه وسلم وخلف أبی بکرؓ و عمرؓ وکانوا یسلمون تسلیمتین عن أیمانهم وعن شمائلهم وروی عن علی انّه قال: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یسلّم تسلیمتین .... وأما الأحادیث فالأخذ بما روینا أولیٰ، لأن علیا وابن مسعود کانا من کبار الصحابة وکانا یقومان بقربه صلی الله علیه وسلم .... الخ. وکذا فی عامة کتب الفقه الحنفی.
نیز دونوں سلام کے وجوب سے متعلق محدثانہ کلام کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب درسِ ترمذی ج:۲ ص:۶۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ تا ۴) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۳ – ۴۷۷ (طبع سعید). وفی تبیین الحقائق ج:۱ ص:۲۸۶ (طبع سعید) وسننها رفع الیدین للتحریمة .... والثناء والتعوّذ .... والصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم والدعاء یعنی بعد التشهد فی القعدة الأخیرة لقوله علیه السلام: اذا صلّی أحدکم فلیبدأ بالثناء علی الله تعالیٰ ثم بالصلوٰة ثم بالدعاء. وقال الشافعی رحمه الله: الصلوٰة علی النبی فرض .... ولنا أنه علیه السلام علم الأعرابی فرائض الصلوٰة ولم یعلمه الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم. وفی شرح العنایة علی الهدایة علی هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۳۴۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وبالسنة ما فعله رسول الله صلی الله علیه وسلم بطریق المواظبة ولم یترکها الا لعذر کالثناء والتعوّذ وتکبیرات الرکوع والسجود، وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع سعید).

تسمیہ، سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال:- تسمیہ، الحمد سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

جواب:- ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/ ۱۸ الف)

باجماعت نماز ادا کرنا سنت ہے یا واجب؟

سوال:- نماز باجماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا واجب؟
نیز سفر کے دوران نماز باجماعت کا اہتمام ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب ہے،[2] اور سفر میں اگر جماعت سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں ساتھیوں سے بچھڑنے کا خطرہ ہو یا سواری کی روانگی کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں جماعت کے بغیر اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے۔ وفی بدائع الصنائع (ج:۱ ص:۱۵۳): وأمّا المسافرون فالأفضل لهم أن يؤذنوا ويقيموا ويصلّوا بجماعة، لأن الأذان والاقامة من لوازم الجماعة المستحبة والسفر لم يسقط الجماعة فلا يسقط ما هو من لوازمها .... الخ۔[3] تاہم حتی الامکان جماعت ہی سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵/ ۵۸)

---

(۱) وفی غنية المتملى ص:۳۰۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) (يسمى) أى يقرأ بسم الله الرحمٰن الرحيم (فيأتى بها) أى بالتسمية (فى أول كل ركعة). وفى الهندية ج:۱ ص:۷۴ (طبع رشيديه كوئٹه) ويأتى بها فى أول كل ركعة وهو قول أبى يوسفؒ وفى الحجة وعليه الفتوىٰ. وفى التنوير مع شرحه باب صفة الصلوٰة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع سعيد) وكما تعود سمّٰى سرًا فى أول كل ركعة.

(۲) وفى الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۲ (طبع سعيد) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدى أرادوا بالتأكيد الوجوب الا فى جمعة وعيد فشرط .... الخ. وفى رد المحتار تحت (قوله قال الزاهدى) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الاتى وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة، وفى النهر عن المفيد الجماعة واجبة وسنة لوجوبها بالسنة .... الخ.

(۳) وفى الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۴ – ۵۵۶ فتسن أو تجب (الجماعة) على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلوٰة بالجماعة من غير حرج، فلا تجب على مريض .... وارادة سفر. وفى الشامية تحت قوله (وارادة سفر) أى واقيمت الصلوٰة ويخشٰى ان تفوته القافلة بحر، واما السفر نفسه فليس بعذر كما فى القنية.
نیز جماعت کے "سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب" ہونے کے مطلب سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۳۳ تا ۵۳۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں

(نیتِ اِستقبالِ قبلہ کی مختلف صورتوں کا تفصیلی جائزہ اور ان کا حکم)

سوال:- زید اِستقبالِ خانہ کعبہ کی نیت سے نماز شروع کرتا ہے، کیا اس کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ علامہ شامیؒ نے تذبذب میں ڈال دیا ہے، کیونکہ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ج:۱ ص:۳۳۲ سے راجح و صحیح جواز معلوم ہوتا ہے:-

اما علی القول الراجح من انه لا یشترط نیتها فلا یضره نیة غیرها بعد وجود الاستقبال الذی هو الشرط .... فما ذکره الشارح تبعًا للبحر والحلیة صحیح.[۱]

اور اس کے بعد عبارت نمبر۲ جو شرح منیہ سے نقل فرمائی ہے کہ:-

ان نیة القبلة وان لم تشترط لٰکن عدم نیة الاعراض عنها شرط وعلیه فهو مفرع علی الراجح۔[۲] سے معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول عدمِ جواز کا ہے، لہٰذا براہِ کرم محقق مفتیؒ بہ جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب:- بیشتر فقہاء نے مسئلہ یہی لکھا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ نماز میں اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، لیکن اِستقبالِ قبلہ کی نیت ضروری نہیں، بغیر نیت اِستقبال ہوجائے گا، تب بھی نماز دُرست ہوگی۔ خود شارحِ منیہ نے بھی یہ مسئلہ ذکر کر کے اس کو صحیح قرار دیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

وقال صاحب الهدایة فی التجنیس نیة الکعبة لیست بشرط فی الصحیح من الجواب لأن استقبال القبلة شرط فلا یشترط فیه النیة کالوضوء انتهٰی. وهٰذا لأن الشروط یراعی وجودها تبعًا لا وجودها قصدًا لأنها وسائل لیست بمقصودة بالذات. (کبیری شرح منیة)۔[۳]

البتہ آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں لیکن عدم نیۃ الاعراض عن القبلۃ شرط ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اعراض عن القبلۃ کی نیت کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ علامہ شامیؒ نے ان کا یہ قول محتمل طریقے سے نقل فرمایا ہے، اس لئے تردّد ہوتا ہے، لیکن علامہ ابراہیم حلبیؒ شارحِ منیہ کی عبارتیں دیکھنے کے بعد ان کے قول کا جو منشاء سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلے کی چند صورتیں ہیں:-

---

(۱، ۲) رد المحتار ج:۱ ص:۴۲۵ (طبع سعید).

(۳) غنیة المتملی ص:۲۱۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

۱:- اِستقبالِ قبلہ بھی ہو اور اس کی نیت بھی ہو، یہ بالاتفاق دُرست ہے۔

۲:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت کچھ نہ ہو، اس صورت میں راجح قول کی بناء پر نماز دُرست ہے، **کما مرّ قول شارح المنیة عن صاحب الهدایة وهو الذی اختاره فی تنویر الأبصار والدر المختار۔**

۳:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت غیرِ قبلہ کی ہو، اس معنی میں کہ وہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اور چیز کو قبلہ سمجھ کر اس کا رُخ کرنا چاہتا ہو، یہ وہ صورت ہے جس میں شارحِ منیہ نے نماز کو فاسد کہا ہے۔

کمن توجه الی الرکن الیمانی ناویًا الصلوٰة الی بیت المقدس فان نیة القبلة وان لم یشترط الا ان عدم نیة الاعراض عنها شرط. (کبیری ص:۲۲۲)۔[1]

اس پر قیاس کرکے انہوں نے یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:-

ان نوی المصلّی یعنی وقت الشروع ان قبلته محراب مسجده لا تجوز صلوٰته لأنه علامة علٰی جهة القبلة. (بحوالہ مذکورہ)۔[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فسادِ صلوٰۃ کی صورت یہ ہے کہ محراب کی طرف اس خیال سے رُخ کرے کہ قبلہ یہی ہے۔ اس پر علامہ شامیؒ نے اس صورت کو بھی قیاس فرمایا ہے کہ کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے تو اس کا بھی حکم یہی ہوگا۔ لیکن مقیس علیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اس وقت ہے جب وہ عرصۂ کعبہ سے صراحۃً اعراض کرنے کی نیت کرے اور محض بناء و جدران کو قبلہ سمجھے، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہو کہ اگر یہ پتھر اس مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو وہی قبلہ ہوں گے اور انہی کا استقبال کیا جائے گا، تب اس کی نماز فاسد ہوگی، لیکن ظاہر ہے ایسا خیال کرنا بہت بعید ہے۔

۴:- چوتھی صورت اس سے خودبخود نکل آئی اور وہ یہ کہ کوئی شخص کسی مسامت قبلہ چیز کے اِستقبال کی نیت کرے، نہ اس وجہ سے کہ وہ قبلہ ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جہتِ قبلہ کی علامت ہے تو اس صورت میں نماز ہوجائے گی، مثلاً محراب کے اِستقبال کی نیت کرے، لیکن مقصد یہ نہ ہو کہ محراب، قبلہ ہے، بلکہ یہ ہو کہ قبلہ کی علامت ہے۔ تو درحقیقت یہ اِستقبالِ محراب کی نیت نہیں ہوگی بلکہ اس کو اِستقبالِ قبلہ کی نیت ہی کہا جائے گا، اس لئے نماز جائز ہوگی۔

کما یفیده قول المنیة ان نوی المصلّی ان قبلته محراب مسجده .... الخ. وقوله

(۱، ۲) غنیة المتملی ص:۲۲۳ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

لأنه علامة على جهة القبلة .... الخ۔[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ قبلہ ہے، بلکہ اس لئے کہ قبلہ کی علامت ہے تو بلاشبہ اس کی نماز دُرست ہوگی۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی شخص نماز میں کعبہ کا رُخ کرنے کی نیت کرے تو اس کی نماز دُرست ہوگی، کیونکہ اس نیت کا مفہوم عرفاً یہی ہے کہ مقصود اِستقبالِ قبلہ وکعبہ ہے، اور خانۂ کعبہ کو عرف میں لفظ کعبہ ہی کے لئے بولتے ہیں، نیز اگر اس سے بناءِ کعبہ ہی مراد ہو تب بھی اس کے اِستقبال کی نیت بوجہ علامت ہونے کے ہے، نہ کہ بوجہ قبلہ ہونے کے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بناء کے پتھر وہاں سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو یہ مصلّی ان کا اِستقبال نہیں کرے گا لہٰذا اس کی نماز دُرست ہے، ہاں! اگر کوئی شخص ان پتھروں کو قبلہ سمجھے اور ان کے اپنی جگہ سے ازالے کے بعد انہی کی طرف رُخ کرنے کا قائل ہو تو اس کی نماز دُرست نہیں ہوگی، وھٰذا لا یتصوّر فی مسلم۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۲۹ الف)

بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران کھڑے ہوجانا

سوال:- نماز بیٹھ کر پڑھنے کے دوران ایک رکعت کے بعد طاقت محسوس کی تو اَب کھڑے ہوجانا دُرست ہے یا نہیں؟ اور بیٹھے ہوئے پڑھنے میں حرج تو نہیں؟

جواب:- نفلوں میں اس طرح کرنا بہتر ہے، اور اگر فرض مجبور ہوکر بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اور طاقت آگئی تو کھڑا ہونا فرض ہے۔[2]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۲۷ الف)

---

(۱) غنیة المتملی ص:۲۲۳ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

(۲) وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۹ ولو افتتحها قاعدًا للعجز يركع ويسجد فقدر على القيام بنٰى قائمًا عند الشيخين .... الخ.

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾
(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

امامت کی نیت کا طریقہ

سوال:- اگر کسی کو امام بنادیا جائے تو اس کو امامت کی نیت کس طرح کرنی چاہئے؟

جواب:- بس یہ نیت کرلیں کہ میں ان تمام لوگوں کی امامت کر رہا ہوں جو میری اقتداء کریں۔ نیت، زبان سے ہونی ضروری نہیں، دِل میں یہ ارادہ کرلینا کافی ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۲/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶/۲۸ الف)

امام کے شرعی اوصاف

سوال:- ایک امام جو تمام اوقات کی نماز پڑھاتا ہو، اس کے شرعی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ کیا اس میں جسمانی اعضاء کا بھی لحاظ ہے؟ مثلاً جس شخص کا ہاتھ پیدائشی طور پر مفلوج ہو، یا پیدائشی چھوٹا ہو اور وہ تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک نہ لے جاسکتا ہو، کیا اس عذر کا شخص نماز پڑھانے کا اہل ہے؟

جواب:- سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ امام، بارگاہِ خدواندی میں مسلمانوں کی درخواست پیش کرنے کے لئے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے شریعت کی طرف سے اس کے کچھ مخصوص اوصاف مقرّر کئے گئے ہیں، تاکہ یہ نمائندہ مسلمانوں کے شایانِ شان ان کی نمائندگی کرسکے۔ ان اوصاف میں سے بعض تو لازمی ہیں، اور جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اور بعض اوصاف ایسے ہیں کہ ان کے بغیر نماز ہوجاتی ہے، مگر مکروہ رہتی ہے، اور بعض اوصاف صرف مستحسن اور پسندیدہ ہیں، ان کے بغیر نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی، مگر بہتر یہ ہے کہ امام اسی شخص کو بنایا جائے جس میں یہ اوصاف بھی موجود ہوں۔

---

(۱) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۱۵ (طبع سعید) و عالمگیریة ج:۱ ص:۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

لازمی اوصاف جن کے بغیر مقتدیوں کی نماز ہی نہیں ہوسکتی، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- امام مسلمان ہو، بالغ ہو، دیوانہ نہ ہو، نشے میں نہ ہو۔

۲:- نماز کا طریقہ جانتا ہو۔

۳:- نماز کی تمام شرائط وضو وغیرہ اس نے پوری کر رکھی ہوں۔

۴:- کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو، جس کی وجہ سے اس کا وضو قائم نہ رہتا ہو، مثلاً مسلسل نکسیر وغیرہ (ایسے شخص کو فقہاء معذور کہتے ہیں، ایسا شخص اپنے جیسے معذور کی امامت تو کرسکتا ہے، مگر تندرست لوگوں کا امام نہیں بن سکتا)۔

۵:- رُکوع اور سجدے پر قادر ہو، اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ رُکوع سجدے پر قادر نہ ہو تو تندرست لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا۔

۶:- گونگا، توتلا یا ہکلا نہ ہو۔[1]

اور دُوسری قسم کے اوصاف جن کے بغیر نماز مکروہ رہتی ہے، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صالح ہو، یعنی کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔

۲:- فاسد العقیدہ نہ ہو۔

۳:- نماز کے ضروری مسائل سے واقف ہو۔

۴:- قرآنِ کریم کی تلاوت صحیح طریقے سے کرسکتا ہو۔

۵:- کسی ایسے جسمانی عیب میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی پاکیزگی مشکوک ہوجائے، یا لوگ اس سے گھن یا اس کا استخفاف کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے نابینا، مفلوج، ابرص وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خلافِ اَولیٰ قرار دیا ہے، لیکن یہ کراہت اسی وقت ہے جب اس سے بہتر دُوسرا امام مل سکتا ہو، اگر اس سے بہتر نہ مل سکے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ (شامی ج:۱ ص:۵۲۳ تا ۵۲۵)[2]

یہ تمام اوصاف تو قانونی انداز کے تھے، ان کے علاوہ چونکہ امامِ مسجد اپنے محلے کا دینی مرکز اور ایک طرح سے مربی بھی ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مندرجہ ذیل مزید اوصاف اس میں پائے جاتے ہوں:-

حاضرین میں علمِ دین اور تلاوتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلند رُتبہ ہو۔

خوش اخلاق، شریف النسب، باوقار اور وجیہ ہو۔

---

(۱) یہ تمام اوصاف رد المحتار لابن عابدین الشامیؒ ج:۱ ص:۵۵۷ تا ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) میں موجود ہیں۔

(۲) شامی ج:۱ ص:۵۶۰ - ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید).

صفائی، ستھرائی، تقویٰ اور طہارت کا خیال رکھتا ہو۔
مستغنی طبیعت رکھنے والا اور سیر چشم ہو، اور محلے کی دینی تربیت کے لئے جتنے اوصاف کی ضرورت ہے، وہ اس میں پائے جاتے ہوں۔

محلے کی مساجد میں امام کا انتخاب کرتے وقت ان اوصاف کی رعایت کرلی جائے تو محلے میں ایک نہایت خوشگوار دینی ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔ جس شخص کے ہاتھ اتنے چھوٹے ہوں کہ وہ کانوں تک نہ پہنچتے ہوں تو اگر اس میں کوئی اور عیب نہیں ہے تو اس کے پیچھے بلاکراہت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

۲۵ محرم ۱۳۸۷ھ (۱)

جس کا علم زیادہ ہو، اسے امام بنانا افضل ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو اُستاذ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے ہیں، ایک اُستاذ مقامی ہیں، جو کہ صرف عالم ہی ہیں، دُوسرے غیر مقامی ہیں جو کہ عالم، قاری اور حافظ بھی ہیں۔ مقامی اُستاذ صرف بچیوں کو پڑھاتے ہیں، دُوسرے اُستاذ بچوں کو سارا دن صبح شام پڑھاتے ہیں، جبکہ نمازیں اور جمعہ کی نماز مقامی اُستاذ پڑھاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے نماز اور جمعہ پڑھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔

جواب:- ان دونوں میں سے جن کا علم زیادہ ہو، خاص طور سے نماز کے مسائل سے جو صاحب زیادہ واقف ہوں اور جن کے علم وتقویٰ پر لوگ زیادہ اعتماد کرتے ہوں، ان کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے، (۲) ویسے جائز دونوں کی امامت ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱/۷/۲۹ ب)

شرعی مسئلے کو نہ ماننے والے کی امامت کا حکم

سوال:- زید کسی جامع مسجد میں امام ہے، اس میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جملہ مقتدی اس سے ناراض ہیں، ناراضگی دُنیوی کاموں پر ہے، سوائے متولّی کے جو کہ اس

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفی الدر المختار (باب الامامة ج: ۱ ص: ۵۵۷) والا حق بالامامة تقديما بل نصبا الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... ثم الأورع .... الخ. وفی الهندية (الباب الخامس فی الامامة الفصل الثانی ج: ۱ ص: ۸۳) الأولى بالامامة أعلمهم بأحكام الصلوٰة هكذا فی المضمرات، وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة .... قدر ما تقوم به سنة القراءة ولم يطعن فی دينه.

سے مجبور ہے، اس ناراضگی کی وجہ سے محلے کے لوگوں نے اسے لاٹھی بھی ماری، پھر بھی وہ پیش امام ہے۔

۲:- مقتدیوں پر بہتان اور ان کے عیوب کو افشاء کرنا اس پیش امام کی عادت ہے۔

۳:- غرور سے اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگر نماز میں کوئی خلل واقع ہو، خود نہیں جانتا، اور اگر مقتدی کسی صاحبِ علم سے مسئلہ تحقیق کر کے بتائیں تو ان کی باتوں کو نہیں مانتا، علماء کو غلط کہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا امام امامت کا حق دار ہے یا اس کو مسجد سے نکال دیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں، یعنی امام خود عالم نہیں ہے اور علماء کے بتائے ہوئے مسئلے کو مانتا نہیں اور مسلمانوں پر بہتان لگاتا ہے تو اسے مقتدیوں کی امامت سے الگ ہوجانا چاہئے، کیونکہ حدیث میں ایسے شخص کی امامت پر اصرار کرنے پر وعید آئی ہے۔[1] اگر وہ خود مستعفی نہ ہو تو متولیٔ مسجد کو بھی اختیار ہے کہ وہ اسے معزول کردے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۷۰ ج)

بدکردار شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ۱:- ایک شخص جو کچھ خفیہ اور اندرونی کوششوں کے ذریعے سے محکمۂ اوقاف کو جل دے کر ایک جامع مسجد میں خطیب اور امام کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۲:- اس شخص کو جس نے خود کو مصنوعی طور پر عالم اور قاری مشہور کر رکھا ہے، مسجد میں کم وبیش ایک سال کا عرصہ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں متعدد نمازیوں کو اس شخص کے علم وفضل، رفتار وگفتار اور کردار واخلاق کے بارے میں قابلِ اعتراض شہادتیں فراہم ہوچکی ہیں، بایں وجہ ایک کثیر تعداد نمازیوں کی اس شخص کی وجہ سے مسجد کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور دُور دُور جاکر فریضۂ نماز ادا کرنے کی زحمت اُٹھا رہی ہے۔ ۳:- یہ شخص تلاوتِ قرآن مجید کے دوران فاسد قسم کی غلطیاں کرتا ہے اور ارکانِ نماز پوری طرح ادا نہیں کرتا اور لوگوں کو غلط مسائل اور فتوے دیتا ہے۔ ۴:- اس شخص کے کردار کے بارے میں بھی بہت سے سنجیدہ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات موجود ہیں، اور بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں کہ اگر ان کی تحقیق کرلی جائے تو اس شخص کا بدکردار ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔ ۵:- یہ شخص مفتی اور مفسر بھی ہے، اس نے مسجد کے مسلمانوں کی جماعت میں شدید

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع سعید) (ولو أم قومًا وهم له كارهون ان) الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذلك تحريمًا لحديث أبي داؤد: "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون."

وفیه أیضًا ج:۱ ص:۵۵۷ والأحق بالامامة تقديما بل نصبا مجمع الأنهر الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) واما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس في الاقتداء بهؤلاء فيؤدي الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

قسم کا انتشار برپا کردیا ہے اور غلط باتوں کے ذریعہ آپس میں لڑا دیتا ہے۔ ۶:- یہ شخص محکمۂ اوقاف کے افسران سے خفیہ ربط و تعلق رکھتا ہے اور ناجائز اثرات استعمال کر کے مسجدِ مذکورہ کے ایک مؤذن کو جو حافظ و عالم تھے، مختلف قسم کے غلط الزامات لگا کر اور سازش و شرارت کر کے علیحدہ کروا چکا ہے۔

۷:- اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس مسجد کے نمازی سخت تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہیں، اور اس شخص سے خلاصی پانے کے لئے انہوں نے کچھ تحقیقات کی ہیں اور جن جن مساجد میں اس نے ملازمت کی ہے، وہاں جاکر دریافتِ حال کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص شدید قسم کا بدکردار، اوباش، مفسد، بددیانت اور بے علم ہے، اور وہاں سے شدید نفرت کے ساتھ نکالا جاچکا ہے، اور یہ ایک مسجد سے دُوسری مسجد بھاگ نکلا ہے، اور وہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس کے لئے کلمۂ خیر کہہ سکتا ہو، مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ غیر شادی شدہ ہے اور اپنے ساتھ ایسے دوستوں کو رکھتا ہے جس سے ماحول مکدر ہو رہا ہے، مندرجہ بالا کوائف پیش کر کے آپ سے التماس ہے کہ یہ شخص قابلِ امامت ہے یا نہیں؟

جواب:- امام کسی ایسے شخص کو بنانا چاہئے جو صحیح العقیدہ، متقی، پرہیزگار اور ضروری دینی مسائل سے کما حقہ باخبر ہو، نیز قراءت صحیح کرتا ہو، اور کم از کم نماز کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہو۔[1] لہٰذا سوال میں جو باتیں لکھی گئی ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[2] اسے معزول کر کے کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جس میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں، البتہ جب تک کسی دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک ان کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو نمازیں اس طرح پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۳۵/۲۷ و)

کسی ناجائز فعل سے منع کرنے پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- عرض یہ ہے کہ سائل امامِ مسجد موضع بٹ تھانہ شیروان ضلع ایبٹ آباد کی جدی طور سے پشت در پشت ۲۱۵ سال سے دیہہ مذکور میں امامت چلی آرہی ہے، اور اب سائل امامت وخطابت

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقديما بل نصبا مجمع الأنهر، (الأعلم بأحكام الصلوٰة) فقط صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدًا (للقراءة ثم الأورع) أى الأكثر اتقاء للشبهات والتقوىٰ اتقاء المحرمات. وفى الشامية تحته (قوله بأحكام الصلوٰة فقط) أى وان كان غير متبحر فى بقية العلوم .... (قوله بشرط اجتنابه .... الخ) .... الأعلم بالسنة أولى الا أن يطعن عليه فى دينه، لأن الناس لا يرغبون فى الاقتداء به وفى البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية علىٰ قلة رغبة الناس فى الاقتداء بهؤلاء فيؤدى الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرًا للأجر.

(۲) وفى الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) (ولو أم قوما وهم له كارهون ان) الكراهة (لفساد فيه .... كره) له ذٰلک تحريمًا. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۵۵۹ و ۵٦۰ ويكره امامة عبد .... وفاسق .... الخ.

کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔
سائل مستند عالمِ دین فارغ التحصیل از مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی ہے۔ مؤرخہ ۱۹۸۳/۹/۲۲ء کو دیہہ مذکورہ کے زرین وغیرہ مسجد شریف کا جنریٹر (بجلی) بدون اجازت سینہ زوری سے اپنے مال و دولت کے نشے میں اپنے عبدالستار کی شادی میں لے گئے تھے۔ ان کے اس فعلِ مجرمانہ پر میں نے بحیثیت امام کے ان کو آگاہ کیا، اور خدا کا خوف دِلایا، کیونکہ جنریٹر بجلی مسجد شریف کی ملکیت کا استعمال ان لوگوں نے ناچ گانے والی عورتوں کے تماشے پر صرف کیا۔ ان ملزموں کو ان کے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے جب میں نے وعظ و نصیحت کی تو اُلٹا انہوں نے میرے گھر پر پتھراؤ کیا، گالی گلوچ کی اور مجھ پر حملہ آور ہوئے، اور مجھے امامت سے برطرف کردیا۔ ملزموں نے مجھے امامت سے اس لئے برطرف کیا ہے کہ میں نے انہیں مضمون جاری کیا اور یہ کہ میں نے انہیں مسجد شریف کی ملکیت جنریٹر ناچ گانوں میں استعمال کرنے سے کیوں منع کیا، اور اس منع کرنے پر ان کی توہین ہوئی، لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ مسجد شریف کی امامت سے مجھے برطرف کردیا گیا۔ لہٰذا آپ بحیثیت مفتی و شرعی جج ہونے کے فیصلہ صادر فرمادیں کہ سائل یہاں امامت و خطابت کا اہل و حق دار ہے یا نہیں؟

۱:- سائل بفضلہٖ تعالیٰ مستند عالم ہے۔

۲:- باشرع ہے، صاحبِ اولاد ہے، چھ بچوں کا باپ ہے، کسی قسم کا کوئی عیب شرعی نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعات مندرجہ سوال دُرست ہیں اور سائل میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے تو ان کے پیچھے نماز بلاشبہ ہوجاتی ہے، اور ایک بُری بات سے منع کرنے کی بناء پر ان کو معزول کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ جہاں تک معزولی کے شرعاً معتبر ہونے کا تعلق ہے وہ یہ جاننے پر موقوف ہے کہ شرائطِ ملازمت کیا تھیں؟

واللہ اعلم
۱۴۰۷/۸/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۴/۳۸ د)

جس امام سے مقتدی راضی نہ ہوں، اس کی امامت کا حکم

سوال:- ایک صاحب گزشتہ پندرہ سال سے ایک مسجد میں امامت کراتے ہیں، مگر علمی قابلیت کے مالک نہیں، جمعہ کی تقریر کے لئے دُوسرے مولانا صاحب آتے ہیں جو مستند عالم ہیں۔ قراءۃ بھی تجوید کے مطابق ہے، لیکن یہ فقط تقریر کرتے ہیں اور نمازِ جمعہ پیش امام مسجد پڑھاتے ہیں، جبکہ لوگوں کی خواہش ہے کہ مقرّر ہی نمازِ جمعہ پڑھائیں، لیکن مذکورہ امام اس وجہ سے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کہیں خطیب صاحب قابض نہ ہوجائیں، جبکہ خطیب صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ میرا

مقصد ان کی جگہ پر قبضہ کرنا نہیں۔ کئی لوگ مذکورہ امام کے پیچھے کئی وجوہ سے نماز نہیں پڑھتے:-
۱:- امام صاحب قرآن وحدیث کا علم نہیں رکھتے۔ ۲:- قراءۃ قرآن مجہول ہے۔ ۳:- خطبہ بھی غلط پڑھتے ہیں۔ ۴:- ذرا سی بات بھی خلافِ طبع ہوجائے تو فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ۵:- لوگ ان کے طرزِ عمل پر انہیں غور کرنے کو کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمادیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اقتداء صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ مقتدی ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے خوش نہیں ہیں اور ان سے زیادہ علم رکھنے والا امام موجود ہے تو ان امام صاحب کا اپنی امامت پر اصرار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، لیکن جو لوگ مذکورہ وجوہات کی بناء پر ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں اکیلے نماز پڑھتے ہوں وہ بھی غلطی پر ہیں، انہیں چاہئے کہ ان کی جگہ افضل امام کو مقرّر کرنے کی کوشش فتنہ برپا کئے بغیر جاری رکھیں اور جب تک دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک انہی امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، کیونکہ ان کے پیچھے نماز بہرحال ہوجائے گی، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اکیلے پڑھنے سے بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولو أم قوما وهم له كارهون ان الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذٰلك تحريمًا (ج:۱ ص:۳۷۶)۔[1]

وفی رد المحتار تحت قوله: ”صلی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة“ أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع لحديث: من صلّى خلف عالم تقي فكأنما صلّى خلف نبي۔ (شامی ج:۱ ص:۳۷۷)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹/۷۰ ۲۷ و)

علمائے دیوبند کے عقائد سے جزوی اختلاف رکھنے والے ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی فتویٰ

(ژوب بلوچستان کے کچھ علمائے کرام اپنے ایک مقامی امام کے عقائد اور نماز میں اس کی اقتداء سے متعلق تنازعے کے تصفیے کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس آئے تھے، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے فریقین کو ایک متفقہ استفتاء مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جس کا حضرتِ والا

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس فی الاقتداء بهؤلاء فيؤدی الی تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید).

دامت برکاتہم نے تفصیلی جواب تحریر فرمایا، اور اس سے پہلے ریکارڈ میں وضاحت اور یادداشت کے لئے ایک تحریر بھی مرتب فرمائی، ریکارڈ سے یہ وضاحتی تحریر، اس کے بعد فریقین کا متفقہ استفتاء اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کی جانب سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب پر بعض حضرات کی طرف سے دوبارہ استفتاء کیا گیا وہ استفتاء اور اس کا جواب بھی آخر میں درج ہے۔) (محمد زبیر عفی عنہ)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی وضاحتی تحریر

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ۔ عرض گزار ہے کہ علاقہ ژوب بلوچستان کے دو فریق احقر کے پاس اپنے ایک تنازعے کے سلسلے میں تحکیم کے لئے تشریف لائے۔ ان میں سے ایک فریق مولانا محمد شیرانی صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ پہلے تشریف لائے، پھر دُوسرا فریق یعنی مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اگلے روز تشریف لائے۔ دونوں نے احقر سے الگ بھی باتیں کیں اور اجتماعی طور پر بھی، دونوں کی خواہش یہ تھی کہ احقر ان کے درمیان حَکَم بن کر ان کے تنازعے کا فیصلہ کرے، لیکن چونکہ احقر کے لئے واقعات کی چھان بین اور تفتیش ممکن نہیں تھی، اس لئے احقر نے تحکیم سے معذوری ظاہر کی، اور یہ عرض کیا کہ اگر دونوں فریق کوئی متفقہ استفتاء مرتب فرمالیں تو احقر اس کا جواب لکھ کر دیدے گا۔

تنازعہ اس بات پر تھا کہ مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے عقائد و نظریات کے لحاظ سے مستحقِ امامت ہیں یا نہیں؟ اس لئے احقر نے تجویز پیش کی کہ ان کے متنازعہ عقائد لکھ کر متفقہ طور پر استفتاء کرلیا جائے، اس پر مولانا شیرانی صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ اس وقت مولانا صبغت اللہ صاحب جو عقائد و نظریات لکھ کر دیں گے وہ ان کے ان حقیقی عقائد و نظریات سے بہت کم اور اَخف ہوں گے جو وہ علاقے میں بیان کرتے رہتے ہیں، اس لئے استفتاء سے صحیح صورتِ حال واضح نہیں ہوگی۔ لیکن بالآخر انہوں نے اس شرط پر متفقہ استفتاء مرتب کرنے کو قبول کرلیا کہ وہ کم سے کم اُمور جن کا انہوں نے اعتراف کیا ہو، اس استفتاء میں درج کئے جائیں گے، اور دُوسرے اُمور چونکہ متفقہ استفتاء میں درج نہیں ہوسکتے، اس لئے یہاں ان کو درج نہیں کیا جارہا، ان کے بارے میں ہم اپنا حقِ استفتاء الگ محفوظ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد متفقہ استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر دونوں فریقوں نے دستخط کردیئے۔

یہ استفتاء اور اس پر احقر کا جواب اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۴/۸/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۰۳)

فریقین کی طرف سے پیش کیا گیا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک صاحب کے عقائد کے بارے میں یہ تنازعہ ہے کہ ان کے عقائد جمہور اہلِ سنت والجماعت بالخصوص مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے عقائد کے پیشِ نظر انہیں امام بنانا شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ اور جو نمازیں ان کے پیچھے ادا کی گئیں ان کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ ان صاحب سے ان کے عقائد کے سلسلے میں کچھ سوالات کیے گئے جن کا جواب انہوں نے تحریری شکل میں دیا ہے۔

آپ ان جوابات[1] کا بغور مطالعہ فرما کر یہ تحریر فرمائیں کہ مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق یہ جوابات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور مذکورہ صاحب کی امامت کے بارے میں شرعی اِستفتاء کے ساتھ سات ورق میں منسلک ہیں۔

جواب:- استفتاء کے ساتھ منسلک مولانا صبغت اللہ صاحب کے لکھے ہوئے چودہ سوالات کے جوابات[2] کا احقر نے بغور مطالعہ کیا، اور بعض اُمور میں مولانا موصوف سے زبانی وضاحتیں بھی طلب کیں، ان میں سے بعض اُمور میں بعض جوابات واضح طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہیں، مثلاً اوقاتِ مکروہہ ومنہیہ میں تحیۃ المسجد کا ممنوع ہونا، یا سوال نمبر۶ کے جواب میں دُعا کے وقت فی الجملہ رفعِ یدین کو موافقِ سنت کہنا، لیکن بعض جوابات مجمل ہیں، مثلاً شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں انہوں نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ جن مسائل میں علمائے دیوبند کو ان حضرات سے اختلاف ہے ان مسائل میں مولانا موصوف کا موقف کیا ہے؟ نیز سوال نمبر۴ کے جواب میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تین دن کے بعد میّت کے گھر جاکر تعزیت کرنے کو مولانا موصوف علی الاطلاق بدعت و ناجائز کہتے ہیں یا اس کی کسی خاص ہیئت کو؟

لیکن مولانا موصوف کے جوابات میں چار اُمور ایسے ہیں جو صراحۃً علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مولانا نے حدیثِ مبارک: **"لا تشد الرحال الّا الٰی ثلاثۃ مساجد"** کی اس تشریح کی طرف اپنا رُجحان ظاہر کیا ہے جو علامہ ابنِ تیمیہؒ سے منقول ہے، چنانچہ وہ زیارتِ قبور کے لئے سفر کو حدیثِ مذکور کی نہی میں شامل سمجھتے ہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی

(۱،۲) امام صاحب کی طرف سے اہلِ علاقہ کو اپنے عقائد سے متعلق دیئے گئے ان وضاحتی جوابات کی تحریر ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، تاہم آگے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف سے دیئے گئے فتویٰ میں چونکہ ان کے عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے لہٰذا اس سے امام صاحب کے عقائد بھی واضح ہوجاتے ہیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو بھی دُرست نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک سفر کا مقصد مسجدِ نبوی کی زیارت ہونا چاہئے اور ضمناً روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ انہوں نے احقر سے زبانی یہ بیان کیا کہ اب تک مجھے چونکہ کوئی نقلی دلیل زیارتِ روضۂ اقدس کے استحباب کی نہیں ملی، اس لئے میرا عمل یہ ہے کہ میں نے مسجدِ نبوی کے قصد سے مدینہ طیبہ کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوگئی، اور آئندہ بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔

مولانا کا یہ نظریہ علمائے دیوبند کے مسلک کے صراحۃً مخالف ہے، اس بارے میں بہت سی تحریریں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے "المهند علی المفند" جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کی مرتب فرمودہ کتاب ہے، اور جس پر اس وقت کے تمام اکابر علمائے دیوبند کے دستخط ہیں، اس کی عبارت یہ ہے کہ:

"ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارتِ قبرِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجے کی قربت اور نہایت ثواب اور سببِ حصول نصیب ہے، اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجدِ نبوی اور دیگر مقامات و زیارت گاہ ہائے متبرکہ کی بھی نیت کرے، پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجدِ نبوی کی بھی زیارت ہوجائے گی......

رہا وہابیہ کا یہ کہنا کہ مدینہ منوّرہ کی جانب سفر کرنے والے کو صرف مسجدِ نبوی کی نیت کرنی چاہئے اور اس قول پر حدیث کو دلیل لانا کہ کجاوے نہ کسے جاویں مگر تین مسجدوں کی جانب، سو یہ قول مردود ہے.... الخ۔" (عقائد علمائے دیوبند ص:۶)

۲:- اسی طرح مولانا نے اپنے جواب میں تعویذ کی ہر قسم کو کم از کم مکروہ بتایا ہے۔ جہاں تک ایسے تعویذات کا تعلق ہے جن میں استمداد بغیر اللہ ہو یا جو غیر معلوم المعنی ہوں تو ان کے حرام ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، لیکن جن نقوش اور ہندسوں کے معنی معلوم ہوں انہیں حرام کہنا، یا آیاتِ قرآنی اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعے تعویذ کو مکروہ قرار دینا علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے، جس کی تصریحات علمائے دیوبند کے فتاویٰ میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ صفحہ:۲۱۸، وعزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۵۲۔ تمام علمائے دیوبند کا عمل بھی اس پر رہا ہے اور حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک مستقل کتاب "اعمالِ قرآنی" اسی مقصد کے لئے تألیف ہوئی ہے، لہٰذا اس عمل کو مکروہ کہنا مسلکِ علمائے دیوبند کے بالکل خلاف ہے۔[1]

---

(۱) تفصیلی دلائل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: ابوداؤد ج:۲ ص:۱۸۶، مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۳۸۸ (طبع قدیمی کتب خانہ)، شامیۃ ج:۶ ص:۳۶۳ (طبع ایچ ایم سعید)، و تکملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷.

۳:- فرض نمازوں کے بعد بہ ہیئتِ اجتماعی ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کا استحباب کتبِ فقہ میں مصرح ہے، اور اگر اسے مستحب سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق دُرست ہے، لیکن مولانا نے اپنے جواب نمبر۱ میں جس شدّت اور عموم کے ساتھ اس پر نکیر کی ہے اور اسے بدعت اور واجب الترک بتایا ہے، وہ علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر ہے، اس میں وہ حدیث وفقہ کے مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

''یہ روایاتِ فقہیہ ہیں جن سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ فرض نماز کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دُعا مانگیں اور دُعا سے فارغ ہوکر ہاتھ منہ پر پھیریں۔'' (کفایت المفتی ج:۳ ص:۲۹۷)[1]

اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن میں اس مسئلے پر بیس صفحات میں بحث کی ہے، اور آخر میں لکھا ہے: **فثبت أن الدعاء مستحب بعد کل صلاة مکتوبة متصلا بها برفع الیدین کما هو شائع فی دیارنا ودیار المسلمین قاطبة** ۔ (اعلاء السنن ج:۳ ص:۲۱۱،۲۱۲)[2]۔ اسی طرح حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے: **فهٰذه وما شاکلها من الروایات فی الباب تکاد تکفی حجة لما اعتاده الناس فی البلاد من الدعوات الاجتماعیة دبر الصلوات، ولذا ذکره فقهاؤنا أیضًا کما فی نور الایضاح** ۔ (معارف السنن ج:۳ ص:۱۲۳ باب ما یقول اذا سلم)۔ اور العرف الشذی کی نقل اس کے مقابلے میں موثوق نہیں ہے، بہرصورت علمائے دیوبند کے مسلک میں فرائض کے بعد دُعا مع رفع الیدین مستحب ہے، بدعت نہیں ہے۔

۴:- مولانا نے نماز کی نیت کے تلفظ کو بھی بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ اگر احضارِ نیت کے خیال سے اس کو سنتِ نبوی یا واجب سمجھے بغیر تلفظِ نیت کیا جائے تو وہ علمائے دیوبند کے نزدیک بدعت نہیں ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: **وأباحه بعض لما فیه من تحقیق عمل القلب وقطع الوسوسة، وما روی عن عمرؓ أنه أدب من فعله فهو محمول علٰی أنه انما زجر من جهر به. (فأما المخافتة به) فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا: ان التلفظ بالنیة سنة لم یرد بها سنة النبی صلی اللہ علیه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وکثرة الشواغل علی**

---

(۱) کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۴۵، ۳۴۶ (جدید ایڈیشن ۲۰۰۱ء دار الاشاعت)۔

(۲) اعلاء السنن باب الانحراف بعد السلام وکیفیته، وسنیة الدعاء والذکر بعد الصلوٰة. ج:۳ ص:۱۶۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)۔

القلوب .... الخ۔ (اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۴)۔(۱)

بہرکیف! مذکورہ چار مسائل میں مولانا صبغت اللہ صاحب نے اپنا جو موقف بیان فرمایا ہے وہ علمائے دیوبند کے موقف سے مختلف ہے، اور مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا موصوف، علمائے دیوبند کے مسلک کے کلی طور پر پابند نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ان کی اپنی تحقیقات ہیں جو زیادہ تر علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا جس مقام پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو امام مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور اگر وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں، تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں، ھذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۸/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۹۱/۳۱ د)

مذکورہ جواب کے چند اُمور کی مزید وضاحت کے لئے
دُوسرا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- حضرت علامہ محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! گزارش کی جاتی ہے کہ جنابِ والا نے جو حکم دربارہ فیصلہ بین الفریقین یعنی مولوی محمد خان و رفقاؤہ و صبغت اللہ و رفقاؤہ دیا تھا، اس میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ: ''جہاں پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں ہیں۔''

اس میں سخت اجمال ہے، کیونکہ اس کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ اس وجہ سے مستحق نہیں کہ دائرۂ اسلام میں نہیں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے۔ پھر سوال پیدا ہوگا کہ ان مذکورہ فی الفتویٰ چار مسائل کا قائل کیا اہلِ سنت والجماعت میں نہیں رہتا؟

اور یہ امکان بھی رکھتا ہے کہ ان مسائل والا متبع مذہبِ حنفی نہیں سمجھا جاتا تو پھر یہ شبہ پیدا ہوگا

---

(۱) اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیلی دلائل کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)، اور فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۲ ص:۱۴۷۔

کہ آیا مذاہبِ اربعہ جو سب اہلِ سنت والجماعت ہیں ان کی ایک دُوسرے کے پیچھے نمازیں صحیح نہیں، فاسد ہیں؟ حالانکہ یہ کہنا کتنے خراب نتائج پیدا کرے گا، بہرحال یہ اجمال محتاجِ ازالہ ہے۔ واضح کر کے مطمئن فرمایا جائے، کیونکہ جب موصوف مستحقِ امامت نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ جانے گا بلکہ نہ اس سے تعلیم حاصل کرے گا، نہ اس کے وعظ ونصیحت کو کوئی سننے کو تیار ہوگا۔ حاصل یہ کہ اس پر اور اس کے ہم خیال لوگوں پر دین کی خدمت کے تمام راستے بند ہوجائیں گے اور اس کی ساری زندگی اُلجھن میں رہے گی، خویش واقارب واغیار ہمیشہ اس کو شک واشتباہ کی نظروں سے دیکھیں گے۔ اگر وہ واقعی اس کا از رُوئے دلیل مستحق ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا عذر خدا کے نزدیک بن جائے گا اور مخالفین کے ساتھ خدا کا حساب کیسے ہوگا۔ برائے مہربانی اصل حقیقت سے واضح الفاظ میں آگاہ فرماویں، خدا تعالیٰ جزائے خیر دیں۔

جواب:- جس استفتاء اور اس کے جواب کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں مولانا صبغت اللہ صاحب کو اس محلے میں غیر مستحقِ امامت قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاذاللہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کو اپنی بعض ایسی تحقیقات پر اصرار ہے جو علمائے دیوبند کے عام مسلک سے مختلف ہیں، اس لئے جہاں علمائے دیوبند سے وابستہ حضرات آباد ہوں، وہاں ان کی امامت موجبِ فتنہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح جن چار نظریات کی بناء پر مذکورہ فتویٰ دیا گیا تھا وہ نظریات علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، لیکن محض ان چار نظریات کی وجہ سے نہ کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوسکتا ہے اور نہ اسے اہلِ سنت والجماعت سے خارج کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ فتویٰ ہی میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں۔ البتہ اس فتویٰ کا حاصل صرف یہ ہے کہ جہاں ایسا امام دستیاب ہو جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہو، وہاں ایسے متفرّد نظریات کا حامل مستحقِ امامت نہیں۔ لہٰذا اس فتویٰ کی بنیاد پر مولانا موصوف کو دائرۂ اسلام سے یا اہلِ سنت والجماعت سے خارج سمجھ کر ان سے کافروں یا غیر اہلِ سنت جیسا برتاؤ کرنا ہرگز دُرست نہیں ہوگا۔ آخر میں عرض ہے کہ خدارا ہر فریق اپنی آخرت کی فکر کرے، ایک دُوسرے پر طعن وتشدّد سے گریز کرے اور مسلمانوں کو ہر قیمت پر فتنے سے بچائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱؍شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۳۶/۳۱ د)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر ماننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اپنے محلّہ کی مسجد میں عرصہ دو مہینے سے مسجد کمیٹی نے ایک پمفلٹ دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے کا بیان ہے۔ ایسے امام کے پیچھے جس کا یہ عقیدہ ہو، نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا ولی کے لئے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۶۲/۲۷ ہ)

داڑھی منڈانے والے کو امام بنانا

سوال:- جو شخص داڑھی منڈاتا یا کتراتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور تراویح میں ایسے شخص کو امام بنایا جاسکتا ہے؟

جواب:- ایسے شخص کو باختیارِ خود امام بنانا جائز نہیں[1]، اور صالح و متدین امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش ضروری ہے، تاہم اس کی اقتداء نہ کرنے کی صورت میں جماعت بالکل فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا انفراداً نماز پڑھنے سے بہتر ہے[2]۔ اور تراویح میں بھی ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں، اگر اور کوئی مہیا نہ ہو تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے پڑھ لینا بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۹/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۵/۴۰ ج)

داڑھی مونڈنے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- اگر بالغ شخص جو داڑھی، مونچھ مونڈتا ہے، کیا وہ امامت کرسکتا ہے؟

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیہ أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراھة تقدیمہ بأنہ لا یھتم لأمر دینہ وبأن فی تقدیمہ للامامة تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعًا. وکذا فی مراقی الفلاح ص:۱۶۵ وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸.
وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۱۸ وأما الأخذ منھا وھی دون ذٰلک کما فعلہ بعض المغاربة مخنثة الرجال فلم یبحہ أحد وأخذ کلھا فعل یھود الھند ومجوس الأعاجم. وفیہ أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة، وقال الشامیؒ تحتہ (قولہ نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلوٰة خلفھما أولٰی من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی کفایت المفتی ج:۳ ص:۷۹ و ۹۹ (طبع دار الاشاعت) وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۲۲۶ و ۲۴۰.

جواب:- داڑھی مونڈنا موجبِ فسق ہے، اور ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،(۱) تاہم جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۷/۲۸ ب)

ایک مشت سے کم داڑھی والے کی امامت کا حکم

سوال:- ہمارا امام کچھ جدّت پسند ہے، ویسے تو دین دار آدمی ہے، مگر داڑھی ایک مشت سے کم رکھتا ہے، نیز وہ بعض فلموں کو جائز سمجھتا ہے، جیسے جن فلموں میں حج وغیرہ دِکھایا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مشت سے کم داڑھی کو کٹوانا ناجائز ہے، اور جو شخص اس پر اصرار کرے اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔(۲)

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/۱۸ الف)

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- قبضہ سے کم داڑھی کتروانا گناہ ہے، ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،(۳) لیکن اگر ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی، اور اگر کوئی متشرّع امام نہ ملے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے بہرحال بہتر ہے۔(۴)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۷ھ

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک بریلوی نے کسی آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھائی، اس کی داڑھی قبضہ سے بالکل کم ہے، بندہ نے کہا کہ ایسے آدمی کے پیچھے نمازِ جنازہ بالکل نہیں ہوسکتی، بندہ کا کہنا صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- داڑھی کو قبضہ سے اُوپر کٹوانا ناجائز ہے،(۵) اور جو شخص اس ناجائز کام کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے،(۶) لیکن اگر کوئی نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، اس کا اعادہ بھی واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۵/۲۷ ہ)

(۱ تا ۶) دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ۔

عرش پر اللہ تعالیٰ کے جسمانی قیام کا عقیدہ رکھنے والے شخص کی امامت کا حکم

سوال:- ہم سب اہلِ محلّہ حنفی المسلک ہیں اور ہمارے جو پیش امام تھے وہ بھی حنفی المسلک کے دعویدار تھے، لیکن دو سال ہوئے ہیں وہ سعودی عرب گئے وہاں تقریباً ایک سال سے زائد عرصہ گزارا اور وہاں مبلغ بھی رہ چکے ہیں، واپسی پر جب آئے ہیں تو ان سے ایسے افعال اور اقوال صادر ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں، بلکہ حنفی المسلک بالکل نہیں ہیں، کیونکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جب حدیثِ نبوی ملتی ہے تو ہم کسی شخص کی تابعداری نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح کی سنتیں اور فرض کے درمیان تحیۃ المسجد پڑھنا اور اوقاتِ مکروہہ میں نماز دُرست کہنا بلکہ فرض نمازوں کے بعد دُعا کو بدعت کہنا، کھانا کھانے کے بعد میزبان کو دُعائے خیر کرنا، مردے کے گھر جاکر ورثاءِ میّت کو دُعا کرنا بدعت سمجھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد پر جانا حرام اور ناجائز سمجھتا ہے، اور حدیث "لا تشد الرحال .... الخ" سے دلیل پیش کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے لئے عرش پر مکان اور قیام کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا افعال و اقوال کے بعد اس شخص کو امام رکھنا ٹھیک ہے یا کہ سبکدوش کیا جائے؟ جبکہ ہمارے سب علماء نے بھی سبکدوشی کا مشورہ دیا ہے، لیکن مولوی موصوف شرعی حکم کے بغیر سبکدوش نہیں ہوتا، جبکہ مسجد میں ایک دو دفعہ جھگڑا بھی ہوا ہے، اور گورنمنٹ سے موصوف نے عدم مداخلت فی المسجد کی ضمانت بھی لی ہے۔ کیا اہلِ محلّہ مولوی صاحب کو سبکدوش کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور تمام اہلِ محلّہ اس کی امامت پر ناراض ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- سوال میں امام صاحب موصوف کی طرف جو خیالات منسوب کئے گئے ہیں اگر واقعۃً ان امام صاحب کے عقائد و خیالات یہی ہیں تو انہیں حنفی مقتدیوں کا امام مقرّر کرنا دُرست نہیں، خاص طور سے اگر وہ باری تعالیٰ کے لئے عرش پر جسمانی قیام کا عقیدہ رکھتے ہیں تو یہ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کے قطعی خلاف ہے، ایسے عقیدے والے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے[1]، ان کے بجائے کوئی صحیح العقیدہ امام متعین کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۹/۳۱ ج)

---

(۱) کیونکہ فسقِ اعتقادی، فسقِ عملی سے زیادہ بُرا ہے، جیسا کہ حلبی کبیر شرح المنیة ص: ۵۱۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) میں ہے: ویکرہ تقدیم المبتدع أیضًا، لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل.

معراجِ جسمانی کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کہتا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ معراج جسمانی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جو لوگ معراجِ رُوحانی کے قائل گزرے ہیں ان کی وہ شخص تکفیر نہیں کرتا، ایسے شخص سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ امامت کا حق دار ہوسکتا ہے؟ اپنے کو حنفی دیوبندی کہلاتا ہے۔

جواب:- جمہور اہلِ سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ معراج جسمانی ہے،[۱] جو شخص معراجِ جسمانی کا منکر ہو وہ فاسق اور مبتدع ہے، لیکن اگر اسراءِ جسمانی کا قائل ہے تو کافر نہیں،[۲] لہٰذا مذکورہ بالا صاحب کا عقیدہ دُرست ہے اور ان کے پیچھے نماز دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۳/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح، قرآن میں مسجدِ اقصیٰ تک بھی ایک رات میں سیر کرانے کی تصریح ہے، اور یہ لفظ ''عبدہ'' کے ساتھ ہے جو جسمانی طور پر سیر کرانے کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے، لہٰذا مسجدِ اقصیٰ تک کی جسمانی سیر کا منکر کافر ہوگا۔ مُلّا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر ص:۱۳۵ پر لکھتے ہیں: من أنكر المعراج ينظر ان أنكر الاسراء من مكة الى بيت المقدس فهو كافر۔[۳] اور علامہ تفتازانیؒ شرح عقائد میں لکھتے ہیں: وقوله الى السماء اشارة الى الرد علىٰ من زعم أن المعراج فى اليقظة لم يكن الا الىٰ بيت المقدس علىٰ ما نطق به الكتاب۔[۴] بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفى شرح المسلم للنوويؒ ج:۱ ص:۹۱ (طبع قديمى كتب خانه) والحق الذى عليه أكثر الناس ومعظم السلف وعامة المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين أنه أسرى بجسده صلى الله عليه وسلم والآثار تدل عليه، وفى التفسير المظهرى سورة الأسرى ج:۵ ص:۴۰۱ والأكثرون علىٰ أن الله تعالىٰ أسرى بعبده محمد صلى الله عليه وسلم ليلة المعراج بجسده فى اليقظة وتواترت الأخبار الصحيحة بذٰلك وعليه انعقد الاجماع ولو كان المعراج فى المنام لما أنكر عليه قريش اذ لا استبعاد فى الرؤيا .... الخ. وفى أيسر التفاسير ج:۲ ص:۵۸۱ تحت الأية: "سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ" الأية، تقرير عقيدة الاسراء والمعراج بالنبى صلى الله عليه وسلم بالروح والجسد معًا من المسجد الحرام الى المسجد الأقصىٰ ثم الى السموات العلىٰ. مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا رسالہ تنویر السراج فی لیلۃ المعراج، اور تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۴۶۶۔

(۲) مکہ سے بیت المقدس، اسراءِ جسمانی کا منکر کافر ہے، جبکہ بیت المقدس سے آسمان تک معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں، فاسق اور گمراہ ہے، چونکہ سوالِ مذکور میں امام صاحب معراجِ جسمانی کے منکر کی تکفیر نہیں کرتے لہٰذا یہ دُرست ہے، کیونکہ معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں فاسق ہے۔ البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) میں ہے: ومن أنكر الاسراء من مكة الىٰ بيت المقدس فهو كافر، ومن أنكر المعراج من بيت المقدس فليس بكافر۔

(۳) الفقه الأكبر ص:۱۰۰ (طبع دار الكتب العربية الكبرىٰ).

(۴) شرح عقائد ص:۱۴۵ (طبع قديمى كتب خانه).

شیعہ کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ہمارے محلے میں شیعہ اور سنی آبادی ملی جلی ہے، اگر ہم الگ جماعت کرتے ہیں تو آپس میں لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہے، اگر ہم مصالحت کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو جائز ہے یانہیں؟ یا فرداً فرداً نماز ادا کریں؟

جواب:- شیعہ حضرات کے پیچھے نماز جائز نہیں[1]، ان کے عقائد سے قطعِ نظر بھی کرلی جائے تو نماز کے اَحکام اتنے مختلف ہیں کہ اہلِ سنت کے ساتھ نماز کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں۔ لہٰذا کوشش کی جائے کہ اہلِ سنت حضرات اپنی مسجد الگ بنائیں اور اس میں باجماعت نماز ادا کرلیں، اور جب تک یہ ممکن نہ ہو کسی کے گھر میں جماعت کرلی جائے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

شیعہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ سنی عقیدہ سے منسلک آدمی نے اپنی بیٹی کا نکاح باوجود عوام و خواص و اعزّہ کے روکنے کے، ایک شیعہ آدمی سے کردیا، اور اپنے لڑکوں کا نکاح شیعہ لڑکیوں سے کردیا، حالانکہ داماد اور بہوؤں کا شیعہ ہونا ظاہر اور مشہور ہے۔ اس شیعہ داماد کا شیعہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنا واضح ہے، نیز شیعہ مسلک سے منسلک مدرسہ کا اہتمام بھی اس کے پاس ہے، شیعوں سے چندے لیتا ہے، شیعوں سے قریبی روابط ہیں، شیعوں کا امام اور خطیب نیز ذاکر بھی ہے۔

جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے علمائے کرام کے فتاویٰ کے مطابق اثناء عشری شیعہ، امامت، عصمتِ ائمۂ کرام، تحریفِ قرآن وغیرہ جیسے اُمور کی وجہ سے کافر ہیں اور مرتد ہیں، ان کے ساتھ معاملات مرتد جیسے ہونے چاہئیں۔

---

(۱) وفی الکفایة شرح الهداية ج:۱ ص:۳۰۵ ويكره الاقتداء بصاحب الهوىٰ والبدعة والحاصل ان كل من كان من أهل قبلتنا ولم يفعل فی هواه حتّی يحكم بكفره تجوز الصلاة (مع الكراهة التحريمية) خلفه، وان كان هوى يكفر أهلها كالجهمي والقدری الذی قال بخلق القراٰن والرافضی الغالي الذی ينكر خلافة أبی بكرؓ لا تجوز.
وفی البحر الرائق (ج:۱ ص:۳۳۸ الامامة) وكره امامة العبد والاعربی والفاسق والمبتدع. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۳۴۹ (المبتدع) بأن لا تكون بدعته تكفره، فان كانت تكفره فالصلوٰة خلفه لا تجوز.
وفی البحر الرائق أيضًا ج:۱ ص:۳۴۹ والرافضی ان فضل عليًّا علىٰ غيره فهو مبتدع. وفی الهندية ج:۱ ص:۸۴ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) قال المرغيناني: تجوز الصلاة خلف هوى وبدعة ولا تجوز خلف الرافضي والجهمي .... الخ. وفی الكبيری شرح المنية ص:۵۱۴ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) ويكره تقديم المبتدع أيضًا لأنه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل.

ترکِ نماز مع الجماعت سے بچنے کے لئے اس کی امامت میں کبھی کبھی نماز جائز ہوسکتی ہے؟ جبکہ یہ آدمی اپنے آپ کو سنی کہتا ہے اور شیعہ کو اپنی زبانی غلط سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا داماد پیسوں کی وجہ سے شیعہ ہے۔ کیا حکم ہے؟ (از مقامی علمائے کرام موضع سلطانی ضلع رحیم یارخان)

جواب:- شیعہ خواہ کافرانہ عقیدے رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، دونوں صورتوں میں کسی سنی کے لئے ان سے نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور پہلی صورت میں نکاح منعقد بھی نہیں ہوتا۔ اب جس شخص کو دین یا عقائدِ دین کی اہمیت کا اتنا بھی احساس نہیں ہے وہ شخص امام بنانے کے لائق نہیں ہے۔[1] تاہم اگر کسی وقت ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو کراہت کے ساتھ نماز ہوجائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۴۱ ز)

لواطت کے مرتکب کی امامت کا حکم

سوال:- ایک پیش امام نے جو شادی شدہ بھی ہے، ایک لڑکے سے لواطت کی اور اس پر دو عادل نمازیوں نے گواہی دی، یہ تمام ماجرا بستی کے مولوی صاحب سے (جو پیش امام کے علاوہ ہے) بیان کیا، مولوی صاحب نے پیش امام سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو پیش امام نے اقرارِ جرم کرلیا، بعد ازاں پیش امام مذکور کو اپنے عہدے سے الگ کردیا گیا، اور تمام لوگوں میں اس بات کی تشہیر کردی گئی، اس کے بعد اس پیش امام نے ایک دفعہ نماز پڑھائی ہے، کیا کوئی صورت ہے کہ امامِ مذکور کو واپس اپنے منصب پر لایا جائے؟

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،[2] لیکن اگر نماز پڑھ لی جائے تو ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ شخص توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں، البتہ اگر وہ صدقِ دِل سے توبہ کرے تو اسے امام بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح، لیکن ایک مسلمان کے گناہ کی تشہیر کرنا ٹھیک نہیں، صرف اتنا کافی تھا کہ ان کو امامت سے معزول کردیتے۔

محمد عاشق الٰہی

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی الشامیة (قوله وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی .... الخ. وراجع أیضًا البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، والهندیة ج:۱ ص:۸۴.

گالی دینے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک امام بدگو، جلد مشتعل ہوجانے والا اور غصّے میں آپے سے باہر ہوجانے والا ہے، نیز غیبت و دروغ گوئی کا بھی عادی ہے، ایسے امام کی اقتداء میں نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ ایک امام جس کے پیچھے اس کی اخلاقی پستیوں کی بناء پر نماز پڑھنے کی طرف دِل مائل نہ ہو اور دُوسری مسجد بھی نزدیک نہ ہو، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز باجماعت پڑھنے سے نماز ادا ہوجائے گی؟

جواب:- سب وشتم کا عادی، جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے والا فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، البتہ جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھ لی گئی ہوں وہ ادا ہوجاتی ہیں، ان کا لوٹانا ضروری نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۷/۱۱/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۲/۱۸ الف)

امام کی بُرائی کرنے والے کا اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص امام کے پیچھے ہر وقت بُرائی کرتا ہے اور پھر اس کے پیچھے نماز بھی پڑھتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پیش امام لائقِ احترام ہے، اس کی بے عزّتی کرنا جائز نہیں، بُرائی کرنا تو ہر مسلمان کا بُرا ہے، خاص طور سے پیش امام کی بُرائی کرنا اور بھی قبیح ہے، لیکن اس سے اس پیش امام کے پیچھے بُرائی کرنے والے کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

سوال:- ایک شخص پیش امام کے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھالیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سابق میں ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۷۷/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق .... الخ.
وفی الدر المختار أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامیؒ تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلاة خلفهما أولیٰ من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، ۳۴۹، والهندیة ج:۱ ص:۸۴.

فسقیہ افعال کے مرتکب کو امام بنانا

سوال:- ایک پیش امام جو عورتوں کو گنڈا تعویذ دیتا ہو اور اکثر و بیشتر وقت عورتوں کے جھرمٹ میں گزارتا ہو، غیر شادی شدہ ہونا ظاہر کر کے شادی کی خواہش رکھتا ہو، اور لڑکیوں کی فوٹو منگوا کر بھی دیکھتا ہو، اور جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کی عادت ہو تو کیا ایسے پیش امام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولنے، دھوکا دینے اور نامحرم عورتوں سے آزادانہ میل جول رکھنے کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۸/۱۹ الف)

گالی گلوچ کرنے والے شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک مستفتی نے کافی طویل خط لکھا جس میں اصل سوال کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱:- ایک امام گالی گلوچ، جھوٹ بیانی اور ہر وقت لڑائی جھگڑے کا مرتکب رہتا ہے، اس کے ان افعال سے تنگ آکر مستفتی نے الگ مسجد بنائی ہے، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ۲:- ایسے افعال والے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- مستفتی نے جو علیحدہ مسجد بنائی ہے، اگر اس میں تمام لوگوں کو آنے کی اجازت عام ہو تو اس میں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ۲:- جو شخص گالی گلوچ، دروغ بیانی اور لڑائی جھگڑے کا مرتکب ہو وہ فاسق ہے، جب تک وہ اپنے ان افعال سے اعلانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں،[2] مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسے نرمی سے سمجھائیں، اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

(آپ کے اتنے طویل خط سے یہی دو معقول سوال سمجھ میں آتے ہیں جن کا جواب لکھ دیا گیا)۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۶/۱۹ الف)

(۲،۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق، وفی الشامیة (قوله وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، والھندیة ج:۱ ص:۸۴.

کس مسجد کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اَولیٰ ہے؟

سوال:- ایک مسجد نئی بن رہی ہے، لوگوں کا عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا اور کھڑے ہوکر سلام پڑھنے کا ہے، وہ لوگ مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ قرآنی آیات اور حدیث پڑھنے، سننے کو، کوئی منع نہیں کرسکتا، جبکہ میں پہلے سے ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- جس مسجد کا امام صحیح العقیدہ اور عملی اعتبار سے زیادہ متقی پرہیزگار ہو اس میں نماز پڑھیئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۱/۲۸ ب)

تصویر کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- عرض اینکہ ماہِ رمضان المبارک میں ایک مسجد کے اندر ایک حافظِ قرآن صاحب جو مسجد میں تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں، اسی مسجد میں پیش امام اور مسجد کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مدرّس بھی ہیں۔ حافظ صاحب کی اعانت کے لئے ایک نائب مدرّس بھی ہے جو اِن ہی حافظ صاحب کا شاگرد ہے۔ ۲۷ر رمضان کی رات ختمِ قرآن کی مجلس میں جن بچوں نے اس سال قرآن شریف ختم کیا تھا اور جو بچے مائک پہ آکر تلاوت کر رہے تھے، ان بچوں کو خطیبِ مسجد کے ہاتھ سے انعام دیا جارہا تھا، اس وقت نائب مدرّس نے تصویر کھینچنا شروع کردیا، جس پر ایک شخص نے فوراً تصویر کشی سے منع کردیا اور خطیب صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ کیا تصویر کھینچنا مسجد میں جائز ہے؟ خطیب صاحب نے کہا مکروہ ہے۔ اس کے بعد وہ نائب مدرّس اس صاحب (جنھوں نے منع کیا تھا) کے پاس آیا اور کہا کہ حافظ صاحب کی اجازت سے کیمرہ میں رِیل بھری گئی ہے میں تصویر کھینچوں گا۔ حالانکہ ان سے کہا گیا کہ دوبارہ حافظ صاحب سے پوچھ لو مگر اس نے ضد کی اور جب حافظ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے تو ان کی کئی جانب سے تصویر کھینچی، حافظ صاحب نے اس کو منع نہیں کیا، بعد میں دُوسرے روز حافظ صاحب نے قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میں نے نہ اجازت دی ہے، نہ رِیل بھروائی ہے۔ کیا مسجد میں تصویر کشی جائز ہے؟ ایسے امام کی اقتداء میں جس نے قسم کھا کر اپنی صفائی پیش کردی

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقدیمًا بل نصبًا مجمع الأنهر (الأعلم بأحکام الصلوٰة) فقط صحةً وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفی الشامیة (قوله بشرط اجتنابه للفواحش) الأعلم بالسنة أولٰی الا ان یطعن علیه فی دینه .... الخ.

ہو، نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب:- تصویر کھینچنا اور کھنچوانا مسجد سے باہر بھی ناجائز ہے، خاص طور پر مسجد کو اس ناجائز فعل سے آلودہ کرنا تو اور بھی گناہ ہے۔ اگر واقعۃً ان کی اجازت سے رِیل بھری گئی تھی اور انہوں نے تصویر کھنچتے دیکھ کر قدرت کے باوجود منع نہیں کیا، اس کے باوجود قسم کھالی کہ میری اجازت سے تصویر نہیں کھینچی گئی تو انہوں نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا، اگر وہ اس گناہ پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں تو خیر ورنہ اگر اصرار کریں تو انہیں اپنے اختیار سے امام نہیں بنانا چاہئے۔[۱] تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں۔ واللہ اعلم

۱۴۰۸/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۳۴۰ ز)

جھوٹ بولنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- امام اگر جھوٹ بولے یا جھوٹی قسم کھائے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی کیا سزا ہوگی؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولتا ہو یا جھوٹی قسم کھاتا ہو وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے اور فاسق ہے، جب تک ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، اس وقت تک اسے امام بنانا جائز نہیں۔[۲] شرعی سزاؤں کو نافذ کرنے کا اختیار صرف اسلامی حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔[۳] واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۱/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۷/۱۸ الف)

بدعتی اور مجہول پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:- ایک شخص ہمیشہ تارکِ صلوٰۃ جماعت ہے، بدعتی ہے، قرآن مجید غلط پڑھتا ہے، ایسا غلط کہ معنی غلط ہوجاتا ہے، حرام کو حلال کہتا ہے، پردہ کو عورتوں کے لئے غیرضروری کہتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ بائیکاٹ کرنے پر لوگوں کو دُعائے خیر دیتا ہے۔ ایک شخص کی شادی میں نتوٹے اور

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی الشامیة قوله (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر ..... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیه أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بأنه لا یهتم لأمر دینه وبأن فی تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعًا. وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۲۲ ویکرہ تقدیم العبد .... والفاسق لأنه لا یهتم لأمر دینه .... وان تقدموا جاز لقوله علیه السلام: صلّوا خلف کل بر وفاجر .... الخ.

(۳) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۵۴۹ (طبع سعید).

مجلس آئی ہوئی تھی، لوگوں نے کہا کہ ہم تیری دعوت کا کھانا نہیں کھاتے اس لئے کہ تم نے بدعت کا کام کیا ہے، یعنی مجلس بلوائی ہے، لیکن یہ شخصِ مذکور شریک ہوا اور کہتا ہے کہ کھانا جائز ہے۔ اب اس کی امامت کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑا پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس نے اپنے چچا کو بھی دیوث کہا ہے، ایک شخص نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے لواطت بھی کی ہے، قبر میں نور نامہ رکھنا جائز قرار دیتا ہے، ایسے شخص کی اقتداء کیسی ہے؟

جواب:- مذکورہ شخص کے بارے میں جو باتیں سوال میں درج ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں، کیونکہ مذکورہ باتوں میں سے بہت سی موجبِ فسق ہیں۔ لہٰذا ایسے امام کو بدلنا چاہئے،[1] البتہ جب تک کسی دُوسرے نیک صحیح العقیدہ امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی، اور اگر دُوسرے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔[2]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۲۸ ب)

جماعتِ اسلامی کے رکن کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- چند مہینوں سے یہ مہم چلی آرہی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور اس کے اہل کاروں کے پیچھے نماز کی اقتداء جائز نہیں، اور جیسا کہ جناب کو معلوم ہے کہ یہ فتویٰ ہزاروی گروپ نے صادر کیا ہے، کیا یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- امیرِ جماعتِ اسلامی کے بعض نظریات جمہور اہلِ سنت کے خلاف ہیں، خاص طور سے بعض انبیاءؑ وصحابہؓ پر جو تنقیص آمیز تنقید انہوں نے کی ہے اس سے اہلِ سنت کے متفقہ عقائد مجروح ہوتے ہیں، لہٰذا جو شخص ان کے ان خیالات سے متفق ہو اسے امام بنانے سے احتراز کرنا چاہئے اور کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو امام بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ اگر کسی وقت ایسا امام میسر نہ ہو اور امیرِ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قوله (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة، وقال الشامیؒ تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلاة خلفهما أولٰی من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع.

جماعتِ اسلامی کے خیالات کے کسی شخص نے نماز پڑھادی تو نماز ہوجائے گی، کیونکہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے ہوجاتی ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

لڑکی کو بیچنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی مسمّٰی احمد دین جو ایک گاؤں کا پیش امام بھی ہے، پچیّس آدمیوں کے رُوبرو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنی زمین فلاں شخص کو اتنے روپیہ پر فروخت کردی ہے، کچھ رقم نقد بھی وصول کرلی ہے اور باقی بوقت بیع نامہ وصول کروں گا۔ دو ماہ کے بعد مسمّٰی مذکور اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا کہ میں زمین نہیں دیتا ہوں۔ مسمّٰی مذکور نے اپنی دُختر فروخت کردی تھی جس کا عوام کو ابھی تک علم نہیں ہوا ہے، اور رقم لے کر ہضم کرچکا ہے، جو ایک زندہ خاوند کی بیوی تھی، اور بدستور امامت بھی کرتا ہے۔ کیا ایسے شخص کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- ایسا شخص جو وعدہ خلافی اور لڑکی کو بیچنے اور دُوسروں کی رقم ناجائز طور سے کھانے کا مرتکب ہو، فاسق ہے، اور جب تک وہ ان گناہوں سے علانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں،[۲] لیکن اگر کسی وجہ سے کوئی نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوجائے گی، واجب الاعادہ نہ ہوگی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامیؒ تحته أفاد ان الصلوٰة خلفهما أولٰی من الانفراد .... الخ. نیز اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب جواہر الفقہ ج:۲ ص:۱۷۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۱۸۱ (مطبع مصطفی البابی، مصر) (و) لذا کره امامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة، قال الطحطاوی: فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة. وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ویکره امامة عبد .... وفاسق) وفی رد المحتار (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد بهٖ من یرتکب الکبائر .... وفیه أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بأنه لا یهتم لأمر دینه وبأن فی تقدیمه تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعاً. وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۱۳۶.

خائن شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔۲:- نام نہاد مدرسہ کے طلبہ اور یتامیٰ کے نام سے زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، خیرات، قربانی کی کھالیں اور عشر وغیرہ وصول کر کے ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاتا ہے، حالانکہ تنخواہ اس کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ یہ باتیں عام لوگوں کو معلوم ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اس سے اُٹھ گیا ہے۔۳:- اپنے عیوب چھپانے کے لئے دُوسروں پر بیباکانہ طور پر اتہام لگاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے نماز صحیح ہے؟

جواب:- اگر واقعۃً کسی شخص میں مذکورہ بالا عیوب پائے جاتے ہوں تو اسے امام بنانا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۲/۲۱ الف)

ماموں سے ناراض شخص کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص نے اپنے ماموں سے قرآن شریف پڑھا ہے، اب اس کا ماموں اس سے سخت ناراض ہے اور اپنے حقوق اس کو نہیں بخشتا، کیا اب اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس کو ماموں اپنے رشتہ داری کے حق حقوق بھی نہیں بخشتا؟

جواب:- اگر ماموں کسی معقول اور شرعی وجہ سے ناراض ہے تو اس پر واجب ہے کہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرے، اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ اس پر موقوف ہے کہ ماموں کی ناراضگی کی وجہ معلوم ہو۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۱۹ الف)

بے خبری میں بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص ایک مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے گیا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسجد کس مسلک

(۱) پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے لوگوں کی ہے۔ بعد ازاں اسے پتہ چلا کہ امام صاحب بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہئے یا نہیں؟ اگر پڑھ لی گئی تو ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب:- نماز پڑھنے کے لئے ایسا امام منتخب کرنا چاہئے جو صحیح العقیدہ ہو، تاہم اگر بریلوی مسلک کے کسی امام کے پیچھے نماز بے خبری میں پڑھ لی گئی یا اس کے علاوہ کہیں اور جماعت ملنا ممکن نہ تھا اس حالت میں پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔(۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷ ج)

جرگے کا فیصلہ مقدم ہے یا باجماعت نماز؟
شور جھگڑے کی بناء پر جماعت کی نماز توڑنا

سوال ۱:- نماز کا وقت ہوگیا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے سامنے جرگے میں بیٹھے تھے، مولوی صاحب کو دو بار آواز دی گئی کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لوگ انتظار کر رہے ہیں، اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ فرض نماز سے پہلے جرگے کا فیصلہ اہمیت رکھتا ہے۔ آئندہ ایسے مولوی صاحب کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

۲:- عصر کی نماز کی جماعت کھڑی تھی، مولوی صاحب خود جماعت کرا رہے تھے، محلے میں شور جھگڑا ہوگیا، مولوی صاحب نماز فوراً توڑ کر مسجد سے باہر بھاگ گئے۔ ایسے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- جرگے کا فیصلہ کرنے کے لئے جماعت ترک کرنا جائز نہیں ہے، اِلَّا یہ کہ مسئلہ ایسا ہو کہ اس وقت فیصلہ بیچ میں چھوڑ دینے سے کسی بڑے فتنے فساد کا اندیشہ ہو، لہٰذا مسئلے کا جواب اس فیصلے کی صحیح نوعیت پر موقوف ہے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں نماز توڑنا جائز نہیں تھا، جن امام صاحب نے ایسا کیا انہیں اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور وہ ایسا کرلیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ و)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامیؒ تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلوٰة خلفهما أولٰی من الانفراد .... الخ.

سیاسی اختلاف کی بناء پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- زید اپنے باپ دادا کے وقتوں سے ایک محلے میں امام چلا آرہا ہے، اچھا عالم ہے، بچوں کو خوب قرآن پڑھاتا ہے، محلے کے دو تین افراد جو اثر و رُسوخ والے ہیں اور پیپلز پارٹی والے ہیں، امام صاحب کے مخالف ہیں، امام صاحب کے حامی عوام غریب ہیں اور ان دو تین افراد کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے۔ بھٹو صاحب کے آخری دور میں سیاسی اختلاف کی بناء پر امام صاحب کو نکال کر دُوسرا امام لائے، اب دُوسرے امام کے پیچھے شرعاً نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب پہلے امام میں کوئی خرابی نہیں تھی تو ان کو محض سیاسی اختلاف کی بناء پر معزول کرنا کسی طرح دُرست نہیں تھا، لیکن اب جبکہ دُوسرے امام صاحب کا تقرّر کردیا گیا ہے تو اگر ان میں کوئی بات موجبِ کراہت نہیں ہے تو ان کے پیچھے بھی نماز جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۸۷۷/۲۸ ج)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالم الغیب" اور "حاضر و ناظر" ماننے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی مولوی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتا ہو یا ان کو عالم الغیب سمجھتا ہو، نیز یہ بھی کہتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی علم ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ بارش کب ہوگی؟ کوئی کب مرے گا؟ یا ان کو نور مانتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- جس امام کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ وہ مذکورہ عقائد کا قائل ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶/۲۲ ب)

---

(۱) وفی الکبیری شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع أیضًا لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل. وفی تنویر الأبصار مع شرحه ج:۱ ص:۵۵۹-۵۶۱ یکره امامة عبد .... ومبتدع أی صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول صلی الله علیه وسلم لا بمعاندة بل بنوع شبهة .... لا یکفرها، وان کفر بها فلا یصح الاقتداء به أصلا .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وانما یجوز الاقتداء به مع الکراهة اذا لم یکن ما یعتقده یؤدی الی الکفر عند أهل السنة، اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز أصلًا. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۲/۳،۱۷۰۔

مسجد کی دُوسری منزل پر جماعت کرانے کا حکم

سوال:- دومنزلہ مسجد کی دُوسری منزل پر نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ منزلِ اوّل بالکل خالی ہو اور امام اور مقتدی سب دُوسری منزل پر نماز ادا کرتے ہوں۔

جواب:- وکرہ تحریما الوطئ فوقه والبول والتغوط، لأنه مسجد الى عنان السماء. (درمختار مع شامی ج:۱ ص:۴۱۲)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد آسمان تک مسجد ہی ہوتی ہے اور اُوپر کی منزل بھی مسجد ہی ہے۔ لہٰذا اس میں جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں[2]، البتہ بلاضرورت ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ یہ تقلیلِ جماعت کا سبب بن سکتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/۱۸ الف)

امام اگر سائبان کے نیچے کھڑا ہو اور مقتدی پیچھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہماری مسجد میں صحن میں سائبان پڑا ہوا ہے، اس کے بعد صحن شروع ہوجاتا ہے، امام صاحب سائبان کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں۔ اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس طرح نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک صف امام کے ساتھ سائبان کے نیچے ہونا ضروری ہے، اگر ایسا نہیں ہوا تو نماز نہیں ہوگی، اگر ہوگی تو مکروہ ہوگی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز دُرست ہے، اور اس میں کوئی کراہت بھی منقول نہیں ملی، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ امام سائبان سے ذرا پیچھے کھڑا ہوجائے اس طرح کہ اس کے قدم سائبان سے باہر ہوں، سجدہ خواہ سائبان کے نیچے ہوجائے، أخذ مما فی الدر المختار وقیام الامام فی المحراب لا سجوده فیه (أی یکره ذلک)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۸ ج)

کیا امام، امامت سے اُستاذ بن جاتا ہے؟

سوال:- چند مسائل درپیش ہیں، جن کا جواب درکار ہے۔

۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرعِ متین دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) اس مسئلے سے متعلق مکمل تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۵ (طبع ایچ ایم سعید)

وہ اُستاذ بنتا ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ اُستاذ بن جاتا ہے تو کیا اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ عام مروّجہ اُستاذوں کا احترام کیا جاتا ہے؟

۲:- عام عرف میں امام کو اُستاذ کہا جاتا ہے، کیا یہ اُستاذیت، امامت کی خصوصیت ہے یا مطلق نماز پڑھنے کی؟

۳:- ایک حافظِ قرآن دُوسرے حافظِ قرآن کی منزل سنتا ہے، کیا یہ منزل سننا تعلیم میں شمار ہوتا ہے یا کہ تذکرہ میں؟ اور یہ بھی بتائیں کہ اُستاذ کب اور کیسے بنتا ہے؟ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- محض امامت سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر امام کی بھی تعظیم کرنی چاہئے۔

۲:- یہ عرف صحیح نہیں ہے، ہاں! اگر امام سے کوئی دین کی بات سیکھی ہو تو وہ اُستاذ ہوگیا۔

۳:- شرعاً اس سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر چونکہ قرآن یاد کرنے میں ایک دُوسرے کی مدد ہوئی، اس لئے ایک دُوسرے کی عزّت کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸/۵۶)

ریڈیو سننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص ایک حد تک بڑا پابندِ شریعت ہے، صرف ایک بات اس میں پائی جاتی ہے یعنی ریڈیو سنتا ہے، ریڈیو میں صرف تلاوتِ قرآن مجید اور ترجمہ اور کوئی مسائل دینی اگر نشر ہوں تو سنتا ہے اور خبریں بھی، باقی فلمی ریکارڈ وغیرہ نہیں سنتا، اور لوگوں کا امام ہے۔ نماز اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر ساز و موسیقی اور دُوسری ناجائز چیزیں سننے سے اجتناب کیا جائے تو ریڈیو سننا بالکل جائز ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، چنانچہ شخصِ مذکور کے پیچھے نماز دُرست ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۲/۱۹ الف)

بلاثبوت، زنا کی تہمت لگانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کسی پر بلاثبوت، زنا کی تہمت لگاتا ہے، ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور اس

کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- کسی شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا گناہِ کبیرہ ہے،[۱] اگر ایسا کرنے والا توبہ نہ کرے تو فاسق ہے،[۲] اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، لیکن اگر نماز پڑھ لی گئی تو ادا ہوجائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۹۶ ب)

امام کا امامت برقرار رکھنے کے لئے چند شرائط لگانے کا حکم

سوال ۱:- ایک مولانا صاحب ہندوستان سے فارغ ہے، یہاں ایک جامع مسجد میں پیش امام ہے، اور اپنے مقتدیوں کو یوں تقریر کرتا ہے کہ اگر امامت کو برقرار رکھنا ہے تو میری نصیحت پر عمل کرو۔

۲:- تم لوگوں پر میری ماہوار تنخواہ کا جو حصہ لگایا جائے گا اس کو ہر مہینے میں دینا ہوگا۔

۳:- پورے مہینے امام کو عمدہ کھانا کھلانا ہوگا۔

۴:- مسجد کی موقوفہ زمین امام کے نام پر رجسٹری وقف کرنا ہوگی۔

۵:- میں گھر جاؤں تو کسی اور کو امام بناؤں گا۔

۶:- جو مقتدی مذکورہ شرائط پر عمل نہ کرے گا، امام اس مقتدی کے کسی دینی دُنیوی کام میں شرکت نہ کرے گا، یعنی میّت کی جنازہ وغیرہ۔

۷:- اور یہی وصیت اپنے خلیفہ کو بھی کرتا ہے۔

جواب:- امام صاحب کی لگائی ہوئی شرائط میں سے نمبر ۳، ۶ و ۷ شریعت کے مطابق نہیں، انہیں چاہئے کہ یہ شرائط عائد نہ کریں، لیکن ان شرائط کے عائد کرنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۰ الف)

کشفِ قبور کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- جو شخص کشفِ قبور کا قائل ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ نور کی آیت:۴ "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" (الآیۃ) کے تحت تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۳۵۳۔

جواب:- کشفِ قبور کوئی اَمرِ محال نہیں، بعض اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے یہ ملکہ دے دیا جاتا ہے، اگر کوئی اس کا قائل ہو تو مضائقہ نہیں، البتہ کشفِ قبور کے ذریعے کسی خلافِ شریعت بات پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ جو شخص کشفِ قبور کے ذریعے کسی ناجائز بات پر استدلال کرے وہ مرتکب بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہوجائے گی۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۲۲ الف)

جھوٹ بولنے والے اور مسجد کا سامان اپنے گھر میں استعمال کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ یہاں سعودی گورنمنٹ بلا تابعیہ مسجد بنانے نہیں دیتی، اس لئے مولوی صدیق تابعیہ والا کے نام سے ہمارے محلے کی مسجد کو تعمیر کرنا پڑا۔ مولوی موصوف چونکہ تابعیہ والا ہے اس لئے مولوی موصوف کو متولّی مسجد بنا کر ہم نے تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسجد کو چلایا ہے، آج عرصہ تین سال سے مولوی موصوف نے ایک مولوی صاحب کو ہماری مسجد کا امام بنادیا ہے، مولوی موصوف نے امامِ مسجد کو خادم کہہ کر اقامہ بھی بنادیا ہے، مولوی موصوف خود امام کا کفیل بھی ہے، جس پاسپورٹ پر اقامہ بنادیا ہے وہ پاسپورٹ چونکہ جعلی تھا، گزشتہ سال جب جعلی پاسپورٹ والوں کی یہاں جوازات کی طرف سے پکڑ دھکڑ اور تلاش ہورہی تھی تو امام صاحب نے اپنا پاسپورٹ چھپالیا، پھر حکومت میں پاسپورٹ گم ہونے کا اعلان کرکے درخواست دے دی، پھر سفارت خانے سے نیا پاسپورٹ حاصل کیا، اس پر پھر اقامہ بنایا۔ امام صاحب نے پاسپورٹ گم ہونے کا جو اعلان کیا ہے وہ بالکل جھوٹ اور کذب ہے، اس میں توریہ وتعریض بھی نہیں کیا، حالانکہ پہلا پاسپورٹ امام کے پاس موجود ہے۔ اس بات پر مقتدیوں نے امام سے ناراض ہوکر اس کے خلف میں اقتداء کرنا چھوڑ دیا، مقتدیوں نے دُوسری مسجد میں جاکر نماز پڑھنا شروع کردیا ہے۔ یہ تو ساری پہلی بات تھی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اس امام صاحب نے مسجد کا سامان گھر میں استعمال کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدمی نے مسجد کے لئے پانی دیا تھا، تاکہ اس سے لوگ وضو کریں، امام صاحب نے یہ پانی بجائے مسجد کے مدرسہ میں اور مسجد کے کرایہ کے مکانوں میں خرچ کیا، جب

محلے کے لوگوں نے امام صاحب سے یہ سب باتیں پوچھیں تو امام صاحب سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا ہے، ان کی وجہ سے محلے کے اکثر لوگوں نے ناراض ہوکر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا، دُوسری مسجد میں نماز پڑھنا شروع کردیا۔ مولوی صدیق صاحب نے مذکورہ امام کو معزول کرنے کی اور دُوسرا امام رکھنے کی اجازت تو دی ہے مگر موجودہ امام متولیٔ مسجد رہے گا اور سب کا سرپرست ہوگا۔ یہ بات محلے والوں پر مشکل گزری۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوّلاً امام صاحب نے اقامہ اور پاسپورٹ کی وجہ سے صریح جھوٹ بولا، ثانیاً مسجد کے فرش، مسجد کے ایئرکنڈیشن اور مسجد کے پانی میں ناجائز تصرف کیا، ثالثاً امام صاحب مقتدیوں سے سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا، رابعاً امام صاحب کو معزول کرنے کی طاقت بھی مقتدیوں کو نہیں ہے، اور امام صاحب کے ساتھ اختلاط کی صورت میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں، ان وجوہ کی بناء پر جو لوگ دُوسری مسجد میں نماز پڑھتے ہیں کیا وہ لوگ غلطی پر ہیں؟

جواب:- جھوٹ بولنا اور مسجد کا سامان گھر میں استعمال کرنا حرام ہے، جو اس حرام کا مرتکب ہو جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے فاسق کے حکم میں ہے، اسے باختیارِ خود امام بنانا یا کسی صالح امام کے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں، اعادے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر یہ اُمورِ محرّمہ ان سے ثابت ہوں اور توبہ بھی نہ کریں تو منتظمینِ مسجد پر واجب ہے کہ وہ کسی صالح امام کا انتظام کریں۔ واللہ اعلم

۲۵/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹۹/۳۹ و)

اپنے اُوپر عائد شدہ مختلف الزامات کے دُرست جوابات دینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ ایک امام صاحب کو مسجد کے احاطے کے اندر کونے میں ایک مکان بناکر دیا ہوا ہے، اور تقریباً ۱۴-۱۵ سال سے وہ اس مسجد کی امامت کر رہے ہیں اور اسی کے احاطے کے اندر ایک مدرسہ ہے، اس مدرسہ کے مہتمم بھی امام صاحب ہیں، مسجد و مدرسہ دونوں کی طرف سے امام کو مبلغ ۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، مسجد و مدرسہ کی کمیٹی کے آفس عہدیداران کی طرف سے امام و مہتمم صاحب پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے ہیں، کمیٹی کے یہ الزامات اور امام صاحب کے جوابات ذیل میں درج ہیں، آپ اپنے شرعی فیصلہ سے مطلع فرماکر مشکور فرماویں۔

(کمیٹی کی طرف سے امام صاحب سے کئے گئے سوالات اور امام صاحب کے جوابات)

سوال:- آپ کو جو مکان مسجد کی طرف سے ملا ہے، اس کی چھت پر مرغیوں کے پالنے کی جگہ کس کی اجازت سے بنائی ہے؟

جواب:- (عرصہ ایک سال ہوا جب بنائی تھی)۔ صدر کمیٹی صاحب سے پوچھا تھا، بنانے سے قبل میں صدر صاحب کے گھر گیا ان سے کہا کہ جناب تنخواہ کم ہے، عیال دار ہوں، خیال ہے کہ جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کی چھت پر کچھ مرغیوں کی جگہ اپنے خرچ سے بناؤں، آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمانے لگے اچھا روزگار ہے، بسم اللہ کرکے شروع کریں۔ مگر اب جبکہ ایک سال کے بعد یہ مسئلہ اُٹھا تو صدر صاحب انکار کرتے ہیں کہ میں نے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔

جناب صدر صاحب قسم کھانے کو تیار ہیں اور امام صاحب بھی قسم اُٹھانے کو تیار ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر صاحب کو وہ اجازت یاد نہیں ہے۔

(نوٹ:- مذکورہ مرغیوں کی جگہ بمع اس کے اسباب کے، امام صاحب نے ذاتی خرچ سے کیا تھا، مسجد کے نام وقف کردیا ہے تاکہ تمام اعتراض ختم ہو۔)

سوال:- مسجد کمیٹی نے آپ کو ذاتی مصرف کے لئے جو بجلی دے رکھی تھی وہ مرغیوں میں آپ نے کس کی اجازت سے جلائی؟

جواب:- مکان کی چھت پر ایک بلب پہلے ہی لگا ہوا تھا اور تقریباً دس گیارہ بجے رات تک ہم اپنے مصرف کی روشنی کے لئے جلاتے تھے، اس بلب سے مرغیوں کی جگہ اور باہر کا کام لیتا رہا اور ایک سال تک یہ بلب اسی طرح جلتا رہا، ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس طرح کرنا بھی اچھا نہیں ہے، اب جبکہ اس سال تین بلب جلانے کی نوبت آئی ہے تو آپ حضرات کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی میں حساب کروا رہا تھا کہ ایک بلب ۶۰ واٹ کا اگر روزانہ اتنا جلے تو مہینے میں کتنی بجلی خرچ ہوتی ہے تاکہ رقم، میں مسجد میں جمع کروادوں، مگر اس سے قبل کہ میں حساب کرواکر جمع کرواتا آپ حضرات کی طرف سے سوال ہوگیا، گزشتہ سال جو ایک بلب جلتا رہا کمیٹی چاہے تو چھوڑ دے اور چاہے تو اس کا سارا حساب کرکے مجھ سے رقم وصول کرلے۔

سوال:- گیس کی پکی ہوئی اینٹیں کسی صاحب نے مدرسہ کو دی تھیں، آپ نے اپنی مرغیوں کی جگہ پر کیوں لگائیں؟

جواب:- مدرسہ کے مدرّس کے لئے ایک کمرہ میری نگرانی میں بنایا گیا، جب اس کی بنیاد

کھودی تو شومئ قسمت سے مستری کے منہ سے نکل گیا کہ کنکر اینٹیں جو پڑی ہیں بنیادوں میں لگ جائیں تو اس کمرہ کی بنیاد مضبوط رہے، وہ کنکر اینٹیں میں نے اپنی مرغیوں کی جگہ بنانے کے لئے منگوائی تھیں، میں نے اس وقت مدرسہ کا فائدہ مدِنظر رکھ کر مستری سے کہا کہ میری اینٹوں سے یہ کنکر اینٹ بنیادوں میں لگادو اور مدرسہ کی اینٹوں کی اتنی تعداد میری اینٹوں میں ڈال دو، اس وقت مدرسہ کا فائدہ ذہن میں تھا، مسئلہ کی حقیقت ذہن میں نہیں آئی کہ میں اس طریقے سے مدرسہ کے لئے نہ اپنی اینٹیں دے سکتا ہوں اور نہ اس طرح لے سکتا ہوں، جب اعتراض اُٹھا تب یہ حقیقت کھلی کہ میں غلط قدم اُٹھا چکا ہوں مگر میرے اس طرح کرنے سے مدرسہ کو فائدہ ہوا، کچھ نقصان نہیں ہوا۔

سوال:- مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں جو لوہا، ریتی، سیمنٹ وغیرہ آیا ہوا ہے اس کو آپ اپنی مرغیوں کی جگہ کے مصرف میں کیوں لائے؟ اور کس کی اجازت سے لائے؟

جواب:- اینٹیں میں نے خود اپنی رقم سے مدرسہ کے آرڈر کے ساتھ منگوائیں رسید میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، سیمنٹ اس کام کے لئے میں نے خود خریدا اس کی رسید بھی میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، البتہ میرے مزدوروں اور مستری سے ایک موقع پر یہ غلطی ہوگئی وہ یہ کہ میں گھر میں موجود نہیں تھا اور کام کرتے ہوئے سیمنٹ ختم ہوگیا تو مستری اور مزدور اپنی یومیہ مزدوری کے خوف سے مدرسہ کا سیمنٹ اُٹھا کر لے گئے کہ یہ کام بھی امام صاحب کروا رہے ہیں اور مدرسہ کا کام بھی امام صاحب ہی کروا رہے ہیں وہ ادا کردیں گے، میں شام کو جب واپس آیا تو مجھے انہوں نے بتلایا جس پر میں ان پر خفا ہوا، اس سیمنٹ کی جتنی قیمت بنتی تھی اس وقت کے نرخ کے حساب سے وہ رقم مدرسہ کے فنڈ میں جمع کرواکر رسید کاٹ دی وہ رقم کی رسید اور جن مزدوروں نے سیمنٹ اُٹھایا تھا ان کا حلفیہ بیان میرے پاس موجود ہے (جو دِکھایا گیا)۔

سریئے کے ردّی ٹکڑے جو بچتے تھے، مؤذّن کو میں کہہ دیتا تھا کہ کوئی ردّی والا آئے تو اسے دے دیا کرو، ایک موقع پر تھوڑے سے مجھے ضرورت پڑے، میں نے لے لئے اور اندازے سے ان کی قیمت ادا کردی (مگر غلطی یہ ہوئی کہ تول کر نہیں لئے)۔

سوال:- مدرسہ میں جو رقم زکوٰۃ وفطرہ اور چرمِ قربانی کی وصول ہوئی وہ مدرسہ کے اکاؤنٹ میں اب نہیں ہے، وہ مدرسہ کے کس مصرف میں استعمال کی؟

جواب:- مدرسہ کی رقم بینک میں جمع تھی، میں تو تعمیری اخراجات کا بل بناکر صدر صاحب کے حوالے کردیتا تھا، صدر صاحب اس کو پاس کرتے تھے اور خازن صاحب کے پاس چیک بک تھی وہ چیک بناتے تھے، جس پر صدر صاحب اور دیگر تین آدمیوں میں سے دو کے دستخط ضروری تھے، میں ازخود

تو ایک پائی بھی بینک سے نہیں نکال سکتا تھا، یہ سوال تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے خیال نہیں کیا کہ جن کی ذمہ داری تھی اور نہ میں بینک سے معلوم کرسکا اور بظاہر اب وہ رقم بھی تعمیری رقم کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر میں خرچ ہوگئی، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اب مدرسہ کی تعمیر کے لئے جو رقم آئے گی اس میں سے مذکورہ رقم نکال کر اس فنڈ کو پورا کرلینا۔

مذکورہ بالا سوالات و جوابات کو ملاحظہ فرما کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں کہ مذکورہ الزامات کے جوابات پڑھنے کے بعد امام صاحب کس قدر مجرم ہیں؟ آیا ان کو امام رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

نوٹ:- چھت پر مرغیوں کے لئے جگہ بنانے کے سلسلے میں جو خرچ اُٹھا اس پر کل .....روپے امام صاحب کے خرچ ہوئے، وہ سارا تعمیری ملبہ بمع تعمیر کے امام صاحب نے مسجد و مدرسہ کو وقف کردیا ہے، اور کمیٹی نے ایک سال ہوا اس پر رضامند ہوکر متفقہ فیصلہ کرلیا تھا، مگر اب پھر فتویٰ نمبر۱ کے چار سوالوں کے ساتھ گزشتہ دو برس کے الزاموں کو شامل کرکے حقیقت میں مفتی صاحب کے سامنے امام صاحب کے جرموں کو سنگین شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ فقط والسلام!

جواب:- مذکورہ سوالات کے جو جواب امام صاحب نے دیئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو امام صاحب بالکل بری الذمہ ہیں اور ان پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے دو سوال کا تعلق ہے وہ تو سوال ہی نامعقول اور غیرمنصفانہ ہیں، جو مکان امام صاحب کو رہنے کے لئے دیا گیا ہے اگر وہ اس میں اپنے معاش کے لئے کوئی کام کریں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح بجلی کا استعمال اپنی ہر ضرورت کے لئے کرسکتے ہیں، کمیٹی والوں نے اس بارے میں جواب طلبی کرکے زیادتی کی ہے، باقی سوالات تو دُرست ہیں، لیکن جوابات بھی معقول ہیں، اور اگر ان کی صحت ثابت ہوجائے تو امام صاحب پر اعتراض کسی طرح دُرست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴/۱۷/۳۰ د)

ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں، یہ کہ ہماری مسجد میں جو امام صاحب ہیں اور جو کہ مسجد کے ملحق دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں، موصوف کو کمیٹی کی طرف سے دو تنخواہیں ملتی ہیں، ۲۳۵ روپے مسجد کی امامت کے اور ۱۲۵ روپے مہتمم ہونے کے، جملہ ۳۶۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، گزشتہ مہینے انتظامیہ کی طرف سے امام صاحب کو ایک اظہارِ وجوہ کا نوٹس

ملا ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے اور نمبروار جوابات بھی درج ہیں۔

(سوالات از کمیٹی)

۱:- گزشتہ تین ماہ سے اہلِ محلّہ کی مسلسل درخواستیں آرہی ہیں کہ آپ کسی نہ کسی نماز میں روزانہ ضرور غیر حاضر رہتے ہیں، نمازی انتظار کرتے ہیں، پھر کوئی دُوسرا نماز پڑھا دیتا ہے، اس پر آپ کو متوجہ کیا گیا، ہنوز اثر نہ ہوا۔

۲:- باوجود منع کرنے کے آپ نے مسجد کی سیڑھی کرائے پر دی اور رقم وصول کی، نوٹس ملنے پر غلط بیانی تحریر کی۔

۳:- آپ کو معلّمِ مدرسہ کی غیر موجودگی میں صرف تھوڑا وقت پڑھانے کو کہا گیا، مگر آپ نے صاف انکار کردیا۔

۴:- باوجود صدر کمیٹی کے منع کرنے کے آپ نے اپنے مکان (مسجد کی ملکیت جو امام صاحب کو ملا ہوا ہے) پر پاخانہ بنوایا۔

(جوابات از امام صاحب)

۱:- گزشتہ دو ماہ یعنی اپریل و مئی میں کچھ وقتوں کی نمازوں میں غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ اپریل ۱۹۷۸ء میں دو روزہ ختمِ نبوّت کانفرنس ہوئی (چونکہ میں یہاں حیدرآباد کی مجلس ختمِ نبوّت کا ضلعی ناظم ہوں) اس کے انتظام کے سلسلے میں مجھے کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی، جس کی وجہ سے اکثر نمازوں میں غیر حاضر ہوجاتا تھا (مگر اپنی جگہ قائم مقام مقرّر کرجاتا تھا، اِلَّا ماشاء اللہ) مگر صدر منتظم صاحب کو میں نے زبانی کہہ دیا تھا کہ کانفرنس کے انتظامات کے سلسلے میں اکثر نمازوں میں میری غیر حاضریاں ہوں گی، میری غیر موجودگی میں مدرّسِ قرآن قاری صاحب یا مؤذّنِ مسجد صاحب نمازیں پڑھائیں گے، صدر صاحب نے فرمایا کہ اللہ مالک ہے، فکر نہ کریں۔ اور ایک دن کے لئے اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرگیا۔ مئی کے شروع میں ایک گھریلو جھگڑے کو نمٹانے ایک دن پھر کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرکے گیا اور صدر نے اجازت دی، اور پھر اس مہینے ہمارے حضرت مولانا غلام حبیب صاحب حلوائی اچانک کراچی تشریف لائے ان سے ملاقات کے لئے کراچی جانا پڑا، اور جب حضرت مولانا حیدرآباد تشریف لائے اور پھر دو روز حضرت کا قیام رہا، میں بھی ساتھ رہا، مگر صدر موصوف سے پوچھ کر گیا۔ علاوہ مذکورہ وجہوں کے، ہفتے میں یوں بھی ایک دو غیر حاضریاں ہوجاتی ہیں کہ لطیف آباد سے شہر گیا واپسی میں وقت پر آنا تو چاہتا ہوں مگر سواری نہیں ملتی یا راستے میں سواری خراب ہوجاتی ہے، کسی شادی و غمی میں جانا پڑتا ہے، بچوں کے علاج و معالجے کے لئے ڈاکٹر کے پاس ہسپتال گیا، وہاں ڈاکٹر کی

مصروفیت کی وجہ سے دیر ہوگئی، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی غیرحاضریاں کوئی جان بوجھ کرنہیں کی جاتیں، بلکہ ہر امامِ مسجد سے اس قسم کی غیرحاضریاں ہو ہی جاتی ہیں، آئندہ کے لئے وعدہ کرتا ہوں کہ عمداً کوئی غیرحاضری نہیں کروں گا، مگر مذکورہ دُوسری قسم کی غیرحاضری تو ہو ہی جاتی ہے۔

۲:- جب سے مجھے منع کیا گیا ہے میں نے خود کسی کو مدرسہ یا مسجد کی سیڑھی کرایہ پر نہیں دی اور بچوں کو بھی منع کردیا کہ کسی کو نہ دینا، مگر اس آٹھ نو ماہ کے عرصے میں پھر بھی تین دفعہ میری عدم موجودگی میں لوگ سیڑھی لے گئے اور بچوں سے کذب بیانی کرکے لے گئے، اور یہ نکال لے جانا اور چھوڑ جانا میری غیرموجودگی میں رہا، مجھے اس کا کوئی کرایہ وغیرہ نہیں ملا، نام ان کے لکھے دیتا ہوں فلاں فلاں ہیں، ایک مرتبہ کا کرایہ میری غیرموجودگی میں ایک آدمی میرے گھر دے کر گیا، اس کو میں نے جمع کروادیا مدرسہ کی رسیدوں میں دیکھ سکتے ہیں، سیڑھی ہر وقت مسجد میں رہتی ہے کوئی لے جائے یا لے آئے، مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ آپ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنے امام پر بدگمانی کرتے ہیں اور پیچھے نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تعجب ہے!

۳:- اس کا جواب میں نے جنرل سیکریٹری جناب ڈاکٹر صاحب کو زبانی دے دیا اور انہوں نے اس وقت میرا عذر قبول کرلیا تھا۔ وہ عذر یہ تھا کہ میرے ذمہ آٹھ دس آدمی اہلِ خانہ کی کفالت کا بوجھ ہے، اس دور میں مہنگائی میں آٹھ نو سو روپے ماہانہ خرچ ہوجاتے ہیں، جبکہ مسجد اور مدرسہ سے بحیثیت امام و مہتمم مجھے کل ۳۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، بقایا اخراجات اس طرح پورا کرتا ہوں کہ صبح ایک اسکول میں جاتا ہوں، ۲۷۵ روپے ادھر سے ملتے ہیں، اور شام بعد نماز ظہر تھوڑا سا آرام کرکے اسکول کے بورڈنگ میں قراءت پڑھانے جاتا ہوں، ۲۰۰ روپے ادھر سے ملتے ہیں، تو اس طرح گھر کا خرچ پورا کرتا ہوں۔

صبح کو بچوں کو پڑھاؤں تو اسکول سے چھٹی ملتی ہے، اور شام کو بورڈنگ جانا بند کروں تو یہ ٹیوشن جاتی ہے۔ آپ میرا یہ عذر قبول کرتے ہوئے مجھے معاف کریں تو احسان ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کچھ وقت نکال لیتے تو اچھا ہوتا، خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا ابھی کوئی عارضی مدرّس رکھ لیں۔ اصل مدرّس کی میں بھی تلاش کرتا ہوں، آپ بھی کریں، اتنی سی بات ہونے کے بعد میں مطمئن ہوگیا کہ ڈاکٹر موصوف صاحب نے میرا عذر قبول کرلیا ہے۔

۴:- مسجد کے جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کے فرش وغیرہ کی اور چھت پر بیت الخلاء کی جس قدر مرمت وغیرہ کی گئی صدر کمیٹی سے اجازت لے کر کروائی ہے، اپنی مرضی سے ایک اینٹ بھی نہیں لگوائی۔ اس مرمت اور چھت پر بیت الخلاء وغیرہ بنانے کی جس کا بھی صدر صاحب انکار کردیں

میں اس کا ہرجانہ دینے کو تیار ہوں۔

مذکورہ سوالات و جوابات میں سے سوال نمبر ایک کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے باقاعدہ چھٹیاں نہیں لی گئیں صرف زبانی کلامی مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا جاتا رہا ہے۔

سوال ۳ کے سلسلے میں جنرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل مطمئن نہیں ہوا تھا بلکہ مدرسہ کا مہتمم ہوتے ہوئے اور مہتممی کی تنخواہ لیتے ہوئے مہتمم کا یہ فرض ہوتا ہے جب کوئی مدرّس غیر حاضر ہو، یا اس کو کمیٹی نکال دے تو اس کی جگہ وہ بچوں کو قرآن مجید وغیرہ پڑھائے، لہٰذا مہتمم نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے، ان کو نکال دینا چاہئے۔

سوال ۴ کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ فرش کی مرمت کی میں نے اجازت دی تھی، مگر بیت الخلاء کی اجازت نہیں دی، اور کبھی کہتے ہیں کہ جب بار بار مجھے مجبور کیا گیا تو میں مجبوراً ہاں نہ کرتا تو کیا کرتا؟ جبکہ بیت الخلاء بنانے میں کل ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپے خرچ ہوئے۔

اب مذکورہ سوالات و جوابات غور و فکر سے پڑھ کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جوابات سے جلد مشکور فرما کر عنداللہ مأجور ہوں، یعنی:-

۱:- مذکورہ امام صاحب امامت کے قابل ہیں اور ان کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا پھر غیر ذمہ دار سمجھ کر ان کو امامت سے برطرف کردینا چاہئے، (جبکہ پنج وقتہ نمازیوں نے ۹۵ فیصد اپنے دستخط سے ایک یادداشت کمیٹی کے نام بھیجی ہے کہ ہم اپنے امام صاحب پر رضامند ہیں اور ان کے خلاف فیصلہ کرنا ہمارے جذبات کو مجروح کرنا ہوگا)۔

۲:- مہتمم ہوتے ہوئے مہتمم نے بچوں کی پڑھائی سے انکار کیا، اس صورت میں ان کو مہتممی سے الگ کردینا چاہئے یا نہیں؟

۳:- صدر صاحب کے انکار پر یا کسی اور کی بات پر امام صاحب کو جھوٹا اور خائن سمجھ کر نکالنا جائز ہے؟ یا صدر صاحب کی بھول سمجھ کر امام صاحب سے کوئی تعارض نہیں کرنا چاہئے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں امام صاحب نے اپنے اُوپر عائد کردہ الزامات کا جو جواب دیا ہے، اگر وہ واقعہ کے مطابق ہے تو امام صاحب پر اس بارے میں کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، اور ان الزامات کی بناء پر انہیں امامت یا مدرسہ کے اہتمام سے سبکدوش کرنا دُرست نہیں۔ کمیٹی کے افراد کو چاہئے کہ وہ امام صاحب کی کماحقہ عزّت کریں اور اس قسم کے الزامات عائد کرکے انہیں پریشان نہ کریں اور امام صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے مفوضہ فرائض دیانت داری سے ادا کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾
(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

مسبوق، سجدۂ سہو کے لئے امام کے سلام میں شرکت نہ کرے

سوال:- مسبوق، امام کے سجدۂ سہو کے لئے سلام میں شرکت کرے یا نہیں؟

جواب:- جس شخص کی کچھ رکعتیں امام کے ساتھ رہ گئی ہوں اسے سجدۂ سہو کے وقت سلام نہ کرنا چاہئے، البتہ امام کے ساتھ سجدہ کرنا ضروری ہے، کذا فی رد المحتار۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/ ۱۸ الف)

مسبوق کی نماز کا طریقہ

سوال:- ایک آدمی نے چار رکعت والی نماز میں دُوسری یا تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شرکت کی، باقی نماز کس طرح ادا کرے؟ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ باقی رکعتوں میں صرف فاتحہ پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ مغرب میں اگر ایک رکعت ہوتو باقیوں میں سورۃ ملائی جائے یا صرف فاتحہ پر اکتفا کیا جائے؟ اس نماز کے بارے میں بھی ان صاحب نے بتایا ہے کہ ایک میں تو سورۃ ملادے، باقی دُوسری رکعت میں فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے۔

جواب:- جس شخص کی ایک یا دو رکعت چھوٹ گئی ہو اُسے مسبوق کہتے ہیں، قراءت کے بارے میں اس کا حکم یہ ہے کہ جب امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی نماز پوری کرے گا تو قراءت کے لحاظ سے یہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی، لہٰذا اس رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآنِ کریم

---

(۱) وفی بدائع الصنائع فصل فی بیان من یجب علیه سجود السهو ج:۱ ص:۱۷۶ (طبع سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو (أی فی سجدة السهو بأن سجد هو) دون السلام بل ینتظر الامام حتی یسلم فیسجد فیتابعه فی سجود السهو لا فی سلامه. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۲ (طبع ایچ ایم سعید) والمسبوق یسجد مع امامه مطلقًا.
وفی الشامیة (قوله والمسبوق یسجد مع امامه) قید بالسجود لأنه لا یتابعه فی السلام.
وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۰۰ (طبع ایچ ایم سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو لا فی السلام، فیسجد معه ویتشهد .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

کی دُوسری آیات بھی پڑھے گا۔ اگر اس کی دو رکعتیں چھوٹی ہیں تو دُوسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا اس کے لئے ضروری ہے، اور اگر تین یا چار رکعتیں چھوٹی ہیں تو پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھے گا مگر اس کے بعد والی رکعتوں میں نہیں پڑھے گا۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۱۹ الف)

مسبوق اپنی نماز کس طرح پوری کرے؟

سوال:- چار رکعتوں میں جس کی ایک رکعت چھوٹ گئی ہو وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پوری کرے؟

جواب:- امام کی نماز ختم ہونے کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی رکعت پوری کرلے اور اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ضروری ہے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ باب صفة الصلوٰة کی عبارت یہ ہے: "ان المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ" اس عبارت میں "ولا یثنی" کا کیا مطلب ہے؟ یا لفظ "لا" غلط ہے، کیونکہ تعوذ پڑھنا اور ثناء ترک کرنا کسی کتاب میں نظر نہیں آتا؟

جواب:- شرح وقایہ کے دستیاب نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے[3]، اور اس پر آپ کا اعتراض

(۱، ۲) فی الدر المختار ج:۱ ص:۵۹۶ (باب الامامة) (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ، وان قرأ مع الامام لعدم الاعتداد بها لکراهتها، مفتاح السعادة (فیما یقضیه) أی بعد متابعته لامامه فلو قبلها فالأظهر الفساد ویقضی أول صلاته فی حق قراءة وآخرها فی حق تشهد، فمدرک رکعة من غیر فجر یأتی برکعتین بفاتحة وسورة وتشهد بینهما وبرابعة الرباعی بفاتحة فقط ولا یقعد قبلها وفی رد المحتار (قوله حتی یثنی .... الخ) تفریع علیٰ قوله: منفرد فیما یقضیه بعد فراغ امامه فیأتی بالثناء والتعوذ، لأنه للقراءة، ویقرأ لأنه یقضی أول صلاته فی حق القراءة کما یأتی وکذا فی الفتاویٰ الهندیة ج:۱ ص:۹۱، ۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۳ ص:۳۷۷، وعزیز الفتاویٰ ص:۲۲۵۔

(۳) شرح الوقایة ج:۱ ص:۱۴۴ (طبع ایچ ایم سعید) (محمد زبیر حق نواز)۔

دُرست ہے، مسئلہ یہی ہے کہ مسبوق کو ثناء پڑھنی چاہئے، تمام متونِ معتبرہ میں مسئلہ یوں ہی لکھا ہے۔

قال فی غنیة المتملّی: والمسبوق یأتی بالثناء اذا أدرک الامام حالة المخافتة ثم اذا قام الی قضاء ما سبق یأتی به أیضًا، کذا ذکرہ فی الملتقط، ووجهه أن القیام الی قضاء ما سبق کتحریمة أخری للخروج به من حکم الاقتداء الی حکم الانفراد.

(کبیری ص:۲۹۷، فصل صفة الصلوٰۃ)[1]

وقال فی الدر المختار: وهو (أی المسبوق) منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ.

(شامیة ج:۱ ص:۴۰۱ أواخر باب الامامة)[2]

اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق جب جماعت میں شامل ہو (اور امام قراءت نہ کر رہا ہو) اس وقت بھی ثناء پڑھے، اور جب اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو اس وقت بھی، البتہ پہلے موقع پر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق تعوّذ نہیں پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ قراءۃ کے تابع ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں مرتبہ تعوّذ بھی پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ ثناء کے تابع ہے، اور فتویٰ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول پر ہے: لما فی رد المحتار لٰکن مختار قاضی خان والهدایة وشروحها والکافی والاختیار وأکثر الکتب هو قولهما أنه تبع للقراءة وبه نأخذ.

(شامی ج:۱ ص:۳۲۹ باب صفة الصلوٰۃ)[3]

بہرحال! شرح وقایہ میں ثناء کی نفی متون کے خلاف ہے، لہٰذا یا تو کتابت کی غلطی سے لفظ "لا" بڑھ گیا ہے یا مصنف شرح وقایہ سے تسامح ہوا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۵ الف)

امام کے سلام کی صورت میں مسبوق تشہد پورا کرے گا یا نہیں؟

(عالمگیری اور شامی و امداد الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق)

سوال:- اگر کوئی مسبوق قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا اور تشہد پورا کرنے سے قبل امام نے سلام پھیرا تو وہ مسبوق اپنا تشہد پورا کئے بغیر اپنی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے یا تشہد پورا کرنا ضروری ہے؟ عالمگیری سے معلوم ہوا کہ پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اور امداد الفتاویٰ سے بحوالہ شامی

---

(۱) غنیة المتملّی ص:۳۰۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۲) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۹۶ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) شامیة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع ایچ ایم سعید).

معلوم ہوتا ہے کہ پورا کرنا ضروری ہے، جواب سے مطمئن فرمایا جاوے۔

جواب:- عالمگیری اور شامی اور امداد الفتاویٰ میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا منشأ یہی ہے کہ مسبوق کے لئے تشہد کو پورا کر کے اُٹھنا افضل ہے، لیکن اگر وہ پورا کئے بغیر اُٹھ جائے تو نماز سب کے نزدیک بلاکراہت ہوجاتی ہے۔ علامہ شامیؒ اس مسئلے کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ومقتضاه أنه يتم التشهد ثم يقوم ولم أره صريحا ثم رأيته في الذخيرة ناقلا عن أبي الليث المختار عندی أنه يتم التشهد وان لم يفعل أجزأه. ولله الحمد. (جلد اوّل باب صفة الصلوٰة بيان الرُّكوع)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فتاویٰ شامية ج: ۱ ص: ۴۹۶ وفتاویٰ عالمگيرية الفصل السادس فيما يتابع الامام وفيما لا يتابعه ج: ۱ ص: ۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)، امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۳۳۹. وكذا في امداد الأحكام ج: ۱ ص: ۵۵۱ وعزيز الفتاویٰ ص: ۲۲۵، وفتاویٰ دار العلوم ديوبند ج: ۳ ص: ۳۷۹.

﴿فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

پہلی صف میں نابالغ بچے کا کھڑا کرنا

سوال:- اگر نابالغ بچے پہلی صف میں کھڑے ہوجائیں تو نماز دُرست ہوجاتی ہے یا مکروہ؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۲۸ ج)

آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا

سوال:- آدھی آستین والی قمیص پہن کر یا آدھی آستین چڑھا کر نماز پڑھنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں، بغیر کسی مجبوری کے؟

جواب:- مکروہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۲/۱۹ الف)

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۱ (طبع ایچ ایم سعید) (ویصف) الرجال ظاهره یعم العبید ثم الصبیان ثم الخناثی ثم النساء، وفی الشامیة تحته (قوله ظاهره یعم العبید) أشار به الٰی أن البلوغ مقدم علی الحریة لقوله صلی الله علیه وسلم: لیلینی منکم أولوا الأحلام والنهی. وفی الدر المختار أیضًا ج:۱ ص:۶۵۶، ۶۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره وفی الشامیة .... والمراد بالحرمة کراهة التحریم .... والا فیکره أی تنزیها.

(۲) اس مسئلے سے متعلق تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ہی کا مصدقہ، راقم مرتب کا فتویٰ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال:- اگر کوئی آدمی آستین چڑھا کر نماز پڑھے تو کیا یہ جائز ہے؟ کہنیاں کھلی ہوئی ہوں یا نہ کھلی ہوئی ہوں، دونوں صورتوں میں کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر کہنیاں کھلی ہوئی ہوں تو اس طرح نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور اس سے کم ہو تو اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مکروہ نہیں، کیونکہ فقہی دلائل میں "مرفقین" "کہنیوں تک" کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کم ہو تو مکروہ نہیں۔ وفي الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۰ (طبع ایچ ایم سعید) وکره کفه أی رفعه ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل وفي الشامیة وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بأن یکون رافعًا کمیه الی المرفقین وظاهره أنه لا یکره الٰی ما دونهما.

(باقی اگلے صفحہ پر)

تصویر والے کمرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- جس کمرے میں کسی مرد یا عورت کا فوٹو آویزاں ہو تو اس جگہ نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟
جواب:- جس مکان میں کسی ذی رُوح کی تصویر لگی یا لٹکی ہو اس میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، اور سب سے زیادہ کراہت اس تصویر میں ہے جو نمازی کے سامنے جانبِ قبلہ میں ہو، پھر وہ جو نمازی کے سر پر معلق ہو، پھر وہ جو اس کے داہنے ہو، پھر وہ جو بائیں جانب ہو، اور سب سے کم کراہت اس میں ہے کہ نمازی کے پیچھے کسی دیوار وغیرہ میں ہو، اور اگر تصویر قدموں کے نیچے ہو تو اس وقت بھی بعض فقہاء کے نزدیک کراہت ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے، لہٰذا پرہیز اس سے بھی کرنا چاہئے۔
کذا فی رد المحتار ج:۱ ص:۴۳۵، باب ما یفسد الصلوٰۃ ویکرہ فیھا۔(۱) واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۹۶/۲۷ و)

محاذات کی دو صورتوں کی تفصیل اور حکم

سوال:- مرسلہ فتویٰ نمبر ۴۵/۳۵۱ محرّرہ مفتی محمد صابر صاحب مدظلہم بتاریخ ۱۲/۲۲/۱۳۸۷ھ میں، آنجناب نے جواب نمبر۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر بیوی اتفاقیہ میاں کے ساتھ نماز پڑھے اور مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے اپنے یہ اعضاء ذرا پیچھے کرکے کھڑی ہو تو کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی، یعنی ہوجائے

(گزشتہ سے پیوستہ)...... اور بعض حضرات کے نزدیک یہ صورت بھی مکروہ ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک آستین چڑھا کر نماز پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے۔ وفی الشامیۃ وقید الکراھۃ فی الخلاصۃ والمنیۃ بأن یکون رافعا کمیہ الی المرفقین وظاھرہ أنہ لا یکرہ الی ما دونھما. قال فی البحر والظاھر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوہ فی الحلیۃ وکذا قال فی شرح المنیۃ الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی قال وھذا لو شمرھما خارج الصلوٰۃ ثم شرع فیھا کذٰلک وراجع أیضًا خلاصۃ الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۸. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۴۲۸ (طبع جدید دارالاشاعت) و امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۶۱ و۵۶۳، و امداد المفتین ص:۳۴۱، ۳۴۲۔

لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ بلاضرورت آستین چڑھا کر نماز نہ پڑھی جائے اور اگر پہلے سے وضو وغیرہ کے لئے آستین چڑھائی ہوئی ہوں تو بہتر یہ ہے کہ عملِ قلیل سے نماز میں آستین نیچے کرلے، مثلاً کچھ رُکوع، کچھ قومہ میں اور کچھ سجدہ میں نیچے کرلے۔
واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد زبیر حق نواز
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ	بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۴۲۳/۷/۲۵ھ	۱۴۲۳/۷/۲۴ھ	۱۴۲۳/۷/۲۶ھ	۱۴۲۳/۷/۲۳ھ

(۱) فی التنویر وشرحہ الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۸ و (کرہ) أن یکون فوق رأسہ أو بین یدیہ أو بحذائہ یمنۃ أو یسرۃ أو محل سجودہ (تمثال) .... واختلف فیما اذا کان التمثال خلفہ، والأظھر الکراھۃ وفی الشامیۃ (الأظھر الکراھۃ) لٰکنھا فیہ أیسر، لأنہ لا تعظیم فیہ ولا تشبہ معراج. وفی الدر المختار أیضًا ج:۱ ص:۶۵۲ (لا یکرہ صلوٰۃ) علی بساط فیہ تماثیل أن لم یسجد علیھا) لما مرّ. وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ لما مر) علۃ لعدم الکراھۃ وھو کونھا مھانۃ ح.

گی، لیکن بہشتی زیور میں یہ لکھا ہے کہ اگر بیوی میاں کے پیچھے نماز پڑھے تو بالکل پیچھے (ایک صف کے فاصلے پر) کھڑی ہو ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی اور مرد کی نماز بھی برباد ہوگی۔

دونوں صورتوں کی الگ الگ کیا نوعیت ہے کہ پہلی صورت میں عورت (ایک مقتدی کی طرح) صرف مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے ذرا پیچھے ہوکر نماز پڑھ سکتی ہے، اور بہشتی زیور کی رُو سے اسے کم از کم ایک صف کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہونا چاہئے؟

جواب:- محاذات کی صحیح تفسیر وہی ہے کہ عورت کا ٹخنہ اور پنڈلی مرد کے کسی عضو کے برابر ہو، لہٰذا اگر کوئی عورت مرد سے اتنے پیچھے کھڑی ہو کہ دونوں کے ٹخنے اور پنڈلی بالکل برابر میں نہیں رہتے، خواہ عورت کے پاؤں کا کوئی حصہ مرد کے پاؤں کے کسی حصے کے برابر میں ہو تو اصح قول کی بناء پر نماز فاسد نہیں ہوگی جس کی صورت یہ ہے:-....... عورت مرد

یہ صورت اصح قول کی بناء پر مفسد نہیں ہے، البتہ بعض فقہاءؒ نے ٹخنے اور پنڈلی کے بجائے پورے قدم کی محاذات کا اعتبار کیا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک مذکورہ صورت مفسد ہے، اور جواز کی صورت ان کے نزدیک یہ ہے:-........................ عورت مرد

بہشتی زیور میں احتیاطاً اس آخری قول کو اختیار کر کے بالکل پیچھے کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے، جس کا مطلب ایک صف پیچھے کھڑا ہونا نہیں ہے بلکہ اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ عورت کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے قدم کے کسی حصے کے برابر نہ ہو۔

قال الشامی عن الزیلعی: المعتبر فی المحاذات الساق والکعب فی الأصح، وبعضهم اعتبر القدم اهـ. فعلیٰ قول البعض لو تأخرت عن الرجل ببعض القدم تفسد وان کان ساقها وکعبها متأخرًا عن ساقه وکعبه، وعلی الأصح لا تفسد وان کان بعض قدمها محاذیًا لبعض قدمه بأن کان أصابع قدمهما عند کعبه مثلًا تأمل. (ثم قال بعد أسطر) .... المانع لیس محاذاة أی عضو منها لأی عضو منه، ولا محاذاة قدمه لأی عضو منها بل المانع محاذاة قدمها فقط لأی عضو منه.(۱)

احتیاط بہرحال بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے میں ہے تاکہ باتفاق نماز دُرست ہوجائے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت ایک صف پیچھے کھڑی ہو بلکہ اس کا مطلب اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ اس کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے کسی عضو کے مقابل میں نہ آئے۔ **المرأة اذا صلت مع زوجها فی البیت ان کان قدمها بحذاء قدم الزوج لا**

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۷۲، وکذا فی التاتارخانیة ج:۱ ص:۶۲۲، ۶۲۳.

تجوز صلاتها بالجماعه، وان كان قدماها خلف قدم الزوج الا أنها طويلة تقع رأس المرأة فى السجود قبل رأس الزوج جازت صلاتهما لأن العبرة للقدم۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۵)۔[1]

والله اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۳۲۷/۱۹ الف)

برآمدے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں

سوال:- بیرونِ مسجد برقی پنکھا لگا ہوا ہے، یعنی برآمدے میں گرمی کے دنوں میں امام صاحب باہر نماز پڑھاتے ہیں سوائے جمعہ کے دن کے، جمعہ محراب میں اندرون مسجد میں پڑھاتے ہیں، کیا اس میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

جواب:- کوئی کراہت نہیں۔

والله سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۶/۱۹ الف)

بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنے کی تفصیل

سوال:- نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جیسا کہ حدیث شریف میں سخت ممانعت آئی ہے، حسبِ ذیل صورتوں میں گزرنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

الف:- اگر نمازی بحالتِ قیام یا قومہ سجدہ گاہ پر نظر کئے ہوئے ہے تو ضرورت مند کتنا فاصلہ چھوڑ کر گزرے؟

ب:- اگر اس کی نظر بحالتِ مذکورہ سجدہ گاہ سے آگے پڑ رہی ہو؟

ج:- اگر نمازی رُکوع یا سجدے میں ہے؟

د:- اس مسئلے میں چھوٹی اور بڑی مسجد کا الگ الگ کیا حکم ہے؟ اور کم از کم کتنی بڑی مسجد کو ''مسجدِ کبیر'' کہا جائے گا؟

جواب:- الف:- اگر مسجد چھوٹی سی ہے تو نمازی کے آگے سے بغیر سترہ کے بالکل نہیں

(۱) فتاوىٰ شامية ج:۱ ص:۵۷۲ (طبع ایچ ایم سعید).

گزرنا چاہئے، اور اگر مسجد بڑی ہے یا

ب،ج:- کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہا ہے تو اتنے آگے سے گزرنا جائز ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ نظر رکھے تو اسے گزرنے والا نظر نہ آتا ہو، جو تقریباً سجدے کی جگہ سے دو گز کے فاصلے تک ہوتا ہے۔ رُکوع، سجدہ، قیام، قومہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔ اور قیام کی حالت میں اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ سے آگے دیکھ رہا ہو تب بھی گزرنے کے لئے فاصلہ اتنا ہی معتبر ہوگا جو اُوپر بیان کیا گیا۔ لما فی رد المحتار: ومقابله ما صححه التمرتاشي وصاحب البدائع واختاره فخر الاسلام ورجحه في النهاية والفتح أنه قدر ما يقع بصره على المار لو صلّى بخشوع أى راميا ببصره الى موضع سجوده۔ (شامی)۔[1]

د:- تقریباً چالیس ہاتھ سے کم رقبے کی مسجد ''چھوٹی'' کہلائے گی، اور اس سے زائد بڑی۔

قال الشامیؒ: قوله ومسجد صغير هو أقل من ستين ذراعًا، وقيل: من أربعين، وهو المختار كما أشار اليه في الجواهر. (قهستاني، شامي)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کندھوں تک بال بڑھا کر رکھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال:- جن لوگوں نے بال کندھوں تک بڑھا کر رکھے ہوئے ہیں تو کیا ان لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے؟

جواب:- نماز تو ہو جاتی ہے، مگر ایسے بال رکھنا جس سے غیر مسلموں یا فساق سے مشابہت پیدا ہو، جائز نہیں۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸/۲۸ الف)

(۱، ۲) رد المحتار باب ما يفسد الصلوٰة .... الخ. ج:۱ ص:۶۳۴ (طبع سعيد).

(۳) وفي سنن أبي داوٗد، باب في لبس الشهرة ج:۲ ص:۲۰۳ (طبع ايچ ايم سعيد) عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی القراءۃ ومسائل زلۃ القاری﴾

(نماز میں قراءت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ کے بعد "رَبّ اغفر لی" کہنا

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کے بعد "رَبِّ اغْفِرْ لِیْ" کہنا کیسا ہے؟

جواب:- "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کے بعد "امین"(۱) کے سوا کوئی جملہ نصوص سے ثابت نہیں، اس لئے "امین" کے سوا کوئی جملہ نہ کہنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/۱۸ الف)

بیماری کی وجہ سے نماز میں الفاظ ادا نہ کرسکے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- اگر کسی شخص کو ایسی بیماری یا کمزوری کی حالت ہو کہ بیٹھ کر نماز تو ادا کرسکے لیکن زبان سے الفاظ ادا کرنے سے سینے میں درد ہوتا ہو تو ایسی حالت میں وہ کس طرح الفاظ ادا کرے؟

جواب:- نماز کے لئے تو یہ ضروری ہے کہ جب تک ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینے پر قدرت ہے، ان سے الفاظ ادا کئے جائیں خواہ معذوری کی وجہ سے اتنے آہستہ ہوں کہ خود بھی نہ سن سکے(۲) اور اتنے آہستہ پڑھنے سے اُمید ہے کہ کوئی معتد بہ تکلیف بھی نہیں ہوگی، معمولی درد کو برداشت کرنا

---

(۱) وفي الصحيح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۱۷۶ باب التسميع والتحميد والتأمين (طبع قديمي كتب خانه) عن أبي هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا أمّن الامام فأمنوا فانه من وافق تأمينه تأمين الملٰئكة غفر له ما تقدم من ذنبه. قال ابن شهاب كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: آمين.

(۲) وفي مجمع الأنهر ج: ص:۱۵۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وأدنى المخافتة اسماع نفسه فقط وهو قول الهندواني وعليه أكثر المشائخ (في الصحيح) احتراز عما قيل: ان أدنى الجهر اسماع نفسه، وأدنى المخافتة تصحيح الحروف، وهو قول الكرخي، وصححه في البدائع .... الخ. وفي الدر المختار ج:۱ ص:۵۳۴ وأدنى المخافتة اسماع نفسه، في "الشامية" فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل الٰى أذنه وبه قال الشافعي، وشرط بشر المريسي وأحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى أذنه، لٰكن بشرط كونه مسموعا في الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه الٰى فيه يسمع، ولم يشترط الكرخي وأبوبكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف .... ثم انه اختار في الفتح أن قول الهندواني وبشر متحدان بناءً علٰى أن الظاهر سماعه .... (باقی اگلے صفحے پر)

چاہئے، البتہ عام ذکر و اذکار دِل دِل میں بھی ادا کئے جاسکتے ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

فاتحہ خلف الامام کا حکم

سوال:- کیا امام کے پیچھے الحمد للہ نہ پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی؟

جواب:- حنفی مسلک میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قراءت کرنا خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا بعد کی سورت، جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے کوئی شخص پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے، فاسد نہیں ہوتی۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ضؔ کا مخرج

سوال:- حرفِ ضاد بعض لوگ مشابہ بدال پڑھتے ہیں، اور بعض مشابہ بظاء، اور بعض ڈال پڑھتے ہیں، صحیح کون سا ہے؟

جواب:- ضاد، ایک مستقل حرف ہے، اس کا مخرج دال، ذال یا ظاء سب سے علیحدہ ہے،

(گزشتہ سے پیوستہ)........بعد وجود الصوت اذا لم یکن مانع .... وذکر أن کلا من قولی الهندوانی والکرخی مصححان وان ما قاله الهندوانی أصح وأرجح لاعتماد أکثر علمائنا علیه وفی البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۳۶ (طبع ایچ ایم سعید) فذهب الکرخی الٰی أن أدنی الجهر أن یسمع نفسه وأدنی المخافتة تصحیح الحروف وفی البدائع ما قاله الکرخی أقیس وأصح. نیز دیکھئے: منحة الخالق علٰی هامش البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۳۶ اور کوئی شخص امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اگر صرف حروف کی صحیح ادائیگی کرے اگرچہ خود کو بھی سنائی نہ دے تب بھی اس کی نماز ہو جائے گی، تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۱۵۵۔

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:

۱:- امام الکلام فی القراءة خلف الامام، از علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ۔

۲:- الدلیل المحکم فی ترک القرائة للمؤتم، از حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ۔

۳:- هدیة المعتدی فی قرائة المقتدی (تالیفاتِ رشیدیہ، ادارۂ اسلامیات)، از حضرت گنگوہی رحمہ اللہ۔

۴:- الدلیل القوی علٰی ترک القرائة للمقتدی، از محدث احمد علی سہارنپوری قدس اللہ سرہٗ۔

۵:- فاتحة الکلام فی القرائة خلف الامام، از حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ۔

۶:- أحسن الکلام فی ترک القرائة خلف الامام، از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم۔ (محمد زبیر)

جو شخص ضاد کو اپنے اصلی مخرج سے ادا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے اسے دال، ذال، یا ظاء پڑھنا جائز نہیں، اور جو شخص اس پر قادر نہ ہو اسے کسی ماہر قاری سے مشق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور جب تک اس کوشش میں کامیاب نہ ہو اسے ظاء کے مشابہ پڑھنا دال کے مشابہ پڑھنے سے بہتر ہے، لیکن نماز دونوں صورتوں میں ہوجائے گی۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸/۲۱ الف)

ضؔ کا مخرج

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" جس کا مخرج زبان کا کنارہ ہے، ڈاڑھوں کے ساتھ ہے، کیا "ولا الظالین" کے مشابہ پڑھ سکتے ہیں یا "ولا الدالین" موٹا کرکے پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- ضاد کا مخرج، دال اور ظاء دونوں سے الگ ہے، اور وہ یہ کہ زبان کا کنارہ دائیں بائیں دونوں ڈاڑھوں کو چھولے، اس کی آواز بھی دال اور ظاء سے الگ ہے، لیکن ظاء کے ساتھ اس کی مشابہت دال کی بہ نسبت زیادہ ہے۔[۲] واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/۳۰ د)

"وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" کے بجائے "وَالْمُشْرِكِيْنَ" پڑھنے کا حکم

سوال:- زید نے نماز میں قراءت کی، اور قراءت میں آیت: "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" (پارہ نمبر۱، آیت نمبر ۱۰۴، سورۂ بقرہ) میں زید نے "وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" کی جگہ "وَالْمُشْرِكِيْنَ" پڑھا، کیا اس سے نماز ادا ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- مذکورہ صورت میں نماز ہوگئی،[۳] دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۳/۲۸ ب)

(۱، ۲) وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وان کان لا یمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقة كالظا مع الضاد .... اختلف المشائخ، قال أكثرهم لا تفسد صلاته، هكذا فی فتاویٰ قاضی خان وكثير من المشائخ أفتوا به. نیز ضؔ کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "رفع التضاد عن حكم الضاد" جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومنها حذف حرف، ان كان الحذف على سبيل الايجاز والترخيم فان وجد شرائطه .... لا تفسد صلاته، وان لم يكن علىٰ وجه الايجاز والترخيم فان كان لا يغيّر المعنى لا تفسد صلاته .... الخ.

تین چھوٹی آیات کے برابر آدھی آیت پڑھنے سے نماز ہوجائے گی

سوال:- نماز میں قرآن کی ایسی بڑی آدھی آیت جو چھوٹی تین آیتوں کے برابر ہو، اسے پڑھنے سے نماز ہوگئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز ہوگئی، اعادے کی ضرورت نہیں۔ **لأن نصف الاٰية الطويلة اذا كان يزيد علىٰ ثلاث اٰيات قصار يصح علىٰ قولهما، فعلىٰ قول أبي حنيفةؒ المكتفي بالاٰية أولىٰ، كذا في رد المحتار۔**[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۵/۲۸ ج)

نماز میں مجہول قراءت کرنا

سوال ا:- لورالائی کی جامع مسجد کا امام مجہول پڑھتا ہے، اس لئے کسی کی نماز نہیں ہوتی، شرعاً کیا حکم ہے؟ ۲:-ض کی جگہ ڈ پڑھتا ہے، اس کا حکم کیا ہے؟ ۳:- اور اس مسئلے میں اگر کسی امام صاحب نے غلط مسئلہ بتایا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب ا:- مجہول پڑھنا غلط ہے، اس کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے، مگر اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر کوئی اور حافظ نہ ملتا ہو تو مجبوراً اسی کے پیچھے پڑھ لیں۔

۲:- ضاد کو صحیح مخرج سے نکالنے کی کوشش بھی واجب ہے، تاہم جس شخص سے کوشش کے باوجود صحیح مخرج سے نہ نکلے اس کی نماز صحیح قول کی بناء پر ہوجاتی ہے[2]، جن امام صاحب نے اس کے خلاف مسئلہ بتایا انہوں نے غلط کہا، لیکن محض اس بناء پر ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۹/۲۸ ج)

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۵۳۷ (طبع سعيد) وفي الشامية أيضًا ج:۱ ص:۵۳۸ لو قرأ اٰية طويلة في الركعتين كاٰية الكرسي أو اٰية المداينة البعض في ركعة والبعض في ركعة اختلفوا فيه علىٰ قول أبي حنيفة قيل لا يجوز لأنه ما قرأ اٰية تامة في كل ركعة وعامتهم علىٰ أنه يجوز. وكذا في الهندية ج:۱ ص:۷۸ (طبع رشيديه كوئٹه).
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۹۰۔

(۲) وفي غنية المتملي شرح المنية ص:۴۷۶ وان لم يكن الا بمشقة كالظاء مع الضاد، والصاد مع السين، والطاء مع التاء فقد اختلفوا، فأكثرهم علىٰ عدم الفساد لعموم البلوىٰ. وكذا في الهندية ج:۱ ص:۷۹. نیز دیکھئے: عزیز الفتاویٰ ص:۲۳۷، نیز ض کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیچ میں چھوٹی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا

سوال:- امام صاحب وتروں میں رمضان المبارک کے اندر پہلی رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ"، دُوسری میں "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ" اور تیسری میں سورۂ اِخلاص پڑھتے ہیں، اور "تَبَّتْ یَدَا" چھوڑ دیتے ہیں، یہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب:- اس طرح بیچ میں کوئی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا مکروہ ہے، بشرطیکہ قصداً ایسا کیا گیا ہو، اور سہواً ہو تو کراہت بھی نہیں ہے، اور نماز ہر صورت میں ہوگئی، نہ سجدۂ سہو واجب ہے، نہ اعادہ۔

لما فی الدر المختار: ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ۔[1]

وفی رد المحتار: الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سھوًا فلا، کما فی شرح المنیۃ (شامی قبیل باب الامامۃ ج:۱ ص:۳۶۷)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ ہ)

۱:- فجر کی پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے طویل کرنا
۲:- قراءت میں متعدّد غلطیوں کا حکم

سوال۱:- امامِ مسجد نے فجر کی جماعت میں پہلی رکعت میں سورۂ مزمل کی چھ آیات از: "یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ" الیٰ "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا" پڑھیں، دُوسری رکعت میں دُوسرا رُکوع سورۂ مذکور کا جو ایک لمبی آیت ہے پڑھ کر سجدہ کیا، کیا نماز ہوگئی؟ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی رکعت سے دُوسری رکعت میں لمبی سورت نہیں پڑھنی چاہئے، اس کی کیا حقیقت ہے؟

۲:- امام صاحب نے پہلی رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتے ہوئے: "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی جگہ سہواً "فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" پڑھا، جب خیال آیا تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" پڑھنا شروع کردیا، پھر دُوسری رکعت میں سورۂ قریش کی تلاوت کی سجدۂ سہو کرکے تمام ختم کرلی، یہ نماز دُرست ہوئی یا نہیں؟

جواب۱:- فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے زیادہ طویل کرنا مستحب ہے اور اس کے برعکس مکروہِ تنزیہی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو امام صاحب نے پہلی رکعت میں مختصر اور

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) شامیۃ ج:۱ ص:۵۴۷ (طبع سعید).

دُوسری رکعت میں اس کے مقابلے میں طویل قراءت کی اس سے مکروہِ تنزیہی کا ارتکاب ہوا، لیکن نماز صحیح ہوگئی۔

لما فی الدر المختار: (وتطال أولی الفجر علی ثانیتها) (واطالة الثانية على الأولٰى يكره) تنزيها (اجماعًا ان بثلاث آيات) ان تقاربت طولا وقصرًا، والا اعتبر الحروف والكلمات، واعتبر الحلبى فحش الطول لا عدد الآيات۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۴)۔[۱]

۲:- نماز تو صحیح ہوگئی، لیکن امام صاحب نے چند غلطیاں کیں، ایک تو جب انہیں یاد آیا تھا تو سورۂ عصر ہی کی تکمیل کرنی چاہئے تھی انہوں نے اس کو ادھورا چھوڑ دیا، دُوسرے سورۂ عصر کے بعد سورۂ فیل شروع کردی، اور اس طرح ایک سورت یعنی سورۂ ہمزہ کو بیچ میں چھوڑ کر قراءت کی، یہ بھی مکروہ ہے۔

أما فی رکعة فیکره الجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة ۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۷)۔[۲]

تیسرے ان غلطیوں پر سجدۂ سہو کیا، حالانکہ ان صورتوں میں سجدۂ سہو نہیں ہے، بہرحال نماز ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۲/۲۸ ج)

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۴۱، ۵۴۲ (طبع ایچ ایم سعید). وفی ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وتطال الأولٰى على الثانية فى الفجر فقط، وعند محمد فى الكل، وفى مجمع الأنهر تحته: بيان للسنة، وهٰذا يعنى اطالة القراءة فى الركعة الأولٰى على الثانية فى الفجر متفق عليه للتوارث، ولما فيه من اعانة المؤمنين علٰى ادراک فضيلة الجماعة، لأنه وقت نوم وغفلة. وفى الهندية ج:۱ ص:۷۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) واطالة القراءة فى الركعة الأولٰى على الثانية من الفجر مسنونة بالاجماع.

(۲) شامية ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) وفى مراقى الفلاح ج:۱ ص:۴۷۵ و ۴۷۷ (طبع مكتبة علم الحديث دمشق) ويكره تكرار السورة فى ركعة واحدة من الفرض .... والجمع بين سورتين بينهما سور أو سورة. وفى حاشية الطحطاوى علٰى مراقى الفلاح (قوله والجمع بين سورتين .... الخ) أى فى ركعة واحدة لما فيه من شبهة التفضيل والهجر (قوله لا يكره هٰذا فى النوافل) يعنى القراءة منكوسا والفصل والجمع وهٰذا كله فى الفرائض. (ص:۲۱۲). وفى الهندية ج:۱ ص:۷۸ (مكتبه رشيديه، كوئٹه) واذا جمع بين سورتين بينهما سور أو سورة واحدة فى ركعة واحدة يكره .... الخ.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾
(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

نمازِ اِشراق و چاشت دو، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں

سوال:- نمازِ اِشراق و چاشت دو، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- پڑھ سکتے ہیں، البتہ چاشت کی نماز چار رکعت پڑھنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷، ۱۹ الف)

تحیۃ المسجد واجب ہے یا مستحب؟

سوال:- بخاری شریف کی ایک حدیث کا حوالہ دے کر تحیۃ المسجد کی دو رکعت نماز، بیٹھنے سے پہلے ادا کرنے کے لئے زور دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نہ ادا کرنے پر سخت گناہ کا مرتکب قرار پائے گا، یعنی تقریباً واجب کا درجہ دیا جاتا ہے، اہل السنّت والجماعت کا اس پر کیا عمل اور فتویٰ ہے؟

جواب:- ''تحیۃ المسجد'' پڑھنا مستحب ہے، اس کے چھوڑنے والے کو گنہگار نہیں کہا جاسکتا، حدیث کا مطلب صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تحیۃ المسجد کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ بخاری شریف کی حدیث میں اَمرِ اِستحباب کے لئے ہے۔ قال ابن بطال: اتفق أئمة الفتویٰ علیٰ أنه محمول علی الندب، والارشاد مع استحبابهم الرکوع لکل من دخل المسجد لما روی أن کبار أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم یدخلون المسجد ثم یخرجون ولا یصلون۔ (حاشیہ بخاری ج:۱ ص:۶۳)۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ)، وفی التنویر مع شرحه باب الوتر مطلب تحیة المسجد ج:۲ ص:۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) (ویُسن تحیة) رب المسجد، وهي رکعتان .... الخ. وفی الشامیة .... والحاصل أن المطلوب من داخل المسجد أن یصلی فیه لیکون ذٰلک تحیة لربه تعالیٰ .... الخ.

سنتِ مؤکدہ کا ترک

سوال:- سنت نمازوں میں سنتِ مؤکدہ کے جان بوجھ کر نہ ادا کرنے پر عذاب و سزا سے متعلق احادیث یا ان کا حوالہ لکھ دیں۔

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مداومت فرمانا، اس کے ترک کے ناجائز ہونے کی کافی دلیل ہے، اور ترکِ سنت پر جو وعیدیں حدیث میں آئی ہیں وہ سب اس کی دلیل ہیں۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

جمعہ کی سنتوں کی تعداد

سوال:- ظہر اور جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں؟ کیا ان کی تعداد میں ائمہ کا اختلاف ہے؟

جواب:- جہاں تک فرض نماز کی رکعتوں کا تعلق ہے، ان کی تعداد میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سب کے نزدیک ظہر کی چار رکعتیں اور جمعہ کی دو رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر کی سنتوں کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک اتنی بات متفق علیہ ہے کہ ان کی تعداد چھ ہے، چار فرضوں سے پہلے اور دو فرضوں کے بعد۔

اب جمعہ کا معاملہ رہ جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اس معاملے میں یہ ہے کہ جمعہ میں چار رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور چار رکعتیں فرض نماز کے بعد سنتِ مؤکدہ ہیں۔[2] ابنِ ماجہ وغیرہ کی

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فیمن صلی فی یوم ولیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة ج:۱ ص:۹۴ (طبع ایچ ایم سعید) عن عائشة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من ثابر علی ثنتی عشر رکعة من السنة بنی الله له بیتًا فی الجنة، أربع رکعات قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر. وفی الشامیة کتاب الطهارة مطلب فی السنة وتعریفها ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید) الذی یظهر من کلام أهل المذهب أن الاثم منوط بترک الواجب أو السنة المؤکدة علی الصحیح لتصریحهم بأن من ترک سنن الصلوات الخمس قیل لا یأثم والصحیح أنه یأثم. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافًا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم لأنه جاء الوعید بالترک اهـ. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۰۹۔

(۲) عن سهل عن أبیه عن أبی هریرةؓ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا صلّی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. رواه مسلم ج:۱ ص:۲۸۸. وفی الجامع للامام الترمذیؒ ورُوی عن عبدالله بن مسعودؓ انه کان یصلی قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا .... الخ. ج:۱ ص:۶۹. وفی الشرح الکبیر ص:۳۸۸ السنة قبل الجمعة أربع وبعدها أربع، اما الأربع بعدها فلما روی مسلم عن أبی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا أربعا. وفی روایة للجماعة الا البخاری: اذا صلی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل والدلیل علی استنان الأربع قبل الجمعة ما رواه مسلم مرفوعًا .... (باقی اگلے صفحے پر)

بعض احادیث اسی کی تائید کرتی ہیں (رد المحتار ج:۱ ص:۶۳۰، استنبول)[۱]۔ لیکن حنفیہ ہی کے بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے کہ فرضوں کے بعد ظہر کی طرح صرف دو رکعتیں مسنون ہیں (فتح القدیر ج:۱ ص:۳۱۶)[۲]۔

امام ابو یوسفؒ جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کو سنت قرار دیتے ہیں[۳]، حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے[۴]۔ اسی وجہ سے متاخرین علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنی چاہئیں، پہلے چار، پھر دو، تاکہ تمام فقہاء کے مذہب کے مطابق سنت ادا ہوجائے، شیخ ابراہیم حلبیؒ ''شرح منیہ'' میں فرماتے ہیں: ''والأفضل أن يصلي أربعًا ثم ركعتين للخروج عن الخلاف.''

افضل یہ ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر دو رکعتیں، تاکہ اختلاف باقی نہ رہے۔ (غنیة المتملی ص:۳۷۳، مجتبائی ۱۳۳۳ھ)[۵]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۵/ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ[۶]

(گزشتہ سے پیوستہ)........من كان مصليًا قبل الجمعة فليصل أربعًا، مع ما رواه ابن ماجة عن ابن عباسؓ قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يركع من قبل الجمعة أربعًا لا يفصل في شئ منهن. وعلى استنان الأربع بعدها ما في صحيح مسلم عن أبي هريرةؓ مرفوعًا: اذا صلّى أحدكم الجمعة فليصل بعدها أربعًا، وفي رواية: اذا صليتم بعد الجمعة فصلوا أربعًا. وفي بدائع الصنائع ج: ۱ ص:۲۸۵ (الصلوٰة المسنونة) واما السنة قبل الجمعة وبعدها فقد ذكر في الأصل وأربع قبل الجمعة وأربع بعدها.

(۱) فتاوىٰ شامية ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع ايچ ايم سعيد). (۲) فتح القدير ج:۱ ص:۳۸۶ (مكتبه رشيديه).

(۳) وفي غنية المتملي ص:۳۸۹ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) وعند أبي يوسفؒ السنة بعد الجمعة ست ركعات وهو مروي عن عليؓ. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل وعن أبي يوسفؒ أنه ينبغي أن يصلي أربعًا ثم ركعتين، وفي منحة الخالق علىٰ هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قوله وعن أبي يوسفؒ) قال في الذخيرة وعن علي رضي الله عنه يصلي ستًا، ركعتين ثم أربعًا، وعنه رواية أخرىٰ انه يصلي بعدها ستًا، أربعًا ثم ركعتين وبه أخذ أبويوسفؒ والطحاوي .... الخ.
وفي فتح القدير ج:۲ ص:۳۹ قبيل باب صلاة العيدين .... أن السنة بعدها ست وهو قول أبي يوسف .... الخ.

(۴) عن أبي عبدالرحمٰن عن علي رضي الله عنه أنه قال: من كان مصليًا بعد الجمعة فليصل ستًا، أخرجه الطحاوي (كتاب الصلوٰة، باب التطوع بعد الجمعة ج:۲ ص:۲۳۳). وفيه أيضًا: وعن أبي عبدالرحمٰن قال: علّم أن يصلّوا بعد الجمعة أربعًا فلما جاء علي ابن أبي طالب رضي الله عنه علّمهم أن يصلّوا ستًا. اهـ. وفي الجامع للامام الترمذي ج:۱ ص:۶۹ وروي عن عبدالله بن مسعود أنه كان يصلي قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا، وروي عن علي بن أبي طالب أنه أمر أن يصلي بعد الجمعة ركعتين ثم أربعًا وعن أبي عبدالرحمٰن السلمي قال: قدم علينا عبدالله رضي الله عنه فكان يصلي بعد الجمعة أربعًا فقدم بعده علي رضي الله عنه فكان اذا صلى الجمعة صلى بعدها ركعتين وأربعًا فاعجبنا فعل علي رضي الله عنه فاخترناه، رواه الطحاوي باب التطوع، بعد الجمعة ج:۱ ص:۲۳۳، وفي اٰثار السنن اسناده صحيح ص:۳۰۳.

(۵) وفي غنية المتملي ص:۳۸۹ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور) والأفضل أن يصلي أربعًا ثم ركعتين للخروج عن الخلاف. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل، وفي الذخيرة والتجنيس وكثير من مشائخنا علىٰ قول أبي يوسف وفي منية المصلي والأفضل عندنا أن يصلي أربعًا ثم ركعتين. وفي منحة الخالق علىٰ هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قوله وعن أبي يوسف) قال في الذخيرة وعن عليؓ أنه يصلي ستًا، ركعتين ثم أربعًا. وعنه رواية أخرىٰ أنه يصلي بعدها ستًا، أربعًا ثم ركعتين، وبه أخذ أبو يوسف والطحاوي وكثير من المشائخ رحمهم الله تعالىٰ، وعلىٰ هٰذا قال شمس الأئمة الحلوانيؒ الأصل أن يصلي أربعًا ثم ركعتين فقد أشار الىٰ أنه مخير بين تقديم الأربع وبين تقديم المثنى، ولٰكن الأفضل تقديم الأربع كيلا يصير متطوعا بعد الفرض مثلها. وفي فتح القدير ج:۲ ص:۳۹ قبيل باب صلوٰة العيدين .... فهٰذا البحث يفيد أن السنة بعدها ست وهو قول أبي يوسف وقيل قولهما.

(۶) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- جمعہ کی سنتوں کی تعداد
۲:- سنتِ غیر مؤکدہ پڑھنے کا طریقہ

سوال ۱:- جمعہ کے بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں؟

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کس طرح پڑھنی چاہئے؟ اور اس میں کیا پڑھیں؟

جواب ۱:- جمعہ کے بعد چھ رکعات مسنون ہیں،[۱] پہلے چار، پھر دو پڑھیں تو بہتر ہے،[۲] اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کا کوئی الگ طریقہ نہیں، نہ کوئی خاص قراءت مقرّر ہے، بلکہ اور نمازوں ہی کی طرح پڑھی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

صبحِ صادق اور فجر کے بعد نوافل پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ صبحِ صادق کے بعد سے فجر کی سنتیں اور فرض پڑھنے تک وقفے میں کوئی نماز نفل وغیرہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر و مغرب کے درمیان یا سورج نکلتے وقت تک، اور نصف النہار کے وقت نماز جائز نہیں ہے، باقی اوقات میں جائز ہے۔

جواب:- ان صاحب نے دُرست کہا ہے، فجر کی نماز کے بعد تو نوافل پڑھنا ناجائز ہے، صبحِ صادق کے بعد بھی سوائے فجر کی دوسنتوں کے کوئی اور نفل پڑھنا جائز نہیں۔

کما فی الدر المختار: وکذا الحکم من کراھة نفل وواجب لغیرہ لا فرض وواجب لعینه بعد طلوع فجر سوی سنته لشغل الوقت به تقدیرا. (شامی ج:۱ ص:۲۵۱)۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ

سنتِ مؤکدہ کو بلاعذر ترک کرنا

سوال:- عمر کہتا ہے کہ دن کی پانچ نمازوں کے فرائض پورے کرلئے جائیں تو یہی کافی

(۱، ۲) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع ایچ ایم سعید). نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۲۴ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔ (مرتب عفی عنہ)

ہے، باقی سنتِ مؤکدہ وغیرہ ادا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا عمر کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- عمر کا کہنا غلط ہے، سنتِ مؤکدہ کو مستقل طور پر چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔[۱]

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۱/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں پڑھنا

سوال:- مسئلہ مسئولہ فتویٰ نمبر ۲۶۰ جلد ۲۸ الف سے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر حنفی مسلک والے انتہائے زوال سے قبل چار رکعت جمعہ پڑھ لیں کہ سبھی پڑھتے ہیں تو کیا ان کی سنتیں ادا ہوجائیں گی؟ دُوسری بات یہ بھی واضح کریں کہ اگر ان سنتوں کو بعد میں ادا کیا جائے تو فرضوں سے متصل ادا کیا جائے یا بقیہ نماز کی ترتیب قائم رکھتے ہوئے یہ بعد میں ادا کی جائیں؟

جواب:- زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں ادا نہ ہوں گی، فرض کے بعد ادا ہوجائیں گی،[۲] اور اس میں بہتر یہ ہے کہ پہلے جمعہ کے بعد والی چھ سنتیں پڑھیں، اس کے بعد پہلے والی سنتیں ادا کی جائیں،[۳] لیکن اگر برعکس کرلیا تو بھی جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کا حکم

سوال:- صلوٰۃ التسبیح شعبان کی پندرھویں کو باجماعت پڑھنے کا ہمارا ارادہ ہو رہا ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صلوٰۃ التسبیح نفلی نماز ہے، اوراس کی جماعت حنفیہ کے مسلک میں مکروہِ تحریمی ہے،

---

(۱) في الهندية ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلاة ان لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه تركها استخفافا، وان راها حقاً فالصحيح انه يأثم، لأنه جاء الوعيد بالترک، كذا في محيط السرخسي. وفي البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم ير السنن حقا فقد كفر، لأنه ترک استخفافا، وان رای حقا منهم من قال لا يأثم والصحيح انه يأثم لأنه جاء الوعيد بالترک. وكذا في الشامية ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) في الدر المختار، باب ادراک الفريضة ج:۲ ص:۵۸ (طبع سعید) .... بخلاف سنة الظهر، وكذا الجمعة، فانه ان خاف فوت ركعة يتركها ويقتدى، ثم يأتي بها على انها سنة في وقته، أى الظهر قبل شفعه عند محمد، وبه يفتي.

(۳) وفي الشامية، باب ادراک الفريضة ج:۲ ص:۵۹ (طبع سعید) أقول وعليه المتون لٰكن رجح في الفتح تقديم الركعتين، قال في الامداد وفي فتاوى العتابي انه المختار وفي مبسوط شيخ الاسلام انه الأصح لحديث عائشة أنه عليه الصلوٰة والسلام كان اذا فاتته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين، وهو قول أبي حنيفة وكذا في جامع قاضي خان وكذا في غنية المتملي ص:۳۹۸ (طبع سهيل اكيڈمي لاهور).

لہٰذا یہ نماز تنہا پڑھنی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۵/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۰۸/۳۰ د)

تہجد کی نیت کس طرح کریں؟

سوال:- تہجد کی نیت نفل کی ہوگی یا سنت کی؟

جواب:- نمازِ تہجد میں نفل کی نیت کی جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

شبِ قدر کے نوافل کا طریقہ

سوال:- مؤدّبانہ گزارش ہے کہ ہم آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس درخواست کے ساتھ جو پرچہ منسلک ہے اس میں لیلۃ القدر کے نوافل کے بارے میں ہماری مسجد (مسجد رحمانیہ) کے امام صاحب نے بتایا ہے کہ یہ طریقۂ نوافل غلط ہے، اور کہیں حدیث میں لیلۃ القدر کے نوافل کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ ہم کو شریعت کی رُو سے صحیح طریقے سے آگاہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- منسلکہ اشتہار[2] میں شبِ قدر کی نوافل کا جو طریقہ لکھا ہے وہ فقہ و حدیث کی مستند و معروف کتابوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا، اشتہار میں بھی کوئی حوالہ کسی مستند کتابِ حدیث کا نہیں دیا گیا کہ اس سے تحقیق کی جاسکتی۔ صحیح احادیث میں شبِ قدر کے اندر مطلق نوافل کی فضیلت وارد ہے، کسی خاص طریقے کی نہیں۔[3]

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۷۸/۳۱ د)

---

(۱) فی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادراک الفریضة) ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکره ذٰلک علٰی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدر .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) اعلم أن النفل بالجماعة علٰی سبیل التداعی مکروه علٰی ما تقدم ما عدا التراویح. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۴۴۔

(۲) یہ اشتہار، ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، بظاہر اس اشتہار میں جماعت کے ساتھ نوافل کا کوئی مخصوص طریقہ لکھا گیا تھا۔

(۳) وفی غنیة المتملی النوافل ج:۱ ص:۴۳۲ واعلم أن النفل بالجماعة علٰی سبیل التداعی مکروه علٰی ما تقدم ما عدا التراویح وصلٰوة الکسوف والاستسقاء، فعلم أن کلا من صلٰوة الرغائب لیلة أول جمعة من رجب وصلٰوة البراءة لیلة النصف من شعبان وصلٰوة القدر لیلة السابع والعشرین من رمضان بالجماعة بدعة مکروهة. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴. ....(باقی اگلے صفحے پر)

سنن ونوافل گھر میں پڑھنے چاہئیں یا مسجد میں؟

سوال:- ملفوظاتِ کمالاتِ اشرفیہ ص:۱۵۶ ملفوظ نمبر۶۵۹ میں ہے: ایک شخص نے دریافت کیا کہ نماز سنتِ فجر مکان میں پڑھ کر مسجد جاتا ہوں، اس وقت نماز تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ فرمایا کہ: ''اس وقت نہ تحیۃ المسجد ہے، نہ تحیۃ الوضوء، نیز ان سنتوں کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ جمیع سننِ مؤکدہ کا، تاکہ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت سے محفوظ رہے، جوکہ تارکینِ سنت ہیں۔'' اور ہم نے یہ سنا ہے کہ مکان میں فجر کی سنتیں پڑھنا مسنون ہے، اس کی تطبیق کیا ہے؟

جواب:-فی الدر المختار: والأفضل فی النفل غیر التراویح المنزل الا لخوف شغل عنها، والأصح أفضلیة ما کان أخشع وأخلص. وقال الشامی: وحیث کان هٰذا أفضل یراعی ما لم یلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبیته، أو کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذ فی المسجد. (شامی ج:۱ ص:۴۵۸)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ تمام سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے، لیکن کسی عارض کی بناء پر یہ افضلیت منتقل ہوسکتی ہے، اور عوارض مختلف ہوسکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں چونکہ سنتوں کو گھر کے لئے چھوڑنے سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی رہ نہ جائیں، اس لئے متأخرین نے سننِ مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا مذکورہ فتویٰ بھی اصلاً اسی عارض پر مبنی ہے، اور اس کے ساتھ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت کی علت مزید شامل کردی ہے، اور حضرت تھانویؒ کا یہ فتویٰ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۸۸[2] میں بھی موجود ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۷ ب)

فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی سنتیں چھوٹ جانے کے بعد کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس کی قضا کی جاسکتی ہے؟

جواب:- طلوعِ آفتاب کے بعد زوال سے پہلے امام محمدؒ کے نزدیک سنتوں کی قضا کی

(گزشتہ سے پیوستہ)..........وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۵، ۲۶ (طبع ایچ ایم سعید) ومن المندوبات .... احیاء لیلة العیدین، والنصف من شعبان، والعشر الأخیر من رمضان، والأول من ذی الحجة، وفی الشامیة تحته علی الصفحة: ۲۶، وفی الامداد ویحصل القیام بالصلوٰة نفلا فرادی من غیر عدد مخصوص، وبقراءة القراٰن والأحادیث .... (تتمة) أشار بقوله فرادی الیٰ ما ذکره بعد فی متنه من قوله ویکره الاجتماع علیٰ احیاء لیلة من هٰذه اللیالی فی المساجد .... وما روی من الصلوات فی هٰذه الأوقات یصلی فرادی غیر التراویح.

(۱) فتاویٰ شامیة باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۲۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۸ سوال نمبر۳۹۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)، نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۶۔

جاسکتی ہے، البتہ شیخینؒ کے نزدیک تنہا سنتوں کی قضا نہیں، ہاں! اگر فرض نماز بھی قضا ہوگئی ہو تو زوال سے پہلے فرض اور سنت دونوں کی قضا کرنی چاہئے۔[۱]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

فجر کے فرض شروع ہونے کے بعد سنتیں کس وقت تک ادا کی جاسکتی ہیں؟

سوال:- فجر کے وقت جب مسجد میں داخل ہوا تو امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے، میں سنتیں پڑھے بغیر جماعت میں شریک ہوا، بعد ازاں سورج نکلنے کے بعد سنتیں ادا کیں، تو میرا یہ عمل دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- فجر کی سنتوں کے بارے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ گھر میں ادا کرکے مسجد جائیں۔[۲] اور اگر گھر میں پڑھے بغیر مسجد پہنچ جائیں تو جب تک جماعت کی رکعت، بلکہ تشہد مل سکتا ہو، فجر کی سنتیں دُور ہٹ کر کسی مقام پر پڑھ لینا جائز ہے، خواہ جماعت شروع ہوچکی ہو، لیکن اگر کوئی شخص جماعت میں شریک ہوگیا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق تنہا سنتوں کی قضا نہیں ہے، آپ نے جو سورج نکلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھیں وہ آپ کی طرف سے نفل ہوگئیں۔

فی الدر المختار باب ادراک الفریضة واذا خاف فوت رکعتی الفجر لاشتغاله بسنتها ترکها لکون الجماعة اکمل والا بأن رجا ادراک رکعة فی ظاهر المذهب وقیل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالی تبعًا للبحر لٰکن ضعفه فی النهر وقال الشامی تحته لأن المدار هنا علٰی ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا علٰی ادراکه بادراک التشهد فیأتی بالسنة اتفاقًا کما أوضحه فی الشرنبلالیة أیضًا وأقره فی شرح المنیة وشرح نظم الکنز (شامی ج:۱ ص:۳۴۹)[۳]
وفی ردّ المحتار أیضًا قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة أی لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید) اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح، واما بعد طلوع الشمس فکذٰلک عندهما وقال محمد أحب الیّ ان یقضیها الی الزوال کما فی الدرر قیل هٰذا قریب من الاتفاق .... الخ.

(۲) وفی غنیة المتملی ص:۳۹۶ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ثم السنة فی سنة الفجر .... (ان یأتی بها اما فی بیته) وهو الأفضل (أو عند باب المسجد) ان أمکنه ذٰلک .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ ص:۴۴۰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۵۶ (طبع سعید).

مع الفجر فیقضیھا تبعًا لقضائہ لو قبل الزوال۔ (أیضًا ج:۱ ص:۷۵۰)۔[۱] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

سننِ مؤکدہ کو بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سننِ مؤکدہ کا قیام فرض ہے یا سنت یا مستحب؟

جواب:- سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر پڑھنا افضل اور مستحب ہے، اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے، لما فی مراقی الفلاح (یجوز النفل) انما عبر بہ لیشمل السنن المؤکدۃ وغیرھا فتصح اذا صلاھا (قاعدًا مع القدرۃ علی القیام) وقد حکی فیہ اجماع العلماء .... الخ. وقال الطحطاویؒ قولہ (یجوز النفل قاعدًا) مطلقًا من غیر کراھۃ کما فی مجمع الأنھر. (طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح باب النوافل ص:۲۲۰)۔[۲]

البتہ فقہاءؒ کی ایک جماعت نے سنتِ فجر کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک ان کو بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اور ان میں قیام فرض ہے (وخالفہ الطحطاوی)۔[۳] اور بعض حضرات نے تراویح کا بھی یہی حکم بتایا ہے، اگرچہ تراویح کے بارے میں قاضی خانؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان اس طرف ہے کہ وہ سننِ فجر کے حکم میں نہیں، لیکن احتیاطاً حتی الامکان انہیں بھی کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے۔ لما فی الدر المختار ومنھا (أی فرائض الصلوٰۃ) القیام فی فرض وملحق بہ کنذر وسنۃ فجر فی الأصح، وقال الشامیؒ ناقلًا عن الحلیۃ: وسنۃ الفجر لا تجوز قاعدًا من غیر عذر باجماعھم کما ھو روایۃ الحسن عن أبی حنیفۃ کما صرح بہ الخلاصۃ فکذا التراویح وقیل یجوز .... قال قاضی خان وھو الصحیح. (شامی باب صفۃ الصلوٰۃ ج:۱ ص:۲۹۹)[۴]، (ومثلہ فی شرح المنیۃ الکبیر ص:۲۶۷)۔[۵]

بہرحال! فجر اور تراویح کے علاوہ دُوسری سننِ مؤکدہ میں فقہائے حنفیہ کا اتفاق ہے کہ قیام

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید).
(۲) (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۳) طحطاوی علی المراقی ص:۲۲۰ (طبع مذکور).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید).
(۵) غنیۃ المتملی ص:۲۷۰ و ص:۲۱ (طبع سھیل اکیڈمی لاھور).

فرض نہیں، مستحب ہے،[۱] البتہ چونکہ سلف کا تعامل سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر ہی پڑھنے کا رہا ہے اس لئے حتی الوسع اس تعامل کو ترک نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

توڑی ہوئی نفل نماز اور طواف و نذر کی نماز میں قیام کا حکم

سوال:- وہ نفل نماز جس کو شروع کر کے توڑ دیا ہو، اس کی قضا، نمازِ نذر اور نمازِ طواف میں قیام فرض ہے یا مستحب؟

جواب:- قیام یوں تو ہر فرض و واجب نماز میں فرض ہے، اور اس میں صلوٰۃ منذور اور صلوٰۃ بعد الطّواف بھی داخل ہے۔ کما مرّ فی عبارۃ الدر المختار فی الجواب الثانی۔[۲] لیکن توڑی ہوئی نفل نماز کے بارے میں بالکل صریح جزئیہ تو نہیں ملا۔ علامہ شامیؒ نے طحطاویؒ اور رحمتیؒ کے بارے میں صرف اتنا نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے، (ج:۱ ص:۲۹۹ صفۃ الصلوٰۃ)،[۳] اور طحطاویؒ نے مراقی کی عبارت سے وجوب مستنبط کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: قولہ والواجبات ظاھرہ شمول قضاء النفل الذی أفسدہ (ص:۱۲۲، طبع قدیمی کتب خانہ)، لیکن اس کے مشابہ ایک مسئلے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ توڑی ہوئی نفل نماز کی قضاء میں قیام، صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا۔

وذٰلک لما فی شرح المنیۃ: اما القعود بغیر عذر بعد الافتتاح قائمًا فیجوز عند أبی حنیفۃ لٰکن مع الکراھۃ علٰی ما اختارہ صاحب الھدایۃ وبلا کراھۃ علٰی ما اختارہ فخر الاسلام

---

(۱) وفی فتح باب العنایۃ بشرح النقایۃ ج:۱ ص:۳۳۷، ۳۳۸ (طبع بیروت) (ویتنفّل راکبًا .... وقاعدًا مع قدرۃ قیامہ) وفیہ تحتہ والسنن الرواتب نوافل .... وقال تحت قولہ (مع قدرۃ قیامہ) لما روی الجماعۃ الا مسلما عن عمران بن حصینؓ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صلوٰۃ الرجل قاعدًا فقال: من صلّٰی قائما فھو أفضل ومن صلّٰی قاعدًا فلہ نصف أجر القائم، ومن صلّٰی نائمًا أو مضطجعًا فلہ نصف أجر القاعد .... وھٰذا فی صلوٰۃ النافلۃ، لأن صلوٰۃ الفرض لا یجوز فیھا القعود مع القدرۃ علی القیام بالاجماع، وفی مجمع الأنھر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) (وصح النفل قاعدًا مع القدرۃ علی القیام) بلا کراھۃ لما روی أنہ علیہ السلام کان یصلّی رکعتین قاعدًا بغیر عذر وفیہ اشارۃ الٰی أنہ لا تجوز المکتوبۃ والواجبۃ والمنذورۃ وسنۃ الفجر والتراویح بلا عذر والصحیح أن التراویح تجوز .... الخ. وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۱۴۷ (طبع دار المعرفۃ بیروت) (الفصل السابع فی أدائھا (التراویح) قاعدًا من غیر عذر) اختلفوا فیہ قال بعضھم لا ینوب عن التراویح علٰی قیاس ما روی الحسن عن أبی حنیفۃ رحمھما اللہ تعالٰی فی رکعتی الفجر انہ لو أداھما قاعدًا من غیر عذر لم یجزہ عن السنۃ وعلیہ الاعتماد فکذا ھٰذا لأنھا مثلہ والصحیح انھا تجوز والفرق ظاھر فان رکعتی الفجر اٰکد وأشھر وھذا الفرق ظاھر یوافق روایۃ أبی سلیمان عن أبی حنیفۃ وأبی یوسفؒ ومحمدؒ ومع الفرق فانہ لا یستحب لما فیہ من مخالفۃ السنۃ والسلف.

(۲) اس سے سابقہ فتویٰ مراد ہے۔

(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع سعید).

.... وأما عندهما فلا يجوز اتمامها مع القعود بلا عذر بعد الافتتاح قائما أصلا لأن الشروع معتبر بالنذر ومن نذر صلوٰة ركعتين قائمًا لا يجوز له أن يصليهما قاعدًا من غير عذر فكذا اذا شرع فيهما ولأبي حنيفةؒ ان اللزوم بالشروع لضرورة صيانة المؤدى عن البطلان وصيانته عنه ليست موقوفة على القيام لصحته بدونه والضرورة تتقدر بقدرها .... ولذا اتفقوا علىٰ أنه لو نذر الحج ماشيًا لزمه بصفة المشي ولو شرع فيه ماشيًا لا يلزمه. (كبيری شرح منية ص:۲۶۸ بعد فرائض الصلوٰة)۔[۱]

اس میں امام ابوحنیفہؒ کی تعلیل صورتِ مسئولہ پر بھی پوری طرح منطبق ہے، لہٰذا امام صاحبؒ کے قول کے قیاس پر صورتِ مسئولہ میں قیام واجب نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

نوافل کی جماعت میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام کرنا

سوال:- ایک آدمی چار، پانچ سال سے یکم محرّم سے ۱۰ر محرّم تک نوافل بالجماعت کا اہتمام کرتا ہے، اور ان دس راتوں میں قرآنِ کریم ختم کرتا ہے، جس میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا بدعت؟ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا اہتمام کرنا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دینا ''تداعی'' ہے، اور تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے،[۲] جو شخص اسے باعثِ ثواب سمجھے وہ مرتکبِ بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہوتو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہوجائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۱/۵ھ
الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۲۲ الف)

---

(۱) غنية المتملی ص:۲۷۱ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور). وفی فتح باب العناية ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع بيروت) (وكره التنفّل قاعدًا بقاءً) بأن يحرم قائمًا ثم يقعد وقال أبو يوسفؒ ومحمدؒ لا يجوز، لأن الشروع ملزم لأن يأتي علىٰ صفة شرع فيها، أو بأكمل منها، فاشبه النذر قائمًا ولأبي حنيفةؒ أن البقاء أسهل من الابتداء وقد جاز ترك القيام في ابتداء النفل فيجوز في أثنائه .... الخ. وفي مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۰۱ (ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز) عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء (ويكره لو بلا عذرٍ) عنده (وقالا لا يجوز الا بعذر) قياسًا لأن الشروع ملزم كالنذر ولو نذر أن يصلّي قائمًا لم يجز أن يصلّي قاعدًا فكذا هذا .... الخ.

(۲) وفي الهندية ج:۱ ص:۸۳ (طبع مكتبه حقانيه) التطوع بالجماعة اذا كان علىٰ سبيل التداعي يكره.

رمضان میں نفل کی جماعت

(۱۹۵۹ء میں ایک صاحب ''محمود حسن'' نے رمضان المبارک میں نفل کی جماعت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اور استفتاء کے ساتھ اسی مسئلے سے متعلق حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریرکردہ جواب بھی ارسال کیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استفتاء جواب کے لئے اپنے فائق اور لائق صاحبزادے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا، جو اس وقت دورۂ حدیث میں داخلہ لینے والے تھے، گویا کہ اس وقت ان کا ضابطے کا طالب علمانہ دور بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اپنے والدِ محترم کے ایماء پر اس استفتاء کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا، جو پیشِ خدمت ہے۔ یہ تفصیلی فتویٰ پہلے ''فقہی مقالات'' کی جلد دوم میں بھی شائع ہوچکا ہے، اب حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کے اس مجموعے میں دیگر فتاویٰ کے ساتھ یہ فتویٰ بھی متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ مرتب عفی عنہ)

استفتاء

در خدمت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

سوال:- حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ ''الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر'' میں شائع ہوا ہے، جس میں رمضان میں تہجد کی نماز تداعی کے ساتھ بھی افضل ہونا درج ہے، اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ نے فتاویٰ رشیدیہ میں رمضان میں تہجد کی جماعت کو اگر بالتداعی ہو، مکروہِ تحریمی بتلایا ہے، اس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے قولِ مرجوح پر مبنی قرار دیا ہے۔ میں نے بہت سارے حضرات کو لکھا، کسی کے یہاں سے فیصلہ کن جواب موصول نہیں ہوا، بجز حضرتِ والا کے اس وقت اس کے متعلق کہیں سے مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کے مفتی حضرات چل بسے۔ مسئلۂ زیرِ بحث بہت اہم ہے، اس کی وجہ سے ایک نیا باب بدعت کا کھل جانے کا اندیشہ ہے، خود مجھے بھی تردّد پیدا ہوگیا۔ یہاں گزشتہ رمضان میں پچاس، ساٹھ، کبھی کبھی سو سے زائد آدمی تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے لگے، اس کا اہتمام ہونے لگا، میں نہ شریک ہوا، نہ کسی کو شریک ہونے کو کہا، نہ کسی کو منع کیا، البتہ اپنے احباب خود ہی دریافت کرتے تو ان سے کہہ دیتا تھا کہ فقہاء تو مطلق طور پر تداعی کو نوافل میں مکروہ ہی لکھتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں سے کسی کا عمل بھی مجھے اس کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔

حضرتِ والا ذرا مفصل طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کے متعلق کچھ تحریر فرماویں۔ اگرچہ حضرتِ والا کو تکلیف ہوگی، لیکن کیا کیا جائے؟ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب منسلک ہے۔ کمترین بندہ محمود حسن عفی عنہ، کراچی

جواب از حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(منقول از "شیخ الاسلام نمبر" صفحہ:۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی)

جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح۔ (منقول از مکتوباتِ مخطوطہ)

فتح القدیر ج:اوّل، باب الاستسقاء ص:۴۳۸ میں ہے[۱]: **وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلٰوۃ الکسوف من الکافی بقولہ "ویکرہ صلٰوۃ التطوع جماعۃ ما خلا قیام رمضان وصلٰوۃ الکسوف، وھٰذا خلاف ما ذکر شیخ الاسلام"۔**

اور رد المحتار ج:۱ ص:۵۲۳ پر ہے[۲]: **قلت ویؤیدہ أیضًا ما فی البدائع من قولہ أن الجماعۃ فی التطوع لیست بسنۃ الا فی قیام رمضان اھ۔ وفیہ والنفل بالجماعۃ غیر مستحب، لأنہ لم تفعلہ الصحابۃ فی غیر رمضان اھ۔**

مذکورہ بالا نصوص میں قیامِ رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابہ کرامؓ سے آخری شب تک نوافل باجماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ مؤطا امام مالک میں بکثرت مروی ہے، اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں یا تہجد، اوائلِ شب میں ہوں یا اَواخرِ شب میں، جماعت کی اجازت ہوگی۔

مؤطا امام مالک صفحہ:۱۱۱ میں ہے[۳]:-

قال محمد: وبھٰذا کلہ نأخذ لا بأس بالصلاۃ فی شھر رمضان أن یصلی الناس تطوعا بامام لأن المسلمین قد اجمعوا علٰی ذٰلک اھ۔

فتح الباری ج: رابع صفحہ:۲۱۵ باب **"فضل من قام رمضان"** میں ہے[۴]:-

أی قیام لیالیہ مصلیا، والمراد من قیام اللیل ما یحصل بہ مطلق القیام، کما قدمناہ فی التہجد سواء (کان قلیلا أو کثیرا)، وذکر النووی أن المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح،

---

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۸، ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) مؤطا امام مالک ص:۱۴۳ (طبع بیرون بوہڑ گیٹ ملتان)۔
(۴) فتح الباری ج:۴ ص:۲۵۱ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور)۔

یعنی أنه یحصل بها المطلوب من القیام، لا أن قیام رمضان لا یکون الا بها، واغرب الکرمانی فقال: اتفقوا علٰی أن المراد بقیام رمضان صلوٰۃ التراویح اھـ. قلت: قال النووی: المراد بقیام رمضان صلوٰۃ التراویح، ولٰکن اتفاق من أین أخذہ بل المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، سواء کان قلیلا أو کثیرا، اھـ. وقال العینی فی الجزء الأول صفحة: ۲۸۱(۱) من کتاب الایمان من عمدة القاری ما نصه، ومعنی من قام رمضان من قام بالطاعة فی لیالی رمضان ویقال یرید صلوٰۃ التراویح، وقال بعضهم: لا یختص ذٰلک بصلوٰۃ التراویح، بل فی أی وقت صلی تطوعا حصل له ذٰلک الفضل. اھـ.

نصوصِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل اُمور معلوم ہوتے ہیں:-

۱:- ہر نفل نماز باجماعت مطلقاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

۲:- مستثنیات میں لفظ قیامِ رمضان اور کسوف کو ذکر کیا ہے۔

۳:- امام محمد اور حاکم اور صاحبِ بدائع وغیرہ متقدمین (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے فقط قیامِ رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔

۴:- قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قولِ مرجوح ہے، جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیامِ رمضان سے تمام نوافل مُراد لے رہے ہیں، خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو، یا دیگر نوافل۔ اور امام نوویؒ کے قول کو مؤوّل قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش فرمادیتے ہیں، اور یہی اَمر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنابریں فتاویٰ رشیدیہ کی تصریح جلدِ ثانی صفحہ:۵۹ اور جلدِ اوّل صفحہ:۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قولِ مرجوح پر مبنی ہے۔ پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو یا بلاتداعی، سب مأذون فیہ بلکہ مستحب ہوگی، اور "**من قام رمضان**" کے تحت داخل ہوں گی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طوافِ نفل یا عمرۂ نافلہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے، **کما ذکر العینی رحمه الله تعالٰی**۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ

(۱) عمدة القاری باب تطوع قیام رمضان من الایمان ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع دار الفکر).

میں اسی پر پایا ہے، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔ اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنتِ عشریہ وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول یہ تھا، اور اہلِ مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبوع طواف کا اسی کا مؤید ہے۔

واللہ اعلم
ننگِ اسلاف
حسین احمد غفرلہٗ
دارالعلوم دیوبند
۱۹؍ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

خط کا جواب از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معاملہ نفسِ مسئلہ کی حیثیت سے تو کچھ اہم نہ تھا، لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے فتویٰ پر تنقید کی حیثیت نے اس کو اتنا مہم بنادیا کہ اس میں کافی بحث وتحقیق کے بغیر قلم اُٹھانا مشکل تھا، رمضان میں مجھ سے بالکل یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلّمہٗ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کردے گا تو پھر میں کچھ لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس لئے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے، پھر ان کے اقتباسات لے کر خود ہی ایک تحریر لکھ دی، اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۴؍شوال ۱۳۷۸ھ

جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دُوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو تو بہرصورت مکروہِ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں یا غیرِ رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء محدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے۔

۱:- بدائع الصنائع میں ہے:-

اذا صلّوا التراویح ثم أرادوا أن یصلّوها ثانیًا یصلّون فرادی لا بجماعة، لأن الثانیة

تطوع مطلق والتطوع المطلق بجماعة مکروه. (بدائع ج:۱ ص:۲۹۰)[1]

علامہ ابنِ نجیمؒ فرماتے ہیں:-

ولو صلّو التراویح، ثم أرادوا أن یصلّوا ثانیًا یصلّون فرادی. اهـ.

(البحر الرائق ج:۲ ص:۴۷)[2]

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ولو صلّوا التراویح ثم أرادوا أن یصلّوا ثانیًا یصلّون فرادی. کذا فی التاتارخانیة.

(عالمگیریه ج:۱ ص:۱۲۳)[3]

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-

صلّوا بجماعة، ثم أرادوا اعادتها بالجماعة یکره، لأن النفل بجماعة علی التداعی یکره الا بالنص. اهـ. (بزازیة علٰی هامش الهندیة ج:۴ ص:۳۱)[4]

مذکورۃ الصدر نصوص سے معلوم ہوا کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور بدائع و فتاویٰ بزازیہ میں اس کی علت کی تصریح بھی فرمادی گئی کہ دُوسری مرتبہ پڑھی جانے والی تراویح نفل مطلق (یعنی وہ نفل جس کے اندر جماعت کی نص نہیں ملتی) ہوجائے گی، اور نفل مطلق جماعت کے ساتھ مکروہ (تحریمی) ہے، تو معلوم ہوا کہ حضراتِ فقہاءؒ کے نزدیک نفل کی جماعت (علی التداعی) بہرصورت مکروہ ہے۔ خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں، کیونکہ اگر رمضان کی نفلیں علی الاطلاق اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز نہ ہوتا، کما هو ظاهر۔

۲:- علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاریؒ خلاصۃ الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

ولو زاد علی العشرین بالجماعة یکره عندنا بناء علٰی أن صلٰوة التطوع بالجماعة مکروه. (خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۶۴)[5]

اگر رمضان کی نفلیں جماعت کے ساتھ علی الاطلاق جائز ہوتیں تو بیس سے زیادہ رکعتیں بالجماعۃ مکروہ نہ ہوتیں۔

۳:- درمختار میں ہے:-

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) الفتاویٰ الهندیة فصل فی التراویح ج:۱ ص:۱۱۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور)
(۴) الفتاوی البزازیة علٰی هامش الهندیة (الباب الثالث فی التراویح) ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۵) (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذٰلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد، کما فی الدرر.[1] (شامی ج:۱ ص:۶۶۳)

علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

والنفل بالجماعة غیر مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان.[2] (رد المحتار ج:۱ ص:۶۶۴)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان وفی الفرض واجبة أو سنة مؤکدة.[3] (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)

محقق ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلوٰة الکسوف من الکافی بقوله "ویکرہ صلوٰة التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلوٰة الکسوف."[4] (فتح القدیر ج:۱ ص:۴۳۸)

نصوصِ مذکورہ بالا میں صلوٰۃ النفل بالجماعۃ کی کراہت کے حکم سے قیامِ رمضان کو مستثنیٰ کیا گیا، اور تراویح کے بجائے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے عموم سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم صرف غیرِ رمضان کے لئے مخصوص ہے، لیکن دراصل یہ قیامِ رمضان کا لفظ (عرفِ فقہاء کے اعتبار سے بالخصوص مسئلۂ جماعت میں) عام نہیں، بلکہ تراویح کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ اِن شاء اللہ ہم عنقریب بالتفصیل بیان کریں گے، واللہ الموفق۔

۴:- حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ شرحِ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ:-

قال الزرقانی رحمه الله ظاهره (أی حدیث أفضل الصلوٰة صلوٰتکم فی بیوتکم الا المکتوبة) یشمل کل نفل، لٰکنه محمول علی ما لا یشرع له التجمیع کالتراویح والعیدین. اھ.[5] (اوجز المسالک ج:۲ ص:۷)

حضرت الشیخ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ شرحِ ابوداؤد میں لکھتے ہیں:-

فان خیر صلاة المرء وهٰذا عام لجمیع النوافل والسنة الا النوافل التی من شعائر الاسلام کالعید والکسوف والاستسقاء، قلت: وهٰذا یدل علی أن صلوٰة التراویح فی البیت أفضل، والجواب عن الذین قالوا بأفضلیتها فی المسجد جماعة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ذٰلک لخوف الافتراض، فاذا زال الخوف بوفاته علیه السلام ارتفع المانع، وصار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) فتح القدیر باب الاستسقاء ج:۲ ص:۵۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)
(۵) (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان).

فعله فی المسجد أفضل ....، فاشبه صلاة العید. (بذل المجهود ج:۲ ص:۳۳۶)[1]

ان نصوص میں لفظِ تراویح استعمال کیا گیا ہے، قیامِ رمضان نہیں کہ اس کے عموم سے عمومِ حکم کا شبہ ہو۔

۵:- عنایہ شرحِ ہدایہ میں ہے:-

(فضل فی قیام شهر رمضان) ذکر التراویح فی فصل علیٰ حدة لاختصاصها بما لیس لمطلق النوافل. (عناية علیٰ هامش الفتح ج:۱ ص:۳۳۳)[2]

البحر الرائق میں ہے:-

(تحت قول الکنز "وسن فی رمضان عشرون رکعة" .... الخ) بیان لصلوٰة التراویح، وانما لم یذکرها مع السنن المؤکدة قبل النوافل المطلقة لکثرة شعبها ولاختصاصها بحکم من بین سائر السنن والنوافل وهو الأداء بجماعة. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۷)[3]

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا جماعت سے ادا کیا جانا تمام سنن ونوافل کے مقابلے میں اسکی خصوصیت ہے۔

۶:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ویستحب أداءها (أی التراویح) بالجماعة، وقال مالک والشافعی رحمهما الله تعالیٰ فی القدیم: الانفراد أفضل کسائر السنن. انتهیٰ. وفیه بعد ذٰلک: والصحیح ان اداءها بالجماعة فی المسجد أفضل، لأن فیه تکثیرا للجماعة، وکذٰلک فی المکتوبات.

(خانية علیٰ هامش الهندية ج:۱ ص:۲۱۳)[4]

پہلی نص میں اشارہ فرمادیا گیا کہ تراویح اور چند اور منصوص سنن کے علاوہ تمام سنن میں ہم بھی شوافع وغیرہم کے قدیمی قول سے متفق ہیں کہ اس میں انفراد افضل ہے۔ دُوسری نص میں فرمایا گیا کہ تراویح اس حکم میں مکتوبات کی شریک ہے، اگر رمضان کی بقیہ نفلوں میں بھی جماعت جائز ہوتی تو تصریح کردی جاتی۔

۷:- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:-

"جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے جو حدیث سے ثابت ہیں، مکروہِ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو اور مراد تداعی سے چار آدمی کا ہونا ہے، پس جماعت صلوٰۃِ کسوف، استسقاء، تراویح کی دُرست اور باقی سب مکروہ ہیں، کذا فی کتب الفقه۔" (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۸۹)[5]

حضرت حکیم الأمت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ شبینہ کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

---

(۱) (طبع معهد الخلیل الاسلامی کراچی).

(۲) عناية علیٰ هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۴) الفتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة باب التراویح ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع مکتبه حقانیه پشاور)

(۵) تالیفاتِ رشیدیہ مع فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۹۶ (ادارۂ اسلامیات لاہور)

''مثلاً اگر تراویح کے بعد یہ عمل ہو تو نفل کی جماعت مجمع کثیر کے ساتھ ہونا جو کہ مکروہ ہے۔''[1]
(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۰)

ان حضرات نے بالکل تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا کہ نفل کی جماعت (تراویح کے سوا) رمضان میں بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح غیرِ رمضان میں۔

۸:- ان روایات کے علاوہ درایت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ نفل باجماعت رمضان میں بھی جائز نہ ہو، اس لئے کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، کیونکہ تراویح تطوّعات میں سے ہے اور تطوّعات میں اخفاء مطلوب ہے برخلاف فرائض کے، اسی لئے تطوّعات کو نہ صرف بلاجماعت، بلکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

''صلٰوۃ المرء فی بیتہ أفضل من صلٰوتہ فی مسجدی ھٰذا الا المکتوبۃ.''[2]

تو ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، اور یہ اُصولِ فقہ کا مُسلَّمہ قاعدہ ہے کہ ''امر خلافِ قیاس اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے'' اس پر قیاس کرکے کسی دُوسرے مسئلے کو اسی کے حکم میں کردینا جائز نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوافل میں جماعت کا مورد کیا کیا ہیں؟ نوافل میں جماعت کا مورد صلوٰۃ الکسوف، صلوٰۃ الاستسقاء اور صلوٰۃ العیدین (علیٰ قول من عدھما من النوافل) اور صلوٰۃ التراویح ہیں، رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں۔ البتہ ایک دو روایتیں اس قسم کی ملتی ہیں، لیکن وہاں پر جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ہے، جو باتفاق بہرصورت جائز ہے، مثلاً حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مشغول تھے، تو میں آپؐ کے بائیں پہلو میں جاکر کھڑا ہوگیا تو حضورؐ نے مجھے (ایک روایت کے مطابق ہاتھ سے) پکڑ کر دائیں جانب گھمادیا۔ اس میں مقتدی صرف حضرت ابنِ عباسؓ ہیں، چنانچہ حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر ترمذی میں ہے کہ:-

وبین التّراویح والتھجد فی عھدہ علیہ السلام لم یکن فرق فی الرّکعات بل فی الوقت والصفۃ أی التراویح تکون بالجماعۃ فی المسجد بخلاف التّھجد. (العرف الشذی ج:۱ ص:۲۳۰)

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

''اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے، کبھی بہ تداعی جماعت نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص آکھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں جیسا کہ حضرت ابنِ عباسؓ خود ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے جاکھڑے ہوئے تھے، بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کرکے ادا کیا۔''
(فتاویٰ رشیدیہ ص:۳۰۷)

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)
(۲) سنن أبی داوٗد باب صلوٰۃ الرجل التطوع فی بیتہ حدیث رقم:۱۰۴۴ ج:۱ ص:۲۷۴ (طبع دار الفکر).

جب یہ معلوم ہوگیا کہ نفل کی جماعت صرف تراویح، کسوف، استسقاء اور عیدین میں مشروع ہے تو بحکم مقدمہ ثانیہ دُوسری نوافل مثلاً تہجد وغیرہ میں اس حکم کو متعدی نہ کیا جائے گا کیونکہ اس میں جماعت منقول و ماثور نہیں، لہٰذا منصوصہ نوافل کے علاوہ تمام نوافل میں خواہ وہ رمضان میں ہوں یا غیر رمضان میں، جماعت بالتداعی مکروہِ تحریمی ہوگی۔

قیامِ رمضان کی تحقیق

حضرتِ شیخ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں وہ نصوص پیش فرمائی ہیں جو نمبر۳ میں اُوپر گزریں، اور اس کے علاوہ مؤطا امام مالک کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے۔ ان سب میں مستثنیات میں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ عینیؒ اور علامہ عسقلانیؒ کی عبارتیں پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد صرف تراویح نہیں، بلکہ "ما یحصل بہ القیام" مطلقاً مراد ہے، اور پھر نتیجہ دونوں کو ملا کر یہ نکالا ہے کہ فقہاء نے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عینی وعسقلانی کی عبارتوں سے اس کا عموم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا رمضان کی ہر نفل میں جماعت جائز ہے۔ لیکن قیامِ رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بے شک عام ہے، مگر عرف، عام فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں، اور تراویح کے بعد قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ ہدایہ کی شرح میں علامہ بابرتیؒ نے یوں نقل کی ہے:-

وترجم بقیام رمضان اتباعا للفظ الحدیث قال صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالٰی فرض علیکم صیامہ وسننت لکم قیامہ۔ (عنایۃ علٰی ھامش الفتح ج: ۱ ص: ۳۳۳)[۱]

ا:- فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا مطلب (کہ قیامِ رمضان کے علاوہ دُوسری نوافل کی جماعت مکروہ ہے) عمدۃ القاری اور فتح الباری سے اخذ کرنے کے بجائے بہتر اور اَنسب یہ ہے کہ خود فقہاء کی عبارتوں سے اخذ کیا جائے، جو مسئلۂ زیرِ بحث میں نص کا درجہ رکھتی ہیں، بخلاف عمدۃ القاری اور فتح الباری کے، کہ ان کے پیشِ نظر اس مقام میں جماعت کی بحث نہیں، بلکہ حدیث "من قام رمضان ایمانًا" کی تشریح ہے، اس لئے ہم یہاں فقہاء کی وہ چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جو مسئلۂ جماعت میں نص ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسئلۂ جماعت میں قیامِ رمضان سے مراد تراویح ہی ہے۔

الف:- علامہ مرغینانیؒ نے ہدایہ میں "فصل فی التراویح" کی جگہ "فصل فی قیام رمضان" کا عنوان لگا کر تراویح کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، اور شارحینِ ہدایہ مثلاً محقق ابن الہمامؒ نے اس عنوان کے تحت قیامِ رمضان کی تشریح کرنے کے بجائے تراویح کی تفسیر شروع کردی:-

"(فصل فی قیام رمضان) التراویح جمع ترویحۃ" (فتح القدیر ج: ۱ ص: ۳۳۳)[۲]

---

(۱) عنایۃ علٰی ھامش فتح القدیر فصل فی قیام شھر رمضان ج: ۱ ص: ۴۰۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) فتح القدیر فصل فی قیام رمضان ج: ۱ ص: ۴۰۶ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

اور علامہ بابرتیؒ نے یہی عنوان لگا کر تراویح کو سنن ونوافل سے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کرنی شروع کردی (جیسا کہ اُوپر نمبر۵ میں گزرا)۔ (عنایہ بحوالہ مذکور)

ب:- ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے بدائع میں جہاں قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، وہیں آگے چل کر دلالۃً اس کی تشریح فرمادی ہے، کہ مراد تراویح ہے، آپ نے فرائض ونوافل کے درمیان مابہ الفرق امتیازات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

ومنها ان الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان، وفی الفرض واجبة أو سنة مؤكدة.

پھر دو ہی سطروں کے بعد اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وانما عرفنا الجماعة سنة فی التراویح بفعل رسول الله صلی الله علیه وسلم واجماع الصحابة. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)[۱]

اس کے علاوہ وہ مسئلہ کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز ہے، اس سے بھی ثابت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ بدائع نے قیامِ رمضان سے مراد تراویح لی ہے، اور وہ جماعتِ نفل کو رمضان و غیرِ رمضان دونوں میں ناجائز قرار دیتے ہیں، وهو ظاهر۔

ج:- علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:-

الفصل الخامس فی کیفیة النیة واختلفوا فیها، والصحیح أن ینوی التراویح أو السنة أو قیام اللیل. (مبسوط للسرخسی ج:۲ ص:۱۴۵)[۲]

د:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ان نوی التراویح أو سنة الوقت أو قیام اللیل فی رمضان جاز.

(خانیة علی هامش عالمگیریة ج:۱ ص:۲۱۶)[۳]

گویا ’’قیام اللیل فی رمضان‘‘ اور ’’تراویح‘‘ دونوں ہم معنی لفظ ہیں، تراویح کی نیت کرتے وقت ’’تراویح‘‘ کا لفظ استعمال کرلو یا ’’قیامِ رمضان‘‘ کا، برابر ہے۔

(جواب نمبر۲) احادیث وآثار میں بھی جہاں ’’قیامِ رمضان‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں پر اس سے ’’تراویح‘‘ ہی مراد لیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ نہیں، مثلاً:-

الف:- عن سلمان الفارسی رضی الله عنه قال: خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید). (۲) (طبع دار المعرفة بیروت).
(۳) الفتاوی الخانیة علی هامش الهندیة فصل فی نیة التراویح ج:۱ ص:۲۳۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

فی اٰخر یوم من شعبان، فقال: یا أیها الناس! قد أظلکم شهر عظیم، شهر مبارک، شهر فیه لیلة خیر من ألف شهر، جعل الله صیامه فریضة وقیامه تطوعا. (مشکوٰۃ بحواله بیهقی ص:۱۷۳)[۱]

اور سننِ نسائی کی روایت میں ہے کہ: "**افترض الله علیکم صیامه سننت لکم قیامه**" یہاں پر "قیام" سے مراد "تراویح" کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قیام سے اگر تہجد مراد لیا جائے گا تو "**قیامه تطوعا**" کا یہ جملہ بیکار ہوجائے گا، اس لئے کہ تہجد کے تطوّع ہونے میں رمضان کی کیا تخصیص ہے؟ وہ تو غیرِ رمضان میں بھی تطوّع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں "قیام" سے مراد تراویح ہی ہے، اور اس "قیام" سے تراویح ہی مراد لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کے اثبات میں نقل فرماتے ہیں:-

(کما فی الفتح ج:۱ ص:۳۳۳[۲]**، والبزازیة ص:۱۳۱**[۳]**، ومراقی الفلاح علیٰ هامش الطحطاوی علی المراقی ص:۲۳۴**[۴]**).**

ب:- عن السائب بن یزید الصحابی قال: کانوا یقومون علیٰ عهد عمر رضی الله عنه بعشرین رکعة وعلیٰ عهد عثمان وعلی رضی الله عنهما مثله.

(عمدة القاری بحواله بیهقی ج:۵ ص:۲۶۷)[۵]

اس حدیث کا سیاق وسباق واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں قیام سے مراد تراویح ہے، اور حنفیہ رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کی بیس رکعت ہونے پر استدلال میں پیش کرتے ہیں، **کما فی العمدة۔**

۳:- عام طور پر شراحِ حدیث بھی "قیامِ رمضان" سے مراد "تراویح" ہی لیتے ہیں، چنانچہ:-

الف:- صحیح مسلم میں اس طرح عنوان قائم فرمایا گیا ہے، (اگرچہ وہ تراجم، امام مسلمؒ کے قائم کردہ نہیں ہیں، تاہم یہ تراجم مستند محدثین نے لگائے ہیں)۔

باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح. (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۹)[۶]

ب:- حضرتِ شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز تقریر ترمذی میں لکھتے ہیں:-

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۴) حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح ص:۲۲۴، ۲۲۵ (طبع نور محمد کتب خانه).
(۵) عمدة القاری (طبع دار الفکر).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

باب ما جاء في قيام شهر رمضان أي التراويح. (العرف الشذی ج:۱ ص:۳۲۹)[1]

ج:- حضرتِ شیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقریر ترمذی میں نص فرماتے ہیں:-

باب في قيام رمضان، هٰذا القيام كان عاما ثم اختص بالتراويح، فمطلقه يراد به التراويح. (الكوكب الدري ج:۱ ص:۲۶۷)[2]

د:- مؤطا امام محمدؒ کی وہ عبارت جو حضرتِ شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے، اس کے سیاق و سباق سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر جو امام محمدؒ نے ''قیام شہر رمضان'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، عبارت یہ ہے:-

قال محمد: وبهٰذا كله نأخذ، لا بأس بالصلوٰة في شهر رمضان أن يصلي الناس تطوعا بامام، لأن المسلمين قد اجمعوا علىٰ ذٰلك.[3]

اس مسئلہ کی جو دلیل پیش کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا اجماع) وہ صرف تراویح ہی پر صادق آتی ہے، غیرِ تراویح پر نہیں، کیونکہ غیرِ تراویح میں جماعت پر اجماع تو درکنار، اس کا نفسِ ثبوت ہی منقول نہیں، اس لئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوارِ مبارکہ میں کہیں غیرِ تراویح میں بالتداعی جماعتِ نفل کا ثبوت نہیں ملتا۔

بہرکیف! ان تمام نصوص سے جو ہم نے اس سلسلے میں اب تک پیش کیں، کم از کم اتنی بات تو بہرصورت ثابت ہوجاتی ہے کہ جہاں فقہاء وغیرہ نے قیامِ رمضان کو کراہتِ جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہاں پر تراویح ہی مرادلیا ہے۔ اگرچہ فی نفسہٖ ''قیام رمضان'' کا لفظ جو حدیث ''من قام رمضان .... الخ'' میں مذکور ہے، وہ ہر نماز اور فعلِ طاعت کو عام اور شامل ہے۔

مسئلہ زیر بحث اور علامہ عینیؒ

مندرجہ بالا عبارتیں وغیرہ تو اس بارے میں تھیں کہ ''قيام الليل في رمضان''، جس میں جماعت کو جائز قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، لیکن چند شراحِ حدیث نے قیامِ رمضان کو عام قرار دیا ہے، جیسا کہ شارحِ بخاری علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ جن کی عبارت کا حوالہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ''قيام الليل في رمضان'' عام ہے تراویح و غیرِ تراویح سب کو، ''ما يحصل

---

(۱) العرف الشذی علىٰ جامع الترمذی ص:۳۰۸ (طبع قدیم، مکتبہ رحیمیہ سہارنپور).
(۲) (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) المؤطا للامام محمد رحمه الله ص:۱۴۳ (طبع قدیمی کتب خانہ).

بـه الـقيـام مطلقًا" کے تحت قیامِ رمضان میں داخل مانا جائے گا۔لیکن اگر غور کیا جائے تو وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آجائے گی کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حدیث "من قـام رمضان ايمانًا واحتسابًا غفر لهٗ" کی تشریح کے تحت آیا ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہے کہ قیامِ رمضان پر جو ثواب اس حدیث میں موجود ہے، وہ صرف تراویح ہی پر نہیں، بلکہ مطلق ہر نماز پر جو رمضان کی رات میں ادا کی جائے، ثواب حاصل ہوگا۔ اس جگہ اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ جماعت سے ادا کی جائے یا بلا جماعت، یہی وجہ ہے کہ یہاں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلۂ جماعت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اس مسئلہ کا ذکر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "بـاب صلٰوة الليل" میں کیا ہے، اس میں ان کی عبارت یہ ہے:-

(حدیث: "صلوا أيها الناس في بيوتكم، فان أفضل الصلٰوة صلٰوة المرء في بيته" کے تحت فرماتے ہیں:)

واستثنـى مـن عـمـوم الحديث عدة من النوافل ففعلها في غير البيت أكمل، وهي ما تشرع فيه الجماعة، كالعيدين، والاستسقاء والكسوف.

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:-

قال الامام حميد الدين الضرير: نفس التراويح سنة، اما ادائها بالجماعة فمستحب.

پھر ایک سطر کے بعد ہے:-

وفـي جـوامـع الـفـقـه: التـراويـح سـنة مؤكدة، والجماعة فيها واجبة، وفي الروضة لأصـحـابنا ان الجماعة فضيلة، وفي الذخيرة لأصحابنا عن أكثر المشائخ أن اقامتها بالجماعة سنة على الكفاية. (۱) (عمدة القاری ج:۵ ص:۲۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قیامِ رمضان کے عموم کو ذکر کیا ہے، وہاں مسئلۂ جماعت ذکر نہیں کیا، اور جہاں مسئلۂ جماعت بیان فرمایا ہے وہاں مستثنیات میں قیامِ رمضان کو ذکر نہیں کیا، بلکہ بلفظ "تراویح" ذکر فرمایا ہے، لہٰذا ان کے قول سے کہ یہ قیامِ شہرِ رمضان کا لفظ عام ہے، تراویح کے سوا دُوسری نوافلِ رمضان کی جماعت جائز ہونے پر استدلال غیر صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس بحث میں درحقیقت فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے، البتہ کلام اس میں ہے کہ حدیث "من قام رمضان ايمانًا" میں جو فضیلت موجود ہے، وہ صرف تراویح کے لئے مخصوص ہے یا مطلق صلٰوۃ

---

(۱) مذکورہ تمام عبارات عمدة القاری (طبع داراحیاء التراث بیروت) کے اسی صفحہ (ج:۵ ص:۲۶۷) پر موجود ہیں۔

پر وہ فضیلت حاصل ہوگی؟ اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کا قول اختیار فرمایا ہے، اور علامہ نووی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ نے دُوسرا (علیٰ ما ذکرہ العینیؒ)۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو جماعتِ دیوبند میں ابوحنیفۂ عصر کا لقب رکھتے تھے، ان کا فتویٰ جمہور علماء وفقہاء کی تحقیق کے عین مطابق ہے، اس کو قولِ مرجوح پر عمل قرار دینا فہم عاجز سے بالاتر ہے۔ رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجرِ مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اتنی بات یقین کے درجے میں معلوم ہے کہ آپؒ نے شروع میں تہجد کی جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی تھی، لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اسی کراہت کی وجہ سے آپؒ نے ساری رات تراویح کا معمول بنالیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سینکڑوں حضرات ہوں گے، واللہ أعلم بحقیقة الحال۔

ایک ضروری گزارش

آخر میں گزارش ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور علمی تبحر کے پیشِ نظر تو اس مسئلہ پر قلم اُٹھانے کی جرأت کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفلِ مکتب اس پر کچھ لکھے۔ لیکن الحمدللہ جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم وتلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دِکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے۔ اس لئے بنامِ خداتعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھے واضح ہوا وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں، آمین۔

اللّٰهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

احقر العباد
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
متعلّم دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۳رشوال ۱۳۷۸ھ - ۱۳راپریل ۱۹۵۹ء

للہ در الـمـجيب حيث أصاب فيما أجاب وأجاد فيما أفاد، مع ملاحظة ادب الأكابر، وفقه الله تعالىٰ لما يحب ويرضىٰ.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
صدر دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۸رشوال ۱۳۷۸ھ

﴿فصل فی التراویح﴾
(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

چار تراویح کے بعد وقفے میں کیا پڑھنا چاہئے؟

سوال:- تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد کیا آیت پڑھی جاتی ہے؟ یہ سنت ہے یا واجب یا مستحب؟ اور یہ آیات صرف امام صاحب پڑھیں یا مقتدی بھی؟ زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد عام رکعتوں کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے، اس وقفے میں کوئی خاص ذکر واجب یا مسنون نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں چاہے کچھ تسبیحات پڑھ لے، چاہے الگ نفلیں پڑھے اور چاہے تو خاموش رہے۔[1] اور مشائخ کا معمول یہ ہے کہ اس میں یہ تسبیح پڑھتے ہیں: "سبحان ذی الملک والملکوت، سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والقدرۃ والکبریاء والجبروت، سبحان الملک الحی الذی لا یموت، سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح، لا الٰہ الّا اللہ نستغفر اللہ نسألک الجنۃ ونعوذ بک من النار" (کذا فی رد المحتار من القھستانی)۔[2] اور یہ تسبیح آہستہ پڑھنی چاہئے امام کو بھی اور مقتدی کو بھی۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

تراویح پر اُجرت کا مسئلہ

سوال:- میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں اور پاکستان میں کبھی کبھی آتا ہوں، اس سال یہاں نمازِ تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا، سوال یہ ہے کہ ایک نوجوان حافظ جس کی عمر ۲۵ سال کے قریب ہے، مستند حافظ ہے، قراءت بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، خود اپنی تجارت کرتے ہیں بلکہ خود اکثر و بیشتر مسجد کی مدد کرتے ہیں، اور مسجد سے کسی قسم کی اُجرت نہیں لیتے، لیکن کچھ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں، اور باہر سے رمضان کے لئے حافظ لانا چاہتے ہیں، اور ان کو ختمِ قرآن پر رقم بھی دینی پڑے گی، کیا یہ جائز ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۶ یجلس ندبا بین کل أربعۃ بقدرھا .... ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوٰۃ فرادی.

(۲) وفی الشامیۃ ج:۲ ص:۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) (قولہ بین تسبیح) قال القھستانی. فیقال ثلاث مرات: "سبحان ذی الملک والملکوت .... الخ".

جواب:- اُجرت پر تراویح پڑھانے کے لئے کسی حافظ سے معاملہ کرنا قطعاً ناجائز ہے،[1] اور جب مسجد کے حافظ صاحب بلا اُجرت نماز پڑھاتے ہیں اور لوگ بھی ان سے خوش ہیں تو خواہ مخواہ باہر سے اُجرت پر حافظ بلوانا بالکل نادُرست ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۸/۲۸ ج)

تراویح پر اُجرت لینا

سوال:- رمضان میں حافظِ قرآن کے لئے لوگ چندہ جمع کرتے ہیں، اس کو کپڑے وغیرہ دیتے ہیں، یا پہلے سے پیسے مقرّر کر کے حافظ کو لاتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- تراویح پڑھانے کے لئے اُجرت مقرّر کرنا بالکل ناجائز ہے،[2] اگر بغیر اُجرت کے حافظ نہ ملتا ہو تو 'اَلَـمْ تَـرَ کَیْفَ .... الخ" سے تراویح پڑھی جائے۔ ہاں! اگر کسی اُجرت کے بغیر کسی حافظ نے تراویح پڑھائی اور کوئی شخص اپنی خوشی سے بطورِ ہدیہ اس کو کچھ پیش کرے تو اس کا لینا دینا جائز ہے، لیکن اوّل تو آج کل اس کا اتنا التزام کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح سے طے شدہ اُجرت بن جاتی ہے، ایسے التزام سے پرہیز لازم ہے۔ دُوسرے اس غرض کے لئے چندہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۰/۳۲ ج)

تراویح پر اُجرت لینے کا حکم

سوال ۱:- احقر قرآن مجید حفظ کر لینے کے بعد اپنے ملکی رواج کے مطابق تراویح میں قرآن مجید سنا کر رقم لیتا رہا، چند سالوں سے توبہ کی ہے اور رقم لینا چھوڑ دیا۔ لی ہوئی رقم حقوق العباد میں داخل تو نہیں؟ کیا صرف اللہ تعالیٰ سے توبہ کافی ہے؟ واضح رہے کہ احقر اس دوران میں صاحبِ نصاب نہ تھا، نیز ختم والی رات سے پہلے اشرافِ نفس بھی ہوتا تھا۔

۲:- امسال رمضان المبارک میں ختم والی رات رقم لینے سے انکار کر دیا، لیکن اس کے بعد کچھ

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۵۶ ویمنع القاری للدنیا، والأخذ والمعطی اٰثمان. فالحاصل ان ما شاع فی زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا یجوز، لأن فیه الأمر بالقراءة واعطاء الثواب للاٰمر والقراءة لأجل المال، فاذا لم یکن للقاری ثواب لعدم النیة الصحیحة فأین یصل الثواب الی المستأجر، ولو الأجرة ما قرأ أحد لأحد فی هٰذا الزمان جعلوا القراٰن العظیم مکسبا ووسیلة الی جمع الدنیا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۳۶۵، و فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۶۲ و ۲۹۸، و امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۵۴.

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

آدمی مخفی طور پر احقر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی خدمت اس لئے نہیں کرتے کہ آپ نے قرآن مجید سنایا، بلکہ طالبِ علم جان کر بطورِ ہدیہ یا صدقہ کے دیتے ہیں، تو احقر نے ان کے اصرار پر کچھ رقم قبول کی، کیونکہ اس سے پہلے احقر کو کسی قسم کا اشراف و انتظار اس رقم کا نہ تھا۔

وہ رقم میرے لئے حرام تو نہیں تھی؟ اگر حرام تھی تو اس سے خلاصی کی کیا صورت ہے؟

جواب ۱:- تراویح سنانے پر اُجرت لینا ناجائز ہے،[1] لہٰذا یہ رقم اس کے اصل مالکوں کو واپس کرنا ضروری ہے، جن جن لوگوں تک پہنچانا وسعت میں ہو ان کو پہنچایا جائے یا ان سے معاف کرایا جائے، اور جہاں پہنچانا وسعت سے باہر ہو، اس کے لئے توبہ و اِستغفار کیا جائے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں جو رقم لے لی گئی وہ اُجرت نہیں، ہدیہ ہے جس کا وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۷/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شبینہ کا حکم

سوال:- ایک شخص شبینہ کا انتظام کرتا ہے، یعنی متعدّد حفاظِ قرآن کو دعوت دے کر ایک ہی رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے، بعض نوافل میں تلاوت کرتے ہیں اور دیگر اس کی اقتداء کرتے ہیں، اور بعض بلا اقتداء تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- جس قسم کے شبینہ کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے اس کا اہتمام مکروہ ہے، کیونکہ وہ نوافل کی جماعت اور ایک رات میں قرآنِ کریم ختم کرنے پر مشتمل ہے، اور یہ دونوں مکروہ ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۹/ ۱۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

۱:- تراویح پر اُجرت کا مسئلہ
۲:- جماعت کے ساتھ فرض نہ پڑھنے والا تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- تراویح کے لئے پیسے طے کرنا حرام ہے، مگر مولانا تھانویؒ و دیگر کچھ حضرات کہتے ہیں اگر طے نہ کیا جائے، لوگ خوشی سے دے دیں تب بھی جائز نہیں، جس کے بعض صحابہؓ سے دلائل دیتے ہیں، مگر وہ حافظ جو طے نہیں کرتے خوشی سے جو دیتے ہیں، لے لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہدیہ ہے جو لینا سنت ہے، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا حافظ پیسے، جوڑا، جوتا خوشی سے دیا ہوا لے سکتا ہے یا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

۲:- کوئی حافظ گھر سے دیر میں پہنچا، مسجد میں جماعت ہوچکی، اس نے انفرادی نماز پڑھی تو کیا تراویح یا وتر پڑھا سکتا ہے؟

جواب ۱:- تراویح پر اُجرت لینا طے کرکے بھی حرام ہے،[۱] اور اگر زبانی طور پر طے نہ کیا جائے لیکن عرف و رواج ایسا ہو کہ زبانی طے کئے بغیر بھی لینا دینا طے سمجھا جاتا ہو تو اس صورت میں بھی ناجائز ہے،[۲] البتہ اگر نہ زبانی طے کیا ہو، نہ عرفاً طے سمجھا جاتا ہو، نہ حافظ کے دِل میں تراویح پڑھانے کا محرک یہ ہو کہ کچھ ملے گا، اس کے بعد اگر مسجد والے اپنی خوشی سے کچھ دے دیں تو لینے کی گنجائش ہے۔

۲:- پڑھا سکتا ہے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/۳۰ د)

۲۳ویں رات میں سورۂ عنکبوت اور رُوم پڑھنا

سوال:- ہمارے دیار میں رمضان کی تیئیسویں رات کو تراویح کے بعد سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم نمبر۲۰، نمبر۲۱ پڑھنے کا رواج ہے، کیا ان سوَر کے پڑھنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

(۲) وفی الشامیة ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعید) المعروف کالمشروط.

(۳) وفی الشامیة، مبحث التراویح ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعید) لو صلیت بجماعة الفرض وکان رجل قد صلّی الفرض وحده، فله أن یصلیها مع ذٰلک الامام، لأن جماعتهم مشروعة، فله الدخول فیها معهم لعدم المحذور.
وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۷ صلّی العشاء وحده، فله أن یصلی التراویح مع الامام .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۴۱۰ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) لو صلّی العشاء وحده، فله أن یصلّی التراویح مع الامام وهو الصحیح .... الخ.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۹۳ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

جواب:- ہمارے علم میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، نہ اس کی پابندی کی کوئی شرعی بنیاد ہے۔
والله اعلم
۱۳۹۷/۱۲/۱۰ھ

شبینہ کا حکم

سوال:- رمضان المبارک میں شبینہ سننا یا سنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- قرآن شریف جتنا زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا جائے اتنا ہی موجبِ ثواب و خیر و برکت ہے، خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، نماز میں اور زیادہ ثواب ہے، لیکن نفلی نماز کی جماعت دو تین آدمیوں سے زیادہ کی مکروہ ہے،[1] بغیر جماعت کے تنہا، یا دو تین آدمیوں کی جماعت میں پورا قرآن شریف تین یا زیادہ راتوں میں ختم کرنا بہت بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن جس طرح کے شبینے اب رائج ہوگئے ہیں کہ نفلی جماعت کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور جماعت بھی تین سے زیادہ آدمیوں کی ہوتی ہے، جو لوگ نماز میں شامل نہیں ہوتے وہ باتیں کرتے رہتے ہیں، یا مٹھائی وغیرہ کے انتظام میں لگے رہتے ہیں، قرآن شریف سننے کی طرف دھیان نہیں کرتے، یہ ناجائز ہے۔ والله اعلم
۱۳۹۷/۱۲/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۹/۲۸ ج)

شبینہ کا حکم

سوال۱:- شعبان کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو شبینہ کیا جاتا ہے، اس میں حفاظ پارے پڑھتے ہیں، ایسے شبینہ میں نیت باندھ کر امام کی اقتداء میں قرآن سننے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح قرآن سننا جائز ہے؟
۲:- شبینہ میں قرآن پڑھنا اور اس میں حصہ لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ ۳:- اس مسجد میں حاضر رہنا اور شبینہ کے کاموں میں تعاون و امداد کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- حنفی مسلک میں نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے۔[2] لہٰذا مذکورہ شبینہ

---

(۱) وفی غنیة المتملی ج:۱ ص:۴۱۱ واعلم ان النفل بالجماعة علیٰ سبیل التداعی مکروہ علیٰ ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادارک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذٰلک علیٰ سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدرر، وکذا فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴ و ص:۲۴۸.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعید) (قبیل باب ادارک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذٰلک علیٰ سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واعلم ان النفل بالجماعة علیٰ سبیل التداعی مکروہ علیٰ ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ.
(محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

جائز نہیں۔ ایسے شبینہ کا انتظام و اہتمام، اس میں امامت یا اقتداء یا اس میں لوگوں کو دعوت دینا یہ تمام باتیں شرعاً جائز نہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۶/۲۸ ج)

شبینہ کا حکم، جائز شبینہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

سوال ۱:- آج کل جو رمضان شریف میں شبینہ ہوتے ہیں، اکثر حفاظ نوافل میں پڑھتے ہیں اور بعض نابالغ بچوں سے پڑھواتے ہیں جبکہ مقتدی بالغ ہوتے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر بھی استعمال ہوتا ہے جس سے اہلِ محلّہ کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں، نیز سننے والے چند اشخاص ہوتے ہیں، اکثر چائے پانی میں مشغول ہوتے ہیں، اور شور وشغب کا بازار گرم رہتا ہے، نیز ان شبینوں کی سرپرستی علماء کو بھی کرتے دیکھا ہے، کیا مروّجہ شبینہ جائز ہے؟ ۲:- شبینہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ۳:- کیا جہری نماز میں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب ۱:- جس قسم کے شبینے کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مکروہِ تحریمی ہے اور اس میں ثواب کے بجائے اُلٹا گناہ ہے، اوّل تو نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے[1]، پھر نابالغ کی اقتداء[2]، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اور شور وشغب کے ذریعے قرآنِ کریم کی بے ادبی، یہ سب اُمور سخت منکرات ہیں اور ان سے پرہیز لازم ہے۔

۲:- جائز شبینہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تراویح کی جماعت رات بھر جاری رہے، اس میں امام بالغ اور متشرّع ہو، تین دن سے کم میں قرآنِ کریم ختم نہ کیا جائے، تمام لوگ ذوق وشوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ قرآنِ کریم سنتے ہوں، زائد روشنی اور چراغاں سے پرہیز کیا جائے، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ ہو اور نام ونمود سے کلی اجتناب کیا جائے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۲/۲۸ ج)

شبینہ کے جواز کی شرائط

سوال:- مساجد میں رمضان المبارک میں شبینہ ہوتا ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، بعض جائز۔ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ شبینہ کے جواز کی شرائط براہ کرم بتادیں۔

---

(۱) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۷، ۵۷۸ ولا یصح اقتداء رجل بامرأة وخنثی وصبی مطلقا ولو فی جنازة ونفل علی الأصح، وفی الشامیة تحته والمختار أنه لا یجوز فی الصلوات کلها .... الخ.

جواب:- شبینہ تراویح میں ہو، نفلوں میں نہ ہو۔ فضول خرچی، شور وشغب اور نام ونمود سے احتراز کیا جائے، اور اس کی فرائض و واجبات کی طرح پابندی نہ کی جائے تو جائز ہے، اور ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو ناجائز ہے۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۰۱/۲۹ ج)

تراویح میں تین بار سورۂ اِخلاص پڑھنا

سوال ۱:- کسی مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ تراویح میں آخری پارہ میں سورۂ اِخلاص تین مرتبہ پڑھنا دُرست ہے، جبکہ زید کہتا ہے کہ سورۂ اِخلاص کا تین مرتبہ پڑھنا بدعت ہے۔ (سند بہشتی زیور جلد گیارہ)۔

۲:- امام نے تراویح کی دو رکعت کی نیت باندھی، لیکن دُوسری رکعت میں التحیات پڑھے بغیر کھڑا ہوگیا، تقریباً پانچ سیکنڈ کے بعد امام صاحب پھر بیٹھ گئے، اور حسبِ معمول دونوں رکعتیں پوری کرکے سلام پھیر دیا۔ زید کا یہ اعتراض ہے کہ امام صاحب کے گھٹنے اور کمر سیدھی ہوگئی، لہٰذا چار رکعت پوری کرکے سجدۂ سہو کرکے چار پوری کرنی چاہئے تھی۔ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

جواب ۱:- جماعت کی نماز میں کسی آیت یا سورت کو بار بار پڑھنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے،[۲] اور آج کل تراویح میں سورۂ اِخلاص کو تین بار پڑھنے کا جو التزام کرلیا گیا ہے کہ اسے سنت سمجھتے ہیں، اس سے اس کے بدعت ہونے کا بھی اندیشہ ہے، لہٰذا اس عمل سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔ بہشتی گوہر میں مسئلہ صحیح ہے اور امداد الفتاویٰ ج:اوّل ص:۳۰۴ میں بھی اسی پر فتویٰ ہے۔[۳]

۲:- امام صاحب نے جو عمل کیا وہ دُرست ہے، دو رکعت کی فرض نماز میں اور سنن ونوافل میں پوری طرح کھڑے ہونے کے بعد بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ زید نے جو مسئلہ بیان کیا وہ چار رکعت کی فرض نماز کے قعدۂ اُولیٰ سے متعلق ہے، صورتِ مسئولہ سے اس کا تعلق نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۸/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۳ حاشیہ نمبر۱۔

(۲) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۰۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) اذا کرّر اٰیة واحدة مرارًا .... ان کان فی الصلوٰة المفروضة فهو مکروه فی حالة الاختیار وأما فی حالة العذر والنسیان فلا بأس. هٰکذا فی المحیط. وکذا فی غنیة المتملی ص:۴۹۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور). نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۶۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۲۷، ۳۲۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

تراویح میں قرآن پڑھے جانے کے باوجود الگ سے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھنا

سوال:- ایک مسجد میں تراویح میں باقاعدہ ختمِ قرآن ہوتا ہے اور بلا اُجرت، لیکن اسی مسجد میں کچھ لوگ "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب مسجد میں ایک حافظ صاحب قاعدے میں تراویح میں قرآنِ کریم سنا رہے ہیں تو ان کی تراویح کی موجودگی میں "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ .... الخ" سے الگ تراویح بلاعذر نہ پڑھنی چاہئے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو اسے بالتفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

تراویح کو ضروری نہ سمجھنا اور بلاعذر تراویح ترک کرنا

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ تراویح سنت ہے، پڑھے یا نہ پڑھے کوئی گناہ نہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ میں کیا حکم ہے؟

جواب:- تراویح سنتِ مؤکدہ ہے، اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ پڑھے یا نہ پڑھے کچھ گناہ نہیں، بالکل غلط ہے۔ جو صاحب ایسا کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔(۱) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۴ھ

تراویح میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سنت ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو جگہ تراویح بیک وقت ہوتی ہے، ان دونوں کی قراءتیں مختلط ہوکر سہو کی وجہ بن جاتی ہیں۔ ان دو اماموں میں سے ایک امام الحی ہے جو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے اختصار کے ساتھ پڑھتا ہے، قوم کی اکثریت امام الحی کے ساتھ ہے، اور دُوسرا حافظِ قرآن ہے، وہ ختم کرتا ہے، اپنے عزیز و اقارب کو سمجھا کر شریک کرتا ہے، اور قوم کو یہ کہتا ہے کہ یہ مختصر تراویح نہیں ہوتی۔ امام الحی کہتا ہے کہ جب قوم پر ختمِ قرآن ثقیل ہو تو اس کا ترک افضل ہے۔ **الأفضل فی زماننا قدر ما لا یثقل علی القوم** ۔ اور کہتا ہے کہ ختمِ قرآن ضرورتِ دین سے نہیں ہے، اور جب ضروریاتِ دین سے نہ ہو تو اس کو ترک کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) فی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلوٰة ان لم یر السنن حقا فقد کفر. لأنه ترکها استخفافا، وان راها حقا فالصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک، وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافًا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک اهـ. وراجع أیضًا الشامیة ج:۱ ص:۱۰۴ (محمد زبیر)

جواب:- قال فی الدر: والختم مرة سُنّة ومرتین فضیلة وثلاثًا أفضل، ولا یترک الختم لکسل القوم لٰکن فی الاختیار الأفضل فی زماننا قدر ما لا یثقل علیهم، وأقره المصنف وغیره، وفی المجتبٰی عن الامام لو قرأ ثلاثًا قصارًا أو اٰیة طویلة فی الفرض فقد أحسن ولم یسیئ فما ظنک بالتراویح؟ (الٰی) من لم یکن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل، وأقره الشامی ج:۱ ص:۴۷۵۔(۱)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تراویح میں ایک مرتبہ قرآنِ کریم ختم کرنا سنت ہے، اور یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جب مقتدیوں پر طویل قراءت ثقیل ہو اس وقت چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنی چاہئے، یہ بالکل مجبوری کی صورت میں ہے، یہ مجبوری ہمارے زمانے میں ایسی نہیں ہے کہ اس کی بناء پر مسجدوں میں اس سنت کو ترک کر دیا جائے، بلکہ تمام مساجد میں قرآنِ کریم ختم ہوتا ہے اور مقتدی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، لہٰذا اس سنت کو مساجد میں بغیر مجبوری کے ترک نہ کرنا چاہئے، بالخصوص جبکہ قرآنِ کریم سنانے کے لئے حافظ موجود ہے تو امام الحی کو چاہئے کہ تراویح اس سے پڑھوائے اور خود "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے پڑھنے پر اصرار نہ کرے، معاملہ دین کا ہے اس میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۹۷/۲۷ و)

تراویح سے متعلق متعدّد مسائل

۱:- پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دینا
۲:- بچے کو سامع بنانا
۳:- حافظ صاحب کا لقمہ قبول نہ کرنا
۴:- اختتام پر پہلی رکعت میں سورۂ ناس اور دُوسری رکعت میں سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھنا

سوال ۱:- رمضان میں تراویح جو حافظ پڑھاتے ہیں، وہ رقم مقرّر کرکے پڑھتے ہیں تو کیا نماز جائز ہوگی؟ اگر رقم مقرّر نہ کی گئی ہو اور تراویح کے خاتمے پر کچھ رقم دے دی جائے تو وہ نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۴۷ (طبع ایچ ایم سعید).

۲:- حافظ صاحب اپنا سامع ساتھ لائیں جو ایک بچہ ہو، اور تراویح میں سوجائے یا ایسی حرکتیں کرے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور لقمہ بھی نہ دے، تو ان حافظ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

۳:- اگر حافظ صاحب لقمہ قبول نہ کریں اور متکبرانہ الفاظ استعمال کریں کہ میں ٹھیک پڑھتا ہوں، اگر وہ غلط بھی پڑھیں تو لقمہ نہ لیں، تو کیا یہ نماز جائز ہوگی؟

۴:- اگر سورۂ ناس پہلی رکعت میں پڑھی جائے اور سورۂ بقرہ دُوسری رکعت میں تو اس سے نماز ٹھیک ہوگی یا نہیں؟

۵:- اگر پیش امام، نماز میں لقمہ قبول نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟ جبکہ وہ بار بار غلطیاں کرتا ہو۔

جواب ا:- اُجرت طے کرکے تراویح سنانا بالکل ناجائز ہے،[1] اس سے بہتر ہے کہ لوگ عام امام کے پیچھے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھ لیں۔ جو حافظ اُجرت لے کر تراویح سناتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، البتہ جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی وہ ہوگئی، اعادہ واجب نہیں۔

پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دے دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ بات اتنی معروف و مشہور نہ ہوگئی ہو کہ طے کئے بغیر بھی طے سمجھی جاتی ہو۔

۲:- بچے کو سامع بنا کر پہلی صف میں کھڑا کرنے کی ضرورۃً گنجائش ہے، اس بچے سے اگر کبھی غلطی ہوجائے تو درگزر کرنا اور فہمائش کرنا چاہئے، محض اس بناء پر امام یا حافظ کے خلاف فتنہ کھڑا کرنا دُرست نہیں۔

۳:- حافظ صاحب کو صحیح لقمہ قبول کرنا چاہئے اور اس کو ذاتی عزّت و وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے، البتہ اس سے نماز میں خلل نہیں آتا، تاوقتیکہ حافظ صاحب نے کوئی مفسدِ صلوٰۃ غلطی نہ کی ہو۔

۴:- ٹھیک ہوگی، اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ختمِ قرآن کے علاوہ دُوسری نمازوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ ناس نہ پڑھے۔[2]

۵:- نماز کا صحیح ہونا یا نہ ہونا غلطیوں کی نوعیت پر منحصر ہے، بعض غلطیوں سے نماز فاسد ہوجاتی

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۰ حاشیہ نمبرا۔

(۲) وفی غنیة المتملی شرح المنیة ص:۴۹۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وفی الولوالجیة: من یختم القرآن فی الصلاة اذا فرغ من المعوذتین فی الرکعة الأولیٰ یرکع ثم یقوم فی الرکعة الثانیة ویقرأ بفاتحة الکتاب وشیٔ من سورة البقرة، لأن النبی صلی الله علیه وسلم قال: خیر الناس الحال المرتحل، أی الخاتم المفتتح.

ہے اور بعض سے نہیں ہوتی، لہٰذا ہر غلطی کا حکم الگ پوچھنا چاہئے، اور جو حافظ صاحب کثرت سے غلطیاں کرتے ہوں اور صحیح لقمہ بھی قبول نہ کرتے ہوں ان کے بجائے کوئی اچھے حافظ صاحب تلاش کرنے چاہئیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض غلطیاں مفسدِ نماز کر جائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۷/۲۸ ج)

داڑھی منڈانے والے کی اقتداء میں تراویح پڑھنا

سوال:- رمضان میں اکثر حافظ جو مساجد میں قرآن شریف سناتے ہیں، داڑھی نہیں رکھتے یا ان کی شرعی داڑھی نہیں ہوتی، تو کیا اس قسم کے حفاظ کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟ فرض نماز اور نمازِ تراویح دونوں کے لئے از رُوئے فقہِ حنفی کیا حکم ہے؟

جواب:- جو شخص داڑھی منڈاتا ہو یا شرعی مقدار سے کم داڑھی رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔[1] تراویح اور فرض نمازوں کا ایک ہی حکم ہے، البتہ جو نماز ایسے شخص کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ادا ہوگئی۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳۸/۳۹ ہ)

کھڑے ہوکر تراویح پڑھنے کے بعد عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سنا ہے چاہے کوئی بوڑھا ہو یا جوان اگر وہ نمازِ تراویح شروع ہی سے کھڑے ہوکر پڑھنی شروع کردے تو تمام نمازِ تراویح کھڑے کھڑے ہی ادا کرنا ہوگا، کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں، اگر عذر ہوتو بیٹھ سکتا ہے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق، وفی الشامیة (قوله وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ واما الأخذ منها وهی دون ذٰلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد، وأخذ کلها فعل یهود الهند ومجوس الأعاجم .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة .... الخ.

جواب:- آپ نے ٹھیک سمجھا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تراویح کھڑے ہوکر شروع کرنے کے بعد کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، وہ دُرست نہیں کہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت عذر پر موقوف ہے، اگر عذر شروع ہی سے ہو تو شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اگر بیچ میں پیش آئے تو بیچ میں بیٹھ جانا بھی جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۱/۲۸ ج)

تراویح کی رکعتوں کی تعداد

سوال:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں یا بیس؟ اور بیس تراویح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کے بارے میں مختلف روایات ہیں، صحابہ کرامؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ تراویح بیس رکعتیں پڑھی جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جاننے والا صحابہؓ سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا، اس لئے بیس رکعات تراویح پڑھنا چاہئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۹ (ولو مرض فی أثناء الصلوٰة بنی بما قدر) يعنی لو شرع فی الصلوٰة صحيحًا قائمًا فحدث به مرض يمنعه عن القيام صلّى ما بقی قاعدًا يركع ويسجد، ولو افتتحها قاعدًا للعجز يركع ويسجد فقدر على القيام بنی قائمًا عند الشيخينؒ. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۲۰۱ ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء ويكره لو بلا عذر عنده .... الخ.

(۲) وفی مصنف ابن أبی شيبة ج:۲ ص:۳۹۴ عن ابن عباسؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلّی فی رمضان عشرين ركعة. وكذا فی التعليق الحسن ص:۵۲. وفی تلخيص الحبير فی أحاديث الرافعی الكبير ج:۲ ص:۵۰۹ (حديث) أنه صلى الله عليه وسلم صلّى بالناس عشرين ركعة ليلتين، فلما كان فی الليلة الثالثة اجتمع الناس فلم يخرج اليهم ثم قال من الغد: خشيت أن تفرض عليكم فلا تطيقوها. وفی كنز العمال: فصلّى بهم عشرين ركعة. ص:۲۸۴. وفی السنن للبيهقی ج:۲ ص:۴۹۶ عن يزيد بن خصيفة عن سائب ابن يزيد قال: كانوا يقومون علىٰ عهد عمر بن الخطاب فی شهر رمضان بعشرين ركعة. وفی آثار السنن ج:۲ ص:۵۵ عن عبدالعزيز بن رفيع وفی مؤطا امام مالک ص:۴۰ عن يزيد بن رومان أنه قال: كان الناس يقومون فی زمان عمر بن الخطاب بثلاث وعشرين ركعة. وفی عمدة القاری ج:۱۱ ص:۳۷ ان عبدالله بن مسعود كان يصلّی عشرين ركعة. وراجع أيضًا فتح الباری ج:۴ ص:۲۱۹، وآثار السنن ج:۱ ص:۵۵، والشامية ج:۲ ص:۴۵ وغنية المتملی ص:۴۰۲ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) وغنية الطالبين ص:۴۶۴ و الجوهر النقی ج:۲ ص:۴۹۶ والمفاتيح لأبواب التراويح، امداد الأحكام ج:۱ ص:۶۳۷. (محمد زبیر)

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا

سوال:- یہاں رمضان میں عورتوں کا خیال ہے کہ مسجد میں جاکر حافظ صاحب کا تراویح میں قرآن سنیں، وہاں پردے کا انتظام ہوگا، مردوں کی صفوں کے بعد عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہوگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- عورتوں کا مسجد میں جاکر جماعت میں شریک ہونا مکروہِ تحریمی ہے، اور اس سے کوئی نماز مستثنیٰ نہیں، خاص طور سے مردوں کی تلاوتِ قرآن سننے کا مقصد موجودہ حالات میں زیادہ تر حسنِ صوت ہوتا ہے، جو اور زیادہ موجبِ فتنہ ہے، **وکره لهن حضور الجماعة الا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتویٰ الیوم علی الکراهة فی کل الصلوٰة لظهور الفساد، کذا فی الکافی عالمگیریة** ج:۱ ص:۹۳۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) الهندية ج:۱ ص:۸۹ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) وکذا فی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۵، ۵۶۶.

﴿فصل فی الوتر﴾
(وتر سے متعلق مسائل)

وتر کا وقت اور طریقہ

سوال:- وتر کس طرح اور کب پڑھتے ہیں؟ اس کی کتنی رکعتیں ہیں اور ان تمام باتوں کے دلائل کیا ہیں؟

جواب:- وتر کا وقت عشاء کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے، اور فجر سے پہلے کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں۔[1] اس کی تین رکعتیں ہیں، دو رکعتوں پر قعدہ کرکے التحیات پڑھیں اور کھڑے ہوجائیں، پھر تیسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائیں[2]، اس کے بعد کانوں تک ہاتھ اُٹھاکر دُعائے قنوت پڑھیں۔[3]

اور وتر سے پہلے عشاء کی دو رکعتیں سنتِ مؤکدہ ہیں[4]، اور بعد میں دو رکعات نفل ہیں، اور جو شخص تہجد میں اُٹھنے کا عادی ہو، اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وتر تہجد کے وقت پڑھے[5]، اور ان تمام باتوں کے دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، یہ فتویٰ میں پوچھنے کی بات نہیں۔ واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۶۱ (طبع سعید) (و) وقت (العشاء والوتر منه الی الصبح ولٰکن لا یصح ان (یقدم علیها الوتر).

(۲) وفی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۵ (طبع سعید) وهو ثلاث رکعات بتسلیمة ویقرأ فی کل رکعة منه فاتحة الکتاب وسورة .... الخ.

(۳) وفی اٰثار السنن باب رفع الیدین عند قنوت الوتر ص:۱۶۹ (مکتبه امدادیه ملتان) عن عبداللّٰه أنه کان یقرأ فی اٰخر رکعة من الوتر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الرکعة. رواه البخاری. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲ باب الوتر والنوافل (طبع ایچ ایم سعید) ویکبّر قبل رکوع ثالثة رافعًا یدیه کما مرّ .... وقنت فیه.

(۴) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع سعید) (وسن) مؤکدًا أربع قبل الظّهر .... ورکعتان .... بعد........ العشاء.

(۵) (والمستحب......) .... تأخیر الوتر الی اٰخر اللیل لواثق بالانتباه، والا فقبل النوم. الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع سعید). وفی الشامیة تحته أی یستحب تأخیره، لقوله صلی اللّٰه علیه وسلم من خاف أن لا یوتر من اٰخر اللیل فلیوتر أوله، ومن طمع أن یقوم اٰخره فلیوتر اٰخر اللیل فان صلوٰة اٰخر اللیل مشهودة وذٰلک أفضل رواه مسلم والترمذی وغیرهما، وتمامه فی الحلیة وفی الصحیحین "اجعلوا اٰخر صلاتکم وترا" والأمر للندب بدلیل ما قبله بحر.

شافعی امام کے پیچھے حنفی کے وتر پڑھنے کا حکم

سوال:- شافعی امام کے پیچھے وتر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہے تو کن شرائط کے تحت؟ براہِ کرم تفصیلی طور پر آگاہ فرمائیں۔

جواب:- شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

ا:- حنفی کے مذہب کے مطابق شافعی کی نماز میں کوئی مفسدِ نماز فعل نہ ہو۔

۲:- حنفی مقتدی کو یقین ہو کہ شافعی امام جائز و ناجائز کے اہم مختلف فیہ مسائل میں احتیاط سے کام لیتا ہے، مثلاً بہتے ہوئے خون کے نکلنے سے وضو کرلیتا ہے، اور اگر اسے اس کا یقین ہو کہ امام احتیاط نہیں کرتا تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ احتیاط کرتا ہے یا نہیں، تو نماز مکروہ ہوگی۔

۳:- وتر میں اقتداء کرنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ تین رکعتوں کو دو سلاموں کے ساتھ نہ پڑھے (جیسا کہ ان کا مذہب ہے)، اور اس میں مقتدی کو اپنا قنوت "اللّٰھم انا نستعینک .... الخ" رُکوع کے بعد پڑھنا چاہئے، پہلے نہیں، کیونکہ شافعی امام بھی رُکوع کے بعد پڑھے گا، اور اس مسئلے میں اس کی متابعت کرنا ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کے دلائل کتبِ فقہ سے حسبِ ذیل ہیں:-

ا:- درمختار میں ہے: ومخالف کشافعي (یعني یکره الاقتداء به) لٰکن في وتر البحر ان تیقن المراعاة لم یکره، أو عدمها لم یصح وان شک کره. اور علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: ھٰذا ھو المعتمد، لأن المحققین جنحوا الیه، وقواعد المذھب شاھدة علیه، وقال کثیر من المشائخ: ان کان عادته مراعاة مواضع الخلاف جاز والا فلا، ذکره السندی.

(شامی ج:ا ص:۵۲۶)[1]

(ومثله في شرح الکنز للعیني ج:اوّل ص:۴۶)[2]۔

۲:- درمختار میں ہے: (وصح الاقتداء فیه) (یعني الوتر) ففي غیره أولٰی ان لم یتحقق منه ما یفسدها في اعتقاده في الأصح کما بسطه في البحر (بشافعي) مثلًا (لم یفصله بسلام) لا ان فصله (علی الأصح) فیهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. (رد المحتار ج:اوّل ص:۶۲۵)[3]

---

(۱) شامي ج:ا ص:۵۶۲، ۵۶۳ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) رمز الحقائق، شرح العیني علٰی کنز الدقائق، باب الوتر والنوافل ج:ا ص:۴۵ (طبع ادارة القرآن کراچي)

(۳) الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:ا ص:۷، ۸ (طبع سعید).

۳:- في الدر المختار: ويأتي المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعي يقنت بعد الركوع، لأنه مجتهد فيه، وقال الشاميؒ تحت قوله: (ولو بشافعي .... الخ) أي ويقنت بدعاء الاستعانة لا دعاء الهداية. وقال تحت قوله (لأنه مجتهد فيه .... الخ) والظاهر أن المراد من وجوب المتابعة في قنوت الوتر بعد الركوع المتابعة في القيام فيه لا في الدعاء. (شامی ج:اوّل ص:۶۲۶)[1]

تنبیہ:- جو شرط ہمارے یہاں شافعی کے پیچھے اقتداء میں ہے کہ کوئی مفسدِ نماز لازم نہ آئے، وہی شرط شافعی حضرات کے یہاں حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ نے شرحِ کنز میں لکھا ہے: الشافعي أيضًا يقول بمثله في حق الحنفي فيقول: لا يجوز اقتداء الشافعي الحنفي الا اذا كان يحتاط في موضع الخلاف۔

پھر چند سطروں کے بعد ہے: يجوز اقتداء الحنفي بالشافعي والشافعي بالحنفي وكذا بالمالكي والحنبلي ما لم يتحقق من امامه ما يفسد صلوٰته في اعتقاده. (عینی ج:۱ ص:۴۶)۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۲/۲۰ھ

۱۴/جون ۱۹۶۰ء[3]

الجواب صحیح

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شافعی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا

سوال:- جناب مولانا تقی صاحب! ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، افریقہ میں اکثر شافعی مسجدیں ہیں، وہاں حنفی مسلک کے لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں، جب وتر کا مسئلہ آتا ہے تو حنفی اگر شافعی مسلک کے امام کے پیچھے تراویح کے بغیر وتر پڑھیں تو صحیح ہے یا علیحدہ جماعت کرنا ضروری ہے؟ مہربانی فرماکر اس مسئلہ کا جواب مندرجہ ذیل پتے پر دیں۔ ٹکٹ کے پیسے لفافے کے اندر نہیں بھیجے کیونکہ یہ قانوناً جرم ہے۔

احمد رحمت اللہ

(دار السلام، تنزانیہ)

جواب:- شافعی حضرات چونکہ وتر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور حنفی مسلک میں اس

---

(۱) شامي ج:۲ ص:۸، ۹ (طبع سعيد).

(۲) شرح العينى على الكنز المسمّٰى برمز الحقائق باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارة القرآن كراچى).

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

طرح نماز نہیں ہوتی،[1] اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ وتر میں ان کے ساتھ شامل نہ ہوں، بلکہ اپنی نماز علیحدہ ادا کریں، تراویح ان ہی کے ساتھ ادا کرلیا کریں اور وتر کے وقت علیحدہ ہوجائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۹/۳۱ ج)

مسجد میں دو جگہ تراویح ہونے کی بناء پر وتر کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- مسجد میں دو جگہ تراویح، اندر اور چھت پر ہوتی ہیں، سب نمازی اندر والے امام کی اقتداء میں فرض پڑھتے ہیں، البتہ وتر کی جماعتیں اندر اور چھت پر علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، کیونکہ تراویح کی دونوں جماعتیں الگ الگ وقت پر ختم ہوتی ہیں، کیا اس طرح وتر کی دو جماعتیں کرانا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الگ الگ وتر کی جماعتیں جائز ہیں۔　　واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۴۷/۳۲ ج)

وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- دُعائے قنوت واجب ہے، اگر وہ بھولے سے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۹، ۴۰ وظهر بهٰذا أن المذهب الصحيح صحة الاقتداء بالشافعیؒ فی الوتر ان لم يسلم علٰى رأس الركعتين وعدمها ان سلم. والله الموفق للصواب. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۷، ۸ وصح الاقتداء فيه بشافعی مثلًا (لم يفصله بسلام) لا إن فصله (على الأصح فيهما) للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. وفی رد المحتار (قوله: على الأصح فيهما) أی فی جواز أصل الاقتداء فيه بشافعی، وفی اشتراط عدم فصله خلافًا لما فی الارشاد من أنه لا يجوز أصلا باجماع أصحابنا .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۹ (ولو نسيه) أی القنوت .... (سجد للسهو).

﴿فصل فی قضاء الفوائت﴾
(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

حیض کی مخصوص صورت کی بناء پر نمازوں کی قضاء

سوال:- ایک عورت کو حیض کا خون ڈھائی دن مسلسل آتا ہے، اس کے بعد معمولی سا آنے لگتا ہے، تین دن کے بعد بالکل بند ہوجاتا ہے، پھر چوتھے دن بالکل خون نظر نہیں آتا، پانچویں دن دوپہر کو تھوڑا سا آکر بند ہوجاتا ہے۔ عورت نماز، روزہ کس طرح ادا کرے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں یہ پانچوں دن حیض شمار ہوں گے، ان کی نمازیں معاف ہیں اور روزوں کی قضا فرض ہے، اور اگر اس کی ہمیشہ عادت ایسی ہی ہے، تب تو وقتِ موقوف میں اسے نہ نماز پڑھنی چاہئے، نہ روزہ رکھنا چاہئے، اور اگر ہمیشہ عادت ایسی نہیں، پہلی بار ایسا ہوا ہے تو چونکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ پاکی کے بعد پھر خون آئے گا، اس لئے اگر وہ غسل کرکے روزہ رکھے گی تو گناہ نہ ہوگا، البتہ یہ روزے معتبر نہ ہوں گے، ان کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/۲۸ ج)

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے

سوال:- جوانی کے عالم میں، میں دین کی طرف سے غافل رہا اور بہت ساری نمازیں قضا ہوتی رہیں، میں ہر ادا نماز کے ساتھ اسی وقت کی ''قضائے عمری'' کی نیت سے فرض (اور وتر بھی) ادا کرتا رہا ہوں کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں گردن بچ جائے۔

میں حال ہی میں ایک کتاب ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، منگوا کر پڑھ رہا ہوں۔ مرحوم علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی اس کے مؤلف ہیں، پہلی جلد کے مقدمے میں ''موضوع احادیث کی معرفت کے اُصول'' میں تحریر کیا گیا ہے کہ جس حدیث میں ''قضائے عمری'' کے بارے میں تذکرہ ہو وہ حدیث جھوٹی ہوگی، علامہ حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ بات شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی کتاب ''عجالۂ نافعہ'' سے نقل کی ہے۔ میں پہلی جلد کے مقدمے کے کچھ حصے کی

فوٹو اسٹیٹ کاپی ارسالِ خدمت کر رہا ہوں (صفحہ:۳۱، پیراگراف:۵) یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے قضائے عمری پڑھنا موقوف کر دیا ہے کہ کہیں یہ بدعت کے زُمرے میں نہ آجائے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، میں سفر پر ہونے کی وجہ سے جواب قدرے تاخیر سے دے رہا ہوں، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی صاحب مرحوم اب دُنیا میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن دینی ضرورت کی وجہ سے اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ غیرمتوازن، انتہاپسند ذہن کے حامل تھے، جس کی بناء پر انہیں اپنے انفرادی نظریات پر اتنا اصرار تھا کہ وہ ساری اُمت کے علماء، فقہاء اور محدثین میں سے کسی کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ انہوں نے متعدّد مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا۔

قضائے عمری کے بارے میں جو بات انہوں نے لکھی ہے، وہ بھی ایسی ہی ہے، اُمت کے جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جو نمازیں قضا ہوگئی ہوں حتی المقدور ان کی ادائیگی لازم ہے، حدیث میں فوت شدہ نمازوں کے قضا کرنے کا حکم ہے، اور اس میں کم یا زیادہ کی کوئی تفصیل نہیں، یہ بات بھی واضح ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کا لازمی حصہ یہ ہے کہ جن غلطیوں کی تلافی ممکن ہو، ان کی تلافی کی جائے، لہٰذا آپ جو قضائے عمری پڑھتے تھے، وہ دُرست تھی، اور اسے بدعت سمجھ کر چھوڑنا دُرست نہیں ہے، آپ یہ عمل جاری رکھیں۔ [1]

والسلام
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۱/۵/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۴/۷۷)

قضائے عمری کی شرعی حیثیت

سوال:- ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ درسِ قرآن دیتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ ''قضائے عمری'' کا جو مسئلہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص نے بہت عرصے تک نمازیں نہ پڑھی ہوں، پھر وہ نماز شروع کرے تو اسے قضائے عمری کے طور پر وہ نمازیں قضا کرنی چاہئیں، قرآن وسنت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، بلکہ پچھلی زندگی میں جو نمازیں قضا ہوئی ہوں، ان کی تلافی صرف توبہ سے

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

ہوجاتی ہے، اتنی ساری نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ براہِ کرم یہ واضح فرمائیں کہ کیا شریعت میں پچھلی نمازوں کی قضا واقعی ضروری نہیں ہے؟ اور کیا ائمۂ اربعہ یا فقہائے کرام میں سے کسی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں زیادہ قضا ہوجائیں تو ان کی تلافی صرف توبہ سے ہوجاتی ہے، اور قضائے عمری پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ان صاحبہ کا بتایا ہوا یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے تو کیا ان کے درس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ نیز اگر قضائے عمری ضروری ہے تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب:- صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:-

من نسی صلاۃ فلیصل اذا ذکرھا، لا کفارۃ لھا الا ذٰلک.

جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر لازم ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے، وہ نماز پڑھے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب المواقیت باب نمبر ۳۷ حدیث نمبر: ۵۹۷)[1]

صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے:-

اذا رقد أحدکم عن الصلاۃ أو غفل عنھا فلیصلھا اذا ذکرھا فان اللہ عزّ وجلّ یقول: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ.

جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے تو جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (میری یاد آنے پر نماز قائم کرو)۔ (صحیح مسلم، آخر کتاب المساجد، حدیث نمبر: ۱۵۶۹)[2]

اور سننِ نسائیؒ میں مروی ہے:-

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یرقد عن الصلاۃ أو یغفل عنھا، قال: کفارتھا أن یصلّیھا اذا ذکرھا. (سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ ص: ۱۷۱)[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے وقت سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب بھی اسے نماز یاد آئے وہ نماز پڑھے۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بیان فرمادیا کہ جب کبھی انسان کوئی نماز وقت پر نہ پڑھے تو اس کے ذمے لازم ہے کہ تنبہ ہونے پر اس کی قضا کرے، خواہ یہ نماز

(۱) ج:۱ ص:۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۲) ج:۱ ص:۲۴۱ (ایضًا).
(۳) ج:۱ ص:۱۰۰ (ایضًا).

بھول سے چھوٹی ہو، سو جانے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی کی روایتوں میں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ قرآن "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ"(۱) کا حوالہ دے کر یہ بھی واضح فرمادیا کہ یہ آیتِ قرآنی نماز کی قضا پڑھنے کے حکم کو بھی شامل ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فریضہ ادا کرنے پر تنبہ ہو، اسے نماز ادا کرنی چاہئے۔

یہ اُصول بیان کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں فرمائی کہ اتنی تعداد میں نمازوں کی قضا واجب ہے، بلکہ ایک عام حکم بیان فرمادیا کہ جو نماز بھی چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ چنانچہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی نمازیں چھوٹیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی قضا فرمائی، جس کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اس سے زیادہ نمازیں چھوٹ جائیں تو ان کی قضا واجب نہیں، یہ ایک مُسلَّم اُصول ہے کہ قرآن وسنت کی طرف سے جب کوئی عام حکم آجاتا ہے تو اس کے ہر ہر جزیئے کے لئے الگ حکم نہ دیا جاسکتا ہے، نہ اس کی ضرورت ہے، مثلاً قرآنِ کریم نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمادیا ہے کہ:-

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ.(۲)

تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی پوری کرے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ عام حکم دے دیا گیا ہے کہ جب روزے بیماری یا سفر کی وجہ سے نہ رکھے جاسکے ہوں تو بعد میں ان کی قضا کرلی جائے، اس میں یہ نہیں بتایا گیا، نہ اس کے بتانے کی ضرورت تھی کہ ایک ماہ کے روزے چھوٹنے کا یہ حکم ہے یا دو رمضانوں کے روزے چھوٹنے کا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا گیا ہے جو روزے چھوٹنے کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اب اگر کسی شخص کے دو رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہوں اور وہ اس دلیل کا مطالبہ کرے کہ دو رمضان کے روزے چھوٹنے کے لئے کوئی الگ حکم ہونا چاہئے، تو جس طرح اس کا مطالبہ غلط اور جاہلانہ مطالبہ ہوگا، اسی طرح زیادہ نمازوں کی قضا کے لئے الگ دلیل کا مطالبہ بھی اتنا ہی غلط مطالبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عام حکم سے استثناء کا دعویٰ کرے تو دلیل اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن وسنت کی کسی دلیل سے مستثنیٰ ہونا ثابت کرے، ورنہ جب تک قرآن وسنت میں کوئی استثناء مذکور نہ ہو، عام حکم اپنی جگہ قائم رہے گا۔

چنانچہ نمازیں قضا پڑھنے کا جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا احادیث میں دیا

---

(۱) سورۃ طٰہٰ آیت:۱۴۔ (۲) سورۃ البقرۃ آیت:۱۸۴۔

ہے اس کی بنیاد پر تمام فقہائے اُمت نے تصریح فرمائی ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازیں کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا ضروری ہے، مشہور حنفی عالم علامہ ابنِ نجیمؒ فقہِ حنفی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

فالأصل فيه ان كل صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوت وجوبها فيه فانه يلزم قضاؤها، سواء تركها عمدًا أو سهوًا أو بسبب نوم، وسواء كانت الفوائت كثيرة أو قليلة.

(البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۱ طبع مكة المكرمة)[1]

اس سلسلے میں اُصول یہ ہے کہ ہر وہ نماز جو کسی وقت میں واجب ہونے کے بعد چھوٹ گئی ہو، اس کی قضا لازم ہے، چاہے انسان نے وہ جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول کر، یا نیند کی وجہ سے، اور چاہے چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں یا زیادہ ہوں۔

یہ موقف صرف حنفی علماء کا نہیں ہے، بلکہ شافعی، مالکی، حنبلی تمام مکاتبِ فکر اس پر متفق ہیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں:-

من نسي صلوات كثيرة أو ترك صلوات كثيرة فليصل علىٰ قدر طاقته، وليذهب الى حوائجه، فاذا فرغ من حوائجه صلّى أيضًا ما بقي عليه حتّى يأتي علىٰ جميع ما نسي أو ترك. (المدونة الكبرىٰ للامام مالك ج:۱ ص:۲۱۵ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

جو شخص بہت سی نمازیں پڑھنا بھول گیا ہو، یا اس نے بہت سی نمازیں چھوڑ دی ہوں، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ چھوڑی ہوئی نمازیں پڑھے، اور اپنی ضروریات کے لئے چلا جائے، لیکن جب ضروریات سے فارغ ہو تو پھر باقی نمازیں پڑھتا رہے، یہاں تک کہ وہ تمام نمازیں پوری کرلے جو وہ بھول گیا تھا یا اس نے چھوڑ دی تھیں۔

امام مالکؒ کے اس قول کی تشریح اور مزید تفصیل کرتے ہوئے مالکی عالم علامہ دسوقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

فيكفي أن يقضي في اليوم الواحد صلاة يومين فأكثر، ولا يكفي قضاء صلاة يوم في يوم الا اذا خشي ضياع عياله ان قضى أكثر من يوم في يوم، وفي أجوبة ابن رشد انه انما أمر بتعجيل قضاء الفوائت خوف معاجلة الموت، وحينئذ فيجوز التأخير لمدة بحيث يغلب على الظن وفاؤه بها فيها. (حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ج:۱ ص:۲۶۳ طبع دار الفكر بيروت)

اتنا کافی ہے کہ ایک دن میں دو دن یا زیادہ کی نمازیں قضا کرلے، اور یہ کافی نہیں ہے کہ ایک دن میں صرف ایک دن کی نمازیں قضا کرے، اِلَّا یہ کہ اسے ایک دن سے زیادہ نمازیں قضا کرنے

(۱) باب قضاء الفوائت ج:۲ ص:۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

کی صورت میں اپنے عیال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور علامہ ابنِ رشدؒ کے جوابات میں یہ مذکور ہے کہ قضا پڑھنے میں جلدی کرنے کا حکم اس خطرے کی بناء پر دیا گیا ہے کہ موت نہ آجائے، لہٰذا اتنی مدّت تک مؤخر کرنا جائز ہے جس میں غالب گمان یہ ہو کہ اس میں نمازیں پوری ہوجائیں گی۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں بھی قریب قریب یہی بات کہی گئی ہے، علامہ مرداویؒ جو امام احمدؒ کے مذہب کے قابلِ اعتماد ترین ناقل ہیں، فرماتے ہیں:-

(ومن فاتته صلوات لزمه قضاؤها على الفور) هذا المذهب نص عليه وعليه جماهير الأصحاب وقطع به كثير منهم: قوله "لزمه قضاؤها على الفور" مقيد بما اذا لم يتضرر في بدنه أو معيشته يحتاجها، فان تضرر بسبب ذلک سقطت الفورية.

(الانصاف للمرداویؒ ج:۱ ص:۴۴۲ طبع احیاء التراث العربی بیروت)

اور جس شخص کی بہت سی نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ان کی فی الفور قضا کرنا واجب ہے، یہی مذہب ہے جس کی تصریح کی گئی ہے، اور حنبلی اصحاب کی بھاری اکثریت کا یہی کہنا ہے (قضا نمازیں فوراً ادا کرنا ضروری ہے)۔ اور بہت سوں نے قطعی طور پر یہی کہا ہے .... البتہ فوری ادائیگی کا لازم ہونا اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کو جسم یا ضروری معیشت میں نقصان نہ ہو، اگر نقصان ہو تو فوری ادائیگی کا حکم ساقط ہوجائے گا (بلکہ تأخیر سے ادا کرنا جائز ہوگا)۔

امام شافعیؒ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر نمازیں کسی عذر سے چھوٹی تھیں تو فوری ادائیگی کے بجائے تأخیر سے ادا کرنا جائز ہے، لیکن کسی عذر کے بغیر چھوٹی تھیں تو فوراً ادا کرنا ضروری ہے:-

(من فاتته) .... (مكتوبة) فأكثر (قضى) ما فاته بعذر أو غيره، نعم غير المعذور يلزمه القضاء فورًا، ويظهر أنه يلزمه صرف جميع زمنه للقضاء ما عدا ما يحتاج لصرفه فيما لا بد منه.

(فتح الجواد ج:۱ ص:۲۲۳ طبع شرکۃ مصطفیٰ البابی مصر)

جس شخص کی ایک یا زیادہ فرض نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ضروری ہے کہ جو نمازیں چھوٹی ہیں ان کی قضا کرے، چاہے نمازیں کسی عذر سے چھوٹی ہوں یا بغیر عذر کے، ہاں! جس شخص نے بغیر کسی عذر کے نمازیں چھوڑی ہوں اس پر قضا فوری طور سے واجب ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کو اپنا پورا وقت قضا پڑھنے میں صرف کرنا چاہئے، سوائے اتنے وقت کہ جو اُسے اپنی لازمی ضروریات کے لئے درکار ہو۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی فقہائے کرامؒ کے یہ مذاہب نقل کرکے ان سے اتفاق کیا ہے، فرماتے ہیں:-

ومن عليه فائتة فعليه أن يبادر الى قضاءها على الفور سواء فاتته عمدًا أو سهوًا عند جمهور العلماء كمالك وأحمد وأبى حنيفة وغيرهم، وكذٰلك الراجح فى مذهب الشافعى أنها اذا فاتت عمدًا كان قضاؤها واجبًا على الفور.

(فتاوىٰ شيخ الاسلام ابن تيمية ج:۲۳ ص:۲۵۹ مطابع الرياض)

جس شخص کے ذمے کوئی چھوٹی ہوئی نماز ہو، اس پر واجب ہے کہ وہ اسے ادا کرنے میں فوری طور سے جلدی کرے، چاہے وہ نماز جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول سے، یہی جمہور علماء مثلاً امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے، اور امام شافعیؒ کے مذہب میں بھی راجح یہی ہے کہ اگر جان بوجھ کر نماز چھوڑی ہے تو اس کو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ:-

رجل عليه صلوات كثيرة فاتته، هل يصلّيها بسننها؟ أم الفريضة وحدها؟

جس شخص کے ذمے بہت سی نمازیں قضا ہوں، وہ انہیں ادا کرتے ہوئے سنتیں بھی پڑھے؟ یا صرف فرض پڑھے؟

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے جواب دیا:-

المسارعة الى قضاء الفوائت الكثيرة أوْلٰى من الاشتغال عنها بالنوافل، وأما مع قلة الفوائت فقضاء السنن معها حسن. (فتاوىٰ شيخ الاسلام ابن تيمية ج:۲۲ ص:۱۰۴)

جب چھوٹی ہوئی نمازیں بہت ساری ہوں تو ان کو قضا کرنا نفلوں میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، البتہ اگر چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں تو ان کے ساتھ سنتوں کو قضا کرنا اچھا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہائے کرامؒ کے درمیان یہ مسئلہ تو زیرِ بحث آیا ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا تنبہ ہوتے ہی فوراً واجب ہوجاتی ہے یا اس میں تأخیر کرسکتے ہیں؟ اور تأخیر کی صورت میں کتنی نمازیں روزانہ قضا کرنی ضروری ہیں؟ نیز یہ کہ صرف فرض نمازیں قضا کی جائیں یا سنتیں بھی؟ اور قضا کرتے ہوئے نمازوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلے میں معروف فقہائے کرامؒ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نمازیں خواہ کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا انسان کے ذمے واجب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قرآنِ کریم کی آیت: "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ تنبہ ہونے پر انسان چھوٹی ہوئی نمازیں قضا کرنے کی فکر کرے، اور قرآن وسنت کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو زیادہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، یوں بھی یہ عجیب وغریب موقف ہے کہ جو شخص کم نمازیں قضا

کرے اس پر تو ادائیگی واجب ہو، لیکن زیادہ نمازیں چھوڑنے والے پر کچھ واجب نہ ہو؟ پھر کون ہے جو کم نمازوں اور زیادہ نمازوں کی تعداد مقرّر کر کے یہ کہے کہ اتنی نمازوں کے بعد قضا واجب نہیں ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر انسان پر بالغ ہونے کے بعد نماز پڑھنا فرض ہوجاتا ہے، اور یہ فریضہ تمام شرعی فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد اور اہم ہے، اور یہ بھی ایک مُسلَّم اُصول ہے کہ اگر کوئی فریضہ قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اسے انسان کے ذمے سے ساقط کرنے کے لئے کم از کم اتنے ہی مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں قطعی دلائل تو درکنار، کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ جو نمازیں انسان کے ذمے فرض ہوئی تھیں، اس کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ان کی فرضیت ختم ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اگر فوت شدہ نمازیں بہت زیادہ ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لازم نہیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل اور ان پر مبنی فقہائے اُمت کے اتفاق کے بالکل خلاف ایک گمراہانہ بات ہے، اور نماز جیسے اہم فریضے کو محض اپنی رائے کی بنیاد پر ختم کردینے کے مرادف ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فوت شدہ نمازوں کے لئے بس توبہ کرلینا کافی ہے، اس لئے کہ توبہ کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کی جتنی تلافی بس میں ہو، وہ تلافی بھی ساتھ ساتھ کرے۔

قضائے عمری کی موضوع احادیث

یہاں یہ واضح کردینا بھی مناسب ہے کہ اُصولِ حدیث کی بعض کتابوں میں موضوع احادیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے قضائے عمری کی حدیث کی مثال دی گئی، مثلاً حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضوع احادیث کی پانچویں علامت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

پنجم آنکہ مخالف مقتضی عقل وشرع باشد وقواعد شرعیہ آں را تکذیب نمایند، مثل قضائے عمری۔

یعنی: پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ حدیث عقل وشریعت کے تقاضوں کے خلاف ہو اور قواعدِ شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں، مثلاً قضائے عمری کی حدیث۔

(عجالۂ نافعہ ص:۲۴ خاتمہ، طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)

ہوسکتا ہے کہ کسی ناواقف یا جاہل آدمی کو اس سے یہ مغالطہ ہو کہ پچھلی عمر کی نمازیں قضا کرنا بے اصل ہے، اور اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ موضوع ہیں۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض غیر مستند وظائف وغیرہ کی کتابوں میں کچھ ایسی موضوع حدیثیں آگئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی خاص دن میں صرف ایک نماز قضا پڑھ لی جائے تو اس سے ستر سال کی نمازیں ادا ہوجاتی

ہیں، محدثین اس قسم کی روایات کو ''قضائے عمری'' کا نام دیتے ہیں، اور ان احادیث کو انہوں نے موضوع قرار دیا ہے، مُلّا علی قاریؒ ''موضوعات'' پر اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:-

حدیث: "من قضی صلاۃ من الفرائض فی اٰخر جمعۃ من شھر رمضان کان ذٰلک جابرًا لکل صلاۃ فائتۃ فی عمرہ الٰی سبعین سنۃ" باطل قطعًا، لأنہ مناقض للاجماع علٰی أن شیئا من العبادات لا یقوم مقام فائتۃ سنوات.

یہ روایت کہ ''جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں ایک فرض نماز قضا پڑھ لے تو ستر سال تک اس کی عمر میں جتنی نمازیں چھوٹی ہوں، ان سب کی تلافی ہوجاتی ہے'' یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے، اس لئے کہ یہ حدیث اِجماع کے خلاف ہے، اِجماع اس پر ہے کہ کوئی بھی عبادت سالہا سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ہے۔ (الموضوعات الکبریٰ ص:۳۵۶، طبع مکتبہ اثریہ شیخوپورہ)

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:-

حدیث "من صلّی فی اٰخر جمعۃ من رمضان الخمس الصلوات المفروضۃ فی الیوم واللیلۃ قضت عنہ ما أخل بہ من صلاۃ سنتہ" ھذا موضوع لا اشکال فیہ.

یہ حدیث کہ ''جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں دن رات کی پانچ فرض نمازیں پڑھ لے، ان سے اس کے سال بھر کی جتنی نمازوں میں خلل رہا ہو، ان سب کی قضا ہوجاتی ہے'' کسی شک کے بغیر موضوع ہے۔ (الفوائد المجموعۃ للشوکانی ج:۱ ص:۵۴ نمبر۱۱۵، مطبع السنۃ المحمدیۃ قاھرۃ)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں قضائے عمری کی جن روایات کو موضوع قرار دیا گیا ہے، ان سے مراد ''قضائے عمری'' کے بارے میں اس قسم کی روایات ہیں، جو ایک نماز یا چند نمازوں کو عمر بھر کی نمازوں کے قائم مقام قرار دیتی ہیں، اور علاوہ اس کے کہ اس قسم کی روایات کی کوئی سند نہیں ہے، ان کے موضوع ہونے کی وجہ مُلّا علی قاریؒ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک یا چند نمازیں سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی نہیں کرسکتیں، اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، لہٰذا اگر کسی کو ان احادیث کو موضوع قرار دینے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ''قضائے عمری'' کا تصور ہی بے بنیاد ہے اور پچھلی نمازوں کی قضا لازم نہیں تو اس کا منشأ جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

قضائے عمری کا صحیح طریقہ

قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کے اتفاق کی روشنی میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جس مسلمان نے اپنی عمر کی ابتداء میں نمازیں اپنی غفلت یا لاپرواہی کی وجہ سے نہ پڑھی ہوں اور بعد

میں اسے تنبہ اور توبہ کی توفیق ہو، اس کے ذمے یہ ضروری ہے کہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا محتاط حساب لگا کر انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ تینوں بزرگ تو اس بات پر متفق ہیں کہ اگر نمازیں کسی عذر کے بغیر چھوڑی ہیں تو تنبہ ہونے کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ ان نمازوں کی ادائیگی فوراً کرے، اور صرف ضروری حاجتوں کا وقت اس سے مستثنیٰ ہوگا، لیکن فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ چونکہ انسان اپنی وسعت کی حد تک ہی کا مکلف ہے اس لئے قضا نماز پڑھنے میں اتنی تأخیر جائز ہے جو انسان کی معاشی اور دُوسری حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے درکار ہو، درمختار میں ہے:-

(أو يجوز تأخير الفوائت) وان وجبت على الفور (لعذر السعي على العيال وفي الحوائج على الأصح). (ابنِ عابدین ج:۱ ص:۵۴۳)[1]

چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا پڑھنے میں تأخیر جائز ہے، اگرچہ ان کا وجوب علی الفور ہوتا ہے، مگر عیال کے لئے معاش کے انتظام اور دُوسری حاجتوں کے عذر کی وجہ سے تأخیر کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

فيسعى ويقضي ما قدر بعد فراغه ثم وثم الى أن تتم.[2]

لہٰذا ایسا شخص اپنے کام کرتا رہے اور فارغ ہونے کے بعد جتنی نمازیں پڑھ سکے، قضا کرتا رہے، یہاں تک کہ تمام نمازیں پوری ہوجائیں۔ (ایضاً)

بعض علماء نے مزید آسانی کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ انسان روزانہ ہر فرض نماز کے ساتھ اسی وقت کی ایک قضا نماز پڑھ لیا کرے، اس طرح ایک دن میں پانچ نمازیں ادا ہوجائیں گی، البتہ جب موقع ملے اس سے زیادہ بھی پڑھتا رہے، فرماتے ہیں:-

وفوره مع كل فرض فرض، اذ لم يجب في اليوم أداء أكثر من خمس، فكذا القضاء، فان زاد أو جمع الخمس فحسن. (البحر الزخار لأحمد ابن المرتضىٰ ج:۱ ص:۱۷۳ طبع صنعاء)

اور قضا نمازوں کی فوری ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض کے ساتھ ایک فرض پڑھا جائے، کیونکہ ایک دن میں پانچ سے زیادہ نمازیں اداء میں ضروری نہیں تو قضاء کو بھی اس پر قیاس کرلیا جائے، لیکن اگر کوئی زیادہ نمازیں پڑھے یا پانچ نمازیں اکٹھی پڑھ لے تو اچھا ہے۔

البتہ قضا پڑھنے میں نیت کا خیال رکھا جائے، یعنی واضح طور پر قضا کی نیت کی جائے، مثلاً فجر کی قضا پڑھ رہے ہیں تو یہ نیت کرے کہ میرے ذمے فجر کی جو سب سے پہلی نماز واجب ہے اس کی قضا پڑھ رہا ہوں۔

(۱، ۲) الدر المختار مع رد المحتار باب قضاء الفوائت ج:۲ ص:۷۴.

نمازوں کا فدیہ

قرآنِ کریم میں روزوں کا فدیہ بیان فرمایا گیا ہے، یعنی جو لوگ روزے رکھنے کی بالکل طاقت نہ رکھتے ہوں، نہ آئندہ ایسی طاقت پیدا ہونے کی اُمید ہو، ان کے لئے قرآنِ کریم نے حکم دیا ہے کہ وہ ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، لیکن نماز کے لئے قرآنِ کریم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ایسا کوئی حکم مذکور نہیں ہے، البتہ امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں اور وہ انہیں ادا نہ کر رہا ہو، اسے چاہئے کہ وہ یہ وصیت کردے کہ اگر میں یہ نمازیں ادا نہ کر پایا اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوگیا تو میرے ترکہ سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، اور وہ فدیہ بھی روزے کے فدیہ کے حساب سے، یعنی ایک نماز کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا (یا پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ) ادا کیا جائے، امام محمدؒ نے یہ حکم احتیاط کے طور پر دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ نمازوں کے فدیہ کا ذکر قرآن وسنت میں نہیں ہے مگر روزے پر قیاس کرکے یہ حکم نکالا گیا ہے، لہٰذا اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس طرح انسان کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، (دیکھئے رد المحتار ج:۱ ص:۵۴۱)۔[1]

لیکن یاد رہے کہ یہ وصیت ترکہ کے ایک تہائی حصے تک نافذ ہوگی، یعنی اگر روزوں یا نماز کا کل فدیہ اس کے کل مال کا ایک تہائی یا اس سے کم ہو تب تو ورثاء کے ذمے واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں، اگر فدیہ کی مقدار ایک تہائی سے بڑھ گئی تو زائد مقدار میں وصیت پر عمل کرنا ورثاء کے ذمے لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے روزے یا نماز کے فدیہ کی وصیت نہ کی تو ورثاء کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ فدیہ ادا کریں، البتہ عاقل و بالغ ورثاء اپنے حصے میں سے رضا کارانہ طور پر فدیہ ادا کریں تو یہ ان کا احسان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ مرحوم کو معاف فرمادیں گے۔

خلاصہ

یہ ہے کہ انسان سے جو نمازیں چھوٹ گئی ہوں، ان کی قضا اس کے ذمے لازم ہے، صرف توبہ کرلینے سے وہ معاف نہیں ہوتیں، خواہ کتنی زیادہ ہوں، البتہ وہ اگر روزانہ پانچ نمازوں کی قضا کرنا شروع کردے اور جب زیادہ پڑھنے کا موقع ملے، زیادہ بھی پڑھے، اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کردے کہ جو نمازیں میں اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکوں ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ قبول فرماکر اس کی کوتاہی کو معاف فرمادیں گے، قضائے عمری کا صحیح

(۱) ج:۱ ص:۷۲، ۷۳۔

طریقہ یہی ہے۔ اور یہ کہنا کہ قضائے عمری پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف توبہ کافی ہے، گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص نماز جیسے بنیادی فریضے میں محض اپنی رائے سے کسی دلیل کے بغیر اس قسم کی گمراہانہ بات کی تلقین اور اس پر اصرار کرے، اس کے درس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳ر رجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵/۵۰۰)

ایام حیض کی نمازوں کی قضا لازم نہیں

سوال:- عورت حیض و نفاس کی حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، تو کیا از رُوئے حدیث یا فقہ بعد غسلِ طہارت از حیض و نفاس اس عورت پر نماز کی قضا واجب ہے یا معاف ہے؟

جواب:- حیض و نفاس کی حالت میں عورت جو نمازیں چھوڑتی ہے اس کی قضا اس پر واجب نہیں بلکہ وہ نمازیں معاف ہیں، البتہ اس حالت میں جو روزے چھوٹے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/۲۸ ب)

قضا نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے

سوال:- زید نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور جب سے بالغ ہوا ہے اس کے بعد اب اس کی عمر تقریباً چالیس پینتالیس سال ہے، اس دوران فرائض، واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہی، اس طرح کچھ حقوق العباد بھی اس کے ذمے ہیں، اب زید تلافی کرنا چاہتا ہے، کیا صورت ہے؟

جواب:- حقوق العباد کی کوتاہی کی تلافی تو صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ جن جن لوگوں کے حقوق تلف کئے ہیں ان کے مالی حقوق یا تو ان کو ادا کرے یا ان سے معاف کروائے، اور غیر مالی حقوق بھی معاف کروائے، اور نماز روزوں کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے نماز روزے رہ گئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک حساب کرے، اور اگر ٹھیک ٹھیک حساب ممکن نہ ہو تو محتاط اندازہ لگائے، اور اس کی قضا شروع کردے اور ساتھ ہی یہ وصیت کردے کہ اگر میں ان کی قضا نہ کرسکوں تو ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، پھر اگر زندگی میں ادائیگی مکمل ہوجائے تو یہ وصیت کاٹ دے،[2] زکوٰۃ کا بھی اسی طرح حساب لگا کر اس کی ادائیگی کردے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۸/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۱ (ویمنع صلوٰة) مطلقًا ولو سجدة شكر (وصوما) وجماعًا (وتقضيه لزوما دونها للحرج) وفی الشامية قوله صلوٰة .... تسقط للحرج وقوله وتقضيه أی الصوم علی التراخی فی الأصح.

(۲) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص:۴۷۷ تا ۴۸۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی سجود السہو﴾
(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ، سورۃ اور رکعتوں میں شک کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہے، طویل عرصے سے مختلف امراض وعوارض میں مبتلا ہے، حرکت کرنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہے، بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہے، اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی بناء پر قویٰ بہت کمزور ہوگئے ہیں، حافظہ اور یادداشت کی قوت بھی کمزور ہوگئی، نماز میں بہت سہو ہوتا ہے اور اکثر ہوتا ہے، کبھی رکعتوں کی تعداد میں شبہ ہوتا ہے کہ ایک ہوئی یا دو یا تین یا چار، کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی ہے یا نہیں؟ اور پھر سورت ملائی ہے یا نہیں؟ رُکوع کیا ہے یا نہیں؟ سجدہ ایک کیا ہے یا دو؟ سجدۂ سہو کیا ہے یا نہیں؟ غرض اس قسم کی مختلف صورتیں پیش آتی ہیں، امکانی سعی اور احتیاط کے باوجود حدیث النفس میں ابتلا اور سہو کی صورت پیش آجاتی ہے، اس پر نہ تو وہ یہ قسم کھا سکتا ہے کہ اس قسم کی غلطی ہوئی، اور نہ یہ قسم کھا سکتا ہے کہ نہیں ہوئی، نہ یقین اور ظنِ غالب ہوتا ہے، البتہ شبہ اور احتمال ترک کا ضرور ہوتا ہے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ کیا شبہ اور احتمال کی طرف سے صَرفِ نظر کرلی جائے اور مطلق التفات ہی نہ کیا جائے؟ مثلاً ظہر کی چار سنتوں میں پہلی رکعت میں شبہ ہوا کہ پہلی رکعت ہے یا دُوسری، تو پہلی رکعت میں دُوسری کے احتمال پر اور دُوسری رکعت میں دُوسری ہی کے شبہ پر اور تیسری رکعت میں چوتھی رکعت کے احتمال پر اور چوتھی رکعت میں چوتھی کے شبہ پر التحیات پڑھے؟ غرض یہ ہے کہ احتیاطاً التحیات پڑھے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ اور یہی شبہ ہونے پر کہ سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت ملائی ہے یا نہیں؟ احتیاطاً سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورت ملالے؟ اور سجدۂ سہو کرنے کے بعد نہ کرنے کا شبہ ہو تو احتیاطاً سجدۂ سہو کرلے وغیرہ وغیرہ کیا کیا جائے؟

۲:- کیا اس قسم کی تمام صورتوں میں اقل کا اعتبار کرکے احتیاطاً دوبارہ سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورۃ ملانے سے اور سجدۂ سہو کرلینے سے نماز صحیح ہوجاتی ہے؟ اور فاسد اور واجب الاداء تو نہیں ہوجاتی؟

جواب ا:- اگر شبہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں احتمال ذہن میں برابر معلوم ہوتے ہیں تو ہر جگہ اقل کا اعتبار کریں[1]، اور ہر اس رکعت پر قعدہ کریں جس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہو[2]، اور جس رکعت میں قعدۂ اُولیٰ ہونے کا محض احتمال ہو، اس پر بیٹھنا ضروری نہیں، مثلاً ظہر کی پہلی رکعت ہی میں شک ہوگیا کہ پہلی ہے یا دُوسری؟ تو پہلی سمجھ کر نماز جاری رکھیں، اور اس رکعت پر نہ بیٹھیں، تیسری پر بھی اس لئے بیٹھیں کہ اس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہے[3]، پھر آخر میں سجدۂ سہو کریں۔

۲:- احتیاطاً دوبارہ فاتحہ پڑھنے اور سورۃ ملانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ سجدۂ سہو میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آخر کی دو رکعتوں میں ایسا کیا تو سجدۂ سہو بھی واجب نہیں، اسی طرح اگر پہلی دو رکعتوں میں سورت کے بعد سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو بھی سجدۂ سہو واجب نہیں، ہاں! اگر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور سجدۂ سہو کے بعد نماز دُرست ہوجائے گی۔ كذا فی رد المحتار[4] والعالمگیریة (ج:۱ ص:۱۲۶)[5]۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۶/۱۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/۳۷ و)

قراءت میں عدمِ ترتیب سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- نماز میں قراءت کے اندر ترتیب قائم نہ رہے تو کیا سجدۂ سہو لازم ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں۔[6]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/۲۸ ج)

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۹۳ (طبع سعید) (وان كثر) شكه (عمل بغالب ظنه ان كان) له ظن للحرج (والا أخذ بالأقل) لتيقنه وقعد فی كل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا لئلا يصير تاركًا فرض القعود أو واجبه وفی الشامية (قوله والا) أی وان لم يغلب علىٰ ظنه شیء، فلو شك انها أولى الظهر أو ثانيته يجعلها الأولىٰ ثم يقعد لاحتمال انها الثانية ثم يصلّی ركعة ثم يقعد لما قلنا ثم يصلّی ركعة ويقعد لاحتمال انها الرابعة ثم يصلّی أخرىٰ ويقعد لما قلنا .... الخ. وفی الهداية ج:۱ ص:۴۵۲ وان لم يكن له رأی بنی علی اليقين لقوله عليه السلام من شك فی صلوٰته فلم يدر أثلاثا صلّی أم أربعا بنی علی الأقل .... الخ.

(۴) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۰، ۴۶۱ وكذا ترك تكريرها قبل سورة الأولیين، وفی الشامية فلو قرأها فی ركعة من الأولیين مرتين وجب سجود السهو لتأخير الواجب وهو السورة .... قال فی شرح المنية قيد بالأولیين لأن الاقتصار علىٰ مرة فی الأخريين ليس بواجب حتّی لا يلزمه سجود السهو بتكرار الفاتحة فيهما سهوا، ولو تعمده لا يكره.

(۵) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۲۶ ولو كرّرها فی الأولیين يجب عليه سجود السهو بخلاف ما لو اعادها بعد السورة أو كرّرها فی الأخريين. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۹۴ (طبع سعید) وذكر قاضی خان وجماعة انها ان قرأها مرتين علی الولاء وجب السجود وان فصل بينهما بالسورة لا يجب وصححه الزاهدی للزوم تأخير السورة فی الأول لا فی الثانی .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۷، ۳۶۸.

(۶) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۰ (طبع سعید) (ويجب) .... بترك واجب. وفی الشامية قوله بترك واجب أی من واجبات الصلوٰة الأصلية لا كل واجب اذ لو ترك ترتيب السور لا يلزمه شیء مع كونه واجبًا .... الخ. وكذا فی الهندية ج:۱ ص:۱۲۶. (محمد زبیر حق نواز)

تسمیہ کے ترک سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد شک ہوجاتا ہے کہ پوری فاتحہ پڑھی ہے یا کچھ رہ گیا ہے جس کے باعث دوبارہ پڑھا کرتا ہوں جو دیر کا باعث ہوتی ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مرتبہ فاتحہ دھیان کے ساتھ دُہرایا کریں، بعد میں شک پیدا ہو تو اس کی پرواہ نہ کریں تاوقتیکہ غلطی کا یقینِ کامل نہ ہو، نماز ہوجائے گی۔

سوال:- نماز کی پہلی رکعت میں اکثر شبہ ہوتا ہے کہ بسم اللہ شریف الحمد سے پہلے پڑھی یا نہیں؟ کیا بسم اللہ نہ پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی؟ اور بسم اللہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سجدۂ سہو تو واجب نہ ہوگا؟

جواب:- اگر بسم اللہ سہواً چھوٹ جائے تو نماز ہوجاتی ہے، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوتا۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تأخیرِ رکن کی وہ مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے

سوال:- ''البلاغ'' کے شمارے میں زیرِ عنوان ''اپنی نماز دُرست کیجئے'' میں ہے: مسئلہ نمبر۳:- ''اگر آپ غلطی سے پہلی یا تیسری رکعت میں بیٹھ گئے تو فوراً کھڑے ہوجائیں، اگر بیٹھ کر اتنی دیر گزر گئی کہ جس میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے تو سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے، ورنہ نہیں۔'' بحوالہ کتب محقق فرمائیں تاکہ تسلی ہو، کیونکہ کبیری میں اس کے خلاف کی تصریح ہے، یعنی تین مرتبہ سبحان اللہ کی مقدار کی تأخیر کی قید نہیں ہے۔

عبارت یہ ہے: **ولو قام فی الصلٰوۃ الرباعیۃ الی الرکعۃ الخامسۃ أو قعد بعد رفع رأسہ من السجود فی الرکعۃ الثالثۃ أو قام الی الرابعۃ فی المغرب، أو الثالثۃ فیہ أو فی الفجر أو قعد بعد رفعہ من الرکعۃ الأولٰی فی جمیع الصلوات یجب علیہ سجود السہو بمجرد القیام فی صورۃ وبمجرد القعود فی صورۃ لتأخیر الواجب وھو التشھد أو السلام فی صورۃ القیام وتأخیر الرکن وھو القیام فی صورۃ القعود، اھـ۔**[2]

---

(۱) وفی الدر مع الرد ویجب .... بترک واجب سهوًا. وفی الشامیة ج:۲ ص:۸۰ واحترز بالواجب عن السنة کالثناء والتعوذ ونحوهما. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶.
(۲) غنیة المتملی ص:۴۵۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

جواب :- اس مسئلے میں احقر کو بھی شک تھا، اس لئے ایک مرتبہ اس کی تحقیق لکھ کر والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی کو دِکھادیا تھا، موصوف نے اس کی تصدیق فرماکر اسے امداد الفتاویٰ جلد اوّل (صفحہ:۳۵۲ طبع جدید کراچی) کا جزو بنادیا تھا۔[1] اس تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ مجرد قعود سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا بلکہ مقدارِ رکن تأخیر سے واجب ہوتا ہے، جس کی تعیین تین تسبیحات سے کی گئی ہے۔

علامہ طحطاویؒ مراقی الفلاح کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: وھو مقدر بثلاث تسبیحات ۔ (ج:۱ ص:۲۵۸، طبع نور محمد کتب خانہ) ''اس کی مقدار تین بار سبحان اللہ کہنے کو مقرّر کیا گیا ہے۔'' تفصیل کے لئے تو امداد الفتاویٰ کے مذکورہ حاشیہ کی طرف رُجوع فرمائیں،[2] یہاں علامہ شامیؒ کی ایک تصریح ذکر کردیتا ہوں، درمختار میں ہے کہ:-

''ویکبر للنھوض علٰی صدور قدمیہ بلا اعتماد وقعود استراحۃ ولو فعل لا بأس''

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال شمس الأئمۃ الحلوانی الخلاف فی الأفضل حتّٰی لو فعل کما ھو مذھبنا لا بأس بہ عند الشافعیؒ ولو فعل کما ھو مذھبہ لا بأس بہ عندنا .... ولا ینافی ھٰذا ما قدمہ الشارح فی الواجبات حیث ذکر منھا ترک قعود قبل ثانیۃ ورابعۃ لأن ذاک محمول علی القعود الطویل ۔ (رد المحتار ص:۳، ۴۷۳، مطبوعہ استنبول)۔[3] لہٰذا جتنی مقدار شوافع کے یہاں بطور جلسۂ استراحت مستحب ہے، اس سے ہمارے نزدیک سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

والسلام
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۱۹ھ

تأخیرِ رکن کی کتنی مقدار سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟

(ایک رکن کی مقدار تأخیر سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے یا ایک تسبیح کی مقدار تأخیر سے؟ مفصل تحقیق)

عباراتِ ذیل زیرِ بحث مسئلے میں قابلِ غور ہیں:-

۱:- قال فی ملتقی الأبحر ویجب ان قرأ فی رکوع أو قعود أو قدم رکنا أو أخّرہ أو کرّرہ أو غیّر واجبًا أو ترکہ کرکوع قبل القراءۃ وتأخیر القیام الی الثالثۃ بزیادۃ علی التشھد، وقال شارحہ العلامۃ شیخ زادہؒ واختلفوا فی قدر الزیادۃ فقال بعضھم بزیادۃ حرف وکلام

(۱، ۲) سجدۂ سہو سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی یہ تحقیق اسی فتویٰ کے بعد آگے ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۶ (طبع سعید).

المصنف يشير الىٰ هٰذا وقال بعضهم بقدر ركن وهو الصحيح كما في أكثر الكتب.
[1] (مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۴۸)

۲:- وقال تحته شارحه العلامة ابن عابدينؒ بقدر ركن. [2] (بالحوالة المسطورة)

۳:- قال الامام ظهير الدين المرغينانيؒ لا يجب بقوله اللّٰهم صل علىٰ محمد وانما المعتبر مقدار ما يؤدي فيه ركنا كذا في الظهيرية. [3] (برجندی شرح وقاية ج:۱ ص:۱۴۹)

۴:- قال ابن البزاز الكردريؒ سها في صلوٰته انها الظهر أو العصر أو غير ذٰلك ان تفكر قدر ما يؤدي فيه ركن كالركوع لزم وان قليلًا فان شك في صلوٰة صلّاها .... الخ.
[4] (الجامع الوجيز علىٰ هامش الهندية ج:۴ ص:۷۰)

ان تمام عبارات سے مشترکہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاخیرِ واجب کی مقدار اکثر فقہاءؒ نے یہ قرار دی ہے کہ اتنی دیر تاخیر ہوجائے جس میں کوئی رکنِ نماز مثلاً رُکوع یا سجدہ وغیرہ ادا ہوسکے، اور وہ تین مرتبہ ''سبحان ربی العظیم'' کہنے کے وقفے میں ہوتا ہے، به صرح الطحطاویؒ في حاشيته على المراقي حيث قال ولم يبينوا قدر الركن وعلىٰ قياس ما تقدم ان يعتبر الركن مع سنته وهو مقدر بثلاث تسبيحات۔ [5] (طحطاوی ج:۱ ص:۲۵۸)

اس قول کے علاوہ بھی بہت سے اقوال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے یا تو مرجوح ہیں، یا وہ کہ جن کا مآل یہی نکلتا ہے، صاحبِ تنویر الابصار نے اس مسئلے کو دو جگہ ذکر کیا ہے اور بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، باب صفة الصلوٰة میں ان کی عبارت یہ ہے: (فان زاد عامدًا كره) فتجب الاعادة (أو ساهيا وجب عليه سجود السهو اذا قال اللّٰهم صلّ علىٰ محمد) فقط (على المذهب المفتىٰ به لا لخصوص الصلوٰة بل لتأخير القيام. (شامی ج:۱ ص:۴۷۷)[6]۔ اس کے تحت علامہ شامیؒ نے کئی اقوال نقل کرکے بحر، زیلعی، شرح منیہ کبیری، وغیرہ سے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ رملیؒ اور شرح منیہ صغیری سے ''وعلىٰ ال محمد'' کی زیادتی کا مرجح ہونا ذکر کیا ہے۔

اور باب سجود السهو میں صاحبِ تنویر فرماتے ہیں: وتأخير قيام الى الثالثة بزيادة على التشهد بقدر ركن ۔ صاحبِ درمختار نے لکھا: وقيل بحرف وفي الزيلعي الأصح وجوبه باللّٰهم

(۱، ۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۳) راجع شرح الوقاية ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) الجامع الوجيز علىٰ هامش الهندية ج:۴ ص:۶۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۵) (طبع نور محمد کتب خانه).
(۶) الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۰ (طبع ایچ ایم سعید).

صل علٰی محمد ۔علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس تعارض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (قوله وفي الزيلعي .... الخ) جزم به المصنف في متنه في فصل اذا أراد الشروع وقال انه المذهب واختاره في البحر تبعًا للخلاصة والخانية والظاهر انه لا ينافي قول المصنف هنا بقدر ركن تأمل. (شامی ج:۱ ص:۴۹۶)[۱]۔ جس سے معلوم ہوا کہ "اللّٰهم صل علٰی محمد" اور بقدرِ رکن، دونوں اقوال کا حاصل اور مآل ایک ہی نکلتا ہے، تو گویا جس جس نے "اللّٰهم صل علٰی محمد" کو مقدارِ تاخیر قرار دیا ہے اس نے بقدرِ رکن کے قول کے منافی کوئی بات نہیں کہی، وبالعکس۔

رہی وہ عبارت جو منية المصلي میں ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھ جائے تو مطلق بیٹھ جانے ہی سے سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا، خواہ مقدارِ رکن بیٹھا ہو یا نہیں، اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت سے سجدۂ سہو لازم آجائے گا (کبیری ص:۴۳۲)، سو اس بارے میں تحقیق وہ ہے جو درمختار اور رد المحتار میں لکھی گئی ہے، وهو هٰذا:-

۱:- قال العلامة الحصكفيؒ في واجبات الصلوٰة: وترك قعود قبل ثانية أو رابعة وكل زيادة تتخلل بين الفرضين[۲] وقال الشاميؒ وكذا القعدة في اٰخر الركعة الأولٰى أو الثالثة فيجب تركها ويلزم من فعلها أيضًا تأخير القيام الى الثانية أو الرابعة عن محله وهٰذا اذا كانت القعدة طويلة اما الجلسة الخفيفة التي استحبها الشافعيؒ فتركها غير واجب عندنا بل هو الأفضل.[۳] (شامی ج:۱ ص:۴۳۸)

۲:- قال في الدر المختار ويكبر للنهوض علٰى صدور قدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس، وقال الشاميؒ تحته، قال شمس الأئمة الحلوانيؒ الخلاف في الأفضل حتّى لو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعيؒ ولو فعل كما هو مذهبه لا بأس به عندنا كذا في المحيط اهـ. قال في الحلية والأشبه أنه سنة أو مستحب عند عدم العذر ويكره فعله تنزيها لمن ليس به عذر اهـ وتبعه في البحر .... أقول ولا ينافي هٰذا ما قدمه الشارح في الواجبات حيث ذكر منها ترك قعود قبل ثانية ورابعة لأن ذاك محمول على القعود الطويل.[۴] (رد المحتار ج:۱ ص:۴۷۳)

اس لئے ان عبارات سے معلوم ہوا کہ دو رکعتوں کے درمیان جلسۂ خفیفہ عمداً جائز ہے اور

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۸۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۰ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۶ (طبع ایچ ایم سعید).

شامیؒ کی تصریح کے مطابق ترکِ قعود جو واجب ہے، وہ قعودِ طویل ہے، قصیر نہیں، درایت کا مقتضا بھی یہی ہے کیونکہ یہ فعل عمداً جائز ہے تو سہواً بدرجہ اَوْلیٰ ہونا چاہئے، نیز چونکہ یہ قول ''بقدرِ رکن'' کی تقدیر کے مطابق ہے اس لئے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے، اور جب اس درایت کے ساتھ شامیؒ کی یہ روایت مل گئی تو اس دعویٰ میں مزید قوت پیدا ہوگئی، اور خود علامہ ابراہیم حلبیؒ کی تصریح علامہ شامیؒ نے نقل فرمائی ہے کہ: عن شرح المنیة انه لا ینبغی أن یعدل عن الدرایة أی الدلیل اذا وافقتها روایة۔

خلاصہ یہ کہ جو مقدار جلسۂ استراحت کی شوافع کے یہاں مسنون ہے، اس مقدار تک بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم نہ آنا چاہئے، ھذا ما بدا لی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	بندہ رشید احمد عفی عنہ	یکم محرّم الحرام ۱۳۸۰ھ
۱۳۸۰/۱/۱ھ	۱۳۸۰/۱/۴ھ	(از حاشیہ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۵۲)

بھولے سے سلام پھیر لینے کے بعد سجدۂ سہو کب تک کر سکتے ہیں؟

سوال:- نماز میں معمولی غلطی ہوئی، اور سجدۂ سہو کرنا بھول گئے، تو بعد میں نماز کس طرح ادا کریں گے؟ اور نماز کے بعد سجدۂ سہو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر غلطی ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا واجب تھا تو سلام پھیرنے کے بعد جب تک کوئی مفسد فعل نہ کیا ہو، سجدۂ سہو کر سکتے ہیں، اس کے بعد نماز پوری کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی مفسدِ نماز فعل کرلیا، مثلاً کوئی بات کرلی یا سینے کا رُخ قبلے سے پھیر دیا، تو نماز کا ازسرِنو اعادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفی عنہ	۱۳۸۸/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی صورت میں سجدۂ سہو کے وجوب سے متعلق فقہاء کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور میں لکھا ہے ''چار رکعت والی نماز میں بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو اب اُٹھ کر اس نماز کو پورا کرے، اخیر میں سجدۂ سہو کرلینے سے نماز ہوجائے گی'' اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دونوں طرف سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو نہ کرے بلکہ نماز کا اعادہ کرے،

کیونکہ پہلا سلام دو چیزوں یعنی نماز سے باہر ہونے اور قوم کی تحیت کے لئے ہے، اور دُوسرا سلام صرف باقی نمازیوں کی تحیت کے لئے، اس لئے یہ دُوسرا سلام کلام کی مانند ہوگا اور کلام منافیٔ نماز ہے، اس لئے سجدۂ سہو کو ساقط کرتا ہے، پس اعادہ لازم ہے۔ ان دونوں قولوں میں شدید اختلاف ہے، مفتیٰ بہ قول کون سا ہے؟

جواب:- بہشتی زیور[1] کا قول ہی مفتیٰ بہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۹ ب)

---

(۱) بہشتی زیور حصہ دوم ص:۱۴۱ (طبع ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ)۔

(۲) وفی البحر الرائق آخر سجود السهو قبیل باب صلٰوة المريض ج:۲ ص:۱۱۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وان توهم مصلی الظهر أنه أتمها فسلم ثم علم أنه صلّى ركعتين أتمها وسجد للسهو لأنه عليه السلام فعل كذٰلك فی حديث ذی اليدين ولأن السلام ساهيًا لا يبطل الصلٰوة .... وحكمه أنه ان كان فی المسجد ولم يتكلم وجب عليه أن يأتی به وان انصرف عن القبلة لأن سلامه لم يخرجه عن الصلٰوة. وفی الدر المختار (باب ما يفسد الصلٰوة وما يكره فيها) ج:۱ ص:۶۱۵ (طبع سعيد) الا السلام ساهيًا للتحليل أی للخروج من الصلٰوة قبل اتمامها علٰى ظن اكمالها فلا يفسد. وكذا فی فتاویٰ دار العلوم ديوبند ج:۴ ص:۴۱۲، و كفايت المفتی ج:۳ ص:۳۷۳. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی سجود التلاوۃ﴾

(سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

امام کے سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلنے کی بناء پر مقتدی رُکوع میں رہ کر اُٹھ گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی اور سیدھے سجدہ میں چلے گئے، میں مسجد کی چھٹی صف میں تھا جو کہ مین ہال اور برآمدہ کے باہر چھت دار صحن میں ہے، ادھر کچھ اندھیرا سا بھی تھا، میں اور میرے برابر والے کچھ نمازی رُکوع میں چلے گئے، جب امام صاحب سجدے سے فارغ ہوکر قیام میں تکبیر کہتے ہوئے آئے، اس وقت پتہ چلا کہ امام صاحب نے رُکوع نہیں کیا بلکہ سجدۂ تلاوت کیا ہے، میں بھی رُکوع سے اُٹھ گیا اور امام صاحب کی قراءت سننے لگا، سجدۂ تلاوت کے فوت ہوجانے سے نماز ہوگئی یا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی۔

لما فی الخانیة: اذا قرأ الامام اٰیة السجدة وبعض القوم کان فی الرحبة فکبّر الامام للسجدة وحسب من کان فی الرحبة أنه کبّر للرکوع فرکعوا ثم قام الامام من السجدة وکبّر فظن القوم أنه رفع رأسه من الرکوع فکبّروا ورفعوا رؤوسهم ان لم یزیدوا علیٰ ذٰلک لم تفسد صلوٰتهم لأنهم ما زادوا الا رکوعا وبزیادة الرکوع لم تفسد الصلوٰة. فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج:۱ ص:۱۶۰[۱]، ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۸۷[۲]، والهندیة ج:۱ ص:۱۳۴[۳].

البتہ اگر رُکوع میں علم ہوجاتا کہ امام سجدے میں گیا ہے تو رُکوع چھوڑ کر سجدے میں چلے جانا چاہئے تھا، لما فی البحر ولو قرأ الامام السجدة فسجد فظن القوم أنه رکع فبعضهم رکع وبعضهم رکع وسجد سجدة وبعضهم رکع وسجد سجدتین فمن رکع ولم یسجد یرفض

(۱ تا ۳) (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

رکوعه ويسجد للتلاوة. البحر الرائق ج:۲ ص:۱۲۲[۱]، ومثله فی الدر المختار مع الشامی۔[۲]

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا کیونکہ رُکوع میں نیت کے بغیر سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد تین آیات پڑھنے سے پہلے رُکوع کردیا ہو تب تو مقتدی کا سجدۂ تلاوت سجدۂ نماز میں بلانیت بھی ادا ہوجائے گا، اور اگر تین آیات یا اس سے زیادہ قراءت کرکے رُکوع کیا ہو تو غـایت ما فی الباب مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا، لیکن اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

لـمـا فـی الـدر الـمـخـتـار ولـو تلاها فی الصلوٰة سجدها فيها لا خارجها لما مرّ، وفی البدائع واذا لم يسجد اثم فتلزمه التوبة.[۳]

اور صورتِ مسئولہ میں چونکہ سجدۂ تلاوت عذر کی بناء پر چھوٹا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ گناہ بھی نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۴۷ ج)

لاؤڈ اسپیکر پر آیتِ سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا

سوال:- تیز آواز والی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیر اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تیز تلاوت کرنے والے یا بانئ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا۔ اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر تیز آواز میں لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) البحر الرائق باب سجود التلاوة ج:۲ ص:۱۲۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۰ (طبع ایچ ایم سعید).

﴿باب صلوٰۃ المریض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

نمازِ قصر کہاں سے شروع کرے؟ کیا اپنے شہر میں قصر کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال۱:- زید کراچی سے حیدرآباد، سکھر جانے کے لئے سفر کو نکلتا ہے، زید اپنے محلے اور بلاک کی حدود سے نکل کر قصر کرے یا کراچی شہر کی ساری حدود سے نکل کر قصر کرے؟

۲:- زید کسی ایسے بڑے شہر میں رہتا ہے جس شہر کی لمبائی تقریباً ۵۰ پچاس، ۵۵ پچپن میل ہے، زید اس شہر کے کونے میں رہتا ہے، زید کو اس شہر کے دُوسرے کونے میں جانا ہے جو کہ تین دن کی مسافت پر ہے پیدل جانے کی صورت میں، لہٰذا زید قصر کرے یا پوری چار رکعت پڑھے؟

جواب۱:- کراچی شہر کی حدود سے نکل کر قصر کرے۔[1]

۲:- صورتِ مسئولہ میں قصر جائز نہیں، اپنا شہر خواہ کتنا ہی طویل و عریض ہو اس میں قصر جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۴/۳۳ الف)

زوجہ اور عقار کو وطنیت کا معیار بنانے پر فتح القدیر اور البحر الرائق کی عبارات کی تحقیق

سوال:- زید ایک عالمِ دین ہے، اس کے دو دینی مدارس ہیں، ۱:- ایک قدیم دیہات میں،

(۱، ۲) وفی الدر المختار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۲۱ (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الأخر. وفی الشامية تحته (قوله من خرج من عمارة موضع اقامته) أراد بالعمارة ما يشمل بيوت الأخبية لأن بها عمارة موضعها قال فی الامداد، فيشترط مفارقتها ولو متفرقة .... وأشار الی أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الاقامة كربض المصر وهو ما حول المدينة من بيوت ومساكن فانه فی حكم المصر وكذا القری المتصلة بالربض فی الصحيح. وكذا فی البحر الرائق باب المسافر، الموضع الذی يبتدأ فيه القصر ج:۲ ص:۱۲۸ (طبع سعيد). وغنية المتملی فصل فی صلوٰة المسافر ص:۵۳۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور).

جہاں بیس تیس سال سے قیام پذیر ہے، اس کے اہل و عیال بھی وہیں ہیں، اس کے نجی مکانات بھی ہیں، اور مدرسہ مع مالہا وما علیہا ہے۔

۲:- عرصہ تین سال سے شہر میں بھی ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے جس میں سلسلۂ تعلیم جاری ہے اور زید کے زیرِ اہتمام و سرپرستی چل رہا ہے، زید کا شہر میں بھی اپنا نجی مکان ہے جس میں وہ رہتا ہے اور اس کے عیال کے بعض افراد مثلاً بیٹے، بہو وغیرہ بھی یہاں پر ہیں، خود زید حسبِ ضرورت دونوں جگہ قیام کرتا ہے، مدارس کے کام کے سلسلے میں جتنے دن شہر میں رہنے کی ضرورت پڑتی ہے وہاں رہتا ہے، پھر دُوسرے مدرسہ میں جتنا نجی یا مدرسہ کا کام ہو، رہتا ہے، مگر اکثر و بیشتر سابقہ دیہاتی مکان میں قیام ہوتا ہے، یاد رہے کہ زید کی دونوں ولادت گاہیں نہیں ہیں، کیا یہ دونوں جگہیں وطنِ اصلی شمار ہوں گی؟ اور جب بھی وہاں پہنچ جائے تو مقیم شمار ہوگا۔ ۱:- **لأن بعضا من عياله هنا وبعضا منه هنا،** ۲:- **ولأن له عقارًا ودورًا في كليهما،** ۳:- **ولأن له توطنا بلا ترجيح وامتياز حسب الضرورة بكليهما،** یا ان میں سے ایک وطنِ اصلی شمار ہوگا بخلاف الآخر؟ مکانات و زمین پر وطنِ اصلی کا مدار معتبر ہے یا زوجہ کی رہائش کی جگہ کو ترجیح ہے؟

فقہاء کی بعض عبارات تنقیح طلب ہیں، مثلاً شامی نے وطنِ اصلی کی تعریف میں لکھا ہے: **هو موطن ولادته أو تاهله أو توطنه (يبطل بمثله)** پھر "تأهله" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فان ماتت زوجته في أحدهما وبقي له فيها دور وعقار قيل لا يبقى وطنًا له اذا المعتبر الأهل دون الدار ـ مگر آگے لکھتے ہیں: **وقيل تبقى،** پھر آگے لکھتے ہیں: **قال في النهر ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلاد لا تبقى وطنا له،** جس سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ اعتبار اہل و عیال کا ہے، لیکن پھر لکھ رہے ہیں: **وقيل تبقى كذا في المحيط،** جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور و عقار کو بھی وطنیتِ اصلی میں دخل ہے۔

بہرحال مسئلہ منقح نہیں ہو رہا ہے، سوال کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جو جواب ہو، مدلل اور باحوالہ ارشاد فرمائیں۔ (مولانا) حسین احمد شرودی، کوئٹہ، بلوچستان

جواب:- آپ نے **ردالمحتار** سے دُوَرْ اور عقار کے مسئلے میں جو عبارت نقل کی ہے، اس کے مطابق اس کے بارے میں دو قول ہیں، اور یہی دو قول عالمگیریہ[1] اور بحر[2] میں بھی نقل کئے ہیں، اور کوئی ترجیح یا تطبیق نہیں دی، البتہ امداد الفتاویٰ میں حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اس مسئلے پر جو

(۱) فتاویٰ عالمگیرية ج:۱ ص:۱۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۶ (طبع سعید). نیز دیکھئے: غنية المتملي ص:۵۴۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

گفتگو فرمائی ہے اس سے حقیقتِ مسئلہ واضح ہوجاتی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:-

''صورتِ مذکورہ میں دونوں قول ہیں، اور یہی دونوں قول فتح القدیر اور البحر الرائق میں بھی نقل کئے ہیں، اور بحر میں دونوں قول کی دلیلیں بھی نقل کی ہیں، اور فتح القدیر میں دونوں کی تطبیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور میرے نزدیک تطبیق ہی مختار ہے، چنانچہ اس صورت میں امام محمدؒ کا قول: **هٰذا حالي وأنا أرى القصر ان نوى ترك وطنه**، نقل کرکے لکھا ہے: **الا ان أبا يوسف كان يتم بها لٰكنه يحمل علٰى أنه لم ينو ترك وطنه اهـ**۔[1]

خلاصہ تطبیق کا یہ ہوا کہ اگر اس دُوسرے شہر میں پھر بطور وطن رہنے کا ارادہ نہیں ہے جس طرح پہلے رہتا تھا تب تو وطن نہ رہا، وہاں جاکر قصر کرے گا جب مسافتِ سفر طے کرکے آئے، اور اگر اب بھی اسی طرح رہنے کا ارادہ ہے تو وہ بھی وطن ہے، پس اس شخص کے دو وطن ہوجاویں گے۔

(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۴، ۴۹۴)[2]

اور اس مجموعہ سے احقر کی سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں اصل مدار مبتلیٰ بہ کی نیت کا ہے اور زوجہ کا ہونا یا ''دور وعقار'' کا ہونا اس نیت کی علامات ہیں، اصل مدارِ مسئلہ نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ نے دیہات کے توطن کو چھوڑے بغیر شہر میں بھی بطور وطن رہنے کا اس طرح ارادہ کیا ہے کہ کبھی یہاں توطن رہے گا اور کبھی وہاں تو یہ دونوں مقامات آپ کے لئے وطنِ اصلی ہیں، اور بحر کی ایک عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: **هٰذا جواب واقعة ابتلينا بها وكثير من المسلمين المتوطنين في البلاد ولهم دور وعقار في القرى البعيدة، منها يصيفون بها بأهلهم ومتاعهم، فلا بد من حفظها أنهما وطنان له لا يبطل أحدهما بالأخر**. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۷)۔[3]

ہاں! اگر نیت شہر کے گھر کو وطن بنانے کی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کام کی غرض سے وہاں جانا ہوگا اور کام ختم ہوتے ہی اپنی اصلی جگہ واپس آجایا کریں گے، تو پھر دیہات وطنِ اصلی اور شہر وطنِ اقامت ہوگا، **هٰذا ما ظهر لي والعلم عند الله العليم الخبير**۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۵/۲۷ ہ)

---

(۱) فتح القدير باب صلٰوة المسافر ج:۲ ص:۱۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).
(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۳.
(۳) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳٦ (طبع ايچ ايم سعيد) وكذا في فتح القدير ج:۲ ص:۱۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا معیار (فارسی)

سوال:- چہ می گویند اندر ایں مسئلہ کی در ایں دیار بوقت فصل خرما خوری اہالیان شہر (الف) کہ وطن اصلی ایشاں است با اہل وعیال نقل مکانی کردہ بشہر (ب) میروند و خاص غرض ومقصد ایشاں خرما خوری است وعزم ایشاں بعد از انقطاع فصل خرما کہ مدت سہ چار ماہ باشد ارتحال وکوچیدن باز بسوئے وطن اصلی خود کہ شہر (الف) ہست میباشد ولی حالا برائے خرما خوری اہل وعیال خود را در شہر (ب) میگزارند، وخود در شہر (ب) ارادہ سکونت کمتر از پانزدہ روز دارند پس اکنون قابل دریافت چند اُمور است اوّل آنکہ ایں جا شہر (ب) ہست وطن اقامت صورت بندد یا نہ؟ دوم اینکہ ایں جا در شہر (ب) نماز ہائے چارگانی قصر کنند یا اتمام؟ بینوا توجروا.

جواب:- جواب صورتِ مسئولہ نزد ایں حقیر آنست کہ اہل وعیال در شہر (ب) بحکم مقیم ہستند واتمام صلاۃ برایشان واجب، زیرا کہ نیت قیام زائد از پانزدہ روز کردہ اند، اما سر پرست آنہا کہ نیت قیام کمتر از پانزدہ روز کردہ است دراں شہر قصر خواہد کرد، پس شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست ودرحق سر پرست وطن السفر واگر سر پرست ہم نیت قیام پانزدہ روز کند او ہم اتمام خواہد کرد، وجوابے کہ منسلک بہ سوال است، اگر مراد او این است کہ ہر شہرے کہ دران اہل باشند، خواہ بہ نیت قیام عارضی، آن وطن اقامت نمی تواند شد، این جواب درست نیست کہ از و لازم می آید کہ ہر سفرے کہ دراں اہل وعیال ہمراہ باشند دراں نیت اقامت درست نہ شود، وھٰذا لم یقل بہ أحد وفقہاء بصراحت ایں مسئلہ نوشتہ اند کہ "والمعتبر نیة المتبوع لأنه الأصل لا التابع کامرأة .... مع زوج." (درمختار مع الشامی ج:۱ ص:۵۳۳،۵۳۴)۔[1]

پس معلوم شد کہ اگر شخصے در شہرے ہمرّاہ زوجہ خود اقامت کند او وطن اقامت می گردد، اما قول فقہاءؒ کہ ووطن الاقامة ما ینوی فیه الاقامة خمسة عشر یوما فصاعدا ولم یکن مولده له لا له به أهل کما فی الکبیری ص:۵۰۶۔[2] پس مراد او مجرد وجود اہل نیست، بلکہ توطن اہل است، واز اینجا است کہ بعض فقہاءؒ در تعریف وطن اقامت ''ولا لہ بہ اہل'' ذکر نمی کردہ اند چنانکہ علامہ شامیؒ گویند:

وهو ما خرج الیه بنیة اقامة نصف شهر سواء کان بینه وبین الأصلی مسیرة السفر أو لا۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۲)۔[3]

---

(۱) الدر المختار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۳۳ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) غنیة المتملی ص:۵۴۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۳) رد المحتار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع سعید).

پس خلاصہ ایں است کہ شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست و درحق مرد اگر نیت اقامت کمتر از پانزدہ روز است منزل سفر ہست وبیش ازاں وطن اقامت، هٰذا ما عندی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲/۷ ۲۹ ب)

وطنِ اصلی سے مکمل طور پر منتقل ہوجانے کے بعد دوبارہ وطن آنے کی صورت میں قصر کا حکم

سوال ۱:- زید علاقہ کالاباغ بستی کوٹ چاندنہ کا رہنے والا ہے اور وہ اس کا آبائی وطن ہے، کسی وجہ سے زید اپنے آبائی وطن سے نقل مکانی کر کے ریاست بھاولپور ضلع رحیم یارخان میں اپنا تـاھل بنالیتا ہے، جو اس کے آبائی وطن سے تقریباً چار سو میل کے فاصلے پر واقع ہے، حسبِ ارشادِ گرامی حضور صلی اللہ علیہ وسلم: من تـأهـل فـی بلد فلیصل صلوٰۃ المقیم، نماز کی قصر نہ کرے گا، لیکن اگر کبھی اپنے آبائی وطن میں اس کا آنا ہو اور وہاں چودہ دن سے کم رہنے کا ارادہ ہو تو وہاں صلوٰۃِ مقیم ادا کرے گا یا قصر؟

۲:- اگر زید اپنے آبائی وطن میں آیا اور اس نے پندرہ دن وہاں قیام کرنے کا اردہ بھی کرلیا، تو اب وہ وہاں قصر نہیں کرے گا، بلکہ صلوٰۃِ مقیم ادا کرے گا، پندرہ دن کے بعد وہ قریب دو تین میل یا بارہ، تیرہ میل یعنی اَڑتالیس میل کے اندر دو تین دن کے لئے سفر کا ارادہ کر کے سفر بھی کرتا ہے اور ایک دورات کے لئے پھر وہ اپنی قیام گاہ یعنی آبائی وطن میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ راستے کی نمازیں اور قیام گاہ کی نمازیں قصر کرے گا؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا ارادہ اپنے آبائی وطن (کوٹ چاندنہ) میں بطور وطن رہنے کا نہیں ہے تو اب یہ بستی آپ کی وطنِ اصلی نہیں رہی، لہٰذا آپ جب مسافتِ سفر طے کر کے یہاں آئیں تو قصر کریں گے، محض جائیداد اور مکانات ہونے کی بنا پر اس صورت میں اسے وطنِ اصلی نہیں کہا جائے گا، لـمـا فـی رد الـمـحـتـار ولو نقل أهله ومتاعه وله دور فی البلد لا تبقی وطنًا له وقیل تبقی[1] ووجـه الـقـول الـثـانـی فی فتح القدیر بأنه محمول علٰی ما اذا عزم علٰی ابقائه وطنًا، وهٰذا التوجیه اختاره الشیخؒ فی امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۳۶۴[2]۔

(۱) رد المحتار باب صلوٰۃ المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) امـداد الـفـتـاویٰ ج: ۱ ص: ۳۹۲، ۳۹۳ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی). وفی الهدایة ج: ۱ ص: ۱۶۷ (طبع مکتبـه شـرکـت عـلـمیه ملتان) ومن کان له وطن فانتقل منه واستوطن غیره ثم سافر فدخل وطنه الأول قصر لأنه لم یبق وطنًـا لـه الا یـری أنـه عـلـیه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمکة من المسافرین وهٰذا لأن الأصل أن الوطن الأصلی تبطل بمثله دون السفر ووطن الاقامة تبطل بمثله وبالسفر وبالأصلی .... الخ.

۲:- جب کوٹ چاندنہ آپ کا وطنِ اصلی نہیں ہے تو آپ صرف اس وقت وہاں اتمام کریں گے جب چودہ دن سے زائد قیام کی نیت کی ہو، اس کے بعد اگر آپ کہیں دُوسری بستی میں جائیں تو اگر یہ بستی وہاں سے اَڑتالیس میل دُور ہو تو آپ وہاں بھی قصر کریں گے، اور واپس کوٹ چاندنہ ایک دو رات کے لئے آئیں گے تو وہاں بھی قصر کریں گے، لیکن جس بستی میں آپ گئے ہیں اگر وہ کوٹ چاندنہ سے اَڑتالیس میل سے کم ہے تو بدستور اتمام کرتے رہیں، **لأن وطن الاقامة یبطل بالسفر وقال فی رد المحتار: والحاصل أن انشاء السفر یبطل وطن الاقامة اذا کان منه، أما لو أنشأه من غیره فان لم یکن فیه مرور علٰی وطن الاقامة أو کان ولٰکن بعد سیر ثلاثة أیام فکذٰلک ولو قبله لم یبطل الوطن .... الخ.** ج:۱ ص:۵۳۳۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۷/۲۸ ج)

فوج کی پوسٹنگ کی تبدیلی کی بناء پر نمازِ قصر سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال۱:- شہر کے قریب فوجیوں کا کیمپ ہے، جب شہر میں اذانِ جمعہ ہوجاتی ہے تو وہاں اس کیمپ میں آواز سنائی دیتی ہے، مگر افسرانِ بالا کی طرف سے حکم ہے کہ کوئی فوجی شہر میں جمعہ کے لئے نہ جائے، اس صورت میں اس کیمپ میں نمازِ جمعہ دُرست ہوگی؟ یہ بات ہے کہ اس کیمپ میں مستقل کوئی مسجد نہیں ہے، پانچوں نمازیں ایک کمرے میں پڑھتے ہیں جو بوقتِ ضرورت خالی بھی کرنا پڑتا ہے، کیا ایسے کمرے میں دیگر نمازیں جمعہ کے علاوہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب۱:- یہ کیمپ شہر سے کتنی دُور ہے؟ کیا شہر کی عمارتوں اور اس کے کیمپ کے درمیان کچھ غیرآباد علاقہ ہے، جو شہر کا حصہ شمار نہ کیا جاتا ہو، اس کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

سوال۲:- جو آفیسر اپنے ماتحت یونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے دُور جاتے ہیں، یعنی تقریباً اَٹھائیس میل کی مسافت طے کرتے ہیں تو کیا یہ لوگ قصر کریں گے؟

جواب۲:- اگر پوسٹ جس کی چیکنگ کے لئے جارہا ہے شہر کی آخری حدود سے اَڑتالیس میل دُور ہے تو قصر کرسکتا ہے۔

سوال۳:- ایک آفیسر فوجیوں کو لے کر جب دُور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، وہاں قیام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، جب کسی آفیسر سے دریافت کیا جاتا ہے تو بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ

(۱) رد المحتار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید).

فوج میں قانون ہے کہ قیام کی حد کا کسی کو نہیں بتایا جاتا، تو اس صورت میں قصر کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب۳:- مذکورہ صورت میں فوجیوں کو قصر کرنا چاہئے، جب تک پندرہ دن قیام کرنے کا عزم نہ ہو قصر ہی کیا جائے گا، خواہ اس غیر یقینی حالت میں کئی مہینے گزر جائیں۔[1]

سوال۴:- اگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں والے سپاہی اور نوکر وغیرہ ہیڈکوارٹر کو پندرہ دن سے کم مدّت کے لئے گئے تو کیا یہ سپاہی قصر کریں گے یا اتمام؟

جواب۴:- اگر یونٹ سے ہیڈکوارٹر کے شہر کا فاصلہ اَڑتالیس میل ہے تو قصر کریں گے۔

سوال۵:- اگر ایک امام مسافر ہو اور کسی جگہ یہ جماعت پڑھاتا ہے تو مقتدی کی نیت اور امام کی نیت میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر امام ہیڈکوارٹر کو جائے تو اس کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں وہاں کتنا قیام کروں گا؟ اگر وہ امام وہاں نماز پڑھائے گا تو کیسے پڑھائے گا؟

جواب۵:- مسافر امام دو رکعتوں کی نیت کرے گا، اور مقتدی چار رکعتوں کی، پھر امام جب دو رکعتوں پر سلام پھیر دے تو مقتدی کھڑے ہوکر اپنی نماز پوری کریں،[2] مگر اس میں قراءت نہ کریں، بلکہ جتنی دیر میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اتنی دیر خاموش کھڑے رہ کر رُکوع میں چلے جائیں، قصر کا مسئلہ وہی ہے جو نمبر۴، نمبر۲ میں گزر گیا ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

شرعی معذور کی نماز کا حکم

سوال:- ہماری مسجد میں ایک صاحب نماز پڑھتے ہیں، وضو کرکے نماز میں شریک ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رُکوع میں جب جاتا ہوں تو ہوا خارج ہوجاتی ہے، ہر نماز میں یہی حالت ہوتی ہے، کیا نماز پڑھنا چھوڑ دیں یا کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- اگر ان صاحب کو چار رکعتیں بھی بغیر وضو ٹوٹے پڑھنے پر قدرت نہیں ہے، تو شرعاً وہ معذور ہیں، اور ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت شروع ہونے پر وضو کرلیا کریں اور

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۴ (طبع سعید) (ولا بد من علم التابع بنية المتبوع فلو نوى المتبوع الاقامة ولم يعلم التابع فهو مسافر حتى يعلم على الأصح) وفي الفيض وبه يفتي كما في المحيط وغيره دفعا للضرر عنه.

(۲) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۱۲۹، ۱۳۰ وصح اقتداء المقيم بالمسافر في الوقت وبعده فاذا قام المقيم الى الإتمام لا يقرأ ولا يسجد للسهو في الأصح، لأنه كاللاحق والقعدتان فرض عليه وقيل لا، قنية وندب للإمام .... وفي شرح الارشاد ينبغي أن يخبرهم قبل شروعه والا فبعد سلامه (أن يقول) بعد التسليمتين في الأصح: أتموا صلوٰتكم فاني مسافر .... الخ.

اس وضو سے نماز پڑھتے رہیں، جب تک اس نماز کا وقت باقی رہے گا اس وقت تک وضو ریح خارج ہونے سے نہیں ٹوٹے گا، ہاں! جب وہ وقت ختم ہوگا اور اگلا وقت شروع ہوگا تو نیا وضو کرلیں اور اس سے نماز پڑھتے رہیں،[1] جب تک یہ عذر باقی رہے اس وقت تک ایسا کرتے رہیں، جب عذر ختم ہوجائے تو حسبِ معمول وضو کیا کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶ الف)

معذور کی نماز کا حکم

سوال:- کبھی کبھی ثقیل یا بادی چیز کھانے کی وجہ سے مرض کا زور ہوتا ہے، تو رفعِ حاجت کے بعد مسے زیادہ متورّم اور سخت ہوجاتے ہیں، اور چند نَفَس بیٹھنے اور دبانے کے باوجود داخل نہیں ہوتے، اس صورت میں مرہم مسوں پر لگا کر اور پھایہ مرہم کے نیچے گدی کپڑے کی رکھ کر لنگر باندھنا پڑتا ہے، رطوبت اور بعض دفعہ خون بھی جو مسوں سے خارج ہوتا ہے گدی میں جذب ہوتا رہتا ہے، بعض مرتبہ صرف ایک یا دو روز کے بعد اور بعض مرتبہ ہفتے عشرے کے بعد سابقہ حالت بحال ہوتی ہے، مجبوراً ان حالات میں نماز ادا کرنی پڑتی ہے، کیا ان حالات میں نماز کی ادائیگی میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے؟ اگر ہے تو اس کے ازالے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ خصوصاً اگر یہ حالت حج کے موقع پر یا امام کو پیش آجائے تو مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے کیا اَحکام ہیں؟ اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- اگر خون یا رطوبت کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے کہ باوضو چار رکعت نماز کی ادائیگی اس اخراج کے بغیر نہیں ہوسکتی تب تو حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی ابتداء میں وضو کرلیا جائے اور اس سے فرض و نفل وغیرہ ادا کرلئے جائیں، یہ وضو مذکورہ اخراج سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسرا وقت آئے تو نیا وضو کرلے۔[2] کپڑے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس پر لگنے والی نجاست ایک گلٹ کے روپیہ کے برابر نہ ہو بلکہ اس سے کم ہو تو اس حالت میں نماز ہوجاتی ہے، اور اگر نجاست اس سے زائد ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر کپڑے کو پھر دھویا گیا تو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے کپڑے کو پھر روپیہ سے زائد نجاست لگ جائے گی تو دھونا واجب نہیں، اس حالت میں نماز ہوجائے گی، اور اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو

(۱، ۲) وفي التنوير وشرحه ج:۱ ص:۳۰۵، ۳۰۶ وصاحب عذر من به سلس بول لا يمكنه امساكه أو استطلاق بطن أو انفلات ريح أو استحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلٰوة مفروضة بأن لا يجد في جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلي فيه خاليا عن الحدث ولو حكما .... وحكمه الوضوء لكل فرض .... ثم يصلّي به فيه فرضًا أو نفلًا فاذا خرج الوقت بطل.

دھونا واجب ہے، اور اگر رطوبت یا خون کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا جس کا ذکر پہلے فقروں میں کیا گیا ہے تو ہر اخراج کے بعد نماز کے لئے وضو کرنا بھی ضروری ہے اور کپڑے دھونا بھی۔

مناسکِ حج میں طواف کے لئے وضو ضروری ہے،(۱) اس لئے اس کا حکم نماز کا سا ہے، باقی ارکان بلا وضو ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ یہ مسائل آپ کسی عالم سے زبانی بھی سمجھ لیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

معذور کے لئے وضو کا حکم

سوال:- زید کو کافی عرصے قبض کی شکایت رہی جس کی بناء پر ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور قضائے حاجت کے قدرتی راستے کو بند کر کے دُوسری جگہ سے قضائے حاجت کا راستہ بنادیا، اس بناء پر زید کو ریح اور قضائے حاجت پر قابو نہیں ہے، ایک کامل نماز کے دوران کم از کم تین چار بار بے اختیاری طور پر ریح خارج ہوجاتی ہے، اور زید کو بار بار وضو کے لئے تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، اس بناء پر زید معذورین میں شمار ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً ایک کامل نماز بھی بغیر خروجِ ریح کے اداء نہیں ہوسکتی تو زید شرعاً معذور ہے، اور وہ ایک وقت کے شروع میں وضو کر کے اس سے جتنی چاہے نماز پڑھ سکتا ہے، اور وقت کے دوران خروجِ ریح سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔(۲)

واللہ اعلم

۱۴۰۵/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲۶/۳۶ و)

شرعی معذور کی تعریف اور عذر کا معیار

سوال:- میری عمر ۴۹ سال ہے، ۲۰ سال کی عمر میں میں نے نماز شروع کی، جن دنوں میں نے نماز شروع کی وہ میری گوناگوں امراض و بیماری کا زمانہ تھا، اس وقت مجھ کو ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ میری ریح نہیں ٹھہرتی تھی، یعنی تکلیف کم و بیش لگی رہتی تھی، جس کے متعلق علماء حضرات سے دریافت کیا

(۱، ۲) دیکھئے سابقہ ص:۵۰۵ کا حاشیہ نمبر ۱، ۲۔

ہوگا، میرے ذہن میں ہے کہ انہوں نے فرمایا ہوگا کہ تم ریح کے معذور ہو، تم ہر وقت وضو کرو، لہٰذا میں اس طرح کرتا رہا۔

اب سے ایک ماہ پیشتر ایسے ہی کرتا رہا ہوں، اور جو میرے ذمہ چھ سالوں کی قضا نمازیں تھیں وہ بھی اس طرح ادا کرتا رہا ہوں، اور سردیوں میں موزے بھی وقت کے اندر پہن لیا کرتا تھا، ایک دن بہشتی زیور میری نظر سے گزری، تو وہاں مولانا صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ معذور آدمی اس وقت موزہ پہنے جب کہ طہارت کامل میں ہو تو پہنے تو پھر وہ مسح کرسکتا ہے، اور میں تو یہ سمجھتا رہا ہوں کہ وقت کے اندر میں پاک ہوں اس طرح مجھ سے غلطی ہوچکی ہے اور متواتر کئی سالوں سے ہو رہی ہے، پھر میں نے اپنے عذر ریاح کی تحقیق کی تو اس میں یہ معلوم ہوا کہ میں بہ تکلیف طہارت سے نماز ادا کرسکتا ہوں، یعنی پریشانی تو ہوتی ہے مگر جان روکنے سے نماز ادا ہوجاتی ہے، کیونکہ تقریباً ایک ماہ میں صرف دو تین دفعہ نمازوں میں دو، دو وضو کرنے پڑے، اب کتاب نور الایضاح وغیرہ جب دیکھی تو اس میں معذور کے متعلق جو حکم ہے کہ پہلی مرتبہ اس کو اتنا وقت نہ ملے کہ وہ نماز پڑھ سکے، مگر میری یہ حالت نہ تھی، تکلیف تو تھی مگر اتنی شدید نہ تھی، بہ جبر و تکلیف میں نماز ادا کرسکتا تھا..... میں معذور ہوں یا نہیں؟

جواب:- ''معذور'' ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں عذر کی کیفیت یہ ہو کہ ایک نماز بھی طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکے اور جتنی دیر میں وضو کر کے ایک فرض نماز پڑھی جائے اتنی دیر تک ریح نہ رُک سکے[1]، چونکہ آپ کی یہ کیفیت نہ تھی جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا ہے، اس لئے آپ پر معذور کے اَحکام جاری نہیں ہوسکتے، اب آپ کو چاہئے کہ گزشتہ سالوں کی نمازیں جس حد تک آپ کو قدرت ہو قضا کرتے رہیں، باقی کے لئے توبہ و اِستغفار بھی کریں، اور وصیت بھی لکھ دیں کہ آپ کے بعد آپ کے ترکہ سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، تاکہ جو نمازیں بوجہ عذر قضا نہ کی جاسکیں ان کی تلافی فدیہ کے ذریعہ ہوجائے[2]۔

موزوں پر مسح کے بارے میں یہ مسئلہ یاد رکھئے کہ آپ اگر معذور ہوتے تب بھی ایک دن ایک رات تک مسح کرنا آپ کے لئے اس وقت تک جائز ہوتا جبکہ آپ نے حقیقی وضو کرکے واقعۃً باوضو ہونے کی حالت میں پہنا ہوتا، اور اگر کوئی معذور ریح خارج ہونے کے بعد موزے پہنے تو وہ صرف وقت ختم ہونے تک مسح کرسکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ **فی الدر المختار ومعذور فانہ یمسح فی**

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۵۰۵ کا حاشیہ نمبر۱،۲۔
(۲) نماز کے فدیہ سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ سابقہ ص:۴۸۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الوقت فقط، الا اذا توضأ ولبس علی الانقطاع الصحیح. (شامی ص: ۲۵۰، والتفصیل فی رد المحتار)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قطرے کا مریض کپڑا دیکھے بغیر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید قطرے کا مریض ہے، شبہ پر جب دیکھا تو بعض مرتبہ قطرہ آیا اور بعض مرتبہ نہیں آیا، ایسا مریض بغیر کپڑا دیکھے سابقہ وضو سے نماز پڑھے تو جائز ہے؟ یا تجدید وضو کرے؟

جواب:- اگر قطرہ نکلنے کا گمان غالب ہو تو چاہے قطرہ نظر آئے یا نہ آئے وضو کرنا واجب ہے، اور اگر محض شبہ یعنی کسی طرف گمان غالب نہ ہوتا ہو تو دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہئے، اور اگر اس صورت میں قطرہ نظر نہ آئے تو نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے، شبہ کی صورت میں اگر کسی عذر کی وجہ سے دیکھنے کا موقع نہ ملے تو بغیر دیکھے اور بغیر تجدید وضو کئے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب المسح علی الخفین ج: ۱ ص: ۲۷۱ (طبع سعید)

﴿فصل فی الجمعۃ﴾
(جمعہ کے متعلق مسائل کا بیان)

حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے شہر کا وجود ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہو، سڑکیں ہوں، اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ

دورانِ خطبہ تشہد کی ہیئت پر بیٹھ کر ہاتھ باندھنا

سوال:- ہمارے ہاں ملک بھر میں رواج ہے کہ جمعہ کی نماز کے خطبے میں، تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور جب خطیب درمیان خطبہ کے بیٹھتا ہے تو آخری خطبے میں ہاتھ رانوں پر رکھ لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا فرض، واجب یا سنت ہے؟ جو ایسا نہ کرے کیا وہ گنہگار ہے؟

جواب:- خطبۂ جمعہ میں اصل یہ ہے کہ اس کو دھیان سے سننا واجب ہے، اور خطبے کے دوران کوئی بات چیت یا ایسا عمل ممنوع ہے جس سے سننے میں خلل واقع ہو،[2] لیکن تشہد کی ہیئت میں بیٹھنا، ہاتھ باندھنا اور خاص وقت پر ہاتھ چھوڑ دینا سنت نہیں، ادب کے خیال سے دوزانو بیٹھنے میں کچھ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۷ ویشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب انه كل موضع له أمير وقاض يقدر علىٰ اقامة الحدود. وفی الشامية عن أبی حنيفةؒ انه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر علىٰ انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح .... الخ. وكذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وكل ما حرم فی الصلوٰة حرم فيها، أی فی الخطبة، خلاصة وغيرها. فيحرم أكل وشرب وكلام ولو تسبيحًا أو ردّ سلام أو أمرًا بمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت.

حرج نہیں، بلکہ بہتر ہے،(۱) لیکن مذکورہ التزامات اگر واجب یا سنت سمجھ کر کئے جائیں تو بدعت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۱/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۱۳/۲۷ و)

خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص دورانِ خطبہ آیا اور بیٹھ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تم نے دو رکعت نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا: نہیں! فرمایا: اُٹھ اور پہلے دو رکعت نماز پڑھ۔ یہ شاید بخاری کی حدیث ہے، اہلِ سنت والجماعت کا خطبے کے دوران عمل اس سے مختلف ہے؟

جواب:- بخاری شریف ہی کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کرنے سے یہاں تک کہ دُوسرے کو خاموش کرنے سے بھی منع فرمایا، (بخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸)۔(۲) نیز معجم طبرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ امام کے خطبہ دیتے وقت جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو نہ نماز جائز ہے نہ بات کرنا، (بحوالہ اعلاء السنن ج:۲ ص:۵۷)۔(۳) نیز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے روکتے تھے، (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔(۴) لہٰذا بخاری شریف میں جو واقعہ حضرت سلیک عطفانی رضی اللہ عنہ کا آیا ہے، وہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت تھی، چنانچہ سننِ دار قطنیؒ اور ابوبکر بن ابی شیبہؒ نے اسی واقعے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیکؓ کو نماز کا حکم فرما کر خود خاموش ہوگئے تھے اور جب تک وہ نماز سے فارغ ہوگئے آپ رُکے رہے، امسک عن الخطبة حتّی فرغ من رکعتیه ثم عاد الی خطبته. (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔(۵) یہاں تفصیل کا موقع نہیں، بعض دُوسرے دلائل کی روشنی میں بھی یہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۷/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۹۵/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع مکتبه رشيديه کوئٹه) اذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبیًا أو متربعًا أو کما تیسر لأنه لیس بصلوٰة عملًا وحقیقةً، کذا فی المضمرات ویستحب أن یقعد فیها کما یقعد فی الصلوٰة کذا فی معراج الدراية. (۲) (طبع قدیمی کتب خانه).

(۳) اعلاء السنن باب کراهة الصلوٰة والکلام اذا خرج الامام للخطبة یوم الجمعة لا سیما اذا شرع فیها ج:۲ ص:۶۷ (طبع ادارة القرآن کراچی).

(۴) باب اذا رای الامام رجلًا جاء وهو یخطب أمره أن یصلّی رکعتین. (طبع دار الفکر).

(۵) دیکھئے حوالہ مذکورہ حاشیہ نمبر۴۔ (محمد زبیر حق نواز)

خطبے کے دوران خاموش رہنا واجب ہے

سوال:- خطیب صاحب دورانِ خطبہ یہ آیتِ کریمہ تلاوت کردیں: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ" الآیۃ، تو دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- خطبے کے دوران بالکل خاموش رہنا واجب ہے،(۱) اور یہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص بول رہا ہو تو اسے چپ کرانے کے لئے بولنا بھی ناجائز ہے،(۲) لہٰذا جب امام آیتِ کریمہ: "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ" الآیۃ(۳) پڑھے تو مقتدیوں کو دِل دِل میں دُرود شریف پڑھنا چاہئے، زبان سے پڑھنا دُرست نہیں، خطبے کے دوران نماز پڑھنا بھی ناجائز ہوجاتا ہے تو دُرود پڑھنا بدرجۂ اَولیٰ نادُرست ہوگا۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۱۹ الف)

جمعہ کی اذانِ ثانی امام اور منبر کے سامنے دینی چاہئے

سوال:- جمعہ کے خطبے کے لئے بروز جمعہ امام صاحب منبرِ رسول پر بیٹھتے ہیں تو مؤذّن صاحب کو ان کے بالکل سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ کر اذان دینی چاہئے؟ اور کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ یا دائیں بائیں ہٹ کر اذان دینی چاہئے؟

جواب:- خطبے کے وقت اذان امام اور منبر کے بالکل سامنے ہونی چاہئے، دائیں یا بائیں ہٹ کر نہیں، اور اذان کے اس طریقے کو بدعت قرار دینا دُرست نہیں، کما صرح بہ الفقھاء(۴) وتمام دلیلہ فی امداد الفتاویٰ۔(۵)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۴/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع سعید) وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیھا أی فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرھا فیحرم أکل وشرب وکلام ولو تسبیحًا أو ردّ سلام أو أمرًا بمعروف بل یجب علیہ أن یستمع ویسکت.
وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۵۷، ۴۵۸ (طبع دار العلوم کراچی).

(۲) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ أنصت والامام یخطب فقد لغوت.

(۳) سورۃ الأحزاب: ۵۶.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۱ ویؤذن ثانیًا (بین یدیہ) أی الخطیب، وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ ویؤذّن ثانیًا بین یدیہ) أی علٰی سبیل السنیۃ کما یظھر من کلامھم، رملی .... الخ. وکذا فی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۱۵۸.

(۵) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ص:۴۷۴ تا ۴۸۱ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنی چاہئے یا بعد نماز؟ سنت طریقہ کون سا ہے؟ اور کیا خطبے سے پہلے وعظ کہنا بدعت ہے؟

جواب:- خطبے سے پہلے اور جمعہ کے بعد دونوں وقت وعظ کہنا جائز ہے، جس صورت میں مسلمانوں کا زیادہ فائدہ اور سہولت ہو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے، اور خطبے سے پہلے وعظ کہنے کو بدعت قرار دینا غلط ہے، ہاں! وہ مباح ہے، خاص اس وقت کے لحاظ سے اسے مسنون یا واجب قرار دینے سے بدعت ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

جمعہ کا خطبہ اور نماز الگ الگ اشخاص پڑھائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب حافظ نہیں ہیں، تراویح ایک دُوسرے حافظ صاحب پڑھاتے ہیں جو قاری بھی ہیں، آخری جمعۃ الوداع کو میں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ خطبہ پڑھادیں حافظ صاحب جمعہ پڑھادیں گے، امام صاحب نے انکار کردیا اور کہا کہ خطبہ اور جمعہ ایک ہی شخص پڑھا سکتا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- امام صاحب نے ٹھیک کہا، جمعہ کا خطبہ اور نماز ایک ہی شخص کو پڑھانا چاہئے، افضل طریقہ یہی ہے اور اس کے خلاف کرنا مناسب نہیں، اِلَّا یہ کہ کوئی عذر ہو، بغیر عذر کے ایسا کرنا خلافِ اَوْلیٰ ہے۔

لما فی الدر المختار لا ینبغی أن یصلّی غیر الخطیب لأنهما کشیٔ واحد فان فعل بأن خطب صبی باذن السلطان وصلّی بالغ جاز. (شامی ص:۵۵۲)[2] ومثله فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۴۰۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۸/۲۷ و)

---

(۱) وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۶۷ (سوال:۲۳۸۵) و امداد الأحکام ج:۱ ص:۷۷۲. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۳۸ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۲ (طبع سعید).

(۳) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۳۵ (طبع مکتبہ دار العلوم)۔

بستی میں جمعہ فرض نہ سمجھنے والے امام کے لئے کسی دُوسرے شخص سے نمازِ جمعہ پڑھوانا

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، بسبب عدمِ جواز جمعہ فی القریٰ نماز نہیں پڑھاتے، خود جمعہ کو تقریر کرتے ہیں اور بکر کو کہہ دیتے ہیں کہ تم نمازِ جمعہ پڑھادو، زید نفل کی نیت باندھ کر بکر کے پیچھے نماز پڑھتا ہے جمعہ نہیں پڑھتا، کیا زید کا یہ رویہ از رُوئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر وہ موضع فی الواقعہ ایسا قریہ ہے جو شہر کی تعریف میں نہیں آتا تو زید کے لئے نہ خود جمعہ کی امامت جائز ہے اور نہ کسی دُوسرے سے جمعہ کی نماز پڑھوانا دُرست ہے، شرعی حکم سب کے لئے ہوتا ہے۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۵۷/۱۹ الف)

قریۂ کبیرہ میں نمازِ جمعہ

سوال:- ہمارے گاؤں میں ڈاک خانہ اور یونین کونسل کا دفتر موجود ہے، اور ہمارا علاقہ ملیر سٹی سے چودہ میل دُور ہے، سرکاری اعداد مردم شماری چار ہزار ہے، روزمرّہ کی زندگی کے ساز وسامان بھی مل رہے ہیں ....الخ۔ کیا جمعہ ایسی جگہ جائز ہے؟

جواب:- سوال میں بستی کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس بستی میں نمازِ جمعہ دُرست ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۳۰۲/۱۹ الف)

قریۂ صغیرہ میں جمعہ کا حکم (فارسی)

سوال:- یک قریہ ہست کہ تقریباً ۷۰۰ ہفت صد نفوس مشتمل ست قاضی رسمی دارد وضروری

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۷ صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریمًا أی لأنہ اشتغال بما لا یصح لأن المصر شرط الصحۃ. وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ صلوٰۃ العید) ومثلہ الجمعۃ ح. وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۷.

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

اَحکامِ شرع نکاح، طلاق، تقسیم میراث وغیرہ را فیصلہ کند وضروریاتِ زندگی مہیا نمی شوند تقریباً ۳ عدد دوکان دارد کہ قبل از دو سال یکی ہم بنود و یک مسجد داد کہ پنج وقت نماز باجماعت گزاشتہ شود و دیگر یک مسجد دو موضع نخلہا و باغات موجود است کہ بقاعدہ نماز باجماعت نمی شود اکثر آدمیاں فرادیٰ نماز میخوانند، نہ امام دارد نہ مؤذّن، جامع مسجد ہم مؤذّن ندارد وتقریباً از ۲۵ سال جمعہ وعیدین قائم کردند بغیر از اذن سلطان اہلِ محلّہ قبل از ۲۵ سال جمعہ نبود ۴ رکعات احتیاطی ہم میخوانند، و دیگر در اطراف دہ جانب قبلہ فاصلہ یک میل انگریزی یک قریہ واقع است مشتمل بر ۱۵۰ ایک صد و پنجاہ نفوس و جانب مشرق فاصلہ دو میل یک قریہ مشتمل بر ۲۲۰ نفوس و یک قریہ در جانب مشتمل بر ۴۰۰ چہار صد نفوس ہم موجود۔ دریں صورت جمعہ وعیدین جائز است یا نہ؟

جواب:- احوال قریہ کہ در سوال مذکورہ شدہ اند، دلالت می کنند کہ او بحکم مصر نیست و جمعہ دران جائز نیست زیرا کہ تعریف مصر یا قریہ بحکم مصر آنست، **بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر علىٰ انصاف المظلوم من الظالم .... الخ**۔[1] **كما حققه فى امداد الفتاوىٰ** ج:۱ ص:۳۸۸۔[2] و در قریہ مسئول عنہا اسواق موجود نیستند و موجودگی سہ دوکانہا قریہ را عرفاً بحکم مصر نمی گرداند و باید دانست کہ در جمعہ عدد سکان مقرر نیست واصل اینست کہ اگر آں قریہ را در عرف شہر یا قصبہ می فہمیتد او بحکم مصر است ورنہ بحکم قریہ ونماز جمعہ دراں جائز نیست۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۹/۱۹ الف)

خطبۂ جمعہ کے دوران ہاتھ میں عصا لینے کی شرعی حیثیت

سوال:- اگر کوئی امام خطبے میں عصا نہ لے اور خطبہ پڑھے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عصا یا کمان ہاتھ میں لے کر خطبہ دیتے تھے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا کرے تو سنت ہے، لیکن یہ خطبے کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے، عصا لئے بغیر بھی خطبہ بلاکراہت دُرست ہے، اور اس کو خطبے کی لازمی شرط قرار دینا التزام مالا یلزم کی بنا پر بدعت ہے، بعض لوگ چونکہ اس کو خطبے کا لازمی جزء سمجھنے لگے تھے اس لئے بعض علماء نے اس کو ترک کرنے کا اہتمام کیا، بلکہ بعض نے اسے بدعت تک کہا ہے، لیکن حقیقت وہی ہے جو

(۱) **رد المحتار باب الجمعة ج:۲ ص:۱۳۷ (طبع سعيد).**

(۲) دیکھئے امداد الفتاویٰ ص:۴۱۵، ۴۱۶۔

اُوپر عرض کی گئی کہ یہ عمل اصلاً سنت ہے، بشرطیکہ اسے واجب نہ سمجھا جائے، واجب سمجھ کر کرنا بدعت ہوجائے گا۔

قال فی الدر المختار وفی الخلاصة ویکره أن یتکئ علیٰ قوس أو عصاء وقال الشامیؒ استشکله فی الحلیة بأنه فی روایة أبی داوٗد أنه صلی الله علیه وسلم قام أی فی الخطبة متوکئًا علیٰ عصاء أو قوس اهـ. ونقل القهستانی عن عبدالمحیط ان اخذ العصاء سنة کالقیام.

(شامی ج:۱ ص:۵۵۳ باب الجمعة)۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۴۹/۲۷ و)

امروٹ شریف میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- پاکستان کے دیہات میں اکثر علماء خواہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا بریلوی سے، قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ بلا جھجک پڑھاتے ہیں، حالانکہ حنفی مسلک میں دیہات میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، مندرجہ بالا حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ جائز ہے اور ان کا مسلک قوی ہے۔

سندھ کے بڑے اکابر میں سے حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹی، امروٹ شریف میں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے جبکہ جمعہ کی اکثر شرائط پوری نہیں ہوتیں، ان کے جانشین کا بھی یہی عمل ہے، دُوسرے حضرت مولانا حماداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہالیجی شریف ہیں۔ اس لئے جو علماء حنفی مسلک پر کاربند ہیں وہ دیہات میں درس و تدریس اور خطابت بغیر جمعہ کے، فرائض سرانجام نہیں دے سکتے، عوام تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یا تو اکابر کو یہ کہو کہ ناحق پر ہیں، اگر حق پر ہیں تو ان کی طرح نمازِ جمعہ تم بھی پڑھاؤ، ایک سال سے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں لیکن چونکہ ہمارا گاؤں ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھروں پر مشتمل ہے، چھ سات دُکانیں بھی ہیں، ڈاکٹری اور دیگر ضروریات کافی حد تک پوری ہوجاتی ہیں، شہر سے تقریباً سات آٹھ میل دُور ہے، جس بستی میں رہائش پذیر ہوں وہ ہماری برادری کی بستی ہے، اس کے اردگرد اور بھی کئی بستیاں ہیں جو مختلف مقامات سے آکر یہاں آباد ہوئی ہیں۔

اور ہماری بستی کے چیئرمین کی زیرِ نگرانی اکٹھے کئی ہزار ایکڑ زمین خریدی گئی تھی، اگر ایک جگہ گاؤں بناتے تھے تو بہت سے آدمی اپنی زمین سے بہت دُور ہوجاتے تھے، اس لئے ہر ایک نے اپنی

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۱۶۳ (طبع سعید). نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۳۶ و۷۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

سہولت کے لئے اپنی اپنی زمینوں سے قریب گھر بنالئے اور ان میں جو سرکردہ لوگ تھے ان کے نام سے وہ گاؤں مشہور ہوگیا، جبکہ چیئرمین سب کا ایک ہی ہے۔ حنفی مسلک کی شرائط کیا ہیں؟ اور ان کا مأخذ قرآن وسنت سے کیا ہے؟ اور حنفی مسلک کی مالکی مسلک پر وجۂ ترجیح کیا ہے؟ ہماری اس بستی میں نمازِ جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- عزیز محترم سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا سوال غور سے پڑھا اور تمام حالات پر غور کیا، لیکن آپ نے اپنی بستی کا جو حال لکھا ہے اس کے پیشِ نظر اسے قصبہ، قریۂ کبیرہ یا شہر کہنا مشکل ہے، اور حنفیہ کی تمام کتابیں متون وشروح و فتاویٰ جمعہ کے لئے مصر یا قریۂ کبیرہ کی شرط کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں بلاشبہ گاؤں میں بھی جمعہ ہوجاتا ہے، لیکن کسی ایک مسئلے میں مالکیہ یا شافعیہ کے قول کو لینا اور باقی نماز حنفیہ کے طریقے پر پڑھنے میں "تـلـفـیـق" کا اندیشہ ہے، جو باجماعِ فقہاء باطل ہے، اور اس سے کسی کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا مالکیہ یا شافعیہ کے مسلک پر عمل کر کے جمعہ ادا کرلینا کسی طرح دُرست نہیں، حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ کے جواز کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ امامِ مسلمین وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دیدے، یہ صورت بھی ہمارے ملک میں مفقود ہے۔

اور یہ جو احقر نے عرض کیا کہ آپ کی بستی میں قریۂ کبیرہ کی تعریف صادق نہیں آتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ قریۂ کبیرہ وہ چیز ہے جسے ہمارے عرف میں قصبہ کہتے ہیں، اس کی تعریف جامع و مانع فقہاء نے نہیں کی، بلکہ اس کا مدار عرف پر رکھا ہے کہ جس بستی کو عرفاً قصبہ کہا جاتا ہو اس میں جمعہ جائز ہے۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ اس میں ایسا بازار ہو جس میں روز مرّہ کی ضروریات مل جاتی ہوں، آبادی اتنی ہو کہ اسے قصبہ کہا جاسکے یا جس میں سڑکیں وغیرہ ہوں اور حکومت کی طرف سے عدالت، تحصیل یا تھانہ وغیرہ ہو، آپ کی بستی میں کل ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھر ہیں جن کی آبادی بہت سے بہت آٹھ سو کے قریب ہوگی، دُکانیں چھ سات ہیں، جسے بازار کہنا مشکل ہے، ڈاک خانہ، تحصیل وغیرہ نہیں ہے، اس لئے اس کو قصبہ نہیں کہہ سکتے، ہاں! اردگرد کی جن دُوسری بستیوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے اگر وہ ایسی ہوں کہ دیکھنے والا ان سب کو ایک سمجھتا ہو اور ان کا مجموعی نام بھی ایک ہو تو اس کی مزید تفصیل لکھ کر سوال دوبارہ پوچھ لیجئے۔ فی الحال تو وہاں جوازِ جمعہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اوّل تو آپ، لوگوں کو امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دار العلوم وغیرہ فتاویٰ کی کتابیں نیز موجودہ مفتیوں کے فتاویٰ دِکھا کر مسئلہ نرمی سے سمجھائیں، اگر اس طرح بات بن جائے فبہا، ورنہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو کسی اور سے جمعہ پڑھوا کر خود مقتدی بن کر نماز بہ نیت نفل پڑھ لیجئے، پھر تنہا ظہر کی نماز ادا کرلیجئے۔ رہا

یہ مسئلہ کہ حنفیہ کے اس مسلک کے قرآن وسنت سے کیا دلائل ہیں؟ سو یہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، اوّل تو یہ بات مجتہدین کے سوچنے کی ہے، ہم مقلدوں کے سوچنے کی نہیں۔ دُوسرے اس پر مفصل رسائل حنفیہ نے لکھ دیئے ہیں، جن میں علامہ نیموی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند رحمہم اللہ وغیرہ کے رسائل معروف ومشہور ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کا رسالہ "اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ" سب سے زیادہ مفصل ہے۔

تیسری مختصر بات یہ ہے کہ بخاری اور ابوداؤد وغیرہ کی معروف حدیث کے مطابق مدینہ طیبہ کے بعد سب سے پہلا جمعہ "جواثی" نامی قلعے میں پڑھا گیا ہے،[1] جو بحرین کی تجارتی منڈی تھی، حالانکہ بحرین کی فتح سے پہلے بیشمار دیہات مسلمان ہوچکے تھے، وہاں کہیں بھی جمعہ پڑھنا ثابت نہیں بلکہ جمعہ نہ پڑھنا ثابت ہے۔

نیز صحیح بخاری میں مروی ہے کہ عوالی بستیوں کے صحابہ کرامؓ باری باری جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے،[2] اگر وہاں جمعہ جائز ہوتا تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھائی ہے، جس پر تمام روایات متفق ہیں، یہ تمام دلائل اس قدر قوی ہیں کہ حنفیہ کے مسلک کو ضعفِ دلیل کی بنیاد پر چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔[3]

جہاں تک امروٹ شریف اور ہالیجی شریف کا تعلق ہے، مجھے وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے کہ وہ کیسی بستیاں ہیں؟ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں کے بزرگوں سے بھی اس مسئلے میں رُجوع کرکے معلوم کرلیں کہ ان کے جمعہ پڑھنے کی وجہ کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۶/۲۸ ج)

صحتِ جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ ہونا ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہو، سڑکیں ہوں اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے ساتھ

---

(۱) دیکھئے صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲۲ (طبع قدیمی کتب خانہ) وابوداؤد ج:۱ ص:۱۶۰ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)۔
(۲) ایضاً ص:۱۲۳۔
(۳) دلائل کی تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۲۶ تا ۷۳۰ و ۷۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۶ الف)

گھر میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا حکم

سوال:- ایک عالم صاحب کسی مسجد میں عرصے سے خطیب تھے، مسجد کی انتظامیہ سے اختلاف کی بدولت الگ ہوگئے، اب انہوں نے مسجد کے مقابلے میں اپنے گھر میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کردی ہے، جبکہ اس گاؤں میں بھی بہت سی مسجدیں ہیں، کیا ایسی صورت میں جمعہ گھر پر جائز ہے؟

جواب:- جس جگہ لوگوں کو جمعہ کے لئے آنے کی عام اجازت ہو وہاں جمعہ ادا تو ہوجاتا ہے، لیکن مسجد کو چھوڑ کر گھر میں جمعہ قائم کرنا مکروہ اور نہایت ناپسندیدہ اقدام ہے۔ اس سے مسجد کی فضیلت بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ مساجد میں تقلیلِ جماعت کا سبب بھی ہے، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی جمعہ کرنے کو علماء نے پسند نہیں کیا، گھروں میں تو بطریقۂ اَوْلیٰ ناپسندیدہ ہے۔

وفی الدر المختار فلو دخل امیر حصنًا أو قصره وأغلق بابه وصلّی بأصحابه لم تنعقد ولو فتحه وأذن للناس بالدخول جاز وکره وقال الشامیؒ لأنه لم یقض حق المسجد الجامع. (شامی)۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۶۳ ج)

کراچی سے اٹھائیس میل دُور قصبہ ''کاٹھور آباد'' میں جمعہ کا حکم

سوال:- کراچی سے ۲۸ میل پر ایک قصبہ بنام ''کاٹھور آباد'' ہے، جس میں ملیر کی طرح باغات ہیں اور ملحقہ قریہ جات کی بھی آبادی تقریباً چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، بازار اور دُکانیں بھی ہیں، جس میں ضروریاتِ زندگی کی مکمل اشیاء میسر ہیں، اسکول، ہسپتال، بینک، پوسٹ آفس اور بجلی اور ٹیلیفون کی لائن بھی ہے، بس سروس بھی جاری ہے، صرف تھانہ موجود نہیں ہے۔

تفصیلاتِ قریہ جات اور دُکانات حسبِ ذیل ہیں:-

	نام قریہ	تعداد مکانات	تعداد دُکانات
۱:-	سراج احمد گوٹھ	ایک سو پچیس	۳

(۱) تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۶۷ تا ۳۰۷ اور ص:۴۹۷ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۲ (طبع سعید).

۲:-	کمال گوٹھ	۸۰ مکان	ا
۳:-	ابراہیم گوٹھ	۵۰	×
۴:-	موریا گوٹھ	۵۰	ا
۵:-	کھوسہ گوٹھ	۵۰	×
۶:-	سوفن گوٹھ	۵۰	ا
۷:-	دین محمد گوٹھ	۲۰	ا
۸:-	دریاخان گوٹھ	۲۵	ا
۹:-	ماچھی گوٹھ	۵۰	ا
۱۰:-	کاچیلو گوٹھ	۲۰	ا
۱۱:-	میانداد گوٹھ	۵	×
۱۲:-	رند گوٹھ	۶	×
۱۳:-	علو گوٹھ	۱۵	×
۱۴:-	نوازعلی گوٹھ	۲۰	×
۱۵:-	حسن لشکری گوٹھ	۲۰	×
۱۶:-	روزی گوٹھ	۲۰	×
۱۷:-	مراد گوٹھ	۲۰	×
۱۸:-	نیک محمد گوٹھ	۱۰	×
۱۹:-	فقیر گوٹھ	۱۵	×
۲۰:-	ہاشم گوٹھ	۱۰	×
۲۱:-	گبول گوٹھ	۱۰	×

دُکانوں میں راشن ہے اور حجام کی دُکان، لوہار کی دُکان اور ہوٹلیں بھی ہیں، جن کی تعداد تقریباً ۲۵ ہوتی ہے، ہسپتال تین ہیں، اور اسکول ۱۷ ہیں، کیا مذکورہ قصبے میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

جوابات اثبات میں ہوں یا نفی میں، دونوں صورتوں میں حوالہ کتب ضرور دیا جائے۔

۱:- کالونی پچاس دُکانیں، مکانات کچھ نہیں۔ ۲:- سراج احمد گوٹھ اور پہلوان گوٹھ چار فرلانگ درمیانی فاصلہ۔

(جواب از حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ)

جواب:- سوال میں کاٹھور کے جن دیہات کا ذکر ہے، ان کی صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لئے ہم نے ان مقامات کا مفصل معائنہ کیا، اس معائنے کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ کاٹھور کسی ایک قصبے یا بستی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل ایک قصبہ ہے، اور سوال میں قصبے کے نام سے اس کے جو اوصاف ذکر کئے گئے، وہ کسی ایک بستی کے اوصاف نہیں ہیں، بلکہ پورے علاقے کاٹھور کے مجموعے کے اوصاف ہیں، اور صورتِ حال یہ ہے کہ:-

۱:- مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سہولت کے مطابق چھوٹی چھوٹی بہت سی بستیاں آباد کر رکھی ہیں جو الگ الگ گوٹھوں کے نام سے موسوم ہیں، اور ہر گوٹھ سے دُوسرے گوٹھ تک آبادی متصل نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان کہیں کھیتوں کا، کہیں جنگلوں کا فاصلہ ہے۔ چند گوٹھ ایسے بھی ہیں جن کے ایک سرے پر کھڑے ہوکر دُوسرے گوٹھ کا سرا نظر آتا ہے، لیکن بیشتر ایسے ہیں کہ ایک گوٹھ سے دُوسرا گوٹھ نظر نہیں آتا، اور بیچ میں دو میل سے لے کر ایک فرلانگ تک کے فاصلے پائے جاتے ہیں جو زرعی زمینوں یا جنگلوں پر مشتمل ہیں۔

۲:- ان گوٹھوں میں سے کوئی گوٹھ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مصر یا قریۂ کبیرہ کا اطلاق دُرست ہو یا جس میں اس کی علامت پائی جائے، عام طور سے آبادیاں، جھونپڑیوں یا کچھ مکانات پر مشتمل ہیں، کچھ مکانات پکے بھی ہیں، ان گوٹھوں میں سب سے بڑا گوٹھ ''سراج احمد گوٹھ'' ہے، جو تقریباً سوا سو مکانات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں بھی گلی، کوچے، بازار وغیرہ نہیں ہیں، البتہ تین متفرق دُکانیں اور دو ہوٹل ہیں، اور نہ مصریت کی کوئی اور علامت پائی جاتی ہے، جب سب سے بڑے گوٹھ کی حالت یہ ہے تو دُوسرے چھوٹے گوٹھوں کا معاملہ اور زیادہ واضح ہے۔

۳:- البتہ ان تمام گوٹھوں کے تقریباً وسط میں ایک بازار واقع ہے، جو کسی بھی گوٹھ کا جزو نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل علاقہ ہے، اس کو ''کاٹھور کالونی بازار'' کہتے ہیں، اس میں سکک وسوق موجود ہیں اور ضروریاتِ زندگی ملتی ہیں، اس میں بینک، مڈل کے اسکول، ہسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ ہے، لیکن یہاں رہائشی مکان صرف ایک ہے، مختلف گوٹھوں کے لوگ بھی یہاں دن میں دُکان داری کرتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے گوٹھ میں چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا تنقیحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تمام بستیاں مستقل الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں سے کسی میں بھی جمعہ کے جواز کی شرائط موجود نہیں ہیں، اور ان کے مجموعے کا نام کاٹھور ہونے سے اس مجموعے کا مصر یا قریۂ کبیرہ ہونا لازم نہیں آتا

کیونکہ ان بستیوں کے درمیان انفصال کافی ہے، اور جس طرح متعدّد بستیوں کے مجموعے پر ضلع کے نام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اس طرح ان بستیوں کے مجموعے کو کاٹھور کہتے ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بستیوں میں سے کسی بستی میں بشمول ''سراج احمد گوٹھ'' جمعہ جائز نہیں، البتہ کاٹھور بازار میں جمعہ کا مسئلہ زیرِ غور ہے، اور چونکہ وہ خالص بازار ہے، رہائشی بستی نہیں ہے، اس لئے اس کی مصریت بھی محلِ نظر ہے، البتہ اگر علاقے کے حاکم یا ڈپٹی کمشنر سے جمعہ قائم کرنے کی اجازت لے لی جائے تو پھر سراج گوٹھ اور کاٹھور کالونی بازار میں جمعہ پڑھنا دُرست ہوجائے گا، اور جن بستیوں میں چالیس یا اس سے زائد مکان ہیں ان میں بھی جمعہ جائز ہوگا، لأن ھٰذا مجتھد فیہ۔

لما فی رد المحتار واذا اتصل بہ الحکم صار مجمعًا علیہ. (شامی ج:۱ ص:۵۳۷)۔[۱]

رشید احمد
دار الافتاء اشرف المدارس
ناظم آباد کراچی
۱۳۹۹/۱/۸ھ

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

ویشترط لصحتہا سبعۃ أشیاء الأول المصر .... وظاھر المذھب أنہ کل موضع لہ أمیر وقاض یقدر علی اقامۃ الحدود. (الدر المختار مع الشامی ج:۱ ص:۵۳۶)۔[۲]

وفی رد المحتار عن أبی حنیفۃ أنہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک وأسواق ولہا رساتیق وفیہا وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمتہ وعلمہ أو علم غیرہ یرجع الناس الیہ فیما یقع من الحوادث وھٰذا ھو الأصح. (شامی ج:۱ ص:۵۳۶)۔[۳]

وفی البحر الرائق فقال المصر فی ظاھر الروایۃ أن یکون فیہ مفت وقاض یقیم الحدود وینفذ الأحکام وبلغت أبنیتہ أبنیۃ منی. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱)۔[۴]

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں مذکورہ بالا جواب دُرست ہے۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	ولی حسن	۱۳۹۹/۱/۱۱ھ
۱۳۹۹/۱/۱۱ھ	جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی	(فتویٰ نمبر ۳۰/۹۴ الف)

(۱) ج:۲ ص:۱۳۸ (طبع سعید)۔
(۲،۳) الدر المختار مع رد المحتار باب الجمعۃ ج:۲ ص:۱۳۷، ۱۳۸۔
(۴) البحر الرائق باب صلوٰۃ الجمعۃ ج:۲ ص:۱۴۰ (طبع سعید)۔

کیا صحراء میں جمعہ فرض ہے؟

سوال:- محترم المقام حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باعثِ تحریر یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک شخص ہے، اس کا مسئلۂ جمعہ میں مندرجہ ذیل نظریہ ہے:-

۱:- نمازِ جمعہ ہر جگہ حتیٰ کہ صحراء میں بھی فرض ہے۔

۲:- بغیر جماعت کے اکیلے بھی اس کو پڑھنا جائز ہے۔

۳:- ائمۂ اربعہ کی شروط قرآن کے خلاف ہیں، کیونکہ قرآن میں جمعہ مطلق اور عام ہے، اس کا کوئی مفسّر مقید اور مخصّص موجود نہیں ہے۔

۴:- جو علماء نمازِ جمعہ کو چھوٹے گاؤں اور صحراؤں میں منع کرتے ہیں وہ خطاکار اور مکروہ وحرام کے مرتکب ہیں۔

۵:- یہ شخص لوگوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جاری کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے جہاں چاروں مذاہب میں جمعہ ناجائز ہے، چنانچہ بعض جگہوں میں جاری ہو بھی گیا ہے۔

الغرض الف:- از رُوئے شرعِ محمدی اس شخص کا کیا حکم ہے؟

ب:- مسئلۂ جمعہ میں صحیح مسلکِ حنفی کیا ہے؟

ج:- علاقے کے علماء کو شخصِ مذکور کے گاؤں کے جمعوں کے متعلق کیا موقف اختیار کرنا چاہئے؟

جواب:- الف:- مذکورہ شخص کا نظریہ ائمۂ اربعہ کے خلاف ہے، چاروں ائمہ میں سے کسی کا بھی وہ مسلک نہیں ہے جو وہ بیان کرتا ہے، بالخصوص ائمۂ اربعہ اور ان کے مقلدین کو اس بارے میں مکروہ یا حرام کا مرتکب بتانا سخت گمراہی کی بات ہے، اس کی بات قابلِ شنوائی نہیں۔

ب:- حنفی مسلک میں جمعہ صرف اس بستی میں جائز ہے جسے عرفاً یا تو شہر کہا اور سمجھا جاتا ہو یا ایسا بڑا گاؤں یا قصبہ ہو جس میں گلی، کوچے اور بازار وغیرہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی عام طور پر ملتی ہوں، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۱۳۷ ویشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب انه كل موضع له أمير وقاض يقدر علیٰ اقامة الحدود. وفی الشامية عن أبی حنيفةؒ انه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر علیٰ انصاف المظلوم من الظالم بحشتمه وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح .... الخ. وكذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶۔

لوگوں کو حنفی مسلک پر عمل کرنا چاہئے، اور مذکورہ شخص کی بات پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۹/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۰/۳۱ د)

ایک قصبے میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- قصبہ شاریاں جس کو اپنے قرب و جوار میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، تجارتی مرکز جبرنی سڑک پر واقع ہے، یونین کونسل کا سینٹر بھی ہے، جس میں ماہوار ایک دو اجلاس ہوتے ہیں، ایک مڈل اسکول، ایک ڈسپنسری، گرلز پرائمری اسکول، ڈاک خانہ وغیرہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت اور رونق ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں جمعہ ہوتا ہے، اب کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ یہاں جمعہ نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ میں اچھی خاصی تعداد لوگوں کی جمع ہوجاتی ہے، اگر لوگوں کو منع نہ کیا جائے تو اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہوجائیں۔ اس میں جمعہ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو اس قصبے میں نمازِ جمعہ دُرست ہے،[1] ڈاک خانہ، تجارتی مرکز اور پھر یونین کونسل کا دفتر ہونا اسے قریہ کی تعریف سے نکال کر مصر کی تعریف میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے جو لوگ منع کرتے ہیں ان کی وجہ معلوم ہوتی تو اس پر کچھ کہا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

جیلوں، چھاؤنیوں اور ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

(میں نے اپنے یمن کے سفرنامے میں جو ''البلاغ'' کے ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ کے شمارے میں شائع ہوا ہے، بر سبیلِ تذکرہ دبئی ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ ادا کرنے کا ذکر کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ ''اذنِ عام'' کی جو شرط فقہائے کرامؒ نے صحتِ جمعہ کے لئے ضروری قرار دی ہے، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس بڑے علاقے میں نماز ادا کی جارہی ہے وہاں کے لوگوں کو جمعہ میں شرکت کی عام اجازت ہو، خواہ اس بڑے علاقے میں باہر کے لوگوں کو انتظامی یا دفاعی اسباب کی بناء پر داخلے کی عام اجازت نہ ہو۔

اس سفرنامے کے شائع ہونے کے بعد بعض حضرات نے مجھے خط میں لکھا کہ اس مسئلے کی تفصیلی وضاحت شائع ہونی چاہئے، میں نے کئی سال پہلے ایک فتویٰ اس موضوع پر لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اسے شائع کردیا جائے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ، چنانچہ ذیل میں وہ فتویٰ

(۱) دیکھئے ص:۵۲۲ کا حاشیہ۔

شائع کیا جارہا ہے۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس فتوے کا اطلاق صرف ایسے ایئرپورٹ پر ہوسکتا ہے جو شہر کے اندر واقع ہو اور اتنا بڑا ایئرپورٹ ہو جس میں افراد کی ایک بڑی جماعت ہر وقت موجود رہتی ہو، دبئی کا ایئرپورٹ ایسا ہی ہے۔)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ جیل خانوں میں قیدی نمازِ جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں متضاد باتیں سامنے آئی ہیں، اس لئے مسئلے کی تفصیلی وضاحت مطلوب ہے، بینوا تؤجروا۔

جواب:- جیل میں جمعہ کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے متقدمین کی کتابوں میں کوئی صریح جزئیہ مذکور نہیں، اسی بناء پر اس مسئلے میں علمائے عصر کے فتوے بھی مختلف رہے، اصل اِشکال کی وجہ یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے جمعہ کے جواز کی شرائط میں اذنِ عام کو بھی ذکر فرمایا ہے، اور چونکہ جیل میں داخلے کا اذنِ عام نہیں ہوتا اس لئے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جمعہ جائز نہیں، ہمارے زمانے میں یہ مسئلہ صرف جیل کا نہیں بلکہ ان تمام فوجی چھاؤنیوں، صنعتی آبادیوں اور ایئرپورٹوں کا بھی ہے جہاں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لئے یہ تحقیق ضروری ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط کس درجے کی ہے؟ اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط اس وقت تھی جب پورے شہر میں جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی کا جمعہ فوت نہ ہو، لیکن جب ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ پڑھنے کا جواز ثابت ہوا اور عملاً متعدّد جگہوں پر جمعہ ہونے لگا تو اَب چونکہ اس بات کا اندیشہ نہیں رہا کہ ''اذنِ عام'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی کا جمعہ فوت ہوجائے گا، اس لئے اب یہ شرط باقی نہیں رہی، یہ حضرات دلیل میں علامہ شامیؒ کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں:-

وكذا السلطان اذا أراد أن يصلّي بحشمه في داره فان فتح بابها وأذن للناس اذنًا عامًا جازت صلاته شهدتها العامة أولا وان لم يفتح أبواب الدار وأغلق الأبواب وأجلس البوابين ليمنعوا عن الدخول لم تجز لأن اشتراط السلطان للتحرز عن تفويتها على الناس وذا لا يحصل الا بالاذن العام اهـ. قلت وينبغي أن يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا في محل واحد، اما لو تعددت فلا لأنه لا يتحقق التفويت كما أفاده التعليل تأمل.

(شامی ج:۲ ص:۱۵۲، طبع سعید)

لیکن اس پر یہ اِشکال ہوتا ہے کہ اگر ''اذنِ عام'' کی شرط کی وجہ سے صرف تفویتِ جمعہ کا خوف ہو تو جس شہر میں متعدّد مقامات پر جمعہ ہوتا ہو وہاں اگر کوئی شخص اپنے ذاتی گھر میں دروازہ بند

کرکے جمعہ کی جماعت کرلے تو وہ بھی جائز ہونا چاہئے، اور یہ کہ جب سے تعدّدِ جمعہ کا رواج ہوا ہے اس وقت سے ''اذنِ عام'' کی شرط کو کتبِ فقہ سے بالکل خارج ہوجانا چاہئے تھا، یا اگر یہ شرط مذکور ہوتی تو ساتھ یہ تصریح بھی ذکر کرنی چاہئے تھی کہ اب یہ شرط واجب العمل نہیں، حالانکہ فقہاء تعدّدِ جمعہ کے رواج کے باوجود اس شرط کو ذکر کرتے چلے آرہے ہیں، یہ اِشکال خاصا قوی ہے لیکن کتبِ فقہ کی مراجعت کے بعد جو صورتِ حال نظر آتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:-

۱:- اذنِ عام کی شرط ظاہر الروایۃ میں موجود نہیں، چنانچہ علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وذکر فی النوادر شرطًا اٰخر لم یذکرہ فی ظاهر الروایة وهو أداء الجمعة بطریق الاشتهار حتی ان أمیرًا لو جمع جیشه فی الحصن وأغلق الأبواب وصلّی بهم الجمعة لا تجزئهم. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے بھی اذنِ عام کو ''شرط'' کے طور پر ذکر نہیں فرمایا، اسی طرح متعدّد فقہاء نے اس شرط کو ذکر نہیں کیا، جن میں شمس الائمہ سرخسیؒ کے اُستاذ علامہ سغدیؒ بھی داخل ہیں، (ملاحظہ ہو: **النتف فی الفتاویٰ** ج:۱ ص:۹۰ **مطبعة الارشاد بغداد**)۔

۲:- نوادر کی اس روایت کے مطابق فقہائے متأخرین نے یہ شرط اپنی کتابوں میں ذکر فرمائی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذنِ عام کے مفہوم میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف رہا ہے، بعض حضرات نے تو اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ فرض ہوا سے اس مقام پر آنے کی اجازت ضروری ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ برجندی وغیرہ سے نقل کرتے ہیں: **أی أن یأذن للناس اذنًا عامًا بأن لا یمنع أحدًا ممن تصح من الجمعة عن دخول الموضع الذی تصلّی فیه وهٰذا مراد من فسر الاذن العام بالاشتهار.** (شامی ج:۲ ص:۱۵۱ طبع سعید)

دُوسری طرف بعض حضراتِ فقہاء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اذنِ عام'' کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس آبادی میں جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی پوری اجازت ہو، خواہ باہر کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ علامہ بحر العلومؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وفی فتح القدیر ان أغلق باب المدینة لم یجز وفیه تأمل فانه لا ینافی الاذن العام لمن فی البلد وأما من فی خارج البلد فالظاهر أنهم لا یجیئون لاقامة الجمعة بل ربما یجیئون للشر والفساد. (رسائل الارکان ص:۱۱۵ طبع قدیم، مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ)

نیز درمختار میں کہا گیا ہے کہ:-

فلا یضر غلق باب القلعة لعدو أو لعادة قدیمة لأن الاذن العام مقرر لأهله وغلقه لمنع

العدو لا المصلّی نعم لو لم یغلق لکان أحسن کما فی مجمع الأنہر.

(الدرالمختار ج:۲ ص:۱۵۲ طبع سعید)

مجمع الانہر میں ہے:-

وما یقع فی بعض القلاع من غلق أبوابہ خوفًا من الأعداء أو کانت لہ عادۃ قدیمۃ عند حضور الوقت فلا بأس بہ لأن الاذن العام مقرر لأھلہ ولٰکن لو لم یکن لکان أحسن کما فی شرح عیون المذھب وفی البحر والمنح خلافہ لٰکن ما قررناہ أولٰی لأن الاذن العام یحصل بفتح باب الجامع وعدم المنع ولا مدخل فی غلق باب القلعۃ وفتحہ ولأن غلق بابھا لمنع العدو لا لمنع غیرہ تدبر. (مجمع الانہر ج:۱ ص:۲۴۶ طبع بیروت)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضراتِ فقہائے کرامؒ نے ''اذنِ عام'' کی شرط کو تفویتِ جمعہ کے خوف پر مبنی قرار دیا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کا پہلا عام مفہوم اس علت کے ساتھ معلول تھا جو تعدّدِ جمعہ کی صورت میں باقی نہیں رہا، لیکن دُوسرا مفہوم اب بھی کافی ہے کیونکہ وہ اس علت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ بقول صاحبِ بدائع ''اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ .... الخ'' کے اشارۃ النص پر مبنی تھا، چنانچہ علامہ شرنبلالیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

قلت أطلعت علٰی رسالۃ للعلامۃ ابن الشحنۃ وقد قال فیھا بعدم صحۃ الجمعۃ فی قلعۃ القاھرۃ لأنھا تقفل وقت صلاۃ الجمعۃ ولیست مصرًا علٰی حدتھا وأقول فی المنع نظر ظاھر لأن وجہ القول بعدم صحۃ صلاۃ الامام بقفلہ قصرہ اختصاصہ بھا دون العامۃ والعلۃ مفقودۃ فی ھٰذہ القضیۃ فان القلعۃ وان قفلت لم یختص الحاکم فیھا بالجمعۃ لأن عند باب القلعۃ عدۃ جوامع فی کل منھا خطبۃ لا یفوت من منع من دخول القلعۃ الجمعۃ بل لو بقیت القلعۃ مفتوحۃ لا یرغب فی طلوعھا للجمعۃ لوجودھا فیما ھو أسھل من التکلف بالصعود لھا وفی کل محلۃ من المصر عدۃ من الخطب فلا وجہ لمنع صحۃ الجمعۃ بالقلعۃ عند قفلھا.

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی ص:۲۷۸ قدیمی کتب خانہ)

اگرچہ علامہ طحطاویؒ نے اس کے تحت علامہ شرنبلالیؒ کی اس بات پر اعتراض فرمایا ہے، لیکن علامہ شرنبلالیؒ کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کا وہ عام مفہوم لینے کی ضرورت نہیں جس کے تحت ہر وہ شخص جس پر جمعہ واجب ہو اس کو وہاں آنے کی اجازت ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی آبادی موجود ہو جس میں گھروں کی یا رہنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہو اور اس آبادی کے تمام لوگوں کو وہاں جمعہ کے لئے آنے کی اجازت ہو تو یہ بات ''اذنِ عام'' کے تحقق کے لئے کافی

ہے، بشرطیکہ اس آبادی کے باہر کے لوگوں کو آنے سے ممانعت کرنے کی وجہ نماز سے روکنا نہ ہو، بلکہ کسی دفاعی یا انتظامی وجہ سے مجرّد داخلے سے روکنا ہو۔

اگر علامہ شرنبلالیؒ کی مذکورہ بالا عبارت کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوگا جو علامہ طحطاویؒ نے وارد فرمایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کی شرط فقہائے حنفیہ کے نزدیک بالکلیہ ختم تو نہیں ہوئی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس آبادی میں (نہ کہ کسی انفرادی گھر میں) جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت ہو، اگر آبادی سے باہر کے لوگوں کو دفاع یا انتظام کے پیشِ نظر اس آبادی سے داخلے سے روکا گیا ہو تو یہ ''اذنِ عام'' کے منافی نہیں بشرطیکہ روکنے کا اصل محرک نماز سے روکنا نہ ہو بلکہ کوئی دفاعی یا انتظامی ضرورت ہو اور اس آبادی سے باہر کے لوگ اس پابندی کی بنا پر جمعہ سے محروم نہ ہوتے ہوں۔

اس پر صرف یہ اِشکال باقی رہتا ہے کہ فقہائے کرامؒ نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ کے دن اپنی علیحدہ ظہر کی جماعت کرنا مکروہ ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ج:۲ ص:۳۵ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ جائز نہیں، ورنہ ان کو ظہر کی جماعت کی حاجت ہی نہ ہوتی۔

لیکن اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ علامہ شامی اور علامہ شرنبلالی رحمہما اللہ کی عبارتوں کی روشنی میں یہ حکم اس دور کا ہے جب جمعہ ایک ہی جگہ سلطان کی قیادت میں ہوتا تھا اور سلطان کی طرف سے دُوسری جگہ اقامتِ جمعہ کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ قیدخانے بھی مختلف نوعیتوں کے ہوتے تھے، ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ قیدخانہ ہو جو کسی ایک ہی گھر یا ایک ہی احاطے پر مشتمل ہو اور اس پر کسی مستقل آبادی کا اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔ ایک اور اِشکال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''بدائع'' میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ:-

السلطان اذا صلّی فی فهندرة والقوم مع أمراء السلطان فی المسجد الجامع قال: ان فتح باب داره وأذن للعامة بالدخول فی فهندرة جاز وتكون الصلوٰة فی موضعین ولو لم یأذن للعامة وصلّی مع جیشه لا تجوز صلوٰة السلطان وتجوز صلوٰة العامة.

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

یہ مسئلہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں مفروض ہے اس کے باوجود سلطان کے ''اذنِ عام'' نہ دینے کی صورت میں نمازِ جمعہ کو غیر منعقد قرار دیا گیا ہے۔

لیکن بظاہر اس صورت سے مراد یہ ہے کہ سلطان اپنے محل میں صرف اپنے لشکروں اور سپاہیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے، اور باقی لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عبارت میں ”ان فتح باب داره .... الخ“ کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا یہاں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا محل اس کی اپنی انفرادی جگہ ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ انفرادی مقامات پر اس وقت تک جمعہ جائز نہیں ہوتا جب تک اسے عام لوگوں کے لئے کھول نہ دیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی ایسی آبادی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں تو اس کو اس جزئیہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:-

۱:- اگر کسی شہر میں جمعہ کی اجازت حاکم کی طرف سے صرف ایک جگہ پڑھنے کی ہو تو جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ ہے اس کو وہاں آکر جمعہ پڑھنے کی عام اجازت ہو، ایسی عام اجازت کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہوگا۔

۲:- اسی طرح اگر کسی کا کوئی انفرادی گھر، محل یا دُکان ہو تو اس میں بھی جمعہ پڑھنا اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک اس گھر، محل یا دُکان میں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دے دی گئی ہو، خواہ شہر میں دُوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو۔

۳:- اگر کوئی آبادی ایسی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں اور وہ شہر کے اندر بھی ہے لیکن دفاعی، انتظامی یا حفاظتی وجوہ سے اس آبادی میں ہر شخص کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ وہاں کا داخلہ ان وجوہ کی بنا پر کچھ خاص قواعد کا پابند ہے تو اس آبادی کے کسی حصے میں ایسی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے جہاں اس آبادی کے افراد کو آکر جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو، مثلاً بڑی جیل، فوجی چھاؤنی، بڑی فیکٹریاں، ایسے بڑے ایئرپورٹ جو شہر کے اندر ہوں اور ان میں سینکڑوں لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں، لیکن ان میں داخلے کی اجازت مخصوص قواعد کی پابند ہے، تو ان تمام جگہوں پر جمعہ جائز ہوگا بشرطیکہ وہ شہر میں داخل ہوں اور اس جیل، چھاؤنی، بڑی فیکٹری، ایئرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن کے تمام افراد کو نماز کی جگہ آکر نمازِ جمعہ پڑھنے کی کھلی اجازت ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۵/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹۲/۱۷ ہ)

ائمہ حرمین کی اقتداء میں کھلے میدانوں میں پڑھی جانے والی جمعہ کی نمازوں کا حکم

سوال:- مسجدِ نبوی کے امام کے پیچھے پاکستان میں کئی لوگوں نے جمعۃ المبارک کی نماز پڑھی ہے، ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- حرمین شریفین کے اماموں کے پیچھے کھلے میدانوں میں جمعہ کی جو نمازیں پڑھی گئیں وہ بلاشبہ ہوگئیں، جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نمازیں نہیں ہوئیں، وہ بالکل غلط کہتے ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۳/۲۷ و)

خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا مقولہ شامل کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سکھر شہر کے ایک بزرگ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی مسجد کے امام صاحب نے خطبۂ جمعہ میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ پہلے خطبے میں تحمید، تسبیح اور چند احادیث پڑھنے کے بعد ان بزرگ کے چند ملفوظات عربی میں ترجمہ کرکے "قال شفیق الأمة" کے عنوان سے پڑھتے ہیں، اس میں خلجان یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اکابرؒ کا انتقال ہوا ہے، مگر کوئی صورت، مذکورہ صورتِ حال کی طرح منظور و مسموع نہیں ہوئی۔ شاید جواز کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن فی نفسہٖ مذکورہ طرزِ عمل پر قلب مضطرب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ فعل آئندہ چل کر غلو فی الدین کا ذریعہ نہ بن جائے اور کہیں یہ طریقہ سلف سے ہٹ کر کسی بدعت کا ذریعہ نہ بن جائے، اس لئے برائے کرم اس کی قابلِ اطمینان حیثیت مدلل طور پر متعین فرما کر ممنون فرمائیں، نیز یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ یہ طرزِ عمل لائقِ اتباع و عمل ہے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ خطبۂ جمعہ میں کسی بزگ کا کوئی مفید مقولہ بیان کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن ہر خطبے میں کسی ایک ہی شخص کے ملفوظات بیان کرنے کا التزام کرنے سے یقیناً غلوّ کا اندیشہ ہے، لہٰذا اسے حکمت اور نرمی سے روکنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۴/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۲۸/۶)

پنج وقتہ نماز کے لئے بنائی گئی جگہ میں جمعہ کا حکم

سوال:- جن مقتدیوں کی نمازِ میّت، امام نہیں پڑھتا، ان لوگوں نے ایک الگ جگہ بنائی ہے جس میں پانچ وقتی نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ دُوسری جگہ جاکر پڑھتے ہیں، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ ان کے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- ہر وہ مسجد جہاں جمعہ کی نماز شرعی شرائط کے مطابق ہوتی ہو، وہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے، لہٰذا ان حضرات کا دُوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا دُرست ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۰/۱۹ الف)

ترکِ سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے
اذانِ اوّل کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم

(سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق حافظ صغیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے درج ذیل فتویٰ جاری کیا گیا۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں حضراتِ علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

۱:- جمعہ کے دن اذانِ اوّل کے بعد فقہائے کرام کے نزدیک "سعی الی الجمعة" واجب ہے، جس کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ نمازی مسجد کی طرف چل پڑے اور مسجد کی طرف چلنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے، اِلَّا یہ کہ جمعہ کی تیاری میں مشغول ہو، یعنی غسل کر رہا ہو، کپڑے تبدیل کر رہا ہو، تیل، سرمہ یا عطر لگا رہا ہو اور پھر اس سے فارغ ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑے۔

نیز اگر کبھی اذانِ اوّل سے قبل جمعہ کی مذکورہ تیاری سے فارغ نہ ہوسکا ہو یا تیاری شروع نہ کرسکا ہو تو اذانِ اوّل پر فوراً تیاری میں مشغول ہوجائے بشرطیکہ خطبے کی اذان سے اتنا قبل فارغ ہوکر مسجد میں پہنچ سکے کہ بہ سہولت سنتیں ادا کرسکے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جمعہ کی تیاری (غسل وغیرہ) کی سنتوں کو موقوف کرکے واجب (مسجد) کی طرف چل پڑے۔

نیز مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ کی مذکورہ تیاری، اذانِ اوّل کے ساتھ شروع کرنے کو عادت نہ بنائے اور یہ جانے کہ تیاری کی صرف اذانِ اوّل کے بعد اجازت ہے، اور اصل یہی ہے

کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کے تحت فوراً مسجد کی طرف چل پڑے کہ یہ عمل واجب ہے اور تاخیر سے واجب کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ ہوگا۔

۲:- یہ بات بھی سب فقہائے کرام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اذانِ اوّل سے قبل یا اذانِ اوّل کے ساتھ کوئی مصلّی تیاری سے فارغ ہوکر بجائے مسجد میں آنے کے گھر میں ہی صلوٰۃ التسبیح، نوافل ادا کرتا ہے یا تلاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دُرود شریف یا دیگر اوراد و وظائف میں یا مطالعے میں مشغول ہوتا ہے یا گھر کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مشغولی ناجائز ہے۔

اب جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اکثر مساجد میں اذانِ اوّل اور اذانِ خطبہ کے درمیان نصف گھنٹہ تا زائد از ایک گھنٹہ بھی وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران ہمارے بلاد اپنے اندر سننے والوں کے لئے پسند و ناپسند کی بہت سی وجوہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقاریر کے سننے اور نہ سننے میں نمازیوں کا ذوق و مزاج مختلف ہوتا ہے، اس لئے اکثر نمازی اس تقریر کئے جانے والے وقت کو دیگر اعمال میں گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بہت سے اس وقت کو خرید و فروخت کے علاوہ دیگر اپنے نجی کاموں کو پورا کرنے میں صَرف کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیا صورتِ مذکورہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ نمازی، جمعہ کی تیاری سے فارغ ہوکر گھر میں ہی تلاوت، صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول رہیں؟ ب:- گھر کے یا نجی کاموں میں شامل رہے اور سنتیں بھی گھر ہی میں ادا کرے اور خطبے کی اذان سے قبل یا خطبے کی اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں پہنچ جائے؟ اگر اس کی گنجائش نہیں تو ایسا کرنے والا کس درجے کا گناہگار ہوتا ہے؟ جواب سے جلد مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی صغیر احمد

احسان منزل امیر معاویہ روڈ راج گڑھ
چوبرجی، لاہور ۵۴۰۰۰
۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ

(اس استفتاء کا دار الافتاء دار العلوم کراچی کی جانب سے یہ جواب دیا گیا جو ماہنامہ ’’البلاغ‘‘ کراچی کے شوال ۱۴۱۵ھ کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔)

جواب:- جن لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے ان کے لئے جمعہ کے دن جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک مفتیٰ بہ قول کے مطابق خرید و فروخت کرنا، سونا، کسی سے باتوں میں مشغول ہونا، یہاں تک کہ بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور کسی کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرنا وغیر ذالک، غرض وہ سارے کام اور مشاغل جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہوں سب کے

سب مکروہِ تحریمی یعنی ناجائز ہیں۔ صرف کھانے کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کھانے کی طرف رغبت اتنی غالب ہو کہ نماز کے دوران دِل اس میں لگا رہنے کا اندیشہ ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذّت ہوجانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ خطبۂ جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اس کے علاوہ جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہیں وہ کئے جاسکتے ہیں، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، لباس پہننا وغیرہ، لیکن قصداً ان کاموں کو اذانِ اوّل تک مؤخر نہ کرنا چاہئے۔

البتہ ایک اہم بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ احادیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے جلد بعد نمازِ جمعہ پڑھ لیتے تھے اور ایسا ہی حضراتِ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بشمول خلفائے راشدینؓ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی، لہٰذا جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اذانِ اوّل شروع ہوئی تو اس اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا تھا، لیکن آج کل نمازِ جمعہ عموماً زوال کے بعد تاخیر سے ادا کی جاتی ہے اور پھر خطبۂ جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہوجانے کی وجہ سے خطبہ و نمازِ جمعہ میں مزید تاخیر ہوجاتی ہے اور اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان بہت وقفہ ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ غفلت پائی جاتی ہے کہ لوگ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کا اہتمام نہیں کرتے کہ ابھی خطبے میں بہت وقت ہے، لوگوں کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا ایک سبب ان کی اپنی کوتاہی اور سستی کے علاوہ مساجد کے منتظمین بھی ہیں، اس لئے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اذانِ اوّل کے بعد جلدی جمعہ ادا کرنے کا اہتمام کریں، کیونکہ اگرچہ نمازِ جمعہ کا اصل وقت (یعنی ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے) ظہر والا ہی ہے، لیکن ظہر کی نماز کی طرح جمعہ میں اِبراد کرنا اَولیٰ نہیں ہے، بلکہ جمعہ میں تعجیل افضل ہے، چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:-

جمعہ و ظہر کا وقت ایک ہے، مگر جمعہ کو ذرا پہلے پڑھنا کہ لوگ سویرے سے آئے ہیں ان کو جلد فراغت ہوجائے تو بہتر ہے، فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۳)

اسی طرح مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہٗ اپنے فتاویٰ عزیز الفتاویٰ میں اس سوال کے جواب میں کہ جمعہ کو سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں یا ڈھائی بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:-

جمعہ میں تعجیل افضل ہے، ایک بجے، سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں۔

(عزیز الفتاویٰ ص:۲۷۴)

اور دُوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ میں تعجیل مستحب ہے، اِبراد یعنی تاخیر جو کہ ظہر کی نماز میں

موسمِ گرما میں مستحب ہے وہ جمعہ میں نہیں ہے، بلکہ جمعہ کو جلد ادا کرنا مستحب ہے، اور احادیث سے بھی جمعہ کی تعجیل ہی ثابت ہوتی ہے، پس زوال کے بعد مثلاً ساڑھے بارہ بجے اذانِ جمعہ ہونی چاہئے، پھر دس پندرہ منٹ بعد خطبہ اور اس کے بعد نماز ہو، چاہئے مثلاً ایک بجے تک یہ سب کام ہوجائیں یا کسی قدر کم وبیش ہو۔ (عزیز الفتاویٰ ص:۲۹۸)

لہٰذا منتظمین کو چاہئے کہ وہ زوال کے بعد جلدی جمعہ ادا کیا کریں اور نیز اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ کیا کریں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اذانِ اوّل کے کافی دیر بعد تقریر شروع کرنے کے بجائے اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے، اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے یا اذانِ اوّل، تقریر کے فوراً بعد ہو، اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ ونماز ہو۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ آج کل معروف نہیں ہے، اس لئے اس کو شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو مسئلہ بتا کر ذہنی طور پر تیار کرلیا جائے تاکہ وقت پر لوگوں کو تشویش نہ ہو، لیکن بہرحال اذانِ اوّل کے بعد گھر کے کام کاج یا گھر میں رہ کر تلاوت یا صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول ہونا، جائز نہیں ہے، اور ایسا کرنے والا مکروہِ تحریمی کا مرتکب ہوگا۔

قال الله تعالٰی: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ"۔[1]

وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۱۶۱ (طبع سعید) ووجب سعی الیھا وترک البیع بالأذان الأوّل وفی الشامیة تحت (قوله وترک البیع) أراد به کل عمل ینافی السعی وخصه اتباعًا للاٰیة نھر.

وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۵ (طبع ایچ ایم سعید) لما روی عن عمرؓ أنه کان یخطب یوم الجمعة فدخل علیه عثمان فقال له أیة ساعة ھذه؟ فقال: ما زدت حین سمعت النداء یا أمیر المؤمنین! علٰی أن توضأت، فقال: والوضوء أیضًا وقد علمت أن رسول الله صلی الله علیه وسلم أمر بالاغتسال.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۳ (طبع سعید) سمع النداء وھو یأکل ترکه ان خاف فوت جمعة أو مکتوبة لا جماعة رستاقی. وفی الشامیة والأکل أی الذی تمیل الیه

(۱) سورۃ الجمعة:۹.

نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر في ترك الجماعة كما مرّ في بابها لٰكن يشكل ما مرّ من وجوب السعي الى الجمعة بالأذان الأوّل وترك البيع ولو ماشيا والمراد به كل عمل ينافي السعي فتأمل.

وفي تقريرات الرافعي بتقييد ما مرّ بما هنا يندفع الاشكال وذٰلك لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذرا في سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلّي يكون عذرا في سقوط واجب السعي اذ لا فرق بين واجب وواجب بخلاف ما اذا خاف فوت الجمعة أو الوقت لفوات الفرض لا لواجب، انتهٰى.

وفي صحيح البخاري ج: ۱ ص: ۱۲۳ (طبع قديمی کتب خانه) عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلّي الجمعة حين تميل الشمس، وعنه أيضًا قال: كنا نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة.

وفي مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵ رقم الحديث:۵۲۱۲)[۱] عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة.

وفي مصنف لابن أبي شيبة (۲: ۶: ۱)[۲] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفانؓ ثم نرجع فنقيل.

وفيه أيضًا (۲: ۸: ۱)[۳] عن أبي رزين قال: كنا نصلّي مع عليؓ الجمعة فأحيانا نجد فيئًا وأحيانا لا نجده.

وفي الدر المختار (ج:۱ ص:۳۶۷)[۴] (وجمعة كظهر أصلا واستحبابا) في الزمانين لأنها خلفه.

وفي الشامية (قوله أصلا) أي من جهة أصل وقت الجواز وما وقع في اٰخره من الخلاف (وقوله استحبابا في الزمانين) أي الشتاء والصيف ح، لٰكن جزم في الاشباه من فن الأحكام انه لا يسن لها الابراد وفي جامع الفتاویٰ لقارئ الهداية: قيل انه مشروع لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها

---

(۱) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامي بيروت).

(۲) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار رقم الحديث:۵۱۲۳ ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۳) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث: ۵۱۴۴ ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) (طبع ايچ ايم سعيد).

مفض الی الحرج ولا کذٰلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اھ۔

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبیداللہ انور میر پوری
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	سحبان محمود	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
			۱۴۱۵/۶/۲۳ھ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

(ان ہی دنوں میں اس مسئلے سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے ایک فتویٰ تحریر فرمایا جو رجب ۱۴۱۵ھ کے رسالہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہوا، یہ فتویٰ درج ذیل ہے۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذانِ اوّل کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے، لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں آجائیں اس لئے ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے ہیں، لوگ اس معصیت سے بچ جائیں اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذانِ اوّل کو تاخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے مابین فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سنتیں پڑھ لیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مثلاً دُوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذان ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو، اُردو میں تقریر اذانِ اوّل سے پہلے ہی ہوجائے اس طرح بہت زیادہ لوگ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے، بعض مساجد میں اس طریقے پر عمل ہو رہا ہے۔

جواب:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال کے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

۱:- المغنی لابن قدامہؒ میں ہے:-

ویبدأ وجوب السعی الیها .... وعند الحنفیة بالأذان الأول عند الزوال. (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

---

(۱) (طبع دار الفکر).

(ترجمہ:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔)

۲:- معارف السنن میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وبالجملة فهٰذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب وكان فى أول وقت الظهر متصلًا بالزوال. (ج:۳ ص:۳۹۶)۔[1]

(ترجمہ:- اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔)

۳:- مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر میں ہے:-

(ويجب السعى وترك البيع بالأذان الأول) عقيب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[2]

(ترجمہ:- جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔)

۴:- عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله زاد النداء الثالث انما سمى ثالثًا باعتبار كونه مزيدًا لأن الأول هو الأذان عند جلوس الامام على المنبر والثانى هو الاقامة للصلوٰة عند نزوله والثالث عند دخول وقت الظهر. (ج:۶ ص:۲۱۱)۔[3]

(ترجمہ:- پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا، کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے جب وہ منبر پر بیٹھا ہوتا ہے، اور دُوسری سے مراد نماز کے لئے اقامت ہے جو امام کے منبر سے اُترنے پر ہوتی ہے، اور تیسری اذان وہ ہے جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے۔)

۵:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وتبين بما مضٰى ان عثمان أحدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة .... الخ. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[4]

(ترجمہ:- سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔)

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۱ ص: ۲۵۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۳) (طبع دار الفكر).
(۴) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).

۶:- تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال بعض العلماء یجب السعی وترک البیع بدخول الوقت لأن التوجه الی الجمعة یجب بدخول الوقت وان لم یؤذن لها أحد ولهٰذا لا یعتبر الأذان قبل الوقت. (ج:۱ ص:۲۲۳)۔[۱]

(ترجمہ:- بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترکِ بیع کا وجوب، جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب، وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، اگرچہ کسی نے بھی اس کے لئے اذان نہ کہی ہو، اسی لئے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔)

۷:- تفسیراتِ احمدیہ میں حضرت مُلّا جیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال الامام الزاهد المراد بالنداء دخول الوقت اذ به یحرم البیع دون الأذان نفسه. (ص:۴۷۵)۔[۲]

(ترجمہ:- امام زاہد نے کہا کہ "نداء" سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے اور عین اذان مراد نہیں ہے۔)

۸:- احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله تعالیٰ وَذَرُوا الْبَيْعَ اختلف السلف فی وقت النهی عن البیع فروی عن مسروق والضحاک ومسلم بن یسار أن البیع یحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهری یحرم بالنداء وقد قیل ان اعتبار الوقت فی ذٰلک أولیٰ اذا کان علیهم الحضور عند دخول الوقت فلا یسقط ذٰلک عنهم تأخیر النداء ولما یکن للنداء قبل الزوال معنی دل ذٰلک علیٰ أن النداء الذی بعد الزوال انما هو بعد ما قد وجب اتیان الصلوٰة. (ج:۵ ص:۶۳)۔[۳]

(ترجمہ:- ارشادِ باری تعالیٰ: "وَذَرُوا الْبَيْعَ" بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ زوالِ آفتاب سے ہی بیع حرام ہوجاتی ہے، مجاہد اور زہری رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اَولیٰ ہے کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لئے حاضری واجب ہوتی ہے، لہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے اس واجب کو ساقط نہیں کرے گا....الخ۔)

اس عبارت سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں:-

---

(۱) (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

(۲) تفسیرات احمدیة سورة الجمعة ص:۷۰۵، ۷۰۶ (مطبع الکریمی، بمبئی).

(۳) (طبع ادارة القرآن کراچی).

الف:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

ب:- بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقتِ زوال سے ہے، تنہا اذان سے نہیں، اگر زوال کے وقت ہی اذان ہو تب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکمِ ممانعت کا تعلق ہوا، اور اگر اذانِ اوّل کو تاخیر سے کہا گیا تو حکمِ ممانعت کا تعلق وقتِ زوال کے ساتھ ثابت ہوگا، اذان کہے جانے تک مؤخر نہیں ہوگا، ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دُشوار نہیں ہوگا کہ اصلاحِ احوال کے لئے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے انتہائی غیر مناسب ہے کہ اس میں ترکِ واجب کے ارتکاب سے بچاؤ تو کیا ہوتا اُلٹا عملی توارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یعنی اذانِ اوّل کی اس کے اصل وقت سے تاخیر۔

جن مساجد میں اذانِ اوّل کو مؤخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کر دیا جائے۔

اصلاحِ احوال کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اذانِ اوّل کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذانِ ثانی کو جہاں تک ہوسکے مقدم کرلیا جائے، لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذانِ اوّل کو سن کر مسجد میں جمع ہوجائیں اور فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھ سکیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے:-

فأحدث عثمان التأذينة الثالثة على الزوراء ليجتمع الناس. (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۱۱)۔[1]

(حضرت عثمانؓ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہوجائیں۔)

اور ایک اور روایت میں ہے: **فأذن بالزوراء قبل خروجه ليعلم الناس ان الجمعة قد حضرت.** (فتح الباری ج:۲ ص:۳۹۴)۔[2]

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دِلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہوجائے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا ہے۔)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہئے، یعنی اذانِ اوّل تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹے بعد اذانِ ثانی کہہ دی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبدالواحد غفرلہٗ
محمد قاسم	عبدالحمید	جامعہ مدنیہ لاہور

---

(۱) (طبع دار الفکر). (۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیه لاهور).

(اس فتویٰ کی اشاعت کے بعد حافظ صغیر احمد صاحب کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کو درج ذیل تحریر بھیجی گئی۔)

محترم و مکرم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہٗ!　　سلامِ مسنون

عرض یہ ہے کہ جناب کے علم میں ہے کہ بندہ ایک کوشش میں مشغول ہے کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے والے مسلمان (بالعموم) اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیانی وقفے پر سعی الی الجمعہ کے منافی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ترکِ واجب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی سلسلے میں ایک استفتاء مرتب کر کے پاکستان کے اہم اہم مدارس سے جواب بھی منگایا، اور جناب کے ہاں سے بھی جواب موصول ہوا تھا، مگر ''انوارِ مدینہ'' کے جلد:۳ شمارہ:۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ (دسمبر ۱۹۹۴ء) میں اسی ذیل میں ایک مضمون (استفتاء اور اس کا جواب) دیکھا جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ حضراتِ مفتیانِ کرام کی خدمت میں اس کو روانہ کر کے رہنمائی چاہوں اور اس کی تیاری بھی کر لی (تیاری کا ایک صفحہ بھی لف ہے) مگر ایک مشفق و محبّ عالم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اپنے اِشکال کے حل کے لئے جناب کی خدمت میں پہلے عرض کر دوں، خدا کرے جناب ہی توجہ فرما کر حل فرماویں، اِشکال یہ ہے کہ:-

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ زوال سے نمازِ جمعہ کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور فضیلت بھی اسی میں ہے کہ اس سے یعنی زوال سے بھی قبل یا زوال پر تیاری شروع کرے، مگر فتویٰ کس پر ہے کہ وجوب سعی الی الجمعہ کا اطلاق زوال کے فوراً بعد ہوگا یا جہاں (جس مسجد میں) جس نمازی نے نماز پڑھنی ہے وجوب کا اطلاق اس نمازی پر اس مسجد کی پہلی اذان سے ہوگا؟ اگر وجوب کا اطلاق زوال سے ہوگا تو پھر سارے عالم کے مسلمانوں کو اس گناہِ کبیرہ سے بچانے کی سعی کیا ہو؟

اُمید ہے جنابِ والا مفتیٰ بہ قول کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔　　(صغیر احمد)

جواب:- (از مفتی عبدالواحد صاحب)

جناب کی جانب سے پہلے جو سوال نامہ آیا تھا اس کا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ واجب اور دُنیوی کاموں میں لگنا یا ایسے شغل میں مشغول ہونا جس سے سعی الی الجمعہ میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے۔

لیکن ایک بات قابلِ غور تھی، اور وہ یہ کہ اذانِ اوّل کا وقت کیا ہے؟ کیا زوال ہوتے ہی کہی جائے یا جب مناسب خیال کیا جائے کہی جائے؟ خواہ زوال کے پندرہ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی زیادہ تاخیر سے۔

اس بات سے نہ تو جناب کے سوال نامے میں کچھ تعرض تھا اور نہ ہی اس کے جواب میں اس سے کچھ بحث کی گئی تھی، ''انوارِ مدینہ'' میں اسی بات کے بارے میں تحقیق پیش کی گئی تھی۔

حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے (لہٰذا اذانِ اوّل کے وقت کے بارے میں یہی مفتیٰ بہ قول ہے) فتح الباری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی تا کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے، معارف السنن کے حوالے سے معلوم ہوا کہ دورِ سلف میں اسی وقت اذان ہوتی تھی اور اسی پر توارثِ عملی چلا آرہا ہے۔

ایک متوارث عمل کو تبدیل کرنا جبکہ:-

۱:- اذانِ اوّل اس لئے شروع ہوئی کہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کے شروع ہونے کا علم ہوجائے۔

۲:- اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے۔

۳:- بعض حضرات کے نزدیک بیع وغیرہ کی حرمت زوالِ شمس سے ہے (اور اس قول کے قوی ہونے کا علم اس سے ہوتا ہے کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تبیین(۱) میں اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اَحکام القرآن(۲) میں یہ قول نقل کر کے نہ تو اس کی تضعیف کی اور نہ ہی اس کے خلاف کیا)۔

۴:- جو مصلحت جناب کے پیشِ نظر ہے، اس کی تفصیل کا متبادل طریقہ موجود ہے، جو کہ ''انوارِ مدینہ'' ہی میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک غیر مناسب اور قابلِ ترک بلکہ واجب الترک اور واجب الاحتراز طریقہ ہے۔

یہ تو ایک اتفاقیہ بات (Accidental) ہوگی کہ اذانِ اوّل زوال ہوتے ہی نہ کہی گئی بلکہ کچھ تاخیر سے کہی گئی ہو اس وقت یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ وجوبِ سعی زوال سے ہو یا اذان سے، لیکن اس اتفاقیہ بات کو ہم عملی معمول نہیں بنا سکتے، عملی معمول وہی ہوگا جو حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ زوال ہوتے ہی اذانِ اوّل کہی جائے اور اس طرح عملاً (Practically) وجوبِ سعی، زوال اور اذانِ اوّل دونوں ہی کے ساتھ مقترن ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد غفرلہٗ

۲۰؍شعبان ۱۴۱۵ھ

---

(۱) تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ج:۱ ص:۲۲۳ (طبع مكتبه امداديه ملتان).

(۲) احكام القرآن، المسئلة السابعة ج:۵ ص:۶۳ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچى).

(اس کے بعد ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہونے والی تحریرات ایک سوال کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو حضرتِ موصوفؒ نے اس کا درج ذیل جواب تحریر فرمایا۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ)

جمعہ کے خطبے سے پہلے تقریر کا متعدّد صحابہ کرامؓ سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جمعہ کے دن خطبے سے پہلے اپنی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جب امام خطبے کے لئے آتے تو وہ اپنی تقریر موقوف کردیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۸ و ج:۳ ص:۵۱۲)۔[1]

قال الحاکم والذھبی صحیح.[2] (از راہِ سنت مولانا محمد سرفراز خان صاحب)۔[3]

اسی طرح اس مستدرک میں حضرت عبداللہ بن بسرؓ کا جمعہ کے دن خطبے سے قبل وعظ کہنا منقول ہے،[4] اور اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج:۱ ص:۱۸۴[5] میں ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے ان کو اجازت دے دی تھی کہ جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کرسکتے ہو۔

مستدرک حاکم اور اصابہ میں ذکر کردہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا معمول خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریر و وعظ کہنے کا تھا۔

اور یہ بھی صحیح احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے بعد جلد نمازِ جمعہ ادا کرلیتے تھے اور یہی طریقہ خلفائے راشدینؓ کا تھا کہ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے: عن أنس بن مالکؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی

---

(۱) وفی المستدرک علی الصحیحین، کتاب معرفۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۵۸۶ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) عن عاصم بن محمد عن أبیہ قال: رأیت أبا ھریرۃؓ یخرج یوم الجمعۃ فیقبض علی رمانتی المنبر قائمًا ویقول: حدثنا أبو القاسم رسول اللہ الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم فلا یزال یحدّث حتّی اذا سمع فتح باب المقصورۃ لخروج الامام للصلوٰۃ جلس، ھٰذا حدیث صحیح الاسناد .... الخ.

(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔

(۳) راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)۔

(۴) دیکھئے مستدرک حاکم، کتاب الجمعۃ ج:۱ ص:۴۲۴، ۴۲۵ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).

(۵) ان روایات کے حوالہ وتفصیل کے لئے راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) مؤلفہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

الجمعة حين تميل الشمس وعنه أيضًا قال: نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة. (ج:۱ ص:۱۲۳)[۱] وفي مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵)[۲] عن عطاء قال: بلغني أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلٰوة. وفي مصنف لابن أبي شيبة (ج:۲ ص:۱۰۶)[۳] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاري عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفان ثم نرجع فنقيل. وفيه أيضًا (ج:۲ ص:۱۰۸)[۴] عن أبي رزين قال: كنا نصلي مع عليؓ الجمعة فأحيانًا نجد فيئًا وأحيانًا لا نجده.

اور فقہائے کرام کی عبارات سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے۔

وفي الشامية لٰكن جزم في الاشباه من فن الأحكام أنه لا يسن لها الابراد وفي جامع الفتاویٰ لقارئ الهداية قيل انه مشروع لأنها تؤدى في وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض الى الحرج ولا كذٰلك الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (ج:۱ ص:۳۶۷)۔[۵]

اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اذانِ اوّل جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی ہے، اس وقت تک تو یہ تقریر اور وعظ یقیناً اذان اور خطبے سے پہلے ہی ہوتی تھی کیونکہ اذانِ ثانی اور خطبے کے درمیان تقریر و وعظ کی نفی صراحۃً اُوپر کی روایات سے ہو رہی ہے، ان میں تصریح ہے کہ جب امام خطبے کے لئے آتا تھا تو یہ تقریر و وعظ موقوف کردیا جاتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جمعہ میں تبکیر کا لحاظ بھی بہت تھا، اکثر لوگ جمعہ میں تبکیر کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے صبح سے ہی مسجد میں آجاتے تھے، تو ان کے لئے وعظ و تقریر اذان سے پہلے ہی مناسب تھی، لیکن جب لوگوں میں سستی ہوئی تو اذانِ اوّل، زوال کے وقت لوگوں کو وقتِ جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی تو اَب کہ جب زوال کے وقت اذانِ اوّل کی ابتداء زوراء پر ہوئی اور اذانِ ثانی عند المنبر خطبے سے قبل ہونے لگی تو معلوم نہیں اس وقت یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں؟

لوگوں کے تکاسل اور سستی پر نظر کرتے ہوئے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء کے بعد ہوتی ہوگی کہ اب تبکیر کی فضیلت کی تحصیل پر لوگ اتنے حریص نہیں رہے تھے

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۲) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامي بيروت)

(۳) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هي أول النهار رقم الحديث:۵۱۲۳ ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث:۵۱۴۴ ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۵) (طبع ایچ ایم سعید).

کہ اذان سے پہلے خود بخود جمع ہوجاتے ہوں، اس لئے ان کو جمع کرنے اور وقتِ جمعہ کے ایذان کے لئے ہی تو یہ اذان علی الزوراء مشروع ہوئی۔

جب لوگوں کا اجتماع اذان کے بعد ہی ہوتا ہو تو پھر اجتماع سے پہلے تقریر و وعظ کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے اور اذان سے پہلے اجتماع کا معمول جب زمان خیر القرون میں کم ہوگیا تھا تو اَب اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

اس لئے ''البلاغ'' کی یہی تجویز متعین اور سلف کے عمل کے موافق ہے کہ ''اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے۔'' (۵۳)

دُوسری تجویز کہ ''اذانِ اوّل تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں، اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ و نماز ہو''، یہ طریقہ علاوہ اس کے کہ معروف نہیں اور اس پر ہر جگہ اور ہر مسجد کے لوگوں کو جمع کیا جانا مشکل ہے، اذانِ اوّل سے پہلے لوگوں کا مسجد میں آنا اس حرص اور دُنیا میں انہماک کے زمانے میں ازبس دُشوار ہے، سلف کے معمول کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور اذانِ اوّل کی مشروعیت سے جو ایذان اور جمعہ کی دعوت تھی اس کے بھی خلاف ہے۔

جمعہ کے لئے اصل داعی اذان ہی ہے، اور ''اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ'' پر ہی ''فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ'' مرتب ہے، اس تجویز ثانی میں اصل داعی وعظ و تقریر ہوگی، لوگ اس کے لئے جمع ہوں گے پھر اس صورت میں تقریر و وعظ کا اذانِ اوّل کے ساتھ اتصال ہوگا، جو معمولِ سلف کے خلاف ہے، ان کا معمول تقریر و وعظ کا اذانِ خطبہ سے پہلے اور اس کے ساتھ اتصال کا تھا، پھر اس صورت میں اذان کا اپنے اصل وقت سے مؤخر کرنا ہے کیونکہ اس کا اصل وقت ''عند الزوال'' ہے، اس تجویز میں پہلے تقریر ہوگی اس کے بعد اذانِ اوّل ہوگی، اذانِ اوّل کو اپنے وقت زوال پر ہی کہنا چاہئے، اس کو اپنی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہئے، جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ و فقہیہ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ہے:-

ا:- ویبدأ وجوب السعی الیها .... عند الحنفیة بالأذان الأوّل عند الزوال. (بحواله الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

---

(۱) (طبع دار الفکر).

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔

۲:- مجمع الأنہر شرح ملتقی الأبحر میں ہے: (ویجب السعی وترک البیع بالأذان الأوّل) عقیب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[1]

جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔

۳:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:-

وتبین بما مضیٰ أن عثمان أحدثہ لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰۃ. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[2]

سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔

۴:- معارف السنن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:-

وبالجملۃ فھٰذا الأذان کان قبل التأذین بین یدی الخطیب و کان فی أول وقت الظھر متصلًا بالزوال. (ج:۴ ص:۳۹۶)۔[3]

اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔ (از "انوارِ مدینہ" لاہور)

مذکورہ بالا حوالہ جات میں فتح الباری کی عبارت سے واضح ہے کہ اذانِ اوّل کی مشروعیت کی غرض ہی یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کو نمازِ جمعہ کے داخل ہونے کی اطلاع ہوجائے، اور دُوسرے حوالوں میں بھی اس اذان کو "عند الزوال"، "عقب الزوال" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ اس اذان کا اصل وقت زوال کے فوراً بعد متصل ہی ہے، کیونکہ عرف میں "عند" اور "عقب" کو گھنٹے کے بعد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، اور علامہ بنوریؒ نے تو "فی أوّل وقت الظھر متصلًا بالزوال" لکھ کر کسی دُوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اس لئے جن مساجد میں اذانِ اوّل کو اس کے اصل وقت سے مؤخر کر کے کہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو ختم کردینا ضروری ہے، کیونکہ یہ عمل توارث اور تصریحاتِ سلف کے خلاف ہونے کے ساتھ اس اذان کی غرضِ مشروعیت کے بھی خلاف ہے، کما مرّ۔

اس لئے پہلی تجویز پر عمل کرنا چاہئے، اذانِ اوّل ظہر کے وقت شروع ہوتے ہی کہہ دی جایا

---

(۱) مجمع الأنہر ج:۱ ص:۱۵۳ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت).

(۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور).

(۳) (طبع ایچ ایم سعید).

کرے اور پندرہ بیس منٹ کا وقفہ نمازیوں کے مسجد میں آنے اور وضو وغیرہ کے لئے مختص کردینے کا اعلان کردیا جائے، اس کے بعد آدھا گھنٹہ مختصر ضروری وقتی مسائل پر مشتمل وعظ ہوجایا کرے، پھر اذانِ ثانی، خطبہ اور نماز ہوجایا کرے، لمبی چوڑی تقریروں اور بے ضرورت مضامین بیان کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے اس کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دِلانے کی ضرورت ہے، نہ یہ کہ اصل وعظ و تقریر ہی کو بند کردیا جائے یا عملِ تواورثِ سلف سے ہٹ کر نیا طریقہ جاری کیا جائے۔

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب کا دِلدادہ گروہ چاہتا ہے کہ ہر ہفتے جو کلمۂ خیر تمام مسلمانوں کے کانوں میں خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑجاتا ہے اس کا موقع نہ رہے، حالانکہ ان مواعظ سے بہت بڑے طبقے کی اصلاح ہورہی ہے اور بکثرت مسلمان اس سے استفادہ کرکے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے ہیں اور یہ بھی ہفتہ وار تبلیغ عام اور عوامی اصلاح کا پروگرام ہے، مگر ہر چیز میں حدودِ شریعت کی پابندی اور اعتدال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور غلوّ سے احتیاط کرنا لازم ہے، خطباء اور مبلغین و واعظین کو اپنے منصب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے ہمارے خطباء اس پر عمل کریں تو یہ "یتخولنا بالموعظة" پر امتثال کا ذریعہ ہوسکتا ہے، آزاد طبقہ اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کئی قسم کے اعتراضات سے اس عملِ خیر پر قدغن لگانا چاہتا ہے، اصل یہ ہے کہ وہ علمائے کرام اور خطبائے عظام کی بات سننا گوارا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطا فرمائیں اور ہمیں اپنی اور سب مسلمانوں کی اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں۔

واللہ اعلم

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

۱۶؍شوال ۱۴۱۵ھ

(یہ تمام تحریرات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، حضرت دامت برکاتہم نے ان سب تحریرات کے مطالعے کے بعد درج ذیل جواب تحریر فرمایا جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی تائیدی دستخط فرمائے۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

الحمدللہ و کفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

احقر نے اس موضوع پر مرسلہ تمام تحریروں کا مطالعہ کیا، ان تمام تحریروں میں احقر اس تحریر سے حرف بہ حرف متفق ہے جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری ہوئی اور "البلاغ" میں شائع ہوئی۔

اصل خرابی یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ جمعہ کو اس کے وقتِ مستحب (تعجیل) سے بہت مؤخر کردیا گیا ہے، اوّلاً اس بات کی ترغیب کی ضرورت ہے کہ تعجیلِ جمعہ کی سنت کو زندہ کیا جائے۔

دُوسرے اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو، جس کی صورت یا تو یہ ہے کہ تقریر زوال سے پہلے کی جائے اور زوال کے متصل بعد اذانِ اوّل اور دس پندرہ منٹ کے بعد اذانِ ثانی ہو، یا پھر تقریر اذانین کے درمیان ہو تو وہ پندرہ، بیس منٹ سے زائد نہ ہو، اور مفصل تقریر جمعہ کے بعد یا زوال سے پہلے ہو، اذانِ اوّل سے پہلے اُردو تقریر کے بارے میں یہ اندیشہ کہ لوگ تقریر سننے نہیں آئیں گے، تجربے سے دُرست ثابت نہیں ہوا۔

جو لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی آجاتے ہیں، اور جو سننا نہیں چاہتے وہ محض اذانِ اوّل کی وجہ سے عموماً نہیں آتے بلکہ اذانِ ثانی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۸/۳۳)

مذکورہ بالا تحریر ناچیز کی رائے میں دُرست ہے اور دار العلوم کراچی کے دار الافتاء سے جو فتویٰ جاری ہوا اور ''البلاغ'' میں شائع ہوا ہے وہ بھی دُرست ہے، البتہ احقر کے نزدیک اذانین کے درمیان وقفہ اگر نصف گھنٹے کا بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں، جس میں بیس پچیس منٹ تقریر اور ۵ منٹ سنتوں کے لئے مل سکتے ہیں، اور لوگوں کے لئے اس میں اِن شاء اللہ دُشواری بھی نہیں ہوگی، اور جو گناہ سے بچنا چاہے گا وہ دُشواری کے بغیر بچ سکے گا۔

سحبان محمود

واللہ اعلم

ناچیز محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۱۵/۱۲/۲۳ھ

﴿فصل فی العیدین﴾
(عیدین کے متعلق مسائل کا بیان)

نمازِ عید کے بعد دُعا مانگی جائے یا خطبے کے بعد؟

سوال:- نمازِ عید کے متصل اگر دُعا نہ مانگی جائے تا کہ ایک ہی دُعا تأخیر سے خطبے کے بعد مانگی جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ بعد خطبے کے کچھ وعظ کر کے بعد میں دُعا مانگی جائے تو کوئی قباحت تو نہ ہوگی؟

جواب:- دُعا، نماز کے متصل بعد ہی مسنون ہے، خطبے کے بعد اجتماعی طور سے دُعا مانگنا کہیں سے ثابت نہیں۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۷/ ۱۸ الف)

تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امامِ اعظمؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف کی تحقیق

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سوال تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف ہے، اس مسئلے میں مفتیٰ بہ قول امام صاحبؒ کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

جواب:- دراصل تکبیرِ تشریق کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان دو مسئلوں میں اختلاف ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کب تک جاری رہے گی؟ اس میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ یومِ عرفہ کی فجر سے یوم النحر کی عصر تک جاری رہے گی۔ اور صاحبینؒ ایامِ تشریق کے آخری دن (یعنی ۱۳/ ذی الحجہ) کی عصر تک واجب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں تو فقہائے حنفیہ

(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے اسی فصل میں صفحہ نمبر ۵۵۲ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

کی بھاری اکثریت نے صاحبینؒ ہی کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔[۱] اور شاید علامہ ابنِ ہمامؒ[۲] اور صاحبِ بدائع[۳] کے سوا معروف فقہائے حنفیہ میں سے کسی نے بھی اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ نہیں دیا۔ اور خود حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مسئلے میں جمہور فقہائے حنفیہ کے مطابق اسی کے قائل ہیں کہ اس مسئلے میں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے۔[۴] اور چونکہ اُمت کا متوارث عمل بھی اسی پر چلا آتا ہے، اور ائمۂ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں اس لئے اس مسئلے میں عمل صاحبینؒ ہی کے قول پر کرنا چاہئے۔

البتہ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے؟ اس میں صاحبینؒ کا قول یہ ہے کہ تکبیر ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر نماز فرض ہے، لہٰذا منفرد، مرد، عورت، مسافر اور گاؤں والوں سب پر تکبیر واجب ہے۔ لیکن امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ صرف مقیم اہلِ شہر پر جماعتِ مستحبہ میں واجب ہے، لہٰذا منفرد، مرد عورت پر، عورتوں کی جماعت پر، مسافروں پر (جبکہ ان کے ساتھ کوئی مقیم نہ ہو) اور گاؤں والوں پر تکبیر واجب نہیں ہے۔ اس مسئلے میں فقہائے حنفیہ کی ترجیحات مختلف ہیں، بعض فقہاء مثلاً صاحبِ بحر، صاحبِ سراج وہاج اور صاحبِ جوہرہ نے اس مسئلے میں بھی صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۶۶) اور بعض نے اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اور بعض فقہاء کی عبارتیں دونوں کو محتمل ہیں۔ اس معاملے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے،[۵] کیونکہ وہ روایۃً و درایۃً اَقویٰ ہے، بہشتی گوہر میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر مسافر اور عورت بھی کہہ لے تو بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا عثمانیؒ کے دلائل قوی ہیں بالخصوص حضرت علیؓ کی حدیث: "**لا جمعة ولا تشريق ولا صلٰوة الفطر والأضحى الا فى مصر جامع**"۔[۶] سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ دُوسری جانب بھی دلائل ہیں، اور بعض فقہاء نے اس کو ترجیح دی ہے، اس لئے اگر کوئی اس پر عمل کرے

---

(۱) وفى الدر المختار قبيل باب الكسوف ج:۲ ص:۱۸۰ .... الٰى عصر اليوم الخامس اخر أيام التشريق وعليه الاعتماد. وفى الشامية (قوله وعليه الاعتماد) هٰذا بناء علٰى أنه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الأصح .... وبه اندفع ما فى الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوى المشائخ بقولهما بحر.

(۲) دیکھئے: فتح القدير ج:۲ ص:۴۸، ۴۹.

(۳) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۵، ۱۹۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۴) دیکھئے: اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۴، ۱۲۵ (طبع ادارة القرآن كراچى).

(۵) راجع اعلاء السنن أبواب العيدين، باب تكبيرات التشريق وانها لا تجب الا علٰى أهل المصر ج:۸ ص:۱۲۸، ۱۲۹ (طبع ادارة القرآن كراچى).

(۶) اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۷ (طبع ادارة القرآن كراچى). (محمد زبیر حق نواز)

تو اس پر بھی نکیر دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ بہشتی گوہر نے عدمِ وجوب کی تقدیر پر بھی اسے بہتر کہا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۱/۳۰ھ

۱:- عرب امارات میں عید پڑھ کر آنے والے کے لئے پاکستان میں دوبارہ نمازِ عید پڑھنے کا حکم

۲:- اور ایسا شخص شوال کے نفلی روزے کب سے شروع کرے؟

سوال:- جناب گرامی قدر .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مشکور ہوں گا اگر مندرجہ ذیل سوالات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیں، جوابی لفافہ شامل ہذا ہے۔

۱:- سائل، ماہِ رمضان میں عرب امارات گیا تھا، وہاں عید کا چاند ایک دن پہلے نظر آیا (یا عید ایک دن پہلے کی گئی)، عید کی نماز پڑھ کر رات کو کراچی (بذریعہ ہوائی جہاز) پہنچا، کراچی میں اگلے دن عید تھی۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا سائل کو یہاں بھی عید کی نماز پڑھنی ضروری تھی یا نہیں؟

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رمضان ختم ہونے کے بعد چھ روزے رکھے جائیں تو اس کا بہت ثواب ہے، اور پورے سال روزے رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ سائل نے عید کی نماز امارات میں ادا کی تھی، اب کراچی میں اسے یہ چھ دن کے روزے کراچی میں عید کے دن سے رکھنے چاہئیں یا کراچی میں عید کا دن گزار کر ابتداء کرے؟ کہا جاتا ہے کہ عید کے دن صرف شیطان روزہ سے ہوتا ہے۔

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں سائل کو کراچی پہنچ کر بھی عید کی نماز میں شامل ہونا چاہئے، اور نمازِ عید ہی کی نیت کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت کا کوئی صریح حکم تو فقہ کی کتب میں نہیں ملا، لیکن اُصول یہ ہے کہ آدمی جس ملک یا شہر میں ہو اسی کے اَحکام کا اعتبار ہوتا ہے۔ لہٰذا کراچی پہنچنے کے بعد اس کے لئے یہ عید ہی کا دن ہے، اس بات کا لحاظ کیا جائے تو عید کی نماز اس کے لئے ضروری ہے۔ لیکن دُوسری طرف وہ ایک مرتبہ عید کی نماز پڑھ چکا ہے، اس کا لحاظ کیا جائے تو ضروری نہیں۔ دونوں احتمالات پر عمل کی محتاط شکل یہی ہے کہ وہ عید کی نماز میں بہ نیتِ عید شامل ہوجائے، تاکہ واجب ہونے کی صورت میں واجب ادا ہوجائے، ورنہ وہ نفل بن جائے گی۔

۲:- شش عید کے روزوں کا متصل ہونا ضروری نہیں[1]، لہٰذا وہ روزے کراچی کے لحاظ سے ۲؍شوال سے شروع کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۲/۴/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸۳/۷۲)

حنفیوں کا غیر مقلد کی اقتداء میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک میدان میں پہلے سے مغربی جانب اہلِ حدیث نمازِ عید پڑھتے ہیں، اب حنفی بھی ایک مشرقی جانب پڑھنے لگے ہیں، اب حنفی کہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پڑھو، اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ہاں بارہ تکبیریں پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے ہاں چھ تکبیریں ہوتی ہیں، لہٰذا تمہارے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ کیا حنفی ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جبکہ باہمی جھگڑے ختم بھی نہ ہوسکیں۔

جواب:- نمازِ عید میں جس تعارض کا ذکر کیا گیا ہے وہ واقعۃً مناسب نہیں، چونکہ اہلِ حدیث حضرات عرصے سے وہاں نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ کسی دُوسری جگہ نماز پڑھیں یا کچھ وقفہ دے کر اسی میدان کے کسی دُوسرے حصے میں نماز ادا کرلیں، اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو باہمی نزاع سے بچنے کے لئے بارہ تکبیروں کے ساتھ نمازِ عید ادا کریں، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک خلافِ اَولیٰ ہے۔

ولو زاد تابعه الٰی ستة عشر لأنه مأثور، وقال الشامی فی اٰخر "مطلب تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة" وذکر فی البحر ان الخلاف فی الأولولیة ونحوه فی الحلیة. (الدر المختار)[2]۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۳۳/ ۱۸ الف)

ایک ہی مقام پر عید کی دو جماعتیں کرانے کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ہم لوگ پاکستان

---

(۱) وفی البحر الرائق کتاب الصوم ج:۲ ص:۲۵۸ (طبع سعید) ومنه أیضًا صوم ستة من شوال عند أبی حنیفة متفرقًا کان أو متتابعًا وعن أبی یوسف کراهته متتابعًا لا متفرقًا، لٰکن عامة المتأخرین لم یروا به بأسًا .... الخ.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۲، ۱۷۳ (طبع سعید) وفی الهندیة الباب السابع عشر فی صلوٰة العیدین ج:۱ ص:۱۵۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) قال محمد رحمه الله فی الجامع اذا دخل الرجل مع الامام فی صلوٰة العید وهٰذا الرجل یری تکبیر ابن مسعود رضی الله عنهما فکبر الامام غیر ذٰلک اتبع الامام الا اذا کبر الامام تکبیرا لم یکبره أحد من الفقهاء فحینئذ لا یتابعه کذا فی المحیط. (محمد زبیر حق نواز)

اسٹیل ملز کراچی لیبر شفٹ میں کام کرتے ہیں، اور ایک شفٹ کی ڈیوٹی سے فراغت کے نصف گھنٹے بعد دُوسری شفٹ ڈیوٹی پر حاضر ہوتی ہے، اس مناسبت سے ہمارے ہاں عیدین کی نمازیں بھی دو مرتبہ ایک ہی جگہ ادا کی جاتی ہیں، جس کی صورت مندرجہ ذیل ہے:-

۱:- ایک ہی جگہ میں ایک مسجد میں دو مرتبہ صلوٰۃِ عید نصف، نصف گھنٹے اور وقفے کے بعد ایک امام کی اقتداء میں ادا کی جاتی ہے، جبکہ امام ایک ہے اور مقتدی پہلی صلوٰۃ میں ایک شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں اور دُوسری مرتبہ اقتداء کرنے والے دُوسری شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں۔

۲:- ایک ہی جگہ اور ایک مسجد میں دو مرتبہ جماعتِ عیدین اس طرح ہوتی ہے کہ اوّل مرتبہ پہلی شفٹ ایک امام کی اقتداء میں اور دُوسری شفٹ دُوسرے امام کی اقتداء میں ادا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جگہ اور ایک مقام میں صلوٰۃِ عیدین کی جماعتِ اوّل اور جماعتِ ثانیہ ایک ہی امام کی اقتداء میں جائز ہے یا ناجائز؟ جبکہ پہلی صورت میں مقتدی تبدیل ہوگئے لیکن امام ایک ہی ہے، اور دُوسری صورت میں امام بھی مختلف اور مقتدی بھی مختلف ہیں، لیکن عیدگاہ و جائے نماز ایک ہے، تو کیا ایک عیدگاہ میں جماعتِ ثانیہ سے صلوٰۃِ عیدین جائز ہوگی یا نہیں؟ اور ان دونوں میں سے کون سی نماز صحیح ہوگی؟

جواب:- مسئولہ دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی ایک ہی امام کے پیچھے دو الگ الگ جماعتیں بالکل جائز نہیں اور اس صورت میں دُوسری جماعت کے لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوگی[۱]، اور دُوسری صورت بھی بغیر شدید اور ناگزیر مجبوری کے اختیار کرنی دُرست نہیں[۲]، لہٰذا یا تو ایک ہی امام کے پیچھے تمام افراد کے بیک وقت نماز ادا کرنے کا انتظام کیا جائے یا اگر دو جماعتیں کسی وجہ سے ناگزیر ہوں تو دو الگ الگ مسجدوں یا عیدگاہوں میں دو الگ الگ اماموں کے پیچھے ادا کی جائیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۸۷/۳۷ ہ)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۹، ۵۸۰ (ولا یصح اقتداء) .... مفترض بمتنفل .... الخ.
نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۵ ص:۲۲۴ (سوال نمبر ۱/۲۶۸۷)۔

(۲) کیونکہ ایک ہی جگہ میں تعدّدِ صلوٰۃِ عید دُرست نہیں۔ وفی البحر الرائق باب العیدین ج:۲ ص:۱۶۲ فاذا فاتت مع امام وأمکنه أن یذهب الیٰ امام اٰخر فانه یذهب الیه لأنه یجوز تعددها فی مصر واحد فی موضعین وأکثر اتفاقًا.
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۴۳۔ (محمد زبیر حق نواز)

جگہ کی تنگی کی بناء پر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- ایک مسجد میں عیدین کے موقع پر جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور مستقل الگ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یا نہ کر سکنے کی وجہ سے عید کی نماز اسی مسجد میں جہاں پہلی جماعت ہوتی ہے، دُوسری جماعت مذکورہ شکایات کی بناء پر جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جگہ کی تنگی کی بناء پر اگر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتیں کر لی جائیں تو عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں، حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''ظاہر عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدّدِ نمازِ عید مطلقاً جائز ہے، ایک موضع میں ہو یا دو موضع میں، جیسا کہ طحطاویؒ حواشی مراقی الفلاح میں لکھتے ہیں: **ولو قدر بعد الفوات مع الامام علی ادراکها مع غیره فعل، للاتفاق علی جواز تعددها**''۔[1] (مجموعۃ الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۴۹)۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۵/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۰/۳۷ ب)

نمازِ عید کے بعد دُعا ہو یا خطبے کے بعد؟

سوال:- عید الفطر کے دن ایک امام صاحب نے جو کہ عالم بھی ہیں، اثناء تقریر میں کہا کہ عیدین کی نمازوں کے سلام پھیرتے ہی دُعا مانگنا سنت ہے، اس بات کی تحقیق میں علم الفقہ دیکھی، اس میں یہ عبارت درج تھی: ''بعد نماز عیدین کے یا بعد خطبے کے دُعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے منقول نہیں، اگر ان حضرات نے کبھی دُعا مانگی ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی، لہٰذا بغرضِ اتباع نہ مانگنا بہتر ہے۔'' (ص:۲۹۰) یہ عبارت مولوی صاحب کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔ بہشتی زیور میں اس کے برعکس عبارت مذکور ہے، یعنی ''صحابہ و تابعین سے منقول نہیں، مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا مسنون ہے اس لئے عیدین میں بھی دُعا مانگنا مسنون ہوگا'' اس کی وضاحت فرمادیں تاکہ اطمینان ہو۔

جواب:- ان مولوی صاحب نے جو بات کہی ہے وہ صحیح ہے، عیدین میں نماز کے بعد دُعا اجتماعی مسنون ہے، خطبے کے بعد مسنون نہیں، حقیقت وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھی ہے کہ اگرچہ خاص عیدین میں نماز کے بعد دُعا مانگنا روایات سے ثابت نہیں،[3] لیکن چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا کرنا ثابت

---

(۱) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۲۹۲ (طبع نور محمد کتب خانہ).

(۲) مجموعہ فتاویٰ عبدالحیؒ ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۳) عید کے اجتماع میں دُعا کا ذکر بخاری شریف ج:۱ ص:۱۳۴ کی اس روایت میں ملتا ہے: **قالت أم عطیة أمرنا أن نخرج فیخرج الحیض والعواتق وذوات الخدور فیشهدن جماعة المسلمین ودعوتهم ویعتزلن مصلاهم** ۔لیکن نماز یا خطبے کے بعد کی کوئی تعیین روایات میں نہیں ملتی، لہٰذا دیگر نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے نمازِ عید کے بعد ہی دُعا کا موقع معلوم ہوتا ہے جیسا کہ دیگر حضراتِ اکابرؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۰۵ تا ۴۰۷، وامداد المفتین ص:۴۰۸ (طبع دار الاشاعت) وفتاویٰ دار العلوم ج:۸ ص:۲۳۱، و ج:۵ ص:۲۳۱۔

ہے اس لئے اس میں عیدین بھی شامل ہیں، اور خطبے کے بعد دُعا کرنے کا ثبوت کہیں نہیں ہے اور اکابرِ دیوبند کا معمول بھی یہی رہا ہے، اور بہشتی زیور فقہی اعتبار سے "علم الفقہ" کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر کتاب ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵۷/۲۸ ب)

نمازِ عید میں تکبیرات چھوڑ کر امام سورۂ فاتحہ شروع کر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عید الفطر کی نماز میں امام صاحب نے نیت باندھ کر ثناء پڑھ کر الحمد شریف پڑھنا شروع کر دیا، اس کے بعد پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا، لقمہ ملنے پر امام صاحب نے الحمد شریف کو روک کر دو زائد تکبیریں کہہ کر پھر سے الحمد شریف شروع کی، ایک تکبیر پھر بھی رہ گئی، کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

جواب:- عید کی تکبیراتِ زوائد واجب ہیں، اگر امام بھول جائے اور انہیں چھوڑ کر سورۂ فاتحہ شروع کر دے تو جب تک قراءت مکمل نہ ہوئی ہو یاد آنے یا کسی کے لقمہ دینے پر تکبیریں کہنی چاہئیں اور تکبیروں کے بعد قراءت ازسرِنو کرنی چاہئے، لہٰذا امام صاحب نے یہ کام تو صحیح کیا کہ سورۂ فاتحہ روک کر تکبیریں کہیں، لیکن ایک تکبیر چھوڑ دی، قاعدے سے اس پر سجدۂ سہو لازم ہونا چاہئے تھا، لیکن عیدین میں سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اس لئے مذکورہ نماز ہوگئی۔

في رد المحتار: ان بدأ الامام بالقراءة سهوًا فتذكر بعد الفاتحة والسورة يمضى فى صلاته، وان لم يقرأ الا الفاتحة كبّر وأعاد القراءة لزوما۔[1]

وفيه أيضًا: ان العود الى التكبير قبل اتمام القراءة ليس لأجل المستحب الذى هو الموالاة، بل لأجل استدراك الواجب الذى هو التكبير (شامى باب العيدين)۔[2]

وفى الدر المختار (والسهو فى صلوٰة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه فى الأولیين لدفع الفتنة كما فى جمعة البحر واقره المصنف وبه جزم فى الدر (شامى باب سجود السهو)۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵۳/۲۷ و)

(۱، ۲) رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۳ (طبع سعید).
(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۹۲ (طبع سعید). (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

﴿فصل فی المسائل الجدیدۃ والمتفرقۃ المتعلقۃ بالصلوٰۃ﴾
(نماز سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

نماز میں اسپیکر کا استعمال

سوال:- احقر کی مسجد میں جمعہ کے دن قریبی خطیب سے شدید آواز تقریر کی سخت مشوش ہے، احبابِ خصوصی کی رائے ہے کہ اگر صرف اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کیا جائے تو تمام نمازیوں کی نماز سکون سے ادا ہوگی۔ ورنہ تمام نمازی خطیب صاحب کی تقریر سے پریشان رہتے ہیں، بعض بزرگانِ دین نماز اور خطبے میں اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کرنا بھی پسند نہیں کرتے، اس لئے احقر بھی نماز اور خطبے میں یہاں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نہ کرتا تھا، لیکن تمام نمازیوں کے اضطراب اور تشویش کے پیشِ نظر آپ سے مراجعت ہے کہ اندرونِ مسجد کے ہارن سے اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ ادا کی جائے تو کیا کوئی شرعی قباحت ہے؟ جبکہ احتیاطاً مکبّرین کا انتظام بھی رکھا جائے کہ اگر خدانخواستہ بجلی فیل ہو تو نماز میں خلل نہ ہو، اور آلۂ مکبّر الصوت وہ ہے جو بٹن کے پاس لگالیتے ہیں۔ والسلام

(المستفتی: مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)
خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ، گلشن اقبال کراچی

جواب:- نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال جائز ہے، اور اس سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی، تاہم اگر کوئی بعض علماء کے اختلاف کی بناء پر احتیاط کرے تو اچھا ہے، لیکن استعمال کرنے والوں پر نکیر نہ کرنی چاہئے، بشرطیکہ وہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہوں۔ مسئلے کی علمی تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''آلاتِ جدیدہ'' میں موجود ہے۔[1]

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اندر کا مکبّر الصوت کھولنے میں شرعی قباحت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۴۰۵/۵/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸/۸۰۹ ج)

---

(۱) اور خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوجاتی ہے؟

سوال:- آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) پر فرض نماز جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیوں؟ کریم آباد بلاک نمبر۴ کی مسجد میں یہ مسئلہ انتہائی نزاعی صورت اختیار کرگیا ہے، دوگرہوں میں شدید کشیدگی ہے۔

جواب:- لاؤڈ اسپیکر پر نماز فرض جائز ہے اور بلاکراہت ہوجاتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، اس مسئلے کے تفصیلی دلائل مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے "آلۂ مکبّر الصوت" میں موجود ہیں، یہ رسالہ "آلاتِ جدیدہ" میں طبع ہوا ہے، تفصیل کے لئے اس کو دیکھ لیا جائے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۱/۲۷ ہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟

سوال:- کیا جہری نمازیں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب:- جب تک ضرورت نہ ہو نماز بغیر لاؤڈ اسپیکر کے پڑھنی چاہئے، لاؤڈ اسپیکر پر نماز کا جواز تو ضرورت کے حالات میں ہے، بلاوجہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال پسندیدہ نہیں، بالخصوص جبکہ اس سے دُور دُور آواز جاتی ہو جہاں لوگ نیند یا دُوسرے کاموں میں مشغول ہوں، تو اس کے استعمال کی کراہت اور بڑھ جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۲/۲۸ ج)

مسجد میں خانۂ کعبہ و مسجدِ نبوی کی تصاویر آویزاں ہوں تو ایسی صورت میں نماز کا حکم

سوال:- اکثر مسجدوں میں کعبہ شریف اور مدینہ منوّرہ کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں، اس حالت میں نماز میں کوئی نقص تو نہیں ہوگا؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن اس کی تصویریں نمازی کے سامنے ہونا کچھ بہتر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

---

(۱) اور خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے شرعی اَحکام

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) تراویح کے لئے اس قدر تیز استعمال ہوتا ہے کہ پورے محلے میں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے، جس میں حسبِ ذیل قباحتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱:- محلے کی خواتین کو نماز ادا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

۲:- محلے کے مریض اور ضعفاء جن کو علاجاً جلد سونا ضروری ہو، نہیں سو سکتے۔

۳:- تلاوت کو ادب سے سماعت کا اہتمام محلّہ والوں سے نہیں ہوتا۔

۴:- سجدۂ تلاوت کا اگر وجوب لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے تو اہلِ محلّہ کے ضعفاء اور خواتین پر سجدۂ تلاوت واجب کرنا اور ان کی طرف سے اس کی ادائیگی کے اہتمام کا فقدان یا مشکل ہونا۔

اس سلسلے میں شریعت کے اَحکام سے ازراہِ کرم مطلع فرمایئے، بینوا توٴجروا۔

العارض

(مولانا) حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ

مدرسہ اشرف المدارس، گلشن اقبال کراچی

جواب:- تراویح میں لاؤڈ اسپیکر اس قدر اُونچی آواز سے استعمال کرنا کہ جس سے سوال میں مذکورہ قباحتیں لازم آتی ہوں، جائز نہیں۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ذکر اللہ اتنی آواز سے کرنا کہ جس سے کسی کی عبادت یا نیند میں خلل آتا ہو صحیح نہیں، نیز مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ نماز میں ہیں اور بہت بلند آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی نماز میں ہیں اور آہستہ آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب دونوں حضرات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور آہستہ تلاوت کر رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اس ذات کو سنادیا ہے جس سے میں سرگوشی کر رہا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور زور سے تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: میں اونگھنے والوں کو بیدار کر رہا تھا اور شیطان کو دھتکار رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! تم اپنی آواز (کچھ) بلند کرو۔ اور

عمرؓ سے فرمایا: اپنی آواز کچھ پست کرو۔ (مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۱۰۷، باب ما یقول اذا قام اللیل)۔[۱]

اس حدیث شریف سے بھی معلوم ہوگیا کہ اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا کہ جس سے بیماروں کے آرام اور خواتین کی نمازوں میں خلل ہوتا ہو صحیح نہیں، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اور لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت کرنا چاہئے۔

قال الشامی: وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی أجمع العلماء سلفًا وخلفًا علٰی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علٰی نائم أو مصل أو قارئ. اھ (ج:۱ ص:۴۴۴)۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۲۱؍ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ[۳]

نماز میں (آلۂ مکبّر الصوت) اسپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت

سوال:- نومبر ۱۹۹۰ء کے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی، ایک چیز نے مجھ کو بڑا مکدّر کیا، وہ تھا نماز کے دوران لاؤڈ اسپیکر کا عدمِ استعمال۔ اس سے اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کی نمازیں خراب ہوئیں، تین دن تک اکثر لوگوں کے سامنے زیادہ تر ایک ہی موضوع زیرِ بحث رہا کہ بھائی میں سجدے میں تھا، اور میں رُکوع میں تھا، اور پتہ نہیں کہ امام صاحب اس وقت کس حالت میں تھے؟ کافی لوگوں نے کئی کئی اوقات کی نمازیں لوٹائیں، مزید یہ کہ خشوع جو نماز کی جان ہے سرے سے مکبّر کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے مفقود ہوجاتا تھا، میرے سمیت اکثر حضرات سجدہ اور رُکوع میں کان لگائے رہتے کہ تکبیر سن سکیں۔ اکثر حضرات کو امام سے پہلے سر اُٹھاکر دیکھتے بھی دیکھا گیا، وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اگلی صف کا کیا حال ہے؟ اتنے بڑے اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر اگر دورانِ نماز استعمال کرلیا جائے تو کیا نماز زیادہ بہتر طریقے پر ادا نہیں ہوگی؟ کیا کچھ شرعی رُخصت اس سلسلے میں نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟

جواب:- نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے مسئلے پر مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مستقل رسالہ ''آلۂ مکبّر الصوت کے شرعی اَحکام'' شائع ہوچکا ہے،[۴] جس میں حضرت

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) رد المحتار فی رفع الصوت بالذکر ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع سعید).
(۳) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)
(۴) ''آلاتِ جدیدہ کے شرعی اَحکام''۔

قدس سرہٗ نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت پر نماز پڑھانے سے نماز بلاکراہت ہوجاتی ہے، اور پاکستان و ہندوستان کے دُوسرے جلیل القدر علماء نے جن میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی فتویٰ کی تصدیق فرمائی ہے۔ البتہ ساتھ ہی حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نماز جتنی سادگی سے ادا کی جائے اور اس میں خارجی آلات کا استعمال جتنا کم سے کم کیا جائے، اور بندے کا براہِ راست تعلق اپنے اللہ سے جتنا بلاواسطہ ہو اتنا ہی بہتر ہے، نیز آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال سے لاؤڈ اسپیکر کے خراب ہوجانے وغیرہ کی صورت میں بعض مفاسد بھی سامنے آئے تھے، اس لئے مذکورہ رسالے میں مشورہ یہی دیا گیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے اس کے بغیر نماز پڑھنی چاہئے، تاہم اگر نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہوجائے گی۔ بعض دُوسرے اہلِ فتویٰ مثلاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے اپنی تحریر میں اور زیادہ توسع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''جبکہ امام کی آواز سامعین کو نہ پہنچتی ہو تو ان کو آواز پہنچادینا غلو نہیں، بلکہ تحصیلِ مقصود ہے، بالخصوص جبکہ تحصیلِ مقصود بآسانی ہو، دُشواری سے نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دُور دُور تک پہنچنا، بناءِ محراب و بناءِ گنبد سے زیادہ آسان ہے، اور بناءِ محراب و بناءِ گنبد بلانکیر مدّتِ مدیدہ سے رائج ہے، اور اس سے بھی رفعِ صوتِ امام مقصود ہے ..... مگر نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دو شرطوں سے جائز ہے، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر اعلیٰ قسم کا ہو کہ امام کو اس کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ توجہ الیٰ غیر اللہ مقصودِ صلوٰۃ کے منافی ہے، دُوسرے مکبّرین کا انتظام مکمل ہو، تاکہ میکروفون فیل ہوجائے تو نماز میں گڑبڑ نہ ہو۔'' (آلاتِ جدیدہ ص:۷)

اس تشریح سے واضح ہوا کہ آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نماز میں ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے، البتہ جہاں مکبّرین سے کسی انتشار کے بغیر کام چلاسکتا ہو، وہاں زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، تاکہ علماء کے قول پر کسی ادنیٰ کراہت کے بغیر نماز ہوجائے۔ لیکن جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، اگر وہ صحیح ہے کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر زیادہ انتشار پیدا ہوا، تو جہاں ایسا اندیشہ ہو، وہاں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال یقیناً زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا اور اس کے ساتھ نماز کے بلاکراہت دُرست ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸/۷/۱۴۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۷/۱۴۱۱ھ)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم اور اسپیکر میں تراویح کے دوران آیتِ سجدہ آنے والی ہو تو کیا کیا جائے؟

سوال:- میں جس مسجد میں قرآن سنا رہا ہوں وہ مسجد چھوٹی ہے، اور امام کی آواز مقتدیوں تک بآسانی پہنچ جاتی ہے، اس کے باوجود آٹھ سال سے اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر تراویح ہو رہی ہے اور اکثریت کی رائے بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر حسبِ سابق تراویح ہوتی رہے لیکن ایک دو آدمی اس کے مخالف ہیں، اور وہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھانے پر زور دیتے ہیں۔

اسی اثناء میں ایک دو روز لاؤڈ اسپیکر خراب رہا تو متصل کی دُکانوں اور ہوٹل سے ریکارڈنگ کی آوازیں اس قدر آتی رہیں کہ تراویح پڑھنا دُشوار ہوگیا، منع کرنے کے بعد بھی وہ نہ مانے، اس کے علاوہ اگر لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ پڑھی جائے تو قریب کی مسجد کی آوازیں بھی خلل انداز ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے، اگر ہم اپنی مسجد میں حسبِ سابق لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھتے رہیں، تو ان خللوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں، لیکن ایک دو آدمی جھگڑا کرتے ہیں کہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھو، کل رات تو اس پر جھگڑے کی نوبت زیادہ آگئی تھی، ان حالات میں شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:- آیتِ سجدہ اگر تراویح کی رکعتوں میں آجائے تو کیا لاؤڈ اسپیکر بند کر کے پڑھنی ہوگی یا حسبِ سابق دُوسری رکعتوں کے، یہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی رہے؟

جواب ا:- سوال میں آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پیشِ نظر لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں،[1] البتہ بہتر یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی پست رکھی جائے کہ مسجد سے باہر دُور تک آواز نہ جائے۔

۲:- اگر مسجد کے باہر آواز نہ جاتی ہو یا بہت ہلکی جاتی ہو تب تو آیتِ سجدہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ لیں، ورنہ آیتِ سجدہ پڑھتے ہوئے امام اپنی آواز نسبۃً پست کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جن دو رکعتوں میں آیتِ سجدہ آنے والی ہو لاؤڈ اسپیکر بند کردیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۱/۲۸ ج)

ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟

سوال:- ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے، بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر؟ نیز یہ بتایئے کہ

---

(۱) تفصیل سابقہ فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

دورانِ سفر اگر قبلے کی طرف رُخ صحیح نہ ہوتو کیا نماز ہوجائے گی؟

جواب:- کھڑے ہوکر ہی پڑھنا واجب ہے،(۱) اور قبلے کی طرف رُخ کرنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ اگر رُخ معلوم نہ ہوتو معلوم کرنے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کریں، اور جس طرف گمان غالب ہو، ادھر رُخ کر کے نماز پڑھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۶۵)

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا جائز ہے

سوال:- ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جہاز میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۶۵)

بے نمازی کا حکم

سوال:- بے نمازی کا کیا حکم ہے؟ سنا ہے بے نمازی کتے سے بھی بدتر ہے؟ کیا اس کا جھوٹا جائز ہے؟

جواب:- بے نمازی فاسق ہے، لیکن کسی مسلمان کو کتے سے بدتر کہنا دُرست نہیں۔(۳)

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۳۸۸/۲/۱۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

■ ■ ■

(۱) وفی تنویر الأبصار ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید) من فرائضها .... ومنها القیام فی فرض لقادر علیه.

(۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۴ تا ۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی مشکوٰۃ المصابیح، باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر.

کتاب الجنائز
(نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے مسائل)

۱:- نمازِ جنازہ پڑھانے میں کس امام کو مقدم کیا جائے گا؟
۲:- مرد نہ ہونے کی صورت میں کیا عورت پر نمازِ جنازہ پڑھنا لازم ہے؟

سوال:- هل امام الجمعة مقدم علیٰ امام مصلی العید لصلوٰة الجنازة أم امام مصلی العید مقدم علیٰ امام الجمعة؟ مع الحوالة.

جواب:- لم أر من صرح بهٰذا والذی ینبغی أن یقدم امام الجمعة لان الرضاء به أتم وأكثر من امام مصلی العید وهو العلة فی التقدیم فی صلوٰة الجنازة، والله اعلم.

سوال:- اذا نقل المیت من موضعه الیٰ موضعة أخریٰ لضرورة فأیها أحق بالامامة؟ امام موضعة المیت أم امام موضعة الذی نقل فیها المیت؟

جواب:- امام الحیّ الذی کان یسکنه المیت أولیٰ من امام الحیّ الذی انتقل الیه لأن علة تقدم امام الحیّ ان المیت رضی بالصلوٰة خلفه حال حیاته فینبغی أن یصلی علیه بعد وفاته کما صرح به الشامیّ فی رد المحتار (۱) والحلبیّ فی شرح المنیة (ص: ۱ ۵۴ (۲)) وهٰذه العلة انما توجد فی امام الحیّ الذی کان المیت یسکنه دون الحیّ الذی انتقل فیه.

سوال:- اذا مات الرجل فی نساء لیس فیها أحد من الرجال فعلی المرأة صلوٰة الجنازة أم لا؟

جواب:- نعم لا مانع من وجوب صلوٰة الجنازة علی النساء اذا لم یکن فی الحیّ رجل غیر أنه لا یجوز لهن غسله وانما علیهن التیمم، لما فی الدر المختار ماتت بین رجال أو هو بین نساء یممه المحرم فان لم یکن فالأجنبی بخرقة. (شامی). (۳)

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنه
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا الله عنه

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۲۰ (طبع ایچ ایم سعید) امام الحیّ وفی الشامیة تحته .... وانّما کان أولیٰ، لأن المیت رضی بالصّلوٰة خلفه فی حال حیاته فینبغی أن یصلّی علیه بعد وفاته .... الخ.
(۲) غنیة المتملّی ص:۵۸۵ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۲۰۱ (طبع سعید).

جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم گن کر میّت کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم

سوال:- میّت کا جنازہ اُٹھاتے وقت ہمارے ہاں عوام میں یہ مروّج ہے کہ چالیس قدم تک گنے جاتے ہیں اور میّت کو اس کا ثواب پہنچایا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر اس کا کوئی جواز ہے؟

جواب:- اس طرح قدم گننے اور ان کا ثواب پہنچانے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۹۶/۳۲ ج)

مردے کو دو مرتبہ غسل دینے کی رسم

سوال:- ہمارے یہاں رواج ہے کہ مردے کو دو مرتبہ غسل دیا جاتا ہے، ایک غسل انتقال کے وقت فوراً قرآن پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور دُوسرا غسل جنازہ ادا کرتے وقت اگر اوّل غسل ٹھیک ہوا بھی ہو، کوئی نجاست وغیرہ ظاہر نہ بھی ہو، تب بھی دُوسرا غسل ضرور دیتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- مردے کو صرف ایک مرتبہ غسل دینا مشروع ہے اور یہ کام وفات کے بعد جلد از جلد ہونا چاہئے،[1] دو مرتبہ غسل دینے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، یہ طریقہ واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۹ ب)

بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کے لئے اس کا چہرہ دیکھنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوجائے تو کیا اس کا خاوند بعد از وصال اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور جنازہ بھی اُٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح عورت اپنے خاوند کے چہرے کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- شوہر کے لئے اپنی بیوی کا چہرہ مرنے کے بعد دیکھنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ اسے چھونے یا غسل دینے سے فقہائے حنفیہ نے منع کیا ہے، اور بیوی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اسے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) یندب دفنہ فی جهة موتہ وتعجیلہ وفی الشامیة تحته (قولہ وتعجیلہ) أی تعجیل جهازہ عقب تحقق موتہ .... الخ.

دیکھ بھی سکتی ہے اور غسل بھی دے سکتی ہے۔

لما فی الدر المختار: ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الأصح، وھی لا تمنع من ذٰلک.(شامی)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۲۹ الف)

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:- آدم جی نگر کی مکہ مسجد کو تعمیر ہوئے ۱۵ سال تقریباً ہوگئے، تب سے جنازے کی نماز مسجد کے میدان میں ہوا کرتی تھی، امام صاحب کی امامت کے آخری ایام میں محراب کے بیچ میں کھڑکی توڑ کر دروازہ بنادیا گیا اور محراب کے باہر چار فٹ اُونچا چبوترہ بنایا گیا، اب چبوترے پر جنازہ رکھ دیا جاتا ہے اور محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھی جاتی ہے، نئے امام صاحب نے جنازے کی نماز کا یہ طریقہ بند کردیا ہے اور پہلے کی طرح نماز کھلے میدان میں ہونے لگی ہے، مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب نے گجراتی کتاب میں جو فتویٰ کی کتاب ہے، لکھا ہے کہ جنازے کی نماز کسی حالت میں مسجد میں پڑھنا مذہبِ حنفی میں مکروہِ تحریمی ہے۔ اب کون سا طریقہ دُرست تھا؟ بہشتی گوہر میں مسئلہ کیا لکھا ہے؟ اور کہا جاتا ہے کہ حرمین میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، آپ واضح فرمائیں کیا حکم ہے؟

جواب:- میّت کو محراب سے باہر رکھ کر اگر نمازِ جنازہ مسجد کے اندر پڑھی جائے تو راجح قول کے مطابق یہ صورت بھی مکروہ ہے، البتہ آس پاس نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے کوئی اور جگہ نہ ہو تو مجبوراً فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں مسجد کے ساتھ مسجد ہی کا کھلا میدان موجود ہے اس لئے جس مسجد کے بارے میں سوال ہے وہاں مسجد کے اندر بلاعذر نماز پڑھنا مکروہ ہے، نئے امام صاحب کا طریقہ دُرست ہے جو نمازِ جنازہ کھلے میدان میں پڑھاتے ہیں، ایسا ہی کرنا چاہئے، لما فی الدر المختار: واختلف فی الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم والمختار الکراھة مطلقًا خلاصة .... وھو الموافق لاطلاق حدیث أبی داوٗد من صلّی علٰی میّت فی المسجد فلا صلوٰة له، (وقال الشامیؒ انما تکره فی المسجد بلا عذر فان کان فلا، شامی)۔[2]

بہشتی گوہر،[3] امداد الفتاویٰ[4] وغیرہ سب میں مسئلہ اسی طرح ہے، اور جب مسجد کے ساتھ کھلی جگہ

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۵، ۲۲۶ (طبع سعید).
(۳) بہشتی گوہر ص:۹۴ مسئلہ نمبر ۱۷ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (۴) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۳۳، ۵۳۴۔

موجود ہے تو مکروہِ تحریمی، مکروہِ تنزیہی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، باہر ہی نماز پڑھنی چاہئے۔ حرمین شریفین کے امام صاحب، مذہب میں حنبلی ہیں، اور حنبلی مذہب کے اندر مسجد میں نمازِ جنازہ جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۳/۲۸ ب)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم (فارسی)

سوال:- درصحن مسجد پنج وقتی یا درصحن جامع مسجد بصورت غیر معتاد نمازِ جنازہ جائز بلاکراہت است یا نہ؟

جواب:- نمازِ جنازہ در مسجد جائز نیست کذا فی کتب الفقہ۔[2] واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے کا حکم

سوال:- میّت کو دفن کرکے لحد میں رکھ دیا، اور لحد میّت کے اُوپر گرگئی، اب اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ لحد صاف کردیں یا کوئی اور قبر کھود کر دفن کریں، اس میّت کے بارے میں غسل اور دوبارہ کفن کا کیا حکم ہے؟

جواب:- غسل تو دوبارہ نہیں دیا جائے گا، لیکن لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قبر پر مٹی نہیں ڈالی گئی تھی تب تو مردے کو نکال کر دوبارہ قبر بنانے کی اجازت ہے۔

لأنه ليس بنبش كما في البدائع، ولو وضع لغير القبلة فان كان قبل اهالة التراب عليه وقد سردوا اللبن ازالوا ذٰلك لأنه ليس بنبش وان اهيل عليه التراب ترك ذٰلك لأن النبش حرام. (بدائع ج:۱ ص:۳۱۹)۔[3]

اور اگر مٹی ڈال دی گئی تھی تو مردے کو منتقل نہ کیا جائے بلکہ اس کو وہیں باقی رکھتے ہوئے لحد کی مرمت کردی جائے۔

---

(۱) وفي المغني لابن قدامة مع الشرح الكبير ج:۲ ص:۳۵۸ (طبع دار الكتاب العربي بيروت) ولا بأس بالصلوٰة على الميّت في المسجد اذا لم يخف تلويثه .... الخ.

(۲) حوالے کے لئے دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲ تا ۴، وامداد المفتین ص:۴۴۵۔ (محمد زبیر)

(۳) (طبع ایچ ایم سعید).

لما فی الدر المختار ولا یخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق آدمی۔[۱]

وفی ردّ المحتار وأما نقله بعد دفنه فلا مطلقًا. (شامی ج:۱ ص:۲۰۲)۔[۲]

اور مرمت کے لئے قبر کو کچھ کھودنا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لما فی تنقیح الحامدیة:-

سئل فیما اذا قرر القاضی زیدا المعماری فی حفر قبور الموتٰی وتعمیرها واصلاحها للاحتیاج لذٰلک لأهلتیه واتقانه، ویرید بعض الحفارین منعه من ذٰلک بلا وجه شرعی فهل یمنع المعارض (الجواب) نعم یمنع. (تنقیح الحامدیة ج:۱ ص:۸)۔[۳]

واللہ اعلم

۲۲/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

میّت کو غسل دینے کے بعد جسم سے خون نکلنے کی صورت میں شرعی حکم

سوال:- میّت کو غسل دینے کے بعد اگر کان سے خون نکل آئے تو رُوئی کا فوس کان میں خون کے بند ہونے کے لئے رکھنا جائز ہے؟ اسی طرح بدن کے دُوسرے اجزاء میں بھی؟

جواب:- غسل دینے کے بعد اگر جسم کے کسی حصے سے خون وغیرہ نکلے تو چونکہ غسل کا لوٹانا واجب نہیں ہے،[۴] اس لئے اسے محض صاف کر دینا کافی ہے، تاہم اگر کان وغیرہ میں رُوئی رکھ دی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ ولا بأس بجعل القطن علٰی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل وأذن وفم. (الدر المختار علٰی هامش الشامی ج:۱ ص:۸۵۳)۔[۵]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۹/۱/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۷۳/۱۹ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- بہت ساری دُشواریوں اور مشکلات کے پیشِ نظر ہر علاقے سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی انجمنیں اور رفاہی سوسائٹیاں بنالیں اور انجمن یا سوسائٹی کے ہر رکن پر باقاعدگی سے ماہوار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۷، ۲۳۸ (طبع سعید).

(۲) شامی ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) (طبع المکتبة الحبیبیة کوئٹه). وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۱۷۰ اذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لما روی أن النبی صلی اللہ علیه وسلم مر بقبر ابنه ابراهیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده وأصلحه ثم قال: من عمل عملًا فلیتقنه. وفی حاشیة اعلاء السنن ج:۸ ص:۲۶۶ (طبع ادارة القرآن) نقلًا عن المغنی لابن قدامة عن ابن عمرؓ أنه کان یتعاهد قبر عاصم ابن عمر، قال نافع توفی ابن له، وهو غائب فقدم فسألنا عنه فدللناه علیه فکان یتعاهد القبر، ویأمر باصلاحه.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۷ (طبع ایچ ایم سعید) ولا یعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه.

(۵) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع مذکور).

چندہ مقرّر کردیا جو باقاعدگی سے دیا اور لیا جاتا ہے، اور ہر انجمن کے سالانہ انتخابات ہوتے ہیں جس میں انتظامیہ کے ممبر چنے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب تمام گاؤں کی سوسائٹیوں اور انجمنوں کو ملاکر پورے علاقے کے نام سے یہاں کراچی میں ایک فیڈریشن بنائی گئی ہے، جس کا نام ''یونائیٹڈ ستّی ویلفیئر فیڈریشن'' ہے، فیڈریشن کو چلانے کے لئے ہر ایک سوسائٹی سے ممبران لئے جاتے ہیں جن کا باقاعدہ کوٹہ مقرّر ہے، اور ہر سوسائٹی فیڈریشن کو مقرّرہ چندہ ماہانہ دیتی ہے اور اس طرح فیڈریشن کا نظام بہ طریقہ احسن چلتا ہے، بعض اوقات فیڈریشن متعلقہ سوسائٹیوں سے ہنگامی چندہ یا رُقوم بھی وصول کرتی ہے۔

اب مندرجہ ذیل دو مسئلے اس کی روشنی میں عنایت فرمادیں۔

۱:- ہماری فیڈریشن کی زیرِ نگرانی اور اخراجات پر اگر خدانخواستہ ہمارے علاقے کا کوئی شخص یہاں کراچی میں حادثاتی یا طبعی موت مرا ہو اور فیڈریشن میں شامل کسی بھی سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر اور رکن ہو اور متعلقہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے تو ایسے شخص کی لاش کو ہماری فیڈریشن پورے کفن اور ضروری چیزوں کے ساتھ اہتمام سے بذریعہ ہوائی جہاز گھر پہنچانے کا انتظام کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی لاش کی دیکھ بھال اور گھر پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لاش اس کے لواحقین کے پاس بحفاظت پہنچائی جائے، یاد رہے کہ ہمارے علاقے کا یہاں سے فاصلہ کم از کم ایک ہزار میل ہے، مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے:-

الف:- کیا یہاں کراچی سے اتنی دُور متوفی کے آبائی گاؤں میں اس کے لواحقین کے پاس لاش کو پہنچانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

ب:- اگر ہے تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

ج:- اگر نہیں ہے تو بھی شرعاً اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب دیتے وقت لاش بھیجنے کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو مدِنظر رکھا جائے، چونکہ بعض اوقات جب علاقے اور قوم کا کوئی شخص یہاں طبعی یا حادثاتی موت کا شکار ہوجاتا تھا تو اپنے کسی شخص یا علاقے کے آدمی سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی بنا پر وہ متوفی لاوارث قرار پاتا اور لاوارث سمجھ کر یہاں ہی دفن کردیا جاتا اور اس کے لواحقین کو کچھ خبر بھی نہ ہوتی۔

نیز علاقے سے متعلق کئی نئے حضرات بسلسلۂ روزگار یہاں کراچی آتے ہیں، لیکن تعلق کا کوئی آدمی نہ ملا یا ملازمت نہ ملی تو بہت پریشانی ہوتی ہے، اپنا آدمی یا کوئی رفاہی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، دریافت طلب یہ ہے کہ اتنے دُور اپنے علاقے میں اپنے گاؤں

کے نادار اور غریب لوگوں کی مدد اس طریقے سے شرعاً جائز ہے؟

جواب:- مردے کو دفن سے پہلے موت کی جگہ سے اُٹھا کر دُوسرے شہر لے جانا مکروہ ہے، البتہ بعض فقہاء نے اس کو جائز بھی کہا ہے، لہٰذا اس عمل کو عام معمول بنالینا دُرست نہیں کہ فتویٰ کراہت ہی پر ہے، البتہ کسی خاص واقعے میں کوئی شدید ضرورت داعی ہو تو بعض دُوسرے فقہاء کے قول پر عمل کرکے میّت کو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به، قیل هٰذا التقدیر من محمد یدل علٰی أن نقله من بلد الٰی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هٰذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الٰی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر .... ولا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری جنائز متفرقات)[1]. وقال الشامی (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقًا وقیل الٰی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أو میلین، لأن مقابر البلد ربما بلغت هٰذه المسافة فیکره فیما زاد، قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (شامی)[2]۔

واللہ اعلم
۱۳۸۹/۸/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۷/۲۸ ج)

نمازِ جنازہ شروع کرنے سے پہلے امام کا نیت وغیرہ بتانا

(دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے ایک صاحب کے فتویٰ پر مستفتی کا اِشکال اور اس کا جواب)

سوال:- آپ کا فتویٰ ۱۴؍ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ کو ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ:-

''اس فعل کو اگر سنت سمجھ کر کیا جائے تو واقعۃً بدعت ہے، اس لئے کہ خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملا، لیکن اس زمانے میں دین کی طرف رغبت بالکل نہیں ہے، لوگوں کو نمازِ جنازہ اور عیدین وغیرہ کی نیت تک نہیں آتی، اس لئے انہیں بتادینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اگر کسی کو مسئلہ بتلانے کے لئے تیمّم کرکے دِکھلایا لیکن دِل میں اپنے تیمّم کرنے کی نیت نہیں ہے بلکہ اس کو دِکھانا مقصود ہے اس کا تیمّم نہ ہوگا، کیونکہ تیمّم ہونے میں تیمّم کرنے کا ارادہ ہونا ضروری ہے، جب ارادہ نہ ہو صرف بتلانا اور دُوسرے کو دِکھلانا مقصود ہو تو تیمّم نہ ہوگا، سائل نے لکھا تھا کہ امام کا نیتِ نمازِ عیدین و جنازہ بتلادینا تلقین من الخارج ہے، اس لئے نماز فاسد ہوتی ہے، اور نیت نماز شروع کرنے سے پہلے بتلائی جاتی

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۲) فتاوی شامیة ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید). میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا مفصل و مدلل فتویٰ آگے ص:۵۷۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ہے، اگر نیت بتلانا جہالت کی وجہ سے کوئی حرج نہیں رکھتا تو پانچ وقت کی نمازوں میں بھی بتلانا چاہئے، جبکہ خیر القرون اور صحابہؓ سے اس کا ثبوت نہیں کہ عیدین و جنازہ کی نماز میں مسلمانوں کو امام نے نیت جہراً اور بلند آواز سے پڑھ کر سنائی ہو، بلکہ نیت کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں، مجھے آپ کا جواب تسلی بخش نظر نہ آیا۔ (خلاصہ از سوال و جواب مستفتی)

جواب:- آپ کی تحریر غور سے بہ نیتِ قبول پڑھی لیکن گزشتہ فتویٰ میں جو بات لکھی تھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہونے کا تعلق ہے، ثابت تو زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا بھی نہیں ہے، اس کے باوجود فقہاءؒ نے تلفظ بالنیۃ کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا ہے۔

فی الدر المختار[1] والتلفظ بها مستحب هو المختار وقيل سنة يعنى أحبه السلف أو سنة علمائنا اذ لم ينقل عن المصطفٰى ولا الصحابة ولا التابعين بل قيل بدعة۔

اس کے ماتحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: وقد استفاض ظهور العمل به فى كثير من الاعصار فى عامة الأمصار فلا جرم انه ذهب فى المبسوط والهداية والكافى الى انه ان فعله ليجمع عزيمة قلبه فحسن فيندفع ما قيل انه يكره. (شامی ج:۱ ص:۲۷۸)[2]۔ اور جب تلفظ بالنیۃ کو بہتر کہا گیا تو اگر امام مقتدیوں کو نیت بتادے تو اس میں شرعاً کوئی اَمر مانع نہیں، اِلَّا یہ کہ اس کو سنتِ نبویہ یا واجب و لازم سمجھ لیا جائے تو وہ بدعت ہوجائے گا، لیکن محض اس خیال سے کہ لوگوں کو الفاظِ نیت معلوم ہوجائیں اگر امام بتادے تو کچھ حرج نہیں، اور امام جب نیت کے الفاظ بتارہا ہو ان الفاظ سے امام کی نیت متحقق نہ ہوگی، بلکہ نماز کے وقت اسے باقاعدہ نیت کرنی پڑے گی، لہٰذا تیمّم کی جو مثال آپ نے دی ہے، وہ اس صورت میں صادق نہیں آتی، هذا ما عندی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۸ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی شخص کا کراچی میں انتقال ہو تو میّت کو پنجاب بھیجنا جائز ہے؟

---

(۱) ج:۱ ص:۴۱۵، ۴۱۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) شامی بحث النية ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع سعيد). وفى اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارة القرآن كراچی) واباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة وما روى عن عمرؓ انه ادب من فعله فهو محمول علٰى انه انما زجر من جهر به فاما المخافتة به فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا ان التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبى صلى الله عليه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على القلوب. وفى الهندية ج:۱ ص:۶۵ ولا عبرة للذكر باللسان فان فعله لتجتمع عزيمة قلبه فهو حسن كذا فى الكافى.

جواب:- دفن سے پہلے میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کے بارے میں فقہائے حنفیہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات اسے جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہِ تحریمی بتاتے ہیں، لہٰذا شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیّت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به قیل هٰذا التقدیر من محمد یدل علٰی أنّ نقله من بلد الٰی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هٰذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الٰی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر لما روی أن سعد بن أبی وقاص مات فی قریة علٰی أربعة فراسخ من المدینة فحمل علٰی اعناق الرجال الیها وقیل لا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری ص:۵۶۳، مسائل متفرقة من الجنائز)[1]۔

واللہ اعلم
۱۳۸۹/۷/۵ھ

میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کا حکم اور مجتہد فیہ اُمور میں نکیر کے درجات

(حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کی تدفین سے متعلق تفصیلی فتویٰ)

باسمه سبحانه وتعالٰی

بقیۃ السلف عارف باللہ محی السنۃ برکۃ العصر محترم المقام واجب الاحترام حضرتِ والا ہردوئی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعدۂ معروض خدمتِ اقدس میں نہایت عاجزانہ اور پُرخلوص گزارش یہ ہے کہ حضرت ہر انسان کا مقدر دُنیا میں آنے سے قبل لکھا جاچکا ہے، یہاں تک کہ اہلِ علم حضرات سے بارہا سنا رُوح قبض ہونے کا وقت و مقام اور جہاں انسان کو دفن ہونا ہے وہاں کی مٹی بھی مقرّر ہے، چاہے انسان دُنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اس کی موت وہاں اس کو کھینچ کر لے جائے گی جہاں دفن ہونا ہے اور وہاں کی مٹی اس کو وہاں کھینچ لے جائے گی۔ اس کی تائید و تصدیق حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد باندویؒ کے وصال سے ہوتی ہے، حضرت کو باندھا (باندہ) سے جب لکھنؤ لے جانے کا فیصلہ ہوا تو حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا: یہ موت کی تکلیف ہے، آگے یہ فرمایا: میرا سلام سب ملنے والوں کو کہہ دینا اور سب

---

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) تفصیل کے لئے اگلا مفصل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

مل کر مدرسہ کا خیال رکھنا۔ اتنا فرما کر ذکر میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد رُوح کو اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کردیا، (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) پھر وہاں سے حضرتِ والا کو ہتھورہ لانے کی تیاری ہونے لگی، اس موقع پر حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انکار فرمایا کہ حضرت کو یہیں دفن کردیا جاوے، اور حضرتِ والا نے بھی اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ حضرت کو ہتھورہ نہ لے جایا جائے، ہزار کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوسکا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت اور مٹی کو اپنے مقام پر کھینچنے میں دخل ہے، ان تمام باتوں پر یقین کے باوجود پھر کوئی انسان اس ضد پر اَڑ جائے کہ جہاں رُوح قبض ہوئی ہے وہیں دفن کیا جائے گا تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں، اور اس بات پر قسم کھالینا کہ میں اس مقام پر کبھی نہیں جاؤں گا جہاں اس کو دفن کیا ہے، اس ضد پر اَڑے رہنا کیا یہ صحیح ہوگا؟ حضرتِ والا سے مؤدّبانہ، عاجزانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم لوگوں کی رہبری فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ خدا حافظ گستاخی معاف

محتاجِ دُعا عبدالخالق
جامع مسجد رسلی کرود بھوپال

مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی کی طرف سے جواب

جواب:- ہر مسلمان کے لئے جیسے تقدیری اُمور پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تشریعی اُمور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، البتہ بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ صرف تشریعی اُمور کا مکلف بنایا ہے، تکوینی اُمور کا مکلف نہیں بنایا ہے، "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"[1]، لہٰذا کسی مسلمان کی موت کہاں ہوئی یا کہاں ہونی چاہئے؟ مسلمان اس کا مکلف نہیں ہے، البتہ موت واقع ہوجانے کے بعد میّت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے؟ اس کو علمائے کرام سے معلوم کرنے کے بعد اس کے موافق معاملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فتاویٰ محمودیہ ج:۲ ص:۴۰۳ (طبع کتب خانہ مظہری) یعنی فتاویٰ حضرت فقیہ الاُمت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ میں ہے: اصل یہ ہے کہ آدمی کا جس بستی میں انتقال ہوا اسی بستی میں اس کو دفن کیا جاوے، اگر اس نے وصیت کی ہو کہ مجھ کو فلاں جگہ دفن کرنا تو اس وصیت پر عمل کرنا لازم نہیں، یہ وصیت باطل ہے۔ **یندب دفنه فی جهة موته أی فی مقابر أهل المکان الذی مات فیه أو قتل** (شامی ج:۱ ص:۶۰۲)[2]۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو انتقال کے بعد دُوسرے مقام پر لے جاکر دفن کیا گیا، جہاں

---

(۱) سورة البقرة:۲۸۶.

(۲) فتاوىٰ شامية مطلب في دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).

انتقال ہوا وہاں دفن نہیں کیا گیا تو حضرت عائشہؓ ایک سفر میں جاتے ہوئے جب ان کی قبر پر گزریں تو فرمانے لگیں: اگر میرا بس چلتا تو تم یہاں دفن نہ کئے جاتے، بلکہ جہاں انتقال ہوا تھا وہیں دفن ہوتے۔
تاہم اس مسئلے میں اتنی تنگی نہیں ہے، امام محمد علیہ الرحمۃ نے میل دو میل کو مقامِ وفات سے حسبِ مصالح دُور لے جاکر دفن کرنے کی بھی گنجائش بتائی ہے، **ولا بأس بنقله قبل دفنه قيل مطلقًا وقيل الى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر.** (فتاویٰ شامی ج:۱ ص:۶۰۲)[1]۔

نیز فتاویٰ دار العلوم میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتیٔ اعظم علیہ الرحمۃ نے اس سوال کے جواب میں کہ نقلِ میّت کیا حرام ہے یا مکروہِ تحریمی یا تنزیہی ہے؟ عباراتِ فقہاء نقل کرکے لکھا ہے کہ: ان عبارات سے واضح ہے کہ قبل دفن نقلِ میّت میں اختلاف ہے، بعض جائز کہتے ہیں، اور بعض ناجائز اور مکروہ، اور ظاہراً مکروہ سے مراد ان کی مکروہِ تحریمی ہے، اور صاحبِ نہر کا اس کو **هو الظاهر** کہنا اس کی ترجیح کو مقتضی ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۸۰، طبع دار الاشاعت کراچی)۔

اور احسن الفتاویٰ یعنی فتاویٰ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کراچی میں تصریح ہے کہ نقلِ میّت مکروہِ تحریمی ہے، نیز آگے کچھ ارشاد ہے: **وقال شمس الأئمة السرخسيؒ وقول محمد في الكتاب لا بأس أن ينقل الميّت قدر ميل أو ميلين بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه**[2] **قاله قاضي خان وقال العلامة الطحطاوي رحمة الله عليه مكروه أي تحريما**[3] **وقد جزم في التاجية بالكراهة وفي التجنيس وذكر أنه اذا مات في بلدة يكره نقله الى أخرىٰ لأنه اشتغال بما لا يفيد وفيه تأخير دفنه وكفىٰ بذٰلك كراهة. البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵**[4]۔

نقلِ میّت میں تأخیرِ تدفین وخطرۂ فسادِ میّت کے علاوہ آج کل مزید مندرجہ ذیل مفاسد پیدا ہوگئے ہیں:-

۱:- اس کا التزام ہونے لگا ہے۔ ۲:- مصارفِ کثیرہ و مشقتِ شدیدہ کا تحمل۔ ۳:- آبائی قبرستان میں دفن کرنے کا التزام اور اس پر اصرار سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقام میں دفن ہونے والی اموات کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ غلط ہے۔ ۴:- جنازے کو منتقل کرنا عموماً نمازِ جنازہ کے تکرار کا سبب بنتا ہے جو ناجائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۱۸)[5]۔

---

(۱) فتاوىٰ شامية مطلب في دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).
(۲) شرح السير الكبير رقم: ۳۰۴ ج:۱ ص:۲۳۶ (طابع مولانا نصر الله منصورؒ).
(۳) حاشية الطحطاوي علىٰ مراقي الفلاح ص:۳۳۷ (طبع نور محمد كتب خانه).
(۴) منحة الخالق علىٰ هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۵) احسن الفتاوىٰ باب الجنائز ج:۴ ص:۲۰۸، ۲۰۹ (طبع ايچ ايم سعيد).

اور بہشتی زیور میں مذکور ہے کہ قبل دفن کے نعش کا ایک مقام سے دُوسرے مقام میں دفن کرنے کے لئے لے جانا خلافِ اَولیٰ ہے، جبکہ دُوسرا مقام ایک دو میل سے زیادہ نہ ہو، اور اگر اس سے زیادہ ہو تو جائز نہیں، اور بعد دفن کے نعش کھود کر لے جانا تو ہر حال میں ناجائز ہے (بہشتی زیور ج:۱۱ ص:۱۰۲)۔

نیز مشکوٰۃ شریف میں ہے: عن جابرؓ قال: لما كان يوم أحد جاءت عمتي بأبي لتدفنه في مقابرنا فنادى منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ الىٰ مضاجعهم۔[1]

اور اسی طرح سننِ ابوداوٗد شریف میں ج:۲ ص:۱۰۲ پر ہے۔[2]

(وقال في شرح هٰذا الحديث) وكذا من مات في موضع لا ينقل الىٰ بلد آخر قاله بعض علمائنا وقال في الأزهار الأمر في قوله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ للوجوب۔ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف ج:۲ ص:۳۷۴،[3] وبذل المجهود ج:۴ ص:۱۹۷۔[4]

ان مذکورہ بالا کتابوں سے واضح ہوا کہ ایک جگہ سے دُوسری جگہ میّت کو منتقل کرنا ناجائز اور منکرِ شرعی ہے، اس کی اصلاح کی سعی ہر ایک کے ذمہ بشرطِ قدرت ہے، جس کی توضیح بھی حضراتِ فقہاء نے فرمائی ہے، اگر عامی شخص ہے تو بشرطِ قدرت کرے اور صبر کرے، اگر مقتداء ہے تو نکیر کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے، اصلاح کی خاطر ترکِ کلام اور ترکِ تعلق بھی کرسکتا ہے اور اس پر قسم بھی کھاسکتا ہے۔ وفي الهداية فان قدر على المنع منعهم وان لم يقدر يصبر وهٰذا اذا لم يكن مقتدىٰ فان كان ولم يقدر علىٰ منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذٰلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين .... الىٰ لقوله تعالىٰ: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، وهذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر. هداية ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)۔

اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی علیہ الرحمۃ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: قوله في ذٰلك شين الدين لأن المقتدىٰ امام في الدين وفعل امام الدين علىٰ خلاف الدين استخفاف بالدين في نظر الناظرين. هامش الهداية ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مذکور)۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ سے ان کی

---

(۱) مشكوٰة المصابيح باب دفن الميّت الفصل الثاني ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع قديمي كتب خانه).
(۲) سنن أبي داوٗد ج:۲ ص:۹۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان).
(۳) مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰة المصابيح رقم الحديث:۱۷۰۴ ج:۴ ص:۱۸۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).
(۴) بذل المجهود كتاب الجنائز ج:۱۴ ص:۱۳۲ (طبع دار الريان للتراث قاهرة).

اصلاح کی خاطر ایک دفعہ ایک ماہ تک ترکِ تعلق رکھا[۱]، اور ابوداؤد شریف جلد دوم ص:۳۴۳[۲] میں ہے کہ حضرت زینبؓ کے حضرت صفیہؓ کو ایک سخت جملہ کہہ دینے کی وجہ سے ان کی اصلاح کی خاطر دو ماہ سے بھی زائد ترکِ تعلق رکھا، اور بخاری شریف جلد دوم ص:۸۹۷[۳] میں ہے کہ: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک جملہ کہہ دینے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے زندگی بھر کلام نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی بہت خوشامد کی اور دُوسرے حضرات سے سفارش کرائی تب حضرت عائشہؓ نے ان کو معاف کیا اور قسم کے خلاف کرنے کی وجہ سے چالیس غلام آزاد کئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے سے ایک جملے کی وجہ سے جس سے حدیث کی مخالفت کا وہم ہوتا تھا، ترکِ تعلق کرلیا، پھر تا حیات ان سے کلام نہیں فرمایا، مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۹۷[۴]۔ پس کسی پر شرعی نکیر کرنا اور ان سے ترکِ تعلق کرنا یا اس کی قسم کھالینا جبکہ وہ اس کے عقیدت مند بھی ہوں اور اُمید ہو کہ وہ اپنی اصلاح کریں گے، بلاشبہ دُرست ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری اور لازم ہے، کما لا یخفی، اور قسم کھاکر پھر مصالح کی بنا پر اس کے توڑنے اور اس کے کفارہ ادا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، اور یہ حدیثِ مذکور سے ثابت ہے۔

تنبیہ:- ضد کہتے ہیں ناحق پر اَڑنے کو، اور کسی دینی مسئلے پر اَڑنا ضد نہیں بلکہ عین اتباعِ شریعت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
العبد شفقت اللہ
۷؍شعبان ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
منظور احمد المظاہری
مفتی مدرسہ جامع العلوم کانپور

الجواب صحیح
ابرار الحق
۸؍شعبان ۱۴۱۸ھ

صح الجواب بلا ارتیاب
محمد حنیف غفرلہٗ

الجواب صحیح
محمد انعام اللہ
مفتی مدرسہ امدادیہ مرادآباد

الجواب صحیح
سبیل احمد غفرلہٗ

الجواب صحیح
فہیم احمد نگینوی
نائب مفتی مدرسہ اشرف المدارس

الجواب صحیح
محمد فاروق غفرلہٗ
مفتی دار العلوم میرٹھ

واصاب المجیب فیما اجاب

احقر کو اس جواب سے حرف بحرف اتفاق ہے، فقط واللہ اعلم

الجواب صواب
محمد عبداللہ پھولپوری

العبد نظام الدین مفتی دار العلوم دیوبند

بندہ کو اس جواب کے ہر ہر جز سے اتفاق ہے
مقصود احمد انبیٹھوی مظاہر العلوم سہارنپوری

---

(۱) الصحیح للبخاریؒ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأیتم الھلال فصوموا .... الخ. رقم الحدیث: ۱۸۱۱ و ۱۸۱۲ ج:۲ ص:۶۷۵ (طبع دار ابن کثیر یمامۃ بیروت)

(۲) أبو داؤد باب ترک السلام علی أھل الأھواء ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الفکر).

(۳) صحیح بخاری شریف باب الھجرۃ ج:۲ ص:۸۹۷ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۴) مشکوٰۃ المصابیح قبیل باب تسویۃ الصفوف ج:۱ ص:۹۷ (طبع مذکور).

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

حامدًا و مصلیًا و مسلمًا، اما بعد! یہ کہ جوابِ استفتاء اَمرِ منکر پر نکیر کرنے کی حد تک مدلل اور اقرب الی التحقیق ہے، البتہ میّت کے دفنانے کے بعد اس مقام پر نہ جانے کا حلف اُٹھانا محتاجِ دلیل ہے، اس لئے کہ منکر کا سبب میّت نہیں، میّت کی تدفین کے بعد مقامِ دفن پر نہ جانے کی قسم سے ضد کا شائبہ ہوسکتا ہے۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

کتبہ
محمد عبدالمجید دین پوری عفی عنہ
دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
۱۴۱۸/۱۱/۲۶ھ

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کا فتویٰ

الجواب باسم ملہم الصواب، ہردوئی سے لکھا ہوا جواب صحیح ہے، بنوری ٹاؤن کے جواب میں جو ضد کے شائبہ کو ظاہر کیا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حالف کا مقصد میّت سے دُشمنی اور اس کے مدفن سے ضد نہیں بلکہ اہلِ میّت کو اس منکر کے ارتکاب پر تنبیہ کرنا اور اس کے غم میں شریک نہ ہونے کا اظہار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
احمد

الجواب صحیح
موسیٰ

عبدالواحد
دار الافتاء والارشاد ناظم آباد
۳/ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

(دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

(مذکورہ بالا تمام فتاویٰ اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کئے گئے، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اس کا جو جواب لکھا وہ درج ذیل ہے۔) (مرتب)

جواب:- سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بحیثیت مسلمان تکوینی اُمور کے مکلف نہیں، بلکہ اَحکامِ شریعت کے مکلّف ہیں، لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ مقدر ہو کہ وہ فلاں جگہ پر دفن ہوگا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جگہ دفن کرنا شرعاً جائز یا مناسب تھا، لہٰذا صورتِ مسئلہ میں یہ استدلال دُرست نہیں ہے کہ چونکہ حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کو اس شہر میں دفن نہیں کیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی بلکہ دُوسرے شہر لے جایا گیا، لہٰذا شرعاً بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ البتہ اصل دار و مدار اس

بات پر ہے کہ شرعاً میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جاکر دفن کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، خود فقہائے حنفیہ کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہ، جن میں سے بعض نے اس کے مکروہِ تحریمی ہونے کی بھی تصریح کی ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ میّت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے جہاں اس کا انتقال ہوا ہو، اور بلاعذر دُوسرے شہر کی طرف منتقل نہیں کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کسی بزرگ نے اس شرعی مسئلے پر عمل کے لئے میّت کو دُوسرے شہر لے جانے سے منع کیا، جبکہ ہمارے زمانے میں اس نقل مکانی پر دُوسرے متعدّد مفاسد بھی مرتب ہونے لگے ہیں تو اس کو موردِ طعن بنانا ہرگز دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ اس بزرگ کی حیثیت ایک مقتدا کی ہو اور وہ لوگوں کی اصلاح اور تربیت کی خاطر ایسا کرے، یہ اور بات ہے کہ شریعت میں نکیر کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں اور کسی غلط بات پر نکیر اس کی نکارت اور مفاسد کے بقدر ہی ہونی چاہئے۔

صورتِ مسئولہ میں نکیر کے لئے جو نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار اور میّت کی قبر پر نہ جانے کی قسم کھانا مذکور ہے، اس میں کوئی بات شرعاً ناجائز نہیں، کیونکہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اس لئے کسی کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کرنے کو جبکہ دُوسرے لوگوں نے اس کی نماز پڑھی ہو، ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی قبر پر جانا کوئی واجب نہیں ہے، اس لئے وہاں نہ جانے کا عزم ظاہر کرنا یا اس پر قسم کھانا ایسا اَمر ہے کہ اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ اس مسئلے میں نکیر جس درجے کی کی گئی وہ زیادہ مناسب تھی یا اس سے کم درجے کی نکیر بھی کافی ہوسکتی تھی؟ تو اس میں آراء مختلف ہوسکتی ہیں، اور مختلف حالات میں اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا جس درجے کی نسبتاً سخت نکیر سوال کے پہلے جواب میں مذکور ہے اس کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اور اس سے نرم درجے کی نکیر بھی اُصولاً جائز اور کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل دلائل سے واضح ہے۔

میت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جانے کا شرعی حکم اور مجتہد فیہ مسائل میں نکیر کے درجات

ورأينا هٰذا مبنى علىٰ ما يأتي:-

ا:- ان المسئلة فيها أقوال مختلفة للفقهاء الحنفية فضلا عن غيرهم من المالكية والحنابلة كما هو ظاهر من العبارات الملحقة.

۲:- من ذهب الى الكراهة فالظاهر من عبارات القوم أنه أراد التنزيهية ولم يصرح

بكونها تحريمية الا الطحطاوى فى حاشيته علٰى مراقى الفلاح ولعله أخذ ذٰلك باطلاق الكراهة وقد صرح من هو أقدم منه بكونه خلاف المستحب كما يظهر من العبارات الملحقة.

۳:- ولئن سلم أن الكراهة تحريمية ولا شك أن العمل به أحوط فلا اقل من أن المسئلة محل خلاف بين الفقهاء الحنفية ومثل هٰذه الأمور المجتهد فيها لا تستحق التشدد فى الانكار كما تستحقه المحرمات القطعية.

۴:- الانكار ينبغى أن يكون علٰى من يرتكب المنكر وينبغى أن يتوجه التأديب اليه ولا شك أن فى الصورة المسئولة انما نقل الميت أهله فلا انكار على الميت فترك الصلوٰة عليه أو الحلف علٰى عدم الذهاب الٰى قبره متوجه الى الميت الذى هو برئ عن عهدة نقله ولا سيما اذا كان عالمًا ورعًا يقتدى به الناس ومن المعروف أن الحلف لا يصار اليه الا عند الضرورة قال فى المحيط الأفضل فى اليمين بالله تعالٰى تقليلها وفى تكثير اليمين المضافة الى المستقبل تعريض اسم الله تعالٰى للهتك.

(طحطاوى على الدر ج:۲ ص:۳۲۴، طبع مكتبة عربيه كوئٹه، وبهشتى زيور ج:۳ ص:۲۶۷)

۵:- وقد أنكرت عائشةؓ علٰى نقل أخيها عبدالرحمٰن بن أبى بكرؓ الٰى غير المكان الذى توفى فيه لٰكنها زارت قبره ولم تترك الزيارة لأجل نقله الٰى ذٰلك المكان.

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۹/۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۹/۲۳)

الجواب صحیح
سحبان محمود

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

اختلاف العلماء فى جواز نقل الميّت

المالكية والحنابلة صرحوا بجواز نقل الميت من بلد الٰى اٰخر قال الدردير فى شرحه لمختصر خليل الشرح الصغير "وجاز نقله أى الميت من مكان الٰى اٰخر وان من بلد لأخر قبل دفنه أو بعده لمصلحة كان يخاف عليه أن يأكله البحر أو السبع وكرجاء بركته للمكان المنقول اليه أو زيارة أهله أو لدفنه بين أهله ونحو ذٰلك (ان لم تنتهك حرمته) بانفجاره أو نتانته.　(ج:۱ ص:۵۶۶، طبع دار المعارف مصر)

وقال ابن قدامةؒ فى المغنى:-

وقال أحمد ما أعلم بنقل الرجل يموت فى بلده الٰى بلد اٰخر بأساً، وسئل الزهرى

عـن ذٰلک فـقـال قـد حمل سعد بن أبی وقاص وسعيد بن زيد من العقيق الى المدينة وقال ابن عيينة مات ابن عمر هنا فأوصى أنه لا يدفن هٰهنا وأن يدفن بسرف. (ج:۲ ص:۳۹۰)[1].

وأما مذهب الشافعية فما جاء فی شرح الاقناع:-

ويحرم نقل الميت قبل دفنه من محل موته الٰی محل أبعد من مقبرة محل موته ليدفن فيه الا أن يكون بقرب مكة أو المدينة أو بيت المقدس.

وفی حاشيته:-

الـمـراد بـالقرب مسافة لا يتغير الميت فيها قبل وصوله والمراد بمكة جميع الحرم ولا يـنبغی التخصيص بالثلاثة بـل لـو كـان بقرب مقابر أهل الصلاح والخير فالحكم كذٰلک لأن الشـخـص يقصد الجار الحسن. (أوجـز الـمسـالـک ج:۴ ص:۲۵۳ طبع اداره تالیفات اشرفیه ملتان) ومثله فی تحفة المحتاج لابن حجر هيتمی. (ج:۳ ص:۲۰۲، ۲۰۳)

اختلاف الأقوال فيما بين الحنفية:

قال فی الدر المختار:-

ولا بأس بنقله قبل دفنه.

وقال ابن عابدين تحته:-

(قـولـه ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقًا وقيل الٰی ما دون مدة السفر وقيده محمد بـقـدر ميل أو ميـلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هٰذه المسافة فيكره فيما زاد قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (ج:۲ ص:۲۳۹ طبع سعيد)

تحقيق كراهة النقل:

قـد مـرّ عن رد المحتار أنه يكره نقل الميت قبل الدفن وذكر الطحطاوی فی حاشيته علٰی مراقی الفلاح (ص:۳۳۷ طبع نور محمد کتب خانه) أنهـا تـحـريمية ولٰكن الظاهر أنه فهم التـحـريـم مـن اطـلاق لـفـظ الـكـراهة ولٰكن يظهر من كتب الفقهاء الحنفية أنهم انما أرادوا الكراهة التی هی ضد المستحب ويظهر ذٰلک من العبارات الاٰتية.

قال العلامة بحر العلوم رحمه الله فی رسائل الأركان:-

الـنـقل بعد نبش القبر كما هو المتعارف اليوم مكروه تحريمًا أشد الكراهة لأن نبش الـقبـر واخراج الميت لا يجوز لأنه قد سلم الى الله تعالٰی وأما قبل النبش فمكروه والأفضل أن

(۱) المغنی لابن قدامة ج:۳ ص:۴۴۳ (طبع دار عالم الكتب، رياض).

لا ينقل. (رسائل الأركان ص: ۱۵۹ طبع قديم مطبع يوسفى فرنگى محل لكهنؤ)

فصرح العلامة رحمه الله بأن النقل بعد الدفن مكروه تحريمًا ثم ذكر مسألة النقل قبل الدفن فأطلق الكراهة ولم يقيدها بالتحريم فظهر أنه أراد به ما هو دون الكراهة التحريمية ولذٰلك أعقبه بقوله: "الأفضل أن لا ينقل".

وانما ذكروه من انه حيث أطلق الكراهة فالمراد به التحريمية ليست بكلية قال ابن عابدينؒ نقلا عن البحر:-

المكروه فى هٰذا الباب نوعان أحدهما ما كره تحريمًا وهو المحمل عند اطلاقهم الكراهة .... ثانيهما المكروه تنزيهًا ومرجعه الٰى ما تركه أولٰى وكثيرًا ما يطلقونه كما فى شرح المنية فحينئذ اذا ذكروا مكروهًا فلا بد من النظر فى دليله فان كان نهياً ظنياً يحكم بكراهة التحريم الا لصارف للنهى عن التحريم الٰى الندب فان لم يكن الدليل نهيًا بل كان مفيدًا للترك الغير الجازم فهى تنزيهية.

(رد المحتار ج: ۱ ص: ۱۳۲ طبع سعيد، قبيل مطلب فى الاسراف فى الوضوء)

وانما استدل علٰى كراهة النقل أولا بما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال فى شهداء أحد: "ردوا القتلٰى الٰى مضاجعهم". (رواه أحمد والترمذى وأبوداوٗد والنسائى)

ولٰكن قال الامام السرخسى رحمه الله فى شرح هٰذا الحديث:-

وهٰذا حسن ليس بواجب وانما صنع هٰذا رسول الله صلى الله عليه وسلم لأنه كره المشقة عليهم بالنقل مع ما أصابهم من القرح. (شرح السير الكبير ج: ۱ ص: ۲۳۴ فقره نمبر ۳۰۱)

والدليل الثانى للكراهة هو حديث عائشةؓ حيث قالت عند زيارة قبر أخيها عبدالرحمٰن ابن أبى بكرؓ الذى نقل من الحبش الٰى مكة: "والله لو حضرتك ما دفنت الا حيث مت" وقد علق عليه الامام السرخسیؒ بقوله:-

وفيه دليل أن الأولٰى أن يدفن القتيل والميت فى المكان الذى مات فيه فى مقابر أولئك القوم. (شرح السير الكبير ج: ۱ ص: ۲۳۶ رقم: ۳۰۳)

واستدل الامام السرخسیؒ بحديث عائشةؓ علٰى أن الأولٰى عدم النقل والنقل خلافه فهو مكروه تنزيهًا.

وانما أخذ الفقهاء الحنفية الكراهة من قول الامام محمدؒ فى السير الكبير ولو نقل ميلًا أو ميلين أو نحو ذٰلك فلا بأس به فاستنبطوا من هٰذا القول أن النقل الٰى ما زاد مكروه

ولذلک قال السرخسی رحمه الله:-

وفی هٰذا بیان أن النقل من بلد الٰی بلد مکروه لأنه قدر المسافة التی لا یکره النقل فیها بمیل أو میلین وهٰذا لأنه اشتغال بما لا یفید فالأرض کلها کفات للمیت قال الله تعالٰی: اَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَآءً وَّأَمْوَاتًا. إلا أن الحی ینتقل من موضع الٰی موضع لغرض له فی ذٰلک وذٰلک لا یوجد فی حق المیت ولو لم یکن فی نقله الا تأخیر دفنه أیا ما کان کافیا فی الکراهة. (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۳۶، ۲۳۷ فقره نمبر ۳۰۴)

وقد سبق أن الامام السرخسیؒ جعل عدم النقل أولٰی فظاهر أن مراده من الکراهة هنا التنزیهیة وما یدل علٰی کون الکراهة تنزیهیة أن کثیرًا من الفقهاء صرحوا بعدم الإثم فی النقل ومن مقدمتهم صاحب الهدایة کما ذکره ابن الهمامؒ عنه فقال:-

قال المصنف فی التجنیس: فی النقل من بلد الٰی بلد لا اثم، ثم ذکر عن صاحب الهدایة نفسه أنه قال:-

اذا مات فی بلدة یکره نقله الٰی أخریٰ لأنه اشتغال بما لا یفید.

(فتح القدیر ج:۲ ص:۱۰۱، ۱۰۲ طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)

فظهر بهٰذا أن المراد بالکراهة ما یجتمع مع عدم الاثم وهو الکراهة التنزیهیة لذٰلک ذکر کثیر من الفقهاء عدم الإثم بدون التصریح بالکراهة وانما ذکروا أن المستحب أن یدفن فی المکان الذی مات فیه.

قال ابن نجیمؒ:-

ولم یتکلم المصنف علٰی نقل المیت من مکان الٰی اٰخر قبل دفنه قال فی الواقعات والتجنیس: القتیل أو المیت یستحب لهما أن یدفنا فی المکان الذی قتل أو مات فیه فی مقابر أولٰئک القوم لما روی عن عائشة رضی الله عنها أنها زارت قبر أخیها عبدالرحمٰن بن أبی بکرؓ وکان مات بالشام وحمل من هناک فقالت: لو کان الأمر فیک بیدی ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. لٰکن مع هٰذا اذا نقل میلًا أو میلین أو نحو ذٰلک فلا بأس وان نقل من بلد الٰی بلد فلا إثم فیه. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ طبع رشیدیه کوئٹه)

وقال العلامة الأفندی فی مجمع الأنهر:-

ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فی مقابر أولٰئک المسلمین وإن نقل قبل الدفن إلی قدر میل أو میلین فلا بأس به وکذا لو مات فی غیر بلده

یستحب ترکه فان نقل الیٰ مصر اٰخر فلا بأس به. (مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۸۷).[۱]

وراجع أیضًا فتاویٰ تاتارخانیة ج:۲ ص:۱۷۵ (طبع ادارة القرآن) وتعلیق الشیخ أبی الوفاء الأفغانی علیٰ کتاب الأٰثار ج:۲ ص:۲۰۴.[۲]

ولقد أطال الشیخ علیّ القاری رحمه الله وأحسن فی التوفیق بین العبارات بعبارة نوردها بتمامها:-

أما اذا أرادوا نقله قبل الدفن أو تسویة اللبن فلا بأس بنقله نحو میل أو میلین قال فی التجنیس لأن المسافة الی المقابر قد تبلغ هٰذا المقدار وقال السرخسیؒ قول محمد بن سلمة ذٰلک دلیل علیٰ أن نقله من بلد الیٰ بلد مکروه والمستحب أن یدفن کل فی مقبرة البلدة التی مات بها، ونقل عن عائشةؓ أنها قالت حین زارت قبر أخیها عبدالرحمٰن وکان مات بالشام وحمل منها: ولو کان الأمر فیک الیّ ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. ثم قال فی التجنیس فی النقل من بلد الیٰ بلد لا إثم لما نقل أن یعقوب علیه الصلوٰة والسلام مات بمصر ونقل عنه الی الشام وموسیٰ علیه الصلوٰة والسلام نقل تابوت یوسف علیه الصلوٰة والسلام بعد ما أتی علیه زمان من مصر الی الشام لیکون مع اٰبائه ولا یخفیٰ أن هٰذا شرع من قبلنا ولم تتوفر فیه شروط کونه شرعًا لنا إلا انه نقل عن سعد بن أبی وقاص أنه مات فی ضیعة علیٰ أربعة فراسخ من المدینة فحمل علیٰ أعناق الرجال الیها وفیه أنه نقل حین موته لا بعد دفنه فلا دخل له فی القضیة ویمکن أن یحمل نقل یعقوب ویوسف عن عذر وأیضًا فلا تنافی بین الإثم والکراهة اذا الکراهة محمولة علی التنزیه وهو خلاف الأولیٰ الا لعارض قال صاحب الهدایة وذکر أن من مات فی بلدة یکره نقله الیٰ أخریٰ لأنه اشتغال بما لا یفید بما فیه تأخیر دفنه وکفیٰ بذٰلک کراهة قلت فاذا کان یترتب علیه فائدة من نقله الیٰ أحد الحرمین أو الیٰ قرب قبر أحد من الأنبیاء أو الأولیاء أو لیزوره أقاربه من ذٰلک البلد وغیر ذٰلک فلا کراهة إلا ما نص علیه من شهداء أحد أو من فی معناهم من مطلق الشهداء والله اعلم. (مرقات ج:۴ ص:۷۳).[۳]

مسئلة النکیر علی الأمور المجتهد فیها

قد صرح غیر واحد من الفقهاء والمحدثین بأنه لا ینبغی التشدد فی النکیر علی الأمور التی اختلف فیها الفقهاء. فی الأحکام السلطانیة للماوردی ص:۳۱۵:-[۴]

---

(۱) مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۷۶ (طبع دار الکتب العلمیه، بیروت).
(۲) (طبع مذکور).
(۳) مرقاة شرح مشکوٰة ج:۴ ص:۱۸۳، ۱۸۴ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).
(۴) ص:۲۵۳ (طبع دفتر تبلیغات اسلامی حوزه علمیه قم).

أما المعاملات المنكرة كالزنا والبيوع الفاسدة وما منع الشرع منه مع تراضي المتعاقدين به اذا كان متفقًا علىٰ حظره فعلي والي الحسبة انكاره والمنع منه والزجر عليه وأمره في التأديب مختلف بحسب الأحوال وشدة الحظر وأما ما اختلف الفقهاء في حظره واباحته فلا مدخل له في إنكاره إلا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كربا النقد فالخلاف فيه ضعيف وهو ذريعة إلى ربا النساء المتفق علىٰ تحريمه فهل يدخل في انكاره بحكم ولايته أو لا؟ علىٰ ما قدمناه من الوجهين وفي معنى المعاملات وان لم تكن منها عقود المناكح المحرمة ينكرها ان اتفق العلماء علىٰ حظرها ولا يتعرض لإنكارها ان اختلف الفقهاء فيها الا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كالمتعة فربما صارت ذريعة إلىٰ استباحة الزنا.

وفي المرقاة ج:۸ ص:۸۶۳ (طبع مكتبه حقانيه پشاور): وما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه لأن انكاره علىٰ ذٰلک للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه الأئمة وأما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وينبغي للآمر والناهي أن يرفق ليكون أقرب الى تحصيل المطلوب.

وفي شرح مسلم للنوويؒ ج:۱ ص:۵۱ (طبع قديمي كتب خانه): ثم انه انما يأمر وينهىٰ من كان عالمًا بما يأمر به وينهىٰ عنه وذٰلک يختلف باختلاف الشئ فان كان من الواجبات الظاهرة والمحرمات المشهورة كالصلوٰة والصيام والزنا والخمر ونحوها فكل المسلمين علماء بها وان كان من دقائق الأفعال والأقوال ومما يتعلق بالاجتهاد ولم يكن للعوام مدخل فيه ولا لهم انكاره بل ذٰلک للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه أما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وهٰذا هو المختار عند كثير من المحققين أو أكثرهم وعلى المذهب الاٰخر المصيب واحد والمخطئ غير متعين لنا والإثم مرفوع عنه لٰكن ان مذهبه علىٰ جهة النصيحة إلى الخروج من الخلاف فهو حسن محبوب مندوب إلىٰ فعله برفق فان العلماء متفقون على الحث على الخروج من الخلاف اذا لم يلزم منه اخلال بسنة أو وقوع في خلاف اٰخر وذكر أقضى القضاة أبو الحسن الماوردي البصري الشافعي في كتابه الأحكام السلطانية خلافا بين العلماء في أن من قلده السلطان الحسبة هل له أن يحمل الناس علىٰ مذهبه فيما اختلف فيه الفقهاء اذا كان المحتسب من أهل الإجتهاد أم لا يغير ما كان علىٰ مذهب غيره والأصح أنه لا يغير لما ذكرناه ولم يزل الخلاف

فی الفروع بین الصحابة والتابعین فمن بعدهم رضی الله عنهم أجمعین ولا ینکر محتسب ولا غیره علیٰ غیره وکذٰلک قالوا لیس للمفتی ولا للقاضی أن یعترض علیٰ من خالفه اذا لم یخالف نصًا أو إجماعاً أو قیاساً جلیاً، والله تعالیٰ أعلم.

وفی إکمال إکمال المعلم ج: ۱ ص: ۱۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت): ثم ما اشتهر حکمه کالصلوٰة وحرمة الزنا یستوی فی القیام به العلماء وغیرهم وما دق من الأفعال والأقوال فانما یقوم به العلماء ثم العلماء لا یغیرون الا ما اتفق علیه ولا یغیرون فی مسائل الخلاف لأنه ان کان کل مجتهد مصیبًا فواضحٌ وکذٰلک علیٰ أن المصیب واحد لأن المخطئ غیر اٰثم نعم یندب إلی الخروج من الخلاف للاتفاق علیٰ رجحان الخروج منه.

وفی أصول الفقه الاسلامی للزحیلی ج: ۲ ص: ۱۰۹۶ (طبع دار احسان دمشق): قد أجمع الصحابة علیٰ ترک النکیر علیٰ من خالف منهم فی المسائل الفقهیة کإرث الجد مع الإخوة ومسألة العول ونحوها من مسائل الفرائض وغیرها فکانوا یتشاورون ویتفرقون مختلفین ولا یعترض بعضهم علیٰ بعض ولا یمنع أحدهم الأخر من افتاء العامة ولا یمنع العامة من تقلیده ولا یمنعه من الحکم باجتهاده وهٰذا کما قال الغزالی: متواتر تواترًا لا شک فیه مع انهم کانوا فیما قام علیه الدلیل القاطع یبالغون فی التأثیم والتشدید کما فعلوا فی تخطئة الخوارج.

وفی الهندیة ج: ۵ ص: ۳۵۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه): ویقال الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء وباللسان علی العلماء وبالقلب لعوام الناس وهو اختیار الزندویسی کذا فی الظهیریة: الأمر بالمعروف یحتاج الیٰ خمسة أشیاء، أوّلها العلم لأن الجاهل لا یحسن الأمر بالمعروف، والثانی أن یقصد وجه الله تعالیٰ واعلاء کلمته العلیا، والثالث الشفقة علی المأمور فیأمر باللین والشفقة، والرابع أن یکون صبورًا حلیما، والخامس أن یکون عاملا بما یأمره کیلا یدخل تحت قوله تعالیٰ: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ، ولا یجوز للرجل من العوام أن یأمر بالمعروف للقاضی والمفتی والعالم الذی اشتهر لأنه اساءة فی الأدب ولأنه ربما کان به ضرره فی ذٰلک والعامی لا یفهم ذٰلک کذا فی الغرائب.

اسی طرح منکر میں وہ تمام بُرائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو

اُمت میں مشہور و معروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت مختلف رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ (از معارف القرآن ج:۲ ص:۱۴۱)

واللہ سبحانہ اعلم

پیدائش کے فوراً بعد مرنے والے بچے کے نام رکھنے، نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے اَحکام

سوال ۱:- ایک عورت کا پانچ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا، پیدائش کے بعد دائی بتاتی ہے کہ بچے نے سانس لیا اور فوراً ہی فوت ہوگیا، بچے کے اعضاء دُرست تھے، جس سے مذکر و مؤنث کی شناخت ہوتی تھی، مگر بہت ہی کمزور و ناتواں تھا۔ زید کہتا ہے کہ اس بچے نے دُنیا میں آکر سانس لیا ہے لہٰذا اس کے سب کام انجام دیئے جائیں، مثلاً غسل، کفن، نمازِ جنازہ اور قبر بھی بنائی جائے۔

۲:- جب غسل کے لئے آدمی آیا تو اس نے اپنے تجربے کی بناء پر کہا کہ اس نے سانس ہرگز نہیں لیا، اس کی ہیئت اور حالت ایسی نہیں کہ اس میں جان پڑی ہو، اگر اس کے سب کام کئے تو آپ گنہگار ہوں گے، لہٰذا اس بچے کو بغیر غسل اور بغیر نماز کے قبرستان کے ایک گوشے میں گڑھا کر کے دبا دیا جائے۔

۳:- اگر یہ سب کام ضروری تھے تو اَب چونکہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو کیا اس کی غائبانہ نماز پڑھی جائے جبکہ نمازِ جنازہ میں میت کا سامنے ہونا شرط ہے؟ اور سنتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جاتی ہے، اور اس سلسلے کی ایک بات یہ ہے کہ ایسے بچوں کا نام رکھنا ضروری ہے؟ بکر کہتا ہے کہ نام رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ حشر میں نام سے پکارا جائے گا، خواہ ولادت مردہ ہو یا زندہ، نام رکھنا ضروری ہے۔ آپ ان سب باتوں کے بارے میں اَحکام بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- بچے نے سانس لیا ہو یا نہ لیا ہو، جب اس کے تمام اعضاء بن چکے تھے تو اسے غسل تو ہر حالت میں دینا چاہئے تھا اور اس کا نام بھی رکھنا چاہئے تھا، البتہ سانس نہ لینے کی صورت میں نماز ضروری نہیں تھی، لیکن جب قابلِ اعتماد دائی گواہی دے رہی ہے کہ بچے نے سانس لیا ہے تو اس کی گواہی معتبر ہے، اور اس کے بعد اس کو غسل دینا، نام رکھنا، کفن دینا، نمازِ جنازہ پڑھنا سب ضروری تھا

اورقبر بھی ہر حالت میں ضرور بنانی چاہئے تھی، کما فی رد المحتار، ولو شهدت القابلة أو الأم على الاستهلال تقبل في حق الغسل والصلٰوة عليه لأن خبر الواحد في الديانات مقبول اذا كان عدلا. (شامی ج:۱ ص:۵۹۴) وفي الدر المختار ومن ولد فمات يغسل ويصلّى عليه۔[۱]

۲:- دائی اگر قابلِ اعتماد تھی تو اس کے مقابلے میں غسل دینے والے کا قول معتبر نہیں تھا۔

۳:- اگر دفن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تجربہ کار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھولی پھٹی نہ ہوگی تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا واجب ہے، قبر پر جاکر اس طرح نماز پڑھ لیں جس طرح میّت کو سامنے رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اور اگر زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھٹ گئی ہوگی تو پھر نماز نہ پڑھیں۔

لما في الدر المختار (وان دفن) واهيل عليه التراب (بغير صلٰوة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له (صلّى على قبره) استحسانًا ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح.[۲] وفي رد المحتار (قوله صلّى على قبره) أى افتراضًا في الأولیين وجوازًا في الثالثة۔

۴:- جی ہاں! نام رکھنا ضروری ہے جیسا کہ نمبر۱ میں گزرا۔　　　واللہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹/۲۹ الف)

دار الحرب میں مرنے والے مسلمان پر شرعی اَحکام جاری ہوں گے

سوال:- ایک آدمی نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا، مگر وہ وہاں کوئی ایسے آدمی کو نہیں پاتا کہ جو اسے قرآن پڑھائے اور فرائض اور واجبات سکھائے، اسی حالت میں چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ شخص مرجاتا ہے، آیا اس پر دین کے اَحکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ اور اگر جاری ہوں گے تو اس کو کس طرح ادا کیا جائے؟

جواب:- اس صورت میں اس شخص کو چاہئے تھا کہ وہ دار الحرب سے ہجرت کرکے ایسی جگہ اقامت اختیار کرنے کی کوشش کرتا جہاں دینی معلومات حاصل ہوسکتی ہوں، بہرحال وہ مسلمان ہے اور اسلامی اَحکام اس پر جاری ہوں گے، اب جبکہ اس نومسلم کا انتقال ہوچکا ہے اس سے ہمدردی رکھنے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۷، ۲۲۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۴، وفي الهندية ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع مکتبہ ماجدیہ) الفصل الخامس كتاب الجنائز، ولو دفن الميت قبل الصلٰوة أو قبل الغسل فانه يصلّى على قبره إلى ثلاثة أيام والصحيح أن هذا ليس بتقدير لازم بل يصلّى عليه ما لم يعلم أنه قد تمزق .... الخ. (مرتب)

والوں کو چاہئے کہ جس قدر ہو سکے اسے ایصالِ ثواب کریں۔

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۴۶۷/۲۲ الف)

دفن کے وقت کفن کی گرہ کھولنے کی حکمت میں حاشیہ شرح وقایہ اور دیگر فقہاءؒ کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کفن کی گرہ کھولنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت آسانی سے مردہ بیٹھ سکے، درایۃً اور روایۃً یہ کہاں تک صحیح ہے؟ لحد ہو یا شق، حقیقی طور پر بیٹھنا تو اس میں ممکن ہی نہیں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- حاشیہ شرح وقایہ[۱] کے اس بیان کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا، تمام فقہائے کرامؒ اس حکم کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ گرہ باندھنا انتشار کے خوف سے تھا، اور اب یہ خوف نہیں رہا، اس لئے کھول دی جائے، کذا فی شرح الوقایۃ،[۲] والھدایۃ،[۳] والدر المختار۔[۴]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

---

(۱) وفی حاشیة شرح الوقایة ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویحل للاستغناء فانه انما عقد خیفة انتشار الکفن، لیسهل علیه الجلوس فی القبر عند سؤال الملکین.
(۲) وفی شرح الوقایة ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع سعید) ویحل العقدة أی العقدة التی علی الکفن خیفة الانتشار.
(۳) وفی الهدایة فصل فی الدفن ج:۱ ص:۱۸۲ (طبع مکتبه شرکت علمیه) (ویحل العقدة) لوقوع الأمن من الانتشار.
(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۶ (طبع سعید) وتحل العقدة للاستغناء عنها وفی الشامیة (قوله للاستغناء عنها) لأنها تعقد لخوف الانتشار عند الحمل.

﴿فصل في إيصال الثواب﴾

(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)

سوال:- جو لوگ گھروں پر قرآن خوانی کراتے ہیں ان کو قرآن کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ پھر اس مردے کے لئے جس کے لئے قرآن خوانی کرائی ہے اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟

اگر اللہ کے نام پر کپڑا یا پیسہ دیا جائے، ہماری نیت اس مردے کی رُوح کو ثواب پہنچانے کی ہو تو کیا اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟ ہم روزانہ تلاوتِ قرآنِ پاک یا دُرود شریف، کلمۂ طیبہ پڑھ کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء تک اور تمام مسلمانوں کو جو رحلت کر چکے ہیں ان کو ایصالِ ثواب کریں تو کیا ان کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

۲:- اگر کسی شخص کا ذاتی کاروبار یا مکان کا کرایہ آتا ہو، وہ اسے چھوڑ کر انتقال کر جائے تو اس شخص کے لئے یہ اثاثہ جو اس کی اولاد استعمال کرتے ہیں، کیا یہ صدقۂ جاریہ ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- نفلی عبادات، خواہ وہ تلاوتِ قرآن ہو یا نفلی نماز ہو یا صدقہ ہو، اس کا ثواب کسی مردے کو پہنچایا جاسکتا ہے اور اس کو ثواب پہنچتا بھی ہے،(۱) اور خود ایصالِ ثواب کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے،(۲) لیکن اس کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس میں نام و نمود اور دِکھاوا وغیرہ نہ ہو۔ آج کل گھروں پر باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے اس میں اکثر نام و نمود ہوتا ہے اور ناجائز رسمیں ہوتی ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کر کے میّت کو ثواب پہنچادیں، روزانہ جو تلاوت یا تسبیح وغیرہ پڑھتے ہیں اس کا ثواب تمام وفات شدہ مسلمانوں کو پہنچایا جاسکتا ہے،(۳) اس میں کوئی حرج نہیں،

(۱ تا ۳) ایصالِ ثواب کے ثبوت کے لئے چند قرآنی آیات یہ ہیں:- فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَات. (سورۃ محمد: ۱۹)، وفی سورۃ الحشر: ۱۰ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ. وفی سورۃ نوح: ۲۸ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ.

کتبِ تفاسیر میں درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:- روح المعانی ج:۲۷ ص:۶۶، ۶۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاهور)، معارف القرآن ج:۷ ص:۲۱۹، وفی صفوۃ التفاسیر ج:۳ ص:۳۲۳ (طبع مکتبہ فاروقیہ پشاور): رَبِّ اغْفِرْ لِیْ، بدأ بنفسه ثم بأبویه ثم عمم لجمیع المؤمنین والمؤمنات لیکون ذٰلک أبلغ وأجمع، وفی کشف الخفاء ومزیل الألباس ج:۲ ص:۳۷۱ رقم:۲۶۳۰ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) من مر بالمقابر فقرأ احدی عشرة مرة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثم وهب أجره الأموات أُعْطِیَ من الأجر بعدد الأموات .... الخ.. (باقی اگلے صفحہ پر)

بلکہ ان شاء اللہ موجبِ ثواب ہوگا۔

(گزشتہ سے پیوستہ)..........اور چند احادیثِ مبارکہ یہ ہیں:-

وفی الصحیح للبخاریؒ باب اذا قال داری صدقة .... الخ رقم: ۲۶۰۵ ج:۳ ص:۱۰۱۳ (طبع دار ابن کثیر یمامة بیروت) عن ابن عباسؓ أن سعد بن عبادةؓ توفیت أمّه وهو غائب عنها فقال: یا رسول الله! ان أمّی توفیت وأنا غائب عنها أینفعها شیٔ ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم! قال: فانی أشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها.

وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عن معقل بن یسار قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اقرؤا سورة یٰسین علٰی موتاکم. رواه أحمد وأبوداوٗد. وفی شرح الصدور للسیوطیؒ ص:۱۳۵ (مطابع الرشید مدینة المنورة) أخرج أبو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب و قُل هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ و اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ثم قال: اللّٰهم انی قد جلعت ثواب ما قرأت من کلامک لأهل المقابر من المؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاءَ له الی الله تعالٰی. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أنسؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسین خفف الله عنهم وکان له بعدد من فیها حسنات. وفیه أیضًا ص:۱۳۲ أخرج الطبرانی فی الأوسط والبیهقی فی سننه عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول: یا ربّ أنّٰی لی هٰذه؟ فیقول: باستغفار ولدک لک. ولفظ البیهقی: دُعاء ولدک لک. وأخرجه البخاری فی الأدب عن أبی هریرةؓ موقوفًا. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أحمد بن حنبلؒ قال: اذا دخلتم المقابر فاقرؤا بفاتحة الکتاب والمعوذتین و قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ واجعلوا ذٰلک لأهل المقابر فانه یصل الیهم.

وفی الصحیح للامام مسلمؒ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم: ۱۶۳۱ ج:۳ ص:۱۲۵۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) عن أبی هریرةؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ثم اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الّا من صدقة جاریة أو علم ینتفع به أو ولد صالح یدعو له. وراجع أیضًا مرقاة المفاتیح ج:۲ ص:۸۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

وفی شرح العقائد ص:۱۷۲ (طبع قدیمی کتب خانه) وفی دعاء الأحیاء للأموات وصدقتهم أی صدقة الأحیاء عنهم أی عن الأموات نفع لهم أی للأموات خلافًا للمعتزلة.

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث و کتبِ عقائد کی عبارات کی بناء پر حضراتِ فقہائے کرامؒ نے اس عقیدۂ ایصالِ ثواب کو دُرست قرار دیا ہے، اور نہ صرف اس کا اثبات فرمایا بلکہ اسے مستحسن قرار دیا، چنانچہ کتبِ فقہ میں ہے:-

وفی الهدایة، باب الحج عن الغیر ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه) ان الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة أو غیرها عند أهل السنة والجماعة.

وفی الشامیة ج:۲ ص:۲۴۳ مطلب فی القراءة للمیت واهداء ثوابها له، صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر بأن للانسان أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة أو غیرها کذا فی الهدایة .... الأفضل لمن یتصدق نفلًا أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لأنها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شیٔ هو مذهب أهل السنة والجماعة (وفیه بعد أسطر) وفی البحر: من صام أو صلّی أو تصدق وجعل ثوابه لغیره من الأموات والأحیاء جاز، ویصل ثوابها الیهم عند أهل السنة والجماعة، کذا فی البدائع.

وفی معارف السنن ج:۵ ص:۲۸۶ (طبع ایچ ایم سعید) وقد تعرض فی الهدایة الٰی مسألة الاثابة واهداء الثواب فقال الأصل فی هٰذا الباب أن الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلٰوة أو صومًا أو صدقة وغیرها عند أهل السنة والجماعة. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۹۱ ثم ان الشافعیؒ لا یجوز اهداء ثواب تلاوة القراٰن ولا یصح عنده الاثابة فیما عدا الدعاء والصدقة ولٰکن الشافعیة أفتوا بایصال ثواب التلاوة ویجوز عندنا اهداء ثواب کل شیٔ .... وتبین أن مذهب أبی حنیفة فی هٰذا الصدد أوسط المذاهب .... الخ. (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

۲:- اگر کسی شخص نے اس نیت سے کمایا ہو کہ یہ میرے بچوں یا عزیزوں کے کام آئے تو اِن شاء اللہ اس پر صدقۂ جاریہ کا ثواب ملنے کی اُمید ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۳ ج)

ایصالِ ثواب کے لئے صدقۂ جاریہ میں کون سی چیز بہتر ہے؟

سوال ۱:- صدقۂ جاریہ کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

الف:- مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا، ب:- دینی مدرسہ کی امداد کرنا، ت:- کنواں تعمیر کرنا، ج:- یا اور کوئی کام جس سے مرحوم کو ثوابِ دارین حاصل ہو۔

۲:- لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے گناہِ کبیرہ اور صغیرہ سرزد ہوں تو ۹۰ ہزار مرتبہ کلمہ شریف یعنی "لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ" پڑھ کر مرحوم کو اس کا ثواب دے دیں یا بخش دیں تو اس کے سارے گناہ اللہ معاف کردیتا ہے، اور اسے عذابِ دوزخ سے نجات دیتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۳:- ثواب سے کیا مراد ہے؟ قرآن پڑھ کر ثواب مرحوم یا مرحومہ کو پہنچادینے سے عذاب ختم ہوجاتا ہے؟

۴:- مجھے پڑھنے کے لئے ایسی چیز بتادیں کہ اس کو پڑھوں اور عذابِ قبر سے محفوظ رہوں۔

۵:- کلامِ پاک یا تیس پارے مسجد میں رکھوادیں تو کیا مرحومہ کو ثواب ہوگا؟

۶:- میری اہلیہ ہارٹ فیل ہونے سے اللہ کو پیاری ہوگئی، نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد نمازِ فجر کے وقت نماز کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا، ایسی عورت کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- یہ تمام اُمور خیر ہی خیر ہیں، اور صدقۂ جاریہ کے لئے ایسے کام کا انتخاب کرنا بہتر ہے جس کی ضرورت بھی زیادہ ہو اور جس کا فائدہ عرصے تک لوگ اُٹھاتے رہیں، اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ ہر شخص کو خود کرنا چاہئے۔

۲:- سارے کے سارے گناہ معاف ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں، لیکن کلمۂ طیبہ یا قرآن شریف پڑھ کر جتنا زیادہ سے زیادہ ثواب میّت کو پہنچاسکتے ہوں، بہتر ہے۔[1]

۳:- اس کا جواب بھی وہی ہے، تلاوتِ قرآن کا ایصالِ ثواب کیا جائے تو ہر حرف پر دس نیکیاں میّت کو ملتی ہیں، لہٰذا جتنا زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کیا جائے گا میّت کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوگا،[2] اور عذاب میں کمی ہوتی چلی جائے گی، لیکن عذاب سے رہائی کی مکمل ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

(۱،۲) دلائل اور حوالے کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

۴:- قرآن مجید کی تلاوت جتنی زیادہ ممکن ہو، کریں، خاص طور سے سورۂ ملک (یعنی "تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ") روزانہ پڑھا کریں، حدیث میں ہے کہ یہ سورت عذابِ قبر سے انسان کو محفوظ رکھنے میں مددگار ہوتی ہے، نیز "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَکْبَرُ" اور اِستغفار کثرت سے کیا کریں، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

۵:- دونوں سے ثواب حاصل ہوگا۔[۱]

۶:- آپ کی اہلیہ کی وفات جس انداز سے ہوئی وہ قابلِ رشک ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی اُمید رکھنی چاہئے کہ اِن شاء اللہ وہ جنتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ایصالِ ثواب میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱/۲۹ الف)

عقیدۂ ایصالِ ثواب

سوال:- قرآن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ہر انسان کے نیک عمل کا جو ثواب ہوگا اس کا صرف کرنے والا حق دار ہے، وہ دُوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، لیکن مسلمان دھڑلے سے ایصالِ ثواب کررہے ہیں، یہاں تک کہ حجِ بدل بھی کرتے یا کرالیتے ہیں، کیا ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم نے یہ فرمایا ہے کہ: "انسان کو بطور حق صرف اسی عمل کا اَجر ملے گا جو اس نے خود کیا ہو"۔[۲] لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے استحقاق سے زائد کوئی اَجر اپنی رحمت سے دے دیں تو یہ اس کے خلاف نہیں،[۳] چنانچہ احادیث میں جو ایصالِ ثواب کا ثبوت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اسی رحمت کی بنیاد پر ہے، احادیث چونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر ہیں اور قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معلّم بنا کر بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر مستند ترین تفسیر ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۸/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰/۵۰۵)

---

(۱) صفحہ نمبر ۵۸۸ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (سورۃ النجم: ۳۹).

(۳) وفی شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القراٰن للمیت أو علی القبر ص:۱۳۴ (طبع مطابع الرشید مدینۃ المنورۃ) لیس للانسان الا ما سعٰی، من طریق العدل فأما من باب الفضل فجائز أن یزیدہ اللہ تعالٰی ما شاء قالہ الحسین بن الفضل، وکذا فی مرقاۃ المفاتیح ج:۴ ص:۸۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان). نیز ایصالِ ثواب سے متعلق مزید تفصیل اور خاص طور پر آیتِ مذکورہ کے مفہوم کے لئے مذکورہ کتاب شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القراٰن للمیت أو علی القبر ص:۱۳۴ اور سابقہ فتویٰ اور حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

﴿کتاب الزکوٰۃ﴾

(مالِ تجارت، نقدی، سونا، چاندی، استعمالی اشیاء،
زمینوں اور مشینوں پر زکوٰۃ کا حکم)

پانچ تولہ سونا اور کچھ نقدی پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ایک آدمی کے پاس پانچ تولہ سونا اور کچھ نقدی دس، بیس روپے ہیں تو کیا حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟

جواب:- جی ہاں! فرض ہوگی، اگر سونے کے ساتھ تھوڑی سی چاندی یا نقدی موجود ہو تو سونے کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب کا حساب کرنا چاہئے، یعنی اگر سونا اور نقدی مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت بن گئی تو زکوٰۃ واجب ہے۔[۱]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ

۱:- مشینری اور آلات پر زکوٰۃ نہیں
۲:- چوزوں اور مرغیوں پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- دوائیاں بنانے کیلئے جو مشین یا آلات استعمال کئے جاتے ہیں کیا ان پر زکوٰۃ ہے؟

جواب ۱:- مشینری اور آلات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔[۲]

سوال:- پولٹری فارم میں چوزے خرید کر ان کو پالا جاتا ہے ۲۲ ہفتوں کے بعد وہ انڈے دینے کے قابل ہوتے ہیں اور ۸۶ ہفتہ انڈا دیتے ہیں، اس کے بعد انڈا دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے انڈے اور ان مرغیوں پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب:- صورت مسئولہ میں انڈوں کی قیمت پر تو زکوٰۃ ہے لیکن چوزوں اور مرغیوں پر زکوٰۃ

---

(۱) فی الهندية ج: ۱ ص: ۱۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وتضم قيمة العروض الى الثمنين، والذهب الى الفضة قيمة كذا فی الكنز حتی لو ملک مائة درهم وخمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكوٰة عنده خلافاً لهما ولو ملک مائة درهم وعشرة دنانير أو مائة وخمسين درهما وخمسة دنانير او خمسة عشر دينارا وخمسين درهما تضم اجماعا.
وكذا فی الهداية ج: ۱ ص: ۱۹۲ (مكتبه شركت علميه ملتان) وكذا فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص: ۳۹۰ (طبع نورمحمد كتب خانه). وفی الهداية ج: ۱ ص: ۱۹۲ (طبع شركت علميه) ويضم الذهب الى الفضة للمجانسة من حيث الثمنية.

وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۲۹۹ (طبع ايچ ايم سعيد) ولو بلغ باحدهما نصابا دون الأخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا وبالأخر اقل قومه بالانفع للفقير. وكذا فی التاتارخانية ج: ۲ ص: ۲۳۷ وفی المبسوط للسرخسی ج: ۲ ص: ۱۹۱.

(۲) وفی الدرالمختار ج: ۲ ص: ۲۶۴ و ۲۶۵ (ايچ ايم سعيد): ولا (زكاة) فی ثياب البدن .... وكذلک آلات المحترفين، الخ. وفی الهداية ج: ۱ ص: ۱۸۶ (مكتبة شركت علميه ملتان) وليس فی دور السكنی .... زكاة .... وآلات المحترفين الخ.

نہیں ہے البتہ جب ان کو فروخت کردیا جائے گا تو ان سے حاصل ہونے والے معاوضے پر زکوٰۃ ہوگی، اگر سال اسی وقت پورا ہو رہا ہو تو اسی وقت، آئندہ کبھی پورا ہو تو اس وقت اس میں سے جتنی رقم باقی رہے اس پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

لما فی الدر المختار والأصل أن ماعدا الحجرین والسوائم إنما یزکی بنیة التجارة...... وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو کسب المال بالمال بعقد شراء أو إجارة أو استقراض، ولو نوی التجارة بعد العقد أو اشتری شئیا للقنیة ناویا أنه إن وجد ربحاً باعه لا زکاة علیه (شامی قبیل باب السائمة)۔[1]

واللہ اعلم
۱۲/۱۰/۱۳۹۷ھ

دورانِ سال رقم کی کمی بیشی سے زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں پڑتا

سوال:- کیا زکوٰۃ کی رقم جو پہلے سال ۱۳۹۶ھ میں دس ہزار تھی اس پر زکوٰۃ ادا کی گئی اور ۱۳۹۷ھ میں بیس ہزار ہوگئی، اب زکوٰۃ دس ہزار پر دینا ہوگی، یا بیس ہزار روپے پر، دس ہزار کی زکوٰۃ ۱۳۹۶ھ میں ادا کردی گئی تھی؟

جواب:- سال پورا ہونے پر جتنی رقم موجود ہو اس سب پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ اس رقم کا کچھ حصہ صرف ایک دن پہلے ہی آیا ہو چنانچہ صورت مسئولہ میں پورے بیس ہزار روپے پر زکوٰۃ فرض ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۶/۹/۱۳۹۷ھ

زمین، مکان اور کار، کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں البتہ ان کے کرایہ پر زکوٰۃ لازم ہے

سوال:- میرے پاس مندرجہ ذیل رہائشی پلاٹ ہیں ان میں سے کس کس پر زکوٰۃ عائد ہے واضح رہے کہ ہم کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۳،۲۷۴ (طبع ایچ ایم سعید) وفی البدائع ج:۲ ص:۲۱، واما صفة هذا النصاب فهی أن یکون معدا للتجارة وهو ان یمسکها للتجارة وذلک بنیة التجارة مقارنة لعمل التجارة الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع ایچ ایم سعید) والمستفاد ولو بهبة أو ارث وسط الحول یضم الی نصاب من جنسه فیزکیه بحول الاصل. وفی الشامیة (قوله ولو بهبة او ارث) ادخل فیه المفاد بشراء او میراث أو وصیة وما کان حاصلا من الاصل کالأولاد والربح الخ . وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۷۵ (رشیدیه) ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الی ماله وزکاه، سواء کان المستفاد من نمائه اولا وبأی وجه استفاد، ضمه الخ. وفی مراقی الفلاح علی الطحطاوی (کتاب الزکوٰة) ص:۳۸۹ (طبع نور محمد کتب خانه) وشرط وجوب ادائها حولان الحول علی النصاب الأصلی واما المستفاد فی أثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواء استفید بتجارة أو میراث او غیره الخ. (محمد زبیر حق نواز)

الف:- ایک پلاٹ جو ہمارے پاس ۱۲ سال پرانا ہے اور ہم نے رہائش کی غرض سے لیا لیکن اس علاقے میں مناسب آبادی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے زمین کی قیمت بھی نہیں بڑھی اور اس کے خریدار بھی عام طور پر نہیں ملتے۔

ب:- ایک چھوٹا قطعہ زمین جو تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس مقصد کے لئے لیا تھا کہ زمین کی قیمت بڑھ جائے گی اور جب بھی ضرورت ہوگی مثلاً شادی، مکان، یا کسی اور مقصد کے لئے تو اس کو بیچ کر رقم استعمال کرلیں گے۔

ج:- تقریباً سات ماہ قبل ایک قطعہ زمین لیا ہے اور ارادہ ہے کہ یہاں مکان تعمیر کرائیں گے لیکن اگر کل اثاثہ بھی اکٹھا کرلیا جائے تو تعمیرِ مکان کے لئے رقم نہیں ہے۔

د:- ہمارے دفتر میں ایک کوآپریٹو سوسائٹی بنائی گئی ہے جس نے مل کر ایک بڑا قطعہ زمین لاہور میں خریدا ہے جس میں سے ایک پلاٹ میں نے بھی لینے کا ارادہ کیا ہے اس قطعہ زمین کا قبضہ ابھی سوسائٹی کو نہیں ملا میں نے ابھی پلاٹ کی رقم کا کچھ حصہ ادا کیا ہے اور ابھی یہ میری ذاتی ملکیت میں نہیں آیا اگر ان میں سے کسی پر زکوٰۃ لاگو ہے تو ان کی قیمت کا تعین کس طرح کیا جائے؟ واضح رہے کہ ابھی ان پلاٹوں کا سرکاری ٹیکس وغیرہ کا کچھ حصہ واجب الاداء ہے۔

سوال۲:- اگر اپنے ذاتی استعمال کے لئے اسکوٹر یا موٹر کار رکھی جائے تو کیا اس کی مالیت پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی؟

جواب:- اس سلسلے میں ایک اصول سمجھ لیجئے کہ زمین، مکان، کار یا اسکوٹر کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور ان پر صرف اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب انہیں خالص تجارت کی غرض سے خریدا یا حاصل کیا ہو، اور اپنی ملکیت میں لاتے وقت ہی نیت تجارت کی ہو، یہاں تک کہ اگر زمین کو محض لے ڈالنے کیلئے خریدا اور دل میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر کچھ نفع بخش ہوا تو اسے فروخت بھی کردیں گے تب بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس اصول کے تحت ''الف''، ''ج'' اور ''د'' پر زکوٰۃ یقیناً واجب نہیں ہے، البتہ ''ب'' کے بارے میں یہ دیکھیں کہ کیا یہ پلاٹ تجارت کی غرض سے خریدا تھا، یا لے کر ڈالنے کی غرض سے کہ شاید کبھی نفع دے جائے پہلی صورت میں زکوٰۃ اس کی موجودہ مالیت پر ڈھائی فی صد کے حساب سے واجب ہوگی، اور دوسری صورت میں نہیں، اور چونکہ ان دونوں میں امتیاز کرنا بعض اوقات مشکل ہوتا ہے اس لئے اس پر احتیاطاً زکوٰۃ دے ہی دیں تو زیادہ بہتر ہے:-

فی الدر المختار وشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو كسب الما ل بالمال بعقد شراء أو إجارة او استقراض ولو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئا للقنيه ناوياً أنه إن وجد ربحا

باعه لا زکوٰۃ علیه، شامي۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۸/۹ھ

استعمالی زیورات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ایسے زیورات سونے کے جو استعمال میں ہوں یا ایسے برتن (سونے چاندی) کے ان کے اوپر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- سونا چاندی خواہ زیور کی شکل میں ہو یا برتنوں کی شکل میں اس پر زکوٰۃ واجب ہے،[2] جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں ہے ان کی بات درست نہیں، البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سونے یا چاندی کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۹۱/۲۷ ه)

میکے اور سسرال کی طرف سے ملنے والے زیور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- اس مسئلہ میں علماء دین کیا فرماتے ہیں کہ عورت کا جو زیور سونے کا ہے جو اس کی ماں نے دیا اور جو سسرال والوں کی طرف سے پڑا اس کی زکوٰۃ کس کے ذمہ واجب ہے؟ برائے کرم پوری تفصیل سے آگاہ کریں مہربانی ہوگی؟

جواب:- میکے سے جو زیور ملا اس کی زکوٰۃ خود عورت پر فرض ہے،[4] اور جو سسرال کی طرف سے ملا، اگر وہ عورت کی ملکیت کر دیا گیا تھا تو عورت پر فرض ہے، ورنہ اس کے شوہر پر۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۹۷/۳۰ د)

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۳ و ۲۷۴ (طبع سعید) وفی البدائع ج:۲ ص:۲۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) واما صفة هذا النصاب فهی أن یکون معدا للتجارة وهو أن یمسکها للتجارة وذلک بنیة التجارة مقارنة لعمل التجارة.
وفی الدر المختار (طبع سعید کراچی) ج:۲ ص:۲۶۷، او نیة التجارة فی العروض اما صریحا ولا بد من مقارنتها لعقد التجارة .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۸ (طبع سعید کراچی) (ومعموله ولو تبرا أو حلیا مطلقا) مباح الاستعمال أولا ولو للتجمل والنفقة لأنهما خلقا أثماناً فیزکیهما کیف کانا.... الخ. وفی الشامیة قوله ومعموله ای ما یعمل من نحو ..... والأوانی وغیرها.

(۳) وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۴۱ (طبع ایچ ایم سعید) وکره الأکل والشرب والادهان والتطیب من إناء ذهب وفضة للرجل والمرأة لإطلاق الحدیث .... الخ. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۱۲۸۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

(۴) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر ۲۔

(زکوٰۃ سے متعلق متفرق سوالات)

جہیز کے لئے خریدی ہوئی چند اشیاء، زمین اور قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال۱:- وہ قیمتی سامان جو بچوں کی شادی کے لئے خریدا گیا ہو مثلاً پارچہ جات، ٹی وی، ریفریجریٹر اور دیگر گھریلو استعمال کی مشینیں وغیرہ ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۱:- بچوں کی شادی میں دینے کے لئے جس سامان کا سوال میں ذکر ہے اس پر زکوٰۃ نہیں[1]، البتہ زیور خواہ بچوں کی شادی میں دینے کے لئے خریدا ہو اس پر زکوٰۃ ہے۔

سوال۲:- ایسی رقم جو کاروباری مقاصد کے لئے زمین کی خریداری کی مد میں ادا کی گئی ہو ابھی کافی رقم کی ادائیگی اور زمین کی ملکیت کی منتقلی باقی ہو اس رقم پر زکوٰۃ ہے؟

جواب۲:- جب تک زمین کی بیع نہیں ہوئی اس وقت تک اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب رقم مل جائے یا زمین کی آپ کے نام بیع ہوجائے اس وقت جتنے سال اس رقم کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی اتنے سالوں کی زکوٰۃ یک مشت ادا کرنی ہوگی،[2] تاہم اگر ہر سال اپنے دوسرے اثاثوں کے ساتھ اس رقم کی زکوٰۃ بھی ادا کرتے رہیں تو زکوٰۃ ادا ہوتی رہے گی،[3] اور زمین اگر اس غرض کے لئے خریدی ہے کہ اسے بیچ کر نفع حاصل کریں گے تو زمین کی مالیت پر بھی زکوٰۃ ہر سال فرض ہوگی،[4] اور ہر سال اُس وقت کی بازاری قیمت کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ میں دینا ہوگا۔

سوال۳:- ایسی زمین جو مستقبل میں رہائشی دکان یا کاروباری دفتر کے لئے خریدی گئی ہو کوئی رقم واجب الاداء نہ ہو اور زمین کی ملکیت منتقل ہوچکی ہو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب۳:- جس روز اس زمین کی بیع آپ کے نام ہوئی اس دن کے بعد سے نہ اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور نہ اس زمین کی مالیت پر کیونکہ وہ رہائشی مقصد کے لئے لی گئی ہے لیکن بیع ہونے سے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴ (طبع سعید کراچی) (ولا فی ثیاب البدن وأثاث المنزل و دور السکنی ونحوھا) .... اذا لم تنو للتجارۃ، وفی الشامیۃ تحت (قولہ وأثاث المنزل) .... ای کثیاب البدن الغیر المحتاج الیھا وکالحوانیت والعقارات. وفی الھدایۃ ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنزل ودواب الرکوب وعبید الخدمۃ وسلاح الاستعمال زکوٰۃ.

(۲) اس کا حوالہ اگلے سوال کے جواب میں آرہا ہے۔

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص: ۲۶۶و ۲۶۷ (طبع سعید کراچی) ولو کان الدین علی مقر ملیٍ او علی معسر او مفلس .... فوصل الی ملکہ لزم زکوٰۃ ما مضٰی.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ص:۲۶۷ (طبع سعید کراچی) او نیۃ التجارۃ فی العروض اما صریحاً، ولا بد من مقارنتھا لعقد التجارۃ.

پہلے جو رقم زمین کی خریداری کے لئے دے رکھی تھی اس پر زکوٰۃ فرض تھی اور بیع مکمل ہونے پر اس کی ادائیگی لازم ہے لقول الشامي: الظاهر أن منه مال المرصد المشهور في ديارنا لأنه إذا انفق المستأجر لدار الوقف على عمارتها الضرورية بأمر القاضي للضرورة الداعية إليه يكون بمنزلة استقراض المتولي من المستأجر، فإذا قبض ذلك كله أو أربعين درهما منه ولو باقتطاع ذلك من أجرة الدار، تجب زكوته لما مضى من السنين والناس عنه غافلون (شامي)۔[1]

سوال۴:- ایسی رقم جو زرعی زمین کی خریداری کے لئے ادا کی گئی ہو، اس زمین کی ملکیت حاصل ہوگئی ہو لیکن زمین کسی کام میں نہ آرہی ہو؟

جواب۴:- اس کا جواب بھی نمبر تین کی طرح ہے کہ جس دن بیع مکمل ہوئی اس دن نہ رقم پر زکوٰۃ ہے نہ زمین پر لیکن بیع ہونے سے پہلے پہلے رقم پر زکوٰۃ فرض تھی اگر وہ ادا نہیں کی ہے تو ادا کی جائے۔

سوال۵:- کاروباری جگہ کی پگڑی کی مد میں ادا کی ہوئی رقم جو ہر سال بڑھ رہی ہو؟

جواب۵:- یہ سوال واضح نہیں ہے واضح کر کے لکھئے تو جواب دیا جائے۔

سوال۶:- کاروبار کی جگہ میں نصب شدہ فرنیچر پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۶:- یہ فرنیچر اگر فروخت کرنے کی غرض سے نہیں خریدا گیا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔[2]

سوال۷:- کاروباری استعمال میں آنے والی اشیاء اور مشین پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۷:- یہ چیزیں بھی اگر برائے فروخت نہیں خریدی گئیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں۔[3]

سوال۸:- ایسا زیور جو اہلیہ کے روزمرہ اور تقریبات کے مواقع پر استعمال ہوتا ہو؟

جواب۸:- اس پر ہر سال زکوٰۃ فرض[4] ہے اور جس روز زکوٰۃ ادا کی جارہی ہو اس روز

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲،۳) و في الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴و۲۶۵ (ایچ ایم سعید) ولا في ثياب البدن .... واثاث المنزل ودور السكنى ونحوها ....اذا لم تنو للتجارة .... وكذلك آلات المحترفين. وفي الهداية كتاب الزكوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شركت علميه) وليس في دور السكنى .... زكوٰة .... وعلى هذا .... آلات المحترفين .

(۴) وفي سنن أبي داؤد باب الكنز ما هو وزكوٰة الحلي ج:۱ ص: ۲۲۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان) عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده ان امرأة أتت رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعها ابنة لها وفي يد ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب فقال: اتعطين زكوٰة هذا؟ قالت: لا، قال: أيسرك أن يسورك الله بهما يوم القيمة سوارين من نار؟ قال فخلعتهما فالقتهما الى النبي صلى الله عليه وسلم وقالت: هما لله ولرسوله، (وكذا في الدراية في تخرج احاديث الهداية على الهداية ج:۱ ص:۱۹۶ طبع شركت علميه) وفي سنن أبي داؤد ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان) عن عبدالله بن شداد بن الهاد أنه قال: دخلنا على عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم فرأى في يدى فتخات من ورق، فقال: ما هذا يا عائشة؟ فقلت: صنعتهن أتزين لك يارسول الله! قال: أتؤدين زكاتهن؟ قلت: لا، أو ما شاء الله، قال: هو حسبك من النار............................

(باقی اگلے صفحے پر)

سونے کی بازاری قیمت پر ڈھائی فی صد زکوٰۃ نکالنی ہوگی بشرطیکہ وہ زیور نصاب تک پہنچتا ہو اور نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہے۔

سوال۹:- ایسا زیور جو نابالغ بچی کے روزہ مرہ اور تقریبات کے مواقع پر استعمال ہوتا ہو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں اگر ہے تو کون اس کی زکوٰۃ نکالے؟

جواب۹:- اگر وہ زیور نابالغ بچی کے باپ یا ماں کی ملکیت ہے تو جس کی ملکیت ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے،(۱) بشرطیکہ اس کا کل مملوکہ زیور نصاب تک پہنچتا ہو اور اگر وہ زیور نابالغ بچی کو ہبہ کر کے اسی کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہے تو پھر جب تک بچی نابالغ ہے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ کسی کے ذمے نہیں،(۲) بالغ ہونے کے بعد بچی پر واجب ہوگی۔

سوال۱۰:- خام سونا جو بچوں کی شادیوں کیلئے رکھا گیا ہو؟

جواب۱۰:- اس کا بھی وہی حکم ہے جو ۹ میں گزرا۔

سوال۱۱:- ایسی رقم جو دوسروں کو قرض کے طور پر دی گئی اور اس کو کئی سال ہوگئے اور وہ رقم واپس ملنے کی اُمید ہو؟

جواب۱۱:- اس پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم واپس مل جائے گی تو جتنے سال رقم مقروض کے پاس رہی ہے اتنے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی یک مشت واجب ہوگی،(۳) لیکن اگر رقم ملنے سے پہلے ہی ہر سال اپنے دوسرے اثاثوں کے ساتھ اس کی زکوٰۃ بھی نکال دیا کریں تو زکوٰۃ ادا ہوتی رہے گی بلکہ بہتر ہوگا۔(۴)

سوال۱۲:- ایسی رقم جو دوسروں کو قرض کے طور پر دی گئی اور اس کو کئی سال ہوگئے اور وہ رقم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)......وراجع للتفصیل اعلاء السنن ج:۹ ص:۵۲-۵۴. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۸ (طبع سعید کراچی) ومعموله ولو تبراً أو حليا مطلقا مباح الاستعمال أو لا ولو للتجمل والنفقة لأنهما خلقا أثمانا فيزكيهما كيف كانا الخ. وكذا في البدائع ج:۲ ص:۱۷ وفتح القدير ج:۲ ص:۱۶۵ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۱) سابقہ حوالہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۵۸ و ۲۵۹ (طبع سعید) وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام، وفی رد المحتار تحت (قوله عقل وبلوغ) فلا تجب على مجنون وصبي لانها عبادة محضة وليسا مخاطبين بها.

وفی الهداية ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) وليس على الصبي والمجنون زكاة (إلى قوله) ولنا انها عبادة فلا تتأدى الا بالاختيار تحقيقا لمعنى الابتلاء ولا اختيار لهما لعدم العقل.

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید کراچی) واعلم أن الديون عند الامام ثلثة قوى، ومتوسط، وضعيف (فتجب) زكوتها اذا تم نصابًا وحال الحول، لكن لا فورًا بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوى كقرض (وبدل مال تجارة) فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم.

(۴) وفی الدرالمختار ج:۲ ص:۲۹۳ (طبع سعید کراچی) (ولو عجل ذو نصاب) زكوته (لسنين او لنصب صح) لوجود السبب وفی رد المحتار (قوله لو جود السبب) اى سبب الوجوب وهوملك النصاب النامي فيجوز التعجيل لسنة واكثر الخ وكذا فى الهندية ج:۱ ص:۱۷۶.

واپس ملنے کی اُمید نہ ہو؟

جواب۱۲:- اگر قرض کے وصول ہونے کی اُمید نہ ہو تو جب تک وہ وصول نہ ہو جائے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، تاہم چونکہ بعض فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اگر قرض پر عدالتی ثبوت موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وصول ہونے پر تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کردی جائے۔[۱]

كما في الدر المختار أو على جاحد عليه بينة، وعن محمد لا زكاة وهو الصحيح، وقال الشامي: الحاصل أن فيه اختلاف التصحيح.[۲]

ثم قال في باب المصرف: ومال الرحمتي الى هذا، وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملاء ته، ولا يقدر الدائن على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم.[۳] وبه أفتى حكيم الامة في امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۱، ۳۲۔[۴]

سوال۱۳:- ایسی رقم جو کئی برس گزر جانے کے باوجود کاروباری لین دین کے سلسلے میں واجب الوصول ہو اور اس کی وصولی کی امید ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

جواب۱۳:- اگر وصولی کی امید ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب رقم وصول ہو جائے البتہ وصول یابی پر کل گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔[۵]

سوال۱۴:- ایسی رقم جو کئی برس گزر جانے کے باوجود کاروباری لین دین کے سلسلہ میں واجب الوصول ہو اور اس کی وصولی کی امید نہ ہو؟

جواب۱۴:- اس کا جواب (۱۲) کی طرح ہے۔

سوال۱۵:- ایسی رقم جو ذاتی رہائش کے لئے مکان کی خرید کے سلسلے میں ادا کی گئی ہو، مکان کا قبضہ لے کر رہائش اختیار کرلی گئی ہو، کل قیمت کا ایک معمولی حصہ ادا کرنا باقی ہو اور مکان ہنوز سابق مالک کے نام ہو، اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب۱۵:- جب تک مکان کی بیع مکمل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک رقم پر زکوٰۃ فرض تھی

---

(۱) وفي الهداية ج:۱ ص:۱۸٦ (طبع شركت علميه ملتان) ولو كان الدين على مقر ملئ أو معسر تجب الزكاة لإمكان الوصول اليه ابتداءً وبواسطة التحصيل وكذا لو كان على جاحد وعليه بينة.
وفي الدر المختار (كتاب الزكوٰة ج:۲ ص:۲٦٦، ۲٦۷ ولو كان الدين علىٰ مقر ملئ او علىٰ معسر او مفلس ... او علىٰ جاحد عليه بينة ....فوصل الى ملكه لزم زكوٰة ما مضىٰ. وكذا في فتاویٰ دارالعلوم ديوبند ج:٦ ص:۹۰.
(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۲٦۷.
(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعيد).
(۴) ص:۳۳ و ۳۴ (طبع مكتبه دارالعلوم كراچی).
(۵) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔

لیکن جب بیع مکمل ہوگئی تو نہ رقم پر زکوٰۃ ہے نہ مکان پر خواہ کاغذات میں وہ مکان کسی دوسرے کے نام پر ہو لیکن جب بیع کا ایجاب وقبول ہوگیا تو بیع ہوگئی اب جو رقم دینی باقی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں بلکہ وہ اس شخص کے ذمے قرض ہے جسے وہ اپنے کل قابلِ زکوٰۃ سرمایہ سے منہا کرسکتا ہے۔

سوال ۱۶:- موٹر جو ذاتی گھریلو استعمال کے علاوہ کاروباری مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوتی ہو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب ۱۶:- موٹر جب تک فروخت کرنے کی غرض سے نہ خریدی گئی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ (۱)

سوال ۱۷:- وہ قیمتی سامان جو گھریلو استعمال کے لئے خریدا گیا ہو مثلاً ٹی وی، ریفریجریٹر، قالین، فرنیچر وغیرہ ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اور جس چیز پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر کتنی زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے؟

جواب ۱۷:- اس سامان پر زکوٰۃ نہیں (۲)، اور مذکورہ چیزوں میں سے جتنی اشیاء پر زکوٰۃ فرض ہے ان سب پر زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فی صد ہے۔ (۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۳۸/۳۲ ج)

جی پی فنڈ کی رقم سے خریدے گئے مکان کے کرایہ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- سائل ایک محکمہ سے ریٹائرڈ ہوا ہے اس محکمہ نے کچھ رقم دی جو کہ جی پی فنڈ کی صورت میں اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی تھی کچھ رقم سے مکان بنوائے اور کرایہ پر دیدئے کچھ رقم بینک اور ڈاکخانے میں اس لئے رکھ دی کہ ایک تو رقم محفوظ رہے گی دوسری بات یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے گزر اوقات ہوتا رہے گا اب دونوں کے بارے میں سود اور زکوٰۃ کے شرعی احکام بتائیں اور مکان کی آمدنی کی بچت پر زکوٰۃ ہوگی یا کل مکان کی قیمت پر؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴،۲۶۵ ولا فی ثیاب البدن .... وأثاث المنزل .... وکذلک الات المحترفین ....الخ. وفی الھدایة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شرکت علمیہ ملتان) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن وأثاث المنازل .... زکوٰة .... والات المحترفین.... الخ.

(۲) ایضاً۔

(۳) وفی الھندیة ج:۱ ص:۱۷۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)، تجب فی کل مائتی درھم خمسة دراھم وفی کل عشرین مثقال ذھب نصف مثقال، وایضًا فی الھندیة ج:۱ ص:۱۷۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ثم فی کل اربعین درھما درھم وفی کل أربعة مثاقیل قیراطان.....الخ.

جواب:- جی پی فنڈ کی رقم سے آپ نے جو مکان بنوا کر کرایہ پر دیدیئے تو اس کی آمدنی آپ کے لئے جائز ہے لیکن جو رقم بینک یا ڈاک خانہ میں رکھی ہے اس پر جو سود لگتا ہے اس کا لینا حلال نہیں صرف اپنی اصل رقم وصول کر سکتے ہیں، اضافہ نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں جس پر سود نہیں لگتا اور مکان سے جو کرایہ ملے گا اس پر زکوٰۃ ہوگی، مکان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

بینک کی طرف سے ملنے والے سود پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- بینک یا ڈاک خانہ میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ ہوگی یا اس کے منافع پر؟

جواب:- بینک یا ڈاک خانے میں جتنی اصل رقم رکھی ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن جو اضافہ بینک یا ڈاک خانے نے دیا ہو وہ سود ہے اس کا لینا حلال نہیں اور غلطی سے لیا ہو تو اس کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

زکوٰۃ کن چیزوں پر فرض ہے؟

سوال:- زکوٰۃ صرف رقم پر ہوتی ہے اور سونے چاندی پر بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں اگر نہیں تو کیوں؟

جواب:- شرعاً زکوٰۃ صرف سونے چاندی، نقدی، مالِ تجارت، زرعی پیداوار اور مویشیوں پر فرض ہوتی ہے دوسری چیزوں پر نہیں، اور ''کیوں؟'' کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسی طرح ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۲۹/ ۲۸ ج)

سونا اور این آئی ٹی یونٹ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں نے مبلغ بیس ہزار روپے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا اور اس سے N.I.T یونٹس اور سونا خرید لیا، کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ میری عمر ۵۵ سال ہے اس بیس ہزار روپے قرض کی قسط اپنی تنخواہ سے ہر ماہ کٹوانا پڑتی ہے، اور مجھے پراویڈنٹ فنڈ ۵ سال کے بعد ملے گا؟

جواب:- صورت مسئولہ میں آپ نے جو سونا خریدا اور جو این آئی ٹی یونٹ حاصل کیے ان پر زکوٰۃ آپ کے ذمے واجب ہے، آپ نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے جو رقم لی ہے وہ شرعاً قرض نہیں ہے بلکہ اپنے باقی ماہانہ حق کی وصولی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸۱/۱۹ ج)

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے بطور قرض لی گئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید کے پاس ۴۰ ہزار روپے کے حصص ہیں، اور واجب الاداء زکوٰۃ ۱۰۰۰ روپیہ ادا کرنے کے لئے زید کے پاس نقد رقم نہیں ہے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرض لینا چاہتا ہے اس طرح قرض ایک ہزار روپیہ لے کر زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔ تو کیا ۴۰ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی یا ۳۹ ہزار پر؟ یا یوں کہئے کہ ۱۰۰۰ روپیہ زکوٰۃ میں ادا کرنا ہے یا ۹۷۵ روپے ادا کرے گا؟

جواب:- صورت مسئولہ میں اس کو پورے چالیس ہزار کی زکوٰۃ یعنی ایک ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے جو روپے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرض لئے گئے انہیں قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۳ھ

کچھ زمین، دو تولہ سونا اور کچھ رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میرے پاس زمین تھی میں نے گزشتہ سال اسی مہینے میں پچیس ہزار میں بیچ دی تھی یعنی خریدار نے روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور میں نے کاغذات اس کے حوالے کردیئے لیکن نام کی تبدیلی خریدار کے نام چار مہینے کے بعد ہوئی اس سے پہلے میرے پاس کچھ نہیں تھا صرف دو تولہ سونا تھا اس پچیس ہزار روپے میں سے بیس ہزار اپنے بیٹے کو دوسرے ملک بھیج دیئے بیٹے کے پاس رہنے کے لئے مکان نہیں تھا اس نے اس پیسے سے مکان خرید لیا شعبان کے مہینے میں زمین بیچنے کی بات ہوگئی تھی روپے پارٹی نے ۵ آدمیوں کے بیچ میں رکھ دیئے تھے اس کے بعد رمضان کا مہینہ آگیا، رمضان میں میں نے زکوٰۃ نہ نکالی تھی کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے دو مہینے کے بعد روپے ملے ملتے ہی بیس ہزار، بیٹے نے بھیج دیئے اب سارے روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر زمین فروخت کرنے سے پہلے دو تولہ سونے کے علاوہ کچھ چاندی یا نقد رقم بھی آپ کے پاس موجود تھی خواہ وہ پانچ دس روپے ہی کیوں نہ ہوں، تو آپ پر رمضان کے بعد سونے

کے علاوہ پورے پچیس ہزار کی زکوٰۃ نکالنی فرض ہے پوری رقم کی زکوٰۃ نکال دیں(۱) اور اگر دو تولہ سونے کے علاوہ کوئی نقد رقم موجود نہ تھی تو مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۲/ ۲۸ج)

سونے چاندی کی زکوٰۃ قیمتِ فروخت کے اعتبار سے نکالی جائے گی

سوال:- تقریباً ۲۰ سال سے کسی عورت نے جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونے سے زیادہ کے زیورات ہیں مگر زکوٰۃ نہیں نکالی اور اب زکوٰۃ نکالنا چاہتی ہیں تو کیا طریقہ کار ہوگا؟ کیا سونے کی موجودہ قیمت لگائی جائے گی یا جس سال کی زکوٰۃ نکالنا ہے اس سال جو سونے کی قیمت ہوگی اس پر زکوٰۃ نکالی جائے گی؟

جواب:- اس عورت پر واجب ہے کہ جتنے سالوں کی زکوٰۃ اس نے ادا نہیں کی ان تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے، واضح رہے کہ زکوٰۃ کا وجوب اس وقت سے شمار ہوگا، جب سے عورت کے پاس بقدرِ نصاب مال آئے ہوئے ایک سال پورا ہوا ہو، البتہ پچھلے ہر سال کی زکوٰۃ موجودہ قیمت(۲) کے اعتبار سے ادا کی جائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/ ۲۷و)

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:- کیا پراویڈنٹ فنڈ پر سال بہ سال زکوٰۃ نکالی جائے گی جبکہ وہ اس ملازم کے قبضہ میں نہیں اور ملازمت کے اختتام کے بعد ہی اس ملازم کو ادا کیا جائے گا؟

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب وہ ملازم کے قبضے

---

(۱) دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر:۱۔

(۲) والخلاف فی زکاۃ المال، فتعتبر القیمۃ وقت الاداء فی زکاۃ المال علی قولھما، وھو الاظھر، وقال ابوحنیفۃ یوم الوجوب (کما فی البرھان غنیۃ ذوی الاحکام فی بغیۃ درر الحکام لأبی الخلاص الشرنبلالی من حاشیۃ درر الحکام ج:۱ ص:۱۸۱). وفی البرھان شرح مواھب الرحمن ج:۱ ص:۵۰۷ (مخطوطۃ) واعتبراھما یوم الاداء اذا الاصل ھو اداء اجزاء من النصاب وللمزکی حق النقل الی القیمۃ فیعتبر یوم النقل، وھو وقت الاداء، وصار کما لو نقصت بعفونتہ وکالسوائم وھو الأظھر، لما قلنا. وکذا فی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۲۲ (طبع سعید).

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸۶ (طبع سعید کراچی) وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا: یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعاً وھو الاصح، ویقوم فی البلد الذی المال فیہ الخ وفی الشامیۃ تحتہ وفی المحیط یعتبر یوم الأداء بالإجماع وھو الأصح فھو تصحیح للقول الثانی الموافق لقولھما وعلیہ فاعتبار یوم الأداء یکون متفقاً علیہ عندہ وعندھما.

میں آجائے اس سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور قبضے میں آنے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بلکہ اسی سال کی واجب ہوگی جس میں وہ قبضے میں آیا ہے۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/۲۷و)

ریڈیو، فریج اور فرنیچر پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- کیا زکوٰۃ ریڈیو، صوفہ سیٹ، میز، کرسی، پھولدان، ٹیلی ویژن، فریج یا اس قسم کی دوسری اشیاء پر بھی ان کی قیمت خرید یا موجودہ بازاری قیمت پر نکالی جائے گی؟ اگر ان اشیاء پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

جواب:- ریڈیو، فرنیچر، ڈیکوریشن کے سامان اور ریفریجریٹر اگر گھریلو استعمال کے لئے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں[۲] البتہ تجارت کے لئے ہوں تو ان کی بازاری قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۵/۲۷و)

مکان پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ذاتی مکان جو قرض لے کر بنایا گیا ہے اور قرض ابھی ادا نہیں ہوا، اس کے ایک حصہ میں رہائش ہے اور باقی حصے کرایہ پر ہیں، اور رہائش پر اس کو ادارہ جہاں وہ ملازم ہے کرایہ ماہوار ادا کرتا ہے تو کیا اس مکان پر زکوٰۃ نکالی جائے گی اور اگر نکالی جائے گی تو طریقہ کار کیا ہوگا؟

جواب:- مکان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے،[۳] البتہ اس کے کرایہ کی جو رقم اخراجات سے بچا کر رکھ لی جائے اس پر دوسری رقموں کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے،[۴] اور جتنا قرض انسان پر واجب ہو اتنی رقم کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں۔[۵] واللہ سبحانہ اعلم

۱۷۔۱۱۔۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۵/۲۷)

---

(۱) مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے ”پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ وسود کا مسئلہ“ مرتبہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ مطبوعہ دارالاشاعت۔

(۲) دیکھئے ص:۴۷ کا حاشیہ نمبر ا۔

(۳) وفی الهداية ج: ۱ ص: ۱۸۶ (مکتبه شرکت علمیه) ولیس فی دور السکنی .... زکوٰة.

(۴) اذا أجر داراً، أو عبده بمائتی درهم لا تجب الزکوٰة ما لم یحل الحول بعد القبض فی قول أبی حنیفةؒ (قاضی خان ج: ۱ ص: ۲۵۳).

(۵) وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۲۶۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) (شرط وجوب الزکاة) فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد، سواء کان للہ کزکاة وخراج أو للعبد .... الخ . وفی الهداية کتاب الزکوٰة ج: ۱ ص: ۱۸۶ (مکتبه شرکت علمیه ملتان) ومن کان علیه دین یحیط بماله فلا زکوٰة علیه .... وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصاباً.

قومی دفاعی سرٹیفکیٹ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- ملازمت سے جو تنخواہ وغیرہ ملتی ہے اس پر حکومت کا آمدنی ٹیکس (انکم ٹیکس) دیا جاتا ہے زیادہ آمدنی پر ٹیکس سے بچنے کیلئے قومی دفاعی سرٹیفکیٹ مرکزی حکومت کے جاری کردہ خرید لئے جاتے ہیں جن کو ۵ سال تک اس لئے فروخت نہیں کیا جاتا کہ اس دوران اس مالیت پر آمدنی ٹیکس میں چھوٹ مل جاتی ہے اگر ۵ سال سے قبل فروخت کر دیئے جائیں تو پھر فروخت شدہ سرٹیفکیٹ سے حاصل شدہ رقم پر آمدنی ٹیکس دینا ہوتا ہے یہ مجبوراً خریدے جاتے ہیں، خانگی اخراجات میں خاص کمی کر کے۔ جواب تحریر فرمادیں کہ کیا ایسے خرید کردہ قومی دفاعی سرٹیفکیٹ کی مالیت پر زکوٰۃ سال بہ سال جب تک وہ فروخت نہ کئے جائیں نکالی جائے گی؟

جواب:- قومی دفاعی سرٹیفکیٹ دراصل ایک قرض ہے جو حکومت کو دیا جاتا ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہے[۱] کیونکہ وہ دَینِ قوی ہے خواہ یہ قرض کسی مجبوری سے دیا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

زکوٰۃ میں قیمتِ خرید کا حساب ہے یا قیمتِ فروخت کا؟

سوال ۱:- ہم اپنے حساب کتاب کی سہولت کے پیشِ نظر زکوٰۃ کا حساب ہر سال دسمبر کے مہینہ میں کرتے ہیں، لہٰذا اس وقت جو مال ہمارے پاس ہوتا ہے اس وقت مال کی قیمت بازار کے بھاؤ سے، قیمت خرید سے زیادہ ہوتی ہے اور کچھ کی کم، کیا ہم قیمت خرید کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں یا بازار کے بھاؤ کے حساب سے؟

جواب ۱:- جس تاریخ میں زکوٰۃ کا سال پورا ہوتا ہے اس تاریخ میں مال کا جتنا اسٹاک موجود ہے اس کی قیمت اسی تاریخ کے بازار کے نرخ کے لحاظ سے لگائی جائے گی[۲] قیمتِ خرید کے لحاظ سے نہیں، البتہ زکوٰۃ کے لئے قمری مہینے کی کوئی تاریخ مقرر کرنی ضروری ہے۔

سوال ۲:- ہمارا ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی ہے جس میں ہم کپڑا بناتے ہیں زکوٰۃ نکالتے وقت

---

(۱) وفی البدائع ج:۲ ص:۱۰، اما القوی فهو الذی وجب بدلًا عن مال التجارة کثمن عرض التجارة ....الی قوله .... ولا خلاف فی وجوب الزکوٰة فیه الا انه لا یخاطب بأداء شئ من زکوٰة ما مضی ما لم یقبض اربعین درهما وکذا فی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید) وفی الدرالمختار ج:۲ ص:۳۰۵ واعلم ان الدیون عند الامام ثلاثة، قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة.... الخ. تاہم ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ کی اصل رقم کے علاوہ زائد رقم سود ہے، اس کا لینا ناجائز ہے۔

(۲) دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

کارخانہ میں مندرجہ ذیل مال پڑے ہوتے ہیں ا:-سوت،۲:-خام کپڑا جو ہم نے بنایا ہے،۳:-رنگین کپڑا جو خام کپڑے کو اپنے کارخانہ میں رنگا ہے،۴:-تیار کپڑے کی گانٹھیں جو تیار پڑی ہوتی ہیں تاکہ جہاز سے باہر ملکوں کو روانہ کریں، ان پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب۲:- سوت، خام کپڑے، رنگین کپڑے اور تیار کپڑے میں سے ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان میں سے ہر ایک چیز کی قیمت اس تاریخ کی بازاری قیمت کے لحاظ سے لگائی جائے گی، قیمت خرید کے اعتبار سے نہیں۔ (۱)

سوال۳:- کیا سوت پر زکوٰۃ قیمت خرید کے اعتبار سے ادا کریں یا وقت کی مارکیٹ قیمت پر۔ دوسرے ۲ اور ۳ نمبر (یعنی خام کپڑا اور رنگین کپڑا) اس پر زکوٰۃ اپنی لاگت جو اس پر پڑی ہے اس پر ادا کریں یا اس قیمت پر جس پر ہم فروخت کریں گے؟ اس میں کچھ مال آرڈر کے ہوتے ہیں اور کچھ مال بغیر آرڈر کے تیار ویسے ہی ہوتے ہیں؟

جواب۳:- قیمت نہ لاگت کے لحاظ سے ہوگی نہ خوردہ نرخ کے لحاظ سے بلکہ یہ مال اگر آپ اس تاریخ میں اکٹھا فروخت کریں تو جتنی قیمتِ فروخت ہوسکتی ہو، وہ قیمت لگائی جائے گی۔ (۲)

سوال۴:- تیسری بات یہ کہ ۴ نمبر (یعنی تیار کپڑے کی گانٹھوں) پر زکوٰۃ ہم اپنی لاگت پر ادا کریں یا اس قیمت پر جس پر یہ مال جہاز پر روانہ ہوکر ہم کو گاہک سے رقم وصول ہوکر ملے گی، عموماً جہاز کے انتظار میں مال پڑا رہتا ہے؟

جواب۴:- اس کا جواب نمبر۳ میں آچکا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۶۷/ ۲۸ب)

زیورات پر زکوٰۃ

سوال:- ہندہ کے پاس اتنے زیورات ہیں کہ اگر اس کو فروخت کیا جائے تو حج فرض ہوجائے گا، جبکہ نقدی اس کے پاس بالکل نہیں ہے، زکوٰۃ و قربانی کیسے ہوگی؟

جواب:- صورت مسئولہ میں ہندہ پر حج، زکوٰۃ و قربانی فرض ہے، (۳) اگر نقد رقم موجود نہ ہو تو کسی کو زیور فروخت کرکے اس سے یہ فرائض ادا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/ ۱۸الف)

(۱،۲) دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر۲۔　　(۳) دیکھئے ص:۴۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

زکوٰۃ قرض منہا کرنے کے بعد نکالی جائے گی اور زکوٰۃ میں یومِ اداء کی قیمت کا اعتبار ہے

سوال:- مندرجہ ذیل املاک پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

۱:- دو عدد مکان، ایک دُکان جس سے ماہانہ آمدنی /۱۲۷۵ روپیہ ہے۔

۲:- سونا اہلیہ کا مقدار تیس تولہ بمعہ کھوٹ، بینک میں /۱۲۰۰۰ ہزار کے عوض گروی رکھا ہوا ہے، اگر اس زیور پر زکوٰۃ ہے تو کس حساب سے ہے؟

۳:- بینک کا ملازم ہوں، تنخواہ /۵۰۰ روپے ملتی ہے۔

۴:- نقد دو چار سو ہیں جن پر سال نہیں گزرا۔

۵:- مجموعی طور پر باون ہزار سودی قرضہ اور پچاس ہزار غیر سودی قرضہ ہے جس کی ماہانہ اقساط کرایۂ مکان و دُکان سے ادا کرتا ہوں۔

جواب:- صورت مسئولہ میں آپ کی اہلیہ کے پاس جو سونا ہے وہ اگر آپ کی ملکیت ہے تو آپ پر زکوٰۃ فرض ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سونے کی موجودہ مالیت اور آپ کا نقد روپیہ (جتنا بھی ہو) مل کر آپ کے تمام قرضوں کی رقم سے اتنا زیادہ ہو کہ اس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکے[1] لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں[2]، پہلی صورت میں آپ سونے کی قیمت اس دن کے نرخ کے مطابق لگائیں جس دن آپ کا سال پورا ہو رہا ہے[3] پھر مجموعی قیمت جوڑ کر اس میں اپنے اس نقد روپے کا اضافہ کرلیں جو اس تاریخ میں آپ کے پاس موجود ہے، (پہلے کتنا رہا؟ اس سے بحث نہیں) پھر اس مجموعی قیمت سے اپنے ذمے جو قرضے باقی ہیں ان کو منہا کرلیں، جتنی رقم بچے اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اس کا چالیسواں حصہ نکال دیجئے۔ اور اگر یہ زیور آپ کی بیوی کی ملکیت ہے تو زکوٰۃ ان پر فرض ہے (بشرطیکہ ان کے ذمہ اتنا قرض نہ ہو جس میں پورا زیور خرچ ہوجائے یا اتنا خرچ ہوجائے کہ بقدرِ نصاب باقی نہ بچے)، اس صورت میں اگر آپ کے پاس کبھی بھی سو دو سو روپے سے زیادہ جمع نہیں ہوئے تو آپ پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، مکان اور دُکان کی عمارت اور زمین کی قیمت پر کوئی زکوٰۃ نہیں، ہاں ان کا جو کرایہ وصول ہو اس پر مذکورہ تفصیل کے مطابق زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کے مفصل احکام

(۱، ۲) وفی الهداية كتاب الزكوٰة ج: ۱ ص: ۱۸٦ (مكتبه شركت علميه)، ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوٰة عليه .... وان كان ماله اكثر من دينه زكى الفاضل اذا بلغ نصابًا.

(۳) دیکھئے ص: ۵۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

کے لئے بہشتی زیور کا مطالعہ فرمائیں یا رسالہ اَحکامِ زکوٰۃ مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مہتمم دارالعلوم کراچی کا مطالعہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۹/۲۸ ج)

مشترکہ کاروبار میں ایک شریک کا زکوٰۃ ادا نہ کرنا

سوال:- کچھ عرصہ کے بعد میرے والد صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، الحمدللہ تبلیغی جماعت میں شرکت کرتا ہوں انہوں نے پچّیس ہزار روپے کاروبار کے لئے دیئے ہیں جس کا نفع و نقصان نہیں مانگتے (واضح رہے کہ رقم نہ تو ہبہ کی ہے اور نہ قرض دی ہے) رقم استعمال ہوتے ہوتے ایک سال ہوگیا والد صاحب زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں اگر میں زکوٰۃ دیدوں تو شدید ناراض ہوں گے کیا میں اس رقم کی زکوٰۃ ادا کروں یا نہیں، میری ملکیت میں کچھ زیورات ہیں کیا ان کی زکوٰۃ مذکورہ بالا کاروبار کے منافع سے ادا کردوں تو ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

جواب:- صورت مسئولہ میں آپ سال کے ختم پر حساب لگا کر یہ متعین کریں کہ کاروبار میں آپ کے سرمایہ اور منافع کی مالیت کتنی ہے، جتنی مالیت آپ کی ثابت ہو اتنی مالیت کی زکوٰۃ ادا کر کے آپ عنداللہ بری ہوجائیں گے۔[1] والد صاحب کو آپ اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ وہ بھی اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کردیں لیکن اگر وہ ادا نہ کریں تو اس کا عذاب وثواب ان پر ہے آپ اپنی زکوٰۃ نکالنے کے بعد بری الذمہ ہیں اور آپ کا کاروبار حلال ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۵/۶ھ

قرض، مملوکہ مال سے زائد ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں

سوال:- میرے پاس مبلغ دس بارہ ہزار روپے تھے، حسبِ معمول زکوٰۃ ادا کرتا رہا، اس دوران میں نے ایک مکان خریدا پچّیس ہزار کا کچھ گھر کے زیورات تھے ان کو بھی فروخت کردیا، علاوہ اس کے پندرہ ہزار روپیہ اپنے ایک بھائی سے قرضہ لے کر ان میں شامل کردیا مکان کا کرایہ دوسو پچّیس روپیہ ماہوار آتا ہے، نیز مذکورہ قرضے سے اب تک ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا گیا اب میرے پاس کچھ

---

(۱) فی التاتارخانیة ج:۲ ص:۲۹۷ فی شرح الطحاوی فان کان نصیب کل واحد منهما علی الإنفراد یبلغ نصابًا کاملًا تجب الزکاة والا فلا سواء کانت شرکتها شرکة عنان او مفاوضة او شرکة بالإرث وغیره من اسباب. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۸۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وکذا فی امدادالفتاویٰ ج:۲ ص:۵۲۵ سوال نمبر ۷[illegible] مکتبه دارالعلوم).

پیسہ کرایہ وغیرہ کا جمع ہوا ہے، جو تقریباً دو ہزار چھ سو چالیس روپیہ ہے اور پانچ تولے سونا بھی ہے زکوٰۃ کیوں اور کیسے ادا ہو؟

جواب:- صورت مسئولہ میں چونکہ قرضہ کی رقم سائل کے پاس موجود مال سے بہت زائد ہے اس لئے اگر اس کے پاس مذکورہ مال (یعنی پانچ تولہ سونا اور ۲۶۴۰ روپیہ نقد) کے سوا کچھ اور مال نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۷/۳/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۹/۱۱۸ الف)

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

سوال:- ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے ایک آنہ فی روپیہ بمد پراویڈنٹ فنڈ کٹتا ہے، اور اس کو ملازمت کے اختتام کے بعد وہ روپیہ سود کے ساتھ مل جاتا ہے، یہ تمام رقم حکومت کی تحویل میں رہتی ہے، اور ملازم کو یہ پتہ ذرا مشکل سے چلتا ہے کہ اس فنڈ میں اس کا کتنا روپیہ ہے ایسی صورت میں کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب:- اس معاملے میں اہل علم کی تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جب تک ملازم کو وصول نہ ہوجائے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور رقم وصول ہونے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسی رقم پر زکوٰۃ کا وجوب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے وہ رقم وصول ہوئی ہے، البتہ جو پراویڈنٹ فنڈ جبری نہ ہو، اور ملازم نے اپنے اختیار سے اس کے لئے رقم کٹوائی ہو اس کے معاملے میں احتیاط اسی میں ہے کہ رقم وصول ہونے پر سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مختصراً اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاءؒ نے دَین کی جو تین قسمیں قوی، متوسط اور ضعیف قرار دی ہیں[۲] پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ان میں سے دَینِ ضعیف ہی میں داخل ہوسکتی ہے، اور دَینِ ضعیف پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے امداد الفتاویٰ جلد سوم ص:۶۴۸ تا ۶۵۰ مطبوعہ کراچی میں لکھ دی ہے،[۳] اور حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف

---

(۱) وفی الهداية ج:۱ ص:۱۸۶ (مكتبه شركت علميه) ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكوٰة عليه وقال الشافعی يجب .... ولنا انه مشغول بحاجته الأصليّة فاعتبر معدومًا.

وفی الهندية كتاب الزكوٰة ج:۱ ص:۱۷۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) قال اصحابنا رحمهم الله تعالىٰ كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد كالقرض الخ.

الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید)۔

صیل کیلئے "پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ" مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

علی صاحب تھانویؒ نے اس کی تصدیق فرما کر اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع فرمایا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۷/۵/۲۴ھ (۱)

تنخواہ میں ترقی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہے زید صاحبِ نصاب ہے مثلاً سال پورا ہونے کی تاریخ ۳۰/مارچ ہے اس دن زید کو زکوٰۃ کے لئے حساب کرنا ہے کہ کتنی زکوٰۃ کل رقم پر بنتی ہے اب دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ زید کی ترقی مثلاً ۲۰/مارچ سے ہوجاتی ہے اور اس سلسلے میں کاغذی کاروائی ۲۰/مارچ کو کردی جاتی ہے، اب زید کو ترقی والی رقم ملنی ہے اگر ۳۰/مارچ سے پہلے پہلے مل جائے تو سابقہ نصاب میں شامل کی جاسکتی ہے لیکن حساب کرکے کاغذات دفتر سے پاس ہوکر ۳۰/مارچ کے بعد ہی آئیں گے اور اس کے ہاتھ ۲،۳/اپریل یا ۱۵/اپریل کو ملیں گے تو کیا کاغذی احکامات کی بناء پر ۳۰/مارچ کو حساب شدہ زکوٰۃ کی رقم میں اس کو بھی شامل کیا جائے یا نہیں؟ چونکہ حکم ترقی کا ۲۰/مارچ کو ہوچکا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تنخواہ میں ترقی کی رقم جب زید کو مل جائے گی اس وقت اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی محض کاغذی طور پر استحقاق پیدا ہونے سے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی لہٰذا ۲۰/مارچ کو جتنی رقم زید کی ملکیت میں ہے صرف اس پر زکوٰۃ نکالنی ہوگی بلکہ اب اس کی زکوٰۃ آئندہ سال نکلے گی، یعنی آئندہ سال زکوٰۃ کی تاریخ میں جتنی رقم ملکیت میں ہوگی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس میں یہ فرق کی رقم بھی شامل ہوجائے گی۔ **لأن الأصح أن الاجرة دَین ضعیف لا تجب علیه الزکوٰة حتی یقبض کالمهر۔** (۲)

لیکن یہ مسئلہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک پر ہے صاحبینؒ کے نزدیک چونکہ ہر قسم کے دَین پر زکوٰۃ واجب ہے اس لئے احتیاطاً ۱۲/اپریل کو ملنے والی رقم کی زکوٰۃ اسی سال کے نصاب میں شمار کرکے نکال دی جائے تو بہتر ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰/۲۸ ب)

---

(۱) یہ فتویٰ البلاغ کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۶ (ایچ ایم سعید) .... وعند قبض مأتین مع حولان الحول بعدهٗ ای بعد القبض (من) دین ضعیف وهو (بدل غیر مال) کمهر ودیة وبدل کتابة وخلع الا اذا کان عنده ما یضم إلی الدین الضعیف.
وفی البدائع ج:۲ ص:۱۰ (طبع سعید) واما الدین الضعیف فهو الذی وجب له بدلًا عن شئ سواء وجب له بغیر صنعه کالمیراث أو بصنعه کالوصیة او وجب بدلا عما لیس بمال کالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الکتابة ولا زکوٰة فیه ما لم یقبض کله ویحول علیه الحول بعد القبض. (محمد زبیر)

نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہونے کا اُصول

سوال:- نقد رقم کی زکوٰۃ میں کچھ اِشکال پیدا ہوا ہے، سونے چاندی، مویشی، اجناس اور تجارتی مال کا نصابِ زکوٰۃ تو بہت واضح ہے۔

البتہ نقد رقم کی صورت میں اِشکال ہے، بہشتی زیور کے باب الزکاۃ کو پورے غور سے پڑھا جس کے مسئلہ (۴) سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس روپیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور مسئلہ (۵) اور مسئلہ (۱۱) میں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سو روپیہ پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔

نقد کے نصاب کے سلسلے میں ترجمان القرآن جلد ۲۹ شمارہ مارچ ۱۳۶۸ھ میں پڑھا جس میں بتایا گیا ہے کہ نقد رقم کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر رقم ہے، آپ فرمایئے کیا صورت حال ہے؟

جواب:- نقد رقم پر زکوٰۃ کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کا نقد روپیہ ضروریاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے[1] اور ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت چونکہ بدلتی رہتی ہے لہٰذا ہر زمانے کی قیمت کا اس زمانے میں اعتبار ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۶/۱۹الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مکان کی تعمیر کے لئے جمع کی گئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید تعمیرِ مکان کے لئے رقم جمع کرتا ہے، کیا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب:- اگر یہ رقم ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۵/۱۸الف)

---

(۱) حوالہ کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۹ (طبع ایچ ایم سعید)، فتاویٰ ہندیہ ج:۱ ص:۱۷۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)، ہدایۃ ج:۱ ص:۱۹۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)، فتاویٰ تاتارخانیہ ج:۲ ص:۲۳۷ (طبع ادارۃ القرآن)۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۷ وثمینة المال کالدراهم والدنانیر لتعینهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزکوٰة کیفما أمسکهما ولو للنفقة. وفی الشامیة ج:۲ ص:۲۶۲ (ایچ ایم سعید) .... ان الزکوٰة تجب فی النقد کیفما أمسکه للنماء أو للنفقة وکذا فی البدائع، فی بحث النماء التقدیری. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۰۶ .... ان الزکوٰة تجب فی النقد کیفما أمسکه للنماء أو للنفقة.

وفی الخانیة ج:۱ ص:۲۵۲، وقال أبوحنیفة اذا وجبت علیه الزکوٰة فی أحد الوجهین ولم تجب فی الوجه الأخر کان علیه الزکوٰة. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ سوال نمبر ۵۰ ج:۲ ص:۲۹. (محمد زبیر)

ترکہ کی دُکان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- ہمارے والد صاحب کا انتقال پچھلی بقرعید سے تین دن پہلے ہوگیا تھا دُعا کیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائے، آمین۔ نقد اور دوسرا سامان وغیرہ سب شرعی طریقے سے تقسیم ہوگیا ہے اب ایک دُکان باقی ہے، یہ دُکان کرائے پر دی ہوئی ہے، اس کا کرایہ ماہ بماہ حساب سے آپس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے کیونکہ آج کل دُکان کے دام کم مل رہے ہیں اس لئے دام صحیح ہونے کا انتظار ہے جس وقت بھی مناسب دام مل گئے اس کو فروخت کرکے حساب سے سب میں تقسیم کردیا جائے گا، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس دُکان پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر ہے تو اس کی قیمت کس طرح سمجھیں کوئی کہتا ہے کہ اتنے کی بکے گی اور کوئی کچھ کہتا ہے، یعنی بالکل صحیح قیمت کا تعین شاید فروختگی کی صورت میں ہی ہوگا اگر اس دُکان (کی مالیت) پر زکوٰۃ واجب ہے اور سال پورا ہونے کے بعد کسی ایک کے پاس یا سب کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرسکے تو اس کے لئے کیا حکم ہے (یعنی اس کے پاس اس کا آیا ہوا کرایہ بھی خرچ ہوگیا ہے)۔ ہم سب لوگ شعبان/رمضان میں زکوٰۃ کا حساب کرتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت میں ہم کو کس طرح حساب کرنا ہے؟

جواب:- جو دُکان کرائے پر چڑھی ہوئی ہے، اس کی مالیت پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، البتہ جو کرایہ ملتا ہے، ہر شخص اپنے سالِ زکوٰۃ کے ختم پر دیکھے کہ اس کا جتنا حصہ اس وقت خرچ سے بچ گیا ہے وہ اگر اپنے دوسرے قابلِ زکوٰۃ اثاثوں کے ساتھ مل کر نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، ورنہ نہیں۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۳/۸۳)

سونے چاندی دونوں کی مجموعی قیمت، چاندی کے نصاب کو پہنچے تو زکوٰۃ واجب ہے

سوال ۱:- زید کے پاس پانچ تولہ سونا اور دو تولہ چاندی بصورتِ زیور ہے۔ اگر نصاب دیکھا جائے تو نصابِ زکوٰۃ کو نہ سونا پہنچتا ہے نہ چاندی اور اگر دو تولہ چاندی کی قیمت لگا کر اسے سونا فرض کیا جائے تب بھی نصابِ زکوٰۃ کو نہیں پہنچتا، دوسری طرف سونے کی قیمت لگا کر اس کو چاندی

---

(۱) وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۲۹۷، فی شرح الطحاوی: فان کان نصیب کل واحد منهما علی الإنفراد یبلغ نصابًا کاملًا تجب الزکوٰة والا فلا سواء کانت شرکتهما شرکة عنان او شرکة مفاوضة او شرکة بالإرث وغیره من اسباب الملک .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۱، ۵۲ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی).

بنالیا جائے تو وہ فرض کی ہوئی چاندی ساڑھے باون تولہ چاندی سے بڑھ جائے گی، فتویٰ درکار ہے آیا زید پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

جواب ا:- صورت مسئولہ میں زکوٰۃ فرض ہے اور وہ اس طرح کہ سونے کی قیمت لگا کر اسے چاندی کے ساتھ ملایا جائے گا[1] دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب سے بڑھ جاتی ہے اس لئے زکوٰۃ فرض ہے۔

سوال ۲:- زید کے پاس صرف پانچ تولہ سونا ہے چاندی بالکل نہیں، اسے قیمت سمجھ کر چاندی فرض کرلیں تو نصابِ زکوٰۃ چاندی کا ساڑھے باون تولہ بن جاتا ہے، آیا اس پر زکوٰۃ فرض ہے؟

جواب ۲:- چاندی بالکل نہ ہو تو کچھ نہ کچھ نقدی ضرور ہوتی ہے اور وہ بھی چاندی کے حکم میں ہے اس لئے سونے کی قیمت لگا کر اس صورت میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔[2]

سوال ۳:- زید کے پاس پانچ تولہ سونا ہے علاوہ ازیں پانچ دس روپے نقد بھی ہیں جو سال بھر اس کے پاس موجود رہے آیا اس پر سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟ کیونکہ ان روپوں کو چاندی اور اس مذکورہ پانچ تولہ سونے کو چاندی فرض کرنے سے چاندی کا نصاب پورا ہوجائے گا۔

جواب ۳:- جس سال کی یہ بات ہے اس کی قیمت کے لحاظ سے اگر ایک ہزار روپے میں ساڑھے باون تولے چاندی آجاتی ہو تو زکوٰۃ فرض ہے ورنہ نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۱/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۳۰د)

قرض منہا کرنے کے بعد جو رقم بچے اگر وہ بقدرِ نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- زید کے پاس اس کی اپنی رقم ۵ ہزار روپے ہے جو کاروبار میں لگا رکھی ہے اور دس ہزار قرض لیا ہے علاوہ ازیں کچھ زیور بطورِ استعمال بھی قرض لے کر بنوایا گیا ہے، زید کو کس رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کو یہ چاہیے کہ اس کے پاس جتنا نقد روپیہ ہے یا جتنا مالِ تجارت یا زیور ہے خواہ وہ قرض روپیہ لے کر ہی حاصل کیا گیا ہو، ان سب کی قیمت لگا کر ان املاک کا مجموعہ نکالے اس کے بعد جتنا قرض اس پر واجب ہے اس کو اس مجموعے سے منہا کرے، جتنی مالیت

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۳ (طبع سعید) و یضم الذهب إلى الفضة وعكسه بجامع الثمنية قيمة وقالا بالأجزاء. وفی الهداية ج:۱ ص:۱۹۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) و یضم الذهب الى الفضة للمجانسة من حيث الثمنية. (محمد زبیر حق نواز)

قرض کی منہائی کے بعد باقی بچے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر ادا کردے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۲۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۹۳/۲۷ و)

نصابی سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- گزشتہ سال میں نے ۴۴ ہزار روپیہ کی ادھاری اور کچھ نقدی کمائی سب کی زکوٰۃ میں نے پورا حساب کرکے نکال دی تھی اور اب وہ ادھاری گھٹ کر ۳۳ ہزار رہ گئی ہے اور کچھ نقدی جمع ہے اب مجھے زکوٰۃ کس طرح سے دینی چاہئے؟

جواب:- جس تاریخ میں آپ کی زکوٰۃ کا نصابی سال پورا ہوتا ہے اس تاریخ میں جو کچھ نقد روپیہ، زیور، مالِ تجارت اور لوگوں کو دیئے ہوئے قرضے ہوں گے سب پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لوگوں کے ذمے آپ کے قرضے اگر اب گھٹ کر ۳۳ ہزار رہ گئے ہیں تو اب ۳۳ ہزار پر زکوٰۃ ہوگی۔[2]

سوال ۲:- اگر ادھار میں رقم ڈوبی ہوئی ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا؟

جواب ۲:- ایسے مال پر ابھی زکوٰۃ واجب نہیں لیکن اگر خلافِ اُمید مل گیا تو پچھلے سالوں کی زکوٰۃ نکلے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ اسی وقت معلوم کرلیں، اور اس میں پہلے یہ بتائیں کہ ڈُوبنے کی وجہ کیا تھی؟

سوال ۳:- اگر رقم لین دین میں چل رہی ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب ۳:- اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقم آپ نے کسی اور کو قرض دے رکھی ہے تو اس کا حکم نمبر ۱ میں گزرا کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہے، اگر کچھ اور مطلب ہے تو دوبارہ واضح طریقے پر سوال لکھ کر مسئلہ معلوم کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۵۶/۲۸ ج)

صرف سو روپے پر زکوٰۃ نہیں

سوال:- زکوٰۃ ہر اس شخص پر واجب ہے جس کے پاس ساڑھے سات تولہ خالص سونا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۳ (ایچ ایم سعید)، (فلا زکوٰۃ علی مکاتب.... ومدیون للعبد بقدر دینہ) فیزکی الزائد ان بلغ نصابًا.... الخ. وفی الھدایۃ کتاب الزکوٰۃ ج:۱ ص:۱۸۶ (مکتبہ شرکت علمیہ) ومن کان علیہ دین یحیط بمالہ فلا زکوٰۃ علیہ .... وان کان مالہ اکثر من دینہ زکی الفاضل اذا بلغ نصابًا.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید) واعلم أن الدیون عند الامام ثلٰثۃ قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکوٰتھا اذا تم نصابًا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض اربعین درھما من الدین (القوی) کقرض وبدل مال تجارۃ.... الخ. وفی الشامیۃ تحت (قولہ أذاتم نصابًا) .... والمراد اذا بلغ نصابًا بنفسہ او بما عندہ مما یتم بہ النصاب.

(ایک سال گزرنے پر) یا ساڑھے باون تولہ خالص چاندی ہو (ایک سال گزرنے پر) ان اوزان میں اگر ایک ایک رتی سونا یا چاندی کم ہو تو ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ اتنا سونا چاندی ہو تو زکوٰۃ نکالے گا۔

دوسری طرف علماء کہتے ہیں کہ اگر ۱۰۰ روپے موجود ہوں اور سال گزر گیا ہے تو اس کی بھی ڈھائی فیصد زکوٰۃ نکالے، جب نصاب مقرر ہے تو ۱۰۰ روپیہ رکھنے والا کیوں زکوٰۃ نکالے؟

جواب:- آج کل کسی شخص کے پاس ۱۰۰ روپے ہوں اور سونا بالکل نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، جس شخص نے اس پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے اس نے غلط کہا ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کے پاس کچھ سونا بھی موجود ہو اور کچھ چاندی یا نقدی روپیہ بھی، اور ان دونوں کی مجموعی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے،[1] مثلاً کسی کے پاس دو تولہ سونا ہے جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے اور اس کے ساتھ سو روپے نقد بھی ہیں تو اب اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی لیکن جب سونا بالکل نہ ہو صرف سو روپے ہوں تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۷۹/۷/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۱/۲۸ ج)

۱:- سال کے آخر میں موجود تمام رقم پر زکوٰۃ واجب ہے
۲:- دیئے گئے قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں ایک تاجر ہوں، تجارت کی ابتداء کئے ہوئے ۱۲ یا ۱۴ ماہ ہوئے ہیں، زکوٰۃ کا مسئلہ دریافت کرنا ہے۔

۱:- تجارت میں سال کے آخر میں جتنا نقد ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ ہوتی ہے یا صرف اس حصہ پر جو کہ سال بھر میں نقد کی صورت میں ہمارے پاس رہے۔ مثلاً سال کے آخر میں ۵ ہزار روپے ہوتے ہیں، چار ہزار روپے ایک ماہ پہلے ملے تھے تو اب زکوٰۃ ۵۰۰۰/ پر یا ایک ہزار پر ادا کرنا ہوگی؟

۲:- اُوپر کے مسئلے کی طرح مالِ تجارت کو لیجئے کیا یہاں بھی وہی اُصول لاگو ہوگا یا کچھ مختلف ہے؟

جواب ۱، ۲:- اگر سال کے شروع اور آخر میں انسان کی قابلِ زکوٰۃ ملکیت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم نہ ہو تو سال پورا ہونے کی تاریخ میں اس کے پاس جس قدر نقد یا مالِ تجارت موجود ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، سال کے دوران جو کمی بیشی ہوتی رہی ہو اس کا کچھ اعتبار

---

(۱) دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر ۱۔

نہیں، چنانچہ آپ نے جو مثال دی ہے اس میں زکوٰۃ پورے پانچ ہزار پر ہوگی، ایک دن پہلے جو رقم آئی ہے وہ بھی شامل کی جائے گی، اور ایک دن پہلے جو رقم چلی گئی ہے وہ شامل نہ ہوگی، یہی معاملہ مالِ تجارت کا بھی ہے سال پورا ہونے کی تاریخ میں جتنی مالیت موجود ہے اس پر زکوٰۃ آئے گی۔ (۱)

سوال۳:- کیا اس رقم پر بھی زکوٰۃ ہوگی جو ہمارے مقروضوں کے ذمے ہے اگر زکوٰۃ ہے تو کیا اس رقم میں سے وہ رقم گھٹائی جائے گی جو ہمارے اُوپر قرض ہے دوسرے لوگوں کی؟ مثلاً ہم کو ۸۰۰۰ روپے وصول کرنے ہیں اور ۶۰۰۰ روپے دینے ہیں تو کیا دو ہزار روپے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی؟

جواب۳:- جی ہاں، جو رقم دوسرے لوگوں پر قرض ہے اس پر زکوٰۃ آپ کے ذمے ہے اگر چہ اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ وصول ہوجائے،(۲) لیکن اس وقت تمام پچھلے سالوں کا حساب کرنا ہوگا لہٰذا سہولت اسی میں رہتی ہے کہ ہر سال جتنی رقم کہیں قرض کی گئی ہے اس کی زکوٰۃ بھی ادا کی جاتی رہے اور اسی طرح اگر آپ پر کسی کا جو قرض ہے وہ آپ کی پوری مالیت سے مستثنیٰ کیا جائے گا اور اسے مستثنیٰ کرنے کے بعد جتنی مالیت آپ کے پاس بچے گی اس پر زکوٰۃ ہوگی، مثلاً آپ کی نقد رقم دس ہزار ہے اور آپ پر پانچ ہزار کے قرضے واجب ہیں تو آپ پر صرف پانچ ہزار کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ (۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۳/۲۸ ج)

مقروض کو زکوٰۃ دے کر اپنے قرض میں واپس لینے کا حکم

سوال:- ایک مال دار آدمی ہے جو ایک غریب آدمی کو زکوٰۃ دینا چاہتا ہے اور اس شخص پر اس آدمی کا قرضہ ہے، وہ مال دار آدمی اس وقت اپنا قرضہ اس شخص سے لے سکتا ہے جس کو ابھی ابھی زکوٰۃ دی ہو؟

جواب:- اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مال دار آدمی غریب کو زکوٰۃ کی رقم سپرد کردے اس

---

(۱) وفی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۵ (طبع ایچ ایم سعید) ولکن هذا الشرط یعتبر فی أول الحول وفی آخره لا فی خلاله .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۸۸، والمستفاد (ولو بهبة أو إرث) وسط الحول یضم إلی نصاب من جنسه فیزکیه بحول الأصل. وفی الشامیة قوله إلی نصاب .... وأشار الیٰ انه لابد من بقاء الأصل .... فان وجد منه شیئا قبل الحول ولو بیوم ضمه وزکی الکل .... الخ.

(۲) دیکھئے سابقہ حوالہ صفحہ:۴۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۳ (طبع سعید کراچی) (فلا زکوٰة علی مکاتب .... ومدیون للعبد بقدر دینه) فیزکی الزائد ان بلغ نصابًا .... الخ. وفی الهدایة کتاب الزکوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع شرکت علمیه) ومن کان علیه دین یحیط بماله فلا زکوٰة علیه .... وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصابًا.

کے بعد اگر غریب آدمی اس رقم میں سے قرضہ ادا کردے تو جائز ہے۔[۱] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۹ھ

سونے چاندی کی کتنی مقدار پر زکوٰۃ لازم ہے؟

سوال:- ایک شخص کے پاس تیس تولہ چاندی اور دوسرے کے پاس چاندی اور کچھ سونا ہے، ان دونوں آدمیوں پر زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں اور کتنی مقدار چاندی اور سونے میں زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے؟

جواب:- اگر کسی کے پاس سونا بالکل نہیں تو زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب ساڑھے باون تولہ چاندی اس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے، اور اگر سونا بھی ہے تو سونے اور چاندی دونوں کی قیمت لگائی جائے، دونوں کی قیمت مل کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۹ھ

قرض پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید نے عارف سے مثلاً ایک لاکھ روپیہ اُدھار لئے، عارف پہلے ہی صاحبِ نصاب تھا اب زید نے عارف کو یہ رقم دس سال کے بعد ادا کی، کیا عارف کو ایک لاکھ روپے پر ۱۰ سالوں کی علیحدہ علیحدہ کر کے مثلاً ایک سال کے ۲۵۰۰ روپے اور دس سالوں کے پچیّس ہزار روپے بطور زکوٰۃ دینا پڑیں گے یا جس سال ملے صرف اسی سال کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی اور ۹ سالوں کی نہیں دینی پڑے گی کیا حکم ہے؟

جواب:- قرض دَینِ قوی ہے،[۲] لہٰذا اس پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی رہتی ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے جب رقم وصول ہو۔ صورتِ مسئولہ میں عارف پر واجب ہے کہ وہ ایک لاکھ روپے وصول ہونے پر گزشتہ پورے دس سال کی زکوٰۃ ادا کرے صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا کافی نہیں۔[۳] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۱/۲۸ ب)

کرنسی کے تبادلے کے لئے دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- زید غیر ملک میں پاکستانی سفارت خانہ میں ملازم ہے، ملازمت کا حصہ ختم ہونے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلة الجواز أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه.

(۲،۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ واعلم أن الدیون عند الامام ثلثة قوی ومتوسط وضعیف، فتجب زکوتها اذاتم نصابًا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض أربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة.

نیز دیکھئے ص:۴۶ کا حاشیہ نمبرا

پر سفارت خانہ میں ۲۰۰۰ روبل گھریلو سامان فروخت کر کے اور پانچ ہزار روبل اپنی کار فروخت کر کے یہ رقوم حکومت کے پاس جمع کرادیں کہ پاکستان آکر حکومت سے ان کے بدلے پاکستانی روپے لے لے گا۔ روبل رُوسی سکہ ہے ایک روبل کے سرکاری طور پر ۱۴ روپے ملتے ہیں اس لحاظ سے تقریباً ۲۸۰۰۰ روپے گھریلو سامان کے، اور کار کے ۷۰۰۰۰ روپے ہوئے، اب زید نے پاکستان آکر اپنے پرانے دفتر میں کام کرنا شروع کردیا جہاں سے وہ سفارت خانے میں کام کرنے گیا تھا، پاکستان میں کچھ قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے زید کو مثلاً دو سال بعد کار کی رقم ستر ہزار مل گئی، زید نے اس رقم کی زکوٰۃ رقم ملنے سے ایک سال پہلے ہی دیدی، اب دوسرے سال کی دینے لگا ہے مگر زید کو قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے ۲۸۰۰۰ ہزار روپے نہیں ملے، اب یہ معلوم کرنا ہے کہ اٹھائیس ہزار روپے مثلاً ابھی مل جاتے ہیں تو اس کی دوسرے سال کی زکوٰۃ (جبکہ زید پہلے ہی ایک سال کی اس رقم کی بھی زکوٰۃ دے چکا ہے) تو ابھی دینی ہے لیکن یہی رقم زید کی زکوٰۃ کے سال ختم ہونے کے بعد اگر ملے تو کیا اس سال کی زکوٰۃ دینا پڑے گی یا پچھلے سال کی بھی یعنی جس سال رقم ملے اس سال کی زکوٰۃ دینا ہوگی یا پچھلے سال کی بھی؟

جواب:- مذکورہ اٹھائیس ہزار روپے آپ کی ملکیت میں آچکے ہیں، اس کے بعد آپ نے وہ سفارت خانے کو تبادلے کے لئے دیئے ہیں لہٰذا ان پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی رہے گی اور وہ روپے جب بھی آپ کو وصول ہوں پچھلے سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی آپ پر واجب ہوگی مثلاً پانچ سال گزرنے کے بعد وصول ہوئے تو آپ کو ۳۵۰۰ روپے زکوٰۃ میں نکالنے ہوں گے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۱/۲۸ ب)

پنشن کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں ایک ملازم پیشہ شخص ہوں حال ہی میں راقم اپنے محکمہ سے ریٹائرڈ ہوا ہے، ریٹائرمنٹ پر مجھے حکومت کی طرف سے ۳۶۰۵۱ روپے ملے میں نے وہ رقم گھر میں غیر محفوظ سمجھ کر بینک میں جمع کرادی، میرا اپنا مکان نہیں ہے اور ذاتی آمدنی بھی اتنی نہیں ہے کہ خرچ پورا ہوسکے، تنگ دستی سے وقت بسر کرتا ہوں، یہ رقم میرے پاس آئے ہوئے صرف نو دن ہوئے تھے کہ بینک والوں نے اس سے ۹۰۲/۵۰ زکوٰۃ کے کاٹ لئے، شرعاً مجھ پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۰۵ (طبع سعید کراچی) واعلم أن الدیون عند الامام ثلٰثة قوی ومتوسط وضعیف، فتجب زکٰوتها اذاتم نصابًا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض أربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة.
نیز دیکھئے ص:۴۶ کا حاشیہ نمبر ۱

جواب:- جس شخص کے پاس اپنی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا زیور یا تجارتی سامان ہو اس کو صاحبِ نصاب کہتے ہیں، جو شخص سال بھر صاحبِ نصاب رہا ہو یا سال کے شروع اور آخر میں صاحبِ نصاب ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، جو شخص سال کے شروع میں صاحبِ نصاب ہو اگر سال کے دوران اس کے پاس کچھ نئی رقم اس نصاب کے علاوہ آجائے تو اس نئی رقم کی زکوٰۃ بھی سابقہ نصاب کے ساتھ ادا کرنی لازم ہوتی ہے، مذکورہ صورت میں آپ اس رقم کے آنے سے کم از کم ایک سال پہلے صاحبِ نصاب تھے یا نہیں، اگر صاحبِ نصاب تھے تو بینک میں جو زکوٰۃ وضع کی گئی وہ درست ہوگئی[1] اور اگر مہینہ رمضان ۱۴۰۰ھ کو آپ صاحبِ نصاب نہیں تھے اور اس رقم کے آنے کے بعد صاحبِ نصاب بنے تو پھر اس رقم سے زکوٰۃ وضع کرنا جائز نہیں، اب آپ درخواست دے کر اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور حکام پر واجب ہے کہ وہ یہ رقم واپس کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۳۴/۳۲ ج)

۱:- زیورات پر زکوٰۃ موجودہ قیمت کے حساب سے لازم ہے
۲:- زیورات میں ٹانکہ اور بنوائی کی قیمت پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- سونے چاندی کی زکوٰۃ موجودہ بھاؤ کے حساب سے قیمت لگا کر دینی چاہئے؟

جواب ۱:- جی ہاں۔[2]

سوال ۲:- زیورات میں ٹانکہ اور بنوائی کی قیمت کو نکالنا ہوگا یا نہیں؟

جواب ۲:- بنوائی کی قیمت کو نکالنا ہوگا، ٹانکے کی قیمت کو نہیں (جبکہ خود اسی چاندی سے زکوٰۃ ادا کی جائے، اور اگر قیمت لگا کر زکوٰۃ نکالی گئی، تو بازار کے نرخ کے مطابق لگے گی جس میں ٹانکے کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۲ محمد شفیع) والمعتبر وزنھما اداءً ووجوبًا (شامی ج:۲ ص:۴۰)۔[3]

سوال ۳:- عام طور پر سونے کے زیورات کو جب فروخت کرنے جاتے ہیں تو کم قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، کیا اس بات کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا؟

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب "جدید فقہی مقالات" ج:۲ ص:۵۷ تا ۱۳۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی بدائع الصنائع کتاب الزکوٰۃ فصل وأما صفة الواجب فی أموال التجارة ج:۲ ص:۲۲ (ایچ ایم سعید) لأن الواجب الأصلی عندهما هو ربع عشر العین، وانما له ولایة النقل الی القیمة یوم الأداء فیعتبر قیمتها یوم الاداء، والصحیح ان هذا مذهب جمیع اصحابنا .... الخ، نیز دیکھئے ص:۵۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۳) الدر المختار باب زکوٰۃ المال ج:۲ ص:۲۹۷ (طبع ایچ ایم سعید). وفی البدائع ج:۲ ص:۲۰ وإنما المعتبر فیهما الوزن .... الخ. (محمد زبیر)

جواب۳:- جس قیمت پر بازار میں فروخت ہوسکتا ہے اسی قیمت کا اعتبار کر کے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔(۱) (محمد شفیع عفی عنہ)

والله سبحانہ تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/ ۱۸الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

سوال:- جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں کیا وہ ٹیکس بھی ادا کریں یا نہیں، دونوں صورتوں میں زبردست مالی خسارہ ہوتا ہے زکوٰۃ نہ دینے کی صورت میں مجرمِ خدا ہوجاتے ہیں، ٹیکس نہ دیں تو حکومت پیچھا نہیں چھوڑتی، کیا ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اب ٹیکس سے بچنے کے لئے اگر کوئی رجسٹروں میں کمی بیشی کرے تو کوئی صورت ہے؟

جواب:- سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی(۲) حکومت کو صرف ایسے ٹیکس لگانے چاہئیں جو عوام پر بار نہ بنیں، اگر حق و انصاف سے زائد ٹیکس لگائے گئے ہیں تو ان سے اخفاء کے ذریعہ نجات حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں جھوٹ وغیرہ کا گناہ مول نہ لیا جائے۔

والله اعلم
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/ ۱۸الف)

زکوٰۃ کا وجوب قمری سال سے ہوتا ہے

سوال:- زکوٰۃ کا وجوب قمری سال سے ہوتا ہے یا شمسی سال سے؟

جواب:- زکوٰۃ کا وجوب، قمری سال سے ہوتا ہے۔(۳)

والله سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۷۵/ ۵۸)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں قیمتِ فروخت کا اعتبار ہے

سوال۱:- زکوٰۃ، جس چیز پر واجب ہو اس کی موجودہ بازاری قیمت دیکھی جائے گی یا خرید کی قیمت؟ مثلاً پہلے جب سونے کا ایک تولہ لیا تھا تو سستا ملا تھا، اب ۵۰۰ روپے کا تولہ ہے کونسی قیمت

---

(۱) دیکھئے: سابقہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۳۱۰ (ایچ ایم سعید): مطلب لا تسقط الزكاة بالدفع الى العاشر فی زماننا: واعلم ان بعض فسقة التجار یظن ان ما یؤخذ من المكس یحسب عنه اذا نوی به الزكوة وهذا ظن باطل .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار قبیل باب زكوة المال ج:۲ ص:۲۹۴ (طبع سعید) وحولها ای الزكوة قمری .... لا شمسی الخ.

کا اعتبار کیا جائے؟

۲:- اگر قیمتِ خرید کی رعایت کی جائے گی تو کیا سامانِ تجارت میں بھی اس کا لحاظ کیا جائے گا؟

جواب ۱:- قیمتِ خرید معتبر نہیں، بلکہ جس دن سال پورا ہو رہا ہو اس دن کی قیمت معتبر ہے،[۱] چنانچہ صورتِ مسئولہ میں ایک تولہ سونا ۵ سو روپے کے حساب سے لگایا جائے گا۔

۲:- دُکان کے سامان میں اعتبار اس کا ہے کہ اگر یہ پورا سامان آج فروخت کیا جائے تو کیا قیمت لگے گی؟ قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں۔[۲] واللہ اعلم

۱۲/۱۰/۱۳۹۷ھ

کمپنی کے ''ریزرو فنڈ'' پر زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- عرصہ سولہ سال سے میں ایک کمپنی میں بحیثیت تقسیمِ کار کے کاروبار کرتا ہوں، گزشتہ سال تک تو سرمایہ کافی تھا مگر اب کام کی وسعت کی وجہ سے یہ سرمایہ بالکل قلیل ہے، شرکاء نے مجبوری سے بینک سے بذریعہ اوور ڈرافٹ روپیہ لینا شروع کیا۔

مندرجہ بالا ادارہ ایک مخصوص رقم بطور ریزرو فنڈ محفوظ رکھتا ہے اس کی کوئی شریک زکوٰۃ نہیں ادا کرتا، اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اصل یہ ہے کہ مشترک کاروبار میں ہر حصہ دار پر اتنے مال کی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے جتنا کاروبار میں سے اس کے حصے میں آئے،[۳] جس میں ریزرو فنڈ میں اس کا حصہ بھی شامل ہے[۴] (تقسیم شدہ منافع کی زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے) لہٰذا اگر ہر حصہ دار اپنے کل حصے کی زکوٰۃ نکال دے تو ریزرو فنڈ کی زکوٰۃ بھی اس میں خود بخود آ جائے گی۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵/۱۲/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۲/۱۸ الف)

زکوٰۃ کی رقم کاروبار میں لگانے کا حکم

سوال:- میرے پاس گاؤں کے مدرسہ کا فنڈ ہے چونکہ دار العلوم کی کوئی مستقل آمدن نہیں ہے صدقات اور زکوٰۃ سے کام چلاتے ہیں، آج کل میرے پاس پچاس ہزار روپے ہیں۔ شوریٰ والے کہتے ہیں کہ اگر اس رقم کو کسی جائز اور منافع بخش کاروبار میں لگا دیں تو اصل بھی محفوظ رہے گا اور منافع

(۱، ۲) دیکھئے: سابقہ صفحہ نمبر ۵۰ اور ۶۶ کا حاشیہ نمبر ۲۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

(۳) حوالہ کے لئے سابقہ صفحہ نمبر: ۵۵ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) ''ریزرو فنڈ'' کی زکوٰۃ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مستقل فتویٰ آگے ص: ۷۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

بھی ملتا رہے گا، اس طرح دارالعلوم کی رقم کاروبار میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر کاروبار میں نفع کا تقریباً یقین ہو تو فنڈ کی فاضل رقم اس میں لگانے کی گنجائش ہے، لیکن دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں، ایک یہ کہ اگر نقصان ہوگیا تو لگانے والے کو اپنی جیب سے بھرنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ کی رقم کو زیادہ عرصہ تک کاروبار میں لگائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے اسے جلد از جلد مستحقین کو پہنچانا ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵/۷۵/۵۸)

انکم ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی

سوال ا:- جو لوگ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ضرور خدا کے مجرم ہیں۔ اور اگر زکوٰۃ ادا کریں اور ٹیکس سے جان چھڑانا چاہیں تو حکومت چھوڑتی نہیں ہے۔ دونوں ادا کرتے ہیں تو زبردست مالی خسارہ اُٹھانا پڑتا ہے، کیا کیا جائے؟

جواب ا:- انکم ٹیکس کا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں، زکوٰۃ عبادت اور اللہ کا حق ہے، اور انکم ٹیکس ایک حکومت کا ٹیکس ہے، لہٰذا ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی ادائیگی نہیں ہوتی،[1] انکم ٹیکس کے لئے حقیقی سرمایہ کو چھپانے میں جب جھوٹ بولنا پڑے یا جھوٹی شہادت دینا پڑے تو وہ جائز نہیں۔

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۱/۱۸ الف)

ا:- بغیر سلے ہوئے کپڑے پر زکوٰۃ کا حکم
۲:- صرف پانچ تولہ سونے پر زکوٰۃ کا حکم
۳:- ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر نقدی پر زکوٰۃ کا حکم
۴:- زکوٰۃ کے لئے قمری سال کا اعتبار ہے

سوال ا:- میں صاحبِ نصاب ہوں میرے پاس کچھ کپڑا بغیر سلا ہوا ایک سال سے زائد عرصہ سے پڑا ہوا ہے اس پر زکوٰۃ دی جانی چاہئے یا نہیں؟

(۱) دیکھئے سابقہ صفحہ نمبر ۶۷ کا حاشیہ نمبر ۲۔

۲:- صرف ۵ تولہ سونا ہے، نقدی وغیرہ اور کچھ نہیں ہے کیا اس پر بھی زکوٰۃ دی جائے؟

۳:- زید کے پاس نہ سونا ہے نہ چاندی ہے، ہاں اتنی رقم ہے کہ جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہوئی یا نہیں؟

۴:- مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ شمسی سال سے دو، مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں فضائل صدقات میں کہ قمری سال سے دو، کس کی بات مانیں؟

جواب ۱:- اگر یہ کپڑا بغرضِ تجارت نہیں لیا گیا تھا تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔[1]

۲:- پانچ تولہ سونے کے ساتھ اگر ایک روپیہ کے برابر نقدی بھی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اتنی نقدی تو ہوتی ہی ہے۔ ہاں اگر واقعۃً ایک روپیہ کے برابر بھی نقدی نہ ہو تو بے شک صرف سونے پر زکوٰۃ اس وقت تک نہ ہوگی جب تک وہ ساڑھے سات تولے نہ ہو جائے۔[2]

۳:- جی ہاں فرض ہے۔

۴:- زکوٰۃ کے لئے قمری سال کا اعتبار ہے، لقولہ تعالیٰ: **یسئلونک عن الأھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج**۔[3] عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نیز بزرگانِ دین کے زمانے میں قمری سال ہی کے مطابق زکوٰۃ کا حساب ہوتا رہا ہے، اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، جو صاحب شمسی سال سے زکوٰۃ کا حساب کرنے کے قائل ہوں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۰۱/۲۹ ج)

کینیڈا میں مکان خریدنے والے مقروض شخص پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- مکرمی محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کینیڈا میں مکانوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بیک وقت ادائیگی مشکل ہے اس لئے مجبوراً قرض پر مکان خریدنا پڑتا ہے اور یہ قرض قسطوں میں 30,25 سال میں ادا کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت میں یعنی مکان کا قرضہ بھی ہر ماہ قسط کی صورت میں اداء ہو رہا ہے، اس کے

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ج:۲ ص:۲۶۲ قولہ وفارغ عن حاجتہ الأصلیۃ .... وھی ما یدفع الھلاک عن الانسان تحقیقًا کالنفقۃ ودور السکنی وآلات الحرب والثیاب المحتاج الیھا لدفع الحر او البرد.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۴، ۲۶۵ (طبع سعید) ولا فی ثیاب البدن .... ودور السکنی ونحوھا .... اذا لم تنو للتجارۃ.

وفی الھدایۃ ج:۱ ص:۱۸۶ (مکتبہ شرکت علمیہ) ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن ....وسلاح الاستعمال زکوۃ .... الخ.

(۲) وفی البدائع کتاب الزکوٰۃ ج:۲ ص:۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) فاما اذا کان لہ ذھب مفرد فلا شیٔ فیہ حتیٰ یبلغ عشرین مثقالًا، فاذا بلغ عشرین مثقالًا ففیہ نصف مثقال .... الخ.

(۳) سورۃ البقرۃ:۱۸۹ وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۹۴ (طبع سعید کراچی) وحولھا ای الزکٰوۃ قمری لا شمسی وسیجئی الفرق .... الخ، وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۱۷۵ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) العبرۃ فی الزکٰوۃ للحول القمری .... الخ.

باوجود 5 یا 10 ہزار ڈالر جمع ہوگئے ہیں، کیا ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟ اور حج بھی فرض ہوگا؟

جواب:- اس رقم پر زکوٰۃ دینی چاہئے کیونکہ مکان کا قرض مؤجل ہے اور قرض مؤجل علی الاصح مانع وجوبِ زکوٰۃ نہیں، وعن ابی حنیفةؒ لا یمنع وقال الصّدر الشهید لا روایة فیه ولکل من المنع وعدمه وجهٌ زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع (شامی ج:۲ ص:۵)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۰/۳۰ د)

بیمہ کمپنی میں جمع کرائی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے
کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے

سوال:- بیمہ کمپنی میں جو مال جمع شدہ ہو اس پر ہر سال زکوٰۃ دی جائے گی؟ اگر اس پر زکوٰۃ ہے تو زکوٰۃ دیتے وقت اپنے مال میں اسے شمار کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- بیمہ کی جو رقم کمپنی میں لگی ہوئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے وقت اسے اپنے مال میں ضرور شمار کریں۔

سوال:- کسی کمپنی کے شیئرز خریدنے اگر جائز ہیں تو اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

جواب:- کمپنی کے حصص خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کا کاروبار جائز ہو اور حصص کی قیمت پر زکوٰۃ بھی واجب ہے۔[۲]

فقط واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

فروخت شدہ زمین کی رقم اور کمپنیوں کے حصص پر زکوٰۃ کا حکم
زکوٰۃ پورے سرمایہ پر لازم ہے یا صرف منافع پر؟

سوال ۱:- زرعی زمین فروخت کردی جائے اور روپے بینک میں رکھیں تو اس پر زکوٰۃ ہوگی یا کسی منافع بخش کاروبار میں لگانے سے زکوٰۃ لازم ہوگی؟

۲:- اگر زرعی زمین کی آمدنی پورے سال نہ رکھی جائے بلکہ خرچ کی جائے تو کیا اس پر زکوٰۃ

---

(۱) ج:۲ ص:۲۶۱ (طبع سعید).

(۲) شیئرز کی خرید و فروخت کی شرائط اور اس پر زکوٰۃ کے وجوب سے متعلق تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" صفحہ نمبر ۸۵ تا ۹۴، اور رسالہ "شیئرز کی خرید و فروخت کے اَحکام" ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

واجب ہوگی؟

۳:- اگر زرعی آمدنی حاصل ہونے کے بعد یہ رقم دورانِ سال کسی کمپنی کے حصص کی خرید پر لگادی جائے تو پورے سرمایہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا ان حصص کی سالانہ آمدنی (نفع) پر؟

۴:- اگر زرعی آمدنی کی رقم کسی تجارت میں لگادی جائے تو پورے سرمایہ پر زکوٰۃ ہوگی یا صرف سالانہ نفع پر اور اس نفع کا سال بھر ہمارے پاس رہنا ضروری ہے؟

جواب ا:- نقد روپیہ کے بارے میں اُصول یہ ہے کہ سال کے اختتام پر جتنا روپیہ جمع ہے خواہ وہ کہیں سے حاصل ہوا ہو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکال دیا جائے، زرعی زمینیں فروخت کر کے جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے جو رقم اختتامِ سال پر موجود ہو اس پوری رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲:- نمبرا میں بتایا گیا ہے کہ سال کے ختم پر جتنی رقم ہو اس کی زکوٰۃ نکال دی جائے، جو رقم دورانِ سال خرچ ہوگئی اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

۳:- کمپنیوں کے حصص جتنی مالیت کے ہوں اتنی مالیت کو اور ان پر جو سالانہ منافع حاصل ہو ان کو نقد رقم میں شامل کرلیا جائے پھر مجموعے کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔[1]

۴:- پورے مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہوگی[2] لیکن مالِ تجارت میں عمارت، دُکان، مشین، فرنیچر شامل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۸/۲۱ الف)

قرضے سے زائد رقم بقدرِ نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں

سوال:- ایک شخص کے پاس بیس ہزار کا زیور ہے اور رہائشی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں ستر ہزار کا مقروض ہے کیا یہ قرض ہوتے ہوئے اس کو اس بیس ہزار کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور اگر سونے کی قیمت قرض کی رقم سے زیادہ ہو تو پھر زکوٰۃ اور صدقہ فطر واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب تک اس کے پاس ستر ہزار سے بقدر نصاب زائد رقم یا زیور نہ ہو، اس پر زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر واجب نہیں۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۱/۱۰ھ

(۱،۲) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۷۵ (رشیدیه کوئٹه) ومن کان له نصابًا فاستفاد فی أثناء الحول مالًا من جنسه ضمه الی ماله وزکاه سواء کان المستفاد من نمائه اولا وبأی وجه استفاد ضمه .... الخ.

(۳) دیکھئے صفحہ نمبر ۱۵ کا حاشیہ نمبر ۵۔

کمپنی کے ریزروفنڈ پر زکوٰۃ کا حکم اور طریقہ

سوال:- محترمی ومکرمی حضرت العلام مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعد سلام مسنون! اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوگا یہاں بحمد اللہ تعالیٰ سب بخیر و عافیت ہیں دُعا گو طالبِ دعا ہیں۔

ضروری گزارش یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں اسلامی بینکوں کے نفع میں سے ایک معینہ حصہ قانوناً ریزروفنڈ (Reserve Fund) کے نام سے رکھا جاتا ہے اب اس ریزروفنڈ کی رقم پر ادائے زکوٰۃ واجب ہونے نہ ہونے پر یہاں کے علمائے کرام میں اختلاف ہو رہا ہے معدودے چند علماء کی رائے زکوٰۃ ادا کرنے کی طرف ہے جیسے بعض عرب علماء کی رائے ہے اس کے لئے بینک کو شخصِ قانونی قرار دے کر ادائے زکوٰۃ کو واجب کہا گیا ہے۔

دوسرے علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اس کے لئے عاقل، بالغ، مسلم ہونا ضروری ہے اس لئے نابالغ ومجانین کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں اسی طرح ریزوفنڈ کی رقم پر بھی چونکہ مالکان کو تصرف کا قانوناً اختیار نہیں ہے اس لئے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اس بارے میں حضرت محترم کی رائے سے مطلع ہونے کا خواہش مند ہوں۔ والسلام

مفتی عبدالرحمٰن

مرکز الفکر اسلامی بنگلہ دیش، گلشن ڈھاکہ

جواب:- مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آنجناب کا گرامی نامہ بینکوں کے ریزروفنڈ پر زکوٰۃ کے بارے میں موصول ہوا، میں اس وقت سفر پر تھا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

یہ مسئلہ صرف بینکوں کے ریزر وفنڈ کا نہیں، بلکہ مشترک سرمائے کی تمام کمپنیوں کے ریزر وفنڈ کا ہے، اس مسئلے پر جتنا کچھ بندہ نے غور کیا ہے، اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں:

ریزروفنڈ عرفاً وقانوناً کمپنی ہی کے اثاثوں کا حصہ ہے، جسے آئندہ کے خسارے وغیرہ کی تلافی کے لئے شرکاء نے تقسیم کرنے کی بجائے الگ کر کے رکھ لیا ہے، لیکن وہ انہی کی ملک ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے مملوک اموال کا کچھ حصہ الگ اُٹھا کر اس لئے رکھ دے کہ آئندہ جب کوئی

بیماری پیش آئے گی اس کو خرچ کرے گا، رہا یہ کہ جب تک کوئی رقم ریزروفنڈ کا حصہ ہے اس پر شرکاء کو تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پابندی خود شرکاء نے باہمی رضامندی سے لگائی ہے، اور وہ جب چاہیں حصہ داروں کی عمومی میٹنگ بلاکر اس شرط کو ختم کرسکتے ہیں، لہٰذا ان کا تصرف اس لحاظ سے برقرار ہے۔ نیز جب کبھی کمپنی ختم ہوگی تو دوسرے اثاثوں کی طرح ریزروفنڈ کے اثاثے بھی انہی شرکاء پر تقسیم ہوں گے، نیز اگر کوئی شخص کمپنی کے ختم ہونے سے پہلے اپنا حصہ فروخت کرے گا تو اس کی قیمت میں ریزروفنڈ میں اس کا جو حصہ ہے وہ بھی منعکس ہوگا۔ لہٰذا ریزروفنڈ یقیناً حصہ داروں کی ملکیت ہے، اور قابلِ زکوٰۃ ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ، خصوصاً امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق کمپنی پر خلطۃ الشیوع کی بنیاد پر بحیثیت کمپنی زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا وہ اپنے تمام قابلِ زکوٰۃ اثاثوں کی قیمت لگاکر اس پر زکوٰۃ ادا کرے گی جس میں ریزروفنڈ بھی شامل ہوگا۔

لیکن حنفیہ کے مسلک میں چونکہ خلطۃ الشیوع معتبر نہیں ہے لہٰذا کمپنی پر بحیثیت کمپنی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ ہر حصہ دار کے اپنے حصے پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر حصہ دار اپنی وجوبِ زکوٰۃ کی تاریخ میں اپنے حصے کی بازاری قیمت معلوم کرے، پھر اگر اس نے وہ حصے فروخت کرنے کی نیت سے خریدے ہیں تو کل بازاری قیمت کا چالیسواں حصہ ادا کرے۔ چونکہ بازاری قیمت میں کمپنی کے تمام اثاثے بشمول ریزروفنڈ، منعکس ہوتے ہیں، اس لئے ریزروفنڈ کی زکوٰۃ الگ سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر فروخت کی نیت سے نہیں، بلکہ شرکت جاری رکھنے کے لئے خریدے ہیں، تو اسے یہ حق ہے کہ کمپنی کے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثوں کا تناسب اپنے حصے کی کل بازاری قیمت سے منہا کرلے مثلاً کمپنی کے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثے (عمارت، فرنیچر، گاڑیاں وغیرہ) اگر کل اثاثوں کا بیس فیصد ہیں تو وہ اپنے حصے کی بازاری قیمت میں سے بیس فیصد منہا کرسکتا ہے۔ ریزروفنڈ چونکہ قابلِ زکوٰۃ اثاثوں میں شامل ہے، اس لئے اسے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثوں کے تناسب میں شامل کرکے منہا نہیں کیا جائے گا۔ والسلام

محمد تقی عثمانی

۱۴۲۵/۵/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰/۱۶۷)

مشترکہ دُکان میں سے اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ

سوال:- مشترکہ دُکان کی زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مثلاً ایک دُکان میں میرا حصہ ۳۵ پیسے ہے، اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- برادرِ عزیز ومکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ موصول ہوا، زکوٰۃ کے بارے میں آپ نے جو وضاحت طلب کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دُکان میں آپ کا حصہ صرف ۳۵ پیسے ہے، باقی کسی اور کا ہے تو آپ پر صرف ۳۵ پیسے کی زکوٰۃ واجب ہوگی[۱]۔ باقی زکوٰۃ اس کے ذمہ ہوگی جو اس کا مالک ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۴/۲/۳۰ھ[۲]

دُکان کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ اور واجب الاداء وقابلِ وصول قرضوں اور نقد پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:- میں اپنی دُکان کی زکوٰۃ کس طرح ادا کروں اور کب ادا کیا کروں؟ اور اس کے سامان کی قیمت کون سی لگاؤں؟ کچھ قرضے لوگوں نے مجھے دینے ہوتے ہیں، کچھ میں نے دینے ہیں، اور کتنی رقم ہونے پر زکوٰۃ ادا کروں؟ طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- زکوٰۃ کا طریقہ یہ ہے کہ قمری حساب سے[۳] جس تاریخ کو آپ نے دُکان قائم کی ہو اس کا محتاط اندازہ کرلیں، پھر ہر سال جب بھی وہ تاریخ آئے تو پہلے یہ دیکھیں کہ اس تاریخ کو نقد روپیہ کتنا موجود ہے؟ اور بیچنے کے لائق سامان کتنا ہے؟ اس کی ہول سیل قیمت لگالیں، پھر جتنی رقمیں دُوسروں کے ذمے واجب الادا ہیں وہ جوڑ لیں، ان تینوں چیزوں کی مجموعی قیمت لکھ لیں، پھر آپ کے اُوپر جو قرضے واجب ہیں وہ اس مجموعی قیمت میں سے منہا کرلیں[۴]، جو رقم باقی بچے، اگر وہ ۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ نکال دیں۔[۵]

دُعا میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔ والسلام واللہ اعلم

۱۲ر ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ[۶]

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۵۹ کا حاشیہ نمبر:۱۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۷۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۵۱ کا حاشیہ نمبر۵۔

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۶) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے خط کی صورت میں دیا۔

قرض پر وجوبِ زکوٰۃ کی تفصیل اور کس قسم کے قرض پر زکوٰۃ واجب ہے؟

سوال:- میرا کسی پر قرض ہے، لیکن اس مقروض کی طرف سے ادائیگی کا پتہ نہیں، دے گا یا نہیں؟ کیونکہ اب اس کی استطاعت شاید نہیں ہے، اگر وہ ادا کردے کبھی، تو کیا مجھے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ اور اگر دینی ہوگی تو پچھلے تمام سالوں کی دینی ہوگی؟ طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- جہاں سے رقم ملنے سے بالکل مایوسی ہوگئی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں[۱]، اگر آئندہ کبھی مل جائے تو صرف اسی سال کی زکوٰۃ دینی ہوگی، جس سال ملی ہے۔ ہاں! اگر بالکل مایوسی نہ ہوئی ہو بلکہ دونوں احتمال ہوں کہ ملے یا نہ ملے تو اس کی زکوٰۃ مؤخر کرسکتے ہیں، لیکن جب ملے اس وقت پچھلے سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔[۲]

واللہ اعلم
۱۸/۹/۱۴۱۴ھ[۳]

(۱، ۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۶ کا جواب نمبر۱۲، ونمبر۱۳، اور اُس کا حاشیہ نمبر۱ تا ۵۔

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی صدقة الفطر﴾
(صدقہ فطر کے مسائل کا بیان)

چاول سے ’’صدقۃ الفطر‘‘ ادا کرنے کا طریقہ اور حکم

سوال:- حضرت والا کو جیسا کہ معلوم ہے کہ برمی اور بنگالی لوگوں کی خوراک چاول ہے لہٰذا ایک صاع گندم یا نصف صاع آٹے کی بجائے ایک صاع چاول درجہ اوّل یا نصف صاع چاول کا آٹا، فطرہ میں دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نصوص میں چاول کی مقدار وارد نہیں ہوئی، لہٰذا اگر چاول سے صدقۃ الفطر نکالنا ہو تو پہلے نصف صاع گندم کی قیمت معلوم کی جائے، اس کے بعد اس قیمت میں جتنے چاول آتے ہوں، اتنے چاول نکال دیئے جائیں، لما فی الدر المختار وما لم ینص علیه کذرة وخبز یعتبر فیه القیمة (شامی)۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶/ ۲۷ و)

زکوٰۃ اور فطرہ میں فرق

سوال:- زکوٰۃ مقبولہ اور صدقہ فطر میں کیا فرق ہے؟

جواب:- زکوٰۃ سالانہ مالی فریضہ ہے اور صدقۃ الفطر خاص عید کے دن کا فریضہ ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۱۸ھ

صدقہ فطر کی مقدار

سوال:- ’’حیات الاسلام‘‘ نے صدقہ فطر فی کس دو روپیہ اعلان کیا ہے صحیح رقم کیا ہوتی ہے؟

جواب:- اصل میں فطرہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہے، اس سال (۱۳۹۷ھ میں) پونے تین روپے تھی۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/ ۲۸ ج)

---

(۱) کتاب الزکوٰۃ باب صدقة الفطر ج:۲ ص:۳۶۴ (طبع سعید کراچی) نیز دیکھئے کفایت المفتی ج:۴ ص:۳۱۲ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(۲) وفی تنویر الابصار (طبع سعید) ج:۲ ص:۳۶۴ نصف صاع من بر او دقیقه او سویقه او زبیب وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۱.

صدقۂ فطر اور قربانی کے وجوب میں اپنے اور اپنے عیال کا نفقہ حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟

سوال:- صدقۂ فطر یا قربانی واجب ہونے میں قوتِ نفس خود و عیال، حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو کتنے روز کا؟ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ''قوتِ یومیہ'' سے کیا مراد ہے؟

جواب:- اپنے اور اپنے عیال کا نفقہ بتصریح جمیع فقہاء حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے، لیکن کتنے یوم کا نفقہ حوائجِ اصلیہ میں شمار ہوگا؟ اس کی تصریح فقہاءؒ کے کلام میں نہیں ملی۔

صدقۃ الفطر کے معاملے میں ایک دن سے زائد کا نفقہ حاجتِ اصلیہ میں شمار نہیں ہوگا۔ اور لفظِ ''قوت'' لغۃً بھی ''نفقۃ الیوم'' کے لئے بولا جاتا ہے، حنفیہؒ کی طرف سے وجوبِ صدقہ کے لئے ملکِ نصاب کی جو شرط عائد کی گئی ہے اس کی دلیل میں **لا صدقة الّا عن ظهر غنًى، واليد العليا خيرٌ من اليد السفلىٰ** کی حدیث ذکر کی گئی ہے (فتح القدیر ج:۲ ص:۳۱)۔[۱]

اور حرمتِ سوال، قوتِ یوم کی موجودگی میں ثابت ہے، **ویؤیّده ما فی الاشباه والنظائر الزكوٰة واجبة بقدرة ميسّرة فتسقط بهلاک المال بعد الحول وصدقة الفطر وجبت بقدرة ممكّنة فلو افتقر بعد يوم العيد لم تسقط. (الاشباه والنّظائر مع شرحه ج: ۱ ص: ۲۲۵ الفن الثانی)۔**[۲]

امامِ شافعیؒ کے نزدیک قوتِ یومیہ سے مراد مطلق ہے خواہ بغیر ملکِ نصاب کے ہو، **لاستدلاله بحديث ابن عمرؓ عناية علىٰ هامش الفتح ج:۲ ص: ۳۱۔**[۳]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) ج:۲ ص:۲۱۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۲) (طبع ادارۃ القرآن کراچی).
(۳) عناية علىٰ فتح القدير ج:۲ ص:۲۱۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

جس زمانے میں حکومت نے زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے نفاذ کا اعلان کیا تھا، اور اس آرڈیننس میں بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس پر غور کرنے کے لئے مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کے تین اجلاس ہوئے، جن میں:

* حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
  مفتی و مہتمم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی محمد ولی حسن صاحبؒ
  مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
  مفتی دارالعلوم کراچی۔
* حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب
  اُستاذ وناظمِ تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔
* حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
  مفتی و شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی ۱۴۔
* حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب
  معین مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴۔

شامل تھے، مجلس کی طرف سے جو متفقہ تحریر تیار کی گئی تھی وہ پیشِ خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت کا بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا شرعی حکم

(پہلا حصہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ!

حکومتِ پاکستان نے سرکاری سطح پر زکوٰۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم کے لئے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے، جس کے ذریعے مسلمانوں پر واجب الاداء زکوٰۃ کا ایک حصہ حکومت وصول کر کے اس کی تقسیم کا انتظام کرے گی۔

زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری ہے، اور اگر حکومت یہ انتظام ٹھیک احکام کے مطابق قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یہ نفاذِ شریعت کی طرف ایک نہایت مثبت قدم ہوگا اور انشاء اللہ اس ملک کے مسلمان اس کی دنیوی اور اخروی برکات سے بہرہ ور ہوسکیں گے، لیکن اس نظام کو سرکاری سطح پر جاری کرتے وقت حکومت کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ اسلامی معیشت کے قیام کے لئے جتنا ضروری اور اہم ہے اتنا ہی نازک اور توجہ طلب بھی ہے، زکوٰۃ دوسرے محاصل یا ٹیکسوں کی طرح کوئی ٹیکس نہیں ہے، بلکہ یہ وہ عظیم الشان عبادت ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رُکن قرار دی گئی ہے، لہٰذا اس میں عبادت اور اطاعتِ خداوندی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حکومت، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام اپنے ذمے لے کر ایک ایسی گراں بار اور نازک ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہے جو اس کے دینی جذبے، اس کے اخلاص اور اس کے حسنِ انتظام کے لئے ایک زبردست آزمائش اور امتحان کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں حکومت کو ایک طرف تو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کسی مسلمان کے ساتھ زکوٰۃ کی وصولی میں کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے، اور جتنی رقم

اس کے ذمے شرعاً واجب الاداء ہے اس سے ایک پائی بھی زائد وصول نہ ہو، کیونکہ حدیثِ پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اَلْمُعْتَدِیُ فِی الصَّدَقَةِ کَمَانِعِهَا. (۱)

یعنی زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسا ہی گنہگار ہے جیسے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا۔

اور دوسری طرف اس بات پر کڑی نظر رکھنی ہوگی کہ زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی یہ مقدس رقوم ٹھیک شریعت کے مطابق اس کے صحیح مستحقین تک پہنچیں، اور اس میں کوئی خیانت، خورد برد، بدعنوانی یا شرعی احکام سے تجاوز نہ ہونے پائے، زکوٰۃ کے تقدس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے مصارف کا تعین انبیاء علیہم السلام پر بھی نہیں چھوڑا، بلکہ اسے بذاتِ خود قرآنِ کریم میں متعین فرمادیا ہے، چنانچہ جب تک زکوٰۃ کو ان مصارف پر صحیح طور سے خرچ کرنے کا اطمینان بخش انتظام نہ ہوجائے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم دونوں کا نظام صحیح طور سے مقرر کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ اس کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا، جس کی برکات ان شاء اللہ کھلی آنکھوں محسوس ہوں گی!

لیکن اگر خدانخواستہ زکوٰۃ کی ان مقدس رقوم کو مستحقین تک پہنچانے کا انتظام صحیح نہ ہوسکا تو کروڑوں مسلمانوں کی عبادت خراب ہونے کا وبال بھی حکومت پر دُنیا و آخرت میں بڑا سنگین ہوسکتا ہے، ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو اس کڑی آزمائش میں پورا اُترنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے اور اس نازک مرحلے کو اس کے لئے آسان فرمائے، آمین۔

لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ زکوٰۃ وعشر کا جو قانون نافذ کیا گیا ہے، وہ شرعی اعتبار سے درست ہو اور اس میں شرعی لحاظ سے کوئی سقم باقی نہ رہے، اور دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اس قانون کے مطابق عمل بھی درست ہو، جہاں تک قانون کا تعلق ہے مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کے اجلاس میں حالیہ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر غور کیا گیا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل تبصرہ اتفاق رائے کے ساتھ منظور کیا گیا۔

نصابِ زکوٰۃ

اس آرڈیننس کی سب سے زیادہ سنگین غلطی یہ ہے کہ اس میں ہر اس شخص پر زکوٰۃ کی

(۱) جامع الترمذی باب المعتدی فی الصدقة ج:۱ ص:۱۴۰ (طبع ایچ ایم سعید).

ادائیگی لازم کردی گئی ہے، جس کے بینک اکاؤنٹ میں زکوٰۃ منہا کرنے کے دن ایک ہزار روپے سے زائد رقم جمع ہو، اور بینکوں کے علاوہ دوسرے مالیاتی اداروں میں یہ ایک ہزار روپے کی قید بھی نہیں ہے، بلکہ ان اثاثوں کے حامل افراد کو ان کے اثاثوں کی مالیت کا لحاظ کئے بغیر لازمی طور پر زکوٰۃ کا مستوجب قرار دے دیا گیا ہے، یہ شرعی لحاظ سے انتہائی سنگین غلطی ہے، اور عملاً اس قانون سے بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوسکتی ہے کہ ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے باوجود ان سے زکوٰۃ وصول کرلی جائے۔

شریعت کی رُو سے زکوٰۃ صرف اس شخص پر فرض ہے جو نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی ہی مالیت کی نقدی یا سونے یا مالِ تجارت کا مالک ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کی ملکیت میں ہو، البتہ اگر کسی شخص کے پاس سونے کے سوا کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے، پھر اگرچہ شرعاً زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر رقم پر علیحدہ سال پورا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ سال کی ابتداء میں اور آخر میں کم از کم بقدرِ نصاب مالیت کا مالک رہا ہو، آرڈیننس میں زکوٰۃ کی ان بنیادی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لہٰذا اگر نظامِ زکوٰۃ کو واقعۃً شرعی اُصولوں کے مطابق قائم کرنا ہے تو آرڈیننس میں ایسی ترمیم ناگزیر ہے، جس کی رُو سے زکوٰۃ صرف انہی افراد سے وصول کی جاسکے جن کے ذمے شرعاً زکوٰۃ فرض ہے، اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ دفعہ۲ ذیل ۲۳ میں ''صاحبِ نصاب'' کی جو تعریف لکھی گئی ہے یعنی:-

صاحب نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کے ذمے اس آرڈیننس کی رُو سے زکوٰۃ واجب الاداء ہو۔

اسے تبدیل کرکے ''صاحبِ نصاب'' کی تعریف اس طرح کی جائے:-

''صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو، یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔''

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس کی قیمت کو وصولئ زکوٰۃ کا معیار مقرر کیا جائے، یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

سال گزرنے کا مسئلہ

زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقدارِ نصاب پر پورا سال گزر چکا ہو، پورا سال گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ صاحبِ نصاب ہوجائے اور سال کے اختتام پر صاحبِ نصاب رہے (درمیانِ سال اگرچہ نصاب سے کم رہ جائے، البتہ بالکل ختم نہ ہو) تو سال کے اختتام پر جتنی بھی رقم اس کی ملکیت میں ہوگی اس ساری رقم پر شرعاً زکوٰۃ واجب الاداء ہوتی ہے، خواہ اس رقم کا کچھ حصہ ایک دن پہلے ہی اس کی ملکیت میں آیا ہو، لہٰذا ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہے۔

موجودہ آرڈیننس کے تحت ایسی صورتیں عملاً ممکن ہیں کہ جس تاریخ میں کسی شخص کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع کی جائے، اس سے صرف چند روز پہلے ہی وہ صاحب نصاب بنا ہو، ایسی صورت میں اس سال ایسے شخص سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

لہٰذا آرڈیننس میں ایسی گنجائش موجود ہونی چاہئے کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ اسے مقدارِ نصاب کا مالک بنے ہوئے سال پورا نہیں ہوا تو اس کی زکوٰۃ وضع نہ کی جائے!

قرضوں کا مسئلہ

آرڈیننس میں قرضہ جات کو قابلِ زکوٰۃ مالیت سے منہا کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، اس سلسلے میں فقہائے اُمت کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر طرح کے قرضے زکوٰۃ سے منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے، امام مالکؒ کے نزدیک قرضے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ سے مانع ہیں، اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ سے نہیں، اور امام شافعیؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ کسی بھی طرح کا قرض زکوٰۃ سے منہا نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہو المجموع شرح المہذب ج:۵ ص:۳۱۳،۳۱۴)۔[1]

موجودہ حالات ایسے ہیں کہ جس کسی شخص نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کوئی قرض لیا ہو، اس کو زکوٰۃ سے منہا نہ کرنا اس شخص پر زیادتی ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ ہمیشہ اہلِ علم کے نزدیک زیرِ غور رہا ہے کہ آج کل بڑے بڑے سرمایہ دار اپنی پیداواری اغراض کے لئے جو قرضے لیتے ہیں، اگر ان سب کو منہا کیا جائے تو ان پر بعض صورتوں میں شاید کبھی بھی زکوٰۃ واجب نہ ہو، جو مقاصدِ شریعت کے بالکل خلاف ہے، اس لئے ایسے قرضوں کے بارے میں اگر امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ زکوٰۃ سے منہا نہیں کئے جائیں گے تو یہ مناسب ہے۔

---

(۱) المجموع شرح المهذب (الشرح) الدين هل يمنع وجوب الزكوة فيه .... الخ ج:۵ ص:۳۴۴ طبع دار الفكر للطباعة.

۱۲؍ربیع الاوّل ۱۳۹۹ ہجری کو زکوٰۃ آرڈیننس کے جس مسوّدے کو رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا تھا، اس میں بھی قرضوں کی منہائی کی گنجائش موجود تھی، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ'' نے اس وقت بھی یہی رائے ظاہر کی تھی (ملاحظہ ہو ماہنامہ ''بینات'' جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ صفحہ: ۸)۔

لہٰذا مجلس کی رائے میں نصاب، حولانِ حول اور قرضوں کے بارے میں تجاویز کو مدِنظر رکھتے ہوئے، آرڈیننس کی دفعہ ۳ مجوّزہ ترمیم کے بعد اس طرح ہونی چاہئے:-

آرڈیننس کے دُوسرے اَحکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر ۱ میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق ہر سال زکوٰۃ کے اختتام پر لازماً زکوٰۃ وصول کی جائے گی، شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخ زکوٰۃ کے دن اس کے قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی، مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔

اموالِ ظاہرہ و باطنہ

بینک اکاؤنٹ اور دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ منہا کرنے پر ایک علمی اشکال یہ ہے کہ فقہائے کرامؒ کی تصریح کے مطابق حکومت کو اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے، اموالِ باطنہ سے نہیں، عام طور پر فقہاءؒ نے مفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں، کھیتوں اور باغات کی پیداوار اور اس مالِ تجارت کو جو شہر سے باہر لے جایا جارہا ہو، اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا ہے اور نقدی، زیورات وغیرہ باقی تمام قابلِ زکوٰۃ اموال کو اموالِ باطنہ قرار دیا ہے بینک اکاؤنٹس چونکہ بصورتِ نقد ہوتے ہیں، اس لئے علمی طور پر یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ:-

موجودہ دور میں بینک اکاؤنٹس کو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ و باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ دونوں قسم کے

اموال سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں جب قابلِ زکوٰۃ اموال کی کثرت ہوگئی اور آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر عاملینِ زکوٰۃ لوگوں کے گھروں اور دُکانوں میں پہنچ کر ان کی املاک کی چھان بین کریں گے تو اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے ان کے مکانات، دُکانوں، گوداموں اور محفوظ شخصی مقامات کی نجی حیثیت مجروح ہوگی تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صرف ان اموال کی زکوٰۃ حکومت کی سطح پر وصول کی جائے جن کی زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مضرّت لاحق نہ ہو، اور جن کا حساب کرنے کے لئے گھروں اور دُکانوں کی تلاشی نہ لینی پڑے، ایسے اموال اس زمانے میں صرف دو قسم کے تھے، یعنی مویشی اور زرعی پیدوار، چنانچہ صرف ان کی زکوٰۃ آپؓ نے سرکاری سطح پر وصول کرنے کا اعلان فرمایا اور باقی اموال کو اموالِ باطنہ قرار دے کر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود مالکان کی ذمہ داری قرار دے دی۔

بعد میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا تو انہوں نے شہروں کے باہر ایسی چوکیاں مقرّر فرمائیں کہ جب کوئی شخص مالِ تجارت لے کر وہاں سے گزرے تو اس سے وہیں زکوٰۃ وصول کرلی جائے، اس موقع پر شہر سے باہر جانے والے مالِ تجارت کو بھی اموالِ ظاہرہ میں شمار کرلیا گیا، کیونکہ حکومت کو اس کی زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کا حساب کرنے کے لئے مالکان کے گھروں، دُکانوں اور نجی مقامات کی تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کی وضاحت کے لئے حضرات فقہاء کرامؒ کی تصریحات درج ذیل ہیں:-

۱:- علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ظاهر قوله تعالیٰ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (الأية) توجب حق اخذ الزكاة مطلقاً للامام، وعلى هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولى عثمانؓ وظهر تغير الناس كره ان تفتش السعاة على الناس مستور اموالهم، ففوض الدفع الى الملاک نيابة عنه، ولم تختلف الصحابةؓ عليه فى ذلک، وهذا لا يسقط طلب الامام اصلا، ولهذا لو علم أن اهل بلدة لا يؤدّون زكاتهم طالبهم بها. (فتح القدير ج:۱ ص:۴۸۷)[1]

۲:- امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وقوله تعالیٰ: خذ من اموالهم صدقة، يدل على أن اخذ الصدقات إلى الامام وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه، لان حق

(۱) طبع قديم مطبعة كبرىٰ اميريه مصر

الامام قائم فی اخذها فلا سبیل له الی اسقاطه، وقد کان النبی صلی الله علیه وسلم یوجّه العمال علی صدقات المواشی ویأمرهم بأن یاخذوها علی المیاه فی مواضعها.

آگے تحریر فرماتے ہیں:-

اما زکوٰة الأموال فقد کانت تحمل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ ثم خطب عثمانؓ فقال "هذا شهر زکاتکم، فمن کان علیه دین فلیؤدّه، ثم لیزک بقیة ماله" فجعل لهم اداءها الی المساکین، وسقط من اجل ذلک حق الامام فی اخذها، لأنه عقد عقده امام من ائمة العدل، فهو نافذ علی الاُمة لقوله علیه السلام : ویعقد علیهم اولهم، ولم یبلغنا انه بعث سعاة علیٰ زکاة الأموال کما بعثهم علی صدقات المواشی والثمار فی ذلک، لأن سائر الأموال غیر ظاهرة للامام، وانما تکون مخبوة فی الدور والحوانیت والمواضع الحریزة ولم یکن جائزاً للسعاة دخول احرازهم ولم یجز ان یکلفوهم احضارها.

...... ولما ظهرت هذه الأموال عند التصرف بها فی البلدان اشبهت المواشی فنصب علیها عمالًا یأخذون منها ما وجب من الزکاة، ولذالک کتب عمر بن عبدالعزیزؒ الی عماله أن یأخذوا مما یمر به المسلم من التجارات من کل عشرین دینارا نصف دینار.

(احکام القرآن ج:۳ ص:۱۵۵، مطبوعه استنبول ۱۳۳۵ھ)[۱]

۳:- فقہِ حنفی کی معروف کتاب الاختیار میں ہے:-

لأن الأخذ کان للإمام وعثمان رضی الله تعالیٰ عنه فوّضه الی الملاک وذلک لا یسقط حق طلب الامام، حتی لو علم ان اهل بلدة لا یؤدّون زکاتهم طالبهم بها ولو مر بها علی الساعی کان له اخذها.

(الاختیار ج:۱ ص:۱۰۰)[۲]

۴:- اور صاحبِ ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:-

---

(۱) وکذا فی طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔
(۲) طبع مکتبہ مصطفی البابی مصر۔

ومن مر علی عاشر بمائة درهم واخبره ان له فی منزله مائة اخری وقد حال علیها الحول لم یزک التی مر بها لقلتها، وما فی بیته لم یدخل تحت حمایته. (فتح القدیر ج:۲ ص:۵۳۶)(۱)

فقہاءِ کرامؒ کی مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ نقد روپیہ اور سامانِ تجارت اس وقت تک اموالِ باطنہ رہتے ہیں جب تک وہ پوشیدہ نجی مقامات پر مالکان کے زیرِ حفاظت ہوں، ایسے اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے میں چونکہ ان نجی مقامات میں دخل اندازی کرنی پڑتی ہے، اس لئے انہیں حکومت کی وصولیابی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، لیکن جب یہی اموال مالکان خود نجی مقامات سے نکال کر باہر لے آئیں، اور وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں تو وہ اموالِ ظاہرہ کے حکم میں آجاتے ہیں، اور حکومت کو ان سے زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار ہوجاتا ہے، گویا کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار ہونے کے لئے دو بنیادی امور ضروری ہیں:-

ایک یہ کہ وہ ایسے نجی مقامات پر رکھے ہوئے نہ ہوں جہاں سے ان کا حساب کرنے کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کرنی پڑے، **كما في العبارة الأولى والثانية**، اور دوسرے یہ کہ وہ حکومت کے زیرِ حفاظت آجائیں، **كما في العبارة الرابعة**۔

اگر اس معیار پر موجودہ بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیا جائے تو ان میں یہ دونوں باتیں پوری طرح موجود ہیں، ایک طرف تو یہ وہ اموال ہیں جنہیں ان کے مالکان نے اپنی حرز (حفاظت) سے نکال کر خود حکومت پر ظاہر کردیا ہے، اور ان کے حساب میں نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے یہ کہ یہ اموال حکومت کے زیرِ حمایت ہی نہیں، بلکہ زیرِ ضمانت آچکے ہیں، بالخصوص جبکہ بینک سرکاری ملکیت میں ہیں اور ان کو جو سرکاری تحفظ حاصل ہے وہ عاشر پر گزرنے والے اموال کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس لئے مجلس کی رائے یہ ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھے ہوئے اموال، اموالِ ظاہرہ کے حکم میں ہیں اور حکومت ان سے زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے۔

اور اگر بالفرض انہیں یا ان میں سے بعض کو اموالِ باطنہ ہی قرار دیا جائے تب بھی فقہائے کرامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ جس علاقے کے لوگ ازخود زکوٰۃ ادا نہ کریں تو وہاں حکومت اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کا بھی مطالبہ کرسکتی ہے، جیسا کہ فتح القدیر اور الاختیار کی عبارتوں میں اس کی تصریح گزرچکی ہے اور یہی مسئلہ بدائع الصنائع جلد:۲ صفحہ:۷ میں بھی موجود ہے۔

---

(۱) فتح القدیر ج:۱ ص:۵۳۶ طبع مکتبہ کبریٰ امیریہ مصر.

زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے جبراً زکوٰۃ وضع کرنے کے بارے میں ایک دوسرا علمی اِشکال یہ ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور دُوسری عبادتوں کی طرح اس کی ادائیگی میں بھی نیت ضروری ہے، لیکن جب مذکورہ اداروں میں جبراً زکوٰۃ وضع کی جائے گی تو اس میں مالکان کی طرف سے شاید نیت نہ ہوسکے؟

فقہائے کرامؒ کی تصریحات میں اس اِشکال کا بھی حل موجود ہے، اور وہ یہ کہ حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے، چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی مختصر الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ اذا اخذھا الامام کرھا فوضعھا موضعھا اجزأ لان لہ ولایۃ اخذ الصدقات فقام اخذہ مقام دفع المالک، و فی القنیۃ: فیہ اشکال، لان النیۃ فیہ شرط ولم توجد منہ اھ قلت: قول الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ فقام اخذہ الخ یصلح للجواب، تامل.

(رد المحتار ج:۲ ص:۳۳)[۱]

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی حیثیت

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر تیسرا شبہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بینکوں میں جو رقوم جمع کرائی جاتی ہیں، وہ فقہی اعتبار سے قرض کے حکم میں ہیں اور مقروض کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ قرض خواہ کی رقم سے زکوٰۃ وصول کرلے۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض بن جانے کے بعد تو یہ اموال مضمون ہونے کی بناء پر اور زیادہ سرکاری تحفظ میں آگئے ہیں، اس لئے قرض ہونے سے حکومت کے وصولیٔ زکوٰۃ کے حق پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا، یہ بلا شبہ دَینِ قوی ہے، جس پر بالاتفاق زکوٰۃ فرض ہے، اور بینکوں کے سرکاری ملکیت ہونے کی وجہ سے یہ رقوم حکومت کے صرف علم ہی میں نہیں، بلکہ اس کے قبضے اور ضمانت میں آجاتی ہیں، اس لئے اگر حکومت ولایتِ عامہ کی بناء پر ان سے زکوٰۃ وضع کرلے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

محتاط طریقہ

لیکن "مجلس" یہ سمجھتی ہے کہ بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (طبع ایچ ایم سعید).

محتاط طریقہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص ان اداروں میں اپنی رقم رکھوانے کے لئے آئے تو وہ ایک فارم پُر کرے جس میں اس کی طرف سے متعلقہ ادارے کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ وہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر اس کی رقم سے زکوٰۃ منہا کر کے زکوٰۃ فنڈ میں دے دے، اس طرح یہ ادارے مالکان کی طرف سے باقاعدہ وکیل باداء الزکوٰۃ بن جائیں گے، پھر اس میں نہ اموالِ باطنہ کی بنیاد پر کوئی اِشکال باقی رہے گا، نہ نیت کی بنیاد پر، اور نہ اکاؤنٹس کے قرض ہونے کی بنیاد پر۔

سودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک اور خلجان بعض ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ یہ سودی اکاؤنٹس ہیں، اور سود اور زکوٰۃ دونوں کیسے جمع ہوسکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی حکومت میں سودی کاروبار کا وجود اس کے ماتھے پر کلنک کا شرمناک ٹیکہ ہے اور بالخصوص زکوٰۃ کا نظام جاری کرنے کے بعد اس حرام و ناپاک ذریعۂ آمدنی کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، لہٰذا یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بعجلتِ ممکنہ مسلمانوں کو سودی نظام کی اس لعنت سے نجات دلائے۔

لیکن جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے فقہی اعتبار سے اگر کسی شخص کی آمدنی حلال و حرام سے مخلوط ہو اور وہ مجموعے پر سے زکوٰۃ نکال دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ حلال آمدنی کا ڈھائی فی صد شرعاً زکوٰۃ ہوگا اور حرام آمدنی کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ نہیں ہوگا، بلکہ وہ صدقہ سمجھا جائے گا جو حرام آمدنی سے جان چھڑانے کی غرض سے کیا جاتا ہے، اصل شرعی حکم یہ ہے کہ سود لینا حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص سود وصول کرلے تو وہ سارے کا سارا واجب التصدق ہے، اب اگر حکومت نے اس میں سے ڈھائی فی صد زکوٰۃ فنڈ میں دے دیا ہے (جبکہ زکوٰۃ فنڈ میں صدقاتِ نافلہ اور عطیات بھی شامل ہیں) تو مالکان پر شرعاً واجب ہے کہ باقی ماندہ سود بھی صدقہ کردیں نہ یہ کہ اس کی بناء پر اصل مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہ کریں۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے ایک ہزار روپے بینک میں جمع ہیں اور اس پر سو روپے سود کا اضافہ ہوگیا تو حکومت پورے گیارہ سو روپے پر ڈھائی فی صد کے حساب سے ساڑھے ستائیس روپے وصول کرے گی، ان ساڑھے ستائیس روپوں میں سے پچیس روپے تو اس شخص کے اصل ایک ہزار روپے کی زکوٰۃ ہے اور ڈھائی روپے زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ سود کی جو رقم پوری کی پوری صدقہ ہونی چاہئے تھی اس کا کچھ حصہ ہے، اگر یہ بھی زکوٰۃ فنڈ میں چلا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس کا مصرف بھی فقراء ہی ہیں۔

نابالغ کی زکوٰۃ

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے صاحبِ نصاب کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، جبکہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نابالغ اور فاتر العقل کے مال پر بھی زکوٰۃ لازم ہے، آرڈیننس میں چونکہ بالغ یا نابالغ کے اکاؤنٹس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا اس لئے اس میں غالباً شافعی مسلک اختیار کیا گیا ہے، اور لوگوں کے موجود حالات کے پیشِ نظر اگر ضرورت داعی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

ترکے کا مال

البتہ بینک اکاؤنٹس میں بعض اموال ایسے ہو سکتے ہیں جو کسی مرحوم شخص کا ترکہ ہوں، چونکہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ہی ان اموال پر ورثاء کا حق ثابت ہو جاتا ہے اور ورثاء میں سے ہر ایک کا صاحبِ نصاب ہونا ضروری نہیں، اس لئے اس مال سے بھی زکوٰۃ وصول کرنا دُرست نہیں ہوگا، لہٰذا آرڈیننس میں یہ استثناء بھی ہونا چاہئے کہ:

جو شخص زکوٰۃ وضع کرنے کے دن انتقال کر چکا ہو، اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

کمپنیاں اور شیئرز

آرڈیننس میں ''کمپنیوں'' کو بھی صاحب نصاب قرار دیا گیا اور کمپنیوں کے حصص کو بھی شیڈول نمبر (۱) میں درج کر کے ان سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کمپنی کے بینک اکاؤنٹ سے بحیثیت فردِ قانونی الگ زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کمپنی کے حصہ داروں سے ان کے حصص پر الگ زکوٰۃ وصول ہوگی، اگر واقعہ یہی ہے تو یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں ایک ہی مال سے سال میں دو مرتبہ زکوٰۃ وصول ہونے کا احتمال ہے جو کسی طرح جائز نہیں، لہٰذا اگر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصول کی جارہی ہے تو حصہ داروں سے الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، اور اگر حصہ داروں سے وصول کی جارہی ہے، تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں سے مجلس کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ حصص پر وصول کی جائے۔

عشر بصورت نقد

آرڈیننس میں عشر کا بھی ایک حصہ لازماً وصول کرنے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، مثلاً بارانی زمینوں کی پیداوار کا پانچ فی صد اور اس کے علاوہ ہر قسم کی زمینوں میں کاشت کار کا حصہ مستثنیٰ رکھا گیا،

لیکن ساتھ ہی یہ تصریح کردی ہے کہ ان پر شرعاً عشر واجب ہے جسے مالکان اپنے طور پر ادا کریں گے، اس حکم میں شرعاً کوئی خرابی نہیں، البتہ آرڈیننس کی دفعہ ۵ ذیل ۵ میں صراحت کی گئی ہے کہ عشر بصورتِ نقد وصول کیا جائے گا، صرف گندم اور دھان کے بارے میں یہ استثناء رکھا گیا ہے کہ اگر صوبائی زکوٰۃ کونسل چاہے تو اسے بصورتِ جنس وصول کرلے۔

مجلس کی رائے میں یہ حصہ بھی لائقِ ترمیم ہے کیونکہ شرعاً عشر کو بصورتِ نقد ادا کرنا لازم نہیں بلکہ شریعت نے اس میں مالکِ پیداوار کی سہولت کو ملحوظ رکھا ہے، لہٰذا یہ پابندی ختم کرکے اس معاملے کو مالکِ پیداوار کی صوابدید پر چھوڑنا چاہئے۔

چوتھائی پیداوار کا عشر سے استثناء

آرڈیننس میں زرعی پیداوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں عشر سے مستثنیٰ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے، اگرچہ بعض ائمہ کے اقوال اس قسم کے منقول ہیں کہ زرعی پیدوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری، باب خرص التمر ج:۳ ص:۲۷۴)[1] لیکن فقہائے حنفیہ اور اکثر فقہاء کے مسلک میں یہ چھوٹ نہیں ہے، لہٰذا اگر حکومت یہ چوتھائی حصہ لازمی وصولی سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرنا چاہئے کہ اس حصے کا عشر مالکان خود ادا کریں۔

تاریخِ زکوٰۃ

موجودہ آرڈیننس کے مطابق ہر زکوٰۃ کا سال یکم رمضان المبارک سے شروع ہوکر شعبان کے آخری دن پر ختم ہوگا، اور یہ بات اطمینان بخش ہے کہ شریعت کے مطابق زکوٰۃ کی تقسیم کے لئے ہجری سال کو اختیار کیا گیا ہے، لیکن مختلف اثاثوں کی قیمت لگانے کے لئے شیڈول نمبر (۱) میں مختلف تاریخیں مقرر کی گئی ہیں، یہ صورت حال شرعاً دُرست نہیں ہے، شرعی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص صاحبِ نصاب بن جائے تو اس کی ہر رقم کے لئے الگ سال شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے تمام اثاثوں کے لئے زکوٰۃ کے وجوب کی ایک ہی تاریخ ہوتی ہے، لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام اثاثوں میں قیمت لگانے کی تاریخ ایک ہی رکھی جائے۔

البتہ اس قیمت کی بنیاد پر زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہیں۔

---

(۱) فتح الباری باب خرص التمر ج:۳ ص:۳۴۴ الی ص:۳۴۷ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاهور.

قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کی زکوٰۃ

آرڈیننس کے شیڈول نمبر (۲) میں ان اشیاء کی فہرست دی گئی ہے جن پر حکومت لازماً زکوٰۃ وصول نہیں کرے گی، بلکہ مالکان پر بطورِ خود ان کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اس فہرست میں قیمتی پتھروں اور مچھلیوں پر بھی زکوٰۃ عائد کی گئی ہے حالانکہ ان دونوں اشیاء پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک تجارت کی نیت سے انہیں خریدا نہ گیا ہو، لہٰذا ان دونوں اشیاء کو اس شیڈول سے خارج کرنا چاہئے، کیونکہ بہ نیتِ تجارت خریداری کی صورت میں ''اموالِ تجارت'' میں شامل ہوجائیں گے، جن کا ذکر شیڈول نمبر (۲) میں موجود ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ

مصارفِ زکوٰۃ کے بیان میں آرڈیننس میں براہِ راست فقراء کو زکوٰۃ پہنچانے کے ساتھ مختلف اداروں کے توسط سے فقراء کی امداد کا بھی ذکر ہے، اس میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ:

ہر صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی مستحقِ زکوٰۃ کو باقاعدہ مالک بنا کر کی جائے گی۔

یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آرڈیننس کے اُردو ترجمے سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ ادارے اسے تعمیر اور عملے کی تنخواہوں پر صرف کرسکیں گے، جو شرعاً جائز نہیں، انگریزی متن اگرچہ نسبۃً بہتر ہے، لیکن اس میں بھی یہ وضاحت ضروری ہے۔

خلاصۂ تجاویز برائے حکومت

۱:- صاحبِ نصاب کی موجودہ تعریف کی جگہ حسبِ ذیل تعریف لکھی جائے:-

صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ مل کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔

پھر ہر سال تاریخِ زکوٰۃ سے پہلے ساڑھے باون تولہ چاندی کی جو قیمت ہو اس کا اعلان کرکے اس قیمت کو وصولیٔ زکوٰۃ کا معیار مقرّر کیا جائے، یعنی صرف ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے جن کی اتنی مالیت کی رقوم بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں میں جمع ہوں۔

۲:- آرڈیننس کی دفعہ نمبر (۳) میں ترمیم کرکے اس کو اس طرح بنایا جائے:-

آرڈیننس کے دوسرے احکام کے تابع ہر مسلمان صاحبِ نصاب شخص سے شیڈول نمبر (۱) میں دی ہوئی تفصیل کے مطابق زکوٰۃ ہر سال کے اختتام پر لازماً

وصول کی جائے گی۔

شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ تاریخِ زکوٰۃ کے دن اس کی قابلِ زکوٰۃ جملہ مملوکات کو نصاب کی مقدار تک پہنچے ہوئے پورا سال نہیں گزرا تو اس کے مذکورہ اثاثوں سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ وہ مقروض ہے اور اس نے قرضہ کسی پیداواری غرض سے نہیں لیا ہے تو اس کے قرضے کی رقم کو قابلِ زکوٰۃ رقم سے منہا کیا جائے گا۔

مزید شرط یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں باضابطہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ذریعہ یہ ثابت ہوجائے کہ وہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخ میں انتقال کرچکا تھا تو بھی اس کے اکاؤنٹ سے زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی۔

۳:- بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں رقم رکھوانے والوں سے ایک وکالت نامہ تحریر کرایا جائے جس میں وہ متعلقہ مالی اداروں کو یہ اختیار دے دیں کہ تاریخِ زکوٰۃ آنے پر وہ ادارہ ان کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرکے زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرادے۔

۴:- کمپنیوں اور ان کے حصص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، بلکہ اگر کمپنیوں سے وصول کی جارہی ہے تو حصص پر الگ الگ زکوٰۃ وصول نہ کی جائے، اور اگر حصص پر وصول کی جارہی ہے تو کمپنیوں سے وصول نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں سے بہتر یہ ہے کہ حصص پر وصول کی جائے۔

۵:- عشر کے بصورتِ نقد وصول کرنے کی پابندی ختم کی جائے، بلکہ یہ امر مالکِ پیداوار پر چھوڑا جائے کہ وہ چاہے تو بصورتِ جنس ادا کرے اور چاہے تو بصورتِ نقد۔

۶:- ہر زرعی پیداوار میں سے چوتھائی حصہ جو حکومت بطورِ منہائی اخراجات چھوڑ رہی ہے، اس کے بارے میں یہ اعلان کیا جائے کہ اس حصے کا عشر مالکان خود ادا کریں۔

۷:- شیڈول نمبر (۱) کے تمام اثاثوں کے لئے قیمت مقرر کرنے کی تاریخ (ویلویشن ڈیٹ) ایک ہی مقرّر کی جائے اور مختلف اثاثوں کے لئے مختلف تاریخیں نہ رکھی جائیں، البتہ زکوٰۃ وضع کرنے کی تاریخیں مختلف اثاثوں کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہیں۔

۸:- قیمتی پتھروں اور مچھلیوں کو شیڈول نمبر (۲) سے خارج کیا جائے۔

۹:- شیڈول نمبر (۲) میں مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرح بیان کرتے ہوئے پانچ سے پچیّس اُونٹ تک کی شرح بہت مجمل ہے، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پانچ سے پچیّس اُونٹوں تک ایک

اُونٹ واجب ہے، اس کی اصلاح کر کے واضح طور پر لکھنا چاہئے کہ پانچ سے پچیس اُونٹوں تک ہر پانچ اُونٹوں پر ایک بکری واجب ہوگی۔

۱۰:- مصارفِ زکوٰۃ میں یہ وضاحت کی جائے کہ ہرصورت میں مستحقِ زکوٰۃ کوزکوٰۃ کا مالک و قابض بنایا جائے گا اور ادارے یہ رقمیں تعمیرات اور اساتذہ کی تنخواہوں میں صرف نہیں کرسکیں گے۔

یہ چند تجاویز ہیں، جو آرڈیننس کے فوری مطالعے سے سامنے آئیں۔

﴿وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا﴾

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

دستخط

* حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
مفتی و مہتمم دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی
* حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
مفتی و مہتمم دارالعلوم کراچی ۱۴
* حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب
خادم دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
* حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب
مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
* حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب
استاذ و ناظم تعلیمات جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
* حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
دارالعلوم کراچی ۱۴
* حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب
نائب مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴

بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کا مسئلہ

(دوسرا حصہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، اَمَّا بَعْدُ!

"مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" نے اپنے ۲۱رشعبان ۱۳۹۹ھ کے اجلاس میں زکوٰۃ وعشر آرڈیننس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو تحریر مرتب کی تھی، اسے اظہارِ رائے کے لئے ملک بھر کے معروف اہلِ فتویٰ علماء کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا، الحمدللہ! ان میں سے اکثر کے جوابات موصول ہوگئے، مندرجہ ذیل حضرات نے اس تحریر پر اصل مسئلے میں کسی ترمیم کے بغیر مجلس کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے تصدیقی دستخط ثبت فرمادیئے:-

۱:- شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب، مہتمم دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک۔

۲:- حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب، مفتی و مہتمم مدرسہ قاسم العلوم، ملتان۔

۳:- حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب، مفتی مدرسہ اشرفیہ، سکھر۔

۴:- حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم، مہتمم جامعہ فاروقیہ ڈرگ کالونی، کراچی (آپ نے نیت کے مسئلے میں قدرے تردّد فرمایا، اور باقی اُمور سے اتفاق فرمایا)۔

۵:- حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب، مہتمم جامعہ رشیدیہ، ساہیوال۔

۶:- حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحب، مفتی مدرسہ مطلع العلوم، بروری روڈ، کوئٹہ۔

۷:- حضرت مولانا فضل محمد صاحب، مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، مینگورہ، سوات۔

۸:- حضرت مولانا مفتی محمد وجیہ صاحب، مفتی دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار، سندھ۔

۹:- حضرت مولانا مفتی محمد خلیل صاحب، مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ، گوجرانوالہ۔

۱۰:- حضرت مولانا حبیب الحق صاحب، مدرس مدرسہ اشرف العلوم، باغبان پورہ گوجرنوالہ۔

۱۱:- حضرت مولانا قاضی سعداللہ صاحب، رکن مجلسِ شوریٰ قلات ڈویژن، مستونگ بلوچستان (وحال رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

۱۲:- حضرت مولانا قاضی بشیر احمد صاحب، دارالافتاء راولاکوٹ، آزاد کشمیر۔

۱۳:- حضرت مولانا مقبول الرحمٰن صاحب قاسمی، دارالافتاء راولاکوٹ، پونچھ، آزاد کشمیر۔

۱۴:- حضرت مولانا عبداللہ صاحب، ناظم دارالعلوم تعلیم القرآن، باغ، پونچھ آزاد کشمیر۔
۱۵:- حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب خطیب جامع مسجد باغ، پونچھ، آزاد کشمیر۔
ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے مجلس کی تحریر پر مفصل یا مختصر تبصرہ تحریر فرمایا، اور اس کے بعض نکات سے اختلاف بھی فرمایا:-
۱:- حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور۔
۲:- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب، مفتی خیر المدارس، ملتان۔
۳:- حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی، دارالعلوم حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا۔
۴:- حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔
ان حضرات میں سے بعض نے کچھ تو مجلس کی تحریر کی چند فروگزاشتوں پر مجلس کو متنبہ فرمایا، جس پر مجلس ان حضرات کی تہ دل سے ممنون ہے، وہ فروگزاشتیں درج ذیل ہیں:-
۱:- مجلس کی تحریر میں ''حولانِ حول'' کی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا تھا کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے یہ ضروری ہے کہ مالِ نامی ''بقدر نصاب'' سارے سال کسی شخص کی ملکیت میں موجود رہا ہو، حالانکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر سال کے اوّل و آخر میں نصاب کامل ہو اور اثناء حول میں ناقص ہوجائے تب بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، مجلس کی تحریرِ سابق میں یہاں نقص[1] رہ گیا تھا، اب اس عبارت کو مجلس کی طرف سے کالعدم سمجھا جائے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے کامل نصاب کا سارے سال ملکیت میں رہنا ضروری ہے۔
۲:- صاحبِ نصاب کی تعریف سابقہ تحریر میں اس طرح کی گئی تھی:-

> صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سونا یا سامانِ تجارت ہو یا ان چاروں اشیاء میں سے بعض یا سب کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔

اس تعریف میں اس صورت کا حکم بیان سے رہ گیا تھا جس میں کسی شخص کے پاس صرف سونا ہی سونا ہو، چاندی یا نقدی بالکل نہ ہو،[2] ایسی صورت میں سونے کا نصاب یعنی ساڑھے سات تولہ سونا

---

(۱) جس کی وجہ یہ ہوئی کہ عباراتِ فقہاء میں مطلقاً مالِ نامی کو نصاب سے تعبیر کر کے قدرِ معہود کو ''نصابِ کامل'' اور اس سے کم کو نصابِ ناقص کہتے ہیں، بوقتِ تحریر لفظِ ''نصاب'' پر نظر رہی اور ''بقدر'' کا لفظ سہواً تحریر میں آگیا، مقصد یہ ہے کہ مالِ نامی سارے سال موجود رہا ہو، مگر سال کے طرفین میں نصاب کا کامل ہونا شرط ہے، اگرچہ درمیان میں ناقص رہ گیا ہو۔
(۲) اس صورت کا حکم اگرچہ تعریف میں درج ہونے سے رہ گیا تھا، مگر تعریف سے پہلے کی عبارت میں اس کی صراحت کردی گئی تھی۔
(حواشی از حضرت والا دامت برکاتہم) مرتب۔

شرعاً معتبر ہوتا ہے، چنانچہ اس فروگزاشت پر متنبہ ہونے کے بعد مجلس نے صاحبِ نصاب کی مجوزہ تعریف میں تبدیلی کر کے اسے اس طرح کردیا ہے:-

> زرعی پیداوار اور مویشیوں کے علاوہ دیگر قابلِ زکوٰۃ اموال میں صاحبِ نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ (۶۱۲٫۳۵ گرام) چاندی یا ساڑھے سات تولہ (۸۷٫۴۸ گرام) سونا یا ان دونوں میں سے کسی کی قیمت کے برابر روپیہ یا سامانِ تجارت ہو یا مذکورہ بالا اشیاء میں سے بعض کا یا سب کا مجموعہ مل کر سونے یا چاندی کے وزنِ مذکور کی قیمت کے برابر ہوجائے۔

مجلس نے اس ترمیم شدہ تعریف سے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی مطلع کردیا تھا، چنانچہ اب حکومت نے جو نیا ترمیم شدہ زکوٰۃ آرڈی ننس ۱۹۸۰ء نافذ کیا ہے، اس میں بفضلہٖ تعالیٰ اس کی روشنی میں ترمیم کردی گئی ہے[1] (ملاحظہ ہو زکوٰۃ وعشر ترمیمی آرڈیننس ۱۹۸۰ دفعہ ۳ ذیل الف)۔

۳:- مجلس کی تحریر میں لکھا گیا تھا کہ شہر سے باہر جانے والے اموالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چوکیاں مقرّر فرمائی تھیں، اس سے تأثر یہ ہوتا تھا کہ ان چوکیوں کا یہ سلسلہ سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے شروع فرمایا تھا، حالانکہ یہ بات دُرست نہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں ان چوکیوں پر زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، (ملاحظہ ہو مبسوط و کتاب الآثار وغیرہ)۔[2]

یہ تو چند جزوی فروگزاشتیں تھیں، لیکن مذکورہ چاروں حضرات نے بنیادی طور پر جس مسئلے سے اختلاف فرمایا ہے یا جس پر اپنے تردّد کا اظہار کیا ہے وہ بینک اکاؤنٹس یا دوسرے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں ان حضرات کے دلائل یا شبہات پر مجلس نے دوبارہ غور کیا، لیکن غور و تحقیق کے بعد اس مسئلے میں مجلس کی رائے تبدیل نہیں ہوئی، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

بینک اکاؤنٹس اور دیگر مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کرنے پر جن شبہات کا اظہار کیا گیا ہے، بنیادی طور پر وہ تین شبہات ہیں:-

۱:- حکومت کو صرف اموالِ ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ

---

(۱) نئے آرڈیننس میں مجلس کی دُوسری بیشتر تجاویز بھی شامل کرلی گئی ہیں، مثلاً حولانِ حول کی شرط، میت کے ترکے کو مستثنیٰ کرنے کی شرط، تمام اثاثوں کے لئے ایک ویلیوایشن ڈیٹ کی تجویز وغیرہ۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

(۲) المبسوط للسرخسي ج:۲ ص:۱۹۹ (طبع دار المعرفة بیروت). (مرتب)

وصول کرنے کا حق حکومت کو نہیں، بلکہ مالکان پر ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی اپنے طور پر فرض ہے اور نقود چونکہ اموالِ باطنہ میں سے ہیں، اس لئے بینک اکاؤنٹس بھی اموالِ باطنہ میں سے ہوئے، ان سے حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

۲:- بینک اکاؤنٹس درحقیقت بینک کے ذمے اکاؤنٹ ہولڈروں کا قرض ہے، جب یہ رقم مالک نے بینک کو دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل گئی، اور بینک کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب اصل مالک پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ بینک سے اس کو واپس وصول کرے گا، اس سے پہلے جو زکوٰۃ بینک اکاؤنٹس سے وضع کی جارہی ہے وہ وجوبِ ادا سے پہلے ایک ایسے مال سے وصول کی جارہی ہے جس پر زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، اور جو اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہے، لہٰذا اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۳:- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے ادا کنندہ کا نیت کرنا ضروری ہے اور بینک اکاؤنٹس میں سے زکوٰۃ وضع کرتے وقت مالک کی نیت بسا اوقات نہیں ہوتی۔

ان تینوں مسائل پر قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں بحث کی جاتی ہے۔

﴿واللہ سبحانہ الموفق﴾

اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ

جیسا کہ ''مجلس'' کی تحریرِ سابق میں امام ابوبکر جصاصؒ اور دوسرے فقہائے کرامؒ کی تصریحات کے حوالے سے عرض کیا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ مبارک میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ ہر قسم کے قابلِ زکوٰۃ اموال سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جب اموال اور آبادی کی کثرت ہوگئی اور اندیشہ ہوا کہ لوگوں کے نجی مکانات وغیرہ میں زکوٰۃ کے کارندوں کی مداخلت سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور اس سے فتنے پیدا ہوں گے تو آپؓ نے صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی تحصیل سرکاری سطح پر باقی رکھی اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں مالکان کو حکومت کا نائب بنادیا۔

حضرات فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ کسی مال کے ''اموالِ ظاہرہ'' میں سے ہونے کے لئے دو اُمور ضروری ہیں:-

ایک یہ کہ ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مالکان کے نجی مقامات کی تفتیش کرنی نہ پڑے۔

دوسرے یہ کہ وہ اموال، حکومت کے زیرِ حمایت ہوں، پھر عرض کیا گیا تھا کہ بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں رکھوائی ہوئی رقموں میں یہ دونوں اُمور موجود ہیں، لہٰذا ان کو ''اموالِ ظاہرہ'' میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کسی مال کے ظاہر ہونے کی اصل علت "خروج من المصر" ہے، چونکہ اس دور میں شہر کے ناکوں پر حکومت کی طرف سے عاشر اس لئے بٹھائے جاتے تھے کہ وہ گزرنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کریں، اس لئے شہر سے نکل کر تمام اموال حکومت کے زیرِ حمایت آجاتے تھے، اور اس بناء پر حکومت ان کی زکوٰۃ وصول کرتی تھی، نجی مقامات کی تلاشی و تفتیش کی ضرورت نہ ہونا اس حکم کی حکمت ہے، علت نہیں، لہٰذا حکم کا مدار "خروج من المصر" پر ہوگا اور چونکہ یہ علت بینکوں اور مالیاتی اداروں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے ان کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کر کے ان سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنا دُرست نہیں۔

مجلس نے اس نقطۂ نظر پر مکرّر غور کیا، اور اس مسئلے میں فقہ اور حدیث کے متعلقہ مواد کو سامنے رکھا، لیکن غور و تحقیق کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ سرکاری سطح پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے "خروج من المصر" کو علت قرار دینا اور اس پر حکم کا مدار رکھنا دُرست نہیں، بلکہ اصل علت وہی ہے کہ وہ اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ ہو، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

حدیث اور فقہ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ حضراتِ خلفائے راشدینؓ اور بعد کے خلفاء واُمراء سالانہ تنخواہوں اور وظائف کی تقسیم کے وقت انہی تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ کاٹ لیا کرتے تھے، اور اس پر صحابہؓ و تابعینؒ اور دوسرے فقہاء نے نہ صرف یہ کہ کوئی نکیر نہیں فرمائی، بلکہ اس طریقے کی تصدیق و تائید فرمائی ہے، چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے:-

قال القاسم بن محمد: وكان ابوبكر الصديقؓ اذا اعطى الناس اعطياتهم سأل الرجل: هل عندك من مال وجبت عليك فيه الزكاة؟ فان قال نعم اخذ من عطاءه زكاة ذلك المال، وان قال: لا، سلم اليه عطاءه ولم يأخذ منه شيئًا.

(مؤطا امام مالکؒ ص:۱۰۳ و ۱۰۴ الزكاة في العين من الذهب والورق[1] ومصنف ابن ابی شیبة ج:۳ ص:۱۸۴ ما قالوا فی العطاء اذا اخذ[2] ومصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۸۶)[3] (كتاب الاموال لأبى عبيد ص: ۴۱۱)[4]

ترجمہ:- حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب

---

(۱) مؤطا امام مالکؒ ص:۲۷۲ (طبع نور محمد کتب خانه). (۲) طبع ادارة القرآن کراچی.
(۳) طبع مجلس علمی کراچی. (۴) كتاب الأموال لأبى عبيدؒ الجزء الثالث ص:۴۱۶ دار الكتب العلميه بيروت.

لوگوں کو (بیت المال سے ملنے والی) تنخواہ یا وظائف دیتے تو ہر شخص سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں تو اس کی تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ لیتے، اور اگر وہ کہتا کہ ''نہیں'' تو اس کی تنخواہ پوری دے دیتے، اور اس میں سے کچھ نہ لیتے۔

اور امام ابوعبیدؒ نے اس روایت کے یہ الفاظ نقل فرمائے:-

فان اخبره ان عنده مالا قد حلت فيه الزكاة قاصه مما يريد ان يعطيه، وان اخبره ان ليس عنده مال قد حلت فيه الزكاة سلم اليه عطاءه.

(كتاب الأموال لأبي عبيد ص: ۴۱۱ فقره: ۱۱۲۵ باب فروض زكاة الذهب والورق)[1]

ترجمہ:- اگر وہ شخص یہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوچکی ہے تو جو تنخواہ آپ اسے دینا چاہتے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے، اور اگر وہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال نہیں ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوگئی ہو تو اس کی تنخواہ اسے پوری دے دیتے تھے۔

نیز امام ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ معمول نقل فرمایا ہے:-

عن عبدالرحمن بن عبدالقارى، وكان على بيت المال فى زمن عمر مع عبيدالله بن الارقم: فاذا خرج العطاء جمع عمرؓ اموال التجارة، فحسب عاجلها وآجلها، ثم يأخذ الزكاة من الشاهد والغائب.

(مصنف ابن ابى شيبه ج:۳ ص:۱۸۴)[2]

ترجمہ:- عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ جو حضرت عمرؓ کے دور میں عبیداللہ بن ارقمؓ کے ساتھ بیت المال پر مقرر تھے، فرماتے ہیں کہ جب (سالانہ) تنخواہوں کی تقسیم کا وقت آتا تو حضرت عمرؓ تمام اموالِ تجارت کو جمع فرما کر ان کے نقد اور اُدھار کا حساب فرماتے، پھر حاضر اور غائب ہر طرح کے مال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔

اور امام ابوعبیدؒ نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمائی ہے:-

فكان اذا خرج العطاء جمع اموال التجار، ثم حسبها شاهدها وغائبها، ثم

---

(۱) كتاب الأموال لأبى عبيدؒ، الجزء الثالث ص:۴۱۶ دارالكتب العلميه بيروت.

(۲) طبع ادارة القرآن كراچى.

اخذ الزکاۃ من شاھد المال علی الشاھد والغائب.

(کتاب الأموال ص:۴۲۵ فقرہ: ۱۱۷۸ باب الصدقۃ فی التجارات والدیون)[۱]

ترجمہ:- جب تنخواہوں کی تقسیم ہوتی تو حضرت عمرؓ تمام تاجروں کے اموال جمع فرماکر اس میں سے حاضر و غائب سب کا حساب فرماتے، پھر موجود مال سے حاضر و غائب ہر طرح کے مال کی زکوٰۃ وصول فرماتے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ:-

و سندہ حسن.

(اعلاء السنن ج:۱۲ ص:۴۳۰ کتاب السیر باب العطاء یموت صاحبہ بعد ما یستوھبہ)[۲]

یعنی اس روایت کی سند حسن ہے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دور میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی کوئی تفریق نہ تھی، اس لئے وہ ہر قسم کے اموال سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ، جنہوں نے یہ تفریق قائم فرمائی تھی، ان کے دور میں بھی تنخواہوں سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا، چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں مروی ہے:-

عن عائشۃ بنت قدامۃ عن أبیھا أنہ قال: کنت اذا جئت عثمان بن عفانؓ اقبض عطائی، سألنی ھل عندک من مالک وجبت فیہ الزکاۃ؟ قال فان قلت: نعم، أخذ من عطائی زکاۃ ذلک المال، وان قلت: لا، دفع الیّ عطائی. (مؤطا امام مالکؒ ص:۱۰۴[۳] و مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۷۷[۴] حدیث: ۷۰۲۹ و کتاب الأم للشافعیؒ ج:۲ ص:۱۴، طبع بولاق، و کتاب الأموال لأبی عبیدؒ ص:۴۱۲ فقرہ: ۱۱۲۷)[۵]

ترجمہ:- عائشہ بنت قدامہ اپنے والد کا قول نقل فرماتی ہیں کہ جب میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس اپنی تنخواہ وصول کرنے جاتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کوئی مال ایسا ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ چنانچہ اگر میں یہ کہتا کہ

(۱) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص:۴۳۰ (دارالکتب العلمیہ بیروت).

(۲) اعلاء السنن ج:۱۲ ص:۵۱۱ (طبع ادارۃ القرآن کراچی).

(۳) مؤطا امام مالکؒ کتاب الزکوۃ، الزکوۃ فی العین من الذھب والورق ص:۲۷۲ (طبع نور محمد کتب خانہ).

(۴) طبع مجلس علمی کراچی

(۵) ص:۴۱۶ الجزء الثالث (دارالکتب العلمہ بیروت).

''ہاں'' تو میری تنخواہ سے اس مال کی زکوٰۃ وصول فرمالیتے، اور میں کہتا کہ ''نہیں''
تو میری تنخواہ مجھے دے دیتے۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی تنخواہ سے زکوٰۃ وضع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا، البتہ ان کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے، جن کی تنخواہیں یا وظائف بیت المال سے جاری ہوں، دوسرے لوگوں کی نہیں، حضرت معاویہؓ کا بھی یہی عمل تھا۔ (مؤطا امام مالک صفحہ:۲۷۳)[۱] اور حضرت ابن عباسؓ وابن عامرؓ بھی اسی کے قائل تھے (حاشیہ مؤطا امام مالک صفحہ:۲۷۳)۔[۲]

نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہیں تقسیم کرتے وقت خود تنخواہ کی زکوٰۃ بھی اسی تنخواہ میں سے وصول فرمالیتے تھے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں ہے:-

عن هبيرة قال: كان ابن مسعودؓ يزكي عطياتهم من كل الف خمسة وعشرين. (مصنف ابن ابی شیبه ج:۲ ص:۱۸۴)[۳]

ترجمہ:- حضرت ہبیرۃ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کی تنخواہوں کی زکوٰۃ (اس حساب سے) وصول فرمایا کرتے تھے کہ ہر ہزار پر پچیس وصول کرلیتے تھے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس روایت کے راویوں کی تحقیق فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ:-

فالاسناد حَسَنٌ. (اعلاء السنن ج:۱۲ ص:۴۲۹، ۴۳۰)[۴]

یعنی یہ سند حسن ہے۔

البتہ چونکہ یہاں زکوٰۃ ان تنخواہوں کی وصولی کی جاتی تھی، جو صاحبِ تنخواہ کی ملکیت میں قبضہ کرنے کے بعد آتی ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ پہلے تنخواہ دے دیتے، پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں ہے:-

عن هبيرة بن يريم عن عبدالله بن مسعودؓ قال: كان يعطي ثم يأخذ زكاته.
(مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۷۸ حدیث: ۷۰۳۶ باب لا صدقة في مال حتى يحول عليه الحول)[۵]

(۱،۲) ص:۲۷۳ (طبع نور محمد کتب خانه).
(۳) طبع ادارة القرآن کراچی.
(۴) اعلاء السنن کتاب السیر باب العطاء یموت صاحبه بعد ما یستوجبه ج:۱۲ ص:۵۵۹ طبع ادارة القرآن کراچی.
(۵) طبع مجلس علمی. (محمد زبیر حق نواز)

ترجمہ:- ہبیرۃ بن یریم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ تنخواہ دے دیتے پھر اس کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔

اور معجم طبرانیؒ میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

کان یعطی العطاء ثم یأخذ زکاته. (۱)

اور علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے:-

رجاله رجال الصحیح، خلا هبیرة، وهو ثقة. (۲)

نیز امام ابوعبیدؒ نے اس روایت کو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے نقل فرمایا ہے:-

عن هبیرة بن یریم قال: کان عبدالله بن مسعودؓ یعطینا العطاء فی زبل صغار، ثم یأخذ منه الزکاة. (کتاب الأموال ص:۴۱۲ فقره: ۱۱۲۸ باب فروض زکاة الذهب والفضة) (۳)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمیں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں تنخواہ دیتے پھر اس سے زکوٰۃ وصول فرماتے۔

تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ خلفائے راشدینؓ کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے:-

عن ابن عون عن محمد قال: رأیت الامراء اذا اعملوا العطاء زکوه.

(مصنف ابن ابی شیبہؒ ج:۳ ص:۱۸۵) (۴)

ترجمہ:- ابن عون حضرت محمدؒ (غالبا ابن سیرینؒ) کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے اُمراء کو دیکھا کہ جب وہ تنخواہ دیتے تو اس کی زکوٰۃ وصول کر لیتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں اگرچہ اموالِ ظاہرہ و باطنہ کی تفریق قائم ہوچکی تھی، لیکن ان کے بارے میں بھی مروی ہے:-

عن عمر بن عبدالعزیز انه کان یزکی العطاء والجائزة.

(مصنف ابن ابی شیبہؒ ج:۳ ص:۱۸۵) (۵)

ترجمہ:- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ وہ تنخواہوں اور انعامات سے

(۱، ۲) مجمع الزوائد للهیثمیؒ، باب أخذ الزکوة من العطاء ج:۳ ص:۶۸ دارالکتاب العربی بیروت.

(۳) الجزء الثالث ص:۴۱۷ دارالکتب العلمیه بیروت.

(۴) طبع ادارة القرآن کراچی.

(۵) ایضاً.

زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔

اور مصنف عبدالرزاقؒ میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

عن جعفر بن برقان ان عمر بن عبدالعزیز کان اذا اعطی الرجل عطاءہ او عمالتہ أخذ منہ الزکاۃ. (مصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۷۸، فقرہ: ۷۰۳۷)[1]

ترجمہ:- جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب کسی شخص کو اس کا وظیفہ یا اس کی اُجرت دیتے تو اس سے زکوٰۃ وصول فرمالیتے تھے۔

یہ معاملہ صرف تنخواہوں اور وظائف کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال پر جس کسی مسلمان کا کوئی مالی حق ہوتا تو اس کی ادائیگی کے وقت اس کی زکوٰۃ وصول کرنے کا معمول قرونِ اُولیٰ میں جاری تھا، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہؒ اور سننِ بیہقیؒ میں مروی ہے:-

عن عمرو بن میمون قال: اخذ الوالی فی زمن عبدالملک مال رجل من اهل الرقة یقال له ابوعائشة عشرین الفا فادخلت فی بیت المال، فلما ولی عمر بن عبدالعزیز اتاہ ولدہ، فرفعوا مظلمتهم الیه فکتب الی میمون: ادفعوا الیهم اموالهم وخذوا زکاۃ عامهم هذا، فلولا انه کان مالا ضمارا اخذناہ منه زکاۃ ما مضیٰ. (مصنف ابن ابی شیبةؒ ج:۳ ص:۲۰۲ طبع ادارۃ القرآن کراچی (ما قالوا) فی الرجل یذهب له المال السنین واخرجه ایضا البیهقی فی السنن الکبریٰ ج:۴ ص:۱۵۰)

ترجمہ:- عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ عبدالملک[2] کے زمانے میں اہلِ رقہ کے ایک شخص ابوعائشہ سے ایک گورنر نے زبردستی بیس ہزار وصول کر کے بیت المال میں داخل کردیئے تھے، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو اس شخص کے لڑکوں نے آکر دادرسی چاہی، اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے میمون کو لکھا کہ: ان کو ان کے اموال دے دو اور اس سے اس سال کی زکوٰۃ وصول کرلو، اس لئے کہ اگر یہ مالِ ضمار نہ ہوتا تو ہم اس سے پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کرتے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس حدیث کی سند کی تحقیق فرما کر ثابت فرمایا ہے

---

(۱) طبع مجلس علمی کراچی.

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ کے مطبوعہ نسخے میں عبدالملک لکھا ہے، لیکن دوسرے نسخے میں اور دوسری کتابوں میں ولید بن عبدالملک کا ذکر ہے اور وہی صحیح ہے۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

کہ اس کے رجال ثقات ہیں اور سند متصل ہے۔ (اعلاء السنن ج:۹ ص:۹ باب لازکاۃ فی المال الضمار)(۱)

نیز یہی واقعہ اجمالی طور پر دوسری سند سے مؤطا امام مالکؒ میں بھی مروی ہے، اور اس میں بھی ایک سال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر موجود ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

ان عـمـر بن عبدالعزيز كتب في مال قبضه بعض الولاة ظلما يأمر برده الى اهـلـه، وتؤخذ زكاته لما مضى من السنين، ثم عقب بعد ذلك بكتاب: لا تؤخذ منه الزكاة الا زكاة واحدة، فانه كان ضمارا.

(مؤطا امام مالکؒ ص:۱۰۷ الزكاة في الدين)(۲)

ترجمہ:- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک ایسے مال کے بارے میں جس پر بعض حکام نے ظلماً قبضہ کرلیا تھا، تحریر فرمایا کہ وہ مال اس کے مالکوں کو واپس کردیا جائے، اور اس کی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی وصول کی جائے، لیکن اس کے بعد ایک اور خط بھیجا کہ اس سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ وصول کی جائے، پچھلے سالوں کی نہیں، کیونکہ وہ مالِ ضمار تھا۔

ان تمام واقعات میں نقد روپے کی زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی گئی، اور وہ بھی عاشر پر گزرنے کی صورت میں نہیں، اور نہ مال کے شہر سے باہر ہونے کی حالت میں، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ تنخواہیں جاری کرتے وقت ان اموال کی زکوٰۃ تنخواہ سے کاٹ کر باقی تنخواہ لوگوں کے حوالے کیا کرتے تھے، اور حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ انہی تنخواہوں کی زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، کیونکہ اگر مالک پہلے سے صاحبِ نصاب ہو تو تنخواہ کی اس رقم پر مال مستفاد ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوتی تھی، البتہ یہ حضرات تنخواہوں سے زکوٰۃ کاٹنے کے بجائے پہلے تنخواہ حوالہ فرمادیتے، پھر مالک سے زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، بہرصورت! اس نقد رقم سے سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، اور یہ سلسلہ اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی تفریق قائم ہونے کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان رقوم سے بھی زکوٰۃ وصول فرمائی جو بیت المال میں ظلماً داخل کردی گئی تھیں۔

اس طریقِ کار سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی مال کے اموالِ ظاہرہ میں شمار

---

(۱) اعلاء السنن ج:۹ ص:۱۲، ۱۳ (طبع ادارة القرآن كراچی).

(۲) مؤطا امام مالکؒ "الزكوة في الدين" ص:۲۸۴ طبع نور محمد كتب خانه، اور اس مطبع کے نسخہ میں لا توخذ منه الزكوة کے بجائے الا توخذ منه .... الخ ہے جو غلط ہے، صحیح عبارت وہ ہے جو اوجز المسالک کے حوالہ سے حضرت والا دامت برکاتہم نے اوپر تحریر فرمائی ہے۔ (محمد زبیر)

ہونے اور اس سے سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اس کا شہر سے باہر لے جانا ضروری نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے نجی مقامات کی تلاشی یا تفتیش کی ضرورت پیش نہ آئے، اور وہ فی الجملہ حکومت کے زیرِ حفاظت آ گئے ہوں۔

تنخواہوں وغیرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا یہ طریقہ اس دور میں بھی بلانکیر جاری رہا ہے، اور خود فقہائے حنفیہؒ نے بھی ان واقعات کو نقل کر کے اس کی تصدیق و تائید فرمائی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کا تنخواہوں اور وظائف سے زکوٰۃ وصول کرنا خود امام محمدؒ نے بھی نقل فرمایا ہے اور لکھا ہے:-

> قال القاسم: وكان ابوبكرؓ اذا اعطى الناس اعطياتهم سئل الرجل هل عندک من مال قد وجبت فيه الزكاة؟ فان قال: نعم، اخذ من عطاءه زكاة ذلک المال، وان قال: لا، سلم اليه عطاءه. قال محمد: وبهذا نأخذ، وهو قول ابی حنيفةؒ. (مؤطا امام محمدؒ ص: ۱۷۰ باب الرجل يكون له الدين هل عليه فيه الزكاة؟)(۱)

اور اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں عائشہ بنت قدامہؓ کی وہ روایت نقل کی ہے جو پیچھے مؤطا امام مالک کے حوالے سے گزر چکی ہے۔

نیز علامہ ابن ہمامؒ اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مذکورہ بالا واقعہ جس میں غصب شدہ مال کو واپس کرتے ہوئے اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کا ذکر ہے، ذکر فرما کر اس سے مالِ ضمار پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے مسئلے میں استدلال فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال سے ایک سال کی جو زکوٰۃ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وصول فرمائی، وہ حنفیہ کے نزدیک بھی معمول بہ ہے، ورنہ وہ اس کی تردید یا توجیہ فرماتے۔

بلکہ امام طحاویؒ کی ایک عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک امام کو مکمل اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان کی زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مصدق بھیج کر سرکاری سطح پر ان کی زکوٰۃ وصول کرے، اور چاہے تو مالکوں کے حوالے کر دے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دیں چنانچہ انہوں نے شرح معانی الآثار میں ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے: باب الزكاة يأخذها الامام ام لا؟ اور اس میں اپنی عادت کے مطابق دونوں نقطۂ نظر بیان فرمانے کے بعد آخر میں لکھا ہے:-

---

(۱) المؤطا للامام محمدؒ ص: ۱۷۴ طبع قدیمی کتب خانہ.

واما وجهه، من طريق النظر فانا قد رأيناهم انهم لا يختلفون ان للإمام أن يبعث الى ارباب المواشي السائمة حتى يأخذ منهم صدقة مواشيهم اذا وجبت فيها الصدقة وكذلك يفعل في ثمارهم يضع ذلك في مواضع الزكوات على ما أمره به عزوجل، لا يأبى ذلك أحد من المسلمين، فالنظر على ذلك أن يكون بقية الأموال من الذهب والفضة وأموال التجارات كذلك .... و هذا كله قول أبي حنيفةؒ وابي يوسفؒ ومحمدؒ.

(شرح معاني الآثار للطحاويؒ ج:۱ ص:۲۶۳، ۲۶۴)[۱]

ترجمہ:- قیاس ونظر کے لحاظ سے بھی اس مسئلے میں صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفت چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں کے مالکان کے پاس بھیج کر ان کے مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کرے جبکہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو، اسی طرح ان کے پھلوں میں بھی یہ حق حاصل ہے، پھر وہ حاصل شدہ زکوٰۃ کو مصارفِ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب صرف کرے، اس بات سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا، لہٰذا نظر و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ باقی اموال، سونا چاندی اور مالِ تجارت کا بھی یہی حکم ہو......اور یہ سب کچھ امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔

یہاں امام طحاویؒ نے کسی قید وشرط کے بغیر امام کا یہ حق بیان فرمایا ہے کہ وہ سونا، چاندی اور مالِ تجارت سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیج سکتا ہے، یہاں انہوں نے مصر یا غیرِ مصر کی بھی کوئی شرط نہیں لگائی، اور نہ عاشر کے پاس گزرنے کا کوئی ذکر فرمایا ہے، امام طحاویؒ کی عبارت کا یہ اطلاق فقہائے حنفیہ کی دوسری تصریحات سے بظاہر معارض معلوم ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا عبارت کے سیاق وسباق میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ان کی یہ ساری گفتگو ما مرّ علی العاشر سے متعلق ہو، لیکن جہاں تک مذکورہ عبارت کا تعلق ہے، اس میں کوئی قید یا شرط نہیں ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امام طحاویؒ کا مقصد یہ ہے کہ ان اموالِ باطنہ سے بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حنفیہ کے نزدیک اصلاً امام کو ہے، البتہ اس مصلحت کے پیشِ نظر جو حضرت عثمان غنیؓ کے پیشِ نظر تھی کہ جہاں لوگوں کے نجی مقامات کی تلاشی یا پڑتال کی ضرورت پڑتی ہو، وہاں مالکوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے اور جہاں یہ مصلحت داعی نہ ہو، وہاں وہ اپنے اصل حق کے مطابق زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، چونکہ

(۱) شرح معاني الآثار للطحاويؒ ج:۱ ص:۳۴۴ (طبع مكتبه حقانيه ملتان).

عاشر پر گزرنے والے اموال میں اس قسم کا کوئی مفسدہ نہیں ہے، اس لئے وہ اپنے اصل حق کے مطابق ان سے زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، اور اگر کچھ مزید اموال ایسے ہوں جن سے زکوٰۃ وصول کرنے میں یہ مفسدہ نہ ہو، وہاں بھی امام کا اصل حق عود کر آئے گا، اور وہ ان اموال سے زکوٰۃ وصول کرسکے گا، جس کی نظیریں تنخواہوں، وظائف اور مال مغصوب کے سلسلے میں پیچھے گزر چکی ہیں، بلکہ اگر کسی جگہ یہ معلوم ہو کہ لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں، وہاں اس مفسدے کے باوجود امام اپنے اصل حق کے مطابق ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرسکے گا، کیونکہ ترکِ زکوٰۃ کا مفسدہ اس مفسدے سے شدید تر ہے، یہی بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہؒ نے تحریر فرمائی ہے، مثلاً علامہ ابنِ ہمامؒ فرماتے ہیں:-

ظاهر قوله تعالىٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الأية توجب حق اخذ الزكاة مطلقا للامام، وعلى هذا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتان بعده، فلما ولى عثمان وظهر تغير الناس كره ان تفتش السعاة على الناس مستور اموالهم، ففوض الدفع الى المـلّاك نيابة عنه، ولم تختلف الصحابة عليه فى ذلك وهذا لا يسقط طلب الامام اصلا، ولهذا لو علم أن اهل بلدة لا يؤدّون زكاتهم طالبهم بها. (فتح القدير ج:۱ ص:۴۸۷)[۱]

ترجمہ:- آیتِ قرآنی: "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الأية" کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کو مطلقاً (ہر قسم کے اموال کی) زکوٰۃ وصول کرنا واجب ہے، اور اسی طرزِ عمل پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دو خلیفہ قائم رہے، لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے اور لوگوں کے حالات بدل گئے تو آپؓ نے یہ بات پسند نہ فرمائی کہ محصلینِ زکوٰۃ لوگوں کے پوشیدہ اموال کی تفتیش کریں، چنانچہ انہوں نے مالکوں کو ادائے زکوٰۃ کا حق سونپ کر اس معاملے میں انہیں اپنا نائب بنادیا، اور صحابہ کرامؓ نے اس معاملے میں ان سے اختلاف نہیں فرمایا، لیکن یہ طرزِ عمل امام کے حقِ مطالبہ کو بالکلیہ ساقط نہیں کرتا، چنانچہ اگر کسی شہر کے لوگوں کے بارے میں امام کو یہ معلوم ہو کہ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو وہ ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے گا۔

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ اصلاً تمام اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق امام ہی کو ہے، اور اموالِ باطنہ کے سلسلے میں یہ حق ایک مصلحت سے چھوڑا گیا ہے، اور بالکلیہ اب بھی ساقط نہیں

(۱) فتح القدير كتاب الزكوة ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

ہوا، بلکہ ان اموال کی زکوٰۃ جو مالکان ادا کرتے ہیں وہ بھی امام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں، اصلاً ان کو یہ اختیار بھی نہیں تھا، اور اسی لئے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے دَین کو فقہاء نے لہ مطالب من جهة العباد قرار دیا ہے۔

یہاں بعض حضرات کو یہ شبہ پیش آیا ہے کہ امام ابوبکر جصاصؒ نے حضرت عثمانؓ کے عمل کا ذکر فرما کر لکھا ہے:-

فجعل لهم اداءها الى المساكين وسقط من اجل ذلك حق الامام فى اخذها لأنه عقد عقده امام من ائمة العدل، فهو نافذ على الأمة.

(احکام القرآن للجصاص ج:۳ ص:۱۹۰)[1]

ترجمہ:- حضرت عثمان غنیؓ نے زکوٰۃ کے مالکوں کو یہ حق دے دیا کہ وہ مساکین کو اپنے طور پر زکوٰۃ دے دیا کریں، اور اس لئے اب ان اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کے سلسلے میں امام کا حق ساقط ہوگیا، اس لئے کہ ائمۂ عدل میں سے ایک امام کا کیا ہوا فیصلہ ہے، جو پوری اُمت پر نافذ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے کے بعد اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق کسی کو نہیں رہا، لیکن امام ابوبکر جصاصؒ کی پوری عبارت کو بغور پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ حقِ امام سے ان کی مراد ایسا حق ہے جس کے بعد مالکانِ اموال کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنے کا اختیار باقی نہ رہے، اور ان کی ادائیگی کو شرعاً تسلیم نہ کیا جائے، چنانچہ ان کی مذکورہ عبارت سے پہلے ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وقوله تعالى: خذ من أموالهم صدقة يدل على أن اخذ الصدقات الى الإمام، وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه، لان حق الامام قائم فى اخذها فلا سبيل له الى اسقاطه.[2]

ترجمہ:- اور باری تعالیٰ کا ارشاد: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا کام امام کے سپرد ہے اور یہ کہ اگر وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے، زکوٰۃ اپنے طور پر مساکین کو ادا کردے تو یہ اس کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ امام کا وصولیابی کا حق قائم ہے، اور اسے ساقط کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔

مذکورہ جملے سے صاف واضح ہے کہ وہ امام کے ایسے حق کا تذکرہ فرما رہے ہیں جس کی

(۱، ۲) احکام القرآن للجصاصؒ ج:۳ ص:۱۵۵ طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔

موجودگی میں مالک کو ازخود زکوٰۃ ادا کرنا ناجائز ہی نہ ہو، بلکہ اس سے زکوٰۃ ادا بھی نہ ہو، پھر اسی حق کے بارے میں آگے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عثمانؓ ائمۂ عدل میں سے تھے اور انہوں نے اموالِ باطنہ کی حد تک یہ حق ساقط کر دیا، اس لئے یہ حق اب ساقط ہوگیا[1] جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ازخود مساکین کو دینا جائز نہیں تھا اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تھی، حضرت عثمانؓ نے یہ اختیار انہیں دے دیا، اب یہ بات طے ہوگئی کہ ایسے اموال کے مالکان اگر ازخود زکوٰۃ ادا کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام کا حقِ اخذ بالکلیہ ساقط ہوگیا، اور اب وہ زکوٰۃ وصول کرنا چاہے تو وصول نہیں کرسکتا، چنانچہ فتح القدیر کی مذکورہ بالا عبارت اس پر صریح ہے کہ:-

وهذا لا يسقط طلب الامام اصلًا.[2]

امام ابوبکر جصاصؒ کی اس پوری بحث کو اور دوسرے فقہاء و محدثین کی عبارتوں اور روایات کو دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:-

☆ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور حضرات شیخینؓ کے زمانوں میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ دونوں سے زکوٰۃ سرکاری سطح پر وصول کی جاتی تھی، البتہ اتنا فرق ضرور تھا کہ مویشیوں اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجے جاتے تھے، اور نقود اور اموالِ تجارت کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مصدق بھیجنے کے بجائے مالکوں کو حکم تھا کہ وہ خود زکوٰۃ لے کر آئیں، لیکن دونوں قسم کے اموال میں ادائے زکوٰۃ کا راستہ یہی تھا کہ وہ حکومت کو دی جائے۔

☆ حضرت عمرؓ نے شہر سے باہر جانے والے اموال کے بارے میں یہ تبدیلی فرمائی کہ اس کی وصولیابی کے لئے مصدق مقرر فرمائے، اور باقی اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ حسبِ سابق مالکان خود لا لاکر دیتے رہے۔

☆ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اموالِ باطنہ کی کثرت ہوگئی، آبادی پھیل گئی اور انہوں نے محسوس فرمایا کہ اب اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کی سرکاری سطح پر وصولیابی کا یہ سلسلہ کہ اس کے بغیر ادائے زکوٰۃ جائز ہی نہ ہو، اگر باقی رکھا گیا تو اس کے لئے اموالِ ظاہرہ کی طرح مصدق مقرر کرنے پڑیں

---

(۱) چنانچہ مویشیوں کے بارے میں اب امام کا حق اسی نوعیت کا ہے کہ اس کی موجودگی میں مالک کو ازخود زکوۃ دینا جائز نہیں، بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک تو اس طرح زکوۃ ادا ہی نہیں ہوتی، مبسوط میں ہے: ''فان قال دفعتها الى المساكين لم يصدق وتؤخذ منه الزكاة عندنا ..... ولنا ان هذا حق مالي يستوفيه الامام بولاية شرعية فلا يملك من عليه اسقاط حقه في الاستيفاء ولا يبرأ بالأداء الى الفقير فيما بينه وبين ربه وهو اختيار بعض مشائخنا (مبسوط ج:۲ ص:۱۶۱، ۱۶۲ طبع دار المعرفة بيروت) (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)۔

(۲) فتح القدير ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

گے، اور لوگوں کے نجی مقامات میں ان کی دخل اندازی سے لوگوں کو تکلیف ہوگی، لہٰذا آپؓ نے مالکان کو اجازت دے دی کہ وہ ان اموال کی زکوٰۃ خود ادا کرلیا کریں۔

* حضرت عثمانؓ کے اس عمل کے بعد لوگوں کو اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر ادا کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن زکوٰۃ کی وصولیابی کا اصلی حق اب بھی امام ہی کو ہے، چنانچہ دو صورتوں میں اب بھی وہ زکوٰۃ کی وصولیابی کا اہتمام کرسکتا ہے، ایک یہ کہ کسی جگہ کے لوگوں کے بارے میں یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور دوسرے یہ کہ کچھ اموالِ باطنہ اس طرح اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوجائیں کہ ان سے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے نجی مقامات کی تفتیش کی ضرورت نہ پڑے۔

* چونکہ قدیم زمانے میں نجی مقامات کی تفتیش کے بغیر اموال کے ظاہر ہوجانے کی جو صورت کثرت سے پیش آتی تھی وہ یہ تھی کہ اموال کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے وقت وہ عاشر پر گزرتے تھے، اس لئے فقہائے کرامؒ نے اس صورت کے اَحکام تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے اور اس طرح تعبیر فرمایا کہ ''یہ اموال شہر سے باہر نکل کر اموالِ ظاہرہ میں شامل ہوگئے ہیں اور جو اموال شہر کے اندر ہیں وہ اموالِ باطنہ ہیں'' اس لئے یہ ''شہر سے باہر نکلنا'' اصل مدارِ حکم یا بطورِ علت نہیں، بلکہ اپنے عہد کے لحاظ سے اس واقعے کا بیان ہے، ورنہ اصل مدارِ حکم وہی ہے جس کی بناء پر اموالِ باطنہ کو زکوٰۃ کی سرکاری وصولیابی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، یعنی تفتیش کے بغیر ان کا ظاہر ہوجانا، چنانچہ قرونِ اُولیٰ میں ان اموال میں سے بھی زکوٰۃ وصول کی گئی جو شہر سے باہر نہیں ہوتے تھے، لیکن تفتیش کے بغیر ظاہر ہوتے تھے مثلاً تنخواہیں، وظائف اور حکومت کے اموالِ مغصوبہ، جس کی روایات پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہاں بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ بعض اموال حکومت پر تفتیش کے بغیر ظاہر ہوجاتے تھے لیکن اس کے باوجود حکومت ان سے زکوٰۃ وصول نہیں کرتی تھی، مثلاً عاشر پر گزرنے والا اگر اپنے نجی مقامات پر رکھے ہوئے اموال کے بارے میں اقرار کرلیتا تو ان کی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی، جس کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے۔

اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ اقرار کے ذریعے تو اموالِ باطنہ میں سے ہر مال ظاہر بن سکتا ہے، لیکن چونکہ جزوی واقعات کو کُلی اَحکام کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اور عاشر کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ جس مال کو چاہے ظاہر قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کرلے، اس لئے اس کو یہ لگا بندھا اُصول بتا دیا گیا ہے کہ جو کوئی شخص تمہارے پاس مال لے کر گزرے تو صرف اس مال سے زکوٰۃ وصول کرسکتے ہو جو اس وقت تمہارے سامنے آجائے، اور لوگوں کے گھروں یا دُکانوں پر جو مال ہے اس سے تعرض نہ کرو، اس اُصول کے تحت ''عاشر'' کو گھروں میں رکھے ہوئے مال سے تعرض کا اختیار نہیں دیا گیا، اور

جب یہ اُصول مقرّر ہوگیا تو اگر کسی جزوی واقعے میں کوئی شخص اپنے مالِ باطن کو عاشر پر اقرار کے ذریعے ظاہر بھی کردے تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہوگا، جس سے اُصول تبدیل نہیں ہوسکتا، اس لئے اس صورت میں بھی بطورِ اُصول اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی۔

ہاں! اگر کچھ ایسے اموال پائے جائیں جن کی نوعیت ہی ایسی ہو کہ وہ سب کے سب بذاتِ خود حکومت پر بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں، اور حکومت ان تمام اموال کے بارے میں یہ طے کردے کہ ان تمام اموال سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی تو اس میں شرعی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ تنخواہوں، وظائف اور اموالِ مغصوبہ سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی وہ اس کے جواز کی واضح نظیر ہے۔

دوسرے الفاظ میں "خروج من المصر" عاشر کے لئے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجازت کی تو علت ہے لیکن امام کے لئے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کی علت نہیں، بلکہ اس کے لئے علت اموال کا تفتیش کے بغیر ظاہر ہوجانا ہے، چنانچہ جن اموال کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ بغیر تفتیش کے ظاہر ہوجاتے ہوں، ان سے مَا مَرّ عَلی العَاشر کی طرح وہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جاری کرسکتا ہے، جیسا کہ تنخواہوں وغیرہ کے معاملے میں کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرامؒ "خروج من المصر" کا تذکرہ "باب فیمن یمر علی العاشر" میں تو فرماتے ہیں، جس کا موضوع یہ ہے کہ عاشر کون سے اموالِ زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے، لیکن جس جگہ امام کے وصولیٔ زکوٰۃ کے اختیار کا بیان ہے، وہاں عموماً "خروج من المصر" کو بطورِ علت ذکر نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں علت یہی بیان کی جاتی ہے کہ اموالِ باطنہ سے زکوٰۃ وصول کرنے میں لوگوں کے نجی مقامات میں دخل اندازی اور ان کی تفتیش لازم آجاتی ہے جس سے عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے، جیسا کہ فتح القدیر کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے، اور امام ابوبکر جصاصؒ کی عبارت مجلس کی تحریرِ سابق میں نقل کی جاچکی ہے۔

بینک اکاؤنٹس کے قرض ہونے کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص بینک میں رقم رکھواتا ہے تو شرعاً وہ رقم بینک کے ذمے قرض ہوتی ہے، امانت نہیں، اس لئے وہ بینک پر مضمون بھی ہوتی ہے اور اس پر زیادتی وصول کرنا سود ہوتا ہے، اور جب کسی شخص نے کوئی رقم کسی دوسرے فرد یا ادارے کو بطور قرض دے دی تو وہ اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب

اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب وہ رقم اسے وصول ہوجائے گی، اس سے پہلے زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، لہٰذا بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وضع کرنے پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب الأداء ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کرلی گئی ہے، اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دائن سے وصول کرنے کے بجائے مدیون کے مال سے وصول کی گئی ہے، حالانکہ اس کی کوئی نظیر معہود فی الشرع نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

ذیل میں ان دونوں اعتراضات کی تحقیق مقصود ہے:-

ان دونوں مسائل کی تحقیق کے لئے پہلے بینک اکاؤنٹس کی صحیح حیثیت متعین کرنا ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فقہی اعتبار سے بینک اکاؤنٹ قرض ہے[1] لیکن دائن کے تصرف کے لحاظ سے یہ ایک بالکل نئی قسم کا قرض ہے جو فقہائے کرامؒ کے عہد میں موجود نہیں تھا اور جس کی نظیریں بھی اس دور میں کم ملتی ہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے حق میں بینک اکاؤنٹس کو بالکلیہ دوسرے دیون اور قرضوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہوگا، وجوبِ زکوٰۃ کے حق میں دَین کے اندر اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دائن کے لئے کس حد تک مرجو الوصول ہے، اور دائن کا تصرف اس پر کس حد تک برقرار ہے، اسی بناء پر فقہائے کرامؒ نے وجوبِ زکوٰۃ کے معاملے میں دَینِ قوی، دَینِ متوسط اور دَینِ ضعیف کی تقسیم فرمائی ہے، اور اسی بناء پر دَینِ مجحود کو مالِ ضمار میں شامل کرکے اسے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جب ہم اس نقطۂ نظر سے بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ دَین ہونے کے باوجود اس معاملے میں دوسرے عام دیون سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:-

(۱) البتہ جن اکاؤنٹس پر سود کا لین دین طے ہوتا ہے، مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں ایک اور بھی احتمال قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ وہ شرکت فاسدہ یا مضاربتِ فاسدہ کا مال ہو، کیونکہ فقہاء کرامؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے شرکت یا مضاربت کرتے وقت نفع کے شائع حصے کے بجائے معین رقم طے کرلی جائے تو شرکت اور مضاربت فاسد ہوجاتی ہے شامی[1] اور شرکتِ فاسدہ اور مضاربتِ فاسدہ دونوں میں جب تک شریکین مال واپس نہ لیں ان کے درمیان شرکت فی الملک قائم ہوجاتی ہے، اور دونوں اپنے اپنے حصے کے مالک رہتے ہیں، وہ رقم دین نہیں بلکہ مالِ تجارت کے حکم میں رہتی ہے، اور غیر سودی اکاؤنٹس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ اصلاً ودیعت تھی، لیکن خلط بالاذن کی بناء پر وہ مال شرکتِ ملک بن گیا، چنانچہ درمختار کتاب الایداع میں تصریح ہے کہ ودیعت خلط بالاذن سے شرکتِ ملک بن جاتی ہے (شامی ج:۴ ص:۸ و۴)[2] اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے سیونگ اکاؤنٹ کو اسی بناء پر شرکتِ ملک کا مال قرار دیا ہے (امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۳۰۹)[3] اگر ان اکاؤنٹس کی یہ توجیہ درست ہو تو ان اکاؤنٹس کے دَین ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس توجیہ میں تامل یہ ہے کہ اس کے مطابق ان اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پھر مضمون نہ ہوگی، حالانکہ فریقین کی طرف سے مضمون ہونا شرط ہوتا ہے۔ فلیتامل

(حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار کتاب الایداع ج:۵ ص:۲۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) طبع مکتبہ دار العلوم کراچی (محمد زبیر)

۱:- عام قرضوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مقرض کے قبضے سے نکلنے کے بعد ان پر مقرض کا کوئی تصرف باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ مقروض کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اسے ادا کرے، اس کے برعکس بینک اکاؤنٹس میں مقرض کے طلب کرنے پر فوری ادائیگی نہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اور یہ بینک کی طرف سے صرف زبانی اقرار نہیں ہوتا، بلکہ بینکوں کا مسلسل بلاتخلف طرزِ عمل یہی ہے، جس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لہٰذا یہ قرض کی وہ قسم ہے جس میں مقرض اپنی رقم جب چاہے فوراً بلاتخلف واپس لے سکتا ہے، اور عملاً وہ ایسی ہی قابل اعتماد ہے جیسے اپنی تجوری میں رکھی ہوئی رقم، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کہ تجوری کی رقم میں ہلاک ہونے کا خطرہ ہے، لیکن بینک اکاؤنٹ میں ایسا خطرہ بھی نہیں ہے۔

۲:- بینک اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم پر ہر اکاؤنٹ ہولڈر ٹھیک اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اپنی الماری میں رکھی ہوئی رقم پر تصرف کرتا ہے، اس وقت تجارت کا سارا کاروبار بینک اکاؤنٹس ہی پر چل رہا ہے اور بیشتر ادائیگیاں بینک ہی کے ذریعے ہوتی ہیں۔

۳:- عرفِ عام میں بھی بینک میں رقم رکھوانے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے یہ رقم کسی کو قرض دے دی ہے، بلکہ وہ اسے اپنی ہی رقم سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ اپنی رقم ہی کا سا معاملہ کرتا ہے، جب کوئی شخص اپنے حاضر و غائب مال کی فہرست بناتا ہے تو بینک اکاؤنٹس کو مالِ حاضر میں شمار کیا جاتا ہے، مالِ غائب میں نہیں۔

۴:- عام قرضوں کا حال یہ ہے کہ معاہدہ قرض کا محرک مستقرض ہوتا ہے، لیکن یہاں محرک مقرض ہوتا ہے، اور اس کا اصل منشاء قرض دینے کے بجائے اپنے مال کی حفاظت ہوتا ہے۔

عام قرضوں کے مقابلے میں بینک اکاؤنٹس کی ان وجوہِ فرق کو ذہن میں رکھ کر قرضوں پر زکوٰۃ کے مسئلے پر غور فرمائیے۔

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر پہلا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ قرضے پر اگرچہ زکوٰۃ فرض تو ہوتی ہے، لیکن اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے، جب وہ دائن کے قبضے میں واپس آجائے، اور زیرِ بحث صورت میں دائن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی زکوٰۃ وضع کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ قرضوں پر زکوٰۃ کا نفسِ وجوب تو متفق علیہ ہے، البتہ امام ابوحنیفہؒ نے مقرض کو یہ سہولت دی ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس پر واجب اس وقت ہوگی جب قرضے کی رقم اسے واپس ملے گی، چنانچہ جب بھی چالیس درہم کی مقدار اس کے پاس واپس آئے گی، ایک درہم بطور زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہوگا، اس سہولت کا پسِ منظر اور اس کی اصل وجہ مندرجہ ذیل روایات سے واضح ہوتی ہے:-

۱:- امام بیہقیؒ روایت فرماتے ہیں:-

عن حمید بن عبدالرحمن بن عبدالقاری، وکان علی بیت مال عمرؓ قال: کان الناس یأخذون من الدین الزکاۃ، وذلک ان الناس اذا خرجت الاعطیۃ حبس لھم العرفاء دیونھم وما بقی فی ایدیھم اخرجت زکاتھم قبل ان یقبضوا، ثم داین الناس بعد ذلک دیونا ھالکۃ فلم یکونوا یقبضون من الدین الصدقۃ الا ما نص منہ ولکنھم کانوا اذا قبضوا الدین اخرجوا عنھا لما مضیٰ.

(السنن الکبریٰ للبیھقی ج:۴ ص:۱۵۰ باب زکاۃ الدین اذا کان علی معسر أو جاحد)(۱)

ترجمہ:- حمید بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المال میں مقرّر تھے، فرماتے ہیں کہ لوگ دَین سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے، جس کا طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا وقت آتا تو عرفاء ان کے دیون کا حساب کرتے، اور جو باقی بچتا اس کی زکوٰۃ ان کے قبضہ کرنے سے پہلے ہی نکال لی جاتی، لیکن اس کے بعد لوگوں نے ایسے دیون کا معاملہ شروع کردیا جو بعض اوقات ضائع ہوجاتے تھے، اس لئے حکام صرف اس دَین سے زکوٰۃ وصول کرتے جو نقد شکل میں آجاتا، لیکن لوگ جب اپنے قرضوں پر قبضہ کرتے تو زمانۂ گزشتہ کی زکوٰۃ بھی نکالتے تھے۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اصلاً دیون کا حکم بھی یہی تھا کہ سال بہ سال ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے، خواہ وہ قبضے میں نہ آئے ہوں، لیکن چونکہ بعض مرتبہ لوگ زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اور بعد میں دیون وصول نہیں ہوتے، اس لئے یہ سہولت دی گئی کہ دیون کی زکوٰۃ دیون وصول ہونے کے بعد دی جائے، لیکن جب ادا کی جائے تو سالہائے گزشتہ کی بھی ادا کی جائے، اس کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی رہا ہے کہ مدیون اگر قابلِ اعتماد ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وصولیابی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ سال کے سال زکوٰۃ ادا کی جاتی رہے، چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت جابر بن زیدؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت میمون بن مہرانؒ، حضرت قتادہؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ وغیرہ کا مسلک یہی تھا۔

(کتاب الأموال لأبی عبید ص:۴۳۴ باب الصدقۃ فی التجارات والدیون فقرہ نمبر ۱۲۳۶(۲) ومصنف عبدالرزاق ج:۴ ص:۱۰۴ باب لا زکاۃ الا فی الناض)(۳)

---

(۱) طبع نشر السنۃ، ملتان.
(۲) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص:۴۳۹ (طبع دارالکتب العلمیہ بیروت).
(۳) طبع مجلس علمی.

اسی کو امام ابوعبیدؒ نے ترجیح دی ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔

(نہایة المحتاج ج:۳ ص:۱۳۰)[1]

لیکن امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ دَین خواہ کتنے قابلِ اعتماد شخص کے پاس ہو، اس میں چونکہ عدمِ ادائیگی کا احتمال بھی رہتا ہے، لہٰذا جب تک وہ مالک کے قبضے اور تصرف میں نہ آجائے اس وقت تک وجوبِ اداء نہیں ہوگا، اس کے لئے انہوں نے حضرت علیؓ کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جسے امام محمدؒ نے روایت کیا ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں:-

عن علی بن ابی طالبؓ قال: اذا کان ذلک دین علی الناس فقبضه فزکاه لما مضٰی قال محمدؒ: و به نأخذ وهو قول أبی حنیفةؒ.

(کتاب الآثار صفحه ۱۰۸)[2]

ترجمہ:- حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب کسی کا دَین لوگوں پر ہو اور وہ اس پر قبضہ کرلے تو زمانۂ ماضی کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلے میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علیؓ کے ارشاد پر رکھی ہے۔

اور حضرت علیؓ کا یہ ارشاد امام بیہقیؒ[3] اور امام ابوعبیدؒ وغیرہ[4] نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے:-

عن علیؓ فی الدین الظنون قال: ان کان صادقا فلیزکه اذا قبضه لما مضی.

ترجمہ:- جس دَین کی وصولیابی مشکوک ہو اس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: اگر دائن سچا ہے تو دین پر قبضہ کرنے کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے۔

امام ابوعبیدؒ نے "دین ظنون" کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:-

هو الذی لا یدری صاحبه أیقضیه الذی علیه الدین أم لا؟

(بیهقی ج:۴ ص:۱۵۰[5] و کتاب الأموال ص:۴۳۱ فقره:۲۲۰[6] او مصنف ابن ابی شیبةؒ ج:۳ ص:۱۶۳[7])

---

(۱) طبع احیاء التراث العربی بیروت.　(۲) کتاب الآثار للامام محمدؒ ص:۵۴ (طبع کتب خانه مجیدیه ملتان).

(۳) دیکھئے السنن الکبری للبیهقیؒ ج:۴ ص:۱۵۰ (طبع نشر السنة ملتان).

(۴) کتاب الأموال لأبی عبیدؒ الجزء الثالث ص:۴۳۶ (دار الکتب العلمیه بیروت).

(۵) طبع نشر السنة ملتان. (۶) الجزء الثالث ص:۴۳۶(دارالکتب العلمیة بیروت). (۷) طبع ادارة القرآن کراچی.

یعنی یہ وہ دَین ہے جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ مدیون اسے ادا کرے گا یا نہیں کرے گا؟

اور اس ارشاد کی تفصیل امام ابنِ ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روایت فرمائی ہے:-

عن الحسن قال: سئل علی عن الرجل یکون له الدین علی الرجل، قال: یزکیه صاحب المال فان توی ما علیه وخشی أن لا یقضی، قال: یمهل فاذا خرج ادی زکاة ماله. (مصنف ابن ابی شیبۃؒ ج:۳ ص:۱۶۲)[1]

ترجمہ:- حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ کسی شخص کا دَین دوسرے پر واجب ہو (تو وہ کیا کرے؟) آپؓ نے فرمایا کہ مالک اس کی زکوٰۃ نکالے، لیکن اگر اسے یہ اندیشہ ہو کہ مدیون ادا نہیں کرے گا تو وہ ٹھہر جائے اور جب دَین وصول ہوجائے تو اس وقت ادا کردے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں حضرت علیؓ کا موقف وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کا ہے یعنی:-

أن عبدالله بن عباسؓ وعبدالله بن عمرؓ قالا: من أسلف مالًا فعلیه زکاته فی کل عام اذا کان فی ثقة. (السنن الکبریٰ للبیهقی ص:۱۴۹)[2]

ترجمہ:- عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کوئی مال قرض دے تو اس پر ہر سال اس کی زکوٰۃ واجب ہے اگر وہ قابلِ اعتماد جگہ پر ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکمل الفاظ یہ ہیں:-

زکوا ما کان فی أیدیکم، وما کان من دَین فی ثقة فهو بمنزلة ما فی أیدیکم، وما کان فی دَین ظنون فلا زکاة فیه حتی یقبضه.

(بیہقیؒ ج:۴ ص:۱۵۰[3] ومصنف ابن ابی شیبۃؒ ج:۳ ص:۱۶۲)[4]

ترجمہ:- جو مال تمہارے ہاتھوں میں ہو اس کی زکوٰۃ نکالو اور جو دَین قابلِ اعتماد جگہ پر ہو، وہ ایسا ہی ہے جیسے تمہارے قبضے کا مال، اور جو دَین ظنون ہو تو اس پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں جب تک وہ قبضے میں نہ آجائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس ارشاد کا ایک حصہ حضرت امام محمدؒ نے بھی نقل فرمایا ہے اور اس

---

(۱) طبع ادارۃ القرآن کراچی۔
(۲) ج:۴ طبع نشر السنة ملتان۔
(۳) ایضاً
(۴) طبع ادارۃ القرآن کراچی۔

سے دَین کے مسئلے میں مالکیہ کے خلاف استدلال فرمایا ہے:-

عن نافع عن ابن عمرؓ انه قال فی الدین یرجی، قال: زکه کل عام.

(کتاب الحجة علی اهل المدینة ج: ۱ ص: ۴۷۲)[۱]

ترجمہ:- حضرت ابنِ عمرؓ نے اس دَین کے بارے میں فرمایا جس کی وصولیابی کی اُمید ہو کہ اس کی زکوٰۃ ہر سال نکالو۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہائے حنفیہؒ نے اس باب میں اپنے مسلک کی بنیاد حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ کے اقوال پر رکھی ہے، اور ان کے نزدیک اگرچہ قبضے کے بعد زکوٰۃ کا وجوب صرف اس صورت میں ہے جبکہ دَین کی وصولیابی مظنون ہو، جہاں وصولیابی کا وثوق ہو، وہاں ان کے نزدیک وجوبِ ادا بھی قبضے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے، لیکن فقہائے حنفیہؒ نے اس پہلو پر نظر فرمائی کہ معروف دیون میں سے ہر دَین میں، خواہ وہ کتنے ہی قابلِ اعتماد شخص کے پاس ہو، عدمِ ادائیگی کا کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہے، لہٰذا انہوں نے ہر دَینِ قوی کو ''دَینِ ظنون'' قرار دے کر یہ عام حکم لگا دیا کہ اس پر نفسِ وجوب تو ہوجاتا ہے، لیکن وجوبِ ادا قبضے کے بعد ہوگا۔

اس پسِ منظر کو ذہن میں رکھ کر جب ہم بینک اکاؤنٹس کا جائزہ لیتے ہیں، اور عام دیون کے مقابلے میں ان کی جو وجوہِ فرق شروع میں بیان کی گئیں، ان کو دیکھتے ہیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دَینِ قوی کی وہ قسم ہے جو فقہائے کرامؒ کے عہد میں موجود نہیں تھی، یا اس کی نظیریں شاذ و نادر تھیں، اور اس قسم کو ''دَینِ ظنون'' کسی طرح قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ وصولیابی کے یقین، دائن کے آزادانہ تصرفات اور عرفِ عام کی رُو سے بالکل اس طرح دائن کی ملکیت اور تقدیری قبضے میں رہتا ہے جیسے اپنے گھر میں رکھا ہوا مال، لہٰذا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ میں "بمنزلة ما فی أیدیکم" کا اطلاق اس سے زیادہ کسی دَین پر نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بینک اکاؤنٹس پر زکوٰۃ کے وجوبِ اداء کے لئے دوسرے دیون کی طرح ان کے نقد ہونے کی شرط لگائی جائے تو اس سے اتنی عملی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی بہت مشکل ہوجائے گی، امام ابوعبیدؒ نے تو عام دیون کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ:-

وانما اختاروا .او من اختار منهم- تزکیة الدین مع عین المال لأن من ترک ذلک حتی یصیر الی القبض لم یکد یقف من زکاة دینه علی حد، ولم یقم بأدائها، وذلک ان الدین ربما اقتضاه ربه متقطعا، کالدراهم

---

(۱) طبع دار المعارف النعمانية.

الخمسة والعشرة واكثر من ذلك واقل، فهو يحتاج في كل درهم يقتضيه فما فوق ذلك الى معرفة ما غاب عنه من السنين والشهور والايام، ثم يخرج من زكاته بحساب ما يصيبه وفي اقل من هذا ما تكون الملالة والتفريط، فلهذا اخذوا له بالاحتياط، فقالوا: يزكيه مع جملة ماله في رأس الحول، وهو عندي وجه الأمر.

(كتاب الأموال ص: ۴۳۴ فقره ۱۲۳۶)[1]

ترجمہ:- جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ دَین کی زکوٰۃ عین مال کے ساتھ ہی ادا کی جائے، انہوں نے اس مسلک کو اس لئے اختیار فرمایا کہ جو شخص دَین کی زکوٰۃ کو قبضہ ملنے تک مؤخر کرے گا وہ اپنے دیون کی زکوٰۃ کو حد کے مطابق معلوم کرکے اس کی صحیح ادائیگی نہ کرسکے گا، اس لئے کہ دَین بعض اوقات قسطوں میں وصول ہوتا ہے، مثلاً کبھی پانچ مل گئے، کبھی دس، کبھی زیادہ، کبھی کم، اب اسے جو درہم بھی حاصل ہوگا اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کتنے سال، کتنے مہینے، کتنے دن اس کے قبضے سے خارج رہا ہے، پھر وہ اسی کے حساب سے زکوٰۃ نکالے گا، اور اس عمل میں مشقت اور کوتاہی کا بڑا امکان ہے، اس لئے ایسے شخص کے لئے علماء نے احتیاط پر عمل فرمایا، اور یہ حکم دے دیا کہ وہ ہر سال اپنے دوسرے مال کے ساتھ دَین کی زکوٰۃ بھی نکال دیا کرے، اور یہی میرے نزدیک صحیح طریقہ ہے۔

عام دیون کے بارے میں یہ دُشواری قابلِ لحاظ ہو یا نہ ہو، لیکن بینک اکاؤنٹس کے بارے میں تو اس قسم کا حساب وکتاب عملی اعتبار سے تقریباً ناممکن ہے، کیونکہ عام طور پر ان اکاؤنٹس سے بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ رقمیں نکالی اور نئی داخل کی جاتی ہیں، اور قبضے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ہر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے اکاؤنٹ کے ہر ہر روپے کے بارے میں یہ ریکارڈ پوری طرح محفوظ رکھے کہ وہ کتنے عرصے بینک میں رہا ہے، تاکہ اس پر واجب ہونے والی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرسکے، اور جب کوئی رقم بینک سے نکالے تو پہلے یہ حساب کرے کہ یہ رقم کتنے سال بینک میں رہی ہے، اور اس پر کتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے، پھر زکوٰۃ ادا کرے، اور اس میں جو عملی تعذر ہے وہ مخفی نہیں۔ اور خود فقہائے حنفیہؒ نے مالِ مستفاد کا الگ سال شمار نہ کرنے پر ایک دلیل

(۱) الجزء الثالث ص: ۴۳۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

یہی عملی تعذر کی پیش کی ہے، چنانچہ امام محمدؒ نے تو مالِ مستفاد پر الگ سال شمار کرنے والوں پر طنز فرماتے ہوئے یہاں تک لکھا ہے کہ:-

ینبغی لصاحب هذا المال ان یقعد حساباً یحسبون زکاة ماله متی تجب؟ ارایتم الرجل اذا کان یفید الیوم الفاً وغدا الفین وبعد غد ثلاثة الاف، وبعد ذلک خمسة الاف وبعد ذلک بعشرین یوما عشرة الاف، أینبغی له ان یزکی کل مال من هذه الاموال علیٰ حدة؟ وهذا قول ضیق لا یوافق ما علیه الناس، ینبغی له ان یجمع ماله کله ثم یزکیه اذا وجبت الزکاة علی ماله الأول. (کتاب الحجة علی اهل المدینة ج:۱ ص:۴۹۱، ۴۹۲)[۱]

ترجمہ:- (ان حضرات کے قول کے مطابق) تو ہر صاحبِ مال کو چاہئے کہ وہ باقاعدہ محاسب اس کام کے لئے بٹھائے کہ وہ اس کی زکوٰۃ کا حساب کیا کریں کہ وہ کب واجب ہوگی؟ ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک شخص کے پاس آج ایک ہزار آتے ہیں، کل دو ہزار، پرسوں تین ہزار، اس کے بعد پانچ ہزار، پھر بیس دن کے بعد دس ہزار، تو کیا وہ ان تمام رقموں کی الگ الگ زکوٰۃ نکالے گا؟ یہ تو بڑا تنگ قول ہے جو لوگوں کے طرزِ عمل کے موافق نہیں، اس کے بجائے اسے چاہئے کہ وہ اپنا سارا مال جمع کرے پھر سارے مال کی زکوٰۃ ایک ساتھ اسی وقت نکالے جب اس کے پہلے مال پر زکوٰۃ واجب ہوئی تھی۔

اور حضرت ابراہیم نخعیؒ "جو فقہ حنفی کا بہت بڑا ماخذ ہیں" ان کا ایک ارشاد امام ابنِ ابی شیبہؒ نے ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے کہ:-

ومن کان له من دین ثقة فلیزکه، وما کان لا یستقر یعطیه الیوم ویأخذ الیٰ یومین فلیزکه. (مصنف ابن ابی شیبةؒ ج:۳ ص:۱۶۲)[۲]

ترجمہ:- جس شخص کا کوئی دَین کسی قابلِ اعتماد شخص پر ہو، اس کو چاہئے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے، اور جو دَین ایک حالت پر نہ رہتا ہو، آج وہ کسی کو دیتا ہو اور دو دن تک واپس لے لیتا ہو اس کی بھی زکوٰۃ نکالے۔

اس کا منشاء بھی غالباً یہی ہے کہ دیون کی جو رقمیں آتی جاتی رہتی ہوں ان کا الگ الگ حساب رکھنا چونکہ متعذر ہے، اس لئے ان سب کی زکوٰۃ ایک ساتھ ہی نکالنی چاہئے، اور اس قسم کے دیون کی

---

(۱) طبع دار المعارف النعمانیة. (۲) طبع نشر السنة ملتان.

جتنی مکمل مثال بینک اکاؤنٹس ہیں اتنی مکمل مثال شاید کوئی اور ممکن نہ ہو۔ لہٰذا ان تمام دلائل کی روشنی میں بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر یہ اعتراض دُرست نہیں رہتا کہ ان کی زکوٰۃ وجوبِ ادا سے پہلے وصول کرلی گئی ہے، بلکہ مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان اکاؤنٹس کا وجوبِ ادا بھی اسی وقت ہوجاتا ہے، جب دوسری رقموں کا سال پورا ہو۔

بینک اکاؤنٹس کے دَین ہونے کی بنیاد پر ان سے زکوٰۃ وضع کرنے پر دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص نے کوئی رقم بینک کو قرض دے دی تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں آگئی، لہٰذا جس رقم سے حکومت زکوٰۃ وصول کررہی ہے وہ بینک کی ملکیت ہے، اور اس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں ہے کہ ایک شخص کی زکوٰۃ دوسرے کے مال سے وصول کی جائے۔

اس اعتراض کے جواب میں عرض یہ ہے کہ جس دَین کی وصولیابی اتنی متیقن ہو جتنی بینک اکاؤنٹس میں متیقن ہوتی ہے، اس سے زکوٰۃ کی وصولیابی کی متعدد نظیریں موجود ہیں کہ اس کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ وصول کی گئی ہے، چند نظائر درج ذیل ہیں:-

۱:- پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم زکوٰۃ کی رقم، دی جانے والی تنخواہوں سے کاٹ لیتے تھے، امام ابوعبیدؒ کی روایت کے یہ الفاظ پیچھے گزرے ہیں کہ:-

فان أخبره أن عنده مالا قد حلت فيه الزكاة قاصه مما يريد أن يعطيه.

(كتاب الاموال ص: ۴۱۱)(۱)

ترجمہ:- اگر تنخواہ لینے والا یہ بتاتا کہ اس کے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے تو حضرت صدیق اکبرؓ جو تنخواہ اسے دینا چاہتے تھے اس میں سے زکوٰۃ کاٹ لیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ تنخواہ کی وصولیابی سے پہلے وہ بیت المال پر دَین ہی تھا، اور چونکہ صاحبِ تنخواہ کا اس پر قبضہ نہیں ہوا تھا، اس لئے ابھی وہ حقیقۃً اس کی ملکیت اور قبضے میں نہیں آیا تھا، لیکن قبضے میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وضع کرنا اس لئے تھا کہ وہ دَین متیقن ہونے کی بناء پر تقدیراً صاحبِ تنخواہ کے قبضے میں آچکا تھا۔ چنانچہ امام محمدؒ نے یہ واقعہ مؤطا میں نقل کرکے اس پر ترجمۃ الباب یہ قائم فرمایا ہے کہ:-

باب الرجل يكون له الدين هل عليه فيه الزكاة؟

---

(۱) كتاب الأموال لأبي عبيدؒ الجزء الثالث ص: ۴۱۶ (دار الكتب العلمية بيروت).

اور پھر یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ:-

کان أبوبکر اذا اعطیٰ الناس اعطیاتھم یسئل الرجل ھل عندک من مال قد وجبت فیہ الزکاۃ؟ فان قال: نعم، أخذ من عطاءہ زکاۃ ذلک المال، وان قال: لا، سلم الیہ عطاءہ.

اور پھر فرمایا ہے:-

قال محمد: وبھذا نأخذ، وھو قول أبی حنیفۃ رحمہ اللہ.
(مؤطا امام محمد ص: ۱۷۰)[1]

اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ کے اس عمل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

وفیہ دلالۃ علی أنھم کانوا یأخذون زکاۃ العطاء لکونہ دینا مستحقا علی بیت المال والا لم یکن لأخذ الزکاۃ منہ معنی. (اعلاء السنن ج: ۱۲ ص: ۴۳۰ کتاب السیر، باب العطاء یموت صاحبہ بعد ما یستوجبہ)[2]

ترجمہ:- ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ تنخواہوں سے زکوٰۃ اس لئے وصول کرتے تھے کہ وہ بیت المال پر دَین ہوتی تھیں (حالانکہ دَینِ اُجرت، دَینِ قرض سے ضعیف ہے) ورنہ ان تنخواہوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

ان تمام روایات وعبارات میں اس بات کی واضح دلیل موجود ہے کہ دَین متیقن کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی اس سے زکوٰۃ وصول کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ متیقن ہونے کی بناء پر تقدیراً مالک کے قبضے میں ہے۔

۲:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں امام ابوعبیدؒ فرماتے ہیں کہ:-

عن نافع عن ابن عمرؓ ان کان یکون عندہ الیتامیٰ فیستسلف اموالھم لیحرزھا من الھلاک، ثم یخرج صدقتھا من اموالھم وھی دین علیہ.
(کتاب الأموال ص: ۴۵۱ فقرہ: ۱۳۰۹[3] مزید ملاحظہ ہو السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ج: ۴ ص: ۱۴۹[4] ومصنف عبدالرزاق ج: ۴ ص: ۷۰ و ۹۸، ۹۹)[5]

---

(۱) المؤطا للامام محمدؒ ص: ۱۷۴ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۲) اعلاء السنن حکم الزکوٰۃ فی العطاء ج: ۱۲ ص: ۵۵۹ (ادارۃ القرآن کراچی).
(۳) ص: ۴۵۶ (دار الکتب العلمیۃ بیروت).
(۴) طبع ادارۃ القرآن کراچی.
(۵) طبع مجلس علمی کراچی.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی سرپرستی میں یتامیٰ ہوتے تھے، تو حضرت ابن عمرؓ ان کے اموال کو اپنے ذمے قرض بنالیتے تھے، تاکہ ان کو ضائع ہونے سے بچائیں، پھران کے اموال سے ان کی زکوٰۃ نکالتے تھے، درآنحالیکہ وہ مال ان کے ذمے دَین ہوتا تھا۔

یہاں یہ مسئلہ تو علیحدہ ہے کہ نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ واقعے میں "یتامیٰ" سے مراد نابالغ یتامیٰ ہیں یا بالغ یتامیٰ؟ لیکن یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان یتامیٰ پر زکوٰۃ فرض سمجھتے تھے، اور ان کے اموال کو خود قرض لے لیتے تھے پھران سے قرض ہونے کی حالت ہی میں زکوٰۃ نکالتے تھے۔ یہ صورت موجودہ بینک اکاؤنٹس کی صورت سے بہت قریب ہے کہ دونوں جگہ رقم کو ودیعت کے بجائے قرض بنانے کا مقصد ان اموال کو مضمون بنانا ہے اور باوجودیکہ وہ رقمیں قرض لینے کے بعد حضرت ابنِ عمرؓ کی ملکیت میں آگئیں، لیکن انہوں نے انہی رقموں سے اصل مالکوں کی زکوٰۃ ادا فرمائی۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دَینِ متیقن کو تقدیراً دائن کے قبضے میں قرار دے کر اس سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کی نیت کا مسئلہ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کی وصولیابی پر تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ بینکوں سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کی صورت میں اصحابِ اموال کی طرف سے نیت متحقق نہیں ہوگی، حالانکہ نیت ادائے زکوٰۃ کے لئے شرط ہے۔

اس سلسلے میں مجلس کی سابقہ تحریر میں عرض کیا گیا تھا کہ جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار حکومت کو ہے، ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور دلیل میں علامہ شامیؒ کی یہ عبارت بھی پیش کی گئی تھی کہ:-

وفی مختصر الکرخیؒ اذا اخذھا الامام کرھًا فوضعھا موضعھا اجزأ، لأن لہ ولایۃ أخذ الصدقات فقام أخذہ مقام دفع المالک، وفی القنیۃ: فیہ اشکال لأن النیۃ فیہ شرط ولم توجد منہ اھ قلت: قول الکرخیؒ فقام أخذہ الخ یصلح للجواب – تامل. (شامی ج:۲ ص:۳۵)[۱]

اس پر بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر فرمایا ہے کہ علامہ شامیؒ نے مذکورہ عبارت کے متصل بعد تحریر فرمایا ہے:-

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (ایچ ایم سعید).

ثم قال فی البحر: والمفتی به التفصیل: ان کان فی الأموال الظاهرة یسقط الفرض لأن للسلطان أو نائبه ولایة أخذها وان لم یضعها لا یبطل أخذه، وان کان فی الباطنة فلا. (۱)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اگر جبراً وصول کرلی جائے تو وہ ادا نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مجلس نے اپنی تحریرِ سابق میں جو الفاظ لکھے تھے کہ "حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے ان میں حکومت کا وصول کرلینا بذاتِ خود نیت کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔" وہ اسی عبارت کے پیشِ نظر لکھے تھے، کیونکہ مذکورہ عبارت میں مدار اس پر ہے کہ سلطان کو "ولایتِ اخذ" حاصل تھی یا نہیں؟ اور بینک اکاؤنٹس سے "ولایتِ اخذ" کے دلائل پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاچکے ہیں، لہٰذا زیرِ بحث مسئلے میں مذکورہ عبارت سے حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت کو ہے ان میں حکومت کی وصولی کا نیت کے قائم مقام ہوجانا ائمہ اربعہ کے نزدیک مُسلّم ہے، اگرچہ ائمہ ثلاثہ نیت کے معاملے میں اتنے سخت ہیں کہ بعض صورتوں میں دلالۃً نیت کو بھی معتبر نہیں مانتے، مثلاً اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بغیر نیتِ زکوٰۃ کے صدقہ کردے تو حنفیہ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ساقط ہوجاتی ہے۔ (عالمگیریہ ج:۱ ص:۱۷) (۲)

لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نیت کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔

(المغنی لابن قدامه ج:۲ ص: ۶۳۹ (۳) والحطاب ج:۲ ص:۳۵۷) (۴)

لیکن حکومت کی وصولیابی کے سلسلے میں ائمہ ثلاثہ بھی اس پر متفق ہیں کہ وہ نیت کے قائم مقام ہوجاتی ہے، چنانچہ فقہ مالکی کی معروف کتاب "مواہب الجلیل" میں ہے:-

اذا أخرج رجل الزکاة بغیر علم من هی علیه وغیر اذنه فی ذلک، فان کان مخرج الزکاة الامام فالزکاة مجزئة.

(مواهب الجلیل للحطاب ج:۲ ص:۳۵۶) (۵)

اور فقہ شافعیؒ کی معروف کتاب "نهایة المحتاج" میں ہے:-

الأصح عند الشافعیة ان نیة السلطان تکفی اذا أخذ زکاة الممتنع.

(نهایة المحتاج ج:۳ ص:۱۳۸) (۶)

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۲۹۰ (ایچ ایم سعید). (۲) طبع مکتبه حقانیه پشاور.
(۳) المغنی لابن قدامه مسئله:۴۲۲ ج:۴ ص:۸۹ (طبع دار عالم الکتب، ریاض).
(۴) طبع دار الفکر. (۵) طبع دار الفکر.
(۶) طبع دار احیاء التراث العربی بیروت.

اور علامہ ابنِ قدامہؒ لکھتے ہیں:-

ولا یجوز اخراج الزکاۃ الا بنیۃ الا أن یأخذھا الامام منه قھرًا.
(المغنی لابن قدامہ ج:۲ ص:۲۳۸)(۱)

پھر یہ ساری تفصیل تو زکوٰۃ کی وصولیابی کے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی میں ہے، اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہی ہو تو اس کے لئے یہ راستہ موجود ہے کہ وہ زکوٰۃ وضع ہونے کے فوراً بعد نیت کر لے، کیونکہ اگر کوئی فضولی کسی کے مال سے زکوٰۃ ادا کر دے تو جب تک مال، فقیر (یا اس کے وکیل) کے قبضے میں ہو، اس وقت تک اصل مالک زکوٰۃ کی نیت کر کے اس کی اجازت دے سکتا ہے، اس کی تصریح فقہائے حنفیہؒ کے کلام میں موجود ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

رجل ادی زکٰوۃ غیرہ عن مالِ ذلک الغیر، فأجازہ المالک، فان کان المال قائما فی ید الفقیر جاز وإلا فلا، کذا فی السراجیة.
(عالمگیریة ج:۱ ص:۱۷۱)(۲)

واللہ سبحانه وتعالٰی أعلم بالصواب!

دستخط

۱:- حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب
دار الافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، کراچی

۲:- حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب
دار الافتاء والارشاد، ناظم آباد، کراچی

۳:- حضرت مولانا مفتی سحبان محمود صاحب
دارالعلوم کراچی

۴:- حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب
مدرسہ اشرفیہ، سکھر

۵:- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
مہتمم دارالعلوم کراچی

۶:- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
دارالعلوم کراچی

۷:- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب
دارالعلوم کراچی

۸:- حضرت مولانا مفتی وجیہ اللہ صاحب
دار العلوم بھاگ، ضلع کچھی، بلوچستان

اہم وضاحتی نوٹ

(از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

نوٹ! بینک ڈپازٹ کو اَموالِ ظاہرہ میں شامل کرنے کی جو گنجائش اس فتوے میں دی گئی ہے، اُس کے بارے میں یہ تصریح مناسب ہے کہ یہ مسئلہ بندہ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی آیا تھا۔ حضرت

(۱) المغنی لابن قدامہ مسئلہ: ۴۲۲ ج:۴ ص:۸۸ (طبع دار عالم الکتب، ریاض).
(۲) طبع مکتبہ حقانیہ پشاور.

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی تحریر تو اس بارے میں بندہ کو نہیں ملی، لیکن زبانی طور پر اُن سے یہ سننا یاد ہے کہ بینکوں کے ڈپازٹس کو اَموالِ ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بارے میں ایک تحریر بھی شائع ہوئی ہے جو انہوں نے ایک سوال نامے کے جواب میں تحریر فرمائی تھی اور ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' اور ماہنامہ ''الصدیق'' ملتان میں شائع ہوئی تھی، اس میں حضرتؒ کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

''حکومت کو اَموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے مطالبے کا حق نہیں (اِلَّا بضرورۃ شدیدۃ) بلکہ وہ صرف اَموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کی حق دار ہے، جیسے مویشیوں کی زکوٰۃ جو سال کے زیادہ حصے میں گھر پر نہیں بلکہ جنگل میں چرتے ہوں اور ان تاجروں کے تجارتی مال کی زکوٰۃ جو ایک شہر سے دُوسرے شہر میں مال لے جاتے ہوں اور باہر سے مال منگاتے ہوں، نیز عشری و خراجی زمینوں کا عشر و خراج بھی اموالِ ظاہرہ سے ہیں، اور جو تاجر اپنے شہر ہی میں تجارت کرتا ہے نہ باہر سے مال منگاتا ہے، نہ بھیجتا ہے اس کا تجارتی مال اموالِ باطنہ میں داخل ہے، اسی طرح جو نقد اور زیور کسی کے گھر میں ہے وہ بھی اموالِ باطنہ سے ہے، البتہ جو روپیہ بینک یا لمیٹڈ کمپنیوں میں ہے اس کو اموالِ ظاہرہ میں داخل کیا جاسکتا ہے۔'' (''ترجمان القرآن'' جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ ص:۳۵۵ و ۳۵۶ جلد:۴۳ عدد:۵)

﴿فصل فی العشر والخراج﴾

(عشر اور خراج سے متعلق مسائل کے بیان میں)

پاکستان کی عشری وخراجی زمینوں کا حکم

سوال:- عشر کس زمین پر واجب ہے؟ سرکار جو خراج لیتی ہے کیا اس زمین پر عشر واجب رہتا ہے اور کتنا ہوتا ہے؟ مزارع اور زمیندار میں سے ہر ایک الگ الگ دے یا ایک پر لازم ہے؟ عشر مدرسہ یا مسجد کو دینا جائز ہے اگر دینا جائز ہو تو ملازمینِ مدرسہ کو دینا اور کتب برائے مدرسہ خریدنا جائز ہے؟ عشر دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

جواب:- پاکستان کی بیشتر اراضی عشری ہیں، جن زمینوں کا خراجی ہونا کسی خاص دلیل سے ثابت نہ ہو ان کو عشری ہی سمجھنا چاہئے، لہٰذا اگر وہ بارانی ہوں یعنی صرف بارش سے سیراب ہوتی ہوں تو ان کی پیداوار میں سے دسواں حصہ اور اگر نہری ہوں یعنی ان کی آبپاشی پر محنت یا خرچ کرنا پڑتا ہو تو بیسواں حصہ بطورِ عشر نکالنا واجب ہے،(۱) اس عشر کا حکم زکوٰۃ کا سا ہے لہٰذا اسے مصارفِ زکوٰۃ ہی میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ حکومت جو ٹیکس وصول کرتی ہے اس سے عشر ادا نہیں ہوتا،(۲) عشر الگ نکالنا ضروری ہے۔

واللہ اعلم — الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ — بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۱/۱۱۹ الف)

عشر ادا کی گئی پیداوار کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہونے کا حکم

سوال:- ایک زمیندار آدمی کے پاس پہلے سے رقم موجود ہے جو حولانِ حول کی بناء پر قابلِ ادائیگیٔ زکوٰۃ ہے، اسی دوران سال میں دوسری فصل کی پیداوارِ زمین فروخت کر کے کچھ رقم حاصل ہوئی جس سے ۱/۱۰ حصہ یا ۱/۲۰ حصہ کی شرح سے عشر بھی ادا کیا گیا ہے، اب صورت یہ ہوئی کہ چار مہینے یا آٹھ

(۱) وفی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۲۵ الی ۳۲۸ (طبع ایچ ایم سعید) یجب العشر فی .... (مسقی سماء) ای مطر و (سیح) ..... ویجب نصفه فی مسقی غرب ای دلو کبیر (ودالیة) ای دولاب لکثرة المؤنة ..... الخ .

(۲) دیکھئے صفحہ نمبر ۶۷ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۲۔

مہینے کے بعد سالِ اوّل کی رقم پر سال پورا ہوکر زکوٰۃ قابلِ ادا ہوگئی مگر دورانِ سال مال سے (یعنی پیداوار سے) جو رقم حاصل ہوئی ہے، اس پر پورا سال نہیں گزرا ہے اور عشر بھی ادا کیا گیا ہے، تو کیا آخر الذکر رقم کو اوّل الذکر رقم کے ساتھ جمع کیا جائے گا جس پر زکوٰۃ فرض ہے یا اس سال میں اس رقم پر زکوٰۃ نہ ہوگی؟ بعض علماء کی رائے ہے کہ ایک چیز پر ایک وقت میں دو وظیفے لاگو نہیں ہوسکتے کہ دورانِ سال عشر بھی ادا کیا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرے، آپ صحیح صورت حال تحریر فرمائیں؟

جواب:- صورت مسئولہ میں زمینی پیداوار کو فروخت کرکے جو رقم سال کے دوران حاصل ہوئی ہے اس کو اصل نقد رقم کے ساتھ ملایا جائے گا اور جب اصل نقد رقم کا سال پورا ہو تو اس کی زکوٰۃ بھی اصل رقم کے ساتھ ادا کی جائے گی، اس سے پہلے جو عشر ادا کیا گیا ہے اس کی بناء پر اس رقم کی زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی، کیونکہ عشر زمین کا وظیفہ ہے، نقد کا نہیں، چنانچہ تمام فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے، علامہ ابنِ ہمام لکھتے ہیں: **واتفقوا علی ضم ثمن طعام ادی عشرہ ثم باعہ وثمن ارض معشورۃ وثمن عبد ادّی صدقۃ فطرہ، اما عندھما فظاھر واما عندہ فلان البدل لیس بدلا لمال الزکوٰۃ لان العشر لا یجب باعتبار الملک.** (فتح القدیر ج:۱ ص:۵۱۱)(۱) **ومثلہ فی البحر**(۲) **وقال الشامی لوادی عشر طعام او ارض او صدقۃ فطر عبد ثم باع حیث تضم اثمانھا اجماعًا.** (شامی ج:۲ ص:۳۲)(۳)۔

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کسی کو دی گئی زمین پر عشر واجب ہوگا یا نہیں؟

سوال:- ایک جگہ پاکستان بننے سے پہلے جنگل تھی۔ حکومتِ برطانیہ نے اس جنگل کی زمین کو چند سو روپیہ مربع پر عوام کے نام الاٹ کردیا تھا اور مالک اس زمین کے، عوام مسلمان ہیں تو اس کی پیداوار پر عشر لازم ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ کافر سے خرید کردہ زمین پر عشر لازم نہیں ہے؟

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۱۲۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۲۲۳ (طبع ایچ ایم سعید)۔
(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۲۸۸ (طبع سعید) نیز دیکھئے احسن الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۶۰۔

جواب:- مذکورہ زمین جس وقت حکومتِ برطانیہ کی طرف سے دی گئی اس وقت وہ بنجر تھی، لہٰذا وہ غیر مملوک ہوئی، اور مسلمانوں نے ہی اس کا احیاء کیا، اس بناء پر اس زمین پر عشر ہی واجب ہوگا۔

لما فی الدر المختار وموات احیاہ ذمی بإذن الإمام او رضخ له کما مر خراجی ولو أحیاہ مسلم اعتبر قربۂ شامی۔[1] کافر سے خریدنے کی صورت میں خراج اس وقت آتا ہے جبکہ کافر نے زمین کو آباد کیا ہو، پھر وہ مسلمان کو بیچ دے، مذکورہ صورت میں چونکہ مسلمانوں نے آباد کیا اس لئے یہ زمین عشری ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۸/۲۲ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱:- ٹیوب ویل سے سیراب کی جانے والی زمین پر نصف عشر واجب ہے
۲:- اخراجات نکالے بغیر عشر دیا جائے گا

سوال ۱:- نہری آبادی پر بیسواں حصہ ادا کرتے ہیں، حالانکہ نہری کی بہ نسبت ٹیوب ویل پر زیادہ خرچ آتا ہے اور ٹیوب ویل پر بھی بیسواں حصہ ادا کرتے ہیں جبکہ خرچہ زیادہ آنے کی وجہ سے عشر اس سے کم ہونا چاہئے۔

۲:- اب کاشت پر کھاد کے زیادہ استعمال کا رواج ہے، اور اس کے بغیر پیداوار حاصل کرنا ناممکن ہے، کھاد کا خرچ فی ایکڑ ۷۰ تا ۸۰ روپے آتا ہے، اسی حساب سے پورے ایکڑ مربع پر خرچ آتا ہے۔ اس پیداوار کا عشر کس حساب سے ادا کیا جائے؟ اور کھاد کے اخراجات نکال کر عشر ادا کرنا دُرست ہے؟

جواب ۱:- ٹیوب ویل سے جو زمین سیراب کی جاتی ہے اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ ہی بطورِ عشر نکالا جائے گا۔ ٹیوب ویل پر جو زیادہ اخراجات ہوتے ہیں ان کی وجہ سے عشر کی شرح اس سے کم نہیں ہوگی۔

۲:- کاشت پر جو اخراجات آتے ہیں انہیں نکال کر عشر کا حساب کرنا غلط ہے، عشر کل پیداوار پر ہوتا ہے، کھاد وغیرہ کے اخراجات عشر سے مستثنیٰ نہیں کئے جاسکتے۔

یجب العشر فی الأوّل ونصفه فی الثانی بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وکری

(۱) رد المحتار کتاب الجهاد باب العشر والخراج والجزیة ج:۴ ص: ۱۸۴ (طبع سعید)

الأنهار واجرة الحافظ ونحو ذلک. د (شامی ج:۲ ص: ۵۱)۔[۱] کھاد پر اگر اخراجات بڑھتے ہیں تو پیداوار بھی بڑھتی ہے، پھر عشر میں کمی کرنے کی فکر نہ ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۴۵/۲۲الف)

پاکستانی زمینوں میں عشری اور خراجی زمینوں کی تعیین اور ان کا حکم

سوال:- واضح فرمائیں کہ عشری اور غیر عشری زمین سے کیا مراد ہے؟

جواب:- عشر کا مسئلہ یہ ہے کہ جو زمینیں پاکستان بننے کے بعد آباد ہوئیں وہ سب عشری ہیں اور جو پہلے سے آباد ہیں ان میں سے صرف وہ خراجی ہیں جو کسی غیر مسلم کے قبضہ میں ہوں یا کسی مسلمان نے انہیں کسی غیر مسلم سے خریدا ہو، اور عشر کا مطلب یہ ہے کہ بارانی زمین ہو تو پیداوار کا دسواں حصہ اور نہری یا چاہی زمین ہو تو بیسواں حصہ ادا کیا جائے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۰/۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۸/۳۰د)

زمین خود کاشت کرنے یا ٹھیکے پر دینے کی صورت میں زکوٰۃ کا حکم

سوال ۱:- اگر زمین خود کاشت کی جائے تو اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کی شرح کیا ہے؟

۲:- اگر زمین ٹھیکہ پر دی گئی ہو اور اس سے سالانہ آمدنی حاصل ہو تو اس پر زکوٰۃ کس شرح سے واجب ہے؟

جواب ۱:- پاکستان کی بیشتر زمینیں عشری ہیں، لہٰذا اگر وہ بارانی ہیں یعنی بارش سے سیراب ہوتی ہیں تو پیداوار کا دسواں حصہ نکالنا واجب ہوگا، اور اگر انسانی ذرائع سے سیراب کی جاتی ہیں تو بیسواں حصہ۔[۲]

۲:- ٹھیکہ کی اُجرت اگر نقد وصول کی گئی ہے تو وہ نقد رقم میں شامل ہوگی اور اس پر نقد ہی کے حساب سے (یعنی چالیسواں حصہ) زکوٰۃ آئے گی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۰/۱۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۸/۲۱الف)

***

---

(۱) رد المحتار باب العشر ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع سعید)

(۲) وفي التنوير مع شرحه باب العشر ج:۲ ص:۳۲۵ إلیٰ ۳۲۸ یجب العشر .... فی مسقی سماء ای مطر وسیح ..... ویجب نصفه فی مسقی غرب ای دلو کبیر ودالیة ای دولاب لکثرة المؤنة ..... الخ.

﴿فصل فی مصارف الزکوٰۃ والعشر وصدقۃ الفطر﴾
(زکوٰۃ، عشر اور صدقۂ فطر کے مصارف کے بیان میں)

مستحقِ زکوٰۃ کون ہے؟

سوال:- میں ایک نہایت غریب آدمی ہوں، پاکستان ٹوبیکو کمپنی میں ایک ادنیٰ ملازم ہوں اور مجھے چار سو پینسٹھ (465) روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، میرے دس بچے ہیں اور دونوں میاں بیوی کو ملا کر اس طرح بارہ آدمیوں کے خاندان کی گزر اوقات کے لئے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ 465 روپے ماہانہ میں کس طرح گزر ہوتی ہوگی، مکان کا کرایہ اور آمدورفت کا خرچ نکال کر کھانے پینے کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کئی ہزار روپے کا مقروض بھی ہوگیا ہوں جس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہے، میرے ایک کرم فرما صاحبِ ثروت شریف آدمی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر مہتمم صاحب دارالعلوم یہ فرمادیں کہ تم زکوٰۃ کے مستحق ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں کیونکہ میرے پاس زکوٰۃ کی رقم موجود ہے، اب میں اس درخواست کے ذریعہ آپ سے اِلتجا کرتا ہوں کہ آپ میری مندرجہ بالا حیثیت اور حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ فرمادیں کہ یہ زکوٰۃ کا مستحق ہے، یہ بھی عرض کردوں کہ میں سیّد نہیں ہوں۔

جواب:- اگر آپ کے پاس اتنا نقد روپیہ یا زیور یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے کہ آپ اگر اس کے ذریعہ اپنا قرض ادا کردیں تو ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت پھر بھی بچی رہے تو آپ مستحقِ زکوٰۃ ہیں، اور آپ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۶/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴/۷ ۳۱ ب)

حقیقی بہن کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- کیا حقیقی بہن کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟

جواب:- حقیقی بہن اگر صاحبِ نصاب نہیں تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ (۲)

واللہ اعلم
۱۴۱۴/۹/۱۸ھ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاۃ (هو فقیر وهو من له أدنی شئی) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة. وفیه ایضًا ج:۲ ص:۳۴۳ (ومدیون لا یملک نصابًا فاضلًا عن دینه).

(۲) حوالہ کے لئے صفحہ نمبر ۱۳۳ اور ۱۵۲ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

برما کے مظلوم مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- برما میں ظالم کافروں کے خلاف مجاہدوں کی جو جماعت ہے اگر اس میں زکوٰۃ لینے والے مستحق افراد بھی شامل ہوں تو زکوٰۃ کی رقم ان مستحقین کو دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی یا نہیں؟

جواب:- ان مستحقینِ زکوٰۃ افراد کو بلاشبہ زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۲/۲۲ ج)

عشر و صدقۃ الفطر امامت کی تنخواہ میں دینے کا حکم

سوال:- والیانِ ریاست کی جانب سے کوئی زمین امامِ مسجد کو دی گئی، وہ وقف ہوگی اس کا عشر اور فطرانہ امامِ مسجد کو دیا جاتا ہے، اور دیگر چھ ماہ امامِ مسجد گاؤں کی امامت بہ شکل ملازمت کر کے عشر اور فطرانہ لیتا ہے، اس پر وہ دُعا کرتا ہے اگر دُعا نہ کرے تو مقتدی ناراض ہوتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ امامِ مسجد کو چرمِ قربانی، عشر، فطرانہ دینا جائز نہیں ہے، شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- عشر یا صدقۃ الفطر کو امامت کی اُجرت میں مقرّر کرنا ہرگز جائز نہیں ہے،(۱) امامت کی تنخواہ الگ مقرّر کرنی چاہئے، پھر اگر تنخواہ پانے کے باوجود امام، صاحبِ نصاب نہ ہو یعنی اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو اسے عشر اور صدقۃ الفطر بھی دیا جاسکتا ہے،(۲) لیکن اس کا امامت سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس کو تنخواہ کا جزء بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۳۶/۲۸ ج)

زکوٰۃ کے واجب ہونے یا مستحقِ زکوٰۃ ہونے کا معیار

سوال:- سیزنل فیکٹریاں جن میں کپاس بیلنے کے کارخانے، رائس ملیں، شوگر ملیں، برف کے کارخانے وغیرہ شامل ہیں، ایسے کارکن جن کو سیزن ختم ہونے پر فارغ کردیا جاتا ہے یعنی بیکار ہوجاتے ہیں ان میں چند ایک جو بند سیزن یعنی کارخانہ بند ہونے کی صورت میں چند ماہ کے لئے کوئی دُوسرا کام تلاش کرلیتے ہیں، باقی بیکار رہتے ہیں اور آئندہ سیزن کا کام شروع ہونے پر تمام کارکن

---

(۱) وفی الھندیۃ کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوی الزکوٰۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستاجرہ إن کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان أیضًا أجزأہ والا فلا.... الخ.

وفیھا ایضًا کتاب الزکوٰۃ ج:۱ ص:۱۷۰ فھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للہ تعالیٰ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکوٰۃ (ھو فقیر وھو من لہ أدنیٰ شئ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجۃ .... الخ.

دوبارہ کام پر آجاتے ہیں، اس طرح مذکورہ کارکنوں کی آمدنی عام آدمی سے نصف، اور غربت دُگنی ہوتی ہے، اس طرح کہ چند ماہ جو لوگ کام کر کے تنخواہ لیتے ہیں، وہ حکومت کے مقرّر کردہ گریڈ کے مطابق تمام الاؤنس وغیرہ شامل کر کے ۲۵۰ روپے ماہوار بنتی ہے اور چالو سیزن کا عرصہ عام طور پر تین چار ماہ ہوتا ہے اس طرح اگر چھ ماہ بھی سیزن چلے تو ایک کارکن کی کل آمدنی ۱۵۰۰ روپے بنتی ہے اور اگر ایک آدھ ماہ کا بونس بھی اس میں شامل کر دیا جائے تو ایک سیزنل ورکر کی تمام سال کی آمدنی ۱۷۵۰ روپے ہے جبکہ یہ حکومت کے یکم رمضان المبارک کو زکوٰۃ کاٹنے کے سلسلے میں اعلان کئے گئے نصاب مبلغ ۲۰۰۰ روپے سے بھی ۲۵۰ روپے کم ہے، پھر کیا ایسے افراد کو اجتماعی طور پر مستحقِ زکوٰۃ قرار دیا جانا جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے واجب ہونے یا مستحقِ زکوٰۃ ہونے کے لئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی شخص کی سالانہ آمدنی کیا ہے؟ بلکہ اگر کوئی شخص ساڑھے باون تولے چاندی یا اسکی قیمت کے زائد از ضرورت سامان کا مالک ہو تو وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہوتا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان سیزنل افراد میں سے جو صاحبان ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کے، ضرورت سے زائد سامان کے مالک ہوں وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں، البتہ جو صاحبان اس معیار پر نہ اُترتے ہوں ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے،[1] زائد از ضرورت سامان میں ٹی وی اور زیورات داخل ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۲/۳/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۳/۳۲ ج)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں اپنے مستحق اعزہ واقارب کو مقدم رکھنا چاہیے

سوال:- (پچھلے سوال میں) مذکورہ کارخانوں کے مالکوں یا انتظامیہ کو اس بات کا پابند کیا جانا جائز ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم مذکورہ بیکار افراد میں تقسیم کریں؟

جواب:- اصل مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا جو حصہ مالکان خود ادا کرتے ہوں اس میں انہیں اختیار ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے جس مصرف میں چاہیں زکوٰۃ کی رقم لگادیں، لیکن ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے عزیز واقارب میں سے ضرورت مند افراد کو مقدم رکھیں، اس کے بعد اپنے پڑوسیوں کو ترجیح دیں،[2] صورتِ مسئولہ میں یہ بے کار افراد اسی اُصول کے تحت عزیز واقارب کے بعد

---

(۱) وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۲۹۵ و۲۹۸ (طبع سعید کراچی) نصاب .... الفضة مائتا درهم .... او فی عرض تجارة قیمته نصاب.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید) مصرف الزکوٰة (هو فقیر وهو من له أدنیٰ شیٔ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین من لا شیٔ له) علی المذهب .... الخ.

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۳۵۳ (طبع سعید کراچی) عن أبی هریرةؓ مرفوعا الی النبی صلی الله علیه وسلم انه قال: یا امة محمد! والذی بعثنی بالحق لا یقبل الله صدقة من رجل وله قرابة محتاجون الی صلته ویصرفها الیٰ غیرهم والذی نفسی بیده! لا ینظر الله الیه یوم القیامة .... وفی القریب جمع بین الصلة والصدقة وفی القهستانی والأفضل اخوته وأخواته ثم أولادهم ثم أعمامه وعماته ثم أخواله وخالاته ثم ذوو أرحامه ثم جیرانه ثم أهل سکنه ثم أهل بلده.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (رشیدیه کوئٹه) والأفضل فی الزکوٰة والفطر والنذور الصرف أولًا الی الاخوة والأخوات ثم الیٰ أولادهم ..... ثم الی الجیران ..... الخ.

زیادہ مقدم ہوں گے بشرطیکہ وہ مستحق رہتے ہوں، لہٰذا فیکٹری کے مالکان کو چاہئے کہ وہ ان کو ترجیح دیں لیکن ان کو بزورِ قانون اس کا پابند نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس علاقے سے جو زکوٰۃ حکومت وصول کرے اس میں بہتر یہی ہے کہ وہ اسی علاقے کے لوگوں پر صرف کرے[۱]، اور ان بیکار افراد کی اس مد سے مدد کرے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۲/۳/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۵۳۱۶/۳۲ ج)

مسجد کے لئے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- مرحوم کی نمازوں کا فدیہ اور زکوٰۃ کی رقم اگر مسجد میں دیدی جائے تو فدیہ اور زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب:- مسجد میں دینے سے زکوٰۃ اور فدیہ ادا نہ ہوگا، کسی فقیر کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۱/۲۸ ج)

زکوٰۃ کی رقم تعمیرِ مسجد اور اساتذہ کی تنخواہوں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال ۱:- ہماری سوسائٹی نے قرآن پاک کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے، جس میں تقریباً ۱۵۰ طلباء وطالبات زیرِ تعلیم ہیں، مدرسہ اور سوسائٹی کی کوئی آمدنی نہیں ہے، سپارے، قرآن پاک مدرسہ کی جانب سے دیئے جاتے ہیں، کیا زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، قربانی کی کھال اور عقیقہ کی کھال کے پیسے کو، مدرسہ کے تعمیراتی کام پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟ ۲:- کیا یہ پیسہ مسجد میں لگایا جاسکتا ہے؟ ۳:- کیا ان پیسوں سے اساتذہ، مؤذّن اور امام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے؟

جواب ۱:- زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرمِ قربانی کی قیمت کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک و مستحق بنا کر دینی ضروری ہے، تعمیرِ مدرسہ میں اس کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔[۳]

۲:- نہیں۔[۴] ۳:- نہیں۔[۵]

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۷/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۳۹/۲۹ ب)

---

(۱) وفی الهندية كتاب الزكوة الباب السابع فی المصارف ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) ويكره نقل الزكوة من بلد الى بلد إلا أن ينقلها الانسان الى قرابته أو الىٰ قوم هم أحوج اليها من أهل بلده وكذا فی الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص: ۳۵۳ (طبع سعيد).

(۲-۴) وفی التنوير مع شرحه ج: ۲ ص: ۳۴۴ (طبع سعيد كراچی) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكاً) لا إباحة .... لا يصرف الى بناء نحو مسجد ..... الخ .

(۵) وفی الهندية كتاب الزكوة، باب المصارف ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو نوى الزكوة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان ايضًا أجزأه وإلا فلا .... الخ . (محمد زبیر حق نواز)

مستحقِ زکوٰۃ کی تفصیل

سوال:- ایک شخص کے پاس دس بیگھے زمین مزروعہ یعنی ۱۵ ایکڑ زمین ہے (جس کو اجارہ پر دیتا ہے، ان سے ضروریات پوری نہیں ہوتیں)۔

۲:- رہائشی گھر، ۳:- ملازمت کی ۲۲۹ روپیہ ماہوار تنخواہ بغیر خورد و نوش کے ہے، اس کی ضروریات میں سے ایک بڑے لڑکے کی شادی کر چکا ہے، دو چھوٹے نابالغ بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا ارادہ ہے، ابھی حفظِ قرآن کر رہے ہیں، اہلیہ فوت ہو چکی ہے، خود شادی کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے، کیا ایسے شخص کو عشر یا زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اور کیا اس کو لینا جائز ہے؟

جواب:- اس میں اُصول یہ ہے کہ اگر شخصِ مذکور کے پاس اس کی ضروریاتِ خورد و نوش ولباس و رہائش سے فاضل اتنی رقم نقد یا ضرورت سے زائد کپڑے، فرنیچر وغیرہ ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے، تو اس کے لئے زکوٰۃ وعشر لینا جائز نہیں، اور اگر اتنی رقم یا ضروریات سے زائد کپڑے، فرنیچر اس قیمت کا نہیں تو اس کے لئے زکوٰۃ وعشر لینا جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ

صدقۂ فطر کی مقدار اور اس کے مستحقین

سوال ۱:- صدقۂ فطر کے مستحقین کون ہیں؟

جواب ۱:- جو لوگ بھی صاحبِ نصاب نہ ہوں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/۲۸ ج)

ایک شخص کو ایک سے زائد فطرہ دینے کا حکم

سوال:- انفرادی حاجت مند کو ایک سے زیادہ فطرہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- دیا جاسکتا ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکٰوۃ والعشر .... (هو فقیر وهو من له أدنیٰ شیء) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة .... الخ۔

(۲) وفی الهندیة کتاب الزکٰوۃ باب صدقة الفطر ج:۱ ص:۱۹۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) ومصرف هذه الصدقة ما هو مصرف الزکٰوۃ.

(۳) وفی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۶۷ (طبع سعید کراچی) وجاز دفع کل شخص فطرته الیٰ مسکین أو مساکین علی المذهب کما جاز دفع صدقة جماعة الیٰ مسکین واحد بلاخلاف.

یتیم خانے میں فطرہ دینے کا حکم

سوال:- یتیم خانے میں منتظمین کے ہاتھ یتیموں کی خاطر کئی فطرہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- اگر یتیم خانے والے یتیموں کو مالک بنا کر دینے یا کھانا کھلانے کا اہتمام کرتے ہوں تو دیا جاسکتا ہے، اور اگر وہ اس کو تعمیر وغیرہ پر صرف کریں تو نہیں۔[1]　واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۴/۲۸ ج)

گھر کی ملازمہ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- میری ملازمہ غریب ہے اور اس کی لڑکی بالغ ہے کیا میں اس کی شادی زکوٰۃ کی رقم سے کرسکتا ہوں؟ اگر کرسکتا ہوں تو کیا کیا چیزیں دے سکتا ہوں؟ اسی طرح ایک غریب بے سہارا عورت میرے ساتھ رہتی ہے، کیا میں اس کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟ گھر کے کام کاج میں بھی برابر کا حصہ لیتی ہے۔

جواب:- اگر آپ کی ملازمہ کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس قیمت کی نقدی یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے، تو وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے، آپ اس کو زکوٰۃ کی رقم مالک وقابض بنا کر دے سکتے ہیں،[2] وہ اپنی لڑکی کی شادی پر بھی اس کو خرچ کرسکتی ہے، نیز اگر لڑکی بھی مذکورہ تفصیل کے مطابق مستحقِ زکوٰۃ ہے تو اس کو بھی زکوٰۃ کی رقم مالک بنا کر دی جاسکتی ہے،[3] یا زکوٰۃ سے اس کے کپڑے بنا کر دیئے جاسکتے ہیں لیکن زکوٰۃ سے اُمراء کی دعوت وغیرہ کرنا جائز نہیں۔[4]　واللہ سبحانہ اعلم

۹/۸/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۸/۲۹ ب)

زکوٰۃ سے یتیم خانے کے لئے کمرہ کرایہ پر لینے کا حکم

سوال:- یتیم خانے کے سرپرست جو رقم دینا چاہتے ہیں وہ زکوٰۃ وصدقہ کی رقم ہے جو یتیم بچوں کی ضروریات میں خرچ ہونے کے لئے دے رہے ہیں، کیا ایسی رقوم سے یتیم خانہ کمرہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف (تملیکاً) لا اباحة، کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میّت، وقضاء دینه .... الخ. وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات .... الخ .

(۲،۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکٰوة (هو فقیر وهو من له ادنیٰ شیء) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة.

(۴) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولا یجوز دفع الزکٰوة الیٰ من یملک نصابًا .... الخ.

جواب:- زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، چرمِ قربانی کی رقوم کسی مستحق کو مالک و قابض بنا کر دینا ضروری ہے، لہٰذا یہ رقوم کسی رفاہِ عامہ کے کام میں خرچ نہیں کی جاسکتیں[۱]، اور ان سے یتیم خانہ کے لئے کوئی کمرہ کرائے پر لینا بھی جائز نہیں۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۹ھ

بیوہ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- کچھ رقم میرے داماد نے بینک سے بھیجی ہے جو کہ زکوٰۃ میں سے دی ہے۔ میری بہن بیوہ ہے، کیا میں ان پر خرچ کرسکتی ہوں؟ بطورِ امداد اور حج میں یہ رقم وہ لگاسکتی ہیں؟ کیونکہ وہ بیوہ ہے کوئی آمدنی اور کوئی جائیداد نہیں ہے۔

۲:- اور کیا یہ رقم تعمیرِ مسجد میں لگائی جاسکتی ہے (زکوٰۃ کا روپیہ ہے) یا کسی خانقاہ میں لگائی جاسکتی ہے یا اسلامی لائبریری میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ ۳:-کسی کا بیٹا اگر جائیداد وغیرہ سب کا مالک ہوجائے یعنی ماں کے نام ہوتے ہوئے ماں کو محروم کردے اور ماں بیوہ ہے اور وہ مجبور ہے تو اس رقم کو وہ اپنے اُوپر لگاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب ۱، ۲:- زکوٰۃ کی رقم صرف ایسے شخص کو دی جاسکتی ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے زائد از ضرورت سامان کا مالک نہ ہو، لہٰذا اگر وہ بیوہ خاتون صاحبِ نصاب نہیں ہیں اور ان کے پاس مذکورہ قیمت کا زیور یا نقد روپیہ یا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو آپ یہ رقم ان کو دے سکتی ہیں، مسجد کی تعمیر یا لائبریری کے قیام میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔[۳]

۳:- اگر وہ بیوہ مذکورہ تفصیل کے مطابق صاحبِ نصاب نہ ہوں تو زکوٰۃ کی رقم لے سکتی ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۲۲/۳۳ د)

مقروض کو زکوٰۃ دینے کی تفصیل

سوال:- ایک عورت بیوہ ہے اس کے بچے ہیں، خود محنت کرتی ہے، اور ایک بچہ نوکری کرتا ہے، اس نے کافی بڑی رقم کچھ عزیزوں سے قرض لے کر مکان خریدا ہے جس میں اب وہ رہتی ہے وہ تھوڑا زیور بھی رکھتی ہے جس کی زکوٰۃ دیتی تھی، کیا اس کو اب بھی زکوٰۃ دینی ہے اگر نہیں تو کیا اس کو بغیر

(۱، ۲، ۳) وفی تنویر الابصار مع شرحہ ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا أباحة .... لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینه. وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات و کری الانهار الخ.

علم میں لائے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- اگر اس پر واجب الاداء قرض اس زیور کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں[1] اور اس کو زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے، اور اگر زیور کی مالیت قرض سے ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سے زائد ہے تو وہ صاحبِ نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہے[2] اور اسے زکوٰۃ بھی نہیں دی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۸/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۷/۲۹ ب)

سادات بنوہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی

سوال:- سیّد خاندان کو زکوٰۃ دینا منع ہے اگر سیّد خاندان کی کوئی خاتون پردہ نشین اور مالی حالت سے پریشان ہے تو اس کی کفالت اور کنبہ پروری پر سیّد اگر اس کی مدد کرے یعنی دونوں سیّد ہیں تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- سادات بنوہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی[3] البتہ ان کو ہدیہ پیش کرنا نہایت موجبِ اجر وثواب ہے، خاص طور پر اگر وہ ضرورت مند ہوں تو ہدایا کے ذریعے ان کی اعانت سب مسلمانوں کو کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۷/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۸۷۵/۲۹ ب)

مستحق کا زکوٰۃ لے کر مسجد کو عطیہ کرنے کا حکم

سوال:- ہمارے محلّہ کی مسجد کمیٹی نے پہلی دفعہ اس ماہ رمضان میں چندہ فطرہ، زکوٰۃ کی رقم مسجد کے لئے اکٹھی کی تھی تاکہ دینی مدرسہ کو ترقی ہو، مگر صدر کمیٹی نے وہ رقمِ فطرہ وزکوٰۃ مسجد فنڈ میں شامل کردی، پہلے یہ رقم ایک طالبِ علم کو دی اس شخص نے وہ رقم مسجد کو بطورِ عطیہ دی، کیا یہ رقم اس طرح منتقل ہوسکتی ہے؟ اور یہ طریقہ جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کسی مستحق کو مالک وقابض بنا کر دینا ضروری ہے، اور

---

(۱) وفی الھندیة کتاب الزکوٰة ج:۱ ص:۱۷۲ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) قال اصحابنا رحمھم اللہ کل دین له مطالب من جھة العباد یمنع وجوب الزکوٰة .... الخ.

(۲) وفی الھدایة کتاب الزکوٰة ج:۱ ص:۱۸۶ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان) ومن کان علیه دین یحیط بماله ....وان کان ماله اکثر من دینه زکی الفاضل اذا بلغ نصابًا.

(۳) وفی الھندیة کتاب الزکوٰة باب المصارف ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولا یدفع الیٰ بنی ھاشم .... الخ،
تفصیلی حوالہ جات صفحہ نمبر ۱۵۹ کے حاشیہ نمبر ۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ رقم مسجد میں یا مدرسہ کی تعمیر میں یا تنخواہوں میں صرف کرنا جائز نہیں[1]، البتہ اگر وہ مستحق شخص اس رقم کو مالک وقابض کی حیثیت سے وصول کرلے اور یہ سمجھ لے کہ یہ رقم اس کی ہوگئی اور اس کے بعد اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ یا لالچ کے وہ رقم مسجد میں اپنی طرف سے دیدے تو اب اس کا استعمال جائز ہے[2]، لہٰذا اگر مذکورہ طالبِ علم کو واقعۃً اس رقم کا مالک بنادیا گیا تھا اور اس نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا اور یہ سمجھ چکا تھا کہ یہ رقم اس کی ہے اور اس کے استعمال میں وہ خود مختار ہے، پھر کسی دباؤ کے بغیر اس نے وہ رقم مسجد میں دیدی تو اب اس رقم کا استعمال مسجد میں جائز ہے ورنہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۷/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵/ ۲۸ الف)

کئی مکانات اور سامان کے مالک کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی

سوال:- الف کے پاس پانچ مکان ہیں اور ضروریاتِ زندگی کے سب سامان کے علاوہ ریڈیو، فریج، ٹی وی بھی موجود ہے پہلے وہ زکوٰۃ بھی دیتا رہا ہے، مگر اب مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے، اور گزر کرائے سے مشکل سے ہوتی ہے، وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے یا اس کے علم میں لائے بغیر اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زیور یا نقد کھانے پینے کی روز مرہ ضروریات سے فاضل موجود نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، لیکن صورتِ مسئولہ میں اس کے لئے زکوٰۃ وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۸/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۶/ ۲۹ ب)

زکوٰۃ وفطرہ رفاہی کاموں اور طلباء کے تعلیمی وظائف میں خرچ کرنا

سوال:- السلام علیکم میں پہلے اپنا تعارف کراتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں یہ ساری

---

(۱) فی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینه. وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر .... وکل ما لا تملیک فیه.

وفی الھندیة کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو نوی الزکٰوۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان أیضا أجزأه والا فلا .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلة التکفین بها التصدق علی فقیر، ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما وکذافی تعمیر المسجد.

معلومات کس لئے چاہتا ہوں؟ میں کوئی عرصہ پانچ سال سے کینیڈا، امریکہ اور اب انگلینڈ برطانیہ سے کچھ پیسہ اکٹھا کر کے انڈیا اور پاکستان کے غریب طلبہ کو دُنیاوی تعلیمی وظائف کے لئے بھیجتا ہوں، الحمدللہ یہ کام اب بہت اچھی طرح چل رہا ہے، کیونکہ اس رقم میں فطرہ، زکوٰۃ، بینک کا سود، صدقہ، خیرات، کفارے کی رقم اور لاٹری کی رقم شامل ہے، اس لئے میں دارالعلوم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر ایک موضوع یعنی فطرہ، زکوٰۃ، بینک کا سود، صدقہ، خیرات، کفارہ اور لاٹری پر یہ فتویٰ صادر کریں کہ مذہب کی روشنی میں یا دینی علوم اور موجودہ حالات کی روشنی میں دارالعلوم کا کیا خیال ہے؟

اُوپر ذکر کی ہوئی بات کو میں تفصیلاً بیان کرتا ہوں فطرہ اور زکوٰۃ کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فطرہ اور زکوٰۃ رفاہی کاموں میں اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال تو ہوسکتا ہے، مگر اس کا اظہار اس پر کرنا ضروری ہے جس کو دیا جارہا ہے، اس سلسلے میں آپ لوگوں کی رائے درکار ہے۔

بینک کے سود اور لاٹری کے سلسلے میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حرام ہیں اور قرآن میں صاف صاف بیان کردیا گیا ہے۔ بینک کا سود ایک صورت ہی میں مل سکتا ہے اور دوسری صورت میں نہیں، یعنی اگر پیسہ سیونگ اکاؤنٹ میں رکھا جائے تو سود مل سکتا ہے او اگر یہی پیسہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھیں تو نہیں ملتا، اس کا کیا حکم ہے؟ سیونگ اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر جو سود مل رہا ہو وہ لے لیں اور رفاہی کام میں استعمال کرلیں تو کیا یہ جائز ہوگا؟ اور ہم کسی گناہ کے مرتکب تو نہیں ہوں گے؟

صدقہ، خیرات اور کفارے کی رقم غریب طلبہ کو وظائف جاری کرنے میں استعمال کرسکتے ہیں؟ ساتھ میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ از رُوئے شرع کفارہ کا کیا حکم ہے؟ نیز یہ کفارہ کینیڈا اور امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں رہنے والا وہاں کے حساب سے کفارہ دے یا انڈیا، پاکستان بھیجنے کی صورت میں انڈیا اور پاکستان کے حساب سے دیا جاسکتا ہے؟ اخیر میں ایک اور سوال دریافت طلب ہے وہ یہ کہ یہاں پر لوگ قربانی کرتے ہیں مگر گوشت کے حصے نہیں کرتے یا وہاں ایسے غرباء نہیں جن میں غرباء کا حصہ تقسیم کیا جائے ان غرباء کے حصے کے سلسلے میں دارالعلوم کیا فتویٰ رکھتا ہے؟

جواب:- پہلے اُصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور کفارہ کی رقم کسی ایسے غریب شخص کو مالک وقابض بناکر دی جانی ضروری ہے، جو صاحبِ نصاب نہ ہو، یعنی اس کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کا نقد روپیہ، زیور یا گھر کا ضرورت سے زائد سامان نہ ہو، لہٰذا جو طلباء ان شرائط پر پورے اُترتے ہوں انہیں تعلیمی وظیفہ اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ رقم ان کو مالک بناکر ان کے حوالے کردی جائے[1] اور پھر وہ اپنے تعلیمی مصارف میں اس کو خرچ کریں یا پھر وہ آپ کے لئے

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا اباحة.

وکالت نامہ تحریر کردیں کہ ہم آپ کو اپنی طرف سے زکوٰۃ کی رقم وصول کرنے اور پھر ہماری طرف سے اس کو ہماری تعلیمی ضروریات پر خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن زکوٰۃ کی مذکورہ رقم کو کسی تعمیر یا اساتذہ کی تنخواہوں یا کسی رفاہی کام پر خرچ کرنا جائز نہیں[۱]، یہ تفصیل تو زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور کفارے کی رقم کے بارے میں ہے۔

جہاں تک بینک کے سود کا تعلق ہے، اس کا لینا دینا قطعاً حرام ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بینک سے سود وصول نہ کریں یا تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوادیں یا سیونگ اکاؤنٹ میں اس تصریح کے ساتھ رکھوائیں کہ ہماری رقم پر سود نہ لگایا جائے، تاہم اگر کسی شخص نے غلطی یا لاعلمی سے بینک سے سود کی رقم وصول کرلی تو اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا ضروری ہے اور اس صدقہ کے بارے میں بھی وہی شرائط ہیں جو اُوپر زکوٰۃ کے بارے میں عرض کی گئیں، یعنی وہ کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے، اسے بھی عام رفاہی کاموں میں نہیں لگایا جاسکتا[۲]، رہی لاٹری! تو وہ شرعاً قمار ہے، اس میں حصہ لینا حرام ہے۔[۳] اور اگر غلطی سے اس کی رقم وصول کرلی ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو سود کا بیان ہوا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۰/۱۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۱/۷ ۳۱ ج)

مسجد کی تعمیر اور اساتذہ کی تنخواہ میں زکوٰۃ نہیں لگ سکتی

سوال ۱:- کیا زکوٰۃ، صدقہ اور فطرہ کا پیسہ مسجد کی تعمیر پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟

۲:- کیا زکوٰۃ، فطرہ اور صدقہ کا پیسہ استادوں کی تنخواہ میں دیا جاسکتا ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم نادار افراد کو مالک وقابض بنا کر دینی ضروری ہے[۴] لہٰذا

---

(۱) فی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحۃ کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینہ. وفی الشامیۃ تحت (قولہ نحو مسجد) کبناء القناطر ..... وکل ما لا تملیک فیہ.

وفی الھندیۃ کتاب الزکٰوۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو نوی الزکٰوۃ بما یدفع المعلم الی الخلیفۃ ولم یستأجرہ ان کان الخلیفۃ بحال لو لم یدفعہ یعلم الصبیان أیضًا أجزأہ والا فلا ..... الخ.

(۲) کسبِ خبیث اور مالِ حرام کے مصرف سے متعلق بعد میں حضرت والا دامت برکاتہم نے مفصل تحقیق فرمائی جو إن شاء اللہ آگے "کتاب الحظر والاباحۃ" میں درج کی جائے گی۔

(۳) اس کی مفصل تحقیق حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب عدالتی فیصلے میں "لاٹری حرام ہے" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ان رقوم کو مسجد یا مدرسے کی تعمیر یا ملازمین واساتذہ کی تنخواہوں پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (۱)

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۵/۲۹ ب)

زکوٰۃ کی رقوم اکٹھی کر کے تعمیرات ومواصلات میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- اگر زکوٰۃ کی رقم کو اکٹھا کر کے حکومت کی تحویل میں دیدیں تو اس کا استعمال کہاں کہاں ہوگا؟ مثلاً فوج، تعمیرات، مواصلات اور دیگر فلاحی کام جو کچھ بھی ترقی پذیر ممالک میں درکار ہوتے ہیں ان میں یہ پیسے خرچ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کا مصرف غرباء اور مساکین ہیں اور یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ ان کو قابض و مالک بنا کر دی جائے، فوج، تعمیرات، مواصلات اور دوسرے ایسے رفاہی کاموں میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں جن میں کسی فردِ واحد کو زکوٰۃ کا مالک نہ بنایا جاتا ہو۔ (۲)

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴/۲۷/ ۲۸ الف)

زکوٰۃ میں دوائیں دی جاسکتی ہیں

سوال:- ہم نے ہفتے میں تین چار دن کا کچھ وقت غریبوں کے علاج کے لئے وقف کیا ہے کچھ دوائیں ہم اپنی طرف سے دیدیتے ہیں باقی مہنگی دوائیں ہم بازار سے لکھ دیتے ہیں جو بازار سے خریدنی پڑتی ہیں جو غریب آدمی کے لئے مشکل ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم وہ دوائیں بھی ان کو زکوٰۃ کے پیسوں سے دیدیں؟ کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کے پیسوں کی دوائیں ہیں؟

جواب:- زکوٰۃ میں دوائیں بھی دی جاسکتی ہیں البتہ شرط یہ ہے کہ جس شخص کو دی جارہی ہیں وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو اور اس کو یہ دوائیں مالک وقابض بنا کر دی جائیں (۳) لیکن اسے یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ (۴)

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۶/ ۲۸ الف)

(۱، ۲) وفی الدر المختار مع رد المحتار کتاب الزکوٰة باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا اباحة کما مر لا یصرف الیٰ بناء نحو مسجد، ولا الیٰ کفن میّت وقضاء دینه، وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر .... وکل ما لا تملیک فیه.

وفی الهندیة کتاب الزکوٰة باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو نوی الزکوٰة بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان أیضًا أجزأه والا فلا .... الخ.

(۳، ۴) اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

اسکول کی عمارت کی تعمیر یا تنخواہ میں زکوٰۃ استعمال کرنا

سوال:- زکوٰۃ کی رقم اسکول کی عمارت کی تعمیر یا دیگر مصارف مثلاً عملہ کی تنخواہوں پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کی رقم فقیر کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے، اسکول کی عمارت کی تعمیر یا عملے کی تنخواہ پر صرف کرنا جائز نہیں۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۰۰/۳۳ ج)

زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں سے مستحق امام مسجد کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال ۱:- امامِ مسجد کو بچوں کو درس قرآن دینے کے عوض قربانی کی کھالیں یا اس کی قیمت دینی جائز ہے یا نہیں؟

۲:- امام کو زکوٰۃ کا پیسہ، فطرہ اور صدقہ کی کھالیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

۳:- ایسی صورت میں جبکہ اس کی گزر اوقات کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں، یا بالفرض ہے تو لیکن اتنا نہیں کہ گزارہ ہوسکے، تو ایسی صورت میں اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- قربانی کی کھالیں کسی کو کسی خدمت کے معاوضہ میں یا تنخواہ میں دینا جائز نہیں۔ (۲)

۲:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر اور صدقے کی کھالوں کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اُجرت یا تنخواہ میں نہیں دی جاسکتیں۔ (۳)

۳:- ایسی صورت میں ان صاحب کے لئے تنخواہ الگ سے مقرّر کرنی چاہئے اس کے باوجود اگر وہ صاحبِ نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں سے بھی ان کی امداد کی جاسکتی ہے لیکن زکوٰۃ، فطرے اور کھالوں کو تنخواہ میں نہیں لگایا جاسکتا۔ (۴)

واللہ سبحانہ اعلم
۲۲/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۶/۲۸ الف)

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..... (۳) وفی الدر المختار مع رد المحتار كتاب الزكوٰة باب المصارف ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعيد) ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا اباحة كما مر لا يصرف الىٰ بناء نحو مسجد، ولا الىٰ كفن ميّت وقضاء دينه، وفي الشامية تحت (قوله نحو مسجد) كبناء القناطر ..... وكل ما لا تمليك فيه . (۴) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع سعيد) وشرط صحة أدائها نية مقارنة له اى للاداء وفي الشامية تحت قوله نية أشار إلى انه لا اعتبار للتسمية فلو سماها هبة أو قرضا تجزيه فى الأصح .... الخ.

(۱-۴) وفي الهندية كتاب الزكوٰة باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو نوى الزكوٰة بما يدفع المعلم الى الخليفة ولم يستأجره ان كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضًا أجزأه والا فلا . نیز دیکھئے گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۴۔ وفي الشامية كتاب الزكوٰة باب المصرف ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع ايج ايم سعيد) مصرف الزكوٰة والعشر .... وهو مصرف ايضًا لصدقة الفطر.

زکوٰۃ سے معلم قرآن کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال:- بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لئے ایک مولوی صاحب مقرّر ہیں محلے کے بچے ایک دو گھنٹہ قرآن پڑھ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، مدرسہ کی جانب سے طعام وقیام کا انتظام نہیں ہے۔ کیا عوام انہیں زکوٰۃ، فطرہ، چرمِ قربانی کی رقم سے تنخواہ دے سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں زکوٰۃ وغیرہ ادا ہوجائیگی؟

جواب:- زکوٰۃ سے مذکورہ معلم صاحب کی تنخواہ شرعاً نہیں دی جاسکتی،[1] ہاں اگر وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو تنخواہ کے علاوہ ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، یعنی تنخواہ الگ مقرّر ہو اور زکوٰۃ اس کے علاوہ دی جائے، یا پھر معلم صاحب کی کوئی تنخواہ مقرّر نہ ہو وہ توجہ سے پڑھائیں پھر جس شخص کو جتنی زکوٰۃ دینے کا موقع ملے انہیں دیدیا کرے لیکن مقررہ نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۹/۳۲ ج)

زکوٰۃ سے امامِ مسجد کو تنخواہ دینا

سوال:- کیا مالِ زکوٰۃ سے امامِ مسجد کو جو بچوں کو قرآن بھی پڑھاتا ہو، تنخواہ دینا جائز ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے مال سے کسی مسجد کے امام یا مدرسہ کے مدرّس کو تنخواہ دینا جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۲۸ الف)

زکوٰۃ سے تبلیغی کتابیں چھپوانے کا حکم

سوال:- کیا مالِ زکوٰۃ سے اسلامی تبلیغی کتابیں چھپوا کر تقسیم کی جاسکتی ہیں جبکہ ان کی قیمت وصول نہ کی جائے؟

جواب:- زکوٰۃ سے تبلیغی کتابیں خریدی جاسکتی ہیں لیکن ایسی کتابیں صرف ان لوگوں کو دی جاسکتی ہیں جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۲۸ الف)

(۱، ۲) دیکھئے گزشتہ صفحہ نمبر ۱۴۳ کے حواشی۔

قومی اتحاد کی تحریک میں زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- موجودہ وقت میں قومی اتحاد کی تحریک کو جہاد کہیں گے یا نہیں؟ اور اس میں زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- دین کی سربلندی کے لئے ہر کوشش اجر وثواب کے لحاظ سے جہاد میں داخل ہے بشرطیکہ وہ خلوصِ نیت سے ہو اور شرعی قواعد کے مطابق ہو، جو لوگ اسی نیت سے شریعت کے اَحکام کی رعایت کرتے ہوئے دین کی سربلندی کے لئے کوشاں ہوں گے انشاء اللہ انہیں جہاد کا ثواب ملے گا، البتہ زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی غیر صاحبِ نصاب شخص کو مالک وقابض بنا کر دی جائے،(۱) محض رفاہی کاموں یا تحریکی فنڈ میں پیسے دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۳/ ۲۸الف)

سال بھر میں تھوڑی تھوڑی کر کے زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے

سوال:- کیا مکمل زکوٰۃ فوری ادا کرنا ضروری ہے یا تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کی جاسکتی ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ زکوٰۃ جتنی جلدی ہوسکے ادا کر دینی چاہئے، اور تھوڑی تھوڑی کر کے سال بھر میں بھی ادا کر دینا جائز ہے۔(۲) واللہ اعلم

۱۴۰۵/۴/۲۸ھ

مستحقِ زکوٰۃ کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے امداد لینے کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ میں نے مکان بنانے کے واسطے قرض لیا تھا، اور مکان گروی کر دیا ہے، چونکہ میری بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا رہی اور اسی میں اس کا انتقال ہوگیا ہے، زیر بار ہوجانے کی وجہ سے قرضہ بمع سود اور صرف قرض بھی ادا کرنے سے قاصر ہوں، سوائے مکان کے، جو قرضہ میں گروی کر دیا ہے کوئی جائیداد یا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، عاجز ہوکر زکوٰۃ فنڈ سے امداد لینا چاہتا ہوں، مہربانی فرما کر فتویٰ مرحمت فرمائیں کہ میں امداد لینے کا مستحق ہوں یا نہیں؟

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ اس کے پاس کوئی سونا چاندی یا بقدرِ نصاب ضرورت سے زائد سامان نہیں ہے، اس لئے وہ زکوٰۃ فنڈ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا مستحق ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۳/۱/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵/ ۳۴الف)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ صفحہ:۱۴۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) حوالہ کے لئے الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۷۱ و ۲۷۲ (طبع سعید) اور فتح القدیر ج:۲ ص:۱۵۵ ملاحظہ فرمائیں۔

ایدھی ٹرسٹ کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- عبدالستار ایدھی ٹرسٹ وغیرہ کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مستحق شخص کو مالک بنا کر دی جائے،(۱) وہ اس پر قبضہ کرلے، اور مالکانہ انداز میں جس طرح چاہے اسے خرچ کرنے کا اختیار اسے حاصل ہو، محض رفاہی کاموں یا شفاخانوں یا مدرسوں کی تعمیر یا عملے کی تنخواہوں وغیرہ پر خرچ نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً مستحقِ زکوٰۃ شخص کو نقد رقم یا کوئی سامان مالک بنا کر دیا جائے، تو زکوٰۃ ادا ہوگی، اور اگر غریبوں کے لئے کوئی ایمبولینس خرید لی یا میّت گاڑی خرید لی تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی،(۲) کیونکہ وہ کسی مستحق کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ اب اگر مذکورہ ادارے زکوٰۃ کو اس طرح صرف کرنے کا اہتمام کریں تو ان کو زکوٰۃ دینا دُرست ہے، لیکن اگر ان کے یہاں زکوٰۃ اور غیرِ زکوٰۃ کا حساب الگ نہ ہو یا زکوٰۃ کو مذکورہ بالا طریقے پر خرچ نہ کریں تو ان کو زکوٰۃ دینا شرعاً جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۱۱/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۱۹/۳۹ ج)

زکوٰۃ ڈسپنسری کی تعمیر، ڈاکٹر اور کمپونڈرز کی تنخواہوں پر نہیں لگ سکتی

سوال:- ہماری سوسائٹی غریبوں، ناداروں، بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کی مختلف قسم کی امدادی خدمات انجام دے رہی ہے، مثلاً بیماری میں امداد، نادار بچوں کی درسی کتابیں، بیواؤں کے لئے سلائی کی مشینیں وغیرہ، لاوارث میّت کے گور وکفن وغیرہ کا انتظام، ان سب اُمور میں زکوٰۃ وفطرہ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ سوسائٹی کا پروگرام ہے کہ ایک رفاہی ڈسپنسری کھولی جائے تا کہ غریبوں کو

(۱،۲) وفی الدرالمختار ج:۲ ص:۳۳۹ مصرف الزکاۃ .... (هو فقیر وهو من له ادنی شیٔ).
وفیه ایضًا ج:۲ ص:۳۴۴ ویشترط ان یکو ن الصرف تملیکا لا اباحة کما مر لا یصرف الی بناء نحو مسجد ولا الی کفن میّت وقضاء دینه .... الخ. و فی الهندية ج:۱ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولا یجوز ان یبنی بالزکوٰة المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیک فیه ولا یجوز ان یکفن بها میّت ولا یقضی بها دین المیّت کذا فی التبیین. وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۲۰۲ ولا یحصل الإیتاء الا بالتملیک فکل قربة خلت عن التملیک لاتجزئ عن الزکوٰة. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۰۱ (مکتبه رشیدیه کوئٹه) هی تملیک المال من فقیر لقوله تعالیٰ: ﴿وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ﴾ والایتاء هو التملیک .... الخ. وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۲۰۷ و۲۰۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ولا یبنی بها مسجد ولا یکفن بها میّت لانعدام التملیک وهو الرکن فان الله تعالیٰ سماها صدقة وحقیقة الصدقة تملیک المال من الفقیر. زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے مستحقِ زکوٰۃ کی تملیک ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک بھی لازم ہے فقہ حنبلی کی کتاب الفروع ج:۲ ص:۶۱۹. فقہ مالکی کی کتاب الشرح الصغیر ج:۱ ص:۶۶۴ والقوانین الفقهية ص:۷۵. فقہ شافعی کی کتاب روضة الطالبین ج:۲ ص:۳۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

سستا علاج مہیا ہو سکے، اس سلسلے میں فطرہ، زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقوم استعمال کی جاسکتی ہیں؟

جواب:- زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقم ڈسپنسری کی تعمیر، کرایہ مکان یا ڈاکٹر، کمپونڈر حضرات کی تنخواہوں پر تو خرچ نہیں کی جاسکتی، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس رقم سے دوائیں خرید کر رکھ لیں، اور یہ دوائیں مستحقینِ زکوٰۃ میں تقسیم کردی جائیں[۱] لیکن واضح رہے کہ زکوٰۃ سے خریدی ہوئی دوائیں صرف مستحقینِ زکوٰۃ پر خرچ کی جاسکیں گی، دوسرے لوگوں پر نہیں، لہٰذا ان کا شعبہ الگ رکھنا ہوگا اور اس شعبے میں دوا کی کوئی قیمت وصول کرنا جائز نہ ہوگا، ہاں! ڈاکٹر کے معائنے کی فیس ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۹/۲۸ ج)

زکوٰۃ، عشر اور قربانی کی کھال کا مستحق

سوال:- ایک بستی میں ایک حافظِ قرآن نے مدرسہ کا کاروبار شروع کیا، اس حافظِ قرآن کی کوئی آمدنی نہیں ہے اور نہ ہی تنخواہ مقرّر ہے۔ بستی والوں سے عشر وصول کرکے اپنی زندگی پر خرچ کرتا ہے، کیا اس حافظ کو یہ عشر لینا جائز ہے یا نہیں؟

۱:- کیا حافظِ قرآن، قربانی کی کھالیں اپنے استعمال میں لاسکتا ہے؟

۲:- فطرہ کا پیسہ مدرسہ کی عمارت، مدرّس کی تنخواہ، یا کنواں بنوانے پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اگر اس حافظِ قرآن کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو اس کے لئے عشر وصول کرنا جائز ہے،[۲] البتہ یہ واضح رہے کہ عشر اس کو بطور تنخواہ نہیں دیا جاسکتا،[۳] بلکہ وہ بچوں کو پڑھانے کی خدمت بلامعاوضہ انجام دے، اور بستی والے عشر کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اس کی امداد کردیا کریں تو درست ہے۔

۲:- قربانی کی کھالوں کا بھی یہی حکم ہے جو اُوپر عشر کا بیان کیا گیا ہے۔

۳:- صدقۃ الفطر کی رقم مدرسہ کی تعمیر، مرمت یا کنویں پر خرچ نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ رقم کسی غیر صاحبِ نصاب کو مالک و قابض بنا کردی جائے۔[۴]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۶/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۵/۲۷ و)

---

(۱) وفی الدرالمختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاۃ...... (هو فقیر وهو من له ادنی شیٔ) وفیه أیضا ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع أیضًا) ویشترط ان یکون الصرف (تملیکا) لا اباحة کما مر لا یصرف الی بناء مسجد وکفن میّت .... الخ (نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ کا حاشیہ)۔

(۲) فی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید کراچی) مصرف الزکاة .... (وهو فقیر و هو من له ادنی شیٔ) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین من لا شیٔ له) علی المذهب.

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے صفحہ نمبر ۱۴۳ کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۴۔

(۴) فی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع أیضًا) و یشترط ان یکو ن الصرف (تملیکاً) لا اباحة کما مر (لا) یصرف (الی بناء) نحو (مسجد) ولا الیٰ (کفن میّت وقضاء دینه). وفی الشامیة تحت (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الأنهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیک فیه.

۱:- سادات اور ملازم کو زکوٰۃ دینے کا حکم
۲:- زکوٰۃ رفاہی تعمیرات میں لگانا ممنوع ہے

سوال ۱:- محتاج سیّد خواہ رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار ہو، مستحقِ زکوٰۃ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اپنا ملازم یا ملازمہ جب ضرورت مند ہوں تو مستحقِ زکوٰۃ ہوسکتے ہیں؟

۳:- اپنے ملازم یا ملازمہ کی اولاد جس کی پرورش کے بعد شادی کردی گئی ہو، کسی طرح گزر اوقات کرلیتی ہے پسماندہ رقم کرنے کی صلاحیت نہیں، ایسی حالت میں زکوٰۃ کے پیسے ان کی نجی مالکانہ رہائش گاہ کے لئے مہیا کئے جاسکتے ہیں؟

۴:- مذکورہ بالا فیملی کو رہائش مہیا کرادینا بذریعہ زکوٰۃ، اور روزہ مرہ کی سہولت کی خاطر کپڑے، پیسے کی شکل میں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

۵:- کیا زکوٰۃ کے پیسے سے تعمیرِ مسجد کے علاوہ ازقسم تعمیرات شفاء خانہ و دیگر عمارات، رفاہِ عامہ کے واسطے سب ممنوع ہیں؟

۶:- کسی شخص (صاحبِ نصاب) کے پس ماندہ یعنی جمع کئے ہوئے پیسے غیر ملک کے بینکوں میں ہوں تو ایک ہی ملک میں مروّجہ زَرِمبادلہ کے مطابق کل واجب الاداء پیسے زکوٰۃ میں دیئے جاسکتے ہیں؟

جواب ۱:- سادات کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے،[1] ہدیہ سے ان کی امداد کیجئے۔

۲:- ملازم کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں بشرطیکہ اُجرت میں نہ لگایا جائے[2] نہ اس کا احسان جتلایا جائے۔

۳:- اگر وہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں تو ان کو زکوٰۃ کے پیسے دے کر ان کی رہائش کا مالکانہ انتظام کرنا دُرست ہے۔

۴:- اگر وہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں تو دے سکتے ہیں۔

۵:- ہر قسم کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم لگانا ممنوع ہے۔[3]

۶:- دے سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۳/۲۸ ج)

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح باب من لا تحل له الصدقة ج:۱ ص:۱۶۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عند عبدالمطلب بن ربیعة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد. رواه مسلم.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۰ (طبع سعید کراچی) ولا إلی بنی هاشم الا من ابطل النص قرابته وهم بنو لهب.

وفی البحرالرائق ج:۲ ص:۲۴۶ (باب المصرف) قوله (وبنی هاشم وموالیهم) أی لا یجوز الدفع لهم.

(۲) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبه رشیدیه کوئٹه) و لو نوی الزکٰوة بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان ایضًا اجزأه والا فلا.

(۳) دیکھئے صفحہ نمبر ۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ۲۔

مقروض کو زکوٰۃ دینے میں تفصیل

سوال:- ناچیز کو ایک چھوٹا سا مسئلہ درپیش ہے جس کی تصدیق وہ آپ سے کرانے کی خواہش رکھتا ہے، اُمید ہے کہ خصوصی توجہ فرمائیں گے۔

مسئلہ:- کیا فرماتے ہیں مفتی حضرات اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو کہ بے حد مقروض ہے، ضعیف العمر ہے، اس کا صرف ایک ہی بڑا بیٹا ہے جو کہ حافظِ قرآن ہے۔

صاحب مقروض صوبہ سرحد کی ایک چھوٹی سی مسجد کے پیشِ امام تھے، اچانک اور بیک وقت چار بیماریوں کے مریض ہوگئے جس میں سب سے بڑی بیماری ٹی بی کی ہے۔

صاحب مقروض امامتی کی حالت میں بھی تنگ دست تھے، اپنی بیماریوں کا علاج اور گھر کا خرچہ اِدھر اُدھر سے قرضہ لے کر کرتے رہے، یہاں تک کہ پونے دو لاکھ روپے کے مقروض ہوگئے۔

یہ گھرانہ دس افراد پر مشتمل ہے، بڑے بیٹے نے قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد درسِ نظامی کا کورس کرنے کا ارادہ کیا تھا، قرضہ معلوم ہونے کی صورت میں اس نے اپنی تعلیم موقوف کردی اور پڑھانے کا ارادہ کیا لیکن یہ ایک جان زیادہ سے زیادہ ماہانہ صرف دو ہزار روپے کما سکے گا، جس سے گھر کا خرچہ وغیرہ چل سکے گا۔ مگر قرضہ ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جس کے لئے گھر کا ہر ایک فرد پریشان ہے، روز بروز قرضہ بڑھتا چلا جارہا ہے۔ کیا ان کا قرضہ ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ یا کسی بھی مد میں رقم دینا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو ازراہِ کرم ایسی تصدیق فرمائیں جس سے صاحبِ خیر حضرات بھرپور تعاون فرمائیں تاکہ یہ گھرانہ قرضے کے بوجھ سے آزاد ہوسکے۔ احقر اس گھرانے سے اچھی طرح واقف ہے اور ساتھ ساتھ ذمہ داری بھی لیتا ہے کہ آپ کی تصدیق پر کسی بھی مد سے ملنے والا ہر ایک پیسہ مقروض تک پہنچا کر رہے گا، اُمید ہے کہ ضرور تصدیق فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ جزیل سے نوازیں، فقط والسلام۔

جواب:- اگر یہ صاحب جو پونے دو لاکھ روپے کے مقروض ہیں ان کے پاس کوئی ذریعہ اور دوسری املاک اتنی نہیں ہیں جس سے یہ قرض ادا ہوسکے تو یہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں، اور انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[۱]

والله سبحانہ اعلم
۱۴۱۸/۸/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۰۳۰)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۳ (ایچ ایم سعید) ومدیون لا یملک نصابًا فاضلًا عن دینه و فی الشامیة تحت (قوله مدیون) ..... فانما جاز الدفع الیه لأنه فقیر یدا.

فیکٹری کے غریب چوکیدار کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک صاحب ہیں جن کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، بمشکل اپنا گزر بسر کرتے ہیں بس سفید پوشی قائم ہے، انتہائی قریبی جاننے والے ان کے حال سے واقف ہیں، یہ صاحب جس فیکٹری میں چوکیدار ہیں فیکٹری والے اس کو کسی کے ساتھ اٹیچ کر کے انہیں سعودی عرب بھیج رہے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی مالی حالت بہتر ہوجانے کی اُمید ہے اور یہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں، کیا کرائے کے لئے ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب واقعی صاحبِ نصاب نہیں ہیں یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے بقدر نقد روپیہ یا زائد از ضرورت سامان نہیں ہے تو ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۵/۲۸ج)

تین تولہ سونے کی مالک عورت کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی دو لڑکیاں ہیں وہ ان کی شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ پوری بالغ ہوچکی ہیں، کوئی سہارا نہیں ہے، والد قرض دار ہے، مارے شرم کے کسی سے ذکر نہیں کرتی ہیں، ان میں سے ایک میرے پاس آئی تھی کہ مجھے زکوٰۃ دی جائے، میں نے معلوم کیا کہ سونا چاندی کتنی ہے؟ اور نقد کتنا ہے؟ اس نے کہا کہ والد کا دیا ہوا کچھ زیور ہے جس کا وزن تین تولہ سونا ہے اور وہ والدہ کے پاس ہے اور والد نے امداد کے طور پر بچیوں کے لئے کپڑے بنوائے ہیں۔ اب معلوم نہیں زکوٰۃ سے بنوائے ہیں یا اپنی ذات سے؟ لڑکی نے کہا کہ میں خرچ میں بہت تنگدست ہوں مجھے زکوٰۃ دی جائے، کیا اس کو یا اس کی والدہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تین تولہ سونا اگر ابھی تک ماں کی ملکیت میں ہے اس نے لڑکیوں کو نہیں دیا تو ماں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی،[2] ہاں اگر لڑکیاں صاحبِ نصاب نہ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، البتہ اگر سونا ماں نے کسی لڑکی کو ہبہ کر کے اس کو اس کا قبضہ دیدیا ہے تو زکوٰۃ اس لڑکی کو نہیں دی جاسکتی لیکن اس صورت میں ماں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۳/۲۸ج)

---

(۱) وفی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکوٰة .... (هو فقیر وهو من له ادنی شیء) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة، ومسکین من لا شیء له .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۷ (طبع أیضًا) ولا الی غنی یملک قدر نصاب فارغ عن حاجته الاصلیة من أی مال کان کمن له نصاب سائمة لا تساوی مائة درهم.

قرضہ معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی

سوال:- زید نے بکر کو مال فروخت کیا جس کی رقم بکر نے بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر اچانک بکر کی حالت خراب ہوگئی، نیز بکر کو عارضۂ قلب ہوگیا جس کی وجہ سے وہ گھریلو اخراجات سے بھی تنگ آگیا، بکر کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کیا زید اس رقم کو جو بکر کے ذمہ ہے زکوٰۃ کھاتے کے نام لکھ کر وصول سمجھ لے تو جائز ہے یا نہیں؟ بکر کا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعۃً بکر صاحبِ نصاب نہیں ہے، یعنی اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان موجود نہیں ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے لیکن اس پر جو رقم واجب الاداء ہے محض اس کو معاف کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ یہ کرنا ہوگا کہ زید، بکر کو اپنے پاس سے کچھ رقم زکوٰۃ کے طور پر مالک و قابض بنا کر دیدے پھر اس کے بعد اگر چاہے تو اس سے اپنا قرضہ وصول کرلے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ج)

کاروبار کی ترقی کے لئے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ہماری برادری کی ایک انجمن ہے جس میں ہم برادری سے زکوٰۃ جمع کرکے مستحق افراد میں تقسیم کردیتے ہیں، برادری کے بعض ایسے افراد ہیں جو اپنے چھوٹے موٹے کاروبار کو بڑھانا چاہتے ہیں، اور یہ لوگ زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ برادری کی جمع شدہ زکوٰۃ کا کچھ حصہ بذریعہ شرعی حیلہ جنرل فنڈ میں تبدیل کرلیں تاکہ مستحق افراد کو قرضے دیئے جاسکیں، اس مقصد کے لئے زکوٰۃ کی رقم کا کیا حیلہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی غیر صاحبِ نصاب شخص کو مالک و قابض بنا کر دی جائے،[2] لہٰذا جن لوگوں کے پاس بقدرِ نصاب مال موجود ہو ان کو محض کاروبار کی ترقی کے لئے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، البتہ برادری کے مستحقِ زکوٰۃ افراد کو زکوٰۃ کی رقم کا مالک اور قابض بنانے کے بعد اگر وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے اس رقم کا کچھ حصہ اس فنڈ میں دیدیں تو اسے قبول کرنا جائز ہے، لیکن ان کو یہ بات اچھی طرح باور کرادی جائے کہ زکوٰۃ کی رقم ان کی ہے اور وہ اسے اپنی مرضی سے

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (ایچ ایم سعید) وحیلة الجواز ان یعطی مدیونه الفقیر زکوٰته ثم یأخذها عن دینه، وفی الشامیة (قوله وحیلة الجواز) أی فیما اذا کان له دین علی معسر واراد ان یجعله زکوٰة عن عین عنده ... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکوٰة (هو فقیر وهو من له ادنی شئ) وفیه أیضًا ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع أیضًا) ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحة.

جہاں چاہیں صرف کرسکتے ہیں[1] محض حیلے کے طور پر انہیں نہ دی جارہی ہو، اس کے بعد وہ خوشی سے دیں تو لے لی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۳/۲۸ ب)

داماد کی لڑکی (جو حقیقی نواسی نہ ہو) کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- سائل اپنے والدین، برادران وہمشیرگان ودیگر عزیزان وجملہ مرحومین کے واسطے صدقہ جاریہ دینا چاہتا ہے۔

۲:- چونکہ سائل بعارضہ اختلاجِ قلب وپیشاب میں دس گیارہ سال سے مبتلا ہے، رمضان شریف کے روزے نہیں رکھ سکا اس کا کفارہ بھی دینا ہے۔

۳:- زکوٰۃ وفطرہ بھی دینا ہے۔

میری دختر کی سوتیلی جوان عمر لڑکی ہے اس کی والدہ بھی نہیں ہے، والد معمولی حیثیت کا ہے اس کی شادی میں رقومِ مذکورہ بالا دی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور مرحومین کو ثواب پہنچتا رہے گا اور زکوٰۃ، فطرہ اور کفارہ بھی ادا ہوجائے گا؟ جواب جلد مرحمت فرمائیں۔

جواب:- اپنی لڑکی کے شوہر کی لڑکی جو حقیقی نواسی نہ ہو، اگر مستحقِ زکوٰۃ ہو تو اس کو زکوٰۃ، فطرہ اور کفارہ وفدیہ کی رقم دی جاسکتی ہے، صدقۂ نافلہ بھی دیا جاسکتا ہے، لأنہ لیس بین السائل وبینھا ولاد ولا زوجیۃ۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۱۴/۲۸ ج)

مقروض کو زکوٰۃ دے کر اپنے قرض میں وصول کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی طرف میرے پانچ سو روپیہ بقایا ہیں اور وہ اوروں کا بھی قرض دار ہے، لیکن وہ اقرار کرتا ہے کہ آپ کے میرے ذمہ پانچ سو بقایا ہیں، مگر مجبور ہوں زکوٰۃ میں وصول کرلئے جائیں تو بہتر ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر اس مقروض شخص کے پاس واقعی ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار روپیہ نہیں

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۵ (طبع سعید کراچی) وقدمنا ان الحیلۃ ان یتصدق علی الفقیر ثم یأمرہ بفعل ھذہ الاشیاء و ھل لہ ان یخالف امرہ؟ لم ارہ، والظاھر نعم. و فی الشامیۃ قولہ الظاھر نعم ...... لانہ مقتضی صحۃ التملیک قال الرحمتی والظاھر انہ لاشبھۃ فیہ لانہ ملکہ ایاہ عن زکوۃ مالہ و شرط علیہ شرطاً فاسداً الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۶ (طبع أیضًا) ولا إلی من بینھما ولاد ولو مملوکًا لفقیر أو بینھما زوجیۃ ولو مبانۃ ....الخ.

ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، لیکن اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ پہلے اس کو زکوٰۃ کے طور پر روپے مالک بنا کر دیدیئے جائیں اور ان کا قبضہ بھی دیدیا جائے اور پھر اس سے اپنا قرض وصول کرلیا جائے،[۱] محض زبانی طور پر قرض سے سبکدوش کردینا کافی نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹/۲۸ ج)

رفاہی کاموں پر زکوٰۃ خرچ کرنے کا حکم

سوال:- ایک رفاہی ادارہ ہے، سب سے اہم خدمت جو ادارہ انجام دے رہا ہے وہ تحصیل و تقسیمِ زکوٰۃ کا کام ہے، ادارہ کے منتظمین شرعی اعتبار سے ان شرطوں کی نشان دہی چاہتے ہیں تاکہ منتظم کمیٹی زکوٰۃ کو صحیح صرف کرسکے اور غلط روی کے عذاب سے محفوظ رہ سکے۔

جواب:- زکوٰۃ کا مستحق وہ شخص ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا سامانِ تجارت یا ضرورت سے زیادہ ساز و سامان موجود نہ ہو، زکوٰۃ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے شخص کو مالک و قابض بنا کر ادا کی جائے۔ عام رفاہی کام مثلاً تعمیرِ مسجد یا شفاخانے کی تعمیر یا ملازمین کی تنخواہ وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ کسی مستحق کو مالک بنانا ضروری ہے۔

یہ تو زکوٰۃ کا ایک حکم ہے، اس کے علاوہ زکوٰۃ کے اور بھی مفصّل اَحکام بہشتی زیور میں یا رسالہ ''اَحکامِ زکوٰۃ'' مؤلفہ حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب، میں اچھی طرح مطالعہ کرلیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ کسی مستند عالم سے باقاعدہ پڑھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۲۶)

زکوٰۃ و فطرہ کی رقوم اپنے گاؤں بھیجنے کا حکم

سوال:- ایک فیڈریشن کے زیرِ اہتمام تمام جملہ سوسائٹیاں اپنے اپنے ارکان سے رمضان میں فطرہ وغیرہ جمع کرتی ہیں اور پھر جمع کرکے ہر ایک سوسائٹی اپنے اپنے طور پر بصورتِ اجتماعی، فطرہ کی تمام رقم اپنے اپنے گاؤں کے غریب، نادار، یتیموں اور بیواؤں وغیرہ کو بھیجنے کا انتظام کرتی ہے اور عید سے پہلے صدقہ کی رقم پہنچ جاتی ہے۔ کیا زکوٰۃ و فطرہ کی رقم گاؤں میں بھیجنا دُرست ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور فطرے کی رقوم اپنے گاؤں میں بھیجنا جائز ہے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (ایچ ایم سعید) وحیلة الجواز أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه.

فی الدر المختار وکرہ نقلها إلا إلی قرابة ..... أو أحوج أو أصلح او أورع أو أنفع للمسلمین الخ وقال الشامیؒ قوله وکرہ نقلها أی من بلد إلی بلد آخر لأن فیه رعایة حق الجوار فکان أولی (زیلعی) والمتبادر منه أن الکراهة تنزیهیة تامل، فلو نقلها جاز لأن المصرف مطلق الفقراء۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۷/۲۸ج)

زکوٰۃ وفطرہ سے سیلاب زدگان اور زلزلہ کے متأثرین کی امداد کا حکم

سوال:- کیا کوئی فلاحی ادارہ جو کہ اپنے ممبران سے زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی وصول کر کے غریب بیوہ، محتاج اور مستحق کی اعانت کرتا ہے کیا وہ اس رقم سے سیلاب و زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں رقم دے سکتا ہے؟ جبکہ مصیبت زدگان میں ہر قوم کے لوگ شامل ہیں، نیز حکومت امدادی فنڈ سے بھی مکانات، نہریں، سڑکیں، ریلوے لائن، پل وغیرہ کی مرمت کراتی ہے۔

جواب:- زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقوم میں یہ ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو مالک[2] بنا کر دی جائیں جو صاحبِ نصاب نہ ہو، اور سیلاب زدگان یا زلزلہ زدگان کے امدادی فنڈ میں جو رقمیں جمع ہوتی ہیں ان میں اس کا اہتمام نہیں ہوتا کہ وہ مستحقین کو مالک بنا کر دی جائیں بلکہ بسا اوقات سیلاب زدگان کے لئے رفاہی کاموں مثلاً سڑکیں بنانے، بند باندھنے وغیرہ میں بھی خرچ ہوتی ہیں لہٰذا زکوٰۃ، فطرہ اور چرمِ قربانی کی رقوم اس فنڈ میں دینا درست نہیں بلکہ اس فنڈ میں الگ سے امداد کرنی چاہئے۔ مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ ایک پائی بھی خرچ نہ کرے بلکہ ایسے کاموں میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدات سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵۴/۲۷ ھ)

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۳۵۳ (ایچ ایم سعید) وفی الهندیة کتاب الزکوٰة الباب السابع فی المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) و یکرہ نقل الزکوٰة من بلد إلی بلد إلا أن ینقلها الإنسان إلی قرابته أو الی قوم هم أحوج الیها من أهل بلدہ .... الخ.

(۲) دیکھئے ص:۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

زکوٰۃ کی رقم مسجد، مدرسہ یا جنازہ گاہ کی تعمیر پر خرچ نہیں کی جاسکتی

سوال:- میرے ایک عزیز کے پاس زکوٰۃ کے کافی روپے موجود ہیں، گاؤں میں جنازہ گاہ تعمیر ہورہی ہے، چاردیواری، فرش اور برآمدہ ہوگا تاکہ دُھوپ اور بارش سے محفوظ رہیں، کیا زکوٰۃ کی رقم اس تعمیر میں لگ سکتی ہے؟

جواب:- زکوٰۃ کی رقم کسی مسجد، مدرسے یا جنازہ گاہ کی تعمیر میں نہیں دی جاسکتی، زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ کسی غیر صاحبِ نصاب مستحقِ زکوٰۃ کو مالک و قابض بنا کر دی جائے جنازہ گاہ کی تعمیر میں زکوٰۃ کے علاوہ چندہ دینا چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷۰/۲۸ ب)

زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغی لٹریچر شائع کرنے کا حکم

خلاصۂ سوال:- ایک تعلیمی تبلیغی ادارہ کو زکوٰۃ وخیرات دینا کیسا ہے، جس کا واحد مقصد تبلیغ کے سلسلے میں نماز، حج، روزہ، وضو، غسل، تیمّم اور دیگر لٹریچر شائع کرنا ہے، اور وہ لٹریچر مفت تقسیم کرتا ہو، کیا معاونین اور غیر معاونین ادارہ اس لٹریچر سے استفادہ کرسکتے ہیں جو صرف مالِ زکوٰۃ وعطیات سے شائع ہورہا ہے؟ یہ لٹریچر دینی مسائل سیکھنے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تو کیا جو لوگ اس سے استفادہ کا حق رکھتے ہیں ان پر واضح کردیا جائے اور جو لوگ استفادہ کا حق نہیں رکھتے ان پر واضح کردیا جائے تاکہ زکوٰۃ کا صحیح مصرف میں استعمال ہوسکے۔

جواب:- زکوٰۃ میں جمہور کے نزدیک کسی غریب کو مالک بنانا شرط ہے، لہٰذا زکوٰۃ کی رقم وصول کرکے اس سے تبلیغی لٹریچر شائع کرنا جائز نہیں۔ تبلیغی کاموں کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عطیات سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ البتہ اگر غلطی سے زکوٰۃ کی رقم سے ایسا لٹریچر شائع کرلیا گیا ہے تو پھر اس کو صرف غریب و نادار (غیر صاحبِ نصاب) افراد پر تقسیم کیا جائے، غیر مستحق افراد کے لئے اس کی کوئی قیمت مقرّر کرلی جائے اور جب قیمت حاصل ہو تو اسے غریب و نادار افراد کو دیدیا جائے، اس کے

---

(۱) دیکھئے ص:۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

زکوٰۃ میں دیئے گئے پلاٹ پر مسجد تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- جمعیت تعلیم القرآن (ٹرسٹ) کو ایک صاحب نے ایک پلاٹ عطیہ دیا اور فرمایا کہ میں اس پلاٹ کے عوض اپنی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہوں، اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ اس رقم سے اندرون سندھ، بلوچستان وغیرہ میں مساجد تعمیر کرائیں، جہاں ضرورت ہو اور ایک مسجد کی لاگت تقریباً پچاس ساٹھ ہزار ہونی چاہئے۔ ہم نے فتویٰ طلب کیا اور اس کی روشنی میں اسے بتایا کہ زکوٰۃ مشروط طور پر نہیں دی جاسکتی، آپ غیر مشروط دیں، لیکن آپ کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا، انہوں نے وہ پلاٹ غیر مشروط طور پر ہماری یقین دہانی پر دیدیا، پلاٹ جمعیت نے فروخت کردیا، پھر اپنی شاخوں سے ایسی مساجد کی درخواستیں طلب کیں جس میں کافی درخواستیں آگئیں، جمعیت میں اکثر آمدنی زکوٰۃ فنڈ سے ہی ہوتی ہے، اس کو کام میں لانے کے لئے آپ سے رجوع کیا گیا تھا، آپ نے جو فیصلہ دیا تھا اس کی کاپی ہمراہ تھی، گویا ہم اس طریقہ سے زکوٰۃ کو متعدد طلباء میں وظیفہ دے کر ان سے فیس وصول کرتے ہیں اور پھر جمعیت کے جملہ کاموں پر وہ پیسہ خرچ ہوتا ہے، کیا اس طرح اس روپے کو جو انہوں نے پلاٹ کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کی ہے اور ہم نے فروخت کردیا ہے، حسبِ معمول طلباء کو وظیفہ دے کر جب ہمارے پاس فیس واپس آئے اس سے ان کی خواہش کے مطابق مساجد بناسکتے ہیں یا نہیں؟

اگر مساجد نہیں تعمیر کرسکتے اور عطیہ کنندگان خواہش کریں کہ آپ میری رقم واپس کردیں کیا ہم واپس دینے کے مجاز ہیں؟

جواب:- عطیہ دہندہ سے رقم وصول کرتے وقت جو بات بھی ہوئی تھی اس کی پابندی ضروری ہے، لہٰذا اپنے طور پر ان کی خواہش کا احترام کرنے کے لئے اگر کوئی بے غبار تملیک کی شکل ہوجائے تو مسجد کی تعمیر کریں، ورنہ ان کو بتائیں کہ تعمیرِ مسجد میں زکوٰۃ نہیں لگ سکتی،[1] لہٰذا آپ چاہیں تو رقم واپس لے لیں اور چاہیں تو مصرفِ زکوٰۃ میں ہم اپنے یہاں خرچ کرلیں۔

والله سبحانہ اعلم
۱۴۱۷/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۲۴)

---

(۱) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعيد كراچي) ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا إباحة كما مر لا يصرف إلى بناء نحو مسجد.... الخ. نیز دیکھئے ص:۱۴۶ کا حاشیہ نمبر ا و ۲۔

زکوٰۃ وفطرہ مدرّسین کی تنخواہ، کرایہ مکان اور بجلی کے بل پر خرچ کرنے کا حکم

سوال:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کو بوقت پیچ نداری مہتمم مدرسہ مدرّسین کی تنخواہوں، مکان کے کرایہ، بجلی کے خرچ، طلبہ کے لحاف وغیرہ مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم کا کسی مستحق کو بلامعاوضہ مالک بنانا ضروری ہے، اس کے بغیر زکوٰۃ یا صدقہ ادا نہیں ہوتا، لہٰذا مدرسہ کی تعمیرات، کرایۂ مکان، بجلی کے خرچ اور مستعار دیئے جانے والے لحافوں اور کتابوں پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ اس میں تملیک کی شرط مفقود ہے، اسی طرح مدرّسین و ملازمین کی تنخواہیں بھی مدِ زکوٰۃ سے نہیں دی جاسکتیں۔[1]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

واللہ سبحانہ واعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲۸/۱۰/۱۳۸۷ھ

زکوٰۃ وفطرہ امامِ مسجد و مدرّس کو بطورِ تنخواہ یا نذرانہ پیش کرنے کا حکم

سوال:- مسجد کے ایک امام صاحب ہیں، محلّہ کے مدرسہ کے مدرّس بھی ہیں، فطرہ کی رقم سے ان کی خدمت میں بطورِ نذرانہ پیش کیا جائے تو کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم امامِ مسجد یا مدرّس کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں ہے،[2] اس کو تنخواہ الگ فنڈ سے دینی چاہئے، ہاں! اگر تنخواہ الگ سے بقدرِ ضرورت مقرّر ہو اس کے باوجود وہ صاحبِ نصاب نہ ہو تو کبھی کبھی اس کی زکوٰۃ یا فطرہ سے امداد کردینے میں مضائقہ نہیں، لیکن زکوٰۃ اور فطرے کی اس رقم کو نہ تنخواہ کا جزء بنایا جائے اور نہ تنخواہ مقرّر کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے کہ اتنی رقم ان کو زکوٰۃ یا فطرے سے بھی ملتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۲۱/۲/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۴/۱۲۸ الف)

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید کراچی) ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة کما مر لا یصرف إلی بناء نحو مسجد .... الخ، وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبه رشیدیه کوئٹه) ولو نوی الزکٰوة بما یدفع المعلم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان ایضًا أجزأه و الا فلا .... الخ.

دینی مدارس کو علی الاطلاق زکوٰۃ دینا جائز ہے یا شرائط کے ساتھ؟

خلاصۂ سوال:- مدارسِ عربیہ میں زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو علی الاطلاق جواز ہے یا مع شرائط کے؟ سنا ہے زکوٰۃ کے مال سے مدرّسین کی تنخواہ، تعمیر وغیرہ کرانا جائز نہیں ہے، لہٰذا مطلع فرمائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم زکوٰۃ بھی ادا کرتے رہیں اور آخرت کا مؤاخذہ بھی باقی رہے؟

جواب:- وہ دینی مدارس جو غریب طلباء کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں، انہیں اس تصریح کے ساتھ زکوٰۃ دینا جائز ہے کہ یہ رقم غریب طلباء کو نقد یا کھانے، کپڑے کی صورت میں دی جائے، مدرّسین و ملازمین کی تنخواہوں، مکانات کی تعمیر وغیرہ میں اسے صرف نہ کیا جائے۔[1] جس مدرسہ کے بارے میں یہ اطمینان ہو تو اسے زکوٰۃ دینے کے بعد آپ عنداللہ بری ہیں، لیکن جس مدرسہ کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس میں مداتِ زکوٰۃ کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ نہیں کیا جاتا، اس کو رقم دینے سے آپ بری نہ ہوں گے، ویسے عام طور سے وقیع دینی مدارس میں زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر ہی صرف کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۹/ ۱۸الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

اولاد کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص کی لڑکی ہے جو شادی شدہ ہے بچوں کی ماں بھی ہے مگر غریب ہے، اگر والدین ان کو زکوٰۃ دیں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- ماں باپ اولاد کو، اور اولاد اپنے ماں باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، اسی طرح شوہر بیوی کو، اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی،[2] اس کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۸/ ۱۸الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۹۰ (مکتبة رشيدية كوئٹه) ولو نوى الزكوٰة بما يدفع المعلم الى الخليفة، ولم يستأجره، إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضاء أجزاه وإلا فلا، وكذا فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۶ ص:۲۱۰، ۲۱۲.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۴۶ (ایچ ایم سعید) ولا الیٰ من بينهما ولاد ولو مملوكًا لفقير أو بينهما زوجية ولو مبانة .... الخ.

۱:- بنی ہاشم پر مالِ زکوٰۃ کی حرمت کیوں؟
۲:- موجودہ زمانے میں ''تألیفِ قلب'' کا مصرف کیا ہے؟
۳:- اجتماعی نظامِ زکوٰۃ قائم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے
۴:- فقیر اور مسکین میں فرق

سوال ۱:- خاندان بنی ہاشم پر مالِ زکوٰۃ کی حرمت کیوں ہے؟

۲:- موجودہ زمانے میں تألیفِ قلب کا مصرف کیا ہوسکتا ہے؟

۳:- کیا نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے علاوہ کسی اور شخص یا ادارے کے ذریعہ بھی ہوسکتی ہے؟

۴:- فقیر اور مسکین میں کیا فرق ہے؟ اور مساکین کا اطلاق سورۂ توبہ آیت نمبر ۶۰ میں کن لوگوں پر ہوتا ہے؟

جواب ۱:- ان کی شرافت اور احترام کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زکوٰۃ لینے سے منع فرمادیا ہے۔[۱]

۲:- اگر کسی غریب حاجت مند مسلمان کی تألیفِ قلب کی ضرورت ہو تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کافر یا صاحبِ نصاب مسلمان کو تألیفِ قلب کے لئے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، تفصیل کے لئے معارف القرآن ج:۴ ص:۴۶ سے ج:۴ ص:۴۰۴ تک ملاحظہ ہو۔

۳:- اجتماعی حیثیت سے صحیح نظامِ زکوٰۃ کے نفاذ کی حد تک تو ذمہ داری حکومت ہی کی ہے،[۲] البتہ ہر شخص یا ادارہ پر اپنے وسائل کی حد تک اس سلسلے میں سعی ضروری ہے۔

---

(۱) وفی المشکاۃ ج:۱ ص:۱۶۱ (طبع قدیمی کتب خانه) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إن هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس، وانها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد (صلی الله علیه وسلم). وفی الطحاوی (الصدقة علی بنی هاشم) ج:۱ ص:۳۵۲ قال أبو جعفر .... فهذه الأثار کلها قد جاءت بتحریم الصدقة علی بنی هاشم، ولا نعلم شیئًا نسخها ولا عارضها.... الخ. وفی الهدایة ج:۱ ص:۲۰۶ (طبع شرکت علمیه ملتان) ولا تدفع الی بنی هاشم لقوله علیه السلام: یا بنی هاشم! ان الله تعالیٰ حرم علیکم غسالة الناس وأوساخهم.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۰ (ایچ ایم سعید) ولا إلی بنی هاشم إلا من ابطل النص قرابته، وهم بنو لهب .... ثم ظاهر المذهب إطلاق المنع، وقال الشامی یعنی سواء فی ذلک کل الأزمان. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۴۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) أطلق الحکم فی بنی هاشم ولم یقیده بزمان ولا بشخص للإشارة إلی رد روایة أبی عصمة .... الخ. وکذا فی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۱ ص:۲۲۴.

(۲) آیت: "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" آیت نمبر ۴۱، سورہ حج پارہ ۱۷ میں اہل اقتدار وسلطنت کے لئے نظامِ زکوٰۃ کو مضبوط کرنے کی ہدایت مذکور ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۶ ص:۲۷۱)۔ (محمد زبیر)

۴:- فقیر اور مسکین کے اصلی معنیٰ میں اگرچہ فرق ہے، ایک کے معنیٰ ہیں، جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنیٰ ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو،[1] لیکن حکمِ زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں، جس شخص کے پاس اس کی ضرورتِ اصلیہ سے زائد بقدرِ نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۷/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۰/۳۹ ہ)

زمین کی پیداوار ہاریوں کو بنیتِ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کا جائز طریقہ

سوال:- زید نے اپنی زمین کاشت پر ہاریوں کے حوالہ کر رکھی ہے، پہلے وہ ہر سال پیداوار کا نصف حصہ دیا کرتے تھے لیکن کئی سالوں سے دینا بند کر دیا ہے، زید اپنی زمین حاصل نہیں کر سکتا اس لئے کہ مقدمہ کرنا اور ساری عدالتی کاروائی کرنے کے بعد بھی بازیابی کی صورت نظر نہیں آتی، کیا زید اس پیداوار کے بقدر ہر سال مال زکوٰۃ سے نیت کر کے منہا کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر مقصد یہ ہے کہ پیداوار کا جتنا حصہ زید کو ملتا، زید یہ نیت کرے کہ اتنی مقدارِ پیداوار میں کاشتکار کو اپنی زکوٰۃ میں دیدی تو یہ طریقہ دُرست نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس کے بجائے یہ کر سکتے ہیں کہ کاشتکار کو کچھ رقم بطور زکوٰۃ دیدیں پھر اس سے اپنا حصہ پیداوار وصول کرلیں، اس غرض کے لئے کاشتکار کو پہلے سے سمجھایا بھی جاسکتا ہے کہ اس طرح کرنے سے تم بھی گناہگار نہیں ہوگے اور ہماری زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی۔

وفی رد المحتار وفی صورتین لا یجوز الأولی أداء الدین عن العین کجعله ما فی ذمة مدیونه زکوٰة لماله الحاضر..... وحیلة الجواز (أی فیما إذا کان له دین علی معسر وأراد أن یجعله زکوٰة عن عین عنده) أن یعطی مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه (شامی بتصرف ج:۲)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۲۹/۲۷ و)

---

(۱) فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ وفی الدر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (ایچ ایم سعید) مصرف الزکاة والعشر .... (هو فقیر وهو من له أدنی شئ) أی دون نصاب، أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة (ومسکین: من لا شئ له) علی المذهب. نیز دیکھئے: فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۱۸۷، ومعارف القرآن ج:۴ ص:۳۹۴، وفتاویٰ دارالعلوم دیو بند ج:۶ ص:۱۹۴.

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۲۷۱ (ایچ ایم سعید). (محمد زبیر حق نواز)

زکوٰۃ کی رقم تعمیرِ مدرسہ پر لگانے کے لئے طلبہ سے تملیک کا صحیح طریقہ

زکوٰۃ کی رقم دیتے وقت زکوٰۃ کا نام لینا ضروری نہیں

سوال ۱:- ہمارے گاؤں میں ابھی ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جس میں بیس طلبہ پڑھتے ہیں، مدرسہ کے مہتمم غریب ہیں جو طلبہ کو پڑھاتے ہیں، چونکہ مدرسہ ابھی زیرِ تعمیر ہے اس لئے مدرسہ کے لئے جو لوگ زکوٰۃ کی رقم دیتے ہیں یہ مہتمم صاحب خود یا دارالعلوم کے طلبہ میں زکوٰۃ کی رقم ایجاب وقبول کراکر دارالعلوم کی تعمیر کی مد میں خرچ کرتے ہیں، تو اس طرح زکوٰۃ کی رقم کا ایجاب وقبول کرنا اور دارالعلوم کی تعمیر پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۲:- زکوٰۃ کی رقم دیتے وقت دینے والے کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے یا بتانا ضروری نہیں، وضاحت فرمائیں؟

جواب ۱:- اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقِ زکوٰۃ طلبہ کو اس طرح دیدی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس رقم کا مکمل مالک ومختار سمجھتے ہیں، اور پھر خود خوش دِلی سے کسی دباؤ کے بغیر وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مدرسے کو چندے کے طور پر دیدیتے ہیں تو اس رقم کو تعمیر کے کام میں خرچ کرنا جائز ہے۔[1]

لیکن اگر محض بناوٹی حیلہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ اپنے آپ کو رقم کا مالک نہیں سمجھتے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رقم بہرحال مدرسے میں دینی ہے، یا دباؤ کے تحت دیتے ہیں تو ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور مہتمم صاحب کو خود تملیک نہ کرنی چاہیے، اِلَّا یہ کہ کوئی زکوٰۃ کی رقم دینے والے نے مہتمم صاحب ہی کو مستحقِ زکوٰۃ سمجھ کر دی ہو تو وہ رقم اگر چاہیں تو مدرسے میں داخل کرسکتے ہیں، مگر جو رقم مدرسے کے نام پر زکوٰۃ میں دی گئی، اس کا مالک خود کو بنا کر مدرسے میں داخل کرنا درست نہیں۔

جواب ۲:- نہیں، بتانا ضروری نہیں، ہدیہ کے نام سے بھی دے سکتے ہیں اور کچھ کہے بغیر بھی دے سکتے ہیں بشرطیکہ نیت زکوٰۃ کی ہو۔[2]

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۵)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وحیلة التکفین بها التصدق علیٰ فقیر ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما، وکذا فی تعمیر المسجد .... الخ. نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: امدادالمفتین ص:۲۶۴ سوال نمبر ۳۲۵.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع مذکور) وشرط صحة أدائها نیة مقارنة له، (ای للأداء) وفی الشامیة (قوله نیة) اشار الیٰ أنه لا اعتبار للتسمیة، فلو سماها هبة أو قرضًا تجزیه فی الأصح. (محمد زبیر حق نواز)

مقروض کو زکوٰۃ دینے کا حکم اور کیا قرض کو زکوٰۃ میں منہا کیا جاسکتا ہے؟

سوال:- راولپنڈی کی مین مارکیٹ میں ایک صاحب سے ہم کاروبار کرتے تھے، لاکھوں کا کاروباری لین دین ہوتا تھا، یہ صاحب جو کافی مال دار اور جائیداد کے مالک تھے، ان پر زوال آگیا سب کچھ ختم ہوگیا، کاروبار تباہ ہوگیا، جائیداد کو فروخت کرکے لوگوں کے قرض ادا کئے گئے، وہ ٹھاٹھ باٹھ گئی، اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ صاحب کسی کے پاس ملازمت کرتے ہیں، بڑی مشکل سے وقت گزار رہے ہیں۔ محترم مفتی صاحب! مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے، ان ہی صاحب نے ہمارا ۶۳۰۰۰ روپیہ دینا ہے اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہمارا قرض جو ان کے ذمہ برقرار ہے ادا کرسکیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم زکوٰۃ کی صورت میں یہ رقم جو ان کے ذمہ ہے منہا کرلیں، آیا ایسی صورتِ حال میں ہماری زکوٰۃ ادا ہوجائے گی اور ان صاحب کا قرض ادا ہوجائے گا، اس طرح دونوں پارٹیوں کا فائد دِکھائی دیتا ہے، آپ کے فتویٰ کا شدّت سے انتظار رہے گا، جس کے لئے دِل سے شکرگزار رہوں گا۔

طلعت محمود (راولپنڈی)

جواب:- برادرِ عزیز و مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگر اُن صاحب کا قرضہ اتنا ہے کہ اگر وہ قرض ادا کریں تو ان کے پاس ½ ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت کا روپیہ، زیور یا ضرورت سے زیادہ سامان نہ بچے گا، تو آپ انہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں،(۱) مگر قرض کو صرف منہا کرنا ٹھیک نہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ انہیں رقم دے دیں، پھر ان سے مطالبہ کرلیں کہ اب آپ کے پاس اتنی رقم آگئی ہے وہ قرض میں ادا کردیجئے۔(۲) اگر خود ایسا نہ کرسکیں تو رقم کسی اور سے دِلوادیں اور قرض خود وصول کرلیں۔ والسلام

واللہ اعلم
۱۴۱۵/۴/۲۰ھ (۳)

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۴۹ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۵۳ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط کی صورت میں دیا۔ (محمد زبیر)

(روزے کے مسائل)

﴿فصل فی رُؤیة الهلال﴾
(چاند دیکھنے سے متعلق مسائل کا بیان)

حسابات کی بنیاد پر قمری مہینوں کا تعین کرنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک ضروری علمی سوال جو آپ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ زید کہتا ہے کہ عرب ممالک میں رؤیتِ ہلال نظری و بصری ضروری قرار نہیں دی جاتی بلکہ علمِ ہیئت و نجوم کی رُو سے جس دن قرانِ شمس وقمر ہوتا ہے یعنی ایک درجہ فلک پر شمس وقمر کا اجتماع ہوتا ہے اسی دن کو بشرطیکہ قران قبل دوپہر ہو، چاند کی پہلی شمار کی جاتی ہے، زید نے اس کی چھان بین کئی بار کی ہے ضروری خیال فرمائیں تو آپ بھی اس کی تحقیق فرمائیں۔

مثلاً آئندہ ماہ یعنی محرم کا چاند انگریزی تاریخ کی ۱۰/۱۱ نومبر قبل دوپہر قرانِ شمس وقمر ہے لہٰذا پہلی ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ شمار ہوگی، حالانکہ رؤیت کا قانون یہ ہے کہ اجتماعِ شمس وقمر کم از کم بیس گھنٹے کے بعد چاند بصورتِ ہلال شفق غربی پر نظر آیا کرتا ہے کیونکہ اس وقت وہ سورج سے دس بارہ درجہ دور آگے نکل جاتا ہے اور تحت الشعاع نہ ہونے کے سبب نظر آجاتا ہے قبل ازیں وہ سورج کے تحت الشعاع ہوتا ہے اور نظر آنا اس کا ممکن نہیں ہوتا، اگر گرہن شمسی کا وقت بھی اجتماعِ شمس کا ہی ہوتا ہے ایسے وقت میں زمین پر سورج کی روشنی بوجہ اس کے کہ سورج کے سامنے چاند آجاتا ہے اہلِ زمین کو نہیں ملتی اور ہم اسے گہنایا ہوا دیکھتے ہیں، علمِ ہیئت میں اس کو نیا چاند کہتے ہیں یعنی اس کے بعد چاند سورج سے آگے نکلنا اور بڑا ہونا شروع ہوجاتا ہے حتیٰ کہ وقتِ گرہن سے کم وبیش ۲۴ گھنٹے بعد ہلال نظر آتا ہے اسی کو رُؤیتِ ہلال کہتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جب عرب ممالک میں رُؤیتِ ہلال کے بجائے نیا چاند بروئے علمِ ہیئت بنیاد قرار پایا تو کیا اس کی شرعاً گنجائش ہے؟

جواب:- سعودی عرب اور مصر کے بارے میں ہم کو تحقیق سے معلوم ہے کہ وہاں حسابات پر مدار نہیں بلکہ ہلال کی رُؤیت پر ہے اور یہی طریقہ شرعاً دُرست ہے، حسابات کی بناء پر قمری مہینوں کا تعین شرعاً دُرست نہیں، اس کی تفصیل مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

کے رسالہ ''رُؤیتِ ہلال'' میں درج ہے، اسے ملاحظہ فرمایا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱۰/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۸۸/۳۰د)

مستند علماء کی ''رُؤیتِ ہلال کمیٹی'' اگر شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرلے تو عوام کو اس پر عمل کرنا لازم ہے

سوال:- کویت میں رُؤیتِ ہلال کا اعلان حکومت کی طرف سے ہوتا ہے، اور اس کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہوئی ہے، دیگر ایام میں تو اس کی کارکردگی سے ہم عوام کو کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا، لیکن رمضان اور شوال کے لئے ان کے اعلان کا انتظار ہوتا ہے، بندہ کو تین رمضان کویت میں گزارنے کا موقع ملا اور بعض احباب کئی سال سے کویت میں ہیں، اپنا تین سالہ تجربہ اور دیگر احباب کا کئی سال کا مشاہدہ یہ ہے کہ کویت میں رمضان المبارک کبھی تیس ایام کا نہیں ہوا، ہر سال اُنتیس کا ہوتا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال یعنی ۱۳۹۵ھ میں صبح کی نماز کے بعد انتیس رمضان المبارک کو مشرق میں چاند دیکھا گیا جو کہ مکانوں کی چھتوں کے اُوپر تھا اور محتاط اندازے کے مطابق چاند کا طلوع آفتاب کے طلوع سے ۱/۴ گھنٹہ پہلے تھا اور ہر ایک کا گمان یہی تھا کہ اس بار تیس روزے پورے ہوجائیں گے اور تقویم میں بھی تیس رمضان کے بعد شوال کے چاند کا غروب سورج سے چھ منٹ بعد تھا لیکن عشاء کی نماز سے کچھ دیر بعد حکومت کی طرف سے اعلان ہوگیا کہ شوال کا چاند ہوگیا ہے اور T.V پر کچھ احباب کی شکلیں بھی دکھائی گئیں کہ ان لوگوں نے چاند دیکھا ہے، مطلع اس دن صاف تھا اور باوجود کوشش کے نہ تو اس دن کسی کو چاند نظر آیا تھا اور نہ ہی اگلے دن نظر آسکا۔

گزشتہ سال رمضان کے آخری ایام میں اعلان ہوا کہ شوال کا چاند کویت کے اُفق پر نظر نہیں آئے گا کیونکہ اس کا غروب سورج کے غروب سے چند منٹ پہلے ہے، یکم شوال کو بھی چاند واضح نہیں ہوگا، اس کے اگلے دن چاند صاف دیکھا جاسکے گا، رمضان المبارک ۲۹ یوم کا ہی ہوا۔

اس سال تقویم میں روزے تو تیس ہی کے ہیں لیکن چاند کا غروب سورج کے غروب سے تین منٹ قبل ہے، یعنی چاند کا شہود پھر بھی نہیں ہوگا اور عین ممکن ہے کہ گزشتہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے ۲۹ رمضان کو ہی شوال کے چاند کا اعلان ہو۔ مندرجہ بالا کوائف کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرعی نقطۂ نظر سے عید کا کیا حکم ہے؟ گزشتہ سے پیوستہ سال یعنی ۱۳۹۵ھ میں کچھ لوگوں نے حکومت کے اعلان پر عید نہیں

کی، ان کا استدلال یہ تھا کہ جب مشرق میں فجر کے وقت چاند اتنا اُونچا تھا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ شام تک سورج، چاند سے آگے نکل جائے، اور جب مطلع صاف ہو تو اس محلّہ میں کسی نہ کسی کو تو نظر آنا ہی چاہئے تھا، اس کے برخلاف اکثر احباب کی رائے تھی کہ عید تو حکومت کے اعلان پر عوام کے ساتھ ہی کرنا چاہئے تھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنانی چاہئے تھی، اس اختلافِ رائے کی وجہ سے ماحول میں کافی تلخی اور کھچاؤ رہا، آپ فرمائیے کیا حکم ہے؟

تنقیح

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اس استفتاء کے ساتھ بھیج دیں تو اس مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- کیا رُویتِ ہلال کمیٹی میں علماء شامل ہیں؟ یا محض انتظامیہ کے افراد ہوتے ہیں؟

۲:- کمیٹی کا طریقۂ کار کیا ہے؟ یعنی وہ شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے یا تقویم کے حساب پر؟

۳:- ۱۳۹۵ھ میں رمضان کا جو اعلان کیا گیا وہ کتنی شہادتوں کی بنیاد پر کیا گیا؟ یا ٹی وی پر کتنے افراد کی شہادت دکھائی گئی؟

۴:- کویت کے عام باشندوں کا فقہی مسلک کیا ہے؟

جوابِ تنقیح از مستفتی

۱:- رُویتِ ہلال کمیٹی پانچ افراد پر مشتمل ہے جن میں ایک عالم ہیں جو کہ مستند قاضی ہیں، کمیٹی کا سربراہ انتظامیہ سے متعلق ہے۔

۲:- کمیٹی کے فیصلہ کی بنیاد شہادتوں پر ہوتی ہے، رمضان کے چاند کے لئے ایک شہادت پر فیصلہ ہوتا ہے اور شوال کے چاند کے لئے دو شہادتوں پر، مطلع ابر آلود ہو یا صاف ہو۔

اگر سعودی عربیہ میں شوال کے چاند کا اعلان ہوجائے تو کویت میں بھی بغیر شہادتوں کے عید کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

۳:- پہلے حصہ کا جواب نمبر۲ میں ہے دوسرے حصے کا جواب اس وقت معلوم نہیں کیا جاسکا۔

۴:- کویت کے عام باشندے مالکی اور حنبلی مسلک پر ہیں۔

جواب:- جب رُویتِ ہلال کمیٹی مستند علماء پر مشتمل ہے اور وہ شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے نہ کہ حسابات کی بنیاد پر، تو پھر عوام کو اس کے فیصلے کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اور زیادہ کنج کاؤ میں پڑکر انتشار پیدا کرنا مناسب نہیں، البتہ جب کمیٹی کے فیصلے میں کوئی شبہ پیش آئے تو مقامی علماء یا کمیٹی

کے علماء سے رُجوع کرنا چاہئے، مثلاً مطلع صاف ہونے کی صورت میں جمِ غفیر کی شہادت ہونی چاہئے تھی[1] اس بات کی طرف کمیٹی کو متوجہ کیا جائے۔ دُور رہنے والے علماء صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں کرسکتے اس لئے مقامی علماء ہی سے رُجوع کیا جائے خواہ وہ حنفی مسلک کے نہ ہوں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۹/۲۸ب)

اَبر کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو کیا حکم

سوال:- برما ملک میں برسات اور ابر کی وجہ سے چاند نظر نہیں آتا، کیا چاروں مہینے تیس تیس دن کے شمار کئے جائیں، برمی حساب میں برمی کی تین تاریخ کو چاند ہونے کا (چاند کی ۲۹ تاریخ کو چاند کا حکم) لگایا جاسکتا ہے جبکہ مطلع صاف نہ ہو۔

جواب:- شریعت نے چاند کا دار و مدار رُؤیت پر رکھا ہے، لقولہ علیہ السلام: صوموا لرُؤیته وأفطروا لرُؤیته فإن غم علیکم فأکملوا العدة ثلاثین۔[2] لہٰذا اگر ابر کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرنے چاہئیں،[3] حسابات کے ذریعہ یا برمی مہینوں کا اندازہ کرکے روزہ رکھنا یا افطار کرنا قطعاً جائز نہیں،[4] اس مسئلے کی مکمل تفصیل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے رسالے ''رُؤیتِ ہلال'' میں موجود ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۶۶/۲۷و)

دو عورتوں کی طرف سے رُؤیتِ ہلال کی شہادت کا حکم

سوال:- ہلالِ رمضان المبارک کچھ مشتبہ ہوگیا، اس کی صراحت فرمادیں کہ شبِ جمعہ کو دو نمازی عورتوں نے چاند دیکھا، اور دوسروں کو بھی دکھایا لیکن دوسرے مطمئن نہیں ہوئے سوائے دو کے،

---

(۱) كذا في رد المحتار كتاب الصوم ج:۲ ص:۳۸۷، ۳۸۸.

(۲) وفي سنن النسائي ص:۳۰۱ (طبع قديمي كتب خانه) كتاب الصوم اكمال شعبان ثلاثين اذا غم، عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته، فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين.
نیز اسی معنیٰ کی حدیث دیکھئے: صحيح بخاري كتاب الصوم ج:۱ ص:۲۵۵، ۲۵۶ (طبع قديمي كتب خانه).

(۳،۴) وفي التاتارخانية كتاب الصوم قبيل الفصل الثالث ج:۲ ص:۳۵۷ (طبع ادارة القرآن كراچی) يجب صوم رمضان برؤية الهلال أو باستكمال شعبان ثلاثين ولا يجوز تقليد المنجم في حسابه لا في الصوم ولا في الإفطار.
وفي البدائع كتاب الصوم ج:۲ ص:۸۰ فان كانت السماء مصحية يعرف برؤية الهلال وان كانت متغيمة يعرف باكمال شعبان ثلاثين يومًا لقول النبي صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فان غم عليكم فاكملوا شعبان ثلاثين يومًا ثم صوموا.

جس پر چند لوگوں نے روزہ رکھا باقی منتظر رہے پھر جمعہ کو ایک معتمد نمازی نے شہادت دی کہ میں نے گھاس کاٹتے ہوئے لبِ سڑک چاند دیکھا تھا، معتمد نمازیوں نے بستی میں آکر تراویح بھی پڑھی اور روزہ بھی رکھا پھر دن میں لوگوں نے پانی میں دیکھا سب کو نظر آیا اب اس کی قضاء ہوگی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مطلع بالکل صاف تھا تب تو صرف دو عورتوں کی شہادت کافی نہیں اور اس سے رمضان ثابت نہیں ہوا، اور اگلے دن میں چاند دیکھنا معتبر نہیں، لیکن اگر مطلع صاف نہیں تھا تو ان دو عورتوں کی خبر سن کر بستی والوں پر روزہ رکھنا ضروری تھا، اور اب جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا وہ اس کی قضا کریں کما فی العالمگیریہ:

إن كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة إذا كان عدلا مسلما عاقلا بالغا حرا كان أو عبدا ذكرا كان أو أنثى (وفيه أيضًا) أما في السواد إذا رأى أحدهم هلال رمضان يشهد في مسجد قريته وعلى الناس أن يصوموا..... إذا لم يكن هناك حاكم يشهد عنده (عالمگيريه).[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۱/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵/۲۸ الف)

پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے طریقۂ کار کے بارے میں چند سوالات کے جوابات

سوال:- پچھلے دنوں مسائلِ جدیدہ پر غور و خوض کے لئے ہمارے صوبہ گجرات (انڈیا) کے مشاہیر اہلِ علم و اربابِ فتویٰ کی ایک میٹنگ زیرِ صدارت حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی مدظلہ (صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) منعقد ہوئی تھی، جس میں منجملہ دیگر اُمور کے رُؤیتِ ہلال کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا، دورانِ بحث پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت معلوم ہونے کے لئے ان اُمور کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس کے افراد کون اور کس قسم کے افراد ہیں؟ شرعی ثبوت فراہم کرنے کا طریقِ کار کیا ہے؟

ریڈیو پر اعلان کس طرح اور کون کرتا ہے؟ وغیرہ تفصیلات کا علم ضروری ہے، اسی کے بعد پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان سے استفادہ کا مسئلہ سوچا جاسکتا ہے۔

لہٰذا جناب والا سے عرض ہے کہ پاکستان کی رُؤیتِ ہلال کمیٹی سے متعلق درج ذیل تفصیلات آپ کے علم میں تو ہوں گی، اور اگر نہ ہوں تو براہِ کرم زحمت گوارا فرما کر معلومات حاصل کر کے مطلع

(۱) فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۱۹۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

فرمائیں، تاکہ ہندوستان میں بھی پاکستان کی رُویتِ ہلال کمیٹی کے اعلان سے استفادہ کا موقع شرعی نقطۂ نظر سے فراہم ہوسکے۔

۱:- پاکستان کی رُویتِ ہلال کمیٹی کن علماء، داعیان اور اُمت کے صالح و متدین افراد پر مشتمل ہے؟ اور کمیٹی کا صدر کون ہے؟

۲:- کیا ثبوتِ ہلال کے تمام شرعی اُصول وضوابط کمیٹی ملحوظ رکھتی ہے؟

۳:- کیا یہ کمیٹی رُویت کا شرعی ثبوت فراہم کرنے کے بعد خود پوری ذمہ داری کے ساتھ ریڈیو پر اعلان کرتی ہے؟

۴:- اعلان کرنے والا کمیٹی کا صدر یا سیکریڑی ہوتا ہے؟

۵:- کیا اس بات سے لوگوں کو پہلے ہی سے مطلع کردیا جاتا ہے کہ اعلان فلاں فلاں صاحب کریں گے؟

۶:- رُویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ میں محکمۂ موسمیات کے حساب وکتاب کو کچھ دخل ہے یا نہیں؟ کیونکہ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں اعلانِ رُویت کا اختیار علمائے کرام سے لے کر محکمۂ موسمیات کے حوالے کردیا گیا تھا، جو شرعاً صحیح نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کے ذمہ دار علمائے کرام نے اس پر اعتراض کیا اور وہاں دوعیدیں ہوئیں، ایک سرکاری اور ایک عوامی، اس کے بعد شاید کچھ اصلاح کی گئی، اب کیا صورتِ حال ہے؟

مصلح الدین
دارالافتاء، اصلاح المسلمین مانڈوی
گجرات، ہندوستان

جواب:-

مکرمی محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ بسلسلۂ رُویتِ ہلال کمیٹی اس سے پہلے بھی احقر کو ملا تھا اور احقر نے اس وقت اس کا مفصل جواب بھی بھیج دیا تھا، افسوس ہے کہ وہ جواب آپ کو نہیں ملا۔

بہرحال! سوالات کے مختصر جوابات دوبارہ عرض کرتا ہوں۔

۱:- پاکستان کی رُویتِ ہلال کمیٹی یہاں کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء پر مشتمل ہے، جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات شامل ہیں، اس کے پہلے چیئرمین حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ تھے، ان کے بعد سے دو بریلوی علماء چیئرمین ہوئے، اب بھی ایک بریلوی عالم اس کے چیئرمین ہیں، اب تک کمیٹی کے تمام فیصلے ارکان کے اتفاق سے ہوتے رہے ہیں۔

۲:- مجھ سے کمیٹی کے چیئرمین نے بیان کیا کہ رُؤیتِ ہلال کمیٹی کا طریقِ کار بنیادی طور پر وہ ہے جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سیّد یوسف بنوریؒ نے منضبط فرمایا تھا، اور یہ طریقِ کار ظاہر ہے کہ شرعی اُصول وضوابط کے مطابق تھا۔

البتہ ایک معاملے میں تھوڑا سا فرق ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ حضرات کے بیان کردہ طریقِ کار میں یہ درج تھا کہ اگر کوئی ذیلی رُؤیتِ ہلال کمیٹی اپنے شہر میں رُؤیت یا اس کی شرعی شہادت کی بناء پر فیصلہ کرے تو ایسی ذیلی کمیٹی کو پورے ملک کے لئے فیصلہ کرنے کی ولایت دے دی جائے اور اعلان اسی کی آواز میں نشر کیا جائے، لیکن اب عمل اس پر ہوتا ہے کہ مرکزی رُؤیتِ ہلال کمیٹی ذیلی کمیٹی کے فیصلے کی خبر ٹیلی فون پر حاصل کرتی ہے اور اس کے فیصلے کا ذکر کرکے خود اعلان کرتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ کمیٹی کے چیئرمین سے کہا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر فیصلے کی خبر لیتے وقت کم از کم یہ احتیاط ضرور کریں کہ یہ خبر استفاضہ کی حد تک پہنچ جائے، اس پر انہوں نے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

۳:- کمیٹی مذکورہ طریقۂ کار کے مطابق ثبوت فراہم ہوجانے پر خود ریڈیو پر اعلان کرتی ہے۔

۴:- یہ اعلان کمیٹی کے چیئرمین کی آواز میں براہِ راست کمیٹی کے مقامِ اجلاس سے نشر کیا جاتا ہے۔

۵:- جی ہاں! یہ بات سب کو معلوم ہے اور اخبارات میں بھی آجاتی ہے کہ اعلان کمیٹی کا چیئرمین کرے گا۔

۶:- کمیٹی کے فیصلے میں موسمیات کے حساب وکتاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا، والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۴۰۳/۸/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۴۷۳ د)

رُؤیتِ ہلال کے سلسلے میں مستند علماء کی طرف سے شرعی شہادت کے مطابق کیئے گئے فیصلے پر عمل کرنا چاہیئے

سوال ۱:- امسال عید الفطر میں پشاور ڈویژن میں بہت سی تحصیلوں میں یکم جنوری ۱۹۶۸ء کو عید الفطر منائی گئی تھی، جبکہ پشاور ڈویژن کے علاوہ پورے مغربی ومشرقی پاکستان میں ۲؍جنوری ۱۹۶۸ء کو عید الفطر منائی گئی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۶۸ء کو دن کے دس بجے تک ہم بمعہ اہل وعیال روزے سے رہے، چونکہ ہمارے گاؤں میں بھی اِسی دن یعنی یکم کو عید الفطر منانے کا فیصلہ ہوا تھا، اس لئے ہم نے بھی اُسی دن عید منائی، باوجودیکہ یہاں پر پشاور، نوشہرہ اور مردان شہروں میں نصف سے زیادہ لوگوں

نے یکم کو عید الفطر نہیں منائی، ہمیں اپنے گاؤں والوں کا ساتھ دینا چاہئے تھا یا شہر والوں کا، جنہوں نے ۲/جنوری کو عید منائی؟

جواب ۱:- آپ کے گاؤں میں اگر کسی مستند عالمِ دین نے چاند کی شہادت لے کر یکم جنوری کو عید منانے کا فیصلہ کیا تھا تو آپ نے یکم جنوری کو عید منا کر صحیح کام کیا، لیکن اگر چاند دیکھنے کی کوئی شرعی شہادت آپ کے گاؤں میں پیش نہیں ہوئی تو محض عام لوگوں کے فیصلہ کر لینے سے عید نہیں ہوتی، آپ کو ایک روزے کی قضا کرنی چاہئے۔

سوال ۲:- اسی طرح عید الاضحیٰ میں بھی صرف چارسدہ تحصیل میں ۹/مارچ کو عید الاضحیٰ منائی گئی، اس حساب سے کہ یہاں پر ۱۹۶۸/۲/۲۸ء کو چاند دیکھنے کی شہادت مل چکی تھی، اس تحصیل کے علاوہ پورے پشاور ڈویژن میں کہیں بھی عید ۱۹۶۸/۳/۹ء کو نہیں منائی گئی، اب بھی ہمارے موضع والوں نے ۱۹۶۸/۳/۹ء کو ہی عید منائی، لہٰذا ہم نے بھی اُن کا ساتھ دیا، اس بناء پر کہ گاؤں والوں کا ساتھ دینا ضروری ہے، یہ ہم نے صحیح کیا یا غلط؟

جواب ۲:- اگر واقعۃً چارسدہ میں رُؤیتِ ہلال کی شہادت کی بنیاد پر ۹/مارچ کو عید الاضحیٰ کا اعلان کیا گیا اور آپ کو اس اعلان کی قابلِ اعتماد اطلاع پہنچ گئی، تو آپ کا ۹/مارچ کو عید کرنا صحیح ہوا۔

آئندہ کے لئے یہ بات یاد رکھیئے کہ رُؤیتِ ہلال ایک خالص دینی معاملہ ہے، اور اس کی شہادت کا شریعت میں خاص ضابطہ ہے، چونکہ عام لوگ اس ضابطے سے واقف نہیں ہیں، اس لئے آپ کے قریب جو مستند علماء ضابطۂ شہادت سے واقف ہوں، ہمیشہ ان سے رُجوع کر کے صحیح صورتِ حال معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۰/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

﴿فصل فی المسائل المتعلقة بالصوم﴾

(روزے سے متعلق مختلف مسائل کا بیان)

سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ روزہ رکھتے تھے یا نہیں؟

سوال ا:- مولانا مودودی صاحب نے تفہیم القرآن حصہ اوّل صفحہ نمبر ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی سفر میں روزہ رکھا اور کبھی سفر میں روزہ نہیں رکھا، کیا یہ تفسیر صحیح ہے؟

۲:- صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگوں میں رہے، کیا صحابہ کرامؓ جنگ کے درمیان روزہ رکھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا مودودی صاحبؒ نے صفحہ نمبر ۱۴۲ پر کہا ہے کہ ''ایسے صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی صحابی روزہ نہیں رکھتا تھا جنگ کے دوران میں'' کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- یہ دُرست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں کبھی روزہ رکھا ہے اور کبھی افطار کیا ہے،(۱) اور مسافر کے لئے دونوں طریقے جائز ہیں،(۲) اور اگر غیر معمولی مشقت کا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے(۳) لقوله تعالیٰ "وأن تصوموا خير لكم"۔(۴)

صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی یہ درست ہے کہ سفر کی حالت میں بعض صحابہؓ روزے سے ہوتے اور بعض افطار فرماتے تھے۔(۵)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۳۹/ ۲۷و)

---

(۱) وفی الصحیح للامام مسلمؒ باب جواز الصوم والفطر فی شهر رمضان للمسافر ج:۱ ص:۳۵۶ (طبع قدیمی کتب خانه) عن ابن عباسؓ قال: سافر رسول الله صلی الله علیه وسلم فی رمضان فصام حتی بلغ عسفان ثم دعا باناء فیه شراب فشربه نهارًا لیراه الناس ثم افطر حتی دخل مكة. قال ابن عباسؓ: فصام رسول الله صلی الله علیه وسلم وافطر من شاء صام ومن شاء افطر. وفی مجمع الزوائد للهیثمیؒ ج:۳ ص:۱۵۸، ۱۵۹ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم كان یصوم فی السفر ویفطر ....الخ (قال الهیثمی) رواه احمد وابویعلیٰ والبزار بنحوه ورجال احمد رجال الصحیح.

(۲، ۳) مذکورہ حدیث کے علاوہ مزید حوالہ جات اگلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۴) سورة البقرة :۱۸۴.

(۵) وفی جامع الترمذی ج:۱ ص:۸۹ (طبع فاروقی کتب خانه) عن ابی سعیدؓ قال: كنا نسافر مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی شهر رمضان فما یعاب علی الصائم صومه، ولا علی المفطر فطره .... الخ . وجاء فی حدیث باب ما جاء فی كراهیة الصوم فی السفر ج:۱ ص:۸۹ (قبل الحدیث السابق) فأفطر بعضهم وصام بعضهم.

سفر میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی سفر میں ہے یا بیمار ہے کیا وہ شخص روزہ چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سفر میں روزہ چھوڑنا جائز ہے لیکن اگر غیر معمولی مشقت کا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ (۱)

بیماری میں روزہ چھوڑنے کے لئے شرط یہ ہے کہ کوئی ماہر اور دیانت دار معالج یہ کہے کہ اس حالت میں روزہ رکھنے سے تکلیف کے بڑھ جانے یا دراز ہونے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑ سکتے ہیں۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۰۱/۳۰ ج)

عمداً کئی سال تک روزے نہ رکھنے کی صورت میں تمام عرصے کی قضاء لازم ہے

سوال:- میری خالہ جن کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی پہلے خرابیٔ صحت کی وجہ سے رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتی تھی، یہاں تک کہ انہیں روزوں کی پابندی سے بچنے کی عادت سی ہوگئی اب تقریباً ۴۰ سال سے انہوں نے یہ فرض ادا نہیں کیا اور نہ ہی اس کا کوئی کفارہ ادا کیا کیونکہ توفیق نہیں تھی پھر جب توفیق ہوئی تو اس کا خیال نہیں آیا۔ اب انہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہے اور کفارہ ادا کرنا چاہتی ہیں، تو کس حساب سے ادا کریں تاکہ خدا کے عذاب سے بچ سکیں۔

جواب:- آپ کی خالہ صاحبہ کو چاہئے کہ وہ اوّل تو چھوڑے ہوئے روزوں کو ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر اپنے وصیت نامے میں لکھ دیں کہ میرے اتنے روزے چھوٹے ہوئے ہیں اگر میں ان کو ادا

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۱۷۷ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشةؓ قالت: إن حمزة بن عمرو الاسلمی قال للنبی صلی اللہ علیہ وسلم أصوم فی السفر؟ وکان کثیر الصیام فقال: إن شئت فصم وإن شئت فافطر. متفق علیه. وکذا فی جامع الترمذی ج:۱ ص:۱۵۲. نیز تفصیل کیلئے دیکھئے: عمدة القاری باب الصوم فی السفر والإفطار ج:۱۱ ص:۴۳. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۱-۴۲۳ لمسافر سفرا شرعیًا ولو بمعصیة .... الفطر ....ویندب لمسافر الصوم لأیة: "وأن تصوموا خیر لکم" و الخیر بمعنی البر، لا أفعل تفضیل إن لم یضره فإن شق علیه ....فالفطر أفضل. وفی الشامیة قوله: إن لم یضره، أی بما لیس فیه خوف هلاک وإلا وجب الفطر .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۲ .... فصل فی العوارض المبیحة لعدم الصوم ....أو مریض خاف الزیادة لمرضه وصحیح خاف المرض .... الخ. وفی الهندیة ج:۱ ص:۲۰۷ وإن خاف زیادة العلة وامتداده فکذلک عندنا ....الخ.

کئے بغیر مرجاؤں تو ان کا فدیہ ادا کر دیا جائے[1]، اس کے بعد ان پر فرض ہے کہ وہ چھوٹے ہوئے روزوں کی قضاء کرنا شروع کریں اور جتنے روزوں کی قضاء کر سکتی ہوں کرلیں[2]، اور جتنے روزے رکھتی رہیں ان کا حساب بھی وصیت نامے میں درج کرتی رہیں، اور جب عمر کی زیادتی اور ضعف و بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنا ان کے لئے ممکن نہ رہے تو جتنے روزے اس وقت باقی ہوں ان کا فدیہ خود اپنی زندگی میں ادا کردیں[3]، اور فدیہ اس حساب سے ادا کریں کہ ہر ایک روزے کے بدلے ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک گندم کسی فقیر کو دیدیں یا اس کی قیمت ادا کردیں[4]، پھر اگر قوت آجائے تو دوبارہ قضاء روزے رکھنے شروع کردیں۔

واضح رہے کہ فدیہ کی ادائیگی صرف اس وقت کافی ہوگی جبکہ روزہ رکھنے کی طاقت بالکل نہ رہے، ورنہ خود روزہ رکھنا ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۴/۲۸ ج)

روزہ اور ظہار کے کفارہ کی تفصیل

سوال ۱:- قرآن مجید کے مطابق کفارہ کی ادائیگی بہ شکل کھانا کھلانا ۶۰ مساکین کو، کیا کھانے کا معیار صاحبِ کفارہ کے نجی اوسط معیار کا ہونا ہے؟

۲:- دارالعلوم کورنگی کے طلباء میں ۶۰ طلباء کو ایک وقت اس قسم کے کھانے کے اگر وہ مستحق ہیں ان کو کھلا دیا جائے تو کفارہ ادا ہوگا یا نہیں؟

۳:- کفارہ کے کھانے کے سلسلے میں ۶۰ مسکین کی جو تعیین قرآن مجید سے ہے ان کے علاوہ پندرہ بیس اشخاص تعداد میں (دوسری نیت سے مثلاً ایصالِ ثواب والدین) اضافہ کئے جاسکتے ہیں؟

جواب ۱:- روزے یا ظہار کے کفارے میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس وقت جائز ہے جبکہ ساٹھ روزے پے درپے رکھنے کی قدرت نہ ہو، یعنی متواتر بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکتا ہو، اگر روزے رکھ سکتا ہو تو متواتر ساٹھ روزے رکھنا ہی ضروری ہے، کھانا کھلانا کافی نہیں، اور

(۱، ۲) فی جامع الفصولین کتاب الصوم ج:۲ ص:۲۳۱ (ناشر اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن) ولو أفطر المریض یقضی بلا فدیة ولو مات قبل البرء لا شئ علیه اذ لم یدرک عدة من أیام اخر، وعلیه ان یوصی بفدیة مکان لکل یوم نصف صاع من بر یجوز فیها ما یجوز فی صدقة الفطر. وفی الهندیة الباب الخامس فی الأعذار التی تبیح الإفطار ج:۱ ص:۲۰۷ فان برئ المریض أو قدم المسافر وأدرک من الوقت بقدر ما فاته فیلزمه قضاء جمیع ما أدرک فان لم یصم حتی أدرکه الموت فعلیه أن یوصی بالفدیة، وکذا فی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۴ والبحر الرائق ج:۲ ص:۲۸۳ (فصل فی العوارض) (طبع مکتبۂ رشیدیه کوئٹه).

(۳، ۴) وفی الهندیة الباب الخامس ج:۱ ص:۲۰۷ فالشیخ الفانی الذی لا یقدر علی الصیام یفطر ویطعم لکل یوم مسکینا کما یطعم فی الکفارة. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۷ (طبع سعید) وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوبا .... الخ.

روزے نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے،[1] اس صورت میں ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کم از کم روٹی سالن کھلائے اور بہتر یہی ہے کہ کھانے کا معیار صاحبِ کفارہ کے نجی اوسط معیار کا ہو، کسی دینی مدرسے کے مستحقِ زکوٰۃ طلباء میں ساٹھ کا انتخاب کرکے دو وقت کھلانے سے بھی کفارہ ادا ہوجائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ کھانا کھلانے کے بجائے اس کی قیمت صدقہ کرے، اس صورت میں ہر مسکین کو پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی،[2] اور کفارہ کا کھانا کھلاتے وقت ساٹھ سے زائد افراد کو کسی اور نیت سے شریک کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۲/۲۸ ج)

سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس کا ہونے کی صورت میں اکتیسواں روزہ بھی فرض ہے

سوال:- ایک آدمی نے سعودیہ میں قضائے قاضی سے روزہ رکھا پھر پاکستان آگیا، اس نے وہاں سعودیہ میں تیس روزے پورے کرلئے جبکہ پاکستان میں عید کا حکم نہیں ہے۔ مفتی رشید احمد صاحب نے احسن الفتاویٰ جدید ج:۴ ص:۴۲۳ میں بہ عنوان ’’سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس یا اٹھائیس ہوگیا‘‘ لکھا ہے یہ آدمی اکتیسواں روزہ بھی رکھے گا۔ نیز اگر یہ آدمی اکتیسواں روزہ نہ رکھے تو اس پر اس کی قضاء ہے یا نہیں؟ برائے کرم تشفی فرمائیں۔

جواب:- احسن الفتاویٰ تو اس وقت سامنے نہیں ہے، لیکن حضرت والد صاحب (حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ) کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد یہاں کا اعتبار کرتے ہوئے اکتیس روزے پورے کرے گا، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ شھود الشھر موجبِ فرضیتِ صوم ہے، اور شھود الشھر ہر علاقے میں وہاں کا معتبر ہے، پاکستان میں چونکہ شھر ابھی موجود ہے اس لئے فرضیتِ صوم اس کے حق میں متحقق ہے، رہی وہ حدیث جس میں شہر کے تیس دن ہونے کا ذکر ہے، سو وہ اس بارے

(۱، ۲) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ثم لا بد من کفارة فنقول کفارة الفطر وکفارة الظهار واحدة وهی عتق رقبة مؤمنة أو کافرة وإن لم یقدر علی العتق فعلیه صیام شهرین متتابعین، وإن لم یستطیع فعلیه إطعام ستین مسکینًا کل مسکین صاعًا من تمرة أو شعیر أو نصف صاع من حنطة علی ما یأتی فی صدقة الفطر. وفی الدر المختار مع ردالمحتار باب الکفارة ج:۳ ص:۴۷۸ فإن عجز عن الصوم أطعم ستین مسکینًا کالفطرة (قوله کالفطرة قدرًا) أی نصف صاع من بُر أو صاع من تمر أو شعیر.

میں قطعی الثبوت والدلالۃ نہیں بلکہ اس میں احتمال موجود ہے اور "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ..... الخ"[۱] کا حکم قرآنی قطعی الثبوت والدلالۃ ہے، مزید یہ کہ احتیاط بھی اسی میں ہے، اور جب روزہ فرض ہوا تو نہ رکھنے سے قضاء بھی لازم ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۸/۱۱/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۱۱/۳۹ ج)

۱:- پاکستان سے سعودی عرب اور سعودیہ سے پاکستان آنے والے شخص کے روزے اور عید میں تفصیل

۲:- روزے کی حالت میں حیض کا شروع ہونا

سوال:- ایک شخص سعودی عرب سے روزے رکھتے ہوئے آیا اور یہاں پر بھی روزے رکھ رہا ہے، پاکستان کے لحاظ سے اس کے دو روزے زائد ہو رہے ہیں ایسی حالت میں کیا حکم ہے؟

۲:- اس کے برعکس ایک شخص پاکستان سے روزے رکھتے ہوئے سعودی عرب جائے اس کے دو روزے سعودی عرب کے لحاظ سے کم ہوجائیں گے ایسی صورت میں کیا شکل اختیار کرے؟

۳:- اگر ایک عورت روزے سے ہو اور دن کے کسی حصہ میں وہ ناپاک (حیض یا نفاس سے) ہوجائے تو وہ کیا کرے؟

۴:- اگر ایک عورت حیض و نفاس سے ناپاک ہوئی کچھ دنوں کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ وہ دن کے کسی حصے میں پاک ہوجائے گی تو وہ اس دن کا روزہ رکھے اور دن میں غسل کرے یا یہ کہ غسل کرنے کے بعد دوسرے دن سے روزہ شروع کرے۔

جواب:- پاکستان پہنچ کر جب تک رمضان باقی ہے اس وقت تک روزہ رکھنا اس پر فرض ہے۔[۲]

۲:- صورت مسئولہ میں جبکہ اس نے پاکستان میں صرف اٹھائیس روزے رکھے تھے اور سعودی عرب پہنچا تو رمضان ختم ہو چکا تھا تو اس کو دو روزے قضا کرنے ہوں گے۔

---

(۱) سورة البقرة:۱۸۵ . وفی جامع الترمذی ج:۱ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه) الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون .... الخ . وفی رد المحتار ج:۲ ص:۳۸۴ تنبیه :- لوصام رائی هلال رمضان واکمل العدة لم یفطر الا مع الإمام لقوله علیه السلام: صومکم یوم تصومون وفطرکم یوم تفطرون. رواه الترمذی.
وفی بدائع الصنائع کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۰ واما صوم رمضان فوقته شهر رمضان لا یجوز فی غیره فیقع الکلام فیه فی موضعین احدهما فی بیان وقت صوم رمضان، والثانی فی بیان ما یعرف به وقته، اما الأول فوقت صوم رمضان شهر رمضان لقوله تعالیٰ: "فمن شهد منکم الشهر فلیصمه" أی فلیصم فی الشهر، و قول النبی صلی الله علیه وسلم: وصوموا شهرکم، أی فی شهرکم لأن الشهر لا یصام وانما یصام فیه .... الخ .
(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔ (محمد زبیر)

۳:- اس کا اس دن کا روزہ نہیں ہوا بعد میں اس کی قضاء کرے۔[1]

۴:- جب تک پاک نہ ہو دن میں کھا پی سکتی ہے، اور پاک ہونے سے پہلے روزے کی نیت بھی درست نہیں، پاک ہونے پر بھی روزے کی نیت درست نہیں، البتہ جس وقت پاک ہوئی اس کے بعد سارے دن کھانا پینا اس کے لئے جائز نہیں[2]، اور اس دن کی قضا بھی واجب ہے،[3] اور اگر غلطی سے کھا پی لیا تب بھی کفارہ نہیں آئے گا،[4] قضاء کافی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۵/ ۲۸ج)

تندرست کے لئے روزہ رکھنا لازم ہے کفارہ کافی نہیں

سوال:- رمضان المبارک کا مہینہ ہے مگر بہت سے لوگ اس سعادت کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں (بیماروں کے علاوہ) اور کہتے ہیں کہ بعد میں کفارہ دیدیں گے۔ اگر کفارہ ادا کیا جائے تو کتنا ادا کیا جائے؟

جواب:- قوی اور تندرست آدمیوں کے لئے کوئی کفارہ یا فدیہ نہیں ہے، ان پر روزے رکھنا ہی فرض ہے، کفارہ ایسے بوڑھوں کے لئے ہے جو کمزوری کے سبب روزے نہ رکھ سکتے ہوں[5] اور ان میں قوّت دوبارہ آنے کی اُمید نہ ہو، ایسے بوڑھے ایک روزے کے عوض پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت صدقہ کریں۔[6]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۴/ ۲۸ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۰، ۲۹۱ (یمنع صلاۃ) مطلقا ولو سجدة شکر (وصوما) وجماعا (وتقضیه) لزوما دونها للحرج. وفی الشا میة تحته قوله وتقضیه أی الصوم علی التراخی فی الاصح. وفی الهدایة ج:۱ ص:۲۲۴ (مکتبه شرکت علمیه ملتان) واذا حاضت المرأة أو نفست افطرت وقضت. وفی الجوهرة النیرة ج:۱ ص:۱۷۷ کتاب الصوم واذا حاضت المرأة أفطرت وقضت وکذا اذا نفست .... الخ. وکذا فی الهندیة کتاب الصوم الباب الخامس ج:۱ ص:۲۰۷.

(۲،۳) وفی الهدایة ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) واذا قدم المسافر أو طهرت الحائض فی بعض النهار أمسکا بقیة یومهما .... الخ.

(۴) وفی الهدایة ج:۱ ص:۲۲۳ (مطبع مذکور) و اذا بلغ الصبی أو أسلم الکافر فی رمضان امسکا بقیة یومهما قضاءً لحق الوقت بالتشبه ولو أفطرا فیه لا قضاء علیهما لأن الصوم غیر واجب فیه.

(۵) وفی کشف الاسرار للبزدویؒ ج:۱ ص:۱۵۱ تحت قوله تعالیٰ: "وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین...." قرأ ابن عباس یطوقونه ویطیقونه، أی یکفلونه علیٰ جهد منهم وعسر وهم الشیوخ والعجائز وحکم هؤلاء الافطار والفدیة .... وفی قراءة ابن عباسؓ: وعلی الذین یطوقونه أی یکلفونه فلا یطیقونه وفی قراءة حفصة: وعلی الذین لا یطیقونه وقیل هو الشیخ الفانی .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۲۷ وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی وجوبا .... الخ.

(۶) وفی الدر المختار باب الکفارة ج:۳ ص:۴۷۸، ۴۷۹ فان عجز عن الصوم اطعم ستین مسکینًا کالفطرة. وفی الشامیة (قوله کالفطرة قدرًا) أی نصف صاع من بر أو صاع من تمر أو شعیر .... الخ.

کمزوری کی بناء پر روزے کا فدیہ دینا
روزے میں زیرِ ناف بال صاف کرنا

سوال:- ایک زچہ رمضان میں روزے نہیں رکھ سکی ہے اور اس کے لئے سارے سال میں روزے رکھنا مشکل ہے، کیا وہ روزے کا فدیہ دے سکتی ہے یا روزہ رکھنا ہی ضروری ہے؟

۲:- کیا روزے کے اندر ناف کے نیچے کے بال صاف کر سکتے ہیں؟

جواب ۱:- تندرستی کے بعد روزے رکھ کر قضاء کرنا ضروری ہے،(۱) فدیہ ادا کرنا کافی نہیں، فدیہ ان بوڑھوں کے لئے ہے جن کی صحت وقوت واپس آنے کی اُمید نہ ہو۔(۲)

۲:- کر سکتے ہیں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۱/۲۸ ج)

۱:- طبّی ہدایات کی بناء پر پائلٹوں کے لئے روزہ نہ رکھنے کی شرعی حیثیت
۲:- آکسیجن ماسک سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال:- پائلٹوں کو بعض طبّی وجوہات کی بناء پر روزے کی حالت میں پرواز کرنے کی ممانعت ہے، ڈاکٹروں کی ہدایات یہ ہوتی ہیں کہ جہاز اُڑانے سے قبل بھی پائلٹ ضرور کچھ کھاپی کر جائیں اور پرواز سے واپس آکر بھی خورد ونوش کریں، ورنہ طبّی نقطۂ نگاہ سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے، کیا اس صورت میں پائلٹ کے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت از رُوئے شرع ہو سکتی ہے؟

نیز اس صورت میں جبکہ پائلٹ جنگی جہاز اُڑاتے ہوں اور ان کی تربیت پروگرام کے تحت لازمی ہو تو کیا ایامِ رمضان میں ان کی اُڑان اور مسافت اپنی اصلی جگہ سے اتنی دُور ہوتی ہے کہ وہ پرواز کرتے ہی مسافر کے حکم میں آجاتے ہیں؟ تو آیا اس صورت میں وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں قضاء کرلیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- نیز پائلٹوں کے لئے آکسیجن ماسک لگانا لازمی ہوتا ہے، آکسیجن ماسک لگانے سے روزہ باقی رہ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ڈاکٹروں کی بعض ہدایات تو محض بربنائے احتیاط ہوتی ہیں جن کی خلاف ورزی سے کوئی واقعی نقصان عموماً نہیں ہوتا، ایسی ہدایات کی بناء پر تو روزہ چھوڑنا درست نہیں، لیکن اگر یہ

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۷۵ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۷۵ کا حاشیہ نمبر ۳ و ۴، اور ص:۱۷۸ کا حاشیہ نمبر ۵، وامداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۵۰، ۱۵۱۔

ہدایات واقعتاً ایسی ہیں کہ ان کی خلاف ورزی سے نقصان کا گمان غالب ہے، تو ایسی صورت میں پائلٹ کے لئے روزہ چھوڑ کر دوسرے دنوں میں قضاء کرنا جائز ہوگا، سفر کی وجہ سے بلاشبہ روزہ قضا کرنے کی اجازت ہے،(۱) لیکن سفر سے پہلے وطن ہی میں کھانا شروع کر دینا ضرورت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

۲:- آکسیجن ماسک لگانے سے اگر سوائے ہوا یا اس کے کسی جزء کے کوئی اور چیز حلق میں نہ جاتی ہو تو اس کے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۶/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۳۳/۲۷ھ)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

فدیہ کی رقم کتنی ہے؟

سوال:- روزے کے فدیہ کی رقم آج کل کے حساب سے کتنی ہے؟

جواب:- آج کے حساب سے فی روزہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کریں۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

روزہ کے فدیہ کی تفصیل

سوال:- زید اسّی سالہ بوڑھا آدمی ہے جس نے اپنی زندگی میں آج تک روزہ نہیں چھوڑا، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے مگر اتفاق سے گرنے کی وجہ سے اس کی ایک پسلی ٹوٹ گئی اور اس میں شگاف آ گیا ہے صرف پہلے پانچ روزے رکھ سکا، روزوں کا فدیہ دینے کی طاقت رکھتا ہے، روزے کا فدیہ کیا ہے؟

جواب:- اگر عمر کی زیادتی اور بیماری کی بناء پر آئندہ کبھی روزے رکھنے کی طاقت واپس آنے کی اُمید نہ ہو تو روزوں کا فدیہ دیا جاسکتا ہے، لیکن اگر طاقت واپس آنے کی اُمید ہو تو قضاء ہی واجب ہے، فدیہ دینے کے باوجود اگر طاقت آ گئی تو پھر قضاء رکھنا واجب ہوگا، اور ایک روزے کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہے(۳) (جو آج کل تقریباً پونے تین روپے ہے اور پورے تین روپے احتیاطاً سمجھنے چاہئیں)۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۰/۲۸ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۷۴ کا حاشیہ نمبر ۱۔ (۲و۳) دیکھئے ص:۱۷۸ کا حاشیہ نمبر ۶، وامداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۵۰، ۱۵۱۔

انجکشن سے روزہ نہ ٹوٹنے کا حکم

سوال:- سیّدنا المحترم زادت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ ۱۹۹۲ء میں ہمارے ایک استاد صاحب نے ٹیکہ لگوانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے سلسلے میں آپ کی خدمتِ عالیہ میں ایک مراسلہ ارسال فرمایا تھا جس کا جواب موصول نہیں ہوا۔ چنانچہ اب جبکہ موقر جریدہ البلاغ کے جنوری/ شعبان کے شمارے میں پھر روزہ کے مسائل کے ضمن میں یہ بات شائع ہوئی تو انہوں نے ایک سابق تحریر کا فوٹو اسٹیٹ عکس بندہ کے حوالے کیا ہے کہ آپ کی توجہ پر ان کی تحقیق پیش ہو، اگرچہ مجھے آپ کے شعبۂ افتاء میں بھیجنا مناسب تھا لیکن آپ سے شرفِ ملاقات کی غرض سے حضورِ والا کے نام بھیج رہا ہوں، ایک جوابی لفافہ ساتھ ہے حضورِ والا سے استدعا ہے کہ اپنے لیٹر پیڈ پر اس کا جواب بندہ کو ارسال فرما کر ممنونِ احسان فرمائیں، جملہ ادارہ کے لئے دُعا کرتا ہوں اور آپ سے خصوصی اوقات میں دُعا کی دست بستہ استدعا کرتا ہوں۔

فقط والسلام نصیر احمد طاہر

وہ مضمون یہ ہے:-

روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین، وعلی الہٖ وصحبہ الطیبین الطاھرین، اما بعد.

روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا مفسدِ صوم ہے دلائلِ شرعیہ سے اس بات کو سمجھنا چند مقدمات پر موقوف ہے۔

ا:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ.“

جس قدر قوت اور پلے ہوئے گھوڑے تم سے ہوسکیں ان کافروں کی لڑائی کے لئے مہیا رکھو، کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے دُشمنوں کو اور اپنے دُشمنوں کو مرعوب کرو، اس کے علاوہ ان کو بھی مرعوب کرو جن کو تم نہیں جانتے، ان کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ خرچ کروگے تم کو اس کا پورا اجر ملے گا اور تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔

اخرج احمد ومسلم وابوداؤد وابن جریر وابن منذر وابن ابی حاتم وابو الشیخ

وابن مردویہ وابو یعقوب اسحاق بن ابراھیم القراب فی کتاب فضل الرمی والبیھقی فی شعب الایمان. عن عقبة بن عامر الجھنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول وھو علی المنبر "وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" اَلا ان القوة الرمی، اَلا ان القوة الرمی قالھا ثلاثا، الدر المنثور.

عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ منبر پر فرما رہے تھے: "وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" خبردار قوت تیر چلانا ہے تین بار فرمایا، اس آیت میں جو لفظ قوت ہے، اس کی تفسیر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر چلانے سے فرمائی۔ بایں ہمہ تفسیر بیان القرآن میں مرقوم ہے اب بندوق اور توپ قائم مقام تیر کے ہیں۔ یعنی تیر چلانا ترک کردیں گے، اور اس کی بجائے بندوق وغیرہ چلانے کی مشق کریں گے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر کو بدلنا کیونکر جائز ہے؟

اس کا جواب فقط یہی ممکن ہے کہ تیر چلانا مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ مقصود حاصل کرنے کا اس زمانے میں واحد ذریعہ تھا۔ مقصود بالذات اس آیت میں یہ امر تھا کہ دُور سے دُشمنانِ اسلام کو قتل کرنے کی مشق کرو۔ دُور سے دُشمنوں کو قتل کرنے کا اس زمانے میں ذریعہ تیر چلانا تھا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، جب دوسرے ذرائع اس سے کہیں بہتر پیدا ہوگئے تو تیر چلانے کو ترک کرنا اور دوسرے موجود ذرائع وغیرہ کو اختیار کرنا فرض ہوگیا، کیونکہ تیر چلانا مقصود بالذات نہیں تھا درحقیقت حکم یہ تھا کہ دُشمنوں کو دُور سے قتل کرنے کی مشق کرو۔

۲:- جب شارع علیہ السلام کی زبان درفشاں سے ایسا لفظ صادر ہو جو محتمل معانی کثیرہ ہو اور شارع علیہ السلام سے کسی ایک معنی کی تعیین ثابت نہ ہو تو یہ مجتہد اپنے اجتہاد سے کسی ایک معنیٰ کی تعیین کرلے اور اس تعیین میں مُصیب نہ ہو تو وہ مجتہد قابل ملامت نہیں بلکہ ایک اجر کا مستحق ہے۔

جس طرح ایک صحابی نے آیت "حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" سن کر دو دھاگے سفید اور سیاہ رات کو تکیہ کے نیچے رکھ دیئے تھے اور اُمہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن نے "اطولکن یدا" سن کر ایک دُوسرے کے ہاتھ ناپ کر حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کا مصداق قرار دیا تھا۔

۳:- جو چیز ہم کھاتے ہیں وہ معدہ میں پک کر آشجو کے مشابہ ہوجاتی ہے جس کو کیموس کہا جاتا ہے، پھر اس میں سے لطیف مادّہ ماساریقا کے ذریعہ جگر کی طرف آتا ہے، اس لطیف مادّہ کو کیلوس کہا جاتا ہے، پھر یہ کیلوس جگر میں پکتا ہے، پکتے وقت اس سے جھاگ پیدا ہوتا ہے اور کچھ مادّہ تہہ

نشین ہوجاتا ہے، یہ جھاگ صفرائی ہوتا ہے اور تہہ نشین مادّہ سوداء، جو چیز پورے طور پر پک جاتی ہے وہ خون ہوتا ہے اور جو کچھ کچا رہ جاتا ہے وہ بلغم ہوتا ہے، پھر جگر ان چاروں خلطوں کو رگوں کے ذریعے سے ان کے مقاموں پر پہنچاتا ہے، صفراء کا مقام پتہ ہے، اور سودا کا مقام تلی، اور بلغم کا مقام پھیپھڑا، پھر جگر اس خون کو دِل کی طرف پہنچا دیتا ہے، دل اس خون میں رُوحِ حیوانی پیدا کرکے شریانوں کو یعنی پھڑکنے والی رگوں میں تقسیم کردیتا ہے، وہ رگیں پورے جسم میں خون کو پھیلا دیتی ہیں، یہی خون جسم کی غذا ہے، یہ خون جب پورے طور پر جسم میں پہنچتا ہے تو اس کے بعض اجزاء تحلیل ہوکر فنا ہوجاتے ہیں اور باقی ماندہ اجزاء کو عروق شعریہ جذب کرکے وریدوں یعنی ساکن رگوں میں لاتی ہیں، پھر ان ساکن رگوں سے منجذب ہوکر جگر کو پہنچتا ہے، جگر پھر اس پرانے اور نئے خون کو دِل کی طرف منتقل کردیتا ہے، خون کا یہ چکر جسمِ انسانی میں تادمِ زیست جاری رہتا ہے، ہمارے کھانے پینے کی غایت یہی خون ہے جو پورے جسم کی غذا ہے۔

الشروع فی المقصد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ ..... الخ.“

اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ”كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى یَتَبَیَّنَ......“ یعنی صبح صادق تک کھاؤ پیو، پہلی آیت میں روزہ کی حقیقت بیان نہیں فرمائی، دُوسری میں بطریقِ مفہومِ مخالف ترکِ اکل وشرب کی طرف اشارہ فرمایا۔ لغت میں صوم کا معنی امساک ہے اور شرعی معنیٰ ہے صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے امساک مع النیۃ، روزہ کے اس شرعی معنیٰ کا قرآن مجید میں ذکر نہیں بلکہ یہ معنیٰ سنتِ نبویہ سے مأخوذ ہے، باجماعِ مسلمین اکل وشرب اور جماع مفسدِ صوم قرار پائے۔

بالفاظِ دیگر صائم کے لئے ضروری ٹھہرا کہ روزہ کی حالت میں شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج کو پورا کرنے سے پرہیز کرے، فقہائے کرام نے تفصیل اَحکام الصیام میں معدہ اور دماغ کی حفاظت ضروری قرار دی ہے کیونکہ بدن کو غذا پہنچانے کا واحد ذریعہ معدہ ہے، اور فرج کو قوتِ شہوانیہ عطا کرنے والا فقط دماغ ہے۔ حفظِ معدہ اور حفظِ دماغ کو بقائے صوم قرار دینا اور ان دونوں میں کسی ایک تک ایسی چیز کا پہنچانا جس میں صلاحِ بدن ہے فسادِ صوم شمار کرنا طبّی نظریہ پر مبنی ہے، اس پر کوئی دلیلِ شرعی موجود نہیں، اسی طرح معدہ اور دماغ تک پہنچنے والی چیز کی راہ منافذِ فطریہ میں محصور کرنا بھی کسی دلیلِ شرعی سے مأخوذ نہیں۔

فقہائے کرام نے اُمورِ معتادہ پر ان مسائل کی بنیاد رکھی ہے، سنتِ نبویہ سے ہمیں بقائے صوم

اور فسادِ صوم کا جو معیار ملا ہے، وہ بالکل سادہ اور عام فہم ہے، طبّی باریکی میں اُلجھنے کی حاجت نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ جسم کے اندر داخل ہونے والی چیز سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، اگرچہ اس حدیث کے رفع پر محدثینِ کرام نے کلام فرمایا ہے اور اس کو حدیثِ موقوف قرار دیا ہے، لیکن اس کے حکماً مرفوع ہونے کا کوئی عالم انکار نہیں کرسکتا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول جو عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں پوری سند سے لکھا ہے وہ یہ ہے: **قال انما الوضوء مما خرج ولیس مما دخل والفطر فی الصوم مما دخل ولیس مما خرج**، حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا وضو باہر نکلنے والی چیز سے فاسد ہوتا ہے اور اندر جانے والی چیز سے نہیں ٹوٹتا، اور روزہ اندر جانے والی چیز سے فاسد ہوتا ہے اور باہر نکلنے والی چیز سے نہیں ٹوٹتا، اس اثر میں روزہ اور وضو کا بقا اور فساد ایک دوسرے کے برعکس بتایا۔

اس تقابل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اندر جانے والی چیز مفسدِ صوم ہے، اس دخول کے لئے منافذِ فطریہ کی کوئی قید نہیں، خواہ دخول منافذ سے ہو یا غیر منافذ سے کیونکہ اس اثر سے بالتقابل وضو کا فساد خروج سے بتایا ہے خواہ وہ خروج منافذ سے ہو یا غیر منافذ سے جیسے بدن کے کسی حصہ میں کانٹا وغیرہ چبھے اور خون جاری ہوجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا، حالانکہ خون غیر منفذ سے نکل رہا ہے، اسی طرح کسی چیز کا دخول خواہ وہ دخول منفذ سے ہو یا غیر منفذ سے مفسدِ صوم قرار دیا ہے، یہ بھی اس امر کی تائید ہے کہ دخول کے لئے منفذِ فطری شرط نہیں، اسی طرح فقہائے کرام کے بیان کردہ بیشتر مسائل میں تضاد پایا جاتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب:- مقدمہ نمبر۳ میں بتایا جاچکا ہے کہ ہر غذا یا دوا جو معدہ میں جاتی ہے تین ہضموں کے بعد مستحیل الی الدم ہوجاتی ہے اور یہی خون درحقیقت پورے جسم کی غذا ہے، معدہ اور جگر درمیان میں اعضاء خادمہ ہیں، اب طبِ جدید نے ٹیکہ ایجاد کیا ہے، ایک سوئی کے ذریعہ سے براہِ راست دوا یا غذا خون میں ملائی جاتی ہے، خون میں یہ دوا، غذا مل کر معدہ والی دوا یا غذا سے بہت جلد فائدہ ظاہر کرتی ہے، ظاہر ہے کہ حدیث شریف کے بیان کردہ معیار کے مطابق ٹیکہ لگانے سے دوا یا غذا اندر داخل ہوتی ہے لہٰذا اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا، روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگانے کے مجوّزین غور فرمائیں کہ روزہ کی علت تو کسرِ شہوات ہے، ٹیکہ لگا کر روزہ کی حالت میں شہوات میں قوت پیدا کردی جائے تو روزہ عبادت نہیں رہے گا۔

مجوّزین سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ روزہ کے بغیر عام حالت میں نشہ کا ٹیکہ لگوانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کہہ دیں کہ جائز ہے تو تمہارا یہ فتویٰ **کل مسکر حرام** کے خلاف ہے لہٰذا باطل ہے، اگر وہ جواب دیں کہ جائز نہیں ہے تو ہم ان سے دلیل دریافت کریں گے، دلیل بیان کرتے ہوئے انہیں لامحالہ

کہنا پڑے گا کہ نشہ آور دوا کا ٹیکہ لگوانا، نشہ آور دوا کے کھانے یا پینے کا حکم رکھتا ہے، **هذا هو المطلوب۔**

ہم بھی یہی بات کہتے ہیں کہ ٹیکہ لگوانے کا حکم کھانے پینے کا سا ہے، الحاصل حق بات یہ ہے کہ جس طرح قوت کی تفسیر کچھ زمانے کے بعد رمی کی بجائے بندوق اور توپ چلانے سے کی گئی، بعینہٖ اسی طرح **تغذیة** اور **مداواة** کا معدہ اور دماغ میں حصر باقی نہیں رہا، بلکہ طبِ جدید نے ثابت کر دیا کہ **تغذیه** اور **مداواة** معدہ اور دماغ کے ذریعے بھی ہوتے ہیں اور براہِ راست سوئی کے ذریعے دوا یا غذا کو خون میں پہنچا دینے سے بھی ہوتے ہیں، اب **امساک عن الأکل والشرب** کے معنیٰ **امساک عن التغذیة والمداواة** کے ہوں گے جس طرح قوت کی تفسیر اس کی علتِ غائیہ سے کی گئی یعنی **قتل الأعداء من بعید** اسی طرح اکل وشرب کی تفسیر اس کی علتِ غائیہ سے کی جائے گی یعنی **تغذیة ومداواة مطلقًا۔**

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں آیت: "**وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ**" کے تحت صوفیائے کرام پر کئے ہوئے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں: "**فیجوز ان یعطی اللہ تعالی لبعض خواص عباده فهما یدرک به من الکتٰب والسنة ما لم یقف علیه احد من المفسرین والفقهاء المجتهدین فی الدین.**" یہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو ایسا فہم عطا کرے جس کے ذریعے وہ کتاب اور سنت کے ایسے معنیٰ معلوم کرلیں جن پر مفسرین وفقہاء ومجتہدین میں سے کوئی ایک مطلع نہ ہوا ہو، لہٰذا یہ اعتراض مندفع ہوگیا کہ کسی مفسر نے اکل وشرب کا معنیٰ مطلقاً تغذیہ و مداواۃ نہیں لکھا، فقہائے کرام نے اکل وشرب معتاد کو دیکھ کر معدہ اور دماغ تک منافذِ فطریہ کے ذریعے کسی دوا یا غذا کے پہنچنے کو فسادِ صوم کی شرط بایں وجہ قرار دیا کہ اکل وشرب کا متبادر مفہوم یہی ہے اگرچہ "**کلوا واشربوا حتی یتبین**" میں یہ متبادر مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد مطلقاً تغذیہ و مداواۃ ہے خواہ وہ معدہ و دماغ کے ذریعے براہ منافذِ فطریہ ہو یا منفذِ مصنوع کے ذریعہ براہِ راست خون میں مل جانے سے ہو۔

فقہائے کرام کی یہ عدمِ اصابت ان کی رفعتِ علمیہ کے لئے قادح نہیں، جس طرح اُمہات المؤمنینؓ کا طول کے لفظ سے طولِ حسی سمجھنا اور صحابیؓ کا خیطِ ابیض اور اسود کو متبادر دھاگے پر حمل کرنا ان کی رفعتِ علمیہ کے لئے قادح نہیں، اگرچہ اُمہات المؤمنینؓ اور صحابیؓ معانی مرادہ کو نہیں سمجھے، اتمامِ حجت کے لئے یہ سطور کافی ہیں۔

ان سطور سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ٹیکہ لگوانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے، اس سے فقط روزہ کی قضاء لازم ہے کفارہ نہیں، کیونکہ یہ فساد میں لذاتِ نفسانیہ نہیں ہے، علمائے کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو ضرور سوچیں کہ جہاں دلائلِ اباحت اور دلائلِ تحریم متعارض ہوں وہاں جانبِ تحریم کی ترجیح لازم ہے، اس تفکر کے بعد اعلان کردیں کہ روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا مفسدِ صوم

ہے تا کہ کل قیامت کے دن احکم الحاکمین کی بارگاہ میں یوں نہ کہنا پڑے: "رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا" والسلام وما علینا الا البلاغ۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ مولانا عبدالرزاق ہاشمی صاحب کا مضمون بسلسلۂ "روزہ" موصول ہوا، اس سے پہلے یہ مضمون پڑھنا یاد نہیں، اب احقر نے دیکھا، لیکن اس طرزِ استدلال سے اتفاق نہ ہوا، تفصیل کا تو موقع نہیں، لیکن مختصراً عرض یہ ہے کہ منسلک تحریر میں استدلال، حکمت کو علت سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے، کسرِ شہوت جیسا کہ صاحبِ تحریر نے لکھا ہے، روزے کی علت نہیں، حکمت ہے، اور حکمت کا ہر جزیئے میں پایا جانا ضروری نہیں، اگر منافذِ اصلیہ اور غیر اصلیہ کا فرق نہ کیا جائے تو کہنا چاہئے کہ جو شخص روزے میں غسل کرے، اور اس سے اس کی پیاس میں تسکین ہو تو اس سے اس کا روزہ ٹوٹ گیا، کیونکہ شربِ ماء میں جو تسکینِ عطش مقصود ہے وہ اس طرح بھی حاصل ہوگئی، اگر غیر اکل وشرب سے حاصل ہونے والا تغذیہ مفطرِ صوم ہو تو نصِ صریح ہے کہ: "ربی یطعمنی ویسقینی"[(۱)] یہ سقی واطعام کیوں مفطر نہ ہوا؟ صوم کا اصل مقصود اتباع ہے، اور وہ امساک عن الأکل والشرب والجماع سے حاصل ہو جاتا ہے، اگر کسی اور ذریعہ سے تغذیہ ہو تو وہ اس کے منافی نہیں، اور اگر اکل وشرب پایا جائے، اور تغذیہ نہ ہو، جیسے پتھر نگلنے کی صورت میں، تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا روزے کا مدار تغذیہ پر نہیں، اکل وشرب پر ہے۔[(۲)] والسلام

(حضرت مولانا مفتی)
محمد تقی عثمانی (مدظلہم)
بقلم: محمد عبداللہ میمن
۱۴۱۵/۹/۱۱ھ

روزہ کی حالت میں دِل کا دورہ پڑنے کی بناء پر پانی پلایا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میری چچی صاحبہ کو سحری کے بعد دِل کا شدید دورہ پڑا، بہت کوشش کے بعد بھی

(۱) وفی صحیح البخاری کتاب الصوم باب الوصال .... الخ ج:۱ ص:۲۶۳ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشۃؓ قالت: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الوصال رحمۃ لھم، فقالوا: انک تواصل! قال: انی لست کھیئتکم، انی یطعمنی ربی ویسقینی .... الخ. نیز یطعمنی ربی ویسقینی اور اس مفہوم کے مختلف الفاظ صحیح بخاری شریف کے اس باب اور ج:۱ ص:۲۶۳، ۲۶۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) کی مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

(۲) اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "ضابط المفطرات" اور "البلاغ" شمارہ رمضان ۱۴۲۲ھ ملاحظہ فرمائیں۔ (از مرتب عفی عنہ)

ہوش نہیں آیا، مجبوراً پانی کے چند چمچے دینے پڑے جس کی وجہ سے پندرہ منٹ کے بعد ہوش آ گیا، چچی روزہ چھوڑنا گوارا نہیں کرتی ہیں، بغیر سحری کے بھی روزہ رکھ لیتی ہیں، ہم نے ان کو بے ہوشی کے عالم میں چند چمچے پانی دے کر روزہ توڑ ڈالا اور وہ ہوش میں نہیں تھیں، اس کا کفارہ کیا ادا کرنا ہوگا؟

جواب:- صورت مسئلہ میں آپ کی چچی صاحبہ کو چاہئے کہ اس روزے کی قضا کرلیں، مذکورہ صورت میں کفارہ واجب نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۱/۲۸ ج)

غروبِ آفتاب سے قبل افطار کرنے کا حکم

سوال:- کل مؤرخہ ۲۹ راگست ۱۹۷۷ء کو مغرب سے قبل ریڈیو پر اذان، غلطی سے نشر ہوگئی اور میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ افطار کا وقت ہوگیا افطار کرلیا، ابھی حلق سے تھوڑی سی غذا اُتری تھی تو پتہ چلا کہ اذان وقت سے قبل نشر ہوگئی، گزارش یہ ہے کہ فقہِ حنفی کی رُو سے اس روزے کا کیا حکم ہے قضاء کرنی ہوگی یا بری الذمہ ہوں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ نے غروبِ آفتاب سے پہلے کچھ کھا لیا تھا تو آپ کا روزہ ٹوٹ گیا، آپ کے ذمے اس کی قضاء واجب ہے البتہ کفارہ واجب نہیں۔

لما فی المتون أو تسحر أو افطر یظن الیوم لیلا والفجر طالع والشمس لم تغرب قضٰی فقط (شامی ج:۲ ص:۱۰۵)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۰/۲۸ ج)

صبحِ صادق کے بعد تک سحری کرتے رہنے کا حکم
ریڈیو کے غلط اعلان کی بناء پر غروبِ آفتاب سے قبل افطار کا حکم

سوال:- سحری کا انتہائی وقت ۴:۴۵ ہے، اذان پانچ بجے ہوتی ہے کیا ہم پانچ بجے تک

---

(۱) وفی الهندیة ج:۱ ص:۲۰۷، المریض اذا خاف علی نفسه التلف أو ذهاب عضو یفطر بالاجماع وان خاف زیادة العلة و امتداده فکذلک عندنا وعلیه القضاء اذا افطر وکذا فی البحر الرائق فصل فی العوارض ج:۲ ص:۲۸۱، ۲۸۲ والشامیة ج:۲ ص:۴۲۲۔

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۴۰۵ وفی الهدایة باب ما یوجب القضاء ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع شرکت علمیه) واذا تسحر وهو یظن ان الفجر لم یطلع فاذا هو قد طلع .... علیه القضاء .... ولا کفارة علیه لأن الجنایة قاصرة لعدم القصد وفی تبیین الحقائق شرح الکنز کتاب الصوم ج:۱ ص:۳۴۱، ۳۴۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) ولو .... تسحر ظنه لیلًا والفجر طالع أو أفطر کذلک والشمس حیة امسک یومه و قضٰی ولم یکفر .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۲۸۔

سحری کھا سکتے ہیں؟ اور کیا پانچ بجے کے بعد تک کھا سکتے ہیں؟ اور انتہائی وقت کیا ہے؟ اور پانچ بجے تک کھانے سے روزے پر کیا اثر پڑے گا؟

نمبر۲:- پیر کے دن کا روزہ جو پانچ منٹ پہلے ریڈیو والوں کی غلطی سے کھل گیا ہے کیا یہ دوبارہ رکھنا پڑے گا؟

جواب۱:- صبحِ صادق کے بعد اگر ایک منٹ بھی مزید کھا لیا تو روزہ فاسد ہے، لہٰذا اگر ۴ بج کر پینتالیس منٹ پر صبحِ صادق ہو رہی ہے تو پانچ بجے تک کیسے کھا سکتے ہیں؟[1] ہاں! بعض اوقات بعض نقشوں میں انتہائے سحر کا وقت صبحِ صادق سے چند منٹ پہلے لکھا ہوتا ہے، اتنے منٹ دیر تک کھانے سے روزہ فاسد نہ ہوگا، لہٰذا اصل چیز صبحِ صادق کا وقت ہے اس کی صحیح معلومات رکھنی چاہئیں، دار العلوم کے نقشے میں صبحِ صادق کا وقت ہوتا ہے۔

۲:- جی ہاں! جن لوگوں نے اس اعلان پر غروب سے پہلے افطار کیا ان پر قضاء لازم ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۵/ ۲۸ ج)

کینیڈا میں روزہ رکھنے کے لئے بیماری سرٹیفکیٹ لینے کا حکم

سوال:- یہاں کینیڈا میں روزہ ساڑھے سترہ گھنٹہ کا ہوتا ہے، بعض فیکٹریوں میں مشقت زیادہ ہونے کی وجہ سے کمزور آدمی کو روزہ نبھانا مشکل ہو جاتا ہے بلکہ بعض تو روزہ ہی چھوڑ دیتے ہیں، اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کے لئے ڈاکٹر سے بیماری کا سرٹیفکیٹ لیتا ہے جبکہ وہ بیمار نہیں اور چھٹی کر لیتا ہے، کیا اس کو ان چھٹیوں میں بیماری الاؤنس لینا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں روزے کے لئے بیماری سرٹیفکیٹ لینا اس تأویل کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے کہ روزہ کی حالت میں انسان کی صحت عموماً بالکلیہ اعتدال پر نہیں رہتی، کم از کم نقاہت تو ہو جاتی ہے، اس تأویل سے الاؤنس بھی لے سکتے ہیں، لیکن یہ اسی وقت کیا جائے جب چھٹی لئے بغیر روزہ رکھنا بالکل ممکن نہ ہو۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۰/ ۳۰ د)

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے حوالہ سابقہ ص: ۱۸۷ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۳) یستأنس ویؤید فیها بهذه العبارة: وفی رد المحتار ج: ۲ ص: ۴۲۰ (طبع سعید) وقال الرملی وفی جامع الفتاویٰ و لو ضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة فله أن یفطر ویطعم لکل یوم نصف صاع أی اذا لم یدرک عدة من أیام أخر یمکنه الصوم فیها والا وجب علیه القضاء وعلی هذا الحصاد اذا لم یقدر علیه مع الصوم ویهلک الزرع بالتأخیر لا شک فی جواز الفطر والقضاء وکذا الخباز....الخ.

وقت سے قبل عمداً افطار کی صورت میں قضاء و کفارہ دونوں لازم ہیں

سوال:- مسمّٰی حبیب الرحمٰن امامِ مسجد نے ماہ رمضان میں دو دن بوجہ ضد کے، وقت سے قبل لوگوں کو روزہ افطار کرایا، اس کے اس جرم پر شریعت میں دعویٰ پیش کیا گیا اور شریعت میں اسے طلب کیا گیا، جس کے جواب میں اس نے تحریری خط بھیجا جس کا مضمون ذیل ہے:

نمبر ۱:- سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے غلطی کی ہے اور مسلسل باقی پیغمبر بھی غلطی کرتے آئے ہیں، تو میں نے کون سی بڑی غلطی کی کہ روزہ قبل از وقت افطار کرادیا۔

نمبر ۲:- اور مجھ ایک عالم پر جھوٹا اور بے بنیاد الزام اور بہتان لگایا گیا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جرائم کے مرتکب کے خلاف کیا حکم ہے؟ روزہ قبل از وقت افطار کو پیغمبروں کے ساتھ غلطی منسوب کرنے والے آدمی کے لئے قرآنِ حکیم اور مجتہدین کے نزدیک کیا حکم ہے؟

اور جو مسلمان ایسے امام کی پیروی کریں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- وقت سے قبل روزہ افطار کرنا یا کسی دوسرے شخص کو افطار پر مجبور کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اور جن لوگوں نے جان بوجھ کر کہ ابھی افطار کا وقت یعنی غروبِ آفتاب نہیں ہوا، روزہ افطار کرلیا ان پر قضاء بھی واجب ہے اور کفارہ بھی، جس شخص نے محض ضد کی وجہ سے ایسی غلطی کی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے گناہ سے توبہ کرے، اس عمل کی تاویلات کرنا اور پیغمبروں کی غلطی کی صف میں اسے کھڑا کرنا، بدترین گستاخی ہے، ایسے شخص کو فوراً اپنے گناہ سے توبہ کرنی چاہئے اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۱۹۵ ج)

سحری کھانے کے اوقات میں امداد الفتاویٰ اور شامی کی عبارت میں کوئی تعارض نہیں

سوال:- فتاویٰ امدادیہ کتاب الصوم ج:۱ ص:۱۶۷ میں ہے کہ فقہاء نے احتیاط کی ہے کہ غروب سے طلوع تک کل وقت جتنا ہے اُس کو سات پر تقسیم کریں، چھ حصے میں سحری کھا سکتے ہیں، تفسیر تنویر الایمان پ۲ ع۷ میں بھی اسی طرح ہے بحوالہ درمختار، مگر میں نے درمختار میں نہیں دیکھا، مگر ہندیہ

اور شامی میں ہے کہ سحری کھانے کا مستحب وقت شب کا آخری حصہ ہے، یعنی آخری چھٹا حصہ ہے۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غروب سے طلوعِ شمس تک کل وقت جتنا ہے، اس کو چھ پر تقسیم کریں، چھ حصے میں سحری کھاسکتے ہیں، سات پر تقسیم کرنا معلوم نہیں ہوتا، بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کو رفع فرماویں۔

جواب:- امداد الفتاویٰ اور شامی میں کوئی تعارض نہیں، امداد الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ غروبِ شمس سے طلوعِ شمس تک کے وقت کو سات حصوں پر تقسیم کریں، ان میں سے چھ حصوں میں سحری کھاسکتے ہیں اور ساتواں حصہ شروع ہونے پر احتیاطاً سحری کھانا بند کردیں، اور شامی میں لکھا ہے کہ غروبِ شمس سے طلوعِ صبح تک کا جو وقت ہے، اسے چھ حصوں پر تقسیم کریں تو چھٹے حصے میں سحری کھانا مستحب ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

کیونکہ اوّل الذکر میں طلوعِ شمس تک کے وقت کو تقسیم کیا جارہا ہے، اور ثانی الذکر میں صرف صبحِ صادق تک کے وقت کو (دیکھئے: شامی ج:۲ ص:۱۱۴، اواخر باب ما یفسد الصوم،[۱] امداد الفتاویٰ کتاب الصوم ج:۲ ص:۵۷[۲])۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸-الف)

روزے میں مسواک چبانے کا حکم

سوال:- کیا روزے میں مسواک چبانا جائز ہے؟

جواب:- مسواک کرنا تو جائز ہے، لیکن چبانے سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہئے۔

بہتر یہ ہے کہ مسواک پہلے سے بنالی جائے، تاہم روزہ چبانے سے بھی نہیں ٹوٹتا تاوقتیکہ عرق حلق تک نہ پہنچے، فی الدر المختار: وکرہ مضغ علک، وقال الشامیؒ تحتہ: ولأن العادۃ مضغہ خصوصًا للنساء لأنہ سواکھن کما یأتی. ج:۲ ص:۴۱۲،[۳] وقد صرح الشامیؒ أن الکراھۃ تنزیھیۃ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/۲۸ج)

---

(۱) وفی الشامیۃ ج:۲ ص:۴۱۹ (طبع سعید) (سحر) .... وھو اسم للمأکول فی السحر وھو السدس الأخیر من اللیل .... الخ.

(۲) امداد الفتاویٰ کتاب الصوم والاعتکاف ج:۲ ص:۹۵، ۹۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۴۱۶ (طبع سعید)، نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۴۰، ۱۴۱۔ (محمد زبیر)

روزے کی نیت کب تک کی جاسکتی ہے؟

سوال:- اگر رمضان میں آدھے دن سے پہلے نیت کرنا بھول جائے، آدھا دن گزرنے کے کچھ دیر بعد یاد آئے اور نیت کرلے، تو کیا یہ جائز ہے؟ اور روزہ ہوجائے گا یا نہیں؟

جواب:- روزے کی صحت کے لئے آدھا دن گزرنے سے پہلے پہلے نیت کرنا ضروری ہے[1]، اس کے بغیر روزہ نہیں ہوتا، لیکن یہ واضح ہونا چاہئے کہ نیت کا مطلب دِل کا ارادہ ہے، زبان سے کچھ کہنا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر ارادہ روزے کا تھا، لیکن زبان سے کچھ الفاظ نہیں کہے تھے تو روزہ ہوگیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۱ھ

روزے کے فدیے کی مقدار اور اس کی ادائیگی کے مختلف اَحکام

سوال:- بوجہ بیماریٔ قلب و کمزوریٔ جسم و جان و بدن، نیز ایمائے ڈاکٹر، رمضان کے روزے نہ رکھ سکا، چنانچہ اب روزوں کا فدیہ فرض ہے یا واجب ہے؟ لہٰذا پورے ماہ کا فدیہ کتنی رقم ہوگی؟ یک مشت دی جائے یا تھوڑی تھوڑی ادا کی جاسکتی ہے؟ ماہِ رمضان میں ادا کی جائے یا کتنے عرصے کے اندر ادا کرسکتے ہیں؟

جواب:- اگر مرض ایسا ہے کہ قابل ڈاکٹر کی رائے میں دوبارہ اتنی قوت آنے کی اُمید ہے کہ جس میں روزے رکھے جاسکیں تو فدیہ کافی نہیں، اور ان روزوں کی قضاء ضروری ہے، لیکن اگر ایسی قوت آنے کی اُمید نہیں تو فدیہ دیا جاسکتا ہے[2]۔ ایک روزے کا فدیہ ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک گندم یا اس کی قیمت ہے[3]۔ تیس دن کا فدیہ اس طرح ترپن سیر نو چھٹانک گندم بنتا ہے، اس کی قیمت بازار سے معلوم کرکے وہ بھی ادا کرسکتے ہیں (لیکن قیمت گندم کی معتبر ہے، آٹے کی نہیں)، ہر روز پونے دو سیر گندم کی قیمت دیا کریں[4]۔ اور فدیہ کا مستحق وہی ہے جو زکوٰۃ کا مستحق ہے، یعنی وہ شخص جس کے پاس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۱۳۲ (سوال نمبر۱۹۱) اور ج:۲ ص:۱۲۳۔

(۲) وفی الرد المحتار ج:۲ ص:۴۲۷: المریض اذا تحقق الیأس من الصحة فعلیه الفدیة لکل یوم من المرض.

(۳) وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۷۲: واوصی بالکفارة یعطی لکل صلوٰة نصف صاع من برّ کالفطرة.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی (جدید ایڈیشن، دارالاشاعت) ج:۴ ص:۱۷۸۔

(۴) وفی الھندیة ج:۱ ص:۵۱۳: ولو أعطی مسکینًا واحدًا کله فی یوم واحد لا یجزیه الا عن یومه ذٰلک، وھٰذا فی الاعطاء بدفعة واحدة واباحة واحدة من غیر خلاف، واما اذا ملکه بدفعات فقد قیل یجزیه وقیل لا یجزیه الا عن یومه ذٰلک وھو الصحیح کذا فی التبیین. وفی الشامیة ج:۳ ص:۷۲۵: لو اعطی مسکینًا واحدًا فی عشرة أیام نصف صاع یجوز ولو أعطاه فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجوز، وقیل لا، وھو الصحیح. وکذا فی فتاویٰ قاضی خان علی ھامش الھندیة ج:۲ ص:۱۸، ۱۹، والتاتارخانیة ج:۵ ص:۶۰.

ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی ہم قیمت کوئی چیز زائد از ضرورت نہ ہو، فدیہ کے لئے ضروری نہیں کہ رمضان ہی میں ادا کیا جائے، بعد میں بھی کر سکتے ہیں، لیکن جتنی جلدی کریں اتنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۱۱/۲۹ج)

نسوار کے استعمال سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے

سوال:- نسوار جس میں چونہ وغیرہ ڈال کر منہ میں رکھا جاتا ہے، کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ اس کو حرام، بعض مباح کہتے ہیں، کیا اس سے روزہ ٹوٹتا ہے؟

جواب:- تمباکو، نسوار وغیرہ کا استعمال مباح ہے، اور اس سے روزہ بھی فاسد ہوجاتا ہے، اس لئے کہ نسوار کا منہ میں رکھنا عملاً کھانے کے حکم میں ہے۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی
بندہ محمد شفیع　　۱۳۸۸/۶/۱ھ
۱۳۸۸/۶/۱ھ　　(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۱۹-الف)

یوم الشک کے روزے کا حکم

سوال:- بعض لوگ یوم شک کے روزے کو مکروہ کہتے ہیں، عن عمار بن یاسر قال: من صام الیوم الذی یشک فیه فقد عصی أبا القاسم صلی اللہ علیه وسلم۔[1] اور بعض کہتے ہیں کہ یوم شک کا روزہ جائز ہے، اور اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لہٰذا آپ فرمایئے کیسے کرنا چاہئے؟

جواب:- یہ حدیث اگرچہ مرفوع نہیں، لیکن موقوف ہے، اور موقوف مرفوع کے حکم میں ہے، لأن الصحابی لا یقول ذٰلک من قبل رأیه، فیکون من قبیل المرفوع (بذل المجهود ج:۴ ص:۱۳۴)[2] اسی وجہ سے حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ عوام اس دن روزہ نہ رکھیں۔ البتہ دُوسرے دلائل کی روشنی میں خواص اہلِ فتویٰ کے لئے اجازت دی گئی ہے۔ قال فی رد المحتار: استحب صومه للخواص، قال فی الفتح وقیده فی التحفة بکونه علی وجه لا یعلم العوام ذٰلک، کی لا یعتادوا صومه، فیظنه الجهال زیادة علٰی رمضان، ویدل علیه قصة أبی یوسف المذکورة فی الإمداد (شامی ج:۲ ص:۳۸۲)[3] اور اگر خواص بھی اس حدیث کی بناء پر روزہ نہ رکھیں تو کچھ حرج نہیں۔

ہاں! اگر کسی کی عادت ہے کہ وہ کسی خاص دن روزہ رکھا کرتا ہے اور وہ دن یوم الشک میں

(۱) مشکوٰۃ المصابیح کتاب الصوم، باب رؤیة الهلال ج:۱ ص:۱۷۴ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) بذل المجهود ج:۴ ص:۱۳۴ (طبع مکتبه قاسمیه ملتان).
(۳) ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۸۲ (طبع ایچ ایم سعید).

آ گیا تو وہ رکھ سکتا ہے۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: لا تقدموا رمضان بصوم یوم ولا یومین الا رجل کان یصوم صومًا فیصومہ، رواہ الستۃ (فتح القدیر ج:۲ ص:۵۴)۔[۱]

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۱۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۴/۱۸-الف)

ریڈیو کے غلط اعلان پر غروبِ آفتاب سے قبل اِفطار کرلیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک روز ریڈیو پاکستان کراچی نے مغرب کی اذان وقت سے ۵ منٹ قبل دے دی، جس سے اکثر لوگوں کے روزے خراب ہوگئے اور انہوں نے افطار کرلیا، پھر اذان بند ہوگئی، لوگوں نے کھانا چھوڑ دیا، پھر اذان ہوئی بہت سے لوگوں نے روزہ نہیں کھولا، ان دونوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:- جن لوگوں نے غروب سے قبل اِفطار کیا، خواہ ریڈیو کے غلط اعلان کی بناء پر کیا ہو، اُن پر اُس روزے کی قضاء واجب ہے، خواہ صحیح وقت معلوم ہونے کے بعد رُک گئے ہوں یا کھاتے پیتے رہے ہوں، قضاء دونوں صورتوں میں واجب ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۷/۲۸-ج)

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۲۴۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۸۷ کا حاشیہ نمبر۲ و امداد الفتاویٰ سوال:۱۸۵، ج:۲ ص:۱۲۸۔

﴿باب الإعتكاف﴾
(اِعتکاف کے مسائل)

رمضان کے آخری عشرے کا اِعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہوسکتا

سوال ۱:- چند اشخاص ایک جامع مسجد میں رمضان کے آخری عشرے میں اِعتکاف کرنے بیٹھے تھے، ان میں سے ایک شخص حالتِ اِعتکاف میں بخار میں مبتلا ہوگیا، صحت یاب نہ ہونے پر علاج معالجے کی ضرورت پڑی، مجبوراً تارک الصوم ہونا پڑا اور اِعتکاف ترک کرکے علاج کے لئے اہل و عیال کے پاس چلے گئے، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں بغیر روزے کے اِعتکاف ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اگر بغیر روزے کے اِعتکاف نہ ہوتا ہو، تو اس کا اِعتکاف ٹوٹ گیا یا نہیں؟

جواب ۱:- رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اِعتکاف جو مسنون ہے، اس کے لئے روزہ شرط ہے، لہٰذا جس روز روزہ اِفطار کیا، اس دن سے اِعتکاف ٹوٹ گیا۔ لما فی ردا لمحتار ومقتضى ذلك أن الصوم شرط ايضًا فى الاعتكاف المسنون، لأنه مقدر بالعشر الأخير، حتى لو اعتكفه بلا صوم لمرض أو سفر ينبغى أن لا يصح عنه ..... وسكتوا عن بيان حكم المسنون لظهور انّهٗ لا يكون الا بالصوم عادة (شامی ج:۲ ص:۱۳۰)۔[1]

۲:- جس روز روزہ اِفطار کیا، اس روز سے اِعتکاف ٹوٹ گیا، ایک دن کے اِعتکاف کی قضا واجب ہے، كما مرّ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷و)

---

(۱) ردّ المحتار باب الاعتكاف ج:۲ ص:۴۴۲ (طبع سعيد)، وفى الهداية باب الاعتكاف ج:۱ ص:۲۱۱ والصحيح أنّهٗ سنّة مؤكّدة لأنّ النبى صلى الله عليه وسلم واظب عليه فى العشر الأواخر من رمضان والمواظبة دليل السنّة وهو اللّبث فى المسجد مع الصّوم .... والصّوم من شرطه .... الخ.
وفى البحر الرائق ج:۲ ص:۲۹۹، ۳۰۰ (طبع رشيديه كوئٹه) .... الاعتكاف المسنون سنّة مؤكّدة وهو العشر الأخير من رمضان فانّ الصّوم من شرطه حتّٰى لو اعتكفه من غير صوم لمرض أو سفر ينبغى أن لا يصحّ .... الخ. وكذا فى الهندية ج:۱ ص:۲۱۱ (طبع رشيديه كوئٹه) (محمد زبیر حق نواز).

مرض کی وجہ سے اِعتکاف توڑنے کا حکم

سوال:- ایک شخص حالتِ اِعتکاف میں بخار میں مبتلا ہوگیا، صحت یاب نہ ہونے پر علاج معالجے کی ضرورت پڑی، مجبوراً تارک الصوم ہونا پڑا، تو آیا اس صورت میں علاج کے لئے اور خدمت کے واسطے اِعتکاف توڑ کر اہل وعیال کے پاس گھر جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- مرض اور اس کا علاج ایسا عذر ہے جس کی وجہ سے اِعتکاف توڑنا جائز ہے۔ ولا فرق (أی فی القضاء) بین فساده بصنعه بلا عذر کالجماع مثلا الا الردّة أو لعذر کخروجه لمرض (شامی ج:۲ ص:۱۳۳)، البتہ ایک دن کے اِعتکاف کی قضا واجب ہوگی۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷و)

اِعتکافِ مسنون میں غسلِ جمعہ یا ٹھنڈک کے لئے غسل کی خاطر مسجد سے باہر نکلنا

سوال:- بخدمت حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب۔

رسالہ ''اَحکامِ اِعتکاف'' کے صفحہ نمبر ۳۹ میں آپ نے معتکف کے غسل کے ذیل میں لکھا ہے کہ: ''معتکف کو غسلِ جمعہ یا برائے ٹھنڈک مسجد سے باہر جانے کی اجازت نہیں، لیکن مسجد کے اندر ٹب میں یا مسجد کے کنارے پر غسل کرسکتا ہے۔'' اس میں ایک بات وضاحت طلب رہ گئی ہے کہ مساجد کے غسل خانے جو کہ حدودِ مسجد سے باہر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ تعینِ حدودِ مسجد کے وقت نماز کے لئے نہیں بلکہ غسل، استنجاء کے لئے بنائے جاتے ہیں، اور حدودِ مسجد وہی ہے جو تعینِ حدود کے وقت نماز کے لئے متعین کی جائے، جیسا کہ آپ نے ''حدودِ مسجد کا مطلب'' کے ذیل میں بحث کی ہے۔ اب مسئلہ باعثِ نزاع یہ ہے کہ مسجد کے غسل خانے جو اگرچہ حدودِ مسجد سے باہر ہوتے ہیں لیکن ملکیتِ مسجد اور احاطۂ مسجد میں شامل ہوتے ہیں، ان میں غسل برائے ٹھنڈک یا غسلِ جمعہ کی اجازت ہے یا نہیں؟ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

---

(۱) ردّ المحتار باب الاعتکاف ج:۲ ص:۴۴۷ (طبع سعید).

جواب:- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا، ''اَحکامِ اِعتکاف'' میں جو مسئلہ لکھا ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ مسجد کے ملحق غسل خانے جو مسجد میں نہیں ہوتے، لیکن مسجد کی ملکیت ہوتے ہیں، ان میں بھی غسلِ جمعہ یا ٹھنڈک کے لئے غسل کی خاطر جانا، اِعتکافِ مسنون میں جائز نہیں،[1] لہٰذا جائز طریقے پر غسل کی صورت وہی ہے کہ مسجد میں ٹب رکھ کر اس میں غسل کریں یا مسجد کے کنارے پر اس طرح بیٹھیں کہ مستعمل پانی مسجد میں نہ گرے۔[2]

جہاں تک اس مسئلے کی دلیل کا تعلق ہے، وہ ''اَحکامِ اِعتکاف'' کے ضمیمے میں لکھ دی گئی ہے،[3] اس کا مطالعہ فرمالیں۔

واضح رہے کہ آج کل بعض علماء نے غسلِ جمعہ کے لئے مسجد سے نکلنے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اس کی کوئی اطمینان بخش دلیل احقر کو اب تک نہیں ملی۔ اور جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان نہیں ہوتا، اور فقہائے کرامؒ کے درمیان مشہور اور مُسلَّم مسئلہ وہی ہے جو احقر نے ''اَحکامِ اِعتکاف'' میں لکھا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۵/۸/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷۶/۳۵ د)

اِعتکافِ مسنون توڑنے کی صورت میں قضاء کا حکم

سوال:- اگر بغیر روزے کے اِعتکاف نہ ہوتا ہو اور اِعتکاف باطل ہوگیا ہو تو مذکورہ بالا حالت میں اپنا خیمہ مسجد میں چھوڑ کر گھر چلے جانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ اور جتنے دن تندرستی کی حالت میں اِعتکاف کے دن گزرے، کیا وہ اِعتکافِ مسنونہ یا نافلہ میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

جواب:- جتنا اِعتکاف اس نے روزے کی حالت میں کیا وہ اِعتکاف شمار ہوگا، اور اُس ایک دن کی قضاء کرنی ہوگی، قضاء کرنے کے لئے رمضان ضروری نہیں، لیکن روزہ ضروری ہے۔ قال

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۴۴، ۴۴۵ وحرم علیه الخروج الّا لحاجة الانسان طبیعیة کبول وغائط وغسل لو احتلم ولا یمکنه الاغتسال فی المسجد. وفی الشامیة (قوله ولا یمکنه ....الخ) فلو أمکنه من غیر أن یتلوث المسجد فلا بأس به. بدائع أی بأن کان فیه برکة ماء أو موضع معدّ للطّھارة أو اغتسل فی اناء بحیث لا یصیب المسجد الماء المستعمل قال فی البدائع: فان کان بحیث یتلوّث بالماء المستعمل یمنع منه لأنّ تنظیف المسجد واجب ....الخ. وفی الهندیة کتاب الصّوم، الباب السابع فی الاعتکاف ج:۱ ص:۲۱۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ثم ان أمکنه الاغتسال فی المسجد من غیر أن یتلوّث المسجد فلا بأس والا فیخرج ویغتسل ویعود الی المسجد.

(۳) ص:۶۱ تا ۶۵ (طبع دارالعلوم کراچی) ''اِعتکاف میں غسلِ جمعہ کا مسئلہ'' کے تحت حضرت والا دامت برکاتہم نے تفصیلی دلائل اور غسلِ جمعہ کی خاطر خروج کے جواز کے قائلین کے جوابات ذکر فرمائے ہیں، تفصیل کے لئے اُسے ملاحظہ فرمائیں۔

فی الشامیة: اذا فات عن وقته المعین، فان فات بعضه قضاه لا غیر ولا یجب الاستقبال (شامی ج:۲ ص:۱۳۳)۔ [1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۷/۲۷ و)

مشرک کے لئے اِعتکاف میں بیٹھنے کا حکم

سوال:- مشرک کو اِعتکاف میں بیٹھنا جائز ہے؟

جواب:- اِعتکاف عبادت ہے جو بغیر اسلام کے ادا نہیں ہوتی، لہٰذا غیر مسلم اِعتکاف میں نہیں بیٹھ سکتا۔ [2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

***

(۱) ردّ المحتار باب الاعتکاف ج:۲ ص:۴۴۷ (طبع سعید) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید) فیظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتکاف المسنون بالشروع وان لزوم قضاء جمعیه أو باقیه مخرج علٰی قول أبی یوسف امّا علٰی قول غیره فیقضی الیوم الّذی أفسدهٗ لاستقلال کل یوم بنفسه وانّما قلنا أی باقیه بناء علٰی أن الشروع ملزم کالنّذر وهو لو نذر العشر یلزمه کله متتابعا ولو أفسد بعضه قضٰی باقیه علٰی ما مرّ فی نذر صوم شهر معین والحاصل أن الوجه یقتضی لزوم کل یوم شرع فیه عندهما بناء علٰی لزوم صومه بخلاف الباقی لأنّ کل یوم بمنزلة شفع من النافلة الرباعیة وان کان المسنون هو اعتکاف العشر بتمامه تأمّل. وفی التتارخانیة الفصل الثانی عشر فی الاعتکاف ج:۲ ص:۴۱۴ ولو شرع فیه ثم قطع لا یلزمه القضاء فی روایة الأصل، وفی روایة الحسن یلزمه، وفی الظّهیریة عن أبی حنیفةؒ انّه یلزمه یومًا .... الخ.

(۲) فی الدرّ المختار ج:۲ ص:۴۴۱ (طبع سعید) والنیة من مسلم عاقل طاهر .... الخ. وفی الشامیة تحته: لأن النیة لا تصح بدون الاسلام .... الخ.

کتاب الحج

(حج کے مسائل)

﴿فصل فی من یفرض علیه الحج﴾

(حج کس پر فرض ہے؟)

غیر محرَم کے ساتھ سفرِ حج کا حکم

سوال:- میری والدہ جن کی عمر پچاس سال ہے اور وہ بیوہ ہیں، وہ اپنے ایک پڑوسی کے ساتھ حج کے لئے جانا چاہتی ہیں، موصوف اپنی زوجہ کے ساتھ جارہے ہیں، کیا میں ان کے ساتھ اپنی والدہ اور والدہ کی چچی کو بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- حنفی مسلک میں عورت خواہ جوان ہو یا بوڑھی، اس کے لئے حج پر جانے کے لئے محرَم کی رفاقت شرط ہے،[1] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر پڑوسی اس بیوہ کا محرَم نہیں ہے تو اس کے ساتھ نہیں جاسکتی۔

شرائطِ حج میں ہے: ومنها المحرَم للمرأة شابة كانت أو عجوزًا اذا كانت بينها وبين مكّة مسيرة ثلاثة أيام. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۱۸)۔[2]

لہٰذا حنفی مسلک میں حکم یہ ہے کہ جب تک محرَم نہ ملے، حج پر نہ جائے، اور آخر عمر تک محرَم نہ ملے تو وصیت کر جائے کہ میری طرف سے حجِ بدل کرا دیا جائے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۲۸ب)

---

(۱) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۱۴۷ (طبع قدیمی کتب خانه) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلٰثا إلّا معها ذو محرم. وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۴۶۴ و ۴۶۵ (طبع سعید) .... ومع زوج أو محرم بالغ .... ولو حجّت بلا محرم جاز مع الكراهة. وفی الشامية (قوله مع الكراهة) أی التحريمية للنّهی فی حديث الصحيحين: "لا تسافر امرأة ثلثاً الّا ومعها محرم" زاد مسلم فی رواية: "أو زوج".
وفی بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۲۳ (طبع سعید) (وأمّا) الّذی يخصّ النّساء فشرطان، أحدهما أن يكون معها زوجها أو محرم لها، فان لم يوجد أحدهما لا يجب عليها الحج، وهٰذا عندنا وعند الشافعی هٰذا ليس بشرط ..... ولنا ما روی عن ابن عباسؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه قال: الا لا تحجّن امرأة الّا ومعها محرم. وعن النبی صلی الله علیه وسلم أنّه قال: لا تسافر امرأة ثلاثة أيام الّا ومعها محرم أو زوج ولأنّها اذا لم يكن معها زوج ولا محرم لا يؤمن عليها .... الخ.
وكذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۱۵ (طبع سعید).
(۲) ج:۱ ص:۲۱۸، ۲۱۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۶۵ (طبع سعید) انّ وجود الزوج او المحرم شرط وجوب ام شرط وجوب اداء والّذی اختارهٗ فی الفتح أنّه مع الصّحة وأمن الطّريق شرط وجوب الأداء فيجب الايصاء ان منع المرض، وخوف الطّريق أو لم يوجد زوج ولا محرم .... الخ. وفی الفتاویٰ الخانية علیٰ هامش الهندية ج:۱ ص:۳۰۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) المرأة اذا لم تجد محرمًا لا تخرج الی الحج الّا أن تبلغ الوقت الّذی تعجز عن الحجّ فحينئذٍ تبعث من يحجّ عنها أمّا قبل ذٰلک لا يجوز الحج لتوهّم وجود المحرم .... الخ. (محمد زبیر حق نواز).

شوہر کی اجازت کے بغیر حج پر جانے کا حکم

سوال:- جناب والا! میں اپنی ایک دینی بہن کے حالات تحریر کر رہا ہوں، پڑھ کر اس کے سوالات کے جوابات شریعت کی رُو سے تحریر فرمائیں۔

اپنی دینی بہن کے حالات اس کی اپنی زبان میں لکھ رہا ہوں۔ میری بہن فرماتی ہیں: میرا خاوند بہت ہی بُری عادتوں میں مبتلا ہے، جس کا ذکر میرے لئے بھی اذیت ناک ہے، بُری عورتوں اور شراب میں مبتلا رہتا ہے۔ میں خود نماز، روزوں کی پابند ہوں، میں نے اور میرے بچوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پیار سے سمجھ جائیں، مگر وہ کسی صورت میں بھی بُری عادتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میرا خاوند آنکھوں کا ڈاکٹر ہے، اور میرے دو بیٹے بھی ڈاکٹر ہیں۔ میرا خاوند حج اور عمرہ کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا اور نہ ہی مجھے اپنے بیٹوں کے ساتھ حج اور عمرہ پر جانے کی اجازت دیتا ہے۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں، مثلاً کوٹھی اپنی ہے، کار بھی ہے اور ہر چیز گھر میں موجود ہے، مگر میں ان سب چیزوں کے باوجود بہت پریشان ہوں۔ میں نے اپنے خاوند کو یہ بھی کہا کہ وہ غلط کام چھوڑ دیں اور ایک اور شادی کرلیں، مگر وہ میری بات پر دھیان نہیں دیتے۔

۱:- میں نے اپنے خاوند کے لئے بہت سارے وظیفے اور تسبیحات کی ہیں کہ میرا خاوند دُرست ہوجائے، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، کیا میرے لئے یہ وظیفے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲:- کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ خاوند کی اجازت کے بغیر حج اور عمرہ پر جاسکتی ہوں یا نہیں؟ کیونکہ میرا خاوند اجازت نہیں دیتا۔

۳:- مہربانی فرما کر مجھے ایسا وظیفہ بتادیں کہ اس پر عمل کرنے سے میرا خاوند راہِ راست پر آجائے، اور میری پریشانی بھی دُور ہوجائے۔ اور یہ بھی جواب طلب ہے کہ میں نے ابھی تک فرض حج بھی ادا نہیں کیا، تو اس حالت میں کیا میرے لئے اپنے شوہر سے اجازت لے کر جانا ضروری ہے یا پھر اس حالت میں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی حجِ فرض ادا کرنے کے لئے اپنے بیٹے کے ساتھ جاسکتی ہوں؟

جواب:- آپ کی پریشانی دُور ہونے کے لئے دِل سے دُعا کرتا ہوں، آپ ہر نماز کے بعد یہ دُعا کم از کم تین مرتبہ پڑھا کریں:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ (۱)

---

(۱) سورۃ الفرقان: ۷۴۔

اگر آپ فرض حج کر چکی ہیں تو نفلی حج یا عمرے کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔ آپ کو ان شاء اللہ گھر بیٹھے نیت کے ذریعے حج اور عمرے کا ثواب ملے گا۔ اور اگر آپ پر حج فرض ہو چکا ہو اور آپ اپنے بیٹے کے ساتھ حج پر جا رہی ہوں تو شوہر حجِ فرض سے نہیں روک سکتا، اگر شوہر روکے تو عورت اس کی اجازت کے بغیر بھی جا سکتی ہے۔ **فی الدر: ولیس لزوجھا منعھا عن حجۃ الاسلام. فی الشامیۃ: أی اذا کان معھا محرم والّا فلہ منعھا کما یمنعھا عن غیر حجۃ الاسلام.** (ج:۲ ص:۴۶۵)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹/۴۰۱)

منہ بولے بھائی کے ساتھ سفرِ حج پر جانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنے لئے منہ بولی بہن بنائی ہے، کیا ایسی بہن کے ساتھ سفرِ حج کر سکتا ہے؟

جواب:- کسی غیر محرَم عورت کو زبان سے بہن کہہ دیا جائے تو وہ شرعاً بہن کے حکم میں نہیں ہوتی، اس لئے اس کا صرف اپنے منہ بولے بھائی کے ساتھ حج کے سفر میں جانا جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۷/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

لڑکیوں کی شادی کئے بغیر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

سوال:- میری عمر ۶۱ سال ہے، حج کی تمنا رکھتا ہوں، میں نے تقریباً پانچ ہزار روپے جمع کئے، حکومت نے دس ہزار کر دیئے۔ میری چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں، دو لڑکیوں کی شادی کر دی، دو گھر میں ہیں، جن کی عمر ۲۲ سال ہے، بڑا لڑکا ۲۲ سال، چھوٹا لڑکا ۱۶ سال کا ہے، دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دو لڑکیوں کی شادی کئے بغیر حج کر سکتا ہوں یا نہیں؟

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید). وفی غنیۃ الناسک ص:۱۲ (طبع قدیم ادارۃ القرآن کراچی) ولیس للزّوج منعھا عن حجّۃ الاسلام اذا کان معھا محرم والّا فلہ منعھا کما یمنعھا عن غیر حجۃ الاسلام .... الخ.

(۲) غیر محرَم کے ساتھ سفر کی ممانعت کے دلائل سابقہ صفحہ:۲۰۱ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- اگر آپ کے پاس اتنی رقم ہے جس سے حج ہوسکتا ہو تو آپ پر حج فرض ہے۔[1] حج کی فرضیت کا لڑکیوں کی شادی سے کوئی تعلق نہیں، حج کی ادائیگی کے لئے ان کی شادی کا انتظار کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱۰/۲۷ ه)

جہاز کی اکانومی کلاس میں ٹکٹ نہ ملنے کی بنا پر کیا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر حج پر جانا فرض ہے

سوال:- میں آپ کو زحمت اس لئے دے رہا ہوں کہ میری عمر ۶۳ سال ہوچکی ہے، اور میرے اُوپر حج فرض ہے، چنانچہ میں مشہد سے حج پر جانے کے لئے تین مرتبہ درخواستیں دے چکا ہوں، مگر قرعہ اندازی میں میرا نام نہیں نکلتا، معاملہ قسمت پر چھوڑ دوں یا پانی کے جہاز سے فرسٹ کلاس سے جانے کے لئے درخواست دوں؟ ایسا کرنے میں پہلے سال تو بہت اِمکان تھا، مگر اس میں دو باتیں ہیں:-

۱:- یہ کہ حکومتِ پاکستان علاوہ عرشہ کے اور تمام درجوں کے مسافروں سے بڑی بھاری رقم بونس واؤچر کے نام سے لیتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ رقم لینا اور دینا مذہباً کہاں تک دُرست ہے؟ حج میں تو کوئی نقصان نہ ہوگا؟

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ میرے چار بچے بھی ہیں، جن میں سے ایک لڑکی جوان بھی ہے، اور باقی تمام کے تمام شادی کی عمر میں ہیں۔ اگر میں عرشہ کے بجائے فرسٹ کلاس میں جاؤں تو اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ اولاد کی شادی میں دیر اور دِقت ہوگی، ان باتوں کو مدِنظر رکھ کر یہ فرمایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

جواب ۱:- اگر آپ کے پاس اپنی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد اتنا روپیہ ہے کہ اس کے ذریعے آپ بونس واؤچر پر حج کرسکیں تو آپ پر اس کے ذریعے حج کرنا واجب ہے۔ اور اولاد کی شادی ضروریاتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔ اور اگر اتنا روپیہ نہیں تو عرشہ کے ذریعے جانے کی درخواست دیتے رہئے، جب نام نکل آئے تو چلے جائیں، آخر عمر تک نہ ہوسکے تو حجِ بدل کی وصیت کرنا ضروری نہ ہوگا۔ فقہاءِ کرام کی مندرجہ ذیل تصریحات اس مسئلے سے متعلق ہیں:-

---

(۱) وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۴۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) .... ذی زاد وراحلة فضلا عما لا بد منه ونفقة عیاله الی عوده.

۱:- وهل ما يؤخذ من المكس والخفارة عذر قولان، والمعتمد لا كما في القنية والمجتبى، وعليه فيحتسب في الفاضل عما لا بد منه القدرة على المكس ونحوه كما في مناسك الطرابلسي، وكذا في الدر المختار، وقال الشامي: المكس ما يأخذه العشار والخفارة ما يأخذه الخفير وهو المجير ومثله ما يأخذه الأعراب في زماننا من الصر المعين. (شامی ج:۲ ص:۱۹۸)۔[۱]

۲:- وعلى تقدير أخذهم الرشوة فالاثم في مثله على الأخذ لا المعطى على ما عرف من تقسيم الرشوة في كتاب القضاء ولا يترک الفرض لمعصية عاص. (البحر الرائق ج:۲ ص:۳۳۸)۔[۲]

۳:- اذا وجد ما يحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج لان الحج فريضة أوجبها الله تعالىٰ علىٰ عبده كذا في التبيين. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۳۱)۔[۳]　　فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۸/۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جائے گا؟

سوال:- ایک غیر مستطیع شخص ایامِ حج کے علاوہ کے دنوں میں عمرے کے واسطے چلا جائے، کیا اس پر حج فرض ہو جائے گا؟ یہ جو مشہور ہے کہ جس نے خود حج نہ کیا ہو، وہ حجِ بدل کے لئے نہ جائے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- غیر ایامِ حج میں عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، جب تک کہ اَشہرِ حج میں اسے حج کرنے کی استطاعت پیدا نہ ہو،[۴] اور یہ صحیح ہے کہ جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے دُوسرے کی

---

(۱) ج:۲ ص:۴۶۳، ۴۶۴ (طبع سعید).　　(۲) ج:۲ ص:۳۱۴ (ایضًا).

(۳) ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۴) وفي الغنية ص:۸ (طبع ادارة القرآن) السابع الوقت أى وجود القدرة فيه، وهو أشهر الحج، أو وقت خروج أهل بلدهٖ ان كانوا يخرجون قبلها، فلا يجب الّا على القادر فيها أو في وقت خروج أهل بلده فان ملک المال قبل الوقت فله صرفه حيث شاء .... الخ.

وفي ارشاد الساري ص:۳۳ (طبع مصطفى محمد مصر) السابع من شرائط الوجوب، الوقت وهو أشهر الحج أو وقت خروج أهل بلدهٖ .... فان ملكهٗ أى المال قبل الوقت أى قبل الأشهر أو قبل أن يتاهب أهل بلدهٖ فله صرفه حيث شاء ولا حج عليه.

وفي الغنية ص:۴ (طبع ادارة القرآن كراچی) (السادس) الاستطاعة، وهى القدرة علىٰ زاد يليق بحالهٖ .....الخ. وفيها أيضًا (ص:۲) والرّاحلة شرط في حقّ الأفاقي فقط قدر على المشى أو لا، امّا المكى ومن حولها وهو من كان داخل المواقيت الى الحرم فلا يشترط في حقّه الرّاحلة اذا كان قادرًا على المشى بلا مشقة زائدة والا فكالأفاقي واما الزّاد فشرط لا بدّ منه قدر ما يكفيه وعياله في أيام اشتغاله بنسک الحج .... الخ. ....(باقی اگلے صفحے پر)

طرف سے حجِ بدل کرنا دُرست نہیں، البتہ ایسا شخص اگر حجِ بدل کی نیت سے حج کرلے تو اس سے حجِ بدل ہی ادا ہوگا، اس کا اپنا حج نہیں ہوگا۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۹/ ۲۸ الف)

ضرورت سے زائد مزروعہ زمین کو فروخت کر کے حج پر جانا فرض ہے

سوال:- فتاویٰ ہندیہ اُردو جلد دوم صفحہ:۴۵ میں لکھا ہے ''اگر کوئی شخص مزروع زمین کا مالک ہے، اور اس کے پاس اس قدر زمین ہے کہ اگر اس میں سے تھوڑی سی زمین بیچ ڈالے تو حج کے اخراجات کے لئے اور بچوں کی ضرورت کے لئے کافی ہے، پھر بھی اتنی زمین بچی رہے گی جس کی آمدنی سے گزر کرسکتا ہے، تو اس پر حج فرض ہوگا'' فرمائیے کیا اس صورت میں حج فرض ہوگا؟

جواب:- فرضیتِ حج کے لئے زکوٰۃ کی طرح مالِ نامی کا مالک ہونا شرط نہیں،[۲] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یعنی کسی شخص کے پاس نقد روپیہ نہ ہو، لیکن گزارے کی ضرورت سے زیادہ زمین یا مکان ہو جسے فروخت کرکے حج کرسکتا ہو تو اس پر حج فرض ہے۔ فتاویٰ ہندیہ کی عبارت یہ ہے: **وان کان صاحب ضیعة ان کان لهٗ من الضیاع ما لو باع مقدار ما یکفی الزاد والراحلة ذاهبا وجائیا**

......(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۴۶۰ (طبع سعید) والحاصل أن الزّاد لا بدّ منه ولو لمکّی کما صرّح به غیر واحد کصاحب الینابیع والسراج وما فی الخانیة والنّهایة من أن المکی یلزمه الحج ولو فقیرًا لا زاد لهٗ، نظر فیه ابن الهمام الّا أن یراد ما اذا کان یمکنه الاکتساب فی الطّریق .... وبعد أسطر .... (تنبیه) فی اللّباب :- الفقیر الأفاقی اذا وصل الی میقات فهو کالمکی قال شارحه أی حیث لا یشترط فی حقّه الّا الزّاد والرّاحلة .... الخ. (وراجع للتفصیل الیها).

اور زبدۃ المناسک ص:۲۱ میں ''ضروری فائدہ'' کے تحت ہے: .... جب مکہ مکرّمہ میں آکر داخل ہوا اور کعبۃ اللہ شریف میں آپہنچا تو اب اس پر فرضیتِ حج متعین ہوجائے گی بالاتفاق .... لیکن اس فقیر پر یہ فرضیتِ حج بالاتفاق تب ہوگی جب اَشہرِ حج میں آکر کعبۃ اللہ شریف میں پہنچا ہو، اور ایامِ حج کا خرچہ کھانے کا بھی رکھتا ہو اور عرفات پر پیادہ جانے کی قدرت بھی رکھتا ہو .... الخ۔ نیز دیکھئے: حیات القلوب ص:۲۶، ۲۷۔

(۱) وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۵۴۶ (طبع ادارة القرآن) والأفضل للانسان اذا أراد أن یحجّ رجلًا عن نفسه (أن یحجّ رجلًا قد حجّ عن نفسه) فانّ الذی لم یحجّ عن حجّة الاسلام عن نفسه لم یجز حجّته عن غیره عند بعض النّاس، ومع هٰذا لو أحجّ رجلًا لم یحجّ عن نفسه حجّة الاسلام یجوز عندنا .... الخ. نیز ''حج صرورة'' سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے صفحہ:۲۱۵ تا ۲۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی ارشاد الساری ص:۲۸ (طبع مصطفی محمد مصر) (ونصاب الوجوب) أی مقدار ما یتعلق به وجوب الحج من الغنی، ولیس له حد من نصاب شرعی علٰی ما فی الزکاة بل هو (ملک مال یبلغه الی مکّة) بل الٰی عرفة (ذاهبا) أی الیها (وجائیا) أی راجعًا الی وطنه. (محمد زبیر حق نواز)

ونفقة عياله وأولاده ويبقى له من الضّيعة قدر ما يعيش بغلة الباقي يفترض عليه الحج والّا فلا.
(فتاویٰ عالمگیریہ)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۲۰/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۲۸ الف)

۱:- کیا عمرہ کرنے کے بعد حج فرض ہوجاتا ہے؟
۲:- اگر کوئی شخص بڑھاپے میں غنی ہوجائے تو کیا اس پر حج فرض ہوگا؟

سوال ۱:- کیا عمرہ کرنے کے بعد حج کرنا فرض ہوجاتا ہے، جبکہ اس پر حج فرض نہ ہوا ہو؟
۲:- اگر کوئی شخص زیادہ عمر یا ضعیفی کے زمانے میں تونگر ہوجائے تو کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، جبکہ اس کی لاغری مانع ہو؟

جواب ۱:- عمرہ اگر ایامِ حج کے علاوہ دُوسرے ایام میں کیا جائے تو اس سے حج فرض نہیں ہوتا، البتہ ایامِ حج میں مکہ مکرّمہ پہنچنے سے حج فرض ہوجاتا ہے، كذا في عمدة المناسك مع زبدة المناسك: ۱۳۱۔[۲]

۲:- اگر صحت وقوت کی حالت میں حج فرض نہیں تھا اور جب اتنا بوڑھا ہوگیا کہ سواری پر بغیر شدید مشقت کے سوار نہیں ہوسکتا، اور اس وقت حج کرنے کے لائق رقم حاصل ہوئی، تو اس کے بارے میں فقہاءِ حنفیہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسے شخص پر حج بالکل فرض نہیں، نہ خود کرنا فرض ہے اور نہ کسی دُوسرے سے کرانا، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک ایسے شخص پر خود تو حج کرنا فرض نہیں لیکن کسی دُوسرے سے کرانا فرض ہے۔ مشائخِ حنفیہ میں سے بعض حضرات نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے، اور بعض نے دُوسرے کو۔ احتیاط اسی میں ہے کہ ایسا شخص صاحبینؒ کے قول پر عمل کرے اور کسی دُوسرے شخص سے اپنی طرف سے حج کروائے یا کم از کم اس کی وصیت کردے کہ میری طرف سے حج کیا جائے۔

في رد المحتار: فلا يجب على مقعد ومفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه .... لا بأنفسهم ولا بالنيابة في ظاهر المذهب عن الامام وهو رواية عنهما، وظاهر الرواية عنهما وجوب الاحجاج عليهم .... وظاهر التحفة اختيار قولهما، وكذا الاسبيجابي

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۸. وفي غنية النّاسك ص:۷ (طبع ادارة القرآن كراچي) وان كان له من الضّياع ما لو باع مقدار ما يكفي الزّاد والرّاحلة يبقى بعد رجوعه من ضيعته قدر ما يعيش بغلّته الباقي يفترض عليه الحج والّا فلا كذا في الخانية. (محمد زبیر حق نواز)
(۲) ص:۲۱.

وقواه فی الفتح .... وحکی فی اللّباب اختلاف التصحیح. (شامی ج:۲ ص:۱۴۲)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۲/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۶۱و)

نکاح ہونے کی صورت میں شوہر اور بیوی کا حج پر جانا جائز ہے

سوال:- عارفہ ۱۹۵۰ء میں اپنے شوہر سے تنگ آکر سندھ سے ملتان چلی گئی، اور ابراہیم شاہ سے پناہ طلب کی، ابراہیم شاہ نے عارفہ کو پناہ میں رکھا، اس دوران عارفہ کے شوہر نے کوئی خرچ نہیں دیا، اور عارفہ کا نان نفقہ ابراہیم شاہ برداشت کرتا رہا، ۱۹۵۱ء میں عارفہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا، بعد عدّت عارفہ نے ابراہیم شاہ سے نکاح کرلیا، ۱۹۵۲ء ۱۷/اپریل کو ملتان چھاؤنی میں عبدالمنان امامِ مسجد نے نکاح پڑھایا، احمد علی، خدابخش ولد خان جانگلہ گواہ تھے، ان کے رُوبرو نکاح ہوا، اُس وقت فارم اور رجسٹرڈ کا عام رواج نہیں تھا، یہ حلفیہ بیان ہے، اب ابراہیم شاہ اور عارفہ دونوں حج کو جانا چاہ رہے ہیں، یہ اپنے عزیزوں کو اس سلسلے میں مدعو کرنا چاہتے ہیں، ان کی اس دعوت میں عزیزوں کا جانا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب عارفہ اور ابراہیم شاہ کے درمیان شرعی طور پر نکاح ہوچکا ہے، تو اب یہ دونوں ساتھ حج کو جاسکتے ہیں، اور ان کی دعوت قبول کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ کوئی اور مانعِ شرعی موجود نہ ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۹۱و)

---

(۱) ج:۲ ص:۴۵۹ (ایچ ایم سعید). وفی غنیة الناسک ص:۹ (مطبع ادارة القرآن کراچی) وأما شرائط وجوب الأداء فخمسة علی الأصح الأوّل: الصحة .... فلا یجب الحج علی المقعد والزمن والمفلوج، ومقطوع الرجلین أو الیدین، أو الرجل الواحدة، والأعمٰی والمریض والمعضوب وهو الشیخ الکبیر الذی لا یثبت علی الراحلة بنفسه وان ملکوا ما به الاستطاعة، فلیس علیهم الاحجاج أو الایصاء، وعندهما یجب الحج علیهم اذا ملکوا الزاد والراحلة، ومؤنة من یرفعهم ویضعهم .... ولٰکن لیس علیهم الأداء بأنفسهم فعلیهم الاحجاج أو الایصاء به عند الموت، وصححه قاضی خان واختاره کثیر من المشایخ، منهم ابن الهمام، وأما ظاهر المذهب فصححه فی النهایة، وقال فی البحر العمیق: هو المذهب الصحیح فقد اختلف التصحیح، وان ملکوا الزاد والراحلة، ولم یجدوا مؤنة من یقودهم لا یجب علیهم الحج فی قولهم .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۲۱۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه). (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی المواقیت﴾
(میقات سے متعلق مسائل کا بیان)

جدہ تک بغیر اِحرام کے جانے والا مسافر اگر کسی دُوسری میقات سے اِحرام باندھ لے تو اس پر دَم نہیں
(''جواہر الفقہ'' کی ایک عبارت کی تحقیق)

سوال:- ''جواہر الفقہ'' کے ذیل کی عبارت: ''اس لئے اہلِ پاکستان اور ہندوستان کے لئے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی اِحرام باندھ لیں، اگر بغیر اِحرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعے جدہ پہنچ گئے تو ان کے ذمہ دَم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہوجائے گی'' میں یہ اِشکال ہے کہ میقات سے بغیر اِحرام گزرنے پر جو دَم لازم ہوتا ہے، وہ عود الی المیقات سے ساقط ہوجاتا ہے، تو ہوائی جہاز میں مسافر پر اگر دَم واجب ہوا لیکن جب وہ جدہ پہنچ گیا اور اِحرام وہاں سے باندھا تو چاہئے کہ وہ دَم ساقط ہوجائے، کیونکہ درمختار میں ہے: وحرم تأخیر الاحرام عنها. (در مختار) وقال علیه المحشی فعلیه العود الٰی میقات منها وان لم یکن میقاته لیحرم منه والا فعلیه دَم کما سیأتی بیانه فی الجنایات (تحت مطلب فی المواقیت ج:۲) فان عاد الٰی میقات ما ثم احرم الٰی قوله .... سقط دمه. (درمختار باب الجنایات)۔

لیکن اس میں اب یہ بات ذہن میں آئی کہ دَم جو بغیر اِحرام کے میقات سے گزرنے پر لازم ہوتا ہے، وہ تب ساقط ہوتا ہے جب یہ شخص کسی ایک میقات کو رُجوع کرے اور جدہ میقات نہیں، لہٰذا اس سے اِحرام باندھنے پر وہ دَمِ واجب ساقط نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ''جواہر الفقہ'' کی عبارت بظاہر صحیح ہے، اگرچہ جدہ سے اِحرام باندھنا اس وجہ سے صحیح ہے کہ وہ میقات کا محاذی ہے۔ سو حاصل یہ نکلا کہ میقات اور محاذی میقات ان دونوں سے اِحرام باندھنا صحیح ہے، لیکن اگر میقات پر بغیر اِحرام کے گزرنے سے دَم واجب ہوا تو وہ عودالی المیقات سے ساقط ہوجائے گا، لیکن عودالیٰ محاذی المیقات سے ساقط نہیں ہوگا۔ مؤدّبانہ گزارش ہے کہ میری اس رائے کی تصحیح یا تردید سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- عزیز گرامی قدر مولانا محمد سردار صاحب سلمہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہت عرصہ قبل آپ نے ایک سوال بھیجا تھا، جو اِحرام کے بغیر جدہ تک پہنچنے سے متعلق تھا،

چونکہ معاملہ قدرے غور وفکر اور مراجعت کا محتاج تھا، اس لئے فوراً جواب نہ دے سکا، اب کچھ غور کرنے کا موقع ملا تو جواب عرض ہے۔

جواہر الفقہ[1] میں ہوائی جہاز کے مسافروں کے لئے جدہ تک بغیر احرام چلے جانے پر جو دَم کا وجوب لکھا ہے، غور وفکر اور علماء سے مشورے کے بعد ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تسامح ہوا ہے، شاید اس وقت ذہن اس طرف گیا ہو کہ مجاوزت قرن المنازل کے میقات کی بغیر احرام ہوئی، لہٰذا پھر عود اس کی طرف نہیں ہوا، بلکہ دُوسرے میقات کی محاذات کی طرف عود ہوا ہے، اس لئے دَم ساقط نہیں ہوا، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ اگر عود کسی اور میقات کی طرف ہو تب بھی دَم ساقط ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بدائع میں ہے: "ولو عاد الی میقات اخر غیر الذی جاوزہ قبل أن یفعل شیئًا من افعال الحج سقط عنه الدم، وعوده الیٰ هذا المیقات والیٰ میقات اٰخر سواء." (بدائع الصنائع ج:۲ ص:۱۶۵، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

اور آپ نے جو احتمال تحریر فرمایا ہے کہ سقوطِ دَم میقات پر عود کرنے سے ہوتا ہے، محض محاذات کی طرف عود کرنے سے نہیں، سو یہ احتمال احقر کی نظر میں نیز دُوسرے علماء جن سے مشورہ ہوا، ان کی نظر میں بھی صحیح نہیں، کیونکہ محاذات جمیع اَحکام میں میقات کے قائم مقام ہے، اگر کوئی فرق ہوتا تو فقہائے کرام ضرور تصریح فرماتے۔[2]

لہٰذا اب مسئلہ صحیح یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز سے جانے والا اگر قرن المنازل کی محاذات سے بغیر اِحرام گزر گیا اور پھر جدہ پہنچ کر اِحرام باندھا تو مجاوزتِ میقات بغیر اِحرام کا گناہ اسے ضرور ہوگا، لیکن دَم واجب نہیں ہوگا، کیونکہ وہ دُوسرے میقات کی طرف نکل گیا ہے اور وہاں سے اِحرام باندھ رہا ہے، هذا ما ظهر لی، واللہ اعلم۔

اگر کوئی اور بات آپ کے ذہن میں آئے تو احقر کو مطلع فرمایئے گا۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۴۰۳/۸/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۲۰/۳۴ د)

---

(۱) جواهر الفقه ج:۱ ص:۴۷۵ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی).

(۲) بلکہ حضراتِ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے محاذاتِ میقات پر عود کرنے پر بھی سقوطِ دَم کی تصریح فرمائی ہے، چنانچہ غنیة الناسک باب مجاوزة المیقات بغیر احرام، فصل فی مجاوزة الأفاقی وقته ص:۶۰ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) میں ہے: وعن أبی یوسف رحمه الله تعالیٰ أن کان الّذی یرجع الیه محاذیًا لمیقاته الّذی جاوزهٗ أو أبعد منه سقط الدّم والّا فلا، فان لم یعد ولا عذر لهٗ أثم أخریٰ لترکه العود الواجب .... الخ. اسی طرح مناسک مُلّا علی القاریؒ باب المواقیت ص:۸۴ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) کے حاشیہ پر فتح القدیر کے حوالے سے ہے: قال فی فتح القدیر وعن أبی یوسف رحمه الله ان کان الّذی رجع الیه محاذیًا لمیقاته أو أبعد منه، فکمیقاته .... الخ. (محمد زبیر)

﴿فصل فی الإحرام وما هو محذور فيه أو مباح﴾

(اِحرام اور اس کے مباحات وممنوعات کا بیان)

اِحرام کے لئے سلا ہوا کپڑا اور ٹیٹرون استعمال کرنے کا حکم

سوال:- اِحرام کے لئے سلا ہوا کپڑا پہننا دُرست ہے یا نہیں؟ دُوسری بات یہ کہ اِحرام کے لئے ٹیٹرون استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟ (عبدالوحید، ریاض سعودی عرب)

جواب:- آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ۱۰ اور ۱۱ رشوال کی درمیانی شب میں واصل بحق ہوچکے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے لئے دُعائے مغفرت اور ہمارے لئے صبر وسکون اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی دُعا فرمائیں۔ اِحرام کے لئے سلے ہوئے کپڑے کا استعمال دُرست نہیں ہے۔[1] ٹیٹرون کے اِحرام میں کچھ حرج نہیں بشرطیکہ سلا ہوا نہ ہو، والسلام۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
ابن حضرت مفتی صاحبؒ
۱۳۹۶/۱۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۷۷/۲۷و)

---

(۱) وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۲۳ (طبع سعید) قوله فاتّق الرفث .... قولهٗ ولبس القميص والسراويل .... وفيه ص:۳۲۴ وذكر الحلبی فی مناسكه أن ضابطه لبس كل شئ معمول علٰى قدر البدن أو بعضه بحيث يخيط به بخياطة أو تلزيق بعضه ببعض .... الخ.

﴿فصل فی القران والتّمتع﴾
(حجِ قران اور تمتع سے متعلق مسائل کا بیان)

سعودی عرب میں مقیم شخص کے لئے حجِ قران کا حکم

سوال:- میرا لڑکا سعودی عرب میں مقیم ہے، اس نے آخری عمرہ گزشتہ رمضان المبارک میں جمعۃ المبارک پر کیا تھا، کیا اب وہ حجِ قران کرسکتا ہے یا تمتع کرنا پڑے گا؟ اس کے شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے صاحبزادے حدودِ میقات میں مقیم نہیں ہیں تو وہ قران کرسکتے ہیں،[1] رمضان المبارک میں عمرہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۷/۲۷و)

حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے والے جدہ میں مقیم شخص کے لئے حجِ قران کا حکم

سوال:- زید جدہ میں مقیم ہے، اَشہرِ حج میں عمرہ بھی کیا ہے، قران کا اِحرام بھی باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اَشہرِ حج میں عمرہ کے افعال بجالاکر وقوفِ عرفہ سے پہلے پہلے حلال ہو چکا ہو اس کے لئے قران جائز نہیں، (کذا فی زبدۃ المناسک ص:۲۸۴)[2] اور جدہ کا مقیم حِلّی میقاتی کے حکم

---

(۱) (وهو) أی القِران (أن يجمع الأفاقی) أی لا المكّی والميقاتی ليكون قرانه مسنونا بين الحج والعمرة. (مناسک مُلّا علی القاریؒ ص:۲۵۶ طبع ادارة القرآن). و كذا فی غنية النّاسک ص:۱۰۹ (طبع ادارة القرآن كراچی).

(۲) زبدة المناسک مع عمدة المناسک قران کا بیان مسئلہ نمبر۲ ص:۲۹۳. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۵۳۹ (طبع سعيد): والمكی ومن فی حكمه يفرد فقط، ولو قرن أو تمتع جاز وأساء، وعليه دَم جبر، وفی ردالمحتار: ومن فی حكمه أی من أهل داخل المواقيت. (قوله يفرد فقط) هذا ما دام مقيمًا .... قال المحبوبی هذا اذا خرج الی الكوفة قبل أشهر الحج وأما اذا خرج بعدها فقد منع من القران فلا يتغير بخروجه من الميقات كذا فی العناية وقول المحبوبی هو الصّحيح. ....(باقی اگلے صفحے پر)

میں ہے، اس لئے بھی اس کے لئے قران اور تمتع جائز نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جدہ کے اس مقیم کے لئے قران کا اِحرام باندھنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۲۸ الف)

فصل فی العمرة
(عمرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

ابتداءً حج کے لئے رقم جمع کرنی چاہئے یا عمرہ کو ترجیح دے؟

سوال:- کیا کوئی شخص عمرہ پر اکتفاء کرسکتا ہے یا حج ہی کے لئے روپیہ جمع کرے؟ کیا وہ عمرہ کو ترجیح دے سکتا ہے؟

جواب:- جس شخص نے حج نہیں کیا، اسے حج ہی کے لئے رقم جمع کرنی چاہئے، لیکن اگر حجِ فرض کر چکا ہے تو اب عمرہ پر اکتفاء کرنا دُرست ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۱۶۱/۲۷ و)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)............ وفی الهداية ج:۱ ص:۲۶۳ ليس لأهل مكة تمتع ولا قران وانّما لهم الافراد خاصّةً خلافًا للشافعيّ والحجّة عليه قوله تعالىٰ: "ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" ولأنّ شرعهما للترفّه باسقاط احدى السفرتين وهٰذا فی حقّ الآفاقی، ومن كان داخل المواقيت فهو بمنزلة المكّی حتّى لا يكون له متعه ولا قران، وفی فتح القدير نقلًا عن البدائع: ....انّ العمرة دخلت فيها رخصة للآفاقی ضرورة تعذر انشاء سفر للعمرة نظرًا لهٗ وهٰذا المعنىٰ لا يوجد فی حق أهل مكة ومن بمعناهم فلم تكن العمرة مشروعة فی اشهر الحج فی حقّهم.
وفی غنية النّاسك ص:۲۱۹ لا تمتع ولا قران، ولا جمع بينهما فی غير أشهر الحج لأهل مكة وأهل المواقيت الخمسة، ومن دونها الىٰ مكّة سواء كان بينه وبين مكّة مسيرة سفر أو لا .... الخ.
اور زبدۃ المناسک ص:۳۰۵ (طبع سعید) میں ہے: مکہ مکرمہ کے رہنے والوں اور میقات پر یا میقات کے اندر حل میں رہنے والوں کو قران اور تمتع کرنا جائز نہیں۔ (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

﴿فصل فی الحجّ عن الغیر والبدل والوصیّۃ﴾

(حجِ بدل اور نفلی حج سے متعلق مسائل کا بیان)

ا:- جس نے اپنا حجِ فرض نہ کیا ہو اس سے حجِ بدل کرانے کا حکم
۲:- حجِ بدل کے لئے مکہ مکرّمہ جانے سے کیا اپنے اُوپر حج فرض ہوجاتا ہے؟

سوال ا:- میرے والد مرحوم پر حج فرض نہ تھا، میں بغرضِ ایصالِ ثواب ان کے لئے حجِ بدل کرانا چاہتا ہوں۔ ایک عالم اس کام پر آمادہ ہیں، لیکن انہوں نے اپنا حج نہیں کیا ہے، اور نہ ان پر حج فرض ہے۔ کیا ایسا شخص جس نے اپنا حجِ فرض نہ کیا ہو کسی کی طرف سے حجِ بدل کرسکتا ہے؟

۲:- اور جس شخص پر حج فرض نہ ہو اور زمانۂ حج میں مکہ معظّمہ پہنچ جائے تو کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے؟

جواب ا:- افضل اور بہتر تو تمام فقہاء کے نزدیک یہی ہے کہ حجِ بدل اس شخص سے کرایا جائے جو اپنا حجِ فرض ادا کرچکا ہو، اور جس شخص نے اپنا حجِ فرض ادا نہ کیا ہو اس کے ذریعے حجِ بدل کرانا مکروہِ تنزیہی ہے، اور جس شخص کو حجِ بدل پر بھیجا جارہا ہے، اگر اس کے ذمے خود حج فرض ہے اور وہ ابھی ادا نہیں کیا تو اس کے لئے حجِ بدل پر جانا مکروہِ تحریمی اور ناجائز ہے،(۱) البتہ بھیجنے والے کا حج بہرصورت ادا ہوجائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کسی ایسے شخص کا حجِ بدل کے لئے انتخاب کریں جو پہلے

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۶۰۳ (طبع سعید) قال فی البحر: والحق أنها تنزیهیة علی الأمر لقولهم والأفضل الخ. تحریمیة علی الصّرورة المأمور الذی اجتمعت فیه شروط الحج ولم یحج عن نفسه لأنه أثم بالتأخیر الخ.
وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۶ ص:۵۷۳.
وفی حاشیة البحر الرائق ج:۳ ص:۶۹ أن حج الصّرورة عن غیره ان کان بعد تحقق الوجوب علیه بملک الزاد والراحلة والصحة فهو مکروه کراهة تحریم علیه لأنه یتضیق علیه.
وفی البحر الرائق ج:۳ ص:۷۰ والحق أنها تنزیهیة علی الأمر تحریمیة علی الصرورة المأمور الذی اجتمعت فیه شروط الحج ولم یحج عن نفسه لأنه آثم بالتأخیر.

اپنا حج کرچکا ہو،[۱] حج فرض کے معاملے کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔

۲:- جس شخص نے اپنا حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض نہیں تھا، تو بعض علماء کے نزدیک محض حجِ بدل کے لئے مکہ معظمہ پہنچ جانے سے اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، لیکن راجح قول یہی ہے کہ اس طرح حج فرض نہیں ہوتا، کذا فی جواهر الفقه. (ج:۱ ص:۵۰۷)۔[۲]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۴۷۶/ ۲۸ ب)

مسئلۂ حجِ صرورہ

(''حجِ صرورہ'' کی مفصّل اور مدلل تحقیق)

سوال:- صرورہ کسے کہتے ہیں؟ اور کیا جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو اُسے دُوسرے کی طرف سے حج پر بھیجنا جائز ہے؟ اگر بھیجا جائے تو حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟ اور ایسا شخص دُوسرے کی طرف سے حج کرے تو کیا اس سے خود اس پر حج فرض ہوجائے گا؟ براہِ کرم یہ مسئلہ مفصّل و مدلل بیان فرمادیں۔

جواب:- جس شخص نے اپنا حج ادا نہ کیا ہو، اس کو ''صرورہ'' کہتے ہیں، وہ اگر دُوسرے کی طرف سے حج کرے تو وہ حنفیہ کے یہاں ادا ہوجاتا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: **فجاز حجّ الصّرورة بمهملة من لم يحجّ** ۔ (درمختار مجتبائی ص:۱۸۲)[۳] بشرطیکہ حج کرنے والے کو کوئی ایسا عذر لاحق نہ ہو کہ جو موت تک مستمر رہے، مگر زائل ہونا ممکن ہو، کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو مالی بھی ہے اور بدنی بھی، اور ایسی عبادت کے بارے میں فقہاءؒ نے یہی حکم دیا ہے، درّ مختار میں ہے: **والمركبة منهما كحج الفرض تقبل النيابة عند العجز فقط لٰكن بشرط دوام العجز الى الموت.** (ص:۱۸۱ مجتبائی)[۴] اور ''بذل المجهود'' میں ہے: **ومركبة من البدنية والماليّة كالحج لا تجرى فيها النّيابة فى غير عذر.** (بذل المجهود ج:۳ ص:۱۱۲)[۵] **ومثله فى كتاب الفقه على المذاهب الأربعة.** (ج:۱ ص:۷۰۷،)[۶] لیکن چونکہ ایک چیز کا ادا ہوجانا اور چیز ہے اور فی نفسہٖ مکروہ ہونا

---

(۱) وفى الفتاوى التاتارخانية ج:۲ ص:۵۴۶ (طبع ادارة القرآن كراچى) والأفضل للانسان اذا أراد أن يحج رجلا عن نفسه. (أن يحج رجلا قد حج عن نفسه) فان الذى لم يحج عن حجة الاسلام عن نفسه لم يجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هٰذا لو أحج رجلا لم يحج عن نفسه حجة الاسلام يجوز عندنا .... الخ.

وفى البحر الرائق ج:۳ ص:۶۹ والأفضل احجاج الحرّ العالم بالمناسك الّذى حجّ عن نفسه.

(۲) نیز ''حج صرورة'' سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے اگلے تفصیلی فتویٰ میں فریقین کے دلائل اور راجح قول ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدرّ المختار ج:۲ ص:۶۰۳ (طبع سعيد). (۴) ج:۲ ص:۵۹۸ (ايضًا)

(۵) طبع مكتبه قاسميه ملتان. (۶) طبع شركة فن الطباعة، مصر. (محمد زبیر)

اور چیز، اس لئے یہاں بھی حجِ صرورہ فی نفسہٖ تو مکروہ ہے، لیکن اگر کوئی کرلے تو ادا ہوجائے گا۔

اب اس کراہت کی نوعیت میں تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اگر حجِ بدل کرنے والا ایسا شخص ہے کہ جس پر حج فرض تھا مگر اس نے نہیں کیا، تب تو اس کے لئے حجِ بدل کرنا مکروہِ تحریمی ہے، اور حج کروانے والے کے لئے مکروہِ تنزیہی ہے۔ (شامی ج:۲ ص:۲۳۱)(۱) اور اگر حجِ بدل کرنے والے پر حج فرض نہیں ہے تو دونوں کے لئے مکروہِ تنزیہی یعنی خلافِ اَولیٰ ہے۔ بہرحال! افضل یہی ہے کہ حجِ بدل اس شخص سے کرایا جائے جس نے اپنا حج کرلیا ہو، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: **والأفضل للانسان اذا أراد أن يحج رجلا عن نفسه أن يحجّ رجلًا قد حجّ عن نفسه ومع هٰذا لو أحجّ رجلًا لم يحجّ عن نفسه حجّة الاسلام يجوز عندنا.** (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۷۴)(۲) اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے: **قالوا وينبغي أن يكون الحاجّ رجلًا حجّ مرّةً.** (فتاویٰ خانیہ ج:۱ ص:۲۶۰)(۳)۔

اور تنقیح حامدیہ میں ہے: **يجوز لمن لم يكن حجّ عن نفسه أن يحجّ عن غيره لٰكنّه خلاف الأفضل.** (العقود الدّرّية ج:۱ ص:۱۳)(۴)۔

الغرض! ان اور ان جیسی دُوسری نصوص سے یہ بات تو پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ حجِ صرورہ عن الغیر خلافِ اَولیٰ ہے، لیکن ادا ہوجاتا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر کوئی صرورہ حجِ بدل کرے تو اس پر اپنا حج فرض ہوجاتا ہے یا نہیں؟ سو اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے، حتیٰ کہ کئی علماء نے اس پر مستقل رسالے لکھے ہیں، جن میں سے سیّد عبدالغنی نابلسی اور سیّد احمد بادشاہ رحمہما اللہ کے رسالوں کا ذکر علامہ شامی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ (العقود الدریۃ ج:۱ ص:۱۳،(۵) وشامی ج:۲ ص:۲۳۲)(۶)۔

اور یہ اختلاف بھی متقدمین میں نہیں ہے، بلکہ مشائخِ متأخرینؒ میں ہے، جیسے کہ علامہ حامد آفندی عمادیؒ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے: **وهل يجب عليه ان يمكث بمكّة حتّٰى يحجّ عن نفسه لم أرهٗ الّا في فتاوىٰ أبي السّعودؒ.** (تنقیح الحامدیۃ ج:۱ ص:۱۳)(۷)۔

---

(۱) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۳ (طبع سعید).
(۲) ج:۱ ص:۲۵۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۳) الفتاویٰ الخانیة علٰی هامش الهندیة ج:۱ ص:۳۰۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۴) كتاب الحج ج:۱ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بيروت).
(۵) كتاب الحج ج:۱ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بيروت).
(۶) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۷) ج:۱ ص:۱۳.

تنقیح خلاف

مجمع الأنهر کے مصنف تحریر فرماتے ہیں: ویجوز احجاج الصّرورة ..... ولٰکن یجب علیه عند رؤیة الکعبة الحجُّ لنفسه وعلیه أن یتوقف الٰی عامٍ قابلٍ ویحجّ لنفسه أو أن یحجّ بعد عوده أهله بماله وان فقیرًا فلیحفظ والنّاس عنها غافلون. (مجمع الأنهر ج:۱ ص:۳۰۸)[۱]۔

مُلّا علی قاریؒ نے بھی شرح منسک کبیر میں اس کی تائید فرماتے ہوئے لکھا ہے: انـه بوصولـه لمکّة وجب علیه الحجّ. (بحوالہ العقود الدریة ج:۱ ص:۱۳)[۲] سیّد احمد بادشاہ رحمہ اللہ نے بھی ایک مستقل رسالہ لکھ کر اس کی تائید کی ہے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، (بحوالۂ مذکورہ)[۳]۔

علامہ ابن حمزہ نقیبؒ نے بھی نهج النجاة میں اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ (شامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۴] علامہ ابوالسعودؒ[۵] اور صاحب سکبُ الأنهر نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ (ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۳۲)[۶]۔

اس کے برخلاف مندرجہ ذیل علماء وفقہاء رحمہم اللہ نے عدمِ وجوب کا قول اختیار کیا ہے:-

۱:- علامہ سیّد عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر مستقل رسالہ لکھ کر ثابت کیا ہے کہ حج واجب نہ ہوگا، (العقود الدریۃ ج:۱ ص:۱۳[۷] وشامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۸]۔

۲:- علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے ردّ المحتار میں اسی قول کو دلالۃً اختیار کیا ہے، (ملاحظہ ہو شامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۹]۔

واجب کہنے والوں کے دلائل

جہاں تک احقر نے جستجو کی ہے، واجب کہنے والوں کے دلائل مجموعی اعتبار سے یہ نظر آئے:-

۱:- حجِ بدل کرنے والا ایک مرتبہ کعبۂ مشرفہ تک پہنچنے پر قادر ہوچکا، لہٰذا "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا"[۱۰] میں داخل ہونے کے سبب اس پر آئندہ سال حج فرض ہوجائے گا۔

۲:- جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے،[۱۱] علامہ ابنِ حمزہ نقیبؒ نے نہج النجاۃ میں یہ

(۱) ج:۱ ص:۴۵۶ (طبع دار الکتب العلمیة، بیروت). (۲) ج:۱ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بیروت).
(۳) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۴) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۳ و ۶۰۴ (ایضًا)
(۵) یہ فتویٰ علامہ حامد آفندیؒ نے اپنے فتاویٰ میں بجنسہٖ نقل کیا ہے، لیکن غالبًا وہ ترکی زبان میں ہے، اس لئے سمجھ میں نہیں آسکا۔
(حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)
(۶) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۷) کتاب الحج ج:۲ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بیروت).
(۸) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید). (۹) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۱۰) سورة اٰل عمران:۹۷. (۱۱) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).

دلیل پیش کی ہے کہ بدائع الصنائع میں ہے کہ: **یکرہ احجاج الصرورۃ لأنّہ تارک فرض الحجّ**[1]۔
اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ وہ شخص دُخولِ مکہ سے حج عن نفسہٖ پر قادر ہو چکا ہے، اگرچہ اس وقت دُوسرے کا حج کرنے میں مشغول ہے۔

۳:- علامہ شامی رحمہ اللہ نے لباب سے نقل کیا ہے: **الفقیر الأفاقیّ اذا وصل الٰی میقات فھو کالمکّی قال شارحہٗ أی حیث لا یشترط فی حقہٖ الّا الزّاد والرّاحلۃ ان لم یکن عاجزًا عن المشی. (ردّ المحتار ج:۲ ص:۱۹۵)**[2]۔
ایک آفاقی فقیر اگر میقات تک پہنچ جائے تو اس کے اَحکام مکی جیسے ہوتے ہیں، اس لئے صرورہ فقیر کا حکم بھی یہی ہوگا۔

قائلینِ وجوب کے جوابات

لیکن یہ تمام دلائل حیزِ قبول میں نہیں ہیں، بلکہ ان کے خلاف دُوسرے دلائل قویّہ موجود ہیں۔
چنانچہ پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ استطاعت معتبر نہیں ہے، کیونکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی امیر شخص کسی غریب کو اداءِ زکوٰۃ کے لئے وکیل بنائے، اور وہ وکیل زکوٰۃ ادا کرے تو کوئی بھی اس کو یہ نہیں کہتا کہ یہ قادر ہوگیا، لہٰذا اس پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، بعینہٖ اسی طرح ایک صرورہ فقیر اگر حجِ بدل کے لئے مکہ پہنچ گیا تو اگر وہ آمر بالحج کے بجائے اپنا حج کرنا شروع کردے تو یہ تصرّف فی مال الغیر بغیر اذنہٖ ہے، اور اگر اپنا حج بھی کرے اور اس کا بھی تو یہ تداخل لازم آنے کے سبب محال ہے، اور اگر ایک سال تک وہیں ٹھہرا رہے تو حرجِ عظیم ہے، کیونکہ وہ فقیر ہے، اور عادۃً سفر میں انسان ایک سال تک کے مصارف ساتھ نہیں رکھتا، اور پھر اس کے اہل وعیال وغیرہ وطن میں بے سہارا رہیں گے، خصوصیت سے اس زمانے میں کہ ایک ملک کی حکومت کسی غیرملکی کو اپنے ملک میں زیادہ عرصہ قیام کی اجازت نہیں دیتی، اور اگر اس وقت لوٹ آئے اور اگلے سال پھر جائے تو یہ دو حال سے خالی نہیں، ایک یہ کہ اس عرصہ میں وہ غنی ہوجائے، سو اس صورت میں ہم بھی وجوبِ حج کے قائل ہیں، نہ اس وجہ سے کہ وہ پہلے حج کو جاچکا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ غنی ہوگیا۔ دُوسرے یہ کہ اگر وہ غنی نہ ہو تو حج بغیر غنیٰ کیسے کرسکتا ہے؟
غرض یہ آیت وجوبِ حج پر دلیل بنا کر پیش کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، بلکہ یہ تو عدمِ وجوب پر دال ہے جیسا کہ ہم انشاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔

---

(۱) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید). (۲) ج:۲ ص:۴۶۰ (ایضًا).

رہی دُوسری دلیل سو دراصل وہ صرورہ غنی کے بارے میں ہے، جیسے کہ ابنِ ہمامؒ کا صنیع اس پر دال ہے کہ انہوں نے صاحبِ بدائع کا یہ جملہ نقل کرنے کے بعد حج صرورہ کی صحت پر استدلالات پیش کئے اور پھر لکھا ہے کہ: والّذی یقتضیه النّظر أنّ حجّ الصّرورة عن غیرہٖ ان کان بعد تحقیق الوجوب علیه بملک الزّاد والرّاحلة والصحة فھو مکروہ کراھة تحریم لأنّهٗ یتضیق علیه .... الخ. (فتح القدیر ج:۲ ص:۳۲۱)۔[1] علامہ شامیؒ نے بھی اس عبارت کو صرورہ غنی پر محمول قرار دیا ہے، (ملاحظہ ہو ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۳۱،۳۳۲)۔[2]

باقی رہی تیسری دلیل تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ صرورہ فقیر قادر بقدرة غیرہٖ ہے، اور قدرت بقدرة غیرہٖ معتبر نہیں، کما قرّرنا۔ بخلاف آفاقی فقیر کے کہ وہ قادر بقدرة نفسه ہے، اس لئے ایک کو دُوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے جہاں آفاقی فقیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے، وہاں تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ: ان المأمور بالحج اذا وصل الٰی مکة لزمهٗ ان یمکث لیحجّ حجّ الفرض عن نفسه لکونهٖ صار قادرًا علٰی ما فیه. (شامی ج:۲ ص:۱۹۵)۔[3] لیکن باب الحج عن الغیر کے اندر اس دلیل کو رَدّ کیا ہے، (شامی ج:۲ ص:۳۳۲)۔[4]

عدمِ وجوب پر دلائل

۱:- وہ آیت جو قائلینِ وجوب کے استدلال میں تحریر کی گئی تھی، دراصل عدمِ وجوب پر دال ہے، کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حج لوگوں پر اس وقت فرض ہوتا ہے جبکہ قطعِ سبیل کی استطاعت ہو، اور صرورہ فقیر اس میں داخل نہیں ہوتا، جیسے کہ ہم نے اُوپر عرض کیا کہ اگر وہ وہاں رہتا ہے تو تکلیف ہے، اور اگر واپس آتا ہے تو اس کی سابقہ اور موجودہ کیفیت میں کوئی فرق نہیں، اگر وہ فقیر ہی ہے تو "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا"[5] میں داخل نہیں، لہٰذا آئندہ سال بھی اس پر حج فرض نہ ہونا چاہئے۔ اور اگر شبہ کیا جائے کہ وہ قرض لے کر جاسکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی قدرت بقدرة غیرہٖ ہوگی، جو معتبر نہیں۔

۲:- "لَا یُکَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"[6] مجمع الأنھر وغیرہ میں صرورہ فقیر کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ یا مکہ میں ٹھہر کر آئندہ سال کا انتظار کرے یا وطن واپس جاکر دوبارہ آئے، تو اس

---

(۱) ج:۳ ص:۹۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).
(۲) ردّ المحتار ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید).
(۳) ج:۲ ص:۴۶۰ (طبع سعید).
(۴) ج:۲ ص:۶۰۴ (ایضًا).
(۵) سورة اٰل عمران:۹۷.
(۶) سورة البقرة:۲۸۶.

کا حاصل یہ ہے کہ وہ اگر دونوں میں سے کسی ایک شق کو اختیار کر لے تو جائز ہے، اب اگر وہ قصداً یا خطاً وہاں سے چلا آئے اور ہم اس پر حج فرض ہونے کا حکم لگادیں تو یہ تکلیف ما لا یطاق ہے، کیونکہ صرورہ اس کی وسعت نہیں رکھتا، اور وہ مذکورۃ الصدر آیت کی رُو سے صحیح نہیں۔

اس آیت میں "اِلَّا وُسْعَهَا" کے الفاظ بطورِ خاص قابلِ غور ہیں، کیونکہ یہاں وسعت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، امکان کا نہیں، اس لئے وہ شبہ بھی اس دلیل سے دُور ہوگیا جو پہلی دلیل میں ہوسکتا تھا کہ وہ قرض لے کر جاسکتا ہے۔

۳:- اور اگر علی سبیل التنزّل یہ مان لیا جائے کہ امکان یا وسعت ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مشقت اور حرجِ عظیم ہے، جو: "اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ"[۱] وغیرہ کے خلاف ہونے کے سبب اَحکامِ شرعیہ میں تخفیف کا باعث بنتا ہے۔

اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ حرج اور مشقت ہر جگہ معتبر نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ ابنِ نجیمؒ نے لکھا ہے: المشقة والحرج انّما یعتبر فی موضع لا نصّ فیه. (الأشباہ والنظائر ج:۱ ص:۱۱۷)۔[۲]

مسئلۂ زیرِ بحث میں بھی کوئی نص موجود نہیں، حتیٰ کہ ائمہ حنفیہ بلکہ مشائخ تک سے کوئی قول منقول نہیں ہے، جیسا کہ علامہ حامد آفندیؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح فرمائی ہے: لم أرہ الّا فی فتاویٰ أبی السّعود. (عقود دریہ ج:۱ ص:۱۳)۔[۳] اس لئے یہاں پر باعثِ تخفیف بننے میں کوئی مانع نظر نہیں آتا۔

خلاصہ

غرض پوری بحث سے خلاصہ کے طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حجِ صرورہ ادا ہوجاتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی فقیر پر حج واجب نہیں ہوتا۔ هٰذا ما ظهر لی بعد بحثٍ وتفتیش ونظر وتفحص کثیر، والعلم الصحیح عند الله اللطیف الخبیر، اذ هو أعلم بما هو صواب والیه مصیرنا والمآب. وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العٰلمین وسلّم علی المرسلین والعاقبة للمتقین.

احقر العباد محمد تقی العثمانی
غفر الله لهٗ وهداهٗ الی الصواب
۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ[۴]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) فی صحیح البخاری، باب الدّین یسرٌ .... الخ ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: انّ الدّین یُسرٌ ولن یشآدّ الدین أحد الّا غلبهٗ فسدّدوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوة والرّوحة وشیٔ من الدّلجة.

(۲) ص:۴۲ (طبع سعید). (۳) ج:۱ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بیروت).

(۴) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے درجۂ تخصص (تمرینِ افتاء) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- بیماری کی وجہ سے کسی دُوسرے کو حجِ بدل پر بھیجنے کا حکم
۲:- جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو اسے حجِ بدل پر نہیں بھیجنا چاہئے

سوال ۱:- پچھلے ماہ سے عرق النساء کی تکلیف میں مبتلا ہوں، تکالیف برداشت سے باہر ہیں، زیادہ چل پھر نہیں سکتا ہوں، اس حالت میں اپنی اہلیہ کو حجِ بدل میں بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟ جبکہ ان کا کوئی محرم نہیں؟ ۲:- دونوں کا حج اُوپر کی شکل میں ہوگا یا نہیں؟ یا میرا حج ہوگا اور اہلیہ کو صرف ثواب ملے گا؟

جواب ۱:- اگر آپ اتنے بیمار ہیں کہ حج خود ادا نہیں کرسکتے تو کسی کو حجِ بدل پر بھیج سکتے ہیں،[۱] لیکن کسی ایسے شخص کے ذریعے حجِ بدل کروائیں جو خود اپنا حج کرچکا ہو۔[۲] جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے حجِ بدل پر بھیجنا مکروہ ہے، البتہ اگر بھیج دیا تو حج ادا ہوجائے گا۔[۳]

۲:- آپ کی اہلیہ نے اگر اپنا حج نہیں کیا تو ان سے اپنا حجِ بدل نہ کرائیں، ہاں اگر وہ اپنا حج کرچکی ہیں تو انہیں محرَم کے ساتھ حجِ بدل پر بھیج سکتے ہیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۱۰/۲۷ ھ)

والدہ مرحومہ کے لئے نفلی حج کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص اپنا حج پہلے کرچکا ہو تو دُوسرے حج کے موقع پر اپنی والدہ مرحومہ کے لئے حج کرسکتا ہے؟

جواب:- جی ہاں کرسکتا ہے۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۹/۲۱ھ

۱:- حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھنے کا حکم
۲:- کیا حجِ بدل کرنے سے حج فرض ہوجاتا ہے؟

سوال ۱:- زید نے حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھا تھا، اور سنا ہے کہ حجِ بدل میں اِفراد کا اِحرام میقات سے باندھنا چاہئے۔

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۵۹۸ (طبع سعید) حج الفرض تقبل النّیابة عند العجز فقط لٰکن بشرط دوام العجز الی الموت .... الخ.

(۲، ۳، ۴) ان مسائل کی مکمل تفصیل اور دلائل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) وفی الغنية ص:۱۷٦ تبرع الولد بالاحجاج أو الحج بنفسهٖ عن أحد أبويه اذا مات وعليه حج الفرض ولم يوص به مندوب اليه جدا. وفی التاتارخانية ج:۲ ص:۲٦۴ من مات وعليه فرض الحج ولم يوص به لم يلزم الوارث أن يحج عنه وان أحب يحج عنه حج، وأرجو أن يجزيه ان شاء الله تعالٰی .... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

۲:- اور کیا حجِ بدل کرنے پر حج فرض ہوجاتا ہے، جبکہ پہلے اس پر فرض نہیں تھا؟ حجِ بدل کے لئے کیا شرائط ہیں؟ صورتِ مذکورہ میں اِحرام تمتع سے کوئی خرابی آتی ہو تو اس کا کوئی تدارک ہوسکتا ہے؟

جواب ۱:- حجِ بدل میں تمتع کا اِحرام باندھنا اگر بھیجنے والے (آمر) کی مرضی اور اجازت سے ہو تو جائز ہے، لیکن اس صورت میں قربانی کی رقم خود حج کرنے والے کے ذمہ ہے، بھیجنے والے پر اس کا دینا ضروری نہیں۔ اگر بھیجنے والے نے تمتع کی اجازت نہیں دی تھی اور حاجی نے تمتع کرلیا تو یہ بھیجنے والے کے حکم کی مخالفت سمجھی جائے گی، اور اس کا حج ادا نہ ہوگا، اور جانے والے کے ذمہ ہوگا کہ خرچہ واپس کردے اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیجنے والے کو چاہئے کہ وہ ہر طرح کے اِحرام کی مامور کو اجازت دیدے۔ ودم القِران والتمتع والجناية على الحاج ان أذن له الأمر بالقِران والتمتع وإلا فيصير مخالفاً فيضمن. (درمختار مع الشامی ج:۲ ص:۳۳۹)[۱] فلو أمره بالافراد أو العمرة فقرن أو تمتع ولو للميّت لم يقع حجه عن الأمر ويضمن النفقة. (حاشیۃ البحر ج:۳ ص:۶۸)[۲]۔

۲:- جس شخص نے اپنا حج نہ کیا ہو، اسے حجِ بدل پر نہ بھیجنا چاہئے، لیکن اگر بھیج دیا تو بھیجنے والے کی طرف سے حج ہوجائے گا، اور اگر جانے والے کے ذمہ پہلے سے حج فرض نہیں تھا تو تحقیق یہی ہے کہ صرف حجِ بدل کرلینے سے حج فرض نہیں ہوگا، تاوقتیکہ خود اس کو استطاعت پیدا نہ ہو۔ (دیکھئے العقود الدرية ج:۱ ص:۱۳[۳] وشامی ج:۲ ص:۲۳۲)[۴]۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵/۱۸ الف)

کیا ضعیف شخص کسی دُوسرے کو اپنی جگہ حج کے لئے بھیج سکتا ہے؟

سوال:- کیا ضعیف آدمی اپنے بجائے کسی اور کو حج کے لئے بھیج سکتا ہے؟

جواب:- اگر ضعیف آدمی خود حج کرنے پر قادر نہیں تو وہ کسی ایسے شخص کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے جس نے اپنا حج کرلیا ہو۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱/۲۷/۲۷و)

---

(۱) ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع سعید)۔

(۲) ج:۳ ص:۶۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) نیز اس مسئلہ کی مزید تفصیل وتحقیق کے لئے امداد الاحکام ج:۲ ص:۱۸۲ تا ۱۸۷ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) کتاب الحج ج:۲ ص:۱۴ (طبع دار المعرفة، بیروت)۔ (۴) ج:۲ ص:۶۰۴ (طبع سعید)۔

(۵) فی الدر المختار ج:۲ ص:۵۹۸ (طبع سعید) حجّ الفرض تقبل النّيابة عند العجز فقط .... الخ.

وفی الهندية ج:۱ ص:۲۵۷ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) والأفضل للانسان اذا أراد أن يحجّ رجلًا عن نفسه أن يحجّ رجلًا قد حجّ عن نفسه.

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلّقة بالحجّ
(حج سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

اگر ایامِ حج میں عورت کو حیض آجائے تو وہ کیا کرے؟

سوال:- اگر کوئی عورت حج کرنے چلی جائے اور ایامِ حج میں حیض آنا شروع ہوجائے تو وہ کیا کرے؟

جواب:- طواف کے ماسوا حج کے تمام کام حالتِ حیض میں کرسکتی ہے، طوافِ زیارت پاک ہونے کے بعد کرے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۵/۲۵ھ

مسجدِ نبوی میں چالیس نمازیں نہ پڑھنے سے حج میں کوئی فرق نہ ہوگا

سوال:- زید سعودی عرب میں ملازم ہے، اُسے حج کرنے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن حج ادا کرنے کے بعد فوراً یا کچھ عرصے کے بعد واپس وطن آنا ہے، جس کی وجہ سے مدینہ منوّرہ میں چالیس وقت کی نمازیں ادا نہیں کرسکتا، کیا اسے اگر چھوڑ دیا جائے تو حج ادا ہوجائے گا؟

جواب:- کوشش تو حتی الامکان یہی کریں کہ چالیس نمازیں کم از کم ہوجائیں، کیونکہ یہ سعادتِ عظمیٰ[2] بار بار نہیں ملتی، لیکن اگر کسی مجبوری کی بنا پر جلد واپس آنا ہو تب بھی حج میں کوئی کراہت وغیرہ پیدا نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۷۴/۲۹ ب)

---

(۱) وفی الهداية ج: ۱ ص: ۲۶۵ (طبع شركت علميه ملتان) (باب التمتع ....) واذا حاضت المرأة عند الاحرام اغتسلت وأحرمت وصنعت كما يصنعه الحاج غير أنها لا تطوف بالبيت حتّى تطهر لحديث عائشةؓ. وكذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج: ٦ ص: ٥٤٦.

(۲) وفی الترغيب والترهيب ج: ۲ ص: ۱۳۹ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت) عن انس بن مالكؓ عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: من صلّی فی مسجدی أربعين صلٰوة لا تفوته صلٰوة كتبت له برا ءة من النّار وبراءة من العذاب وبرئ من النفاق. وكذا فی مسند احمد ج: ۳ ص: ۱۵۵ رقم الحديث: ۱۲٦۰٥ (طبع مؤسسة قرطبة، مصر).

جس کو حج کے لئے رقم دی ہو، اگر اس کا نام قرعہ میں نہ نکلے تو اس رقم کا کیا حکم ہے؟

سوال:- کسی شخص نے کسی کو رقم دی کہ حج کرو۔ دینے والا شخص حاجی ہے، اس نے کئی سال تک متواتر کوشش کی، مگر اس کا نام حج کی فہرست میں نہ آسکا، پھر زَرِ مبادلہ زیادہ ہوگیا، ایسی صورت میں اب یہ رقم کس کی ہے؟

جواب:- اگر یہ رقم دینے والے نے اپنی طرف سے یا کسی اور کی طرف سے حجِ بدل کے لئے دی تھی تو یہ واپس کرنا واجب ہے، اور اگر بطورِ امداد دی تھی اور ہبہ کر دیا تھا، تو واپسی واجب نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

(نکاح کے مسائل)

﴿فصل فی وعدِ النکاح﴾
(منگنی کے مسائل کا بیان)

منگنی کی شرعی حیثیت اور منگنی کے بعد لڑکی کا نکاح سے انکار کرنا

سوال:- ایک مسلمان عورت یا مرد تین دفعہ قرآن شریف کو ہاتھوں میں لے کر اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر عہد کرے کہ زندگی میں اگر شادی کروں گی یا کروں گا تو تم سے، ورنہ نہیں، اگر دُوسرے مرد سے شادی کروں تو قرآن میرے خلاف گواہی دے گا، اس عورت نے یا مرد نے تین دفعہ ہاتھ میں ہاتھ لے کر عہد کیا۔ آج سے دو سال پہلے میں نابالغ تھی، میرے والدین سے یٰسین نے ان کی جھولی میں قرآن مجید رکھ کر اپنے لئے رشتہ مانگا، اور صاف کہہ دیا کہ میری دُوسری بیوی زندہ ہے، مگر اس سے سلوک اچھا نہیں ہے، میرا اس سے قطع تعلق کرنے کا ارادہ ہے۔ بعد میں وہ عید کے موقع پر ہمارے لئے اور تقریباً سب گھر والوں کے لئے کپڑے اور میرے لئے منگنی کی انگوٹھی لے کر آیا، میری والدہ نے والد سے کہا کہ: یہ چیزیں قبول کرنا ہو تو سوچ سمجھ کر قبول کرو، کیونکہ یہ شخص غرض مند ہے۔ میری موجودگی میں میرے والد نے کہا: کوئی بات نہیں ہے، اللہ مالک ہے۔ میں نابالغ ضرور تھی مگر مجھے تمام باتوں کی سمجھ تھی، چار پانچ روز کے بعد میری والدہ نے میرے بڑے بھائی کو کہا کہ: یہ سامان یٰسین لے کر آیا ہے، تیرے والد نے قبول کرلیا ہے، میرے بھائی نے کہا: اماں! یہ سامان تیرے مشورے سے آیا ہے، کیونکہ یہ تو منگنی کا سامان ہے۔ اور ماں کی شان میں بہت گستاخی کی اور کہا کہ: اماں! تم بے غیرت ہو۔ اگلے روز یٰسین کو پتہ لگا، اس نے میری والدہ سے حقیقت معلوم کی، میری والدہ نے رو کر کہا کہ: میرے لڑکے نے آج مجھے بے غیرت کہہ کر بالکل ننگا کر دیا ہے۔ یہ بات سن کر یٰسین نے کہا کہ: جب میں نے ماں کہا ہے تو سگی ماں سے زیادہ آپ کی عزّت کروں گا۔ رات میں یٰسین نے میرے بھائی کی جھولی میں اپنی لڑکی ڈال دی (جس کی عمر نو سال ہے) کہ اس سے تم اپنے بھائی کی شادی کرلینا، بدلے کے طور پر دیتا ہوں اور اس رشتے کے بدلے تم سے میں کچھ نہیں مانگوں گا، تحریر لکھ کر دستخط کر کے دے دیئے، والد اور والدہ نے پھر مشورہ کیا کہ یٰسین کی لڑکی کو یونہی نہیں لیں گے، بلکہ اس کے بدلے میں

رشتہ دے دو، یٰسین کو بلا کر کہا گیا کہ: تم میری چھوٹی لڑکی اپنے لڑکے کے لئے لے لو، اس پر یٰسین نے کہا کہ: اگر رشتہ دینا ہے تو بڑی لڑکی کا میرے لئے دو، ورنہ میں اپنی لڑکی تو آپ کو دے چکا ہوں۔ تین چار دن کے صلاح مشورے کے بعد میرے والدین میرا رشتہ دینے پر رضامند ہوگئے اور میری والدہ نے میرے بڑے بھائی کو صاف لفظوں میں کہا کہ: سوچ لو اپنے لئے بڑی لڑکی کا رشتہ مانگ رہا ہے، کبھی کل مجھ پر الزام نہ دینا کہ ماں نے ہمیں دھوکا دیا، اور یہ طعنہ دینا کہ لڑکی سوکن پر دی ہے۔

عید پر میرے والدین منگنی کے کپڑے لے کر یٰسین کے گھر گئے جو کہ یٰسین نے قبول کر لئے، عید کے بعد یٰسین نے اپنی لڑکی کی منگنی کا اعلان میرے حقیقی ماموں، بڑے بھائی اور میری والدہ اور دیگر عزیزوں کے سامنے کردیا، دُعائے خیر بھی کی گئی، بعد میں یٰسین کی حالت خراب ہوگئی، اس کے رشتہ دار طاقت ور ہیں، اس کی لڑکی کو بے اجازت اپنے گھر لے گئے، بعد میں یٰسین کی ساس فوت ہوگئی تو یٰسین اپنی لڑکی اور اپنے لڑکے کو بھی وہاں چھوڑ آیا، تین چار دفعہ لینے گیا تو انہوں نے کہا کہ: جب تک منگنی نہیں توڑو گے، بچے واپس نہیں ملیں گے۔ یٰسین نے کہا کہ: میں قرآن اُٹھا کر لڑکی دے چکا ہوں، میرا قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا، میری زندگی میں میری لڑکی کا دُوسرا خاوند نہیں ہوسکتا۔ میرے گھر والوں نے یٰسین کا کچھ ساتھ دیا، لیکن یٰسین نے یہاں تک کہا کہ: لڑکا ساتھ بھیج دو میں وہیں جاکر شرعی نکاح پڑھوادوں گا، لیکن میرے باپ اور بھائی نے انکار کردیا، سرگودھا سے مفتی سیّد احمد صاحب سے فتویٰ منگوایا، انہوں نے لکھ دیا کہ نابالغ لڑکی کا باپ جس جگہ اور جس وقت چاہے نکاح کرسکتا ہے، میرے بھائی اور باپ نے اس پر بھی ٹھکرادیا، میں اب بالغ ہوں اور میں اپنی مرضی کی خودمختار ہوں، اس کے علاوہ میں نے خود تین دفعہ قرآن اُٹھا کر عہد کیا ہے اور عہد مجھے عزیز ہے، اور مجھے قرآن و ایمان عزیز ہے، کیا عہد پورا کرنا چاہئے یا نہیں؟ یہ بیان فرمادیں تاکہ سیدھے راستے پر چلنے میں کامیاب ہوجاؤں۔

جواب:- شرعاً منگنی کی حیثیت ایک وعدے کی ہے،[1] جس کا پورا کرنا واجب ہے، اور بغیر کسی عذر کے اس کی خلاف ورزی جائز نہیں، لہٰذا آپ اب بالغ ہونے کے بعد مختار ہیں کہ اگر یٰسین سے نکاح کرنے میں آپ کو کوئی خرابی محسوس ہوتی ہو تو انکار کرسکتی ہیں، لیکن اگر اس میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تو اس کے ساتھ کئے وعدے کو پورا کرنا[2] اور اس کے ساتھ نکاح کرلینا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۰/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ وان للوعد فوعد، وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطيتنيها فقال أعطيت ان كان المجلس للوعد فوعد وان كان للعقد فنكاح. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۴۸ تا ۵۱۔

(۲) وفی صحیح البخاری کتاب الإیمان باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اية المنافق ثلاث، اذا حدث كذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان.

منگنی کی شرعی حیثیت اور کیا منگنی توڑنا جائز ہے؟

سوال:- عرض یہ ہے کہ میرے والدین نے پانچ سال قبل میری منگنی اپنے بہت قریب ترین رشتہ داروں میں کی، اور تین سال سے میں ملک سے باہر سعودی عرب میں تھا، اور اب میں ملک واپس آیا ہوں، اور شادی بھی تیار ہے، لیکن میرے والدین اب عین وقت پر شادی کے حق میں نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم نے اس جگہ شادی کی تو، تو ہمارا بیٹا نہیں رہے گا، جبکہ میں نے منانے کی بہت کوشش کی، معززین نے بھی بہت سمجھایا ہے، لیکن وہ نہیں مانتے، آخر میں مجبور ہوگیا، اب شریعتِ مطہرہ کی طرف رُجوع کرتا ہوں، اس رشتہ ٹوٹنے پر دو بھائیوں سے قطع تعلق ہوجائے گا، یعنی میرے والدین اور سسرال میں، میرا خیال ہے کہ میں شادی کرلوں اور والدین کے حقوق بھی ادا کرتا رہوں، اور باقی بھائیوں کی زیادہ خدمت کی ہے اور کرتا رہوں گا، جبکہ والدین اس رشتے کے توڑنے پر زیادتی کر رہے ہیں، کوئی خاص شرعی وجہ بھی نہیں ہے کہ جس پر رشتہ چھوڑ دوں، اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں کیا کروں؟

جواب:- منگنی نکاح کا وعدہ ہے،[1] اور جب تک کوئی معقول عذر پیش نہ آئے، اس وعدے کو پورا کرنا دیانۃً ضروری ہے،[2] البتہ اگر کوئی معقول عذر پیش آجائے تو منگنی توڑی بھی جاسکتی ہے، اب اگر آپ کے والدین کسی معقول عذر کی بناء پر منگنی ختم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ اس پر ٹھنڈے دِل سے غور کریں، اگر والدین کی بات معقول معلوم ہو اور کوئی عذر سامنے آجائے، تو آپ ان کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے منگنی ختم کرسکتے ہیں، لیکن اگر والدین کسی معقول عذر کے بغیر منگنی ختم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، تو آپ کے لئے اس معاملے میں ان کی اطاعت واجب نہیں ہے، ان کو حتی الامکان راضی کرنے کی کوشش کرتے رہیں، اور نکاح کرلیں، لیکن یہ فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ عموماً والدین اپنی اولاد کی بھلائی ہی کی بات سوچتے ہیں، لہٰذا ان کی بات کو سرسری طور پر نظرانداز نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۴/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۵/۳۹ ج)

منگنی کے بعد انکار کرنے کا حکم

سوال:- زید نے اپنی دختر کے بارے میں ایک مجلس میں بکر سے کہا کہ میں اپنی بیٹی آپ کے

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد، وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح.

(۲) وفی صحیح البخاری کتاب الإیمان باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اٰیة المنافق ثلاث، اذا حدث کذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان.

بیٹے کو دیتا ہوں، لیکن نکاح بعد میں ہوگا، صرف بات ہوئی تھی نکاح نہیں ہوا تھا، اب گھریلو اختلافات کی وجہ سے بکر انکار کر رہا ہے، کیا اب انکار کرنا اس کا دُرست ہے اور کیا نکاح ہوگیا تھا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر کے لڑکے کا زید کی دختر سے نکاح منعقد نہیں ہوا تھا، صرف وعدۂ نکاح ہوا تھا،(۱) اب اگر زید نے اپنی لڑکی کی شادی بکر یا اس کے لڑکے کو اطلاع دیئے بغیر دُوسری جگہ کردی تو اسے وعدہ کی خلاف ورزی کا گناہ ہوا،(۲) لیکن یہ نکاح دُرست ہوگیا۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۹/۱۸ الف)

منگنی کے بعد انکار کرنے کا حکم

سوال:- دو فریق آپس میں رُوبرو امام، رُوبرو مجلس یہ فیصلہ کریں یا بیان دیں کہ میں نے فلاں نام کی لڑکی کا رشتہ فلاں نام کے لڑکے کو دے دیا ہے، مجلس میں پھر دُعا مانگی گئی اور مٹھائی تقسیم کردی گئی، اس کے بعد کچھ ناراضگی کی وجہ سے لڑکی کا رشتہ دُوسری جگہ دے دیا، ایسا کرنے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- نکاح کا رشتہ دے دینا، نکاح کا وعدہ ہے، اور وعدے کی خلاف ورزی بغیر شدید عذر کے ناجائز ہے، البتہ شدید عذر کی صورت میں گنجائش ہے۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۰/۲۸ الف)

معقول عذر کی بناء پر منگنی توڑی جاسکتی ہے

سوال:- ایک صاحب نے اپنے لڑکے کی منگنی کی، اور لڑکی کے والد نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کیا کہ یہ لڑکی تمہاری ہے اور لڑکا میرا ہے، یہ منگنی کی رسم اس طرح ادا ہوئی تھی، اب کچھ عرصہ بعد دونوں فریقوں میں کشیدگی ہوگئی، اب لڑکی والا رشتہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اب ہمارے اُوپر شریعت کی رُو سے کوئی کفارہ لازم تو نہیں ہوتا؟

---

(۱) وفی الدرّ المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح.
(۲، ۳) دیکھئے: امداد المفتین ص:۵۸۲ تا ۵۸۴، سوال نمبر ۴۴۶ تا ۴۴۸۔

جواب:- شرعاً منگنی کی حیثیت ایک وعدے کی ہے،[۱] اور حتی الامکان وعدے کی پابندی ضروری ہے،[۲] لیکن اگر کوئی معقول عذر پیش آجائے، مثلاً لڑکی اس لڑکے سے نکاح پر رضامند نہ ہو یا لڑکے کے اخلاق و عادات سے متعلق کچھ ایسی باتیں سامنے آئی ہوں جو پہلے معلوم نہ تھیں، تو منگنی کو توڑنا بھی جائز ہے، اور منگنی کے وقت اگر زبان سے کوئی قسم نہیں کھائی تھی تو اس پر کوئی کفارہ بھی واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۸/۲۸ ج)

لڑکے کے طور طریق کا دُرست نہ ہونا، منگنی توڑنے کے لئے معقول عذر ہے

سوال:- علاقہ راجستھان میں سائل کے اجداد کے دور سے ایک قدیم رسم چلی آرہی ہے کہ ہم لوگ اپنے بچوں کی عالمِ شیرخوارگی و خوردسالی میں ہی منگنی اس طرح کر دیتے ہیں کہ بچوں کو رسماً چینی چٹادی جاتی ہے، اس رسم کو ''چینی چٹائی رسم'' کہا جاتا ہے، اس طرح دو بچوں کی نسبت طے کردی جاتی ہے اور بلوغت پر ان کا عقدِ شرعی کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اسی کہنہ علاقائی رسم کے مطابق سائل نے کراچی میں اپنی شیرخوار دختر جمیلہ (جبکہ اس کی عمر ڈیڑھ سال تھی) کی بشیر پسر بھورے شاہ ساکن نزد بارودخانہ ولایت آباد نمبر۲ منگھوپیر روڈ کراچی سے (جبکہ اُس کی عمر پانچ سال تھی) منگنی طے کردی تھی، اور رسم چینی چٹائی عمل میں لائی گئی تھی۔ اب دونوں بالغ ہیں، لڑکے کے طور وطریق کو دیکھ کر سائل لڑکی کی منگنی کو ناقابلِ قیام اور رشتہ مناکحت کے قابل نہیں سمجھتا ہے، اور شرعاً اُس سے عقد کرنا نہیں چاہتا ہے، کیا سائل اس نسبت کو منقطع کرنے کا حق دار ہے؟ یا کیا وہ دختر کو سائل کی مرضی کے خلاف اس سے عقد کرنے یا اُس کو زوجہ بنانے کا شرعاً مستحق ہے یا نہیں؟

جواب:- منگنی خواہ زبانی ہو یا عملی ہو (مثلاً صورتِ مسئولہ میں چینی چٹا کر) وہ نکاح نہیں بلکہ محض نکاح کا وعدہ ہے، جس سے کوئی عقد منعقد نہیں ہوتا،[۳] البتہ وعدے کی خلاف ورزی بلاعذر ناجائز ہے،[۴] اور کوئی عذر معقول ہو تو جائز ہے، اور لڑکے کے طور طریق کا دُرست نہ رہنا یا لڑکی کا اس رشتے پر راضی نہ ہونا عذرِ معقول ہے، اور اُس کی بنا پر اگر آپ منگنی ختم کردیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لڑکے والوں کو اس پر شرعاً اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۹/۲۸ ب)

(۱ تا ۴) دیکھئے حوالہ سابقہ صفحہ نمبر ۲۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۳۔

خِطبہ کسے کہتے ہیں؟ اور منگنی یا سلامتی کے عنوان سے اجتماع کی شرعی حیثیت

سوال:- شریعتِ اسلامیہ میں منگنی (یا سلامتی) کا کیا حکم ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ لڑکے والا کسی لڑکی والے کے ہاں بذاتِ خود یا کسی نمائندہ کے ذریعے نکاح کا پیغام دیتا ہے، اگر لڑکی والا اس پیغام کو قبول کرلیتا ہے تو لڑکے کے ماں باپ یا ذمہ دار حضرات لڑکی کے ماں باپ یا ذمہ دار حضرات سے اوّلاً نکاح کے سلسلے میں مہر کی مقدار اور نکاح کی تاریخ وغیرہ کی تعیین کرتے ہیں، گویا نکاح کی بات چیت پکی ہوگئی۔ اس کے بعد مزید تشہیر کے لئے نکاح کے دن سے قبل لڑکی والوں کے گھر پر منگنی (یا سلامتی) کے نام سے ایک دن مقرّر کرکے ایک مجلس قائم کرتے ہیں جس میں اپنی اپنی حیثیت کے موافق پچاس، سو یا ہزار دو ہزار آدمی دونوں طرف کے متعلقین اور رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے، مقرّرہ تاریخ میں یعنی سلامتی کے دن جب سب لوگ جمع ہوجاتے ہیں تو ایک شخص کھڑے ہوکر اعلان کرتا ہے کہ یہ فلاں اور فلانہ کی سلامتی ہے، فلاں کا لڑکا فلاں سے اور فلاں کی لڑکی فلانہ سے اتنے اتنے مہر پر سلامتی ہوگئی ہے، اور لڑکی کے لئے مہر متعینہ زیورات یا روپیہ وغیرہ لڑکی والوں کو برسرِ مجلس سپرد کردیا جاتا ہے، اور لڑکی والے ان اسباب کو اپنی تحویل میں لیتے ہیں، اور جو سامان لڑکی کے لئے دیا جاتا ہے زیورات وغیرہ برسرِ مجلس لڑکی والے اس تمام سامان کی باضابطہ جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اہلِ شرکاء میں سے بعض حضرات کو دِکھایا جاتا ہے، اس کے بعد امام صاحب دُعا کرتے ہیں اور لڑکی والوں کی طرف سے تمام شرکائے مجلس کو حسبِ حیثیت ضیافت کرتے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نکاح کا پیغام قبول کرنے کے بعد اور جانبین کی رضامندی سے نکاح کے سلسلے میں مہر کی مقدار اور نکاح کی تاریخ وغیرہ متعین کرنے کے بعد اس طرح سلامتی کے نام سے لوگوں کو جمع کرکے مجلس قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں کے ایک مستند عالم جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جانبین کی رضامندی کے بعد اس طرح سلامتی کے نام سے مجلس قائم کرنا شرعاً جائز ہے، بلکہ موجبِ ثواب ہے۔ حدیث شریف میں جسے خِطبہ کہتے ہیں، وہ اسی کو کہتے ہیں۔ اس عالم صاحب کا کہنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ صورتِ مسئولہ میں جو دو صورتیں پیش کی گئی ہیں، پہلی صورت کو خِطبہ کہتے ہیں یا دُوسری صورت کو؟

جواب:- شرعاً خِطبہ کا حاصل صرف اتنا ہے کہ مرد یا اس کے اقارب، عورت یا اس کے اقارب کو نکاح کا پیغام دیں، اس غرض کے لئے کوئی اجتماع یا تحائف کا تبادلہ خِطبہ کے لئے ہرگز

ضروری نہیں، لہٰذا منگنی یا سلامتی کے نام سے جس اجتماع کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے، اس کو سنت قرار دینا بالکل غلط ہے، بلکہ سنت سمجھ کر ایسا کرنا بدعت اور واجب الترک ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۴/۱۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۷۸/۳۵ ھ)

منگنی خُطبۂ نکاح کے قائم مقام نہیں ہوسکتی

سوال:- میری عمر ۷۲ سال کی ہوچکی ہے، اللہ نے تین فرزند اور بیٹیاں عطا کر رکھی ہیں، تین لڑکوں اور تین بیٹیوں کی شادیوں سے میرے مالک نے سبکدوش کردیا ہے، اب صرف ایک چھوٹی بچی کا فریضہ ادا کرنا میرے ذمہ باقی ہے، اس لڑکی کی عمر ۲۹ سال ہے، صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے، اور اُمورِ خانہ داری میں معقول مہارت رکھتی ہے، والدہ کی وفات کے بعد خاموش رہتی ہے، اور اس کی خاموشی مجھے شاق گزرتی ہے۔

میری رفیقۂ حیات کا ڈیڑھ سال ہوا کہ وہ انتقال کرگئی اور مناسب رشتہ کی تلاش کرتی رہی اور یہ حسرت دِل میں لئے چلی گئی، بیٹی کی افسردگی نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ اس کی شادی جلد کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں، چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ایک قریبی رشتہ دار کی وساطت سے اس بچی کی منگنی کردی گئی، جب لڑکے کو اُس کے رشتہ دار کے ذریعے پیغام شادی کا بھیجا تو اُس نے جواب دیا کم از کم دو سال تک انتظار کریں ورنہ بصورتِ دیگر آپ جہاں چاہیں اپنی لڑکی کی شادی کرسکتے ہیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ میں اُس لڑکے کی منّت سماجت کروں، کیا رسمِ منگنی کو خطبۂ نکاح کا مقام دیا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی دُوسرا موزوں لڑکا مل جائے تو کیا ہم اُس سے نکاح کرسکتے ہیں منگنی رُکاوٹ تو نہیں بنے گی؟

جواب:- منگنی خُطبۂ نکاح کے قائم مقام نہیں ہوسکتی، اور نہ شرعاً اس سے نکاح منعقد ہوتا ہے، وہ تو محض نکاح کا ایک وعدہ ہے،(۱) اور وعدے کی خلاف ورزی کسی عذر کے بغیر جائز نہیں۔(۲) ہاں! اگر کوئی عذر ہو مثلاً لڑکے میں کوئی عیب جو پہلے معلوم نہیں تھا اب معلوم ہوجائے، یا لڑکی اس رشتے کو

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید) وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطیتنیها فقال أعطیت ان کان المجلس للوعد فوعد وان کان للعقد فنکاح.

(۲) وفی صحیح البخاری باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: اٰیة المنافق ثلاث، اذا حدث کذب واذا وعد أخلف واذا اؤتمن خان. (الحدیث)

ناپسند کرے تو ایسی صورت میں منگنی توڑ دینا جائز ہے، لیکن اس کی اطلاع فریقِ ثانی کو کردینی ضروری ہے۔[۱]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۱/۲۸ ب)

منگنی کے عوض لڑکی والوں کا رقم وصول کرنا

سوال:- ایک شخص مسمّٰی سلمان ایک جگہ اپنے بیٹے مسمّٰی عبدالستار کی منگنی کرچکا تھا، اور لڑکی والوں کو حسبِ دستور دو ہزار ایک سو روپیہ بھی دے چکا تھا، لیکن اُس کے بعد مسمّٰی عبدالستار کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے فوراً مجمع میں اعلان کرکے شادی کرنے سے انکار کردیا، پھر تقریباً دو ماہ بعد وہ لڑکی وفات پاچکی جس کے ساتھ شادی ہونے والی تھی، اب ہم جب لڑکی والوں سے اپنے دیئے ہوئے اکیس سو روپے کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ یہ کہہ کر کہ ہماری بیٹی مرگئی ہے لہٰذا تمہارے پیسے بھی واپس نہیں دیں گے، رقم واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیا یہ رقم ہمیں واپس مل سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- بعض مقامات پر لڑکی کی منگنی کے معاوضے میں جو رقم لڑکی والے وصول کرتے ہیں، وہ شرعاً رشوت کے حکم میں ہے، جس کا لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، لہٰذا لڑکی کا انتقال ہوتا یا نہ ہوتا، ہر حالت میں لڑکی والوں پر واجب تھا کہ یہ رقم واپس کریں۔[۲] ہاں! اگر یہ رقم مہر کا جزء بنا کر دی جائے تو یہ لڑکی کو دینی چاہئے تھی،[۳] لیکن چونکہ نکاح منعقد ہونے سے پہلے ہی لڑکی کا انتقال ہوگیا اس لئے اب مہر کا بھی کوئی سوال نہیں رہا، لہٰذا لڑکی والوں پر بہرصورت واجب ہے کہ وہ رقم واپس کریں۔

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۲۹/۲۷ و)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد المفتین ص:۵۸۲ تا ۵۸۴، سوال نمبر ۴۴۶ تا ۴۴۸۔

(۲) وفی الدّر المختار کتاب النکاح باب المهر ج:۳ ص:۱۵۶ (طبع سعید) أخذ أهل المرأة شيئًا عند التسليم فللزّوج أن يستردّه لأنّه رشوة .... الخ. وفی الهندية ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع ماجديه) ولو أخذ أهل امرأة شيئًا عند التسليم فللزّوج أن يستردّه لأنّه رشوة .... الخ.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۱۵۱، ولو بعث الى امرأته شيئًا ولم يذكر جهة عند الدّفع غير جهة المهر .... فقالت هو أی المبعوث هدية وقال هو من المهر أو من الكسوة أو عارية فالقول له بيمينه.

﴿فصل فی المحرّمات﴾
(کس سے نکاح جائز ہے اور کس سے حرام؟)
(قرابت و رضاعت کے رشتوں کا بیان)

رضاعی بھتیجی اور رضاعی بھانجی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- ایک دُودھ پیتا بچہ جو بھوک یا کسی اور وجہ سے رو رہا ہے اور اس کی ماں کسی اور کام میں مصروف ہے، اس دوران بچے کی دادی آجاتی ہے اور وہ بچے کو اپنا دُودھ پلا دیتی ہے، کیا اس کی وجہ سے بچے کی ماں اور باپ کے رشتے میں فرق آئے گا؟ اور بچہ کا باپ کیا اس کا رضاعی بھائی بن گیا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس بچے کی دادی اس کی رضاعی ماں بھی بن گئی، لہٰذا فرق یہ پڑے گا کہ پہلے اس دادی کی پوتیاں یا نواسیاں اس بچے کی چچازاد یا پھوپھی زاد بہن ہوتیں اور ان سے نکاح جائز ہوتا، لیکن اب اس کی رضاعی بھتیجیاں اور بھانجیاں بن گئیں اور ان سے نکاح جائز نہیں رہا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۱۲۷۹ و)

بیوی کا دُودھ پینے سے بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال:- زید نے اپنی بیوی کا دُودھ غلطی سے پی لیا، یا جان بوجھ کر پی لیا، دونوں صورتوں میں یہ فعل حرام ہے یا مکروہ؟ اور اس سے نکاح تو نہیں ٹوٹتا؟

---

(۱) وفی سنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) عن عائشة زوج النبی صلی الله علیه وسلم ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة.
وفی جامع الترمذی، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید) عن علی قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب. وفی المشکوة، کتاب النکاح، باب المحرمات ص:۲۷۳ عن علی أنه قال: یا رسول الله! هل لک فی بنت عمک حمزة فانها أجمل فتاة فی قریش، فقال له: اما علمت ان حمزة أخی من الرضاعة، وان الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب، رواه مسلم.

جواب:- اپنی بیوی کا دُودھ پینا جائز نہیں،[1] لیکن کوئی شخص ایسا کرے تو اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۸/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۹/۲۷ و)

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- مسماۃ حلیمہ کا دُودھ محمد عمر اور محمد ہارون نے اکٹھے پیا، مسماۃ حلیمہ، محمد عمر کی پھوپھی ہے، اور محمد ہارون کی حقیقی ماں ہے، اس کے بعد مسماۃ حلیمہ کے ہاں ایک لڑکی رشیدہ پیدا ہوئی، کیا رشیدہ کا نکاح محمد عمر کے ساتھ ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ رشیدہ، محمد عمر کی رضاعی بہن ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴/۲۸ الف)

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زبیر احمد نے شیر خواری کے عالم میں اپنی پھوپھی کا دُودھ پیا تھا، یہ دُودھ صرف دو دن کے لئے پلایا گیا تھا، اب زبیر احمد جوان ہوگیا ہے، اور اس کی منگنی پھوپھی کی لڑکی (ہمشیرہ حمید) سے ہوگئی ہے، اب یہ شادی شرعاً جائز ہوگی یا نہیں؟ اس کے علاوہ حمید کی منگنی زبیر کی بہن سے ہوئی ہے، کیا حمید کی شادی زبیر کی بہن سے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زبیر احمد ہمشیرۂ حمید کا رضاعی بھائی ہے، لہٰذا ہمشیرۂ حمید کا نکاح اس سے نہیں ہوسکتا،[4] البتہ زبیر کی بہن نے اگر والدہ حمید کا دُودھ نہیں پیا تو اس کا نکاح حمید سے ہوسکتا ہے۔[5]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۷/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ (طبع سعید) ولم یبح الارضاع بعد مدته، لأنه جزء ادمی والانتفاع به لغیر ضرورة حرام علی الصحیح.

(۲) وفی الخانیة علی هامش الهندیة ج:۱ ص:۴۱۷ (طبع ماجدیه کتب خانه) اذا مص الرجل ثدی امرأته وشرب لبنها لم تحرم علیه امرأته لما قلنا انه لا رضاع بعد الفصال.

(۳، ۴) "حرمت علیکم أمهاتکم .... وأخواتکم من الرضاعة" (الأیة) سورة النساء:۲۳.

(۵) "واحل لکم ما وراء ذٰلکم" (الأیة) سورة النساء:۲۴.

اغواء کنندہ کی پوتی سے، مغویہ کے لڑکے کا نکاح دُرست ہے

سوال:- ایک مرد، زید کی منکوحہ بیوی کو اغواء کرکے لے آیا، اور اپنے پاس دو ماہ تک رکھا، اس سے صحبت بھی کی، جس کا وہ زبانی بھی اقرار کرتا ہے، عورت بھی اقرار کر رہی ہے، اب عورت اپنے خاوند کے پاس ہے، اور وہاں جاکر لڑکا پیدا ہوا تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد، اب اسی اغواء کنندہ مرد کی پوتی سے مغویہ کے لڑکے کا نکاح ہوا ہے، کیا یہ شرعاً جائز ہوا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر حرمت کی کوئی اور شرعی وجہ نہ ہو، تو محض مذکورہ اغواء کی بناء پر نکاح میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہے، اغواء کنندہ کی پوتی سے مغویہ کے لڑکے کا نکاح دُرست ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۵۹/۲۷ ہ)

مرضعہ کی کسی بیٹی سے دُودھ پینے والے کا نکاح نہیں ہوسکتا

سوال:- زید نے بنتِ عدی کا دُودھ پیا، بنتِ عدی کے بطن سے بہت سی بیٹیاں ہیں، کیا زید شرعاً بنتِ عدی کی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی سے شادی کرسکتا ہے؟

جواب:- اگر زید نے ڈھائی سال سے کم عمر کے اندر بنتِ عدی کا دُودھ پیا ہے تو بنتِ عدی کی کسی بیٹی سے زید کا نکاح جائز نہیں، لقولہ علیہ السلام: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۶/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۷۲۹ ب)

دُوسرے کی منکوحہ سے نکاح کا حکم

سوال:- زید نے ایک عورت اغواء کی، دُوسری کسی جگہ بکر سے دو ہزار روپے لے کر نکاح کردیا، عورت کے اغواء ہونے کا علم نہ بکر کو اور نہ ہی گاؤں کے معززین اور نکاح خواں و گواہان کو تھا، عورت کی فروختگی میں ہاشم اور سرور شریک تھے، جو بکر کے گاؤں کے تھے، انہوں نے جان پہچان کا ثبوت دیا کہ ہم زید کو جانتے ہیں، چنانچہ وہ لڑکی بکر کے گاؤں پہنچی، گاؤں کے معزّزین اور نکاح خواں کو

---

(۱) ویحل لأصول الزانی وفروعه، أصول المزنی بها وفروعها. (رد المحتار باب المحرمات ج:۳ ص:۳۲).

(۲) سنن ترمذی ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید). وکذا فی سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید). وفی الهندیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۴۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعًا .... الخ.

بکر اور اس کے گھر والوں نے نکاح کے لئے مدعو کیا، عورت سے بیان لیا گیا کہ کسی جبر کی وجہ سے تو نکاح نہیں کر رہی ہو؟ عورت نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے نکاح کی اجازت دی، زید عورت کو اپنے فوت شدہ بھائی کی بیوی بتاتا تھا، اور عورت نے بھی اس کو دیور تسلیم کیا، اس واقعے کے تیسرے روز اس کے شوہر منشی محمد نے بمعہ پولیس چھاپہ مارکر عورت کو برآمد کیا اور بتایا کہ یہ میری بیوی ہے جو بال بچے دار ہے۔ ۱:- اب فرمائیے کہ زید جس نے عورت کو اغواء کیا وہ وکیل تھا اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ ۲:- گواہوں کے لئے شرعی تعزیر کیا ہے؟ ۳:- نکاح خواں جبکہ غیر شادی شدہ ہے اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ۴:- گواہان اور نمبردار جس نے بیانات لئے اور نکاح کی اجازت دی، ان کا کیا حکم ہے؟ ۵:- اور جنہوں نے اس فروختگی میں حصہ لیا اور انہیں علم بھی تھا، ان کے لئے کیا سزا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر سے اس مغویہ عورت کا جو نکاح کیا گیا، وہ شرعاً بالکل باطل ہے،[1] اور زید جس نے عورت کو اغواء کرکے بکر سے اس کا نکاح کیا وہ سخت گناہگار ہوا، اور جن جن لوگوں نے جان بوجھ کر اس نکاح میں حصہ لیا وہ بھی سخت گناہگار ہوئے، البتہ جن لوگوں نے بےخبری کی بنا پر نکاح میں شرکت کی وہ معذور ہیں،[2] اور مذکورہ گناہ کے لئے شریعت میں کوئی حد مقرر نہیں، قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اس پر سزا جاری کرسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۸/۲۷ و)

کسی غیر کی بیوی سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنی چھوٹی لڑکی دُوسرے آدمی کے چھوٹے لڑکے کے ساتھ نکاح کرکے دے دی، اب ایک تیسرے مولوی صاحب نے خفیہ طور پر اپنے لئے نکاح پڑھوایا، اور اب وہ لڑکا لڑکی تیرہ اٹھارہ سال کے ہیں، اور مولوی صاحب نے اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھا ہے، اور لڑکا اپنی منکوحہ کو طلاق نہیں دیتا، اب سوال یہ ہے کہ مولوی صاحب کا نکاحِ ثانی صحیح ہوا یا غلط؟ اور نکاحِ اوّل صغرسنی کی وجہ سے لیکن دونوں کے ولیوں نے کروایا، صحیح ہوا یا نہیں؟

جواب:- پہلا نکاح صحیح ہوا، اور ثانی نکاح مولوی صاحب کا بالکل کالعدم ہے،[3] اُسے چاہئے

---

(۱) وفی التفسیر المظھری ج:۲ ص:۶۴ تحت قولہ تعالیٰ: "والمحصنٰت من النساء" عطف علٰی أمھاتکم یعنی حرمت علیکم المحصنٰت من النساء أی ذوات الأزواج لا یحل للغیر نکاحھن ما لم یمت زوجھا أو یطلقھا وتنقضی عدتھا من الوفاۃ أو الطلاق. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۸ أسباب التحریم أنواع، قرابۃ، مصاھرۃ، رضاع .... وتعلق حق الغیر بنکاح. وفی الھندیۃ کتاب النکاح الباب الثالث القسم السادس المحرّمات الّتی یتعلّق بھا حقّ الغیر ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیہ) لا یجوز للرجل أن یتزوج زوجۃ غیرہ وکذٰلک المعتدۃ.

(۲) دیکھئے: کفایت المفتی جواب نمبر۱۰ ج:۵ ص:۳۵ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت).

(۳) دیکھئے: حاشیہ نمبر۱۔

کہ لڑکی فوراً شوہر کے پاس پہنچادے، اور جو شخص جان بوجھ کر دُوسرے کی بیوی کو اپنے پاس رکھے وہ فاسق ہے، لہٰذا مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے جب تک علانیہ توبہ کا اعلان نہ کرے تب تک اس کو اِمام بنانا جائز نہیں۔

والله سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۱/۱۸ الف)

باپ کی منگیتر سے اس کے انتقال کے بعد خود نکاح کرنے کا حکم

سوال:- زید کی بیوی وفات پاگئی، اسی بیوی سے زید کا ایک لڑکا خالد ہے، زید نے دُوسری جگہ منگنی کی، ایجاب وقبول ہوچکا ہے، اب زید انتقال کرگیا، کیا زید کا لڑکا اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے جس سے زید نے منگنی کی تھی؟

جواب:- اگر زید نے اس لڑکی سے صرف منگنی کی تھی باقاعدہ نکاح نہیں ہوا تھا، تو زید کے لڑکے کے لئے اس سے نکاح کرنا جائز ہے[1]، لیکن اگر نکاح ہوگیا تھا تو جائز نہیں[2]، خواہ رُخصتی نہ ہوئی ہو، اور نکاح کا مطلب یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں مرد وعورت میں سے کوئی، یا ان کا وکیل یہ کہے کہ: ''میں نے فلاں سے نکاح کیا، یا کرایا'' اور دُوسرا جواب میں کہے: ''میں نے قبول کیا''۔ اور منگنی صرف وعدۂ نکاح کو کہتے ہیں۔

والله سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۹/۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱۳/۱۹ الف)

منکوحہ غیر مدخول بہا کی لڑکی سے شوہر کے نکاح کا حکم

سوال:- مسماۃ ہندہ کا شوہر وفات پاگیا اور اسی شوہر سے ایک لڑکی مسماۃ رابعہ ہے، ہندہ نے دُوسری جگہ شادی کی، مگر قبل دُخول کے ہندہ وفات پاگئی یا قبل دُخول کے شوہر نے ہندہ کو طلاق دے دی، آیا اسی شوہر کا نکاح مسماۃ رابعہ سے جو اس منکوحہ غیر مدخول بہا کی لڑکی ہے، دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں رابعہ کے ساتھ ہندہ کے شوہر کا نکاح دُرست ہے، کیونکہ ہندہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۲ وان للوعد فوعد. وفی الشامیة ص:۱۱ لو قال هل أعطيتنيها فقال أعطيت، ان كان المجلس للوعد فوعد، وان كان للعقد فنكاح.

(۲) "ولا تنكحوا ما نكح اٰباؤكم من النّساء" (الأية) سورة النساء:۲۲. وفی الهندية ج:۱ ص:۲۷۴ نساء الأباء والأجداد من جهة الأب أو الأم وان علوا فهٰؤلاء محرّمات على التأبيد نكاحًا ووطأً. وفی الدر المختار كتاب النكاح فصل فی المحرّمات: وتحرم موطؤات اٰبائه وأجداده وان علم ولو بزنا والمعقودات لهم عليهن بعقدٍ صحيح.

کے ساتھ اس کا دُخول نہیں ہوا، قرآنِ کریم میں ہے: "وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ، فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ الآية"۔[1]

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۳/۱۹ الف)

منکوحہ غیر مطلقہ سے کسی غیر کے نکاح کا حکم

سوال:- میاں بیوی کے درمیان کسی جھگڑے کی وجہ سے لڑکی کے والد نے لڑکی قوم کے اختیار میں دے دی ہے، اور قوم کو پورے اختیارات دے دیئے کہ قوم جو چاہے سو کرے، قوم مالک ہے، اس کے بعد قوم نے ایک شخص کو جو کہ قوم کا صدر بھی ہے، اسے قوم نے اپنا امین سمجھتے ہوئے بطورِ امانت رکھ دی، لیکن اس امین نے بغیر قوم سے دریافت کئے ہوئے لڑکی کا نکاح اپنے بھتیجے سالے کے لڑکے سے کردیا کیونکہ اس میں امین کا ذاتی فائدہ تھا، آیا شرع میں اس شخص کو اپنا امین سمجھا جائے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب لڑکی کا نکاح اپنے شوہر سے قائم تھا، تو صدر نے بھتیجے سے اس کا نکاح کرکے سخت گناہ کا کام کیا،[2] یہ نکاح باطل اور حرام ہے،[3] لڑکی کا نکاح بدستور اپنے شوہر سے قائم ہے، جس شخص نے یہ حرکت کی اسے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے اور جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کرے مسلمانوں کو اپنا کوئی ذمہ داری کا عہدہ اسے سونپنا نہیں چاہئے، بشرطیکہ وہ واقعات دُرست ہوں جو سوال میں تحریر کئے گئے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۰/۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۸۲۳/۲۱ الف)

صرف پستان منہ میں لینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- ہم سات بہن بھائی تھے، تین برادر ایک بہن ہماری مادرزاد تھی اور ہم تین بھائی مسمّٰی سلطان محمد خان، شیر باز، محمد نواز ان سے چھوٹے تھے، جب میری والدہ نے میرے باپ سے

---

(۱) سورة النساء: ۲۳.

(۲،۳) وفى الهندية كتاب النكاح الباب الثالث ج: ۱ ص: ۲۸۰ (طبع ماجديه) لا يجوز للرجل أن يتزوج زوجة غيره وكذٰلک المعتدة .... الخ. وكذا فى كفايت المفتى ج: ۵ ص: ۲۸۵ (دارالاشاعت جدید ایڈیشن).
وفي الدر المختار ج: ۳ ص: ۲۸ أسباب التحريم أنواع، قرابة، مصاهرة، رضاع .... وتعلق حق الغير بنكاح.
نیز دیکھئے: تفسير مظهرى ج: ۲ ص: ۶۴ تحت قوله تعالٰى: "والمحصنٰت من النساء" (الأية). وفى ردّ المحتار ج: ۳ ص: ۱۳۲ اما نكاح منكوحة الغير ومعتدته فالدخول فيه لا يوجب العدة أن علم أنها للغير لأنه لم يقل أحد بجوازه فلم ينعقد أصلًا.

شادی کی میرا ایک بچہ پیدا ہوا تین چار ماہ بعد اس کی والدہ فوت ہوگئی۔ اس کے بعد بچہ کی پرورش دادی کے ذمہ تھی، دُودھ بکری کا نپل کے ذریعہ پیتا تھا، اس وقت میری والدہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی، بدن پر خون گوشت کا تنکا بھی نہ تھا، کبھی کبھی دادی والدہ کی حسرت پوری کرنے کے لئے بچہ کو لیتی کیونکہ وہ چیختا چلاتا تھا چپ کرواتی لیکن قسم سے پستانوں سے دُودھ کہاں پانی بھی نہیں نکلتا تھا، میرے بھائی محمد نواز کی لڑکی جوان ہے، میرا لڑکا جس کی عمر دو سال مادرزاد چچا کے گھر بیس سال کا شادی شدہ ہے، اولاد سے محروم ہے، میرے بھائی کی لڑکی میرے لڑکے کے ساتھ نکاح میں کوئی خلل تو نہیں جائز ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے لڑکے نے آپ کی والدہ کے صرف پستان منہ میں لئے تھے اور دُودھ نہیں نکلا تھا تو آپ کے لڑکے کی شادی آپ کے بھائی کی لڑکی سے ہوسکتی ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۹۳ ج)

رضاعی بھانجے سے نکاح کا حکم

سوال:- ہندہ کا دُودھ اس کی حقیقی پوتی نے پیا، تو کیا ہندہ کے حقیقی نواسے یعنی ہندہ کی سگی بیٹی کے لڑکے سے اس دُودھ پینے والی لڑکی کا نکاح جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہندہ کی پوتی کا نکاح ہندہ کے نواسے سے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ نواسہ لڑکی کا رضاعی بھانجا ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۱۲۷۸ و)

رضاعی چچا سے نکاح کا حکم

سوال:- جمال خان کے دو فرزند ہیں، غلام علی اور نورالدین۔ غلام علی کی زوجہ زینت کا دُودھ نورالدین نے پیا ہے جنت کے ساتھ، جنت غلام علی کی بیٹی ہے، اب غلام علی کا بیٹا عبدالکریم جو جنت بہن کے بعد غلام علی کے ہاں پیدا ہوا ہے، یہ عبدالکریم اب نورالدین کی بیٹی فاطمہ سے نکاح کرنا

---

(۱) وفی الشامیة، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۲ (طبع سعید) لو أدخلت الحلمة فی الصبی وشکت فی الأرتضاع لا تثبت الحرمة بالشک. وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۲ فلو التقم الحلمة ولم یدر أدخل اللبن فی حلقه أم لا؟ لم یحرم.

(۲) "حرمت علیکم أمهاتکم وبناتکم .... وبنات الأخ وبنات الأخت" الأیة سورة النساء:۲۳. وفی الحدیث: عن علی رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب. (جامع الترمذی، ابواب الرضاع، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷). نیز دیکھئے: کفایت المفتی (جدید ایڈیشن دارالاشاعت) ج:۵ ص:۱۷۲، و فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۴۰۱.

چاہتا ہے، کیا یہ نکاح ہوجائے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر عبدالکریم زینت کے بطن سے ہے تو وہ فاطمہ کا رضاعی چچا ہونے کے سبب فاطمہ کے لئے حرام ہے، اور دونوں میں نکاح نہیں ہوسکتا،[1] اور اگر عبدالکریم زینت کے علاوہ غلام علی کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے تب بھی عبدالکریم کا فاطمہ سے نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس صورت میں بھی عبدالکریم غلام علی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اگرچہ حقیقتاً فاطمہ کا چچازاد بھائی ہے، تاہم رضاعت کی نسبت سے عبدالکریم فاطمہ کا باپ شریک رضاعی چچا ہے، لہٰذا ہر دو صورت میں فاطمہ عبدالکریم پر حرام ہے اور دونوں کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا، لحرمة لبن الفحل۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۵ھ

بیوی کو طلاق دینے کے بعد دورانِ عدّت اس کی بہن سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی کا نکاح ایک عورت سے ہے، اس کو طلاق دے دی، طلاق دے کر اسی جگہ اس وقت اس کی حقیقی بہن سے نکاح کرلیا، کیا یہ نکاحِ ثانی جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ نکاح جائز نہیں، جب تک پہلی بیوی کی عدّت ختم نہ ہوجائے (یعنی اسے تین مرتبہ حیض نہ آجائے، یا اگر اسے حیض نہیں آتا تو تین مہینے پورے نہ ہوجائیں) اس وقت تک اس کی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے، اور ایسا نکاح کالعدم ہوگا، لما فی البدائع: وكما لا يجوز للرجل أن يتزوج المرأة في نكاح أختها لا يجوز له أن يتزوجها في عدة أختها. (بدائع الصنائع ج:۲ ص:۲۶۳)۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۷/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) عن علی رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب. (جامع الترمذی، باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ج:۱ ص:۲۱۷ طبع سعید). وفی سنن أبی داؤد كتاب النكاح باب يحرم من الرّضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) عن عائشة زوج النبی صلی الله علیه وسلم ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۱۴ (رضاعی چچا و خالو سے نکاح حرام ہے)۔

(۲) (طبع سعید) وفی المبسوط للسرخسی، كتاب النكاح ج:۴ ص:۲۰۴ (طبع دار المعرفة بیروت) وعدة الأخت تمنع نكاح الأخت. وفی الهداية، كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۰۹ و ۳۱۰ (طبع شركت علميه) واذا طلّق الرجل امرأته بائنًا أو رجعيًا لم يجز له أن يتزوج بأختها حتى تنقضي عدتها.

رضاعی بہن سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زید کی ایک حقیقی پھوپھی ہے، زید اس پھوپھی کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، جبکہ زید نے پھوپھی کا چھ مہینے دُودھ بھی پیا ہے، کیا یہ نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی پھوپھی کی لڑکی اس کی رضاعی بہن ہے، اس لئے اس سے نکاح جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بھائی کے لڑکے سے اپنی پوتی کا نکاح کرانے کا حکم

سوال:- ایک عورت ہے، اس کا ایک سگا بھائی ہے، اور اس کا ایک لڑکا ہے، اب وہ بھائی کے لڑکے سے اپنے لڑکے کی لڑکی کا نکاح کرنا چاہتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- بھائی کے لڑکے سے اپنی پوتی کا نکاح کرنا جائز ہے،[2] بشرطیکہ کوئی دُودھ پینے کا رشتہ نہ ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۰/۱۱/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۳/۲۱ الف)

بیوی کے پستان منہ میں لینے سے نکاح پر اثر نہیں پڑتا

سوال:- میری شادی ہوئی ہے، میں نے کسی کی غلط باتوں میں آکر اپنی بیوی کی چھاتیاں چوسنا شروع کردیں، لیکن کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ اس فعل سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کا نکاح نہیں ٹوٹا،[3] اور بیوی کے پستان منہ میں لینا شرعاً ممنوع بھی نہیں، بشرطیکہ اس سے دُودھ منہ میں چلے جانے کا اندیشہ نہ ہو، اگر دُودھ منہ میں چلا گیا تو

---

(۱) ولا حل بین رضیعی امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزمن، (الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۷). وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۴۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعا .... الخ.

(۲) یہ "وأحل لکم ما وراء ذٰلکم" الأیة (سورة النساء:۴) میں داخل ہے، دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۱۹۴، سوال نمبر ۲۷۰۔

(۳) وفی الدّر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۲۵ (طبع سعید) مص رجل ثدی زوجته لم تحرم.

ایک ناجائز چیز پینے کا گناہ ہوگا،(۱) لیکن نکاح پھر بھی نہیں ٹوٹے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۲۸ الف)

سوتیلی بہن کی پوتی سے نکاح کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ میرے والد نے میری سوتیلی بہن کی شادی اپنے چچازاد بھائی سے کی اور اس چچازاد بھائی کا اس عورت سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، اب اس لڑکے کی ایک لڑکی ہے جو کہ میری اس سوتیلی بہن کی پوتی لگتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ میرا نکاح اس لڑکی کے ساتھ جو میری سوتیلی بہن کی پوتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آپ کے لئے اپنی سوتیلی بہن (یعنی باپ شریک) کی پوتی سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے، قال فی العالمگیریة ج:۲ ص:۵ فی بیان المحرمات النسبیة: وکذا بنات الأخ والأخت وان سفلن۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۵/۲۱ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

سوتیلے والد کی سابقہ بیوی کی بیٹی سے نکاح جائز ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جس وقت طلاق دی تھی، اس وقت اس عورت کی لڑکی پیدا ہوئی جو بعد میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی، اور اس شخص نے ایک اور عورت سے نکاح کیا، اور جس عورت سے نکاح کیا تھا، اس کا ایک لڑکا سابق شوہر سے تھا، اب وہ لڑکی اور یہ لڑکا دونوں جوان ہوگئے ہیں، کیا ان کا آپس میں نکاح دُرست ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ ولم یبح الارضاع بعد مدته لأنه جزء اٰدمی والانتفاع به لغیر ضرورة حرام علی الصحیح. وکذا فی کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۶۲.

(۲) الفتاویٰ الهندیة، کتاب النکاح الباب الثالث فی بیان المحرمات ج:۱ ص:۲۷۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وفیها أیضًا الباب الثالث القسم الأوّل ج:۱ ص:۲۷۳ (طبع ماجدیه) وبنات الأخت فهن محرمات نکاحا ووطأً ودواعیه علی التأبید .... الخ. وفی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۵۶ تحت قوله تعالٰی: "وبنٰت الأخ وبنٰت الأخت" یعنی فروع الأخت والأخت بناتهما وبنات أبنائهما، وبنات بناتهما، وان سفلن سواء کان الأخ والأخت لأبوین أو لأحدهما.
وکذا فی معارف القراٰن ج:۲ ص:۳۵۸.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں دونوں کا نکاح ہوسکتا ہے۔[1]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲۹/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

رضاعی بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- دو سگے بھائی ہیں، بڑے بھائی کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، چھوٹے بھائی کا ایک لڑکا اور چار لڑکیاں ہیں، بچپن میں چھوٹے بھائی کی بیوی نے اپنی لڑکی کو بڑے بھائی کی بیوی کا دُودھ پلایا تھا، اب وہ جوان ہیں، بڑے بھائی کے گھر والے چاہتے ہیں کہ جس لڑکی کو ان کی بیوی نے دُودھ پلایا تھا اس کی شادی اپنے لڑکے سے کریں۔ اس لڑکے سے شادی نہیں کر رہے ہیں جو لڑکی کو دُودھ پلاتے وقت گود میں تھا، بلکہ اس کے بڑے بھائی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اس لڑکی کی شادی دُودھ پلانے والی عورت کی کسی لڑکی سے ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکی نے جس عورت کا دُودھ پیا ہے اس کے تمام لڑکے اس کے رضاعی بھائی ہیں، اور ان سے اس لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا،[2] خواہ لڑکی کے دُودھ پینے کے وقت وہ شیرخوار ہوں یا نہ ہوں، لہٰذا مجوّزہ نکاح شرعاً جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۵/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰۰/۲۸ الف)

دو رضاعی بہنوں سے بیک وقت نکاح کرنا حرام ہے

سوال:- نمی الدین نامی ایک شخص کے گھر میں لڑکا نہیں جیتا تھا، تو بہت برس کے بعد اس نے ایک لڑکی کی پرورش کی، اللہ کے حکم سے پندرہ دن کے بعد شخصِ مذکور کی بیوی کو جو حاملہ تھی ایک لڑکی پیدا ہوگئی، اب دونوں ہمشیر ہوگئے، رفتہ رفتہ ان میں سے ایک بالغ ہوگئی تو اس کی نذیر احمد نامی شخص سے شادی کرادی اور ساتھ دُوسری لڑکی بھی بالغہ ہوئی اور بہنوئی کے گھر میں آگئی، لوگوں کو جب زنا کا اندیشہ ہوا تو ان کے زجر وتوبیخ پر باپ اُسے اپنے گھر لے گئے، پھر چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ موصوفہ پھر بہنوئی کے گھر گئی ہے، لوگوں نے اس سے پوچھ پاچھ کیا، اس نے اقرار کیا کہ میں حاملہ ہوں، بعد میں بہنوئی

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۳۱ (طبع ایچ ایم سعید) أما بنت زوجة أبیه أو ابنه فحلال.

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۱ ص:۲۱۷ ولا حلّ بین رضیعی امرأة لکونهما أخوین وان اختلف الزمن. وفی الهندیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۴۳ (طبع ماجدیه) یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعًا .... الخ.

سے پوچھا گیا تو اس نے بھی زنا کا اقرار کیا، بعد میں داماد نے سسر کو ایک سو روپے جھوٹی بات کہنے کے لئے دیئے تو باپ نے روپے کے حرص میں کہا کہ یہ لڑکی رضیعہ نہیں، ایک مجلس طلب کی گئی، اس میں گواہ پیش ہوئے کہ یہ رضیعہ نہیں ہے، مگر اس کی خالہ اس لڑکی کو موصوفہ دایہ کے پاس لے گئی، اس نے لڑکی کے والد کو کہا کہ تم روپے کے خوف سے جھوٹ بات منہ سے نکالتے ہو، اس پر وہ خاموش رہا، اب شرعاً وسیاسۃً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ دو معتبر گواہ اس بات کے موجود ہیں کہ ان دونوں لڑکیوں نے ایک ہی عورت کا دُودھ پیا ہے تو ان دونوں سے بیک وقت نکاح کرنا نذیر احمد کے لئے حرام ہے،(۱) اور جو گواہیاں رضیعہ نہ ہونے پر لائی گئی ہیں، وہ قابلِ قبول نہیں ہیں، کیونکہ **المثبت مقدم علی النافی**، نذیر احمد کو چاہئے کہ فوراً دُوسری لڑکی کو چھوڑ دے اور اس گناہ سے توبہ و اِستغفار کرے، اور وہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو تو عدالت کے ذریعے بھی دونوں میں تفریق کرائی جاسکتی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۰/۱۲/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۴/۲۱ الف)

باپ شریک بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- زید کے پاس دو عورتیں ہیں، زید نے ان دونوں عورتوں کو چھوڑ دیا، پھر ان دونوں عورتوں نے الگ الگ مرد سے اپنا نکاح کرلیا، ایک عورت کے یہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، البتہ اس کے مرد کی پہلی عورت سے ایک لڑکا ہے، دُوسری عورت کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، اب اس لڑکی کا نکاح اُس لڑکے سے ہوسکتا ہے جو اُوپر ذکر کیا گیا ہے؟

جواب:- سوال پوری طرح واضح نہیں ہے، اگر مذکورہ لڑکا اور لڑکی آپس میں باپ شریک بھائی بہن ہیں، تب تو ان کے درمیان نکاح نہیں ہوسکتا،(۲) اور اگر دونوں کے ماں باپ بالکل الگ ہیں تو صورتِ مسئولہ میں نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کوئی اور سببِ حرمت موجود نہ ہو۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ یہی سوال ہر مرد و عورت اور لڑکے لڑکی کا نام لکھ کر وضاحت سے دوبارہ پوچھ کر پھر عمل کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۰۹/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الشامیة، کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۲۴ وهی شهادة عدلین أی من الرجال وأفاد انه لا یثبت بخبر الواحد امرأة کان أو رجلًا. وفی الهندیة کتاب الرضاع ج:۱ ص:۳۴۷ (طبع ماجدیه) ولا یقبل فی الرضاع الّا شهادة رجلین أو رجل وامرأتین عدول.

(۲) وفی التفسیر المظهری ج:۲ ص:۵۶ (طبع دهلی) تحت قوله تعالیٰ: "حرّمت علیکم أمهاتکم وبنٰتکم وأخواتکم" تعمّ ما کانت منها لأب أو لأم أو لهما .... الخ.

رضاعی پھوپھی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- زید کی ماں محمودہ کا دُودھ خالد نے پیا، پھر تقریباً سولہ سال بعد خالد کی بیوی کا دُودھ ظفر نے پیا، اب ظفر کا نکاح زید کی حقیقی بہن صاعقہ سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں صاعقہ ظفر کے رضاعی باپ کی رضاعی بہن ہوئی، اس لئے ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ رضاعی رشتے سے ظفر کی پھوپھی ہے، ویحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

مزنیہ سے نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک لڑکا اور لڑکی جو باہم رشتہ میں بھائی بہن ہیں، یعنی ماموں کی لڑکی اور پھوپھی کا لڑکا، ان دونوں میں ناجائز تعلق ہوگیا، جس کے نتیجے میں لڑکی حاملہ ہوگئی، بزرگوں کو معلوم ہونے پر دونوں کی شادی طے کردی ہے، جس کا انعقاد کل ۱۵رجون کو ہے، آپ سے دریافت کرنا ہے کہ آیا یہ شادی جائز ہے؟ اور پیدا ہونے والا بچہ جائز ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکے اور لڑکی نے زنا کرکے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، دونوں پر واجب ہے کہ صدقِ دل سے توبہ و اِستغفار کریں، اور صورتِ مسئولہ میں دونوں کا باہم نکاح صحیح ہوجائے گا،[2] اور اگر بچہ نکاح کے چھ مہینے بعد پیدا ہوا تو بچے کو بھی ثابت النسب سمجھا جائے گا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۰/ ۲۸ ب)

---

(۱) سنن أبی داوٗد، کتاب النکاح، باب یحرم من الرّضاعة ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع سعید) و جامع الترمذی ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید).

(۲) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۸ وصحّ نکاح حبلٰی من زنی. وفی الشامیة تحته (وصحّ نکاح حبلٰی من زنی) أی عندهما، وقال أبویوسف: لا یصحّ، والفتویٰ علٰی قولهما .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۹ لو نکحها الزّانی حلّ له وطؤها اتفاقا والولد له ولزمه النفقة. وفی الشامیة تحته قوله والولد لهٗ أی ان جاءت بعد النکاح لستة أشهر مختارات النوازل فلو لأقل من ستّة أشهر من وقت النکاح لا یثبت النسب ولا یرث منه.

مزنیہ سے نکاح کا حکم

سوال:- اگر کسی لڑکے نے زنا کرلیا اور لڑکی حاملہ ہوگئی، لڑکا چاہتا ہے کہ وہ اُس لڑکی سے نکاح کرلے تو کیا حمل کے دوران نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- جی ہاں! نکاح کرسکتا ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۷/۱۱/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۷۲/۳۲ ج)

مزنیہ سے نکاح کے بعد وطی کا حکم

سوال:- ہندہ منکوحہ نے رُخصتی سے قبل زنا کرلیا اور حمل ٹھہر گیا، اب ہندہ کے والد نے ہندہ کی رُخصتی کردی تو اب ہندہ کے شوہر کو اس سے وطی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہندہ کا شوہر اس سے وطی کرے تو کسی قسم کا گناہ تو نہ ہوگا؟

جواب:- اگر شوہر اس حمل کو اپنی طرف منسوب کرنے سے انکار کرتا ہے تو جب تک وضعِ حمل نہ ہوجائے اس کے لئے وطی جائز نہیں۔(۲)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۴/۱۱/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۵۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

رضاعت کا ایک مسئلہ

سوال:- زید اور بکر گو کہ دونوں حقیقی بھائی باپ کی طرف سے نہیں، ماں کی طرف سے ہیں، یعنی ماں ایک ہے، اور باپ دو، زید پہلے باپ سے ہے، جبکہ بکر دُوسرے باپ سے ہے، زید کا انتقال ہوچکا ہے، جس نے عمرو کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا دُودھ پیا تھا، اب مسئلہ درپیش یہ ہے کہ بکر جو کہ دُوسرے باپ کی اولاد ہے، یعنی زید کی ماں نے جس دُوسرے خاوند سے نکاح کیا، آیا شریعت کی رُو سے بکر، عمرو کو اپنی بیٹی عقدِ نکاح میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ براہِ کرم مندرجہ دونوں صورتوں میں الگ الگ وضاحت فرمائیں۔

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب المحرّمات ج:۳ ص:۴۸ (طبع ایچ ایم سعید) (وصح نکاح حبلیٰ من زنی لا) (حبلیٰ) (من غیرہ) أی الزّنی لثبوت نسبہ .... الخ. وفی الشامیة تحتہ أی عندھما، وقال أبویوسف: لا یصحّ، والفتویٰ علی قولھما .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۸، ۴۹ (و) صحّ نکاح (حبلی من زنی) لا حبلی (من غیرہ) أی الزّنی .... (وان حرم وطؤھا) ودواعیہ (حتی تضع) متصل بالمسئلة الأولیٰ لئلّا یسقی ماؤہ زرع غیرہ.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بکر اور عمرو کے درمیان کوئی رضاعی رشتہ قائم نہیں ہوا، کیونکہ رشتہ رضاعت زید اور عمرو کے مابین ہے، بکر اور عمرو کے مابین نہیں ہے، لہٰذا عمرو کی ماں بکر کی رضاعی ماں نہیں ہے، لقوله فی الدر المختار فیحرم منه ما یحرم من النسب .... الا ام أخیه وأخته ..... فان حرمة أم أخته وأخیه نسبا لکونها أمّه أو موطؤة أبیه وهذا المعنی مفقود فی الرضاع. (شامی ج:۲ ص:۴۰۷)[۱] اور جب عمرو کی ماں کا بکر کے ساتھ کوئی نسبی یا رضاعی تعلق نہیں تو وہ بکر کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے۔

بالفاظِ دیگر بکر کی بیٹی عمرو کے رضاعی بھائی زید کی بھتیجی ہے اور رضاعی بھائی کی نسبی بہن سے بھی نکاح جائز ہے، کما قالوا وتحلّ أخت أخیه رضاعًا. (شامی ج:۲ ص:۴۰۸)[۲] تو رضاعی بھائی کی بھتیجی سے بطریقِ اَولیٰ جائز ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عمرو، بکر کی بیٹی سے شرعاً نکاح کرسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۱/۸/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۱/۲۲ ب)

غیر ثابت النسب لڑکی سے نکاح کا حکم

سوال:- ایک صاحب اپنے لڑکے کی شادی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ لڑکی اپنے والدین کی ناجائز یعنی حرامی اولاد ہے، اُس کی ماں کا نکاح اُس کے باپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، از رُوئے شریعتِ اسلامی ایک حرامی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہوگا کہ نہیں؟

جواب:- اگر حرمت کی کوئی اور وجہ نہ ہو تو محض لڑکی کے غیر ثابت النسب ہونے کی بنیاد پر اس سے نکاح حرام نہیں، نکاح ہوسکتا ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۴۲/۲۷ و)

تایازاد بہن کے ساتھ نکاح کا حکم

سوال:- کیا تایازاد بہن کے ساتھ مذہبِ اسلام میں نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) الدر المختار باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۳ الی ۲۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۷.
(۳) کیونکہ یہ محرمات میں داخل نہیں: "واحل لکم ما وراء ذٰلکم" سورة النساء:۲۵۔

جواب:- تایازاد بہن کے ساتھ نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کوئی اور سببِ حرمت، رضاعت یا مصاہرت کا نہ پایا جاتا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۳/۲۷ و)

رضاعی بہن سے نکاح کا حکم

سوال:- میری خالہ کی لڑکی نے اُس وقت میری والدہ کا دُودھ پی لیا جبکہ پانچ سال چھوٹا ایک میرا بھائی، میری والدہ کا دُودھ پیتا تھا، خالہ کو دُودھ کم تھا، میری والدہ نے دُودھ پلایا، جس لڑکی نے میری والدہ کا دُودھ پیا ہے کیا اُس لڑکی سے میرا نکاح ہوسکتا ہے، جبکہ میں نے اُس کے ساتھ دُودھ نہیں پیا ہے؟

جواب:- اگر آپ کی خالہ کی لڑکی نے آپ کی والدہ کا دُودھ مدتِ رضاعت میں یعنی دو سال سے کم عمر میں پیا ہے،[1] تو وہ آپ کی رضاعی بہن ہوگئی اور اُس کے ساتھ آپ کا نکاح نہیں ہوسکتا،[2] دُودھ خواہ آپ کے ساتھ پیا ہو یا آپ کے چھوٹے بھائی کے ساتھ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۲/۲۸ ج)

غیر مطلقہ منکوحہ سے کسی دُوسرے شخص کے نکاح کا حکم

سوال:- قاضی بشیر احمد کی بیوی بسااوقات اپنے خاوند سے محض بیوقوفی اور سخت مزاجی سے پیش آیا کرتی تھی، لہٰذا خاوند مذکورہ نے علالت کے باعث منکوحہ سے تنگ آکر اس کی والدہ کو بلاکر منکوحہ کو گھر بھیج دیا کہ میں فی الحال اس ہٹ دھرمی کو ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوئے آپ کے حوالے کرتا ہوں اور جس طرح آپ صحت یاب ہونے پر حکم فرمائیں گی میں تعمیل کروں گا، لہٰذا ان کی منکوحہ سے ایک دو ماہ بعد فوری طور پر بغیر کسی طلاق کے مولوی عبداللہ نے نکاح کرلیا، کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں اور قاضی بشیر احمد نے اپنی بیوی زلیخا بی بی کو کوئی طلاق نہیں دی تو وہ بدستور قاضی بشیر احمد کی بیوی ہے، اور مولوی عبداللہ کے ساتھ اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱ (طبع سعید) ویثبت التحریم فی المدّۃ فقط. وفی الشامیۃ تحتہ اما بعدھا فانہ لا یوجب التحریم.

(۲) "حرّمت علیکم أمھاتکم .... وأخواتکم من الرضاعۃ" (الأیۃ) سورۃ النساء:۲۳.

(۳) وفی الدر المختار کتاب النکاح، باب الرضاع ج:۱ ص:۲۱۷ (طبع سعید) ولا حلّ بین رضیعی امرأۃ لکونھما أخوین وان اختلف الزّمن.

نکاح شرعاً باطل اور کالعدم ہے،[۱] جتنے عرصے زلیخا بی بی، محمد عبداللہ کے پاس رہی، ناجائز طور پر رہی، اب ان کا فوراً الگ ہونا ضروری ہے، دونوں توبہ و اِستغفار کریں اور زلیخا بی بی اپنے اصلی شوہر قاضی بشیر احمد کے پاس واپس آجائے، اور چونکہ محمد عبداللہ سے زلیخا کا نکاح ہی دُرست نہیں ہوا، اس لئے طلاق کی تحریریں بے کار ہیں، قاضی بشیر احمد عدالت کے ذریعے بیوی کو دوبارہ واپس آنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۶/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۸ اسباب التحریم أنواع، قرابة، مصاهرة، رضاع .... وتعلق حق الغير بنكاح .... الخ. وفی الشامية ج:۳ ص:۱۳۲ اما نكاح منكوحة الغير ومعتدته فالدخول فيه لا يوجب العدّة ان علم أنها للغير، لأنه لم يقل أحد بجوازه فلم ينعقد أصلًا.

وفی الهندية كتاب النكاح الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجديه) لا يجوز للرّجل أن يتزوّج زوجة غيره وكذٰلک المعتدّة .... الخ. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۲۸۵. (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

﴿فصل فی أحکام الحرمة المصاهرة﴾

(حرمتِ مصاہرت کے اَحکام)

بہو سے زنا کرنے سے بیٹے پر اس کی بیوی حرام ہوجائے گی

سوال:- اگر کسی شخص کے اپنی بہو یعنی لڑکے کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا ہوجائیں اور سسر نے بہو سے صحبت کرلی ہو تو کیا حکم ہے؟ اگر صحبت نہ کی ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیوی سے زنا کرے تو وہ اس کے بیٹے پر حرام ہوجاتی ہے،[1] ایسی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی سے یہ کہہ کر فوراً الگ ہوجائے کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔[2] اور اگر پوری صحبت نہیں ہوئی تو واقعے کی صحیح صحیح تفصیل لکھ کر بھیجئے اُسے دیکھ کر ہی حکم بتایا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۶/۲۸ ب)

سالی سے زنا کرنے پر حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- ایک شخص اپنی سالی (بیوی کی بہن) سے زنا کا مرتکب ہوا ہے، کیا اس کا نکاح ٹوٹ گیا یا نہیں؟ یا نکاح میں کچھ خلل واقع ہوا ہے یا نہیں؟ (محمد ریاض، حفر الباطن، سعودی عرب)

جواب:- اس شخص نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، جس پر اُسے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور آئندہ اُس سالی سے پردہ کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اس عمل سے اس کی بیوی کے ساتھ نکاح پر کوئی

---

(۱) وفی الشامیة ج:۳ ص:۳۲ (طبع سعید) قال فی البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علٰی أصول الزّانی وفروعه نسبًا ورضاعًا. وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۱۰۱، والهندیة ج:۱ ص:۲۷۵ الباب الثالث فی المحرمات.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۳۷ وبحرمة المصاهرة لا یرتفع النکاح حتّٰی لا یحلّ لها التزوج باٰخر الّا بعد المتارکة. وفی الشامیة تحته: .... وقد علمت ان النکاح لا یرتفع بل یفسد وقد صرّحوا فی النکاح الفاسد بأنّ المتارکة لا تتحقّق الّا بالقول ان کانت مدخولا بها کترکتک أو خلیت سبیلک. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۳۲۳. (محمد زبیر عفی عنہ).

اثر نہیں پڑا، وہ بدستور اس کی منکوحہ ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۲/۴/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۴/۳۳ الف)

---

(۱) تاہم سالی کے استبراء یعنی اُس کے ایک حیض گزرنے تک یا اُس کے حاملہ ہونے کی صورت میں اُس کے وضعِ حمل تک اپنی بیوی سے جماع کرنا جائز نہیں، بلکہ علیحدہ رہنا واجب ہے۔ دراصل اس مسئلے میں کہ مذکورہ صورت میں مزنیہ کا استبراء واجب ہے یا مستحب؟ حضراتِ فقہائے کرامؒ کے مختلف اقوال ہیں، جن کی روشنی میں محتاط یہی ہے کہ مزنیہ کا استبراء واجب ہے، تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ راقم کا درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:-

مذکورہ مسئلے سے متعلق عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں حضراتِ متقدمین کے مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دو قول مروی ہیں:-

۱:- سالی سے زنا کی صورت میں سالی کے تین حیض گزرنے تک بیوی سے علیحدہ رہنا واجب ہے، یعنی مذکورہ صورت میں زنا سے عدت، نکاح میں عدت ہی کی طرح ہے۔

۲:- ایک حیض گزرنا واجب ہے۔

۳:- فقہائے حنابلہ نے ایک تیسرے قول کو بطورِ احتمال کے ذکر کیا ہے، جو اس کے ضعف کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ واجب نہیں، بلکہ بعض فقہائے حنابلہ نے یہ تیسرا قول ذکر ہی نہیں کیا۔

فی المغنی لابن قدامه تحت رقم المسئلة: ۱۱۳۹ ج: ۹ ص: ۴۷۹ و ۴۸۰ (طبع دار عالم الکتب ریاض) وان زنیٰ بامرأة فليس لهٗ أن يتزوج أختها حتى تنقضي عدتها وحكم العدة من الزنا والعدة من وطء الشبهة كحكم العدة من النكاح. فان زنیٰ بأخت امرأته فقال أحمد يمسك عن وطء امرأته حتى تحيض ثلاث حيض وقد ذكر عنه فی المزنی بها انها تستبرأ بحيضةٍ لأنه وطء فی غير نكاح ولا أحكامه أحكام النكاح ويحتمل ان لا تحرم بذٰلک أختها ولا اربع سواها لأنها ليست منكوحة ومجرد الوطء لا يمنع بدليل الوطء فی ملک اليمين لا يمنع أربع سواها.

تنبيه:- اذا وطیء بشبهة أو زنی لم يجز فی العدة أن ينكح أختها ولو كانت زوجته نص عليه وفيه احتمال. (المبدع فی شرح المقنع ج: ۷ ص: ۶۲ طبع المكتب الاسلامی بيروت). (وكذا فی الفقه الاسلامی وأدلّته ج: ۷ ص: ۱۶۵ طبع دار الفكر دمشق).

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے استبراء مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں ملکِ یمین میں بھی استبراء مستحب ہے۔ (**مغنی المحتاج ج: ۳ ص: ۱۸۰ طبع دار احياء التراث العربی**)۔ (**وكذا فی التهذيب ج: ۵ ص: ۳۶۱ طبع دار الكتب العلمية بيروت**)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس مسئلے میں نہیں مل سکا، جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے ہاں اس مسئلے میں دو قول ملتے ہیں، ایک قول شامی میں نقل کیا گیا ہے کہ استبراء مستحب ہے، **يعنی اذا زنیٰ بأخت امرأته أو بعمّتها أو بخالتها أو بنت أخيها أو أختها بلا شبهة فان الأفضل أن لا يطاء امرأته حتى تستبرأ المزنية .... الخ. شامی ج: ۶ ص: ۳۸۰ باب الاستبراء (طبع سعيد).** اور یہی قول **جامع الرموز للقهستانی كتاب الكراهية ج: ۲ ص: ۳۱۴ (طبع سعيد)** میں بھی مذکور ہے۔ (**وكذا فی شرح الملتقی ص: ۲۱۱ علیٰ مجمع الأنهر**) مگر ایک دُوسرا قول استبراء کے واجب ہونے کا بھی ہے جو **دراية عن الكامل** کی عبارت: **لو زنیٰ باحدی الأختين لا يقرب الأخریٰ حتى تحيض الأخریٰ حيضة .... الخ.** کے علاوہ **النتف فی الفتاویٰ كتاب النّكاح ص: ۱۸۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)** میں یوں مذکور ہے:-

الموانع فی النكاح .... والخامس عشر:- اذا وطأ ذات محرم من امرأته ممن لا يحرم عليه بزنا فانه لا يطأ امرأته حتى يستبرئ الموطوءة بحيضةٍ لانه لا يحلّ له رحمان محرمان فيهما ماؤه. ....(باقی اگلے صفحے پر)

سالی سے زنا کرنے سے بیوی حرام نہیں ہوتی

سوال:- آیا سالی سے ناجائز تعلقات ہونے کی بناء پر نکاح برقرار رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سالی سے زنا کرنا یا ناجائز مقاربت کرنا سخت گناہ کا موجب ہے، لیکن اس سے بیوی حرام نہیں ہوتی ہے۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۶۷ ج)

مزنیہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں

سوال:- جس عورت سے ناجائز تعلقات رہے ہوں، اس عورت کی لڑکی سے شادی جائز ہے یا نہیں؟ (لڑکی کا نطفہ شخصِ مذکور سے نہیں ہے)۔

جواب:- جس عورت سے زنا کیا ہو یا ناجائز طور پر بوس و کنار کیا ہو، اس کی لڑکی سے نکاح حرام اور باطل ہے،(۲) خواہ وہ لڑکی زانی کے نطفے سے نہ ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۶۷ ج)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)............(نیز علامہ عبدالرحمٰن شیخی زادہ آفندیؒ نے مجمع الأنهر ج:۱ ص:۴۷۹ (طبع دار الکتب العلمية بیروت) میں صرف درایہ عن الکامل کی عبارت ذکر کی ہے، اُس پر کوئی اِشکال وغیرہ ذکر نہیں فرمایا) اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے ہاں ایک قول استبراء کے واجب ہونے کا بھی ہے، لہٰذا حنابلہ کے ہاں مطلقاً استبراء کے واجب ہونے اور حنفیہ کے ایک قول کے مطابق استبراء واجب ہونے کی بناء پر محتاط بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان رحمۃ اللہ علیہ ونوّر اللہ مرقدہٗ نے امداد المفتین ص:۵۵۳ میں تحریر فرمائی ہے کہ کم از کم ایک حیض گزرنے تک بیوی سے علیحدہ رہنے کو واجب قرار دیا جائے، خاص طور پر جبکہ معاملہ فروج سے متعلق ہے جس میں احتیاط والے پہلو کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یُعمل بالاحتیاط خصوصًا فی باب الفروج. (شامی ج:۳ ص:۲۸۳ طبع سعید)۔

فی الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۷ ص:۱۶۵ (طبع دار الفکر دمشق): وان زنی الرجل بامرأة فلیس لهٗ أن یتزوج بأختها حتی تنقضی عدتها وحکم العدة من الزنا والعدة من وطء الشبهة کحکم العدة من النکاح.

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم وعلمهٗ أتم وأحکم
محمد زبیر عفی عنہ
۱۴۲۲/۱/۱۲ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	محمد عبداللہ عفی عنہ	محمد عبدالمنان	اصغر علی ربانی

---

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)۔

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۳۲ (طبع سعید): (و) حرم أیضًا بالصهریة (اصل مزنیته) .... الخ. وفی الشامیة، قال فی البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علیٰ أصول الزانی وفروعه نسبًا ورضاعًا وحرمة أصولها وفروعها علی الزّانی نسبًا ورضاعًا کما فی الوطءِ الحلال .... الخ.
وکذا فی البحر الرائق فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۱۰۱، و الفتاویٰ الهندیة الباب الثالث فی المحرمات ج:۱ ص:۲۷۵ (محمد زبیر عفی عنہ).

شہوت کے صرف شبہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی

سوال:- اکثر مجھے شبہ ہوتا ہے کہ فلاں بات سے کیا کوئی طلاق واقع ہوئی ہے یا فلاں بات سے حرمتِ مصاہرت ہوئی ہے، براہِ کرم ذیل کے مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۱:- ساس کے ساتھ شہوت سے ہاتھ لگے، یا ساس کی ماں کے ساتھ شہوت سے ہاتھ لگے، دونوں صورتوں میں حرمتِ مصاہرت ہوجاتی ہے یا نہیں؟ البتہ شہوت میں مرد کا معیار یہ ہے کہ اس کے آلۂ تناسل میں حرکت آجائے۔

ایک مرتبہ میری ساس نے مجھے چائے کی پیالی دی تو میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے لگا تو فوراً بوجۂ شبہ دھیان آلۂ تناسل کی طرف چلا گیا، آلۂ تناسل میں حرکت نہ ہوئی، جیسا کہ حرکت بیوی کو ہاتھ لگانے سے شہوت کے خیال کے ساتھ آنا شروع ہوجاتی ہے، البتہ بطور میری عادت، آلۂ تناسل کی طرف دِل کی دھڑکن سے بھی خفیف دھڑکن غالباً دو مرتبہ خیالِ شہوت ہوا، چونکہ آلۂ تناسل میں حرکت نہ ہوئی تو غالباً اس سے حرمتِ مصاہرت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دو، تین ایام قبل میری ساس کی بوڑھی والدہ محترمہ نے میرا ہاتھ چوما پھر مذکورہ صورتِ حال پیدا ہوئی، مارے خوف کے آلۂ تناسل کی طرف دھیان رکھا، اُس میں حرکتِ جسمانی محسوس نہ ہوئی، صرف خفیف دھڑکن، بہت خفیف دھڑکن ہوئی، لیکن آلۂ تناسل میں جسمانی حرکت شہوت والی نہ آئی، میری کسی عورت پر نظر پڑجائے تو آلۂ تناسل کی طرف دِل کی طرف سے ہوتی ہوئی دھڑکن (خفیف) سی دو، تین، چار مرتبہ اندرونی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شہوت مجھے کافی آتی ہے اور مذکورہ صورت میں وہ حرکت آلۂ تناسل میں نہ آئی سوائے وہ آلۂ تناسل کے سرے تک کی دھڑکن جیسا کہ دھیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے تک دھڑکن جاتی ہے، ساس کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ لگنے اور ان کی والدہ محترمہ کے بوسہ لیتے وقت خوف سا بھی ہوگیا کہ حرمتِ مصاہرت نہ ہوجائے اور خوف کی وجہ سے آلۂ تناسل میں حرکت نہیں آیا کرتی، کیا دھڑکن شہوت سمجھی جائے گی؟

۲:- ایک شخص بیمارِ جنسیات ہو اور کسی سے ہاتھ وغیرہ لگ جانے سے فوراً آلۂ تناسل میں حرکت آجاتی ہو تو اس شخص کا اگر ہاتھ ساس کے ہاتھ سے لگ جائے اور حرکت تناسل ہوجائے جبکہ ارادہ اُس شخص کا شہوت کا اور بُرائی کا نہ ہو، تو اس بیماری کی وجہ سے کیا حرمتِ مصاہرت لازم ہوگی کہ نہ ہوگی؟

جواب:- آپ وساوس کو دُور کرنے کے لئے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" آخر سورت تک کثرت سے پڑھا کریں، اور جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت

نہیں ہوئی، مس بلا کسی حائل کے شہوت کے ساتھ ہو تو اس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہے، اور شہوت کے لئے آلۂ تناسل میں جسمانی طور پر انتشار پیدا ہونا شرط ہے، محض انتشار کے شبہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔ وحد الشهوة فی الرجل أن تنتشر آلته أو تزداد انتشارًا ان کانت منتشرة کذا فی التبیین وهو الصحیح، کذا فی جواهر الأخلاطی وبه یفتیٰ، کذا فی الخلاصة .... هذا الحد اذا کان شابًّا قادرًا علی الجماع. (عالمگیریہ ج:۱ ص:۲۷۵)۔[۱]

۲:- اگر یہ واقعہ کسی کے ساتھ پیش آیا ہے تو پہلے یہ بتائیں کہ جنسی بیماری کیا اس قسم کی ہے کہ کسی مرد یا کسی اور چیز کو ہاتھ لگانے سے بھی آلۂ تناسل میں حرکت آجاتی ہے یا عورت کو ہاتھ لگانے سے ہی حرکت آتی ہے؟ اس کے بعد جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۱/۲۸ ب)

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۳۳ (طبع سعید) وحدها فیهما تحرّک آلته أو زیادته به یفتیٰ. وفی الشامیة قال فی الفتح ثم هذا الحد فی حقّ الشّاب .... الخ.

فصل فی المناکحة بالکفّار و أهل الکتاب والفِرَق الضّالة

(کفار، اہلِ کتاب اور گمراہ فرقوں سے نکاح کا بیان)

عیسائی عورت سے نکاح کا حکم

سوال:- میرے ایک عزیز کی شادی ایک عیسائی لڑکی سے ہوئی ہے، لڑکی کا باپ مسلمان ہے اور ماں عیسائی، باپ چونکہ ہندوستانی فوج میں میجر تھا اور مذہب کی بیگانگی۔ اور شرافت سے بیگانگی کی وجہ سے لڑکی سے محبت ہوگئی، انہوں نے بزرگوں کی مرضی سے سِوِل میرج کرلی، لڑکی کی ماں کہتی تھی کہ میں نکاح نہیں کرنے دوں گی، لڑکے کا باپ نکاح کرنے پر مُصر تھا، لڑکی کے باپ نے کہا کہ: ابھی تو لڑکی کی ماں کا کہا مان لیں، کیونکہ وہ بہت ضدی ہے، آپ اپنے گھر لے جاکر نکاح پڑھوالیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، سب نے یہی سمجھا کہ لڑکا مسلمان ہے، لہٰذا لڑکی بھی مسلمان ہوگی، جب دو بچے پیدا ہوگئے تو معلوم ہوا کہ لڑکی اپنی ماں کے مذہب پر ہے، یعنی عیسائی ہے، اور لڑکی نے بھی اقرار کیا کہ عیسائی ہوں، اب شرعاً کیا یہ شادی جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- عیسائی عورت سے مسلمان کا نکاح شرعاً منعقد ہوجاتا ہے، شرط یہ ہے کہ عورت واقعۃً عیسائی مذہب پر ہو،[1] آج کل کے عیسائیوں کی طرح نہ ہو جو نام کے تو عیسائی ہوتے ہیں، اور اُن کے عقائد دہریوں کے عقائد ہوتے ہیں کہ خدا، رسول کسی کو نہیں مانتے۔ نیز دُوسری شرط یہ ہے کہ نکاح شرعی طریقے پر دو گواہوں کے سامنے ہوا ہو،[2] اگر یہ دونوں شرطیں موجود ہیں تو وہ نکاح دُرست ہوچکا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۱/۲۸ ب)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۵ (طبع ایچ ایم سعید) (وصحّ نکاح کتابیة) وان کره تنزیها (مؤمنة بنبی) مرسل (مقرّة بکتاب) منزل وان اعتقدوا المسیح الٰها. وفی الشامیة (قوله مقرّة بکتاب) فی النهر عن الزّیلعی، وأعلم أن من اعتقد دینا سماویًا وله کتاب منزل کصحف ابراهیم وشیث وزبور داوٗد فهو من أهل الکتاب، فتجوز مناکحتهم.

(۲) وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر .... وشرط حضور شاهدین حرّین او حرّ وحرّتین مکلّفین سامعین قولهما معًا. (الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص: ۹ و ۲۱ طبع سعید).

لا مذہب اور شیعہ سے نکاح کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ ایک ایسی لڑکی جس کے والدین کا تعلق دیوبندی مسلک سے ہے، اس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے جس کے والدین شیعہ ہیں، اور لڑکا ان کے ساتھ کسی مذہبی تقریب میں شرکت نہیں کرتا۔ نیز نکاح پڑھانے کے لئے قاضی بھی مسلک دیوبندی کا ہی بلایا جائے گا، کیا یہ نکاح جائز ہے؟ نیز یہ لڑکا اور لڑکی دونوں بالغ ہیں، اور لڑکی نیک پارسا، قرآن پاک اور نماز پڑھتی ہے، اور دیوبندی مسلک کی ہے، جبکہ لڑکے کا قول یہ ہے کہ میں نہ شیعہ ہوں، نہ سنی، میں کسی مذہبی تقریب میں نہیں جاتا۔ جب ہم نے لڑکے کے گھر کہا کہ لڑکا اگر اخبار میں اور پوری طرح سنی ہونے کا اعلان کرے تو کوئی بات شاید بن جائے، لیکن اسی وقت اس کی والدہ نے کہا کہ: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لڑکے کا باپ شیعہ اور میں خود شیعہ ہوں، یہ اعلان کیسے کرسکتا ہے؟ اس وقت لڑکے نے بھی اس کی تردید نہیں کی، بلکہ والدہ کی بات سے اتفاق کرلیا۔ ہمارے سامنے اس کے حالات مشکوک ہیں، اس وقت چونکہ رشتے کی بات سامنے ہے، اس لئے جو کچھ بھی ہم لکھوائیں گے وہ لکھ کر دیدے گا، اور ہمارے ہر سوال کا جواب ہاں سے دے گا، لیکن ہمیں اس کی باتوں پر اطمینان نہیں، کیا یہ رشتہ ہوسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب لڑکا صراحۃً سنی ہونے کا انکار کر رہا ہے اور اس کے والدین واضح طور پر شیعہ ہیں، تو اب شیعہ ہونے سے انکار کا مطلب یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ تقیۃً ایسا کر رہا ہے، اور حقیقت میں وہ شیعہ ہے۔ یا پھر وہ کوئی مذہب ہی نہیں رکھتا، لا مذہب ہے۔ اور دونوں صورتوں میں اس کا نکاح سنی صحیح العقیدہ لڑکی سے کرنا جائز نہیں۔ [1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۱۰/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۱۵۹ ز)

---

(۱) اگر لا مذہب ہے یا کفریہ عقیدہ رکھنے والا شیعہ ہے تو ان دونوں صورتوں میں اس کے کافر ہونے کی وجہ سے یہ نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ اور اگر کفریہ عقیدہ رکھنے والا شیعہ نہیں تو پھر بھی اس کے ساتھ سنی لڑکی کا نکاح کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ سنی لڑکی کا کفو نہیں ہے۔

وفی الشامیة کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۶ وبهٰذا ظهر أن الرّافضی ان کان ممّن یعتقد الألوهیة فی علی أو انّ جبریل غلط فی الوحی أو کان ینکر صحبة الصدیق أو یقذف السیّدة الصدیقة فهو کافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدِّین بالضّرورة. وفی البحر الرّائق کتاب السیر باب أحکام المرتدین ج:۳ ص:۱۲۱ (طبع سعید) ویکفّر من أراد بغض النبی صلی الله علیه وسلم .... وبعد أسطر بقذفه عائشة رضی الله عنها من نسائه صلی الله علیه وسلم فقط وبانکاره صحبة أبی بکر رضی الله عنه. وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث (طبع ماجدیه) ج:۱ ص:۲۸۲ ولا یجوز تزوّج المسلمة من مشرک ولا کتابی. وفی البدائع ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) ومنها اسلام الرّجل اذا کانت المرأة مسلمة فلا یجوز انکاح المؤمنة الکافر، لقوله تعالیٰ: "ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا" ولأنّ فی انکاح المؤمنة الکافر خوف وقوع المؤمنة فی الکفر .... الخ.

قادیانی سے نکاح کا حکم اور کیا مسلمان ہونے کے لئے سرٹیفکیٹ ضروری ہے؟

سوال:- عرض یہ ہے کہ ایک شخص جو قادیانی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، کوئٹہ میں جعل سازی اور خورد بُرد کے مقدمات میں ملوث تھا، فرار ہوکر کراچی آ گیا اور یہاں جعلی ڈاکٹر بن کر ڈاکٹر کیپٹن ایم اے خالد کے نام سے ملیر سٹی کراچی میں اپنا کلینک چلانے لگا، حالانکہ یہ شخص نہ ڈاکٹر تھا اور نہ کیپٹن، بلکہ کوئٹہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا، جہاں اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے کافی رقم خورد بُرد کرلی، جس کی وجہ سے اس کے خلاف جعل سازی، دھوکا دہی، فراڈ اور خورد بُرد کے متعدّد مقدمات قائم ہوئے، جن سے فرار ہوکر کراچی آ گیا، اور وہاں اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا، اپنی مجرمانہ ضرورت کے تحت اپنا نام اور مذہب تبدیل کرتا رہتا ہے، کچھ عرصہ قبل ہمارے مکان سے متصل میری پھوپھی کے مکان میں ظفر ہسپتال کے نام سے اپنا کلینک چلا رہا تھا، کرایہ وغیرہ کے سلسلے میں جھگڑا شروع ہوا، اور بات عدالت تک جا پہنچی، اس نے کرایہ داری کا مقدمہ دائر کردیا، عدالتی معاملات کو سنبھالنے کے لئے میرے والد صاحب نے اپنی بہن یعنی میری پھوپھی کی مدد کی، تو یہ شخص میرے والد کا دُشمن بن گیا، اور مختلف حیلے بہانے سے دونوں خاندانوں کو تنگ کرتا رہا، میرے والد سے بدلہ لینے کی خاطر اس نے روزانہ کالج آتے جاتے، میرا پیچھا کرنا شروع کردیا، کئی بار راستے میں مل کر مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا، وقتی جذبات میں آکر میں اس کی باتوں میں آ گئی، اور ایک دن اس نے مجھے ایک ہوٹل پر لے جاکر نکاح نامہ کے سادے فارم پر دستخط کروالئے، ساتھ ہی دو اسٹامپ پیپروں پر بھی دستخط کروالئے، نکاح نامہ کے فارم اور اسٹامپ پیپروں کی خانہ پُری بعد میں کی گئی، اس نکاح کا میرے والدین اور کسی دُوسرے رشتہ دار کو کوئی علم نہ تھا، نہ ہی ان کی مرضی شامل تھی، نکاح کی اس کاروائی کے وقت کوئی نکاح خواں یا قاضی موجود نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی گواہ موجود تھا، بلکہ اس وقت ہم دو افراد کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود نہیں تھا، نہ ہی میں نے زبان سے اقرار کیا اور نہ اس نے اپنی زبان سے کچھ الفاظ ادا کئے، بس اس کے کہنے پر میں نے فارم پر دستخط کردیئے اور اپنے گھر واپس آ گئی، اس کے بعد کی کاروائی کا مجھے علم نہیں تھا، شادی کے تمام گواہوں کے نام اور مہر کی رقم وغیرہ کا تعین بعد میں اس نے اپنی مرضی سے کیا، یہاں تک کہ دُلہن کے گواہوں کے نام کے خانے میں جن افراد کے نام لکھے گئے ہیں، میں ان سے قطعی طور پر ناواقف ہوں، اس کے بعد ان کاغذات کے بل بوتے پر وہ مجھے بلیک

میل کرتا رہا، میرے گھر والوں کو مجھے زبردستی لے جانے کی دھمکیاں دیتا رہا، اور دو مرتبہ چند افراد کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوکر زبردستی لے جانے کی کوشش کی، میں اس کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں تھی، اس لئے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کردیا، جو ابھی زیرِ سماعت ہے۔

یہ شخص قادیانی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کا پورا خاندان کٹر قادیانی ہے، خود کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے اس نے کسی مولوی سے قادیانی مذہب ترک کرنے اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، یہ سرٹیفکیٹ اس نے مجھ سے نکاح کرنے سے صرف بیس دن پہلے حاصل کیا اور مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرچکا ہے اور اس کے چار بچے بھی ہیں، اس کا اصل نام خالد سیف اللہ ولد عطاء الرحمٰن ہے، جبکہ میرے نکاح نامہ میں اس نے اپنا نام منوّر احمد لکھا ہے، اور اپنے والد کا نام محمد عظیم لکھا ہے، اور مسلمان ہونے کے سرٹیفکیٹ میں اس نے اپنا نام نور احمد ولد عطاء الرحمٰن ایم اے لکھا ہے۔

میرے خاندان کے دُوسرے لوگوں کو بھی تنگ کرنے کے لئے ان پر جھوٹے مقدمات کردیئے اور خلع کا ایک مقدمہ میرے جعلی دستخط سے میری طرف سے خود ہی عدالت میں دائر کردیا، اور اس کے جواب میں مجھ پر اور میرے گھر والوں پر بے بنیاد جھوٹے الزامات عائد کردیئے، اپنی کاغذی کاروائی کو مزید مضبوط کرنے کے لئے میرا ایک شناختی کارڈ میرے جعلی دستخط سے بنوالیا، جس میں میرا نام نفیس فاطمہ زوجہ منوّر احمد درج کروایا، اس کے علاوہ اپنے ایک دوست مسمّٰی عبدالرشید کے حق میں ایک فرضی اور جھوٹا امانت نامہ مالیتی چالیس ہزار روپے میرے جعلی دستخط سے تیار کردیا، اور یہ تمام جعلی دستاویزات عدالت میں پیش کردیئے تاکہ کسی بھی طرح میری جان اس جھوٹے دھوکے باز قادیانی سے نہ چھوٹ سکے، کوئٹہ کے ادارہ تحفظِ ختمِ نبوّت کی اطلاع کے مطابق یہ شخص وہاں پر بھی ایک لڑکی کو اغواء کرکے اس کا جعلی نکاح نامہ تیار کرچکا ہے، اب سوال یہ ہے کہ:-

۱:- نکاح کی بیان کردہ صورتِ حال میں کیا میرا نکاح اس شخص سے ہوگیا؟ جبکہ نکاح نامہ میں اس نے غلط نام اور ولدیت استعمال کیا ہے، اور نکاح کی کاروائی تنہائی میں ہم دو افراد کے درمیان انجام پائی۔ ۲:- اور کیا یہ شخص قادیانی سے مسلمان ہوگیا ہے جبکہ اس نے مسلمان ہونے کے سرٹیفکیٹ میں بھی اپنا غلط نام اور ولدیت استعمال کی ہے، اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے کے تمام کاغذات میں خود کو مسلمان ظاہر کرتا رہا ہے، شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں؟

جواب ۱:- اگر سوال میں ذکر کردہ واقعات دُرست ہیں تو مسماۃ نفیس فاطمہ کا نکاح مذکورہ

شخص خالد سیف اللہ سے نہیں ہوا، نکاح نامہ کے سادہ فارم پر صرف دستخط کردینے سے شرعاً نکاح منعقد نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ضروری ہے۔(۱) اس کے علاوہ اگر مذکورہ شخص اب بھی قادیانی ہے اور مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ جھوٹا ہے، تو قادیانی مرد سے کسی مسلمان عورت کا نکاح شرعاً ہو ہی نہیں سکتا،(۲) خواہ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کیا ہو، لہٰذا اگر سوال میں ذکر کردہ واقعات دُرست ہیں تو نفیس فاطمہ کو اس کے خلاف خلع کا نہیں، بلکہ انخلاء زناشوئی کا مقدمہ کرنا چاہئے تھا۔

۲:- قادیانی سے مسلمان ہونا، درحقیقت قلبی عقائد کی تبدیلی اور ان کے اعلان پر موقوف ہے، اگر کوئی شخص قادیانی عقائد سے واقعۃً تائب ہوجائے، اور زبان سے اس کا اعلان کردے تو وہ مسلمان ہوسکتا ہے، خواہ اس کے پاس سرٹیفکیٹ نہ ہو، اور اگر دِل سے تائب نہ ہوا ہو تو محض جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینے سے مسلمان نہیں ہوسکتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۸/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۷/۳۹ و)

شیعہ سے نکاح کا حکم

سوال:- رافضی شیعہ اور اثناعشری میں کوئی فرق ہے تو تحریر کیجئے، نیز ایسے عقائد رکھنے والوں سے کسی سنی العقیدہ عورت کا یا مرد کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ خلفائے ثلاثہؓ پر تبرّا پڑھتے ہیں، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے میرے صحابی کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی، جس نے مجھے تکلیف دی اس نے گویا خدا کو ناراض کیا، ان ارشادات کی روشنی میں نکاح کا کیا حکم ہے؟

جواب:- شیعوں کے بہت سے فرقے ہیں، وہ سب اپنے آپ کو شیعہ اور اثناعشری کہتے ہیں اور اہلِ سنت ان سب کو رافضی کہتے ہیں، یہ تمام فرقے علی الاطلاق کافر نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے جو لوگ حضرت علیؓ کی خدائی کے قائل ہوں یا قرآنِ کریم کو تحریف شدہ مانتے ہوں یا اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ پر تہمت لگاتے ہوں، یا اس قسم کے کسی اور کافرانہ عقیدے کے معتقد ہوں وہ تو کافر ہیں اور ان

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص: ۹ و ۲۱ وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر وشرط حضور شاهدین حرین أو حر وحرتین مکلّفین سامعین قولهما معًا. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه) ولا ینعقد نکاح المسلمین الّا بحضورِ شاهدین حرین عاقلین بالغین مسلمین.

(۲) وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الثالث (طبع ماجدیه) ج:۱ ص:۲۸۲ ولا یجوز تزوّج المسلمة من مشرک ولا کتابی. وفی البدائع ج:۲ ص:۲۵۳ (طبع سعید) ومنها الاسلام فی نکاح المسلم والمسلمة. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۹۶ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت).

سے نکاح نہیں ہوتا[1]، لیکن جو لوگ اس قسم کے کفریہ عقائد نہ رکھتے ہوں وہ کافر نہیں ہیں، ان سے نکاح تو ہو جاتا ہے مگر مناسب نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۵/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۰/۲۸ الف)

حاجی عثمان کے پیروکار سے نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص حاجی عثمان صاحب کا معتقد ہے، اس کی خانقاہ میں جاتا ہے، اس کے بارے میں دریافت کرنا ہے:

۱:- اس سے رشتہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟
۲:- اگر رشتہ کرلیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب از مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہم دارالافتاء والارشاد

حضراتِ اکابر مفتیانِ کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حاجی عثمان گمراہ ہے، ۵؍شوال ۱۴۰۸ھ کو اکابر مفتیانِ کرام نے حاجی عثمان کو، دار الافتاء والارشاد ناظم آباد میں بلاکر اس سے مفصل گفتگو کی، اس کے نتیجے میں حاجی عثمان کے جو نظریات سامنے آئے ان کے بارے میں سب حضرات نے حاجی عثمان کے نام ایک نصیحت نامہ اپنے دستخطوں سے روانہ فرمایا، جس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

۱:- آپ میں بیعت وارشاد کی اہلیت نہیں۔
۲:- آپ نے بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا تو اس سے شدید گمراہی پھیلنے کا سخت خطرہ ہے۔
۳:- آپ کے بعض معتقدات اہلِ حق کے معتقدات کے خلاف ہیں:
۱:- اپنی تحقیق یا استخارہ کو بالکل قطعی اور یقینی سمجھنا۔
۲:- ایک خلیفہ کے مشاہدے کی بناء پر ایک صحیح حدیث کا انکار کرنا۔
۴:- یہ سب انتہائی خطرناک اور گمراہانہ خیالات ہیں، جس سے زندقہ کی راہ کھلتی ہے۔
۵:- مکاشفہ، مشاہدہ یا اِلہام کی بناء پر شریعت کے کسی بھی حکم یا دلیل کا انکار کھلی ہوئی گمراہی ہے۔
۶:- آپ کے خلیفہ کا مشاہدہ ایک صحیح حدیث کے خلاف ہوا تو آپ کو کوئی تردّد پیدا نہیں ہوا،

---

(۱) وفی الشامیة کتاب النکاح فصل فی المحرمات ج:۳ ص:۴۶ وبهٰذا ظهر أن الرّافضی ان کان ممّن یعتقد الألوهیة فی علي أو أنّ جبریل غلط فی الوحی أو کان ینکر صحبة الصدیق أو یقذف السیّدة الصدیقة فهو کافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدِّین بالضّرورة. وفی البحر الرائق، کتاب الجهاد، باب أحکام المرتدین ج:۳ ص:۱۲۱ (طبع سعید) ویکفر من أراد بغض النبی صلی الله علیه وسلم .... وبعد أسطر وبقذفه عائشة رضی الله عنها من نسائهٖ صلی الله علیه وسلم فقط وبانکاره صحبة أبی بکر رضی الله عنه. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۱۹۵۔

لیکن جب آپ کے ایک مریدزادہ ''چاند میاں'' کی شادی کے بارے میں اس خلیفہ کا مشاہدہ آپ کے استخارہ کے خلاف ہوا تو تردّد پیدا ہوگیا، آپ نے اپنے استخارہ کے نتیجے کو ایک صحیح حدیث سے بھی زیادہ فوقیت دی۔

۷:- جو خلیفہ خود آپ کے بقول سالہا سال تک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھتا رہا اس کو اپنی طرف سے نہ صرف ''کامل'' ہونے بلکہ ''اکمل'' کے قریب ہونے کی گواہی دی، بلکہ اسے یہ سند بھی عطا کی کہ وہ ''غوث'' اور فرد کی منزلیں طے کرچکا ہے اور ''قطب وحدت'' کے منصب پر پہنچ گیا ہے۔

۸:- مریدین کی اصلاح وتربیت اور نگرانی کی، آپ میں ہرگز صلاحیت نہیں۔

۹:- حضرت مولانا فقیر محمد صاحب مدظلہم العالی نے خلافت سلب فرمائی تو پھر آپ نے حضرت مولانا کی طرف رُجوع کرکے ان اسباب کے ازالے کی کوشش نہ کی جن کی بناء پر خلافت سلب ہوئی تھی، بلکہ آپ نے بیعت لینے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا، آپ کا یہ طرزِ عمل طریقت وسلوک کے بنیادی اُصولوں کے بھی خلاف تھا، شیخ کی ناراضگی کے اسباب دُور کرنے کے بجائے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیعت کا سلسلہ جاری رکھنا طریقت وسلوک کے ابجد کے بھی خلاف ہے، جو شخص اپنے شیخ کے حکم کی اطاعت نہ کرے وہ اپنے مریدوں سے اطاعت کرانے کا اہل کیسے ہوسکتا ہے؟

۱۰:- آپ کا طرزِ عمل طریقت وسلوک کے مُسلّم بنیادی اُصولوں کے خلاف ہے۔

۱۱:- آپ کے پاس اتنا علم نہیں جو ایک شیخِ طریقت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

۱۲:- طریقت وسلوک میں پیش آنے والے مراحل کے بارے میں آپ کے خیالات و تصوّرات ومعتقدات دُرست نہیں۔

۱۳:- نہ مریدین کی اصلاح وتربیت کے بنیادی تقاضوں سے واقفیت ہے۔

۱۴:- نہ کسی شیخ محقق کے ساتھ آپ نے کوئی رابطہ رکھا ہے۔

۱۵:- آپ کے لئے اصلاح اور ارشاد کا سلسلہ جاری رکھنا شرعاً ہرگز جائز نہیں۔

۱۶:- نہ کسی مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ آپ کے ساتھ مریدی کا تعلق قائم کرے۔

۱۷:- آپ اپنے غلط خیالات اور غلط طرزِ عمل سے تائب ہوں۔

۱۸:- خانقاہ کا یہ سلسلہ اور بیعت لینا موقوف کردیں اور اس کا اعلان کریں۔

۱۹:- دُوسروں کی اصلاح کی فکر میں پڑنے کی بجائے اپنی اصلاح کی فکر کریں۔

۲۰:- اصلاحِ خلق کا خیال دِل سے نکال کر خالص اپنی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو شیخ کے

حوالے کریں، اور صرف رسمی تعلق کی بجائے اپنے معاملے کو ان کے سامنے پیش کریں، ان سے ہدایات لیں اور ان کا مکمل اتباع کریں، خواہ وہ ہدایات آپ کی اپنی رائے، تحقیق، مکاشفات وغیرہ کے کتنی خلاف ہوں، یہی آپ کے لئے راہِ نجات ہے، ورنہ آپ بہت خطرناک راستے پر پڑ چکے ہیں۔

۲۱:- آپ کے لئے عزّت کا راستہ یہی ہے کہ از خود اس مشورہ پر عمل کرلیں۔

حاجی عثمان نے اس نصیحت نامے کی طرف کوئی توجہ نہ دی، تو آپ کے شیخ نے دوبارہ خلافت سلب کرنے کا اعلان فرمایا، اور حاجی عثمان کو توبہ کی تلقین فرمائی ہے، وہ اس پر بھی تائب نہ ہوا تو شیخ نے تحریر فرمایا:-

اگر حاجی عثمان تکبر کرے اور فساد کرے تو فساد کو روکنے کے لئے حکومت کے ذریعے انتظام کرنا۔

اس تفصیل کے بعد سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:-

۱:- ایسے گمراہ شخص کے مرید یا معتقد سے رشتہ کرنا جائز نہیں۔

۲:- کسی ناجائز اور حرام کام کے بارے میں یہ دریافت کرنا کہ کرلیا جائے تو کیا ہوجائے گا یا نہیں؟ سخت گناہ ہے، بلکہ اس پر کفر کا خطرہ ہے، اس لئے کہ نفس پرستی کے لئے ارتکابِ حرام میں اَحکامِ شریعت کی تخفیف وتوہین ہے۔

علاوہ ازیں حاجی عثمان جس ڈگر پر چل رہا ہے، پھر اتنے بڑے اکابر علماء ومفتیانِ کرام کے علاوہ خود اپنے شیخ کے سمجھانے پر بھی باز نہیں آرہا، اس کے اور اس کے مریدین ومعتقدین کا کسی بھی وقت کفر تک پہنچ جانا کوئی بعید نہیں، العیاذ باللہ ایسی حالت میں اس نکاح کا انجام کیا ہوگا؟ عمر بھر حرام کاری اور اولاد ولد الزنا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبدالرحیم
رشید احمد	ولی حسن	نائب مفتی دارالافتاء والارشاد
دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی	جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی	۴ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ

جواب:- از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

۱:- ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ حاجی عثمان صاحب کے عقائد سے متعلق جو اُمور جواب میں بیان کئے گئے ہیں، وہ گمراہانہ عقائد ہیں، ایسے گمراہانہ عقائد کے حامل کسی شخص سے یا اس کے کسی پیروکار سے نکاح کرنا ناجائز ہے۔

۲:- اگر نکاح کر ہی لیا تو، خواہ وہ منعقد ہو جائے، مگر سخت گناہ کا کام ہوگا۔

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
دارالافتاء دارالعلوم کراچی
۱۴۰۹/۴/۶ھ

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۹/۴/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۱/۴۰ ب)

کافر شوہر پر اسلام پیش کرنے کے بعد اگر وہ مسلمان ہو جائے تو یہ نکاح برقرار رہے گا

سوال:- غیر مذہب کی ایک عورت ہے (یعنی ذکری) اس عورت کا خاوند بھی غیر مسلم ہے، اب وہ عورت مسلمان ہونا چاہتی ہے اور وہ عورت کہتی ہے کہ میرا خاوند مجھے ناجائز تنگ کرتا ہے، میرا لڑکا ہر وقت شراب نوشی کر کے تنگ کرتا ہے، لڑکا کوئی کام نہیں کرتا، صبح و شام مجھ سے پیسے مانگتا ہے، اگر پیسے نہ ملیں تو مجھے مارتا پیٹتا ہے، جس کی وجہ سے میں تنگ آگئی ہوں، اس نے ایک مسلمان شخص سے کہا کہ مجھے تم کورٹ لے جاؤ، وہاں جا کر میں بیان دوں گی کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں، اس شخص نے کہا کہ تمہارے شوہر نے طلاق نہیں دی تو میں کیسے نکاح کرلوں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلے عورت مسلمان ہو جائے اس کے بعد عدالت میں دعویٰ دائر کرے، عدالت اس کے شوہر پر اسلام کی پیشکش کرے، اگر شوہر بھی مسلمان ہوگیا تو ان کا نکاح برقرار رہے گا، اور اگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا تو عدالت دونوں کا نکاح فسخ کردے، اس فسخِ نکاح کے بعد عورت عدّتِ طلاق گزار کر کسی مسلمان سے نکاح کر سکے گی۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۶/۲۸ الف)

کافر شوہر کے نکاح سے نکلنے کا طریقہ

سوال:- ایک غیر مسلم عورت مسلمان ہونا چاہتی ہے، اس عورت کا شوہر بھی زندہ ہے، وہ بھی غیر مسلم ہے، اس کا ایک لڑکا ہے جو شراب نوشی کر کے ماں کو مارتا ہے، عورت شوہر کو کہتی ہے کہ لڑکے کو سمجھاؤ تو شوہر کہتا ہے میں نہیں کہوں گا، آپ جدھر جانا چاہیں چلی جائیں، اس عورت نے

(۱) اس فتویٰ کے تفصیلی حوالہ جات اسی جواب پر دوبارہ آئے ہوئے سوال کے جواب میں لکھے گئے اگلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

مسلمان ہوکر کسی مسلمان سے شادی کرنے کا اقرار کرلیا ہے، اس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ ''عورت مسلمان ہوجائے اور عدالت میں دعویٰ دائر کرے، پھر عدالت شوہر کو مسلمان ہونے کی پیشکش کرے اگر شوہر مسلمان ہوجائے تو دونوں کا نکاح برقرار رہے گا، اور اگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا تو عدالت دونوں کا نکاح فسخ کردے، فسخِ نکاح کے بعد عورت عدّتِ طلاق گزار کر کسی بھی مسلمان سے نکاح کرسکتی ہے''، لوگوں کو بھی اس کے مسلمان ہونے کا علم ہوگیا ہے، اب اس کو جان سے ماردیں گے، لہٰذا عدّت گزارنا اور عدالت میں مقدمہ پیش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، کیا یہ عورت مسلمان ہوکر کسی مسلمان سے نکاح کرے، یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کافر شوہر کے نکاح سے نکلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عدالت میں دعویٰ کرکے شوہر پر اسلام پیش کیا جائے، وہ انکار کرے تو قاضی تفریق کردے[۱]، اس کے بغیر عورت کا دُوسری جگہ نکاح نہیں ہوسکتا، اور عورت کو شوہر سے جان کا خطرہ ہو تو مسلمانوں کی پناہ حاصل کرلے، **وما لم یفرق القاضی فھی زوجته.** (شامی ج:۲ ص:۳۸۹[۲]) ہاں! اگر شوہر نے خود طلاق دے دی ہو تو اسلام لاتے ہی نکاح کرسکتی ہے، لیکن محض گھر سے نکال دینے سے طلاق نہ ہوگی، تاوقتیکہ شوہر کے مذہب میں اس کو طلاق نہ سمجھا جاتا ہو۔ اور اگر ملکی قوانین کی رُو سے کوئی ایسا طریق کار موجود نہ ہو جس کے ذریعے عدالت شوہر کو بلاکر اس پر اسلام پیش کرے، تو اُس صورت میں عدّت گزار کر دُوسری جگہ نکاح کی گنجائش ہوگی۔ **إما لأنه فی حکم دار الکفر فی ھٰذہ الجزئیة بخصوصھا، واما عملا بمذھب الأئمة الأخریٰ عند الضرورة۔**[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۳/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۷/۲۸ ب)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۴۱۳ اور حیلۂ ناجزہ ص:۱۰۵۔ **وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۸۸ واذا أسلم أحد الزوجین المجوسیین او امرأة الکتابی عرض الاسلام علی الأخر، فان أسلم فبھا والّا بان أبی أو سکت فرق بینھما، وکذا فی الھدایة علی فتح القدیر ج:۳ ص:۲۸۸، والتاتارخانیة ج:۳ ص:۱۸۱، والھندیة ج:۱ ص:۳۳۸، وفی اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۹۸ .... اذا أسلمت المرأة فی دار الاسلام وفیھما دلالة علی أنھا فی نکاح زوجھا حتی یعرض علیه الاسلام فیأبی فیفرّق القاضی أو الامام بینھما. وراجع أیضًا للتفصیل فتح القدیر ج:۳ ص:۱۸۸، والبحر الرائق ج:۳ ص:۲۱۱ والنتف فی الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۹.**

(۲) **ج:۳ ص:۱۸۹ (طبع سعید).**

(۳) اِمام مالک، اِمام شافعی اور اِمام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک جب کسی غیرمسلم کی بیوی مسلمان ہوجائے تو اس کی عدّت گزرتے ہی اس کا نکاح اس کے سابق شوہر سے خودبخود فسخ ہوجائے گا۔ فسخ کے لئے عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ **فی المغنی لابن قدامة مع الشرح الکبیر ج:۷ ص:۵۳۶ (طبع دار الفکر بیروت)** میں ہے:- **اذا اسلم أحد الزّوجین وتخلف الأخر حتّی انقضت عدة المرأة انفسخ النکاح فی قول عامّة العلماء .... الخ.** اس مسئلہ کی تحقیق اور ائمہ اربعہؒ کے مذاہب کی تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا اس موضوع پر عدالتی فیصلہ ملاحظہ فرمائیں جو P.L.D ۱۹۸۸ء ص:۱۰۷ تا ۱۲۷ میں موجود ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی الأنکحة الفاسدة و الصحیحة﴾
(صحیح اور فاسد نکاح کے بیان میں)

چھ ماہ کی حاملہ عورت سے نکاح کا حکم

سوال:- کیا چھ ماہ کی حاملہ عورت سے نکاح جائز ہے؟

جواب:- اگر حمل کسی سابق شوہر سے ہے تو جب تک ولادت نہ ہوجائے، نکاح دُرست نہیں،[۱] اور اگر حمل زنا کا ہے تو نکاح ہوجائے گا،[۲] لیکن اگر نکاح کرنے والا وہ نہ ہو جس سے زنا کیا تھا تو نکاح کے بعد صحبت کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک بچے کی ولادت نہ ہوجائے۔[۳]

واللہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۳/۳۲ ج)

ایامِ حیض میں نکاح جائز ہے

سوال:- کیا زمانۂ ایامِ حیض میں عقدِ شرعی ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- زمانۂ حیض میں نکاح تو منعقد ہوجاتا ہے، لیکن چونکہ ایسی حالت میں شوہر کے لئے جماع جائز نہیں ہے، اس لئے ایامِ حیض میں رُخصتی کرنا احتیاط کے خلاف ہے، اور اگر کسی مجبوری سے رُخصتی بھی ہوجائے تو شوہر کو جماع سے پرہیز لازم ہے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۵/۲۱ الف)

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں وہ عدّت میں ہوگی اور حاملہ کی عدّت وضعِ حمل ہے، لہٰذا وضعِ حمل سے پہلے کسی اور سے اس کا نکاح جائز نہیں، "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰی يَبْلُغَ الْكِتٰبُ أَجَلَهٗ" (البقرة:۲۳۵)۔
وفی الهندية كتاب النّكاح، الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجديه) لا يجوز للرّجل أن يتزوّج زوجة غيره وكذا المعتدّة .... الخ.
(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۲۴۷ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۲۴۸ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۴) "فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ" (الآية) البقرة:۲۲۲.

نکاح خواں کے جواب میں "لڑکی دی" کے لفظ سے نکاح منعقد ہوجائے گا

سوال:- عرض اینکہ ایک لڑکی نے اپنے نکاح کا وکیل ایک شخص کو مقرّر کیا جو کہ اس کا محرَم نہ تھا، نکاح خواں نے ایجاب وقبول کراتے وقت لڑکی کے وکیل کو مخاطب کرکے یہ الفاظ کہے کہ: فلاں لڑکی فلاں کی بیٹی، فلاں لڑکا فلاں کا بیٹا تم نے بعوض اتنے روپے مہر کے قبول کی؟ اس کے جواب میں وکیل نے کہا: "میں نے قبول کیا" ایک دُوسرے آدمی نے صحیح کہنے کی غرض سے کہا کہ: اس طرح کہو کہ تم نے فلاں لڑکی فلاں کی بیٹی فلاں لڑکے کے لئے دی، وکیل نے کہا "دی"، اس کے بعد لڑکے سے قبول کرایا گیا، آیا اس صورت میں نکاح کا انعقاد کس سے ہوا؟ وکیل سے یا لڑکے سے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نکاح خواں نے دُوسری مرتبہ جو جملہ وکیل سے مخاطب ہوکر کہا، اور وکیل نے اس کے جواب میں کہا: "دی" اس سے نکاح منعقد ہوگیا،[1] اور لڑکے ہی سے نکاح ہوا، وکیل سے نہیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ لڑکی نے نکاح خواں کو وکیل بنادیا ہو،[2] ورنہ مذکورہ جملے کے بعد لڑکے سے جو ایجاب وقبول کرایا گیا، اس سے نکاح منعقد ہوگیا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۱/۳ الف)

نکاح منعقد ہونے کے لئے گواہوں کا ایجاب وقبول کو سننا لازم ہے

سوال:- (عقد کے سلسلے میں موصولہ تحریر) میں مسمّٰی عبدالرحمٰن خان بن عبدالرحیم خان جو کہ مسماۃ صوفیہ افضال بنت افضال اللہ خان کی جانب سے اس کے نکاح خوانی کی تکمیل کے لئے وکیل مقرّر کیا گیا ہوں، شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ایجاب کی تکمیل کراچکا ہوں، اور پاکستان دستور مسلم فیملی لاء کے مطابق اس تحریر کو جناب ارشاد علی خان ولد جناب جواد علی خان کو ارسال کرتا ہوں کہ وہ میرا فریضہ انجام دہی کے لئے نکاح خوانی کے متعلق وکیل کی نیابت قبول کریں اور نکاح خوانی کی مجلس

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب النکاح ج:۳ ص:۱۱، لو قال هل أعطيتنيها فقال أعطيت ان كان المجلس للوعد فوعد وان كان للعقد فنكاح. وفی ردالمحتار أيضًا ج:۳ ص:۱۲ (قوله ان المجلس للنكاح) أی لانشاء عقده لأنه يفهم منه التحقيق فی الحال فاذا قال الأخر أعطيتكها أو فعلت لزم .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار كتاب النكاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعيد) وينعقد متلبسًا بايجاب من أحدهما وقبول من الأخر .... كزوّجت نفسی أو بنتی أو مؤكلّتی منک. وفی الشامية (قوله كزوّجت نفسی) أشار الٰی عدم الفرق بين أن يكون الموجب أصيلا او وليًا أو وكيلًا.

منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) پاکستان میں مسمّٰی معید الظفر خان عرف ممو خان بن جناب عبدالرشید خان صاحب کو قبولیت کرائیں۔

۱:- یہ کہ میں مہر مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکۂ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو بحق مسمّٰی معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح وزوجیت میں دیتا ہوں۔

۲:- کہ میں مہرِ مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکہ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو بحق مسمّٰی معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح و زوجیت میں دیتا ہوں۔

۳:- میں مہرِ مؤجل ۹ ہزار روپیہ سکہ پاکستانی کے بالعوض اپنی مؤکلہ مسماۃ صوفیہ افضال دختر افضال اللہ خان صاحب کو مسمّٰی معید الظفر خان عرف ممو خان بن عبدالرشید خان صاحب کے نکاح و زوجیت میں دیتا ہوں۔ عبدالرحمٰن خان، وکیل

تحریرِ بالا لڑکی کے والد کی لکھی ہوئی ہے، اور دستخط عبدالرحمٰن خان صاحب کے ہیں، لہٰذا معلوم کرنا ہے کہ اس تحریر کے مطابق نکاح خوانی انجام پاسکتی ہے؟

جواب:- نکاح میں یہ ضروری ہے کہ نکاح کے گواہ ایجاب وقبول دونوں کو سنیں،(۱) لہٰذا یہ تحریر انعقادِ نکاح کے لئے کافی نہیں ہے، البتہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ لڑکی کا کوئی وکیل بذاتِ خود حیدرآباد جاکر لڑکی کی طرف سے ایجاب کرے اور لڑکا اُسی مجلس میں قبول کرے، اور گواہ ایجاب وقبول کو سن لیں۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۹ھ

گواہوں کا فسق انعقادِ نکاح میں مانع نہیں، مگر ثبوتِ نکاح میں مانع ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں ایک شخص نے اپنی لڑکی کی منگنی اپنے ایک رشتہ دار کے لڑکے سے کردی، منگنی کے وقت لڑکی اور لڑکا دونوں نابالغ تھے، کچھ عرصہ کے بعد نااتفاقی ہونے کے سبب لڑکی والوں نے جواب دے دیا کہ ہم تم سے رشتہ کرنا ہی نہیں

(۱، ۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) وینعقد متلبسا بایجاب من أحدهما وقبولٍ من الأخر. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدین حرّین أو حرّ و حرّتین مکلّفین سامعین قولهما معًا.

چاہتے اور جو کچھ منگنی کے وقت لڑکے والوں نے دیا تھا وہ ان کو واپس کر دیا، اور انہوں نے اپنی چیزیں واپس لے لیں اور اب تک نکاح کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، کچھ عرصے کے بعد لڑکی والوں نے اس لڑکی کا دُوسری جگہ رشتہ کرنا چاہا تو لڑکے والوں نے یہ کہا کہ اس لڑکی سے ہمارا نکاح ہے، جس کے ایسے دو شخصوں کو گواہ مقرّر کر دیا جن کی سیرت حرام کاری میں بہت زیادہ داغدار ہے، یعنی پرلے درجے کے فاسق و فاجر ہیں، نیز وہ دونوں گواہ جس شخص کا لڑکا ہے اس کا ایک بھتیجا اور دُوسرا بہنوئی ہے، جو ایک وہاں سے چودہ میل اور دُوسرا سات، آٹھ میل پر رہتا ہے، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم رات کے وقت گئے اور انہوں نے اپنی لڑکی کا نکاح کر کے دیا۔ لڑکی والے حلفاً بیان کرتے ہیں کہ ہم نے کوئی نکاح کر کے نہیں دیا، یہ لوگ فقط ہمیں بدنام کرنے اور ہمارے کام میں روڑے اٹکانے کے لئے پروپیگنڈا کر رہے ہیں، نیز لڑکی والوں کے آس پاس والے خواہ ان کے رشتہ دار ہوں یا دُوسری قوم کے آدمی ہوں، سب یہ کہتے ہیں کہ اس نکاح کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ نیز جس نکاح خواں کا لڑکے والے نام لیتے ہیں کہ فلاں شخص نے نکاح پڑھایا ہے وہ شخص بھی آج سے عرصہ چار پانچ سال پہلے انتقال کر چکا ہے، حاصل یہ ہے کہ ان کے پاس سوا ان دو گواہوں کے اور کوئی ثبوت، نکاح کا نہیں ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس لڑکی کا نکاح لڑکے والوں کے دعوے کے مطابق شرعاً ثابت ہوگا یا نہیں؟

۲:- جس قسم کے یہ گواہ ہیں، اس قسم کے فاسق و فاجر گواہان کی گواہی شرعاً قبول ہے یا نہیں، جبکہ وہ خود حرام کاری میں مبتلا ہیں اور بے نکاحی عورتوں کو گھر میں بٹھانے کے عادی ہیں، اگر یہ نکاح شرعاً ثابت نہیں تو اس لڑکی کا نکاح دُوسری جگہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۳:- لڑکے والوں کا بھتیجا اور بہنوئی شرعاً ان کی گواہی معتبر ہے یا نہیں؟ نیز اگر شرعاً اس لڑکی کا نکاح ان گواہوں سے ثابت ہو جائے تو لڑکی والوں کے لئے کیا حکم ہوگا؟ یعنی کیا ان کی قسم پر اعتبار کیا جائے گا یا ان کو لڑکی بیاہ کر دینی ہوگی، اس کا جواب فقہِ حنفی کے مطابق مفصل تحریر فرما کر بحوالہ کتبِ فقہ مشکور فرماویں۔

جواب:- مفتی عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ اس سے جو سوال کیا جائے اس کے حکم کے مطابق جواب دے سکتا ہے، معاملہ حلال و حرام کا ہے، اس لئے دونوں فریق خوب سمجھ لیں کہ اگر واقعۃً نکاح ہو چکا تو لڑکی کو بھیجنا لازم ہے، محض جھوٹی قسمیں کھانے سے آخرت کا عذاب نہیں ٹل سکتا۔ اور اگر نکاح نہیں ہوا تھا تو محض دو جھوٹے گواہ پیش کرنے سے آخرت کا عذاب نہیں ٹل سکتا، اس لئے دونوں فریقوں کو اپنی قبر اور آخرت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ یہ حکم تو دیانت کا ہے، اور اگر معاملہ شرعی عدالت میں جائے تو صورتِ مسئولہ میں چونکہ دونوں گواہ فاسق و فاجر اور جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں،

اس لئے صرف ان کی گواہی پر نکاح کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، ہاں! اگر ان گواہوں میں شرعی شرائط پائی جاتی ہوں تو ان کی گواہی سے قاضی نکاح کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ واضح رہے کہ گواہوں کا فسق انعقادِ نکاح سے تو مانع نہیں، لیکن ثبوتِ نکاح کے لئے قابلِ اعتماد گواہ ہونے ضروری ہیں۔[1]

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶ ۱/۱۷ ۳۰ د)

بالغ لڑکے کی عدمِ منظوری سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:- ایک نابالغ لڑکی کو والد کی موجودگی میں چچا نے ایک دُوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرادیا تھا، اورلڑکے کے باپ نے لڑکی کی طرف سے قبول کیا لڑکا اس وقت بالغ تھا، نہ لڑکے کو یہ پیغام اس وقت سنایا ہے، اور نہ زوج نے منکوحہ کو دیکھا ہے، اورلڑکی نے اس کو دیکھا ہے، اور عین نکاح کے وقت ایک تولہ سونا مہرلڑکی کے حوالے کردیا، چند ماہ بعدلڑکی کے والدین نے برما سے ہجرت کا قصد کرلیا تو لڑکے کے والدین کو بولا، لیکن انہوں نے انکار کردیا، (اس وقت نکاح نہیں ہوا تھا) اس میں اَن بن ہونے کی وجہ سے مذکورہ دیا ہوا مہر واپس کردیا گیا اورلڑکے کے والدین نے لے لیا، جب لڑکی کے والدین کراچی آئے تو اس لڑکے کے چچا نے ایک خط برما بھیجا، جس میں لکھا تھا کہ لڑکی کو دُوسرے آدمی کے نکاح میں دے دو، کراچی میں والد نے دُوسرے شخص کے ساتھ نکاح کی بات چیت کرلی تھی، مگرلڑکی جس وقت بالغ ہوئی تو وہ اس شخص پر راضی نہ تھی، جس کی وجہ سےلڑکی والدین کے گھر سے نکل کر چلی گئی اور اپنی خوشی سے ایک لڑکے کے ساتھ نکاح کرلیا، اب والدین لڑکی پر زور ڈال رہے ہیں کہ لڑکی کا نکاحِ اوّل اب تک باقی ہے، کیا نکاحِ اوّل ہنوز باقی ہے؟

تنقیح:-

۱:-لڑکی کے باپ نے اس نکاح کو منظور کیا تھا یا نہیں؟
۲:-لڑکے نے زبان سے اس نکاح کو منظور کیا تھا یا نہیں؟
۳:-جس وقت لڑکی بالغ ہوئی، اس وقت اس نے اپنے نکاح کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا؟

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص: ۲۱ الی ۲۳ (طبع سعید) وشرط حضور شاهدین .... مسلمین لنکاح مسلمة ولو فاسقین أو محدودین فی قذف .... الخ. وفی ردّ المحتار قوله (ولو فاسقین) اعلم أن النکاح له حکمان، حکم الانعقاد، وحکم الاظهار، فالأوّل ما ذکره والثانی انّما یکون عند التجاحد فلا یقبل فی الاظهار الا شهادة من تقبل شهادته فی سائر الأحکام .... الخ. وفی الدر المختار کتاب الشهادات ج:۵ ص:۴۶۵ (طبع سعید) ونصابها لغیرها من الحقوق سواء کان الحق مالا أو غیره کنکاح وطلاق ووکالة .... رجلان... أو رجل وامرأتان... ولزم فی الکل... لفظ أشهد... (لقبولها والعدالة لوجوبه) فی الینابیع العدل من لم یطعن علیه فی بطن ولا فرج. وفی الشامیة (قوله العدل) قال فی الذّخیرة: واحسن ما قیل فی تفسیر العدالة أن یکون مجتنبًا للکبائر، ولا یکون مصرًا علی الصغائر، ویکون صلاحه أکثر من فساده وصوابه أکثر من خطئه .... الخ.

ان سوالات کے جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح:۔

۱:۔ جس وقت چچا نے لڑکی کو نکاح دیا تھا اس پر باپ راضی تھا۔

۲:۔ لڑکے نے زبان سے اس نکاح کو منظور نہیں کیا بلکہ صرف لڑکے کے باپ نے منظور کیا۔

۳:۔ لڑکی جب بالغ ہوئی، کوئی رویہ اختیار نہیں کیا، صرف لڑکے کی طرف سے کچھ بات چیت ہوئی تھی اور ایک مہر دیا تھا، پھر واپس کرلیا۔

جواب:۔ جبکہ لڑکا بوقتِ نکاح بالغ تھا اور اس نے نہ خود مجلس میں شرکت کی، اور نہ بعد میں اسے منظور کیا تھا، تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوا، لہٰذا لڑکی آزاد ہے، جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۲/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۶/۷ھ

بالغہ لڑکی کا نکاح اُس کی اجازت کے بغیر دُرست نہیں

سوال:۔ ایک لڑکی بالغہ کا نکاح پڑھایا جائے اور اس میں لڑکی سے کسی نے نہیں پوچھا اور لڑکی موقع پر موجود بھی نہیں، اور نہ لڑکی کا باقاعدہ شرع کے مطابق کوئی وکیل ہے، کیا اس حالت میں نکاح منعقد ہوجائے گا یا نہیں؟

۲:۔ لڑکی کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے انکار کردیا، اور اب بھی تقریباً تین سال گزرنے کے بعد بھی انکار کرتی ہے۔

۳:۔ لڑکا، جس کے والد نکاح کے دعویدار ہیں، وہ لڑکا اس وقت ہیروئن پیتا ہے، چرس اور ہر قسم کے نشے اور جوئے کا عادی ہے، اور فی الحال اس جرم کی پاداش میں جیل میں بند ہے، کیا مندرجہ بالا تفصیل کے ساتھ یہ نکاح ہوگیا ہے؟ اگر نہیں ہوا تو چھڑانے کے لئے طلاق تو لینی نہیں پڑے گی؟ اگر نکاح ثابت ہوچکا ہے تو نمبر۳ میں بیان کردہ وجوہات کی بناء پر اس لڑکی سے شادی کرسکتا ہے یا لڑکی کے والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ لڑکی کی شادی نہ کرائیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔

جواب:۔ اگر یہ دُرست ہے کہ نکاح کے وقت نہ لڑکی سے پوچھا گیا، نہ لڑکی نے کسی کو نکاح کا وکیل بنایا، نہ نکاح کی اجازت دی اور نہ وہ نکاح کے وقت موجود تھی اور بعد میں بھی جب اسے نکاح

کی اطلاع ہوئی تو اس نے نکاح کو منظور نہیں کیا تو یہ نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوا،[1] لہٰذا لڑکی جہاں چاہے اپنا نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۷/۵/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹/۷۴۹ ب)

دُوسرے کے کئے ہوئے نکاح کی عملی اجازت دینے سے نکاح منعقد ہوجائے گا

سوال:- ایک شخص کے لئے اس کے بھائی نے نکاح کردیا، جب وہ آیا تو اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے تو بالکل معلوم نہیں اور نہ مجھ سے کسی نے پوچھا ہے، تو کیا یہ نکاح صحیح ہے؟ اور اس کے بعد یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے لئے گیا ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب نکاح کا عقد اس شخص کے بھائیوں نے اس کی عدم موجودگی میں کیا تو اگر اس کی اجازت سے ایسا کیا تھا تو وہ بھائی وکیلِ نکاح ہوگئے اور ان کا ایجاب و قبول کرنا کافی ہوگیا۔ اور اگر بھائیوں نے نکاح کرتے وقت اس شخص سے اجازت نہیں لی تھی تو وہ نکاحِ فضولی ہوا، اور اس کے بعد جب یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے لئے گیا تو اس کا جاکر بیوی کو لے آنا عملاً نکاح کی اجازت ہے، اس لئے کہ اگرچہ عقدِ نکاح تو تعاطی سے نہیں ہوسکتا، لیکن فضولی کے کئے ہوئے نکاح کی اجازت عمل سے ہوسکتی ہے، **قال الشامی رحمہ اللہ: وھل یکون القبول بالفعل کالقبول باللفظ کما فی البیع. قال فی البزازیة .... أنه یکون قبولًا وأنکره صاحب المحیط وقال الامام ما لم یقل بلسانه قبلت بخلاف البیع .... وبخلاف اجازة نکاح الفضولی بالفعل لوجود القول ثمه اھ (شامی ج:۲ ص:۲۶۵)**۔[2] لہٰذا یہ نکاح دُرست ہوگیا اور اب ازسرِنو ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ بھائیوں نے عقدِ نکاح گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و

---

(۱) وفی الهندیة کتاب النکاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۷ (طبع ماجدیه) لا یجوز نکاح أحد علٰی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنها بکرًا کانت أو ثیبًا فان فعل ذٰلک فالنّکاح موقوف علٰی اجازتها فان أجازتهٔ جاز وان ردّته بطل .... الخ. وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب الولی ج:۳ ص:۵۸ (طبع سعید) ولا تجبر البالغة البکر علی النّکاح لانقطاع الولایة بالبلوغ. وفی الهدایة کتاب النکاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شرکت علمیه) وینعقد نکاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها .... الخ.

(۲) ردّ المحتار کتاب النکاح قبیل مطلب التزوّج بارسال کتاب ج:۳ ص:۱۲ (طبع سعید).
وفی الهندیة کتاب النّکاح، الباب الرّابع فی الأولیاء ج:۱ ص:۲۹۹ (طبع ماجدیه) وتثبت الاجازة لنکاح الفضولی بالقول والفعل. کذا فی البحر الرّائق.
وفی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء والأکفاء ج:۳ ص:۱۲۳ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۳ ص:۱۱۵) رجل زوّج رجلًا بغیر امره فهنّأه القوم وقبل التهنئة فهو رضا لأنّ قبول التهنئة دلیل الاجازة.

قبول کر کے کیا ہو، اگر کوئی اور صورت ہوئی تھی تو دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں۔

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۶۶/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بالغ لڑکی کا، نکاح کی منظوری دینے کے بعد انکار کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔ مسئلہ:- اگر فرض کیا کہ ایک عاقلہ، بالغہ اور مسلمان لڑکی رُو بروئے پنچایت یا عدالت وغیرہ، نکاح کے بعد یہ بیان دیتی ہے کہ اُس نے نکاح اپنی بلوغت کی عمر میں اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا، بلکہ اپنی حقیقی ماں کا دِل رکھنے کے لئے کیا تھا، تو اس نکاح کی قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟ اور اس بیان کی کیا حیثیت ہے؟ میرے خیال کے مطابق لڑکی کا یہ بیان اُس وقت قابلِ قبول ہونا چاہئے جبکہ لڑکی کا نکاح نابالغی کی عمر میں ہوا ہو اور لڑکی بالغ ہونے کے بعد بقائمی ہوش وحواسِ خمسہ بیان مذکورہ بالا دے، تو پھر قابلِ قبول نہیں ہونا چاہئے، فتویٰ صادر کیجئے اور یہ بھی تحریر کیجئے کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی روشنی میں لڑکی اور اُسے اُکسانے والوں کے لئے کیا سزا تجویز ہے؟

جواب:- جب لڑکی بالغ ہو اور اس نے نکاح کی منظوری دے دی ہو تو نکاح ہوگیا[1]، بعد میں اس کا یہ کہنا کہ میں نے والدہ کا دِل رکھنے کے لئے کہا تھا، اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نکاح قائم ہے۔

والله سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۰)

کیا شوہر کو قتل کروانے کے بعد عورت کا دُوسری جگہ نکاح ہوجائے گا؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔ مسئلہ: فرض کیا اگر میری بیوی اور اُس کے گھر والے وغیرہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ اب کسی بھی طریقے سے اور بذریعہ عدالت بھی اس خاوند سے جان نہیں چھوٹ سکے گی تو اگر میری بیوی اور اُس کے گھر والے اپنی لڑکی یعنی میری بیوی کی دُوسری شادی کرنے کے لئے مجھے قتل کروا دیتے ہیں تو

---

(۱) وفی الهداية كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها.
وفی الهندية كتاب النكاح الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۹ (طبع ماجديه) ومنها رضا المرأة اذا كانت بالغة بكرًا كانت أو ثيبًا .... الخ.

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں قتل کا گناہِ کبیرہ تو میری بیوی اور اُس کے گھر والوں وغیرہ پر ہوگا ہی لیکن کیا مجھے قتل کروانے کے بعد میری بیوی جو بیوہ ہوگی اُس کا نکاح کسی دُوسرے مرد کے ساتھ جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- قتل کا سخت گناہ ہوگا،[1] مگر عدّت گزارنے کے بعد دُوسرے شخص سے نکاح ہوجائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱/۳۷۳)

والد کی طرف سے نابالغ لڑکی کا کیا ہوا نکاح دُرست ہے

سوال:- زید نے بکر کے طفل صغیر کے ساتھ اپنی دخترِ صغیرہ کا نکاح اپنی رضا و رغبت کے ساتھ کردیا ہے، اب صغیرہ مذکورۃ الصدر حد بلوغت کو پہنچ چکی ہے اور بکر کا طفل صغیر حد بلوغت کو نہیں پہنچا ہے، البتہ چار پانچ سال تک بالغ ہوجائے گا، لہٰذا زید اب یہ چاہتا ہے کہ میں اتنی مدت دراز تک اپنی لڑکی بالغہ کو کیسے بٹھائے رکھوں گا۔ شرع شریف میں میرے لئے کوئی نجات کی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بلاطلاق اپنی لڑکی کا نکاح کسی نوجوان کے ساتھ کرسکتا ہوں یا بغیر طلاق لئے عقدِ ثانی نہیں ہوسکتا؟ ایسی مجبوری کی حالت میں دُوسرے ائمہ کی تقلید کرلینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید نے اپنی نابالغ لڑکی کا جو نکاح بکر کے نابالغ لڑکے کے ساتھ کردیا ہے، وہ شرعاً منعقد ہوگیا ہے، اب لڑکے کے بالغ ہونے تک طلاق[2] یا فسخِ نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۷/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶/۷۲۸ ب)

نابالغ کے ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال:- زید نے اپنی دخترِ صغیر کا عقدِ نکاح بکر کے نابالغ لڑکے کے ساتھ مجلسِ عام میں بولایتِ خود، اپنی رضا و رغبت کے ساتھ کر دیا ہے، اب چونکہ لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور بکر کے لڑکے کو کسی حد تک کچھ دیر ہے، یعنی چھ سات برس کے بعد بالغ ہوگا، لڑکی کے بلوغ کے بعد ایک اختلاف پیدا ہوگیا

---

(۱) "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَأَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا" سورة النساء:۹۳.

(۲) وفی الفتاویٰ الهندية كتاب الطّلاق الباب الأوّل فصل فيما يقع طلاقه وفيمن لا يقع طلاقه ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجديه كوئٹه) يقع طلاق كلّ زوج اذا كان بالغًا عاقلًا .... ولا يقع طلاق الصّبي وان كان يعقل.

وفی الهداية كتاب الطلاق ج:۲ ص:۳۵۸ (طبع شركت علميه ملتان) ويقع طلاق كل زوج اذا كان عاقلًا بالغًا ولا يقع طلاق الصّبي والمجنون والنّائم لقوله عليه السلام: كلّ طلاق جائز الّا طلاق الصّبي والمجنون ولأنّ الأهلية بالعقل المميّز وهما عديم العقل والنّائم عديم الاختيار .... الخ.

ہے کہ بوقت ایجابِ نکاح بکر نے قبول نہیں کیا ہے، بلکہ بکر نے اپنے طفلِ صغیر کی زبان سے ایجاب و قبول کرایا ہے، نکاح کی مجلس کے بعض حضرات اس کی تصدیق کرتے ہیں، اور اکثریت عوام الناس اس بات کی تردید کرتی ہے کہ ایجاب و قبول بذاتِ خود بکر نے کیا ہے، ہاں! اگر خدانخواستہ بکر سے سہواً ایسا ہوگیا ہے یا عمداً ایسا کیا گیا ہے کہ صغیر کی زبانی اپنی موجودگی اور سرکردگی میں ایجاب و قبول کرایا ہے تو شرعاً یہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟

جواب:- نابالغ کا ایجاب و قبول معتبر نہیں، لہٰذا اگر بکر نے اپنے نابالغ بچے کا نکاح کراتے وقت خود ایجاب و قبول کیا ہے تب تو نکاح صحیح ہوگیا، اور اگر خود کرنے کے بجائے نابالغ بچے سے کرایا ہے تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۷۲۸ ب)

وٹہ سٹہ کے نکاح کی شرعی حیثیت

خلاصۂ سوال:- زید نے عمر سے اپنے لڑکے کے لئے لڑکی طلب کی، حسبِ رواج زید نے عوضاً لڑکی طلب کی، عمر نے بھی اس کو لڑکی دینے کا وعدہ کیا، اور عمر کے تین چار لڑکے تھے، عمر نے کہا کہ اگر میرا نمبر دوم لڑکا راضی ہوا تو ان کے ساتھ نکاح کراؤں گا، ورنہ پھر اپنے جس لڑکے کو بھی اگر دوں تو تجھ کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، زید رضامند ہوگیا، زید کی لڑکی نابالغ تھی، البتہ زید کا لڑکا اور عمر کی لڑکی جوان تھے، ان کا نکاح ہوگیا، اب عمر نے اپنے نمبر دوم لڑکے کی شادی دُوسری جگہ کی، زید کی لڑکی بھی جوان ہوگئی، عمر نے مطابق وعدہ لڑکی طلب کی تیسرے لڑکے کے لئے، زید کی زوجہ نے رواج کے مطابق منگنی وغیرہ بھی کی، مگر یاد رہے کہ اب تک شرعی نکاح نہیں ہوا ہے، جب زید نے لڑکی سے اجازت لینی چاہی تو لڑکی نے صاف انکار کردیا، زید نے بھی عوضاً لڑکی دینے سے انکار کردیا، حکمِ شرعی کیا ہے؟

جواب:- نکاح میں لڑکی کے بدلے لڑکی کے معاوضے کی شریعتِ اسلام میں کوئی حقیقت نہیں ہے،[2] اس لئے صورتِ مسئولہ میں اگر زید کی بالغ لڑکی عمر کے لڑکے سے شادی کرنے پر راضی نہیں

---

(۱) وفي الدر المختار كتاب النكاح باب الولي ج:۳ ص:۵۵ (طبع سعيد) وهو أى الولي شرط صحة نكاح صغير ومجنون .... الخ. وفي الهندية كتاب النكاح، الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۷ (طبع ماجديه) وأما شروطه فمنها العقل والبلوغ والحرية في العاقد الّا ان الأوّل شرط الانعقاد فلا ينعقد نكاح المجنون والصبي الذي لا يعقل.

(۲) وفي الدر المختار ج:۳ ص:۱۰۶، ووجب مهر المثل في الشغار هو أن يزوّجه بنته على أن يزوّجه الأخر بنته أو أخته مثلًا معاوضة بالعقدين وهو منهي عنه لخلوه عن المهر، فأوجبنا فيه مهر المثل فلم يبق شغارًا. وفي الشامية (قوله هو ان يزوّجه) قال في النهر: وهو ان يشاغر الرّجل أى يزوّجه حريمته على أن يزوّجه الأخر حريمته ولا مهر الّا هذا. وفي الشامية أيضًا قوله وهو منهي عنه لخلوّه عن المهر .... هو أى النّهي محمول على الكراهة، أى والكراهة لا توجب الفساد .... فيكون الشرع أوجب فيه أمرين الكراهة ومهر المثل .... الخ.

ہے تو اسے شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا،[۱] چونکہ لڑکی عاقل و بالغ ہے اس لئے اس کی مرضی کے خلاف نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔[۲]

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

اصل ولدیت ظاہر نہ کرنے کی صورت میں نکاح کا حکم

سوال:- مسماۃ مہر النساء انجم بنتِ سیّد شاکر علی مرحوم کا نکاح ہمراہ عشرت علی ولد انور علی سے ہوا، عشرت علی کے حقیقی والد تو کوئی اور صاحب تھے، انور علی، عشرت علی کے سوتیلے والد ہیں، کیا شرعاً نکاح میں کوئی سقم ہے؟ اگر ہے تو اس کا مداوا کس طرح ہوسکتا ہے؟

جواب:- عشرت علی صاحب کو اپنی ولدیت ہمیشہ اپنے اصل والد کی بتانی چاہئے،[۳] سوتیلے باپ کی طرف نسبت کرنا خلافِ واقعہ ہونے کی بنیاد پر جائز نہیں، لیکن اگر نکاح کے وقت غلط ولدیت بتادی گئی مگر عورت یا اس کا وکیل جانتا تھا کہ اس سے مراد کون سے عشرت علی ہیں، تو نکاح دُرست ہوگیا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۰۱/۳۲ ج)

سولہ سالہ گواہ کی گواہی سے نکاح دُرست ہوجائے گا

سوال:- ایک آدمی نے اپنی لڑکی مطلقہ سے اجازت لے کر اکیلے مکان میں روبرو دو گواہوں کے ایجاب و قبول نکاح کرایا (بغیر خطبہ وغیرہ)، مکانِ مذکور میں صرف چار آدمی تھے، باقی عورت وغیرہ کوئی موجود نہ تھا، مکان میں ایک سسر، دُوسرا شوہر اور دو گواہ تھے، گواہوں میں ایک کی عمر ۱۶ سال کی تھی، جس کے منہ پر داڑھی وغیرہ کے آثار نہیں تھے، اس کم عمر والے گواہ کے ہونے سے مذکورہ نکاح دُرست ہے؟

(۱،۲) وفي الدر المختار كتاب النكاح باب الولي ج:۳ ص:۵۸ (طبع سعيد) ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ. وفي الهندية كتاب النكاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۷ (طبع ماجديه) لا يجوز نكاح أحد علىٰ بالغة صحيحة العقل من أب أو سلطان بغير اذنها بكرًا كانت أو ثيبًا .... الخ. وفي الهداية كتاب النكاح، باب في أولياء ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها .... الخ.

(۳) وقال الله تعالىٰ: "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ." (سورة الأحزاب:۵).

جواب:- دُرست ہے، لڑکا پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے سے بالغ شمار کیا جاتا ہے۔[۱]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹ ۲۷/۲۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حلالہ کی نیت سے کئے گئے نکاح کی شرعی حیثیت اور اسے موردِ لعنت قرار دینے کا حکم

سوال:- اگر حلالہ کرنے والے مرد اور عورت کو ایک دُوسرے کی نیت کا علم ہے مگر عقد میں اس کی تصریح نہیں کرتے تو کیا یہ نکاح بھی ناجائز اور موردِ لعنت ہے؟ ''احسن الفتاویٰ'' ج:۵ ص:۱۵۵ میں ہے:

> ایسے نکاح کی حرمت اور موردِ لعنت ہونے کے لئے شرطِ تحلیل کی تصریح ضروری نہیں بلکہ ایک دُوسرے کی نیت کا علم بھی بقاعدہ ''المعروف کالمشروط'' اسی میں داخل ہے، وھو مفھوم قولہ: اما اذا اضمر ذٰلک لا یکرہ۔

حضرتِ والا کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

(مولانا) محمد عامر (اُستاذ جامعۃ الرشید کراچی)

جواب:- اَحوَط تو بیشک وہی ہے جو حضرتؒ نے ''احسن الفتاویٰ'' میں لکھا ہے، لیکن اس کو موردِ لعنت قرار دینا محلِ نظر ہے،[۲] فقہاء کے کلام سے اس کی تائید نہیں ہوتی، علم ہونے اور ''معروف کالمشروط''[۳] ہونے میں بظاہر فرق ہے، معروف اس وقت کہیں گے جب کسی عرف کی بناء پر کوئی بات بغیر صراحت کے بھی مشروط سمجھی جاتی ہو، محض متعاقدین کے علم سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی، تمام حِیلِ مباحہ میں متعاقدین کو علم ہوتا ہے مگر اسے مشروط نہیں سمجھا جاتا۔

واللہ اعلم

۱۴۲۴/۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳/۶۲۲)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الحجر فصل فی بلوغ الغلام (طبع سعید) بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والجاریة بالاحتلام والحیض والحبل فان لم یوجد فیھما شیء فحتّی یتمّ لکل منھما خمس عشر سنة بہ یفتٰی.

وفی الھندیة کتاب الحجر الفصل الثانی فی معرفة حدّ البلوغ ج:۵ ص:۶۱ (طبع رشیدیہ) والسن الّذی یحکم ببلوغ الغلام والجاریة اذا انتھیا الیہ خمس عشرة سنة عند أبی یوسف ومحمد رحمھما اللہ وھو روایة عن أبی حنیفة وعلیہ الفتویٰ.

(۲) حوالہ کے لئے ص:۴۲۰ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۳۷ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الشامیة ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعید) أن المعروف کالمشروط. وکذا فی البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۲۴ (طبع دار المعرفة بیروت).

﴿فصل فی الولایة والکفاءة وخیار البلوغ﴾

(ولایت، کفاءت (رشتوں میں برابری وہمسری) اور خیارِ بلوغ سے متعلق مسائل کا بیان)

معروف بسوء الاختیار کے نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص بدکردار کا ناجائز تعلق ایک پھوپھی زاد رشتہ دار شادی شدہ عورت کے ساتھ تھا، اس ناجائز تعلق کے دوران بچے بھی پیدا ہوئے، کچھ عرصہ بعد اس شخص نے جس عورت سے ناجائز تعلق رکھا ہوا تھا، اس کی سگی بہن سے شادی کرلی، جس کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی اور شادی کے بعد اس شخص نے ناجائز تعلقات جو اس عورت سے قائم کر رکھے تھے قطع کردیئے، اور اس عورت نے ایک اور غیر قوم کے مرد سے ناجائز تعلقات وابستہ کرلئے جس سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں، اب وہ پہلا شخص جو اپنی عورت کی سگی بہن سے شادی سے پہلے تعلق رکھ چکا تھا، چند معتبر آدمیوں کے مجبور کرنے پر اپنی نابالغہ لڑکی کا عقد سابقہ معشوقہ کے بطن سے جو غیر قوم کے مرد کے نطفہ سے لڑکا پیدا ہوا تھا، کردیا، جب لڑکی بالغ ہوئی اور سارے واقعات سے باخبر ہونے لگی تو لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کیا کہ میں اس لڑکے کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ لڑکی دیندار اور دینی تعلیم بھی رکھتی ہے، اور لڑکا بدکار کلمہ طیبہ تک نہیں جانتا، اب حسبِ شرع کیا حکم ہے؟ عقد صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے اور لڑکی راضی نہیں تو اب کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟

جواب:- لڑکی کے باپ کے حالات جو نکاح سے قبل بیان کئے گئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو ان کے پیشِ نظر اسے معروف بسوء الاختیار کہا جاسکتا ہے، اور اس صورت میں جبکہ لڑکا لڑکی کے لئے کسی طرح کفو نہیں، اس لئے بعد بلوغ لڑکی کو خیارِ فسخ حاصل ہے، بشرطیکہ جس وقت آثارِ بلوغ ظاہر ہوں، فوراً بلاتأخیر زبان سے کہہ دے کہ میں نے اپنا نکاح فسخ کردیا، اور اس پر گواہ بھی بنالے، اور پھر کسی مسلمان جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے باقاعدہ نکاح فسخ کردے۔[1] وفی الدر المختار (لم

---

(۱) بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سامنے آئی کہ اس صورت میں عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں، نکاح اصل سے باطل ہے۔ یہ تحقیق آگے ص:۲۸۹ پر آرہی ہے۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

یعرف منهما سوء الاختیار) مجانة وفسقا (وان عرف لا) یصح النکاح اتفاقًا وکذا لو کان سکران فزوّجها من فاسق أو شریر أو فقیر أو ذی حرفة دنیئة لظهور سوء اختیاره فلا تعارضه شفقته المظنونة بحر وقال الشامی والحاصل ان المانع هو کون الأب مشهورًا بسوء الاختیار قبل العقد فاذا لم یکن مشهورا بذٰلک ثم زوج بنته من فاسق صح وان تحقق بذٰلک انه سیئ الاختیار شامی.[1] وفیه أیضًا ثم اعلم ان ما مر عن النوازل من أن النکاح باطل معناه انه سیبطل.[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷/ ۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

عجمیوں کے درمیان نسب میں کفاءت کا اعتبار نہیں

سوال:- ایک آدمی نے عاقلہ بالغہ لڑکی کو اغواء کیا اور اسے ڈرا دھمکا کر نکاح کرلیا، لڑکی کے والدین اس نکاح پر ناراض ہیں، کیونکہ لڑکی آرائیں قوم سے ہے اور لڑکے کا تعلق شیخ قوم سے ہے، (شیخ سے مراد کھوجہ قوم ہے) اور دونوں قوموں کی شرافت میں فرق ہے، آرائیں معزز سمجھے جاتے ہیں اور شیخ ذلیل، تو کیا اس صورت میں نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب:- آرائیں اور کھوجہ دونوں عجمی نسلیں ہیں، اور عجمیوں کے درمیان نسب میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہے،[3] اور مذکورہ نکاح چونکہ عاقلہ بالغہ نے اپنی اجازت و رضامندی سے کیا ہے اس لئے نکاح شرعاً منعقد ہوگیا، اب اگر لڑکی یا اس کے رشتہ دار نکاح ختم کرنا چاہتے ہیں تو سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ لڑکے سے طلاق حاصل کریں، قال فی الدر المختار واما فی العجم فتعتبر حریة واسلاما. (شامی ج:۲ ص:۳۱۹)۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱، ۲) فتاویٰ شامیة ج:۳ ص:۶۶، ۶۷ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) وفی الشامیة ج:۳ ص:۸۷ (طبع سعید) فالنسب معتبر فی العرب فقط واسلام الأب والجد فی العجم فقط، والحریة فی العرب والعجم .... الخ.
(۴) فتاویٰ شامیة ج:۳ ص:۸۷ (طبع ایچ ایم سعید).

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد، آلِ رسول ہے اور کیا سیّد کا نکاح غیر سیّد میں ہوسکتا ہے؟

سوال:- زید کہتا ہے کہ سیّد کوئی قوم نہیں، کیونکہ نسب نرینہ اولاد سے چلتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لڑکا صاحبِ اولاد نہیں تھا۔ کیا زید کا یہ کہنا صحیح ہے؟ اور کیا سیّد کا نکاح غیر سیّد میں ہوسکتا ہے؟

جواب:- زید کا خیال غلط ہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد آلِ رسول ہے۔ اور غیر سیّد تو بہت سی قومیں ہوسکتی ہیں، بعض سادات کی کفو ہیں اور بعض نہیں،[1] اور غیر کفو میں لڑکی اور اولیاء دونوں کی مرضی سے نکاح تو ہوجاتا ہے،[2] مگر بہتر یہ ہے کہ نکاح کفو میں ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۵/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۹/۲۸ ج)

سوءِ اختیار ثابت کئے بغیر باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں ہوسکتا

سوال:- زید بعمر ۵ سال کا، سعیدہ بعمر ۲ سال سے نکاح ہوا، بالغ ہونے پر سعیدہ نے نکاح کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا، زید نے نوٹس کے ذریعے سعیدہ کی رُخصتی کا مطالبہ کیا، تو سعیدہ نے نوٹس کے جواب میں زید کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور عدالتِ عالیہ سے درخواست کی کہ اس کے اس حق کو تسلیم کیا جائے اور نکاح منسوخ قرار دیا جائے، سات سال کی مقدمہ بازی کے بعد عدالت نے اس حق کو تسلیم کرلیا اور اس بات کی تصدیق کردی کہ نکاح منسوخ ہوگیا ہے، اس کے خلاف اپیل کی جو مسترد ہوگئی، اب فرمائیں کہ نکاح شرعاً منسوخ ہوگیا یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سعیدہ کا نکاح خود اس کے باپ نے کیا تھا تو اب بالغ ہونے کے بعد سعیدہ کو اسے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے،[3] تاوقتیکہ وہ سوءِ اختیار کو ثابت نہ کرے۔

---

(۱) سادات کی کفو قوموں میں صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، عباسی، زبیری، یعنی شیوخِ قریش وغیرہ شامل ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ج:۵ ص:۲۰۶ (طبع دارالاشاعت جدید ایڈیشن)۔

(۲) وفی المبسوط کتاب النکاح ج:۵ ص:۲۶ (طبع دارالمعرفة بیروت) واذا تزوّجت المرأة غیر کفء فرضی به احد الأولیاء جاز ذٰلک.

(۳) وفی الھندیة (ج:۱ ص:۲۸۵) فان زوجھما الأب والجد فلا خیار لھما بعد بلوغھما وان زوجھما غیر الأب والجد فلکل واحد منھما الخیار. وفی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰).

اور اگر سعیدہ کا نکاح کرنے والا خود اس کا باپ نہیں تھا، خواہ باپ کا وکیل ہی کیوں نہ ہو، تو لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے[1]، اس صورت میں عدالت کا فیصلہ[2] فیصلہ شریعت کے مطابق ہوگا، ولزم النکاح ولو بغبن فاحش.... أو بغیر کفء إن کان الولی المزوج بنفسه بغبن أبا أو جدا لم یعرف منهما سوء الاختیار .... وان کان المزوج غیرهما أی غیر الأب وأبیه ولو الأم أو القاضی أو وکیل الأب.... لا یصح من غیر کفء أو بغبن فاحش أصلا.... وان کان من کفءٍ وبمهر المثل صح ولهما خیار الفسخ (الدر المختار باختصار مع الشامی ج:۲ ص:۴۱۷ تا ۴۲۰)[3]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۶ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

باپ کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں کیا جاسکتا

سوال:- مسمّٰی رحیم بخش نے اپنی حقیقی لڑکی کا نکاح بحالتِ نابالغی بعمر ۹، ۱۰ سال کے خوشی و رضامندی کے ساتھ شیر محمد کے ساتھ کردیا، کچھ عرصہ بعد مسمّٰی شیر محمد باہر چلا گیا اور عدم الخبر ہوا، عرصہ چار پانچ سال کے بعد لڑکی کے باپ نے عدالت میں تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا، عدالت میں مقدمہ سات آٹھ ماہ چلتا رہا، اس دوران عدالت نے شیر محمد مذکور کے وارثوں کو حکم دیا کہ وہ شیر محمد کو تین ماہ کے اندر اندر حاضر عدالت کریں، ورنہ حکم تنسیخ کردیا جائے گا، چنانچہ اس قلیل وقت میں لڑکے کو عدالت میں حاضر نہ کیا جاسکا تو عدالت نے تنسیخِ نکاح کا حکم دے دیا، تنسیخ سے قبل عدالت نے سرکاری طور پر شیر محمد کو تلاش نہیں کیا، نہ تو عدالت نے کوئی نوٹس دیا اور نہ کوئی اعلان یا اخبار میں اشتہار دیا، تنسیخ کے بعد دُوسری شادی کی اجازت دے دی گئی، چنانچہ بعد تین ماہ عدّت گزارنے کے لڑکی کے باپ نے اس کی شادی ایک اور شخص مسمّٰی محمد شفیع سے کردی، نکاح کے دو تین ماہ بعد شیر محمد مذکور آگیا، اور اس نے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا، مگر لڑکی کے والد نے انکار کردیا اور کہا کہ لڑکی دُوسرے شخص محمد شفیع کے گھر رہے گی، کیونکہ عدالت نے نکاحِ ثانی کی اجازت دے دی ہے اور اب تک بضد قائم ہے، لہٰذا اب صورتِ

---

(۱) وفی الهندیة (ج:۱ ص:۲۸۵) فان زوجهما الأب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار. وفی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰).

(۲) رجسٹر نقل فتاویٰ میں یہ فیصلہ موجود نہیں ہے، سوال و جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالت نے فسخِ نکاح کا فیصلہ کیا تھا۔ (محمد زبیر)۔

(۳) الدر المختار ج:۳ ص:۶۶-۶۹ (طبع ایچ ایم سعید).

مذکورہ میں کیا نکاحِ اوّل منسوخ ہوگیا یا نہیں؟

جواب:- اس سوال کے ساتھ عدالت کا جو فیصلہ منسلک تھا، اس میں فسخِ نکاح خیارِ بلوغ کی بناء پر کیا گیا ہے، جس پر تنقیحات کی گئیں، ان تنقیحات کے بعد مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے، ۱:- لڑکی کا نکاح خود باپ نے کیا تھا، ۲:- لڑکی نے آثارِ بلوغ ظاہر ہوتے وقت نکاح کو نامنظور کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔

لہٰذا اوّلاً تو یہ نکاح چونکہ باپ کا کیا ہوا ہے (اور اس کے سیئ الاختیار ہونے کا دعویٰ لڑکی نہیں کرتی) اس لئے اس میں لڑکی کو خیارِ بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے، کما ھو مصرح فی سائر کتب الفقه[1]، دُوسرے اگر حاصل ہوتا تب بھی لڑکی نے خیارِ بلوغ کے حق کو استعمال کرنے کا وقت گزار دیا، لہٰذا شرعاً خیارِ بلوغ کی بناء پر عدالت کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار نہیں تھا، اور شریعت کی رُو سے اس کا فسخِ نکاح صحیح نہ ہوا، لہٰذا محمد شفیع سے اس کا نکاح باطل و کالعدم ہے، اور اصل خاوند شیر محمد بدستور لڑکی کا شوہر ہے، البتہ اگر محمد شفیع لڑکی کے ساتھ صحبت کر چکا ہو تو جب تک اسے تین حیض نہ آجائیں شیر محمد کے لئے اس سے صحبت کرنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ثیبہ کے نکاح کے لئے اس کی صراحۃً رضامندی شرط ہے

سوال:- کتاب تجرید صحیح بخاری کے صفحہ:۶۲ پر یہ حدیث نظر سے گزری، اُمید ہے کہ آپ اس کے بارے میں پوری تشریح فرمائیں گے (نابالغہ کو بالغ ہونے پر فسخِ نکاح کا اختیار) حضرت خنساء بنت حذام انصاریہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میرے والد نے میرا نکاح کسی شخص سے کر دیا، اس سے قبل میری ایک مرتبہ شادی ہو چکی تھی، کنواری نہ تھی، اور اس نکاح سے میں خوش نہ تھی، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ نے نکاح کو ناجائز قرار دیا اور لوٹا دیا.... الخ۔ اس کے علاوہ دیگر کتب سے سن بلوغ اور اختیار فسخِ نکاح پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- یہ حدیث صحیح ہے، اور اسی کی بناء پر اسلامی فقہ میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جو

---

(۱) وفی الهندية ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجديه) فان زوجهما الأب والجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما.
وفی البحر الرائق كتاب النكاح باب الأولياء ج:۳ ص:۱۲۰ (طبع رشيديه كوئٹه) ولهما خيار الفسخ بالبلوغ فی غير الأب والجد .... الخ.

عورت ثیبہ ہو یعنی پہلے ایک مرتبہ اس کی شادی ہو چکی ہو، تو اس کا نکاح اس وقت تک منعقد نہیں ہوتا جب تک کہ وہ صریح الفاظ میں رضامندی ظاہر نہ کرے،(۱) اس طرح رضامندی حاصل کئے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ حدیثِ مذکور میں حضرت خنساءؓ چونکہ ثیبہ تھیں اور ان کے والد نے ان کی مرضی لئے بغیر نکاح کردیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کو ناجائز قرار دیا،(۲) لیکن اس حدیث کو نابالغ لڑکی کے فسخِ نکاح کے حق سے کوئی تعلق نہیں ہے، نابالغ کا حقِ فسخ دُوسری روایات سے ثابت ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لڑکی کا نکاح اگر باپ دادا کے علاوہ کسی اور شخص نے نابالغی کی حالت میں کردیا تو لڑکی کو یہ حق ہے کہ وہ بالغ ہوتے ہی فوراً نکاح کو نامنظور ہونے کا اعلان کردے تو وہ نکاح ختم ہوجاتا ہے،(۳) جسے عدالت کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے، اور بالغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کو حیض آنا شروع ہوجائے یا شرعی عمر پورے پندرہ سال کی ہوجائے۔(۴) واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۲/۱۹ الف)

اولیاء کی رضامندی کے بغیر لڑکی کا غیر کفو میں نکاح کرنا

سوال:- خلاصہ سوال کا یہ ہے کہ باپ کی مرضی کے خلاف میری لڑکی نے ایک جگہ ایک ایسے آدمی سے نکاح کیا ہے جو نیک سیرت نہیں ہے، مزید براں اس کے پہلے سے ایک بیوی اور چار بچے بھی موجود ہیں، گھر میں جھگڑے وغیرہ کی بناء پر اب اس لڑکی کو میں عاق کرنا چاہتا ہوں، رہنمائی کیجئے۔

جواب:- سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی نے جس شخص سے شادی کی ہے، اس کو لڑکی کا باپ اپنے لئے کفو نہیں سمجھتا، اور شرعاً لڑکی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ باپ کی اجازت و رضامندی کے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۶۲ .... بل لا بدّ من القول (کالثّیب) البالغة .... الخ.

(۲) وفی صحیح البخاری ج:۲ ص:۷۷۱ (طبع قدیمی کتب خانه) باب اذا تزوّج ابنته وھی کارھة فنکاحه مردود، عن خنساء بنت خذام الأنصاریة أنّ أباھا زوّجھا وھی ثیب فکرھت ذٰلک فأتت رسول الله صلی الله علیه وسلم فردّ نکاحھا.

(۳) وفی الھندیة کتاب النکاح الباب الرابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیه) فان زوّجھما الأب والجد فلا خیار لھما بعد بلوغھما وان زوّجھما غیر الأب والجد فلکل واحد منھما الخیار ...... ویشترط فیه القضاء.
وکذا فی البحر الرائق کتاب النکاح باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۲۰ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۴) وفی الدر المختار کتاب الحجر، فصل فی بلوغ الغلام ج:۶ ص:۱۵۳ والجاریة بالاحتلام والحیض والحبل فان لم یوجد فیھما شیء فحتّٰی یتم لکل منھما خمس عشرة سنة، وبه یفتٰی.
وفی البحر الرائق ج:۸ ص:۸۵ باب الحجر بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال .... والجاریة بالحیض والاحتلام والحبل، ویفتٰی بالبلوغ فیھما بخمسة عشرة سنة. وکذا فی البدائع ج:۷ ص:۱۷۱.

بغیر غیر کفو میں نکاح کرے، لہٰذا اگر وہ شخص واقعۃً کفو نہیں ہے، تو اس کا یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا،[1] رشتہ داروں کو چاہئے کہ وہ لڑکی کو نرمی سے سمجھائیں کہ یہ نکاح دُرست نہیں ہوا، اور اس کے ساتھ رہ کر وہ حرام کی مرتکب ہوگی، لما فی الدر المختار: فلا تحل مطلقة ثلاثا نکحت غیر کفؤ بلا رضا ولی بعد معرفته ایاہ فلیحفظ. (شامی ج:۲ ص:۴۰۹)[2]۔ لیکن عاق کرنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، باپ کو کسی حال میں یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی میراث سے محروم کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نابالغہ کا نکاح باپ نے کیا ہو تو بعد میں خود باپ وہ نکاح فسخ نہیں کرسکتا

سوال:- زید نے اپنی نابالغہ لڑکی کا نکاح بکر کے ساتھ اپنے وکیل سے کرایا اور ایجاب و قبول کی مجلس کے اندر مؤکل (یعنی باپ) موجود تھا، اور مہر اور خطبہ بھی پڑھا گیا، چند سال بعد زید اپنی لڑکی کے نکاح کے ایجاب وقبول سے انکار کرتا ہے، مگر پہلے نکاح کے وکیل اور گواہ موجود ہیں، اور اقرار بھی کرتے ہیں، اب زید اور اس کے معین فی ہذا عند الشرع کیا حکم رکھتے ہیں؟ اور جو مولوی صاحب نکاح پڑھائے گا وہ کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کفو میں مہر کے ساتھ کیا گیا ہے تو یہ نکاح منعقد ہوگیا، اب زید کو اس نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے،[3] البتہ لڑکی کو بلوغ کے وقت یہ اختیار ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو بالغ ہوتے ہی فوراً اس نکاح کو نامنظور کردے، اس صورت میں نکاح فسخ ہوجائے گا، لما فی الدر المختار: وإن المزوّج غیرهما أی غیر الأب وأبیه ولو الأم أو القاضی

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب النکاح (باب الولی) ج:۳ ص:۵۶ ویفتیٰ فی غیر الکفو بعدم جوازہ أصلًا وهو المختار للفتویٰ لفساد الزمان. وفی المبسوط (باب الاکفاء ج:۵ ص:۲۵ طبع دار المعرفة بیروت) واذا زوّجت المرأة نفسها من غیر کفؤ فللأولیاء أن یفرّقوا بینهما، لأنها الحقت العار بالأولیاء.

(۲) الدّر المختار ج:۳ ص:۵۷ (طبع سعید).

(۳) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ کتاب الطلاق وأهله زوج عاقل. وفی الشامیة احترز بالزّوج عن سیّد العبد ووالد الصغیر.

أو وكيل الأب .... لا يصح النكاح من غير كفؤ أو بغبن فاحش أصلًا، وان كان من كفؤ وبمهر المثل صحّ ولهما خيار الفسخ. (شامی ج:۲ ص:۴۱۹، ۴۲۰)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۶ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفی عنہ

بچپن میں نکاح کی صورت میں بلوغت کے بعد لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل ہوگا

سوال:- زید نے اپنی نابالغ لڑکی کا ایجاب وقبول کرانے کے لئے بکر کے لڑکے کے ساتھ، ایک شخص کو وکیل بنایا، وکیل زید نے (مؤکل) کے رُوبرو ایجاب وقبول کرلیا، نکاح خوانی بھی ہوگئی، چند عرصہ کے بعد لڑکی نے انکار کردیا (یعنی جوان ہونے کے بعد)، اور زید نے بھی انکار کردیا، وکیل اور گواہ اقرار کرتے ہیں ایجاب وقبول کا۔ کیا اس صورت میں زید اپنی بیٹی کا نکاح دُوسری جگہ کرسکتا ہے؟ اور جس مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا تھا اس کے پیچھے نماز کیسی ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی لڑکی کا نکاح بکر کے لڑکے کے ساتھ منعقد ہوگیا، البتہ لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل ہے،[2] جس کی تفصیل اس وقت بتائی جاسکتی ہے جب مندرجہ ذیل سوالات کا جواب آپ لکھ کر بھیج دیں:-

۱:- جب زید کی لڑکی پر آثارِ بلوغ (حیض) ظاہر ہوئے تو اس نے اپنے نکاح کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا؟

۲:- لڑکی نے بالغ ہونے کے کتنے عرصے کے بعد نکاح سے انکار کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۱/۲ھ

---

(۱) الدر المختار کتاب النکاح باب الولی ج:۳ ص:۶۷ الی ۶۹ (طبع سعید).
وفی الهندية كتاب النكاح الباب الرابع ج: ۱ ص:۲۸۵ (طبع مكتبه ماجديه) وان زوّجهما غير الأب والجد فلكل واحد منهما الخيار اذا بلغ ..... الخ. وكذا فی البحر الرائق كتاب النكاح باب الأولياء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بيروت، وفی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰).
(۲) وفی الهندية كتاب النّكاح الباب الرّابع ج: ۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجديه) وان زوّجهما غير الأب والجد فلكل واحد منهما الخيار اذا بلغ .... الخ.

لڑکی نے بالغ ہوتے ہی اپنا خیار استعمال نہ کیا تو بعد میں فسخِ نکاح کا اختیار نہیں

سوال:- لڑکی نابالغہ کا نکاح چچا نے کردیا، جب تقریباً بائیس سال کی ہوئی تو اس نے تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا کہ میرے چچا نے میری مرضی کے مطابق نکاح نہیں کیا، اب کیا یہ نکاح قابلِ فسخ ہے یا نہیں؟

جواب:- لڑکی کو خیارِ بلوغ کے تحت فسخِ نکاح کا حق اسی وقت حاصل تھا جب اس پر بلوغ کے آثار (حیض) ظاہر ہوئے تھے، جب اس نے اس وقت نکاح فسخ نہیں کیا تو اس کے بعد سالہا سال گزر جانے پر وہ خیارِ بلوغ کا حق استعمال نہیں کرسکتی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲ھ

اولیاء کی رضامندی سے غیر قوم میں نکاح کرنے کا حکم

سوال:- مسماۃ بی بی حنیف سیّد خاندان سے تعلق رکھتی ہے، اور جوان العمر ہے، وہ ایک غیر قوم سے نکاح کرنا چاہتی ہے، کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟

جواب:- اگر لڑکی کے اولیاء غیر قوم میں شادی کرنے پر راضی ہوں اور لڑکی بھی راضی ہو تو بلاشبہ وہ نکاح کرسکتی ہے،[2] اور اگر اولیاء راضی نہیں ہوں تو غیر قوم کی تفصیل لکھئے کہ جس قوم میں لڑکی شادی کرنا چاہتی ہے وہ کون سی قوم ہے؟ اور اولیاء اس کے ساتھ نکاح کرنے پر کیوں راضی نہیں ہیں؟ تب جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

---

(۱) وفی قاضی خان کتابُ النّکاح فصل فی الخیارات ج:۱ ص:۲۸۶ (طبع ماجدیه) واذا بلغت وهی بکر فسکتت ساعة بطل خیارها فان اختارت نفسها کما بلغت واشهدت علیٰ ذٰلک صحّ. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷۴ (ولا یمتد الی اٰخر المجلس) وفی الشامیة تحتهٗ أی مجلس بلوغها أو علمها بالنکاح کما فی الفتح: أی اذا بلغت وهی عالمة بالنکاح أو علمت به بعد بلوغها فلا بدّ من الفسخ فی حال البلوغ او العلم فلو سکتت ولو قلیلًا بطل خیارها ولو قبل تبدّل المجلس.

(۲) وفی الهدایة کتاب النکاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شرکت علمیه) وینعقد نکاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها. وفی البحر الرائق، کتاب النکاح، باب الأولیاء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بیروت وفی طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نکاح حرّة مکلفة بلا ولی، لأنها تصرّفت فی خالص حقها وهی من أهله لکونها عاقلة بالغة .... وانما یطالب الولی بالتزویج کیلا تنسب الی الوقاحة .... الخ. وفی الهندیة کتاب النّکاح الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۹ (طبع ماجدیه) ومنها رضاء المرأة اذا کانت بالغة بکرًا کانت أو ثیّبًا .... الخ.

بالغ لڑکی اپنا نکاح خود کرسکتی ہے

سوال:- میرے والد صاحب میں بہت سی بُری، خراب عادتیں موجود ہیں، جو ہمارے لئے تکلیف کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری عزّتوں کی حفاظت میں رُکاوٹ بھی ہیں۔ نشے کے عادی ہیں، گھر میں خرچ نہیں دیتے، والدہ کے ساتھ گالی گلوچ کے ساتھ بات کرتے ہیں، کئی مرتبہ اُنہوں نے خودکشی کے لئے نشہ آور دوائیں کھائی ہیں، مگر خدا نے ہر مرتبہ بچایا، خاندان والوں نے اُن کو خاندان سے نکال دیا ہے، اچھی سے اچھی نوکری والد صاحب کو ملتی ہے، مگر چھ سات ماہ سے زیادہ نوکری نہیں کرتے، کچھ نہ کچھ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ نوکری سے علیحدہ کردیئے جاتے ہیں۔ سات آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ اچانک رات کو گھر سے غائب ہوگئے، رات بھر نہ آئے، دُوسرے دن ہمارے گھر پر آدمی آنے لگے اور کہنے لگے کہ: تمہارے والد نے ہم سے کئی ہزار روپیہ باہر بھجوانے کا لیا ہے، وعدہ کرکے بلایا ہے، کہاں ہیں؟ ان تمام واقعات کی روشنی میں اب یہ سوال ہے کہ: میری ایک چھوٹی بہن ہے، اُس کی عمر ۱۴ سال ہے، اُس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے، اب تک میرے ماموں سرپرست ہیں، ہمارا خرچ بھی برداشت کرتے ہیں، والد صاحب کو بتایا کہ میں اپنی بہن کا رشتہ فلاں جگہ کرنا چاہتا ہوں، وہ بولے کہ میری مرضی کے بغیر لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی ہے اور میں یہ شادی ہونے نہیں دوں گا۔ کیا شرعاً سرپرست، والد کی اجازت کے بغیر ہمارا نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر لڑکی عاقل بالغ ہے تو وہ اپنا نکاح خود کرسکتی ہے، بشرطیکہ جس لڑکے سے نکاح کرے وہ خاندانی، نسبی اور دینی اعتبار سے اُس کا کفو ہو، ایسی صورت میں باپ سے اجازت لینا ضروری نہیں،[1] لیکن بہتر ہے کہ اُس کو بھی کسی طرح راضی کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۴/۲۸ الف)

---

(۱) وفی الهداية، كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها وان لم يعقد عليها ولی بكرًا كانت أو ثيبًا.
وفی البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بيروت وفی طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نكاح حرّة مكلّفة بلا ولی لأنها تصرّفت فی خالص حقها وهی من أهله لكونها عاقلة بالغة .... وانما يطالب الولی بالتّزويج كيلا تنسب الی الوقاحة .... الخ. وكذا فی الهندية، كتاب النكاح، الباب الأوّل ج:۱ ص:۲۶۹ (طبع ماجديه).

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دام ظلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حضرت سے گزارش یہ ہے کہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کا رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تحریر فرمادیں تاکہ آئندہ کام آسکے، اور دارالافتاء میں محفوظ رہے۔

جواب:-

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

احقر نے احسن الفتاویٰ جلد پنجم میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کا تحریر فرمودہ رسالہ "کشف الغبار عن مسئلۃ سوء الاختیار" کا مطالعہ کیا، اور متعلقہ عبارات پر غور کیا، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے اس رسالہ میں جو تحقیق فرمائی ہے، وہ دُرست ہے، اس کے مطابق سوء الاختیار کی صورت میں جو نکاح غیر کفو یا غبنِ فاحش کے ساتھ کیا گیا ہو وہ اصلاً ہی باطل ہے اور غیر منعقد ہے، لہٰذا اس کے فسخ کے لئے قضاءِ قاضی کی ضرورت نہیں، البتہ جو نکاح کفو میں ہو، یا مہرِ مثل کے ساتھ ہو، وہ منعقد ہوجاتا ہے، لیکن اس صورت میں بھی کوئی ناگوار اور ناقابلِ برداشت صورتِ حال ہو، مثلاً عمر میں بہت زیادہ فرق ہو، جس کی وجہ سے لڑکی کا شوہر کے ساتھ نباہ نہ ہوسکتا ہو، تو وہاں بھی سوءِ اختیار واضح ہونے کی صورت میں لڑکی کو خیارِ بلوغ ملنے پر غور کرنا چاہئے، لیکن اس صورت میں عدالت سے نکاح فسخ کرانا بھی ضروری ہونا چاہئے، جیسا کہ اس رسالے کے آخر میں درج ہے۔ اور اس کی ایک بنیاد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باپ، دادا کی شفقتِ مظنونہ کی وجہ سے انعقادِ نکاح کا جو حکم تھا، وہ سوءِ اختیار واضح ہونے کی صورت میں جب غیر کفو یا غبنِ فاحش کی صورت ہو تو مرتفع ہوگیا، اب باپ، دادا اور ولیِ غیر اَب برابر ہوگئے، کہ دونوں کا کیا ہوا نکاح غیر منعقد قرار پایا، تو کفو اور مہرِ مثل کی صورت میں بھی جب سوءِ اختیار واضح ہو تو باپ کا حکم ولیِ غیر اَب جیسا ہونا چاہئے کہ اس میں خیارِ بلوغ ملتا ہے، تو یہاں بھی ملنا چاہئے، لیکن یہ بات فی الحال حتمی نہیں محض ایک خیال ہے اور مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰/۱)

باپ، دادا کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کے خیارِ بلوغ کا حکم

سوال:- والد نے لڑکی کا نکاح ایسی جگہ یا خاندان میں کرایا جہاں پردہ کا کوئی انتظام نہیں اور نہ لڑکی اور اس خاندان کے رہن سہن میں مطابقت ہے، اس لڑکی کے والد نے اس کی شادی سے پہلے لڑکی کے ماموں کو کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے لڑکے کی شادی اس لڑکی کا بٹہ دے کر کرلو، مگر اس میں ایک شرط یہ ہے کہ مہاجرین سے رشتہ نہ کرنا، مگر لڑکی کے والد نے خود اس سے خلاف کیا اور لڑکی کا نکاح مہاجر سے کردیا، اور ان کا کاروبار کاشتکاری ہے۔۲:- لڑکی نے بلوغ پر خود ہی نکاح فسخ کرنا منظور کیا۔۳:- لڑکی بالغ ہونے پر ایک دن بھی اپنے شوہر کے ہاں آباد نہیں ہوئی۔ تو کیا اس صورت میں نکاح باقی ہے؟

جواب:- باپ، دادا کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیارِ بلوغ صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ باپ فاسق و فاجر ہو یا لالچی ہو، اور اس کا سوءِ اختیار معروف ومشہور ہو،[1] اور اس نے غیر کفو میں نکاح کیا ہو، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے یہ نکاح محض لالچ کی بنا پر کیا تھا، بٹہ پر نکاح کرنا بوجہ رواج عام کے اس کی کافی وجہ نہیں ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں خیارِ بلوغ کی بناء پر نکاح فسخ کرنے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، اب اگر دونوں میں نبھاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے، تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ شوہر سے معاوضہ وغیرہ کے ذریعے طلاق حاصل کی جائے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	۱۳۹۱/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۱/۲۲ ب)

بالغ لڑکی، والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

سوال:- مسماۃ گلزار دختر ملکی امان عمر ۲۰ سال نے حلفی بیان دیا ہے کہ میری عمر تقریباً ۲۰ سال ہے، میں میر محمد سے شادی کرنا چاہتی ہوں، میں نے اپنی مرضی سے اپنے والدین کا گھر چھوڑا ہے، مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا، میرے والدین میری مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتے ہیں، اس لئے اُن کا گھر چھوڑ دیا ہے۔

جواب:- استفتاء میں سوال کی وضاحت نہیں ہے، اگر یہ پوچھنا مطلوب ہے کہ مذکورہ بالغ لڑکی اپنے والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہتر یہی ہے کہ

---

(۱) وفی رد المحتار کتاب النکاح، باب الولی ج:۳ ص: ۶۶ و ۶۷ (طبع سعید) لو عرف من الأب سوء الاختیار لسفهه أو لطمعه لا یجوز عقدهٔ اجماعًا. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ۔

والدین کی مرضی حاصل کر کے نکاح کرے، تاہم چونکہ وہ بالغ ہے اس لئے اگر والدین کی مرضی کے بغیر اپنے کفو میں شرعی طریقے سے نکاح کرلے گی تو نکاح منعقد ہوجائے گا،[۱] البتہ غیر کفو میں نکاح کیا تو وہ والد کی مرضی کے بغیر منعقد نہیں ہوگا۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۴۳۱/۲۷ ہ)

باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح، لڑکی بلوغ کے بعد فسخ نہیں کرسکتی

سوال:- زید نے اپنی چھ سالہ لڑکی کا نکاح ایک نابالغ لڑکے سے کردیا، لڑکی ابھی حد بلوغت کو نہیں پہنچی تھی کہ اس کو اپنے نکاح کا علم ہوگیا، تو اس نے ناخوشی کا اظہار کیا، اور بالغ ہونے کے بعد بھی وہ اس بات پر مصر ہے کہ مجھے وہ نکاح منظور نہیں، کیا اس صورت میں لڑکی کا والد اس کا نکاح دُوسری جگہ کراسکتا ہے یا نہیں؟ اور پہلا نکاح خودبخود فسخ ہوجائے گا یا نہیں؟

جواب:- باپ، دادا کا کیا ہوا نکاح لڑکی بلوغ کے بعد بھی فسخ نہیں کرسکتی،[۳] لہٰذا وہ نکاح دُرست ہوچکا ہے، اور لڑکی کے انکار سے فسخ نہیں ہوگا، البتہ اگر لڑکی بالغ ہونے کے بعد یہ دعویٰ کرتی ہو کہ میرے باپ نے کسی لالچ کی وجہ سے میری خیرخواہی کے برخلاف میرا نکاح کردیا تھا تو ایسی صورت میں اس لالچ کی تفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے، اس صورت کا حکم اسی وقت بتایا جائے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۱/۲۸ الف)

باپ کا کیا ہوا نکاح فسخ نہیں کیا جاسکتا

سوال:- زید نے اپنی رفیقۂ حیات زیب الٰہی کی سفارش پر اپنے بہنوئی کے طفلِ صغیر کے ساتھ اپنی صغیرہ نابالغہ لڑکی کا عقدِ نکاح مجلسِ عوام وخواص میں برضا ورغبت کردیا، اب لڑکی جوان ہوگئی

---

(۱) وفی الهداية، كتاب النكاح ج:۲ ص:۳۱۳ (طبع شركت علميه) وينعقد نكاح الحرّة العاقلة البالغة برضائها. وفي البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۱۷ (طبع بيروت و فى طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۰۹) نفذ نكاح حرّة مكلّفة بلا ولي، لأنّها تصرّفت في خالص حقها وهي من أهله لكونها عاقلة بالغة.

(۲) وفي الدر المختار، كتاب النكاح (باب الولي) ج:۳ ص:۵۶ و ۵۷ ويفتىٰ في غير الكفو بعدم جوازه أصلًا وهو المختار للفتوىٰ لفساد الزمان. وفي المبسوط باب الاكفاء ج:۵ ص:۲۵ (طبع دار المعرفة بيروت) واذا زوّجت المرأة نفسها من غير كفؤ فللأولياء أن يفرّقوا بينهما، لأنّها الحقت العار بالأولياء.

(۳) وفي الهندية كتاب النّكاح، الباب الرّابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجديه) فان زوّجهما الأب والجد فلا خيار لهما بعد بلوغهما. وفي البحر الرائق، كتاب النكاح، باب الأولياء ج:۳ ص:۱۲۸ (طبع بيروت وفي طبع مكتبه رشيديه كوئٹه ج:۳ ص:۱۲۰) ولهما خيار الفسخ بالبلوغ في غير الأب والجد .... الخ.

ہے، لڑکا ابھی تک جوان نہیں ہوا ہے، البتہ دس سال تک جوان ہوجائے گا، اب زید یہ عذر پیش کرتا ہے کہ میں نے برضا و رغبت اپنی دختر صغیرہ نابالغہ کا نکاح نہیں کیا ہے، اور اتنی طویل مدّت کی زحمت کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا (کہ مزید دس سال لڑکے کے بالغ ہونے کا انتظار کروں)، لہٰذا عدالتِ عالیہ میں دعویٰ دائر کرکے اپنی لڑکی کی طلاق لینا چاہتا ہوں، اور دُوسری جگہ اُس کا نکاح کردینا چاہتا ہوں، آج دعویٰ تنسیخِ نکاح کا رائج ہوگیا ہے، کیا یہ شرعاً دُرست ہوگا؟

جواب:- باپ کے کئے ہوئے نکاح میں عدالت کے ذریعے فسخِ نکاح کا کوئی سوال نہیں، شرعاً ایسا فسخِ نکاح معتبر نہ ہوگا۔[۱] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴؍۷؍۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۷۳۵/۲۸ ب)

اولیاء کی رضامندی کے بغیر غیر کفو میں نکاح کا حکم

سوال:- ایک شخص بنام احمد جس کی لڑکی ہے، جب لڑکی عاقل بالغ ہوگئی تو احمد نے پانچ چھ گواہوں کے سامنے اپنی لڑکی اپنے چچازاد بھائی سے منگنی کروانے کا زبانی اقرار کیا اور واقعی وعدہ کیا، اور چچازاد بھائی جس کا نام غلام قادر ہے اس نے قبول کیا، اور منگنی کی شرائط کو گواہوں کے رُوبرو قبول کیا، اس کے بعد لڑکی کی ماں لوگوں کے ورغلانے سے خاوند کا گھر چھوڑ کر لڑکی کو لے کر ماسی کے گھر چلی گئی، وہاں پہنچ کر لڑکی کی ماں کہنے لگی کہ جہاں میرا خاوند میری لڑکی دینا چاہتا ہے، وہاں میں راضی نہیں ہوں، اور نہ میری لڑکی راضی ہے، کیونکہ وہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے، جس غیرمحرم کے گھر ماں اور لڑکی گئی تھی اُس غیرمحرم نے لوگوں کے مشورے سے لڑکی کا نکاح احمد کی مرضی کے خلاف کروادیا، جس لڑکے سے نکاح ہوا وہ احمد اور احمد کی بیوی کے ماموں کا لڑکا ہے، اس کے بعد احمد اپنے دو سگے لڑکے بھائی کے پاس چھوڑ کر اپنی بیوی اور لوگوں سے ناراض ہوکر سندھ چلا گیا، کیونکہ یہ نکاح اس کی مرضی کے خلاف ہوا تھا، نکاح کے وقت لڑکی نے نکاح کا ولی ماموں کو بنایا، ماموں نے ولی بن کر نکاح پڑھوایا، یہ نکاح رات کے وقت جبکہ لوگ سو رہے تھے کیا گیا، اور جس قوم میں یہ لڑکی دی گئی ہے، وہ قوم احمد کے گھر والے، احمد کی بیوی اور ماں اور دادی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، باقی احمد کے باپ اور دادا دُوسرے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، احمد کے باپ دادا کا نسب چودہ پندرہ پشت گزرنے کے بعد اس قوم سے ملتا ہے، آیا یہ نکاح جائز ہوا یا نہیں؟

---

(۱) وفی الفتاویٰ الهندیة، کتاب النکاح، الباب الرّابع ج:۱ ص:۲۸۵ (طبع ماجدیه) فان زوّجهما الأب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوّجهما غیر الأب والجد فلکل واحد منهما الخیار .... الخ. وکذا فی الشامیة ج:۳ ص:۶۸.

تنقیح:-

ا:- احمد کی لڑکی نے جس مرد سے نکاح کیا ہے، وہ قومی اور خاندانی اعتبار سے احمد کا کفو ہے یا نہیں؟ یعنی کیا دونوں خاندانوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک خاندان، دُوسرے خاندان میں شادی بیاہ کرنے کو عرفاً عار اور عیب سمجھتا ہو؟ یا اتنا فرق نہیں ہے اور دونوں خاندانوں میں بغیر کسی عار کے شادی بیاہ ہوتے ہیں؟

۲:- کیا دینداری کے اعتبار سے احمد کے گھرانے اور اُس مرد کے گھرانے میں فرق ہے؟

ان دو سوالات کا جواب اسی کاغذ پر لکھ کر بھیجئے، ان سوالات کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جائے گا۔

محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح:-

وہ مرد اور اس کے گھرانے میں اتنا فرق دینداری کے اعتبار سے ہے کہ احمد اور احمد کے گھرانے موحد ہیں، اور جس مرد سے احمد کی لڑکی کا نکاح کیا گیا وہ مرد اور اُس کے گھرانے بدعتی ہیں، اور اُن میں مشرکانہ صفتیں بھی ہیں، چند صفتیں یہ ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے، مشکلات میں پیر کو پکارتا ہے، مرنے کے بعد عہد نامہ کو قبر میں دفن کرتا ہے، نمازِ جنازہ پڑھ کر دائرہ بنا کر اسقاط کرتا ہے، احمد ان باتوں کے خلاف ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں احمد کی لڑکی کا نکاح جس شخص سے کیا گیا، وہ احمد کا کفو نہیں ہے، لما فی رد المحتار: فانهم قالوا لا یکون الفاسق کفوًا لبنت الصالحین. (شامی ج:۲ ص:۳۲۰ باب الاکفاء)۔[۱] اور فسقِ اعتقادی فسقِ عملی سے اشد ہے،[۲] لہٰذا مذکورہ صورت میں احمد کی رضامندی کے بغیر جو نکاح کیا گیا وہ باطل ہے، احمد کی لڑکی کو چاہئے کہ وہ فوراً اُس شخص سے الگ ہوجائے، لما فی الدر المختار: وله اذا کان عصبة الاعتراض فی غیر الکفوء ما لم تلد منه، ویفتیٰ بعدم جوازہٖ أصلًا وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان. (شامی ج:۲ ص:۲۹۷)۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۱/۲۷ و)

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۳ ص:۸۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) وفی حلبی کبیر شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ..... فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل.
(۳) الدر المختار ج:۳ ص:۵۶،۵۷ (طبع سعید)

ہندوستان میں مقیم لڑکی، پاکستان میں کسی سے نکاح کے لئے اپنا وکیل مقرّر کرسکتی ہے

سوال:- نفسِ مسئلہ پوری طرح واضح نہ ہوسکا، لہٰذا وضاحت کے لئے معاملے کی نوعیت بیان کرتا ہوں۔

لڑکی ہندوستان میں ہے، جہاں شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ایجاب کی تکمیل ہوچکی ہے، وکیل مقرّر شدہ جناب عبدالرحمٰن خان صاحب نے جو ہندوستان میں مقیم ہے، ارشاد علی خان صاحب جو پاکستان میں مقیم ہے، کو بذریعہ تحریر ہذا اپنا وکیل نامزد کیا تاکہ وہ نکاح خوانی کی مجلس منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) میں نکاح خوانی کے متعلق وکیل کی نیابت قبول کرے، ایسی صورت میں معلوم کرنا ہے کہ جناب ارشاد علی خان صاحب لڑکی کے وکیل کی حیثیت سے لڑکی کی طرف سے ایجاب کرسکتے ہیں اور مجلس منعقدہ لطیف آباد (حیدرآباد) میں لڑکے کے قبول کرنے پر نکاح کی تکمیل شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ارشاد علی خان صاحب لڑکی کی طرف سے ایجاب کرسکتے ہیں، بشرطیکہ لڑکی ان کو وکیل بنانے پر راضی ہو۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کیا غیر کفو میں نکاح نہیں ہوتا؟ اور کفو میں نکاح کی شرعی حیثیت اور حکمت

سوال:- کیا نکاح اپنے کفو میں کرنا ضروری ہے؟ اس کے بغیر کسی اور خاندان میں نکاح نہیں ہوسکتا؟ کفو میں نکاح کیوں کرنا چاہئے؟ اور اپنے خاندان ہی میں نکاح کی کوشش کرنا کیسا ہے؟

جواب:- نکاح ہر ذات میں دونوں خاندانوں کی رضامندی سے ہوسکتا ہے[۱]، لیکن کفو میں نکاح کرنا اس لئے بہتر ہوتا ہے کہ اس میں عموماً طبیعتیں مل جاتی ہیں، اگر اس خیال سے اپنے کفو میں نکاح کی کوشش کی جائے تو شرعاً کوئی حرج نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۶/۲۸ھ[۲]

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۲۸۷ کا حاشیہ نمبر۲ اور ص:۳۰۵ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ایک جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی الجهاز والمهر﴾
(جہیز اور مہر سے متعلق مسائل کا بیان)

نکاح میں مہر مقرّر نہ کیا ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک آدمی کی شادی ہوئی تقریباً دو سال ہوگئے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ حق مہر کیا چیز ہوتی ہے؟ نہ اس نے دیا، وہ آدمی پنجاب کا ہے، دیہاتی ہے، اب اس کو معلوم ہوا ہے کہ حقِ مہر دینا ضروری ہے، اب وہ کیا کرے؟

جواب:- اگر نکاح کے وقت کوئی مہر مقرّر کیا گیا ہو تو مقرّر کی ہوئی مقدار اور تفصیل کے مطابق مہر ادا کردیا جائے، اور اگر کوئی مہر مقرّر نہ ہوا ہو تو بیوی کے خاندان کی عورتوں کا عام طور پر جتنا مہر مقرّر ہوتا ہے، مثلاً بہنوں کا، اُتنا مہر واجب ہوگا جسے مہرِ مثل کہا جاتا ہے۔[1]

والله سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۷۲ ج)

مہر دینا واجب ہے

سوال:- جنابِ عالی! گزارش ہے کہ محمد فرید خان ولد شیر زمان قوم سَتّی، تحصیل کوہِ مری، ضلع راولپنڈی نے اپنی بیوی کو طلاق دی، جبکہ پانچ لڑکے اس سے ہیں، اب بات یہ ہے کہ عدالت نے لکھا ہے کہ اس کا مہر حق داری باقی ہے، اب مہر حق داری جناب زمین، مکان، باغ وغیرہ کا ہے، محمد فرید خان کی بیوی افراز جان بی بی اپنا مہر کا حق وصول کرنے کی شریعت میں حق دار ہے یا نہیں؟ ضروری بات یہ ہے کہ ایک سال چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے، افراز بی بی کے لئے شرعی فتویٰ جاری کیا جائے، تاکہ سب وطن میں دین کا قانون جاری ہوجائے۔

جواب:- اگر محمد فرید خان نے طلاق دینے سے پہلے بیوی کو مہر ادا نہیں کیا تھا، تو اس پر واجب ہے کہ فوراً طے شدہ مہر ادا کرے، خواہ وہ مہر نقد روپے کی شکل میں ہو یا زمین یا باغ کی شکل

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۰۸ (طبع ایج ایم سعید) (وکذا یجب) مهر المثل (فیما اذا لم یسمّ) مهرا.
وفی الشامیة قوله فیما اذا لم یسمّ مهرا أی لم یسمّه تسمیة صحیحة أو سکت عنه نهر.

میں ہو، فوراً ادا کرنا واجب ہے۔[1] اور نابالغ بچوں کا نفقہ بھی اس کے ذمے واجب ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۱۱/۱۳۹۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۹۴/۳۰ د)

۱:- برادری کا مہر کی مقدار مقرّر کرنا، اور مہر کے ذکر کے ساتھ کئے گئے نکاح پر رضامندی مہر پر بھی رضامندی متصوّر ہوگی
۲:- شوہر اور لڑکی کے والدین کی طرف سے لڑکی کو دیئے گئے سامان کا حکم

سوال ۱:- ہماری میمن برادری میں عورتوں کا مہر بوقتِ نکاح اس وقت ۵۰۰ روپے مقرّر ہے، قبل ازیں ۱۲۵ روپے اور اس سے پہلے ۲۵ روپے تھا، یہ رقم برادری کی مجلسِ عامہ کی جانب سے مقرّر کی جاتی ہے، کیا مردوں کا یا ایک کمیٹی کا عورتوں سے پوچھے بغیر مہر مقرّر کرنا شرعاً صحیح و جائز ہے؟ نیز کیا عورت کی رضامندی ضروری ہے؟

۲:- دُلہن کو مرد کی طرف سے یا دُولہا کے خاندان کی طرف سے سونے کے زیورات دیئے جاتے ہیں، اگر طلاق ہوگئی تو زیورات واپس لئے جاتے ہیں، اس پر مطلقہ کا حق نہیں گردانا جاتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے پاس کچھ نہیں رہتا، وہ بے سروسامانی کی حالت میں میکے سدھارتی ہے، اگر مطلقہ صاحبِ اولاد ہو تو اور بھی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، دین میں ایسی مطلقہ کو کیا رعایت حاصل ہیں؟

جواب ۱:- مہر مقرّر کرنے کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے، لیکن نکاح کے وقت جب اس سے اجازت لی جاتی ہے اُس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ: ”تمہارا نکاح فلاں شخص سے اتنے مہر پر کیا جارہا ہے“ اگر اس نے اس وقت رضامندی دے دی تو مہر پر بھی رضامندی ہوگئی، جہاں تک

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح، باب المهر ج:۳ ص:۱۰۲ وتجب .... عند وطءٍ أو خلوة صحت من الزوج أو موت أحدهما أو تزوّج ثانيًا في العدة، وفي الشامية ج:۳ ص:۱۰۲ واذا تأكد المهر بما ذكر لا يسقط بعد ذٰلک وان كانت الفرقة من قبلها، لأن البدل بعد تأكده لا يحتمل السقوط الا بالابراء. وفي الهندية كتاب النّكاح الباب السابع الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكد بأحد معان ثلاثة، الدّخول والخلوة الصحيحة، وموت أحد الزوجين سواء كان مسمّى أو مهر المثل حتّٰى لا يسقط منه شئ بعد ذٰلک الا بالابراء من صاحب الحق.

(۲) وفی الفتاویٰ الهندية، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النّفقات ج:۱ ص:۵۶۰ (طبع ماجديه كوئٹه) نفقة الأولاد الصّغار على الأب لا يشاركهٗ فيها أحد.

وفی الدر المختار، كتاب الطّلاق، باب النّفقة ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعيد) وتجب النفقة بأنواعها على الحرّ لطفله يعم الأنثٰى والجمع الفقير الحر. وفی الشامية تحت (قوله الفقير) أی ان لم يبلغ حدّ الكسب .... الخ.

برادری کی طرف سے مہر کے تعین کا تعلق ہے، عورت اس کی پابند نہیں ہے، بلکہ اگر چاہے تو اس سے زیادہ بھی مقرّر کرا سکتی ہے۔

۲:- اگر یہ زیورات عورت کو مالک بنا کر صراحۃً نہیں دیئے گئے تو وہ شوہر ہی کی ملکیت ہیں،[1] اور جدائی کے وقت شوہر واپس لے سکتا ہے، لیکن اس پر مہر کی ادائیگی واجب ہے اور لڑکی کو اس کے والدین کی طرف سے جو کچھ چڑھایا گیا ہو وہ اس کی ملکیت ہے،[2] جو جدائی کے وقت اپنے ساتھ لے جا سکتی ہے، خلاصہ یہ کہ طلاق کے بعد شوہر کی طرف سے ایک تو مہر کی ادائیگی واجب ہے،[3] بشرطیکہ وہ پہلے ادا نہ کیا ہو، دُوسرے عدّت کے دوران اس کا نفقہ واجب ہے،[4] اس کے علاوہ کوئی اور چیز اس کے ذمے واجب نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۸۰۳ ج)

میکے اور سسرال کی طرف سے لڑکی کو دیا گیا سامان کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- میری بھتیجی جس کو تین طلاقیں دی گئی ہیں، وہ اپنے گھر واپس آگئی ہے، اور طلاق کے وقت میری بھتیجی جو کپڑے اور زیور پہنے ہوئی تھی، اُس کے ساتھ آئی، اور وہ تمام جہیز کا سامان جو لڑکی کے والدین نے شادی پر اُس کو دیا تھا، اور وہ تمام سامان جو کہ اُس کے سابقہ شوہر نے اور اُس کے والدین نے (یعنی سابقہ شوہر کے) شادی پر دیا تھا یہ سب سامان سابقہ شوہر کے پاس ہے۔ طلاق مؤرخہ ۱۹۷۶/۸/۸ء کو دی گئی تھی، بہرحال جو سامان سابقہ شوہر اور سابقہ شوہر کے والدین نے شادی کے موقع پر دیا تھا وہ کس کی ملکیت ہے؟

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا .... ورکنها هو الایجاب والقبول .... وحکمها ثبوت الملک للموهوب لهٗ .... وتصح بایجاب کوهبت ونحلت .... الخ.

(۲) وفی ردّ المحتار ج:۳ ص:۵۸۵ (طبع سعید) انّ الجهاز ملک المرأة وأنّهٗ اذا طلّقها تأخذهٗ کلّه واذا ماتت یورث عنها.

(۳) وفی الدّر المختار، کتاب النّکاح، باب المهر ج:۳ ص:۱۰۲ (طبع سعید) وتجب .... عند وطءٍ أو خلوة صحّت من الزّوج أو موت أحدهما أو تزوّج ثانیًا فی العدّة .... الخ. وفی الهندیة، کتاب النکاح، الباب السابع، الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجدیه) والمهر یتأکّد بأحد معان ثلٰثة الدّخول والخلوة الصحیحة وموت أحد الزّوجین سواء کان مسمّٰی أو مهر المثل حتّٰی لا یسقط منه شیٔ بعد ذٰلک الا بالابراء من صاحب الحق .... الخ.

(۴) وفی الفتاویٰ الهندیة، کتاب الطّلاق، الباب السابع عشر فی النفقات، الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجدیه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النّفقة والسکنٰی کان الطّلاق رجعیًا أو بائنًا أو ثلٰثًا حاملًا کانت المرأة أو لم تکن، کذا فی فتاویٰ قاضی خان. وفی الدّر المختار، کتاب الطّلاق، باب النفقة ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع سعید) وتجب لمطلّقة الرّجعی والبائن والفرقة بلا معصیة .... الخ.

جواب:- جو سامان سابقہ شوہر یا اس کے والدین نے شادی کے وقت دیا تھا، اگر وہ آپ کی بھتیجی کو ہبہ کرکے اور مالک بنا کر دینے کی صراحت کی تھی، تب تو وہ آپ کی بھتیجی کی ملکیت ہے،[۱] اور اگر ایسی صراحت نہیں ہوئی تھی تو ہمارے زمانے میں عرف یہ ہے کہ وہ شوہر ہی کی ملکیت ہوتا ہے، لہٰذا اس عرف کے مطابق وہ شوہر کی ملکیت ہوگا،[۲] البتہ جو جہیز لڑکی کو اس کے والدین نے دیا تھا، وہ لڑکی کی ملکیت ہے، اور شوہر پر واجب ہے کہ اس کو واپس کرے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۴/۲۸ الف)

مہر عورت کے لئے ''اعزازیہ'' ہے یا ''عوض'' اور ''اُجرت''

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مضمون ''مہرِ شرعی کی حقیقت'' کے تناظر میں حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہم کا سوال)

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۲ر نومبر کے ''جنگ'' (لندن ایڈیشن) میں آں محترم کا کالم ''مہرِ شرعی کی حقیقت'' کے عنوان سے نکلا تھا، میں نے اس کو اسی وقت سے سامنے رکھا ہوا تھا، اس لئے کہ اس نے ایک کئی سال پُرانا سوال تازہ کردیا تھا، مگر اس سلسلے میں جو لکھنا مقصود تھا اس کی نوبت آتے آتے اتنا وقت لگ گیا۔

یہاں ایک اہلِ تعلق انگریزی میں اسلام کی ترجمانی کے سلسلے میں لکھتے رہتے ہیں، ایک دفعہ مہر کے بارے میں انہوں نے یہی اعزازیہ (Honorarim) کی تعبیر اختیار کرنے کا خیال میرے سامنے ظاہر کیا، جو عنوان آپ نے اختیار فرمایا ہے، تو مجھے یہ اِشکال ہوا تھا کہ عنوان تو بہت اچھا ہے مگر مہر کا شرعی حکم اور شریعت کی بیان کردہ نوعیت اس تعبیر سے ہم آہنگ نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ منکوحہ عورت کا حق ہے، اور نوعیت اس حق کی وہ ہے جو قرآنی تعبیر ''اُجُوْرَھُنَّ'' سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی تشریح میں آپ حضرات (یعنی فقہائے کرام) اسے ''عوض ملک بضع'' بتاتے ہیں۔ آپ کے

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزًا غیر مشغول .... ورکنها هو الایجاب والقبول .... وحکمها ثبوت الملک للموهوب له .... وتصحّ بایجاب کوهبت ونحلت .... الخ.

(۲) وفی الشامیة ج:۵ ص:۸۸: والعرف فی الشرع لهٗ اعتبار　　لِذا علیه الحکم قد یدار.

(۳) وفی الشامیة ج:۳ ص:۵۸۵ (طبع سعید) فانّ کل أحد یعلم أن الجهاز ملک المرأة وأنّه اذا طلّقها تأخذهٗ کلّه واذا ماتت یورث عنها .... الخ. نیز میکے اور سسرال سے لڑکی کو دیئے گئے سامان کے مذکورہ حکم کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد المفتین ص:۵۶۰ و ۵۶۱. (محمد زبیر)

مضمون میں یہ تعبیر پاکر بھی یہی اِشکال ہوا، اور کوئی جواب اس کا وہاں نظر نہ آیا۔ صحیح یہ ہے کہ اپنے ناقص فہم کی رو سے مہر کی نوعیت اگر ''اعزازیہ'' کی ہو تو پھر آگے کوئی اِشکال نہیں ہوتا، چاہے زوج کی مالی حیثیت کی کمزوری کی بناء پر کتنا ہی کم تر ہو، لیکن اجر اور عوض کی صورت میں اس کے لئے ''کل ما جاز ان یکون ثمنًا وقیمۃً لشیءٍ'' کا کافی ہونا یا مالکیہ اور حنفیہ کے مطابق تین درہم یا دس درہم کا کافی ہونا، اس میں تو اللہ معاف کرے اپنی ناقص عقل کے مطابق، عورت کی بڑی بے وقعتی کا پہلو نکلتا ہے، جبکہ شریعتِ الٰہی یقیناً اس سے بری ہے، کاش! آپ کے ذریعہ اس مسئلے میں مدد ملے، والسلام

آپ کا مخلص اور محبّ

عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)

رجب ۱۴۱۶ھ

جواب:- بگرامی خدمت جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ باعثِ افتخار ومسرّت ہوا، اتفاق سے میں کچھ عرصے سے کمر کے مہرے کی تکلیف میں ہوں، جس کی بناء پر بیٹھ کر کام نہیں کر پارہا، اس لئے لیٹے لیٹے یہ سطور اِملا کرا رہا ہوں اور براہِ راست مکاتبت کا شرف حاصل نہیں کر سکا، اُمید ہے کہ معذور قرار دیں گے۔

مہر کے لئے ''اعزازیہ'' کی تعبیر اختیار کرتے وقت میرے ذہن میں صاحبِ ہدایہ کی ایک عبارت تھی جس میں وہ فرماتے ہیں: ''ثم المهر واجب شرعًا ابانة لشرف المحل'' نیز چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں: ''ولأنه حق الشرع وجوبًا اظهارًا لشرف المحل، فيقدر بماله خطر'' اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''واما انه ابانة لشرفه فلعقلية ذٰلک أذ لم يشرع بدلًا كالثمن والأجرة والا لوجب تقديم تسميته، فعلمنا ان البدل النفقة، وهٰذا لاظهار خطره، فلا يستهان به، واذًا فقد تأكد شرعًا باظهار شرفه مرّة باشتراط الشهادة، ومرة بالزام المهر'' (فتح القدير مع الكفاية ج:۳ ص۲۰۵)[۱]۔

نصوصِ شرعیہ پر غور کرنے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مہر کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ عقدِ نکاح کا لازمی تقاضا ہے، اور اس طرح اس میں عوض ہونے کی ایک مشابہت ہے، اس حیثیت کے لحاظ سے قرآنِ کریم میں اس پر ''اُجُوْرَهُنَّ'' کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے، لیکن دُوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹھیٹھ معنیٰ میں کسی مادّی چیز کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ وہ عورت کے اعزاز

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

کے لئے مشروع کیا گیا ہے، اسی لئے سورۃ النساء میں فرمایا گیا: "وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً"(۱) یہاں مہر کو "صدقہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں: "وسمی به لانه يظهر صدق ميل الرجل الى المرأة" میرے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ مُلّا علی قاریؒ کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

یعنی مہر کو "صُداق" اور "صَدُقه" اس لئے کہتے ہیں کہ صدق کے اس مادّے میں "سچ" کے معنٰی ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے، اس لئے اس مناسبت سے مہر کو "صدق" کہنے لگے۔

(معارف القرآن ج:۲ ص:۲۹۹ طبع ادارۃ المعارف کراچی)

نیز قرآنِ کریم نے اس کے ساتھ "نِحْلَة" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو عطیہ کو کہتے ہیں اور اِمام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "انما سمی المهر نحلة، والنحلة فی الأصل العطية والهبة فی بعض الوجوه، لأن الزوج لا يملک بدله شيئًا، لان البضع فی ملک المرأة بعد النكاح كهو قبله، الا ترى أنها لو وطئت بشبهة كان المهر لها دون الزوج، فانما سمی المهر نحلة لأنه لم يعتض من قبلها عوضا يملكه، فكان فی معنى النحلة الّتى ليس باذائها بدلا، وانما الذى يستحقه الزوج منها بعقد النكاح هو الاستباحة لا الملک" (أحكام القرآن للجصاصؒ ج:۲ ص:۵۷)۔(۲)

تقریباً یہی بات اِمام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحریر فرمائی ہے، (تفسیر کبیر ج:۹ ص:۱۸۰) قرآنِ کریم کی اس تعبیر اور اِمام جصاصؒ اور اِمام رازی کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصلاً مہر کسی بدل کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ عقد کا ایک ایسا تقاضا ہے جس کا منشا محلِ عقد کی تکریم اور اعزاز ہے، البتہ چونکہ اس کے بعض اَحکام ایسے ہیں جو عام طور پر معاوضوں کے ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ عورت اس کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اسے شوہر کے ذمے دَین قرار دیا گیا ہے، وغیرہ، اس لئے اس مشابہت کی وجہ سے قرآنِ کریم میں بعض جگہ اسے "اُجور" سے تعبیر کیا گیا۔

اور معاوضے کے اَحکام جاری کرتے وقت بعض فقہائے کرام نے بھی اس مشابہت کی وجہ سے اسے ملک بضع کا بدل کہہ دیا ہے، لیکن جس طرح اس تعبیر میں "ملک" کا لفظ اپنے حقیقی معنٰی میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس سے مراد حقِ انتفاع ہے، اسی طرح "بدل" کا لفظ بھی من کل الوجوہ حقیقی معنٰی میں نہیں ہے، بلکہ مذکورہ مشابہت کی وجہ سے مجازاً یہ تعبیر اختیار کی، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

---

(۱) سورۃ النساء:۴۔ (۲) طبع سهيل اكيڈمی لاهور.

۱:- عقدِ معاوضہ میں بدل کا تعین عقد کی صحت کے لئے شرط ہوتا ہے، لیکن نکاح میں مہر کی تعیین کوئی ضروری نہیں، نکاح اس کے بغیر بھی ہوجاتا ہے اور مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔

۲:- بیع میں اگر یہ شرط لگادی جائے کہ خریدار کوئی قیمت ادا نہیں کرے گا تو بیع دُرست نہیں ہوتی، لیکن نکاح میں اگر یہ شرط لگادی جائے کہ کوئی مہر نہ ہوگا تو نکاح ہوجاتا ہے، اور مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔

۳:- معاوضات میں شرعاً بدل کی کوئی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار مقرّر نہیں ہوتی، لیکن مہر کی کم سے کم مقدار کم از کم حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں مقرّر ہے۔

۴:- عقودِ معاوضہ میں اگر معقود علیہ دُوسرے فریق کے حوالے نہ کیا جائے تو عوض واجب الاداء نہیں ہوتا، لیکن نکاح میں اگر رُخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوجائے تو نصف مہر پھر بھی واجب ہوتا ہے۔

اس جیسے اور بھی متعدّد اُمور یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مہر میں عوض ہونے کی مشابہت ضرور ہے، لیکن عوض کے تمام اَحکام اس میں موجود نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ''اعزازیہ'' ہے، لیکن اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے شرعاً لازم ہے، اور بیوی کو اس کے مطالبے کا حق بھی حاصل ہے، معاوضے کے مشابہ اور تکریم پر مبنی ہونے کی دونوں حیثیتوں کو تعبیر کرنے کے لئے مجھے ''اعزازیہ'' سے بہتر کوئی اور لفظ نہیں ملا، اور یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ ''اعزازیہ'' بھی بعض اوقات واجب الاداء اور لائقِ مطالبہ ہوتا ہے۔

جہاں تک دس درہم یا تین درہم کی بے وقعتی کا تعلق ہے، سو یہ بات میں اپنے مضمون میں عرض کرچکا ہوں کہ عورت کا اصل حق شرعاً مہرِ مثل ہے، البتہ اگر وہ خود اپنا حق کسی وجہ سے کم کرنا چاہے تو کم سے کم ایسی حد شریعت نے مقرّر کردی ہے کہ فی الجملہ معتد بہ ہو، اور چونکہ یہ کم سے کم حد ہے، مہر کی مطلوب مقدار نہیں، اس لئے اس میں بے وقعتی کا کوئی پہلو نہیں۔

والسلام
۲۸؍رجب ۱۴۱۶ھ (۱)

(۱) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائلِ موصوف کے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿فصل فی أحکام الولیمة﴾
(ولیمہ کے مسائل)

ولیمہ کی شرعی حیثیت اور اس کا وقتِ مسنون

سوال:- ذی استطاعت پر ولیمہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ اور ایسا ولیمہ جو نکاح کے دس دن یا چار پانچ دن کے بعد کیا جائے یہ بھی مسنون و جائز ہوگا یا نہیں؟ اور ایسے ولیمہ کے کھانے کے لئے جانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ولیمہ کب تک کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- ولیمہ کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، اس کا وقتِ مسنون زفاف کے بعد ہے، جس قدر جلد کیا جائے اتنا ہی سنت سے قریب ہوگا، چار پانچ دن کے بعد ولیمہ کیا جائے تو سنتِ ولیمہ ادا ہوجائے گی۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

ولیمہ کا مسنون وقت کون سا ہے؟

سوال:- دُلہن، عصر کے وقت چار بجے لائی گئی، نکاح سات بجے شام کو منعقد ہوا، آیا سات اور چار بجے کے درمیان طعام ولیمہ میں شمار ہوگا یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ ولیمہ بعد الدخول اور بعد النکاح ہی سنت ہے، اور بکر کہتا ہے کہ بعد الدخول اور بعد النکاح اور بعد الزفاف تمام سنت ہیں، کیونکہ: **قال فی الفتح: وقد اختلف السّلف فی وقتها عند العقد أو عقبه أو عند الدّخول أو عقبه أو موسع من ابتداء العقد الیٰ انتهاء الدخول علیٰ أقوال. انتهیٰ. والفرق بینهما ان عند یشترط فیه الحضور۔** معلوم ہوا کہ لفظ "عند" عقد کے بعد اور ماقبل کو بھی شامل ہے، **کما فی الحدیث: انه قالت ثلٰث اوقات نهانا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نصلّی فیها وان لا نقبر موتانا عند طلوع الشمس وعند غروبها وعند الاستواء. جزئیة ومنع عن الصلوٰة وسجدة التلاوة وصلوٰة الجنازة عند طلوع الشمس وعند الغروب والاستواء۔** اس سے بھی معلوم ہوا کہ "عند" عام ہے، نیز دُلہن نے اپنے آپ کو عقدِ نکاح کے لئے سپرد کیا تو یہ تمام وقت عقدِ نکاح کے لئے صالح ہے۔ نیز نکاح صدقہ اور ہبہ سے ہوسکتا ہے، جب دُلہن یا ولی نے شوہر کو زوجہ پر تسلط دیا تو تملیک اور قبضہ بھی

---

(۱) حوالے اور تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اُس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب عفی عنہ)۔

آیا، ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں، جیسے کہ ھبہ کے اندر ہے، تو طعام مذکور بھی ''ولیمہ'' میں شمار ہوگا یعنی (چار سے سات تک)۔

جواب:- ولیمہ کا وقتِ مسنون بعد الدخول ہے۔ قال السبکی: والمنقول من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم انّھا بعد الدّخول، وفی حدیث انس رضی اللہ عنہ عند البخاری وغیرہ التصریح بأنّھا بعد الدّخول لقولہ اصبح عروسا بزینب فدعا القوم. (بذل المجھود ج:۲ ص:۳۲).[1] السنّة فی الولیمة أن تکون بعد البناء وطعام ما قبل البناء لا یقال لہ: ولیمة عربیة. (فیض الباری ج:۴ ص:۳۰۰).[2]

جن حضرات نے عند العقد اور عقب العقد ولیمہ کو مسنون کہا ہے، ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اوقات میں ولیمہ کرنے سے سنتِ ولیمہ ادا ہوجاتی ہے، جس طرح مسواک کے مسئلے میں (کہ برش کرنے سے سنتِ سواک ادا ہوتی ہے، سنتِ آلہ ادا نہیں ہوتی)، اسی طرح یہاں سنتِ ولیمہ ادا ہوگئی، مگر سنتِ وقت ادا نہیں ہوئی، یعنی ولیمہ وقتِ مسنون میں ادا نہ ہوگا، لیکن عقدِ نکاح سے پہلے ''ولیمہ'' کی کوئی اصل نہیں، اس کے جو دلائل بیان کئے گئے ہیں وہ تمام محلِ نظر ہیں، ''عند'' اور ''لدی'' کا فرق اس وقت ہوتا ہے جبکہ ''عند'' مکان میں مستعمل ہو، ظرف کے وقت اطلاق قبل کے معنی پر نہیں ہوتا، عند طلوع، بعد الطّلوع، عند الغروب، عند الاصفرار میں بڑا فرق ہے۔ نہ ''ھبہ'' سے نکاح کا منعقد ہونا یہ معنی رکھتا ہے، فالحاصل ان النکاح ینعقد بالھبة اذا کان علیٰ وجہ النکاح، بحر (ج:۳ ص:۲۲)۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱/۱۱/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۸/۱۸ الف)

---

(۱) بذل المجھود کتاب النکاح ج:۴ ص:۳۲ (طبع مکتبہ قاسمیہ ملتان). وکذا فی نیل الأوطار ج:۶ ص:۱۵۰.

(۲) طبع مکتبہ اسلامیہ شارع کانسی، کوئٹہ.

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے شبِ زفاف کے بعد ولیمہ کرنا ثابت ہے، جیسا کہ درج ذیل حدیثِ بخاری میں تصریح ہے، اور یہی جمہور کا مسلک ہے، تاہم درج ذیل مختلف اقوال کی بناء پر سنتِ ولیمہ نکاح کے بعد یا رُخصتی سے قبل یا بعد کسی بھی وقت میں کرلینے سے ادا ہوجاتی ہے۔
وفی الصحیح للبخاری ج:۲ ص:۷۷۶ باب الولیمة حق .... وکان أوّل ما أنزل فی مُبتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزینب ابنت جحش أصبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم بھا عروسًا فدعا القوم فأصابوا من الطّعام .... الحدیث.
وفی ھامشہ: وقد اختلف السّلف فی وقتھا، ھل ھو عند العقد أو عقبہ أو عند الدّخول أو عقبہ؟ .... واستحب مالک کونھا أسبوعًا. وفی اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۲ حدیث انس فی ھٰذا الباب صریح أنّھا أی الولیمة بعد الدّخول لقولہ فیہ أصبح عروسًا بزینب فدعا القوم. وفی التاج الجامع للأصول فی أحادیث الرسول، للشیخ منصور علی ناصف ج:۲ ص:۲۷۹ فصریح الحدیث ان الولیمة کانت صباح لیلة الدّخول فیکون وقتھا بعد الدّخول عند الجمھور. وقال جماعة عند الدّخول وقال اٰخرون عند العقد، والظّاھر ان وقتھا موسع من العقد الی الدّخول ففی أیّ وقت عملت کفی لأنّھا نوع من اعلان النّکاح ومن أنواع البرّ والاکرام، واللہ اعلم. وفی المرقاة تحت رقم الحدیث: ۳۲۱۰ ج:۶ ص:۳۶۶ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) قیل انھا تکون بعد الدّخول، وقیل عند العقد، وقیل عندھما، واستحب أصحاب مالک أن تکون سبعة أیام والمختار أنہ علیٰ قدر حال الزوج. وکذا فی فتح الباری ج:۹ ص:۱۹۹. و فتح الملھم ج:۳ ص:۴۸۹. و أوجز المسالک ج:۴ ص:۳۱۸. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۷ ص:۱۶۷.

(۳) البحر الرائق ج:۳ ص:۸۷ (طبع ایچ ایم سعید). وفی الشامیة (قولہ کھبة) أی اذا کانت علیٰ وجہ النّکاح.

﴿فصل فی متفرّقات النّکاح والمسائل الجدیدة المتعلّقة بالنّکاح﴾

(نکاح کے جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

ٹیلی فون پر نکاح کی شرعی حیثیت

سوال:- ٹیلی فون پر آج کل نکاح ہوتا ہے، کیا یہ دُرست ہے اور نکاح ہوجاتا ہے؟

جواب:- نکاح میں چونکہ یہ ضروری ہے کہ دو گواہ مجلسِ نکاح میں حاضر ہوں اور ایجاب و قبول دونوں سنیں،[1] اس لئے ٹیلی فون پر نکاح دُرست نہیں ہوتا، اگر دُوسرے شہر یا ملک میں نکاح کرنا ہو تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس شہر میں کسی شخص کو اپنے نکاح کا وکیل مقرّر کردیں، وکیل اس کی طرف سے دُوسرے فریق کے ساتھ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کرے، اس طرح نکاح صحیح ہوجائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۱۲ ج)

خطبۂ نکاح ایجاب وقبول سے پہلے ہو یا بعد میں؟

سوال:- بوقتِ نکاح خطبۂ نکاح ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا سنت ہے یا ایجاب وقبول کے بعد پڑھنا سنت ہے؟

جواب:- خطبۂ نکاح کا ایجاب وقبول سے پہلے پڑھنا سنت ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۴۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر، وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدین حرّین أو حرّ وحرّتین مکلفین سامعین قولهما معًا. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع شرکت علمیه) ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین حُرّین عاقلین بالغین مسلمین. وفی الهندیة کتاب النکاح، الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۶۸ ومنها سماع الشاهدین کلامهما معًا. هٰکذا فی فتح القدیر.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۸ ویندب اعلانه وتقدیم خُطبة. وفی الشامیة (وتقدیم خُطبة) بضم الخاء ما یذکر قبل اجراء العقد من الحمد والتشهد .... الخ. وفی البحر الرائق کتاب النکاح ج:۳ ص:۸۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) یستحب أن یکون النکاح ظاهرًا وأن یکون قبله خطبة.

آزاد شخص چار تک شادیاں کرسکتا ہے

سوال:- موجودہ زمانے میں غلامی کا نظام ختم ہوچکا ہے، صرف غلامی اور آقا کا نام رہ گیا ہے، ایک غلام کے گھر میں دو بیویاں ہیں، جو پہلے سے نکاح میں لاکر گھر میں رکھے ہوئے ہے، اب ان دو عورتوں کے علاوہ اس نے ایک آزاد عورت سے تیسری شادی کرلی ہے، جو کہ اس کے خاندان سے نہیں ہے، وہ تو خود عبد ہے، لیکن تیسری بیوی حر ہے، کیا یہ نکاح صحیح ہوا؟ اکثر فقہ کی کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک عبد دو عورتوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا ہے۔

جواب:- آج کل شرعی غلاموں اور باندیوں کا وجود نہیں ہے، اگر کسی شخص کے آباء واجداد غلام رہے ہوں تو محض اتنی بات سے وہ غلام نہیں ہوتا، آج کل سب احرار ہیں، لہٰذا چار تک بیویاں رکھنا ان کے لئے جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲/ ۲۸ الف)

ٹیلی فون پر نکاح کا حکم

سوال:- ٹیلی فون پر نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بصورتِ اوّل کن شرطوں کے ماتحت؟

جواب:- ٹیلی فون پر نکاح نہیں ہوسکتا، کیونکہ دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول اس میں شرعی شرائط کے مطابق ممکن نہیں۔[2] البتہ غیر ممالک میں رہنے والے اگر نکاح کرنا چاہیں تو اس کی یہ صورت ممکن ہے کہ جس شہر میں لڑکی موجود ہو اس شہر کے کسی آدمی کو لڑکا اپنا وکیل بنادے اور اس سے کہہ دے کہ میرا نکاح فلاں لڑکی سے کردو، اب یہ وکیل دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکی یا اس کے وکیل کے ساتھ ایجاب وقبول کرلے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷۱/ ۳۲ ج)

دو عیدوں کے درمیان نکاح بلاشبہ جائز ہے

سوال:- کئی آدمیوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے درمیان شادی کرنا منع ہے اور جائز نہیں ہے، اگر دونوں عیدوں کے درمیان کوئی شادی کرلیتا ہے تو اس کو ۲۷/رمضان

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ." سورة النساء:۳.

(۲) وفی الدر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الأخر، وفيه أيضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاهدين حرّين أو حرّ وحرّتين مكلفين سامعين قولهما معًا. وفى الهداية ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع شركت علميه) ولا ينعقد نكاح المسلمين الّا بحضور شاهدين حرّين عاقلين بالغين مسلمين.
وفى الهندية كتاب النكاح الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۶۸ ومنها سماع الشاهدين كلامهما معًا. هٰكذا فى فتح القدير.

المبارک کو نکاح پڑھانا پڑتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- شرعی اعتبار سے یہ بات قطعی بے بنیاد اور لغو ہے کہ دوعیدوں کے درمیان نکاح جائز نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے شوال کے مہینے میں ہوا ہے۔[1] ایسی بے بنیاد باتوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، دوعیدوں کے درمیان نکاح باجماعِ اُمت جائز ہے، اور اس کے لئے ۲۷؍رمضان کو نکاح پڑھنے کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹؍۷؍۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۸/۲۸ ج)

رُخصتی کے انکار سے نکاح ختم نہیں ہوگا

سوال:- محمد عمر نے اپنے بھانجے یامین کی شادی شہداد پور میں محمد یوسف کی لڑکی کے ساتھ کی، اور اس کے بدلے میں محمد عمر نے اپنی لڑکی کی شادی محمد یوسف کے لڑکے کے ساتھ کی، اس شادی کا پسِ منظر یہ ہے کہ محمد عمر نے جب اپنے بھانجے کی منگنی محمد یوسف کی لڑکی کے ساتھ کی تو اس وقت محمد یامین کی عمر چالیس سال تھی، اور لڑکی کی عمر تقریباً سولہ سال تھی، تو محمد عمر نے بدلے میں اپنی لڑکی جو کہ آٹھ نو سال کی تھی محمد یوسف کے لڑکے کے نکاح میں دینا قبول کی اس کی عمر دس گیارہ سال تھی، اب جب محمد یامین نے شادی کی، واپسی پر معلوم ہوا کہ یامین نے اپنے سسر کو ڈھائی ہزار روپے بھی دیئے ہیں، اس لئے کہ محمد یوسف جلدی شادی کردے، اور کوئی شخص رُکاوٹ نہ ڈالے، جب محمد عمر کو پتہ چلا کہ یامین نے پیسے دیئے ہیں تو میں لڑکی بدلے میں کیوں دوں؟ محمد یامین کی شادی کے دو روز بعد محمد یوسف اپنے لڑکے کی بارات لے کر آگیا، لوگوں نے محمد عمر کو بہت سمجھایا، مگر نہ مانا، لوگوں نے کہا تو پھر محمد یوسف اپنی لڑکی لے جائے گا اور طلاق لے لے گا اور تمہارے بھانجے یامین کے پیسے بھی ڈُوب جائیں گے، لہٰذا تم اپنی لڑکی کا نکاح کردو، لہٰذا بھائیوں کے سمجھانے پر محمد عمر نے کہا چلو نکاح کردیتا ہوں، لیکن لڑکی جب تک جوان نہ ہوگی اسے سسرال نہ بھیجوں گا، بھائیوں نے کہا کہ وہ تو بعد کی بات ہے، لہٰذا باقاعدہ قاضی کے ذریعے ایجاب وقبول ہوا اور مہر ۳۲ روپے ۸ آنے مقرر ہوا، گواہوں کے سامنے لڑکی کی طرف سے محمد عمر نے قبول کیا، شادی کو دس بارہ سال ہوچکے ہیں، لڑکی بالغ ہوچکی ہے، اب محمد یوسف مرحوم جس کا انتقال ہوچکا ہے، کے بھائیوں نے محمد عمر کو لڑکی رُخصت کرنے کو کہا، تو محمد عمر کہتا ہے کہ

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح والخطبۃ والشرط ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشۃ قالت: تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شوال وبنی بی فی شوال، فایُّ نساء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان أحظیٰ عندہ منی. رواہ مسلم. وفی حاشیۃ المشکوٰۃ تحتہ: فای نساء انما قالت ھذا ردًا علی أھل الجاھلیۃ فانھم کانوا لا یرون الیمن فی التزوج والعرس فی أشھر الحج.

میں ہمیشہ یہی کہتا رہوں گا کہ میری لڑکی کا نکاح نہیں ہوا ہے، دس برس میں دونوں فریقوں میں کوئی لین دین نہیں رہا، پھر پنچایت ہوئی، لوگوں نے کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے، محمد عمر کہتا ہے کہ بھائیوں کے مجبور کرنے پر نکاح کر دیا تھا، اس لئے نکاح لڑکی کا نہیں ہوا، فتویٰ منگوالو کہ نکاح ہوا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب محمد عمر نے اپنی لڑکی کا نکاح باضابطہ دو گواہوں کے سامنے قاضی کے ذریعے ایجاب و قبول کر کے دے دیا تو نکاح منعقد ہوگیا،[۱] اور اس نے رُخصتی کرنے سے جو انکار کیا تھا، اس سے نکاح کے انعقاد پر کوئی فرق نہیں ہوتا، لہٰذا اس پر واجب ہے کہ وہ لڑکی کی رُخصتی کرے یا شوہر سے طلاق حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۶۱/۲۷ ه)

دُوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں

سوال:- مطلقہ عورت کا دُوسرا نکاح ۱۰ ماہ ۱۸ دن کے بعد ہوا، پہلی بیوی کی موجودگی میں پہلی بیوی سے دُوسرا نکاح کرنے کی شرعی طور پر اجازت لی ہو اور پہلی بیوی اس بات پر بھی آمادہ ہو کہ ساتھ رہیں، کیا یہ نکاح دُرست ہے؟

جواب:- اگر شوہر کو یہ اطمینان ہو کہ وہ ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں شرعی طور پر عدل و انصاف قائم رکھے گا تو وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دُوسرا نکاح کر سکتا ہے،[۲] اور اس کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا بھی ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۰۹/۳۲ ج)

ہندو مردہ کے جلنے کا منظر دیکھنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال:- ایک روز دِل میں خیال آیا کہ ہندو اپنا مردہ کس طرح جلاتے ہیں، دیکھنا چاہئے، ایک بڑے زمین دار ہندو کا انتقال ہوگیا، زید یہ دیکھنے کے لئے مسان گھاٹ چلا گیا، دُور چھپ کر دیکھتا رہا، چند سال گزر جانے کے بعد زید نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا، ایک دوست نے کہا کہ تمہارا نکاح فسخ ہوگیا، لہٰذا آپ دُوسرا نکاح کریں۔ کیا شرعاً یہ دُرست ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) (وینعقد) (بایجاب) من أحدھما (وقبول) من الأخر.

(۲) "فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی وثلٰث وربٰع" سورۃ النساء:۳. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷ ومکروھا لخوف الجور. وفی الشامیۃ .... وترک الشارح قسما سادسًا ذکرہ فی البحر عن المجتبٰی وھو الاباحۃ ان خاف العجز عن الایفاء بموجبہ أی خوفًا غیر راجح والّا کان مکروھا تحریمًا لأنّ عدم الجور من مواجبہ.

جواب:- غیر مسلموں کی مذہبی اور معاشرتی رسموں میں دیکھنے کے لئے بھی شرکت نہیں کرنی چاہئے، لیکن ایسا کرنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں زید کا نکاح فسخ نہیں ہوا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۶/۲۷ د)

شوہر کو بھائی یا باپ کہنے سے نکاح پر اثر نہیں پڑتا

سوال:- شوہر اور بیوی کے جھگڑے میں بیوی نے اپنے شوہر کو بھائی باپ کہا، اور بعد میں افسوس کرنے لگی، کیونکہ وہ غصے میں بولی تھی، اب شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- بیوی کو ہرگز نہ چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو بھائی یا باپ کہے، لیکن اس طرح کہنے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا،(۱) وہ بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۴/۲۸ ج)

لڑکی کی شادی کم سے کم کتنی عمر میں کر سکتے ہیں؟

سوال:- لڑکی کی شادی کم سے کم کتنی عمر میں کر سکتے ہیں؟ از روئے شرع جواب سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- شادی کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں، ہر عمر میں نکاح کرنا جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ بلوغ کے بعد نکاح کیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بیوی کی طرف سے شوہر کو کافر کہنے پر نکاح نہیں ٹوٹتا

سوال:- ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اپنے اوزار وغیرہ لے کر چلا گیا، بیوی کو غصہ آیا تو گھر کے کپڑے جلا دیئے اور کہنے لگی: ”کافر چلا گیا“ اور کئی دفعہ ایسا کہا، عورت کو اپنے خاوند کے متعلق کسی دوسری عورت سے تعلق کا شبہ ہے، کیا عورت کا اپنے شوہر کو کافر کہنے سے نکاح ٹوٹا یا نہیں؟

جواب:- بیوی نے اپنے شوہر کو کافر کہہ کر سخت گناہ کا ارتکاب کیا،(۲) اُسے چاہئے کہ اس پر

---

(۱) دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند باب الظہار ج:۱۰ ص:۲۱۱۔

(۲) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۲ ص:۴۱۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أیما رجل قال لأخیہ کافر، فقد باء بہا أحدہما. متفق علیہ. وفیہ أیضًا بعدہٗ رقم الحدیث: ۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتالہ کفرٌ.

توبہ و استغفار کرے اور شوہر سے بھی معافی مانگے، لیکن اس سے نکاح نہیں ٹوٹا، نکاح برقرار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵۵/۲۸ ب)

دُوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں

سوال:- اگر کوئی شخص ایک سے زائد نکاح کا خواہش مند ہو تو کیا پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے یا صرف برابری کرنا ضروری ہے اجازت لینا نہیں؟

جواب:- پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ بہتر ہے، لیکن بیویوں کے درمیان ہر طرح سے انصاف رکھنا لازمی ہے، اگر اس میں ذرا بھی بے انصافی کا خطرہ ہو تو دُوسری شادی جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۷/۲۹ ب)

۱:- شادی میں فائرنگ کی رسم واجب الترک ہے
۲:- ناجائز رُسومات والی شادی میں مقتداء علماء کو شرکت نہیں کرنی چاہئے

سوال ۱:- شادی میں لوگ فخر و اشتہار کے لئے فائرنگ کرتے ہیں، فائرنگ کی یہ رسم تبذیر ہے یا نہیں؟

۲:- کیا ایسی شادی بیاہ جس میں رُسومات ہوں اس میں کسی کی شرکت اور خاص کر علماء کی شرکت جائز ہے؟

جواب ۱:- فائرنگ کی یہ رسم فضول خرچی بھی ہے اور متعدّد منکرات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے واجب الترک ہے۔

۲:- جس شادی میں شرعی منکرات ہوں اس میں مقتداء علماء کو شرکت نہ کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲/۷۲/۵۸)

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۷ (ایچ ایم سعید) (ومکروھا لخوف الجور) فان تیقنہ حرم ذٰلک، وفی الشامیة (قولہ فان تیقنہ) أی تیقن الجور حرم لأن النکاح انّما شرع لمصلحة تحصین النفس وتحصیل الثواب وبالجور یأثم ویرتکب المحرمات فتنعدم المصالح لرجحان ھٰذہ المفاسد. بحر، وترک الشارح قسما سادسًا ذکرہ فی البحر عن المجتبٰی وھو الاباحة ان خاف العجز عن الایفاء بموجبہ اھ. أی خوفا غیر راجح والّا کان مکروھا تحریمًا لأن عدم الجور من مواجبہ .... الخ.

شوہر کتنا عرصہ بیوی سے جدا رہ سکتا ہے؟

(ملازمت یا تعلیم وتبلیغ کے لئے عرصہ دراز تک بیوی سے جدا رہنے سے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مدظلہ کے سوال کا جواب)

سوال:- بخدمت جناب مولانا عبداللہ میمن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

آنجناب کی ارسال کردہ کتابوں کے ہدیہ کی تیسری قسط موصول ہوئی، جو کہ اصلاحی خطبات اور بیوی کے حقوق پر مشتمل تھی، اس انتہائی عنایت اور کرم فرمائی پر بہت ہی مشکور وممنون ہوں اور دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب کی جان و مال اور علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں۔

جناب کے ہدیہ کی مناسبت سے ایک سوال نوکِ قلم پر آ گیا لیکن اس کا جواب جناب کے اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کے طیبِ خاطر پر موقوف کرتا ہوں۔

رسالہ ''بیوی کے حقوق'' میں مولانا مدظلہ نے تحریر فرمایا:-

فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کے لئے چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر جائز نہیں۔ (ص:۶۱)

مفہوم مخالف سے یہ نکلا کہ بیوی کی اجازت سے سال دو سال کے لئے باہر رہ سکتے ہیں۔

اُردو کی بعض کتابوں میں تو یہ مسئلہ ایسے ہی لکھا ہے لیکن کیا عربی فتاویٰ اور فقہ کی کتابوں میں بھی حنفیہ کے نزدیک مسئلے کے اس طرح ہونے کی تصریح موجود ہے؟ یہ تصریح تو موجود ہے کہ بیوی کی رضامندی اور خوش دِلی سے وطی کو چار ماہ سے زائد مؤخر کرسکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا کہ کوئی شخص جوان بیوی سے اجازت لے کر سال دو سال اور زائد مدّت کے لئے باہر جاسکتا ہے مشکل ہے۔ پھر اِکا دُکا کوئی واقعہ ایسا ہو تو شاید غیر معمولی حالات پر محمول کرلیا جائے، لیکن موجودہ دور میں بڑے پیمانے پر ملازمت، تعلیم اور تبلیغ کے لئے اس طرح نکلنا سمجھ سے باہر ہے۔

بہرحال اگر ایسا کوئی حوالہ جناب مولانا مدظلہ سے حاصل کر کے روانہ کریں تو بڑا احسان ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر ایسا کوئی حوالہ موجود ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ ہوگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ مجاہدین چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں، اور یہ حکم کیوں نہ دیا کہ چار مہینوں سے زیادہ کے لئے بیویوں سے اجازت لے کر نکلا کریں۔

میں نے اپنے اِشکال کا خلاصہ تحریر کیا ہے، اگر اس بارے میں کوئی رہنمائی میسر آجائے تو

ممنون ہوں گا۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر شکریہ قبول فرمائیں۔ مولانا مدظلہ کی خدمت میں سلام پیش فرمائیں۔

والسلام علیکم

(مولانا ڈاکٹر عبدالواحد)

جامعہ مدنیہ لاہور

جواب:- گرامی قدر مکرّم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا عبداللہ میمن صاحب کے نام موصول ہوا، اور آنجناب نے جس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اس پر غور کیا، آپ نے دُرست فرمایا ہے کہ چار ماہ سے زائد گھر سے باہر رہنے کے جواز کے لئے صرف بیوی کی اجازت اور خوش دِلی کافی نہیں ہونی چاہئے، اس مسئلہ میں فقہاء کی کوئی تصریح تو نہیں ملی، سوائے درمختار کی اس عبارت کے:

ویسقط حقها بمرة ویجب دیانةً احیانًا ولا یبلغ مدّة الایلاء الا برضاها.

اسی کے تحت علامہ شامیؒ نے فتح القدیر کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے:-

ویجب ان لا یبلغ به مدة الایلاء الا برضاها وطیب نفسها به.

(درمختار مع شامی ج:۳ ص:۲۰۲)[1]

لیکن یہ مسئلہ حقِ جماع سے متعلق ہے، اور اس میں یہ تصریح ہے کہ عورت اپنی رضامندی سے اپنا یہ حق ترک کرسکتی ہے، لیکن یہ دُرست ہے کہ مطلق سفر کے بارے میں فقہاء کرامؒ کی کوئی تصریح احقر کی نظر سے بھی نہیں گزری، لیکن حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے علیٰ اختلاف الروایات چار مہینے یا پانچ مہینے یا چھ مہینے تک سفر پر رہنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ عورت کے حق کی وجہ سے ہے، اور یہ جب اس کا حق ہے تو وہ اس سے دست بردار بھی ہوسکتی ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بیوی کی اجازت سے سپاہیوں کو چار ماہ سے زائد کے سفر پر بھیجا جاسکتا ہے، تو اس کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنے لشکر کے سپاہیوں کے لئے ایک ضابطہ مقرّر کرنا تھا کہ ان کو کتنی مدّت کے بعد واپس بلایا جائے، اس کے لئے انہوں نے چار ماہ کی مدّت علی الاطلاق مقرّر فرمادی، چنانچہ ان کے الفاظ یہ منقول ہیں کہ:-

---

(۱) (طبع سعید کراچی)

لا احبس الجيش اكثر من هذا. (سنن بيهقي، كتاب السير ج: ٩ ص: ٢٩)[1]

اور:-

فكتب عمر ان لا تحبس الجيوش فوق أربعة أشهر.

(مصنف عبدالرزاق ج:٧ ص: ١٥١، ١٥٢)[2]

چونکہ سپاہیوں کے لئے کوئی نہ کوئی مدّت مقرّر کرنی ہی تھی، اس لئے آپؓ نے چار ماہ کی مدّت علی الاطلاق مقرّر فرمادی، اور اس تدقیق کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کس کی بیوی اس سے زائد کے لئے راضی ہے، اور کس کی بیوی راضی نہیں۔

البتہ یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ گھر سے باہر رہنے میں کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو، جہاں فتنے کا اندیشہ ہو، وہاں صرف بیوی کی اجازت گھر سے باہر رہنے کے لئے کافی نہیں، اور فتنے کے اس دور میں اس طرزِ عمل کی ہرگز حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہئے۔ آپ کا یہ فرمانا بھی بجا اور دُرست ہے کہ احیاناً ضرورت کے مواقع پر طویل سفر اختیار کرنا اور بات ہے اور اس عمل کو معمول بنالینا دُوسری بات ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں فتنے کے امکانات بہت قوی ہوجاتے ہیں، اس لئے اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ جہاں فتنے کا ظن غالب ہو وہاں تو بیوی کی اجازت کے ساتھ بھی سفر اختیار کرنا جائز نہیں، اور اس میں مدّت کی کوئی قید نہیں، اور جہاں ظن غالب نہ ہو، لیکن معتد بہ احتمال ہو وہاں بھی حتی الامکان اس سے احتراز ہی لازم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے چار ماہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ عوارض سے قطع نظر کرتے ہوئے محض عورت کے حق کی بنیاد پر فرمایا ہے، لیکن جہاں عوارضِ فتنہ موجود ہوں، وہاں اس تفصیل پر عمل ہونا چاہئے جو اُوپر عرض کی گئی۔

هذا ما ظهر لي

والله سبحانه وتعالىٰ اعلم

والسلام

محمد تقی عثمانی

۱۴۱۴/۴/۹ھ[3]

---

(۱) طبع نشر السُّنّة ملتان.

(۲) ناشر مجلسِ علمي.

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

﴿کتاب الطّلاق﴾

(طلاق کے مسائل)

﴿باب ایقاع الطّلاق﴾

(طلاق دینے اور طلاق واقع ہونے کا بیان)

پاگل پن اور نیند کی حالت میں طلاق کا حکم
نابالغ کی طلاق کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں (فقہِ حنفی کی روشنی میں)۔

مسئلہ:- اگر کوئی مسلمان بالغ شخص جنون کی حالت میں، پاگل پن کی حالت میں یا نشے کی حالت میں یا نیند کی حالت میں یا غصے کی حالت میں یا مذاق سے یا دھمکی دینے کے انداز میں اپنی بیوی کو تین دفعہ طلاق دے دیتا ہے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا اگر ایک نابالغ خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا اگر ایک شخص قریب المرگ ہو اور وہ حالتِ نزع میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا طلاق ہوجاتی ہے کہ نہیں؟

جواب:- پاگل پن اور نیند کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی،[1] نیز نابالغ کی طلاق واقع نہیں ہوتی،[2] باقی تمام صورتوں میں حنفی مسلک کے لحاظ سے طلاق ہوجاتی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۲)

مدہوش کی طلاق کا حکم

سوال:- زید دو راتوں کا جاگا ہوا بسلسلہ نوکری اپنی اَن تھک محنت سے فارغ ہوکر جب گھر

(۲،۱) وفی تنویر الأبصار کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۴۲ لا یقع طلاق المولٰی علٰی امرأۃ عبدہٖ والمجنون والصبی ..... والمدھوش. وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیہ والمدھوش .... الخ. وفی البدائع ج:۳ ص:۱۰۰ ومنھا ان لا یکون معتوھا ولا مدھوشًا ولا مبرسمًا ولا مغمی علیہ ولا نائمًا فلا یقع طلاق ھؤلاء لما قلنا فی المجنون .... الخ. وفی شرح الوقایۃ باب ایقاع الطّلاق ج:۲ ص:۷۳ (طبع سعید) لا طلاق صبی ومجنون ونائم. وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۲۴۹ وفتح القدیر ج:۳ ص:۳۵۰. وفی فتح القدیر ج:۳ ص:۳۴۳ ویقع طلاق کل زوج اذا کان عاقلًا بالغًا ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم.

آجاتا ہے تو گھر میں اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے کچھ لوگوں (گھر کے ہی) نے اس سے کانا پھوسی کی، جو اس کی بیوی کے خلاف تھی، زید نے مشتعل ہوکر بیوی کو بند کمرے میں پیٹنا شروع کردیا، زید کی بیوی کی پٹائی دیکھ کر زید کے بھائیوں نے مداخلت کی جس پر زید اور مشتعل ہوا اور بحالتِ تکرار وغصہ وجنون سی کیفیت میں بھائیوں سے تکرار کرنے لگا اور اسی حالت میں زید اپنی بیوی کو تین مرتبہ سے زائد طلاق دیتا ہے، کیا وہ جنون اور غصّے کی حالت میں دی ہوئی طلاق دُرست ہے؟ زید دو گھنٹے کے بعد جاگا تو ان کی حالت بدلی ہوئی تھی اور اپنے کئے ہوئے پر پریشان نہیں بلکہ روتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے کئے ہوئے میں میرے دِماغ کا دخل نہیں، مجھے علم نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟

جواب:- جوابِ تنقیح کے بیانات سے معلوم ہوا کہ طلاق کے وقت شوہر کے ہوش وحواس معطل تھے اور وہ اپنے قابو میں نہیں تھا، یہاں تک کہ اس نے والدین کو بھی نہیں پہچانا، اب اگر شوہر یہ حلفیہ بیان دے کہ جس وقت اس نے طلاق کے الفاظ زبان سے نکالے اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے؟ اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ تو صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی اور اس کی بیوی بدستور اس کے نکاح میں ہے۔ **فی الشامیة والذی یظھرلی ان کلًا من المدھوش والغضبان لا یلزم فیه ان یکون بحیث لا یعلم ما یقول بل یکتفی فیه بغلبة الھذیان واختلاط الجد بالھزل کما ھو المفتی به فی السکران علی ما مرّ ولا ینافیه تعریف الدّھش بذھاب العقل فان الجنون فنون** (شامی ج:۳ ص:۲۴۴ طبع جدید)۔[1]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۷/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵۲/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

طلاق واقع ہونے کے لئے عدالت کے تصدیق نامے کی ضرورت نہیں

سوال:- ایک لڑکی جسے تین طلاقیں دے دی گئی تھیں، اس لڑکی کے لئے دوبارہ شادی کرنے کی صورت میں عدالت سے کسی قسم کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے؟ کہ طلاق کب عدالت میں Confirm ہوئی، کیونکہ سابقہ شوہر نے 13-10-1976 کو چیئرمین کو نوٹس دے کر طلاق دی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور طلاق کنفرم Confirm کی جائے عدالت سے ابھی طلاق کنفرم نہیں ہوئی اور تاریخ پیشی 7-2-1977 مقرّر ہوئی ہے۔

---

(۱) تحت مطلب فی طلاق المدھوش (طبع سعید).

جواب:- طلاق واقع ہونا شرعاً عدالت کی تصدیق پر موقوف نہیں، جس روز طلاق ہوئی اس کے بعد تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزار کر عورت جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۳ھ

محض دِل میں طلاق کا خیال آنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- عرض اینکہ زید نے ایک کتاب کا مطالعہ کیا جس میں نکاح وطلاق کے مسائل درج تھے، اور زید ایک شادی شدہ مرد ہے وہ اس بارے میں کافی محتاط ہوگیا، احتیاط اس حد تک بڑھ گیا کہ آرام وسکون بھی ختم ہوگیا، کبھی دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر بیوی نے فلاں کام کیا تو طلاق، صرف خیال آتا ہے، منہ سے ایسا نہیں کہتا، کبھی دُوسرا خیال آتا ہے کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو بیوی کو طلاق، پھر توبہ کرتا ہے اور خدا سے مغفرت چاہتا ہے کہ اے خدا میرے دِل کو ان خیالات سے پاک کردے۔ عرض یہ ہے کہ طرح طرح کے خیالات ان کے دِل میں آتے ہیں اور توبہ کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی خیال آتا ہے کہ اگر توبہ کی تو طلاق، پھر توبہ بھی کی، اور خدا سے پھر معذرت چاہی۔ جنابِ عالی! کیا ان خیالات سے جو صرف دِل ہی میں ہوتے ہیں اور منہ پر نہیں لاتے، زید کے نکاح میں فرق تو نہیں آیا؟ نیز خدانخواستہ اگر زید کے دِل میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ اگر بیوی نے روٹی پکائی تو طلاق، اور بیوی نے روٹی پکائی تو کیا اس سے نکاح میں فرق آتا ہے یا نہیں؟ زید ہر وقت اپنے ذہن سے جھگڑتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

جواب:- محض دِل میں خیال آنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک کہ طلاق کے الفاظ زبان سے نہ کہے جائیں،[1] لہٰذا زید کے دِل میں جو خیالات آئے ہیں ان سے ان کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑا مطمئن رہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۷/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۴۳/۳۹ ھ)

حالتِ حمل میں طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- میرے اور میری بیوی کے درمیان جھگڑا ہوگیا تھا اور میں نے اپنی بیوی کو لفظ

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنه لفظ مخصوص) وفی الشّامیة (قوله ورکنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة علٰی معنی الطّلاق من صریح أو کنایة .... وأراد اللّفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارة الأخرس .... الخ. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۴۷ (طبع سعید) وأراد بما اللّفظ أو ما یقوم مقامه من الکتابة المستبینة أو الاشارة المفهومة .... لأنّ رکن الطّلاق اللّفظ أو ما یقوم مقامهٗ ممّا ذکر کما مرّ.

طلاق تحریر میں لکھ کر دیا، اُس وقت میری بیوی حاملہ تھی، میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- حالتِ حمل میں بھی طلاق ہوجاتی ہے،[1] لہٰذا طلاق واقع ہوگئی، کس قسم کی طلاق ہوئی؟ یہ بات طلاق کے وقت جو الفاظ جتنی مرتبہ آپ نے کہے ہوں وہ لکھ کر بھیجئے تو ان کا حکم بتایا جاسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۴/۲۸ ج)

رسمی طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- مسمّٰی عبداللہ نے عقدِ ثانی کذبانو سے کیا، شادی کے بعد دُلہن کو دُولہا نے اپنی جگہ پدری میں رکھا اور میکے میں داخل نہیں ہوسکا تھا، کیونکہ عبداللہ کی پہلی زوجہ کے ورثاء نے اس کو ڈانٹا اور جبراً عبداللہ سے طلاق دِلوادی، یعنی طلاق کی رسم پوری کرائی، میں (سائل) اس کے پاس گیا اس نے قسم اُٹھا کر کہا کہ میں نے رسمی طلاق دی تھی۔ کیا یہ طلاق ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات صحیح ہیں تو مسماۃ کذبانو پر طلاق واقع ہوگئی ہے،[2] اور طلاق کے بعد اگر اس کو تین مرتبہ ماہواری آچکی ہو تو اس کی عدّت بھی ختم ہوگئی،[3] اب جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۱۹ الف)

ناسمجھی اور مفلسی کی وجہ سے دی گئی طلاق بھی ہوجاتی ہے

سوال:- میری شادی مسماۃ حسینہ سے ۱۷/۸/ اگست ۱۹۶۶ء کو ہوئی، سال ڈیڑھ کے بعد کچھ

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب طلاق السنة ج:۲ ص:۳۵۶ (طبع شركت علميه ملتان) وطلاق الحامل يجوز عقيب الجماع.

(۲) عن أبي هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ثلاث جدّهن جدّ وهزلهن جدّ: النكاح والطّلاق والرّجعة. (جامع الترمذی باب ما جاء فی الجد والهزل فی الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ طبع سعيد).
وكذا فی أبی داؤد (باب فی الطّلاق علی الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ طبع حقانيه ملتان) وكذا فی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۵ والبحر الرائق ج:۳ ص:۲۴۴.

(۳) وفی الدّر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۲۰ (طبع سعيد) ومبدأ العدّة بعد الطّلاق وبعد الموت على الفور وتنقضی العدّة وان جهلت المراة بهما.

معمولی جھگڑے ہوئے، کچھ معاشی تنگی کے باعث میرا دماغ خراب ہوگیا تھا، اس درمیان میں بعض احباب جو اس عقد سے سے ناخوش تھے درمیان میں ہوکر علیحدگی کے چکر میں پڑ گئے، اور مسماۃ مذکورہ کو بھی ورغلایا، ایک دن مجبور ہوکر ٹاؤن کمیٹی لے جاکر معہ دو گواہان کے رُوبرو تین طلاق کا ایک طلاق نامہ لکھوا کر مجھ سے دستخط کروالئے، مسماۃ مذکورہ نے مہر بھی معاف کردیا، میں نے ناسمجھی اور مفلسی کے باعث یہ حرکت کردی، اور مسماۃ بھی اس معاملے سے خوش نہ تھی، مگر ان لوگوں کے رُعب کی وجہ سے ساکت ہوگئی، اس وقت سے اب تک میں اور وہ دونوں پریشان ہیں، قانونی طور پر چیئرمین نے نہ مجھ سے بیان لیا اور نہ مسماۃ حسینہ سے بیان لیا، اگر لیتا تو ہم انکار کرتے، اب ہم لوگ ایک دُوسرے سے ملنے کو تیار ہیں اور مسماۃ مذکورہ کا کوئی کفیل بھی نہیں ہے، اب اگر کوئی صورت ہو تو تحریر فرما کر ممنون فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں حسینہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب آپ کے لئے بغیر حلالہ کے حلال نہیں ہوسکتی۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

شوہر کے گھر سے چلی جانے والی عورت کو طلاق دینے کا حکم اور طلاق دینے کا صحیح طریقہ

سوال:- ایک شخص نے دُوسری شادی پہلی عورت کی رضامندی سے کی، دُوسری شادی کے ایک سال بعد پہلی عورت میکے چلی گئی ناراض ہوکر، شوہر نے واپس لانے کی بہت کوشش کی، رشتہ داروں کو بطور جرگہ بھیجا، لیکن واپس نہ آئی، اب اس واقعہ کو پانچ سال گزر گئے ہیں، اب اگر اس کا شوہر طلاق دیدے تو کیا کوئی حرج ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج واقعات دُرست ہیں تو شوہر کو چاہئے کہ اوّلاً اپنے طرزِ عمل پر نظر ڈال کر یہ دیکھے کہ اس کی پہلی بیوی کے چلے جانے کا سبب اس کی کوئی ناانصافی تو نہیں ہے؟ اگر ناانصافی ہو تو اس کو دُور کرے، اور اس کو واپس لانے کی کوشش کرے، اگر وہ پھر بھی واپس نہ آئے تو اس کو تحریری طور پر متنبہ کرے کہ اگر تم واپس نہ آئیں تو تمہیں طلاق دے دُوں گا، اس کے باوجود وہ واپس نہ آئے تو پھر چاہے تو اسے طلاق دیدے،[2] لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر۲ اور ص:۳۷۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الشّامیة ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنة اذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أھلھما لیصلحوا بینھما فان لم یصطلحا جاز الطّلاق والخلع .... الخ.

جب عورت حیض سے پاک ہو تو اُسے صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے،[۱] عدّت گزرنے کے بعد وہ خود نکاح سے خارج ہو جائے گی۔[۲] تین طلاقیں بیک وقت دینا گناہ ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۰/۲۸ ج)

محض وہم سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- مسمّٰی اکبر خان نے عرصہ چار سال ہوئے کہ شادی کی تھی، خانگی تعلقات انتہائی خوشگوار رہے تھے، اچانک اکبر خان کو وہم کا مرض لاحق ہوگیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق بائن دے دی ہے، اور یہ مرض اکبر خان کے بیان کے مطابق اس حد تک ہے کہ اگر ایک کام کا تصور ذہن میں آیا اور وہ نہ ہوسکا تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے میری بیوی پر طلاق بائن پڑ جائے گی، چنانچہ اکبر خان کے سسرال والے اس رویے سے تنگ آکر اکبر خان کی بیوی کو اپنے گھر لے گئے ہیں، اکبر خان کہتا ہے کہ شریعت میں مجھ جیسے وہمی آدمی کے لئے کوئی خلاصی کا قانون ہے؟ بیوی سے جدائی بھی برداشت نہیں، کیونکہ صاحبِ اولاد ہوں اور اس حالت میں یہ خوف بھی رہتا ہے کہ کہیں عذابِ خداوندی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ کیا میں اگر حقِ طلاق اپنی منکوحہ کو سونپ دُوں تو شرعاً جائز ہے؟ علاوہ ازیں کوئی اور صورت ہو کہ جس سے وہم وگماں کی صورت میں بھی یہ معتوب نہ ہو تو ارشاد فرمائیں۔

جواب:- اگر اکبر خان نے زبان سے کبھی طلاق نہیں دی تو طلاق کے محض وہم ہو جانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی،[۳] اکبر خان کو چاہئے کہ وہ یہ وہم دِل سے نکال کر اطمینان سے بیوی کو گھر میں رکھے اور اُس کے ساتھ رہے، اور اپنے وہم کا علاج کرائے۔ طلاق کا حق بیوی کو دینے سے بیوی کو تو طلاق کا حق مل جاتا ہے،[۴] لیکن شوہر کا حقِ طلاق ختم نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ وجہ سے بیوی کو حقِ طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے، اس کا حل تو وہم کا علاج کرانا ہی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۵/۲۸ ب)

(۱،۲) وفی مصنف ابن أبی شیبة ج:۴ ص:۵ عن ابراهیم قال: کانوا یستحبّون أن یطلقها واحدة ثم یترکها حتّٰی تحیض ثلٰثة حیض. وفی الدر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) وأقسامه ثلٰثة حسن وأحسن وبدعی .... طلقة رجعیة فقط فی طُهر لا وطیٔ فیه وترکها حتّی تمضی عدّتها أحسن .... الخ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۵۴ (طبع شرکت علمیه ملتان) فالأحسن أن یطلّق الرّجل امرأته تطلیقة واحدة فی طهر لم یجامعها فیه، ویترکها حتّی تنقضی عدّتها .... الخ.

(۳) وفی الدّر المختار کتابُ الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنهٗ لفظ مخصوص) وفی الشّامیة (قوله ورکنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة علٰی معنی الطّلاق من صریح أو کنایة .... وأراد اللّفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارة الأخرس .... الخ. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۴۷ (طبع سعید) وأراد بما اللّفظ أو ما یقوم مقامه من الکتابة المستبینة أو الاشارة المفهومة .... لأنّ رکن الطّلاق اللّفظ أو ما یقوم مقامه ممّا ذکر کما مرّ.

(۴) وفی الدّر المختار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ (طبع سعید) قال لها: "اختاری أو امرک بیدک" ینوی تفویض الطّلاق او "طلّقی نفسک" فلها أن تطلق فی مجلس علمها به .... الخ.

مذاق، غصّے اور حمل کی حالت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے
کسی کے طلاق دینے کا واقعہ یا شرعی حکم بیان کرنے سے طلاق نہیں ہوتی

سوال:- میں نے اس سے پیشتر ایک فتویٰ منگایا، جس کا جواب مجھ کو موصول ہوگیا ہے، معلوم یہ کرنا تھا کہ آئندہ اگر میں نے طلاق کا لفظ زبان سے ادا کیا خواہ غصّے میں ہو یا سنجیدگی میں، اس بارے میں یہ دریافت کرنا ہے کہ ا:- اگر عورت حمل سے ہو تو کیا طلاق ہوسکتی ہے؟ ۲:- اگر ذکراً یا مذاقاً طلاق کا لفظ زبان سے ادا ہوجائے تو کیا وہ اس مسئلے پر صادق آتا ہے؟ ۳:- آپ کے جواب میں اس جملے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، ذرا تصریح فرمادیں وہ جملہ یہ ہے: ”اگر آئندہ تیسری مرتبہ میری زبان سے لفظِ طلاق نکل گیا خواہ وہ غصّے میں ہو یا سنجیدگی میں ہر حالت میں آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوجائے گی اور دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہ ہوسکے گا۔“

جواب ا:- جی ہاں! حالتِ حمل میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔[1]

۲:- مذاق میں طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔[2]

۳:- طلاق کا لفظ زبان سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی سے یہ کہیں کہ میں نے تمہیں طلاق دی، یا تمہیں طلاق ہے، یا کسی اور سے کہیں کہ میری بیوی کو میری طرف سے طلاق ہے، اس مفہوم کے جملے خواہ غصّے میں کہے جائیں یا مذاق میں یا حالتِ حمل میں، بہرحال اُن سے طلاق واقع ہوجائے گی۔[3] لہٰذا اس قسم کے جملوں سے احتیاط رکھیں، ہاں! اگر کسی اور شخص کے بارے میں آپ یہ نقل کریں کہ فلاں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے،[4] یا طلاق دینے کا شریعت میں یہ حکم ہے، تو اس سے طلاق واقع نہ ہوگی۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۹۴/۲۷ و)

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب طلاق السنّة ج:۲ ص:۳۵۶ (طبع شركت علميه، ملتان) وطلاق الحامل يجوز عقيب الجماع.

(۲،۳) وعن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث جدّهن جدّ وهزلهن جدّ: النكاح والطّلاق والرّجعة. (جامع الترمذى باب ما جاء فى الجد والهزل فى الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ طبع سعيد) وأبو داوٗد باب فى الطّلاق على الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ طبع حقانيه ملتان). وفى الدّر المختار كتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۵، ۲۳۶ ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا أو مكرها أو هازلًا لا يقصد حقيقة كلامه. وفيه أيضًا ج:۳ ص:۲۴۲ بخلاف الهازل واللاعب فانّه يقع قضاءً وديانةً لأن الشّارع جعل هزله به جدًا. وفى البحر الرّائق كتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۴۴ ولم يشترط أن يكون جادًا فيقع طلاق الهازل به واللاعب للحديث المعروف ثلاث جدهن جد وهزلهن جد .... الخ. وفى الهندية ج:۱ ص:۳۵۳ وطلاق اللاعب والهازل به واقع. وكذا فى فتح القدير ج:۳ ص:۳۴۴.

(۴،۵) وفى الشّامية كتاب الطّلاق باب الصّريح مطلبٌ فى قول البحر ان الصّريح يحتاج فى وقوعه ديانةً الى النيّة ج:۳ ص:۲۵۰ (طبع سعيد) (قوله أو لم ينو شيئًا) لما مرّ أن الصّريح لا يحتاج الى النيّة ولٰكن لا بدّ فى وقوعه قضاء وديانة من قصد اضافة لفظ الطّلاق اليها عالمًا بمعناهٗ ولم يصرفه الٰى ما يحتمله كما افاده فى الفتح وحققهٗ فى النّهر احترازًا عمّا لو كرّر مسائل الطّلاق بحضرتها أو كتب ناقلًا من كتاب امرأتى طالق مع التلفّظ أو حكى يمين غيره فانّه لا يقع أصلًا ما لم يقصد زوجته .... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

غیر محرَم کے ساتھ سفر کرنے والی نافرمان بیوی کی اصلاح اور اُسے طلاق دینے کا حکم اور طریقہ

سوال:- زید کی بیوی نے کہا کہ: میرے والدین بیمار ہیں، مجھے ملنے کے لئے کراچی بھیج دو، کچھ روز کے بعد پھر یہ کہا کہ: میرے منجھلے بھائی نے پرمٹ بنواکر بھیج دیا ہے آپ مجھے خرچہ دیں، سیٹیں بک کراکر سوار کرادیں۔ چنانچہ زید نے خرچہ دے کر اور سیٹیں بک کراکر سوار کرادیا، وہ کراچی آگئیں، کراچی سے کسی غیر محرَم کے ہمراہ عراق تفریح کے لئے چلی گئیں، پھر اسی غیر محرَم کے ساتھ بمبئی تفریح کے لئے چلی گئیں، تقریباً ایک ماہ بعد واپس کراچی آگئیں۔ اس کے بعد زید بھی کراچی آیا، تمام مذکورہ بالا حالات معلوم ہوئے، اس کے منجھلے بھائی نے جو پرمٹ انڈیا بنواکر بھیجا تھا اُس میں ہندہ کو بیوہ ظاہر کیا گیا تھا، وہ خود بھی اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کرتی ہے، زید کے کچھ مہمان لاہور سے آئے ہوئے تھے تو زید نے غیر محرَم سمجھ کر ایک کمرہ علیحدہ دے دیا، وہ دو تین روز وہاں رہتا رہا، ایک روز رات میں زید کمرے میں گیا تو دیکھا کہ مسہری پر آمنے سامنے غیر محرَم اور زید کی دھوکے باز بیوی کمبل اوڑھے بیٹھی ہوئی محوِ گفتگو ہے، مسہری صرف اتنی لمبی ہے کہ غیر محرَم جیسے پیر پھیلائے ہوئے تھا وہ شرم پر ٹھہرتا، دو روز کے بعد مہمان چلا گیا، تو میں نے اپنی بیوی کو بُرا بھلا کہا، اس نے قرآن کی قسم کھائی، حالانکہ زید کے سامنے کا واقعہ تھا۔ شرعاً اس کا حکم صادر فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان صحیح ہے تو عورت نے سخت گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے اور اپنے شوہر سے معافی مانگنی چاہئے، شوہر کو چاہئے کہ وہ پہلے اپنی بیوی کو اس کی خطاکاریوں پر نرمی سے سمجھائے، اگر نہ مانے تو اس سے الگ سونے لگے، اگر اس پر بھی وہ راہِ راست پر نہ آئے تو تأدیب کے لئے اتنا مارنے کی بھی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے،[1] اس کے باوجود اصلاح نہ ہو تو فریقین کے اہلِ خاندان کو جمع کرکے خرابیوں کی اصلاح کرائیں، پھر بھی اصلاح نہ ہو تو شوہر اگر ایسی بیوی کو نہیں رکھ سکتا تو طلاق دیدے،[2] لیکن تین طلاقیں بیک وقت دینا

---

(۱) وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. الأية. (سورة النساء:۳۴) تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ''نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ'' ج:۲ ص:۳۹۹۔

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا. (سورة النساء:۳۵) وفی ردّ المحتار باب الخلع ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنة اذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أهلهما لیصلحوا بینهما فان لم یصطلحا جاز الطّلاق والخلع. وفی الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۰ (طبع سعید) الّا اذا خافا أن لّا یقیما حدود الله فلا بأس أن یتفرّقا. وفی ردّ المحتار .... لأنّ التّفریق حینئذ مندوب بقرینة قوله فلا بأس لٰکن سیأتی اوّل الطلاق انه یستحب لو مؤذیة أو تارکة صلٰوة ویجب لوفات الإمساک بالمعروف.

ناجائز ہے،[۱] اس سے پرہیز کرے۔ هٰکذا أمرنا الله تعالٰی فی القرآن الکریم ورسول الله صلی الله علیه وسلم فی الأحادیث الکثیرة المعروفة۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۷/۲۸ ب)

لوگوں کا طلاق دینے پر اُکسانے اور بلاوجہ طلاق دینے کا حکم

سوال:- لڑکی کے والدین اپنی لڑکی کو پیسے کمانے کی خاطر لوگوں کو ٹھگتے ہیں، نکاح شرعی طور پر جائز ہوتا ہے، لڑکی کو چھڑانے کے لئے اُکساتے اور غلط بیان دلائے جاتے ہیں، تاکہ ان جھوٹے بیانوں سے لڑکی کو آزاد کرالیا جائے، لڑکی کے والدین جیسا کہ پہلے دو شوہروں سے طلاق حاصل کر چکے ہیں، تیسرے شوہر سے بھی کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شوہر اپنی بیوی کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں۔ اپنے لئے پیسے کمانے کی خاطر مظلوم لڑکیوں کے ساتھ یہ کاروبار چلا رہے ہیں، ان حالات میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہر کے قاضی، چیئرمین شہر کو لڑکی کے والدین اور لڑکی کو سزا دینے کا حق ہے یا نہیں؟

جواب:- جب تک شوہر خود طلاق نہ دے اس وقت تک وہ اس کی بیوی رہے گی، اور شوہر کو چاہئے کہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں میں آکر اپنی بیوی کو طلاق نہ دے،[۲] اور جو لوگ خواہ مخواہ شوہر کو طلاق دینے پر بلاوجہ اُکسائیں وہ گناہگار ہیں، اگر کوئی شرعی قاضی ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تعزیراً سزا بھی دے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۰۹/۳۲ ج)

طلاق مکرَہ کا حکم

سوال:- طلاقِ مکرَہ کے بارے میں زید کہتا ہے کہ واقع نہیں ہوتی، اور دلیل میں مشکوٰۃ کی

---

(۱) وفی سنن النسائی کتاب الطّلاق ج:۲ ص:۹۹ (طبع قدیمی کتب خانه کراچی) أُخبِرَ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن رجل طلّق امرأته ثلٰث تطلیقات جمیعًا فقام غضبانًا ثم قال: أیُلعَبُ بکتاب الله وأنا بین أظهرکم؟ حتّی قام رجل وقال: یا رسول الله! ألا أقتله؟. وفی الهندیة کتاب الطلاق الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۴۹ .... ان یطلّقها ثلاثًا فی طهر واحد بکلمة واحدة أو بکلماتٍ متفرّقة .... فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا .... الخ.

(۲) وفی سنن أبی داؤد کتاب الطّلاق باب فی کراهیة الطّلاق ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع سعید) عن محارب قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما أحلّ الله شیئًا أبغض الیه من الطّلاق (وبعدهٗ). عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أبغض الحلال الی الله عزّ وجلّ الطّلاق. وفی الشامیة ج:۳ ص:۲۲۸ (طبع سعید) وأمّا الطّلاق فانّ الأصل فیه الحظر بمعنٰی أنّه محظور الّا لعارض یبیحه وهو معنٰی قولهم الأصل فیه الحظر والاباحة للحاجة الی الخلاص فاذا کان بلا سبب أصلًا لم یکن فیه حاجة الی الخلاص بل یکون حمقًا وسفاهة رأی ومجرّد کفران النعمة واخلاص الایذاء بها وبأهلها وأولادها .... فحیث تجرّد عن الحاجة المبیحة لهٗ شرعًا یبقی علٰی أصله من الحظر .... الخ.

حدیث: "لا طلاق ولا عتاق في اغلاق"[1] پیش کرتا ہے جبکہ حنفیوں کے نزدیک طلاقِ مکرَہ واقع ہوجاتی ہے، لہٰذا حنفیوں کی کون سی حدیث سے دلیل ہے؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک طلاقِ مکرَہ واقع ہوجاتی ہے، حنفیہ کے دلائل درج ذیل ہیں:-

الف:- قوله صلى الله عليه وسلم ثلاث جدّهن جدٌّ وهزلهنّ جدٌّ النّكاح والطّلاق والرّجعة. اخرجه الترمذى وقال حسن غريب.[2] وقد اخرج الجصاص فى أحكام القرآن عن سعيد بن المسيّب عن عمر قال: أربع واجبات على كل من تكلّم بهنّ العتاق والطّلاق والنّكاح والنذر.

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ محض تلفظِ طلاق موجبِ وقوعِ طلاق ہے، خواہ نیت وارادہ ایقاعِ طلاق کا نہ ہو، اور اکراہ میں بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

ب:- عن صفوان بن عمران الطائى أن رجلًا كان نائمًا فقامت امرأته فأخذت سكينًا فجلست على صدره فقالت: لتطلّقنى ثلاثًا أو لأذبحنّك، فطلّقها ثم أتى النبى صلى الله عليه وسلم فذكره له ذٰلك، فقال: لا قيلولة فى الطّلاق. أخرجه الامام محمدٌ والعقيلىؒ. (مرقاة المفاتيح ج:٦ ص:٢٨٨).[3]

اور علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۲۵[4] میں اس بات پر دلائل دیئے ہیں کہ یہ حدیث سنداً قابلِ استدلال ہے۔

ج:- مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ مکرَہ کی طلاق کو واقع قرار دیتے تھے، اور یہی مذہب مصنف عبدالرزاق میں امام شعبیؒ، امام نخعیؒ، حضرت قتادہؒ اور حضرت ابوقلابہؒ سے بھی مروی ہے۔[5]

اور ابوداؤد کی حدیث: "لا طلاق ولا عتاق فى اغلاق" کی توجیہ حنفیہ یہ کرتے ہیں کہ "اغلاق" کا لفظ اکراہ کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی غلبۂ عقل کے بھی ہیں، لہٰذا اس کا

---

(۱) سنن أبي داوٗد ج:۱ ص:۳۰۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان).

(۲) جامع الترمذى باب ما جاء فى الجدّ والهزل فى الطّلاق ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع سعيد) وأبو داوٗد باب فى الطّلاق على الهزل ج:۱ ص:۳۰۵ (طبع حقانيه ملتان).

(۳) ان الفاظ سے یہ روایت "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۷۷ (طبع ادارۃ القرآن) میں نقل کی گئی ہے، جبکہ چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ "مرقاۃ المفاتیح" ج:۶ ص:۲۸۸ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) اور "لسان المیزان" ج:۴ ص:۱۲۴ اور "نصب الرایۃ" ج:۳ ص:۲۲۲ میں بھی مذکور ہے۔

(۴) دیکھئے: اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۷۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۵) دیکھئے: "مصنف عبدالرزاق" ج:۶ ص:۴۰۶ تا ۴۱۱ (طبع مجلس علمی) اور "اعلاء السنن" ج:۱۱ ص:۱۷۷ اور "سنن ابی داؤد" ج:۱ ص:۳۰۵۔

مطلب یہ ہے کہ مغلوب العقل ہونے کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی،[۱] اور اگر بالفرض ''اکراہ'' ہی کے معنی میں لئے جائیں تو مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے اس کا منسوخ ہونا سمجھ میں آتا ہے،[۲] اور وہ روایت یہ ہے: ''عن سعید بن جبیر أنه بلغه قول الحسن لیس طلاق المکره بشيء، فقال: یرحمه الله! انّما کان أهل الشّرک یکرهون الرّجل علی الکفر والطّلاق، فذٰلک الّذی لیس بشيء وامّا ما صنع أهل الاسلام بینهم فهو جائز، حکاه الزّیلعی فی نصب الرّایة والحافظ فی الدّرایة وسکتا علیه. (راجع اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۲۵)''۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۴/۲۸ ج)

نافرمان بیوی کو طلاق دینے کا حکم اور طلاق دینے کا صحیح طریقہ

سوال:- ایک نیک، دین دار مسلمان نے ایک مسلمان عورت سے چھ سال پہلے شادی کی، اُس سے دو بچے ہیں، عورت مذکورہ شادی کے بعد کچھ دنوں تک نماز پڑھتی رہی، جب بچہ پیدا ہوا نماز پڑھنا چھوڑ دیا اور بے پردہ بازار میں جانے لگی، مرد کی نافرمانی کرنے لگی، حکم نہیں مانتی، مرد نماز پڑھنے کو کہتا ہے، پردہ کرنے کو کہتا ہے مگر عورت نہیں مانتی، فارغ اوقات میں قرآن تلاوت کرنے کو کہتا ہے، اور شوہر کہتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوگی لاکر دُوں گا مگر بے پردہ مت رہ، اللہ اور اس کے رسول کے دین کے مطابق چلو، لیکن وہ نہیں سمجھتی، اس لئے مرد چاہتا ہے کہ دُوسری شادی کرلے اور اس عورت کو طلاق دیدے، لیکن یہ عورت طلاق نہیں لیتی اور نہ طلاق لینا منظور کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کی زندگی خراب ہوگی، کیا حکم ہے؟

جواب:- بیوی کو طلاق دینے کو حدیث میں ''أبغض المباح''[۴] فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ مباحات میں یہ چیز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، لہٰذا حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ منکوحہ کو طلاق نہ دی جائے۔ قرآنِ کریم کا حکم یہ ہے کہ اگر عورت نافرمانی کرتی ہو تو پہلے اسے

---

(۱) دیکھئے: اغلاق کے معنی کی توجیہ اور اس کے معنی میں مختلف احتمالات کی تفصیل ''اعلاء السنن'' ج:۱۱ ص:۱۸۰ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۲) وفی حاشیة اعلاء السنن ج:۱۱ ص:۱۷۸ (طبع ادارة القرآن کراچی) قال الشیخ العثمانی رحمة الله علیه: قلت وعلٰی هٰذا فحدیث عائشة رضی الله عنها: ''لا طلاق ولا اعتاق فی اغلاق'' منسوخ ولعلّه کان قبل الهجرة.

(۳) دیکھئے: ''اعلاء السنن'' ج:۱۱ ص:۱۷۷ و ۱۷۸ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۴) وفی سنن أبی داؤد کتاب الطّلاق باب فی کراهیة الطّلاق ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع سعید) عن محارب قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما أحلّ الله شیئًا أبغض الیه من الطّلاق (وبعدهٗ) عن ابن عمر رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أبغض الحلال الی الله عزّ وجلّ الطّلاق.

نرمی سے سمجھاؤ، اگر باز نہ آئے تو اپنے سونے کی جگہ اس سے الگ کرلو، اگر اس سے بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوتو تأدیب کے لئے ہلکے ہلکے مارنے کی بھی اجازت ہے،[۱] (لیکن تکلیف دہ حد تک مارنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے)۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو شوہر اور بیوی دونوں کے رشتہ داروں میں سے ایک ایک آدمی کو بیچ میں ڈال کر تنازعے کا تصفیہ کیا جائے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر فریقین اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں کے لئے بھلائی کی صورت پیدا کردے گا۔[۲] لہٰذا طلاق دینے سے پہلے اصلاح کے لئے یہ تمام اُمور انجام دینے ضروری ہیں، اگر ان سے اصلاح ہوجائے تو طلاق کا اقدام نہیں کرنا چاہئے، لیکن اگر اصلاح کی کوئی اُمید باقی نہ رہے تو بہرحال! شریعت نے مرد کو طلاق کا اختیار دیا ہے،[۳] اور بچوں کی وجہ سے یہ اختیار شرعاً ساقط نہیں ہوتا، البتہ بچوں کی عام مصلحت چونکہ بلاشبہ اسی میں ہے کہ طلاق نہ دی جائے، لہٰذا طلاق کا اقدام سخت مجبوری کے بغیر نہیں کرنا چاہئے، اور طلاق دینے کا عزم کرلیں تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس طُہر میں بیوی سے جماع نہ کیا ہو اس میں اسے صرف ایک طلاق دی جائے،[۴] عدّت گزرنے کے بعد وہ خودبخود نکاح سے نکل جائے گی۔[۵] اور دُوسری شادی شرعاً جائز ہے، لیکن پہلی بیوی کی موجودگی میں دُوسری شادی کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے اُوپر پورا اعتماد ہو کہ میں دونوں بیویوں کے درمیان ہر اعتبار سے مکمل برابری کا سلوک اور انصاف کرسکوں گا، اگر بے انصافی کا ذرا بھی خطرہ ہوتو پھر دُوسرا نکاح شرعاً بھی جائز نہیں،[۶] اور چونکہ آج کل بیویوں کے درمیان برابری کا سلوک بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے دُوسری شادی کا اقدام بھی انتہائی ضرورت کے موقع پر کرنا چاہئے، ہاں! اگر پہلی بیوی کو طلاق دے کر دُوسرا نکاح کرے تو یہ جائز ہے اور بچوں کی وجہ سے اس کی اجازت ختم نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۷/۲۸ ب)

---

(۱) وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. الأية. (سورة النساء:۳۴) تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ''نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ'' ج:۲ ص:۳۹۹۔

(۲) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا. الأية. (سورة النساء:۳۵)

(۳) وفی ردّ المحتار باب الخلع ج:۳ ص:۴۴۱ (طبع سعید) السنّة اذا وقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أهلهما لیصلحوا بینهما فان لم یصطلحا جاز الطّلاق والخلع .... الخ. وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۲۹ (طبع سعید) بل یستحب لو مؤذیة أو تارکة صلٰوة وفی الشّامیة (قوله ومفاده) ای مفاد استحباب طلاقها .... الخ.

(۴، ۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۲۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

(۶) وفی الدّر المختار کتاب النّکاح ج:۳ ص:۷ ومکروهًا لخوف الجور فان تیقّنه حرّم ذٰلک. وفی ردّ المحتار تحته: قوله ومکروهًا أی تحریمًا بحر. (قوله فان تیقّنه) أی تیقّن الجور حرم لأنّ النّکاح انّما شرع لمصلحة تحصین النفس وتحصیل الثّواب، وبالجور یأثم ویرتکب المحرّمات فتنعدم المصالح لرجحان هٰذه المفاسد بحر .... الخ.

محض طلاق کا خیال آنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کو عرصہ چھ ماہ سے وہم اور وسوسہ کی بیماری ہے، اور وہ یہ ہے کہ زید کو عرصہ چھ ماہ سے اکثر طلاق کا وہم اور وسوسہ ہوجاتا ہے۔ اکثر غیرارادی طور پر طلاق کی سوچ آتی ہے، توجہ اِدھر اُدھر کرنے کے بعد پھر اچانک یہی طلاق کی غیراختیاری سوچ آجاتی ہے، اور اس میں اتنی شدّت ہوتی ہے کہ باتیں کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طلاق کے الفاظ نکل رہے ہیں، حالانکہ زید کا قطعی اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے، اب اسی حالت میں ایک دفعہ اچانک غیرارادی طور پر مسلط خیال کی وجہ سے طلاق کا تلفظ ہوجاتا ہے، فوراً زید کلمہ پڑھتا ہے کہ ایسا تو نہیں ہوسکتا، برائے مہربانی فرمائیں کچھ واقع تو نہیں ہوگا؟ برائے مہربانی یہ بھی بتائیں کہ اس وہم کا علاج اور اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اکثر و بیشتر اسی وسوسے کا تسلط رہتا ہے۔

جواب:- اگر سوال میں بیان کردہ واقعات دُرست ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ محض طلاق کا خیال آنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی،(۱) اسی خیال کے دوران اگر کوئی لفظ بھی اس طرح زبان سے نکل جائے کہ اسے بولنے والا خود بھی نہ سن سکے تو اس سے بھی طلاق نہیں ہوتی، اور اگر الفاظ اس طرح زبان سے ادا ہوئے کہ یقینی طور پر خود بھی سن لیا تو اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں، اور پوچھتے وقت وہ الفاظ لکھیں جو زبان سے ادا ہوئے اور انہیں خود سنا، نیز یہ بھی لکھیں کہ کیا اس طرح اور الفاظ بھی غیراختیاری طور پر زبان سے نکلتے رہتے ہیں یا نہیں؟ اور وہم کی بیماری دُور کرنے کے لئے کسی طبیب یا ڈاکٹر سے رُجوع کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۳/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷/۵۴۳)

نشے کی حالت میں طلاق کا حکم

سوال:- از رُوئے شرعِ محمدی ایک شخص غلام مصطفیٰ نامی نے شادی کی، اور بیوی کو عرصہ نو ماہ تک رکھا، پھر والدین کے سامنے کہا کہ: میں نے بیوی کو چھوڑ دیا، طلاق دیدیا میں نہیں رکھتا۔ والدین کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارا لڑکا چرس وغیرہ نشے کا عادی تھا، ہم نے سمجھا کہ یہ سب کچھ بکواس کی شکل میں

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۰ (طبع سعید) (ورکنہٗ لفظ مخصوص) وفی الشامیة تحته هو ما جعل دلالة علٰی معنی الطّلاق من صریح أو کنایة .... وأراد اللّفظ ولو حکمًا لیدخل الکتابة المستبینة واشارة الأخرس .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ ص:۳۱۷ کا حاشیہ نمبر ۱۔

اس نے کہہ دیا، مگر وہ دو ماہ گزر کر عورت کی طرف رُجوع نہیں کرتا اور اپنا سامان اُٹھا کر بیچ دیا اور کدھر باہر جا کر از عرصہ دو سال سے غائب ہے، باہر جاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغی توازن خراب ہے۔ اب اس کی بیوی والدین کے کہنے کے پیشِ نظر مطلقہ ہے، اور دُوسری جگہ یہ نکاح کرسکتی ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر غلام مصطفیٰ نے واقعی اپنی بیوی کے بارے میں وہی الفاظ کہے تھے جو سوال میں مذکور ہیں اور وہ اس وقت مجنون نہیں تھا، خواہ نشے میں ہو،[1] تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوچکی ہے،[2] اور جس وقت شوہر نے وہ الفاظ کہے تھے اس کے بعد سے تین ایامِ ماہواری پورے ہونے پر بیوی کی عدّت پوری ہوگئی۔ بہرصورت! عدّت کے پورے ہونے کے بعد مذکورہ عورت دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۱۷/۲۹ ب)

زبردستی طلاق کے الفاظ کہنے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔

مسئلہ:- جناب مفتی صاحب! آپ نے میری درخواست مؤرخہ 30-06-1999 کی پشت پر یہ تحریر کیا تھا کہ میں فقہِ حنفی کی روشنی میں طلاق کی بابت پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر زبردستی بھی طلاق کی بابت زبان سے کہلوادیا جائے تو فقہِ حنفی کی رُو سے طلاق ہوجاتی ہے۔

مفتی صاحب! میں فقہِ حنفی کی اس بات سے متفق نہ ہوں، کیونکہ خاوند بے چارے کا کیا قصور ہے؟ اُس سے تو زبردستی طلاق کے الفاظ کہلوائے گئے ہیں۔

میرے علم کے مطابق فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفریہ والے فقیہ بھی نیک اور متقی لوگ تھے، اگر اِن میں سے کسی بھی فقہ کی رُو سے ''زبردستی طلاق کے الفاظ خاوند سے زبان سے کہلوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی'' تو اگر ایک حنفی مسلمان جیسے میں ہوں وہ متعلقہ فقہ یا فقہ ہائے مذکورہ بالا کے اِس مسئلے سے اتفاق کرتے ہوئے زبردستی زبان سے کہلوائے گئے الفاظ کو طلاق کا واقع

(۱،۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۹ (طبع سعید) أو سکران ولو بنبیذ أو حشیش أو أفیون أو بنج زجرًا بہٖ یفتٰی تصحیح القدوری .... الخ. وفی الھندیة کتاب الطّلاق فصل فی من یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه) وطلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر أو النبیذ، وھو مذھب اصحابنا رحمھم اللہ تعالٰی کذا فی المحیط .... ومن سکر من البنج یقع طلاقه ویحدّ لفشو ھٰذا الفعل بین الناس وعلیه الفتویٰ فی زماننا .... الخ.

ہونا نہیں سمجھتا تو کیا ایک حنفی مسلمان کے لئے اسلام ایسا دین نہیں ہے کہ جس میں ذرّہ برابر بھی ظلم ہو، لہٰذا میں بالکل اس بات سے متفق نہیں ہوں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- آپ نے فقہِ حنفی کے مطابق جواب مانگا تھا، فقہِ حنفی کے مطابق دارالافتاء سے جو جواب دیا گیا وہ صحیح ہے، حنفی فقہ میں زبردستی طلاق کے الفاظ کہنے سے بھی طلاق ہوجاتی ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳/۳۷۳)

شادی سے پہلے زنا کرنے کے بعد توبہ کرنے والی عورت کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- ایک لڑکی جو بڑے اچھے گھرانے کی شریف لڑکی ہے، نیک سیرت، نماز روزے کی پابند ہے، ایک ایسے ہی لڑکے سے شادی ہوگئی ہے، بیس سال کی عمر میں، تین ماہ تک خوشی سے زندگی بسر کرتے رہے، تین ماہ کے بعد لڑکے نے لڑکی سے کہا کہ سچ بتا تو نے کبھی کسی کے ساتھ بدفعلی تو نہیں کی؟ اس پر لڑکی نے کہا کہ آج سے چار سال قبل ایک لڑکے سے میں نے بدکاری کی تھی جس کا کسی کو علم نہیں۔ اس دن سے لڑکا اپنی بیوی سے نفرت ظاہر کرتا ہے اور طلاق کا ارادہ رکھتا ہے، کیا اس حالت میں طلاق دینا صحیح ہے؟

جواب:- توبہ اگر صدقِ دِل کے ساتھ کی جائے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم بھی دِل میں ہو تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرمادیتا ہے، لہٰذا اگر لڑکی توبہ کرچکی ہے اور اَب اس کے حالات دُرست ہیں تو شوہر کو بھی درگزر کرنا چاہئے، اور اس بناء پر طلاق نہ دینا چاہئے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹۷/۱۹ الف)

---

(۱) وفي الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۵ (طبع سعید) ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا أو مکرهًا فانّ طلاقه صحیح .... الخ. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیه کوئٹه) یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغًا عاقلًا سواء کان حرًا أو عبدًا طائعًا او مکرهًا.

﴿فصل فی الطّلاق الصّریح﴾

(طلاقِ صریح کا بیان)

ایک طلاقِ رجعی کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین ذیل کی صورت میں کہ کچھ لوگوں نے مجھے مجبور کردیا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو، میں نے بحالتِ مجبوری ایک طلاق دے دی، پھر اس کے بعد انہوں نے مجھ سے دستخط کرالئے جس کا مضمون مجھے معلوم نہیں تھا، کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- اگر سوال میں درج کئے ہوئے واقعات دُرست ہیں تو آپ کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ جس دن آپ نے زبان سے طلاق دی تھی اس دن کے بعد بیوی کو تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے اگر آپ زبان سے یہ کہہ دیں کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا'' تو عورت بدستور آپ کی بیوی رہے گی[1]، لیکن اگر رُجوع کئے بغیر عورت کو تین مرتبہ ماہواریاں گزر گئیں تو نکاح ختم ہوجائے گا، البتہ اس کے بعد دونوں کی رضامندی سے نکاح ہوسکے گا۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۸/ ۱۹ الف)

دو طلاقیں دینے کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ: شوہر بیوی کے درمیان گھریلو

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شركت علميه ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأتهٗ تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فی عدّتها. وفی الشامية ج:۳ ص:۳۹۹ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی) والمستحب ان يراجعها بالقول فافهم. وفی الهندية ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع رشيديه كوئٹه) فالسُّنی ان يراجعها بالقول.

(۲) وفی الهداية باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ اذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فی عدّتها رضيت بذٰلک أو لم ترض، لقوله تعالٰی: فَأَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، من غير فصل ولا بدّ من قيام العدّة لأن الرّجعة استدامة الملک الا ترىٰ انه سمی امساكًا وهو الابقاء وانّما يتحقق الاستدامة فی العدّة لأنّه لا ملک بعد انقضائها..... الخ. وفی فقه السنة كتاب الطّلاق بحث حكم الطّلاق الرّجعی ج:۲ ص:۲۷۴ (طبع دار الكتاب العربی، بيروت) فاذا انقضت العدّة ولم يراجعها بانت منهٗ .... الخ.

جھگڑے میں شوہر نے اپنی بیوی سے بحالتِ غصہ دو دفعہ الفاظ دُہرائے کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں'' کیا دو دفعہ مندرجہ بالا الفاظ کہنے سے طلاقِ صریح یا مغلّظہ ہوگئی یا طلاقِ بائن ہوئی؟ اگر طلاقِ بائن ہوئی تو شوہر کب تک بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے؟ اگر رُجوع کرسکتا ہے تو کیا نکاح ضروری ہے؟

جواب:- اگر سائل کا یہ بیان دُرست ہے کہ اس نے صرف دو مرتبہ طلاق کے مذکورہ بالا الفاظ کہے تھے، تین مرتبہ نہیں کہے تھے، تو صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جس کا حکم یہ ہے کہ طلاق دینے کے وقت سے عورت کو تین مرتبہ ماہواری آنے تک اس کی عدّت ہے،[1] اس عدّت کے دوران شوہر اگر چاہے تو طلاق سے رُجوع کرسکتا ہے،[2] اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ میں نے تجھ سے رُجوع کرلیا،[3] اس کے بعد وہ دونوں حسبِ سابق میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں۔ البتہ آئندہ طلاق دینے سے سخت احتیاط لازم ہے، کیونکہ اگر ایک مرتبہ بھی طلاق دے گا تو بیوی اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجائے گی، اور آپس میں دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہیں ہوسکے گا۔[4] واضح رہے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے کہ جبکہ شوہر نے صرف دو مرتبہ طلاق کے الفاظ کہے ہوں، اگر شوہر نے تین مرتبہ الفاظ طلاق کہہ کر غلط بیانی سے یہ فتویٰ حاصل کرلیا تو اس کی ذمہ داری مفتی پر نہیں، ایسا کرنے سے وہ عمر بھر حرام کاری میں مبتلا رہے گا اور جھوٹ کا وبال الگ ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۴/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۴۳۴/۲۹ الف)

''جاؤ میں نے تجھے طلاق دیا'' دو مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- ایک شخص نے جھگڑے کی حالت میں اپنی بیوی سے دو مرتبہ یہ الفاظ کہے کہ: ''جاؤ میں نے تجھے طلاق دے دیا، جاؤ میں نے تجھے طلاق دے دیا۔'' آیا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟

---

(۱) وفی الدّر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید) وھی فی حق حرّة بعد الدّخول حقیقة أو حکمًا ثلاث حیض کوامل .... الخ.

(۲) وفی الهدایة کتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شرکت علمیه) واذا طلّق الرجل تطلیقة رجعیة أو تطلیقتین فله أن یراجعها فی العدّة.

(۳) فی الدر المختار ج:۳ ص:۴۰۱ وندب اعلامها بها .... وندب الاشهاد بعدلین. فی الشامیة تحت قوله ولو بعد الرجعة بالفعل ..... فالسُّنی أن یراجعها بالقول ویشهد علی رجعتها ویعلمها. وفی الهندیة ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) فالسُّنی ان یراجعها بالقول ویشهد علی رجعتها شاهدین.

(۴) حوالے کے لئے آگے صفحہ:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

اور کتنی طلاق سمجھی جاویں گی؟ کیا یہ عورت اس موجودہ شوہر کی زوجیت میں بدون حلالہ وغیرہ کے شرعاً رہ سکتی ہے؟ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ واضح فرمائیں۔

جواب:- اگر واقعۃً طلاق صرف دو مرتبہ ہی دی ہے، تیسری بار مذکورہ الفاظ نہیں کہے تو صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئیں، جن کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر چاہے تو عدّت کے دوران (یعنی طلاق کے وقت سے تین ماہواریاں گزرنے سے پہلے پہلے) بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے،[1] اور رُجوع کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں اس سے یہ کہہ دے کہ میں نے تم سے رُجوع کیا"،[2] اس کے بعد وہ دونوں پھر میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں، اور اگر رُجوع کے بغیر عدّت گزر گئی تو بعد میں باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کرکے نکاح ہوسکتا ہے،[3] لیکن خواہ رُجوع کیا جائے یا دُوسرا نکاح، دونوں صورتوں میں شوہر کو صرف ایک طلاق کا حق باقی رہ گیا، یعنی اب اگر وہ صرف ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے گا تو بیوی مغلّظہ ہوکر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا،[4] لہٰذا آئندہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے بہت احتیاط رکھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۷/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۰/۷۲۸ ب)

"میں نے تجھے طلاق دی" کے الفاظ ایک مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کرنے کا طریقہ

سوال:- میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو بیان دیتا ہوں وہ میرے علم کے مطابق بالکل ٹھیک ہے، میرا اور میری بیوی کا جھگڑا لڑکے کے اُوپر ہوا، میں نے لڑکے کا گلا دبایا تھا، پھر میں نے اس کو چھوڑ کر کہا کہ: "میں نے تجھے طلاق دی" اس کے بعد اس نے کہا: "نہیں ایسا نہیں ہوسکتا" اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور میں صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اس کی والدہ آئی تو میں نے اس کو بتلایا کہ میں نے تمہاری لڑکی کو طلاق دے دی ہے، اب اس کو لے جاؤ، پھر اپنے والد کو بتلایا کہ میں نے نفیسہ کو طلاق دے دی ہے، آپ ان کے گھر والوں سے فیصلہ کرلیں، میرے خیال میں یہ تھا کہ میں نے اس کو تین مرتبہ طلاق دے دی ہے، لیکن میں نے دو دن تک سوچا پھر اپنی بیوی سے پوچھا، بلکہ اس نے قرآن مجید اُٹھایا، اس نے بھی یہی کہا کہ تم نے ایک مرتبہ طلاق دی تھی، دُوسری مرتبہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۴۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۴۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔
(۳) دیکھئے صفحہ:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر ۲ اور اگلے صفحہ:۳۴۳ کا حاشیہ نمبر ۵۔ (۴) دیکھئے صفحہ:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا، چنانچہ مجھے اپنی بیوی کی بات پر بھی یقین ہے، اس مسئلے میں شرعی طور پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان دُرست ہے اور واقعۃً سائل نے اپنی بیوی کو صرف ایک مرتبہ ہی طلاق دی تھی اور بعد میں بیوی کے والدین کو اسی طلاق کی خبر دی[1]، نئی طلاق دینا مقصود نہ تھا، تو اس کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی ہے[2]، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران اگر شوہر رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے[3]، جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کرلیا ہے''[4]، اور اگر عدّت گزرنے تک رُجوع نہ کیا تو عدّت پوری ہونے پر بیوی بائنہ ہوجائے گی یعنی ازسرِنو نکاح کئے بغیر اس کے نکاح میں نہ آسکے گی۔[5] یہ واضح رہے کہ شوہر رُجوع کرے یا عدّت کے بعد نیا نکاح کرے تو اب اسے صرف دو طلاقوں کا اختیار باقی ہوگا، یعنی اگر آئندہ اس نے صرف دو مرتبہ طلاق کے الفاظ کہہ دیئے تب بھی وہ مغلّظہ ہوجائے گی اور پھر بغیر حلالہ کے نکاح نہ ہوسکے گا، لہٰذا آئندہ سخت احتیاط لازم ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۹/۱۰/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۹۳ د)

ایک طلاق رجعی کے بعد طلاق کی خبر دینے سے مزید طلاق واقع نہیں ہوگی، زبان سے رُجوع کرنے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم

سوال:- میں نے اپنی بیوی کو غصّے میں کہہ دیا کہ: ''تم سب رشتہ داروں کے گھر چلی جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں، میں نے تمہیں طلاق دے دیا'' اس کے بھائیوں نے کہا کہ: اسے طلاق دے دو، میں نے جواب دیا کہ: ''میں نے اسے طلاق دے دیا ہے'' پھر تیسری مرتبہ بیوی کے چچا سے کہا کہ: ''میں نے اس کو طلاق دے دی ہے''، شرعاً کتنی طلاقیں ہوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب آپ نے اپنی بیوی کے بھائی اور چچا سے یہ کہا کہ: ''میں نے اسے طلاق دے دی ہے'' تو اگر آپ کی نیت نئی طلاق واقع کرنے کی نہیں تھی بلکہ بیوی کو دی

(۱،۲) وفی الشامیة ج:۳ ص:۲۹۳ واذا قال: أنت طالق، ثم قیل له: ما قلت؟ فقال: قد طلقتها، أو قلت هی طالق، فهی طالق واحدة لأنه جواب، کذا فی کافی الحاکم. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۵۵ ولو قال لامرأته: أنت طالق، فقال لهٗ رجل: ما قلت؟ فقال: طلّقتها، أو قال: قلت هی طالق، فهی واحدة فی القضاء. کذا فی البدائع.

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔ (۴) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۵) فی الدر المختار ج:۳ ص:۴۰۹ (طبع سعید) وینکح مبانة بما دون الثلاث فی العدّة وبعدها بالاجماع.

ہوئی ایک طلاق کو نقل کرنا مقصود تھا تو آپ کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عدّت یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری کے گزرنے سے پہلے اگر زبان سے رُجوع کرلیں تو آپ کا نکاح بدستور قائم رہے گا،(۱) بہتر یہ ہے کہ اس رجعت پر گواہ بھی بنالیں۔(۲) اور اگر نیت تین طلاقیں دینے کی تھی تو طلاقِ مغلظ واقع ہوگئی اور آپ کی بیوی حلالہ کے بغیر آپ کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتی۔(۳)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۷/۱۹ الف)

''میں نے تم کو طلاق دی'' دومرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا طریقہ

سوال:- ایک شخص گھریلو تنازعے کی وجہ سے اپنی منکوحہ کو ایک ہی مجلس میں پہلے یہ کہتا ہے کہ: ''اگر تم نے زبان بند نہ کی تو میں تم کو طلاق دے دُوں گا'' اور اُس کے فوراً بعد دومرتبہ کہہ دیتا ہے کہ: ''میں نے تم کو طلاق دی'' اب وہ شخص اپنی بیوی سے رُجوع کرنا چاہتا ہے، اس سلسلے میں شریعت اورقرآن وحدیث کی روشنی میں جواب باصواب سے مطلع کریں۔

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ اُس شخص نے پہلی بار یہی الفاظ کہے تھے کہ: ''اگر تم نے زبان بند نہ کی تو میں تم کو طلاق دے دُوں گا'' اور اس کے بعد صرف دومرتبہ یہ کہا کہ: ''میں نے تم کو طلاق دی'' تو اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے شوہر رُجوع کرسکتا ہے،(۴) جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کرلیا''،(۵) اور اگر عدّت گزر گئی تو پھر باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کرکے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،(۶) لیکن واضح رہے کہ اب شوہر کو صرف ایک طلاق کا اختیار رہ گیا ہے، اب اگر ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی مغلّظہ ہوکر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔(۷)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۷/۷/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۷۸۵/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔
(۲) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۳) دیکھئے: ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔
(۴) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔
(۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۶) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۷) دیکھئے: ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔

ایک طلاقِ رجعی کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ اور رُجوع کے بعد بیوی پر شوہر کے گھر آنا لازم ہے

سوال:- مسمّٰی سلیمان ولد محمد صاحب نے اپنی منکوحہ بیوی مسماۃ سکینہ بی بی دُختر محمد صاحب کو ناراضگی کی وجہ سے ایک طلاق دے دی، مؤرخہ ۲۸؍اپریل ۱۹۷۷ء کو، مسمّٰی سلیمان اپنی بیوی کو ایک طلاق دینے کے بعد رُجوع کرنے کے لئے متعدّد بار محلے کے مرد اور عورتوں کو بلانے کے لئے بھیج چکا ہے، مگر فدوی کے سسرال والوں نے بھیجنے سے انکار کردیا ہے، ایسی صورت میں عورت کو تین طلاقیں ہوجاتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر واقعۃً صرف ایک طلاق دی تھی، تین مرتبہ طلاق کا لفظ نہیں کہا تھا تو عدّت کے دوران (یعنی طلاق دینے کے بعد سے تین ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے) شوہر رُجوع کرسکتا ہے،[1] جس کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا''،[2] لیکن اگر گواہوں کے بغیر کہہ دیا تب بھی رُجوع صحیح ہوگیا،[3] اس کے بعد بیوی پر واجب ہے کہ وہ شوہر کے پاس واپس آجائے، بیوی کے میکے والے اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، البتہ اگر طلاق کے بعد تین ماہواریاں آچکی ہوں اور شوہر نے رُجوع نہ کیا ہو تو باہمی رضامندی سے نیا نکاح ہوسکتا ہے،[4] شوہر عورت کو واپس آنے پر مجبور نہیں کرسکتا، اور یہ جواب اسی صورت میں ہے جبکہ طلاق صرف ایک دی ہو، تین طلاقیں دے دی ہوں تو یہ حکم نہیں ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۷/۲۸ ج)

ایک طلاقِ رجعی کے بعد رُجوع کا بہتر طریقہ اور حاملہ کی عدّت

سوال:- مسمّٰی قاسم عمر ۸۵ سالہ نے اپنی زوجہ مسماۃ خدیجہ بائی بنت گل محمد کو حالتِ غصہ میں دس جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک طلاق دے دی، جبکہ اس کی بیوی موجود نہیں تھی، دونوں الگ الگ رہ رہے ہیں، لیکن صلح کرنے کی نیت کرتے ہیں، اس کا شرعی حکم ارشاد فرمائیں۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ مسمّٰی قاسم نے اپنی بیوی کو صرف ایک طلاق دی تھی تو یہ طلاقِ رجعی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران شوہر رُجوع کرسکتا ہے،[5] جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا،[6] اور عدّت تین ماہ نہیں، بلکہ تین

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔ (۲، ۳) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔
(۴) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (۵) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۶) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

حیض ہے[1]، اور اگر بیوی حاملہ ہو تو بچے کی پیدائش ہے[2]، عدّت کے بعد رُجوع نہیں ہوسکتا البتہ باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرّر کر کے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے[3]، آئندہ طلاق دینے میں احتیاط رکھے کیونکہ اب اگر دو طلاق بھی دیدے گا تو بیوی مغلّظہ ہوجائے گی اور دوبارہ نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۰۷/۲۷ ہ)

دو مرتبہ ''طلاق دیا'' کے الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- میں نے ایک مرتبہ غصّے کی حالت میں اپنی بیوی کو دو طلاق کہا، طلاق اس طرح کہا: ''طلاق دیا، طلاق دیا'' اُس کے بعد بہت پشیمان ہوکر اُسی وقت بیوی کی خوشامد کی اور معافی مانگ کر اپنے گھر آٹھ روز تک نہایت خوش اور محبت سے رہ کر میکے چلی گئی، گھر لاکر میں نے بیوی کو کہا کہ میں نے تیرا نام کہہ کر تو نہیں کہا، میکے میں بھی ہم دونوں نہایت محبت اور خوشی سے ملتے رہتے ہیں، چھ بچے اور میاں بیوی اب بھی ہر روز محبت سے ملتے رہتے ہیں، میں نے کوئی تحریر بھی اس کو لکھ کر نہیں دی جس سے طلاق ہوجاتی ہے، اب اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ طلاق صرف دو مرتبہ دی تھی، تین مرتبہ نہیں، تو آپ کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت (یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری) گزر چکی ہو تو رُجوع نہیں ہوسکتا، لیکن باہمی رضامندی سے نئے مہر پر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔[4]

بہرصورت! رُجوع کریں، یا نیا نکاح کریں، آئندہ آپ کو صرف ایک طلاق کا اختیار رہے گا، یعنی اگر آئندہ ایک مرتبہ بھی طلاق دے دی، خواہ زبانی ہو یا تحریری[5]، غصّے میں ہو[6]، یا مذاق میں[7]، بیوی آپ پر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔[8]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰۶/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲) دیکھئے: حوالہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۳) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۳ کا حاشیہ نمبر۵۔
(۴) حوالہ کے لئے ص:۳۰۳ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) حوالہ کے لئے آگے ص:۳۷۹ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۶ و ۷) حوالہ کے لئے ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۸) حوالہ کے لئے آگے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

لوگوں کے دباؤ کی بناء پر اپنی بیوی کے بجائے اس کی بہن کا نام لے کر طلاق دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص سلطان کا نکاح مسماۃ صاحبزادی کے ساتھ ہوا، اور برادری نے اس کو مجبور کیا کہ تم اس لڑکی کو طلاقیں دے دو، سخت مجبوری کی وجہ سے اُس کو کہنے لگے کہ: ''تم صاحبزادی کو طلاقیں دے دو'' سلطان کہتا ہے کہ میری بیوی کا نام صاحبزادی ہے، اور اُس کی دُوسری بہن کا نام نواب زادی ہے، میرا ارادہ یہ ہوا کہ برادری کے دباؤ سے بچ جاؤں اور اپنی بیوی کو طلاق دینے سے بھی بچ جاؤں، اُنہوں نے کہا کہ اس کی بیوی کا نام کیا ہے؟ (اُس وقت لڑکی کا والد موجود نہیں تھا) اور دُوسرے لوگوں کو اس کا نام نہیں آتا تھا، انہوں نے سلطان سے پوچھا کہ تیری بیوی کا کیا نام ہے؟ اُس نے جان بوجھ کر نواب زادی کہا، اُنہوں نے کہا اس کو تو طلاق دیدے، سلطان نے کہا کہ میں نے کہا کہ: ''نواب زادی کو چھوڑا ہے'' تین مرتبہ کہا، وہ خوش ہوگئے، گھر آکر اُس نے دو تین آدمیوں سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی صاحبزادی کو طلاق نہیں دی ہے بلکہ نواب زادی کو دی ہے، ان لوگوں سے بچنے کے لئے فرضی طور پر چھوڑا کا لفظ استعمال کردیا ہے۔ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ تمام واقعات صحیح ہیں تو سلطان کے مذکورہ جملے سے اُس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی[1]، وہ بدستور سلطان کے نکاح میں ہے، البتہ آئندہ اس قسم کی باتوں سے احتیاط کرنا چاہئے اور دباؤ کا خطرہ ہو تو پہلے سے کسی مفتی عالم سے ایسا طریقہ پوچھ لیں جس سے دباؤ بھی ختم ہوجائے اور طلاق بھی واقع نہ ہو، کیونکہ اس طرح بعض صورتوں میں طلاق ہو بھی جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۵/۲۸ ج)

''چل تجھے طلاق ہے، طلاق ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- بیان حق نواز ولد فیض قوم بلوچ 6-7-1980 بروز ہفتہ کا واقعہ ہے، میرے اور میری بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا، میری بیوی ناراضگی کی وجہ سے اپنی ہمشیرہ شادی شدہ کے گھر چلی گئی اور میری ساس بھی آئی ہوئی تھی، میں اپنی سالی کے گھر گیا اور اپنی ساس کو سمجھانے لگا کہ خدا کے لئے تو

---

(۱) فی الھندیة ج:۱ ص:۳۵۸ ولو قال امرأته الحبشية طالق ولا نية له فی طلاق امرأته وامرأته ليست بحبشية لا يقع عليها وعلى هٰذا اذا سمى بغير اسمها ولا نية له فی طلاق امرأته. وفی الھندیة ج:۱ ص:۳۵۸ قال امرأته عمرة بنت صبيح طالق وامرأته عمرة بنت حفص ولا نية لهٗ لا تطلق امرأته.... الخ.

اپنی لڑکی مسماۃ افضل خاتون کو سمجھا، وہ مجھے سخت الفاظ کہنے لگی، میرا اس کے ساتھ سخت کلام ہوا، میں نے کہا: نہ تو وہ میری روٹی پکاتی ہے اور نہ مال مویشی کو پانی پلاتی ہے۔ اتنے میں وہ آگئی یعنی میری بیوی، اس نے مجھے سخت بُرا بھلا کہا اور گالی گلوچ دینے لگی، میں نے غصّے میں آکر یوں کہا کہ: ''چل تجھے طلاق ہے، طلاق ہے'' موقع پر میری بیوی، میری سالی نذیراں، مریم، سکینہ، میری زوجہ موجود تھیں، نذیراں، مریم سکینہ کے بیانات میں سہ طلاق کا ذکر ہے، حق نواز کی سالی نے ۱۲ طلاق کا ذکر کیا ہے، جو کہ حق نواز کی مخالفت میں پیش پیش ہے، اس طرح حق نواز کی سالی بھی اپنی والدہ کی حمایت میں ہے، صرف دو عورتیں غیر جانبدار ہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر حق نواز کا بیان دُرست ہے تو اس کی بیوی پر دو طلاق واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ اگر عدّت کے دوران حق نواز نے رُجوع نہ کیا تو عدّت گزرنے پر اس کی بیوی بائنہ ہوجائے گی،[1] اور جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، البتہ عدّت کے دوران حق نواز کو رُجوع کرنے کا حق حاصل ہے،[2] اگر اس نے رُجوع کرلیا تو وہ بدستور حق نواز کی بیوی رہے گی، البتہ آئندہ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوجائے گی، اور بغیر حلالہ کے حلال نہ ہوگی۔[3]

واللہ اعلم

۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۶۶/۲۱ د)

''میں آپ کی لڑکی کو طلاق دے رہا ہوں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- ''آج میں آپ کی لڑکی کو طلاق دے رہا ہوں، میرے اس کو طلاق دینے کے وجوہات یہ ہیں، اس نے میری بے عزّتی دولڑکے ذات گوجر سالا اور بہنوئی کے پاس سے کرائی، اس بے عزّتی کی وجہ صرف اس کی بدمعاشی تھی، کیونکہ اس نے ان کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے تھے، میں نے اس کو اس بات سے منع کیا، مگر اس نے میری پروا تک نہیں کی، آپ کی لڑکی کے کئی قسم کے فوٹو بھی اس لڑکے کے پاس ہیں جو کہ اس نے مجھے دِکھائے بھی تھے، مگر میں بات برداشت نہ کرسکا، اس لئے میں نے اس کو طلاق طلاق کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔'' کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- مندرجہ بالا تحریر سے لکھنے والے کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر عدّت کے دوران رُجوع کرسکتا ہے،[4] اور عدّت کے بعد باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔
(۳) حوالہ کے لئے آگے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۴) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شركت علميه) واذا طلّق الرّجل امرأته تطليقة رجعيّة أو تطليقتين فلهٗ أن يراجعها فی عدّتها .... الخ.

ہوسکتا ہے،[۱] مذکورہ تحریر میں اگر چہ لفظِ ''طلاق'' تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، لیکن آخری دو الفاظ طلاق دینے کے لئے نہیں طلاق کی وجہ بیان کرنے کے لئے ہیں، اس سے الگ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

الجواب صحیح واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۰/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۷۹/۲۱ الف)

''میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دی'' اور ''میں انہیں طلاق دیتا ہوں'' الفاظ کا حکم

سوال:- ۲۵/نومبر کو میری زوجہ خالدہ بیگم اور اُن کی والدہ بغیر میری اجازت کے اپنے بہنوئی کے یہاں چلی گئیں، جبکہ اُن کو کورنگی سے جا کر کپڑے لانے تھے، میں دفتر سے تقریباً ۷ بجے گھر پہنچا، معلوم کرنے پر چھوٹے سالے نے بتایا کہ امی اور باجی کورنگی گئی ہوئی ہیں، رات کے ۹ بجے ہیں، مجھے پریشانی لاحق ہوئی، چھوٹا بچہ ساتھ ہے، بہرحال ½ ۹ بجے اسکوٹر پر اپنے بہنوئی کے ساتھ آئیں، میں غصّے کی وجہ سے پلنگ پر لیٹ گیا، ساڑھو کے جانے کے بعد میں نے بیوی کو کافی ڈانٹا کہ کپڑے لینے نہیں گئیں اور بہن کے گھر چلی گئیں، اس پر انہوں نے کہا کہ: رُخسانہ بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ملنے گئے تھے۔ میں گھر سے اُٹھ کر جانے لگا تو میرے سسر نے مجھے روکنے کی کوشش کی، میں غصّے میں تھا، میں نے اُن سے کہہ دیا کہ ۱:- میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دی۔ ۲:- میں انہیں طلاق دیتا ہوں۔ اور پھر میری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی خالدہ بیگم منہ پھیر کر باہر کمرے میں چلی گئیں، میں فوراً گھر سے چلا آیا۔ عزیز واقارب کا اصرار ہے کہ تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے، بیوی دو ماہ کی حاملہ بھی ہے، جواب سے مطلع فرمائیں تاکہ شریعت کے مطابق عمل کرسکوں۔

جواب:- اگر آپ نے سوال کے مطابق صرف دو مرتبہ ہی طلاق کے الفاظ استعمال کئے تھے، تین مرتبہ نہیں تو آپ کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران آپ رُجوع کرسکتے ہیں،[۲] جس کا طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں[۳] زبان سے یہ کہہ دیں کہ: ''میں نے اپنی بیوی کی طلاق سے رُجوع کرلیا''،[۴] اس کے بعد وہ بدستور آپ کی بیوی رہیں گی، لیکن آئندہ آپ کو صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، یعنی آئندہ اگر ایک مرتبہ بھی آپ کے منہ سے

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۴۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و۲۔ (۳ و ۴) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔

طلاق نکل گئی خواہ غصے میں ہو یا سنجیدگی سے ہر حالت میں آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوجائے گی،(۱) اور دوبارہ نکاح بھی بغیر حلالہ کے نہ ہوسکے گا،(۲) لہٰذا آئندہ طلاق کے معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۸۲/۲۷ و)

''میں تجھے طلاق دیتا ہوں'' دو مرتبہ کہنے کا حکم اور رُجوع کا بہتر طریقہ

سوال:- مسمّٰی محمد تقی ولد حاجی عبدالغنی مرحوم ساکن 52/8 C-4 لانڈھی کالونی کراچی نے دو ماہ قبل اپنی منکوحہ بیوی نورجہاں بیگم دُختر نواب بیگ کو غصّے کی حالت میں اور مکان سے باہر سڑک پر کھڑے ہوکر دو بالغ گواہوں کی موجودگی میں اور مکان کی طرف منہ کرکے جیسے کہ وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہو دو مرتبہ بلند آواز میں یہ کہا کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں، میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔'' بیوی نے کہا کہ: میں نے شوہر کے طلاق دینے کے جملے بالکل نہیں سنے۔ نورجہاں بیگم اپنے والد نواب بیگ کے گھر رہتی ہیں اور میاں بیوی میں جدائی ہوگئی ہے، اگر طلاق نہیں ہوئی تو کیا کفارہ کچھ واجب ہے؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ مسمّٰی محمد تقی نے صرف دو مرتبہ اپنی بیوی کو یہ جملہ کہا ہے کہ: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں''، تین مرتبہ نہیں کہا تو اس کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں، جن کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران (یعنی طلاق کے بعد سے تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے) اگر شوہر رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے،(۳) اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تمہاری طلاق سے رُجوع کرلیا''۔(۴) اور عدّت گزرنے کے بعد شوہر رُجوع تو نہیں کرسکتا البتہ باہمی رضامندی سے نئے مہر پر دُوسرا نکاح ہوسکتا ہے،(۵) اور اس کا کفارہ کوئی نہیں۔

واضح رہے کہ شوہر رُجوع کرے یا نیا نکاح، ہر صورت میں اب اسے صرف ایک طلاق کا اختیار رہ جائے گا، اور آئندہ ایک مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی بالکل حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔(۶)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۶/۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے: حوالہ سابقہ ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔
(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و ۲۔
(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۶) دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور حواشی نمبر۱ تا ۳۔

''طلاق دیتا ہوں'' الفاظ کا حکم اور زبان سے رُجوع کا طریقہ

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق نامہ بھیجا، جن کے الفاظ یہ ہیں: ''میں محمد انور ولد گل محمد عثمانی باوانی مسماۃ مہر النساء دُختر عثمانی نور محمد باوانی کو طلاق دیتا ہوں، وہ اب میری بیوی نہیں ہے۔'' اس طلاق نامے پر دو گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں، اس طلاق نامے کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرعی فیصلے سے ممنون فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مہر النساء پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت یعنی طلاق کے بعد سے تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنے کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، لیکن شوہر کو اختیار ہے کہ وہ عدّت گزرنے سے پہلے پہلے اگر چاہے تو رُجوع کرسکتا ہے[1]، اگر زبان سے کہہ دے کہ: ''میں نے طلاق سے رُجوع کرلیا'' تو مہر النساء دوبارہ اس کی بیوی بن جائے گی[2]، لیکن عدّت گزرنے کے بعد اس کو یہ اختیار باقی نہ رہے گا۔[3]

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۵/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' کہنے کا حکم

سوال:- ایک نابالغہ بچی کا ۳-۴ سال کی عمر میں نکاح کردیا گیا، بعد ازاں وہ مرد جس سے اس نابالغہ کا نکاح ہوا تھا، اُس نے رُوبرو گواہوں کے یہ کہہ دیا کہ: ''میں نے یہ رشتہ نہیں لیا، جدھر مرضی ہو وہ شادی کرلیں، کیونکہ لڑکی مجھے پسند نہیں ہے۔'' گواہ موجود ہیں جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اس مرد نے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ بمعہ اہلِ خانہ کے اعلانیہ کہا کہ: ''میں نے اسے چھوڑ دیا، جدھر چاہیں دے دیں۔'' کیا اس لڑکی کا نکاح اس مرد سے رہا یا نہیں؟ بچی جوان ہے عصمت کا خطرہ ہے، مذکورہ بالا بیان حلفیہ ہے۔

جواب:- اگر یہ بیان دُرست ہے کہ مرد نے رُخصتی سے پہلے ہی اُس منکوحہ کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے کہ: ''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' تو صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر طلاقِ بائن واقع

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔　(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۳۔
(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۳۳ کا حاشیہ نمبر ۵۔

ہوگئی ہے،[1] اور چونکہ رُخصتی نہیں ہوئی، اس لئے اس پر عدّت بھی واجب نہیں، وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے کہ جبکہ شوہر نے واقعۃً یہ الفاظ کہے ہوں کہ: ''میں نے اُسے چھوڑ دیا'' اگر کوئی اور الفاظ کہے ہوں تو وہ لکھ کر بھیجئے ان کے مطابق جواب دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳/۷ ۲۹ ب)

میمنی زبان میں ''میں تم کو رجاء دیتا ہوں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- محمد طیب نے اپنی بیوی کو غصّے کی حالت میں یہ لفظ کہے: ''میں تمہیں اجازت دیتا ہوں'' اور اس سے مراد اس کی طلاق تھی، اب شریعت میں طلاق ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے تو کون سی طلاق ہوتی ہے؟ (اور یہ الفاظ گجراتی زبان میں ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' تین مرتبہ کہا ہے)۔

تنقیح:-

پہلے یہ بتایئے کہ گجراتی زبان میں جب بیوی سے یہ کہا جائے کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' تو کیا یہ لفظ صرف طلاق ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا اس کا کوئی اور مطلب بھی ہوسکتا ہے؟ اس سوال کا واضح جواب اسی کاغذ پر لکھ کر دیں، تو اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

جوابِ تنقیح:-

جھگڑے کے درمیان بیوی نے شوہر سے کہا کہ: تم مجھ کو رضا دے دو، اس پر شوہر نے تین مرتبہ کہا کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' رضاء کے معنی اجازت کے بھی آتے ہیں، جیسے شادی میں کہیں جانا ہو تو بیوی رضا چاہتی ہے، اُس وقت بھی شوہر کہتا ہے کہ: ''میں تم کو رضا دیتا ہوں'' لیکن یہ جس موقع کی بات ہے اُس وقت اُس سے طلاق ہی کی نیت تھی اور اُس کے لئے ہی یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

جواب:- تحریری و زبانی جوابِ تنقیح سے، نیز میمنی زبان کے دُوسرے اہلِ زبان سے تحقیق کرکے معلوم ہوا کہ میمنی زبان میں لفظ ''رجا'' کے معنی اگرچہ دُوسرے بھی ہوتے ہیں، لیکن طلاق کے سوا دُوسرے معنی مراد لینے کے لئے قرینہ یا دلالتِ حال کی ضرورت ہے، اور کسی قرینے یا دلالتِ حال کے بغیر اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے کہے کہ: ''میں نے تم کو رجا دے دی ہے'' تو اس سے طلاق ہی کے معنی

(۱) وفی ردّ المحتار کتابُ الطّلاق باب الکنایات ج:۳ ص:۲۹۹ (طبع سعید) فانّ سرّحتک کنایة لٰکنه فی عرف الفرس غلب استعماله فی الصّریح فاذا قال: "رها کردم" أی سرّحتک یقع به الرّجعی مع انّ اصله کنایة أیضًا، وما ذاک الّا لأنّه غلب فی عرف الفرس استعماله فی الطّلاق، وقد مرّ أن الصّریح ما لم یستعمل الّا فی الطّلاق من أیّ لغة کانت ..... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۲۵، امداد المفتین ص:۶۱۶، امداد الاحکام ج:۲ ص:۴۴۳، اور آگے ص:۳۶۵ کا فتویٰ۔

سمجھے جائیں گے، اور یہ علامت اس لفظ کے صریح طلاق ہونے کی ہے،[۱] اور اس کی نظیر اُردو میں ''چھوڑ دیا'' ہے،[۲] اور فارسی میں ''رہا کردم'' [۳] کہ اگر یہ طلاق کے سوا بولے جائیں تو طلاق ہی کے معنی ہوتے ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تینوں طلاقیں چونکہ صریح ہیں اس لئے تینوں واقع ہوگئیں، اور محمد طیب کی بیوی مغلّظہ ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر وہ محمد طیب کے لئے حلال نہیں ہوسکتی،[۴] اور نہ حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔[۵]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۹/۴/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۷/۲۸ ب)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۷/۴/۶ھ

''ایک طلاق دے رہا ہوں'' الفاظ سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی

سوال:- ہماری ہمشیرہ افشین اعجاز جو کہ محمد یوسف کے نکاح میں تھی، محمد یوسف کے اس لیٹر پر جس میں اس نے اس کو طلاق دی ہے کیا پرچے کے حساب سے جو تاریخ اس نے دی ہے تاریخ گزر جانے پر اس کو طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس تاریخ کو محمد یوسف نے منسلکہ پرچہ تحریر کیا، اس تاریخ کو اس کی بیوی افشین اعجاز پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی، جس کی عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزرنا ہے،[۶] اگر عدّت کے دوران محمد یوسف نے اس طلاق سے رُجوع نہیں کیا تو عدّت گزرنے پر افشین اعجاز اس کے نکاح سے خارج ہوکر کسی دُوسری جگہ نکاح کرنے کے لئے آزاد ہوگی،[۷] البتہ اگر یہ میاں بیوی چاہیں تو آپس میں دوبارہ نئے مہر پر نئے ایجاب وقبول کے ساتھ عدّت کے بعد بھی نکاح کرسکتے ہیں۔[۸]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۹۵)

طلاق نامہ

میں محمد یوسف ولد محمود احمد نے تمہارے اور تمہارے والدین کے پیدا کئے ہوئے نامناسب حالات اور نازیبا اور جابرانہ سلوک اور زبردستی اور بار بار تمہاری اور تمہارے والدین کی طرف سے طلاق کی بلا جواز اور ناجائز مانگ کی وجہ

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع سعید) .... فیقع بلا نیّة للعرف. وفی الشامیة (قوله فیقع بلا نیّة للعرف) أی فیکون صریحًا لا کنایة .... وقد مرّ أن الصّریح ما غلب فی العُرف استعمالهُ فی الطّلاق بحیث لا یستعمل عرفا الّا فیه من أیّ لغة کانت، وهٰذا فی عرف زماننا کذٰلک فوجب اعتباره صریحًا کما أفتی المتأخّرون فی ''انت علیّ حرام'' بانّه طلاق بائن للعُرف بلا نیّة مع أنّ المنصوص علیه عند المتقدّمین توقّفه علی النّیة.

(۲،۳) لفظ ''چھوڑ دیا'' کے طلاق صریح ہونے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور اگلے صفحہ: ۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۴،۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۶) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

(۷) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر ۲۔

(۸) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر ۱۔

سے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں بطور تنبیہ ایک طلاق شریعت کے حکم کے مطابق دُوں، کیونکہ تم لوگوں کی طرف سے تحریری اور زبانی کئی کئی بار اور کئی مواقع پر طلاق کا مطالبہ ہوچکا ہے، اور تم سب اسی بات پر بضد ہو، حالانکہ ہماری طرف سے یہ نکاح قائم رکھنے کی ساری کوششیں تم سب ضائع کر رہے ہو، جس کا جواب وہ دُنیا والوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور، میں یا میرے خاندان والے ہرگز نہیں ہیں، اس کی مکمل ذمہ داری تم پر اور تمہارے والدین پر عائد ہوتی ہے، ہمارے خاندان میں تو طلاق کو نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور کوئی بھی باشعور آدمی اس لفظ کو اپنی زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرتا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ جائز اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند اللہ تعالیٰ کو طلاق ہے۔

ایک طلاق میں اس لئے دے رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے مستقبل قریب میں تم راہِ راست پر آجاؤ، اور غیروں کی باتوں میں اپنے کے بجائے میری فرمانبردار ہوجاؤ اور میری باتیں سنو اور سمجھ جاؤ، اور فی الحال جو چھوٹے چھوٹے مسائل اور فضول کی باتوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دُور کردو، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ تم ابھی شرعاً اور قانوناً میری منکوحہ بیوی ہو۔

اس لئے بطور پہلے قدم کے میں تمہیں ایک طلاق دے رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس تنبیہ یا Warning کی وجہ سے انشاء اللہ تعالیٰ تم اپنا رویہ بدل ڈالو اور میرے ساتھ ایک اچھی اور خوشگوار زندگی مستقبل قریب میں بسر کرنے کے لئے راضی ہوجاؤ، لیکن اگر تم نے نفی میں اس بات کا جواب دیا تو میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس معاملے کو سنجیدگی اور فراخدلی سے زیرِ نظر رکھوگی، میں تمہارے جواب کا ایک مہینے تک انتظار کروں گا، فقط۔

محمد یوسف

۳ر نومبر ۱۹۹۷ء

تین مرتبہ لفظ ''چھوڑا'' استعمال کرنے کا حکم

سوال:- زید نے بحالتِ غصہ اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے: ''چھوڑا، چھوڑا، چھوڑا'' کیا ان الفاظ سے طلاق ہوگئی؟

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ طلاق کے ماحول کے پیشِ نظر ''چھوڑا'' کی اضافت زوجہ ہی کی طرف تھی، اور ''چھوڑا'' ہمارے عرف میں طلاقِ صریح ہے،(۱) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاقِ مغلّظ واقع ہوگئی، اب حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۱/۱۹ الف)

---

(۱) فی الشامیة ج:۳ ص:۲۹۹ (طبع ایچ ایم سعید) بخلاف فارسیة قوله سرحتک وهو "رها کردم" لأنّه صار صریحًا فی العرف علی ما صرّح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری .... فان سرحتک کنایة لٰکنه فی عرف الفرس غلب استعماله فی الصّریح، فاذا قال "رها کردم" أی سرحتک یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة أیضًا وما ذاک الّا لأنّه غلب فی عرف الفرس استعماله فی الطّلاق وقد مرّ ان الصریح ما لم یستعمل الّا فی الطّلاق من أیّ لغة کانت.

وفیها أیضًا ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع ایچ ایم سعید) (قوله فیقع بلا نیّة للعرف) أی فیکون صریحًا لا کنایة .... وقد مرّ ان الصریح ما غلب فی العرف استعماله فی الطّلاق بحیث لا یستعمل عرفًا الا فیه من أیّ لغة کانت، وهٰذا فی عرف زماننا کذالک فوجب اعتباره صریحًا کما افتی المتأخّرون فی انت علیّ حرام بأنّه طلاق بائن للعرف بلا نیّة مع ان المنصوص علیه عند المتقدّمین توقّفه علی النیّة. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۲۵، امداد المفتیین ص:۶۱۶، امداد الاحکام ج:۲ ص:۴۴۳۔

ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنے غیظ وغضب کی حالت میں زبان سے طلاق کا لفظ چھوڑ دیا، یعنی طلاق کہہ دیا، عدد استعمال نہیں کیا، اب مذکورہ صورت پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کتنی واقع ہوگی؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعہ دُرست ہے اور طلاق کا لفظ ایک سے زائد مرتبہ استعمال نہیں کیا تو مذکورہ صورت میں اس کی بیوی پر ایک طلاقِ رجعی ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران یعنی تین ماہواریاں گزرنے سے پہلے اگر شوہر چاہے تو رُجوع کرسکتا ہے،[1] جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں بیوی سے یہ کہہ دے کہ: ''میں نے تم سے رُجوع کیا''،[2] اور عدّت گزرنے کے بعد دونوں کی رضامندی سے نئے مہر پر نیا نکاح ہوسکتا ہے،[3] البتہ دونوں صورتوں میں اب اس کو صرف دو طلاقوں کا اختیار باقی رہے گا، یعنی آئندہ اگر اس نے صرف دو مرتبہ بھی طلاق دی تو بیوی مغلّظہ ہوکر حرام ہوجائے گی، پھر حلالہ کے بغیر نیا نکاح بھی نہ ہوسکے گا،[4] لہٰذا آئندہ طلاق کے معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۱ الف)

''طلاق دے دُوں گا'' کے الفاظ سے طلاق نہیں ہوتی

سوال:- تین ماہ قبل میرے سسر مجھ سے اپنی لڑکی مسماۃ حمیدہ بیگم دختر نکا خان کے نام دباؤ ڈال کر زرعی اراضی لکھوانا چاہتے تھے، میں نے انکار کردیا اور کہا کہ: ''ایسی صورت میں تمہاری لڑکی کو طلاق دے دُوں گا''، اور کچھ نہیں کہا، اس وقت غصّے کی حالت میں تھا، آیا طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر واقعۃً وہی خط کشیدہ الفاظ کہے تھے جو سوال میں لکھے ہیں، یعنی ''طلاق دے دُوں گا'' تو ان سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی،[5] لیکن آئندہ طلاق کے الفاظ بولنے میں سخت احتیاط

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔ (۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۳) حوالہ کے لئے ص:۳۷۳ کا حاشیہ نمبر۱ دیکھئے۔ (۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ تا ۳۔
(۵) وفی الفتاویٰ تنقیح الحامدیة کتاب الطّلاق ج:۱ ص:۳۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) صیغة المضارع لا یقع بها الطّلاق الّا اذا غلب فی الحال کما صرّح به الکمال بن الهمام.
وفی الدّر المختار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۹ (طبع سعید) .... بخلاف قوله طلّقی نفسک فقالت أنا طالق، أو أنا اطلّق نفسی، لم یقع لأنّه وعد .... الخ.

لازم ہے، اور اگر الفاظ کچھ اور بولے تھے تو الفاظ ٹھیک ٹھیک یاد کرکے لکھیں اور دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۱/۲۸ ج)

طلاق کی تعداد میں شک ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- قریباً ۴½ سال قبل میں (محمود شوکت)، میری بیوی اور ایک بیٹی عمر ۶ ماہ کے ہمراہ سسرال میں قیام پذیر تھا، میرا اپنا گھر پنجاب میں ہے، یہاں کراچی میں رہنے کی وجہ سے مجھے اکثر گیس ٹربل کی تکلیف ہوا کرتی تھی۔ ایک روز مجھے شدید تکلیف کا دورہ ہوا، اور اسی دوران ایک معمولی بات کی وجہ سے چھوٹی سالی سے تکرار کر بیٹھا، اُس کی باتوں کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اپنی بیوی سے اُلجھا، اس سے پیشتر بیوی سے تعلقات اچھے تھے اور کوئی جھگڑا نہ تھا، لیکن اُس وقت شدید غصّے کے عالم میں اور اپنے مرض کی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہوئے نادانی میں تحریراً طلاق لکھ دی، یہ عمل صرف سسرال پر دباؤ ڈالنے کے لئے کیا تھا، اس لئے مجھے طلاق کی تعداد کا کامل یقین نہیں ہے کہ کتنی دفعہ دی ہے۔ دُوسرے روز اپنی حرکت پر اس قدر پریشان ہوا اور اپنے سسر صاحب سے اپنی پشیمانی کا اظہار کیا، بیوی سے بھی معافی مانگی، اُس کو اپنے ہمراہ پنجاب چلنے پر آمادہ کیا، میرے بار بار اصرار پر میری بیوی نے معاف کردیا، چونکہ اپنی بیوی سے تعلقات ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھا، اس لئے میں اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلا گیا، اور لیٹر بھی (طلاق نامہ) پھاڑ دیا، اس واقعے کے چوتھے روز میں خود مفتی شفیع صاحب مرحوم کی قیام گاہ پہنچا، اُنہوں نے تعداد کے یقین کے بارے میں پوچھا، لیکن میں خود بھی تعداد کے بارے میں یقین نہ رکھتا تھا، اور اُسی دن اپنی بیوی اور بچی کو لے کر پنجاب چلا گیا۔

آج اُس واقعے کو گزرے ہوئے تقریباً ۴½ سال گزر چکے ہیں، لیکن میرے سسر صاحب اب تک مطمئن نہیں ہوئے ہیں، اور اُنہوں نے مجھ سے اور اپنی بیٹی سے تعلقات منقطع کرلئے ہیں، یہ حالات ہمارے خاندان کی رُسوائی کا موجب بنے ہوئے ہیں، ہمارے حالات اور میری نیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں شرعی فیصلہ دیں تاکہ ہم اپنی آئندہ زندگی سکون سے گزار سکیں۔ نہ ہی میری بیوی کو تعداد کا یقین ہے کہ کتنی مرتبہ لکھی ہے، دو دفعہ یا تین دفعہ۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں محمود شوکت اور فرحت دونوں کو پوری احتیاط اور غور وفکر کے ساتھ یاد کرنا چاہئے کہ کتنی طلاقیں لکھی تھیں؟ اور جو دُوسرے لوگ اس وقت موجود تھے یا انہوں نے تحریر پڑھی تھی اُن سے بھی تحقیق کرنی چاہئے، اگر خود یاد آجائے یا کسی دُوسرے پڑھنے والے کے بیان سے

یہ گمانِ غالب قائم ہوجائے کہ تین طلاقیں دے دی تھیں، تو فرحت اپنے شوہر پر حرام ہوگئی، اس پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور حلالہ کے بغیر دونوں کے درمیان دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکتا، دونوں پر فرض ہے کہ فوراً ایک دُوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیں، اور جتنا عرصہ طلاق کے بعد ساتھ گزرا اس پر توبہ و اِستغفار کریں، لیکن اگر غور وفکر اور تحقیق کے بعد بھی یاد نہ آئے کہ کتنی طلاقیں لکھی تھیں اور نہ کسی طرف گمان غالب ہو تو صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ محمود شوکت کی بیوی پر دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں اور چونکہ محمود شوکت نے عملاً ان سے رُجوع کرلیا ہے اس لئے فرحت بدستور اس کی بیوی ہے، البتہ اب محمود شوکت کو صرف ایک طلاق کا اختیار باقی ہے، یعنی اب اگر وہ ایک طلاق بھی دیدے گا خواہ غصّے میں دے یا مذاق میں دے تو اُس کی بیوی اُس پر حرام ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہ ہوگی۔

مذکورہ صورت میں اگرچہ محمود شوکت کو اپنی بیوی کو رکھنے کا اختیار ہے، لیکن چونکہ حلال وحرام کا معاملہ نازک ہے، اور اس کو تردّد پیدا ہوگیا ہے، اور بعض فقہاء ایسی صورت میں بھی تین طلاقوں کے وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں، لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ وہ بہرصورت بیوی سے علیحدگی اختیار کرلے، اور اس کی عدّت گزار کر بیوی کسی اور جگہ نکاح کرلے، پھر اگر کسی وجہ سے دُوسرا شوہر خود طلاق دیدے تو اس کی عدّت کے بعد محمود شوکت بھی اس سے نکاح کرسکے گا۔

والدليل على كل ذٰلک ما يأتي

۱:- قال الله تعالىٰ: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ." (۱)

۲:- عن عليّ رضي الله عنه قال: سمع النبي صلى الله عليه وسلم رجلًا طلّق البتة فغضب وقال: تتخذون اٰيات الله هزوًا أو دين الله هزوًا أو لعبًا؟ من طلق البتة الزمناه ثلاثا لا تحل له حتى تنكح زوجًا غيره .... وفي حديث ابن عمر قال: قلت: يا رسول الله! أرأيت لو طلّقتُها ثلاثًا، قال: اذًا عصيت ربک وبانت منک امرأتک. (المغني لابن قدامة ج:۷ ص:۱۰۳). (۲)

وقد أخرج البيهقي قصة طلاق الحسن بن علي امرأتهٗ ثلاثًا وفيه حديث مرفوع الى النبي صلى الله عليه وسلم.

۳:- قال ابن نجيم: شک أنه طلّق واحدة أو أكثر بنى على الأقل كما ذكره الاسبيجابي الّا ان يستيقن بالأكثر أو يكون أكبر ظنه علىٰ خلافه وان قال الزّوج عزمت علىٰ أنّه ثلاث يتركها. (الاشباه والنظائر، مجتبائي ج:۱ ص:۸۱، القاعدة الثالثة). (۳)

۴:- وعن الامام الثاني اذا كان لا يدري أثلاث أم أقلّ يتحرّى وان استويا عمل بأشد

---

(۱) سورة البقرة: ۲۳۰.

(۲) كتاب الطّلاق تحت مسئلة ۱۲۴۸ ج:۱۰ ص:۳۳۲ (طبع دار عالم الكتب رياض).

(۳) الاشباه والنظائر الفن الأول القاعدة الثالثة ص:۹۱ (طبع ادارة القرآن كراچي و ص:۶۴ طبع قديمي كتب خانه).

ذٰلک علیہ اشباہ عن البزازیۃ قال ط وعلی قول الثانی اقتصر قاضی خان ولعلّہ لأنّہ یعمل بالاحتیاط خصوصًا فی باب الفروج اھـ. قلت ویمکن حمل الأول علی القضاء والثانی علی الدیانۃ. (شامی ج:۲ ص:۴۵۴)۔[(۱)]

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مفتی کو علمِ غیب نہیں ہوتا، اُس کے سامنے جیسا سوال کیا جائے گا، وہ اُس کے مطابق جواب دے گا۔ سوال کی صحت کی ذمہ داری سائل پر ہے، اور چونکہ معاملہ حلال وحرام کا ہے، اور ہر شخص کو آخرت میں اپنی جواب دہی کرنی ہے، لہٰذا بہت احتیاط اور غور وفکر کے ساتھ یہ متعین کیا جائے کہ کتنی طلاقیں دی تھیں؟ اگر ذرا بھی گمان غالب تین طلاقوں کا ہو تو دونوں کا ساتھ رہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۷/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰۵/۲۹ ب)

''میں نے اس کی بہن کو چھوڑا'' کے الفاظ دو مرتبہ کہنے کے بعد طلاق کی خبر کسی کو دینے سے مزید طلاق نہ ہونے کا حکم اور رُجوع کا طریقہ

سوال:- زید کی مار پیٹ سالے سے ہو رہی ہے، میرا میاں بیوی کا کوئی جھگڑا نہیں، میں نے طلاق دی تھی اور میری بیوی اندر کمرے میں تھی، میں نے دو دفعہ سالے کو یہ کہہ دیا: ''میں نے اس کی بہن کو چھوڑا'' فوراً ایک عورت نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، یہی عورت اس بات کی گواہ ہے، میں نے سالے کی دُکان پر جا کر غل مچایا: ''میں اس کی بہن کو چھوڑ آیا ہوں'' اب تو یہ بتلا کر میں نے اور کئی جگہ بھی کہا، یہ بات آٹھ روز پہلے کی ہے، ان لوگوں نے میری بیوی کی چوڑیاں بھی اُتار لیں، کیا اس صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں،[(۲)] ان دو طلاقوں کے بعد سالے کی دُکان پر جو الفاظ سائل نے یعنی: ''میں اس کی بہن کو چھوڑ آیا ہوں'' یہ طلاقِ جدید کا انشاء نہیں بلکہ سابق دو طلاقوں کی خبر ہے، اُردو محاورے کے لحاظ سے ''چھوڑ آیا ہوں'' کا یہی مفہوم ہے، اور سائل سے زبانی دریافت کیا گیا تو اس نے بھی اسی مراد کا اظہار کیا ہے، لہٰذا اس جملے سے تیسری طلاق واقع نہیں ہوئی۔ تین مرتبہ ایامِ ماہواری سے پہلے پہلے اگر شوہر طلاق سے رُجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے،[(۳)] اور رُجوع کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں بیوی سے کہے کہ: ''میں نے تمہاری

---

(۱) ردّ المحتار قبیل باب طلاق غیر المدخول بھا. ج:۳ ص:۲۸۳ (طبع سعید).

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ و۲، اور پچھلے صفحہ:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۰ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔

طلاق سے رجوع کرلیا"،[1] اس کے بعد وہ بدستور اس کی بیوی ہوگی، لیکن طلاق دے دی تو بیوی بالکل حرام ہوجائے گی، اور بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۷/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۸۹۵ ب)

الفاظ "طلاق لے لو" کا حکم
"المرأة کالقاضی" کا مطلب
عددِ طلاق میں زوجین کے اختلاف کا حکم

(زوجین میں الفاظ اور وقوعِ طلاق میں اختلاف کے فیصلے اور تحکیم کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مولانا سیاح الدین کاکاخیلؒ کے سوال کا مفصل و مدلل جواب)

سوال:- مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں تحقیقی اور کتبِ فقہ حنفی کے حوالوں کے ساتھ جواب تحریر فرمایئے، بڑی مہربانی ہوگی۔

ایک لڑکی کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر نے دو دفعہ طلاق دی تھی، جس کے بعد بھی مجھے پاس رکھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ طلاق کن الفاظ سے واقع ہوتی ہے اور اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟ اس لئے میں نے والدین سے کوئی ذکر نہیں کیا، اور شوہر کے ساتھ رہتی رہی، کچھ عرصہ بعد اُس نے ایک دفعہ غصّے میں آکر ایک دم تین مرتبہ طلاق دے دی، مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اس طرح کہنے سے عورت مرد پر مستقل حرام ہوجاتی ہے، اس لئے نہ عام طور سے کسی کو اس کا ذکر کیا اور نہ سمجھی کہ مجھے تین طلاقیں ہوچکی ہیں اور میں اُس شوہر پر حرام ہوچکی ہوں، البتہ اپنی والدہ سے اس کا ذکر کیا تھا، مگر ڈر تھا کہ والد صاحب کو داماد کی ایسی باتوں اور غصّے کا علم ہوجائے تو اس سے ناراض ہوگا جھگڑا ہوجائے گا، اس لئے والد کو نہیں بتایا، اور والدہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، کچھ عرصہ بعد کسی اور سے یہ مسئلہ معلوم ہوا، اور بہشتی زیور دیکھ کر خود بھی اس کا علم ہوا کہ ایسی صورت میں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور عورت اس مرد کے لئے حرام ہوجاتی ہے، اس لئے خوفِ خدا کی بنا پر میں اب اس مرد کے پاس نہیں رہ سکتی، اور اب اُس نے والد کو بھی یہ واقعہ بتادیا ہے، (لڑکی کا خود لکھا ہوا تفصیلی بیان آپ ملاحظہ فرمایئے)۔ اس کے جواب میں شوہر کہتا ہے کہ ہاں میں نے پہلی دفعہ غصّے میں آکر کہا تھا: "مجھ سے طلاق لے لو" پھر نادم ہوا اور اس کو میں نے طلاق سمجھا ہی نہیں تھا، پھر ایک دُوسرے موقع پر غصّے میں آکر کہا کہ: "طلاق

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر۳۔

لے لو' اور اس کو بھی میں نے طلاق نہیں سمجھا اور بیوی کو اپنے پاس رکھا، پھر ایک موقع پر غصے میں آ کر طلاق کے الفاظ دو دفعہ محض بیوی کو ڈرانے دھمکانے کے ارادے سے کہے، (شوہر کا اپنا تحریر کردہ بیان بھی آپ ملاحظہ فرمائیے)۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ لڑکی کہتی ہے کہ میرا نکاح ٹوٹ گیا ہے، میں اس شوہر کے ہاں نہیں رہ سکتی۔ لڑکا کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے، کیونکہ میں نے ان الفاظ کو طلاق سمجھا ہی نہیں، اور اگر آخری الفاظ کو طلاق قرار بھی دیا جائے تو بس دو دفعہ کہا ہے، اور میں رُجوع کر چکا ہوں، اور بیوی کو اس کے بعد بھی اپنے پاس بیوی بنا کر رکھا تھا، اب بھی وہ میری بیوی ہے۔ ان دونوں نے تحریری بیان دے کر ایک عالمِ دین کو اس بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے، جو وہ فیصلہ کریں گے دونوں مانیں گے، اس کا والد بھی کہتا ہے کہ حق واضح ہوجانے کے بعد شریعت کا فیصلہ مانوں گا، اور جو بھی فیصلہ شرعی طور پر صادر کردیا جائے میں اُسے تسلیم کروں گا۔

اس معاملے میں خصوصی اہمیت پر یہ طے کیا گیا ہے کہ دُوسرے علمائے کرام اور مفتیانِ اَحکامِ شرعی کی خدمت میں پیش کر کے اُن سے بھی استفادہ کیا جائے، اور پھر اُن فتاویٰ کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جائے، لہٰذا آپ سے بھی عرض ہے کہ مندرجہ بالا صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

۱:- کیا صرف دو طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور مرد رُجوع کر کے بیوی کو رکھ سکتا ہے؟

۲:- یا تین طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور حرمتِ مغلّظہ ثابت ہوئی ہے؟

۳:- اگر وہ مرد قسم کھا کر کہے کہ میں نے صرف دو طلاقیں دی ہیں تو اس کے حلف کا اعتبار کر کے اس کا قول معتبر قرار دیا جائے گا یا نہیں؟

۴:- ظاہر ہے کہ گواہ تو بالکل موجود نہیں، تو اس صورت میں قضاءً و دیانۃً حکم ایک ہے یا مختلف؟

۵:- عورت اس حکم پر عمل کرے گی جو قضاءً ہے یا اس پر جو دیانۃً ہے؟ ایک مفتی اس کو کیا مسئلہ بتائے گا؟

۶:- فقہائے کرام جو عموماً "المرأۃ کالقاضی" لکھتے ہیں، اس سے یہ مراد ہے کہ ایسی صورت میں قضاءً جو حکم ہوسکتا ہے عورت بھی اس حکم پر عمل کرے گی یا اس جملے کا مطلب کچھ اور ہے؟

۷:- جس عالم کو دونوں نے اس معاملے میں فیصلہ دینے کا اختیار دیا ہے، اس کی حیثیت حَکَم اور قاضی کی ہے اور وہ قضاءً فیصلہ دے گا یا اس کی حیثیت ایک مفتی کی ہے اور وہ دونوں کو وہ فیصلہ سنادے جو دیانۃً حکمِ شرعی ہے؟ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر غور فرما کر کتبِ فقہ کے مفصل حوالے

دیجئے جس کی روشنی میں اُس عالمِ دین کو پوری جرأت کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع ملے اور وہ عنداللہ ماٴخوذ نہ ہو۔

سائل:- (حضرت مولانا) سیّد سیاح الدین کاکاخیل
(مدرسہ اشاعت العلوم گھنٹہ گھر کچہری بازار فیصل آباد)

لڑکی کا بیان

میرے شوہر نے ایک دفعہ مجھے اپنے گھر میں کہا: ''جا میں نے تجھے طلاق دی''، اور اس پر میں نے اُن سے کہا: آپ یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں، اور بہت سے الفاظ ہیں، اس کے علاوہ استعمال کے لئے، لہٰذا کچھ دنوں کے بعد یہ مجھ سے بولنے لگے ہیں یعنی خود میں نے اُن کو بلایا، دُوسری بار اُنہوں نے مجھے راہووالی میں کہا: ''جا تجھے میں نے طلاق دی'' صرف تمہارے والد کا انتظار کرتا ہوں، جب وہ آجائیں گے تو تم ان کے ساتھ چلی جانا، مجھے تمہاری ضرورت نہیں، اگر ابھی جانا چاہو تو ابھی چلی جاؤ، میں سیٹ بک کروادیتا ہوں، تم اکیلی جاؤ، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، اس کے بعد جہاز میں ناراض ہوگئے اور مجھے بہت ناجائز باتیں کہہ دیں، میں نے کہا کچھ سوچ کر الفاظ نکالیں تو کہنے لگے: بکواس بند کرو، میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے، ''جا میں نے تجھے طلاق دی ایک، جا میں نے تجھے طلاق دی دو، جا میں نے تجھے طلاق دی تین'' یعنی ساتھ گنتے بھی رہے، لہٰذا میں خاموش ہوگئی یہ سوچ کر کہ گھر جاکر سب کچھ والدین سے کہہ دُوں گی، اور ساتھ یہ بھی سوچتی تھی کہ دادا کی وفات کا تازہ صدمہ اس کو پہنچا ہے اب یہ دُوسرا صدمہ کس طرح برداشت کریں گے؟ اس کے بعد راستے میں مجھے بڑی تاکید کی کہ دیکھنا جو تم نے کوئی بات اپنے والدین سے کی یعنی جو کچھ میں نے جہاز میں کہا ہے۔ میں اس کی بات سے ڈرگئی، گھر جاکر کسی سے کوئی بات نہیں کی، امی جان کو دو تین روز بعد یہ قصہ سنایا، وہ اس وقت جب یہ مجھ سے دوبارہ جھگڑنے لگے اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی تاکید کی کہ اباجان کو نہ بتاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا، میں نے امی جان کو تو بتادیا مگر یہ تاکید کی کہ اباجان کو نہ بتانا کیونکہ اس کی طبیعت سخت ہے اس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ مجھے اس وقت علم نہیں تھا کہ اس طرح طلاق دینے سے طلاق ہوجاتی ہے، میں تو یہ سمجھتی تھی کہ طلاق تو وہ ہوتی ہے جو گواہوں کے سامنے ہو اور لکھ کر دی جائے۔ پانچ ماہ گزرنے کے بعد مجھے صحیح مسئلے کا پتہ چلا تو میں نے امی جان کو کہا کہ اب وہ سارا واقعہ اباجان کو بتادیں تاکہ وہ مفتی صاحب سے صحیح فیصلہ کرالیں، اس کے بعد رات کو خود میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ نے مجھے جہاز میں تین طلاق دی تھی، تو کہنے لگے: کیوں پوچھتی ہو؟ میں نے کہا: آپ میری بات کا جواب دیں پھر وجہ بتاؤں گی۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ: ''ہاں!'' یعنی تین بار طلاق دی تھی، میں نے کہا: اب میرا

آپ کے پاس رہنا ناجائز ہے، کل مفتی صاحب آپ کو صحیح فیصلہ بتادیں گے۔ جب مفتی صاحب نے پوچھا تو انہوں نے انکار کردیا، اور کہا کہ انہوں نے تو صرف دو بار کہا ہے، حالانکہ رات میں نے تصدیق کرالیا تھا، اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ: آپ نے مفتی صاحب کے سامنے جھوٹ کیوں کہا؟ کہنے لگے: اب اس بات کو چھوڑ دو، لوگ تو ایسی باتیں چھپاتے ہیں اور تم ظاہر کرتی ہو۔ میں نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے دُنیاوی معاملے کو تو میں چھپاسکتی ہوں لیکن یہ تو اللہ کا حکم ہے، اس کو میں کسی صورت میں نہیں چھپاؤں گی، لہٰذا آپ کو بھی اقرار کرنا ہوگا۔ مجھے میرے والدین اور بھائی بہنوں کا واسطہ دینے لگے کہ مفتی صاحب کے سامنے بھی دو بار کہو، میں نہیں مانی، تیسرے دن مجھے کہنے لگے: خدا کی قسم تجھے اُنگلی بھی نہیں لگاؤں گا، بس میرے ساتھ بولنا ہنسنا، لیکن کسی پر ظاہر نہ کرنا کہ میں نے تین بار کہا ہے۔ میں نے کہا کہ: میرا ہنسنا بولنا بھی حرام ہے، جبکہ آپ نے تین بار کہا ہے۔ پھر کہنے لگے: تم جھوٹی ہو، میں نے تمہارے سامنے اقرار نہیں کیا۔ میں نے کہا: یہ تو کچھ دن پہلے کی بات ہے، خدا سے ڈریں آخرت کو سوچ کر۔ کہنے لگے: اچھا اگر یہ بات ہے تو میں اپنے ۲ سالہ لڑکے کو لے کر چلا جاؤں گا، لیکن اس بات کا کبھی اعتراف نہیں کروں گا، تم چاہتی ہو کہ دُنیا کے سامنے ذلیل ہوجاؤں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اُنہوں نے تین دفعہ مجھے جہاز میں کہا ہے، اب یہ جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ میں نے دو دفعہ کہا ہے، یہ جھوٹی قسمیں بہت کھاتے ہیں۔ واللہ یشھد علی ما اکتب وھو علی کل شیءٍ شھید۔

لڑکے کا بیان

جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر لکھ رہا ہوں، جہاز چڑھتے وقت میری بیوی نے پردہ نہیں کیا تھا، جہاز میں بیٹھتے ہی میں نے اُسے پردے کے لئے کہا، معلوم نہیں اُس نے سنا، یا نہیں، دوبارہ میں نے پھر کہا تو اُس نے کہا: ''اچھا!'' اچھا اس طرح کہا کہ مجھے بُرا لگا، لیکن تھوڑی دیر بعد پھر میں نے تیسری بار پردے کے لئے کہا، اس نے پردہ تو کیا مگر غصّے سے اور عجیب طرح کیا، جس پر مجھے غصہ آگیا، اس وقت میں نے اُسے کہا: ''تو پھر جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' دوبارہ پھر تھوڑی دیر کے بعد میں نے دُوسری بار کہا: ''جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' اس کے بعد میں چپ ہوگیا اور دِل میں کہہ رہا تھا کہ اے اللہ جو میں نے غصّے کی حالت میں کہا ہے اس کو کہیں سچ نہ سمجھ بیٹھنا ویسے بھی دو دفعہ کہا تھا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر تیسری بار کہہ دیتا تو یقیناً طلاق ہوجانی تھی، اس لئے دو دفعہ کے بعد چپ ہوگیا تھا، لیکن بعد میں کچھ اور باتیں اِدھر اُدھر غصّے میں ہوتی رہیں، لہٰذا میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے دو دفعہ کہا ہے وہ بھی دِل سے نہیں کہا۔

اس واقعے سے قبل ایک دفعہ ''تو تو میں میں'' آپس میں ہوئی تھی تو اس وقت میں نے اپنی بیوی کو یہ کہا تھا کہ کیا تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو مجھ سے طلاق لے لو، جاؤ طلاق لے لو، تو میں نے ویسے کہا تھا، دِل سے نہیں کہا تھا، لہٰذا اس وقت تھوڑی دیر کے بعد ہم آپس میں بالکل ٹھیک ہوگئے تھے، میں پھر عرض کرتا ہوں جہاز کے سوا کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور دُعا کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں آئندہ آپس میں اتفاق سے رہنے کی توفیق دے، آمین۔

جہاز میں بھی کہے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر گئے ہیں، بالکل ٹھیک ٹھاک، ہنسی خوشی رہ رہے تھے، معلوم نہیں کیا بات ہوگئی جو اُس نے ایسا کہنا شروع کردیا کہ مجھے تین دفعہ کہا ہے، لیکن میں کہتا ہوں میں نے دو دفعہ کہا ہے، آپ ہی اس مسئلے کو طے کریں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلا قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ شوہر نے جہاز کے واقعے سے قبل اپنی بیوی سے جو کہا کہ: ''کیا تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو مجھ سے طلاق لے لو، جاؤ طلاق لے لو'' اس سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بظاہر تو یہ جملہ عربی کے جملے: ''خذی طلاقک'' فقالت: ''أخذت'' اختلف فی اشتراط النیة، وصحح الوقوع بلا اشتراطها اھ. وظاهره أنه لا یقع حتی تقول المرأة ''أخذت'' ویکون تفویضًا وظاهر ما قدمناه عن الخانیة خلافه، وفی البزازیة معزیا الی فتاویٰ صدر الاسلام: والقاضی لا یحتاج الی قولها أخذت. (البحر الرائق ج:۳ ص:۲۷۰)۔(۱)

علامہ شامیؒ نے بحر کی اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:-

ومنه خذی طلاقک، فقالت: أخذت. فقد صحّح الوقوع به بلا اشتراط نیّة کما فی الفتح وکذا لا یشترط قولها ''أخذت'' کما فی البحر. (شامی ج:۲ ص:۴۳۰ باب الصریح تحت قول الدر وما بمعناها من الصریح).(۲)

لیکن جس سیاق میں شوہر نے مذکورہ جملہ کہا ہے، اس کے پیشِ نظر اُس میں اور عربی جملے ''خذی طلاقک'' میں فرق ہے، اور وہ فرق یہ ہے کہ اُردو محاورے میں مذکورہ جملے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ ''جب تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو پھر میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق لے لو'' اور دُوسرا مطلب اُردو محاورے میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: ''جب تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو پھر مجھ سے طلاق لے لو'' یعنی مجھ سے طلاق طلب کرلو، اُردو محاورے کے لحاظ سے مذکورہ جملے میں

---

(۱) باب الطّلاق الصّریح (طبع دارالمعرفة بیروت) وفی طبع مکتبة سعید کراتشی ج:۳ ص:۲۵۱. وکذا فی الشّامیة ج:۳ ص:۲۴۸ (طبع سعید).

(۲) ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۴۸ (طبع سعید).

دونوں معنی کا یکساں احتمال ہے، اس کے برخلاف "خذی طلاقک" میں عربی محاورے کی رُو سے دُوسرا احتمال نہیں، بلکہ وہ پہلے معنی پر صریح ہے، اسی لئے وہاں نیت کی ضرورت نہیں۔

اب اُردو محاورے کے لحاظ سے اگر متکلم کی مراد پہلے معنی ہوں تب تو "خذی الطّلاق" کے معنی میں ہوکر اس سے طلاق واقع ہوجائے گی، لیکن اگر دُوسرے معنی مراد ہوں تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ وہ طلاق کا ایقاع نہیں بلکہ بیوی کو اپنے آپ سے طلاق طلب کرنے کا اَمر ہے، اس صورت میں فقہ کے قریب تر جزئیات یہ ہیں:-

امرأة طلبت الطّلاق من زوجها فقال لها: ''سہ طلاق بردار ورفتی'' لا یقع، ویکون هذا تفویض الطّلاق الیها، وان نویٰ یقع. (عالمگیریة ج:۱ ص:۳۸۲)۔[1]

رجل دعا امرأته الی الفراش فأبت، فقال لها: اخرجی من عندی، فقالت: طلّقنی حتی أذهب، فقال الزوج: "اگر آرزوئے تو چنیں است چنیں گیر" فلم تقل شیئًا وقامت، لا تطلق، کذا فی المحیط. (عالمگیریة ج:۱ ص:۳۸۲)۔[2]

اور جب شوہر کے مذکورہ جملے میں دونوں کا احتمال ہے تو کسی ایک معنی کی تعیین میں اس کا قول معتبر ہوگا، لہٰذا وہ جو اِن الفاظ کو ''دھمکی اور مستقبل کا ارادہ'' بتلاتا ہے، اگر وہ اس پر حلف کرے کہ میرا مقصد طلاق دینا نہ تھا، بلکہ بیوی کو طلاق کے مطالبے کا حکم دینا تھا، تو اس کا قول قضاءً معتبر ہوگا، اور ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

البتہ شوہر نے جہاز کے واقعے میں جن الفاظ کے تکلم کا اقرار کیا ہے، یعنی ''تو پھر جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' اور تھوڑی دیر بعد پھر ''جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' کے الفاظ سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئیں۔

لیکن اس میں پیچیدگی یہ ہے کہ شوہر جہاز کے واقعے میں صرف دو مرتبہ طلاق دینے کا اقرار کرتا ہے، اور عورت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف اس وقت تین مرتبہ طلاق دی ہے، بلکہ بعد میں تنہائی کے وقت ان تین طلاقوں کا اقرار بھی کیا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ مفتی کے سامنے میں نے اصل واقعے کو چھپانے کے لئے صرف دو طلاقوں کا اقرار کیا ہے، اب اگر عورت کے پاس ان باتوں کے گواہ موجود ہوتے تب تو اس کے لئے اپنا دعویٰ ثابت کرنا آسان تھا، لیکن چونکہ اس کے پاس گواہ موجود نہیں ہیں اور یہ ساری باتیں تنہائی میں ہوئی ہیں، اس لئے ایسی صورت میں جب قاضی کے پاس معاملہ جائے گا تو وہ شوہر سے حلف کروائے گا، اور اگر اس نے اس بات پر حلف کرلیا کہ اس نے دو سے زیادہ

(۱، ۲) طبع رشیدیه کوئٹه.

طلاقیں نہیں دیں، تو قضاءً اُس کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا، لیکن عورت نے چونکہ اپنے کانوں سے تین طلاقیں سن لی ہیں، اس لئے اس کے حق میں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مرد کو مقاربت کا موقع دے، اور اس کی عملی تفصیل یہ ہے کہ اگر جہاز کے واقعے کے بعد (جس میں شوہر نے دو طلاقیں دینے کا اقرار کیا ہے) عدّت گزرنے تک شوہر نے زبانی یا عملی رُجوع نہیں کیا، تب تو وہ عدّت گزرتے ہی شوہر کے نکاح سے نکل گئی، اب اُس عورت کے لئے حلالہ کے بغیر اس مرد سے دوبارہ نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا، اور شوہر قضاءً بھی اُسے نکاحِ ثانی پر مجبور نہیں کرسکتا، ہاں! اگر شوہر نے جہاز کے واقعے کے بعد عدت گزرنے سے پہلے پہلے زبانی یا عملی رُجوع کرلیا تھا تو اُس صورت میں وہ قضاءً بیوی کو اپنے پاس رہنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں عورت کو یہ چاہئے کہ اوّل تو وہ شوہر کو خدا کا خوف دِلائے اور عذابِ آخرت سے ڈرا کر اُسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے کہ وہ غلط بیانی کرکے ساری عمر حرام کاری میں مبتلا ہونے کے بجائے یا تیسری طلاق کا اقرار کرے، یا پھر کم از کم عورت کو علیحدہ کردے، اور اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو اس کا مہر معاف کرکے یا روپیہ دے دِلا کر اس سے اپنی جان چھڑائے۔[1] اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کے کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے یہاں رہنے لگے، اور ہر ممکن طریقے پر اس کو مقاربت سے باز رکھے، اور اگر زیادہ عرصہ اس طرح رہنا ممکن نہ ہو تو دیانۃً اس کی بھی گنجائش ہے کہ وہ عدّت کا زمانہ گزرنے کے بعد اس کی غیر موجودگی یا لاعلمی میں دُوسرا نکاح کرے، اور جب دُوسرا شوہر طلاق دیدے تو اُس کی عدّت گزار کر پہلے شوہر کے پاس جائے اور اس سے یہ کہہ کر تجدیدِ نکاح کا مطالبہ کرے کہ مجھے چونکہ نکاح میں شبہ پیش آگیا ہے اس لئے میں دوبارہ عقد کرنا چاہتی ہوں (**كما في العبارة الأولىٰ والثانية**)۔

اور اگر ان میں سے کسی بات پر عمل کرنا عورت کے لئے ممکن نہ ہو تو چونکہ عورت مجبور ہے، اور قاضی کے پاس شوہر کے حلف کرلینے کے بعد قاضی نے شوہر کے حق میں فیصلہ کردیا ہے، اس لئے اگر وہ شوہر سے کسی طرح جان چھڑانے پر قادر نہ ہو تو سارا گناہ مرد پر ہوگا، اور عورت عنداللہ معذور سمجھی جائے گی (**كما في العبارة الثالثة**) بشرطیکہ اس نے جان چھڑانے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کرلی ہوں، اور جان نہ چھڑا سکی ہو (**كما في العبارة الرابعة**)، اس سلسلے میں فقہاء کی عبارات درج ذیل ہیں:-

---

(۱) آج کل عدالتوں میں جبری خلع کے غیر شرعی قانون پر عمل ہو رہا ہے، ایسے جبری خلع کے فیصلے شرعاً قابلِ قبول نہیں ہوتے، لیکن مذکورہ صورت میں عورت اگر عدالت سے جبری خلع کروا کر الگ ہوجائے تو یہ فیصلہ اگرچہ شرعاً نافذ نہ ہوگا، لیکن عورت کو چونکہ دیانۃً علیحدگی کا حکم ہے، اس لئے اس کی علیحدگی کو سرکاری تحفظ اس طرح حاصل ہوجائے گا، اور اس موقع پر عورت کے لئے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، **فليتأمل والله اعلم**۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

ا:- البحر الرائق میں ہے:-

ولهٰذا قالوا لو طلقها ثلٰثا وأنكر، لها أن تتزوج بأٰخر وتحلل نفسها سرًّا منه اذا غاب في سفر، فاذا رجع التمست منه تجديد النكاح لشك خالج قلبها، لا لانكار الزوج النكاح، وقد ذكر في القنية خلافًا، فرقم للأصل بأنها ان قدرت على الهروب منه لم يسعها أن تعتد وتتزوج بآخر، لأنها في حكم زوجية الأوّل قبل القضاء بالفرقة، ثم رمز شمس الأئمة الأوزجندى وقال: قالوا هٰذا في القضاء ولها ذٰلك ديانة، وكذٰلك ان سمعته طلقها ثلٰثا ثم جحد وحلف أنه لم يفعل وردها القاضي عليه لم يسعها المقام معه ولم يسعها أن تتزوج بغيره أيضًا، قال يعني البديع: والحاصل أنه على جواب شمس الاسلام الأوزجندى ونجم الدين النسفي والسيّد أبي شجاع وأبي حامد والسرخسي يحل لها أن تتزوّج بزوج اٰخر فيما بينها وبين الله تعالٰى وعلٰى جواب الباقين لا يحل .... حلف بثلٰثة فظن أنه لم يحنث وعلمت الحنث وظنت أنها لو أخبرته ينكر اليمين، فاذا غاب عنها بسبب من الأسباب فلها التحلل ديانةً لا قضاءً، قال عمر النسفي سألت عنها السيّد أبا الشجاع فكتب أنه يجوز، ثم سألته بعد مدة، فقال انه لا يجوز، والظاهر أنه انّما أجاب في امرأة لا يوثق بها. (البحر الرائق ج:۴ ص:۵۷، ۵۸، فصل فيما تحلّ به المطلقة).[1]

۲:- وفي التاتارخانية:-

وسئل الشيخ الامام أبو القاسم عن امرأة سمعت من زوجها أنّه طلقها ثلثًا ولا تقدر أن تمنع نفسها منه هل يسعها أن تقتله؟ قال: لها أن تقتله في الوقت الذى يريد أن يقربها ولا تقدر علٰى منعه الا بالقتل، وهٰكذا كان فتوىٰ شيخ الاسلام أبي الحسن عطاء بن حمزة والامام أبي شجاع، وكان القاضي الامام الاسبيجابي يقول: ليس لها أن تقتلهٗ وفي الملتقط وعليه الفتوىٰ. (أيضًا ص:۵۸).[2]

۳:- فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-[3]

سمعت بطلاق زوجها ايّاها ثلٰثًا ولا تقدر علٰى منعهٖ الّا بقتله ان علمت أنه يقربها تقتله بالدواء ولا تقتل نفسها، وذكر الأوزجندى رحمه الله أنها ترفع الأمر الى القاضي، فان لم تكن لها بينة تحلفه، فان حلف فالاثم عليه .... وفي النوازل: حرمت عليه بثلٰث ويمسكها

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

(۲) التاتارخانية ج:۳ ص:۲۰۹ (طبع ادارة القرآن كراچی)۔ وكذا في البحر الرائق ج:۴ ص:۵۸ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۳) فتاوىٰ بزازية علٰى هامش الهندية ج:۴ ص:۲۶۰، ۲۶۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

یباح لها أن تتزوّج بآخر من غیر علم الزوج، ولا یطلق لها، وقال الامام صاحب النظم (التاسع فی الحظر والاباحة من الطّلاق).

۴:- علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

والفتویٰ علیٰ أنه لیس لها قتلهٗ ولا تقتل نفسها، بل تفدی نفسها بمال أو تهرب. .... وفی البزازیة عن الأوزجندی أنها ترفع الأمر للقاضی، فان حلف ولا بینة لها فالاثم علیه اهـ. قلت: أی اذا لم تقدر علی الفداء أو الهرب ولا علیٰ منعه عنها، فلا ینافی ما قبله. (شامی ج:۲ ص:۴۳۲ باب الصّریح تحت قوله ولو صرح به دیّن فقط).[۱]

مذکورہ بالا تفصیل سے جناب کے سوالات میں سے نمبر۱ تا نمبر۴ کا جواب ہوگیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مرد اس بات پر حلف کرلیتا ہے کہ اس نے دو سے زیادہ طلاقیں نہیں دیں، تو قضاءً دو ہی طلاقیں واقع ہوں گی، البتہ عورت کے حق میں دیانۃً تین طلاقیں ہوچکی ہیں۔

اب باقی سوالات کا جواب درج ذیل ہے:-

۵:- عورت دیانت کے حکم پر عمل کرے گی، اور مفتی اس کو دیانت ہی کا وہ حکم بتائے گا جو اُوپر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے، البتہ فقہائے متأخرین نے جب یہ دیکھا کہ قاضیوں میں جہالت عام ہوچکی ہے تو انہوں نے یہ حکم دیا کہ مفتی کو دیانت کے حکم کے ساتھ قضاء کا حکم بھی ضرور لکھنا چاہئے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

لٰکن یکتب (المفتی) بعدهٗ ولا یصدق قضاءً لأن القضاء تابع للفتویٰ فی زماننا لجهل القضاة، فربما ظن القاضی أنه یصدق قضاء أیضًا. (ردّ المحتار کتاب الحظر والاباحة).[۲]

نیز تنقیح الحامدیہ میں ہے:-

المراد من قولهم یدین دیانة لا قضاء أنه اذا استفتیٰ فقیها یجیبه علیٰ وفق ما نویٰ، ولٰکن القاضی یحکم علیه بوفق کلامه ولا یلتفت الی نیته اذا کان فیما نویٰ تخفیف علیه .... جری العرف فی زماننا أن المفتی لا یکتب للمستفتی ما یدین به بل یجیبه عنه باللسان فقط لئلا یحکم له القاضی لغلبة الجهل علیٰ قضاة زماننا. (تنقیح الحامدیة ج:۱ ص:۳).[۳]

۶:- فقہائے کرامؒ کے مقولے "المرأة کالقاضی"[۴] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں

---

(۱) شامیة ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) ج:۶ ص:۴۲۱ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) (طبع دارالمعرفة بیروت).
(۴) ردّ المحتار مطلب فی قول البحر ان الصّریح یحتاج فی وقوعه دیانةً الی النّیّة. ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع سعید).

اس حکم پر عمل کرے گی جو قضاءً ہوسکتا ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قاضی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ الفاظ کے ظاہری اور کثیر الاستعمال مفہوم پر عمل کرے، اور خلافِ ظاہر نیت کا اعتبار نہ کرے، اسی طرح عورت کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے الفاظ کے ظاہر کو دیکھے، اس کی خلافِ نیت پر بھروسہ نہ کرے، لہٰذا زیرِ بحث مسئلے میں "المرأة كالقاضی" کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر قاضی نے خود اپنے کانوں سے شوہر کو تین طلاقیں دیتے ہوئے سنا ہوتا تو وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرتا، اور تین طلاقیں نافذ کردیتا۔[1] اسی طرح عورت چونکہ خود بغیر کسی شک کے تین طلاقوں کے الفاظ سن چکی ہے، اس لئے اس کے لئے تین طلاقوں ہی کے حکم پر عمل کرنا لازم ہے، قاضی نے خواہ کچھ فیصلہ کیا ہو۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ "المرأة كالقاضی" کوئی مستقل قاعدہ نہیں ہے، بلکہ فقہائے کرامؒ یہ جملہ ایسے ہی مواقع پر ذکر فرماتے ہیں جہاں شوہر اپنے الفاظ کے ظاہری مفہوم کے خلاف کسی اور معنیٰ کی نیت کا دعویٰ کرتا ہے، ایسے مواقع پر فقہاءؒ لکھتے ہیں کہ عدالتی فیصلہ اس کے ظاہری الفاظ پر ہوگا، نیت قضاءً معتبر نہ ہوگی، اور اس معاملے میں عورت کا حکم قاضی جیسا ہے کہ اگر اس نے خود وہ الفاظ سنے ہوں یا اُن الفاظ کے تکلم کا یقین ہوگیا ہو، تو وہ ظاہر پر عمل کرے گی شوہر کی نیت پر نہیں، چند عباراتِ فقہیہ ملاحظہ ہوں:-

الف:- اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو أنت طالق کہے اور یہ دعویٰ کرے کہ میرا مقصد طلاق دینا نہیں تھا، بلکہ قید سے آزاد ہونا تھا، تو اس کے بارے میں علامہ ابنِ نجیمؒ لکھتے ہیں:-

ويديّن في الوثاق والقيد ويقع قضاء، الا أن يكون مكرها، والمرأة كالقاضي اذا سمعته أو اخبرها عدل لا يحل لها تمكينه، هٰكذا اقتصر الشارحون وذكر في البزازية: وذكر الأوزجندي أنها ترفع الأمر الى القاضي فان لم يكن لها بينة تحلفه، فان حلف فالاثم عليه اهـ. ولا فرق في البائن بين الواحدة والثلاث. (البحر الرائق ج:۳ ص:۲۷۷ (طبع دار المعرفة، بيروت) باب الطّلاق الصّريح تحت قوله "وتقع واحدة رجعية وان نوى الأكثر .... الخ).[2]

---

(۱) طلاق کے معاملے میں اُصولِ حنفی مذہب کے مطابق قاضی اپنے علم وسماع کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے: "القاضي يقضي في حقوق العباد بعلمه بأن علم في حال قضائه في مصره أن فلانا غصب مال فلان أو طلّق امرأته .... الخ." معين الحكام ص:۱۵۲، (مطبع حاجی عبدالغفار وپسران تاجرانِ کتب ارگر بازار قندھار افغانستان) اگرچہ فقہائے متاخرین نے قاضیوں کے فساد کی وجہ سے اس پر فتویٰ نہیں دیا۔ (شامی ج:۴ ص:۳۵۵)۔[1] (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

---

(۱) وفي ردّ المحتار مطلبٌ في حكم القاضي بعلمه ج:۵ ص:۴۲۳ (طبع سعيد) للقاضي العمل بعلمه والفتوىٰ علىٰ عدمه في زماننا كما نقله في الأشباه عن جامع الفصولين وقيّد بزماننا لفساد القضاة فيه وأصل المذهب الجواز ..... الخ۔

(۲) وفي طبع مكتبة سعيد كراتشي ج:۳ ص:۲۵۷. (محمد زبیر حق نواز)

ب:- یہی مسئلہ علامہ فخر الدین زیلعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولو قال لها أنت طالق ونویٰ به الطّلاق عن وثاق لم یصدق قضاء، ویدیّن فیما بینه وبین الله تعالٰی، لأنه خلاف الظاهر، والمرأة کالقاضی، لا یحل لها أن تمکنه اذا سمعت منه ذٰلک أو شهد به شاهد عدل عندها. (زیلعی شرح کنز ج:۲ ص:۱۹۸ باب الطّلاق)۔ (۱)

علامہ شامیؒ نے بھی "المرأة کالقاضی" کا جملہ اسی مسئلے میں ذکر فرمایا ہے، (شامی ج:۲ ص:۴۳۲ باب الصریح)۔ (۲)

ج:- اسی طرح اگر کوئی شخص تین مرتبہ لفظ طلاق استعمال کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ میری نیت تاکید کی تھی، نہ کہ تاسیس کی، تو اس کے بارے میں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی لیکن قضاءً نہیں، اس کے بارے میں علامہ حامد آفندیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے "المرأة کالقاضی" کا مذکورہ بالا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے:-

لا یصدق فی ذٰلک قضاء، لأن القاضی مأمور باتباع الظاهر والله یتولی السرائر .... وقال فی الخانیة: لو قال أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق، وقال: أردت به التکرار صدق دیانة، وفی القضاء طلقت ثلٰثًا اهـ. ومثله فی الأشباه والحدادی، وزاد الزیلعی أن المرأة کالقاضی، فلا یحل لها أن تمکنه اذا سمعت منه ذٰلک أو علمت به، لأنها لا تعلم الّا الظاهر. (تنقیح الحامدیة ج:۱ ص:۳۷ کتاب الطّلاق)۔ (۳)

اس سے واضح ہوگیا کہ قاضی سے عورت کی تشبیہ من کل الوجوہ نہیں، بلکہ حکم بالظاہر کے معاملے میں ہے۔

د:- اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ: "أنت علیّ کظهر أمّی" اور یہ دعویٰ کرے کہ میرا مقصد ماضی کی جھوٹی خبر دینا تھا، تو اس کے بارے میں فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

لو قال لامرأته أنت علیّ کظهر أمّی کان مظاهرا .... ولو قال أردت به الاخبار عما مضی کذبا لا یصدق فی القضاء، ولا یسع المرأة ان تصدقه کما لا یسع القاضی، ویصدق فیما بینه وبین الله تعالٰی. (عالگمیریة ج:۱ ص:۵۰۷ باب الظهار)۔ (۴)

---

(۱) تبیین الحقائق ج:۳ ص:۲۱ (طبع دار الکتب العلمیة، بیروت)

(۲) شامیة ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) تنقیح الحامدیة ج:۱ ص:۳۶ و ۳۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۴) (طبع رشیدیه کوئٹه)

ان تمام عبارتوں سے "المرأة كالقاضي" کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے کہ عورت نے اپنے شوہر سے جو الفاظ خود سنے ہوں اُن کے ظاہر پر عمل کرنا اُس پر واجب ہے، خواہ معاملہ قاضی کے پاس پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، اور مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر قاضی نے بیّنہ کے فقدان کی بناء پر کوئی فیصلہ شوہر کے حق میں کردیا تو عورت بھی اس پر عمل کرے، خواہ اُس نے خود شوہر سے اس کے خلاف الفاظ سن رکھے ہوں، کیونکہ اگر "المرأة كالقاضي" کا مطلب یہ ہوتا تو تلفظ طلاق میں زوجین کے اختلاف کی صورت میں فقہاء یہ نہ فرماتے کہ قضاءً طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن عورت پر واجب ہے کہ اس سے دُور رہے اس مسئلے کی مفصّل عبارتیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۷:- طلاق کے تنازعات میں تحکیم جائز ہے، اور اس میں حَکَم کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، لما فی معین الحکام: يجوز التحكيم في الأموال والطّلاق والعتاق .... وينفذ حكم المحكّم في سائر المجتهدات نحو الكنايات والطّلاق والعتاق وهو الصحيح، لٰكن شيوخ المذهب امتنعوا عن الفتوىٰ بهٰذا لئلا يتجاسر العوام فيه. (معين الحكام ص:۲۸ فصل نمبر۸)۔[1]

لہٰذا زوجین نے جس عالم کو حَکَم بنایا ہے وہ فیصلہ تو اس حکم کے مطابق کرے گا، جو قضاءً ثابت ہو، لیکن صورتِ مسئولہ میں اوّل تو اُسے چاہئے کہ شوہر کو خدا کا خوف دِلا کر صحیح صحیح بیان دینے پر آمادہ کرے، اور جھوٹے حلف کا گناہ، نیز مطلقۂ ثلاثہ کو اپنے پاس رکھنے کا گناہ اُسے بتادے، اس کے باوجود وہ اگر حلف کرے اور عورت کوئی بیّنہ پیش نہ کرسکے تو فیصلہ مرد کے حق میں دے، لیکن عورت کو بحیثیت مفتی دیانت کا مذکورہ بالا حکم بھی بتادے، بلکہ اگر اُسے عورت کی سچائی کا ذاتی طور پر گمان غالب ہو تو عورت کو مرد سے علیحدہ رکھنے کی جو تدبیر بھی اس کے اختیار میں ہو، اُسے نجی طور سے اختیار کرے، اور اس معاملے میں نجی طور پر عورت کی پوری مدد کرے، چنانچہ درمختار میں ہے:-

وعن الامام ان علم القاضي في طلاق وعتاق وغصب يثبت الحيلولة على وجه الحسبة لا القضاء.[2]

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

قوله: "يثبت الحيلولة" أي بأن يأمر بأن يحال بين المطلق وزوجته والمعتق وأمَته أو عبده والغاصب وما غصبه بأن يجعله تحت يد أمين الى أن يثبت ما علمه القاضي بوجه شرعي (قوله على وجه الحسبة) أي الاحتساب وطلب الثواب لئلا يطأها الزوج أو السيد أو الغاصب

---

(۱) مطبع حاجی عبدالغفار وپسران تاجرانِ کتب ارگر بازار قندھار افغانستان.
(۲) الدر المختار ج:۵ ص:۴۳۹ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(قوله لا القضاء) أی لا علی طریق الحکم بالطّلاق أو العتاق أو الغصب. (رد المحتار ج:۴ ص:۳۵۵، ۳۵۶ باب کتاب القاضی الی القاضی، مطلب قضاء القاضی بعلمه).[1]

هٰذا ما ظهر لهٰذا العبد الضعیف
واللّٰه سبحانه وتعالیٰ اعلم
بالصواب والیه المرجع والمآب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنه
۱۳۹۷/۳/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۰۹ ب)

الجواب صحیح
فللّٰه دَرُّ المصیب کثّر اللّٰه تعالیٰ أمثاله
وزاده بسطةً فی العلم والجسم
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
بندہ عبدالحلیم غفرلہٗ

الجواب صحیح
العبد منیب الرحمٰن

''میں نے تجھے چھوڑ دیا'' کے الفاظ تین مرتبہ کہنے کا حکم

سوال:- میں نے چھ سات ماہ قبل اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہے تھے کہ: ''میں نے تجھے چھوڑ دیا'' اور یہ الفاظ میں نے تقریباً دس بارہ دفعہ دُہرائے تھے، اور وجہ اس کی، ایک جھگڑا تھا جو میری بیوی اور میرے درمیان ہوا تھا، اس وقت نہ بیوی پاس موجود تھی اور نہ یہ الفاظ کہتے وقت بیوی کا نام لیا تھا، اس کے دو ماہ بعد بحکمِ والد صاحب میں نے اپنی بیوی سے ہم بستری کی، اور یہ الفاظ کہتے وقت میں نے طلاق کا نام یا لفظ بالکل نہیں کہا تھا۔

جواب:- ''میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے'' یہ الفاظ اگر تین یا زائد مرتبہ کہہ دیئے ہیں تو آپ کی اہلیہ پر تین طلاق واقع ہوگئیں،[2] اب وہ آپ پر بغیر حلالہ کے ہرگز حلال نہیں ہوسکتیں، اس واقعے کے بعد جو ہم بستری کی گئی وہ جائز نہیں تھی، اس پر توبہ واِستغفار کرنا چاہئے۔ لأن الألفاظ المذکورة صریحة فی الطّلاق فی عرفنا فلا تحتاج الی النیة[3] وأما الضمیر فینبغی عن تسمیة المرأة اذا کان مرجعهٗ معلومًا۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۵۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

---

(۱) رد المحتار ج:۵ ص:۴۳۹ (طبع ایچ ایم سعید کمپنی)
(۲ و ۳) لفظ ''چھوڑ دیا'' سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے اگلے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور پچھلے صفحہ:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

”تجھے طلاق دے دیں گے“ الفاظ کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کی اپنی اہلیہ سے گھریلو باتوں پر تیز اور تلخ گفتگو ہوئی، بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ: تم گھر سے چلے جاؤ، زید نے کہا کہ: ”ہم چلے جائیں گے اور تجھے طلاق دے دیں گے“ اور دو مرتبہ اُسے دُہرایا ہے، اس پر اہلیہ خاموش ہوگئی، پھر زید اس کے بعد طلاق وغیرہ دیئے بغیر اپنے کام میں باہر کہیں چلا گیا، اب سوال یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سائل کا بیان صحیح ہے اور شوہر نے یہی الفاظ استعمال کئے ہیں کہ: ”تجھے طلاق دے دیں گے“ تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی[1]، وہ دونوں بدستور میاں بیوی ہیں، البتہ آئندہ طلاق کے الفاظ استعمال کرنے میں بڑی احتیاط لازم ہے، بعض صورتوں میں بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے، لہٰذا آئندہ کسی مستند عالمِ دین سے مشورہ لئے بغیر طلاق کا لفظ کبھی زبان سے نہ نکالیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۴/۲۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۷۷ ب)

امداد الفتاویٰ میں دو بیویوں کو طلاق دینے کے مسئلے میں درمختار کا جزئیہ ذکر کرنے میں تسامح ہے

سوال:- امداد الفتاویٰ مبوب ج:۲ ص:۳۵۰ میں ہے کہ: خاوند نے اپنی دو بیویوں کو کہا تم کو دو طلاق ہے ....الخ۔

حضرت حکیم الاُمت قدس سرہٗ نے جواب لکھا کہ ہر بیوی پر دو دو طلاقیں واقع ہوگئیں، اس جواب پر کسی عالم نے تنقید کی کہ اس جواب میں تسامح ہے، صحیح یہ ہے کہ تحریر کردہ جزئیہ کے تحت ہر ایک بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی۔ چنانچہ یہ تنقید بھی اسی صفحے پر طبع ہوگئی ہے۔

مسئلہ بالا میں بندہ کی رائے یہ ہے کہ جوابِ اوّل صحیح ہے، لیکن اس جواب کے لئے حضرت تھانویؒ نے جو جزئیہ نقل کیا ہے وہ جزئیہ صورتِ سوال پر منطبق نہیں، کیونکہ جزئیہ میں ”بینکن تطليقة أو تطليقتان“ کے الفاظ ہیں، اور صورتِ سوال میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، الفاظِ جزئیہ ہی کو سامنے رکھ کر

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۴۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ناقد نے تنقید کی ہے، اور ان الفاظ کے اعتبار سے یہ تنقید دُرست بھی ہے، لیکن صورتِ سوال کے لحاظ سے تنقید غلط ہے، الغرض جوابِ اوّل اور تنقید دونوں میں فی الجملہ تسامح معلوم ہوتا ہے، گو صحیح جوابِ اوّل ہے۔

بندہ کے نزدیک صورتِ سوال پر منطبق اور اقرب جزئیہ ذیل ہے:-

ولو قال لثلٰث نسوة له انتن طوالق ثلٰثًا أو طلقتكن ثلٰثًا يقع علٰى كل واحدة ثلٰث ولا ينقسم اهـ. (هندية ج:۲ ص:۵۳)۔ (۱)

جس کی بناء پر صورتِ مسئولہ میں ہر بیوی پر دو دو طلاقیں واقع ہونی چاہئیں، آپ کی کیا رائے ہے؟

سائل:- (مولانا مفتی) عبدالستار (صاحب مدظلہم)

(جامعہ خیر المدارس ملتان)

جواب:- مخدومِ گرامی قدر ومکرّم دامت الطافہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ باعثِ مسرّت ہوا۔

امداد الفتاویٰ (۲) میں طلاق کے جس مسئلے سے متعلق آپ نے تسامح کی نشاندہی فرمائی ہے، احقر کو آپ کی رائے سے اتفاق ہے، واقعۃً عالمگیریہ کا جزئیہ یہاں قابلِ اتباع ہے، درمختار کا جزئیہ یہاں منطبق نہیں ہوتا۔ دُعاؤں کی درخواست۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۴۰۳/۳/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۵۴۲ ب)

لفظِ ''چھوڑ دیا'' طلاقِ صریح ہے یا کنایہ؟

(دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور جامعہ دارالعلوم کراچی کا الگ الگ موقف)

سوال:- میں نے کہیں پڑھا تھا کہ لفظ ''چھوڑ دیا'' جبکہ کوئی شخص اپنی بیوی کو بلانیتِ طلاق بھی کہہ دے تو طلاق وقوع پذیر ہوجاتی ہے، غالبًا حضرت تھانویؒ کا دیا ہوا تھا، آپ کی کیا رائے ہے؟ مثلاً کسی شخص سے گھر کے دیگر افراد نے پوچھا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ تو اُس نے کہہ دیا کہ ''میں نے اس کو میکے میں چھوڑ دیا ہے'' اُس کا مطلب یہ تھا کہ ایک دو دن میکے ٹھہرے گی پھر واپس آجائے گی۔ مثلاً ایک گانا عموماً ریڈیو، ٹیلی ویژن پر گایا جاتا ہے جس کا مندرجہ ذیل شعر ہے:-

---

(۱) ج:۱ ص:۳۶۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

(۲) ج:۲ ص:۴۰۴ سوال نمبر ۴۹۰۔

دِل کا لگانا ہائے ہائے
دِل کا لگانا ہم نے چھوڑ دیا، چھوڑ دیا

اب اگر کوئی شخص یہ گانا سنتے وقت خود بھی گانے لگے اور بیوی موجود اور بیوی بھی گانے لگے (ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کر) گانا گانے والے گویے کے ساتھ ساتھ گانے لگ گئے، (طلاق کا خیال تک بھی میاں بیوی میں نہ ہو) تو کیا ایسی صورت میں چھوڑ دیا لفظ کو یقیناً کنایہ نہ مانا جائے گا؟ مثلاً بیوی نے خاوند سے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں فلاں جگہ ماں کے ہاں یا کہیں اور یہ کام کرنا ہے، تو خاوند نے کہہ دیا کہ ''اچھا'' یا کہہ دیا ''چھوڑ دیا'' جبکہ نیتِ طلاق قطعاً نہ ہو، جبکہ پنجاب میں یہ عرف نہ تسلیم کیا جاتا ہو، کیونکہ حقیقۃً کنایہ ہے کیا ان صورتوں میں آپ بھی طلاق کا فتویٰ دیتے ہیں یا کہ چونکہ اب ایسا لفظ عرفِ عام بدل لفظ طلاق بالکل نہیں ہے خاص کر خطۂ پنجاب میں تو اس سے بلانیت طلاق بالکل نہیں ہوتی ہے؟ مثلاً زوجہ نے خاوند سے جماع کے لئے اشارہ صاف طور پر کہہ دیا خاوند نے کہہ دیا ''چھوڑ دو''، غصّے سے بیوی نے کہہ دیا چھوڑو؟ (سوالاً صورت میں) تو خاوند نے کہہ دیا ''ہاں'' یا کہہ دیا ''اچھا'' یا کہہ دیا ''چھوڑو'' تو کیا ان صورتوں میں طلاق کا ایقاع ہوتا ہے؟ مفتی محمود صاحب کے ایک شاگرد نے بتلایا کہ میرا خیال یہی ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے بلانیت طلاق بالکل واقع نہیں ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں خصوصاً پنجاب میں یہ لفظ ''چھوڑ دیا'' دونوں صورتوں یعنی طلاق اور دیگر مقاصد کے لئے (جبکہ طلاق کا خیال تک نہیں ہوتا ہے) استعمال کیا جاتا ہے یعنی کنایہ ہے تو پھر بھی جبکہ کسی کی نیت بلکہ خیال طلاق تک نہ ہو تو کیا اس مذکورہ لفظ کے استعمال سے بلانیت بھی طلاق کا حکم دیتے ہیں یا کہ نہیں؟

(جواب از مفتی محمد فرید مدظلہم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)

جواب:- واضح رہے کہ یہ لفظ ''چھوڑ دیا'' طلاق اور غیر طلاق دونوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، قرائن کی وجہ سے کسی ایک کا تعین کیا جاتا ہے، بس بہ ظاہر یہ لفظ ''ترکتھا'' کی طرح کنایات سے ہوگا، جن میں نیت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، نیز یہ لفظ اگر طلاق میں متعارف ہو تو طلاق بائن میں متعارف ہوگا، اہلِ عرف کے نزدیک بینونت مراد لی جاتی ہے، **والصریح قد یقع به البائن کما فی رد المحتار ج:۲ ص:۶۳۹**.[1] **والصریح لا یقع به الطلاق دیانةً عند عدم النیّة کما فی رد**

(۱) رد المحتار ج:۳ ص:۲۵۲ (طبع سعید).

المحتار ج:۲ ص:۵۹۳. نعم اذا کان هازلًا فیقع طلاقه لکونه ناویا زجرًا وللحدیث المشهور فافهم۔

محمد فرید عفی عنہ
دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور
نمبر ۱۰۶۱۹

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم جامعہ دارالعلوم کراچی)

جواب:- اور اس سے زیادہ واضح مثال فارسی کے لفظ ''بہشتم'' اور ''پائے کشادہ کردم ترا'' کی ہے کہ ظاہر ہے یہ الفاظ مختلف لفظی قرائن کے ساتھ دُوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود فقہاء نے ان کو عرف کے غالب استعمال کی بناء پر صریح قرار دیا، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: ولو قال الرجل لامرأته: ''ترا چنگ باز داشتم'' أو ''بہشتم'' أو ''پلّہ کردم ترا'' أو ''پائے کشادہ کردم ترا'' فهٰذا کله تفسیر قوله "طلقتک" عرفًا، حتّٰی یکون رجعیًّا، ویقع بدون النیّة، کذا فی الخلاصة، وکان الشیخ الامام ظهیر الدین المرغینانی رحمه الله تعالٰی یفتی فی قوله "بهشتم" بالوقوع بلا نیّة ویکون الواقع رجعیًّا ویفتی فیما سواها باشتراط النیّة .... الخ. (عالمگیریه ص:۳۷۹ فصل الطلاق بألفاظ الفارسیة)۔(۱)

لہٰذا اگر دُوسرے قرائنِ لفظیہ کے ساتھ لفظ ''چھوڑ دیا'' غیر طلاق کے لئے مستعمل ہو تو یہ اس کے صریح ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ الفاظِ صریحہ بھی دُوسرے قرائنِ لفظیہ کی موجودگی میں غیرِ طلاق کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور اُن سے طلاق واقع نہیں ہوتی، لہٰذا اس سے ان علماء کے خلاف حجت قائم نہیں ہوتی جو لفظ ''چھوڑ دیا'' کو صریح قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو مثالیں آپ نے لکھی ہیں، اُن میں تو کسی کے نزدیک بھی طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہاں غیر طلاق کے معنی کے صریح قرائن موجود ہیں، لیکن جب اس قسم کے قرائن موجود نہ ہوں اور کوئی شخص بیوی کو کہے کہ: ''میں نے تمہیں چھوڑ دیا'' تو راجح یہ ہے کہ اُردو محاورے میں یہ صریح لفظ ہے، تاہم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''امداد المفتین'' کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ: ''غرض اس میں علماء کا اختلاف ہے، سائل کو دیانۃً جس پر زیادہ اعتماد ہو اس کے فتویٰ کو اختیار کرنا چاہئے۔'' (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۲ ص:۵۰۲)۔(۲)

اور یہ ساری گفتگو اُردو محاورے میں ہے، پنجاب کے عرف سے احقر کو علی وجہ البصیرۃ واقفیت نہیں ہے، اس میں پنجاب کے اہلِ فتویٰ سے رُجوع کر کے عمل کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۹/ ۲۸ ب)

---

(۱) ج:۱ ص:۳۷۹ (طبع رشیدیه کوئٹه). (۲) ص:۶۱۲ (طبع دارالاشاعت کراچی)۔

﴿فصل فی الطّلاق بالکنایات﴾
(کنایاتِ طلاق کا بیان)

”جا اور شادی کرلے، میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں“ الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شوہر نے اپنی بیوی کو کہا کہ: ”تو جا اور شادی کرلے، میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے“ اس صورتِ حال میں شوہر سے پوچھا گیا کہ تو نے طلاق دی ہے، شوہر نے کہا کہ: میں نے رنج کی وجہ سے کہا ہے، سسر نے موقع پاکر ثبوتِ طلاق کرانے کی نیت سے داماد کو کہا کہ تیرے مذکورہ الفاظ سے طلاقِ بائنہ ہوچکی ہے، اب میں تم سے غیر آدمی کو ملاتا ہوں تیرا نکاح دوبارہ کرتے ہیں، یہ کہہ کر سسر ایک غیر آدمی کو گواہی کے طور طریقے سکھا سمجھا کر لایا کہ تو طلاق کے بارے میں پوچھ، غیر آدمی نے شوہر سے پوچھا کہ تو نے طلاق دی ہے؟ شوہر نے کہا: ہاں دی ہے، پھر کہا کس طرح دی ہے؟ شوہر چپ رہا، سسر نے کہا کہ: تو کہہ میں نے طلاقِ بائنہ دی ہے، پھر شوہر نے کہا کہ: میں نے طلاقِ بائنہ دی ہے۔ اب اس صورت میں مذکورہ مسئلہ اور شوہر کے اقرار کے حکمِ شرعی سے مطلع فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر اور بیوی دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ”جا اور شادی کرلے .... الخ“ الفاظ کنایہ ہیں، جو محتمل رد و جواب ہیں، کما فی البحر ولو قال: اذھبی فتزوّجی، وقال: لم انو الطّلاق، لم یقع شئ لأن معناہٗ تزوّجی ان أمکنک وحلّ لک. (البحر الرائق ج:۳ ص:۳۲۶)[1]۔ اور صورتِ مسئولہ میں جب شوہر سے ان الفاظ کے ذریعہ طلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے نیتِ طلاق کی نفی نہیں کی، اور نہ کوئی ایسے معنی بتائے جن میں رَدِّ طلاق کہا جاسکے، بلکہ یہ کہا کہ: ”میں نے رنج کی وجہ سے کہا ہے“ پھر جب اس سے کہا گیا کہ ان الفاظ کے

---

(۱) البحر الرّائق باب الکنایات فی الطّلاق ج:۳ ص:۳۰۲ (طبع سعید) وفی الھندیة کتاب الطّلاق الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو قال لھا اِذھبی فتزوّجی تقع واحدة اذا نویٰ .... الخ.

ذریعہ طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے، تب بھی اس نے کوئی اور مفہوم واضح نہیں کیا، یہاں تک کہ پھر صراحةً اقرار بالطّلاق کیا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۰/۱۱/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۰/۲۱ الف)

''مجھ کو تیری ضرورت نہیں، جا چلی جا'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص کیمبلپور میں ہے اور اس کا داماد کراچی ملز میں ملازم ہے، شخصِ مذکور نے اپنی لڑکی کو داماد کے پاس پہنچادیا، چنانچہ میاں بیوی کچھ مدّت تک اتفاق وسلوک سے رہے، لیکن بعد میں ناچاقی ہوگئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکی نے شوہر کو کہا کہ: اگر تجھ کو میری ضرورت نہیں تو مجھ کو ستانا نہیں، گھر بھیج دو۔ شوہر نے اس کو کہا کہ: ''مجھ کو تیری کوئی ضرورت نہیں، جا چلی جا'' اور سب چیزیں اس سے لے لیں اور ایک برقعہ دے کر کہا کہ یہ تمہارا حق مہر ہے۔ اور مکان سے نکال کر تالا لگادیا، لڑکی اپنے والد کے گھر پہنچ گئی، لڑکی کے والد نے کچھ دنوں تک تو ناراضگی کی وجہ سے داماد کے پاس خط بھی نہیں بھیجا، کچھ دنوں کے بعد خط بھیجا کہ عزیز اپنی بیوی کو سنبھال اور اگر نہیں سنبھال سکتے یا تجھ کو ضرورت نہیں تو چھوڑ دے، کیونکہ وقت نازک ہے اور ہم غریب آدمی ہیں، اس پر داماد نے لکھا کہ: ''آپ نے جو کچھ بندہ کی عزّت کی ہے اور جو کچھ شادی کرنے سے آرام ملا ہے اور جو کچھ عزّت کی گئی ہے، یہ کافی ہے، اور اب بندہ کو ضرورت نہیں، اپنی لڑکی کو واپس لے کر بندہ کو شکریہ کا موقع دیں، کیونکہ میں اس کے سنبھالنے سے معذور ہوں۔'' اب لڑکا کہتا ہے کہ میں نے صریح طلاق نہیں دی اور طلاق سے انکار کر رہا ہے، تو کیا اس صورت میں طلاقِ بائن واقع نہیں ہوتی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں شوہر نے دو جملے استعمال کئے ہیں، ایک یہ کہ: ''مجھ کو تیری ضرورت نہیں'' اور دُوسرے ''جا چلی جا'' ان میں سے پہلے جملے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، خواہ طلاق کی نیت کی ہو، لما فی الھندیة ولو قال: لا حاجة لی فیک، ینوی الطّلاق فلیس بطلاق. (عالمگیریة نولکشور ج:۲ ص:۸۵)۔[1] البتہ دُوسرا جملہ یعنی ''جا چلی جا'' کنایاتِ طلاق میں سے

---

(۱) الفتاویٰ الھندیة الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع رشیدیہ کوئٹہ). وفی بدائع الصنائع الکنایات القسم الثالث ج:۳ ص:۱۰۷ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) ولو قال: لا حاجة لی فیک، لا یقع الطّلاق، وان نویٰ لأنّ عدم الحاجة لا یدلّ علٰی عدم الزّوجیة فانّ الانسان قد یتزوّج بمن لا حاجة لهٗ الی تزوّجها فلم یکن ذٰلک دلیلًا علٰی انتفاء النّکاح فلم یکن محتملًا للطّلاق .... الخ. وفی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۳ (طبع سعید) اذا قال: لا حاجة لی فیک .... فانّه لا یقع وان نویٰ .... الخ.

ہے، اور اس میں رد اور جواب دونوں کا احتمال ہے، اور حالت ہے مذاکرۂ طلاق کی، اس لئے بغیر نیت کے طلاق واقع نہیں ہوگی، لما فی العالمگیریة وفی حالة مذاکرة الطّلاق یقع الطّلاق فی سائر الأقسام قضاء الا فیما یصلح جوابًا وردًا فانه لا یجعل طلاقًا کذا فی الکافی ج:۲ ص:۸۴۔[۱]
اس لئے مذکورہ صورت میں دار و مدار شوہر کی نیت پر ہے، اگر اس نے "جا چلی جا" کہتے ہوئے طلاق کی نیت کی تھی تو ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی، اور اگر اس نے نیت طلاق کی نہیں کی تو طلاق واقع نہیں ہوگی،[۲] اور چونکہ اس معاملے میں شوہر کا قولِ قضاءً معتبر ہے اس لئے اس کا نیتِ طلاق سے انکار کرنا بحلف معتبر ہوگا، شوہر کو چاہئے کہ وہ یومِ آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر صحیح صحیح بتائے کہ اس کی نیت کیا تھی؟ اگر وہ پھر بھی اس بات پر قائم رہے کہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی تو پھر لڑکی بدستور اس کی منکوحہ ہے، اور اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یا تو اسی سے طلاق لینے یا خلع کرنے کی کوشش کی جائے، یا عدالت میں نان ونفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا جائے، عدالت شوہر کو بلاکر اسے نان ونفقہ دینے پر مجبور کرے، اگر وہ آمادہ نہ ہو یا حاضرِ عدالت ہونے سے انکار کرے تو عدالت نکاح فسخ کرسکتی ہے، اس کے بعد عدّت گزار کر لڑکی دُوسری جگہ نکاح کرسکے گی۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۱/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۹۰/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

"تو میری ماں بہن ہے" الفاظ کا حکم

سوال:- مرد اپنی عورت کو ماں بہن کہے، یعنی یہ کہے کہ: "تو میری ماں بہن ہے، اگر میرے ساتھ نہیں آؤ گی اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں آؤ گی تو میری ماں اور بہن ہے۔" اتنا کہہ کر مرد چلا گیا، دو سال خرچہ بند کیا، یعنی میں باہر جا رہا ہوں، اگر تم ساتھ نہیں چلتی، عورت نے کہا کہ: میں اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں ساتھ جاؤں گی، اس پر شوہر نے کہا: "تو میری ماں بہن ہے" اور یہ کہہ کر چلا گیا، اور میں نے شوہر کے پاس خط لکھا ہے کہ: "تو میری ماں بہن ہے" اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟

جواب:- "تو میری ماں بہن ہے" کہنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، یہ جملہ لغو ہے، لہٰذا

(۱) الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع رشیدیه کوئٹه).
(۲) دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۳۲، ۴۳۳ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔
(۳) فسخِ نکاح کا مفصل طریقۂ کار ص:۴۶۱ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

صورتِ مسئولہ میں عورت بدستور اپنے شوہر کے نکاح میں ہے، اگر علیحدگی مقصود ہو تو شوہر کو صریح لفظوں میں طلاق دینی چاہئے، لما فی الدر المختار وان نوی بأنت علیّ مثل أمّی أو کأمّی ..... برّا أو ظهارا أو طلاقًا صحت نیّته ووقع ما نواه لأنه کنایة والّا ینو شیئًا أو حذف الکاف لغا وتعین الأدنی. (شامی ج:۲ ص:۵۷۶، ۵۷۷)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۶/۲۸ ج)

”ہمارا رشتہ میاں بیوی والا ختم ہے“ کے الفاظ سے طلاق کا حکم

سوال:- ایک شخص محمد سلیمان ولد محمد اسلم نے اپنی بیوی مسماۃ عائشہ بیگم کو خط کے ذریعہ طلاق بھیجی ہے، اس عورت کو خالہ نے پالا پوسا تھا اور سلیمان باہر ملازمت پر جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ اُسے اپنے پاس بلالوں گا، سات سال کا طویل عرصہ گزر گیا، اس دوران ایک مرتبہ پاکستان آیا اور لڑکی سے بغیر ملے چلا گیا، خط میں طلاق کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ حرف بحرف درج ذیل ہیں:-

”میں اپنے ہوش وحواس قائم رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر و ناظر کرتے ہوئے نہایت تسلی کے ساتھ آج مؤرخہ پہلی مارچ ۱۹۷۷ء بروز منگل کو تمہیں اطلاع کرتا ہوں کہ ہمارا رشتہ میاں بیوی والا ختم ہے، اور اس فیصلے کو شرعی یا قانونی طور پر جسے طلاق کہتے ہیں سمجھیں، اس کے بعد اور کوئی گنجائش، اُمید یا شک والی بات رہ ہی نہیں گئی جس سے یہ خیال کیا جاوے کہ ہمارا رشتہ میاں بیوی والا قائم ہے، میرے اس فیصلے سے اب تم اپنی مرضی سے جس طرح اپنی بہتری خیال کرتی ہو بے شک کرو، چونکہ میری طرف سے اب فارغ ہو۔“

لڑکی اپنی دادرسی کے لئے شرعی عدالت میں کن کن حقوق کے لئے دعویٰ کرسکتی ہے؟ مثلاً سات سال کا خرچہ، حق مہر اور عدّت کی مدّت کا خرچہ اس کے علاوہ وہ اور کن حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ عائشہ بیگم پر طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے،[۲] اور وہ عدّت

---

(۱) کتاب الطّلاق باب الظّهار ج:۳ ص:۴۷۰ (طبع سعید). نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۸۰، ۴۸۲۔ عزیز الفتاویٰ ص:۴۹۳، ۴۹۴، سوال نمبر:۹۰۰، ۹۰۱۔ وامداد المفتین ص:۶۲۵۔

(۲) وفی الهندیة کتاب الطّلاق الباب الثّانی فی ایقاع الطّلاق الفصل الخامس فی الکنایات ج:۱ ص:۳۷۶ (طبع ماجدیه) ولو قال .... لم یبق بینی وبینک عمل ونویٰ یقع کذا فی العتابیة. وفی الهندیة أیضًا ج:۱ ص:۳۷۵ قال لم یبق بینی وبینک نکاح، یقع الطّلاق اذا نویٰ .... الخ.

گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، اگر شوہر اس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ کرچکا تھا تو اس پر پورا مہر واجب ہے[1]، اور مسماۃ عائشہ کو اس کے وصول کرنے کا بذریعہ عدالت حق حاصل ہے، نیز عدّت کے زمانے کا نفقہ بھی وہ اپنے شوہر سے وصول کرنے کا حق رکھتی ہے[2]، البتہ گزشتہ سات سال کے نفقے کا مطالبہ صورتِ مسئولہ میں نہیں ہوسکتا[3]، شوہر کو چاہئے کہ یہ نفقہ بھی ادا کردے، لیکن اگر وہ ادا نہ کرے تو بذریعۂ عدالت اُسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵۴/۲۸ ب)

''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے یا نہیں؟'' الفاظ کا حکم

سوال:- زید کی بیوی اپنے شوہر کا کہا دُنیاوی معاملات میں نہیں مانتی، ایک دن ایسے ہی واقعے کی بناء پر زید نے سخت غصّے کی حالت میں کہا کہ: ''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے کہ نہیں؟'' زید کا مطلب اس سے یہ تھا کہ بیوی اگر شوہر کا کہا بالکل نہ مانے تو سخت گناہ کی بات ہے، بلکہ وہ محاروۃً بیوی نہیں رہی۔ زید کی بیوی کا کہنا ہے کہ چونکہ تم نے نکاح پر شک کیا ہے اس لئے دو گواہوں کے سامنے اقرار کرو کہ نکاح برقرار ہے ٹوٹا نہیں، براہِ کرم زید کی بیوی کے مطالبے کی شرعی حیثیت اور زید کے مندرجہ بالا الفاظ کی حیثیت واضح کریں کہ کیا زید کے ان الفاظ سے نکاح میں خدانخواستہ کوئی خلل واقع ہوگیا ہے، جبکہ زید کا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں، بیوی کا مطالبہ غلط ہے۔

جواب:- زید نے جو یہ الفاظ کہے کہ: ''اب تو مجھے نکاح پر شک ہے کہ وہ قائم ہے کہ نہیں'' ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور نہ نکاح ٹوٹا ہے، دونوں کا نکاح بدستور قائم ہے، بیوی کو ایسا مطالبہ کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ایسا کرنے سے مسئلے پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۳/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۱۶/۳۲ الف)

---

(۱) وفی الهندية كتاب النكاح الباب السابع ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكّد بأحد معان ثلثة الدّخول والخلوة الصّحيحة وموت أحد الزّوجين سواء كان مسمّى أو مهر المثل حتّى لا يسقط منه شيء بعد ذلك الا بالابراء من صاحب الحق .... الخ.

(۲) وفي الهندية الفصل الثالث فى نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجديه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النفقة والسكنى كان الطّلاق رجعيًا أو بائنًا أو ثلثًا حاملًا كانت المرأة أو لم تكن، كذا فى فتاوىٰ قاضى خان.

وكذا فى البحر الرّائق ج:۴ ص:۱۹۸ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۳) وفى الدّر المختار ج:۳ ص:۵۹۴ (طبع سعيد) والنفقة لا تصير دينًا الّا بالقضاء أو الرّضا أى اصطلاحهما على قدر معيّن أصنافًا أو دراهم فقبل ذٰلك لا يلزمه شيء. وفى الشامية (قوله والنفقة لا تصير دينًا) أى اذا لم ينفق عليها بأن غاب عنها أو كان حاضرًا فامتنع فلا يطالب بها بل تسقط بمضى المدّة .... الخ. وكذا فى البحر الرّائق ج:۴ ص:۱۸۶ (طبع رشيديه كوئٹه).

''میری طرف سے فیصلہ ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص کی دو بیویاں تھیں، پہلی بیوی کو دو دفعہ اور دُوسری بیوی کو ایک دفعہ طلاق دے کر رُجوع کر چکا تھا، پھر ایک موقع پر اس نے دونوں بیویوں کے متعلق کہا کہ: ''میری دونوں بیویاں کل تک ضرور میرے پاس آجائیں، اگر کل تک نہ آئیں تو میری طرف سے فیصلہ ہے۔'' مگر بیویاں اس کے پاس نہ گئیں، اس واقعے کی تفصیل آپ کے دارالافتاء لکھ کر بھیجی تھی، تو جناب کی طرف سے ۱۳۹۳/۳/۶ھ کو جواب موصول ہوا تھا کہ پہلی بیوی کو تینوں طلاقیں ہوچکی ہیں، اور دُوسری بیوی کو طلاقِ بائن ہوئی ہے کہ رُجوع نہیں ہوسکتا، باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ مگر دُوسری بیوی آمادہ نہ ہوئی نتیجتاً دونوں بیویاں اپنی اولاد کے پاس رہنے لگیں، اب وہ شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے اور وہ الفاظ میں نے غصّے کی حالت میں کہے تھے، حالانکہ یہ بالکل واضح تھا کہ جب اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ اس کی مراد طلاق تھی، اگر وہ شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ نہیں کہے تھے تو اس کے اس دعویٰ کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:- پہلے جواب میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ ''اگر یہ بات غصّے کی حالت میں کہی تھی تو نیت کے بغیر بھی طلاق ہوگئی۔'' اور موجوہ سوال میں شوہر خود اقرار کر رہا ہے کہ یہ بات اس نے غصّے کی حالت میں کہی تھی لہٰذا طلاق واقع ہوگئی[1]، اس کے علاوہ سوال میں (جس کا نمبر ۲۴/۳۴۸ ب ہے) یہ تصریح ہے کہ اس نے مذکورہ الفاظ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ: ''یہ نہ سمجھنا کہ میں خالی دھمکی دے رہا ہوں، بلکہ پرسوں وکیل کے ذریعہ تحریری طلاق بھی ارسال کردُوں گا۔'' یہ صراحۃً مذاکرۂ طلاق ہے، اور مذاکرۂ طلاق میں بھی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا طلاقِ بائن واقع ہوچکی ہے[2]، اور شوہر کے قول کا اعتبار نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۵ر رمضان ۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۰۵/۲۷ ھ)

(۱، ۲) ''فیصلہ دیا'' کے الفاظ کے حکم کے بارے میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری شدہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایک مصدقہ فتویٰ میں درج ہے کہ: ''میں نے فیصلہ دیا'' کے الفاظ کنایہ ہیں جو کہ فارغ خطی کے ہم معنیٰ ہیں، اور فارغ خطی کے الفاظ میں امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۴۴۷ (جواب سوال نمبر ۵۳۶) میں حضرت تھانویؒ نے ایقاعِ طلاقِ بائن کو متعارف لکھا ہے، اور نیز یہ الفاظ کنایات کی تیسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں صرف جواب کا احتمال ہو اور اس قسم میں حالتِ غضب میں بلا نیت بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ کذا فی الشامیة ج:۳ ص: ۳۰۱ (طبع سعید)۔ (فتویٰ نمبر ۹۷/۷۴۰ ج) رجسٹر نقلِ فتاویٰ دارالعلوم کراچی۔

بطور گالی لفظِ ''حرام'' کہنے کی ایک مخصوص صورت کا حکم

سوال:- زید کی بیوی کی ایک سہیلی مصری تھی، وہ اپنے بچوں کو منع کرتی تو لفظِ ''حرام'' عموماً استعمال کرتی، زید کی بیوی کو بھی اس لفظ کی عادت ہوگئی، زید کی بیوی نے زید کو ایک مرتبہ کہہ دیا حرام، تو جواباً زید کی زبان سے نکل گیا: ''تو!'' زید کی نیت طلاق دینے کی قطعاً نہ تھی۔

۲:- زید نے ایک مرتبہ بطور گالی اپنی زوجہ کو ''حرام زادی'' کہنا چاہا مگر فوراً گالی کا ذہن میں آجانے سے صرف لفظِ ''حرام'' کہہ کر ہی رُک گیا، کیا مندرجہ بالا صورتوں میں طلاق ہوگی؟

جواب ا:- اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسے تحریر کیا گیا تو اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

۲:- اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اس سے بھی کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، لأن المتأخرین انما أفتوا بانصراف لفظ الحرام الی الطّلاق لغلبة العُرف،(۱) ولا عرف فیما ذکره السائل۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۵/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۴۵۳ ب)

بذریعۂ مُبارات ایک طلاقِ بائن کا حکم

سوال:- شہزی نقوی ولد فرزند علی نقوی نے اپنی بیوی یاسمین شیخ بنتِ عثمان شیخ کو جون ۱۹۹۳ء کو بذریعہ مُبارات طلاق دی تھی مطلقہ نے مہر معاف کیا تھا اور کفالت کے لئے عدّت کے دوران ۴۰ ہزار روپیہ طے پایا تھا، فریقین اس پر راضی تھے، دونوں نے معاہدے پر دستخط کئے تھے جو منسلک ہیں اور گواہان کے بھی دستخط ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا یہ طلاق مکمل ہے جبکہ فریقین نے ضلع کونسل کو نوٹس نہیں دیا تھا اور وکلاء کے مشورے پر ضلع کونسل کو نوٹس مارچ ۱۹۹۷ء میں دیا گیا، برائے مہربانی اس پر رائے دی جائے جو برطانیہ میں عدالت میں پیش کیا جاسکے۔

جواب:- میں نے منسلک معاہدے کا مطالعہ کیا، یہ ایک مباراۃ کا معاہدہ ہے، اور اس کی رُو سے شہزی نقوی نے اپنی بیوی یاسمین شیخ کو مہر کی معافی اور دیگر شرائطِ معاہدہ کے عوض طلاق دی ہے، لہٰذا شرعاً اس معاہدے کی رُو سے یاسمین شیخ پر شہزی نقوی کی طرف سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم شرعاً یہ ہے کہ اب شہزی نقوی کو رُجوع کرنے کا اختیار نہیں ہے، یاسمین ان کے نکاح سے

---

(۱) وفی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۰ لو قال لها أنت علیّ حرام والحرام عندهٗ طلاق وقع وان لم ینو، وذکر الامام ظهیر الدین لا نقول لا تشترط النیّة ولٰکن نجعله ناویًا عرفا .... الخ. وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۴۳۳ الیٰ ۴۳۵ قال لامرأته أنتِ علیّ حرام .... یفتٰی بانّه طلاق بائن وان لم ینوه لغلبة العُرف. (راجع للتّفصیل الی ردّ المحتار تحت قوله لغلبة العُرف).

علیحدہ ہوچکیں، البتہ اگر دونوں باہمی رضامندی سے نئے مہر پر نکاح کرنا چاہیں تو ان کے درمیان دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،(۱) نیز جس تاریخ کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے اور شوہر نے طلاق دی، اس(۲) تاریخ سے تین ایامِ ماہواری گزر جانے کے بعد یاسمین کسی اور جگہ شرعاً نکاح کرسکتی ہیں،(۳) البتہ اس کے قانونی تقاضے پورے کرنے کے لئے کسی قانون داں سے رُجوع کیا جائے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/۱۱/۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹/۲۵۷)

ایک طلاقِ بائن کے بعد نکاحِ جدید کی صورت

سوال:- پشت پر مندرجہ اقرار نامے کے ذریعہ زوجین کے مابین علیحدگی کے بعد ان کے درمیان مصالحت اور یکجائی کے لئے شریعتِ اسلامیہ کیا راستہ تجویز کرتی ہے؟

۲:- اگر مصالحت کا واحد راستہ زوجین کے درمیان دوبارہ نکاح کا انعقاد ہو تو یہ فرمایا جائے کہ اس میں شرعاً کراہت کا کوئی پہلو تو نہیں ہے؟

۳:- مذکورہ اقرار نامہ سخت غیظ کے عالم میں تحریر کیا گیا، نیز زوجین سات ماہ کے لڑکے کے والدین بھی ہیں، ایسی صورت میں مصالحت کے شرعی وسماجی مصالح کیا ہیں؟

۴:- محولہ اقرارنامے کے ذریعے علیحدگی کے بعد رجعت یا نکاحِ جدید کے لئے وقت اور میعاد کی کیا شرط ہے؟

۵:- اگر دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہو تو کیا اس کے لئے تحلیل (حلالہ) ضروری ہے یا اس کے بغیر بھی براہِ راست دُوسری بار نکاح پڑھایا جاسکتا ہے؟

۶:- اگر دوبارہ نکاح ضروری ہو تو کیا اس کے لئے اسی اہتمام، اعلان اور اسی پیمانے کی تقریب کی ضرورت ہے جیسی پہلی بار منعقد ہوئی تھی یا گھر میں نکاح پڑھایا جاسکتا ہے؟

جواب:- مندرجۂ پشت اقرار نامے کی رُو سے محمد جنید فاروقی صاحب کی بیوی صبیحہ گل اندام صاحبہ پر ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر اب یک طرفہ طور سے رُجوع

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الرّجعة فصل فيما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شرکت علمیه ملتان) واذا كان الطّلاق بائنًا دون الثلاث فله أن يتزوّجها فی العدّة وبعد انقضائها .... الخ.

وفی الدرّ المختار ج:۳ ص:۴۰۹ (طبع سعید) وينكح مبانة بما دون الثلاث فی العدّة وبعدها بالاجماع.

وكذا فی الهندية ج:۱ ص:۴۷۲، ۴۷۳ (طبع رشیدیه کوئٹه)

(۲،۳) وفی الشامية ج:۳ ص:۵۲۹ (طبع سعید) ويظهر ان ابتداء العدّة من وقت وقوع الطّلاق لا من وقت الأخبار .... الخ. وفی الدّر المختار باب العدّة ج:۳ ص:۵۰۴ و ۵۰۵ وهی فی حقّ حرّة .... بعد الدّخول حقيقة أو حكمًا ثلاث حيض كوامل .... الخ.

نہیں کرسکتا، ہاں! اگر فریقین راضی ہوں تو ازسرِ نو نکاح کرسکتے ہیں[۱]، اس نکاح کے لئے عدّت گزرنا شرط نہیں، بلکہ جب چاہیں نکاح ہوسکتا ہے[۲]، اور صورتِ مسئولہ میں حلالہ کی ضرورت نہیں، نکاح کے لئے اُس اہتمام اور اعلان اور تقریب کی ضرورت نہیں جو پہلے نکاح میں ہوئی تھی بلکہ صرف دو مسلمان مردوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرلیں تو نکاح منعقد ہوجائے گا[۳]، کسی عالم سے نکاح پڑھوائیں تو بہتر ہے، البتہ اس نکاح کے لئے الگ مہر مقرّر کرنا ہوگا، اور آئندہ شوہر کو صرف دو طلاقوں کا اختیار رہ جائے گا، اس کے بعد احتیاط رکھیں کیونکہ اب صرف دو طلاقوں سے بھی بیوی مغلّظہ ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر سہ بارہ نکاح بھی نہیں ہوسکے گا۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹/۲۸ الف)

۱:- طلاقِ صریح میں رجعت کے اختیار اور بائن میں نیا نکاح ضروری ہونے کی وجہ

۲:- بیوی کو زنانی (عورت) کہنے سے کوئی طلاق نہیں ہوئی

۳:- ''بیوی کو اُس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤ'' کہنے کا حکم

سوال:- بعض علمائے کرام کے نزدیک جب کوئی شخص اپنی زوجہ کو کہہ دے کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا، تو اس سے طلاقِ صریح کا وقوع پذیر ہونا مانا جاتا ہے، یعنی طلاقِ صریح سے طلاقِ رجعی مراد ہوتی ہے اور نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی، اب اگر کوئی اپنی زوجہ کو یہ کہہ دے کہ: ''تو مجھ پر حرام ہے'' تو اس سے طلاقِ صریح کیوں واقع نہیں ہوتی بلکہ بائن واقع ہوتی ہے جس میں نکاح کی ضرورت پڑتی ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس میں فرق کیا ہے؟

۲:- بیوی نے مجھے کسی بات پر ٹوکا تو میں نے کہا کہ: زنانیوں (عورتوں) کی عادت ہوتی ہے، اور میں نے شک دُور کرنے کے لئے اُس سے کہہ دیا کہ تو بھی تو میری زنانی (بیوی) ہے، شک یہ دُور کرنا ہے کہ میں نے ''بیوی'' کیوں نہ کہا؟ ''زنانی'' کیوں کہا؟ غالباً نعوذ باللہ یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اُسے میں اپنی بیوی نہیں سمجھتا، بہرکیف جب میں نے اُسے کہا کہ تو بھی تو میری زنانی (بیوی) ہے

(۱،۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) وفی الدّر المختار کتاب النکاح ج:۳ ص:۹ (طبع سعید) وینعقد بایجاب من أحدھما وقبول من الأخر.
وفیه أیضًا ج:۳ ص:۲۱ وشرط حضور شاھدین حرّین أو حرّ وحرّتین مکلّفین سامعین قولھما معًا.

(۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

پھینی پھینی، پنجابی زبان میں چپٹے ناک والی کو کہتے ہیں، کیا صورتِ مذکورہ میں نکاح پر تو کوئی اثر نہیں پڑا؟ طلاق کی نیت نہیں تھی۔

۳:- آج سے تقریباً ۴½ سال قبل جب میں نے نئی نئی شادی کی تھی تو بیوی کو کسی بات پر غصہ آ گیا تھا، والدہ اور دیگر رشتہ دار عورتوں کے سامنے میں نے والدہ کو اپنی زوجہ کے سامنے (زوجہ کو سنانے کے لئے) یہ مندرجہ ذیل لفظ پنجابی زبان میں کہہ دیا تھا جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے: ''اس کو (بیوی کو) اس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤ'' یا یہ کہا تھا: ''چھوڑ آؤ اس کو اس کی ماں کے گھر'' معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس فقرۂ مذکورہ سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟ میں نے یہ رُعب ڈالنے اور دھمکانے کے لئے کہا تھا۔

جواب ۱:- اس فرق کو سمجھنے کے لئے فقہ پڑھنے کی ضرورت ہے، لہٰذا یا تو آپ فقہ کی تعلیم حاصل فرمائیں یا پھر اہلِ علم سے مسئلہ پوچھ کر اس پر عمل فرمائیں اور دلائل کے پیچھے نہ پڑیں۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کچھ شک اور تردّد میں نہ پڑیں۔

۳:- اگر آپ کی نیت ان الفاظ سے طلاق کی نہیں تھی تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۹/۲۸ ب)

''یہ ہیں تمہارے لے لو'' الفاظ طلاق کی نیت سے بولے جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- محمد صالح اور اُس کی بیوی کے درمیان ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا، اس جھگڑے کے دوران ایک دن محمد صالح نے غصّے میں اپنا ہاتھ اپنی جیب کے قریب لا کر سامنے بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے کہا کہ: ''یہ ہیں تمہارے لے لو'' (جیب سے کچھ نہیں نکالا)، دُوسری بار پھر یہی الفاظ دُہرائے تھے کہ فوراً اُس کی بیوی وہاں سے اُٹھ گئی اور باہر جا کر رونے لگی۔ بعد میں محمد صالح سے مذکورہ بات کہنے کا مقصد پوچھا گیا کہ کیا مقصد تھا؟ تو اس نے کہا کہ میرا مقصد اپنی بیوی کو طلاق دینا تھا، شرعاً طلاق ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اس کا صریح جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن قواعد اور مماثل جزئیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لئے کہ ''یہ ہیں تمہارے لے لو'' میں طلاق کا نہ کوئی صریح لفظ ہے نہ کنایہ اور نہ مقتضا اور مقدّر، اور ایسی صورت میں نیت کے باوجود طلاق واقع نہیں ہوتی۔

علامہ شامیؒ، علامہ رملیؒ سے نقل کرتے ہیں: **وبه يعلم جواب ما يقع من الأتراك من رمى ثلاث حصوات قائلًا: أنت هكذا ولا ينطق بلفظ الطّلاق، وهو عدم الوقوع تأمل. (منحة الخالق**

حاشیه البحر الرائق ج:۳ ص:۳۰۹، باب الصریح تحت قوله "أنت طالق هٰکذا")[1]۔ اور عالمگیریہ میں ہے: ولو قال لها بعد ما طلبت منه الطّلاق: "گفتہ گیر" لا یقع وان نوٰی، کذا فی الخلاصة. (عالمگیریة ج:۱ ص:۳۸۰)[2]۔

تاہم چونکہ صریح جزئیہ نہیں ملا، اس لئے اگر دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرکے معلوم کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۸/ ۲۸ ب)

"بیوی کو اپنے اُوپر حرام کرتا ہوں" الفاظ سے طلاق بائن کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مندرجہ ذیل الفاظ طلاق کے لئے استعمال کئے: "میں اپنی بیوی مسمات فلاں کو اپنے اُوپر حرام کرتا ہوں" ان الفاظ سے کون سی قسم کی طلاق واقع ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے،[3] بغیر ازسرِنو نکاح کے زوجین میں تعلقاتِ زوجیت قائم نہیں ہوسکتے۔ واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸۷/ ۱۸ الف)

"البائن لا یلحق البائن" میں دُوسرے بائن سے مراد وہ ہے جو اصل وضع میں بائن ہو اگرچہ عرف کی وجہ سے صریح بن گیا ہو

سوال:- بخدمت شیخی واُستاذی مدظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے حضرتِ والا کی خدمت میں ایک فقہی سوال لکھا تھا، حضرتِ والا نے اس کا جواب یوں تحریر فرمایا:-

اس کے لئے مراجعت کرنی ہوگی، اور وقت بھی درکار ہے، لہٰذا اگر یہ سوال الگ ارسال فرمادیں تو اس کی مستقل تحقیق کرلی جائے۔

حضرتِ والا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بندہ الگ سے اس سوال کو دوبارہ مزید منقح کرکے

---

(۱) ج:۳ ص:۲۸۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۲) (طبع مکتبه ماجدیه کوئٹه).

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۴۳۳ الٰی ۴۳۵ (طبع سعید) قال لأمرأته انتِ علیّ حرام ...... یفتٰی بانّه طلاق بائن وان لم ینوه لغلبة العُرف، وکذا فی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۰۰. نیز دیکھئے امداد المفتین ص:۲۶۶۔

لکھ رہا ہے۔

سوال:- وہ طلاقِ بائن جو عرف کی وجہ سے صریح بن گئی ہے، اس سے بلا نیت کے بھی طلاق ہوجاتی ہے (مثلاً: تو مجھ پر حرام ہے، تو آزاد ہے، وغیرہ)، کیا وہ طلاق سابق (خواہ وہ صریح ہو یا کنایہ) سے عدّت کے دوران لاحق ہوجائے گی یا نہیں؟

رد المحتار ج:۳ ص:۳۰۶[1] کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ لاحق نہیں ہوگی:

"قال ح: ولا یرد انت علی حرام علی المفتی به من عدم توقفه علی النیة مع انه لا یلحق البائن، ولا یلحقه البائن لکونه بائنا لما أن عدم توقفه علی النیة امر عرض له لا بحسب اصل وضعه اهـ"۔

اسی عبارت کے مطابق امداد المفتین ص:۶۲۶ میں عدمِ لحوق کا فتویٰ مذکور ہے۔ مگر ردالمحتار ج:۳ ص:۳۰۸[2] کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے لاحق ہونی چاہئے: "(قوله لا یلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذی لا یلحق هو ما کان بلفظ الکنایة لأنه هو الذی لیس ظاهرًا فی انشاء الطلاق کذا فی الفتح"۔

اس عبارت میں طلاق بائن بالکنایۃ (ثانی) کے عدمِ لحوق کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ انشاء طلاق میں ظاہر نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طلاق انشاءِ طلاق میں ظاہر ہو اس کو لاحق ہونا چاہئے، اور طلاق بائن صریح (مثلاً: تو مجھ پر حرام ہے، تو آزاد ہے، وغیرہ) تو انشاءِ طلاق میں ظاہر ہے، لہٰذا اس کو بھی طلاق سابق سے لاحق ہونا چاہئے۔

احسن الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۸۳[3] میں اسی کے مطابق لحوق کا فتویٰ مذکور ہے۔

اس بارے میں صحیح بات کیا ہے؟　　سائل:- مولانا محمد عامر صاحب

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

جواب:- مکرمی　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ردّ المحتار میں لحوق کی بحث تفصیل سے پڑھی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صورتِ مسئولہ میں طلاقِ ثانی لاحق نہیں ہوگی، جیسا کہ امداد المفتین میں مذکور ہے، اور اس میں جو حوالہ دیا ہے وہ بھی اس پر صریح ہے، علامہ شامیؒ کی جس عبارت سے آپ کو اِشکال ہوا ہے، یعنی: "لأنه هو الذی لیس ظاهرًا فی انشاء الطّلاق" اس کا مطلب ہے "لیس ظاهرًا باعتبار أصله" چنانچہ خود انہوں نے اگلے صفحے پر "قوله: أو أبنتک بتطلیقة" کے تحت اس کی تقریباً صراحت کردی ہے، فرماتے ہیں:-

---

(۱ تا ۳) طبع ایچ ایم سعید کمپنی۔

وأشار به الى أنه لا يشترط اتحاد اللفظين، فشمل ما اذا كان الأول بلفظ الكناية البائنة ..... بعد كون الثاني بلفظ الكناية البائنة كالخلع ونحوه مما يتوقف على النية، ولو باعتبار الأصل، كانت حرام. [1]

صورتِ مسئولہ میں عدمِ لحوق پر مندرجہ ذیل دلائل مزید ہیں:-

۱:- بائن کے بائن کو لاحق نہ ہونے کی علت تمام کتبِ فقہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ثانی کو اخبارعن الاول قرار دینا ممکن ہوتا ہے، اسی لئے درمختار میں فرمایا: "اذا امكن جعله اخبارا عن الأول" [2] اور "أنت حرام" میں ایسا ہی ہے۔

۲:- کافی حاکمؒ سے علامہ شامیؒ نقل فرماتے ہیں: "واذا طلقها تطليقة بائنة ثم قال لها في عدتها: أنت عليّ حرام .... وهو يريد به الطّلاق لم يقع عليها شيء، لأنه صادق في قوله هي عليّ حرام" اھ۔ [3] علامہ شامیؒ اس پر لکھتے ہیں: "أي لأنه يمكن جعل الثاني خبرًا عن الأول" یہاں علت وقوعِ طلاق کے موقوف علی النیۃ ہونے کو قرار نہیں دیا، بلکہ اس بات کو علت قرار دیا ہے کہ ثانی کو اخبارعن الاول بنانا ممکن ہے، اور عرف سے توقف علی النیۃ ختم ہوا ہے، احتمال الاخبار ختم نہیں ہوا۔

۳:- علامہ شامیؒ نے نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ البائن يلحق الصّريح میں صریح سے مراد صریحِ رجعی ہے، صریحِ بائن نہیں، لہٰذا صریحِ بائن کو بائن لاحق نہیں ہوتی، اور "أنت عليّ حرام" صریح ہونے کے باوجود بائن ہے، شامی میں یہ پوری بحث غور سے پڑھنے پر اُمید ہے کہ آپ کو کوئی اِشکال نہیں رہے گا۔

احسن الفتاویٰ ج:۵ ص:۱۸۳ میں لحوق کے مسئلے سے بحث نہیں فرمائی گئی صرف حرام کے صریح ہونے کا ذکر ہے، البتہ قوسین میں لکھا ہے کہ: "اس پر اِشکال و جواب تتمہ میں ہے" یہ تتمہ مجھے نہیں ملا، لیکن رد المحتار کی پوری بحث پڑھنے کے بعد کم از کم بندے کو کوئی اِشکال نہیں کہ یہ طلاق لاحق نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۶؍شوال ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۱)

---

(۱) ج:۳ ص:۳۱۰ رد المحتار (طبع ایچ ایم سعید کمپنی).
(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۳۰۹ (طبع أيضًا).
(۳) رد المحتار ج:۳ ص:۳۰۸ (طبع أيضًا).

﴿فصل فی الطّلاق بالکتابۃ﴾
(تحریری طلاق دینے کا بیان)

خود طلاق نامہ لکھنے، یا کسی سے لکھوانے کے بعد دستخط کرنے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- ان السیّد المرحوم رفیع الرحمٰن قد طلّق زوجته نجمة بنت منظور بوثیقة الطّلاق المرفقة باللّغة الانکلیزیة مع ترجمتها العربیة، وانه قد کتب هٰذه الوثیقة للثامن والعشرین من شهر ابریل سنة ۱۹۸۰م، وتزوج السیّد رفیع الرحمٰن زوجةً أخریٰ، وله من کل واحد من الزوجتین أولاد، وقد توفی قریبًا، فالمرجو افادتنا، هل طلقت نجمة بنت منظور بالوثیقة المرفقة؟ وهل ترث الأن من السیّد رفیع الرحمٰن أم لا ترث؟ بیّنوا وتؤجروا.

جواب:- ان کان السیّد المرحوم رفیع الرحمٰن کتب هٰذه الوثیقة[1] بنفسه أو استکتبها من غیره ووقّع علیها، فان نجمة بنت منظور وقع علیها الطّلاق منه[2] وخرجت من نکاحها وجاز لها أن تتزوّج غیره بعد انقضاء العدّة. وبما أنّ رفیع الرحمٰن توفّی قریبًا، فی حین أن وثیقة الطّلاق کتبت قبل أکثر من عشر سنوات، فالظّاهر أن نجمة قد أکملت عدّتها، وهی ثلٰث حِیَض، وبما أنها لم تکن زوجته وقت وفاة رفیع الرحمٰن، فانها لا ترث منه شیئًا، أما الأولاد، فانهم یرثون من کلّهم، سواء کانوا من بطن نجمة أو من بطن زوجته الثانیة.

والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

محمد تقی العثمانی

دار الافتاء، دار العلوم کراتشی ۱٤

غرة ذی الحجة سنة ۱٤۱٤ھ

---

(۱) یہ وثیقہ (طلاق نامہ) اس جواب کے بعد آرہا ہے۔

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲٤٦ (طبع سعید) کتب الطّلاق ان مستبینًا علیٰ نحو لوح وقع ان نوی وقیل مطلقًا. وفی ردّ المحتار "مطلب فی الطّلاق بالکتابة" ان أرسل الطّلاق بأن کتب: امّا بعد! فانتِ طالق. فکما کتب هٰذا یقع الطّلاق. وبعد أسطر.... ولو قال للکاتب اکتب طلاق امرأتی کان اقرارًا بالطّلاق وان لم یکتب ولو استکتب من اٰخر کتابا بطلاقها وقرأه علی الزّوج فاخذهٗ الزّوج وختمه وعنونه وبعث بهٖ الیها فأتاه وقع .... الخ. وکذا فی الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق الباب الثانی فی ایقاع الطّلاق الفصل السادس فی الطلاق بالکتابة ج:۱ ص:۳۷۹.

وثیقة طلاق

انني سيّد رفيع الرحمٰن بن سيّد سعيد الرحمٰن المسلم، البالغ، العمر حوالى ٤٠ سنة، المهنة خدمة خاصة، الساكن ب - ١٨٠ بلوك - ١١، منطقة فيدرل بى، كراتشي، اقرر تحريرا بانني قد اطلق زوجتي نجمة بنت منظور على المسلمة، البالغة، عمرها حوالى ٣٥ سنة القاطنة في ١٥/١ دهرم بورة، لاهور (باكستان) بناء على ما يلي:-

١:- بأن منذ مدة ٨ سنوات ماضية خلال مدة زواجها معي انها كانت متمردة ومنازعة معي.

٢:- بأنها تسئى التّصرف والسلوك وتتعسف لي.

٣:- وبالعموم لكل الوقت خلال اسكانها في البيت انها يبدعت قذع وتعارض على اساس نجمة.

وبنتيجة هٰذا غير ممكن لي بالرغم عن جهدى المخلص السكن معها بين حدود الله.

انني لذٰلك الفظ طلاق لها.

١:- انني سيّد رفيع الرحمٰن بن سيّد سعيد الرحمٰن اطلق لكم نجمة عالية بنت منظور على.

٢:- ________ كالمذكور ________

٣:- ________ كالمذكور ________

سيّد رفيع الرحمٰن بن سيّد سعيد الرحمٰن. الساكن ب - ١٨٠ بلوك - ١١، منطقة فيدرل بى، كراتشي.

توقيع الشاهد
سيّد محمد الحق
سعود اٰباد كراتشي

توقيع:
۱۹۸۰/٤/۲۸م

تین طلاق لکھ کر دینے سے بھی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں

سوال:- فیاض علی کا نکاح مسماۃ نسیم اختر کے ساتھ ۱۴/نومبر ۱۹۶۰ء کو ہوا، بعد نکاح نہ لڑکی سسرال گئی اور نہ لڑکے نے آکر سسرال میں قرابت کی، اس وجہ سے کہ لڑکی کے والدین نے یہ شرط رُخصتی کے لئے عائد کی تھی کہ جب تک لڑکا بی.ایس.سی کرے گا جب لڑکی کی رُخصتی ہوگی، اور یہ شرط لڑکے نے منظور کرلی تھی، لیکن کچھ عرصہ بعد فریقین میں نزاع پیدا ہوگیا، اور لڑکی کے والدین نے طلاق طلب کی اور لڑکے نے تحریری تین طلاق دے دی، اب کیا اس لڑکی کا نکاح اس لڑکے کے ساتھ ہوسکتا ہے؟

جواب:- طلاق نامہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ لڑکے نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں، لہٰذا اب وہ لڑکے کے لئے قطعی طور پر حرام ہوچکی ہے، اب اس کے ساتھ حلالہ کے بغیر نکاحِ ثانی بھی

نہیں ہوسکتا۔(۱)

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۵/۷/۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۷۹۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

تحریر سے بھی طلاق ہوجاتی ہے اور طلاق کے لئے گواہ ضروری نہیں

سوال:- عرض یہ ہے کہ میری ہمشیرہ نجمہ اعوان بنتِ غلام ربانی اعوان کی شادی ایک صاحب بنام ڈاکٹر ہارون ایم قاضی ولد قاضی محمد اسحاق سے مؤرخہ ۳۰؍جون ۱۹۸۶ء کو قرار پائی، یعنی نکاح ہوا، اور پھر ۲؍جولائی کو رُخصتی ہوئی، شادی کے دُوسرے ہی روز سے موصوف نے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ گالی گلوچ اور میری مرحومہ والدہ کو گالیاں دینا شروع کردیں، ساتھ میرے بوڑھے والد صاحب کے بارے میں بھی یہی رویہ اختیار کیا، شادی کے چند روز کے بعد ہی دونوں میاں بیوی امریکہ روانہ ہوگئے، کیونکہ میرا بہنوئی امریکہ میں سرجن کی حیثیت سے پچھلے بیس سال سے وہاں آباد ہے۔ امریکہ پہنچنے کے پندرہویں روز میرے بہنوئی نے اپنی بیوی (میری ہمشیرہ کو) مارنا پیٹنا شروع کردیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی گالی گلوچ اور مار پیٹ میں شدّت آتی گئی، اور ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہے، جب اس طرح ایک سال گزر گیا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو تبدیل نہ کیا تو آخرکار میری ہمشیرہ نے تنگ آکر طلاق کا مطالبہ کیا، انہوں نے طلاق نہ دی، دونوں کے کراچی آنے پر ان کے بڑوں نے اور ہم نے دونوں کو سمجھایا، جب ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ انہیں بیوی سے کیا شکایات ہیں تو انہوں نے کہا کہ: ''مجھے یاد نہیں کہ یہ کیا کہتی ہے یا کرتی ہے؟'' الغرض ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں مار پیٹ اور گالی گلوچ کی عادت ہے اور شکایت کچھ نہیں۔ ہم نے خدا کی ذات پر بھروسہ کرکے ان کی بیوی کو امریکہ اس اُمید پر روانہ کردیا کہ خدائے پاک کی ذات رحیمی اپنے فضل سے ڈاکٹر صاحب کو ایک محبت کرنے والا شوہر بنادے اور حالات بہتر ہوجائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ بھی کیا کہ اب وہ مار پیٹ سے گریز کریں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے یہ حرکات دوبارہ شروع کردیں، بہت مار پیٹ کی، ننگی گالیاں میرے والد اور مرحومہ والدہ کو دیں، جب یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا، تو میری بہن نے طلاق کا مطالبہ کیا، ہر دفعہ کی طرح انہوں نے اس بار بھی انکار کیا، اس کے بعد بھی گالی گلوچ کا سلسلہ تقریباً ہر روز ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً ہاتھ گھمانا ان کا مشغلہ بنتا چلا گیا، آخر میری ہمشیرہ نے ایک دن جب انہوں نے ہمیشہ کی طرح بے وجہ بے گناہ مارا پیٹا اور گالیاں دیں تو ان سے

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۳۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

مطالبہ کیا کہ وہ ہر حال میں طلاق دے دیں، اس کے بعد انہوں نے اُٹھ کر ایک پرچے میں انگریزی میں تحریر کردیا کہ: ''میں نجمہ کو تین طلاق دیتا ہوں۔'' اور نیچے اپنے نام کے دستخط کردیئے، مگر طلاق دیتا ہوں کے الفاظ منہ سے ادا نہ کئے۔

اس واقعے کے بعد میری ہمشیرہ کچھ عرصہ تو وہیں رہیں، مگر تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے اصرار کرنا شروع کردیا کہ تم کراچی واپس چلی جاؤ، انہوں نے مجھے ایک خط بھی امریکہ سے بھیجا جس میں یہ تحریر کیا کہ نجمہ کو واپس کراچی بلالو، میں اُسے گھر لے دُوں گا، خرچہ وغیرہ اس کا اور بچوں کا بھیجتا رہوں گا، اس طرح شادی ٹوٹنے سے بچ جائے گی۔ ابھی ہم اس بات پر غور کر ہی رہے تھے کہ انہوں نے نجمہ کو زبردستی ٹکٹ وغیرہ دِلا کر کراچی روانہ کردیا، اور بہت سے وعدے کئے، واپسی پروگرام بتایا جیسے وہ خوشی خوشی روانہ کر رہے ہوں۔ کل مؤرخہ ۱۹راگست ۱۹۸۸ء کو ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے حالات تحریر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ چونکہ میں پہلے نجمہ کو ''طلاق مقرتین'' جس کا مطلب وہ کہتے ہیں کہ ''دو طلاقیں'' دے چکا ہوں اس لئے اب میں تیسری طلاق بھیج رہا ہوں، اور ہمارا اب ایک دُوسرے سے واسطہ نہیں رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ تینوں طلاقیں ڈاکٹر ہارون نے تحریر تو کردیں مگر زبان سے ادا نہیں کی ہیں، اور اس کی بیوی حاملہ بھی ہے، طلاق واقع ہوگئی ہے؟ اگر طلاق ہوگئی ہے تو تین ماہ کے اندر دوبارہ صلح ہوسکتی ہے؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔ کیا وقوعِ طلاق کے لئے طلاق دیتے وقت گواہوں کا ہونا ضروری نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی ہمشیرہ نجمہ اعوان پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، طلاق کے لئے زبان سے کہنا ضروری نہیں، تحریر سے بھی طلاق ہوجاتی ہے،[1] اور اس کے لئے گواہوں کی موجودگی بھی شرط نہیں، تیسری طلاق کے بعد اب وہ کسی صورت میں اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں ہیں، اور اب مصالحت کرکے ایک ساتھ رہنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے،[2] آپ کی ہمشیرہ چونکہ حمل سے ہیں، اس لئے ان کی عدّت بچے کی پیدائش پر پوری ہوگی،[3] بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۵ الف)

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۴۶ (طبع سعید) کتب الطّلاق ان مستبینًا علٰی نحو لوح وقع ان نویٰ وقیل مطلقًا.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔ (۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲۔

طلاق نامہ لکھنے کے بعد طلاق نامے سے انکار کرنے یا الفاظِ طلاق لکھتے وقت سر چکرانے کا دعویٰ کرنے کی ایک مخصوص صورت

خلاصۂ سوال:- مسمّٰی جلال الدین نے بغرضِ خودکشی خواب آور گولیاں کھالیں، اور اس پر بے ہوشی طاری ہوئی، ڈاکٹر کو بلایا گیا، تفتیش کرنے سے اس کی جیب سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس میں وصیت لکھی ہوئی تھی، وصیت نامے کے آخر میں اپنی بیوی کو یہ الفاظِ طلاق لکھے تھے: ''طلاق، طلاق، طلاق دی، طلاق، طلاق، طلاق دی، اور خود بھی خودکشی کر رہا ہوں، پرچہ میں نے ہوش و حواس میں لکھا ہے، کسی دُوسرے کا ہاتھ اس میں نہیں ہے۔'' آخر میں تاریخ اور اپنا نام درج کردیا ہے۔ علاج معالجے کے بعد جلال الدین صحت یاب ہوگیا ہے، اور اب کبھی کہتا ہے کہ میں نے الفاظ طلاق نہیں لکھے اور کبھی اقرار کرتا ہے، ایک دُوسری جگہ سے فتویٰ منگوایا گیا ہے اس میں طلاقِ مغلّظ کا لکھا ہے، اب عرض یہ ہے کہ جلال الدین کبھی تو پورے پرچے کا انکار کرتا ہے اور الفاظِ طلاق کا انکار کرتا ہے اور کبھی تمام باتوں کا اقرار کرتا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ اور پرچہ تو ہوش و حواس میں لکھا ہے مگر لفظ طلاق اس وقت لکھا ہے جب میں بے ہوش ہو رہا تھا، اور میرے سر میں چکر تھا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ ایک مرتبہ جلال الدین اس بات کا اقرار کرچکا ہے کہ طلاق کے الفاظ اُس نے لکھے ہیں اس لئے اس کی بیوی پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی،[1] حلالہ کے بغیر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، سر چکرانے کی جو حالت جلال الدین بیان کرتا ہے اس کی وجہ سے مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لأنہ لا یصدق علیہ حد السکران علٰی مذھب ابی حنیفۃؒ حتّٰی لا یعرف الأرض من السماء ولا علٰی مذھب الجمھور حتّٰی یھذی ویخلط کلامہ،[2] ولو صدق علیہ السکران فان لی شبھۃ فی وقوع الطلاق فانہ ینبغی أن لا یقع طلاق السکران بالکتابۃ کما لا یقع طلاق المکرہ علی ما صرحوا بہ.[3] لا سیما اذا کانت الکتابۃ غیر مرسومۃ فانّ وقوع الطّلاق بھا یحتاج الی النیّۃ عند البعض،[4] وعلّل صاحب البحر عدم وقوع طلاق المکرہ بالکتابۃ

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۴۶ (طبع سعید) کتب الطّلاق، ان مستبینًا علٰی نحو لوح وقع ان نویٰ وقیل مطلقًا.... الخ.

(۲) راجع التفصیل الی ردّ المحتار مطلب فی تعریف السکران وحکمہ ج:۳ ص:۲۳۹ (طبع سعید).

(۳) وفی الشامیۃ قبیل مطلب فی المسائل الّتی تصح مع الاکراہ ج:۳ ص:۲۳۶ (طبع سعید). وفی البحر ان المراد الاکراہ علی التّلفّظ بالطّلاق، فلو اکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق لأنّ الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا .... الخ.

(۴) وفی الشامیۃ مطلب فی الطّلاق بالکتابۃ ج:۳ ص:۲۴۶ ففی غیر المستبینۃ لا یقع الطّلاق وان نویٰ وان کانت مستبینۃ لٰکنّھا غیر مرسومۃ ان نویٰ الطّلاق یقع والّا لا .... الخ.

بقوله: لأن الكتابة اقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا.[1] (راجع رد المحتار ج:۲ ص:۵۷۹،[2] و ج:۲ ص:۵۸۲،[3] و ج:۲ ص:۵۸۹)[4] فليتأمل۔

صورتِ مسئولہ میں مغلظہ طلاق واقع ہوگئی

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

انگریزی طلاق نامے میں "Divorce" کے بجائے "Divorse" لکھ دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

سوال:- میں نے اپنی بیوی کو جو میری بغیر اجازت کے اپنے والدین کے یہاں چلی گئی تھی، اس کو ڈرانے کے لئے ایک تحریر نامہ لکھا جو انگریزی میں تھا، بذریعہ ڈاک بھیج دیا، اس میں لفظ "Divorse" انگریزی میں لکھا ہوا ہے، جس کے معنی طلاق کے بالکل نہیں ہوتے، میرا منشاء بالکل طلاق دینے کا نہیں تھا، صرف اس لئے لکھا تھا کہ آئندہ کے لئے میری بیوی اس حرکت کا ارتکاب نہ کرے، تو کیا اس صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- اس مسئلے کا جواب دارالعلوم کراچی کی طرف سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے پہلے لکھ دیا ہے، وہ جواب پورے غور وفکر اور تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے، اور وہی دُرست ہے، ہجاء کی مذکورہ غلطی سے کہ "Divorce" کو "Divorse" لکھ دیا، کوئی فرق نہیں پڑتا، تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوچکی ہیں، اور اب دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اِلَّا یہ کہ وہ عدّت گزارنے کے بعد کہیں اور نکاح کریں، پھر اس شوہر کا انتقال ہوجائے یا وہ بھی کسی وجہ سے صحبت کے بعد طلاق دیدے، اس کی عدّت گزارنے کے بعد باہمی رضامندی کے ساتھ آپ سے نکاح ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۱/۲۴ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۴) متعلقہ عبارات پچھلے صفحہ کے حاشیہ نمبر۱ تا حاشیہ نمبر۴ میں ذکر کردی گئی ہیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

بیوی نے جعلی طلاق نامہ تیار کیا ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میری زوجہ نے میری جانب سے جعلی تحریر و دستخط کے ذریعہ اپنی جانب سے طلاق نامہ پیش کر کے طلاق فرضی حاصل کی ہے، نقول جعلی طلاق نامہ پیشِ خدمت ہیں، کیا اس صورت میں میری جانب سے میری بیوی کو طلاق واقع ہوگئی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج کیا ہوا بیان دُرست ہے، یعنی منسلکہ تحریر[1] جعلی ہے، تو آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لئے کہ طلاق کے وقوع میں اگر زوجین کا اختلاف ہو تو یہ ضروری ہے کہ یا تو شوہر طلاق دینے کا اقرار کرے یا گواہوں کے ذریعہ شرعی طریقہ پر عدالت میں یہ ثابت کردیا جائے کہ شوہر نے طلاق دی ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۷۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

طلاق نامہ پر زبردستی دستخط کروانے کا حکم

سوال:- کسی خانگی جھگڑے کی وجہ سے میری بیوی میکے چلی گئی، کچھ عرصہ بعد واپس آگئی، اور میری غیر موجودگی میں مکان خالی چھوڑ کر واپس میکے چلی گئی، جب میں نے والدین سے یعنی بیوی کے والدین سے سبب دریافت کیا کہ تم لوگوں نے کیوں یہ اقدام کیا تو وہاں ان کے دُوسرے رشتہ دار بھی موجود تھے، انہوں نے مجھے طلاق کی دھمکی دے دی، اور پھر چیئرمین اور ممبران کی زبردستی سے طلاق نامہ تحریر کیا، اور مجھ سے زبردستی اس پر دستخط لے لئے، نہ مجھے تحریر سنائی اور نہ میں نے زبان سے الفاظِ طلاق کہے تھے۔

تنقیح:-

زبردستی دستخط کرانے کی کیا صورت پیش آئی؟ اگر آپ دستخط نہ کرتے تو آپ کو کیا اندیشہ تھا؟ اس کا جواب آنے پر اصل مسئلہ کا جواب لکھا جائے گا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

---

(۱) ریکارڈ میں یہ تحریر موجود نہیں۔ (مرتب)

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۵۶ (فان اختلفا فی وجود الشرط) أی ثبوته لیعم العدمی (فالقول لهٗ مع الیمین) لانکاره الطّلاق.

جوابِ تنقیح:-

وجہ یہ تھی کہ میری چچازاد بہن میرے سالے کے گھر تھی، تو انہوں نے اس کو کافی تکلیف دینے کے بعد طلاق کا کاغذ دے دیا تھا تو بعد میں مجھے دھمکی دینے لگے کہ تم سے بھی یہی معاملہ کردیں گے، چونکہ میں اکیلا ہوں، میرا کوئی بھائی و مددگار نہیں، اس لئے میں نے وہاں سے گھر بھی بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے نہ چھوڑا اور زبردستی دستخط کرنا پڑے۔

جواب:- صورتِ مذکورہ میں اگر آپ کو یہ معلوم تھا کہ جس کاغذ پر مجھ سے دستخط لئے جارہے ہیں وہ طلاق نامہ ہے، تو اس پر دستخط کرنے سے طلاق واقع ہوگئی، کتنی طلاقیں واقع ہوئیں؟ اور دوبارہ زوجیت کا تعلق قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ ان باتوں کا جواب طلاق نامہ دیکھ کر دیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۴ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

﴿فصل فی تعلیق الطّلاق﴾
(طلاق کو کسی شرط پر معلق کرنے کا بیان)

''کُلَّمَا طلاق کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا'' الفاظ کا حکم

(حضرت مولانا علی محمد رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم کبیروالا کے سوال کے جواب میں)

سوال:- غیر متزوّج (غیر شادی شدہ) نے یوں کہا: ''مجھے کلما طلاق کی قسم فلاں فلاں کام نہیں کروں گا'' پھر کرلیا، کیا نکاح کرسکتا ہے؟

۲:- اگر قسم صحیح ہوجائے تو کیا تزویج فضولی واجابۃ بعملہ کا حیلہ یہاں چل سکتا ہے؟

(حضرت مولانا) علی محمد (صاحب)

(مہتمم دارالعلوم عیدگاہ کبیروالا، ملتان)

جواب:- ان الفاظ کا کوئی صریح حکم کتب میں نہیں ملا، البتہ قواعد کا مقتضا یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں نکاح کرنے سے طلاق واقع نہ ہو۔ **قال الشامیؒ فی ردّ المحتار نقلًا عن الفتح وقد تعورف فی عُرفنا فی الحلف: الطّلاق یلزمنی لا أفعل کذا یرید ان فعلته لزم الطّلاق ووقع فیجب أن یجری علیهم لأنّه صار بمنزلة قوله ان فعلت فأنتِ طالق، وکذا تعارف أهل الأریاف الحلف بقوله علیّ الطّلاق لا أفعل اهـ وهٰذا صریح فی أنّه تعلیق فی المعنیٰ علیٰ فعل المحلوف علیه بغلبة العُرف وان لم یکن فیه أداة تعلیق صریحًا. (شامی ج:۲ ص:۴۳۳)۔**[(۱)]

اس سے معلوم ہوا کہ جب کلام میں صریح الفاظِ تعلیق موجود نہ ہوں تو اعتبار عرف کا ہوتا ہے، جن صورتوں میں فقہاء نے وقوعِ طلاق کا حکم دیا ہے، وہ سب شادی شدہ شخص سے متعلق ہے، کیونکہ شادی شدہ شخص ایسے الفاظ استعمال کرے تو عرفاً ان کا مطلب تعلیقِ طلاق ہی ہوتا ہے، لیکن غیر شادی شدہ شخص کا یہ کہنا کہ مجھے طلاق کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا، یہ تعلیق مضاف الی الملک میں متعارف نہیں ہے۔[(۲)]

---

(۱) ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۵۳ (طبع سعید).

(۲) حاشیہ نمبر۲ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

خاص طور پر ''کلما طلاق کی قسم'' الفاظ متعارف تو کیا، عوام کی سمجھ سے بھی باہر ہیں، اور جب عرف میں ان الفاظ کو تعلیقِ طلاق مضاف الی الملک نہیں سمجھا جاتا تو ان سے طلاق بھی واقع نہیں ہوگی، لأنّ مبنی الأیمان علی العُرف۔[1]

البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ شخص اپنا نکاح خود نہ کرے، بلکہ کوئی فضولی اس کے حکم کے بغیر اس کا نکاح کردے، اور پھر وہ اسے اپنے عمل سے، مثلاً مہر ادا کر کے نافذ قرار دیدے، اس طرح نکاح دُرست ہوجائے گا،[2] اور بلاشبہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۲۲ ب)

''میں نے اس کو طلاق دیا، طلاق، طلاق اِن شاء اللہ'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے سخت غصّے کے عالم میں اور ناسمجھی میں اپنی بیوی کو جبکہ وہ غیر حاضر تھی اس طرح الفاظ کہے: ''میں نے اس کو طلاق دیا، طلاق، طلاق انشاء اللہ'' اب جبکہ غصہ دُور ہوگیا، کیا یہ شخص اپنی بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ''اِن شاء اللہ'' اگر متصلاً کہہ دیا تھا، یعنی بیچ میں خاموشی نہیں آئی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، لما فی البحر والفاصل اللغو یبطل المشیئة فلذا طلقت ثلاثًا

(حاشیہ متعلقہ صفحۂ گزشتہ).....(۲) اور تعلیقِ طلاق کے صحیح ہونے کے لئے اضافت الی الملک یا اضافت الی سبب الملک کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ فتح القدیر ج:۳ ص:۴۴۲ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) میں ہے: ولا بدّ من التصریح بالسبب فی المحیط لو قال کلّ امرأة اجتمع معھا فی فراش فھی طالق فتزوّج امرأة لا تطلق. وفی مجموعة رسائل ابن عابدین، امّا الزیادة علیٰ شرط الحالف بدلالة العُرف لا تجوز لأنّه لا تأثیر لھا فی جعل ما لیس بملفوظٍ ملفوظًا ولھٰذا لو قال لأجنبیة ان دخلت الدّار فأنت طالق کان لغوًا ولا یراد الملک فی لفظه بالعُرف لیصیر کأنّه قال ان دخلت الدّار وأنت فی نکاحی فأنت طالق، وان کان المتعارف فیما بین الناس لأنّ الملک لیس بمذکور فی لفظه ولا تأثیر للعُرف فی جعل ما لیس بملفوظٍ ملفوظًا (رفع الانتقاض ودفع الاعتراض علیٰ قولھم الأیمان مبنیة علی الألفاظ لا علی الأغراض ص:۲۹۸). اور فتاویٰ محمودیہ ج:۱۱ ص:۲۴۶ میں ہے: قسم کا مدار الفاظ پر ہوتا ہے نہ کہ اغراض پر، جیسا کہ فقہ میں تصریح ہے: مبنی الأیمان علی الألفاظ دون الأغراض.... لہٰذا ''کلما کی قسم'' منعقد ہی نہیں ہوئی، کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے قسم منعقد نہیں ہوتی۔

(مذکورہ حاشیہ رجسٹر نقلِ فتاویٰ دار الافتاء دار العلوم کراچی کے فتویٰ نمبر ۲۵۸/۴۴ سے ماخوذ ہے)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۱) دیکھئے: فتاویٰ شامیہ مطلب الأیمان مبنیة علی العُرف .... الخ. ج:۳ ص:۷۴۳ (طبع سعید)

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۸۴۶ (طبع سعید) حلف لا یتزوّج فزوّجه فضولی .... فأجاز نکاح فضولی بالفعل لا یحنث .... الخ.

فی قوله أنت طالق ثلاثًا وثلاثًا ان شاء الله وفی قوله أنت طالق وطالق وطالق ان شاء الله .... بخلاف أنت طالق واحدة وثلاثًا ان شاء الله لکونه أفاد التکمیل کقوله أنت طالق وطالق طالق ان شاء الله. (البحر الرائق ج:۴ ص:۳۷)۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۶۲ ج)

''اگر اب تم میرے گھر آئی تو اِن شاء اللہ تمہیں طلاق ہوجائے گی'' الفاظ کا حکم

سوال:- مسئلہ کہ س کی بیوی ن آپنے والدین کے گھر چلی گئی اور س نے بیوی سے کہا کہ: ''اگر اب تم میرے گھر آئی تو اِن شاء اللہ تمہیں طلاق ہوجائے گی'' جبکہ کچھ دنوں کے بعد س کے چھوٹے برادران، ہمشیرگان ن کے والدین کے گھر جاکر زبردستی یعنی س کی بیوی خود راضی نہ تھی، س شوہر کے گھر لے آئے، شوہر نے جب بیوی کو اپنے گھر دیکھا تو اس پر ناراض ہوا اور کہا کہ منع کیا تھا کہ گھر مت آنا ورنہ تین طلاق ہوجائے گی، اور پھر شوہر نے ایک ہی نشست میں تین بار کہا کہ: ''اِن شاء اللہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' واضح رہے کہ بیوی ن نو ماہ کی حاملہ بھی ہے، جواب دیں۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ دونوں خط کشیدہ جملوں کی ادائیگی کے وقت آپ نے ''اِن شاء اللہ'' کہا تھا تو صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، وہ بدستور آپ کے نکاح میں ہیں، لیکن اگر کسی ایک مرتبہ بھی ''اِن شاء اللہ'' نہ کہا ہو تو جواب مختلف ہوگا، اس صورت میں مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں اور معاملہ چونکہ حلال وحرام کا ہے اس لئے خوب سمجھ سوچ کر فیصلہ کریں۔ (۲)

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۱۷۹۴ و)

---

(۱) (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه). وفی الهدایة باب الأیمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۹ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) واذا قال لامرأته أنتِ طالق ان شاء الله تعالٰی متصلًا لم یقع الطّلاق. وفی الدّر المختار باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۶۶ الٰی ۳۶۸ (طبع سعید) قال لها: أنتِ طالق ان شاء الله متصلًا مسموعًا لا یقع.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۶۶ و ۳۶۸ قال لها: أنتِ طالق ان شاء الله، متصلًا مسموعًا لا یقع. وفیه أیضًا ج:۳ ص:۳۷۲ فالمفتٰی به عدم الوقوع اذا قدّم المشیئة ولم یأت بالفاء .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

''اگر زوجہ کے باپ نے ایک ہفتے کے اندر عورت نہ دی تو میری طرف سے طلاق ہے'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی زوجہ کے متعلق جو کہ اس وقت باپ کے گھر میں ناراض بیٹھی ہوئی ہے، کہا کہ: ''اگر زوجہ کے باپ نے ایک ہفتے کے اندر عورت نہ دی تو میری طرف سے طلاق ہے'' اس پر لڑکے کے والد نے ڈانٹا اور لڑکے نے پھر وہی الفاظ دُہرائے، پھر والد نے ڈانٹا اور لڑکے نے پھر کہا کہ: ''اگر ایک ہفتے کے اندر نہ دی تو میری طرف سے آزاد ہے'' اب اس گفتگو کی نہ عورت کو خبر ہے نہ اس کے والد کو اطلاع ہے، نہ زوجہ کے پیچھے کوئی لانے کے لئے گیا ہے، کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر زوجہ کا باپ اس کو ایک ہفتے کے اندر شوہر کے پاس نہیں بھیجے گا تو زوجہ پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، لما فی الدّر المختار فی أیمان الفتح ما لفظه وقد عرف فی الطّلاق أنه لو قال ان دخلت الدار فأنت طالق، ان دخلت الدار فأنت طالق، ان دخلت الدار فأنت طالق، وقع الثلاث. (شامی ج:۲ ص:۵۱۵)۔[(۱)]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۱/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶ الف)

''اگر میں ہندہ کو آئندہ چاہوں اور بدخیالی کروں تو جو بیوی ابھی میرے نکاح میں ہے مجھ سے تین طلاق'' الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- زید نے اپنے چچازاد بھائی جو رضاعی بھائی بھی ہے، اُن کی لڑکی ہندہ سے خفیہ تعلقات قائم کئے، باپ کو اطلاع ہونے پر زید کو مارنا چاہا تو لوگوں نے خلافِ مصلحت بتاکر روک دیا، لوگوں نے کہا کہ زید سے ایک اقرارنامہ لے لیا جائے تاکہ دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرسکے، مضمون اس طرح ہے: ''میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر میں ہندہ کو آئندہ چاہوں اور بدخیالی کروں تو جو بیوی ابھی میرے نکاح میں ہے مجھ سے تین طلاق ہوجائے گی اور اس مجلس میں بدرستگیٔ دِماغ اقرار کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کو آئندہ اپنی بیٹی سمجھوں گا۔''

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الأیمان باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۷۶ (طبع سعید).
وفی الهندیة کتاب الطّلاق، الباب الرّابع فی الطّلاق بالشّرط، الفصل الثالث فی تعلیق الطّلاق بکلمة إن وإذا وغیرهما ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجدیه کوئٹه) واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقًا مثل أن یقول لامرأته ان دخلت الدار فأنت طالق. وفی الهدایة کتاب الطّلاق، باب الأیمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شرکت علمیه، ملتان) واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط مثل أن یقول لامرأته ان دخلت الدّار فأنت طالق.

اس مضمون کی تحریر پر چار گواہوں کے دستخط بھی ہیں، اس اقرارنامے کے بعد ہندہ کے باپ نے دُوسری جگہ شادی کردی، شادی کے دس پندرہ روز کے بعد ایک نکاح نامہ بنواکر اپنے چند حامیوں کی مدد سے ہندہ کے شوہر (یعنی داماد) کے پاس گئے اور نکاح نامہ دِکھلا کر کہا کہ: میری بیوی دو، ورنہ پولیس سے گرفتار کرا دُوں گا، لیکن داماد اور چند آدمیوں نے زید کو جعل باز و مکار کہہ کر بھگادیا، دو ایک روز کے بعد زید، ہندہ کو زبردستی اُٹھاکر لے گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اقرارنامے کے بعد اُن شرطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملوّث ہوا ہے، لہٰذا وجودِ شرط ہوتا ہے یا نہیں؟ اور زید کی منکوحہ مطلقہ ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں اور زید نے واقعۃً ہندہ کو جھوٹے طریقے پر اپنی بیوی بنانے یا اُسے اغوا کرنے کی کوشش کی ہے تو اس کے خط کشیدہ الفاظ کی رُو سے اُس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،(۱) اور وہ حلالہ کے بغیر اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۵۸/۲۸ ج)

تعلیق کی ایک مخصوص صورت میں طلاق کے عدمِ وقوع کا حکم
بیوی کے کلمۂ کفر کہنے پر طلاق کو معلق کیا اور بیوی نے کلمۂ کفر کہہ دیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے دفتر میں دیگر ساتھیوں نے ایوبیہ جاکر سیر کرنے کا پروگرام بنایا، میں نے بیوی کو بتایا کہ ایوبیہ جارہا ہوں، اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ کر اکیلے سیر کو جاؤگے، میں نے کہا کہ: ''تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، صبح جاؤں گا شام کو آجاؤں گا'' اس پر وہ کہنے لگی کہ اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساتھ لے جاؤگے، میں نے کہا: وہاں صرف مرد جائیں گے۔ خط کشیدہ فقرہ اس لئے کہا کہ خیالِ طلاق دِل میں آگیا تھا، بہرکیف بعد میں اُس نے پوچھا کہ: تم پھر کل جاؤگے، میں کسی اور دھیان میں تھا، کہہ دیا: ''ہاں!'' اب اگر کل میں چلا جاؤں (طلاق کی نیت بالکل نہیں ہے اور نہ تھی) تو کیا اس سے طلاق واقع ہوجائے گی؟ اور فرض کریں کہ اگر پٹائی کے دوران یہ کہا جائے کہ ''اب تو چھوڑتا ہوں آئندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس سے طلاق تو نہیں ہوگی؟

---

(۱) وفی التاتارخانیة ج:۳ ص:۵۰۳ قال لامرأته ان دخلت الدار فأنت طالق، فدخلت امرأته وقع الطلاق لوجود الشرط. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

۲:- اگر زید نے اپنی بیوی کو کہا کہ: ''اگر تم کفریہ کلمہ کہوگی یا کفریہ بات کروگی تو تمہیں طلاق ہوگی'' تو اُس کی بیوی نے کسی مصیبت کی حالت میں غلطی سے کہہ دیا (معاذ اللہ) ''خدا بھی تو رحم نہیں کرتا'' (جبکہ کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہ کہے) کیا طلاق ہوگئی؟ اور کیا دوبارہ نکاح کرنا ہوگا؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے ایو بیہ جانے سے طلاق واقع نہیں ہوگی، نیز مارنے کی صورت میں جب یہ کہے کہ: ''اب تو چھوڑتا ہوں، آئندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس سے بھی طلاق نہیں ہوگی۔

۲:- ''خدا بھی تو رحم نہیں کرتا'' (معاذ اللہ) کلمۂ کفر ہے، ایسی صورت میں بیوی سے توبہ کرا کر دوبارہ نکاح کرنا چاہئے، اور صورتِ مسئولہ میں نکاحِ جدید کے بعد احتیاطاً یہ سمجھنا چاہئے کہ آئندہ وہ صرف دو طلاقوں سے مغلّظہ ہوجائیں گی، کیونکہ اس کا صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا۔

وفی العالمگیریة من نسب الله تعالیٰ الی الجور فقد کفر. (عالمگیریة ج:۲ ص:۲۵۹)۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷/۵۷ ب ۲۸)

شوہر کے الفاظ ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' میں شوہر کی نیت کی ایک مخصوص صورت

سوال:- فتویٰ مجریہ دار الافتاء دار العلوم کراچی، ۱۳۹۱/۴/۱ھ مرسل خدمت ہے، یہ مسئلہ حسبِ ارشاد دوبارہ رُجوع خدمتِ عالیہ ہے، تاکہ کوئی حتمی وقطعی فتویٰ صادر فرمایا جائے، اس کے لئے چند اُمور اور واقعات متعلقہ مختصراً درج ذیل ہیں:-

نمبر۱:- شوہر کا اصل خط از لاڑکانہ مؤرخہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۱ء جس کی نقل (فتویٰ کی پشت پر ہے) عالی جناب نے پڑھ لیا ہے، اس میں شوہر نے دُوسری صورت کے متعلق ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' کی مدّت، اس مہینے کی آخر تک یعنی ۳۰/اپریل تک مشروط رکھی ہے کہ اس کو خط لکھ کر سامانِ جہیز اور مہر وغیرہ سے متعلق باتوں کا تصفیہ اس مہینے کے آخر تک کرلیں۔

نمبر۲:- بیوی کے والد نے اس کو جواباً ایک خط مؤرخہ ۲۶/اپریل ۱۹۷۱ء ذریعہ رجسٹری لکھا، اس کی نقل منسلک ہذا ہے، جس میں جہیز اور مہر وغیرہ کا ذکر کئے بغیر یہ لکھا گیا ہے کہ شوہر اور اس کے

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

والد صاحب ''جلد از جلد اندرون ایک ہفتہ آئیں تاکہ معاملات کو مناسب طریقے سے سلجھایا جاسکے''، مگر افسوس کہ شوہر نہ آئے اور نہ ان کے والد صاحب آئے، اس طرح کوئی بات نہ بنی۔

نمبر۳:- بیوی کے والد نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے موقع پر شوہر اور اس کے والد کو بلایا لیکن پھر بھی حاضر نہ ہوئے۔

نمبر۴:- بیوی کے والد کا قیام لندن میں ہے، وہ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے موقع پر حاضر ہوئے اور چاہا کہ اس معاملے کا بھی تصفیہ ہوجائے، لیکن ناکام رہے۔

نمبر۶:- جملہ ''تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' کے متعلق فتویٰ منسلکہ کے پہلے پیراگراف کے آخری سطور میں شوہر کا مقصد دریافت کیا گیا ہے۔ غیب کا علم اللہ کو ہے، لیکن بندہ صرف یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ شوہر تہذیب یافتہ ہے اور مرنجان و مرنج طبیعت کا حامل ہے، کسی سنگین معاملے کی خود ابتداء کرنا نہیں چاہتا اور نہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لینا چاہتا ہے۔

نمبر۷:- اس کی بیوی اس ماہ اندازاً آٹھ مہینے کی حاملہ ہے، اور وسط فروری ۱۹۷۱ء سے اپنے میکے میں ہے، شوہر اس بارے میں اپنی بیوی کو حسرت و یاس میں رکھتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس طلاق کے احتمال کی خبر کی بابت شوہر کا مقصد عیاں نہیں مبہم ہے، وہ اپنے آپ پر اس کی ذمہ داری لینا نہیں چاہتا، شوہر نے اپنے مذکورہ خط مؤرخہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۱ء کے بعد اب تک اپنی بیوی سے ملاقات نہیں کی، اور نہ ہی بیوی اپنے شوہر کے گھر جاسکتی ہے، یعنی بیوی تادمِ ہذا اپنے میکے میں ہے، اور اِن شاء اللہ اگلے مہینے اپنی پہلی زچگی سے فارغ ہوگی، بیوی اب تک آپ کے وقیع اور مؤثر فتویٰ کی خواہاں ہے تاکہ وہ اپنی ازدواجی زندگی استوار کرسکے۔

جواب:- جو حالات آپ نے دوبارہ لکھے ہیں، ان سے فتویٰ کے جواب میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ شوہر نے جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ: ''دُوسری صورت میں تمہیں طلاق تو ہوجائے گی'' ان کی صحیح مراد شوہر ہی سے معلوم کی جاسکتی ہے کہ کیا وہ ان الفاظ کی تحریر کے وقت طلاق واقع کرنے کی نیت رکھتا تھا یا محض آئندہ واقع ہوجانے کی خبر دے رہا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ سابقہ فتویٰ اس کے پاس بھیج کر اس سے وضاحت طلب کی جائے، اور وضاحت میں وہ جو کچھ تحریر کرے وہ یہاں بھیج دیا جائے اُسے دیکھ کر ہی کوئی حتمی جواب دیا جاسکے گا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگر شوہر جواب میں یہ ظاہر کرے کہ ان الفاظ سے وہ طلاق ہی واقع کرنا چاہتا تھا تب بھی ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدّت کے دوران (یعنی بچے کی

پیدائش سے پہلے پہلے) وہ رُجوع کرسکتا ہے،[1] اور عدّت کے بعد دوبارہ باہمی رضامندی سے نکاح بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا اس طلاق کی وجہ سے آئندہ تصفیہ کی راہ میں کوئی خاص رُکاوٹ نہیں ہوگی، آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ یہاں سے شوہر کے نام کوئی مشورہ کا خط لکھا جائے، لیکن فریقین کے حالات سے کما حقہٗ واقفیت کے بغیر محض یک طرفہ بیان پر ایسا کوئی خط لکھنا دار الافتاء کا منصب نہیں ہے، اس لئے اس معاملے میں معذرت قبول فرمائیں، یہ معاملہ باہمی گفتگو ہی سے سلجھانا چاہئے، اگر وہ آپ کے پاس نہیں آتا تو آپ اس کے پاس جاسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۹/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

شوہر کے الفاظ ''اپنے دو بھائیوں کی گھر والیوں سے کچھ نہ مانگوں گا، اگر مانگوں تو مجھ پر میری بیوی سات شرطوں پر طلاق'' کا حکم

سوال:- تین بھائی ہیں، دو بھائیوں کے درمیان گھر کے کسی معاملے میں بات بڑھ گئی، ایک بھائی نے یہ کہا کہ: ''میں اپنے دونوں بھائیوں کی گھر والیوں سے کچھ نہیں مانگوں گا، اگر مانگوں تو مجھ پر میری بیوی سات شرطوں پر طلاق ہوگی۔'' کیا اگر وہ اب کوئی چیز مانگے یا بغیر اُس کے مانگے، بھابھیاں اگر خود اُس کو چائے، پانی دے دیں تو طلاق ہوجائے گی؟

جواب:- اگر اُس بھائی نے ٹھیک وہی الفاظ استعمال کئے تھے جن کا خط کھینچ دیا گیا ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بھائی جب بھی کبھی اپنی دونوں بھاوجوں میں سے کسی سے کوئی چیز مانگے گا تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔[2] اور پھر اس بیوی سے دوبارہ نکاح بھی حلالہ کے بغیر نہ ہوسکے گا، ہاں! اگر وہ خود کوئی چیز دیں اور یہ لے لے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن مانگنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہوگی، اور اگر اس خطرے سے مکمل طور پر بچنا ہو اور بھاوجوں سے کچھ مانگنا ضروری ہو تو اس مشکل سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی بیوی کو صرف ایک طلاقِ رجعی دیدے اور عدّت گزر جانے دے، عدّت گزرنے کے بعد بیوی نکاح سے نکل جائے گی، اب دونوں بھابھیوں سے کچھ

---

(۱) وفی الھدایة کتاب الطّلاق باب الرجعة ج:۲ ص:۳۹۴ (طبع شرکت علمیه، ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فی عدّتها .... الخ.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

مانگ لے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی،[۱] پھر اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نئے مہر پر نکاح کرلے،[۲] تو اس نئے نکاح کے بعد ہمیشہ کے لئے بھابھیوں سے کچھ مانگنا اس کے لئے ممکن ہوجائے گا اور پھر اس سے کبھی طلاق واقع نہ ہوگی،[۳] البتہ آئندہ اُسے صرف دو طلاقوں کا اختیار رہ جائے گا، لیکن اس طریقے پر عمل کرنے سے پہلے کسی مستند عالم سے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے معاملہ خراب ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۴/۳۴ ۲۸ ج)

"تم اگر بغیر اجازت گھر سے باہر قدم رکھوگی تو تمہاری جانب سے خلع یعنی طلاق ہوجائے گی" الفاظ کا حکم

سوال:- میری شادی کو ساڑھے تین سال کا عرصہ ہوا ہے، اور ڈھائی سالہ لڑکی بھی ہے، اور گزشتہ ساڑھے تین سال سے ہی میرے گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہیں، اکثر میری بیوی معہ بچی کے اپنے گھر بیٹھ جاتی ہے، اور اس طرح ہم دونوں کی صحت پر بُرا اثر پڑا ہے، میرا خیال ہے کہ میرے سسرال والوں کی جانب سے میری بیوی کو شہ ملنے کی وجہ سے صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی گئی، میں بدنام اور بے عزّت ہوا، اکثر گھر کا بے گھر ہوا، مجھے ڈرایا دھمکایا گیا، اور کبھی کبھی ان کے بھائی اور والدہ صاحبہ ان کو میرے گھر آکر لے گئے، اس طرح ہماری زندگی گزرتی رہی، ان کے گھر والوں کی جانب سے کاروائی بھی کرنے کا یعنی لڑکی کو روکے رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا، بہرحال اب جبکہ میری بیوی دو مہینے گزار کر میرے گھر واپس لوٹی تو ہم اچھی طرح رہ رہے تھے، چھ دن میں بیمار رہا اور گھر میں پھر تنازعہ پیدا ہوگیا، اس طرح آفس کو آٹھ دن نہ جاسکا، مجھے میری بیوی کا بغیر اجازت میرے غائبانہ میں باہر کسی کے گھر جاکر ملنا بالکل ناپسند ہے، گوکہ میری بیوی پر مجھے کامل بھروسہ ہے۔ ایک دفعہ جب میں آفس جانے لگا تو میری بیوی نے میری چابیوں میں سے گھر کی چابی نکال کر رکھ لی، اس پر میں نے ان کو کہا: تم کہیں بھی نہیں جانا۔ اس پر میری بیوی نے کہا کہ: میں ضرور جاؤں گی، اکیلی گھر میں بند نہیں رہ سکتی۔ اس پر میں برہم ہوگیا اور کہا کہ: تم کو میں ہر بار سمجھاتا ہوں پر تم نہیں مانتی۔ پھر میں نے قرآن شریف کو

(۱،۲) وفی الدّر المختار باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۵۵ (طبع سعید) فحیلة من علّق الثّلاث بدخول الدّار أن یطلّقها واحدة ثمّ بعد العدّة تدخلها، فتنحلّ الیمین فینکحها .... الخ.

وکذا فی الهندیة الباب الرّابع فی الطّلاق بالشرط الفصل الأوّل فی الفاظ الشّرط ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع ماجدیه)

(۳) وفی الدر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب التّعلیق ج:۳ ص:۳۵۲ (طبع سعید) تنحلّ أی تبطل الیمین ببطلان التّعلیق اذا وجد الشرط مرّة .... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

گواہ رکھ کر یہ الفاظ کہے: ''تم اگر بغیر اجازت میرے غائبانہ میں گھر سے باہر قدم رکھوگی تو تمہاری جانب سے خلع یعنی طلاق ہوجائے گی۔'' اس کے بعد پڑوسی جو مالکِ مکان ہے، اُس کو بھی کہہ دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو باز رکھنے کے لئے ایسا کہہ دیا ہے، اس کی خلاف ورزی کرے گی تو خود ذمہ دار ہوگی، پھر میں گھر کے اندر آیا اور جب میں نے اپنی بیوی کی ضد دیکھی تو میں نے جانے کی اجازت دے دی اور قرآن شریف کو گواہ رکھا، پھر میں نے اُسی وقت مالکِ مکان کو آواز دے کر کہا کہ: آپ اپنی بیوی کو میری بیوی کو سمجھانے کے لئے بھیج دیں، اسے میں نے اجازت دے دی ہے۔ اُس کے بعد میں سسرال گیا اور اپنے سسر صاحب کو پورا واقعہ سنایا، وہ آئے اور غصہ ہوئے اور کہا کہ: میں تمہاری بیوی کو بطور امانت لے جارہا ہوں، آفس فون کردُوں گا آپ جمعہ کو آکر لے جائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں آپ کے اُوپر کے جملے کی تصدیق کراؤں گا، اس پر میں نے بہشتی زیور اور اُوپر کے کہے ہوئے الفاظ لکھ کر ان کے والد صاحب کو دے دیئے کہ کسی سے تصدیق کرلیں، کہیں یہ لوگ غلط فہمی میں میری بیوی کو بٹھا کر مجھ سے دُور نہ کردیں، اس کا فتویٰ صادر فرمائیں۔

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں تو آپ کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، وہ بدستور آپ کی بیوی ہیں، اور آپ انہیں اپنے گھر لا سکتے ہیں، اور خط کشیدہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ ان الفاظ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بیوی کی طرف سے شوہر پر طلاق کے وقوع کو خروج من الدار پر معلق کیا گیا ہو اور اس صورت میں طلاق کا عدمِ وقوع ظاہر ہے۔

لما فی ردّ المحتار: (اذا قال أنا منک طالق یلغو) فان قوله أنا منک طالق منه وصف الرجل بالطّلاق صریحًا فلا یقع لأن الطّلاق صفة للمرأة. (شامی ج:۲ ص:۴۳۳)۔[1]

دُوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ شوہر کی طرف سے خلع کی معلّق پیشکش ہو، اس صورت میں یہ زوجہ کے قبول پر موقوف ہوگی، اور قبول تعلیق کے وقت ہوا نہیں، اور شرط ابھی تک پائی نہیں گئی، اور شوہر زبانی اس احتمال کی نفی کرتا ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اِخبار ہو بیوی کے خلع کرنے سے، یعنی مطلب یہ ہو کہ تیرا خروج بلا اذن علامت ہوگی تیری خواہشِ خلع یا ایجابِ خلع کی (اور شوہر اپنے جملے کا یہی مطلب زبانی بیان کرتا ہے) اس صورت میں یہ قولِ کذب یا کم از کم لغو ہے، اس سے کوئی انشاء طلاق نہیں ہوتا۔ بہرصورت! مذکورہ الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۴/۲۸ ج)

(۱) **ردّ المحتار تحت مطلب فی قوله علیّ الطّلاق من ذراعی ج:۳ ص:۲۵۴ (طبع سعید).**

شوہر کے الفاظ ''اگر پھر دوبارہ والدہ کے بارے میں کچھ کہا تو میں طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں'' کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الف کی اپنی بیوی ب سے شدید تکرار ہوئی، جس پر ب نے الف شوہر کی والدہ صاحبہ کی شان میں گستاخی کی، الف نے بیوی کو کہا کہ: ''اگر پھر دوبارہ والدہ صاحبہ کے بارے میں کچھ کہا تو میں تمہیں طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں۔'' بیوی بدستور لڑتی رہی، لیکن دوبارہ والدہ صاحبہ کے بارے میں کچھ نہ کہا، کیا بیوی کو طلاق ہوگئی؟ جواب دیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الفؔ کی بیوی الفؔ کی والدہ کی زبان سے گستاخی کرے گی یا ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے گی جو ان کی بُرائی پر مشتمل ہو تو الفؔ کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی(۱)، اور وہ حلالہ کے بغیر الفؔ کے لئے ہرگز حلال نہ ہوگی۔ لیکن جب تک والدہ کے بارے میں کچھ بُرائی کی بات نہ کہے اس وقت تک وہ بدستور الفؔ کے نکاح میں ہے۔ تاہم شدید احتیاط کی ضرورت ہے، اگر کبھی کوئی کلمہ غلطی سے بھی منہ سے نکل گیا تو طلاق واقع ہوجائے گی، اگر شوہر اس خطرناک صورت سے بچنے کے لئے اپنے مذکورہ طلاق کے جملے کو بے اثر اور کالعدم کرنا چاہے تو اس کا طریقہ کسی وقت زبانی آکر سمجھ لے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۳/۳۷ ج)

کسی کو اس کی ہجو بتانے پر طلاق کو معلق کرنے کے بعد اُسے ہجو سنادی تو بھی طلاق واقع ہوجائے گی

سوال:- خالد نے زید و بکر کے رُوبرو عمرو کی ہجو کی ہے، زید نے بکر کو کہا کہ: یہ ہجو عمرو کو بتادے۔ تو دونوں شخص عمرو کے پاس گئے، تو بکر نے عمرو سے کہا کہ: خالد نے ہماری ہجو کی ہے، چنانچہ وہ ہجو زید نے عمرو کو سنادی، تو اس نے اس کو اپنی توہین جان لیا، عمرو جب خلاف میں دامن گیر ہوا تو قدم کشیدی زید نے اختیار کی کہ میں نے ہجو کو بتادینے سے عمرو کو مطلع نہیں کیا بلکہ بکر نے مطلع کیا ہے، چونکہ اس نے خود ہجو سنادی ہے اور بتائی نہیں، اس لئے پہلے پہلے بکر نے ہجو بتادینے سے عمرو کو مطلع کردیا ہے، نیز بکر کی زبانی شہادت اور باقی گواہوں کی شہادت کو بکر نے صرف زید کے مشورے سے اتنی کہا کہ خالد نے تمہاری ہجو کی ہے، چونکہ ہجو زید خوب جانتا ہے مجھے معلوم نہیں گزارش یہ ہے کہ جب

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۹۰ و ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

بستی والوں نے زید سے سوال کیا کہ تم نے عمرو کو ہجو کیوں بتادی؟ زید نے کہا کہ: میں نے ہجو سنادی ہے اور سنانے کی میری حلف نہیں۔

جواب:- پہلے دو مرتبہ اس سوال کا جواب دیا جاچکا ہے، بتانے اور سنانے میں کوئی فرق نہیں، اگر ہجو بتانے پر طلاق کو معلق کیا تھا اور بعد میں ہجو سنادی تو طلاق واقع ہوگئی[1]، اگر اس پر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا تو اطمینان پیدا کرنا کسی کی قدرت میں نہیں ہے، فضول بار بار سوالات کر کے وقت ضائع نہ کیجئے، دین و شریعت کے معاملے میں بہانہ جوئی سخت گناہ ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۹/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

"ہم پر اپنی عورتیں بشرعِ محمدی حرام ہوں اگر فلاں واقعہ نہ ہوا ہو" الفاظ کا حکم

سوال:- غلام محمد ولد ہر محمد قوم قصاب سکنہ بھرال۔ ۲:- محمد عباس ولد شاہول قوم اعوان سکنہ بھرال۔ ۳:- بشیر محمد ولد دوست محمد قوم اعوان۔ ۴:- سردار ولد شیر محمد۔ ۵:- دوست محمد ولد محمد شیر نے اوّلاً جھوٹی قسم اُٹھائی کہ غوث محمد ولد نور محمد کو مظفر خان ولد حاجی محمد خان نے بمع گیارہ ہمراہیوں کے اغواء کرلیا ہے، پھر دُوسرے دن کو غوث محمد نے اور اس کے ہمراہوں نے حاجی محمد خان مسماۃ صاحبہ خاتون دختر حاجی محمد خان خالد مظفر خان، اسلم خاتون دختر مظفر خان کو قتل کردیا ہے، پھر انہی

۱:- مذکورہ پانچ اشخاص نے پولیس کے رُوبرو ان الفاظ سے طلاق اُٹھائی ہے، باوضو ہوکر قرآن شریف سر پر اُٹھا کر اور زبانی بولا کہ: "ہم قسم اُٹھاتے ہیں اس کلامِ پاک کی کہ غوث محمد ولد نور محمد کو مظفر خان ولد حاجی محمد خان نے بمع گیارہ اشخاص کے اغواء کرلیا ہے۔

۲:- ہم پانچوں اشخاص نے اپنی اپنی بیویوں کے نام لے کر تین تین دفعہ یہ الفاظ بولے کہ:

"ہم پر اپنی عورت بشرعِ محمدی حرام ہو، اگر غوث محمد ولد نور محمد کو مندرجہ بالا اشخاص نے اغواء نہ کیا ہو۔"

جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ غوث محمد ولد نور محمد کی زندگی کا ثبوت اور اشتہاری ملزم ہونے کا ثبوت ہر اخبار میں درج ہے، اور اس کی گرفتاری 26-8-1968 کو عمل میں آئی ہے۔

جواب:- اگر سوال کا یہ بیان دُرست ہے کہ غوث محمد کو کسی نے اغواء نہیں کیا تو پولیس کے

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

سامنے قسم کھانے والے تمام افراد کی بیویوں پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،(۱) اب وہ حلالہ کے بغیر ان کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تعلیق کی ایک مخصوص صورت میں شوہر کی نیت کا اعتبار

سوال:- زید نے ایک دن اپنے خاص کمرے میں آرام کیا، جس وقت وہاں اس کی بیوی سوئی ہوئی تھی، اتنے میں زید کے والد اس کے کمرے کے قریب گزرے، اس علاقے میں دن میں بیوی کے ساتھ سونا عیب سمجھا جاتا ہے، جب زید اپنے کمرے سے نکلا تو والدہ نے اس کو کہا کہ: تم دن کو کیوں بیوی کے ساتھ سوتے ہو؟ زید نے اپنی امی کے زجر پر کہا کہ: ''اگر ایسا ہے تو میری بیوی پر تین طلاق ہے''، اب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے اس کلام کا کیا مطلب ہے؟ اس نے کہا کہ: میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے والد صاحب نے مجھے بیوی کے ساتھ سوتے ہوئے دیکھا ہے تو بیوی تین طلاق ہے۔ چونکہ کمرے کا دروازہ بند تھا، لہٰذا اس کے والد صاحب کے دیکھنے کا امکان بھی نہیں، اب سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورت میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟ نیز زید کے کلام کا کیا مطلب ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کے کلام ''اگر ایسا ہے .... الخ'' کا مطلب خود اسی سے معلوم کیا جائے گا، اگر وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بیان دیتا ہے کہ اس کی مراد والد صاحب کا میاں بیوی کو ساتھ سوتے ہوئے دیکھنا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی، اور طلاق کا دار و مدار والد کے دیکھنے پر ہوگا، اگر انہوں نے ان دونوں کو ساتھ سوئے ہوئے دیکھ لیا ہو تو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، ورنہ نہیں۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۸/۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الهندية كتاب الطّلاق الباب الرّابع فی الطّلاق بالشّرط الفصل الثالث فی تعليق الطّلاق ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجديه كوئٹه) واذا اضافه الى الشّرط وقع عقيب الشّرط اتفاقًا. وفی البحر الرّائق ج:۳ ص:۳۴۰ (طبع سعيد) والمعلّق بالشّرط كالمرسل عند وجود الشّرط .... الخ. وفی الهداية باب الأيمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شركت علميه) واذا اضافه الى شرط وقع عقيب الشرط .... الخ. نیز دیکھئے ص:۳۹۰ اور ص:۳۹۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

''اگر اُس نے نماز نہ پڑھی تو اس کو طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کی عدمِ موجودگی میں یہ الفاظ کہے: ''اگر اُس نے نماز نہ پڑھی تو اس کو طلاق ہے'' بعینہٖ پورے الفاظ کی حاضری نہیں ہے، لیکن غالباً یہ الفاظ یاد آتے ہیں، ایسے الفاظ دو یا تین دفعہ کہے گئے ہیں، غالباً یہ بھی تین دفعہ کا گمان ہے، بعد میں انہوں نے بیوی کو اس کی اطلاع کردی، کچھ عرصہ تک تو وہ نماز پڑھتی رہی، یعنی جب تک خاوند کے گھر میں تھی، جب والدین کے ہاں چلی گئی تو نماز بالکل نہیں پڑھتی تھی، اور بعد میں پھر جب خاوند کے ہاں آئی تو پھر نماز کی پابند ہوگئی۔ یاد رہے کہ اس بیوی کو سلسل البول کا عارضہ ہے، کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہوگئی؟

جواب:- طلاق کے اَحکام کا تمام تر دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے، کہنے والے کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح الفاظ کو یاد کرے کہ کیا کہا تھا؟ اگر غالب گمان انہی الفاظ پر قائم ہوتا ہے جو سوال میں درج کئے گئے ہیں تو ان سے مندرجہ حالات میں طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن اگر الفاظ اس کے علاوہ کچھ اور یاد آئیں تو دوبارہ مسئلہ پوچھ لیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

''اگر فلاں زمین کو فروخت نہ کروں تو میری بیوی کو طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- ایک شخص مسمّٰی میر اَکبر نے والد سے ناراض ہوکر بات چیت کے دوران ایسے کہا کہ ''فلاں زمین کا رقبہ جو میری حق اسامی ہے موقع ملنے پر باہر فروخت نہ کروں تو میری عورت پر تین طلاق سے طلاق ہے'' اور یہ بھی کہا کہ: ''تجھ کو دُوں تب بھی بیوی تین طلاق سے طلاق''۔ ازاں بعد چھ مہینے خاموش رہ کر یہ زمین والد کے پاس رہن کردی البتہ فروخت نہیں کی، اب یہ پریشان ہے، زمین باہر فروخت کرنے سے بھی سخت مجبور ہے، کیونکہ زمین کم ہے اور والد کے ہاتھ بھی فروخت نہیں کرسکتا، اگر ایسا کرے گا تو طلاق ہوگی۔ طلاق سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟

جواب:- میر اکبر نے ایسے الفاظ استعمال کر کے گناہ کا اِرتکاب کیا جس پر اسے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور موجودہ صورتِ حال سے بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ یہ زمین کسی شخص کو فروخت کردے، فروخت کرنے کے بعد پھر اس سے دوبارہ خرید لے تو پھر زمین اپنے پاس رکھنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی،[1] اور آئندہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے سے مکمل پرہیز کیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(فتویٰ نمبر ۲۳/۳۳ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب الأيمان فی الطّلاق ج:۲ ص:۳۸۵ (طبع شركت علميه ملتان) واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط مثل أن يقول لامرأته: ان دخلت الدّار فأنت طالق. وفی الهندية كتاب الطّلاق الباب الرّابع ج:۱ ص:۴۲۰ (طبع ماجديه كوئٹه) واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط اتّفاقًا. نیز دیکھئے ص:۳۹۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

﴿فصل فی تفویض الطّلاق﴾
(کسی کو طلاق واقع کرنے کا حق دینے کا بیان)

''تین طلاق تفویض'' کہنے کا حکم

سوال:- زید جس کی عمر تقریباً سترہ سال ہوگی، اس نے اپنی بیوی ہندہ کو بالفاظِ واضح دو عدد شاہدان کے سامنے یہ الفاظ کہے ''تین طلاق تفویض''، اب اس میں بعض جاہل بضد ہوکر اختلاف کر رہے ہیں کہ زید نابالغ ہے اس لئے طلاق نہیں ہوئی، دُوسرے کہتے ہیں کہ زید کی عمر جب سترہ سال ہے تو بالغ ہے اور طلاق بالغ کی ہوجاتی ہے، شرعاً صحیح صورت کیا ہے؟

جواب:- سترہ سال کی عمر کا لڑکا شرعاً بالغ ہے[۱]، اگر وہ طلاق دے تو طلاق واقع ہوجاتی ہے[۲]، اور سوال میں جو تفویض کے الفاظ لکھے ہیں اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اُس نے خود طلاق دے دی تب تو طلاق بلاشبہ ہو ہی گئی، اور اگر تفویض سے مراد یہ ہے کہ اُس نے عورت کو اپنے اُوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار دے دیا ہے تو معاملہ عورت کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ اپنے نفس پر طلاق واقع کرلے تو طلاق ہوجائے گی، ورنہ نہیں[۳]۔

واللہ اعلم
الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۱۵۳ (طبع سعید) بلوغ الغلام بالاحتلام والاحبال والانزال .... فان لم یوجد فیھما شئ فحتّی یتم لکلّ منھما خمس عشرة سنة بہٖ یفتیٰ.

(۲) وفی الھندیة کتاب الطّلاق الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع ماجدیہ) یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغًا عاقلًا.

(۳) فی الدّر المختار ج:۳ ص:۳۱۴ (طبع سعید) وأنواعه ثلاثة تفویض وتوکیل ورسالة والفاظ التفویض ثلاثة تخییر، وأمر بید، ومشیئة.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ ۱۳۸۷/۱۰/۳۰ھ

شرائط کی خلاف ورزی پر طلاق کا حق بیوی اور سسر کو تفویض کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے ایک سفید کاغذ پر مندرجہ ذیل اقرار نامہ لکھا۔ ۱:- اپنی زوجہ کو پردۂ شرعی کا پابند کروں گا۔ ۲:- نان نفقہ وغیرہ رزقِ حلال کا ضامن رہوں گا۔ ۳:- اپنی زوجہ کو زدوکوب نہیں کروں گا۔ ۴:- سسرال کے پڑوس و جوار میں رہوں گا اور مکان اپنا بناؤں گا۔ ۵:- سسرال وغیرہ کا خدمت گزار رہوں گا، صلہ رحمی کروں گا۔ ۶:- بیوی کو فی ماہ کے حساب سے مبلغ ۵ روپے نفقہ کے طور پر ادا کروں گا۔ ۷:- بدون اجازتِ بیوی دُوسری شادی نہیں کروں گا۔ ۸:- دینی اُمور مثل صوم وصلوٰۃ وغیرہ کا حتی المقدور ادا کرنے کا پابند رہوں گا۔ بصورتِ عدمِ پابندی مذکورہ بالا ہر ایک شرائط یا کسی شرط میں زوجہ ام کو یا باپِ زوجہ کو طلاقِ بائنہ واقع کرنے کا پورا پورا اختیار ہوگا۔

اب خلاف ورزی کر کے زوجہ کو مارنے لگا، سسر کے چھڑانے پر سسر کو کہتا ہے کہ تو کافر ہے، بے ایمان ہے۔ مذکورہ فساد کی بناء پر سسر نے اس کو دو لاٹھی ماری، داماد نے سسر کو گردن سے پکڑ کر زمین پر گرادیا۔ ۲:- دُوسرے دن زوجہ کو طلب کرنے میں سسر پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر حقیقی بھائی کے روکنے سے باز رہا اور فساد و حملہ کے ڈر سے سسرال سے چھ میل دُور دیہات میں بسنے لگا۔ دو تھانہ میں درخواست دی کہ سسرال میری زوجہ اور ۷۵ روپیہ اور زیورات لے گئے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ ۳:- عدالتِ دیوانیہ میں زن آشوئی کا مقدمہ دعویٰ دائر کرچکا ہے۔ ۴:- رقم نقدی سسرال سے اُدھار تھوڑے دن میں واپس کرنے کا عہد کر کے واپس نہیں دیتا، گیارہ ماہ گزر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گزری ہوئی قربانی میں سسر سے اپنی قربانی کے حصے کی رقم گاؤں میں دِلا کر اب تک ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے اور حق مہر بھی نہیں دیتا، کیا ان خلاف ورزیوں کی صورت میں طلاق ہوگئی؟

جواب:- اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو بلاشبہ شوہر نے اقرار نامے کی کئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بیوی یا سسر کو طلاق واقع کرنے کا اختیار صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاقِ بائنہ واقع

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ و ۳۱۶ (طبع سعید) قال لها اختاری أو أمرک بیدک ینوی تفویض الطّلاق .... أو طلّقی نفسک فلها أن تطلق فی مجلس علمها به مشافهة أو اخبارًا وان طال .... ما لم تقم لتبدّل مجلسها حقیقة أو حکمًا بان تعمل ما یقطعه .... لا تطلق بعده أی المجلس .... الخ.

کرے،(۱) اور اس میں بالکل تاخیر نہ کرے،(۲) اگر شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع نہیں کی اور ذرا بھی دیر ہوگئی تو عورت یا سسر کا طلاق واقع کرنا صحیح نہ ہوگا،(۳) البتہ اقرارنامہ چونکہ کئی شرائط پر مشتمل ہے اس لئے اگر بیوی یا سسر نے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر فوراً طلاق واقع نہیں کی تو اب انہیں آئندہ اسی شرط کی دوبارہ خلاف ورزی پر طلاق کا اختیار نہ ہوگا، لیکن اس کے بعد اگر شوہر کسی اور شرط کی خلاف ورزی کرے تو اس وقت انہیں پھر اختیار ملے گا بشرطیکہ خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع کریں، اب مذکورہ صورت میں اگر بیوی نے کسی شرط کی خلاف ورزی کے بعد مذکورہ بالا احکام کے مطابق طلاق دی ہے تو وہ واقع ہوگئی(۱)، اور اگر شرط کی خلاف ورزی کے بعد دیر کردی اور پھر طلاق واقع کی تو طلاق نہیں ہوئی۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۲۱ الف)

مسئلہ غلط سمجھنے کی بناء پر تفویضِ طلاق متحقق نہ ہونے کے باوجود طلاقِ بائن کا وقوع سمجھنا

سوال:- میری شادی لاہور میں ۲۴ر جولائی ۱۹۵۳ء کو یعنی چوبیس سال قبل نجمہ خاتون سے ہوئی، نجمہ خاتون کے ماں باپ نہیں تھے، اپنی خالہ، اور پھر ان کی وفات کے بعد خالہ زاد بہنوں کے پاس پرورش پائی، میری شادی ان کی خالہ زاد بہن کے ذریعہ ہوئی، شادی سادہ طریقے پر ہوئی، مہر مبلغ پانچ ہزار معجّل عند الطلب قرار پایا۔ میں پاکستان ایئرفورس میں ملازم تھا، پانچ اولادیں ہوئیں، تنخواہ قلیل تھی لیکن زندگی ہنسی خوشی سے گزری، اس کے بعد میری بیوی نے مانع حمل دوائیں استعمال کرکے اپنے کو مزید اولاد سے بچالیا (چونکہ کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور مزید بچوں کی پیدائش تعلیم میں مانع ہوسکتی تھی)۔

جب میری شادی ہوئی تو وہ معمولی پڑھی لکھی تھی، چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو گھر پر پڑھانا شروع کیا، جب میری پہلی بچی پیدا ہونے والی تھی اُسے آٹھویں جماعت کا کورس پڑھانا شروع کردیا، اور ۱۹۶۰ء میں جبکہ میرا تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کو میٹرک کا امتحان دِلوادیا، جس میں وہ دو تین پرچوں میں فیل ہوگئی، اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں جبکہ میری بچی میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی میں نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ پڑھایا اور دونوں کا امتحان دِلوایا، خدا کے فضل سے دونوں کامیاب

(۱،۲) گزشتہ صفحے کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوگئیں۔ بعد میں میری بچی نے بی اے کرلیا، اور میں نے اپنی بیوی کو طبیہ کالج کراچی میں چار سالہ کورس کے لئے داخلہ دِلوادیا، اور میں نے یہ اس خیال سے کیا کہ اگر میں مرجاؤں تو میری بیوی کسی پر بار نہ بنے اور عزّت کے ساتھ اپنا پیٹ بھر کر بچوں کی پرورِش وتعلیم دِلا سکے۔

۱۹۶۵ء کی سترہ دن کی جنگ میں ایک دَم بوڑھا ہوگیا، جب میں سرگودھا سے واپس آیا تو میرے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہوچکے تھے، ۱۲رفروری ۱۹۶۴ء کو پاکستان ایئرفورس کی طرف سے میں دو تین سال کے لئے ابوظہبی ایئرفورس میں مقرّر ہوکر چلا گیا، اس وقت میری بیوی طبیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھیں اور میں کورنگی کریک میں رہتا تھا، جانے سے قبل ناظم آباد میں کرایہ پر مکان لے کر اس میں بیوی بچوں کو منتقل کردیا اور چلا گیا۔

۱۹۶۷ء میں طبیہ کالج سے انہوں نے اپنا چار سالہ کورس مکمل کرلیا، اور اپنے کالج کے ایک ساتھی جو اِن سے دو سال پہلے فارغ ہوگئے تھے وہ اِن دنوں کلینک چلا رہے تھے اور اپنی ہونے والی بیوی کے لئے علیحدہ کلینک بھی چلانے کا پروگرام بنا رہے تھے، اُن سے ان شرائط پر کہ ان کی زیرِ نگرانی شام کے اوقات میں کلینک پر یہ بیٹھیں گی اور وہ جلد ہی ان کو رجسٹریشن کے لئے سرٹیفکیٹ دے دیں گے اور ساتھ ہی اپنی آمدنی میں سے بھی کچھ حصہ ان کو مل جایا کرے گا۔ لہٰذا وہ بیٹھنے لگیں، یہ تمام باتیں میری بیوی نے مجھ کو خط کے ذریعہ مطلع کیں اور میں نے اجازت دے دی، چونکہ مجھے اپنی بیوی پر مکمل اعتماد تھا اور میں اس کی کسی بات پر شک نہیں کرتا تھا، اب تک ہماری زندگی انتہائی پُرمسرّت گزری تھی۔

ابوظہبی کے دورانِ قیام میں تین ہزار روپیہ ماہوار بھیجتا رہا، دو ہزار خرچ کے لئے اور ایک ہزار مکان کی تعمیر کے لئے، یا مکان خریدنے کے لئے، لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ تین ہزار روپے خرچ ہوتے رہے اور پھوٹی کوڑی بھی جمع نہیں کرسکی، اس دوران اُنہوں نے دُوسرا مکان ناظم آباد میں کرایہ پر لے لیا جس کا کرایہ چار سو روپے ماہوار تھا، اس میں ٹیلیفون بھی تھا، مجھے یہ کہا گیا کہ ٹیلیفون سے یہ فائدہ ہے کہ مہینے میں کم از کم ایک بار بھی ٹرنک کال پر بات ہوسکتی ہے، میں مطمئن بلکہ خوش تھا۔ لیکن یہ ٹیلیفون میرے لئے سب سے بڑی پریشانی کا سبب بنا، اس کے ذریعہ میری بیوی نے دوستیاں بڑھانا شروع کردیں، اس بات پر ماں بیٹے میں جھگڑے شروع ہوگئے، میرے بڑے لڑکے کو ان باتوں پر اعتراض ہوتا تھا، تنگ آکر لڑکے نے مجھ کو ایک خط میں ان حالات سے مطلع کیا، میں نے لڑکے کو بہت سخت اور ڈانٹ کر خط لکھا کہ تم نے اپنی ماں کے بارے میں ایسا کیونکر سوچا؟ ساتھ ہی اپنی بیوی کو بھی کافی ڈانٹ کر سخت خط لکھا، یہ بات فروری ۱۹۶۶ء کی ہے، لیکن میری بیوی نے مجھے اور اپنی اولاد سے اب جھوٹ بولنا شروع کردیا، اور اُن کی دوستی کا سلسلہ چلتا رہا، انتہا یہ کہ انہوں نے اپنے ایک ''بھائی'' کے اشتراک

میں علیحدہ کلینک کھول لی اور مجھ کو انہوں نے یہ باور کرایا کہ یہ لڑکا شادی شدہ ہے (جو کہ غلط تھا)، اور ایک ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے (یہ بھی غلط تھا)، خود میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا ہے (یہ بھی غلط تھا)، غرضیکہ مجھ سے تمام باتیں جھوٹ اور غلط لکھ کر نئی کلینک کھولنے کی اجازت لے لی، اب حالات اور خراب ہوگئے، دو دو ماہ تک خط کا منتظر رہتا، خیریت کی اطلاع نہیں ملتی، روپیوں کا کوئی حساب نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے پاس کس قدر رقم جمع ہوئی ہے؟

دُوسرے لوگوں کے جو خطوط آئے ان کے ذریعہ معلوم ہوتا کہ گھر کا ہر فرد تباہ ہو رہا ہے، بچے اسکول نہیں جا رہے ہیں، اور مسلسل ناغوں کی وجہ سے ایک بچے کا نام کٹ گیا ہے، غرضیکہ نہایت پریشان کن اطلاعات ملتی رہیں، ان حالات سے تنگ آ کر ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں ان تمام حالات کی نشاندہی کی، ساتھ ہی ساتھ خط میں ایک جملہ محض روانی میں تحریر کر دیا: ”حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال اگر تم چاہو تو میں اس پر غور کرسکتا ہوں۔“

حسنِ اتفاق سے میں انہی دنوں تفہیم القرآن کا مطالعہ کر رہا تھا، اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اس دن جو سورت زیرِ مطالعہ تھی وہ سورۂ اُحزاب کی سورت تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ ظاہر کیا کہ اگر تمہاری بیویاں دُنیا کی آسودگیاں چاہتی ہیں تو اُن کو کچھ دے کر علیحدہ کر دو، اور اگر اللہ اور رسول کا قرب چاہتی ہیں تو اس کا بڑا اجر وثواب ہے، جب میں نے اس کی یہ تفسیر پڑھی تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، اور میں یہ سمجھا کہ میرے اس مذکورہ جملے سے میں نے اپنی بیوی کو یہ حق منتقل کر دیا ہے، حالانکہ قبل ازیں میرا کوئی ارادہ یا مقصد نہیں تھا اور نہ ہی بعد میں کوئی ارادہ ہوا اور نہ اب ہے، چنانچہ میں نے اس جملے کے بعد کا سارا مضمون جو زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا، حذف کر دیا اور تفہیم القرآن کی وہ تمام عبارت جو اس سورۃ سے متعلق تھی نقل کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ: ”میں نے محض اتفاقیہ طور پر نادانستگی میں یہ جملہ لکھ دیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ اگر مرد، عورت کو طلاق کا اختیار دیدے اور وہ اس کو حاصل کرنے کے بعد طلاق مانگ لے تو ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے، اور اس کے بعد سارا معاملہ ختم ہوجاتا ہے، لہٰذا تم کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح حالات کو دیکھ لو، اسی لئے میں نے تم کو پوری تفسیر کی نقل کر کے روانہ کی ہے، ساتھ ہی ساتھ میں اس تفسیر کے مطالعے کے بعد وقت بھی معین کر رہا ہوں یعنی ۲۴ر جولائی ۱۹۷۶ء کو رات بارہ بجے تک تم مجھ کو اپنے جواب سے مطلع کر دو۔ خیال رہے کہ یہ تاریخ ہماری شادی کی سالگرہ بھی ہے، تمہارا جواب مجھ کو ۳۰-۳۱ جولائی تک مل جائے گا، میں بہت بے چینی سے تمہارے خط کا منتظر ہوں۔“ وغیرہ۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو

خط بھیجا اس میں اس سے متعلق جو جملہ تھا وہ اس طرح کا تھا: ''آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک بار کہا تھا کہ ہماری زندگی میں لفظ طلاق اگر کبھی مذاق میں بھی آیا تو میں سمجھوں گی کہ ہوگئی، اور اس خط میں تو آپ نے یہ لفظ طلاق سینکڑوں بار استعمال کیا ہے۔''

میں نے اُن کے اس جواب سے یہ سمجھا کہ انہوں نے طلاق مانگ لی، چنانچہ میں نے ان کو جو خط لکھا اس میں جو جملہ تحریر کیا تھا وہ یہ تھا: ''آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، باقی کی طلاقیں خود بخود وقتِ مقرّرہ پر ہوجائیں گی، جس کی تفصیل میں اپنے پچھلے خط میں تحریر کر چکا ہوں۔'' ساتھ ہی ان کو ہدایات کیں کہ اب آپ اپنی رہائش کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرلیں، حق مہر اداء کر چکا ہوں، پھر بھی اگر آپ کہتی ہیں کہ نہیں ملا تو جو رقم آپ کے پاس بینک میں جمع ہے اس میں سے آپ اپنا مہر لے سکتی ہیں، گھر کی ہر چیز آپ کی ملکیت ہے، البتہ بچی کے جہیز کی جو چیزیں ہیں وہ اس کو دے دیں اور اگر بچوں کے کپڑے دے دیں گی تو بڑا احسان ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی بچی کو بڑا تفصیلی خط لکھا کہ تمہاری ماں کو میں نے محض اتفاقیہ یہ جملہ لکھا تھا اور اُنہوں نے فوراً طلاق حاصل کرلی، میں ان کو زندگی کے کسی حصے میں سکون سے رہنے نہیں دُوں گا، بچوں سے پوچھ لو کہ وہ کس کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں؟ اگر ماں کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں تو تم ان کو میرے بڑے بھائی کے گھر پہنچادو۔

اس خط کے جواب میں ۲۳؍اگست کو میری بیوی کا جو خط آیا اس میں اُنہوں نے لکھا کہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ نہ تو میں نے جب طلاق مانگی تھی اور نہ ہی اب مانگ رہی ہوں، میں نے اس خط میں آپ کو محض ایک بات یاد دِلائی تھی، آپ ذرا ذرا سی بات کو کس قدر اہمیت دے رہے ہیں، میرا کون ہے اور میں اب طلاق لے کر کیا کروں گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ خط مجھ کو ملا میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور نمازِ شکرانہ ادا کی، لہٰذا ۲۴؍ستمبر سے پہلے ۱۳؍ستمبر کو میں پاکستان آیا اور باقاعدہ تعلقات زن وشو قائم کئے۔

اب میری بیوی کو چند لوگوں نے یہ یقین دِلا دیا کہ اُس کو طلاق ہوچکی ہے، چنانچہ میں ابوظہبی سے اپنا قیام ختم کر کے جون ۱۹۷۷ء میں واپس آیا تو کچھ عرصہ بعد ہی اس نے یہ کہنا شروع کردیا کہ ہماری طلاق ہوچکی ہے، اور ۱۸؍ستمبر ۱۹۷۷ء کو بچوں اور گھر کو چھوڑ کر چلی گئی اور عدالت میں تنسیخِ نکاح کا دعویٰ بھی کردیا، اس کا کہنا یہی ہے کہ یہ مجھ کو طلاق دے چکے ہیں۔ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی ان حالات میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟

تنقیح:-

صفحہ:۵ کے آخر کی خط کشیدہ عبارت اور صفحہ:۶ کی شروع کی خط کشیدہ عبارت کے متعلق چند باتیں وضاحت طلب ہیں، جن کے بارے میں آپ کی زبانی وضاحت زیادہ مناسب ہے، لہٰذا آپ جمعہ کے علاوہ کسی بھی صبح ۹ بجے دار الافتاء دارالعلوم کورنگی کے ایریا کراچی نمبر۱۴ میں تشریف لاکر ملاقات کریں۔

والسلام
بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۳۹۸/۴/۱۶ھ

جوابِ تنقیح:-

۱:- حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ اگر اللہ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید میں کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال اگر تم چاہو تو اس پر غور کرسکتا ہوں۔

۲:- لیکن اب پتہ چلا کہ اگر مرد، عورت کو طلاق کا اختیار دیدے اور وہ اُس کو حاصل کرنے کے بعد طلاق مانگ لے تو ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے، اور اس کے بعد معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔

۳:- ساتھ ہی ساتھ اس تفسیر کے مطالعے کے بعد وقت معین کر رہا ہوں، یعنی ۲۴ر جولائی ۱۹۷۶ء رات بارہ بجے تک تم مجھ کو اپنے جواب سے مطلع کردو۔

۴:- آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک بار کہا تھا کہ ہماری زندگی میں لفظِ طلاق اگر کبھی مذاق میں بھی آیا تو میں سمجھوں گی کہ ہوگئی، اور اس خط میں تو آپ نے یہ لفظِ طلاق سینکڑوں بار استعمال کیا ہے۔

۵:- آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے، باقی طلاقیں خود بخود وقتِ مقررہ پر ہوجائیں گی، جس کی تفصیل میں اپنے پچھلے خط میں تحریر کرچکا ہوں۔

۶:- آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ نہ تو میں نے جب طلاق مانگی تھی اور نہ ہی اب مانگ رہی ہوں، میں نے اس خط میں (سیاہ) تو آپ کو محض ایک بات یاد دِلائی تھی، آپ ذرا ذرا سی بات کو کس قدر اہمیت دے رہے ہیں، اور میں اب طلاق لے کر کیا کروں گی۔

۷:- میں نے ان خطوط کی نقل اپنے پاس رکھ لی تھی جو میں نے پھاڑ کر جلادیئے تاکہ اس تلخ واقعے کی یاد پھر کبھی نہ آئے۔

۸:- یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی ان حالات میں طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس قدر باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ سائل نے جو جملے صفحہ:۴ کے آخر میں نقل کیا ہے کہ: ''اگر اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسند کام طلاق نہ ہوتا تو شاید میں کب کا دے چکا ہوتا، بہرحال

اگر تم چاہو تو میں اس پر غور کر سکتا ہوں'' اس جملے سے تفویضِ طلاق متحقق نہیں ہوتی، لیکن سائل نے تفہیم القرآن کے مطالعے سے غلط طور پر یہ سمجھا کہ مذکورہ جملے سے تفویضِ طلاق ہوگئی ہے، اس کی بنیاد پر جب بیوی نے اس کو خط لکھا تو سائل نے یہ کہا کہ: ''آپ کے خط کے بموجب ایک عدد طلاقِ بائن واقع ہوگئی ہے۔''

یہ انشاءِ طلاق نہیں بلکہ حکمِ شرعی کا غلط بیان ہے، اس لئے اس سے بھی طلاق واقع نہ ہوگی، لیکن یہ جواب صرف اُس صورت میں ہے جبکہ سائل نے اپنے خطوط میں یا زبانی انشاءِ طلاق کا کوئی جملہ استعمال نہ کیا ہو، اگر کوئی ایسا جملہ اس نے کہا یا لکھا ہو جس کا ذکر اس سوال میں نہیں ہے تو صورتِ حال مختلف ہوگی، لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر اور آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر عمل کریں۔

ھٰذا ما عندی
واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۳۷/۲۹ ب)

شرائط کی خلاف ورزی پر بیوی کو طلاق کا حق دیا ہوا ہو تو بیوی اپنے اُوپر طلاق واقع کر سکتی ہے

سوال:- اقرار نامہ جو تین بار لکھا گیا ہے، حسبِ ذیل ہے۔ ۱:- یہ کہ زوجہ کے لئے شرعی پردہ کا انتظام کروں گا۔ ۲:- یہ کہ نفقات وغیرہ رزقِ حلال کا ضامن رہوں گا۔ ۳:- یہ کہ زوجہ کو زدوکوب نہیں کروں گا، حسنِ سلوک سے گزر کروں گا۔ ۴:- یہ کہ سسرال کا خدمت گزار رہوں گا اور صلہ رحمی کروں گا۔ ۵:- یہ کہ دینی اُمور مثل صوم وصلوٰۃ وغیرہ میں پابند رہوں گا۔ اس صورت میں داماد نے سسر کو گردن سے پکڑ کر گرا دیا، چند منٹ تک سسر اور داماد آپس میں لڑتے رہے، جن کو کافی آدمیوں نے مل کر چھڑایا تھا۔ ۲:- سسر نے داماد کے قربانی کے لئے رقم دی تھی، چند بار طلب کرنے پر نہیں دیتا، ان خلاف ورزیوں کے باوجود عورت نے اپنے اُوپر تین طلاقیں واقع کی ہیں جس کا تمام لوگوں میں اعلان ہو چکا ہے، اس بناء پر شوہر کہتا ہے کہ طلاق زوج کرتا ہے عورت کی طلاق کیوں جائز ہے؟ بلکہ شوہر کہتا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ میرے اقرارنامہ کی وجہ سے میری زوجہ پر طلاق ہوگی، اب قابلِ دریافت اَمر یہ ہے کہ شوہر کا عذرِ طلاقِ زوجہ میں کیا حق رکھتا ہے، چاہے عذر سچا ہو یا جھوٹا؟ عورت پر طلاق بائن کن خلاف ورزیوں سے پڑتی ہے؟

جواب:- اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو بلاشبہ شوہر نے اقرارنامے کی کئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں بیوی یا سسر کو طلاق واقع کرنے کا

اختیار صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاقِ بائن واقع کرے اور اس میں بالکل تاخیر نہ کرے، اگر شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع نہیں کی اور ذرا بھی دیر ہوگئی تو اس کے بعد عورت یا خسر کا طلاق واقع کرنا صحیح نہیں ہوگا،(۱) البتہ اقرار نامہ چونکہ کئی شرائط پر مشتمل ہے، اس لئے اگر بیوی یا خسر نے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی پر فوراً طلاق واقع نہیں کی تو اب انہیں آئندہ اسی شرط کی دوبارہ خلاف ورزی پر تو طلاق کا اختیار نہ ہوگا، لیکن اس کے بعد شوہر کسی اور شرط کی خلاف ورزی کرے تو اس وقت انہیں پھر اختیار ملے گا بشرطیکہ وہ خلاف ورزی کے فوراً بعد طلاق واقع کرلیں،(۲) اب مذکورہ صورت میں اگر بیوی نے کسی شرط کی خلاف ورزی کے فوراً بعد مذکورہ بالا اَحکام کے مطابق طلاق دی ہے تو وہ واقع ہوگئی اور اگر شرط کی خلاف ورزی کے بعد دیر کردی اور پھر طلاق واقع کی تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب تفویض الطّلاق ج:۳ ص:۳۱۵ (طبع سعید)
قال لها اختاری أو أمرک بیدک ینوی تفویض الطّلاق .... أو طلّقی نفسک فلها أن تطلق فی مجلس علمها به مشافهة أو اخبارًا وان طال .... ما لم تقم لتبدّل مجلسها حقیقة أو حکمًا بان تعمل ما یقطعه .... لا تطلّق بعده أی المجلس .... الخ.

﴿فصل فی الطّلاق الثلٰث و أحکامه﴾
(تین طلاق کے اَحکام)

تین طلاق کا مسئلہ اور حاملہ کی عدّت اور شرعی حلالہ کا طریقہ

سوال ۱:- میاں بیوی میں جھگڑا ہوگیا، میاں نے انتہائی غصّے کی حالت میں کہا کہ: ''خاموش ہوجاؤ ورنہ طلاق دے دُوں گا'' بیوی نے کہا: ''دے دو'' میاں نے کہا: ''اچھا! طلاق، طلاق، طلاق'' آیا شوہر کے فقط یہ الفاظ کہنے سے اُس کی بیوی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟

۲:- اگر ہوگئی تو رجعی ہوئی یا مغلّظہ؟

۳:- یہ عورت حمل سے ہے، اس کی عدّت کیا ہوگی؟

۴:- اگر عورت مرد کے نکاح میں رہنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔

۲:- مغلّظ طلاق ہوئی۔ (۱)

۳:- صورتِ مسئولہ میں اس کی عدّت وضعِ حمل یعنی بچے کی ولادت ہے۔ (۲)

۴:- کوئی صورت نہیں، بجز اس کے کہ عدّت گزارنے کے بعد وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ شخص اپنی مرضی سے کسی وقت اس کو ہم بستری کے بعد طلاق دیدے یا اس کا انتقال

---

(۱) وفی الفتاویٰ الهندیة کتاب الطّلاق، الباب الأوّل ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ماجدیه کوئٹه) وامّا البدعی .... أن یطلّقها ثلٰثًا فی طهر واحد بکلمة واحدة أو بکلمات متفرّقة .... فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا.

وفی الهدایة کتاب الطّلاق باب طلاق السنّة ج:۲ ص:۳۵۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه ملتان) وطلاق البدعة أن یطلّقها ثلٰثًا بکلمةٍ واحدة أو ثلٰثًا فی طهر واحد فاذا فعل ذٰلک وقع الطّلاق وکان عاصیًا .... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۲۳۲ (طبع سعید) والبدعی ثلٰث متفرّقة. وفی الشامیة (قوله ثلٰثة متفرّقة) وکذا بکلمةٍ واحدة بالأولٰی........ وذهب جمهور الصّحابة والتّابعین ومن بعدهم من أئمّة المسلمین الی أنّه یقع ثلٰث.

(۲) وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ. (الطّلاق:۴)

وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار باب العدّة ج:۳ ص:۵۱۱ (طبع سعید) وفی حق الحامل مطلقًا .... وضع جمیع حملها .... الخ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۴۲۳ (طبع شرکت علمیه ملتان) وان کانت حاملًا فعدّتها أن تضع حملها .... الخ

ہوجائے تو اس کی عدّت گزارنے کے بعد یہ عورت پہلے شوہر سے نئے مہر پر نیا نکاح کرسکتی ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۴/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۳/۲۹ ب)

ایک وقت میں تینوں طلاقیں واقع ہونے پر ائمہ کا اجماع ہے، اور اس اجماع کے خلاف کوئی بات قابلِ قبول نہیں

سوال:- زید کی بیوی اپنے لڑکے کو مار رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی، اتنے میں زید بھی آگیا، زید نے بیوی کو گالیاں دینے سے منع کردیا، مگر بیوی باز نہ آئی اور شوہر کو بھی گالیاں دینی شروع کردیں، جس پر زید کو غصہ آیا اور اس نے یہ الفاظ کہے: ''طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے'' لفظِ طلاق تین مرتبہ سے بھی زائد کہا ہے، مگر اس کو یاد نہیں ہے، اور یہ بات زید نے اپنے خاندان کے تقریباً تیس آدمیوں کے سامنے بیان کی ہے، کیا طلاق واقع ہوگئی اور کتنی؟ اب کوئی صورت ہے حلال ہونے کے لئے؟

۲:- اگر مذہبِ حنفی کے مطابق تین طلاق ہوچکی ہیں تو اہلِ حدیث سے فتویٰ لے کر عمل کیا جائے؟ کیونکہ نہ شوہر بیوی کو جدا کرنا چاہتا ہے، اور نہ بیوی جدا ہونا چاہتی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب وہ زید کے لئے مغلّظاً حرام ہوچکی ہے اور حلالہ کے بغیر ہرگز اس کے ساتھ نکاحِ ثانی بھی جائز نہیں ہے، دونوں کو فوراً الگ ہوجانا چاہئے، اگر وہ الگ نہ ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان سے بیزاری کا اظہار کریں۔

۲:- تین طلاق دینے کی صورت میں چاروں ائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت مغلّظاً حرام ہوجاتی ہے،[۲] اور بغیر حلالہ کے حلال نہیں ہوسکتی، اس اجماع کے خلاف جو بات بھی کہی جائے وہ قابلِ قبول نہیں،[۳] اور کسی سے خلافِ اجماع ائمہ اربعہ فتویٰ

---

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: جاءت امرأة رفاعة القرظی الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقالت: انی کنت عند رفاعة، فطلّقنی فبتّ طلاقی فتزوّجت بعدهٗ عبدالرحمن بن الزبیر وما معه الا مثل هدبة الثّوب، فقال: اتریدین أن ترجعی الی رفاعة؟ قالت: نعم! قال: لا! حتّی تذوقی عُسَیلته ویذوق عسیلتکِ. متفق علیه. وفی الهدایة کتاب الطّلاق، باب الرّجعة، فصل فیما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شرکت علمیه ملتان) وان کان الطّلاق ثلٰثًا فی الحرّة أو ثنتین فی الامة لم تحلّ لهٗ حتّی تنکح زوجًا غیره نکاحًا صحیحًا ویدخل بها ثم یطلّقها أو یموت عنها والأصل فیه قوله تعالیٰ: "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ." والمراد الطلّقة الثّالثة.

(۲، ۳) حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

لے کر اس پر عمل کرنا اور بھی گناہ ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

محمد عاشق الٰہی بلندی شہری عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۰ الف)

حاشیہ متعلقہ صفحہ گزشتہ......(۲ و ۳) ایک وقت میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجانے اور اس پر ائمہ اربعہؒ کے اجماع اور مخالفین کے دلائل کے جوابات سے متعلق مدلل اور مفصل تحقیق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

سوال:- میں اپنے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ لینا چاہتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ رہنمائی فرمائیں گے۔ میں نے اپنی بیوی کو کچھ گھریلو مسائل سے پریشان ہوکر اور اس کے علیحدہ گھر کے مطالبے پر باقاعدہ تین طلاقیں لکھ کر بذریعہ کورٹ بھیج دیں، میری بیوی انتہائی غصّے والی ہے اور میری نافرمان بھی رہی، طلاق سے پہلے معاملات کو سنبھالنے کے لئے میں نے اپنے ماموں کو بھی بیچ میں ڈالا مگر اس سے اور کچھ ان کے رویے سے غلط فہمیاں اور بڑھیں اور مجھے یہ قدم اُٹھانا پڑا، میں نے یہ ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو کیا، اب تک ایک ماہ اور ۱۵ دن گزر چکے ہیں، میری بیوی اب تمام باتوں کی معافی مانگتی ہے اور بقول اس کے کہ وہ پہلے بھی تیار تھی مگر میرے ماموں کی غلط باتوں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا، اس لئے میں بھی رُجوع کرنا چاہتا ہوں، میرا تعلق حنفی فرقے سے ہے، میری معلومات کے حساب سے اہلِ حدیث حضرات رُجوع کی اجازت دیتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:- سائل کے سوالات کے حل پیش کرنے سے پہلے ہم اصل مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس میں یہ ثابت کریں گے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں خواہ ایک جملے سے دی ہوں یا الگ الگ جملوں سے دی ہوں، تین طلاقیں شمار ہوں گی اور تینوں طلاقیں واقع ہوں گی اور حرمتِ مغلظہ ثابت ہوگی جس میں رُجوع نہیں ہوسکتا، اور حلالہ کے بغیر دوبارہ باہم نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ مذکورہ موقف قرآنِ کریم، احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اور اسی پر جمہور صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم اور چاروں اماموں یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا اتفاق ہے۔

اگر کسی نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، خواہ ایک جملے سے ہوں یا الگ الگ جملوں سے ہوں تو اس کا یہ فعل خلافِ سنت اور ناجائز ہے، تاہم اگر کسی نے اس طریقے سے تین طلاقیں دیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوکر حرمتِ مغلظ ثابت ہوجائے گی، ذیل میں اختصار کے ساتھ قرآنِ کریم، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہؓ اور عباراتِ فقہ ملاحظہ ہوں:-

قال اللہ تعالیٰ: "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ. الآیة." (سورة البقرة).(۱)

"طلاق دو مرتبہ کی ہے، پھر خواہ قاعدے کے مطابق رکھ لے، خواہ اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔"

اس آیتِ کریمہ سے علمائے کرام نے ایک دفعہ میں تین طلاقیں دینے سے تینوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ اس آیتِ کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ طلاق دو دفعہ کی ہے، اب اس میں دونوں احتمال ہیں کہ دو طلاق الگ الگ طہر میں دیدے یا ایک ساتھ دیدے، بہرصورت دونوں واقع ہوں گی، اور جب ایک وقت میں دو طلاقیں واقع ہوسکتی ہیں، تو تین بھی واقع ہوں گی، ....(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) آیت نمبر: ۲۲۹ پ ۲۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........اس لئے کہ دو اور تین میں فرق کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری میں "باب من اجاز الطّلاق الثلٰث"[1] میں تین طلاقوں کے واقع ہونے پر اسی آیتِ کریمہ سے استدلال کیا ہے۔

قال ابوبکر الرازی تحت عنوان "ذکر الحجاج لایقاع الثلٰث معًا" قوله تعالیٰ: الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان، الأیة. یدل علٰی وقوع الثلٰث معًا مع کونه منهیا عنه وذٰلک لأن قوله تعالیٰ: "الطّلاق مرتان" قد ابان عن حکمة اذا وقع اثنتین بان یقول: أنتِ طالق، أنتِ طالق، فی طهر واحد، وقد بینا ان ذٰلک خلاف السنّة فاذا کان فی مضمون الأیة الحکم بجواز وقوع الاثنتین علی هٰذا الوجه دلّ ذٰلک علٰی صحة وقوعهما لو أوقعهما معًا لأن أحدًا لم یفرق بینهما اهـ.
(رساله حکم الطّلاق الثلٰث بلفظ واحد فتویٰ علماء الحرمین الشریفین)

وفی الصحیح للامام البخاری رحمه الله تعالیٰ: باب من أجاز طلاق الثلٰث لقوله تعالیٰ: الطلاق مرتان فامساک بمعروف أو تسریح باحسان. اهـ.(ج:۲ ص:۷۹۱).[2]

وفی عمدة القاری شرح الصحیح للامام البخاریؒ: وجه الاستدلال به ان قوله تعالیٰ: ("الطّلاق مرتان") معناه مرة بعد مرة، فاذا جاز الجمع بین اثنتین جاز بین الثلٰث. اهـ.[3](ج:۹ ص:۵۳۸)

اس آیتِ کریمہ کے علاوہ بھی چند آیاتِ مبارکہ اور بھی ہیں، جن سے تین طلاقوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم نے ایک آیت کے ذکر کو کافی سمجھا۔ اب چند احادیثِ طیبہ ملاحظہ ہوں جن سے مذکورہ موقف ثابت ہورہا ہے:-

فی سنن النسائیؒ[4]: اخبر رسول الله صلی الله علیه وسلم عن رجل طلّق امرأته ثلٰث تطلیقات جمیعًا، فقام غضبانا، ثم قال: ایُلعب بکتاب الله وانا بین أظهرکم؟ الحدیث.

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی کہ ایک شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصّے میں کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ: میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جارہا ہے۔"

اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصّے کا اظہار تو کیا، لیکن تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار نہیں دیا، بلکہ تینوں کو نافذ فرمایا، جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **"فلم یرده النبی صلی الله علیه وسلم بل امضاه."**

عن سهل بن سعد فی هٰذا الخبر قال: فطلّقها ثلٰث تطلیقات عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فانفذه رسول الله صلی الله علیه وسلم.(ابوداؤد ج:۱ ص:۳۰۶).[5]

"حضرت عویمرؓ نے اپنی بیوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دے دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں کو نافذ فرمایا۔"

کان ابن عمر رضی الله عنهما اذا سُئل عمّن طلّق ثلٰثاً قال: لو طلقت مرة أو مرتین فان النبی صلی الله علیه وسلم أمرنی بهٰذا، فان طلّقها ثلٰثًا حرمت حتّی تنکح زوجًا غیره. (بخاری شریف ج:۲ ص:۷۹۲)۔[6]

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۲ ص:۷۹۱ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) (طبع قدیمی کتب خانه)
(۳) ج:۲۰ ص:۲۳۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).
(۴) ج:۲ ص:۹۹ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۵) (طبع میر محمد کراچی).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)........... ''حضرت ابنِ عمرؓ سے جب اس شخص کے متعلق سوال کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں تو فرماتے: اگر تو نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوتیں (تو رُجوع کرسکتا تھا)، اس لئے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کا (یعنی رجعت کا) حکم دیا تھا، اور اگر تین طلاقیں دے دیں تو عورت حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ وہ دُوسرے مرد سے نکاح کرے۔''

ان احادیثِ مبارکہ کے علاوہ بھی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی تھیں۔

غیرمقلدین حضرات جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرتے ہیں، وہ عام طور پر دو روایات سے استدلال کرتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:-

حدیث نمبر۱:- **عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: طلّق رکانۃ بن عبد یزید اخو بنی مطلب امرأتہ ثلٰثًا فی مجلس واحد فحزن علیہا حزنًا شدیدًا، قال: فسألہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکیف طلّقتہا؟ قال: طلقتہا ثلٰثًا، قال: فقال: فی مجلس واحد؟ قال: نعم! قال: فانما تلک واحدۃ فارجعہا ان شئت. قال: فرجعہا. اسنادہ صحیح.** (مسند احمد ج:۴ ص:۴۷۷)۔(۱)

''حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں اور پھر وہ بہت افسردہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ: تم نے کیسے طلاق دی؟ انہوں نے عرض کیا: تین طلاقیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ایک مجلس میں؟ عرض کیا: جی ہاں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو رُجوع کرلو، چنانچہ انہوں نے رُجوع کرلیا۔''

حدیث نمبر۲:- **عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: کان الطلاق علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأبی بکر وسنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلٰث واحدۃ. الحدیث.** (مسلم شریف ج:۱ ص:۴۷۷)۔(۲)

''حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کے شروع میں (ایک مجلس کی) تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں۔''

غیرمقلدین اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے عام طور پر مذکورہ بالا ان دو روایتوں سے استدلال کرتے ہیں، لیکن ان روایتوں سے مذکورہ موقف پر استدلال دُرست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:-

حدیث نمبر۱ میں حضرت رکانہؓ کی طلاق کا جو قصہ مذکور ہے، اس میں روایات کے اندر اضطراب پایا جاتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے، اور بعض روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ ''بتّہ'' سے طلاق دی تھی، اور طلاقِ ''بتّہ'' سے مراد وہ طلاق ہے جس میں ایک سے تین طلاقوں تک کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی اگر ایک طلاق کی نیت ہو تو ایک، اور تین کی نیت ہو تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اسی اضطراب کی وجہ سے اس روایت کے بارے میں علمائے حدیث نے مختلف اقوال اختیار کئے، مثلاً:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو ''معلول'' قرار دیا۔

علامہ ابنِ عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کو ''ضعیف'' کہا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۴ ص:۲۱۵ (طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت).

(۲) ج:۱ ص:۴۷۷ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........حضرت امام ابوبکر جصاص اور علامہ ابن الہمام رحمہما اللہ نے اس کو "منکر" فرمایا۔

کیونکہ یہ روایت ان معتبر اور ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہے جنہوں نے لفظِ "بتّہ" کے ذریعہ طلاق دینا نقل کیا ہے۔

حضرت امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو طلاقِ "بتّہ" دی تھی، کیونکہ حضرت رکانہؓ کے گھر والوں نے اس کو روایت کیا ہے اور گھر والے گھر کے قصے کو دُوسروں سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے فرمایا:-

عن عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانة عن أبیه عن جده أنه طلّق امرأته "البتة" فاتی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: ما اردت؟ قال: واحدة! قال: آلله؟ قال: الله! قال: هو علی ما اردت، قال ابوداؤد: وهٰذا أصح من حدیث ابن جریج ان رکانة طلّق امرأته ثلٰثًا لأنهم أهل بیته وهم أعلم به. (سنن ابی داؤد).(۱)

"حضرت یزید اپنے والد حضرت رکانہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاقِ "بتّہ" دے دی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ: تمہاری نیت کیا تھی؟ عرض کیا: ایک طلاق کی! آپ نے فرمایا: خدا کی قسم؟ عرض کیا: جی ہاں خدا کی قسم! آپ نے فرمایا: جو تم نے نیت کی وہی معتبر ہے (یعنی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہوئی)۔ امام ابوداؤدؒ نے فرمایا کہ: یہ حدیث کے بیان کرنے والے ان کے اپنے گھر کے افراد ہیں، اور وہ اس واقعے کو دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت رکانہؓ نے اس وجہ سے رُجوع نہیں کیا تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طلاق شمار کرکے ان کو رُجوع کا حکم دیا تھا، بلکہ اس وجہ سے انہوں نے رُجوع کیا تھا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاق کی نیت سے طلاقِ "بتّہ" دی تھی۔

حدیث نمبر۲:- اسی طرح غیرمقلدین کا اس حدیث شریف سے بھی اپنے موقف پر استدلال کرنا دُرست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:-

الف:- اس روایت میں راوی کو "وَہم" ہوا ہے، کیونکہ ابنِ طاؤسؒ سے اس کے خلاف روایت منقول ہے، اور علامہ باجیؒ نے حضرت ابنِ طاؤسؒ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ اوجز المسالک میں اس مضمون کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

فی أوجز المسالک شرح المؤطا للامام مالک نقلًا عن الباجیؒ: وما روی عن ابن عباس فی ذٰلک من روایة طاؤس، قال فیه بعض المحدثین: هو وهم، وقد روی ابن طاؤس عن أبیه عن ابن وهب خلاف ذٰلک وانما وقع الوهم فی التأویل، قال الباجی: وعندی ان الروایة عن ابن طاؤس بذٰلک صحیحة فقد رواه عنه الأئمة معمر وابن جریج وغیرهما. (ج:۴ ص:۲۳۱)۔(۲)

وفی السنن الکبریٰ للبیهقی: وهٰذا الحدیث أحَد ما اختلف فیه البخاری ومسلم فأخرجه مسلم وترکه البخاری وأظنه انما ترکه لمخالفته سائر الروایات عن ابن عباس. (ج:۷ ص:۳۳۷)۔(۳)

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۱ ص:۳۰۱ (طبع میر محمد). (۲) ج:۱۰ ص:۷ و ۸ (طبع تالیفات اشرفیه ملتان).
(۳) (طبع نشر السنة ملتان).

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........''اس حدیث کے بارے میں حضرت امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ کا اختلاف ہوا، سو امام مسلمؒ نے اس کو اپنی کتاب میں نقل کیا اور امام بخاریؒ نے چھوڑ دیا، اور میرے خیال میں امام بخاریؒ نے اس روایت کو اس لئے نہیں لیا کہ یہ روایت حضرت ابنِ عباسؓ کی دیگر روایات کے خلاف ہے۔''

وفي الجوهر النقي علیٰ هامش السنن الكبریٰ: وذكر صاحب الاستذكار: ان هٰذه الرواية وهم وغلط لم يعرج عليها أحد من العلماء اهـ. (ج:۷ ص:۳۳۷)۔[۱]

''صاحبِ استذکارؒ نے فرمایا کہ: یہ روایت وہم اور غلط ہے، علماء میں سے کسی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔''

ب:- اگر وہم وغیرہ سے قطع نظر بھی کی جائے تو بھی اس حدیث کے کئی معنیٰ و مطلب ہوسکتے ہیں، ایک مطلب وہ بھی بن سکتا ہے جو غیر مقلدین نے لیا ہے، لیکن یہ مطلب دُوسری احادیث کی بناء پر دُرست نہیں، اور فقہائے کرامؒ میں سے کسی نے بھی اس مطلب کو صحیح قرار دے کر یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین نہیں بلکہ ایک شمار ہوگی، لہٰذا اس کا سب سے زیادہ صحیح اور قوی معنیٰ و مطلب ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جسے حضرت امام قرطبیؒ نے پسند فرمایا ہے اور جس کو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت ملتی ہے۔

اس حدیث شریف میں کسی عام قاعدہ کا ذکر نہیں، بلکہ اس کا تعلق ایک خاص صورت سے ہے، اور یہ کہ شوہر لفظِ طلاق کو ''تاکید'' کی نیت سے دُہرائے، ہر جملہ سے الگ الگ طلاق کی نیت نہ ہو، تو اس صورت میں شوہر کی تصدیق کی جائے گی اور ایک ہی طلاق کے واقع ہونے کا حکم جاری کیا جائے گا، لیکن شوہر کی تصدیق اس وقت تک کی جاتی تھی اور شوہر پر اس وقت تک اعتماد کیا جاتا تھا جب لوگوں کے سینے اور دِل دھوکا وفریب سے صاف وشفاف تھے، لیکن جب حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگوں میں جھوٹ، دھوکا اور فریب کا رواج ہونے لگا اور اب کسی کی دیانت پر بھروسہ کرکے اس کے دعویٰ کی تصدیق مشکل ہوگئی، تو حضرت عمرؓ نے ظاہر تکرار کو دیکھ کر اس کے مطابق تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا اور نیتِ تاکید کے دعویٰ کو قبول نہیں فرمایا۔

في تكملة فتح الملهم: وهٰذا الجواب ارتضاه القرطبي وقوّاه بقول عمر: ان الناس استعجلوا في أمر كانت لهم فيه اناة وكذا قال النووي: ان هٰذا أصحّ الأجوبة. (ج:۱ ص:۱۵۸)۔[۲]

''اس جواب کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے پسند فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے اس کی تائید بھی فرمائی جس میں انہوں نے فرمایا کہ: لوگوں نے مہلت والی چیز میں جلدبازی سے کام لیا، حضرت امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا ہے اور یہ صحیح ترین جواب ہے۔''

اب چند مشہور اور کبار صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ ملاحظہ ہوں جن میں تین طلاقیں تین ہی شمار کی ہیں، یہ فتاویٰ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں مذکور ہیں:-

كان عمر اذا أتي برجل قد طلّق امرأته ثلاثا في مجلس أوجعه ضربًا وفرّق بينهما. [۳]

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب کسی ایسے شخص کو حاضر کیا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں، تو حضرت عمرؓ اس کو سزا دیتے اور میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی فرماتے۔''

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) (طبع نشر السنة ملتان). (۲) (طبع مكتبه دارالعلوم كراچي).
(۳) مصنف ابن أبي شيبة ج:۵ ص:۱۱ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه).

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)........جاء رجل الی عثمان فقال: انی طلّقت امرأتی مائة، قال: ثلاث تحرمها علیک وسبعة وتسعون عدوان.[۱]

''ایک آدمی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں، اس پر انہوں نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تمہارے اُوپر حرام ہوگئی اور باقی ستانوے حد سے تجاوز ہے۔''

جاء رجل الی علیّ فقال: انی طلّقت امرأتی ألفًا، قال: بانت منک بثلاث اھ.[۲]

''ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آکر عرض کرنے لگا کہ: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تم سے الگ ہوگئی۔''

عن عبداللہ انه سئل عن رجل طلق امرأته مائة تطلیقة، قال: حرمتها ثلاث.[۳]

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کسی شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی تھیں، تو انہوں نے فرمایا کہ: وہ تین طلاقوں سے حرام ہوگئی۔''

ان حضراتِ صحابہ کرامؓ کے علاوہ حضرت ابنِ عمر، حضرت ابنِ عباس، حضرت عمران بن حصین اور حضرت مغیرہ بن شعبہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔

اب مذاہبِ اربعہ کی عبارات ملاحظہ ہوں!

قال ابن الهمام الحنفی رحمه اللہ: وذهب جمهور الصحابة والتابعین ومن بعدهم من أئمة المسلمین الٰی أنه یقع ثلاث. (فتح القدیر ج:۳ ص:۲۵)۔[۴]

''جمہور صحابہؓ، تابعینؒ اور بعد میں آنے والے اماموں کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوں گی۔''

وقال العلامة الحطاب المالکی رحمه اللہ: وکلّما طلّق من ذٰلک یلزمه اھ. (مواہب الجلیل ج:۴ ص:۳۹)۔[۵]

''تین طلاقیں شوہر جس طریقے سے بھی دیدے، وہ تینوں نافذ و لازم ہوں گی۔''

وقال العلامة النووی الشافعی رحمه اللہ: فقال الشافعی ومالک وأبو حنیفة وأحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلٰث اھ. (شرح النووی شرح الصحیح للامام مسلمؒ ج:۱ ص:۴۷۸)۔[۶]

''حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور اگلے پچھلے علماء میں سے جمہور علمائے کرام کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تین ہی واقع ہوں گی۔''

(باقی اگلے صفحے پر)

(۱) ج:۵ ص:۱۳ (طبع ادارة القرآن).
(۲) مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۱۳ (طبع أیضًا).
(۳) مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۱۲ (طبع أیضًا).
(۴) ج:۳ ص:۴۵۱ (طبع مکتبه عثمانیه کوئٹه).
(۵) (طبع دار الفکر بیروت).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

تین طلاق کے بعد حلالہ کا شرعی طریقہ

سوال:- اگست ۱۹۶۰ء میں میری شادی ہوئی تھی، اگست ۱۹۶۳ء کو ایک لڑکا تولد ہوا، جنوری ۱۹۶۴ء کو میں نے اپنی زوجہ کو تحریری طور پر تین طلاق دے دی، زوجہ ابھی تک لڑکے کے ساتھ والدین کے ہاں ہے، اب والدین بھی بہت ناراض ہیں، میں خود بھی پریشان ہوں، کیونکہ یہ کام میں نے دُوسروں کے ورغلانے سے کیا تھا، اب کوئی صورت ہوسکے تو تحریر فرمائی جائے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر طلاقِ مغلّظ واقع ہوچکی ہے، اب حلالہ کے بغیر اس سے دُوسرا نکاح نہیں ہوسکتا، جس کی صورت یہ ہے کہ بیوی کسی دُوسرے شخص سے نکاح کرے اور اس کے ساتھ وظائفِ زوجیت بھی پورے کرے،[1] اس کے بعد اگر وہ شخص کسی وجہ سے اسے طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہوجائے تو آپ بیوی کی عدّت گزر جانے کے بعد اس کی صریح مرضی سے دوبارہ نکاح کرسکیں گے،[2] اس عمل کو "حلالہ" کہتے ہیں، لیکن حلالہ کی نیت سے دُوسری جگہ نکاح کروانا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)........وقال العلامة ابن قدامة رحمه الله: وان طلّق ثلثًا بكلمة واحدة وقع الثلث وحرمت عليه حتّى تنكح زوجًا غيره. اهـ. (بحواله رساله حكم الطلاق الثلث بلفظ واحد أعني فتوىٰ علماء الحرمين الشريفين بالعربية)

"اگر شوہر نے بیوی کو تین طلاقیں دیں، تو تینوں واقع ہوں گی۔"

واللہ تعالیٰ اعلم		الجواب صحیح
عصمت اللہ عصمہ اللہ		احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۹/۷/۲۹ھ		۱۴۱۹/۸/۹ھ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمود اشرف غفر اللہ لہٗ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد کمال الدین الراشدی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

***

(۱، ۲) وفي مشكوٰة المصابيح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قديمى كتب خانه) عن عائشة رضى الله عنها قالت: جاءت امرأة رفاعة القرظى الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت: انى كنت عند رفاعة، فطلّقنى فبتّ طلاقى فتزوّجت بعدهٗ عبدالرحمن بن الزبير وما معه الا مثل هدبة الثّوب، فقال: اتريدين أن ترجعى الى رفاعة؟ قالت: نعم! قال: لا! حتّى تذوقى عُسَيلته ويذوق عسيلتكِ.

وفي الهندية ج:۱ ص:۴۷۳ (طبع ماجديه) وان كان الطّلاق ثلثًا فى الحرّة وثنتين فى الأمَة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيرهٗ نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها.

وفي الهداية كتاب الطّلاق، باب الرّجعة، فصل فيما تحلّ به المطلّقة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شركت علميه ملتان) وان كان الطّلاق ثلثًا فى الحرّة أو ثنتين فى الامة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلّقها أو يموت عنها والأصل فيه قوله تعالىٰ: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ." والمراد الطلقة الثالثة.

جائز نہیں ہے۔[1]

والله اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۰/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

تین طلاق کے بعد شوہر کا بیوی کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا

سوال:- میرے خاوند مسمّٰی سردار خان نے عرصہ تین سال ہوا طلاقِ مغلّظہ مثلثہ سہ بار طلاق، طلاق، طلاق دے کر مجھے آزاد کردیا، اور میرے اصرار پر ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھ کر میرے حوالہ کردیا، بعدۂ تین سال تک مکمل میری کوئی خبر نہیں لی، اور نہ ہی مجھے اس کا پتہ معلوم ہوسکا، اب تین سال بعد آیا اور مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کے ساتھ رہ کر حقوقِ زوجیت ادا کروں، قرآن وسنت اور حنفی مسلک کی روشنی میں کیا میں اس کے ساتھ رہ کر حقوقِ زوجیت ادا کرسکتی ہوں؟

جواب:- مفتی عالم الغیب نہیں ہوتا، بلکہ جو صورت سوال میں بیان کی جاتی ہے، اُس کے مطابق جواب دے دیتا ہے، چنانچہ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے شوہر نے آپ کو تین مرتبہ زبانی طور پر طلاق دے دی تھی تو آپ اس کے نکاح میں نہیں رہیں، بلکہ آپ پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوچکی ہے،[2] اب شوہر کو نہ رُجوع کا اختیار ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر آپ سے دوبارہ نکاح کرسکے گا،[3] لہٰذا اب اُس کا یہ مطالبہ کہ آپ اس کے ساتھ رہیں سراسر ناجائز مطالبہ ہے جس کی تعمیل آپ کے لئے حرام ہے، آپ ہرگز اُس کے پاس نہ جائیں اور اگر طلاق کے بعد آپ کو تین ماہواریاں گزر چکی ہیں تو آپ دُوسری جگہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔[4]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۳/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۳۸/۳۲ الف)

تین طلاق کے بعد غلط بیانی کرکے بیوی کو ساتھ رکھنے کا حکم

سوال:- اورنگی ٹاؤن سیکٹر نمبر 13C کراچی نمبر ۴۱ کا رہنے والا بنام شمس العالم زوج ماجدہ خاتون بنت سلطان احمد نے اپنی ساس لباس خاتون سے جھگڑا کرکے اپنی بیوی ماجدہ خاتون کو تین

---

(۱) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۲۸۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم المحلّل والمحلّل له. رواه الدارمی ورواه ابن ماجة عن علیّ وابن عباس وعقبة بن عامر.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۴۱۴ (طبع سعید) وکره التزوّج للثّانی تحریمًا لحدیث لعن المحلّل والمحلّل له بشرط التحلیل کتزوجتک علٰی ان أحلّلک وان حلّت للأوّل لصحّة النکاح .... الخ.
(۲ تا ۴) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

طلاق دے دی، مؤرخہ ۵/۶/۷۷ ۱۹ء کی رات کو محلے کے معتبر اشخاص کو لے جاکر سارے جھگڑے کی نوعیت بتائی اور صاف الفاظ میں سب کے سامنے تین طلاق کا اقرار کیا اور بیان دے کر دستخط بھی ثبت کئے، اور متواتر تین چار روز مختلف آدمی اور محلے کے ذی استعداد علماء کے سامنے بار بار تین طلاق کا اقرار کیا، جس کی بناء پر علمائے کرام نے طلاقِ مغلّظہ کا فتویٰ دے دیا، اور آپ سے اور دُوسرے معتبر مفتی صاحب سے تائیداً مہر اور دستخط لے گیا، اس نے خفیہ طور سے اپنے اصلی بیان کو مولوی محمد یونس کے ذریعہ تبدیل کرا کے دارالعلوم سے جواز کا فتویٰ لیا، آپ مہربانی فرما کر اس فتویٰ کو منسوخ قرار دے دیں تاکہ لوگ اس کو زنا سے باز رکھ سکیں۔

جواب:- اصل یہ ہے کہ مفتی کو علمِ غیب نہیں ہوتا، اُس کا کام صرف یہ ہے کہ جیسا سوال اس کے سامنے آئے اُس کا جواب سوال کے مطابق دیدے، اگر کوئی شخص تین طلاقیں بیان کرے گا تو مفتی اس کا حکم بتادے گا، اور اگر کوئی شخص ایک یا دو طلاق بیان کرے گا تو اس کا حکم بتادے گا، اصل واقعے کی تحقیق نہ مفتی کا فرض ہے اور نہ اس کے لئے ممکن ہے۔

لہٰذا اگر کسی شخص نے غلط سوال مرتب کر کے اپنی مرضی کا جواب حاصل کرلیا تو اس کا سخت وبال اُس شخص پر ہوگا، لہٰذا اگر واقعۃً اس شخص نے تین طلاقیں دی تھیں اور پھر اس بات کو چھپا کر عورت کے حلال ہونے کا فتویٰ حاصل کرلیا تو اس نے کئی سخت گناہوں کا ارتکاب کیا، جھوٹ بولنے اور مفتی کو دھوکا دینے کا گناہ الگ ہے، اور ساری عمر زنا میں مبتلا رہنے کا گناہ الگ ہے، اس کو چاہئے کہ خدا سے اور آخرت کے حساب و کتاب سے ڈرے، اور بیوی کو فوراً علیحدہ کر کے توبہ و اِستغفار کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۷/۱/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۳ الف)

عورت اگر اپنے کانوں سے طلاق سن لے تو اسے "المرأة کالقاضی" کے مسئلے پر عمل کرنا لازم ہے

سوال:- میری بیٹی انجم ظفر اور داماد (سابقہ) سردار محمود علی خان کے درمیان طلاق کا مسئلہ چل رہا ہے، دونوں نے اپنے تحریری بیان دے کر بنوری ٹاؤن مسجد کے مفتی صاحب سے فتویٰ لیا جو ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

انجم ظفر نے آپ کے سامنے بیان دیا کہ اُسے ۱۹۷۶ء میں دو مرتبہ طلاق اس کے خاوند سردار

محمود علی خان نے زبانی دی، اور تیسری اور آخری مرتبہ ۱۹۸۰ء میں لکھ کر دی۔

سردار محمود علی خان جو ابھی آپ کے سامنے موجود ہیں، اُس نے بیان دیا کہ ۱۹۷۶ء کے متعلق اُسے کچھ یاد نہیں، ہاں! ۱۹۸۰ء میں ایک بار اُس نے لکھ کر طلاق دی، مگر علاوہ اس کے وہ حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اُس نے پوری زندگی میں انجم ظفر کو طلاق نہیں دی۔ اپنی شرعی حتمی رائے سے نوازیں، مہربانی ہوگی۔

جواب:- میں نے پشت پر لکھے ہوئے فریقین کے مشترک سوال اور منسلکہ تحریروں کا مطالعہ کیا جن میں ہر فریق نے اپنے طور پر مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کے دار الافتاء سے سوالات کئے ہیں، پھر احتیاطاً دونوں فریقوں سے زبانی بھی ان کا موقف سن لیا، سردار محمود علی خان صاحب کا بیان یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایک مرتبہ ۱۹۸۰ء میں تحریری طور پر اپنی بیوی انجم کو طلاق دی ہے، اور ۱۹۷۶ء کا جو واقعہ انجم صاحبہ بیان کرتی ہیں وہ انہیں یاد نہیں، لہٰذا وہ اس بات پر حلف کرنے کو تیار ہیں کہ انہوں نے صرف ایک طلاق ۱۹۸۰ء میں دی ہے۔ دُوسری طرف انجم ظفر صاحبہ پورے وثوق سے کہتی ہیں کہ ۱۹۷۶ء میں ان کے شوہر سردار محمود علی صاحب نے ان کو دو مرتبہ ''میں نے تمہیں طلاق دی'' کے الفاظ استعمال کرکے طلاق دی، اور اس کے بعد کہا کہ: ''ان کو پکی سمجھو'' اس کے بعد کچھ اعزّہ کے کہنے سننے سے رُجوع ہوگیا، پھر ۱۹۸۰ء میں ایک مرتبہ انہوں نے میرے کہنے پر تحریری طور پر مجھے طلاق دی، جس میں انہوں نے لکھا کہ: ''میں بہ ہوش و حواس طلاق دیتا ہوں۔'' ان حالات میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب مسماۃ انجم نے خود اپنے کانوں سے دو مرتبہ طلاق کا لفظ سنا ہے، اور تیسری بار تحریراً دیکھا ہے تو معروف فقہی قاعدے ''المرأۃ کالقاضی''[1] کے اُصول پر اب ان کے لئے سردار محمود علی خان صاحب کے ساتھ بیوی کی حیثیت میں رہنا کسی طرح جائز نہیں، اُن پر شرعاً واجب ہے کہ وہ محمود علی خان صاحب سے علیحدہ رہیں، اور انہیں وظائفِ زوجیت کا موقع نہ دیں[2]، اور جب اُن کے لئے یہ امر ناجائز ہے تو سردار محمود علی خان صاحب کو بھی چاہئے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار نہ کریں، تاکہ وہ بیوی کو گناہ میں مبتلا کرنے کا سبب نہ بنیں، دیانت کا حکم یہی ہے[3]، اور اب اسی میں فریقین کے لئے عافیت ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۴/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳۸/۳۵ د)

(۱، ۲) وفی ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۵۱ (طبع سعید) والمرأۃ کالقاضی اذا سمعته أو أخبرها عدل لا یحلّ لها تمکینه ..... الخ.

(۳) ''المرأۃ کالقاضی'' کے مفہوم کی مفصل تشریح اور ''دیانت'' کے حکم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے ص:۳۴۹ تا ۳۶۱ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

رُخصتی سے پہلے اور رُخصتی کے بعد تین طلاق کی صورت میں مہر کی ادائیگی کی تفصیل

سوال:- زید نے بیوی سے کہا کہ: ''اگر تو عمر سے بات کرے گی تو تجھے تین طلاق ہے'' چنانچہ بیوی نے جان بوجھ کر عمر سے بات کی، کیا طلاق ہوگئی؟ اور مہر کتنا دینا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی،(۱) اب وہ زید کے لئے حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی،(۲) اور اگر زید نے اب تک اس کا مہر ادا نہیں کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ فوراً بیوی کو مہر ادا کرے۔(۳)

اگر یہ طلاق رُخصتی کے بعد دی ہے تو پورا مہر ادا کرنا ہوگا،(۴) اور اگر رُخصتی سے پہلے دی ہے تو آدھا۔(۵)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۸/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تین طلاق کا حکم اور تین طلاق کے بعد کسی اور فرقے کے عالم سے فتویٰ لے کر بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا

سوال ۱:- ایک شخص نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی چند افراد کی موجودگی میں، نشست تبدیل کر کے، یہ طلاق مغلّظہ ہوگئی یا نہیں؟ اس کے بعد شوہر نے بیوی کو زبردستی لے جا کر مباشرت بھی کی ہوگی، اور عورت اس پر قطعاً راضی نہیں۔

۲:- طلاق دینے کے وقت جو افراد موجود تھے وہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ اس عورت کا اب تجھے گھر رکھنا جائز نہیں، اور کچھ افراد کہتے ہیں کہ طلاقیں نہیں ہوئیں، اس عورت کو پاس رکھنا شرعی نقطۂ نگاہ سے قطعاً جائز ہے۔ وہ مرد کہیں شہر سے فتویٰ بھی لے کر آیا ہے اور کہتا ہے کہ عورت میرے نکاح سے باہر نہیں ہوئی۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۹۰ اور ۳۹۱۔ (۲) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳، ۴) وفی الهندية كتاب النّكاح الباب السابع الفصل الثانی ج: ۱ ص: ۳۰۳ (طبع ماجديه) والمهر يتأكّد بأحدِ معان ثلثةٍ: الدخول والخلوة الصّحيحة وموت أحد الزّوجين .... حتّى لا يسقط منه شئ بعد ذٰلک الّا بالابراء من صاحب الحق.

(۵) وفی الدّر المختار كتاب النّكاح باب المهر ج: ۳ ص: ۱۰۴ ويجب نصفه بطلاق قبل وطءٍ أو خلوة ....الخ.

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور مغلّظہ ہوگئی،[۱] یعنی اب وہ حلالہ کے بغیر سابق شوہر کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، ایسی صورت میں اسے زبردستی پکڑ کر لے جانا گناہِ عظیم کا ارتکاب ہے، عورت کو چاہئے کہ وہ جس طرح ممکن ہو اس سے اپنی جان چھڑائے، اور امکانی حد تک اسے مباشرت کا موقع نہ دے۔

۲:- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورت شوہر پر حرام نہیں ہوئی، غلطی پر ہیں، ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ کسی کے مذہب میں حلال ہونے کی گنجائش نہیں ہے،[۲] اور کسی فرقہ کے کسی عالم سے فتویٰ کا سہارا لے کر اپنا مطلب حاصل کرلینا سخت ظلم اور گناہ ہے، معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، بیوی جس مسلک سے تعلق رکھتی ہو اسی مسلک کے علماء کا فتویٰ اس کے حق میں معتبر ہوگا۔

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۶/۲۸ھ

جواب صحیح ہے، اگر شوہر کو اس کے رکھنے ہی پر اصرار ہے تو حرام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلالہ کے بعد شریعت کے مطابق دوبارہ نکاح کرکے رکھے۔ بندہ محمد شفیع

زبان سے تین مرتبہ طلاق دی مگر بعد میں صرف ایک مرتبہ لکھ کر دی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے زبان سے اپنی بیوہ زہرہ کو تین مرتبہ یہ کہا کہ: ”میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی“ بعد میں لکھ کر ایک مرتبہ دی، واضح رہے زہرہ حاملہ بھی ہے۔

جواب:- صورتِ مذکورہ میں زید کی بیوی زہرہ پر تین طلاقیں اسی وقت واقع ہوگئی تھیں جب اس نے زبان سے یہ الفاظ کہے تھے، اس وقت اگر زہرہ حاملہ تھی تو اس کی عدّت بچے کا پیدا ہونا ہے،[۳] بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، اب وہ زید کے لئے ہرگز حلال نہیں

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی شرح الصّحیح لمسلم للعلامة النّووی کتاب الطّلاق باب طلاق الثلٰث ج:۱ ص:۴۷۸ (طبع قدیمی کتب خانه) وقد اختلف العلماء فیمن قال لامرأته أنتِ طالق ثلاثا، فقال الشافعی ومالک وأبوحنیفة وأحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثّلاث .... الخ.

وفی الشّامیة کتاب الطّلاق ج:۳ ص:۲۳۳ (طبع سعید) وذهب جمهور الصّحابة والتّابعین ومن بعدهم من أئمة المسلمین الٰی أنّه یقع ثلاث وبعد أسطر وقد ثبت النقل عن اکثرهم صریحًا بایقاع الثّلاث ولم یظهر لهم مخالف، فماذا بعد الحق الا الضّلال! نیز دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر ۲۔

ہوسکتی اور حلالہ کے بغیر دونوں دوبارہ نکاح بھی نہیں کرسکتے۔[۱]

والله سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۳/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۹/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تین طلاق کا مسئلہ اور بیوی کی طرف سے مہر معاف کرنے سے مہر معاف ہوجائے گا

سوال:- آج مؤرخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مسمّٰی سیّد سلطان اختر نے اپنی بیوی کنیز فاطمہ بنتِ سیّد یعقوب علی کو اُس کے بار بار کے مطالبے پر کہ مجھے طلاق دے دو، یہ سمجھایا کہ اس سے تمہارا اور بچوں کا مستقبل تباہ ہوجائے گا، اس پر اُس نے کہا کہ مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، چھوٹی بچی میرے پاس رہے گی اور باقی دو بچیاں تم لے جاؤ اور میں نے اپنا مہر اور ہر قسم کا خرچ نان نفقہ معاف کیا، اُس کی اس وضاحت اور شدید مطالبے پر خلع کا فیصلہ ان الفاظ پر: ''میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی'' کیا گیا، ''اب اس صورت میں تم آزاد ہو اور مجھ پر سگی بہن اور ماں کی طرح حرام ہو'' جو اُس نے قبول کرلیا۔

جواب:- مذکورہ صورت میں تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی ہے،[۲] جس کا حکم یہ ہے کہ اب وہ حلالہ کے بغیر شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی،[۳] اور چونکہ عورت نے مہر معاف کردیا ہے، اس لئے مہر بھی شوہر پر واجب نہیں۔[۴]

والله سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۰۶/۲۷ ہ)

(۱ تا ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۴) وفی الهندیة کتاب النّکاح الباب السابع الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجدیه) والمهر یتأکّد بأحد معان ثلثة: الدخول، والخلوة الصحیحة .... حتّٰی لا یسقط منه شیء بعد ذٰلک الّا بالابراء من صاحب الحق.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۱۱۳ (طبع سعید) (وصحّ حطّها) لکلّه أو بعضه (عنه) قبل او لا. وفی الشامیة تحت (قوله وصحّ حطّها) الحطّ الاسقاط کما فی المغرب .... الخ. وفی الشامیة أیضًا کتاب النکاح باب المهر ج:۳ ص:۱۰۲ واذا تأکّد المهر .... لا یحتمل السقوط الّا بالابراء. وفی الهدایة باب المهر ج:۲ ص:۲۹۵ (طبع شرکت علمیه) وان حطّت عنهٔ من مهرها صحّ الحطّ، لأنّ المهر حقّها والحطّ یلاقیه حالة البقاء .... الخ.

تین طلاق کا مسئلہ اور عدّت کے اَحکام

سوال:- ایک شخص نے اپنی بی بی سے جہالت میں کہہ دیا کہ: ”تجھ کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا“ اس میں حکمِ شرعی کیا ہے؟ اور عدّت اپنے میکے میں گزارے یا اور کہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب وہ حلالہ کے بغیر آپ کے لئے حلال نہیں ہوسکتیں،[۱] عدّت شوہر کے گھر میں گزارنی چاہئے،[۲] لیکن پردہ وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۱/۱۱/۱۳۹۰ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۷/۲۱ الف)

غصّے کی حالت میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے اور صدقہ سے طلاق کا اثر زائل ہونے کا مسئلہ غلط ہے

سوال:- ایک شخص نے غصّے میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اس طرح کہ: ”تم کو طلاق دیا، تم کو طلاق دیا، تم کو طلاق دیا“ اس صورت میں عندالاحناف کس قسم کی طلاق واقع ہوئی؟ اگر شوہر بیوی سے رجعت کرنا چاہے تو کیا صورت ہوگی؟ ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ: غصّے کی حالت میں طلاق نہیں ہوتی اور غریب و مسکین کو کھلا پلا دینے سے اور عزیزوں پر صدقہ کردینے سے طلاق کا اثر زائل ہوجائے گا، کیونکہ غصّے میں طلاق دینے کی نیت اُس کی نہیں تھی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اُس شخص کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،[۴] اب وہ شوہر کے لئے حرام ہوچکی ہے اور حلالۂ شرعیہ کے بغیر اس سے دُوسرا نکاح بھی نہیں ہوسکتا،[۵] طلاق غصّے کی

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار باب العدّة ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) وتعتدّان ای معتدّة طلاق وموت فی بیت وجبت فیه ولا یخرجان منه الّا أن تخرج أو ینهدم المنزل أو تخاف انهدامه أو تلف مالها .... الخ.
وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵، والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۷ (طبع سعید) ولا بدّ من سترة بینهما فی البائن وان ضاق المنزل علیهما أو کان الزّوج فاسقًا فخروجه أولٰی .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵ والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴.

(۴ و ۵) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

حالت میں بھی واقع ہوجاتی ہے،[۱] اور تین طلاقوں کے بعد رجعت نہیں ہوسکتی،[۲] اور صدقہ کرنے سے بھی طلاق کا اثر زائل نہیں ہوتا، جن صاحب نے یہ مسئلہ بتایا ہے، بالکل غلط بتایا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۲/۲۸ ب)

تین طلاق کے لئے تین ماہ میں ہونا ضروری نہیں

سوال:- ایک شخص نے شادی کی اور شادی کے چار پانچ یوم کے بعد اس کی بیوی کے والدینؒ نے بیوی دینے سے انکار کردیا، اور کہا کہ یہ لڑکا شادی کے قابل نہیں، اس کشمکش میں ایک ماہ گزر گیا، اور اُس شخص کو طلاق پر مجبور کردیا، اس مجبوری کی حالت میں چند آدمیوں کے سامنے طلاق نامہ لکھوایا اور زبانی دو دفعہ اس نے کہا کہ: ''میں نے اپنی بیوی کو جدا کردیا'' ایک مہینے کے بعد چیئرمین کی طرف سے نوٹس آیا کہ تمہاری طلاق نہیں ہوئی ہے، چونکہ تین ماہ میں تین طلاق نہیں دی ہے اس لئے تمہاری طلاق واقع نہیں ہوئی، اور پھر اس کی بیوی واپس کردی سات مہینے سے ساتھ رہ رہی ہے، از رُوئے شریعت یہ بتایئے کہ طلاق ہوگئی ہے یا نہیں؟ جواب تک پاس رکھا ہے یہ کیسا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، اب وہ بغیر حلالہ کے اس کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتی،[۳] تین طلاقوں کے لئے تین ماہ میں ہونا ضروری نہیں ہے، ایک وقت میں تین طلاقیں دی جائیں تب بھی واقع ہوجاتی ہیں۔[۴]

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۹/۱۹ الف)

''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق'' الفاظ اور عدّت کے نفقہ کا حکم

سوال:- حاجی فضل احمد صاحب نے اپنی بیوی کو بوجہ جھگڑے کے یہ الفاظ کہے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق''، (ساتھ دو مردوں اور تین عورتوں کی گواہی بھی حسبِ ذیل تھی):-

۱:- ایک شخص مسمّٰی عبدالرشید کہتا ہے کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''تین طلاق دیدیا ہو''

---

(۱) وفي ردّ المحتار کتاب الطّلاق مطلب في طلاق المدهوش ج:۳ ص:۲۴۴ (طبع سعید) ويقع طلاق من غضب خلافًا لابن القيم وهذا الموافق عندنا لما مرّ في المدهوش.

(۲) وفي الهداية كتاب الطّلاق باب الرّجعة ج:۲ ص:۳۹۹ (طبع شركت علميه ملتان) وان كان الطّلاق ثلثًا في الحرّة أو ثنتين في الأمة لم تحلّ لهٗ حتّى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلّقها أو يموت عنها والأصل فيه قوله تعالى: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ .... الخ.

(۳ و ۴) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۲:- دُوسرا شخص مسمّٰی عبدالہاشم کہتا ہے کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تجھے تین طلاق دیا ہوں۔'' یاد رہے کہ یہ دو گواہی اقرار کی ہے یعنی شاہد نہیں۔

۳:- وہ تین عورتیں جو عینی شاہد ہیں کہتی ہیں کہ: طلاق کے الفاظ یہ تھے: ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تین طلاق۔''

طلاق بتاریخ ۲۲/اپریل کو دی تھی، عدّت کب سے شروع ہوگی؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہو، پردہ، خورد و نوش کا کیا انتظام ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں حاجی فضل احمد صاحب کی بیوی پر تین طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی ہے، اور اب وہ حلالہ کے بغیر اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی،(۱) جس دن طلاق دی تھی (۲۲/اپریل) اسی دن سے عدّت شمار کی جائے گی،(۲) اور عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری کا گزرنا ہے، عدّت کے دوران شوہر پر نان و نفقہ اور رہائش کا انتظام کرنا واجب ہے۔(۳)

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی
۱۳۸۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۷/۱۹ الف)

''ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق'' الفاظ کا حکم

سوال:- آج سے تقریباً پانچ مہینے ہوئے ہیں کہ میں بہنوئی کے مکان پر گیا، وہاں کچھ رشتہ داروں کے ساتھ بات چیت ہو رہی تھی، دورانِ گفتگو میری بیوی کا تذکرہ آیا، میرے ساتھیوں نے میری بیوی کی بداخلاقی، فحش حرکات کے سلسلے میں بہت کچھ کہا، مجھے اس پر سخت غصہ آیا، میں نے غضبناکی کی حالت میں ''ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق'' لفظ استعمال کیا، لیکن دیا اور کس کو دیا، اس کا تلفظ نہیں کیا، اس وقت میری بیوی وہاں ایک میل دُور فاصلے پر سسرال کے ہاں تھی اور چار ماہ کی حاملہ تھی، اب حضرتِ والا سے درخواست ہے کہ شرعی حکم سے مطلع فرماویں۔

نوٹ:- اس سوال کے ساتھ کئی شہادتیں بھی آئی تھیں، جن میں سے کچھ تو وہی الفاظ کہتے تھے جو کہنے والے نے کہے تھے، اور دو شاہدوں نے لفظ ''دیا'' کو ذکر نہیں کیا۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۲) فی الشامیة ج:۳ ص:۵۲۹ (طبع سعید) ویظهر انّ ابتداء العدّة من وقت وقوع الطّلاق .... الخ.
وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۲۰ (طبع سعید) ومبدأ العدّة بعد الطّلاق علی الفور.

(۳) وفی الفتاویٰ الهندية كتاب الطّلاق، الباب السابع عشر فی النّفقات، الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجدیه کوئٹه) المعتدّة عن الطّلاق تستحق النّفقة والسكنیٰ كان الطّلاق رجعیًا أو بائنًا أو ثلثًا حاملًا كانت المرأة أو لم تكن كذا فی فتاویٰ قاضی خان.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سائل کی بیوی پر تین طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئیں، اب وہ بغیر حلالہ کے اس کے لئے ہرگز حلال نہیں ہوسکتی،[1] سیاق وسباق نسبت الی الزوجہ کو معین کرنے کے لئے کافی ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۱/۱۹ الف)

تین طلاق کے بعد مہر اور پردے کی تفصیل

سوال:- میری شادی ۱۹۶۹ء میں ہوئی، پھر میرے شوہر نے ۱۹۹۴ء میں الگ الگ ۴ مرتبہ مجھے یہ الفاظ کہے میرا نام درشہوار لے کر کہا کہ: ”میں نے تم کو طلاق دی“ بچے لڑکے ۲۵ اور ۲۶ سال کے ہیں۔

۱:- طلاق کے الفاظ جب کہے تو ۲ مرتبہ لڑکے موجود تھے۔

۲:- اور ۲ مرتبہ تنہائی میں کہے۔

مسئلہ عرض یہ ہے کہ اس ایک سال کے عرصے میں اُن کی شادی ہوگئی ہے، انہوں نے فتویٰ دِکھا کر کہا کہ اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔

۳:- کچھ عرصے بعد اُن کی طرف سے مسئلہ اُٹھا کہ پردہ نہ کرو، اور یہ کہ میں نے تم کو طلاق نہیں دی ہے، اگر تم چاہتی ہو تو اب دے دُوں گا، اور یہ بھی کہ کورٹ کے ذریعہ دُوں گا، وغیرہ یا گھر سے جاؤ۔

۱:- ان کا کہنا ہے کہ میری نیت نہیں تھی کہ طلاق دُوں۔

۲:- چار مرتبہ صاف کہا ہے کہ: ”درشہوار تم ایک طلاق“ پھر اس طرح کہا کہ: ”تم کو دُوسری طلاق“، پھر اسی طرح مختلف مواقع پر ۲ مرتبہ پھر کہا، اب کہتے ہیں کہ: ”ہر دفعہ میں نے پہلی سمجھ کر کہا ہے، مجھ سے پردہ نہ کرو۔“

۱:- وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔

۲:- میں اپنے بچوں کے ساتھ الگ گھر میں رہتی ہوں، پردے کی وجہ سے انہوں نے کئی بار گھر میں آکر مارا ہے، گالیاں وغیرہ دی ہیں۔

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۲) وفی ردّ المحتار کتاب الطّلاق باب الصّریح تحت مطلب "سن بوش" یقع به الرّجعی ج:۳ ص:۲۴۸ (طبع سعید) ولا یلزم کون الاضافة صریحة فی کلامه لما فی البحر لو قال طالق فقیل لهٗ من عنیت؟ فقال امرأتی، طلّقت امرأتهٗ ....الخ.

مجھے فتویٰ دیں طلاق اور پردے کے بارے میں کیا اَحکام ہیں؟ شادی کے وقت میرا مہر سکہ رائج الوقت ۵ ہزار تھا، اُس کا کیا مسئلہ ہوگا؟ وہ بھی مجھے نہیں ملا ہے۔

پہلا فتویٰ بنوری ٹاؤن سے عبدالوہاب صاحب نے دیا تھا، وہ انہوں نے جلا دیا کہ بیٹی جوان ہے، اُس کے لئے مسئلہ نہ ہو کہ ماں کو طلاق ہوگئی ہے۔

جواب:- اگر سوال میں مذکورہ واقعہ دُرست ہے تو آپ پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں،(۱) اور اب شوہر کو طلاق سے رُجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اور نہ آپ کے درمیان حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح ہوسکتا ہے،(۲) آپ دونوں پر واجب ہے کہ ایک دُوسرے سے الگ رہیں اور پردہ کریں،(۳) نیز اگر انہوں نے اب تک آپ کو مہر ادا نہیں کیا ہے تو ان کے ذمے ضروری ہے کہ فوراً آپ کو مہر ادا کریں۔(۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۶/۶/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۷۱)

تین مرتبہ طلاقِ صریح کے الفاظ میں نیت اور غصّے کا اعتبار نہیں

سوال:- زید نے طیش میں آکر تین بار یہ جملہ کہا کہ: ”جا میں نے تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی“ شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،(۵) الفاظِ صریح میں نیت اور غصّے کی حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا،(۶) لہٰذا اب زید کی بیوی اس کے لئے حلالہ کے بغیر ہرگز حلال نہیں ہوسکتی، حلالہ کے بغیر نکاحِ ثانی بھی نہیں ہوسکتا۔(۷)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۳/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ و ۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۷ (طبع سعید) ولا بدّ من سترة بینهما فی البائن وان ضاق المنزل علیهما أو کان الزّوج فاسقًا فخروجه أوْلٰی .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۵۳۵ (طبع ماجدیه)، والبحر الرّائق ج:۴ ص:۱۵۴ (طبع رشیدیه).

(۴) وفی الهندیة کتاب النّکاح، الباب السابع، الفصل الثانی ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع ماجدیه) والمهر یتأکّد بأحدِ معان ثلٰثة: الدخول والخلوة الصّحیحة وموت أحد الزوّجین .... الخ.

(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔

(۶) وفی الشّامیة ج:۳ ص:۲۵۰ (طبع سعید) (قوله أو لم ینو شیئًا) لما مرّ أن الصّریح لا یحتاج الی النیة ولٰکن لا بدّ فی وقوعه قضاءً ودیانةً من قصد اضافة لفظ الطلاق الیها عالمًا بمعناهُ. وفی الهدایة ج:۲ ص:۳۵۹ (طبع شرکت علمیه ملتان) فالصّریح قوله أنتِ طالق ومطلقة وطلقتک فهٰذا یقع به الطّلاق الرجعی .... ولا یفتقر الی النیة لأنه صریح فیه.

(۷) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

معاملات میں نہایت سادہ شخص کی طلاق کا حکم

سوال:- سلطان محمد نے رسم و رواج کے مطابق تین پتھر مارے اور کہا کہ: ''یہ ہیں میری عورت کی طلاقیں، اب یہ مجھ سے آزاد ہے۔'' سلطان محمد کو باؤلا سمجھا جاتا ہے، ویسے پہاڑ سے جانوروں کے لئے گھاس بھی لاتا ہے، اور یہ شخص خرید و فروخت بھی کرتا ہے، اس نے ایک بکری چالیس روپے پر تین میل دُور فروخت کردی ہے، جبکہ اس کے قرب و جوار والے اس سے یہی بکری چار پانچ روپے کم پر طلب کرتے تھے، علیٰ ہذا القیاس اس کے اکثر و بیشتر افعال صحت پر مبنی ہوتے ہیں، چونکہ سادہ ہے اس وجہ سے بیوقوف کہلاتا ہے، مگر درحقیقت اس کے افعال و اطوار پاگلوں جیسے نہیں، سلطان محمد کو عارضہ ضرع (مرگی) کا لاحق ہے، یہ عارضہ پانچ دس منٹ تک رہتا ہے اس کے بعد پھر صحیح تندرست ہوجاتا ہے، آیا اس کی طلاقیں واقع ہوئی ہیں یا نہیں؟

جواب:- سوال میں سلطان محمد کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں،(۱) مندرجہ حالات کے پیشِ نظر اس کو معتوہ کہنا مشکل ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

دو یا تین طلاق دینے میں شک ہو اور گواہ تین طلاق کی گواہی دیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- رشید احمد نے گواہ نمبر۱ شہادت علی کو بلوایا اور گواہ نمبر۲ عبدالرشید پہلے سے مزاج پُرسی کے لئے آئے ہوئے تھے، رشید احمد صاحب تقریباً ایک برس سے بیمار ہیں، رشید احمد صاحب نے ان دونوں گواہوں کی موجودگی میں طلاق دی، دونوں گواہوں کی گواہی اس کاغذ کی پشت پر درج ہے، لیکن رشید احمد صاحب کا بیان ہے کہ: ''مجھے یاد نہیں کہ میں نے دو طلاقیں دی ہیں یا تین'' اور ثمینہ بیگم کو بھی اس طلاق کی اطلاع نہیں دی گئی، وہ شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔

کل رات گواہ نمبر۲ سے دوبارہ دریافت کیا تو انہوں نے جو بیان دیا کیفیت کے عنوان کے تحت درج ہے، اب آپ اس کا شرعی حکم بتائیں کہ بیوی شوہر کے پاس رہ سکتی ہے یا نہیں؟

بیان گواہ نمبر۱:- 22-8-1977 بوقت دن کے گیارہ بجے یہ بیان خدا کو حاضر و ناظر جان کر

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳۔
(۲) ''معتوہ'' کی تعریف کے لئے دیکھئے: ردّ المحتار ج:۱ ص:۱۴۳ اور ج:۲ ص:۲۵۸، اور ''معتوہ'' کی طلاق کے حکم کے لئے دیکھئے: رد المحتار ج:۳ ص:۲۴۳ (طبع سعید)۔ اور ھندیۃ ج:۱ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیہ)۔

دیتے ہیں: گواہ نمبرا صوفی شہادت علی: مجھے گھر سے بلایا گیا اور کہا کہ: میں طلاق دے رہا ہوں، میں نے ثمینہ بیگم کو طلاق دی، یہی الفاظ تین دفعہ دُہرائے، کلمہ طیبہ بھی پڑھا۔ دستخط شہادت علی۔

گواہ نمبر۲:- عبدالرشید: میں ملنے خود آیا تھا اور کہنے لگے کہ: میں طلاق دے رہا ہوں، میں نے ثمینہ بیگم کو طلاق دی، یہی الفاظ تین دفعہ دُہرائے۔ دستخط عبدالرشید۔

مدعی یعنی صاحبِ واقعہ کا بیان:- رشید احمد خودمختار، میں نے ان دونوں اشخاص کی موجودگی میں طلاق دی، لیکن مجھے یہ نہیں پتہ کہ طلاق میں نے دو دفعہ دی یا تین دفعہ۔ دستخط رشید احمد۔

کیفیت:- میری طبیعت خراب تھی کافی عرصے سے بیمار ہوں اور اُس وقت مجھے بہت تیز بخار تھا، حالت ٹھیک نہیں تھی، میں نے کلمہ یا بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ عبدالرشید۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر صوفی شہادت علی اور عبدالرشید دونوں گواہ ایسے ہیں کہ عام طور سے جھوٹ نہیں بولتے اور اُن کی گواہی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے تو ثمینہ بیگم پر تین طلاق واقع ہوگئی ہیں، اب وہ اپنے شوہر پر حرام ہوچکی ہے اور نہ اب طلاق سے رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالہ کے بغیر دُوسرا نکاح ممکن ہے، لما فی الدر المختار ولو شک أطلق واحدة أو أكثر بنى الأقل. [1]....
وفی رد المحتار وان اخبره عدول حضروا ذٰلک المجلس بانها واحدة وصدقهم اخذ بقولهم. (شامی ج:۲ ص ۴۵۴)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۰/۲۸ ج)

تین طلاق ایک وقت میں دینے سے تینوں واقع ہوجانے پر ائمہؒ کا اجماع ہے، تین طلاقوں کے بعد بیوی کو اپنے پاس رکھنا

سوال ۱:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو لفظِ واحد کے ساتھ تین طلاقیں دیں، اب یہ ایک طلاق پڑی ہے یا تین؟ اس میں کوئی ائمہ کا اختلاف ہے؟

۲:- اگر یہ شخص بغیر نکاحِ ثانی کے اس کو پھر بیوی بنالے تو شریعت کی رُو سے اس کے ساتھ تعلقات رکھنا کیسا ہے؟

جواب ۱:- تین طلاق ایک مجلس میں ایک لفظ سے دی جائیں یا مختلف الفاظ سے، بہرصورت تینوں واقع ہوجاتی ہیں، اور بیوی مغلّظہ ہوجاتی ہے، اس مسئلے پر چاروں ائمہ، امام ابوحنیفہؒ،

(۱) ردّ المحتار قبیل باب طلاق غیر المدخول بها ج:۳ ص:۲۸۴ (طبع سعید). وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۶۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) فان قال الزوج عزمت علی انها ثلاث او هی عندی علی انها ثلاث أضع الأمر علی أشدّه فأخبره عدول حضروا ذٰلک المجلس وقالوا کانت واحدة قال اذا کانوا عدولا أصدّقهم وآخذ بقولهم.

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا اتفاق ہے، چاروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔[1]

۲:- ایسا شخص حرام کاری کا مرتکب ہے، اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا چاہئے اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے میل جول کے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۱۱/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۰۰/۲۹ ج)

تین طلاق کے بعد بغیر حلالہ دوبارہ نکاح کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص اپنی عورت کو تین عدد طلاقیں دے کر کافی مدّت کے بعد بغیر حلالہ کے اسی عورت سے نکاح کر لیتا ہے، اب یہ شخص شریعت میں کیسا سمجھا جائے گا؟ جو لوگ ان کے نکاح میں شریک تھے ان پر کیا کفارہ ہے؟ اب اگر یہ شخص حلالہ کے لئے تیار ہو جائے تو کیا طریقہ ہے؟

۲:- اس شخص کے بارے میں علماء کیا فرماتے ہیں کہ جس نے مسجد میں کھڑے ہو کر، ایک شخص کو دھوکا دے کر یا جھوٹ بول کر کہا کہ حلالہ ہو چکا ہے، اور نکاح پڑھوا لیتا ہے، کیا اس نکاح خواں کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- تین طلاقوں کے بعد بیوی شوہر پر بالکل حرام ہو جاتی ہے،[2] اور حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی جائز نہیں رہتا،[3] لہٰذا جس شخص نے اپنی مغلّظہ بیوی کو حلالہ کے بغیر نکاح کر کے اپنے پاس رکھا اس کا نکاح باطل ہے،[4] اور اس کو ساتھ رکھنا حرام ہے، اگر اس نے صحبت کی تو زنا کے حکم میں ہے، اسے فوراً توبہ و استغفار کر کے الگ ہو جانا چاہئے۔ عورت کو چاہئے کہ وہ عدّت گزار کر کسی اور شخص سے نکاح کرے، اور وہ شخص مر جائے یا از خود طلاق دیدے، تو اس کی عدّت گزار کر پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔

۲:- جن صاحب نے حلالہ کے بغیر پہلے شوہر سے نکاح پڑھایا، اگر انہیں پوری بات کا علم تھا کہ عورت مغلّظہ ہے اور حلالہ نہیں ہوا، تو توبہ کرنی چاہئے، اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو اُن کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۳۵/۲۷ ہ)

(۱ تا ۳) حوالہ کے لئے ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ اور ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر۱ و۲۔

''تم کو طلاق دی اور تم کو چھوڑ دیا'' کے الفاظ کئی مرتبہ کہے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- میرے شوہر نے مجھے کہا کہ: ''تم کو طلاق دے دیا'' اور بیسیوں دفعہ یہ کہا کہ ''ہم نے تم کو چھوڑ دیا اور چھوڑ دیا''، تو کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب:- اگر سائلہ کا بیان دُرست ہے اور اس کے شوہر نے واقعۃً یہ الفاظ کہے تھے کہ: ''تم کو طلاق دے دیا اور تم کو چھوڑ دیا''، (۱) تو اس کے شوہر کی طرف سے اس پر طلاق واقع ہوچکی، اور عدّت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے، عدّت تین مرتبہ ایامِ ماہواری کا گزرنا ہے، اور یہ اس وقت سے شمار ہوں گے جب طلاق دی گئی تھی، (۲) اگر اس کے بعد تین مرتبہ ماہواری آچکی ہے تو عدّت گزر گئی اور اب سائلہ آزاد ہے، اور کسی مزید انتظار کے بغیر نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۵۶/۲۲ الف)

''ان کو طلاق دیتا ہوں'' کے الفاظ تین مرتبہ کہنے کے بعد آخری دو جملوں میں تاکید کی نیت کا دعویٰ کرنا

سوال:- میرے شوہر مسمّٰی سیّد ظفر احمد ولد سیّد احمد نے اُمورِ خانہ داری پر معمولی گفتگو شروع کی، لیکن ہمارے مابین اختلاف ہوا، یہاں تک کہ بات بڑھی، دورانِ گفتگو میرے شوہر مذکور نے نہایت غضب ناک ہوکر غصّے کی حالت میں میرے بھائی کی طرف مخاطب ہوکر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ: ''ان کو طلاق دیتا ہوں'' یہ جملہ تین مرتبہ دُہرایا ہے۔

دُوسرے تیسرے روز مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے لگے اور غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی شوہر موصوف نے کہا اور یہی کہتے ہیں کہ: ''میرا ارادہ تو صرف ایک طلاق کہنا تھا، میں نے صرف غصّے کی حالت میں ایسا کہہ دیا، میرا ارادہ اور میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔'' دُوسری خاص بات یہ کہ جس وقت طلاق کے الفاظ اور یہ واقعہ ہوا ہے اُس وقت میں (سائلہ) ایامِ حمل میں ہوں، بہرحال ایامِ حمل میں اور غصّے کی نہایت شدّت کی حالت میں یہ واقعہ ہوا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر

---

(۱) لفظ ''چھوڑ دیا'' سے متعلق تفصیل کے لئے ص:۳۶۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور ص:۳۴۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۳۱۸ کا حاشیہ نمبر ۳، اور ص:۳۳۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ پر تینوں طلاقیں قضاءً واقع ہوگئی ہیں، یعنی اب آپ کے لئے اُن کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنا جائز نہیں، اور اب حلالہ کے بغیر اُن سے دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور طلاق حالتِ حمل میں بھی ہوجاتی ہے، **لما فی الدر المختار کرّر لفظ الطّلاق وقع الکل وإن نوی التأکید دیّن. وقال الشامیؒ أی ووقع الکل قضاءً وکذا اذا أطلق أشباہ: أی بأن لم ینو استئنافًا ولا تأکیدًا، لأن الأصل عدم التأکید.** (شامی ج:۲ ص:۴۶۰)[1]۔

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۹/۲۸ ج)

عدالت میں تین طلاقوں کی گواہی کے لئے جن گواہوں کی ضرورت ہے وہ گواہ کیسے ہونے چاہئیں؟

سوال:- میں مسمّٰی محمد سوار خان ولد افسر خان کی شادی مسماۃ سکینہ بیگم دختر شیر زمان کے ساتھ ایک سال قبل ہوئی تھی، لیکن اسی دوران لڑائی جھگڑے ہوتے رہے اور مجھے بیوی نے قتل کرانے کی کوشش کی، اور یہی کوشش اب تک جاری ہے، اس لئے میں مجبور ہوکر اپنی زوجہ مسماۃ سکینہ بیگم مذکورہ بالا کو (اور جو تین چار جگہ بدنام بھی ہوچکی ہے) تین دفعہ طلاق شرع کے بموجب بتکرار سہ بار ''طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں، ایسی عورت کو اپنے نکاح میں رکھنا نہیں چاہتا، اور جو حق مہر تھا اُس کو اداء کردیا ہے، لہٰذا اب یہ عورت مجھ پر حرام ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' محمد سوار خان

گواہ: محمد صدیق خان۔ گواہ: محمد حسین خان۔ گواہ: محمد سلیم خان۔

مندرجہ بالا طلاق نامے کی رُو سے شرعی حکم کیا ہے؟ اور طلاق کا مسئلہ اگر عدالت میں پیش ہو، اور طلاق دہندہ منکر ہو تو گواہان کی ضرورت ہوگی، شرعاً گواہ کیسے ہونے چاہئیں؟

جواب:- مندرجۂ پشت طلاق نامے کی رُو سے سکینہ بیگم پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ اپنے شوہر پر طلاقِ مغلّظہ سے حرام ہوچکی ہے، اب حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، اور گواہوں کے بارے میں جو بات آپ نے پوچھی ہے اس میں بڑی تفصیل ہے، جسے مکمل طور پر یہاں لکھنا مشکل ہے، یہ کام حاکم کا ہے کہ وہ گواہیاں لیتے وقت اس بات کی تحقیق کرے کہ ان میں شرعی

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۳ ص:۲۹۳ (طبع سعید).

شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اُن کی طرف سے استصواب ہو تو حکم بتادیا جائے گا۔ واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۸۱/۲۷ و)

تین طلاق کے بعد عدّت کے اَحکام اور طے شدہ حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال:- مسماۃ ساجدہ باجازتِ شوہر بغیر کسی تنازع کے اپنے والدین کے گھر کچھ عرصہ کے لئے رہنے گئی، چند ہی ایام کے بعد ساجدہ کو بذریعہ ڈاک طلاق نامہ موصول ہوا، ساجدہ کے والد نے شوہر زید کو طلاق نامہ دِکھایا، زید نے طلاق نامے سے انکار کیا اور بولا کسی دُشمن کی کاروائی ہے، زید اپنی بیوی ساجدہ کو پھر اپنے گھر لے گیا، کچھ عرصہ بعد لڑکی پھر اپنے میکے گئی، اُسے پھر زید نے بذریعہ ڈاک طلاق نامہ بھیج دیا، استفسار پر پھر زید نے طلاق نامے سے انکار کیا، تیسری مرتبہ بھی مسماۃ مذکورہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا، مسمّٰی زید نے پہلے تو حسبِ سابق طلاق سے انکار کیا، مگر مزید دریافت اور تفتیش پر اپنے ہم عمر دوستوں اور عزیزوں کو صاف بتلادیا کہ اُس نے ساجدہ کو طلاق دی ہے، اس سے قبل بھی دو مرتبہ طلاق نامے بھجوائے تھے، ساجدہ خاتون اُسی مکان میں رہائش پذیر ہے، جس میں شوہر رہتا ہے، زید کے دو تین برادران بھی اُسی میں رہتے ہیں، ساجدہ کے والدین اور برادری کے لوگ چاہتے ہیں کہ اُس کو والدین کے گھر لے آئیں، اور ساجدہ کا عقدِ ثانی بکر سے کرکے بکر سے طلاق لینے کے بعد ساجدہ کا نکاح پھر زید سے کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اوّل اور دُوسری طلاق کے درمیان ساجدہ کے بطن سے ایک بچہ بھی پیدا ہوا ہے جو حیات ہے۔ نمبرا: کیا ساجدہ کا اُسی مکان میں رہنا جائز ہے جہاں زید و بکر رہتے ہیں؟

نمبر۲:- کیا پہلے سے طے کرکے کہ بکر سے نکاح کے بعد طلاق لے کر زید سے نکاح ہوگا، یہ حلالہ شرعی ہوگا؟

نمبر۳:- اگر متذکرہ بالا صورت جائز ہے تو ان لوگوں سے جو ایسا کرنا چاہتے ہیں اُن سے تعلقات رکھنا، ساتھ کھانا پینا شرعاً کیسا ہے؟

نمبر۴:- مابین دو طلاقوں کے جو اولاد ہوئی ہے اُس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ساجدہ پر طلاق واقع ہوچکی ہے، اور طلاق کے بعد بچے کی پیدائش سے عدت بھی ختم ہوگئی ہے، لہٰذا اب ساجدہ کا زید کے مکان میں رہنا شرعاً کسی طرح دُرست

نہیں، بالخصوص جبکہ کمرہ ایک ہی ہے،[1] اور اس میں دُوسرے بھائی بھی رہتے ہیں۔

۲:- پیشگی طے شدہ پروگرام کے تحت حلالہ کی غرض سے نکاح کرنا شرعاً جائز نہیں،[2] حدیث میں اس پر وعید آئی ہے، البتہ بغیر حلالے کی غرض کے دُوسرا شوہر اتفاقاً طلاق دیدے تو عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوسکتی ہے، لیکن حلالہ کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ پہلے طلاق نامے میں ہی تین طلاقیں دی گئی ہوں، اور اگر پہلے طلاق نامے میں تین طلاقیں نہ دی ہوں، بلکہ بعد کے طلاق ناموں کو شمار کرکے تین طلاقیں پوری ہوئی ہوں تو اس کا حکم الگ ہوگا، اس صورت میں پہلا طلاق نامہ بھیج کر دوبارہ مسئلہ پوچھ لیں، اور یہ کاغذ ساتھ ضرور بھیجیں۔

۳:- جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں اُنہیں خدا کا خوف دِلاکر فہمائش کرنی چاہئے۔

۴:- اگر اولاد طلاق کے بعد دو سال کے اندر اندر پیدا ہوجائے تو اس کا نسب طلاق دینے والے شوہر سے ثابت ہوگا، بشرطیکہ عورت نے اس دوران عدّت ختم ہونے کا اقرار نہ کیا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۸/۲۷ ہ)

ایک وقت میں تین طلاق دینے سے ائمہ اربعہؒ کے نزدیک تینوں واقع ہوجاتی ہیں

سوال:- گزارش یہ ہے کہ میرے (شمیم اختر کے) شوہر نے مجھ سے لڑکر معمولی بات پر میری خالہ اور خالو کے بولنے پر تین طلاقیں لکھ بھیجی ہیں، جو کہ شدید غصّے کی حالت میں لکھیں اور میرے نام اور میرے پتے پر بھیجنے کے بجائے میری خالہ کے گھر بھیجیں، اب وہ خود بہت سخت نادم ہے اور معافی مانگتا ہے، میں بھی بہت پریشان ہوں، میں نہیں چاہتی کہ علیحدہ ہوں، وہ اب فتویٰ بھیجتا ہے اور مجھے بلاتا ہے، بتایئے میرے لئے کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ میری ڈیڑھ سال کی بچی بھی ہے اور میں سخت پریشان ہوں، وہ بھی بہت پریشان ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں شمیم اختر پر اس کے شوہر کی طرف سے تین طلاقیں واقع ہوچکی

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر۲ و۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فی الدر المختار ج:۳ ص:۴۱۴ (طبع سعید) وکرہ التزوج للثانی تحریمًا لحدیث لعن المحلّل والمحلّل لہٗ بشرط التحلیل کتزوجتک علی ان احلّلک وان حلت للأوّل لصحۃ النکاح وبطلان الشرط .... الخ.

وفی الھندیۃ ج:۱ ص:۴۷۴ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) رجل تزوّج امرأۃ ومن نیتہ التحلیل ولم یشترطا ذٰلک تحل للأوّل بھٰذا ولا یکرہ ولیست النیۃ بشیء ولو شرطا یکرہ وتحل عند أبی حنیفۃ وزفر رحمھما اللہ تعالٰی کذا فی الخلاصۃ.

نیز دیکھئے ص:۴۲۰ کا حاشیہ نمبر۱۔

ہیں، اور وہ اپنے شوہر پر حرام ہوچکی ہے، اور بغیر حلالہ کے اس کے لئے سابقہ شوہر سے نکاح بھی جائز نہیں ہے۔ (۱) امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ چاروں بلکہ جمہور فقہائے اُمت کا یہی مسلک ہے، (۲) شمیم اختر پر واجب ہے کہ وہ حلالہ کے بغیر شوہر کے پاس جانے سے مکمل اجتناب کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۹/۲۸ ج)

تین طلاقیں مجتمعاً یا متفرقاً دینے سے تینوں واقع ہوجاتی ہیں

سوال:- ہمارے ہاں مسمّٰی زید نے اپنی بیوی ہندہ کو یکدم تین طلاقیں دے دیں، اور باقاعدہ کچہری سے عرض نویسی لکھوا کر دو شہادتیں تحریر کرا کر دستخط اپنے بھی اور گواہوں کے بھی کرا کر اپنی بیوی کو دے دی، میرے پاس طلاق نامہ لائے، میں نے کہا یہ طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی، زید کسی اور مفتی سے فتویٰ لے کر آیا کہ ایک ہی طلاق رجعی ہوئی ہے، اور میاں بیوی رہنے لگے، گاؤں کے باشندے معترض ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ زید اور ہندہ کے ساتھ کیا برتاؤ شرعاً کرنا چاہئے؟

جواب:- تین طلاقیں خواہ بیک وقت دی جائیں یا متفرق اوقات میں، بہرصورت واقع ہوجاتی ہیں، (۳) اور ان کے بعد نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالہ کے بغیر از سرِ نو نکاح ممکن ہے، (۴) اس مسئلے پر چاروں ائمہ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا اجماع ہے، (۵) لہٰذا اگر زید نے واقعۃً ہندہ کو تین طلاقیں دی تھیں تو ہندہ اپنے شوہر پر حرام ہوگئی اور حلالہ کے بغیر اس سے دوبارہ نکاح بھی ہرگز جائز نہیں۔ (۶) بعض ایسے حضرات جو چاروں ائمہ مجتہدینؒ میں سے کسی کی تقلید نہیں کرتے، جمہورِ اُمت کے برخلاف تین بیک وقت دی ہوئی طلاقوں کو ایک شمار کر کے رُجوع کا فتویٰ دے دیتے ہیں، لیکن یہ فتویٰ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی فقہ کی رُو سے صحیح نہیں ہوتا، (۷) محض خواہشِ نفس کی خاطر ایسے لوگوں سے فتویٰ لے کر مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھ لینا بدترین گناہ ہے، زید اور ہندہ کو فوراً الگ ہوجانا واجب ہے، ورنہ وہ

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۴ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۴) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) دیکھئے حاشیہ نمبر ۲۔
(۶) دیکھئے حاشیہ نمبر ۱، اور ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔
(۷) دیکھئے حاشیہ نمبر ۲۔

ساری عمر حرام کاری کے مجرم رہیں گے، احباب واقارب کو بھی چاہئے کہ اپنا اثر ورُسوخ استعمال کر کے انہیں سمجھائیں اور اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸۶/۲۹ ب)

تین طلاق کے بعد عدّت کے دوران پردے کا اہتمام واجب ہے

سوال:- میاں بیوی کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا، اور میاں نے بیوی کو غصّے میں آکر ایک ہی دفعہ بول دیا کہ: ''جاؤ تم مجھ پر تین شرط طلاق ہو، جاؤ تم طلاق ہو اور یہ ماں بہن ہے'' صرف ایک دفعہ کہا ہے، لڑکی کے ماں باپ کا نام نہیں لیا اور لڑکی خود موجود تھی، اب یہ عورت اس مرد کے گھر میں رہنے کے قابل ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ مغلّظہ ہوچکی ہے،[1] اب دونوں کے درمیان نکاح بھی حلالۂ شرعیہ کے بغیر نہیں ہوسکتا،[2] عدّت کے دوران بیوی شوہر کے گھر میں رہے، لیکن پردے کا پورا اہتمام کیا جائے،[3] کیونکہ اب وہ اپنے شوہر کے لئے بالکل اجنبی عورت کے حکم میں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۲۸ ب)

طلاق کی تعداد یاد نہیں مگر کم از کم تین بار کا گمانِ غالب ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:- کسی بات پر میری بیوی سے میرا جھگڑا ہوگیا تھا، دورانِ جھگڑا میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا، اور نہ ہی مجھے کسی بات کا علم تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ماں کے کہنے پر کہ طلاق دے دو، میں نے اچانک اپنی ماں کی آواز پر لفظِ ''طلاق'' کہہ دیا، میرا اندازہ ہے کہ میں نے تین دفعہ کہا ہے، لیکن مجھ کو یہ پتہ نہیں کہ میرے منہ سے لفظِ ''طلاق'' کتنی مرتبہ نکلا؟ اور نہ ہی میں اس کی شہادت دے سکتا ہوں، میں نے اپنی بیوی سے پوچھوایا کہ بتاؤ تم کو طلاق دی ہے؟ اس نے یہ کہا کہ: ''میں نے طلاق کے لفظ اپنے کان سے نہیں سنے۔''

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر۲ و ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

بیوی کا بیان:- میرا جھگڑا ہو رہا تھا، میں اس جھگڑے میں اتنی پریشان تھی کہ میرے شوہر نے لفظِ ''طلاق'' کہا یا نہیں کہا میں نے کچھ سنا نہیں، جس کی شہادت میں اللہ اور رسول کو رکھتی ہوں۔ نور النساء

ماں کا بیان:- میں نے لڑکے کے منہ سے لفظِ ''طلاق'' نہیں سنا، میں خدا اور رسول کو گواہ کرتی ہوں۔

جواب:- سائل سے زبانی معلوم ہوا کہ اس نے کئی بار طلاق کے الفاظ کہے، اور کہتا رہا، لیکن صحیح عدد یاد نہیں، غالب گمان اُس کا یہ ہے کہ کم از کم تین مرتبہ ضرور کہے ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اور وہ مغلظہ ہوچکی ہے،(۱) اب اس کی بیوی آزاد ہے کہ عدت گزار کر دُوسرا نکاح کرسکتی ہے، اب سائل سے اس کا دُوسرا نکاح بھی بغیر حلالۂ شرعیہ کے نہیں ہوسکتا۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۳/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۴۸ ب)

تین طلاق کے بعد حاملہ کی عدّت اور حلالہ کا مسئلہ

سوال:- مسمّٰی بشیر احمد نے اپنی زوجہ ہاجرہ کو بحالتِ غصہ یہ الفاظ کہے: ''طلاق، طلاق، طلاق'' جبکہ اس کا نہ کوئی پہلے سے ارادہ طلاق دینے کا تھا، اور نہ اس وقت، بس غصے میں بغیر سوچے سمجھے تین چار مرتبہ لفظِ ''طلاق'' استعمال کیا۔ بصورتِ مذکورہ بالا مسماۃ ہاجرہ پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کون سی طلاق؟ اور باہمی رضامندی کی کیا صورت ہے؟

مسماۃ ہاجرہ کسی بھی صورت سے (یعنی یہ کہ اگر طلاق واقع ہوگئی تب بھی) بشیر احمد کے گھر سے جانے کے لئے تیار نہیں، اور اس وقت مسماۃ ہاجرہ حاملہ بھی ہے، چار بچے زیرِ پرورش ہیں، کسی صورت میں مسماۃ ہاجرہ بشیر کے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسمّٰی بشیر احمد کی زوجہ ہاجرہ پر تین طلاقیں ہوگئی ہیں، یہ طلاق مغلّظہ ہے،(۳) لہٰذا اب شوہر نہ رُجوع کرسکتا ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ باہم نکاح ہوسکتا ہے،(۴) اور طلاق حمل کی حالت میں بھی ہوجاتی ہے،(۵) البتہ اس کی عدّت بچے کی پیدائش ہے،(۶) بچہ پیدا ہونے تک وہ شوہر کے گھر میں پردے کے ساتھ رہے،(۷) اور میاں بیوی کی حیثیت میں ایک دُوسرے سے ملنا اور

(۱ تا ۴) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۵) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۲۱ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۶) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۷) حوالہ کے لئے ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

بے پردہ سامنے آنا سب ناجائز ہے، بچے کی پیدائش کے بعد مسماۃ ہاجرہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے،[1] پھر اگر وہ شوہر ہم بستری کے بعد ازخود طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہوجائے تو اس وقت وہ مسمّٰی بشیر احمد کے ساتھ نئے مہر پر نکاح کرسکتی ہے، اس کے سوا باہم ملنے کی کوئی صورت نہیں۔　　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۱/۲۸ ج)

رُخصتی سے پہلے تین دفعہ لفظِ ''طلاق'' استعمال کرنے کا حکم

سوال:- علماء کیا فرماتے ہیں اس مسئلے میں کہ جس وقت میری عمر ۱۳ سال کی تھی، میری والدہ نے میرا نکاح ایک غیر ملکی باشندے سے جس کا نام حمیروز ولد نادر خان تھا، منگنی کی، رُخصتی نہیں ہوئی، غیر ملک سے بغیر پاسپورٹ کے آیا تھا، مذکورہ شخص نے اپنی چالاکی سے میری بیوہ والدہ کو مرعوب کیا اور بنگلہ، موٹرکار وغیرہ کا لالچ دے کر میرا نکاح حاصل کیا، اس شخص نے میری والدہ کے تقریباً ۱۴ ہزار روپے بھی غبن کردیئے، میری والدہ اور عزیزوں نے اس شخص پر زور دیا کہ وہ رُخصتی تک کا خرچ اور وہ رقم جو اس نے میری والدہ سے ہتھیالی تھی واپس کرے، مگر اس نے نہ ہی والدہ کی رقم ادا کی اور نہ ہی رُخصتی کا بندوبست کیا، جون ۱۹۶۸ء کی ایک شب تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جبکہ میرے والد کے گھر عزیز و اقرباء اور محلے دار بھی جمع تھے حمیروز ولد نادر خان نے مجھے زوردار الفاظ میں تین دفعہ ''طلاق، طلاق'' کہا اور گواہوں کے سامنے اس نے مجھے تین روپیہ دیا اور سب کے سامنے کہا کہ: ''تم میری ماں بہن ہو'' یہ کاروائی بحضورِ گواہان ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت میری عمر ۱۴ سال ہے، میں بالغ ہوں اور چاہتی ہوں کہ اپنی پسند سے شادی کروں، میری والدہ بیوہ ہیں، کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہوں، اس صورت میں میرے لئے شرعی کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں، اور حمیروز ولد نادر خان نے واقعۃً رضیہ بیگم کو طلاق دی تھی تو ایک طلاقِ بائن واقع ہوچکی،[2] اور چونکہ اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں اس لئے عدّت بھی ختم ہوگئی، اب رضیہ بیگم جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۱/۷/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۶۳/۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے اگلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

اگر خلوت ہوئی ہو تو تین طلاق سے بیوی مغلّظہ ہو جائے گی

سوال:- مسمّٰی زید نے اپنی بیوی بنتِ بکر کو ایک رجسٹری بھیجی، آپس میں طویل جھگڑے کی بناء پر بنتِ بکر نے اسے وصول کرنے سے انکار کر دیا، مسمّٰی زید نے اسی رجسٹری کی نقل متعلقہ چیئرمین یونین کمیٹی کو بھیجی، جس کی عبارت مندرجہ ذیل تھی: ''بنتِ بکر کو جو کہ میری منکوحہ بیوی ہے جس کے بطن سے میرے نطفے سے کوئی اولاد نہیں ہے، میں چند وجوہات (جن کا ذکر یہاں میں مناسب خیال نہیں کرتا ہوں) کی بناء پر اسے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے خارج اور آزاد کرتا ہوں، میں اسے طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں، وہ میری زوجیت سے خارج ہے اور آزاد ہے .... الخ'' اس واقعے کو پانچ ماہ گزر چکے ہیں، بنتِ بکر کے لئے شریعت کی روشنی میں کوئی راستہ متعین کرلیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی طرف سے اس کی بیوی پر تین طلاق واقع ہوگئی ہیں اور وہ مغلّظہ ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ اب حلالہ کے بغیر دونوں میں نکاحِ ثانی بھی جائز نہیں ہے،[1] لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ نکاح کے بعد رُخصتی ہوچکی ہو، اور شوہر و بیوی میں خلوت ہوچکی ہو،[2] اگر خلوت نہیں ہوئی تھی تو مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی غفرلہٗ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۶۴ الف)

ایک وقت میں تین طلاق دینے سے تینوں واقع ہونے پر ائمہ کا اتفاق ہے اور اس کے خلاف فتویٰ کا اعتبار نہیں

سوال:- اس سوال کے ساتھ ایک طلاق نامہ منسلک ہے جو سہیل احمد فیضی صاحب نے اپنی بیوی کو دیا اور یونین کونسل کے چیئرمین صاحب کو اس کا نوٹس ارسال کیا۔ دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ اس طلاق نامہ کی رو سے سہیل احمد صاحب کی اہلیہ پر طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟ اور اگر واقع ہوگئی ہے تو کونسی؟ نیز یہ کہ سہیل احمد صاحب نے اس طلاق کے بعد طلاق سے رُجوع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، کیا شرع میں ان کو رُجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ اس تحریر میں تین طلاق صاف

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳۔

(۲) وفی الدر المختار باب الطلاق غیر المدخول بها ج:۳ ص:۲۸٦ (طبع سعید) وان فرّق بانت بالأولٰی ولم تقع الثانیة بخلاف الموطؤة حیث یقع الکل وعم التفریق. وفی الشامیة تحته (قوله بخلاف الموطؤة) أی ولو حکمًا کالمختلی بها فانها کالموطؤة فی لزوم العدّة وکذا فی وقوع طلاق بائن اٰخر فی عدّتها .... الخ.

الفاظ میں لکھی ہوئی ہیں، اور انہوں نے کہیں سے تین طلاقوں کے ایک ہونے پر فتویٰ بھی لیا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- مندرجہ پشت طلاق نامے[1] پر غور کیا گیا، شرعی اعتبار سے اس طلاق نامے کی رُو سے سہیل احمد فیضی صاحب کی بیوی خاور سلطانہ صاحبہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں[2]، اور طلاقِ مغلّظہ واقع ہونے کی بناء پر وہ سہیل احمد فیضی صاحب کے لئے حرام ہوچکی ہیں، اب نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ نیا نکاح ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" (سورة البقرة: ۲۳۰) ۔یعنی "پس اگر شوہر اسے تیسری طلاق دیدے تو وہ شوہر کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرلے۔" نیز نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سے احادیث کا یہی تقاضا ہے۔ مثلاً حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ایما رجل طلق امرأته ثلاثا عند الاقراء او ثلاثا مبهمة لم تحل لهٗ حتّٰی تنکح زوجًا غیره." (سنن البیهقی ج:۷ ص:۳۳۶)[3]۔

اس کے علاوہ تمام صحابہؓ و تابعینؒ کا بھی یہی فیصلہ ہے اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے تمام مقلدین قرآن وسنت کے ان دلائل کی روشنی میں اسی بات کے قائل ہیں کہ تین طلاقیں خواہ ایک مرتبہ دی جائیں یا مختلف اوقات میں، ان سے بیوی حرام ہوجاتی ہے، اور جن بعض لوگوں نے اس کے خلاف کوئی فتویٰ دیا ہے، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کسی مذہب کے علماء نے اس کو قابلِ اعتبار قرار نہیں دیا۔ تفصیلی دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو: تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۱۵۴ تا ۱۶۱[4]۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاقِ مغلّظہ واقع ہوچکی ہے اور طلاق کی تاریخ سے تین مرتبہ اَیامِ ماہواری گزرنے کے بعد مسماۃ خاور سلطانہ صاحبہ شرعاً آزاد ہیں کہ جہاں چاہیں نکاح کرلیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱۷/۳۷ ب)

---

(۱) نقلِ فتاویٰ کے ریکارڈ میں یہ طلاق نامہ موجود نہیں ہے، تاہم اس میں شوہر کی طرف سے تین طلاقوں کا ہونا جواب سے واضح ہے۔ (محمد زبیر)

(۲) وفی السنن لأبی داوٗد ج:۱ ص:۳۰۶ (طبع حقانیه ملتان) عن مجاهد قال: کنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال انه طلق امرأته ثلاثا، قال: فسکت حتّی ظننت انه رادها الیه ثم قال: ینطلق احدکم فیرکب الحموقة ثم یقول یابن عباس یابن عباس وان الله قال: "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" وانک لم تتق الله فلا أجد لک مخرجًا عصیت ربک وبانت منک امرأتک.

(۳) (طبع نشر السنة ملتان) باب ما جاء فی امضاء الطّلاق الثلاث وان کن مجموعات.

(۴) (طبع مکتبة دار العلوم کراچی).

﴿فصل فی الخلع وأحکامه والطّلاق علی المال﴾

(خلع اور مال کے بدلے طلاق کے اَحکام)

خلع کے لئے شوہر اور بیوی دونوں کی رضامندی ضروری ہے، نیز خلع کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- فیصلہ:- مدعیہ نے اپنے دعویٰ میں تحریر کیا ہے کہ وہ مدعا علیہ سے شادی شدہ تھی، اُس سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا، بعد میں مدعیہ کو علم ہوا کہ مدعا علیہ کے اس کی بھاوج کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، مدعیہ کے منع کرنے پر مدعیہ پر جھوٹا زنا کا الزام لگایا اور زدوکوب کیا، حق مہر ادا نہیں کیا گیا، نیز ان حالات میں مدعیہ اور مدعا علیہ کے درمیان گزارہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی حدود حقوق اللہ قائم رہ سکتی ہیں، مدعا علیہ نے ان الزامات کی تردید کی اور اُس نے اس بناء پر مقابلہ کیا کہ اصل میں مدعیہ وہ رقم ہضم کرنا چاہتی ہے جو کہ بوقت نکاح مدعا علیہ نے ادا کی تھی، اس لئے مقدمہ مدعیہ کا فسخ کیا جائے اور ۱۹۷۳/۱۱/۳ء کو مدعا علیہ نے ایک علیحدہ دعویٰ حقوقِ زن وشو دائر کردیا جو مندرجہ ذیل تنقیحات پر ۱۹۷۳/۵/۸ء کو وضع کی گئی اور کاروائی مثل تنسیخِ نکاح پر عمل میں لائی گئی۔

تنقیح نمبر۴:- مدعیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تنسیخِ نکاح کے عوض اپنا حق مہر معاف کرتی ہے جو کہ ابھی تک ادا نہیں ہوا اس کے متعلق مدعا علیہ نے کوئی واضح جواب نہیں دیا، اور شہادت جو صفحہ مثل پر ہے وہ ہر لحاظ سے کافی ہے کہ مدعیہ کے حق میں تنسیخِ نکاح قرار دیا جائے کیونکہ جانبین فریقین مقدمہ بازی فوجداری زنا کے الزام میں رہی ہے، بیوی کی رائے خاوند کے متعلق اچھی نہیں ہے، اُس نے اپنی بھاوج کے ساتھ شوہر کے ناجائز تعلقات کا الزام لگایا ہے، میں اس مقدمے کو صحیح قرار دیتے ہوئے خلع کی بنیاد پر تنسیخِ نکاح کی ڈگری اُس رقم کے عوض جو کہ مدعا علیہ نے حق مہر دینی ہے دیتا ہوں وہ رقم کافی ہے۔

دادرسی:- میری تمام تنقیحات کا نتیجہ یہ ہے کہ مدعیہ کا مقدمہ بابت تنسیخِ نکاح مقدمہ نمبر ۵۶ آف ۱۹۷۲ء مدعیہ کے حق میں ڈگری برخلاف مدعا علیہ کے صادر کیا جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں مدعا علیہ کا مقدمہ حقوقِ زن وشو مقدمہ نمبر ۵ آف ۱۹۷۳ء بمعہ خرچہ فسخ کیا جاتا ہے، نیز ڈگری بابت تنسیخِ

نکاح یونین کونسل تلہ گنگ کو سات دن کے اندر اندر برائے ضروری کاروائی زیر دفعہ (8) مسلم فیملی لاء آرڈیننس بھیجی جائے، کھلی عدالت میں سنایا گیا۔ ۱۹۷۵/۱۲/۴ء

دستخط سول جج تلہ گنگ

جواب:- منسلکہ فیصلے کے ساتھ کوئی سوال مستفتی نے نہیں لکھا، اگر مقصد یہ ہے کہ اس فیصلے کی شرعی حیثیت سے آگاہ کیا جائے تو عرض یہ ہے کہ منسلکہ عدالتی فیصلہ ائمہ اربعہ کے مذہب کے مطابق قرآن وسنت کی رُو سے شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے، کیونکہ اس فیصلے میں خلع کا حکم صادر کیا گیا ہے اور خلع باجماعِ اُمت زوجین کا ایک معاملہ ہے، جو باہمی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے، لہٰذا اگر شوہر خلع کرنے پر راضی ہو تو خلع کرے اس صورت میں عورت کا نکاح اس سے ختم ہوجائے گا، اور اگر وہ خلع پر راضی نہ ہو تو شرعاً اس کو عورت کو علیحدہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ چونکہ نوبت ایسی مقدمہ بازی تک پہنچ چکی ہے اس لئے شوہر کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خلع کو منظور کر کے بیوی کو الگ کردے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۶/۲۷ و)

اگر قصور لڑکی کا ہو تو شوہر خلع کے بدلے بیوی سے رقم لے سکتا ہے

سوال:- منکہ محمد اسحاق کی شادی بچپن میں ہوگئی تھی، اُس وقت ہم دونوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی ناچاقی تھی، شادی کے عرصہ تین سال بعد ناچاقی ہوئی، اب بندہ بالغ ہے لیکن سسرال والے منکر ہیں، اب اُنہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ آپ کو گھر داماد رہنا ہوگا اور لڑکی کو ہمارے گھر ہی پر رکھنا ہوگا، جب میں نے ان کی یہ شرط منظور کی تو انہوں نے ایک اور شرط لگادی کہ اگر آپ ۵ تولہ سونا، ۱۲ چھٹانک چاندی کے زیورات لاسکتے ہیں تو ہم لڑکی بھیجیں گے اور ماہانہ خرچ بھی دینا پڑے گا۔ میں نے کہا سردست میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے، اگر تمہیں اپنی لڑکی ان شرائط کے بغیر بھیجنی ہے تو میں تیار ہوں، کیونکہ سسرال والوں کی طرف سے تقاضا ہے کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے، زیادہ دن تک ہم گھر لڑکی رکھنے کو تیار نہیں ہیں، میں غریب آدمی ہوں بڑی مشکل سے شادی کے بوجھ سے ابھی ہلکا ہوا ہوں، سسرال والے اس پر تقاضا کر رہے ہیں کہ تم فوراً ہماری لڑکی کو چھٹکارا دے دو، میں غریب آدمی ہوں وہ مجھ سے جبراً چھٹکارا حاصل کر رہے ہیں، سسرال والے مال دار ہیں، میری شادی پر خوب خرچ کروایا ہے، لہٰذا سسرال والوں کو کہا کہ مبلغ ۵۰۰۰ روپے نقد ادائیگی کے بعد چھٹکارا دے سکتا ہوں، کیا یہ پانچ ہزار میرے لئے جائز ہوں گے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ واقعات دُرست ہیں تو زیادتی لڑکی والوں کی طرف سے ہے، لہٰذا اگر آپ پانچ ہزار روپے پر خلع کریں تو آپ کے لئے جائز ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ مہر معاف کروانے پر اکتفاء کرلیں اور اس سے زائد کچھ نہ لیں، لما فی الدر المختار: وکرہ أخذ شئ ان نشز وان نَشَزَت لا، ولو منه نشوز أيضًا، ولو بأكثر مما أعطاها على الأوجه "فتح" وصحح الشمني كراهة الزيادة وتعبير الملتقى لا بأس به يفيد أنها تنزيهية وبه يحصل التوفيق. (شامی ج:۲ ص:۵۶۱)۔[1]

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۴۲ ج)

نفرت کی بناء پر دعویٰ تنسیخِ نکاح کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں؟ فتویٰ چاہتا ہوں۔

مسئلہ:- اگر لڑکی رُخصتی سے پہلے تنسیخِ نکاح کے دعویٰ میں یہ بیان دیتی ہے کہ اُسے اپنے خاوند سے نفرت ہوگئی ہے (بغیر کسی جائز شرعی وجہ کے) تو کیا قانونِ اسلام کے مطابق تنسیخِ نکاح کی ڈگری عدالت کو صادر کردینی چاہئے یا نہیں؟ یا پھر دعویٰ تنسیخ نکاح خارج کر کے لڑکی کو اور ایسا جھوٹا دعویٰ کروانے والوں کو عدالت کو کیا سزا دینی چاہئے؟ اور کیا بغیر کسی جائز شرعی وجہ کے خلع کی بنیاد پر لڑکی تنسیخِ نکاح یا تکذیبِ نکاح کی ڈگری حاصل کرسکتی ہے؟

جواب:- اس مسئلے میں تفصیل ہے، لہٰذا سوال کا جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب لڑکی کا مفصل بیان سامنے ہو۔

والسلام
۱۴۲۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۳/۱۳)

---

(۱) ج:۳ ص:۴۴۵ (طبع سعید).

﴿فصل فی فسخ النّکاح عند کون الزّوج مفقودًا أو عنّینًا أو متعنّتًا أو مجنونًا﴾

(شوہر کے مفقود، نامرد، متعنّت اور مجنون ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کے اَحکام)

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- مسماۃ ہندہ کا شوہر تقریباً چار سال ہوئے کہ لاپتہ ہو چکا ہے، والدین اور بیوی کے ساتھ بنگلہ دیش سے کراچی آیا، حکومت نے ان کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور بیوی کو کیمپ میں رکھا، اس کے بعد سے لاپتہ ہے، ہر چند تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی سراغ نہ مل سکا، اب تک ہندہ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے، ایسی صورت میں ہندہ کیا عقدِ ثانی کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ ہندہ کو یہ حق ہے کہ وہ مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے پہلے یہ ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، پھر اُس کے بعد گواہوں سے اس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، بعد ازاں عدالت خود بھی مفقود کی تفتیش اور تلاش کرے اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہو جائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، پھر اگر ان چار سال کے اندر بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو مفقود کو چار سال کی مدّت ختم ہونے پر مردہ تصوّر کیا جائے گا، اس وقت حاکم کے پاس دوبارہ درخواست دے کر عدالت سے اُس کے مردہ ہونے کا حکم حاصل کرے، اور پھر چار مہینے دس دن عدّتِ وفات گزار کر وہ دُوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ اور یہ ساری تفصیل اُس وقت ہے کہ جب کہ عورت مزید چار سال صبر و تحمل اور عفت کے ساتھ گزار سکتی ہو، لیکن اگر عورت کے لئے اتنا عرصہ صبر کرنا مشکل ہو اور گناہ میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو صورتِ مسئولہ میں حاکم کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ چار سال کے بجائے صرف ایک سال انتظار کرنے کا حکم دے، اور ایک سال کے بعد شوہر مذکور

کی طرف سے اس کو طلاقِ رجعی یعنی تین مرتبہ ایامِ ماہواری گزار کر وہ دُوسری جگہ نکاح کر سکے گی۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۳/۲۸ ج)

---

(۱) ''زوجۂ مفقود کے حکم'' سے متعلق تفصیل وتحقیق کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:-

سوال:- مفقود کی بیوی کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔

جواب:- مفقود کی بیوی کے لئے اصل حکم تو یہ ہے کہ وہ عفت وعصمت کے ساتھ اپنی زندگی گزارے، لیکن اگر وہ مفقود شوہر کے نکاح سے رہائی حاصل کرنا چاہے تو درج ذیل صورت اختیار کر کے حاصل کرنے کی گنجائش ہے:-

مفقود کی بیوی اپنا یہ مقدمہ مسلمان قاضی کی عدالت میں پیش کرے اور گواہوں سے ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص کے ساتھ ہوا تھا، پھر گواہوں سے اس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، اس کے بعد قاضی خود اپنے طور پر اس کی تفتیش وتلاش کرے، جہاں اس کے جانے کا غالب گمان ہو وہاں آدمی بھیجا جائے، اور جس جس جگہ جانے کا غالب گمان نہ ہو صرف احتمال ہو وہاں اگر خط ارسال کرنے کو کافی سمجھے تو خطوط ارسال کر کے تحقیق کرے، اور اگر اخبارات میں شائع کردینے سے خبر ملنے کی اُمید ہو تو یہ بھی کرے۔

الغرض تفتیش وتلاش میں پوری کوشش کرے اور جب پتہ چلنے سے مایوسی ہوجائے تو قاضی، عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، پھر ان چار سالوں کے اندر بھی اگر مفقود کا پتہ نہ چلے تو عورت قاضی کے پاس دوبارہ درخواست کرے، جس پر قاضی اس کے مردہ ہونے کا فیصلہ سنادے، اس کے بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر عورت کو دُوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا۔

اور اگر عورت زنا کا شدید خطرہ ظاہر کرے تو ایسی صورت میں چار سال کے انتظار کا حکم ضروری نہیں بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ شوہر کے غائب ہونے کے وقت سے اب تک کم از کم ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے یا نہیں؟ اگر گزر چکا ہو تو قاضی مزید مہلت دیئے بغیر اس وقت بھی نکاح ختم کرسکتا ہے، اسی طرح اگر زنا میں مبتلا ہونے کا خطرہ تو نہیں لیکن مفقود کا اتنا مال موجود نہیں جو ان چار سالوں میں اس کی بیوی کے نان ونفقہ کے لئے کافی ہو، یا بیوی کے لئے مفقود کے مال سے نان ونفقہ حاصل کرنا مشکل ہو تو اس صورت میں اگر نان و نفقہ دیئے کے بغیر کم از کم ایک ماہ گزرا ہو تو قاضی نکاح ختم کرسکتا ہے۔

واضح رہے کہ آخری ان دونوں صورتوں میں عورت عدّتِ وفات کے بجائے عدّتِ طلاق گزارے گی، جو قاضی کے فیصلے کے وقت سے شمار ہوگی۔

فی البحر: (قوله: ولا يفرق بينه وبينها: أى بين زوجته، لقوله عليه السلام فى امرأة المفقود: انها امرأته حتى يأتيها البيان، وقول على رضى الله عنه فيها: هى امرأة ابتليت فلتصبر حتى يتبين موت أو طلاق اهـ. (ج:۵ ص:۱۶۴). (۱)

فى شرح الجليل على مختصر الخليل: فيؤجل أربع سنين ان دامت نفقتها .... فان لم تدم نفقتها من ماله فلها التطليق لعدم النفقة بلا تأجيل، وكذا ان خشيت على نفسها الزنا فيزاد على دوام نفقتها عدم خشيتها الزنا. (ج:۲ ص:۳۸۵).

وفى حاشية الدسوقى: فيؤجل أى المفقود الحر أربع سنين ان دامت نفقتها من ماله والا طلق عليه لعدم النفقة اهـ. (ج:۲ ص:۴۷۹). (۲)

وفى الشرح الصغير: والا فلها التطليق عليه لعدم النفقة .... أى ولم تخش العنت والا فتطلق عليه لضرر فهى أولى من معدومة النفقة. (ج:۲ ص:۶۹۴). (۳)

وفى الفقه الاسلامى وأدلته للشيخ الزحيلى: ورأى المالكية والحنابلة جواز التفريق للغيبة اذا طالت وتضررت الزوجة بها، ولو ترك لها الزوج مالاً تنفق منه اثناء الغياب، لأن الزوجة تتضرر من الغيبة ضررًا بالغًا، والضرر يدفع بقدر الامكان لقوله صلى الله عليه وسلم: "لا ضرر ولا ضرار" .... وجعلوا حد الغيبة الطويلة سنة فأكثر على المعتمد، وفى قول ثلاث سنوات اهـ. (ج:۷ ص:۵۳۳). (۴)

(باقی اگلے صفحے پر)

---

(۱) (طبع ماجدیہ کوئٹہ).
(۲) (طبع دار الفكر بيروت).
(۳) (طبع دار المعارف بمصر).
(۴) (دار الفكر بيروت).

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- ثریا کی شادی زید سے تقریباً سترہ برس ہوئے ہوچکی تھی، کسی جرم کی بناء پر زید کو سات سال سزا ملی، سات سال گزرنے کے بعد زید لاپتہ ہوگیا، ثریا اب بھی انتظار میں ہے، حکام جیل سے پتہ کیا جاتا ہے وہ بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، آخر کار ثریا مجبور ہوکر بکر کے گھر رہنے لگی، بغیر نکاح کے، اور بکر سے دو تین بچے بھی حرام طریقے پر پیدا ہوگئے، یاد رہے کہ زید ابھی تک لاپتہ ہے، کیا ثریا بکر سے نکاح کرسکتی ہے کہ اس جرمِ عظیم سے بچ جائے؟ جو صورت ہو تحریر فرمائی جائے۔

جواب:- ثریا کو چاہئے تھا کہ جونہی اس کا شوہر لاپتہ ہوا تھا وہ فوراً عدالت کی طرف رُجوع کرکے اپنا نکاح فسخ کرالیتی، بہرحال اب اس کو چاہئے کہ بکر سے فوراً میاں بیوی کے تعلقات منقطع کرکے سابقہ عمل پر توبہ و اِستغفار کرے اور عدالت میں نان نفقہ نہ ہونے اور عصمت کے خطرے کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)......وفی الأحوال الشخصیة للشیخ محمد أبو زهرة: والتفریق للتضرر من الغیاب هو مذهب مالک وأحمد، لأن المرأة قد تقع فی جریمة دینیة باهمالها .... ولا بد للتفریق بالغیاب ان تمضی مدة تستوحش فیها الزوجة وتتضرر فعلًا، لأن الفرقة بسبب ذٰلک هی للضرر الواقع لا للتضرر المتوقع فقط، وقد جعل أحمد أدنٰی مدة یجوز أن تطلب التفریق بعدها ستة أشهر .... أما مذهب مالک رضی الله عنه فقد اختلف فی الحد الأدنٰی للتضرر، فقیل: ثلاث سنین، وقیل: سنة، وبهٰذا أخذ القانون اهـ.(ص:۳۹۰)

وفی الشرح الصغیر: وتعتد زوجة المفقود حرة أو أمة صغیرة أو کبیرة فی أرض الاسلام متعلق بالمفقود عدة وفاة علٰی ما تقدم، ابتداءها بعد الأجل اهـ.(ج:۲ ص:۶۹۴).[۱]

وفی شرح منح الجلیل: ثم بعد التلوم وعدم وجدان النفقة والکسوة طلق وان کان غائبًا .... یعنی ان الغائب البعید الغیبة ولیس له مال أو له مال لا یمکنها الوصول الیه الا بمشقة حکمه حکم العاجز الحاضر اهـ.

وفیه: وله أی الزوج المطلق علیه لعدم النفقة الرجعة للزوجة المطلقة لأنه طلاق رجعی، ابن عرفة.

(ج:۲ ص:۴۴۳)

وفی اٰخر فتویٰ العلامه هاشم رحمه الله مفتی المالکیة بالمدینة المنورة زادها الله شرفًا: وهٰذا (التطلیق) بعد التلوم بنحو شهر أو باجتهاده عند المالکیة (یعنی فی صورة عدم النفقة) .... وان کان لخوفها الزنا وتضررها بعدم الوطی والعنانة مع وجود النفقة والغنا فبعد صبرها سنة فأکثر عند جل المالکیة اهـ.(الحیلة الناجزة ص:۱۲۴).[۲]

الجواب صحیح	واللہ تعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	عصمت اللہ عصمہ اللہ
۱۴۱۸/۸/۱۷ھ	۱۴۱۸/۸/۱۴ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی	بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ	محمد عبدالمنان عفی عنہ

(۱) ج:۲ ص:۶۹۳ (طبع دار المعارف مصر).
(۲) دارالاشاعت کراچی۔

پر تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردے، عدالت کو اختیار ہوگا کہ وہ معاملات کی تحقیق کرکے زید سے ثریا کا نکاح فسخ کردے، اس کے بعد عدّت گزار کر وہ بکر سے نکاح کرسکے گی۔[۱] فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴۴/۱۸ الف)

حاکم کے پاس مقدمہ لے جانے پر وہ تحقیق کرائے، اس کے بعد ایک سال کی مدت کی مہلت دے، اس مدّت میں شوہر نہ آئے تو نکاح فسخ کردے، اس کے بعد ثریا عدّت گزار کر شادی کرسکتی ہے۔[۲] محمد عاشق الٰہی

زوجۂ مفقود کے لئے فسخِ نکاح کا طریقۂ کار

سوال:- میری بیٹی مختار بیگم کا نکاح مؤرخہ ۳۱/اگست ۱۹۷۶ء کو بمقام راولپنڈی ہوا تھا، لڑکا (محمد پیارے جان) دُبئی میں ملازم تھا، نکاح کے تقریباً دو ماہ بعد وہ واپس اپنی ملازمت پر دُبئی چلا گیا، اس دوران لڑکی کو وہ کراچی تک ساتھ لے گیا اور سارا زیور غائب کردیا، لڑکے نے کہا کہ گم ہوگیا ہے، اس پر ہم سے اور ہماری لڑکی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا، اُس تاریخ سے آج تک تقریباً دس سال گزر چکے ہیں، ہم نے ان کے تمام رشتہ داروں سے دریافت کرلیا، اس کا کوئی پتہ نہیں، نہ خط ہے، نہ خرچہ ہے، بیوہ ہوں میرا کوئی سہارا نہیں، لڑکی جوان ہے میں پریشان ہوں کیا میں اُس کا دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہوں؟ (انوری بیگم)

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مختار بیگم کے لئے زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی تلاش جاری رکھے اور فسخِ نکاح نہ کروائے، لیکن اگر وہ شوہر کے بغیر صبر نہ کرسکتی ہو یعنی یا تو اُس کے نفقہ کا انتظام نہ ہو یا اُسے اپنی عفت کے بارے میں خطرہ ہو تو وہ یہ کرسکتی ہے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے پہلے یہ ثابت کرے کہ میرا نکاح محمد پیارے جان سے ہوا تھا، اس کے بعد گواہوں کے ذریعہ اُس کا مفقود اور لاپتہ ہونا ثابت کرے، اس پر حاکم خود بھی اس کی تفتیش اور تلاش کرے، اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، اگر ان چار سال کے اندر بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو اس مدّت کے اختتام پر شوہر کو مُردہ تصوّر کیا جائے گا، اس کے

(۱، ۲) زوجۂ مفقود کے مسئلے سے متعلق مزید تفصیل اور دلائل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ہی کا مصدقہ فتویٰ پچھلے فتویٰ کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر مختار بیگم دُوسری جگہ نکاح کرسکیں گی، لیکن اگر مختار بیگم کے لئے چار سال کی مدّت گزارنا بھی ممکن نہ ہو، اور چونکہ اس نے دس سال تک پہلے ہی صبر کیا ہے اور عاجز ہوکر درخواست دی ہے، اس لئے معصیت میں مبتلا ہونے کا قوی خطرہ ہو تو اس صورت میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ حاکم چار سال کے بجائے صرف ایک سال کے انتظار کا حکم دے اور ایک سال گزرنے کے بعد عورت کے طلب کرنے پر اس کا نکاح فسخ کردے، اس صورت میں فسخِ نکاح کے بعد تین ماہواری عدّت گزار کر وہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۴/۲۸ ب)

شوہر کے نفقہ نہ دینے یا غائب ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کی صورت

سوال:- جس عورت کا خاوند بیوی کو چھوڑ کر چلا جائے، طلاق بھی نہ دے اور اپنے گھر بھی نہ لے جائے، وہ لڑکی کتنی دنوں کے بعد دُوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے؟ اگر ایسا نہیں کرسکتی تو کتنے دنوں تک بیٹھی رہے؟

جواب:- پہلے خاوند کو تلاش کرکے اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو اُسے خلع پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہو تو عدالت میں اس کے خلاف نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر، اور اگر اس کا پتہ نہ چلے تو اس کے گمشدہ ہونے کی بنیاد پر تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت اپنے طور پر اس کی تلاش کرے، اگر پتہ معلوم ہوجائے اور وہ آجائے تو اسے حکم دے کہ یا بیوی کو آباد کرو یا طلاق دو، اگر وہ آباد کرے تو ٹھیک ہے، اور اگر انکار کرے یا اطلاع یابی کے باوجود حاضرِ عدالت نہ ہو تو عدالت نکاح فسخ کرسکتی ہے، اور اگر عدالت کو تلاش کے باوجود نہ ملے تو چار سال انتظار کے بعد نکاح فسخ کرسکتی ہے،[2] جب تلاش میں ناکامی ہوجائے تو اس کی تفصیلات معلوم کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱۱/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۷۲/۳۲ ج)

(۱و۲) تفصیلی حوالے اور دلائل کے لئے ص:۴۴۷ اور ص:۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

۱:- زوجۂ مفقود کا حکم

۲:- شوہر کو مردہ سمجھ کر دُوسرا نکاح کرنے کی صورت میں پہلا شوہر واپس آجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک عورت جس کا شوہر اگر کہیں گم ہوجائے اور کہیں بھی اس کا پتہ نہ مل سکے تو اس صورت میں عورت شوہر کا کب تک انتظار کرے؟

۲:- اگر کسی صورت سے اس بات کی تصدیق ہوجائے کہ اس عورت کا شوہر فوت ہوچکا ہے، (مدّتِ معین کے دوران) تو پھر عدّت کب سے شروع ہوگی اور کب ختم ہوگی؟

۳:- اگر صورت نمبر۲ کے مطابق عورت عدّت پوری کرکے دُوسرا نکاح بھی کرلیتی ہے لیکن اس کے پہلے شوہر کی موت کسی غلط فہمی کے باعث یقینی صورت اختیار کرگئی تھی، لیکن اب اس کا پہلا شوہر بھی واپس آجاتا ہے، اس صورت میں عورت کس کے نکاح میں رہے گی؟ اوّل کے یا ثانی کے؟ اگر کسی ایک نکاح کی تنسیخ فوری طور پر ہو تو کون سے نکاح کو ترجیح دی جائے گی۔

جواب:- ایسی صورت میں عورت کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت سے رُجوع کرکے شرعی ضابطۂ شہادت سے یہ بات ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، اس کے بعد اس کا لاپتہ ہونا ثابت کرے، پھر حاکم خود بھی شوہر کی تلاش و تفتیش کرے، اور جب پتہ ملنے سے مایوسی ہوجائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم دے، اگر ان چار سال میں بھی مفقود کا پتہ نہ چلے تو ان چار سال کی مدّت کے اختتام پر اسے مُردہ تصوّر کیا جائے گا، نیز چار سال ختم ہونے کے بعد چار ماہ دس دن عدّتِ وفات گزار کر عورت کو دُوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوگا،[1] اگر عورت اپنے نفقہ کا انتظام نہ ہونے یا گناہ میں مبتلا ہونے کے اندیشے سے چار سال تک صبر نہ کرسکتی ہو تو شدید ضرورت کے موقع پر حاکم، انتظار کی مدّت چار سال کے بجائے ایک سال بھی قرار دے سکتا ہے۔[2]

۲:- اگر شوہر کی وفات کا یقین ہوجائے تو عدّت اس کی تاریخِ وفات سے چار مہینے دس دن شمار کی جائے گی۔[3]

۳:- ایسی صورت میں بیوی بدستور پہلے شوہر کے نکاح میں رہے گی، دُوسرے شوہر کے

(۱، ۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبرا۔

(۳) قال الله تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا. (سورة البقرة: ۲۳۴) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۵۱۰ (طبع سعید) والعدة للموت أربعة أشهر وعشر من الأيام .... الخ.

ساتھ اس کا نکاح خودبخود باطل ہوجائے گا،[۱] البتہ پہلے شوہر کو اس کے ساتھ صحبت کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ دُوسرے شوہر کی عدّت پوری نہ کرلے،[۲] عدّت کے دوران وہ پہلے شوہر ہی کے پاس رہے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۲۸/۱۹ الف)

۱:- سیلاب میں غائب ہونے والے شوہر سے فسخِ نکاح کا حکم

۲:- سیلاب میں شوہر کے غائب ہونے کے گیارہ دن بعد دُوسرے نکاح کا حکم

سوال:- پاکستان کے جزیرہ ہاتیہ میں سیلاب کے باشندے ہیں جس پر گزشتہ ۱۲/نومبر کو سیلاب آیا تھا، اس میں صالحہ نامی عورت کا شوہر گم ہوگیا، اب تک یقینی پتہ نہیں کہ مرگیا یا نہیں؟ غالب خیال ہے کہ مرگیا ہوگا۔ کیا اس پر مفقود کا حکم لگایا جائے گا؟

۲:- اس میں کریمہ کا شوہر عبدالرحیم بھی گم ہے، سیلاب سے گیارہ دن بعد کریمہ کا نکاح ہوگیا، اب یہ نکاح باطل ہے یا فاسد؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں شوہر پر مفقود ہی کے اَحکام جاری ہوں گے، کیونکہ اس کی موت کا یقین نہیں ہے، البتہ جس وقت ایسے مفقود کی بیوی فسخِ نکاح کے لئے مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ کرے تو حاکم کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ طوفان کے حالات پر نظر کرکے اگر یہ گمان غالب سمجھے کہ شوہر طوفان میں ہلاک ہوگیا ہے اور اتنی مدّت گزر چکی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی کوئی خبر مل جاتی تو وہ مزید انتظار کئے بغیر بھی تفریق کردے، لما فی رد المحتار ومقتضاہ انہ یجتھد ویحکم القرائن الظاھرۃ الدالۃ علٰی موتہ وعلٰی ھٰذا یبتنی ما فی جامع الفتاویٰ حیث قال واذا فقد فی المھلکۃ فموتہ غالب فیحکم بہ کما اذا فقد فی وقت الملاقاۃ مع العدو أو مع قطاع الطریق أو سافر علی المرض الغالب ھلاکہ أو کان سفرہ فی البحر وما أشبہ ذٰلک حکم بموتہ لأنہ الغالب فی ھٰذہ الحالات .... لٰکن لا یخفٰی أنہ لا بُدّ من مضی مدّۃ طویلۃ حتی یغلب علی الظن موتہ لا بمجرد فقدہ عند ملاقاۃ العدو أو سفر البحر ونحوہ الا اذا کان ملکا عظیمًا فانہ

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے ''حیلہ ناجزہ'' ص:۶۷ تا ۷۰ ''واپسی مفقود کے اَحکام''۔

اذا بقی حیًا تشتهر حیاته فلذا قلنا ان هٰذا مبنی علٰی ما قاله الزیلعی تأمل. (شامی ج:۳ ص:۵۱۲، بولاق)۔[۱]

۲:- یہ نکاح بالکل باطل اور کالعدم ہے،[۲] کریمہ اور عبداللہ پر واجب ہے کہ فوراً علیحدہ ہوجائیں اور جب تک مذکورہ طریقہ پر عدالت سے سندِ تفریق حاصل نہ ہو اور عدّتِ وفات نہ گزر جائے، کریمہ کے لئے کسی دُوسری جگہ نکاح جائز نہیں، اب تک جو نکاح کے تعلقات قائم کئے ان پر دونوں توبہ و اِستغفار کریں اور نکاح کے معاملے میں باطل اور فاسد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔[۳]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۵۸/۲۱ الف)

شوہر کے لاپتہ ہونے کی بناء پر بیوی کا نکاح دُوسری جگہ کرنے کی صورت میں پہلا شوہر واپس آجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص کی ۱۹۳۹ء میں شادی ہوئی تھی، یہ شخص ۱۹۴۰ء میں برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہوگیا، جاپان، سنگاپور، ملایا میں جاکر قید ہوگیا، لہٰذا ۵ سال تک لاپتہ رہا، کوئی پتہ نہ چلا مرگیا یا زندہ ہے، گورنمنٹ کے دفتروں سے بھی معلوم کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا، پنچائیت سے انتظار کے بعد اس شخص کے وارثوں نے فیصلہ کرایا کہ بڑا بھائی نہ معلوم مرگیا یا زندہ ہے؟ ۵ سال سے کچھ خبر نہیں، لہٰذا چھوٹے بھائی سے نکاح کروادیا، نکاح کے بعد لڑکا بھی پیدا ہوا، جو شخص لاپتہ تھا وہ ۱۹۴۶ء میں قید سے چھوٹ کر آگیا، اب سوال یہ ہے کہ پہلے خاوند کا نکاح باقی رہا یا نہیں؟ پہلا خاوند بیوی کو گھر میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس شخص نے بیوی کو گھر میں رکھ لیا ہے تو اس کی امامت دُرست ہے یا نہیں؟ براہِ کرم جواب دیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت بدستور پہلے شوہر یعنی بڑے بھائی ہی کے نکاح میں ہے،[۴] اور اس کی واپسی کے بعد اس پر فرض ہے کہ اسی شوہر کے پاس جائے اور اسی کے پاس رہے، اور

---

(۱) رد المحتار کتاب المفقود ج:۴ ص:۲۹۷ (طبع سعید)

(۲) وفی الشامیة کتاب الطلاق، بابُ العدّة، مطلبٌ فی النکاح الفاسد والباطل ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید) أما نکاح منکوحة الغیر ومعتدّته .... لم یقل أحدٌ بجوازہٖ فلم ینعقد أصلًا .... الخ. وفی الھندیة کتاب النکاح الباب الثالث ج:۱ ص:۲۸۰ (طبع ماجدیه) لا یجوز للرجل أن یتزوّج زوجة غیرہٖ وکذٰلک المعتدّة .... الخ.

(۳) وفی الشامیة تحت مطلب فی النکاح الفاسد والباطل ج:۳ ص:۵۱۶ (طبع سعید). أنه لا فرق بین الفاسد والباطل فی النکاح بخلاف البیع .... الخ.

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے ''حیلۂ ناجزہ'' ص:۶۷ تا ۷۰ ''واپسی مفقود کے اَحکام''۔

وہ پہلا شوہر اسے بیوی بنا کر رکھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ اسے رکھنا ہی چاہئے اور اس کی غیر حاضری میں چھوٹے بھائی سے جو نکاح ہوا اس کا حکم اور اس سے ہونے والی اولاد کا حکم اس بات پر موقوف ہے کہ پنچائیت نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ کس بنیاد پر کیا تھا؟ اس پنچایت میں کون لوگ شامل تھے؟ اور انہوں نے پہلے شوہر کو تلاش کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا تھا؟ اگر ان باتوں کا جواب معلوم ہوجائے تو اس نکاح کا حکم بتایا جاسکتا ہے۔

بہرحال اب عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر کے پاس چلی جائے،(۱) البتہ جب تک دُوسرے شوہر کے نکاح کا حکم معلوم نہ ہوجائے اس پہلے شوہر کو چاہئے کہ وہ احتیاطاً تین ایام ماہواری گزرنے تک اس بیوی سے ہم بستری نہ کرے۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۲/۳ھ

تقسیمِ ہند و پاک کے وقت فسادات میں لاپتہ ہونے والے شوہر کی بیوی کا حکم

سوال:- خلاصۂ سوال یہ ہے کہ بوقتِ تقسیم ہند و پاک بیوی دہلی سے پاکستان منتقل ہوگئی، اور شوہر وہیں رہا، اب معلوم نہیں کہ وہ فسادات کی نذر ہوگیا یا زندہ ہے؟ بہرحال لاپتہ ہے کہ زندہ ہے یا مردہ؟ اور کہاں ہے، اگر ہے؟ تو اب اس بیوی کی اس کی زوجیت سے گلوخلاصی شرعاً ہوچکی ہے یا نکاح قائم ہے؟ اگر قائم ہے تو کیسے خلاصی ہو؟....الخ۔

جواب:- آپ کی ہمشیرہ کا نکاح ابھی مسمّٰی غلام محمد سے قائم ہے، اگر اس کا کسی طرح پتہ معلوم ہوسکے تو اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، اور اگر وہ لاپتہ ہو تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ کیا جائے۔(۳) عدالت کے فسخ کئے بغیر نکاح فسخ نہ ہوگا۔(۴)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۴۴/۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۲،۱) دیکھئے حیلہ ناجزہ ص:۶۷ تا ۷۰ ”واپسی مفقود کے احکام“۔

(۴،۳) مذکورہ صورت میں فسخ نکاح کا مفصل و مدلل طریقۂ کار سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

زوجۂ غائب غیر مفقود کے فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- زید نے ہندہ کے ساتھ نکاح کیا، دو چار دن ہندہ کو گھر میں رکھنے کے بعد زید اپنے بڑے حقیقی بھائی کی بیوی زینت کو اغواء کر کے لے گیا اور ہندہ میکے واپس آگئی، اب زید کا کہیں پتہ نہیں ہے، البتہ وہ اپنے والدین کی طرف خط بھیجتا رہتا ہے، ہندہ پانچ سال سے ازدواجی زندگی سے محروم ہے، ہندہ کسی دُوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ شوہر کا خط اس کے والدین کے پاس آتا ہے، اس لئے یہ صورت غائب غیر مفقود کی ہے، اس صورت میں اوّل تو ہندہ کو یہ چاہئے کہ وہ زید کے والدین کے ذریعہ زید سے طلاق حاصل کرنے یا خلع کرنے کی کوشش کرے، لیکن اگر وہ اس پر راضی نہ ہو اور ہندہ کے خرچ کا انتظام نہ ہو، یا اس کو اپنی زندگی عفت کے ساتھ گزارنی مشکل ہو تو اس کے لئے مندرجہ ذیل صورت ہوسکتی ہے:-

ہندہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے گواہوں سے زید کے ساتھ اپنا نکاح ہونا ثابت کرے، پھر یہ ثابت کرے کہ وہ مجھ کو نفقہ دے کر نہیں گیا، اور نہ وہاں سے اس نے میرے لئے نفقہ بھیجا، نہ یہاں کوئی انتظام کیا، اور نہ میں نے نفقہ معاف کیا، اور ان سب باتوں پر حلف بھی کرے، عدالت زید کے پاس حکم بھیجے کہ یا تو خود حاضر ہو کر اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو یا اس کو بلالو یا وہیں سے کوئی انتظام کرو، ورنہ اس کو طلاق دے دو، اور اگر تم نے ان باتوں میں سے کوئی بات نہ کی تو پھر ہم خود تم دونوں میں تفریق کردیں گے، اور یہ حکم بذریعہ ڈاک بھیجنا کافی نہیں بلکہ عدالت یہ حکم نامہ دو ثقہ آدمیوں کو سنا کر اُن کے حوالے کرے، یہ دونوں شخص زید کو حکم نامہ پہنچا کر اس سے جواب طلب کریں اور جو کچھ جواب تحریری یا زبانی دے اُسے محفوظ رکھ کر عدالت کے سامنے آکر اس کی گواہی دیں، ہاں! اگر زید ایسے دُور دراز ملک میں ہو جہاں آدمی بھیجنا ممکن نہ ہو تو پھر آدمی بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ بہرصورت! اگر اس تمام کاروائی کے بعد بھی زید کوئی صورت قبول نہ کرے تو عدالت ایک مہینے کے مزید انتظار کا حکم دے اس مدّت میں بھی اگر اس کی شکایت رفع نہ ہوئی تو اس عورت کو زید کی زوجیت سے الگ کردے، اس کے بعد ہندہ عدّتِ طلاق گزار کر دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۲/۲۸ الف)

---

(۱) مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

زوجۂ مفقود کا حکم

سوال:- ایک بیوی کا شوہر تقریباً دو سال سے نہیں ہے، اور کچھ پتہ نہیں چلتا، اب یہ بیوی نان نفقہ کی وجہ سے کسی دُوسرے آدمی کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ عورت کی خلاصی کی صورت یہی ہے کہ مذکورہ عورت کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے اور مبتلا بالمعصیۃ ہونے کے اندیشے کی بناء پر فسخِ نکاح کا مقدمہ دائر کرے، عدالت شوہر مذکورہ کو عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور کرے، اور اگر ثابت ہوجائے کہ وہ نہیں آتا تو اس کی طرف سے یہ عورت کو طلاق دیدے، اس کے بعد عورت عدّتِ طلاق گزار کر دُوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، اگر عدالت مذکورہ بالا کاروائی کرلے تو اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا،[1] ہاں! دعویٰ دائر کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ خلع یا شوہر کے مفقود ہونے نہ ہونے کا دعویٰ نہ ہو بلکہ شوہر پر نان ونفقہ ادا نہ کرنے کا دعویٰ ہو کیونکہ خلع اور مفقود کے دعوؤں سے متعلق موجودہ عدالتیں جو فیصلے کررہی ہیں ان میں شرعی شرائط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۶۸ الف)

فسخِ نکاح سے متعلق برطانوی شرعی کونسل کے اہم سوالات کے جوابات

سوال:- بگرامی خدمت اقدس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر وعافیت ہوگا

برطانیہ میں مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لئے شرعی ضرورت کے ماتحت شرعی کونسل کا قیام چند سال ہوئے کیا گیا جس کا عمل جاری ہے، شرعی کونسل وہ عائلی مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو عموماً فسخِ نکاح سے متعلق ہوتے ہیں، برطانیہ میں مابین زوج و زوجہ، ہونے والے اختلافات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ زوجہ کو مار پیٹ اور دُوسری اذیتوں سے ستایا جاتا ہے اور طلاق دے

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ اور ۴۴۸ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

کر علیحدہ بھی نہیں کیا جاتا، بناء بریں زوجہ برطانوی کورٹ سے رُجوع کرتی ہے تاکہ کورٹ دونوں کے درمیان علیحدگی کردے، کورٹ اپنی کوشش دونوں کے درمیان میل ملاپ کی کرتی ہے، ناممکن ہونے پر دونوں کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کردیتی ہے، چونکہ فیصل عیسائی غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اس فیصلے سے عورت شرعاً علیحدہ نہیں ہوتی، اس لئے وہ شرعی کونسل سے رُجوع کرتی ہے۔

شرعی کونسل دوبارہ دونوں کے درمیان تنازع کے پیشِ نظر میل ملاپ کی سعی کرتی ہے، ناکام ہونے کی صورت میں شرعی کونسل کی علماء کی کمیٹی دونوں کے درمیان نکاح فسخ کرکے شرعی علیحدگی کردیتی ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے بارے میں درج ذیل چند ضروری باتوں میں جناب کی فوری رہبری کی ضرورت ہے، اُمید ہے کہ جناب زحمت گوارا فرماکر جلد جواب سے نوازیں گے۔

۱:- برطانیہ کی کورٹ سے عورت کی علیحدگی کے فیصلے کے بعد شرعی کونسل اگر اس فیصلے پر اس معنیٰ میں مطمئن نہ ہو کہ واقعی دونوں کے درمیان میل ملاپ کی کوئی صورت ممکن نہیں اور علیحدگی کے سوا چارۂ کار نہیں تو کیا اس کے بعد بھی شرعی کونسل دونوں کے درمیان علیحدگی کے لئے مکمل کاروائی کی شرعاً مکلّف ہے؟ یا برطانوی کورٹ کی کاروائی کافی ہے؟

۲:- زوجین پاکستانی ہوں اور نکاح بھی پاکستان میں ہوا ہو پھر دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک:- زوج پاکستان میں ہے قانونی رُکاوٹوں کی وجہ سے وہ برطانیہ آنہیں سکتا، اور لڑکی پاکستان رہنے پر تیار نہیں اور لڑکا طلاق دینے پر آمادہ نہیں، اس صورت میں مقدمہ شرعی کونسل میں آتا ہے، اس صورت میں شرعی کونسل اس میں کیا طریقہ اختیار کرے؟

۳:- زوجین کا نکاح پاکستان میں قانونی طور پر رجسٹر ہونے کی صورت میں اور لڑکا پاکستان میں ہے اور لڑکی برطانیہ میں اور لڑکی شرعی کونسل سے رُجوع کرتی ہے، لڑکا یہ کہتا ہے کہ عقدِ نکاح پاکستان میں ہوا ہے اس لئے فسخ بھی پاکستان ہی میں ہوگا، ایسی صورت میں شرعی کونسل اس نکاح کے فسخ کرنے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

۴:- برطانیہ کی کورٹ میں لڑکی کے فسخِ نکاح کے جواب میں زوج اپنے وکیل کی معرفت یہ لکھواتا ہے کہ یہ شادی نبھنے والی نہیں اس لئے اسے فسخ کرنے اور توڑنے میں مجھے حرج نہیں، یہ اور اس کے ہم معنیٰ بات لکھواتا ہے، (ایک کاپی بطور نمونہ ساتھ منسلک ہے) تو کیا اس صورت میں یہ بات لڑکے کی طلاق یا فسخِ نکاح پر رضامندی میں شمار ہوکر یہ شرعی جدائی ہوگی یا نہیں؟ ان چند ضروری باتوں

کے بارے میں جناب ہی سے اطمینان ہوسکتا ہے، بناء بریں جناب کی گوناگوں مصروفیات کے احساس کے باوجود زحمت کی گستاخی کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ جلد جواب سے نوازیں گے۔

محترم حضرت مولانا محمد رفیع مدظلہٗ کی خدمت میں سلامِ مسنون اور دُعا کی درخواست۔

احقر

یعقوب منشی القاسمی

۴؍ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ

۱۴؍مارچ ۱۹۹۷ء

Dear Sirs,

Re: Hashim V Hashim

We have now been instructed by Mr. Mohammad Amjad Hashim in relation to the unfortunate breakdown of his marriage. He has, in addition to this, brought with him a copy of the Divorce Petition which he has received from the Court. Mr. Hashim is very upset about the particulars contained in the divorce petition, he denies each and every allegation but realises that the marriage has innetrievably broken down and is therefore prepared to agree to the divorce proceeding on the basis of your client's allegations of behaviour.

Our client is advising us under the Green Form as he is a full-time student.

We would be obliged if you could confirm that your client would be prepared to withdraw her claim for costs as we not that she also is instructing you under the Green Form. If your Client is not prepared to withdraw her claim for costs we reserve the right to raise counter allegations at any subsequent hearing in relation to the issue of costs.

We look forward the hearing from you in relation to this. Once we have comfirmation from you in relation to the costs issue we will forward the Acknowledgement of service to the court.

جواب:- سوال پر غور کیا گیا، اور ذکر کردہ مسائل کی تحقیق کی گئی، ذیل میں نمبروار جواب ملاحظہ ہو:-

۱:- اس صورت میں شرعی کونسل کو میاں بیوی کے درمیان نکاح فسخ کرنے کے لئے مکمل شرعی کاروائی کرنا ضروری ہے، صرف یہ بات کہ زوجین کے درمیان نبھاؤ مشکل نظر آتا ہے، شرعی کونسل کی طرف سے فسخِ نکاح کی بنیاد نہیں بن سکتی، خواہ یہ نتیجہ برطانوی عدالت نے اخذ کیا ہو یا شرعی کونسل نے، بلکہ شوہر کا متعنّت ہونا، سخت مار پیٹ کرنا، مفقود ہونا، مجنون ہونا، اور عنّین وغیرہ ہونا اس میں داخل ہیں، اور ان اسباب کی تحقیق کے لئے بھی صرف برطانوی عدالت کی کاروائی کافی نہیں، کیونکہ اوّلاً تو جج غیر مسلم ہوگا، دُوسرے وہ ان شرعی اُمور کا احاطہ نہیں کرے گا جو فسخِ نکاح کے لئے شرعاً درکار ہیں، پھر اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب نہ پایا جائے اور نبھاؤ مشکل ہو تو شرعی کونسل شوہر کو خلع یا طلاق علیٰ

مالِ پر راضی کرنے کی کوشش کرے، اس سے زائد کوئی کاروائی اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، لہٰذا وہ مقدمہ خارج کردے۔

۲:- اگر لڑکا پاکستان میں ہے، اور وہ لڑکی کو پاکستان میں خوش اُسلوبی کے ساتھ رکھنے پر تیار ہے، اس لئے وہ طلاق دینا نہیں چاہتا تو یہاں فسخِ نکاح کی شرعاً کوئی وجہ نہیں، لہٰذا شرعی کونسل کو بجائے فسخِ نکاح کے، لڑکی کو پاکستان آنے، اور شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ کرنا چاہئے، بصورتِ دیگر مقدمہ خارج کردینا چاہئے، البتہ اس صورت میں بھی اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب موجود ہو، مثلاً شوہر مجنون یا عنّین ہو تو شرعی کونسل برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی شوہر کو نوٹس جاری کرکے فسخِ نکاح کی کاروائی کرسکتی ہے، مگر اس میں تمام شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور اگر معتبر اسبابِ فسخ میں سے کوئی سبب موجود نہ ہو اور شرعی کونسل شوہر و بیوی کے درمیان خوش اُسلوبی سے رہنے کی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتا نہ دیکھے تو پھر باہمی رضامندی سے ان کے درمیان خلع کرادے یا کسی قدر مال کے عوض شوہر سے طلاق دِلوادے۔

۳:- اگر یہاں بھی یہ صورت ہے کہ لڑکا خوش اُسلوبی سے لڑکی کو پاکستان میں رکھنے کے لئے تیار ہے، لیکن لڑکی برطانیہ سے پاکستان آنا پسند نہیں کرتی تو یہ لڑکی کی غلطی ہے، اس کو چاہئے کہ پاکستان آئے اور شوہر کے ساتھ رہے، لہٰذا شرعی کونسل یہاں بھی لڑکی کو اسی پر آمادہ کرے اور ان کا نکاح فسخ نہ کرے، کیونکہ فسخِ نکاح کی کوئی شرعی وجہ یہاں موجود نہیں ہے، اور اگر کوئی معتبر وجہِ فسخ موجود ہو تو صورتِ مسئولہ میں فسخِ نکاح کی کاروائی برطانیہ میں کی جائے یا پاکستان میں؟ اس معاملے میں کوئی صریح حکم تو کتبِ فقہ میں نہیں ملا، نہ ملنے کی اُمید ہے، لیکن قواعد کا تقاضا یہ ہے کہ اگر عورت ناشزہ ہوکر برطانیہ میں رہ رہی ہے تو شوہر کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے کہ فسخِ نکاح کی کاروائی پاکستان میں کی جائے، لیکن اگر شوہر خود اُسے وہاں اپنی رضامندی سے چھوڑ کر چلا گیا ہے، اور اس کے پاس پاکستان جانے کے وسائل نہیں ہیں تو اس صورت میں شرعی کونسل کاروائی کرسکتی ہے، البتہ جہاں شوہر کے حالات کی تحقیق مثلاً جنون یا نامردی کا ثبوت درکار ہو، وہاں وہ متعلقہ ثبوت کی کاپی شوہر کو بھیج کر اس کا موقف معلوم کرلے، اور ضرورت ہو تو اس کام کے لئے پاکستان میں علماء کی کسی مجلس کو اپنا نمائندہ بناکر بھی حالات کی تحقیق کرسکتی ہے۔

۴:- شوہر کے وکیل نے منسلکہ کاپی میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ اگرچہ طلاق پر شوہر کی رضامندی کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن بذاتِ خود انشاءِ طلاق کے لئے کافی نہیں، کیونکہ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ: ”لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ نکاح ناقابلِ تلافی طور پر ٹوٹ چکا ہے، لہٰذا وہ طلاق کی کاروائی سے اتفاق

کرنے کے لئے تیار ہے'' یہاں نکاح ٹوٹنے کے لئے صرف محسوس کرنے کا ذکر ہے، نیز اگلے جملے سے یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ طلاق کی کاروائی ابھی نہیں ہوئی گو وہ آئندہ کرنے سے متفق ہے، ان میں سے کوئی لفظ انشاءِ طلاق کا نہیں ہے۔ البتہ وکیل سے شوہر نے جو الفاظ کہے، یا اسے لکھ کر دیئے، اگر وہ انشاءِ طلاق کے الفاظ ہوں تو اُنہیں طلاق کے لئے کافی سمجھا جاسکتا ہے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ٹھیک ٹھیک وہی الفاظ لکھ کر بھیجے جائیں، منسلکہ پرچے میں وکیل کے الفاظ ہیں، شوہر کے الفاظ نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۷/۱۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۶۱)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- زید نے ہندہ کو بے عزّت کرکے گھر سے نکال دیا، مسلسل سات سال ہوچکے ہیں، نہ تو آج تک نان نفقہ دیتا ہے، نہ زوجیت میں رکھنا چاہتا ہے، معلق کردیا ہے، ہرچند ثالثین نے سمجھایا کہ اگر رکھنا نہیں چاہتے تو طلاق دے دو، زید کسی بات پر راضی نہیں ہوتا، بینوا توٴجروا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہندہ اور اس کے اولیاء کو چاہئے کہ وہ شوہر سے خلع کرنے کی کوشش کریں، اگر وہ اس پر راضی نہیں، تو مسلمان عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت شوہر کو حکم دے گی کہ وہ یا تو عورت کے حقوق ادا کرے یا طلاق دے، اگر شوہر ان میں سے کسی صورت پر راضی نہ ہو تو عدالت کو اختیار ہوگا کہ وہ شوہر کے قائم مقام ہوکر عورت کو طلاق دیدے۔(۱)

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) اس مسئلے کی مفصل تحقیق اور حوالہ جات اور فسخِ نکاح کا مکمل طریقہ کار حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

استفتاء:- کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ جو شوہر استطاعت کے باوجود اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی راضی نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کے لئے مذکورہ شوہر سے خلاصی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الجواب حامدًا و مصليًا

۱:- اگر کوئی شوہر ایسا ہو جو باوجود استطاعت کے اپنی بیوی کو نان ونفقہ نہیں دیتا، اور عورت کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اور شوہر طلاق یا خلع کے لئے بھی تیار نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ مالکی مذہب کے مطابق اس شوہر سے عدالت کے ذریعہ خلاصی حاصل کر سکتی ہے۔

۲:- خلاصی حاصل کرنے کے لئے عورت اپنا مقدمہ کسی مسلمان جج کی عدالت میں پیش کرے اور یہ ثابت کرے کہ وہ فلاں کی بیوی ہے اور وہ باوجود استطاعت کے اس کو نان ونفقہ نہیں دیتا اور نہ اس کے پاس نان ونفقہ کا کوئی انتظام ہے، جس سے اس کو سخت ''ضرر'' لاحق ہے اور وہ اس وجہ سے اس کی زوجیت سے نکلنا چاہتی ہے۔

۳:- عورت ''فلان'' کے ساتھ نکاح اور اس کا مذکورہ رویہ گواہوں سے ثابت کرے، اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں، یا گواہ ہوں لیکن اس نے پیش نہ کئے تو اگر شوہر عدالت میں حاضر ہو تو اس سے قسم لی جائے گی، اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ عورت کا دعویٰ دُرست ہے، اب جج شوہر سے کہے کہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو، یا طلاق/خلع دو، ورنہ ہم تفریق کردیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ ظالم کسی صورت پر عمل نہ کرے تو قاضی کوئی مہلت دیئے بغیر اسی وقت بیوی پر طلاق واقع کردے۔

۴:- لیکن شوہر یا اس کا وکیل عدالت میں حاضر نہ ہو، جیسا کہ آج کل عموماً ایسا ہی ہے، اور عدالت کے بار بار نوٹس اور سمن جاری کرنے اور شوہر نوٹس اور سمن کے بارے میں مطلع ہونے کے باوجود حاضرِ عدالت نہ ہوتا ہو، تو اگر بیوی کے پاس گواہ موجود ہوں اور وہ پیش بھی کرے تو جج ان کی گواہی کی بنیاد پر بیوی کے حق فسخِ نکاح کا فیصلہ جاری کرے، اور اگر عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں، یا ہوں لیکن وہ پیش نہ کرے تو شوہر کا بار بار بلانے کے باوجود عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم سے انکار (نکول) سمجھا جائے گا، اور اس انکار کی بنیاد پر عدالت شوہرِ غائب کے خلاف اور بیوی کے حق میں فسخِ نکاح کا فیصلہ جاری کرلے گی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوہر اگر غائب ہو اور عورت کے پاس گواہ موجود نہ ہوں، یا موجود ہوں لیکن عورت نے پیش نہ کئے تو اس صورت میں اس غائب شوہر کے خلاف اور عورت کے حق میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ یہ ''قضاء علی الغائب'' کا مسئلہ ہے، جو مذہبِ حنابلہ سے لیا گیا، یعنی ان کے ہاں غائب کے خلاف فیصلہ جائز ہے، اور یہی موقف حضراتِ شافعیہؒ کا بھی ہے، اور ان کے ہاں مدعی کے پاس گواہ ہوتے ہوئے بھی اگر مدعی گواہ پیش نہ کرے، تو مدعا علیہ سے قسم لینا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا دُرست ہے، یہی موقف حضراتِ شافعیہؒ کا بھی ہے، اور حضراتِ حنفیہؒ میں سے حضرت امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔ لیکن اگر مدعا علیہ غائب ہو تو اس پر قسم پیش کرنا چونکہ متعذر ہوتا ہے اس لئے بار بار بلانے کے باوجود اس کا عدالت میں حاضر نہ ہونا اس کی طرف سے قسم سے انکار (نکول) سمجھا جائے گا، اور اب اس انکار کی بنیاد پر مدعی کے حق میں فیصلہ جاری کرنے کے لئے مدعی سے قسم لینا ضروری نہیں، جیسا کہ حنفیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

۵:- بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ درخواست برائے فسخِ نکاح، نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر دے، اور جج اپنے فیصلے میں بھی اسی کو بنیاد بنائے۔ ''خلع'' کا طریقۂ کار ہرگز اختیار نہ کرے، اس لئے کہ یک طرفہ خلع شرعاً کسی کے نزدیک بھی جائز اور معتبر نہیں۔ تاہم اگر کسی فیصلے میں بنیادِ فیصلہ فی الجملہ صحیح ہو، یعنی شوہر کا ''تعنّت'' ثابت ہو رہا ہو، البتہ عدالت نے فسخ کے بجائے خلع کا راستہ اختیار کیا ہو، اور خلع کا لفظ استعمال کیا ہو، ....

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........تو ایسی صورت میں خلع کے طور پر تو یک طرفہ فیصلہ دُرست نہ ہوگا، تاہم فسخِ نکاح کی شرعی بنیاد پائے جانے کی وجہ سے اس فیصلے کو معتبر قرار دیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس فیصلے کی بنیاد پر نکاح فسخ ہوگیا ہے، اور عورت عدّتِ طلاق گزار کر کسی دُوسری جگہ اگر چاہے تو نکاح کرسکتی ہے، بشرطیکہ یہ فیصلہ مذکورہ بالا شرائط اور طریقۂ کار کے مطابق ہو۔

یاد رکھئے! کہ شرعاً فیصلہ معتبر ہونے کی صورت میں عدّت کا اعتبار فیصلہ جاری ہونے کی تاریخ سے ہوگا۔

(عربی حوالہ جات ملاحظہ ہوں)

فی المغنی لابن قدامة: فان امتنع (المدعٰی علیه) من الحضور أو تواریٰ فظاهر کلام أحمد: جواز القضاء علیه لما ذکرنا عنه فی روایة حرب. وروی عنه أبوطالب فی رجل وجد غلامه عند رجل فأقام البینة أنه غلامه فقال الذی عنده الغلام: أودعنی هٰذا رجل، فقال أحمد: أهل المدینة یقضون علی الغائب یقولون: انه لهٰذا الذی أقام البینة وهو مذهب حسن وأهل البصرة یقضون علی غائب یسمونه الإعذار وهو اذا ادّعٰی علٰی رجل الفًا وأقام البینة فاختفی المدعٰی علیه یرسل الٰی بابه فینادی الرسول ثلٰثًا فان جاء والا قد اعذروا الیه، فهٰذا یقوّی قول أهل المدینة وهو معنی حسن وقد ذکر الشریف أبوجعفر وأبوالخطاب أنه یقضی علی الغائب الممتنع وهو مذهب الشافعی، لأنه تعذر حضوره وسؤاله فجاز القضاء علیه کالغائب البعید، بل هٰذا أولٰی لأن البعید معذور وهٰذا لا عذر له اهـ.(ج:۹ ص:۱۱۱).(۱)

وفی الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف: فان امتنع من الحضور سمعت البینة وحکم بها فی احدی الروایتین وهو المذهب اهـ.(ج:۱۱ ص:۳۰۲).(۲)

وفی الحاوی الکبیر للعلامة الماوردیؒ: فان قال المدعی: لیست لی بینة ، فقد اختلف أصحابنا، هل یکون هٰذا الامتناع من الحضور کالنکول فی ردّ الیمین علی المدعی أم لا؟ علٰی وجهین: احدهما: انه لا یجعل نکولا .... والوجه الثانی: وهو أشبه أن یجعل کالنکول بعد النداء علٰی بابه بمبلغ الدعوی واعلامه بأنه یحکم علیه بالنکول لوجود شرطی النکول فی هٰذا النداء اهـ.(ج:۱٦ ص:۳۰۲).(۳)

وفی المبدع: وان نکل قضی علیه بالنکول نصّ علیه واختاره عامة شیوخنا اهـ.(ج:۱۰ ص:٦۴).(۴)

وفی الانصاف: هو المذهب.(ج:۱۱ ص:۲۵۴).(۵)

وفی الفقه الاسلامی وأدلّته: لٰکن المختار عند الحنابلة القول بعدم ردّ الیمین.(ج:٦ ص:۵۱۷).(٦)

وفی المغنی لابن قدامةؒ: وان قال المدعی: لا أرید اقامتها (البینة) وانما أرید یمینه اکتفی بها استحلف لأن البینة حقه فاذا رضی باسقاطها وترک اقامتها فله ذٰلک کنفس الحق اهـ. (ج:۹ ص:۸۹)(۷) کذا فی الانصاف (ج:۱۱ ص:۲٦۳) و المبدع (ج:۱۰ ص:۷۲) وروضة الطالبین (ج:۲ ص:۴۰) وزاد المحتاج (ج:۴ ص:۵۴۱).

وفی البدائع: حتی لو قال المدعی: لی بینة حاضرة ثم أراد أن یحلف المدعی علیه لیس له ذٰلک عنده، وعندهما له ذٰلک اهـ. (ج:٦ ص:۲۲٦).(۸)

واللہ تعالٰی أعلم
عصمت اللہ عصمہ اللہ
دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴
۱۴۱۹/۹/۱۴ھ

الجواب صحیح
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمود اشرف غفر اللہ لہٗ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ

---

(۱) ج:۱۴ ص:۹٦ (طبع دار عالم الکتب، الریاض). (۲) (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت).
(۳) (طبع دار الکتب العلمیة بیروت). (۴) (طب المکتب الاسلامی بیروت).
(۵) (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت). (٦) (طبع دار الفکر بیروت).
(۷) ج:۴ ص:۷۲ (طبع دار عالم الکتب، الریاض). (۸) (طبع رشیدیه کوئٹه).

نفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- میری شادی ہوئے سولہ[۱۶] سال ہوگئے، نکاح کے بعد ایک ہفتہ سسرال رہی، پھر والدین کے گھر چلی آئی، شوہر نے آٹھ سال تک کوئی خرچہ وغیرہ نہیں دیا، آٹھ سال بعد پھر بیوی کو لے گیا، تھوڑا عرصہ رکھنے کے بعد پھر گھر سے نکال دیا، اس دوران بیوی کو اُمیدواری تھی جس سے ایک بچی پیدا ہوئی، جس کی عمر اس وقت دس سال ہے، اس کی پرورِش نانا، نانی نے کی، بچی کی پیدائش کے بعد ابھی تک لڑکی میکے میں ہے، لڑکی کے باپ نے پھر بھی کوئی خبر نہیں لی، یہاں تک کہ لڑکی کا نانا چند ماہ ہوئے فوت ہوگیا، پھر بھی نہ تو سسرال والوں نے اور نہ ہی بیوی کا خاوند باپ کی تجہیز و تکفین میں شامل ہوا۔ اب ستم بالاستم یہ کہ چند دن ہوئے اطلاع ملی کہ خاوند نے دُوسری شادی کرلی ہے، اب میں اپنے شوہر سے خلاصی چاہتی ہوں اور سولہ سال کا اپنا خرچہ اور بچی کے خرچے کا مطالبہ کرنا چاہتی ہوں، نیز بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کرکے یہ ثابت کریں کہ آپ کا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا اور یہ کہ وہ اتنے عرصے سے نہ اپنا گھر آباد کرتا ہے اور نہ نفقہ کا انتظام کرتا ہے، اس پر عدالت آپ کے شوہر کو بلوا کر اُسے مجبور کرے گی کہ یا تو وہ نفقہ کا انتظام کرے اور تمام حقوقِ زوجیت ادا کرے، یا آپ کو طلاق دے، اگر آپ کا شوہر دونوں میں سے کوئی بات تسلیم کرلے تو ٹھیک ہے، ورنہ عدالت آپ کا نکاح اس سے خود فسخ کردے گی، اس کے بعد عدّت گزار کر آپ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں[۱]، آپ کا اور آپ کی بچی کا پچھلے تمام سالوں کا نفقہ آپ کے شوہر پر دیانۃً واجب ہے، اور اُسے ادا کرنا چاہئے، ادا نہ کرنے سے وہ سخت گناہگار ہوگا، لیکن عدالت کے ذریعہ پچھلی مدّت کا نفقہ حاصل کرنے میں جو تفصیل ہے وہ آپ کو پہلے لکھی جاچکی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۲۴ ج)

نان و نفقہ نہ ہونے اور عصمت کے خطرے کے پیشِ نظر عورت کے لئے فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- مسمّٰی محمد صدیق ولد گل زمان عمر ۱۳ سال کا عقد نکاح بحالت غائب ہونے محمد

---

(۱) تفصیل اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

صدیق کے ہمراہ زرینہ دختر کالا عمر ۸ سال تخمیناً، بحالتِ نابالغی بوکالت پدر ہوا، والدین ہی نے ایجاب وقبول کیا، تین سال کے بعد لڑکا بسلسلۂ ملازمت امریکہ چلا گیا، دو سال تک لڑکے سے خط و کتابت کا رابطہ قائم رہا، لڑکی جوان ہونے پر ورثاء نے لڑکے کو لکھا کہ رُخصتی پوری ہوجائے، لڑکے نے جواب میں لکھ دیا کہ میں یہاں شادی کر چکا ہوں، میرا پیدائشی سرٹیفکیٹ بھیج دو، چنانچہ سرٹیفکیٹ بھیج دیا گیا، مگر تین ماہ بعد رجسٹری جس کے ذریعہ سرٹیفکیٹ بھیجا گیا تھا واپس آگئی، اس پر لڑکی والوں نے لڑکے کو بلانے اور شادی پر زور دیا کہ اندیشہ عصمت دری کا ہے، مگر لڑکے نے مزید خط و کتابت بند کردی، اس کے بعد متعدّد خطوط بھیجے گئے، مگر کسی کا جواب نہ آیا، یہاں تک کہ دو سال گزر گئے، باوجود کوشش بسیار کے لڑکے کا کوئی سراغ نہ مل سکا، اور لڑکی جوان ہے، جس کو گھر پر رکھنا مشکل ہے، جو حکم ہو تحریر فرمایا جائے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مندرجہ واقعات دُرست ہیں تو عورت کو چاہئے کہ وہ نان و نفقہ نہ ہونے اور عصمت کو خطرہ ہونے کی بنیاد پر عدالت میں فسخِ نکاح کا دعویٰ کرے، عدالت شریعت کے مقرّرہ اُصولوں کے مطابق تحقیق کرے، اگر یہ محسوس کرے کہ عورت حالتِ مجبوری میں ہے، تو وہ ایک سال صبر کے بعد نکاح فسخ کرسکتی ہے۔[1]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۴۲/۱۹ الف)

نفقہ نہ دینے کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا عدالتی فیصلہ شرعاً دُرست ہے

سوال:- ایک عورت مسماۃ شمیم کی شادی آج سے دس گیارہ برس قبل ایک شخص ڈاکٹر کرامت مرزا سے ہوئی، اور شمیم کے بطن سے ڈاکٹر کرامت کی ایک لڑکی پیدا ہوئی، شادی کے ایک سال بعد ڈاکٹر کرامت مرزا صاحب ولایت چلا گیا، ولایت جانے کے بعد اپنی بیوی اور بچی کی کفالت نہیں کی، اور خرچہ بھی روانہ نہیں کیا، اور نہ کوئی خط و کتابت کی، بیوی سخت پریشان و حیران پھرتی رہی، اس کے بعد اُس نے مجبور ہوکر سِول کورٹ لاہور میں دعویٔ تنسیخ نکاح دائر کردیا، عدالت میں فسخ نکاح کا مقدمہ تقریباً آٹھ دس ماہ تک جاری رہا، اس دوران بھی کرامت مرزا نے عدالتی اطلاع پر توجہ نہ دی، نہ اصالۃً نہ وکالۃً۔

چنانچہ عدالت نے ضروری کاروائی کے بعد مسماۃ شمیم کے حق میں تنسیخِ نکاح کا فیصلہ صادر کردیا جس کی نقل ہمراہ سوال ہذا مرسل ہے، اس کے بعد مسماۃ شمیم نے تین ماہ عدّت گزار کر ایک

(۱) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص:۴۶۱ کے حاشیہ نمبر۱ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مصدقہ فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

دُوسرے شخص مسمّٰی ڈاکٹر احمد سے نکاح کرلیا، مگر مقامی نکاح خواں نے یہ نکاح پڑھنے سے انکار کردیا اور یہ نکاح ایک دُوسرے شخص سے پڑھوا دیا گیا، اس کے بعد یہ عورت مسماۃ شمیم، ڈاکٹر احمد کے گھر آباد ہوگئی اور اس کے بطن سے ڈاکٹر احمد کے دو بچے بھی پیدا ہوئے، چار پانچ سال گزر جانے کے بعد ڈاکٹر احمد کو بعض لوگوں نے شک میں مبتلا کردیا کہ یہ نکاح صحیح نہیں ہے اور بعض نے تو یہاں تک وہم ڈال دیا کہ یہ بدکاری ہے، اس کی وجہ سے مسماۃ شمیم کے خاندانی افراد بھی پریشان ہیں، اب فتویٰ مطلوب ہے کہ

۱:- یہ نکاح دُرست ہے یا نہیں؟

۲:- یہ کہ اب اس موجودہ صورت میں صحیح طریقِ کار کیا ہونا چاہئے؟

تنقیح:-

۱:- آپ نے عدالت کا پورا فیصلہ ساتھ نہیں بھیجا، پورا فیصلہ روانہ فرمائیے۔

۲:- یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر کرامت کے نام عدالت نے کوئی نوٹس بھیجا تھا یا نہیں؟ اگر بھیجا تھا تو کس مضمون کا تھا؟ اور اس میں اس کو نان ونفقہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا یا نہیں؟

پچھلے دنوں دار الافتاء میں سوالات بہت زیادہ آگئے تھے، اس لئے آپ کے لفافے کا نمبر بہت دیر میں آیا، آپ ان سوالات کا جواب ارسال فرمائیں گے اور ساتھ یہ کاغذ بھی واپس بھیج دیں گے تو اِن شاء اللہ جواب جلد روانہ کردیا جائے گا۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جوابِ تنقیح:-

۱:- جواباً عرض ہے کہ عدالت کا فیصلہ مفصل ومکمل بصورت فوٹو اسٹیٹ پہلے بھی ارسال کیا تھا، اب پھر دوبارہ حاضر خدمت ہے، اور یہ نقلِ فیصلہ ہر طرح مکمل اور مفصل ہے۔

۲:- دورانِ مقدمہ عدالت نے ڈاکٹر کرامت مرزا کا پتہ معلوم کرکے باقاعدہ بذریعہ رجسٹری کرامت مرزا کے نام نوٹس روانہ کیا، بلکہ دو یا تین مرتبہ نوٹس جاری کیا، جواب نہ ملنے کی صورت میں باقاعدہ طور پر عدالتی کارگزاری کے مطابق اخبار میں بھی اشتہار شائع کرایا، اور اُس اشتہاری نوٹس کا اخبار باقاعدہ طور پر کرامت مرزا کو بھجوایا گیا۔

اس کے بعد جب ہر طرف سے عدالت کو عدمِ تعمیل کی وجہ سے مایوسی ہوئی تو پھر کرامت مرزا کے والد سے عدالت نے رابطہ قائم کیا اور اُس کو عدالت میں طلب کیا، اس مرتبہ طلبی پر کرامت مرزا کے والد نے قطعی توجہ نہ دی، تمام حالات سے مایوس ہوکر عدالت نے ملحقہ فیصلہ صادر فرمادیا، سوئے اتفاق

سے کرامت مرزا کے نام جاری کئے گئے نوٹس وغیرہ اور اخبار اشتہار کی کاپی یا اس اشاعت کی تاریخ وغیرہ اس وقت معلوم نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے کہ عدالت سے پھر اُس مقدمے کا نمبر وغیرہ دے کر نوٹس وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم ہوسکتی ہیں، مگر یہ معاملہ بہت طویل ہوجائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ نوٹس روانہ کئے گئے، اشتہار شائع کیا گیا، کرامت مرزا کے پتے پر بھیجا گیا، اُس کے والد سے رابطہ قائم کیا گیا، اس کے بعد ہی فیصلہ صادر ہوا، اور یہ واقعات حقائق ہیں۔

جواب:- منسلکہ فیصلہ جو آپ نے پہلے ارسال فرمایا تھا اور اس مرتبہ پھر وہی بھیج دیا ہے، عدالت کا پورا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ صرف ڈگری کے الفاظ ہیں، جج جو فیصلہ لکھتا ہے اس میں پورے واقعات تفصیل کے ساتھ درج ہوتے ہیں، وہ فیصلہ آپ نے اس مرتبہ بھی نہیں بھیجا، تاہم تنقیحات کے جواب میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں اُن کی روشنی میں حکم یہ ہے کہ اگر عورت نے نان ونفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر ڈاکٹر کرامت سے نکاح فسخ کرنے کا دعویٰ کیا تھا اور عدالت نے اس کو اسی بنیاد پر حاضرِ عدالت ہونے کا حکم جاری کیا، لیکن وہ خود حاضر نہ ہوا، یا اس کے والد اس کی طرف سے پیش ہوئے اور اُنہوں نے نان ونفقہ کی ادائیگی کے سلسلے میں کسی ایسے معقول انتظام کا وعدہ نہیں کیا جو عدالت کو مطمئن کرسکے تو عدالت کا منسلکہ فیصلہ صحیح ہے، اور اس کی بناء پر ڈاکٹر کرامت سے مسماۃ شمیم کا نکاح فسخ ہوگیا،(۱) اور فسخِ نکاح کے بعد اگر عدّت گزار کر مسماۃ شمیم نے ڈاکٹر احمد سے نکاح کیا ہے تو یہ نیا نکاح دُرست ہے، ڈاکٹر احمد کو کچھ تردّد نہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور صورت ہو تو مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیا جائے، لیکن اس صورت میں عدالت کا مکمل فیصلہ بھیجنا ضروری ہوگا۔ منسلکہ فیصلہ مکمل نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۸/۲۸ ب)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- ایک لڑکی کو اُس کا خاوند پانچ برس سے نہیں لے جاتا، اور طلاق بھی نہیں دیتا، پانچ بچے لڑکی کے ساتھ ہیں، خرچہ بھی ۵ سال سے نہیں دیتا، لڑکی کا والد بوڑھا اور غریب ہے، جب کہا جاتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو لے جاؤ، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں رکھتا اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ اس کا شرعی حکم بتادیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت کو چاہئے کہ شوہر کو طلاق دینے یا خلع کرنے پر راضی

---

(۱) دلائل کے لئے ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

کرے، اگر وہ اس پر رضامند نہ ہو تو عدالت میں اس کے خلاف نان ونفقہ نہ ہونے کی بنا پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کرے، عدالت مرد کو بلا کر کہے کہ یا تو تم اپنی بیوی کو اپنے گھر آباد کرو اور اس کے حقوق نان ونفقہ ادا کرو، ورنہ اس کو طلاق دے دو، اگر وہ نفقہ دینے پر آمادہ نہ ہو اور ساتھ لے جائے تو مقصد حاصل ہے، اور اگر نہ نفقہ ادا کرے اور نہ طلاق دے تو عدالت اس شوہر سے عورت کا نکاح فسخ کرسکتی ہے، جس کے بعد عدت گزار کر عورت دُوسری جگہ نکاح کرسکے گی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۵/۷/۱۳۹۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۹۳ ب)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- آپ کا فتویٰ مؤرخہ ۱۲/۲/۱۳۹۰ھ کے مطابق بندی نے برما میں وہاں کے مسٹر عبدالرحیم چودھری صاحب کے ہاں اپنی عاجزی اور بے کسی بیان کر کے شوہر کو یہاں بھیج دینے یا نان نفقہ دینے کے لئے خط بھیجا تھی، فی الحال شوہر عابدالرحمٰن پہاڑی باغیوں میں شامل ہوکر وہیں جنگلات کے اندر زندگی گزار رہا ہے، اور انہوں نے میری خبر پاکر مجھے نان نفقہ دینے کے بجائے مجھ سے روپے مانگا ہے جیسا کہ اس لیٹر سے جو کہ وہاں سے بھیجا ہے حضورِ والا کو پتہ لگ جائے گا، لہٰذا بندی کو خلاصی کی کوئی شرعی صورت بتائی جائے۔ میں تین چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت بڑی مصیبت میں ہوں، نہ میں برما جاسکتی ہوں اور نہ شوہر یہاں آنے کو تیار ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مسماۃ گورابائی کو حق ہے کہ وہ عدالت میں اپنے شوہر پر نان و نفقہ کا دعویٰ کرے، عدالت شوہرِ مذکور کو نفقہ ادا کرنے پر مجبور کرے، اگر وہ اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہو یا نان ونفقہ ادا کرنے سے انکار کرے تو عدالت کو حق ہوگا کہ وہ مسماۃ گورابائی سے شوہرِ مذکور کا نکاح فسخ کردے، اگر عدالت اس طور پر مکمل تحقیق کر کے نکاح فسخ کرے گی تو گورابائی تاریخِ فسخ سے عدت کی مدّت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکے گی۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲/۷/۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۸۴۱ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ و ۲) تفصیلی طریقۂ کار اور حوالہ جات سابقہ ص:۴۶۱ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عدم ادائیگیٔ نفقہ کو فسخِ نکاح کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- ابھی میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والدین نے میری شادی ایک شخص مسمّیٰ مظفر حسین شاہ ولد نادر شاہ سے کردی، جب چند سال بعد میں بالغہ ہوگئی تو میں نے اپنے خاوند کو نہیں پایا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ علاقہ پاکستان میں مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہے، بعد میں چند دفعہ گھر بھی آیا تھا، میں نے اس کے ساتھ چلنے کا مطالبہ کیا، مگر وہ انکاری ہوگیا، اور کہا: مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ والد صاحب نے جرگہ پنچایت کو جمع کرکے اس سے کہا کہ یا تو بیوی کو ہمراہ لے جا، یا اپنے گھر چھوڑ جا، مگر وہ ایک بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ عالیجاہ! میرا والد غریب سفید پوش آدمی ہے، آج تک انہوں نے میرا خرچہ برداشت کیا، اب اگر کوئی صورت ہو تو فرما کر ممنون فرمائیں۔ نیز وہ کہتا ہے کہ اگر ایک ہزار روپیہ دوگے تو طلاق مل جائے گی۔ مگر عالیجاہ! ایک ہزار روپیہ میں کہاں سے لاؤں؟ بہرصورت اگر اب بھی ہم آپس میں مل جائیں تو تعلقات کے بہتر ہونے کا خیال نہیں، ایسے شوہر پر کیا اعتبار؟ براہِ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو حق ہے کہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان ونفقہ نہ ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کریں، عدالت شوہر کے نام نوٹس جاری کرے گی کہ یا تو بیوی کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو، ورنہ تمہارے نکاح کو فسخ کردیا جائے گا، اگر اس پر شوہر حقوق کی ادائیگی نہ کرے اور طلاق بھی نہ دے، تو عدالت شوہر کے قائم مقام ہوکر آپ کو طلاق دیدے گی، اس کے بعد عدت گزار کر کہیں اور نکاح کرسکیں گی۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۷۵ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بیوی کو جنوبی افریقہ چھوڑ کر خود مستقل پاکستان آنے والے سے بیوی کے فسخِ نکاح کا طریقہ

سوال:- میں ایک مسلمان عورت ہوں، ساکنہ جنوبی افریقہ، میرا خاوند آج سے ڈھائی سال کا عرصہ ہوا ہے کہ میرے اکلوتے لڑکے اسماعیل کو لے کر بغیر رُخصت کے وطن ترک کرکے پاکستان میں مقیم ہے، روانگی کے وقت میرے خاوند نے رُخصت تو درکنار مجھے اطلاع تک نہیں دی کہ وہ پاکستان

(۱) مکمل تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

جارہے ہیں، نہ میری رہائش اور بود و باش کا انتظام کیا۔ جنوبی افریقہ میں ایک غیرمسلم حکومت ہے، مسلمان قاضی یا جج کے عہدے پر کوئی نہیں ہے، لہٰذا آپ کے شعبۂ دار الافتاء سے متوجہ ہوں، میرے خاوند نے اپنے قیام کے دوران پاکستان میں عقدِ ثانی کیا ہے، مزید پاکستان سے جنوبی افریقہ آنے والے مسافروں کی زبانی میرے خاوند نے یہ پیغام مجھے بھیجا ہے کہ میں تا عمران کو طلاق نہیں دوں گا، اور اپنے وطنِ پیدائش جنوبی افریقہ آنے کا ارادہ بھی ترک کردیا ہے۔ ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مجھ مظلومہ کے لئے کوئی راستہ ہموار فرما کر کوئی فیصلہ صادر فرماویں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ جنوبی افریقہ میں علماء کی کسی جماعت سے رُجوع کریں، یہ جماعت کم از کم دِین دار اور مستند علماء پر مشتمل ہونی چاہئے، علماء کی یہ جماعت معاملے کی غیرجانبدارانہ تحقیق کرے اور اگر یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو کہ مرد باوجود وسعت کے خرچ نہیں دیتا تو یہ جماعت شوہر کے نام نوٹس جاری کرے کہ یا اپنی بیوی کے حقوق ادا کرو، ورنہ ہم نکاح ختم کردیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ کسی صورت پر عمل نہ کرے تو علماء کی یہ جماعت شوہر کے قائم مقام ہوکر طلاق واقع کردے، اس طلاق کی عدّت (تین حیض) گزار کر آپ جہاں چاہیں نکاح کرسکیں گی[1]، لیکن علماء کی جس جماعت کے پاس آپ اپنا مقدمہ لے جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام متعلقہ مسائل سے باخبر ہونے کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب "الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة" کا ص:۲۴ سے ص:۳۱ تک، اور ص:۶۳ سے ص:۶۴ تک غور سے مطالعہ کریں اور جس جگہ کوئی اُلجھن ہو، دُوسرے علماء سے رُجوع کریں۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۸/۱۹ الف)

شوہر کی ضربِ شدید اور ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- بخدمت جناب مفتی صاحب دار العلوم کراچی

گزارش ہے کہ علمائے دین اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں جو یہ ہے کہ فسخِ نکاح کا فیصلہ عدالت نے کیا ہے، اس مسئلے میں ہمیں اطمینان دِلایا جائے، عین نوازش ہوگی۔ محمد عرفان ڈرائیور

دار العلوم کراچی

(۱) مزید تحقیق اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- منسلکہ فیصلہ احقر نے پڑھا، اس فیصلے[1] میں شوہر کے ضربِ شدید اور ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت رسانی کی بنیاد پر مسماۃ شمیم اختر کا نکاح محمد سرور سے فسخ کردیا گیا، فسخِ نکاح کی بنیاد مالکی مذہب کے مطابق دُرست ہے، اور فقہائے حنفیہ نے ضرورت کے موقع پر اس مسلک کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، لہٰذا عدالت کے فیصلے کے بعد مسماۃ شمیم اختر کا نکاح محمد سرور سے ختم ہو چکا ہے، اب وہ عدّت پوری کرے، یعنی تین مرتبہ ایام ماہواری گزارنے کے بعد کہیں اور نکاح کرسکتی ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۱۱/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹۵/۳۱ د)

نان ونفقہ نہ دینے کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- ممتاز بی بی کی گیارہ سال ہوگئے شادی ہوچکی ہے، ان گیارہ سالوں میں سے ایک سال بمشکل ممتاز بی بی نے سسرال میں گزارا ہوگا، کئی طرح کی باتیں ہوئیں، ممتاز بی بی کے شوہر سے کئی بار اپیل کی گئی کہ یا تو طلاق دے دیں یا خرچ دے دیا کریں، یا آپ ہمارے پاس آتے رہا کریں یا آپ ہمیں بلالیں، تاکہ کوئی فیصلہ ہوجائے، مگر سوائے پریشانی کے عبدالقیوم نے کوئی فیصلہ اس میں نہیں کیا، اور نہ وہ بیوی کو پاس بلاتا ہے اور نہ خرچ دیتا ہے، اس صورت میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ممتاز بی بی کو چاہئے کہ اپنے شوہر کو سمجھا بجھا کر طلاق حاصل کرلے، اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو خلع کرلیں، مثلاً اگر اپنا مہر معاف کرکے اس سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کرے، اگر وہ کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہو تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر دعویٰ دائر کیا جائے، عدالت شوہر کو بلا کر یہ کہے گی کہ یا طلاق دو یا نان ونفقہ ادا کرو، اور اگر شوہر ان میں سے کچھ ماننے پر تیار نہ ہو تو شوہر کے قائم مقام کی حیثیت سے عدالت کو طلاق دینے کا اختیار ہوگا۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۳ھ

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- میری شادی محمد سرور کے ساتھ ڈیڑھ سال قبل ہوئی تھی، اور اُس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کی عمر دس ماہ ہے، ڈیڑھ سال کا عرصہ محمد سرور کے ساتھ بڑی ہی تکلیف سے گزارا، مجھے وہ

(۱) انگریزی میں فسخِ نکاح کا یہ عدالتی فیصلہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے خود پڑھ کر مذکورہ فتویٰ صادر فرمایا، یہ فیصلہ اگرچہ رجسٹر میں محفوظ نہیں تاہم فتویٰ سے عدالتی فیصلے کے مندرجات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

(۲) تفصیلی طریقۂ کار اور حوالہ جات سابقہ ص:۴۶۱ کے فتویٰ اور اس کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اکثر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتا تھا، میں والدین کے گھر آجاتی، والدین مجھے روپے، کپڑے وغیرہ دے کر واپس بھیجتے، محمد سرور محنت مزدوری نہیں کرتا، وہ زیادہ تر رات کو کوارٹر میں تالا لگا کر چلا جاتا اور صبح آ کر تالا کھول دیتا، نہ معلوم کہ رات بھر وہ کہاں رہتا، ایک دن یہ بول کر گھر سے نکال دیا کہ دو سو روپے لے کر آؤ ورنہ ذبح کردوں گا۔ میرے والدین محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ کہاں تک دیتے رہتے، اب میرے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ طلاق لے لوں، لہٰذا مجھے طلاق دِلائی جائے۔ اگر وہ پریشان کرنے کے لئے طلاق نہ دے تو میں کیا عدالت سے اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہوں اور وہ شرعاً معتبر ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں پہلے تو اس بات کی کوشش کی جائے کہ شوہر کو خدا کا خوف دِلا کر اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ از خود طلاق دیدے، لیکن اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو اور نفقہ وغیرہ بھی ادا نہ کرے تو پھر مسماۃ شمیم اختر کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے پہلے یہ ثابت کرے کہ اس کا نکاح محمد سرور کے ساتھ ہوا تھا، اور یہ کہ وہ نان و نفقہ ادا نہیں کرتا، حاکم معاملات کی شرعی تحقیق کے بعد اگر یہ دیکھے کہ شوہر نہ نان و نفقہ دیتا ہے، اور نہ اس کا اطمینان دِلاتا ہے، تو وہ نکاح فسخ کرسکتا ہے، اس طرح اگر اس نے نکاح فسخ کردیا تو وہ شرعاً معتبر ہوگا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۳۰/۲۷ ہ)

زوجۂ متعنّت کا حکم

سوال:- ایک عورت کا شوہر عرصہ بارہ چودہ سال سے چلا گیا ہے، وہ فوج میں ملازم اور کراچی میں رہتا ہے، اس درمیان میں ہر طرح کوشش کی گئی کہ وہ بیوی کو اپنے پاس رکھے یا طلاق دے لیکن وہ نہیں مانتا، کیا حکمِ شرعی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عورت کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں نان نفقہ نہ ہونے کی بنیاد پر شوہر کے خلاف تنسیخِ نکاح کا دعویٰ دائر کرے، عدالت شوہر کو عدالت میں حاضر کر کے اسے نان و نفقہ اور حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرے گی اور اگر وہ راضی نہ ہو یا عدالت میں حاضر نہ ہو تو اسے نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶۲/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

شوہر کے نامرد ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کی شرائط،
نیز عدم ادائیگیٔ نفقہ کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- رائج الوقت ملکی قانون میں عدم فراہمیٔ نفقہ اور عدم ادائیگیٔ حقوقِ زوجیت کی صورت میں عورت کو دو سال تک انتظار کرنے کے بعد تفریقِ نکاح کا حق پہنچتا ہے۔

شریعت میں کیا اس طرح کی تحدید ہے؟ اگر نہ ہو تو جرم کے تحقق کے لئے کچھ مدّت کا گزرنا ضروری ہے، وہ مدّت کتنی ہے؟

(مولانا قاضی) بشیر احمد
(قاضی عدالت باغ ضلع پونچھ، آزاد کشمیر)

جواب:- جہاں تک عدم ادائیگیٔ حقوقِ زوجیت کا تعلق ہے شرعاً یہ اُس وقت فسخِ نکاح کا موجب ہوسکتی ہے جبکہ شوہر عنّین ہو، اور اس صورت میں عورت کو دعویٰ دائر کرنے کے لئے کسی انتظار کی ضرورت نہیں، البتہ شرط یہ ہے کہ عورت کو نکاح سے قبل شوہر کے عنّین ہونے کا علم نہ ہو، نکاح کے بعد ایک مرتبہ بھی شوہر نے وطی نہ کی ہو، عنّین ہونے کا علم ہونے کے بعد عورت نے شوہر کے نکاح میں رہنے پر ایک مرتبہ بھی رضامندی ظاہر نہ کی ہو، ہاں! اس صورت میں جب قاضی کے پاس معاملہ پہنچے تو وہ شوہر کو ایک سال کی مہلت دے گا، اس ایک سال میں بھی وہ تندرست نہ ہو تو عورت کو فسخ کا اختیار دے گا، اگر وہ اسی مجلس میں تفریق کو اختیار کرے تو نکاح فسخ کردے گا، عنّین ہونے کے بغیر اگر کوئی شخص حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا ہو تو یہ اس کے لئے گناہ تو ہے لیکن فسخِ نکاح کا سبب نہیں، **لما فی الدر المختار لحصول حقها بالوطء مرة وقال الشامی وما زاد علیها فهو مستحق دیانة لا قضاء، بحر، عن جامع قاضی خان ویأثم اذا ترک الدیانة متعنتا مع القدرة علی الوطء (باب العنّین** ج:۲ ص:۹۷۷)۔[1] اور عدم ادائیگیٔ نفقہ کی بنیاد پر فسخِ نکاح کا جو حق عورت کو دیا گیا ہے، یہ مسئلہ مذہبِ مالکی سے مأخوذ ہے، اس میں دعویٰ کے لئے کوئی انتظار شرط نہیں، ہاں! یہ شرط ہے کہ شوہر خلع پر راضی نہ ہو، اور عورت کے خرچ کا کوئی دُوسرا انتظام نہ ہو۔ ان شرائط کے تحقق کے بعد مذہبِ مالکی پر عمل کیا جائے گا، اور مذہبِ مالکی میں اس بنیاد پر فسخِ نکاح کے لئے کسی مدّت کے انتظار اور مہلت کی باتفاقِ مالکیہ ضرورت نہیں (الحیلۃ الناجزۃ ص:۷۸)۔[2]

ھٰذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۲۸ ب)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب العنین ج:۳ ص:۴۹۵ (طبع سعید)۔ نیز ''زوجۂ عنین'' کے فسخِ نکاح کی مذکورہ شرائط کی تفصیل کے لئے حیلۂ ناجزہ ص:۴۳ تا ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) ص:۷۳، ۷۴ (طبع دار الاشاعت کراچی)۔

صرف مردانہ کمزوری کی بناء پر عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں

سوال:- ایک لڑکی بالغہ نے ایک بالغ لڑکے سے نکاح کیا تھا، اس کے بعد لڑکی کہتی ہے کہ میرا شوہر طاقتِ مردانہ کے اعتبار سے کمزور ہے، میں اس شوہر کے ساتھ رضامند نہیں ہوں، اس لئے میں نکاح کو فسخ کرنا چاہتی ہوں، اور لڑکا اقرار کرتا ہے کہ میں تندرست ہوں۔ اس کا کیا حکم ہے؟ لڑکا کہتا ہے کہ اگر طلاق ہوجائے تو مہر دینا پڑے گا یا نہیں؟

جواب:- صرف مردانہ کمزوری سے عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ مرد کا بالکل نامرد ہونا ثابت نہ ہو،[۱] لہٰذا اس صورت میں اس پر مکمل مہر واجب ہوگا، شوہر کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو طلاق دینے کے لئے مہر معاف کرنے کی شرط لگائے، اس صورت میں اگر عورت مہر معاف کردے تو مہر معاف ہوجائے گا۔

(نوٹ) مرد کو چاہئے کہ جب وہ طلاق دے تو طلاق کا لفظ صرف ایک مرتبہ کہے، اور ایک مرتبہ سے زیادہ طلاق نہ دے، تین طلاق دینا ناجائز ہے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۸۸/۷/۴ھ

نامردی کے دعویٰ کو رَدّ کر کے صرف ظلم کی بناء پر فسخِ نکاح کے عدالتی فیصلے کی شرعی حیثیت

سوال:- بیوی نے شوہر کے خلاف دو وجہ سے فسخِ نکاح کا دعویٰ کیا، ایک نامردی، دُوسرے ظلم کی بناء پر خلع بذریعۂ عدالت، عدالت نے نامردی کے سبب کو رَدّ کردیا، اور ظلم کی بناء پر خلع کے دعویٰ کو صحیح مان کر نکاح فسخ کردیا، کیا نکاح فسخ ہوگیا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لڑکی کے فسخِ نکاح کی شرعی صورت صرف یہ تھی کہ شوہر کا نامرد ہونا ثابت ہوجاتا اور علاج کے باوجود اس کی اصلاح نہ ہوتی، لیکن منسلکہ فیصلے میں تصریح کی گئی ہے کہ عورت کا یہ الزام دُرست ثابت نہیں ہوا، اگر واقعہ یہی ہے تو عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل نہیں ہے، خلع کی جو بنیاد بیان کی گئی ہے وہ شرعاً دُرست نہیں، کیونکہ خلع کا معاملہ صرف زوجین کی باہمی رضامندی سے انجام پاسکتا ہے، اگر شوہر اس پر راضی نہ ہو تو اسے خلع پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہاں! جس ظلم کی بنیاد پر خلع کا دعویٰ کیا گیا ہے، اس ظلم کے ازالے پر بزورِ عدالت مجبور کیا جاسکتا ہے، لیکن حنفی فقہ کی رُو سے ہر ظلم کی بناء پر عدالت شوہر کو خلع پر مجبور کرنے کی مجاز نہیں ہے، قال الامام أبوبکر الجصاص رحمه

---

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) حوالہ کے لئے ص:۳۲۰ اور ۳۲۳ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

الله لو كان الخلع الى السلطان شاء الزوجان أو أبيا اذا علم انهما لا يقيمان حدود الله لم يسئلهما النبى صلى الله عليه وسلم عن ذلك ولا خاطب الزوج بقوله اخلعها بل كان يخلعها منه ويرد عليه حديقته، وان أبيا أو واحد منهما. كما كانت فرقة المتلاعنين الى الحاكم لم يقل للملاعن خل سبيلها بل فرق بينهما. (أحكام القرآن للجصاص ج:۱ ص:۴۲۸)[۱]. وقال فى العالمگيرية وشرطه شرط الطلاق (ج:۱ ص:۵۱۵)[۲]. وقال السرخسى لأنه عقد يعتمد التراضى. (المبسوط ج:۶ ص:۱۷۳)[۳] مذکورہ نصوص سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں شرعی حیثیت سے نکاح فسخ نہیں ہوا، اور عورت کو دُوسری جگہ شادی کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۱/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۷۰۳/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نان ونفقہ دینے سے انکار کی بناء پر فسخِ نکاح کا حکم

سوال:- مسمّٰی مختار بیگم کی شادی ایک آدمی کے ساتھ کروائی تھی، حالانکہ ان کی مرضی نہیں تھی، لیکن مجبوری کی بناء پر نکاح کرلیا، اور اب تین سال کے بعد اس کو گھر سے نکالا جارہا ہے اور شوہر نان و نفقہ سے انکار کرتا ہے، اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم پیسے کماؤ زنا پر، تو شریعت میں ایسے آدمی کا کیا حکم ہے اور بیوی کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ صورت میں مختار بیگم کو چاہئے کہ وہ کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں شوہر کی طرف سے نان ونفقہ نہ ہونے کی بناء پر فسخِ نکاح کا دعویٰ کرے، حاکم، شرعی شرائط کے مطابق شوہر کو حاضرِ عدالت کرکے اسے مجبور کرے کہ وہ مختار بیگم کو نان ونفقہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک کرے، بصورتِ دیگر اسے طلاق دے، اگر شوہر حاضرِ عدالت نہ ہو یا نان ونفقہ اور طلاق دونوں سے انکار کرے تو عدالت شوہر کی طرف سے طلاق دے سکتی ہے، اس کے بعد مختار بیگم تین مرتبہ ایام ماہواری بطور عدّت گزار کر جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔[۳]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۲/۲۲ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

---

(۱) ج:۱ ص:۳۹۵ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).
(۲) عالمگيرية ج:۱ ص:۴۸۸ (طبع رشيديه كوئٹه).
(۳) (طبع دار المعرفة بيروت).
(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۱۹ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

﴿باب العدّة و أحكامها﴾
(عدّت اور اُس کے اَحکام)

تین طلاق کے بعد عدّت کی مدّت اور نفقہ و سکنیٰ کے اَحکام

سوال:- میری بیوی سے رات کو تلخ کلامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی کو مجھ پر شک تھا کہ میں نے اپنی پڑوسن سے بات کی تھی، لیکن میں نے قسم کھا کر تسلی دے دی تھی، لیکن فجر کی نماز کے بعد دوبارہ پھر تلخ کلامی ہوئی اور میں نے انہیں گھر سے باہر نکال دیا، تو وہ اندر آگئی تو میں نے کہا: ''تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے''، کیا اس سے طلاق ہوئی یا نہیں؟ نباہ کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز بیوی کو چھ سات مہینے کا حمل بھی ہے، اور اگر طلاق ہوگئی ہے تو عدّت اور نان و نفقہ کے بارے میں بھی ذکر کردیں، اور ساتھ رہ سکنے کے بارے میں بھی بتادیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی طرف سے آپ کی بیوی پر طلاقِ مغلّظہ واقع ہوگئی ہے، اور اب وہ آپ کے لئے حرام ہوچکی ہے، نہ رُجوع ہوسکتا ہے اور نہ حلالۂ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،[۱] اور طلاق حمل کی حالت میں بھی ہوجاتی ہے،[۲] اب آپ کی بیوی کی عدّت بچے کی پیدائش پر ختم ہوگی،[۳] اس دوران آپ پر ان کا نان ونفقہ اور رہائش کا انتظام واجب ہے،[۴] وہ آپ کے گھر میں الگ کمرے میں پورے پردے کے اہتمام کے ساتھ رہیں،[۵] میاں بیوی کی طرح آپس میں ملنا بالکل حرام ہے، بچے کی پیدائش کے بعد وہ جہاں چاہیں نکاح کرسکتی ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۹/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۲ کا فتویٰ اور اس کے حواشی نمبر ۱ تا ۳ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۳۲۱ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۱۱ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۴) وفی الهداية كتاب الطلاق باب النفقة ج:۲ ص:۴۴۳ (طبع شركت علميه ملتان) واذا طلّق الرّجل امرأته فلها النّفقة والسكنىٰ فی عدّتها رجعيًا كان أو بائنًا. وكذا فی الشامية باب النّفقة مطلب فی نفقة المطلّقة ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع سعيد). وكذا فی الهندية كتاب الطّلاق الفصل الثالث فی نفقة المعتدّة ج:۱ ص:۵۵۷ (طبع ماجديه كوئٹه).
(۵) حوالہ کے لئے سابقہ ص:۴۲۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳ اور اگلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

خلوت کے بعد خلع کی صورت میں عدّت واجب ہے

سوال:- میری ایک عزیزہ کی شادی مئی ۱۹۷۴ء میں ہوئی، چند روزہ تعلقات کے بعد لڑکی اپنے بھائی کے گھر آ گئی، اب جبکہ عرصہ دو سال کا ہوگیا لڑکی نے اپنے شوہر کی شکل تک نہیں دیکھی، اور ماہِ رواں کے شروع میں خلع لے لیا، اس کی عدّت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت ہوچکی تھی تو صورتِ مسئولہ میں آپ کی اس عزیزہ پر عدّت واجب ہے،[۱] خواہ دو سال سے اس نے شوہر کی صورت نہ دیکھی ہو اور عدّت تین ماہواریوں کی تکمیل ہے،[۲] اس دوران اس کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلنا بالکل جائز نہیں ہے،[۳] اور یہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس نے اپنے شوہر سے جو خلع کیا ہے وہ شوہر کی رضامندی سے کیا ہو، اگر کوئی اور صورت ہوتو سوال دوبارہ بھیج کر اس کا حکم معلوم کرلیا جائے۔　　واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۳/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۱/۲۸ ب)

شوہر کے گھر عدّت گزارنا ضروری ہے

سوال:- ایک خاتون، پاکستان کوارٹرز میں رہتی تھیں، ان کے شوہر بیمار ہوئے، ہسپتال میں گئے وہاں انتقال ہوگیا، ان کے بھائی یعنی دیور بورہ پیر اپنے گھر متوفی کو لے آئے، یہیں سے تدفین کی، خاتون کو بھی یہیں عدّت کرنے کو کہا، وہ بورہ پیر پر ہی عدّت گزار رہی ہیں۔ پاکستان کوارٹرز یعنی ان کے گھر انڈیا سے مہمان آگئے، بورہ پیر جانے سے یعنی دیور کے مکان پر پردے کا اور غیر ہونے پر دُوسری پریشانیاں بھی ہیں، یہ مہمان خاتون کے بہن اور بھائی ہیں حقیقی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ خاتون اپنے گھر میں منتقل ہوکر عدّت کے باقی دن پورے کرے، بہن بھائی سب ایک جگہ جمع ہوجائیں۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مرحوم کی بیوہ کو اپنے شوہر کے مکان (پاکستان کوارٹرز) ہی

---

(۱) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۰۴ (طبع سعید) (وسبب وجوبها) عقد (النكاح المتأكد بالتسليم وما جرى مجراه) من موت أو خلوة أى صحيحة.

(۲) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۰۴، ۵۰۵ (طبع سعید) (وهى فى) حق (حرة تحيض لطلاق بعد الدخول حقيقة أو حكمًا ثلاث حيض كوامل).

(۳) وفی الدّر المختار كتاب الطّلاق باب العدّة فصل فى الحداد ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) (وتعتدان) أى معتدّة طلاق وموت فى بيت وجبت فيه ولا يخرجان منهُ الّا أن تخرج أو ينهدم المنزل أو تخاف انهدامه .... الخ.

میں عدت گزارنی چاہئے تھی[1]، تاہم مذکورہ اعذار کی بناء پر اب بھی وہ دیور کے مکان سے پاکستان کوارٹر اپنے مکان میں منتقل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۶۵/۱۹ الف)

عدّت کے دوران سودا سلف کے لئے باہر جانے کا حکم

سوال:- ایک خاتون کے شوہر ۲۷؍شوال ۱۴۰۰ھ کو انتقال کر گئے ہیں، گھر میں کوئی مرد نہیں جو گھر کا سودا سلف اور دیگر بازار کے کام کر سکے، ان کا بازار جانا لازم ہے، شام ۴ بجے سے صبح ۷ یا ۸ بجے تک گھر میں رہیں، باقی وقت میں وہ سودا سلف لاسکتی ہیں؟ ان کی عدت کب ختم ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون دن کے وقت یعنی طلوعِ آفتاب کے بعد سے مغرب سے قبل قبل سودا سلف لانے کے لئے گھر سے نکل سکتی ہیں، لیکن رات سے پہلے پہلے گھر واپس آنا ضروری ہے، اور رات گھر ہی میں گزارنی ضروری ہے[2]، اگر وہ حاملہ نہیں ہیں تو ان کی عدت چار مہینے دس دن ہیں۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۰/۱۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۶/۳۶ د)

عدّت کے دوران گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت رسم نہیں، بلکہ شرعی حکم ہے

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہوگیا، اُن کی بیوہ جن کی عمر ۵۰ سال ہے، عدت گزار رہی تھیں کہ کراچی سے بیوہ کو اپنے بھائی کی علالت اور حالت زیادہ خراب ہونے کی اطلاع ملی، چنانچہ بیوہ نے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے اس معاملے میں فتویٰ مانگا تو انہوں نے کہا کہ عدت ایک رسم ہے جس کی مدت ۴ ماہ ۱۰ دن مقرر کی گئی ہے، تاکہ اگر مرنے والے سے حمل وغیرہ ہو تو اس عرصے میں ظاہر

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) (وتعتدان) أی معتدّة طلاق وموت فی بیت وجبت فیه ولا یخرجان منه، إلّا أن تخرج أو ینهدم المنزل أو تخاف انهدامه .... الخ.
وفی الهدایة .... کما اذا خافت علٰی متاعها أو خافت سقوط المنزل أو کانت فیها بأجر ولا تجد ما تؤدّیه. وفی فتح القدیر (قوله خافت علٰی متاعها اللّصوص) أی فانها تخرج لأنه عذر. (فتح القدیر ج:۴ ص:۱۶۷).

(۲) فی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۳۶ (طبع سعید) ومعتدة موت تخرج فی الجدیدین وتبیت اکثر اللیل فی منزلها لان نفقتها علیها فتحتاج للخروج حتّی لو کان عندها کفایتها صارت کالمطلقة فلا یحل لها الخروج فتح وجوز فی القنیة خروجها لاصلاح ما لا بد لها منه کزارعة ولا وکیل لها.

(۳) قال الله تعالٰی: وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا. (البقرة:۲۳۴).

ہوجائے، اس کے علاوہ اور کوئی دینی اہمیت نہیں ہے، چونکہ بیوہ اس عمر سے تجاوز کر چکی ہیں اور حقیقی بھائی کا آخری دیدار بھی ضروری ہے، لہٰذا آپ کراچی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ وہ محترمہ کراچی چلی گئیں، کچھ دنوں کے بعد بھائی کا انتقال ہوگیا، وہ ابھی تک کراچی ہی میں ہیں، اس کا شرعی حکم صادر فرمائیں۔

جواب:- مذکورہ امام صاحب نے یہ بات صحیح نہیں کہی کہ ''عدّتِ وفات کا اصل مقصد صرف حمل کا معلوم کرنا ہے، نیز یہ کہ عدّت کے دوران گھر سے نکلنے کی ممانعت کوئی شرعی حکم نہیں بلکہ محض رسم ہے'' امام صاحب کی یہ دونوں باتیں نادُرست ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عدّت کے دوران گھر سے نکلنے کی ممانعت ایک شرعی حکم ہے[1] محض رسم کی بات نہیں، اور صورتِ مسئولہ میں مذکورہ خاتون کو چاہئے تھا کہ دن دن کے وقت اپنے بھائی کی عیادت کرآتیں اور رات شوہر کے گھر میں گزارتیں۔ بہرحال! اب بھی اُن پر واجب ہے کہ وہ فوراً واپس آکر عدّت کے باقی ایام شوہر کے گھر میں پورے کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۵/۲۸ ج)

سابقہ بیوی کو پردے کے بغیر گھر پر رکھنے کا حکم

سوال:- زید کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی، تقریباً دس سال سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، بقضائے خدا اس کو آنتوں کا مرض ہوا، مرض شدّت اختیار کر رہا تھا جس میں فوت ہونے کی زیادہ توقع تھی، عورت نے یہ کہا کہ میری زندگی کی اُمید نہیں ہے، اس لئے میری زندگی میں زید کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہوجائے تو بہتر ہے۔ برضائے والدین مریضہ و زید یہ طے ہوا کہ زید مریضہ کو طلاق دیدے، زید نے طلاق دے دی، اور دُوسری بہن سے شادی ہوگئی، قدرتِ الٰہی مریضہ قدرے صحت یاب ہوجاتی ہے، لیکن وہ دائم المریض ہے، اس صورت میں زید بحیثیت بہن اس کو گھر میں کفیل بن کر رکھ سکتا ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کی سابقہ بیوی اب اس کے لئے اجنبی ہوچکی ہے، لہٰذا اسے پردے کے بغیر اپنے گھر رکھنا جائز نہیں،[2] پردے کے ساتھ عام عورتوں کی طرح کبھی کبھی آجائے تو مضائقہ نہیں، لیکن مستقل طور پر گھر میں رکھنا پردے کے ساتھ بھی مناسب نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۲/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(۱) حوالہ کے لئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲، اور ص: ۴۲۶ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

﴿فصل فی الحضانة والنسب﴾

(بچوں کی پرورِش اور نسب کے اَحکام)

سات ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کا نسب ثابت ہے

سوال:- عمر سے ایک عورت کی شادی ہوئی، تین چار ماہ کے اندر اُس نے طلاق دے دی، تاریخ نکاح سے پورے سات ماہ بعد اس عورت مطلقہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، اب یہ لڑکی اس عمر کی جائز اولاد ہے اور اس کی وارث ہوسکتی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وہ لڑکی جو عمر سے نکاح کرنے کے سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی، اس کا نسب عمر سے ثابت ہے،[1] اور وہ عمر کی (بصورتِ عدم موانع ارث) جائز وارث ہے، کیونکہ وضعِ حمل کی کم سے کم مدت شرعاً چھ ماہ ہے، کما فی الهداية وأقل مدة الحمل ستة أشهر۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۹/۱۸ الف)

نوسال کی عمر تک بچی کی پرورِش کا حق ماں کو حاصل ہے
بچی کے نامحرَم سے ماں کی شادی کی صورت میں بچی کی پرورِش کا حق نانی کو ملے گا

سوال:- میاں بیوی کے مابین ناچاقی کی وجہ سے مرد نے عورت کو طلاق دے دی، عورت مذکورہ کی اس مرد سے ایک بچی بھی موجود ہے، اب صورتِ مسئولہ یہ ہے کہ بچی کی کفالت کا حق یعنی

---

(۱) وفي الهندية كتاب الطّلاق الباب الخامس عشر في ثبوت النّسب ج:۱ ص:۵۳۶ (طبع ماجديه) واذا تزوج الرّجل امرأةً فجاءت بالولد لأقل من ستة أشهر منذ تزوّجها لم يثبت نسبه، وان جاءت به لستة أشهر فصاعدًا يثبت نسبه منه اعترف به الزّوج أو سكت. وفي الشامية ج:۳ ص:۴۹ (طبع سعيد) (قوله والولد لهٗ) أي ان جاءت بعد النكاح لستة أشهر مختارات النّوازل فلو لأقل من ستة أشهر من وقت النكاح لا يثبت النسب ولا يرث منه .... الخ.

(۲) هداية ج:۲ ص:۴۳۳ (طبع شركت علميه ملتان).

دُودھ پلانے کا حق کس کو ہے؟

۲:- اگر عورت نے دُوسری جگہ شادی کرلی ہو تو حقِ حضانت نانی کو حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے سال تک نانی کو حضانت کا حق حاصل ہے؟

۳:- اگر عورت کی دُوسری جگہ شادی کردینے کے بعد حضانت کا حق نانی کو حاصل ہو تو نانی اپنی خوشی سے بچی کو دُودھ پلانے کے لئے ماں کے سپرد کردے تو بچی کے باپ کو شرعاً رُکاوٹ ڈالنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے سال تک نانی کو حضانت کا حق ہے؟ ماں اپنی بچی کو دُودھ پلانے کے سلسلے میں دُوسرے شوہر کو کھل کر اجازت دے تو مدّتِ رضاعت کے اندر ماں سے بچی کو چھین لینے کا حق باپ کو شرعاً حاصل ہے کہ نہیں؟

جواب ۱:- بچی جب تک بالغ نہ ہوجائے، اس کی پرورِش کا حق اس کی ماں کو ہے،(۱) بشرطیکہ ماں نے کسی ایسے شخص سے نکاح نہ کیا ہو جو بچی کے لئے غیر محرَم ہو۔(۲)

۲:- اگر عورت نے بچی کے کسی نامحرَم شخص سے نکاح کرلیا ہو تو پرورِش کا حق نانی کو ملے گا،(۳)

---

(۱) وفی سنن أبی داوٗد کتاب الطّلاق، باب من أحقّ بالولد ج: ۱ ص: ۳۱۷ (طبع مکتبه حقانیه) عن عبدالله بن عمرؓ أنّ امرأة قالت: یا رسول الله! ان ابنی هٰذا کان بطنی لهٗ وعاء وثدیی لهٗ سقاء وحجری لهٗ حواء، وان أباه طلّقنی وأراد أن ینتزعه منّی، فقال لها رسول الله صلی الله علیه وسلم: أنت أحقّ به ما لم تنکحی.

وفی تنویر الأبصار مع الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۶۶، ۵۶۷ (طبع سعید) (والأم والجدّة) لأم أو لأب أحقّ بها بالصغیرة حتّی تحیض أی تبلغ فی ظاهر الروایة .... وغیرهما أحقّ بها حتّی تشتهی وقدّر بتسع وبه یفتٰی .... وعن محمد ان الحکم فی الأم والجدّة کذٰلک وبه یفتٰی لکثرة الفساد زیلعی وفی الشامیة تحت (قوله کذٰلک) أی فی کونها أحقّ بها حتّی تشتهی. (قوله وبه یفتٰی) قال فی البحر بعد نقل تصحیحه، والحاصل أن الفتوٰی علٰی خلاف ظاهر الروایة.

وراجع أیضًا الهدایة باب حضانة الولد ومن أحق به. ج:۲ ص:۴۳۴ (طبع شرکت علمیه ملتان). ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ لڑکی کے بالغ ہونے تک اس کی پرورِش کا حق ماں کو حاصل ہے، مگر کئی فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ لڑکی کے حدِ شہوت تک پہنچنے تک ماں کو اس کی پرورِش کا حق حاصل ہے اور حدِ شہوت کی عمر میں اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی عمر ۹ سال بیان کی ہے اور اسی پر فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ مذکورہ عبارت شامی کے علاوہ صاحبِ بحر نے اسے ذکر کرکے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ مگر چونکہ لڑکی کے حدِ شہوت تک پہنچنے کی مذکورہ مدّت متعین نہیں بلکہ لڑکی کی صحت وتندرستی اور علاقے کے موسم وحالات وغیرہ کی بناء پر یہ عمر مختلف ہوسکتی ہے جیسا کہ علامہ زیلعیؒ نے فرمایا ہے: واختلف فی حد الشهوة وفی الولواجیة ولیس لها حدّ مقدر لأنّه یختلف بأختلاف حال المرأة .... الخ. (البحر الرائق ج:۴ ص:۱۶۹) اس لئے کئی فقہاء کرامؒ نے ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ اور ہمارے اکابر نے بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دیا ہے، چنانچہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امداد المفتین ص:۶۲۲ میں، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الاحکام ج:۲ ص:۸۷۷ میں، اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عزیز الفتاویٰ ص:۵۶۶ میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ لڑکی کے بالغہ ہونے تک اس کی پرورِش کا حق ماں کو حاصل ہے۔ تفصیل کے لئے اکابر کی ان کتبِ فتاویٰ کی طرف رُجوع فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) وفی الدر المختار مع رد المحتار ج:۳ ص:۵۶۵ (طبع سعید) والحاضنة یسقط حقّها بنکاح غیر محرمه أی الصغیر .... الخ.

(۳) فی الهندیة کتاب الطّلاق الباب السادس عشر فی الحضانة ج: ۱ ص: ۵۴۱ (طبع ماجدیه کوئٹه) وان لم یکن لهٗ أم تستحق الحضانة بأن کانت غیر أهل للحضانة أو متزوجة بغیر محرم أو ماتت فأم الأم أولٰی من کل واحدة وان علت .... الخ. وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار ج:۳ ص:۵۶۲، ۵۶۳ (طبع سعید). (ثم) أی بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقّها أو تزوّجت بأجنبی (أم الأم) وان علت.

اور وہ بھی بچی کے بالغ ہونے تک پرورش کرسکتی ہے۔

۳:- ماں اگر نانی کے گھر میں جاکر دودھ پلایا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر بچی کو اس نے مستقل طور سے شادی شدہ ماں کے پاس چھوڑ دیا ہو تو باپ کو حق حاصل ہے کہ وہ بچی کو خود اپنی تربیت میں لے لے۔ لما فی الدر المختار لو تزوجت الأمّ بآخر فأمسکته أم الأم فی بیت الرابّ فللأب أخذہ. (شامی ج:۲ ص:۶۳۹)۔[۱] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۳۳/۲۸ ج)

بچیوں کے بالغ ہونے تک اُن کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور ماں سے اس کی بچیاں عرصہ ڈھائی سال تک زبردستی چھین رکھی ہیں، کیا ماں اپنی بچیوں کو واپس لے سکتی ہے؟ اور کیا ان بچیوں کا باپ خرچہ دے گا جبکہ ایک بچی کی عمر ۵ سال اور دُوسری کی عمر ۴ سال ہے؟ برائے کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- طلاق کے بعد بچیوں کی پرورش کا حق بچیوں کے بالغ ہونے تک بچیوں کی ماں کو ہے،[۲] البتہ اگر ماں دُوسرا نکاح کرلے یا کوئی اَمر پرورش کے حق کے لئے مانع ہو تو بات دُوسری ہے،[۳] اگر بچیوں کی ماں نے دُوسرا نکاح نہیں کیا، اور کوئی دُوسرا مانع بھی موجود نہیں ہے، تو بچیاں اسی کو ملنی چاہئیں، وہی ان کی حق دار ہے،[۴] اور ان بچیوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے۔[۵] واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۰/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۵۸/۴۰ ہ)

نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی ثابت النسب ہے

سوال:- زید کی شادی کے چار ماہ بعد زید کے گھر والوں کو مع زید یہ پتہ چلا کہ لڑکی حاملہ ہے، اور ظاہراً اس کا پتہ چلتا تھا، اب سسرال والوں نے میکے والوں سے اس حمل کے بارے میں ذکر کیا تو میکے والوں نے کہا کہ لڑکی کو حمل لڑکے ہی کی طرف سے ہے، اور شادی کے سات ماہ بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی، آیا یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دوبارہ نکاح کی کیا صورت ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ بچی کی ولادت نکاح کے سات ماہ بعد ہوئی ہے، اس

---

(۱) ج:۳ ص:۵۶۵ (طبع سعید).
(۲و۴) دیکھئے پچھلے صفحے کا جواب نمبر۱ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔
(۳) دیکھئے پچھلے صفحے کا جواب اور حاشیہ نمبر۲۔
(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۸۸ کا حاشیہ نمبر۱۔

لئے یہ بچی شرعاً زید ہی کی قرار دی جائے گی،[۱] اور اس بچی کا نسب زید ہی سے ثابت ہوگا،[۲] اور زید کا نکاح صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۰۱ ج)

اگر ماں بچے کی پرورِش کا اپنا حق ساقط کردے تو اس کے بعد بھی وہ رُجوع کرسکتی ہے

سوال:- میرے بڑے بھائی جناب سیّد عالم نے اپنی بیوی مسمّٰی حلیمہ خاتون کو طلاق دے دی، جس کو تقریباً دو سال ہوگئے، طلاق کے وقت ایک بچہ تھا جس کی عمر طلاق کے وقت تقریباً ڈیڑھ سال تھی، تو اس وقت یہ فیصلہ طے پایا کہ بچہ ماں کی پرورِش میں ایک سال رہے گا اور پرورِش کے چھ ماہ تک ۱۵ روپیہ لے گی، چھ ماہ کے بعد سے بیس روپیہ کے حساب سے لے گی۔ میرے بھائی اس حساب سے ادا کرتے رہے، جس کی رسید ہمارے پاس موجود ہے، مگر اب جبکہ ہم لوگ عیدالفطر پر بچے کو لینے گئے تو اُنہوں نے بچہ دینے سے انکار کردیا، شرعی نقطۂ نگاہ سے بچہ کب تک ماں کے پاس رہ سکتا ہے؟

جواب:- مذکر بچہ جب تک سات سال کی عمر کا ہو اُس کی پرورِش کا حق ماں کو ہے،[۳] اور شروع میں جو ماں نے صرف ایک سال تک بچہ اپنے پاس رکھنے کا معاہدہ کیا تھا اس سے اس کا حق ساقط نہیں ہوا، بلکہ وہ اب بھی سات سال عمر ہونے تک بچے کو دینے سے انکار کرسکتی ہے، لما فی الدّر المختار واذا أسقطت الأمّ حقّها صارت کمیتة .... الخ. وفی رد المحتار تحته واستظهر الرحمتی أن هٰذا الاسقاط لا یدوم، فلها الرّجوع لأنّ حقّها یثبت شیئًا فشیئًا، فیسقط الکائن لا المستقبل. (شامی ج:۲ ص:۶۳۶)۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۱۹ ج)

متبنّیٰ (لے پالک) نسبی بیٹے کے حکم میں نہیں

سوال:- مکرمی جناب مفتی صاحب مدظلکم العالی السلام علیکم مزاج گرامی

لے پالک لڑکے کا مسئلہ معلوم کرنے میں جناب کی طرف سے جواب موصول ہوا تھا، جس پر

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۸۰ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۶۶ (طبع سعید) والحاضنة اما أو غیرها أحقّ به أی بالغُلام حتّی یستغنی عن النساء وقدّر بسبع وبه یفتٰی .... الخ.

(۴) ج:۳ ص:۵۵۹ (طبع سعید).

نہ دستخط، نہ مہر، نہ تاریخ تھی، مستفتین کو مشتبہ معلوم ہوا، واپس ارسال خدمت ہے، گستاخی معاف ہو جناب نے مشورہ دیا شادی کرلو، ا:-اوّل تو عمر کا تقاضا نہیں، نصف نصف کے قریب ہے۔۲:-جس کو بیٹا بنا کر پالا، پرورِش کی، یہ کیسے غیرت گوارا کرے گی کہ اُسے شوہر بناؤں؟ ۳:-دُنیا کیا کہے گی؟ یہ تو کوئی حل نہ ہوا ۴:- نہ ہی یہ ایسا عمل ہے کہ جو کہ ناقابلِ معافی ہو، خداوند کریم غفور رحیم ہے، بڑے بڑے گناہ معاف کردیتا ہے، اور کردے گا۔۵:-ایک حل یہ سوچا ہے کہ میں اپنی ہمشیرہ کی دختر کے ساتھ شادی کردوں گی جس میں ابھی ۵، ۶ سال کا وقت درکار ہے، فریقین رضامند ہیں، پھر تو یہ میرے اور میری والدہ ہمشیرہ کے لئے نواسہ داماد ہوگا، اب بھی فتویٰ معلوم ہونے پر وہ کوئی پردہ نہیں کرتا ہے، نہ میری محبت اور خدمت اُسے جدا کرنے کو تیار، نہ مجھے پردہ کرنے کی بیٹے کی طرف سے یارہ، وہ میری ہمشیروں کو خالہ، بھائیوں کو ماموں کہتا ہے، صرف والد صاحب واسطہ نہیں رکھتے نہ وہ نانا کہلواتے ہیں، نہ وہ مجھے ملتے ہیں، لے پالک لڑکا اور میں ایک جگہ گھر میں رہتے ہیں، کوئی حل بتلایئے شب و روز کی یومیہ بازاری ضروریات گھریلو زندگی میں پیش رہتی ہیں، کس طرح پوری کرائی جائیں؟ آج کل کے حالات میں کون کسی کا خیال کرتا ہے؟ والدین نحیف ہیں، بازار جاتے نہیں، یہ لڑکا ہی کرتا ہے، آج کل کے نوکر چاکر مرضی کا کام نہیں کرتے، عقل حیران ہے کس طرح زندگی گزرے گی؟ فتویٰ تو دے دیا مگر مجبوری پر غور نہ فرمایا۔

جواب:- مسئلے کا شرعی حکم تو وہی ہے جو سابق فتویٰ میں بیان کیا گیا، قرآنِ کریم نے بڑی تاکید اور وضاحت کے ساتھ یہ حکم بیان فرمایا ہے کہ لے پالک نسبی بیٹے کے حکم میں ہرگز نہیں ہوسکتا،[1] لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دونوں پر ماں بیٹے کے شرعی اَحکام جاری نہیں ہوسکتے، البتہ حسنِ سلوک کے معاملے میں وہ آپ کے ساتھ ماں جیسا اور آپ اس کے ساتھ بیٹے جیسا معاملہ کریں تو اس میں کچھ حرج نہیں، جہاں تک پردے کا تعلق ہے، نامحرَم ہونے کی بناء پر آپ پر اس سے پردہ واجب ہے، اور جو ضروریات آپ نے اس سے وابستہ قرار دی ہیں وہ پردے کے ساتھ بھی پوری ہوسکتی ہیں، آپ کے لئے شریعت کا حکم یہی ہے کہ اس کے ساتھ پردے سے رہیں اور لوگوں کے غلط عمل کی بناء پر شریعت کا حکم نہیں بدل سکتا، اور جب کبھی پردے کی خلاف ورزی ہو اس پر توبہ و اِستغفار کریں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ اگر اپنی ہمشیرہ کی بیٹی سے اس کا نکاح کردیں گے تب بھی وہ غیرمحرَم ہوگا، البتہ اگر آپ کی کوئی رضاعی بیٹی ہو تو اس سے نکاح کرنے پر وہ آپ کا محرَم بن سکے گا۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۴/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۹۰/۳۱ ب)

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ" سورة الأحزاب:۵.

نکاح کے چھ ماہ بعد پیدا ہونے والا ثابت النسب ہوگا

سوال:- میری شادی کو سات ماہ ہوئے تھے تو لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی سات ماہ کی نہیں تھی پورے نو ماہ کی تھی، کیونکہ اس کے سر کے بال بڑے تھے، اور ناخن بھی بڑے تھے، ٹھیک ایمان سے کہتا ہوں کہ لڑکی میری نہیں ہے، میری بیوی کے پیٹ میں پہلے ہی سے بچہ تھا، لڑکی کے والدین کو یہ واقعات بتادیئے وہ اپنی لڑکی کو اپنے گھر لے گئے اور ہم نے گھر سے نکال دیا، تقریباً گیارہ مہینے ہوگئے ہیں، کیا میں اس عورت کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہوں؟

جواب:- شرعاً اگر نکاح کے بعد چھ مہینے کے اندر بچہ پیدا ہو تو وہ شوہر ہی کا قرار دیا جاتا ہے،[1] اور جب تک آپ کے پاس عورت کے زنا کرنے کا شرعی ثبوت مہیا نہیں ہوتا، صورتِ مسئولہ میں جو بچہ نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہوا وہ شرعاً آپ ہی کا سمجھا جائے گا،[2] آپ اپنی بیوی کو دوبارہ گھر میں لاکر آباد کرسکتے ہیں، بلکہ ایسا ہی کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۶/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۷۹۰ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا حکم

سوال:- جو بچہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہوا ہو وہ جائز ہے اور اس کا نسب ثابت ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بچے کا نسب اس شوہر سے ثابت نہیں ہوگا جس سے ولادت سے صرف تین ماہ قبل نکاح ہوا ہے۔[3]

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۱۳ ج)

طلاق کے بغیر دُوسری جگہ نکاح کی صورت میں اولاد کے نسب کا حکم

سوال:- ایک شادی شدہ لڑکی اپنے خاوند کو چھوڑ کر دُوسرے شخص کے ساتھ چلی گئی، دُوسرا

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۴۹ (طبع سعید) لو نکحها الزّانی حلّ لهٔ وطؤها اتفاقًا والولد لهٔ ولزمه النفقة. وفی الشامیة تحته أی ان جاءت بعد النکاح لستة أشهر مختارات النوازل فلو لأقل من ستّة أشهر من وقت النّکاح لا یثبت النّسب ولا یرث منه. وفی الهندیة ج:۱ ص:۵۴۰ کتاب الطّلاق الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب ولو زنٰی بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدت ان جاءت به لستة أشهر فصاعداً ثبت نسبه .... الخ. وفیها أیضًا ج:۱ ص:۵۳۶ واذا تزوّج الرّجل امرأة فجاءت بالولد لأقل من ستّة أشهر منذ تزوّجها لم یثبت نسبه وان جاءت به لستّة أشهر فصاعدًا یثبت نسبه منه. وکذا فی البحر الرائق ج:۴ ص:۱۵۵، وفتح القدیر ج:۴ ص:۱۷۸.

شخص مرزائی ہے، پہلے خاوند نے طلاق بھی نہیں دی، پہلے سے کوئی اولاد نہیں، اب اس کے اولاد بھی ہے، وہ اولاد حلال کی کہلائے گی یا حرامی؟ مثلاً اگر وہ مسلمان ہوجائے تو پھر اس کا نکاح دُرست ہوسکتا ہے اگر پہلے خاوند نے طلاق بھی نہیں دی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اس شادی شدہ عورت نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اس پر واجب ہے کہ فوراً اپنے شوہر کے پاس آجائے، البتہ جو بچے پیدا ہوئے ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اصل شوہر کے نکاح میں ہے اس وقت تک وہ بچے اُس کے شوہر ہی کے سمجھے جائیں گے،[1] ہاں! اگر شوہر ان بچوں کو اپنی طرف منسوب کرنے سے انکار کرے تو عدالت میں جاکر انکار کردے، جس پر لعان ہوگا،[2] اور یا تو عورت کو زنا کی سزا ملے گی یا دونوں کے درمیان عدالت کی طرف سے نکاح فسخ کردیا جائے گا، اور بچے شوہر کے بجائے اپنی ماں کی طرف منسوب ہوں گے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۲۳۶ ج)

(۱، ۲) وفی ردا لمحتار کتاب الطلاق باب ثبوت النسب مطلب الفراش علی أربع مراتب ج:۲ ص:۶۸۴ .... وقوی هو فراش المنكوحة ومعتدّة الرّجعی فانه فیه لا ینتفی الا باللّعان. وفی الهندیة کتاب الطلاق، الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب: لثبوت النسب ثلاث مراتب الأوّل النكاح الصحیح وما هو فی معناه من النكاح الفاسد والحكم فیه أنه یثبت النسب من غیر دعوة ولا ینتفی بمجرّد النفی وانما ینتفی باللّعان فان كان ممن لا لعان بینهما لا ینتفیٰ نسب الولد.

﴿فصل فی نفقة الزّوجة والأولاد والاٰباء والأمّهات وسکناهم﴾

(زوجہ، اولاد اور والدین کے نفقہ اور سکنیٰ کے اَحکام)

بیوی کے لئے الگ مکان کے انتظام کا حکم

سوال:- زید شادی شدہ ہے اور ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہے، اور تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، عرصہ سے اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے جاتا، وہ کبھی میکے میں ہوتی ہے، اور کبھی سسرال میں، جب زید سے کہا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے والد کی خدمت کے لئے چھوڑی ہے جبکہ والد کی خدمت کے لئے گھر میں اور لوگ بھی ہیں، اور کہتا ہے کہ اگر بیوی ساتھ لے چلوں تو پھر تبلیغی کام نہیں ہوسکتا، دھیان بیوی کی طرف ہوگا، مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے، مجھے خداوند کریم کی ضرورت ہے۔ کیا اس کو مکان الگ کردینا ضروری نہیں جبکہ دُوسرے رشتہ دار بھی اس بات پر ناراض ہیں، جب کالج سے موسمی چھٹیاں ہوجاتی ہیں تو تبلیغی پروگرام میں چلّے کاٹنا چاہتا ہے، عید کے لئے رائے ونڈ جاتا ہے، ان دنوں میں بھی بیوی کے حقوق نہیں ادا کرتا، جب گھر آتا ہے تو پھر یا تو مسجد میں سوجاتا ہے یا مکان سے الگ ایک بیٹھک میں سوتا ہے۔

جواب:- زید کے اُوپر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نان، نفقہ اور رہائش کا اس طرح انتظام کرے کہ وہ کسی کی محتاج نہ رہے، اور رہائش کے لئے ایسا مقفل کمرہ، باورچی خانہ اور بیت الخلاء ہونا ضروری ہے جس میں کسی دُوسرے کا اشتراک نہ ہو[1]، اس کے علاوہ اس کے اُوپر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اس کے جائز حقوقِ زوجیت ادا کرکے اس کی دِل داری کرے، اگر ان حقوق کی ادائیگی کے ساتھ وہ تبلیغ کے لئے جائے تو اس کے لئے جائز اور ثواب ہے، لیکن ان حقوق میں کوتاہی کرکے تبلیغ کے لئے جانا شرعاً جائز نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

---

(۱) وفی الهداية ج:۲ ص:۴۴ا (طبع سعيد) وعلى الزّوج أن يسكنها فی دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلّا أن تختار ذٰلک. وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۵۹۹ وكذا تجب لها السكنٰى فی بيت خالٍ عن أهله ... الخ.

وفی البحر الرائق ج:۴ ص:۱۹۳ أی الاسكان للزّوجة علٰى زوجها فتجب لها كما تجب النفقة .... ليس له أن يشترک غيرها لأنّها تتضرّر به .... الخ. وكذا فی الهندية ج:۱ ص:۵۵٦ (طبع رشيديه كوئٹه).

ماں کے پاس پرورش کے دوران بچوں کا نفقہ باپ پر ہوگا

سوال:- مسلم قانون میں کہا گیا ہے کہ نابالغ کا کنٹرول اور سپرویژن باپ کا رہے گا اور کسٹڈی ماں کی رہے گی، اگر لڑکا ہے تو ۷ برس تک، اور لڑکی ہے تو بلوغت تک، کنٹرول اور سپرویژن کے کیا معنی ہیں؟

جواب:- مطلب یہ ہے کہ نان ونفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہوگی،[۱] اور اس کی تربیت کی پالیسی میں بھی اسی کی رائے معتبر ہوگی بشرطیکہ وہ خلافِ شرع نہ ہو، لیکن بچہ تحویل میں ماں کی رہے گا، وہ اس کو پالے گی۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۹/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۷۵/ ۲۹ ب)

تنگ دست فاسقہ ماں کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے

سوال:- ایک عورت زنا کا ارتکاب کرتی ہے، وہ اپنے بیٹے کے احسن طریقے سے سمجھانے سے بھی اس فعلِ بد سے اجتناب نہیں کرتی، ایک دن ماں بیٹے میں اس بات پر تلخ کلامی ہوئی اتنے میں ایک بزرگ تشریف لائے اور انہوں نے بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے فرمایا کہ ماں اگر کنجری بھی ہو تو بیٹے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کی بے عزتی کرے۔ اتفاق سے اُس وقت میں بھی وہاں چلا گیا، (پنجاب میں ''کنجری'' اُس عورت کو کہتے ہیں جو حکومت سے لائسنس لے کر پیشہ کرائے)، لیکن مجھے اس بزرگ کی باتوں سے اتفاق نہیں تھا، میں نے ایک عالم سے رُجوع کیا، وہ فرمانے لگے کہ بیٹے کو چاہئے کہ ماں کو احسن طریقے سے سمجھائے، اگر نہ سمجھے تو اُس کا مقاطعہ کردے، لیکن خرچ ضرور دیتا رہے، مقاطعہ کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں کہ گھر سے ماں کو نکال دے یا خود نکل جائے، ماں کو نکال دیا جائے تو بیٹے کی بدنامی ہوگی، گھر میں رہ کر وہ بُرائی کراتی رہے تو بیٹا بھی گناہگار ہوگا، ایسی حالت میں بیٹے کو کیا کرنا چاہئے؟ تاکہ بُرائی رُک جائے اور بیٹا خدا کے نزدیک بھی مجرم قرار نہ دیا جائے۔

جواب:- ماں اگر تنگ دست ہے تو اُس کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے، خواہ وہ کتنی بدعمل کیوں

---

(۱) وفی الهداية كتاب الطّلاق باب النفقة ج:۲ ص:۴۴۴ (طبع شركت علميه ملتان) نفقة الأولاد الصّغار على الأب لا يشاركهٗ فيها أحد كما لا يشاركه فى نفقة الزّوجة لقوله تعالىٰ: "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ" والمولود له هو الأب.
وفى الدّر المختار باب النفقة ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعيد) وتجب النّفقة بأنواعها على الحرّ لطفله الفقير الحر.
وفى الشامية أى ان لم يبلغ حدّ الكسب.

(۲) وفى الدر المختار مع ردّ المحتار كتاب الطلاق باب الحضانة ج:۳ ص:۵۵۵ (طبع سعيد) الحضانة تثبت للأم .... الخ. وفيه أيضًا ج:۳ ص:۵۶۶ (طبع سعيد) والحاضنة أمًّا أو غيرها أحقّ به أى بالغلام حتّى يستغنى عن النّساء وقدّر بسبع وبه يفتىٰ .... والأم والجدّة لأم أو لأب أحق بها بالصغيرة حتّى تحيض أى تبلغ فى ظاهر الرواية .... الخ.

نہ ہو، زنا تو ایک سنگین معصیت ہے، لیکن تنگ دست ماں باپ اگر کافر و مشرک ہوں تب بھی ان کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی سے پیش آنا فرض ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: ''وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا'' الآیة۔[1] یعنی اگر تمہارے والدین تمہیں مشرک بنانے کی کوشش کریں تب ان کی اطاعت تو نہ کرو، لیکن دُنیوی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ۔ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو اپنی کافر ماں کے ساتھ صلۂ رحمی کا حکم دیا،[2] اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: ونفقة الأصول والفروع للجزئية وجزء المرء فی معنی نفسه فکما لا تمتنع نفقة نفسه بکفره لا تمتنع نفقة جزئه. (شامی ج:۲ ص:۶۸۳)۔[3] اور تفسیر مظہری میں ہے: یجب بهٰذه الأیة (وهی الأیة المذکورة) الانفاق علی الأبوین الفقیرین وصلتهما وان کانا کافرین. (مظہری ج:۷ ص:۳۵۶)۔[4] اور جب کفر کے باوجود نفقہ واجب ہے تو محض فسق کی بنا پر وہ ساقط نہیں ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بیٹے پر واجب ہے کہ اپنی ماں کو نفقہ دیتا رہے، البتہ ساتھ ہی ایک تو اس کی بدکاری پر اُسے فہمائش مسلسل جاری رکھے،[5] مثلاً جن لوگوں سے وہ ملوّث ہوسکتی ہے اُن کا داخلہ گھر میں بند کردے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۶/۲۸ الف)

۱:- شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کا گھر سے باہر جانا
۲:- بیوی اپنے لئے الگ گھر کا مطالبہ کرسکتی ہے
۳:- میکے میں رہنے کی صورت میں شوہر پر نفقہ اور زچگی کے اخراجات لازم نہیں

سوال ۱:- کیا بیوی کے لئے شوہر کی مرضی کے بغیر گھر سے چلے جانا جائز ہے؟ ایک خاتون

---

(۱) سورة لقمان: ۱۵.

(۲) وفی صحیح البخاری باب صلة المرأة أمّها ولها زوج ج:۲ ص:۸۸۴ (طبع سعید) عن أسماء قالت: قدمت أمّی وهی مشرکة فی عهد قریش ومدتهم اذا عاهدوا النبی صلی اللہ علیه وسلم مع أبیها فاستفتیتُ النبی صلی اللہ علیه وسلم فقالت: انّ أمّی قدمت وهی راغبة، قال: نعم صِلِی أُمَّکِ.

(۳) ج:۳ ص:۶۳۱ (طبع سعید). (۴) (طبع بلوچستان بک ڈپو).

(۵) وفی رد المحتار کتاب الحدود باب التّعزیر ج:۴ ص:۷۸ (طبع سعید) اذا رأی منکرًا من والدیه یأمرهما مرّة فان قبلا فبها وان کرها سکت عنهما واشتغل بالدُّعاء والاستغفار لهما فان اللہ تعالٰی یکفیه ما أهمّه من أمرهما .... الخ.

صفیہ سلطانہ شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے چلی گئی ہے، کیا اس کے لئے یہ جائز ہے؟

۲:- صفیہ سلطانہ عرف شاہینہ مذکورہ اور ثناء الرحمٰن کی شادی فریقین کی رضامندی اور اولیائے ہر دو جانب کے مابین طے ہوکر قرار پائی تھی، اب مسماۃ مذکورہ کہتی ہے کہ مجھے شوہر کی شکل اچھی نہیں لگتی، اور شوہر کے ساتھ اس شرط کے ساتھ رہنے کو تیار ہے جبکہ ڈرگ کالونی میں کرایہ کا مکان لے کر وہیں رہا جائے، اور ساس وسسر کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہے، بلکہ شوہر نے اپنے والدین سے علیحدہ رکھا ہوا ہے، پھر بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

۳:- صفیہ سلطانہ عرف شاہینہ حاملہ تھی، اور یہاں سے جانے کے پندرہ روز کے بعد وضعِ حمل کے مراحل سے دوچار ہوئی، حالانکہ صفیہ کے شوہر ثناء الرحمٰن نے ان مراحل سے گزرنے کے لئے (یعنی زچگی کے لئے) تین چار اچھے اسپتالوں میں انتظام کر رکھا تھا، لیکن شاہینہ مذکورہ کے والدین نے زبردستی اُسے روکے رکھا اور کسی معمولی زچہ خانے میں داخل کرادیا، اس صورت میں شوہر بیوی کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے بغیر اس کے گھر سے جانا بیوی کے لئے سخت گناہ کی بات ہے،(۱) صورتِ مسئولہ میں صفیہ سلطانہ پر واجب ہے کہ وہ فوراً شوہر کے گھر آجائے اور اپنے سابقہ عمل پر اللہ سے توبہ و استغفار کرے اور شوہر سے معذرت کرے۔(۲)

۲:- بیوی کو حق ہے کہ وہ اپنے لئے ایسے گھر کا مطالبہ کرے جس میں ساس، سسر کا کوئی عمل دخل نہ ہو، لہٰذا صفیہ سلطانہ کا مطالبہ اگر اسی قدر ہے تو بجا ہے اور اس کا پورا کرنا شوہر کے لئے ضروری ہے، لیکن کسی خاص جگہ کی تعیین کا بیوی کو حق نہیں کہ مثلاً ڈرگ کالونی میں ہی رہوں گی، یہ شرط لگانا بیوی کے لئے ناجائز ہے اور اس کی پابندی بھی شوہر پر واجب نہیں بلکہ علیحدہ مکان کا جہاں بھی شوہر انتظام کردے بیوی کے حق کی ادائیگی ہوجاتی ہے، لما فی الدر المختار وبیت منفرد من دار له غلق .... کفاها. وفی البحر عن الخانیة یشترط ان لا یکون فی الدر أحدٌ من أحماء الزوج یؤذیها(۳) ..... وقال الشامیؒ: فینبغی الافتاء بلزوم دار من بابها .... فعلی المفتی أن ینظر الٰی حال أهل زمانه .... الخ. (شامی ج:۲ ص:۶۶۴)۔(۴)

(۱، ۲) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی حقّ الزّوج علی المرأة ج:۱ ص:۲۱۹ (طبع سعید) عن أبی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لو کنت امر أحدًا أن یسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها.
وفی الدرّ المختار کتاب النکاح، باب القسم ج:۳ ص:۲۰۸ (طبع سعید) وحقّه علیها أن تطیعه فی کل مباح یأمرها.

(۳) الدرّ المختار ج:۳ ص:۶۰۰، ۶۰۱ (طبع سعید)

(۴) ردّ المحتار ج:۳ ص:۶۰۱، ۶۰۲ (طبع سعید) وفی الهدایة کتاب الطّلاق باب النفقة ج:۲ :۱۴۴ (طبع سعید) وعلی الزّوج أن یسکنها فی دار مفردة لیس فیها أحد من أهله الّا أن تختار ذٰلک.

۳:- صورتِ مسئولہ میں زچگی کا خرچہ شوہر پر واجب نہیں ہے، اور جب تک بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے میں رہے گی اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب نہ ہوگا، **اجرة القابلة علیٰ من استأجرها من زوجة وزوج، ولو جاءت بلا استئجار قیل علیه وقیل علیها.** (شامی ج:۲ ص:۶۴۹)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ

بیوی کا علاج شوہر کے ذمہ ہے یا نہیں؟

سوال:- بہشتی زیور میں اور دیگر کتبِ حنفیہ میں زوجہ کے نان ونفقہ وکسوہ وغیرہ کو مرد کے ذمے واجب لکھا ہے، ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ زوجہ بیمار ہوجائے تو اس کے علاج معالجے کا خرچ شرعاً شوہر پر واجب نہیں بلکہ اپنے مال سے کرے، ہاں! شوہر تبرعاً علاج کرادے تو وہ اس کا احسان ہے۔

طلبہ نے سبق پڑھتے وقت یہ اِشکال کیا تھا کہ دُکھ بیماری انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، بعض دفعہ علاج کی فیس، ڈاکٹروں اور آپریشنوں پر ہزاروں روپے لگ جاتے ہیں، تو بیچاری بیوی یہ کہاں سے خرچ کرے گی؟ اس کا کیا حل ہے؟

جواب:- اس مسئلے میں احقر کو بھی مدّت سے تردّد ہے، ایک مرتبہ اس مسئلے پر دُوسرے فقہاء کی کتابوں کی بھی مراجعت کا اتفاق ہوا، اور یہ عجیب بات نظر آئی کہ سب کے ہاں صورتِ حال یکساں ہی سی ہے، یعنی علاج کے خرچے کو نفقہ کا حصہ قرار نہیں دیا گیا۔[2] لیکن تلاش کے باوجود قرآن وسنت کی کوئی ایسی نص بھی نہیں ملی جس میں یہ صراحت ہو کہ علاج کا خرچہ شوہر پر واجب نہیں، اس لئے احقر کو کچھ یہ خیال ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں نفقہ کے ساتھ ''بالمعروف'' کی قید لگائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفقہ کا تعین عرف پر مبنی ہے، پچھلے دور میں چونکہ علاج کا خرچہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا اس لئے شاید عرف یہ تھا کہ وہ نفقہ میں شامل نہیں، اگر یہ بات دُرست ہو تو عرف کی تبدیلی سے حکم بدل جانا چاہئے، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں عرفاً علاج، نفقہ کا حصہ ہے، یوں بھی عقلاً یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر شوہر پر علاج کا خرچہ واجب نہ ہو تو بیماری کی صورت میں عورت کیا کرے؟ جبکہ موجودہ دور میں علاج کا خرچہ اتنا ہوتا ہے کہ ایک ایسی بیوی جس کا کوئی ذریعہ روزگار نہ ہو اس کا تحمل نہیں کرسکتی۔ لیکن یہ ساری باتیں ابھی تک سوچ ہی کی حیثیت میں ہیں، چونکہ کہیں منقول نہیں

---

(۱) الدرّ المختار ج:۳ ص:۵۷۹، ۵۸۰ (طبع سعید)

(۲) وفی الشامیة کتاب الطّلاق باب النفقة ج:۳ ص:۵۷۵ (طبع سعید) کما لا یلزمه مداواتها أی اتیانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة.

دیکھیں، اور نہ دُوسرے اہلِ علم سے اس پر مشورہ ہوا، اس لئے احقر کو اس پر جزم نہیں ہے، بہتر ہوگا کہ آپ سوال مندرجہ ذیل حضرات کو بھی بھیج دیں:-

۱:- حضرت مفتی رشید احمد صاحب، دار الافتاء والارشاد ناظم آباد نمبر۴، کراچی۔

۲:- مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب، دارالعلوم حقانیہ، ساہیوال ضلع سرگودھا۔

۳:- مفتی عبدالستار صاحب، جامعہ خیر المدارس، ملتان۔

۴:- مولانا مفتی عبدالواحد صاحب، جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور۔

۵:- مولانا مفتی عبدالقادر صاحب، دارالعلوم کبیر والا، ضلع ملتان۔

احقر نے اُوپر اپنی جو سرسری سوچ لکھی ہے، اگر وہ بھی احقر کے بعینہ الفاظ میں ان کو بھیج دیں تو بہتر ہے، ان حضرات کے جو جوابات موصول ہوں ان سے براہِ کرم احقر کو بھی مطلع فرمائیں، والسلام۔

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

(فتویٰ نمبر ۴۵/۸۵)

﴿کتاب الأيمان والنذور﴾

(قسم، منّت اور نذر کے اَحکام)

قسم کا کفارہ اور کسی گناہ پر قسم کھانے کی صورت میں اس گناہ کو ترک کرنا واجب ہے

سوال:- چار سال پہلے ایک کام کرنے کا ارادہ کیا، اس سلسلے میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی اور پھر میں نے یہ عہد توڑ دیا، آپ نے فتویٰ میں غریبوں کو کھانا کھلانے کے متعلق لکھا تھا، جن کی تعداد مجھے یاد نہیں، براہِ کرم تعداد بتلا دیں۔

جواب:- قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے، یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے رکھے جائیں[1]، آپ نے اگر قسم توڑنے کے بعد دس مسکینوں کو کھانا کھلا دیا تو کفارہ ادا ہوگیا[2]، توبہ و اِستغفار بھی کرلیں، توبہ اگر سچے دِل سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑے گناہ کو معاف فرمادیتا ہے، اِن شاء اللہ یہ گناہ معاف ہوجائے گا، بشرطیکہ جس کام کے کرنے کی آپ نے قسم کھائی تھی وہ مباح کام ہو، اور اگر وہ کام خود گناہ ہو تو اُس کا ترک کرنا واجب ہے، اور مذکورہ کفارہ اس کے لئے کافی نہیں ہوگا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۴۳/۲۷ ہ)

کسی سے ناجائز اَمر پر قسم کے لئے دباؤ ڈالنے اور لفظ ''اللہ'' سے قسم منعقد ہونے کا حکم

سوال:- کسی شخص کی ساس اور سالے نے خسر کی موجودگی میں اُس کی بیوی کی زچگی کے زمانے میں زبردستی داماد سے ہاتھ پر قرآن رکھ کر یہ عہد لیا کہ ''آئندہ سے عہد کرو کہ ہماری بہن کی اولاد نہ ہوگی، یہ چار ہی بچے رہیں گے اور اپنے دِل میں بیوی سے قربت جائز رہے گی''، آیا طلاق

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ، ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ... الأية (المائدة: ۸۹)

وفی الدر المختار كتاب الأيمان ج:۳ ص:۷۲۵، ۷۲۶ (طبع سعيد) وكفّارته تحرير رقبة أو اطعام عشرة مساكين أو كسوتهم بما يصلح للأوساط .... وان عجز عنها كلّها وقت الأداء صام ثلٰثة أيام ولاء.

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷۲۷ (طبع سعيد) ولم يجز التكفير ولو بالمال خلافًا للشافعی قبل حنث .... الخ.
وفی الشامية تحته لأن الحنث هو السبب كما مرّ فلا يجوز الّا بعد وجوده .... الخ.

(۳) وفی تنوير الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعيد) ومن حلف علٰى معصية كعدم الكلام مع أبويه أو قتل فلان اليوم وجب الحنث والتكفير.

ہوگئی؟ اُن کا زور اس بات پر تھا کہ داماد نس بندی کرالے، جس کی داماد نے سخت مخالفت کی اور سختی سے انکار کردیا، اس وجہ سے یہ عہد زبردستی لیا گیا۔

جواب:- مذکورہ عہد کرنا جائز نہیں تھا، نہ بیوی کے رشتہ داروں کے لئے جائز تھا کہ وہ شوہر سے زبردستی ایسا عہد لیں اور اس عہد سے بیوی پر نہ طلاق واقع ہوئی ہے اور نہ قربت حرام ہوئی ہے، بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ قربت کرتا رہے، اور جب استقرارِ حمل ہو تو قسم کا کفارہ ادا کرے، اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ یا تو دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا ان کو لباس دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن روزے رکھے،[۱] اور یہ کفارہ بھی اُس صورت میں واجب ہے جبکہ اس نے اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا ہو،[۲] اور اگر اللہ کی قسم نہیں کھائی تو کفارہ بھی واجب نہیں۔[۳] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۰۳/۲۷ ه)

''قرآن کی قسم'' کا حکم اور قرآن اُٹھائے بغیر بھی قسم منعقد ہوجاتی ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ حسن اللہ دو سال سے ایک کارخانے میں ملازم ہے اور شادی شدہ ہے، شاہدہ بھی چند یوم میں کام پر لگی ہے، جو کہ دوشیزہ ہے، دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے، حسن اللہ کارخانے میں چند لوگوں کے سامنے لڑکی شاہدہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور لڑکی شاہدہ حسن اللہ سے بچنے کے لئے آگے آگے بھاگتی ہے، اور حسن اللہ گالیاں دیتا ہوا پکڑنا چاہتا ہے، شاہدہ کی مدد کو کچھ لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور شاہدہ کو اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں، لڑکی شاہدہ ناظم کارخانہ سے شکایت کرتی ہے، حسن اللہ لڑکی کی شکایت دُرست تسلیم نہیں کرتا ہے تو ناظم کارخانہ حسن اللہ اور شاہدہ کی موجودگی میں گواہان کے ہاتھ پر یٰسین شریف کی کتاب رکھ کر حلفیہ بیان لیتا ہے، جس سے حسن اللہ کا قصور ثابت ہوتا ہے، اب حسن اللہ کے آدمی ناظم کارخانہ پر قرآنِ شریف کی بے حرمتی کا الزام لگاتے ہیں، کیا اس بات سے قرآنِ کریم کی بے حرمتی ہوئی ہے؟ جواب سے مشکور فرمائیں۔

جواب:- حلف قرآنِ کریم کو اُٹھائے بغیر، محض اللہ کی قسم کھانے سے بھی ہوجاتا ہے، لیکن

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲، ۳) وفي تنوير الأبصار مع الدر المختار كتاب الأيمان ج:۳ ص:۷۰۱ الى ۷۱۲ (طبع سعيد) والقسم بالله تعالى وباسم من أسمائه كالرّحمٰن والرحيم والحق أو بصفة من صفاته تعالى .... لا يقسم بغير الله تعالى كالنبي .... الخ. وفي الشامية ج:۳ ص:۷۱۲ (طبع سعيد) قوله لا يقسم بغير الله تعالى عطف على قوله والقسم بالله تعالى أي لا ينعقد القسم بغيره تعالى أي غير اسمائه وصفاته .... الخ.

اگر قرآنِ کریم کو ہاتھوں پر اُٹھا کر قسم کھائی جائے تو اس سے قرآنِ کریم کی بے حرمتی نہیں ہوتی، اور اس طرح بھی قسم صحیح ہوجاتی ہے۔ کذا یؤخذ مما فی رد المحتار ج:۲ ص:۷۰ نقلًا عن العینی۔[۱]

واللہ اعلم

۱۳۹۰/۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۸۲۴/۲۱ الف)

کئی قسموں کے متعدد کفارے دینا لازم ہے

سوال:- زید نے قسم کھائی کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا، اپنی بے اعتدالی کی وجہ سے ایفا نہ کرکے وہ کام کرگزرا، اب تک کفارہ نہ دیا تھا کہ پھر قسم کھائی کہ یہ کام نہ کروں گا، پھر بے اعتدالی کی وجہ سے ایفا نہ کرکے وہ کام کرگزرا، ھلم جرًا آخر میں کفارہ دینے کو چاہا، تو اب ایک کفارہ دے گا یا ہر ایک قسم کا الگ الگ کفارہ ہوگا؟

دُوسری صورت میں بین الکفارتین فصل ہوگی یا متصل ہوگی؟

جواب:- قسم جتنی مرتبہ کھائی جائے گی خلاف ورزی کی صورت میں ہر قسم کا ایک کفارہ دینا ضروری ہوگا، خاص طور سے جبکہ دوسری قسم پہلی قسم کی خلاف ورزی کے بعد کھائی گئی ہو۔

فی الدر المختار وتتعدد الکفارۃ لتعدد الیمین والمجلس والمجالس سواء ولو قال عنیت بالثانی الأول ففی حلفہ باللہ لا یقبل. (شامی ج:۳ ص:۷۱)۔[۲] البتہ کفارات میں وصل ضروری نہیں، فصل بھی کرسکتا ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۶/۱۸ الف)

اللہ تعالیٰ اور قرآن کے لفظ کی قسم کھانے کا حکم اور قسم کا کفارہ کیا ہے؟

سوال:- علی حسین جنرل سیکریٹری یونائیٹڈ فیڈریشن پاکستان اور دُوسرے فریق عبدالغنی،

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۲، ۷۱۳ (طبع سعید) قال الکمال ولا یخفی أن الحلف بالقرآن الأن متعارف فیکون یمینًا وأمّا الحلف بکلام اللہ فیدور مع العُرف وقال العینی وعندی أن المصحف یمین لا سیما فی زماننا وعند الثلاثۃ المصحف والقران وکلام اللہ یمین. وکذا فی الفتاویٰ الھندیۃ کتاب الأیمان، الباب الثانی الفصل الأوّل ج:۲ ص:۵۳ (طبع رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) الدر المختار کتاب الأیمان ج:۳ ص:۷۱۴ (طبع سعید) وفی البحر الرائق ج:۴ ص:۲۹۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وفی التجرید عن أبی حنیفۃ اذا حلف بأیمان فعلیہ لکل یمین کفّارۃ والمجلس والمجالس سواء ولو قال عنیت بالثانی الأوّل لم یستقم ذٰلک فی الیمین باللہ تعالٰی.

۲:-نوشہ،۳:-ظہیرالدین، ان فریقین نے قرآن پر یہ قسم کھائی تھی کہ ایک دُوسرے کے ساتھ رہیں گے، اور ایک دُوسرے کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے جو ناجائز ہوگی۔ اس سلسلے میں علی حسین نے فریق دوم کے تینوں افراد کو ۵، ۵ فٹ جگہ دی اور یہ کہ ڈگری کی رقم ادا کرنا ہوگی جو بھی ہو، تمام خرچہ ملاکر، لیکن عبدالغنی ڈگری کی رقم دینے سے انکار کرتا رہا کہ میں نہیں دُوں گا، اور علی حسین یہ کہتا رہا کہ ڈگری کی رقم بعد میں دینا ہوگی۔ فریق دوم نے ڈگری کی رقم ادا نہیں کی، قسطیں کرائیں، ان کو بھی ادا نہیں کیا، بعد میں نوشہ نے ۵ فٹ کی جگہ ۱۵ فٹ جگہ لے لی، ظہیر نے رقومات قسطیں کرانے کے باوجود ادا نہ کیں، اور دُوسرے معاملات جو کہ علی حسین کے مفاد کے خلاف ہیں اس میں بھی عبدالغنی، نوشہ، ظہیر مداخلت کرتے ہیں، جبکہ قسم پر کہا تھا کہ ہم کسی معاملے میں نہیں بولیں گے۔

۲:-علی حسین نے غصّے کے عالم میں دُوسرے نادہندگان ڈگری کے سلسلے میں قرآن کی قسم کھائی کہ میں یک مشت ڈگری کی رقم وصول کروں گا اور کورٹ میں لوگوں کو جاکر روپیہ جمع کرنا ہوگا، لیکن دو آدمیوں کا نام زبانی لے لیا محمد یامین اور مُنّا کا اور کہا کہ سب کو ڈگری جمع کرنا ہے۔

۳:- ہم چار افراد ایک مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک شخص ببرالدین آیا اور اس نے کہا کہ چاروں آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھو پانچوں نے ہاتھ پر اپنا اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ قرآن درمیان میں ہے کہ حالانکہ قرآن نہیں تھا، اب نیت میں کچھ فتور پائے جاتے ہیں چونکہ ہر ایک کے معاملے میں مداخلت کر رہے ہیں، رقم تیسرے فریق سے حاصل کی گئی تھی اور اُس رقم سے اسٹال وغیرہ تعمیر کئے گئے تھے، چونکہ مسئلہ کلامِ پاک کا ہے، چونکہ فریق دوم، سوم سب قسطیں چاہتے ہیں، اور مجھ فریق اوّل کو روپیہ کی ادائیگی ان لوگوں کو کرنا ہے جنھوں نے بغیر اپنے مفاد کے روپیہ ہمیں قرض دیا تھا، حالانکہ اگر یہ لوگ روپیہ ادا کرنا چاہیں تو نمبر ا، ۲، ۳، ادا کرسکتے ہیں، آج ۳ سال سے اس جگہ کی آمدنی سے کافی رقم حاصل کرچکے ہیں۔

جواب:- قسم کھانے کا حکم سمجھ لیجئے، اس سے تینوں مسئلوں کا جواب ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ یا قرآنِ کریم کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہوجاتی ہے[1]، اور اگر یہ قسم کسی ناجائز کام پر نہ کھائی گئی ہو تو اُسے توڑنا گناہ ہے، اور اگر کسی ناجائز کام پر کھائی گئی ہو تو توڑنا واجب ہے[2]۔ دونوں صورتوں میں اس کا کفارہ دینا ہوگا۔ کفارہ یہ ہے کہ یا دس مسکینوں کو فی کس پونے دو سیر گندم کے حساب سے غلّہ یا اس کی

(۱) ''اللہ تعالیٰ'' کے لفظ سے قسم منعقد ہونے کا حوالہ سابقہ ص:۴۹۶ کے حاشیہ نمبر ۲ و ۳ میں، اور ''قرآنِ کریم کی قسم'' سے قسم منعقد ہونے کا حوالہ پچھلے صفحہ:۴۹۷ کے حاشیہ نمبرا میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی تنویر الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعید) ومن حلف علی معصیة کعدم الکلام مع أبویه أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر.

قیمت دے، یا دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کے لباس کا انتظام کرے، اور اگر ان میں سے کسی بات کی استطاعت نہ ہو تو تین دن متواتر روزے رکھے۔[1] صورتِ مسئولہ میں جن باتوں پر آپ نے قسمیں کھائی ہیں، ان کی تفصیل سوال سے سمجھ میں نہیں آئی، اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کام جائز ہیں یا ناجائز؟ بہرصورت قسموں کی خلاف ورزی پر مذکورہ کفارہ ادا کریں اور ہر قسم کے توڑنے پر الگ کفارہ ہوگا۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۷/۲۸ ج)

”تمہارے ہاتھ کا بھرا پانی پیؤں تو سور کے خون کے قطرے پیؤں“ الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی

سوال:- تین سال قبل رمضان میں روزہ کھولنے سے ۱۵ منٹ قبل پینے کا پانی رکھا تھا، اور اس میں برف ڈال دیتا تھا، لیکن آخر رمضان میں ایسا ہوا کہ میں پانی رکھنا اور برف لانا بھول گیا، جب روزہ کھولنے میں ۵ منٹ رہ گئے تو مجھے اس بات کا خیال آیا، مگر گھڑے کے پاس پانی نکالنے گیا مگر گھڑے میں پانی نہیں تھا، پھر میں صحن میں آیا تو دیکھا کہ میرا ایک لڑکا نثار جس کی عمر ۲۰ سال ہے صحن میں کھڑا ہوا ہے، میں نے اُس سے کہا: نثار! تم نل سے پانی لا دو، میں برف لے کر آتا ہوں۔ مگر نثار نے پانی لانے سے انکار کر دیا، اس پر میں نے کہا کہ تم برف لے آؤ، پانی میں لے آتا ہوں، لیکن اُس نے برف لانے سے بھی انکار کر دیا، مجھے بہت غصہ آیا اور میں نل پر پانی لینے چلا گیا، اتنے میں میرے دُوسرے دو لڑکے نل پر پانی لینے آگئے، ایک نے کہا پانی میں بھر دیتا ہوں، دُوسرے نے کہا برف میں لے آتا ہوں، یہ کام دونوں کے سپرد کر کے گھر واپس آگیا، نثار اُسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں چھوڑ کر اُسے باہر گیا تھا، میں نے غصّے میں کہا: ”نثار! اگر ہم تمہارے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی پئیں تو سور کے خون کے قطرے پئیں“ پھر ڈیڑھ سال تک ہماری اُس سے بول چال بند رہی، اس کے بعد اُس نے معافی مانگی، میں نے معاف کر دیا، لیکن پانی نہ پینے کی جو قسم کھائی تھی ہنوز اُس پر قائم ہوں، اگر کوئی شرعی گنجائش ہو تو تحریر فرمائیں، ورنہ ساری عمر اس پر قائم رہوں گا۔

جواب:- سوال کے خط کشیدہ الفاظ سے شرعی قسم متحقق نہیں ہوئی، لہٰذا اگر اب آپ نثار کے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی پی لیں تو آپ پر کوئی کفارہ عائد نہیں ہوگا، آپ اس کے ہاتھ سے پانی پی سکتے ہیں،

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۹۵ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۴۹۷ کا فتویٰ اور اُس کا حاشیہ نمبر۱ ملاحظہ فرمائیں۔

لما فی الدر المختار وان فعله فعلیه غضبه أو سخطه أو لعنة الله أو هو زان أو سارق أو شارب خمر أو آکل ربا لا یکون قسمًا وفی رد المحتار عن الولوالجیة هو یستحل الدم أو لحم الخنزیر ان فعل کذا لا یکون یمینا. (شامی ج:۳ ص:۵۷)۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۷/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۲۸ ب)

''اگر مزید سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں'' الفاظ سے قسم منعقد ہونے کا حکم

سوال:- تقریباً چار سال قبل ایک مرتبہ میں نے بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تو (یعنی ذکر طلاق ہوگیا تھا) تب پڑے گی کہ جب تم کفریہ بات کروگی یا تم کفریہ کلمہ کہوگی، غالباً پہلا فقرہ کہا تھا، آج بیوی سے بات ہو رہی تھی اُس کو چھ تولے سونے کا زیور بنواکر دینے کی، وہ کہنے لگی کہ ۸ تولے سونے کا زیور بنوادو، فلاں فلاں زیور، پھر اگر بعد میں میں مزید سونا لوں یا یوں کہا کہ اور سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں، اب اگر ۸ تولے سونا لے کر دے دوں اور بعد میں کبھی وہ اور سونا مانگے تو کیا اس سے واقعی کافر ہوجائے گی اور پھر اس سے ایک طلاقِ صریح یا بائن پڑ جائے گی؟

جواب:- آپ کی بیوی نے جو یہ کہا کہ ''اگر میں بعد میں مزید سونا مانگوں تو کافر ہوجاؤں'' ان الفاظ سے قسم متحقق ہوگئی ہے، یعنی آئندہ اس کے لئے مزید سونا مانگنا ناجائز ہے، اگر مانگے گی تو اسے قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، لیکن وہ اس کی بناء پر کافر نہیں ہوگی، اور نہ اس سے اُس پر طلاق واقع ہوگی، فی الدر المختار وان فعل کذا فهو کافر فیکفّر بحنثه لو فی المستقبل والأصح أن الحالف لم یکفر. (شامی ج:۳ ص:۵۵)۔[۲]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۵/۲۸ ب)

---

(۱) الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۳ ص:۷۲۱ (طبع سعید) وفی الفتاویٰ الهندیة الباب الثانی فیما یکون یمینًا وما لا یکون یمینًا الفصل الأوّل ج:۲ ص:۵۵ (طبع رشدیه کوئٹه). لو قال ان فعلت کذا فأنا زان أو سارق أو شارب خمر أو آکل ربا فلیس بحالف هٰکذا فی الکافی.

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۷، ۷۱۸ (طبع سعید) وفی الهندیة کتاب الأیمان الباب الثانی فیما یکون یمینًا وما لا یکون یمینًا ج:۲ ص:۵۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله أو یعبد الصّلیب أو نحو ذٰلک ممّا یکون اعتقاده کفرا فهو یمین استحسانًا کذا فی البدائع حتّٰی لو فعل ذٰلک الفعل یلزمه الکفارة وهل یصیر کافرًا اختلف المشائخ فیه قال شمس الأئمة السرخسیؒ والمختار للفتویٰ انّه ان کان عنده انّه یکفر متٰی أتٰی بهٰذا الشّرط ومع هٰذا أتٰی یصیر کافرًا لرضاء بالکفر وکفّارته أن یقول لا اله الّا الله محمد رسول الله وان کان عنده انه اذا أتٰی بهٰذا الشّرط لا یصیر کافرًا لا یکفّر .... الخ.

قسم کی خلاف ورزی کو دیانۃً بہتر سمجھنے کی صورت میں خلاف ورزی کرنا اور کفارہ دینا بہتر ہے

سوال:- ایک لڑکی کو اس بات کا حلف اس کے والدین نے دباؤ ڈال کے اُٹھوایا کہ تم صرف زید کو اپناؤ گی، لڑکی نے دباؤ میں آکر یہ حلف تو اُٹھالیا مگر اب وہ اس حلف کو توڑنا چاہتی ہے، کیا یہ حلف جو کہ دباؤ میں آکر اُٹھایا گیا ہے، حلف کہلانے کا مستحق ہے؟ اور اس کا گناہ کس کے سر پر ہوگا؟

۲:- اگر اس حلف کی کوئی شرعی حیثیت ہے تو اس کو توڑنے کا کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

۳:- بالفرض اس نے دباؤ سے نہ بھی اُٹھایا ہو بلکہ دِل سے اقرار کیا ہو، تو کیا کفارہ ہوگا؟

جواب ۱:- کسی شخص پر اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر حلف اُٹھانے کے لئے دباؤ ڈالنا دُرست نہیں ہے، لیکن اس طرح اگر کوئی شخص حلف کرے (یعنی اللہ کی قسم کھا کر کسی بات کا وعدہ کرے) تو حلف صحیح ہوجاتا ہے۔[1]

۲:- ایسی صورت میں حلف اُٹھانے والا اگر حلف کی خلاف ورزی کو دیانۃً بہتر سمجھتا ہے تو اس کے لئے حلف کی خلاف ورزی جائز ہے،[2] لیکن اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔[3] کفارے کا مطلب یہ ہے کہ تین کاموں میں سے کوئی ایک کام کرے، یا دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلائے، یا دس مساکین کو متوسط درجے کا لباس دے، اور اگر ان پر قدرت نہ ہو تو تین روزے رکھے۔[4]

۳:- اگر دِل سے بغیر کسی جبر کے حلف کیا ہو، لیکن بعد میں دیانۃً دُوسری جانب کا بہتر ہونا سمجھ میں آیا ہو تب بھی قسم توڑنے کی گنجائش ہے،[5] اس صورت میں بھی وہی کفارہ ادا کرنا ہوگا جس کی تفصیل نمبر۲ میں گزری۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۴۳/۲۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۹۶ کا حاشیہ نمبر۲ و۳۔

(۲، ۳، ۵) وفی سنن النسائی باب من حلف علٰی یمین فرأی غیرها خیرًا منها ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی موسٰی عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ما علی الأرض یمین أحلف علیها فأری غیرها خیرًا منها الا أتیتُهٗ. وفی کتاب الأصل (المبسوط للشیبانیؒ) کتاب الأیمان ج:۳ ص:۱۹۰ قد بلغنا عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه قال: من حلف علٰی یمین فرأی غیرها خیرًا منها فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عنه یمینه. وکذا فی الهدایة کتاب الأیمان.

(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۹۵ کا حاشیہ نمبر۱۔

قسم کھانے کا حکم اور قسم کے کفارہ کی تفصیل

سوال:- میں نے ایک کام نہ کرنے کے سلسلے میں اللہ کے حضور میں قرآن پاک کی قسم کھائی، اب میں اس کو کرنا چاہتا ہوں، اس کا کیا کفارہ ہے؟

جواب:- اگر اللہ کی قسم کھا کر آپ نے کوئی کام نہ کرنے کا عزم کیا تھا، اور زبان سے کہا تھا تو آپ کے لئے جائز نہیں کہ وہ کام کریں، اِلَّا یہ کہ وہ کوئی نیک کام ہو۔ بہرصورت اگر وہ کام آپ نے کرلیا تو کفارے کے طور پر یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں، یا دس مساکین کو ایک ایک جوڑا کپڑا دیں، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن روزے رکھیں۔ ان میں سے جو کام بھی کرلیں گے کفارہ ادا ہوجائے گا۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۰۵/۲۱ الف)

جواب صحیح ہے، جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اگر وہ کام شرعاً جائز ہے اور اس کے کرنے کی آپ کو ضرورت ہے تو وہ کام کرلیں، پھر کفارۂ قسم دے دیں[۲] جس کی تفصیل جواب میں آگئی ہے۔

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نذر کی قربانی کا گوشت خود کھانا جائز نہیں

سوال:- زید نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہوجائے تو میں بقرعید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بکرا قربان کروں گا، چنانچہ قربانی کے موقع پر بکرا قربان کیا گیا، اب اس بکرے کا کیا حکم ہے؟ کیا ناذِر خود کھاسکتا ہے یا صدقہ کرے؟

جواب:- نذر کی قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں، اگر غلطی سے کھالیا تو جتنا گوشت کھایا ہے اس کی قیمت کا صدقہ کیا جائے۔ ولا یأکل النّاذر منها فان أکل تصدّق بقیمة ما أکل. درمختار مع الشامی ج:۵ ص:۲۸۵۔[۳]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۶۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الأیمان ج:۳ ص:۷۲۵ و ۷۲۷ (طبع سعید) وکفارته تحریر رقبة أو اطعام عشرة مساکین (الٰی قوله) صام ثلاثة أیام ولاء. وفی الهندیة کتاب الأیمان فصل فی الکفّارة ج:۲ ص:۶۱ (طبع رشیدیه) وهی أحد ثلاثة أشیاء ان قدر عتق رقبة یجزیٔ فیها ما یجزیٔ فی الظهار أو کسوة عشرة مساکین لکل واحد ثوب فما زاد وأدناه ما یجوز فیه الصلوٰة أو اطعامهم (الٰی قوله) فان لم یقدر علٰی أحد هٰذه الأشیاء الثلاثة صام ثلاثة أیام متتابعات.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے گزشتہ صفحہ:۵۰۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۲،۳ و ۵۔

(۳) الدّر المختار ج:۶ ص:۳۲۱ (طبع سعید).

﴿کتابُ الوقف﴾

(وقف کے مسائل)

وقف ہونے کے لئے مالک کا باقاعدہ وقف کرنا ضروری ہے
وقف ہونے کے محض دعویٰ سے زمین وقف نہیں ہوتی

سوال:- عرض اینکہ آج سے نوّے سال قبل ملک مظفر خان کے والد ملک محمد امیر بھچر ہمارے خاندان کے ایک بزرگ میاں احمد کو وال لیچراں لائے، ایک کوٹھی بنا کر اپنی زمین میں بٹھادیا، جب وہ فوت ہوئے تو وہیں دفن ہوئے۔ اس کے قریب کافی جگہ جنگل کی صورت میں ہمارے آباء و اجداد کو دے دی گئی، آج تک ملک صاحبان کی اولاد میں سے کسی نے اس جگہ کا مطالبہ نہیں کیا، ہمارے بزرگوں کو ۱۹۵۶ء میں علم ہوا کہ یہ جگہ دیہہ آبادی ہے، پٹواریوں کے کاغذات میں اس کا قبضہ ہمارے نام ہے۔ ضرورت کے مطابق ہم یہاں رہائشی مکانات بناتے رہے، ہمارے بزرگ کی قبر کے قریب قبریں بھی بنتی رہیں، نہ ہم نے قبریں بنانے سے کسی کو روکا، نہ ہی ہمیں مکان بنانے سے کسی نے روکا۔ ۱۹۷۷ء میں ہمارے رشتہ دار نذر حسین اینڈ برادرز ولد غلام حسین نے ایک کوٹھی کی تعمیر شروع کی، وال لیچراں کے ملک شیر محمد ولد ملک بندہ نے ڈپٹی کمشنر میانوالی کو درخواست دی کہ یہ جگہ قبرستان کے لئے وقف ہے۔ اس پر سماعت شروع ہوئی، ملک عمر حیات، ملک خضر حیات پسران ملک عطاء محمد برادر ملک مظفر خان نے عدالت میں جا کر بیان دیا کہ ہمارے آباء و اجداد نے یہ تمام جگہ ان کے بزرگوں کو دے دی تھی، یہ جو کچھ اس جگہ پر تعمیر کریں، ہمیں کچھ اعتراض نہیں۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہوا جس کا تحریری ثبوت ہے۔ اس کے بعد کوٹھی اور دیگر درجنوں مکان تعمیر ہوئے، شہر کے کسی فرد نے کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالی۔ گزشتہ سال تعمیر اور فیصلے کے گیارہ سال بعد عطاء محمد زمان قوم لیجر وغیرہ نے پھر مسئلہ کھڑا کر دیا اور یہ کہا کہ: یہ جگہ قبرستان کی ہے، یہاں مردے دفن ہوتے رہے۔ اس پر قبریں مسمار کر کے مکان تعمیر کئے گئے۔ برائے کرم یہ بتائیں کہ ان لوگوں کا یہ رویہ کہاں تک دُرست ہے؟ جبکہ ان کے پاس وقف کے کوئی ثبوت نہیں ہیں۔

جواب:- کسی زمین کے وقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مالکِ زمین نے اس کو وقف کیا ہو[1]، اور جب تک وقف کرنے کا شرعی ثبوت موجود نہ ہو، کسی زمین کو وقف نہیں کہا جاسکتا۔ محض یہ بات کہ اس زمین میں مُردے دفن ہوتے رہے ہیں، اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ یہ زمین قبرستان

---

(۱) دیکھئے اگلے فتویٰ کا حاشیہ نمبر۱۔

کے لئے وقف ہے، اور نہ کسی شخص کا محض دعویٰ، وقف کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب تک مدعیانِ وقف زمین کے وقف ہونے پر کوئی ایسی شہادت پیش نہ کریں جس سے شرعاً یہ ثابت ہوسکے کہ فلاں مالکِ زمین نے اس کو فلاں فلاں مقاصد کے لئے وقف کیا تھا، اس وقت تک اس کو وقف قرار دینا دُرست نہیں، اور اس بناء پر جو لوگ اس پر قابض و متصرف چلے آرہے ہیں اور اس کے مملوک ہونے کے دعوے دار ہیں ان کو اس زمین سے بے دخل کرنا یا ان کے مالکانہ تصرفات کو روکنا بھی جائز نہیں ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۸/۱۱/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۴۹۴ ح)

۱:- مہتممِ مدرسہ متولّیٔ وقف ہے یا چندہ دہندگان کا وکیل؟
۲:- زمین کو خریدنے اور اُس کا مالک بننے سے پہلے اسے وقف کرنا

سوال ۱:- مہتممِ مدرسہ بمنزلہ متولّیٔ وقف ہے یا وکیل عن المعطین دَرحق اموالِ مدرسہ؟

۲:- اس شہر کی تمام زمین کو حکومت جو شیعہ اثناعشریہ ہے اپنا خالصہ سمجھتی ہے اور لوگوں کے ہاتھ جب تک وہ پہلے سے کچھ بناء وغیرہ کے ذریعہ تصرف نہ کریں خاص زمین کو فروخت بھی نہیں کرتی ہے، اس لئے شہر کے چند آدمی متفق ہوکر کچھ چندہ جمع کرکے ایک قطعہ زمین کو عیدگاہ کے نام سے دیوار کرکے اپنے تصرف میں لائے اور ایک دو بار اس میں نماز بھی پڑھ چکے ہیں، اس کے بعد نماز پڑھنا اس کے اندر متروک ہوگیا ہے۔ اب وہ آدمی جنھوں نے اس کی دیوار بنانے میں چندہ دیا ہے اس بات پر راضی ہوچکے ہیں کہ اس کو مدرسہ میں جو اس کے قریب ہے شامل کردیا جائے، کیونکہ یہ جگہ عیدگاہ کے لئے ناکافی ہے اور عیدگاہ دُوسری جگہ بنانا پڑے گی، تو آیا اس زمین کو دینی مدرسہ کے تصرف میں لانا شرع کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

۳:- اس زمین کے شرق سے لے کر شمال تک بیرونی جانب بھی کچھ زمین موجود تھی جس کو

---

(۱) وفی أحکام الأوقاف للخصاف ص:۱۳۴: أرأیت هٰذه الوقوف الّتی تقادم أهلها ومات الشهود الذین یشهدون علیها ما السبیل فیها؟ قال: ما کان فی أیدی القضاة منها وما کان لها رسوم فی دواوین القضاة أجریت علی الرّسوم الموجودة فی دواوینهم استحسانًا اذا تنازع أهلها فیها وما لم یکن لها رسوم فی دواوینهم یعمل علیها فالقیاس فیها اذا تنازع القوم فیها أن یحملوا علی التثبیت فمن ثبت فی ذٰلک شیئًا حکم له به. بحوالہ امداد الاحکام دیکھئے: ج:۳ ص:۶۰.
وفی رد المحتار کتاب الوقف مطلب فی الوقف اذا انقطع ثبوته (ج:۴ ص:۳۹۶ طبع سعید کراچی) ان الأوقاف الّتی تقادم أمرها ومات شهودها فما کان لها رسوم فی دواوین القضاة وهی فی أیدیهم أجریت علیٰ رسومها الموجودة فی دواوینهم استحسانًا اذا تنازع أهلها فیها، وما لم یکن لها رسوم فی دواوین القضاة القیاس فیها عند التنازع ان من أثبت حقا حکم له به.
وفی الاشباه والنظائر ص:۲۰۹ لا تثبت الید فی العقار الا بالنّیّة.

ان لوگوں نے فقط تحجیر کر کے چھوڑ دیا ہے اور خیال اُس وقت یہ تھا کہ اس کو بھی آئندہ عیدگاہ میں شامل کردیں گے، اور اس پر نماز ادا نہیں کی گئی۔ آیا جوازِ تصرف برائے مدرسہ میں ان دونوں مذکورہ بالا زمینوں میں کچھ تفاوت ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- مدرسہ کی زمین، عمارات اور کتابیں وقف ہوتی ہیں، لہٰذا مہتمم ان اوقاف کا متولّی ہے، لیکن نقد روپیہ یا استعمالی اشیاء جو مدرسے میں بطور چندہ دی جاتی ہیں وہ وقف نہیں ہوتیں، لہٰذا اُن کے حق میں مہتممِ مدرسہ کی حیثیت وکیل المعطین کی ہے، کذا یفهم من امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۰۳ سوال نمبر ۶۵۲۔

۲، ۳:- اگر وہ زمین ابھی تک حکومت سے خریدی نہیں گئی تھی بلکہ صرف دیوار بنائی گئی تھی تاکہ اس کی بنیاد پر حکومت سے خریدی جائے تو یہ زمین ابھی عیدگاہ کے لئے وقف نہیں ہوئی، کیونکہ وقف کی صحت کے لئے واقف کا مالک ہونا شرط ہے، لما فی رد المحتار ذکر فی البحر أن مفاد کلام الحاوی اشتراط کون أرض المسجد ملکا للبانی. (شامی ج:۳ ص:۳۷۰)۔[1]

لہٰذا اب اگر اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دُوسری جگہ عیدگاہ بنانا چاہتے ہیں اور اس زمین میں مدرسہ بنانا مقصود ہے تو ایسا کرنا جائز ہے، اور اس حکم میں وہ زمین بھی داخل ہے جس میں نماز شروع کردی گئی تھی، اور وہ زمین بھی جس میں نماز شروع نہیں کی گئی بلکہ صرف دیوار بنائی گئی تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ

مسجد کی تعریف اور تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کی گئی جگہ میں امام کا مکان بنانے کا حکم

سوال:- ہمارے محلے کی مسجد جو صدیوں پُرانی ہے، ایک سو سال ہوا کہ ایک نابینا حافظ صاحب جو تونسہ شریف پنجاب کے باشندے تھے آکر اس مسجد کے ملحقہ چھوٹے سے حجرے میں جو ۸ فٹ چوڑا تھا مقیم ہوئے، لیکن استدعا کی کہ ایک بڑا حجرہ ہونا چاہئے جس میں درسِ قرآن جاری کرسکوں۔ محلے والوں سے تو کچھ نہ ہوسکا، امام صاحب نے اپنی جانب سے ایک کشادہ حجرہ ۱۴×۱۴

---

(۱) وفی الشامیة أیضًا ج:۴ ص:۳۴۰ (طبع سعید) (وشرطه شرط سائر التبرعات) أفاد أنّ الواقف لا بدّ أن یکون مالکه وقت الوقف ملکًا باتًّا .... الخ.

وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۵۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) ومنها الملک وقت الوقف .... الخ.

وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۸۸ (طبع رشیدیه کوئٹه) الخامس من شرائطه الملک وقت الوقف .... الخ.

وفی قانون الحلال والانصاف ص:۱۱ یشترط لصحة الواقف أهلًا للتبرّع أعنی حرًّا عاقلًا بالغًا وان یکون مالکًا للعین الموقوفة. وکذا فی ص:۲۰.

مربع فٹ کا بنوا کر قرآنی تعلیم کے لئے وقف کردیا اور اپنی رہائش بھی منتقل کرلی، تقریباً پچاس سال درس دیتے رہے، بیسیوں حفاظ اور سینکڑوں ناظرہ خواں طلباء مستفیض ہوئے، آخر داعیٔ اجل کا پیغام آپہنچا اور لبیک کہہ کر اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے وفات پا جانے کے بعد مقامی دیہات سے ایک اور حافظ صاحب، اِمام مقرّر ہوئے، جب شادی کی تو پردہ دار رہائشی مکان کا مطالبہ کیا، ان کے لئے مسجد سے علیحدہ کسی مقام کا انتظام تو نہیں ہوسکا مگر چند ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ اسی قرآنی تعلیم کی جگہ کے صحن میں دو دیواریں ڈال کر اسی کو پردہ دار مکان بنادیا جائے، مگر میں نے بدلائلِ ذیل اس کی مخالفت کی۔ ۱:- سابق اِمام مرحوم نے جو اپنی جانب سے قرآنی تعلیم کا حجرہ بنا کر وقف کیا اس کے وقف کا حق پامال کرکے کیا واقف کی رُوح کو تڑپانے کے مترادف نہ ہوگا؟ اور کیا ہم گناہگار نہ ہوں گے؟ ۲:- ہر انسان چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو، سکھ ہو یا عیسائی، یہودی ہو یا مجوسی مسجد کے کسی حصے میں آنے جانے کا حق رکھتا ہے، بشرطیکہ الف:- پاگل نہ ہو، ب:- ایسا غلیظ لباس نہ رکھتا ہو جس سے دیگر حاضرین کو گھن آئے، ج:- نشے کی حالت میں نہ ہو، د:- کسی سے دُشمنی کا ارادہ نہ رکھتا ہو، وغیرہ وغیرہ، مگر مکان بنانے سے حق چھن جائے گا۔ ۳:- صحنِ حجرہ اتنا وسیع وعریض نہیں جس میں مکان کے علاوہ کسی اور حجرے کے بنانے کی گنجائش ہوتا کہ قرآنی تعلیم جاری کی جاسکے۔ ۴:- پردہ دار مکان بن جانے سے صحنِ حجرہ میں مسجد میں جاتے وقت جوتے اُتارنے کا حق بھی تلف ہوگا۔ ۵:- مسجد کے محراب والا کمرہ اور حجرہ متصل ہیں، اور درمیان میں ایک کھڑکی بھی لگی ہوئی ہے جس سے سابق نابینا اِمام مرحوم بوقتِ امامتِ جماعت آمد و رفت رکھتا تھا، اب حجرہ جو رہائشی کمرہ بن جائے اور اس میں بال بچے رہنے لگیں اور اگر اِمام صاحب بھیڑ بکری بھی رکھتے ہوں تو ان کی آواز سے، کمرے متصل ہونے اور بیچ میں کھڑکی ہونے سے نماز میں خلل واقع ہونے کا احتمال ہے۔ ۶:- اپنے شہر میں اور دیگر شہروں میں بھی یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ مکان کو قربان کرکے مسجد بنائی جاتی ہے اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ جو مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں گھر ملتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں اس کا کیا بنے گا جو اس کے برخلاف مسجد کو گھر بناتا ہے؟ اس کو آخرت میں کیا ملے گا؟ ۷:- مسجد میں مکان بن جانے سے اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ بھی اندرونِ مسجد ہوگا جبکہ مسجد کا اپنا داخلی دروازہ بھی بالمقابل گھر کے ہوگا، اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی اتفاقاً نمازیوں کا اور گھر میں آنے جانے والی عورتوں کا آمنا سامنا ہوجائے جو ایک معیوب بات ہے۔

کرم فرمائے بندہ! دریں حالات یہ دریافت طلب اَمر ہے کہ اَز رُوئے شریعتِ حقہ احاطۂ مسجد میں جو زیادہ وسیع وعریض بھی نہ ہو، ایک سابق حجرۂ قرآنی تعلیم اور اس کے صحن کے تمام حقوق غصب

کر کے پردہ دار رہائشی مکان بنانا کیسا ہے؟ کیا ہم مکان بنا کر گناہگار نہ ہوں گے؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ شرعاً مسجد صرف وہ جگہ ہوتی ہے جس کو بنانے والے نے مسجد قرار دیا ہو، اور صرف نماز پڑھنے کی نیت سے بنایا ہو، لیکن جو جگہ کسی اور مقصد مثلاً تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کی گئی ہو وہ نہ شرعاً مسجد ہوتی ہے اور نہ اس پر مسجد کے اَحکام جاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں صحنِ حجرہ کو اگر بانی یا واقف نے مسجد قرار دیا تھا تب تو اس کو نماز پڑھنے کے سوا کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، چنانچہ اس میں رہائشی مکان بھی نہیں بن سکتا، لیکن اگر بانی یا واقف نے اس کو مسجد قرار نہیں دیا بلکہ تعلیمِ قرآن کے لئے یا مسجد کی دیگر ضروریات کے لئے وقف کیا تھا تو اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ واقف کی شرائط کیا تھیں[۱]؟ اگر اس نے وقف کرتے وقت کوئی ایسی صراحت کر دی تھی کہ یہ پوری جگہ تعلیم ہی میں استعمال ہوگی، اساتذہ وغیرہ کے مکانات میں نہیں، تب بھی یہاں مکان بنانا جائز نہیں[۲]۔ لیکن اگر وقف میں تعلیمِ قرآن کی تمام متعلقہ ضروریات کی نیت کی گئی تھی تو اس میں ضرورت کے وقت اساتذہ کا مکان بنانے کی گنجائش ہے، البتہ تعمیر اس انداز سے کرنی چاہئے کہ حتی الامکان نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو، اور بے پردگی کا بھی احتمال کم سے کم ہو۔　　واللہ اعلم

۱۴۰۰/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۸/۳۱ د)

دارالعلوم دیوبند کے لئے دُکان کا کرایہ وقف ہونے کی صورت میں کون سے دارالعلوم دیوبند کو کرایہ بھیجا جائے؟

سوال:- باعث تحریر آنکہ میرپورخاص میں ایک صاحب جو رحلت فرما چکے ہیں، تقسیمِ پاک و ہند سے پہلے دو دُکانیں دارالعلوم دیوبند کے لئے وقف فرما گئے تھے۔ ان دونوں کا کرایہ وصول یابی کے بعد دارالعلوم کو ترسیل ہوتا رہا ہے، اب چند سالوں سے دارالعلوم کی حیثیت میں نمایاں فرق آیا اور وہاں دو انتظامیہ قائم ہوگئیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ دارالعلوم کی نئی اور پُرانی انتظامیہ دونوں اس کرایہ کے حصول کے لئے متقاضی ہیں، نئی انتظامیہ کا کہنا یہ ہے کہ حسبِ سابق یہ رقم پُرانی عمارت کے دارالعلوم کو ملنی چاہئے، جبکہ پُرانی انتظامیہ جس نے جامع مسجد دیوبند میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ سابقہ عمارت اب وقف نہیں رہی، اس لئے رقم کی ترسیل بھی اس کو نہیں ہوسکتی،

(۱ و ۲) وفی الشامیة ج:۴ ص:۳۶۶ (طبع سعید کراچی) أن شرائط الوقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله أن یجعل ماله حیث شاء ما لم یکن معصیة ..... وکذا سیأتی فی فروع الفصل الأوّل أن قولهم شرط الواقف کنصّ الشارع، أی فی المفهوم والدّلالة ووجوب العمل به.

کیونکہ پُرانی عمارت کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹر کرالیا ہے، جس کے تحت وقف املاک کی حیثیت ختم ہوکر سوسائٹی کی ملکیت ہوجاتی ہے، لہٰذا اب جبکہ دارالعلوم وقف ہی نہ رہا تو وقف کے معاملات میں ان کا اطلاق بھی نہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں فرمایا جائے کہ رقم سابقہ عمارت کی نئی انتظامیہ کو اِرسال کی جائے، یا جامع مسجد میں قائم کردہ دارالعلوم کی (سابقہ انتظامیہ جو دارالعلوم کو وقف لکھتی ہے) پُرانی انتظامیہ کو اِرسال کی جائے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں میرپور خاص کے وقف کے متولّی کو چاہئے کہ دارالعلوم دیوبند کی دونوں قسم کی انتظامیہ میں سے جس کو اپنی تحقیق اور بصیرت کے مطابق دارالعلوم کا جائز متولّی سمجھے اس کو وقف کی آمدنی اِرسال کردے، بشرطیکہ وہ دارالعلوم کو ایک مذہبی ادارہ اور اس کی وقف جائیدادوں کو اس پر وقف ہونا تسلیم کرے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۸/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۹۴/۳۹ و)

مسجد میں تنگی کی بناء پر باہر کی جگہ کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا صحن کم ہے، نمازی کثرت سے آتے ہیں اور مسجد کے باہر ایک مسلمان کی جگہ ہے، وہ بہ قیمت بھی جگہ نہیں دیتا اور اس جگہ ہوٹل اور دُکانیں تعمیر کرتا ہے جو کہ مسجد کے لئے سخت نقصان کا موجب ہیں۔ کیا زبردستی بہ قیمت جگہ لے کر مسجد میں شامل کردیں تو دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر باہر کی جگہ اس مسلمان کی اپنی ملکیت ہے تو اس پر زبردستی کرکے جگہ کو مسجد میں داخل کرنا جائز نہیں ہے،[1] ہاں! اس کو راضی کیا جائے کہ وہ جگہ مسجد کو فروخت کردے، اور بحیثیت ایک مسلمان اس کو چاہئے کہ وہ مسجد کی ضرورت کا خیال کرے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۵۰/۳۲ ج)

---

(۱) وفي مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ألا لا تظلموا، ألا لا یحلّ مال امرئ الّا بطِیبِ نفس منه. رواه البیهقي في شعب الایمان. وفي حاشیته: أي بالاذن أو بالأمر.

﴿فصل فی أحکام المساجد و اٰدابها﴾

(مسجد کے اَحکام اور آداب کا بیان)

نیچے گودام اور اُوپر مسجد بنانے کا حکم

سوال:- اگر کسی مسجد کے زیرِ زمین حصے میں گودام ہو اور اُوپر کے حصے میں مسجد ہو تو کیا اُوپر کا حصہ بدستور جو بطور مسجد استعمال ہوتا ہے، وہ مسجد کے حکم میں آسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر بنانے والوں نے شروع سے ہی اس طرح تعمیر کیا کہ نیچے مسجد کی ضروریات کے لئے گودام رکھا اور اُوپر مسجد بنائی تو یہ صورت جائز ہے، لیکن اگر شروع میں اس جگہ کو مسجد بنادیا گیا تھا بعد میں گودام بنانا طے کیا گیا تو یہ جائز نہیں، **لما فی الدر المختار واذا جعل تحته سردابا لمصالحه أی المسجد جاز کمسجد القدس (الٰی قوله) أما لو تمت المسجدیة ثم أراد البناء منع۔**[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ

جو جگہ مسجد بنائی جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی

سوال:- ایک مدرسہ ہے، اس میں ایک مسجد بھی ہے جو کمروں کے درمیان میں ہے، اور ایک طرف شارعِ عام بھی ہے، ارکانِ مدرسہ کا خیال ہے کہ مسجد کو شارعِ عام کی طرف منتقل کیا جائے، اور یہ شارعِ عام بھی مدرسہ ہی کا ہے، اور قدیم مسجد میں طلباء کے لئے کمرے بنائے جائیں، کیا یہ اِنتقال جائز ہوگا؟

جواب:- جو جگہ ایک مرتبہ مسجد بن جاتی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے، اور جب تک وہ جگہ بالکل ویران نہ ہوجائے اسے منتقل کرنا جائز نہیں ہوتا۔[2] دُوسری جگہ مسجد کی ضرورت ہو تو الگ

---

(۱) ردّ المحتار کتاب الوقف ج:۴ ص:۳۵۷ (طبع سعید). وفی الهندیة کتاب الوقف ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس. کذا فی الهدایة.

(۲) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید) (ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدًا عند الامام والثانی) أبدًا الٰی قیام الساعة (وبه یفتٰی) حاوی القدسی. وفی الشامیة (قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا وهو الفتویٰ.

بنالی جائے۔ ہاں! اگر یہ جگہ عارضی طور پر نماز پڑھنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اور اسے باقاعدہ مسجد نہیں بنایا گیا تھا تو اَب اسے منتقل کرسکتے ہیں۔ کذا فی الدر المختار[1] والبحر[2] وسائر کتب الفقہ۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۳/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

مسجد کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ مسجد کو اپنی جگہ سے ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو جگہ ایک مرتبہ مسجد بن گئی، اب وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اور جب تک اس سے کامل استغناء نہ ہوجائے، یعنی وہ جگہ بالکل ویران نہ ہوجائے مسجد کو وہاں سے منتقل کرنا باتفاق جائز نہیں ہے۔ قال أبو یوسفؒ: ھو مسجد أبدًا الٰی قیام الساعة لا یعود میراثًا ولا یجوز نقلهٗ ونقل مالهٖ الٰی مسجد اٰخر سواء کان یصلّون فیه أو لا وھو الفتویٰ. کذا فی الحاوی القدسی وفی المجتبیٰ وأکثر المشایخ علٰی قول أبی یوسفؒ ورجح فی فتح القدیر قول أبی یوسف بأنّهٗ الأوجه. (البحر الرائق ج:۵ ص:۲۷۲)[3]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

فضائل کی کتاب پڑھنے کے لئے مسجد کی بجلی، موم بتی وغیرہ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فضائل کی کتاب پڑھنے کے لئے مسجد کی بجلی، موم بتی وغیرہ جلانا اور پنکھے چلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اس مسئلے میں اصل مدار واقف کی نیت اور شرط پر ہے، اور اگر واقف کی نیت و

---

(۱) دیکھئے گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) قال أبو یوسفؒ ھو مسجدٌ أبدًا الٰی قیام السّاعة لا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا وھو الفتویٰ.

(۳) البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع سعید). وکذا فی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید). (نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حواشیہ)۔

شرط مصرّح نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی اگر مسجد کی روشنی اور پنکھے وغیرہ کو دُوسرے دینی اُمور میں استعمال کرنا متعارف ہو اور مسجد کے چندہ دہندگان اس پر اعتراض نہ کرتے ہوں تو جائز ہے، اور ہمارے عرف میں اس پر اعتراض نہیں کیا جاتا، اس لئے فتویٰ کی رُو سے جائز ہے۔

لما فی العالمگیریة: ولا بأس بأن یترک سراج المسجد فی المسجد الٰی ثلث اللیل، ولا یترک أکثر من ذٰلک الا اذا شرط الواقف ذٰلک أو کان ذٰلک معتادا فی ذٰلک الموضع (عالمگیریة قبیل باب الوتر ج:۱ ص:۱۱۰)۔[۱]

وفیها أیضًا: ان أراد انسان أن یدرس الکتاب بسراج المسجد ان کان سراج المسجد موضوعًا فی المسجد للصلاة قیل: لا بأس به، وان کان موضوعًا فی المسجد لا للصلاة بأن فرغ القوم من صلاتهم وذهبوا الٰی بیوتهم وبقی السراج فی المسجد قالوا: لا بأس بأن یدرس به الٰی ثلث اللیل وفیما زاد علی الثلث لا یکون له حق التدریس کذا فی فتاویٰ قاضی خان. (عالمگیریة کتاب الوقف ج:۲ ص:۴۵۹)۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۵۲/۲۷ و)

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کو مسجد سے باہر نکال کر جلسے کے لئے استعمال کرنا

سوال:- قصبہ باغ کے مسلمانوں نے چندہ کرکے جامع مسجد کے لئے لاؤڈ اسپیکر خریدا، ضرورت یہ پیش آتی تھی کہ قصبے میں گنجان آبادی کے باعث نمازِ جمعہ وعیدین اور دیگر مجامع میں اذان یا خطبہ کی آواز لوگوں تک نہیں پہنچتی تھی اور مذہبی وتبلیغی مجالس میں بھی لاؤڈ اسپیکر کی اشد ضرورت تھی، اس ضرورت کے پیشِ نظر چندہ سے لاؤڈ اسپیکر خرید لیا گیا۔ اب چند سالوں سے بعض دیہات وغیرہ میں اور فوجی مراکز میں اجلاس ہوتے ہیں، دیہات میں تو مذہبی اجلاس ہوتے ہیں اور فوج میں تو نری نمائش ہوتی ہے، یا خوشی کے دن کچھ مجالس منعقد ہوتی ہیں، اور خالص قصبہ مذکور میں بھی کبھی کبھی سیاسی مجالس ہوتی ہیں، یہ لوگ مسجد کا لاؤڈ اسپیکر لے جاکر استعمال کرتے ہیں، بعض تو کرایہ بھی نہیں دیتے اور بار بار

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ).

(۲) الفصل الاوّل (طبع مکتبہ رشیدیہ). وفیها أیضًا کتاب الکراهیة ج:۵ ص:۳۲۲ هل یجوز أن یدرس الکتاب بسراج المسجد والجواب فیه انّه ان کان موضوعًا للصلٰوة فلا بأس به وان وضع لا للصلٰوة فان فرغوا من الصلٰوة وذهبوا فان أخّر الٰی ثلث اللیل لا بأس به وان أخّر من ثلث اللیل لیس لهٗ ذٰلک کذا فی المضمرات فی کتاب الهبة.
وفیه أیضًا کتاب الصلٰوة قبیل باب الوتر ج:۱ ص:۱۱۰ ولا بأس بالجلوس فی المسجد لغیر الصلٰوة لٰکن لو تلف به شئ یضمن کذا فی الخلاصة.

پریشان کرتے ہیں، کبھی کبھی لاؤڈاسپیکر خراب ہوجاتا ہے تو راولپنڈی لے جاکر مرمت کرانی پڑتی ہے۔
تو گزارش یہ ہے کہ مذکورہ بالا مجالس میں اس لاؤڈاسپیکر کا استعمال دُرست ہے یا نہیں؟ اور نمازِ جمعہ اسپیکر پر پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں لاؤڈاسپیکر کو مسجد سے باہر نکال کر کسی بھی جلسے وغیرہ میں استعمال کرنا دُرست نہیں ہے، لقول الفقهاء: **ولا يعار (أي الوقف ودخل فيه المنقول المتعارف) ولما في البحر وليس لمتولّي المسجد أن يحمل سراج المسجد الٰى بيته ..... ويجوز الدرس بسراج المسجد ان كان موضوعًا فيه لا للصلاة ..... الٰى ثلث الليل ..... وفيما زاد على الثلث ليس لهم تأخيرها فلا يكون لهم حق الدرس.** (البحر الرائق ج:۵ ص: ۲۷۱)[1]۔

اور نمازِ جمعہ لاؤڈاسپیکر پر پڑھ سکتے ہیں۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ　　۱۳۸۸/۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۲/۱۹ الف)

مسجد کا لاؤڈ اسپیکر رفاہی ضروریات کے لئے استعمال کرنا

سوال:- مسجد کا لاؤڈاسپیکر اور مسجد کو سیلاب زدگان کا امدادی فنڈ جمع کرنے کے لئے اور دیگر اعلانات کرنے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں؟

جواب:- اصل یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے مسجد کی اشیائے موقوفہ کو مسجد کی ضروریات کے علاوہ استعمال نہ کیا جائے، البتہ جو اشیاء مسجد پر وقف نہ ہوں انہیں چندہ دینے والوں کی اجازت سے کسی اور مقصد میں استعمال کرسکتے ہیں۔ چونکہ جو لوگ مسجد میں لاؤڈاسپیکر وقف کرتے ہیں اُن کی طرف سے اُس کی اجازت معتاد ومتعارف ہے، اوراس معاملے میں مدار عرف وعادت ہی پر ہے، اس لئے مذکورہ مقاصد میں استعمال کی گنجائش ہے۔ لما في الهندية: **ولو وقف على دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه جميع الليل بل بقدر حاجة المصلّين، ويجوز الٰى ثلث الليل أو نصفه اذا احتيج اليه للصلاة فيه. كذا في السراج الوهاج. ولا يجوز أن يترك فيه كل الليل الا في**

---

(۱) البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۰ (طبع سعید). وفي الهندية ج:۲ ص:۴۶۲ متولّي المسجد ليس لهٗ أن يحمل سراج المسجد الٰى بيته ولهٗ أن يحمله من البيت الى المسجد كذا في فتاوىٰ قاضي خان.
وفي البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۰ وفي الاسعاف وليس لمتولّي المسجد أن يحمل سراج المسجد الٰى بيته. وفي خلاصة الفتاوىٰ ولا يحمل الرجل سراج المسجد الٰى بيته ويحمل من بيته الى المسجد ج: ۱ ص: ۲۲۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) بحوالہ امداد الاحکام دیکھئے ج:۳ ص:۱۷۲۔

موضع جرت العادة فيه بذلك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبي صلى الله عليه وسلم والمسجد الحرام، أو شرط الواقف تركه فيه كل الليل كما جرت العادة به في زماننا، كذا في البحر الرائق. (عالمگیریة کتاب الوقف باب: ۱۱ فصل: ۱ ج: ۲ ص: ۴۵۹)۔ (۱) واللہ اعلم

۱۳۸۸/۳/۲۳ھ

۱:- مسجد کو حتی الامکان آباد کرنا ضروری ہے
۲:- ضرورتِ شدیدہ کے وقت مسجد کو منتقل کرنے کی گنجائش ہے
۳:- ضد کی وجہ سے بنائی گئی مسجد کا حکم
۴:- استغناء کی وجہ سے دُوسری مسجد کو سامان دے دینے کے بعد پھر پہلی مسجد کو ضرورت پیش آئے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- حکومتِ برطانیہ کے دور میں یہاں ایک مسجد آباد تھی، جب ہندو لوگ مشن کر کے چلے گئے اور مسلمان بھی وہاں سے ختم ہوگئے تو ایک صاحب نے اس مسجد کو دُور کے گاؤں والوں کو دے دیا، پھر ہندوستان سے یہاں آکر آباد ہوگئے اور انہوں نے ایک اور مسجد بنوادی جس میں جمعہ وغیرہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک بی ڈی ممبر نے ایک تیسری مسجد قائم کردی، چند دنوں سے اس میں نماز بھی ہو رہی ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ مسجدِ ثانی کو نابود کیا جائے۔ سابق مسجد (یعنی سب سے پہلی مسجد) کے متولّی کی خواہش ہے کہ اُسی سابق مسجد کی جگہ نئی مسجد قائم کی جائے اور وہاں نماز پڑھا کریں کیونکہ ثانی مسجد کے آس پاس صرف چھ سات آدمی رہتے ہیں، وہ لوگ اس مسجد میں بھی چل کر آسکتے ہیں۔ اب عرض یہ ہے کہ ۱:- سابق مسجد جو برطانیہ کے دور میں آباد تھی اس کو آباد کیا جائے؟ ۲:- دُوسری مسجد کو کیا کیا جائے؟ ۳:- تیسری مسجد ضرار ہے؟ ۴:- سابقہ مسجد کے ٹین جو دُوسری مسجد میں دیئے گئے ہیں کیا کیا جائے؟

جواب ۱:- جب مسلمانوں کے دوبارہ آباد ہونے کی وجہ سے پہلی مسجد کی ضرورت پیش آئی تھی تو اُسے آباد کرنا چاہئے تھا، اور اب بھی اس کو آباد کیا جائے، لأنه مسجد الیٰ قیام الساعة علیٰ قول الشیخین المفتیٰ به۔ (۲)

۲:- دُوسری مسجد بھی تمام اَحکام میں مسجد کی طرح ہے، اُسے باقی رکھنا ضروری ہے، ہاں! اگر

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔

(۲) وفي البحر الرائق ج:۵ ص:۱۵۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) قال أبو یوسفؒ: هو مسجد أبدًا الیٰ قیام السّاعة لا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الیٰ مسجد اٰخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا. وهو الفتویٰ، وکذا في الدّر ج:۴ ص:۳۵۸۔

یہاں سے مسجد کو منتقل کرنے کی ضرورت شدید ہو اور یہاں نماز پڑھنے والے باقی نہ رہیں، تو ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر اس کو منتقل کرنے اور اس کا ملبہ و سامان وغیرہ سابقہ مسجد میں لے جانے کی گنجائش ہے۔(۱) وفی جامع الفتاویٰ: لهم تحويل المسجد الىٰ مكان اٰخر ان يتركوه بحيث لا يصلّى فيه. (رد المحتار ج:۳ ص:۵۱۲).

وقد أفتىٰ بجواز ذٰلک شيخنا التهانویؒ عند الضرورة الشديدة ۔ (امداد ج:۲ ص:۶۲۴)
لیکن مسجد کی جگہ کو اس طرح محفوظ کر دیں کہ بے ادبی نہ ہو، صرف سامان منتقل کر سکتے ہیں۔

۳:- تیسری مسجد بھی تمام اَحکام میں مسجد ہے، اس میں نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ اگر بنانے والوں نے واقعۃً ضد کی وجہ سے بنائی ہے اور اس سے دُوسری مسجد کو ویران کرنا مقصود ہے تو بنانے والوں پر اس کا گناہ ہوگا، اس صورت میں بھی اس کو مسجدِ ضرار تو نہیں کہہ سکتے مگر ضد کی وجہ سے اس کے مشابہ ہوگی، لیکن اس سے اس کی مسجدیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔(۲)

۴:- یہ جزئیہ تلاش کے بعد بھی نہیں مل سکا کہ ایک مسجد کا سامان جب استغناء کے وقت دُوسری مسجد کو دے دیا گیا ہو پھر پہلی مسجد کو اس کی ضرورت پڑے تو واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ ٹین وغیرہ دُوسری مسجد کے ہوگئے، پہلی مسجد میں نہ لوٹائے جائیں۔ احتیاطاً اس میں دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۷ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری عفی عنہ

---

(۱) وفی البحر ج:۵ ص:۱۵۲ (طبع رشيديه كوئٹه) وبه علم أن الفتوىٰ علىٰ قول محمدؒ فی آلاٰت المسجد (أی فی جواز نقلها للضرورة) وعلىٰ قول أبی يوسفؒ فی تابيد المسجد.
وفی الشامية ج:۴ ص:۳۶۰ سئل شيخ الاسلام عن أهل قرية رحلوا وتداعى مسجدها الى الخراب، وبعض المتغلبة يستولون علىٰ خشبه وينقلونه الىٰ دورهم، هل لواحد لأهل المحلّة أن يبيع الخشب بأمر القاضی ويمسک الثمن ليصرفه الىٰ بعض المساجد أو الىٰ هٰذا المسجد؟ قال: نعم، وحكي أنه وقع مثله فی زمن سيّدنا الامام الأجل فی رباط فی بعض الطرق خرب، ولا ينتفع المارة به وله أوقاف عامرة تسئل هل يجوز نقلها الىٰ رباط اٰخر ينتفع الناس به؟ قال: نعم، لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ويحصل ذٰلک بالثانی. وفی الشامية ج:۴ ص:۳۵۹ جزم به فی الاسعاف حيث قال: ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود الىٰ ملک الواقف عند أبی يوسف فيباع نقضه باذن القاضی ويصرف ثمنه الىٰ بعض المساجد.
(۲) كل مسجد بنی مباهاة أو رياء أو سمعة أو لغرض سوى ابتغاء وجه الله تعالىٰ أو بمال غير طيب فهو لاحق بمسجد الضّرار قال صاحب الكشاف وعن عطاء لمّا فتح الله الأمصار علىٰ عمر رضی الله عنه أمر المسلمين أن يبنوا المساجد وأن لا يتخذوا فی مدينة مسجدين يضار أحدهما صاحبه. هٰذا لفظه، فالعجب من المشائخين المتعصبين فی زماننا يبنون فی كل ناحية مساجد طلبًا للاسم والرّسم واستعلاء لشأنهم واقتداء بأبائهم ولم يتأمّلوا ما فی هٰذه الأية والقصّة من شناعة حالتهم وسوء أفعالهم. (الاكليل ج:۴ ص:۲۸۴). بحواله فتاویٰ محمودية ج:۱۰ ص:۱۶۷. فراجع اليه للتفصيل. وفی التفسيرات الأحمدية: وقال فی المنهية ونهی الصلوٰة فی مسجد الضّرار مخصوص به فلا يتعدّى الىٰ ملحقاته. (الاكليل ج:۴ ص:۲۸۴) بحواله فتاویٰ محمودية ج:۱۰ ص:۱۶۴.

دیگر مساجد دُور ہونے کی وجہ سے قریب کے علاقے میں مسجد بنانے اور اس کی مخالفت کا حکم

سوال:- ہمارے پاس ایک پلاٹ جو کہ کے.ڈی.اے (گورنمنٹ ادارہ) نے عوام الناس کے رفاہی مقاصد کے لئے مختص کیا ہوا ہے، متذکرہ پلاٹ کے.ڈی.اے کی جانب سے ابھی تک کسی کو الاٹ نہیں کیا گیا، جس سیکٹر میں یہ پلاٹ موجود ہے، اس علاقے کے چند لوگوں نے کراچی کے دیگر علاقوں کے رہائش پذیر حضرات سے مل کر ایک انجمن برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ تشکیل دی، یہ انجمن خالصتاً مذہبی ہے اور اس کا تعلق فقہِ حنفی سے ہے، کسی سیاسی پارٹی سے اس کا کوئی تعلق قطعاً نہیں ہے۔

اس انجمن نے کے.ڈی.اے کو متذکرہ پلاٹ برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی، اس پلاٹ کو الاٹمنٹ جاری کرنے کے لئے کے.ڈی.اے کی جانب سے طلب کردہ نوآبجکشن سرٹیفکیٹ (N.O.C) جو کہ علاقے کے ڈپٹی کمشنر سے لینا ہوتا ہے (یہ سرٹیفکیٹ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ متذکرہ پلاٹ اس انجمن کو برائے تعمیرِ مسجد/ مدرسہ الاٹ کردیا جائے اس سے مقامی انتظامیہ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا)، الحمدللہ سرٹیفکیٹ ڈپٹی کمشنر نے ہماری انجمن کے حق میں جاری کردیا ہے۔

اس صورت سے انجمن کو گورنمنٹ سندھ کے رجسٹرار آفس سے اپنے اغراض و مقاصد تحریری پیش کرکے رجسٹرڈ کروانا ہوتا ہے، الحمدللہ انجمن نے رجسٹرار کی جانب سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرلیا ہے، قانون کے مطابق مسجد اور مدرسہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے کل خرچ کا دس فیصد انجمن کے پاس موجود ہونا چاہئے، الحمدللہ سرکاری بینک سے یہ سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرلیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تمام سرٹیفکیٹس حاصل کرلینے کے بعد کے.ڈی.اے کے افسرِ اعلیٰ نے ہماری الاٹمنٹ کی درخواست وصول کرتے ہوئے اس پر جو حکم تحریر کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ''مکمل کاروائی کرکے الاٹمنٹ کمیٹی کے سامنے فوری پیش کردیا جائے۔ ڈائریکٹر جنرل۔'' خیر انجمن کے ممبران نے اس بات کی تحقیق کرلی ہے کہ مذکورہ پلاٹ کے الاٹمنٹ کے لئے ہماری درخواست سے قبل اور اب تک کسی دُوسرے اور ادارے/ انجمن نے کے.ڈی.اے کو درخواست نہیں دی ہے، لہٰذا انجمنِ ہٰذا کے تمام ممبران اور علاقے کے دیگر لوگوں کے مشورے سے اس پلاٹ پر سیمنٹ بلاکس کی مسجد تعمیر کرلی گئی ہے، اور اس تعمیر شدہ مسجد میں ایک ماہ سے زائد عرصے سے پنج وقتہ نمازیں باجماعت ہو رہی ہیں۔ ایک مستند عالمِ دِین کے ماتحت علاقے کے بچوں کو دِینی تعلیم اور ناظرہ قرآن پاک پڑھانے کے لئے بھی انتظام

کردیا گیا ہے، جس میں علاقے کے بچے اور بچیاں بلامعاوضہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

۱:- اب جنابِ والا سے گزارش ہے کہ مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر آپ یہ فرمائیں کہ اس قائم شدہ مسجد میں نمازیں ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ علاقے کے کچھ افراد اس قائم شدہ مسجد کی مخالفت کر رہے ہیں اور دُوسرے لوگوں کو اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے روک رہے ہیں، اور ان کی مخالفت یہاں تک ہے کہ حکامِ بالا سے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرکے نعوذ باللہ اس مسجد کو منہدم کروانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اس علاقے میں دو مسجدیں کافی ہیں، تیسری کی ضرورت نہیں۔ جبکہ پہلے سے قائم شدہ دونوں مسجدیں اس نئی قائم شدہ مسجد سے کافی فاصلے پر ہیں۔

۲:- فریقِ مخالف اس قائم شدہ مسجد کو منہدم کرواکر اس پلاٹ پر لائبریری یا اس قسم کا کوئی اور سینٹر وغیرہ قائم کروانا چاہتا ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان کا یہ پروگرام اَز رُوئے شرع کیسا ہے؟ جبکہ انجمن (جس کے تحت یہ مسجد قائم ہے) کے پروگرام میں یہ بات واضح ہے کہ اس پلاٹ پر مسجد کے ساتھ ساتھ ایک بڑا دِینی مدرسہ قائم کیا جائے گا، جس کے ساتھ مسجد ہونا اشد ضروری ہے۔

جواب:- جب دُوسری مسجدیں فاصلے پر ہیں، تو اس جگہ مسجد بنانے کی کوشش باعثِ اَجر و ثواب ہے،[1] اور جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں انہیں اس سے باز آنا چاہئے۔ اس تمہید کے بعد سوالات کا جواب درج ذیل ہے:-

۱:- نماز پڑھنا جائز ہے۔

۲:- مسجد کی تعمیر کی مخالفت جبکہ اس کی ضرورت ہو اور اس کی قانونی کاروائی جاری ہو، کسی طرح جائز نہیں، بلکہ وبال کا اندیشہ ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۷۹۸ و)

مسجد کو اُونچا کرنے کی غرض سے مسجد کے نیچے بنے ہوئے کمروں کا حکم

سوال:- ایک جامع مسجد پہاڑی علاقے میں آج سے تقریباً چالیس برس پہلے تعمیر ہوئی تھی، پہاڑی علاقے کی ڈھلانی سطح کی وجہ سے اس مسجد کے نیچے چار پانچ کمرے بنائے گئے تاکہ ہموار جگہ بن جائے، اور اس کے اُوپر جامع مسجد تعمیر کی گئی، اُس وقت کے بعد کچھ عرصہ تک نیچے والے کمرے قائم

(۱) وفی مشکوۃ المصابیح، باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ ج:۱ ص:۶۸ (طبع قدیمی کتب خانہ کراچی).
عن عثمان رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من بنٰی للہ مسجدًا بنی اللہ لہٗ بیتًا فی الجنّۃ. متفق علیہ.

رہے، بعد میں جوں جوں مسجد کی ضروریات بڑھتی گئیں وہ کمرے کرایہ پر دے دیئے گئے، اب اس مسجد کا خطیب زید ہے، کمیٹی مسجد والوں نے اُن کمروں کے ساتھ مسجد سے باہر لیٹرین، غسل خانہ وغیرہ بنادیا ہے تاکہ زید اپنے بال بچوں سمیت ان زیرِ مسجد کمروں میں رہے، کیونکہ رہنے کے لئے ان کمروں کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے، اور ان کمروں کی صفائی وغیرہ اور لیٹرین، غسل خانے پر تقریباً چار ہزار روپے سے زائد رقم بھی خرچ کی جاچکی ہے، اور زید نے عام ماحول کے تحت جبکہ مسجد کے نیچے دُکانیں اور مکانات وغیرہ ہوتے ہیں، اس معاملے میں کوئی التفات نہ کیا، اب جب اُس نے اس معاملے میں مسائل کو دیکھا تو تردّد میں پڑگیا کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ کمرے فارغ بھی نہیں چھوڑے جاسکتے، اور اب یہاں سے بال بچوں کو واپس بھیجنے میں مسجد کمیٹی والوں کے معاملے میں کچھ فتنہ وفساد کا بھی خطرہ ہے۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان مجبوریوں کی بناء پر زید مسجد کے نیچے اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ سکتا ہے یا تحت الثریٰ تک مسجد ہونے کی وجہ سے کسی صورت میں بھی بال بچوں کے ساتھ مسجد کے نیچے والے کمروں میں نہیں رہ سکتا۔ بصورتِ دیگر ان کمروں کو کسی اور کرایہ دار کو جو بال بچے دار ہو کرایہ پر دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- جس جگہ پر یہ کمرے بنائے گئے ہیں اگر وقف کرنے والے نے اس جگہ کو مسجد پہلے بنادیا تھا اور کمرے بعد میں تعمیر کئے تب تو یہ کمرے مسجد کے ہیں اور انہیں رہائشی مکان میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر واقف نے شروع سے ہی یہ تصریح کی تھی کہ نیچے کے کمرے امام کی رہائش یا مسجد کی مصالح میں سے کسی اور مصلحت کے لئے وقف ہوں گے اور ان کی تعمیر کے بعد جب جگہ ہموار ہوجائے گی تو اُس پر مسجد تعمیر کی جائے گی، اور صرف اُوپر کا حصہ مسجد ہوگا، نیچے کا نہیں، تو اس صورت میں یہ نیچے کے کمرے امام کی رہائش کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کمرے مصالحِ مسجد کے لئے وقف تو ہوں گے لیکن ان پر مسجد کے اَحکام جاری نہیں ہوں گے۔

لما فی الهداية: ولو كان السرداب لمصالح المسجد جاز كما فی مسجد بيت المقدس، وروى الحسن عنه أنه قال: اذا جعل السفل مسجدًا وعلىٰ ظهره مسكن فهو مسجد لأن المسجد مما يتأبد وذٰلک يتحقق فی السفل دون العلو، وعن محمدؒ علىٰ عكس هٰذا لأن المسجد معظم واذا كان فوقه مسكن أو مستغل يتعذر تعظيمه، وعن أبی يوسفؒ انه جوز فی الوجهين حين قدم بغداد ورأى ضيق المنازل فكانه اعتبر الضروة وعن محمدؒ أنه حين دخل الریّ أجاز ذٰلک كله. (هدايه اوّلين ج:۲ ص:۶۲۵)۔[1] **وفی الدر المختار: لو بنى فوقه بيتًا للامام**

(۱) هداية كتاب الوقف ج:۲ ص:۶۴۴ و ۶۴۵ (طبع شركت علميه ملتان).

لا یضرّ لأنه من المصالح، أما لو تمت المسجدیة ثم أراد البناء منع. (شامی کتاب الوقف أحکام المسجد)[1]. وراجع أیضًا امداد الفتاویٰ[2] وامداد المفتین[3]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۹۶/۲۸ ج)

قبلے سے بائیس درجے انحراف پر بنائی گئی مسجد کا حکم

سوال:- گوجرہ منڈی ضلع لائل پور کی جس مسجد کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا کہ اُس کا رُخ پُرانی مسجد سے ۲۲ درجہ جنوب کو پھرا ہوا ہے، جناب نے فرمایا تھا کہ صفوف کا نشان پُرانی مسجد کے مطابق لگالیا جائے، منتظمین حضرات صفوں کے نشان پُرانی مساجد کے مطابق لگانے کے لئے تیار نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ رُخ پُرانی مساجد سے زیادہ سمتِ قبلہ کی جانب ہے، دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح تعمیرِ مسجد سہواً نہیں بلکہ عمداً کی گئی ہے، رُخ دُرست کرنے والے صاحب پرویز مسلک کے تھے جیسے کہ علامہ مشرقی نے بھی کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی تمام مساجد کا رُخ غلط ہے، پُرانی مسجد کا رُخ، یہ مسجد تعمیر کرتے ہوئے غلط جان کر ترک کیا گیا تھا، اب اگر کوئی شخص نمازِ جماعت میں ذرا رُخ بدل کر جماعت میں شریک ہوجائے تو کیا جائز ہے؟ اور اس کی نماز دُرست ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ مسجد کے رُخ پر نماز پڑھنے پر اس کا دِل نہ مانتا ہو۔

جواب:- کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ اہلِ مسجد سمتِ قبلہ کے سلسلے میں متفق ہوکر اپنا رُخ صحیح کرلیں، تاہم اگر اہلِ مسجد اس پر آمادہ نہیں ہیں تو ۲۲ درجے انحراف سے نماز فاسد نہیں ہوتی[4]۔ دفعِ شر کے لئے اسی رُخ پر نماز پڑھ لینے کی گنجائش ہے جس رُخ پر تمام اہلِ محلّہ نماز پڑھ رہے

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید کراچی).
(۲) امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۸۳ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی).
(۳) امداد المفتین ص:۸۱۱ (طبع دار الاشاعت کراچی).
وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) لو بنیٰ بیتًا علیٰ سطح المسجد لسکنی الامام فانّه لا یضرّ فی کونه مسجدًا لأنه من المصالح .... الخ.
وفی الدر المختار ج:۴ ص:۳۵۷ و ۳۵۸ (طبع سعید) واذا جعل تحته سردابًا لمصالحه أی المسجد جاز کمسجد القدس ولو جعل لغیرها أو جعل فوقه بیتًا وجعل باب المسجد الی طریق وعزله عن ملکه لا یکون مسجدًا اھ.
وفی الفتاویٰ التاتارخانیة ج:۵ ص:۸۴۴ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی) وفی النّوازل: ولو جعل العلو مسجدًا والسفل وقفًا علی المسجد وأخرجه من یده یجوز وکذٰلک لو جعل السفل مسجدًا للناس أو سردابًا وقفا علیٰ ذٰلک وأخرجه من یده یصح لأنّه لله تعالیٰ. وکذا فی الهندیة ج:۲ ص:۴۵۵.
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۸۳ تا ۶۸۵۔
(۴) تفصیل کے لئے ''جواہر الفقہ'' (مؤلفہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) میں رسالہ ''سمتِ قبلہ'' خصوصاً ج:۱ ص:۲۴۲ تا ۲۴۴ ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں۔ امام کے رُخ سے منحرف ہوکر اپنا الگ رُخ کرنا اس کے مقابلے میں زیادہ بُرا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح　　　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع　　　　۱۳۸۸/۵/۱۸ھ

بوقتِ ضرورت مسجد سے پانی لینے کی نیت سے چندہ دینے کا حکم

سوال:- مسجد کے اخراجات میں چندہ اس نیت سے دیا کہ جب پانی کی ضرورت ہوگی تو مسجد سے لے جائیں گے، اس صورت میں مسجد سے پانی لے جانا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- اگر چندہ دہندگان میں یہ بات معروف ہو کہ ضرورت کے وقت اہلِ محلّہ بھی وہاں سے پانی لے سکیں گے تو گنجائش ہے، ورنہ نہیں۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۴۰ ب)

مسجد میں نکاح کی تقریب میں ویڈیو اور مووی بنانے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ چونکہ نکاح خوانی عمان میں مسجد میں ہوتی ہے، اور نکاح کی من جملہ تقریبات و پروگرام ویڈیو فلم پر ریکارڈ کئے جاتے ہیں، تاکہ آئندہ مستقلاً بذریعہ کیسٹوں کے دوبارہ یاد تازہ رہ سکے، کیا اسلام میں مسجدوں میں ویڈیو فلموں کی کیسٹیں تیار کرنا جائز ہے؟

جواب:- دُرست نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۳/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۵۰۶/۴۰ ب)

مسجد کمیٹی کے اوصاف
اور کیا بے نمازی مسجد کمیٹی کا ممبر بن سکتا ہے؟

سوال:- ایک شخص مسجد کی انتظامی کمیٹی کا ممبر بننے کے لئے خود کو پیش کرتا ہے، اِصرار کرتا ہے اور ممبر بن جاتا ہے، حالانکہ مذکورہ شخص متعلقہ مسجد میں کسی بھی وقت کی نماز ادا کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، جس سے خیال ہوا کہ شاید کسی نظری اختلاف کے باعث کسی دُوسری مسجد میں ادا کرتا ہوگا۔ اگرچہ دیکھا نہیں گیا، مگر عام رائے یہی ہے کہ موصوف چونکہ نماز کا پابند نہیں اس لئے کسی بھی مسجد میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب سوال یہ ہے کہ:-

---

(۱) وفي الشامية ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعيد) أنّ المعروف كالمشروط. وكذا في البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۲۴ (طبع دار المعرفة بيروت).

۱:- ایسے شخص کا کسی ایسی مسجد میں جس میں وہ قطعاً نماز ادا نہیں کرتا، انتظامی کمیٹی کا ممبر بننا کیسا ہے؟

۲:- ایسے شخص کا مستقل نمازیوں پر مشتمل کمیٹی کے کاموں میں دخل اندازی کرنا کیسا ہے؟

۳:- ایسے شخص کا مسجد کی مِلک یا جائیداد کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروانا یا مستقل نمازیوں پر مستقل کمیٹی کے مشترکہ فیصلے کے خلاف استعمال کروانا کیسا ہے؟

جواب:- مسجد کا انتظام نیک، متقی لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے،(۱) اور کم سے کم نماز کا پابند ہونا تو نہایت ضروری ہے۔ جو شخص نماز کا پابند نہ ہو اہل نمازیوں کی موجودگی میں اس کو مسجد کی انتظامیہ کا رُکن بنانا دُرست نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ اَز خود اس رُکنیت کا طالب ہو، اور مسجد کی مصالح کے خلاف کام کرتا ہو۔(۲)

واللہ اعلم

۱۴۱۰/۱/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۲/۴۱ الف)

خانقاہ کے ''تسبیح خانہ'' کے لئے چندہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک خانقاہ ہے اس میں ایک تسبیح خانہ ہے جس میں بچھانے کے لئے ایک قیمتی قالین خریدنے کے لئے چندہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- تسبیح خانے میں کوئی عمل اگر بدعت کا نہ ہو تو اس کی ضرورت کے لئے چندہ جائز ہے، لیکن چندہ جبر کر کے نہ ہو۔(۳)

واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

العبد محمد عاشق الٰہی

وقتی ضرورت کے لئے بنائی گئی مسجد کی جگہ پر دُکان تعمیر کرنے کا حکم

سوال:- ایک کارخانہ دار کے کارخانے کے کونے میں ایک جگہ نماز کے لئے بنا کر رکھی تھی،

(۱، ۲) وفی الهندية ج:۲ ص:۴۰۸ (طبع ماجديه كوئٹه) الصالح للنظر من لم يسئل الولاية للوقف وليس فيه فسق يعرف هٰكذا فی فتح القدير. وفی الاسعاف: لا يولى الا أمين قادر بنفسه أو بنائبه .... الخ. وفی الشامية ج:۴ ص:۳۸۰ (طبع سعيد) (قوله غير مأمون) قال فی الاسعاف: ولا يولى الا أمين قادر بنفسه أو بنائبه لأنّ الولاية مقيدة بشرط النّظر وليس من النّظر تولية الخائن لأنّه يخلّ بالمقصود. وكذا فی الهندية ج:۲ ص:۴۰۸، و قانون العدل والانصاف ص:۱٦۸.

(۳) وفی المشكٰوة ج:۱ ص:۲۵۵ (طبع سعيد) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الا لا تظلموا الا لا يحلّ مال امرئ مسلم الا بطيّب نفسٍ منه. رواه البيهقی فی شعب الايمان وفی حاشيته أی بالاذن أو بالأمر.

جہاں اسٹاپ کے لوگ غیر منظّم یعنی انفرادی طور پر نماز ادا کرتے تھے، اب کارخانہ ختم ہوچکا ہے اور وہ جگہ مویشیوں کی منڈی میں تبدیل ہوگئی ہے، کیا اس جگہ پر دُکان وغیرہ تعمیر کرسکتے ہیں جہاں نماز پڑھی جاتی تھی؟ کیا یہ فیکٹری والا اس زمین کو کسی دُوسرے کام میں لاسکتا ہے؟

جواب:- دراصل دار و مدار اِس بات پر ہے کہ زمین کے مالک نے اس جگہ کو مسجد بنانے کی نیت سے وقف کیا تھا یا نہیں؟ اگر مسجد بنانے کی نیت سے وقف کیا تھا تب تو اس جگہ کو کسی اور کام میں نہیں لایا جاسکتا، اور اگر اس نیت سے وقف نہیں کیا تھا، بلکہ وقتی ضرورت کے لئے اس جگہ کو نماز کے لئے مخصوص کیا تھا، تو یہ جگہ بحکمِ مسجد نہیں ہوئی اور ضرورت ختم ہونے پر اسے دُوسرے کام میں لایا جاسکتا ہے۔[۱]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۶/۵/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۱۶/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

مسجد کے کسی حصے کو درس گاہ میں شامل کرنے اور مسجد میں دِینی تعلیم دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرعِ متین اندریں مسئلہ کہ ایک درس گاہ برائے حفظ و ناظرہ قرآن مجید زیرِ تعمیر ہے، مسجد سے متصل ایک چمن نما صحن جو داخلِ مسجد ہے، جس میں گرمی، سردی ہر دو موسم میں سایہ اور دُھوپ میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ زیرِ تعمیر درس گاہ اس کے مشرقی جانب بالکل ملحق ہے، اگر درس گاہ کو اپنی جگہ ایک کمرہ اور برآمدہ کی شکل میں تعمیر کریں تو درس گاہ ناکافی ہوگی۔ اس لئے منتظمین کا خیال ہے کہ درس گاہ والی پوری جگہ میں ایک ہال کمرہ بنادیا جائے اور برآمدے کی چھت جو ایک دو صفوں کی مقدار جگہ پر مشتمل ہوگی صحن مسجد سے لے لی جائے، اس طرح مسجد کی زیب و زینت وغیرہ میں کوئی نقصان نہ ہوگا، بلکہ بوقتِ ضرورت بارش یا گرمی میں اس جگہ نماز پڑھی جاسکے گی، جس سے نمازیوں کو فائدہ ہوگا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کی جگہ بہ نیت تعمیر بہ نیت برآمدۂ درس گاہ چھت ڈالی

---

(۱) وفی حلبی کبیر ص:۶۱۴ ولو اتخذ فی بیته موضعًا للصلٰوة فلیس له حکم المسجد أصلًا.
وفی الهندیة ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع ماجدیه کوئٹه) (الفصل الأوّل فیما یصیر به مسجدًا) أمّا ان وقّت الأمر بالیوم أو الشهر أو السَّنَة ففی هٰذا الوجه لا تصیر الساحة مسجدًا لو مات یورث عنه، کذا فی الذخیرة. وفی الهندیة أیضًا ج:۲ ص:۴۵۵ (طبع ماجدیه کوئٹه) من جعل مسجدًا تحته سرداب أو فوقه بیت .... فله ان یبعه وان مات یورث عنه.
وفی التاتارخانیة ج:۵ ص:۸۴۳ وان جعل وسط داره مسجدًا وأذن للناس بالدخول فیه فله أن یبیعه.
نیز دیکھئے: کفایت المفتی (طبع جدید دارالاشاعت) ج:۷ ص:۴۷ و ۴۸ اور دیکھئے ج:۷ ص:۵۴۔

جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- مسجد کے کسی حصے کو درس گاہ میں شامل کرنا جائز نہیں ہے[1]، البتہ اگر اس جگہ برآمدہ بنانا مسجد کے لئے بھی مناسب اور مفید ہو تو بہ نیت تعمیرِ مسجد وہاں برآمدہ بنا سکتے ہیں، وہ برآمدہ مسجد ہی کا جزء ہوگا، درس گاہ نہیں، اور ضرورت کے وقت اس میں دِینی تعلیم کا کام بھی کیا جاسکتا ہے[2]۔ لیکن یہ بات ہر کس و ناکس پر واضح رہنی چاہئے کہ یہ برآمدہ مسجد کا ہے، درس گاہ کا نہیں ہے، جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ برآمدے کو درس گاہ سے بالکل متصل بنانے کے بجائے برآمدے اور درس گاہ کے درمیان تھوڑی سی جگہ امتیاز کے لئے چھوڑ دی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۸/۱۰/۱۳۹۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۷۳۰ د)

متعارف اور عام طریقے سے ہٹ کر بنائے گئے مسجد کے منبر کو توڑنے یا برقرار رکھنے کا حکم

سوال:- جنابِ عالی! آپ کے پاس ایک استفتاء مورخہ ۳۰/جولائی ۱۹۸۵ء کا لکھا ہوا

---

(۱) وفی البحر الرائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع ماجدیه کوئٹه) قال أبو یوسفؒ: هو مسجد أبدًا الٰی قیام الساعة لا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا، وهو الفتویٰ.

وفی الدر المختار ج:۴ ص۳۵۸ (طبع سعید کراچی) (ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدًا عند الامام والثانی) أبدًا الٰی قیام الساعة. (وبه یفتٰی) حاوی القدسی. وفی الشامیة (قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثًا ولا یجوز نقله ونقل ماله الٰی مسجد اٰخر سواء کانوا یصلّون فیه أو لا وهو الفتویٰ.

(۲) یہاں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے ایک مصدقہ فتویٰ سے ''مسجد میں عارضی طور پر تعلیم دینے'' کی شرائط اور تفصیل نقل کی جاتی ہے:-
مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی کر کے مسجد میں تعلیم دینا جائز ہے:-
۱:- مدرسہ زیرِ تعمیر ہونے کی وجہ سے مسجد میں تعلیم عارضی طور پر دی جارہی ہو۔
۲:- بچے ہوشیار اور عقل مند ہوں، مسجد کا پورا پورا احترام کرتے ہوں، مسجد کو گندا اور ناپاک نہ کرتے ہوں۔
۳:- اُستاذ، تعلیم دینے کے لئے مسجد میں بیٹھتے وقت اِعتکاف کی نیت بھی کرتے ہوں اور اگر مدرسہ بالکل موجود نہ ہو تو جلدی سے مدرسہ کا انتظام کرنا ضروری ہے، مدرسہ کا انتظام ہونے تک مسجد میں تعلیم دینا شرائطِ بالا کے ساتھ جائز ہے۔

وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۹ (طبع رشیدیه کوئٹه) وأما المعلّم الّذی یعلم الصبیان بأجر اذا جلس فی المسجد یعلم الصبیان لضرورة الحر أو غیره لا یکره وفی نسخة القاضی الامام وفی اقرار العیون جعل المسئلة المعلم کمسئلة الکاتب والخیاط فان کان یعلم حسبة لا بأس به وان کان بأجر یکره الا اذا وقع ضرورة. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۰ وفتح القدیر ج:۱ ص:۳۶۹ والفتاویٰ الخانیة ج:۱ ص:۶۵ والاشباه والنظائر ج:۲ ص:۲۳۱.

وفی الدر المختار: ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.

وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۵ أما هؤلاء المکتبون الّذین یجتمع عندهم الصبیان واللّغط فلا ولو لم یکن لغط لأنّهم فی صناعة لا عبادة از هم یقصدون الاجارة لیس هو لِلّٰه بل للارتزاق ومعلم الصبیان القراٰن کالکاتب ان کان لأجر لا وحسبة لا بأس به. وکذا فی الاشباه والنظائر ص:۲۴۱.

نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۷ ص:۱۰۰ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔ (محمد زبیر حق نواز)

متعلق (منبر مسجد خیرالبشر) ایک منبر آیا تھا، جس کا آپ نے جواب تحریر فرمایا تھا، اس استفتاء میں کچھ باتیں تشنہ رہ گئی تھیں، مثلاً یہ کہ مؤذّن جب خطبہ کے وقت اذان کہتا ہے تو اس کا چہرہ امام کے پاؤں کے سامنے نہیں ہوتا بلکہ منبر کی اُونچائی فرش سے صرف ساڑھے تین فٹ ہے لہٰذا مؤذّن کا پیٹ اور سینے کا حصہ امام کے پیروں کے سامنے ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ کہ یہ منبر بنانے والوں نے مسجدِ نمرہ کے منبر کو دلیل نہیں بنایا بلکہ ایسے منبر کی نشاندہی کے طور پر یہ عرض کیا تھا کہ ایسا منبر مسجدِ نمرہ اور سعودی عرب کی کئی مساجد میں تعمیر کیا گیا ہے۔ تیسری بات یہ کہ مسجدِ نمرہ کے منبر کی جو تاریخ اس استفتاء میں بیان کی گئی ہے، آرکیٹکٹ کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس بناء پر براہِ کرم یہ فرمائیں کہ کیا اس منبر کو توڑنا ضروری ہے؟ اور اگر اس کو برقرار رکھا جائے تو کیا شریعت کے خلاف کام ہوگا؟ ذیل میں منبر کی شکل کا نقشہ دے رہا ہوں:-

مساجد میں عام طور پر تیار کیا گیا منبر مسجد خیرالبشر میں تعمیر کیا گیا منبر

جواب:- پہلے سوال سے یہ مترشح تھا کہ منبر تین سیڑیوں سے زائد پر مشتمل ہے، نیز یہ کہ اس پر امام کے کھڑے ہونے کی صورت میں اس کے پاؤں مؤذّن کے چہرے کے محاذی ہوجاتے ہیں، اس لئے اُسے خلافِ مسنون کہا گیا تھا۔ اب جو صورت سامنے آئی ہے اس میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، اس لئے اس منبر کو ناجائز، مکروہ یا بالکلیہ خلافِ سنت نہیں کہا جاسکتا۔ اور جبکہ منبر بن چکا ہے تو اُسے توڑنا واجب نہیں، اور اس کو برقرار رکھنے کی صورت میں اُسے خلافِ شرع نہیں کہہ سکتے۔ اگر سوال، بنانے سے قبل کیا جاتا تو مشورہ معروف طریقے کا منبر بنانے ہی کا دیا جاتا، کہ وہ اقرب الی السنۃ ہے، تاہم جب منبر بن چکا ہے تو اَب اس کو توڑنا ضروری نہیں ہے، اور اس مسئلے پر خواہ مخواہ زیادہ بحث و مباحثہ اور فتنہ ومجادلہ کی ہرگز ضرورت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۰۶/۱/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸/۳۷ الف)

مسجد کی چھت پر امام کے لئے حجرہ بنانے کے مسئلے میں فتاویٰ لکھنویہ اور عزیز الفتاویٰ و امداد المفتین میں تضاد کی تحقیق

سوال:- کیا مسجد کی چھت پر امامِ مسجد کا حجرہ بنانا جائز ہے؟ فتاویٰ لکھنویہ میں جائز ہونا، جبکہ عزیز الفتاویٰ اور امداد المفتین اور آدابُ المساجد میں ناجائز ہونا لکھا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- امداد المفتین میں یہ مسئلہ نہیں مل سکا، البتہ آدابُ المساجد میں جو عدمِ جواز مذکور ہے وہ علی الاطلاق نہیں ہے، اسی طرح مولانا عبدالحی صاحبؒ نے جو جواز ذکر کیا ہے وہ بھی مطلقاً نہیں ہے، بلکہ چند شرائط کے ساتھ جائز ہونا لکھا ہے۔ (ص:۲۴۳)

اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- وقف کرنے والے نے ایک خاص حصے کو مسجدیت سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہو، اور تعمیرِ مسجد سے پہلے پہلے حجرہ بنوادیا ہو یا اپنی نیت کا اعلان کردیا ہو۔

۲:- اور یہ استثناء مصالحِ مسجد کی وجہ سے ہو۔

یہی حکم کتبِ فقہ میں مذکور ہے جیسا کہ درمختار کی کتابُ الوقف میں ہے: **لو بنى فوقهٗ بيتًا للامام لا يضرّ لأنّهٗ من المصالح أمّا لو تمّت المسجدية ثم أراد البناء مُنِعَ ولو قال عنيتُ ذٰلك لم يصدق.** (شامی ج:۳ ص:۵۱۲)۔[1]

اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ وہ حجرہ بحکمِ مسجد ہوگا یا نہیں؟ سو اِس بارے میں صحیح یہی ہے کہ وہ بحکمِ مسجد نہیں ہوگا جیسا کہ آدابُ المساجد میں ذکر کیا گیا ہے۔

عزیز الفتاویٰ میں جو حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے کہا ہے کہ ''وہ بحکمِ مسجد ہوگا، اس لئے بول و براز اس پر جائز نہیں ہوں گے'' (ج:۵ ص:۱۳۵)۔[2] اس کا منشاء یا تو یہ ہے کہ اس حجرے کے مسجد سے غایت اِتصال کے سبب تقاضائے ادب و احترام یہ ہے کہ بول و براز سے اس کو بچایا جائے، اور اگر یہ توجیہ نہ ہو تو پھر اس میں تسامح ہوا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی دلیل آپ نے یہ بیان فرمائی ہے:-

وبه صرّح فى الاسعاف فقال: واذا كان السرداب أو العلو لمصالح المسجد أو كان وقفًا عليه صار مسجدًا اهـ. شرنبلالية قال فى البحر وحاصلهٗ ان شرط كونه مسجدًا أن يكون سفلهٗ وعلوهٗ مسجدًا لينقطع حق العبد. (شامی ج:۳ ص:۴۴۴)۔[3] حالانکہ یہ دلیل اس لئے صحیح نہیں

---

(۱) ردّ المحتار کتاب الوقف ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید).

(۲) عزیز الفتاویٰ ص:۲۱۰ (طبع دار الاشاعت کراچی)

(۳) شامی ج:۴ ص:۳۵۷ (طبع سعید)

کہ اس میں "صار" کی ضمیر "سفل وعلو" کی طرف نہیں بلکہ "مسجد" کی طرف راجع ہے، جیسا کہ سیاقِ کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے، کیونکہ ذکر مسجد کی مسجدیت کا ہے، سفل وعلو کی مسجدیت کا نہیں، اور اس اَمر کی تصریح حضرت تھانویؒ نے بھی بالفاظ ذیل فرمائی ہے:-

غالباً آپ نے مرجع ضمیر صار کا سرداب وعلو کو سمجھا ہے، سو یہ مرجع نہیں ہے ..... بلکہ مرجع اس کا وہ مسجد ہے جس کے مصالح کے لئے سرداب وعلو بنی یا وقف کیا گیا۔[1] (امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۹۶)

اور بحر کی عبارت میں "أن یکون سفله وعلوه مسجدًا" کا مطلب "موقوفًا علیٰ مصالح المسجد" ہے۔

بہر کیف! یہ ثابت ہوا کہ حجرۂ امام کا بنانا بشرائطِ مذکورہ جائز ہے، اور ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر حجرہ بنالیا جائے تو وہ بحکمِ مسجد نہیں ہے، البتہ بتقاضائے احترامِ مسجد بہتر یہ ہے کہ اس میں بول و براز نہ کیا جائے، خصوصیت سے جبکہ حجرہ مسجد سے اتنا متصل ہو کہ اس کی بدبو اور دُوسرے اثرات مسجد تک پہنچ کر ایذاء کے موجب ہوں، تو اس صورت میں وہاں بول و براز کرنا مکروہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۲/۲۴ھ[2]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

مسجد کی چھت پر اِمام کے لئے حجرہ بنانے کا حکم

سوال:- مسجد کی چھت پر اِمام کے لئے حجرہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- دُرّ مختار کتابُ الوقف میں ہے: لو بنٰی فوقهٗ بیتًا للامام لا یضر لأنّهٗ من المصالح أما لو تمّت المسجدیّة ثمّ أراد البناء مُنِعَ ولو قال عنیت ذٰلک لم یُصدَّق. تاترخانیة فاذا کان هٰذا فی الواقف فکیف بغیرهٖ فیجب هدمهٗ ولو علٰی جدار المسجد.

علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: قولهٗ امّا لو تمّت المسجدیّة أی بالقول علی المفتٰی بهٖ أو بالصلاة فیه علٰی قولهما. وعبارة التتارخانیة وان کان حین بناهٗ خلّی بینهٗ وبین النّاس ثمّ جاء بعد ذٰلک یبنی لا یترک اهـ. وبهٖ علم ان قولهٗ فی النّهر وأمّا لو تمّت المسجدیّة ثم أراد هدم ذٰلک البناء فِانّهٗ لا یمکن من ذٰلک .... الخ. فیه نظر لأنّهٗ لیس فی عبارة التتارخانیة ذکر الهدم وان کان الظاهر ان الحکم کذٰلک. (شامی ج:۳ ص:۵۱۲)[3]۔

---

(۱) ج:۲ ص:۶۸۴ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے درجہ تخصص (تمرینِ افتاء) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

(۳) ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۵۸ (طبع سعید).

عالمگیریہ میں ہے: **الصعود علیٰ سطح کلّ مسجد مکروہ ولھٰذا اذا اشتدّ الحرّ یکرہ أن یصلّوا بالجماعۃ فوقہٗ الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکرہ الصعود علیٰ سطحہ للضرورۃ.** (عالمگیریۃ ج:۱ ص:۳۵۶)۔[1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجدیت کے مکمل ہونے سے پہلے اگر ایسا کیا جائے تو جائز ہے ورنہ نہیں، فتاویٰ لکھنویہ میں جو حکم لکھا ہے وہ صرف چارپائی بچھانے کا ہے، اور انہوں نے جو استدلال کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کے وقت وہاں چارپائی بچھائی تھی، وہ خود محلِ نظر ہے، کیونکہ اعتکاف کی وجہ سے چارپائی بچھانا عذر ہے، اس پر عام حالات کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

واللہ اعلم
۱۳۷۹/۱۲/۲۴ھ[2]

مسجد کی تعمیر سے بچی ہوئی اینٹیں اِمام کے مکان پر لگانے کا حکم

سوال:- مسجد تعمیر کرنے پر جو پُرانی اینٹیں بچ جائیں تو کیا اِمامِ مسجد کے مکان میں اُنہیں لگانا جائز ہے؟

جواب:- لگا سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

۱:- کیا اِمام صاحب یا مہتمم کو مسجد کمیٹی کی میٹنگ میں بلانا ضروری ہے؟
۲:- نماز کی گستاخی کرنے والے کو مسجد کمیٹی کا ممبر بنانے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ:-

۱:- کسی مسجد و مدرسہ کی ایک ہی کمیٹی بنی ہوئی ہو اور اس مسجد و مدرسہ کا مہتمم بھی ایک ہی ہو، اس مسجد و مدرسہ کی تعمیر و انتظامی اُمور کی کوئی میٹنگ ہو تو کچھ ممبر حضرات اِمام و مہتمم صاحب کی میٹنگ میں شمولیت ضروری سمجھیں مگر کچھ ممبر صاحبان یہ دلیل دے کر شامل نہ ہونے دیں کہ اِمام و مہتمم صاحب چونکہ کمیٹی کے ملازم ہیں، ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں، لہٰذا تنخواہ دار ملازم اِمام صاحب و مہتمم صاحب کو مسجد و

(۱) عالمگیریۃ کتاب الکراھیۃ ج:۵ ص:۳۲۲ (طبع رشیدیہ).
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجہ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)۔

مدرسہ کی میٹنگ میں بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ جواب سے مطلع فرماویں کہ جو شخص ایسا عقیدہ اپنے اِمام صاحب کے متعلق رکھتا ہو یعنی اِمام صاحب کو کمیٹی کا ملازم سمجھتا ہو وہ شخص مسجد و مدرسہ کی کمیٹی کا ممبر رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اپنے ملازم اِمام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۲:- اور یہ کہ جو شخص بغیر جماعت کے صرف اپنے گھر میں اکیلا نماز پڑھنے والا ہو اور وہ یہ کہے کہ میں ایک روز صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد میں گیا وہاں نماز میں اتنی دیر لگ گئی کہ میری زندگی کے سارے معمولات اُلٹ پلٹ ہوگئے، یعنی معمولات کا ناس ہوگیا، اس دن سے پھر میں نے کبھی بھی نماز باجماعت کی ہمت نہیں کی۔ جواب سے مطلع فرماویں کہ مذکورہ بالا الفاظ کہنے والے کو مسجد کمیٹی کا ممبر یا عہدیدار بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۳:- اور یہ کہ مذکورہ بالا شخص اِمامِ مسجد کی غیرحاضریوں کو نوٹ کرنے کے لئے تو مسجد کے محراب کے پاس آ آ کر دیکھے کہ اِمام صاحب آج کی نماز میں حاضر ہیں کہ نہیں؟ مگر جماعت کی نماز میں شریک نہ ہو، یعنی مذکورہ کام کے لئے تو وقت نکالے مگر نماز باجماعت کے لئے وقت نکالنا اس کے معمولات میں فرق ڈالتا ہو، ایسے شخص کو مسجد کمیٹی کا ممبر اور عہدیدار بنانا چاہئے یا نہیں؟

۴:- یہ کہ مسجد و مدرسہ کی تعمیر و تنظیمی میٹنگ میں اِمام صاحب و مہتمم صاحب کو شامل کرنا ضروری ہے یا اس کو ملازم سمجھتے ہوئے الگ رکھنا ضروری ہے؟ اسلامی تعلیم اور آئین اس کے لئے کیا حکم دیتا ہے؟

جواب ۱:- کمیٹی کے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اِمام صاحب یا مہتمم صاحب کو ضرور اپنی میٹنگ میں بلائیں، البتہ بلانا اچھا ہے، اور اگر کوئی بات ایسی ہو کہ اِمام صاحب کی موجودگی میں کرنا کمیٹی مناسب نہ سمجھے تو اِمام صاحب کو ضرور شرکت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، البتہ اِمام صاحب کو ''تنخواہ دار ملازم'' کے الفاظ سے یاد کرنا بڑی بے ادبی کی بات ہے، جس سے احتراز لازم ہے۔

۲:- ایسے شخص نے بڑی گستاخی کی بات کہی، اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تو وہ کمیٹی کا ممبر بننے کا اہل نہیں۔

۳:- ایضاً۔

۴:- نمبر ۱ میں اس کا جواب آ گیا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۱۴/۳۰ د)

بعض غیر مسلم ممالک میں مساجد محدود ہونے اور نمازیوں کی کثیر تعداد کے پیشِ نظر ایک مسجد میں کئی جماعتیں کرانے کی شرعی حیثیت

(وضاحت از مرتب) اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس امریکہ سے مذکورہ مسئلہ سے متعلق ایک سوال آیا، حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ہدایت کے مطابق مفتی مجاہد شہیدؒ نے اس کا جواب لکھا، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے رائے معلوم کرنے کے لئے یہ جواب حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس بھیجا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے مفتی مجاہد شہیدؒ کے جواب کی تصدیق وتصویب فرمائی، بعد میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے دوبارہ غور فرما کر مستقل دُوسرا جواب لکھا، جو مفتی مجاہد شہیدؒ کے جواب سے مختلف تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی یہ دُوسری تحقیق مفتی محمد صاحب نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے حضرتِ والا کے پاس بھیجی، اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے خود مستقل جواب تحریر فرمایا، یہ تمام تحریرات ترتیب وار ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔(محمد زبیر)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کا خط بنام
حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بگرامی خدمت حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امریکا کی مساجد میں جماعتِ ثانیہ کا حکم:

احقر کے پاس امریکا سے ایک سوال آیا تھا، اس کے جواب میں ایک تحریر ہمارے ایک رفیق نے بطور تجویز لکھی ہے، احقر کا رُجحان اس تحریر کے موافق ہے، لیکن مستفتی کو باقاعدہ جواب دینے سے پہلے آنجناب کی رہنمائی کا طالب ہے، براہ کرم اس سلسلے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں، نیز اگر تکرارِ جماعت کی اجازت ہوتو اَذانِ ثانی کا کیا ہوگا؟ کیا اس کا بھی تکرار کیا جائے گا۔ والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: محمد عبداللہ میمن

سوال:- بعض غیر مسلم ممالک مثلاً: امریکا میں یہ صورتِ حال درپیش ہے کہ مساجد محدود ہیں، علاقے کے نمازیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے تمام نمازی مسجد میں نہیں سما سکتے ہیں اور مسجد کے پہلو اور اطراف و جوانب میں بھی نمازیوں کے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی قانوناً اجازت نہیں ہے، ایسی صورتِ حال عموماً جمعہ کے موقع پر پیش آتی ہے۔ بعض مقامات میں یہ تنگی اس لئے پیش آتی ہے کہ

وہاں کسی عمارت میں اجتماع کے لئے قانوناً ایک تعداد محدود ہوتی ہے، اس سے زیادہ افراد کا جمع ہونا قانوناً منع ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال میں ایک ہی مسجد میں ایک سے زیادہ مرتبہ جماعت کی اجازت ہے یا نہیں؟ بینوا توجرا۔

(جواب از مفتی مجاہد شہیدؒ زیرِ ہدایت حضرتِ والا دامت برکاتہم)

جواب:- اس مشکل کا اصل حل تو یہ ہے کہ اہلِ علاقہ کو چاہئے کہ جہاں سابقہ مسجد میں توسیع ممکن ہو وہاں توسیع کی جائے تاکہ تمام نمازی ایک ہی جماعت میں شریک ہوسکیں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اور مساجد تعمیر کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں یہ دونوں باتیں مشکل ہوں تو مسجد میں گنجائش کم ہونے کی صورت میں ایک بار پوری مسجد بھر کر جماعت ہوجانے کے بعد جو لوگ جگہ میں گنجائش نہ ہونے کی بناء پر پہلی جماعت میں شریک نہیں ہوسکے ان کے لئے اسی مسجد میں دوبارہ جماعت کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جن فقہاء نے تکرارِ جماعت سے منع کیا ہے انہوں نے ممانعت کی دو علتیں ذکر کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:-

۱:- اگر تکرارِ جماعت کی اجازت دے دی جائے تو پہلی جماعت کی اہمیت کم ہوگی، جماعتِ اُولیٰ سے تقاعد اور اس میں تقلیل ہوگی، اور یہ بات تکرارِ جماعت سے ممانعت کی محض ایک حکمت نہیں، بلکہ علت ہے، اس لئے کہ جن صورتوں میں تکرارِ جماعت کی اجازت ہے، فقہاء نے اس اجازت کو مذکورہ علت نہ ہونے پر متفرع فرمایا ہے، مثلاً مسجدِ شارع میں جماعتِ ثانیہ کا جواز، بعض فقہاء کے ہاں بلاتداعی تکرارِ جماعت کا جواز، غیر اہلِ محلّہ کے نماز پڑھنے کی صورت میں اہلِ محلّہ کے لئے جماعتِ ثانیہ کا جواز اور بلا اَذان و اقامت تکرارِ جماعت کا جواز اسی علت کے نہ ہونے کی بناء پر ہے، چنانچہ بدائع الصنائع میں ہے: "**ولأنّ التکرار یؤدّی ألٰی تقلیل الجماعة لأنّ النّاس أذا علموا أنّھم تفوتھم الجماعة فیستعجلون فتکثر الجماعة واذا علموا انّھا لا تفوتھم یتأخّرون فتقل الجماعة وتقلیل الجماعة مکروہ بخلاف المساجد الّتی علٰی قوارع الطّریق لأنّھا لیست لھا أھل معروفون فأداء الجماعة فیھا مرّة بعد أخریٰ لا یؤدّی ألٰی تقلیل الجماعات وبخلاف ما أذا صلّی فیہ غیر أھلہ لأنّہ لا یؤدّی ألٰی تقلیل الجماعة لأنّ أھل المسجد ینتظرون أذان المؤذّن المعروف**" (بدائع ج:۱ ص:۱۵۳)۔[1]

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید)

اِمام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ولنا أنا أمرنا بتكثير الجماعة وفى تكرار الجماعة فى مسجد واحدٍ تقليلها لأن الناس اذا عرفوا انهم تفوتهم الجماعة يعجّلون للحضور فتكثر الجماعة واذا علموا انه لا تفوتهم يؤخرون فيؤدّى الىٰ تقليل الجماعات وبهٰذا فارق المسجد الذى علىٰ قارعة الطريق لأنه ليس لهٗ قوم معلومون فكل من حضر يصلّى فيه فاعادة الجماعة فيه مرة بعد بمرة لا تؤدّى الىٰ تقليل الجماعات .... الخ." (المبسوط للسرخسی ج:۱ ص:۱۳۶)۔[1]

۲:۔ بعض فقہاء نے تفرق کلمۃ المسلمین کو علت قرار دیا ہے، چنانچہ اِمام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "واذا كان للمسجد امام راتب ففاتت رجلًا أو رجالا فيه الصلوٰة صلّوا فرادىٰ ولا أحب أن يصلّوا فيه جماعة فان فعلوا اجزأتهم الجماعة فيه وانما كرهت ذٰلك لهم لأنهٗ ليس مما فعل السلف قبلنا، بل قد عابه بعضهم، قال الشافعى: وأحسب كراهية من كره ذٰلك منهم انما كان لتفرق الكلمة وان يرغب رجل عن الصلوٰة خلف امام جماعة فيتخلف هو ..... الىٰ أن قال ..... فأما مسجد بنى علىٰ ظهر الطريق أو ناحية لا يؤذّن فيه مؤذّن راتب ولا يكون له امام معلوم ويصلّى فيه المارّة ويستظلون فلا أكره ذٰلك فيه لأنه ليس فى المعنى الذى وصفت من تفرق الكلمة وأن يرغب رجال عن امامة رجل فيتخذون امامًا غيره." (الأمّ ج:۱ ص:۱۵۴)۔[2]

مذکورہ صورت میں یہ دونوں علّتیں موجود نہیں، لہٰذا ایسی صورت میں تکرارِ جماعت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مسجد میں جتنے افراد کی گنجائش ہے پہلی جماعت میں اتنے افراد موجود ہوں، جگہ خالی نہ ہو، اگر پہلی جماعت میں گنجائش ہوتے ہوئے کچھ لوگ دُوسری جماعت میں شریک ہوں گے تو وہ پہلی جماعت میں شریک ہونے میں سستی کے گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

واللہ اعلم

احقر محمد مجاہد عفی عنہ

۱۴۱۲/۸/۱۸ھ

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مذکورہ جواب کی تصدیق وتصویب

جواب صحیح ہے۔ تکرارِ اذان کا تو جواز معلوم نہیں ہوتا، خارج از مسجد جماعت کے لئے مسجدِ محلّہ

(۱) ج:۱ ص:۱۳۵ و ۱۳۶ (طبع دار المعرفة بيروت).   (۲) (طبع دار المعرفة بيروت)

کی اَذان کافی ہوجاتی ہے، تو مسجد میں جماعتِ ثانیہ کے لئے بطریقِ اَولیٰ کافی ہوگی۔

تکرارِ اقامۃ کے جواز میں تردّد ہے، بلاعذر جماعتِ ثانیہ میں اِقامت کے ساتھ زیادہ کراہت اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان عدمِ اقامہ، ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی اقامۂ ثانیہ نہ ہو۔

رُجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ اگر دونوں جماعتوں کے درمیان کسی وجہ سے زیادہ فصل ہوا ہو تو اقامت دوبارہ کہی جائے ورنہ نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹ر رمضان ۱۴۱۶ھ

(اس تصدیق وتصویب کے بعد حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے دُوسرا جواب تحریر فرمایا، یہ جواب حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے اس خط کے ساتھ حضرتِ والا دامت برکاتہم کو بھیجا)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام
حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا خط

بگرامی خدمت حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی زید مجدہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند سال قبل مساجدِ امریکا میں اِقامت جماعتِ ثانیہ سے متعلق آپ کی طرف سے ایک سوال کا جواب تصویب کے لئے آیا تھا، میں نے تصویب کردی تھی، آپ کی طرف جواب ارسال کرنے کے بعد انہی دنوں میں نظرِ ثانی کے بعد جواب تبدیل کردیا تھا، یہ یاد نہیں کہ اس کی نقل آپ کو بھیجی تھی یا نہیں، اب احسن الفتاویٰ کی تبویب کے دوران وہ مسئلہ سامنے آیا تو اس خیال سے کہ شاید اس کی نقل آپ کو نہ بھیجی گئی ہو اب ارسال کی جاتی ہے۔

(حضرت فقیہ العصر مفتی) رشید احمد (صاحب مدظلہم)
بقلم: محمد
دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی
۲۷ر محرم ۱۴۲۲ھ

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کا جواب

جماعتِ ثانیہ کی کراہت کو دوعلّتوں ''تقلیل الجماعۃ اور تفرق وتشتّت'' سے معلول قرار دینا اور

یہ تفصیل کرنا کہ جہاں یہ علتیں پائی جاتی ہوں وہاں کراہت ہے، ورنہ نہیں، دُرست نہیں، اس لئے کہ یہ حکمتیں ہیں، علتیں نہیں، اسی لئے کسی فقیہ نے نہ یہ تفصیل بیان فرمائی ہے اور نہ اس تفصیل کو مدارِ حکم ٹھہرایا ہے۔

اس تفصیل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ حکم صورتِ سوال کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ اس کے علاوہ ہر مسجدِ محلّہ میں بھی اگر کچھ لوگ کبھی کسی معتد بہ عذر کی بناء پر جماعت سے رہ جائیں تو ان کے لئے جماعتِ ثانیہ بلاکراہت جائز ہو، بلکہ واجب ہو، کیونکہ دائمی معمول بنانا تو سببِ تقلیل وتشتت ہے، کبھی کبھار ایسے کرنے سے یہ لازم نہیں آتا، ولا قائل به احد۔

صحیح حل:- مسجد میں سب کے بیک وقت جماعت میں شریک نہ ہوسکنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں:-

۱:- قانوناً محدود اجتماع سے زیادہ پر پابندی نہیں، مگر مسجد میں گنجائش نہیں۔

۲:- قانوناً محدود تعداد سے زیادہ اجتماع ممنوع ہے، مسجد میں گنجائش ہے۔

صورتِ اُولیٰ کا حکم:

جماعتِ ثانیہ جائز نہیں، کیونکہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے کہ ایسی صورت میں صفیں قریب قریب بنائی جائیں اور ہر پچھلی صف کے نمازی اگلی صف کے نمازیوں کی پشت پر سجدہ کریں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وان سجد للزحام علىٰ ظهر مصل صلٰوته الّتي هو فيها جاز وان لم يصلّها بل صلّى غيرها او لم يصل اصلًا او كان فرجة لا يصح.

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: وفي الكلام اشارة الىٰ ان المستحب التأخير الىٰ ان يزول الزحام كما في الجلابي والى انه لا يجوز غير الظهر لٰكن في الزاهدي يجوز على الفخذين والركبتين بعذر على المختار وعلى اليدين والكمين مطلقًا والى انه لا يجوز علىٰ ظهر غير المصلي كما قال الحسن لٰكن في الأصل انه يجوز كما في المحيط وفي تيمم الزاهدي يجوز علىٰ ظهر كل مأكول اهـ. (رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۳)[1]۔

صورتِ ثانیہ کا حکم:

اس صورت میں بھی جماعتِ ثانیہ مطلقاً جائز نہیں، البتہ صحیح صورت جو نصوصِ فقہیّہ سے ثابت ہے، یہ ہے کہ غیر اہلِ محلّہ پہلے جماعت کریں اور اہلِ محلّہ بعد میں جماعت کریں، اس صورت میں یہ بھی شرط نہیں کہ پہلی جماعت کے وقت مسجد میں کوئی جگہ خالی نہ رہے۔

---

(۱) طبع ایچ ایم سعید۔

یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ مسجد سے باہر قانوناً محدود تعداد کے اندر کئی جگہ جماعت کا انتظام کریں، سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ مساجد کی توسیع اور تعداد بڑھانے کی کوشش کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۹ر رمضان ۱۴۱۶ھ

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے اس جواب پر جناب مفتی محمد صاحب نے اپنے اس خط میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے دریافت کی۔

(خط از مفتی محمد صاحب)

بگرامی خدمت قابلِ صد احترام حضرت شیخ الاسلام صاحب مدظلہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ مسئلہ اب بھی قابلِ غور ہے، اگر جنابِ والا اپنے قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر اس کے متعلق اپنی رائے سامی سے مطلع فرمادیں تو خدام پر شفقت اور بہت احسان ہوگا۔

محمد ومعاونینِ تبویب

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی

۱۴۲۲/۱/۲۷ھ

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب)

گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرتِ والا کی دُوسری تحریر پہلے مجھے نہیں ملی تھی، آپ نے بھیج دی، جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً۔

چونکہ آپ نے احقر ناکارہ کی رائے معلوم فرمائی ہے اس لئے عرض ہے کہ احقر کی رائے کا رُجحان اب بھی اسی تحریر کی طرف ہے جو مولانا محمد مجاہد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی تھی، یہ بات کہ فقہاء نے کراہیتِ تکرار کی جو وجوہ لکھی ہیں وہ حکمت ہیں، علت نہیں، اس وقت دُرست ہوتی جب تکرارِ جماعت کی ممانعت پر کوئی نصِ صریح ہوتی۔ لیکن احقر کے ناقص علم کی حد تک اس پر کوئی نصِ صریح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے استدلال کیا گیا ہے، جو ممانعت پر صریح نہیں، لہٰذا جس جگہ اُن مفاسد کا معدوم ہونا یقینی ہو جو فقہاء کرام نے بیان فرمائے ہیں، وہاں تکرارِ جماعت اس بات سے اَہوَن معلوم ہوتا ہے کہ دُوسروں کی پشت پر سجدہ کیا جائے، جبکہ سجدہ رکنِ صلاۃ ہے، پھر بھی اُن

ممالک میں سے بعض جگہوں پر مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا، بالخصوص جبکہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے، تو اس میں گنجائش ہونی چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۲/۲/۱ھ

۱:- مسجد کی تعریف
۲:- کیا جس مسجد میں ہفتے میں چند نمازیں ہوتی ہوں وہ بحکمِ مسجد ہے؟

سوال ۱:- مسجد کی کیا تعریف ہے۔

۲:- کیا ایسی جگہ جہاں ہفتے میں پانچ دن ایک یا دو وقت کی نماز ہوتی ہو، حکمِ مسجد میں ہے؟

جواب ۱و۲:- ہر وہ جگہ جسے اس کے مالک نے مسجد کے لئے وقف کردیا ہو، اس کے زبانی یا تحریری طور پر وقف کردینے سے مسجد بن جاتی ہے اور اس پر مسجد کے اَحکام جاری ہوجاتے ہیں، خواہ اس میں نماز پڑھی جائے یا نہیں۔ وهٰذا عند أبی یوسفؒ فانه یکفی عنده القول بالوقف فی المسجد خلافًا لمحمدؒ وقال الشامیؒ: وقدم فی التنویر والدرر والوقاية وغيرها قول أبی یوسفؒ وعلمت أرجحيته فی الوقف والقضاء (شامی)۔[1]

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱:- اِمام صاحب کا مسجد کے محراب میں دروازہ کھول کر آمد و رفت رکھنا
۲:- مچھر مارنے کے لئے بدبودار دَوا مسجد میں استعمال کرنے کا حکم

سوال ۱:- پہلے اِمام صاحب اپنے حجرے کے مشرقی دروازے سے نکل کر پکے راستے پر ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے برآمدے سے ہوکر مسجد میں نماز پڑھانے آتے تھے اور واپس جاتے تھے، جب سے نئے سورتی اِمام صاحب آئے ہیں، اُنہوں نے مشرقی دروازہ کو بند کروادیا ہے اور محراب کی طرف دروازہ کھلوا کر محراب سے ہوکر آتے ہیں، اور مسجد کے محراب کے دروازے کو اپنے گھر میں آنے جانے کا راستہ بنالیا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟

---

(۱) فتاویٰ شامية ج:۴ ص:۳۵۶ (طبع سعید کراچی).

۲:- مچھروں کی تکلیف سے بچنے کے لئے مچھر مارنے والی کوئی دوا جس میں بدبو یا خوشبو ہوتی ہے چھڑکنا کیسا ہے؟

جواب ا:- دونوں اِمام صاحبان کے طریقے ٹھیک تھے، شرعاً دونوں میں کوئی حرج نہیں، جس طریقے میں سہولت ہو اُسے اختیار کرلیا جائے۔[1]

۲:- مچھر مارنے کے لئے ایسی دوائیں اب ملنے لگی ہیں جن میں بدبو نہیں ہوتی بلکہ خوشبو ہوتی ہے، مسجد میں ایسی دوا استعمال کی جائے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۰ھ

تعمیرِ مسجد کے لئے غیر مسلموں سے چندہ لینے کا حکم

سوال:- بلاک ایچ شمالی ناظم آباد میں ایک جامع مسجد زیرِ تعمیر ہے، اس میں علاقے کے لوگوں کے علاوہ دُوسرے حضرات بھی سرمایہ پیش کرتے ہیں، اب زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ان میں بعض غیر مسلم مگر اہلِ کتاب حضرات کی جانب سے رقم پیش کی گئی تو تعمیر کے لئے لینا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ اِحتمال نہ ہو کہ کل کو اہلِ اسلام پر احسان رکھیں گے، اور نہ یہ اِحتمال ہو کہ اہلِ اسلام ان کے ممنون ہوکر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو قبول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے مذہب کی رُو سے بہ نیتِ ثواب چندہ دے رہا ہو۔[3] (کذا فی امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۲۰۴ و ۲۰۶)۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

---

(۱) دار لمدرس المسجد مملوكة أو مستأجرة متصلة بحائط المسجد هل له أن ينقب حائط المسجد ويجعل من بيته بابًا الى المسجد وهو يشترى هٰذا الباب من مال نفسه فقالوا: ليس له ذٰلک وان شرط علٰى نفسه ضمان نقصان ظهر فى حائط المسجد كذا فى جواهر الاخلاطى. (عالمگيرية كتاب الكراهية باب آداب المسجد ج:۵ ص:۳۲۰ طبع رشيديه). وفى الدر المختار كتاب الصلٰوة ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع سعيد كراچى) وكره تحريما اتخاذه طريق بغير عذر. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۶۷ و ۵۶۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

(۲) وفى مشكٰوة المصابيح باب المساجد ص:۶۸ (طبع سعيد) عن جابر رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أكل من هٰذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتأذّى ممّا يتأذّى منه الانس. (متفق عليه).

(۳) وفى البحر الرائق ج:۵ ص:۱۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) لو وقف علٰى مسجد بيت المقدس فانه صحيح لأنّه قربة عندنا وعندهم.
وفى ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۴۱ (طبع سعيد كراچى) (وأن يكون قربة فى ذاته) .... أن شرط وقف الذّمى أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء أو علٰى مسجد القدس .... الخ. وكذا فى فتح القدير ج:۵ ص:۴۱۷. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان قدس اللہ سرہٗ ج:۴ ص:۳۳۱۔

(۴) امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۶۳ تا ۶۶۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔ (محمد زبیر)

مسجد میں گم شدہ بچے یا چیز کے اعلان کا حکم

سوال:- گم شدہ بچے یا اور کوئی چیز اگر گم ہو جائے، مسجد میں لاؤڈ اسپیکر میں اعلان کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرنے سے حدیث میں ممانعت آئی ہے[1]، فقہاء نے بھی اسے مکروہ قرار دیا ہے، ویکرہ .... انشاد الضالّة (شامی)[2]۔ لہٰذا اعلان ضروری کرنا ہو تو مائیکروفون کو مسجد سے باہر لے جا کر اعلان کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

مسجد میں مٹی کا تیل جلانے کا حکم

سوال:- دیہات کی مسجدوں میں روشنی کے لئے مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ بھی مشہور ہے کہ مٹی کے تیل کی وجہ سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

جواب:- مٹی کا تیل جلانے سے چونکہ بدبو ہوتی ہے اور حدیث میں ہر بدبو کا کام مسجد میں کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ کچی پیاز کھا کر مسجد میں آنے کو منع کیا گیا ہے کہ اس سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے[3]، اس لئے فقہاء نے مسجد میں مٹی کا تیل جلانے کو ناجائز بتایا ہے، اس سے پرہیز لازم ہے[4]۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۶۱۴[5]۔ و رسالہ آداب المساجد[6] ص:۱۹، مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۴۴/۲۸ الف)

---

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد ص:۶۸ (طبع قدیمی کراچی) عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من سمع رجلًا ینشد ضالّة فی المسجد فلیقل لا رَدّها الله علیک، فان المساجد لم تبن لهٰذا. نیز دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج:۲ ص:۱۹۹۔

(۲) ردّ المحتار ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع سعید). وفی الهندیة کتاب الکراهیة ج:۵ ص:۳۲۱ (طبع رشیدیه) حرمة المسجد خمسة عشر .... والخامس أن لا یطلب الضّالّة فیه .... الخ.

(۳) فی مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد ص:۶۸ (طبع سعید) عن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من أکل من هٰذه الشجرة المنتنة فلا یقربن مسجدنا فان الملائکة تتأذّی ممّا یتأذّی منه الانس.

(۴) وفی الدرّ المختار ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع سعید کراچی) فلا یجوز الاستصباح بدهن نجس فیه.

(۵) امداد الفتاویٰ احکام المسجد ج:۲ ص:۶۹۸ (طبع مکتبه دار العلوم کراچی).

(۶) آداب المساجد ص:۲۰ و ۲۱ (طبع دار الاشاعت کراچی). (محمد زبیر حق نواز)

کتاب الشرکۃ والمضاربۃ

(شرکت ومضاربت (پارٹنرشپ اور سرمایہ کاری) کے مسائل)

۱:- پندرہ فیصد نفع، نقصان کی بنیاد پر ''شرکت'' کا حکم
۲:- مضاربت میں مضارب کے لئے نفع کا ایک حصہ اور تنخواہ مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ کسی شخص کا سرمایہ بندہ اپنی تجارت میں لگا رہا ہے، اس شخص کو سرمایہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ نفع ونقصان کی ایک خاص نسبت کی بنیاد پر مثلاً پندرہ فیصد منافع اور پندرہ فیصد نقصان کی بنیاد پر اپنے ساتھ شریکِ تجارت کر رہا ہوں، کیا از رُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

۲:- ایک شخص کا صرف سرمایہ ہے، دُوسرے کی صرف محنت ہے سرمایہ نہیں، محنت والے شخص کو مثلاً ۳۰ فیصد فائدہ اور ایک فیصد خاص مقدار تنخواہ بھی دی جائے، جبکہ یہ محنت والا شخص نقصان میں شریک نہیں ہے، از رُوئے شریعت ایسا کرنا جائز ہے؟

اُمتی گل، افغان اسٹور
(ابوظبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اگر آپ اس شخص سے یہ طے کریں کہ آپ کے اور میرے سرمائے سے تجارت کرنے کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس نفع کا ۱۵ فیصد آپ کا ہوگا، تو یہ صورت جائز ہے۔[1] البتہ نقصان کی صورت میں ۱۵ فیصد کا تعین اسی صورت میں جائز ہوگا جب اس کا لگایا ہوا سرمایہ تجارت کے کل سرمائے کا ۱۵ فیصد ہو۔ اگر اس کا لگایا ہوا سرمایہ کل تجارت کے سرمائے کے ۱۵ فیصد سے کم یا زیادہ ہے تو اس صورت میں اُسے ۱۵ فیصد نقصان میں شریک کرنے سے شرکت فاسد ہوجائے گی۔ اُصول یہ ہے کہ نفع کا تناسب تو شرکاء باہمی رضامندی سے جو چاہیں مقرّر کرسکتے ہیں، لیکن نقصان ہمیشہ سرمائے کے تناسب کے مطابق ہونا ضروری ہے، یعنی جس نے جتنا فی صد سرمایہ لگایا اتنا ہی فیصد نقصان بھی اُٹھائے۔[2]

(۱و۲) وفی کنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ الوضیعة علی المال والرّبح علٰی ما اصطلحوا علیه. وکذا فی مصنف ابن أبی شیبة ج:۵ ص:۴ رقم الحدیث:۱۰ ومصنف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۱۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علٰی قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعة اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال. وفی فتح القدیر کتاب الشرکة، فصل ولَا تنعقد الشرکة الخ، ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفٰی بابی مصر) وفی طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ج:۵ ص:۳۹۷ الربح علٰی ما شرطا والوضیعة علٰی قدر المالین الخ. وکذا فی التتارخانیة ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارة القرآن) والمحیط البرهانی ج:۶ ص:۴۰۱ (طبع غفاریہ کوئٹہ)، وعامة کتب الفقه.

۲:- یہ صورت جائز نہیں ہے، آپ یا تو اس کا نفع میں کچھ فیصد حصہ رکھیں، پھر تنخواہ مقرّر کرنا جائز نہیں[(۱)]، کیونکہ یہ مضاربت ہوگی[(۲)]، یا تنخواہ مقرّر کریں اور وہ متعین رقم ہو، نفع کا فی صد نہ ہو، نفع میں بحیثیت شریک حصہ دار کوئی فیصد حصہ مقرّر نہ کریں، اس صورت میں یہ اجارہ ہوگا، دونوں چیزوں کو جمع کرنا دُرست نہیں۔[(۳)]

واللہ اعلم

۱۲/۷/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۶۵/۳۹ ہ)

(شرکت ومضاربت سے متعلق چند اہم سوالات اوران کے جوابات)

ا:- نفع کی ایک مقرّر مقدار تک مضاربت ختم نہ کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا رَبّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ جب تک مضارب ایک لاکھ نفع نہ کمالے اس وقت تک مضاربت ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوگا؟ اگر یہ معاہدہ کرلیا تو کیا اِس کا پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

جواب:- جو شرط آپ نے لکھی ہے، اس کا جواز نظر نہیں آتا،[(۴)] کیونکہ یہ غیر محدود مدّت تک مضارب کو پابند کرنے کے مرادف ہے،[(۵)] اور اس میں فی الجملہ رَبّ المال کے نفع کی ضمانت بھی ہے۔[(۶)]

(۱ و۲) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۲۶ کتاب الشرکۃ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ مطلب یرجع القیاس الخ (طبع سعید). لا أجر للشریک فی العمل بالمشترک.

وفی النتف فی الفتاویٰ کتاب الاجارۃ اجارۃ الشریک شریکہ ص:۳۴۹ (طبع سعید) لو کان طعام بین رجلین فقال أحدھما لصاحبہ احملہ الی الموضع کذا ولک فی نصیبی من الأجر کذا، أو قال اطحنہ ولک فی نصیبی کذا من الأجر، جاز ذٰلک فی قول زفر ومحمد بن صاحب ولا یجوز فی قول أبی حنیفۃ وأبی یوسف ومحمد رحمھم اللہ تعالٰی.

(۳) وفی المعجم الأوسط للطبرانیؒ ج:۲ ص:۱۶۹ (طبع دار الحرمین قاھرۃ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تحلّ صفقتان فی صفقۃ. وفی مجمع الزوائد ج:۴ ص:۸۴ (طبع دار الرّیان للتراث قاھرۃ و دار الکتاب العربی بیروت) عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: نھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صفقتین فی صفقۃ واحدۃ.

(۴ و ۵) وفی البدائع للکاسانی ج:۶ ص:۱۰۹ (طبع سعید) وأما صفۃ ھٰذا العقد یعنی المضاربۃ فھو أنہ عقد غیر لازم ولکل واحد منھما اعنی رب المال والمضارب الفسخ لٰکن عند وجود شرطہ وھو علم صاحبہ.

نیز مضاربت کی توقیت اورلزوم کی دوصورتوں اوران کے حکم سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ج:۲ ص:۱۷۳ تا ۱۷۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) دیکھئے صفحہ:۴۲ و ۴۸ کے حواشی۔

۲:- فسخِ مضاربت کی صورت میں سارا مال ربّ المال کے حوالے کرنے کے معاہدے کا حکم

سوال:- کیا ربّ المال مضارب سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ اگر مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو مضارب سارا مال ربّ المال کے حوالے کردے، اور ربّ المال کی جگہ پر لے جاکر اس کی سیٹنگ کردے، اگر ایسا معاہدہ کرلیا ہو تو کیا مضارب پر اس کی پابندی ضروری ہے؟

جواب:- فسخِ مضاربت پر اگر رقم نقد ہو تو مضارب اسے واپس کرنے کا پابند ہے، نقد نہ ہو تو تنضیض کا[1]، البتہ اگر ربّ المال عروض خریدنا چاہے تو جائز ہے[2]، اس صورت میں اگر قیمتِ خرید میں نفع ہو تو وہ بھی جانبین میں تقسیم ہوگا، پہلے سے یہ شرط کہ فسخ ہونے پر مال ربّ المال کو بیچا جائے گا، عقدِ مضاربت میں نہیں لگائی جاسکتی، ہاں اگر عقد اس شرط سے خالی ہو، اور بعد میں مضارب وعدہ کرلے تو جائز ہے۔ البتہ مالِ مضاربت اگر عروض کی شکل میں ہو، اور ربح ظاہر ہوچکا ہو، اور مضارب ربّ المال سے یہ مطالبہ کرے کہ یہ مال میں خریدنا چاہتا ہوں تو ربّ المال اِنکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اِمام طحاویؒ فرماتے ہیں:-

وان کان فی تلک العروض فضل أجبر المضارب علٰی بیعها علی المضاربة حتی یستوفی رب المال رأس ماله، ویکون الفضل ان کان،

---

(۱) وفی الهدایة کتاب المضاربة فصل فی العزل والقسمة ج:۳ ص: ۲۷۰ و ۲۷۱ (طبع مکتبه رحمانیه) وفی طبع سعید ج:۳ ص: ۲۲۱ وأن کانا یقتسمان الرّبح والمضاربة بحالها ثم هلک المال بعضه أو کلّه ترادا الربح حتی یستوفی ربّ المال رأس المال لأنّ قسمة الرّبح لا تصحّ قبل استیفاء رأس المال لأنّه هو الأصل وهٰذا بناء علیه وتبع لهٗ.

وفی المبسوط للسرخسیؒ: الرّبح لا یظهر ما لم یسلم جمیع رأس المال لربّ المال لأنّ الرّبح اسم للفضل فما لم یحصل ما هو الأصل لربّ المال لا یظهر الفضل فقال صلی الله علیه وسلم مثل المؤمن کمثل التاجر لا تخلص لهٗ نوافله ما لم تخلص لهٗ فرائضه فالتّاجر لا یسلم له الرّبح حتّٰی یسلم له رأس ماله .... الخ.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۱۰۷ وانّما یظهر الرّبح بالقسمة وشرط جواز القسمة قبض رأس المال فلا تصحّ قسمة الرّبح قبل قبض رأس المال ..... الخ.

دیگر ائمہ کے نزدیک بھی فسخ مضاربت پر نفع کی حتمی تقسیم کے لئے سرمایہ اور اثاثے کو نقد میں تبدیل کرنا ضروری ہے، دیکھئے: منهاج الطالبین ص:۶۵، والشرح الصغیر علی اقرب المسالک ج:۳ ص:۷۰۰ لعلّامه احمد الدردیر المالکیؒ و المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۳۳ (طبع دار الفکر)۔

(۲) وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۱۰۱ (طبع سعید) ویجوز شراء ربّ المال من المضارب وشراء المضارب من ربّ المال وان لم یکن فی المضاربة ربح فی قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر لا یجوز الشراء بینهما فی مال المضاربة وجه قول زفر ان هٰذا بیع ماله بماله ..... ولنا أنّ لربّ المال فی مال المضاربة ملک رقبة لا ملک تصرّف وملکه فی حقّ التّصرّف کملک الأجنبی وللمضارب فیه ملک التصرّف لا الرقبة فکان فی حق ملک الرقبة کملک الأجنبی حتّٰی لا یملک ربّ المال منعه عن التّصرف فکان مال المضاربة فی حق کل واحد منهما کمال الأجنبی لذٰلک جاز الشراء بینهما ..... الخ.

وفی الهندیة الباب الرّابع (المضاربة) إذا باع ربّ المال مال المضاربة من المضارب أو باعه المضارب من ربّ المال فهو جائز سواء کان فی المال فضل علٰی رأس المال أو لم یکن.

بینهما علٰی ما أشترطا، إلّا أن یشاء المضارب أن یعطی رَبّ المال رأس ماله وحصته من الربح ویحبس العروض بنفسه فلا یکون لربّ المال الامتناع عنه. (الشروط الصغیر للطحاوی ج:۲ ص:۷۳۱ طبع بغداد)[1]

جہاں تک سیٹنگ کی شرط کا تعلق ہے وہ اموالِ مبیعہ کی حالت پر موقوف ہے، اگر اموال ایسے ہیں جن میں گھر پر لے جا کر سیٹ کرنا تجار میں متعارف ہے، تو یہ شرط جائز ہے، ورنہ فاسد۔

۳:- نقدی کے بجائے "مضاربت بالعروض" کا حکم

سوال:- اگر رَبّ المال نقدی کی بجائے عروض (سامان) مضارب کو دیتا ہے تو کیا اس طرح مضاربت دُرست ہے؟

جواب:- حنفیہ اور جمہور کے نزدیک مضاربت بالعروض دُرست نہیں،[2] اِلَّا یہ کہ انہیں بیچ کر نقد بنالیا جائے، البتہ اِمام احمدؒ کی ایک روایت میں جائز ہے،[3] اور وقتِ عقد کی قیمت کو رأس مال المضاربہ قرار دیا جائے گا،[4] (الانصاف للمرداوی ج:۵ ص:۴۰۹)۔[5] حاجت کے وقت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے شرکۃ بالعروض میں مالکیہ کا قول[6] اختیار کرنے کی گنجائش دی ہے۔ (امداد الفتاویٰ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۶۷ طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ (باب نفقة المضارب) (واذا اشتری المضارب بمال المضاربة متاعًا وفیه فضل أو لا فضل فیه فأراد المضارب أن یمسکهٗ حتّٰی یجد به ربحًا کثیرًا وأراد ربّ المال أن یبیعهٗ فان کان لا فضل فیه أجبر المضارب علٰی أن یبیعه أو یعطیه ربّ المال برأس ماله لأنّهٗ لاحق للمضارب فی المال فی الحال فهو یرید أن یحول بین ربّ المال وبین ماله بحقٍ موهومٍ ...... وان کان فیه فضل وکان رأس المال ألفًا والمتاع یساوی ألفین فالمضارب یجبر علٰی بیعه لأنّ فی تاخیره حیلولةً بین ربّ المال وبین ماله وهو لم یرض بذٰلک حین عاقدهٗ عقد المضاربة إلّا أن للمضارب هنا أن یعطی ربّ المال ثلثة أرباع المتاع برأس ماله وحصته من الرّبح ویمسک ربع المتاع وحصته من الربح ولیس لربّ المال أن یأبٰی ذٰلک علیه لأنّ الربح حق والانسان لا یجبر علٰی بیع ملک نفسه لتحصیل مقصوده. (محمد زبیر حق نواز)

(۲) وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ لا تصحّ الشرکة فی العروض. وفیه أیضًا معنی الوکالة من لوازم الشرکة والوکالة التی یتضمنها الشرکة لا تصحّ فی العروض .... الخ. وکذا فی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۱ ص:۱۵۹.

وفی مجلّة الأحکام ج:۴ ص:۱۳۴۲ (طبع نور محمد کتب خانه) لا تصحّ الشرکة علی الأموال الّتی لیست معهودة من النقود کالعروض والعقار أی لا تجوز أن تکون هٰذه رأس مال للشرکة.

(۳ و ۴) وفی المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۱۰ و ۱۱ (طبع دارالفکر بیروت) فأمّا العروض فلا تجوز الشرکة فیها فی ظاهر المذهب نصّ علیه أحمد. .... وعن أحمد روایة أُخریٰ أنّ الشرکة والمضاربة تجوز بالعروض وتجعل قیمتها وقت العقد رأس المال، قال أحمد اذا اشترکا فی العروض یقسم الرّبح علٰی ما اشترطا.

(۵) کتاب الشرکة (طبع مکتبة علمیة) فعلی الرّوایة الثانیة ویجعل رأس المال قیمتها وقت العقد الخ.

(۶) وفی الشرح الصغیر علی أقرب المسالک للدّردیر ج:۳ ص:۴۵۹ (و) تصحّ (بعین) من جانب (وبعرض) من الأخر (وبعرضین) من کلّ جانب عرض (مطلقًا) اتفقا جنسًا أو اختلفا کعبد وحمار أو ثوب.

وفی المغنی لابن قدامة ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفکر) ..... مقصود الشرکة جواز تصرفهما فی المالین جمیعًا وکون ربح المالین بینهما وهٰذا یحصل فی العروض کحصوله فی الأثمان فیجب أن تصحّ الشرکة والمضاربة بها کالأثمان.

ج:۳ ص:۴۹۵)[1]۔ یہ گنجائش یہاں بھی ہوسکتی ہے۔[2]

۴:- مضارب کے لئے فسخِ مضاربت کے وقت رَبّ المال کے بجائے کسی اور کو مال فروخت کرنے کا حکم

سوال:- مضاربت ختم کرنے کا ارادہ ہوا تو رَبّ المال نے کہا: ''سارا مال مجھ کو فروخت کردو'' مگر مضارب کہتا ہے کہ: ''میں آپ کو نہیں دوں گا بلکہ میں اپنے فلاں دوست کو فروخت کروں گا'' تو کیا مضارب کو اس کا اختیار ہے کہ رَبّ المال کے بجائے اپنے دوست کو فروخت کرے؟

جواب:- اگر مضارب کا دوست زیادہ قیمت دے رہا ہو تو یقیناً وہ مقدم ہے، لیکن اگر قیمت دونوں برابر دینا چاہتے ہوں تو اس کا صریح جزئیہ تو یاد نہیں، لیکن قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ رَبّ المال اسے مجبور نہ کرسکے، کیونکہ مالِ مضاربت میں حقِ تصرف کلیۃً مضارب کو حاصل ہوتا ہے،[3] رَبّ المال کو مداخلت کا حق نہیں ہوتا،[4] اگرچہ دُوسری جہت یہ ہے کہ رَبّ المال کو ابتدائی ملکِ رقبہ حاصل ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے، لیکن بظاہر یہ محض اخلاقی ترجیح ہے، قضاءً اس پر مجبور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۵:- شرکت و مضاربت اِکٹھے کرنے کی صورت میں دونوں کا نفع اِکٹھا فیصد کے طور پر مقرّر کرنے کا حکم

سوال:- اگر ایک شخص دُوسرے کے ساتھ شرکت اور مضاربت دونوں معاملات اِکٹھے کرنا چاہتا ہے تو دونوں معاملات کا نفع اِکٹھے فیصد میں متعین ہوسکتا ہے؟ مثلاً ایک نے دُوسرے کو لاکھ روپیہ بطور شرکت اور لاکھ روپیہ بطور مضاربت دیا اور کہا کہ: ''مجموعی طور پر جو نفع ہو اس کا ۴۰ فیصد دینا'' تو کیا اس طرح دُرست ہے؟

---

(۱) طبع مکتبہ دار العلوم کراچی.

(۲) جیسا کہ المغنی لابن قدامۃ میں شرکت کے ساتھ مضاربت بالعروض کے جواز کی بھی صراحت کی گئی ہے۔
وفی المغنی لابن قدامۃ ج:۵ ص:۱۱ (طبع دارالفکر) .... مقصود الشرکۃ جواز تصرفهما فی المالین جمیعًا وکون ربح المالین بینهما وهٰذا یحصل فی العروض کحصوله فی الأثمان فیجب أن تصح الشرکۃ والمضاربۃ بها کالأثمان.
نیز جس مال سے شرکت جائز ہے اس سے مضاربت بھی جائز ہے، کما فی الهدایۃ ج:۳ ص:۲۱۳ طبع سعید وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۳ ص:۲۶۳ ولا تصحّ إلّا بالمال الّذی تصح به الشرکۃ .... الخ.

(۳ و ۴) وفی الهدایۃ ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعید) واذا صحت المضاربۃ مطلقۃ جاز للمضارب أن یبیع ویشتری ویوکل ویسافر ویبضع ویودع. وفیها أیضًا قبلها ج:۳ ص:۲۱۴ (طبع سعید) ولا بدّ أن یکون المال مسلمًا الی المضارب ولا ید لربّ المال فیه .... الخ.

جواب:- یہ صورت اسی وقت متصوّر ہوسکتی ہے جب مضارب بھی اپنا سرمایہ لگا رہا ہو، لہٰذا اگر مجموعی کاروبار ایک ہی ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ دو لاکھ بطور مضاربت دیئے اور مضارب کو اپنا سرمایہ لگانے کی اجازت دی[1]، اس صورت میں شرط صرف یہ ہے کہ ربّ المال کا حصہ نفع مالِ شرکت میں اس کے رأس المال کے تناسب سے زائد نہ ہو، لہٰذا چالیس فیصد نفع کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ مضارب اپنی طرف سے کتنا سرمایہ لگا رہا ہے؟ کیونکہ شرط عدم العمل کی صورت میں شریک اپنے رأس المال کے تناسب سے زیادہ حصہ متعین نہیں کرسکتا، وراجع البدائع[2]، ایسی صورت میں نفع کی تقسیم کے طریقے پر بندے نے اپنی اس انگریزی کتاب میں بحث کی ہے جس کا ترجمہ مولانا زاہد صاحب نے ''اسلامی بینکاری کے اُصول'' کے نام سے کیا ہے۔

۶:- ایک شریک بغیر عمل کے پانچ لاکھ روپے دُوسرا ایک لاکھ بمع عمل شرکت کریں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- دو شخص شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک شخص ۵ لاکھ روپیہ دے گا لیکن کام نہیں کرے گا، اور دُوسرا ایک ہزار روپیہ دے گا لیکن ساتھ کام بھی کرے گا، لیکن نفع دونوں میں نصف نصف تقسیم ہوگا، تو کیا اس طرح دُرست ہے؟ اگر دُرست ہے تو اس میں اور مضاربت میں کیا فرق ہوگا؟ بندے کے خیال میں صرف دو فرق ہیں، ۱-کام کرنے والا ۱/۵۰۰ نقصان بھی برداشت کرے گا، ۲-مال خریدنے کے بعد اس کی مالیت میں اضافہ ہوا تو ۱/۵۰۰ کے بقدر کام کرنے والا بھی شریک ہوگا۔ ان دو کے علاوہ کیا کچھ اور بھی فرق ہے؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- فرق نمبر۱ دُرست ہے[3]، نمبر۲ دُرست نہیں، کیونکہ کام کرنے والا نفع کے اضافے میں ۱/۵۰۰ کے حساب سے نہیں بلکہ طے شدہ تناسب (یعنی نصف نصف) کے حساب سے شریک ہوگا[4]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ

---

(۱) وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲۲ ص:۱۳۳ خلط ألف المضاربة بألف من ماله قبل الشراء جاز.

(۲) بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۳ (طبع سعید).

(۳ و ۴) وفی مصنّف عبدالرّزاق ج:۸ ص:۱۴۷ رقم الحدیث:۱۵۰۸۵ وکنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲ الوضیعة علی المال والرّبح علی ما اصطلحوا علیه وکذا فی مصنّف ابن أبی شیبة ج: ۵ ص: ۴ وفتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷.

کم سے کم ۵ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد منافع دینے والے ادارے ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ آج کل کراچی میں کاروباری ادارے عوام سے رقم لے کر اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، اور اس کے منافع عوام میں بھی تقسیم کر رہے ہیں، یہ ادارے پہلے سے مقرّر کردہ منافع بھی دیتے ہیں، جو کہ سود ہے۔ بعض ادارے باقاعدہ منافع کی تقسیم کر رہے ہیں جو ہر ماہ کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے اور ان کا کام تقریباً بینک جیسا ہے، جو عوام کا پیسہ لے کر مختلف کاروباروں میں لگاتے ہیں اور منافع کھاتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ادارہ ''صمد پراپرٹی انوسٹمنٹ کارپوریشن'' ہے جو زمینوں، پلاٹوں اور مکانات وغیرہ کا کاروبار کرتا ہے، اس کا منافع بھی بڑھتا یا کم ہوتا رہتا ہے، جو کہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں انہوں نے مختلف مہینوں میں سات فیصد، ساڑھے آٹھ فیصد اور نو فیصد منافع بھی دیا ہے، لیکن ان کے ساتھ حصے میں لکھا ہوتا ہے کہ پانچ فیصد سے بیس فیصد تک منافع دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ:

۱:- کم سے کم منافع پانچ فیصد مقرّر کرنے سے کیا یہ سود کی تعریف میں آئے گا؟ جبکہ منافع بہرحال کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

۲:- زیادہ سے زیادہ بیس فیصد حد مقرّر کردینے سے کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

۳:- اس کاروبار کو جائز شرعی صورت دینے کے لئے معاہدے میں کیا تبدیلی کرنی ہوگی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- اس قسم کے کاروبار کا جائز یا ناجائز ہونا اس کاروبار کے مفصل طریقِ کار پر موقوف ہے، صرف ایک آدھی بات دیکھ کر کوئی حتمی حکم لگانا دُرست نہیں، لہٰذا جس کاروبار کے بارے میں حکم معلوم کرنا ہو، اس کے طریقِ کار کی تفصیل لکھئے تب جواب دیا جاسکے گا۔

۱:- اگر معاہدے میں یہ طے کرلیا جائے کہ سرمایہ کا کم سے کم پانچ فیصد نفع ضرور دیا جائے گا

تب یہ سود ہے۔[1]

۲:- زیادہ سے زیادہ نفع مقرّر کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، متعلقہ کاروبار کی تفصیل لکھیں تو جواب دیا جاسکے گا۔ یہ دونوں باتیں اس وقت ہوں جب معاہدے میں کم سے کم منافع کی شرح سرمائے کے تناسب سے طے کی گئی ہو، لیکن اگر معاہدہ یہ ہو کہ جو کچھ بھی منافع ہوگا اس منافع کا ۵ یا دس فیصد دیا جائے گا، اور اگر کچھ منافع نہ ہو تو کچھ نہ دیا جائے گا،[2] لیکن ساتھ ہی سرمایہ لگانے والے کو یہ بتادیا گیا کہ عموماً اس کاروبار میں اتنے فیصد تک نفع ہوتا ہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۰۷/۱۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸۵۶/۳۸ ه)

مشترک مالِ تجارت باہر سے منگوانے کی صورت میں اگر جہاز ڈوب جائے تو شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوایا تھا، اس مال میں ایک صاحب کی شراکت تھی، نفع نقصان آدھا آدھا، مال منگوانے میں پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح شرکت کا مال آتا رہتا ہے کہ کبھی ہم نے منگوایا، کبھی انہوں نے منگوایا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا، کبھی پیسہ

(۱ و ۲) وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع رشیدیه کوئٹه) وأن یکون الرّبح معلوم القدر فان کان مجهولًا تفسد الشرکة وأن یکون الرّبح جزأً شائعًا فی الجملة لا معیّنًا فان عینا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک کانت الشرکة فاسدة.

وفی الهدایة ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع مکتبه رحمانیه) ولا یجوز الشرکة اذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح لأنّه شرط یوجب انقطاع الشرکة فعساه لا یخرج اِلّا قدر المسمّی لأحدهما ونظیره فی المزارعة.

وفی مجمع الأنهر ج:۲ ص:۵۴۴ (طبع مکتبه غفاریه) ورکنها الایجاب والقبول وشرطها عدم ما یقطعها کشرط دراهم معیّنة من الرّبح لأحدهما.

وفی الدّر المنتقی مع مجمع الأنهر کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۶ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) وکون الرّبح بینهما مشاعًا فتفسد ان شرط لأحدهما عشرة دراهم مثلًا.

وفی تبیین الحقائق ج:۴ ص:۲۴۸ کتاب الشرکة (طبع سعید) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح لأنّه شرط یوجب انقطاع الشرکة فی بعض الوجوه فلعلّه لا یخرج الّا القدر المسمّٰی لأحدهما من الرّبح.

وکذا فی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعید) وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی لاهور)

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) یشترط أن تکون حصص الرّبح الّتی تنقسم بین الشرکاء جزأً شائعًا کالنّصف والثلث والربع فاذا اتفق الشرکاء علیٰ اعطاء أحدهم قدرًا معیّنًا کانت الشرکة باطلة. وکذا فی شرح المجلّة للأتاسی ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه).

بعد میں انہوں نے دے دیا، بہرکیف دس بارہ سال سے کاروباری تعلقات ہیں، اور ایک دُوسرے کو ایک دُوسرے پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا وہ خداوندقدوس کی مرضی سے پورا کا پورا ڈُوب گیا، کیا ہم اس مال کی جس کی ہم نے ادائیگی پوری کی پوری کردی ہے اس کی آدھی رقم حمید صاحب سے جو نفع ونقصان میں شریک تھے لے سکتے ہیں؟

جواب:- اگر مال منگوانے سے پہلے شرکت کا یہ معاہدہ ہوچکا تھا کہ مال منگوانے میں دونوں فریق آدھا آدھا روپیہ لگائیں گے اور نفع ونقصان میں نصف نصف شریک ہوں گے، اور پھر مال اسی معاہدے کے تحت ان کے علم اور اِطلاع سے منگوایا گیا تھا، تو اس مال کے منگوانے میں جو رقم خرچ ہوئی آپ کے شریک اس کا نصف حصہ آپ کو دینے کے ذمے دار ہیں، خواہ مال وصول ہوا ہو یا ڈُوب گیا ہو۔ بدائع میں ہے:

"واختلاط الربح یوجد وان اشتری کل واحد منهما بمال نفسه علیٰ حدة، لأن الزیادة وهی الربح تحدث علی الشرکة ...... حتّی لو هلک بعد الشراء بأحدهما کان الهالک من المالین جمیعًا لأنه هلک بعد تمام العقد."

(بدائع ج:۶ ص:۶۰)(۱)

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/ ۲۷ه)

کاروبار میں شرکت کے لئے رقم دینے کے بعد نفع کے بجائے ماہانہ سود کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- دو سال ہوئے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، بوقتِ انتقال والد صاحب پر قرضہ تھا، جوکہ والد صاحب کے کاروبار سے ادا کیا جارہا ہے، اِن شاء اللہ حال ہی میں تمام قرضہ ادا ہوجائے گا۔ ایک شخص ایسا بھی ہے کہ اُس نے چلتے ہوئے کاروبار یعنی والد صاحب کی دُکان میں دس

---

(۱) طبع سعید، وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۹ (طبع رشیدیّه کوئٹه) .... بخلاف ما بعد الخلط حیث یهلک علی الشرکة لأنّه لا یتمیّز فیُجعل الهالک من المالین،(وان اشتریٰ أحدهما بماله وهلک مال الآخر قبل الشراء فالمشتری بینهما علیٰ ما شرطا) لأن الملک حین وقع وقع مشترکًا بینهما لقیام الشرکة وقت الشراء ...الخ.
وفی درر الحکام شرح غرر الأحکام، أرکان الشرکة وشروطها وبعدهٗ أی بعد الخلط یهلک علیهما لأنّهٗ لا یتمیّز فیهلک من المالین فان هلک مال أحدهما بعد شراء الآخر بماله فمشریه لهما علیٰ ما شرطا لأنّ الملک حین وقع وقع مشترکًا بینهما لقیام الشرکة وقت الشراء فلا یتغیّر الحکم بهلاک مال الآخر. وراجع أیضًا الی الفتاوی الهندیة ج:۴ ص:۳۰۹ الیٰ ص:۳۱۱ (طبع رشیدیه کوئٹه).

ہزار روپیہ لگا کر شراکت کی، لیکن دو ماہ کے بعد شرکت کی بجائے سود لینے کا مطالبہ کردیا، ورنہ دس ہزار کی واپسی کا مطالبہ کردیا، اس لئے مجبوراً ماہانہ سود دینا پڑا، اس طرح کچھ عرصہ سود دیا جاتا رہا لیکن دُکان دن بدن منڈی والوں کی مقروض ہوتی چلی گئی اور دُکان کا کاروبار ختم ہوگیا، مجبوراً والد صاحب بیرون ملک چلے گئے تاکہ اس شخص کا قرض ادا کیا جائے، قرض کی ادائیگی کے وقت سود کے نام پر جو رقم دی گئی ہے وہ منہا کرکے دی جائے یا پوری دی جائے؟

جواب:- سود کی رقم کا لین دین جائز نہیں ہے،[۱] دو ماہ بعد سود کے مطالبے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شرکت ختم کردی، ایسی صورت میں حساب ہونا چاہئے تھا، اور اس وقت نفع یا نقصان میں جو حصہ بنتا وہ ان کو دِیا جاتا، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا، اس لئے اب اندازہ لگائیں کہ جب شرکت ختم ہوئی، اس وقت دُکان میں نفع تھا یا نہیں، اگر نفع تھا تو جو رقم سود کے طور پر دی گئی، وہ اگر نفع کے برابر ہو تو ٹھیک، اور زائد ہو تو اُسے منہا کرکے انہیں اصل رقم واپس کردیں جو دس ہزار روپے ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۰/ ۲۸ ج)

تاج کمپنی لمیٹڈ میں ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی شرط پر سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- تاج کمپنی لمیٹڈ قرآنِ حکیم کی طباعت اور نشر و اِشاعت کا ایک معروف ادارہ ہے، عوام الناس کو شرکت کی دعوت دیتا ہے، ۱۵ تا ۲۰ فیصد منافع کی پیشکش کرتا ہے، اس میں سرمایہ لگا کر منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ منافع اگر کاروبار کے مجموعی منافع کے بجائے لگائی ہوئی رقم کا ۱۵ یا ۲۰ فیصد ہوتا ہے تو یہ منافع نہیں بلکہ سود ہے،[۲] اور اس کا لین دین جائز نہیں،[۳] جائز صورت صرف یہ ہے کہ جو شخص جتنی رقم لگائے وہ کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو اور کل سرمایہ کی جتنی فیصد رقم اُس نے لگائی ہے نفع کا اُتنا ہی فیصد وصول کرے، دی ہوئی رقم پر معین شرح سے فیصد وصول کرے اور کاروبار خواہ قرآن مجید کی نشر و اشاعت کا ہو اس کی بنا پر سود جائز نہیں ہوسکتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۲/۶/۱۳۹۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸۳/ ۲۸ ب)

---

(۱) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر ۱ اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔
(۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۲، ۴۸، ۵۳ وص:۵۴ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر ۴۔

کھانے میں روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس مشترک ہونے کی صورت میں تقسیم میں مساوات ضروری ہے یا نہیں؟

سوال:- چند اَحباب نے برابر اپنے کھانے کے لئے پیسے جمع کئے اور ان پیسوں سے سالن روٹی وغیرہ تیار ہوئی، سالن میں بھی اور روٹیوں میں بھی ہر ایک کی برابر رقم لگی ہوئی ہے، دسترخوان پر ہر چیز میں برابر ہر ایک شریک ہے، لیکن کھانا جب کھایا جاتا ہے تو اس میں ظاہر ہے کمی زیادتی ہونا لازمی امر ہے، ایک عالم اس کو جائز کہتے ہیں، مختلف اجناس ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی جائز ہے، دُوسرے صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ شرکت اور اس میں بغیر تقسیم مال ہر ایک کا حصہ جدا کئے بغیر جائز نہیں، اور تقسیم بھی برابری میں ہو کیونکہ شرکت ہر چیز میں برابر ہے، ان کے دلائل یہ ہیں: **فشرکة الأملاک العین یرثها رجلان ویشتریانها فلا یجوز لأحدهما أن یتصرّف فی نصیب الآخر الّا باذنه وکل واحد منهما فی نصیب صاحبه کالأجنبی الٰی أن قال الّا فی صورة الخلط والاختلاط فانه لا یجوز الّا باذنه. هدایه** (ج:۲ ص:۶۰۵)[1]۔ اور ردّالمحتار میں ہے: **قوله من حیث الأمانة فان مال أحد الشریکین أمانة فی ید الآخر کما ان مال المفقود أمانة فی ید الحاضر.** (ج:۴ ص:۲۹۸)[2]۔

اس لئے یا تو ہر ایک کا حصہ پہلے ہی الگ کردیا جائے اور ہو بھی سب کا برابر، سالن بھی برابر اور روٹی بھی برابر یا روٹی کے بدلے سالن زیادہ لے یا سالن کے بدلے روٹی سب کی رضامندی سے ایسی شرکت کا امتیاز کرلیا جائے تو پھر صحیح ہے اور یہ مشکل ہے، اس لئے اس شرکت میں قباحتیں ہیں اُوپر کی دو مختلف اجناس میں کمی زیادتی جائز ہے، یہ اُصول تقسیم اور بیع کا ہے جو یہاں واقع نہیں ہوا اس لئے جائز نہیں، اس لئے ایسا کرلیا جائے کہ یہ تمام احباب ایک شخص کو رقم دے دیں اور وہ ان سب کی اپنی طرف سے دعوت کردے۔ پہلی صورت میں جواز کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ روٹی، سالن، گوشت اور سبزی وغیرہ مختلف اجناس ہیں، اس لئے تقسیم میں مساوات رِبا سے بچنے کے لئے ضروری نہیں بلکہ باہمی رضامندی سے تفاضل جائز ہے، چنانچہ جب سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تو ہر شخص جتنا کھا رہا ہے وہ اس کا حصہ سمجھا جائے گا، بشرطیکہ تمام شرکاء راضی ہوں، لہٰذا کوئی اِشکال نہیں۔ البتہ اگر اس طرح صرف ایک ہی ایسی چیز خریدی جائے جو یا وزنی ہو یا کیلی تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تقسیم میں مساوات ضروری ہوگی، لہٰذا یا تو اس

---

(۱) هدایة، کتاب الشرکة ج:۲ ص:۶۰۵ (طبع مکتبه رحمانیه).

(۲) ردّ المحتار، کتاب الشرکة ج:۴ ص:۲۹۸ (طبع سعید).

کے ساتھ کوئی دُوسری جنس کی چیز شامل کرلی جائے جیسے قربانی کے گوشت میں فقہائے کرام نے لکھا ہے، یا پھر سب لوگ مل کر اپنی اپنی رقم کا مالک ایک شخص کو بنادیں، وہ اپنے لئے وہ چیز خرید لے، پھر وہ اپنی خوشی سے سب کی دعوت کردے، جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اِمام بخاریؒ نے کتاب الشرکہ میں اس قسم کے اشتراک کو ''نہد'' قرار دِیا ہے، اور عہدِ رسالت میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''لم یر المسلمون فی النهد بأسا، أن یأکل هٰذا بعضا وهٰذا بعضا.

(صحیح البخاری، کتاب الشرکة ج:۱ ص:۳۳۷)

اس کے تحت حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''انها لیس من باب المعاوضات التی تجری فیه المماکسة أو تدخل تحت الحکم وانما هی من باب التسامح والتعامل، وکیف تکون خلاف الاجماع مع انه قد جری به التعامل من لدن عهد النبوة الٰی یومنا هٰذا.

(فیض الباری ج:۳ ص:۳۴۲)[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹/۲۷)

---

(۱) طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه.

وفی عمدة القاری شرح البخاری ج:۱۳ ص:۶۰ (طبع دار احیاء التراث) باب الشرکة فی الطعام والنهد والعروض وکیف قسمة ما یکال ویوزن مجازفة أو قبضة قبضة لما لم یر المسلمون فی النهد بأسا أن یأکل هٰذا بعضا وهٰذا بعضا وکذٰلک مجازفة الذهب والفضة والقران فی التمر أی هٰذا باب فی بیان حکم الشرکة فی الطعام وقد عقد لهٰذا باباً مفردا مستقلا یأتی بعد أبواب إن شاء الله تعالٰی قوله والنهد بفتح النون وکسرها وسکون الهاء وبدال مهملة قال الأزهری فی التهذیب النهد إخراج القوم نفقاتهم علٰی قدر عدد الرفقة یقال تناهدوا وقد ناهد بعضهم بعضا وفی المحکم النهد العون وطرح نهده مع القوم أعانهم وخارجهم وقد تناهدوا أی تخارجوا یکون ذٰلک فی الطعام والشراب وقیل النهد إخراج الرفقاء النققة فی السفر وخلطها ویسمی بالمخارجة وذٰلک جائز فی جنس واحد وفی الأجناس وإن تفاوتوا فی الأکل ولیس هٰذا من الربا فی شیء وإنما هو من باب الاباحة.

وفیه أیضًا ج:۱۳ ص:۶۱ (طبع دار احیاء التراث) قوله لما لم یر المسلمون اللام فیه مکسورة والمیم مخففة هٰذا تعلیل لعدم جواز قسمة الذهب بالذهب والفضة بالفضة مجازفة أی لأجل عدم رؤیة المسلمین بالنهد بأسا جوزوا مجازفة الذهب بالفضة لاختلاف الجنس بخلاف مجازفة الذهب بالذهب والفضة بالفضة لجریان الربا فیه فکما ان مبنی النهد علی الاباحة وإن حصل التفاوت فی الأکل فکذٰلک مجازفة الذهب بالفضة وان کان فیه التفاوت بخلاف الذهب بالذهب والفضة بالفضة لما ذکرنا قوله أن یأکل هٰذا بعضا تقدیره بأن یأکل وأشار به الٰی أنهم کما جوزوا النهد الذی فیه التفاوت فکذٰلک جوزوا مجازفة الذهب والفضة مع التفاوت لما ذکرنا قوله والقران فی التمر بالجر ویروی والاقران عطف علٰی قوله أن یأکل هٰذا بعضا أی بأن یأکل هٰذا تمرتین تمرتین وهٰذا تمرة تمرة.

وفیه أیضًا ج:۱۳ ص:۶۲ (طبع دار احیاء التراث) مطابقته للترجمة تؤخذ من قوله فأمر أبو عبیدة بأزواد ذٰلک الجیش فجمع ذٰلک کله ولما کان یفرق علیهم کل یوم قلیلًا قلیلًا صار فی معنی النهد واعترض بأنه لیس فیه ذکر المجازفة لأنهم لم یریدوا المبایعة ولا البدل وأجیب بأن حقوقهم تساوت فیه بعد جمعه فتناولوه مجازفة کما جرت العادة.

......................(باقی اگلے صفحے پر)

کیا شرکت یا مضاربت میں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لی جاسکتی ہے؟

(الائنس موٹرز کمپنی میں جمع کرائی ہوئی رقم واپس لوٹانے کی شرط کا حکم)

وضاحت:- سائل نے پہلے یہ سوال دارالافتاء والارشاد میں بھیجا اور وہاں سے جواب حاصل کر کے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، سوال اور دارالافتاء والارشاد کی جانب سے اس کا جواب اور پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ الائنس موٹرز کے نام سے آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ یہ ایک پرائیویٹ کمپنی ہے، جس میں لوگ اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں، اور کمپنی کی جانب سے انہیں ہر ماہ حاصل شدہ منافع کا چالیس فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ میں کمپنی کا مقرّر کردہ نمائندہ ہوں، اور کمپنی کے اُصول کے مطابق لوگوں سے سرمایہ وصول کر کے کمپنی پہنچادیتا ہوں۔ کمپنی کے اُصولوں میں سے ایک اُصول یہ بھی ہے کہ سرمایہ کار اگر اپنی جمع شدہ رقم کمپنی سے نکلوانا چاہے تو اُسے ایک ماہ پیشگی نوٹس دینا ہوتا ہے، جس کا منافع یعنی اس ماہ کا منافع سرمایہ کار کو نہیں ملتا۔

اب زید ایک سرمایہ کار نے اپنی رقم کمپنی سے نکلوانے کے لئے فرض کریں یکم جنوری کو نوٹس دیا، لہٰذا یکم فروری کو زید کی رقم لوٹادی جاتی ہے، جبکہ ماہِ جنوری کا منافع زید کو نہیں دیا گیا (کمپنی کے اُصول کے مطابق جس کا سرمایہ کار کو علم ہے)، خیال رہے کہ یکم فروری کو بکر کمپنی میں سرمایہ کاری کی غرض سے اتنی ہی رقم لے کر آئے تھے جتنی زید کو مطلوب تھی، لہٰذا یہی رقم زید کو لے کر دی گئی تھی، اور زید کی رقم بکر کی رقم شمار کی گئی، اب سوال یہ ہے کہ ماہِ جنوری کے منافع کا حق دار کون ہے؟ کمپنی کے اُصول کے مطابق یہ رقم مجھے دی گئی ہے، آیا میں اس کا حق دار ہوں یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)......... وفی فتح الباری، کتاب الشرکة ج:۵ ص:۱۷۰، ۱۷۱ (طبع مکتبة الرشد) وأما بفتحها فجميع أصناف المال وما عدا النقد يدخل فيه الطعام فهو من الخاص بعد العام ويدخل فيه الربويات ولٰكنه اغتفر فی النهد لثبوت الدليل علٰی جوازه واختلف العلماء فی صحة الشركة كما سيأتی قوله وكيف قسمة ما يكال ويوزن أی هل يجوز قسمته مجازفة أو لا بد من الكيل فی المكيل والوزن فی الموزون وأشار الٰی ذٰلک بقوله مجازفة أو قبضة قبضة أی متساوية قوله لما لم تر المسلمون بالنهد بأسا هو بكسر اللام وتخفيف الميم وكأنه أشار الٰی أحاديث الباب وقد ورد الترغيب فی ذٰلک وروی أبو عبيد فی الغريب عن الحسن قال أخرجوا نهدكم فانه أعظم للبركة وأحسن لأخلاقكم قوله وكذٰلک مجازفة الذهب والفضة كأنه ألحق النقد بالعرض للجامع بينهما وهو المالية لٰكن انما يتم ذٰلک فی قسمة الذهب مع الفضة أما قسمة أحدهما خاصة حيث يقع الاشتراک فی الاستحقاق فلا يجوز اجماعًا قاله بن بطال وقال بن المنير شرط مالک فی منعه أن يكون مصكوكًا والتعامل فيه بالعدد فعلٰی هٰذا يجوز بيع ما عداه جزافا ومقتضی الأصول منعه وظاهر كلام البخاری جوازه ويمكن أن يحتج له بحديث جابر فی مال البحرين والجواب عن ذٰلک أن قسمة العطاء ليست علٰی حقيقة القسمة لأنه غير مملوک للآخذين قبل التمييز والله أعلم.

(جواب از دارالافتاء والارشاد ناظم آباد، کراچی)

جواب:- دراصل جس تاریخ کو نوٹس دیا جاتا ہے اس تاریخ میں سرمایہ کار کے حصص کمپنی خرید لیتی ہے، اور اس کے ثمن کی ادائیگی ایک ماہ بعد ہوتی ہے، لہٰذا وہ رقم آپ کے لئے حلال ہے۔

واللہ اعلم

محمد موسیٰ
دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی
فتویٰ نمبر ۲۲۸۹۵

الجواب صحیح
عبدالرحیم
نائب مفتی دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

شرکت یا مضاربت میں رقم لوٹانے کا سوال نہیں ہوتا، اور اس کی جو توجیہ دارالافتاء والارشاد کے مذکورہ جواب میں ذکر کی گئی ہے وہ دُرست ہوسکتی ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یا تو رقم لگانے والے کو یہ اِختیار ہو کہ وہ اپنا حصہ جسے چاہے فروخت کردے، یا پھر حصے کی قیمت پہلے سے اتنی مقرّر نہ کی جائے جو اَصل لگائی ہوئی رقم کے برابر ہو، کیونکہ اس صورت میں رأس المال مضمون ہوجائے گا جو شرکت اور مضاربت دونوں میں جائز نہیں ہے، اس کے بجائے یا تو خریداری کے وقت اثاثوں کی بازاری قیمت پر خریدے، یا باہمی رضامندی سے کوئی قیمت وقت پر مقرّر کرلی جائے۔ اگر اس معاہدے میں یہ بات ہے تب تو دُرست ہے لیکن اگر ہر صورت میں اصل لگائی ہوئی رقم پر بیچنے کی شرط ہے تو اس سے رأس المال کے مضمون ہونے کی بنا پر یہ شرط فاسد ہوگی[1]، البتہ مضاربت شرطِ فاسد سے فاسد نہیں

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں اس شرط (یعنی اپنی لگائی ہوئی مکمل رقم واپس نکلوانے کی شرط) کا حاصل یہ ہوگا کہ نقصان برداشت نہ کرنے کی شرط لگائی گئی ہے، اور یہ شرط فاسد ہے۔

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع مکتبہ غفاریہ کوئٹہ) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة هی الخسران علی المضارب لأنّ الخسران جزء هالک من المال فلا یجوز أن یلزم غیر ربّ المال لٰکنه شرط زائدٌ یوجبُ قطع الشرکة فی الربح.

وفی الفتاویٰ التاتارخانیة کتابُ الشرکة الفصل الرابع فی العنان ج:۵ ص:۲۵۵ (طبع ادارة القرآن کراچی) وان شرطا أن یکون الرّبح والوضیعة بینهما نصفین فشرط الوضیعة بصفة فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة لأنّ الشرکة لا تبطل بالشروط الفاسدة وان وضعا فالوضیعة علیٰ قدر رأس مالهما.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الرّبح أو یقطع الشرکة فیه یفسدها والّا بطل الشرط. وفی الشامیة تحته (قوله بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب.

وفی المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی ج:۶ ص:۱۰۶ (طبع غفاریه کوئٹه) وان شرط الوضیعة والرّبح نصفان فشرط الوضیعة نصفان فاسد لأنّ الوضیعة هلاک جزء من المال فکأن صاحب الألفین شرط ضمان شیء ممّا هلک من ماله علیٰ صاحبه وشرط الضمان علی الآخر فاسد ولٰکن بهٰذا لا تبطل الشرکة حتّی لو عملا وربحا فالرّبح بینهما علیٰ ما شرطا.

وفی تبیین الحقائق ج:۵ ص:۲۵۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب. وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه).

ہوتی،[۱] لہٰذا مضاربت کا عقد اس کے باوجود دُرست ہے،[۲] ہاں خلافِ شرع شرط لگانے کا گناہ ہوگا اور یہ شرط واجب التعمیل نہ ہوگی۔[۳] چنانچہ اس کاروبار سے جو منافع تقسیم کیا گیا، اگر اس میں کوئی اور خلافِ شرع اَمر نہ ہو تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ مہینے کے شروع میں بکر نے جو رقم لگائی، وہی زید کو دے دی گئی، سو اس سے مسئلے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس کی وجہ سے بکر جنوری کے نفع کا مستحق نہیں ہوا، کیونکہ بکر کے دیتے ہی وہ رقم مالِ مضاربت میں شامل ہوگئی، اور نقود متعین نہیں ہوتے، لہٰذا چاہے وہ رقم زید کو دے دی گئی ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ زید کو اس کے حصے کی قیمت دی گئی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۸/۱۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸۸/۳۹ز)

والد کی طرف سے شروع کرائے ہوئے کاروبار میں والد کو بیٹوں کے حصے مقرّر کرنے اور ان میں کمی بیشی کا اِختیار ہے

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین بیچ اس مسئلے کے: زید کے والد عبداللہ کے چار لڑکے: زید، حارث، بکر، خالد۔ زید اپنے والد کے ساتھ دُکان پر کام کرتا ہے، زید کو اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوا تو زید نے اپنی کوشش سے ایک دُکان کرایہ پر لی اور باپ نے الگ دُکان پر کام شروع کیا، اور اللہ کے حکم سے ایک اور کاروبار شروع کیا، یہ کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے ٹرانسپورٹ کا، رات آٹھ بجے دُکان بند کرکے گیرج پر بسوں کی مرمت وغیرہ کا کام، تقریباً تین سال بعد یہ کام بند کردیا کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہوا، اس دوران زید کی شادی ہوئی، شادی کے بھی نو ماہ بعد اتفاق سے کچھ قانونی کام کے لئے والد صاحب کی دُکان پر اور زید کی دُکان پر پارٹنرز بنانے کا سوال آیا، والد صاحب کی دُکان پر چاروں بھائی کے چار چار آنے حصہ مقرّر ہوا، زید کی

(۱ تا ۳) وفی ردّ المحتار، کتاب الشرکۃ ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید) .... لأنّ الشرکۃ لا تفسد بالشروط الفاسدۃ.
وکذا فی فتح القدیر، کتاب الشرکۃ، فصل ولا تنعقد الشرکۃ ج:۶ ص:۱۷۷ (طبع مصطفیٰ بابی مصر)
وفی المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی ج:۶ ص:۴۰۲ (طبع غفاریہ کوئٹہ) فالشرکۃ ممّا لا تبطل بالشروط الفاسدۃ ....الخ. وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) .... بطل الشرط وصحّ العقد وفی الشامیۃ تحتہ کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.
وفی مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ کوئٹہ) .... شرطٌ زائد .... فلا یفسد المضاربۃ لأنّھا لا تفسد بالشروط الفاسدۃ کالوکالۃ .... الخ. وکذا فی الدر المنتقیٰ علیٰ مجمع الأنھر ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریہ) وفی الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج:۵ ص:۶۵۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) ان الشرکۃ لا تبطل بالشروط الفاسدۃ. (محمد زبیر حق نواز)۔

دُکان پر زید کے سات آنے، بکر، حارث، خالد کے تین تین آنے طے ہوئے، کیونکہ زید کو والد نے کام کے لئے روپے دیئے تھے، اور زید نے رات دن محنت کی تھی، زید رات دو تین بجے روز سوتا تھا، باپ نے زید کو تقریباً اٹھارہ ہزار روپے دیئے تھے، دُکان کر کے زید نے چھ سات سال بعد دُکان بھی خریدی، ۱۹۷۵ء میں والد صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، جانے سے پہلے وصیت نامہ تحریر کیا، تحریر کرتے وقت خود اپنی دُکان میں حسبِ سابق زید، بکر، حارث، خالد کو چار چار آنے کا حصہ دار مقرّر کیا، اور بعد میں فرمایا کہ زید کی دُکان میں سب کو چار چار آنے دیا جائے، زید نے والد صاحب کو یاددہانی کرائی کہ آپ نے پہلے زید کی دُکان میں زید کو سات آنے اور حارث کو تین آنے، بکر کو تین آنے، خالد کو تین آنے تحریر کئے ہیں، زید کے احتجاج پر والد صاحب نے زید کو سات آنے کا حصہ دار تسلیم کیا، زید کی دُکان میں حج سے آنے کے بعد ایک بار پھر پارٹنرز بنانے کا نیا معاہدہ تحریر کرنا پڑا تو والد صاحب نے فرمایا کہ زید کے لئے سات آنے کے بجائے چار آنے مقرّر کیا جائے، زید نے اپنے والد کو یاددہانی کرائی اور اپنی والدہ کو سب حالات سے آگاہ کیا، والدہ نے کہا کہ وہ والد سے بات کریں گی، والدہ نے بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہارے والد کو اس بات پر راضی کیا ہے کہ تم چھ آنے لے لو، زید نے کہا دو بار تحریر کرنے کے بعد چھ آنے کی کیا وجہ ہے؟ مجھ کو سات آنے دیا جائے، چھ آنے سات آنے کے مسئلے پر ایک یا ڈیڑھ سال یہ بات تفصیل میں رہی، ایک بار پھر چھ آنے سات آنے پر بات ہوئی تو والد صاحب چھ آنے کو چھوڑ کر فرمانے لگے کہ زید کو زید کی دُکان میں چار آنے دیئے جائیں۔ زید نے اپنی والدہ کو پھر آگاہ کیا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ والد صاحب چھ آنے دینا چاہتے ہیں، لیکن وہ تو پھر چار آنے کی بات کر رہے ہیں، والدہ نے کہا کہ وہ پھر بات کریں گی، والدہ نے آٹھ روز بعد جواب دیا کہ میں نے بات کی چھ آنے تم کو دیئے جائیں گے، میں نے والدہ سے کہا کہ آپ والد صاحب سے کہیں کہ سات آنے کر دیا جائے اور کچھ تجاویز بھی میری طرف سے پیش کریں، ۱- تجویز اگر آپ زید کو زید کی دُکان میں سات آنے نہیں دینا چاہتے تو آج تک حساب کر کے زید کو زید کی دُکان سے تین آنے دے دیں، آئندہ زید کو زید کی دُکان میں سب کے برابر دیا جائے، زید کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، حالانکہ زید کسی بھائی کو کچھ بھی نہ دینا چاہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا، دُکان زید نے خریدی، زید کے نام پر ہے، تمام کاروبار زید کے نام پر ہے، لیکن زید اپنے وعدے سے نہیں پھرنا چاہتا، والد صاحب سے والدہ نے جو آٹھ روز پہلے بات کی تھی کہ زید کو چھ آنے دے دیا جائے اس بات کے بعد پھر اچانک فرمایا: نہیں! زید کو چار آنے دیا جائے، وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر زید کو سات آنے دے دُوں تو حارث، بکر، خالد کے ساتھ بے ایمانی ہوگی۔ زید والد سے یہ تو نہیں کہتا کہ آپ اپنی دُکان میں سات

آنے دیں، زید تو صرف اپنی کمائی ہوئی رقم سے سات آنے چاہتا ہے، جو والد کے وعدے کے عین مطابق ہے، یہ وعدہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کیا تھا اور پھر ۱۹۷۵ء میں تجدید کر لی۔ از راہِ کرم شریعت کی رُو سے ایسا کرنے پر والد صاحب کیا بے ایمانی کے مرتکب ہوتے ہیں؟ یا زید کو اس کا حق دیتے ہیں؟ زید کے بھائی حارث عمر ۲۷ سال نے صرف ڈیڑھ یا دو سال کام کیا، بکر نے آٹھ سال یا نو سال کام کیا، عمر ۲۰ سال، خالد نے ساڑھے تین سال کام کیا، عمر ۱۸ سال۔ زید عمر ۳۳ سال، بائیس سال کام کیا، ایک لڑکی، دو لڑکے، ۶ سال، ۵ سال، ۴ سال۔ زید عمر کا ایک بڑا حصہ والد صاحب کے ساتھ گزار چکا ہے، وہ کسی کام کی بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا، اس لئے آپ کو یہ مسئلہ تحریر کر رہا ہے تاکہ وہ حق کی رہنمائی حاصل کر سکے اور کوئی بات غلط ہو تو اپنی غلطی دُور کر لے ورنہ یہ فتویٰ اپنے والد کے رُوبرو پیش کر کے فیصلہ ان پر چھوڑ دے، زید کی معلومات کے مطابق اسلام وعدے کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔

جواب:- اگر زید کے والد نے زید کو تجارت کے لئے رقم دیتے وقت یہ طے کیا تھا کہ کاروبار میں سات آنے زید کے اور تین تین آنے باقی بھائیوں کے ہوں گے، تو اس پر اس طے شدہ معاہدے کی پابندی لازم ہے،[1] اور اس کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں۔[2]

البتہ سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں زید کی دُکان پر زید تنہا کام کرتا تھا، اس کے بعد دُوسرے بھائی بھی کام میں شریک ہوتے گئے، اگر صورتِ حال یہی ہے تو سات آنے والے معاہدے کی پابندی اسی وقت تک لازم ہے جب تک زید تنہا کام کرتا رہا، اور جس تاریخ سے دُوسرا کوئی بھائی کام میں شریک ہوا اس تاریخ سے باپ کو نیا معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہے،[3] جس میں زید کا حصہ کم کر کے دُوسرے کام کرنے والے بھائیوں کا حصہ زیادہ بھی کر سکتا ہے۔[4] اور اگر شروع ہی سے تمام بھائی کام میں شریک تھے، یا اس وقت سے شریک تھے جب سے سات آنے کا معاہدہ ہوا تو سوال لکھ کر اس صورت کا مسئلہ دوبارہ پوچھ لیا جائے، اس صورت میں یہ کاغذ بھی ساتھ ضرور روانہ کریں۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۰۹/۳۰ د)

(۱ تا ۴) کیونکہ ایسی صورت میں یہ سارا کاروبار زید کے والد کی ملکیت ہوگا، اور زید کے والد نے زید اور اس کے بھائیوں کے لئے جتنا حصہ مقرر کیا ہو، وہ اُتنے ہی حصے کے حق دار ہوں گے۔

وفی الشامیۃ ج:۴ ص:۳۲۵ (طبع سعید) لما فی القنیۃ الأب وابنہ یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما شیء فالکسب کلّہ للأب ان کان الابن فی عیالہ لکونہ معینًا لہٗ .... الخ.

وفی الھندیۃ کتاب الشرکۃ الباب الرّابع فی شرکۃ الوجوہ وشرکۃ الأعمال ج:۲ ص:۳۲۹ (طبع رشیدیہ) أب وابن یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ لم یکن لھما مال فالکسب کلّہ للأب اذا کان الابن فی عیال الأب لکونہ معینًا لہٗ، الا تریٰ انّہ لو غرس شجرۃً تکون للأب ....الخ. (باقی اگلے صفحے پر)

شرکت میں فریقین کے لئے علیحدہ علیحدہ مال متعین کر کے اس پر نفع نقصان حاصل کرنے کی مخصوص صورت کا حکم

سوال:- ایک شخص نے دُوسرے شخص سے چار گنا زیادہ رقم ایک کاروبار میں ڈالی اور کاروبار کی صورت یہ رکھی کہ وہ پہلا شخص جس کی چار گنا رقم ہے دُوسرے شخص کو مال خرید کر دیتا ہے اور دُوسرے شخص کی رقم پہلے شخص سے چوتھائی ہے، اور جب مال خرید کر دُوسرے شخص کو دیتا ہے تو اس پر پانچ فیصد کے حساب سے نفع لگاتا ہے اور اس کے بعد نفع پہلے اور دُوسرے شخص کو تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے شخص کو تین فیصد اور دُوسرے شخص کو دو فیصد نفع اس مال کی مالیت سے ملتا ہے، اور اس صورت میں سے شخص بَری ہوجاتا ہے کہ دُوسرے شخص کو مال میں سے نفع ہو یا نقصان، پھر دُوسرا شخص مال اِکٹھا کر کے پہلے شخص کو دیتا ہے اور وہ مال لاتا ہے اور پھر وہ اس طریقے سے نفع لگاتا ہے اور نفع دونوں میں تقسیم ہوتا ہے، کیا یہ کاروبار از رُوئے شریعت دُرست ہے؟

جواب:- سوال مجمل ہے، غور کرنے سے معاملے کی صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ''الف'' اور ''ب'' میں شرکت کا معاملہ ہے، اصل سرمائے میں چار حصے ''الف'' نے اور ایک حصہ ''ب'' نے لگایا ہے، اس مجموعی سرمائے سے جو سامانِ تجارت خریدا گیا، اسے فروخت کرنے سے قبل دونوں نے اندازہ کرلیا کہ اس پر پانچ فیصد نفع ہوگا، اور پھر اس کو فروخت سے پہلے ہی اس طرح تقسیم کرلیا کہ تین حصے ''الف'' کے اور دو حصے ''ب'' کے قرار پائے۔ ''الف'' نے اپنے تین حصے وصول کر کے سامان فروخت کے لئے ''ب'' کے حوالے کردیا کہ اگر نفع زیادہ ہو تو بھی اس کا ہے، اور نقصان ہو تو بھی اس پر ہے۔ اگر معاملے کی صورت یہی ہے جو اُوپر لکھی گئی تو یہ صورت ناجائز ہے[1]، اس لئے کہ اس میں ''الف'' کا تین فیصد نفع معین ہے اور ''ب'' کا نفع مشتبہ ہے[2]، معاملہ اس طرح کرنا چاہئے کہ نفع کا فروختگی سے پہلے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) .... وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة کتاب الشرکة ج:۱ ص:۹۵ (طبع میمنیة مصر) أب وابن اکتسبا ولم یکن لهما مال فاجتمع لهما من الکسب أموال الکل للأب لأنّ الابن اذا کان فی عیاله فهو معین لهٗ الا تریٰ أنّه لو غرس شجرةً فهی للأب ....الخ.

وفی الفتاویٰ الکاملیة کتاب الشرکة ص:۵۱ (طبع رشیدیه) اذا کان الولد فی عیال أبیه ومعینًا لهٗ یکون جمیع ما تحصل من الکسب لأبیه ....الخ.

وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۹۸ ج:۱ ص:۷۴۱ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه) اذا عمل رجل فی صنعة هو وابنه الّذی فی عیاله فجمیع الکسب لذلک الرّجل وولده یُعدّ معینًا لهٗ وکذا اذا اعانهٗ ولده الّذی فی عیاله عند غرسه شجرةً فتلک الشجرة للأب لا یشارکه ولده فیها .... الخ. (وکذا فیه شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۳۱۹ طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه). (محمد زبیر حق نواز)

(۱و۲) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۴۲ و ۴۸ اور اگلے صفحے کے حواشی۔

اندازہ کرنے کے بجائے مثلاً یہ طے کرلیا جائے کہ اس سامان کو فروخت کر کے اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا ایک چوتھائی "ب" کا اور تین چوتھائی "الف" کا ہوگا۔(۱) باہمی رضامندی سے نفع کا کوئی اور تناسب بھی طے کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ تناسب نفع کا ہونا چاہئے، اصل مال کا نہیں۔(۲) اور اگر معاملے کی صورت کچھ اور ہے تو کسی عالم کو سمجھا کر اس سے دوبارہ سوال لکھوائیں اور بھیج دیں، اس کا جواب دے دیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۸/۲۲ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مضاربت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے پر ہوگا، جبکہ شرکت (پارٹنرشپ) میں ہر فریق کو اپنے سرمائے کے بقدر نقصان برداشت کرنا ہوگا

سوال:- "Sleeping Partner" کے طور پر کسی کاروبار میں اس شرط کے ساتھ پیسہ لگانا کہ جو نفع ونقصان بھی ہوگا ایک متعین فیصد Sleeping Partner کے حصے میں آئے گا، مثلاً ۲۵ فیصد نفع اور نقصان دونوں میں۔ اس میں بھی دو ذیلی امکان موجود ہوں: ۱- Active Partner صرف محنت کر رہا ہے، اس کا سرمایہ شاملِ تجارت نہیں ہے، ۲- Active Partner نے محنت کے علاوہ سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

جواب:- اگر کام کرنے والا صرف محنت کر رہا ہے، اس کا کوئی سرمایہ شامل نہیں ہے، تو اس

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) یشترط أن تکون حصص الرّبح الّتی تنقسم بین الشرکاء جزءًا شائعًا کالنصف والثلث والرّبع فاذا اتفق الشرکاء علیٰ اعطاء أحدهم قدرًا معیّنًا کانت الشرکة باطلة. وکذا فی شرح المجلّة للأتاسیّ ج:۴ ص:۲۶۰ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه) وکذا فی البحر الرّائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعید) وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اکیڈمی، لاهور).

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعید) ومنها أن یکون الرّبح معلوم القدر .... ومنها أن یکون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معیّنًا فان عیّنا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک کانت الشرکة فاسدة لأنّ العقد یقتضی تحقق الشرکة فی الرّبح والتعیین یقطع الشرکة لجواز أن لا یحصل من الرّبح الّا القدر المعین لأحدهما فلا یتحقق الشرکة فی الرّبح ....الخ. وفی الهدایة ج:۳ ص:۲۶۳ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن شرطها أن یکون الرّبح بینهما مشاعًا لا یستحق أحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح ..... الخ. (محمد زبیر حق نواز)

صورت میں نقصان کی کوئی ذمہ داری اس پر ڈالنا شرعاً جائز نہیں،[۱] معاملے کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفع کا کوئی فیصد حصہ دونوں کے لئے متعین کیا جائے، اور یہ طے کیا جائے کہ نقصان کی صورت میں تمام نقصان سرمایہ لگانے والے کا ہوگا۔[۲]

اور اگر کام کرنے والے نے محنت کے علاوہ کچھ سرمایہ بھی لگایا ہے تو دونوں کے درمیان نفع کا تناسب باہمی رضامندی سے طے ہوسکتا ہے،[۳] لیکن نقصان کی صورت میں دونوں اپنے اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے اُسے برداشت کریں گے،[۴] مثلاً کام کرنے والے نے کل سرمائے کا دس فیصد اپنے پاس سے لگایا ہو، اور نوّے فیصد دُوسرے فریق نے لگایا ہو تو نقصان کی صورت میں پہلا فریق دس فیصد اور دُوسرا فریق نوّے فیصد کا ذمہ دار ہوگا۔[۵]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب المضاربة ج:۵ ص:۶۴۸ (طبع سعید) کل شرط یوجب جهالة فی الرّبح أو یقطع الشرکة فیه یفسدها وإلّا بطل الشرط وصحّ العقد.

وفی الشامیة (قوله بطل الشرط) کشرط الخُسران علی المضارب .... الخ.

وفی مجمع الأنهر، کتاب المضاربة ج:۳ ص:۴۴۷ (طبع غفاریه کوئٹه) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة أی الخُسران علی المضارب لأنّ الخُسران جزءٌ هالِکٌ من المال فلا یجوز أن یلزم غیر رَبّ المال لٰکنه شرط زائد لا یوجب قطع الشرکة فی الرّبح ولا الجهالة فیه فلا یفسد المضاربة لأنّها لا تفسد بالشروط الفاسدة .... الخ.

وفی تبیین الحقائق، کتاب المضاربة ج:۵ ص:۵۲۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب .... وشرط الوضیعة شرطٌ زائدٌ لا یوجب قطع الشرکة فی الرّبح ولا الجهالة فیه فلا یکون مفسدًا وتکون الوضیعة وهو الخُسران علی ربّ المال لأنّه ما فات جزءٌ من المال بالهلاک یلزم صاحب المال دون غیره. وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۷۵۷ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه).

نیز دیکھئے ص:۴۲ وص:۴۸ کے حواشی۔

(۳ تا ۵) وفی مصنَّف عبدالرّزّاق ومصنَّف ابن أبی شیبة: "عن علی رضی الله عنه: الوضیعة علی المال والرّبح علیٰ ما اصطلحوا علیه" (کنز العمّال ج:۱۵ ص:۱۷۶ رقم الحدیث:۴۰۴۸۲).

وفی موسوعة الاجماع: اتفقوا علیٰ أنّ الرّبح والخُسران فی الشرکة بین الشرکاء کل بقدر ماله.

وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۲ (طبع سعید) والوضیعة علیٰ قدر المالین متساویًا ومتفاضلًا لأنّ الوضیعة اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال.

وکذا فی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

وفی المدوّنة الکبریٰ للامام مالک ج:۳ ص:۶۰۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) الوضیعة عند مالک علیهما علی قدر رؤس أموالهما.

وفی المجموع شرح المهذّب ج:۱۴ ص:۷۱ (طبع دار احیاء التراث بیروت) ویقسم الرّبح والخُسران علیٰ قدر المالین.

وفی المغنی لابن قدامةؒ ج:۵ ص:۲۲ (طبع دارالفکر بیروت) الخسران فی الشرکة علیٰ کل واحد منهما بقدر ماله فان کان مالهما متساویًا فی القدر فالخُسران بینهما نصفین، وان کان اثلاثًا فالوضیعة أثلاثًا لا نعلم فی هٰذا خلافًا بین أهل العلم وبه یقول أبو حنیفة والشافعی وغیرهما .... الخ.

مضارب کا مضاربت کے اِختتام پر مالِ مضاربت کو قیمتِ اسمیہ پر خریدنے کی شرط کا حکم

سوال:- فضيلة الدكتور / عبدالستار أبو غدة المحترم[۱]

نائب رئيس هيئة الفتوىٰ والرقابة الشرعية ورئيس لجنتها التنفيذية وعضو الهيئة المنتدَب

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته،

تعرض احدى شركات الطاقة الكبرىٰ في أبوظبي على المصرف ترتيب اصدار صكوك مضاربة لصالحها بالتعاون مع بنک بارکليز. والمسألة المتكررة دومًا، ونودُّ أن نعالجها من البداية، هي مسألة الثمن الذى يتعهد المضارب بشراء اصول المضاربة به، وما يجرى عليه العمل – للأسف في معظم الصكوک – من اعتماد القيمة الاسمية مع المبالغ المتحققة وغير الموزعة من الأرباح. فهل يمكن للخروج من الاشكال الشرعى، أن نمسک العصا من الوسط، ونعالج الأمر على النحو الآتى:-

أوّلا:- يذكر في اجراءات الاسترداد أنها تتم بإنهاء المضاربة باستخدام حامل الصک اشعارًا معينًا، ومن ثم يشترى المضارب اصول المضاربة منه.

ثانيًا:- ينصُّ في التعهد بالشراء بأن المضارب يتعهد بأن يشترى أصول المضاربة بالقيمة الاسمية ويكون هٰذا التعهد مضافًا الىٰ ما بعد انتهاء أو انهاء المضاربة بالنحو المتقدِّم.

وبهٰذه الكيفية يكون تعهد المضارب مضافًا الى الوقت الذى لا يكون (لا يبقىٰ) فيه مضاربًا.

هٰذه هي المعالجة المقترحة بشكل مجمل، فهل ترونها مقبولة؟

وتقبلوا فائق الاحترام والتقدير.

محبكم
أسيد كيلاني

جواب:- الىٰ فضيلة الشيخ أسيد كيلاني، حفظه الله تعالىٰ

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فان تعهد المضارب بشراء الأصول بالقيمة الاسميّة لا يجوز،[۲] ولو كان بعد انتهاء

(۱) سائل نے شیخ عبدالستار ابوغدّہ کی طرف یہ اِستفتاء بھیجا تھا اُنہوں نے جواب کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۷ اور ص:۴۷ کے فتاویٰ اوران کے حواشی۔

المضاربة، ما دام هٰذا التعهد موجودًا عند عقد المضاربة، بمعنى أنه يوقّع عند ابرام عقد المضاربة، سواء كان منصوصًا فى عقد المضاربة أو منفصلًا عنه. والله سبحانه أعلم

أخوكم

محمد تقى العثمانى عفا الله عنه

۷/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

شرکتِ متناقصہ میں بینک کو قیمت کی ادائیگی سے قبل قلبِ دَین کی ایک مخصوص صورت کا حکم

(اسلامی بینک بنگلہ دیش کے ایک سوال کا جواب)

سوال:- فضيلة الشيخ / الأستاذ محمد تقى عثمانى حيّاه الله تعالىٰ

نائب رئيس دار العلوم كراتشي، باكستان،

وعضو مجمع الفقه الاسلامى التابع لمنظمة المؤتمر الاسلامى

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فيسرنا أن نتقدم لفضيلتكم بأطيب التحيات وأخلص التقديرات متمنين لكم دوام الصحة والعافية، وبعد، فنرجو من فضيلتكم التكرم بابداء الرأى الشرعى فى الصورة التالية:

ان أحد عملاء البنك الاسلامى يتمتع بتسهيلات استثمارية تحت صيغة بيع المرابحة للآمر بالشراء بمبلغ قدره ۳۵ مليون تاكا، وكان يتعامل مع البنك بصفة مرضية حيث كان يشترى من البنك بضائعه المطلوبة مرابحة بالأجل فى حدود المبلغ أعلاه فيبيعها فى السوق فيسدد بقيمتها دينه المترتب عليه للبنك، قبل حلول الأجل. لٰكنه فى الآونة الأخيرة اشترى سيارات وشاحنات عددها ۲۶ بقيمة البضائع المباعة دون أن يسدد بها دينه المترتب عليه بغير اذن مسبق من البنك. والجدير بالذكر أن الأجل لتسديد الدين المترتب عليه لم يحل الى الآن. وفى هٰذا الوضع اقترح العميل للبنك اقتراحًا جديدًا من توقيع عقد جديد عقد اجازة بالبيع تحت شركة الملك حيث يشارك البنك مع العميل فى ملكية السيارات والشاحنات المذكورة بمقابل ۱۰ مليون تاكا من دين المرابحة الذى يستحقه البنك فبذٰلك يتخلص العميل من دين المرابحة بقدر ۱۰ مليون تاكا الذى كان عليه تسديده للبنك فيكون البنك مالكًا (أى شريكًا) للسيارات والشاحنات المذكورة أعلاه ويؤجرها للعميل ويدفع العميل للبنك أجرة معينة علىٰ أقساط كما أنه يشتريها من البنك تدريجيًا بدفع قيمتها علىٰ أقساط معينة. فهل يجوز للبنك أن يوافق علىٰ اقتراح العميل فى الصورة الموضحة أعلاه؟

شاكرين لكم حسن تعاونكم معنا، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

مع أطيب التقديرات

محمد سراج الاسلام

عضو وأمين اضافي هيئة الرقابة الشرعية

بنک بنغلاديش الاسلامي المحدود

جواب:- حيث ان المعاملة المقترحة تكون شركة متناقصة، ويراعى في مبلغ الأجرة ربح للبنک فوق أجرة المثل، فان هٰذه المعاملة تكون من قبيل قلب الدَّين، فلا تجوز، أمّا اذا كانت أجرة السيارات أجرة المثل وكان شراء حصص السيارات من قبل العميل علىٰ أساس القيمة السوقية فلا بأس بهٰذه المعاملة، بشرط أن لا تكون عقود البيع والاجارة مشروطًا بعضها ببعض،[1] بل يكون كل عقد منفصلًا عن الآخر.[2] والله سبحانه وتعالىٰ أعلم

محمد تقي العثماني

۴رشعبان ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵/۹۸۹)

(میاں فارم ٹرانسوال افریقہ کی ایک فیملی شراکتی کمپنی سے متعلق مختلف سوالات کے جوابات)

(ایک معاہدۂ شرکت کی حیثیت)

۱:- والد کی طرف سے اپنی تجارت و جائیداد چار بیٹوں کو مشترکہ طور پر فروخت کرنے کے ایک معاہدۂ شرکت کا حکم

۲:- معاہدۂ شرکت کی خلاف ورزی کرنے والے شریک کا حکم

۳:- معاہدۂ شرکت میں سرمایۂ تجارت کی مقدار متعین طور پر نہ لکھی ہوئی ہو تو کیا حکم ہے؟

۴:- کسی شریک کے کام نہ کرنے یا غائب ہو جانے سے شرکت ختم ہو جائے گی یا نہیں؟

(۱ و ۲) وفي سنن أبي داوٗد ج:۳ ص:۲۸۳ (طبع رحمانيه) لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع. وكذا في جامع الترمذي ج:۳ ص:۵۳۵ (طبع سعيد) وفي المعجم الأوسط للطبراني ج:۴ ص:۳۳۵ (طبع دارالحرمين قاهره) ان النبي صلى الله عليه وسلم نهىٰ عن بيع و شرط. وفي الهداية ج:۳ ص:۶۲ (طبع رحمانيه) لو باع عبدًا علىٰ أن يستخدمه البائع شهرًا أو دارًا علىٰ أن يسكنها ...... لأنه شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ولأنه نهىٰ عن بيع وسلف ولأنه لو كان الخدمة والسكنىٰ يقابلهما شيء من الثمن يكون اجارة في بيع ولو كان لا يقابلها يكون اعارةً في بيع وقد نهىٰ النبي صلى الله عليه وسلم عن صفقتين في صفقةٍ. نیز دیکھئے ص:۸۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت کو ختم کرنے کے لئے دُوسرے شرکاء کا فسخ کو قبول کرنا ضروری نہیں

۶:- معاہدے میں کسی شریک کے تحریراً اِستعفاء دینے کے چھ ماہ بعد اُس کی شرکت ختم ہوجانے کے اُصول کی شرعی حیثیت

۷:- کسی شریک کے مستعفی ہوجانے کے چھ ماہ بعد بھی دیگر شرکاء اُس کو حصہ دیتے رہے تو اس کی شرکت باقی ہوگی یا نہیں؟

۸:- فسخِ شرکت کے لئے دیگر شرکاء کو اِطلاع دینا ضروری ہے، محض استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لینے سے شرکت ختم نہیں ہوگی

۹:- کسی شریک کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کاروبار میں شریک ہوگی یا نہیں؟ اور مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار بنانے کی مجلس میں بعض شرکاء کے سکوت اِختیار کرنے کا حکم

سوال:- ضروری تمہید مختصراً:-

حاجی موسیٰ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد وتجارات کو اپنے چار فرزندوں کو زبانی طور پر فروخت کیا، بعد ازیں ان چار بیٹوں نے ان تجارات و جائیداد کو حاصل کرکے اور اس پر قبضہ پانے کے بعد ایک تجارتی شرکت جاری کی، اس تجارتی شرکت کو باقاعدہ چلانے کی غرض سے انہوں نے ایک معاہدۂ شرکت مرتب کیا، جو آنحضور کی خدمتِ عالی میں مع اِستفتاءِ ھٰذا کے ارسال ہے، اب دریافت طلب اُمور حسبِ ذیل ہیں، قوی اُمید ہے کہ حضرتِ والا توجہ خاص فرماکر جلد از جلد اِستفتاءِ ھٰذا کے جوابات مفصل و مدلل تحریر فرماکر مرہونِ منّت کریں گے، والاجر عند اللہ۔

۱- ملفوف کردہ دستاویز (معاہدہ نامہ)[1] آیا شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۲- اگر کوئی معاہد اس معاہدے کے خلاف عمل کرے تو ایسی مخالفت از رُوئے شریعت مخالفت ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) شراکت کا یہ تفصیلی معاہدہ اس سوال کے آخر میں درج ہے، جس میں اس معاہدۂ شراکت کی تمام جزوی تفصیلات اور دفعات موجود ہیں۔ (محمد زبیر)

۳- اگر معاہدہ نامے میں شرکتِ تجارت کا سرمایہ یعنی اس کی مقدار متعین طور پر مذکور نہ ہو، مگر کسی خاص وجہ سے اس کی متعین مقدار سالانہ گوشوارے میں مذکور ہو تو شرکت معتبر ہوگی یا نہیں؟

۴- اگر کوئی شریک معاہدے کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دے یعنی تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا چھوڑ دے جبکہ تجارت میں ذاتی طور پر کام کرنا معاہدہ نامے میں شرط کے طور پر مذکور ہے، اور پھر کام چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور پندرہ سال تک اسی طرح غائب رہے تو شرعاً ایسا غائب شریک تجارت میں شریک سمجھا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کی شرکت ختم ہوجاتی ہے یا نہیں؟

۵- اگر کسی شریک کے مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء ان کے اِستعفاء کا جواب (یعنی ان کو باقی شرکاء ان کے استعفاء کی قبولیت یا عدمِ قبولیت کی اطلاع) نہ دیں تو ایسا اِستعفاء جو معاہدے کی دفعہ کے مطابق دیا گیا، شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

۶- معاہدۂ شرکت میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شریک نے تحریراً شرکت سے الگ ہونے کا اِستعفاء دیا تو اِستعفاء کی تاریخ کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت ازخود ختم ہوجائے گی، آیا اس دفعہ کے مطابق اگر کسی شریک نے تحریراً اِستعفاء دیا تو اس کی شرکت ختم ہوجائے گی یا نہیں؟

۷- اگر کسی شریک کے اس طرح مستعفی ہونے کے بعد بھی باقی شرکاء ان کو شریکِ تجارت مانتے رہے یعنی تقسیمِ مال کے وقت ان کو باقی شرکاء ان کا چوتھا حصہ دیتے رہے تو آیا مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء سے اپنا چوتھا حصہ ملنے کی بناء پر اس کی شرکت باقی رہتی ہے یا ختم ہوجاتی ہے؟

۸- اگر کسی شریک نے اپنی طرف سے اِستعفاء تحریر کیا لیکن اس کا علم کسی شریک کو نہیں ہوا، اب کئی برس کے بعد اتفاقاً کہیں سے مذکورہ اِستعفاء ملا تو جبکہ یہ اِستعفاء بظاہر کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، نہ کسی کو اس کا علم تھا، شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور اگر معتبر ہے تو کس تاریخ سے اس کا اعتبار ہوگا؟

۹- اگر کوئی شریک معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اپنا اِستعفاء باقی شرکاء کو پیش کرے تو ایسا اِستعفاء شرعاً معتبر ہوگا یا نہیں؟

۱۰- ایک شریک کے انتقال کے بعد باقی تمام شرکاء نے ایک مجلس منعقد کر کے اس میں مرحوم شریک کی اولاد کو ان کی جگہ شریکِ تجارت بنانے کا عقد کیا، اب بعض شرکاء کا یہ کہنا ہے کہ اس مجلس میں یہ عقد ضرور کیا گیا اور ہماری موجودگی میں کیا گیا، اور ہم نے اس سے اس وقت انکار بھی نہیں کیا، لیکن ہم نے عقد ہونے کے وقت اس لئے اپنی نامنظوری اور انکار اور عدمِ رضاء ظاہر نہیں کی کہ ہمارا بڑا بھائی موجود تھا، اور چونکہ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا اس واسطے ہم نے بالارادہ سکوت اِختیار کیا، تو آیا شرعاً ایسے سکوت کے باوجود مرحوم کی اولاد شریکِ تجارت مانی جائے

گی یا نہیں؟ (از راہِ کرم ضمیمہ متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶ ملاحظہ فرمائیں)۔

دُعاگو

بندہ بشیر احمد سنجالوی غفرلہٗ ولوالدیہ

از جوہانسبرگ جنوبی افریقہ

مخدومی ومکرمی

اس مسئلے اور معاملے میں آنجناب کی خاص مدد کی اشد ضرورت ہے، پوری اُمید آنجناب سے وابستہ ہے کہ ہر طرح کی مدد فرمائیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ آنجناب کے درجات سرفراز فرمائیں، آمین۔

طالبِ دُعا

بندہ بشیر احمد

بندہ شعبہ غفرلہٗ

(ضمیمہ از مستفتی متعلق بسوال نمبر ۵ اور ۶)

۱- مذکور مستعفی نے زبانی طور پر اِستعفاء دیا، پھر دوبارہ تحریراً اِستعفاء دیا، اور اس کے بعد اپنے اِستعفاء کے پیش کرنے کی شرکاء سے یاددہانی کرتے رہے، اور اس کے بعد انہوں نے خود شرکت کی تمام تجارتوں کا مکمل حساب و گوشوارہ تیار کیا جس میں انہوں نے اپنی شرکت کے حصے کی مجموعی قیمت لگاکر تحریر کی، اس مجموعہ قیمت سے کسی شریک نے انکار نہیں کیا تھا، اب مذکورہ تمام اُمور یعنی اِستعفاء پیش کرنے، نیز یاددہانی کرنے اور نام بنام دُوسرے شرکاء سے اس مجموعہ قیمت کی نقلیں بھیج کر پھر تجارت سے دست بردار ہوکر کام چھوڑ کر چلے جانا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اِستعفاء کی پختگی مقصود تھی، اور یہ کہ وہ ہر طرح سے مکمل طور پر مستعفی ہونے کو چاہتے تھے، اب ایسے شریک کا اس طرح اِستعفاء دینا آیا من حیث الشرع مسموع ومعتبر ہوگا یا نہیں؟

۲- نیز مذکورہ مستعفی اِستعفاء دینے کے بعد وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت مختلف رقمیں شرکت کی تجارت سے کچھ پندرہ بیس سال تک برابر وصول کرتے گئے، اب آیا ان مختلف رقموں کو کس چیز کے عوض میں شمار کیا جائے گا؟ آیا اس کی شرکت کا حصہ شمار ہوگا یا قرضہ مان لیا جائے؟ فقط۔

(معاہدۂ شرکت)

(تمہید)

الف:- چاروں شریکوں نے اقرار کیا کہ موسیٰ اسماعیل کی تمام جائیداد اور دیگر ملکیتوں کو انہوں نے حاصل کیا ہے۔

ب:- چاروں نے اس مجموعہ تجارت میں شریک بننے اور شرکت قائم کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اور انہوں نے اس شرکت کو قائم کیا۔

ج:- عقدِ شرکت کے شروط و قیود کو تحریری طور پر ایک دستاویز میں قلم بند کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، جو حسبِ ذیل ہے:-

(دفعات)

۱- مذکورہ شرکاء اس بات کی رضاء ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب اس ''جنرل مرچنٹ'' کی تجارت میں شرکاء کی حیثیت رکھیں گے۔

۲- اس مجموعہ تجارت کی ظاہری صورت ''سلیمان اسماعیل میاں اینڈ کمپنی'' ہوگی، نیز یہ شرکت والی تجارت تینتالیس مارکیٹ اسٹریٹ سے جاری رکھی جائے گی، اور اس کے بعد جہاں سے شرکاء اپنی رضامندی ظاہر کریں گے۔

۳- باوجودیکہ شرکت شروع ہونے کی تاریخ اس دستاویز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس شرکت کی ابتداء کی تاریخ پہلی جولائی انیس سو بتیس عیسوی ہوگی۔

۴- شرکتِ ھٰذا کے سرمایہ میں ہر شریک کا برابر حصہ ہوگا (لیکن دستاویز میں سرمایہ کی مقدار نہیں لکھی گئی، اور وہ درج نہیں ہے)۔

۵- اس تجارت کا نفع برابر حصوں میں شریکوں کا حق ہوگا، اور چاروں شریک برابر حصے سے تجارت کا نقصان اُٹھائیں گے۔

۶- تجارت کے حساب کے دفاتر باقاعدہ اچھی طرح سے رکھے جائیں گے، نیز ہر عقدِ تجارت اور ہر معاملۂ تجارت درج ہوتا رہے گا، اور مسلسل تاریخ بتاریخ اس کا ریکارڈ رکھا جائے گا، دیگر یہ کہ جہاں جہاں بھی تجارت جاری ہوگی وہاں بعینہٖ ہر جگہ ایسا دفتر رکھا جائے گا جس میں نقود و معاملات و حسابات پورے پورے لکھے جائیں گے، نیز یہ کہ ایسے دفاتر اور حسابات کے رجسٹر ہر شریک جب بھی چاہے گا ان کا معائنہ کرنے کا حق رکھے گا۔

۷- ہر سال کی تیس جون یا اس کے بعد جب بھی عملاً ممکن ہو ایک گوشوارہ نیز نفع/ نقصان کا حساب تیار کیا جائے گا، جس میں شریکوں کی ملکیتوں میں نفع/ نقصان درج کیا جائے گا، اور ہر شریک کا الگ حصہ اس کے نام پر درج کیا جائے گا، لیکن کسی شریک کا نفع بغیر تمام شریکوں کی تحریری اجازت کے نہیں نکالا جائے گا۔

۸- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ حسبِ ذیل اُمور میں عملاً حصہ لے گا:-

الف:- ہر شریک اپنا پورا وقت اور پوری توجہ اس شرکت کی تجارت میں لگائے گا، اور اِشتیاق وایمان داری سے حتی الوسع اپنی ذمہ داریاں دیگر شرکاء کے باہم مشورے سے ادا کرے گا۔

ب:- شرکاء پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے ہم شریک سے ایمان داری اور اِنصاف سے کام کرے گا، اور یہ کہ وہ ہر وقت آپس میں ایک دُوسرے کو باخبر رکھتے جائیں گے، اور جہاں بھی جس وقت بھی کوئی وضاحت طلب بات پیش آئے گی تو وہ بخوشی وضاحت کریں گے، بغیر کسی اِخفاء و جبر کے۔

ج:- حسبِ معمول تمام رُقومِ تجارت کو، نیز تمام چیکوں کو اور دیگر معاوضاتِ تجارت کو بینک کے کھاتے میں رکھا جائے گا۔

د:- ہر شریک پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنا ذاتی قرضہ خود اَدا کرے تاکہ دُوسرے شرکاء ایسے اِخراجات سے ہر وقت بری اور منزہ رہیں۔

۹- ہر شریک حسبِ ذیل اُمور کا مستحق ہوگا:-

الف:- تجارت کی طرف سے چیک نکلوانا۔

ب:- اپنے نفع کے حصے سے ماہانہ پچیّس پونڈ نکالنا جو اس کے حساب سے منہا کیا جائے گا یعنی منہا ہوتا رہے گا۔

ج:- ہر چار سال میں ایک برس کی تعطیل ملے گی۔

۱۰- کسی شریک کو بغیر دیگر حاضرین شرکاء کی سابق رضامندی کے حسبِ ذیل اُمور کا حق نہیں پہنچے گا:-

الف:- بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی اور الگ تجارت میں مشغول ہونا۔

ب:- خود اپنے ذاتی سرمائے کے حصے سے کچھ رقم وقتاً فوقتاً نکالنا۔

ج:- ایسے لوگوں اور گاہکوں کے بارے میں جن کو دُوسرے شریکوں نے بھروسہ دار ماننے سے سابق طور پر تحریر کے ذریعہ منع کیا ہو، ان کو قرضہ دینا یا اُدھار پر مال فروخت کرنا۔

د:- کوئی بھی ایسا کام کرنا یا اپنی طرف سے کفالت یا ضمانت دینا جس سے شرکت کی تجارت یا جائیداد کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔

ر:- تجارت کے ایسے کاغذات پر تصدیق یا ادائیگی کا سکہ لگانا جس سے تجارت کو نقصان ہو۔

س:- اپنے حصے سے تجارت کی جائیداد یا منافع کو بیچنا، تحویل کرنا، یا رہن رکھنا۔

ص:- تجارت کی رقم یا مال و متاع کو کام میں لانا یا رہن رکھنا، سوائے تجارت کے عام نفع کے لئے یا روزمرہ تجارتی کاموں میں۔

ط:- تجارت کے کسی ملازم کو ملازمت پر رکھنا یا اس کو معزول کرنا، بجز فحش بداخلاقی کی وجہ سے۔

ع:- تجارتی غرض سے ٹرانسوال صوبے کی حدود سے آگے سفر کرنا۔

ف:- ایک سو پونڈ سے زیادہ کا معاہدہ یا وعدہ یا اِجارہ کرنا، بشرطیکہ ایسا معاملہ معمولی تجارتی کارروائی کے خلاف نہ ہو۔

ی:- کوئی بھی ایسا معاہدہ انجام دینا جو اس تجارت کی روزمرہ کارروائی کے خلاف ہو۔

۱۱- ہر شریک کو یہ حق رہے گا کہ وہ جس وقت بھی چاہے مستعفی ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ مستعفی ہونے سے چھ مہینے پہلے اپنا اِستعفاء شریکوں کو پیش کرے یعنی جون ماہ کی تیس تاریخ کو یا اگر دسمبر ماہ کی اکتیس تاریخ کو طالبِ فسخ اپنا اِستعفاء دینے کا ارادہ کرے تو پھر ایسے شریک کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنا اِستعفاء چھ ماہ پہلے پیش کردے یعنی جنوری کی پہلی تاریخ کو یا جولائی ماہ کی پہلی تاریخ کو، نیز اِستعفاء کا تحریری ہونا ضروری ہوگا، ایسے اِستعفاء کے پیش کردینے کے بعد چھ ماہ گزرتے ہی اس کی شرکت ختم ہوجائے گی بربناء اِستعفاء پیش کردینے کے، لہٰذا مستعفی شریک کی شرکت کو فسخ سمجھنے پر دفعہ نمبر۱۲ کی شرطیں اب مستلزم ہوجائیں گی گویا کہ فسخ کرنے والے شریک کا انتقال ہوگیا ہو، جس کی بنا پر وہی قواعد و ضوابط لازم سمجھے جائیں گے جو کہ کسی شریک کے انتقال کے وقت سمجھے جاتے ہیں، کسی شریک کی وفات یا اِستعفیٰ پر باقی شریکوں کے حق میں عقدِ شرکت قائم اور باقی سمجھا جائے گا۔

۱۲- شرکت جاری ہوتے ہوئے اگر کسی شریک کا انتقال ہوجائے تو باقی زندہ شرکاء میں سے ہر ایک اس کی موت کی تاریخ سے اپنے الگ حصے کے مطابق متوفی شریک کے تجارتی حصے میں مشترک طور پر مالک بن جائے گا، نیز تیس جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرے ہیں ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو ان کے حصے سے ماہانہ پچیس پونڈ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کی جائے گی (یعنی متوفی شریک کے حصے کو ان کی اولاد سے باقی زندہ شرکاء خرید لیں گے) جبکہ شریک دفعہ نمبر۱۱ کے مطابق مستعفی ہوجائے تو یا تو اِستعفاء کی تاریخ تیس جون کی ہے یا پھر اکتیس دسمبر کی ہے تو اگر تیس جون کی ہوگی تو اس سے اگلے سال کی تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا حق دار ہوگا مع اس سال کے تجارتی نفع کے، اور اگر اکتیس دسمبر کی ہوگی تو پھر اس سال کے تیس جون کو اس کے حصے میں جتنی رقم تھی اتنی ہی رقم کا وہ حق دار ہوگا مع ایک سو پچاس پونڈ کے، جو جون کی تیس تاریخ سے لے کر اکتیس دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا۔ کسی مستعفی شریک کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ پگڑی کی رقم طلب کرے، نہ اس کو یہ حق پہنچے گا کہ تجارتی نقصان جو حسابِ تجارت سے منہا کیا گیا ہے اس کی بابت وہ کچھ تبدیل کرانے کا مطالبہ کرے، مستعفی شریک یا متوفی شریک کے نمائندے کو ثمن

مبیع قسط وار ماہانہ پانچ سو پونڈ کے حساب سے چھتیس ماہانہ قسطوں میں (دونوں میں جو اَقل مقدار ہوگی) ادا کیا جائے گا۔

۱۳- شرکت کی بابت اگر کچھ جھگڑا یا نااتفاقی پیش آئے تو سب سے پہلے شریکوں کے والد محترم یعنی حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں شریکوں کی والدہ یعنی حاجیانہ امینہ سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں اس تجارت کے محاسب منشی سے رُجوع کیا جائے گا، اور ان کی عدم موجودگی میں دو حَکَم ایسے مقرّر کئے جائیں گے جن کا انتخاب فریقین کی طرف سے ہوگا، اور پھر یہ مقرّر کئے ہوئے دو حَکَم اس معاملے میں اپنی طرف سے کام شروع کرنے سے پہلے کوئی ایسے شخص کو نامزد کریں جو ان دونوں حَکَم کے درمیان میں حاکم قرار دیا جائے گا تاکہ یہ حَکَم حکمین کی نااتفاقی کی صورت میں قطعی فیصلہ کرسکے۔

۱۴- شرکاءِ تجارتِ ھٰذا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب کوئی جھگڑا پیدا ہوگا درمیان تجارت کے مینیجر اور کسی شریک کے تو پھر یہی دفعہ نمبر۱۳ کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، مذکورہ بالا شرطوں کے باوجود اگر شرکاء کے درمیان میں تجارت کے سلسلے میں کوئی نااتفاقی پیدا ہوئی تو اکثر شریکوں کی رائے کا اعتبار ہوگا، نیز یہ کہ اگر کوئی شریک حاضر نہ ہوسکے تو پھر اس کو حق پہنچے گا کہ وہ اپنی طرف سے کسی شخص کو وکیل مقرّر کرے۔ (ختم شد) شاہد نمبر۱:- زید شاہد نمبر۲:- عمرو

امضاءات شرکاء

۱- ایوب ابن موسیٰ ۲- یونس بن موسیٰ

۳- ہارون بن موسیٰ ۴- سلیمان بن موسیٰ

جواب:- سوالات کے جوابات بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صورتِ مسئولہ میں شرکت دُرست ہوگئی، اور اگرچہ حنفی مسلک میں ''شرکت بالعروض'' دُرست نہیں ہوتی،[۱] لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں حاجی موسیٰ اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں نے تمام جائیدادیں اپنے والد سے مشترک طور پر خرید لیں، اس لئے ان کے درمیان ''شرکۃ الملک'' متحقق ہوگئی،[۲] اور ''شرکۃ الملک'' کے تحقق کے بعد ''شرکۃ العقد'' عروض میں بھی دُرست

(۱) راجع للدلیل والتفصیل إلیٰ بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ لا تصح الشرکۃ فی العروض، والمبسوط للسرخسی ج:۱۱ ص:۱۵۹ (طبع ادارۃ القرآن) والتاتارخانیۃ ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع قدیمی کراچی) وفتح القدیر ج:۵ ص:۳۸۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) وشرح المجلّۃ لعلی حیدر ج:۱۰ ص:۳۷۴ رقم المادّۃ:۱۳۴۲ (طبع دار الکتب بیروت) ومجلّۃ الأحکام العدلیۃ ج:۴ ص:۱۳۴۲ (طبع نور محمد کراچی).

(۲) وفی البحر الرّائق، کتاب الشرکۃ ج:۵ ص:۱۶۶ (طبع سعید) أن یملک اثنان عینًا ارثًا أو شراءً بیان للنوع الأوّل منھا وقولہ ارثًا أو شراءً مثال لا قید .... والحاصل أنھا نوعان جبریۃ واختیاریۃ فاشار الی الجبریۃ بالارث والی الاختیاریۃ بالشراء کما فی المحیط .... الخ.

ہے، لما فی الهندية:-

والحيلة في جواز الشركة في العروض و كل ما يتعيّن بالتعيين أن يبيع كل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتى يصير مال كل واحد منهما نصفين، وتحصل شركة ملك بينهما، ثم يعقدان بعد ذلك عقد الشركة فيجوز بلا خلاف كذا في البدائع.

(عالمگیریة ج:۲ ص:۳۰۷، باب اوّل، فصل:۳).(۱)

لہٰذا صحتِ شرکت میں عروض کی وجہ سے اِشکال نہ رہا۔

جہاں تک اس معاہدۂ شرکت کا تعلق ہے، جو ضمیمے کی دستاویز میں قلم بند ہے، سو اس کی اکثر شرائط دُرست ہیں، لیکن اس میں بعض شرطیں فاسد بھی ہیں، مثلاً وہ شرط جو دفعہ۱۰ ذیل الف میں مذکور ہے کہ کوئی شریک بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کوئی الگ تجارت نہیں کر سکے گا۔ یہ شرط شرکتِ عنان کے مقتضا کے خلاف ہے، اور شرکتِ مفاوضہ کی شرائط یہاں موجود نہیں، لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، لیکن شرکت میں اگر کوئی شرطِ فاسد لگادی جائے تو اس سے شرکت باطل نہیں ہوتی، بلکہ صرف وہ شرط فاسد ہوجاتی ہے اور اس پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔

لما في ردّ المحتار: لأنّ الشركة لا تفسد بالشروط الفاسدة.

(شامی ج:۳ ص:۳۷۶).(۲)

ایک اور شرطِ فاسد معاہدے کی دفعہ۱۲ میں یہ مذکور ہے کہ کسی ایک شریک کی وفات کی صورت میں ۳۰؍جون سے لے کر وفات تک جتنے ماہ گزرتے ہیں، ہر ماہ کے مقابلے میں ان کی اولاد کو پچیّس پونڈ ماہانہ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کیا جائے گا، انگریزی معاہدہ نامے میں یہ صراحت ہے کہ یہ پچیّس پونڈ ماہانہ کی رقم اس نفع کے قائم مقام سمجھی جائے گی جو ۳۰؍جون کے بعد وفات کی تاریخ تک مرحوم کے حصے میں آئی ہو۔

دفعہ۱۱ میں بھی اسی قسم کی ایک شرطِ فاسد یہ ہے کہ اگر کوئی شریک ۳۱؍دسمبر کو شرکت ختم کردے تو وہ اتنی رقم کا حق دار ہوگا جو ۳۰؍جون کو اس کے حصے میں تھی، مع ایک سو پچاس پونڈ کے جو ۳۰؍جون سے ۳۱؍دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائے گا، یہ شرط بھی مذکورہ بالا وجہ کی بناء پر فاسد ہے، اگر اس

---

(۱) (طبع مكتبة رشيديه كوئٹه)

وفي بدائع الصنائع، كتاب الشركة ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعيد) والحيلة في جواز الشركة في العروض وكل ما يتعيّن بالتعيين ان يبيع كلّ واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتّى يصير مال كل واحد منهما نصفين، وتحصل شركة ملك بينهما ثم يعقدان بعد ذلك عقد الشركة فتجوز بلا خلاف. وكذا في الدّر المختار ج:۴ ص:۳۱۰ (طبع سعيد) وكذا في التاتارخانية ج:۵ ص:۴۲۴ (طبع قديمى كراچى).

(۲) ردّ المحتار، كتاب الشركة ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعيد) وكذا في الهندية ج:۲ ص:۳۰۳ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) (محمد زبیر حق نواز)

طرح کسی ایک شریک کے لئے کوئی متعین رقم بطورِ نفع اصل شرکت ہی میں مقرّر کرلی جاتی تو اس سے شرکت ہی فاسد ہوجاتی۔

لما فی الدر المختار: وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة كما مر لا لأنه شرط، لعدم فسادها بالشروط.

(درمختار مع شامی ج:۳ ص:۳۷۶ و ۳۷۷)۔[1]

لیکن چونکہ اسی معاہدہ نامے کی دفعہ۵ میں شرکاء کے درمیان نفع کی تقسیم کا عام طریقہ شریعت کے مطابق ہے اور اس میں کسی بھی فریق کے لئے کوئی معین رقم مقرّر کرنے کے بجائے نفع ونقصان میں برابر کی شرکت طے کی گئی ہے، اور اصل شرکت کا معاہدہ اسی دفعہ پر مبنی ہے، اور دفعہ۱۱ و۱۲ میں جو طریقِ کار مقرّر کیا گیا ہے وہ دفعہ۵ سے متعارض ہے، اور صرف فسخِ شرکت کے وقت حساب کا ایک طریقہ طے کرنے کے لئے مقرّر کیا گیا ہے، بلکہ انگریزی متن میں معین رقم کو ''نفع کا قائم مقام'' قرار دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ نفع تو وہی ہوگا جو دفعہ۵ کے تحت مقرّر ہوگا، لیکن یہ معین رقم اس کے قائم مقام سمجھی جائے گی، اس لئے اس شرطِ فاسد کی وجہ سے اصل عقدِ شرکت باطل نہ ہوگا، البتہ یہ شرط باطل ہوجائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''معاہدۂ شرکت'' کی وہ دستاویز جو اِستفتاء کے ساتھ منسلک ہے، اس حد تک تو شرعاً معتبر ہے کہ اس کی بنیاد پر شرکت دُرست ہوگی، لیکن اس میں جو شرائطِ فاسدہ مذکور ہیں، جن کا ذکر اُوپر آیا ہے، وہ شرائط شرعاً واجب العمل نہیں ہیں۔

۲:- جن شرائطِ فاسدہ کا ذکر سوال نمبر۱ کے جواب میں آیا ہے، ان پر تو عمل واجب نہیں،

---

(۱) الدّر المختار ج:۴ ص:۳۱۶ (طبع سعید)
وفی الهداية ج:۲ ص:۶۱۱ (طبع رحمانيه) ولا يجوز الشركة اذ اشرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة .... الخ.
وفی الهندية ج:۲ ص:۳۰۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وأن يكون الرّبح معلوم القدر فان كان مجهولًا تفسد الشركة وان يكون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عيّنا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک كانت الشركة فاسدة .....الخ.
وفی بدائع الصنائع ج:۶ ص:۵۹ (طبع سعيد) (ومنها) أن يكون الرّبح جزءًا شائعًا فی الجملة لا معيّنًا فان عيّنا عشرة أو مائة أو نحو ذٰلک كانت الشركة فاسدة لأنّ العقد يقتضی تحقق الشركة فی الرّبح والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لا يحصل من الرّبح الّا القدر المعيّن لأحدهما فلا يتحقق الشركة فی الرّبح.
وفی فتح القدير، كتابُ الشركة ج:۵ ص:۴۰۲ (طبع رشيديه) ولا تجوز الشركة اذ اشرط لأحدهما دراهم مسماة من الرّبح قال ابن المنذر لا خلاف فی هٰذا لأحد من أهل العلم ووجههٗ ما ذكره المصنف بقوله لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساهٗ لا يخرج الّا قدر المسمّٰی.
وفی تبيين الحقائق، كتابُ الشركة ج:۴ ص:۲۴۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وتفسد ان شرط لأحدهما دراهم مسمّاة من الرّبح لأنّه شرط يوجب انقطاع الشركة فی بعض الوجوه فلعلّه لا يخرج الّا القدر المسمّٰی لأحدهما من الرّبح. وكذا فی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۹۴ (طبع امجد اكيڈمی لاهور) والبحر الرّائق ج:۵ ص:۱۷۷ (طبع سعيد) وشرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۱۳۳۷ ج:۲ ص:۷۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(محمد زبیر حق نواز)

لیکن باقی تمام شرائط جو شرعاً دُرست ہیں، ان کی مخالفت کسی بھی شریک کے لئے جائز نہیں، لأنّ المسلمین علیٰ شروطھم الا شرطًا حرّم حلالًا أو أحلّ حرامًا۔[1]

۳:- اگر یہ بات متعین طور پر معلوم ہو یا کسی جگہ لکھی ہوئی محفوظ تھی کہ چاروں بھائیوں نے اپنے والد سے جو جائیدادیں خریدی ہیں، وہ کیا کیا ہیں؟ اور کہاں کہاں ہیں؟ تو پھر معاہدہ نامۂ شرکت میں ان کی جزوی تفصیلات اور مقدار بیان کرنا شرکت کی صحت کے لئے ضروری نہیں تھا، اس کے دو سبب ہیں:-

الف:- پہلا سبب یہ کہ سرمایۂ شرکت کی مقدار کا تعین عقد کے وقت عقد کی صحت کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی البدائع: وأما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فلیس بشرط لجواز الشرکة بالأموال عندنا وعند الشافعی رحمه الله شرط ..... ولنا أن الجهالة لا تمنع جواز العقد لعینها، بل لافضائها الی المنازعة وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضی الی المنازعة، لأنه یعلم مقداره ظاهرًا وغالبًا لأنّ الدراهم والدنانیر توزنان وقت الشراء فیعلم مقدارها فلا یؤدی الی جهالة مقدار الربح وقت القسمة. (بدائع الصنائع ج:۶ ص:۶۳)[2]

ب:- دُوسری وجہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں چاروں بھائیوں کے درمیان عقدِ شرکت عنان سے پہلے شرکتِ ملک قائم ہوچکی تھی، جیسا کہ سوال نمبر۱ کے جواب میں لکھا گیا ہے، اور سب کے حصے بھی برابر تھے، اور نفع بھی، اس لئے مقدار معلوم نہ ہونے سے جہالت مفضی الی المنازعہ کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، شرکت فی العروض کا جو حیلہ سوال نمبر۱ کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے سلسلے میں علامہ ابنِ ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

وهٰذا لأنّ المانع من کون رأس مال الشرکة عروضًا کل من أمرین: لزوم ربح ما لم یضمن، وجهالة رأس مال کل منهما عند القسمة، وکل منهما منتف، فیکون کل ما ربحه أحدهما ما هو مضمون علیه، ولا تحصل جهالة

---

(۱) وفی جامع الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۷۲ "المسلمون علیٰ شروطھم الّا شرطًا حرّم حلالًا أو أحلّ حراماً" (وکذا فی الصحیح للبخاری، کتاب الاجارۃ).

(۲) (طبع سعید) وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۰۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) اما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فلیس بشرط عندنا.

فی رأس مال کل منهما، لأنه لا یحتاج الی تعرف رأس مال کل منهما عند القسمة حتی یکون ذٰلک بالحذر فتقع الجهالة لأنهما مستویان فی المال شریکان فیه فبالضرورة یکون کل ما یحصل من الثمن بینهما نصفان.

(فتح القدیر ج:۵ ص:۳۹۶)[۱]

۴:- محض کام چھوڑ دینے اور غائب ہوجانے سے شرکت ختم نہیں ہوتی۔

لما فی العالمگیریة: وان عمل أحدهما ولم یعمل الآخر بعذر أو بغیر عذر صار کعملهما معا، کذا فی المضمرات.

(فتاویٰ عالگمیریة ج:۲ ص:۳۲۰، کتاب الشرکة باب:۳ فصل:۲)[۲]

اگر دُوسرے شرکاء اس کے کام چھوڑ دینے کی صورت میں اس کے ساتھ شرکت پسند نہیں کرتے تھے تو ان کو اس کے ساتھ صراحۃً شرکت فسخ کردینی چاہئے تھی۔

۵:- یک طرفہ طور پر شرکت فسخ کرنے کے لئے شرعاً ضروری نہیں کہ فریقِ ثانی فسخ کو قبول کرے۔

لما فی الدر المختار: وتبطل أیضًا بانکارها وبقوله لا أعمل معَک فتح وبفسخ أحدهما. (شامی ج:۳ ص:۳۸۴)[۳]

اور جو معاہدۂ شرکت صورتِ مسئولہ میں لکھا گیا ہے اس میں بھی اِستعفاء کے مؤثر ہونے کو دُوسرے شرکاء کی قبولیت پر موقوف نہیں رکھا گیا، لہٰذا جب کسی شریک نے معاہدے کے مطابق اِستعفاء دیا تو اس کی شرکت معاہدے میں مذکورہ مدّت سے ختم سمجھی جائے گی، خواہ دُوسرے شرکاء نے اِستعفاء قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

۶:- ہوجائے گی، دلیل نمبر۵ میں گزرگئی۔

(۱ و ۲) (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) الدّر المختار، کتابُ الشرکة، فصل فی الشرکة الفاسدة ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعید).

وفی الهندیة ج:۲ ص:۳۳۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) واذا قال أحد الشریکین لصاحبه لا أعمل معک بالشرکة فهو بمنزلة قوله فاسختک الشرکة.

وفی التاتارخانیة ج:۵ ص:۶۳۷ (طبع ادارة القرآن) واذا انکر أحد المتفاوضین المفاوضة انفسخت المفاوضة هٰکذا ذکر شیخ الاسلام فیجب أن یکون الحکم فی جمیع الشرکات هٰکذا وفی الظهیریة واذا أنکر أحد الشریکین الشرکة ومال الشرکة امتعة کان هٰذا فسخًا للشرکة.

وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۳۸۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) لأن عقد الشرکة عقد غیر لازم فان لکل منهما ان یفسخه اذا شاء.

وفی درر الحکام شرح المجلّة لعلی حیدر، تحت المادّة رقم:۱۳۵۳ تنفسخ الشرکة بفسخ أحد الشریکین أو بانکاره الشرکة أو یقول أحدهما للآخر لا أعمل معک فانه بمنزلة فاسختک. (محمد زبیر حق نواز)

۷:- اُوپر گزر چکا ہے کہ معاہدے کے مطابق اِستعفاء دے دینے سے مستعفی شریک کی شرکت ختم ہوگئی، اب اس کو دوبارہ شریک قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ اَزسرِنو عقدِ شرکت کیا جائے، لہٰذا اگر اس کے بعد دُوسرے شرکاء نے اس شخص کے ساتھ واضح طور پر دوبارہ تحریری یا زبانی عقدِ شرکت قائم کرلیا ہو، اور اس کی بناء پر وہ اسے چوتھا حصہ دیتے رہے ہوں تب تو وہ دوبارہ شریک سمجھا جائے گا، ورنہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی نیا عقدِ شرکت نہیں ہوا اور اسے دُوسرے شرکاء محض چوتھا حصہ دیتے رہے تو اس میں کئی اِحتمالات ہیں، ایک یہ کہ شرکاء اسے تبرّعاً یہ رقم دیتے رہے ہوں، دُوسرے یہ کہ شرکت کے فسخ کی بناء پر مستعفی شریک کے جس حصے کی ادائیگی دُوسرے شرکاء پر واجب تھی یہ رقم اس کے حصے کے طور پر دیتے رہے ہوں، لہٰذا جب تک فریقین کے درمیان نئے عقدِ شرکت کا صریح معاہدہ نہ ہوا ہو ان احتمالات کی موجودگی میں محض چوتھے حصے کی ادائیگی کو عقدِ شرکت نہیں کہا جاسکتا، لأن الشركة لا تثبت بالاحتمال۔

۸:- شرعاً بھی شرکت کے فسخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ فسخ کرنے والا دُوسرے شرکاء کو اپنے فسخ کی اطلاع دے، اس کے اطلاع دیئے بغیر شرکت فسخ نہیں ہوتی۔

لما في الدر المختار: وتبطل أيضًا بانكارها .... وبفسخ أحدهما ..... ويتوقف على علم الآخر لأنه عزل قصدي، وفي ردّ المحتار: (قوله لأنّه عزل قصدي) لأنّه نوع حجر فيشترط علمه دفعًا للضرر عنه فتح.[1]

(ردّ المحتار ج:۳ ص:۳۸۴ و ۳۸۵)

اور منسلکہ معاہدے میں بھی اِستعفاء کے لئے دُوسرے شرکاء پر پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کسی شریک نے اِستعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کسی دُوسرے شریک کو پیش نہیں کیا، تو اس سے شرکت فسخ نہیں سمجھی جائے گی، ہاں جب کبھی وہ شریک ازخود وہ اِستعفاء نکال کر دُوسرے شرکاء کو پیش کردے تو پیش کرنے کی تاریخ سے چھ ماہ بعد حسبِ معاہدہ شرکت فسخ ہوگی۔

---

(۱) ردّ المحتار ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعيد كراچی)

وفي التاتارخانية ج:۵ ص:۶۳۷ (طبع ادارة القرآن) .... وهٰذا اذا فسخ بحضرة صاحبه اما لو فسخ بغيبة صاحبه ولم يعلم صاحبه بالفسخ لا يصح.

وفي الهندية ج:۲ ص:۳۳۵ (طبع رشيديه كوئٹه) ولو لم يمت لٰكن فسخ أحدهما الشركة ولم يعلم شريكه لا تنفسخ الشركة. وكذا في فتح القدير، كتاب الشركة ج:۵ ص:۴۱۳ (طبع رشيديه).

وفي شرح المجلّة لعلي حيدر ج:۱۰ ص:۳۹۰ (طبع دار الكتب بيروت) تنفسخ الشركة بفسخ أحد الشريكين ولٰكن يشترط ان يعلم الآخر بفسخه ولا تنفسخ الشركة ما لم يعلم الآخر فسخ الشريك.

۹:- یہ سوال واضح نہیں، معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف اِستعفاء پیش کرنے کی کیا شکل ہے؟ وضاحت سے لکھا جائے تو جواب ممکن ہوگا۔

۱۰:- یہ جزئیہ صراحۃً نظر سے نہیں گزرا، لیکن متعدّد دُوسرے جزئیات پر قیاس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مرحوم شریک کی اولاد کو شریکِ کاروبار تصوّر کیا جائے گا۔ اصل یہ ہے کہ مرحوم کی وفات پر ان کے ساتھ شرکت ختم ہوگئی، اب ان کے دُوسرے شرکاء پر لازم ہوگیا کہ مرحوم کا حصہ ان کے ورثاء کو اَدا کردیں، اور اگر انہیں شریکِ کاروبار رکھنا چاہیں تو تمام شرکاء کی رضامندی لازمی ہوگی۔

لما فی الدر المختار: لا یملک الشریک الشرکة الّا باذن شریکه جوهرة. (ج:۳ ص:۳۷۸)[۱]

اب یہ رضامندی عام حالات میں صریح الفاظ کے ساتھ ہونی چاہئے، لأنّ الساکت لا ینسب الیه قول[۲]، لیکن جب دو شریکوں نے اسی غرض کے لئے مجلس منعقد کی، اور اس میں مرحوم کی اولاد کو شریک بنانے کا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ تمام شرکاء کی طرف سے کیا گیا، اس وقت ایک شریک موجود ہونے کے باوجود خاموش رہا، اور اس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کے بعد مرحوم کی اولاد شریکِ کاروبار کی حیثیت سے مدّت تک تصرف کرتی رہی، پھر بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، تو یہ مجموعی طرزِ عمل رضامندی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

نظیره ما فی الاشباه: سکوته عند بیع زوجته أو قریبه عقارًا اقرار بأنّه لیس له علی ما افتی به مشایخ سمرقند.

وفیه بعد ذٰلک: رآه یبیع أرضًا أو دارًا فتصرف فیه المشتری زمانا وهو ساکت یسکت دعواه.

اس کے تحت علامہ حموی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

فیه عما قبله زیادة تصرف المشتری بعد الشراء زمانا وهو ساکت فهو قید فی الأجنبی لا فی الزوجة والقریب کما یفهمه اطلاقه.

(شرح الاشباه والنظائر للحموی ج:۱ ص:۱۸۷)[۳]

یہی مسئلہ درمختار اور ردّ المحتار میں اشباہ سے نقل کرکے اسی طرح کتاب الوقف میں

(۱) الدُّر المختار، کتابُ الشرکة ج:۴ ص:۳۱۷ (طبع سعید).

(۲) رد المحتار ج:۳ ص:۶۲ قاعدة لا ینسب الیٰ ساکت قول. وکذا فی الأشباه والنظائر ج:۲ ص:۱۷۰ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) القاعدة الثانیة عشر ج:۱ ص:۷۹ (طبع سعید).

بھی ذکر کیا گیا ہے۔ (ردّ المحتار ج:۳ ص:۴۸۹)[۱]

۱۱:- مستفتیٔ مذکور ہی کی طرف سے زیرِ بحث معاملے ہی کے متعلق ایک اور اِستفتاء بعد میں موصول ہوا، اس میں انہی سوالات کا اعادہ ہے جن کا جواب پیچھے آچکا ہے، البتہ اس میں ایک سوال زائد ہے، اور وہ یہ کہ معاہدہ نامے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ شرکت کا کاروبار صوبہ ٹرانسوال تک محدود رکھا جائے گا، بعد میں برضامندیٔ شرکاء اس کاروبار کو دُوسرے علاقوں تک بھی وسعت دی گئی، سوال یہ کیا گیا ہے کہ آیا اس عمل سے شرکت کی عرفی حیثیت پر کوئی فرق تو نہیں پڑا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمام شرکاء کی رضامندی سے تجارت ٹرانسوال سے باہر لے جائی گئی تو شرکت کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا، شرکت بدستور قائم ہے۔ اور اگر دُوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر کوئی شریک مالِ تجارت ٹرانسوال سے باہر لے گیا تو شرکت تو پھر بھی باقی رہے گی، البتہ باہر تجارت کرنے سے اگر کوئی خسارہ ہوجائے تو خسارے کا تاوان صرف اس شریک پر آئے گا جو باہر لے گیا تھا۔

لما فی رد المحتار: وان خصّ له (أی المضارب) ربّ المال التصرف فی بلد بعينه أو فی سلعة بعينها لم يجز أن يتجاوز ذٰلک فان خرج الٰی غير ذٰلک البلد أو دفع المال الٰی من أخرجه لا يكون مضمونًا عليه بمجرّد الاخراج حتّی يشتری به خارج البلد، فان هلک المال قبل التصرف فلا ضمان عليه، وكذا لو أعاده الی البلد عادت المضاربة كما كانت علٰی شرطها، وان اشتری به قبل العود صار مخالفًا ضامنًا ..... والظاهر أن الشركة كذٰلک. (شامی ج:۳ ص:۳۰۸)[۲]

هذا ما ظهر لی والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

وعلمه أتم وأحكم

۲۰؍ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۳۹/ ۳۷ د)

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۴۸۲ (طبع سعيد) (فی الاشباه السكوت كالنطق فی مسائل) عدّ منها سبعة وثلاثين. وفی الشامية تحته (مطلب المواضع الّتی يكون فيها السكوت كالقول) ..... ۲۴ سكوته عند بيع زوجته أو قريبه عقارًا اقرار بأنّه ليس لهٗ علیٰ ما أفتٰی به مشائخ سمرقند ..... الخ. ......۲۵ رأه يبيع عرضًا أو دارًا فتصرف فيه المشتری زمانًا وهو ساكت تسقط دعواهٗ.

(۲) ردّ المحتار كتاب الشركة ج:۴ ص:۳۲۱ (طبع سعيد)

وفی الهداية كتاب المضاربة ج:۳ ص:۲۶۵ (طبع مكتبه رحمانيه لاهور) وان خصّ لهٗ ربّ المال التّصرف فی بلدٍ بعينهٖ أو فی سلعة بعينها لم يجز لهٗ أن يتجاوزها لأنّه توكيل وفی التخصيص فائدة فيتخصص وكذا ليس لهٗ أن يدفعه بضاعة الٰی من يخرجها من تلک البلدة لأنّه لا يملک الاخراج بنفسه فلا يملک تفويضه الٰی غيره فان خرج الٰی غير تلک البلدة فاشتریٰ ضمن وكان ذٰلک لهٗ ولهٗ ربحهٗ لأنّه تصرّف بغير أمره وان لم يشتر حتّی ردّه الی الكوفة وهی الّتی عينها بریء من الضمان كالمودع اذا خالف فی الوديعة ثم ترک ..... الخ. (محمد زبیر)

شرکت میں ایک شریک کے انتقال کے بعد شرکت ختم ہوجاتی ہے

سوال:- زید اور بکر نے برابر کی شرکت سے ایک کاروبار کیا، کاروبار چالو ہوگیا، کچھ عرصہ بعد زید کا اچانک انتقال ہوگیا، مرحوم نے پسماندگان میں ایک بیوہ، تین نابالغ بچے، (جس میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں) اور ایک بڑا بھائی چھوڑا ہے۔

اب یہ بتایا جائے کہ آیا زید مرحوم کی شرکت اس کاروبار میں باقی ہے یا ختم ہوگئی؟ اگر ختم ہوگئی ہے تو اَب زید مرحوم کا حصہ کس شخص کے حوالے کیا جائے؟ بیوہ کہتی ہے کہ مجھے دے دو، لہٰذا شرعی حکم سے مطلع فرمایا جائے، نیز اگر بچوں اور بیوی کی رضامندی سے مرحوم کا یہ حصہ شرعی حصوں کے مطابق تقسیم کر کے ہر ایک حصہ اس کے حوالے کر دیا جائے اور بچوں کا حصہ والدہ کے پاس رکھوا دیا جائے تو کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

جواب:- مذکورہ صورت میں زید کے انتقال ہوجانے کی وجہ سے مرحوم کی شرکت[1] بکر کے ہمراہ ختم ہوگئی، بکر پر واجب ہے کہ زید کا جس قدر حصہ کاروبار میں ہے، وہ جدا کردے اور پھر جو شخص مرحوم کے ترکے کی تقسیم کا انتظام کر رہا ہو، اُس کے حوالے کردے، اور بہتر یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے حوالے کردے تاکہ بعد میں کوئی فساد نہ ہو۔ اور ایسا بھی کرسکتا ہے کہ خود شرع کے مطابق تقسیم کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۶۵۸/۲۸ ب)

بیٹے کا مال اپنے کاروبار میں لگا کر ماہوار اسے متعینہ رقم دینے کا حکم

سوال:- باپ نے اپنے بیٹے کو مثلاً دس ہزار روپے دے دیئے اور پھر اپنے ہی کاروبار میں اس کے نام سے شریک کرلئے اور ہر ماہ اپنے لڑکے کو ایک رقم مثلاً سو روپیہ ماہوار دیتا ہوں، اور بیٹا نہ محنت میں شریک ہے اور نہ نقصان میں، تو کیا یہ صورت جائز ہے؟

---

(۱) فی الدر المختار ج:۴ ص:۳۲۷ (طبع سعید) وتبطل الشرکة أی شرکة العقد بموت أحدهما علم الآخر أو لا.
وفی الجوهرة النیّرة (قبیل کتاب المضاربة) ج:۳ ص:۱۲۸ واذا مات أحد الشریکین أو ارتد ولحق بدار الحرب بطلت الشرکة ....الخ.
وفی تبیین الحقائق فصل فی الشرکة الفاسدة ج:۱۰ ص:۱۷۸ وتبطل الشرکة بموت أحدهما.
وفی فتح القدیر فصل فی الشرکة الفاسدة واذا مات أحد الشریکین أو ارتدّ ولحق بدار الحرب بطلت الشرکة ....الخ.
وفی شرح مجلّة الأحکام للأتاسیؒ ج:۴ ص:۲۷۷ رقم المادّة:۱۳۵۲ (طبع مکتبه اسلامیه کوئٹه) اذا مات أحد الشریکین أو جن جنونًا مطبقًا تنفسخ الشرکة ....الخ.

جواب:- آپ اپنے بچے کے مال کو تجارت میں لگا سکتے ہیں، اس صورت میں وہ آپ کا شریک ہوگا، لیکن اس شرکت کی حیثیت سے اسے نقصان سے بَری رکھنا یا سو روپیہ ماہوار مقرّر کردینا شرعاً دُرست نہیں، تجارت چونکہ ایسا اَمر ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہے، لہٰذا آپ کو بحیثیت باپ کے اپنے بیٹے کا مال تجارت میں لگانے کا اختیار ہے اور اس کے بعد وہ نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوگا، ہاں اگر آپ بنظرِ شفقت اپنے حصے میں سے سو روپے ماہوار اس کے لئے مقرّر کردیں تو یہ الگ بات ہے، یا ایسا کریں کہ سو روپیہ ماہوار اس کے حصۂ نفع میں سے علی الحساب دیتے رہیں، سال دو سال میں حساب سے جو صورت بنے اس کے مطابق کرلیں۔ وما تردد من العقود بین نفع وضرر کالبیع والشراء توقف علی الاذن. (شامی ج:۵ ص:۱۶۸)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۳/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۸/۲۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱) الدر المختار ج:۶ ص:۱۷۳ (طبع سعید).

﴿کتاب البیوع﴾

(خرید وفروخت کے مسائل)

﴿فصل فی البیع الفاسد والباطل والموقوف والمکروہ﴾

(بیع فاسد، باطل، موقوف اور مکروہ کا بیان)

بیع اور اِجارہ کا معاملہ اِکٹھے کرنے کا حکم

سوال:- زید اپنی سوئی ہوئی بھینس بمع بچے کے بکر کو بیچتا ہے بعوض سترہ سو روپے کے، جبکہ اسی کے ساتھ زید زمین کی بٹائی کا معاملہ بکر سے کرتا ہے چالیس کنال زمین جس میں سے سترہ کنال گنا ہے، گنے کی قیمت چودہ سو روپے اور باقی زمین کی آئندہ بٹائی تیرہ سو روپے طے پایا۔

۲:- یہ تمام معاملہ طرفین میں چار ہزار چار سو کا ہوا، جن میں سے بکر نے ایک ہزار نقد زید کو دے دیئے، چودہ سو روپے ۱۵/۴/۱۹۷۷ء کو اور دو ہزار ۴/۷/۱۹۷۸ء کو دینے کا وعدہ کیا۔

۳:- زید مذکور نے ہی زمین عمرو کو مزارعت پر مطابق نصف پر لئے، اس کا حصہ زید نے دینا تھا، اب رہا بعد کا حساب تو ۳۱/۸/۱۹۷۶ء سے ۱۵/۵/۱۹۷۸ء تک زمین کے جملہ اِخراجات بکر مذکور پر ہوں گے، بکر نے زمین کی کاشت خود کرنے کا فیصلہ کیا تو مزارع عمرو نے ناراض ہوکر کہا کہ پھر میں تمہیں اس سال کا گنا جس میں نصف سے کہا گیا کہ تم بکر کو پندرہ سو روپے دے دو، زمین اور بھینس واپس لو جبکہ بکر نے بھینس کا بچہ ۷۰۰ روپیہ پر فروخت کیا ہے اور اس دوران زمین کی آمدنی گھاس وغیرہ بھی لیا ہے، وہ سب مفت میں، کیا شریعت کی رُو سے بکر کے لئے اس رقم کے لینے کا جواز ہے؟ حالانکہ معاملے کی ابتداء میں ایک ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ظاہر یہ ہے کہ زمین کے اِجارے کو بھینس اور اس کے بچے کی بیع کے لئے مشروط قرار دے کر بیع اور اِجارے کا معاملہ مجموعی طور پر کیا گیا تھا، لہٰذا یہ معاملہ "صفقۃ فی

صـــفـــقة" ہونے کی بنا پر فاسد[1] اور واجب الفسخ تھا،[2] اور فریقین نے اس کو جو منسوخ کیا وہ دُرست کیا، لیکن ایسی صورت میں بکر زید سے اتنی ہی رقم شرعاً وصول کرسکتا ہے جتنی اُس نے زید کو ادا کی ہے، اس سے زائد وصول کرنا اس کے لئے جائز نہیں بلکہ بھینس کے بچے کو بیچ کر جو قیمت اس نے وصول کی ہے وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے۔ اور گھاس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ خودرو گھاس تھی تو اسے بیچ کر جو پیسے بکر نے کمائے وہ اسی کے ہیں،[3] اور اگر وہ باقاعدہ کاشت کی ہوئی تھی تو اس کو بیچ کر جو رقم بکر نے حاصل کی وہ بھی زید کو واپس کرنی ضروری ہے، لما فی الدر المختار فی حکم فسخ البیع الفاسد لو نـقص فی ید المشتری بفعل المشتری أو المبیع أو بآفة سماویة أخذه البائع مع الأرش. (شامی ج:۴ ص:۱۳۱)۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۶/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۴۳/۲۸ب)

عورت کی خرید وفروخت اور اسے باندی بنانے کا حکم

سوال:- اگر ہم بازار سے کوئی لڑکی خریدیں تو اس سے باندیوں والے حقوق لے سکتے ہیں؟

جواب:- آج کل شرعی باندیوں کا کہیں وجود نہیں ہے، لہٰذا موجودہ حالت میں کسی لڑکی کو خریدنا بھی حرام ہے[5] اور اس سے باندیوں کی طرح اِنتفاع کرنا بھی حرام ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

---

(۱) وفی الـمـعـجـم الأوسط للطبرانیؒ ج:۲ ص:۱۶۹ (طبع دار الحرمین قاهرة) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ثـم لا تـحـلّ صفقتان فی صفقة. وفی مجمع الزوائد ج:۴ ص:۸۴ (طبع دار الرّیان للتراث قاهرة و دار الکتاب العربی بیروت) عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه قال: نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة.

(۲) وفـی الـدر الـمـختارمع ردّ المحتار ج:۵ ص:۹۰ و ۹۱ (و) یجب (علیٰ کلّ واحد منهما فسخه (أی فسخ البیع الـفـاسـد) قبـل الـقـبـض) ویـکـون امتناعًا عنه ابن ملک (أو بعده ما دام) المبیع بحاله جوهرة (فی ید المشتری) اعدامًا للفساد، لأنّه معصیة فیجب رفعها بحر.

وفـی الهـنـدیة البـاب الـحادی عشر فی أحکام البیع الغیر الجائز ج:۳ ص:۱۴۷ (طبع رشیدیه) ..... ویثبت الملک قیاسًا واستحسانًا الّا أنّ هٰذا الملک یستحق النّقض ویکره للمشتری أن یتصرّف فیما اشتریٰ شراً فاسدًا بتملیک أو انتفاع .... الخ.

(۳) وفی المشکوٰة ص:۲۶۲ (طبع رحمانیه) المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنّار (الحدیث).

(۴) الـدّر الـمـختار ج:۵ ص:۱۰۰ (طبع سعید). وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۴۸ (طبع رشیدیه) وان انتقص المبیع فی یـد الـمـشتری ان کان النّقصان بآفة سماویة فللبائع أن یأخذ المبیع مع أرش النقصان وکذٰلک النقصان بفعل المشتری أو بفعل المعقود علیه .... الخ.

(۵) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۵۲ وبطل بیع ما لیس بمال کالدّم والمیتة والحرّ. وکذا فی الهدایة ج:۳ ص:۵۳.

ذبح سے پہلے جانور کے مختلف اعضاء کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- جانور کے ذبح کرنے سے پہلے سر، پیر، کلیجی، دِل وغیرہ کا فروخت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب:- جانور کے کلیجی گردے اور دِل پھیپھڑے وغیرہ کی بیع انہیں نکالنے سے پہلے جائز نہیں ہے، قال فی الدر المختار: ولؤلؤ فی صدف للغرر وصوف علیٰ ظهر غنمٍ .... وكذا كل ما اتصالهٗ خلقی كجلد حيوان ونوى تمر وبن وبطيخ لما مرّ أنه معدومٌ عرفًا (شامی ج:۴ ص:۱۴۹)۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۱۹ الف)

یک طرفہ بیع مالک کی رضامندی پر موقوف ہے

سوال:- ایک خاندان کے دو حقیقی بھائیوں میں علیحدگی ہوگئی، ایک بھائی چند ماہ بعد ایک حادثے میں مبتلا ہوا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کام کرنے لگا، اور صرف خانگی اِخراجات لیا کرتا تھا، بعد میں پاکستان آگیا، مگر بیوی بچے ہندوستان ہی میں تھے، بڑے بھائی بیوی بچوں کو ۲-۳ سو روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ اور ضروریات بھی پورا کیا کرتے تھے، چھوٹا بھائی ہندوستان سے پاکستان آتے وقت ایک چھوٹی سی جائیداد تقریباً ۹ بیگھ بڑے بھائی کے نام لکھ کر آیا تھا کہ فروخت کرکے روپیہ دے دیجئے گا، میرے بیوی بچے ہندوستان سے ۱۹۶۵ء میں پاکستان چلے آئے، یہاں جو روپیہ اور جائیداد میری تھی دُوسروں کے ہاتھ میں تھا، ان حالات میں ۱۹۷۰ء تک بڑے بھائی کو لکھا کہ جائیداد فروخت کرکے میری امداد کریں، مگر ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء کوئی جواب نہیں آیا، ۱۹۷۱ء میں لڑکا ہندوستان گیا تو ۲۵ ہزار لڑکے کو دیا، لڑکا سمجھا کہ وہ امدادی طور پر دے رہے ہیں، لے لیا، ۱۹۷۶ء میں معلوم ہوا کہ رقم مذکور جو کھیت کی قیمت کے طور پر دی تھی اُس سے زیادہ قیمت تھی۔ اس واقعے کے بعد لکھا کہ ۲۵ ہزار

---

(۱) الدر المختار ج:۵ ص:۶۳ باب البیع الفاسد (طبع سعید) وفی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۷۶ (طبع سعید) وفی الخانية ولو اشترىٰ لؤلؤة فی صدفه قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ یجوز البیع وله الخیار اذا رای، وقال محمد رحمه الله تعالیٰ لا یجوز وعلیه الفتویٰ اھ. وهٰكذا فی الولوالجية معلّلا للفتویٰ بانها منه خلقة .... الخ.

وفی الهندية ج:۳ ص:۱۲۹ الفصل التاسع (طبع رشیدیه): ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا یجوز فان ذبح بعد ذٰلک ونزع الجلد والكرش وسلم لا ینقلب العقد جائزا كذا فی الذخیرة.

وفی شرح البداية ج:۳ ص:۵۴ ولا بیع الحمل ولا النتاج ولا اللبن فی الضرع ولا الصّوف علیٰ ظهر الغنم وجذع فی السقف.

وكذا فی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۸۱ وامداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۶۱ وامداد الأحكام ج:۳ ص:۴۱۷ و ۴۱۸.

روپیہ لے کر زمین واپس کردیں، بڑے بھائی کی صرف لڑکیاں ہیں، جائیداد اور نقد روپیہ لڑکیوں کو لکھ دیا، سوائے اس زمین کے اب وہ اس زمین کو بھی نواسے کے لئے لکھنا چاہتے ہیں، شریعت کی رُو سے کیا ہونا چاہئے؟ میں نہ صبر کرسکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی دیتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی زمین کسی اور کو فروخت کئے بغیر اپنے پاس رکھ لی اور آپ کو یک طرفہ طور پر ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو یہ بیع آپ کی رضامندی پر موقوف تھی،[1] اگر آپ نے ۲۵ ہزار میں زمین اُن کو دینے پر رضامندی کا اظہار کردیا ہو تو بیع صحیح ہوگئی،[2] اور بڑے بھائی اس کے مالک ہوگئے، اس میں جو چاہیں کرسکتے ہیں، اور اگر آپ نے اس بیع کو مسترد کردیا تھا تو آپ کے بڑے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین کو آپ کی امانت سمجھیں اور آپ پر واجب ہے کہ ان کے ۲۵ ہزار روپے واپس کردیں، لیکن اگر معاملہ اب تک مبہم چل رہا ہے تو آپ کو یہ چاہئے کہ ان کو خط لکھ کر بتادیں کہ آپ کتنی رقم میں وہ زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں، اس صورت میں آپ کے بھائی اگر اتنی رقم میں لینا چاہیں گے تو لے لیں گے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۰ھ
(فتویٰ نمبر ۶۳۷/ ۲۸ ب)

مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت

سوال:- چھوٹا بھائی اس بیع و شراء کو اَمانت ہی خیال کرتا ہے، ۲۵ ہزار روپے دے دینے سے بیع نہیں ہوسکتی، جبکہ طرفین سے خرید و فروخت پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی، یہ ضرور ہے کہ زمینِ مذکور چھوٹا بھائی کسی طرح بھی حاصل نہیں کرسکتا تھا اور نہ اب حاصل کرسکتا ہے، مجبورِ محض ہے۔ موجودہ زمانے میں یعنی ۱۹۷۱ء میں جائیداد کی قیمت لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، چھوٹا بھائی نہ صبر کرسکتا ہے اور زرِ نقد جو اُنہوں

(۱ و ۲) وفی مشکوٰة المصابیح ص: ۲۶۱ (طبع رحمانیہ) باب الغصب والعاریة عن أبی حرّة الرقاشی عن عمّہٖ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ألا لا تظلموا ألا لا یحلّ مال امرئ الّا بطیب نفس منه.

وفی شرحه: أی بالأمر أو بالاذن.

وفی المجلّة: لا یجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی .... الخ.

وفی الشامیة ج:۴ ص:۶۱ (طبع سعید) اذ لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی. وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۰۶ .... (من یتصرّف فی حقّ غیره)...... (بغیر اذن شرعی)......(کل تصرّف صدر منه) تملیکًا کان کبیع وتزویج أو اسقاطًا کطلاق واعتاق وله مجیز .... انعقد موقوفًا .... الخ.

وفی الهدایة کتاب البیوع فصل فی بیع الفضولی ج:۳ ص:۹۳ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن باع ملک غیره بغیر أمره فالمالک بالخیار ان شاء اجاز البیع وان شاء فسخ. وکذا فی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۱۳۴.

وفی مجلّة الأحکام کتاب البیوع رقم المادّة:۳۶۸ البیع الّذی یتعلّق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفًا علی اجازة ذٰلک الآخر .... الخ. وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۵۲ (طبع رشیدیه) اذا باع الرجل مال الغیر عندنا یتوقف البیع علی اجازة المالک ....الخ. نیز دیکھئے آگے صفحہ:۸۷ کا حاشیہ۔

نے دیا اس کو لینا چاہتا ہے، کل بھی اور آج بھی واپس کرنے کو تیار ہے۔ ۱۹۵۹ء سے قبل جب بیوی بچے ہندوستان میں تنگ دستی کے دن گزار رہے تھے، اگر یہ رقم قیمتِ جائیداد کہہ کر دیتے تو بہت ممکن تھا کہ یہ بات پیدا نہ ہوتی، اس لئے اتنی رقم سے بچے کچھ کام بھی کرتے اور تعلیم بھی جاری رکھتے، اور اللہ کی مرضی سے تنگ دستی بھی ختم ہوجاتی، جبکہ ایک شخص جائیدادِ مذکور کا ایک لاکھ سے بھی زیادہ دینے پر تیار ہوگیا تھا۔ چھوٹا بھائی اس وقت شریعت کا قانون جاننا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہتا ہے بڑا بھائی کروڑوں کا مالک ہے، چھوٹا بھائی اللہ تعالیٰ کی مرضی خیال کرتا ہے نہ کہ حسد و بغض۔

جواب:- آپ جواب غور سے پڑھتے تو دوبارہ سوال کی نوبت نہ آتی، جب آپ نے وہ ۲۵ ہزار روپے بطور امانت اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں اور بیع پر رضامندی بھی ظاہر نہیں کی تو زمین بدستور آپ کی ملکیت ہے، آپ کے بھائی پر واجب ہے کہ وہ زمین آپ کی رضامندی سے اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت آپ کے حوالے کریں، اور آپ ۲۵ ہزار روپے واپس کردیں، **لقوله تعالیٰ:** "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ"۔ (۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۷/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۳/۲۸ ب)

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کرکے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- تقسیمِ ہند کے بعد جب مہاجر پاکستان آئے تو ہنود کی کئی جگہوں پر قبضہ ہوا، عموماً ایسا بھی ہوا کہ جس کو جو گھر خالی مل گیا اس نے قبضہ کرلیا، وغیرہ۔ ایسے ہی ایک زمین پر ایک شخص کا قبضہ تھا، دُوسرے شخص نے اس سے وہ قطعہ خرید لیا اور قیمت ادا کردی، مگر بعد میں جب پیمائش کی تو سودے کی مقرّرہ مقدار سے ۳ یا ۴ مرلے زیادہ زمین مشتری کے پاس آگئی۔ اب اس کا کیا حل ہے؟ کیا ان چند مرلوں کی قیمت حکومت کو دیں یا بائع کے ورثاء کو دیں یا کچھ نہ کریں؟ کیونکہ قبضہ و مالکانہ تصرفات کا اختیار تھوڑے عرصے بعد ہی حکومت نے سنبھال لیا تھا، یہ معاملہ آج سے تقریباً ۳۸ سال قبل کا ہے۔ سائل متقی شخص ہے، کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مجھ پر اس کا وبال نہ آئے۔

جواب:- اس سوال کا جواب اس تنقیح پر موقوف ہے کہ جن لوگوں نے اس علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کیا، ان کا وہ قبضہ حکومت نے تسلیم کرکے ان کو مالک قرار دے دیا تھا یا

---

(۱) سورۃ النساء آیت نمبر: ۲۹.

نہیں؟ اگر مالک قرار دے دیا تھا تب تو یہ بیع دُرست ہوئی، اور جو زمین زائد مشتری کے پاس آئی وہ یا اس کی قیمت بائع کو لوٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر حکومت نے ان قابضین کو مالک قرار نہیں دیا تھا اور یہ بات مشتری کو بھی معلوم تھی تو یہ بیع دُرست نہیں ہوئی۔[1] اور اَب زائد زمین کی قیمت تو یقیناً حکومت ہی کو دینی ہوگی لیکن جتنی زمین پہلے قابض سے خرید کر حاصل کی اس کی قیمت بھی دیانۃً حکومت کو دینی چاہئے۔ ہاں! اگر مشتری کو یہ معلوم نہ تھا کہ قابض زمین کا مالک نہیں ہے، تو اس صورت میں بائع پر واجب ہے کہ وہ قیمت حکومت کو ادا کرے اور حکومت سے اس بیع کی اجازت حاصل کرکے مشتری کو دے، اگر حکومت نے قیمت قبول کرلی تو یہ حکماً اجازت ہوگی۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۱۱/۱/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵/۸۵)

مشتری کے قبضے سے پہلے اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو نقصان بائع کا متصوّر ہوگا

سوال:- مسمّی حافظ عبدالرشید صاحب نے ایک بھینس کا بچہ جس کی قیمت ایک سو دس روپیہ ٹھہری، بیعانہ میں پچاس روپے بائع کو دے دیئے، اور بائع نے یہ کہا: حافظ صاحب! یہ بھینس کا بچہ کس وقت لے جاؤ گے؟ حافظ صاحب نے کہا کہ: شام کو لے جاؤں گا یا کل آکر لے جاؤں گا۔ بیع کے وقت

---

(۱) کیونکہ ایسی صورت میں غیر مملوک کی بیع ہوئی جو دُرست نہیں۔

وفی جامع الترمذی وأبی داوٗد والنسائی عن عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندک. (مشکوٰۃ المصابیح ص:۲۴۸).

وفی المرقاۃ ج:۶ ص:۸۷ عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: نھانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن أبیع ما لیس عندی. رواہ الترمذی فی روایۃ لہ ولأبی داوٗد والنسائی: قال: قلت: یا رسول اللہ! یأتینی الرّجل فیرید منی البیع ولیس عندی فابتاع لہ من السوق، قال: لا تبع ما لیس عندک. ھٰذا یحتمل أمرین .... والثانی أن یبیع منہ متاعًا لا یملکہ ثم یشتریہ من مالکہ ویدفعہ الیہ وھٰذا باطل لأنّہ باع ما لیس فی ملکہ وقت البیع وھٰذا معنیٰ قولہ (قال ولا تبع ما لیس عندک) أی شیئًا لیس فی ملکک حال العقد.

وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۰۵ وشرط المعقود علیہ ستۃ: کونہ موجودًا مالًا متقوّمًا مملوکًا فی نفسہ وکون الملک للبائع فیما یبیعہ لنفسہ وکونہ مقدور التّسلیم فلم ینعقد بیع المعدوم .... ولا بیع ما لیس مملوکًا لہ .... الخ.

وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۶ ومنھا وھو شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکًا للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد .... وھٰذا بیع ما لیس عندہ، ونھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع ما لیس عند الانسان.

وکذا فی المبسوط للسرخسی ج:۱۳ ص:۸ و شرح المجلّۃ ج:۲ ص:۳۴۹.

وفی الدّر المختار کتاب البیوع ج:۵ ص:۵۸ (طبع سعید) وبطل بیع ما لیس فی ملکہ.

(۲) اور حقیقتاً یا حکماً اجازت لینا اس لئے ضروری ہے کیونکہ فضولی کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، عبارات و جزئیات ص:۸۰ اور ص:۸۷ کے حاشیہ نمبر ۱ و ۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بچہ صحیح وسلامت تھا، پھر حافظ صاحب حسبِ وعدہ دُوسرے روز نہیں جاسکے، تیسرے روز بچہ لینے گئے تو وہ بچہ مرچکا تھا۔ اب بائع بقایا قیمت کا حق دار ہے یا نہیں جو ادائیگی سے رہ گئی تھی یا بائع کو مشتری سے جو رقم لے چکا ہے وہ واپس کرنا ہوگی؟ شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں بھینس کے بچے کے مرنے سے نقصان بائع کا ہوا، مشتری کا نہیں، بائع نہ صرف باقی قیمت کا حق دار نہیں ہے بلکہ جو پچاس روپے اس نے وصول کئے تھے اُن کو بھی واپس کرنا اس پر واجب ہے، کیونکہ فریقین کے درمیان پچاس روپے کے بیعانہ پر جو بات چیت ہوئی اگر اسے عقدِ بیع کے بجائے وعدۂ بیع قرار دیا جائے تو یہ حکم ظاہر ہے کہ ابھی بیع ہوئی ہی نہ تھی، اور اگر اس بات چیت کو عقدِ بیع قرار دیا جائے تب بھی مشتری نے اس پر قبضہ نہیں کیا، اور قبضے سے پہلے مبیع بائع کے ضمان میں ہوتی ہے، قال فی ردّ المحتار وفی الفتح والدر المنتقی: لو هلك المبيع بفعل البائع أو بفعل المبيع أو بأمر سماويّ بطل البيع ويرجع بالثمن لو مقبوضًا ...... (شامی ج:۴ ص:۴۲، قبیل باب خیار الشرط)[1]۔

وفی الدر المختار: ثم التسليم يكون بالتخلية علىٰ وجه يتمكّن من القبض بلا مانع ولا حائل، وقال الشامی: لو اشترى بقرًا فی السرح فقال البائع: اذهب واقبض ان كان يرى بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضًا الخ. (ج:۴ ص:۴۳)[2]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۴۶/ ۲۸ ج)

---

(۱) ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۶۰ (طبع سعيد). وفی فتح القدير ج:۵ ص:۴۹۶ (طبع رشيديه كوئٹه) فلو هلك فی يد البائع بفعله أو بفعل المبيع بنفسهٖ بأن كان حيوانًا فقتل نفسه أو بأمر سماويّ بطل البيع فان كان قبض الثمن أعاده الى المشترى .... الخ. نیز دیکھئے خلاصة الفتاویٰ ج:۳ ص:۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۴ ص:۵۶۱ (طبع سعيد). وفی فتح القدير ج:۵ ص:۴۹۶ (طبع رشيديه كوئٹه) فی التّجريد تسليم المبيع أن يخلّی بينه وبين المبيع علىٰ وجه يتمكن من قبضه من غير حائل.
وفيه أيضًا ج:۵ ص:۴۹۷ (طبع رشيديه) اذ اشترىٰ بقرًا فی السّرح فقال البائع: اذهب واقبض ان كان يرىٰ بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضًا .... الخ.
وفی البحر الرّائق كتاب البيوع ج:۵ ص:۳۰۸ (طبع سعيد) وأمّا ما يصير بهٖ قابضًا حقيقة ففی التّجريد تسليم المبيع أن يخلّی بينه وبين المبيع علىٰ وجه يتمكّن من قبضه بغير حائل وكذا تسليم الثمن.
وفيه أيضًا ج:۵ ص:۳۰۹ وكذا لو اشترىٰ بقرًا فی السرح فقال البائع: اذهب فاقبض ان كان يرىٰ بحيث يمكنه الاشارة اليه يكون قبضًا .... الخ.
وفی الهندية ج:۳ ص:۱۶ وتسليم المبيع هو أن يخلّی بين المبيع وبين المشترى علىٰ وجه يتمكن المشترى من قبضه بغير حائل .... وأجمعوا علىٰ أنّ التّخلية فی البيع الجائز تكون قبضًا .... الخ.
وكذا فی خلاصه الفتاویٰ ج:۳ ص:۸۹ (طبع رشيديه كوئٹه) وبدائع الصنائع ج:۵ ص:۲۴۴ (طبع سعيد).

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنے کا حکم

سوال:- رمضان میں روزے کے دوران بیکری کا سامان فروخت کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور پتہ ہو کہ یہ شخص روزے کی حالت میں کھائے گا تو اُسے بھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز و مکرّم جناب طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رمضان میں بیکری کا سامان فروخت کرنا جائز ہے، البتہ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے دن کے وقت کھانے کے لئے خرید رہا ہے اسے بیچنا جائز نہیں،[1] معلوم نہ ہو کہ کیا کرے گا تو جائز ہے۔[2]

والسلام

واللہ اعلم

۸؍شعبان ۱۴۰۸ھ

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر کے کاروبار کا حکم

سوال:- ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی، وی سی آر کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ کرنا چاہئے یا نہیں؟

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- برادرِ عزیز و مکرّم طلعت محمود صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کی دُکان میں تو مضائقہ نہیں،[3] لیکن ٹی وی اور وی سی آر کا کاروبار کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتا،[4] لہٰذا اگر کوئی دُوسرا کاروبار کرسکیں تو زیادہ بہتر ہے، حتی الامکان اسی کی کوشش کریں۔

والسلام

۷؍۴؍۱۴۱۴ھ[5]

(۱ و ۲) جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ان دونوں صورتوں کا یہی حکم ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''....اگر (بیچنے والے کو) علم نہ ہو کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب یا گھر کرایہ پر لے کر اس میں صرف سکونت کرے گا یا کوئی ناجائز کام فسق وفجور کا کرے گا، اس صورت میں یہ بیع و اجارہ بلاکراہت جائز ہے، اور اگر اس کو علم ہے کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر شراب بنائے گا یا مکان کرایہ پر لے کر فسق وفجور کرے گا یا سودی کاروبار کرے گا یا جاریہ خرید کر اس کو گانے کے کام میں لگائے گا وغیرہ تو ایسی صورت میں یہ بیع و اجارہ مکروہ ہے .....اور معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو بغیر کسی تغیر وتصرف کے ....تو یہ صورت مکروہِ تحریمی ہے۔ تفصیل کے لئے حضرت مفتیٔ اعظم رحمہ اللہ کا رسالہ ''تفصیل الکلام فی مسئلة الاعانة علی الحرام'' جواھر الفقه ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۶۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳ و ۴) وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۴ (طبع سعید) ویجوز بیع آلات الملاھی من البربط والطبل والمزمار والدّف ونحو ذٰلک .... انّه یمکن الانتفاع بھا شرعًا من جھة اُخریٰ بأن تجعل ظروفًا لأشیاء ونحو ذٰلک من المصالح .... الخ.

وفی الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۴ ص:۳۰۲۹ (طبع دارالفکر) والضّابط عندھم (أی عند فقھاء الحنفیة) أنّ کل ما فیه منفعة تحلّ شرعًا فان بیعه یجوز لأنّ الأعیان خلقت لمنفعة الانسان.

نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے اگلا صفحہ: ۸۵ و ۸۶ کے حواشی۔

(۵) اس صفحے کے مذکورہ دونوں فتاویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے سائل موصوف کے خط کے جواب میں تحریر فرمائے۔ (محمد زبیر)

وی سی آر کے کاروبار کی شرعی حیثیت اور غلطی سے خریدے ہوئے وی سی آر کو بیچنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے اپنی حلال آمدنی سے دس یا بارہ ہزار کا ایک وی سی آر سیٹ خریدا تھا، جس پر وہ خود بھی فلمیں دیکھتا تھا، دُوسروں کو بھی دِکھاتا تھا، حق تعالیٰ نے دعوت وتبلیغ کے ذریعے اس کو ہدایت دی، بُرے کام چھوڑ دیئے اور صلوٰۃ وصوم کا پابند ہوگیا ہے، وہ اُسے بالکل استعمال نہیں کرتا۔ وہ پوچھتا ہے کہ اگر وی سی آر کو فروخت کروں تو وہ پیسہ میرے لئے حلال ہوگا یا حرام؟ یا کسی درجے میں کوئی حل ہے؟ اگر نہ بیچوں ویسے توڑ دوں تو مالی نقصان بہت ہے، جس وقت خریدا تھا وہ حلال آمدنی سے خریدا تھا، مزید یہ کہ جس کو فروخت کروں گا وہ فلمیں دیکھے گا، تو کیا اس کا گناہ بائع کو ہوگا؟

جواب:- وی سی آر کی بیع کو کاروبار کے طور پر اِختیار کرنا بحالتِ موجودہ تو دُرست نہیں،(۱) لیکن جو اِتفاقی صورت آپ نے لکھی ہے، اس میں بھی وی سی آر کی بیع کراہت سے خالی معلوم نہیں ہوتی،(۲) اس لئے احتیاط کے خلاف ہے۔ تاہم اگر صورتِ مسئولہ میں اُسے بیچ دیا تو چونکہ اس آلے کا کچھ صورتوں میں جائز طور پر استعمال کرنا بھی ممکن ہے، اس لئے اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۲۱۱ و ۲۱۲ (طبع سعید) (وضمن بکسر معزف) بکسر المیم آلة اللّهو. وقالا لا یضمن ولا یصحّ بیعها وعلیه الفتویٰ ملتقی.

وفی البحر الرّائق ج:۸ ص:۱۲۴ و ۱۲۵ (ومن کسر معزفًا ضمن) وهٰذا قول الامام وقالا لا یضمنها لأنّها معدة للمعصیة فیسقط تقومها کالخمر ـــ والفتویٰ فی زماننا علیٰ قولهما لکثرة الفساد .... (وصح بیع هٰذه الأشیاء) وهٰذا قول الامام وقالا لا یجوز بیع هٰذه الأشیاء لأنّها لیست بمال متقوّم.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۱۶ وما کان الغالب علیه الحرام لم یجز بیعه ولا هبته.

وفیها أیضًا ج:۵ ص:۱۳۱ ویجوز بیع البربط والطبل والمزمار والدّف والنّرد والاشباه ذٰلک فی قول أبی حنیفة رحمه الله وعندهما لا یجوز بیع هٰذه الأشیاء قبل الکسر .... والفتویٰ علیٰ قولهما .... الخ. وکذا فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة ج:۲ ص:۳۵۴.

(۲ و ۳) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۲۶۸ (طبع سعید) لا یکره بیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح والدّیک المقاتل والحمامة الطیارة لأنّه لیس عینها منکرًا وانّما المنکر فی استعمالها المحظور .... وعرف بهٰذا أنّه لا یکرہ بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح والحمامة الطیارة العصیر والخشب الّذی یتخذ منه المعازف.

وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۴۴ (طبع سعید) ویجوز بیع آلات الملاهی من البربط والطبل والمزمار والدّف ونحو ذٰلک عند أبی حنیفة رحمه الله، لکنه یکره وعند أبی یوسف ومحمد لا ینعقد بیع هٰذه الأشیاء لأنّها آلات معدّة للتّلهی بها موضوعة للفسق والفساد .... ولأبی حنیفة انه یمکن الانتفاع بها شرعًا من جهةٍ أُخریٰ.

وفی فتح القدیر فصل فی غصب مالا یتقوم ج:۸ ص:۲۹۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومن کسر لمسلم بربطًا أو مزمارًا أو دفا أو اراق له سکرًا أو منصّفًا فهو ضامن وبیع هٰذه الأشیاء جائز وهٰذا .... (باقی اگلے صفحے پر)

’’بیعِ فضولی‘‘ کی ایک مخصوص صورت کا حکم

سوال:- مندرجہ ذیل فیصلہ ایک مولوی صاحب نے میری موجودگی میں کیا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ شریعت کے مطابق ہے۔ ایک عورت کو جہیز میں سامان کے ساتھ ایک بیل دیا گیا جس کی وہ مالک تھی، اُس کے شوہر نے وہ بیل چالاکی سے اپنی بیوی کے قبضے سے نکالنا چاہا، ایک آدمی کو اپنی بیوی کے پاس بھیجا کہ جا کر کہو کہ بیل تمہارا لڑکا مانگ رہا ہے، عورت نے اپنے فرزند کو دینے کے لئے وہ بیل آنے والے شخص کے حوالے کر دیا۔ دُوسرے دن جب عورت کو معلوم ہوا کہ بیل لڑکے کو نہیں ملا تو اُسے تشویش ہوئی اور بیل لے جانے والے شخص سے معلوم کیا کہ بیل کہاں ہے؟ تو لے جانے والے شخص نے بتایا کہ وہ بیل دراصل تمہارے شوہر سے میں نے نو سو روپے میں خریدا ہے۔ اس پر عورت نے کہا کہ یہ بیل مجھے جہیز میں ملا ہے، میرے شوہر کی ملکیت نہیں ہے، تم نے کس طرح خریدا؟ مجھے بیل واپس کرو۔ عورت شوہر پر برہم ہوئی کہ تم نے پیسے کیوں لئے جبکہ یہ میری ملکیت ہے؟ مجھے واپس دِلاؤ، کیوں فروخت کیا؟ بیل خریدنے والے نے یہ بیل اپنے بھائی کے ہاتھ فروخت کر دیا، عورت نے اُس کے بھائی سے کہا کہ یہ میرا بیل واپس کرو، اُس کے بھائی نے کہا کہ جتنے میں خریدا ہے میری رقم واپس کردو، بیل دے دُوں گا۔ بیل واپس لینے والے شخص نے اِس شخص کے بھائی کا اُونٹ خریدنے والے بھائی کو دے دیا کہ یہ تمہارے بھائی کا اُونٹ ہے، اس کو رکھ لو، وہ تمہارے بیل کے پیسے دے کر اُونٹ لے جائے گا، اور بیل اس عورت کی ملکیت ہے اسے واپس کرو۔ دُوسرے دن وہ چار آدمی لے کر بیل کے مالک کے پاس آئے اور کہا کہ بیل واپس کرو، شوہر نے کہا کہ بیل میرا نہیں ہے، میری بیوی کا ہے، وہ بیچنا نہیں چاہتی، اب تمہارے بیل کے پیسے جو میں نے بیل فروختگی کے عوض لئے تھے وہ رقم میری بقایا رقم چار ہزار میں سے وضع کر کے دیں، مجبوراً وہ لوگ واپس چلے گئے۔ تقریباً پندرہ یوم کے بعد وہ لوگ بیل چرا کے لے گئے، تھانے میں رپورٹ درج کرائی، معاملہ مولوی صاحب پر ڈالا گیا کہ وہ فیصلہ کردیں، بیل والی کے شوہر نے بیان دیا کہ بیل میں نے فروخت نہیں کیا تھا بلکہ زمین آباد کرنے کے لئے دیا تھا اور جو پیسے اس بیل پر لئے ہیں وہ میرے چار ہزار قرضے والی رقم سے وضع کرلیں۔ دونوں فریقین کے پاس بیل کے لین دین کا گواہ نہیں تھا، دونوں قرآن شریف اُٹھانے کو تیار تھے، اور کہتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ..... عند أبی حنیفة، وقال أبو یوسف ومحمد رحمهما الله لا یجوز بیعها ولأبی حنیفةؒ أنّها أموال لصلاحیتها لما یحل من وجوه الانتفاع وان صلحت لما لا یحل فصار کالأمة المغنیة وهٰذا لأنّ الفساد لفعل فاعل مختار فلا یوجب سقوط التقوّم.

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۱ وجاز بیع عصیر عنب ممن یعلم انه یتخذه خمرًا لأنّ المعصیة لا تقوم بعینہٖ بل بعد تغیّره وقیل یکره لاعانته علی المعصیة .... بخلاف بیع أمرد ممن یلوط به وبیع سلاح من أهل الفتنة لأن المعصیة تقوم بعینہٖ. وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۱۰، وراجع للتفصیل جواهر الفقه ج:۲ ص:۴۳۹ الیٰ ص:۴۶۲ (طبع مکتبه دارالعلوم).

کہ بیل جو ہم رات کو لے گئے یہ چوری نہیں ہے بلکہ اپنی خریدی ہوئی چیز لے گئے، دُوسرا فریق کہتا ہے کہ میں نے فروخت نہیں کیا، کوئی گواہ موجود ہو تو پیش کریں۔

مولوی صاحب کا فیصلہ

۱:- بیل فروخت ہوچکا ہے کیونکہ مالکہ سات سو روپے کے عوض بیل کیوں واپس لینے کو تیار تھی؟ آخر کیا مصلحت تھی؟

۲:- بیل چوری نہیں ہوا کیونکہ اُن کی خریدی ہوئی چیز تھی، اگر جرم ہے تو بیل فروخت کرنے والے کا، پھر تھانے میں کیوں رپورٹ درج کرائی؟ شوہر کہتا ہے کہ بیل میری بیوی کی ملکیت ہے، میرا چار ہزار باقی ہے اس میں یہ رقم منہا کرلی جائے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ فیصلہ صحیح ہے، فریقین کو ماننا پڑے گا۔

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات سب دُرست ہیں، تو بیل بدستور اُس عورت کی ملکیت ہے، اور اُس کے شوہر نے اگر اُس بیل کو فروخت کردیا ہو تب بھی یہ بیع دُرست نہیں ہوئی،[1] کیونکہ وہ بیل کا مالک نہیں تھا، مالک اُس کی بیوی تھی جس نے نہ خود بیع کی اور نہ اس نے بیع کی اجازت دی، لہٰذا یہ بیع باطل ہوئی،[2] اور اب جبکہ بیل اصل مالکہ کے پاس آگیا تو اس کی رضامندی کے بغیر اُسے وہاں سے لے جانا جائز نہیں۔ جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق مولوی صاحب کا فیصلہ دُرست نہیں، البتہ اُن کے سامنے معاملے کی کوئی دُوسری صورت لائی گئی ہو تو بات دُوسری ہے۔ عورت نے جو سات سو روپے کی ادائیگی کی پیشکش کی اُسے شرعاً بیع پر رضامندی نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اپنے شوہر کے دَین کی ادائیگی پر تبرّعاً راضی ہوجانا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۶۰/۲۷ و)

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۰۶ فصل فی الفضولی هو من یتصرّف فی حق غیره بغیر اذن شرعی کل تصرّف صدر منه تملیکًا کان کبیع وتزویج، او إسقاطًا کطلاق و إعتاق (وله مجیز) أی لهٰذا التصرّف من یقدر علیٰ اجازته حال وقوعه انعقد موقوفًا.

وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۵۲ اذا باع الرجل مال الغیر عندنا یتوقف البیع علیٰ اجازة المالک .... الخ.

وکذا فی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۳ ص:۱۳۴.

وفی الهدایة کتاب البیوع فصل فی بیع الفضولی ج:۳ ص:۸۸ ومن باع ملک غیره بغیر أمره فالمالک بالخیار ان شاء أجاز البیع وان شاء فسخ.

وفی مجلّة الأحکام کتاب البیوع رقم المادّة:۳۶۸ البیع الّذی یتعلّق به حقّ الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفًا علیٰ اجازة ذٰلک الآخر.

سودی بینک کے لئے مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کا حکم

سوال:- سودی بینک کے لئے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فروخت کرنے کی صورت میں ملنے والی رقم حلال ہے یا حرام؟ محمد عامر (اُستاذ جامعۃ الرشید)

جواب:- چونکہ بینک کے سرمایہ کی اکثریت حرام نہیں، اس لئے بیچنے کی گنجائش تو معلوم ہوتی ہے،(۱) لیکن کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۲/۲۹ھ

اسمگل شدہ گھڑیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- اسمگلنگ کی گھڑیاں جو آدھی قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں، ان کی خرید کیسی ہے؟

جواب:- اگر ان گھڑیوں کی خرید میں جھوٹ بولنا یا کسی اور گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو خریدنا جائز ہے۔(۳)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۳۲/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

سگریٹ کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- سگریٹ بیچنا کیسا ہے؟ دُکان پر دیگر اشیاء کے ساتھ سگریٹ بھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ طلعت محمود

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار ج:۴ ص:۲۶۸ باب البغاۃ (طبع سعید) قلت وافاد کلامھم ان ما قامت المعصیۃ بعینہٖ یکرہ بیعہ تحریمًا والّا فتنزیھًا (قولہ نھر) وعبارتہ وعرف بھٰذا أنّہ لا یکرہ بیع ما لم تقم المعصیۃ بہ کبیع الجاریۃ المغنیۃ بہ والکبش النطوح والحمامۃ الطیارۃ والعصیر والخشب ممن یتخذ منہ المعازف.

وکذا فی البحر الرائق ج:۵ ص:۱۴۳ (طبع سعید) وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ کتاب الاجارۃ ج:۲ ص:۱۵۳.

نیز تفصیل کے لئے دیکھئے جواہر الفقہ ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۶۲۔

(۳) ''اسمگلنگ'' سے متعلق تفصیلی حکم اور حوالہ جات کے لئے ص:۹۰ کا فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ اور بیع میں جھوٹ اور دھوکے سے بچنے سے متعلق حوالہ جات ص:۱۰۲ تا ص:۱۰۴ کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- سگریٹ فروخت کرنا حرام نہیں ہے،[۱] لیکن کچھ اچھا بھی نہیں ہے، اگر اس کے بغیر کام چل سکے تو خیر، ورنہ بیچنے کی گنجائش ہے۔

والسلام
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵رشعبان ۱۴۰۷ھ

سگریٹ کی خرید وفروخت اور اس کی کمائی کا حکم

سوال:- سگریٹ ایجنسی کی کمائی کیسی ہے؟ اور سگریٹ پینا حرام تو نہیں؟

جواب:- سگریٹ پینا حرام نہیں، اس کی ایجنسی کی کمائی بھی حلال ہے۔[۲] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷/۱۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

اسمگلنگ کی شرعی حیثیت

سوال ا:- اسمگلنگ جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں، جبکہ حکومت کی طرف سے یہ کاروبار بند ہے اور عزّت کا بھی خطرہ ہے۔

۲:- اگر ملک کے اندر یہ چیزیں پہنچ جائیں تو بعد میں ملک کے اندر علی الاعلان اُس کی تجارت کی جاتی ہے، کیا ایسا سامان خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

۳:- بعض لوگ ملک کی سرحدوں پر رہتے ہیں، مثلاً ایران کی سرحد پر تو یہ لوگ اپنی ضروریات پاکستان اور ایران دونوں جگہ سے پوری کرتے ہیں، ان کے جواز کی صورت ہے؟

۴:- اگر کوئی شخص خود اِیران نہ جائے بلکہ اپنے ایرانی دوست کو لکھ کر اپنے لئے سامان منگوائے اور وہ خرید کر روانہ کردے۔ مثلاً ایران سے آج کل موٹر سائیکلیں مکران کے راستے بہت آرہی ہیں، لوگ اُدھر خرید کر لوگ مجبوراً کراچی میں اُس کے کاغذات بنواتے ہیں، چونکہ بغیر کاغذات کے چلانا

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۴۵۴ (طبع سعید) وصحّ بیع غیر الخمر ممّا مر ومفاده صحة بیع الحشیشة .... الخ.
وفی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة مسائل وفوائد شتّٰی ج:۲ ص:۳۶۶ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه) وبالجملة ان ثبت فی هٰذا الدّخان اضرارٌ صرف خال عن المنافع فیجوز الافتاء بتحریمه وان لم یثبت انتفاعه فالأصل حلّه مع ان فی الافتاء بحلّه دفع الحرج عن المسلمین فان أکثرهم مبتلون بتناوله مع ان تحلیله أیسر من تحریمه وما خیّر رسول الله صلی الله علیه وسلم بین أمرین الا اختار أیسرهما.
وفی مجموعة الفتاویٰ کتاب البیوع ج:۲ ص:۱۲۷ أما بیعها وشرائها فیجوز لامکان الانتفاع بها.
نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیه ص:۴۸۸ و کفایت المفتی ج:۹ ص:۱۴۸ (طبع جدید دار الاشاعت).

منع ہے کراچی میں نمبر حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار خرچ ہوتا ہے، عوام و خواص اس میں مبتلا ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب ۱ تا ۴:- اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضرورت یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے،[1] لہٰذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جاکر بیچنا شرعاً مباح ہے،[2] لیکن ایک صحیح اسلامی حکومت اگر عام مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کسی مباح چیز پر پابندی عائد کردے تو اس کی پابندی کرنا شرعاً بھی ضروری ہوجاتا ہے،[3] اب موجودہ مسلمان حکومتوں نے چونکہ اسلامی قوانین کو ترک کرکے غیر اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہیں، لہٰذا ان کو وہ اختیارات نہیں دیئے جاسکتے جو صحیح اسلامی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن اُن کے اَحکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ رقم المادّة:۱۱۹۲ ج:۳ ص:۱۳۲ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء. وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۱۴۰ رقم المادة:۱۱۹۷ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) لا یمنع أحد من التصرّف فی ملکه أبدًا الّا اذا کان ضررهٗ لغیره فاحشاً.

وکذا فی ردّ المحتار ج:۵ ص:۴۴۸ (طبع سعید).

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا ینبغی للسلطان أن یسعر علی النّاس لقوله علیه السلام: "لا تسعّروا فانّ الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق. ولأنّ الثمن حقّ العاقد فالیه تقدیره فلا ینبغی للامام أن یتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامة.

وکذا فی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۲۹ والدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۸ وللبائع أن یبیع بضاعته بما شاء من ثمن ولا یجب علیه أن یبیعه بسعر السوق دائمًا وللتجّار ملاحظة مختلفة فی تعیین الاثمان وتقدیرها ..... الخ.

(۳) وفی أحکام القرآن للمحدّث العلّامة ظفر أحمد العثمانی رحمه الله ج:۲ ص:۲۹۲ طبع ادارة القرآن وهٰذا الحکم أی وجوب طاعة الأمیر مختص بما اذا لم یخالف أمره الشرع یدل علیه سیاق الآیة فانّ الله تعالیٰ أمر النّاس بطاعة اُولی الأمر بعد ما أمرهم بالعدل فی الحکم تنبیهًا علیٰ أن طاعتهم واجبة ما داموا علی العدل اهـ. وکذا فی تفسیر المظهری ج:۲ ص:۱۵۲ والجامع لأحکام القرآن ج:۵ ص:۲۵۹.

وفی الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج:۲ ص:۱۷۲ (طبع سعید) تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة.

وفیها أیضًا ج:۶ ص:۴۶۰ وفی شرح الجواهر تجب اطاعته فیما اباحه الشّرع وهو ما یعود نفعه علی العامّة وقد نصّوا فی الجهاد علیٰ امتثال أمره فی غیر معصیة.

وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۱۶۷ (طبع سعید) (قوله یعزّر) لأنّ طاعة أمر السلطان بمباح واجبةٌ. وفی الدّر المختار کتابُ الجهاد باب البغاة ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید) لأنّ طاعة الامام فیما لیس بمعصیة فرض .... الخ.

وفی الأشباه والنظائر ج:۱ ص:۱۵۷ تصرّف الامام بالرّعیة منوطٌ بالمصلحة.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۳ ص:۳۲۳ وص:۳۲۴ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) المسلم یجب علیه أن یطیع أمیرهٗ فی الأمور المباحة فان أمر الأمیر بفعل مباح وجبت مباشرته وان نهی عن أمر مباح حرم ارتکابه .... ومن هنا صرّح الفقهاء بأن طاعة الامام فیما لیس بمعصیة واجبة .... هٰذه الطاعة کما أنّها مشروطة بکون أمر الحاکم غیر معصیة فانّها مشروطة أیضًا بکون الأمر صادرًا عن مصلحة لا عن هویٰ أو ظلم لأنّ الحاکم لا یطاع لذاته وانّما یطاع من حیث أنّه متولّ لمصالح العامّة اهـ.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۱۶۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) کل من یسکن دولة فانّه یلتزم قولًا أو عملًا بانّه یتبع قوانینها وحینئذٍ یجب علیه اتباع أحکامها ..... الخ.

عزّت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہٰذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے۔[1] اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اِختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔[2] اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اصلاً باہر کے ملک سے مال لے کر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اس سے اِجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۷۷/۲۸ ج)

سوتر منڈی فیصل آباد میں پرچی کے ذریعے خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:- بخدمت اقدس سیّدی ومرشدی حضرت شیخ الاسلام مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرتِ والا بعافیت تمام ہوں، حق تعالیٰ حضرتِ والا کا قیمتی سایہ صحت وعافیتِ کاملہ کے ساتھ سلامت رکھیں، اور اس ناکارہ کو حضرتِ والا کے فیوض سے فہمِ سلیم کے ساتھ بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں سوتر منڈی میں پرچی کے کاروبار کی ایک صورت چل رہی ہے، جس کا حکمِ شرعی معلوم کرنے کے لئے احقر نے ایک تحریر مرتب کی ہے۔ یہ تحریر بغرضِ راہنمائی حضرتِ والا کی خدمت میں اِرسال کر رہا ہوں۔ چونکہ کاروباری طبقے کو حضرتِ والا کی رائے گرامی پر کافی اِعتماد ہے اس لئے حضرتِ والا سے درخواست ہے کہ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ احقر اِن شاء اللہ کسی وقت فون پر اس کاروبار کی صورتِ حال ذِکر کر کے حضرتِ والا کی رائے معلوم کرلے گا۔

آخر میں حضرتِ والا سے دُعاؤں کی درخواست ہے۔

والسلام
خویدکم
محمد عالمگیر غفرلہٗ
دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد
۱۸/۶/۱۴۲۴ھ

(۱و۲) دیکھئے پچھلے صفحے کے حواشی۔

مسئلے کی تفصیلی صورت

سوتر منڈی فیصل آباد میں کاروبار کی ایک صورت عام چل رہی ہے کہ ایک شخص کسی دُکان دار سے سوتر خریدتا ہے، دُکان دار نے جو مال فروخت کیا ہے وہ اس کے گودام میں موجود ہوتا ہے اور خریدار کو بھی فروخت کنندہ کے گودام میں مال کی موجودگی کا بھروسہ ہوتا ہے۔ سودا طے پا جانے کے بعد فروخت کنندہ اس مال کی وصول کی پرچی جسے ڈیلیوری آرڈر کہا جاتا ہے خریدار کے حوالے کردیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ خریدار جب چاہے فروخت کنندہ کے گودام سے مال اُٹھواسکتا ہے۔ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے بعد خریدار عموماً گودام سے مال نہیں اُٹھواتا بلکہ اسی آرڈر کی بنیاد پر یہ مال آگے کسی تیسرے شخص کو فروخت کردیتا ہے۔ خرید وفروخت کے مذکورہ معاملے کے بارے میں سوتر منڈی کے مختلف حضرات سے تفصیلات معلوم کرنے پر یہ اُمور سامنے آئے:

۱- جب تک فروخت شدہ مال اصل فروخت کنندہ کے گودام میں موجود ہے، اس وقت تک وہ مال اسی کے ضمان میں رہتا ہے، لہٰذا اگر خدانخواستہ گودام کو آگ لگ جائے یا گودام میں موجود مال کسی اور طریقے سے ضائع ہوجائے تو یہ نقصان خریدار (ڈیلیوری آرڈر وصول کرنے والے) کا نہیں بلکہ اصل فروخت کنندہ کا سمجھا جاتا ہے۔

۲- گودام میں سوتر کے بورے کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں، لہٰذا خریدار کے لئے گودام کے اندر اپنا مال دُوسرے مال سے الگ جگہ پر رکھوانا یا کم از کم اس کی تعیین کرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر کوئی خریدار اس کا مطالبہ کر بھی لے تو پلے داروں (مال کی حفاظت اور اس کے اُٹھوانے پر مامور ملازمین) کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ آپ کا خریدا ہوا مال پیچھے ہے، اور اس کے آگے دُوسرے بورے رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا مال الگ جگہ رکھوانے یا اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اس کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے آگے موجود سارا مال اُٹھایا جائے اور پھر تعیین یا تمییز کی جائے، اور یہ ان لوگوں کے لئے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

۳- فروخت کنندہ کے گودام میں کثیر مقدار میں مال آتا بھی رہتا ہے اور ساتھ ساتھ نکلتا بھی رہتا ہے، اب فروخت کنندہ اپنے آپ کو اس کا پابند نہیں سمجھتا کہ جو مال اس نے ایک شخص کو فروخت کردیا ہے وہ اسے اپنے گودام میں سنبھال کر رکھے بلکہ وہ بسااوقات اسی مال کی ڈیلیوری کسی اور کو بھی کروادیتا ہے، لیکن چونکہ اس کے گودام میں مال بکثرت آ بھی رہا ہوتا ہے اس لئے اسے اطمینان ہوتا

ہے کہ جب بھی خریدار مال اُٹھوانا چاہے گا تو اسے مطلوبہ کوالٹی کا مال اُٹھوادیا جائے گا۔

۴- نیز اس پرچی (ڈیلیوری آرڈر) کی بنیاد پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس مال کی خرید وفروخت ہوتی رہتی ہے جبکہ مال ابھی اصل فروخت کنندہ کے گودام میں ہی ہوتا ہے۔ بسااوقات ایک مختصر وقت میں یہ مال متعدّد ہاتھوں میں فروخت ہوچکا ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ آخری خریدار یہ مال سب سے پہلے فروخت کنندہ کے گودام سے اُٹھوالیتا ہے، محض فرق برابر کرنے یا سٹہ کرنے کا اِمکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب ایسی صورت میں تھوڑے وقفے کے بعد مال کی تعیین یا تفریق پر پلے دار قطعاً آمادہ نہیں ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی تعیین مشکل ہے۔

مذکورہ بالا صورت کے شرعی حکم پر غور کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ پیچھے دی گئی تفصیل کے مطابق محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی شرعی قبضہ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کے باوجود فروخت شدہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہتا ہے، مارکیٹ کے عرف کے مطابق اس کا ضمان خریدار کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا گودام سے مال اُٹھوائے یا اپنا مال الگ کئے بغیر محض ڈیلیوری آرڈر کی وصولی کی بنیاد پر ہی یہ مال آگے فروخت کیا جارہا ہے، تو یہ بیع قبل القبض ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

اس صورت کے عدمِ جواز کے بارے میں مارکیٹ کے بعض متدین احباب سے جب گفتگو کی گئی تو ان کا سوال یہ تھا کہ اگر ہم مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف دیانۃً خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرلیں، مثلاً اگر خدانخواستہ فروخت کنندہ کے گودام کو آگ لگ جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس میں موجود مال جل کر ضائع ہوجاتا ہے تو اپنے خریدے ہوئے بوروں کی حد تک ہم اس نقصان کے ذمہ دار ہوں گے (اگرچہ خریدار کے اس ضمان کے بارے میں فروخت کنندہ کو بتایا نہیں جائے گا، کیونکہ اس صورت میں فروخت کنندہ کی طرف سے بددیانتی کا خدشہ ہے) تو پھر ہمارے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر اس مال کو آگے فروخت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سوال پر مزید غور ومشاورت کے بعد جو اُمور سامنے آئے، انہیں ذیل میں نمبروار درج کیا جارہا ہے:-

۱- قبضے میں بنیادی چیز اِنتقالِ ضمان (رِسک) ہے، لہٰذا اگر کسی جگہ حسی قبضہ نہ ہوسکے البتہ خریدی ہوئی چیز کا ضمان خریدار کی طرف منتقل ہوجائے تو اسے بھی قبضہ ہی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر

کمپنی کے شیئرز ہیں۔ شیئرز کی خرید وفروخت درحقیقت کمپنی کے مشاع اثاثوں کی خرید وفروخت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مشاع اثاثوں پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہٰذا اِنتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: فقہی مقالات ج:۱ ص:۱۵۴)۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں بھی اگر خریدار رِسک قبول کرنے کے لئے تیار ہے تو اس کے لئے محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید وفروخت جائز ہونی چاہئے۔

لیکن اس صورت کے جواز کا فتویٰ دینے میں کچھ اِشکالات ہیں جو ذیل میں درج ہیں:

الف:- شیئرز اور مجوث عنہ صورت میں واضح فرق ہے، وہ یہ کہ شیئر ہولڈرز اگر خریدے ہوئے شیئرز کی پشت پر موجود اَثاثوں کی تعیین یا ان کا افراز کرانا چاہے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہے، اس لئے وہاں اِنتقالِ ضمان کو ہی کافی سمجھا گیا ہے، بخلاف مجوث عنہ صورت کے کہ اس میں فروخت شدہ مال کی تعیین وافراز مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور درحقیقت یہ مشکل بھی کاروباری طبقے کے عام رواج اور کاروبار کی تیز رفتاری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کمپنی کو اس مسئلے کی نظیر بنانا مشکل ہے۔

ب:- پھر شیئرز کی خرید وفروخت کی صورت میں اسٹاک ایکسچینج اور شیئرز کا کاروبار کرنے والے لوگوں کا عام عرف ہی یہ ہے کہ شیئرز خریدتے ہی رِسک خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اگرچہ شیئر سرٹیفکیٹ پر ابھی تک قبضہ نہ ہوا ہو۔ جبکہ مجوث عنہ صورت میں عرف اس کے خلاف ہے، خریدا ہوا مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں ہے اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں سمجھا جاتا ہے۔ اس عرفِ عام کے خلاف اگر کوئی شخص اِنفرادی طور پر اس مال کی ضمان قبول کرلیتا ہے تو اسے قبضہ قرار دینے سے دیگر کاروباری اَفراد کے غلط فہمی میں واقع ہوجانے کا خطرہ ہے، خاص طور پر جبکہ خریدار اپنی اس ضمان کے متعلق فروخت کنندہ کو آگاہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

ج:- زبانی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جو خریدار ڈیلیوری آرڈر ملتے ہی فروخت کنندہ کے گودام میں موجود خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرنے کے لئے تیار ہیں وہ بھی صرف اس صورت میں رِسک قبول کریں گے جبکہ خدانخواستہ فروخت کنندہ کے گودام میں موجود سارا کا سارا مال ضائع ہوجائے۔ اس صورت میں یہ اپنے خریدے ہوئے مال کی حد تک ضامن بننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر گودام میں موجود سارا مال نہیں بلکہ کچھ مال ضائع ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ تعیین کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ بہت مشکل ہے، اور اس میں نزاع کا بھی شدید خطرہ ہے، نیز خریدار اس صورت میں

ضامن بننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خریدار نے خریدے ہوئے مال کا رِسک مکمل طور پر قبول نہیں کیا۔ جبکہ کمپنی میں یہ صورتِ حال نہیں، کیونکہ کمپنی کے تمام اثاثے مشاعاً تمام شیئر ہولڈرز کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا جزوی طور پر اَثاثوں کے ضائع ہونے کی صورت میں تمام شیئر ہولڈرز اپنے حصے کے تناسب سے اس نقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

د:- اور آخری اِشکال یہ ہے کہ محض ڈیلیوری آرڈر کی بنیاد پر آگے خرید وفروخت کو جائز قرار دینے سے کہیں سٹے کا دروازہ نہ کھل جائے، چنانچہ مارکیٹ کے بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں سٹے کا کاروبار رہا ہے، اور اَب بھی سٹہ چلتا ہے، لیکن بہت کم۔

ان چار وجوہ کی بنیاد پر خریدار اگر اپنے طور پر خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کر بھی لے تو بھی اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردّد ہے۔

۲- ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جس وقت مال فروخت کنندہ کے گودام میں بوروں کی شکل میں آرہا ہے اسی وقت یا مال تیار کرتے وقت ملز کی طرف سے ہی ان بوروں پر کوئی سیریل نمبر لگادیا جائے۔ پھر جب بوروں کا سودا ہوا تو فروخت کنندہ ڈیلیوری آرڈر پر فروخت شدہ بوروں کا نمبر بھی لکھ دے۔ مثلاً اگر خریدار نے سو بورے خریدے ہیں تو دُکان دار ڈیلیوری آرڈر پر تعیین کردے کہ بورہ نمبر۱۰۱ سے بورہ نمبر۲۰۰ تک فروخت کیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ فروخت شدہ مال کی تعیین کے لئے افراز یا کسی اور عمل کی ضرورت نہیں رہے گی اور خریدار مارکیٹ کے عرف کے خلاف اپنے طور پر اگر اس مال کا رِسک قبول کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن ہوگا اور خدانخواستہ گودام میں موجود مال کا کچھ حصہ ضائع ہوجانے کی صورت میں یہ معلوم کرنا بھی آسان ہوگا کہ کس کا مال ضائع ہوا ہے؟ جس کی وجہ سے باہم نزاع کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

لیکن اس تجویز کے بارے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

الف:- جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مارکیٹ کا عام عرف یہی ہے کہ مال جب تک فروخت کنندہ کے گودام میں موجود رہے گا، اس وقت تک وہ اسی کے ضمان میں رہے گا، خریدار کی طرف اس کا ضمان منتقل نہیں ہوگا۔ اور مجوّزہ صورت میں خریدار مارکیٹ کے عام عرف کے خلاف صرف اپنی دیانت پر خریدے ہوئے مال کا رِسک قبول کرے گا، اور قبولِ رِسک کے بارے میں فروخت کنندہ کو بالکل آگاہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسے خطرہ ہے کہ اگر میں فروخت کنندہ کو اپنے رِسک کے متعلق آگاہ کروں گا تو وہ

بددیانتی کا مرتکب ہوگا۔ مثلاً کسی تیسرے شخص کو یہی مال اُٹھوادے گا اور مجھے یہ کہے گا کہ آپ کا مال چوری ہوگیا ہے، اور چونکہ رِسک آپ کا تھا اس لئے یہ مال آپ کا ضائع ہوا ہے، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس جیسے خطرات کے پیشِ نظر خریدار فروخت کنندہ کو اپنے رِسک کے متعلق آگاہ نہیں کرنا چاہتا۔ اب قابلِ غور یہ ہے کہ کیا قبضہ متحقق ہونے کے لئے اس طریقے پر رِسک قبول کرنا کافی ہوگا؟

ب:- بوروں پر سیریل نمبر لگانے کی تجویز گو فی نفسہٖ قابلِ عمل ہے، لیکن تجار کے اَحکامِ شرعیہ کے ساتھ قلّتِ اعتناء اور حلال وحرام کی فکر نہ ہونے کے پیشِ نظر اس پر عمل ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ چند گنتی کے افراد اس تجویز کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو سوتر کے خریدار ہیں، نہ کہ گودام مالکان اور فروخت کنندگان، اس لئے یہ تجویز صرف تصوّر کی حد تک ہوگی جس کا کوئی عملی وجود نہیں ہوگا۔

۳- یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے کہ خریدے ہوئے سوتر کو آگے فروخت کرنے کے لئے اس پر قبضے کو شرط قرار دِیا جائے جیسا کہ حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب ہے۔ لیکن مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ صرف طعام میں بیع قبل القبض ناجائز ہے۔ طعام کے علاوہ باقی اشیاء میں بیع قبل القبض ناجائز نہیں۔ اِمام احمدؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔ اس وقت خاص طور پر سوتر منڈی میں سوتر کی بیع قبل القبض کا عام اِبتلاء ہے، اور مارکیٹ کی صورتِ حال یہ ہے کہ گو کچھ افراد بیع قبل القبض سے بچنے اور قبضے کے بعد مال فروخت کرنے پر تیار ہوں گے، لیکن عام لوگوں کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے۔ اس لئے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اس صورتِ حال میں مالکیہ کے مذہب پر فتویٰ دے دیا جائے، کیونکہ معاملات میں توسع کی بناء پر اِفتاء بمذہب الغیر کے نظائر خاص طور پر موجودہ زمانے میں کم نہیں۔ نیز کاروبار کا ایک طریقہ جو لوگوں میں رَواج پاچکا ہے، اس سے انہیں ہٹانا خاصا دُشوار اور ان کے لئے حرج کا باعث ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے پھلوں کی بیع کی ایک صورت میں ظاہر الروایۃ سے عدول کرنے کی وجہ یہی ارشاد فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

(قوله وأفتى الحلواني بالجواز) وزعم أنه مروى عن أصحابنا وكذا حكى عن الامام الفضلي، وقال استحسن فيه لتعامل الناس وفى نزع الناس عن عادتهم حرج، قال في الفتح: وقد رأيت رواية فى نحو هذا عن محمد فى بيع الورد على الأشجار فان الورد متلاحق، وجوز البيع فى الكل وهو قول

مـالک قال الزيلعي: وقال شمس الأئمة السرخسي: والأصح أنه لا يجوز لأن المصير الٰى مثل هٰذه الطريقة عند تحقق الضرورة ولا ضرورة هنا لأنه يمكنه أن يبيع الأصول علٰى ما بينا .... قلت: لٰكن لا يخفى تحقق الضرورة في زماننا ولا سيما في مثل دمشق الشام كثيرة الأشجار والثمار فانه لغلبة الجهل على الناس لا يمكن الزامهم بالتخلص بأحد الطرق المذكورة، وان أمكن ذٰلك بالنسبة الٰى بعض أفراد الناس لا يمكن بالنسبة الٰى عامتهم وفي نزعهم عن عادتهم حرج كما علمت. (شامي ج:۴ ص:۵۵۵).

لیکن مجوث عنہ صورت میں مالکیہ کے مذہب کے مطابق بیع قبل القبض کے جواز کا فتویٰ دینے میں سٹے کا دروازہ بھی کھلنے کا خطرہ ہے، اس لئے اس کے جواز کا فتویٰ دینے میں تردّد ہے۔

آنجناب سے درخواست ہے کہ مذکورہ مسئلے کے متعلق اپنی قیمتی رائے سے آگاہ فرمادیں اور پیچھے ذکر کی گئی صورتوں میں سے جوصورت زیادہ مناسب ہو یا کوئی اور صورت جو آنجناب کے ذہن میں ہو تحریر فرمادیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد عالمگیر غفرلہٗ
دارالافتاء سوتر منڈی فیصل آباد
۱۴۲۴/۶/۱۷ھ

جواب:- پرچی کے ذریعے خرید وفروخت کے مروّج طریقے میں دو خرابیاں ہیں، ایک مبیع کا غیر متعین ہونا، دُوسرے بیع قبل القبض۔ لہٰذا یہ طریقہ جائز نہیں ہے۔[1] اوّل تو پہلی خرابی کی موجودگی میں بظاہر مالکیہ کے مسلک پر بھی بیع جائز نہیں ہوگی،[2] دُوسرے اس قول پر فتویٰ دینے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں ہے، بلکہ موجودہ دور میں سٹہ وغیرہ کی خرابیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر فتویٰ نہ دیا جائے، خود مالکی علماء بھی آج کل اس پر فتویٰ دینے میں تردّد کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ کاروبار

(۱) بیع قبل القبض کے عدمِ جواز سے متعلق تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۸۲ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۲۳ کا حاشیہ نمبر۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفي مواهب الجليل لشرح مختصر الخليل ج:۶ ص:۸۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وجهل بمثمون أو ثمن ولو تفصيلًا يعني ان من شرطة صحّة البيع أن يكون معلوم العوضين فان جهل الثمن أو المثمون لم يصحّ البيع وظاهر كلامه أنّه متٰى حصل الجهل بأحد العوضين من المتبايعين أو من أحدهما فسد البيع وصرّح بذٰلك الشارح في الكبير وهو ظاهر التوضيح أيضًا.

کی جائز صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ بوروں پر نمبر ڈال کر خریداری کے وقت نمبروں کے ذریعے ان کا تعین کرلیا جائے[1]، اور پرچی پر وہ نمبر درج ہوں، نیز بائع اپنی طرف سے تخلیہ کردے، یعنی یہ کہہ دے کہ یہ بورے اب آپ کے ہیں، جب چاہیں اُٹھا کر لے جائیں، اب میں ان بوروں کا ضامن نہیں ہوں، جب تک میرے گودام میں رہیں گے آپ کی امانت کے طور پر رہیں گے، میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ یہ بات پرچی پر بھی لکھ دی جائے۔ اس صورت میں چونکہ مبیع متعین بھی ہوجائے گی اور ضمان بھی بائع کے تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہوجائے گا، اس لئے خریدار کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوگا[2]۔ صرف خریدار کا یہ سمجھ لینا کافی نہیں کہ مبیع میرے ضمان میں آگئی ہے، خواہ بائع اسے اپنے ضمان میں سمجھتا ہو، اور عرف بھی یہ ہو کہ گودام میں رہنے تک بائع کا ضمان ختم نہیں ہوتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۴/۶/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۴۴/۴)

زندہ جانور کو وزن کرکے فروخت کرنے کا حکم

سوال:- آج کل جانور مرغی اور بکری وغیرہ کو وزن کرکے اور تول کر فروخت کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟　　(مفتی عبدالواحد)

جواب:- آپ نے فرمایا ہے کہ آج کل مرغی اور بکری جو تُل کر بیچی جاتی ہیں، اُن کے بارے میں احقر کی کیا رائے ہے؟ غالباً سوال کا مقصد یہ ہے کہ کیا اب اُن کو عددی کی بجائے وزنی قرار دے دیا جائے؟[1] فی الحال احقر کا جواب نفی میں ہے[2]۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب بھی وہ عددی ہیں[3]، اور اُن کا تولنا درحقیقت آحاد میں سے کسی ایک کے انتخاب میں مدد لینے کے لئے ہوتا ہے۔ ''وزنی'' ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس چیز کو مشتری جتنے وزن میں چاہے، جب چاہے، خرید سکے۔ مرغی اور بکری میں یہ ممکن نہیں، **کما هو ظاهر**۔ لہٰذا امرِ واقعہ یہ ہے کہ تولنے کے ذریعے یہ جاننا مقصود ہوتا ہے کہ جانور کتنا

(۱ و ۲) وفی الهندية ج:۳ ص:۱۶ ويعتبر فی التسليم أن يكون المبيع مفرزًا غير مشغول بحق غيره هٰكذا فی الوجيز للكردری واجمعوا علٰی أن التخلية فی البيع الجائز تكون قبضًا ...الخ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۲۴۴ فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلّی وهو أن يخلّی البائع بين المبيع وبين المشتری برفع الحائل بينهما علٰی وجهٍ يتمكن المشتری من التّصرّف فيه فيجعل البائع مسلّما للمبيع والمشتری قابضًا لهٗ اهـ. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۸۳ کا حاشیہ نمبر۲۔

پُر گوشت ہے؟ جب یہ بات تُلنے سے واضح ہوگئی تو سودا عدداً ہی ہوتا ہے، لہٰذا وہ عددی ہی شمار ہوگا۔ (۴)

والسلام
محمد تقی عثمانی
یکم صفر ۱۴۱۲ھ

(۱ تا ۴) جانور کے ہمیشہ عددی رہنے اور جانور کو وزن کر کے فروخت کرنے سے متعلق مذکورہ تمام اُمور کی وضاحت اور تفصیلی حکم کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مصدقہ درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

زندہ جانور تول کر بیچنے کا مفصل و مدلل حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زندہ جانور مثلاً مرغی، بکرا وغیرہ کو وزن کر کے خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامدًا و مصلیًا

اگر خریدار اور فروخت کنندہ زندہ جانور کو وزن کر کے خرید وفروخت پر راضی ہوں، تو زندہ جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیر جنس کے ذریعے خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ متعین جانور کا فی کلو کے حساب سے نرخ طے کرلیا گیا ہو، نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کرلی گئی ہو۔ جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً ایک بکرے کی ضرورت ہے، تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرا منتخب کرلیتا ہے اور تاجر اس کو بتادیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتادیتا ہے کہ مثلاً یہ بیس کلو کا ہے۔ اب اگر خریدار اس کو قبول کرلے تو بیع منعقد ہوجائے گی اور اس طرح کی گئی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں اس بات کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء کے فقہی اَحکامات جاری کرنا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ جانور کو وزن کر کے بیچنا اور خریدنا، تو یہ بلاشبہ جائز ہے، اس لئے کہ عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لیکن دُوسری بات کہ جانور کو موزون قرار دینا اور اس پر موزونی اشیاء پر جاری ہونے والے تمام اَحکامِ فقہیہ کو جاری کرنا۔ تو یہ دُرست نہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں:-

۱- پہلی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کا کیلی، وزنی یا عددی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں منصوص یا معلوم ہو، ان کی وہ حیثیت تبدیل نہیں ہوتی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جانوروں کا عددی ہونا معلوم ہے، البتہ جن اشیاء کا کیلی یا وزنی ہونا منصوص نہیں تو ان کا مدار عرف پر ہے۔ اگر عرف ان کے کیل کرنے کا ہے تو وہ کیلی ہیں، اور اگر عرف وزن کرنے کا ہے تو وہ وزنی ہیں۔ جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: **وما لا نص فیہ ولم یعرف حالہٗ علٰی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعتبر فیہ عرف الناس. فان تعارفوا کیلًا فھو کیلی وان تعارفوا وزنًا فھو وزنی. کذا فی المحیط۔** (العالمگیریۃ ج:۳ ص:۱۱۷) تو جب جانور کا عددی ہونا معلوم ہے تو اس کے عددی ہونے کی حیثیت وزناً بیع کرنے سے تبدیل نہ ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ بیع صحیح ہوجائے گی، **لعدم المانع۔**

۲- دُوسری وجہ یہ ہے کہ جانور کو دیگر اشیاءِ موزونہ کی طرح حسبِ منشا کم یا زیادہ کر کے وزن کرنا ناممکن ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح دیگر اشیاءِ موزونہ کی جتنی مقدار مطلوب ہوتی ہے اتنی مقدار کو بلاتکلف وزن کر کے الگ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً چینی ۲۰ کلو ۱۵ گرام کی ضرورت ہے تو بلاتکلف چینی کی یہ مقدار وزن کے ذریعے الگ کی جاسکتی ہے، بخلاف جانور کے کہ اس میں یہ بات ممکن ہی نہیں مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ ۲۰ کلو ۱۵ گرام کا بکرا چاہئے، کچھ کم زیادہ نہ ہو، تو یہ بظاہر محال ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جانور کو موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر بالفرض جانور کو سارے جہان میں وزن کر کے بیع کرنے کا عرف قائم ہوجائے تو بھی جانور کو بنیادی طور پر موزونی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں موزونی اشیاء والی صفات ہی نہیں پائی جاتیں، کما مرّ۔

مذکورہ تفصیل کے بعد جانور کی بیع وزناً کے جائز ہونے کا حاصل یہ ہے کہ فی کلو کے حساب سے جانور کی قیمت کا ایک معیار مقرّر کرلیا گیا ہے، جس کی بناء پر جانور کو وزن کر کے اس کے وزن کے اِعتبار سے قیمت کا اندازہ لگا کر مناسب قیمت متعین کرلی جاتی ہے۔ صورتِ مذکورہ میں وزن کو صرف آلہ بنا کر قیمت متعین کرنے میں آسانی پیدا کی گئی ہے، لہٰذا عرفاً تو اس کو بیع وزناً کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کا بیع وزناً ہونا محلِ تامل ہے۔ البتہ یہ بیع بہرحال جائز ہے جبکہ جانور بھی متعین ہوجائے اور قیمت بھی متعین ہو، فافهم۔

جانور کی اس بیع وزناً میں بعض لوگوں کو کچھ اِشکالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ان متوقع اِشکالات کو نقل کر کے ان کے مختصر جوابات دیئے جاتے ہیں، تاکہ اوہام رفع ہوسکیں اور کوئی اِنتشار باقی نہ رہے۔

۱- پہلا اِشکال بعض لوگوں کو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جارہا ہے کہ **لیس بموزون** یعنی جانور وزن کی جانے والی چیز نہیں ہے، اور یہی کتبِ فقہ میں مصرّح ہے، لیکن دُوسری طرف آپ نے کہا ہے کہ اس کو وزن کر کے بیچنا جائز ہے، **فکیف التوفیق؟**

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اِشکال اس وقت ہوسکتا ہے جب اس بیع کو حقیقتاً بیع وزناً مانا جاتا لیکن جب یہ حقیقتاً بیع وزناً ہے ہی نہیں، جیسا کہ ماقبل میں وضاحت ہوچکی تو کوئی اِشکال وارد ہی نہیں ہوتا، نہ مذکورہ اِشکال اور نہ آئندہ آنے والے اِشکالات، لیکن اگر اس کو بیع وزناً مان لیا جائے **ولو عرفًا ومجازًا** تو بھی اس کا جواب ماقبل کلام میں وضاحت سے ہوچکا کہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں، جن کا مطلب بھی الگ الگ ہے۔ "**لیس بموزون**" کا مطلب یہ ہے کہ اس پر موزون اشیاء کے اَحکامِ فقہیہ جاری نہیں ہوں گے، مثلاً اِستقراض کا جائز ہونا، رِبا الفضل کا اس میں جاری ہونا وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی بیع وزناً بھی جائز نہ ہو، بلکہ حدیث: **اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم** کا عموم اس بیع کے جواز کا مؤید ہے، اس حدیث کو اِمام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی کتاب المساقاۃ میں اور ابوداؤدؒ نے کتاب البیوع میں نقل کیا ہے۔ نیز کسی شیٔ کی بیع وزناً کے جواز کے لئے اس کا موزون ہونا ضروری اور شرط نہیں ہے، بہت سی اشیاء موزون نہیں لیکن وزن کر کے ان کو خریدا اور فروخت کیا جاتا ہے۔ آج کل کی بیوع میں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ کپڑا بالاتفاق مذروع ہے یعنی ناپ کی جانے والی چیز ہے، لیکن بڑے شہروں کے بعض بازاروں میں کپڑے کو وزن کر کے "لاٹوں" کے حساب سے بیچا جاتا ہے۔ تو اگر کپڑا متعین ہو اور نرخ بھی طے ہو، تو اس طرح بیچنا بلاشبہ جائز ہے وغیرہ وغیرہ، اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

۲- دُوسرا اِشکال بعض لوگوں کو یہ ہوسکتا ہے کہ جانور کے وزن کی پوری پوری مقدار معلوم کرنا دُشوار ہے "**لأنہ یخفف نفسہ مرۃ ویثقلہٗ أُخریٰ**" یعنی اس لئے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو ہلکا کرلیتا ہے اور کبھی بوجھل، اور یہ وجہ کتبِ فقہ میں بھی موجود ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ بات یقینی نہیں کہ جانور اپنے آپ کو ہلکا اور بوجھل کرلیتا ہے بلکہ یہ صرف اِحتمال ہے۔ اور عبارتِ مذکورہ کو کتبِ فقہ میں بابِ رِبا میں ذِکر کیا گیا ہے اور بابِ رِبا میں تفاضل کا اِحتمال بھی ممنوع ہے جیسا کہ شامی میں ہے: "**فانہ لا یصح لاحتمال الربا واحتمالہٗ مانع کحقیقتہ**" (شامی ج:۴ ص:۵۳۱)۔ لہٰذا اگر جانور کو گوشت ہی کے بدلے میں خریدا جائے تو اس وقت تو بعض صورتوں میں منع کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اِحتمالِ رِبا ہے لیکن جب روپے کے بدلے خریدا جائے تو صرف اس اِحتمال کی بناء پر ممنوع نہ ہوگا۔

ثانیاً کہ اگر جانور کی اس حرکت کو "کہ وہ اپنے آپ کو کبھی ہلکا اور کبھی بوجھل کرلیتا ہے" تسلیم کرلیا جائے تو بھی یہ اس وقت عدمِ جواز کی دلیل نہیں بنتی جبکہ بیع روپوں کے عوض ہورہی ہو، اس لئے کہ جانور کے اس عمل سے اگر وزن میں فرق پڑے تو وہ بہت قلیل ہوگا، اور اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وزن میں جہالتِ یسیرہ لازم آئے گی، اور عام بیوع میں جہالتِ یسیرہ کو برداشت کیا گیا ہے۔ اور جہالتِ یسیرہ کی وجہ سے عدمِ جواز کا قول کسی نے اِختیار نہیں کیا، فتاویٰ شامی میں ہے: "**وقیدنا بالفاحشۃ لما قالوہ، لو باعہٗ جمیع ما فی ھٰذا القریۃ أو ھٰذہ الدار والمشتری لا یعلم ما فیھا لا یصح لفحش الجھالۃ، أما لو باعہٗ جمیع ما فی ھٰذا البیت أو الصندوق أو الجوالق فانہ یصح لأن الجھالۃ یسیرۃ**" (شامی ج:۴ ص:۵۲۹)۔ نیز ہمارے مسئلے میں جہالت کو بائع اور مشتری دونوں قبول کرنے پر راضی ہیں اور نزاع کا اِحتمال نہیں، اس لئے کہ بوقتِ بیع جانور نے حالتِ خفت اِختیار کی ہوئی ہے یا حالتِ ثقل؟ اس کا بائع اور مشتری دونوں کو علم نہیں۔ حالانکہ حالتِ خفت میں بائع کا نقصان ہے کہ کم وزن کے پیسے ملیں گے .... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اور حالتِ ثقل میں مشتری کا نقصان ہے کہ زائد پیسے ادا کرنے پڑیں گے، لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ اس نقصان کو برداشت کرنے پر راضی ہیں کیونکہ بیع بالتراضی ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ جہالتِ یسیرہ اس بیع کے عدمِ جواز کی وجہ کسی طرح بھی نہیں بن سکتی نہ عرفاً نہ شرعاً۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جب بیع روپوں کے عوض ہو رہی ہو تو یہ اِشکال وارِد ہوتا ہے۔ اس صورت میں اِشکال اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ بیع کے وقت کا وزن معتبر ہے، خواہ جانور حالتِ خفت میں ہو یا حالتِ ثقل میں ہو، کیونکہ حالتِ خفت میں یہ نہ کہا جائے گا کہ جانور میں سے کوئی چیز نکالی گئی ہے یا جدا کرلی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن کم ہوگیا ہے، جیسا کہ حالتِ ثقل میں یہ نہ کہا جائے گا کہ اس میں باہر سے کوئی اور چیز شامل کردی گئی ہے جس کی وجہ سے وزن بڑھ گیا ہے، بلکہ ہر کوئی یہی کہے گا کہ خواہ حالتِ ثقل ہے یا حالتِ خفت اس وقت جانور کا یہی وزن ہے، اور یہ اسی جانور کا وزن ہے کسی خارجی چیز کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا بوقتِ بیع جانور کا جو وزن ہوگا وہی معتبر ہوگا، اسی وزن کے ساتھ بیع ہوگی جو کہ صحیح ہوگی۔

۳- تیسرا اِشکال بعض لوگوں کو یہ ہوسکتا ہے کہ **"لا یجوز بیع صبرة طعام کل قفیز بدرهم"** کی طرح یہ بیع بھی ناجائز ہونی چاہئے کیونکہ جس طرح وہاں یہ علت پائی جاتی ہے کہ مبیع اور ثمن مجہول ہیں، پتہ نہیں کہ کتنے کلو اس ڈھیر میں ہوں گے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کل درہم کتنے ادا کرنے پڑیں گے وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیع الحیوان وزناً کی صورتِ جواز بیان کرتے ہوئے یہ قید اسی لئے لگائی گئی ہے کہ ''جانور کو مشتری کے سامنے وزن کر کے کل وزن بھی بتادیا جائے'' تاکہ جہالتِ مبیع اور جہالتِ ثمن دونوں رفع ہوجائیں۔ اس صورت میں یہ بیع جائز ہوجائے گی جیسا کہ اس صبرۂ طعام کی بیع کو جہاں ناجائز کہا ہے وہاں ساتھ ہی اس صورت کو جائز کہا ہے کہ جبکہ اس صبرۂ طعام کو اسی مجلس میں ناپ لیا جائے یا اس کی کل مقدار بتادی جائے، لہٰذا فرمایا: **"وصح فی الکل ان کیلت فی المجلس لزوال المفسد قبل تقرره أو سمی جملة قفزانها"** (الدر المختار ج:۴ ص:۵۳۹)۔ اور اسی بحث کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ: **"وأراد اصبرةً مشارًا الیها کما سیأتی، ولیست قیدًا بل کل مکیل أو موزون أو معدود من جنس واحد"** (فتاویٰ شامی ج:۴ ص:۵۳۹)۔ یعنی یہ صرف صبرۂ طعام کا حکم نہیں بلکہ ہر کیلی، وزنی اور عددی چیز جس کو وزن کر کے بیچا جائے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب کل معلوم ہوجائے تو بیع صحیح ہوجائے گی۔

مذکورہ بالا عدمِ جواز کی ممکنہ وجوہات کہ جن کا جواب ہوچکا، ان کے علاوہ کوئی اور وجہ عدمِ جواز کی ہمیں ملی نہیں۔ **فاغتنم تحقیق هذا المقام بما یرفع الظنون والأوهام ویندفع به التناقض واللوم عن عبارات القوم. والله سبحانه وتعالٰی أعلم بالصواب وعلمه أتم۔**

العبد الضعیف
الیاس زمان رکن پوری
دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

الجواب صحیح احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ ۱۴۲۲/۱/۱۷ھ	الجواب صحیح عبداللہ عفی عنہ ۱۴۲۲/۱/۲۳ھ	الجواب صحیح احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۱۴۲۲/۱/۲۱ھ
الجواب صحیح محمد عبدالمنان عفی عنہ ۱۴۲۲/۱/۲۲ھ	الجواب صحیح بندہ عبدالرؤف سکھروی ۱۴۲۲/۱/۲۲ھ	

⁂⁂⁂

﴿فصل فی الغرر والعیب﴾
(بیع میں دھوکا اور عیب کا بیان)

اصلی کمپنی کے خالی ڈبوں میں دُوسری قسم کا تیل ڈال کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:- میں موبل آئل کا کام کرتا ہوں، وہ تیل گیلن والے ڈبوں میں بند ہوتا ہے، مختلف کمپنیوں کا ہوتا ہے، لیکن اکثر لوگ اصل کمپنی کے خالی ڈبوں میں اسی قسم کا تیل ڈال کر اپنی طرف سے کمپنی کا سیل لگاکر کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور پچھتّر فیصد یہی تیل بکتا ہے، اور لوگ اصل سمجھ کر خریدتے ہیں، اگر انہیں اصل کمپنی کا تیل زیادہ نرخ پر دیا جائے تو نہیں خریدتے اور اصل تیل ملتا بھی نہیں، اور اگر کبھی ملتا ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے، اصل تیل کی اتنی کمی ہے کہ میں دو بار تیل خریدنے گیا کرایہ میں ساٹھ روپے خرچ ہوگئے اور تیل نہیں ملا۔ جس کی وجہ سے کمپنی کے ڈبوں مین دُوسرا تیل جو بھرا ہوا ہوتا ہے اس کو یہ بتاکر فروخت کرتا ہوں کہ اصل تیل کمپنی کے ڈیلروں سے نہیں ملتا، ہم دُکان داروں سے لے کر آتے ہیں جیسا وہ لوگ دیتے ہیں ویسا ہی ہم آپ کو دیتے ہیں۔ آیا اس طریقے سے تیل بیچنا حرام ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر آپ گاہکوں کو اصل حقیقت بتادیتے ہیں تو اس تیل کی فروخت آپ کے لئے جائز ہے،[1] اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اصلی تیل بھی اپنے پاس رکھیں اور یہ دُوسرا تیل بھی، اور گاہکوں کو دونوں دِکھاکر دونوں کی قیمتیں بتاکر اور دونوں کا فرق واضح کرکے بیچا کریں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۸/۱۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۹/۲۸ ج)

(۱ و ۲) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۲۷۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البیعان بالخیار ما لم یتفرّقا أو قال: حتّی یتفرقا، فان صدقا وبیّنا بورک لھما فی بیعھما، وان کذبا وکتما محقت برکة بیعھما. وفیھا أیضًا قبلہ: بیع المسلم المسلم لا داء ولا خبثة ولا غائلة ..... وقال عقبة بن عامر لا یحلّ لامرئ ان یبیع سلعة یعلم أنّ بھا داءً الّا أخبرہ .... الخ.

(باقی اگلے صفحے پر)

کسی اور سے مال بنواکر اپنے نام کا مونوگرام لگانے کا حکم

سوال:- حکومتِ سندھ کا قانون ہے کہ جو کانٹے اور بٹے تولنے والے بنائے، وہ اپنا مونوگرام یعنی نام ڈالے، بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اپنا مال نہیں بنا سکتا اور پنجاب کے دُوسرے کارخانوں سے مال بنواتا ہوں اور اُن پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلواتا ہوں یا ڈال دیتا ہوں، اگر حکومتِ پنجاب کا مونوگرام ڈلوادوں تو حکومتِ سندھ پاس نہیں کرتی، میرا لائسنس حکومتِ سندھ کا ہے، اُس کی سالانہ فیس بھرتا ہوں، مونوگرام کچھ اس طرح ہوتا مثلاً پنجاب کے بنانے والے کا نام عبدالشکور ہے تو وہ اُردو یا انگریزی میں اپنے نام کا مخفف ڈالے گا، اسی طرح میں محمد غیاث ہوں تو یہ مونوگرام ڈلواؤں گا ''جی ایچ'' اس سے گاہک کو دھوکا مقصود نہیں بلکہ حکومتِ سندھ کی خانہ پُری کرنا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- اگر یہ مال سندھ کے مروّجہ اوزان اور پیمانوں کے مطابق ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور آپ پنجاب کے کارخانے سے آرڈر دے کر بنواتے ہیں، سارا مال آپ کی ملکیت ہوتا ہے تو آپ اُس پر اپنے نام کا مونوگرام ڈلوا سکتے ہیں۔ لیکن اگر پنجاب کے مروّجہ اوزان اور پیمانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) .... وفی مشکوٰة المصابیح ص: ۲۴۹ (طبع قدیمی کتب خانه) من باع عیبًا لم ینبه لم یزل فی مقت اللہ أولم تزل الملٰئکة تلعنه. رواہ ابن ماجة.

وفی تکملة فتح الملهم ج: ۱ ص: ۳۷۷ عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: البیعان بالخیار ما لم یتفرّقا فان صدقا وبینا بورک لهما فی بیعهما وان کذبا وکتما محق برکة بیعهما. رواہ مسلم. قوله فان صدقا وبینا أی صدق البائع فی اخبار المشتری صفة المبیع وبین العیب ان کان فی السعة اھ.

وفی البحر الرائق: کتمان عیب السلعة حرام. (ج:٦ ص:۲۵).

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۴۷ (طبع سعید) لا یحل کتمان العیب فی مبیع أو ثمن لأن الغش حرام اھ.

وفی الشامیة: ذکر فی البحر أوّل الباب بعد ذٰلک عن البزازیة عن الفتاویٰ: اذا باع سلعة معیبة علیه البیان. (ج:۵ ص:۴۷).

وفی الهندیة ج:۳ ص:۲۱۰ رجل أراد ان یبیع السلعة المعیبة وهو یعلم یجب أن یبیّنها فلو لم یبین قال بعض مشائخنا یصیر فاسقًا مردود الشهادة وقال الصدر الشهید: لا نأخذ به کذا فی الخلاصة.

وفی الفتاویٰ البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج:۴ ص:۵۲۱ (طبع رشیدیه کوئٹه) وفی الفتاویٰ: اذا باع سلعة معیبة علیه البیان .... الخ.

وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۳. وامداد الأحکام ج:۳ ص:۴۰۳. وکفایت المفتی باب نمبر:۷ ج:۸ ص:۲۰ نیز دیکھئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

سندھ سے مختلف ہیں تو یہ دھوکا اور ناجائز ہے،[1] خلاصہ یہ کہ جھوٹ اور دھوکے سے بچتے ہوئے اگر آپ پنجاب میں مال بنوا کر اپنا مونوگرام ڈلوالیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۰۴/۲۸ ج)

پاکستان کی بنی ہوئی چیز پر امریکا یا اِٹلی کا نام لکھ کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:- حال ہی میں یہاں پر میں نے اپنی آمدنی کو بڑھانے کی غرض سے کچھ تجارت کا سوچا، پاکستان کی بنی ہوئی چند مصنوعات یہاں درآمد کی جاتی ہیں۔ ہم نے پاکستان سے تولیہ اور جوتوں کے Samples منگوائے، کوالٹی کے اعتبار سے دونوں بہت اچھے ہیں، لیکن جس دُکان دار کے پاس بھی گئے اس نے ایک ہی کہی کہ جب تک تولیہ پر "Made In USA" اور جوتوں پر "Made In Italy" نہ لکھا ہوا ہوگا، ہم انہیں لینے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ یہاں کے عوام USA اور Italy کے لیبل کے بغیر خریدتے نہیں۔ یہاں پر مارکیٹ میں جتنا تولیہ بکتا ہے اس میں سے بیشتر پاکستان کا بنا ہوا ہے، لیکن اس پر سب لوگ Made in USA لکھوا کر لاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بِک جاتا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم بھی ان حالات میں ایسا کر سکتے ہیں؟ ہمارا پروگرام پاکستان سے منگوا کر دُکان داروں کو ہول سیل بیچنے کا ہے، اِن دُکان داروں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تولیہ پاکستان کا بنا ہے لیکن USA لکھا ہوا ہے۔ اگر ہم اِن کو بیچتے وقت بتادیں کہ اصل بات یہ ہے تو

(۱ و ۲) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی کراهية الغش فی البیوع ج:۱ ص:۲۴۵ (طبع سعید) عن أبی هريرة رضی الله عنه أنّ رسول الله صلی الله عليه وسلم ..... ثم قال: من غش فليس منّا. وقال الترمذی: حديث أبی هريرة حديث حسن صحيح والعمل علیٰ هٰذا عند أهل العلم کرهوا الغش وقالوا: الغش حرام.
وکذا فی المشکوٰة ج:۱ ص:۲۴۸ من غشّ فليس منا.
وفی جمع الفوائد ج:۱ ص:۴۲۸ المسلم أخ المسلم، لا يحل لمسلم باع من أخيه بيعًا فيه عيب الّا بيّنه له.
وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۵۴ من علم بسلعة عيبًا لم يجز بيعها حتّی يبيّنه للمشتری فان لم يبيّنه فهو آثم عاص نصّ عليه أحمد لما روی حکيم بن حزام رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم أنّه قال: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، فان صدقا وبيّنا بورک لهما وان کذبا وکتما محق برکة بيعهما اهـ.
وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۳۵ (تنبيه) کتمان عيب السلعة حرام.
وفی البزازية وفی الفتاویٰ اذا باع سلعة معيبة عليه البيان.
وفی الهندية ج:۳ ص:۲۱۵ ولا بأس ببيع المغشوش اذا کان الغش ظاهرًا کالحنطة بالتّراب وان طحنه لم يجز حتّٰی يبيّنه.
وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۴۷ لا يحل کتمان العيب فی مبيع أو ثمن لأن الغش حرامٌ.
نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اُس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

کیا شرعی اعتبار سے اس کی اجازت ہے؟　　ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد ابوظبی (امارات)

جواب:- پاکستان کی بنی ہوئی مصنوعات پر ایسا جملہ لکھنا جس سے اس کے امریکا یا اِٹلی میں بننے کا دعویٰ کیا گیا ہو، صریح غلط بیانی ہے، جس کی شرعاً بالکل اجازت نہیں،[1] ہاں! اگر کسی اور نے یہ جملہ لکھ دیا اور پھر آپ کو بیچنا پڑا تو لکھنے کا گناہ لکھنے والے کے سر ہوگا، آپ یہ کہہ کر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ اس پر لکھا ہوا کچھ اور ہے لیکن یہ پاکستان کا بنا ہوا ہے۔[2] رہا یہ عذر کہ لوگ ان مصنوعات کو اس کے بغیر خریدتے نہیں ہیں، تو اس کی وجہ سے غلط بیانی جائز نہیں ہو سکتی۔ والسلام

(۱و۲) حوالہ اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور اُن کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی أنواع البیوع المختلفة﴾

(بیع کی مختلف اقسام بیعِ وفاء، سلم، استصناع اور بیعِ اِستجرار کا بیان)

بیع بالوفاء کا حکم (فارسی فتویٰ)

(حاشیہ میں اس فارسی سوال و جواب کا اُردو ترجمہ کردیا گیا ہے)

سوال:- زید از حکومت ایک ہزار روپیہ قرض گرفت وقتیکہ حکومت طلب کرد چونکہ نزد زید روپیہ نہ بود البتہ نو ایکڑ زمین نزد حکومت رہن بود حکومت گفت کہ اگر قرضہ ادا نمی کنید زمین تو نیلام کنم ازیں ضرورت زید زمین خود را بہ عمرو فروخت کرد بعوض ۱۲۵۰ بایں شرط کہ اگر ایں رقم را وقتیکہ ادا کنم زمین من واپس کنید عمرو قبول کرد و نام عمرو بہ نیلام نوشت و روپیہ ۱۲۵۰ بحوالہ حکومت کرد و عمرو بر زمین قابض شد الحال زید بہ عمرو می گوید اکنون پیسہ شما را می دھم زمین بمن واپس کنید عمرو انکار کند و عمرو زمین را وقف کرد است سوال ایں است کہ زمین رہن را فروختن جائز است یا نہ؟ بر تقدیر جواز زید را از عمرو پیسہ واپس گرفتن جائز است یا نہ؟ واگر بیع اول جائز نیست پس زید کہ زمین خود را از حکومت وقتے نیلام بہ طور وکالت بنام عمرو گرفت و نام عمرو در نیلام نوشت درحق عمرو نافذ می شود یا نہ؟ عمرو را زمین، زمین متنازع فیہا را وقف کردن جائز است یا نہ؟

جواب:- درصورتِ مسئولہ عقدے کہ میان زید وعمرو واقع شد بیع بالوفا است و اورا دراصل مذہب بیع فاسد است بیشتر فقہاء کرام بروا احکام رہن جاری کنند[(۱)] وبیع را فاسد می گویند ونزد بعض فقہاء بیع صحیح است،[(۲)] ومشتری راحق بود کہ ازو نفع گیرد لکن اوراحق نمی بود کہ کسے را بیع کند در ردّ المحتار اقوال کثیر نقل کردہ قول جامع بایں طور ذکر میکند کہ قولہ (وقیل بیع یفید الانتفاع بہ) ھٰذا محتمل لأحد القولین: الأوّل: أنّہ بیع صحیح مفید لبعض أحکامہ من حل الانتفاع بہ الّا أنّہ لا یملک بیعہ قال الزیلعی فی الاکراہ وعلیہ الفتویٰ. الثانی: القول الجامع لبعض المحققین أنّہ فاسد فی حق

---

(۱) وفی تنویر الأبصار ج:۵ ص:۲۷۶ قیل ھو رھن. وفی الشامیة تحت قولہ (وصورتہ ....) ھو أن یقول البائع للمشتری بعتُ منک علیٰ أن تبیعہ منّی متیٰ جئتُ بالثمن فھٰذا البیع باطل وھو رھن وحکمہ حکم الرھن وھو الصحیح.

(۲) وفی الدّر المختار (بحوالہ مذکورہ) وقیل بیع یفید بہ الانتفاع. تفصیلی عبارت آگے اسی فتویٰ میں آرہی ہے۔

بعض الأحكام حتّٰى ملك كل منهما الفسخ، صحيح فى حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع البيع، ورهن فى حق البعض حتّٰى لم يملك المشترى بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدّين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزّرافة فيها صفة البعير والبقر والنّمر جوّز لحاجة الناس اليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال فى البحر وينبغى أن لا يعدل فى الافتاء عن القول الجامع. وفى النهر والعمل فى ديارنا علىٰ ما رجحه الزيلعى. (ردّ المحتار، باب الصرف ج:۴ ص:۳۴۲)[۱] ۔ ازیں معلوم شد کہ در بیع وفا مشتری را حق بیع ورہن ووقف وغیرہ نزد کسے حاصل نیست اختلاف فقط دریں صورت است کہ آیا اوراحق انتفاع حاصل است یا نہ کسانیکہ وایں عقد را رہن گویند انتفاع مشتری را جائز قرار نمی دہند،[۲] وکسانیکہ ایں عقد را بیع گویند انتفاعش را نیز جائز گویند اما بیع ووقف وغیر نزد کسے جائز نیست،[۳] پس دریں صورتِ مسئولہ وقفے کہ عمرو کردہ است، درست نہ شد، واکنون برو لازم است کہ رقم از زید وصول کردہ زمین بدو واپس کند و در حکم ہیچ اختلاف نیست زیرا کہ اگر ایں عقد موافق قول بعضے فقہاء رہن است پس وقت ادائیگیٔ رقم بر عمرو لازم بود زمین واپس دہد، واگر ایں بر قول بعض فقہاء بیع است، ایں انرا واپس گردانیدن نزد ایشاں ہم ضروری است۔

واللہ اعلم
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۲۸/ ۱۸ الف)

الجواب صواب
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

---

(۱) شامي ج:۵ ص:۲۷۶ (طبع سعيد) وكذا في البحر الرائق ج:۶ ص:۸ (طبع سعيد) وتبيين الحقائق ج:۵ ص:۱۸۳.

(۲) کیونکہ شئ مرہون سے فائدہ اُٹھانا جائز نہیں۔

كما في البحر الرائق ج:۸ ص:۲۳۸ (طبع سعيد) ولا ينتفع المرتهن استخدامًا وسكنىٰ ولبسًا واجارةً واعارةً لأن الرهن يقتضى الحبس الىٰ ان يستوفى دينه دون الانتفاع.

وفى ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۴ ص:۲۷۳ (طبع مكتبه غفاريه كوئته) وليس للمرتهن الانتفاع بالرّهن ولا اجارته ولا اعارته.

وفى ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعيد) لا يحلّ له أن ينتفع بشئ منه بوجهٍ من الوجوه وان أذن له الرّاهن لأنّه اذن له فى الرّبا ..... الخ.

(۳) فتویٰ میں موجود حوالہ ملاحظہ ہو۔

(مذکورہ فارسی سوال و جواب کا اُردو ترجمہ)

''بیع بالوفا'' کا حکم

سوال:- زید نے حکومت سے ایک ہزار روپے بطور قرض لئے، اور (وقتِ مقررّہ پر) حکومت نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، لیکن زید کے پاس پیسے نہیں تھے، ہاں البتہ اس کی نو ایکڑ زمین .... (باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)............حکومت کے پاس بطورِ رہن موجود تھی اس لئے حکومت نے کہا کہ اگر پیسے ادا نہیں کرو گے تو تمہاری اس زمین کو نیلام کردیں گے۔ لہٰذا مجبور ہوکر زید نے اپنی وہ زمین عمرو کو ۱۲۵۰ روپے کے عوض بیچ دی، لیکن شرط یہ رکھی کہ جب بھی میں آپ کو یہ رقم ادا کروں گا تو اپنی زمین واپس لے لوں گا، اور عمرو نے یہ شرط قبول کرلی، لہٰذا زید نے عمرو کا نام نیلام میں لکھوا کر ۱۲۵۰ روپے حکومت کے حوالے کردیئے اور عمرو زمین پر قابض ہوگیا۔ اب (پیسوں پر) قادر ہونے کے بعد زید، عمرو سے کہتا ہے کہ میں آپ کو آپ کے پیسے دیتا ہوں آپ مجھے میری زمین واپس کردیں، تو عمرو (ادائیگی سے) اِنکار کرتا ہے کیونکہ اس زمین کو وہ وقف کرچکا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اَرضِ مرہونہ کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ بر تقدیرِ جواز زید کو عمرو سے (یا عمرو کو زید سے) پیسے واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر بیع اوّل جائز نہیں تو زید نے جو اپنی زمین نیلام کے وقت حکومت سے وکالۃً عمرو کے نام پر لے لی تھی اور عمرو کا نام نیلام میں لکھوادیا تو یہ بیع عمرو کے حق میں نافذ ہوگی یا نہیں؟ اور عمرو کا اَرضِ متنازع فیہا کو وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مسئلۂ مذکورہ میں زید اور عمرو کے درمیان جو عقد ہوا ہے، یہ بیع بالوفاء ہے، اور اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے، اکثر فقہائے کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں، اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو بھی اس سے نفع اُٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیچ دے۔ اور ردّ المحتار میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کئے ہیں، لیکن جو قول جامع ہے اس کو بایں طور ذکر کرتے ہیں: قوله (وقيل بيع يفيد الانتفاع به) هٰذا محتمل لأحد القولين: الأوّل: أنّه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به الّا أنّه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الاكراه وعليه الفتوىٰ. الثاني: القول الجامع لبعض المحققين أنّهُ فاسد في حق بعض الأحكام حتّٰى ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتّٰى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدَّين بِهَلاكِهٖ فهو مركب من العقود الثلاثة كالزّرافة فيها صفة البعير والبقر والنّمر جوّز لحاجة الناس اليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال في البحر وينبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع. وفي النهر والعمل في ديارنا علىٰ ما رجحه الزيلعي. (ردّ المحتار، باب الصرف ج:۴ ص:۳۴۲). (شامي ج:۵ ص:۲۷۶ طبع سعيد والبحر الرّائق ج:۶ ص:۸ وتبيين الحقائق ج:۵ ص:۱۸۳)۔ اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیعِ وفا میں مشتری کو بیع، رہن، وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں، اختلاف صرف اِس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہٰذا جن حضرات نے اِسے عقدِ رہن قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اُٹھانا بھی ناجائز ہے، اور جن حضرات نے اسے عقدِ بیع قرار دیا ہے، ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، لہٰذا مذکورہ مسئلے میں عمرو کا آگے وقف کرنا ناجائز ہے، اور اُس پر لازم ہے کہ فی الفور زید سے رقم لے کر اُس کی زمین اس کو واپس کردے، اور اس حکم میں کسی کا بھی اختلاف نہیں کیونکہ اس عقد کو اگر ہم رہن قرار دیں اُن فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو رہن کہتے ہیں، تب بھی زید کے رقم کی ادائیگی کے وقت عمرو پر لازم ہے کہ وہ زمین اس کو واپس کرے، اور اگر اس عقد کو ہم بیع قرار دیں ان فقہاء کے قول کے مطابق جو اس کو بیع کہتے ہیں، تو ان کے نزدیک بھی اس کا واپس کرنا واجب ہے۔ واللہ اعلم

''اَحسن الفتاویٰ'' میں بیع الثمار قبل بدوّ الصّلاح کی صورت میں اسے بیع الأزھار مان کر جواز کا قول اختیار کرنے کا حکم

سوال:- بیع الثمار قبل الظہور کے سلسلے میں "تکملة فتح الملهم" ج:۱ ص:۳۸۳ تا ۴۰۰ اور کاپی درسِ ترمذی ج:۴ میں جو تفصیلی اور محققانہ بحث مذکور ہے اس کی رُو سے بیع الثمار قبل الظهور کسی طرح جائز نہیں سواءً جری بہ التعامل أو لا، اور بعض شرائط نہ پائی جانے کی وجہ سے اس کو بیعِ سلم میں بھی داخل کر کے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے برعکس اس صورت کو مذہبِ مالک کی رُو سے احسن الفتاویٰ ج:۶ ص:۴۸۶ تا ۴۹۲ میں بیعِ سلم میں داخل مان کر جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے کیونکہ مذہبِ مالک میں بعض شرائط ضروری نہیں بلکہ اَحسن الفتاویٰ میں تو حنفی مذہب کی رُو سے قبل بدوّ الصّلاح یعنی صرف أزھار کی صورت میں بیع الأزھار مان کر جواز کو اِختیار کیا گیا ہے کہ أزھار بعض جہات سے قابلِ اِنتفاع ہے۔

۱:- اب عرض یہ ہے کہ مالکی مذہب کی رُو سے جو فتویٰ ''اَحسن الفتاویٰ'' میں مذکور ہے آنجناب کی رائے میں وہ صحیح اور موجبہ ہے یا نہیں کہ عمومِ بلویٰ کے وقت مالکی مذہب کی طرف رُجوع کیا جائے۔

۲:- اور بیع الأزھار کی تأویل قبل بدوّ الأثر کے بارے میں آنجناب کی رائے کیا ہے؟

جواب:- احقر نے اس مسئلے میں ''اَحسن[1] الفتاویٰ'' کی مراجعت کی، اس میں اِمام مالک رحمہ اللہ کا مسلک اس حد تک مفید ہوسکتا ہے کہ ثمن تین دن کے اندر اندر اَدا کر دیا جائے، یا بلا شرط اس سے زیادہ تاخیر ہو، لیکن جہاں تک مقدارِ ثمر کی جہالت کا تعلق ہے اُس کے ساتھ تو عقدِ سلم کسی کے نزدیک جائز نہیں، اور نصِ صریح: "فلیسلم فی کیلٍ معلومٍ أو وزنٍ معلومٍ"[2] میں بھی علمِ مقدار و اَجل شرط ہے، ''اَحسن الفتاویٰ'' میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں، اس لئے قابلِ تحمل ہے، لیکن مقدارِ مبیع کی جہالت کو تراضیٔ طرفین کی وجہ سے قابلِ تحمل قرار دینا سخت محلِ نظر معلوم

---

(۱) ج:۶ ص:۴۸۷ تا ۴۹۰ (طبع سعید).

(۲) فی جامع الترمذی کتاب البیوع ج:۱ ص:۲۴۵ (طبع سعید) عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم المدینة وهم یسلفون فی الثمر فقال: من أسلف فلیسلف فی کیلٍ معلومٍ ووزنٍ معلومٍ الیٰ أجلٍ معلومٍ. وفی الدر المختار ج:۵ ص:۲۱۴ (طبع سعید) وشرطه بیان جنس ونوع وصفة وقدر وأجلٍ وأقله شهر الخ، وهٰکذا فی البحر الرائق ج:۶ ص:۱۶۰

وفی المجلّة ج:۲ ص:۳۹۲ رقم المادّة:۳۸۶ یشترط لصحة السّلم بیان جنس المبیع مثلًا أنه حنطة ..... وبیان مقدار الثمن والمبیع .... الخ. (وکذا فی عامّة کتب الحدیث والفقه).

حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص اس صورت (بیع قبل الأزھار کو سلم میں شامل کرنے) سے متعلق اِمداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۰۵ میں یہ فتویٰ تحریر فرمایا ہے:-

(باقی اگلے صفحے پر)

ہوتا ہے کیونکہ جن عقود میں غررِ شدید ہو، وہ تراضیٔ طرفین سے بھی جائز نہیں ہوتے، شریعت متعاقدین میں سے ہر ایک کے جائز مفاد کا تحفظ کرتی ہے، خواہ وہ خود اپنے مفاد سے دست بردار ہوگیا ہو۔ لہٰذا ابھی تک احقر کو اس بات پر اِطمینان نہیں ہوا کہ یہ امر مقدارِ مبیع کے تعین کی منصوص شرط چھوڑنے کے لئے کافی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کو سلم قرار نہیں دیا، بلکہ ضرورت کی نظیر کے طور پر سلم کو ذِکر فرمایا ہے۔[1] البتہ جب أزهار کا ظہور ہوگیا ہو تو أزهار کی بیع (من حيث الأزهار) کی واقعی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اس کا ذکر "تکملة فتح الملهم" میں بھی کیا گیا ہے، اور خود فقہائے حنفیہ صاحبِ ہدایہ وغیرہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ رہا شرطِ ترک کا معاملہ تو وہ بھی متعارف ہونے کی بناء پر جائز قرار دینے کی گنجائش موجود ہے، مگر ظہورِ أزهار سے پہلے اس کو سلم قرار دے کر جائز کہنے پر ابھی تک اطمینان نہیں ہوا، ولعلّ الله يحدث بعد ذٰلک أمرًا۔

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۰/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶۵/۱۳)

شركة خليجية اور مجموعة سعودی بن لادن کے درمیان مشروع حرمین سے متعلق عقدِ اِستصناع کا مسئلہ

سوال:- نرسل اليک عقدًا تريد شركة خليجية أن تدخل فيه مع شركة سعودی بن لادن لِانجاز مشروع الحرمين، بحيث تطلب شركة سعودی بن لادن صناعة هٰذا المشروع من شركة خليجية علٰى أساس الاستصناع، ثم ان الشركة الخليجية تعقد استصناعا موازيا مع شركة محمد بن لادن، فهل هٰذا العقد صحيح شرعًا؟

عصام الطواری

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..... "خود ضرورتِ عامہ دلیلِ مستقل نہیں جب تک کسی کلیۂ شرعیہ میں وہ صورت داخل نہ ہو، جیسا عباراتِ مذکورۂ سوال میں صرف ضرورت کو جواز کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ضرورت کو داعی قرار دیا کسی کلیہ میں داخل کرنے کا مثل الحاق بالسلم وغیرہ کے، اور بیع قبل ظهور الثمار میں یہ الحاق ہو نہیں سکتا، اسی طرح کوئی دُوسرا کلیہ بھی نہیں چلتا، فلا يقاس احدهما على الآخر، اور سلم میں اس کا داخل نہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اگر اشتراط وجود مسلم فيه من وقت العقد الىٰ حلول الأجل سے قطعِ نظر کر کے شافعیؒ کا مذہب بھی لے لیا جائے کہ ان کے نزدیک صرف وجود وقت الحلول کافی ہے، تب بھی یہ اس لئے سلم نہیں کہ اوّلاً مقدار ثمار کی متعین نہیں، ثانیاً کوئی اجل معین نہیں، ثالثاً اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ بائع اوّل ہی سے اَشجار کو مشتری کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اسی وقت سے اس پر قابض ہو جاتا ہے، پھر خواہ ثمر قلیل ہو یا کثیر ہو، اور خواہ نہ ہو، رابعاً اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متماثل نہیں، خامساً اکثر پورا ثمن پیشگی یک مشت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا، غرض یہ سلم کسی طرح نہیں ہوسکتا۔"

(۱) دیکھئے ردّ المحتار على الدّر المختار ج:۴ ص:۵۵۶ (طبع سعید)۔

جواب:–الی الأخ العزیز السیّد عصام الطواری حفظه الله

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد:

فقد تسلمت الأوراق المتعلقة بمشروع الحرمین وطالعت فی ضوءها العقود المرسلة من قبل، فوجدت أن هٰذا العقد فی صورته الموجودة غیر مقبول شرعًا، والأسباب الأساسیة لهٰذا الحکم هی کالتّالی:–

۱– المفروض فی صیغة الاستصناع أن یکون هناک عقد استصناع بین شرکة الخلیج وبین مجموعة سعودی بن لادن، فیکون سعودی بن لادن هو المستصنع، وشرکة الخلیج هی الصانعة، ثم اذا شاءت شرکة الخلیجیة فانها تعقد الاستصناع بینها وبین محمد بن لادن بصفة کونهٖ صانعًا، وینبغی أن یکون هٰذا العقد منفصلًا کل الانفصال عن العقد الأوّل، ولٰکن العقد المقترح بین الشرکة الخلیجیة وبین سعودی بن لادن یوضح أنه قد وقع هناک عقد مسبق للمقاولة بین سعودی بن لادن ومحمد بن لادن، وان هٰذا العقد هو المشار الیه فی بند التعریفات وفی عدّة مواضع أخریٰ من العقد بما یدلّ بأن العقد حقیقةً انما وقع بین سعودی بن لادن ومحمد بن لادن، وان دخول الشرکة الخلیجیة فی هٰذا العقد لیس اِلّا حیلة مصطنعة للتمویل فقط.

۲– ان کانت الشرکة الخلیجیة هی الصانعة الحقیقیة بازاء سعودی بن لادن، فینبغی أن تتحمّل جمیع المسئولیات لتسلیم المشروع بجمیع صفاته المطلوبة الیٰ سعودی بن لادن، ولٰکن فی بند (3.2) فقرة B الیٰ F من عقد الشرکة مع السعودی بن لادن، قد صرحت الشرکة بأنها لا تقبل أیّة مسئولیة تجاه المستصنع فی هٰذا الصدد، ان هٰذا البند یجعل الاستصناع فاسدًا لا یمکن أن یقبل من الناحیة الشرعیة.

۳– ان تسلیم المشروع الیٰ سعودی بن لادن قد جعل العقد متوقفًا علیٰ تسلیم محمد بن لادن، للمشروع الی الشرکة الخلیجیة، وذٰلک بحکم فقرة (4.1) وهٰذا أیضًا غیر جائز شرعًا، لأنّ عقد الشرکة الخلیجیة مع سعودی بن لادن یجب أن یکون منفصلًا تمامًا عن العقد مع محمد بن لادن، کما ذکرت سابقًا.

هٰذه هی النکات الأساسیة المخالف لأحکام الشرع، وهناک بنود فرعیة أیضًا تحتاج الیٰ تعدیل لا یمکن ذکرها بالمکاتبة، ویمکن أن تناقش فی الجلسة.

وانتظرت هاتفكم وحيث لم يتصل فاني أرسل رأيي عن طريق الفاكس.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقي عثماني

ماہنامہ ’’البلاغ‘‘ کے قارئین کا پیشگی ماہانہ رقم کی ادائیگی کا معاملہ ’’بیعِ اِستجرار‘‘ میں شامل ہونے کی وضاحت

سوال:- بندہ ’’البلاغ‘‘ کا قاری ہے اور اس سلسلے میں بندے کو آنجناب سے ایک تردّد اور خلجان دُور کرنا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ ’’البلاغ‘‘ کی جانب سے ذی الحجہ میں اگلے سال کے چندے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ’’البلاغ‘‘ کے قارئین میں وہ حضرات بھی ہیں جو درمیانِ سال رسالے کے خریدار بنے ہیں اور اَب تک ان کی خریداری کی مدّت بھی پوری نہیں ہوئی، تو کیا ایسی صورت میں ماہِ ذی الحجہ میں ان قارئین سے خریداری کی مدّت پوری ہونے سے پہلے اگلے سال کے چندے کا مطالبہ شرعاً دُرست ہے؟ اسی طرح جب کسی قاری کا ’’البلاغ‘‘ سے سال بھر کا معاہدہ طے شدہ رقم میں ہوچکا ہے تو درمیانِ سال (مدّتِ خریداری پوری ہونے سے پہلے) کاغذ وغیرہ کی گرانی کی صورت میں ’’البلاغ‘‘ کا ان قارئین سے مزید چندے کا مطالبہ دُرست ہے؟ نیز فقہی اعتبار سے یہ معاملہ کہ رقم شروع میں جمع کرادی جائے، پھر ماہانہ رسالہ لیا جائے، کس زُمرے میں شامل ہوگا؟

جواب:- محترمی ومکرّمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ باعثِ مسرّت ہوا، آپ نے جس دِینی مسئلے کی طرف توجہ دِلائی اس پر آپ کا شکرگزار ہوں۔ ’’البلاغ‘‘ میں چندے کے اضافے کا مطالبہ انہی خریداروں سے کیا گیا ہے جن کی مدّتِ خریداری ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ پر ختم ہو رہی ہے۔ اور ہمارے یہاں خریداروں کی بھاری اکثریت وہی ہے۔ جو خریدار دورانِ سال بنتے ہیں، انہیں بھی محرّم سے شمارے بھیج دیئے جاتے ہیں، اس کے باوجود جو حضرات یہ منظور نہ کریں، اور اثنائے سال سے خریداری شروع کریں، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور ان سے زیادہ پیسے بھیجنے کا مطالبہ بھی نہیں کیا گیا، ان کی خریداری ختم ہونے تک انہیں کسی اضافی رقم کے بغیر رسالہ جاتا رہے گا، اِن شاء اللہ۔

لیکن جہاں تک فقہی مسئلے کا تعلق ہے، اس کی رُو سے کاغذ وغیرہ کی شدید گرانی کی صورت میں خریداروں سے درمیانِ سال بھی مطالبہ کرنے کا شرعاً حق حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خریداروں کے

ساتھ "البلاغ" کا معاملہ فقہی اعتبار سے "بیع استجرار"[۱] کی تعریف میں آتا ہے، شرعاً جب تک کوئی چیز وجود میں نہ آجائے اس کی بیع نہیں ہوسکتی[۲]، لہٰذا پیشگی چندہ "البلاغ" کے پاس بطور امانت ہے، (اس امانت میں چونکہ مالک نے استعمال کی اجازت دے دی ہے اس لئے وہ فقہی اعتبار سے قرضِ مضمون بن گیا ہے)۔[۳] جب کوئی رسالہ شائع ہوجاتا ہے اس وقت بحصۂ رسدی بیع ہوتی ہے[۴] یہ امانت

(۱ و ۳ و ۴) وفی مؤطا الامام مالک کتاب البیوع باب جامع بیع الطّعام ص: ۵۹۰ (طبع میر محمد کتب خانه) ولا بأس بأن یضع الرّجل عند الرّجل درهمًا ثم یأخذ منه بثلث أو بربع أو بکسر معلوم سلعةً معلومةً ..... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۵۱۶ (طبع سعید) ما یستجرّه الانسان من البیاع اذا حاسبه علیٰ اثمانها بعد استهلاکها جاز استحسانًا. وفی الشامیة تحت قوله (ما یستجرّه الانسان .... الخ) ذکر فی البحر أن من شرائط المعقود علیه أن یکون موجودًا فلم ینعقد بیع المعدوم ثم قال وممّا تسامحوا فیه وأخرجوه عن هٰذه القاعدة ما فی القنیة الأشیاء الّتی تؤخذ من البیاع علیٰ وجه الخرج کما هو العادة من غیر بیع کالعدس والملح والزّیت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صحّ فیجوز بیع المعدوم هنا .... وخرجها فی النّهر علیٰ کون المأخوذ من العدس ونحوه بیعًا بالتّعاطی وأنّه لا یحتاج فی مثله الیٰ بیان الثمن لأنّه معلوم اهـ. واعترضه الحموی بأن أثمان هٰذه تختلف فیفضی الی المنازعة قلت ما فی النّهر مبنی علیٰ أنّ الثمن معلوم لکنّه علیٰ هٰذا لا یکون من بیع المعدوم بل کلّما أخذ شیئًا انعقد بیعًا بثمنه المعلوم .... قلت ووجهه أن ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بیعًا بالتعاطی وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله فکذا اذا تأخّر دفع الثمن بالأولیٰ وهٰذا ظاهر فیما کان ثمنه معلومًا وقت الأخذ مثل الخبز واللّحم أمّا اذا کان ثمنه مجهولًا فانه وقت الأخذ لا ینعقد بیعًا بالتعاطی لجهالة الثمن فاذا تصرّف فیه الآخذ وقد دفعه البیاع برضاه بالدّفع وبالتّصرّف فیه علیٰ وجه التّعویض عنه لم ینعقد بیعًا وان کان علیٰ نیة البیع لما علمت من ان البیع لا ینعقد بالنّیة فیکون شبیه القرض المضمون بمثله أو بقیمته فاذا توافقا علیٰ شیء بدل المثل أو القیمة برئت ذمّة الآخذ .... الخ. (شامیة ج:۴ ص:۵۱۶)

وراجع أیضًا الی الشّامیة تحت "مطلب فی بیع الاستجرار" (ج:۴ ص:۵۱۷).

وفی البحر الرّائق کتاب البیع ج:۵ ص:۲۳۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) وممّا تسامحوا فیه وأخرجوه عن هٰذه القاعدة ما فی القنیة الأشیاء الّتی تؤخذ من البیاع علیٰ وجه الخرج کما هو العادة من غیر بیع کالعدس والملح والزّیت ونحوها ثم اشتراها بعد ما انعدمت صحّ فیجوز بیع المعدوم هنا.

وفی شرح المجلّة (سلیم رستم باز) رقم المادّة:۱۷۵ ص:۸۰ (طبع مکتبه حنفیه کوئٹه) ویصحّ أیضًا ولو کان الاعطاء من أحد الجانبین فقط وبه یفتیٰ وصورته أن یتفقا علی الثمن ثم یأخذ المشتری المبتاع ویذهب برضا صاحبه من غیر أن یدفع الثمن أو أن یدفع المشتری الثمن للبائع ویذهب بدون قبض المبیع فان البیع لازم علی الصّحیح.

وکذا فی شرح المجلّة للخالد الأتاسی رقم المادّة:۱۷۵ ج:۲ ص:۳۶ (طبع حقانیه پشاور)

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة البیع بالتعاطی والاستجرار ص:۶۷ والّذی یظهر لی أن هٰذا المبلغ دفعة تحت الحساب وهی وان کانت قرضًا فی الاصطلاح الفقهی من حیث انه یجوز للمدفوع له أن یصرفها فی حوائج نفسه من حیث کونها مضمونة علیه ولکنها قرض یجوز فیه شرط البیع اللّاحق لکونه شرطًا متعارفًا فانّ الدّفعات تحت الحساب لا یقصد بها الاقراض وانّما یقصد بها تفریغ ذمّة المشتری عن أداء الثمن عند البیع اللّاحق وان یتیسر له شراء الحاجات دون أن یتکلّف نقد الثمن فی کل مرّة فهٰذا قرض تعورف فیه شرط البیع والشرط کلما کان متعارفًا فانه یجوز عند الحنفیة وان کان مخالفًا لمقتضی العقد کما فی شراء النّعل بشرط أن یحذوه البائع.

نیز حضرتِ والا دامت برکاتہم نے "فقہ المعاملات" سے متعلق اپنی ایک اہم غیر مطبوعہ کتاب میں مذکورہ مسئلے سے متعلق تحریر فرمایا:

"....ویتفرّع علیه حکم الاشتراک فی الصحف والمجلّات الدوریة فان العادة فی عصرنا أن الناس یدفعون بدل الاشتراک السنوی فی بدایة کل سنة الیٰ ناشر المجلّة وأنّهم یبعثون الیهم نشرة من المجلّة فی کل شهر أو فی کل أُسبوع وهٰذا استجرار بثمن مقدّم ویقع بیع کل عدد من المجلّة عند ما تصل المجلّة الی المشتری فلو انقطعت المجلّة فی أثناء السّنة لزم علیٰ ناشرها أن یردّ ما بقی من بدل الاشتراک." *نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۳۲۔ (محمد زبیر)*

(۲) وفی مسند أحمد ج:۱۲ ص:۱۳۰ رقم الحدیث:۱۵۲۵۳ عن حکیم بن حزام رضی الله عنه قال: قلت یا رسول الله انی اشتری بیوعًا فما یحلّ لی منها وما یحرم علیّ؟ قال: فاذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتّی تقبضه. وکذا فی سنن البیهقی ج:۵ ص:۳۱۳، وراجع أیضًا الیٰ جامع الترمذی ابواب البیوع ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع سعید).

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتری شیئًا مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتّٰی یقبضه لأنّه نهٰی عن بیع ما لم یقبض.

وکذا فی شرح المجلّة ج:۲ ص:۱۷۳ وتکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۱ وشرح مجلّة الأحکام للعلّامة سلیم باز، رقم المادّة:۳۵۳ ج:۱ ص:۱۲۸.

اس لئے رکھی ہوتی ہے کہ ہر ماہ اس میں سے رقم لے کر رسالہ خریدار کو بھیج دیا جائے۔ اور پچاس روپے میں بارہ رسالے دینا ایک وعدہ ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی ناگزیر عذر پیش آجائے تو خریدار کو اس عذر سے آگاہ کر کے اس وعدے کو فسخ کیا جاسکتا ہے[۱]، ایسی صورت میں اگر خریدار اضافی رقم دینے پر آمادہ ہو تو خیر ورنہ معاملہ فسخ ہوجائے گا، اور اس کی جتنی رقم اپنے پاس باقی ہے وہ واپس کرنی ہوگی۔

والسلام

۱۴۱۰/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۱/۴۱ الف)

***

(۱) ''وعدہ'' کی حیثیت اور حکم نیز عذر کی صورت میں استثناء کی گنجائش سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنی زیرِ تحریر غیر مطبوعہ کتاب میں تفسیر، حدیث اور أئمہ أربعہ کی کتب کے حوالے سے تفصیلی بحث فرمانے کے بعد فرمایا:-

فهٰذه الآيات والأحاديث بمجموعها لا تدع مجالًا للشک في أنّ الوفاء بالوعد واجب واخلافه اثم الّا اذا كان بعذر مقبول .... وبعد أسطر .... فالّذي يتخلص من القرآن والسُّنّة أن الوعد اذا كان جاذمًا يجب الوفاء به ديانةً ويأثم الانسان بالاخلاف فيه الّا اذا كان لعذر مقبول وجاء في مجلّة مُجمّع الفقه الاسلامي قرار رقم: ۲ و ۳ العدد الخامس ۲: ۱۵۹۹ الوعد يكون ملزمًا للواعد ديانةً الّا لعذر .... الخ. (محمد زبیر)

﴿فصل فی البیع بالتّقسیط﴾

(قسطوں پر خرید وفروخت کا بیان)

نقد کے مقابلے میں اُدھار مہنگے داموں فروخت کرنے کا حکم

سوال:- کچھ بیج ایک آدمی دُوسرے آدمی کو بیچتا ہے لیکن اُس وقت اُس آلو کے بیج کی قیمت ساٹھ روپے فی من تھی، اور یہ آدمی کہتا ہے کہ آپ لے لیں، جب آپ کی فصل تیار ہوگی اُس وقت قیمت سو روپے فی من ہوگی، اب میں سستا نہیں بیچتا، آیا شریعت میں یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس کو سود کہتے ہیں، اس پر اکثر یہاں جنگ و جدل ہوجاتا ہے، یعنی اگر اب یہ بیج لیتے ہو تو ساٹھ روپے میں لے لو، ورنہ کچھ دنوں کے بعد سو روپے فی من دوگے۔

جواب:- اگر بیج فروخت کرنے والا یہ کہے کہ ”قیمت نقد ادا کرو تو بیج کی قیمت ساٹھ روپے من ہوگی، اور اُدھار خریدو تو سو روپیہ ہوگی“ اور پھر یہ طے ہوجائے کہ خریدنے والا اُدھار خرید رہا ہے تو یہ بیع جائز ہے،[1] اس میں سود نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۳/۲۹ ب)

---

(۱) وفی جامع التّرمذی نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة، وقال الترمذی: وقد فسّر بعض أهل العلم قالوا: بیعتین فی بیعة أن یقول: أبیعک هٰذا الثّوب بنقدٍ بعشرة وبنسئة بعشرین ولا یفارقه علیٰ أحد البیعین فاذا فارقه علیٰ أحدهما فلا بأس اذا کانت العقدة علیٰ واحدٍ منهما. (الترمذی کتاب البیوع باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة ج: ۱ ص: ۲۳۳ طبع سعید).

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج: ۱۳ ص: ۸ و ۹ (طبع غفاریه کوئٹه) واذا عقد العقد علیٰ أنه الیٰ أجل کذا بکذا وبالنقد بکذا أو قال الی شهر بکذا أو الیٰ شهرین بکذا فهو فاسدٌ ..... وهٰذا اذا افترقا علیٰ هٰذا فان کان یتراضیان بینهما ولم یتفرّقا حتّی قاطعه علیٰ ثمن معلوم وأتما العقد علیه فهو جائز .... الخ.

وفی ردّ المحتار ج: ۵ ص: ۱۴۲ ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن .... الخ.

وکذا فی فتح القدیر ج: ۶ ص: ۲۶۲ (طبع مصطفیٰ بابی مصر).

وفی الهدایة ج: ۳ ص: ۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) لأنّ للأجل شبهًا بالمبیع ألا یریٰ أنّه یزاد فی الثمن لأجل الأجل.

وفیها أیضًا ج: ۳ ص: ۲۱ (طبع رحمانیه) ویجوز البیع بثمن حال ومؤجّل اذا کان الأجل معلومًا.

وفی البحر الرّائق ج: ۶ ص: ۱۱۴ لأنّ للأجل شبها بالمبیع الا تریٰ أنّه یزاد فی الثمن لأجل الأجل.

وفی المجلّة رقم المادّة: ۲۴۵ البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص: ۷ أمّا الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقد أجازوا البیع المؤجّل بأکثر من سعر النقد بشرط أن یبتّ العاقدان بأنّه بیع مؤجّل بأجل معلوم بثمن متفق علیه عند العقد.

قسطوں کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت اور اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کا حکم

سوال:- (خلاصۂ سوال) ہمارا علاقہ سیم زدہ ہے، موسمِ گرما میں سیم کا پانی تین فٹ زمین کی سطح پر رہتا ہے، سردیوں میں جب پانی خشک ہوجاتا ہے تو اس پر ایسی گھاس ہوتی ہے جو بیلوں کے ذریعے ہل چلانے سے نہیں اُکھڑتی، جس کے لئے ہمیں ٹریکٹر لانا پڑتا ہے، وہ دس روپیہ فی گھنٹہ سے کم ملتا نہیں، اور اس کے حصول کے لئے بینک کی طرف رُجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح بینک کے ذریعے سے پندرہ ہزار کا ٹریکٹر مل جاتا ہے، اس کی اقساط اور نفع ادا کرنے پر اٹھارہ ہزار روپے ادا کرنے پڑتے ہیں، مذکورہ اقساط سات سال کی مدّت میں ادا کرنی پڑتی ہیں، اب اگر نقدی پر یہ ٹریکٹر خریدا جائے تب بھی اٹھارہ ہزار روپے میں خریدا جاسکتا ہے، اب نقدی سے تو ہم مجبور ہیں، اب اقساط پر ہم ٹریکٹر حاصل کرسکتے ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اور وجہ معاملے کے ناجائز ہونے کی نہ ہو تو ٹریکٹر کو قسطوں پر خریدنا جائز ہے، اور اُدھار کی وجہ سے اصل قیمت پر کچھ اضافہ کردینا فقہاء کی تصریح کے مطابق معاملے کو ناجائز نہیں بناتا،[1] بشرطیکہ مجلسِ عقد میں قیمت کا نقد یا اُدھار ہونا معین ہوگیا ہو، لہٰذا معاملے کی جو صورت سوال میں ذکر کی گئی ہے وہ جائز ہے،[2] بشرطیکہ اس معاملے میں کوئی اور شرطِ فاسد نہ لگائی جائے۔

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۸۵/ ۱۸ الف)

نقد ایک لاکھ کا پلاٹ چوبیس ماہ کی اَقساط پر سوا لاکھ میں خریدنے کا حکم

سوال:- اگر پلاٹ، مکان، دُکان کی نقد قیمت ایک ہو، اور اَقساط پر اس سے زائد۔ مثلاً ایک پلاٹ نقد ایک لاکھ روپے میں اور ۲۴ ماہ کی اَقساط پر سوا لاکھ روپے میں ملتا ہو تو کیا یہ پلاٹ اَقساط پر خریدنا جائز ہے؟ یا ۲۵ ہزار روپے سود شمار کئے جائیں گے؟

(۱و۲) دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

جواب:- یہ اس شرط سے جائز ہے کہ جس وقت مکان وغیرہ کی خریداری عمل میں آئے اس وقت قیمت اور قسطیں کسی ابہام کے بغیر طے ہوجائیں[1]، اور پھر جو قیمت اس طرح طے ہوئی ہے خریدار سے ہر حال میں اسی کا مطالبہ ہو[2] ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اس پر کوئی اِضافہ نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۶/۴۰ و)

گورنمنٹ سے قسطوں پر نیلام کی جانے والی زمین خریدنے کا حکم

سوال:- گورنمنٹ جو زمین نیلام کرتی ہے وہ رقم قسطوں میں بمع سود وصول کرتی ہے، یہ خریدنا جائز ہے؟

جواب:- اگر حکومت یہ اعلان کرے کہ زمین اگر نقد روپے سے خریدی جائے تو اس کی قیمت کم ہوگی اور اگر قسطوں پر اُدھار خریدی جائے تو قیمت زیادہ ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے،[3] لیکن اگر قسطوں کی صورت میں یہ کہے کہ قیمت تو وہی نقد کی ہے باقی سود لیا جائے گا، تو یہ صورت جائز نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ　　　الجواب صحیح

۱۳۸۸/۶/۵ھ　　　بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷/۱۹ الف)

قسطوں پر گاڑی خریدنے کے بعد اس کی ٹوٹ پھوٹ کا ذمہ دار خریدنے والا ہوگا

سوال:- زید ایک موٹر کار مبلغ پچاس ہزار میں لے کر ٹیکسی میں پاس کرواکر بکر کے ہاتھ مبلغ ستر ہزار روپے میں قسط وار ادائیگی کی شرط پر فروخت کردیتا ہے، اور ماہانہ دو ہزار روپے قسط ادا کرتا ہے۔ جس کے حوالے گاڑی کی ہے وہ تمام ٹوٹ پھوٹ اور دیگر مرمت کا ذمہ دار ہے، پوری قسط ہوجانے کے بعد زید گاڑی کے تمام مالکانہ حقوق بکر کو دے دیتا ہے، قسط کی ادائیگی کے درمیان گاڑی سے جو بھی نفع نقصان ہوگا بکر کا ہوگا، زید کا اُس سے کچھ تعلق نہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- مذکورہ معاملہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس معاملے سے موٹر اس کی ملکیت

(۱و۲و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

ہوجائے گی،[1] اور قبضہ کرنے کے بعد اس کی تمام ٹوٹ پھوٹ وغیرہ کا ذمے دار وہ ہوگا، زید کو صرف قیمت یا اُس کی قسطیں وصول کرنے کا حق باقی رہے گا۔ اور قسط پوری ہونے کے بعد مالکانہ حقوق بکر کو دینے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس وقت گاڑی بکر کے نام سرکاری کاغذات میں منتقل کردی جائے گی، اس لئے اس شرط میں کچھ حرج نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/۲۸ ج)

قسطوں پر خرید وفروخت کا حکم

سوال:- ایک شخص ''الف'' دُوسرے شخص ''ب'' کو مال دِلواتا ہے اور اُس سے وہی مال فوراً بڑھتی میں خرید لیتا ہے اور پیسے کی ادائیگی روزانہ تھوڑی تھوڑی کرتا ہے یا روزانہ ایک مقرّرہ رقم ادا کرتا ہے اور وہ مال خود کسی بڑھتی میں بیچ دیتا ہے اور اس پیسے سے اور کام کرتا ہے جس میں نفع سے دُوسرے فریق کا بالکل تعلق نہیں ہے تو کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟

جواب:- ''مال دِلوانے'' کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ''ب'' اس کی خریداری میں مدد کرتا ہے، اس صورت میں اگر ''الف'' نے ''ب'' سے جو مال خریدا ہے اس میں قیمت کی ادائیگی کی مدّت اور اگر قسطیں مقرّر کی گئی ہوں تو قسطوں کی مقدار اور میعاد سب طے کرلی ہیں، تو مذکورہ طریقہ جائز ہے،[2] اور اس کے بعد ''الف'' جو مال آگے بیچ کر نفع کمائے گا وہ حلال ہوگا۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۱/۲۸ ج)

---

(۱) وفی ردّ المحتار کتاب البیوع ج:۴ ص:۵۰۶ (طبع سعید) وحکمه ثبوت الملک أی فی البدلین لکل منهما فی بدل ....الخ.

وفی الهندیة کتاب البیوع البابُ الأوّل فی تعریف البیع ورکنه .... الخ ج:۳ ص:۳ (طبع رشیدیه کوئٹه) وأمّا حکمه فثبوت الملک فی المبیع للمشتری وفی الثمن للبائع اذا کان البیع باتًا .... الخ.

وفی شرح المجلّة ج:۲ ص:۳۷۳ البیع النّافذ یفید الحکم فی الحال أی ثبوت الملک فی البدلین لکل منهما فی بدل وهٰذا هو الحکم الأصلی للبیع النّافذ .... الخ. وفی شرح المجلّة للأتاسی ج:۲ ص:۳۵۷ رقم المادّة: ۳۶۹ حکم البیع المنعقد الملکیة یعنی صیرورة المشتری مالکًا للمبیع والبائع مالکًا للثمن .... الملکیة تثبت بمجرّد العقد اذا استجمع البیع شرائط الانعقاد والصّحة واللّزوم النّفاذ .... الخ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۸ اذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منهما الّا مِن عیب أو عدم رؤیة ....الخ.

وکذا فی الهندیة ج:۳ ص:۸ (طبع بلوچستان بُک ڈپو).

وفی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۶۲ البیع یلزم بایجاب وقبول أی حکم البیع یلزم بهما.

وفی شرح المجلّة للأتاسی ج:۲ ص:۱۶۶ رقم المادة:۲۴۵ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه) البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح.

نیز قسطوں پر خرید وفروخت کے جواز سے متعلق حوالہ کے لئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲و۳) دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

قسطوں پر خرید و فروخت اور اس کی شرائط

سوال:- زید بجلی کا پنکھا خریدنا چاہتا ہے، قسطوں کی صورت میں اس کو زیادہ رقم دینی پڑتی ہے اور اگر پوری رقم ایک دفعہ دی جائے تو کم رقم آتی ہے، کیا ایسی صورت میں قسطوں پر خریدنا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر اور کوئی وجہ بیع کے فاسد ہونے کی نہ ہو تو اس طرح قسطوں پر پنکھا خریدنا جائز ہے، کیونکہ اُدھار کی صورت میں زیادہ قیمت کا لین دین فقہاء کی تصریح کے مطابق جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۶۸/۱۸ الف)

لیکن معاملہ اس طرح نہ کریں کہ قیمت مثلاً سو روپیہ اور سود اس پر پچیس روپے، بلکہ شروع سے اُدھار کی وجہ سے ۱۲۵ قیمت مقرّر کرلیں۔

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) فی الفتاویٰ الشامیۃ ج:۵ ص:۱۴۲ (طبع سعید) ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن قصدًا.
وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) لأن للأجل شبها بالمبیع ألا یریٰ انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل،
کذا فی فتح القدیر ج:۶ ص:۲۶۲ کتاب البیوع. نیز مزید حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ کا حاشیہ۔

﴿فصل فی أحکام المال الحرام والمخلوط﴾

(مخلوط اور حرام مال کے اَحکام)

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کا بعینہٖ صدقہ ضروری ہے یا اس کے بقدر رقم؟

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کی موجودہ مالیت کا صدقہ ضروری ہے یا صرف حرام رقم کا؟

مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کا طریقہ؟

سوال ۱:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کا بذاتِ خود تصدّق بہتر ہے یا اس کے بقدر قیمت کا تصدّق بہتر ہے؟

جواب ۱:- اگر بعینہٖ حرام رقم سے خریدی گئی ہے تو بعینہٖ اس کا تصدّق بہتر ہے،(۱) اور اگر حرام کو حلال سے مخلوط کر کے خریدی گئی ہے تو اس چیز کا تصدّق ضروری نہیں، رقم کا تصدّق کافی ہے۔(۲)

سوال ۲:- حرام رقم سے خریدی ہوئی چیز کو حلال کرنے کے لئے کیا موجودہ مالیت کے بقدر تصدّق لازم ہے یا فقط حرام رقم کے بقدر تصدّق لازم ہے؟

جواب ۲:- اُوپر کی صورتِ اُولیٰ میں موجودہ مالیت کے بقدر،(۳) ورنہ فقط حرام رقم کے بقدر۔(۴)

(۱ و ۳) وفی ردّ المحتار کتاب البیوع باب المتفرّقات مطلب اذا اکتسب حرامًا ثم اشتریٰ فهو علیٰ خمسة أوجه ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع سعید).

(قوله اکتسب حرامًا) توضیح المسئلة ما فی التّاتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالًا من حرام ثم اشتریٰ فهٰذا علیٰ خمسة أوجهٍ امّا ان دفع تلک الدّراهم الی البائع أوّلًا ثم اشتریٰ منه بها أو اشتریٰ قبل الدّفع بها ودفعها أو اشتریٰ قبل الدّفع بها ودفع غیرها أو اشتریٰ مطلقًا ودفع تلک الدّراهم أو اشتریٰ بدراهم آخر ودفع تلک الدراهم .... قال الکرخی فی الوجه الأوّل والثانی لا یطیب وفی الثلاث الأخیرة یطیب وقال أبوبکر لا یطیب فی الکل لکن الفتویٰ الآن علیٰ قول الکرخی دفعًا للحرج عن النّاس اهـ.

وفی الهدایة کتاب الغصب ج:۳ ص:۳۷۵ و۳۷۶ (طبع رحمانیه) أمّا فیما لا یتعیّن کالثمنین فقوله فی الکتاب "اشتریٰ بها" اشارة الیٰ أن التّصدّق انّما یجب اذا اشتریٰ بها ونقد منها الثمن أمّا اذا أشار الیها ونقد من غیرها أو نقد منها وأشار الیٰ غیرها أو أطلق اطلاقًا ونقد منها یطیب له وهٰکذا قال الکرخی لأنّ الاشارة اذا کانت لا تفید التّعیین، لا بدّ أن یتأکد بالنّقد لیتحقق الخبث وقال مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ لا یطیب له قبل أن یضمن وکذا بعد الضّمان بکل حال وهو المختار لإطلاق الجواب فی الجامعین والمبسوط.

(حاشیہ نمبر ۲ و ۴ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

سوال۳:- ایک شخص نے حرام رقم سے کوئی چیز خریدی، پھر وہ چیز کسی دُوسرے کو فروخت کردی، دُوسرے کو خیال آیا کہ یہ چیز تو حرام رقم سے خریدی ہوئی تھی، تو اَب اِس کو حلال کس طرح کیا جائے؟ کیا حرام رقم کے بقدر بائع پر تصدّق لازم ہے یا مشتری کا تصدّق کرنا ہی کافی ہے؟ نیز مشتری کے تصدّق کی صورت میں بائع کو بتانا ضروری ہے یا نہیں؟　　محمد عامر اُستاذ جامعۃ الرشید

جواب۳:- اصل حکم یہ ہے کہ چیز لوٹا کر رقم واپس لے لے،(۱) اگر مجبوری ہو کہ بائع واپس نہ کرے تو بائع پر تصدّق کا سوال ہی نہیں، کسی فقیر کو تصدّق کرکے اس سے خرید لے (ثمنِ مثل پر)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

مالِ مخلوط کا نفع حلال ہے یا حرام؟

(''ہدایہ'' اور ''فتح القدیر'' کی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخدمت شیخی و اُستاذی مدظلکم۔

چند مسائل میں حضرتِ والا کی رائے معلوم کرنی ہے:-

۱:- وہ مال جو حلال وحرام سے مخلوط ہو اس سے جب کاروبار شروع کیا جائے تو منافع حلال ہے یا نہیں؟ ''فتح القدیر'' کی درج ذیل عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً حلال ہے چاہے حلال غالب ہو یا مغلوب۔ قال ابن الھمام رحمہ اللہ تعالیٰ: **والخبث لفساد الملک دون الخبث لعدم الملک فیوجب شبھة الخبث فیما یوجب فیه عدم الملک حقیقة الخبث وھو ما یتعین**

(حاشیہ نمبر۲و۴ متعلقہ صفحہ گزشتہ) (۲ و ۴ و ۱) وفی ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۹۲ (طبع سعید) ان المراد لیس ھو نفس الحرام لأنّه ملکه بالخلط وانّما الحرام التّصرّف فیه قبل أداءِ بدله ..... نعم لا یباح الانتفاع به قبل أداء البدل فی الصحیح من المذھب. وکذا فی الطحطاوی علی الدّر المختار ج:۴ ص:۱۹۲.

وفی الھندیة ج:۵ ص:۳۴۹ (طبع مکتبه رشیدیه) والسبیل فی المعاصی ردّھا وذٰلک ھٰھنا بردّ المأخوذ ان تمکن من ردّہ بأن عرف صاحبه .... الخ. وفی ردّ المحتار علی الدر المختار ج:۵ ص:۹۹ (طبع سعید) والحاصل انّه ان علم أرباب الأموال وجب ردّہ علیھم والّا فان علم عین الحرام لا یحلّ له ویتصدّق به بنیّة صاحبه .... وبعد أسطر .... ومفادہ الحرمة وان لم یعلم أربابه وینبغی تقییدہ بما اذا کان عین الحرام لیوافق ما نقلناہ اذ لو اختلط بحیث لا یتمیّز یملکه ملکًا خبیثًا لکن لا یحلّ له التّصرّف فیه مالم یؤدّ بدله .... الخ.

وفی الدّر المختار کتاب الغصب ج:۶ ص:۱۸۲ (طبع سعید) ویجب ردّ عین المغصوب فی مکان غصبه ویبرأ بردّھا ولو بغیر علم المالک .... أو یجب ردّ مثله ان ھلک وھو مثلی.

وفی ردّ المحتار ج:۶ ص:۳۸۵ ویردونھا علیٰ أربابھا ان عرفوھم والّا تصدّقوا بھا لأنّ سبیل الکسب الخبیث التصدّق اذا تعذر الرّدّ علیٰ صاحبه.

کالجارية في مسئلتنا ويتعدى الىٰ بدلها وشبهة الشبهة فيما يوجب فيه عدم الملک الشبهة وهو مالا يتعين وشبهة الشبهة غير معتبرة. (فتح القدير ج:۶ ص:۱۰۴ باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه)۔

چند ماہ قبل بندے نے اسی عبارت کے پیشِ نظر منافع کے حلال ہونے کا ایک فتویٰ لکھا تھا، جس پر اُستاذِ محترم مفتی .... صاحب نے تصدیق بھی کردی تھی، لیکن اب خیال ہوا کہ حضرتِ والا سے بھی رہنمائی حاصل کرلوں۔ محمد عامر اُستاذ جامعۃ الرشید کراچی

جواب:- مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''فتح القدیر'' کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا دُرست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط مال کا رِبح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدمِ ملک کی وجہ سے آئی ہے، مثلاً غصب یا بحکمِ غصب ہے، یا عقدِ باطل کے ذریعے حاصل ہوا ہے، تو خود فتح القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ الخبث پیدا کرے گا جو معتبر ہے، اور غصب کی صورت میں تو محض شبہ نہیں، بلکہ حقیقتِ خبث پیدا کرے گا، کیونکہ غصب میں دراہم و دنانیر باتفاقِ حنفیہ متعین ہوجاتے ہیں۔[1] دُوسرے اگر حرمت فسادِ ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک ''فتح القدیر'' اور ''ہدایہ'' کے اس مسئلے کی وجہ سے رِبح حلال ہوگا۔ مگر یہ مسئلہ اُس قول پر مبنی ہے جس کی رُو سے دراہم و دنانیر عقودِ فاسدہ میں بھی متعین نہیں ہوتے، حالانکہ صاحبِ ہدایہ نے اَصح اس کو قرار دیا ہے کہ عقودِ فاسدہ میں دراہم و دنانیر متعین ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اسی مسئلے کے بارے میں صاحبِ عنایہ فرماتے ہیں: **"وهـــذا انـما يستقيم على الرواية الصحيحة، وهى أنّها لا تتعين، لا على الأصح، وهى الّتى تقدمت أنّها تتعين فى البيع الفاسد لأنها بمنزلة المغصوب."** (عناية ج:۶ ص:۱۰۴)[2] (اگرچہ علامہ ابنِ ہمامؒ نے اَصح بھی عدمِ تعیین کو قرار دیا ہے، کیونکہ جاریہ والا مسئلہ اَصحابِ مذاہب سے منقول ہے) البتہ عدمِ ملک کی صورت میں رِبح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مالِ مخلوط میں غالب

---

(۱) وفى النتف فى الفتاوىٰ ص:۴۵۴ ولو غصب دراهم أو دنانير أو غير ذٰلک من الكيلي والوزنى فاتجر فيه وربح فانه يتصدّق بالرّبح. وكذا فى فتح القدير ج:۸ ص:۲۵۵، والمبسوط للسرخسى ج:۱۱ ص:۷۷.

وفى بدائع الصنائع ج:۶ ص:۱۴۹ اذا غصب ألفًا فاشترىٰ جارية فباعها بألفين ثم اشترىٰ بالألفين جارية فباعها بثلاثة آلاف انّه يتصدّق بجميع الرّبح.

وفى الهداية ج:۳ ص:۳۷۳ (طبع رشيديه كوئٹه) ومن غصب عبدًا فاستغلّه فنقصته الغلّة فعليه النّقصان لما بينّا ويتصدّق بالغلّة لأنّه حصل بسبب خبيث وهو التّصرف فى ملک الغير.

وفى الشامية ج:۶ ص:۱۸۹ (طبع سعيد) (قوله وتصدق الخ)أصله ان الغلّة للغاصب عندنا لأنّ المنافع لا تتقوّم إلّا بالعقد والعاقد هو الغاصب فهو الّذى جعل منافع العبد مالًا بعقدهٖ فكان هو أوْلىٰ ببدلها ويومر أن يتصدّق بها لاستفادتها ببدل خبيث وهو التّصرّف فى مال الغير.

(۲) دیکھئے فتح القدير، باب البيع الفاسد فصل فى أحكامه ج:۶ ص:۱۰۴.

حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں رِبح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو، مثلاً ۱/۴ حلال تھا، اور ۳/۴ حرام، تو رِبح کا ۱/۴ حصہ حلال اور باقی حرام۔ اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی احتیاط اسی میں ہے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ نے اَصح تعیین الدراھم فی العقود الفاسدۃ[1] کو قرار دیا ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۴/۳/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۳۰)

مالِ مخلوط کے نفع سے متعلق مذکورہ فتویٰ کی مزید وضاحت اور ایک اِشکال کا جواب

سوال:- بخدمت شیخی واُستاذی حفظکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے گزشتہ علمی خط میں حضرتِ والا کی خدمت میں مالِ مخلوط کے منافع کی مطلقاً حلت کا خیال ذِکر کیا تھا اور اِس کے لئے فتح القدیر کی عبارت پیش کی تھی، حضرتِ والا نے جواب تحریر فرمایا کہ ''فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے علی الاطلاق یہ حکم نکالنا دُرست معلوم نہیں ہوتا کہ ہر مخلوط مال کا ربح حلال ہے، جس کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ مخلوط کا جو حصہ حرام ہے، اگر اس میں حرمت عدمِ ملک کی وجہ سے آئی ہے ......تو خود فتح القدیر کی اس عبارت میں تصریح ہے کہ یہ شبہۃ الخبث پیدا کرے گا جو معتبر ہے ......اگر حرمت فسادِ ملک کی وجہ سے آئی ہے تو بے شک فتح القدیر اور ہدایہ کے اس مسئلے کی وجہ سے ربح حلال ہوگا ....البتہ عدمِ ملک کی صورت میں ربح کے حلال یا حرام ہونے میں دخل اس بات کا نہ ہوگا کہ مالِ مخلوط میں غالب حلال ہے یا حرام، بلکہ دونوں صورتوں میں ربح کا وہ حصہ حرام ہوگا جو حرام کے مقابل ہو......اور فسادِ ملک کی صورت میں بھی اِحتیاط اسی میں ہے ......واللہ اعلم۔''

اس بارے میں تردّد یہ ہے کہ حضرتِ والا نے مالِ مخلوط کے دو حصے بنائے ہیں اور ہر ایک حصے کے ربح کا حکم الگ کیا ہے، لیکن بندہ شرح التنویر کی درج ذیل عبارت کے پیشِ نظر یہ سمجھا ہوا ہے کہ مالِ مخلوط مکمل خالط کی ملک میں آجاتا ہے لیکن ملک خبیث ہوتی ہے اور خالط حرام رقم کے بقدر ضامن بن جاتا ہے۔

قال الحصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ: أو اختلط المغصوب بملک الغاصب بحیث یمتنع امتیازہ کاختلاط برہ ببرہ أو یمکن بحرج کبرہ بشعیرہ

(۱) وفی الھدایۃ ج:۲ ص:۶۸ (طبع رحمانیہ) .... لأنھا تتعین فی البیع الفاسد وھو الأصح.

ضمنه وملكه بلا حل انتفاع قبل أداء ضمانه. (الدر مع الرد ج:٦ ص:١٩١)

اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مالِ مخلوط علی الاطلاق مضمون ہوتا ہے اور اِس میں فسادِ ملک ہوتا ہے، لہٰذا فتح القدیر کی تحقیق کے مطابق علی الاطلاق ربح بھی حلال ہونا چاہئے۔

حضرتِ والا سے مزید رہنمائی کی درخواست ہے۔

جواب:- وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت بہت تدقیق کے ساتھ مراجعت کا تو موقع نہیں ہے، لیکن ہدایہ کے مسئلۂ جاریہ[1] کو غصب میں مالِ مخلوط کے مملوک ہوجانے کے مسئلے[2] سے ملاکر مذکورہ نتیجہ نکالنا بندے کو اَب بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل تو خلط المغصوب بغیر المغصوب کے مسئلے میں ملکیت اِلتزام الضمان (بلکہ نیت اداء الضمان) سے آئے گی، جو شخص ضمان کا اِلتزام ہی نہ کرے اسے مالک کیسے قرار دِیا جاسکتا ہے؟ دُوسرے جو عبارت آپ نے لکھی ہے، خود اسی میں تصریح ہے کہ قبل اداء الضمان اس سے اِنتفاع حلال نہیں۔ اور استرباح اِنتفاع کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اور مسئلہ اسی صورت میں مفروض ہے جب ضمان ادا نہ کیا ہو، ضمان ادا کردیا ہو تو پھر حلت میں کوئی اِشکال نہیں۔ البتہ آج کل بنک وغیرہ کے ملازمین کو جو ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی اور صورت گزارے کی نہ ہو تو اِلتزامِ ضمان کرکے اور اس کی ادائیگی کی پکی نیت رکھ کر اس رقم کو اِستعمال کرلیں، یا کاروبار میں لگالیں، اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ وہ غصب نہیں، بلکہ جانبِ آخر کی رضامندی سے ایک ناجائز عقد کیا گیا ہے جس میں جانبِ آخر کوئی مطالبہ بھی نہیں رکھتا، لہٰذا معاملہ صرف حق اللہ کا رہ جاتا ہے اور توبہ، اِلتزامِ ضمان اور نیتِ اداء کی صورت میں اس کا وجوب علی الفور کے بجائے علی التراخی ہونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، ضرورت کے وقت اس گنجائش سے فائدہ اُٹھانے اور ساتھ ساتھ اِستغفار کرتے رہنے کا مشورہ دے دیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۴/۵/۲۰ھ

مالِ حرام کو حلال کرنے کے لئے غیرمسلم سے قرض والے حیلے کی شرعی حیثیت

سوال:- حرام رقم کو حلال کرنے کا بعض علماء یہ حیلہ بتاتے ہیں کہ کسی غیرمسلم سے قرض لے لے اور حرام رقم سے قرضہ ادا کرے، کیا حضرتِ والا کے نزدیک یہ حیلہ دُرست ہے؟ اگر کسی نے

---

(۱) دیکھئے هداية ج:۳ ص:۶۸ و ۶۹ (طبع رحمانیه)۔

(۲) دیکھئے الدر المختار مع الرد المحتار ج:٦ ص:١٩١ (طبع سعید)۔

ایسا کرلیا ہوتو اب کیا کرے؟ (محمد عامر)

جواب:- اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی،(۱) صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا،(۲) لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے، اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں ہے: ''حرام کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ مفید نہیں'' تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۱۴۴ (طبع دارالعلوم کراچی) ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الهندية كتاب الكراهية الباب الثانى عشر فى الهدايا والضيافات ج:۵ ص:۳۴۲ (طبع بلوچستان بُک ڈپو) وفى شرح حيل الخصاف لشمس الأئمّة رحمه الله تعالىٰ ان الشيخ أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة يقضى بها ديونه والحيلة فى هٰذه المسائل أن يشترى نسيئة ثم ينقد ثمنه من أىّ مال شاء، وقال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفةؒ عن الحيلة فى مثل هٰذا فأجابنى بما ذكرنا.

وفى الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحّة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه الّا اذا وكل ذمّيا ببيعه الخ.

وفى خلاصة الفتاوىٰ كتاب الكراهية الفصل الرّابع فى المال من الاهداء والميراث وغير ذٰلك ج:۴ ص:۳۴۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وفى شرح حيل الخصاف لشمس الأئمّة الحلوانى رحمه الله ان الشيخ الامام أبا القاسم الحكيم كان ممن يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض بجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة كان يقضى به دينه والحيلة فى مثل هٰذه المسائل ان يشترى شيئًا ثم ينقد ثمنه من أىّ مال أحبّ. قال أبو يوسف رحمه الله: سألت أبا حنيفةؒ عن الحيلة فى مثل هٰذا، قال: فأجابنى بما ذكرناه الخ.

وفى السراجية المغنية اذا قضى دينها من كسبها اجبر الطالب على الأخذ.

وفى الهندية كتاب الحيل الفصل الأوّل ج:۶ ص:۳۹۰ (طبع رشيديه) كل حيلة يحتال بها الرّجل ليتخلّص بها عن حرام أو ليتوصّل بها الىٰ حلال فهى حسنة. نیز دیکھئے: امداد المفتين ص:۸۰۲ و ۸۰۳، ومجموعة الفتاوىٰ ج:۲ ص:۲۶۷ (طبع سعيد).

(۳) وفى سنن الترمذى ج:۱ ص:۲۴۹ (طبع مكتبه رحمانيه) ..... انّه لا يربوا لحم نبت من سحت إلّا كانت النار أولىٰ به. وفى صحيح ابن حبان ج:۵ ص:۹ (طبع مؤسسة الرسالة) يا كعب بن عجرة انّه لا يدخل الجنة لحمٌ نبت من سحتٍ.

وفى مسند أحمد بن حنبل رقم الحديث:۵۷۳۲ ج:۵ ص:۲۱۸ و ۲۱۹ (طبع دارالحديث القاهرة) عن ابن عمر رضى الله عنهما أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من اشترى ثوبًا بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله تعالىٰ له صلوٰة ما دام عليه.

وفى الصحيح للإمام المسلمؒ ج:۱ ص:۳۲۶ (طبع مكتبة الحسن) عن أبى هريرة رضى الله عنه فى حديث: .... ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه الى السماء يا رَبّ! يا رَبّ! ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فأنّى يستجاب لذٰلك. (مسلم).

وفى مسند أحمد رقم الحديث:۳۶۷۲ ج:۳ ص:۵۳۹ (طبع دارالحديث القاهرة) عن عبدالله بن مسعود رضى الله عنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يكسب عبد مالًا من حرام فينفق فيه فيبارك له فيه ولا يتصدق به فيتقبل منه ولا يترك خلف ظهره الّا كان زاده الى النّار. الحديث (رواه أحمد).

ناجائز طریقے سے آئی ہوئی رقم غلطی سے استعمال ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- کاروبار میں کبھی غلطی سے ناجائز اور حرام رقم آجاتی ہے، جو کبھی استعمال ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے بعد میں دِل میں کافی پریشانی پیدا ہوجاتی ہے اور اس پریشانی میں نماز چھوڑ دیتا ہوں، شرعاً کیا حکم ہے؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور اِستغفار کرنا چاہئے، اور تلافی کے لئے اتنی رقم صدقہ کردینا چاہئے۔[1] لیکن اس کی وجہ سے نماز چھوڑ دینا تو کسی طرح بھی جائز نہیں، اس کے بعد تو اور زیادہ اہتمام سے نماز پڑھنے کی ضرورت ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۵/۴/۲۸ھ[2]

ماں کے لئے مجبوراً بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:- اگر کسی کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہی اپنی ماں کا کفیل ہو، اور اُس کی آمدنی ناجائز ہو تو ماں کے لئے اُس کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ مجبوراً اسی بیٹے کی کمائی کھاتی ہے جبکہ ظاہراً ماں اُس حرام مال کو دیکھ رہی ہے، لیکن کھانے پر مجبور ہے کیونکہ دُوسرا کفیل نہیں، ایسی عورت کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمے واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو، توبہ اور اِستغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش

---

(۱) وفی الاختیار لتعلیل المختار ج:۳ ص:۶۱ والملک الخبیث سبیله التصدّق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز ثم ان کان غنیًا تصدق بمثله وان کان فقیرًا لا یتصدق. نیز دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم نے سائل موصوف کے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔

جاری رکھے۔(۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۷/۲۷ و)

باپ کی طرف سے صدقے کے لئے دی گئی حلال رقم خود استعمال کر کے مالِ حرام سے صدقہ کرنے کا حکم

سوال:- باپ نے بیٹے کو حلال رقم کسی نیک کام میں کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے دی کہ اس رقم سے فلاں چیز خرید کر فلاں مستحق کو دے دو، بیٹے کے ذرائع آمدنی ناجائز ہیں، بیٹے نے باپ کی دی ہوئی وہ رقم خود خرچ کر کے بعد میں اپنی ناجائز آمدنی سے وہ چیز خرید کر مستحق کو دی۔ تو کیا اس صورت میں باپ کے ثواب میں فرق پڑے گا؟ کہیں باپ کا ثواب تو ختم نہیں ہوگا؟

طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- باپ کے ثواب میں تو اِن شاء اللہ اس صورت میں فرق نہیں پڑے گا، لیکن بیٹے کو یہ گناہ ہوگا کہ اس نے باپ کی دی ہوئی رقم خرچ کرلی، اور ناجائز آمدنی حاصل کی،(۲) اور باپ نے اسے پاک صاف مال سے خریدنے کو کہا تھا، اس نے ناجائز آمدنی سے چیز خریدی، لہٰذا بیٹے پر اوّل تو یہ واجب ہے کہ وہ ان گناہوں سے توبہ کرے اور ناجائز ذرائع آمدنی کو ترک کرے، دُوسرے! باپ جو مال کسی کام کے لئے دے، اسی سے خرچ کرے اور اسے الگ رکھے۔ وانما صح الشراء علیٰ قول

---

(۱) وفی الشامیة ج:٦ ص:١٩١ وفی جامع الجوامع: اشتری الزّوج طعامًا أو کسوةً من مال خبیثٍ جاز للمرأة أکله ولبسها والاثم علی الزّوج ....الخ.
وفی ردّ المحتار أیضًا ج:٦ ص:٣٨٦ (طبع سعید) امرأة زوجها فی أرض الجور اذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصبًا أو اشتریٰ طعامًا أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذٰلک والاثم علی الزّوج.
وکذا فی الخانیة علی الهندیة ج:٣ ص:٤٠٣.
وفی أحکام المال الحرام ص:٢٨٩، فاذا کان المال الحرام فی ید الوالد ینفق منه علیٰ نفسه وأبنائه لغیر حاجة أو فقرٍ فانّ الأب یکون آثمًا بهٰذا الانفاق اذا وجد المال الحلال أو کان قادرًا علیٰ تحصیله .... أمّا الأبناء ففی حکم انفاقهم من المال الحرام الّذی عند الأب ینبغی التّفریق بین حالتین، الأولیٰ: أن یکون الابن غیر قادر علیٰ تحصیل المال الحلال إمّا لعجزه أو لصغر سنّه وکانت نفقته واجبة علیٰ أبیه أو کان طالب علم لیس له مصدر رزق للعیش ودفع نفقات الدّراسة الّا هٰذا المال الحرام الّذی عند الأب فانّ حکمه فی الأخذ من هٰذا المال حکم المضطر الیٰ دفع الأذیٰ عن نفسه بالمیتة فیجوز له أن یأخذ ما ینفقه علیه والده وان ینتفع به مع انکاره فی قلبه لهٰذا الأمر الیٰ أن یصبح قادرًا علی الاعتماد علیٰ نفسه فی تحصیل الکسب الحلال أو أن یأتیه مال من مصدر حلال فیستغنی به عمّا عند والده من مال حرام لأنّه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته الی الانفاق علیٰ نفسه من المال الحرام ویکون لزامًا علیه أن ینفق علیٰ نفسه من هٰذا المال الحلال ویحرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام.
نیز دیکھئے صفحہ:۱۲۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۲) مالِ حرام حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے گناہ سے متعلق احادیث ص:۱۲۵ کے حاشیہ نمبر۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الکرخی رحمہ اللہ تعالیٰ، وصحت الصدقۃ۔(۱)

واللہ اعلم
۱۴۰۶/۶/۲۸ھ(۲)

مالِ حرام سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق

(وضاحت از مرتب) مالِ حرام کے بارے میں عام طور پر فتاویٰ میں یہ بات درج کی جاتی ہے کہ اسے بلانیتِ ثواب کسی فقیر اور مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیا جائے، یعنی تصدق کے ساتھ ساتھ تملیک کی بھی شرط لگائی جاتی ہے، اور اسی کے مطابق پہلے دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سے فتاویٰ جاری ہوتے تھے، مگر بعد میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس موضوع پر خاص طور پر تحقیق فرمائی کہ

---

(۱) وفی الشامیة مطلب اذا اکتسب حرامًا ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع سعید) مطلب اذا اکتسب حرامًا ثم اشتری فهو علیٰ خمسة أوجه قوله (اکتسب حرامًا. الخ) توضیح المسألة ما فی التتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهٰذا علیٰ خمسة أوجه أما ان دفع تلک الدراهم الی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها ودفعها أو اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها أو اشتری مطلقا ودفع تلک الدراهم أو اشتری بدراهم أخر ودفع تلک الدراهم قال أبو نصر یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق الّا فی الوجه الأول والیه ذهب الفقیه أبو اللیث لٰکن هٰذا خلاف ظاهر الروایة فانه نص فی الجامع الصغیر اذا غصب ألفا فاشتری بها جاریة وباعها بألفین تصدق بالربح وقال الکرخی فی الوجه الأول والثانی لا یطیب وفی الثلاث الأخیرة یطیب.
وقال أبوبکر لا یطیب فی الکل لٰکن الفتوی الآن علیٰ قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس اهـ.
وفی الولوالجیة وقال بعضهم لا یطیب فی الوجوه کلها وهو المختار لٰکن الفتوی الیوم علیٰ قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام اهـ.
وفی الهندیة، فصل فی الاحتکار ج:۳ ص:۲۱۵ (طبع رشیدیه کوئٹه) اکتسب مالًا من حرام ثم اشتریٰ شیئا منه فان دفع تلک الدراهم الی البائع أوّلًا ثم اشتریٰ منه بتلک الدراهم فانه لا یطیب له ویتصدق به وان اشتریٰ قبل الدفع بتلک الدراهم ودفعها فکذٰلک فی قول الکرخی وأبی بکر خلافًا لأبی نصر وان اشتریٰ قبل الدفع بتلک الدراهم ودفع غیرها أو اشتریٰ مطلقًا ودفع تلک الدراهم أو اشتریٰ بدراهم أُخریٰ ودفع تلک الدراهم قال أبو نصر یطیب ولا یجب علیه أن یتصدق وهو قول الکرخی والمختار قول أبی بکر اِلّا أن الیوم الفتویٰ علیٰ قول الکرخی کذا فی الفتاوی الکبریٰ.
وفی الهندیة، فصل فی تملک الغاصب الخ ج:۵ ص:۱۴۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وان کان مما لا یتعین فقد قال الکرخی انه علیٰ أربعة أوجهٍ اِمّا اِن أشار الیه ونقد منه أو أشار الیه ونقد من غیره أو أطلق اطلاقًا ونقد منه أو أشار الیٰ غیره ونقد منه وفی کل ذٰلک یطیب له اِلّا فی الوجه الأوّل وهو ما أشار الیه ونقد منه قال مشایخنا لا یطیب له بکل حال أن یتناول منه قبل أن یضمنه وبعد الضمان لَا یطیب الربح بکل حال وهو المختار والجواب فی الجامعین والمضاربة یدل علیٰ ذٰلک واختار بعضهم الفتویٰ علیٰ قول الکرخی فی زماننا لکثرة الحرام وهٰذا کله علیٰ قولهما.
وفی العنایة شرح الهدایة علی فتح القدیر ج۸/ص۲۵۸ (طبع رشیدیه) (اشتریٰ بها اشارة الیٰ أن التصدق انما یجب اذا اشتریٰ بها ونقد منها) قال فخر الاسلام: لأن ظاهر هٰذه العبارة یدل علیٰ أنه أراد بها اذا أشار الیها ونقد منها، أما اذا أشار الیها ونقد من غیرها أو نقد منها وأشار الیٰ غیرها أو أطلق اطلاقًا ونقد منها یطیب له، وهٰذه أربعة أوجه، ففی واحد منها لا یطیب، وفی الباقی یطیب.
وذکر فی المبسوط وجهًا آخر لَا یطیب فیه أیضًا، وهو أنه اذا دفع الی البائع تلک الدراهم أوّلًا ثم اشتریٰ منه بتلک الدراهم وهٰذا التفصیل فی الجواب قول الکرخی رحمه الله، لأن الاشارة اذا کانت لا تفید التعیین کان وجودها وعدمها سواء، فلا بد أن یتأکد بالنقد لیتحقق الخبث. قالوا: والفتوی الیوم علیٰ قوله لکثرة الحرام دفعا للحرج عن الناس.
(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنے جوابی خط میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر)

''کسبِ خبیث'' واجب التصدق ہونے کے ساتھ ساتھ واجب التملیک بھی ہے یا نہیں؟ یعنی مالِ حرام کا صرف صدقہ کردینا کافی ہے یا اس کے ساتھ ساتھ کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا بھی ضروری ہے؟

اس تحقیق کے نتیجے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا رُجحان اس طرف ہوا کہ کسبِ خبیث واجب التصدق تو ہے مگر واجب التملیک نہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے یہ تحقیق فرما کر یہ تحریر صدرِ دارالعلوم کراچی مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے کئی جگہوں پر حواشی تحریر فرمانے کے بعد اس تحقیق کے آخر میں اپنا رُجحان بھی تحریر فرمایا۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی یہ اہم تحقیق، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے حواشی اور ان کی رائے کے ساتھ درج ذیل ہے۔ (محمد زبیر)

مالِ حرام کے تصدق میں تملیک ضروری ہے یا نہیں؟

(خط از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ بنام حضرت صدرِ دارالعلوم کراچی دامت برکاتہم)

بگرامی خدمت حضرت صدر صاحب[1] مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کسبِ خبیث جو واجب التصدق ہوتا ہے، اس کے بارے میں مدّت سے ذہن میں یہ تردّد تھا کہ اس کے ''واجب التملیک'' ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ مقصد اصل مالک کو ثواب پہنچانا ہے جو تملیک میں منحصر نہیں۔ بعد میں اس مسئلے کی کچھ تحقیق کی نوبت آئی، اس سلسلے میں کتبِ فقہ سے جو اُمور سمجھ میں آئے، وہ احقر نے منسلکہ تحریر میں اِملاء کرادیئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ ان اُمور پر غور کیا جائے۔ آنجناب ملاحظہ فرما کر اپنی رائے تحریر فرمادیں، پھر حضرت ناظم صاحب اور مولانا محمود اشرف صاحب کو بھجوادیں تو کرم ہوگا۔ یہ سطور عجلت میں اسلام آباد جاتے ہوئے لکھ رہا ہوں۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

(۱) صدر جامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔

مولانا محمود اشرف صاحب سلّمہٗ

میں نے یہ تحریر پڑھ لی ہے، کچھ اس پر لکھ بھی دیا ہے۔ آپ بھی دیکھ لیں، بعد ازاں حضرت ناظم صاحب مدظلہم کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔

والسلام

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی أمّا بعد

کسی شخص کے پاس جو مال کسی حرام یا ناجائز ذریعے سے آ گیا ہو، اور اس کو اصل مالک یا اس کے وارثوں تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نیتِ ثواب کے بغیر ہی اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دیا جائے۔ عام طور سے تأثر یہ ہے کہ اس صدقے میں بھی تقریباً وہ تمام شرائط ملحوظ ہیں جو زکوٰۃ کے سلسلے میں معروف ہیں، چنانچہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس صدقے میں بھی تملیکِ فقراء ضروری ہے، اور کسی رفاہی کام میں تملیک کے بغیر خرچ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے بزرگوں میں سے بعض نے اس کے بارے میں صراحۃً فتویٰ بھی دیا ہے۔

دیکھئے (امداد المفتین ص:۴۵۴ کتاب الزکوٰۃ، طبع دار الاشاعت) البتہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا رُجحان اس طرف ہے کہ اس قسم کا مال بحکم لقطہ ہے، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالکِ غیر معلوم کی طرف سے صدقۂ نافلہ ہے، اور اس میں تملیک ضروری نہیں، اس سلسلے میں اِمداد الاحکام جلد سوم میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم الامت رحمہ اللہ کا یہ رُجحان صراحۃً نقل فرمایا ہے اور وجداناً اسی قول کی طرف رُجحان کا اِشارہ کیا ہے، ان کی عبارت درج ذیل ہے:

> (الجواب) لقطہ کے بارے میں فقہاء کے اقوال سے اتنا تو ثابت ہے کہ غنی پر اس کا تصدق واجب ہے، لیکن آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لقطہ کا حکم وقت تصدق صدقہ واجبہ کا حکم ہے (حتی یجب فیہ التملیک کالصدقات الواجبۃ) یا اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف تصدق واجب ہے اور صدقاتِ واجبہ کی طرح نہیں ہے **"کما اذا جمع مالًا من کسب حرام فیجب التصدق بہ ولا یکون مثل صدقات واجبۃ حتی یبرأ ذمتہٗ بالتصدق علی ابنہ الکبیر الفقیر"** احقر اَب

تک اس کو مثلِ صدقات واجبہ کے لازم سمجھتا تھا، اور حضرت حکیم الامت واجب التصدق سمجھتے ہیں صدقہ واجبہ نہیں سمجھتے تھے، اور اَب تک کسی جزئیہ صریحہ سے یہ اختلاف مرتفع نہیں ہوا، البتہ رُجحان قول حکیم الامت کو معلوم ہوتا ہے وجداناً، بعد میں جزئیہ مل گیا کہ اس میں دونوں قول ہیں، مگر مشہور تملیک فقراء ہے۔

(امداد الاحکام ج:۳ ص:۴۷)[1]

(تتمة الجواب الأوّل) قال فی الدر فی مصارف بیوت المال ما نصه:

ورابعها الضوائع مثل مالا
یکون له أناس وارثونا
ورابعها فمصرفه جهات
تساوی النفع فیها المسلمونا[2]

قال الشامی: قوله الضوائع: جمع ضائعة أی اللقطات وقوله مثل مالا ای مثل ترکة لا وارث لها اصلا أو لها وارث لا یردّ علیه کأحد الزّوجین الخ وقوله ورابعها فمصرفه جهات الخ موافق لما نقله ابن الضیاء فی شرح الغزنویه عن البزدوی من انه یصرف الی المرضی والزمنی واللقیط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذٰلک.[3]

اس کے علاوہ اِمداد الفتاویٰ میں حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کے ایک فتویٰ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے صدقے کو واجب التملیک نہیں سمجھتے، کتاب الوقف میں اس سوال وجواب کی عبارت درج ذیل ہے:

سوال: زید نے بکر سے پتھر سنگِ مرمر خریدے اور ان پتھروں سے مسجد میں منبر ومصلیٰ بنوادیا، اب بعد میں زید کو معلوم ہوا کہ وہ پتھر جو بکر نے اس کے ہاتھ فروخت کئے تھے قبر کے پتھر تھے جو بکر نے قبرستان میں سے قبروں سے اُکھڑوادیئے تھے، اور جو قبریں اس کی ملکیت نہیں ہیں اس مصلیٰ پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ پتھر مسجد میں لگے رہنے جائز ہیں یا نہیں؟

(الجواب) پتھر قبر پر لگانے سے وقف نہیں ہوتا بلکہ لگانے والے کی ملک رہتا ہے،

---

(۱) ج:۳ ص:۴۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔
(۲ و ۳) الدر المختار مع ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع سعید)

پس اجنبی آدمی کا بیع کرنا اس کو صحیح نہیں ہوا لیکن اگر لگانے والا معلوم نہ ہو یا معلوم ہو مگر اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو وہ حکم لقطہ میں ہے[1]، اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ کسی نیک کام میں صَرف کر دیا جائے اس صورت میں مسجد میں لگا رہنے دیا جاوے کہ اپنے مصرف میں لگ گیا ہے، البتہ جس نے بیع کیا ہے اس کے لئے قیمت دُرست نہیں اور اگر اس کا مالک یا مالک کا وارث معلوم ہو تو اس سے دریافت کیا جائے، اگر وہ اجازت دے، لگا رہنے دیا جائے خواہ مفت یا قیمت لے کر، اور وارث اگر اجازت نہ دے، اُکھاڑ دیا جاوے، اور اگر کئی وارث ہوں سب سے اجازت لینا ضروری ہے اور نابالغ کے حصے کی قیمت دینا ضروری ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج:۲ ص:۵۸۷ سوال نمبر۷۰۹ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

حضرت نے اس مسئلے میں قبرستان کے پتھر کو لقطہ قرار دے کر اس کا مسجد میں لگا رہنا جائز قرار دِیا اور فرمایا کہ وہ اپنے مصرف میں پہنچ گیا، نیز یہ صراحت فرمائی کہ لقطے کا حکم یہ ہے کہ اسے کسی نیک کام میں صَرف کر دیا جائے، اس کے لئے تملیک کو ضروری قرار نہیں دیا اور ظاہر ہے کہ مسجد میں لگے رہنے سے تملیک متحقق نہیں ہوتی۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے اس رُجحان کے پیشِ نظر مسئلے کی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی، تو حضرتِ والاؒ کی تائید میں متعدّد دلائل سامنے آئے، جو اہلِ علم کے غور کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔

ملکِ خبیث کا واجب التملیک ہونا فقہائے مذہب کی کتابوں میں کہیں صراحت کے ساتھ نہیں بلکہ اس پر لفظ تصدق سے اِستدلال کیا گیا ہے کہ چونکہ صدقہ عموماً تملیکاً ہوتا ہے اس لئے ملکِ خبیث کو بھی واجب التملیک سمجھا گیا، حالانکہ خاص طور پر صدقۂ نافلہ میں لفظ صدقہ کا اِطلاق ان وجوہِ خیر میں خرچ کرنے پر بھی ہوا ہے جن میں تملیک کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً حدیثِ معروف ہے کہ "اذا مات ابن آدم انقطع عمله اِلّا من ثلاث"[2] اس میں تیسرا عمل "أو صدقة جارية ينتفع بها"[3] قرار دِیا گیا ہے، یہ صدقۂ جاریہ واضح طور پر بغیر تملیک کے ہے، اسی طرح وقف پر صدقہ کا اطلاق بھی

---

(۱) حکمِ لقطہ میں ہونے پر احقر کو یہ اِشکال ہے کہ پتھر لگانے والے نے جہاں لگائے تھے وہیں لگے رہنے پر وہ راضی تھا، پس وہیں کیوں نہ لگے رہنے دیئے جائیں، یا وہیں کیوں نہ لگا دیئے جائیں کہ مالک نے ایک اَمرِ مباح میں ان کو اپنی مرضی سے لگا دیا تھا، اس اِشکال کا اثر اگرچہ ہمارے اپنے زیرِ بحث مسئلے پر نہیں پڑتا، لیکن ضمناً اسے ذِکر کرنا بھی ناچیز کو مناسب معلوم ہوا۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲ و ۳) دیکھئے سنن ابن ماجه، باب ثواب معلم الناس الخير ص:۲۱ (طبع سعيد)، مشكوٰة المصابيح، كتاب العلم ج:۱ ص:۳۲ (طبع قديمي كتب خانه).

احادیث کی کتابوں میں شائع ہے، مثلاً صحیحین[۱] میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خیبر کی زمین کے بارے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها"[۲]

ترجمہ:- اگر تم چاہو تو اس اصل زمین کو روک رکھو اور اس کو صدقہ کردو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مشورے پر جس طرح عمل کیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"فتصدق بها عمر أنه لا يباع أصلها لا يباع ولا يورث ولا يوهب قال فتصدق عمر في الفقراء وفي القربى هذا لفظ مسلم في كتاب الوقف.

(تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۱۱۷ تا ۱۲۰ طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)

لہٰذا صدقۂ نافلہ میں صرف لفظ صدقہ سے اس بات پر اِستدلال نہیں ہوسکتا کہ اس میں تملیک ضروری ہے، اس کے علاوہ بعض فقہائے کرامؒ نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ مالِ حرام کے لئے فقہائے کرامؒ نے جو صدقہ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد محض تملیکاً صدقہ کرنا نہیں بلکہ عام مصارفِ خیر میں خرچ کرنا ہے، علامہ قرافیؒ نے لکھا ہے کہ:

انما يذكر الأصحاب صدقة في فتاويهم في هذه الأمور لأنه الغالب والا فالأمر كما ذكرته لك.[۳] (الذخيرة للقرافي بحواله أحكام المال الحرام ص:۱۹۰)

اگرچہ علامہ قرافی رحمہ اللہ مالکی المذہب ہیں اور وہ اپنے اصحاب کے قول کی تشریح فرمارہے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ باوجود صدقے کا لفظ استعمال کرنے کے مصارفِ خیر میں بدون تملیک خرچ کرنا بھی فقہاءؒ کی عبارتوں میں مراد ہوسکتا ہے۔

۲- فقہائے حنفیہؒ کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو ملکِ خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوٰۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ متعدّد جہات سے زکوٰۃ اور واجب التصدق کے مصرف میں فرق ہے، مثلاً یہ بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دے سکتا ہے،[۴] چنانچہ علامہ حمویؒ لکھتے ہیں:

لو كان غنيا لم يحل له ذلك بل يتصدق على الفقير اجنبيا ولو زوجة أو

(۱ و ۲) الصحيح للبخاري، باب الشروط في الوقف ج:۱ ص:۳۸۲ (طبع سعید) والصحيح للمسلم ج:۲ ص:۴۱ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۳) احكام المال الحرام ص:۲۸۹ (طبع ماریہ اکیڈمی)

(۴) اس کی وجہ ناچیز کی سمجھ میں یہ آتی ہے کہ مالِ واجب التصدق کا صدقہ اصل مالک کی طرف سے ہوتا ہے اور متصدق کی بیوی اور اولاد اس کے حق میں اجنبی ہیں۔ رفیع　　(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

قریبًا ولو اصلا أو فرعا کما فی التنویر اھ.

(حاشیة الاشباه للحموی، کتاب الصید والذبائع ج:۲ ص:۱۰۶ طبع ادارة القرآن)

ومثله فی الدر المختار (ج:۴ ص:۲۷۸ تا ۲۸۰ طبع سعید) والّا تصدق بها علٰی فقیر ولو علٰی أصله وفرعه وعرسه ....الخ.

نیز چونکہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقۂ نافلہ ہے اس لئے حنفیہ کے ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے، الدرالمختار میں ہے:

وجازت التطوعات من الصدقات وغلة الأوقاف لهم ای لبنی هاشم سواء سماهم الواقف أو لا الخ. (ج:۲ ص:۳۵۱ طبع سعید)

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

نقل فی البحر عن عدة کتب ان النّفل جائز لهم اجماعًا وذکر أنه المذهب وأنه لا فرق بین التطوع والوقف کما فی المحیط وکافی النسفی ....

(رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۱، کتاب الزکٰوة باب المصرف طبع سعید)

لیکن اس کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے زیلعی کے حوالے سے اس مسئلے کو مختلف فیہ قرار دیا ہے، اور ذِکر کیا ہے کہ علامہ ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں دلیل کے اعتبار سے اس بات کو قوی قرار دِیا ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقاتِ واجبہ اور نافلہ دونوں ناجائز ہیں، لیکن علامہ ابنِ نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے صدقۂ نافلہ میں جواز کا قول فقہائے حنفیہ کے متعدّد موثوق مراجع سے نقل کرنے کے بعد اسی کو مذہب قرار دِیا ہے، اور اس پر فقہائے مذہب کے اِجماع تک کا دعویٰ کیا ہے، اور علامہ ابنِ ہمامؒ کے بعض دلائل کی تردید کی ہے اور جواز کی وجہ بھی یہ بتائی ہے کہ زکوٰۃ تطہیرِ نفس کا موجب ہے لہٰذا اس کو اَوساخِ ناس سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن صدقۂ نافلہ تبرّعِ محض ہے، اس لئے وہ اوساخ میں داخل نہیں[1]، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بنی ہاشم کے لئے صدقاتِ نافلہ جائز ہیں، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لقطے سے مبینہ انتفاع کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الا ان الصدقة الواجبة کانت لا تحل لهم وهٰذا لم یکن من تلک الجملة فلهذا استجاز علی رضی الله عنه الشراء بها لحاجته.

(المبسوط للسرخسی ج:۱۱ ص:۸ کتاب اللقطة طبع مطبعة السعادة مصر ۱۳۲۴ھ)

---

(۱) فرق کی یہ وجہ سمجھ میں نہیں آئی، جبکہ صدقۂ واجبہ کی طرح یہ بھی کفارۂ سیئات اور موجبِ رفع درجات ہوتے ہیں۔ رفیع
(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے متعدّد بزرگوں نے صاحبِ بحر کے قول ہی کو اِختیار کیا، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ لقطے کے بارے میں فرماتے ہیں:

ونقول انه صدقة نافلة وهي جائزة لأهل البيت عند أكثرنا وان تردد فيه فخر الدين الزيلعي وابن همام ولذا قلنا يجوز اللقطة على الفروع [1] والأصول فافترق الزكٰوة والتصدق باللقطة.

[2]
(العرف الشذی، کتاب اللقطة ص:۲۵۷، طبع ایچ ایم سعید)

نیز علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وأيضًا فانّ بني هاشم انما لا تحل لهم الزكٰوة والعشر وصدقة الفطر وأما ما عدا ذٰلك من الصدقات النافلة فتحلّ لهم باتفاق أئمتنا رحمهم الله واللقطة ان كانت واجبة التصدق ليست من الصدقات الواجبة بل مصارفها مصارف الصدقة النافلة حيث جاز أن يتصدق بها علٰى فقير ذمي.

(اعلاء السنن ج:۱۳ ص:۲۶ طبع ادارة القرآن)

نیز حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط سرخسی کے ہی اس قول کی بنیاد پر اسی توجیہ کو اِختیار کیا ہے کہ صدقۂ نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہے۔ (بذل المجهود ص:۲۸۵)[3]

اسی طرح زکوٰۃ ذمی کو نہیں دی جاسکتی لیکن واجب التصدق مال ذمی کو بھی دیا جاسکتا ہے جیسا کہ درمختار وشامی میں کوئی اختلاف نقل کئے بغیر ذِکر کیا گیا ہے۔ (شامی ج:۴ ص:۳۵۱)[4]

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ واجب التصدق مال کے مصرف کو من کل الوجوہ زکوٰۃ کے مصرف کے مثل سمجھنا دُرست نہیں۔[5]

---

(۱) ناچیز کی سمجھ میں یہ تعلیل بھی نہیں آئی، کیونکہ جواز اللقطہ علی الفروع والاصول کی وجہ بظاہر یہ نہیں ہے کہ یہ صدقۂ نافلہ ہے بلکہ وجہ ناچیز کو یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ ہے اور ملتقط کے اُصول وفروع اصل مالک کے اُصول وفروع نہیں، لہٰذا اصل مالک کی طرف سے اُن پر صدقہ جائز ہوا جیسا کہ اُس کی طرف سے ان کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہوتا۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

(۲) ص:۴۱۳ (طبع مکتبہ رحیمیہ سہارنپور)۔

(۳) ج:۲ ص:۵۰ طبع معهد الخليل وفي طبع دار الريان للتراث قاهرة ج:۸ ص:۱۹۵ وامّا آل النبي صلى الله عليه وسلم فقال اكثر الحنفية .... انّها تجوز لهم صدقة التطوّع دون الفرض. قالوا لان المحرم عليهم انّما هو أوساخ الناس وذٰلك هو الزكٰوة لا صدقة التطوع ...الخ.

(۴) وفي الدر المختار ج:۲ ص:۳۵۱ (طبع سعيد) ولا تدفع الٰى ذمي وجاز دفع غيرها.

(۵) چنانچہ مصرف میں وہی فرق ہوگا جو صدقۂ واجبہ اور صدقۂ نافلہ کے مصرف میں ہے۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

۳- یہ بات تقریباً مُسلّم ہے کہ کسبِ خبیث کا واجب التصدق ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کا صحیح مالک یا تو معلوم نہیں یا اس تک مال پہنچانا متعذر ہے، لہٰذا وہ لقطے کے حکم میں ہوگیا، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ واجب التصدق ہے، اور چونکہ فقہائے حنفیہؒ نے بیت المال کے مصارف ذِکر کرتے ہوئے لقطے کا مصرف صرف فقراء کو قرار دِیا ہے، اس لئے اس سے یہ اِستنباط کیا گیا کہ زکوٰۃ کی طرح اس کی بھی تملیک ضروری ہے، لیکن یہ اِستنباط محلِ نظر ہے۔

اوّل تو بعض فقہائے حنفیہؒ نے لقطے کو صرف فقراء کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اسے تمام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کو دُرست قرار دِیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے علامہ بزدویؒ سے نقل کیا ہے:

أنه يصرف الى المرضى والزمنى واللقيط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذٰلك.(۱)

الدرالمختار میں علامہ ابن الشحنہ سے مصارف بیت المال سے متعلق جو اَشعار منقول ہیں ان میں بھی یہی موقف اِختیار کیا گیا ہے، البتہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اس پر یہ اِعتراض کیا ہے کہ عام کتابوں میں لقطے کا مصرف فقراء کو قرار دِیا گیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

واما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقيط الفقير والفقراء الذين لا أولياء لهم فيعطى منه نفقتهم وأدويتهم وكفنهم(۲) وعقل جنايتهم.

(رد المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ طبع سعید)

بیت المال میں لقطے کے مصرف کے بارے میں اور بھی متعدّد کتب میں یہی عبارت موجود ہے، لیکن اس عبارت پر غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ فقہاء نے فقراء کو لقطے کا مصرف قرار دِیا ہے، لیکن اس کے لئے تملیک ضروری نہیں قرار دی جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فقیر اموات کی تکفین کو بھی لقطے کے مصرف میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ میّت کی تکفین میں تملیک متحقق نہیں ہوتی چنانچہ زکوٰۃ کے باب میں اکثر متون میں یہ صراحت ہے کہ اس کو تکفینِ میّت میں صَرف نہیں کیا جاسکتا، الدرالمختار میں ہے:

ويشترط ان يكون الصرف (اى الزكٰوة) تمليكًا لا اباحةً كما مرّ لا يصرف

---

(۱) رد المحتار ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع سعید).

(۲) علامہ شامیؒ کے کلام میں کفن پر اس کو خرچ کرنے کا جواز تو علامت اس کی ہے کہ علامہ شامیؒ کے نزدیک اس کی تملیک واجب نہیں، لہٰذا عمارۃ القناطیر ونحو ذالک بھی اس کے مصرف ہوسکتے ہیں۔ رفیع

(حاشیہ از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

الٰی بناء نحو مسجد ولا الٰی کفن میّت.

علامہ شامیؒ الٰی کفن میت پر لکھتے ہیں:

لعدم صحة تملیک منه. (رد المحتار ج:۲ ص:۳۴۴ طبع سعید)

اس سے یہ واضح ہوا کہ فقہائے کرام نے تکفینِ میّت کو تملیک قرار نہیں دیا، اس کے باوجود لقطے کے مصارف میں تکفین کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ تملیک کے بغیر بھی فقراء پر صَرف کیا جاسکتا ہے۔

۴- لقطے اور کسبِ خبیث کے مصارف میں صرف فقراء کی تخصیص ائمہ اَربعہ میں سے صرف حنفیہؒ کے ہاں ہے، دُوسرے ائمہ کرامؒ یہ تخصیص نہیں فرماتے بلکہ وہ اس کو عام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے:

(فی المعیار المعرب: ج:۶ ص:۱۴۶)[1] وسئل بعض الفقهاء عمّن تاب وبیده مال حرام، لا تعرف أربابه، ولیس معه غیره هل یأخذ منه ما یقتات منه أم لا؟ فأجاب: قال الداودی: توبته تزیل ما بیده اما للمساکین أو ما فیه صلاح المسلمین ...الخ.

وفی الذخیرة للقرافی[2]

الأموال المحرّمة من الغصوب وغیرها اذا علمت أربابها ردت الیهم، والا فهی من أموال بیت المال تصرف فی مصارفه الأولی فالأولی من الأبواب والأشخاص علٰی ما یقتضیه نظر الصارف من الامام أو نوّا به أو من حصل ذٰلک عنده من المسلمین فلا تتعیّن الصدقة قد یکون الغزو أولٰی فی وقت أو بناء جامع أو قنطرة، فتحرم الصدقة لتعیین غیرها من المصالح.

وفی المجموع شرح المهذب (ج:۹ ص:۳۵۱)[3] (فرع) قال الغزالی اذا کان معه مال حرام وأراد التوبة والبراءة منه فان کان له مالک معین وجب صرفه إلیه أو إلٰی وکیله فان کان میتًا وجب دفعه الٰی وارثه وان کان لمالک لا یعرفه ویئس من معرفته فینبغی أن یصرفه فی مصالح المسلمین

---

(۱) طبع دار الغرب الاسلامی بیروت.

(۲) کتاب القراض الباب الاوّل ج:۵ ص:۱۶۷ (طبع دار الکتب العلمیة).

(۳) ج:۱۰ ص:۵۲۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

العامة كالقناطر، والربط، والمساجد، ومصالح طريق مكة، ونحو ذٰلك مما يشترك المسلمون فيه، وإلّا فيتصدّق به على الفقراء.

وفي نهاية المحتاج الٰى شرح المنهاج (ج:۵ ص:۱۸۵)[1] أما مع جهلهم فان لم يحصل اليأس من معرفتهم وجب إعطاؤها للإمام ليمسكها أو ثمنها لوجود ملاكها وله اقتراضها لبيت المال، وان أيس منها أى عادة كما هو ظاهر صارت من أموال بيت المال فلمتوليه التصرّف فيها بالبيع واعطاؤها لمستحق شيء من بيت المال. (كذا في تحفة المحتاج بشرح المنهاج ج:٦ ص:۴۵)[2]

وفي الانصاف للمرداوى (ج:۱۱ ص:۲۱۳)[3] قوله: واختار الشيخ تقى الدين رحمه الله تعالٰى فيمن كسب مالًا محرما يرضى الدافع، ثم تاب كثمن خمر ومهر بغى، وحلوان كاهن، الٰى قوله: في مال مكتسب من خمر ونحوه يتصدق به، فاذا تصدق به فللفقير أكله ولولى الأمر أن يعطيه لأعوانه وقال أيضًا فيمن تاب ان علم صاحبه دفع اليه وإلّا دفعه في مصالح المسلمين وله مع حاجته أخذ كفايته.

(هٰكذا في كتاب الفروع لابن مفلح ص:۴۴۹)[4]

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۹/۱۰/۲۷ھ

اِضافہ از مولانا محمد افتخار بیگ:

حضرت اقدس مفتی کفایت اللہ دہلوی قدس سرہٗ کفایت المفتی میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں (سوال مسجد کے بنک میں جمع شدہ روپیہ پر سود کے استعمال سے متعلق ہے):

جواب:- جو روپیہ بنکوں میں جمع کیا جائے اس کا سود بنک سے وصول کرلیا جائے تاکہ اس کے ذریعے سے مسیحی مذہب کی تبلیغ اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اعانت کا گناہ نہ ہو، وصول کرنے کے بعد اس روپے کو اُمورِ خیر میں جو رفاہِ عام سے متعلق ہوں، یا فقراء ومساکین کی رفعِ حاجات کے لئے مفید ہوں، مثلاً یتامیٰ

---

(۱) طبع دار احياء التراث العربى بيروت.

(۲) تحفة المحتاج على صدر حواشي الشيرواني فصل فيما يطرأ على المغصوب.

(۳) طبع دار احياء التراث العربى بيروت.

(۴) ج:٦ ص:۴۴۸ (طبع عالم الكتب بيروت).

ومساکین اور طلباء مدارسِ اسلامیہ کے وظائف اور اِمداد کتب وغیرہ میں خرچ کرنا یا مسافر خانہ، کنواں، سڑک وغیرہ تعمیر کرنا، سڑکوں پر روشنی کرنا، یہ سب صورتیں جائز ہیں، البتہ مسجد پر خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدسِ مسجد کے منافی ہے، واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔

جواب از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ: اوّل تو مسجد کا روپیہ بنک میں جمع کرنا جب دُوسرا طریق حفاظت کا ہو، خلافِ اِحتیاط ہے، اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا مجبوری سے ایسا اتفاق ہوگیا تو اس وقت وصول کرنے میں تو وہی عمل کرے جو مجیبِ اوّل نے تحریر فرمایا، البتہ جزوِ اَخیر یعنی مصارفِ مذکورہ میں صَرف کرنا اس میں ترمیم کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ خاص مسجد میں صَرف کرنا تو تقدسِ مسجد کے خلاف ہے، اور دُوسری جگہ صَرف کرنا ملکِ مسجد کا غیرِ مسجد میں صَرف ہے، اس لئے دونوں محذوروں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اس قدر روپیہ کسی سے قرض لے کر مسجد میں صَرف کردے اور اس سود کی رقم سے وہ قرضہ ادا کرے، اور یہ ثابت ہے کہ مسجد کی نیت سے جو قرض لیا جائے اس کا مسجد کی آمدنی سے ادا کرنا جائز ہے۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ ۱۱؍ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

الجواب الثانی صحیح: بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مسعود احمد عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴؍ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ

(کفایت المفتی ج:۷ ص:۱۰۴)(۱)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت اقدس حکیم الامت قدس سرہٗ اموالِ خبیثہ کو تصدق علی الفقراء تملیکاً کے قائل نہیں، کیونکہ یہاں حضرتؒ نے اس رقم کو مسجد کی ملکیت قرار دیا ہے، البتہ مسجد میں یا کسی دُوسری جگہ صَرف کرنے کو دُوسری وجوہات کی بنا پر دُرست قرار نہیں دیا، اس کے بجائے صَرف علی المسجد کے لئے حیلہ بیان فرمایا، اور لقطہ کے بارے میں حضرتؒ کا موقف بالتفصیل شروع میں گزر چکا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) ج:۷ ص:۱۰۵ و ۱۰۶ (طبع دار الاشاعت).

(رائے گرامی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

ناچیز کا رُجحان عرصۂ دراز سے اسی طرف ہوتا تھا کہ کسبِ خبیث (اموالِ واجبۃ التصدق) کے تصدق میں تملیک واجب نہ ہونی چاہئے، کیونکہ یہ صدقہ اصل مالک کی طرف سے بہ طور صدقۂ نافلہ کے ہوتا ہے، اور صدقاتِ نافلہ میں صدقاتِ جاریہ بھی داخل ہیں، جن میں تملیک نہیں ہوتی۔

تحریرِ ھٰذا کو دیکھنے سے اس رُجحان میں اور اِضافہ ہوا، البتہ جن بزرگوں نے تملیک کو شرط یا واجب قرار دِیا ہے، تحریرِ ھٰذا میں ان کی دلیل صرف یہ مذکور ہے کہ ''فقہائے کرامؒ نے اسے صدقہ قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے اِستنباط کیا گیا کہ اس میں بھی صدقاتِ واجبہ کی طرح تملیک واجب ہوگی'' اگر یہی دلیل ہے تو احقر کے مذکورہ بالا رُجحان میں اس سے کمی واقع نہیں ہوئی، کوئی اور دلیل بھی اگر ہو تو اُسے دیکھ کر ہی کچھ عرض کرسکتا ہوں۔

واللہ اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۱۹/۱۲/۱۱ھ

﴿فصل فی بیع الصّرف وأحکام الحلی والأوراق النقدیة﴾

(بیعِ صَرف، زیورات کی خرید وفروخت اور کرنسی نوٹوں کا بیان)

کاغذی کرنسی کا باہم تبادلہ ''بیعِ صَرف'' نہیں ہے

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی موقف)

سوال:- سونا، چاندی کا موجودہ نوٹوں سے مثلاً پاکستانی کرنسی یا ملائشیا کی کرنسی سے تبادلہ بیعِ صَرف ہے یا نہیں؟ یعنی اس کاروبار میں تقابض فی المجلس ضروری ہے یا نہیں؟ کیونکہ کاروبار عمومی طور پر نوٹوں کے ذریعے ہوا کرتا ہے، یہ اس لئے لکھا کہ حضرت کی تحقیق ''کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم'' سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نوٹ سونے یا چاندی کے حکم میں نہیں جیسا کہ صفحہ نمبر۴۰ پر ہے: ''پھر ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان تبادلے کے وقت اگرچہ کمی زیادتی جائز نہیں، لیکن یہ بیعِ صَرف بھی نہیں ہے کیونکہ یہ نوٹ کرنسی خلقی ثمن نہیں ہے بلکہ ثمنِ عرفی یا اصطلاحی ہیں۔'' نوٹوں پر زکوٰۃ کے بارے میں صفحہ نمبر۲۳ پر علامہ احمد ساعاتیؒ کی عبارت یوں نقل کی گئی ہے:

''فالذی أراہ حقًا وادین اللہ علیہ ان حکم الورق المالی کحکم النقدین .....الخ''

میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں یہ ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلے میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہٖ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے۔

چونکہ بندے سے یہ مسئلہ کئی دفعہ پوچھا گیا تو بندے نے جیسے اپنے اساتذۂ کرام خصوصاً مفتی عبداللطیف صاحب دارالعلوم سرحد پشاور سے سیکھا تھا کہ: ''یہ معاملہ بیعِ صَرف کا ہے، اس لئے اس میں اُدھار جائز نہیں'' بتادیا، حتیٰ کہ ہمارے علاقے کے جو لوگ ملائشیا میں سونے چاندی کا اُدھار پر کاروبار

کرتے ہیں تو حتی الوسع ان کو بھی اس کاروبار سے منع کیا اور بہت سے متعلقین اور سنار حضرات منع بھی ہوگئے، لیکن جب حضرت کے مقالے کا مطالعہ کیا تو تردّد پیدا ہوا، اس لئے بندے نے اپنے اُستاذِ محترم مفتی عبداللطیف سے رجوع کیا، حضرت اُستاذِ محترم نے مسئلۂ مذکورہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ معاملہ بیع صَرف کا ہے، لہٰذا بغیر تقابض فی المجلس کے جائز نہیں۔ اسی طرح بندے نے بنوری ٹاؤن سے جواب منگوایا تو وہ بھی یہی تھا کہ یہ مذکورہ معاملہ بیع صَرف ہے، لہٰذا بغیر تقابض کے جائز نہیں۔ لہٰذا بندہ آپ کی طرف متوجہ ہوا کہ کرنسی نوٹ کے بارے میں ''ثمنِ عرفی ہونے کی وجہ سے باہم تبادلے کے وقت تقابض ضروری نہیں، احد البدلین کا قبض ہونا کافی ہے'' یہ حضرت کی ذاتی رائے ہے یا عصرِ حاضر کے فقہائے کرام وعلمائے عظام کی موافقت بھی شامل ہے؟ کیونکہ مسئلہ حلال حرام کا ہے، پھر عمل آپ محترم کی رائے پر کیا جائے یا اور حضراتِ محترمین کی رائے پر؟ کیونکہ اسی اُصول پر بہت سی جزئیات متفرّع ہیں۔

والسلام

بندہ شیر محمد، فاضل دارالعلوم سرحد پشاور

مدرسہ عربیہ مسجد بلال، بونیر

جواب:- مکرّمی ومحترمی زید مجدکم السامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، مختلف جنس کی کاغذی کرنسیوں کے باہم تبادلے کے بارے میں احقر کا موقف یہ ہے کہ یہ بیعِ صَرف نہیں ہے، لہٰذا تقابض فی المجلس ضروری نہیں، احد البدلین پر قبضہ کافی ہے۔ اور مختلف جنس کی کرنسیوں کے تبادلے میں تفاضل بھی جائز ہے اور نسیئہ بھی، البتہ چونکہ نسیئہ کو رِبا کے جواز کا حیلہ بنایا جاسکتا ہے اس لئے نسیئہ کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے بلکہ ثمنِ مثل پر بیع ہو۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا دُوسرے علماء بھی اس رائے سے متفق ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احقر کی یہ رائے ہندوستان کے مولانا مجاہدالاسلام صاحب نے وہاں کے بہت سے مفتی حضرات کو بھیجی تھی، ان میں سے اکثر حضرات نے اس سے اتفاق فرمایا، البتہ صرف ایک صاحب کا اختلاف مجھے یاد ہے۔ پاکستان کے بعض علماء نے اتفاق فرمایا، اور اب آپ نے دو علماء کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا فتویٰ اس سے مختلف ہے، اب معلوم نہیں کہ احقر کے دلائل ان حضرات کے سامنے تھے یا نہیں تھے؟ البتہ عرب ممالک کے بیشتر علماء اس معاملے میں احقر سے اختلاف کرتے ہیں، واضح رہے کہ علامہ احمد ساعاتی رحمہ اللہ کی جو عبارت[1] احقر نے اپنے مقالے میں نقل کی ہے وہ صرف وجوبِ زکوٰۃ کی حد تک

(۱) شرح الفتح الرّبانی للساعاتی، آخر باب زکوٰۃ الذّھب والفضّۃ ج:۸ ص:۲۵۱.

ہے، مبادلے کے صَرف ہونے یا نہ ہونے کے متعلق انہوں نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اب یہ نوٹ تمام اَحکام میں سونے چاندی کے قائم مقام ہیں، لہٰذا ان پر بیعِ صَرف کے اَحکام کا ہی اطلاق ہوگا، احقر کو ابھی تک اس موقف پر اِطمینان نہیں ہوا جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- کرنسی نوٹوں کا ثمن ہونا تو اَب واضح ہوچکا ہے، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اِن کو ثمنِ خلقی کہا جائے گا یا ثمنِ اعتباری اور ثمنِ عرفی؟ ظاہر ہے کہ انہیں ثمنِ خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں، لازماً انہیں ثمنِ اعتباری یا ثمنِ عرفی ہی کہا جاسکتا ہے، لہٰذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا، کیونکہ وہ بھی ثمنِ اعتباری ہیں، بلکہ نوٹوں کا ثمنِ اعتباری ہونا زیادہ واضح ہے، کیونکہ ان کی ذاتی قدر و قیمت فلوس سے بھی کم ہوتی ہے، انہیں ثمن بنانے والی چیز اعتبار اور اِصطلاح کے سوا کچھ نہیں، اور فلوس کے بارے میں فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان کا باہم تبادلہ صَرف نہیں، نہ اس میں تقابض فی المجلس ضروری ہے۔ (۱)

۲:- اگر کرنسی نوٹوں کے باہم تبادلے کو صَرف کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں صَرف جاری ہوتا ہے، اُن میں ایک چیز کا اضافہ ہوگیا، یعنی نصوص سے صرف سونے چاندی میں صَرف جاری ہونا ثابت ہوتا ہے، اب لازم آئے گا کہ کرنسی نوٹ میں بھی سونے چاندی کے علاوہ صَرف جاری ہو، "ما یجری فیه الصَّرف" میں اس اضافے کی کوئی بنیاد نصوص یا کلامِ فقہاء میں نہیں ملتی۔

۳:- یہ بات میں اپنے مقالے میں واضح کرچکا ہوں کہ نوٹوں کی پشت پر اب نہ کوئی سونا ہے، نہ چاندی ہے، لہٰذا ان کو سونے چاندی کا نمائندہ قرار دے کر بھی ان پر صَرف کے اَحکام جاری کرنا مشکل ہے۔

۴:- اگر ان میں صَرف جاری کیا جائے اور ساتھ ہی سونے چاندی میں بھی صَرف کو بدستور جاری سمجھا جائے تو سوال یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے سونا یا چاندی خریدنے کو صَرف کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر کہا جائے گا تو عجیب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے یا چاندی کے تبادلے کو کلی طور پر صَرف نہ کہا جائے (۲) جبکہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی ہوتا ہے، اور صرف انہی کے وزن کی حد تک ان میں تقابض شرط ہوتا ہے، زیادہ میں نہیں، اور کرنسی نوٹوں کے تبادلے کو کلی طور پر صَرف کہا جائے جبکہ ان میں سونا چاندی بالکل موجود نہیں ہے۔

---

(۱) راجع للتّفصیل الدّر المختار ج:۵ ص:۱۷۹ وفتح القدیر ج:۶ ص:۱۶۲ والعنایة للبابرتیؒ ج:۶ ص:۱۶۲ وتکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ الیٰ ۵۹۰.

(۲) راجع البحر الرّائق ج:۶ ص:۳۳۴ (طبع رشیدیه) وردّ المحتار ج:۵ ص:۲۶۵ و ۲۶۶ (طبع سعید) ومجمع الأنهر ج:۳ ص:۱۷۶ (طبع غفاریه) والهندیة ج:۳ ص:۲۱۹، وراجع للتّفصیل الیٰ تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۶.

ان وجوہ سے ابھی تک احقر کو اس بیع کے صَرف قرار دینے پر اِطمینان نہیں ہوا، اگر اِن اِشکالات کا کوئی واضح جواب مل جائے تو احقر کو کوئی اِصرار نہیں ہے، لیکن ابھی تک بہت سے علماء سے گفتگو کے نتیجے میں ان اِشکالات کا کوئی جواب احقر کو نہیں ملا۔ عرب علماء کا بنیادی نکتہ یا تو یہ ہے کہ ذھب و فضّۃ میں اَحکامِ صَرف جاری ہونے کی علّت ثمنیت ہے،[1] اور مالکیہ کے مسلک کے مطابق وہ ثمنیتِ عرفیہ کو بھی شامل ہے،[2] اور نوٹوں میں یہ علّت پائی جاتی ہے، لیکن حنفیہ کے مسلک کے مطابق نہ ثمنیت علّت ہے[3] اور نہ ثمنیتِ عرفیہ تمام اَحکام میں ثمنیتِ خلقیہّ کے مساوی ہے۔ یا پھر وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر تقابض شرط قرار نہ دیا گیا اور نسیئہ کو جائز کہا گیا تو رِبا کا یہ حیلہ آسان ہو جائے گا کہ قرض لینے والا کسی غیر ملکی کرنسی میں ثمنِ مثل سے زائد اُدھار ادائیگی کا معاملہ کرلے گا، لیکن اس کا حل احقر یہ عرض کر چکا ہے کہ نسیئہ کی وجہ سے قیمت میں اضافے کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور نسیئہ کی صورت میں مبادلے کے لئے ثمنِ مثل کو ضروری قرار دیا جائے، اور کسی محظور سے بچنے کے لئے ثمنِ مثل کی پابندی فقہائے کرامؒ نے متعدّد مسائل میں ضروری قرار دی ہے، مثلاً بیع العینہ میں،[4] نیز کتابتِ فتویٰ کی اُجرت میں،[5] لہٰذا اس محظور کا سدِّ باب بآسانی ممکن ہے۔

دُوسری بات یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ جو عرب علماء کرنسیوں کے باہم تبادلے کو صَرف قرار دیتے ہیں، وہ ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تقابض کے لئے دونوں طرف سے چیک پر قبضہ کرلینا کافی ہے، جو احقر کے نزدیک سخت محلِ اِشکال ہے۔ نیز ان میں سے بعض حضرات نوٹوں کو سونے چاندی

(۱ و ۲) لأنّ الثمنية علّة عند المالكية لتحريم ربا الفضل سواء كانت الثمنية حقيقية أو عرفية وجاء في المدوّنة الكبرىٰ للامام مالكؒ ج:۳ ص:۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولو أنّ النّاس اجازوا بينهم الجلود حتّى تكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذّهب والورق نظرة ..... لأنّ مالكًا قال: لا يجوز فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذّهب والفضّة ولا بالدّنانير نظرة .... الخ.

وراجع للتفصيل الىٰ تكملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ الىٰ ص:۵۹۰.

(۳) تفصیل کے لئے تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۵۸۷ تا ۵۹۰ وفقہی مقالات ج:۱ ص:۳۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفي فتح القدير ج:۶ ص:۶۸ (ومن باع جارية بألف درهم حالّة أو نسيئة فقبضها ثم باعها من البائع قبل نقد الثمن) بمثل الثمن أو أكثر جاز، وان باعها من البائع بأقل لا يجوز عندنا.

وفي البحر الرّائق ج:۶ ص:۸۲ لم يجز شراء البائع ما باع بأقل ممّا باع .... وقيّد بالأقل احترازًا عن المثل أو الأكثر فانّه جائز.

وكذا في الدّر المختار ج:۵ ص:۷۴ ومجمع الأنهر ج:۳ ص:۸۸ وخلاصة الفتاوىٰ ج:۳ ص:۵۰ والكفاية ج:۶ ص:۳۲۳.

(۵) وفي الدّر المختار كتاب الاجارة مسائل شتّى ج:۶ ص:۹۲ (طبع سعيد) يستحق القاضي الأجر علىٰ كتب الوثائق قدر ما يجوز لغيره كالمفتي، فانه يستحق أجر المثل علىٰ كتابة الفتوىٰ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان .... الخ.

وكذا في البزازية على الهندية ج:۵ ص:۴۹ وخلاصة الفتاوىٰ :۴ ص:۴۸ (طبع امجد اكيڈمی لاهور).

کے حکم میں قرار دینے کے بعد خود سونے یا چاندی کے عروضِ تجارت ہونے کے قائل ہوگئے ہیں، جس میں تفاضل اور نسیئہ کو جائز کہنے لگے ہیں، جو خلافِ نصوص ہے۔

جہاں تک برِصغیر کے بعض ان علماء کا تعلق ہے جو کرنسیوں کی بیع کو صَرف قرار دینے کی طرف مائل ہیں (اور ان کی تعداد احقر کے علم میں بہت کم ہے) اور احقر کو ان سے گفتگو کی نوبت آئی، سو ان میں سے اکثر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹوں کی پشت پر سونا یا چاندی ہوتا ہے، لہٰذا اس پر سونے چاندی ہی کے اَحکام جاری ہونے چاہئیں، لیکن یہ بات بحالاتِ موجودہ واقعے کے بالکل خلاف ہے، جیسا کہ احقر اپنے مقالے میں اس کو تفصیل سے واضح کرچکا ہے۔

بہرکیف! یہ احقر کی سوچ بچار کا حاصل ہے، تاہم اگر آپ احقر کی یہ تحریر مع احقر کے مقالے کے ان علماء کی خدمت میں بھیج دیں جنھوں نے اس معاملے کو صَرف قرار دیا ہے (تاکہ احقر کے دلائل ان کے سامنے آجائیں) تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ مفید ہوگا۔ اگر وہ حضرات احقر کے مذکورہ بالا اِشکالات کا جواب عنایت فرمائیں تو براہِ کرم احقر کو بھی مطلع فرمادیں، اگر احقر کی سمجھ میں آگیا تو اِن شاء اللہ اس کا اعلان کردوں گا۔ مسئلہ حلال وحرام کا ہے، اس لئے اس میں تثبت ضروری ہے، اللّٰھم أرنا الحقّ حقًّا وارزقنا اتّباعه وأرنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه۔

والسلام

۱۴۱۶/۵/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۹/۲۹)

ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلے کی صورت میں تفاضل کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ (عربی فتویٰ)

سوال:- یعلم من مؤلفاتکم - تکملة فتح الملهم والمقالات الفقهية- أن بيع الدولار بالروبيات الباكستانية نساءً يجوز. مع أنكم رجحتم مذهب الامام محمدؒ لئلا يفتح باب الربوا، فاذا كان كذٰلك فلا سبيل الىٰ جواز البيع المذكور لأنه اذا حرم التفاضل حرم النساء بدليل توقف حرمة التفاضل علىٰ وجود جزئى العلة (القدر والجنس) وتوقف حرمة النساء علىٰ وجود أحدهما، فبينهما عموم وخصوص من وجهٍ، وان كنتم تحكمون فى حرمة بمذهب الامام محمدؒ وفى جواز البيع المذكور بمذهب الشيخينؒ فهٰذا عند الأحقر، تلفيق، أرجو من سماحتكم أن تبينوا وتوجروا، والسلام۔

محمد حقانی

۱۴؍شوال ۱۴۱۷ھ

جواب:- لا شك أنّ التفاضل الذى يحرم بوجود القدر والجنس يتلازم مع حرمة النسيئة ولكن التّفاضل الذى يحرم فى الفلوس ليس نتيجة لوجود القدر، لأنّ الفلوس عددية بالاجماع وليست وزنية، وانما حرمة التّفاضل فيها عند اتحاد الجنس ناتجة عن كونها أمثالًا متساوية قطعًا،[۱] فيؤدى التّفاضل فيه الى الفضل الخالى عن العوض، وهٰذا المعنىٰ صرّح به السرخسىّ فى المبسوط[۲] والبابرتىّ فى العناية،[۳] ولعلّى نقلت عباراتهما فى بحثى علىٰ هٰذا الموضوع، وحرمة التفاضل فى مثله لا تتلازم مع حرمة النسيئة، ولهٰذا صرّح العلّامة ابن عابدينؒ وغيره ان الفلس بالفلسين لا يجوز عند محمد رحمه الله،[۴] والفلس بالفلس جائز بشرط أن يقبض أحد البدلين فى المجلس،[۵] وهٰذا يدلّ علىٰ أنّه ان قبض أحد البدلين فى المجلس، وأُجّل البدل الآخر، فان ذٰلك يجوز، فهو تصريح بإباحة النساء مع حرمة التّفاضل عند محمد رحمه الله فى المتعينين، وعند كل من الأئمّة الثلاثة اذا كانت بغير أعيانهما.[۶] فليس هناك تلفيق.

هٰذا ما ظهر لى
۱۴۱۷/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۰/۲۵۷)

(۱، ۳ و ۲) قال البابرتى رحمه الله فى العناية علىٰ فتح القدير (ج:۲ ص:۱۶۲ طبع مكتبه رشيديه كوئٹه): بيع الفلس بجنسه متفاضلًا علىٰ أوجه أربعة بيع فلس بغير عينه بفلسين بغير أعيانهما وبيع فلس بعينه بفلسين بغير أعيانهما وبيع فلس بغير عينه بفلسين بأعيانهما وبيع فلس بعينه بفلسين بأعيانهما والكل فاسد سوى الوجه الرابع. أما الأوّل فلأن الفلوس الرائجة أمثال متساوية قطعا لاصطلاح الناس علىٰ اهدار قيمة الجودة منها فيكون أحد الفلسين فضلًا خاليًا عن العوض مشروطًا فى العقد وهو الربا. وأمّا الثانى فلأنه لو جاز أمسك البائع الفلس المعين وطلب الآخر وهو فضل خال عن العوض. وأمّا الثالث فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسين وردّ اليه أحدهما مكان ما استوجبه فى ذمته فيبقى الآخر له بلا عوض اهـ.

وفى تكملة فتح الملهم ج: ۱ ص:۵۸۷ بيع فلوس غير معينة بالتّفاضل، كبيع الفلس الواحد بالفلسين اذا لم يعين المتعاقدان أحد البدلين، فانه لا يجوز باتفاق العلماء الحنفية، أما اذا كان البدلان غير متعينين فلان الفلوس الرائجة أمثال متساوية قطعًا لاصطلاح الناس علىٰ اهدار قيمة الجودة منها، فيكون أحد الفلسين فضلًا خاليًا عن العوض، مشروطًا فى العقد، وهو الربا. واما اذا كان الفلس الواحد متعينًا بعينه والآخران بغير أعيانهما، فلأنه لو جاز أمسك البائع الفلس المعين وطلب الآخر، وهو فضل خال عن العوض، واما اذا كان الفلس الواحد غير متعين والآخران متعينين، فلأنه لو جاز قبض البائع الفلسين، وردّ اليه أحدهما مكان ما استوجبه فى ذمته، فيبقى الآخر له بلا عوض اهـ.

وفى الدّر المختار ج:۵ ص:۱۷۹ باع فلوسًا بمثلها أو بدراهم أو بدنانير فان نقد أحدهما جاز وان تفرقا بلا قبض أحدهما لم يجز.

وفى التكملة ج: ۱ ص:۵۸۷ بيع الفلوس بمثلها، كالفلس الواحد بالفلس الواحد الآخر، وهٰذا انما يجوز اذا تحقق القبض فى أحد البدلين فى المجلس قبل أن يفترق المتبايعان فان تفرقا ولم يقبض أحد شيئًا فسد العقد لأن الفلوس لا تتعين فصارت دَينًا علىٰ كل أحد والافتراق عن دَين بدَين لا يجوز.

(۲) وفى المبسوط للسرخسىّ ج:۱۲ ص:۲۲۰ (طبع مكتبه غفاريه كوئٹه) ...... لأنّ الفلوس الرائجة أمثال متساوية قطعًا لإصطلاح الناس علىٰ سقوط قيمة الجودة فيها ليكون أحد الفلسين فضلًا خاليًا عن العوض.

(۴ و ۵) راجع الىٰ ردّ المحتار ج:۵ ص:۱۷۹ و ص:۱۸۰ (طبع سعيد).

۱:- سو روپے والے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے کے بدلے فروخت کرنا

۲:- ایک ملک کی کرنسی کا دُوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا

۳:- ڈالر کی خرید وفروخت کا حکم

سوال ۱:- ہماری برمی حکومت نے ملک برما میں استعمال کرنے کے لئے ایک سو والا نوٹ رائج کیا تھا، اب ۳؍نومبر ۱۹۸۵ء کو حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آج سے ایک سو والا نوٹ منسوخ کردیا گیا ہے لہٰذا آج سے پورے برما میں اس کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے جن جن لوگوں کے پاس ایک سو والا نوٹ موجود ہے وہ ۳۱؍دسمبر کے اندر اندر اپنے اپنے متعلقہ بینکوں میں داخل کردیں، اس اعلان کے دو دن بعد یہ اعلان ہوا کہ ایک گھرانے کا صرف ایک ہی فرد ایک ہی مرتبہ بینک میں داخل ہوسکے گا اور جتنی رقم داخل کی جائے گی پانچ ہزار روپے تک فوراً تبدیل کرکے دے دیئے جائیں گے اور پانچ ہزار سے زائد ہوگا تو اس میں سے پچاس فیصد فوراً دیا جائے گا اور باقی پچاس فیصد پھر بعد میں تحقیق وتفتیش کے بعد واپس تبدیل کرکے دینے کے قابل ہوئے تو دے دیا جائے گا، ورنہ حکومت اس رقم کو ضبط کرلے گی۔ اس اعلان کے بعد ایک سو والے نوٹ کی خرید وفروخت شروع ہوگئی، اس طرح سو کا نوٹ چالیس، پچاس روپے میں بکنے لگا، کیونکہ جن لوگوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں سو کا نوٹ جمع ہے ان کو خطرہ ہوگیا کہ اگر زیادہ تعداد میں روپیہ جمع کیا جائے تو کہیں قانون کی زد میں نہ آجائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طرح سو کا نوٹ کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۲:- ایک ملک کے مروّجہ روپے کا دُوسرے ملک کے مروّجہ روپے سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک شخص پاکستان میں دُوسرے شخص کو پاکستانی سو روپے دیدے تو وہ شخص ملک برما میں دو سو برمی روپے اس کے بدلے میں دے تو یہ کمی بیشی جائز ہے یا نہیں؟

سوال ۳:- بہت سے لوگ ڈالر کی خرید وفروخت کرتے ہیں، شرعاً اس کا حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- سو روپے کے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپے میں خریدنا جائز نہیں[۱]، کیونکہ آج کل یہ نوٹ فلوس کے حکم میں آگئے ہیں اور بیع الفلس بالفلسین امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر مطلقاً اور شیخینؒ کے قول پر غیر معین ہونے کی صورت میں ناجائز ہے[۲]، اور فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے[۳]، لہٰذا نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں۔ اور جو حضرات نوٹوں کو فلوس کے بجائے دَین کی رسید قرار دیتے ہیں، ان کے قول پر بھی یہ بیع الکالئ بالکالئ ہونے کی بناء پر ناجائز ہوگی[۴]، لہٰذا سوال میں جو معاملہ مذکور ہے وہ کسی بھی طرح شرعاً جائز نہیں ہے۔[۵]

البتہ اگر اپنی مالیت کے نقصان سے بچنا ہو تو اپنے سو روپے کے نوٹ ایسے شخص کے ہاتھ سو ہی روپے میں فروخت کئے جائیں جس کے پاس پانچ ہزار سے کم نوٹ ہوں، تاکہ وہ یہ نوٹ بینک میں داخل کر کے متبادل نوٹ یقینی طور پر وصول کر سکے۔

جواب ۲:- مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے[۶]، بشرطیکہ کم از کم ایک فریق اپنے روپے پر مجلسِ بیع ہی میں قبضہ کرلے، لئلا یکون افتراقًا عن دَین بدَین۔

جواب ۳:- ڈالر کی خرید و فروخت کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر ڈالر کو ڈالر سے بیچا جائے تو مساوات ضروری ہے، اور اگر کسی اور ملک کی کرنسی سے بیچا جائے تو کمی بیشی جائز ہے[۷]، بشرطیکہ کم از کم ایک فریق أحد العوضین پر مجلسِ بیع ہی میں قبضہ کرلے۔[۸]

اگر مختلف ملکوں کی کرنسیوں کو سرکاری سطح پر مقرّر کردہ نرخ کے مطابق فروخت کیا جائے تو نمبر۲ ونمبر۳ میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق بیع بالکل جائز ہوگی، لیکن اگر اس نرخ سے کم و بیش نرخ مقرّر کیا جائے تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر ملک ایسا ہے کہ جہاں سرکاری طور پر مقرّر کردہ نرخ کی مخالفت قانوناً جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا لیکن ملکی قوانین کی مخالفت[۹] اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی بنا پر جائز نہیں ہوگا۔[۱۰]

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷۰/۳۷ ب)

(۱ و ۲ و ۳) فی الهداية ج:۳ ص:۸۵ (طبع رحمانیه) ویجوز بیع الفلس بالفلسین بأعیانها عند أبی حنیفة وأبی یوسف وقال محمد لا یجوز لأن الثمنیة تثبت باصطلاح الکل فلا تبطل باصطلاحهما واذا بقیت اثمانا لا تتعین فصار کما اذا کان بغیر اعیانهما.....اهـ

(۴و ۵ و ۶ و ۷ و ۸) فی المستدرک للحاکمؒ: ج:۲ ص:۶۵ و ۶۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) "عن ابن عمر رضی الله عنهما أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الکالئ بالکالئ." رقم: ۲۳۴۲. "عن ابن عمر رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه نهیٰ عن بیع الکالئ بالکالئ هو النسیئة بالنسیئة" رقم: ۲۳۴۳. والله اعلم.

(۹) "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" سورة النساء آیت:۵۹۔ نیز دیکھئے ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۱۰) فی القرآن الکریم: "وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ" سورة البقرة آیت:۱۹۵۔

مختلف ممالک کی کرنسی کے باہمی تبادلے کا حکم

سوال:- ایک ملک کی کرنسی کو دُوسرے ملک کی کرنسی کے مقابلے میں بیچنے اور شرحِ تبادلہ کے بارے میں حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- ایک ملک کی کرنسی کو دُوسرے ملک کی کرنسی سے بیچنا جائز ہے اور دونوں کے درمیان جو شرحِ تبادلہ باہمی رضامندی سے طے ہوجائے اس کا لین دین دُرست ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ

چیک سے سونا چاندی کی خرید وفروخت سے متعلق "تکملة فتح الملهم" کی ایک عبارت کی توضیح وتصحیح

سوال:- من العبد عبدالقادر العارفی عفی عنه، الیٰ سماحة أُستاذی وشیخی العلّامة العثمانی حفظه الله ورعاه، السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته!

أرجو الله العلی القدیر لکم الصّحّة والعافیة الدائمة التامّة کما أدعوه تعالیٰ أن یبقیکم ذخرًا للاسلام والمسلمین ویرزقکم صحّة وعافیة دائمة، وأنا بخیر والحمدلله.

أُستاذی المؤقر! أنا تلمیذکم من ایران، قد زرتکم بدار العلوم قبل خمسة أیّام بعد العصر ثم فی یوم الأربعاء صاحبتکم لصلاة الظهر بخارج دار العلوم فی معمل یقع أمام باب دار العلوم، وتکلّمت حول بعض المسائل ومنها: شراء الذّهب والفضّة نسیئة، وأیضًا شراء الذّهب والفضّة ودفع الشیک المصرفی بدل ثمنها؟ فأجبتمونی بأن هاتین المسئلتین جائزتان ولا غبار علیٰ جوازهما. ولٰکن جاء فی التکملة ۱/۵۱۵ فی مبحث الشیک المصرفی هٰکذا ولا یجوز اشتراء الذّهب والفضّة به لفقدان التقابض فی المجلس.

أرجو منکم الافادة ولکم الشکر الجزیل، وألتمس منکم الدُّعاء

تلمیذکم عبدالقادر العارفی
جامعه دارالعلوم أهل السُّنّة
خیابان خیام، مسجد مکی، زاهدان
بلوچستان، ایران

جواب:- عزیز گرامی قدر مولانا عبدالقادر عارفی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے واقعتاً بہت صحیح بات کی نشان دہی فرمائی۔ تکملة فتح الملهم

(ج:۱ ص:۵۱۵) پر میں نے جو لکھا ہے کہ: "ولا یجوز اشتراء الذّهب والفضّة به لفقدان التقابض في المجلس" اس میں احقر سے غلطی ہوگئی ہے، دراصل یہ حکم اس وقت تھا جب نوٹ یا سکے چاندی سونے کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن اب جبکہ نہ سکہ چاندی سونے کا ہے، نہ نوٹ کی پشت پر چاندی سونا ہے، اور چیک نوٹ ہی کے جاری ہوتے ہیں اور سونے چاندی کی خرید و فروخت نوٹوں سے ہوتی ہے تو چیک سے سونے چاندی کی خرید و فروخت جائز ہے، کیونکہ وہ صَرف نہیں، اور تقابض شرط نہیں، کما أوضحته في أحکام الأوراق النقدیة۔[1] چنانچہ "تکملة فتح الملهم"[2] میں تصحیح کردی گئی ہے۔

جزاکم الله تعالیٰ خیرا۔

والسلام

۱۴۱۹/۱/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۵۱/۳۰۹)

جیولری کے کاروبار اور سونے کی خرید و فروخت کے بارے میں اہم نوعیت کے مختلف سوالات کے جوابات (عربی فتویٰ)

سوال:- صاحب الفضیلة الشیخ مولانا محمد تقی العثمانی حفظه الله وأدام ثوابه

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وبعد.

أسأل الله سبحانه وتعالیٰ أن یدیم علیکم نعمة العفو والعافیة وأن یحفظکم وآل بیتکم من کل سوء ومکروه، وأن یجزیکم عنا وعن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء، انه سمیع مجیب.

صاحب الفضیلة: سبب کتابتی هٰذه الرسالة الیٰ فضیلتکم کثرة السؤال عن بعض المعاملات التجاریة فی مجال بیع الذّهب والفضّة، ولا یخفی ما لفضیلتکم من باع طویلة فی الدراسات الفقهیة، لا سیما الاقتصادیة منها، فأحببت أن أفید نفسی وغیری ناهلًا من عذبکم الفیاض، مسترشدًا بآرائکم القیّمة، آملًا عظیم الأجر لکم عند الله، راجیًا أن یعین ذٰلک السائلین علی السیر علی الصراط المستقیم.

صاحب الفضیلة: من المعاملات التی کثر عنها السؤال ما یأتی:

۱- زید تاجر ذهب فی المدینة المنوّرة یصنع مصوغاته لدی مصنع فی جدة، فیحتاج الیٰ شراء سبائک من الذهب بوزن (۱,۰۰۰) جم، فیتصل بالبنک أو بتاجر جملة للذّهب (بکر) لشراء الذّهب فیخبر بأن سعر الکیلو یساوی (۴۲,۰۰۰) ریال، فیطلب زید من

---

(۱) أحکام الأوراق النقدیة ص:۱۵۵ تا ۱۵۹۔

(۲) ج:۱ ص:۵۱۵ (طبع مکتبه دارالعلوم کراچی).

بكر أن يحجز له كمية من الذّهب بالسعر المذكور ثم يبعث بالقيمة عن طريق الحوالة (بالكمبيوتر) فاذا استلم البائع المبلغ سلم الذّهب للمصنع.

٢- المعاملة الأُخرىٰ والتى تسمّى بـ (الشراء على السعر المفتوح) وصورتها كالتالى:

زيد المريد شراء الذّهب عند ما أراد شراءه وكان يتوقع سعر الكيلو يساوى (٤٢,٠٠٠) ريال، وجد أن سعر الذّهب ارتفع فجاءة الىٰ (٤٤,٠٠٠) ريال، وهو يتوقع نزول السعر عمّا قريب، لكنه بحاجة الى الذّهب فيتفق مع بكر علىٰ أن يشترى منه الذهب ويرسل له المبلغ وقدره (٤٢,٠٠٠) ريال، علىٰ أن يبقى السعر مفتوحا، فاذا نزل السعر بعد فترة قفل السعر، وهنا يرد احتمالان:-

الاحتمال الأوّل: أن يرتفع السعر أكثر، ولنفترض أنه وصل الىٰ (٤٥,٠٠٠) ريال فيطلب البائع فرق السعر، فيضطر المشترى الى الدفع، وهو بعد ذٰلك بالخيار بين أن يقفل السعر بالسعر الحالى، أو ينتظر نزول السعر ويستمر علىٰ تلك الحالة.

الاحتمال الثانى: أن ينزل السعر الىٰ أدنى من (٤٢,٠٠٠) ريال، ولنفترض أنه وصل الىٰ (٤١,٠٠٠) ريال فيطلب المشترى من البائع قفل السعر، فيقفل البائع السعر، ويرد له المبلغ المتبقى.

٣- يتعامل بعض الناس (بالشراء على المفتوح) السابق الذكر لا لقصد شراء الذّهب نفسه، ولٰكن بقصد الاستثمار، وقصدهم من ذٰلك أن يشتروا الذّهب بسعر يومه، ولنفترض أنه (٤٢,٠٠٠) ريال، ثم اذا ارتفع السعر باعوه، لكن هٰذه المعاملة تبقى من حيث البيع والشراء الفعلى على الورق فقط، اذ لا يكون فيه استلام ولا تسليم لأنه غير مقصود بذاته، بل المقصود هو الاستثمار فقط، وان كان البائع يلتزم بالبيع الفعلى وتسليم الذّهب للمشترى لو طلب منه ذٰلك، وفى هٰذه المعاملة أمر آخر كذٰلك وهو أن البائع يتيح الفرصة للمستثمرين باستثمار كمية كبيرة من الذّهب بمبلغ قليل وعلىٰ سبيل المثال: يمكن للمستثمر أن يشترى ١٠ كيلو جرام من الذّهب والذى يبلغ قيمته افتراضًا (٤٢٠,٠٠٠) ريال علىٰ أن لا يدفع سوى ٢٠٪ من قيمة الصفقة، ويبقى التعامل كما سبق ذكره فى الصورة السابقة، وواضح أن البائع لن يسلم الذّهب للمشترى لأنّه لم يستلم كامل القيمة بل يتولّى بنفسه بيعها ليأخذ قيمتها ويدفع المكسب للمشترى الأوّل ان كان هناك مكسب، فان حصلت الخسارة فى البيع أخذه من المشترى، لأنّه بمثابة الوكيل له.

٤- وضمن هٰذه الصّورة صورة أُخرىٰ وهى أن يقوم بكر ببيع كمية من الذّهب لزيد دون أن يكون زيد قد اشترى شيئًا ولنفترض أن بكرًا باع لزيد كيلو ذهب بسعر (٤٢,٠٠٠)

ریـال، رغـم أن زیدًا لا یملک شیئًا من هٰذا الذّهب، ولکن بکرًا باع هٰذا من عنده له، والقصد مـن هـٰذا البیـع أن لو نزل السعر فیما بعد فان زیدًا یشتری الذهب ویرده لبکر، فاذا زاد السعر خلاف المتوقع فان زیدًا سیخسر فرق السعر وان نزل السعر کسب بقدره.

ویبقـی أن أوضـح لفضیلتکم أن بکرًا یستفید من عملیتی البیع والشراء دلالة، وانه یـحتفظ بمبلغ من المال أکثر من المنصرف فی البیع والشراء تحاشیًا للخسارة فی حالة ما اذا تقاعس زید عن تحمل الخسارة ان وجدت خلال عملیتی البیع والشراء.

۵- بیـع آخـر وهـو أن یـحتـاج الـمـرء لشراء الذّهب عندما یکون السعر ۴۰,۰۰۰ (أربـعیـن ألف) ریال، فیبیع علیه تاجر الجملة بسعر ۴۵,۰۰۰ (خمسة أربعین ألف) ریال علیٰ أن یسدد له المبلغ بعد مدة (قد تطول الیٰ سنة).

هٰذا وأرجـو من فضیلتکم التفضل بالاجابة علیها مدعما بالأدلّة، ولو لا یقینی بوقف حیاتکم الکریمة فی خدمة الاسلام والمسلمین لما تجرأت بالکتابة الیٰ فضیلتکم لما أعلم من کثـرة مشاغلکم والمسئولیـات المنـوطـة بفضیلـتکم، الا أن شدة حاجة الناس الیٰ ایجاد حل شـرعـی لهٰـذه المعاملات التی هم واقعون فیها شجعنی الی الکتابة الیکم، فأرجو قبول عذری فی الکتابة، وقبول رجائی فی الاجابة.

أثابکم الله علیٰ ما تقومون به من خدمات الجلیلة للاسلام والمسلمین، وجعل ذٰلک فی میزان حسناتکم یوم الدِّین، ویوفقنی وایاکم للعمل علیٰ نهج سیّد المرسلین.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

تلمیذکم / محمد یعقوب محمد یوسف الدهلوی

۲۱/صفر ۱۴۱۸ھ المدینة المنوّرة

جواب:- الـی الأخ الـعزیـز فـی الله السیّد محمد یعقوب محمد یوسف الدهلوی، حفظه الله تعالیٰ.

انـی أحـمـد الیـکـم الله الـذی لا الٰـه الّا هـو، وأصلّی وأسلّم علیٰ نبیّه الکریم الهادی الأمین، وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، وبعد:

فـلا أدری کیف أعبّر عن ندمی فی التأخیر فی الاجابة علیٰ أسئلتکم الکریمة، ولیس لـی الّا أن أطـلـب مـنـکـم الـعـفـو والمعذرة فی ذٰلک، وأرجوکم أن تعذُرونی بسبب ازدحام الأشغال وتتابع الأسفار الذی أعانیه کلّ حین.

والیکم الجواب عن الأسئلة:

۱ - هـٰذا الـطـریق للتعامل فی شراء الذّهب سلیم من النّاحیة الشّرعیة، فان الاتصال بتـاجـر الـذّهب بجدّة وطلب حجز کمیة من الذّهب لیس إلّا مساومة، والحجز التزام أو وعد

من قبل التاجر بأنه سيبيع هٰذا الذّهب عندما يتسلّم ثمنه، أمّا عقد البيع فانه يقع بعد ما يحوّل زيد ثمن الذّهب الىٰ حساب التّاجر، وفي الوقت نفسه يسلم التّاجر الذّهب الى المصنع، ولئن كان هناك فصل بين تسلّم الثمن وتسليم الذّهب، فالثمن يكون أمانة بيد التّاجر الىٰ أن يسلّم الذّهب الى المصنع، وحين يسلّم الذّهب اليه، فإن الأمانة تنقلب ثمنًا، وبهٰذا تصحّ المعاملة، حتّى علىٰ قول من يشترط التقابض في المجلس في مبادلة الذّهب بالأوراق النقدية،[1] أمّا علىٰ قول من يقول: انّ مبادلة الذّهب بالنقود الورقية ليست صرفًا،[2] ولا يشترط فيها التّقابض، فلا اشكال أصلًا، وإن هٰذا القول هو الراجح عندى،[3] وعند أغلبية علماء الهند وباكستان.

٢- الشّراء على السّعر المفتوح" كما شرحتموه في السؤال الثّاني، لا يجوز أصلًا لأنّ هٰذا البيع فيه غررٌ بجهالة الثّمن عند العقد، ولا يقاس جوازه علىٰ جواز البيع بما ينعقد عليه السّعر (كما أجازه الحنابلة وبعض الحنفية) لأنّ المراد من السّعر هناك سعر السّوق يوم العقد، أما في صورتنا المسئول عنها، فانّ المراد من السّعر ليس السّعر يوم العقد، وانّما المراد السّعر الذى تنتهي اليه السّوق بعد العقد الىٰ مدّة مجهولة، فلا شكّ في أنّ هٰذه الجهالة مفسدة للعقد، ولا يجوز البيع بهٰذا الطريق.

٣- انّ هٰذه الصّورة أشدّ حرمة، لأنه قد ازداد فيها محظور آخر غير الجهالة والغرر، وهو أنه ليس هناك بيع حقيقي يراد به التّسليم والتّسلّم، وانّما المقصود دفع فروق الثّمن، فهو أشبه بالمضاربة القمارية الرائجة في البُرصات، ولا يجوز بحال.

أمّا الصّورة الأخرى الّتي ذكرتموها في هٰذا السؤال، وهو أن البائع يتيح الفرصة للمستثمرين باستثمار كمية كبيرة من الذّهب بمبلغ قليل ... الخ، فان كان هٰذا علىٰ أساس السّعر المفتوح، فهو غير جائز كما بيّنا، أمّا اذا كان السّعر معلومًا متعيّنًا عند الشّراء، ولٰكن انما يدفع المشترى ٢٠٪ من الثّمن فقط، فلا يجوز عند من يشترط التقابض في شراء الذهب بالنقود الورقية. أما على القول الآخر، وهو عدم اشتراط التقابض في مبادلة الذّهب بالنّقود الورقية، وهو الراجح عندى، فانّما تجوز هٰذه المعاملة بشروط تالية:

(ألف)- أن يقع البيع باتًّا، ويكون الثّمن متعيّنًا غير مذبذب.

(ب)- أن يخلّى البائع بين الذّهب والمشترى، بحيث يمكن للمشترى أن يقبض الذّهب المبيع متىٰ شاء.

(ج)- أن يوكّل المشترى نفس البائع ببيع ذٰلك الذّهب نيابة عنه بعد التّخلية، ويجب أن لا يكون هٰذا التوكيل مشروطًا في عقد البيع.

(د)- أن يكون الذّهب المبيع مفصولًا عن غير المبيع، ويكون في ضمان المشترى،

(١ إلى ٣) راجع لتفصيل هٰذين المسلكين ودلائلهما إلىٰ ص: ١٤١ إلىٰ ص: ١٤٥ مع هوامشه.

بحيث إن هلک أو سُرِق فانه يهلک من مال المشترى، وليس من مال البائع.

وانـمـا تشترط هٰذه الشروط فى ۸۰٪ من المبيع الّذى لم يدفع المشترى ثمنه، لئلّا يكون بيع الكالئ بالكالئ. أمّا ۲۰٪ من الذّهب المبيع الّذى دُفع ثمنه، فيصحّ فيه التّوكيل وان لـم يـقـع الـفصل والتّخلية، لأنّه لا يشترط قيام الأثمان فى ملک البائع أو فى قبضه عند العقد، كما فى مبسوط السرخسى ۱۴: ۲۴.

۴- الـظّـاهـر مـن قـولكم: "لو نزل السّعر فيما بعد، فان زيدًا يشترى الذّهب ويرده لبـكـر" أنّ الـذّهـب الّـذى يبيـعـه بكر لزيد، فكأنّما يقرض بكرٌ زيدًا هٰذا القدر من الذّهب، ثمّ يـوكّـلـه زيد ببيعه نيابة عنه، فان كان هٰذا هو المقصود فانّ ذٰلک جائز بشرط أن يلتزم زيد أنه يـرد عيـن ذٰلک الـمـقدار الىٰ بكر سواء أنزل السّعر أم ارتفع، فمثلًا: يستقرض ۱۰۰۰ غرام مـن الـذهـب مـن بـكر، ويلتزم ردّ ۱۰۰۰ غرام من الذّهب علىٰ سبيل القرض (دون البيع) ثمّ يـوكـلـه ببيع هٰذا الذّهب نيابة عنه دون أن يشترط التوكيل فى عقد الإقراض، وفى النهاية يردّ عـلـىٰ بـكـر ألف غـرام من الذهب، سواء أنزل السِّعر أم ارتفع، وفى هٰذه الحالة يجوز لبكر أن يـطـالـب عـمـولة عـلىٰ خدماته كوكيل للبيع، ويجب أن تكون هٰذه العمولة مساوية لأجر مثل هٰـذه الـخدمات فى السّوق، ولا يزاد علىٰ أجر المثل لئلا يكون قرضا جرّ نفعا. وما ذكرتم من أن "بـكـرًا يستفيد من عمليتى البيع والشراء دلالةً .... الخ" ان كان المقصود منه أنه يتقاضى أجـرة الـسـمـسـرة فى عمليتى البيع والشـراء، فـقد ذكرت أن أجرة السمسرة انما تجوز علىٰ عـمـلية البيع بالنيابة عن زيد. أمّا إقراض الذّهب كما ذكرت او بيع الذّهب الىٰ بكر فلا يجوز تـقـاضـى الأجر عليه، وان كان المقصود غير ذٰلک فالمرجو الايضاح، فانى لم أفهم كلامكم هٰذا حق الفهم.

۵- هـٰذا لا يـجوز عند من يشترط التقابض فى مبادلة الذّهب بالعُملة الورقية، ولكن يجوز عند من لا يشترط ذٰلک، وهو الراجح عندى بشرط أن تكون مدّة التسديد معلومة عند الـعـقـد، أمـا الأدلة فـقـد بـسـطتهـا فـى كتابى "أحكام الأوراق النقديّة". والخلاصة أن النّقود الـورقيّة ليـسـت أثمانا خلقيّة وانما هى أثمان اعتبارية، فهى بمنزلة الفلوس، فيجرى فيها حرمة التـفـاضـل فـيـمـا بيـنـهـا اذا كـانـت من جنس واحد، ولكن لا تجرى أحكام الصّرف فى مبادلة الـذّهـب بهـا، كما أنها لا تجرى فى مبادلة الفلوس بالذّهب. والله سبحانه وتعالىٰ أعلم وعلمه أتـمّ وأحـكـم، وأرجـو أن فـى هـٰذا الـجـواب كفاية، فان كان لديكم مزيد من الاستيضاحات، فالمرجو الاستفسار مرّة ثانية.

والله تعالىٰ هو الموّفق!

۱۴۱۸/۳/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۶/۲۷۶)

عالمی مارکیٹ میں کرنسی کے کاروبار کا طریقۂ کار اور اس کی شرعی حیثیت

(کمپنی کے ذریعے ڈالرز کی مخصوص مقدار کی لاٹ خرید کر کرنسی کے کاروبار کی شرعی حیثیت)

سوال:- عرض ہے کہ میں کرنسی کا کاروبار کرتا ہوں، جس کی نوعیت اس طرح سے ہے کہ امریکا سے پوری دُنیا میں مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کی قیمتوں کا اجراء ہوتا ہے، ہم لاہور میں بیٹھ کر سیٹلائٹ کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر وہ قیمتیں وصول کرتے ہیں، قیمتیں ملکی حالات کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہیں، ہم ان قیمتوں پر کرنسی کی خرید وفروخت کرتے ہیں، جس کا طریقہ اس طرح سے ہے کہ ہم براہِ راست کرنسی کی خرید وفروخت نہیں کرسکتے بلکہ ایک کمپنی کے ذریعے یہ کاروبار کرتے ہیں، انہوں نے ایک اُصول وضع کیا ہوا ہے، وہ یہ کہ دو لاکھ ڈالرز کی ایک لاٹ ہوتی ہے، جو آدمی خرید کر پھر اُس کو فروخت کرسکتا ہے، لیکن ہمیں صرف اس کا پانچ فیصد کمپنی کو اپنے نام پر جمع کروانا ہوتا ہے، جو کہ صرف ایک ہزار ڈالرز بنتا ہے، ایک ہزار ڈالرز سے اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر اب ہم اس قابل ہیں کہ دُنیا کی مارکیٹ میں ہم ایک لاٹ خرید سکتے ہیں، ہماری طرف سے بقیہ رقم بطور زَرِضمانت کمپنی جمع کرواتی ہے، اس طرح ہمارا بظاہر ایک ہزار ڈالرز کی سرمایہ کاری ہوئی، لیکن ہم کاروبار دو لاکھ ڈالرز کا کر رہے ہوتے ہیں، یعنی ہم دو لاکھ ڈالرز کی کرنسی کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ اب ہمیں نفع یا نقصان کیسے ہوتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم کمپیوٹر اسکرین پر دُنیا کے مختلف بینکوں کی طرف سے دی گئی قیمتوں کا جائزہ لیتے ہیں، کرنسی کے ماہرین اپنی رائے دیتے رہتے ہیں کہ آیا یہ کرنسی آئندہ قیمت میں بڑھ جائے گی یا کم ہوجائے گی، آپ کے علم میں ہوگا، بہرحال اگر مزید کسی بات کی وضاحت درکار ہو تو میں حاضر ہوں، لیکن اس خط وکتابت میں وقت لگ جائے گا۔ مجھے اس کے متعلق چند گزارشات سے مطلع فرمائیں:-

۱- کیا یہ سارا کاروبار ناجائز ہے یا اس کی کچھ جزئیات؟

۲- اگر کچھ جزئیات ناجائز ہیں تو ان کی مختصر وضاحت فرمائیں۔

۳- کس طریقے سے یہ کاروبار جائز ہوسکتا ہے؟

اس کے علاوہ ہمیں کرنسی کے متعلق مختلف ملکوں کی خبریں بھی وصول ہوتی رہتی ہیں، اور پھر کمپیوٹر پر ہی مختلف گراف کے ذریعے اُس کرنسی کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آئندہ لمحات میں اس کرنسی کی کیا صورتِ حال ہوگی۔ تو ان تمام قرائن کے ذریعے ہم ایک رائے قائم کرکے اس کو خرید

لیتے ہیں، مثلاً اسکرین پر ہمیں پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت 1.6700 نظر آرہی ہے، ہم کمپنی کے ذریعے بذریعہ ٹیلی فون اُس بینک سے اس قیمت کی تصدیق کرواتے ہیں کہ آیا آپ کی قیمتِ فروخت یہی ہے؟ وہ ہمیں اس قیمت کے معمولی فرق کے ساتھ قیمت بتاتے ہیں، تصدیق کے بعد ہم پہلے ان سے زبانی معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک لاٹ ہم نے خریدلی، پھر اس معاہدے کو تحریری طور پر لکھ کر بذریعہ فیکس اُن تک پہنچاتے ہیں، اب یہ لاٹ ہم نے خریدلی، اور یہ ہماری ہوگئی، اب ہمیں ہر صورت میں اس کا نفع یا نقصان اُٹھانا ہوگا، اس خریداری میں اُس کرنسی پر حسی قبضہ تو ہوا نہیں، اور نہ ہی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ وہ کرنسی ہمارے ضمان (رِسک Risk) میں آگئی، اب جب اُس کرنسی کی قیمت بڑھ گئی تو اسی طریقے پر بذریعہ ٹیلی فون ہم نے اس کو فروخت کردیا، مثلاً اگر 1.6700 پر خریدا اور 1.6710 پر اُس کو فروخت کردیا، اور اس قیمتِ خرید کا بھی تحریری معاہدہ ہوگیا، یہ جو 10 اعشاریہ ہمیں نفع میں بچے اس کی قیمت 125 ڈالرز ہوئی، وہ اس طرح کہ انہوں نے ایک پوائنٹ کی قیمت 12.50 ڈالرز طے کی ہوئی ہے، اس طرح 10 پوائنٹ کی 12.50 x 10 = 125 ہوئی جو ہمارا نفع ہے، اگر کرنسی کی قیمت کم ہوجائے تو اس شرح سے ہمیں نقصان اُٹھانا پڑے گا، قبضے کی صورت کا جو حوالہ میں نے عرض کیا ہے وہ آپ کی کتاب ''شیئرز کی خرید وفروخت'' میں سے اخذ کرکے لکھا ہے۔

کمپنی کا مفاد:- کمپنی ہمیں کاروبار کروانے کے لئے یہ ساری سہولتیں میسر کرتی ہے: ۱-ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ، ۲-مارکیٹ جہاں بیٹھ کر ہم کاروبار کرتے ہیں، ۳-انٹرنیٹ سسٹم، ۴-دو لاکھ ڈالرز کا زَرِ ضمانت۔ اس کے علاوہ چند اور سہولتیں بھی۔ ان تمام سہولتوں کے ساتھ ہم ایک ٹریڈ (یعنی ایک دفعہ کرنسی کو خرید کر پھر فروخت کرنے سے ایک ٹریڈ مکمل ہوجاتی ہے) کرسکتے ہیں اس ایک ٹریڈ پر کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کمیشن وصول کرتی ہے، اس ٹریڈ میں ہمیں نفع ہو یا نقصان، کمپنی کا 60 ڈالرز کا کمیشن طے ہے، یہ اُس صورت میں ہے کہ اگر ہم ایک کرنسی کو اُسی دن خرید کر فروخت کردیں، اگر آج ہم نے کرنسی خریدی ہے اور اُس کی قیمت مناسب نہیں مل رہی ہے، اُس کو ایک دن بعد یا چند دن بعد فروخت کرنا چاہتے ہیں تو کمپنی ہم سے 60 ڈالرز کے علاوہ ہر دن کے حساب سے 20 ڈالرز مزید وصول کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کا دو لاکھ ڈالرز کاروبار میں بطور زَرِ ضمانت جمع ہوا ہے یا استعمال ہو رہا ہے، اس پر کمپنی 20 ڈالرز یومیہ وصول کرتی ہے، اگر ہم ایک ہی دن میں خرید وفروخت مکمل کرلیں تو پھر صرف 60 ڈالرز کمیشن ہی کمپنی لے گی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- کرنسی کے کاروبار کی جو تفصیل آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے، اس تفصیل کے مطابق یہ کاروبار جائز نہیں، جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس طرح کے کاروبار میں جب کوئی لاٹ خریدی جاتی ہے تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کرکے حوالے نہیں کی جاتی،(۱) بلکہ اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کردی جاتی ہے، پھر جب وہ خریدار اسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اُسے نفع ہو تو صرف نفع واپس کردیا جاتا ہے، اور اگر نقصان ہو تو اس سے وہ نقصان طلب کرلیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ پوری خرید کردہ لاٹ تحویل میں نہیں دی جاتی بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردی جاتی ہے، اور آخر میں نفع اور نقصان کا فرق برابر کرلیا جاتا ہے، جو سٹے کی ایک قسم ہے۔

۲- یہ واضح رہے کہ کرنسی کے حکمی قبضے کے لئے بھی یہ کافی نہیں ہے کہ کرنسی کی قیمت بڑھنے یا گھٹنے کا نقصان متعلقہ شخص کے ذمے ہوجائے، بلکہ قبضے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدی ہوئی کرنسی غیر خرید شدہ کرنسی سے بالکل ممتاز کرکے الگ کرلی جائے،(۲) اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اسے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعینہ کرنسی جل جائے یا چوری ہوجائے تو نقصان خریدار کے ذمے سمجھا جائے،(۳) ظاہر ہے کہ یہ صورت مذکورہ کاروبار میں نہیں کہ کرنسی کو الگ کرلیا گیا ہو، اور خریدار کے کسی نمائندے کی تحویل میں دے دیا گیا ہو۔

واضح رہے کہ شرعی اعتبار سے کرنسی اور دُوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دُوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں، لیکن کرنسی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعے قبضہ نہ کرلے۔(۴)

۳- آپ نے جو طریقِ کار لکھا ہے، اس کی رُو سے خریدار صرف ایک ہزار ڈالرز کی ادائیگی کرتا ہے، باقی کی ادائیگی نہیں کرتا، اگرچہ باقی رقم بطور زَرِ ضمانت کمپنی جمع کراتی ہے، مگر رقم درحقیقت

(۱و۲و۳) وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۶ ویعتبر فی التسلیم أن یکون المبیع مفرزًا غیر مشغول بحق غیره هٰکذا فی الوجیز للکردری، وأجمعوا علیٰ أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا .... الخ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۲۴۴ فالتسلیم والقبض عندنا هو التّخلیة والتخلّی وهو أن یخلّی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علیٰ وجهٍ یتمکن المشتری من التّصرّف فیه فیجعل البائع مسلّمًا للمبیع والمشتری قابضًا لهٗ اهـ.

(۴) وفی البدائع ج:۵ ص:۲۱۸ (طبع سعید) ان الدراهم والدنانیر وان کانت لا تتعیّن بالعقد ولٰکنّها تتعین بالقبض وقبضها واجب.

وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۱۹ ان الدراهم والدنانیر لا تتعین بالتعیین وانما تتعین بالقبض فشرطنا التقابض للتعیین لا للقبض.

وفی فتح القدیر ج:۶ ص:۱۶۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) فان الدّراهم والدنانیر لا تتعیّن مملوکة بالعقد الّا بالقبض الخ.

وفی المحیط البرهانی ج:۸ ص:۷۵ و ۷۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) انّ الدّراهم والدّنانیر أن کانا لا یتعیّنان فی عقود المعاوضات یتعیّنان عند القبض، فینعقد العقد فیما بین المتعاقدین فی الحال مفیدًا الملک عند التعیین بالقبض الخ.

خریدار کے ذمے دَین ہوتی ہے۔

دُوسری طرف کرنسی بیچنے والا خریدار کو اس شرعی طریقے پر قبضہ نہیں دیتا جس کا ذکر اُوپر نمبر۲ میں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رقم دونوں طرف دَین ہوتی ہے، لہٰذا یہ بیع الکالی بالکالی میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔ (۱)

۴- درمیانی کمپنی جو کمیشن وصول کرتی ہے وہ یا تو ضمانت کی فیس ہے یا اس رقم کا معاوضہ ہے جو وہ خریدار کی طرف سے بیچنے والے کو اَدا کرتی ہے، پہلی صورت میں یہ "أجرت علی الکفالة" ہے اور دُوسری صورت میں یہ قرض پر سود ہے، اور دونوں طریقے ناجائز ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۰/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶۳/۶)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے اور "نوٹ" کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور اُدھار خرید وفروخت کا حکم

سوال:- الیٰ فضیلة الأستاذ القاضی مولانا محمد تقی العثمانی حفظه الله تعالیٰ ورعاه

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، نتمنّٰی أن تکونوا بالصّحّة والعافیة وأن یجعلکم الله تعالیٰ علی الخیر فی الدارین وبعد:

أستاذنا الفاضل: نشتغل بتجارة بضاعة الزینة مصنوع من الفضّة بیعًا وشراءً، فی بلدنا أکثر التجارة یدور بالشّیک والسند موقوتًا وغیر موقوت، وأحیانًا دون الشّیک أی یدفع فی المستقبل بدون تعیین الوقت فی أثناء البیع. هٰکذا کُنّا نستمر بالتّجارة الیٰ أن نسمع أن بیع الفضّة والذّهب أو بضاعة الزینة مصنوع من الفضّة والذّهب لا یجوز بالشّیک والسند موقوتًا لا بد من دفع النّقود فی أثناء القبض. فنحن المسلمون ینبغی علینا أن نعیش بأحکام الشرعیة فی أمورنا الدنیویة من أجل ذٰلک ذهبنا الیٰ علمائنا الأتراک وسألنا عن المسئلة، بعضهم أجابوا بالجواز، لأن الفضّة فقدت کیفیة النقد وکأنها صارت کالبضاعة والسلعة. والآخرون قالوا لا یجوز بیع الموقوت ولو کان بالشّیک والسند، لأنّ فیه نص یحرمه.

بین هٰذین جوابین تحیّرنا وتعجّبنا، حتّی بعض مِنّا بدأنا أن نغیر عملنا ونبحث عن

---

(۱) عن ابن عمر رضی الله عنهما أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الکالئ بالکالئ هو النسیئة بالنّسیئة. (مستدرک للحاکم ج:۲ ص:۶۵ و ۶۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) رقم الحدیث: ۲۳۴۲، ۲۳۴۳).
وشرح معانی الآثار ج:۴ ص:۲۱.

عمل جديد لنجتنب عن الشبهات ولنطمئن من كسبنا، وأنا منهم.

الرجاء من فضيلتكم توضيح مشكلتنا وتبيين الحقيقة عند الشرع، لو فضلتم جوابكم بالفاكس سريعًا فيكون أحسن.

بارك الله فيكم وجزاكم الله خير الجزاء فى الدارين. بمناسبة شهر رمضان والعيد المبارك كل عام وأنتم بخير، تقبل الله طاعتنا، فى أمان الله، والسلام عليكم.

جواب:- الى الأخ العزيز الأستاذ خيرالدين شاهين

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته!

أما الذّهب سواء كان تبرًا أو مصوغًا فقد أجمع الأئمّة الأربعة علىٰ أنه لا يعامل معاملة البضائع، وانما يعمل أحكام النّقود فى جميع الأمور، لكن "الأوراق النّقدية" قد وقع فيه خلاف بين العلماء المعاصرين، وان كثيرًا من علماء البلاد العربية جعلوها فى حكم الذّهب سواء بسواء، ولكن خالفتهم فى رسالتى "أحكام الأوراق النّقدية" وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذّهب فى جميع الأمور، فلا تجرى فيها أحكام الصّرف، ولذٰلك يجوز عندى أن يشترى الذّهب أو الفضّة بالنّقود، ويجوز أيضًا أن يشترى الذّهب نسيئة بالأوراق النقدية،[1] ولٰكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين فى المجلس اذا كان ذهبا خالصا، وأن يُعرف الأجل عند العقد وقد قبل هٰذا الموقف معظم علماء الهند وكثير من باكستان، والتفصيل فى رسالتى "أحكام الأوراق النّقدية".[2]

أما كون الذّهب والفضّة فقدا صفة النقدية، فهٰذا غير مسلّم حتّى الآن.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد تقى العثمانى

بقلم: عبدالله ميمن

۱۴۲۱/۹/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۴۵۹/۴۸)

---

(۱) وفى المبسوط للسرخسىؒ ج:۱۴ ص:۲۵ وان اشترىٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضا قبل التّفرق أو لم يتقابضا لأنّ هٰذا بيع وليس بصرف فانّما افترقا عن عين بدين لأنّ الختام يتعين بالتّعيين بخلاف ما سبق فانّ الدّراهم والدّنانير لا يتعين بالتّعيين فلهٰذا شرط هناك قبض أحد البدلين فى المجلس ولم يشترط هنا.

وفى الهندية ج:۳ ص:۲۲۴ وان اشترىٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسًا وليست الفلوس عندهٗ فهو جائز تقابضا قبل التّفرق أو لم يتقابضا لأنّ هٰذا بيع وليس بصرف.

وفى البحر الرّائق ج:۶ ص:۱۹۴ (طبع سعيد) وقيد بالذّهب والفضّة لأنه لو باع فضّة بفلوس أو ذهبًا بفلوس فانه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما، كذا فى الذخيرة.

وفى الهندية ج:۳ ص:۲۲۴ ولو باع تبر فضّة بفلوس بغير أعيانها وتفرقا قبل أن يتقابضا فهو جائز.

(۲) راجع للتفصيل اليه ص:۱۵۵ الىٰ ۱۵۹.

سونے کا زیور فروخت کرنے میں ٹانکے اور سونے کی مجموعی یا الگ الگ قیمت لگانے کا حکم

سوال:- زرگروں کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ جبکہ ان کے اُصول مندرجہ ذیل ہوں، ۱-سونا اور چاندی اصلی لگاتا ہو، ۲-نہایت قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ زرگر جب کوئی زیور بناتا ہے تو اس کو جوڑتے وقت اس میں ٹانکے لگاتا ہے، یہ بھی سونا ہوتا ہے، مگر بہت خراب، بغیر اس کے زیور کو جوڑ نہیں لگتا، جیسے موٹر وغیرہ کو ٹانکہ لگایا جاتا ہے، اور اس ٹانکے کی قیمت بھی ہم اصل سونے کے حساب سے لیتے ہیں، اور جب گاہک دوبارہ واپس دینا چاہتا ہے تو ہم اس ٹانکے کی قیمت اصل سونے کی نہیں دیتے، صرف اصل سونے کی قیمت ان کو دیتے ہیں۔

جواب:- بیچنے والے کو شرعاً اِختیار ہے کہ وہ اپنی مملوک چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرے،[1] لہٰذا اگر کوئی زرگر سونے کے ٹانکے کو بھی سونے کی قیمت پر فروخت کرے تو جائز ہے،[2] بشرطیکہ تلبیس نہ کرے اور دھوکا نہ دے،[3] یعنی بتادے کہ اس میں ٹانکے کی قیمت بھی شامل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۶۶۲/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۶/۷ھ

***

(۱ و ۲) وفی الهداية ج:۴ ص:۴۷۱ (طبع مكتبه شركت علميه وفی طبع مكتبه رحمانيه ج:۴ ص:۴۷۲) .... لأنّ الثّمن حقّ العاقد فاليه تقديره فلا ينبغي للامام أن يتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامّة .... الخ.
وكذا فی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعيد) وبدائع الصّنائع ج:۵ ص:۱۲۹.
وفی البحوث فی قضايا فقهيّة معاصرة ص:۸ وللبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائمًا وللتّجار ملاحظ مختلفة فی تعيين الأثمان وتقديرها .... الخ.
وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة:۱۱۹۲ ص:۶۵۴ (طبع حنفيه كوئٹه) كل يتصرّف فی ملكه كيف شاء.
وفی المبسوط للسرخسیّ ج:۲ ص:۲۴ وان اشترىٰ خاتم فضّة أو خاتم ذهب فيه فصّ أو ليس فيه فصّ بكذا فلوسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضا قبل التّفرّق أو لم يتقابضا.
وكذا فی الهندية ج:۳ ص:۲۲۴، وفتح القدير ج:۶ ص:۲۷۸.
(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ تا ۱۰۴ کے حواشی۔

﴿فصل فی أحکام السّندات المالیّة والصّکوک والأوراق المالیّة﴾

(مختلف مالی دستاویزات، بانڈز اور چیک وغیرہ کا بیان)

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدنے اور ان پر نفع حاصل کرنے کا حکم

سوال:- عرض اینکہ حکومت نے ان لوگوں کے لئے جو بیرونِ ملک رہتے ہیں اور اپنا زَرِ مبادلہ باہر سے لے کر آتے ہیں، ان کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس کے نام سے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کے ذریعے باہر سے لائے ہوئے زَرِ مبادلہ کے عوض یہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں، اور اس کا حامل اس کو اِسٹاک ایکسچینج میں بھی نفع پر فروخت کرسکتا ہے۔ از خود پاکستانی بینک بھی ایک سال کے بعد سو روپے کے سرٹیفکیٹ کو ½۱۴ روپے مزید نفع کے ساتھ دو سال کے بعد ۳۱، اور تین سال کے بعد ۵۲ روپے سود یا نفع کے ساتھ فروخت کرسکتے ہیں اور اگر چاہے تو اسی کے ذریعے بوقتِ ضرورت زَرِ مبادلہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ ان سرٹیفکیٹ کا خریدنا اور ان پر نفع حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(گل رشید، ابوظبی امارات)

جواب:- فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کے بارے میں تحقیق سے ان کی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جو لوگ پاکستان سے باہر ملازمت کرتے ہیں، وہ اگر زَرِ مبادلہ پاکستان لے کر آئیں تو حکومت کا قانون یہ ہے کہ وہ بیرونی زَرِ مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائیں اور اس کے بدلے حکومت کے طے کردہ نرخ کے مطابق پاکستانی روپیہ وصول کریں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے زَرِ مبادلہ اپنے پاس رکھنا بھی قانوناً جائز نہیں اور جب ایک مرتبہ یہ زَرِ مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرادیا جائے تو اس کے بعد کسی وقت اس کو واپس لینا بھی قانوناً ممکن نہیں، اب حکومت نے یہ فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ اس مقصد سے جاری کئے ہیں کہ جو شخص باہر سے زَرِ مبادلہ لاکر ان کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرلے تو اس کو تین فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو دِکھا کر اس کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کرسکتا ہے۔

دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سال بھر تک یہ سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھے تو وہ اُسے ساڑھے بارہ فیصد نفع کے ساتھ پاکستانی روپیہ میں بھنا سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ سال گزرنے سے پہلے یا کسی بھی وقت وہ بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں جس قیمت پر چاہے فروخت کرسکتا ہے۔

چونکہ اس سرٹیفکیٹ کی وجہ سے اس کے حامل کو زَرِمبادلہ حاصل کرنے کا استحقاق پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے عام طور پر اسٹاک ایکسچینج میں لوگ اُسے زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں، مثلاً سو روپے کا سرٹیفکیٹ ایک سو دس روپے میں بک سکتا ہے۔

سرٹیفکیٹ کو دیکھنے اور اس کے متعلق مطبوعہ معلومات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ سرٹیفکیٹ غیرملکی زَرِمبادلہ کی رسید نہیں، بلکہ اس پاکستانی روپیہ کی رسید ہے جو کسی باہر سے آنے والے کو زَرِمبادلہ حکومت کے حوالے کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ عام پاکستانی روپیہ یا اس کی نمائندگی کرنے والے تمسکات کی بنیاد پر زَرِمبادلہ حاصل کرنے کا کوئی اِستحقاق نہیں ہوتا، لیکن اس سرٹیفکیٹ کے حامل کو زَرِمبادلہ کے حقوق کا اِستحقاق حاصل ہے، لہٰذا فقہی اعتبار سے اس کی صورت یہ بنی کہ حکومت نے باہر سے آنے والا زَرِمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض میں خرید لیا، لیکن یہ پاکستانی روپیہ فوراً ادا کرنے کے بجائے اُسے اپنے ذمے میں دَین بنالیا، اور اس دَین کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ جاری کردیا، اور اس کے حامل کو یہ اِختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہے تو یہ دَین اپنے اصل پاکستانی روپے کی شکل میں وصول کرے یا اگر چاہے تو ادائیگی کے دن کی قیمت کے لحاظ سے زَرِمبادلہ کی شکل میں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ حامل کے اس پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے جو حکومت کے ذمے دَین ہے، اب اگر حکومت ایک سال کے بعد یہ سو روپے کا وثیقہ ایک سو ساڑھے بارہ روپے میں لیتی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دَین پر ساڑھے بارہ فیصد زیادہ ادا کر رہی ہے، جو شرعاً واضح طور پر سود ہے۔ اسی طرح اگر اس سرٹیفکیٹ کا حامل یہ وثیقہ بازارِ حصص میں اس کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے تو اس کے معنیٰ بھی یہ ہوئے کہ وہ اپنا دَین زیادہ قیمت پر دُوسرے کو فروخت کر رہا ہے اور یہ معاملہ بھی سود ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سرٹیفکیٹ غیرملکی زَرِمبادلہ کی رسید ہے، اور اس وجہ سے ان کو پاکستانی روپے میں کسی بھی طے شدہ نرخ پر فروخت کرنا جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ غیرملکی زَرِمبادلہ

کی رسید نہیں ہے، جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ پر غیرملکی زَرِمبادلہ کے بجائے صراحۃً پاکستانی روپے کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔

اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے جب کبھی زَرِمبادلہ حاصل کیا جائے تو اتنا زَرِمبادلہ نہیں ملے گا جس کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہوا تھا، بلکہ تبادلے کے دن غیرملکی زَرِمبادلہ کے نرخ کے مطابق زَرِمبادلہ دیا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے پچیّس سعودی ریال دے کر سو روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا، اور چھ ماہ بعد جبکہ سعودی ریال مہنگا ہوچکا ہے، تو اُسے اتنے سعودی ریال دیئے جائیں گے جتنے اس روز سو پاکستانی روپے میں حاصل ہوتے ہیں، مثلاً اس دن کے زَر کی شرحِ مبادلہ اگر ۲۳ ریال ہو تو اُسے اس سرٹیفکیٹ کے ذریعے ۲۳ ریال ہی حاصل ہوں گے۔ پس یہ واضح دلیل ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ سعودی ریال کا وثیقہ نہیں، بلکہ پاکستانی روپے کا وثیقہ ہے، لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کو اس بناء پر خریدنا کہ اُسے زیادہ قیمت پر اسٹاک ایکسچینج میں بیچ دیا جائے گا، یا سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد نفع حاصل کیا جائے گا، سودی معاملہ ہونے کی بناء پر قطعاً ناجائز وحرام ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اس غرض سے سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقتِ ضرورت اس کے ذریعے زَرِمبادلہ حاصل ہوسکے، اور اُسے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کرنے یا حکومت سے اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، لیکن خریدنے کے بعد اُسے زیادہ قیمت پر بیچنا یا اس پر حکومت سے منافع حاصل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۸/۸/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۷۳۴ و)

اِنکم ٹیکس سے بچنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدنے کا حکم

سوال:- جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم

آپ کا مضمون ''فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم'' نظر سے گزرا، اس مضمون میں آپ نے صفحہ نمبر ۴ پر تین فوائد ذکر کئے ہیں، جبکہ ان کا اہم مقصد ایک یہ بھی ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کا حامل ان کو کیش کرانے کے بعد اس کی رقم کسی بھی کاروبار میں لگائے گا تو اس سے اس رقم کی پوچھ نہیں ہوگی، اور اِنکم ٹیکس میں رعایت دی جائے گی، یہ اس سرٹیفکیٹ کا اہم فائدہ ہے، اسی لئے یہ سرٹیفکیٹ اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی Black Money کو White کرلیتے ہیں، اور کسی بھی کاروبار میں لگاسکتے ہیں۔

۱- اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان سرٹیفکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ قیمت پر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ گورنمنٹ کے اِنکم ٹیکس کے قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان سے بچنے کے لئے White کی رقم کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ اس سرٹیفکیٹ سے مہیا ہوسکتی ہے۔

۲- اکثر حضرات ان سرٹیفکیٹوں کو باہر سے منگواتے ہیں لیکن ان کے کاروبار میں لگانے کی نوبت ایک سال بعد آتی ہے، اور جب ان کو کیش کروانے جاتے ہیں تو حکومت سے ساڑھے بارہ فیصد منافع کے ساتھ رقم ملتی ہے، اب ہم اس منافع کی رقم کا کیا کریں؟ کیونکہ بعض اوقات حالات کے مطابق دو سال بھی گزر جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہماری نیت صرف رقم کو White کرانا ہے، منافع حاصل کرنا نہیں، لیکن منافع اس کو کیش کرانے پر گورنمنٹ خود دیتی ہے، اب اس رقم کو ہم کہاں صَرف کریں؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جیسا کہ ''البلاغ'' کے فتوے میں کہا گیا ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں اس کو زیادہ قیمت پر بیچنا بھی ناجائز ہے، اور خریدنا بھی ناجائز، لہٰذا اِنکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اگر ان کو خریدنا چاہیں تو اس کی جائز صورتیں صرف دو ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص واقعۃً باہر سے زَرِمبادلہ لے کر آیا ہو، اور اس کے عوض وہ یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرے، اور دُوسرا راستہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ ان کی اصل قیمت پر دینے پر راضی ہو تو برابر سرابر رقم پر اُسے حاصل کیا جائے، شرعاً یہ بیع نہیں ہوگی، بلکہ حوالہ ہوگا۔ مثلاً اگر پانچ سو روپے کے سرٹیفکیٹ ہیں تو ان کو پانچ سو روپے کے عوض حاصل کیا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اس شخص کو پانچ سو روپے نقد قرض دیئے اور اس نے اپنے قرض کا حوالہ حکومت پر کردیا اور اس حوالے کی توثیق کے لئے یہ سرٹیفکیٹ آپ کو دیئے۔ (یہ تشریح اس لئے ضروری ہوگی کہ شرعاً دَین کی خرید وفروخت جائز نہیں[1]، جس کو فقہاء ''بیع الدّین من غیر من علیہ الدّین''[2] کہتے ہیں)۔

مذکورہ بالا دو طریقوں کے ذریعے اگر کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے اور پھر اس کو کیش کراتے وقت حکومت کی طرف سے زیادہ رقم ملے تو اوّلاً یہ زیادہ رقم لینی نہیں چاہئے، لیکن اگر کسی وجہ سے

(۱ و ۲) وفی بدائع الصّنائع ج:۵ ص:۱۴۸ (طبع سعید) ولا ینعقد بیع الدّین من غیر من علیہ الدّین لأنّ الدّین امّا أن یکون عبارۃ عن مال حکمی فی الذّمۃ وامّا أن یکون عبارۃ عن فعل تملیک المال وتسلیمہ وکل ذٰلک غیر مقدور التّسلیم فی حق البائع ولو شرط التّسلیم علی المدیون لا یصحّ أیضًا لأنّہ شرط التّسلیم علیٰ غیر البائع فیکون شرطًا فاسدًا فیفسد البیع اھ۔

وراجع للتّفصیل الی الشامیۃ ج:۴ ص:۵۱۷ (طبع سعید) و تکملۃ فتح الملھم ج:۱ ص:۳۶۳ وبحوث فی قضایا فقھیّۃ معاصرۃ ص:۲۱ (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی)۔

لینی ضروری ہو تو جتنی رقم زیادہ ملی ہے اس کو اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کر دیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۰۸/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۰۹۱/۳۹ ز)

''فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ'' کا شرعی حکم، چند شبہات اور ان کے جوابات

سوال:- معظم ومحترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم

شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ یعنی جون ۱۹۸۸ء کے ''البلاغ'' میں فارن کرنسی سرٹیفکیٹ کے بارے میں جنابِ والا کی تحقیق اور رائے نظر سے گزری، اس سلسلے میں کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

۱- یہ مفروضہ کہ ہر پاکستانی کو وطن واپسی پر سارا فارن ایکسچینج حکومت کے پاس جمع کرانا ہوتا ہے، دُرست نہیں۔ عرصہ دراز سے حکومتِ پاکستان نے یہ اجازت دی ہوئی تھی کہ واپس آنے والے پاکستانی چھ ماہ تک غیر ملکی زَرِمبادلہ اپنے پاس فارن کرنسی اکاؤنٹ میں رکھ سکتے ہیں، پھر ۱۹۸۵ء کے آخر میں یہ مدّت بڑھا کر تین سال کر دی گئی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ گزشتہ سال جب فارن کرنسی سرٹیفکیٹ جاری کئے گئے اس وقت خریدنے والے سارے حضرات یا بیشتر حضرات قانوناً اس بات کے مجاز تھے کہ حکومت کو زَرِمبادلہ نہ دیں، اور اپنے پاس ہی رکھیں، اور جن لوگوں نے یہ سرٹیفکیٹ خریدے، ان کے پیشِ نظر یا تو اور جگہوں سے ملنے والی منافع کی شرح تھی، یا وہ اپنے سرٹیفکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کر کے حکومت کی مقرّر کردہ شرحِ تبادلہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۲- جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''سرٹیفکیٹ کا حامل جب چاہے کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کرسکتا ہے'' یہ کچھ حد تک صحیح ہے، کیونکہ حامل کو یہ کرنسی پاکستان سے باہر ہی ملے گی، اگر وہ اس سے پاکستان میں فارن کرنسی اکاؤنٹ کھولنا چاہے گا تو اُسے اس بات کی اجازت نہ ہوگی، البتہ وہ حامل جس کا پہلے سے فارن کرنسی اکاؤنٹ موجود ہے وہ سرٹیفکیٹ اس اکاؤنٹ میں جمع کراسکتا ہے۔

۳- گو کہ یہ دُرست ہے کہ حکومت باہر سے آنے والا زَرِمبادلہ پاکستانی روپے کے عوض خرید کر فوراً ادا کرنے کے بجائے اُسے اپنے ذمے دَین بناتی ہے، لیکن فروخت کرنے والا صرف اس لئے حال کے بجائے مستقبل کے روپے میں (جو کہ اِفراطِ زَر کی وجہ سے روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے) اور حقیقی شرحِ تبادلہ سے کم لینے کو تیار ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں زَرِمبادلہ لینے کا اِستحقاق برقرار رکھتا ہے،

ماہرینِ معاشیات کے مطابق صرف اور صرف "Floating Rate" ہی کسی کرنسی کی حقیقی قیمت تبادلہ ہوتا ہے حکومتوں کے مقرّر کردہ ریٹ کرنسی کی صحیح "Worth" یعنی "Intrinsie Value" کو "Reflect" نہیں کرتے، اب اگر حکومت مصنوعی طور پر فارن کرنسی کے بدلے کم قیمت دے گی تو بازار میں اس پر "Premium" زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آج اگر حکومت زبردستی پر اُتر آئی اور ڈالر کی قیمت دس روپے طے کردے تو مارکیٹ میں ڈالر دس فیصد (موجودہ) "Premium" کے بجائے نوّے یا سو فیصد پریمیم پر بکے گا، جو کہ اس کی صحیح قیمت ہے۔ میں اس ضمن میں یاد دِلانا چاہتا ہوں کہ آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر جب حکومت نے ڈالر کی شرحِ تبادلہ "4.75" روپے مقرّر کی ہوئی تھی، ڈالر بازار میں چودہ روپے کا ملتا تھا، اور حکومت خود چودہ روپے کی قیمت کو بلاواسطہ بونس واؤچر اسکیم کے ذریعے "Support" کر رہی تھی۔ مختلف کرنسیوں میں ایک دُوسرے کے مقابلے میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے جو کہ ان ممالک میں اِفراطِ زَر اور شرحِ سود کا ایک فنکشن ہے، لیکن جن ملکوں میں کرنسی کی نقل وحرکت پر کوئی پابندی نہیں یا جہاں حکومت مصنوعی طور پر شرحِ تبادلہ طے نہیں کرتی، وہاں مارکیٹ کی شرح اور حکومت کی شرحِ تبادلہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں شرحیں مقامی کرنسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی حکومت کو (جو کہ اِسلامی حکومت بھی نہیں) اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ عوام کو ان غیرممالک میں کمائی کی قیمت دے (جبکہ کسٹم، پولیس، عدالتیں، انکم ٹیکس، غرض ہر اِدارہ انہیں لوٹنے پر تیار بیٹھا رہتا ہے) اور اگر وہ کم قیمت دیتی ہے تو عوام اس بات کے کس حد تک مجاز ہیں کہ وہ اپنے زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت بازار سے حاصل کرلیں خصوصاً جبکہ اسی حکومت نے زَرِمبادلہ کی بازار میں فروخت قانونی قرار دی ہوئی ہے؟

۴- دورانِ تحقیق جنابِ والا کے علم میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ حکومتِ پاکستان کو ہنڈی کے کاروبار سے ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا، کیونکہ لوگ حکومت کی مصنوعی شرح کو چھوڑ کر پرائیویٹ اِداروں کے ذریعے رُقوم کی ترسیل کر رہے تھے۔ بیئرر فارن ایکسچینج سرٹیفکیٹ جاری کرکے اور ان کے اسٹاک ایکسچینج میں فروخت کو قانونی بناکر دراصل حکومت نے ہنڈی کے کاروبار پر ضرب لگائی ہے، اور اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ لوگ زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرسکیں، لہٰذا ہنڈی کے کاروبار کے سلسلے میں فقہی نقطۂ نظر سے آگاہ فرمائیں؟

ان باتوں کے پیشِ نظر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ جائز فارن کرنسی کی حقیقی قیمت ہونے کی وجہ سے؟ بالکل اسی طرح جس طرح کمپنیوں کے حصص وغیرہ بازار میں "Par Value" سے زیادہ یا کم اپنی "Intrensie Value" کی بناء پر

فروخت ہوتے ہیں، البتہ اس بات سے مکمل اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ سال بھر گزرنے کے بعد اس پر حکومت کی طرف سے جو ساڑھے بارہ فیصد منافع حاصل کیا جائے گا وہ سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز وحرام ہوگا۔

۵- آخری پیراگراف میں جنابِ والا نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس غرض سے یہ سرٹیفکیٹ خریدے کہ بوقتِ ضرورت اس کے ذریعے زَرِمبادلہ حاصل ہوسکے تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے۔ یہ اجازت بھی عام آدمی کے لئے مسائل کھڑے کرسکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص پاکستان واپسی پر صرف اور صرف اسی غرض سے یہ سرٹیفکیٹ لیتا ہے کہ بوقتِ ضرورت اس سے زَرِمبادلہ حاصل ہوسکے گا لیکن تین سال بعد جب اس کے بدلے زَرِمبادلہ لینا چاہتا ہے تو ایک لاکھ روپے کے سرٹیفکیٹ کی"Surrnder Value" ایک لاکھ باون ہزار روپے ہوجانے کی وجہ سے اُسے زیادہ زَرِمبادلہ ملتا ہے، یہ باون ہزار یقیناً سود ہے اور اس شخص کے پاس اس سے بچت کی کوئی صورت نہیں۔ حکومت یہ رقم اُسے زبردستی دے گی، ایسی صورت میں کیا وہ سود وصول کرنے کا گناہگار نہ ہوگا؟ بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے؟ لیکن ایسی صورت میں روپے کی قیمت میں کمی سود سے پوری ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرّمی جناب متبسم مسعود صاحب، حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، جواب کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی، وہ پچھلے دنوں مفقود رہی، اس لئے جواب میں قدرے تاخیر ہوگئی، شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے جس تفصیل کے ساتھ فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کا پورا پسِ منظر بیان فرمایا ہے، اس پر میں تہِ دِل سے آپ کا شکرگزار ہوں۔ باہر سے زَرِمبادلہ پاکستان منتقل کرنے والوں پر جو پابندیاں قانوناً عائد ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ مشکلات کا شکار ہیں ان کا کچھ اندازہ پہلے بھی تھا، آپ کی مفصل تشریح سے اور زیادہ ہوگیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ کی موجودہ شرعی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، ان مشکلات کا اصل حل تو یہ ہے کہ حکومت زَرِمبادلہ بازاری نرخ پر حاصل کرے، یا پھر شرعاً اس بات کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی کہ حکومت ان سرٹیفکیٹس کو پاکستانی روپے کا نہیں بلکہ اس زَرِمبادلہ کا نمائندہ قرار دے جو حکومت کے حوالے کیا گیا ہے۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ زَرِمبادلہ کا نمائندہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت کے ذمے زَرِمبادلہ دَین ہے، اب اس کے بعد حکومت کسی بھی آئندہ مرحلے پر اُسے باہمی رضامندی سے طے شدہ قیمت پر خرید سکتی ہے، اور یہ قیمت بازاری قیمت سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے بشرطیکہ زیادہ قیمت پہلے سے طے نہ ہو، بلکہ خریداری کے وقت طے کی

جائے۔ نیز متبادل طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ سرٹیفکیٹ کا حامل بازار میں اُسے بطورِ حوالہ دے کر اس کے ذریعے زیادہ پاکستانی روپے حاصل کرلے۔

لیکن شرعاً دُشواری یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ اس سرٹیفکیٹ کو زَرِمبادلہ کے بجائے پاکستانی روپے کا وثیقہ قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے اس وقت زَرِمبادلہ کو سرکاری نرخ پر پاکستانی روپے سے خرید لیا ہے اور اس پاکستانی روپے کے بدلے یہ سرٹیفکیٹ جاری کردیا ہے۔ اب زَرِمبادلہ اس شخص کی ملکیت میں نہیں رہا، جس کی بنیاد پر مذکورہ دو طریقوں سے اس کی بیع ممکن ہوتی۔

رہا یہ کہنا کہ موجودہ صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے اندر جو دس یا بارہ فیصد منافع ہوتا ہے وہ زَرِمبادلہ کی حقیقی قیمت ہونے کی بناء پر جائز ہونا چاہئے۔ سو یہ توجیہ دو وجہ سے ممکن نہیں، اوّل تو اس لئے کہ وہ زَرِمبادلہ کی نہیں بلکہ پاکستانی روپے کی قیمت ہے، کیونکہ سرٹیفکیٹ پاکستانی روپے ہی کا وثیقہ ہے، اور روپوں کے ہم جنس تبادلے میں کمی بیشی جائز نہیں۔ اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ پر بازار میں جو دس یا بارہ فیصد منافع ملتا ہے، نہ وہ کلیۃً زَرِمبادلہ کے سرکاری اور بازاری نرخوں کے فرق پر مبنی ہوتا ہے، اور نہ اس فرق کے مساوی ہوتا ہے۔ اگر یہ منافع دس یا بارہ فیصد ہے تو سرکاری اور بازاری نرخوں کا فرق عموماً اس سے کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کو بازار میں بیچنے سے حامل کو ہنڈی کے ذریعے زَرِمبادلہ بھیجنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے جناب کا یہ فرمانا احقر کے نزدیک دُرست نہیں کہ حکومت کی طرف سے کھلے بازار میں اس سرٹیفکیٹ کی فروخت کی اجازت بازار سے زَرِمبادلہ کی صحیح قیمت حاصل کرنے کی اجازت کے مرادف ہے، اس کے برخلاف صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت نے بازار میں زَرِمبادلہ کو اس کی بازاری قیمت پر بیچنا تو ممنوع قرار دے رکھا ہے، لیکن اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ زَرِمبادلہ سرکار کو کم قیمت پر فروخت کرکے اس قیمت کی بنیاد پر سودی معاملہ کرکے اپنے اس نقصان کی تلافی کرسکتے ہو۔

یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ غیرملکی کرنسی کا سرکاری نرخ اس کے بازاری نرخ سے بہت کم مقرّر کرنا جبکہ کھلے بازار میں زَرِمبادلہ کی خرید وفروخت بھی قانوناً ممنوع ہو، ایک طرح کا ظلم ہے، جس کی عام حالات میں شرعاً اجازت نہیں ہے، لیکن اگر حکومت ایک غلط کام کر رہی ہو تو اس سے سودی معاملے کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، بلکہ وہ بدستور ناجائز ہی رہے گا۔

البتہ چونکہ حکومت نے سرٹیفکیٹ کے حامل سے زَرِمبادلہ جبراً کم قیمت پر خریدا ہے، اس لئے اگر حکومت اُسے سال بھر کے بعد سرٹیفکیٹ پر بارہ فیصد منافع دیتی ہے تو اگرچہ وہ سود ہے لیکن اس میں سے اتنی رقم رکھ لینے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن زَرِمبادلہ کے سرکاری

نرخ اور بازاری نرخ کے فرق کے برابر ہو، مثلاً کسی نے ایک سو ڈالر دے کر ۱۷۰۰ پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جبکہ اس کی بازاری قیمت ۱۷۵۰ روپے تھی، اس میں اس کو پچاس روپے کا نقصان سرکاری جبر کی وجہ سے ہوا جس پر وہ دِل سے راضی نہیں تھا، اب اگر سال بھر کے بعد حکومت اُسے سرٹیفکیٹ کے بدلے ۲۰۴۰ روپے دیتی ہے، تو ان روپوں میں سے ۵۰ روپے اگر وہ اپنے ذاتی نقصان کی تلافی کے طور پر وصول کرلے تو شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن باقی روپے اپنے استعمال میں لانے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوگی۔

لیکن اگر اسٹاک ایکسچینج میں سرٹیفکیٹ بیچ کر بارہ فیصد منافع حاصل ہو تو اس میں سے یہ پچاس روپے وصول کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہوگا، وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں یہ پچاس روپے کا نقصان اسی فریق سے وصول کیا جارہا ہے جس نے یہ نقصان پہنچایا تھا، اور دُوسری صورت میں منافع دینے والا فریق وہ نہیں ہے جس نے نقصان پہنچایا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ''الف'' کسی ناجائز طریقے سے ''ب'' کے ۵۰ روپے غصب کرے، پھر وہی ''الف'' سود کے نام سے اس کو اپنی طرف سے ۵۰ روپے ادا کرے تو ''ب'' کے لئے یہ ۵۰ روپے بحیثیتِ سود نہیں بلکہ بحیثیتِ تلافیٔ نقصان لینے کی گنجائش ہے، لیکن اگر ''ج'' اس کو اس کے کسی قرض پر ۵۰ روپے سود دے تو اس کا استعمال اس کے لئے اس بناء پر جائز نہیں ہوجائے گا کہ ''الف'' نے اسے ۵۰ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔

اس تفصیل سے آپ کے آخری سوال کا جواب بھی ہوجاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص صرف زَرِمبادلہ وصول کرنے کے حق کا تحفظ کرنے کے لئے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ خریدتا ہے اور سال بھر کے بعد اس پر حکومت سود دیتی ہے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ سرٹیفکیٹ کی اصل قیمت (Face Value) اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، اور اس سے زائد رقم لینے کی بھی گنجائش ہے جو سرٹیفکیٹ خریدنے کے دن (نہ کہ منافع وصول ہونے کے دن) اس کے ادا کردہ زَرِمبادلہ کی بازاری قیمت اور سرکاری نرخ کے فرق کے برابر ہو۔ لیکن اس سے زیادہ جتنی رقم حکومت کی طرف سے ملے وہ یقیناً سود ہے اور اُسے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں بلکہ اس سے اپنی جان چھڑانے کی نیت سے اُسے صدقہ کردینا واجب ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آپ نے جو لکھا ہے کہ ''بحالتِ مجبوری کیا وہ باون ہزار روپے خیرات کردے یا جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لے کر باقی خیرات میں دیدے'' اس کے بارے میں عرض ہے کہ جتنی فارن کرنسی اس نے حکومت کو دی تھی، اتنی لینا دُرست نہیں، بلکہ اس

فارن کرنسی کے دیتے وقت اس کی بازاری قیمت سرٹیفکیٹ کی اصلی قیمت(Face Value) سے جتنی زائد تھی، صرف اتنی وصول کرنے کی گنجائش ہے، اس سے زائد نہیں، اور اِحتیاط تو بلاشبہ اس میں ہے کہ اصلی قیمت(Face Value) پاس رکھ کر باقی سب صدقہ کردی جائے۔

ایک اور بات آخر میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ آپ نے ایک جگہ اِفراطِ زَر کی بنیاد پر روپے کی قیمت میں کمی کا بھی ذکر فرمایا ہے، جس سے ایسا لگتا ہے کہ ادائیگیوں میں روپے کی قیمت میں کمی کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔ شرعی نقطۂ نظر سے قرض اور دیگر واجبات اور دیون کے لین دین میں اِفراطِ زَر کی شرح میں تبدیلی کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لئے ادائیگی کے وقت اس پہلو کو مدِنظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس مسئلے کی مکمل تحقیق احقر نے اپنے ایک مفصل مقالے میں کی ہے جو اِن شاء اللہ عنقریب ''البلاغ'' میں شائع ہوجائے گا۔

دُعا میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔

والسلام
۱۴۰۸/۱۲/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۶/۳۹ ح)

فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ کا شرعی حکم

سوال:- محترم مولانا مفتی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ابھی فون پر بات ہوئی FCBC اسکیم کی تفصیل ارسال ہے، اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ بصورت دیگر تجویز کریں کہ اس میں کیا ترامیم اس کو جائز بنانے کے لئے ضروری ہیں، اس اسکیم میں اصل زَر اور نفع دونوں ڈالر میں لے سکتے ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے کے بارے میں کہ:-

حکومت نے فروری ۱۹۹۸ء میں نئے فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ جاری کئے ہیں، یہ سرٹیفکیٹ امریکی ڈالر اور برطانوی پاؤنڈ کے ہوں گے، اس اسکیم کی مدّت تین سال ہے، کم از کم مالیت ایک ہزار ڈالرز یا پاؤنڈز ہیں۔ حکومت نے اس پر مندرجہ ذیل فوائد دینے کا اعلان کیا ہے:-

۱- اصل زَر اور منافع پر حکومتِ پاکستان کی گارنٹی۔
۲- تین سالہ مختصر تکمیلی مدّت۔
۳- اِنکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ۔
۴- خریداری کی مالیت لامحدود۔
۵- زیادہ مدّت کے لئے خریداری پر زیادہ سے زیادہ منافع۔

۶- معینہ مدّت سے پہلے کیش کرانے پر کوئی کٹوتی نہیں۔
۷- اسٹاک ایکسچینج میں قابلِ خرید وفروخت۔
۸- مجاز ڈیلر سے سرٹیفکیٹ بنانے کی سہولت۔

اسٹیٹ بینک نے یہ اعلان کیا ہے کہ سرٹیفکیٹ کیش کراتے وقت حاملِ سرٹیفکیٹ کو اِختیار ہوگا کہ وہ سرٹیفکیٹ میں مذکور فارن کرنسی کے مطابق فارن کرنسی لے لے، یعنی اتنی ہی مقدار میں کرنسی لے جتنی مقدار کا سرٹیفکیٹ ہے، اور منافع بھی اسی شکل میں وصول کرے یا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے وصول کرے۔

واضح رہے کہ ان سرٹیفکیٹ پر فارن کرنسی ہی لکھی ہوئی ہوتی ہے، پاکستانی روپے نہیں، یعنی ایک ہزار امریکی ڈالرز دینے کے بعد بینک سے جو سرٹیفکیٹ جاری ہوگا اس میں ایک ہزار امریکی ڈالرز مذکور ہوں گے، جس دن سرٹیفکیٹ جاری ہوا اس دن کے ریٹ کے مطابق پاکستانی روپے مذکور نہیں ہوں گے، اس سرٹیفکیٹ کی جو اسکیم اسٹیٹ بینک نے جاری کی ہے، وہ سوال کے ساتھ منسلک ہے (سائل نے اِستفتاء کے ہمراہ انگریزی زبان میں اسکیم کی فوٹو کاپی منسلک کی تھی)۔ ان سرٹیفکیٹ کو خریدنا، اس پر منافع حاصل کرنا اور منافع پر اسی کرنسی میں یا پاکستانی روپے میں اسے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (المستفتی: ارشد سعید)

جواب:- نئے فارن کرنسی بیئرر سرٹیفکیٹ کی جو صورتِ حال سوال میں مذکور ہے اس کے مطابق اس کا حکم یہ ہے کہ فارن کرنسی دے کر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا دراصل حکومت کو فارن کرنسی قرض دینا ہے اور یہ سرٹیفکیٹ اس کی سند ہے۔ قرض پر نفع حاصل کرنا حرام ہے،[1] اور قرض کو حوالے کرنا جائز ہے، لہٰذا ان سرٹیفکیٹ کو نفع حاصل کرنے کی نیت سے لینا ناجائز وحرام ہے، اور یہ حاصل ہونے والا نفع سود کے حکم میں ہوگا۔ البتہ ٹیکس سے بچنے کی قانونی سہولت حاصل کرنے کی نیت سے یا رقم کو محفوظ کرنے کی نیت سے یا حکومت کو قرض دینے کی نیت سے اگر کوئی شخص یہ سرٹیفکیٹ خرید ے، اور اس پر منافع حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو تو اس غرض سے خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ جب اس پر منافع کی پیشکش کی جائے تو گورنمنٹ سے منافع لیا ہی نہ جائے، اور اگر اپنے اِختیار کے بغیر منافع ملے تو اسے بغیر نیتِ ثواب کے کسی مستحقِ زکوٰۃ پر صدقہ کردیا جائے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۵ ص:۱۶۶ وفی الاشباہ کل قرض جر نفعًا حرام (کتاب المداینات ص:۱۴۴، طبع سعید کراچی). نیز دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۲۔

جہاں تک اس سرٹیفکیٹ کو بازار میں فروخت کرنے کا تعلق ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اسے ڈالر ہی میں فروخت کیا جائے تو اتنے ہی ڈالر لینے جائز ہوں گے جتنے ڈالر کا وہ سرٹیفکیٹ ہے، اس سے کم یا زائد میں بیچنا حرام اور سود کے حکم میں داخل ہے۔ اور اگر اس سرٹیفکیٹ کو پاکستانی روپے میں فروخت کیا جائے تو تبادلے کی شرح اس دن کی بازاری قیمت کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ البتہ سرکاری شرحِ تبادلہ پر بیچنا ضروری نہیں، بلکہ مجاز ڈیلرز جس شرح پر اس دن ڈالر خرید رہے ہوں، اس شرح پر سرٹیفکیٹ بیچا جاسکتا ہے، مثلاً سرٹیفکیٹ ایک ہزار امریکی ڈالرز کا ہے، اور تبادلے کے دن عام بازار میں ڈالر کا نرخ چھیالیس روپیہ فی ڈالر ہے، تو یہ سرٹیفکیٹ چھیالیس ہزار ہی میں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ چھیالیس ہزار روپے سے زائد قیمت لگا کر بیچنا جائز نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے سرٹیفکیٹ کی فروخت کا مطلب یہ ہے کہ نقد پاکستانی روپے کے عوض ڈالر نسیئۃ فروخت کئے، پھر جو ڈالرز واجب الذمہ ہوئے ان کا حوالہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے (یعنی حکومت) پر کردیا۔ جو علماء نوٹوں کے تبادلے کو صَرف قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک تو اس بیع میں نسیئۃ بالکل ہی ناجائز ہے، اور احقر کے نزدیک اگرچہ یہ صَرف نہیں ہے، اس لئے اس میں تقابض شرط نہیں، لیکن نسیئۃ کی صورت میں ثمنِ مثل پر بیچنا اس لئے ضروری ہے تاکہ اسے رِبا کا ذریعہ نہ بنایا جاسکے۔ اور یہ سرٹیفکیٹ چونکہ اصلاً سودی ہے، اس لئے بازار میں کوئی بھی شخص اسے بازاری شرحِ تبادلہ سے زائد پر اس وقت تک نہیں خریدے گا جب تک اس کا ارادہ اس سرٹیفکیٹ پر عائد ہونے والے سود سے اِنتفاع نہ ہو، لہٰذا اس سرٹیفکیٹ کے معاملے میں بطورِ خاص ثمنِ مثل کی شرط کی رعایت ضروری ہے۔ البتہ ثمنِ مثل سرکاری قیمت نہیں، بلکہ وہ بازاری قیمت ہے جو مجاز ڈیلروں کے یہاں معروف ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفع حاصل کرنے کی غرض سے اس سرٹیفکیٹ کی خریداری جائز نہیں، البتہ نفع حاصل نہ کرنے کے مستحکم ارادے کے ساتھ اس نیت سے خریدا جاسکتا ہے کہ اس سے ٹیکس میں قانونی رعایت حاصل کی جائے یا اپنی رقم کی مالیت کا تحفظ کیا جائے، اور روپے کی گرتی ہوئی قیمت کے مقابلے میں اپنی ملکیت مستحکم کرنسی میں محفوظ کی جائے، یا حکومت کو بلاسود قرض دیا جائے۔ لیکن جب یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا جائے تو خواہ حکومت کو واپس کیا جائے، یا بازار میں فروخت کیا جائے، دونوں صورتوں میں اس دن کی بازاری شرحِ تبادلہ کے مطابق ہی فروختگی ضروری ہے، بازاری شرحِ تبادلہ سے زائد پر فروخت کرنا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۱/۲۲)

"نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ" میں ملنے والے منافع کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ میں سرمایہ کاری کرنا کیسا ہے؟ اور اس میں جو منافع ملتا ہے وہ سود ہے یا حلال ہے؟

جواب:- نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ پر جو منافع ملتا ہے شرعاً وہ سود ہے، اور اس کا لینا حرام ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱/۱۱/۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۵۱/۳۹ ز)

اِنعامی بونڈز کی شرعی حیثیت

سوال:- اِنعامی بانڈ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کا خریدنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اِنعامی بانڈ کا اِنعام لینا شرعاً جائز نہیں،[1] اس میں سود بھی ہے اور قمار کی رُوح بھی۔

واللہ اعلم
۱۸/۷/۱۴۰۲ھ

پرائز بانڈز کی خرید وفروخت اور اِنعام کا شرعی حکم

(اور اس سلسلے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کی حقیقت اور قانونی نکتے کی وضاحت)

(سائلِ موصوف نے اِستفتاء سے قبل حضرتِ والا دامت برکاتہم کو درج ذیل خط لکھا)

بگرامی خدمت مکرم ومحترم جناب حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب زادمجدکم

السلام علیکم، حضرتِ والا! ایک سوال یا مسئلہ وجہ اختلاف بنا ہوا ہے، وہ یہ کہ اِنعامی بانڈ اسکیم جو حکومتِ پاکستان نے جاری کی ہوئی ہے، اس میں کوئی رقم لگانا اور اِنعامی بانڈ خریدنا اور اِنعام نکلنے کی صورت میں اِنعام کی رقم حلال اور جائز ہے یا قمار اور حرام ہے؟ ہمارے ہاں بعض علماء اس کو حرام اور قمار کہتے ہیں، اور بعض دُوسرے اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں۔ جو جائز کہتے ہیں وہ آپ کے فیصلے کو بنیاد بناتے ہیں، جو اس کو حلال اور جائز کہتے ہیں وہ شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلے مندرجہ PLD 1992

---

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق حوالہ جات ص:۲۶۷ کے حاشیہ نمبر۱ اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے جواہر الفقہ ج:۲ ص:۳۳۹ میں رسالہ "احکام القمار" میں ملاحظہ فرمائیں۔

S,C 153 میں آپ کے، پیر کرم شاہ صاحب مرحوم اور تیسرے جج صاحب کے مندرجات کو بنیاد بنا کر حلال کہتے ہیں۔ یہ آپ ہی واضح کرسکتے ہیں۔ فیصلے کی نقل فوٹو کاپی لف ھٰذا ہے، اور اِستفتاء بھی لف ہے، اس مسئلے میں فتویٰ صادر فرمائیں تاکہ ابہام اور اختلاف ختم ہو۔

نیازمند
کفایت اللہ
بودلہ کالونی
شجاع آباد

(اِستفتاء)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین کہ گورنمنٹ پاکستان کی جاری کردہ اِنعامی اسکیم جس کو ''اِنعامی بانڈ'' (Prize Bond) کہتے ہیں، جس پر قرعہ اندازی کے ذریعے بعض نمبروں پر اِنعامات دیئے جاتے ہیں، جس کو اِنعام ملتے ہیں یا نہیں ملتے ان کی اصل رقم ہر حال میں محفوظ رہتی ہے، تو کیا ان بانڈز کا خریدنا، سرمایہ لگانا اور اِنعام ملنے کی صورت میں اِنعامی رقم حلال اور جائز ہے یا حرام یا قمار ہے؟ PLD 1992 SC 153 کی روشنی میں، بینوا توجروا (سائل: کفایت اللہ بودلہ، شجاع آباد، ملتان)

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، پرائز بانڈ کے بارے میں بندہ کا فتویٰ شروع سے یہ ہے کہ اس کی خریداری اور اس پر ملنے والا اِنعام شرعاً ناجائز ہے۔[1] میرے جس فیصلے کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ پرائز بانڈ جائز ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت فیڈرل شریعت کورٹ نے اس کو ناجائز قرار دیا تھا، اس وقت اُسے مالیاتی معاملات میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، یہی موقف شفیع الرحمٰن صاحب کے فیصلے میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پرائز بانڈ کی حلّت و حرمت کے مسئلے کو سپریم کورٹ کی طرف سے کسی آئندہ موقع کے لئے کھلا رکھا جائے۔ البتہ پیر کرم شاہ صاحب مرحوم پرائز بانڈ کے جواز کے قائل تھے، اس لئے انہوں نے اپنے فیصلے میں صراحۃً اس کو جائز قرار دیا، لیکن میرے اور شفیع الرحمٰن صاحب کے فیصلے میں اس کے جواز یا عدمِ جواز سے بحث کئے بغیر اس بناء پر اپیل مسترد کی گئی کہ فیڈرل شریعت کورٹ کو اُس وقت حتمی فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا، اس میں یہ مفہوم قانونی طور پر پنہاں ہے کہ جب فیڈرل شریعت کورٹ کو مالی اُمور میں فیصلے دینے کا حق ملے گا، اس وقت وہ بھی حتمی فیصلہ جاری کرسکتا ہے۔ لہٰذا میرے اس فیصلے کو پرائز بانڈ کے جواز میں دلیل

---

(۱) تفصیل اگلے فتاویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کے طور پر پیش کرنا دُرست نہیں ہے۔ اس کے عدمِ جواز پر میرے فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں،[1] لیکن چونکہ اس فیصلے میں اس کے عدمِ جواز کا حکم لکھنے سے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہ ہوتی، اور آئندہ اس مسئلے پر عدالتی چارہ جوئی کا راستہ بھی بند ہونے کا اِمکان تھا، اس لئے میں نے اس جملے پر اِکتفا کیا جو ''نتائجِ بحث'' کے عنوان کے تحت پیرگراف نمبر۳ میں درج ہے۔

والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۴۲۵/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲/۲۰/۷)

پرائز بانڈز اور اس پر ملنے والی اِنعامی رقم کا حکم

سوال:- اِنعامی (پرائز) بانڈ کا مسئلہ درپیش ہے، اس پر اِنعام نکلنے پر ان روپوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور کن کن کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟

جواب:- مروّجہ اِنعامی بانڈز پر جو اِنعام ملتا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس میں سود کو قمار کے ذریعے تقسیم کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ اِنعام وصول کرنا شرعاً حرام ہے،[2] البتہ اگر کوئی رقم اس طرح غلطی سے وصول کرلی گئی ہو تو اُسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دینا ضروری ہے، اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے مستحق قریبی رشتہ داروں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۲۷/۲۷ھ)

پرائز بانڈز پر ملنے والی اِنعامی رقم کا حکم

سوال:- پرائز بانڈز کے جو اِنعامات ہیں وہ شرع کی رُو سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مروّجہ اِنعامی بانڈز میں سود کو قمار کر کے بطور اِنعام دیا جاتا ہے، اس لئے اس اِنعام کو وصول کرنا شرعاً حرام ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷۱۰/۲۷و)

اِنعامی بانڈز اور اس کی رقم سے زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا حکم

سوال:- میری والدہ کی کفالت میرے ذمے ہے، علاوہ اس کے وہ اپنے تین بچوں کو تعلیم

---

(۱) یہ فتاویٰ آگے آرہے ہیں۔　　(۲و۳) دیکھئے ص:۱۷۳ کا حاشیہ۔

قرآن بھی دیتی ہے، جو ہدیہ وہ وصول کرتی ہے وہ ان کے ذاتی مصرف کے علاوہ ہے۔ قربانی، زکوٰۃ، خیرات میں استعمال ہوتا ہے، اس رقم سے والدہ نے کچھ اِنعامی بانڈ بھی خرید رکھے تھے کہ وقتِ ضرورت کام آئے، قدرت کی کرم نوازی سے ان کے بانڈ پر ۵۰۰۰ روپیہ اِنعام آیا، رقم وصول ہوتے ہی جو زکوٰۃ واجب تھی وہ ادا کردی، نیز کچھ حصہ گھر کے خرچ میں ملایا گیا، باقی محفوظ ہے، والدہ کی خواہش ہے کہ حج کی سعادت نصیب ہو، کیا وہ اس رقم سے حج کرسکتی ہے؟

جواب:- اِنعامی بانڈز پر جو رقم بطورِ اِنعام دی جاتی ہے، قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ خالصتاً سود کی رقم ہے، جسے قمار کے طریقے پر تقسیم کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا لینا جائز نہیں[1]۔ اور اگر یہ رقم غلطی سے لے لی ہے تو اسے نیتِ ثواب کئے بغیر صدقہ کرنا واجب ہے، اس رقم کو نہ حلال آمدنی کی زکوٰۃ پر خرچ کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس سے حج کرسکتے ہیں، نہ ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ لہٰذا جو رقم انہوں نے بطورِ زکوٰۃ نکالی ہے اگر وہ ان کی حلال آمدنی کی زکوٰۃ تھی تو وہ ادا نہیں ہوئی، دوبارہ زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اور اگر اِسی اِنعام کی رقم کی زکوٰۃ نکالی تھی تو اسے دوبارہ نہ نکالا جائے، اور اس رقم میں سے جس قدر حصہ گھر کے استعمال میں لائی ہیں، اسے بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹۷/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

اِنعامی بانڈز کا حکم

سوال:- اِنعامی بانڈز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

جواب:- تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہر بونڈ خریدنے والے کے نام پر ایک معین شرح سے سود لگایا جاتا رہتا ہے، لیکن پھر بجائے اس کے کہ ہر شخص کی رقم پر علیحدہ سود دیا جائے، تمام افراد کے سود کی مجموعی رقم کو قرعہ اندازی کے ذریعے صرف ان لوگوں پر تقسیم کیا جاتا ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بانڈ کے اِنعام کی رقم سود کو قمار کرکے ادا کیا جاتا ہے، اس لئے یہ رقم لینا حرام ہے[2]۔ والسلام[3]

☆☆☆

(۱و۲) دیکھئے ص:۱۷۳ کا حاشیہ۔
(۳) یہ فتویٰ "البلاغ" سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی أحکام الأسهم﴾
(شیئرز کے اَحکام)

حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے

سوال:- شیئرز خرید کر کسی کمپنی میں حصہ دار بننا اور نفع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بکر کہتا ہے کہ جائز ہے، میں نے مفتی رشید احمد اور مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب سے پہلے فتویٰ حاصل کیا تھا۔

جواب:- اگر کمپنی کا کاروبار خلافِ شرع نہ ہو تو شیئرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔

واللہ اعلم

کونسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے؟ نیز اسٹاک ایکسچینج والوں کو کمیشن دینے کا حکم

سوال:- کونسی کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز ہیں؟ اور کس حال میں یعنی جب کمپنی کس حالت میں پہنچے تو اس کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہوگی؟ اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر کمپنی کسی حرام کاروبار میں ملوّث نہیں ہے اور اس کے کچھ اثاثے وجود میں آچکے ہیں تو اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز ہے،[1] اور اسٹاک ایکسچینج والوں کو اس پر دلالی کا کمیشن دینا بھی جائز ہے،[2] لیکن جو کمپنی حرام کاروبار میں ملوّث ہو، اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔[3] نیز جس کمپنی کے اثاثے ابھی وجود میں نہ آئے ہوں، بلکہ اس کے سارے اثاثے نقد روپے کی شکل میں ہوں اس کے حصے کو اس کی اصل قیمت (Face Value) سے کم یا زیادہ میں خریدنا بیچنا بھی حرام ہے۔[4]

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۳۷۵)

(۱ تا ۴) ان مسائل کی تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸٦ تا ص:۹۲ ملاحظہ فرمائیں۔

اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید وفروخت اور شیئرز پر قبضے سے متعلق حکمِ شرعی کی تحقیق

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ: آج کل شیئرز کی خرید وفروخت کثرت سے ہو رہی ہے، علمائے کرام کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ شیئرز کے قبضے میں آنے سے پہلے ان کو فروخت کرنا جائز نہیں، جبکہ اسٹاک ایکسچینج کی مروّجہ صورتِ حال کے پیشِ نظر شیئرز پر قبضہ کس طرح ممکن ہے؟ اور شیئرز پر قبضہ کب سمجھا جائے گا؟ اور کب شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہوگی اور کب جائز نہ ہوگی؟ براہِ کرم اس بارے میں شریعت کی روشنی میں تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں۔

سائل: عبداللہ، کورنگی

جواب:-

الحمد لله رب العالمين، والصلٰوة والسلام علىٰ رسوله الكريم، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، وعلىٰ كل من تبعهم باحسان الىٰ يوم الدّين

آج کل کمپنیوں کے حصص کی بیع وشراء جن طریقوں سے ہوتی ہے، ان کی شرعی حیثیت کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور پوچھے بھی جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے اس طریقِ کار کی صحیح واقفیت ضروری ہے جو اس بیع وشراء میں اختیار کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو ان کمپنیوں کے حصص کے بارے میں ہو رہی ہے، جن کا کاروبار شرعاً حلال ہے اور ان کے حصص کی خریداری حضرت حکیم الاُمت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے فتویٰ "القصص السنی فی حصص الکمبنی" کی رُو سے جائز ہے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے اہلِ علم کی ایک جماعت نے کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، ایکسچینج کے ذمہ داروں سے عملی صورتِ حال معلوم کی، اور ان کے قواعد وضوابط حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جو صورتِ حال واضح ہوئی وہ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

بنیادی طور پر قابلِ تحقیق اُمور مندرجہ ذیل تھے:-

۱- ڈے ٹریڈنگ، یعنی ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن بیچ دینا۔

۲- مستقبل کے سودے (Forward)۔

۳- بدلے کے معاملات۔

ڈے ٹریڈنگ

ڈے ٹریڈنگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک ہی دن میں حصص خرید کر اسی دن کسی اور شخص کو وہ حصص بیچ دیتا ہے، یہ ڈے ٹریڈنگ فوری سودوں (Spot Transactions) میں بھی ہوتی ہے، اور مستقبل کے سودوں (Forward Trading) میں بھی۔ پہلے ہم فوری سودوں کی تحقیق کرتے ہیں۔

فوری سودے (Spot Trading)

فوری سودوں کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہے تو اس خریداری کا اندراج فوری طور سے KAT میں ہوجاتا ہے، جو اسٹاک ایکسچینج میں ہونے والے سودوں کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ ہوتا ہے، اور اسٹاک ایکسچینج ان سودوں میں فریقین کی ذمہ داریوں کی ضمانت دیتا ہے، اس سودے کو حاضر سودا بھی کہا جاتا ہے، فوری سودوں میں ہر سودے کے تین دن بعد خریدار کو طے شدہ قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، اور بیچنے والے کو بیچے ہوئے حصص کی ڈیلیوری دینی ہوتی ہے۔ ڈیلیوری کا مطلب حصص کی بیع میں یہ ہوتا ہے کہ جس کمپنی کے حصص بیچے گئے ہیں اس کمپنی کے ریکارڈ میں سی ڈی سی کے ذریعے ان حصص کی منتقلی خریدار کے نام ہوجاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدے تو اس کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ پہلے اس چیز پر قبضہ کرے، پھر اس کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، قبضے سے پہلے بیع جائز نہیں۔ اب حصص کی خریداری میں صورتِ حال یہ ہے کہ ڈیلیوری، خریداری کے تین دن بعد ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ خریداری اور ڈیلیوری کے درمیان جو تین دن کی مدّت ہے، کیا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس درمیانی مدّت میں وہ اپنے خریدے ہوئے حصص کسی اور شخص کو فروخت کردے؟

اگر ڈیلیوری کو شرعی قبضہ قرار دیا جائے تو ڈیلیوری سے پہلے فروخت کرنا بیع قبل القبض قرار پائے گا، اور ناجائز ہوگا، لیکن دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ ''ڈیلیوری'' شرعی قبضے سے عبارت نہیں، بلکہ کمپنی میں حصص کے خریدار کے نام پر اِندراج کو ''ڈیلیوری'' کہا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک خریدے ہوئے حصص کے جملہ منافع اور نقصانات کا تعلق ہے، وہ خریداری کے متصل بعد خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، یعنی اگر خریداری اور ڈیلیوری کی درمیانی مدّت میں کمپنی کو کوئی نقصان ہوجائے تو وہ نقصان خریدار ہی برداشت کرتا ہے، اور اگر کمپنی کو نفع ہوجائے تو اس نفع کا فائدہ بھی خریدار ہی کو پہنچتا ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ حصص کی بیع کا مطلب کمپنی کے حصصِ مشاعہ کی بیع ہے، لہٰذا یہ ''بیع المشاع'' ہے اور مشاع میں حِسی قبضہ ممکن نہیں ہوتا۔ دُوسری طرف بیع قبل القبض کی ممانعت کی علّت یہ ہے کہ جب تک مشتری مبیع پر قبضہ نہ کرے، یا کم از کم بائع تخلیہ نہ کرے، مبیع بائع ہی کے ضمان

میں رہتی ہے، یعنی اگر اس دوران وہ ہلاک ہوجائے تو بیع فسخ ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر قبضہ کئے بغیر مشتری نے مبیع کسی اور کو فروخت کردی، بعد میں بائعِ اصلی ہی کے قبضے میں ہلاک ہوگئی تو پہلی بیع فسخ ہوجائے گی، تو اس کے نتیجے میں دُوسری بیع بھی فسخ ہوجائے گی، لہٰذا اس دُوسری بیع میں شروع ہی سے غررِ اِنفساخ پایا جاتا ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ بیع قبل القبض کی ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ولأنه بيع فيه غرر الانفساخ بهلاک المعقود عليه، لأنه اذا هلک المعقود عليه قبل القبض يبطل البيع الأوّل، فينفسخ الثاني.

(بدائع الصنائع ج:۴ ص:۳۹۴، مؤسسة التاريخ العربي)[1]

بیع قبل القبض کی ممانعت کی اس سے زیادہ واضح علّت یہ ہے کہ اس سے ربح مالم یضمن لازم آتا ہے، کیونکہ قبضے سے پہلے مبیع کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اب اگر وہ اسے آگے فروخت کرے اور اس میں نفع کمائے تو یہ ربح مالم یضمن ہوگا، جس کی ممانعت مندرجہ ذیل حدیث میں آئی ہے:-

لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم تضمن.

(سنن أبي داؤد ج:۳ ص:۲۸۳، كتاب البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده)[2]

جامع ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے:-

لا يحلّ سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن.

(جامع الترمذي ج:۳ ص:۵۳۵، باب ما جاء في كراهية بيع ما ليس عندهٗ)[3]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

يريد به الربح الحاصل من بيع ما اشتراه قبل أن يقبضه وينتقل من ضمان البائع الىٰ ضمانه، فان بيعه فاسد، في شرح السُّنّة: قيل: معناه ان الربح في كل شيء انما يحل إن لو كان الخسران عليه، فان لم يكن الخسران عليه كالبيع قبل القبض اذا تلف فان ضمانه على البائع.

(مرقاة المفاتيح ج:٦ ص:۸۹)[4]

---

(۱) ج:۵ ص:۱۸۰ (طبع سعيد).
(۲) سنن ابي داؤد ج:۲ ص:۱۳۹ (طبع مكتبه رحمانيه).
(۳) ابواب البيوع، ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع سعيد).
(۴) ج:٦ ص:۸۲ (طبع مكتبه امداديه ملتان).

اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وربح ما لم یضمن، یرید به الحاصل من بیع ما اشتراه قبل أن یقبضه وینتقل من ضمان البائع الیٰ ضمانه، فان بیعه فاسد. (شرح الطیبی ج:٦ ص:٨٢)[1]

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

(وربح مالم یضمن) هو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل من ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض.

(حاشیة السندی علی المجتبیٰ للنسائی ج:٧ ص:٢٩٥)[2]

اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا ربح مالم تضمن، أی لا یحل ربح شیءٍ لم یدخل فی ضمانه وهو ربح مبیع اشتراه فباعه قبل أن ینتقل عن ضمان البائع الأوّل الیٰ ضمانه بالقبض.

(بذل المجهود ج:١٥ ص:١٨٠، کتاب البیوع، باب فی الرجل یبیع ما لیس عنده)[3]

حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع قبل القبض اس لئے ناجائز ہوتی ہے کہ قبضے کے بغیر اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر وہ نفع پر آگے بیچنا چاہتا ہے تو یہ ربح مالم یضمن میں داخل ہے، نیز جیسا کہ صاحبِ بدائع نے فرمایا، قبضے سے پہلے اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو بائع کے ضمان میں ہونے کی بناء پر بیع فسخ ہوجائے گی، اور اس کے نتیجے میں اگلی بیع بھی فسخ ہوگی، لہٰذا اگلی بیع میں شروع ہی سے غررِ اِنفساخ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر ضمان حسّی اور حقیقی قبضے کے بغیر تخلیہ کے ذریعے مشتری کی طرف منتقل ہوجائے تو پھر چونکہ نہ ربح مالم یضمن کا اندیشہ ہے، نہ غررِ اِنفساخ کا، اس لئے مشتری کے لئے اسے آگے بیچنا جائز ہے، اسی لئے فقہائے کرام رحمہم اللہ نے تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:-

وأجمعوا علیٰ أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضًا، وفی البیع الفاسد روایتان والصحیح انها قبض .... رجل باع خلًّا فی دنّ فی بیته فخلّی بینه وبین المشتری فختم المشتری علی الدنّ وترکه فی بیت البائع فهلک

---

(١) (طبع ادارة القرآن کراچی).
(٢) ج:٢ ص:٢٢٦ (طبع مکتبة الحسن).
(٣) کتاب الإجارة ج:٤ ص:٢٨٧ و ٢٨٨ (طبع معهد الخلیل الإسلامی).

بعد ذٰلک فانه یهلک من مال المشتری فی قول محمد، وعلیه الفتویٰ.
(فتاویٰ عالمگیریة ج:۳ ص:۱۶، کتاب البیوع، باب:۴ فصل:۲)[(۱)]

اب دیکھنا یہ ہے کہ مُشاع کی بیع میں قبضہ کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں بھی فقہائے کرام نے یہی فرمایا ہے کہ مشاع کی بیع میں تسلیم اور قبض کا تحقق تخلیہ ہی سے ہوتا ہے۔ علامہ سرخسی رحمہ اللہ اجارۃ المشاع (جو اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں) اور بیع المشاع کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

وهٰذا بخلاف البیع، لأن التسلیم هناک بالتخلیة یتم وذٰلک فی الجزء الشائع یتم. (مبسوط السرخسی ج:۱۵ ص:۱۴۶، کتاب الاجارة)[(۲)]

صاحبِ ہدایہ رحمہ اللہ نے بھی اس فرق کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

ولأبی حنیفة أنه آجر ما لا یقدر علیٰ تسلیمه فلا یجوز، وهٰذا لأن تسلیم المشاع وحده لا یتصور، والتخلیة اعتبرت تسلیمًا لوقوعه تمکینًا، وهو الفعل الذی یحصل به التمکن، ولا تمکن فی المشاع، بخلاف البیع لحصول التمکن فیه.[(۳)]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اجارہ میں چونکہ مقصود صرف اِنتفاع ہوتا ہے، مِلک نہیں، اور حصۂ مشاعہ میں تمکین اِنتفاع نہیں ہوسکتی، اس لئے اس میں تخلیہ متصوّر نہیں ہے، اس کے برخلاف بیع میں مقصود مِلک ہوتی ہے، لہٰذا تخلیہ کے ذریعے اس میں تمکین ہوسکتی ہے، چنانچہ صاحبِ عنایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

بخلاف البیع فان المقصود به لیس الانتفاع، بل الرقبة، ولهٰذا جاز بیع الجحش فکان التمکن بالتخلیة فیه حاصلًا.[(۴)]

اور صاحبِ کفایہ اس کو مزید واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ان التخلیة اعتبرت تسلیمًا اذا کان تمکینًا من الانتفاع، وانما یکون تمکینًا اذا حصل بها التمکن، والتمکن لا یحصل به فلم یعتبر فعلهٗ تمکینًا

---

(۱) طبع رشیدیه کوئٹه.
(۲) باب اجارة الدّور والبیوت ج:۱۵ ص:۱۶۳ (طبع غفاریه کوئٹه).
(۳) هدایة کتاب الأجارات ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مکتبه رحمانیه) یہاں یہ بات واضح رہے کہ ہدایہ کے مذکورہ نسخے میں "انه آجر ما یقدر علیٰ تسلیمه" کے الفاظ ہیں، بظاہر وہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔ صحیح الفاظ وہی ہیں جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُوپر ذِکر فرمائے ہیں یعنی "انه آجر ما لا یقدر علیٰ تسلیمه" اور فتح القدیر ج:۸ ص:۴۱ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) اور مکتبہ شرکت علمیہ ملتان کے طبع شدہ نسخۂ ہدایہ ج:۳ ص:۳۰۳ اور مکتبۃ البشریٰ کراچی کے طبع شدہ ہدایہ (ج:۶ ص:۲۹۸) کے نسخے میں بھی اسی طرح ہے۔
(۴) عنایة علیٰ فتح القدیر ج:۸ ص:۴۱ (طبع رشیدیه).

بخلاف البیع، لحصول التمکن ثمّہ من البیع والاعتاق وغیر ذٰلک۔
(فتح القدیر مع العنایة والکفایة ج:۸ ص:۴۱ و ۴۲ باب الاجارة الفاسدة)[۱]

صاحبِ کفایہ کی خط کشیدہ عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ مشاع میں حِسی قبضے کے بغیر تخلیہ قبضے کے قائم مقام ہوجاتا ہے اور مشتری کے لئے اس میں ملک کے تصرفات کرنا جائز ہوجاتا ہے، جن میں اسے آگے فروخت کرنا بھی شامل ہے۔

علامہ طوری رحمہ اللہ نے بھی تکملہ البحر الرائق میں فرق کی وضاحت صاحبِ ہدایہ اور صاحبِ عنایہ کے بیان کے مطابق کی ہے۔ (تکملة البحر ج:۸ ص:۳۶، باب الاجارة الفاسدة)[۲]

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع کی بیع میں حسی قبضہ تو ممکن نہیں ہوتا، لیکن تخلیہ اور تمکین سے قبضے کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے، اور مشتری کے لئے اس تخلیہ یا تمکین کے بعد اسی مُشاع کو آگے فروخت کرنا بھی جائز ہوجاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حصص کی بیع میں بائع کی طرف سے تمکین اور تخلیہ کا تحقق ہوجاتا ہے یا نہیں؟

اگرچہ اسٹاک ایکسچینج کے ذمہ دار اور اس میں کام کرنے والے اس بات پر متفق نظر آئے کہ سودا ہوتے ہی بیچے ہوئے شیئرز کے حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، گویا شیئرز خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں (اور اس لحاظ سے اگر خریدار انہیں آگے بیچے تو "ربح مالم یضمن" لازم نہیں آتا) لیکن اسٹاک ایکسچینج کے قواعد وضوابط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قبضۂ شرعی کا تحقق ڈیلیوری سے پہلے نہیں ہوتا، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- یہ بات فقہِ اسلامی میں طے شدہ ہے کہ "قبض کل شیء بحسبه"[۳] یعنی ہر چیز کا قبضہ اس شئ کی نوعیت کے لحاظ سے عرفاً مختلف ہوتا ہے، شیئرز کے بارے میں عرفِ عام یہی ہے کہ سودے کے وقت محض اسٹاک ایکسچینج کے فوری اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ "ڈیلیوری" تین دن بعد ہوگی، ڈیلیوری کے معنی ہی قبضہ دینے کے ہیں، لہٰذا عرف نے اسی کو قبضہ قرار دیا ہے۔

۲- اسٹاک ایکسچینج میں "بیع مالا یملک الانسان" (Short Sale) کا رواج عام ہے، جب ہم نے اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا، اس وقت ہمیں یہ بتایا گیا کہ حاضر سودوں یعنی فوری سودوں میں شارٹ سیل ممنوع کردی گئی ہے، لیکن قواعد وضوابط سے پتہ چلتا ہے اور بعد میں اسٹاک ایکسچینج کے صدر

---

(۱) طبع رشیدیہ۔
(۲) ج:۸ ص:۲۱ (طبع سعید)۔
(۳) کما فی البحر الرّائق ج:۵ ص:۲۴۸ (طبع سعید) قبض کل شیءٍ وتسلیمہ یکون بحسب ما یلیق بہ۔ وفیہ بعد أسطر: قبض کل شیء یکون بما یلیق بہ۔

صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ بلینک سیل (Blank Sale) ہے، یعنی ایسی بیع جس میں بائع کے پاس نہ تو ملکیت میں ہوں، اور نہ اس نے شیئرز کی خریداری کے لئے کسی سے قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو، لیکن حاضر سودوں میں شارٹ سیل کی اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی گئی ہے کہ بیچنے والا خریدار کو بتادے کہ وہ شارٹ سیل کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے وقت پر شیئرز کی ڈیلیوری کے لئے کسی سے قرض لینے کا انتظام کر رکھا ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ حاضر سودوں میں شارٹ سیل کا امکان موجود ہے، اور اگر بالفرض قواعد کے لحاظ سے شارٹ سیل منع بھی ہو تو اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص شارٹ سیل کر رہا ہے، یعنی شیئرز اس کی ملکیت میں نہیں ہیں، پھر بھی بیچ رہا ہے تو نہ صرف یہ کہ "بیع مالا یملک" ہونے کی بناء پر یہ بیع شرعاً باطل ہے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی شیئرز کے حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں یا خریدار کے ضمان (Risk) میں آجاتے ہیں، وہ یہ بات شرعی مفہوم میں نہیں کہتے، کیونکہ یہ بات وہ شارٹ سیل کی صورت میں بھی کہتے ہیں، حالانکہ شرعی مفہوم میں شارٹ سیل کی صورت میں ضمان منتقل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب شیئرز بائع ہی کی ملکیت میں نہیں ہیں تو وہ خریدار کو تمکین یا تخلیہ کیسے کرسکتا ہے؟ اور اس سے شرعی مفہوم میں ضمان کیسے منتقل ہوسکتا ہے؟

۳- کراچی اسٹاک ایکسچینج کی طرف سے ہمیں جو قواعد وضوابط فراہم کئے گئے، ان میں حاضر سودوں کے قواعد وضوابط (Rules For Ready Delivery Contracts) کی پہلی دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام حاضر سودوں کا تصفیہ آئندہ ہفتے میں پیر کے دن ہونا ضروری ہے، یعنی پیر کے دن بائع شیئرز کی ڈیلیوری دے گا، اور خریدار اس کی قیمت بائع کو اَدا کرے گا، لیکن اسی دفعہ کی شق بی میں یہ صراحت ہے کہ اگر بائع نے مقرّرہ وقت تک ڈیلیوری نہ دی تو خریدار کو حق ہوگا کہ کسی کمپنی کے جتنے شیئرز اس نے بائع سے خریدے تھے، وہ بازار سے خرید لے (جس کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں "Buy In" کہا جاتا ہے) اور شق سی میں کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں اگر خریدار کو بازار سے خریداری کرنے میں کوئی نقصان ہو (مثلاً وہ شیئرز بازار سے زیادہ قیمت میں ملیں) تو بائع کا فرض ہوگا کہ وہ خریدار کے نقصان (Damages) کی تلافی کرے۔

یہ قاعدہ واضح طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ سودے کے وقت قبضہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ بائع کی طرف سے ڈیلیوری نہ دینا، دو ہی صورتوں میں ممکن ہے، یا تو بائع نے شارٹ سیل کی تھی، یعنی

(1) Regulations For Short Selling Under Ready Market, 2002, Clause.

شیئرز کے ملکیت میں ہونے کے بغیر فروخت کردیئے تھے، اس صورت کا بطلان اُوپر نمبر۲ میں گزر چکا ہے، یا پھر اس نے شارٹ سیل نہ کی تھی، مگر خریدار سے سودا کرنے کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے وہ خود رکھنے یا کسی اور کو بیچ دینے کا فیصلہ کرلیا، جب اس کے لئے رائے بدل کر شیئرز کو خود رکھ لینا یا کسی اور کو بیچنا ممکن ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سودے کے وقت اس نے خریدار کو تمکین کردی ہے یا اس کے حق میں تخلیہ کردیا ہے؟ نیز اس صورت میں اسٹاک ایکسچینج کے قواعد یہ نہیں کہتے کہ جو شیئرز فروخت کئے گئے تھے بائع کو ان کی ڈیلیوری دینے پر مجبور کیا جائے، بلکہ خریدار کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بائع کو ڈیلیوری پر مجبور کرنے کے بجائے بازار سے اسی کمپنی کے اسی مقدار میں دُوسرے شیئرز خرید لے، اور اس خریداری میں اسے کوئی نقصان ہو تو بائع کو اس کی تلافی پر مجبور کرے، جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی بیع یک طرفہ طور پر فسخ کرے، اور کسی تیسرے شخص سے نئی بیع کرے۔

۴- اسٹاک ایکسچینج کے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حاضر سودوں کے علاوہ فارورڈ سودوں میں بھی حقوق و التزامات فوراً منتقل ہوجاتے ہیں، صرف کمپنی کے ریکارڈ میں نام کی منتقلی حاضر سودوں کے مقابلے میں زیادہ تأخیر سے ہوتی ہے، حالانکہ فارورڈ سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہ حضرات حقوق و التزامات کی جس منتقلی کا ذکر کر رہے ہیں وہ شرعی مفہوم میں ضمان کی منتقلی نہیں ہے۔ اور اس سارے مجموعے سے جو بات واضح ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں حاضر سودا کہا جا رہا ہے، اس میں سودے کے وقت شرعی مفہوم میں قبضہ متحقق نہیں ہوتا، اور جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ سودا ہوتے ہی تمام حقوق و التزامات خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں، وہ اس معنی میں کہتے ہیں کہ اسٹاک ایکسچینج معاملے کو اِنتہاء تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے، اور شیئرز کی قیمت بڑھے یا گھٹے، بائع اسی قیمت پر شیئرز کی ڈیلیوری کرنے کا، اور خریدار وہی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، اور اگر کوئی فریق اپنی یہ ذمہ داری پوری نہ کرے اور خریدار کی عدمِ ادائیگی کی صورت میں بائع کو بازار میں شیئرز فروخت کرنے (Sale Out) میں اور بائع کے قبضہ نہ دینے کی صورت میں خریدار کو بازار سے شیئرز خریدنے میں جو نقصان ہو، دُوسرا فریق اس کی تلافی کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شرعی حکم یہ ہے کہ شیئرز کے خریدار کے لئے اس وقت تک شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے جب تک کہ ڈیلیوری نہ مل جائے۔ اگر بیچنے والے نے شارٹ سیل کی ہے یعنی شیئرز ملک میں لائے بغیر فروخت کئے ہیں تو یہ بیع ہی باطل ہے، اور اگر شیئرز بائع کی ملک میں

تھے، اور عقدِ بیع کے ارکان متحقق ہوگئے ہیں تو یہ بیع دُرست ہے، اسے بیع الکالئ بالکالئ[1] اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ کمپنی کے شیئرز بائع کی ملکیت میں ہیں اور بیع حال ہے، اور تأخیرِ تسلیم محض رسمی اجراآت کی وجہ سے ہے، یا حبس المبیع لاستیفاء الثمن[2] ہے، اور مبیع عین ہے دَین نہیں، لیکن خریدار کے لئے آگے بیع کرنا اسی وقت جائز ہوگا جب اسے باقاعدہ ڈیلیوری مل جائے، لہٰذا اس وقت جس طرح ڈے ٹریڈنگ ہو رہی ہے (جس میں ڈیلیوری سے پہلے شیئرز آگے بیچ دیئے جاتے ہیں) وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

مستقبل کے سودے (Futures)

مذکورہ بالا تفصیل حاضر سودوں کے بارے میں تھی، جنھیں "Spot Sales" یا "Ready Contracts" کہا جاتا ہے۔ جب حاضر سودوں میں صورتِ حال یہ ہے تو مستقبل کے سودوں میں جنھیں Forward یا Future کہا جاتا ہے۔ بطریقِ اَوْلیٰ یہ حکم ہوگا کہ ڈیلیوری کے بغیر شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں، اس لئے کہ ان سودوں میں شارٹ سیل کا رواج حاضر سودوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، اور شارٹ سیل پر جو پابندیاں حاضر سودوں میں ہوتی ہیں، مستقبل کے سودوں میں اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔

اسٹاک ایکسچینج کے دورے کے دوران ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ حاضر سودوں اور مستقبل کے سودوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ حاضر سودوں میں ڈیلیوری جلدی ہوجاتی ہے، اور مستقبل کے سودوں میں دیر سے ہوتی ہے، لیکن خریدے ہوئے شیئرز کے حقوق و التزامات فوراً منتقل ہوجاتے ہیں، لیکن ان حضرات کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ حقوق و التزامات کی منتقلی کا لفظ وہ شرعی مفہوم میں استعمال نہیں کر رہے، بلکہ اس معنی میں استعمال کر رہے ہیں کہ شیئرز کی قیمت ڈیلیوری سے پہلے بڑھے یا گھٹے، ہر صورت میں بائع طے شدہ قیمت پر ڈیلیوری دینے اور خریدار طے شدہ قیمت ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مستقبل کے سودوں (Forward Sale) یا Future Sale کا حکم یہ ہے کہ:-

۱- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ بیع مالا یملک ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے۔

---

(۱) مستدرک حاکم ج:۲ ص:۶۵ و ۶۶ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت).

(۲) فی الهداية ج:۳ ص:۴۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ...... فصار کحبس المبیع لمّا تعلّق زواله باستیفاء الثمن لا یزول دون قبض جمیعه.

۲- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری بھی لے چکا ہے، اور آئندہ کی تاریخ کے لئے آج ہی ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کی تکمیل کر رہا ہے، جسے (Forward Sale) کہا جاتا ہے، یعنی بیع آج ہی مکمل ہوگئی ہے، لیکن وہ بیع آئندہ تاریخ کے لئے ہے، تو یہ **بیع مضاف الی المستقبل** ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

۳- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں (یعنی وہ ان کی ڈیلیوری لے چکا ہے) اور بیع آئندہ تاریخ کے لئے نہیں، بلکہ آج ہی کی تاریخ کے لئے ہوئی ہے، البتہ قیمت اُدھار رکھی گئی ہے کہ خریدار قیمت آئندہ کسی تاریخ پر اَدا کرے گا، تو اس صورت میں شیئرز کی ڈیلیوری خریدار کو دینی ہوگی، اور قیمت کی وصولی کے لئے ڈیلیوری دیئے بغیر شیئرز اپنے قبضے میں رکھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیع مؤجل ہے، اور بیع مؤجل میں **حبس المبیع لاستیفاء الثمن** جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

قال أصحابنا رحمهم الله تعالیٰ: للبائع حق حبس المبیع لاستیفاء الثمن اذا کان حالًا کذا فی المحیط، وان کان مؤجّلًا فلیس للبائع أن یحبس المبیع قبل حلول الأجل ولا بعده، کذا فی المبسوط.

(فتاویٰ عالگمیریة ج:۳ ص:۱۵، باب:۴ من کتاب البیوع)[۱]

۴- اگر بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ آج کی تاریخ ہی کے لئے خریدار کو بیچ رہا ہے، اور ان کی ڈیلیوری بھی خریدار کو دیتا ہے، لیکن قیمت، آئندہ تاریخ کے لئے اُدھار رکھی گئی ہے اور خریدار کو ڈیلیوری دینے کے بعد پھر وہی شیئرز (جو خریدار کے نام منتقل ہوچکے ہیں) اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے تو یہ صورت جائز ہے۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ، الدر المختار میں فرماتے ہیں:-

ولو کان ذٰلک الشیء الذی قال له المشتری: أمسکه، هو المبیع الذی اشتراه بعینه لو بعد قبضه، لأنه حینئذ یصلح أن یکون رهنًا بثمنه، ولو قبله لا یکون رهنًا، لأنه محبوس بالثمن.[۲]

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ اس کے تحت فرماتے ہیں:-

قوله: لأنه حینئذ یصلح ... الخ أی لتعیین ملکه فیه، حتّی لو هلک یهلک

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ).

(۲) الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۷ (طبع سعید).

علی المشتری، ولا ینفسخ العقد ط قوله "لأنه محبوس بالثمن" أی وضمانه یخالف ضمان الرهن، فلا یکون مضمونًا بضمانین مختلفین .... الخ. (ردّ المحتار، کتاب الرهن ج:٦ ص:٤٩٧)[1]

صورت نمبر۳ اور صورت نمبر۴ کا فرق بھی علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ کی اس عبارت میں موجود ہے، اس کی مزید وضاحت بندہ کی کتاب "بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة" (ص:۱۶ تا ۱۸، طبع دارالقلم دمشق) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۵- پانچویں صورت یہ ممکن ہے کہ بیچنے والے کی ملک اور قبضے میں شیئرز ہیں، اور وہ بیع ابھی نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص قیمت پر آئندہ بیچنے کا وعدہ کرتا ہے، اور خریدار آئندہ اس قیمت پر خریدنے کا صرف وعدہ کرتا ہے، بیع ابھی مکمل نہیں ہوتی، علمائے معاصرین کی ایک بڑی جماعت (جس میں مجمع الفقه الاسلامی جدة بھی داخل ہے) دوطرفہ وعدملزم کو بھی عقد کے حکم میں قرار دے کر اسے ناجائز قرار دیتی ہے، اور جن فقہاء نے بعض معاملات (مثلاً بیع بالوفاء) میں وعدملزم کو جائز قرار دیا ہے، وہ بھی اسے حاجتِ عامہ سے مشروط مانتے ہیں، چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

لأن المواعدة قد تکون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس.

(الفتاویٰ الخانیة ج:٢ ص:١٦٥)[2]

مذکورہ صورت میں کوئی ایسی حاجت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے کوئی حرجِ عام لازم آئے، بلکہ اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کے رُجحان کو روکنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "وعدہ" غیرملزم ہی رہے،[3] لہٰذا اگر دونوں فریق وعد غیرملزم (Non-Binding Promise) کرلیں تو یہ جائز ہے، اس صورت میں اگر کوئی فریق وعدے کو پورا نہ کرے تو وہ دیانۃً تو گناہگار ہوگا، لیکن قضاءً اسے مجبور نہ کیا جاسکے گا۔

بدلہ کے معاملات

اسٹاک ایکسچینج میں بدلہ کے معاملات اس طرح ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ایک شخص بہت سے حصص خرید لیتا ہے، مگر قیمت ادا کرنے کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی، ایسی صورت میں وہ خریدے ہوئے حصص کسی تیسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ بیچ دیتا ہے کہ وہ ایک طے شدہ مدّت کے

---

(۱) (طبع سعید).

(۲) (طبع رشیدیه).

(۳) موجودہ قانون اور طریقِ کار میں یہ وعدہ ملزم ہوتا ہے، لہٰذا یہ صورت ناجائز ہے۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم)۔

بعد خریدار سے وہی حصص زیادہ قیمت پر خرید لے گا، مثلاً الف نے ب سے یکم اپریل کو ایک لاکھ روپے کے دس ہزار حصص خریدے، لیکن اس کے پاس ایک لاکھ روپے نہیں ہیں، لہٰذا وہ یہ دس ہزار حصص ج کو اس شرط کے ساتھ بیچتا ہے کہ ۱۳/اپریل کو وہ یہی حصص ایک لاکھ دو ہزار روپے میں واپس خرید لے گا۔

اس طریقِ کار میں شرعی اعتبار سے دو خرابیاں ہیں، ایک یہ کہ عموماً بدلے کا یہ معاملہ ڈیلیوری سے پہلے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ بیع قبل القبض ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔ دُوسرے ج کو جو شیئرز بیچے جارہے ہیں وہ زیادہ قیمت پر واپس خریدنے کی شرط کے ساتھ بیچے جارہے ہیں، یہ شرط فاسد ہے، جو بیع کو فاسد کردیتی ہے، اور درحقیقت اس کا مقصد ایک لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ دو ہزار روپے واپس کرنا ہے جو سود کی ایک شکل ہے، جس کے لئے اس بیع فاسد کو بہانہ بنایا گیا ہے، اس لئے بدلہ کے یہ معاملات بھی شرعاً ناجائز ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہٗ اَتم واَحکم

الجواب صحیح	بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	۲۱/صفر ۱۴۲۶ھ-۲/اپریل ۲۰۰۵ء
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ	(فتویٰ نمبر ۴۷/۸۰۳)

نوٹ:- دار الافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کی مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ کا اجلاس بروز پیر بتاریخ ۲۶/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۴/جولائی ۲۰۰۵ء منعقد ہوا، جس میں درج بالا تحریر لفظاً لفظاً پڑھی گئی اور مناقشہ کے بعد سب اہلِ مجلس نے اس سے اتفاق کیا۔ اس مجلس میں درج ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:-

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مدظلہم	(اُستاذِ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی محمد عبدالمنان صاحب مدظلہم	(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی)
مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم	(رفیق دار الافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا عصمت اللہ صاحب مدظلہ	(رفیق دار الافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محفوظ احمد صاحب مدظلہ	(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہ	(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)
مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہ	(اُستاذ جامعہ دارالعلوم کراچی)

مولانا محمد یعقوب صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا محمد افتخار بیگ صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا خلیل احمد اعظمی صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا احسان کلیم صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب مدظلہ (رفیق دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب مدظلہ (اُستاذ جامعہ دار العلوم کراچی)

۱:- ڈیلیوری سے پہلے شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۲:- ایک ماہ بعد کے وعدے پر شیئرز فروخت کرنے کا حکم

۳:- شیئرز فروخت کرنے کے بعد وصولیٔ رقم کی ضمانت کے طور پر وہی شیئرز بطور رِہن رکھنے کا حکم

محترم جناب حضرت جی، دامت برکاتہم حفظہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

شیئرز سے متعلق جو آپ نے فرمایا ہے، اُس میں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، میں تفصیل علیحدہ لکھ رہا ہوں۔

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ شیئرز میں نے آج خرید لئے، ایجنٹ کی معرفت وہ شیئرز میں اُسی ایجنٹ کی معرفت فروخت کرنا چاہتا ہوں، ڈیلیوی یعنی CDC میں دو تین دن بعد آتا ہے۔

جواب:- مکرّم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

سوال:- شیئرز میں نے خریدے اور اُن کو مہینے بعد کے وعدے پر فروخت کردیئے، اُسی ایجنٹ کی معرفت جس سے لئے تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ ٹھیک نہیں، البتہ آپ ادائیگی کرنے کے بعد اُس کی ڈیلیوری دیں، لیکن آپ نے جو یہ فرمایا کہ میں اس کو ضمانت کے طور پر رکھ سکتا ہوں، اس کی سمجھ نہیں آئی، ہوسکے تو مہربانی فرما کر وضاحت فرمادیں، آپ کی مہربانی ہوگی۔ والسلام طالبِ دُعا

الطاف حسین برخوردار یہ

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ماہ بعد فروخت کرنا ہے، اس میں دو کام ضروری ہیں، ایک یہ کہ آپ پہلے خریدے ہوئے شیئرز کی ڈیلیوری لے لیں[1] پھر اس کو فروخت کریں۔ دُوسرے یہ کہ ایک ماہ بعد کا سودا آج کرنا تو دُرست نہیں ہے[2]، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اسے فروخت تو آج ہی کردیں، اور ڈیلیوری بھی اس کو دے دیں[3]، لیکن بعد میں وہی شیئرز آپ اس سے گروی کے طور پر رکھ لیں، تاکہ ایک ماہ بعد اس کو جو رقم ادا کرنی ہے، اس کی ضمانت میں یہ شیئرز رِہن بن جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۶/۲/۵ھ

۱:- شیئرز کے نفع کو ذریعۂ آمدنی بنانے کی غرض سے شیئرز خریدنا
۲:- کاروبار میں سودی رقم شامل کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم
۳:- تجارت کی غرض سے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال ۱:- "Join Stock Companies" کے شیئرز خرید کر اس کے Dividend کو ذریعۂ آمدنی بنانا، شیئرز "Ordinary" ہیں، یعنی نفع ونقصان کی گارنٹی کے بغیر اور نفع ونقصان کے فیصد کے تعین کے بغیر ہیں۔ اور "Companies" جائز تجارت اور صنعت کا کاروبار کرتی ہیں۔ "Capital Financing" بھی بغیر سود کے کی گئی ہے۔

۲:- اُوپر والی صورت، مگر اس فرق کے ساتھ کہ "Financing" کے لئے رقم سود پر حاصل کی گئی ہے۔

۳:- نمبر۱ کی صورت، مگر اب شیئرز کی خرید "Dividend" کے بجائے کلیۃً اس شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے کی گئی ہے، یعنی آمدنی کی صورت اب "Capital Gain" پر منحصر ہے، نہ کہ "Dividend" کی آمدنی پر۔

۴:- نمبر۲ کی صورت، مگر شیئرز کی خریداری صرف "Capital Gain" کے لئے ہے۔

(۱ تا ۳) تفصیل کے لئے ص:۱۸۷ تا ۱۹۰ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب ۱:- اس صورت میں شیئرز خریدنا جائز ہے۔[۱]

۲:- اس صورت میں بھی شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے،[۲] البتہ کمپنی والوں کو یہ لکھ دیا جائے کہ سود کے لین دین پر ہم راضی نہیں ہیں۔ اور کمپنی کے سالانہ اِجتماع میں بھی اس بات کا اِظہار کردیا جائے، خواہ پھر وہ اس پر عمل نہ کریں۔[۳]

۳و۴:- خرید و فروخت کی غرض سے بھی شیئرز خریدنے میں کوئی حرج نہیں،[۴] البتہ سوال نمبر۳ کی صورت میں بھی سودی معاملے کے ساتھ اپنی عدم رضامندی کا اظہار کرنا چاہئے، جیسا کہ نمبر۲ میں گزرا۔ نیز ڈیلیوری سے پہلے آگے فروخت نہ کئے جائیں۔　　　　واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

اسلامی بینکاری اور شیئرز کے بارے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

(اسلامی بینکاری اور شیئرز سے متعلق خط و کتابت)

لندن کے ایک عالم مولانا موسیٰ کرماڈی صاحب نے ایک خط کے ذریعے حضرتِ والا دامت برکاتہم سے شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق دریافت کیا، لیکن وہ خط ڈاک کے ریکارڈ میں دستیاب نہ ہوسکنے کی بناء پر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اُن کے فیکس کے جواب میں ''اسلامی بینکاری'' سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی۔ بعد میں سائلِ موصوف کی طرف سے وہ سابقہ اصلی خط دوبارہ بھیجا گیا جس میں درحقیقت شیئرز سے متعلق دریافت کیا گیا تھا، چنانچہ پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم نے شیئرز سے متعلق ان کے دریافت کردہ اُمور کا تفصیلی جواب دیا۔ یہ خط و کتابت ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے، دیگر چار ہفتے پہلے الحاج الطاف حسین

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۵تا۸۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) تفصیل اور حوالہ کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۹۱ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) اور ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۷ وص:۸۸ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) شیئرز سے تجارت یعنی "Capital Gain" کے بارے میں علماء کی مختلف آراء اور تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۸۹تا۹۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

برخوردار یہ صاحب کی معرفت ایک تفصیلی مراسلہ[1] ارسال کیا تھا، نہ آنے پر یاد دہانی کے لئے فیکس کر رہا ہوں، سخت انتظار ہے، اُمید ہے کہ حضرتِ والا اپنی گوناگوں مصروفیات میں کچھ وقت فارغ کر کے جواب سے آگاہ فرمائیں گے۔ فقط والسلام

موسیٰ کرماڈی، لندن

جواب:- گرامیٔ قدر مکرّم جناب مولانا موسیٰ کرماڈی صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ الطاف برخوردار یہ صاحب کی معرفت ایسے طریقے سے ملا کہ وہ جواب طلب ڈاک میں شامل نہ ہوسکا، اور کاموں کے ہجوم میں ذہن سے نکل گیا۔ اب آپ کا براہِ راست فیکس موصول ہوا تو یاد آیا، اور اَب وہ گرامی نامہ مل نہیں رہا ہے، تاہم جہاں تک یاد ہے، آپ نے یہ اِستفسار فرمایا تھا کہ کیا اسلامی بینکاری کے بارے میں میری رائے تبدیل ہوئی ہے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اسلامی بینکاری کے بارے میں جو کچھ بندہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' میں لکھا ہے، یا انگریزی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو اسلامک فائنانس'' میں لکھا ہے، چند بہت جزوی معاملات کے سوا اس کے بارے میں بندہ کی رائے تبدیل نہیں ہوئی۔ اس پر تنقید میں جو رسائل نظر سے گزرے، جن میں سے ایک پر آنجناب کی تقریظ بھی ہے، اُن کے مطالعے کے بعد بھی بندہ کی رائے وہی ہے جو ان کتابوں میں مذکور ہے۔ البتہ اس بات کا اظہار میں نے متعدّد مقامات پر کیا ہے کہ میں اس موضوع میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوا تھا، یہ میری ذاتی دِلچسپی کا موضوع نہیں ہے، نیز میں سمجھتا ہوں کہ اِسلامی مالیاتی اِداروں کو مرابحہ، اِجارہ وغیرہ پر ہی قانع ہوکر نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ شرکت اور مضاربت کی طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ نیز میں اپنے دیگر علمی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے ان اِداروں کے شریعہ بورڈ کی رُکنیت سے رفتہ رفتہ علیحدگی اِختیار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس وضاحت سے بندہ کا موقف واضح ہوگیا ہوگا، اگر مزید کوئی بات دریافت طلب ہو تو بندہ سے براہِ راست رابطہ فرمالیں۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۷/۱۲/۱۸ھ

---

(۱) یہ مراسلہ جو شیئرز سے متعلق کئی سوالات پر مشتمل تھا، آگے اس سوال کے جواب کے بعد آرہا ہے۔

۱:- شیئرز کی خرید وفروخت میں اُمت کی کونسی مجبوری اور اِضطرار ہے؟

(''اِمداد الفتاویٰ'' اور ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں جواز کے فتویٰ کی روشنی میں اِضطرار و مجبوری کے مفہوم اور درجے کی وضاحت)

۲:- شیئرز کے فتویٰ جواز اور ''اِنعام الباری'' کی ایک عبارت کی وضاحت

محترم المقام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہٗ اُمید ہے کہ آپ حضرت بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آنجناب کا اِرسال کردہ فیکس موصول ہوا، میرا اگلا خط سامنے ہوتا تو شاید جواب تشنہ نہ رہتا، بہرحال اس خط کی کاپی دوبارہ اِرسالِ خدمت ہے۔ اس کے علاوہ مکتبہ دارالعلوم کراچی کی شائع کردہ کتاب ''اِمداد الفتاویٰ'' جلد:۳ کے صفحہ:۴۹۹ کی کاپی بھی اِرسال ہے، جس میں حضرت تھانویؒ نے پچھلے چند صفحوں کی دس باتوں پر عربی زبان میں تبصرہ فرماتے ہوئے اَخیر میں لکھا ہے کہ: ''یقول اشرف علی ان ھٰذا التوسع کلہ فی امثال ھٰذہ المعاملات لمن ابتلیٰ بھا او اضطر الیھا واما غیرہ فالتوقی الورع'' اس عبارت میں حضرتؒ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پچھلی ساری سہولتیں صرف اِضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں۔

بناء بریں آنجناب نے ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' کے صفحہ:۸۷، ۸۸ پر جواز کی جو صورت نکالی ہے، اس میں اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے یہ میری ناقص سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ ''انعام الباری'' جلد:۶ میں شیئرز کو مثل سٹہ، سرمایہ دارانہ نظام اور عجیب وغریب قسم کا بازار جو لکھا ہے مجھے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لہٰذا:-

۱- شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز پر اُمت کے لئے کونسی ایسی اِضطراری اور مجبوری کی حالت آپ کے نزدیک ہے؟ کچھ وضاحت فرمائیں تو مناسب ہوگا۔ نیز

۲- شیئرز کے جواز اور جلد:۶ کی سٹہ ہونے میں کوئی تضاد تو نہیں؟ یا مجھے غلط فہمی ہورہی ہے؟

برائے مہربانی تکلیف فرماکر مطلع فرمائیں تاکہ اطمینان ہو۔　　فقط

موسیٰ کرماڈی، لندن

محترمی جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدۂ اُمید ہے کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے۔ دیگر آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تقریباً دو سال کی محنت کے بعد ہند و پاک اور برطانیہ کے مختلف مفتیانِ کرام کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فتاویٰ اور موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسائل کافی تعداد میں میرے پاس جمع ہوگئے ہیں، جس کے سترہ سو صفحے کی تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا نام ''عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل'' تجویز کیا ہے۔

ان تین جلدوں میں آنجناب کے بھی حسبِ منشاء مختلف فتاویٰ شامل کئے ہیں، جن میں سے ایک فتویٰ ''اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت اور ان پر قبضے کا شرعی حکم'' اور دُوسرا ''شیئرز کی خرید و فروخت'' بھی شامل ہے۔

ان تین جلدوں کی کتابت، تصحیح وغیرہ مکمل ہونے پر طباعت کے لئے کراچی کا سفر کرنے ہی والا تھا کہ اس درمیان دارالعلوم لندن کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ صاحب کا ایک تفصیلی فتویٰ بنام ''شیئرز کے متعلق ایک اِستفتاء اور اس کا جواب'' .... صاحب نے مجھے دیا، جس میں حضرتِ والا کے شیئرز کے جواز پر عدمِ اتفاق کا اظہار ہے (کاپی اِرسالِ خدمت ہے)۔

اس کے علاوہ مکتبہ حبیبیہ کراچی کا شائع کردہ رسالہ بنام ''تکملۃ الردّ الفقھی علیٰ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی'' بھی پڑھنے کو ملا، یہ رسالہ بڑی تعداد میں برطانیہ کے علمائے کرام تک پہنچایا گیا ہے، اس کے مقدمے کے صفحہ نمبر ۶ پر حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ کلفٹن کراچی نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ:

چنانچہ مفتی صاحب نے اپنی کتاب انعام الباری شرح صحیح البخاری جلد:۶ صفحہ:۲۵۱ پر وضاحت کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت کے متعلق لکھا ہے کہ ''شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ ہے، سرمایہ دارانہ نظام ہے، اور عجیب و غریب قسم کا بازار ہے'' بحوالہ ماہنامہ ''ندائے شاہی مرادآباد'' آگے اس صفحے پر مکۃ المکرّمۃ کی ایک علمی گفتگو کا آنجناب کا فرمان نقل کیا ہے کہ ''یہ ایک حیلہ نکالا گیا ہے، اس کے حیلہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، میں رفتہ رفتہ ان معاملات سے الگ بھی ہو رہا ہوں، اس لئے کہ بہت ہوگیا اور پوری سرگرمیاں اس پر لگا دینا نہیں چاہتا۔''

آگے صفحہ:۷ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے آپ حضرات نے جو اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کیا تھا، اس کی رُوئیداد تحریر کر کے لکھا ہے کہ وہاں سے جو معلومات حاصل کیں اس کے نتیجے میں ان تمام طریقوں کو ناجائز، حرام، سود اور باطل قرار دیا ہے۔ جس پر آنجناب اور حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی کے علاوہ دارالعلوم کراچی کے دیگر مفتیانِ کرام کے دستخط موجود ہیں۔

آگے صفحہ:۷، ۸ پر مفتی حبیب اللہ صاحب نے جس درد و کرب کے ساتھ ''مایوس کن صورتِ حال'' کے ذیلی عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا، حقیقت یہ ہے کہ نہایت ہی قابلِ توجہ ہے ....

حاصلِ کلام:-

حضرت مفتی صاحب! چونکہ میں نے ''عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل اور اُن کا حل'' میں آنجناب کے ذکر کردہ یہ دو فتوے بھی شامل کئے ہیں، اور اس میں شیئرز کی حلت اور جواز موجود ہے، جبکہ حضرت مفتی حبیب اللہ صاحب کی عبارت کے مطابق شیئرز کے سٹہ ہونے، حرام، ناجائز اور باطل ہونے پر آنجناب کے تصدیق دستخط ہونے سے میں عجیب کشمکش کا شکار ہوگیا ہوں، میرے ناقص علم کے مطابق مجھے تو اس میں تضادِ بیان کا شبہ ہو رہا ہے، برائے مہربانی اوّل فرصت میں مجھے مطلع فرمائیں اور بتائیں:-

الف:- کیا آنجناب نے شیئرز کی حلت کے فتویٰ سے رُجوع فرمالیا ہے؟ جیسا کہ مفتی حبیب اللہ صاحب کے ''انعام الباری'' کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگر رُجوع کرلیا گیا ہے تو صاف الفاظ میں وضاحت فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں، اور اگر آپ اپنی سابقہ تحقیق پر قائم ہیں تو برائے مہربانی حسبِ بالا عبارت پر تبصرہ فرما کر ہمیں آگاہ فرمائیں۔ اُمید ہے کہ تکلیف فرما کر اطمینان بخش جواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔

نوٹ:- شاید آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا، پچھلے سال برطانیہ میں ایک دن کے لئے آپ کی تشریف آوری پر اوقاتِ نماز کے مشاہدات پر گفتگو کے لئے مولانا یعقوب مفتاحی صاحب سیکریٹری حزب العلماء (یو.کے) کے ساتھ بندہ بھی حاضرِ خدمت ہوا تھا۔

فقط والسلام

احقر موسیٰ کرماڈی، لندن

۱۴۲۶/۱۱/۶ھ

گرامیٔ قدر مکرّم جناب مولانا موسیٰ سلیمان کرماڈی صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ بذریعہ فیکس موصول ہوا، اور اس کے ساتھ پچھلے گرامی نامے کی کاپی بھی

ملی۔ آپ نے اوّلاً ''اِمداد الفتاویٰ'' ص:۴۹۹ کی عبارت نقل کرکے فرمایا ہے کہ: ''اس عبارت میں حضرتؒ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پچھلی ساری سہولتیں صرف اِضطراری یا مجبوری کی حالت میں ہیں.....اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے؟'' اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ حضرتؒ نے یہ عبارت اوّل تو مالِ مخلوط کے سلسلے میں لکھی ہے، دُوسرے حضرتؒ نے خود شیئرز کی خریداری کو بشروط جائز قرار دیا ہے۔ اگر یہ اجازت صرف اِضطراری حالات کے لئے ہے تو یہ سوال حضرتؒ کی تحریر پر بھی ہوسکتا ہے کہ اُمت کے سامنے شیئرز خریدنے کے لئے کونسی ایسی مجبوری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کا مقصد اِصطلاحی اِضطرار نہیں ہے جس میں میتہ کھانا حلال ہوجاتا ہے، بلکہ کاروباری حاجت اور اِبتلائے عام ہے، جیسا کہ خود حضرتؒ نے ص:۴۹۵ پر فرمایا ہے کہ: ''پس اِبتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلے میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکتِ مذکورہ کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے'' نیز جو عبارت حضرتؒ نے ص:۴۹۹ پر لکھی ہے، اس میں "فالتوقّي الورع" کے الفاظ واضح فرما رہے ہیں کہ یہ ورع یعنی تقویٰ کی بات ہے، جہاں تک فتویٰ کا تعلق ہے، فتویٰ جواز ہی کا ہے۔

ثانیاً آنجناب نے ''انعام الباری'' جلد:۶ کے حوالے سے پوچھا ہے کہ بندہ نے شیئرز کو سٹہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ بندہ نے صرف ''اِنعام الباری'' میں نہیں، بلکہ دُوسری متعدّد تحریروں میں بھی یہ عرض کیا ہے کہ شیئرز کی خرید وفروخت میں اگر اَحکامِ شریعت کی رعایت نہ کی جائے تو اُس سے سٹہ بازی کا دروازہ کھلتا ہے، لیکن اگر اَحکامِ شریعت کا لحاظ رکھا جائے تو سٹہ بازی ہو ہی نہیں سکتی، مثلاً شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی بیع قبل القبض نہیں ہوسکتی[1]، اگر تنہا اس حکم کو اسٹاک ایکسچینج پر نافذ کردیا جائے تو سٹہ بازی کا دروازہ مکمل طور پر بند ہوجاتا ہے، کیونکہ سٹہ کے کاروبار کی ساری بنیاد ہی بیع قبل القبض اور بیع مضاف الی المستقبل پر ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں ختم ہوجائیں تو سٹہ ختم ہوجائے۔ لیکن اگر شیئرز کی خرید وفروخت حاضر سودوں میں ہو، اور قبضے سے پہلے آگے بیع نہ کی جائے تو اس میں نہ سٹہ کا کوئی احتمال ہے، نہ سرمایہ دارانہ نظام کی کوئی اور خرابی اس میں لازم آتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے روئی، گندم اور دُوسری اَجناس میں بھی سٹہ ہوتا ہے، لیکن اس لئے ہوتا ہے کہ ان اَجناس کی بیع قبل القبض یا مضاف الی المستقبل کی جاتی ہے، ان محظوراتِ شرعیہ سے اِجتناب کے ساتھ اگر ان اَجناس کی خرید وفروخت ہو تو نہ اس میں سٹہ ہے، اور نہ وہ شرعاً ناجائز ہیں۔

ہم نے دارالعلوم کے علماء کے ساتھ اسٹاک ایکسچینج کا دورہ کرکے جس معاملے کی تحقیق کی تھی،

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۲۳ کا حاشیہ نمبر۳۔

وہ یہ تھی کہ شیئرز پر قبضہ کب اور کس طرح ہوتا ہے؟ اس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ قبضہ خریداری کے فوراً بعد نہیں ہوتا، بلکہ اس میں کچھ وقت لگتا ہے، لہٰذا ہم نے یہ فتویٰ[1] جاری کیا کہ جس دن خریداری ہوئی ہے، اگر اُس دن قبضہ نہیں ملا (جیسا کہ پاکستان میں یہی صورت ہے) تو پھر اُسی دن شیئرز کو آگے بیچنا جائز نہیں ہے، بلکہ قبضہ ملنے کے بعد بیچنا جائز ہوگا۔ نیز اسٹاک ایکسچینج میں بدلے کے نام سے جو سودے ہوتے ہیں وہ شرعاً جائز نہیں ہیں۔ ہماری یہ تحریر ''البلاغ'' میں شائع ہوچکی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قبضے وغیرہ کی شرعی شرائط پوری کر کے کوئی خرید وفروخت کی جائے تو وہ بھی ناجائز ہے۔

مکہ مکرمہ میں بندہ کی جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں میں نے شیئرز کی خرید وفروخت کو حیلہ نہیں کہا تھا، بلکہ اس کا صحیح سیاق وسباق اِسلامی بینکاری کے بعض طریقوں سے متعلق تھا، جس کی حقیقت میں اپنے پہلے خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔

اُمید ہے کہ مذکورہ بالا گزارشات سے شیئرز کے بارے میں بندہ کا موقف واضح ہوگیا ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۱ر محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۹۳۶/۱۲)

"Vested Stock" کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کا شکریہ، اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، اس خط کے ساتھ دو اُمور کے کاغذات منسلک ہیں۔

۱- "Stock Options" پر زکوٰۃ کا مسئلہ، آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے کمپنی کے ذمہ دار افراد سے پوچھا کہ اسٹاک شروع میں کسی کی ملکیت میں ہوتا ہے اور "Issued Capital" کا حصہ ہوتا ہے یا نہیں؟ کمپنی کے لوگ مجھے تسلی بخش جواب نہیں دے سکے اور انہوں نے کسی اور "Tax Advisor" سے مشورہ کرنے کو کہا ہے۔ میں نے دُوسرے مسلمان برادران سے پوچھا جو اسی کمپنی میں

(۱) وہ فتویٰ اسی "فصل فی احکام الأسھم" کے ص:۱۷۸ تا ص:۱۹۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کام کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اسٹاک پہلے کمپنی کی ملکیت ہوتا ہے اور بعد میں ملازم کو دیا جاتا ہے، اس خط و کتابت کی نقل منسلک ہے، اب اس کے مطابق ایسا راستہ بتادیں کہ شک و شبہ رفع ہوجائے اور اگر زکوٰۃ دینی ہے تو دی جائے، پوری تفصیل دُوسرے کاغذ (پہلے خط) میں موجود ہے۔ والسلام

جواب:- محترمی و مکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"Vested Stock" کے بارے میں آپ کا سوال دوبارہ موصول ہوا، جو جوابات آپ نے منسلک کئے ہیں ان سے صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی، لیکن ان سوالات کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ "Vested Stock" کے حق کو اِستعمال کرکے ان شیئرز کو "Face Value" پر خریدنے کا جواز ان سوالات کے جواب پر موقوف ہے۔ لہٰذا ان سوالات کے واضح جواب کے بغیر میں یہ تو عرض نہیں کرسکتا کہ ایسے شیئرز لینا جائز ہے یا نہیں؟ لیکن جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ جس شخص نے اپنا یہ حق ابھی استعمال نہ کیا ہو، یعنی شیئرز نہ لئے ہوں، اُس پر ان کی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ جب تک شیئرز عملاً نہ لئے ہوں، ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

والسلام
۱۴۱۹/۸/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۹/۹۱)

﴿فصل فی القرض والدّین﴾
(قرض اور دَین سے متعلق مسائل)

''قرضِ حسن'' سے کیا مراد ہے؟ اور قرضِ حسن کی واپسی کے اطمینان کا طریقہ

سوال:- ایک بیوہ اپنی زرخرید زمین پر اپنا ذاتی رہائشی مکان بنوانے کے لئے ایک کروڑپتی شخص سے بلاسودی قرضہ بطور قرضِ حسنہ لینا چاہتی ہے، اور ہر ماہ قسط وار ادا کرتی رہے گی، وہ شخص بینک کے تحفظ پر قرضِ حسنہ دینے کو تیار ہے تاکہ اگر قسط کی ادائیگی میں تاخیر یا ناغہ ہو تو بینک عدالتی کارروائی کرکے وصول کرسکے۔ قرضِ حسنہ کی واپسی کے لئے مقروض کو عدالتی مروّجہ قوانین کے تحت پابند کرنا ضروری اور لابدی ہے یا نہیں؟ شرعاً قرضِ حسنہ کی واپسی کا اطمینان کس طرح کیا جائے؟ بیوہ کا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے عزیز واقارب کے یہاں رہ رہی ہے۔

جواب:- قرضِ حسن سے مراد وہ قرض ہے جس پر سود کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے، البتہ قرض کی واپسی کے لئے اطمینان کا کوئی انتظامی معاملہ کرنا قرضِ حسن کے منافی نہیں ہے، مثلاً اگر کسی شخص کی کفالت طلب کی جائے،[1] یا کوئی چیز رہن رکھ لی جائے،[2] (بشرطیکہ اس رہن شدہ چیز سے قرض دینے والا کوئی فائدہ نہ اُٹھائے[3])، تو شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح قرض لینے والے سے کوئی تحریر لے لی جائے جس کے تحت اسے عدالت کے ذریعے قرضے کی واپسی پر مجبور کیا جاسکے تو یہ بھی دُرست ہے۔ آپ نے بینک

---

(۱) وفی الهداية كتاب الكفالة ج:۳ ص:۱۲۲ (طبع مكتبه رحمانيه) وأمّا الكفالة بالمال فجائزة معلومًا كان المكفول به أو مجهولًا اذا كان دَينًا صحيحًا .... الخ.

(۲) وفی صحيح البخاری ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع قديمی كتب خانه) عن الأعمش قال: ذكرنا عند ابراهيم الرّهن فی السلف فقال: لا بأس به .... الخ.

وفی الهداية كتابُ الرّهن ج:۴ ص:۵۱۸ (طبع رحمانيه) ولا يصحّ الرّهن الّا بدَينٍ مضمون لأنّ حكمه ثبوت يد الاستيفاء والاستيفاء يتلو الوجوب .... الخ.

(۳) فی الدّر المختار كتابُ الرّهن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعيد) لا يحلّ له أن ينتفع بشیءٍ منه بوجهٍ مّن الوجوه وان أذن له الرّاهن لأنّه أذن له فی الرّبا لأنّه يستوفی دينه كاملًا فتبقى له المنفعة فضلًا فيكون ربا وهٰذا أمرٌ عظيمٌ.

وفی ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲ لا يحلّ للمرتهن الانتفاع به مطلقًا .... الخ.

وكذا فی البحر الرّائق ج:۶ ص:۴۳۸ (طبع رشيديه) وملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۴ ص:۲۷۳ (طبع مكتبه غفاريه كوئٹه).

کے تحفظ کے بارے میں جو پوچھا ہے اس کی پوری صورت واضح نہیں ہوئی، اس معاملے کی تفصیل لکھیں تو اُس کا حکم بتایا جاسکتا ہے، البتہ مذکورہ بالا صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے جائز ہے، اور اس سے مقروض کی امداد کا ثواب اِن شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۴/۲۸ الف)

سودی قرضے سے مکان بنوا کر بینک ملازمت کی پنشن کی رقم قرض میں ادا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص سودی بینک میں ملازم تھا، اُس نے اس دوران بینک سے قرضہ لے کر مکان بنوایا، بعد میں یہ شخص ریٹائر ہوگیا تو کیا یہ شخص پنشن خود لینے کے بجائے اس کو قرضے کی ادائیگی میں دیدے تو اس کی گنجائش ہے؟ (مولانا) محمد عامر

اُستاذ جامعۃ الرشید، احسن آباد کراچی

جواب:- سودی بینک سے جو قرض لیا گیا وہ قرض صحیح ہوگیا،(۱) اگرچہ سودی معاملہ کرنے کا سخت گناہ ہوا، اس اصل قرض کا لوٹانا حلال مال سے واجب ہے،(۲) لہٰذا اگر نوکری حرام تھی تو اس کی پنشن سے قرض ادا کرنا دُرست نہیں۔(۳) والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۳۹۶ (طبع سعید) وأمّا حکم القرض فھو ثبوت الملک للمستقرض فی القرض للحال وثبوت مثله فی ذمّة المستقرض ..... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۴ (طبع سعید) ویملک المستقرض القرض بنفس القبض عندھما ..... الخ.

اور بینک سے قرض لینے میں اگرچہ واپسی کے وقت ''سود'' دینے کی شرط ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود ''قرض'' کا معاملہ دُرست ہوجائے گا کیونکہ ''قرض'' ان معاملات میں شامل ہے جو شرط لگانے سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ شرط خود باطل ہوجاتی ہے۔

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۵ (طبع سعید) القرض لا یتعلّق بالجائز من الشروط فالفاسد منھا لا یبطله ولٰکنه یلغو شرط. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۴۹ وما یصح ولا یبطل بالشرط الفاسد ..... سبعة وعشرون ..... القرض ..... الخ.

وفی الشامیة ما یصحّ أی فی نفسه ویلغو الشرط. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۶۹.

(۲ و ۳) وفی الھندیة باب:۲۷ ج:۵ ص:۳۶۷ (طبع رشیدیه) ولو کان الدّین لمسلم علٰی مسلم فباع المسلم خمرًا وأخذ ثمنھا وقضاہ صاحب الدّین کرہ له أن یقبض ذٰلک من دَینه کذا فی السراج الوھاج.

وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ (طبع سعید) وجاز أخذ دَین علٰی کافر من ثمن خمر لصحة بیعه بخلاف دَین علی المسلم لبطلانه ..... بخلاف المسلم لعدم تقومھا فی حقه فبقی الثمن علٰی ملک المشتری.

وفی البحر الرّائق ج:۸ ص:۲۰۱ (طبع سعید) اذا کان لشخصٍ مسلم دَین علٰی مسلم فباع الّذی علیه الدّین خمرًا وأخذ ثمنھا وقضی الدّین لا یحلّ للمدین أن یأخذ ذٰلک بدینه ..... الخ.

وفی ملتقی الأبحر مع مجمع الأنھر کتاب الکراھیة، فصل فی البیع ج:۴ ص:۲۱۴ (طبع مکتبه غفاریه کوئٹه) ولو باع مسلم خمرًا وأوفٰی دَینه من ثمنھا کرہ لربّ الدّین أخذہ وان کان المدیون ذمّیًا لا یکرہ.

وکذا فی الدر المنتقٰی علٰی مجمع الأنھر ج:۴ ص:۲۱۴ (طبع غفاریه).

وفی الھدایة کتاب الکراھیة ج:۴ ص:۴۶۸ (طبع امدادیه ملتان).

وفی تبیین الحقائق، کتاب الکراھیة، فصل فی البیع ج:۷ ص:۶۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت). (محمد زبیر حق نواز)

والدین سے قرض لی گئی رقم والدین کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء میں تقسیم کرنا لازم ہے، اور والدین اور بہن بھائیوں پر خرچ کی گئی رقم ''قرض'' شمار ہوگی یا نہیں؟

سوال:- مکرمی و محترمی، السلام علیکم! براہِ کرم مندرجہ ذیل مسئلے کے متعلق جواب ارسال فرما کر مشکور فرمایئے۔ میری عمر اس وقت تقریباً ۷۰ سال ہے، میرے پانچ بھائی اور دو ہمشیرگان ہیں، قبلہ والد صاحب مرحوم گورنمنٹ ملازم تھے اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، ۱۹۳۵ء میں پنشن لے لی تھی، ۱۹۲۸ء سے میری صحت خراب ہوگئی تھی اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا، اور پریشان رہا کرتا تھا، جب والد صاحب ریٹائر ہوگئے تو میری پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا، کیونکہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی فکر تھی، لہٰذا تجارت کو میں نے اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہا تھا، جس کی والد صاحب نے رضامندی دے دی تھی اور میں نے دُکان داری شروع کردی تھی، والد صاحب ہمیشہ مذہبی خیال کے تھے اور تبلیغی کاموں میں دِلچسپی لیا کرتے تھے، پنشن کا بیشتر حصہ اس قسم کے کاموں میں خرچ ہوا کرتا تھا، لہٰذا اِخراجات کا بیشتر بار مجھ پر پڑا، اس وقت میرے ایک بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی بہن سب زیرِ تعلیم ہی تھے، دُکان میں تھوڑی سی پونجی لگی تھی، آمدنی کم اور اِخراجات بہت زیادہ تھے، دیگر چیزوں کو ملاکر پندرہ بیس افراد کا خرچ تھا، میں نے سوچا کہ اس طرح تو دُکان کا دیوالیہ نکل جائے گا، لہٰذا اہلیہ کا زیور فروخت کیا اور دیگر لوگوں سے قرض لے کر تجارت میں لگایا اور شب و روز محنت کی، ڈاکٹروں نے مجھے کہا کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کہیں نکل جاؤں، مگر گھر کے حالات اور بھائی بہنوں کی تعلیم کا خیال کرتے ہوئے میں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنی صحت کی بھی پروا نہیں کی، خداوند تعالیٰ نے فضل و کرم کیا اور سب بھائی بہن اپنی اپنی تعلیم مکمل کرچکے تھے اور برسرِ روزگار بھی ہوگئے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا، ہندوستان میں ہم سب ایک ہی جگہ رہتے تھے مگر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد شروع میں دو جگہ تقسیم ہوگئے تھے، چونکہ میرے پاس فلیٹ میں جگہ کم تھی اس لئے والدین مرحوم اور دیگر بھائی بہن دُوسرے بھائی کے ساتھ تھے، والدہ صاحبہ نے یہاں آنے کے بعد ہی حالات دیکھ کر مجھ سے اِخراجات دینے کی فرمائش کی، جس کی میں نے تعمیل کی، چونکہ یہاں تجارت کی ابتدا ہی تھی اور دو بھائیوں نے مجھے فریب دیا اس لئے میری مالی حالت جلد خراب ہوگئی اور میں مقروض ہوگیا، میں نے دُوسرے بھائیوں سے مدد طلب کی مگر بے سود، ''پڑھی نمازِ جنازہ بھی اپنی غیروں نے، مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے'' والدین سے ہی کچھ روپیہ بطورِ قرض لیا تھا، دُوسروں کا بھی ابھی تک

مقروض ہوں۔ ہندوستان میں میں نے نے بہت پریشانیاں اُٹھائیں اور پاکستان میں ان سے زیادہ ابھی تک اُٹھا رہا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں والد صاحب نے والدہ صاحبہ سے مشورہ کرکے مجھے ایک خط لکھ کر دیا تھا، جس میں لکھا ہے کہ یہ تمہاری جدوجہد و جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے بھائی بہن تعلیم حاصل کرسکے، ورنہ میری ذرا سی پنشن میں کیا ہوسکتا تھا، یہ سب خداوند تعالیٰ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ والد صاحب اکثر والدہ صاحبہ سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ عبدالقیوم کے ساتھ بہت بے انصافی ہوئی ہے اور نیز بہت ظلم ہوا ہے۔ والدین کا انتقال شروع میں ہوچکا ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ والدین سے جو رقم بطورِ قرض لی تھی مندرجہ بالا حالات میں اس کا کیا ہوگا؟ زکوٰۃ کا حساب کرنا ہے اس لئے براہِ کرم جلد از جلد جواب عنایت فرماکر مشکور وممنون فرمایئے گا۔

جواب:- آپ نے والدین سے جو رقم قرض لی تھی، اگر انہوں نے قرض زندگی میں معاف نہیں کیا تو اس کی ادائیگی آپ پر واجب ہے، جب بھی موقع ملے یہ رقم والدین کے ترکے میں شامل کرکے ان کے دُوسرے ترکے کی طرح اس کو اُن تمام ورثاء پر تقسیم کریں جن میں خود آپ بھی شامل ہوں گے، یعنی جتنا حصہ آپ کے حصے میں آئے وہ چھوڑ کر باقی رقم ان کے دُوسرے ورثاء تک پہنچانی ہوگی، اس سے پہلے آپ نے اپنے والدین یا بہن بھائیوں پر جو خرچ کیا، اگر اس وقت اس تصریح کے ساتھ کیا تھا کہ یہ آپ ان کو قرض دے رہے ہیں تب تو آپ ان سے واپس لے سکتے ہیں، لیکن اگر خرچ کرتے وقت یہ تصریح نہیں کی تھی تو وہ آپ کی طرف سے ہدیہ شمار ہوگا، جس کا آپ کو اِن شاء اللہ ثواب ملے گا، لیکن آپ واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۹/۹/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۰۸/۳۰ ج)

قرض کے لین دین میں تحریر اور گواہی کا اہتمام کرنا بہتر ہے ضروری نہیں

سوال ۱:- رشتہ داری ہونے کی صورت میں دُوسرے کو ایسی رقم دینا جس کی واپسی ضروری ہو، گواہوں کی موجودگی میں تحریر لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

۲:- گواہ موجود ہونے کی صورت میں بھی کسی کو ایسی رقم دی جائے جس کا واپس لینا ضروری ہو اور تحریر نہ لکھی جائے تو کیا رقم دینے والا گنہگار ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- قرض کے معاملے میں بہتر یہی ہے کہ تحریر لکھی جائے اور دو گواہ موجود ہوں،

قرآنِ کریم(۱) میں دیون کے سلسلے میں اسی طریقے کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن اگر اس کے بغیر بھی قرض دے دیا جائے تو کچھ گناہ نہیں ہے۔

۲:- نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۴/ ۲۸ ب)

حوالہ میں محتال لہٗ (قرض خواہ) کی رضامندی ضروری ہے اور قرض کے حوالہ اور مقاصہ کی ایک مخصوص صورت

سوال:- عرض اینکہ میں عبدالمجید ولد نور محمد مندرجہ ذیل بیان حلفیہ لکھواتا ہوں کہ میرا سودا سیکورٹی آفیسر شکیل احمد کے ساتھ ایک کوارٹر کے بارے میں مبلغ دس ہزار روپے میں ہوا تھا، کوارٹر کے سودے میں متفق ہوکر امان گل دُکان دار کے پاس آئے، امان گل کے سامنے شکیل احمد نے کہا کہ ہم نے کوارٹر آٹھ ہزار روپے میں لیا، دو ہزار منافع لوں گا، سودا اس طرح ہوا کہ دو ہزار روپے نقد دو، باقی ایک ہزار روپے ماہانہ قسط میں ادا کی جائے۔ اس پر امان گل دُکان دار نے کہا کہ میرا شکیل احمد کے اُوپر دُکان کا اُدھار پندرہ سو روپے ہے، باقی پانچ سو روپے میں نے امان دُکان دار سے قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے، بعد میں شکیل احمد کو کوارٹر کا قبضہ دینے کے لئے کہا کہ کوارٹر ہم کو دو، اور کوارٹر کے لئے کاغذات لکھ کر دو، میں اور شکیل احمد عدالت میں گئے، اور شکیل احمد نے دستاویز لکھ دی۔ بعد میں ہم نے پندرہ سو قرضہ لے کر شکیل احمد کو دیئے۔ جب کوارٹر پر قبضہ دینے چلا تو اصل مالک آگئے اور پتہ چلا کہ شکیل احمد نے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا، اس فراڈ کا کیس مکان کے مالک نے کیا، مجھے اور شکیل احمد کو تھانے میں بلایا گیا، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ شکیل احمد بہت فراڈی آدمی ہے، جعلی کام کئی دفعہ کرچکا ہے، میں شکیل احمد کو تھانے میں چھوڑ کر امان کے پاس گیا اور اُس کے فراڈ کی تمام حالت بیان کی، پھر ہم امان گل کو تھانے میں لے کر آئے، امان گل کو کہا کہ یہ شکیل احمد فراڈی آدمی ہے لہٰذا دُکان فروخت نہ ہوگی، پندرہ سو روپے ان سے لے لو، میں اب ان پیسوں کا ذمہ دار نہیں ہوں، اور ابھی شکیل احمد جو اَب موجود ہے ان سے وصول کرو، میری ذمہ داری ختم ہے، آپ جانو اور شکیل احمد جانے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے بعد شکیل احمد تین چار ماہ یہاں رہا، اب وہ چلا گیا۔ اس صورتِ حال کا شرعی حکم بیان فرمائیں۔

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ فی کلامہ المجید: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ" (سورۃ البقرۃ: ۲۸۲).

جواب:- اس معاملے کی حقیقت یہ ہوئی کہ عبدالمجید نے امان گل دُکان دار سے دو ہزار روپے شکیل احمد کو مکان کی قیمت میں ادا کرنے کے لئے قرض لئے، ان دو ہزار میں سے پانچ سو روپے نقد امان گل سے وصول کئے اور ڈیڑھ ہزار روپے کا شکیل احمد کے دَین سے مقاصہ کرلیا۔ بہرصورت! عبدالمجید پر اَمان گل کے دو ہزار روپے بطورِ قرض واجب ہوگئے، اس معاملے کا کوارٹر کی اس بیع سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو عبدالمجید اور شکیل احمد کے درمیان ہوئی، لہٰذا اس بیع کے ختم ہوجانے سے اس قرض پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ عبدالمجید پر واجب ہے کہ وہ امان گل کا پورا قرضہ دو ہزار روپے ادا کرے، اور شکیل احمد نے اس کے ساتھ جو دھوکا کیا ہے اس میں شکیل احمد کے خلاف چارہ جوئی کرکے اپنے دو ہزار روپے اس سے وصول کرے، شکیل احمد سے وصول کرنے کی ذمہ داری امان گل پر ڈالنا جبکہ امان گل نے اس کو بطورِ حوالہ قبول نہیں کیا، شرعاً دُرست نہیں ہے،(۱) امان گل، عبدالمجید سے دو ہزار روپے کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۸/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵۷/ ۳۹ و)

زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے مسجد کو قرض دینے کا حکم اور مسجد سے ایسا قرض اُتارنے کا طریقہ

سوال:- محترمی ومکرمی جناب مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بحوالہ جناب کا فتویٰ مؤرخہ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۴۱۷ھ جس کی کاپی منسلک ہے، مزید صورتِ حال کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ:

۱:- جناب کے فتویٰ کی نقل سابقہ کمیٹی کے جملہ ممبران کو اس استدعا کے ساتھ ارسال کی گئی کہ حسبِ فتویٰ فطرے کی رقم کی وصولی کے لئے بندوبست کریں اور موجودہ کمیٹی تعاون کے لئے حاضر ہے، جواباً مکمل خاموشی ہے۔

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الحواله ج:۵ ص:۳۴۱ (طبع سعید) الحوالة شرط لصحّتها رضا الکل بلا خلاف.
وفی الشامیة تحت (قوله رضا الکل)... أمّا رضا المحتال فلأنّ فیها انتقال حقّه الیٰ ذمّة أُخریٰ والذّمم متفاوتة .... الخ.
وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۲۴۷ (طبع سعید کراتشی) وتصح فی الدین لا فی العین .... برضا المحتال والمحال علیه لأن المحتال هو صاحب الحق وتختلف علیه الذمم فلا بدّ من رضاه لاختلاف الناس فی الایفاء.
وفی الهندیة ج:۳ ص:۲۹۵ و۲۹۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) وأما شرائطها فانواع .... وبعضها یرجع الی المحتال له .... وأما الذی یرجع الی المحتال له .... ومنه الرضا.
وفی البدائع ج:۶ ص:۱۶ (طبع سعید کراتشی) وأما الشرائط .... وبعضها یرجع الی المحال .... وأما الذی یرجع الی المحال علیه فأنواع .... ومنها الرضا.
وفی الهدایة کتاب الحوالة ج:۳ ص:۱۳۶ (طبع رحمانیه) وتصحّ الحوالة برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیه.

۲:- لوگوں کو یہ بخوبی علم ہے کہ مذکورہ رقم مسجد کے اِخراجات کے ساتھ بے جا عدالتی کارروائی پر خرچ ہوئی ہے، جس نے یہ اقدام کیا، وہی ذمہ دار ہے، قرض کی ادائیگی کے لئے چندہ دینے سے گریزاں ہیں، بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی، سات سال سے زیرِ تعمیر مسجد امریکا میں موجود اُمتِ مسلمہ کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے، اور ہماری بداعمالیوں کا مظہر بھی۔

۳:- موجودہ کمیٹی نے اپنے پہلے اجلاسِ عام میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ایک مد کی رقم دُوسری مد میں خرچ کرنے کی رسم ترک کرتی ہے، اس اُصول پر سختی سے کاربند بھی ہے۔

اب لوگوں نے جو چندہ تعمیرِ مسجد کے لئے دیا ہے اسی اعتماد پر دیا ہے کہ ان کی رقم تعمیرِ مسجد پر خرچ ہوگی، اگر یہ رقم قرض کی ادائیگی میں صَرف کی جاتی ہے تو چندہ دہندگان کے ساتھ وعدہ خلافی اور آئندہ کے لئے عدم اعتماد کا باعث بھی ہوسکتی ہے، جس کا انہیں سابق میں تجربہ بھی ہوچکا ہے۔ موصولہ رقم چیک، ڈرافٹ کے علاوہ نامعلوم مسلمانوں کی نقد رقم بھی ہے، جس کی واپسی یا قرض میں ادائیگی کی اجازت محال ہے، مندرجہ بالا حالات کے پیشِ نظر از رُوئے فتویٰ نہ تو فی الحال قرضِ مذکورہ کی ادائیگی ممکن نظر آرہی ہے اور نہ ہی تعمیرِ مسجد کے اِمکانات، ہر دو کام فی الوقت مفلوج ہیں۔ تعمیری کام کو جاری رکھتے ہوئے قرضِ مذکورہ کی طرف لوگوں کو توجہ دِلاتے رہیں تو اُمید ہے کہ اس مد میں بھی وہ ابتداء کریں گے، جبکہ وہ اپنی رقم جو تعمیر پر خرچ کرنے کے لئے دی ہے خرچ ہوتے دیکھ لیں تو اطمینان ہوجائے۔

دریافت طلب مسئلہ اب یہ ہے کہ:-

الف:- کیا از رُوئے شرع ایسا ممکن ہوسکتا ہے کہ تعمیرِ مسجد کی مد میں جمع شدہ رقم تعمیرِ مسجد ہی پر صَرف کی جائے، یعنی تعمیرِ مسجد کو آگے بڑھایا جائے، اور کام کی اَبتداء کی جائے جو رُکی ہوئی ہے؟

ب:- دریں اثناء قرض، فطرہ کی مد میں جو رقم وصول ہو اسی مد میں خرچ کی جائے۔ بینوا توجروا!

جواب:- زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے کسی ایسی مد کے لئے قرض لینا جائز نہیں جس کی وصول یابی یقینی نہ ہو، مسجد کے چندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس کی وصول یابی یقینی نہیں، لہٰذا مسجد کو قرض دینا پہلی انتظامیہ کے لئے جائز نہیں تھا، لیکن اب جبکہ یہ رقم مسجد کے ذمے قرض ہوچکی ہے تو مسجد کے چندے سے اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور پہلی انتظامیہ ہی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ لوگوں سے مسجد کا قرض اُتارنے کے لئے چندہ کرے، اور اسے زکوٰۃ اور فطرے کے مستحقین پر خرچ کرے۔ مسجد کی نئی انتظامیہ کو بھی اس میں تعاون کرنا چاہئے، اور بہتر یہ ہے کہ دونوں انتظامیہ مل جل کر مسجد کے لئے چندہ فراہم کریں، تاکہ مسجد کا قرض اُتر جائے۔ چونکہ قرض کی رقم سے مسجد کے اِخراجات پورے کئے گئے تھے اس لئے جو لوگ مسجد میں قرض اُتارنے کے لئے چندہ دیں گے اِن شاء اللہ انہیں مسجد ہی کو

چندہ دینے کا ثواب ملے گا۔ جب تک یہ قرض ادا نہ ہو مسجد کی مزید تعمیر روک دینی چاہئے، اور قرض ادا کرنے کے بعد تعمیر شروع کرنی چاہئے، البتہ اس مسجد میں نماز پڑھنا بلاشبہ جائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۹ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۷۰/۲۴۷)

۱:- راشی سے لئے ہوئے قرضے کی عدم واپسی کا حکم
۲:- بینک کی سودی رقم سے قرض ادا کرنے کا حکم

سوال ۱:- (خلاصۂ سوال) ایک افسر کا رِشوت کا روپیہ کسی شخص پر قرض ہے، اگر مقروض اس افسر کا قرضہ ادا نہ کرے جس طرح کہ سود کا روپیہ دینا ضروری نہیں ہے، اسی طرح رِشوت سے کمائے ہوئے روپے کا قرضہ نہ دیا جائے، کیا گناہ ہوگا؟ توبہ کی تو ضرورت نہیں ہے؟

سوال ۲:- اگر بینک سے سود لے کر کسی شخص کا قرضہ ادا کردیا جائے یا کہ جو قرضہ بلاسود ہے اس بلاسود قرضے کو بینک سے سود لے کر ادا کردیا جائے؟

جواب ۱:- رِشوت کا معاملہ کرنا ہی سرے سے ناجائز تھا، اس گناہ پر اِستغفار کرنا چاہئے[1]، پھر اگر ابھی تک وہ روپیہ اس نے رِشوت خور اَفسر کو نہیں دیا ہے تو وہ اسے اپنے پاس ہی رکھ سکتا ہے، لیکن معاملۂ رِشوت پر توبہ اِستغفار کرنا چاہئے، اور اگر اَفسر نے رِشوت کی رقم کسی دُوسرے سے وصول کر کے قرض دیا ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

جواب ۲:- جس شخص کا قرضہ ادا کیا جارہا ہے اگر وہ مستحقِ صدقہ ہے (خواہ قرض ہی کی وجہ سے ہو) تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے کہ سود کی رقم اس کو دے دی جائے پھر وہ اپنا قرض ادا کردے، مگر خود اپنا دُوسرا قرضہ اس سے ادا کرنا جائز نہیں، اور بہرصورت بہتر یہی ہے کہ بینک سے سود لیا ہی نہ جائے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق اِلٰہی بلندشہری

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۲۵/۱۸ الف)

---

(۱) فی المشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاء ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) "عن عبداللہ بن عمرو قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی."

سودی قرضہ لے کر کاروبار کرنے کا حکم

سوال ۱:- عرصہ سولہ سال سے میں ایک کمپنی میں بحیثیت تقسیم کار کے کاروبار کرتا ہوں، گزشتہ سال تک تو سرمایہ کافی تھا مگر اب کام کی خرابی کی وجہ سے سرمایہ بالکل قلیل ہے، شرکاء نے مجبوری سے بینک سے بذریعہ اوور ڈرافٹ روپیہ لینا شروع کیا جس کا سود بھی دینا پڑتا ہے، ایسے کام کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

۲- مندرجہ بالا کاروبار کسی حیلے سے جائز ہوسکتا ہے؟

۳- اگر مندرجہ بالا کاروبار ناجائز ہے تو ہم اپنی حلال کمائی کیسے الگ کریں؟

۴- اِستغفار اور توبہ سے یہ گناہ معاف ہوجائے گا؟

جواب ۱ و ۲:- سود پر قرض لے کر کاروبار کرنا بالکل حرام ہے، اس سے بہرصورت بچنا ضروری ہے،(۱) اب راستہ یہ ہے کہ آئندہ کے لئے سودی قرضہ نہ لینے کا عزم کر کے اپنے گناہوں پر توبہ و اِستغفار کیا جائے، اور آئندہ کاروبار چلانے کے لئے سود پر قرض لینے کے بجائے کسی صاحبِ ثروت شخص کو کاروبار میں شریک کرلیا جائے۔

۳- سود پر قرض لینے کا معاملہ ناجائز وحرام ہے،(۲) لیکن چونکہ آمدنی میں کوئی سود کی رقم شامل نہیں ہے اس لئے توبہ اِستغفار کے بعد اس آمدنی کو اِستعمال کیا جاسکتا ہے۔(۳)

۴- توبہ و اِستغفار خلوصِ دِل کے ساتھ اور اس کے آداب و شرائط کو ملحوظ رکھ کر کی جائے تو ہر گناہ کی مغفرت کی اُمید ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۱۲/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

کسی کا مقروض سے رقم لے کر اس کے قرض خواہ کو دینے سے قرض کی ادائیگی کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- حاجی اِمام بخش کی سالی کے لڑکے کا لڑکا اللہ ڈنو اور حاجی اِمام بخش کے بھانجے

(۱ و ۲) فی الشامیة ج:۵ ص:۱۶۶ کتاب البیوع، کل قرض جر نفعًا .... الخ فھو حرام. کذا فی الأشباہ والنظائر، الفن الثانی ص:۲۵۷ (طبع قدیمی). کذا فی تکملة فتح الملھم ج:۱ ص:۵۷۵ کتاب المساقات (طبع دار العلوم). نیز دیکھئے ص:۲۷۸ کا حاشیہ۔

(۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبر ۱۔

سوڈھو، غلام قادر ہے، یہ سب اہلِ معاملہ ہیں، واقعے کی تفصیل یہ ہے:-

اللہ ڈنو نے غلام قادر سے ایک بوری گندم قیمتاً حاصل کی، اللہ ڈنو نے سوڈھو سے ایک عدد ریڈیو حاصل کیا، مگر مذکورہ بالا دونوں اشیاء کی قیمت ادا نہیں کی۔ کچھ عرصہ بعد اللہ ڈنو نے بھینس فروخت کی تو غلام قادر نے بزرگ ہونے کی حیثیت سے حاجی اِمام بخش سے کہا کہ: ''اللہ ڈنو کے پاس پیسے ہیں، ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے، اس لئے ہمیں پیسے دِلا دیں، آپ کہیں گے تو وہ ہمیں پیسے دیدے گا ویسے نہیں دے گا۔'' غلام قادر کے دِل میں یہ بات تھی کہ اگر اللہ ڈنو پیسے دے گا تو ہم ریڈیو اور گندم میں قطع کرلیں۔

حاجی اِمام بخش نے اللہ ڈنو سے کہا کہ: ''کیا تمہارے پاس پیسے ہیں؟'' اللہ ڈنو نے جواب دیا: ''ہاں! پیسے ہیں'' حاجی اِمام بخش نے کہا کہ: ''دوسو روپے مجھے دے دو'' اللہ ڈنو نے اِمام بخش کو دو صد روپے دیئے جو اِمام بخش نے اپنے بھانجے غلام قادر کو اُسی وقت دے دیئے۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی اِمام بخش اور بھانجوں مذکورہ بالا کے درمیان ناراضگی ہوگئی، ادھر اللہ ڈنو اور مذکورہ بالا دونوں بھانجوں میں دوستی بڑھ گئی۔ ایک فیصلے میں غلام قادر نے حاجی اِمام بخش سے کہا کہ: ''آپ نے جو اللہ ڈنو سے دوصد روپے لئے تھے وہ ادا کریں'' اس پر حاجی اِمام بخش نے کہا کہ: ''وہ روپے تو لے کر میں نے تم کو دے دیئے تھے، تم جانو اور وہ جانے، تم دونوں دوست ہو۔'' لیکن غلام قادر نے دوصد روپے کی وصولی سے قطعی انکار کردیا، حاجی اِمام بخش نے غلام قادر کے بڑے بھائی سوڈھو سے کہا کہ: ''میں نے دوصد روپے اللہ ڈنو سے لے کر غلام قادر کو دیئے تھے، اس میں سے ایک صد روپے غلام قادر نے آپ کو بعوض ریڈیو ادا کئے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟'' سوڈھو نے اقرار کیا کہ غلام قادر نے ریڈیو کے عوض ایک صد روپیہ دیا ہے، مگر غلام قادر نے انکار کیا کہ میں نے سوڈھو کو اپنی طرف سے ایک صد روپے دیئے۔ ایک فیصلہ کنندہ نے یہ بیانات سن کر کہا کہ: ''تم کو پیسے ملے ہیں، تم جھوٹے ہو'' دُوسرے فیصلہ کنندہ کا یہ اصرار ہے کہ: ''اِمام بخش نے اللہ ڈنو سے غلام قادر شاہد کے رُوبرو پیسے لئے ہیں، لہٰذا تم دو صد روپے بھرو۔'' اس مضمون پر غور فرما کر شریعت کا فیصلہ صادر فرمائیں۔

جواب:- اگر حاجی اِمام بخش نے اللہ ڈنو کو یہ بتا کر روپیہ لیا تھا یا بعد میں بتادیا تھا کہ اس روپے کے ذریعے غلام قادر کی واجب الادا رقم جو تمہارے ذمے تھی تمہاری طرف سے ادا کردی ہے، اور غلام قادر نے واقعۃً وہ رقم وصول کرلی ہے تو حاجی اِمام بخش پر کوئی تاوان نہیں آتا۔ اور غلام قادر کے انکار کا حل یہ ہے کہ حاجی اِمام بخش اس بات پر گواہ پیش کرے کہ اُس نے غلام قادر کو روپیہ دیا ہے، اگر

دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس کے حق میں گواہی دیں تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا، اور اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو غلام قادر اللہ کی قسم کھائے کہ میں نے حاجی اِمام بخش سے مذکورہ روپیہ نہیں لیا، اگر وہ یہ قسم کھانے سے انکار کرے تب بھی حاجی اِمام بخش کے حق میں فیصلہ ہوگا، اور اگر قسم کھالے تو غلام قادر کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا،[1] اور حاجی اِمام بخش کو یہ روپے بھرنے پڑیں گے، لیکن اگر غلام قادر نے جھوٹی قسم کھائی تو اس پر دُنیا و آخرت میں سخت وبال کا اندیشہ ہے،[2] لہٰذا وہ اپنی موت و آخرت کو دیکھ کر کام کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷/۲۸ الف)

قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا شرعی حکم نیز حج اور عمرہ کی ادائیگی کے لئے قرض لینے کا حکم

سوال:- آج کل قرض لینے اور اُدھار یا قسطوں پر خریداری کا بہت رَواج ہوگیا ہے، سوال یہ ہے کہ قسطوں پر قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز حج اور عمرہ ادا کرنے کے لئے قرض لینے یا اُدھار معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- سود کے بغیر قرض لینا اگرچہ جائز ہے، جبکہ ادائیگی کی نیت پکی ہو، لیکن احادیث شریفہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہو، حتی الامکان اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اس ناپسندیدگی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو فی الصلاۃ ویقول اللّٰھم انّی أعوذ بک من المأثم والمغرم، فقال لہ قائل: ما أکثر ما تستعیذ یا رسول اللہ من المغرم، قال: ان الرجل اذا غرم حدث فکذب ووعد فأخلف.

(صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب من استعاذ من الدین ۲۳۹۷، طبع: دارالسلام)

---

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح، باب الأقضیۃ والشھادات ج:۲ ص:۳۳۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدّہٖ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "البیّنۃ علی المدعی والیمین علی المدّعیٰ علیہ." رواہ الترمذی ج:۱ ص:۳۸۱ (طبع مکتبہ رحمانیہ).

(۲) فی صحیح المسلمؒ ج:۲ ص:۳۲۶ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "علیکم بالصّدق! فان الصّدق یھدی الی البر، وان البر یھدی الی الجنّۃ .... وایاکم والکذب! فان الکذب یھدی الی الفجور، وان الفجور یھدی الی النار ...."اھ (رقم الحدیث: ۶۷۲۱، باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضلہ).

ترجمہ:- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دُعا فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے: یا اللہ! میں گناہ سے اور مقروض بننے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تو کسی کہنے والے نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ بکثرت قرض سے کیوں پناہ مانگتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب کوئی شخص مقروض بن جاتا ہے تو بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اور وعدہ کرتا ہے تو اُس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اور روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی ایسے صاحب کا جنازہ لایا جاتا جن کا اِنتقال مقروض ہونے کی حالت میں ہی ہوگیا ہو، اور ان کے ترکے میں اتنا مال نہ ہو جس سے اُن کا قرض ادا کیا جاسکے تو آپ اُس پر بذاتِ خود نمازِ جنازہ پڑھانے کے بجائے دُوسرے صحابہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یؤتی بالرجل المتوفی علیه الدین، فیسأل: هل ترک لدینه فضلا؟ فان حُدِّث أنه ترک لدینه وفاء صلّی، والّا قال للمسلمین: صلوا علٰی صاحبکم.

(صحیح البخاری، کتاب الکفالة حدیث:۲۲۹۸)(۱)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے ایک ایسے ہی جنازے کی نماز پڑھانے سے اِنکار فرمادیا، لیکن جب ایک صحابی (حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اِعلان فرمایا کہ میں ان کا پورا قرض اُتارنے کا ذمہ لیتا ہوں، تب آپ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

أن النبی صلی اللہ علیه وسلم أُتی بجنازة لیصلی علیها، فقال: هل علیه من دین؟ قالوا: لا، فصلی علیه، ثم أُتی بجنازة أُخریٰ، فقال: هل علیه من دین؟ قالوا: نعم، قال: فصلوا علٰی صاحبکم. قال أبوقتادة: علیّ دینه یا رسول اللہ! فصلی علیه. (أیضًا حدیث:۲۲۹۵)(۲)

مستدرک حاکم میں اس پر یہ اِضافہ ہے کہ جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کا قرض ادا کردیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الآن بردت علیه جلدته" (رواہ الحاکم فی

(۱) ج:۱ ص:۳۰۸ (طبع سعید).
(۲) الصحیح للبخاری ج:۱ ص:۳۰۶ (طبع سعید).

کتاب البیوع، حدیث: ۲۳۴۶، وقال: صحیح، وأقره علیه الذهبی، طبع: دار الکتب العلمیة)۔

نیز حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

لا تخیفوا أنفسکم بعد أمنها، قالوا: وما ذاک یا رسول اللہ؟ قال: الدین.

(مسند أحمد، مسند عقبة بن عامر رضی اللہ عنه، حدیث: ۱۷۳۲۰، طبع: مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- تم اپنے آپ کو اَمن حاصل کرنے کے بعد خوف میں مبتلا نہ کرو۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ خوف کی بات کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مقروض بننا۔

ان تمام روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مدیون یا مقروض بننا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اسی لئے فقہائے کرامؒ نے فرمایا ہے کہ اپنے اُوپر قرض کا بوجھ کسی حقیقی حاجت کی وجہ ہی سے لینا چاہئے، اس کے بغیر نہیں۔

البتہ بعض صحابہؓ سے ایسی روایتیں بھی منقول ہیں کہ وہ مقروض یا مدیون بننے کو پسند کرتے تھے، مثلاً حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:

کانت میمونة تدّان فتکثر، فقال لها أهلها فی ذٰلک ولاموها ووجدوا علیها، فقالت: لا أترک الدین، وقد سمعت خلیلی وصفیّی صلی اللہ علیه وسلم یقول: ما من أحد یدّان دینا فعلم اللہ عزّ وجلّ أنه یرید قضاءهٗ اِلّا أدّاه اللہ عنه فی الدنیا.

(السنن الکبریٰ للنسائی، کتاب البیوع، حدیث: ۶۲۸۵)[1]

ترجمہ:- حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اُدھار لیا کرتی تھیں، اور بہت لیتی تھیں، چنانچہ اُن کے گھر والوں نے اُن سے بات کی، اور انہیں ملامت کی، اور ناراضگی کا اِظہار کیا۔ اس پر حضرت میمونہؓ نے فرمایا: میں اُدھار لینا نہیں چھوڑ سکتی، جبکہ میں نے اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو شخص بھی کوئی ایسا اُدھار لیتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اُس کا اِرادہ اُس اُدھار کو اَدا کرنے کا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف سے دُنیا ہی میں ادائیگی فرما دیتے ہیں۔''

یہی حدیث اِمام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کی ہے، اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

عن میمونة أنها کانت تداین، فقیل لها: انک تداینین فتکثرین وأنت

---

(۱) طبع مکتبة الحسن.

موسرة ؟ فقالت: انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من اذان دینا ینوی قضاءه کان معه عون من الله علیٰ ذٰلک، فأنا ألتمس ذٰلک العون. (السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی جواز الاستقراض وحسن النیة، ج:۵ ص:۳۵۴، طبع: شرح السنة ملتان)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مالی اِعتبار سے خوش حال ہونے کے باوجود اُدھار کا معاملہ کرتی تھیں، اور اُسے حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا وسیلہ قرار دیتی تھیں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ:

أنها کانت تداین فقیل لها: ما لک والدین، ولیس عندک قضاء؟ فقالت: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ما من عبد کانت له نیة فی أداء دینه إلّا کان له من الله عون، فأنا ألتمس ذٰلک العون.

(السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب البیوع، ج:۵ ص:۳۵۴ طبع شرح السنة ملتان)

ترجمہ:- وہ اُدھار لیا کرتی تھیں، تو ان سے کہا گیا کہ: آپ کیوں اُدھار لیتی ہیں جبکہ آپ کے پاس ادائیگی کا اِنتظام نہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جس بندے کی بھی یہ نیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا قرض ادا کرے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مدد ہوتی ہے، اس لئے میں وہ مدد تلاش کرتی ہوں۔

اور اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی مزید تفصیل اس طرح ذکر فرمائی ہے:

کان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه اذا صلی الصبح یمر علیٰ أبواب أزواج النبی صلی الله علیه وسلم فرأی علیٰ باب عائشة رجلًا جالسا فقال: ما لی أراک جالسا هٰهنا؟ قال: دین لی أطلب به أمّ المؤمنین، فبعث الیها عمر: یا أم المؤمنین! أما لک فی سبعة آلاف درهم أبعث بها الیک فی کل سنة کفایة؟" فقالت: بلیٰ! ولٰکن علینا فیها حقوق وقد سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول: من اذان دینا ینوی قضاءه کان معه من الله عزّ وجلّ حارس، فأنا أحب أن یکون معی من الله عزّ وجلّ حارس.

(شرح مشکل الآثار للطحاوی، حدیث: ۴۲۸۹ طبع مؤسسة الرسالة)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے دروازوں کے پاس سے گزرا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے پر ایک شخص کو بیٹھا دیکھا، تو اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ تم مجھے یہاں بیٹھے نظر آرہے ہو؟ اُس نے کہا کہ: میرا قرض ہے جو میں اُمّ المؤمنین سے مانگنے آیا ہوں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ: ''اُمّ المؤمنین! میں جو ہر سال سات ہزار درہم آپ کے پاس بھیجتا ہوں، کیا وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہوتے؟'' حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: ''بے شک کافی ہوتے ہیں، لیکن ہم پر ان میں بہت سے حقوق ہیں، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''جو شخص بھی ایسا اُدھار لے جس کی ادائیگی کا وہ اِرادہ رکھتا ہو، تو اللہ کی طرف سے اُس کے لئے ایک حفاظت کرنے والا مقرّر کردیا جاتا ہے'' لہٰذا میں یہ پسند کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حفاظت کرنے والا میرے ساتھ رہے۔''

ان احادیث وآثار سے اُدھار لینے کی جو بظاہر پسندیدگی نظر آرہی ہے، وہ اُن احادیث سے متعارض معلوم ہوتی ہے جو اُوپر ذِکر کی گئی ہیں، اس ظاہری تعارض کو حل کرنے کے لئے اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناجائز اور مذموم اُدھار وہ ہے جس میں انسان اُس کی ادائیگی سے غافل ہوجائے، اور غفلت میں پڑا رہنے کی وجہ سے وہ قرض اُس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اُس کا خوف اُس پر مسلط ہوجائے۔ چنانچہ وہ یہ حدیث روایت فرماتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الغفلة فی ثلاث: الغفلة عن ذکر اللہ عزّ وجلّ، ومن لدن أن یصلی صلاة الصبح حتی تطلع الشمس، وأن یغفل الرجل عن نفسه فی الدین حتی یرکبه. (شرح مشکل الآثار للطحاوی حدیث:۴۲۸۵)(۱)

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث: ''لا تخیفوا أنفسکم'' روایت کرنے کے بعد اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فتأملنا هذا الحدیث لنقف علی المراد به ما هو ان شاء اللہ فوجدنا النهی

(۱) طبع مؤسسة الرسالة.

الـذی فیه مقصودا به الٰی اخافة الأنفس بالدیون وکان معقولًا أنه لا یخیف الأنـفـس الا مـا غـلـب عـلیها حتی صارت بذٰلک خائفة منه وکان ذٰلک کمثل ما قد روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم غیر هٰذا الحدیث.

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کر کے اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وکان ما کان من الدیون التی لا ترکب من هی علیه العمل فی خلاصه منها وبراءتـه مـنهـا الٰی أهلها بخلاف الدیون التی یغفل من هی علیه عن براءته مـنهـا والـخـروج منها الٰی أهلها فمن کان من أهل هٰذه المنزلة الثانیة کان مـذمـومًـا وکـان مـخیـفًـا لنفسه من الدین الذی علیه سوء العاقبة فی الدنیا بسـوء الـمـطالبة وفی الآخرة بما هو أغلظ من ذٰلک فأما ما کان من الدین الـذی هو علیه علی الحال الأول من هاتین الحالتین فغیر خائف علٰی نفسه مـا یـخـافه علٰی نفسه من کان علی الحال الأخریٰ فی الدین الذی علیه بل مـن کـان عـلـی الـحال المحمودة من هاتین الحالتین فی الدین الذی علیه مـرجوا له الثواب فیما هو علیه من ذٰلک والعون من اللہ عزّ وجلّ ایاه علٰی مـا هـو عـلیـه فیـه کما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیه. (شرح مشکل الآثار للطحاوی، باب:٦٦٤، ج:١١ ص:٦٧ الی ٦٩ طبع مؤسسة الرسالة)

اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تطبیق کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان غفلت کی حالت میں کوئی قرض اپنے ذمہ لے، اور اُس کی ادائیگی کا اہتمام نہ ہو تو یہ ناجائز اور مذموم ہے، اور حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے واقعات اس غفلت والے دَین میں داخل نہیں، بلکہ وہ چونکہ ادائیگی کا اِرادہ رکھتی تھیں، اور اس کے اسباب بھی اُن کے پاس موجود تھے، اس لئے اُن کا مدیون بننا جائز تھا، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ اُدھار کسی حاجت ہی کی وجہ سے لیا ہوگا، اس لئے اِمام طحاویؒ نے اُس کو ذِکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور چونکہ ان کی نیت اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کی تھی، اس لئے نہ صرف یہ کہ اُس میں کوئی کراہت نہیں تھی، بلکہ وہ موجبِ ثواب بھی تھا، لیکن ہر شخص اپنے آپ کو اُمہات المؤمنینؓ پر قیاس نہیں کرسکتا، جب کوئی مقروض بنتا ہے تو جس غفلت، خوف اور دُوسرے مذموم حالات کا ذِکر اَحادیث میں آیا ہے، اُن کا اِحتمال رہتا ہی ہے، اس لئے فقہائے کرام نے اِستقراض کے جواز کو حاجت کے ساتھ مشروط فرمایا ہے، جس کا مأخذ وہ حدیث ہے جس میں قرض دینے

کو صدقہ سے افضل قرار دِیا گیا ہے، اُس میں الفاظ یہ ہیں کہ:

فقلت: یا جبریل! ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: ان السائل قد یسئل وعنده والمستقرض لا یستقرض اِلّا من حاجة.

(سنن ابن ماجة، أبواب الصدقات، حدیث: ۲۴۳۱ طبع دار السلام)

یہ حدیث اگرچہ ایک راوی خالد بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے، (کما فی مصباح الزجاجہ) لیکن اتنی بات کہ مستقرض کو کسی حاجت ہی کی وجہ سے قرض لینا چاہئے، احادیث کے مجموعی مزاج سے بھی واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے حاجت کے وقت بھی جواز کے لئے "لا بأس" کی تعبیر اِختیار کی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں فرمایا گیا ہے:

لا بأس بأن یستدین الرجل اذا کانت له حاجة لا بد منها، وهو یرید قضاءها. (عالمگیریة، کتاب الکراهیة ج:۵ ص:۳۶۶)[1]

البتہ حاجت میں دُنیوی اور دِینی دونوں طرح کی حاجتیں داخل ہیں، اور ان کے تعین میں اِختلافِ رائے بھی ممکن ہے۔ اُمہات المؤمنینؓ کا جو عمل اُوپر ذِکر کیا گیا ہے، اُس میں یہ بات واضح ہے کہ اُن کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات کے لئے قرض لینے کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ اُن کا سال بھر کا نفقہ اُنہیں مل جایا کرتا تھا، حضرت عائشہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مذکورہ بالا سوال وجواب میں اس کی تصریح ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ اِعتراف بھی اُس روایت میں موجود ہے کہ اُن کو دِیا جانے والا سالانہ نفقہ اُن کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن انہوں نے کچھ دُوسرے حقوق کا ذِکر فرمایا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ عمل متعدّد روایات سے ثابت ہے کہ وہ بکثرت صدقات وخیرات کیا کرتی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

وکانت لا تمسک شیئًا مما جاءها من رزق الله اِلّا تصدقت.

(صحیح البخاری، مناقب قریش، حدیث: ۳۵۰۵)[2]

لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ اُنہیں قرض لینے کی ضرورت صدقات وخیرات کی وجہ سے پیش آتی تھی، اور اُن کا مزاج یہ تھا کہ کسی ضرورت مند کو اُس کی ضرورت پوری کئے بغیر واپس کرنا اُنہیں گوارا نہیں تھا، چاہے اس کے لئے خود تنگی گوارا کرنی پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دِینی اور دُنیاوی دونوں قسم کی

---

(۱) طبع رشیدیہ وبلوچستان بک ڈپو.

(۲) الصحیح للبخاری ج۱ ص:۴۹۷ (طبع سعید).

حاجتوں میں قرض لینے کی گنجائش ہے۔

احادیث مذکورہ بالا، صحابہؓ کے آثار اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں مندرجہ ذیل اَحکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱- اگر قرض لیتے وقت ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو تو ایسا قرض لینا حرام ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: **"ولو استدان دينا وقصد أن لا يقضيه فهو آكل السحت"**۔[1]

۲- اگر کسی دِینی یا دُنیوی حاجت کے لئے قرض لیا جائے، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو، اور ادائیگی کے ظاہری اسباب بھی موجود ہوں تو ایسا قرض لینا بلاکراہت جائز ہے۔

۳- اگر قرض کسی حاجت کے واسطے لیا جارہا ہو، اور لیتے وقت ادائیگی کی نیت تو ہو، لیکن ادائیگی کے اسباب موجود نہ ہوں، تو ایسا قرض لینا عام حالات میں مکروہ ہے، اِلَّا یہ کہ ضرورت کے درجے تک پہنچ جائے۔

۴- قرض لینے کی کوئی حقیقی دِینی و دُنیوی حاجت ہی نہ ہو، خواہ ادائیگی کی نیت اور اسباب بھی موجود ہوں، تو اُس صورت میں قرض لینا کم ازکم مکروہ ضرور ہے۔

ان اُصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے آج کل اُدھار پر چیزیں خریدنے کا جو عام رُجحان پیدا ہوگیا ہے، اُس میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اُدھار خریدی جارہی ہے، کیا اُس کی واقعی حاجت ہے؟ اگر واقعی کوئی ایسی حاجت کی چیز ہو جو ایک متوسط زندگی گزارنے کے لئے عرفاً ضروری سمجھی جاتی ہو، مثلاً وہ گھریلو سامان جو متوسط درجے کے آدمی کے گھر میں ہوتا ہی ہے، تو بے شک اُدھار یا قسطوں پر خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ قرض کی ادائیگی کی نیت اور اُمید بھی ہو، لیکن صرف اشیائے تعیش کی خریداری کے لئے اپنے آپ کو مقروض بنانا کراہت سے خالی نہیں۔

جہاں تک دِینی حاجتوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں فقہائے کرامؒ نے اس مسئلے پر بحث فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ یا حج فرض ہوگیا ہو، اور اُن کی ادائیگی کے لئے اُس کے پاس مال نہ ہو تو کیا وہ قرض لے کر حج یا زکوٰۃ ادا کرے؟

اس سلسلے میں ایک اثر حضرت طارق بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

سمعت ابن أبي أوفىٰ يُسئل عن الرجل يستقرض ويحج، قال:

---

(۱) ج:۵ ص:۳۶۶ (طبع بلوچستان بک ڈپو، ورشیدیه).

یسترزق الله، ولا یستقرض. قال: وکنا نقول: لا یستقرض إلّا أن یکون له وفاء.

(السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الحج، باب الاستسلاف للحج ج:۴ ص:۳۳۳)[۱]

(واضح رہے کہ معرفۃ السنن والآثار (کتاب الحج، حدیث:۲۶۶۴)[۲] اور کتاب الأم (کتاب الحج ج:۵ ص:۳۵)[۳] میں یہ حدیث جس طرح نقل کی گئی ہے، اُس سے اس کے مرفوع ہونے کا شبہ ہوتا ہے، لیکن بظاہر سنن کبریٰ کی اس روایت سے اس کا حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہونا زیادہ واضح ہے)

لیکن فقہائے کرامؒ کی تصریحات کی روشنی میں اس کا مطلب وجوبِ استقراض کی نفی ہے، جواز کی نفی نہیں۔ چنانچہ حضرت اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومن لم یکن فی ماله سعة یحج بها من غیر أن یستقرض فهو لا یجد السبیل، ولٰکن اذا کان ذا عرض کثیر فعلیه أن یبیع بعض عرضه أو الاستدانة فیه حتی یحج. (کتاب الأم للشافعی ج:۵ ص:۳۵ طبع: دار قتیبة)

اور حنفیہ میں سے اِمام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت تو یہ منقول ہے کہ اُس پر واجب ہے کہ قرض لے، لیکن دُوسرے فقہاء نے فرمایا ہے کہ واجب تو نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا غالب گمان یہ ہے کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کردے گا تو اُس کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ قرض لے کر فرض زکوٰۃ یا حج ادا کردے، لیکن اگر غالب گمان یہ ہو کہ ادائیگی کی نیت کے باوجود وہ قرض ادا نہیں کرسکے گا تو افضل یہ ہے کہ قرض نہ لے، چنانچہ درمختار میں ہے:

وقالوا: لو لم یحج حتّی أتلف ماله وسعه أن یستقرض ویحج ولو غیر قادر علٰی وفاءه، ویرجی أن لا یؤاخذه الله بذٰلک، أی لو ناویا وفاء اذا قدر کما قیده فی الظهیریة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"قوله وسعه أن یستقرض الخ" أی جاز له ذٰلک، وقیل: یلزمه الاستقراض کما فی لباب المناسک، قال مُلّا علی القاری فی شرحه علیه: وهو روایة عن أبی یوسف، وضعفه ظاهر، فان تحمل حقوق الله تعالٰی أخف من ثقل حقوق العباد، انتهٰی. قلت: وهٰذا یرد علی القول الأوّل أیضًا ان کان

(۱) ص:۵۴۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).
(۲) باب الاستسلاف للحج ج:۷ ص:۳۶۳ (طبع موقع جامع الحدیث).
(۳) باب الاستسلاف للحج ج:۲ ص:۱۱۶ (طبع دار المعارف).

المراد بقوله "ولو غير قادر علىٰ وفاءه" أن يعلم أنه ليس له جهة وفاء أصلا، أما لو علم أنه غير قادر في الحال وغلب علىٰ ظنه أنه لو اجتهد قدر على الوفاء فلا يرد، والظاهر أن هٰذا هو المراد أخذا مما ذكره في الظهيرية أيضًا في الزكٰوة حيث قال: ان لم يكن عنده مال وأراد أن يستقرض لأداء الزكٰوة فان كان في أكبر رأيه أنه اذا اجتهد بقضاء دينه قدر، كان الأفضل أن يستقرض، فان استقرض وأدى ولم يقدر علىٰ قضاءه حتى مات، يرجى أن يقضي الله تبارك وتعالىٰ دينه في الآخرة. وان كان أكبر رأيه أنه لو استقرض لا يقدر علىٰ قضاءه، كان الأفضل له عدمه، انتهى. واذا كان هٰذا في الزكٰوة المتعلق بها حق الفقراء، ففي الحج أولىٰ.

(رد المحتار، كتاب الحج ج:۲ ص:۴۵۷ و۴۵۸ طبع: ایچ ایم سعید)

یہ ساری بحث حجِ فرض سے متعلق تھی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر حج فرض ہو چکا ہو، اور کسی کے پاس ادائیگی کا اِنتظام نہ ہو، تو اُس کے لئے نہ صرف یہ کہ قرض لینا بلاکراہت جائز ہے، بلکہ اگر اُس کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کردے گا تو قرض لینا افضل ہے۔

عمرے کا معاملہ یہ ہے کہ مذہب میں راجح یہ ہے کہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، اور اُس کے بعد مستحب ہے، چنانچہ درمختار میں ہے:

والعمرة في العمر مرة سُنّة مؤكدة على المذهب وصحح في الجوهرة وجوبها. (شامی ج:۲ ص:۴۷۲)(۱)

چونکہ عمرہ واجب نہیں ہے، اس لئے اگر کسی شخص کے پاس ادائیگی کا فوری اِنتظام نہ ہو تو اُس کے لئے عمرے کی خاطر قرض لینا بظاہر مکروہ ہوگا، اور اگر فوری طور پر رقم کا اِنتظام نہیں ہے، لیکن اُس کے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے اُمید ہے کہ عنقریب اتنی رقم کا اِنتظام ہوجائے گا جو عمرے کے اِخراجات کے لئے کافی ہو تو اُس کے لئے بھی افضل یہ ہے کہ وہ اِنتظار کرے، اور قرض لینے کے بجائے اُس وقت عمرہ کرے جب اِنتظام ہوجائے، اس سے پہلے قرض لے کر عمرہ کرنا عام حالات میں خلافِ اَولیٰ ہے، کیونکہ فقہائے کرامؒ نے حج کو جانے والے کے لئے مستحب قرار دِیا ہے کہ اگر اُس کے ذمے پہلے سے کوئی دَین ہے تو حج کو جانے سے پہلے اُسے ادا کر کے جائے، اگر وہ دَین معجّل ہے تب تو اُس کی ادائیگی حج سے پہلے واجب ہے، اور اگر مؤجل ہے تو بھی افضل یہ ہے کہ دَین ادا کرے، پھر جائے۔ چنانچہ

(۱) طبع سعید.

غنیۃ المناسک میں ہے:

وکذا مدیون لا مال له یقضی، فانه یکرہ له الخروج الی الحج والغزو إلّا بإذن الغریم .... هٰذا فی الدین الحال. أما فی المؤجل فله أن یسافر قبل حلول الأجل .... ولٰکن یستحب أن لا یخرج حتّٰی یوکل من یقضی عنه عند حلوله .... ولو کان له مال فیه وفاء للدین یقضی الدین أوّلا وجوبا اذا کان معجلا، وان کان مؤجلا فالأفضل أن یقضی الدین.

(غنیۃ المناسک ص:۳۵)(۱)

جب پہلے سے واجب دَین مؤجل میں بھی افضل یہ ہے کہ وہ اُسے ادا کر کے جائے تو خاص حجِ نفل یا نفلی عمرے کے لئے ایک دَین پیدا کرنا بھی یقیناً خلافِ اَولیٰ ہوگا۔

لیکن بعض صورتیں ایسی ہوسکتی ہیں جن میں اُسے یہ خیال ہو کہ جب رقم کا اِنتظام ہوگا، اُس وقت عملی طور پر عمرہ کرنا ممکن نہیں رہے گا، مثلاً یہ کہ اُس وقت ویزا نہیں مل سکے گا، یا کوئی عورت ہے جسے محرَم نہیں مل سکے گا، یا جن ساتھیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے، وہ میسر نہیں آسکیں گے، یا اُس کے اپنے حالات اُس وقت کسی اور وجہ سے سفر کی اِجازت نہیں دیں گے، تو اس صورت میں جبکہ اُس کے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے قوی اُمید ہو کہ وہ قرض ادا کر سکے گا، تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اُس کے لئے قرض لینا یا قسطوں پر اِخراجات کی ادائیگی کرنا خلافِ اَولیٰ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ حجِ فرض کے لئے اگر ادائیگی کا اِنتظام نہ ہونے کے باوجود قرض لینا افضل قرار دِیا گیا ہے، تو حجِ نفل یا عمرے کے لئے ادائیگی کا اِنتظام ہونے کی شرط کے ساتھ ایسا کرنا بلاکراہت جائز ہونا چاہئے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

یہاں یہ بات بھی واضح کرنا مناسب ہے کہ قرض لینے کی جو کراہت یا مذمت ہے، اس سے مراد وہ صورت ہے جسے عرف میں مقروض بننا کہا جاتا ہے، لیکن بعض مرتبہ دو اَشخاص یا تاجروں کے درمیان اس قسم کے معاملات چلتے رہتے ہیں کہ وہ مال کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ عملی سہولت کی بنا پر مختصر مدّت کے لئے اُدھار کے معاملات کرتے رہتے ہیں، پھر کسی قریبی تاریخ میں حساب کر لیتے ہیں، مثلاً بیع اِستجرار یا اُس کے مشابہ معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی اگرچہ ٹھیٹھ معنی میں اِستقراض ہی ہے، لیکن عرفِ عام میں اس کو قرض کا معاملہ نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ ہر شخص ہر وقت ادائیگی یا مقاصہ کر سکتا ہے، اور یہ اِستقراض کسی مالی تنگی کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ معاملات کی کثرت کی وجہ سے بار بار ادائیگی کرنے کے بجائے کئی معاملات کے اِکٹھے ہونے پر یکبارگی ادا کرنے کو فریقین آسان سمجھتے ہیں، اور اُسی کی

---

(۱) (طبع ادارۃ القرآن).

بنیاد پر کام کرتے رہتے ہیں، لہٰذا بظاہر اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، اور فقہائے کرامؒ نے بیع اِستجرار کو کسی کراہت کے بغیر جو جائز قرار دیا ہے،[۱] وہ اس کی دلیل ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد تقی عثمانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی
۱۳؍شعبان ۱۴۳۰ھ

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۱۲ تا ص:۱۱۴ کا فتویٰ اور اُس کے حواشی۔

﴿فصل فی المسائل الجدیدة والمتفرّقة المتعلّقة بالبیع﴾

(خرید وفروخت کے جدید اور متفرّق مسائل)

۱- سی آئی ایف معاہدے کی شرعی حیثیت اور پورٹ تک پہنچنے سے پہلے مال بائع کی ملکیت ہے

۲- ایف او بی معاہدہ اور اس کی شرائط کا شرعی حکم

سوال:- قابلِ احترام جسٹس مولانا تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں ایک کتاب ''اسلام کا قانونِ معاہدہ'' تحریر کر رہا ہوں، یہ تصنیف انگریزی میں ہوگی، عنوان "Islamic Law of Contract" (اسلامک لاء آف کنٹریکٹ) ہے۔ چند عنوانات کے بارے میں مواد کافی کاوش کے باوجود نہیں مل سکا، براہِ کرم مجھے فتویٰ کی شکل میں اس کا جواب مہیا فرمائیں، جواب بے شک اُردو میں مہیا فرمائیں، میں انگریزی میں ترجمہ کرلوں گا، اگر جواب عربی میں دینا چاہیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ میں اُسے من وعن شائع کرسکوں گا۔ کتاب مذکورہ بالا آخری مراحل میں ہے اور اِن شاء اللہ جلد منصۂ شہود پر آجائے گی، شائع ہونے پر ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ ان سوالات پر فتویٰ درکار ہے جو دُوسرے صفحے پر ہیں۔ (۱)

---

(۱) یہ سوالات نقل فتاویٰ کے رجسٹر یعنی ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا اس خط میں سائل کے ذکر کردہ سی آئی ایف اور ایف او بی معاہدات اور ان کی شرائط کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔ تاہم آگے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی خریداری کے ان دو معاہدات میں سے سی آئی ایف میں ''انشورنس'' کی شرط کے علاوہ اس قسم کی شرائط طے کی گئیں کہ جن سے بائع کی طرف سے مال جہاز تک پہنچانے کے باوجود بائع کی ملکیت رہے گا، جبکہ ایف او بی معاہدہ میں اس قسم کی کئی شرائط طے کی گئیں جن کی رُو سے پورٹ پر مال پہنچنے کے بعد بائع کا ذمہ ختم ہوکر جہاز راں کمپنی خریدار کی وکیل طے پائی۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں خریدار کا قبضہ شرعاً کب متحقق ہوگا؟ اور پورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہلاکت کی صورت میں نقصان کس کا متصوّر ہوگا؟ نیز پورٹ پر پہنچنے سے قبل خریدار مال آگے فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ان دونوں معاہدوں کی مختلف شرائط کی رُو سے الگ الگ جواب مرحمت فرمائے۔ سوالات کی کچھ مزید تفصیل خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جوابات سے بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ (محمد زبیر)

جواب:- سی آئی ایف معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں ان میں سے انشورنس کی شرط اس لئے دُرست نہیں کہ انشورنس کے مروجہ طریقے عموماً سود یا قمار پر مشتمل ہوتے ہیں،(۱) باقی تمام شرائط دُرست ہیں۔ اوران کا اثر یہ ہوگا کہ جب تک مال اس پورٹ پر نہ پہنچ جائے جہاں پہنچانا طے ہوا ہے، اس وقت تک یہ سمجھا جائے گا کہ مال ابھی بیچنے والے کی تحویل میں ہے، خریدار کے قبضے میں نہیں آیا، لہٰذا اگر اس دوران مال ضائع یا خراب ہو تو بیچنے والے کا نقصان سمجھا جائے گا۔(۲) نیز جب تک مال مذکورہ پورٹ تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خریدار اُسے اپنی ملکیت ہونے کی بناء پر آگے کسی کو فروخت نہیں کرسکتا۔(۳) اس کے علاوہ اگر انشورنس اسلامی اُصولوں کے مطابق ہو تو پہنچنے سے پہلے نقصان کی صورت میں ہرجانے کا دعوے دار خریدار کے بجائے بیچنے والا ہوگا۔

---

(۱) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ "بیمۂ زندگی" ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۳ ص:۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) هلاک المعقود علیه قبل القبض ان کان بآفة سماویة أو بفعل البائع أو بفعل المعقود علیه بأن کان المعقود علیه حیوانًا فقتل نفسه فانّ البیع یبطل فی هذا کلّه امّا اذا کان الهلاک بآفة سماویة أو بفعل المعقود علیه فلا یشکل وکذٰلک اذا کان بفعل البائع لأنّ المبیع فی یده مضمون بالثمن قبل القبض بدلالة انّه لو هلک سقط ثمنه من المشتری ولا یجوز أن یکون مضمونًا بالقیمة .... الخ.

وفی الشامیة ج:۴ ص:۵۶۰ (طبع سعید) لو هلک المبیع بفعل البائع أو بفعل المبیع أو بأمر سماوی بطل البیع ویرجع بالثمن لو مقبوضًا .... الخ. وکذا فی فتح القدیر ج:۵ ص:۴۹۶ (طبع رشیدیه).

(۳) کیونکہ ایسی صورت میں یہ بیع قبل القبض ہوگی جو ناجائز ہے۔

وفی مسند أحمد ج:۳ ص:۴۰۲ عن حکیم بن حزام رضی الله عنه قال: قلت: یا رسول الله! انی اشتری بیوعًا فما یحل لی منها وما یحرم علیّ؟ قال: فاذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتّٰی تقبضه.

وفی سنن الترمذی رقم الحدیث:۱۱۵۵ وسنن أبی داؤد رقم الحدیث:۳۰۴۱ وسنن النسائی رقم الحدیث:۴۵۵۱ عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع ما لیس عندک. (بحواله مشکوٰة المصابیح ص:۲۴۸).

فی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ و۷۹ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتری شیئًا مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتّٰی یقبضه لأنّه نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأن فیه غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک اهـ.

وفی فتح القدیر ج:۵ ص:۲۶۶ قال أبو حنیفةؒ وأبو یوسفؒ یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات ویجوز فی العقار الذی لا یخشیٰ هلاکه اهـ.

وفی المبسوط للامام السرخسیؒ ج:۱۳ ص:۸ قال ومن اشتری شیئًا فلا یجوز له أن یبیعه قبل أن یقبضه ولا یولیه أحدًا ولا یشرک فیه .... لیس لمشتری الطّعام أن یبیعه قبل أن یقبضه لما روی أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الطعام قبل أن یقبض وکذٰلک ما سوی الطعام من المنقولات لا یجوز بیعه قبل القبض عندنا اهـ.

وفی الدر المختار ج:۵ ص:۱۴۷ (فلا) یصح .... (بیع منقول) قبل قبضه ولو من بائعه اهـ.

وفی البدائع ج:۵ ص:۱۴۶ (ومنها) وهو شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکًا للبائع عند البیع فان لم یکن لا ینعقد وان ملکه بعد ذٰلک بوجه من الوجوه الا السلم خاصة وهٰذا بیع ما لیس عنده ونهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع ما لیس عند الانسان ورخص فی السلم اهـ.

وفی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۱ (طبع مکتبه دار العلوم) قال أبوحنیفةؒ وأبو یوسفؒ یمتنع البیع قبل القبض فی سائر المنقولات، ویجوز فی العقار لا یخشیٰ هلاکه.

۲:- ایف او بی معاہدے کی جو شرائط اُوپر ذکر کی گئی ہیں، ان کی رُو سے یہ معاہدہ شرعاً دُرست ہے، اوران کا اثر یہ ہے کہ جس جہاز پر سامان لادا گیا ہے، اس کی جہازراں کمپنی کو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خریدار کی طرف سے مال پر قبضہ کرنے کی وکیل یا ایجنٹ ہے، اس کے جہاز پر مال سوار ہونے سے یہ سمجھا جائے گا کہ بیچنے والے کی تحویل ختم ہوگئی اور خریدار نے اپنے نمائندے کے ذریعے مال پر قبضہ کرلیا، اب اگر سامان راستے میں خراب یا ضائع ہوتو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی[1]، اور خریدار کے لئے یہ بھی جائز ہوگا کہ جب اُسے یہ اطلاع مل جائے کہ جہازراں کمپنی نے مال وصول کرلیا ہے تو اس کے بعد وہ اُسے آگے کسی اور کو فروخت کردے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۹/۲/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۹/۴۰ الف)

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے ''بزناس'' کے فتویٰ پر ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کا اِشکال اوراس کا جواب

سوال:- بخدمت گرامی حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کچھ عرصے سے دارالعلوم کے دارالافتاء سے چند ایک ایسے فتوے دیئے گئے ہیں جن پر تعجب ہوا، اور خیال ہوا کہ توثیق وتصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ میں ان کو صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکا ہوں گا اور میں نے اصل کتب سے صحیح نتیجہ اخذ نہ کیا ہوگا۔ بہرحال میرے لئے یہ یقیناً ایک اُلجھن کی بات بن گئی ہے کیونکہ جناب کی ذات اور دارالعلوم کا ادارہ عام لوگوں میں ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے، لوگ جب معارضے کے طور پر آپ کا نام استعمال کرتے ہیں تو کچھ کہنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، فوری اہمیت کے چند ایک مسائل یہ ہیں:-

۱:- Biznas کے بارے میں فتویٰ، اس کے بارے میں جو میں نے لکھا تھا اس کی ایک کاپی ملفوف ہے۔ دارالعلوم سے ۱۴۲۳/۶/۲۰ھ کو جو فتویٰ لکھا گیا اس میں اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دُوسری صورت میں اگر Product کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہوتو واضح قمار ہوگا، کمپنی

---

(۱) وفی الهداية ج:۳ ص: ۱۹۰ باب الوكالة بالبيع والشراء (طبع مكتبه رحمانيه) فان هلك المبيع فی يده قبل حبسه هلك من مال المؤكل ولم يسقط الثمن لأن يده كيد المؤكل فاذا لم يحبسه يصير المؤكل قابضًا بيده.
وكذا فی البحر الرائق ج:۷ ص:۱۵۶ باب الوكالة بالبيع والشراء (طبع سعيد) فلو هلك فی يده قبل حبسه هلك من مال المؤكل ولم يسقط الثمن لأن يده كيد المؤكّل فاذا لم يحبس يصير المؤكل قابضًا بيده.
وكذا فی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۱۵۸ الفصل الخامس فی الوكالة بالشراء.

کے حق میں اس کا رِشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار نہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال یہ تو پریشانی کی چیز نہیں، لیکن اس کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ: ''اب رہی یہ بات کہ یہ فیس زیادہ ہے یا برابر ہے یا کم ہے، اس کی تحقیق مفتی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ جو شخص اس میں شامل ہونا چاہتا ہے وہ خود تحقیق کرے، اگر تحقیق کے نتیجے میں اس کا دِل اس بات پر مطمئن ہو کہ پروڈکٹ کی جو فیس اس نے ادا کی ہے وہ واقعۃً بازاری قیمت کے برابر ہے تو اس میں شمولیت اختیار کرے ورنہ اس سے اجتناب کرے۔''

حالانکہ عام لوگ اس کی کیا تحقیق کر سکتے ہیں؟ دارالعلوم کے مفتی صاحبان تو اپنے جاننے والوں سے اس کی بآسانی تحقیق کر سکتے ہیں، وہ معلوم کر کے حتمی جواب لکھتے تو عام لوگوں کو سہولت ہوتی۔ ہم لوگ کمپنی والوں سے پوچھیں گے جو ان کو بازاری قیمت کے برابر یا کم ہونے کا ہی یقین دِلائیں گے۔

تیسری صورت میں یہ تو لکھا ہے کہ: ''اگر پروڈکٹ کی بازاری قیمت جمع کردہ رقم کے کم از کم برابر بھی ہو تب بھی پروڈکٹ کے مقصود نہ ہونے کی وجہ سے یہ قمار کے مشابہ ضرور ہے، نیز اس میں کمیشن ایجنسی پروڈکٹ کی خریداری کے ساتھ مشروط ہونے کی خرابی بھی ہے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے'' ممبرشپ حاصل کرنے والوں کی عظیم اکثریت اسی تیسری صورت میں داخل ہے، اس حقیقت اور واقع نفس الامری کو نظرانداز کر کے ''اگر'' کے ساتھ جواب دینا عجیب لگتا ہے، پھر اس بات کو اگلی بات کہہ کر بالکل ہی کمزور کر دیا، یعنی ''اس میں وکالت پروڈکٹ کے معاملے کے ساتھ مشروط ہے ....الخ۔''

پھر جو اِشکال اور اس کا جواب لکھا گیا ہے وہ بھی ناقابلِ فہم ہے، شاید اصل صورتِ حال ذہن میں مستحضر نہ رہی ہو، اس کو میں نے اپنے جواب میں خاصی وضاحت سے لکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''بزناس'' والے ہر ایک کے سامنے آپ کے فتوے کو اپنے حق میں پیش کر رہے ہیں۔

والسلام علیکم

عبدالواحد غفرلہٗ

۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

(مذکورہ اِستفتاء کے ساتھ ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے اپنا درج ذیل مضمون بھی ارسال فرمایا)

بزناس یا دِین و دُنیا کا ناس

توجہ فرمایئے

(حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، جامعہ مدنیہ لاہور)

کچھ عرصے سے بزناس (Biznas) کے نام سے ایک کمپنی کام کر رہی ہے، کراچی اور اسلام

آباد کے بعد اس نے لاہور میں زور پکڑا ہے، یہ کمپنی انٹرنیٹ (Internet) پر کام کرتی ہے، اور ستر ڈالر کی فیس کے عوض ممبر کو کمپیوٹر کے کچھ کورس اور ویب سائٹ کی پیش کش کی جاتی ہے، اس حد تک تو معاملہ بظاہر ٹھیک نظر آتا ہے، کیونکہ جس کو پیش کش سے فائدہ اُٹھانے میں دِلچسپی ہو وہ فیس دے تو معاملہ جائز ہے۔

لیکن اس کمپنی کے کام کے پھیلاؤ کا راز اس کے کام کے دُوسرے رُخ کی وجہ سے ہے۔ وہ رُخ یہ ہے کہ ستر ڈالر کی فیس دے کر بننے والے ممبر کو کمپنی آگے کمائی کرنے کی پیش کش کرتی ہے، جس کے مطابق اگر یہ ممبر براہِ راست اور بلاواسطہ دو مزید ممبر بنائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک آگے مزید دو دو ممبر بنائے یہاں تک کہ بالآخر کم از کم نو ممبر بن جائیں تو کمپنی پہلے ممبر کو اپنی کمائی میں حصہ دار بنالیتی ہے۔
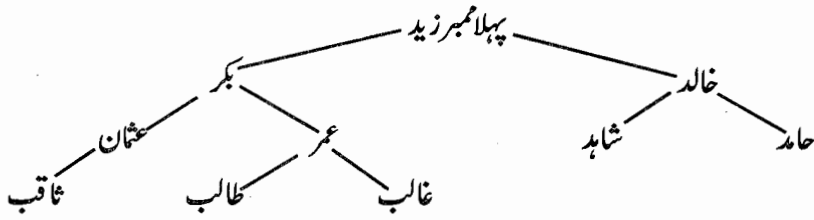
دائیں طرف تین ممبر اور بائیں طرف چھ ممبر ہوئے۔

کمپنی والے کہتے ہیں کہ کل ممبر جب مثلاً چودہ ہوجائیں گے تو کمپنی آپ کو پچاس ڈالر دے گی، اور جب کُل تیس ہوجائیں تو وہ آپ کو سو ڈالر دے گی، بلاواسطہ مزید ممبر بنانے پر وہ آپ کو پانچ ڈالر فی کس اور دے گی۔

حکم:

یہ کاروبار مکمل طور پر ناجائز ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دلالی کی صورت ہے لیکن اس میں دلالی کی شرائط مفقود ہیں۔ دلال (Broker) کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اوّلاً تو کوئی اُجرت نہیں ملتی اور اگر اُجرت ملتی ہے تو دُوسرے کی محنت کی شرط پر۔ مثلاً اُوپر دیئے گئے نقشے کے مطابق زید نے اپنی محنت سے دو ممبر بنائے یعنی بکر اور خالد، لیکن فقط اس محنت پر جو کہ زید کی اپنی محنت ہے، زید کو کوئی اُجرت و کمیشن نہیں ملتی، اگر زید آگے مزید محنت نہ کرے اور صرف بکر اور خالد محنت کریں اور ممبر بنائیں اور وہ بھی آگے ممبر بنائیں یہاں تک کہ دیئے گئے نقشے کے مطابق کم از کم نو ممبر بن جائیں تب زید کو کمیشن ملے گا جو کہ تمام ممبران کے عدد کے تناسب سے ہوگا، اور اگر بکر اور خالد بھی آگے محنت نہ کریں اور ممبر سازی کا سلسلہ آگے نہ

چلے تو زید کو اپنی محنت پر بھی کچھ نہ ملے گا، حاصل یہ ہے کہ اس معاملے میں مندرجہ ذیل خرابیاں ہیں:-

۱:- زید کی اپنی محنت کی اُجرت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آگے سات ممبر اور بنیں، اور وہ بھی وہ سات ممبر جو دُوسروں نے بنائے ہوں۔ اُجرت کو اس طرح کی شرط کے ساتھ مشروط کرنے سے خود معاملہ فاسد اور ناجائز ہوجاتا ہے۔

۲:- زید دو ممبر بنانے کے بعد بالکل محنت نہ کرے، بنائے ہوئے ممبر آگے محنت کریں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے تو دُوسروں کی محنت کے معاوضے میں زید بھی شریک ہوتا ہے، اس لئے کمپنی چودہ ممبر پورے ہونے پر زید کو پچاس ڈالر دیتی ہے اور تیس ممبر مکمل ہونے پر زید کو سو ڈالر دیتی ہے، یہ بھی ناجائز ہے اور حرام ہے۔

عام طور پر یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ آگے جو ممبر بنے آخر ان کی بنیاد زید ہی کی تو محنت تھی، اگر وہ بکر اور خالد کو ممبر نہ بناتا تو آگے سلسلہ کیسے چلتا؟ علاوہ ازیں زید اب بھی دُوسروں کو محنت کی ترغیب تو دیتا ہے، اس مغالطے کا جواب یہ ہے کہ محض محنت کی ترغیب دینا تو خود محنت نہیں ہے، جس کا عوض ہو، اِلَّا یہ کہ کسی کو اس کام پر ملازم رکھ لیا جائے، دُوسرے کو کام کرنے کی ترغیب دینے کو دلالی نہیں کہتے۔ اس لئے زید صرف اپنی محنت پر عوض کا حق دار ہوسکتا ہے، اس کی بنیاد پر آگے جو دُوسرے لوگ کام کریں ان کے محنتانہ میں شریک نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ:- شریعت کا ضابطہ ہے کہ: "الأمور بمقاصدها" یعنی کاموں اور معاملات کا دار و مدار مقاصد پر ہوتا ہے، جب ہم بزناس (Biznas) کمپنی کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہیں تو اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس کو وہ اپنی Products کہتے ہیں، یعنی کمپیوٹر کے ٹریننگ کورس اور ویب سائٹ کی فراہمی۔ دُوسرا وہ حصہ جس کو وہ Marketing کہتے ہیں، یعنی آگے ممبر بنانا، اور اس پر اپنے ممبروں کو اپنی آمدنی میں شریک کرنا۔ ان دو حصوں میں سے کمپنی کا جو اصل مقصد ہے وہ اس کی Marketing یعنی ممبرسازی کا حصہ ہے، اور Products کا حصہ تو محض یہ دِکھانے کے لئے ہے کہ وہ فی الواقع تجارتی بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔ ہمارے اس دعوے پر یہ مشاہدہ کافی دلیل ہے کہ اس کمپنی کے جو لوگ ممبر بن رہے ہیں ان میں سے اکثریت کے پاس تو اپنے کمپیوٹر بھی نہیں ہیں اور ان کو کمپیوٹر کی الف ب سے بھی کوئی واقفیت نہیں ہے، اور نہ ہی کسی کمپیوٹر کورس یا ویب سائٹ سے ان کو کوئی دِلچسپی ہے، یا اس سے ان کا کوئی بھی مفاد وابستہ ہے۔ غرض کمپنی کا اصل مقصد تو مارکیٹنگ (Marketing) ہے اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں ہم وضاحت سے بتاچکے ہیں کہ وہ سرے سے ناجائز اور حرام ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ اس سے ملتے جلتے طریقے پہلے بھی چلائے گئے اور

چلائے بھی جارہے ہیں، یہ سب درحقیقت لوٹ کھسوٹ کے طریقے ہیں، البتہ حکمت یہ اختیار کی ہے کہ لوٹ کھسوٹ میں دُوسروں کو بھی شریک کرلو تاکہ اصل جرم لوگوں کی نظروں میں نہ آئے بلکہ وہ خود مال کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ لوٹ کھسوٹ کروائیں۔

عبدالواحد
جامعہ مدنیہ لاہور

جواب :- گرامی قدر مکرم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب، زید مجدکم السامی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں انتہائی ندامت کے ساتھ آپ کے ایک گرامی نامے کا جواب غیرمعمولی تاخیر سے دے رہا ہوں، جو غالباً شوال میں مجھے ملا تھا اور اس میں دارالعلوم سے جاری ہونے والے تین فتووں(۱) کے بارے میں توجہ دِلائی گئی تھی، جو خطوط مراجعت اور غور وفکر چاہتے ہیں، ان کی میرے پاس الگ ترتیب رہتی ہے، اور اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی فوری تقاضا مسلط رہتا ہے، آنے والوں کی کثرت، فوری ڈاک کی بھرمار اور اَسفار کا سلسلہ، ان کی وجہ سے قابلِ مراجعت اُمور ٹلتے چلے جاتے ہیں۔ آنجناب کے مکتوب میں چونکہ تین مسائل تھے، کسی وقت ایک مسئلے پر کچھ دیر غور یا مراجعت کا وقت ملا، مگر پھر کوئی عارض سامنے آگیا، اسی طرح باوجودیکہ وہ مکتوب ہر روز میری میز پر رہا، لیکن جواب لکھنے کی پوزیشن میں نہ آسکا، یہاں تک کہ یہ وقت آگیا۔ بہرحال! اس تأخیر پر تہِ دِل سے معذرت خواہ ہوں، اور ساتھ ہی شکرگزار ہوں کہ آپ نے ان اُمور کی طرف توجہ دِلائی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''توثیق وتصحیح سے قبل جناب کو ان پر بھرپور نظر ڈالنے کی فرصت نہ ملی ہوگی'' واقعہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوشش تو یہی کرتا ہوں کہ دُوسرے فتاویٰ کی توثیق سوچ سمجھ کر ہی کروں، چنانچہ ایسے اوقات میں لوگوں کو فتوے لانے سے روکتا ہوں جب ذہن فارغ نہ ہو، لیکن فتویٰ کا کام ہی ایسا ہے کہ ہر وقت غلطی کا ڈر لگا رہتا ہے، بالخصوص ایسے مسائل میں جہاں صریح جزئیہ دستیاب نہ ہو، اور میرے پاس زیادہ تر ایسے ہی مسائل دارالافتاء سے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا ہے کہ وہ حفاظت فرمائیں۔

اب ان تین مسائل کے بارے میں اپنی گزارشات عرض کرتا ہوں۔

۱:- پہلا مسئلہ بزناس کا ہے، بندے نے آنجناب کے ارشادات پر بار بار غور کیا، اس سلسلے میں آنجناب نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں، پہلی یہ کہ ''اگر پروڈکٹ کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ لی گئی ہو تو کمپنی کے حق میں اس کا رِشوت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، قمار ہونا نہیں۔'' بندے کی ناقص رائے میں اس میں قمار کا پہلو اس طرح ہے کہ جو قیمت زیادہ دی جارہی ہے وہ اس موہوم اُمید پر داؤ پر لگائی

(۱) مزید سوالات اور ان کے جوابات متعلقہ باب کے تحت آئیں گے، إن شاء اللہ۔ (محمد زبیر)

جارہی ہے کہ مارکیٹنگ سسٹم کے نتیجے میں اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل ہوگی، اور اس طرح اس میں تعلیق التملیک علی الخطر پایا جارہا ہے، البتہ اگر اس کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ یہ زائد قیمت دلالی کا عقد کرنے کے لئے دی جارہی ہے تو اس میں رشوت کا پہلو بھی ہے، بہرصورت یہ حرام ہے۔

آنجناب نے دُوسری بات یہ لکھی ہے کہ: ''پروڈکٹ کی قیمت کے کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ عام آدمی پر چھوڑنے کے بجائے خود تحقیق کرکے اس کا حکم لکھنا چاہئے تھا'' تو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے متعدّد جاننے والوں سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پروڈکٹ کی قیمت یا فیس بازار میں مروّج قیمت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن چونکہ ہم اس کی تکنیکی باریکیوں سے براہِ راست واقف نہیں، اس لئے بہ نظرِ احتیاط مناسب سمجھا کہ اس واقعے کے بیان کی ذمہ داری خود لینے کے بجائے متعلقہ افراد کو پابند کیا جائے کہ وہ خود بھی اس کی تحقیق کرلیں۔

تیسری بات آپ نے جو فتوے میں لکھی ہے کہ: ''دلال کو اپنی محنت پر دلالی ملتی ہے، لیکن بزناس کے گورکھ دھندے میں اپنی محنت پر اوّلاً تو کوئی اُجرت ملتی نہیں، اور اگر اُجرت ملتی ہے تو دُوسرے کی محنت کی شرط پر۔'' یہ بڑی اہم بات ہے، اور فتویٰ لکھنے سے پہلے بندے نے اس پر خصوصی اہمیت کے ساتھ فتویٰ لکھنے والے صاحب کو متنبہ کیا تھا، لیکن پھر انہوں نے متعلقہ افراد سے تحقیق کی اور صراحۃً بتایا کہ ہر شخص ابتدا میں جو دو گاہک یا ممبر بناتا ہے، اس پر بھی اس کو ساٹھ روپے فی ممبر ملتے ہیں، جیسا کہ ان کے بیان کردہ پلان اور اِستفتاء میں صفحہ:۴ اور ۵ پر یونی لیول پلان کے زیرِ عنوان بیان کیا گیا ہے۔ بندے نے اسی فہم کی بنیاد پر مذکورہ فتوے کی توثیق کی ہے، آنجناب کے ارشاد کے بعد بندے نے ان سے مکرّر اس پہلو کی تصدیق کے لئے کہا، اور انہوں نے تصدیق کی، لیکن اگر واقعۃً صورتِ حال وہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے کہ اپنی محنت پر کچھ نہیں ملتا، بلکہ کمیشن دُوسروں کی محنت پر موقوف رہتا ہے، اور یہ بات ثابت ہوجائے تو بندہ اس فتوے سے یقیناً رُجوع کرلے گا، اگر اس بارے میں یقینی بات آپ کو بہ درجۂ ثبوت معلوم ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔

اور اگر یہ ثابت نہ بھی ہوسکے تب بھی چونکہ اس قسم کی اسکیمیں یکے بعد دیگرے آرہی ہے، اس لئے ان کے بارے میں اجتماعی غور و فکر مناسب معلوم ہوتا ہے، اور بندے نے اپنے دارالافتاء کے حضرات سے کہا ہے کہ وہ اہلِ فتویٰ کی ایک مجلس میں اس مسئلے کو رکھ کر اِجتماعی غور کا اہتمام کریں۔

والسلام

۱۴۲۴/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۱/۱۸)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''فقہی مقالات'' (جلد اوّل) میں قسطوں پر خرید وفروخت، مرابحہ مؤجلہ، حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت وغیرہ سے متعلق چند شبہات اور ان کے جوابات

(وضاحت)

(دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مفتی غلام قادر نعمانی صاحب نے بیع بالتقسیط، مرابحہ مؤجلہ اور بینکوں میں اس کے اِجرا، قرض، حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت اور مروّجہ پگڑی سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کے مقالوں پر کچھ اِشکالات تحریر فرمائے، اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کو خط لکھا جس کے ساتھ ان شبہات پر مشتمل اپنی مطبوعہ تحریر بھی بھیجی۔ پہلے وہ خط، اس کے بعد ان کی تحریر، پھر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جوابی خط اور اِشکالات کے جوابات پر مشتمل فتویٰ ذیل میں پیشِ خدمت ہیں) (مرتب عفی عنہ)

(خط از مفتی غلام قادر نعمانی صاحب)

گرامی قدر محترم المقام جناب شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی

سلامِ مسنون کے بعد، اُمید ہے مزاجِ گرامی خیریت سے ہوں گے، گزارش یہ ہے کہ بندے نے ''فقہی مقالات'' جلد اوّل کا کچھ سرسری مطالعہ کیا، اس میں کچھ اِشکالات سامنے آئے، وہ اِرسالِ خدمت ہیں، اُمید ہے کہ ہمیں جواب سے نوازا جائے گا۔

والسلام

اخوکم فی اللہ

غلام قادر عفی عنہ

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

(شبہات پر مشتمل تحریر)

دورِ حاضر کے محقق اور جدید معاشیات کے ماہر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی کی فقہی خدمت قابلِ تعریف ہے۔ مولانا عثمانی صاحب نے اس دور کے نو وارِد جدید مسائل کے حل کا راستہ تلاش کیا ہے، اور علمائے اُمت کے لئے اکثر مسائل میں راہنمائی فرماکر تحقیق کی راہ ہموار کی۔ اور علماء خصوصاً اور عوام عموماً ان کی تحقیق کے فائدے سے مستفید ہوئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر بات ہے کہ قدیم زمانے سے اکثر مسائل میں علماء کا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اور اس اختلافِ رائے کی وجہ سے اسلام میں مذاہبِ اربعہ مرتب ہوئے ہیں، اور اُمتِ مسلمہ نے تسلیم کئے ہیں۔ تاہم بندے نے جنابِ والا کی گراں قدر تصنیف ''فقہی مقالات'' جلد اوّل کا مطالعہ کیا، اس تصنیف میں بعض مسائل میں مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور اس رائے میں کچھ اِشکالات ہیں، لہٰذا مصنف صاحب

کی آراء پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تا کہ یہ اِشکالات زائل ہوکر کتاب کی تنقیح کی جاسکے۔ اور چونکہ یہ کتاب عام ہوچکی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہ تحریر نشر کی جائے تا کہ قارئین حضرات کے شکوک وشبہات رفع ہوجائیں۔ ترتیب یہ ہے کہ ہم پہلے وہ مسئلہ لکھتے ہیں جس مسئلے میں مصنف صاحب نے اپنی رائے قائم کی ہے، اور پھر مصنف صاحب کی رائے ذکر کرتے ہیں، اور اس کے بعد اِشکال لکھتے ہیں۔

اِشکال ا:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ سامان وغیرہ اشیاء نفع کے ساتھ قرض فروخت کردیتا ہے تو اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان نہ کرے اور سامان فروخت کردے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ بائع نفع کی مقدار بیان کرے، مثلاً یوں کہے کہ دس مہینے تک مدّت قرض ہوگی اور اصل قیمت کے علاوہ ایک ہزار نفع ہوگا۔ فقہ میں پہلی صورت کو مساومہ کہتے ہیں اور دُوسری صورت کو مرابحہ مؤجلہ کہتے ہیں۔ اب دونوں صورتوں میں بیع تام ہونے کے بعد اگر بائع، مشتری سے یہ کہے کہ اگر آپ قرض کی مدّت پوری ہونے سے پہلے قرض ادا کریں تو میں اس مدّت کے عوض میں آپ کو اتنی رقم معاف کردُوں گا۔ تو یہ مدّت کے مقابلے نفع میں معافی اور کمی بیعِ مساومہ میں جائز نہیں ہے، اور مرابحہ مؤجلہ کی صورت میں اس تعجیل کی وجہ سے نفع میں کمی کرنا جائز ہے۔ بلکہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ جب دائن مدیون سے تعجیلِ دَین کا مطالبہ کرے تو اس تعجیل کی صورت میں بقدرِ تعجیلِ مدّت دائن مدیون سے نفع میں کمی کرے گا۔ مثلاً بائع نے دس مہینوں تک ایک ہزار نفع پر مرابحہ مؤجلہ کا معاملہ کیا ہے، اب بائع پانچ مہینے پہلے دَین کا مطالبہ کر رہا ہے، تو اس مطالبے کی صورت میں مدیون سے پانچ مہینوں کے حساب سے نفع کم لیا جائے گا، تو ایک ہزار کے نفع میں پانچ سو نفع چھوڑ دے گا، اور پانچ سو نفع وصول کرے گا۔ مصنف صاحب نے اس مسئلے کی توثیق کے لئے اپنی کتاب ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۱۶ پر متعدّد کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں (ردّ المحتار لابن عابدین ج:۶ ص:۷۵۷ آخر الحظر والاباحة) یہی مسئلہ کتاب البیوع میں فصل فی القرض سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ حانوتی، علامہ نجم الدین اور علامہ ابوالسعود نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ دیکھئے: شامی ج:۵ ص:۱۶۰۔ اور یہی مسئلہ حاشیة الطحطاوی علی الدر میں بھی مذکور ہے، دیکھئے: ج:۳ ص:۱۴۰ و ج:۴ ص:۳۶۳۔ بعینہٖ یہی مسئلہ تنقیح الفتاویٰ الحامدیه میں بھی مذکور ہے۔ ان حوالہ جات کے علاوہ جناب مصنف صاحب کی عبارت میں ص:۱۱۷ پر اسی مسئلے پر فتاویٰ الانقروی، التنویر اور شرح المجلة للاتاسی کے حوالے بھی مذکور ہیں۔ مصنف صاحب کے حوالوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان مذکورہ کتابوں میں اسی پر فتویٰ ہے کہ تعجیلِ دَین کی صورت میں مرابحہ مؤجلہ میں بائع نفع میں کمی کرے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مذکورہ بحث کے بعد مصنف صاحب ص:۱۱۸ پر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں بیعِ مساومہ اور بیعِ مرابحہ کا کوئی فرق نہیں ہے (یعنی فقہائے کرام نے جو فرق بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے) اس کے بعد فرماتے ہیں: لہٰذا میری رائے میں بیع بالتقسیط اور بیع مرابحہ کے وہ معاملات جو اِسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- اِشکال یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے فقہائے کرام نے (جو مذکورہ بالا حوالہ جات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے) بیع مساومہ اور بیعِ مرابحہ کے حکم میں فرق کیا ہے اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ بیع مساومہ اور بیع مرابحہ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ فقہائے کرام کے فرق سے انکار محلِ تأمل ہے۔ اور فرق یقیناً موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بیعِ مساومہ میں مدّت کے مقابلے میں قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہے، جبکہ مرابحہ مؤجلہ میں مدّت کے مقابلے میں قیمت میں اضافہ ہے۔ دُوسرا فرق یہ ہے کہ جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی بیشی کو ناجائز قرار دیا ہے وہ مشروط ہے، اور جہاں فقہائے کرام نے نفع میں کمی کا قول کیا ہے تو اس صورت میں ہے کہ پہلے سے کمی بیشی مشروط نہ ہو۔ اور مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ وہ معاملات جو اِسلامی بینکوں میں رائج ہیں ان میں مندرجہ ذیل فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔ تو جہاں تک بینک کے معاملات کا تعلق ہے تو عدمِ جواز اس صورت میں ہے کہ بینک کے معاملات میں سامان کی اصل قیمت میں تردّد ہو یا تعینِ اجل میں تردّد ہو اور اگر مرابحہ مؤجلہ میں سامان کی قیمت بھی متعین ہو اور اَجل بھی متعین ہو تو اس صورت میں جواز ہے اور مصنف صاحب نے اس صورت کے جواز پر ص:۸۳ پر قول کیا ہے، اور اس کے جواز پر ائمہ اَربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک نقل کیا ہے، لہٰذا فقہائے کرام کا فتویٰ مطلقاً غیر مناسب سمجھنا دُرست نہیں ہے، بلکہ مناسب مسئلے کی تفصیل ہے، تاکہ مسئلے کی نوعیت بھی واضح ہو اور فقہائے کرام کا فتویٰ بھی مجروح نہ ہو۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اگر مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں بیعِ مرابحہ اور قسطوں پر بیع کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہوجائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ۔ مصنف صاحب نے اپنی رائے کی توثیق کے لئے جو وجہ بیان کی ہے، یہ انتہائی کمزور ہے، اس وجہ سے کہ فقہائے کرام کے فتویٰ پر عمل کرنے سے اگرچہ سودی معاملات سے مشابہت ہوجائے گی لیکن یہ مشابہت نقصان دہ نہیں ہے، اس لئے کہ فقہاء نے مرابحہ مؤجلہ میں قلّتِ نفع پر قول کیا ہے، اور سودی معاملات میں زیادتِ نفع پر اِصرار کیا جاتا ہے، لہٰذا قلّتِ نفع پر قول کرنے

سے سودی معاملات سے مشابہت کم ہوجائے گی، اور زیادتِ نفع پر قول کرنے سے سودی معاملات سے مشابہت زیادہ ہوجائے گی، جیسا کہ مصنف صاحب کی رائے ہے، لہٰذا فقہائے کرام کی رائے راجح ہے، اور مصنف صاحب کی رائے مرجوح ہے۔

اِشکال۲:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی کی مدّت پوری ہونے سے پہلے مدیون کا انتقال ہوجائے تو کیا وہ دَین پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا یا وہ دَین فی الفور واجب الاداء ہوگا، اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دَین کی ادائیگی کا فوری مطالبے کا حق حاصل ہوجائے گا یانہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دَین مؤجل فوری واجب الادا ہوجاتا ہے، اور اِمام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے، لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دَین کی توثیق کردیں اور اس کی ادائیگی پر اِطمینان دِلادیں تو اس صورت میں وہ دَین مدیون کی موت سے فوری واجب الادا نہیں ہوگا، بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب مذکورہ مسئلے میں اپنی رائے قائم کرتے ہوئے ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۳۷ پر لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دَین فی الفور واجب الادا ہوجائے گا لیکن بیع بالتقسیط اور مرابحہ مؤجلہ جن میں ثمن کا کچھ حصہ مدّت کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے اگر ان میں ہم فوری واجب الادا کے قول لے لیں تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دوقولوں میں سے ایک قول کو اِختیار کرلیا جائے، یا تو متأخرینِ حنفیہ کا قول لے لیا جائے کہ ادائے دَین کی جو مدّت متفق علیہ تھی اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے اس وقت کے مقابلے میں جتنا ثمن آتا ہے، وہ ساقط کردیا جائے، لہٰذا مدیون کے ترکے میں سے صرف اَیامِ گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو وہ وصول کرلیا جائے۔ یا پھر حنابلہ کا قول اِختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دَین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے البتہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے اس دَین کی توثیق کردیں۔ شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی اور جس کی وجہ سے صورۃً سودی معاملات سے مشابہت ہوجاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- اس رائے میں دوقسم کے اِشکال ہیں:-

۱- اپنا مذہب چھوڑ کر کسی دُوسرے مذہب کو اِختیار کرنا اس وقت جائز ہے جب کوئی ضرورتِ

شدیدہ پیش آجائے اور جب کوئی ضرورتِ شدیدہ نہ ہو تو دُوسرے مذہب کو اِختیار کرنا یا ترجیح دینا اُصولِ اِفتاء کے خلاف ہے اور تقلید کے منافی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: "ان اختیار مذهب الغير في بعض المسائل والافتاء به يجوز للمجتهد فلا يجوز الا بشرائط" اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں: "فلا يجوز الا بشروط الضرورة الشديدة وعموم البلوىٰ والاضطرار" (جواهر الفقه ج:۱ ص:۱٦٦)۔

۲- حنابلہ کے مذہب کو ترجیح دینے میں یہ اِشکال ہے کہ اگر ترکہ تقسیم نہ کیا جائے، اور مدّتِ قرض تک موقوف کیا جائے تو پھر یتیموں اور بیواؤں کے ان حقوق میں تاخیر آجائے گی جو ترکۂ میّت سے متعلق ہیں، اور اگر ترکہ تقسیم کیا جائے یعنی دَین ادا کرنے سے پہلے تو اس ترکے سے دَین متعلق ہے، اور دَین کی ادائیگی سے پہلے ترکہ تقسیم کرنا اِرشادِ خداوندی کے خلاف ہے، اِرشادِ خداوندی ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ"۔

۳- مصنف صاحب نے اس سے پہلے بیع بالتقسیط کے جواز کا قول کیا ہے، اس قول کے بعد مرابحہ موَجلہ میں تاویلات کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ بیع بالتقسیط اور مرابحہ موَجلہ کا حکم ایک ہی ہے۔

اِشکال ۳:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی صاحب کا حقِ شرب یعنی کسی نہر یا چشمے سے پانی لینے کا حق ہو، تو اس حقِ شرب کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اس حقِ شرب کی بیع کے بارے میں فقہائے اَحناف کے اقوال مختلف ہیں، چنانچہ حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، اور بعض فقہائے کرام نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، چنانچہ ردّ المحتار، مبسوط السرخسی، فتح القدیر، عنایۃ، ان کتابوں میں عدمِ جواز پر فتویٰ ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- جنابِ مصنف نے "فقہی مقالات" ج:۱ ص:۱۸۷ پر اس مسئلے پر تحقیق قلم بند کی ہے، اور اپنی رائے صراحۃً قائم نہیں کی ہے۔ لیکن ان کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب کی رائے حقِ شرب کی بیع کے جواز کی ہے۔ مصنف صاحب کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، مصنف صاحب لکھتے ہیں: حنفی مسلک کی ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں) لیکن نظرِ غائر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جن فقہاء نے حقِ شرب کی بیع کا عرف قائم ہونے کے باوجود اس کے جواز سے منع کیا ہے، ان حضرات نے غرر اور جہالت کی وجہ سے منع کیا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ حقِ شرب مال نہیں۔ اور ص:۱۹۸ پر لکھتے ہیں: اِمام سرخسیؒ نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعۃ میں

زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اَخیر میں بیعِ شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متأخرین کا قول ذکر کیا اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ اور اسی صفحے کے اَخیر میں لکھتے ہیں: بعض متأخرینِ اَحناف نے لکھا ہے جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے، مثلاً حقِ تعلّی، حقِ مسیل، حقِ شرب، ان کا عوض لینا بطریقِ بیع تو جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔ علامہ خالد اتاسیؒ مال کے بدلے میں وظائف سے دستبرداری کا مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اقول وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ...الخ" جناب مصنف صاحب کی ص:۱۹۲ پر عبارت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جناب مصنف صاحب حقِ شرب کی بیع کے جواز کی طرف رُجحان رکھتے ہیں۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- مصنف صاحب ص:۱۸۷ پر فرماتے ہیں کہ ظاہر روایت یہ ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، پھر بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ مصنف صاحب کا یہ دعویٰ دُرست نہیں ہے کہ بہت سے مشائخ نے حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے، کیونکہ مصنف صاحب نے حقِ شرب کی بیع کے جواز پر دو حوالے پیش کئے ہیں، جبکہ خود مصنف صاحب نے عدمِ جواز پر چار حوالے پیش کئے ہیں، اور عدمِ جواز ظاہر روایت ہے، اور جواز بعض متأخرین کی رائے ہے۔ پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے مشائخ نے حقِ شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مصنف صاحب نے اپنی رائے کے اِثبات کے لئے مبسوط سرخسی کا حوالہ دیا ہے اور یہ حوالہ محلِ تأمل ہے کیونکہ صاحبِ مبسوط نے حقِ شرب کی بیع کا عدمِ جواز صراحۃً نقل کیا ہے، اور جواز کا قول ضمناً نقل کیا ہے۔ اور پھر اس جواز کے قول پر رَدّ بھی کیا ہے۔ نیز مصنف ص:۱۸۹ پر لکھتے ہیں: اِمام سرخسیؒ نے دوبارہ یہ مسئلہ کتاب المزارعۃ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اَخیر میں بیعِ شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متأخرین کا قول نقل کیا ہے اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ "وبعض المتأخرین من مشائخنا ....الخ" مصنف صاحب نے اہتمام کے ساتھ مبسوط کا حوالہ نقل کیا ہے اور اس کی نسبت مشائخ متأخرین کی طرف کی ہے۔ حالانکہ اسی جگہ یہ تصریح ہے کہ جمہور متأخرین نہیں بلکہ بعض متأخرین مراد ہیں اور اس بعض متأخرین کا مصداق صاحبِ مبسوط کے نزدیک ایک ہی شیخ ہے، صاحبِ مبسوط لکھتے ہیں: "وکان شیخنا الاسلام یحکی عن استاذہ انہ کان یفتی بجواز بیع الشرب ....الخ" پھر ایک ہی شیخ سے بہت سے مشائخ سے تعبیر کرنا بے جا ہے۔ نیز مصنف صاحب نے ص:۱۸۹ پر اپنی رائے کے اِثبات کے لئے بعض متأخرین کا قول

نقل کیا ہے اور جمہور کے قول سے چشم پوشی کی ہے۔ جب کہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ دونوں اقوال نقل کرتے۔ اور جمہور کے مقابلے میں بعض متأخرین کے قول کو ترجیح دینا اُصولِ اِفتاء کے خلاف ہے۔

مصنف صاحب ص:۱۸۹ پر لکھتے ہیں کہ بعض متأخرینِ اَحناف نے لکھا ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن صلح کے طریقے پر ان کا عوض لینا جائز ہے۔

مصنف صاحب نے اس تحریر کے بعد علامہ خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، یہاں بھی یہ وہم ہوتا ہے کہ متأخرینِ اَحناف کوئی جماعت ہے، حالانکہ مصنف صاحب نے ایک ہی عالم خالد اتاسیؒ کا قول نقل کیا ہے، اور خالد اتاسیؒ نے فتویٰ نہیں دیا ہے، انہوں نے ایک تجویز پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''اقول وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ....الخ'' اور مصنف صاحب نے علامہ خالد اتاسیؒ کی تجویز کو جواز پر حمل کرکے متأخرینِ اَحناف کو منسوب کیا، مطلقاً متأخرینِ اَحناف کو جواز کی نسبت دُرست نہیں ہے۔

اِشکال۴:- مسئلہ یہ ہے کہ حقوقِ مجردہ یعنی آں حقوق کہ اعیان نہ ہوں، ان میں ایک، حقِ اسبقیت ہے، حقِ اسبقیت سے مراد یہ ہے کہ مباح الاصل چیز پر سب سے پہلے قابض ہونے کی وجہ سے انسان کو مالک بننے کا جو حق یا اس مال کے ساتھ جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے، اس کو حقِ اسبقیت کہا جاتا ہے، مثلاً افتادہ بنجر زمین کو قابلِ استعمال بنانے سے مالک بننے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:- مصنف صاحب ص:۱۹۷ پر لکھتے ہیں: فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کسی فقیہ نے حقِ اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہوا، فقہائے اَحناف اور مالکیہ نے تو یہ ذکر کیا ہے کہ افتادہ بنجر زمین پر نشان لگانے سے وہ شخص زمین کے استعمال کرنے اور زمین کا مالک بننے کا زیادہ حق دار ہوجاتا ہے، لیکن مجھے اس حق کی بیع کی بحث ان فقہاء کے یہاں نہیں ملی، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے نزدیک بھی حقِ اسبقیت کی بیع جائز نہ ہو، اِلَّا یہ کہ دست برداری کے طور پر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض فقہاء اس بیع کو جائز کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی بڑی جماعت کی رائے اس کے عدم جواز کی ہے، البتہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطورِ صلح کے دست بردار ہوجانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:- مصنف صاحب پہلے یہ فرماتے ہیں کہ فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا کہ کسی فقیہ نے حقِ اسبقیت کی بیع کا مسئلہ چھیڑا ہو، اور

بعد میں فرماتے ہیں البتہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہوجانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

۱- مصنف صاحب کے کلام میں تعارض ہے، کیونکہ پہلے یہ فرماتے ہیں کہ مجھے فقہائے اَحناف اور مالکیہ کی کتابوں میں نہیں ملا، اور بعد میں یوں کہتے ہیں کہ حقِ اسبقیت سے مال لے کر بطور صلح کے دست بردار ہوجانا فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ جب مصنف صاحب کو پہلے یہ مسئلہ کتابوں میں ملا نہیں پھر فقہاء سے جواز کہاں سے ثابت ہوا؟ لہٰذا فقہائے اَحناف کی طرف یہ نسبتِ جواز دُرست نہیں ہے۔

۲- مصنف صاحب نے حقِ اسبقیت کے مسئلے میں اَحناف کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے، محض قیاس آرائی پر مسئلہ حمل کیا ہے۔ آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ راجح یہ ہے کہ حقِ اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ فقہائے کرامؒ نے تصریح کی ہے، اور حقِ اسبقیت سے دستبرداری کے طور پر بھی مال لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر جواز کا فتویٰ دیا جائے تو بہت سے لوگ سرکاری زمینوں میں نشانات لگا کر اس کی بیع اور دستبرداری کے طور پر مال لینے میں مصروف ہوجائیں گے۔

اِشکال۵:- مصنف صاحب ص:۲۱۷ پر لکھتے ہیں: ہمارے زمانے کی موجودہ پگڑی جو مالک کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں ہے۔ اور پگڑی کے نام پر لی جانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدے پر منطبق نہیں ہوتی، لہٰذا یہ رقم رِشوت اور حرام ہے، البتہ پگڑی کے مروّجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ممکن ہیں۔

۱- مالکِ مکان و دُکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے، جسے متعینہ مدّت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی۔ اس یکمشت لی ہوئی رقم پر اِجارہ کے سارے اَحکام جاری ہوں گے۔ یہاں مصنف صاحب مروّجہ پگڑی کی متبادل صورت بتارہے ہیں، اور اس متبادل صورت میں اسی مروّجہ پگڑی کو فروغ ملتا ہے، کیونکہ مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، جب یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہو پھر تو یہ وہی پگڑی ہوگی جو پہلے اس کی حرمت پر بحث کی گئی ہے، لہٰذا عبارتِ ھٰذا کی وضاحت چاہئے۔

اِشکال۶:- مصنف صاحب مکان و دُکان کے اِجارے کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ص:۲۱۷، ۲۱۸ پر لکھتے ہیں: اگر اِجارہ متعین مدّت کے لئے ہو تو مالکِ مکان و دُکان کے لئے جائز نہیں کہ شرعی عذر کے بغیر اِجارہ فسخ کردے، اگر مالک عذرِ شرعی کے بغیر دورانِ مدّت اِجارہ فسخ کرنا چاہے

تو کرایہ دار کے لئے جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور اس کا یہ اِقدام بالعوض اپنے حق سے دستبرداری ہوگی، یہ عوض اس کے علاوہ ہوگا جس کا کرایہ دار اپنی یکمشت دی ہوئی رقم میں سے اِجارہ کی باقی مدّت کے حساب سے حق دار ہوگا۔ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۴۰۸ھ میں یہی فیصلہ کیا ہے۔

مصنف صاحب کی رائے:۔ مصنف صاحب آگے چل کر ص:۲۱۹ پر لکھتے ہیں: اَحناف کے یہاں راجح یہ ہے کہ حقِ وظیفہ کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مال کے بدلے میں اس سے دستبرداری جائز ہے، اسی طرح مکان یا دُکان کے حقِ کرایہ داری کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن مالی معاوضہ لے کر اس سے دستبردار ہونا جائز ہے۔

مصنف صاحب کی رائے پر اِشکال:۔ مصنف صاحب نے حقِ وظیفہ سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ اور اسی طرح حقِ کرایہ داری سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضے کو جائز قرار دیا ہے، اور اس جواز کی نسبت فقہائے اَحناف کی طرف کی ہے۔ یہ جواز کی نسبت فقہائے اَحناف کی طرف دُرست نہیں ہے (یعنی حقِ کرایہ داری کے معاوضے کی نسبت)، کیونکہ مکان یا دُکان سے دستبرداری کی صورت میں مالی معاوضہ لینا یہ اَحناف کا مسلک نہیں ہے، اور نہ مصنف صاحب نے اس پر اَحناف کی کوئی دلیل پیش کی ہے، بلکہ یہ مصنف صاحب کا قیاس ہے جو انہوں نے ص:۲۱۷ پر قائم کیا ہے۔ البتہ اگر اس کو علمائے جدہ کا فیصلہ کہا جائے تو دُرست ہے، جیسا کہ مصنف صاحب نے ص:۲۱۸ پر اس کی تصریح کی ہے۔

(جوابی خط اَز حضرتِ والا دامت برکاتہم)

گرامی قدر مکرّم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ مؤرخہ ۹؍دسمبر ۲۰۰۰ء آپ کے اس مضمون کے ساتھ ملا جس میں آپ نے احقر کے ''فقہی مقالات'' کے بارے میں کچھ اِشکالات ذکر فرمائے تھے۔ میں نے اس کا جواب اسی زمانے میں لکھنا شروع کردیا تھا، لیکن بعض مسائل میں مراجعت کی ضرورت تھی، اس لئے دُوسری مصروفیات حائل ہوگئیں، اور میں جواب مکمل نہ کرسکا۔ اتفاق سے مولانا محمد زاہد صاحب کچھ عرصہ پہلے تشریف لائے اور اَحقر نے آپ کی تحریر انہیں دِکھائی، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی اس پر غور فرمالیں، انہوں نے باقی ماندہ حصے کے بارے میں اپنی رائے خود ہی لکھ دی، میں نے اسے دیکھا تو مجھے وہ

دُرست معلوم ہوئی، اب یہ تحریر جس کا تقریباً نصف حصہ میرا لکھا ہوا ہے اور باقی نصف مولانا محمد زاہد صاحب کا (اور اَحقر کو اس سے اتفاق ہے) آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اور تاخیر پر شرمندہ و معذرت خواہ ہوں۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۴۲۲/۷/۲ھ

(اِشکالات کے جوابات از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

گرامی قدر و مکرّم جناب مفتی غلام قادر صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ منسلک تحریر موصول ہوئی، آپ نے جس دِقتِ نظر کے ساتھ اَحقر کے ''فقہی مقالات'' کا مطالعہ کیا، اور اس سلسلے میں اپنی آراء سے نوازا، اس کے لئے میں آپ کا تہِ دِل سے شکرگزار ہوں۔ اَحقر کی جب کوئی فقہی تحریر اہلِ علم کی نظر سے گزرتی ہے تو اَحقر کو خوشی ہوتی ہے، اور اس بات کی توقع قائم ہوتی ہے کہ اس سے تحریر پر نظرِ ثانی کا موقع ملے گا، جس سے غلطیوں کی اِصلاح ہوسکتی ہے۔ چونکہ آپ نے تبصرہ اِرسال فرماکر اَحقر سے بھی رَدِّعمل معلوم کیا ہے، اس لئے چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں:-

۱- ''مرابحہ مؤجلہ'' کے سلسلے میں اَحقر نے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ عبارتیں[۱] نقل کرنے کے باوجود جو خیال ظاہر کیا ہے کہ مصارفِ اسلامیہ کو اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے، اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:-

(الف) مرابحہ کے سلسلے میں یہ فتویٰ جو علامہ ابنِ عابدینؒ اور علامہ نجم الدین وغیرہ نے دیا ہے، یہ اصحابِ مذہب سے منقول نہیں، اصحابِ مذہب کا قول ''ضع وتعجل'' کے سلسلے میں معروف ہے،[۲] جو اَحقر نے بھی نقل کیا ہے، اس میں اصحابِ مذہب نے مرابحہ اور غیرمرابحہ میں کوئی تفریق نہیں فرمائی،[۳] لہٰذا یہ علمائے متاخرین کا فتویٰ ہے، جسے نہ اصحابِ مذہب کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، اور نہ اسے اس درجے کی قوّت حاصل ہے جو اَصحابِ مذہب کے اقوال کو ہوتی ہے۔

---

(۱) دیکھئے ردّ المحتار ج:۶ ص:۷۵۷، قبیل کتاب الفرائض، و ج:۵ ص:۱۶۰، و حاشیة الطحطاوی علی الدّرّ المختار ج:۳ ص:۱۰۴، و ج:۴ ص:۳۶۳.

(۲ و۳) وفی شرح السیر الکبیر للسرخسیّ رقم:۲۷۳۸ ج:۴ ص:۱۴۱۲ ضعوا وتعجّلوا ومعلوم ان مثل هٰذه المعاملة لا یجوز بین المسلمین فان من کان لهٗ علیٰ غیره دَین الٰی أجل فوضع عنه بعضه بشرط أن یعجّل بعضه لم یجز کره ذٰلک عمر و زید بن ثابت وابن عمر رضی اللہ عنهم.

نیز دیگر حوالہ جات کے لئے ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۰۰ تا ۱۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(ب) یہ دُرست ہے کہ ''مرابحہ مؤجلہ'' میں قیمت کا کچھ حصہ ''اجل'' کے مقابلے میں ہوتا ہے، لیکن ''اجل'' کے مقابلے میں ''عوض'' کا کچھ حصہ ہونا اس وقت جائز ہے جب یہ معاوضہ کسی بیع کے ضمن میں ہو، چنانچہ جہاں "اعتیاض عن الأجل" کو جائز کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اصل بیع کسی اور چیز کی ہے، اور ضمن میں ''اجل'' کی وجہ سے اس مبیع کی قیمت میں اضافہ کردیا ہے۔ اسی کو "هداية"[1] میں ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: "ألا ترى أن الثمن يزاد لأجل الأجل"[2] لیکن ''اجل'' ہی کو مقصود بنا کر اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، جس کو صاحبِ ہدایہ نے فرمایا: "الاعتياض عن الأجل حرام"[3] لہٰذا اگر اَصل مرابحہ میں اجل کی وجہ سے مبیع کی قیمت میں اضافہ کیا گیا تو یہ "اعتیاض عن الأجل" ضمنی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ "اعتیاض عن الأجل" ہے ہی نہیں، بلکہ پورا ثمن مبیع ہی کا ہے، البتہ اس کے تعین کے وقت ''اجل'' کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

لیکن اگر متأخرین کے مذکورہ بالا فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مشتری ''اجل'' سے پہلے ادائیگی کردے تو وہ قیمت میں کمی کا حق دار ہے تو اس صورت میں یہ "اعتیاض عن الأجل" ضمنی نہیں، بلکہ مقصود ہوگا، کیونکہ قیمت میں کمی کے وقت سوائے اجل کے اور کوئی چیز موجود نہیں۔

(ج) یہ کہنا کہ چونکہ ثمن میں اضافہ ''اجل'' کی وجہ سے کیا گیا ہے، لہٰذا تعجیل کے وقت وہ اضافہ ساقط ہونا چاہئے، اس لئے بھی محلِ نظر ہے کہ یہ اِستدلال اس وقت دُرست ہوسکتا ہے جب بائع نے اپنے طور پر مشتری کو تعجیل پر مجبور کیا ہو، لیکن جہاں مشتری خود اپنی طرف سے ثمن جلدی لے آیا، جبکہ بائع نے ایسا کوئی مطالبہ مشتری سے نہیں کیا تو یہ اِستدلال دُرست نہیں بنتا، کیونکہ اجل مشتری کا حق ہے، اور یہ حق بائع نے اس کو دیا ہوا ہے، پھر مشتری اس کو اِستعمال کرے یا نہ کرے، اس سے عقد کے مؤجل ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی بائع اب بھی اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ اجل کو استعمال کرے، لہٰذا اپنی طرف سے تعجیل کی صورت میں ثمن میں کمی کا لازمی مطالبہ دُرست نہیں۔

(د) مصارفِ اسلامیہ کے حالات کے پیشِ نظر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر وہاں اس فتویٰ پر عمل کیا گیا تو مآلِ کار سود کا وہی میٹر چلنا شروع ہوجائے گا۔

اِشکال نمبر۲:-

مرابحہ مؤجلہ اور بیع بالتقسیط میں حنابلہ کا یہ قول[4] اختیار کرنے کی تجویز دی گئی ہے کہ مدیون

(۱ و ۲) وفی الهداية كتاب البيوع ج:۳ ص:۷۸ (طبع مكتبة رحمانيه) الا يرىٰ انه يزاد فى الثمن لأجل الأجل.

(۳) وفی الهداية كتابُ الصلح بابُ الصلح فى الدَّين ج:۳ ص:۲۵۷ (طبع مكتبه رحمانيه) .... وذلک اعتياض عن الأجل وهو حرام.

(۴) دیکھئے: المغنی لابن قدامة كتاب المفلس ج:۴ ص:۴۸۶۔

کی موت کی صورت میں اگر ورثہ دَین کی رہن یا کفیل وغیرہ کے ذریعے توثیق کردیں تو دَین بدستور مؤجل رہے گا[۱]، اور موت کی وجہ سے حال نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ یہ اِفتاء بمذہب الغیر ہے جو بلاضرورتِ شدیدہ جائز نہیں۔ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ عام مسائل میں بالعموم اور معاملاتِ مالیہ کے مسائل میں بالخصوص ضرورتِ شدیدہ کی بجائے محض حاجتِ عامہ یا اِبتلائے عام کی وجہ سے بھی اکابر سے اِفتاء بمذہب الغیر منقول ہے[۲]، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کو یہ نصیحت فرمائی تھی[۳]، اور اِمداد الفتاویٰ جلد سوم میں بھی اس کی متعدّد مثالیں ملتی ہیں[۴]، لہٰذا جن بزرگوں نے ضرورتِ شدیدہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ان کی مراد بھی ضرورت سے حاجت ہی ہے، اور فقہائے کرامؒ کے کلام میں حاجت پر لفظِ ضرورت کے اطلاق کی مثالیں بہت سی ہیں[۵]۔ یہاں جس حاجت کی وجہ سے یا جس مشقت اور ضرر سے بچنے کے لئے یہ تجویز دی گئی ہے اس کا ذکر مذکورہ مقالہ ''قسطوں پر خرید وفروخت'' میں موجود ہے۔ باقی یہ بات کہ ایسی کوئی حاجت یا مشقت متحقق ہے یا نہیں تو اس کا تعلق اَمرِ واقعہ سے ہے جس میں ذوق یا تجربے یا مشاہدے کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہوجانا کوئی بعید بات نہیں۔ مذکورہ مقالہ دراصل مالیاتی اِداروں کے معاملات کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے، اور مالیاتی اِداروں کے معاملات میں مدیون کی موت پر دَین کے حال ہوجانے سے بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں، جس کا اندازہ ان اِداروں کے ساتھ تعامل رکھنے والوں کو بخوبی ہے، تاہم اگر یہ مشکل کسی طرح حل کرلی جائے تو یقیناً دَین کا حال ہوجانا راجح ہوگا۔

رہی یہ بات کہ اس صورت میں دَین اگر مؤجل رکھا جائے اور ترکہ حلول اجل سے پہلے تقسیم

---

(۱) دیکھئے: المغنی لابن قدامة کتاب المفلس ج:۴ ص:۴۸۶۔

(۳) نیز حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فتویٰ میں بھی تحریر فرمایا کہ: ضرورت کے وقت روایتِ غیر مفتیٰ بہا پر اور مذہبِ غیر پر عمل کرنا دُرست ہے، اگرچہ اَوْلیٰ نہیں خصوصاً اِضطراری وعمومِ بلویٰ میں۔ کذا فی ردّ المحتار، دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۹۸ (طبع قدیم ایچ ایم سعید)۔

(۲ و۴) جیسا کہ حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۰۶ میں سلم کے ایک مسئلے (وقتِ میعاد تک مبیع کے برابر پائے جانے میں ضرورت کی بناء پر اِمام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر، اور ج:۳ ص:۴۹۵ میں شرکت کے ایک مسئلے (عروض میں شرکت) میں ابتلائے عام کی بناء پر اِمام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(۵) **منها ما جاء فی تبیین الحقائق للزیلعیؒ کتاب الکراهیة ج:۷ ص:۲۷ (طبع سعید) ولا یقبل قول الکافر فی الدّیانات وانما یقبل قوله فی المعاملات خاصّة للضرورة .... والحاجة ماسة الیٰ قبول قوله لکثرة وقوع المعاملات ولا یقبل فی الدّیانات لعدم الحاجة ....الخ.**

وفی الاشباه والنظائر لابن نجیمؒ ج:۱ ص:۱۲۶ الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة کانت أو خاصّة.

کرلیا جائے تو آیت: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ" (النساء:۱۲) کے خلاف ہوگا تو اس کے بارے میں گزارش ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ انفاذِ وصیت اور ادائے دَین کے بعد جو کچھ بچے ورثہ کا حق صرف اسی میں ہے، یہ مقصد نہیں کہ عملاً بھی جب تک دَین ادا نہ ہوجائے اس وقت تک ورثہ کے لئے ترکے میں سے اپنا حصہ لینا بھی ناجائز ہے، آخر دَین کو حال قرار دے کر بھی تو یہ ممکن ہے کہ دائن از خود ورثہ کو مہلت دیدے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس مدّتِ مہلت کے دوران ورثہ ترکہ تقسیم کر لیتے ہیں تو فقہِ حنفی کی رُو سے بھی یہ ناجائز نہیں ہوگا۔

اِشکال نمبر۳:-

اس اِشکال کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ "حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت" کا اصل مقصود (جیسا کہ اس رسالے کی تمہید میں بھی ذکر کیا گیا ہے) حقِ مرور، حقِ تعلّی، حقِ تسییل اور حقِ شرب وغیرہ ان حقوق کے حکم کی تحقیق نہیں ہے جو فقہاء کے کلام میں صراحۃً مذکور ہیں، بلکہ اصل مقصود اس دور میں نئے پیدا ہونے والے حقوق جن کی خرید و فروخت آج کل بکثرت ہو رہی ہے کا حکم جاننے کی کوشش کرنا ہے، اس کے لئے ظاہر ہے کہ حقوق کی قدیم اقسام کے بارے میں فقہاء کی عبارات اور دلائل میں غور کرکے ان اُصول کا اِستنباط کرنا ہوگا جن کی بنیاد پر فقہاء نے یہ اَحکام ذکر کئے ہیں، اور ان اُصول کی روشنی میں حقوق کی جدید اقسام کی بیع یا نزول بعوض کا حکم معلوم ہوسکے گا۔

حقِ شرب کے بارے میں بھی رسالہ مذکورہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصود بھی بذاتِ خود حقِ شرب کی بیع کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فیصلہ کن بات کہنا نہیں ہے، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اصل مقصود اس مسئلے میں بھی فقہاء کی عبارات سے عمومی ضابطے کا اِستنباط ہے، اور لبِ لباب پوری بحث کا یہ ہے کہ بعض فقہاء نے تو عرف کی وجہ سے حقِ شرب کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، اور جن حضرات نے عرف کے باوجود ناجائز قرار دیا ہے اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ عرف وتعامل کے باوجود قابلِ بیع نہیں بنا، بلکہ ناجائز ہونے کی اصل وجہ ان فقہاء کے نزدیک غرر اور جہالت ہے، اور یہ بات ثابت کرنے کے لئے متعدّد عبارات کا حوالہ دیا گیا ہے اور آخر میں ان سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

> فقہائے اَحناف نے بیع شرب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقوق کے مسئلے میں بعینہٖ وہی باتیں معلوم ہوئیں جو حقِ مرور اور حقِ تسییل کی بیع کے مسئلے میں ان کی بحثوں سے معلوم ہوئیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "حق اگر کسی عین مال

سے متعلق ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی، بشرطیکہ وہاں کوئی مانع مثلاً غرر اور جہالت وغیرہ نہ پایا جائے۔[1]

جناب کے اِشکال کا بغور مطالعہ کرنے کے باوجود اس میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جو رسالے میں ذکر مذاہب اور عبارات سے اس قاعدے کے اِستنباط میں مانع ہو۔

باقی رہی جناب کی یہ بات کہ مذکورہ رسالے میں بیع شرب کے بارے میں صراحۃً رائے قائم نہیں کی گئی لیکن مصنف کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواز کے قائل ہیں۔ تو صریح رائے ذکر نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو اُوپر تمہید میں ذکر کی گئی کہ بذاتِ خود اس مسئلے کی تحقیق مقصود نہیں بلکہ مقصود اُصول کا اِستنباط ہے، مصنف کی رائے جو پوری بحث سے سمجھ میں آتی ہے وہ مطلقاً جواز کی نہیں ہے بلکہ پوری بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شرب کی بیع غرر اور جہالت کی وجہ سے ناجائز ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ عرف اور تعامل کے باوجود قابلِ بیع بننے کی بذاتِ خود صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا اگر کہیں اس کی بیع کا عرف ہو اور غرر اور جہالت بھی نہ پائی جائے (مثلاً جدید آلات سے پانی کی پیمائش ممکن ہو) تو ان فقہاء کی عبارات کی رُو سے یہ بیع جائز ہوگی، اور یہ محض ایک آدھ فقیہ کی رائے نہیں ہے بلکہ رسالے میں ذکر کردہ تمام عبارات سے یہی بات نکلتی ہے۔

اِشکال نمبر۴:-

جناب نے یہ اِشکال فرمایا ہے کہ پہلے تو لکھا گیا ہے کہ فقہائے مالکیہ وحنفیہ کے ہاں حقِ اسبقیت کی بیع کا حکم ان کی کتابوں میں نہیں ملا، اور پھر آگے چل کر حکم لکھ بھی دیا ہے، ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ حکم لکھتے وقت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ یہ حکم ان کتابوں میں مصرّح ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ حکم ان کے قواعد سے سمجھ میں آتا ہے اور یہ قواعد رسالے میں پہلے تفصیل سے بیان ہوچکے ہیں۔ جناب نے تحریر فرمایا ہے: ''آخر اس قیاس آرائی کی کیا ضرورت ہے؟ راجح یہ ہے کہ حقِ اسبقیت کی بیع بھی جائز نہیں'' مذکورہ رسالے میں بھی عدمِ جواز ہی کو قیاس کا تقاضا قرار دیا گیا ہے، البتہ اگر یہ بات قیاس آرائی کے بغیر کسی صریح جزئیہ سے ثابت ہو رہی ہے تو اُمید ہے کہ جناب اس سے مطلع فرما کر احسان فرمائیں گے۔

باقی رہی حقِ اسبقیت سے نزول بعوض کی بات تو یہ بات پہلے ص:۱۶۶ پر بیری، شامی اور

---

(۱) ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۸۹ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

ص:۱۹۰ پر اتاسی کے حوالے سے لکھی جاچکی ہے کہ جوحق اِصالۃً ثابت ہو دفعِ ضرر کے طور پر نہ ہو ان سے صلح کرنا اور عوض لینا جائز ہے، یاد رہے کہ یہ قاعدہ اتاسی نے اپنی رائے کے طور پر نہیں لکھا بلکہ دُوسرے فقہاء سے نقل کیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے: ''أقول: وعلیٰ ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ....الخ.''(۱)

اِشکال نمبر ۵ و ۶:-

اس اِشکال کا حاصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پگڑی کی مروّجہ شکل کا جو متبادل پیش کیا گیا ہے اس میں بھی اسی پگڑی کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ اشتباہ بظاہر درج ذیل اُمور کی طرف دھیان نہ جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:-

۱- مروّجہ پگڑی میں لی گئی رقم شرعاً کسی بھی قابلِ اعتیاض چیز کا عوض نہیں ہے، جبکہ یہاں پیشگی لی گئی رقم اُجرت کا حصہ ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ یکمشت رقم ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کرائے کا حصہ ہی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ کرایہ کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا گیا ہے، ایک حصہ یکمشت پیشگی وصول کرلیا گیا ہے اور دُوسرا ماہانہ یا سالانہ وصول ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے اِجارہ فسخ ہوجائے تو یکمشت رقم میں سے باقی ماندہ مدّت کے مقابل جو رقم آئے گی وہ مؤجر مستأجر کو واپس کرے گا، اسی طرح اگر مالکِ مکان یا دُکان مستأجر کو مقرّرہ مدّت سے پہلے نکالنا اور بغیر عذرِ شرعی کے اِجارہ فسخ کرنا چاہتا ہے اور مستأجر نے عوض کا مطالبہ کئے بغیر رضامندی سے اِجارہ فسخ کردیا تو بعد میں کسی عوض کا مطالبہ نہیں کرسکتا صرف باقی ماندہ مدّت کی رقم وصول کرسکتا ہے۔

۲- مکان یا دُکان مقرّرہ مدّت سے پہلے خالی کرنے کی صورت میں مستأجر پگڑی کی جو رقم واپس لیتا ہے وہ مروّجہ پگڑی میں کسی ثابت شدہ حق کا عوض نہیں ہوتا، جبکہ یہاں مدّتِ مقرّرہ تک اِجارہ کرنے سے اسے قرار کا حق حاصل ہوگیا ہے جو ایک عین کے ساتھ متعلق ہے، اور شفعہ کی طرح صرف دفعِ ضرر کے لئے مشروع نہیں ہے، اس لئے اس کی بیع جائز نہ بھی ہو تب بھی پہلے ثابت شدہ قاعدے کے مطابق نزول بعوض جائز ہے، یہاں مستأجر کو اصل حق رقم وصول کرنے کا نہیں مل رہا، بلکہ قرار کا حق مل رہا ہے، لہٰذا اس کے پاس پہلا اختیار یہی ہے کہ وہ اَڑ جائے کہ میں مقرّرہ مدّت سے پہلے نہیں نکلوں گا، معاوضہ لے کر دستبرداری تو صلح کی ایک شکل ہے۔

---

(۱) دیکھئے: ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع میمن اسلامک پبلشرز)۔

جناب نے یہ جو کہا ہے کہ حقِ کرایہ داری کا عوض لینے کے جواز کی نسبت فقہائے حنفیہ کی طرف دُرست نہیں، بلکہ یہ محض مصنف کا قیاس اور علمائے جدہ کی رائے ہے، تو اصل بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ کتبِ فقہ میں صراحۃً تو مذکور نہیں، جس طرح جواز مصرّح نہیں، اسی طرح عدمِ جواز بھی مصرّح نہیں، ایسی صورت میں دُوسرے فقہی نظائر اور قواعد سے ہی حکم لگانا پڑتا ہے، یہاں بھی یہ حکم پہلے تفصیل سے ذکر کردہ قواعد اور نظائر ہی کی روشنی میں لگایا گیا ہے۔[1]

حکومت کی طرف سے ملنے والی چیز اگر ضرورت سے زائد ہو تو اسے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:- میں جو دھندا کرتا ہوں اُس کے لئے چینی کی ضرورت ہوتی ہے، اور مجھے حکومت کی طرف سے ڈیڑھ من چینی ملتی ہے، دھندا کم ہونے سے کبھی وہ چینی بچ جاتی ہے، کیا یہ چینی مناسب نفع پر بیچ سکتا ہوں؟

جواب:- بیچ سکتے ہیں۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۴ھ

مکان بنا کر کرایہ پر دینے یا این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت کرنے میں سے کونسی صورت بہتر ہے؟

سوال:- زید کے پاس کچھ رقم ہے، اس کے ذہن میں آمدنی حاصل کرنے کی چند صورتیں ہیں، آپ ہی اس کا فیصلہ کریں۔ ایک تو یہ کہ مکان بنا کر کرایہ پر دیں۔ ثانیاً گورنمنٹ کے جاری کردہ این.آئی.ٹی یونٹ میں شرکت ہے۔ بعض لوگ تجارتی مکان بنانے کو دُرست نہیں جانتے۔

جواب:- مکان بنا کر کرایہ پر دینا بلاشبہ جائز ہے، اور اس کام میں رقم لگائی جاسکتی ہے۔ البتہ این.آئی.ٹی کے طریقۂ کار کی ہمیں تحقیق نہیں ہے، اس کا مفصل طریقۂ کار معلوم کرکے آپ بھیج دیں تو جواب دیا جاسکے گا، خاص طور سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم کی جائیں: ۱-اس میں نفع کسی معین شرح سے تقسیم ہوتا ہے یا متناسب طریقے سے؟ ۲-یونٹ خریدنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت کرتا ہے یا نہیں؟ ۳-عوام کی رقم کس کام میں لگائی جاتی ہے؟　　واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۹ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے ''فقہی مقالات'' ج:۱ ص:۲۱۷ و ۲۱۸ (طبع میمن اسلامک پبلشرز) ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

حکومت کے لئے اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرنے کا حکم

سوال:- جن چیزوں پر کمپنی کی طرف سے قیمت نوٹ ہوتی ہے ان سے زائد رقم پر ڈیلر فروخت کرسکتا ہے؟ اور جن چیزوں پر گورنمنٹ نے کنٹرول کردیا ہے ان کو مقرّرہ قیمت سے زائد پر فروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب:- جب عوام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حکومت کو اَشیاء کے نرخ پر کنٹرول کرنا جائز ہے، ایسی صورت میں متعین قیمت سے زائد میں مال فروخت کرنا تاجروں کے لئے جائز نہیں ہے۔ درمختار میں ہے: ”اذا تعدی أرباب غیر القوتین وظلموا علی العامة فیسعّر علیهم الحاکم بناء علی ما قال ابو یوسفؒ ینبغی أن یجوز“۔(۱) اور علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: ”ان الامام یری الحجر اذا عم الضّرر کما فی المفتی الماجن والمکاری المفلس والطبیب الجاهل وهٰذه قضیة عامة فتدخل مسئلتنا فیها لأنّ التسعیر الحجر معنًی لأنه منع عن البیع بزیادة فاحشة وعلیه فلا یکون مبنیًا علیٰ قول ابی یوسفؒ“ فقط۔ (شامی ج:۵ ص:۳۵۳)(۲)۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۰۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

دُکان دار کے بیٹے کا اپنے والد کی دُکان سے مال کسی کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا

سوال:- ایک شخص دُکان دار ہے، اس کے تین بیٹے ہیں، دو دُکان پر والد کے ساتھ کام کرتے ہیں، ایک تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس شخص کا بڑا لڑکا جو ہے وہ بندہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ آپ کی چھوٹی سی دُکان ہے، غریب آدمی ہیں، آپ میرے سے سامان قیمتِ خرید پر کم وبیش خرید لیا کریں، میں رعایت پر دے دیا کروں گا بشرطیکہ میرے والد اور میرے چھوٹے بھائی کو

---

(۱) الدر المختار ج:۶ ص:۴۰۰ کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع (طبع سعید).

(۲) ردّ المحتار علی الدر المختار ج:۶ ص:۴۰۱، وکذا فی البحر الرائق ج:۸ ص:۳۷۰، کتاب الکراهیة (طبع رشیدیه)، کذا فی المحیط البرهانی ج:۸ ص:۲۶۸ (طبع مکتبه غفاریه).

علم نہ ہو، اگر ان کو علم ہوگیا تو وہ ناراض ہوں گے۔ آپ فتویٰ دیں کہ بندہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- وہ بڑا لڑکا اگر بحیثیت ملازم کے دُکان پر کام کرتا ہے تو اس کے لئے مالک یعنی والد کی مرضی کے بغیر رعایۃً سامان فروخت کرنا جائز نہیں،[۱] ایسی صورت میں اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی جائز نہ ہوگا،[۲] اور اگر وہ دُکان میں حصہ دار ہے تب بھی یہی حکم ہے کہ باقی شرکاء کی مرضی کے بغیر ایسی رعایت سے سامان فروخت کرنا اس کے لئے جائز نہیں جو عام طور سے تاجر نہ کرتے ہوں،[۳] ہاں اگر دُکان کا مالک وہی ہو اور باپ اور بھائی اس میں بطورِ ملازم یا تبرّعاً کام کرتے ہوں تو اس صورت میں اس کے لئے رعایت کرنا بھی جائز ہے،[۴] اور آپ کے لئے اس سے رعایت پر سامان خریدنا بھی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۹۸/۳۲ ج)

---

(۱) فی مشکوٰۃ المصابیح ج:۱ ص:۲۶۱ (طبع رحمانیہ) "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ."

فی الدر ج:۶ ص:۲۰۰ لا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنہ ولا ولایتہ .... اھ.

(۲) فی الدّر المختار ج:۵ ص:۹۸ (طبع سعید) الحرمۃ تتعدد مع العلم بھا. وقال الشامیؒ تحتہ: امّا لو رأی المکاس مثلًا یأخذ من أحد شیئًا من المکس ثم یعطیہ آخر ثم یأخذ من ذٰلک الآخر فھو حرامٌ.

وفیہ أیضًا قبل ذٰلک وما نقل عن بعض الحنفیۃ من أن الحرام لا یتعدی ذمتین سألت عنہ الشھاب بن الشلبی فقال: ھو محمول علٰی ما اذا لم یعلم بذٰلک.

وفی الاشباہ الحظر والاباحۃ ص:۸۸ الحرمۃ تتعدی مع الأموال مع العلم الّا فی حق الوارث .... الخ.

(۳) وفی شرح المجلّۃ لسلیم رستم باز ص:۶۵۴ رقم المادّۃ:۱۱۹۲ (طبع حنفیہ کوئٹہ) کل یتصرّف فی ملکہ کیف یشاء.

وکذا فی شرح المجلّۃ للأتاسیؒ ج:۴ ص:۱۳۲ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ).

وفی بدائع الصنائع کتاب الشرب ج:۶ ص:۱۹۰ (طبع سعید) وحق الکل متعلق بالماء ولا سبیل الی التصرف فی الملک المشترک والحق المشترک الا برضاء الشرکاء.

وفی تبیین الحقائق شرح کنز الدّقائق کتاب الشرکۃ ج:۴ ص:۲۳۵ (طبع سعید) وکل اجنبی فی قسط صاحبہ أی وکل واحد منھما أجنبی فی نصیب صاحبہٖ حتّٰی لا یجوز لہٗ أن یتصرّف فیہ الّا باذنہٖ کما لغیرہ من الأجانب .... الخ.

وفی مجمع الأنھر شرح ملتقی الأبحر أوائل کتاب الشرکۃ (الشرکۃ ضربان) (وکل منھما) أی کل واحدٍ من الشریکین أو الشرکاء شرکۃ ملک أجنبی فی نصیب الآخر حتّٰی لا یجوز لہ التّصرف فیہ الّا باذن الآخر کغیر الشریک لعدم تضمنھا الوکالۃ .... الخ.

(۴) وفی الھدایۃ باب الکراھیۃ فصل فی البیع ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع رحمانیہ) ولأنّ الثمن حق العاقد فالیہ تقدیرہٗ ....الخ.

وفی الھندیۃ ج:۳ ص:۱۷۳ حطّ بعض الثمن صحیح ویلتحق بأصل العقد عندنا کالزیادۃ .... الخ.

وفی الھدایۃ ج:۳ ص:۸۰ (طبع رحمانیہ) ویجوز للمشتری ان یزید البائع فی الثمن ویجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع ویجوز ان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذٰلک .... الخ.

وکذا فی الدّر المختار فصل فی التصرف فی المبیع والثمن قبل القبض والزیادۃ والحط فیھا ج:۵ ص:۱۵۴.

Sky Biz 2000 کی ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا

سوال:- محترم ومکرم عالی جناب قبلہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب، زادکم اللہ علماً وشرفاً

بعد سلامِ مسنون، امریکا میں تلسا اوکلا میں دسمبر ۱۹۹۸ء میں ایک کمپنی کی ابتداء ہوئی ہے، اس کمپنی کا نام ''اسکائے بیز ۲۰۰۰'' (Sky Biz 2000) ہے، اس کمپنی کا کام ملٹی لیول مارکیٹنگ (Multy Level Marketing) کا ہے۔

۱- سوال یہ ہے کہ میں نے اس کمپنی کی ویب سائٹ (Web-Site) خریدی ہے جس کے ذریعے میں اپنے کاروبار کو پوری دُنیا میں پھیلا سکتا ہوں، جبکہ اخبارات کے ذریعے یہی اِشتہار اگر دیا جاتا تو جہاں تک وہ اخبار جاتا ہے وہاں تک اپنے کاروبار کی پبلسٹی (Publicity) ہوتی ہے، لیکن ویب سائٹ کے ذریعے عالمی پیمانے پر پبلسٹی ہوسکتی ہے۔ اس کمپنی کے ممبر بننے سے دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ کمپنی انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف قسم کی تعلیمات دیتی ہے، مثلاً یہ کمپنی حسبِ ذیل تعلیم اپنے ممبران کو دیتی ہے:

۱- ونڈوز ۹۵(Windows 95)، ۲- ونڈوز ۹۸(Windows 98)، ۳- ونڈوز ۳.۱(Windows 3.1)، ۴- انٹرنیٹ ایجوکیشن، ۵- ویب سائٹ ایجوکیشن، ۶- ویب بلڈر(Web Builder)، ۷- لنک سرچنگ، ۸- ہوم بیزک بزنس وغیرہ۔

اگر مذکورہ تعلیمات مجھے اور میرے گھر کے افراد کو کسی کلاس میں جاکر حاصل کرنا ہو تو اس سب ہی افراد کی مجھے الگ الگ فیس دینی پڑے گی۔ دوم یہ کہ ہمیں اس کلاس کے اوقات کی پابندی کرنی ہوگی، جبکہ اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر اور ممبر بن کر ایک ہی فیس سے میں اور میرے گھر کے سارے افراد اپنی فرصت کے وقت مذکورہ تعلیمات حاصل کر سکتے ہیں، جس میں ظاہر ہے کہ پیسوں کی بھی بچت ہے اور وقت کی عدمِ پابندی یہ بھی بہت بڑا فائدہ ہے۔

۲- اس کمپنی سے جو بھی چھ ہزار ایک سو روپے دے کر ویب سائٹ خریدتا ہے یا اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرتا ہے تو کمپنی اپنی ویب سائٹ کے خریدار کو ایک کاروبار بھی دیتی ہے، اپنی کمپنی کے ممبر کو ایک ایجنسی دیتی ہے، جس میں کمپنی کی طرف سے یہ شرط ہے کہ بننے والا ممبر کمپنی کے نو ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرے جس میں ایک دایاں اور ایک بایاں(Left, Right) ہوتا ہے، ایک ہی طرف نو ممبر نہ ہوں، بلکہ ایک طرف چار ہوں تو دُوسری طرف پانچ، ایک طرف چھ تو دُوسری طرف تین، اس طریقے سے ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے پر کمپنی ستر ڈالر کا چیک ایجنٹ پر بھیجتی ہے، اسی

طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے مثلاً نو خریدار تیار کرنے پر ستر ڈالر، پھر اٹھارہ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۲۷ پر ۳۵ ڈالر، پھر ۳۶ پر ۷۰ ڈالر علیٰ ہذا القیاس، اسی طرح یہ کمپنی اپنے ایجنٹ کو کمیشن دیتی رہتی ہے۔

۳- یہ کمپنی کمپیوٹر سوفٹ ویئر، ہارڈ ویئر، اور پہننے کے کپڑے وغیرہ بناتی ہے، تو اس طریقے سے ویب سائٹ خرید کر ایجنٹ بن کر کاروبار کرنے میں جس کی تفصیل اُوپر بتائی گئی ہے، نیز ویب سائٹ کے خریدار کو تیار کرنے میں ہمیں اپنا وقت لگانا پڑتا ہے، اپنی گاڑی، اپنا فون استعمال کرنا ہوتا ہے، یعنی کہ اچھی خاص محنت کے بعد خریدار تیار ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں کمپنی کمیشن کے طور پر اپنے نفع میں سے ایجنٹ کو نفع دیتی ہے، جس کی تفصیل اُوپر ذکر کی گئی۔

اب دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ میں اس کمپنی سے ویب سائٹ خرید کر انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کاروبار کو عالمی پیمانے کا بنانا چاہتا ہوں، نیز کمپنی کا ممبر بن کر مذکورہ بالا تعلیمات حاصل کرنا چاہتا ہوں، نیز ایجنٹ اس طریقے پر محنت کر کے کمپنی کے ویب سائٹ کے خریدار تیار کر کے اپنی محنت کے عوض کمپنی سے کمیشن لینا چاہتا ہوں، تو میرا یہ کمیشن لینا کیسا ہے؟ کیا شرعی اعتبار سے مجھے اجازت حاصل ہے یا نہیں؟ اُمید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

والسلام
محمد علی سیر گر
نگینہ محل، راندیر، سورت

خادم دارالافتاء دارالعلوم اشرفیہ راندیر	خادم دارالافتاء اشرفیہ، راندیر	خادم دارالافتاء اشرفیہ
عارف حسن عثمانی	محمد اکرام الدین غفرلہٗ	محمد کلیم لوہاروی

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ویب سائٹ خریدنا اور اس کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا، نیز اس کمپنی کا ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا جائز ہے، البتہ یہ تمام معاملات الگ الگ ہونے چاہئیں[۱]، یعنی کمپنی کا ممبر بن کر تعلیم حاصل کرنا ایجنٹ بننے سے مشروط نہ ہو،[۲] بلکہ تمام معاملات ایک دُوسرے سے الگ ہوں۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۱/۱۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸/۴۷۰)

مختلف کمپیوٹر سوفٹ ویئرز خریدنے کا حکم
(جبکہ بعض سوفٹ ویئرز چوری کے ہوتے ہیں)

سوال:- میں ایک کمپیوٹر سائنس کالج کا طالب علم ہوں، ہمیں سوفٹ ویئر کی اکثر ضرورت

(۱ و ۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۸۷ کا حاشیہ نمبرا وص:۵۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲۔

رہتی ہے، اور نئے سے نئے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہم کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں پوری دُنیا کے برابر چل سکیں، اس ضرورت کے پیشِ نظر ہم چند طلباء نے مل کر ایک سوسائٹی کے تحت یہ کام شروع کیا کہ ہم کالج کے پیسوں سے یا طلباء کے پیسوں سے مختلف اور نئے سوفٹ ویئرز خرید کر طلباء کو مفت گھر میں Instalation کے لئے دیں، کیونکہ تمام طلباء یہ سوفٹ ویئرز نہیں خرید سکتے اس کے لئے کالج نے اجازت اور سرمایہ بھی ہمیں دے دیا تھا، مگر چند لوگوں نے کہا کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے سوفٹ ویئرز چوری کے (Pirated) ہوتے ہیں، پھر لوگ اس کی کاپیاں کر کے تقسیم کرتے ہیں، کیا تعلیم اور فلاح و بہبود کے لئے ایسا سوفٹ ویئر استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب:- مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کلی طور پر یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ پاکستان میں استعمال ہونے والے تمام سوفٹ ویئرز چوری کے ہوتے ہیں، لہٰذا اس مفروضے پر خریداری کو بالکلیہ ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ جو شخص سوفٹ ویئر بیچ رہا ہے، اس بات کا ذمہ دار وہ خود ہے کہ وہ کہاں سے کس طرح لایا؟ جب تک ہمیں متعین طور پر یقین سے معلوم نہ ہو کہ یہ چوری کا ہے، ہم خرید سکتے ہیں۔ (۱)

والسلام

۱۴۲۰/۹/۲۵ھ

---

(۱) وفی فیض القدیر رقم الحدیث:۸۴۴۳ ج:۱۱ ص:۵۶۵۴ (طبع مکتبہ مصطفی الباز، الریاض) من اشتریٰ سرقةً وھو یعلم أنّھا سرقة فقد شرک فی عارھا واثمھا.

وفی الشامیة ج:۵ ص:۹۸ نقل الحموی عن سیدی عبدالوھاب الشعرانی أنه قال فی کتابه المنن، وما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا یتعدی ذمتین سألت عنه الشھاب بن الشلبی فقال ھو محمول علیٰ ما اذا لم یعلم بذٰلک، اما لو رای المکاس مثلًا یأخذ من أحد شیئًا من المکس ثم یعطیه آخر ثم یأخذ من ذٰلک الآخر فھو حرام.

وفی أحکام المال الحرام ص:۲۳۳ فمن علمت أنه سرقة أو خانه فی أمانة .... لم یجز ان أخذه منه لا بطریق الھبة ولا بطریق المعاوضة .... الخ.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۹۸ الحرمة تتعدّد مع العلم بھا الّا فی حقّ الوارث .... الخ.

وفی الھندیة ج:۵ ص:۳۶۴ کل عین قائمة یغلب علیٰ ظنّه أنّھم أخذوھا من الغیر بالظّلم وباعوھا فی السّوق فانّه لا ینبغی أن یشتری ذٰلک وان تداولتھا الأیدی.

وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۵۴ رجل علم بجاریة أنّھا لرجل فرأی یبیعھا ویقول وکلنی صاحبھا ببیعھا وسعه أن یبتاعھا منه.

نیز ''چوری کے مال کی بیع'' سے متعلق دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۴۹۹ (طبع سعید)۔

اخبار کا بِل ایڈوانس دینے کی صورت میں اخبار کے ادارے کی طرف سے مختلف رعایتوں اور گاہک کی انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- میں یہاں پر شائع کردہ انگریزی زبان کا اخبار روزانہ خریدتا ہوں، اس کی Payment کی صورت مندرجہ ذیل طریقے سے ہوسکتی ہے:-

ہر ماہ کے اختتام پر مہینہ کا بل دے دیا جائے۔

ہر۳ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

ہر٦ ماہ کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

پورے ایک سال کا ایڈوانس دے دیا جائے۔

ان تینوں صورتوں میں اخبار والوں کی طرف سے دو سہولتیں ملتی ہیں، ۱-اخبار مجموعی طور پر سستا پڑتا ہے،۲-اخبار والے بغیر کوئی اضافی رقم لئے اسی اخبار کے ایڈوانس میں اتنی ہی مدّت کے لئے Accident Insurance کرلیتے ہیں، یعنی اگر موت کسی حادثے کی وجہ سے ہوجائے تو اخبار کی طرف سے لواحقین کو مخصوص رقم دے دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ اخبار والوں نے اپنے اخبار کی Sale کو بڑھانے کے لئے کیا ہوا ہے، کیا اس ٹائپ کی Insurance کروانا جائز ہے؟ جہاں کہ کوئی اضافی Premium وغیرہ نہ دینا پڑے۔

ڈاکٹر ظہور احمد بمعرفت مولانا خلیل احمد صاحب
(ابوظبی، متحدہ عرب امارات)

جواب:- اخبار کا بل ایڈوانس دینے کی صورت میں جو رعایت خریدار کو ملتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خریدار نے ادارے کو رقم قرض دے دی ہے، اس لئے وہ قرض کے مقابلے میں رعایت دے رہا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رعایت جائز نہ ہو،[1] کیونکہ یہ ایک نفع ہے جو قرض سے حاصل کیا گیا۔[2] لیکن دُوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ رعایت قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ خریدار کے مستقل گاہک ہونے کی وجہ سے ہے، اور چونکہ یہ تاجروں کا طریقہ ہے کہ اپنے

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

مستقل گاہکوں کو رعایت دیا کرتے ہیں، اس لئے وہ یہ رعایت دے رہے ہیں اور پیشگی رقم کا مطالبہ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہے کہ یہ شخص واقعۃً مقرّرہ مدّت تک اخبار خریدتا رہے گا۔ اس صورت میں یہ رعایت شرعاً جائز ہے،[1] اور مذکورہ معاملے میں احقر کو یہی صورت راجح معلوم ہوتی ہے،[2] تاجروں کا عرف اور علمائے عصر کا تعامل بھی اس کی تائید کرتا ہے،[3] لہٰذا احقر کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس رعایت کو لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ رہا انشورنس کا معاملہ! سو اگر انشورنس کی یہ رقم اخبار کا ادارہ خود ادا کرتا ہے، اور یہ کسی بیمہ کمپنی سے وصول نہیں کرنی پڑتی، تو مذکورہ صورت میں اس کے لینے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس انشورنس کے لئے اخبار کے خریدار نے کوئی پریمیم ادا نہیں کیا، یہ یک طرفہ اِنعام ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف تاجر اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے یک طرفہ طور پر مختلف اِنعامات کا اعلان کرتے رہتے ہیں، خریدار کو اپنی رقم کا پورا پورا معاوضہ خریدی ہوئی چیز کی صورت میں مل جاتا ہے، اور ملنے والا اِنعام تاجر کی طرف سے یک طرفہ اِنعام ہوتا ہے۔[4]

البتہ اگر یہ رقم انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہو، تو وہ دو وجہ سے ناجائز ہے، اوّل تو اس لئے کہ اس صورت میں اخبار کا ادارہ ضرور انشورنس کمپنی کو کوئی پریمیم ادا کرے گا، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ کمپنی کے ساتھ سود اور قمار کا معاملہ کرے گا، اور یہ رقم اس حرام معاملے کے نتیجے میں حاصل ہوگی، دُوسرے یہ کہ انشورنس کمپنی کی بیشتر آمدنی سود یا قمار پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس سے رقم لینا بھی جائز نہ ہوگا۔

والسلام
۲۲/۱۱/۱۴۱۴ھ

(۱ تا ۳) وفی الشامیة ج:۴ ص:۵۱۶ ولو أعطاه دراهم وجعل یأخذ منه کل یوم خمسة أمناء ولم یقل فی الابتداء اشتریت منک یجوز وهٰذا حلال وان کانت نیته وقت الدفع الشراء لأنه بمجرد النیة لا ینعقد البیع وانما ینعقد البیع الآن بالتعاطی والآن البیع معلومٌ فینعقد البیع صحیحًا قلت ووجهه ان ثمن الخبز معلوم فاذا انعقد بیعًا بالتعاطی وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله ...الخ. اور جب یہ رقم اخبارات کا ثمن ہے تو ثمن میں رعایت شرعاً جائز ہے۔
وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۷۱ (طبع رشیدیه) الزیادة فی الثمن والمثمن جائزة حال قیامهما ...الخ (الباب السادس عشر فی الزیادة فی الثمن والمثمن والحط والابراء عن الثمن).
وفی الهدایة ج:۳ ص:۸۰ (طبع رحمانیه) ویجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحطّ عن الثمن ویتعلّق الاستحقاق بجمیع ذٰلک. وفی حاشیته لأن الزیادة لما التحقت بأصل العقد صارت کالموجودة عند العقد.
نیز تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۱۱۳ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱ تا نمبر۴۔
(۴) وفی الهندیة ج:۳ ص:۱۷۳ حطّ بعض الثمن صحیح ویلتحق بأصل العقد عندنا کالزّیادة .... الخ.
وفی شرح المجلّة لخالد الأتاسی ج:۲ ص:۱۸۲ رقم المادّة:۲۵۶ حطّ البائع مقدارًا من الثمن المسمّٰی بعد العقد صحیحٌ ومعتبرٌ وکذا حطّ جمیعه ...... وبعد أسطر ...... وهٰذا اذا کان بلفظ الحطّ ومثله.
وکذا فی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۴۷ فصل فی التصرّف فی المبیع والثمن قبل القبض والزّیادة والحطّ فیها .... الخ.
وکذا فی مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج:۴ ص:۱۱۶.

کیا نفع کی شرعاً کوئی حد متعین ہے یا نہیں؟

سوال:- کیا کاروبار میں نفع کی کوئی حد شرعاً مقرّر ہے؟ شرعی نقطۂ نظر سے اگر کوئی شخص زیادہ نفع لے تو یہ دُرست ہے؟ طلعت محمود، راولپنڈی

جواب:- کاروبار میں شرعاً نفع کی کوئی حد مقرّر نہیں ہے،[۱] البتہ دھوکا نہیں ہونا چاہئے،[۲] پھر اپنے حالات کے لحاظ سے جتنا نفع کوئی لینا چاہے اس پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔[۳] والسلام

۲۸/۶/۱۴۱۱ھ

تجارتی اِنعامی اسکیموں کا شرعی حکم

حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے تجارتی اِنعامی اسکیموں سے متعلق درج ذیل مضمون لکھ کر حضرتِ والا دامت برکاتہم سے رائے طلب کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جس کا حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، مضمون اور اس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے درج ذیل ہے۔ (مرتب)

اِنعام وہ ہوتا ہے جو کسی مطلوب وصف پر حوصلہ افزائی کے لئے دیا جاتا ہے، مثلاً امتحان میں اوّل و دوم وغیرہ آنے پر اِنعام دیا جاتا ہے تاکہ علم میں جس کا سیکھنا مطلوب وصف ہے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے یا گھڑ دوڑ میں جو اوّل و دوم آئے اس کو اِنعام دیا جاتا ہے کیونکہ گھڑ دوڑ میں جہاد کی تربیت ہے اور یہ تربیت حاصل کرنا وصفِ مطلوب ہے، پیدل دوڑ اور تیراکی وغیرہ بھی جہاد کی تربیت کی نیت سے ہوں تو یہ بھی مطلوب ہیں۔

ولا بأس بالمسابقة في الرمي والفرس والبغل والحمار والابل وعلى الأقدام لأنه من أسباب الجهاد فكان مندوبًا وعند الثلاثة لا يجوز في الأقدام أي بالجعل أما بدونه فيباح في كل الملاعب. (در مختار ج:۵ ص:۲۸۵).

(۱ و ۳) وفي سنن ابن ماجة باب من كره أن يسعّر ص:۱۵۹ (طبع قديمي كتب خانه) عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: غلا السّعر علىٰ عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالوا: يا رسول الله! قد غلا السعر فسعّر لنا، فقال: ان الله هو المسعر القابض الباسط الرّازق.

وفي الهندية ج:۳ ص:۱۳۱ (طبع رشيديه) من اشترىٰ شيئًا وأغلى في ثمنه جاز .... الخ.

وفي الهداية ج:۴ ص:۴۷۲ (طبع مكتبه رحمانيه) ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه السلام: لا تسعّروا فانّ الله هو المسعّر القابض الباسط الرّازق. ولأنّ الثمن حقّ العاقد فاليه تقديره فلا ينبغي للامام أن يتعرّض لحقّه الّا اذا تعلّق به دفع ضرر العامّة.

وكذا في بدائع الصنائع ج:۵ ص:۱۲۹ والدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعيد)

وفي البحوث في قضايا فقهية معاصرة ص:۸ وللبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائمًا وللتّجار ملاحظ مختلفة في تعيين الأثمان وتقديرها .... الخ.

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۰۲ تا ص:۱۰۴ کے حواشی۔ (۴) ج۶،ص:۴۰۲ طبع سعید

(قوله فيباح في كل الملاعب) أي التي تعلم الفروسة وتعين على الجهاد لأن جواز الجعل فيما مر انما ثبت بالحديث علىٰ خلاف القياس فيجوز ما عداها بدون الجعل وفي القهستاني عن الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوز وعن الجواهر قد جاء الأثر في رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهي فانه مكروه. (ردّ المحتار ج:٦ ص:۴٠۲).

حل الجعل وطاب ..... ان شرط المال في المسابقة من جانب واحد وحرم لو شرط فيها من الجانبين لأنه يصير قمارًا الّا اذا أدخلا ثالثًا محلّلًا بينهما بفرس كفء لفرسيهما يتوهم أن يسبقهما والّا لم يجز ..... وكذا الحكم في المتفقهة فاذا شرط لمن معه الصواب صح. (در مختار ج:٦ ص:۴٠٣) وان شرطاه لكل علىٰ صاحبه لا والمصارعة ليست ببدعة الّا للتلهي فتكره ..... وأما السباق بلا جعل فيجوز في كل شيء (أي مما يعلم الفروسية ويعين على الجهاد بلا قصد التلهي...... (در مختار و ردّ المحتار ج:٦ ص:۴٠۴).

مذکورہ بالا ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسابقت یا تو علم میں مہارت حاصل کرنے میں جائز ہے یا صرف ان کاموں میں جائز ہے جن میں جہاد کی تربیت ہو اور وہ بھی جبکہ جہاد کی نیت سے ہو، اگر محض کھیل کود کے طور پر ہو تو اس وقت مسابقت اگرچہ بغیر اِنعام کے ہو مکروہ ہے، جہاد کی تربیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے دوطرفہ اِنعام تک کو جائز رکھا، مگر قمار سے نکالنے کے لئے اس میں محلل کو داخل کیا۔

اب ہم کاروباری اِنعام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

۱:- پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ خریداری خواہ دُکان دار کی ہو یا صارف کی، یہ کوئی وصفِ مطلوب نہیں ہے، اس میں نہ تو جہاد کی تربیت ہے، نہ علمی مہارت کی تحصیل ہے، اور نہ ہی کسی اور پسندیدہ خلق مثلاً خدمتِ خلق وغیرہ کی تحصیل ہے، لہٰذا اس میں مسابقت کی ترغیب دینا اُصولی طور پر غلط بات ہے۔

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ بائع جس کسی صورت میں بھی مبیع میں اضافہ کرتا ہے خواہ وہ اِنعام کے نام سے ہو، وہ اصل مبیع کا حصہ قرار پاتا ہے، اور مشتری قیمت میں جس نام سے بھی اضافہ کرے وہ اصل قیمت میں اضافہ شمار ہوتا ہے۔

وصح الزيادة في المبيع ولزم البائع دفعها ان في غير سلم زيلعي وقبل المشتري وتلتحق أيضًا بالعقد، فلو هلكت الزيادة سقط حصتها من الثمن وكذا لو زاد في الثمن عرضًا فهلك قبل تسليمه انفسخ العقد بقدره. (در مختار ج:۵ ص:۱۵۵، ایچ ایم سعید).

جب یہ بات واضح ہوئی کہ مزعومہ اِنعام کی صورت درحقیقت مبیع یا ثمن میں کمی بیشی ہوتی ہے تو اس میں مندرجہ ذیل شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:-

۱:- اِنعام ایسی چیز ہو جو مبیع اور ثمن بن سکے۔

۲:- اس کے وجود میں خطر و اندیشہ نہ ہو کہ نہ جانے ہو یا نہ ہو۔

۳:- اس کی مقدار میں جہالت یا تردّد نہ ہو۔

اگر ایسی صورت پائی جائے کہ جس میں یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہوں تو وہ اِنعام صحیح ہوگا، اور اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں پہلی یا دُوسری یا تیسری شرط یا تینوں ہی مفقود ہوں تو اِنعام صحیح نہ ہوگا۔

اِنعام صحیح ہونے کی مثال

لپٹن چائے کی پیکنگ کے اندر بسکٹ کی ایک چھوٹی پیکنگ ملتی رہی ہے، اسی طرح کسی ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ دانتوں کا برش رکھ دیا جائے یا کسی فریج کے ساتھ ٹوسٹر یا سینڈوچ میکر دیا جائے یا گھی کی مقدار میں ۲۰ فیصد اضافہ دیا جائے تو صحیح ہے کیونکہ یہ اشیاء مبیع بھی بن سکتی ہیں اور ان کے وجود اور ان کی مقدار میں کسی قسم کی جہالت اور تردّد نہیں ہے۔

اِنعام صحیح نہ ہونے کی مثالیں

۱:- پہلی شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی والا یہ طے کرے کہ جو ہم سے اتنی مالیت کا سامان خریدے گا، ہم اس کو عمرہ کرائیں گے یا ہم اس کو ڈرائیور سمیت گاڑی فراہم کریں گے جس پر وہ مری کی سیر کے لئے جاسکتا ہے۔ ان صورتوں میں کمپنی منافع مہیا کر رہی ہے جن پر اِجارہ ہوتا ہے بیع نہیں ہوتی، لہٰذا وہ مبیع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے یہ اِنعام بھی دُرست نہیں ہے۔

۲:- دُوسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دُکان داروں سے یا کوئی بھی بائع اپنے خریداروں سے کہے کہ جو لوگ اتنا اتنا سامان خریدیں گے ہم ان کو کوپن دیں گے اور ان کے درمیان قرعہ اندازی کریں گے جس کے ذریعے صرف ان خریداروں کو اِنعام ملے گا جن کے نام کا قرعہ نکلے گا۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ زید کے نام کا قرعہ نکلے اور ہوسکتا ہے کہ نہ نکلے۔

۳:- تیسری شرط مفقود ہو

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی دُکان داروں سے کہے کہ جو ہم سے اتنا سامان خریدیں گے ہم سب کو اِنعام دیں گے، لیکن قرعہ اندازی سے خریداروں کو کم و بیش مالیتوں کے اِنعام دیں گے۔

۴:- تینوں شرطیں مفقود ہوں

اس کی مثال یہ ہے کہ کمپنی اپنے خریداروں سے کہے کہ جو کوئی ہم سے اتنی اتنی خریداری

کرے گا ہم اس کو کوپن دیں گے، اور پھر قرعہ اندازی کریں گے، جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اس کو ہم عمرہ کرائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سعودیہ آنے جانے کا اور وہاں رہائش کا بندوبست کریں گے، لیکن اس کو ٹکٹ نہیں دیں گے۔

۳:- تیسری بات یہ ہے کہ چونکہ اِنعام مشروط ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں شرط فاسد ہوتی ہے تو اس سے سودا بھی فاسد ہوجاتا ہے۔

۱- جب کمپنی کے اعلان کے مطابق خریدار سامان خریدتے ہوئے یوں کہے کہ میں اس شرط پر اتنا سامان خریدتا ہوں کہ آپ کو مجھے عمرہ کرانا ہوگا یا مری کی سیر کے لئے گاڑی فراہم کرنا ہوگی، چونکہ یہ شرط سودے کے تقاضے کے خلاف ہے اور اس میں خریدار کا فائدہ ہے، لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، اور اس کی وجہ سے سارا سودا ہی فاسد ہوجاتا ہے، اور بائع اور خریدار دونوں گناہگار ہوتے ہیں، اور دونوں پر لازم ہے کہ وہ اس سودے کو ختم کریں اور اگر چاہیں تو اس شرط کے بغیر نئے سرے سے سودا کریں۔

۲- اِنعامی اسکیم یہ ہو کہ جو اتنا سودا خریدے گا اس کو کار کی قرعہ اندازی میں شریک کیا جائے گا، اب جو شخص اس اِنعامی اسکیم کے مطابق سودا خریدتا ہے اور کوپن بھر کر دیتا ہے تو جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا کار بھی مبیع کا حصہ بنے گی لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ وہ ملے گی یا نہیں، اس لئے مبیع کی مقدار بھی مجہول ہے، اس لئے اس میں قمار کے ساتھ بیع بھی فاسد ہوئی۔

تنبیہات

۱- بعض اوقات کمپنی کے ملازم، خریدار کو کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اس اِنعامی اسکیم میں کچھ تردّد ہے تو ہم تمہاری طرف سے کوپن خود بھر دیتے ہیں، اور اس کو قرعہ اندازی میں شامل کر دیتے ہیں۔

کمپنی کے ملازم کے اس طرح کرنے سے قباحت میں کچھ کمی نہیں آتی کیونکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم کوپن خود بھر دیتے ہیں تو وہ خریدار کے وکیل بن گئے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جب یہ ایک منکر ہے تو اس وقت ملازموں کے کہنے پر خاموشی دُرست نہیں بلکہ نہی کرنا واجب ہے۔

۲- کمپنیوں والے جو اتنے بیش قیمت اِنعامات دُکان داروں کو دیتے ہیں یہ سرمایہ دارانہ نظام کا طریقہ ہے، اصل ہمدردی تو صارف سے ہونی چاہئے کہ اس کو رعایت ملے، ورنہ دُکان داروں کو دیئے گئے اِنعامات کا بوجھ بھی بالآخر صارفین پر پڑے گا، کیونکہ عام طور سے اِنعامات کو بھی اِخراجات میں شمار کر کے اشیاء کی قیمت طے کی جاتی ہے۔

۳- بعض اوقات کمپنی والے اپنی مصنوعات کی کسی ایک یا چند ایک پیکنگ میں اِنعامی پرچی

رکھ دیتے ہیں تاکہ لوگ اس اِنعام کے لالچ میں زیادہ خریداری کریں، چونکہ وہ اِنعام کسی ایک کا یا چند ایک کا نکلنا ہے اس لئے ہر خریدار کے لئے اس اِنعام کے نکلنے کا وجود خطر و اندیشے کا شکار ہے، اور چونکہ جوئے کے معنی میں یہ بات شامل ہوتی ہے اس لئے جو خریدار اس موہوم اِنعام کے لالچ میں وہ سامان خریدتا ہے وہ ایک درجے میں جوا کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی کی مثل ایک صورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مختلف قسم کی نمائشوں کے اندر داخلے کا ٹکٹ ہوتا ہے، اور نمائش کے منتظمین یہ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص مثلاً دس روپے کا ٹکٹ یک مشت خریدے گا وہ اپنے اس ٹکٹ کے ذریعے عام لوگوں کی طرح نمائش میں بھی داخل ہوسکے گا اور ان ٹکٹوں پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ اِنعام مقرّر ہوتے ہیں، جس کا نمبر نکل آئے اس کو وہ اِنعام بھی ملتا ہے۔

یہ صورت صریح قمار سے تو نکل جاتی ہے کیونکہ ٹکٹ خریدنے والے کو اس ٹکٹ کا معاوضہ بصورت داخلہ نمائش مل جاتا ہے، لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے، جو شخص موہوم اِنعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونہ قمار کا ارتکاب کر رہا ہے'' (جواہر الفقہ ج:۲ ص:۳۵۱)۔

ایک شخص نے ایسی کوئی شے خریدی اور اس میں اِنعامی پرچی نکل آئی جبکہ اس کو پرچی اسکیم کا علم تھا اور اگر علم نہ تھا تو اس نے شے کو اپنی ضرورت سے خریدا تھا، اِنعام کے لالچ میں نہیں خریدا تھا، اس صورت میں بھی اس شخص کو اس پرچی پر اِنعام لینا جائز نہیں، کیونکہ ایک تو اس میں ناجائز اسکیم کے ساتھ تعاون اور شراکت ہے اور دُوسرے نیت تو ایک مخفی چیز ہوتی ہے لہٰذا حکم اس پر نہیں لگتا بلکہ ظاہر پر لگتا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ جب یہ اِنعام وصول کر رہا ہے تو اسی کے لئے اس نے شے خریدی ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد

(حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب)

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدکم السامی

آپ کا مضمون ''تجارتی اِنعامی اسکیموں کا شرعی حکم'' دار الافتاء کے توسط سے بندے کو موصول ہوا، آنجناب نے چونکہ فرمائش کی ہے کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں، اس لئے عرض ہے کہ بندے کے خیال میں یہ اِنعام زیادۃ فی المبیع نہیں ہے، بلکہ ایک ہبۂ مبتدأہ کا یک طرفہ وعدہ ہے۔ بائع اور مشتری میں سے کوئی بھی اسے زیادۃ فی المبیع نہیں سمجھتا، نہ عرفِ عام میں اسے زیادۃ فی المبیع سمجھا جاتا ہے، اور شرعاً بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ بیع تام ہونے کے بعد جب بھی بائع مشتری کو کوئی چیز بلا قیمت دے تو اسے زیادۃ فی المبیع قرار دیا جائے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ اِنعام ہمیشہ مسابقت پر ہی دیا جائے،

نہ یہ ضروری ہے کہ جو ہبہ اِنعام کے نام سے کیا جائے وہ مسابقت کی مشروعہ صورتوں سے منسلک ہو۔[1]

آنجناب نے "جواهر الفقه" کی عبارت پر جو اِشکال فرمایا ہے کہ: "نیت تو ایک مخفی چیز ہے لہٰذا حکم اس پر نہیں لگتا" اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ قضاء کا حکم تو واقعی اکثر نیت پر نہیں لگتا، لیکن دیانت کے بہت سے اَحکام نیت پر موقوف ہیں، کما لا یخفی علیکم، مثلاً کوئی چیز جو معصیت اور غیر معصیت دونوں میں استعمال ہوسکتی ہو اسے بہ نیتِ معصیت خریدنا ناجائز ہے، اور نیت معصیت کی نہ ہو تو جائز،[2] اور "جواهر الفقه" میں حکم دیانت ہی کا بیان فرمایا گیا ہے، قضاء کا نہیں۔

لہٰذا آنجناب کی تحریر بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے باوجود صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے "جواهر الفقه" میں تحریر فرمائی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۴۲۸/۴/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷/۹۶۱)

---

(۱) اِنعام کا کسی مسابقت یا مسابقتِ مشروعہ کے ساتھ مختص ومنسلک ہونا ضروری نہیں جیسا کہ اِنعام سے متعلق درج ذیل عبارات سے واضح ہے:
فی مجموعة قواعد الفقه ص:۱۹۴ والانعام بالكسر عرفا الارض التي أعطاها السلطان أو نائبه.
فی القاموس الفقهی ص:۷۳ الجائزة العطية.
فی تاج العروس ج:۴ ص:۱۹ الجائزة العطية من اجازه يجيزه اذا أعطاه وأصلها ان أميرًا وافق عدوا بينهما نهر فقال: من جاز هٰذا النهر فله كذا، فكلما جاز منهم واحد أخذ جائزة. وقال أبوبكر في قولهم أجاز السلطان فلانا بجائزة. أصل الجائزة أن يعطي الرجل الرجل ماء ويحيره ليذهب لوجهه فيقول الرجل اذا ورد ماء لقيم الماء أجزني ماء اى أعطني ماء حتي اذهب لوجهي وأجوز عنك ثم كثر هٰذا حتي سمّوا العطية جائزة فقال الجوهري اجازه بجائزة سنية أى بعطاء ..... ومن المجاز الجائزة التحفة واللطف ..... ومثله في جمهرة اللغة.
فی القاموس المحيط ج:۴ ص:۲۵۶ أنعمها الله تعالىٰ عليه وأنعم بها ونعيم الله تعالىٰ عطيته ونعم الله تعالىٰ بك كسمع ونعمك وأنعم بك عينًا أقر بك عين من تحبه أو أقر عينك بمن تحبه. وفيه ج:۲ ص:۲۴۳ الجائزة العطية والتحفة واللطف ومقام الساقي من البئر.
فی روح المعاني ج:۱ ص:۲۵۸ والانعام ايصال الاحسان الى الغير من العقلاء كما قاله الراغب فلا يقال أنعم على فرسه ولذا قيل ان النعمة نفع الانسان من دونه بغير عوض.
فی البيضاوی ج:۱ ص:۴۰ (طبع رحمانيه) والانعام ايصال النعمة وهي في الأصل الحالة الّتي يستلذه الانسان فاطلقت لما يستلذها من النعمة وهي اللين.
فی البحوث لشيخنا العثماني حفظه الله ورعاه ج:۲ ص:۲۲۹ وان مثل هٰذه الجوائز اللّتي تمنح علىٰ أساس عمل عمله أحد لا تخرج عن كونها تبرعا وهبة لأنّها ليس لها مقابل وان العمل الذي عمله الموهوب له لم يكن علىٰ أساس الاجارة أو الجعالة حتّي يقال ان الجائزة أجرة لعمله وانما كان علىٰ أساس الهبة للتشجيع وجاء في الموسوعة الفقهية (الكويتية) الأصل اباحة الجائزة علىٰ عمل مشروع سواء كان دينيًّا أو دُنيويًّا لأنه من باب الحث على فعل خير والاعانة عليه بالمال وهو من قبيل الهبة.
نیز "اِنعام" سے متعلق مزید تفصیلات کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث في قضايا فقهية معاصرة میں رسالہ "احكام الجوائز" ج:۲ ص:۲۳۳ تا ۲۴۴ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) وفی قاضی خان ج:۲ ص:۲۸۱ ويكره أن يبيع المكعب المفضّض من الرّجل اذا علم أنه يشترى ليلبس .... الخ.
نیز دیکھئے ص:۸۴ تا ص:۸۶ کے حواشی۔

فروختگی کے لئے وکیل کو دیا ہوا سامان چوری ہو جائے تو نقصان وکیل کا ہوگا یا مالک کا؟

سوال:- زید نے مبلغ دس ہزار کی شکر بازار سے خرید کر بکر آڑھتی کی دُکان کرایہ پر اس کے اندر جمع کردی، اور بکر سے کہہ دیا کہ بازار جب مہنگا ہو تو اس کو فروخت کردینا، میں آپ کو کمیشن دے دُوں گا۔ دُکان کی چابی بھی زید نے بکر کے سپرد کردی تو اب اس آڑھت سے شکر تقریباً آٹھ بوری چوری ہوگئی، تو اس کا تاوان زید پر ہوگا یا بکر پر؟ جبکہ یہ تمام شکر بکر کے قبضے میں ہو اور بازار کا قانون یہ ہے کہ جو چیز آڑھتی کے قبضے سے چوری ہو اس کا ذمہ دار آڑھتی ہوگا مالک نہیں ہوگا، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر چوری بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے نہیں ہوئی تو نقصان کا بار زید پر ہوگا، اور اگر بکر کی بے احتیاطی کی وجہ سے چوری ہوئی تو وہ نقصان کا ذمہ دار ہوگا،[1] کیونکہ وہ وکیل بالبیع ہے، اور وکیل کا قبضہ قبضِ امانت ہوتا ہے۔[2] اور اگر بازار میں شکر کی قلّت ہو تو اس طرح کی ذخیرہ اندوزی کرنا سخت گناہ ہے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵۷/۱۸ الف)

کاروبار بیچنے کے بعد مشتری کی طرف سے مقرّرہ مدّت تک ثمن ادا نہ کرنے کی صورت میں بیع کو فسخ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

سوال:- اگر ایک شخص دُوسرے کو کاروبار بیچے لیکن مشتری نے مقرّرہ مدّت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا، جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو کیا بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیع کو فسخ کرے اور اس کے نتیجے میں اپنا کاروبار واپس لے لے، اور ثمن کا

(۱و۲) حوالہ کے لئے دیکھئے شرح المجلة لسلیم رستم باز ص:۳۸۴ رقم المادة:۱۴۶۳ وص:۴۳۶ رقم المادة:۷۸۷ (طبع مکتبة حنفیه کوئٹه)۔

(۳) وفی شعب الایمان للبیهقی ج:۱۳ ص:۵۱۱ رقم الحدیث:۱۰۷۰۲ عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: بئس العبد المحتکر اذا رخّص الله الأسعار حزن واذا غلی فرح.

وفی المستدرک علی الصحیحین للحاکم ج:۲ ص:۱۴ کتاب البیوع رقم الحدیث:۲۱۶۴ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: المحتکر ملعون. وکذا فی مصنف عبدالرزاق، باب الحکرة ج:۸ ص:۲۰۴ رقم الحدیث:۱۴۸۹۳.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۹۸ وکره احتکار قوت البشر کتبن وعنب ولوز والبهائم فی بلد یضر بأهله.

وفی الهدایة ج:۴ ص:۳۹۸ ویکره الاحتکار فی أقوات الآدمیین والبهائم اذا کان ذٰلک فی بلد یضر الاحتکار بأهله.

وکذا فی البدائع للکاسانی ج:۵ ص:۱۲۹ وخلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۵۳ والبحر الرائق ج:۸ ص:۲۰۲.

جتنا حصہ وصول کر چکا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹا دے؟ مثال کے طور پر بائع نے ایک کروڑ روپے کا کاروبار بیچا اور مشتری نے اس پر قبضہ بھی کرلیا لیکن مقرّرہ مدّت تک مکمل ثمن یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا جبکہ وہ دیوالیہ بھی نہیں ہوا ہے، تو چونکہ مشتری نے اس معاہدے کے مطابق ثمن ادا نہیں کیا تو کیا یہ جائز ہے کہ بائع بیع کو فسخ کر کے اپنی مبیع (کاروبار) واپس لے لے اور جتنا ثمن اس نے وصول کیا ہے وہ مشتری کو واپس لوٹا دے؟ مجھے اس کے جواز کی کوئی عبارت فقہاء کے کلام میں نہیں ملی ہے، کیونکہ جب بیع مکمل ہوگئی تو بائع کا حق صرف ثمن میں باقی ہے اور وہ کاروبار بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں منتقل ہوگیا ہے، لہٰذا بائع کے لئے اسے واپس لینا جائز نہیں۔ برائے مہربانی یہ وضاحت کیجئے کہ کیا ایسا کرنا بائع کے لئے جائز ہے؟

المستفتی

ایم ایس عمر ایڈووکیٹ

ڈربن، جنوبی افریقہ

جواب:- اگر کسی چیز کے بیچتے وقت عقد میں یہ شرط لگائی جائے کہ: ''اگر خریدنے والے نے مقرّرہ مدّت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع ختم ہوجائے گی'' تو یہ صورت ''خیار النقد'' کی ہے اور بیع میں یہ شرط لگانا جائز ہے، اور یہ شرط اپنے وقت پر مؤثر بھی ہوگی، چنانچہ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر خریدنے والے نے مقرّرہ مدّت تک کل رقم یا اس کا کچھ حصہ ادا نہیں کیا تو یہ بیع فاسد ہوجائے گی[1] اور خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں پر واجب ہوگا کہ اس بیع کو فسخ کریں،[2] لہٰذا ایسی صورتِ حال میں اگر وہ مبیع اس حالت پر باقی ہو جس حالت میں اسے بیچا گیا تھا تو ایسی صورت میں بائع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مبیع خریدنے والے سے واپس لے لے اور ثمن کا جتنا حصہ اس نے وصول کیا ہے وہ خریدنے والے کو واپس لوٹا دے۔

تاہم اگر بیع میں ''خیار النقد'' کی شرط نہ لگائی جائے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کے لئے یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا اور مبیع کو خریدنے والے سے واپس لینا جائز نہیں کیونکہ جب ایک بار طرفین کی رضامندی کے ساتھ ایجاب وقبول ہوکر بیع مکمل ہوجائے تو فریقین میں سے کسی کے لئے بھی یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا بلکہ ایسی صورت میں بیچی ہوئی چیز خریدنے والے کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے اور بیچنے والے کا حق صرف ثمن میں باقی رہتا ہے، جس کی ادائیگی پر وہ خریدنے والے کو مجبور کرے گا، لیکن اگر اس کے باوجود وہ ثمن ادا نہ کرے تو ایسی صورت میں بیچنے والے کو دو اِختیار حاصل ہیں:-

---

(۱و۲) حوالہ جات اسی فتویٰ میں آگے آرہے ہیں۔

۱:- خریدنے والے کو راضی کر کے اصل ثمن پر اقالہ کرے۔

۲:- ثمن کی وصول یابی کے لئے اس کے خلاف مقدمہ دائر کرے۔

البتہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''أحسن الفتاویٰ'' ج:۲ ص:۵۳۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''بلکہ بدونِ شرط بھی جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہوجائے تو بائع کو فسخِ بیع کا حق حاصل ہے'' ان کے اس فتویٰ کی بنیاد صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت ہے:-

ولأنه لمّا تعذر استيفاء الثمن من المشترى فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (۱) (هداية ج:۳ ص:۱۱۵)

ترجمہ:- جب مشتری سے ثمن کا وصول کرنا متعذر ہوجائے تو اس بیع میں بائع کی رضامندی فوت ہوگئی ہے، لہٰذا بائع کو بیع کے فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

لیکن درحقیقت صاحبِ ہدایہ کی مذکورہ عبارت سے ذکر کردہ مسئلے پر استدلال کرنے میں تسامح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ کی یہ عبارت خاص اس صورتِ حال سے متعلق ہے جس میں خریدنے والے نے اس بات سے انکار کردیا ہو کہ وہ بائع سے مبیع خرید چکا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بیع پہلے ہی خریدنے والے کو تسلیم نہیں ہے، لہٰذا اگر بیچنے والا بھی ثمن وصول نہ ہونے کی وجہ سے اس بیع کو ختم کردے تو یہ فسخ فریقین کی طرف سے ہوجائے گا جو کہ معتبر ہے۔ لیکن یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنا صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جائز نہیں، چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے اسی صفحے پر آگے جاکر یہ بیان فرمایا ہے کہ جب بیع ایک بار مکمل ہوجائے تو بائع اور مشتری دونوں میں سے کسی کو بھی یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، عبارت درج ذیل ہے:-

لأن أحد المتعاقدين لا يتفرد بالفسخ كما لا يتفرد بالعقد. (۲) (هداية ج:۳ ص:۱۱۵)

ترجمہ:- متعاقدین میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ نہیں کرسکتا جس طرح ان دونوں میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر عقد نہیں کرسکتا۔

اس کے برخلاف آپ نے سوال میں جس صورتِ حال کو ذکر کیا ہے وہ بالکل ہی مختلف ہے، اس میں نہ تو مشتری نے کاروبار کے بائع سے خریدنے سے انکار کیا ہے اور نہ اس نے بائع کو بیع کے فسخ کرنے کی پیشکش کی ہے، بلکہ وہ صرف وقتِ مقرّرہ پر ثمن ادا نہیں کرسکا ہے، ایسی صورتِ حال میں بائع

(۱) كتاب ادب القاضى ج:۳ ص:۱۵۳ (طبع مكتبه رحمانيه).
(۲) كتاب ادب القاضى ج:۲ ص:۱۵۴ (طبع مكتبه رحمانيه).

کے لئے یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، اِلَّا یہ کہ بیع کرتے وقت خیار النقد کی شرط لگائی جائے، جس کی تفصیل اُوپر ذکر کی جاچکی ہے۔

فی شرح المجلة ج:۲ ص:۲۵۷

المادّة: ۳۱۳ اذا تبایعا علیٰ ان یؤدی المشتری الثمن فی وقت کذا وان لم یؤده فلا بیع بینهما صح البیع، وهٰذا یقال له خیار النقد (الیٰ قوله) وان بین المدة أکثر من ثلاثه أیام، قال أبو حنیفة رحمه الله: البیع فاسد، وقال محمد رحمه الله: البیع جائز. وفی البحر عن غایة البیان ان أبا یوسف مع الامام فی قوله الأوّل والذی رجع الیه انه مع محمد، وقد اختارت جمعیة المجلة قول محمد رحمه الله مراعاة لمصلحة الناس فی هٰذا الزمان، کما صرحت بذٰلک فی تقریرها المتقدم للمرحوم عالی باشا الصدر الأعظم.[۱]

فی شرح المجلة لسلیم رستم باز ص:۱٦٦

المادّة:۳۱۴ اذا لم یؤد المشتری الثمن فی المدّة المعیّنة کان البیع الذی فیه خیار النقد فاسدًا[۲] ولکل من العاقدین فسخه اذا بقی المبیع علیٰ حاله.

وفی الکفایة بهامش فتح القدیر ج:٦ ص:۴۲۱

والعلّامة النسفی ذکر فی الکافی اشکالًا فی هٰذا الموضع فقال ذکر فی الهدایة لأن أحد المتعاقدین لا ینفرد بالفسخ کما لا ینفرد بالعقد لأنه حقهما فبقی العقد فعمل التصدیق وذکر قبله ولأنه لما تعذر استیفاء الثمن من المشتری فات رضا البائع فیستبد بفسخه، والتوفیق بین کلامیه صعب، قلت لا تناقض بین کلامیه فیحتاج الی التوفیق لأن مراده بقوله لأن أحد المتعاقدین لا ینفرد بالفسخ فیما اذا کان الآخر علی العقد معترفًا به کما اذا قال أحدهما اشتریت وأنکر الآخر لا یکون انکاره فسخًا للعقد، اذ لا یتم به الفسخ وفیما اذا قال اشتریت منی هٰذه الجاریة وأنکر فالمدعی للعقد هو البائع والمشتری ینکر العقد والبائع بانفراده علی العقد فیستبد بفسخه أیضًا.[۳]

(۱) رقم المادّة:۳۱۳ ج:۲ ص:۲۵۷ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه).
(۲) شرح المجلة للأتاسیؒ رقم المادة:۳۱۴ ج:۲ ص:۲۵۸ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه).
(۳) طبع رشیدیه کوئٹه.

وفی بدائع الصنائع ج:۵ ص:۳۰۶

وأما بیان ما یرفع حکم البیع فنقول وبالله التوفیق حکم البیع نوعان، نوع یرتفع بالفسخ وهو الذی یقوم برفعه أحد العاقدین وهو حکم کل بیع غیر لازم کالبیع الذی فیه أحد الخیارات الأربع والبیع الفاسد ونوع لا یرتفع الا بالاقالة وهو حکم کل بیع لازم وهو البیع الصحیح الخالی عن الخیار.[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۲۷/۵/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹/۸۷۳)

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے جائیداد خریدنے کا حکم

سوال:- مولانا مفتی عبدالواحد صاحب نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ایک سوال بھیجا جس میں اُنہوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے تفصیلی طریقۂ کار کا ذِکر فرما کر حضرت سے رائے دریافت کی، یہ سوال ریکارڈ میں موجود نہیں، مگر جواب سے سوال کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ H.B.F.C کے تفصیلی طریقۂ کار کی روشنی میں اس سے جائیداد خریدنا یا بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (مرتب)

جواب:- ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن جس طریقِ کار پر عمل کر رہی ہے، اس کا جائزہ[۲] لینے کے بعد دارالعلوم اور احقر کی طرف سے جو فتویٰ دیا جارہا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی جائز نہیں۔

آپ نے جو مسائل اُٹھائے ہیں، ان میں سے دو مسئلے تو ایسے ہیں جن کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے، ایک شریک سے ابتدائے معاملہ میں فیس وصول کرنا، اور دُوسرے عدم ادائیگی کے نوٹس کی قیمت رقم کے تناسب سے مقرّر کرنا

البتہ جہاں تک معدوم کے اِجارے یا معدوم کی بیع کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہمارے ذہن میں جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ یہ ''شرکتِ ملک'' (نہ کہ شرکتِ عقد) قرار دے کر شرکت، اِجارہ اور بیع، تینوں عقود الگ الگ اپنے اپنے وقت پر کئے جائیں۔ البتہ شروع میں فریقین کے درمیان ایک

---

(۱) طبع سعید.

(۲) H.B.F.C کے ذریعے جائیداد خریدنے اور بنوانے کے بارے میں ۱۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ کو جامعہ دارالعلوم کراچی میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا اِجلاس ہوا، جس میں طویل غور وفکر کے بعد عدمِ جواز کا فیصلہ کیا گیا تھا، جس کی تفصیل حضرتِ والا دامت برکاتہم کے جواب میں مذکور ہے۔

معاہدہ طے پاجائے کہ فلاں تاریخ سے ''شرکتِ ملک'' منعقد ہوگی، اس کے بعد فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر ''اِجارہ'' ہوگا، اور فلاں تاریخ یا فلاں مرحلے پر بیع بالاقساط ہوگی۔ پھر ان میں سے ہر عقد اپنے اپنے وقت پر اَنجام پائے۔ معاہدے کی حیثیت میں فریقین پر لازم ہو کہ وہ معینہ اوقات پر ان عقود کا اِنشاء کریں۔ اس صورت کے جواز پر بہت سے علماء اور مفتی حضرات سے مشورہ بھی کرلیا گیا تھا۔ لیکن جب عملاً یہ اسکیم نافذ کی گئی ہے تو یہ شرائط بھی ملحوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ اس اسکیم کے اِجراء کے بعد احقر نے مالیاتی اِداروں کے ایک اِجتماع میں جس میں ایچ بی ایف سی کے سربراہ بھی موجود تھے یہ مسائل اُٹھائے، لیکن جو غلط طریقِ کار چل نکلا تھا، وہ بدل نہیں سکا۔ احقر کئی سال سے مالیاتی اِداروں کے طریقِ کار کے دُرست کرنے کے لئے کوشاں ہے، لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ (۱)

جو صورت احقر نے اُوپر لکھی ہے، اس پر اپنی رائے سے بھی مطلع فرمائیں، اور اگر ایچ ایف بی سی کو کسی اور بہتر طریق پر چلانا آپ کی رائے میں ممکن ہو تو اس سے بھی احقر کو آگاہ فرمائیں۔ احقر چونکہ ان مسائل پر کام کرتا رہتا ہے اس لئے آپ کی رائے اور تجاویز احقر کی رہنمائی کریں گی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

والسلام

۲۰؍ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ

☆☆☆

(۱) گزشتہ صفحے کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

﴿کتاب الرّبٰوا والقمار والتّأمین﴾

(سود، جوے اور انشورنس وغیرہ سے متعلق مسائل)

﴿فصل فی الرّبٰوا وأحکام ربٰوا البنوک والمؤسّسات المالیة الحدیثة﴾

(سود کے اَحکام اور مختلف بینکوں اور جدید مالیاتی اداروں سے متعلق مسائل کا بیان)

۱:- حربی یا ذمی کافروں سے سود لینے کا حکم
۲:- حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم اور اس کی صورت
۳:- بینک کے سود کا حکم

سوال ۱:- کیا حربی یا ذمی کافروں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟
۲:- بینک میں رقم جمع کرنا حفاظت کی غرض سے جبکہ اُس پر سود نہ لیا جائے جائز ہے یا نہیں؟
۳:- بعض عالم کہتے ہیں کہ بینک سے سود حاصل کرلو، پھر اس کو غریبوں میں تقسیم کردو، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب ۱:- سود قرآن وسنت کے صریح ارشادات کے مطابق حرامِ قطعی ہے، اس کا لینا دینا سب ناجائز ہے،[1] مسلمان اور ذمی سے سود کے لین دین کی حرمت پر تو اِجماع ہے،[2] البتہ دار الحرب کے

---

(۱) قال الله تعالیٰ: "وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرة:۲۷۵).
"يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا" (البقرة:۲۷۸)
"يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" (آل عمران: ۱۳۰)
وفی صحیح المسلمؒ: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الرّبا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواءٌ. ج:۲ ص:۲۷ (طبع قدیمی کتب خانه) وجامع الترمذی کتاب البیوع ج:۱ ص:۲۲۹ (طبع سعید) وسنن أبی داؤد ج:۲ ص:۱۱۷ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).
(۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۸۶ (طبع سعید) ولا ربٰوا بین حربی ومسلم. وفی ردّ المحتار احترز بالحربی عن المسلم الأصلی والذّمی وکذا عن المسلم الحربی. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۷.

کافروں سے سود کا لین دین بعض فقہاء جائز کہتے ہیں[۱]، دُوسرے فقہاء اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہیں[۲] اور فتویٰ اسی پر ہے۔[۳]

۲:- بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوائی ہے تو سب سے بہتر اور بے غبار صورت یہ ہے کہ لاکر میں رکھوائے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانے کی بھی گنجائش ہے جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور جن مدّات پر سود لگتا ہے مثلاً سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈپازٹ، ان میں رقم رکھوانا دُرست نہیں۔

۳:- سود بینک سے وصول نہ کرنا چاہئے، اگر غلطی سے وصول کرلیا ہو تو صدقہ کردے[۴]، کیونکہ وصول کرکے صدقہ کرنا ایسا ہے جیسے گناہ کرکے کفارہ کیا جائے، اس سے بہتر یہ ہے کہ شروع ہی سے گناہ نہ کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۹ الف)

اس فتویٰ کے جواب نمبر۳ سے متعلق اس مقام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے ایک اہم وضاحت تحریر فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

یہ اور آگے بھی اس قسم کے متعدّد فتاویٰ میں یہی موقف اِختیار کیا گیا ہے کہ بینکوں سے سود لیا ہی نہ جائے، اور عام حالات میں یہی موقف اِحتیاط کا تقاضا بھی ہے، لیکن بعد میں بعض علمائے کرام،

(۱ تا ۳) وفی الدّر المختار کتاب البیوع باب الرّبا ج:۵ ص:۱۸۶ (طبع سعید) ولا ربا بین حربی ومسلم ثمه لأنّ ماله ثمه مباح فیحلّ برضاه مطلقًا بلا عذرٍ ..... الخ.

وفی البحر الرّائق باب الرّبا ج:۶ ص:۱۳۵ (طبع سعید) لا ربا بینهما فی دار الحرب عندهما خلافًا لأبی یوسف .... الخ.

وراجع أیضًا هدایة باب الرّبوٰا ج:۳ ص:۸۷ (طبع رشیدیه کوئٹه) و تبیین الحقائق ج:۴ ص:۹۷ و فتح القدیر ج:۶ ص:۱۷۸ واعلاء السنن ج:۱۴ ص:۳۴۵ و أحکام القرآن للتهانویؒ ج:۱ ص:۶۷۴.

دراصل جمہور فقہاء حضرت اِمام مالک، اِمام احمد بن حنبل، اِمام شافعی رحمہم اللہ اور علمائے اَحناف میں سے اِمام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دار الحرب میں کفار سے سود لینا ناجائز ہے، جبکہ اِمام ابوحنیفہ اور اِمام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے مطلقاً احتراز کیا جائے، جیسا کہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں تحریر فرمایا ہے، تفصیل کے لئے امداد المفتین ص:۸۴۹ تا ۸۵۱، اور امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۸ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز دیکھئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ج:۱ ص:۳۵۶ (طبع: دار القلم)۔

(۴) اُوپر حضرتِ والا کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ صفحہ نمبر: ۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۸ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بالخصوص حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کے توجہ دِلانے پر اس موقف میں بھی وزن معلوم ہوا کہ سود کی رقم لے کر بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردی جائے، چنانچہ بہت سے علماء کا فتویٰ یہی ہے، اور خاص طور پر غیر مسلم ممالک میں رکھی ہوئی رُقوم کے بارے میں اب بندہ کا رُجحان بھی یہی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۴۳۱/۵/۱۰ھ

غیر مسلم ممالک میں بینک کے سود کا حکم (عربی فتویٰ)

سوال:- فضيلة الشيخ حضرة مولانا مفتي محمد تقي عثماني حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فانی اعرض الیٰ سماحتكم أن يفتينی بما أشكل علیّ، أوّلًا أعرفكم بما أشكل علیّ، نحن نسكن فی سنكيانغ كاشغر فيض آباد (الصين الشعبيّة) كما تعرف أحوالنا والناس يضع الفلوس فی البنک والبنک للدولة والدولة كافرة وسياستهم وقانونهم الشيوعية. اذا يضع الفلوس يرجع مع الربح اذا أخذ الفلوس يرجع مع الربح هل يجوز ربح البنک أم لا؟ والمسئلة فی الهداية: "لا ربا بين المسلم والكافر" أفتونی بما نزل والحديث والاجماع والقياس والواضح لأنكم عندی أفقه الأمة فی هٰذا العصر.

جواب:- السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

تسلمت رسالتكم واليكم جواب الأسئلة التی قد ارسلتموها الیّ:

۱- ان الربح أو الفائدة التی تعطيها البنوک اليوم داخلة فی الرّبا قطعًا، وقد أفتیٰ معظم الحنفية بأن الرّبا حرام فی دار الحرب أيضًا، وما ذكرتم من المسئلة المذكورة فی الهداية[۱] من أنه لا ربا بين المسلم والحربی، فان ذٰلک قول مرجوح لم يأخذ به الفقهاء المحققون، وان أدلة ذٰلک مبسوطة فی المجلد الثالث من امداد الفتاویٰ للشيخ أشرف علی التهانوی رحمه الله تعالیٰ.[۲] والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

۱۴۱۴/۶/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸/۱۲۳)

بینک سے سود لینا، اس میں اکاؤنٹ کھولنا اور بینک میں ملازمت کرنا

سوال:- بینک سے سود لینا اور بینک میں اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ اور بینک کی

---

(۱) هداية باب الرّبٰوا ج:۳ ص:۸۷ (طبع رشيديه).
(۲) وراجع للتفصيل الیٰ ص:۱۵۷.

ملازمت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں کا سود لینا اور دینا حرام ہے،[۱] شدید ضرورت ہو تو روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے، اور تصریح کر دی جائے کہ اس روپیہ پر سود نہ لگائیں، بینکوں میں چونکہ زیادہ تر سود کا کاروبار ہوتا ہے اس لئے اس میں ملازمت دُرست نہیں۔[۲] واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

بینک کی طرف سے ملنے والے منافع کی مختلف صورتیں اور اس کے استعمال کا حکم

سوال:- میری عمر تقریباً ۶۵ سال ہے، کئی سال سے بیمار ہوں، نمازیں مسجد میں جماعت سے ادا کرنے سے قاصر ہوں، گھر میں بھی فرض نماز کے علاوہ بقیہ نمازیں بیٹھ کر ادا کرتا ہوں، میں اس قابل نہیں رہا کہ کوئی تجارت، ملازمت یا ٹیوشن وغیرہ کرسکوں، نہ کوئی ایسا ادارہ ہے جہاں روپے رکھنے سے اندیشہ نہ ہو، میرے پاس جو پیسہ تھا میں نے سال بہ سال اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے اور بینک سے جو سود ملا اس کو اس سال تک اپنے اُوپر صرف نہیں کیا ہے، ضرورت مندوں اور مستحقین کو دے دیا ہے، کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بینک میں جو پیسہ سود کا چھوڑ دیا جاتا ہے وہ ناجائز طریقوں میں خرچ کرلیا جاتا ہے۔ مئی ۱۹۷۵ء میں، میں اپنا مکان فروخت کر کے اور جو کچھ پیسہ تھا وہ لے کر لاہور اپنے لڑکے کے پاس جو بینک میں ملازم ہے چلا آیا تھا، یہاں پہنچ کر میں بہت زیادہ بیمار ہوگیا اور جب سے اب تک مختلف حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کرا رہا ہوں، جس میں کافی روپیہ خرچ ہوگیا، میرے لڑکے نے وہ روپے بینک میں جمع کر دیئے کہ اس سے جو سال بہ سال منافع ملے گا وہ خرچ کرتے رہیں گے، چنانچہ میں نے یہی کیا، پانچ سال کے لئے روپیہ جمع کرنے کے بعد جو رقم میرے پاس تھی اس میں سے کچھ باقی ہے باقی پیسہ خرچ ہوچکا ہے۔ دوم مجھے علاج کے لئے دُوسری جگہ جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے مگر اب میرے پاس ضروری اخراجات کے لئے بھی پیسہ نہیں ہے، اور نہ بینک سے پانچ سال تک نکل سکتا ہے، اب کیا ایسا کرسکتا ہوں کہ: ۱- اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جو منافع کا پیسہ ملے گا اس کو میں اپنے مذکورہ بالا اخراجات میں صَرف کرسکتا ہوں؟ اور پانچ سال بعد جب اصل رقم ملے گی اس میں سے کسی مستحق کو

---

(۱) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ نیز مزید دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) یہ بینک کی اُس ملازمت کا حکم ہے جس میں براہِ راست سودی معاملات انجام دیئے جاتے ہوں۔ اور جس ملازمت کا سودی معاملات سے تعلق نہ ہو اُس کا یہ حکم نہیں۔ بینک ملازمت کی یہ دو قسمیں اور ان کی مکمل تفصیل کے لئے اسی جلد کی کتاب الاجارۃ میں ص:۳۹۳ تا ص:۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

دے دُوں گا۔ ۲:- دُوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے بلاسودی قرض لے لوں، جب منافع کا پیسہ ملے اس کو ادا کردوں؟ ۳:- یا جب اصل رقم واپس ہو اس وقت یہ سب حساب کرکے اس میں سے نکال دوں، اگر مذکورہ بالا تینوں شکلیں جائز نہ ہوں تو پھر کیا صورت جائز ہوسکتی ہے؟

جواب:- بینک، منافع کے عنوان سے جو کچھ دیتا ہے شرعاً وہ سود ہے[1] جو قطعاً حرام ہے، اس کا لینا دینا، کھانا اور کھلانا سب حرام ہے،[2] قرآن و حدیث میں اس کے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں،[3] ایک حدیث کی رُو سے سودخوری کا ادنیٰ درجہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا،[4] اس لئے مذکورہ حالات میں بھی سود لینا حلال نہیں بلکہ سود لینے کی نیت سے پیسہ جمع کرنا بھی دُرست نہیں، اگر بینک میں روپیہ رکھنا ہی ہو تو ایسے اکاؤنٹ میں رکھنا لازم ہے جس میں سود نہ ملتا ہو، جیسے کرنٹ اکاؤنٹ اور لاکرز وغیرہ، اور موجودہ جمع شدہ رقم پر اگر بینک نے سود دے دیا ہے تو اس کا وصول کرنا جائز نہیں ہے،[5] صرف اصل جمع شدہ رقم واپس لے سکتے ہیں، غرباء کو دینے کی نیت سے بھی سود نہیں لے سکتے، البتہ اگر غلطی سے وصول کر ہی لیا ہے تو اس حرام سے جان چھڑانے کی نیت سے کسی غریب محتاج کو دے دیں،[6] مذکورہ صورتیں ناجائز ہیں۔

اگر آپ کی بیوی اور کوئی نابالغ اولاد نہیں ہے اور کوئی ایسا عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے جس کا نفقہ آپ پر واجب ہو تو آپ پر مذکورہ بالغ لڑکے اور اس کی بہو کا کوئی نان نفقہ کسی طرح کا واجب نہیں، صرف آپ پر اپنا خرچ واجب ہے جسے آپ اپنی موجودہ رقم سے کرتے رہیں، بالفرض اگر یہ رقم ختم ہوگئی اور آپ کمانے کے لائق نہ ہوئے تو شرعاً آپ کا نفقہ آپ کے بالغ لڑکے کے ذمے ہوگا، وہ برداشت کرے گا۔ بہرحال حرام کے استعمال کا کوئی راستہ نہیں، البتہ جو صورت آپ نے لکھی ہے کہ بینک فی الحال جو رقم سود کے نام سے دے رہا ہے اُس کو وصول کرکے خرچ کرلیں پھر پانچ سال بعد جو اصل رقم ملے اُس میں سے سود کی رقم کی مقدار صدقہ کردیں، شرعاً اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جب اکتوبر میں بینک کچھ رقم منافع کے نام سے دے، اُس کو آپ اس نیت سے وصول کریں کہ یہ آپ کے اصل قرض

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲ و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۴) وفی مشکوٰۃ المصابیح باب الرّبوٰا الفصل الثالث ج:۱ ص:۲۴۶ (طبع قدیمی کتب خانہ)
عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الرّبوٰا سبعون جزءاً ایسرھا أن ینکح الرّجل أمّہ.
وفی المرقاۃ ج:۶ ص:۶۵ أن ینکح الرّجل أمّہ ای یطأھا، وفی روایۃ الرّبا ثلاثۃ وسبعون بابًا ایسرھا مثل أن ینکح الرّجل أمّہ.... وفی روایۃ الرّبا اثنان وسبعون بابًا أدناھا مثل اتیان الرّجل أمّہ ..... الخ.

(۵ و۶) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

کی رقم ہے، اور پھر جب پوری رقم اس طرح واپس مل جائے تو اُس کے بعد حاصل ہونے والی رقم کو صدقہ کردیں، کیونکہ بینک میں روپیہ رکھوانے کا معاملہ شرعاً قرض ہے اور قرض دینے والے کو اِختیار ہے کہ وہ اپنی رقم جب چاہے واپس کرنے کا مطالبہ کردے، خواہ قرض مؤجل کہہ کر دیا گیا ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۹/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۳۹۱/۲۷ ب)

بینکوں کا سود وصول کر کے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں جمع شدہ رقم سے اگر ہم سود حاصل نہ کریں تو بینک اس کو خلافِ شرع کاموں میں خرچ کریں گے، خلافِ شرع کاموں سے اس رقم کو بچانے کے لئے اگر ہم سود لے کر کسی غریب طالب علم، بیوہ یا یتیم بچے کی مدد کردیں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بینک آپ کے جمع شدہ روپے پر جو رقم سود کے طور پر لگاتے ہیں وہ شرعی اعتبار سے آپ کی ملک نہیں ہوتی، اور جو رقم آپ کی ملکیت نہ ہو، آپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور کو صدقہ یا ہبہ کریں، یہ دُرست ہے کہ بینک عام طور سے یہ رقم ناجائز کاروبار سے حاصل کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص حرام مال کمائے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے، آپ اسے نصیحت تو کرسکتے ہیں مگر اس سے وہ مال ناجائز طریقے سے لے کر کسی غریب کو نہیں دے سکتے۔

رہا یہ معاملہ کہ سود کی رقم اگر بینکوں میں چھوڑ دی جائے تو اس سے ان کے ناجائز کاموں میں اعانت ہوگی، سو اس قسم کی اعانت تو محض بینک میں روپیہ جمع کرانے سے بھی ہوتی ہے، اسی لئے علماء کا کہنا یہ ہے کہ بینک میں روپیہ جمع کرانا ضروری ہو تو اُسے چالو کھاتہ (Current Account) میں جمع کرایا جائے، جس میں گردش کا احتمال چونکہ کم ہوتا ہے اس لئے اس پر عام طور سے سود لگایا ہی نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ کہ سود کی رقم ازخود لینا تو جائز نہیں، ہاں اگر اتفاقاً کسی وجہ سے سود آپ کے پاس پہنچ جائے تو مجبوراً اس کا راستہ یہ ہے کہ اُسے کسی غریب پر صدقہ کردیا جائے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۳/۵ھ[2]

---

(۱) ملاحظہ ہو ص:۲۶۸ پر حضرت والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰، ۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم اور غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کی صورت میں ملنے والے سود کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرنے پر کچھ سود بھی ملتا ہے، اگر سود بینک سے نہ لیا جائے تو بینک کا عملہ سود کی رقم اپنے مصارف میں لاتا ہے، اگر لیا جائے تو اس کا کیا مصرف ہے؟

جواب:- بینک میں اکاؤنٹ رکھنا ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ یا لاکرز میں رکھنا چاہئے، جس پر سود نہیں لگایا جاتا، اور غلطی سے اگر سود والے اکاؤنٹ میں رکھ دیا اور اس پر سود لگ گیا تو سود کی رقم کسی غیر صاحبِ نصاب آدمی کو صدقہ کردی جائے، لیکن ابتداء سے ہی اپنے اختیار کے ذریعے سودی اکاؤنٹ میں روپیہ رکھوانا اور سود وصول کرنا جائز نہیں۔(۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳/ ۲۸ الف)

حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- کیا بینک میں حفاظت کی غرض سے رقم رکھوانے کی اجازت ہے؟

جواب:- بینک میں اگر حفاظت کی غرض سے رقم جمع کرائی جائے اور اس پر سود نہ لیا جائے تو اس کی شرعاً اجازت ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۰/ ۲۸ ج)

بینک سے سود وصول کر کے غرباء میں تقسیم کرنے کا حکم

سوال:- سود لے کر غرباء میں تقسیم کردیا جائے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکومتی قانون کے خلاف ہے، شریعت میں کیا حکم ہے؟

جواب:- بینکوں سے سودی رقم کے بارے میں تحقیق یہی ہے کہ اس کو وصول ہی نہ کیا

---

(۱) ملاحظہ ہو ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۱۲۰، ۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

جائے[۱]، البتہ اگر کسی وجہ سے وصول ہو جائے تو اس کو غرباء میں صدقہ کر دیا جائے۔[۲] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۸/۱۸ الف)

۱:- ڈاک خانے میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے اضافے کا حکم
۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر "سود" کے نام سے ملنے والے اضافے کا حکم

سوال ۱:- ہم چند افراد ایک ادارے کے ملازم ہیں، ہم لوگوں کا کچھ روپیہ بطور ضمانت کافی عرصہ ہوا محکمے نے ہماری تنخواہوں سے وضع کر کے پوسٹ آفس میں جمع کرا دیا ہے، اب کافی عرصے کے بعد ہم نے وہ روپیہ ڈاک خانے سے مع سود وصول کیا جو وقتی طور پر ہم لوگوں کو اصل رقم کے ساتھ مل گیا، باقی احتیاطاً ہم نے یہ ضرور کیا کہ اصل رقم ہم نے صَرف کر دی، مگر سود کو صَرف نہ کیا، اب اگر یہ رقم کسی مستحق کو بغیر نیت ثواب دے دیں تو جائز ہے؟

جواب ۱:- آپ کو ڈاک خانے سے جو سود کی رقم ملی ہے، اسے کسی غیر صاحبِ نصاب آدمی پر بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کر دیں،[۳] کیونکہ اس کا معاملہ پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف ہے۔

سوال ۲:- جی پی فنڈ کی رقم مع سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (یعنی گورنمنٹ جو رقم تنخواہ سے وضع کر کے ریٹائر ہونے کے بعد مع سود دیتی ہے)۔

جواب ۲:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی "سود" کے نام سے دی جاتی ہے، وہ درحقیقت سود نہیں ہے، لہٰذا اس کو حاصل کر کے استعمال کرنا جائز ہے۔[۴] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۰/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۱۹ الف)

(۱ تا ۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت، نیز مالِ حرام کے صدقہ کے بارے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ایک اہم تحقیق کتاب البیوع کی "فصل فی أحکام المالِ الحرام والمخلوط" میں ص:۱۲۹ تا ص:۱۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ "پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ" از مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

بینک میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ۱:- جو رقم بینک میں جمع کرائی جاتی ہے اس پر جو منافع ملتا ہے کیا وہ سود ہے؟
۲:- اگر بینک سے ملنے والا نفع سود ہے تو اس رقم پر اگر سود لگ چکا ہو تو اس سود کا مصرف کیا ہے؟
۳:- اگر بینک میں اس شرط پر رقم جمع کرائی جائے کہ سود نہیں لیا جائے گا کیا یہ جائز ہے؟ اور اس طرح سودی کاروبار میں معاون تو شمار نہیں ہوگا؟ جبکہ رقم کی حفاظت کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو۔

جواب ۱:- جی ہاں سود ہے۔[1]
۲:- اسے وصول نہ کریں[2] اور اگر وصول کرلیا ہو تو کسی غریب کو بلانیتِ ثواب صدقہ کردیں،[3] اس سے سود وصول کرنے کا کفارہ ہوجائے گا۔
۳:- جب رقم کی حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس شرط کے ساتھ بینک میں روپیہ رکھوانے کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۶/ ۲۸ ج)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- بینک سے حاصل کئے ہوئے سود کا کیا حکم ہے؟

جواب:- بینک سے سود نہ لینا چاہئے، بلکہ روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں جس پر سود نہ لگے، البتہ اگر غلطی سے وصول کرلیا ہو تو کسی فقیر کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردیں۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۹۷۰/ ۲۸ ج)

سودی رقم مستحقِ زکوٰۃ کو دینے کا حکم

سوال:- میرے پاس کچھ سودی رقم تھی، چونکہ میں خود سود نہیں لیتا اس واسطے میں نے اپنی ایک عزیزہ کو وہ سودی رقم دے دی، کیا میں بری الذمہ ہوگیا؟

جواب:- اپنی جس عزیزہ کو آپ نے سود کی وہ رقم دی، اگر وہ مستحقِ زکوٰۃ تھیں (یعنی ان کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے مساوی نقد یا سونا موجود نہیں تھا)[5] تو آپ کا یہ فعل

(۱ تا ۵) ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت ملاحظہ فرمائیں، نیز دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی، ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

دُرست تھا، اس کے بعد آپ پر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے، انہیں یہ بتادینا بھی ضروری نہیں تھا کہ یہ رقم سود کی ہے۔

واللہ اعلم

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۷/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۷۷۶/۱۹ الف)

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اکاؤنٹ کا حکم

سوال:- مکرمی محترمی عالی جناب مفتی صاحب، کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دِین شرعِ متین درمیان اس مسئلے کے کہ:- زید کو اتفاق سے امسال پہلی مرتبہ بینک سے ۶۵۰ روپے بینک سے سود کے طور پر ملے، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، اب زید اس رقم کو لینا نہیں چاہتا، مگر یہ سود والی رقم بینک میں چھوڑ دی جاوے تو وہ لوگ خرد برد کرلیں گے۔ یا یہ رقم کسی غریب یتیم، مسکین، محتاج، اپاہج مجبور لوگوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یا کسی غریب بیوہ عورت کو سلائی مشین خرید کر دی جاسکتی ہے؟ تاکہ وہ اپنی گزربسر کرسکے یا نقدی کی صورت میں ضرورت مند کو دی جائے تاکہ وہ صاحب اپنے کام میں لاسکے، جواب سے مطلع فرماویں۔ انتظار ہوگا۔

جواب:- اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں دیا جاتا، یا اپنے اکاؤنٹ کے ساتھ بینک کو لکھ کر دینا چاہئے کہ میری رقم پر سود نہ لگایا جائے، آئندہ آپ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرلیں، البتہ اب جو سود کی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگئی ہے اسے کسی غریب کو صدقہ کرسکتے ہیں، نیت اس میں حرام مال سے جان چھڑانے کی ہونی چاہئے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۸۹/۳۰ ج)

فِلسڈ ڈپازٹ میں رقم رکھوانے اور اس پر ملنے والے اضافے کا حکم

سوال:- فِلسڈ اکاؤنٹ کے انٹرسٹ کی رقم اگر مسلم بینک کے ذمہ داران اُصولِ تملیک پر عمل کرکے وہ رقم بشکل چندہ کسی دینی ادارے کو دے دیں تو آیا اس رقم کا دِینی اداروں میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۲۰، وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب:- فِسکڈ ڈپازٹ پر چونکہ سود دیا جاتا ہے اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں[1]، رقم کی حفاظت کے لئے بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، جس پر سود نہیں دیا جاتا، لیکن اگر غلطی سے رقم فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ دی اور اُس پر سود مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردینا چاہئے، البتہ جسے صدقہ کیا گیا، وہ مالک ومختار ہونے کے بعد کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے کسی دِینی ادارے میں چندہ دیدے تو اس دِینی ادارے کے لئے اس کا استعمال جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۵/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵۸/۲۹ ب)

بینکوں کے سود اور پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- ۱-بینک کا سود، ۲-پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا سود، کیا قابلِ قبول اور قابلِ استعمال ہے؟ یا ان کو مذکورہ اداروں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے؟

جواب ۱:- بینکوں میں جس سود کا لین دین ہوتا ہے وہ بلاشبہ ''سود'' اور ''رِبا'' کی تعریف میں داخل ہے[2]، اور اس کا لین دین حرام اور گناہِ کبیرہ ہے، لما فی الجامع الصغیر من الحدیث المرفوع أو الموقوف : کل قرض جرّ منفعة فهو ربًا۔[3] لہٰذا اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے تاکہ اس پر سود نہ لگے، اور اگر لاعلمی کی حالت میں رقم پر سود لگ جائے تو اسے وصول نہ کرنا چاہئے یا وصول کرکے صدقہ کردینا چاہئے۔

۲:- پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہو تو اس پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً ''سود'' کی تعریف میں داخل نہیں، لہٰذا اس کا لینا جائز ہے[4]، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس زیادہ رقم کو صدقہ کردیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۲۱/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

(۱ و ۲ و ۳) تفصیلی حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۴) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی زائد رقم کا حکم

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود دیا جاتا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- احتیاط تو اسی میں ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر جو رقم ملازم نے اپنے اختیار سے کٹوائی ہے اس پر ملنے والی زیادہ رقم کو صدقہ کر دیا جائے۔ لیکن شرعی نقطۂ نظر سے یہ زیادہ کی رقم سود کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے اسے اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے۔[1] واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۱۸/۱۱۹ الف)

بینک کے سود اور جبری پراویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال:- میں محکمہ زراعت میں ملازم ہوں، میری تنخواہ سے جی پی فنڈ مبلغ پانچ روپے ماہانہ کاٹے جاتے ہیں، اس رقم پر حکومت ایک مقرّرہ فیصد سالانہ سود اَدا کرتی ہے، میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میں اس رقم پر سود نہیں لوں گا، اور اصل زر کا حق دار ہوں گا، اس طرح بینک اور ڈاک خانے میں بھی رقم بحیثیت اصل جمع ہے تو کیا میں حکومت سے سود کی رقم لے کر کسی غریب کو دے سکتا ہوں؟

جواب:- جہاں تک بینک کے سود کا تعلق ہے وہ تو ناجائز اور حرام ہے،[2] اور اس میں بہتر یہ ہے کہ اسے لیا ہی نہ جائے،[3] جس کی شکل یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوائی جائے، ہاں اگر کبھی غلطی سے سود لگ کر مل گیا تو اسے بغیر نیتِ ثواب صدقہ کر دینا چاہئے۔ البتہ جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے ملتی ہے وہ شرعاً سود کے حکم میں نہیں ہے،[4] اسے وصول کر کے اپنے استعمال میں لانا بھی شرعاً جائز ہے، ہاں اگر کوئی شخص تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرے تو اسے رقم لے کر صدقہ کر دینا چاہئے،[5] اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے بیوی، بچوں اور دُوسرے اعزہ اور رشتہ داروں پر بھی صَرف کیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۸۲/۲۲ ب)

(۱و۴و۵) تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ و۳) ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت کے ساتھ ساتھ دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور مزید تفصیل کے لئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

بینک کا سود صدقہ کرنے کی صورت

سوال:- میں کئی سالوں سے موجودہ پاکستانی بینکوں میں پیسہ جمع کر رہا ہوں، اس دوران بینک کی طرف سے میری جمع شدہ رقموں میں بہت سود بھی شامل ہوگیا ہے، سود جس قدر ہے اس کا اندازہ بینک والوں کو ہے، اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سود کی رقم کسی فقیر یا بیوہ، نادار شخص کو دی جاسکتی ہے؟ یا اس رقم کو کسی اور جگہ لگایا جاسکتا ہے؟

جواب:- بینک سے سود کی رقم لینا جائز نہیں[1]، بلکہ اگر رقم بینک میں رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے جس پر سود نہیں دیا جاتا، تاہم اگر غلطی سے سود وصول کرلیا تو یہ رقم اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی فقیر یا مسکین کو صدقہ کردیں[2]، اس میں بھی مالک بنا کر دینا ضروری ہے، تعمیر وغیرہ رفاہی کاموں میں یہ رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۷/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰۱/۲۹ ب)

بینک کے سود کا حکم

سوال:- ہم بینک سے سود لے کر صدقہ یا کسی رفاہی کام میں لگادیں تو اچھا ہے یا سود ہی نہ لیں؟

جواب:- اوّل تو بینک میں روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانا چاہئے، جس پر عموماً سود نہیں لگایا جاتا، اور اگر بینک کی طرف سے اس پر سود لگادیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ وہاں سے سود لیا ہی نہ جائے، لے کر صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہ کرکے کفارہ کیا جائے، اور نہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ سرے سے گناہ کیا ہی نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ دُوسری صورت افضل ہے۔ موجودہ بینک عام طور سے ایسی رقموں کو رفاہی کاموں میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے اسے چھوڑنے میں کوئی قومی نقصان بھی نہیں ہے۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ　　　　الجواب صحیح

۱۳۸۸/۹/۶ھ　　　　بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۷۸/۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲ و ۳) دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی اور تملیک کی شرط کے بارے میں دُوسری تحقیق کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔
(۴) دیکھئے ص:۲۶۸ پر اہم وضاحت نیز ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

ایک اکاؤنٹ سے سود لے کر دُوسرے اکاؤنٹ میں سود ادا کرنے کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ ایک بینک اکاؤنٹ میں سود ملتا ہے اور دُوسرے بینک اکاؤنٹ میں سود دینا پڑتا ہے، یعنی سود لینا دینا دونوں بینک ہی میں ہے، کوئی اور اس میں Involve نہیں ہے، تو کیا ایسی صورت میں سود سے سود اَدا کرسکتے ہیں؟

جواب:- بینک میں سودی اکاؤنٹ کھولنا بھی جائز نہیں،[1] رقم رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائی جائے، اور بینک سے سودی قرض لینا بھی جائز نہیں۔[2] لہٰذا مذکورہ طریقے پر بینک کے سود کو بینک ہی کے سود میں محسوب کرنے کی غرض سے سودی اکاؤنٹ کھولنا یا سودی قرض لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ماضی میں غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوادیئے گئے ہیں اور سودی قرض لے لیا گیا تو اس طرح تصفیہ کرسکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دُوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دیئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو، برابر ہوجائے، لیکن آئندہ کے لئے یہ سلسلہ بالکل بند کردیں۔

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۹/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۵۶/۴۰ د)

بینک سے وصول شدہ سود کا حکم

سوال:- اگر زید بینک میں رقم رکھتا ہے اور اُسے سود بھی دیا جاتا ہے، سود لینا حرام ہے اور چھوڑ دینا گویا متعلقہ افراد کو حرام کھانے کا موقع دینا ہے، اب لینا بہتر ہے یا چھوڑ دینا؟ کیا کسی عمومی فائدے میں یہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، اگر غلطی سے دُوسرے اکاؤنٹ میں رکھوادی ہو اور اس پر سود لگ گیا ہو تب بھی سود وصول کرنا دُرست نہیں، اور اگر غلطی سے وصول کرلیا تو اُسے کسی غیر صاحبِ نصاب کو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۲/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۴/۲۸ الف)

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴ اور ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبرا ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبرا، وص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر ملنے والے منافع کا حکم

سوال ا:- میرے پاس ڈاک خانے کے خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ ہیں، اُن پر ہر سال ساڑھے گیارہ فیصد منافع ملتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟

۲:- اگر منافع جائز ہے اور سود حرام ہے تو پھر فرق کیسے ہوا؟ کیا یہ رقم سود کے زُمرے میں آتی ہے؟

جواب:- ڈاک خانے کے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم زیادہ دی جاتی ہے وہ خواہ منافع کہہ کر دی جائے یا سود کہہ کر دی جائے، شرعی طور پر وہ سود ہی ہے، اور اس کا وصول کرنا جائز نہیں،(۱) اور اگر غلطی سے وصول کرلی گئی تو اسے نیتِ ثواب کے بغیر صدقہ کردینا ضروری ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۴۴۲/۲۷ ه)

بینک کا سود وصول کرکے صدقہ کیا جائے یا وصول ہی نہ کیا جائے؟

سوال:- بینک میں بغرضِ حفاظت روپیہ رکھا جاتا ہے، بینک باقاعدہ حساب کرکے رقم سود والے حساب میں جمع کردیتا ہے، میرے حساب میں جو رقم سود کی جمع ہوتی ہے بغیر نیتِ اَجر فوراً غریبوں کو دے دیتا ہوں، بڑی رقم سود کی، دِینی مدارس کے یتیم نادار بچوں کے خرچے کے لئے بھیج دیتا ہوں، مفتیٔ اعظم صاحب کو بھی ایک مرتبہ زکوٰۃ اور سود کی رقم بھیجی تھی، رسید آگئی، اس معاملے میں جناب کی رہبری کی ضرورت ہے۔

جواب:- اصل مسئلہ یہی ہے کہ بینک سے سود وصول ہی نہ کرنا چاہئے(۱) بلکہ ایسے اکاؤنٹ میں رقم رکھوانی چاہئے جس پر سود لگایا ہی نہ جاتا ہو، کیونکہ سود کا معاملہ کرنا اور اُسے وصول کرنا بذاتِ خود گناہ ہے، غریبوں کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دینا اس گناہ کا کفارہ ہے، اور گناہ کرکے کفارہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ گناہ کیا ہی نہ جائے۔ لہٰذا آئندہ آپ سود وصول ہی نہ کیا کریں۔ حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہی تھا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۱/۲۸ الف)

(۱و۲و۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز دیکھئے ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱، وص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

بینک میں رقم رکھوانے اور کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم

سوال ۱:- بینک میں پیسہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۲:- اس کے علاوہ سیونگ کھاتہ میں سود ملتا ہے، وہ سود لیا جائے یا بینک والوں کے پاس ہی چھوڑ دیا جائے یا لے کر خیرات کردیا جائے؟

جواب:- بہتر تو یہ ہے کہ روپیہ کی حفاظت کا خود کوئی انتظام کیا جائے یا بینک میں لاکر کرایہ پر لے کر اس میں روپیہ رکھوایا جائے، لیکن اگر ان دونوں صورتوں میں شدید دُشواری ہو تو بینک کی اس مد میں روپیہ رکھوایا جائے جس میں سود نہیں لگتا، مثلاً کرنٹ اکاؤنٹ۔

۲:- سیونگ اکاؤنٹ میں چونکہ سود لگتا ہے، اس لئے اس میں روپیہ رکھوانا دُرست نہیں،[1] اگر غلطی سے رکھوادیا تو سود کی رقم وصول نہ کی جائے،[2] اور اگر غلطی سے وصول بھی کرلی تو صدقہ کردی جائے۔[3]　　　واللہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۶/۲۸ ب)

مسلم ممالک کے لئے غیرمسلم ممالک کے بینکوں میں رقم جمع کراکر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- اکثر سننے میں آیا ہے کہ امیر مسلمان ممالک اپنا فالتو سرمایہ امریکا یا یورپ کے بینکوں یا سودی کاروبار میں لگاتے ہیں، کیونکہ فی الحال ان کے اپنے وسائل اتنے نہیں کہ اپنے ملک کے اندر تمام سرمایہ لگاسکیں، عام معلومات یہ ہیں کہ یہ امیر مسلمان ممالک حاصل شدہ سودی رقم غریب برادر ممالک کو اسلحہ اور اس قسم کی دیگر ضروریات کے لئے صَرف کرتے ہیں۔

جواب:- اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ غیرمسلم ممالک کے بینکوں میں روپیہ جمع کراکر اُس پر سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاءؒ نے دارالحرب کے کفار سے سودی معاملے کی گنجائش دی ہے،[4] مسلمان ممالک ضرورت کے مواقع پر غریبوں کی اِمداد کے لئے اس گنجائش پر عمل کرسکتے ہیں اور بلاضرورت اس سے احتراز واجب ہے۔[5]　　　واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۷/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۶۸۳/۲۸ ب)

(۱ تا ۳) دیکھئے ص:۲۶۸ پر اہم وضاحت اور ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴، مزید اہم تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۴ و ۵) دیکھئے ص:۲۶۷ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ اور ص:۲۶۷ وص:۲۶۸ کے حواشی۔

سیونگ اکاؤنٹ کے سودی منافع سے متعلق جامعہ ازہر کے شیخ طنطاویؒ کے فتویٰ کی حیثیت

سوال:- عرض ہے کہ میرے پاس کچھ نقد رقم ہے، میرا ذہن کاروباری نہیں کہ میں اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کرلوں اور نہ ہی مجھے زمینوں کے جھگڑے نبٹانے آتے ہیں کہ میں اس رقم سے فروخت کرنے کی غرض سے کچھ زمین خرید لوں۔ لہٰذا میں اپنی اس نقد رقم کو حکومتِ پاکستان کے قومی بچت (نیشنل سیونگ) میں رکھنا (انوسٹ کرنا) چاہتا ہوں، تاکہ اس رقم سے میں منافع (پرافٹ) حاصل کرسکوں۔ اس لئے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک اُردو اخبار میں جامعہ ازہر قاہرہ، مصر کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں روپے پیسے کو قومی بچت کے بینکوں میں رکھنا اور اس رقم پر منافع (پرافٹ) لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے شریعت کی رُو سے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس سلسلے میں فتویٰ دیں، جوابی لفافہ موجود ہے، جواب/فتویٰ جلد از جلد ارسال کیجئے، شکریہ والسلام۔

جواب:- مذکورہ سیونگ اسکیم پر ملنے والا منافع شرعاً سود ہے، اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا شرعاً حرام ہے۔[1] جامعہ ازہر کے شیخ طنطاوی کا جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس کو عالمِ اسلام کے تقریباً تمام علماء نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اور وہ فتویٰ قرآن وسنت کے دلائل کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۸/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹۶/۳)

سیونگ اکاؤنٹ پر ملنے والے سود کا حکم، نیز حکومت کا بینک سے زکوٰۃ وصول کرنا

سوال:- زید بینک کا کیشئر ہے، اس نے ۲۷/جون کو مسمّٰی بکر کے سودی کھاتہ کی اصل رقم مبلغ ایک ہزار روپے کے ساتھ سالانہ سود مبلغ ۷۵ روپے بحساب ساڑھے سات روپے فی صد ملادی، پھر ۵/جولائی کو کل رقم ایک ہزار پچھتّر روپے سے زکوٰۃ کاٹی جو کہ ۲۵ روپے بنتی ہے، لیکن یہ وضاحت نہ کی گئی کہ اصل رقم سے زکوٰۃ کاٹی گئی ہے یا کل سے۔ مندرجہ بالا صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ نیز اگر کل سے کٹوتی سرکاری طور پر ہوئی ہے بحیثیت ممبر مشاورتی کونسل جناب کے نوٹس میں یہ بات ہوگی کہ کل رقم سے کٹوتی کی صورت میں بندے کے ذہن کے مطابق سود کی

---

(۱) دیکھئے حوالہ ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۱۔

آمیزش ہوگئی جو کہ شرعی طور پر قابلِ مؤاخذہ ہے۔

جواب:- سیونگ اکاؤنٹ چونکہ سودی اکاؤنٹ ہے، اس لئے اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں،[۱] بلکہ اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہئے جس پر سود نہیں لگتا، تاہم آپ نے سیونگ اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی تھی اُس پر حکومت کی طرف سے جو زکوٰۃ کاٹی گئی شرعاً وہ ادا ہوگئی،[۲] اصل میں زکوٰۃ تو آپ کی رکھوائی ہوئی رقم پر واجب تھی اور اسی سے زکوٰۃ وضع کی جاتی ہے، اور پچھتّر روپے جو بطور سود آپ کی رقم پر اضافہ ہوا تھا آپ کے ذمے واجب تھا کہ وہ بینک سے نہ لیں، یا اگر لیں تو اس کا صدقہ کردیں، اس میں سے کچھ رقم اگر زکوٰۃ فنڈ میں چلی گئی تو اس سے آپ کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر کچھ فرق نہیں پڑا، بہرصورت آپ کی مندرجہ رقم کی زکوٰۃ ادا ہوچکی ہے،[۳] آئندہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں تاکہ سود نہ لگے، یا پھر سیونگ اکاؤنٹ ہی میں یہ لکھ دیں کہ ہماری اس رقم پر سود نہ لگایا جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۰۶ ج)

سیونگ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر اصل رقم سے زائد ملنے والی رقم ''سود'' ہے

سوال:- حکومتِ پاکستان کی جانب سے سرمایہ لگانے کی بہت ساری اسکیمیں ہیں، ۱-ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس، ۲-نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ، ۳-خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹس وغیرہ، کیا ان کو خریدنے کے بعد حکومت سے مقررہ نفع وصول کرنا جائز ہے؟

جواب:- سیونگ سرٹیفکیٹ اور ڈپازٹ سرٹیفکیٹ پر جو رقم اصل رقم سے زائد ''اِنٹرسٹ'' کے نام سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود ہے،[۴] اور اُس کا وصول کرنا حلال نہیں، اگر غلطی سے وصول کرلی

---

(۱) دیکھئے اسی صفحے کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲ و ۳) بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی سے متعلق تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مقالہ ''بینکوں اور مالیاتی اداروں سے متعلق'' اور اُس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تازہ اہم نوٹ فتاویٰ عثمانی ج:۲ ص:۸۰ تا ص:۱۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) کیونکہ وہ قرض پر اضافہ ہے جو ''سود'' ہے۔

وفی کنز العمّال رقم الحدیث:۱۵۵۱۶ ج:۶ ص:۲۳۸ کل قرض جرّ منفعة فهو ربا. وکذا فی الجامع الصغیر ج:۶ ص:۹۴.

وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۴۹۸ (باب کل قرض جرّ منفعة) عن علیّ أمیر المؤمنین رضی الله عنه مرفوعًا: کل قرض جرّ منفعة فهو ربا. وأخرجه البیهقی ج:۵ ص:۳۵۰ وکذا فی المرقاة ج:۶ ص:۶۷ و ۶۸ وارواء العلیل ج:۵ ص:۲۳۴ و درّ منثور للسیوطی ج:۵ ص:۳۵۰ والمطالب العالیة لابن حجر ص:۱۳۷۳.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۶۶ وفی الأشباه کل قرض جرّ نفعًا فهو حرام............................(باقی اگلے صفحے پر)

جائے تو کسی غریب کو صدقہ کردی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶۱/۲۸ ب)

ضرورت کی بناء پر بینک سے سودی قرض لینے کا حکم

سوال:- کیا بینک سے سودی قرض بضرورت لینا جائز ہے؟

جواب:- بینک سے سود پر قرض لینا جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۶/۵ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۷۷/۱۹ الف)

بینک میں رقم رکھوانے کا حکم

سوال:- بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- بینک میں رقم رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائے جس پر سود نہیں دیا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۹ الف)

مستحق کے لئے سود کی رقم کسی بھی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہے

سوال:- ایک شخص نے سود کی رقم ایک فقیر کو دی، اور وہ اس موصوفہ رقم کو سود کی معلوم ہونے پر کھانے پینے کے علاوہ کرایہ وغیرہ میں استعمال کرے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کھانے میں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ وہ خود اگرچہ فقیر یا ضرورت مند ہے لیکن صاحبِ تقویٰ ہے، مجبوری کی وجہ سے ان دیگر مدات رقم استعمال کرلیتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر ایک شخص کے اکاؤنٹ میں سود کی رقم لگ جائے، وہ اس کو رفاہی کاموں میں استعمال کرے، کیسا ہے؟ یا مسجد یا مدرسے کے غسل خانے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

وفی بدائع الصنائع ج:۷ ص:۳۹۵ وأمّا الّذی یرجع الیٰ نفس القرض فهو أن لا یکون فیه جرّ منفعة فان کان لم یجز نحو ..... أقرضه وشرط شرطًا له فیه منفعة.

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۴ ص:۳۵ انّ المنفعة اذا کانت مشروطة فی الاقراض فهو قرض جرّ منفعة.

وفی البحر الرائق ج:۶ ص:۱۲۱ ولا یجوز قرض جرّ نفعًا. وکذا فی الهندیة ج:۳ ص:۲۰۲ وشرح المجلّة ج:۲ ص:۴۵۴ اشارة الیٰ هذا وقال شمس الأئمة الحلوانی انه حرام لانه قرض جر منفعةً۔ نیز بینکوں کے سود سے متعلق تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۵ میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا رسالہ "رافع الضنک عن منافع البنک" اور امداد المفتین میں ص:۸۴۹ تا ۸۵۱، اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا رسالہ پی ایل ایس اکاؤنٹ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیت الخلاء بنوادے تو کیسا ہے؟ کیا سودی کاروبار کرنے والے کا ہدیہ کسی فقیر صاحبِ تقویٰ عالم کے لئے کرایہ وغیرہ میں لگانا جائز ہے؟

جواب:- سود کی رقم اگر اصل مالک کو واپس پہنچانا ممکن نہ ہو تو بغیر نیتِ ثواب کے اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔[1] ایسی صورت میں جس فقیر کو وہ رقم دی جائے، اس کے لئے اُسے اپنے ہر استعمال میں لانا جائز ہے، خواہ کھانا پینا ہو، یا کرائے میں دینا ہو، تاہم اگر کوئی فقیر تقویٰ کے لحاظ سے اُسے کھانے پینے میں استعمال کرنے سے پرہیز کرے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ اور اس مسئلے میں عالم غیر عالم کا کوئی فرق نہیں ہے، ہاں اگر کسی عالم کے سود کی رقم لینے سے اندیشہ ہو کہ لوگوں کے دِل سے سود کی حرمت کی سنگینی میں کمی آئے گی تو ایسی صورت میں عالم کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سود کی رقم معلوم ہونے کے بعد نہ لے۔ واللہ سبحانہ اعلم بالصواب

۱۶/۱/۱۴۱۲ھ

قرض پر منافع حاصل کرنے کی دو صورتوں کا حکم

سوال ۱:- برادرانِ اسلام، السلام علیکم، کے بعد عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں کہ محمد حسین نامی شخص کو پیسوں کی سخت ضرورت پڑی، اس نے تمام شہر سے سوال کیا کہ مجھے پندرہ سو روپے دے دیں، مگر کسی نے نہ دیا، لیکن ایک شخص بنام سردار نے کہا کہ میں تجھے پندرہ سو روپے دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تیرا فلاں رقبہ جو پانچ ایکڑ ہے اس کا نصف فصل جو تجھے ملے وہ بھی مجھے دے دیں اور یہ پندرہ سو روپیہ بھی واپس کردیں یا روپے مذکورہ اور پانچ ایکڑ۔ رقبہ مذکورہ محمد حسین نے پہلے کسی دُوسرے شخص کو بٹائی پر دیا ہوا تھا اس کا نصف فصل مذکورہ محمد حسین نے لیا تھا اس وقت محمد حسین نے یہ شرط قبول کرلی۔ اور پندرہ سو روپے لے لیا، اب یہ رقم شرعاً حلال ہے یا نہیں؟ اگر حرام ہے تو سود بنتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرماویں۔ شکریہ۔

۲:- ایک شخص پندرہ ایکڑ رقبہ اس شرط پر دیتا ہے کہ رقبہ پندرہ ایکڑ کے بدلہ دو ہزار روپے مجھے دیدے اور رقبہ تو کاشت کرلے، اس سے حاصل فصل جتنا بھی ہو نصف تیرا، نصف میرا، جب تک میں دو ہزار روپیہ واپس نہ دُوں یہ رقبہ تم کاشت کرتے رہو، جب رقم ادا کردوں گا رقبہ واپس لے لوں گا، یہ جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقے میں یہ بیماری بڑی ہوگئی ہے برائے مہربانی جلدی جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

---

(۱) دیکھئے ص:۱۲۰ وص:۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

جواب ۱:- مذکورہ معاملہ بلاشبہ سود ہے،[1] اور اس طرح کا معاملہ فریقین کے لئے حرام ہے، اس معاملے کو فوراً ختم کرنا واجب ہے۔[2]

۲:- یہ معاملہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ دو ہزار روپے جب واپس کرنے کی غرض سے لئے گئے تو وہ شرعاً قرض ہوئے، اور اس کے ساتھ زمین بٹائی پر لینے کی شرط لگانا "کل قرض جرّ منفعة"[3] میں داخل ہے، اور دُوسری طرف اگر اس معاملے کی توجیہ یوں کی جائے کہ زمین بٹائی پر دینے کے لئے دو ہزار روپے قرض دینے کی شرط لگائی گئی ہے تو بٹائی میں اس طرح کی شرطِ فاسد لگانا بھی جائز نہیں، لہٰذا یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۷/۳۰ د)

مسجد کا چندہ سودی اکاؤنٹ میں جمع کراکر سود وصول کرنے کا حکم

سوال:- مسجد کمیٹی ضیاء المساجد نواب شاہ سکھر نے مسجد کی اعانت کے سلسلے میں وصول ہونے والی عطیات کی رقم ایک بینک میں جمع کر کے حساب و کتاب کھلوایا ہے، بینک والوں نے اب اس رقم پر کچھ سود کی رقم جمع کی ہے، مسجد کمیٹی اس سلسلے میں شرعی حکم معلوم کرنے کی خواہش مند ہے۔

جواب:- مذکورہ سود کی رقم بینک سے وصول نہ کی جائے،[5] اور اگر غلطی سے وصول کر لی جائے تو غریبوں میں صدقہ کردی جائے،[6] مسجد پر خرچ نہ کی جائے، اور آئندہ اگر مسجد کا روپیہ بینک میں رکھوانا ضروری ہو تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوایا جائے جس پر سود نہیں لگتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۷۹/۲۸ ج)

ایل سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرانے کی صورت میں دو خرابیوں کی وجہ سے معاملہ ناجائز ہے

سوال:- امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار جو اور لحاظ سے جائز ہو مگر L/C کی وجہ سے ان

(۱ و ۲ و ۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۴) دیکھئے هداية، كتاب المزارعة ج:۴ ص:۴۲۶ (طبع شركت علميه ملتان)

الدر المختار ج:۶ ص:۲۷۶ (طبع سعيد)

البحر الرائق ج:۸ ص:۲۹۳ (طبع رشيديه كوئٹه)

وشرح المجلة رقم المادّة:۱۴۳۵ ج:۲ ص:۶۷۱ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

(۵ و ۶) دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت نیز ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی اور اہم تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

کے اخراجات آمدنی میں ایک قلیل عنصر سود کا شامل ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر جس دن بینک Retire Documents کرنے کے لئے Advice دیتا ہے، اس دن بھی کاغذات Retire کرنے پر ایک دن کا Interest ادا کرنا پڑتا ہے، کیا یہ مجبوری اِضطراری شمار ہوگی؟ اور اس طرح یہ آمدنی جائز قرار دی جائے گی؟

جواب:- اگر ایل.سی کھولتے وقت پوری رقم جمع نہ کرائی جائے تو اس میں صرف یہی خرابی نہیں ہے جو آپ نے ذکر کی، بلکہ اس میں ایک اور خرابی بھی ہے، اور وہ یہ کہ بینک گارنٹی کی فیس دینی پڑتی ہے، شرعاً وہ بھی ناجائز ہے،[۱] لہٰذا شرعی اعتبار سے جائز طریقہ یہ ہے کہ ایل.سی کھولتے وقت پوری رقم جمع کرادی جائے،[۲] یا کسی ایسے بینک سے معاملہ کیا جائے جو اِسلامی اُصولوں کے مطابق کام کرتا ہو۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

بینک کا کسی کمپنی کو ڈالر کے ڈسکاؤنٹ پر ایل.سی کھول کر بعد میں اداشدہ ڈالر کی قیمت سے زیادہ وصول کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم ایک پارٹی کو پاکستان سے باہر مال بیچتے ہیں تو اس کے لئے بینک میں ایل.سی کھولتے ہیں، فرض کریں کہ ہم نے ایک ڈالر کے حساب سے کوئی چیز تین ماہ کی ادائیگی پر بیچی ہے، تو بینک یہ سہولت دیتا ہے کہ ہم بینک سے فوراً ادائیگی لے لیں، اور بینک ہماری پارٹی سے تین ماہ کے بعد ہمارے بجائے خود ادائیگی وصول کرے گا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب بینک ہمیں ادا کرے گا تو وہ ادائیگی کے وقت ڈالر کا جو ریٹ ہوگا اس سے کرے گا، اور پارٹی سے جب تین ماہ بعد ادائیگی وصول کرے گا تو وہ اس ادائیگی کے وقت کا ریٹ لگائے گا، اور اس میں زیادہ گمان ڈالر کے ریٹ بڑھنے کا ہوتا ہے، اس طرح ایل.سی کھول کر کام سود کے زُمرے میں تو نہیں آتا؟

مزید وضاحت اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب خریدار DA90 دونوں کی ایل.سی کھولتا ہے تو بینک ہمیں ڈسکاؤنٹ نرخ کے اُوپر فوراً ادا کردیتا ہے، بشرطیکہ ہماری ساکھ اچھی ہو، اس کا طریقہ یہ ہے کہ بینک ہمیں ڈالر ڈسکاؤنٹ ریٹ کے اُوپر ادا کرتا ہے، اگر حاضر میں 19.75 ڈالر کا نرخ ہے تو بینک ہم سے ڈسکاؤنٹ خرید لیتی ہے، اور اس نے ہم کو 19.25 روپے کے حساب سے ادا کیا، جب مقررہ

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''اِسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۱۱۹ تا ۱۲۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

وقت پر بینک کو ادائیگی وصول ہوتی ہے تو اس وقت کے حالات کے مطابق جو بھی بینک ریٹ ہوتا ہے وہ ملتا ہے، چاہے وہ 20.50 روپے ہوجائے، اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو صورتِ حال لکھی ہے وہ ایک طرح جائز ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ خریدار کے ذمے آپ کی جو قیمت واجب ہوئی خریدار اس کا حوالہ بینک کو ڈالروں کی شکل میں دے، اور بینک اس حوالے کو قبول کرے، پھر اگر بینک آپ کو قانونی مجبوری کی وجہ سے ڈالر دینے کے بجائے ڈالر کی اس روز کی قیمت کے لحاظ سے پاکستانی روپیہ دے اور بعد میں اصل خریدار سے ڈالر وصول کرے یا ڈالر کی اس روز کی قیمت کی کوئی اور کرنسی وصول کرے تو جائز ہے، لیکن واضح رہے کہ حوالے کے معاملے میں ڈالر کی ادائیگی کا طے ہونا معاملے کی صحت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔[۱]

مزید یہ واضح رہے کہ جتنے ڈالر کا حوالہ کیا گیا، بینک کو اتنے ہی ڈالر آپ کو دینے ضروری ہوں گے، ان میں کمی بیشی جائز نہیں ہوگی، لہٰذا بلوں کو ڈسکاؤنٹ کرنے کا جو طریقہ رائج ہے،[۲] وہ سود ہے۔[۳] نیز آپ کو جو پاکستانی روپیہ ادا کیا جارہا ہے وہ ڈالر کے مارکیٹ ریٹ پر یا بینک ریٹ پر ہونا ضروری ہے (لقوله علیه السلام لا بأس أن تأخذها بسعر یومها، رواه أبو داؤد)،[۴] مارکیٹ اور بینک ریٹ سے اتنی کمی بیشی جس میں بینک اپنے سود کی مقدار پوری کرلے جائز نہیں۔ ہاں! ڈالر کی بازاری قیمت میں تین ماہ کے اندر جو فرق آئے گا وہ فرق بینک کا منافع ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۹/۹/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۵۷/۴۰ د)

پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے نفع کا حکم

سوال:- ایک ملازم کی تنخواہ سے ماہوار ایک خاص رقم بطور ''جی. پی فنڈ'' کاٹ دی جاتی ہے اور جس وقت ملازم کی میعادِ ملازمت ختم ہوجاتی ہے تو ریٹائر ہونے کے بعد جتنی رقم اس ملازم کی جمع ہوئی ہے اس کی دُگنی رقم اِمداد کی شکل میں مل جاتی ہے، کیا اس رقم کا لینا جائز ہوگا؟

---

(۱) فی الهدایة کتاب الحوالة ج:۳ ص:۱۳۶ (طبع رحمانیه) وتصح الحوالة برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیه.

(۲ و۳) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ج:۲ ص:۹۸ تا ص:۱۲۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادتی محکمہ دیتا ہے وہ بحکمِ سود نہیں ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۸۸/۲/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۳۱/۱۹ الف)

بینک کے سود کا حکم، بینک میں کونسا اکاؤنٹ کھلوانا دُرست ہے؟

سوال ۱:- بینک کے سود کا کیا حکم ہے؟ وہ لینا چاہئے یا نہیں؟ اگر لے لیا تو کیا حکم ہے؟

۲:- دارالعلوم یا دیگر رفاہی ادارے جو بینک میں پیسے رکھتے ہیں وہ کونسے اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں؟ اور سودی رقم کا کیا مصرف لیتے ہیں؟

جواب ۱:- بینک کا سود لینا نہ چاہئے،[۲] غلطی سے لے لیا تو بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردے،[۳] اور ملازموں وغیرہ کو بھی دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اُجرت میں نہ لگائیں۔

۲:- روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھواتے ہیں، جس پر سود نہیں لگتا، اور ایسا ہی سب کو کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

پراویڈنٹ فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں، جہاں ہر ماہ میری تنخواہ سے کچھ پیسے کٹتے ہیں، ان پیسوں کے برابر کمپنی اپنی طرف سے اتنا ہی پیسہ ہمارے نام جمع کرتی ہے، اس کے علاوہ ان پیسوں پر سود بھی دیا جاتا ہے، کیا یہ سود شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب:- یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ کی ہے، اس کا لینا جائز ہے، اور سود کے نام سے اس میں جو رقم دی جاتی ہے، شرعاً وہ سود نہیں ہے، اس کو وصول کرنا اور استعمال میں لانا دُرست ہے، اس مسئلے کی مفصل تحقیق مع دلائل مطلوب ہو تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ پراویڈنٹ فنڈ ملاحظہ فرمائیں۔[۴]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۴/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۷۶/۲۸ ب)

---

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ "پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ" ملاحظہ ہو۔

(۲ و ۳) فی الشامیة ج:۵ ص:۹۹ (طبع سعید) لا یحل اذا علم عین الغصب مثلًا وان لم یعلم مالکه لما فی البزازیة أخذ مورثه رشوة أو ظلمًا، ان علم ذٰلک بعینه لا یحل لهٗ اخذه والّا فله أخذهٗ حکمًا أما فی الدیانة فیتصدق به بنیة ارضاء الخصماء. اھ نیز دیکھئے ص:۲۶۸ پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی اہم وضاحت اور مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ص:۱۲۰ و۱۲۱ کے حواشی اور ص:۱۲۹ کا فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔

(۴) مزید دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے مکان خریدنے کا حکم

سوال:- ایک شخص کے پاس مکان بنوانے کے لئے رقم نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں رہتا ہے، کیا وہ شخص ہاؤسنگ سوسائٹی سے قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- سود پر قرض لینا تو حرام ہے،(۱) البتہ جو سوسائٹی مکان فروخت کر رہی ہے اُس سے جس قیمت پر بھی معاملہ ہو جائے وہ کیا جا سکتا ہے، بالاقساط رقم ادا کرنے کی صورت میں اگر وہ مکان کی قیمت، نقد قیمت کے مقابلے میں بڑھا کر وصول کرے تو اس طرح خریدنے کی بھی گنجائش ہے۔(۲)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ

''این.آئی.ٹی'' یونٹ کی جدید صورتِ حال اور اس کا شرعی جائزہ

سوال:- N.I.T یونٹ جس کا شمار سرکاری تمسکات میں ہوتا ہے، اس کا شرعی حکم جاننا چاہتا ہوں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد کساد بازاری پیدا ہوئی تو حکومتِ پاکستان نے مذکورہ یونٹ کی تجارتی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے قیمت اور نفع مقرّر کر دیا ہے، ایسی صورت میں نفع سود کی تعریف میں آئے گا یا نہیں؟ اور اس کو رشتہ داروں، حاجت مندوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- اس نئی صورتِ حال کی بناء پر ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کا مسئلہ مشتبہ اور قابلِ غور ہو گیا ہے، اس کے لئے ہمیں ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کی پوری اسکیم کے مطالعے کی ضرورت ہے، لہٰذا اسمبلی کے جس ایکٹ یا حکومت کے جس گزٹ کے ذریعے یہ اسکیم جاری ہوئی ہے، براہِ کرم اس کی ایک کاپی کہیں سے فراہم کر کے ہمیں بھجوا دیجئے، کیونکہ اس پر غور کر کے ہی کوئی جواب دیا جا سکتا ہے، واضح رہے کہ ''این.آئی.ٹی'' یونٹ کے پراسپکٹس جو مطبوعہ ملتے ہیں وہ ہمارے پاس موجود ہیں، مگر ان سے بات واضح نہیں ہوتی، لہٰذا اصل اسکیم جس ایکٹ یا گزٹ کی بنیاد پر جاری ہوئی، وہ کہیں سے فراہم کر کے بھیج دیجئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۳۰ و)

---

(۱) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲) حوالہ جات کے لئے دیکھئے ص:۱۱۵ اور ص:۳۱۰ کا حاشیہ۔

''این.آئی.ٹی'' کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا تفصیلی حکم

سوال:- آپ کا خط مؤرخہ ۱۷/۳/۱۳۹۸ء آج موصول ہوا، آپ کا خط پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، غالباً پچھلے خط میں اپنا مافی الضمیر میں آپ کو واضح طور پر بتلا نہیں سکا۔

آپ کی مایہ ناز تصنیف میں مجھے یہ بات محلِ نظر معلوم ہوئی کہ آپ نے N.I.T کاروبار کو جائز کہا ہے، اس ضمن میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بھی گورنمنٹ کنٹرول میں ایک اِدارہ ہے، جس کا کاروبار یہ ہے کہ سرمایہ کمپنیوں کے حصص کی خریداری میں لگاتے ہیں اور گورنمنٹ کے سودی کاروبار میں اس طرح جو منافع اور سود حاصل ہوتا ہے اس کو ایک خاص طریقے سے تقسیم کردیتے ہیں، اصل سرمایہ محفوظ اور سرمایہ پر منافع کی گارنٹی ہوتی ہے۔

آپ کی طرف سے وضاحت یہ ہوتی کہ بہرحال یہ سود نہیں ہے اور جائز ہے، تو میں مان لیتا یا آپ یہ کہتے کہ یہ ناجائز ہے۔

آپ نے جو خط لکھا اس سے جو صورتِ حال بنتی ہے وہ یہ ہے:-

بقول آپ کے اُس وقت N.I.T میں نفع کی کوئی ضمانت نہ تھی، بلکہ یہ اصول تھا کہ یونٹ لینے والا کاروبار کے نفع ونقصان دونوں میں شریک ہوگا، اُس وقت یہ کاروبار بلاشبہ جائز تھا۔ نفع و نقصان میں شرکت محض بہکانے کے لئے تھی، اُس وقت بھی ۱-حکومت کا اس میں حصہ تھا، ۲-اس رقم سے جو اس اِدارے میں جمع ہوتی تھی سود وغیرہ کا غیرشرعی کاروبار کیا جاتا تھا۔

ان دونوں شقوں کے ہوتے ہوئے اَب اس کاروبار کو ''بلاشبہ جائز'' قرار دے رہے ہیں، دوبارہ غور فرمالیں۔

جب گورنمنٹ پبلک کو یہ اطمینان دِلانے کے لئے کہ ان کو ڈھائی فیصد سود کم سے کم ضرور ملے گا تاکہ لوگ اس میں روپیہ لگائیں، آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یونٹ خریدنے پر اِنکم ٹیکس میں چھوٹ مل جاتی ہے۔

اُس وقت کا ذکر کرکے آپ لکھتے ہیں:-

''اس کے شرعی جواز میں تردّد پیدا ہوگیا، لیکن بعد میں علماء کی ایک مجلس میں یہ مسئلہ زیرِ غور آیا تو اس اِدارے کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا گیا، معلوم ہوا کہ یہ اِدارہ خالص نجی شعبے سے تعلق رکھتا ہے، حکومت نے اس کے کچھ حصے ضرور لئے ہیں مگر ان کا تناسب مجموعے کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لئے علماء اور اہلِ فتویٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ کاروبار چند شرائط کے ساتھ جائز ہوسکتا ہے: ۱-حکومت

کا اس میں حصہ نہ ہو، ۲-اس رقم سے جو اِدارے میں جمع ہوتی ہے سود وغیرہ کا کوئی غیرشرعی کاروبار نہ کیا جائے، بلکہ تجارت کی جائے۔ ان دو شرطوں کی موجودگی میں اگر حکومت فریقِ ثالث کی حیثیت سے ڈھائی فیصد منافع کی ضمانت دیدے تو یہ سود نہیں ہوگا۔''

آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ کیا حکومت نے یہ دو شرائط مان لی ہیں، اور یہ کاروبار شرعی ہوگیا یا حکومت نے یہ شرائط نہیں مانیں اور یہ کاروبار غیرشرعی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں مانیں تو پھر اس کو غیرشرعی ماننے میں آپ کو کیا تکلف ہے؟

یہ بھی عجوبہ ہے کہ ایک طرف تو آپ حکومت کو اس میں حصہ نہ لینے کو کہتے ہیں اور دُوسری طرف اس کو فریقِ ثالث بناتے ہیں۔

اس کو بجائے "Private Sector" کے گورنمنٹ کنٹرول میں کہنے کی کیا آپ کوئی مثال دے سکیں گے "Private Sector" میں کاروبار کرنے والے اِدارے کا سربراہ گورنمنٹ مقرّر کرتی ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پیشتر اس کے سربراہ قرنی C.SP آفیسر تھے۔

زید اور عمر کے مشترکہ کاروبار کی جو مثال آپ نے دی وہ N.I.T پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں شراکت کا سوال ہی نہیں ہے، N.I.T اپنے یونٹ بیچتی ہے، اس کی قیمتِ خرید اور فروخت مقرّر کرتی ہے، اس میں شراکت کا کوئی مفہوم ہے ہی نہیں، قرض لیتا اور سود اَدا کرتا ہے۔

آپ عالم ہیں، میں آپ کی بات مانے لیتا ہوں، کہ ایک آدمی دُوسرے کا روپیہ لے کر اپنی تجارت میں لگائے اور اس کو یقین دِلائے کہ تمہارا سرمایہ محفوظ رہے گا، نقصان میں تم شریک نہیں ہو، منافع میں البتہ شریک ہو۔ میں نے سود کے متعلق جو پڑھا ہے وہ تو یہی ہے کہ اگر نفع ونقصان میں شریک ہے تو یہ جائز ہے، اور اگر صرف نفع میں شریک ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو تو سود ہے۔

اگر زحمت نہ ہو تو میرے سوال کا جواب دیں، جو یہ ہے کہ کیا N.I.T کاروبار میں روپیہ لگانا جائز ہے؟ میرے خیال میں یہ سود ہے اور ناجائز ہے۔

جواب:-

این.آئی.ٹی یونٹ میں جب تک حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت نہیں دی تھی، اس وقت تک تو اس کاروبار کی اصل نوعیت شریعت کے مطابق تھی، لیکن جب سے حکومت نے ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دی ہے، اُس وقت سے یہ شبہ پیدا ہوگیا ہے کہ اوّل تو شرکت ومضاربت میں ہونے والا نفع حاصل نہ ہوجائے وہ کوئی حقِ واجب نہیں ہوتا، اور ضمانت یا کفالت کی صحت کے لئے شرط یہ ہے کہ حقِ مضمون حقِ واجب ہو، لما فی العالمگیریة: "ولا تجوز الکفالة بالأمانات کالودائع وأموال

المضاربات والشركات لأن هٰذه الأشياء غير مضمونة لا عينها ولا تسليمها." (ہندیہ ج:۳ ص:۲۵۴)۔[۱]

وفي الفتاویٰ الانقروية: "وفيما كان أمانة فان كان غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تجوز الكفالة بتسليمه" (الفتاویٰ الانقرویۃ ج:۱ ص:۳۱۸)۔[۲]

وفي فتح القدير: "وضمان الخسران باطل، لأن الضمان لا يكون إلّا بمضمون، والخسران غير مضمون علىٰ أحد، حتّى لو قال: بايع في السوق علىٰ أنّ كل خسران يلحقك فعلَيّ، أو قال لمشتري العبد ان أبق عبدك هٰذا فعلَيّ، لا يصح" (فتح القدیر ج:۵ ص:۴۲۴)۔[۳]

وهٰذا الأصل مسلّم عند الفقهاء الأربعة راجع المجموع شرح المهذب ج:۱۳ ص:۴۵۹[۴]، والمقنع لابن قدامة ج:۲ ص:۱۱۵[۵]، والشرح الصغير علىٰ أقرب المسالك ج:۳ ص:۴۳۲۔[۶]

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کفالت اگر فریقِ ثالث کی طرف سے ہو تو اُس کے صحیح نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قضاءً نافذ نہیں ہوگی، لیکن اگر دو آدمی عقد کر رہے ہوں اور تیسرا شخص ان میں سے کسی سے یہ وعدہ کرلے کہ اگر تمہیں کوئی نقصان ہوا یا نفع نہ ہوا تو میں اس کی تلافی کروں گا، تو ایک وعدے کی حیثیت سے اس میں کوئی حرج نہیں، اور اَخلاقاً و دیانۃً اس پر اس وعدے کا ایفاء لازم ہوگا، اِلَّا یہ کہ کوئی عذرِ شرعی پیش آجائے، چنانچہ جب وہ اپنے اس وعدے کا ایفاء کرے تو لینے والے کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

لہٰذا حکومت اگر فریقِ ثالث کی حیثیت میں ڈھائی فیصد نفع کی ضمانت دے رہی ہے تو یہ قانونِ ضمانت کے طور پر تو دُرست نہیں ہے، لیکن وعدے کے طور پر دُرست ہے، جس کے ایفاء پر

---

(۱) (طبع رشیدیہ کوئٹہ)، وفي فتح القدير ج:۶ ص:۳۱۲ (طبع رشیدیہ) .... ولا بما كان أمانة كالوديعة والمستعار والمستأجر ومال المضاربة والشركة ...الخ.

وفيه تحته: الكفالة بأمانة غير واجب التسليم كالوديعة ومال المضاربة والشركة لا تصحّ أصلًا .... الخ.

(۲) طبع قديم.

(۳) فتح القدير كتاب الكفالة ج:۶ ص:۳۲۳ (طبع رشيديه كوئٹه).

(۴) وفي كتاب المجموع شرح المهذب للشيرازي كتاب الضّمان ج:۱۳ ص:۱۲۲ (طبع دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان) ويشترط في المال المكفول به أن يكون دينًا فلا تصحّ الكفالة في الأمانات كالعني المستعارة والعين المودعة وكذا مال المضاربة والشركة فاذا استعار أحد سلعة من آخر واتىٰ له بضامن يضمنه في ردّ تلك السلعة فانّهٗ لا تصحّ، وكذا اذا أودع عند آخر وديعة أو مالا يعمل به مضاربة ....الخ.

وفيه أيضًا ج:۱۳ ص:۱۲۲ (طبع مذكور) القسم الرّابع يرجع الى المضمون به سواء كان دينًا أو عينًا أو نفسًا فيشترط في الدَّين أن يكون لازمًا في الحال أو المال ومثال الدَّين اللّازم في الحال القرض، وثمن السلعة المبيعة ونحو ذٰلك ....الخ.

(۵) طبع المطبعة السلفية.

(۶) طبع دار المعارف مصر.

حکومت کو قضاءً مجبور تو نہ کیا جاسکے گا لیکن اگر وہ ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈر کو اس کا لینا جائز ہونا چاہئے۔

البتہ اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں حکومت فریقِ ثالث نہیں ہوتی بلکہ کاروبار میں شریک ہے، کیونکہ این.آئی.ٹی کے کاروبار میں حکومت کا بھی حصہ ہے، لہٰذا وہ مضمون لہم سے خود ہی عقدِ مضاربت کر رہی ہے اور خود ہی نفع کی ضمانت دے رہی ہے، تو یہ عقد رِبا ہوجائے گا۔

لیکن غور کرنے سے اس شبہ کا بھی جواب مل جاتا ہے، اور وہ یہ کہ این.آئی.ٹی کا پورا اِدارہ یونٹ ہولڈروں کے لئے مضارب ہوتا ہے اور اس اِدارے میں بہت سے ارکان شریک ہیں، جن میں سے ایک رُکن حکومت بھی ہے، لہٰذا مضارب کوئی ایک رُکن نہیں بلکہ ارکانِ اِدارہ کی پوری جماعت ہے، اور ضمانت دینے والی صرف حکومت ہے جو اس اِدارے کی محض ایک رُکن ہے، لہٰذا اس کو یوں نہیں کہا جاسکتا کہ مضارب نے نفع کی ضمانت دی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مضاربین کی جماعت میں سے صرف ایک رُکن نے اپنی شخصی حیثیت میں ضمانت دی ہے، اس کا حکم فریقِ ثالث ہی کی ضمانت کا ہوگا۔

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مضاربین کی اس جماعت کے تمام ارکان اس کاروبار میں ایک دُوسرے کے لئے شریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر شریک دُوسرے کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے ایک شریک کا فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ شریک کا وہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب ہوتا ہے جو وہ بحیثیت شریک کرے، اور یہاں حکومت بحیثیتِ شریک ضمانت نہیں دے رہی ہے بلکہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں یہ ضمانت دے رہی ہے، اس لئے اس کا یہ فعل تمام شرکاء کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور اس کو یہ نہ کہیں گے کہ یہ ضمانت مضارب نے دی ہے، کیونکہ مضارب تنہا حکومت نہیں، بلکہ ارکانِ اِدارہ کی جماعت من حیث المجموع ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حکومت نے ڈھائی فیصد کی ضمانت دی ہے، وہ شرعاً کفالت کی شرائط پر پوری نہیں اُترتی، لہٰذا قضاءً اس کا ایفاء حکومت پر لازم نہیں، البتہ یہ ایک وعدہ ہے، اور اگر حکومت اس کا ایفاء کرے تو یونٹ ہولڈروں کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

البتہ چونکہ مذکورہ مسئلے کی کوئی صراحت فقہاء کے کلام میں نہیں ہے، بلکہ مذکورہ بالا حکم قواعد کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، اور اس میں صورۃً سود کی مشابہت پائی جاتی ہے، اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ جب این.آئی.ٹی کے کاروبار میں نفع نہ ہوا ہو اور حکومت نے اپنے پاس سے اس کی تلافی کی ہو تو یہ تلافی کی رقم یا تو وصول نہ کی جائے یا اُس کا صدقہ کردیا جائے، کیونکہ اگر بالفرض حکومت کی یہ ضمانت بحیثیتِ وعدہ بھی فاسد ہو اور اس کا لینا حلال نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ ضمانت ہی فاسد ہوگی، اس سے

این.آئی.ٹی کے ساتھ کیا ہوا اصل عقد باطل نہ ہوگا۔ لما في البدائع: "وكذٰلك لو شرط عليه أن الوضيعة عليّ وعليك فهٰذه مضاربة والربح بينهما والوضيعة على ربّ المال لأن شرط الوضيعة على المضارب شرط فاسد، فيبطل الشرط وتبقى المضاربة." (بدائع الصنائع ج:۶ ص:۸۰)[۱]۔

البتہ یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ این.آئی.ٹی کا اِدارہ رقمیں وصول کرکے انہیں کسی جائز کاروبار میں لگاتا ہو، لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس اِدارے کی بعض رُقوم سودی قرض دینے پر بھی لگائی جاتی ہیں، اور سودی کاروبار کا تناسب مجموعی کاروبار میں مختلف سالوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لہٰذا مذکورہ جواز اس صورت میں ہوگا جبکہ اِدارے کا اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگایا جاتا ہو، اور اگر کسی سال یہ معلوم ہوجائے کہ اکثر سرمایہ سودی قرضوں یا کسی اور حرام کاروبار میں لگا ہوا تھا تو اس صورت میں یونٹ کا نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، اور جس صورت میں اکثر سرمایہ جائز کاروبار میں لگا ہو اور کچھ حصہ ناجائز کاروبار میں لگا ہو تو اس وقت بھی یونٹ ہولڈر کو چاہئے کہ یونٹ خریدتے وقت اِدارے کو یہ لکھ دے کہ اس کی رقم سودی کاروبار میں نہ لگائی جائے، پھر اگر اِدارہ لگائے گا تو اس لگانے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، یونٹ خریدنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ امداد الفتاویٰ میں کمپنیوں کے شیئرز کے بارے میں یہی طریقہ لکھا ہے (امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۹۱)۔

خلاصہ:- یہ کہ یونٹ خریدنا اس شرط سے جائز ہے کہ کاروبار کی رقم کا اکثر حصہ حرام کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو، اس شرط کی موجودگی میں اگر کاروبار میں واقعۃً ڈھائی فیصد سے زیادہ نفع ہوا ہو تو وہ نفع وصول کرنا بلاشبہ جائز ہے، البتہ جس صورت میں کاروبار کو ڈھائی فیصد سے کم نفع ہوا ہو، اور حکومت نے تلافی کے طور پر اپنے پاس سے رقم ادا کرکے ڈھائی فیصد نفع پورا کیا ہو، تو جتنی رقم حکومت نے ادا کی ہے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وصول نہ کی جائے، تاہم اس صورت میں بھی پورا نفع لینے کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
محمد تقی عثمانی
۱۳۹۸/۴/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۳۹ ب)

رشید احمد عفا اللہ عنہ	عبدالرزّاق اسکندر	ولی حسن
۱۳۹۸/۴/۱۲ھ	۱۳۹۸/۴/۱۲ھ	دارالافتاء مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی

---

(۱) (طبع سعید).

''این.آئی.ٹی'' کا جدید حکم (تفصیلی فتویٰ)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے ''این.آئی.ٹی'' یونٹ خرید کر کسی دِینی ادارے کو دیئے ہیں اور اس کا منافع بھی اسی دِینی ادارے کو دیتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ منافع جائز ہے یا ناجائز؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز ثابت کرکے وضاحت فرمائیں۔

جواب:- **الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، أمّا بعد!**

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این.آئی.ٹی) کے نام سے سرمایہ کاری کا ایک ادارہ عرصۂ دراز سے ملک میں قائم ہے، ابتداء میں اس کا طریقِ کار سودی قسم کا تھا، لیکن ۱۹۷۹ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق حکومت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ اس ادارے سے سود کا عنصر ختم کرکے اُسے اسلامی اَحکام کے مطابق چلایا جائے، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے لئے متبادل طریقِ کار بھی تجویز کردیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۷۹ء کے بعد اس ادارے کے طریقِ کار میں تبدیلی لائی گئی، حکومت نے اس میں سے اپنے حصے واپس لے لئے، اور اس ادارے نے جن غیرشرعی کمپنیوں کے حصص خرید رکھے تھے، رفتہ رفتہ وہاں سے رقمیں نکال کر ایسی کمپنیوں کے حصص خریدے جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے، یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ادارے کے ذمہ دار حضرات سے ممکنہ تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ادارے کا بنیادی کام ایسی کمپنیوں کے حصص خریدنا اور ان سے منافع حاصل کرنا ہے، جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہے۔ چنانچہ اس تحقیق کے بعد ہم نے یہ فتویٰ دیا کہ اس ادارے کے یونٹ خریدنا بھی جائز ہے، اور ان یونٹوں پر ملنے والا نفع بھی حلال ہے، البتہ ساتھ ہی مستفتی حضرات سے یہ بھی کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ ہر سال کی بیلنس شیٹ کے ذریعے اس بات کا اطمینان بھی کرلیا کریں کہ کسی غیرشرعی کاروبار کے حصص تو اس میں شامل نہیں ہوئے۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے احقر کو معلوم ہوا کہ ''این.آئی.ٹی'' نے کمپنیوں کے حصص خریدنے کے علاوہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کی بنیاد پر براہِ راست بھی کاروباری افراد کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کردیا ہے، چونکہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے تحت سرمائے کی

فراہمی کا شرعی حکم ان کا تفصیلی طریقِ کار معلوم ہونے پر موقوف تھا، اور ہمارے ملک میں ان ناموں سے سراسر غیر شرعی کاروبار بھی ہوتا رہا ہے، اس لئے احقر نے اس اطلاع کے بعد ''این.آئی.ٹی'' کے بارے میں آئے ہوئے تمام سوالات روک لئے، اور مستفتی حضرات کو لکھ دیا گیا کہ اب اس ادارے کے طریقِ کار میں بعض تبدیلیوں کا علم ہوا ہے، جن کی تحقیق کی جارہی ہے، لہٰذا تحقیق ہونے تک ہم جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے، تحقیق کے بعد جو صورتِ حال واضح ہوگی، اس کے بعد اِن شاء اللہ جواب دیا جائے گا۔

اس دوران احقر نے ''این.آئی.ٹی'' کے سربراہ سے مل کر مذکورہ طریقہ ہائے تمویل کی پوری حقیقت اور تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن کئی بار وقت طے ہونے کے باوجود کبھی احقر کے کسی سفر یا مصروفیت کی بناء پر اور کبھی ان کے کسی عذر کی بناء پر یہ ملاقات نہ ہوسکی۔

اب کچھ عرصہ پہلے احقر کو ''این.آئی.ٹی'' کے دفتر میں جاکر ان کا طریقِ کار دیکھنے اور ان کے معاملات کی حقیقت جاننے کا موقع ملا، اس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوئی کہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے ناموں سے جو سرمایہ فراہم کیا جارہا ہے، وہ شرعی اعتبار سے یقینی طور پر ناجائز ہے اور اس کو کسی تأویل سے بھی حلال نہیں کہا جاسکتا۔ ''مارک اَپ'' کا اصل تصوّر یہ تھا (اور اسٹیٹ بینک کے ہدایت نامے میں بھی اسی کا ذکر ہے) کہ ادارہ کوئی سامان خرید کر اُسے نفع پر فروخت کرے گا، لیکن عملاً دُوسرے بینکوں کی طرح ''این.آئی.ٹی'' بھی کوئی سامان خرید کر بیچنے کے بجائے براہِ راست کاروباری افراد کو رقمیں مہیا کرتا ہے، اور وہ اس رقم سے جو چیزیں چاہیں خریدتے ہیں، اور محض کاغذی طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ وہ چیزیں ''این.آئی.ٹی'' نے ان کو نفع پر فروخت کی ہیں، حالانکہ ''این.آئی.ٹی'' کو ان خرید کردہ اشیاء کی مقدار وغیرہ کا علم تک نہیں ہوتا، چہ جائیکہ وہ اشیاء ان کی ملک یا قبضے میں آئیں۔ لہٰذا یہ طریقِ کار شرعاً بلاشبہ سود ہے، اور سود کا نام ''مارک اَپ'' رکھ لینے یا اس کاغذی کارروائی سے معاملے کی حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، تقریباً یہی صورت ''ٹی ایف سی'' میں ہے۔

جہاں تک ''پی ٹی سی'' (پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کا تعلق ہے، اصلاً یہ معاملہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر ہونا چاہئے تھا، اور اس کا اصل تصوّر یہی تھا، لیکن موجودہ طریقِ کار کے تحت ان میں بہت سی شرائط خلافِ شریعت ہیں، جن کی وجہ سے یہ معاملہ بھی شریعت کے مطابق نہیں رہا، اور اب ادارے نے رفتہ رفتہ ''پی ٹی سی'' کو بھی ''ٹی ایف سی'' میں تبدیل کرنا شروع کردیا ہے۔ لہٰذا خلاصہ یہ

ہے کہ ''مارک اَپ''، ''پی ٹی سی'' اور ''ٹی ایف سی'' کے نام سے جو کاروبار یہ ادارہ کر رہا ہے وہ شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حرام ہے۔

اس کے بعد ادارے کی بیلنس شیٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے کی سرمایہ کاری کا بہت بڑا حصہ انہی تین مدات میں صَرف کیا جا رہا ہے، جس کی تفصیل جون ۱۹۸۶ء کی پوزیشن کے مطابق یہ ہے:-

مارک اَپ:-	۱۶ء۲۲
پی ٹی سی:-	۲ء۵۴ فیصد
ٹی ایف سی:-	ء۹۵

اس کے علاوہ بینکوں اور سودی مالیاتی اداروں کے حصص میں بھی ادارے کی ۶۷ء۱ فی صد رقم جمع ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''این.آئی.ٹی'' اپنی رقموں کا ۳۸ء۲۱ فیصد حصہ ان ناجائز کاموں میں لگا رہا ہے۔ مزید ۲۸ء۲ فیصد سرمایہ کاری ''آئی سی پی'' کے میوچول فنڈ میں ہو رہی ہے، جس کی بیلنس شیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بینکوں کے حصص میں بھی سرمایہ کاری کی گئی ہے، اس طرح سرمایہ کاری کی ۶ء۲۴ فیصد مدات ناجائز یا مشکوک ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جون ۱۹۸۷ء تک ''مارک اَپ'' پر دیئے گئے سرمائے کی شرح اور بھی بڑھ کر تقریباً اڑتیس فیصد ہوگئی۔ اور اس طرح جون ۱۹۸۷ء پر ختم ہونے والے سال میں ناجائز مدات میں لگے ہوئے سرمائے کا تناسب تقریباً ۴۶ فیصد تک پہنچ گیا۔

لہٰذا یہ معلوم ہونے کے بعد شرعی حکم یہ ہے کہ ''این.آئی.ٹی'' کے یونٹ خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جن لوگوں نے سابق فتوے یا ادارے کے اعلانات کے مطابق ''این.آئی.ٹی'' یونٹ جائز سمجھ کر خرید رکھے ہیں، اور ان پر انہیں سالانہ منافع (Divident) بھی تقسیم کیا گیا ہے، ان کے لئے اس منافع کا کیا حکم ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ادارے سے یہ بات معلوم کر لی جائے کہ اس کے سالانہ کل منافع میں سے کتنے فیصد منافع ان تین مدات میں سے حاصل ہوا ہے، پھر اپنے منافع (Divident) کا اُتنا ہی فیصد حصہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ یہ رقم باپ، بیٹے، یا شوہر یا بیوی کو دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ یہ سب مستحقِ زکوٰۃ ہوں۔ مثلاً ادارے سے یہ معلوم ہوا کہ کل منافع کا ۳۰ فیصد حصہ ان ناجائز مدات سے حاصل ہوا تھا، اب یونٹ ہولڈر اپنے منافع میں سے ۳۰ فیصد رقم صدقہ کردے۔ جون ۱۹۸۷ء میں ختم ہونے والے مالی سال میں احقر کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ ادارے کے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ شرعی اعتبار سے ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے، لہٰذا ہر یونٹ ہولڈر اپنے منافع کا ۳۰ فیصد حصہ صدقہ کردے۔

لیکن چونکہ ابھی تک ''این.آئی.ٹی'' کے منافع کا اکثر حصہ جائز حصص کے ذریعے حاصل ہو رہا ہے اور جائز منافع کی مقدار ناجائز منافع کے مقابلے میں زیادہ ہے، اس لئے جن لوگوں نے ''این.آئی.ٹی'' کے اعلانات پر اعتماد کرتے ہوئے ''این.آئی.ٹی'' کو جائز کاروبار سمجھ کر اس میں روپیہ لگادیا تھا، ان کی طرف سے ادارے کو ناجائز کاروبار میں سرمایہ کاری کی اجازت نہیں تھی، ان کے لئے اب تک جو منافع ملا ہے وہ پورا اپنے استعمال میں لانے کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ مذکورہ صورت میں ناجائز کاروبار کے ذمہ دار ''این.آئی.ٹی'' کے منتظمین ہیں، البتہ آئندہ ان کو چاہئے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقمیں واپس لے لیں۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

اذا دفع المسلم الی النصرانی مالًا مضاربة بالنصف فهو جائز (أی فی القضاء کما صرّح به فی امداد الفتاویٰ عن المبسوط ج:۳ ص: ۴۲۱). الّا انه مکروه فان اتّجر فی الخمر والخنزیر فربح جاز علی المضاربة فی قول أبی حنیفةؒ وینبغی للمسلم أن یتصدق بحصته من الربح وعندهما ..... لا یجوز علی المضاربة ..... وان أربیٰ فاشتری درهمین بدرهم کان البیع فاسدًا. ولٰکن لا یصیر ضامنًا لمال المضاربة والربح بینهما علی الشرط. (عالمگیریة ج:۴ ص:۳۳۳ کتاب المضاربة باب: ۲۲)[1]

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس عبارت کے تحت فرماتے ہیں:-

قلنا: قوله ینبغی للمسلم أن یتصدق بحصته محمول علی الورع کما هو الظاهر وان حمل علی الوجوب فهو اذا کان قد اتّجر فی الخمر والخنزیر ولم یتّجر فی غیرهما والّا فحمله ما سیجیٔ فی المخلوط.

---

(۱) (طبع رشیدیة).

اس کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مالِ مخلوط کے اَحکام فتاویٰ قاضی خان سے نقل کئے ہیں، جس میں یہ جزئیہ بھی ہے کہ:-

لو أن فقيرًا يأخذ جائزة السلطان مع علمه ان السلطان يأخذها غصبًا أيحل له ذٰلك؟ قال: ان كان السلطان خلط الدراهم بعضها ببعض فانه لا بأس به، وان وضع عين الغصب من غير خلط لم يجز أخذه، قال الفقيه ابو الليث: هٰذا الجواب يستقيم علىٰ قول أبي حنيفةؒ لأن عنده اذا غصب الدراهم من قوم وخلط بعضها ببعض يملكها الغاصب أمّا علىٰ أبي يوسف ومحمد رحمهما الله انه لا يملكها الغاصب ويكون علىٰ ملك صاحبها.

(قاضي خان ج:۴ ص:۳٦۳ و ۳٦۴)[۱]

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:-

فاذا خلط الوكيل دراهم الربا ببعض الدراهم الّتي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منهما لكون الخلط مستهلكًا عند الامام لا سيّما اذا كان الوكيل كافرًا، لا سيّما والتقسيم مطهر عندنا كما اذا بال البقر في الحنطة وقت الدّياسة فاقتسمها الملاك حلّ لكل واحد أكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أورثت احتمالًا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا هٰهنا اذا أربى الوكيل بالتّجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم والله تعالىٰ أعلم.

(امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۲۳، رساله "القصص السنّي")[۲]

ان عبارات سے مذکورہ بالا حکم واضح ہوجاتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ حکم "این.آئی.ٹی" کے موجودہ طریقِ کار پر مبنی ہے، "این.آئی.ٹی" کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مل کر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ادارے سے ناجائز سرمایہ کاری کا حصہ بالکل ختم کردیا جائے، اگر یہ کوشش کامیاب ہوئی اور حالات تبدیل ہوگئے تو حکم بھی بدل سکتا ہے، ایسی

---

(۱) المطبع العالي الواقع في لكنو.

(۲) ج:۳ ص:۴۸٦ (طبع جديد جمادى الاولىٰ ۱۴۲۴ھ طبع مكتبه دارالعلوم كراچى).

صورت میں اِن شاء اللہ پھر اعلان کردیا جائے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب

وإلیہ المرجع والمآب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۸/۶/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۱۲۶ د)

الجواب صحیح
سحبان محمود

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
رشید احمد، دار الافتاء والارشاد، ناظم آباد کراچی

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ

''این.آئی.ٹی'' کی نئی صورتِ حال

(وضاحت از مرتب)

حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے مذکورہ فتویٰ میں این آئی ٹی میں سرمایہ کاری کے عدمِ جواز کے ساتھ ساتھ ان کے ذمہ داروں سے بات چیت کرنے کا بھی ذِکر کیا گیا تھا، چنانچہ مذکورہ فتویٰ کے بعد اکابر علماء کی طرف سے مسلسل بات چیت جاری رہنے کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی واقع ہوئی تو حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے پھر نئی صورتِ حال کے مطابق حکم تحریر فرمایا جو ''البلاغ'' کے اِداریہ میں شائع ہوا، این آئی ٹی میں چونکہ مسلسل تبدیلیاں آتی رہیں اس لئے ترتیبِ زمانی کے اِعتبار سے اس کے اَحکام اور پورے تسلسل کو سمجھنے کے لئے ذیل میں ''البلاغ'' کا وہ اِداریہ پیش کیا جارہا ہے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم نے مذکورہ فتویٰ کے بعد تحریر فرمایا اور ''البلاغ'' کے شمارہ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں شائع ہوا۔

''البلاغ'' کے رجب المرجب ۱۴۰۸ھ - مارچ ۱۹۸۸ء کے شمارے میں نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (این آئی ٹی) کے کاروبار کے سلسلے میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس اِدارے میں سرمائے کا ایک بڑا حصہ ایسی مدات میں لگا ہوا ہے جن کی آمدنی شرعی اِعتبار سے دُرست نہیں ہے، لہٰذا اس کا شرعی حکم یہ بتایا گیا تھا کہ بحالاتِ موجودہ این آئی ٹی یونٹ خریدنا جائز نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے پہلے یونٹ خرید رکھے تھے، ان کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان پر حاصل ہونے والے منافع کا تیس فی صد بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردیں۔

اس فتوے کی اِشاعت کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ بھی عرض کردیا گیا تھا کہ این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفت وشنید کرکے کاروبار کی اِصلاح کی کوشش جاری ہے، اور اگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی ہوئی تو اِن شاء اللہ دوبارہ اِعلان کردیا جائے گا۔

چنانچہ اس کے بعد این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو اور باہمی مشورے کا سلسلہ جاری

رہا، بفضلہٖ تعالیٰ ان حضرات نے اِدارے کو غیر شرعی سرمایہ کاری سے پاک کرنے کے لئے ہماری تجاویز کا نہ صرف خیر مقدم کیا، بلکہ اس سلسلے میں عملی تعاون کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً دس ماہ کی کوشش کے بعد بحمداللہ اِدارے کے طریقِ کار میں مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں، اِدارے کی طرف سے کئے جانے والے تمام معاہدات پر نظرِ ثانی کر کے علماء کے مشورے سے ان کو شریعت کے مطابق بنایا گیا ہے، اور اس طرح ایک مرتبہ پھر این آئی ٹی کی نئی صورتِ حال کا شرعی حکم بیان کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اپنی سابقہ تحریر میں عرض کیا تھا، این آئی ٹی کی سرمایہ کاری جن ناجائز مدات میں ہو رہی تھی، ان کا بیشتر حصہ مارک اَپ، پی ٹی سی (Participation Term Certificate) اور ٹی ایف سی (Term Finance Certificate) پر مشتمل تھا۔

ان تین مدات میں سے اب این آئی ٹی نے پی ٹی سی کا طریقِ کار تو بالکل ختم ہی کر دیا ہے اور مارک اَپ اور ٹی ایف سی کے طریقِ کار کو ختم کر کے ان دونوں کو ''مرابحۂ مؤجلہ'' میں تبدیل کر دیا ہے۔

سابق طریقِ کار اور نئے طریقِ کار میں فرق یہ ہے کہ پہلے جس کسی شخص یا اِدارے کو پیداواری قرض دیا جاتا تھا، اس کو این آئی ٹی کی طرف سے مارک اَپ پر روپیہ فراہم کیا جاتا تھا، لیکن صرف تعبیر کی حد تک یہ کہا جاتا تھا کہ این آئی ٹی کی طرف سے وہ سامان نفع پر فروخت کیا جارہا ہے جو قرض لینے والے کو اس رقم سے خریدنا ہے۔ حالانکہ وہ سامان نہ این آئی ٹی کی ملکیت میں آتا تھا، نہ قبضے میں، لہٰذا یہ محض ایک فرضی کارروائی تھی، اور حقیقت یہی تھی کہ روپیہ دے کر اس پر نفع وصول کیا جاتا تھا جو درحقیقت سود ہے۔ یہ وہی طریقِ کار ہے جو اس وقت ملک کے بیشتر رواجی بینکوں میں جاری ہے۔

لیکن اب ''مارک اَپ'' کی جگہ ''مرابحۂ مؤجلہ'' کا عقد کیا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی مال خریدنے کے لئے قرض درکار ہوتا ہے، این آئی ٹی اس کو روپیہ دینے کے بجائے وہ مال خرید کر اسے نفع پر فروخت کر دیتا ہے، اور قیمت بعد میں وصول کرتا ہے۔ اِس نئی صورت کے مطابق وہ مال پہلے این آئی ٹی کی ملکیت اور ضمان میں اس طرح داخل ہو جاتا ہے کہ اگر اسی حالت میں وہ مال ہلاک ہو تو اس کا نقصان این آئی ٹی پر ہوگا۔ اس کے بعد وہ اس کو اپنے گاہک کے ہاتھ نفع پر فروخت کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ مال کی خریداری کے لئے گاہک ہی کو اپنا وکیل بنادے، لیکن جس وقت تک گاہک بحیثیتِ وکیل کام کرتا ہے، اس وقت تک سامان کی تمام تر ذمہ داری این آئی ٹی پر ہی ہوتی ہے، وکیل کی حیثیت سے خریداری مکمل کرنے کے بعد پھر وہ این آئی ٹی سے اس مال کی خریداری کا مستقل عقد کرتا ہے۔

''مارک اَپ'' اور ''ٹی ایف سی'' کے جملہ معاہدات کو مذکورہ بالا طریقِ کار کے مطابق تبدیل کر دیا گیا ہے، اور اس طرح یہ معاملات جوازِ شرعی کی حدود میں آگئے ہیں۔

''مرابحۂ مؤجلہ'' کے علاوہ این آئی ٹی نے ''اِجارہ'' کے معاملات بھی شروع کئے ہیں، یعنی وہ مشینری وغیرہ خرید کر اپنے گاہکوں کو طے شدہ کرایہ پر فراہم کرتا ہے، اور اس کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ ''عقدِ اِجارہ'' کے لئے بھی مستقل معاہدات شرعی شرائط کے مطابق تیار کر لئے گئے ہیں، اور گاہکوں سے اسی کے مطابق معاہدات کئے جارہے ہیں۔

اس طرح اب این آئی ٹی کا بیشتر سرمایہ جائز تجارتی کمپنیوں کے حصص خریدنے، مرابحۂ مؤجلہ اور عقدِ اِجارہ میں لگا ہوا ہے، اور چونکہ یہ تینوں صورتیں فقہی طور پر جواز کی حدود میں آتی ہیں، اس لئے اب بیشتر سرمایہ کاری جائز طریقے سے ہونے لگی ہے۔

البتہ ایک مد ایسی ہے جسے تبدیل کرنے پر اِدارہ قادر نہیں ہوا، اور وہ یہ کہ وہ بعض اوقات اپنی رقمیں عام تجارتی بینکوں کے پی ایل ایس اکاؤنٹ میں رکھواتا ہے، اور یہ بات ''البلاغ'' کے صفحات میں بار بار لکھی جاچکی ہے کہ پی ایل ایس (یا نفع ونقصان کی شراکت) کے نام سے جو کاروبار مروّجہ بینکوں میں ہو رہا ہے، وہ شرعاً دُرست نہیں ہے، لہٰذا اس کی آمدنی شرعاً حلال نہیں ہے، این آئی ٹی اس مد سے رقمیں نکالنے پر قادر نہیں ہوسکا، لہٰذا یہ مد ابھی تک شرعاً دُرست نہیں ہے، اور اس مد سے حاصل ہونے والا منافع بھی حلال نہیں۔

لیکن اب این آئی ٹی نے اپنے یونٹ ہولڈروں کے لئے جو نئے فارم طبع کرائے ہیں اس میں ایک خانے کا اِضافہ کردیا گیا ہے جس میں یونٹ ہولڈر کو یہ کہنے کا اِختیار دیا گیا ہے کہ میں این آئی ٹی کی سرمایہ کاری کی مدات میں سے فلاں فلاں مد کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا۔ اس خانے میں اگر یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس کی آمدنی وصول نہیں کرنا چاہتا تو اس صورت میں یونٹ ہولڈر کو پی ایل ایس کی آمدنی نفع میں نہیں دی جائے گی، اور صرف مذکورہ بالا تین مدات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے نفع دیا جائے گا۔

این آئی ٹی کے ذمہ دار حضرات نے اس بات کا اِہتمام کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ اگرچہ ہر شخص کی رقم کو علیحدہ رکھ کر اس کی الگ سرمایہ کاری عملاً ممکن نہیں ہے، لیکن جتنے لوگ فارم میں پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اِعلان کریں گے ان کی مجموعی رُقوم کے برابر رقم ضرور دُوسرے مدات ہی میں لگائی جائے گی، لیکن کسی بھی وقت ایسا نہیں کیا جائے گا کہ جائز مدات میں لگی ہوئی رُقوم اس مجموعی رقم کی مقدار سے کم رہ جائیں جس کے یونٹ ہولڈروں نے پی ایل ایس کی آمدنی نہ لینے کا اِظہار واِقرار کیا ہو۔

چونکہ پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا تناسب اِدارے کی مجموعی آمدنی کے مقابلے میں بہت کم ہے، اور مذکورہ فارم کے ذریعے اس آمدنی سے بچنے کا ایک راستہ بھی اِدارے کی

طرف سے فراہم کردیا گیا ہے، اس لئے اب این آئی ٹی یونٹ کی خریداری کا شرعی حکم یہ ہے کہ:-

این آئی ٹی یونٹ میں رقم لگانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اِدارے کی طرف سے شائع شدہ فارم میں یہ لکھ دیا جائے کہ میں پی ایل ایس سے حاصل ہونے والی آمدنی لینا نہیں چاہتا۔ اس تحریر کے بعد جو منافع اِدارے کی طرف سے ملے، اُس کو ذاتی اِستعمال میں لانا بھی جائز ہے۔

لیکن یہ وضاحت ایک مرتبہ پھر کی جاتی ہے کہ یہ حکم این آئی ٹی کے موجودہ طریقِ کار کا ہے، چونکہ اس اِدارے کا طریقِ سرمایہ کاری مختلف اوقات میں بدلتا رہا ہے، اور اِنتظامیہ اور اس کی پالیسی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لئے آئندہ پھر طریقِ کار میں تبدیلی کا اِمکان موجود ہے۔ لہٰذا یونٹ ہولڈروں کو چاہئے کہ وہ ہر سال اِدارے کی سرمایہ کاری کی مدات کا یا تو خود جائزہ لیں، یا پھر اِدارے کی سالانہ بیلنس شیٹ بھیج کر ہر سال تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں اِستفتاء کرلیا کریں۔

احقر

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۹/۸/۴ھ

''این.آئی.ٹی'' کے کاروبار اور اس کے یونٹ خریدنے کا حکم

سوال:- ایسے اِدارے میں سرمایہ لگانا جو نفع کا یقین تو نہ کرتے ہوں، مگر ایک Minimum کی گارنٹی دیتے ہیں، بیشک مفروضہ یہ ہے کہ اِدارے کا کاروبار جائز ہے اور Financing اور کاروبار سود کی لعنت سے بھی بچا ہوا ہے۔ میرے ذہن میں این.آئی.ٹی کا اِدارہ ہے، گوکہ اب تو آپ کے فتوے کے مطابق این.آئی.ٹی کے کاروبار کا کچھ حصہ سودی لین دین پر مشتمل ہے، بہرحال اگر یہ صورت نہ ہوتی تو کیا N.I.T یونٹس خریدنا جائز ہوتا؟

جواب:- جو اِدارے خود کم سے کم نفع کی گارنٹی دیتے ہوں ان میں سرمایہ لگانا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی اِدارہ ایسا ہو جس میں حکومت شریک نہ ہو، اور پھر حکومت نقصان کی تلافی یا کم سے کم شرحِ منافع اپنے پاس سے بطورِ اِمداد دینے کا وعدہ کرلے تو اس کی گنجائش ہے۔ این.آئی.ٹی میں یہی صورت ہے، اور اس کو جو سابق فتویٰ میں ناجائز کہا گیا تھا اس کی وجہ اس کے سودی کاروبار میں ملوّث ہونا تھا، لیکن اب پھر اس نے اپنے طریقِ کار میں علماء کے مشورے سے ترمیمات کی ہیں، جس کے بعد حکم بھی بدل گیا ہے، جس کی تفصیل ماہنامہ ''البلاغ'' (رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ - مئی ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوچکی ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱۲/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۷۵/۴۰ و)

''این.آئی.ٹی'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم جناب تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم۔ N.I.T کے سرٹیفکیٹ میں Investment جائز ہے یا نہیں؟ میں نے سنا ہے کہ N.I.T، Mudarba کمپنی ہے، جو صرف Equity میں Investment کرتی ہے، اور Debt میں نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ اور کون کون سی صورتیں ہیں کہ جس میں Investment شرعاً جائز ہے؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''این.آئی.ٹی'' نے بہت سے شیئرز بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے لے رکھے ہیں، اس لئے اس میں سرمایہ کاری دُرست نہیں ہے۔(۱)

والسلام

۱۴۲۱/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۲/۴۶۰)

بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ اور اِنعامی بانڈز کا حکم

سوال:- میری زمین ہے جسے فروخت کر کے میں روپیہ بینک میں جمع کروانا چاہتی ہوں، چونکہ مجھے کچھ عرصے کے لئے باہر جانا ہے، واپسی تک اُس رقم پر یقیناً سود ملے گا، کیا وہ سود کی رقم کسی یتیم خانے کو دے سکتی ہوں؟ کیونکہ میں سود لینا نہیں چاہتی بلکہ گناہ سمجھتی ہوں۔ یا پھر میں نے مکان کے لئے لون لیا ہے، اُس کا سود ادا کر رہی ہوں، تو وہ سود جو میری اپنی رقم پر بینک مجھے دے گا، لے کر اُدھر لون والا سود ادا کرسکتی ہوں؟ ایسا کرنے سے مجھے سود لینے کا گناہ تو نہیں ہوگا؟ اِنعامی بانڈز خریدنا اور اِنعام لینا کیسا ہے؟

جواب:- آپ اپنا روپیہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوائیں، اس پر سود نہیں لگے گا، اور اگر غلطی سے کسی دُوسرے اکاؤنٹ میں رکھوادیا اور اُس پر سود لگ گیا تو وہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیں۔(۲) اور بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے،(۳) ایسے قرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔ اور

---

(۱) این آئی ٹی کی صورتِ حال بدلتی رہی ہے، اس لئے مختلف زمانوں میں اس کے بارے میں مختلف فتوے جاری ہوئے ہیں جن میں سے بعض پیچھے گزر چکے ہیں، آخری فتویٰ یہی ہے کہ چونکہ اس میں ناجائز سرمایہ کاری کا تناسب بہت زیادہ ہوچکا ہے، اس لئے اب اس میں سرمایہ کاری جائز نہیں ہے۔ کبھی صورتِ حال بدلے تو حکم بھی بدل سکتا ہے۔ (تقی)

(۲) دیکھئے ص:۱۲۰ و ۱۲۱ کے حواشی اور مزید اہم تفصیل کے لئے دیکھئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔

(۳) دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۲۔

اِنعامی بانڈز پر جو رقم بطور اِنعام ملتی ہے وہ سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہے اور اس کا وصول کرنا حرام ہے، اگر بانڈ خرید لیا ہو تو صرف اپنی دی ہوئی اصل رقم وصول کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۵/۲۸ ج)

جبری پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی اصل رقم پر زیادتی ''سود'' نہیں

سوال:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو کہ ملازمین کی ہر ماہ تنخواہ میں سے کاٹ کر بینک میں جمع کی جاتی ہے، اس رقم پر بینک والے سود بھی باقاعدہ لگاتے ہیں، اب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ پراویڈنٹ فنڈ تو بہرحال جمع کروانا ہے، اور اگر بینک والے سود لگاتے ہیں تو یہ ہمارے لئے مجبوری کا باعث ہے، بینک والے سود لگاتے رہیں، ہم جب کل رقم بمع سود واپس لیں گے تو اس رقم میں سے اپنی اصلی رقم اپنے پاس رکھ لیں گے اور باقی سود کی رقم کسی کنگال اور بھوکے شخص کو دے دیں گے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب:- جبری پراویڈنٹ فنڈ کی اصل رقم پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں ہے، اس لئے اس کا وصول کرنا جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۳۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

جبری اور اختیاری پراویڈنٹ فنڈ پر اصل رقم پر زیادتی کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی تنخواہ کا کچھ حصہ ماہانہ کاٹا جاتا ہے، جس کو جی پی فنڈ (جنرل پراویڈنٹ فنڈ) کہا جاتا ہے، اس رقم پر حکومت اپنے ملازم کو منافع بھی دیتی ہے، کیا یہ منافع بھی سود کہلائے گا؟ اس کی دو صورتیں ہیں، حکومت ہر ملازم سے تنخواہ کا کچھ حصہ جبراً کاٹتی ہے، دُوسری صورت یہ ہے کہ ملازم اپنی مرضی سے حکومت کی مقرّر کردہ رقم سے زیادہ کٹواتا ہے، ان دونوں کا حکم تحریر فرمائیں۔

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ پر جو زیادہ رقم محکمے کی طرف سے دی جاتی ہے وہ شرعاً سود نہیں ہے،[1] لہٰذا اس کا لینا اور استعمال میں لانا جائز ہے۔ جبری اور اختیاری فنڈ دونوں کا حکم یہی ہے۔ البتہ جو رقم اپنے اختیار سے کٹوائی گئی ہو اس پر ملنے والی زیادتی کو احتیاطاً صدقہ کر دیں تو بہتر ہے۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۸ الف)

پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے کے بعد واپسی کے وقت اصل رقم سے زیادہ واپس کرنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی ملازم دفتر میں نوکری کرتا ہے تو اس کی تنخواہ سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر کاٹ لیا جاتا ہے، جس کو جمع کر کے ریٹائرمنٹ یا اس سے قبل نوکری چھوڑتے ہوئے دُگنا ملازم کو دیا جاتا ہے، کیا یہ ساری زیادتی شرعاً سود نہیں ہے؟ لیکن جب یہ ملازم اس سے قرض لے کر قسطوں میں ادا کرتا ہے تو اس سے سود لیا جاتا ہے، تو کیا یہ سود نہیں ہے؟ اور یہ مسئلہ حضرت مفتی صاحب کے رسالے میں یا کہیں ہے؟

جواب:- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے قرض لینے پر واپسی کے وقت جو زائد رقم سود کے نام سے فنڈ میں دی جاتی ہے شرعاً وہ سود نہیں۔ یہ مسئلہ بھی حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ کے رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ'' ہی میں موجود ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۴/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۴۷/۳۲ ج)

مغربی ممالک میں سودی قرضوں کے ذریعے گھر خریدنے کا طریقہ اور اُس کا حکم

سوال:- آئرلینڈ وغیرہ ملکوں میں گھر خریدنا مشکل نہیں، محض 5% قیمت کا حصہ دے کر باقی قرضہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کو اگر انٹرسٹ کے ساتھ ماہانہ ادا کیا جائے تو وہ عموماً اس گھر کے کرایہ وغیرہ سے کم ہوتا ہے، اور جب پانچ چھ سال بعد لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو گھر بیچ دیتے ہیں، اس

(۱ و ۲) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۵۲ (مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

طرح جو ماہانہ کرایہ ضائع ہوتا تھا وہ اُن کی اپنی پراپرٹی بنانے کے کام آتا ہے اور جو قیمت میں اضافہ ہوا وہ الگ فائدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی طرف بکثرت مائل ہوتے جارہے ہیں، مگر سب سے اہم مسئلہ سود کا ہے، اس سلسلے میں مجھے درج ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں۔

کیا اُوپر تحریر کیا گیا لین دین جائز ہے؟

کیا یہ لین دین کچھ خاص حالات میں جائز ہے مثلاً ایسا ملک جہاں خرید وفروخت ہوتی ہی اس طرح ہو؟

آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد اور دیگر معلومات کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے موجودہ عمل میں کچھ ترامیم کے بعد اس کو جائز بنایا جاسکتا ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمتِ خرید ایک لاکھ مگر پچیّس سال میں Interest کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ہوں تو Deal اس طرح کی جائے کہ گھر کی اصل قیمت ڈیڑھ لاکھ تصوّر کی جائے اور اس کو پچیّس سال میں برابر قسطوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ کیا اس طرح سے Deal کرنا صحیح ہے؟ میری ناقص معلومات کے مطابق اس طرح کی Deal شکوک سے خالی ہے اور یہاں پر چند سوالات جنم لیتے ہیں جن کا اب تک کوئی حل سامنے نہیں آیا، اس لئے آپ کی جانب سے ان کے جوابات کا خاص کر انتظار رہے گا۔ اس طرح کی پچیّس سال کی Deal کے بعد اگر گھر پانچ سال کے بعد بیچنا ہو تو کیا ہمیں بینک یا قرض دینے والے ادارے کو پورے ڈیڑھ لاکھ ہی ادا کرنے ہوں گے گو کہ حقیقتاً ہم نے قرض ایک لاکھ کا لیا تھا؟ فرض کیجئے آپ سوال نمبر۴ کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ڈیڑھ لاکھ ادا کرنے ضروری ہیں، چاہے گھر کتنے ہی عرصے کے بعد فروخت کیا جائے تو پھر آخری سوال یہ ہے کہ اگر بینک اپنی خوشی سے Deal کرے تو صحیح ہے، مثلاً گھر کی اصل قیمت ایک لاکھ، پچیّس سال کی Deal کے مطابق ڈیڑھ لاکھ، یعنی ہر بیس ہزار کے عوض تیس ہزار، اس حساب سے ہر پانچ سال پر ادا کرنے ہیں تیس ہزار۔ اب اس موقع پر گھر بیچنے کی صورت میں اگر بینک اپنی خوشی سے یہ کہے کہ میں اپنی خوشی سے اس گھر کی قیمت مثال کے طور پر ڈیڑھ سے کم کرکے ایک لاکھ دس ہزار کرتا ہوں، جو کہ حقیقتاً اس نے Interest کرکے کیا ہے، مگر جب تک آپ نے اس چھوٹ کی Deal نہ کر رکھی ہو تو کیا یہ خرید وفروخت صحیح ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی جناب عدیل صدیقی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، مغربی ملکوں میں سودی قرض کے ذریعے گھر خریدنے کا جو طریقہ رائج ہے، وہ

سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، البتہ اگر گھر کے مالک سے معاملہ اس طرح طے ہوجائے کہ گھر کی پوری قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرّر کرلی جائے، اور پھر اس کی ادائیگی قسطوں میں ہو تو یہ صورت جائز ہے۔[1] اگر یہ معاملہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کے ذریعے ہو تو یہ ضروری ہے کہ وہ بینک یا مالیاتی ادارہ پہلے وہ گھر خود اپنے لئے خرید لے، اور بنا ہوا گھر ہو تو اس پر قبضہ بھی کرلے،[2] پھر آپ کو اُدھار فروخت کرے، اس اُدھار قیمت کا تعین کرتے وقت وہ بازاری قیمت سے جتنا اضافہ مناسب سمجھے، اتنا اضافہ کرکے قیمت مقرّر کرے،[3] لیکن معاملے کے وقت یہ طے ہونا ضروری ہے کہ کُل قیمت کیا ہوگی؟ اور یہ بھی کہ کتنی قسطوں میں ادائیگی کی جائے گی، جب قیمت اس طرح متعین ہوگئی تو اَب کوئی ایک فریق دُوسرے کو اس قیمت میں کمی بیشی کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، لہٰذا اگر خریدار آخری ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے گھر کسی اور کو فروخت کرنا چاہے اور رقم کی پیشگی ادائیگی کرنے پر قادر ہوجائے

(۱ تا ۳) مذکورہ معاملے سے متعلق حوالہ جات وعبارات درج ذیل ہیں:

وفی اعلاء السنن ج:۱۴ ص:۱۷۳ (طبع ادارة القرآن کراچی) عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة.

وفیه أیضًا ج:۴ ص:۱۷۵ و۱۷۶ (طبع مذکور) عن عبدالله بن عمرو رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یحلّ سلف وبیع ولا شرطان فی بیع اهـ.

وفی الشرح الکبیر لابن قدامة ج:۴ ص:۵۳ قال ابن مسعود رضی الله عنه: صفقتان فی صفقة ربًا وهٰذا قول أبی حنیفة والشافعیؒ وجمهور العلماء .... الخ.

وفی المبسوط ج:۱۳ ص:۸ ومن اشتریٰ شیئًا فلا یجوز له أن یبیعه قبل أن یقبضه .... لما روی أن النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیع الطّعام قبل أن یقبض وکذٰلک ما سوی الطّعام من المنقولات لا یجوز بیعه قبل القبض.

وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۱۴۷ صحّ بیع عقار ..... فلا یصح ..... بیع منقول قبل قبضه ولو من بائعه ..... الخ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن اشتریٰ شیئًا ممّا ینقل ویحوّل لم یجز له بیعه حتّٰی یقبضه لأنه علیه السلام نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأنّ فیه غرر انفساخ العقد علیٰ اعتبار الهلاک .... الخ.

وکذا فی تکملة فتح الملهم ج:۱ ص:۳۵۰ والمجلّة للأتاسیؒ ج:۲ ص:۱۷۳ وفتح القدیر ج:۵ ص:۲۶۶.

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۱۳ ص:۷ و ۸ واذا عقد العقد علیٰ أنّه الیٰ أجل کذا بکذا وبالنقد بکذا .... فهو فاسدٌ .... وهٰذا اذا افترقا علیٰ هٰذا، فان کان یتراضیان بینهما ولم یتفرّقا حتّٰی قاطعه علیٰ ثمن معلوم وأتما العقد علیه فهو جائزٌ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۲۱ (طبع رحمانیه) ویجوز البیع بثمن حال ومؤجّل اذا کان الأجل معلومًا لاطلاق قوله تعالیٰ: "وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ" الآیة.

وفی الشامیة ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن قصدًا. (طبع بیروت ج:۷ ص:۳۶۲).

وفی البحوث ص:۱۴ الجزم بأحد الثمنین شرط للجواز .... الخ.

وکذا فی البزّازیة ج:۴ ص:۴۳۱ والهندیة ج:۳ ص:۱۳۶ والشامیة ج:۵ ص:۱۴۲ والهدایة ج:۳ ص:۷۴.

وفی المجلّة رقم المادّة:۲۴۵ البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح ..... الخ.

وفی الهدایة ج:۳ ص:۷۸ (طبع مکتبه رحمانیه) .... لأنّ للأجل شبهًا بالمبیع، ألا یریٰ أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل اهـ وکذا فی الشامیة ج:۵ ص:۱۴۲ و ۳۲۶.

وفی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۷ امّا الأئمّة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقد أجازوا البیع المؤجّل بأکثر من سعر النعقد بشرط أن یبتّ العاقدان بأنه بیع مؤجّل بأجل معلوم وبثمن متفق علیه عند العقد .... الخ.

تب بھی وہ اپنے بیچنے والے ادارے سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ قیمت میں کمی کردے، ہاں اگر وہ ادارہ اپنی خوشی سے قیمت میں کمی کردے جبکہ اس پر کوئی جبر نہ ہو، نہ ایسا کوئی پیشگی معاہدہ ہو تو اپنی خوشی سے کمی کرسکتا ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

۱۴۲۰/۱۲/۲۸ھ

بینک یا ہاؤس بلڈنگ فائنانس کے ذریعے گھر خریدنے کا حکم

سوال:- اِمارات میں یا پاکستان میں یا دُنیا کے کسی بھی ملک میں میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں، جہاں پر میرے والدین کا بنایا ہوا ڈھائی کمروں کا مکان ہے، اور یہ بھی میرے چھوٹے بھائی اور میری بہن کی ملکیت ہے۔ میرے اپنے چار بچے ہیں، جن کی عمریں تین سال سے نو سال تک ہیں، ہر شخص کی طرح ایک گھر کا ہونا میری بھی بنیادی ضرورت ہے، آج اگر میری نوکری یہاں سے اچانک ختم ہوجائے تو مجھے لازماً واپس پاکستان ہی آنا پڑے گا، اور وہاں اپنی ضرورتوں کی وجہ سے گاؤں میں بس نہیں سکتا، لازماً کسی شہر ہی میں ڈیرا لگانا پڑے گا، کسی بھی مناسب جگہ پر اپنا گھر کا ہونا ایک ہی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے، موجودہ حالات میں میں اپنی تنخواہ سے اتنے پیسے جمع نہیں کرسکتا کہ مکان بنوانے کا سوچوں، اس کام کے لئے مجھے کہیں نہ کہیں سے قرض ہی لینا پڑے گا، چاہے وہ کوئی فرد ہو (جو کہ ناممکن ہے) یا کوئی ادارہ جیسے بینک یا ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن۔ اگر میں اِن اداروں سے قرض لے لوں اور گھر بنوالوں تو میں یہ قرضہ آہستہ آہستہ دُوسرے لوگوں کی طرح اُتار سکتا ہوں، جیسے جیسے دیر ہو رہی ہے زمین اور مکان بنوانے کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور میں دن بدن اور زیادہ مصیبت میں گھِرتا جارہا ہوں، کیا میں اپنے حالات کے مدِنظر بینک یا ایسے ہی کسی ادارے سے قرض لے کر گھر بنواسکتا ہوں؟ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ ایسے قرضوں پر واپسی کے وقت مجھے کچھ رقم بطور سود دینی ہی پڑے گی۔ اگر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی تو برائے مہربانی میرے اس مسئلے کا حل ضرور لکھئے گا تاکہ میں گھر بنواسکوں۔

جواب:- پاکستان میں ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن نے جو طریقۂ کار پچھلے چند سالوں سے اختیار کیا ہوا ہے، اس میں اگرچہ صراحۃً سود کا نام تو نہیں رہا، لیکن اب بھی اس کا طریقِ کار متعدّد غیرشرعی اُمور پر مشتمل ہے۔ اس لئے مکان بنوانے کے لئے اس سے رقم لینے کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔(۱)

(۱) تفصیل کے لئے ص:۲۶۳ کا فتویٰ اور اُس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی شخص ایسا بے گھر ہو کہ اگر اس سے معاملہ نہ کرے اسے سر چھپانے کی جگہ میسر نہ آئے تو اس کے لئے گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن جس شخص کے پاس رہنے کی کوئی جگہ -خواہ کرایہ کی ہو- یا اسے لینے کی استطاعت ہو، اس کے لئے اس طریقِ کار کے تحت رقم لینا دُرست نہیں۔ البتہ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس کا طریقِ کار دُرست ہوجائے، بعض دُوسرے ادارے بھی ایسی اسکیمیں نکالنا چاہتے ہیں لیکن اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی، فی الحال ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں جس سے اس سلسلے میں رُجوع کیا جاسکے۔

والسلام

(حضرت مولانا مفتی) محمد تقی عثمانی (صاحب مد ظلہم)

بقلم محمد عبداللہ میمن

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

"بینک آف خیبر" کی طرف سے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے مرابحہ کی منسوخی کی صورت میں بینک کو گفٹ کے طور پر ملنے والی رقم کا حکم

سوال:- جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے!

درج ذیل مسئلے میں آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے:-

بینک آف خیبر نے دسمبر ۲۰۰۶ء میں فوڈ ڈپارٹمنٹ صوبہ سرحد کے ساتھ گندم کی خریداری کے سلسلے میں مرابحہ کیا تھا، جس کے تحت بینک آف خیبر نے ان کے لئے گندم پاسکو سے خریدنی تھی، اس سلسلے میں بینک نے ان کو گندم کی خریداری کے لئے اپنا ایجنٹ مقرّر کر کے رقم ان کو دے دی تھی، لیکن بعد میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ فوڈ ڈپارٹمنٹ، پاسکو سے اس معاملے میں پہلے بات چیت کر کے معاملہ طے کر چکا تھا، (اس سلسلے میں ہونے والے معاہدے لف ہیں)۔

اس وجہ سے شریعہ ایڈوائزر نے اس معاملے میں مرابحہ ناممکن قرار دیا، اس لئے بینک آف خیبر نے خط کے ذریعے فوڈ ڈپارٹمنٹ سے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا (خط کی کاپی منسلک ہے)۔

فوڈ ڈپارٹمنٹ نے وہ رقم تین ماہ بعد واپس کردی، اور اَب مزید کچھ رقم بھی دے دی ہے، جو بینک نے اپنے ریزرو میں رکھی ہوئی ہے اور ابھی تک اس کو اِستعمال نہیں کیا۔ فوڈ ڈپارٹمنٹ کے افسران سے بات ہوئی ہے، انہوں نے عندیہ دیا ہے کہ وہ یہ رقم بطور گفٹ ہمیں دے رہے ہیں، اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں مل کر ایک ایسے خط کا مضمون لکھا جائے جو بینک کے لئے قابلِ قبول ہو۔

اس معاملے میں External Auditor نے بھی اعتراض کیا ہے کہ ہم نے دسمبر میں انکم Accure کی ہے، جبکہ مرابحہ نہیں ہوا تھا، (اعتراض منسلک ہے) اگرچہ اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ FAS.1 Murabaha میں اس بات کی گنجائش ہے اور وعدۂ مرابحہ کی بنیاد پر اِنکم ریکارڈ کی گئی، لیکن اس کو ڈپازٹرز میں بالکل تقسیم نہیں کیا گیا ہے، اور وہ Reserve میں رکھا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں درج ذیل تجاویز پیشِ خدمت ہیں:-

الف:- بینک یہ رقم ڈپارٹمنٹ کو چیف منسٹر کے ذریعے واپس کردے۔

ب:- بینک اس رقم کو گفٹ کے طور پر فوڈ ڈپارٹمنٹ کی رضامندی سے قبول کر کے اپنے منافع میں شامل کرے اور ڈپازٹرز کو دیدے۔

اُمید ہے کہ آپ درج بالا مسئلے کے بارے میں رہنمائی فرماکر مشکور فرمائیں گے۔ نیز اس سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائیں کہ مستقبل میں یہ کام کیسے سرانجام دے سکتے ہیں؟ (محمد اسد)

جواب:- مکرمی جناب محمد اسد صاحب ہیڈ اسلامک بینکنگ ڈویژن، بینک آف خیبر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فوڈ ڈپارٹمنٹ سے منسوخ شدہ مرابحہ کے بعد جو ۵ ملین کی رقم بطور گفٹ موصول ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ کا سوال موصول ہوا۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر بینک کی طرف سے اس زائد رقم کا کوئی صراحۃً، اشارۃً یا کنایۃً مطالبہ ہوا تھا، خواہ گفٹ کے نام سے ہو، تب تو اس رقم کا رکھنا بالکل جائز نہیں، یہ سود کے حکم میں ہے، اور اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اور اگر بینک کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں تھا، تب بھی اگر یہ گفٹ کسی فرد کی طرف سے ہوتا تو بات اور تھی، لیکن فوڈ ڈپارٹمنٹ ایک سرکاری محکمہ ہے جسے عام طور سے یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی فرد یا اِدارے کو ۵ ملین روپے گفٹ کے طور پر دیدے، لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ وہ 200 ملین قرض سے نفع اُٹھانے کی بنا پر دی گئی ہے، اور غالباً فوڈ ڈپارٹمنٹ کے حسابات میں اسی طرح درج کی جائے گی۔ اس لئے بھی اس کو بینک کی آمدنی میں شامل کرنا دُرست نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۸/۴/۲۵ھ

***

﴿فصل فی القمار والتّأمین﴾

(جوا اور انشورنس کا بیان)

زندگی، گھر اور مال وغیرہ کے انشورنس کا حکم

سوال:- کیا انشورنس جائز ہے؟ مثلاً زندگی، گھر، مال وغیرہ کا۔

جواب:- انشورنس سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر بالکل حرام ہے، البتہ جو انشورنس حکومت کی طرف سے لازمی ہو، مثلاً موٹر وغیرہ کا بیمہ، اس کو مجبوراً کراسکتے ہیں، مگر جب رقم ملے تو صرف اتنی رقم خود استعمال کرسکتے ہیں جتنی خود داخل کی تھی، اس سے زائد نہیں۔　　واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۷/۲۹ ب)

مروّجہ انشورنس کا متبادل ''تکافل''

(وضاحت از مرتب)

۱۴۲۳ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا ایک اہم اِجلاس جامعہ دارالعلوم کراچی میں مروّجہ انشورنس کے متبادل پر غور وفکر کے لئے منعقد ہوا تھا، جس میں پاکستان کے اکابر مفتیان کرام کے علاوہ بنگلہ دیش اور شام کے علماء بھی شریک ہوئے تھے۔ اِجلاس سے قبل حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ''شرکات التکافل پر چند اِشکالات'' کے عنوان سے ایک تحریر شرکاءِ اجلاس کو اِرسال فرمائی تھی، بعد میں دو دِن تک جاری رہنے والے اس اِجلاس میں تبرّع یا وقف کی بنیاد پر اِنشورنس کے متبادل پر طویل غور وفکر کیا گیا اور تبرّع کے بجائے مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے ابتدائی اکابر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کے پہلے سے تجویز کئے گئے متبادل پر تفصیلی غور وفکر کیا گیا جو وقف اور مضاربت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، چنانچہ انہی اکابر رحمہم اللہ کے اس متبادل کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی۔ ذیل میں پہلے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کے اِشکالات پر مشتمل وہ تحریر اور اس کے بعد مجلس کی طرف سے ان اِشکالات کے جوابات کے ساتھ اکابر علماء کی قرارداد پیش کی جارہی ہے۔ (محمد زبیر)

شرکات التکافل پر چند اِشکالات

(از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد النبی

الأمین، وعلٰی آله وأصحابه أجمعین، وعلٰی کل من تبعهم بإحسان إلٰی یوم الدین، أما بعد:

آج کل مختلف اشیاء کے بیمے کا کاروبار دُنیا کے ہر خطے میں انشورنس کمپنیاں انجام دے رہی ہیں، معاصر علمائے اسلام کی اکثریت نے اس کاروبار کو ''غرر'' یا ''قمار'' پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے، اس لئے شرقِ اَوسط کے مسلمانوں نے اپنے علاقے کے علمائے کرام کے مشورے سے ایسی کمپنیاں ''**شرکات التکافل**'' کے نام سے قائم کی ہیں، جو بیمہ کے مقاصد شرعی اُصولوں کے ماتحت حاصل کرنے کی مدعی ہیں۔

دونوں قسم کی کمپنیوں کے طریقۂ کار میں فرق یہ ہے کہ وہ انشورنس کمپنیاں جو شرعی قواعد کی پابند نہیں (جنہیں آئندہ مروّجہ انشورنس کمپنیاں کہا جائے گا) لوگوں سے باقاعدہ تجارتی معاہدہ کرتی ہیں جس کی بنیاد پر وہ بیمہ دار سے ماہانہ یا سالانہ ایک رقم ''پریمیم'' کے نام سے وصول کرتی ہیں اور اس کے مقابلے میں یہ اِلتزام کرتی ہیں کہ جس چیز کا بیمہ کرایا گیا ہے اگر وہ ہلاک ہوجائے یا اس کو نقصان پہنچ جائے تو انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی۔ یہ کمپنیاں پریمیم کا تعین ایک خاص حساب کے ذریعے کرتی ہیں، جس کے لئے ایک مستقل فن ''ایکچوری'' کے نام سے مشہور ہے، اس حساب کے ذریعے وہ یہ اندازہ لگاتی ہیں کہ انہیں سال بھر میں اوسطاً کتنے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑے گی، اور اس پر کتنا خرچ آنے کی توقع ہے جتنا خرچ آنے کی توقع ہوتی ہے اس پر وہ اپنے منافع کی ایک مقدار کا اِضافہ کرکے مختلف اشیاء کے پریمیم کا تعین کرتی ہے، اگر سال بھر میں ان کے اِخراجات توقع کے مطابق ہوں تو باقی ماندہ رقم ان کے منافع کا حصہ ہوتی ہے، لیکن اگر اِخراجات توقع سے زیادہ بڑھ گئے تو چونکہ انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی اور انشورنس کمپنی سے معاملہ کرتی ہیں کہ ایسے نقصان کی صورت میں وہ کمپنیاں ان کے نقصان کی تلافی کریں، اس عمل کو انگریزی میں ری انشورنس "Re-insurance" اور عربی میں ''**اعادة التأمین**'' کہا جاتا ہے۔ مروّجہ انشورنس کمپنیاں ''**اعادة التأمین**'' کے لئے ''ری انشورنس'' کمپنیوں کو پریمیم ادا کرتی ہیں۔

دُوسری طرف ''**شرکات التکافل**'' جو شرقِ اَوسط میں قائم کی گئی ہیں، وہ کسی تجارتی معاہدے کے بجائے ''تبرّع'' کے اُصول پر قائم ہوتی ہیں، ان کمپنیوں میں مختلف افراد جو رقمیں دیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ دینے والوں کی طرف سے ''تبرّع'' ہے، اس طرح رقمیں دینے والوں کو ''**حملة الوثائق**'' کہا جاتا ہے، اور ان رقموں کو کاروبار میں بھی لگایا جاتا ہے اور اس طرح جو رقمیں جمع ہوتی ہیں وہ تمام چندہ دہندگان کے نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جاتی ہیں، اگر سال میں

جن نقصانات کی تلافی کی گئی، اس کے بعد کچھ رقم بچ رہی تو وہ کمپنی کا منافع نہیں ہوتا بلکہ انہیں ان حملة الوثائق میں تقسیم کردیا جاتا ہے جنہوں نے اِبتداء میں تلافی نقصانات کے لئے رقمیں دی تھیں۔

شـرکـات التـکـافـل کا بنیادی تصوّر تو یہی ہے جو اُوپر ذِکر کیا گیا لیکن عملاً اس تصوّر میں مندرجہ ذیل مسائل پیدا ہوتے ہیں:

۱- چونکہ تکافل کی کارروائی دُنیا کے کسی بھی ملک کے قانون میں ایک کمپنی کے قائم کئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کچھ لوگوں کو اپنا اِبتدائی سرمایہ لگا کر ایک کمپنی قائم کرنی پڑتی ہے، ان لوگوں کو ''شیئر ہولڈرز'' یا ''حاملِ حصص'' کہا جاتا ہے، چونکہ مروّجہ انشورنس کمپنیوں کی طرح یہ لوگ نقصانات کی تلافی سے بچی ہوئی رقم کے حق دار نہیں ہوتے، اس لئے ان کی آمدنی صرف ان کے لگائے ہوئے سرمایہ پر تجارتی نفع کی حد تک محدود ہے، اور تکافل فنڈ سے انہیں کچھ نہیں ملتا، البتہ بعض ''شـرکات التکافل'' ان کو تکافل فنڈ سے فنڈ کے اِنتظام واِنصرام کی اُجرت ادا کرتی ہیں، اور ملیشیا کی تکافل کمپنیاں ان کو تکافل فنڈ کی بچی ہوئی رقم سے رقم کا ایک مخصوص فیصد حصہ ادا کرتی ہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ آیا کمپنی کے مؤسسین کو یہ ادائیگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس بنیاد پر؟

۲- اگرچہ تکافل فنڈ تبرّع کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس فنڈ سے خود متبرّع بھی نقصان کی صورت میں مستفید ہوتا ہے، بلکہ تکافل فنڈ میں لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے دیئے ہوئے ''تبرّع'' کی مقدار کی بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی جس کا جتنا زیادہ تبرّع ہوگا، وہ اتنے ہی بڑے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کراسکے گا، دُوسرے الفاظ میں تبرّع کی رقم کا تعین اس چیز کی قیمت کے لحاظ سے ہوتا ہے جس کے نقصان کی وہ تلافی چاہتا ہو۔

چنانچہ اگر کوئی شخص سوزوکی کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے کم تبرّع کرنا پڑے گا، اور اگر مرسڈیز کار کے نقصان کی تلافی کا خواہش مند ہو تو اسے زیادہ تبرّع کرنا پڑے گا، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں جبکہ متبرّع اس نقطۂ نظر سے اور اس بنیاد پر رقم کی مقدار کا تعین کر رہا ہے کہ اس کو کس نقصان کی تلافی مقصود ہے تو کیا واقعۃً تبرّع رہے گا؟ یا یہ بھی عقدِ معاوضہ میں داخل ہوجائے گا؟ شرقِ اَوسط کے جن حضرات نے اس کو تبرّع قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ رقمیں جو کوئی شخص دیتا ہے وہ تکافل فنڈ کا حصہ بن جاتی ہیں، اس تکافل فنڈ کے قواعد وضوابط خود اس فنڈ کے قائم کرنے والوں نے جن میں ہر متبرّع داخل ہے، یہ مقرّر کئے ہیں کہ جس شخص نے جتنا چندہ دیا ہوگا، اسی حساب سے وہ اس فنڈ سے اپنے نقصانات کی تلافی کراسکے گا، اور جو فنڈ باہمی تعاون اور تبرّع کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہو اس کے قواعد وضوابط فنڈ کے تمام شرکاء باہمی رضامندی سے مقرّر کرسکتے

ہیں، لہٰذا اگر یہ قاعدہ مقرّر کرلیا گیا ہے کہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے تبرّعات کی مقدار کے حساب سے کی جائے گی تو اس سے فنڈ کے تبرّع پر مبنی ہونے پر کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، سوال یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ نقطۂ نظر دُرست ہے؟

۳- جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا مروّجہ انشورنس کمپنیاں نقصان کے خطرے کے پیشِ نظر ''ری انشورنس'' کمپنیوں سے ''اعادة التأمين'' کراتی ہیں، ''شركات التكافل'' کو بھی یہ خطرہ درپیش رہتا ہے کہ تکافل فنڈ کی رقم نقصانات کی تلافی کے لئے ناکافی ہوجائے۔

اگرچہ ایک دو مقامات پر مسلمانوں نے ''اعادة التكافل'' کی کمپنیاں بھی قائم کی ہیں، مگر ان کی صلاحیت بہت محدود ہے، اس لئے عرب کے علماء نے ان کو اس بات کی اِجازت دی ہے کہ جب تک شرعی بنیادوں پر ''اعادة التكافل'' کا نظام مستحکم نہ ہو، اس وقت تک وہ بدرجہ مجبوری مروّجہ ''ری انشورنس'' کمپنیوں سے ''اعادة التأمين'' کراسکتی ہیں، ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ تأمین کی حرمت رِبا اور قمار کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ''عقدِ غرر'' ہے چونکہ انشورنس کمپنی نقصان کی صورت میں نقصانات کی تلافی محض پیسے دینے کی شکل میں نہیں کرتی جس سے ''مبادلة النقود بالنقود'' لازم آئے بلکہ وہ نقصان کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے، مثلاً کار تباہ ہوئی تو اس کی جگہ دُوسری کار فراہم کرنا، مکان تباہ ہوا تو اس کی جگہ دُوسرا مکان تیار کرنا وغیرہ، لہٰذا یہ عقد رِبا یا قمار نہیں بلکہ عقدِ غرر ہے، اور ''غرر'' کو حاجتِ عامہ کی بنا پر گوارا کیا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ موقف دُرست ہے؟ اور اگر نہیں تو اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کوئی دُوسرا طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

مجلس کی طرف سے مذکورہ اِشکالات کا جواب اور ''تکافل'' سے متعلق اکابر علمائے کرام کی قرارداد

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ!

جامعہ دارالعلوم کراچی کے شعبۂ مرکز الاقتصاد الاسلامی کی دعوت پر پاکستان، بنگلہ دیش اور شام کے اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ حضرات کا اہم اِجتماع بتاریخ ۲۱-۲۲ رشوال ۱۴۲۳ھ بروز جمعرات، جمعہ مطابق ۲۶-۲۷ ردسمبر ۲۰۰۲ء جامعہ دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کے ہال میں بیمہ کے متبادل نظام ''تکافل'' پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا۔

مجلس کے علمائے کرام نے مروّجہ انشورنس کے متبادل نظام ''شرکۃ التکافل'' پر غور کیا، جس کی عملی صورت بنگلہ دیش، شرقِ اَوسط اور ملائشیا کی بعض کمپنیوں نے اِختیار کی ہے۔ اس متبادل طریقۂ کار پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ''شرکات التکافل پر چند اِشکالات'' کے نام سے جو تحریر اہلِ علم کے مطالعے کے لئے اِرسال کی تھی، اسے مجلس میں پڑھا گیا اور ان اِشکالات کا جائزہ لیا گیا۔

مجلس کے آغاز میں مہمان عرب عالمِ دِین اور متعدّد مالیاتی اِداروں کے شرعی اُمور کے نگران جناب شیخ عبدالستار ابوغدہ نے مغربی بیمہ کمپنیوں کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور اَب اِسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں کام کر رہی ہیں ان کے طریقِ کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ بعد میں شرکاءِ مجلس کے بعض سوالات وشبہات کے جوابات دیئے۔

اس کے بعد متعدّد اہلِ مجلس نے اپنی آراء بیان فرمائیں اور طویل بحث کے بعد مجلس نے یہ طے کیا کہ اس وقت اسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں اسلامی اُصولوں کے مطابق کام کر رہی ہیں یا کام کرنا چاہتی ہیں ان سب کی بنیاد ''حملة الوثائق'' (پالیسی ہولڈرز یا بالفاظِ دیگر پریمیم قسط ادا کنندگان) کی طرف سے ''تبرّع'' پر رکھی گئی ہے، اور اس تبرّع کی بنیاد پر وہ اپنے متوقع مالی خطرات کا اِزالہ کرتے ہیں، مجلس نے محسوس کیا کہ وقف کے بغیر تبرّع کی بنیاد پر تکافل کمپنیوں کے قیام میں متعدّد اِشکالات ہیں۔ شیخ عبدالستار ابوغدہ اور دُوسرے عرب علماء نے اگرچہ ان اِشکالات کے اپنے اپنے طور پر جوابات دیئے ہیں لیکن مجلس کو خیال ہوا کہ اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی، اگر فی الحال ترجیحاً ان کمپنیوں کی بنیاد تبرّع کے بجائے وقف پر رکھی جائے تو اس قسم کے اِشکالات سے حفاظت ہوسکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ۱۳۸۴ھ میں مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا ولی حسن رحمہم اللہ اور دیگر اکابر کی سرپرستی میں بیمۂ زندگی کے متبادل کے طور پر جو نظام تجویز کیا تھا، اس کی بنیاد بھی وقف اور مضاربت پر رکھی تھی (دیکھئے ''بیمۂ زندگی'' مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ ص:۲۵)۔

ان جلیل القدر اکابر کی تجویز کردہ بنیاد ''وقف'' پر اگر تکافل کمپنی قائم کی جائے تو نسبۃً اِشکالات کم پیش آئیں گے، لہٰذا مجلس نے تبرّع کے مقابلے میں وقف کی بنیادوں پر قائم شرکۃ التکافل کے قیام کی صورت کو ترجیح دی جس میں اوّلاً مساہمین (شیئر ہولڈرز یعنی تکافل کمپنی حصہ داران) اپنے طور پر اُصولِ ثابتہ (اموال غیرمنقولہ) یا نقود یا دونوں کو شرعی اُصول وضوابط کے مطابق وقف کریں گے جنہیں محفوظ رکھا جائے گا اور ان کے لئے آخری جہت ''قربت''، یعنی فقراء اور مساکین پر تصدق ہوگی، پھر حملة الوثائق (پالیسی ہولڈرز) اس وقف میں جو رُقوم دیں گے یا وقف کے جتنے منافع یا زوائد ہوں

گے وہ سب وقف کے مملوک ہوں گے اور وقف کو وقف کے طے شدہ اُصول وضوابط کے مطابق ان مملوکات ومنافع میں تصرف کا مکمل اِختیار ہوگا۔

اس اُصول کے طے ہونے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے تین اِشکالات پر غور کیا گیا۔ نمبروار اِشکالات کے جوابات یہ طے کئے گئے:

(۱)

(الف) مساہمین تکافل فنڈ سے فنڈ کے اِنتظام واِنصرام کی اُجرت درج ذیل شرائط کے ساتھ وصول کر سکتے ہیں:

۱- یہ اُجرت فنڈ سے ادا کی جائے کیونکہ یہ لوگ فنڈ کے اَجیر ہیں نہ کہ حملۃ الوثائق کے۔

۲- اس اُجرت کا متعین ہونا ضروری ہے خواہ وہ تعیین رقم کی صورت میں ہو یا حصۂ متناسبہ کی صورت میں۔

۳- یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اُجرت اعمالِ مضاربت سے خارج کسی اور عمل پر ہو۔

(ب) اگر وقف کے متولّیین (یعنی شرکۃ التکافل) شرعی حدود میں وقف کے لئے مضاربت کی خدمات انجام دیں تو وہ مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع کے متناسب متعین حصے کے بھی حق دار ہوسکتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرائط ہیں:

۱- مضاربت اور اِجارہ کی حدود علیحدہ علیحدہ واضح طور پر متعین ہوں تاکہ اِجارہ کے طور پر وہ صرف متعین اُجرت کے حق دار ہوں، اور مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع میں سے حصہ متناسبہ کا حق رکھیں۔

۲- ھیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ سے مضاربت کی باقاعدہ اِجازت لے لی جائے۔

(۲)

حملۃ الوثائق جو کچھ تبرّع کی بنیاد پر وقف کو دیں اس میں کمی یا زیادتی کی بنیاد پر کم یا زیادہ نقصان کی تلافی کا اگر حملۃ الوثائق کو قانونی حق نہ ہو، بلکہ وقف کی طرف سے محض وعدہ کی حیثیت ہو تو اس میں بظاہر شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تبرّع کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر تلافیٔ نقصان کی کمی اور زیادتی حملۃ الوثائق کا قانونی حق ہو تو اس میں مجلس کے بعض شرکاء کی رائے یہ تھی کہ یہ صورت جائز نہیں کیونکہ یہ صورت عقدِ معاوضہ میں داخل ہوگی اور یہ بعینہٖ وہی صورت ہے جو بیمہ کمپنیوں میں فی الحال رائج ہے، لیکن مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ تھی کہ حملۃ الوثائق کے قانونی حق بننے کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ اس بنیاد پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کرے کہ اس نے فلاں

وقت میں وقف فنڈ کو اتنی رقم دے کر اس سے نقصان کی تلافی کا معاہدہ کیا تھا، لہٰذا اب اس کے اتنے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے، یہ صورت تو یقیناً ناجائز ہے کیونکہ یہ بات اسے عقودِ معاوضہ میں داخل کر کے اس میں ربا اور غرر کی خرابیاں پیدا کردے گی۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ اپنے سابقہ تبرّع کی بنیاد پر اپنے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد وضوابط کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافیٔ نقصان کا حق دار ہوں۔ مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ ہے کہ حاملِ وثیقہ شرعاً اپنا یہ حق اِستعمال کرسکتا ہے اور اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقدِ معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''اسلام کا نظامِ اراضی'' (ص:۱۴۶،۱۴۷) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاءِ مستقل کے لئے سابقہ ضرر کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

اس پر بعض حضرات کو ایک اِشکال ہے، یہ اِشکال اور اس کا جواب جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے، آگے آرہا ہے۔

(۴)

رائج الوقت اعادۃ التأمین میں جہاں پورے پریمیم کے ڈُوبنے کا خطرہ ہو، وہاں غرر کے علاوہ قمار کی خرابی بھی پائی جاتی ہے، اور جہاں پریمیم ڈُوبنے کا ڈَر نہ ہو وہاں غرر ہونا تو بہرحال طے ہے، اور غرر بھی فاحش ہے، لہٰذا محض اعادۃ التأمین کی خاطر اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ درج ذیل متبادل صورتوں کو اِختیار کیا جاسکتا ہے:

۱- اعادۃ التکافل کی کمپنیاں بھی شرعی بنیادوں پر قائم ہوں۔

۲- تبرّع کرنے والوں سے مزید تبرّع کی درخواست کی جائے۔

۳- تبرّع کرنے والوں سے قرض لے کر فی الحال اس سے ادائیگیاں کی جائیں یا ان سے بطور مضاربت رقم لے کر سرمایہ کاری کی جائے، اور حاصل ہونے والے نفع سے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

۴- اِحتیاطیات میں رقم زیادہ رکھی جائے۔

۵- وقف پر تلافیٔ نقصان کی ذمہ داری نسبۃً کم رکھی جائے۔

۶- اسلامی تکافل کمپنیاں آپس میں اِعادۃ التکافل کی خدمات انجام دیں۔

ملحوظہ:

۱- مجلس میں شریک علمائے کرام نے یہ بھی طے کیا کہ ہر تکافل کمپنی کے اندر مستند علمائے کرام اور اہلِ فتویٰ حضرات پر مشتمل ایک ھیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ (شریعہ بورڈ) لازمی ہے جو کمپنی کے تمام

معاہدات اور جملہ قابلِ ذکر اُمور کے شریعت کے مطابق ہونے کی نگرانی کرے گا۔

۲-مجلس نے یہ سفارش پیش کی کہ چونکہ مجلس کا طے شدہ تکافل کا نظام ''تبرّع'' کے بجائے ''وقف'' پر قائم ہوا ہے، اس لئے بیمہ کمپنیوں کی قدیم اِصطلاحات میں تبدیلی کرکے انہیں بھی فقہِ اسلامی کے مطابق کرنا مناسب ہے۔

ایک اِشکال اور اس کا جواب

جب کوئی شخص پریمیم جمع کراتا ہے تو اس نیت سے کراتا ہے کہ بوقتِ نقصان زیادہ ملے گا۔ اور اس زیادت کے لئے وہ کمپنی کو مجبور بھی کرسکتا ہے۔ اس کی توجیہ حضرت نے یہ فرمائی کہ دینا محض تبرّع ہے اور لینا صندوق کے قوانین کے تحت ہے۔

حضرت کی توجیہ سے یہ عقد صریح قمار سے تو نکل گیا لیکن اس میں شبہِ رِبا ہے۔ وہ اس طرح کہ دیتے وقت نیت یہ ہے کہ زیادہ ملے چاہے کسی قانون سے ہو، اور اِرشاد ہے کہ: ''وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِر وقال ابن عباس لا تعط عطية تلتمس بها أفضل منها''(۱) اسی وجہ سے نیوتہ کو ناجائز کہا گیا ہے، حالانکہ اس میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینا ایک مستقل عطیہ ہے اور دُوسرا جب دیتا ہے تو وہ ایک مستقل عطیہ ہے، لیکن چونکہ نیت لینے کی ہے اس لئے علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس کو قرض میں داخل فرمایا ہے۔

في التتارخانية: وفي الفتاوى الخيرية سئل فيما يرسله الشخص الٰى غيره في الأعراس ونحوها هل يكون حكمه حكم القرض فيلزمه الوفاء به أم لا؟ أجاب: ان كان العرف بأنهم يدفعونه علٰى وجه البدل يلزم الوفاء به مثليا فبمثله وان قيميا فبقيمته وان كان العرف خلاف ذٰلك بأن كانوا يدفعونه علٰى وجه الهبة ولا ينظرون في ذٰلك الٰى اعطاء البدل فحكمه حكم الهبة .... والأصل فيه ان المعروف عرفا كالمشروط شرطا. اهـ

قلت: والعرف في بلادنا مشترك نعم في بعض القرىٰ يعدونه قرضًا حتّٰى انهم في كل وليمة يحضرون الخطيب يكتب لهم ما يهدى فاذا جعل المهدى وليمة يراجع المهدى الدفتر فيهدى الأول الى الثاني مثل ما أهدى اليه. (ج:۵ ص:۶۹۶)(۲)

لہٰذا یہاں بھی جب دینا اس غرض سے ہے کہ واپس ملے گا اور وہ بھی زیادہ ملے گا، تو ایک تو

---

(۱) تفسیر قرطبی ج:۱۹ ص:۶۷ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) و ج:۱۹ ص:۶۳ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور)

(۲) ردّ المحتار ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید).

یہ اس آیت کی وعید میں داخل ہے اور کم از کم مکروہ ضرور ہوگا۔ اور دُوسرا علامہ ابنِ عابدینؒ کی توجیہ کے مطابق قرض میں داخل ہوجائے گا۔ اور زیادت سود سے مشابہ ہوگی۔ اور سود کے بارے میں یہ حکم ہے: "فدعوا الربا والريبة"، تو یہ کہیں ریبہ میں تو داخل نہیں؟

عن الحسين قال: سمعت أبا معاذ يقول: أخبرنا عبيد قال: سمعت الضحاک يقول في قوله: وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِيْٓ اَمْوٰلِ النَّاسِ فهو ما يتعاطى الناس بينهم ويتهادون يعطي الرجل العطية ليصيب منه أفضل منها وهٰذا للناس عامة وأما قوله: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ فهٰذا للنبي خاصة لم يكن له أن يعطي الّا الله ولم يكن يعطي ليعطي أكثر منه. (قرطبی ج:۲۱ ص:۴۶)[1]

لیکن حاضرین کی اکثریت نے اس اِشکال کا جواب یہ دیا کہ اس بات پر تمام فقہائے کرام کا اِتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اُٹھانے کی نیت کرے بلکہ وقف نامے میں اپنے اِنتفاع کی باقاعدہ شرط لگائے، تو اس کی اِجازت ہے، جس کی دلیل حدیثِ معروف ہے: "يكون دلوه فيها كدلاءِ المسلمين"۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ وقف کے اَحکام اِنفرادی ہدایا سے مختلف ہیں، اور اس کی وجہ واضح ہے کہ وقف کا موضوع لہٗ ہی موقوف علیہم کو فائدہ پہنچانا ہے، لہٰذا اگر واقف وقف سے فائدہ اُٹھاتا ہے تو وہ وقف کے موضوع لہٗ میں داخل ہونے کی بناء پر اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ چنانچہ وقف کی صورت میں چندہ دینے والا اگر وقف سے فائدہ اُٹھائے تو وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق فائدہ اُٹھائے گا۔ اگر وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق وہ مستحق قرار نہ پائے تو وہ فائدہ نہیں اُٹھاسکتا۔

نیوتہ میں کوئی وقف نہیں ہوتا اس میں "مہدی لہٗ" کا موضوع لہٗ بھی یہ نہیں ہے کہ وہ دُوسروں کو ہدیہ دے، وہ دو اَفراد کا باہمی معاملہ ہے جس میں ہدیہ کا لوٹانا مشروط یا معروف ہو تو اس میں عقدِ معاوضہ ہونے کے سوا کوئی دُوسرا اِحتمال نہیں ہے۔ جبکہ دُوسری طرف وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا اِستحقاقِ انتفاع بالکل دُوسرا معاملہ۔ اس لئے وقف کے معاملے کو نیوتہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) تفسیر طبری باب:۳۷ ج:۲۰ ص:۱۰۵ (طبع مجمع الملک فهد).

(۲) صحیح البخاری، كتاب المساقات، باب في الشرب ج:۱ ص:۳۱۶ (طبع قديمی کتب خانه).
أيضًا فيه كتاب الوصايا، باب اذا وقف أرضًا أو بئرًا واشترط لنفسه مثل دلاء المسلمين.
وفي جامع الترمذی، أبواب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان "فيجعل دلوه مع دلاء المسلمين".
كذا في النسائي، كتاب الاحباس، باب وقف المساجد.
وفي مسند أحمد بن حنبل (ج:۱ ص:۷۵) فيكون دلوه فيها كدلیء المسلمين.

شرکائے مجلس کے اسماء اور مذکورہ قرارداد پر ان کے دستخط

نام	ادارہ	دستخط
۱- حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲- الشیخ عبدالستار ابو غدہ حفظہ اللہ	شام	
۳- حضرت مولانا مفتی عبیدالحق صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۴- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۵- حضرت مولانا مفتی اظہارالاسلام صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۶- حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۷- حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی صاحب مدظلہم	علامہ بنوری ٹاؤن کراچی	دستخط
۸- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہم	جامعہ خیرالمدارس ملتان بندہ اس اجتماع میں شریک ہوا	دستخط
۹- حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۰- حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۱- حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہم	دارالافتاء والارشاد کراچی	
۱۲- حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۳- حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب مدظلہم	ضربِ مؤمن کراچی	دستخط
۱۴- حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۱۵- حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب مدظلہم	جامعہ حقانیہ ساہیوال (سرگودھا)	دستخط
۱۶- حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب مدظلہم	جامعہ اشرف المدارس کراچی	دستخط
۱۷- حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحب مدظلہم	جامعہ فاروقیہ کراچی	دستخط
۱۸- حضرت مولانا مفتی رضوان احمد صاحب مدظلہم	ادارہ غفران اسلام آباد	
۱۹- حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۰- حضرت مولانا مفتی محمد صاحب مدظلہم	دارالافتاء والارشاد کراچی	

سودی بیمہ کے شرعی متبادل کے لئے یہ تحریر ابتدائی خاکہ کا درجہ رکھتی ہے دیگر شرائط وتفاصیل اور عملی نفاذ میں ممکنہ فقہی مشکلات پر کام ہونا باقی ہے۔ دستخط

نام	ادارہ	دستخط
۲۱- حضرت مولانا مفتی مخلص الرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۲- حضرت مولانا مفتی میزان الرحمٰن صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۳- حضرت مولانا مفتی کمال الدین ظفری صاحب مدظلہم	بنگلہ دیش	دستخط
۲۴- حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۵- حضرت مولانا مفتی زبیر اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط
۲۶- حضرت مولانا ڈاکٹر عمران اشرف عثمانی صاحب مدظلہم	جامعہ دارالعلوم کراچی	دستخط

مروّجہ انشورنس کے متبادل ’’تکافل‘‘ کے طریقۂ کار کا جائزہ اور اس کی بعض شقوں کی وضاحت

سوال:- گرامی قدر حضرت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج بخیر! جنابِ عالی!

یہاں ساؤتھ افریقہ میں مروّجہ انشورنس کے مقابلے میں تکافل کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، اس کا مقصد جائز طریقے سے انشورنس کے مقصد کو حاصل کرنا ہے، بندے نے اس کی ماہیت و وضع سے متعلق پوری تفصیل لکھی ہے جو کہ مرسل ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اس کا مطالعہ فرما کر اپنی عالی رائے سے سرفراز فرمائیں اور غلطی کی اصلاح فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

’’تکافل ساؤتھ افریقہ‘‘

دُنیا میں رائج انشورنس کے مقابلے میں یہاں ساؤتھ افریقہ میں چند مسلمانوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شرعی و جائز طریقے سے رائج انشورنس کے فوائد و مقاصد حاصل کئے جائیں، اس ادارے کو ’’تکافل‘‘ کا نام دیا ہے، یہ لفظ بمعنی ضمانت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تعاون وتناصر ہے، دُنیا کے مختلف ممالک میں بھی اسی غرض سے اس نام سے ادارے قائم ہیں۔ تکافل ساؤتھ افریقہ کا ڈھانچہ و ماڈل اس طرح ہے کہ:-

۱- چند محدود افراد نے اس نیت سے محدود رقم وقف کر کے ایک فنڈ قائم کیا ہے کہ جو لوگ اس وقف فنڈ کے ممبر ہوں گے، ان پر اگر کوئی حادثہ یا نقصان عارض ہوا تو طے شدہ قواعد و شرائط کے تحت اس ممبر کی اس وقف فنڈ کے منافع سے مدد کی جائے گی، اور اس میں سے محدود نسبت کے ساتھ کچھ رقم فقراء میں بھی تقسیم کی جائے گی۔

۲- اس وقف فنڈ کو جائز اسلامی سرمایہ کاری کے ذریعے بڑھایا جائے گا، نیز جو اس وقف فنڈ کا ممبر بنے گا اس سے اس فنڈ کے لئے چندہ وصول کیا جائے گا، یہ چندہ وقف فنڈ کے منافع کے حکم میں ہوگا، یہ چندہ وقف کے حکم میں نہیں ہوگا، جیسا کہ مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو چندہ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے منافع ہوتے ہیں اور یہ منافع مسجد کے مصالح پر خرچ کئے جاتے ہیں (والتفصیل فی امداد الأحکام ج:۳ ص:۲۲۰)۔

۳- جو شخص وقف فنڈ کو چندہ دے گا تو وہ وقف فنڈ کے مقاصد کو پورا کرنے کی نیت سے

چندہ دے گا، اور وہ اس چندے کا مالک نہیں رہے گا، بلکہ یہ چندہ وقف فنڈ کی ملکیت ہوجائے گا۔

۴- اس وقف فنڈ کا ممبر حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس بنیاد پر تلافی کا دعویٰ کرے گا کہ وہ اس وقف فنڈ کے مقاصد کے مطابق مستحق ہے، اگر وقف فنڈ کے متولی اس کے نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کریں تو وہ عدالت سے اس بنیاد پر رُجوع کرسکتا ہے کہ وقف فنڈ کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے متولی اس وقف فنڈ کو اس کے مقاصد کے مطابق چلانے کے ذمہ دار ہیں، لیکن وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں، لہٰذا عدالت ان سے باز پُرس کرے۔ گویا یہ حقوق اللہ میں سے ہوگیا، جیسا کہ مالِ غنیمت تقسیم سے پہلے کسی ایک مجاہد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا اور ہر مجاہد کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ بھی مال کافروں سے حاصل ہو وہ لاکر اِمام کے پاس جمع کرے، نہ خود چھپائے اور نہ ہی کسی دُوسرے کو چھپانے دے، اگر کسی مجاہد نے دُوسرے کے غلول کو چھپایا تو وہ بھی گناہگار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "ومن یکتم غالًّا فانه مثله" رواه أبو داؤد (مشکوٰة ص: ۳۵۱)۔

نیز جس طرح جہاد میں ہر مجاہد کی نیت ابتداء میں مال حاصل کرنے کی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ بعض دفعہ امیر یہ بھی اعلان کردیتا ہے کہ: "من قتل قتیلًا فله سلبه" تاکہ قتال پر اُبھارا جائے اور سستی پیدا نہ ہو، اس کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہوتا ہے تو ہر مجاہد اپنے حصے کی غنیمت و اِنعام خصوصی کا جس کا اعلان کیا گیا ہو دعویٰ کرسکتا ہے، غزوۂ حنین میں فتح ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: "من قتل قتیلًا له علیه بینة فله سلبه" (مشکوٰة ص:۳۴۸) تو ایک صحابی حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "من یشهد لی" لیکن کوئی گواہی دینے کے لئے کھڑا نہیں ہوا تو آپ بیٹھ گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پھر اعلان کیا، یہ صحابی دوبارہ کھڑے ہوئے لیکن انہیں کوئی گواہ نہیں ملا تو بیٹھ گئے، تیسری دفعہ بھی اسی طرح ہوا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہؓ سے پوچھا کہ: کیا بات ہے؟ انہوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک کافر کو قتل کیا ہے، اس کے بعد ایک دُوسرے صحابی نے (جن کے پاس اس مقتول کا سامان تھا) حضرت ابو قتادہؓ کی تصدیق کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس مقتول کا سامان مجھے دے دیا جائے اور ابوقتادہ کو راضی کردیا جائے، لیکن حضرت ابوقتادہؓ اس پر راضی نہیں ہوئے لہٰذا انہیں مقتول کا سامان دیا گیا، متفق علیہ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ تبرّع کی نیت سے کچھ کرنے کے بعد (جہاد میں جانا اور اپنی جان و مال خرچ کرنا بھی تبرّع ہے)، اگر کسی چیز کا استحقاق ثابت ہوجائے تو اس کے لئے دعویٰ کرنا جائز ہے، نیز یہ موقوف علیہ بھی ہے، لہٰذا مستحق ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرسکتا ہے (درمختار ج:۳ ص:۴۴۰ و ۴۴۱)۔

۵- یہ بھی طے ہوا ہے (متولیوں کی طرف سے) کہ اس وقف فنڈ کو شریعت کے مطابق چلانے اور اس کی نگرانی کرنے کے لئے ایک شریعہ بورڈ قائم ہوگا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اس فنڈ کو چلایا جائے گا، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس فنڈ کو جاری رکھنا شریعت کے مطابق نہیں ہے اور ائمہ اَربعہ میں سے کسی کے بھی نزدیک صحیح نہیں ہے یا یہ فنڈ اپنے مقاصد کے مطابق چل نہ سکے تو اس فنڈ کی جتنی بھی رقم و جائیداد وغیرہ ہوگی وہ سب فقراء وغیرہ میں تقسیم کرکے اس فنڈ کو ختم کردیا جائے گا۔

۶- وقف فنڈ کے منافع کا سالانہ حساب کیا جائے گا اور اصل وقف رقم سے زائد جو رقم ہوگی وہ ممبران میں تقسیم کی جائے گی۔

۷- جو رقم وقف کی گئی ہے اس میں کمی نہیں کی جائے گی، تقسیم منافع وقف کی ہوگی اگر کسی وقت دعوے زیادہ ہوں اور منافع وقف سے اس کی تکمیل نہ ہوسکے تو وقف فنڈ کو بلاسودی قرض دیا جائے گا اور بعد میں اس کے منافع سے اس قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔

۸- چونکہ تکافل ساؤتھ افریقہ ایک نئی کمپنی یا ادارہ ہے اور ان کے پاس کافی رقم نہیں ہے جبکہ حکومتی قانون کے مطابق ایسی کمپنی کو جاری کرنے کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے اور تکافل کمپنی کے پاس اس لائسنس کو حاصل کرنے کے لئے رقم نہیں ہے، نیز اس میدان کی انہیں تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت بھی حاصل نہیں ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تکافل ساؤتھ افریقہ نے ایک مروّجہ انشورنس کمپنی سے معاہدہ کیا کہ تکافل کمپنی ان کے لائسنس کو اِستعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی، اس کے عوض تکافل کمپنی اس انشورنس کمپنی کو طے شدہ اُجرت ادا کرے گی۔

۹- جن حضرات نے اس فنڈ کے لئے رقم وقف کی ہے، وہ اس کے متولّی ہیں، وہ اس فنڈ کو چلانے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے بحیثیت وکیل کام کریں گے اور اس کے لئے انہیں متعین اُجرت دی جائے گی، اس اُجرت میں تمام ملازمین کی تنخواہ اور انتظامی اِخراجات شامل ہوں گے۔

۱۰- تکافل ساؤتھ افریقہ نے ری انشورنس کا معاملہ نہیں کیا۔

تکافل ساؤتھ افریقہ کے ماڈل کے لئے مندرجہ بالا بنیادی اُمور ہیں، ان اُمور کی بنیاد پر اس تکافل کو چلایا جائے گا، اس سلسلے میں اگر کوئی مزید سوال ہو تو بلاجھجک پوچھ سکتے ہیں۔ برائے کرام اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمائیں۔

فقط والسلام

محمد اشرف اسپرنگز ساؤتھ افریقہ

۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

۱۴ر جولائی ۲۰۰۴ء

جواب :- گرامی قدر مکرم مولانا محمد اشرف خان صاحب، زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ اور تکافل کے بارے میں آپ کی تحریر ملی، اس میں نمبر۱ سے نمبر۷ تک کی تجاویز تقریباً وہی ہیں جو دارالعلوم میں منعقدہ علماء کے اجتماع میں طے کی گئی تھیں، لہٰذا وہ شریعت کے مطابق ہیں۔ صرف نمبر۶ کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زائد رقم کا ممبران پر تقسیم ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ رقم وقف کی ملکیت ہوچکی ہے اس لئے وقف کے قواعد کے تحت اس کو وقف ہی میں محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے تاکہ سالِ آئندہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی میں کام آئے، اور یہ صورت بندے کو زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

البتہ نمبر۸ میں جو تجویز دی گئی ہے کہ: ''تکافل کمپنی کسی مروّجہ انشورنس کمپنی کا لائسنس استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی'' اس کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا مشکل ہے، جب تک مروّج انشورنس کمپنی کے ساتھ تکافل کمپنی کا معاہدہ سامنے نہ ہو۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۲۵/۸/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۷۳۶/۵)

مروّجہ انشورنس کی مختلف اقسام کا حکم اور انشورنس کے جواز کے قائل علماء کی آراء کی شرعی حیثیت

سوال :- میرا مسئلہ Life Insurance کے متعلق ہے۔ Pakistan State Life کے منیجر میرے دوست ہیں، وہ مجھے پچھلے کئی سالوں سے Insurance کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، لیکن آج دن تک میں نے اس ڈر سے Insurance نہیں کروائی کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ میرے دوست نے پورا ایک بنڈل پڑھنے کے لئے دیا جس میں دُنیا کے مختلف علماء کی Insurance کے بارے میں رائے تھی، اور ان کے مطابق Insurance غیر اسلامی نہیں ہے۔ ان علماء میں مصر، ابوظبی اور سعودی عرب کے علماء تھے۔ اور تقریباً تین ہفتے پہلے ابوظبی کے صدر کے مذہبی مشیر نے بیان دیا ہے کہ جو یہاں کے اخباروں میں شائع ہوا ہے، انہوں نے بھی موجودہ Life Insurance کو اسلام کے منافی قرار نہیں دیا، کیا میں ان کے فیصلے کو معتبر سمجھتے ہوئے اپنی Insurance کرواسکتا ہوں یا نہیں؟ آپ سے ایک درخواست ضرور ہے کہ جواب تفصیل سے دیجئے گا۔

جواب :- انشورنس کے جو طریقے اس وقت تک مروّج ہیں وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں، اور حرام ہیں۔ مختلف انشورنس کمپنیاں جن علماء کے بیانات شائع کرتی رہتی ہیں، ان میں دو قسم کے بیانات ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ان کمپنیوں نے بعض علماء کی طرف غلط بیانات منسوب کئے ہیں، اور بعض مرتبہ علماء کی طرف بیانات کی نسبت غلط نہیں ہوتی، لیکن جن علماء نے موجودہ انشورنس کو جائز کہا ہے، ان کی بات بحیثیتِ مجموعی عالمِ اسلام کے علماء نے قبول نہیں کی، لہٰذا وہ شاذ اقوال کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کے دلائل بھی نہایت کمزور ہیں۔ "مُجمّع الفقه الاسلامی جدة" میں ساری دُنیائے اسلام کے علماء نے جمع ہوکر اس مسئلے پر مفصل بحث کی، اور بالآخر انشورنس کے مروّجہ طریقوں کی حرمت کا فتویٰ دیا، اور بعض علماء کے شاذ اقوال کو باطل قرار دیا۔ اس اجتماع میں ۴۵ اسلامی ملکوں کے تقریباً ۱۵۰ علماء شریک تھے، یہ تنظیم سارے اسلامی ملکوں کے علماء کی تنظیم ہے۔ خاص طور پر بیمہ زندگی کی حرمت کے دلائل میرے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے "بیمہ زندگی" میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

والسلام
۲۲/۱۱/۱۴۱۴ھ

۱:- انشورنس اور اس کی تمام اقسام کا حکم
۲:- بغیر سود والے انشورنس کے ناجائز ہونے کی وجہ
۳:- انشورنس کی حرمت کے دلائل اور اس کے جواز سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور بعض دیگر علماء کی رائے کی حقیقت

سوال ۱:- انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- انشورنس کی جتنی صورتیں فی زماننا رائج ہیں، سب ناجائز ہیں، کیونکہ وہ سب سود اور قمار پر مشتمل ہیں۔ (۱)

سوال ۲:- بغیر سود کے انشورنس کا فتویٰ کیا ہے؟

جواب ۲:- بغیر سود کا انشورنس بھی قمار کی وجہ سے ناجائز ہے۔ (۲)

سوال ۳:- اپنے فتویٰ میں قرآنی آیات یا احادیث جس سے استنباط کیا گیا ہو؟

(۱ و ۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۶۰، امداد المفتین ص:۸۵۲ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ "بیمہ زندگی" اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" ص:۱۵۹ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب۳:- ربا اور قمار کی حرمت کی تمام آیات واحادیث، انشورنس کے حرام ہونے کی دلیل ہیں۔[۱]

سوال۴:- مولانا ابوالکلام آزاد یا دُوسرے علمائے کرام نے جو اس کے حق میں فیصلہ دیا ہے، اس کے بارے میں اظہارِ خیال؟

جواب۴:- مستند علماء میں سے کسی نے انشورنس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، بعض علماء کی طرف فتاویٰ غلط منسوب کیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے بارے میں تحقیق نہیں ہے کہ اُنہوں نے کیا فتویٰ دیا تھا، اور وہ اہلِ فتویٰ علماء میں بھی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح احقر محمد تقی عثمانی

بندہ محمد شفیع ۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

شدید مجبوری میں انشورنس کی رقم بطورِ قرض استعمال کرنے کا حکم

سوال:- محترم مرشدی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اُمید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔

بعد گزارش! انشورنس کی رقم کے بارے میں مسئلہ معلوم ہوا۔ مزید ایک بات دریافت کرنی ہے، وہ یہ کہ مجھے انشورنس کمپنی سے ساٹھ ہزار یا ستر ہزار کی رقم بمع پرافٹ وغیرہ کے مل جاتی ہے، اگرچہ میں اپنی اصل رقم ہی کا مالک ہوں، اب میری ضرورت مجبوری ہے، آیا میں وقتی طور پر بطورِ قرض کے یہ تمام رقم اپنے استعمال میں لاسکتا ہوں؟ جب میرے پاس اپنی رقم ہوجائے گی تو اپنی اصل رقم اپنے پاس رکھ کر بقایا رقم آپ کی ہدایات کی روشنی میں تقسیم کردی جائے گی، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ آیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ اُمید ہے جواب سے نوازیں گے۔

آپ کی دُعاؤں کا محتاج

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- محترمی ومکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انشورنس کمپنی سے جو اصل رقم مل رہی ہے اس کو تو استعمال میں لانا جائز ہے، البتہ اس پر سود کی جو رقم مل رہی ہے، اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، البتہ شدید اور انتہائی مجبوری میں اس کو اس نیت سے ذاتی استعمال میں لاسکتے ہیں کہ بعد میں اتنی ہی رقم صدقہ کریں گے، لیکن اس صورت میں اپنے پاس اس

(۱) ربا کی حرمت سے متعلق ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱، اور قمار کی حرمت سے متعلق تفصیلی دلائل کے لئے "جواہر الفقہ" ج:۲ ص:۳۳۹ میں رسالہ "أحکام القمار" ملاحظہ فرمائیں۔

کا حساب رکھیں، جب ضرورت رفع ہوجائے اس وقت اس رقم کو صدقہ کردیں۔ الاختیار میں ہے:

والملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم ان کان غنیا تصدق بمثله، وان کان فقیرًا لا یتصدق.

(الاختیار لتعلیل المختار ج:۳ ص:۶۱ أوائل کتاب الغصب)

والسلام
محمد عبداللہ میمن
بحکم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

۱۹۹۹/۱۱/۱۲ء

''بیمۂ زندگی'' کا حکم

سوال:- بیمہ بونس جو کہ ہر سال مختلف ہوتا ہے، کیا اسے سود کہا جاتا ہے؟ اور زندگی ختم ہونے پر جو مقرّر رقم ملتی ہے کیا وہ ناجائز ہے؟ کیا درمیان میں یعنی پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے قبل اموات کی حالت میں جو رقم ورثاء کو کمپنی ادا کرتی ہے ناجائز ہے؟ اس سلسلے میں دلائل بھی تفصیل سے بیان فرمادیں۔

جواب:- بیمۂ زندگی کی جو صورت آج کل رائج ہے اس میں اصل رقم سے زائد جتنی بھی رقم ملتی ہے، اس سب کو لینا حرام ہے، اگر ناواقفیت کی بناء پر پالیسی خرید لی گئی ہو تو اصل رقم واپس لے لی جائے، اور زائد رقم وصول نہ کی جائے، دلائل کی تفصیل یہاں درج نہیں کی جاسکتی[1]، مختصر یہ کہ بیمے کی موجودہ صورت سود اور قمار سے مرکب ہے اور یہ دونوں چیزیں قطعی طور پر حرام ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۲/۱۸ الف)

مروّجہ بیمے کی تمام اقسام کا حکم اور ''اِمدادِ باہمی'' کے اُصول پر جائز بیمے کا تصوّر

سوال:- ایک پارٹی کو انشورنس کی پالیسی بیچتے وقت اسے عرض کیا کہ یہ رقم گورنمنٹ منصوبہ

(۱) دلائل کی تفصیل اور تحقیق کے لئے دیکھئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''بیمۂ زندگی''۔

جات جیسے کھاد فیکٹری، بجلی کے کارخانے، بند و دیگر بڑے بڑے منصوبہ جات پر استعمال ہوکر قوم کے کام آتی ہے، اور اِنسان کی رقم بھی جو کہ جمع ہوکر مثلاً اس کی بیٹی کا جہیز بنتی ہے، بچے کی تعلیم بن کر سامنے آتی ہے، چونکہ اس دور میں یک مشت رقم گھر سے نکالنا بہت مشکل ہے، یہ اِمدادِ باہمی بھی ہے، گورنمنٹ جو قرضہ جات لیتی ہے اسی بناء پر کہ اُسے کسی منصوبے کے لئے رقم درکار ہے، انسان بھی اسی بناء پر اُدھار تک پہنچتا ہے اگر لائف انشورنس خودکشی کے لئے کی جائے تو بُرا ہے، لیکن مندرجہ بالا کو مدِنظر رکھ کر تو شاید بُرا نہیں۔ لیکن یہ فرماتے ہیں کہ کسی عالمِ دِین سے اجازت لازمی ہے تو کیا انشورنس پالیسی خریدنا جائز ہے؟

جواب:- بہ حالتِ موجودہ جتنی انشورنس کمپنیاں قائم ہیں وہ سب سود اور قمار کے اُصولوں پر مبنی ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ زندگی وغیرہ کا بیمہ کرانا شرعاً ناجائز ہے،[1] ہاں اگر کوئی کمپنی علماء کی ہدایات کے مطابق صرف اِمدادِ باہمی کے اُصول پر چلائی جائے اور اس کو سود اور قمار سے پاک رکھا جائے تو دُرست ہے، لیکن ابھی تک ایسی کوئی کمپنی قائم نہیں ہے، لہٰذا اس وقت کسی بھی کمپنی کی پالیسی لینا جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

”بیمۂ زندگی“ کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال:- بیمہ یا انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ کمپنی والے یہ کہتے ہیں کہ ہم سال بھر کے منافع بیمہ کرنے والے کے حصص کے اعتبار سے انہیں بطورِ منافع دیتے ہیں۔

جواب:- زندگی کے بیمے کی جتنی صورتیں اس وقت رائج ہیں، وہ سب ناجائز ہیں۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۸/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(۱و۲) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ”بیمہ زندگی“ ملاحظہ فرمائیں۔

تجارتی مال بردار جہاز کے ڈوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال۱:- قانون کے بموجب جب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر ہم کو انشورنس کرانا پڑتا ہے، ہم قانون کو پورا کرنے کے لئے سب سے آخری درجے کی انشورنس کراتے ہیں، اس انشورنس کے تحت یہ بات ہوتی ہے کہ اگر سارا کا سارا مال ختم اور ضائع ہوگیا تو انشورنس والے ذمہ دار ہیں، ورنہ نہیں، اس صورت میں (یعنی پورے کے پورے نقصان کی صورت میں) انشورنس واپسی مال کی پوری کی پوری رقم ادا کرتی ہے، بلکہ اصل سے بھی کچھ زیادہ۔ لہٰذا انشورنس والوں نے ہم کو پورے کے پورے مال کا پیسہ ادا کردیا ہے، اس رقم کو ہم کیا کریں؟ آیا یہ رقم لینا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال۲:- بھائی حمید صاحب جو اس کام میں آدھا شریک تھے، جب ان سے آدھے نقصان کا مطالبہ کیا گیا تو وہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اُن کا فرمانا یہ ہے کہ آپ کو انشورنس کمپنی سے پورے نقصان کی رقم مل گئی ہے۔ اگر حمید صاحب اپنے حصے کا آدھا نقصان ادا نہ کریں تو ہم ان کے حصے کی آدھی رقم انشورنس کے پیسے میں سے (جو ہم کو وصول ہوچکا ہے) لے سکتے ہیں؟

سوال۳:- حمید صاحب کا مطالبہ ہے کہ انشورنس والوں سے رقم اصل سے بھی زیادہ وصول ہوگئی ہے، لہٰذا آدھے حصے سے جو زیادہ ہے اُس میں سے حصہ دو، کیا یہ ادا کردیں؟

جواب۱:- انشورنس کے مروّجہ طریقے میں سود بھی ہے اور قمار بھی، لہٰذا انشورنس کمپنی سے صرف اُتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے اقساط کے طور پر اب تک جمع کی تھی، اس سے زائد لینا جائز نہیں تھا، اب جو رقم زائد ہے اُسے صدقہ کردینا ضروری ہے، اور اس کا صدقہ قریبی غیر صاحبِ نصاب رشتہ داروں کو بھی کیا جاسکتا ہے۔

جواب۲:- جواب نمبر۱ کے مطابق انشورنس سے لی ہوئی زائد رقم سے نقصان کی تلافی نہیں ہوئی، لہٰذا آپ کے شریک پر اپنے حصے کا نقصان برداشت کرنا واجب ہے، اگر وہ نہ دیں تو گنہگار ہوں گے، انشورنس کی زائد رقم پھر بھی آپ کے لئے جائز نہیں۔

جواب۳:- جب انشورنس کی اکثر رقم ہی ناجائز ٹھہری تو جو نقصان سے زائد رقم ہے وہ تو بطریقِ اَولیٰ ناجائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۲۸/۲۷ ج)

مشترک مالِ تجارت کا جہاز ڈُوبنے کی صورت میں انشورنس کمپنی یا شریک سے نقصان کی تلافی کرانے کا حکم

سوال:- ہم نے ایک مال چائنا سے منگوایا، اس مال میں ایک دوست الف سے ہماری شراکت تھی (لکھت نہیں زبانی، زبانی) کہ نفع نقصان آدھا آدھا۔ مال منگوانے میں پورا پورا پیسہ ہم نے لگایا کیونکہ ہمارا اور اُن کا اس طرح کی شراکت کا مال آتا رہتا تھا، کبھی ہم نے منگوایا اور کبھی انہوں نے منگوایا، کبھی پیسہ بعد میں ہم نے دے دیا اور کبھی پیسہ بعد میں اُنہوں نے دے دیا، ہمارے دس بارہ سال سے بھائیوں جیسے تعلقات ہیں، ایک دُوسرے کو ہر ایک پر پورا بھروسہ ہے۔ قانون کے بموجب ہم مال باہر سے منگواتے ہیں تو لازمی طور پر انشورنس کرانا پڑتا ہے، انشورنس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر سارا مال ختم یا ضائع ہوجائے تو انشورنس والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ورنہ نہیں۔ پورے نقصان کی صورت میں انشورنس والے مال کی پوری پوری رقم بلکہ اُس سے بھی کچھ زائد ادا کرتے ہیں۔ یہ مال جس جہاز پر آرہا تھا خداوند کریم کی مرضی سے پورا کا پورا ڈُوب گیا، انشورنس والوں نے ہم کو رقم ادا کردی، جو اصل لاگت سے زیادہ ہے، اب سوال یہ ہے کہ:-

۱- انشورنس والوں سے جو پیسہ ملا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اگر جائز نہیں تو کیا اصل لاگت سے جو زیادہ پیسے وصول ہوئے وہ بھی جائز ہیں یا نہیں؟

۳- اگر ساری کی ساری رقم یا زیادہ رقم ناجائز ہے تو ہم اس رقم کو کیا کریں؟ صدقہ کردیں؟

۴- اگر ساری رقم معہ زیادہ اگر ناجائز ہے تو کیا اپنی لاگت کی رقم جو پوری کی پوری ہم نے لگائی ہے اُس کا نصف اپنے دوست سے لے سکتے ہیں یا نہیں؟

۵- اگر ہم یہ رقم (یعنی اپنی لاگت کا آدھا حصہ) اگر اپنے دوست الف سے لے سکتے ہیں تو کیا ہم ایسا کرلیں؟ کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئی ہے اُس کا آدھا حصہ تو اپنے دوست (الف) کو روانہ کردیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے صدقہ کردیں اور باقی آدھا حصہ ہم اپنے پاس رکھ لیں اور اپنے ہاتھ سے صدقہ کردیں (آپ نے فرمایا کہ انشورنس کی رقم ناجائز ہے)۔ اور جو مال کی اصل لاگت تھی تو اُس کا آدھا حصہ اُن سے منگائیں۔

جواب ۱:- انشورنس کے مروّجہ طریقے میں شرعاً سود بھی ہے اور قمار بھی، لہٰذا انشورنس کمپنی سے صرف اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے جتنی رقم آپ نے کمپنی کے پاس اقساط کے طور پر جمع کی تھی، اس

سے زائد لینا جائز نہیں، اور جب یہ رقم ہی جائز نہیں تو جو رقم لاگت سے زیادہ ملی ہے وہ تو بطریقِ اَولیٰ ناجائز ہے۔

۲:- اصل حکم تو یہ ہے کہ انشورنس کی یہ زائد رقم وصول ہی نہ کی جائے، لیکن اگر غلطی سے وصول کرلی ہے تو اس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردینا واجب ہے۔

۳:- اگر دوست سے یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہوچکا تھا کہ جو مال آپ اب منگوا رہے ہیں وہ مشترک طور پر منگوایا جائے گا، رقم بھی دونوں لگائیں گے اور نفع ونقصان بھی دونوں پر آدھا آدھا ہوگا، تو آپ اپنے دوست سے لاگت کی آدھی رقم وصول کرسکتے ہیں، اور اُن پر اس کی ادائیگی واجب ہے۔

كما يفهم من ردّ المحتار في قوله: "دفع الى رجل ألفًا وقال اشتر بها بيني وبينك نصفين والربح لنا والوضيعة علينا، فهلك المال قبل الشراء ويضمن وبعده ضمن المشترى النصف بحر عن الذخيرة، قلت: ووجهه أنّهٗ لما أمرهٗ بالشراء نصفين صار مشتريا للنصف وكالةً عن الآمر وللنصف اصالة عن نفسه وقد اوفى الثمن من مال الآمر فيضمن حصة نفسه. (ردّ المحتار ج:۳ ص:۳۴۰)[1]۔

قلت:- والصورة المسئولة عكسه ولا فرق في العلّة۔

لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ معاہدہ زبانی یا تحریری ہوچکا ہو، اور اگر آپ کے دوست کو اس مال کے منگوانے کا علم نہیں تھا یا انہوں نے اس مال کے بارے میں آپ کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور آپ نے محض ماضی کے تعلقات کے اعتماد پر منگوایا تھا تو پھر پورے نقصان کے ذمہ دار آپ ہیں، دوست پر نقصان کی ذمہ داری نہیں۔

۴:- جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ رقم لی ہی نہ جائے، لیکن اگر غلطی سے لے لی تو اسے صدقہ کرنا واجب ہے، خواہ پوری رقم آپ صدقہ کریں، اور خواہ آدھی خود صدقہ کریں اور آدھی دوست صدقہ کرے۔

۵:- اس کا مفصل جواب نمبر۳ میں آچکا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲/۲۸ الف)

(۱) الدّر المختار مع رد المحتار، كتاب الشركة ج:۴ ص:۳۱۱ (طبع سعيد كراچی).

غیرملکی سفر کے لئے ’’بیمۂ زندگی‘‘ کی قانونی پابندی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت

سوال:- جن لوگوں کا سعودی عرب، متحدہ عرب اِمارات یا کویت میں کام کرنے کا ویزا لگ جاتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ جاتے ہیں تو حکومتِ پاکستان اُس کا بیمہ کراتی ہے، جو ایک لاکھ کا ہوتا ہے، یہ بینکوں میں ۶۵۰۰ روپے جمع کرتا ہے، اگر یہ ایک سال کے اندر وہاں مرجائے تو بیمہ والے اس کو ایک لاکھ روپے یا کم زیادہ دے دیتے ہیں۔ بعض ایسے جانے والے جو غریب ہوتے ہیں یا ایسے ہی نہیں دیتے تو ٹریول ایجنسی والے ایئرپورٹ میں بات کر کے اُس سے روپے لے لیتے ہیں اور اپنے لئے بھی اس میں روپے رکھ لیتے ہیں، کیا ایسی کمائی ٹریول ایجنسی کے لئے شریعت کی رُو سے حلال ہے یا حرام ہے؟

جواب:- بیمہ شرعاً جائز نہیں، اگر کسی کو سفر میں جانا ضروری ہو اور قانوناً سفر میں اس کے بغیر نہ جاسکتا ہو تو مجبوراً بیمہ کراسکتا ہے، مگر ہلاک ہونے کی صورت میں صرف اتنی رقم بیمہ کمپنی سے وصول کرسکتا ہے جتنی پریمیم میں جمع کرائی تھی، لہٰذا اگر کسی سرکاری افسر سے بات کر کے کسی کو بغیر بیمہ کے روانہ کیا جاتا ہے تو اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس کے لئے رِشوت نہ دینی پڑے، اس کی اُجرت لینے کی بھی گنجائش ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۱/۱/۲ھ

گروپ انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ کا شرعی حکم

سوال ۱:- تمام سرکاری دفاتر میں ایک اسکیم Provident Fund and Group Insurance Scheme (گروپ انشورنس) کے نام سے گورنمنٹ نے لازمی طور پر شروع کی ہے، جس کے تحت گورنمنٹ ہر ملازم کے لازمی طور پر (اس کی مرضی کے مطابق یا خلاف) ایک فیصد یعنی سو روپے میں سے ایک روپیہ ماہانہ کے حساب سے اصل تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، اس کے بعد اگر ایک ملازم دورانِ نوکری میں بھی مرجائے تو اگر اس مرنے والے ملازم کی اُصل تنخواہ ایک سو پچاس روپے ماہوار تک تھی تو اس کے نامزد کردہ وارث کو گورنمنٹ دو ہزار روپیہ دے گی، اس طریقے سے اگر تنخواہ پانچ سو تھی تو پانچ ہزار اور اگر سات سو تھی تو دس ہزار دے گی۔ اگر ملازم نوکری کے دوران نہیں مرا بلکہ ریٹائر ہونے سے پہلے مرا یعنی ساٹھ سال تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے مندرجہ ذیل شرح سے اس کے (مرنے والے ملازم کے) نامزد کردہ وارث کو ماہوار رقم ملے گی، اگر اس مرنے والے کی اصل تنخواہ ماہوار ایک سو تھی تو اس کے نامزد وارث کو گورنمنٹ ۵۰ روپیہ ماہوار ادا کرے گی، اگر دو سو ہو تو پچھتّر،

تین سو ہو تو ایک سو، چار سو ہو تو ایک سو پچھتّر۔ بصورتِ دیگر یعنی اگر وہ ملازم نہ نوکری کے دوران مرا ہے اور نہ ہی ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرتا ہے اس کو گورنمنٹ کچھ نہیں دیتی اور نہ ہی اس کی ماہوار ایک فیصد کے حساب سے لازمی طور پر کاٹی ہوئی رقم جو اس کی پوری نوکری کے دوران ہر ماہ کٹتی رہی (لازمی طور پر) واپس کی جاتی ہے، یعنی اس کی اپنی کاٹی ہوئی رقم بھی واپس نہیں کی جاتی، کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

سوال۲:- گورنمنٹ ہر ملازم سے جی پی فنڈ کے نام سے کم از کم ۱۰ روپے ماہوار یا مزید جس قدر ملازم کٹوانا چاہے لازمی طور پر کاٹتی ہے، اور نوکری کے ختم پر اس ملازم کو تمام نوکری کے دوران کاٹی ہوئی رقم بمع سوا چھ فیصد سالانہ کے حساب سے سود دیتی ہے۔ اب یہ سود ہوگا یا نفع یا انعام؟ اور جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب۱:- گروپ انشورنس کی جو صورت آپ نے تحریر کی ہے، نیز اس کے جو قواعد وضوابط معلوم ہوسکے ہیں ان کی رُو سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:-

۱:- ہر ملازم کی تنخواہ سے کچھ رقم جبری طور پر کاٹی جاتی ہے۔

۲:- اس طرح ملازموں کی تنخواہوں سے کٹوتی کرکے حکومت نے ایک فنڈ قائم کیا ہے جس کی رقوم نفع بخش کاموں میں صَرف کی جائیں گی۔

۳:- ملازم کی وفات کے بعد ہر ملازم کے مقرّر کردہ وصی کو ایک معین رقم دی جائے گی جو کٹوتی کی مقدار سے زیادہ ہوگی۔ اس معاملے پر غور کرنے سے اس کی صورت شرعاً جبری پراویڈنٹ فنڈ سے مختلف معلوم نہیں ہوتی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کے بارے میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اس پر جو زیادہ رقم حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے وہ سود نہیں ہے، اس کا لینا ملازم کے لئے جائز ہے، اسی طرح گروپ انشورنس کے لئے جو جبری کٹوتی کی جائے گی وہ دَینِ ضعیف ہونے کے سبب ملازم کی مملوکِ تام نہیں ہے، لہٰذا حکومت یا محکمے نے جو تصرف کرکے اس کو بڑھایا تو یہ تصرف ملازم کی ملکیت میں نہیں ہوا، اور نہ ملازم کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ ہوا، اب اگر حکومت ان حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ اپنے ملازم کو دیتی ہے تو وہ شرعاً ایک اِنعام اور تبرّع ہے، سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے، اور ملازم کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ البتہ چونکہ یہ حاصل شدہ منافع بعض ایسے معاملات کے ذریعے بھی ہوتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ تنخواہ میں سے جتنی رقم کاٹی گئی ہے وہ تو ملازم خود رکھ لے، اور باقی رقم غریبوں کو صدقہ کردے، اور یہ ایسا صدقہ ہے کہ اپنے غریب رشتہ داروں اور بیوی بچوں پر بھی صَرف کیا جاسکتا ہے، یہ جواب شرعی قواعد کی رُو سے لکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ کتبِ

فقہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، اس لئے بہتر ہے کہ اس معاملے میں دُوسرے علماء سے بھی اِستصواب کرلیا جائے۔

جواب۲:- پراویڈنٹ فنڈ کا حکم سوال نمبر۱ کے جواب میں آگیا ہے کہ اس پر جو زیادتی حکومت دیتی ہے وہ سود نہیں ہے، اسے لینا جائز ہے، اور کوئی شخص احتیاط کرے تو بہتر ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

''گروپ انشورنس'' کا حکم

سوال:- سرکاری ملازمین کی جو ''گروپ انشورنس'' (اجتماعی بیمہ) ہوتی ہے اس کے لئے رقم کا ادا کرنا اور اس پر بصورتِ حادثہ رقم کا حاصل کرنا کیسا ہے؟ مثلاً زید نے ساڑھے سترہ سو روپے مالی سال کے شروع میں ادا کئے، اگر اس کو اس سال میں حادثہ پیش آگیا تو اس کے وارثین کو سات ہزار روپیہ مل جائے گا، اگر حادثہ پیش نہ آیا تو مالی سال کے اختتام پر یہ ساڑھے سترہ سو روپے کی رقم ختم ہوجاتی ہے اور اگلے سال سے نیا معاہدہ کرنا ہوگا۔

جواب:- ''گروپ انشورنس'' کے قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس اسکیم میں ہر ملازم کی تنخواہ سے جبری طور پر کٹوتی وصول کی جاتی ہے، اگرچہ محکمہ والوں کے لئے ایسا کرنا دُرست نہیں، لیکن جن ملازمین کی تنخواہ سے جبراً یہ رقم وصول کی گئی اگر انہیں یہ رقم واپس نہ ملی تو یہ محکمہ والوں کی طرف سے شرعاً ''غصب'' ہوگا، اور اگر کسی حادثے کی صورت میں کوئی بڑی رقم اصل رقم سے زائد دی گئی تو یہ پراویڈنٹ فنڈ کی زیادتی کی طرح سود شمار نہ ہوگی[1]، کیونکہ دَینِ ضعیف پر زیادتی ہے، مرحوم کے وارثان کے لئے اسے وصول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جو رقم اصل کٹوتی سے زائد وصول ہوئی ہے اسے صرف غریبوں پر خرچ کیا جائے خواہ رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۷/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۸۵۴/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا رسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

گروپ انشورنس کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم

سوال:- گروپ انشورنس کے بارے میں آپ کا فتویٰ مؤرخہ ۱۳۹۱/۵/۲۱ھ قاری سعید الرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ راولپنڈی کی مہربانی سے مجھے بھی دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ سوال پوچھنے والے نے اس بارے میں صحیح حالات آپ کو نہیں بتائے، چونکہ مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اسکیم کے متعلق کچھ مزید حالات آپ کی خدمت میں پیش کروں، ممکن ہے کہ اس کے بعد اس اسکیم کے جواز کے متعلق آپ اپنی قیمتی رائے یا فتویٰ دینا چاہیں۔

حکومت نے ایک انشورنس کمپنی کا بندوبست کیا ہے کہ فوجیوں کی زندگی کا ایک خاص طریقے سے بیمہ کیا جائے، اس کو ''گروپ انشورنس'' کہا جاتا ہے، اس کے مطابق فوجیوں سے ان کے عہدے کے مطابق ایک مقرّرہ رقم سال میں ایک دفعہ وصول کر کے بیمہ کمپنی کو دے دی جاتی ہے، اس سال کے دوران اگر ان فوجیوں میں کوئی آدمی فوت ہوجائے تو بیمہ کمپنی مرحوم کے وصی کو ایک مقرّر شدہ رقم ادا کرتی ہے۔ جو اصل وصول شدہ رقم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر فوجی جو اس سال کے دوران زندہ رہتے ہیں ان کو اور ان کے وصی کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اگر بیمہ کمپنی کو اس کاروبار میں کافی نفع ہو تو بعض حالات میں بیمہ کمپنی اس نفع میں سے کچھ رقم حکومت کے فنڈ میں بھی دے دیتی ہے، لیکن جن فوجیوں سے رقم وصول کی گئی تھی ان کو بالواسطہ کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس اسکیم کے چند اہم نکات یہ ہیں:-

۱- اس اسکیم کے ماتحت ملازم کی تنخواہ میں سے رقم کاٹی نہیں جاتی بلکہ وقتِ مقرّرہ پر طلب کی جاتی ہے، اور فوجی تنخواہ وصول کر لینے کے بعد اس میں سے یا اپنی جیب سے مقرّرہ رقم حکومت کے ایک نمائندے کو ادا کر دیتا ہے۔ اسی طرح مختلف افراد سے جمع کی ہوئی رقم انشورنس کمپنی کو پہنچادی جاتی ہے۔

۲- اس کو جبری کٹوتی کہنا ٹھیک نہیں، بعض فوجی یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عقیدے کی بناء پر اس اسکیم میں شامل نہیں ہونا چاہتے، تو ان کو ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ میں خود اس اسکیم میں شامل نہیں ہوں، اور نہ مجھ سے کوئی کٹوتی ہوتی ہے، اور نہ میں کسی اور طریقے سے رقم ادا کرتا ہوں۔

۳- فوجیوں سے جمع کی ہوئی رقم حکومت کے پاس نہیں رہتی اور نہ ہی حکومت اس کے صَرف سے کچھ تعلق رکھتی ہے، بلکہ حکومت کے نمائندے رقم جمع کر کے انشورنس کمپنی کو دے دیتے ہیں، اور وہ کمپنی ہی اس کا صَرف کرتی ہے۔

۴- بظاہر یہ صورت پراویڈنٹ فنڈ سے بہت مختلف ہے، بلکہ چند قسم کے بیموں کی طرح ہے۔ مثلاً ہوائی سفر کا بیمہ۔ بعض مسافر بیمہ کمپنی سے بندوبست کرتے ہیں اور کچھ رقم ادا کر کے یہ فیصلہ ہوتا

ہے کہ اگر مسافر ہوائی حادثے میں فوت ہوجائے تو کمپنی اس کے وصی کو ایک مقرّرہ رقم ادا کرے گی جو اصل رقم سے کئی گنا زیادہ ہوگی، اور اگر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ حادثہ کوئی نہ ہو تو مسافر کو یا اس کے وصی کو کوئی رقم نہیں ملتی، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- گروپ انشورنس کے بارے میں چونکہ سوالات مختلف اَطراف سے آرہے تھے اس لئے ہم نے اس کے وہ مطبوعہ قواعد منگا کر دیکھے جو حکومت کی طرف سے طے کئے گئے تھے، ان سے ہمیں مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے:-

ا:- یہ کٹوتی جبری ہے، اگر کوئی شخص اپنا وصی نامزد نہ کرے تب بھی رقم کٹے گی اور اس کی موت کے بعد کسی مناسب رشتہ دار کو دی جائے گی۔

۲:- یہ رقم تنخواہ میں سے تنخواہ کی ادائیگی سے قبل کاٹی جائے گی، تنخواہ دینے کے بعد ملازم ازخود نہیں دے گا۔

۳:- کاٹی ہوئی رقمیں کسی بیمہ کمپنی کو دینے کے بجائے ان سے ایک فنڈ قائم کیا جائے گا، جس سے تجارت کی جائے گی، اور اس سے حاصل ہونے والا منافع متوفی ملازمین کے رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔

گروپ انشورنس کے بارے میں ہمارا پہلا جواب انہی تین بنیادوں پر مبنی تھا، لیکن آپ نے جو صورت لکھی ہے اس میں یہ تینوں باتیں مفقود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سوِل ملازمین اور فوجی ملازمین کے قواعد میں حکومت نے کوئی فرق رکھا ہو۔ بہرحال جو صورت آپ نے لکھی ہے اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو اس اسکیم میں حصہ دار بننا بلاشک وشبہ ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص غلطی سے حصہ دار بن گیا ہو تو وہ یا اس کا وصی صرف اپنی اصل رقم وصول کرسکے گا، جو زیادتی دی جائے گی، اس کا لینا ناجائز ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اور بیمہ زندگی میں شرعی اَحکام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور اس میں سود وقمار پایا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس اسکیم کے فوائد کو جائز طور پر کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ سو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام ملازمین اپنی مرضی سے بلاجبر و اِکراہ ایک رضاکارانہ اِمدادِ باہمی فنڈ قائم کریں، اور اس میں اپنی خوشی سے تنخواہ کا کوئی حصہ ہر ماہ دیا کریں، جو شخص اس میں شریک نہ ہونا چاہے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ پھر فنڈ کی جمع شدہ رقم کو کسی جائز تجارت میں لگائیں، اس طرح فنڈ کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اس کے بعد اس فنڈ سے مرنے والے ملازمین کے پسماندگان کی اِمداد کی جائے۔ اس میں یہ شرط

رکھی جاسکتی ہے کہ یہ امداد صرف اُن لوگوں کے ورثاء کو دی جائے گی جو فنڈ کے ممبر ہوں گے۔[1] اگر مسلمان ملازمین کوشش کر کے اسکیم کو بدلوا کر شریعت کے مطابق بنائیں تو اَجرِ عظیم ہوگا۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ اسکیم بناتے وقت مستند مفتیوں سے رُوبرو مشورہ کرلیا جائے تاکہ پھر کوئی شرعی قباحت پیدا نہ ہو۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۱/۸/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۷۳/۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

انشورنس کی رقم وصول کرنے کا مشورہ دینا اور اسے استعمال کرنے کا حکم

سوال:- آپ کا جواب ملا، عرض یہ تھی کہ فریقِ ثانی (یعنی جس سے ہماری شراکت تھی) کچھ اس قسم کے آدمی ہیں کہ انشورنس کے کام کو غلط نہیں سمجھتے، لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ اگر ان سے فتویٰ کی بات کی جائے تو شاید وہ مذاق اُڑائیں، لہٰذا ہم ایسا کرلیں کہ جو رقم انشورنس والوں کے پاس سے آئے اس کا آدھا حصہ تو ان کو روانہ کردیں اور بقیہ آدھا حصہ صدقہ کردیں؟

۲:- جو مال کی اصل لاگت تھی اس کا آدھا حصہ اُن سے منگالیں؟

جواب:- انشورنس کی رقم لینے کا کسی بھی مسلمان کو مشورہ نہیں دیا جاسکتا، آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ انشورنس کی آدھی رقم ان کو بھیج کر انہیں اپنی طرف سے اس بات پر مامور کریں کہ وہ یہ رقم صدقہ کردیں، کیونکہ اس کا رکھنا جائز نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی آپ کو اُن سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا بھی جائز ہے، اب وہ آپ کی رقم آپ کو جہاں سے چاہیں دیں، اپنے فعل کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے اور انہیں انشورنس کا مسئلہ ضرور بتلا دینا چاہئے، وہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۴۷/۲۷ و)

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' ص:۱۶۰ تا ۱۶۳ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز تجارتی بیمہ کا متبادل ''تکافل'' کے نام سے بھی منظر پر آچکا ہے جس کی قدرے تفصیل کے لئے ص:۳۱۴ تا ۳۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۱:- مختلف معموں کے ذریعے حاصل کئے گئے اِنعام کا حکم
۲:- لائف انشورنس کی مختلف مروّجہ صورتوں کا حکم

سوال:- کیا معموں کے ذریعے اِنعام حاصل کیا ہوا روپیہ حرام ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟
جواب:- معمے کے حل بھیجنے کے لئے اگر کوئی فیس مقرّر کی گئی ہو تو وہ قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔(۱)

سوال:- اپنے آپ کو انشورڈ کرانا جائز ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟
جواب:- زندگی کے انشورنس کی جو صورتیں رائج ہیں وہ بھی اسی مذکورہ بالا وجہ سے ناجائز ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۹ الف)

انشورنس کی مروّجہ صورتوں اور مسجد کا انشورنس کرانے کا حکم

سوال:- حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام عرضِ خدمت ہے

ایک سوال عرضِ خدمت ہے، لیکن اس سے پہلے یہاں کے حالات عرض کرنا چاہتا ہوں۔
یہاں نیوزی لینڈ میں تقریباً بیس ہزار مسلمان آباد ہیں جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے ہیں اور زیادہ تر مسلمان پچھلے دس سالوں میں آئے ہیں جو اکثر دُکان اور فیکٹری وغیرہ میں کام کرتے ہیں، اور کچھ رفیوجی آئے ہوئے ہیں جو صومالیہ اور عرب ممالک کے ہیں جو مالی اعتبار سے غرباء ہیں۔ یہاں پورے ملک میں پانچ مساجد اور آٹھ عبادت گاہ ہیں، جو ملک کے مختلف شہروں میں پائی جاتی ہیں، اور فی الحال آکلینڈ شہر میں دو مسجد اور ایک مسلم اسکول کا کام چل رہا ہے، اور زیادہ تر چندہ مقامی مسلمانوں نے جمع کیا ہے، یہاں کی کرنسی ڈالر ہے، ایک ڈالر کے پاکستانی بائیس روپے ملتے ہیں، اور یہاں کی حکومت کے قوانین برطانیہ کے قوانین جیسے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہاں دو ایک مسجد والوں نے مسجد کا انشورنس کروایا ہے، اور ایک مسجد جو آٹھ ماہ پہلے بن کر تیار ہوئی ہے اس میں کسی نے جمعرات ۶/اگست ۱۹۹۸ء کو صبح چار بجے آگ لگادی اور آگ لگانے سے پہلے قیمتی سامان کی چوری کی، ابھی تک کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا ہے، اب ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا مسجد کا انشورنس لے سکتے ہیں یا

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

نہیں؟ اگر انشورنس دُرست نہ ہو تو ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟ برائے کرم جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

فقط والسلام محتاجِ دُعا

بندہ خلیل احمد آکلینڈ، نیوزی لینڈ

بروز پیر ۱۰ اگست ۱۹۹۸ء

جواب:- مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، انشورنس کی مروّجہ تمام صورتیں سود یا قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں، لہٰذا مسجدوں کا انشورنس نہیں کرانا چاہئے تھا، لیکن اب جبکہ کرالیا تو حادثے کی صورت میں کمپنی سے رقم وصول کرلیں، پھر جتنی رقم اب تک مسجد کی طرف سے پریمیم کے طور پر ادا کی گئی ہے، اتنی رقم تو مسجد ہی کی مرمت وغیرہ میں براہِ راست استعمال کرسکتے ہیں، باقی رقم کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردی جائے، پھر اگر وہ شخص اپنی خوشی سے وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مسجد کو بطورِ چندہ دیدے تو اس کو بھی مسجد میں استعمال کرسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۹/۴/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۴/۸۷)

تقسیمِ اِنعامات کے لئے قرعہ اندازی کرنے کا حکم

سوال:- عالمگیر ویلفیئر ٹرسٹ نے کھالیں جمع کرنے والے بچوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لئے اِنعامات تقسیم کئے، ہمارے پاس کچھ اِنعام اضافی ہوگئے تھے، ہم نے یہ اعلان کیا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے یہ اِنعام انہی بچوں میں تقسیم کردیئے جائیں گے، لیکن ایک صاحب نے توجہ دِلائی کہ یہ عمل ناجائز ہے اور جوئے کے زُمرے میں آتا ہے، ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- اگر بچوں سے اِنعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے،[1] اور قرعہ اندازی تقسیمِ اِنعامات کے لئے جائز ہے۔[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

۱۴۱۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۲)

(۱ و ۲) وفی ردّ المحتار کتاب الحظر والاباحة ج:٦ ص:۴۰۳ لأنّ القمار من القمر الّذی یزداد تارة وینقص أُخریٰ وسمّی القمار قمارًا لأنّ کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذهب ماله الیٰ صاحبه ویجوز ان یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنّصّ .... الخ.

وفی المبسوط للامام السرخسیّ ج:۱۵ ص:۷ استعمال القرعة فی مثل هٰذا الموضع جائز عند العلماء أجمع رحمهم الله بهٰذا الحدیث قلنا اذا تزوج أربع نسوة فله أن یقرع بینهنّ لابدائه بالقسم لأن له أن یبدأ بهن بمن شاء منهن فیقرع بینهن تطیبًا لقلوبهن اهـ. هٰکذا فی فتح القدیر ج:۴ ص:۳۸۵ معارف القرآن ج:۷ ص:۴۷۸.

نیز تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا فیصلہ: لاٹری حرام ہے "البلاغ" ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی أحکام البنوک﴾
(مختلف بینکوں کے اَحکام)

حبیب بینک اور دُوسرے بینکوں کے نفع، نقصان کے کھاتہ میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- حبیب بینک نے P.L.S کھاتہ میں سود سے پاک نفع ونقصان کی بنیاد پر شراکت شروع کی تھی، اس میں میرے والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، آپ کی معلومات کے مطابق کیا بینک کی یہ شراکت شرعی اُصولوں کے موافق ہے؟

جواب:- حبیب بینک یا دُوسرے پاکستانی بینکوں کے ''نفع و نقصان کے کھاتے'' میں سرمایہ کاری اس لئے دُرست نہیں کہ یہ سارے بینک آگے اس روپے کو جو استعمال کرتے ہیں وہ سودی کاموں میں استعمال کرتے ہیں، اگرچہ نام بدلا ہوا ہے، لہٰذا اس کھاتے میں رقم رکھوانا اور اس کے نفع کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے،[1] جواب تک نفع ہوا ہے، اسے بغیر نیتِ ثواب کے صدقہ کردیا جائے۔

والسلام
۱۴۱۹/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۲/۷)

''فیصل اسلامک بینک'' کا طریقۂ کار اور اس کی مختلف شاخوں کا حکم

سوال۱:- عرض یہ ہے کہ حضرتِ والا سے معلوم ہوا کہ ''فیصل اسلامک بینک آف بحرین'' کا P.L.S اکاؤنٹ جواز کے درجے میں ہے، جبکہ عام بنکوں کے P.L.S اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ فیصل اسلامک بینک کے اکاؤنٹ P.L.S میں رقم رکھ کر منافع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی المشکوٰۃ ج:۱ ص:۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال ھُم سواء. (رواہ مسلم). نیز دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

۲:- ہمارے دفتر میں ملازمین نے ایک نجی ادارہ رضا کارانہ طور پر قائم کیا ہے، جس کا نام KEBF ہے، یہ ادارہ شرعی وقف ہے، اس کا مقصد ملازمین میں سے (جو کہ ادارے کے ممبر ہوں) کسی کے انتقال پر ان کے لواحقین کو فوری مالی امداد پہنچانا ہے، جب کوئی انتقال کرتا ہے تو اس کی مالی حالت کا لحاظ کئے بغیر اس کے لواحقین کو ایک مقرّرہ رقم پہنچادی جاتی ہے، اس فنڈ کی کثیر رقم این آئی ٹی میں رکھی تھی، مگر اب چونکہ این آئی ٹی جائز نہ ہونے کا فتویٰ شائع ہوچکا ہے اس لئے وہاں سے رقم نکالی جارہی ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال میں ہم جو این آئی ٹی کا منافع لے چکے ہیں، اس کا تیس فیصد تقریباً ۱۵ ہزار روپے بنتا ہے، جبکہ فنڈ کے پاس کل جمع شدہ رقم دو لاکھ ہے، مندرجہ بالا تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے (فنڈ کا وقف ہونا فنڈ کا استعمال ناجائز منافع ۱۵ ہزار جبکہ کل رقم دو لاکھ ہے) کیا ہم پر لازم ہے کہ پچھلے دو سال کے منافع کا ۳۰ فیصد صدقہ کردیں، یا اس خاص صورت میں (جبکہ منافع لیتے وقت اس کے ناجائز ہونے کا علم بھی نہ تھا) یہ رقم فنڈ میں ہی رہنے دی جاسکتی ہے؟

جواب ۱:- فیصل اسلامک بینک کی جو شاخ کراچی میں قائم ہوئی ہے، اُس کے طریقِ کار اور معاملات کی جس قدر تحقیق احقر کرسکا ہے اس کی رُو سے اس کے معاملات جوازِ شرعی کی حدود میں ہیں، لیکن دو وضاحتیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حکم صرف کراچی شاخ کا ہے، بحرین اور سعودی عرب میں یہ بینک جس طریقِ کار کے تحت کام کر رہا ہے اس میں بعض اُمور خلافِ شرع بھی ہیں، جن کی اصلاح کی کوشش کی جارہی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ یہ حکم بینک کے موجودہ طریقِ کار کا ہے، اگر بینک اپنے اس طریقِ کار میں کوئی تبدیلی کرلے تو اس تبدیلی کے مطابق حکم ہوگا،[1] لہٰذا وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرتے رہنا چاہئے۔

۲:- این آئی ٹی کے منافع میں سے جو ۳۰ فیصد منافع ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا اس کا اصل حکم تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں یا اداروں کو لوٹایا جائے جہاں سے حاصل ہوا تھا، لیکن اگر ان کا معلوم ہونا مشکل ہو جیسا کہ ظاہر یہی ہے، تو پھر یہ رقم صدقہ کرنی ضروری ہے، اس کو فنڈ کا حصہ بنانا تو دُرست نہیں ہوگا، البتہ اس رقم کو علیحدہ کرکے اُسے صرف ایسے افراد پر صَرف کیا جاسکتا ہے جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں، خواہ وہ اس ادارے کے ملازمین یا فنڈ کے ممبران ہی کیوں نہ ہوں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۸/۱۰/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۱۳۷/۳۹ ز)

(۱) چنانچہ بعد میں اس بینک کے حالات تبدیل ہوگئے، اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہ رہا۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

اِمارتِ اسلامی کے قیام کے بعد افغانستان کے اسلامی بینکوں کے لئے لوگوں سے پچھلے قرضوں پر سود وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال:- ماذا رأی علماء الأمّة فی المسئلة التالية؟ وهی أن البنوک الاسلامية الأفغانية بعد قيام الامارة الاسلامية فی أفغانستان واجهت مشكلة كبيرة، وهی أن البنوک الأفغانية قبل الامارة الاسلامية فی النظام الربوی لها ديون علی الآخرين وكذا عليها ديون للآخرين، ولكن قروض البنوک الأفغانية علی الآخرين كثيرة ووفيرة جدًّا يمكن بها تجهيز المملكة بأسرها التی سقط اقتصادها كل السقوط، فهل يمكن حصول تلک القروض الربوية لاستحكام الامارة الاسلامية فی ضوء القرآن والسُّنّة أم لا؟ وهل يجوز إعطاء تلک الديون الربوية علی البنوک للدّائنين أم لا؟

جواب:- لا يجوز للبنوک الأفغانية أخذ الفوائد علیٰ قروضها، ولها الحق فی استرداد أصل القرض، وكذٰلک يجوز لها أن تصالح مديونيها علیٰ أساس المضاربة الشرعيّة فتشاركهم فی أرباحهم الّتی حصلوا عليها من استخدام مبالغ هٰذه القروض، وذٰلک اقتداء بفعل سيّدنا عمر بن الخطّاب رضی الله عنه، حيث جعل قرض ابنه الذی اقترضه من بيت المال قراضًا، كما رواه مالک فی المؤطا،[1] أمّا قروضها الّتی اقترضتها من غيرها، فلا يجوز دفع الفائدة عليها، الّا اذا اضطُرّت اليه لسبب من الأسباب.

والله سبحانه وتعالیٰ أعلم وعلمه أتم وأحكم

محمد تقی العثمانی عفا الله عنه

۲۸/شعبان ۱۴۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۹۴)

(۱) وفی المؤطّا للامام مالک رحمه الله كتابُ القِراض ص:۶۹۱ (طبع نشر جمعية احياء التراث الأسدی) وفی طبع مكتبه قديمی كتب خانه ص:۶۱۶ و۶۱۷.

عن زيد بن أسلم عن أبيه أنّه قال: خرج عبدالله وعبيدالله ابنا عمر بن الخطّاب فی جيشٍ الی العراق، فلمّا قفلا مرّا علیٰ أبی موسی الأشعری وهو أمير البصرة فرحّب بهما وسهّل ثم قال: لو أقدر لكما علیٰ أمر أنفعُكما به لفعلتُ، ثم قال: بلیٰ هٰهُنا مالٌ من مال الله اُريد أن أبعث به الیٰ أمير المؤمنين فأسلفكماهُ فتبتاعان به متاعًا من متاع العراق ثم تبيعانه بالمدينة فتؤدّيان رأس المال الیٰ أمير المؤمنين فيكون لكما الرّبح، فقالا: وَدِدْنا ففعل وكتب الیٰ عمر بن الخطّاب أن يأخذ منهما المال، فلمّا قدما باعا فاربحا فلمّا دفعا ذٰلک الیٰ عمر بن الخطّاب قال: أكلّ الجيش أسلفه مثل ما أسلفكما قالا: لا، فقال عمر بن الخطّاب: ابنا أمير المؤمنين فأسلفكما أدّيا المال وربحه فأمّا عبدالله فسكت وأمّا عبيدالله فقال: ما ينبغی لک يا أمير المؤمنين هٰذا لو نقص المال أو هلک لضمنّاه. فقال: أدّياه فسكت عبدالله وراجعه عبيدالله، فقال رَجُلٌ من جلساء عمر: يا أمير المؤمنين! لو جعلته قِراضًا، فقال عمر: جعلته قِراضًا، فأخذ عمر رأس المال ونصف ربحه وأخذ عبدالله وعبيدالله نصف رِبُح المال.

"البنک الأهلی التّجاری" میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- سعودی عرب کے ایک بینک "البنک الأهلی التّجاری" میں والد صاحب نے اکاؤنٹ کھولا ہے، جس میں شیئرز کا کاروبار ڈالروں کی شکل میں ہے، اس کی پراسپکٹس ہمراہ ہے، جس میں اُصول وقواعد درج ہیں، والد صاحب نے بھی اس کے شیئرز خریدے ہیں، کیا اس بینک کا شیئرز کا کاروبار جائز ہے؟

جواب:- "البنک الأهلی التّجاری" کے فنڈ کے پراسپکٹس میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ مرابحہ پر مبنی ہے، اور شرعی اعتبار سے اُصولاً جائز اور دُرست ہے، لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ بہت سے بینک اس معاملے کی شرعاً (ساری) شرائط پوری نہیں کرتے، اور بعض اس کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے معاملات کی براہِ راست چیکنگ کرنی پڑتی ہے، چونکہ ان کا دعویٰ شرعی اُصولوں کے مطابق بیع وشراء کا ہے، اس لئے ایک عام آدمی کے لئے اس میں سرمایہ کاری کی گنجائش تو ہے کیونکہ پراسپکٹس میں صحیح اُصولوں کا اعلان کرنے کے بعد اگر ادارے کے منتظمین کوئی غلطی کریں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک کوئی عالم ان کے بیع وشراء کے ایگریمنٹس کا تنقیدی جائزہ لے کر انہیں دُرست قرار نہ دے، اس وقت تک احتراز کیا جائے۔ والسلام

۱۴۱۹/۱۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۳۵۲/۷)

سعودی عرب کے دو مالیاتی اداروں "دار المال الإسلامی" اور "الشرکة الإسلامیة للإستثمار الخلیجی" کا حکم

سوال:- آپ کا مضمون غیرسودی کاؤنٹر، ماہنامہ "بینات" کے جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ کے شمارے میں پڑھا، میں آپ کو "دار المال الاسلامی" اور "الشرکة الاسلامیة للاستثمار الخلیجی" کے داعیانہ کاغذات بھیج رہا ہوں، ان دونوں کے حلال یا مشکوک ہونے کے بارے میں آپ اپنی مخلص رائے ارسال فرمائیں، میں آپ کے جواب کا شدید منتظر ہوں۔

جواب:- احقر نے آپ کے بھیجے ہوئے کتابچوں[1] کا مطالعہ کیا، ان میں دو باتیں واضح نہیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ کس پر کس تناسب سے پڑے گا؟ دُوسرے یہ کہ مضارب

(۱) یہ کتابچے ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں۔

کمپنی اس رقم کو کس قسم کے کاروبار میں لگائے گی اور اس کو سود سے پاک رکھنے کا کیا انتظام کرے گی؟ جب تک ان دو بنیادی سوالات کا جواب معلوم نہ ہو، اس مسئلے کا جواب ممکن نہیں، لہٰذا آپ معلومات کر کے ان سوالوں کا جواب ارسال فرمائیں، اس کے بعد اس مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم
۱۴۰۱/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۹۱ ج)

''دبئ اسلامی بینک'' اور ''فیصل اسلامک بینک'' میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم۔ میں یہ خط ابوظہبی میں مقیم مولانا خلیل احمد صاحب کی وساطت سے لکھ رہا ہوں، مجھے چند ایسے مسائل کا سامنا ہے جن کا تعلق موجودہ دور کی Economics سے ہے، بدقسمتی سے مجھے یہاں کوئی ایسا عالمِ دِین نہیں مل سکا جسے Modern Economics Affairs پر دسترس ہو۔ مولانا خلیل صاحب میرے دوست ہیں اور جب ان سے ان چیزوں کے بارے میں بات کی تو انہوں نے مجھے آپ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ میں یہاں پر پچھلے پندرہ سال سے حکومت کے ایک ادارے میں کام کرتا ہوں، میرا ذریعہ آمدنی صرف اور صرف میری تنخواہ ہے، اس کے علاوہ نہ اِمارات میں اور نہ ہی پاکستان میں کوئی اور ذریعہ آمدنی ہے، یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ میرے مسائل کا حل میرے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دے سکیں۔

U.A.E میں ایک بینک ہے جو کہ ''دبئ اسلامی بینک'' کے نام سے مشہور ہے، مولانا خلیل صاحب کے مطابق U.A.E کی شرعی عدالت کی نظر میں اس بینک میں سرمایہ رکھنا یا تجارت میں لگانا جائز ہے۔ حال ہی میں پاکستان سے ایک ممتاز عالمِ دِین تشریف لائے، میری اُن سے اس معاملے پر بات ہوئی تو انہوں نے دوٹوک فیصلہ سنادیا کہ دبئ اسلامی بینک یا فیصل اسلامی بینک یا پاکستان میں قائم شدہ اسلامی بینک (جس کا میں نام بھول گیا) سب غلط ہیں اور اِن کا منافع مکمل طور پر سود ہے۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اگر آپ ان بینکوں کی کارکردگی سے واقف ہیں تو مجھے ان کی اصلیت سے ضرور آگاہ کریں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی عدالتِ شرعیہ نے اس بینک میں سرمایہ کاری کو جائز قرار دیا ہے، تو کیا اِن کے فیصلے کا احترام کافی ہے اور غلط ہونے کی صورت میں بھی کیا میں بری الذمہ ہوں یا

مجھے اس سلسلے میں دُوسرے علماء سے بھی پوچھنا ضروری ہے؟ اگر دو عالم دِین یا مفتی ایک ہی مسئلے پر مختلف رائے دیں تو کس کی بات زیادہ معتبر سمجھی جائے؟

میں نے کچھ پیسے دبئی اسلامک بینک میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس بینک میں Invest کئے ہوئے ہیں، کیا اس کا منافع میرے لئے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- محترمی ومکرمی جناب ڈاکٹر ظہور احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں:-

احقر کو ''دبئی اسلامک بینک'' کے مفصل طریقِ کار کا علم نہیں ہے، اس لئے احقر اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا، اس بینک میں ایک شرعی مشاورتی بورڈ ہے، آپ اس بورڈ کے رُکن علماء سے رُجوع کریں، بشرطیکہ وہ علماء آپ کے خیال میں قابلِ اعتماد ہوں، پھر اگر وہ اس بینک کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے کو جائز قرار دیں تو آپ کے لئے بظاہر گنجائش ہوگی، اور جو شخص بینک کے تفصیلی طریقۂ کار سے باخبر نہ ہو، اس کے جائز کہنے یا ناجائز کہنے پر مدار نہ رکھنا چاہئے۔

جہاں تک ''فیصل اسلامک بینک'' کا تعلق ہے، میں اس کے شریعہ بورڈ کا رکن ہوں، اس کے معاملات ملے جلے قسم کے ہیں، اور کیونکہ ابھی تک اس کو غیرشرعی معاملات سے بالکلیہ پاک نہیں کیا جاسکا، اس لئے میں دوستوں کو اس کے نفع بخش کھاتوں میں رقم رکھوانے اور نفع وصول کرنے کا مشورہ نہیں دیتا۔

رہا یہ سوال کہ ایک مسئلے پر دو مفتی مختلف رائے دیں تو کس کی رائے معتبر سمجھی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مفتی کے علم اور تقویٰ پر آپ کو زیادہ اعتماد ہو، اس پر عمل کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

ٹیکس اتھارٹیز کا تعامل اسلامی بینک کی تمویل سے ٹیکس کے اِستثناء کے لئے کافی ہے

سوال:- بخدمت جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اُمید ہے کہ آپ اور تمام متعلقین مع خیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کی شدید مصروفیت کا علم

ہونے کے باوجود آپ کو زحمت دے رہا ہوں، جس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ایک مسئلہ جو تقریباً چھ سال سے راقم الحروف اور اکثر اِسلامی بینکوں کے اربابِ حل و عقد، خصوصاً میزان بینک کے سرکردہ اَصحاب کے درمیان وجۂ نزاع بنا ہوا ہے، وہ مرابحہ کے معاملے پر محصولات کے لاگو ہونے، ان کی ادائیگی یا حکومت کی اجازت سے ان کے عدمِ اطلاق کا ہے۔

''اِصلاحی خطبات'' جلد نمبر ۱۱ میں آپ نے ان تمام حکومتی قوانین، جو شریعت کے کسی قانون سے متصادم نہ ہوں، کی پاسداری کے متعلق اِظہارِ خیال کیا ہے، ان کی روشنی میں راقم الحروف کی سوچ یہ ہے کہ خرید وفروخت کے معاملات پر واجب الادا تمام محصولات کا اطلاق بجنسہٖ مرابحہ کے ان معاملات پر بھی ہوتا ہے جو اِسلامی بینکوں میں رائج ہیں تاوقتیکہ حکومت یا اس کا مجاز ادارہ، بورڈ، اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کو ان سے مستثنیٰ قرار دے دیں، میری یہ رائے اس بنیاد پر ہے کہ:-

۱- مرابحہ فی الواقع خرید وفروخت کا معاملہ ہے اور قیمت کی ادائیگی کو مؤخر کرکے بینکوں نے اسے تاجر حضرات کو اُدھار مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

۲- خرید و فروخت کے تمام معاملات، چاہے وہ بینکوں ہی کی طرف سے روبعمل لائے جائیں، محصولات کے ان قوانین کے مطابق ہونا چاہئیں جو حکومتِ پاکستان نے بنائے ہیں اور جو شریعت سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

۳- ان قوانین میں سے بعض کو ۱۹۷۹ء اور بعض کو ۱۹۹۰ء میں رائج کیا گیا جب پاکستان میں کوئی بھی بینک (ماسوائے فیصل بینک جو مرابحہ کا Documentation تو اِستعمال کر رہا تھا، لیکن اس کے شرعی تقاضوں کو نہیں پورا کر رہا تھا) اسلامی بینکاری نہیں کر رہا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں بنائے گئے انکم ٹیکس قانون کو ۲۰۰۱ء میں نئی شکل دی گئی اور اَب ۲۰۰۱ء کا آرڈیننس مع تبدیلیوں کے مروّجہ قانون ہے۔ ۲۰۰۱ء میں بھی شریعت میں مطلوب معیار کی کوئی پاکستانی بینک پاسداری نہیں کر رہا تھا۔

۴- ان قوانین کے زمانۂ اطلاق کے پیشِ نظر اور ان کے الفاظ اور غایت کی روشنی میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کسی بھی قانون کا مقصد اِسلامی بینکوں کے لئے کوئی مشکلات یا پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں ہے، یا دیدہ و دانستہ یہ قوانین اسلامی بینکاری کو رائج ہونے سے روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

۵- ۲۰۰۰ء کے آخر سے اب تک بعض افراد، بینک دولت پاکستان اور ICAP (Institute

of Chartered Accountants Pakistan) نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے باعث اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کے معاملات کو بعض محصولات سے چھوٹ دے دی گئی ہے، اگر تمام اسلامی بینک، خصوصاً وہ بینک جو اس وقت اس شعبے میں زیادہ مشہور اور آگے ہیں، مل کر کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بقیہ قوانین میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت حکومت سے منوائی نہ جاسکے، جبکہ اس کے سبب حکومت کو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہے۔

۶- ICAP نے جو Accounting Standard (معروف بہ IFAS-1) وضع کیا ہے اس کی رُو سے مرابحہ کرنے والے بینکوں کے لئے لازمی ہے کہ سامان کی خرید اور فروخت کا اندراج کتابوں میں کریں اور Invoice وصول اور جاری کریں تاکہ بعد میں آڈٹ کرنے والوں کو یہ اِطمینان ہوسکے کہ مرابحہ کا ہر معاملہ سامان کی واقعی (تیسرے فریق سے) خرید اور پھر بینک کی جانب سے فروخت پر مبنی ہے۔ اگر IFAS-1 پر کماحقہٗ عمل کرلیا جائے تو اِن شاء اللہ مرابحہ کے معاملات میں تمام خرابیوں کا سدِ باب ہوسکتا ہے، خصوصاً Rollover کو جڑ و بنیاد سے اُکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔

۷- بحیثیت بینکر کے احقر کو خوب اندازہ ہے کہ ٹیکس قوانین میں تبدیلیوں کے بغیر IFAS-1 پر عمل کرنا نہ صرف دُشوار ہے بلکہ محصولات کی ادائیگی کے سبب یا تو اِسلامی بینکوں کی شرحِ منافع ناقابلِ برداشت حد تک متأثر ہوگی یا پھر Customers کو سودی بینکوں کے مقابلے میں زیادہ اِخراجات دینا ہوں گے جو مسابقت کے موجودہ ماحول میں بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

۸- اگر آپ کی رائے میں مرابحہ کے معاملے پر ٹیکس قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، چونکہ سودی بینکوں کے بیع عینہ (Buy-Back) کے معاملے بھی یوں ہی ہو رہے ہیں، یا حکومتِ پاکستان کے ٹیکس قوانین کی خلاف ورزی خلافِ شرع نہیں ہے تو براہِ کرم اپنی تحریری رائے سے مطلع فرمائیں تاکہ ہم لوگوں کو یہ اِطمینان ہوجائے کہ ان قوانین کی بظاہر خلاف ورزی کے باوجود ہم کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں اور عنداللہ مأخوذ نہ ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
طالب دُعائے خیر
انوار احمد مینائی

جواب:- مکرّم بندہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کسی ٹیکس سے اِستثناء صریح عبارت سے بھی ہوسکتا ہے، اور متواتر عمل سے بھی۔ حکومت اور

ٹیکس اتھارٹیز سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مرابحہ ایک بیع ہے، ساتھ ہی وہ جانتے ہیں کہ یہ بیع ایک آلۂ تمویل کے طور پر اِستعمال ہو رہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ سودی تمویل پر ٹیکس نہ ہو، اور شرعی تمویل پر ٹیکس عائد کیا جائے، اس لئے ان کا متواتر تعامل یہ ہے کہ کسی اسلامی بینک سے سیلز ٹیکس کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اسے ٹیکس سے مستثنیٰ سمجھنے میں کم از کم بندہ کو کوئی دُشواری نہیں ہے۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۸/۱۲/۱۴۲۷ھ

***

﴿فصل فی البطاقات وأحکامها﴾
(کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کے اَحکام)

کریڈٹ کارڈ کا حکم

(بنوری ٹاؤن، ''جنگ'' اخبار اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ)

سوال:- کریڈٹ کارڈ (Credit Card) کے بارے میں معلوم کرنا تھا، اس کو استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟ میری معلومات یہ ہیں کہ Credit Card کی سالانہ فیس دو ہزار روپے ہے، کریڈٹ کارڈ کو ملک کے اندر یا بیرون ملک استعمال کریں تو ایک ماہ کے اندر وہ رقم واپس کردیں تو کوئی سود نہیں دینا پڑتا، اور ایک ماہ بعد اگر رقم دیں تو اس پر سود دینا پڑتا ہے، یہ بیرون ملک کام آتا ہے، رقم لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نوٹ:- اس کے ساتھ دو جوابوں کی فوٹو کاپی آپ کو روانہ کر رہا ہوں، دونوں کے جواب مختلف ہیں جناب مفتی جمیل صاحب (''جنگ'' اقرأ والے) نے آپ کا حوالہ دیا ہے، مہربانی فرماکر تفصیل کے ساتھ جواب تحریر فرماکر شکریہ کا موقع دیں۔

''جنگ'' اخبار کا جواب

جواب:- ایک مہینے کے اندر اگر رقم ادا کردی گئی تو جائز ہے، بعد میں ادا کرنے پر سود دینا پڑتا ہے، یہ جائز نہیں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کا جواب

صورتِ مسئولہ میں دو ہزار روپے سے جو کریڈٹ کارڈ خریدا جاتا ہے، وہ ایک رسید کی حیثیت رکھتا ہے، فی نفسہٖ اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ قرضہ حاصل کرنے کے اجازت نامے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی رُو سے قرضہ لینے والا ایک ماہ تک بغیر مزید سود ادا کئے قرضے کی رقم سے استفادہ کرسکتا ہے، اور یہ سہولت صرف ایک سال تک رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے والا ایک ماہ کی مدّت پر سال بھر جو قرضہ اس ادارے سے حاصل کرے گا اس کا پیشگی سود مبلغ دو ہزار روپے ادارے نے کریڈٹ کارڈ کی فیس کی شکل میں وصول کرلیا، یہ سودی قرضے کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے،

جس طرح لوگ نت نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں، اسی طرح یہ شکل سود کی جدید شکل ہے، اس لئے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، لوگوں کو دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح کتبہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ محمد عبدالقادر

الجواب صحیح ۱۴۱۷/۵/۵ھ

سعید احمد جلال پوری

(دارالافتاء) ختم نبوّت کراچی

حضرتِ والا دامت برکاتہم کا جواب

جواب:- احقر کی نظر میں ''جنگ'' والا جواب دُرست ہے، سالانہ فیس کا قرض سے کوئی تعلق نہیں، دراصل کارڈ جاری کرنے والا اور بھی بہت سی خدمات فراہم کرتا ہے، جن میں کارڈ کا اجراء، اس کے حامل کو مختلف سفری سہولیات فراہم کرنا، دُنیا کے ہر خطے میں کارڈ کی گمشدگی کی صورت میں متبادل کارڈ کی فراہمی، کارڈ کے حامل کا پورا حساب رکھنا وغیرہ۔ ان تمام خدمات کی اُجرت سالانہ فیس کے ذریعے وصول کی جاتی ہے، چاہے کوئی شخص اس کارڈ کے ذریعے خریداری کرے یا نہ کرے، یعنی قرض وجود میں آئے یا نہ آئے، لہٰذا اس فیس کی وجہ سے کارڈ کا ممبر بننا ناجائز نہیں، البتہ جب کارڈ کو اِستعمال کیا جائے تو مقرّرہ مدّت کے اندر اندر بل کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ سود نہ لگے،[1] اور اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ Direct Debit کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی کارڈ والے براہِ راست آپ کے بینک سے بل کی رقم وصول کرلیں، تاکہ غیرارادی طور پر بھی تأخیر کی وجہ سے سود عائد نہ ہو۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۳/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲/۲۷۳)

(۱ و ۲) دراصل آج کل رائج کارڈوں کی تین قسمیں ہیں، ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ، ان میں سے ڈیبٹ کارڈ اور چارج کارڈ کا مذکورہ بالا حکم بیان کیا گیا ہے، اور ان دونوں کارڈوں پر بھی ''کریڈٹ کارڈ'' کا اطلاق کردیا جاتا ہے، تاہم جہاں تک اصلاً ''کریڈٹ کارڈ'' کا تعلق ہے تو اس کا استعمال ان دونوں کارڈوں کے میسر نہ ہونے کی صورت میں اُنہی کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ان تینوں کارڈوں کا تعارف اور ان کا تفصیلی حکم حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی ہدایت اور نگرانی میں لکھے گئے اُن کے مصدقہ درج ذیل فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

سوال:- محترم جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(جاری ہے)

جناب سے گزارش یہ ہے کہ کریڈٹ کارڈ کے بارے میں تفصیل سے حکم بیان فرمادیں کہ آیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کریڈٹ کارڈ کی اور اقسام جو رائج ہیں ان کا حکم بھی بیان فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

جواب:- آج کل رائج کارڈ کی تین اقسام پائی جاتی ہیں:-

۱- ڈیبٹ کارڈ Debit Card

۲- چارج کارڈ Charge Card

۳- کریڈٹ کارڈ Credit Card

۱- ڈیبٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اکاؤنٹ اس ادارے میں موجود ہوتا ہے جس ادارے کا اس نے کارڈ حاصل کیا ہے، حاملِ بطاقہ یعنی کارڈ ہولڈر اس کارڈ کو جب بھی استعمال کرتا ہے، ادارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کردیتا ہے۔ اس میں حاملِ بطاقہ کو اُدھار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ صرف اس وقت تک کارڈ کو استعمال کرسکتا ہے جب تک اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اس کے ذریعے خرید وفروخت کرنا دُرست ہے، کیونکہ اس میں نہ قرض کی صورت ہے، نہ سود کی۔ البتہ حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں استعمال نہ کرے۔

۲- چارج کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا ادارے میں پہلے سے اکاؤنٹ نہیں ہوتا بلکہ ادارہ حاملِ بطاقہ کو اُدھار کی سہولت فراہم کرتا ہے، حاملِ بطاقہ کو ایک متعین ایام کی اُدھار کی سہولت میسر ہوتی ہے، جس میں اس کو ادارے کو ادائیگی کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اس مدّت میں ادائیگی ہوجائے تو سود نہیں لگتا، البتہ اگر حاملِ بطاقہ نے وقت پر ادائیگی نہ کی تو پھر اس کو سود کے ساتھ ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔

ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ استعمال کرنا جائز ہے:-

۱- حاملِ بطاقہ اس بات کا پورا انتظام کرے کہ وہ معین وقت سے پہلے پہلے ادائیگی کردے اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

۲- حاملِ بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی اُمور میں استعمال نہ کرے۔

۳- اگر ضرورت ڈیبٹ کارڈ سے پوری ہو رہی ہو تو بہتر ہے کہ اس کارڈ کو استعمال نہ کرے۔

۳- کریڈٹ کارڈ

اس کارڈ کے حامل کا بھی کوئی اکاؤنٹ ادارے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ معاہدہ ہی اُدھار پر سود کا کرتا ہے، اس معاہدے میں اگرچہ ادارہ ایک متعین مدّت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر حاملِ بطاقہ ادائیگی کردے تو اس کو سود ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تجدیدِ مدّت (Rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، جس سے ادائیگی کی مدّت بڑھ جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ شرحِ سود میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور بعض صورتوں میں اضافی رقم لی جاتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کارڈ کا استعمال جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ الگ سے مہیا نہ ہو اور اس کو ڈیبٹ کارڈ یا چارج کارڈ کی طرح مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ (جاری ہے)

ان تمام کارڈ کو "کریڈٹ کارڈ" کہا جاتا ہے، لیکن جو اصلاً کریڈٹ کارڈ ہے اس کا استعمال جائز نہیں، البتہ کریڈٹ کارڈ کا اطلاق مذکورہ بالا پہلی دو قسموں پر کیا جائے تو ان کا استعمال جائز ہے۔

ان کے علاوہ کارڈ کی ایک قسم ہے جس کو ATM (Automated Transfer Machine) کارڈ کہتے ہیں، یہ رقم نکالنے کا کارڈ ہوتا ہے، بعض دفعہ اس کا وجود اُوپر ذکر کردہ کارڈ کے ضمن میں بھی ہوتا ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ ڈیبٹ کارڈ میں رقم نکالنے کی سہولت بھی موجود ہو۔

اس کارڈ کا حکم یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنے پر اگر متعین رقم مشین کے استعمال کی اُجرت کے طور پر ادارہ وصول کرے جو مقدارِ رقم سے قطع نظر ہو تو جائز ہے، لیکن اگر ادارہ رقم کو بنیاد بنا کر اس پر کچھ وصول کرے تو یہ جائز نہیں بلکہ سود ہوگا، البتہ ادارہ کارڈ جاری کرنے کی فیس وصول کرسکتا ہے۔

فی المعاییر الشرعیة:

خصائص بطاقة الحسم الفوری

۱ – تصدر هٰذه البطاقة من المؤسسة لمن له رصید فی حسابه.

۲ – تخول هٰذه البطاقة لحاملها السحب، أو تسدید اثمان السلع والخدمات بقدر رصید المتاح، ویتم الحسم منه فورًا، ولا تخوله الحصول علی ائتمان.

۳ – لا یتحمل العمیل رسومًا مقابل استخدامه هٰذه البطاقة غالبًا اِلّا فی حال سحب العمیل نقدًا، أو شرائه عملتهٔ أخریٰ عن طریق مؤسسة أخریٰ غیر المؤسسة المصدرة للبطاقة.

۴ – تصدر هٰذه البطاقة برسم أو بدونه.

خصائص بطاقة الائتمان والحسم الآجل

۱ – هٰذه بطاقة أداة ائتمان فی حدود سقف معین لفترة محددة، وهی أداة وفاء أیضًا.

۲ – تستعمل هٰذه البطاقة فی تسدید أثمان السلع الخدمات، وفی الحصول علی النقد.

۳ – لا یتیح نظام هٰذه البطاقة تسهیلات ائتمانیة متجددة لحاملها، حیث یتعین علیه المبادرة بسداد ثمن مشتریاته خلال الفترة المحددة عند تسلمه الکشوف المرسلة الیه من المؤسسة.

۴ – اذا تأخر حامل البطاقة فی تسدید ما علیه بعد الفترة المسموح بها یترتب علیه فوائد ربویة، أما المؤسسات فلا ترتب فوائد ربویة.

خصائص بطاقة الائتمان المتجدد

۱ – هٰذه البطاقة أداة ائتمان فی حدود سقف متجدد علیٰ فترات یحددها مصدر البطاقة، وهی أداة وفاء أیضًا.

۲ – یستطیع حاملها تسدید أثمان السلع والخدمات، والسحب نقدًا، فی حدود سقف الائتمان الممنوح.

۳ – فی حالة الشراء للسلع أو الحصول علی الخدمات یمنح حاملها فترة سماح یسدد خلالها المستحق علیه بدون فوائد کما تسمح له بتأجیل السداد خلال فترة محددة مع ترتب فوائد علیه. أما فی حالة السحب النقدی فلا یمنح حاملها فترة سماح.

الحکم الشرعی لأنواع البطاقات

بطاقة الحسم الفوری

یجوز للمؤسسات اصدار بطاقة الحسم الفوری ما دام حاملها یسحب من رصیده ولا یترتب علی التعامل بها فائدة ربویة.

بطاقة الائتمان والحسب الآجل

یجوز اصدار بطاقة الائتمان والحسم الآجل بالشروط الآتیة:–

۱ – الا یشترط علیٰ حامل البطاقة فوائد ربویة فی حال تأخیره عن سداد المبالغ المستحقة علیه.

۲ – ان تشترط المؤسسة علیٰ حامل البطاقة عدم التعامل بها فیما حرمته الشریعة وانه یحق للمؤسسة سحب البطاقة فی تلک الحالة.

(جاری ہے)

کریڈٹ کارڈ اور اس کی مختلف قسموں کا حکم

سوال:-الیٰ حضرة الشیخ العلّامة مولانا محمد تقی العثمانی، حفظه الله تعالیٰ

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته.

أسئل الله أن تصلکم رسالتی هٰذه وأنتم فی خیر حال وعافیة، الحمد لله أن وفقّنی لقراءة بعض کتبک بالعربیة (قضایا فقهیة معاصرة) ثم أطلعت علیٰ بعض کتبک مترجمة بالانجلیزیة فأردت التنبیه الیٰ أن الترجمة فیها شیء من الضعف فهی أقرب للغة العوام منها الی اللغة الاکادیمیة.

ومما قرأته کذٰلک ان صح فهمی هو فتواک بجواز التعامل ببطاقات الائتمان (Credit Card) اذا کان المشتری بها یثق أنه سیسدد الدین قبل حلول موعد اضافة الفائدة للدین، والسؤال هل یجوز الاقدام علیٰ عقد یتضمن شرطًا محرمًا کالربا هنا ولو کان المتعاقد یعلم أنه لن یقع تحت طائلة الشرط؟ ومعلوم أن عقد الحصول علیٰ Credit Card یتضمن شرطًا ربویًا، ولیس الحکم علیٰ عقد بأنه حرام وباطل مانعًا من الاقدام علیه الا لضرورة أو لحاجة تنزل منزلتها ولو ترک باب العقود المحرمة مفتوحًا اعتمادًا علیٰ ثقة المتعاملین فیها بعدم الوقوع فی الشرط أو البند المحرم أو الباطل لا نفتح باب شر وفتنة علی الناس، والله هو المحافظ. ولی سؤال هل تمت ترجمة کتابکم قضایا فقهیة معاصرة الی الانجلیزیة أو بحث بیع الحقوق المجردة، فانی أحتاج الیه فهل لکم أن تدلونی علیٰ ذٰلک.

وختامًا أرجو المسامحة فی التطویل علیکم واسئل الله دوام العافیة وتمام النعمة وثبوت البرکة والأجر　　والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

محبکم وتلمیذکم

محمد علی احداش

طالب علم علی الفقه المالکی، لندن

۹ربیع الاوّل ١٤٢٤ھ

۱۰مایو ۲۰۰۳م

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بطاقة الائتمان المتجدد

لا یجوز للمؤسسات اصدار بطاقات الائتمان ذات الدین المتجدد الذی یسدده حامل البطاقة علیٰ أقساط آجلة بفوائد ربویة.

والله اعلم وعلمه أتم

عبداللہ صدیقی غفر اللہ لہٗ

۲۸/۱/۱۴۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۶۱/۵۱)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	
محمد تقی عثمانی	بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبداللہ عفی عنہ	محمد عبدالمنان عفی عنہ

جواب:- الیٰ سیادة الأخ الکریم محمد علی احداش، حفظه الله تعالیٰ

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد:

فشکرًا لک علیٰ رسالتک والتنبیه علیٰ أن بعض کتبی المترجمة بالانجلیزیة یوجد فیها بعض الضّعف، ولعلّ تفصیل مواضع الضّعف یصعب علیک، ولٰکن لو أخبرتنی ما هی الکتب التی وجدت فیها ذٰلک، فانّی أخبر به نشرة هٰذا الکتب، فان کثیرًا منهم تناولوا ترجمة ما شاءوا من مؤلفاتی وفوّضوا ذٰلک الیٰ مترجمین مختلفین، ثم لم تقع منی مراجعة ذٰلک لازدحام أشغالی.

أمّا بالنسبة لما ذکرت من جواز استخدام بطاقة الائتمان، فالذی أفتی به أن الطریق الأفضل أن تستخدم هٰذه البطاقة علیٰ أساس التسدید المباشر (Direct Debit) بأن تستخدم البطاقة فی حدود الغطاء الموجود عند البنک مصدر البطاقة، حتّٰی لا یکون هناک احتمال وجوب دفع الفائدة، أما اذا لم یتیسر ذٰلک، فیجوز استخدام بطاقة الائتمان، ان کان حاملها علیٰ یقین أنه سیسدد الفاتورة قبل أن توضع علیها فائدة.[1]

أما کون العقد مشتملًا علی شرط لزوم الفائدة عند التأخیر فی السّداد، فان مثل هٰذه الشّروط موجودة الیوم فی کثیر من التعاقدات، مثل عقود استخدام الکهرباء والتلیفون، والجوّال والضرائب الحکومیة وما الٰی ذٰلک فلا یمکن الیوم استخدام الکهرباء الّا بالتوقیع علی العقد الذی یشترط فوائد التأخیر، ولکن بما أن هٰذه شروط غیر معتبرة فی الشرع، فما دام الانسان مُطمئنًا بأنها لا تطبّق عملیًا، وذٰلک بالتزام السّداد فی حینه، فانه یمکن أن یتسامح فیها لعموم البلویٰ، وقد یستأنس فی ذٰلک (ولا أقول: یستدل) بحدیث شراء عائشة أُمّ المؤمنین لبریرة رضی الله عنهما بعقد فیه شرط لأن یکون الولاء للبائع، وأجاز رسول الله صلی الله علیه وسلم اشتراط ذٰلک،[2] مع کونه شرطًا ممنوعًا فی الشّرع، لکونه علیٰ یقین بأنه لا یطبّق، والله سبحانه تعالیٰ أعلم.

وأرجو أن لا تنسونی فی أدعیتکم الصالحة.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

أخوکم

محمد تقی العثمانی

کراتشی، ۲۹/۳/۱۴۲۴ھ

(۱) تفصیلی حکم کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) جامع الترمذی ابوابُ الولاء والهبة ج:۲ ص:۳۳ (طبع سعید).

کتاب الإجارۃ

(کرایہ داری سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی نفس الإجارۃ﴾
(اِجارہ "کرایہ داری" سے متعلق مسائل کا بیان)

پٹواری کے پیشہ اور نظام کی شرعی حیثیت

سوال:- ہمارے علاقے میں قوم بُزدار بلوچ کئی ہزار کی تعداد میں رہتے ہیں، جہاں برطانیہ کے دورِ حکومت سے اب تک کوئی پٹواری کا کوئی انتظام نہیں، اور بارانی علاقہ ہے آمدنی زیادہ نہیں ہوتی، اور ہتھیاروں کی ہر قسم کی آزادی ہے، اور زمینوں کی حدود کے اندر تنازعات واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان کشت وخون بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے اب حکومتِ پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہاں پٹواریوں کا انتظام کیا جائے، لیکن اس کے مقابلے میں قوم نے اجتماعی مشورے کے بعد یہ طے کیا ہے اور بعض جگہ درمیان میں قرآن مجید رکھ کر یہ طے کیا ہے کہ اس فیصلے کو نافذ ہونے نہیں دیں گے، اور بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ یہ مدافعت جہاد ہے اور مقتول شہید ہے، اس قوم کے بعض مطالبے اور بھی ہیں، اور حکومت کے ذمہ دار مثلاً کمشنر صاحب یقین دِلاتے ہیں کہ ہم تمہارے مطالبے حکومت سے منظور کرائیں گے، لیکن قوم باور نہیں کرتی، ازیں بنا پر قوم مسلح ہوکر جنگ اور مقابلے کے لئے تیار ہے، اور بعض دفعہ انہوں نے گولیاں بھی ماریں اور حکومت بھی اپنی طاقت استعمال کرنے کے لئے تیار ہے، اب قابلِ دریافت سوالات درج ذیل ہیں: ۱-پٹواری نظام دِین میں جائز ہے یا ناجائز؟ ۲-اس تصادم میں جو لوگ مارے جائیں گے ان دونوں فریقین میں سے کون سے فریق کے لوگ شہید ہوں گے اور کون سا فریق ناحق؟ ۳-قرآن مجید کے ذریعے جو عہد کیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ باقی رکھنا چاہئے یا توڑنا جائز ہے؟ ۴-عوام کا یہ خدشہ کہ پٹواری رشوت وغیرہ ناجائز کارروائیاں جاری کریں گے لہٰذا ہم ان کو آنے نہ دیں گے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ۵-حکومت اس قوم کو باغی سمجھ کر قتل کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- پٹواری کا کام فی نفسہٖ جائز ہے، البتہ رشوت وغیرہ کے ناجائز ذرائع استعمال کرنا حرام ہے،[۱] لہٰذا اس علاقے میں پٹواری کا نظام نافذ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور جب حکومت اسے نافذ کرنا چاہتی ہے تو اس جائز اقدام میں اس کی اطاعت ضروری ہے،[۲] اور اس کے خلاف جنگ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، جو لوگ حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے مریں گے وہ شہید نہیں ہوں گے، لہٰذا ضروری ہے کہ لوگوں نے اس نظام کے خلاف جو معاہدہ کیا ہے اس کی پابندی نہ کریں، پھر اگر انہوں نے مخالفت کرنے پر اللہ کی قسم بھی کھائی ہو تو اس قسم کا کفارہ ادا کریں،[۳] اور اس فعل سے باز آجائیں۔ اگر پٹواری کو قتل کردیا تو قتلِ نفس کا گناہِ کبیرہ ہوگا، جس کی سزا حسبِ تصریح قرآن مجید دخولِ جہنم ہے۔[۴]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

کیا سودی معاملات کرنے کی بناء پر حکومت کی ہر ملازمت ناجائز ہے؟

سوال:- میرا ایک دوست کہتا ہے کہ آج کل کی حکومت غیرشرعی ہے، حکومت خود سودی کاروبار کرتی ہے اور سود کی رقم سے ہم کو تنخواہ ملتی ہے، لہٰذا ہماری تنخواہ بھی حرام ہوئی، شرعاً کیا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال علی الاطلاق دُرست نہیں، حکومت کی ہر ملازمت ناجائز

---

(۱) وفی سنن الترمذی ج:۳ ص:۶۲۳ (طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۱ ص:۳۸۰) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الرّاشی والمرتشی. و أبی داؤد ج:۳ ص:۳۰۰ (طبع دار الفکر وفی طبع مکتبہ رحمانیہ ج:۲ ص:۶۰) وسنن ابن ماجة ج:۲ ص:۷۷۵ (طبع دار الفکر، بیروت وفی طبع مکتبہ قدیمی ج:۱ ص:۱۶۷) وفی مجمع الزّوائد ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الرّیان للتراث قاهرة، دار الکتاب العربی، بیروت وفی طبع مکتبہ دارالفکر ص:۳۵۹) الراشی والمرتشی فی النّار.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۱۷۲ تجب طاعة الامام فیما لیس بمعصیة.
وراجع للدّلائل والتفصیل الیٰ الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعة الامام ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید).
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ سوال نمبر ۳۹۳ ج:۳ ص:۴۰۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۳) وفی تنویر الأبصار ج:۳ ص:۷۲۸ (طبع سعید) ومن حلف علیٰ معصیة کعدم الکلام مع أبویه أو قتل فلان الیوم وجب الحنث والتکفیر .... الخ.
وفی سنن النسائی باب من حلف علیٰ یمین فرأی غیرها خیرًا ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع مکتبة الحسن) عن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: ما علی الأرض یمین أحلف علیها فأری غیرها خیرًا منه الّا آتیه.
وفی کتاب الأصل (المبسوط للشیبانیؒ) کتاب الأیمان ج:۳ ص:۱۹۰ قد بلغنا عن النبی صلی اللہ علیه وسلم أنّه قال: من حلف علیٰ یمین فرأی غیرها خیرًا منه فلیأت الّذی هو خیر ولیکفر عنه یمینه.

(۴) ”وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا“ (سورۃ النساء آیت:۹۳).

نہیں ہے، اور نہ ہر ملازمت کی تنخواہ حرام ہے، جس ملازمت میں کوئی غیر شرعی کام نہ کرنا پڑتا ہو یا براہِ راست حرام آمدنی سے تنخواہ نہ دی جاتی ہو، وہ جائز ہے اور اس کی تنخواہ حلال ہے۔ واللہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/ ۲۸ الف)

آغا خانیوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر آغا خان فاؤنڈیشن کو دُکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسئلے میں: ایک شخص نے (جو کہ علمِ دِین کی طرف منسوب بھی ہے) گلگت میں ایک عمارت برائے کرایہ تعمیر کرائی ہے، جو کہ ہوٹل کے قابل بھی ہے (یعنی کوئی ہوٹل بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہے تو لے سکتا ہے)۔ آغا خان فاؤنڈیشن کا ادارہ اس عمارت کو اپنے دفاتر بنانے کے لئے کرایہ پر لینا چاہتا ہے، اس ادارے کو کرایہ پر دینا شرعی لحاظ سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

نوٹ:- آغا خان فاؤنڈیشن والا ادارہ (ARSP) تقریباً بارہ پندرہ سال سے قائم ہے، یہ ادارہ رفاہی کاموں کا ادارہ ہے، اس کے تحت اسکول، اسپتال اور گاڑیاں، ہیلی کوپٹر کام کرتے ہیں، پہاڑی علاقوں میں سنگین مریضوں کو عندالضرورۃ ہیلی کوپٹر کے ذریعے گلگت اسپتال لایا جاتا ہے، ورنہ عام مریضوں کو لانے کے لئے گاڑیوں کا انتظام ہے۔

اس کے علاوہ دُوسرے رفاہی کام بھی یہ ادارہ اپنے خرچ پر کراتا ہے، مثلاً کہیں راستے کی ضرورت ہے یا نہر کی یا ٹینکی کی، تو یہ ادارہ اپنے اُصول وشرائط کے مطابق وہ کام کراتا ہے، اس ادارے میں ملازمین کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں بلکہ قابلیت کی بناء پر وہ ملازمتیں دیتے ہیں، نیز اس ادارے کے تحت ادارے کے فائدے کے لئے اقتصادی پروگرام بھی ہوتے ہیں، مثلاً شہد (عسل) کا اِنتاج، گلگت کے فروٹ کو جدید ترین انداز میں پیکنگ کرکے برآمد کرنا یا پاکستان کے بڑے شہروں میں فروخت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ادارے کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک عالمی فنڈ ہے جو کہ غریب علاقوں کے لئے ہے، اس میں اسلامی ممالک کا بھی چندہ ہے، آغا خان کی حیثیت چیئرمین کی ہے، باوثوق ذرائع بلکہ متواتر طریقے سے ثابت ہے کہ نواز شریف نے اپنی سابقہ وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں گلگت کے علاقے کے لئے پانچ کروڑ کی امداد دی تھی جو کہ اس ادارے کے ذریعے وہ گلگت کے ترقیاتی کاموں

میں خرچ کی گئی ہے، وہ یہ رقم گلگت کے حکومت (یعنی کمشنر) کے ذریعے خرچ کرسکتا تھا، مگر ان کو اس ادارے پر اعتماد کی وجہ سے اس ادارے کے ذریعے اپنی اس امداد کو گلگت میں استعمال کرایا۔

مزید معلومات کے لئے عرض ہے کہ داریل (داریل خالص سنیوں کا علاقہ ہے، اس میں شیعہ اور آغا خانیوں کا نام ونشان نہیں ہے) کے علماء اس ادارے کے مخالفت میں شروع میں سختی کرتے تھے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ عالمی فنڈ ہے، آغا خان اپنی جیب سے نہیں دیتا ہے، اور داریل والے اپنے علاقے کے لئے مخصوص کی ہوئی رقم نہیں لیتے ہیں تو یہ رقم آغا خانیوں کے علاقے میں خرچ ہوتی ہے، جب سے ان کو یہ معلوم ہوا ہے اس وقت سے انہوں نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے، جو کہ سال کے شروع ہی میں داریل کے ترقیاتی کاموں کی رقم (جو کہ فاؤنڈیشن کی طرف سے مخصوص ہے) پیسہ پیسہ کرکے وصول کرکے اپنی زیرِ نگرانی اپنے علاقے میں خرچ کرتے ہیں، اور پھر آغا خان فاؤنڈیشن کے ادارے کو حساب دیتے ہیں کہ ہم نے جو رقم لی تھی اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے خرچ کیا۔

دس پندرہ سالوں میں ادارے نے جو عمارتیں کرایہ پر لی ہیں، انتہائی صاف ستھری رکھی ہیں، اس خوبی کی بناء پر اکثر لوگ ان کو کرایہ پر دینے کی تمنا کرتے ہیں، مذکورہ عمارت کا مالک اسی ادارے کو دینے کی تمنا میں تو نہیں، البتہ اس کے بعض رشتہ دار کافی حد تک مصر ہیں، اور وہاں کے بعض علماء سے جواز کا اشارہ ملنے پر مصر ہیں، اس وجہ سے مالک عمارت شرعی لحاظ سے جواز یا عدمِ جواز کے فتویٰ کا منتظر ہے، تاکہ دینے نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔

وصلّی اللہ وسلّم علیٰ سیّدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلّم

از طرف عبدالقیوم حال مکہ مکرّمہ

جواب:- اگرچہ کسی غیر مسلم کو کوئی عمارت کسی جائز مقصد کے لئے کرایہ پر دینا فی نفسہٖ جائز ہے،[1] بالخصوص جبکہ وہ رفاہی کاموں کے لئے ہو، لیکن مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:-

---

(۱) وفی الهندية كتاب الاجارة ج:۴ ص:۴۵۰ (طبع ماجدية) واذا استأجر الذمی من المسلم دارًا يسكنها فلا بأس بذٰلك، وان شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصليب أو أدخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فی ذٰلك بأس لأن المسلم لا يؤاجرها لذٰلك انما آجرها للسكنى، كذا فی المحيط.

قال العلّامة سراج الدين رحمه الله: آجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار أو بِيعة أو كنيسة أو يباع فيه الخمر لا بأس به عند أبی حنيفة خلافًا لهما (فتاویٰ سراجية علىٰ هامش قاضی خان، كتاب الاجارة ج:۴ ص:۲۴۱).

ومثله فی خلاصة الفتاویٰ كتاب الاجارات ج:۳ ص:۱۴۹.

وفی الهندية ج:۴ ص:۴۴۹ (طبع ماجدية) اذا استأجر الذّمی من المسلم بيتًا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبی حنيفة خلافًا لهما.

وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۵۰ لو استأجر الذّمی مسلمًا ليبنی له بِيعة أو كنيسة جاز.

۱:- وہ غیر مسلم جو اپنے غیر مسلم ہونے کا اعتراف کئے بغیر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے، اُس کا معاملہ دُوسرے غیر مسلموں سے زیادہ شدید ہے، اس کے ساتھ مستقل نوعیت کے تعلقات قائم کرنا دُرست نہیں۔

۲:- اگر غیر مسلم عمارت کو رفاہی کام کے لئے استعمال کرے، لیکن اس رفاہی کام کے پیچھے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت مقصود ہو، تاکہ ضرورت مند مسلمان اپنی ضروریات پوری ہوتے دیکھ کر اس غیر مسلم کے مذہب کی طرف مائل ہوں، تو ایسے غیر مسلم کو کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے یہ کام کر رہا ہو تو اس کا خطرہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کے عقائد کو ناواقف مسلمان اسلام کا حصہ سمجھنے لگیں گے۔

۳:- آغاخانی فرقہ باتفاقِ مسلمین دائرۂ اسلام سے خارج ہے[1]، مگر وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے، لہٰذا اس کا معاملہ اُن غیر مسلموں سے زیادہ سخت ہے جو کھلے طور پر اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرتے ہیں۔

ان تین اُمور کو مدِنظر رکھتے ہوئے ''آغاخان فاؤنڈیشن'' اگر آغاخانیوں کی قائم کی ہوئی ہے، اور وہی اس کو چلا رہے ہیں، خواہ ملازم کے طور پر مسلمان بھی کام کرتے ہوں، اور وہ اس فاؤنڈیشن کے ذریعے مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں، جیسا کہ وہاں کے متعدّد علماء سے معلوم ہوا ہے، تو ان کو عمارت کرایہ پر دینا جائز نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
محمد تقی عثمانی
۱۴۱۸/۱/۲۴ھ

الجواب صحیح
سحبان محمود

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ
۱۴۱۸/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۶/۲۶۵)

محکمۂ پولیس اور شراب کی کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- ایک شخص جو کہ پہلے پولیس میں ملازم تھا، اور اَب ایک شراب کی کمپنی میں ملازم ہے، کیا اُس کی روزی حلال ہے؟ اور اس کے اہل و عیال پر کیا واجب ہوتا ہے؟

جواب:- اگر رِشوت اور دُوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے اجتناب کیا جائے تو پولیس کی

---

(۱) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۰۴ تا ۱۰۶ ملاحظہ فرمائیں۔

ملازمت تو جائز ہے، البتہ شراب تیار کرنے، یا بیچنے والی فرم کی ملازمت حرام ہے،[۱] اور آمدنی بھی حرام ہے،[۲] ایسے شخص کے اہل وعیال کو چاہئے کہ وہ اُسے جائز آمدنی کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۲۵/۲۸ ب)

۱:- مدرّسین ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کے حق دار ہیں یا نہیں؟
۲:- مدرّسین کو خارجی اوقات میں کسی دُوسرے کام سے روکنا
۳:- پیشگی اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ کاٹنے کا حکم

(وضاحت از مرتب)

مذکورہ تین مسائل سے متعلق حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ نے ایک اِستفتاء اپنی رائے کے ساتھ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے ارسال فرمایا، جن کے جواب میں اوّلاً حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم نے مفصل فتویٰ تحریر فرمایا، اور دار الافتاء دارالعلوم کراچی کے حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھری صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم نے اپنی رائے تحریر فرمائی۔ جس کے بعد یہ تمام تحریرات اُستاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، جس پر آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اپنا فتویٰ تحریر فرمایا۔ یہ تمام تحریرات اور آخر میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا فتویٰ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

اِستفتاء ورائے گرامی از
حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ

سوال:- عزیز محترم مولانا محمد تقی عثمانی سلّمہم وعافاہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

---

(۱) قال العلّامة طاهر بن عبدالرشيد البخاريّ: ولا يجوز الاستيجار علىٰ شيء من الغناء والنوح والمزامير. (خلاصة الفتاویٰ ج:۳ ص:۱۱۶ كتاب الاجارات).

قال العلّامة المرغينانيّ: ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذا سائر الملاهي لأنه استيجار على المعصية، والمعصية لا تستحق بالعقد. (الهداية ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مكتبه رحمانيه) باب الاجارة الفاسدة). ومثله في ردّ المحتار (ج:۶ ص:۵۵ باب الاجارة الفاسدة).

وفي الهندية ج:۴ ص:۴۱۱ ومنها أي من شرائط صحة الاجارة أن يكون مقدور الاستيفاء حقيقة أو شرعًا فلا يجوز استئجار الآبق ولا الاستئجار على المعاصي لأنّه استئجار علىٰ منفعة غير مقدور الاستيفاء شرعًا.

وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۴۹ لا تجوز الاجارة علىٰ شيءٍ من الغناء والنّوح والمزامير والطبل .... الخ. وكذا في البدائع ج:۴ ص:۱۸۹.

اُمید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔

جامعہ خیر المدارس کے جلسہ شوریٰ میں ماہِ رمضان المبارک کی تنخواہ کے مدرّس کے لئے اِستحقاق کا ذکر آیا تھا، فتاویٰ خلیلیہ میں کئی اکابر کے جوابات اس سلسلے میں موجود ہیں، ان سب پر حضرتِ اقدس مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا محاکمہ بھی درج ہے کہ:-

''میری رائے یہ ہے کہ مدرّسین کا معاملہ مدرسے کے ساتھ عقدِ اجارہ ہے، اور مدرّسین اَجیرِ خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں، تعطیل کا زمانہ ملازمت کا زمانہ ہے کہ اس میں عقدِ اجارہ باقی ہے، عقد قطع نہیں ہوا، مگر تنخواہ کے متعلق ایک شرط لگی ہوئی ہے کہ رمضان المبارک کی تنخواہ کا اِستحقاق اس وقت ہوگا جبکہ ابتدائے شوال میں حاضر ہوں، شرعاً شرط، خلافِ مقتضائے عقد، اِجارہ کے لئے مفسد ہوتی ہے، لہٰذا عقدِ اِجارہ فاسد ہوا، اور فسادِ عقد کی صورت میں اجیر مستحق اجرِ مسمی نہیں ہوتا بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا صورتِ موجودہ میں وہ مدرّس تنخواہ کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ اجرِ مثل کا مستحق ہوگا، اور اگر اس کو شرط فی العقد نہ قرار دیا جائے بلکہ خارجِ عقد کہا جائے یا شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرّس واقعہ متنازع فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔ اور احتمالات اور اختلاف حکم صرف رمضان المبارک (میں) ہے اور ایامِ شوال میں جب مدرّس اپنے کارِ منصبی پر مامور ہے تو اپنی تنخواہ کا ضرور مستحق ہوگا، فقط خلیل احمد عفی عنہ ۱۰ رج ۱، ۱۳۳۸ھ۔'' (فتاویٰ خلیلیہ ج:۱ ص:۲۴۸)۔

اس پر آپ غور کرلیں پھر جو رائے قائم ہو، مطلع کریں۔

فہمِ ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ ابتدائے شوال میں آنے کی شرط کو ہی حذف کردیا جائے اور بہرصورت مدرّس کو رمضان المبارک کی تنخواہ کا مستحق قرار دیا جائے، کیونکہ عقدِ اجارہ قائم ہے، یہ شرط لگاکر عقدِ اجارہ کو کیوں فاسد کیا جائے؟

۲:- ''مدرّسین اَجیرِ خاص ہیں، کیونکہ وقت کے پابند ہیں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتِ اِجارہ کے بعد وہ اجیر نہیں ہے، اس کو دُوسرے کسی کام سے نہیں روکا جاسکتا، اجیرِ خاص کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور کارِ منصبی کے علاوہ تمام اُمور سے ممنوع ہے۔

اس لئے کسی مدرّس کو دُوسرے کام کرنے سے روکنا عقدِ اِجارہ کے خلاف ہوگا۔ رہا یہ کہ دُوسری جگہ کام کرنے سے کارِ منصبی میں فرق آتا ہے، تو اس کا تدارک نہ ہوسکے عقدِ اِجارہ کو فسخ کرنے کا اختیار مہتمم مدرسہ کو حاصل ہے، فقط واللہ اعلم۔

آپ کو وقت نہیں ملتا اس لئے محاکمہ کی مختصر نقل کرکے بھیج رہا ہوں، ورنہ یہ ساری بحث قابلِ ملاحظہ ہے۔

باقی دُعاؤں کا محتاج ہوں، امراضِ قلب کی وجہ سے کام نہیں ہوتا، آپ کے لئے اور سب اہلِ خانہ کے لئے دُعا گو ہوں، والسلام۔ سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

اضافہ:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، جب مدرّس نے کام کیا ہے اُجرت کا مستحق ہوگیا، اب اس کی واپسی اس کے ذمے کیوں ہو؟ اسی طرح مدرسے والے ایک ماہ کی مزید تنخواہ دینے کے کیوں مکلّف ہیں؟ جب اس نے اس ماہ میں کام ہی نہیں کیا تو اُجرت کس چیز کی؟ اِجارہ کے اصول پر غور مطلوب ہے۔

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

۱۹۹۷/۵/۵ء

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم العالی)

بعد الحمد والصلوٰۃ

احقر نے حضرت مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب مدظلہم و دام مجدہم کی تحریر پڑھی، اکابر کے سامنے نااہل اصاغر کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے، مگر امتثالاً للامر عرض ہے کہ احقر ناچیز کی رائے میں ابتدائے شوال میں آنے کی شرط پر ماہِ رمضان (ایامِ بطالت و استراحت) کی تنخواہ کو مشروط کرنا اب مفسدِ عقد نہیں، کیونکہ اب یہ شرط معروف ہوچکی ہے، اور خود شیخ المحدثین حضرت سہارن پوری قدس سرہٗ نے ''فتاویٰ خلیلیہ'' میں اپنے محاکے میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ:

> شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرّس واقعہ متنازعہ فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔ (فتاویٰ خلیلیہ ج:۱ ص:۲۴۸)[1]

اس شرط کا معروف ہونا کئی وجوہات سے واضح ہے، جو درج ذیل ہیں:-

الف:- مدارسِ دینیہ میں اس شرط کا معروف ہوجانا محتاجِ بیان نہیں کہ تقریباً سب مدارس اس پر عمل پیرا ہیں۔

ب:- یہ شرط معروف عند الفقہاء بھی ہے کیونکہ ایامِ بطالت کی تنخواہ کا اِستحقاق اسی لئے ہے کہ استراحت کے بعد دوبارہ زیادہ نشاط کے ساتھ کام کرسکے، اگر اَیامِ بطالت کے بعد کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں تو ایامِ بطالت کی تنخواہ کا استحقاق کیسے ہوگا؟

ج:- یہ شرط مالِ وقف کی حفاظت اور اسے صحیح تر مصرف پر خرچ کرنے کے بھی عین مطابق ہے، اس لئے کہ مدارس میں زکوٰۃ وعطیات کی رقم معطین یا طلباء کی امانت ہے، اس امانت میں احتیاط کا

(۱) طبع مکتبة الشيخ كراچي.

تقاضا یہ ہے کہ یہ رقم کسی کو بلا عمل یا بلا عوض نہ دی جائے، لہٰذا یا عمل موجود ہونا چاہئے (جیسا کہ ایامِ عمل میں) یا مظنون ہونا چاہئے (جیسا کہ ایامِ استراحت میں جبکہ آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو) ورنہ اُجرت کا جواز محلِ نظر ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایامِ بطالت کی تنخواہ ماضی کے عمل کی وجہ سے ہے تو اس پر یہ شبہ ہے کہ ماضی کی خدمت کی بنیاد پر ایامِ بطالت کی اُجرت جبکہ مستقبل میں کام کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو، عطیہ اور ہبہ سے زیادہ اشبہ ہے، اور مہتمم یا صدر کو اس طرح کے عطیہ کی اجازت محلِ شبہ ضرور ہے۔

د:- یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر شوال میں آنے کی شرط کو مفسدِ عقد قرار دے کر مہتمم کے لئے یہ شرط لگانا ناجائز قرار دیا جائے تو کیا مدرّس کے لئے ایامِ بطالت میں عدمِ عمل کی شرط لگانا مفسد نہ ہوگا؟ جبکہ اُجرت کے استحقاق کے لئے اجیرِ خاص میں عمل ورنہ تسلیمِ نفس ضرور ہے، ادھر مدارس میں یہ عرف ہے کہ مدرّس ایامِ بطالت میں نہ عمل کرتا ہے اور نہ تسلیمِ نفس پر راضی ہوتا ہے، بلکہ بعض مدارس میں اگر اسے مجبور کر کے ایامِ بطالت میں کام پر مأمور کیا جائے تو اضافی تنخواہ دی جاتی ہے ورنہ اِنعام کے نام سے اس کی دِلجوئی کی جاتی ہے۔ گویا معاہدۂ ملازمت میں اب یہ بات -تحریراً ورنہ عرفاً وعملاً- مشروط ہے کہ ملازم ایامِ بطالت میں (جو دو ماہ طویل ہوتی ہیں) نہ عمل کرے گا اور نہ تسلیمِ نفس کرے گا، اور اس کے باوجود عقد فاسد قرار نہیں دیا جاتا۔

لہٰذا اگر مدرّسین کی طرف سے ایامِ بطالت میں عدمِ عمل اور عدمِ تسلیمِ نفس کی شرط مفسدِ عقد نہیں (حالانکہ اُجرتِ بطالت کی وصولی مالِ وقف سے ہوگی) کیونکہ اب یہ شرط معروف ہوچکی ہے تو مہتمم کی طرف سے آئندہ سال کام کرنے کی بنیاد پر رمضان کی تنخواہ کے استحقاق کی شرط بھی مفسدِ عقد نہیں ہونی چاہئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

۲:- اس سلسلے میں احقر (عفا اللہ عنہ وعافاہ) کی بھی رائے یہ ہے کہ مدرّس کو اوقاتِ کار (اوقاتِ اِجارہ) کے بعد اپنا پابند بنانا شرطِ فاسد ہے، اسی طرح اوقاتِ کار چھ یا آٹھ گھنٹوں کے بجائے چوبیس گھنٹے متعین کر کے ملازم کو مسلسل دن رات کا پابند بنانا شرطِ فاسد ہے، اور اس میں کئی طرح کی قباحتیں ہیں۔

الف:- ملازم اور غلام میں کام اور وقت کے متعین ہونے اور نہ ہونے ہی کا فرق ہے، اور پابندی کی یہ شرط اشبہ بالاِجارہ نہیں، البتہ اگر یہ اِجارہ نہ ہوتا بلکہ نفقہ ہوتا تو شاید اس کی گنجائش ہوتی کیونکہ زوجہ کسی وقت اطاعتِ بعل سے انکار نہیں کرسکتی (اِلَّا لعذر شرعی) اور امیر المؤمنین بھی کسی

وقت مصالح المؤمنین سے اغماض نہیں کرسکتا، مگر فی الوقت مدارس میں اِجارہ بلکہ اِجارۂ محضہ کی صورت رائج ہے۔

ب:- یہ وہ شرط ہے جس پر عمل کرنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، لہٰذا اس شرط کو تسلیم کرنا اور کرانا گناہ میں مبتلا ہونا اور گناہ میں مبتلا کرنا ہے۔

ج:- یہ سلف صالحینؒ کے تعامل کے خلاف ہے، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور اور تھانہ بھون میں اس کے خلاف ہی تعامل رہا ہے، اور مدرّسین فارغ اوقات کو اپنے جملہ مشاغل حتیٰ کہ کاروباری مصروفیات میں صَرف کرتے رہے ہیں، اکابرؒ کے واقعات اس پر شاہد ہیں، بلکہ یہ مصروفیات اسلامی معاشرے میں علماء کی شمولیت اور برکت کی حامل رہی ہیں۔

د:- یہ شرط بظاہر مفسدِ اِجارہ بھی ہے کیونکہ متقضائے عقدِ اِجارہ کے خلاف بھی ہے اور غیر معروف بھی بلکہ غیر معمول بھی، البتہ چونکہ اس شرط پر عمل کرنا چونکہ ناممکن ورنہ مشکل ضرور ہے اس لئے اگر اس شرط کو فاسد قرار دے کر اِجارہ کو صحیح قرار دیا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں۔

ہ:- علامہ شامیؒ کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدرّس اِجارہ کو اوقاتِ کار کے بعد طلبِ معاش کی اجازت ہونی چاہئے کیونکہ انہوں نے ساکنینِ مدرسہ کو جن کا وظیفہ اور نفقہ وقف کی طرف سے متعین ہو طلبِ معاش کے لئے سفر کی اجازت دی ہے، اور اسے عذرِ شرعی قرار دیا ہے، اور اس سفر کی بناء پر اس کا وظیفۂ متعینہ ساقط نہ ہونے کا حکم ذکر کیا ہے، علامہ شامیؒ کی عبارت درج ذیل ہے:-

(قوله ونظم ابن شحنه الغيبة الخ) أقول حاصل ما في شرحه تبعًا للبزازية انه اذا غاب عن المدرسة فإما أن يخرج من المصر أو لا فان خرج مسيرة سفر ثم رجع ليس له طلب ما مضى من معلومه بل يسقط وكذا لو سافر لحج ونحوه وان لم يخرج لسفر بأن خرج الى الرستاق فان أقام خمسة عشر يومًا فأكثر فان بلا عذر كالخروج للتنزه فكذٰلك وان لعذر كطلب المعاش فهو عفو الّا أن تزيد غيبته علىٰ ثلاثة أشهر فللغيره أخذ حجرته ووظيفته أى معلومه، وان لم يخرج من المصر فان اشتغل بكتابة علم شرعي فهو عفو والّا جاز عزله أيضًا واختلف فيما اذا خرج للّرستاق وأقام دون خمسة عشر يومًا لغير عذر فقيل يسقط وقيل لا، هٰذا حاصل ما ذكره ابن الشحنه في شرحه.

وملخصه أنه لا يسقط معلومه الماضى ولا يعزل في الآتي: اذا كان في

المصر مشتغلًا بعلم شرعی أو خرج لغیر سفر وأقام دون خمسة عشر یومًا بلا عذر علیٰ أحد القولین، أو خمسة عشر فأکثر لکن لعذر شرعی کطلب المعاش ولم یزد علیٰ ثلاثة أشهر.　　　(ردّ المحتار ج:۴ ص:۴۱۸)[۱]

شامی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین ماہ یعنی رُبع سے کم کم طلبِ معاش کی اجازت ہے، اگرچہ اس کا وظیفہ بحیثیت ساکن مدرسہ طے شدہ اور جاری ہو، اور اس طلبِ معاش کی وجہ سے نہ اس کا وظیفہ ساقط ہوگا اور نہ وہ مستحقِ عزل ہوگا۔

اگرچہ علامہ شامیؒ کی بیان کردہ یہ تفصیل ایک خاص صورت کے بارے میں ہے جس کی وضاحت خود علامہ شامیؒ نے درج ذیل عبارت سے کی ہے:-

وهٰذا التفصیل المذکور فی الغیبة انما هو فیما اذا قال وقفت هٰذا علیٰ ساکنی مدرستی وأطلق، أما لو شرط شرطًا تبع کحضور الدرس أیاما معلومة فی کل جمعة فلا یستحق المعلوم الّا من باشر خصوصًا اذا قال: من غاب عن الدرس قطع معلومه فیجب اتباعه.[۲]　　　(ج:۴ ص:۴۱۹)[۳]

لیکن علامہ شامیؒ کی عبارت سے یہ امر ضرور واضح ہے کہ طلبِ معاش ایک عذرِ شرعی ہے اور مالِ وقف میں اس کی رعایت کا حکم ہے، تو مدارس میں اس عذرِ شرعی کی رعایت بطریقِ اَولیٰ ہونی چاہئے۔ البتہ یہ امر بہرحال لازم ہے کہ مدرّس اِجارہ کے لئے طلبِ معاش کا یہ عمل محض ضمنی ہو، مقصودی نہ ہو، اور اس کی وجہ سے مدرّس کے اوقاتِ اِجارہ اور عملِ اِجارہ میں کسی قسم کی اختیاری کوتاہی واقع نہ ہو۔

۳:- الف:- ایک ماہ پہلے اطلاع نہ دینے کی صورت میں مدرّس سے ایک ماہ کی تنخواہ واپس لینے کی شرط کسی قاعدۂ شرعیہ پر منطبق نظر نہیں آتی، کیونکہ مدرّس اپنے عمل یا تسلیمِ نفس کی بناء پر اس اُجرت کا مستحق ہوچکا تھا، اب اس اُجرت کا استرداد ایک قسم کی تعزیرِ مالی ہے، اور معاہدۂ اِجارہ میں اس تعزیرِ مالی کو لازم قرار دینا مفسدِ عقد ہونا چاہئے، اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں اس کے مفسد ہونے کی تصریح فرمائی ہے:-

سوال:- یہ شرط اگر چند روز پہلے نوکری کے اطلاع نہ دوگے تو اس قدر جرمانہ دینا

---

(۱) کتاب الوقف (طبع سعید) (هامش ردّ المحتار علی الدّر المختار کتاب الوقف ج:۴ ص:۴۱۸)۔
(۲) قلت یجب اتباع هٰذا الشرط لأن شرط الواقف کنصّ الشارع. ۱۲ (حاشیہ از حضرت مولانا محمود اشرف صاحب مدظلہم)۔
(۳) کتاب الوقف (طبع سعید)۔

ہوگا، متممات عقد سے ہے اور لازم؟

جواب:- اِجارہ شرطِ فاسد سے فاسد ہوجاتا ہے، اور یہ شرط خلاف مقتضائے عقد کی ہے، لہٰذا عقد کو فاسد کردیو یگی، اس کا ذکر نہ کرنا چاہئے، **تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد**، درمختار۔ اور یہ شرط ظاہر ہے کہ اَجیر کو مفید اور مستأجر کو نافع اور عقد کے خلاف ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ ص:۴۲۲)[1]

البتہ مدرّس پر یہ شرط رکھی جاسکتی ہے کہ ملازمت ترک کرنے سے ایک ماہ پہلے اطلاع دینی ہوگی، ورنہ اطلاع کے بعد ایک ماہ تک اصالۃً یا نیابۃً کام کرنا لازم ہوگا۔

ب:- جہاں تک مدرسے کی طرف سے فی الفور اِخراج پر ایک ماہ کی تنخواہ کی ادائیگی لازم ہونے کی شرط ہے، تو یہ شرط بھی بظاہر مفسدِ عقد ہے، البتہ مدرسے کی طرف سے تبرّع کی تأویل ہوسکتی ہے، لیکن یہ تبرّع بھی اسی وقت جائز ہوگا جبکہ معطین اور طلباء کی طرف سے اِذن صراحۃً پایا جاتا ہو۔

البتہ اس مسئلے میں یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جس طرح مکان و دُکان کے اِجارہ غیر متعینہ میں یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں آئندہ پورے ماہ کا اِجارہ لازم ہوجاتا ہے، اسی طرح کیا یہاں بھی یکم تاریخ کو اطلاع نہ دینے کی صورت میں پورے ماہ کا اِجارہ لازم نہ ہوجائے گا؟

فليتأمل الأكابر واليهم المفاهيم ومنهم الأوامر

احقر محمود اشرف عثمانی غفر اللہ لہٗ

۱۴۱۸/۴/۲۵ھ

(رائے مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مدظلہم)

احقر نے حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب مدظلہم کی تحریر پر غور کیا، اس میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے اُصولی طور پر وہ دُرست ہے، اور اس سلسلے میں ''اَحسن الفتاویٰ'' ج:۷ ص:۲۸۷ تا ۲۹۴[2] میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے، حضراتِ اکابر کو اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔

اور احقر کی ایک تجویز یہ بھی ہے کہ مدارس کا عقدِ اِجارہ عرف و رواج کے مطابق اگرچہ اِجارہ مسانہہ ہے، تاہم اِجارہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ عقدِ اِجارہ کے وقت باضابطہ اس کی مدّت طے کی جائے ایک سال کے لئے، اور پھر ہر سال اس کی تجدید کی جائے، اور مدرّس کو پورے سال کی تنخواہ دی جائے، یعنی ایامِ تعطیل کی تنخواہ بھی دی جائے۔ اس صورت میں اگر یہ

---

(۱) طبع ادارۂ اسلامیات۔

(۲) طبع ایچ ایم سعید۔

اِشکال ہو کہ ایامِ تعطیل میں مدرّس اپنے آپ کو تسلیم نہیں کرتا اور تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا تو پھر تنخواہ کا استحقاق کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے دورانِ تدریس جمعہ کے روز مدرّس تدریس کے لئے حاضر نہیں ہوتا لیکن اس کا معاہدہ قائم ہونے کی وجہ سے یا راحت لینے اور تازہ دم ہونے کی وجہ سے اس کو تنخواہ دی جاتی ہے، اسی طرح ایامِ تعطیل یعنی اَواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ اس کو ملنی چاہئے۔ البتہ اگر کسی مدرّس کو رمضان کے بعد دوبارہ تدریس کے لئے حاضر ہونے کا ارادہ نہ ہو، اور اَواخرِ شعبان ہی میں اس نے اس کا فیصلہ کرلیا ہو تو ایسی صورت میں دیانۃً اس کو اَواخرِ شعبان اور رمضان کی تنخواہ نہیں لینی چاہئے کیونکہ یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اب راحت و آرام لینے کا فائدہ اس مدرسے کو نہیں پہنچے گا۔

واللہ اعلم

محمد عبدالمنان عفی عنہ

۱۴۱۸/۴/۲۲ھ

(رائے مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی مدظلہم)

احقر کو مذکورہ دونوں حضرات کی رائے دُرست معلوم ہوتی ہے، اور اس پر مزید اِضافے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۱۸/۶/۱۶ھ

(حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ اِستفتاء پر دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے حضرات مفتیان کرام نے اپنی مذکورہ آراء تحریر فرمائیں اور آخر میں اپنی آراء کے ساتھ حتمی فیصلے اور فتویٰ کے لئے یہ تحریر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی، جس پر حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے فتویٰ تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے)

(فتویٰ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

مخدوم مکرّم حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

افسوس ہے کہ گرامی نامے کا جواب جلد نہیں دے سکا، مختلف اَسفار و اَشغال کے ازدحام نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ اپنے اختیار اور انتخاب کے مطابق کسی مسئلے کی تحقیق کرسکوں۔ احقر نے یہ تحریر اپنے دار الافتاء میں بھجوادی تھی، وہاں کے حضرات کی آراء منسلک ہیں، احقر کسی محاکمے کا اہل نہیں، لیکن تعمیلِ حکم میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شوال میں کام کرنے کو رمضان کی تعطیل کی تنخواہ کے لئے موقوف علیہ قرار دینا اور نہ قرار دینا دونوں امر جائز ہیں، موقوف علیہ قرار نہ دینے کا جواز واضح ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ عقدِ اِجارہ میں ایک ماہ کی تنخواہ بلاعمل جو مقرّر کی گئی، وہ گویا سارے سال کے

مجموعی عمل پر ایک اُجرتِ اضافیہ ہے، جو معلوم ہے، اور فریقین کے اتفاق سے جائز ہے۔ اور موقوف علیہ قرار دینے کے جواز کی ایک وجہ تو وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کے جواب میں اشارہ موجود ہے کہ: ''یا شرطِ معروف قرار دی جائے ... الخ'' اور جس پر مولانا محمود اشرف صاحب نے اپنی تحریر کی بنیاد رکھی ہے۔ اور دُوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایامِ بطالت کی تنخواہ تجدیدِ عقدِ اِجارہ کے لئے شرط قرار دی گئی ہے، یعنی اگر شوال میں آئندہ سال کے لئے عقد کی تجدید کی گئی تو ایامِ بطالت کی تنخواہ بھی دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ گویا اس صورت میں عقدِ اِجارہ شعبان پر ختم ہوگیا، شوال میں تجدیدِ عقد کے وقت ایامِ بطالت کی تنخواہ اضافی طور پر شوال کے ساتھ دی گئی۔

بہرصورت! دونوں تخریجات کے مطابق یہ شرط دُرست ہے، اور حکیم الاُمت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا جواب بھی دو مرتبہ اسی کے مطابق فتاویٰ خلیلیہ (ج:۱ ص:۲۴۵ و ۲۴۷) میں موجود ہے۔[1]

البتہ ملازم پر یہ شرط عائد کرنا کہ وہ خارج اوقات میں کوئی معاشی کام نہ کرے، شرطِ فاسد ہے، ہاں مؤجر کو یہ حق ہے کہ وہ خارجی کام کی صورت میں ملازم کی تنخواہ کم مقرّر کرے۔

نوٹس نہ دینے کی صورت میں ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ شاید اس بنیاد پر دُرست ہو کہ عقدِ اِجارہ کی جو مدّت طے ہوئی تھی اس کی پابندی فریقین پر لازم تھی، بلاعذر اسے توڑنے سے فریقِ ثانی کا جو نقصان ہوا، اگر اس کی تلافی کے لئے جانبین ایک ماہ کی تنخواہ کا مطالبہ طے کرلیں تو شاید ''لا ضرر ولا ضرار''[2] کے مطابق ہو، مگر یہ محض ایک احتمال کے درجے میں ہے جس پر مزید غور و تحقیق کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۳۰۱)

کرایہ دار نے کرایہ کی دُکان پر کمرہ اور غسل خانہ وغیرہ بنوایا ہو تو اس کا خرچ کس پر ہے؟

سوال:- زید نے بکر سے ایک دُکان مبلغ سات سو روپے ماہوار پانچ سال کے لئے کرایہ پر لی، اور پانچ سال کا کرایہ پیشگی ادا کردیا، کچھ عرصہ بعد بکر کو تین ہزار روپے کی ضرورت پڑی، زید سے تین ہزار روپے قرضِ حسنہ لیا اور وعدہ کیا کہ ایک ماہ میں ادا کروں گا، مگر وعدے پر تین ہزار روپے نہیں

(۱) طبع مکتبۃ الشیخ کراچی۔

(۲) لا ضرر ولا اضرار. (سنن ابن ماجۃ، باب من بنیٰ فی حقہ ما یضرّ بجارٍ ص:۲۹۶ طبع مکتبہ فاروقی).

دیئے اور کہا یہ روپے بھی کرایہ میں مجرہ کرلینا۔ دُکان کی چھت تقریباً دو سال بعد دو تین جگہ سے ٹپکنے لگی، زید اپنے طور پر مرمت کراتا رہا، مگر جب زیادہ خراب ہوگئی تو بکر سے چھت بنوانے کے لئے کہا، بڑی مشکل سے بکر نے زید سے کہا کہ چھت بنوالو جو خرچہ ہوگا وہ تم اپنے پاس سے کرو، کرایہ میں مجرہ کرو۔ دُکان پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا جب چھت دوبارہ بنوائی تو اس کا توڑنا لازمی تھا، کمرہ توڑ دیا گیا، بکر کہنے لگا کہ: اگر کمرہ دُکان کے اگلے حصے پر بنوالیں تو دُکان کی شو ہوجائے گی، زید نے کہا کہ: مجھ کو اعتراض نہیں، جس حصے پر چاہو بنوادوں۔ کئی روز تک مختلف تجاویز ہوتی رہیں، آخر جواب بکر نے یہ دیا کہ: ہمیں کمرے کی ضرورت نہیں، تم اپنے خرچے سے بناؤ، میں خرچہ نہیں دُوں گا۔ زید کو چونکہ بیوپاریوں کے لئے جگہ کی ضرورت تھی لہٰذا اس نے اپنے خرچے سے کمرہ اور پائخانہ اور غسل خانہ بنوالیا، اب جبکہ پانچ سال کرایہ کے اور کچھ مزید مدّت خرچے کی پوری ہوگئی تو کیا زید کو یہ حق ہے کہ کمرہ اور غسل خانے اور پائخانے پر جو خرچ کیا ہے بکر سے وصول کرے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ زید نے کمرہ، غسل خانہ اور پائخانہ خود اپنی مرضی سے بنوایا ہے اور بکر نے اس سے صراحۃً یہ کہہ دیا تھا کہ: ''میں اس خرچ کا نہ خود ذمہ دار ہوں گا اور نہ اس خرچ کو کرایہ میں مجرا کیا جاسکے گا'' تو بکر کے ذمے اس کے اِخراجات ادا کرنا نہیں ہے،[1] ہاں اگر بکر ادا کردے تو اس کے لئے اچھا اور باعثِ اجر ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۲ ب)

معاہدے کی مدّت ختم ہونے پر مکان خالی کرنا لازم ہے

سوال:- اُردو اخبار ''جنگ'' جمعہ ایڈیشن مؤرخہ یکم مئی میں ''غصب کردہ مکان میں نماز'' کے عنوان سے ایک فتویٰ شائع ہوا ہے، جس کی ایک فوٹو کاپی مرسل ہے،[2] جناب کے دارالافتاء سے

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۷۹ (طبع سعید) وعمارة الدّار المستأجرة وتطيينها واصلاح الميزاب وما كان من البناء علىٰ ربّ الدّار وكذا كل ما يخلّ بالسكنىٰ .... واصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج علىٰ صاحب الدّار لكن بلا جبر عليه لأنّه لا يجبر علىٰ اصلاح ملكهٖ فان فعله المستأجر فهو متبرّع.

وفى الشامية تحته: (قوله فهو متبرّع) أى ولا يحسب له من الأجرة.

وفى شرح المجلّة للأتاسیؒ رقم المادّة: ۵۲۹ وان عمل هٰذه الأشياء المستأجر يكون متبرعًا فليس له أن يطالب الأجر بشیءٍ ممّا أنفق على التّعمير والتّرميم قال فى ردّ المحتار: وليس له أن يحسبه من الأجرة.

(۲) ریکارڈ میں یہ فوٹو کاپی موجود نہیں ہے، تاہم حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

ایک فتویٰ حاصل ہوجائے تو ارادہ ہے کہ اسے قانون سازی کے ذمہ دار حکومتی اداروں کو بھیجا جائے کہ وہ شرع کی روشنی میں قانونِ کرایہ داری میں ترمیم کرکے بہت سے جھگڑوں کو ختم کریں، اگر ضروری ہوا تو اس کی ایک نقل صدرِ محترم کو بھی بھیج دی جائے گی۔

جواب:- منسلکہ تراشے[1] میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ دُرست ہے، کرایہ دار کو صرف اُسی وقت تک قبضہ رکھنے کا حق ہے جب تک معاہدے کی مدّت باقی ہو، اور مدّت ختم ہونے پر جب مالک خالی کرنے کو کہے اس وقت خالی کرنا واجب ہے،[2] اِلّا یہ کہ وہ معاہدے کی تجدید پر راضی ہوجائے۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۷۶ ج)

✡✡✡

---

(۱) ریکارڈ میں یہ فوٹو کاپی موجود نہیں ہے، تاہم حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب سے اس تراشے میں موجود مسئلے کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

(۲) وفی الدر المختار کتاب الاجارة ج:۶ ص:۴۵ (طبع سعید) آجر داره كل شهر بكذا فلكل الفسخ عند تمام الشهر.

وفی تبيين الحقائق باب الاجارة الفاسدة ج:۶ ص:۱۱۲ (طبع دار الكتب العلمية، بيروت) ثم اذا تمّ الشهر كان لكل واحد منها نقض الاجارة لانتهاء العقد الصحيح .... الخ.

وكذا فی المبسوط للسرخسی ج:۱۵ ص:۱۴۶ (طبع مكتبه غفاريه كوئثه).

وفی الهندية ج:۴ ص:۴۲۸ كان الرّد على المستأجر بعد انقضاء المدّة ويضمن لو هلك قبل الرّد لأنّه غاصب اهـ.

وفی المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۵۹۶ ص:۳۱۸ لو استعمل واحد ما لا بدون اذن صاحبه كان غاصبًا .... فانّما يلزمه ضمان المنفعة أى أجر المثل اذا لم يكن استعماله بتأويل ملك أو عقد .... الخ. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیّ ص:۶۹۷ (طبع مكتبه حبيبيه).

وفی البحوث فی قضايا فقهية معاصرة ص:۱۱۴ اذا كانت الاجارة لمدّة معلومة استحق المستأجر البقاء عليها الىٰ تلك المدّة ..... الخ.

(۳) وفی الهندية ج:۴ ص:۴۱۱ وأمّا شرائط الصّحة (أى شرائط صحّة الاجارة) فمنها رضاء المتعاقدين ..... الخ.

﴿فصل فی إجارة الأرض والأشجار والحیوان﴾

(زمین، حیوان اور درختوں کے اِجارہ سے متعلق مسائل)

''اِحکار'' یعنی ہمیشہ کے لئے زمین کرایہ پر لینے کا حکم اور تفصیلی شرائط

سوال:- ہمارے علاقے میں ایک قسم کا عقد مروّج ہے کہ ایک شخص دُوسرے شخص کو زمین مکان بنانے کے لئے دیتا ہے، عقد ہی میں کرایۂ مکان متعین کیا جاتا ہے، کرایہ غلے یا نقد کی صورت میں ہوتا ہے، اور سال کے ختم ہونے پر لیا جاتا ہے۔ لیکن عقد کے وقت مدّتِ سکونت کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ یہ عرفاً قدیم زمانے سے متوارث چلی آرہی ہے کہ صاحبِ مکان ہمیشہ کے لئے اپنے گھر میں رہے گا، اس کی وفات کے بعد اس کے ورثاء پشت در پشت، الغرض مالکِ زمین اپنی حیات میں نہ تو مالکِ مکان کو گھر سے نکال سکتا ہے اور نہ ان کے ورثاء۔ اس طرح مالکِ زمین کی وفات کے بعد اس کے ورثاء بھی نہ تو مالکِ مکان کو نکال سکتے ہیں، اور نہ اس کے ورثاء۔ بس مالکِ زمین یا اس کے ورثاء صرف کرایہ لے سکتے ہیں، اور یہ عدم تعیینِ مدّت مفضی الی النزاع بھی نہیں ہے، کیونکہ عرف ایسا ہی ہے۔ پشتو میں اس عقد کو ''غولہ'' یعنی حریم کہا جاتا ہے، البتہ اگر خود مالکِ مکان، مکان کو چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ ہمارے علماء حضرات اس عقد کو احکار میں داخل تصوّر کرتے ہیں اور اِجارۂ مؤبدہ کا نام بھی دیتے ہیں۔ اب امرِ مطلوب یہ ہے کہ ۱:- یہ عقد جائز ہے کہ نہیں؟ ۲- یہ احکار ہے کہ نہیں؟ ۳- صاحبِ زمین صاحبِ مکان کو یا اس کے ورثاء کو بلاوجہ مکان سے نکال سکتے ہیں کہ نہیں؟ ۴- صاحبِ زمین کے ورثاء ایسا کرسکتے ہیں کہ نہیں؟ ۵- اِجارۂ مؤبدہ کا نام کتبِ فقہ میں کہاں ذکر ہے؟

جواب:- اگر کرایہ داری کا عقد کرتے وقت مدّت کا کوئی ذکر نہ کیا جائے تو اصل حکم یہ ہے

کہ اِجارہ صحیح نہیں ہوتا،[۱] یا اگر کوئی مجہول مدّت مقرّر کرلی جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔[۲] لیکن اگر عقد ہی میں یہ بات طے کرلی جائے کہ کرایہ دار اس زمین پر ہمیشہ اپنا قبضہ برقرار رکھے گا اور مالک زمین کو کرایہ ادا کرتا رہے گا اور جب تک وہ زمین کی اُجرتِ مثل ادا کرتا رہے اس وقت تک مالک کو زمین خالی کرانے کا حق نہیں ہوگا، تو اس کو بھی بعض فقہائے کرامؒ نے جائز قرار دیا ہے، اور اسی کو اصطلاح میں ''اِحکار'' (نہ کہ اِحتکار) کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ۱- مالک، عقد ہی کے وقت کرایہ دار کو پٹہ دوامی لکھ دے کہ یہ زمین ہمیشہ کے لئے کرایہ پر دی جارہی ہے۔ ۲- کرایہ دار اس زمین میں کوئی تعمیر وغیرہ کرلے۔ ۳- معاہدے میں یہ بات بھی طے ہو کہ جب اُس جیسی زمینوں کا کرایہ بڑھے گا تو اِس زمین کا بھی کرایہ اسی حساب سے بڑھ جائے گا۔ ۴- کرایہ دار پابندی سے کرایہ دیتا رہے گا۔ ۵- کرایہ دار تین سال تک زمین کو معطل نہ چھوڑے۔ یہ شرائط علامہ شامیؒ نے ردّ المحتار میں ''مطلب مرصد ومشدّ مسكة'' کے عنوان کے تحت (ج:۵ ص:۲۱ و۲۲)[۳] نیز اپنے رسالے ''تحرير العبارة فيمن هو أحق بالاجارة'' میں بیان فرمائی ہیں (رسائل ابنِ عابدین ج:۲ ص:۱۵۴)۔ اور حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ''جواهر الفقه'' (ج:۲ ص:۳۰۳) میں اس مسئلے پر مفصل بحث فرمائی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اصل بات یہ ہے کہ یہ شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ ہم چونکہ آپ کے علاقے کے عرف سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے، لہٰذا آپ مقامی اہلِ افتاء علماء سے رُجوع کرکے ان سے فیصلہ کرائیں کہ جو شرائط ''جواهر الفقه'' میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں وہ یہاں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہوں تو یہ عقد جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔

واللہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۵۹/۲۸۰)

(۱ و ۲) وفي الدّر المختار باب الاجارة الفاسدة ج:۶ ص:۴۶ و ۴۷ تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما أفسد البيع ممّا مرّ يفسدها كجهالة مأجور أو أجرة أو مدّة أو عمل ..... الخ.

وفي خلاصة الفتاوىٰ كتاب الاجارات ج:۳ ص:۱۰۳ (طبع رشيديه كوئٹه) عقد الاجارة لا يجوز الّا أن يبيّن البدل من الجانبين جميعًا أمّا بيان المنفعة فباحدىٰ معان ثلاثة بيان الوقت وهو الأجل ..... الخ.

وفي الفتاوىٰ الكاملية كتاب الاجارات مطلب تفسد الاجارة بجهالة الأجر ويفسد بها العقد سواء كانت الجهالة في الأجرة أو المدّة أو العمل .... الخ. وكذا في البحر الرّائق ج:۸ ص:۱۷.

وفي الهندية كتاب الاجارة ج:۴ ص:۴۱۱ (طبع رشيديه كوئٹه) وأمّا شرائط الصّحة (صحّة الاجارة) .... ومنها بيان المدّة في الدّور والمنازل والحوانيت .... الخ. وفيها أيضًا ج:۴ ص:۴۳۹ الفساد قد يكون لجهالة قدر العمل .... وقد يكون لجهالةقدر المنفعة بأن لا يبيّن المدّة .... الخ.

وكذا في البزازية على الهندية ج:۵ ص:۱۱ كتاب الاجارات.

(۳) ردّ المحتار مطلب في المرصد والقيمة ومشد المسكة ج:۶ ص:۲۶ و ۲۷ (طبع سعيد).

''اِجارۂ اَشجار'' درختوں کے اِجارہ کی شرعی حیثیت اور جواز کا حیلہ

سوال:- کیا درختوں کا اِجارہ یعنی درختوں کو کرایہ پر دینا جائز ہے؟ سنا ہے کہ فتاویٰ رشیدیہ میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ نیز اگر ناجائز ہے تو متبادل طریقۂ کار سے بھی آگاہ فرمائیں۔

جواب:- درختوں کے اِجارہ کو تمام فقہاءؒ نے ناجائز لکھا ہے، چنانچہ علامہ خیرالدین رملیؒ فرماتے ہیں: ''استأجر بقرة لیشرب لبنها لا ینعقد، وکذٰلک لو استأجر بستانًا لیأکل ثمره.'' (فتاویٰ خیریہ ج:۲ ص:۱۲۸)۔[۱] والمسئلة مصرّح بها فی منح الغفّار وکثیر من الکتب وفی الإجارة المذکورة أمور أُخر توجِب فسادها خصوصًا عندنا کالشّیوع وطول المدّة فی الوقف۔

اس کے علاوہ اور بہت سی کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ بتصریح موجود ہے، حتیٰ کہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' جس کا حوالہ دے کر اِستفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ اِجارۂ اَشجار جائز ہے، خود اس میں بھی پوری تصریح کے ساتھ جواز کے بجائے عدمِ جواز کا فتویٰ موجود ہے، مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

درخت کا اِجارہ دُرست نہیں کیونکہ اِجارہ منافع کا ہوتا ہے اعیان و زوائد کی بیع ہوتی ہے.....الخ۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل مبوّب ص:۴۴۷)[۲]

اور اسی پر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے فتویٰ دیا ہے (امداد ج:۳ ص:۱۲۸)[۳]۔

لیکن اس سلسلے میں فقہاء نے جواز کا ایک حیلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ پہلے مالک درختوں کو مساقاۃ (بٹائی) پر اس شرح سے دیدے کہ ایک ہزار میں سے ایک حصہ مالک کا، اور باقی تمام حصے مساقی کے، اور اس کے بعد اسی شخص کو وہ زمین کرایہ پر دیدے، اور اس کی شرح میں مثلی اُجرت پر اتنا اضافہ کردے کہ جتنا عقدِ مساقاۃ میں کم کیا تھا۔ شرط یہ ہے کہ زمین قابلِ زراعت ہو، نیز یہ حیلہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ یہ زمین اور درخت مالِ وقف یا مالِ یتیم میں سے نہ ہوں، چنانچہ اگر کسی نے مالِ وقف یا مالِ یتیم میں یہ حیلہ جاری کردیا تو دونوں عقد باطل ہوجائیں گے، مساقاۃ تو اس لئے کہ اس میں یتیم و وقف کا ضرر ہے، اور اِجارہ اس لئے کہ وہ مساقاۃ کے بطلان کے بعد کیا گیا تو گویا اَرضِ مشغول پر اِجارہ منعقد ہوا، اور وہ باطل ہوتا ہے، اور اسی لئے حیلے میں عقدِ مساقاۃ کو مقدم کرنے کی شرط لگائی گئی

---

(۱) الفتاوی الخیریة علٰی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج:۲ ص:۲۰۴ (طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ).
(۲) ص:۵۱۵ (طبع سعید).
(۳) ج:۳ ص:۳۸۷.

ہے کہ اگر معاملہ بالعکس کردیا تو اِجارۂ زمین باطل ہوجائے گا، لکونها فی الأرض المشغولة۔

ان تمام باتوں کے دلائل کتبِ فقہیہ سے حسبِ ذیل ہیں:-

۱- قال فی الدر المختار وأفاد فساد ما یقع کثیرًا من أخذ کرم الوقف أو الیتیم مساقاةً فیستأجر أرضه الخالیة من الأشجار بمبلغ کثیر ویساقی علیٰ أشجارها بسهم من ألف سهم فالحظّ ظاهر فی الإجارة لا فی المساقاة.

۲- وقال الشامیؒ تحته: اعلم أنّه حیث فسدت المساقاة بقیت الأرض مشغولة فیلزم فساد الإجارة أیضًا کما قدّمناه وان کان الحظّ والمصلحة فیها ظاهرین فتنبّه لهٰذه الدّقیقة.

۳-وفی فتاویٰ الحانوتی التنصیص فی الإجارة علیٰ بیاض الأرض لا یفید الصحة حیث تقدّم عقد الإجارة علیٰ عقد المساقاة اما اذا تقدم عقد المساقاة بشروطهٖ کانت الإجارة صحیحة کما صرّح بهٖ فی البزّازیّة.

(شامی ج:۵ ص:٦ و ۷)(۱)

۴- وفیه بعد أسطر: وهٰذا بالنّسبة إلی الوقف وأمّا مساقاة المالک فلا ینظر فیها إلی المصلحة (ای عدم الجواز) کما لو آجر بدون أجر المثل اهـ.

(ردّ المحتار ج:۵ ص:۷)(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۰/۵/۸ھ(۳)

زمین کی مال گزاری مؤجر پر ہے یا مستأجر پر؟

سوال:- یہاں بعض علاقوں میں رواج ہے کہ زمین اِجارہ میں مال گزاری یعنی فی بوگہ ۸ روپیہ مؤجر ادا کرتا ہے، اور بعض جگہ میں مستأجر ادا کرتا ہے، اور میری کچھ کچھ زمین دونوں علاقوں میں ہے جہاں مؤجر مال گزاری ادا کرتا ہے وہاں تو مجھ سے طلب کیا جاتا ہے اور جہاں مستأجر دیتا ہے کیا اس پر مؤاخذہ عنداللہ ہوگا؟

جواب:- اگر زمین روپیہ کے عوض کرایہ پر دی گئی ہے تو مال گزاری کی ادائیگی کی شرط مستأجر پر لگائی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کی مقدار معلوم ہو اور حکماً یہ کرایہ کا جزء ہوگا، لیکن اگر بٹائی (مزارعت) پر دی گئی ہے تو اس میں یہ شرط مزارع پر عائد نہیں کی جاسکتی اور اگر یہ شرط لگادی گئی ہے تو مزارعت فاسد ہوجائے گی۔

(۱ و ۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الاجارة ج:٦ ص:۸ (طبع سعید).

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

لما في الدر المختار: فتبطل ان شرط لأحدهما قفزان مسماة أو ما يخرج من موضع معين أو رفع ربّ البذر بذرهٔ أو رفع الخراج الموظف (شامی ج:۵ ص: ۲۴۱، استنبول)۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۶۴۳/۱۹ الف)

گائے یا بھینس پرورش کے لئے نصف حصے پر دینے کا حکم اور جواز کی صورت

سوال:- زید اپنی بھینس بکر کو نصف حصے پر دیتا ہے پرورش کے لئے، گائے یا بھینس کی بچیاں چھوٹی چھوٹی تقریباً ڈیڑھ سال کی ہوتی ہیں، زید بکر کو کہتا ہے کہ: یہ کٹی لے جاؤ اور اس کی پرورش کرو۔ ہر قسم کا چارہ وغیرہ یا مکمل انتظام اس کی پرورش کا بکر ہی کرتا ہے، زید کے متعلق کوئی خرچہ نہیں، بکر کی پرورش کرتے کرتے کٹی بچہ دیتی ہے، پہلی دفعہ جب وہ نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے اُس کو ہمارے علاقے کے عرف میں ''وہ تمام سوا'' یعنی جب تک وہ دُودھ دیتی رہتی ہے وہ سارا سوا بکر خود کھاتا پیتا رہتا ہے، جبکہ پہلی دفعہ زید کی طرف سے بھی اس کی اجازت ہوتی ہے، دُوسری مرتبہ جب وہ بھینس بیاتی ہے یا بچہ جنتی ہے تو اب فریقین اس بھینس کا حصہ ختم کرنا چاہتے ہیں، یعنی زید بکر کو کہتا ہے کہ یہ بھینس جو میں نے تمہیں پرورش کے لئے دی ہوئی ہے اس کی قیمت لگاکر یا نصف قیمت لگاکر مجھے دیدے اور بھینس تو لے لے یا نصف قیمت تو لے کر مجھے دیدے، چنانچہ اس طرح کرلیتے ہیں۔ اب قابلِ دریافت اُمور یہ ہیں: ۱-بھینس کا بکر کو نصف حصے پر پرورش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۲-بھینس کی نصف ملکیت بکر کی پرورش کی وجہ سے ہوجاتی ہے یا تمام بھینس کا مالک صرف زید ہی رہتا ہے؟ ۳-اس طرح قیمت لگاکر لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۴-عرفاً یا شرعاً اس طرح بھینس کو پرورش کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ۵-پرورش کرنے والا بھینس کا حصہ تقسیم یا ختم کرنے کے وقت لگاتا ہے مالک بھینس کی قیمت نہیں لگاتا؟ بعدہ بھینس دینے والا مختار ہوتا ہے چاہے نصف قیمت پرورش کرنے والے

---

(۱) الدّر المختار کتاب المزارعة ج:۶ ص:۲۷۶ (طبع سعید).
وفي البحر الرّائق كتاب المزارعة ج:۸ ص:۱۶۱ (طبع سعيد) أو اشترطا لأحدهما قفزانا مسماة أو ما على الماذيانات والسواقي أو أن يرفع ربّ البذر بذره أو يرفع من الخارج الخراج والباقي بينهما فسدت ...... وفيه بعد أسطر .... أو يرفع ربّ البذر بذره أو يدفع الخراج فلأنّه يؤدّى الىٰ قطع الشركة في البعض أو الكل وشرط صحتها أن يكون الخارج مشتركًا بينهما والمراد بالخراج الخراج المؤظف نصفًا أو ثلثًا أو نحو ذٰلک .... الخ.
وكذا في الهندية، كتاب المزارعة ج:۵ ص:۲۳۵ (طبع رشيديه) والهداية، كتاب المزارعة ج:۴ ص:۴۲۶ (طبع شركت علميه وفي طبع مكتبه رحمانيه ج:۴ ص:۴۲۴) و بدائع الصنائع، كتاب المزارعة ج:۶ ص:۱۸۰ (طبع سعيد).

کو دے کر بھینس لے لے یا نصف قیمت اُس سے لے کر بھینس پرورش کرنے والے کو دیدے۔ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- گائے یا بھینس کو پرورش کے لئے نصف حصے پر دینا شرعاً جائز نہیں، اس سے اِجارہ فاسد ہوجاتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بھینس بدستور زید کی ملکیت ہے اور بکر نے اسے جتنا چارہ اپنی ملکیت میں سے کھلایا اس کی قیمت زید بکر کو ادا کرے، نیز بکر نے اس کی جتنے دن خدمت کی اس کی اُجرت بھی زید پر واجب ہے،[1] اور اُجرت اتنی ہوگی جتنی عام طور سے اس مقصد کے لئے کسی شخص کو مزدوری پر رکھ کر دی جاتی۔[2] دُوسری طرف بکر نے اُس بھینس کا جتنا دُودھ یا سوا استعمال کیا اُتنا ہی دُودھ اور سوا اُس پر واجب ہے کہ زید کو ادا کرے، بھینس بہرصورت پوری کی پوری زید کی ملکیت ہے، لہٰذا پہلے تو باہم معاملہ اس طرح دُرست کرلیں، اس کے بعد اگر زید بکر کو پوری بھینس یا اس کا نصف حصہ فروخت کرنا چاہے تو دونوں باہمی رضامندی سے ایسا کرسکتے ہیں، اور پرورش کا مذکورہ معاملہ تو ناجائز ہے۔ لہٰذا جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ زید بکر کو بھینس کا نصف حصہ فروخت کردے، اس کے بعد اس کی قیمت معاف کردے، اور بکر سے کہے کہ تم اس کی پرورش کرو اور دُودھ آدھا آدھا ہوگا، اور بکر اس پر راضی ہوجائے، تاہم اس صورت میں بکر کسی وقت چارے کا نصف خرچ وصول کرنا چاہے تو کرسکے گا۔ لما فی العالمگیریة دفع بقرة الیٰ رجل علیٰ أن یعلفها وما یکون من اللبن والسمن بینهما أنصافًا فالإجارة فاسدة، وعلیٰ صاحب البقرة للرجل أجر قیامه وقیمة علفه إن علفها من علف هو ملکه لا ما سرحها فی المرعیٰ، ویردّ کل اللبن إن کان قائمًا و إن أتلف فالمثل إلیٰ صاحبها .... والحیلة فی جوازه أن یبیع نصف البقرة منه بثمن ویبرئه عنه ثم یأمر باتخاذ اللبن والمصل فیکون بینهما. (عالمگیریة ج:۴ ص:۴۴۵، ۴۴۶ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وما معناه من الاجارة)۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۴/۲۸ الف)

(۱ و ۲) وفی الهدایة ج:۳ ص:۳۰۳ (طبع مکتبه رحمانیه) والواجب فی الاجارة الفاسدة أجر المثل لا یجاوز به المسمّٰی .... الخ.

(۳) طبع مکتبة رشیدیة. وفی خلاصة الفتاویٰ کتاب الاجارات وما یتصل بهٰذا ج:۳ ص:۱۱۴ (طبع مکتبه رشیدیه). وفی فتاویٰ النسفی رجل دفع بقرة الیٰ رجل بالعلف مناصفة وهی الّتی بالفارسیة کاونیم سود بأن دفع علیٰ أن ما یحصل من اللّبن والسمن بینهما نصفان فهٰذا فاسد والحادث کلّه لصاحب البقرة والاجارة فاسدة.

وکذا فی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة کتاب الاجارة النّوع الثّالث فی الدّواب ج:۵ ص:۳۷ (طبع رشیدیه).

نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۳۴۲ و ۳۴۳ (طبع دار العلوم کراچی)۔

وکذا فی الهدایة ج:۳ ص:۳۰۵ کتاب الاجارات والدّر المختار ج:۶ ص:۵۶ باب الاجارة الفاسدة والبحر الرّائق ج:۸ ص:۲۳ کتاب الاجارة (طبع سعید).

جانور کو نصف پر دینے کا حکم

سوال:- ایک آدمی بغرضِ پرورِش اپنی گائے دُوسرے آدمی کو بالنصف دیتا ہے، یعنی جو اولاد پیدا ہوگی، نصف نصف ہوگی، اس صورت میں اگر گائے مالک کے پاس آجائے یا لینے والے کے حصے میں آجائے اور اس سے کوئی تیسرا شخص خریدے یا دونوں سے متفقہ طور پر خریدے تو کیا اس گائے کی قربانی دُرست ہوگی؟

جواب:- مذکورہ صورت میں معاملہ ناجائز ہے،[1] لہٰذا پہلے یہ لکھئے کہ مالک یا پالنے والے کے پاس گائے کس طرح آئی آیا پورا جانور بیع سے آیا یا اس کے آدھے حصے کو فروخت کیا۔

واللہ اعلم
۱۳۸۷/۲/۱۴ھ

(۱) تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ ہو۔

﴿فصل فی نفس الأجرة﴾

(”تنخواہ، اُجرت“ اور مختلف الاؤنسز سے متعلق مسائل)

شرعاً ملازم کی تنخواہ مقرّر کرنے کا معیار کیا ہے؟ ملازم کی ضرورت یا اس کی قابلیت؟

سوال:- بخدمت جناب مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنابِ عالی! میں نے ابھی حال میں ایک صاحب کو دُوسرے صاحب سے مسئلہ دریافت کرتے ہوئے سنا، جواب سے تسکین نہیں ہوئی، چنانچہ اس لئے سوال اور اس کا جواب ذیل میں درج کر رہا ہوں، اس مسئلے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ صحیح جواب کیا ہے؟

”سوال- مسئلہ یہ ہے کہ ایک ملازم ایک انجینئر ہے اور اس کے دو بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہوار ہے، دُوسرا ملازم ایک مزدور ہے اور اس کے چھ بچے اور ایک بیوی ہے، اس کی تنخواہ صرف ایک ہزار روپے ہے، اسلام کے قوانین اور نظام کے مطابق تعین ملازم کی قابلیت پر ہوتا ہے یا ملازم کی ضروریات کی بنیاد پر۔

جواب- اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔“

برائے مہربانی جواب ارسال کرتے وقت مندرجہ ذیل اُمور پر بھی روشنی ضرور ڈالیں جو مذکورہ سوال سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں:

۱-ایک ملازم کی ضروریات کا تعین کیسے کیا جائے گا؟

۲-ایک ملازم اکیلا ہوگا، دُوسرے کے کئی بچے ہوں گے، اور اگر دونوں ایک ہی قابلیت رکھتے ہوں گے تو تنخواہ کا فیصلہ کیسے ہوگا؟

۳-حکومت کے ملازم اور نجی فرم کے ملازم کی تنخواہیں ایک طریقے سے مقرّر ہوں گی یا طریقہ جدا جدا ہوگا؟ اور گھریلو ملازمین کی تنخواہ مقرّر کرتے وقت طریقۂ کار میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

۴- امریکا اور دُوسرے ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں کی کم از کم تنخواہ مقرّر ہے، جو حکومت

وہاں کی مہنگائی کو سامنے رکھ کر مقرّر کرتی ہے، اور کچھ عرصہ بعد اس کم از کم تنخواہ کو مہنگائی کے مطابق بڑھاتی رہتی ہے، البتہ کم از کم تنخواہ کے بعد وہاں تنخواہیں قابلیت اور پیسے کی مانگ کی بنیاد پر مقرّر ہوتی ہیں، یہ طریقۂ کار کس حد تک اسلامی طریقے سے قریب ہے؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، دراصل ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے ''عقدِ اِجارہ'' ہے، جس میں جانبین کی باہمی رضامندی سے جو اُجرت بھی طے کرلی جائے وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ایک فریق نے دُوسرے فریق کی منظوری زبردستی حاصل نہ کی ہو، اس طرح جو اُجرت بھی طے ہوجائے، شرعاً وہ دُرست ہے، خواہ وہ اہلیت کی بنیاد پر ہوئی ہو، یا کام کی بنیاد پر، یا ضرورت کی بنیاد پر۔

البتہ اسلامی حکومت اگر یہ دیکھے کہ محنت کرنے والوں کی اُجرتیں مناسب مقرّر نہیں کی جارہی ہیں، تو وہ اُجرتوں کا کوئی معیار بھی مقرّر کرسکتی ہے،(۱) جس کی پابندی فریقین پر لازم ہوگی۔(۲) اس معیار کے تعین کے وقت حکومت کو اہلیت، کام اور ضرورت تینوں باتوں کو مدِنظر رکھنا ہوگا، کسی ایک بنیاد پر مقرّر کرنا دُرست نہیں ہوگا۔

اس تشریح سے واضح ہوگیا ہوگا کہ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ: ''اسلامی نظام میں تنخواہ کا تعین قابلیت کی بنیاد پر نہیں، مزدور کی ضروریات کی بنیاد پر ہوتا ہے'' اس سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوگیا ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۴/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۱/۷/ج)

مزدور کی اُجرت کی تعین کا شرعی معیار کیا ہے؟

سوال ۱:- معاوضے کی ادائیگی کا معیار کیا ہے؟ پیداوار، محنت یا کارکن کی ضرورت؟

۲:- سیزنل فیکٹریوں میں تمام آمدنی کا واحد ذریعہ چالو سیزن میں حاصل شدہ پیداوار ہے جس کی کھپت کے منافع سے فیکٹری کے تمام شعبہ جات کی اُجرتوں کی ادائیگی ہوتی ہے، اور دیگر اِخراجات پورے کئے جاتے ہیں، اس طرح بند سیزن میں رکھے گئے کارکنوں

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۹۹ (طبع سعید) (الحظر والاباحۃ) ولا یسعّر حاکم لقولہ علیہ الصلوٰۃ السلام: لا تسعّروا فانّ اللہ ھو المسعّر القابض الباسط الرّازق. الّا اذا تعدّی الأرباب عن القیمۃ تعدیا فاحشًا فیسعر بمشورۃ أھل الرأی.
ونظیرہ کما فی البحر الرّائق کتاب القسمۃ ج:۸ ص:۱۴۸ (طبع سعید) ..... والّا نصب قاسمًا یُقسم بأجرۃ بعدد الرّؤس یعنی ان لم ینصب قاسمًا رزقہ فی بیت المال نصیبہ وجعل رزقہ علی المتقاسمین لأنّ النفع لھم علی الخصوص ..... ویقدر لہ القاضی أجرۃ مثلہ کی لا یطمع فی أموالھم ویتحکم بالزیادۃ.
وفی الأشباہ والنظائر ص:۱۵۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) تصرّف الامام علی الرّعیۃ منوط بالمصلحۃ.

(۲) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۱۷۲ تجب طاعۃ الامام فیما لیس بمعصیۃ.
وراجع للدّلائل والتّفصیل الی الدّر المختار مطلب فی وجوب طاعۃ الامام ج:۴ ص:۲۶۴ (طبع سعید). نیز دیکھئے ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

کو تنخواہیں اور دیگر مراعات بھی اس منافع سے دی جاتی ہیں، جبکہ بیکار ہونے والے افراد کی تنخواہ اور دیگر مراعات یکسر بند کردی جاتی ہیں، اور جن کارکنوں کو بارہ ماہ مستقل کام کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے وہ بارہ ماہ تو کام نہیں کرتے چونکہ پیداوار ہی چند ماہ ہوتی ہے، مگر اس پیداوار کی کھپت کے منافع سے جس میں سیزنل کارکن بھرپور حصہ لیتے ہیں مذکورہ مستقل کارکن کو تنخواہیں اور دیگر مراعات تمام سال فراہم کی جاتی ہیں، جبکہ سیزنل کارکنوں کو صرف دورانِ سیزن، کیا یہ جائز ہے؟

۳:- نئی لیبر پالیسی میں مزدوروں کی اُجرت کا تعین "وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ" (سورۂ بقرہ آیت:۲۱۸) کی بنیاد پر کیا جانا جائز ہے؟

جواب ۱:- شرعاً اُجرت کے تعین کا معیار باہمی معاہدہ ہے، یعنی باہمی رضامندی سے جو اُجرت مقرّر کردی جائے وہ شرعاً جائز ہے[1]، البتہ ہر فریق پر دیانۃً یہ واجب ہے کہ وہ دُوسرے فریق کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر کوئی ایسی اُجرت مقرّر نہ کرے جو اتنی کارکردگی کے لحاظ سے عرفاً ناکافی یا بہت زائد ہو[2]، چنانچہ یہ آجر کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اُجرت کے تعین کے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ اَجیر کو اس کی کارکردگی کے مطابق مناسب اور کافی اُجرت ملے[3]۔ دُوسرے الفاظ میں قانونی طور پر اُجرت کے تعین کا معیار اگرچہ باہمی معاہدہ ہے، لیکن اخلاقی طور پر اور دیانۃً اس کا معیار کارکردگی کی نوعیت ہے، اور اگر کسی جگہ آجر اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی بجائے مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر کم اُجرت مقرّر کرتے ہوں تو ایسی صورت میں حکومت کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ کم سے کم اُجرت متعین کردے، اس صورت میں آجروں پر اس کی پابندی قانوناً بھی لازمی ہوگی[4]۔

۲:- اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہر کام کرنے والا اتنی مدّت کی اُجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی مدّت اس نے کام کیا، لیکن اگر کوئی آجر کسی اَجیر کو اس بات کا پابند کردے کہ وہ سارے سال اس کا ملازم رہے گا خواہ اس کو کام کرنا پڑے یا نہ پڑے، چونکہ اس کو سارے سال کے لئے پابند کرلیا گیا ہے اس لئے آجر پر اس کے سارے سال کی تنخواہ واجب ہوگی، خواہ وہ اس سے کام لے یا نہ لے[5]۔ اس کے برخلاف اگر کسی کو سارے سال کے لئے پابند نہیں کیا گیا تو اس کی صرف اتنی مدّت کی تنخواہ آجر پر

(۱ تا ۳) وفي سنن الترمذي، باب ما جاء في التسعير رقم الحديث:۱۲۳۵ "عن أنس رضي الله عنه قال: غلا السعر علىٰ عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالوا: يا رسول الله! سعّر لنا. فقال: انّ الله هو المسعّر القابض الباسط الرّزاق وانّي لأرجوا أن ألقىٰ ربّي وليس أحدٌ منكم يطلبني بمظلمة في دم ولا مال" قال أبو عيسىٰ: هٰذا حديث حسنٌ صحيحٌ.
وفي حاشية السندي علىٰ ابن ماجة ج:۴ ص:۴۲۲ .... وفيه اشارة الىٰ أن التسعير تصرّف في أموال الناس بغير اذن أهلها فيكون ظلمًا فليس للامام أن يسعّر لٰكن يأمرهم بالانصاف والشفقة على الخلق والنّصيحة.
(۴) دیکھئے پچھلے صفحے کے حواشی اور ص:۹۰ کا حاشیہ نمبر۳۔
(۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۸۸ کا حاشیہ۔

واجب ہوگی جتنی مدّت کا اسے پابند کیا گیا ہے، باقی مدّت میں چونکہ وہ دُوسرا کام کرنے کے لئے آزاد ہے اس لئے اس کی اُجرت بھی آجر پر واجب نہیں۔

ہاں! اگر کام سے آزاد رہنے کی مدت ایسی ہو کہ اس میں مزدور کو کسی دُوسری جگہ کام ملنے کی توقع نہ ہو تو وہ آجر سے یہ معاہدہ کرسکتا ہے کہ اس کی مدّتِ کارکردگی کی اُجرت اتنی زیادہ مقرّر کی جائے جو اس کی بےکاری کے اَیام کی بھی کفالت کرسکے۔

۳:- "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ"(۱) کا اُجرت کے تعین کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان اپنی زائد از ضرورت رقم کو ضرورت مند اَفراد میں خرچ کیا کریں(۲)، یعنی ان کو کسی اُجرت کے طور پر نہیں، بلکہ ہدیہ یا صدقہ کے طور پر دیا کریں، جہاں تک اُجرت کا تعلق ہے اس کے تعین کا مسئلہ سوال نمبر۱ کے جواب میں گزر چکا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۵۳ ج)

مدرّس کے لئے اَیامِ غیرحاضری کی تنخواہ کا حکم

سوال:- واعظ مدرّس کو صاحبِ مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسے سے غیرحاضری کے اَیام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسے سے باضابطہ رُخصت لی ہے، اور وعظ پر اُجرت نہ لینے کا کوئی معاہدہ منتظمینِ مدرسہ سے نہیں ہوا تو جائز ہے۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱/ ۱۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

اِمامت میں ناغہ کرنے کی بناء پر تنخواہ کاٹنے کا حکم

سوال:- باتنخواہ اِمام اگر نمازوں میں ناغہ کرے اس کو پوری تنخواہ لینی جائز ہے یا نہیں؟ اگر

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت: ۲۱۹.

(۲) دیکھئے تفسیر "معارف القرآن" ج:۱ ص:۵۳۸۔

(۳) فی الشامیۃ ج:۴ ص:۴۱۹ (طبع سعید) اما لو شرط شرطًا تبع کحضور الدرس أیّامًا معلومۃ فی کل جمعۃ فلا یستحق المعلوم الا من باشر خصوصًا اذا قال من غاب عن الدّرس قطع معلومہ فیجب اتباعہ. وتمامہ فی البحر.

ناجائز ہے تو لینے پر اِصرار کی صورت میں اَکلِ حرام کا مرتکب ہوگا یا نہیں؟ ایسی صورت میں اس کی اقتداء دُرست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- تنخواہ دار پیش اِمام کے لئے معاہدے کے خلاف ناغہ کرنا جائز نہیں، اور اگر معاہدے میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغہ کرنے پر تنخواہ کاٹی جائے گی تو انہیں پوری تنخواہ نہ لینی چاہئے،(۱) اگر انہوں نے غفلت یا بے توجہی سے پوری تنخواہ لے لی ہے تو انہیں متنبہ کردینا چاہئے، اور اگر اس پر بھی وہ تنخواہ کا واجب الرّد حصہ واپس نہ کریں اور اس کو عادت بنالیں تو جب تک توبہ نہ کریں ان کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی، لیکن فاسد نہیں۔　　واللہ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　۱۳۸۸/۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵/ ۱۱ الف)

سودی معاملات کرنے کی وجہ سے حکومت کے ہر ملازم کی تنخواہ کو ناجائز قرار دینے کا حکم

سوال:- ہمارے ایک دوست ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی تنخواہ جو بھی ملازم لیتا ہے

---

(۱) کیونکہ اِمام اَجیرِ خاص ہے جو تسلیمِ نفس اور وقت دینے پر ہی اُجرت کا مستحق ہوتا ہے، اگر ناغہ کرے تو اُجرت کا مستحق نہیں۔

وفی الدر المختار ج:٦ ص:٦٩ والثانی وهو الأجیر الخاص ویسمّٰی أجیر وحد وهو من یعمل لواحد عملًا مؤقتًا بالتخصیص ویستحق الأجر بتسلیم نفسه فی المدّة وان لم یعمل کمن استوجر شهرًا للخدمة أو شهرًا لرعی الغنم المسمّٰی بأجر مسمّٰی.

وفی الهندیة ج:۴ ص:۵۰۰ والأجیر الخاص من یستحق الأجر بتسلیم نفسه وبمضی المدّة ولا یشترط فی العمل فی حقه لاستحقاق الأجر.

اور ناغہ کرنے پر تنخواہ کے کٹنے کی صراحت مبسوط کے اس جزئیہ میں ہے:-

ولو کان یبطل من الشهر یومًا أو یومین لا یرعاها حوسب بذٰلک من أجره سواء کان من مرض أو بطالة لأنّه یستحق الأجر بتسلیم منافعه وذٰلک ینعدم فی مدّة البطالة سواء کان بعذر أو بغیر عذرٍ.

المبسوط للسرخسی ج:۱۵ ص:۱۶۲.

وفی الشامیة ج:٦ ص:۴۵ (طبع سعید) ووجه الفساد أنّ مقتضی العقد أن لا تلزم الأجرة مدّة العطلة قلت أو کثرت.

نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۸۶۲۔ واضح رہے تنخواہ کے کٹنے کا مذکورہ حکم کبھی کبھار کی جائز چھٹیوں کے علاوہ ناغے کرنے سے متعلق ہے، جیسا کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے ''جائز چھٹیوں کے علاوہ'' کی صراحت فرمادی ہے، کیونکہ ضرورت وراحت کی غرض سے عرف ورواج کے مطابق کبھی کبھار چھٹی کی گنجائش ہے، چنانچہ شامی کتاب الوقف ج:۴ ص:۴۱۹ (طبع شیدیہ):-

امام یترک الامامة لزیارة أقربائه فی الرساتیق أسبوعًا أو نحوه أو لمصیبة أو لاستراحة لا بأس به ومثله عفو فی العادة والشرع.

تفصیل کے لئے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند عزیز الفتاویٰ ص:۶۶۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

حرام ہے، کیونکہ حکومت کا تمام کاروبار سودی ہے، اور سودی رقم سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے، اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب:- آپ کے دوست کا خیال دُرست نہیں، حکومت کی ساری آمدنی سودی نہیں ہے بلکہ بہت سے ذرائع آمدنی جائز ہیں، اور ایسی صورت میں اس سے تنخواہ وصول کرنا شرعاً جائز اور دُرست ہے۔[1]

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۷۵۱/۲۷ و)

غلط بیانی کر کے سواری کا الاؤنس وصول کرنے کا حکم

سوال:- ہم اسکول کے ملازم ہیں، ہم کو سواری الاؤنس ملتا ہے، اس طرح کہ دفتر یا اسکول سے گھر کا فاصلہ ساڑھے تین میل سے زائد ہو تو مبلغ پچیّس روپیہ ماہوار، اور ساڑھے سات میل ہو تو تیس روپیہ ماہوار بطور کرایہ حکومت دیتی ہے، اب اگر کوئی شخص اسکول کے ایک فرلانگ پر رہتا ہے، غلط بیانی کر کے کہتا ہے کہ میں آٹھ میل کے فاصلے پر رہتا ہوں، اور مطلوبہ رقم تیس روپے وصول کرلیتا ہے تو یہ جائز ہے؟

جواب:- غلط بیانی کر کے حکومت کے قانون کے خلاف یہ الاؤنس وصول کرنا بھی ناجائز ہے اور جو افسر جانتے بوجھتے اس کی اجازت دیتا ہے وہ بھی گناہگار ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۵۸/۲۸ الف)

قربانی کی کھال اور فطرے سے اِمام کو تنخواہ دینے کا حکم

سوال:- کیا پیش اِمام کو فطرانہ یا قربانی کی کھال وغیرہ دینا دُرست ہے؟ جبکہ اِمام بالکل غریب آدمی ہے اور دس بارہ کھانے والے ہیں، تنخواہ بھی بہت کم ہے، یہ چیزیں اُجرت میں نہیں دی جاتیں بلکہ صرف ﷲ دی جاتی ہے، کیا یہ دینا دُرست ہے؟

جواب:- اگر پیش اِمام صاحبِ نصاب نہیں ہے تو اسے فطرہ اور قربانی کی کھال وصول کرنا

---

(۱) کیونکہ غالب حلال ہونے کی صورت میں اس سے تنخواہ لینا جائز ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۵ کا حاشیہ نمبر۳۔

جائز ہے،[۱] اور اگر وہ کسی بھی طرح صاحبِ نصاب ہو تو وصول کرنا جائز نہیں۔[۲] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۴/۱۸ الف)

اور یہ کہ اُجرت میں دیتے ہیں یا بطور خدمت؟ اس کا فیصلہ اِمام اور مقتدی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کرلیں، اگر کوئی شخص قربانی کی کھال اور فطرے کی رقم دُوسرے کو دیدے اور اِمام یا اِمام کا ہمدرد ناراض نہ ہو تو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خدمت ہے اُجرت نہیں، اگر اِمام کو نہ دیں تو اِمام شکایت کرتا پھرے یہ نشانی اُجرت کی ہے، اللہ سے ڈر کر غور کریں۔[۳]

کتبہ العبد الحقیر

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

بغیر سواری کے آنے والے سرکاری ملازم کے لئے کرایۂ سواری لینے کا حکم

سوال:- فیڈرل گورنمنٹ اپنے ملازمین کو سواری کا کرایہ دیتی ہے، اس کی حد بھی مقرّر ہے کہ ساڑھے تین میل تک پچیّس روپے اور ساڑھے سات میل سے اُوپر کے لئے تیس روپے، ایک آدمی اسی شہر میں رہتا ہے جہاں وہ ڈیوٹی دیتا ہے یعنی اسکول میں ملازم ہے، اور اسکول سے چار سو گز کے فاصلے پر قیام پذیر ہے، بس یا کسی اور ذریعے سے اسکول نہیں آتا لیکن بل میں ہر ماہ تیس روپے درج کردیتا ہے اور یہ عذر کرتا ہے کہ میرا گھر بھی دوسو، چار سو میل دُور ہے، ماہ میں ایک مرتبہ جانا پڑتا ہے۔ اس طرح سے یہ کرایہ اور الاؤنس لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ کرایۂ سواری اگر تنخواہ کا جزء ہوتا تب تو ہر حال میں اس کا لینا جائز تھا، لیکن حکومت نے تفصیل رکھی ہے کہ اتنے میل پر جس کی رہائش ہو اُسے اتنا کرایہ دیا جائے گا، یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ رقم تنخواہ کا جزء نہیں بلکہ کرایۂ آمد و رفت ہے، لہٰذا اس نام سے اتنی ہی رقم وصول کرنا شرعاً جائز ہے جتنی رقم واقعۃً کرایہ میں لگتی ہو، چنانچہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۳۳۹ (طبع سعید) مصرف الزّکوٰۃ هو فقیر (وهو من له أدنی شیء) أی دون نصاب أو قدر نصاب غیر نام مستغرق فی الحاجة.

وفی الهندیة کتاب الزکوٰۃ ج:۱ ص:۱۸۹ ولا یجوز دفع الزکوٰۃ الیٰ من یملک نصابًا .... الخ.

(۲) ولا یجوز دفع الزّکوٰۃ الیٰ من یملک نصابًا ..... الخ.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۲ ص:۳۴۴ (طبع سعید) ویشترط أن یکون الصّرف تملیکًا لا اباحة ..... الخ.

وفی الهندیة کتاب الزکوٰۃ باب المصارف ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو نوی الزّکوٰۃ بما یدفع المعلّم الی الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصّبیان أیضًا أجزأه والّا فلا .... الخ.

کرایۂ سواری وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہ تأویل بھی دُرست نہیں کہ اصلی گھر دو سو یا چار سو میل دُور ہے، کیونکہ حکومت نے اصلی گھر تک پہنچانے اور وہاں سے واپس لانے کے کرائے کی ذمہ داری نہیں لی ہے، اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی تو اسے حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے، اس سے صدقہ کرنا بھی دُرست نہیں، اِلَّا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اس صورت میں بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردی جائے۔(۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۱/۲۷ و)

اُوور ٹائم لگائے بغیر اس کی تنخواہ وصول کرنے کا حکم

سوال:- میں بحیثیت اسٹونو ٹائپسٹ کے ملازمت کرتا ہوں، میرے محکمے کا سب سے بڑا سربراہ چیف انجینئر ہوتا ہے، میرے محکمے میں ہر ملازم کو تقریباً تیس گھنٹے کا اُوور ٹائم ملتا ہے، روز کے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے حساب سے، آفس کے اوقات کے بعد عموماً کبھی کبھی گھنٹہ دو گھنٹہ اُوور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہم لوگ دو بجے کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں کیونکہ کام ہی اتنا ہوتا ہے۔ اب دریافت یہ ہے کہ کیا بغیر اُوور ٹائم کئے ہوئے اُوور ٹائم کی رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ چیف انجینئر صاحب کو بھی اس کا پتہ ہے کہ کبھی کبھی اُوور ٹائم کے لئے رُکتا ہے، اکثر نہیں رُکتا، اس کے باوجود وہ تیس گھنٹے کا اُوور ٹائم لگادیتے ہیں، جبکہ آفس کے کام کے بعد اُوور ٹائم کا کام نہیں ہوتا۔

جواب:- اُوور ٹائم کے نام سے کوئی رقم وصول کرنا اُسی وقت جائز ہوگا جبکہ واقعۃً ملازم نے وقتِ مقرّرہ سے زائد کام کیا ہو، جس روز وقتِ مقرّرہ سے زائد کام نہیں کیا اُس روز کا اُوور ٹائم لینا دُرست نہیں۔ اگر چیف انجینئر صاحب واقعۃً ملازمین کی خیرخواہی کرنا چاہتے ہیں تو تنخواہ میں اضافہ کرادیں، لیکن اُوور ٹائم کے نام سے غلط بیانی کی شرعاً اجازت نہیں ہوسکتی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۱۴/۲۷ ب)

غلط بیانی کرکے تنخواہ میں اضافہ کرانے کا حکم

سوال:- غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی دلیل یہ ہو کہ چونکہ حکومت تنخواہ نہیں بڑھاتی اُوپر سے گرانی بھی ہوتی چلی جارہی ہے، اور وہ آدمی اگر پرائیویٹ پڑھاتا تو اتنی ہی (یعنی زیادہ) تنخواہ مل جاتی۔ اب اس کو مدِنظر رکھ کر غلط بیان دے کر اپنی تنخواہ بڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفي الشامية ج:۵ ص:۹۹ والحاصل انّه ان علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم وإلّا فان علم عين الحرام لا يحلّ له ويتصدّق به بنيّة صاحبه .... الخ.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں چونکہ وہ شخص غلط بیان دیتا ہے، اس لئے یہ عمل جائز نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ　　　　الجواب صحیح

۱۳۸۷/۱۲/۱۷ھ　　　　محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۲/۱۸ الف)

زکوٰۃ وصدقات کی رُقوم سے مہتمم اور مدرّسین و ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کا حکم

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، اس مسجد میں ایک چھوٹا سا دِینی مدرسہ بھی قائم ہے، جس کا مہتمم زید ہی ہے، یہ مدرسہ اقامتی ہے، طلباء، اساتذہ، باورچی وغیرہ کے لئے تین ٹائم کھانے کا انتظام بھی مدرسے کے ذمے ہے، زید کے اعتماد، تعلق اور کوشش سے حاصل شدہ چندہ وغیرہ کی آمدنی سے مدرسے کا کام چل رہا ہے، مالی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اکاؤنٹینٹ نہیں ہے، زید آمد وخرچ کا حساب کرتا ہے، کیا زید از رُوئے شرع مدرسہ ھٰذا کے فنڈ سے مشاہرہ لینے کا حق رکھتا ہے؟ جبکہ مدرسے کی کوئی کمیٹی نہیں خود اپنی تنخواہ مقرّر کرسکتا ہے؟

جواب:- پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ مدرّسین، مہتمم یا دُوسرے ملازمین کی تنخواہیں زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رُقوم سے شرعاً نہیں دی جاسکتیں،[1] لہٰذا اگر مذکورہ رقمیں زکوٰۃ کی ہیں تو اُن سے نہ مدرّسین کی تنخواہ دی جاسکتی ہے، نہ آپ تنخواہ لے سکتے ہیں۔[2] ہاں جو رُقوم زکوٰۃ کے علاوہ عام چندے کی ہوں اُن سے مدرّسین و ملازمین کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور مہتمم بھی اُن سے تنخواہ وصول کرسکتا ہے، البتہ تنخواہ کا تعین کرنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ چندہ دہندگان کی رائے معلوم کی جائے اور تنخواہ مقرّر کرنے میں اس بات کی رعایت رکھی جائے کہ وہ بالمعروف ہو، یعنی اُس جیسے مدرسے میں اُس جیسے کام کرنے والے مہتمم کی عموماً کیا تنخواہ مقرّر ہوتی ہے؟ اُس سے زائد مقرّر نہ کی جائے، اور موضعِ تہمت سے بچنے، نیز احتیاط کے پیشِ نظر چندہ دہندگان یا دُوسرے مدرّسین و ملازمین سے مشورہ کرلینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲۵/۲۷ و)

(۱ و ۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۳۹۰ کے حواشی۔

﴿فصل فی الإجارة علی المعاصی﴾

(مختلف ناجائز اور معصیت کی ملازمتوں کے اَحکام)

سودی کاروبار کرنے والے مالیاتی ادارے کی ملازمت اور آمدنی کا حکم

سوال:- میں ایک مالیاتی ادارے میں کام کر رہا ہوں، جہاں سودی کاروبار ہے، یعنی بعض کمپنیوں کو سود پر اور بعض کو نفع ونقصان پر قرضے دیتی ہے، اور نفع بھی اس طرح ہے کہ فیصد فکسڈ ہے، یعنی پندرہ فیصد سال میں، اور اگر نقصان ہوجائے تو بھی پانچ فیصد، بلکہ نقصان کی صورت میں بھی اس کو منافع ہوتا ہے، کیونکہ پندرہ فیصد جو منافع کا حصہ ہے اس کے برابر کمپنی کے سرٹیفکیٹس یعنی حصص لے لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ سودی کاغذات بھی لکھنے پڑتے ہیں کہ آپ کے ذمے اتنا سود ہے، اسے ادا کرو۔ اور سود کی جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے، بعض اوقات جسے قرضے دیتے ہیں اس کے لئے کمپنی کا معائینہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ شرع کی رُو سے جواب دیں کہ اس میں نوکری جائز ہے؟ یا بالکل ناجائز؟ یا اور کوئی صورتِ حال ہے؟ اور اس میں میرا شمار سودی کاتبین میں ہوگا یا نہیں؟ اور یہ میرے اُوپر کتنا گناہ ہے؟ اور یہ جو سود کرتے ہیں یہ جو اسلام نے بیان کیا ہے وہ ہے یا نہیں؟

جواب:- ادارے کی جو تفصیلات آپ نے لکھی ہیں، اگر وہ دُرست ہیں اور ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دُوسرے ناجائز ذرائع پر مشتمل ہے، یا اس ادارے میں آپ کو سود کے معاملات کا حساب و کتاب وغیرہ کرنا پڑتا ہے، تو اس میں ملازمت شرعاً جائز نہیں۔[1] ایسی صورت میں آپ کو چاہئے کہ

---

(۱) وفی صحیح البخاری کتابُ الطّلاق رقم الحدیث:۵۵۰۵ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الرّبٰوا وموکلہ. وکذا فی الصحیح لمسلمؒ رقم الحدیث: ۲۹۹۴ و ۲۹۹۵.

ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دُوسرے ناجائز اُمور پر مشتمل ہو تو اُس حرام آمدنی سے اُجرت حاصل کرنا جائز نہیں، جیسا کہ درج ذیل فقہی عبارات سے واضح ہے:-

فی الدّر المختار ج:۶ ص:۳۸۵ (طبع سعید) وفی الأشباہ الحرمة تنتقل. وفی الشامیة تحتہ، قال الشیخ عبدالوھّاب الشعرانی فی کتاب المنن وما نقل عن بعض الحنفیة من أنّ الحرام لا یتعدی الیٰ ذمتین سألت عنہ الشِّھاب ابن الشلبی فقال: ھو محمول علیٰ ما اذا لم یعلم بذٰلک امّا من رای المکاس یأخذ من أحد شیئًا من المکس ثم یعطیہ آخر ثم یأخذہ من ذٰلک الآخر فھو حرام.

(باقی اگلے صفحے پر)

دُوسرے حلال روزگار کو تلاش کریں، اور اس کے ملنے پر یہاں سے علیحدہ ہوجائیں۔ جب تک دُوسرا روزگار مہیا نہ ہو اس وقت تک موجودہ ملازمت کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس پر اِستغفار کرتے رہیں، اور جلد از جلد حلال روزگار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔ واللہ اعلم

بینک کی ملازمت کا تفصیلی حکم

سوال:- بینک کی ملازمت کے بارے میں آپ سے پوچھنا تھا کہ بعض علماء سے سنا ہے کہ فتویٰ یہ ہے کہ بینک کی بعض ملازمتیں جائز ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟ جبکہ میرے خیال میں بینک کی ہر ملازمت ناجائز ہے کیونکہ بینک کی جو بھی ملازمت ہو اُس میں چونکہ ناجائز کام میں اعانت اور تعاون کرنا پڑتا ہے لہٰذا وہ ناجائز ہونی چاہئے۔ اور تنخواہ بھی ظاہر ہے کہ بینک کی حرام آمدنی سے ہی دی جائے گی لہٰذا اس وجہ سے وہ بھی ناجائز ہونی چاہئے۔ کیا یہ بات دُرست ہے یا نہیں؟ اگر بینک کی کوئی ملازمت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..... وفی الھندیۃ ج:۵ ص:۳۴۲ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) لو أنّ فقیرًا یأخذ جائزۃ السلطان مع علمہ أنّ السلطان یأخذھا غصبًا أیحلّ لہ قال: ان خلط ذٰلک بدراھم أخریٰ فانّہ لا بأس بہ وان دفع عین المغصوب من غیر خلط لم یجز ..... وقالا: لا یملک تلک الدّراھم وھی علیٰ ملک صاحبھا فلا یحلّ لہ الأخذ .... الخ.

وفیھا أیضًا ج:۵ ص:۳۴۲ ولا یجوز قبول ھدیۃ أمراء الجور لأنّ الغالب فی مالھم الحرمۃ الّا اذا علم أنّ أکثر مالہ حلال بأن کان صاحب تجارۃ أو زرع فلا بأس بہ لأنّ أموال النّاس لا تخلوا عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وکذا أکل طعامھم ..... الخ.

وفیھا أیضًا ج:۵ ص:۳۴۳ آکل الرّبٰوا وکاسب الحرام أھدیٰ الیہ أو أضافہ وغالب مالہ حرام لا یقبل ولا یأکل ما لم یخبرہ أنّ ذٰلک المال أصلہ حلال ورثہ أو استقرضہ وان کان غالب مالہ حلالًا لا بأس بقبول ھدیتہ والأکل منھا.

اور ادارے کی اکثر آمدنی تو جائز ہو مگر اُس ادارے میں ناجائز کام کی ملازمت ہو، مثلاً سود کا حساب وکتاب کرنا پڑے تو ایسی ملازمت معصیت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے:-

وفی الھدایۃ باب الاجارۃ الفاسدۃ ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنّوح وکذا سائر الملاھی لأنّہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد.

وکذا فی خلاصۃ الفتاویٰ کتاب الاجارات جنس آخر فی المتفرقات ج:۳ ص:۱۱۶.

وفی الھندیۃ ج:۴ ص:۴۴۹ (طبع رشیدیہ) ولا تجوز الاجارۃ علیٰ شیءٍ من الغناء والنّوح والمزامیر والطبل وشیء من اللّھو وعلیٰ ھٰذا الحداء وقرأۃ الشعر وغیرہ ولا أجر فی ذٰلک وھٰذا کلہ قول أبی حنیفۃ وأبی یوسف ومحمد رحمھم اللہ تعالٰی کذا فی غایۃ البیان لو استأجر لتعلیم الغناء أو استأجر الذّمی رجلًا لیخصی عبدًا لا یجوز .... الخ.

وفی الدّر المختار کتاب الاجارۃ مطلب فی الاستئجار علی المعاصی ج:۶ ص:۵۵ (طبع سعید) ولا تصحّ الاجارۃ لعسب التیس وھو نزوہ علی الأناث ولا لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاھی ولو أخذ بلا شرط یباح.

وفی الشامیۃ تحتہ وفی المنتقیٰ امرأۃ نائحۃ أو صاحبۃ طبل أو زمر اکتسبت مالًا ردّتہ علیٰ أربابہ ان علموا والّا تتصدّق بہ وان من غیر شرط فھو لھا. قال الامام الأستاذ: لا یطیب، والمعروف کالمشروط .... الخ.

وفی الھندیۃ ج:۴ ص:۴۱۱ ومنھا (أی من شرائط صحّۃ الاجارۃ) أن یکون مقدور الاستیفاء حقیقۃ أو شرعًا فلا یجوز استئجار الآبق ولا الاستئجار علی المعاصی لأنّہ استئجار علیٰ منفعۃ غیر مقدور الاستیفاء شرعاً.

وفی بدائع الصنائع ج:۴ ص:۱۸۹ .... وکذا کل اجارۃ وقعت لمظلمۃ لأنّہ استئجار لفعل المعصیۃ فلا یکون المعقود علیہ مقدورۃ الاستیفاء شرعًا. نیز دیکھئے ص:۴۱۰ کا حاشیہ نمبر۱۔ (محمد زبیر حق نواز)

جائز ہے تو کس قسم کی ملازمت اور کس وجہ سے جبکہ تنخواہ تو ظاہر ہے بینک سے ہی دی جائے گی؟

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا دُوسرا سوال جو انگریزی میں تھا، اس کا جواب بھی اُردو میں اس لئے دے رہا ہوں کہ آپ اُردو جانتے ہیں۔

دراصل بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ ملازمت میں سود وغیرہ کے ناجائز معاملات میں اِعانت ہے، دُوسرے یہ کہ تنخواہ حرام مال سے ملنے کا احتمال ہے، ان میں سے پہلی وجہ یعنی حرام کاموں میں مدد کا جہاں تک تعلق ہے، شریعت میں مدد کے مختلف درجے ہیں، ہر درجہ حرام نہیں،[1] بلکہ صرف وہ مدد ناجائز ہے جو براہِ راست حرام کام میں ہو، مثلاً سودی معاملہ کرنا، سود کا معاہدہ لکھنا، سود کی رقم وصول کرنا وغیرہ۔[2] لیکن اگر براہِ راست سودی معاملے میں انسان کو ملوّث نہ ہونا پڑے، بلکہ اس کے کام کی نوعیت ایسی ہو جیسے ڈرائیور، چپراسی، یا جائز ریسرچ وغیرہ تو اس میں چونکہ براہِ راست مدد نہیں ہے، اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

جہاں تک حرام مال سے تنخواہ ملنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا اُصول یہ ہے کہ اگر ایک مال حرام اور حلال سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے۔[3] بینک کی صورتِ حال یہ ہے کہ اس کا مجموعی مال کئی چیزوں سے مرکب ہوتا ہے، ۱-اصل سرمایہ، ۲-ڈپازیٹرز کے پیسے، ۳-سود اور حرام کاموں کی آمدنی، ۴-جائز خدمات کی آمدنی، اس سارے مجموعے میں صرف نمبر۳ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جاسکتا، اور چونکہ ہر بینک میں نمبر۱ و نمبر۲ کی اکثریت ہوتی ہے، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجموعے میں حرام غالب ہے، لہٰذا کسی جائز کام کی تنخواہ اس سے وصول کی جاسکتی ہے۔

یہ بنیاد ہے جس کی بناء پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں خود

---

(۱) مدد اور اِعانت کے مختلف درجات اور ان کے تفصیلی حکم کے لئے "جواہر الفقہ" ج:۲ ص:۴۵۷ تا ۴۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی مشکوٰۃ المصابیح باب الرّبٰوا الفصل الأوّل ج:۱ ص:۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء، رواہ مسلم. نیز تفصیلی عبارات اور حوالہ جات کے لئے سابقہ ص:۳۹۳ و ص:۳۹۴ کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الھندیۃ ج:۵ ص:۳۴۲ ولا یجوز قبول ھدیۃ امراء الجور لأنّ الغالب فی مالھم الحرمۃ الّا اذا علم أنّ أکثر مالہ حلال بأن کان صاحب تجارۃ أو زرع فلا بأس بہ لأنّ أموال النّاس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب وکذا أکل طعامھم. وفیھا أیضًا ج:۵ ص:۳۴۳ اٰکل الرّبٰوا وکاسب الحرام أھدیٰ الیہ أو أضافہ وغالب مالہ حرام لا یقبل ولا یأکل ما لم یخبرہ أنّ ذٰلک المال أصلہ حلال ورثہ أو استقرضہ وان کان غالب مالہ حلالًا لا بأس بقبول ھدیتہ والأکل منھا .... الخ.

کوئی حرام کام کرنا نہ پڑتا ہو، جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔

والسلام
۱۴۲۳/۴/۳ھ [1]

بینک میں کلرک کی ملازمت

سوال:- محترم مفتی صاحب، السلام علیکم، سلام کے بعد آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میں صوبہ سرحد پشاور شہر میں اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر میں سینئر کلرک کے عہدے پر کام کر رہا ہوں، جس کی تنخواہ آج کل نئے الاؤنسوں اور مہنگائی الاؤنس کے ساتھ ۶۶۰ روپے بنتی ہے۔ لیکن میں نے حبیب بینک میں نوکری کے لئے درخواست دی تھی، جس کے ٹیسٹ اور انٹرویو وغیرہ میں میں پاس ہو چکا ہوں، اور اب کراچی سے میرے پیچھے ٹریننگ کے لئے بلانے کا خط آرہا ہے، یعنی میں منتخب ہو چکا ہوں۔ یہ عہدہ پروفیشنل آفیسر کا عہدہ ہے، اور اس کی تنخواہ آج کل تقریباً ۱۰۰۰ روپے کے لگ بھگ ہے، جس کے سودی کاروبار وغیرہ سے آپ خوب واقف ہیں، لہٰذا آپ صاحبان اگر مجھے فتویٰ بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں تو میں ازحد مشکور ہوں گا، فتویٰ میں یہ وضاحت ہونی چاہئے کہ میں یہ موجودہ نوکری چھوڑ کر بینک کی نوکری کروں یا نہیں؟

جواب:- بینک کی ملازمت شرعاً حرام اور ناجائز ہے، [2] اور حرام آمدنی خواہ زیادہ ہو، مگر ایک مسلمان کے لئے بے کار ہے، کم تنخواہ پر قناعت کرنا اور حلال کمانے کی خاطر زیادہ آمدنی کو چھوڑ دینا اِن شاء اللہ دُنیوی و اُخروی برکات کا موجب ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۸۸/۳۰ ج)

بینک کی ملازمت کا حکم

سوال ۱:- بینک کی ملازمت کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟
۲:- اگر ملازمت اختیار کر چکا ہے تو قائم رکھے یا نہیں؟

جواب:- بینک کا بیشتر کاروبار چونکہ سود پر مبنی ہے، اس لئے اس کی ملازمت جائز نہیں۔ [3]

---

(۱) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جوابی خط کی صورت میں تحریر فرمایا۔
(۲) بینک ملازمت کی دو قسموں کے تفصیلی حکم اور حوالہ کے لئے پچھلے ص:۳۹۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) یہ بینک کی اُس ملازمت کا حکم ہے جس میں سودی معاملات کرنے پڑتے ہوں۔ تفصیل کے لئے سابقہ دونوں فتاویٰ اور اُن کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔ وفی تکملة فتح الملهم ج:١ ص:٦١٩ قوله: وكاتبه، لأنّ كتابة الرّبا أعانة عليه ومن هنا ظهر أن التوظف فى البنوك الربوية لا يجوز فان كان عمل الموظف فى البنك ما يعين على الرّبا كالكتابة أو الحساب فذٰلك حرام لوجهين، الأوّل اعانة على المعصية، والثانى أخذ الأجرة من مال الحرام ..... الخ.

۲:- دُوسری جائز ملازمت حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کرے اور جب تک نہ ملے دُعا وتوبہ و اِستغفار کرتا رہے، اور ملتے ہی یہ ملازمت چھوڑ دے، پھر جب اللہ توفیق دے بینک سے کمائی ہوئی رقم رفتہ رفتہ صدقہ کردے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ
(فتویٰ نمبر)

حلال روزگار ملنے تک بینک کی ملازمت جاری رکھنے کے مشورے کی شرعی حیثیت

سوال:- محترم ومکرم جناب مفتی صاحب اَطال اللہ بقائہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد:

آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں، وہ ہے بینک کی ملازمت کا۔ ہمارا معاشرہ ایک سودی معاشرہ ہے، رِبا، قمار کی نت نئی شکلیں آئے دن سامنے آتی ہیں، اور انہیں ترقیاتی اسکیموں کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ بینک کی ملازمت اَشد حرام ہے، اس بناء پر بعض لوگ اس حرام سے چھٹکارے کی نیت سے اہلِ علم حضرات کا رُخ کرتے ہیں، اور بڑی معصومیت سے اپنی خستہ حالی کی سرگزشت سناتے ہیں، ''اگر میں یہ ملازمت چھوڑ دُوں گا، تو میری مسکین بیوی، چھوٹے چھوٹے ننھے منے پھول، کلیوں جیسے بچوں اور معمر ضعیف، معذور، مریض والدین اور جواں سال بے سہارا بے چاری بہنوں کے گزر کا سامان ہی کیا ہوگا، سوائے اس حرام تنخواہ کے۔'' اہلِ علم حضرات رحم دِل وغم خوار تو ہوتے ہی ہیں، اُن کی طرف سے غالباً متفقہ طور پر ایک ہی نوعیت کا جواب ملتا ہے، اور وہ آپ حضرات کو بخوبی معلوم ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ ''بینک کی ملازمت حرام ہے، اور اس کی تنخواہ حرام ہے، لیکن دُوسری ملازمت کی تلاش جاری رکھو اور جب تک کوئی متبادل صورت نہ بنے بینک کی یہ حرام ملازمت کرتے رہو، اور اس کی حرام تنخواہ سے اپنے بیوی بچوں والدین اور بہنوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔'' ایمانی تنزل اور اس سرتوڑ مہنگائی، بڑھتے ہوئے اِخراجات اور ہویٰ پرستی کے دور میں ایک بینک منیجر کے لئے اس قدر ہمدردی کافی تھی، جواز کا یہ پروانہ اُسے خدا اور رسول سے ڈٹ کر مقابلے پر آمادہ کرتا ہے، بندے سے بھی بارہا اس طرح اِستفتاء کیا گیا، دِل کسی بھی صورت میں جواز کا فتویٰ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، ایک خالی ہاتھ فقیر کی طرح آپ اہلِ علم حضرات کا دروازہ کھٹکھٹا کر بھیک مانگتا ہوں، ''فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' قرآن وحدیث واقوالِ

فقہائے کرامؒ یا قواعدِ فقہیہ میں سے جن دلائل کا سہارا لے کر جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے مفصل و مدلل بیان فرمادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جزاکم اللہ خیراً۔

جواب:- مکرّم بندہ زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جو بات کہی جاتی ہے اس کا مطلب جواز کا فتویٰ دینا نہیں ہوتا، فتویٰ حرمت ہی کا ہے،[1] آگے اسے مشورۃً یہ کہا جاتا ہے کہ اگر موجودہ ملازمت ترک کرنے سے ناقابلِ برداشت تنگی کا اندیشہ ہو تو اس ملازمت کو حرام سمجھتے ہوئے دُوسری ملازمت اس طرح تلاش کرو جیسے ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، خواہ تنخواہ کچھ کم ہی کیوں نہ ہو، جب وہ مل جائے تو ترک کردو۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ سے سنا ہے کہ اس مشورے کا حاصل أھون البلیتین پر عمل کرنا ہے، کیونکہ بعض اوقات ترکِ ملازمت کے بعد فقر و فاقے میں مبتلا ہوکر لوگوں کے دِین و ایمان ہی سے برگشتہ ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات حضرت حکیم الأمت قدس سرہٗ سے بھی نقل فرمائی تھی، مگر احقر کو یہ بات جزم کے ساتھ یاد نہیں۔

والسلام

۱۴۲۱/۳/۳ھ[2]

غیر مذبوح جانور کا گوشت فروخت کرنے والی کمپنی میں اکاؤنٹینٹ کی ملازمت کا حکم

سوال:- محترم مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک صاحب جو کینیڈا میں حال ہی میں معاش کے لئے گئے ہیں، اُن کی طرف سے سوال کیا ہے کہ کیا فرماتی ہے شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں کہ اُن کو ایک ایسی کمپنی میں

---

(۱) وفی الصّحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث: ۳۹۷۲ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الرّبٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء. مشکوٰۃ المصابیح ج: ۱ ص: ۲۴۴ (طبع قدیمی کتب خانہ).

وفی تکملۃ فتح الملھم ج: ۱ ص: ۶۱۹ (قولہ وکاتبہ) لأنّ کتابۃ الرّبا اعانۃ علیہ ومن ھنا ظھر أن التوظّف فی البنوک الرّبویۃ لا یجوز فان کان عمل الموظّف فی البنک ما یعین علی الرّبا کالکتابۃ والحساب فذٰلک حرام لوجھین الأوّل اعانۃ علی المعصیۃ، والثانی أخذ الأجرۃ من المال الحرام، فان معظم دخل البنوک حرام مستحلب بالرّبا وأمّا اذا کان العمل لا علاقۃ لہ بالرّبا فانہ حرام للوجہ الثانی فحسب فاذا وجد بنک معظم دخلہ حلال جاز فیہ التوظّف للنّوع الثانی من الأعمال واللہ أعلم.

نیز تفصیلی عبارات کے لئے دیکھئے ص: ۳۹۳ تا ص: ۳۹۶ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل کے مذکورہ خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے جو گوشت پیک کر کے سپلائی کرتی ہے، ظاہر ہے کہ کینیڈا میں یہ گوشت عام طور پر حلال نہیں ہوتا، اور اس کی تمام چیزیں جو وہ کمپنی بناتی ہے وہ حلال نہیں ہیں۔ اس کمپنی کا جس میں اِن صاحب کو ملازمت کی پیشکش کی گئی ہے سوائے گوشت اور گوشت کی دیگر خوردنی مصنوعات کو بنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ اِن صاحب کو اس کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی پیشکش ہے، اُن کا پوچھنا یہ ہے کیا ایسی کمپنی میں ملازمت اُن کے لئے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ ابھی اُنہوں نے ہجرت کی ہے اور وہ معاش کی تلاش میں کچھ دنوں سے پھر رہے ہیں اور اُنہیں کوئی خاطر خواہ ملازمت نہیں مل رہی، جواب اِرشاد فرما کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مذکورہ کمپنی کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ غیرمذبوح گوشت اگرچہ ہمارے نزدیک حلال نہیں اور اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں، لیکن غیرمسلموں کے نزدیک چونکہ جائز ہے، اس لئے فقہائے کرامؒ نے ان کے درمیان ہونے والی ایسی بیع کو نافذ قرار دِیا ہے، اور اس کی مالیت کا اِعتبار کیا ہے، لہٰذا اس خرید وفروخت سے انہیں جو رقم حاصل ہوئی ہے، وہ عقدِ باطل کے ذریعے نہیں ہوئی۔ البتہ کسی مسلمان کو بذاتِ خود اس خرید وفروخت میں ملوّث ہونا جائز نہیں۔ لیکن اکاؤنٹ کی ملازمت میں اگر مسلمان کو خود یہ گوشت بیچنا نہ پڑے بلکہ صرف کمپنی کے حسابات رکھنے پڑیں تو یہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہو کر حرام نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعانتِ بعیدہ ہے، لہٰذا حاجت کے وقت اس ملازمت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ تاہم پرہیز کرنے میں اِحتیاط ہے۔ اور اس معاملے میں دُوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب کرلینا چاہئے، اگر ان کا جواب اس سے مختلف ہو تو ہمیں بھی مطلع کردیا جائے۔ متعلقہ فقہی عبارات منسلک ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۲/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۷۵/۴۹۶)

(متعلقہ فقہی عبارات درج ذیل ہیں)

فی البحر (ج:٦ ص:٧٠ طبع سعید) قال تحت قوله (لم یجز بیع المیتة والدم) لانعدام المالیة التی هی رکن البیع فانهما لا یعدان ما لا عند أحد وهو من قسم الباطل ..... وفی القاموس المیتة ما لم تلحقه ذکاة وبالکسر للنوع اهـ فان ارید بعدم الجواز عدمهٗ فی حق المسلمین بقیت المیتة علیٰ اطلاقها وان ارید الأعم للمسلم والکافر فیراد بها ما مات حتف انفهٖ، اما المنخنقة والموقوذة فغیر داخلة لما فی التجنیس، اهل الکفر اذا باعوا

الـميتة فيـمـا بينهم لا يجوز لانها ليست بمال عندهم، ولو باعوا ذبيحتهم وذبـحهم ان يخنقوا الشاة ويضربوها حتّى تموت جاز لأنها عندهم بمنزلة الـذبيـحة عـنـدنـا، وفي جامع الكرخي يجوز البيع عندهم عند أبي يوسف خـلافًا لمحمد لأبي يوسف انهم يتمولونها كالخمر ولمحمد ان احكامهم كـأحـكمانا الا في الخمر، وفي الذخيرة اراد بالميتة ما مات حتف انفه اما التـي مـاتت بالسبب كالخنق والجرح في غير موضع الذبح فالبيع فاسد لا بـاطـل، وكـذٰلـک ذبـائح المجوس مال متقوم عندهم بمنزلة الخمر، كذا فـي الـمـعـراج، وحاصله ان فيما لم يمت حتف انفه بل بسبب غير الذكاة روايتيـن بـالـنسبة الـى الـكافر وفي رواية الجواز، وفي رواية الفساد، واما البطلان فلا، واما في حقنا فالكل سواء.

في البناية (ج:۷ ص:۱۸۸ طبع رشيديه) تحت قوله (فالبيع فاسد كالبيع بـالميتة) والميتة في اللغة هو الذى مات حتف انفه وانما قيد باللغة لتخرج الـمخنوقة وأمثالها فان ذٰلک عند من ليس له دين سماوى بمنزلة الذبيحة عـنـدنـا، ولهٰذا باعوا ذٰلـک فيما بينهم جاز، وكره المصنف في التجنيس وان كـان ميتة عندنا بخلاف الميتة حتف انفها فان بيعهٗ فيما بينهم لا يجوز ولانها ليست بمال عندهم.

فـي تبيين الحقائق (ج:۴ ص:۳۶۲ طبع سعيد) قال بعد قوله لم يجز بيع الـميتة .... لـعـدم ركـن البيـع وهـو مـبـادلة الـمال بالمال، وبيع هٰذه الأشياء باطل لما ذكرنا.

وفيـه أيـضًـا بـعد أسطر: والأصل فيه ان بيع ما ليس بمال عند أحد كالحر والـدم والـميتة التي ماتت حتف انفها والمدبر وام الولد والمكاتب باطل، وان كـان مـالا عـنـد البعض كالخمر والخنزير والميتة التي لم تـمت حتف انفها، مثل الموقوذة فان هٰذه الأشياء مال عند أهل الذمة.

فـي شـرح الـوقـاية (ج:۳ ص:۳۹ طبـع رحـمـانية) اعـلم ان المال عين يـجـري فيـه التنافس والابتذال فيخرج التراب ونحوه، والدم والميتة التي مـاتـت حتف انفه اما التي خنقت أو جرحت في غير موضع الذبح كما هو عـادة بعض الكفـار وذبـائح المجـوس فـمـال الا انهـا غير متقومة كالخمر والخنزير.

فـي الدر المختار (ج:۵ ص:۵۵، ۵۶ طبع سعيد) قوله (كخمر وخنزير

ومیتة لم تمت حتف انفها) بل بالخنق ونحوه فانها مال عند الذمی کخمر وخنزیر.

وقال الشامی تحت قوله (ومیتة لم تمت حتف انفها) هٰذا فی حق المسلم، اما الذمی ففی روایة بیعها صحیح، وفی أُخریٰ فاسد کما قدمناه عن البحر.

فی فتح المعین (ج:۲ ص:۵۲٦ طبع سعید) تحت قوله (فبیع المیتة) یعنی التی ماتت حتف انفها اما غیرها مثل الموقوذة فمال عند أهل الذمة کالخمر زیلعی.

وفیه أیضًا بعد أسطر: ثم لا فرق فی حق المسلم بین التی ماتت حتف انفها أو کانت منخنقة أو موقوذة أو ماتت بالجرح فی غیر المذبح اما فی حق الذمی فیراد بها الأول وأما الثانی فاختلف فیه ففی التجنیس جعله من قسم الصحیح لأنهم یدینونه ولم یحک خلافا وفی الایضاح هو قول ابی یوسف وعند محمد لا یجوز وجزم فی الذخیرة بفساده والموقوذة هی التی قتلت بالخشب.

فی الطحطاوی علی الدر (ج:۳ ص:٦۳ طبع بولاق مصر) تحت قوله (المیتة) بفتح المیم وسکون الیاء هی التی ماتت حتف انفها لا بسبب والمیتة بفتح المیم وتشدید الیاء المکسورة هی التی لم تمت حتف انفها بل ماتت بسبب غیر الذکاة کالمنخنقة والموقوذة، والقسم الأول لیس بمال عند المسلمین وأهل الذمة اتفاقا والقسم الثانی لیس بمال فی حق المسلمین اتفاقا وفی حق أهل الذمة روایتان وقال الشیخ کمال الدین انها فی حکم المیتة شرعا وانما نحکم بجوازه اذا وقعت بینهم لأنها مال عندهم کالخمر کذا ذکره المصنف فی التجنیس من غیر ذکر خلاف وفی جامع الکرخی یجوز بینهم عند ابی یوسف خلافا لمحمد انتهی ملخصًا من حاشیة المرحوم نوح وحاصله کما فی البحر.

فی مجمع الأنهر (ج:۳ ص:۷۷ طبع دار الکتب العلمیة بیروت) تحت قوله (بیع ما لیس بمال الٰی قوله والمیتة) التی ماتت حتف انفها لانه المنخنقة وامثالها مال عند أهل الذمة.

فی الدر المنتقی فی شرح الملتقٰی (ج:۳ ص:۷۸ طبع علمیة) تحت قوله (بیع مال غیر متقوم کالخمر والخنزیر) وقال عبدالواحد وغیره البیع

فیھما فاسد لا باطل کما فی النظم وکذا بیع ما مات بخنق وجرح کما فی الکشف لٰکن فی المحیط بیع منخنق المجوسی باطل خلافا لمحمد .....وذکرہ القھستانی (ج:۳ ص:۴۵۶).

فی شرح المجلۃ (ج:۲ ص:۱۰۳ طبع مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ) وقول المجلۃ باع جیفۃ ای میتۃ ماتت حتف انفھا، اما لو ماتت بسبب غیر الذکاۃ کالمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ، ففی حق المسلم لا فرق بینھا وبین المیتۃ حتف انفھا من حیث بطلان البیع الٰی قولہ واما فی حق غیر المسلم ففی التجنیس جعلہ قسما من الصحیح لأنھم یدینونہ ولم یحک فیہ خلافًا وجزم فی الذّخیرۃ بفسادہٖ وجعلہ فی البحر من اختلاف الرّوایتین وفی البزازیۃ علٰی ھامش الھندیۃ ج:۴ ص:۳۷۲ (طبع رشیدیہ) وبیع المجوسی ذبیحتہ أو ما ھو ذبح عندہ کالخنق من کافر جاز عند الثانی.

سودی بینک کو مکان کرایہ پر دینے اور اس کے لئے بروکری کا حکم

سوال۱:- سودی بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ ملنے والا کرایہ حلال ہے یا حرام؟

سوال۲:- مذکورہ صورت میں بروکری جائز ہے یا نہیں؟ بروکری کی صورت میں ملنے والا کمیشن حلال ہے یا حرام؟

محمد عامر، جامعۃ الرشید کراچی

جواب۱:- ”جواھر الفقہ“ میں اعانۃ علی المعصیۃ کے بارے میں مفصل تحقیق اسی بارے میں ہے، وہ دیکھ لیں، خلاصہ یہ کہ اگر وہ مکان خاص بینک کے مقاصد کو مدِنظر رکھ کر بنایا گیا ہے تو ناجائز ہے، ورنہ مکروہ۔[۱]

جواب۲:- جہاں جواز ہے وہاں دلالی بھی جائز،[۲] جہاں ناجائز ہے وہاں دلالی بھی ناجائز۔

واللہ اعلم

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

---

(۱) ”جواھر الفقہ“ میں ہے: ”اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراہت تحریم ہے، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بینک ہی کے لئے نہیں دُوسرے کاموں اور دفاتر کے لئے بھی بنتے ہیں، تو کراہت تنزیہ کہا جاسکتا ہے۔“ تفصیلی دلائل اور حوالہ جات کے لئے ”جواھر الفقہ“ ج:۲ ص:۴۳۹ تا ۴۶۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:۶ ص:۶۳ (طبع سعید) مطلب فی أجرۃ الدّلال قال فی التاترخانیۃ وفی الدّلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیہ أن فی کل عشرۃ کذا فذاک حرام علیھم. وفی الحاوی سئل محمد بن سلمۃ عن أجرۃ السمسار فقال: أرجوا أنّہ لا بأس بہ وان کان فی الأصل فاسدًا لکثرۃ التّعامل وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام.

وکذا فی البحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ ص:۲۰۷ و ۲۰۸.

﴿فصل فی الإجارة الجدیدة والمتفرّقة﴾
(اِجارہ کے جدید اور متفرّق مسائل کا بیان)

اِنٹرنیٹ سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا

سوال:- حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد عرض ہے کہ میں ح.س.بٹ میرا تعلق مکہ مکرّمہ سے ہے اور حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی (دامت برکاتہم) میرے ماموں ہیں، اور میں نے ان سے سوال کیا کہ میں ایک کام کرنا چاہ رہا ہوں اور اس میں سوال یہ ہے کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ سے عرض کر کے جواب مفصل حاصل کروں۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ میں ایک انٹرنیٹ کیفے (جہاں پر لوگ انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لئے آتے ہیں) کھولنا چاہ رہا ہوں، تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سعودی عرب میں انٹرنیٹ مکمل طور پر صاف ہے (یعنی جو بھی غیر اخلاقی مواد ہے وہ حکومت کی طرف سے بند کیا گیا ہے)۔ اور انٹرنیٹ کو لوگ اپنے اپنے طریقے سے استعمال کرتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ لوگ اسے ٹیلیفون کے لئے استعمال کرتے ہیں (اس میں ٹیلیفون کافی سستا ہوتا ہے)، کچھ لوگ اسے تعلیمی مصالح کے لئے استعمال کرتے ہیں، کچھ لوگ اس سے تجارتی استفادہ کرتے ہیں، اور بھی بہت کچھ۔ مگر احتیاط کے طور پر یہ سوال کر رہا ہوں کہ آیا اس کام میں شریعت کی مخالفت تو نہیں؟ اُمید ہے کہ آپ متوجہ ہوکر مستفید فرمائیں گے، اور اگر لکھنے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

آپ سے دُعاؤں کا اُمیدوار اور جواب کا منتظر

ح.س.بٹ، مکہ مکرّمہ سعودی عرب

جواب:- اگر حکومت کی طرف سے غیر اخلاقی مواد بند کر دیا گیا ہے تو اس قسم کی اِنٹرنیٹ سروس مہیا کرنا اور اس پر فیس وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۳/۸۱)

کمپنی کی گاڑی خراب ہونے کی صورت میں گاڑی کی دُرستگی ومرمت اور متبادل انتظام فراہم کرنے کا ایک جدید عقد اوراس کی شرعی حیثیت (عربی فتویٰ)

سوال:- وما يقول الشيخ أدام الله عزه في عقد خدمات يدفع فيه صاحب السيارة مبلغًا محددًا لشركة تقوم باصلاح السيارة أو نقله من طرق المدينة أو الطريق السريع الىٰ أى مكان يختاره اذا تعطلت سيارته، والخطورة هي في الطريق السريع لأنها بين المدن وليست آمنة تماما، واذا تعطلت السيارة في ذٰلک الطريق ألزمت الشرطة صاحب السيارة بنقلها على الفور الأمر الذي يكلفه ضعف ذٰلک المبلغ المحدد، فهل يجوز التعاقد علىٰ ذٰلک حيث لا يعرف هل تتعطل السيارة أم لا.

سائلًا المولىٰ عزّ وجلّ لكم التّوفيق والسداد ودوام العافية، وأرجوا منكم الدعاء فنحن في بلد غير مسلم والله المستعان، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

راجي رحمة ربّه
محمد علي محمد احداش

جواب:- وسؤالک الثاني: يتعلق بعقد صيانة السيارة ونقلها، و إن مثل هٰذه العقود قد انتشرت في عصرنا، مثل عقود صيانة السيارات، والحاسب الآلي والمعدّات الكهربائية وغيرها، والواقع أن هٰذا العقد لا ينطبق تمامًا علىٰ أحد من العقود المعروفة في الفقه الاسلامي، فإن اعتبرناه عقد الإجارة فانه لا يصح علىٰ كونه متضمنًا للغرر.[1] فانه لا يعرف هل تحتاج السيارة إلىٰ صيانة أو نقل أم لا؟ وقد كيّفه بعض المعاصرين علىٰ أساس الجعالة، ولٰكنني غير مقتنع تمامًا علىٰ هٰذا التكييف، فإنّ عقود الجعالة تعتمد علىٰ عمل نشأ سببه عند العقد، إلّا أن نقول: إن وجود السيارة يلزمه أن تحتاج الىٰ صيانة في وقت أو آخر.

وبالجملة، فلم ينشرح صدري حتّى الآن علىٰ تكييف مقبول لهٰذا العقد، ويبدو أنه أشبه بالتأمين منه بالجعالة أو الإجارة، وقد طرح الموضوع علىٰ مجمع الفقه الاسلامي، ولم يتمكن من إصدار قرار فيه حتّى الآن، ولٰكن الحاجة داعية الىٰ مثل هٰذه العقود في عصرنا، فينبغي أن ينظر فيه الفقهاء ويلتمسوا له تكييفا مقبولا أو بديلا مناسبا، والله سبحانه أعلم

والسلام عليكم ورحمة الله
أخوكم: محمد تقي العثماني
۲۰۰۴/۲/۲۹ء

---

(۱) في كتاب المبسوط: في كتاب الشرب: قال أبو يوسف سألت أبا حنيفةؒ عن الرجل استأجر النهر يصيد فيه السمک أو استأجر جهة يصيد فيها السمک، قال: لا يجوز. ..... وذٰلک كله من باب الغرر.

پگڑی کی شرعی حیثیت

سوال:- پگڑی پر مکان لے کر کسی دُوسرے کو وہی مکان کرایہ پر دینا اور اس طرح کاروبار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کرایہ کی صورت میں جو آمدنی ہوگی وہ میرے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں[1]، البتہ کرایہ جتنا زیادہ مقرّر کرنا چاہے مالک مقرّر کرسکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے مہینے کا کرایہ زیادہ مقرّر کردے اور بعد کے مہینوں کا کم۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۲۰/ ۲۸ ج)

”پگڑی“ کا حکم

سوال:- ایک دُکان مثلاً ۲۵ ہزار پگڑی لے کر کرایہ پر دے دی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ یہ دُکان مالک کے قبضے میں ہے اور مالک کرایہ پر دے رہا ہے۔

جواب:- مروّجہ پگڑی کا لین دین شرعاً جائز نہیں ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۲/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۸/ ۲۸ الف)

پگڑی کی مخصوص صورت

(ایک شریک کی طرف سے شرکت ختم کرنے کی صورت میں دُوسرے شریک سے کرایہ کی دُکان کی مد میں کچھ رقم لینے کا حکم)

سوال:- زید اور عمر بہت عرصے سے مال میں شریک تھے، دونوں نے شراکت کے زمانے میں ایک دُکان کرایہ پر لی تھی، دُکان کے اُوپر ایک کمرہ ہے جس کا اُوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، البتہ نیچے دُکان کے اندر سے ایک آدمی کا آنے جانے کا راستہ ہے، وہ راستہ بھی عارضی ہے، وہ اس طریقے سے

(۱ و ۲) فی البحوث فی قضایا فقهیة معاصرة ص:۱۱۴ تحقیق ممّا ذکرنا أنّ البدل الخلو المتعارف الّذی یأخذه المؤجر من مستأجره لا یجوز ولا یتطبق هٰذا المبلغ المأخوذ علیٰ قاعدة من القواعد الشرعیّة ولیس ذٰلک الا رشوة حرامًا.

کہ دُکان کے اندر عارضی سیڑھی لگا کر آدمی اُوپر کمرے کو چلا جاتا ہے، پھر آدمی کو اُترتے وقت پھر سیڑھی لگا کر اُترنا پڑتا ہے، یہ بات واضح رہے کہ دُکان کے اُوپر جو کمرہ ہے اس کا اُوپر کوئی دروازہ نہیں ہے، مذکورہ دُکان کو یعنی اس کرائے کی دُکان کو دو حصے کرکے ایک حصے کو کرایہ پر دے دیا اور ایک حصے میں اپنی شرکت کا کاروبار کر رہے ہیں، اب زید وعمر شراکت کو ختم کرکے زید عمر سے کہتا ہے کہ کرایہ کی دُکان کو تو لے لینا مجھ کو اس کی قیمت دے دینا، عمر اس پر راضی ہوا، عمر نے اس کرایہ کی دُکان کی قیمت قسطوں میں کچھ عرصے میں ادا کی، زید نے ایک سال کے عرصے کے بعد عمر پر دعویٰ کیا کہ تو نے جو قیمت دی ہے وہ نیچے دُکان کی دی ہے، دُکان کے اُوپر کمرے کا حصہ لے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں عمر کے ذمے دُکان کے مال کے آدھے حصے کی قیمت ادا کرنا واجب تھا، جو وہ ادا کرچکا ہے، جہاں تک دُکان کا تعلق ہے چونکہ وہ ان شریکوں کی ملکیت نہیں تھی بلکہ دونوں نے کسی سے کرائے پر لی ہوئی تھی، اور عمر آئندہ بھی اس دُکان میں کاروبار کرے گا تو اس کا کرایہ مالک دُکان کو ادا کرتا رہے گا، لہٰذا دُکان کے سلسلے میں عمر کے ذمے کوئی رقم زید کی نہیں تھی، جتنی رقم اُس نے دی وہ بھی زیادہ دی، اس اُوپر کے حصے میں زید کا مطالبہ شرعاً بالکل ناجائز ہے، عمر کے ذمے کچھ واجب نہیں ہے، شریعت کی رُو سے پگڑی کا لین دین بھی جائز نہیں ہے۔[۱]　　واللہ سبحانہ اعلم

۲۶/۱۰/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۱۵/۳۲ ج)

پگڑی کی صورت

سوال:- یہاں پر کمرے وغیرہ عمدہ عمدہ قیمت میں نیلام ہوتے ہیں، اور ماہانہ کرائے کی ایک خاص مقدار مقرّر ہے، اس کے باوجود مالکانِ مالک بڑی بڑی رقوم طلب کرتے ہیں، مسجد کا وقف شدہ مکان وکمرہ نیلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- یہ پگڑی کی صورت ہے اور حقِ اِستیجار کی بیع ہے، جو حقِ مجرّد ہے، اور حقوقِ مجرّدہ کی بیع شرعاً ناجائز ہے، اس لئے ایسا نیلام کرنا دُرست نہیں۔[۲]　　واللہ اعلم

۲۹/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۲/۲۸ الف)

(۱و۲) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ۔

۱:- ویزا لگانے کی اُجرت کا حکم
۲:- کسی کو مختلف غیر قانونی طریقوں سے باہر ملک بھجوانے کی اُجرت کا حکم
۳:- صرف ٹکٹیں بیچنے کے لائسنس پر ٹکٹوں کے علاوہ ویزے لگوانے کا کام کرنا

سوال:- محترم مفتی صاحب! مندرجہ ذیل چند مسئلے قرآن کی روشنی میں تحقیق کرکے بتائیں کہ شریعت میں اِس کی کیا حیثیت ہے؟

۱:- ایک عام آدمی بیرونِ ملک مثلاً امریکا، یورپ یا رُوس وغیرہ کا ویزا یا کسی اور اسلامی ملک کا ویزا لگانا چاہتا ہے، ہم سے وہ رُجوع کرتا ہے، ہم اُس ملک کی ایمبیسی کے کونسلر سے مل کر اُسے پیسے دیتے ہیں تاکہ وہ اس آدمی کو ویزا ضرور دے دیں، اس میں اگر ہم اپنے لئے اُس آدمی سے زیادہ روپے لے لیں تو وہ ہمارے لئے حلال ہیں یا حرام؟

۲:- ایک آدمی ہمارے پاس آتا ہے کہ مجھے باہر کے کسی ملک میں پہنچادو، ہم ٹریول ایجنسی والے اُس کے ساتھ خاص ریٹ پر متفق ہوتے ہیں، اُس کے بعد اُس کی تصویر ایسے دُوسرے شخص کے پاسپورٹ پر لگادیتے ہیں جس کا ویزا لگا ہوتا ہے، اور وہ نہیں جانا چاہتا یا اُس کے پاس دو پاسپورٹ ہیں جس میں دونوں پر ویزا ہے، تو اس کی تصویر تبدیل کرکے اور ایئرپورٹ میں روپے دے دیتے ہیں تاکہ اُس کو نہ روکیں، اس طریقے سے کمائی حلال ہے یا حرام؟

۳- بہت سے افغانیوں نے پاکستانی پاسپوٹ بنائے ہیں اور سعودی عرب یا اِمارات وغیرہ کے ویزے لگائے ہوئے ہیں، لہٰذا جب وہ جاتے ہیں تو اُن کے پکڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ٹریول ایجنسی سے رابطہ کرتے ہیں، ٹریول ایجنسی والے ایئرپورٹ میں F.I.A والوں سے بات کرکے پیسے دیتے ہیں تاکہ اس کو جانے دیا جائے، اس میں ٹریول ایجنسی والے بھی اپنے لئے روپے رکھ لیتے ہیں، اس صورت میں ٹریول ایجنسی کی کمائی حلال ہے یا حرام ہے؟

۴:- ٹریول ایجنسی کا حکومتی لائسنس دو طرح کا ہوتا ہے، ایک میں صرف ٹکٹیں بیچنے کی اجازت ہوتی ہے، اور دُوسرے لائسنس میں صرف ویزے لگانے کی اجازت ہوتی ہے، لیکن دونوں طرح کی ایجنسیاں دونوں کام کرتی ہیں، یعنی ٹکٹیں بیچنا اور ویزے لگانا، حکومت یہ جانتے ہوئے خاموش

ہے، کیا اس طرح اجازت کے بغیر دونوں کاموں سے کمانا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ برائے مہربانی تحقیق کر کے قرآن و حدیث کی روشنی میں فتویٰ لکھ کر عنایت فرمائیں۔

۵:- ایک آدمی نے ہم کو کسی کام کے لئے روپے دے دیئے یا کوئی چیز ضمانت کے طور پر رکھ دی اور اُس کا کام ابھی ہوا نہیں ہے کہ وہ پشیمان ہوگیا اور اُس کے کام پر ہمارے روپے خرچ نہیں ہوئے یا کم خرچ ہوئے ہیں، اور چونکہ معاہدہ توڑا ہے تو ہم اُس سے زیادہ لیں تو کیا یہ زیادہ رقم لینا حلال ہے یا حرام؟

جناب مفتی صاحب! مندرجہ بالا مسئلوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کر کے لکھیں اور برائے مہربانی مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں، مجھے شدید انتظار رہے گا۔

ارشد احمد
ایئر انٹرنیشنل ٹریولز، پشاور

(مذکورہ بالا اِستفتاء کے ساتھ سائل نے حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام درج ذیل خط بھی لکھا)

(خط از سائل)

بخدمت جناب حضرتِ اقدس حضرتِ والا دامت برکاتہم

بعد از سلام عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت اللہ ربّ العزّت سے نیک مطلوب ہے۔

میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، ایک دفعہ ایک لائبریری میں آپ کا کتابی سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' ہاتھ لگا، اُس کو جب پڑھا تو میں نے سمجھا کہ مجھے اسلامی تاریخ کا ایک خزانہ مل گیا، اس کے بعد پشاور میں میں نے شیخ الحدیث مولانا حسن جان صاحب سے آپ کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے اس طریقے سے آپ کی تعریف کی کہ میری آپ سے دِلی محبت اور بڑھ گئی، اور اب میرے پاس آپ کی بہت سی تصانیف کا ایک چھوٹا سا مجموعہ موجود ہے، اور مزید یہ کہ جس طرح آپ کی تصانیف پڑھتے پڑھتے اور پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے، اُسی طرح آپ کے ساتھ ملاقات کا بھی شوق بڑھ رہا ہے، لیکن مالی حالات اور مصروفیات کی وجہ سے کراچی آنے اور زیارت کا شرف حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بہرحال اگر یہ خط آپ کو ملے تو آپ اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت فارغ کر کے مجھے چند لفظ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجیں تو مجھے تسلی سی ہوجائے گی کہ آپ کی زیارت ہوگئی۔ باقی خط زیادہ لمبا کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، لیکن آپ سے دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اپنی دُعاؤں میں اس ناچیز کو بھی مت بھولیے۔

ارشد احمد

جواب:- مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ نے جو اِظہارِ محبت فرمایا ہے، اس کے لئے شکرگزار ہوں، اور دُعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضائے کاملہ عطا فرمادیں، آمین۔ آپ کے لئے بھی دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں، آمین۔ آپ کے سوالات کا جواب نمبروار درج ذیل ہے:-

۱:- ویزا حاصل کرنے کی جائز محنت پر آپ اُجرت وصول کرسکتے ہیں،[۱] لیکن اس کے لئے کسی کو رِشوت دینا جائز نہیں،[۲] اور اس رِشوت کی وجہ سے اُجرت بڑھانا بھی جائز نہیں، ہاں ویزے کی جو فیس قانونی ہوتی ہے، وہ آپ اپنی اُجرت کے علاوہ وصول کرسکتے ہیں۔

۲:- یہ کام بالکل حرام ہے، دھوکا دہی ہے، اس کی اُجرت بھی حرام ہے۔[۳]

۳:- یہ کام بھی بالکل حرام ہے، اور اس کی آمدنی بھی حرام۔[۴]

۴:- اگر حکومت کی طرف سے قانوناً یا عملاً اس کی اجازت مل جائے تو جائز ہے۔

آپ کا آخری سوال واضح نہیں، اس لئے جواب سے معذور ہوں۔ والسلام

۱۴۲۱/۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰۸/۷۴)

انشورنس کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:- انشورنس کے محکمے میں ایجنٹ بننے یا اس محکمے کے دُوسرے اہل کاروں کی ملازمت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

---

(۱) لأنّه عمل مباح يجوز أخذ الأجرة عليه، ويستأنس في هٰذه المسئلة من العبارات الآتية:-
في الهندية الباب الثاني والثلاثون في المتفرّقات ج:۴ ص:۵۲۶ (طبع رشيديه كوئٹه) في الكبرىٰ أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل فاستأجروا رجلًا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم الى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم ذكر هٰهنا انّه ان كان بحال لو ذهب الىٰ بلد السلطان تهيا له اصلاح الأمر يومًا أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل ذٰلک الّا بمدة فان وقّتوا للإجارة وقتًا معلومًا فالاجارة جائزة والأجر كلّه له وان لم يوقتوا فهي فاسدة وله أجر مثله.
وفي فتاوىٰ قاضي خان باب الاجارة الفاسدة ج:۳ ص:۱۸ أهل بلدة ثقلت عليهم المؤنات فاستأجروا رجالًا بأجر معلوم ليذهب الى السلطان ويرفع القصّة ليخفف عنهم السلطان نوع تخفيف وأخذ الأجر من عامّة أهل البلدة من الأغنياء والفقراء قالوا: ان كان بحال لو ذهب الىٰ بلدة السلطان يتهيّأ له اصلاح الأمر في يوم أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل المقصود في يوم أو يومين وانّما يحصل في مدّة فان وقّتوا الاجارة وقتًا جازت الاجارة وله كل المسمّٰى وان لم يوقّتوا فسدت الاجارة وكان له أجر المثل علىٰ أهل البلدة علىٰ قدر مؤنتهم ومنافعهم .... الخ.

(۲) وفي المشكوٰة، كتاب الإمارة والقضاء ج:۱ ص:۳۲۶ (طبع رحمانيه) عن عبدالله بن عمرو قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي.

(۳و۴) کیونکہ یہ ''إجارہ علی المعاصی'' ہے، جو ناجائز ہے، تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۳۹۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- اس محکمے میں ملازمت کرنا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۵۹۶/۱۹ الف)

وکالت کے پیشے اور اس کے ذریعے حاصل کی گئی رقم کا حکم

سوال:- کیا وکیل کا وکالت کے ذریعے کمایا ہوا روپیہ حلال ہے؟ جبکہ وکیل کو سچے مقدمے کی پیروی کرنے میں بھی کبھی کبھی حقائق کو رَدّ و بدل کے ساتھ پیش کرنا پڑتا ہے۔

جواب:- وکالت میں اگر جھوٹ بولنا یا ناحق کو حق ثابت کرنا نہ پڑے تو جائز ہے،[2] لیکن جس مقدمے میں یہ کام کرنے پڑیں اس میں وکالت جائز نہیں اور ایسی وکالت کی آمدنی بھی حرام ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۹۳/۱۹ الف)

۱:- ملازمت سے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

۲:- رِشوت دے کر ملازمت پر بحال ہونے والے ملازم کے لئے برطرفی کے زمانے کی تنخواہ کا حکم

سوال:- محترم ومکرم جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

---

(۱) وفی الهداية باب الاجارة الفاسدة ج:۳ ص:۳۰۶ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا يجوز الاستيجار على الغناء والنّوح وكذا سائر الملاهي لأنّه استيجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد.

وفی بدائع الصنائع ج:۴ ص:۱۸۹ (طبع سعید) وكذا كل اجارة وقعت لمظلمة لأنّه استئجار لفعل المعصية فلا يكون المعقود عليه مقدورة الاستيفاء شرعاً.

وكذا فی الهندية ج:۴ ص:۴۱۱.

وفی تكملة فتح الملهم ج:۱ ص:۶۱۹ فان كان عمل الموظّف فی البنک ما يعين على الرّبا كالكتابة أو الحساب فذٰلک حرام بوجهين، الأوّل اعانة على المعصية، والثاني أخذ الأجرة من المال الحرام .... الخ. نیز دیکھئے ص:۳۸۰ کا حاشیہ۔

(۲) وفی نور الأنوار ص:۱۰۷ ان وكّل أحد رجلًا أن يخاصم المدعى عند القاضي يحمل علىٰ مطلق الجواب لأنّ الخصومة هو الانكار فقط محقًا كان المدعى أو مبطلًا وهو حرام شرعًا لقوله تعالىٰ: "ولا تنازعوا" فلا بدّ أن يصرف الى الجواب مطلقًا بالرّد والاقرار مجازًا من قبيل اطلاق الخاص الى العام فلو أقرّ الوكيل علىٰ مؤكله جاز عنده .... الخ.

وفی الهداية كتاب الوكالة ج:۳ ص:۱۷۶ ويجوز الوكالة بالخصومة فی سائر الحقوق لما قدّمنا من الحاجة اذ ليس كل أحد يهتدى الىٰ وجوه الخصومات وقد صحّ أنّ عليًّا وكّل فيها عقيلاً وبعد ما أسن وكّل عبدالله بن جعفر.

نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۳۲۰ وامداد الاحکام ج:۳ ص:۵۸۰ و۵۸۱ وعزیز الفتاویٰ ص:۶۶۷ (طبع دار الاشاعت)۔

عرض ہے کہ درج ذیل مسئلے کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں مطلوب ہے۔

زید پاکستان ایئرفورس کی ایک شاخ (جو بین الاقوامی جہازوں پر کام کرتی ہے) کے شعبہ ''انجریئنگ'' کے ایک اہم عہدے پر مستقل ملازم تھا، ادارے نے اس کو چار سال قبل ملازمت سے برطرف کردیا کہ تمہاری وجہ سے دو جہازوں پر کام پندرہ بیس منٹ تاخیر سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی کے ذمہ دار کچھ اور لوگ تھے، زید اس ادارہ کا ایک مستند، دیانت دار اور محنتی و مستقل ملازم تھا۔ خیر! مقدمہ عدالتوں میں چلا، اور تین سال بعد ایک عدالت کے پرانے جج نے فیصلہ دیا کہ اس کو کیوں نکالا گیا یہ ایک الگ بات ہے، (یہ زیرِ غور نہیں، نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی) اس کو نکالنے کا جو قانونی طریقہ تھا وہ اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے اس کو فوراً ملازمت پر بحال کیا جائے اور اس کے پچھلے تمام واجبات ادا کئے جائیں۔ لیکن عدالت کے اس حکم کو نہ مانتے ہوئے ادارے نے 'مقدمہ' عدالتِ عالیہ میں داخل کردیا، اور درخواست کی اگر اس میں کوئی قانونی سقم ہو تو فیصلہ کیا جائے۔ عدالتِ عالیہ کے سب سے بڑے جج نے حکم دیا کہ تمام واجبات ادا کرو، اور تنخواہ جاری کرو، جب فیصلہ ہوگا اُس وقت اگر زید ہار گیا تو سب رقم واپس کردے گا، اور اگر مقدمہ جیت گیا تو ملازمت بحال، اور سب رقم اس کی۔

اب زید کے رقم وصول کرنے کا وقت ہے، یعنی ماہانہ تنخواہ اور پچھلے واجبات، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے چار سال تک تو نہ ان کا کام کیا اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا، اور ہر ماہ کی بغیر کام کئے جو تنخواہ ملے گی آیا اس رقم کا وصول کرنا میرے لئے جائز ہے یا حرام؟ اور مقدمہ جیتنے کی صورت میں وہاں دوبارہ ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ادارہ حکومت کا ہے، ہر شخص اس کا ملازم ہے، یہ شاخ ایئرفورس کے چھوٹے، بڑے ملازمین کے پیسوں سے قائم ہوئی تھی، اس کا فائدہ خود انہیں اور ایئرفورس کو جاتا ہے، زید اس کا صرف ملازم تھا، یہ ادارہ کسی کا ذاتی نہیں، یہاں ملازم رکھنے اور نکالنے کا طریقہ شرعی نہیں، جو قوانین موجودہ ہمارے ملک کے اداروں، عدالتوں وغیرہ میں چل رہے ہیں، اسی کے مطابق یہ کارروائی ہوئی ہے اور ہوگی۔

زید کا کہنا ہے کہ اگر میرے لئے یہ رقم اور ملازمت پر دوبارہ جانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے تو میں اس کو حاصل نہیں کروں گا۔

سوال۲:- بالکل اسی طرح کا ایک اور مقدمہ ہے کہ اس شخص نے عدالت کے ایک اہم اہلکار کو قلیل سی رقم دے کر یعنی بطور رِشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کروالیا، اور اب تنخواہ بغیر کام کئے کے لے رہا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ شخص بھی حق پر تھا، اور اپنا جائز کام کرانے کے لئے رِشوت دی تھی، بصورتِ دیگر اس کے خلاف بھی فیصلہ ہوسکتا تھا، اب اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- حکومت کے جس قانون کے تحت سرکاری ملازمین (فوجی ہوں یا سِوِل) کا تقرّر، تنزل، یا معزولی وغیرہ عمل میں آتے ہیں، اس قانون کے نافذ ہوجانے کے بعد وہ قانون فریقین کے معاہدۂ ملازمت کا حصہ بن جاتا ہے، اور اس پر وہی اَحکام جاری ہوتے ہیں جو معاہدۂ اِجارہ کی شرائط پر ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کی خلاف ورزی شرائطِ معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھی جائے گی۔ اب اگر کسی سرکاری ادارے نے ان شرائط یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی ملازم کو معزول کیا، جبکہ قانون میں یہ بھی ہو کہ ایسی معزولی قانوناً معتبر نہ ہوگی، تو یہ معزولی شرائطِ معاہدہ کے خلاف ہونے کی بناء پر شرعاً بھی دُرست نہ ہوئی اور زید بدستور ملازمت پر برقرار رہا۔ اور اس کا اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی خدمات ادارے کو پیش کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ و تیار تھا، اس لئے اس کا کام نہ کرنا اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ادارے کی غلطی کی وجہ سے ہوا، جس نے اس سے کام نہیں لیا۔ لہٰذا اگر عدالت اُسے اس زمانے کی تنخواہ بھی محکمے سے دِلواتی ہے تو مندرجہ بالا وجہ کی بناء پر اس کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔ تاہم اگر وہ احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس زمانے کی تنخواہ نہ لے تو یہ تقویٰ کی بات ہے جو اِن شاء اللہ موجبِ اجر ہوگی۔

جواب ۲:- اس ملازم کو رِشوت دینا ہرگز جائز نہیں تھا،[1] اس نے رِشوت دے کر سخت حرام کا ارتکاب کیا، اور اگر رِشوت کے ذریعے ناحق فیصلہ کرایا تو گناہ بھی دُگنا ہے، اور یہ رقم لینا بھی حلال نہیں، لیکن اگر فیصلہ جواب نمبر ۱ کی تفصیل کے مطابق شرعاً دُرست ہو تو رِشوت کے گناہ کے باوجود کام نہ کرنے کے زمانے کی تنخواہ لینے اور اسے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، جس کی وجہ جواب نمبر ۱ میں لکھی جاچکی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۰۹/۱۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹۳۱/۴۰ ب)

حکومت کی طرف سے ''قابض'' کو الاٹمنٹ کا حق دینے کی صورت میں پلاٹ کا مالک مؤجر ہوگا یا کرایہ دار؟

سوال:- ہمارے پاس ایک اَن اتھرائز جگہ جو بغیر الاٹ شدہ ہے، جس پر تھوڑی دیوار اور چھت بنی ہوئی تھی ہمارے پاس کرایہ پر ہے، اور محمد اسلم سے کرایہ پر لیا ہے، اس جگہ کا کرایہ ۴۲۵ روپے مہینہ ہے، یہ جگہ جیکب لائن میں ہے، محمد اسلم سے ہمارا 2-4-1979 کو ایک اگریمنٹ ہوا

(۱) وفی سنن الترمذی ج: ۱ ص: ۲۴۸ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی هریرةؓ قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الراشی والمرتشی فی الحکم۔ نیز دیکھئے ص: ۴۰۹ کا حاشیہ نمبر ۲۔

جو پانچ سال کے لئے تھا، اگریمنٹ پر جو ایڈوانس چار ہزار روپے دیئے تھے اور جو جگہ ہم نے تعمیر کرائی، بجلی ہم نے لگوائی اور بجلی کا بل بھی ہمارے نام ہے، ان تمام اخراجات کی ہمارے پاس تحریر اور رسیدیں موجود ہیں، اب گورنمنٹ اس جگہ کو الاٹ کر رہی ہے، گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو جگہ پر قابض ہوگا وہ سروے کراسکتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے نام کے سروے کرایا ہے، اور ابھی ہمارے پانچ سال بھی نہیں ہوئے، ہم نے اس جگہ کو دو حصے میں کر دیا تھا جس ایک حصے کو ہم نے ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ پر دے دیا تھا، یہ ساری تعمیر ایڈوانس کے علاوہ ہمارا خرچ ہے، ہماری کرایہ پر دی ہوئی جگہ کا بھی اُس کرایہ دار نے گورنمنٹ سے سروے کرلیا، جگہ کے مالک نے ہم دونوں کو دھونس دے کر سروے سلپ لے لی، پھر ہم سے کہا کہ جو جگہ کرایہ پر دی ہے اس کو خالی کرادو، تو ایک سروے سلپ تم کو دے دُوں گا۔ لہٰذا ہم نے چار سو روپے دے کر وہ جگہ خالی کرالی اس دوران ہم نے اس سے کہا کہ ہم آپ کی جگہ خالی کرتے ہیں لہٰذا ہم کو ایڈوانس اور ہمارا جو خرچہ ہوا ہے وہ دے دو، اس نے کہا کہ: ہم ایک سروے سلپ دیں گے، اب وہ سروے سلپ دینے کو تیار نہیں بلکہ خرچہ دینے کو تیار ہے، حالانکہ سروے سلپ ہمارے نام ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جگہ الاٹمنٹ اسی کے نام ہوگا جس کے نام سروے سلپ ہے، اور وہ شخص بھی کسی طرح اس جگہ کو نہیں لے سکتا جب تک ہم اس کو لکھ کر نہ دیں۔ اسلم سے جو اگریمنٹ ہم نے کیا تھا اس کی انگریزی کاپی منسلک ہے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ جو کرایہ دار ہے جگہ اسی کے نام الاٹ ہوگی۔ نیز بجلی کے مصارف اور دیوار، چھت وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوا ہے اس کے کاغذات موجود ہیں۔

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اس جگہ کا اصل قابض محمد اسلم ہے، کیونکہ اس نے اس پر عمارت تعمیر کر رکھی ہے اور شرعاً یہ کرایہ عمارت کا ہوا، لہٰذا بشیر احمد کی حیثیت عمارت کے کرایہ دار کی ہے، جس نے کرایہ کے معاہدے میں یہ صراحت کی ہے کہ وہ پانچ سال کے بعد اس عمارت کو خالی کردے گا، لہٰذا اگر حکومت نے الاٹمنٹ کا حق صرف قابض کو دیا تھا تو اس کا اصل حق دار محمد اسلم ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۲/۷/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۸۲/۳۳ ج)

لیز پر گاڑی خریدنے کا حکم

سوال:- شیخ الحدیث و مفتی صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لیز پر جو بینک سے گاڑی ملتی ہے اُس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- محترمی! سلام مسنون

لیز پر جو معاہدات ہوتے ہیں وہ جائز وناجائز ہر طرح کے ہوتے ہیں، آج کل اکثر لیز کے معاملات ناجائز ہیں، البتہ میزان بینک کا طریقہ بہتر ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے کی گنجائش ہے۔

والسلام

۱۴۲۵/۳/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۶/۱۸)

سودی قرضہ لے کر خریدے گئے مکان کے کرائے کا حکم

سوال:- حضرت علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون آکلینڈ (نیوزی لینڈ) سے خلیل احمد کا سلام قبول ہو، اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت سے رکھے اور ہم کو آپ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائے، آمین۔

دیگر عرض ہے کہ آپ سے فون پر جو بات ہوئی تھی، اسی حوالے سے سوال عرض ہے کہ یہاں ایک کمیٹی ہے جس کے ماتحت ایک اور کمیٹی ہے جو کاروبار کرتی ہے اور جو منافع ہوتا ہے وہ مختلف مساجد کو دیتے ہیں گویا یہ کمیٹی نیوزی لینڈ کے تمام مسلمانوں کی ہے۔

انہوں نے چند مہینوں پہلے ایک مکان خریدا کرایہ کے لئے، جس کی قیمت ۸ لاکھ ۶۰ ہزار ڈالر ہے، جس میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار بینک سے قرضہ لے کر ادا کیا، باقی قرضِ حسنہ کے طور پر جمع کر کے ادا کیا گیا۔ اس عمارت کو اُجرت پر دیا گیا ہے سالانہ ۷۰ ہزار ڈالر آمدنی ہے، جو مساجد اور کارِ خیر میں استعمال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں سودی قرضہ لگایا گیا ہے، لہٰذا گناہ ہے اور اس معاملے کو ختم کردیا جائے، اور اس مکان کو بیچ کر بینک کا قرضہ ختم کردیا جائے۔ لیکن ایک دُوسری رائے ہے کہ اس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور سودی قرضہ جلد از جلد ادا کردیا جائے، کیونکہ اس مکان کو بیچ کر جو قرضہ ادا کیا جائے گا تو تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اور شریعتِ اسلامیہ ہمیں کیا رہنمائی فرماتی ہے؟ برائے کرام دلائل کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور جلد از جلد جواب ارسال فرمائیں۔

احقر خلیل احمد نادات

۲۰۰۲/۸/۱۳ء

جواب:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس ملا، سوال کا جواب یہ ہے کہ بینک سے سود پر قرض لینا بہت سخت گناہ ہے،[1] اور اگر غلطی سے ایسا سودی قرض لے لیا گیا ہو تو اُس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی جو بھی صورت ہو، اِختیار کرنا شرعاً واجب ہے۔[2] لیکن اس قرض کی رقم سے جو مکان خریدا گیا اُس سے فائدہ اُٹھانا حرام نہیں۔[3] اور اگر اسے کرایہ پر دیا گیا ہے تو وہ کرایہ بھی حرام نہیں۔[4] لہٰذا اگر مکان کو فروخت کئے بغیر اس سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہو تو مکان فروخت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے کرائے سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (دیکھئے امداد الفتاویٰ ص:۱۶۹ و ۱۷۰ ج:۳ سوال نمبر ۲۲۴)۔ لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ممکن ہو۔ اگر مکان کو فروخت کئے بغیر سودی قرض سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو، یا اس میں بہت دیر لگنے کا اندیشہ ہو جس سے سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے، اور مسلسل سود کی ادائیگی کا گناہ جاری رہے تو پھر مکان کو فروخت کر کے سودی قرض سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۸ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷/۵۶۳)

☆ ☆ ☆

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۲۵ کا حاشیہ نمبر۳ اور ص:۲۶۷ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔
(۲) دیکھئے ص:۱۲۰ و ص:۱۲۱ کے حواشی، اور مزید تفصیل کے لئے ص:۱۲۹ کا فتویٰ۔
(۳ و ۴) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۱۲۸ اور ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

کتاب الرّھن
(رہن یعنی گروی رکھنے اور اُس سے متعلق مختلف مسائل کا بیان)

ڈپازٹ کے طور پر رکھوائی جانے والی رقم رہن ہے یا قرض؟

(چند فقہی عبارات کی وضاحت)

سوال:- بخدمت شیخی ومرشدی واُستاذی مدظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ میں ایک علمی خط لکھا تھا، جس میں بطورِ ڈپازٹ رقم رکھوانے کے جواز کی فقہی تخریج پر ایک شبہ عرض کیا تھا، حضرتِ والا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ: ''اس فتویٰ کی کاپی دارالعلوم سے منگوالی جائے، اس میں جہاں تک یاد ہے، مفصل تخریج بیان کی گئی ہے۔'' بندہ نے اس کے بعد فتویٰ کی فوٹو کاپی حاصل کی، فتویٰ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی مدظلہٗ کا لکھا ہوا تھا، اور اس پر حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہٗ کے دستخط تھے، لیکن اس فتویٰ کو دیکھ کر بھی بندہ کا شبہ دُور نہ ہوا، تو بندہ نے دوبارہ حضرتِ والا کی خدمت میں اپنے شبہ کا اعادہ کیا، تو حضرتِ والا نے فرمایا کہ ایک طالبِ علم کے ذمہ اس کی تحقیق لگائی ہوئی ہے، جب وہ تیار ہوجائے تو لے لیں۔'' چنانچہ اس کے بعد بندہ نے متعدّد مرتبہ دارالافتاء سے رُجوع کیا لیکن اس بارے میں کچھ معلومات نہیں ہو پارہی تھیں، بالآخر کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ فتویٰ تیار ہوگیا ہے، بندہ نے وہ فتویٰ مولانا افتخار بیگ کے توسط سے حاصل کیا، اِس فتویٰ پر حضرتِ والا کی تصدیق ہے۔

پہلے تو بندہ کا خیال یہ تھا کہ شاید حضرتِ والا کے ذہن میں فقہی تخریج کوئی اور ہوگی یا اِس فتویٰ میں بندہ کے شبہ سے تعرض کرکے اس کا جواب دیا گیا ہوگا، لیکن اِس فتویٰ کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں، اس فتویٰ میں وہی تخریج ہے جو مفتی عبدالرؤف صاحب نے لکھی ہے، اور اِس فتویٰ کے بارے میں بندہ کو وہی شبہ ہے جو سابق فتویٰ میں تھا۔

اس لئے بندہ دوبارہ اپنے شبہ کا اعادہ کرنے کی جرأت کر رہا ہے، اُمید ہے کہ اِس مرتبہ حضرتِ والا شفقت فرماتے ہوئے اس شبہ کا اِزالہ فرمائیں گے۔

بطور ڈپازٹ رقم رکھوانے کی فقہی تخریج کا حاصل یہ ہے کہ یہ معاملہ اِجارہ بشرط القرض ہے، اور چونکہ اِس شرط کا عرف عام ہے اس لئے جائز ہے۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جس غرض اور مقصد کے تحت یہ رقم دی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر اس رقم پر رہن کی تعریف صادق آتی ہے، رہن کی تعریف تنویر الابصار میں اِن الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

"حبس شیء مالی بحق یمکن استیفاؤه منه" (ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۷۷) اور عقود میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے، نیز عرفِ عام میں بھی بندہ کے علم میں کوئی بھی اس رقم کو قرض نہیں سمجھتا ہے بلکہ رہن ہی سمجھا جاتا ہے۔

اور دُوسری طرف رہن کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ رہن سے اِنتفاع جائز نہیں ہے (ردّ المحتار ج:۶ ص:۴۸۲) اور ڈپازٹ کی رقم سے اِنتفاع کیا جاتا ہے۔

دُوسرا شبہ یہ ہے کہ ردّ المحتار ج:۶ ص:۵۰۸ میں اس کی تصریح ہے کہ ثمن کو اِبتداءً رہن بنانا صحیح نہیں ہے، حیث قال: "والثمن وان کان دینا لا یصح رهنه ابتداء لٰکنه یصح رهنه بقاء" اس کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بطور ڈپازٹ رقم رکھوانا سرے سے جائز ہی نہ ہو۔

اس لئے حضرتِ والا سے دوبارہ عرض ہے کہ شفقت فرماتے ہوئے اِن شبہات کا اِزالہ فرمادیں۔

حضرتِ والا سے علم وعمل میں ترقی کی دُعاؤں کی درخواست ہے۔ بندہ محمد عامر

خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

جواب:- عزیز مکرّم سلّمہٗ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن اگرچہ دراہم ودنانیر کا ہوسکتا ہے (اور ثمن کے دَین کے بارے میں آپ نے جو عبارت لکھی ہے، اس میں غالباً "وان کان" کی واوَ غلط ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب ثمن دَین ہو تو وہ ابتداءً رہن نہیں کی جاسکتی) جیسا کہ تمام متون میں تصریح ہے، مثلاً ہدایہ میں "ویجوز رهن الدراهم والدنانیر" (ج:۴ ص:۵۳۱)۔[1] لیکن ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا، کما فی الهدایة وغیرها والرهن بالدرک باطل، والکفالة بالدرک جائزة، والفرق ان الرهن للاستیفاء ولا استیفاء قبل الوجوب، واضافة التملیک الی زمان فی المستقبل لا تجوز. (ایضاً ج:۴ ص:۵۲۷)۔[2] ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی

---

(۱) ج:۴ ص:۵۲۹ (طبع مکتبہ رحمانیہ)۔

(۲) ج:۴ ص:۵۲۵ (طبع مذکور)۔

وفی الدّر المختار، کتاب الرّهن، باب ما یجوز ارتهانه ومالا یجوز ج:۶ ص:۴۹۲ (طبع سعید) ثم لما ذکر ما لا یجوز رهنه ذکر ما لا یجوز الرّهن به فقال ولا بالأمانات کودیعة وأمانة ولا بالدّرک خوف استحقاق المبیع فالرّهن به باطل بخلاف الکفالة کما مرّ.

وفی الشامیة تحته (قولهٗ بخلاف الکفالة) أی بالدّرک فانّها جائزة والفرق أنّ الرّهن للاستیفاء ولا استیفاء قبل الوجوب لأنّ ضمان الدّرک هو الضّمان عند استحقاق المبیع فلا یصحّ مضافًا الیٰ حال وجوب الدَّین لأنّ الاستیفاء معاوضة واضافة التّملیک الی المستقبل لا تجوز أمّا الکفالة فهی لالتزام المطالبة لا لالتزام اصل الدَّین ولذا لو کفّل بما یذوب لهٗ علیٰ فلان یجوز ولو رهن به لا یجوز کفایة ملخّصًا .... الخ. وکذا فی البحر الرّائق ج:۸ ص:۲۴۴ (طبع سعید).

(محمد زبیر حق نواز)

کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا محض محتمل ہوتا ہے، لہٰذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے، اور مشروط بحکم العرف ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۲۵/۵/۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۳۶/۷۱۸)

رہن کے طور پر حاصل کی ہوئی دُکان کو کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:- زید نے اپنی دُکان بکر کے پاس گیارہ سو روپے میں رہن بالقبض رکھ دی، اور یہ طے پایا کہ دُکانِ مذکور کو مرتہن چاہے جس کرایہ پر اُٹھادے، تین سال کے اندر راہن خود یہ روپے ادا کرے تو مرتہن دُکان چھوڑ دے گا، مرتہن نے پچاس روپے ماہانہ پر دُکان کرایہ پر اُٹھادی، یہ کرایہ جو تین سال میں اٹھارہ سو روپے ہے مرتہن کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ یا سود ہے؟ یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ اگر راہن نے تین سال کے اندر روپیہ ادا نہ کیا تو رہن بالقبض کی رجسٹری مرتہن کو کرادے گا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں دُکان کو کرایہ پر اُٹھانے سے رہن باطل ہوگیا، اور کرایہ کی جتنی رقم بکر نے وصول کی ہے وہ ساری کی ساری زید کا حق ہے، بکر کے لئے اس رقم کا اپنے پاس رکھنا سودخوری کے گناہِ عظیم میں مبتلا ہونا ہے۔ ہاں! وہ یہ کرسکتا ہے کہ اپنے قرض کی رقم جو گیارہ سو روپے ہے اپنے پاس رکھ لے اور باقی سات سو روپے مع دُکان کے زید کو واپس کردے۔

فی ردّ المحتار: وأما الإجارة فالمستأجر إن كان هو الراهن فهي باطلة وكانت بمنزلة ما اذا أعار منه أو أودعهٔ وان كان هو المرتهن وجدّد القبض للاجارة أو اجنبيًا بمباشرة أحدهما العقد باذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض للعاقد ولا يعود رهنا الّا بالاستئناف اهـ. (شامی ج:۵ ص:۴۵۲)[1]۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۸۴/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۶ھ

---

(۱) ردّ المحتار، كتاب الرّهن، باب التصرّف فى الرّهن والجناية عليه وجنايته ...الخ ج:۶ ص:۵۱۱ (طبع سعيد وفى طبع دار الفكر بيروت ج:۶ ص:۵۱۱).
وفى الهندية، كتاب الرّهن، الباب الثامن فى تصرّف الرّاهن أو المرتهن فى المرهون ج:۵ ص:۴۶۴ (طبع بلوچستان بک ڈپو) وان آجر المرتهن من اجنبى بأمر الرّاهن يخرج من الرّهن وتكون الأجرة للرّاهن .... الخ.
وكذا فى فتح القدير ج:۹ ص:۱۱۷، كتاب الرّهن، وبدائع الصنائع، كتاب الرهن ج:۶ ص:۱۴۶ (طبع سعيد)، والبحر الرّائق، كتاب الرّهن ج:۸ ص:۲۶۲ (طبع سعيد) والعناية شرح الهداية ج:۹ ص:۱۱۷.

مرہون زمین پر کاشتکاری اور اس کی آمدنی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے اپنی زمین کسی کے ہاں رہن رکھ دی، مرتہن اس سے نفع حاصل کرتا رہا، اب ایک نیا ایکٹ جو حکومت نے جاری کیا ہے کہ جس آدمی کے ہاں رہن زمین بیس سال تک رہے اس کے بعد بغیر کسی عوض کے زمین راہن کو واپس کردی جاتی ہے، کیا یہ معاملہ دُرست ہے؟

جواب:- مرتہن کے لئے رہن زمین سے نفع اُٹھانا جائز نہیں تھا،[۱] اس نے کاشت کے لئے دے کر جتنی آمدنی کمائی وہ راہن کی امانت ہے، اب اگر یہ آمدنی قرض کو پورا کردیتی ہے تو اَب راہن کے ذمے قرض باقی نہیں رہا، اور اگر پورا نہیں کرتی تو جتنا قرض زائد ہے اتنی کا واپس کرنا مرتہن کے ذمے لازم ہے۔[۲]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۵۵/۱۸ الف)

رہن سے نفع اُٹھانے اور بیس سال بعد زمین واپس راہن کو ملنے کے حکومتی قانون کا حکم

سوال:- (خلاصۂ سوال) یہاں رواج ہے کہ لوگ زمین رہن پر فروخت کردیتے ہیں اور مرتہن مالِ مرہون سے فائدہ بھی اُٹھاتا ہے، اس وقت تک کہ راہن پوری رقم لے کر واپس نہ کردے،

---

(۱) وفی الدّر المختار، کتاب الرّھن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعید) لا انتفاع بہٖ مطلقًا لا باستخدام ولا سکنٰی ولا لبس ولا اجارۃ ولا اعارۃ سواء کان من مرتھن أو راھن (اِلّا باذن) کل للآخر وقیل لا یحلّ للمرتھن لأنّہ ربا.

وفی الشامیۃ تحتہ ..... لا یحلّ لہٗ أن ینتفع بشیء منہ بوجہٍ من الوجوہ وان اذن لہ الرّاھن لأنّہ اذن لہٗ فی الرّبا لأنّہ یستوفی دینہ کاملًا فتبقی لہ المنفعۃ فضلًا فیکون ربا ..... الخ.

وکذا فی حاشیۃ الطحاوی ج:۴ ص:۲۳۴ کتاب الرھن، والبحر الرّائق ج:۸ ص:۲۳۸ کتاب الرّھن، والھدایۃ ج:۴ ص:۵۲۲ کتاب الرّھن (طبع شرکۃ علمیۃ).

کفایت المفتی ج:۸ ص:۱۴۴ (طبع جدید دارالاشاعت) میں ہے: زمین پر مرتہن کو صرف قبضہ کرنا جائز ہے، اس کو کاشت کرنا یا کاشت کے لئے کسی کو دینا جائز نہیں، اور اگر خود کاشت کرے تو اس کا پورا کرایہ راہن کو اَدا کرے، یا اس کی رقم میں سے وضع کرے، اور اگر کسی دُوسرے کو کاشت کے لئے دی ہے تو اس کا پورا معاوضہ راہن کو دے یا رقم رہن میں سے وضع کرے۔

اب حکومت نے قانون نافذ کیا ہے کہ ایسی رہن زمین اگر بیس سال مرتہن کے پاس رہے تو اس کے بعد رہن زمین بلا معاوضہ راہن کو واپس مل جاتی ہے۔

جواب:- رہن زمین سے نفع اُٹھانا بالکل ناجائز، حرام اور بحکمِ سود ہے، جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے اس کے لئے اس رواج کو جس حد تک ممکن ہو روکنا واجب ہے، **لا یحلّ لهٗ ان ینتفع بشیء منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لأنه اذن لهٗ في الربا لانه یستوفي دینه کاملًا فتبقی له المنفعة فضلًا فیکون ربًا وهٰذا امر عظیم، (شامی جلد خامس)۔**[1]

پھر اگر حکومت کے قانون کی رُو سے بیس سال بعد قرض دار کو بلا معاوضہ زمین واپس مل جائے اور اس عرصے میں زمین کے منافع قرض خواہ اس قدر اُٹھا چکا ہو جو اس کے قرضے کے برابر یا زیادہ ہوں تو قرض دار کے لئے اپنی زمین سے فائدہ اُٹھانا بلاشبہ حلال ہے۔ اور مرتہن پر واجب ہے کہ قرض سے زائد انتفاع کا کرایہ راہن کو دے۔[2]

واللہ اعلم

الجواب صحیح　　　　احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

محمد عاشق الٰہی بلند شہری　　　　۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۴/۱۸ الف)

گروی موٹر سائیکل استعمال کر کے اس کا کرایہ قرض میں محسوب کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے ہمارے پاس مبلغ بیس ہزار روپے کے عوض ایک اسکوٹر گروی رکھوائی ہے، اور ہمیں اجازت دی ہے کہ جب تک وہ میری رقم ادا نہ کرے ہم اس کی اسکوٹر اِستعمال کر سکتے ہیں، کیا یہ ہمارے لئے جائز ہے؟

جواب:- جو موٹر سائیکل گروی رکھی گئی ہے، قرض خواہ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے،[3] البتہ اگر اِستعمال کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرّر کر کے اسے قرض میں محسوب کیا جائے تو جائز ہے۔[4]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۸/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۳)

---

(۱) شامیة، کتاب الرّهن ج:۶ ص:۴۸۲ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص:۴۲۲ کا حاشیہ۔
(۲) دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ۔
(۳ و ۴) حوالہ جات کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۴۲۲ کا حاشیہ۔

۱- قرض کے عوض دُکانیں رہن پر رکھوانے کی مخصوص صورت کا حکم
۲- مرتہن کی اجازت کے بغیر راہن کا گروی دُکانیں فروخت کرنے کا حکم
۳- گروی دُکانوں میں سامان رکھنے سے رہن کا معاملہ ختم نہیں ہوگا

سوال ۱:- گزارش یہ ہے کہ ایک مسئلے کے متعلق فتویٰ تحریر فرمائیں، وہ مسئلہ اس طرح ہے کہ ایک شخص محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان نے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے مبلغ ۱۱۰۲۰۸۹ روپے دینے ہیں، جس کی تصدیق وہ اپنی تحریر میں کرتا ہے، محمد اسلم خان ولد عباس خان اپنی ملکیتی جائیداد میں سے تین دُکانوں کا قبضہ شبیر احمد ولد عبدالمجید کو دے دیتا ہے، اور بطور ثبوتِ قبضہ کرایہ کی تین رسیدیں اپنی طرف سے دے دیتا ہے، (یہ واضح رہے کہ کرائے کی ادائیگی نہیں کی گئی) اور کہتا ہے کہ میں فلاں تاریخ تک تمہیں رقم ادا کر کے اپنی دُکانیں واپس لے لوں گا۔ اور اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دُکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کرلیں۔ براہِ کرم فتویٰ تحریر فرمائیں کہ اس معاملے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعی طور پر کیا حق حاصل ہے؟ عین نوازش ہوگی۔

جزاکم اللہ فی الدارین۔

سوال ۲:- مندرجہ معاملے کے بعد محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان فرار ہوگئے، ایک حافظ عبدالرشید سورتی (بقول ان کے اس نے بھی محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان سے پانچ لاکھ روپے لینے تھے) نے محمد اسلم خان ولد محمد عباس خان کی ملکیتی جائیداد (مارکیٹ) کے کاغذات حاصل کر کے اپنے ایک دوست کے نام مارکیٹ کی ملکیت منتقل کرادی۔

اسی مارکیٹ میں ایک دُکان کسی دُوسرے شخص کے قبضے میں ۱۴۰,۰۰۰ روپے کے عوض میں تھی، حافظ عبدالرشید سورتی نے یہ رقم ادا کر کے دُکان آزاد کروا کر دُکان اپنے قبضے میں کرلی، اس دُکان کے علاوہ اسی مارکیٹ کی مزید چار دُکانیں حافظ عبدالرشید سورتی کے قبضے میں ہیں، مارکیٹ کی ملکیت منتقل کرانے سے قبل حافظ عبدالرشید سورتی کے علم میں یہ بات تھی کہ تین دُکانیں اسی مارکیٹ میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس بطور رہن ہیں، مارکیٹ کی ان دُکانوں میں شبیر احمد ولد عبدالمجید نے کچھ سامان رکھ دیا تاکہ دُکانیں خالی نہ رہیں اور قبضے کا ثبوت رہے، کسی قسم کا کاروباری معاملہ ہرگز نہیں کیا گیا، اور نہ تجارتی طور پر ان دُکانوں کو اِستعمال کیا گیا، لیکن حافظ عبدالرشید سورتی نے صرف سامان رکھنے کی وجہ سے ان دُکانوں کے رہن ہونے کا انکار کردیا، بعد ازاں حافظ عبدالرشید سورتی، شبیر احمد ولد عبدالمجید کو مقدمہ بازی کی دھمکی دیتے ہوئے ایک معاہدہ کرالیتا ہے جس میں وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ

دُکانوں کا کرایہ ادا کرے (اور کرایہ وصول کر رہا ہے) اور جس وقت دُکانیں فروخت کی جائیں تو شبیر احمد ولد عبدالمجید، حافظ عبدالرشید سورتی کو دو لاکھ روپے بطور رسید بدلوائی کے ادا کرے، جبکہ یہ دُکانیں شرعی نقطۂ نگاہ سے شبیر احمد ولد عبدالمجید کے پاس رہن ہیں، اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ تحریر فرمائیں:-

۱- حافظ عبدالرشید کا یہ فعل شرعی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہے؟

۲- حافظ عبدالرشید سورتی کے معاہدے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳- حافظ عبدالرشید سورتی پر شرعاً کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

۴- اس معاملے میں شبیر احمد ولد عبدالمجید کو شرعاً کیا حق حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

جواب:- مندرجہ بالا دونوں سوالوں میں جو واقعات تحریر کئے گئے ہیں، اگر وہ بالکل دُرست ہیں تو دونوں سوالوں کا مشترک جواب یہ ہے کہ محمد اسلم خان نے تقریباً گیارہ لاکھ روپے کے مدیون ہونے کی حیثیت سے شبیر احمد کو اپنی تین دُکانوں کا قبضہ جو یہ کہہ کر دیا کہ ''اگر میں اس تاریخ تک رقم ادا نہ کروں تو آپ دُکانیں فروخت کر کے اپنی رقم وصول کرلیں''، شرعاً اس سے یہ دُکانیں شبیر احمد کے پاس رہن ہوگئیں (للعبارة الأولیٰ) اور بطور ثبوتِ قبضہ کرائے کی جو تین رسیدیں دی گئیں ان سے اس معاملے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور یہ رہن ہی شمار ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شبیر احمد کی طرف سے نہ کرایہ ادا کیا گیا، نہ محمد اسلم خان کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا، اور نہ کرائے کو اَصل قرض میں محسوب کرنے کا کوئی معاہدہ طے پایا۔ اب جبکہ یہ دُکانیں رہن ہوگئیں تو مرتہن یعنی شبیر احمد کی اجازت کے بغیر ان دُکانوں کا بیچنا محمد اسلم خان کے لئے جائز نہیں تھا، اب اس نے حافظ عبدالرشید سورتی کو اپنی مارکیٹ کی جو بیع کی وہ ان دُکانوں کی حد تک مرتہن یعنی شبیر احمد کی اجازت پر موقوف رہی، **(للعبارة الثانية)**۔

اگر شبیر احمد نے اس بیع کی اجازت دے دی ہوتی، خواہ صریحاً یا ضمناً تو یہ بیع دُرست ہوجاتی، لیکن سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شبیر احمد نے اس بیع کی اجازت نہیں دی، اس کے بعد شبیر احمد نے حافظ عبدالرشید سورتی کے ساتھ کرایہ داری کا جو معاہدہ کیا، اگر وہ کسی زور زبردستی کے بغیر اور مکمل رضامندی کے ساتھ ہوتا تب بھی اس معاہدے کو بیع کی ضمنی اجازت قرار دیا جاسکتا تھا، اور اس کی وجہ سے یہ دُکانیں رہن سے نکل جاتیں، اور ان میں کرایہ داری کا معاملہ دُرست ہوجاتا **(للعبارة الثالثة)**۔

لیکن سوال میں جو صورتِ حال بیان کی گئی ہے اور جس کی وضاحت سائل نے زبانی بھی کی وہ یہ ہے کہ کرایہ داری کا یہ معاہدہ برضا و رغبت نہیں ہوا، بلکہ شبیر احمد کی طرف سے یہ معاہدہ اس دباؤ

کے تحت کیا گیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ کیا جاتا تو دُکانیں جو اس کے پاس رہن تھیں اس کے قبضے سے نکل جاتیں اور قانونی طور پر اس کے لئے اپنا قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ تھا، کیونکہ اس کو مقدمہ بازی کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔ لہٰذا اگر صورتِ حال یہی ہے جو سوال میں بیان کی گئی ہے، تو یہ کرایہ داری کا معاہدہ بھی شرعاً دُرست نہیں ہوا (للعبارة الرابعة)۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شبیر احمد نے قبضے کے ثبوت کے طور پر دُکانوں میں کچھ سامان رکھ دیا، سو اس سے اس کے رہن ہونے کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اوّل تو یہ سامان سائل کی تصریح کے مطابق صرف قبضے کے ثبوت کے لئے رکھا گیا، دُکانوں کے باقاعدہ استعمال کے لئے نہیں۔

دُوسرے اگر مرتہن شیٔ مرہون سے کوئی فائدہ بھی اُٹھائے تو یہ فائدہ اُٹھانا اس کے لئے شرعاً ناجائز ضرور ہے لیکن شیٔ مرہون کے رہن ہونے کی حیثیت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور اس سے رہن باطل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بصورت صحتِ واقعاتِ مندرجہ سوال یہ تینوں دُکانیں اب بھی شبیر احمد کے پاس بطورِ رہن ہیں، اور اس کے ذمے حافظ عبدالرشید سورتی کو کرایہ دینا شرعاً واجب نہیں۔ ان اَحکام کی دلیل کے لئے عباراتِ فقہیہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱ - **العبارة الأولیٰ:- وأمّا رکن عقد الرّهن فهو الایجاب والقبول وهو أن یقول الراهن رهنتک هٰذا الشیء بمالک علیّ من الدَّین أو یقول هٰذا الشیء رهن بدَینک وما یجری هٰذا المجریٰ ویقول المرتهن: ارتهنت أو قبلت أو رضیت وما یجری مجراهٗ فامّا لفظة الرهن فلیست بشرطٍ حتّی لو اشتریٰ شیئًا بدراهم فدفع الی البائع ثوبًا وقال له: أمسک هٰذا الثوب حتّی أعطیک الثمن، فالثوب رهن لأنه أتی بمعنی العقد والعبرة فی باب العقود للمعانی کذا فی البدائع. (عالمگیریة ج:۵ ص:۴۳۲)**.[1]

۲ - **العبارة الثانیة:- توقف بیع الراهن رهنه علیٰ اجازة مرتهنه أو قضاء دینه فان وجد أحدهما نفذ وصار ثمنه رهنًا فی صورة الاجازة ...الخ. (الدر المختار ج:٦ ص:۵۰٦)**[2]

۳ - **العبارة الثالثة:- وکذٰلک لو استأجره المرتهن صحّت الاجارة وبطل الرّهن اذا جدّد القبض للاجارة. (شرح المجلّة ج:۳ ص:۱۹۱)**.[3]

۴ - **وفی الدر:- أو حبس أو قیدٍ مدیدین بخلاف حبس یوم أو قیدهٖ أو ضربٍ غیر**

---

(۱) عالمگیریة، کتاب الرّهن ج:۵ ص:۴۳۱ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۲) الدّر المختار ج:٦ ص:۵۰۸ (طبع سعید)

وفی شرح المجلّة للأتاسیّ رقم المادّة:۷۴۷ ص:۱۸۹ (طبع مکتبه حبیبیه) لو باع الراهن الرهن بدون رضی المرتهن لا ینفذ البیع ...الخ.

وکذا فی الهندیة ج:۵ ص:۴٦۲ الباب الثامن، وکذا فی الهدایة ج:۴ ص:۵۳۷ (طبع مکتبه رحمانیه) کتاب الرّهن (طبع شرکة علمیه).

(۳) طبع مکتبة حبیبیه کوئٹه.

شدیدٍ الا لذی جاہ (درر) حتی باع أو اشتری أو أقرّ أو آجر فسخ ما عقد ولا یبطل حق الفسخ بموت أحدهما (الٰی) أو أمضٰی لأن الاکراہ والملجئ وغیر الملجئ یعدمان الرضاء والرضاء شرط لصحّة هٰذه العقود وکذا لصحّة الاقرار فلذا صار له حق الفسخ والامضاء. (ج:٦ ص:١٣٠).[1]

وفی الدر:- وهل الاکراہ بأخذ المال معتبر شرعًا ظاهر القنیة نعم وفی الوهبانیة إن یقل المدیون انی مرافع، لتبری فالاکراہ معنی مصور (قولهٗ ظاهر القنیة نعم) وعبارتها ف ع متغلب قال لرجلٍ: امّا ان تبیعنی هٰذه الدار أو أدفعها الیٰ خصمک، فباعها منه، فهو بیع مکره، ان غلب علٰی ظنّهٖ تحقیق ما أوعده. قال رضی الله عنه: فهٰذهٖ اشارة الٰی أن الاکراہ بأخذ المال اکراہ شرعًا (شامی) قوله (انی مرافع) أی مرافعک للحاکم أی وکان ظالمًا یؤذی بمجرّد الشکایة کما فی القنیة. (شامی ج:٦ ص:١٤٢، مطبوعه ایچ ایم سعید).

واللہ سبحانہ اعلم
١/١١/١٤١٠ھ
(فتویٰ نمبر ۷۴/۴۱ و)

(وضاحت)

مذکورہ فتویٰ کے بعد تنازعہ کے ایک فریق کی طرف سے دوبارہ ایک سوال مرتب کیا گیا جس کا حضرتِ والا دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا، وہ سوال اور جواب درج ذیل ہیں۔ (محمد زبیر)

حقِ کرایہ داری اور پگڑی کو رہن کے طور پر رکھنے کی ایک مخصوص صورت اور اس کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ محمد اسلم خان نے پانچ لاکھ روپے قرض لے کر اس کے بدلے میں چیک دیا اور یہ کہا کہ اگر یہ چیک کیش نہ ہوگا تو میں اپنی بیوی کو طلاق پر حلف اُٹھاتا ہوں، اور وقتِ مقرّرہ پر چیک کو بینک میں نہیں ڈالنے دیا کہ میرا گھر برباد ہوجائے گا، اس طرح چار ماہ گزر گئے، آخر میں پتہ چلا کہ وہ بہت مقروض ہے اور کراچی چھوڑ کر جاچکا ہے، اس کے والد صاحب اور بھائیوں کی خوشامد کرکے ان کو واپس بلوالیا، محمد اسلم کے آنے پر پتہ چلا کہ ان کے ذمے ۹۰ لاکھ کا قرضہ ہے، ہم نے پیسے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک مارکیٹ ہے، اس میں متعدّد دُکانیں ہیں، اس میں سے چار عدد دُکانیں میں اپنے قرض خواہوں کو ان کے روپے کے بدلے میں دے چکا ہوں حقوقِ کرایہ داری کے ساتھ، اب میرے پاس پوری مارکیٹ کی ملکیت اور پانچ دُکانیں خالی ہیں، وہ آپ مجھ سے لے لیں، اور مجھ کو مزید تین لاکھ دے دیں تاکہ میں

(۱) طبع سعید.

ایک دُکان خالی کراسکوں، جس پر ایک قرض خواہ قابض ہے، اور چار دُکانیں میں نے مروّجہ طور پر یعنی پگڑی پر قرض خواہوں کو دے دی ہیں، اور کرایہ داری کی رسید بھی بنادی ہے، مارکیٹ کے حقوقِ ملکیت آپ کی طرف منتقل کرنے میں یہ شرط ہوگی کہ آپ ان کے حقوقِ کرایہ داری تسلیم کریں، تاکہ میری عزّت خراب نہ ہو، اور بعد میں باقاعدہ اس کی رسید جاری کریں، اس پر ان کے سالے فیروز صاحب نے یہ شرط رکھی۔ ہم نے ان کی یہ شرط منظور کرلی اور مزید پیسہ دے کر پوری مارکیٹ کے حقوقِ ملکیت اور پانچ خالی دُکانیں اپنے نام پر منتقل کرالیں، اور باقاعدہ رجسٹری بھی کرالی، مارکیٹ کی ملکیت اسلم صاحب کی بیوی کے نام تھی، اسلم صاحب کی بیوی نے اپنے بھائی اور سسر صاحب کے ساتھ کورٹ میں جاکر ہمارے نام منتقل کردی اور ہمیں قبضہ دیا، اور ہم نے اپنے ایک ساتھی کے نام کروالی۔

کچھ عرصے کے بعد مولوی منیر صاحب تین دُکانوں کی رسید اور ایک پرچہ اسلم صاحب کا لے کر آئے کہ یہ تین دُکانیں ہمارے پاس رہن ہیں، ہم نے کہا کہ مارکیٹ رجسٹری کرانے سے پہلے اسلم صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ یہ تین دُکانیں منیر صاحب کو دے دی ہیں، تم ان کے نام تین پکی رسید جاری کردینا، اور رسید جاری کرنے کے لئے مزید پیسے کا مطالبہ نہ کرنا، ورنہ میری عزّت خراب ہوگی، تاہم اس کو تسلیم کرتے ہوئے مولوی منیر صاحب نے کہا کہ ہم آپ کی کرایہ کی رسید بنانے کے لئے تیار ہیں، ہم اس کو رہن تسلیم نہیں کرتے، اس لئے کہ اسلم صاحب نے آپ کی کرایہ داری تسلیم کرکے رسید بنانے کے لئے کہا ہے، ورنہ ہمارے نام محمد اسلم خان پوری مارکیٹ رجسٹری نہ کرتا، منیر صاحب نے جو پرچہ اسلم خان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا ہے اسی طرز کا اسلم خان کے ہاتھ کا ایک اور پرچہ بنام محمد اقبال صاحب جس میں یہی مضمون ہے کہ اگر میں نے اس کے پیسے ادا نہ کئے تو یوسف مارکیٹ کی دو دُکانیں نمبر ۶ اور نمبر ۷ کو فروخت کرکے اپنے پیسے وصول کرلیں، جبکہ وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروّجہ پگڑی کا مالک تھا، اور اسلم خان کے نام کرایہ کی رسید تھی جو کہ بعد میں ان کی بیوی اور سالے نے افضل صاحب کے نام پر رسیدیں منتقل کروادیں۔

منیر صاحب سے ہم نے کہا کہ پرچہ دِکھانے کی ضرورت نہیں، ہماری اطلاع میں پہلے ہی یہ بات ہے کہ اسلم خان نے یہ تین دُکانیں آپ کو دی ہیں، اور ہم سے بھی یہ وعدہ لیا ہے کہ ہم آپ کے قبضے کو تسلیم کریں اور رسیدیں بنادیں، ہم رسید بنانے کو تیار ہیں، جس پر ان کا اصرار تھا کہ جب تک ہم کسی اور کو فروخت نہ کریں ہم سے کرایہ نہ لیا جائے، ہم نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا، کرایہ تو دینا پڑے گا، آئندہ آپ کسی کو بیچیں گے تو ہم رسید کٹوائی لیں گے، جس پر یہ ناراض ہوئے کہ چلو کسی مفتی کے پاس، ہمارے ساتھی نے کہا کہ ہم کو کسی مفتی کے پاس جانے کی جلدی نہیں، انہوں نے کہا: اس طرح ہم ڈیفالٹر ہوجائیں گے، تو ہم نے کہا کہ آپ کورٹ میں پیسہ جمع کرادیں، اس طرح ڈیفالٹر نہ ہوں گے۔

ہم نے ان کو کوئی دھمکی نہیں دی، جس پر یہ بعد میں مفتی اکمل صاحب کے پاس ہمیں لے گئے اور ان کے سامنے مروّجہ طور پر ایک فیصلہ طے پایا جو بعد میں لکھ لیا گیا۔

جہاں تک اِستفتاء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کرایہ کی رسید لی تھی اور محمد اسلم خان کو کرایہ نہیں دیا تھا، تو انہوں نے ہم سے بھی کرایہ کی رسید کے وقت یہ بات کہی تھی کہ ہم کرایہ نہیں دیں گے، جس کے ہاتھ پر ہم بیچیں گے آپ اس سے کرایہ لیجئے گا، تو ہم نے ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ کرایہ دینا پڑے گا۔

اور ہم اس بات پر حلف اُٹھا سکتے ہیں کہ کرایہ داری کی رسید کے لئے ہم نے ان پر کوئی زور زبردستی نہیں کی، بلکہ جب انہوں نے کہا کہ ہم ڈیفالٹر ہو جائیں گے، تو ہم نے کہا تھا کہ اس سے بچنے کے لئے آپ عدالت میں کرایہ جمع کرادیں تا کہ آپ کا حقِ قبضہ باقی رہے۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

تنقیحات

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب اسی کاغذ کے ساتھ لکھ کر بھیجیں، اِن شاء اللہ اس کے بعد جواب دیا جائے گا:-

۱:- سوال کے پہلے صفحے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مارکیٹ اور اس کی تمام دُکانیں محمد اسلم کی ملکیت تھیں، جن میں سے پوری مارکیٹ کی حقیقی ملکیت اس نے آپ کے نام منتقل کی، اور پانچ خالی دُکانیں قبضہ سمیت دیں۔ لیکن دُوسرے صفحے پر لکھا ہے کہ ''وہ مارکیٹ اسلم خان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ مروّجہ پگڑی کا مالک تھا'' ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، صحیح صورت کیا ہے؟ محمد اسلم مارکیٹ کا مالک تھا یا نہیں؟ اور اس نے آپ کو مارکیٹ مالکانہ طور پر فروخت کی؟ یا اس مارکیٹ میں صرف پگڑی لینے کا حق فروخت کیا؟ دُوسری صورت میں اس کا اصل مالک کوئی اور ہے یا نہیں؟

۲:- جب آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ تین دُکانیں مولوی محمد منیر صاحب کے پاس رہن ہیں؟

۳:- مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ طے پایا تھا، اس کی نقل ارسال فرمائیں۔

۴:- یہ فیصلہ جو ''مفتی محمد اکمل صاحب'' کی موجودگی میں ہوا، اس میں مولوی محمد منیر نے کیا اپنے آپ کو بحیثیت کرایہ دار واقعۃً تسلیم کیا تھا؟ یا یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے آپ کو کرایہ دار تسلیم نہیں کرتے، بلکہ بحیثیت مرتہن دُکانوں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے قانونی مجبوری کے تحت کرایہ داری لکھ رہے ہیں؟

۵:- کیا جب سے آپ نے محمد اسلم سے مارکیٹ خریدی اس وقت کے بعد کسی وقت مولوی محمد منیر صاحب نے اس بیع کی اجازت دی؟ یا آپ کو پوری مارکیٹ کا مالک تسلیم کیا؟ یا کوئی ایسا کام کیا

جس سے آپ کے مالک ہونے کا اعتراف لازم آتا ہو؟

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۱/۶/۱۴۱۱ھ

جوابِ تنقیحات

۱:- یہ دو مختلف مارکیٹیں ہیں، جن میں سے پہلی مارکیٹ کی مالک محمد اسلم کی اہلیہ تھی اور اسی مارکیٹ کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے، اور دُوسری مارکیٹ یوسف مارکیٹ ہے جس میں دو دُکانیں مروّجہ پگڑی پر محمد اسلم نے خریدی ہوئی تھیں اور محمد اسلم نے ان دو دُکانوں کے بارے میں بھی تقریباً وہی مضمون محمد اقبال کو لکھ کر دیا ہوا ہے، جو پہلی مارکیٹ میں مولوی منیر صاحب کو لکھ کر دیا تھا، یعنی ''اگر فلاں وقت تک رقم ادا نہ ہو تو دُکانیں فروخت کرکے رقم وصول کرلیں''۔ محمد اقبال اور محمد اسلم کے مابین معاہدے کی فوٹو کاپی ساتھ میں منسلک ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کو حقِ قبضہ (مروّجہ پگڑی) اور کرایہ داری دیا جارہا ہے، اسی لئے اس نے کرایہ داری کی رسید مولوی منیر صاحب کو جاری کی تاکہ کوئی ان کے کرایہ داری کے حق کو سلب نہ کرسکے اور قبضہ واپس نہ لے سکے۔

۲:- جب مارکیٹ ہمارے نام منتقل ہوئی اس وقت محمد اسلم نے ہم سے کہا تھا کہ تین دُکانیں مولوی منیر صاحب کو دے کر کرایہ کی رسید جاری کردی جائے، جب وہ کسی کو بیچیں تو کرایہ کی رسید بدل دینا، اس کا ذکر ہم اِستفتاء میں کرچکے ہیں۔

۳:- مفتی اکمل صاحب کی موجودگی میں جو فیصلہ ہوا اس کی نقل حاضرِ خدمت ہے۔

۴:- مولوی منیر صاحب نے ہمارے پاس آکر سب سے پہلے تین باتیں کی، اوّل یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے کہ تین دُکانیں اسلم صاحب نے ہمیں کرایہ کی رسیدیں دے کر قبضہ دیا ہوا ہے، تاکہ ہم اس کو بیچیں اور اپنی رقم وصول کرلیں۔ (دُوسری بات) اب آپ رسیدیں دیں اور کرایہ نہ لیں جس کو ہم بیچیں کرایہ آپ اسی سے لیں، اور ہم نے اسلم صاحب سے بھی رسیدیں لے کر کرایہ نہیں دیا تھا۔ (تیسری بات) جب ہم فروخت کریں تو رسید بدلوائی بھی نہیں دیں گے، وہ لینے والا آئندہ بیچے تو آپ اس سے رسید بدلوائی لے سکتے ہیں۔

ہم نے اس کو قبول نہیں کیا، اور تینوں دُکانوں کے کرایہ کا مطالبہ کیا اور رسید بدلوائی کے ۵ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا کہ جب آپ بیچیں گے تو ہم آپ سے پانچ لاکھ روپیہ لیں گے، اس پر وہ اور ہم جناب مفتی اکمل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں ان کی موجودگی میں جو طے ہوا اس کی نقل موجود ہے کہ تینوں دُکانوں کا کرایہ گیارہ سو روپے ماہانہ اور فروخت کرکے دو لاکھ روپیہ ہم کو دیں گے، یہ بات طے ہوئی اس فیصلے کی نقل منسلک ہے۔

۵:- مندرجہ بالا باتیں جو ہم سے مولوی منیر صاحب نے کی تھیں وہ ہم کو مالک تسلیم کر کے ہی کی تھیں، اور ہم نے سارے کاغذات ان کو دِکھا دیئے تھے، اور یہ ہم کو کرایہ دیتے رہے مسلسل چھ ماہ تک اس درمیان ہم سے کوئی بات نہیں ہوئی، چھ ماہ بعد نیا اِستفتاء مرتب کر کے فتویٰ لیا اور نئی چیز کھڑی کر دی اس دوران ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ ۱۹۹۰-۱۲-۳۰

مزید تفصیل جواب نمبر۱: محمد اسلم نے جو تحریر مولوی منیر صاحب کو دی ہے اس تحریر کی بنیاد پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یکم اکتوبر تک ادائیگی کہی تھی، ورنہ فروخت کا اختیار دیا تھا اور کرایہ داری کی رسید دے کر یہ بات ثابت کی کہ حقِ کرایہ داری فروخت کرسکتا ہے، گویا کہ حقِ کرایہ داری (مروّجہ پگڑی) کو رہن رکھوایا، اگر ملکیت رہن رکھی ہوئی ہوتی تو قاعدے کے حساب سے جائیداد کے کاغذات رکھوائے جاتے ہیں اور بیچنے کا اختیار دیا جاتا ہے، یہاں کرایہ داری کی رسید جاری کی یعنی وہ پگڑی پر بیچ سکتا ہے، اس لئے کہ مولوی منیر اور محمد اقبال دونوں کو جو تحریر دی ہے وہ ایک جیسی ہے، اور دونوں کو فروخت کی اجازت دی ہے اور حقِ کرایہ داری۔ فقط عبدالرشید عفا اللہ عنہ

جواب:- اس قضیہ سے متعلق ہمارے پاس اس سے پہلے شبیر احمد صاحب کی طرف سے ایک اِستفتاء آچکا ہے، کیونکہ اس قسم کے معاملات میں فریقین کے بیانات عموماً متضاد ہوتے ہیں جن سے مسئلے کے شرعی حکم پر فرق پڑجاتا ہے، اس لئے اُن کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے فریقِ مخالف یعنی حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے ساتھ مل کر ایک متفقہ اِستفتاء مرتب کریں تاکہ صورتِ مسئلہ دونوں کے اتفاق سے سامنے آنے کے بعد جواب دونوں کے لئے واجب التسلیم ہو، لیکن انہوں نے متفقہ سوال کے مرتب ہونے کے اِمکان کی نفی کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ مفتی کا کام چونکہ واقعات کی تحقیق نہیں ہے، بلکہ وہ سوال کی صورت کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے، چنانچہ سوال کی جو نوعیت اُس وقت تحریری طور پر بیان کی گئی اُس وقت اُس کے مطابق جواب دے دیا گیا، جو مؤرخہ ۱۴۱۰/۱۰/۲۸ھ کو ہمارے دارالافتاء سے جاری ہوا۔ اُس کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کی طرف سے یہ اِستفتاء موصول ہوا، اُن کو بھی یہی مشورہ دیا گیا کہ صورتِ سوال متفقہ طور پر فریقین کی طرف سے بطورِ اِستفتاء پیش کی جائے تو قضیہ کے حل میں سہولت ہوگی۔ لیکن انہوں نے بھی اس سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سوال کا جواب طلب کیا۔ اور اس اِستفتاء کو جوابِ تنقیحات کے ساتھ غور سے پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ اس سوال میں صورتِ مسئلہ اُس صورتِ مسئلہ سے مختلف ہے جو شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء میں بیان کی گئی تھی، دُوسرے متعدّد اختلافات کے علاوہ دونوں سوالات میں دو بنیادی فرق موجود ہیں، جن کی وجہ سے مسئلے کے شرعی حکم پر

بہت فرق پڑتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء میں یہ بات ظاہر تھی کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن کے طور پر دی تھیں، صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن نہیں رکھا تھا، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ اِستفتاء میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ محمد اسلم نے دُکانیں نہیں بلکہ اُن کا صرف حقِ کرایہ داری مولوی منیر احمد صاحب کے پاس رہن رکھا تھا۔

اور دُوسرا فرق یہ ہے کہ شبیر احمد صاحب کے اِستفتاء کے مطابق مفتی محمد اکمل صاحب کی موجودگی میں حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے لئے کرایہ داری کی جو تحریر لکھی گئی تھی وہ محض قانونی مجبوری اور دباؤ کے تحت لکھی گئی، برضا و رغبت نہیں، جبکہ حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ اِستفتاء میں زور زبردستی یا کسی قسم کے دباؤ کی نفی کی گئی ہے۔

اب حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے حالیہ اِستفتاء میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر احمد صاحب کو دُکانیں رہن نہیں رکھی تھیں بلکہ صرف اُن کا حقِ کرایہ داری رہن رکھا تھا، اور جب اُس نے یہ کہا تھا کہ ''اگر وہ یکم اکتوبر تک ادائیگی نہ کرے تو مولوی منیر احمد صاحب کو یہ دُکانیں فروخت کرنے کا اختیار رہوگا''، تو اس سے مراد دُکانوں کی حقِ ملکیت کی فروختگی نہیں بلکہ حقِ کرایہ داری کی فروختگی مراد تھی (جس کو عرفِ عام میں پگڑی کہتے ہیں) اگرچہ جو الفاظ محمد اسلم کی تحریر میں موجود ہیں اُن سے اس صورتِ حال پر دلالت نہیں ہوتی (اور محض یہ بات کہ یہی الفاظ محمد اقبال کے لئے لکھی گئی تحریر میں بھی موجود ہیں، جن کا مقصد پگڑی کا رہن ہے، اس بات کے لئے کافی نہیں کہ مولوی منیر احمد صاحب کی تحریر میں بھی اُن کے وہی معنی لئے جائیں، کیونکہ اوّل الذکر دُکانوں میں محمد اسلم صرف حقِ کرایہ داری کا مالک تھا، اور ثانی الذکر میں حقِ ملکیت اُس کا تھا) لیکن کاروباری عرف کے لحاظ سے اُن الفاظ میں پگڑی کے تصوّر کا احتمال ضرور موجود ہے، اور اگر مولوی منیر احمد صاحب اور محمد اسلم کے درمیان یہ بات باہم طے شدہ تھی کہ مولوی منیر احمد صاحب کو صرف حقِ کرایہ داری دیا جارہا ہے، اور مولوی منیر احمد صاحب نے یہی سمجھ کر اُن دُکانوں کا قبضہ لیا تھا تو بے شک یہی سمجھا جائے گا کہ محمد اسلم نے صرف حقِ کرایہ داری ان کی طرف منتقل کیا تھا، اور سوال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مولوی منیر احمد صاحب پر اچھی طرح واضح تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ جوابِ تنقیح نمبر۴ کے مطابق مولوی منیر صاحب نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے پاس آکر جو تین باتیں کہیں اُن میں سے دُوسری بات یہ تھی کہ: ''جس کو ہم بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' ان الفاظ سے واضح ہے کہ خود اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ جو کچھ فروخت کریں گے وہ حقِ کرایہ داری ہوگا، کیونکہ حقِ ملکیت کہنے کی صورت

میں حافظ عبدالرشید سورتی صاحب کے خریدار سے کرایہ لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا اگر یہ بات دُرست ہے کہ محمد اسلم نے مولوی منیر صاحب کو محض حقِ کرایہ داری کا قبضہ دیا تھا اور یہ بات مولوی منیر صاحب پر بھی واضح تھی اور انہوں نے حافظ عبدالرشید سورتی صاحب سے وہ بات کہی تھی کہ: ''ہم جس کو بیچیں، کرایہ آپ اُسی سے لیں'' تو شرعی حکم یہ ہے کہ یہ رہن دُرست نہیں ہوا، کیونکہ محض حقِ کرایہ داری یا پگڑی کا حق شرعاً نہ قابلِ فروخت ہے، نہ اس کو رہن رکھا جاسکتا ہے، اور پگڑی یا محض رسید بدلوانے کے اُوپر کسی رقم کا لین دین بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اور جب یہ رہن صحیح نہیں ہوا تو مولوی منیر صاحب کا دَین بدستور محمد اسلم کے ذمے واجب ہے، اور دُکانوں کی ملکیت چونکہ عقدِ بیع کے ذریعہ حافظ عبدالرشید صاحب سورتی کی طرف منتقل ہوچکی ہے، لہٰذا وہ دُکانیں اُن کی ملکیت ہیں اور مولوی منیر صاحب کے ذمہ دُکانوں کا کرایہ واجب ہوگا۔

اور مذکورہ بالا تفصیل کے بعد دُوسری بات (یعنی کرایہ داری کی تحریر کے جبری یا رضامندی کے ساتھ ہونے کے مسئلے) پر بحث کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ اس مسئلے کا تعلق اس صورت سے ہے جب دُکانوں کا حقِ کرایہ داری نہیں بلکہ دُکانیں رہن رکھی گئی ہوتیں، اور اس اِستفتاء کی بنیاد چونکہ پہلی صورت پر ہے اس لئے اب اس بحث میں پڑنا غیرضروری ہے۔

اور یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مروّجہ پگڑی اور رسید بدلوانے پر رقم وصول کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور فریقین کو اس قسم کے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے۔

فی الهندية (ج:۵ ص:۴۳۵)(۱): ما يجوز بيعه يجوز رهنه وما لا يجوز بيعه لا يجوز رهنه.

وفی الدّرّ عن الأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجرّدة .... الخ. (جلد:۴ ص:۵۱۸)(۲).

وفی الشامية ناقلًا عن البدائع: الحقوق المفردة لا تحتمل التّمليک ولا يجوز الصّلح عنها. اهـ.

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۴۱۱/۷/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸/۲)

---

(۱) (طبع رشيديه كوئٹه) وفی الدّر المختار، كتاب الرّهن ج:۶ ص:۴۹۰ (طبع سعيد) وفی الأشباه ما قبل البيع قبل الرّهن، وفی الشامية تحته قوله ما قبل البيع قبل الرّهن أی كل ما يصحّ بيعه صحّ رهنه.
وكذا فی شرح مجلّة الأحكام المادّة:۲ ج:۱ ص:۱۲۱، وراجع أيضًا: "فقهی مقالات" ج:۱ ص:۱۵۹ بيع حقوق المجرّدة.
(۲) (طبع ايچ ايم سعيد).

مرابحہ، اِجارہ یا مشارکہ کی تمویل میں رہن طلب کرنے کا حکم

سوال:- محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ مع الخیر ہیں، اُمید ہے کہ آنجناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔

یہاں چینائی میں چند مخیّر حضرات نے مل کر اپنے ایک دیرینہ خواب ''بلاسودی مالیات'' (Interest Free Financing) پر چند مہینوں سے کوشش شروع کی تھی، اِن شاء اللہ بہت جلد وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔ اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل ایک مسئلے پر علماء کی رائے مطلوب ہے۔

کیا کسی بزنس یا پروجیکٹ کے لئے مالیات کی فراہمی کے لئے کسی بھی قسم کا رہن کا طلب کرنا ممنوع ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات یہاں واضح ہو کہ اسلامی بینک قائم کرنے کی کئی کوششیں ہندوستان میں کی گئیں، مگر اکثر ناکام رہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ رقم لینے کے بعد کسی قسم کی پابندی/ ذمہ داری کی غیر حاضری پر رقم لینے والے کو رقم لوٹانے کی فکر نہیں رہتی یا پروانہیں رہتی۔

اگر یہ ممنوع ہے تو دی گئی پونجی کی حفاظت کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس معاملے پر تفصیلی روشنی ڈالیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہن طلب کرنے کا جائز یا ناجائز ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ مالیات کی فراہمی کس بنیاد پر کی جارہی ہے؟ اگر مرابحہ کی بنیاد پر ہے تو چونکہ وہ ایک بیع ہے جس کی قیمت مستقبل میں واجب الاداء ہونے کی وجہ سے خریدار کے ذمے دَین بن چکی ہے،[1] اس لئے گاہک سے رہن طلب کرنا بالکل جائز ہے۔[2] اسی طرح اگر تمویل اِجارہ کی بنیاد پر ہے تب بھی اُجرت کی توثیق کے لئے رہن طلب کرنا جائز ہے۔ لما فی البحر: ''ولا یلزم علینا صحۃ الإبراء عن الأجرۃ والکفالۃ والرھن بھا لأنا

(۱ و ۲) وفی الدر المختار، کتاب الرھن ج:۶ ص:۴۷۷، ۴۷۸ (طبع سعید) (ھو) ......(حبس شیءٍ مالی)...... (بحقٍ یمکن استیفاءہ) أی أخذہٗ منہٗ کلًّا أو بعضًا کأنْ کان قیمۃ المرھون أقل من الدَّین (کالدّین) کاف الاستقصاء لأنّ العین لا یمکن استیفاؤھا من الرّھن الّا اذا صار دینا حکمًا کما سیجیء (حقیقۃ) وھو دین واجب ظاھرًا وباطنًا أو ظاھرًا فقط کثمن عبد ....(أو حکمًا) کالأعیان (المضمونۃ بالمثل أو القیمۃ) ...الخ.

وفی الھدایۃ، کتابُ الرّھن ج:۴ ص:۵۱۸ (طبع مکتبہ رحمانیہ) ولا یصح الرّھن الّا بدین مضمون لأن حکمہ ثبوت ید الاستیفاء والاستیفاء یتلو الوجوب.

وفی الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۷ (طبع سعید) باع عبدًا علٰی أن یرھن المشتری بالثمن شیئًا بعینہٖ أو یعطی کفیلًا کذٰلک بعینہٖ صحّ ولا یجبر المشتری علی الوفاء لما مرّ انّہٗ غیر لازم وللبائع فسخہٗ لفوات الوصف المرغوب الّا أن یدفع المشتری الثمن حالًا أو یدفع قیمۃ الرّھن المشروط رھنا لحصول المقصود.

وفی الشامیۃ تحت (قولہ لفوات الوصف المرغوب) لأن الثمن الّذی بہٖ رھن أوثق ممّا لا رھن بہٖ فصار الرّھن صفۃ للثمن وھو وصف مرغوب فلہ الخیار بفواتہ.

نقول: ذاک بناء علی وجود السبب فصار کالعفو عن القصاص بعد وجود الجرح“ (البحر الرائق ج:۷ ص:۱۱ ۵)۔[1] لیکن یاد رہے کہ رہن کا مقصد صرف ادائیگی کی توثیق (Security) ہے۔ لہٰذا مرتہن (یعنی صورتِ مسئولہ میں مالیات فراہم کرنے والے) کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس رہن سے کسی بھی صورت میں فائدہ اُٹھائے۔[2] البتہ اگر مدیون ادائیگی نہ کرے تو اسے بیچ کر اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

اور اگر تمویل مشارکہ کی بنیاد پر ہے تو اس صورت میں رہن طلب کرنا جائز نہیں،[3] کیونکہ شریک مدیون نہیں ہوتا۔[4] البتہ وہ اگر خیانت کرے یا اپنے فرائض صحیح طریقے سے بجا نہ لائے تو اس وقت وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۲۷/۶/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۹۶/۱۱)

☆ ☆ ☆

(۱) البحر الرائق، کتاب الاجارة ج:۷ ص:۳۰۰ (طبع سعید) نیز گزشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے ص:۴۲۲ تا ۴۲۳ کے فتاویٰ اور اُن کے حواشی۔
(۳ و ۴) وفی الهداية ج:۴ ص:۵۲۴ و ۵۲۵ (طبع رحمانيه) ولا يصح الرّهن بالأمانات كالودائع والعوارى والمضاربات ومال الشركة لأنّ القبض فى باب الرّهن قبض مضمون فلا بد من ضمان ثابت ليقع القبض مضمونًا ويتحقق استيفاء الدّين منه.
وفى حاشيته قوله قبض مضمون اى قبض يصير به المقبوض مضمونًا على القابض بقدر الدّين فلا بد من ضمان على الرّاهن حتى يصير المرهون مضمونًا على المرتهن بقدر ذٰلك الضمان وليس فى الأمانات ضمان فان حق صاحب الأمانة مقصود على العين.
وفى الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۲ (طبع سعيد) ولا بالأمانات كوديعة وأمانة.
وفى الشامية (قوله كوديعة وأمانة) الأصوب وعارية وكذا مال مضاربة وشركة كما فى الهداية ...الخ.

﴿کتاب الهبة﴾

(ہبہ کے مسائل کا بیان)

۱:- مرض الوفات سے قبل ہبہ کیا جاسکتا ہے اور بیوی کو کتنا مال ہبہ کرنا چاہئے؟

۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے مگر قبضہ ضروری ہے

سوال ۱:- کیا انسان اپنا مال اور مملوکہ جائیداد اپنے کسی وارث کو اپنی زندگی میں دے سکتا ہے یا نہیں؟ میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ بیوی کو اور دُوسرے وارثوں کو جائیداد وغیرہ دے دُوں، بیوی کو کتنا دینا چاہئے؟ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ اور اپنا مال کسی کو دینا چاہوں تو دے سکتا ہوں؟

سوال ۲:- کیا میں زبانی طور پر کسی کو ہبہ کرسکتا ہوں؟ اور زبانی ہبہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس سے دُوسرا مالک بن جائے گا یا نہیں؟ ہبہ کا بہتر طریقہ کیا ہے اور ہبہ اپنی کیسی حالت تک کرسکتا ہوں؟

جواب ۱:- مرضِ وفات (یعنی وہ مرض جس میں انسان کی موت واقع ہو) سے پہلے پہلے انسان اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر طرح کا جائز تصرف کرسکتا ہے،[1] جس میں ہبہ بھی داخل ہے،[2] لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جس سے ایک وارث کے سوا تمام دُوسرے ورثاء اس کی جائیداد سے محروم ہوجائیں،[3] لہٰذا بہتر صورت آپ کے لئے یہ ہے کہ بیوی کے مہر معاف کردینے کے باوجود

(۱ و ۲) وفی شرح المجلّة للاتاسیؒ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) کل یتصرّف فی مِلکه کیف شاء لأنّ کون الشیء ملکًا لرجل یقتضی أن یکون مطلقًا فی التّصرف فیه کیفما شاء.
وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة: ۱۱۹۲ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء.
(۳) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۳۵۲ (طبع قدیمی) عن حُمید بن عبدالرحمٰن ومحمّد بن النعمان بن بشیر أنّهما حدثاه عن النّعمان بن بشیر رضی الله عنه أنّ أباه أتٰی به الٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: انّی نحلت ابنی هٰذا غلامًا، فقال: أکلّ ولدک نحلت مثله؟ قال: لا! قال: فارجعه."
وفی فتح الباری ج:۵ ص:۲۸۰ (طبع مکتبة الرشد) وذهب الجمهور الیٰ أنّ التسویة مستحبة فان فضل بعضًا صحّ وکره، واستحبت المبادرة الی التسویة أو الرّجوع فحملوا الأمر علی النّدب والنّهی علی التّنزیه.
وکذا فی عمدة القاری ج:۱۳ ص:۲۱۴ إلیٰ ص:۲۱۶ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) وکذا فی اعلاء السنن ج:۱۶ ص:۹۶، ۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)
وفی شرح الطیبی علی المشکوٰة ج:۶ ص:۱۸۱ ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم، نص علیه محمد .....الخ.
وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید) لا بأس بتفضیل بعض الأولاد .... وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوّی بینهم ..... ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وأثم.
وفی الهندیة ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) ولو وهب شیئًا لأولاده فی الصّحّة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفة لا بأس به، اذا کان التفضیل لزیادة فضل فی الدِّین وان کانا سواء یکره. وروی المعلی عن أبی یوسفؒ أنّه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم وهو المختار ....الخ.
وکذا فی البحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۸ والبزازیة علیٰ هامش الهندیة ج:۶ ص:۲۳۷ وفتاویٰ قاضی خان ج:۳ ص:۲۷۹.

آپ اُسے مہر کی رقم یا اس قیمت کی جائیداد دے دیں، یا اگر اس کو ناکافی سمجھیں تو جائیداد کا اتنا حصہ مزید بیوی کو ہبہ کردیں جس کی آمدنی سے اس کی گزر اوقات بہ آسانی ہوسکے، اور باقی جائیداد اپنی ملکیت میں رکھیں جو آپ کے بعد آپ کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوسکے۔

جواب۲:- ہبہ زبانی بھی ہوسکتا ہے،(۱) لیکن ہبہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک موہوب لہٗ (یعنی وہ شخص جس کو ہبہ کیا جارہا ہے) اس پر قبضہ نہ کرلے۔(۲) اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہبہ تحریری طور پر کیا جائے اور اس پر دو گواہ بھی بنالئے جائیں تاکہ آئندہ کوئی تنازعہ نہ ہوسکے۔ واضح رہے کہ بیوی کے لئے کسی بھی قسم کا ہبہ صرف اس وقت شرعاً نافذ ہوگا جبکہ وہ مرض الموت سے پہلے پہلے کرلیا جائے، اگر بیماری کی حالت میں ہبہ کیا اور اسی بیماری میں انتقال ہوگیا تو یہ ہبہ کالعدم ہوگا۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

---

(۱) وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ (طبع مكتبه رحمانيه، و ج:۳ ص:۲۸۳ فی طبع مكتبه شركت علميه) وتصحّ بالايجاب والقبول ....الخ.
وفی الدّر المختار مع ردّ المحتار ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعيد) وركنها هو الايجاب والقبول .... الخ.
وفی الدّر المنتقیٰ علی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاريه كوئٹه) وتصحّ بايجاب وقبول ولو بالفعل فی حق الموهوب لهٗ.
وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ (طبع مكتبه حبيبيه) تنعقد الهبة بالايجاب والقبول .... الخ.
(۲) وفی الدّر المختار، كتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعيد) وشرائط صحتها فی الموهوب أن يكون مقبوضًا.
وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۰ وتتم الهبة بالقبض الكامل.
وفی مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۱ (طبع غفاريه كوئٹه) وتتم بالقبض الكامل لقوله عليه الصلوٰة والسلام لا تجوز الهبة الّا مقبوضة.
وفی الهداية ج:۳ ص:۲۸۵ و۲۸۶ (طبع مكتبه رحمانيه) وتصحّ بالايجاب والقبول والقبض .....ولنا قوله عليه السلام لا يجوز الهبة الّا مقبوضة.
وفی ملتقی الأبحر ج:۳ ص:۴۸۹ وتتم (الهبة) بالقبض الكامل.
وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز ص:۴۶۲ وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرّعات والتبرع لا يتمّ الّا بالقبض ......الخ. وفيها أيضًا ج:۱ ص:۴۷۳ رقم المادّة: ۸۶۱ يملک الموهوب لهٗ الموهوب فالقبض شرط لثبوت الملک. وكذا فی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۳ ص:۳۴۴ رقم المادة:۸۳۷ وج:۳ ص:۳۸۱ رقم المادة: ۸۶۱ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).
(۳) وفی الهندية، كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰ (طبع رشيديه) لا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت فجازت من الثلث، واذا مات الواهب قبل التّسليم بطلت.
وكذا فی البزازية علی الهندية ج:۶ ص:۳۳۹ (طبع رشيديه).
وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعيد) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّی مات بطلت الهبة .... الخ.
وفی شرح المجلّة للاتاسی رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) اذا وهب أحد فی مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم تجز الورثة الباقون لا تصحّ تلک الهبة. وكذا فی الهداية، كتاب الوصايا ج:۴ ص:۶۵۷ (طبع شركت علميه ملتان).
وكذا فی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۱ ص:۴۸۳ (طبع حنفيه كوئٹه).

ہبہ کی گئی زمین موہوب لہٗ کی ملکیت ہے اور واہب کی موت کے بعد اُس میں میراث جاری نہیں ہوگی

سوال:- بکر نامی شخص کی دو لڑکیاں تھی، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دُوسری کا نام زینت تھا، اور دو لڑکے تھے، ان میں سے ایک کا نام غلام رسول تھا اور دُوسرے کا نام غلام نبی تھا، اور ایک بھانجا تھا جس کا نام خالد تھا۔

اور بکر کی دُوسری لڑکی فاطمہ کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا، لڑکے کا نام محمد شریف خان تھا، اور لڑکی کا نام کلثوم تھا، اور کلثوم کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے ایک کا نام غازی خان ہے اور دُوسرے کا نام نبی خان ہے

اب بکر نے مرض الموت سے پہلے اپنی زمین کے کل تین حصے کرکے ایک حصہ اپنے بھانجے خالد کو دے دیا، اور دو حصے اپنے دونوں بیٹے غلام رسول اور غلام نبی کو دے دیا، اور اپنی دونوں لڑکیاں یعنی فاطمہ اور کلثوم کو کچھ نہیں دیا، گویا کہ اپنی زمین کے حصے سے ان دونوں کو محروم کردیا۔

اب فاطمہ جو بکر کی لڑکی ہے، اس کی لڑکی جو کلثوم ہے اُس کا بیٹا غازی خان یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ مجھے میری نانی یعنی فاطمہ کی میراث ملنی چاہئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میری والدہ یعنی کلثوم مجھے فوت ہونے کے وقت یہ کہہ گئی ہے کہ آپ اپنی نانی فاطمہ کی میراث طلب کریں، اور اس دعوے پر غازی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اور غازی خان کے دُوسرے بھائی نبی خان نہ اپنی نانی کی میراث کا دعویٰ کر رہا ہے اور نہ اپنی والدہ کلثوم کی وصیت کا ذکر کرتا ہے، آیا اس صورتِ مذکورہ میں غازی خان کا یہ دعویٰ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ بکر نے اپنی زندگی میں مرض الموت سے پہلے ہی[1] اپنی زمین اپنے بھانجے اور دو بیٹوں کو مالک و قابض بنا کر ہبہ کردی تھی، اور اُنہوں نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اَب وہ زمین بکر کی ملکیت سے نکل کر بھانجے اور بیٹوں کی ملکیت میں آگئی،[2] اور اس سے بکر کے ورثاء کا کوئی تعلق نہیں رہا، چنانچہ یہ زمین بکر کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، اور دُوسرے ورثاء کو اس پر دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں اگر بکر نے اس زمین کے علاوہ بھی کچھ مال یا جائیداد چھوڑی ہو تو وہ اس کے

---

(۱) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

(۲) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وتتم الهبة بالقبض الكامل .... الخ. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب لهٗ غير لازم .... الخ. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتها فى الموهوب أن يكون مقبوضًا ....الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگی، لہٰذا اُس زمین پر غازی خان کا دعویٰ شرعاً قابلِ قبول نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۰/۳/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۵/۲۸ ب)

ہبہ دُرست ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، محض کاغذات میں نام کرنے سے ہبہ نہیں ہوتا

سوال:- اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کوئی جائیداد اپنی اولاد کے نام خریدتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ جائیداد میں نے اولاد کو ہبہ کردی، تو کیا اُس کے انتقال کے بعد ہبہ کی ہوئی جائیداد اُس کی وراثت میں شامل کرنی ہوگی؟

۲:- کیا شریعت میں صرف زبان سے کہہ دینے سے ہبہ ہوجاتا ہے یا اُس کے لئے لکھت ہونا ضروری ہے؟ کیا زبان سے کہہ دینے کے لئے کسی گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

مثلاً زید نے اپنے بیٹے بکر کے نام ایک جائیداد خریدی، تمام کاغذات بکر کے نام ہیں، زید نے بکر سے اپنی زندگی میں کہہ دیا کہ یہ جائیداد تمہیں ہبہ کرتا ہوں، اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں جو کہ بکر کی والدہ، دادی اور چاچا ہیں، کیا زید کے انتقال کے بعد اس ہبہ کی ہوئی جائیداد کو وراثت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب۱،۲:- شرعاً ہبہ کے لئے تحریری ہبہ نامہ مرتب کرنا ضروری نہیں، یعنی زبانی بھی ہوسکتا ہے،[۱] البتہ یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کرلے،[۲] لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر بکر نے اس جائیداد پر زید مرحوم کی زندگی ہی میں قبضہ بھی کرلیا تھا تو یہ جائیداد بکر کی ملکیت ہوگئی،[۳] زید کے دُوسرے ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس کو زید کے ترکے میں شامل نہیں سمجھا جائے گا۔

واضح رہے کہ محض کاغذات کسی کے نام بنوادینے سے ہبہ نہیں ہوتا، بلکہ زبانی یا تحریری طور پر ہبہ کی تصریح اور موہوب لہٗ کا اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے،[۴] یہاں چونکہ زبانی تصریح موجود ہے اس لئے قبضے کی شرط کے ساتھ ہبہ دُرست ہوگیا۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم
۶/۹/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔
(۲ تا ۵) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(اس فتویٰ کی مزید وضاحت کے لئے سائل نے دوبارہ سوال بھیجا جو درج ذیل ہے)

''مکرّر استفتاء''

ہبہ کئے گئے مکان کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے کے معاملات انجام دینا شرعاً اس پر ''قبضہ'' شمار ہوگا

سوال:- قبضہ موہوب لہٗ سے کیا مراد ہے؟ جبکہ خریداری زمین اور تمام سرکاری وغیر سرکاری اِداروں میں موہوب لہٗ کا نام درج ہے، یہ اس لئے وضاحت طلب کی جارہی ہے کہ اگر ہبہ شدہ عمارت میں ایک یا زیادہ کرایہ دار آباد ہوں تو قبضہ تو اُن کے پاس ہے، البتہ رسیدات وغیرہ دینے والا موہوب لہٗ ہے، اور وہی ٹیکس وغیرہ اپنے نام سے اَدا کرتا ہے، لہٰذا قبضہ مالکانہ مراد ہے یا آباد ہونا شرط ہے؟

۲:- موہوب لہٗ (بکر) نے واہب زید کی زندگی میں ہی مالکانہ قبضہ حاصل کرلیا تھا، البتہ جس بلڈنگ میں کرایہ دار آباد ہیں وہ اُسی طرح سے آباد بطور کرایہ دار چلے آرہے ہیں، تو کیا اس صورت میں موہوب لہٗ کا قبضۂ شرعی دُرست مانا جائے گا؟

جواب:- قبضے کے لئے موہوبہ مکان میں بذاتِ خود آباد ہونا ضروری نہیں، بلکہ صورتِ مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ واہب کرایہ داری کا معاملہ فسخ کردے، اور موہوب لہٗ کرایہ داروں سے نیا کرایہ داری کا عقد کرلے اس طرح جب کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرنے وغیرہ کے معاملات واہب کے بجائے موہوب لہٗ نے انجام دینے شروع کردیئے تو قبضہ ہوگیا، اور ہبہ مکمل ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۷/۲۸ ج)

بغیر قبضے کے دو بھائیوں کو مشترکہ طور پر جائیداد ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- میرے تایا نے اپنی جائیداد اپنے دو بھائیوں یعنی میرے والد اور چچا کے نام کردی ہے، میرے تایا کی کوئی اولاد، بیوی، بہن وغیرہ نہیں ہے، میرے والد کی مذکورہ جائیداد جو اُنہوں نے اپنے دو بھائیوں کے نام کی ہے، وہ جائیداد ابھی میرے تایا کے زیرِ اِستعمال ہی ہے، میرے تایا، عمر کے

---

(۱) وفی الشامیة کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ یوخذ ویستأنس ذٰلک من العبارات الآتیة
قلت فقد أفاد انّ التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدّالّة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیء ....الخ.
وفی بدائع الصنائع کتاب الهبة ج:۶ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالة .... وامّا الدلالة فهی أن یقبض الموهوب لهٗ العین فی المجلس ولا ینهاه الواهب فیجوز قبضه استحسانًا ..... الخ. وکذا فی شرح المجلّة کتاب الهبة رقم المادّة:۸۴۲ ص:۳۵۳ (طبع مکتبه حبیبیه کوئٹه). نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۶۶.

آخری حصے اور نہایت کمزوری اور ضعف میں ہیں، اس جائیداد کے بارے میں اب شرعی حکم کیا ہے؟ اور ان کی یہ جائیداد کس کی ہے؟ اور اس کا انتظام و دیکھ بھال کے بارے میں بھی آگاہ فرمائیں۔ ''جنگ'' اخبار میں آپ کے کالم نہایت ہی مفید اور پسند ہیں۔ کیا اسلام آباد اور راولپنڈی میں آپ کے والد صاحب کے کوئی خلیفہ ہیں؟

طلعت محمود راولپنڈی

جواب:- برادر عزیز ومکرّم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تایا نے اگر اپنی ساری جائیداد اپنے دونوں بھائیوں کو دی ہے تو شرعاً یہ ہبہ اس لئے دُرست نہیں ہوا کہ دونوں بھائیوں کو الگ الگ کر کے دینا ضروری تھا،(۱) اور قبضہ بھی نہیں ہوا،(۲) لیکن چونکہ آپ کے تایا کی کوئی اولاد نہیں ہے، اور بیوی بھی نہیں ہے، اور بہن بھی نہیں ہے، تو آپ کے تایا کے شرعی وارث آپ کے والد اور چچا ہی ہیں، لیکن جب تک آپ کے تایا زندہ ہوں، اس وقت تک ان کی جائیداد کو انہی پر خرچ کرنا ضروری ہے، البتہ ان کی جائیداد کے انتظام کے معاوضے کے طور پر کچھ مناسب رقم دونوں بھائی لینا چاہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

''جنگ'' کے کالم کی پسندیدگی کا شکریہ! دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسے مفید بنائے۔ راولپنڈی اسلام آباد میں حضرت والد صاحبؒ کے کوئی خلیفہ تو نہیں ہیں، لیکن نواب قیصر صاحب اسلام آباد میں مقیم ہیں، جو حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ ہیں، ان کی ہفتہ وار مجلس بھی ہوتی ہے، مولانا عبداللہ صاحب جامعہ فریدیہ سے ان کا پتہ معلوم ہوسکتا ہے۔

والسلام

۲۸/شعبان ۱۴۱۴ھ (۳)

---

(۱) وفی الدّر المختار ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرائط صحتها فی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزا غیر مشغول ....الخ. وفی هامش مجمع الأنهر ج:۳ ص:۴۹۰ (طبع غفاریه) وفی الموهوب أن یکون مقبوضًا غیر مشاع ممیّزًا غیر مشغول وتتم بالقبض الکامل ....الخ.

وفی ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ (طبع سعید) وذکر قبله هبة المشاع فیما یقسم لا تفید الملک عند أبی حنیفةؒ وفی القهستانی لا تفید الملک وهو المختار کما فی المضمرات.

وفی خلاصة الفتاویٰ، کتاب الهبة، الفصل الثالث فیما یکون خطبا وفیما لا یکون ....الخ، ج:۴ ص:۳۹۰ (طبع مکتبه رشیدیه) ومن شرائط الهبة الافراز حتّی لا یجوز هبة المشاع فیما یحتمل القسمة کالبیت والدّار والأرض ونحوها وان کان لا یحتمل القسمة یجوز کالبئر والحمام والرحی .....الخ.

وفی البحر الرّائق، کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۶ (طبع رشیدیه) .... فأفاد أنّه لو قبضه مشاعًا لا یملکه فلا ینفذ تصرّفه فیه لأنّها هبة فاسدة مآلاً وهی مضمونة بالقبض ولا تفید الملک للموهوب لهٗ وهو المختار.

وکذا فی مجمع الأنهر، کتاب الهبة ج:۳ ص:۴۹۴ (طبع غفاریه کوئٹه) وشرح المجلّة للاتاسیؒ ج:۳ ص:۳۷۸ (طبع حقانیه پشاور).

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) یہ جواب حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائلِ موصوف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر حق نواز)

گھر کے استعمال کے لئے دی گئی رقم سے بچا کر زیور بنایا گیا ہو تو کس کی ملکیت ہے؟

سوال:- شوہر اگر اپنی بیوی کو گھر کا انتظام چلانے کے لئے روپے دیتا ہے اور بیوی ان پیسوں میں سے بچا کر زیور یا نقدی جمع کر لیتی ہے، بیوی کے انتقال کے بعد ایسا مال شوہر کا ہے یا نہیں؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- شوہر اپنی بیوی کو گھر کے انتظام کے لئے جو رقم دیتا ہے اگر وہ اس نیت کے ساتھ دی تھی کہ بیوی سے حساب نہیں لوں گا، بلکہ جو کچھ بچ جائے وہ بیوی کی ملکیت ہے، تب تو بچی ہوئی رقم سے خریدا ہوا زیور بیوی کی ملکیت تھا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں شامل ہو کر اس کے تمام شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر شوہر نے بیوی کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ حساب رکھے اور جو رقم بچے وہ واپس کرے تو پھر یہ زیور شوہر کی ملکیت تھا، اور اگر اس نے بیوی کو ہبہ نہیں کیا تو وہ اس کے انتقال کے بعد واپس لے سکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴۴/۲۸ ب)

محض کاغذی طور پر جائیداد کسی کے نام کرنے یا کسی کے نام سے خریدنے کی شرعی حیثیت

سوال:- ایک صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، اُنہوں نے کچھ جائیداد اپنے لڑکوں کے نام سے لی تھی، جبکہ لڑکے چھوٹے تھے، اب لڑکے یہ کہتے ہیں کہ جب سے والد صاحب نے یہ چیزیں ہمارے نام خریدی تھیں اب ہم اُن کے مالک ہیں، والد صاحب کی کوئی تحریر ان کے نام سے نہیں ہے، اب یہ جائیدادیں کس طرح تقسیم ہو سکتی ہیں؟

جواب:- محض کاغذی طور پر کوئی جائیداد کسی کے نام لکھ دینے یا کسی کے نام خریدنے سے تو ہبہ ثابت نہیں ہوتا،[1] البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں یہ جائیداد زبانی طور پر کسی خاص اولاد کو ہبہ کر دی تھی اور اس اولاد نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا، تو اس جائیداد کو اُسی مخصوص اولاد کی ملکیت سمجھا جائے گا،[2] وہ والد مرحوم کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی،[3] تحریری ہبہ نامہ ہونا بھی

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۸ (طبع سعید) وشرط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضًا. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الكامل. وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحكمها ثبوت الملك للموهوب له غير لازم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

ضروری نہیں، زبانی ہبہ[1] کا ثبوت گواہوں سے ہوجائے تو وہ بھی کافی ہے،[2] لیکن اگر زبانی ہبہ[3] کا بھی ثبوت نہ ہوتو پھر یہ جائیداد والد مرحوم کے ترکے میں شامل ہوکر تمام ورثاء میں بحصۂ رسدی تقسیم ہوگی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۰/۲۸ ج)

خصوصی خدمت اور تیمارداری کی بناء پر دیگر ورثاء کی رضامندی سے اپنا مکان صرف خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- اب سے تقریباً چار سال قبل میں فالج میں مبتلا ہوا تھا، اس بے بسی اور بیماری کی حالت میں میرے ایک بیٹے حفیظ الرحمٰن خان نے سعادت مندی کا ثبوت دیا، پیشاب، پائخانہ خود صاف کرتا تھا، (میری بیوی انتقال کرچکی تھی) اور اپنے روپے سے سینکڑوں روپے کا علاج کرایا، اس عمل سے خوش ہوکر میں نے اپنا رہائشی مکان جو میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، اُس کو اِنعام کے طور پر دے دیا، ایسا کرنے سے پہلے میں نے اپنی دیگر اولاد سے جو میری مزاج پُرسی کے لئے آیا کرتے تھے رائے لی تھی، انہوں نے رضامندی ظاہر کردی، اور کہا کہ اس کا یہی لڑکا مستحق ہے، یہ فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا، اور مزید یہ بھی کیا کہ روزنامہ اخبار میں اعلانِ عام کرادیا کہ میں اپنا ذاتی مکان اپنے لڑکے حفیظ الرحمٰن خان کو اِنعام کے طور پر دے رہا ہوں، اگر کسی کو کوئی عذر ہوتو ۱۵ دن کے اندر عذر پیش کرے، ورنہ اس کے بعد کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ کوئی اعتراض کسی کا وصول نہیں ہوا، لہٰذا قانونِ مروّجہ کے مطابق اُس کی پختہ کارروائی کرالی اور مکان کا قبضہ بھی دے دیا، جس پر اوتھ کمشنر اور گواہوں وغیرہ کے دستخط گواہی ثبت ہوگئی۔ یہ فروری ۱۹۷۴ء میں مکمل ہوگیا، اور مکان کا لیز بھی اُسی کے نام اب ہوگیا ہے، میں اب بھی اُسی مکان میں رہتا ہوں اور اسی لڑکے کی زیرِ کفالت ہوں، ہر قسم کا ٹیکس وہی ادا کرتا ہے اور مکان کی بقدرِ ضرورت مرمت اُسی نے کرائی ہے۔

میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، سب کی شادیاں ہوچکی ہیں سوائے ایک لڑکے کے، جس کی شادی بوجہ کمزوریٔ دِماغ اور بوجہ آمدنی نہ ہونے کے انکار کردیا ہے، سب لڑکیوں کو رسم و رواج کے مطابق ہزاروں کا زیور و دیگر سامان اور کپڑے اپنے روپے سے کئے ہیں، میرے پاس اب سوائے

(۱و۳) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۱۔

(۲) فی الدّر المختار، کتاب الدعویٰ ج:۵ ص:۵۵۰ (طبع سعید) وعدها فی الأشباه سبعًا بینة واقرار ویمین ونکول عنه .... وکذا اذاادعیٰ دینًا او عینًا علی وارث اذا علم القاضی کونه میراثًا او اقر به المدعی او برهن الخصم علیه فیحلف علی العلم ولو ادعی هما ای الدین والعین الوارث علی غیره یحلف المدعی علیه علی البتات کموهوب وشراء درر ....الخ.

کفن دفن کے اخراجات کے کچھ نہیں بچا، اب سوال یہ ہے کہ میرے انتقال کے وقت اس مکان پر کسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ آپ نے دیگر ورثاء کی رضامندی بھی حاصل کرلی ہے تو آپ کے لئے اس مکان کا اپنے خدمت گزار بیٹے کو ہبہ کردینا جائز بھی ہے،[1] اور جب بیٹے کو اس کا مالک وقابض بنادیا گیا تو یہ ہبہ شرعاً نافذ بھی ہوگیا۔[2] اب حفیظ الرحمٰن خان ہی اس مکان کا مالک ہے،[3] اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے دُوسرے ورثاء کا اس میں حق نہیں ہوگا، اور نہ یہ مکان آپ کے ترکے میں شامل ہوسکے گا، لما فی الدر المختار: "لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار ..... ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز وأثم. (قلت: یعنی اذا لم یرض به ورثته الآخرون). (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ کتاب الهبة)۔[4]

وفیه أیضًا: "وهبة مقعد ومفلوج وأشل ومسلول من کل ماله ان طالت مدته" وقال الشامی تحته: "لأنه اذا تقادم العهد صار طبعًا من طباعه کالعمی والعرج، وهٰذا لأنّ المانع من التّصرّف مرض الموت وهو ما یکون سببًا للموت غالبًا، وانّما یکون کذٰلک اذا کان بحیث یزداد حالًا فحالًا الٰی أن یکون آخره الموت، وأما اذا استحکم وصار بحیث لا یزداد ولا یخاف منه الموت لا یکون سببًا للموت کالعمی ونحوه. (شامی کتاب الوصایا ج:۵ ص:۴۲۳)۔[5]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۰/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶/۷۴۸ ب)

(۱ و ۴) الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید)، وفی شرح معانی الآثار للطحاوی کتاب الهبة ج:۲ ص:۲۷۱ (طبع سعید) وقد فضل بعض أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ورضی عنهم بعض أولادهم فی العطایا ....الخ. وراجع أیضًا أوجز المسالک کتاب الهبة، باب مالا یجوز من النّحل ص:۲۲۰ (طبع مکتبه مظاهر علوم) واعلاء السُّنن ج:۱۶ ص:۹۶ و۹۷ (طبع ادارة القرآن کراچی)

وفی الهندیة کتاب الهبة ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیه) ولو وهب رجل شیئًا لأولاده فی الصّحة وأراد تفضیل البعض علی البعض عن أبی حنیفة أنه لا بأس به اذا کان التّفضیل لزیادة فضل له فی الدِّین وعن أبی یوسفؒ أنه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم وان کان فی ولده فاسق لا ینبغی أن یعطیه أکثر من قوته کیلا یصیر معینًا له فی المعصیة.

وفی البزازیة علیٰ هامش الهندیة الجنس الثالث فی هبة الصّغیر ج:۶ ص:۲۳۷ ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم نصّ علیه محمّد ولو خصّ بعض اولاده لزیادة رشده لا بأس به ....الخ.

وفی فتاویٰ القاضی خان علیٰ هامش الهندیة فصل فی هبة الوالد لولده ج:۳ ص:۲۷۹ وروی المعلّی عن أبی یوسفؒ انّه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بینهم. وکذا فی البحر الرّائق کتاب الهبة ج:۷ ص:۲۸۸.

(۲ و ۳) وفی الدّر المختار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۲ وتتم الهبة بالقبض الکامل.

وفی بدائع الصنائع فصل وأمّا حکم الهبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وأمّا أصل الحکم فهو ثبوت الملک للموهوب له فی الموهوب من غیر عوض ....الخ. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۵) الدّر المختار کتاب الوصایا ج:۶ ص:۶۶۰ (طبع سعید). (محمد زبیر حق نواز)

۱:- اولاد میں کسی کو زیادہ کسی کو کم دینے کا حکم اور مشترکہ کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کاروبار کے غیر شریک بیٹے کو محروم کرنے کا حکم
۲:- زندگی میں علیحدہ ہوجانے والے بیٹے کو بھی میراث سے حصہ ملے گا

سوال ۱:- ایک باپ جس کے تین بیٹے ہیں، وہ سب شادی شدہ ہیں، بڑا لڑکا سرکاری ملازم ہے، باقی دو لڑکے اور والد صاحب نے مل کر ایک دُکان کی، سب اِکٹھے ہیں، والد صاحب کی کوئی غیرمنقولہ جائیداد نہیں ہے، صرف رقم کی صورت میں موجود ہے، اب والد صاحب نے ناراضگی کے بغیر بڑے لڑکے کو علیحدہ کردیا، مگر علیحدگی کے وقت جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا، اور ساری رقم ان کے لئے مخصوص کردی جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، کیا یہ بات والد صاحب کے لئے جائز ہے کہ ایک بھائی کو بلاوجہ محروم کردیں اور دو بھائیوں کو سب کچھ دے دیں؟

سوال ۲:- والد صاحب کے فوت ہونے کے بعد کیا صورت ہوگی جبکہ لڑکا بہت پہلے علیحدہ ہوچکا ہے، اور پھر اس کے بعد دونوں لڑکے اور والد اِکٹھے کام کرتے رہے ہوں، کیا سب کو برابر تقسیم ہوگا یا دونوں بھائیوں کی ذاتی محنت شمار ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں مناسب تو یہ تھا کہ باپ کاروبار کے اپنے حصے سے کچھ رقم تیسرے بیٹے کو بھی دیتا، لیکن باپ نے اگر اپنے بڑے لڑکے کو جمع شدہ رقم میں سے کچھ نہیں دیا تو اس میں اُس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ رقم دُوسرے لڑکوں کے ساتھ کئے ہوئے کاروبار سے حاصل شدہ تھی، اور زندگی میں اگر کسی اولاد کو کم، کسی کو زیادہ دیا جائے تو جب تک بدنیتی سے نقصان پہنچانے کا مقصد نہ ہو تو گنجائش ہے، وفی الخانیة: "لا بأس بتفضیل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب، وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده یسوّی بینهم." (شامی ج:۴ ص:۵۱۳ کتاب الهبة)[1]۔

جواب ۲:- والد صاحب کی وفات کے وقت جو رقم یا جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوگی، وہ تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگی، اس میں بڑے لڑکے کو بھی حصہ ملے گا۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۴/۲۸ ج)

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۶ (طبع سعید) نیز دیکھئے ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر۱و۴۔

مرض الوفات سے قبل ہبہ کی گئی رقم موہوب لہٗ کی ملکیت ہے

سوال:- (خلاصۂ سوال) کمنا مرحوم نے اپنے مرتے وقت کوئی منقولہ یا غیرمنقولہ جائیداد نہیں چھوڑی۔ نورمحمد، کریم الدین دونوں بھائیوں نے بھی کل زندگی میں کوئی بھی جائیداد نہیں بنائی ہے، دونوں بھائی ہر وقت اور ہمیشہ لڑتے رہے، اور ایک دُوسرے سے جدا رہے، کمائی بھی ہر ایک کی الگ ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو کریم الدین انتقال کرگیا، کریم الدین کی ایک لڑکی ہے، جس کو وہ بہت محبوب رکھتا تھا، زندگی بھر اس لڑکی کے ہاں رہا اور پوری زندگی میں یہی کہتا رہا کہ میرا تمام مال میری اس لڑکی کا ہے، مرحوم کے دو ہزار روپے نقد اس لڑکی کے پاس تھے، انتقال کے بعد کریم الدین کا بھائی لڑکی کے پاس آیا، تو لڑکی نے وہ دو ہزار روپے لاکر اس کو کہا کہ یہ روپے آپ لے لیں، اس پر نورمحمد بھائی کریم نے کہا کہ: یہ تمہارا مال ہے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ: اب تک تمہاری خدمت والد کر رہے تھے اور اَب میں کروں گا۔ اس تمام ماجرا کے دس بارہ آدمی گھر کے شاہد ہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر کریم الدین نے اپنی زندگی میں واقعۃً یہ دو ہزار روپے کا اپنی لڑکی کو ہبہ کردیا تھا اور لڑکی نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو وہ شرعاً اس کی ملکیت ہوگیا،[1] دُوسرے وارثوں کا اس میں حق نہیں، بشرطیکہ یہ روپے کریم الدین نے مرضِ وفات سے پہلے ہبہ کئے ہوں۔[2]

واللہ اعلم بالصواب
۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۱۹/۱۸ الف)

مرحوم کے انتقال کے بعد ملنے والے ''ہبہ نامہ'' کی حیثیت اور چند ورثاء میں تقسیمِ میراث کا طریقہ

سوال:- زید کی زندگی میں زید کی بیوی اور والدین کا انتقال ہوگیا تھا، زید نے دُوسری شادی کی، اس سے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی، کچھ عرصہ بعد زید کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے ورثاء میں ایک

---

(۱) وفی الدّر المختار کتاب الھبة ج:۵ ص:۶۸۸ وشرط صحتھا فی الموھوب أن یکون مقبوضًا ....الخ.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۹۲ وتتمّ الھبة بالقبض الکامل ....الخ.
وفیه أیضًا ج:۵ ص:۶۸۸ وحکمھا ثبوت الملک للموھوب لهٗ غیر لازم.
وفی بدائع الصنائع فصل وامّا حکم الھبة ...الخ ج:۶ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وامّا أصل الحکم فھو ثبوت الملک للموھوب لهٗ فی الموھوب من غیر عوض. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۲) وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۰ وھب فی مرضهٖ ولم یسلم حتّٰی مات بطلت الھبة. وفی شرح المجلّة للأتاسی واذا وھب واحد فی مرض موتهٖ شیئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم یجز سائر الورثة لا تصح تلک الھبة. وکذا فی الھدایة، کتاب الوصایا ج:۴ ص:۶۵۷. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

لاولد بیوہ، پہلی بیوی سے ایک لڑکی شادی شدہ، ایک بھائی اور دو بہنیں چھوڑی ہیں، مرحوم کے انتقال کے بعد یہ "ہبہ نامہ" ملا جو کہ اِستفتاء ھٰذا کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے، یہ "ہبہ نامہ" رجسٹری نہیں ہوا، جن گواہوں کے دستخط ہیں ان کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے مرحوم نے کسی چیز کا بھی قبضہ نہیں دیا تھا اور جن کے نام ہبہ کیا تھا ان لوگوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ اُن کو قبضہ نہیں دیا گیا تھا، ہبہ نامہ کے علاوہ بھی نقدی اور زیورات ہیں، مرحوم کی جائیداد کس طرح تقسیم کی جائے؟

جواب:- اگر مذکورہ جائیدادیں مرحوم نے اپنی بیٹی اور بیوی کو الگ الگ[1] کر کے قبضے میں نہیں دی تھیں، تو یہ ہبہ تام نہیں ہوا،[2] اور یہ تمام جائیدادیں بدستور مرحوم کی ملکیت میں رہنے کی بنا پر ان کے ترکے میں شامل اور دُوسرے مال کی طرح تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوں گی۔

لما فی الدر المختار: وتتم الهبة بالقبض الکامل. وفی ردّ المحتار تحته: فیشترط القبض قبل الموت ولو کانت فی مرض الموت للأجنبی کما سبق فی کتاب الوقف. (شامی ج:۴ ص:۵۱۰)۔[3]

اور صورتِ مسئولہ میں پہلے مرحوم کے ترکے سے ان کی تجہیز و تکفین کے درمیانہ درجے کے اِخراجات نکالے جائیں، پھر اگر ان کے ذمے کوئی قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر بھی اگر ابھی تک ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے معاف بھی نہ کیا ہو تو وہ بھی قرض ہے، اسے ادا کیا جائے، اس کے بعد اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کی ہو تو ۱/۳ کی حد تک اس پر عمل کیا جائے، پھر جو مال بچے اس کا آٹھواں حصہ مرحوم کی بیوہ کو، اور آدھا حصہ لڑکی کو دیا جائے، اور اس کے بعد جو مال باقی بچے اُس کے چار حصے کر کے دو حصے بھائی کو اور ایک ایک حصہ دونوں بہنوں کو دے دیا جائے، سہولت کے لئے کل ترکے کے بتیس حصے کرلیں، جس میں سے بیوہ کو چار حصے، لڑکی کو سولہ حصے، بھائی کو چھ حصے اور ہر بہن کو تین تین حصے دے دیئے جائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۶/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱۲/۲۸ ج)

کسی شریک کا قابلِ تقسیم مشترکہ زمین کسی کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں کہ مسمیان جمعہ و عبدالرحیم پسران عبدالرحمٰن دو حقیقی بھائی ہیں، مسمّٰی عبدالرحیم نے اپنی زمین جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی تھی، بلکہ مشترک تھی،

---

(۱) دیکھئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱۔ (۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) شامی کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعید).

مسمیٰ محبوب ولد عبداللہ چچازاد بھائی کو خفیہ ہبہ کردیا، لیکن رقبہ موہوبہ کا قبضہ موہوب لہٗ کو نہیں دیا، ہبہ کے بعد واہب تین سال تک زندہ رہا لیکن اس عرصے میں واہب نے موہوب لہٗ کو قبضہ نہیں دیا، بلکہ زمین حقیقی بھائی جمعہ کے قبضے میں رہی۔ مذکور کے فوت ہونے کے بعد بھی مسمیٰ جمعہ نے محبوب موہوب لہٗ کو تقریباً تیرہ سال تک قبضہ نہیں دیا، اس سال موہوب لہٗ نے مسمیٰ جمعہ برادر عبدالرحیم واہب جو اکیلا واہب کا وراث ہے، اس سے اس کے ضعیف العمر غریب اور بے کس ہونے کی وجہ سے جبراً قبضہ لے لیا، کیا یہ ہبہ شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہبہ ایسی مشترک زمین کا ہوا ہے جو قابلِ تقسیم ہے، لیکن ہوئی نہیں، اور واہب نے قبضہ بھی نہیں دیا۔ مفصل و مدلل جواب عنایت فرماویں اس سال موہوب لہٗ نے مسمیٰ جمعہ سے اس کا ذاتی رقبہ بھی چھین لیا جبکہ ہبہ کا صرف ایک ہی گواہ زندہ ہے، بینوا بالصواب توجروا بالثواب۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ شرعاً دُرست نہیں ہوا،[1] زمین میں مسمیٰ عبدالرحیم مرحوم کا جو حصہ تھا، وہ مرتے وقت تک اس کی ملکیت میں رہا، اور مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء کی ملکیت ہوگیا، موہوب لہٗ مسمیٰ محبوب نے عبدالرحیم کی وفات کے بعد زمین پر جو زبردستی قبضہ کیا، وہ شرعاً بالکل ناجائز اور حرام ہے، اس پر شرعاً واجب ہے کہ یہ زمین عبدالرحیم کے ورثاء کو واپس کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۴۱۲/۱/۸ھ
(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۴۰)

اصل مالک کی طرف سے کوارٹر پر قبضہ دِلائے بغیر محض الاٹمنٹ سے ملکیت نہیں آتی

سوال:- والد صاحب مرحوم نے بیرونِ ملک دو چلتی ہوئی کاروباری دُکانیں چھوڑی ہیں، اس کاروبار کو والدہ صاحبہ کی سرپرستی حاصل ہے، کراچی میں دو دُکانیں کرایہ کی چھوڑی ہیں، جو خالی پڑی ہیں، دو عدد کوارٹرز بھی چھوڑے ہیں جو گورنمنٹ سے الاٹ شدہ ہیں، ایک والدہ کے نام پر الاٹ ہوا ہے، دُوسرا بھائی کے نام پر الاٹ ہوا ہے، ان مذکورہ بالا دونوں کوارٹروں میں ایک دُوسرا بھائی (جس کے نام الاٹ نہیں ہے) مع اپنی بیوی بچوں کے رہ رہا ہے، ان رہائش پذیر کوارٹروں میں مقیم بھائی نے تعمیر پر کچھ رقم لگائی ہے، لہٰذا ترکے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ دو کوارٹر جن کے نام پر الاٹ ہوئے ہیں وہ ان کے مالک ہیں یا والد مرحوم کی ملکیت تھے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

---

(۱) حوالہ کے لئے ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- مرحوم کی یہ تمام دُکانیں اور دونوں کوارٹر مرحوم کے ترکے میں شامل ہوں گے، کوارٹروں کی قیمت مرحوم کے ذمے دَین ہے، وہ ترکے میں سے پہلے نکال کر گورنمنٹ کو دی جائے گی، اور محض کوارٹروں کے کسی کے نام الاٹ ہونے سے وہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک وہ ہے جس نے ان کوارٹروں کی خریداری کا معاملہ کیا، ہاں اگر مرحوم نے مذکورہ کوارٹروں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی تندرستی میں زبانی یا تحریری ہبہ کسی کے نام کردیا ہو اور اُس نے اُس کوارٹر پر قبضہ بھی کرلیا ہو تو وہ مالک ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۰/۲۸ ج)

۱:- بیوی کے نام سے خریدی گئی زمین اور اُس پر تعمیر کی جانے والی کوٹھی بیوی کی ملکیت ہے

۲:- تحریری اسٹامپ کے ساتھ دی گئی رقم کا ہبہ دُرست ہے

۳:- کسی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرائی یا جائیداد خریدنے سے ہبہ دُرست ہوجاتا ہے

۴:- کسی کے نام سے جمع کرائی گئی رقم کی چیک بک پر قبضے سے ''ہبہ'' مکمل ہوگیا

۵:- بیوی اور لڑکیوں کی دستبرداری کے بعد کل جائیداد بیٹوں کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال ۱:- متوفی شوہر نے ایک قطعہ زمین اپنی بیوی کے نام سے کراچی میں خریدا، اس کے بعد اس کو فروخت کردیا، تو بیوی نے اعتراض کیا کہ آپ نے کیوں بیچ دیا؟ تو مرحوم شوہر نے فرمایا کہ: ''میں تمہارے لئے ایک پلاٹ حیدرآباد میں خرید دیتا ہوں'' اور مرحوم شوہر نے ایک پلاٹ زمین ''لطیف آباد'' (حیدرآباد) بیوی کے نام سے ہی خریدا اور بیوی کے نام ہی رجسٹری کرائی، اس کے بعد مرحوم شوہر نے مذکورہ پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کرائی، دورانِ تعمیر بیوی سے کہا کہ: ''میں نے تمہارے لئے کوٹھی

(۱) تفصیلی حوالہ جات کے لئے ص:۴۴۰ کے تمام حواشی اور ص:۴۴۴ کا حاشیہ نمبر۱ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

بنوادی ہے، تم عمر بھر اس میں رہنا'' جب کوٹھی بالکل مکمل ہونے والی تھی تو شوہر کا انتقال ہوگیا، تو ایسی صورت میں کیا پلاٹ اور کوٹھی دونوں بیوی کی ملکیت ہوں گے یا صرف پلاٹِ زمین؟ یا اگر دونوں بیوی کی ملکیت نہیں ہوئیں تو کیا دُوسرے وارثوں میں تقسیم کردی جائے۔ (نوٹ: ابھی اس کوٹھی میں کوئی نہیں گیا تھا)۔

سوال۲:- بڑے لڑکے کو ۵۵ ہزار مروّجہ قانون کے تحت گفٹ کیا، جس میں ایک اسٹامپ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ میرا لڑکا میری بہت خدمت کرتا ہے اس کو میں خوش ہوکر اپنے سرمائے میں سے اتنی رقم دے رہا ہوں، اور یہ رقم متوفی نے مندرجہ بالا طریق پر دے دی تھی، کیا یہ ہبہ ہوگئی؟

سوال۳:- چھوٹے لڑکے کو متوفی نے اس طرح رقم دی کہ اس کے نام سے بینک میں جمع کرادیئے، اور اس کے نام سے ایک تجارتی جائیداد خرید دی تھی، یہ رقم اور جائیداد ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر ہبہ نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کرکے تقسیم کردیں؟

سوال۴:- بیوی کے نام بھی انہوں نے یعنی مرحوم نے بیوی کے نام سے بینک میں رقم جمع کرادی تھی، یہ رقم ہبہ ہوئی کہ نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو شاملِ ترکہ کرکے تقسیم کردیں؟

سوال۵:- بہنوں نے اور والدہ نے زبانی یہ کہا کہ ہم اپنا حصہ اپنے دونوں بھائیوں اور والدہ اپنے دونوں لڑکوں کو ہبہ کرتی ہیں، تو کیا وہ ترکہ جو کہ اُن کو ملنے والا تھا، ہبہ ہوگیا؟ حساب کرکے لڑکیوں اور بیوی کو بتلادیا گیا تھا کہ تمہارا اتنا حصہ نکل رہا ہے، اگر ہبہ نہیں ہوا تو براہِ مہربانی ہبہ کا صحیح طریقہ تحریر کریں۔

جواب۱:- صورتِ مسئولہ میں زمین اور جس قدر کوٹھی متوفی کی وفات سے قبل تعمیر ہوئی تھی، بیوی کی ملکیت ہوگئی، بشرطیکہ زمین کا ہبہ مرضِ وفات سے پہلے ہوا ہو،[1] فقہی اِصطلاح میں اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے زمین بیوی کو ہبہ کی تھی، اس پر بیوی کی اجازت سے کوٹھی کی تعمیر بیوی کی طرف سے قبضہ ہے، جس سے ہبہ تام ہوگیا،[2] اور زمین بیوی کی ملکیت ہوگئی۔[3] اب بیوی کی طرف سے تعمیر کے تصرف کی اجازت اس شرط پر ہے کہ کوٹھی اس کی ہو، لہٰذا تعمیر کے لئے جتنا سامان خریدا گیا وہ بیوی کو نقد ہبہ کیا گیا اور اس کا زمین پر تعمیر میں لگنا بیوی کی طرف سے قبضہ ہوا، لہٰذا جس قدر کوٹھی تعمیر ہوئی اس پر قبضہ مکمل ہوکر بیوی کی ملکیت ہوگیا۔ اب قبضے کے لئے کوٹھی میں جاکر رہنا ضروری نہیں، شرط یہی ہے کہ کوٹھی بھی مرضِ وفات سے پہلے بنائی گئی ہو۔[4] واللہ اعلم

جواب۲:- صورتِ مسئولہ میں ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطیکہ ہبہ مرضِ وفات میں نہ ہوا ہو۔[5]

(حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

جواب۳:- اگر چھوٹے لڑکے نے جائیداد پر اور بینک کی چیک بک پر قبضہ کرلیا ہوتو ہبہ صحیح ہوگیا،(٦) بشرطیکہ مرضِ وفات میں نہ ہو۔(٧)

جواب۴:- اگر بیوی نے چیک بک پر قبضہ کرلیا ہو، تو ہبہ منعقد ہوگیا، بشرطِ مذکور۔

جواب۵:- اس ہبہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو وارث اپنا حصہ چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ ترکے میں سے کوئی چیز مثلاً کپڑے لے کر اپنا باقی حصہ دُوسرے ورثاء کے لئے چھوڑ دیں، جسے تخارج کہتے ہیں۔(٨)

نوٹ:- اولاد کو ہبہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب کا حصہ برابر ہو، خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، لہٰذا بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا جس سے انہیں ضرر پہنچے، شرعاً ناجائز ہے،(٩) لیکن اگر ایسا کرکے ہبہ کرنے والا فوت ہوچکا ہے تو ہبہ نافذ ہوگیا،(١٠) بشرطیکہ ہبہ مرض الوفات میں نہ ہوا ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۴۱۷/۱۸ الف)

سوتیلے بیٹے کی طرف سے والد کو قرض یا ہبہ کے طور پر بھیجی گئی رقم کا حکم

سوال:- ایک شخص نے پہلی شادی کی تھی، اس سے تین لڑکیاں ہیں، اور بیوی فوت ہوگئی، اُس کے بعد دُوسری شادی کی جس سے ایک لڑکی ہوئی اور بیوی فوت ہوگئی، تیسری شادی ایک بچے کی ماں سے کی، یعنی اُس عورت کا شوہر سے ایک لڑکا تھا، وہ ساتھ لے کر آئی تھی، بعد میں وہ بچہ چلا گیا۔

اس لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو اور اچھی زندگی بسر کرو، حج کو جاؤ، اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرو۔ اب اس رقم سے سونا خرید لیا گیا، اس میں منافع ہوا، اور ایک رہائش کے لئے مکان خریدا گیا، اُس میں بھی منافع ملتا ہے، مکان میں مرحوم نے اپنی رقم بھی لگائی تھی، تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور وہ فوت ہوگئی، بیوی کے مرنے کے بعد شوہر بھی فوت ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کا کیا کیا جائے؟

(۱و۴و۵و۷) حوالے کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ اور ص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲و۳و٦) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(٨) حوالہ کے لئے دیکھئے السراجی فی المیراث ص:٦٢ (طبع مکتبہ سیّد احمد شہیدؒ لاہور)۔

(٩) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر۱ و۴۔

(١٠) وفی الھندیۃ کتاب الھبۃ الباب السادس ج:۴ ص:۳۹۱ (طبع رشیدیہ) رجل وھب فی صحّتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثمًا فیما صنع ....الخ. نیز دیکھئے حوالہ سابقہ۔

سوتیلے لڑکے نے جو رقم بھیجی تھی اُس کی کوئی تحریر بھی نہیں ہے کہ یہ رقم امانت ہے۔ دونوں شخصوں کے مرنے کے بعد لڑکا تحریر کرتا ہے کہ امانت ہے، اب تقسیم کے وقت دو بیویوں کی چار لڑکیاں ہیں اور ایک یہی سوتیلا لڑکا ہے، لہٰذا جو رقم آئی تھی اُس کا کیا جائے؟ اور مکان میں جو نفع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اور سونے میں جو منافع ہوتا ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ اب لڑکیاں کہتی ہیں کہ یہ سب ہمارا ہے اور لڑکا کہتا ہے کہ یہ سب میرا ہے۔

تنقیح

نمبر۵ کے ضمن میں لکھا ہے کہ: ''لڑکے نے پندرہ بیس سال بعد رقم بھیجی تھی اور تحریر کیا تھا کہ مکان خریدو اور خرچ کرو'' اس بات کی وضاحت کریں کہ یہ رقم کس کو بھیجی تھی؟ اپنی ماں کو یا سوتیلے باپ کو؟ اور بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ جس کو بھیجی تھی اس کو اس کا مالک و قابض بنادیا تھا یا محض مکان خریدنے کے لئے بھیجی تھی اور مالک خود ہے؟

نمبر۶ میں یہ رقم جس سے سونا خریدا گیا کس کو بھیجی تھی؟ اور مالک و قابض بنایا تھا یا نہیں؟

نمبر۸ مرحومہ کے انتقال کے وقت اس کے والدین زندہ تھے یا نہیں؟ اور ان کے علاوہ کون کون سے رشتہ دار زندہ تھے؟ اور کیا اس کی میراث تقسیم ہوچکی ہے یا نہیں؟

جوابِ تنقیح

نمبر۵ رقم تو باپ کے نام آئی تھی، مگر ماں باپ دونوں کے خرچے کی تھی، اور لکھا تھا کہ آپ مکان خرید کر اُس میں آرام سے دونوں آباد ہوجائیں، اس کی ملکیت سے لڑکے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

نمبر۶ سونا خریدنے کی علیحدہ رقم کوئی نہ تھی، مکان خریدنے کے لئے جو رقم تھی وہ ہی پڑی تھی، اُس سے سونا خرید لیا تاکہ منافع ہوکر رقم بڑھ جائے اور اچھا مکان لے لیں۔

نمبر۸ والدین مرحومہ کی زندگی میں وفات پاگئے تھے، مرحومہ نے لاولد وفات پائی، البتہ پہلے خاوند سے وہ لڑکا موجود ہے جو برما میں آباد ہے، اور جس نے اپنی حقیقی ماں اور سوتیلے باپ کے آرام کی خاطر رقم بھجوائی تھی، مگر اس سے مکان خریدا نہیں گیا، جبکہ وہ خریدِ مکان کی غرض سے تھی، مگر اس سے سونا خرید کر نفع کمایا جو بڑی رقم میں تبدیل ہوگئی۔ اب لڑکے کو جب سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وفات کی خبر ملی اور پتہ چلا کہ میں نے جو رقم خریدِ مکان کے لئے بھجوائی تھی اُس کو سونا خرید کر منافع حاصل کیا ہے تو وہ اپنی رقم کا دیگر وارثان سے یہ کہہ کر مطالبہ کرتا ہے کہ یہ تو میں نے امانت کے طور پر جمع رکھنے کے لئے بھجوائی تھی، اب جھگڑا صرف یہ ہے کہ یہ رقم اُسے واپس کی جائے یا ترکے میں تقسیم کی جائے جس میں یہ بھی بقدرِ حصہ خود حق دار ہوگا۔

اس لڑکے کی حقیقی ماں پہلے فوت ہوئی اور سوتیلا باپ بعد میں فوت ہوا ہے، نیز واضح ہو کہ اب یہ رقم جس سے سونا خرید کر نفع کمایا تھا، ایک مکان کی خریداری میں لگ گئی ہے، جس میں سوتیلے باپ نے بھی کچھ رقم اپنی ڈال کر مکان خریدلیا تھا، جسے اپنی بیوی کے نام خریدا تھا وہ اس لڑکے کی حقیقی ماں ہے، اِسی میں اُن کی سکونت تھی، اس لڑکے نے رقم بھجواتے وقت امانت کا لفظ نہیں لکھا تھا، اب امانت بتاتا ہے۔

تفصیل وارثان:- مرحومہ کی وفات کے وقت دُوسرا خاوند زندہ تھا، ایک پہلے خاوند کا لڑکا تھا (جس کی رقم کا جھگڑا ہے)، اور دُوسرے خاوند کی پہلی اور دُوسری بیویوں کی چار لڑکیاں تھیں، بعد میں خاوند کا انتقال جب ہوا تو اُس کی پہلی دو بیویوں سے چار لڑکیاں خاوند کے صلب سے موجود تھیں، اور تیسری بیوی کا پہلے خاوند سے ایک لڑکا تھا جو برما میں تھا۔ اس لئے ترکے میں ایک مکان جو تیسری بیوی کے نام سے خریدا تھا چھوڑا اور کچھ نقد رقم چھوڑی ہے، سوال جواب طلب یہ ہے کہ اس کے ترکے کی تقسیم کیسے ہوگی؟ بیوی کے نام خریدا ہوا مکان مرحومہ بیوی کا لڑکا مانگتا ہے جسے مرحوم کی لڑکیاں دینے پر رضامند نہیں ہیں، وہ کہتی ہیں کہ یہ تو ہمارے باپ کا ہے، جبکہ وہ بیوی کے نام سے خریدا تھا اور اس میں بڑی رقم بیوی کے لڑکے کی ہے، تھوڑی رقم مرحوم کی لگی ہے۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر رقم بھیجنے والا لڑکا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے جو رقم بھیجی تھی وہ قرض کے طور پر بھیجی تھی، ہبہ کے طور پر نہیں، تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور یہ رقم اس لڑکے کو واپس کی جائے گی، مرحوم یا مرحومہ کے ترکے میں شامل نہیں ہوگی، لما فی ردّ المحتار: "**ولو دفع دراهم وقال: أنفقها عليک، يکون قرضًا**" (ج:۴ ص:۵۰۹)۔[۱] **وفيه أيضًا: "دفع دراهم الیٰ رجل وقال: أنفقها، ففعل فهو قرض.....**" (وفيه أيضًا): **رجل اشترى حليا ودفعه الى امرأته واستعملته ثم ماتت ثم اختلف الزوج وورثتها أنها هبة أو عارية فالقول قولُ الزوج مع اليمين أنّه دفع ذٰلک اليها عارية لأنّه منکر للهبة**" (ج:۴ ص:۵۲۲)۔[۲]

البتہ یہ حکم صرف اتنی رقم کا ہے جو لڑکے نے بھیجی تھی، اس رقم کو تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل ہوا وہ لڑکے کا نہیں ہے، بلکہ جس کو اس نے قرض دیا تھا اُس کا ہے،[۳] اس سے معلوم کیا جائے کہ

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الهبة ج:۵ ص:۶۸۹ (طبع سعيد) وفي الهندية ج:۴ ص:۳۷۵ (طبع رشيديه) رجل عنده دراهم لغيره فقال لهٗ صاحب الدراهم: اصرفها في حوائجک، کان قرضًا ....الخ.

(۲) ردّ المحتار ج:۵ ص:۷۰۱ (طبع سعيد).

(۳) کیونکہ قرض لینے کے بعد مستقرض قرض کا مالک ہوجاتا ہے، اور قرض کی رقم اور اُس کا نفع اُسی کی ملکیت ہوتا ہے، حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۰۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

اس نے یہ قرض اپنی حقیقی ماں کو دیا تھا یا سوتیلے باپ کو؟ یا دونوں کو نصف نصف؟ پہلی صورت میں یہ نفع ماں کے ترکے میں شامل ہوگا، دُوسری صورت میں باپ کے ترکے میں، اور تیسری صورت میں نصف ماں کے ترکے میں اور نصف باپ کے ترکے میں شامل ہوگا، اسی طرح مکان میں جو رقم باپ نے خود لگائی تھی وہ بھی اس کے ترکے میں شامل ہوگی۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب ماں کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہ تھا، تو اس کی کل متروکہ جائیداد و ساز و سامان میں سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے اِخراجات نکالے جائیں، پھر اگر اس کے ذمے کوئی قرضہ ہو تو اسے ادا کیا جائے، پھر کوئی جائز وصیت کی ہو تو اُسے ۱/۳ کی حد تک نافذ کیا جائے، اس کے بعد اُس کے کل ترکے کو چار مساوی حصوں پر تقسیم کرلیں، ان میں سے ایک حصہ مرحومہ کے شوہر کا ہے، اور باقی تین حصے اُس کے حقیقی لڑکے کے ہیں جو برما میں مقیم ہے، اور اس کی سوتیلی بیٹیاں اس کی وارث نہیں ہیں۔

اور باپ کے انتقال کے وقت اگر اس کا کوئی اور رشتہ دار زندہ نہیں تھا تو تجہیز و تکفین، قرضوں کی ادائیگی، اور وصیت کے نفاذ کے بعد جتنا بھی مال ہو (اور اس میں اپنی مرحومہ بیوی کے ترکے سے ملنے والا ۱/۴ حصہ بھی شامل ہے) اُسے مرحوم کی تمام لڑکیوں میں برابر تقسیم کردیا جائے، مرحوم کا سوتیلا بیٹا جو برما میں ہے، مرحوم کا شرعی واث نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس وقت ہے جب مرحوم کا کوئی بھی رشتہ دار بیٹیوں کے سوا زندہ نہ ہو، اور اگر کوئی دُوسرا رشتہ دار مثلاً چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجا، پھوپھی وغیرہ موجود ہو تو یہ مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۰/۲۸ ج)

۱:- ورثاء کے امیر یا غریب ہونے کی صورت میں کل جائیداد کسی کو ہبہ یا وقف کرنا

۲:- متبنّیٰ (لے پالک) شرعاً وارث نہیں ہے

سوال:- میں لاولد ہوں اور میری کوئی اولاد نہیں ہے، میری زوجہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں میری زندگی میں ہوگیا، میرے کوئی بھائی یا بہن نہیں ہے اور نہ کبھی تھا، ایک مختصر شجرہ قلم بند کرتا ہوں:-

میری بیوی کے رشتے کی بہن (ماموں زاد بہن) کا لڑکا سیّد افسر علی ہے، جسے اُنہوں نے اور میں نے متبنّیٰ کیا جو معہ اپنے اہل وعیال کے میرے ساتھ رہتا ہے، میری ضعیف العمری میں میری ہر طرح خدمت کرتا ہے۔ میری جائیداد میری وفات کے بعد ان کو کس حصے میں پہنچتی ہے؟ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی جائیداد کا کچھ حصہ کلی طور پر اپنی زندگی میں دینا چاہتا ہوں، اگر کل جائیداد کسی کو دُوں یا وقف کروں تو اس میں کوئی اِشکال ہے؟
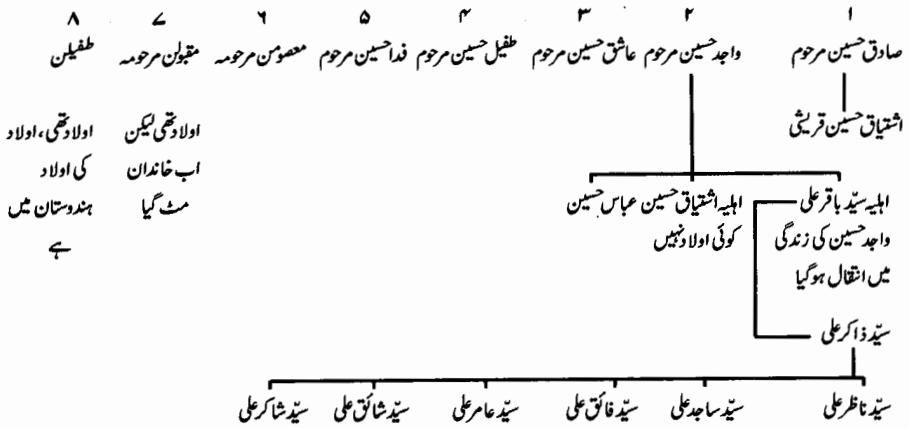
جواب:- اس سوال کا جواب یہ معلوم ہونے پر موقوف ہے کہ معصومن، مقبولن اور طفیلن مرحومات کی اولاد کی اولاد کی تفصیل کیا ہے؟ ان کے ہندوستان میں ہونے سے فرق نہیں پڑتا، اگر آپ کی کوئی خالہ، ماموں یا ان کی اولاد موجود ہو تو ان کی صراحت بھی ضروری ہے، آپ کی پھوپھیوں کی اولاد کی اولاد؟

بہرصورت اگر آپ کے ورثاء مالی اعتبار سے مستحکم ہوں تو آپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی زندگی میں مرضِ وفات سے پہلے پہلے اپنی پوری جائیداد کسی کو ہبہ کردیں، یا وقف فرمادیں، لیکن اگر وہ مالی اعتبار سے کمزور اور نادار ہوں تو پوری جائیداد کسی کو دینا دُرست نہیں، کم از کم دو تہائی حصہ ورثاء کے لئے چھوڑ کر ایک تہائی حصہ وقف یا ہبہ کردیں، یا یہ وصیت کرجائیں کہ میری وفات کے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے۔

ویؤخذ ذٰلک من ردّ المحتار حیث قال: ان کانت الورثة فقراء ولا یستغنون بما یرثون فالترک أوْلیٰ ..... وان کانوا أغنیاء أو یستغنون بنصیبهم فالوصیة أوْلیٰ .....

فالتفصیل انما هو فی الکبار اما الصغار فترک المال لهم أفضل ولو کانوا أغنیاء. (شامی ج:۵ ص: ۴۷۳)۔(۱)

اور جن صاحب کو آپ نے متبنّٰی بنایا وہ آپ کے وارث نہیں، البتہ آپ زندگی میں اُن کو اُن کی خدمت کی مکافات میں جو رقم یا جائیداد مناسب سمجھیں دے سکتے ہیں، اور ایک تہائی مال کی حد تک ان کے حق میں وصیت بھی کر سکتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۵/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۹ ب)

قبضے کے ساتھ جائیداد کسی کو دینے سے ہبہ دُرست ہوگیا اگرچہ کاغذات میں واہب کا نام ہو

سوال:- شیر محمد کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، شیر محمد نے اپنی مملوکہ و مقبوضہ زمین و مکانات اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیئے اپنی وفات سے تقریباً بارہ سال قبل، تقسیم کر کے اُن کو مالک و قابض بنا دیا، سرکاری کاغذات میں زمین والد ہی کے نام تھی صرف موقع پر تقسیم کر کے قبضہ دے کر مالک بنا دیا تھا، اس جائیداد میں بہنیں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر یہ صحیح ہے کہ شیر محمد مرحوم نے اپنی زندگی میں بحالتِ تندرستی اپنی جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے ان کو مالک و قابض بنا دیا تھا تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا،(۲) مذکورہ بیٹے اس جائیداد کے مالک ہوگئے،(۳) اور شیر محمد کی وفات کے بعد اس کے دیگر ورثاء کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں، محض کاغذی طور پر جائیداد کے شیر محمد کے نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۱۹/۲۸ ج)

محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رُجوع نہیں ہوسکتا

سوال:- والد نے اپنی زندگی میں اپنی املاک بطور ہبہ اپنی اولاد لڑکے اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی، اب یہ اولاد اس ملکیت پر فرداً فرداً قابض و متصرف ہیں، اس اولاد میں اسی ملکیت کے انتظامیہ کاروبار میں کچھ بالاشتراک کاروبار بھی ہیں، ان اشتراکی معاملات میں بعض صرف اپنے ذاتی مفاد کا خیال رکھتے ہیں، خواہ دُوسروں کا اس میں نقصان ہی ہو، ان معاملات میں ان کے والد نے بطور تحفظ حقوقِ

(۱) ردّ المحتار علی الدر المختار، کتاب الوصایا ج:۶ ص: ۶۵۱، ۶۵۲.
(۲و۳) دیکھئے ص: ۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲و۳۔

مساوات تجویزیں پیش کیں، کچھ نے قبول کیں، کچھ نے انکار کردیا، یہاں تک کہ اولاد کے خلاف عملی کوشش بھی کی گئی، ایسی حالت میں والد صاحب کو اپنی موہوب ملکیت واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

جواب:- جب والد نے اپنی املاک اپنی اولاد کو ہبہ کردیں اور انہوں نے اُس پر قبضہ بھی کرلیا تو ہبہ تام ہوگیا،[1] اب باپ کو شیٔ موہوب کے واپس لینے کا اختیار نہیں، فلو وھب لذی رحم محرم منہ لا یرجع، کذا فی التنویر مع الشامی ج:۴ ص:۵۱۸۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۱ ب)

ہبہ سے رُجوع دُرست نہیں

سوال:- میں یعنی حقیقی والد نے اپنا ایک ہی مکان اپنے پسر کے نام ہبہ کیا ہو، اور اپنی بزنس اور دُکان بلامعاوضہ پسرِ مذکور کے نام کردیا ہو تحریری، اور عرصہ آٹھ سال سے اُس کی انکم سے محروم رہا ہوں، میری سیکنڈ وائف سے چار بچے ہیں، اِن حالات کے پیشِ نظر اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا شرعاً اُس کا واپس لینا میرے لئے جائز ہے؟

جواب:- جب آپ نے اپنا مکان، دُکان اور کاروبار باقاعدہ اپنے بیٹے کو ہبہ کردیا، اور بیٹے نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے تو اَب آپ کو واپس لینے کا اختیار نہیں رہا، فلو وھب لذی رحم محرم منہ نسبًا ولو ذمّیا أو مستأمنًا لا یرجع. (شامی ج:۴ ص:۵۱۸)۔[3] البتہ آپ کے بیٹے کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھے، اور آپ سے صلۂ رحمی کرے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۳/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۳۲ ب)

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) الدّر المختار مع ردّ المحتار، کتاب الھبۃ، باب الرّجوع فی الھبۃ ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعید).
وفی صحیح البخاری، کتاب الھبۃ، باب الھبۃ للمشرکین ج:۱ ص:۳۵۷ (طبع قدیمی) عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لیس لنا مثل السوء الّذی یعود فی ھبتہ کالکلب یرجع فی قیئہٖ.
وفی الھدایۃ، کتابُ الھبۃ، باب ما یصحّ رجوعہ وما لا یصحّ ج:۳ ص:۲۹۲ (طبع مکتبہ رحمانیہ، وفی طبع مکتبہ شرکت علمیہ ج:۳ ص:۲۹۰) وان وھب ھبۃ لذی رحم محرم منہٗ لم یرجع فیھا لقولہ علیہ السلام: "اذا کانت الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع فیھا" (رواہ البیھقی) وکذا فی مجمع الأنھر، باب الرجوع ج:۳ ص:۵۰۳ (طبع غفاریہ کوئٹہ).
وفی الھندیۃ ج:۴ ص:۳۸۶ (طبع رشیدیہ) والبحر الرّائق، کتاب الھبۃ ج:۷ ص:۲۹۴ (طبع سعید) والبدائع ج:۶ ص:۱۳۲ (طبع سعید) وفی شرح المجلّۃ لسلیم رستم باز رقم المادّۃ:۸۶۶ کتاب الھبۃ، باب ثالث ج:۱ ص:۴۷۶ (طبع حنفیہ کوئٹہ) من وھب لاصولہ وفروعہ أو لأخیہ أو اختہ أو لأولادھما أو لعمہ أو لعمّتہ أو لخالہ أو لخالتہ شیئًا فلیس لہ الرجوع.

(۳) الدّر المختار مع رّد المحتار، کتاب الھبۃ ج:۵ ص:۷۰۴ (طبع سعید).
نیز دیکھئے سابقہ حاشیہ۔

شرم و مروّت میں کئی دن تک کھانا کھلایا پھر اس کے بدلے رقم طلب کی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے بکر کو کچھ رقم قرض کے طور پر دی، زید کے پاس بکر کے بچے بھی زیرِ تعلیم تھے، بکر زید کو کھانا دیتا رہا، کچھ عرصہ بعد بکر نہایت مفلس بن گیا اور ساتھ ہی ساتھ بیمار بھی ہوگیا، بکر پر ایسے حالات آئے کہ محلے کے ہر جاننے والے شخص سے قرض لیا حتیٰ کہ سود پر بھی قرض لیا، اسی دوران بکر نے زید کو بار بار کہا کہ وہ اپنا انتظام کرلے کیونکہ وہ کھانا دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا، مگر زید آنکھیں بند کرکے بکر کے گھر کھانا کھاتا رہا، اگر کسی دن کھانا نہیں پہنچتا تھا تو بکر کے گھر جاکر مطالبہ کرتا تھا۔

بکر کا کہنا ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود جب زید میرے گھر کھانا کھاتا تھا تو میں صرف اہلِ محلّہ اور اقارب میں شرمندگی کی وجہ سے گھر سے کھانا بھیجتا رہا، کچھ دنوں کے بعد زید نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا، مطالبے پر بکر نے کچھ رقم دے دی اور کچھ رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا، مگر زید نے پوری رقم یا آدھی رقم کا دوبارہ مطالبہ کیا، اور بات شرمندہ کرنے تک پہنچ گئی، اس پر بکر نے یہ کہا کہ جب سے میں نے تمہیں کھانا کھانے کا اپنا انتظام کرنے کا نوٹس دیا تھا اس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم میرے حوالہ کردو، کیونکہ اس میں مجھے نہ تو ثواب کی نیت تھی اور نہ میں نے اپنی خوشی سے کھلایا، صرف عزّت بچانے کی خاطر دیتا رہا۔

کیا بکر کا یہ مطالبہ شرعاً دُرست ہے کہ نوٹس کے بعد کے دنوں کے کھانے کی رقم دو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر بکر زید کے گھر اس لئے کھانا کھاتا تھا کہ زید اس کا مقروض تھا، اور قرض کی وجہ سے زید اسے کھانا کھلاتا تھا تب تو یہ کھانا سود کے حکم میں ہوکر حرام ہوا،(۱) اور اس کی قیمت قرض سے منہا کرنی ضروری ہے، لیکن اگر کھانا قرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ پہلے سے باہمی تعلق کی بنا پر کھلاتا تھا تو جب بکر نے زید کو اپنے گھر کھانے سے منع کردیا تھا تو زید کے لئے جائز نہیں تھا کہ اُس کے گھر کھانا کھاتا، لقولہ علیہ السلام: "لا یحلّ مال امریء مسلم اِلّا بطیب نفس منہ"۔(۲) اور بکر کی مرضی کے خلاف اس کے گھر کھانا کھاکر زید نے گناہ کا ارتکاب کیا، اس گناہ کی تلافی کے لئے دیانۃً زید پر واجب ہے کہ جتنے دن بکر کی مرضی کے خلاف اُس کا کھانا کھایا ہے اُتنے دن کے کھانے کی قیمت اس کو اَدا کرے، لیکن چونکہ بکر نے اس کو کھانا اپنے اختیار سے دیا ہے، خواہ لوگوں کی شرم کی بناء پر دیا ہو، اور اس پر کوئی اِکراہ نہیں تھا اور اس نے کھانا دیتے وقت زید کو یہ بھی نہیں کہا کہ میں

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۲۸۴ کا حاشیہ نمبر۴۔

(۲) مشکوٰۃ المصابیح، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ)۔

اس کی قیمت لوں گا، اس لئے اس کی طرف سے یہ ہبہ ہوگیا۔[1] اور اَب اس کے لئے اس کی قیمت کا مطالبہ کرنا دُرست نہیں، بالخصوص زید سے لئے ہوئے قرضے کو اس بناء پر روک لینا اس کے لئے جائز نہیں، بکر کو چاہئے کہ زید کی قرضے کی رقم واپس کردے اور زید پر دیانۃً لازم ہے کہ وہ کھانے کی قیمت بکر کو اَدا کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۸ ج)

ایک بیوی کے نام سے خریدے گئے مکان میں واہب کی موت کے بعد دُوسری بیوی کے ورثاء کا دعویٰ میراث کرنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس مسئلے میں، زید نے اپنے انتقال کے وقت چھ لڑکے اور ایک لڑکی اور ایک زوجہ چھوڑی۔ زید نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دُوسرا نکاح کیا تھا، پہلی بیوی سے دو لڑکے چھوڑے ہیں اور دُوسری بیوی سے چار لڑکے ایک لڑکی اور زوجہ چھوڑی۔ زید نے ایک زمین خریدی اپنی دُوسری بیوی کے نام سے جس کی رجسٹری بھی قانونی طریقے پر دُوسری بیوی کے نام سے کرائی، سرمایہ بھی قانونی طریقے پر اپنے کاروبار سے نکالا، اس پر مکان بھی تعمیر کروایا دُوسری بیوی کی اولاد کی زیرِ نگرانی مکان تعمیر ہونے کے بعد کتبہ بھی دُوسری بیوی کے نام کا لگوایا یعنی دُوسری بیوی کے نام پر اس مکان کا نام رکھا۔ سرمایہ، زمین اور مکان کی تعمیر یہ سب زید نے دیا، زید کے انتقال کے نو ماہ بعد دُوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا، اب زید کی دُوسری بیوی کے لڑکے اور لڑکی کہتے ہیں کہ یہ مکان ہماری والدہ کا ہے اس لئے اس کے وارث ہم ہیں، کیونکہ یہ مکان زید نے اپنی زندگی میں ہماری والدہ کے نام سے تیار کرا کے قانونی طریقے سے ہبہ کردیا تھا، اب پہلی بیوی کے دونوں لڑکے بھی اس میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ فرمائیں کہ شرعی اعتبار سے پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں کو اس مکان میں ورثہ ملنا چاہئے یا نہیں؟

تنقیح

کیا زید مرحوم نے کبھی زبانی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنی دُوسری بیوی کی ملکیت کرکے خریدا ہے یا ان کو ہبہ کردیا ہے؟ نیز کیا کبھی ایسا ہوا کہ زید مرحوم نے اس مکان کا قبضہ

---

(۱) وفی بدائع الصنائع، کتاب الھبۃ ج:۶ ص:۱۲۴ والاذن نوعان صریح ودلالۃ ..... وامّا الدّلالۃ فھی أن یقبض الموھوب لہ العین فی المجلس ولا ینھاہ الواھب فیجوز قبضہ استحسانًا ....الخ.

وفی الشامیۃ، کتابُ الھبۃ ج:۵ ص:۶۸۸ قد أفاد أنّ التّلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدّالۃ علی التّملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضہٗ ولم یتلفّظ واحد منھما بشیءٍ ....الخ.

اپنی دُوسری بیوی کو بلاشرکتِ غیر دے دیا ہو اور خود کسی اور مکان میں مقیم رہتے ہوں؟ ان سوالات کا جواب اسی کاغذ کی پشت پر لکھ کر دے دیں تو اِن شاء اللہ اصل مسئلے کا جواب دے دیا جائے گا۔

جوابِ تنقیح

زمین جب خریدی گئی اسی ارادے سے خریدی گئی کہ اس کی ملکیت موجودہ بیوی کی رہے گی، علاوہ اس کے زبانی بھی انتقال سے کچھ روز قبل انہوں نے موجودہ بیوی سے کہا کسی طرح کی بیوی کی بات پر کہ تیرے لئے تو میں اپنی ملکیت کا مکان چھوڑ کر جارہا ہوں۔ نیز مرحوم کی زندگی میں پیشگی ٹیکس فکس نہیں ہو رہا تھا، زید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ طے ہوا تب جملہ ٹیکس موجودہ بیوی کی اولاد دیتی رہی، کبھی ایسا ہوا نہیں کہ وہ خود کسی اور مکان میں رہے ہوں، بیوی موجودہ حال میں چونکہ ایک جھگڑے کی بات پر ہوتا دیگر کوئی دُوسرا خیال بھی اس شہر میں زید کا تھا بھی نہیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید اور اس کی بیوی دونوں کا انتقال ہوچکا ہے، معاملے کی صحیح نوعیت خود اَصحابِ معاملہ سے تو معلوم نہیں ہوسکتی، البتہ ظاہر حال کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مکان بیوی ہی کی ملکیت ہے، بیوی کے نام رجسٹری اور بیوی اور اس کی اولاد کا اس مکان پر قبضہ بیوی کے نام کا کتبہ اور مرحوم کی زبانی گفتگو سب ظاہری طور پر اس بات کے قرائن ہیں کہ مرحوم نے یہ مکان اپنی زندگی ہی میں بیوی کی ملکیت کردیا تھا،(۱) اس صورت میں اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کردے کہ اس مکان کو بیوی کے نام رجسٹری کرانا محض ایک بنیادی کارروائی تھی اور حقیقت میں زید مرحوم نے یہ مکان بیوی کی ملکیت نہیں کیا تھا، تب تو یہ مکان ان کے ترکے میں شامل ہوکر ان کے تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا، لیکن اگر پہلی بیوی کی اولاد قابلِ اعتماد گواہوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کرسکے تو اس مکان کو زید مرحوم کی دُوسری بیوی کی ملکیت سمجھا جائے گا،(۲) اور اس میں پہلی بیوی کی اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

واللہ اعلم
۱۴۰۰/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱/۸۵۹ ج)

بیوی بچوں کی نافرمانی کی بناء پر اپنی ساری رقم صدقہ کرنے یا تبلیغ میں خرچ کرنے کا حکم

سوال:- میری بیوی اور بچوں کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، جس کی وجہ یہ

(۱ و ۲) وفی الشامیة، کتاب الھبة ج:۵ ص:۶۸۸ قلت فقد افاد أن التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیٔ ....الخ.
نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ کتاب الھبة ج:۳ ص:۴۶۶۔

ہے کہ میں اپنے بڑے لڑکے کو غلط لڑکوں کی صحبت سے روکتا ہوں، نماز پڑھنے پر زور دیتا ہوں، لوگوں نے کہا کہ یہ بالغ ہے اپنی نماز روزے کا خود ذمہ دار ہے، لہٰذا اس سے کہنا اور بولنا چھوڑ دیا۔ میں نے بیوی کو کہا کہ وہ ٹی وی لانے کو کہتا ہے، منع کردو، میں اس کے خلاف ہوں۔ لیکن بیوی نے کوئی اثر نہیں لیا، اور وہ ٹی وی لے آیا، اس قدر زور سے بجاتا ہے کہ پریشان ہوجاتا ہوں۔ ماں لڑکے کی حمایت کرتی ہے، تھوڑی دیر گھر میں رہنا بھی محال ہوگیا ہے، صاحبزادے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہتے ہیں، ہر اتوار زور زور سے بجا کر بہت پریشان کیا جاتا ہے، ان حالات میں میرا تبلیغی جماعت میں نکل جانے کا ارادہ ہے، لڑکا روزانہ پچاس ساٹھ روپے کماتا ہے، مکان پر دعویٰ کرتا ہے کہ مکان میرا ہے، گھر سے چلے جاؤ۔ دس بارہ ہزار روپیہ میرے پاس ہے، جس میں سے مسجد میں نصف صدقۂ جاریہ کے طور پر لگانا چاہتا ہوں، اور نصف اپنی ضرورت کے لئے رکھنا چاہتا ہوں، میرے لئے شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی زندگی میں اپنے روپے کے بارے میں اختیار ہے کہ اُسے جس جائز کام میں چاہیں صَرف کریں۔[1] البتہ آپ کی بیوی کا نفقہ آپ پر ہر حال میں واجب ہے،[2] لہٰذا اپنا، اپنی بیوی کا (اور اگر کوئی نابالغ اولاد ہو تو اس کا بھی)[3] نفقہ نکال کر باقی تمام مال میں آپ تصرف کرسکتے ہیں،[4] اُسے صدقۂ جاریہ میں بھی لگا سکتے ہیں اور تبلیغ کے کام میں بھی صَرف کرسکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۰/۳/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱۳/۲۸ ب)

ساری جائیداد بیٹی کو قبضے کے ساتھ ہبہ کردی تو ہبہ دُرست ہوگیا

سوال:- میرے منجھلے تائے مرحوم منشی حسام الدین صاحب جو میرے خسر بھی تھے، اولاد میں صرف ایک اکلوتی لڑکی (میری بیوی حسن بانو عرف حسنہ) تھی، میرے والد صاحب مرحوم منشی جمیل

(۱ و ۴) وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ ج:۴ ص:۱۳۲ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع مکتبہ حقانیہ پشاور) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء لأنّ کون الشیء ملکًا لرجل یقتضی أن یکون مطلقًا فی التّصرف فیه کیفما شاء.

(۲) وفی شرح المجلّة لسلیم رستم باز ج:۱ ص:۶۵۴ رقم المادّة:۱۱۹۲ (طبع حنفیه کوئٹه) کل یتصرّف فی ملکه کیف شاء ....الخ.

وفی الدّر المختار، کتاب الطّلاق، باب النفقة ج:۳ ص:۵۷۲ (طبع سعید) ونفقة الغیر تجب علی الغیر بأسباب ثلاثة زوجیة وقرابة وملک فتجب للزوجة بنکاحٍ صحیح علیٰ زوجها.

(۳) وفی الدّر المختار ج:۳ ص:۶۱۲ (طبع سعید) وتجب النفقة بأنواعها علی الحر (لطفله) یعمّ الأنثیٰ والجمع الفقیر. وفی الشامیة تحته (قوله بأنواعها) من الطّعام والکسوة والسکنیٰ ....الخ.

وفی البحر الرّائق باب النفقة ج:۴ ص:۲۰۱ (طبع سعید) قوله ولطفله الفقیر أی تجب النفقة والسکنیٰ والکسوة لولده الصغیر الفقیر ....الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۵۶۰ (طبع رشیدیه) نفقة الأولاد الصّغار علی الأب لا یشارکهٗ فیها أحد کذا فی الجوهرة النیرة ....الخ.

الدین صاحب، اولاد میں بڑی بہن جن کا انتقال والد صاحب کی ہی زندگی میں ہوگیا تھا، ہم چار بھائی فریدالدین صاحب، بلیغ الدین و وحیدالدین صاحبان پاکستان ۱۹۴۷ء میں آگئے تھے، چوتھے محمد احمد صاحب مرحوم جو انڈیا ہی میں رہے، اوّل الذکر تین بھائیوں نے متروکہ جائیداد کے عوض جو ہند میں چھوڑ آئے تھے کلیم کرکے زمین حاصل کرلی، جبکہ محمد احمد صاحب انڈیا ہی میں رہ کر وفات پاگئے۔

والد صاحب قبلہ کے انتقال کو ۳۶ سال گزر گئے، میرے خسر منشی حسام الدین صاحب کے انتقال کو تقریباً ۴۶ سال گزرے، گویا والد صاحب کی زندگی ہی میں میرے خسر کا انتقال ہوگیا تھا۔

ہند میں مشترکہ جائیداد کا انتظام بڑے تایا منشی محمد مہدی صاحب کیا کرتے تھے، جائیداد مشترکہ مقروض ہوگئی، اور حالانکہ میرے خسر کی اولاد میں صرف لڑکی تھی، ان پر بھی برابر کا قرضہ پڑا، حالانکہ لڑکی اکثر اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی ملازمت پر رہی تھی، ضرورت محسوس ہوئی کہ بعد ادائیگیٔ قرضہ جو زمین صحرائی اور سکنیٰ جائیداد رہ گئی تھی وہ حصہ برابر میں تقسیم کردی جائے، جس کی تکمیل بڑے تایا کی ہی زندگی میں ہوکر ہر ایک کے نام داخل خارج ہوگیا تھا۔

میرے خسر کو والد صاحب مرحوم اور دُوسرے اعزّہ نے مشورہ دیا کہ کل جائیداد زرعی و سکنیٰ اپنی لڑکی کے نام ہبہ کردیں، چنانچہ تمام جائیداد ہبہ کردی۔ خود والد صاحب نے ہبہ نامہ کی تکمیل کرائی اور بطورِ گواہ دستخط کئے، اور دستخط رجسٹرار کے سامنے خود میرے خسر نے باہوش وحواس کیا۔ ہبہ نامہ مکمل ہوگیا، سب جائیداد متعلقہ جو بلاشرکتِ غیرے میرے خسر کے نام چلی آرہی تھی، میری مرحومہ حسن بانو کے قبضے اور ملکیت میں چلی گئی، میرے خسر کے انتقال کے بعد دس سال میرے والد زندہ رہے لیکن کبھی انہوں نے اپنا شرعی حق میری بیوی سے طلب نہیں کیا، اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب میرے حقیقی بھائی وحیدالدین کو وسوسہ پیدا ہوا ہے کہ مسماۃ حسن بانو کی پاکستان میں حاصل کردہ جائیداد پر شرعی حق جتا کر اپنا حصہ طلب کروں۔ میرے حقیقی بھائی اور اُن کی اولاد، مرحومہ حسن بانو کے حقیقت میں شرعی وارث ہیں یا نہیں اور یہ حق دار ہیں یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے خسر منشی حسام الدین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد اپنی بیٹی حسن بانو کو ہبہ کردی تھی، اور حسن بانو نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو اب یہ ساری جائیداد حسن بانو کی ملکیت ہوگئی،[1] یہ آپ کے خسر کے ترکے میں شامل ہوکر اُن کے دُوسرے ورثاء کو نہیں مل سکتی، اور نہ اس میں کسی اور کا حصہ ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ حکم اس صورت کا ہے جبکہ مذکورہ ہبہ منشی حسام الدین صاحب نے اپنے مرضِ وفات سے پہلے ہی تکمیل کردیا ہو،[2] اور اگر مرضِ وفات میں

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) دیکھئے حوالہ ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۳ وص:۴۴۹ کا حاشیہ نمبر۲۔

ہبہ کیا ہو تو اس کا حکم دوبارہ لکھ کر معلوم کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۲/۲۸ الف)

صرف کاغذات میں نام کرانے سے شرعاً ملکیت نہیں آتی

سوال:- میں بمعہ والد، والدہ اور تینوں بہنوں کے ہندوستان سے پاکستان پہنچا تھا، یہاں آکر میں (نورالحسن) اور میرے چھوٹے بھائی محمد سلیم دونوں نے دفتر میں نوکری کرنی شروع کردی، والد صاحب ضعیف العمر تھے، دونوں بڑی بہن حسن آرا بیگم، فردوس جہاں اپنے اپنے گھر رہنے لگیں، کیونکہ ہندوستان میں شادی ہوگئی تھی، تیسری بہن چھوٹی تھی وہ ساتھ رہتی تھی، پیسے جوڑ کر ناظم آباد میں ایک پلاٹ لیا، تھوڑا سا بنوا کر گورنمنٹ ہاؤس بلڈنگ فائنانس سے قرضہ لیا اور جوں جوں روپیہ ملتا گیا مکمل کرتا گیا۔

عرض یہ ہے کہ یہ پلاٹ ہم دونوں بھائیوں نے والدہ (بسم اللہ بیگم) کے نام سے لیا تھا، محض اس لئے کہ ہندوستان سے رنجیدہ حالات میں آئی ہیں، اس کا کچھ حصہ کرایہ پر بھی دیا ہوا تھا، کرایہ گھر میں خرچ ہوگیا تھا، اب والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس سے قبل چھوٹی بہن کی بھی شادی ہوگئی تھی، والدہ اور ہم دونوں بھائی اور کرایہ دار اس مکان میں رہتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں بہنوں کا بھی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ صرف والدہ کے نام تھا محض ان کی بزرگی کی وجہ سے، اس کا علم بہنوں کو بھی ہے۔

جواب:- اگر یہ دُرست ہے کہ یہ مکان آپ نے اپنی والدہ کو باقاعدہ ہبہ نہیں کیا تھا بلکہ محض کاغذات میں ان کے نام کر رکھا تھا، مالک آپ دونوں ہی تھے، تو یہ مکان آپ دونوں کی ملکیت ہے، اور یہ والدہ کے ترکے میں شمار نہ ہوگا، لہٰذا بہنوں کا اس مکان میں کوئی حق نہیں ہے۔ (۱)

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

---

(۱) فی الدر المختار ج:۵ ص:۶۹۰ (طبع سعید کراچی) وتتم الهبة بالقبض الکامل.

وفيه أيضًا ج:۵ ص:۶۹۶ اتخذ لولده أو لتلميذه ثيابًا ثم أراد دفعها لغيره ليس له ذٰلک ما لم يبين وقت الاتخاذ انها عارية.

وفی الشامية قوله: لولده، أی الصغير وأمّا الكبير فلا بد من التسليم. نیز دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر۲۔

زندگی میں تقسیمِ جائیداد کا حکم اور طریقۂ کار

سوال ۱:- ایک شخص کی دو بیویاں ہیں، پہلی کو طلاق دے کر اُس کی اولاد کو اگر جائیداد میں سے کچھ نہ دے تو جواب دہ ہوگا یا نہیں؟

سوال ۲:- اگر اُس کے پاس ورثے میں جائیداد آئی ہے اُس میں سے اس کو حصہ نہ دے تو گناہگار ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- زندگی میں کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہتا ہے تو ساری اولاد کو برابر دینا چاہئے،(۱) خواہ وہ اولاد موجودہ بیوی سے ہو یا مطلقہ بیوی سے، بعض کو دینا اور بعض کو نہ دینا دُرست نہیں۔(۲)

جواب ۲:- اگر اُس شخص کو کسی اور شخص کی میراث سے کچھ حصہ ملا ہے تو اپنی زندگی میں اس میں سے کوئی حصہ کسی اور کو دینا واجب نہیں، وہ سارا حصہ خود رکھ سکتا ہے، لیکن اگر اولاد کو اس میں سے کچھ دینے کا ارادہ ہو تو برابر دے۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۶۱)

مرض الموت میں ہبہ ''وصیت'' کے حکم میں ہوتا ہے

سوال:- ایک شخص مرض الموت کے بستر پر پڑا ہوا ہے، جس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے، اور کچھ بھتیجے ہیں، اس کے بعض بھتیجے جاکر وکیل کو اس کے گھر پر بلالیتے ہیں اور اس شخص کے بھائی اور بہن کو معلوم ہوئے بغیر اسے بہلاکر اس کا ترکہ اپنے نام ہبہ لکھواتے ہیں، اور اس کے دستخط کراتے ہیں، اور اس سے پہلے اس کے مال پر اس کی موت سے پہلے بھتیجوں کا کسی قسم کا قبضہ نہ ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ ہبہ صحیح ہوگیا جبکہ اس ہبۂ مرحوم پر بھائی اور بہن ناراض ہیں۔

(۱ تا ۳) فی الهندية ج:۴ ص:۳۹۱ الباب السادس فی الهبة للصغير ولو وهب رجل شيئًا لأولاده فی الصحة وأراد تفضيل البعض علی البعض ..... روی عن أبی حنيفة رحمه الله تعالیٰ أنه لا بأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل له فی الدِّين وان كانا سواء يكره، وروی المعلی عن أبی يوسف رحمه الله تعالیٰ انه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوّی بينهم يعطی الابنة مثل ما يعطی الابن وعليه الفتویٰ.

فی البحر ج:۷ ص:۹۰ (طبع بيروت وفی طبع سعيد ج:۷ ص:۲۸۸) المختار التسوية بين الذكر والانثیٰ فی الهبة. نیز دیکھئے ص:۴۴۷ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۴۔

جواب:- چونکہ اس شخص نے بھتیجوں کو قبضہ نہیں دیا، اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگیا، اور اگرچہ مرضِ موت میں ہبہ بحکم وصیت ہوتا ہے[1] لیکن اسی وقت جبکہ موہوب لۂ کو قبضہ دے دیا گیا ہو،[2] قبضے کے بعد ثلثِ مال سے وہ ہبہ نافذ ہوتا ہے،[3] لیکن جب قبضہ ہی نہ دیا تو پھر ہبہ باطل ہوگیا، اور کل جائیداد اس کا ترکہ سمجھی جائے گی۔ لما فی الهندية: قال فی الأصل: ولا تجوز هبة المريض ولا صدقته الّا مقبوضة فاذا قبضت جازت من الثلث واذا مات الواهب قبل التسليم بطلت. (عالمگيرية، كتاب الهبة، باب ١٠ فی هبة المريض ج:۴ ص:۴۰۰)۔[4]

واللہ اعلم
۱۳۹۱/۳/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۲ الف)

والد کا کئی بیٹوں کو مکان ہبہ کرنا دُرست نہیں

سوال:- عبدالجبار نے ایک مکان تعمیر کرایا، اور اپنی دو لڑکیوں اور چار لڑکوں کے ساتھ اس میں آباد ہوگیا، عبدالجبار نے حالتِ صحت میں اس مکان کو اپنے چاروں بیٹوں کو زبانی ہبہ کردیا اور چاروں سے کہا کہ تم اس کے برابر کے مالک ہو اور اس مکان پر تمہارا قبضہ ہے، عبدالجبار نے کہا کہ میرا اس مکان کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ میں اس مکان میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ اس ہبہ کے گواہ موجود ہیں۔

انتقال کے وقت عبدالجبار اپنی اولاد کے ساتھ اس مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھا، کیا

(۱، ۲ و ۳) وفی ردّ المحتار، باب الرّجوع فی الهبة ج:۵ ص:۷۰۰ (طبع سعيد) وهب فی مرضه ولم يسلم حتّى مات بطلت الهبة لأنّه وان كان وصية حتّى اعتبر فيه الثلث فهو هبة حقيقة فيحتاج الى القبض ....الخ.

وفی تكملة حاشيه ردّ المحتار ج:۲ ص:۳۰۲ لأنّ الوصية تمليك بعد الموت ..... كذا الهبة فی مرضه لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية.

وفی المحيط البُرهانی، كتاب الدعویٰ، الفصل الرابع والعشرون فی دعوى الوصية....الخ ج:۱۶ ص:۳۴۴ (طبع ادارة القرآن كراچی) ..... ان كانت الهبة فی حالة المرض فالجواب فيها كالجواب فی الوصية لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية ....الخ

وفی شرح المجلّة لسليم رستم باز رقم المادّة: ۸۷۹ كتاب الهبة الفصل الثانی (طبع حنفيه كوئٹه) اذا وهب واحد فی مرض موته شيئًا لأحد ورثته وبعد وفاته لم يجز سائر الورثة لا تصحّ تلك الهبة أصلًا لأنّ الهبة فی مرض الموت وصية .....الخ. وفی شرح المجلّة للأتاسیؒ كتاب الهبة الفصل الثانی فی هبة المريض رقم المادّة: ۸۷۹ ج:۳ ص:۴۰۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) لأن هبته (أی المريض) وان كان هبة حقيقة لٰكن لها حكم الوصية.

وكذا فی الهندية ج:۴ ص:۴۰۰ كتاب الهبة، الباب العاشر فی هبة المريض (طبع رشيديه) والبزازية علىٰ هامش الهندية، كتاب الهبة، نوع فی هبة المريض ج:۶ ص:۲۳۹ (طبع رشيديه).

(۴) طبع رشيديه كوئٹه.

لاعلمی کی وجہ سے ایک حصے میں پندرہ ایکٹر رقبہ بارانی آ گیا، جبکہ باقی تمام حصوں میں رقبہ نہری تھا، اُس وقت محمد شریف نے تقسیم پر جو اِعتراض کیا وہ دُرست تھا، اور چاروں بھائیوں کو چاہئے تھا کہ تقسیم ازسرِنو کرتے (کما یفهم من العبارة الأولیٰ)۔ لیکن جب دُوسرے بھائیوں نے ازسرِنو تقسیم کرنے سے انکار کیا تو محمد شریف زمین کو نہری قرار دینے کی درخواست دے کر اور انور علی کے ساتھ شرکت کر کے عملاً دوبارہ تقسیم کے حق سے دستبردار ہوگیا، اب انور علی کے ساتھ شرکت قائم کرنے سے ان دونوں کے درمیان جو تقسیم ہوئی تھی وہ فسخ ہوگئی، اور محمد شریف اور انور علی کے حصوں کی زمین ان دونوں کے درمیان پھر سے مشترک ہوگئی، (کما یفهم من العبارة الثانية)۔ اب جبکہ یہ دونوں الگ ہونا چاہتے ہیں انہیں ازسرِنو تقسیم کر کے الگ ہونا چاہئے، اس سلسلے میں عباراتِ فقہیہ درج ذیل ہیں:-

العبارة الأُولیٰ:- "اذا اقتسما دارًا فلما وقعت الحدود بينهما اذا أحدهما لا طريق له فإن كان يقدر علىٰ أن يفتح لنصيبه فى حيزه طريقًا آخر فالقسمة جائزة وإن كان لا يقدر علىٰ أن يفتح لنصيبه طريقًا إن علم وقت القسمة أن لا طريق له فالقسمة جائزةٌ وان لم يعلم فالقسمة فاسدة." (عالمگيرية ج:۵ ص:۲۱۱، كتاب القسمة، باب:۳)[۱]۔

العبارة الثانية:- "القسمة تقبل النقض، فلو اقتسموا وأخذوا حصتهم ثم تراضوا على الاشتراك بينهم صح) وعادت الشركة فى عقار أو غيره لأن قسمة التراضى مبادلة ويصح فسخها ومبادلتها بالتراضى" (درمختار مع شامی ج:۵ ص:۱۷۰، كتاب القسمة)[۲]۔

هٰذا ما ظهر لى واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۳/۲۷ و)

---

(۱) وفى الهداية ج:۴ ص:۴۱۷، كتاب القسمة (طبع شركت علميه).

وفى البحر الرّائق، كتاب القسمة (طلب بعض الشركاء القسمة) ج:۸ ص:۱۵۳ (طبع سعيد) ولو أقسموا دارًا فاذا لا طريق لأحدهم وقدر علىٰ أن يفتح فى نصيبه طريقًا يمرّ فيه الرّجل دون الحمولة جازت القسمة لأنّها لم تتضمن تفويت منفعة وان لم يقدر ينظر ان لم يعلم أنّه لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة وان علم انه لا طريق لهٗ جازت القسمة لأنّه رضى بهٰذه القسمة.

وفى المحيط البُرهانى، كتاب القسمة، فصل فى بيان ما يقسم وما لا يقسم ...الخ ج:۱۱ ص:۱۵۰ (طبع ادارة القرآن) واذا اقتسم الرّجلان دارًا فلمّا وقعت الحدود بينهما فاذا أحدهما لا طريق لهٗ فان كان يقدر علىٰ أن يفتح فى حيّزه طريقًا فى القسم جائز وان كان لا يقدر أن يفتح لنصيبهٖ طريقًا فان لم يعلم وقت القسم أن لا طريق لهٗ فالقسمة فاسدة لأنها تضمنت تفويت منفعة علىٰ بعض الشركاء بغير رضاهٗ وان علم وقت القسمة أن لا طريق لهٗ فالقسمة جائزة .....الخ.

(۲) الدّر المختار ج:۶ ص:۲۶۸ (طبع سعيد)

وفى بدائع الصّنائع، كتاب القسمة، فصل وامّا صفات القسمة ....الخ ج:۷ ص:۲۸ (طبع سعيد)

وأمّا فى قسمة التّراضى فيجوز الرّجوع لأنّ قسمة التّراضى لا تتمّ الّا بعد خروج السهام كلّها وكل عاقد بسبيل من الرّجوع عن العقد قبل تمامهٖ كما فى البيع نحوه.

وفيه أيضًا ج:۷ ص:۲۶ (طبع سعيد) ان قسمة الجمع فى الدّور بالتّراضى جائزة بلا خلاف ومعنى المبادلة وان كان لازمًا فى نوعى القسمة لٰكن هٰذا النوع بالمبادلات أشبهُ واذا تحققت المبادلة صح البناء .....الخ.

جواب:- آپ کی والدہ صاحبہ نے اپنی صحت کی حالت میں (یعنی مرضِ وفات سے پہلے پہلے)[1] جو کچھ آپ کو دے دیا اور آپ نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے،[2] وہ آپ کی ملکیت ہے، اس میں ان کے دُوسرے ورثاء کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

واللہ اعلم
۱۴۲۸/۱۲/۲۷ھ

☆☆☆

(۱ و ۲) دیکھئے ص:۴۴۰ کا حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

﴿کتاب الودیعۃ والعاریۃ﴾
(امانت اور عاریت کے مسائل کا بیان)

عاریت پر دیئے ہوئے زیورات کی بعینہٖ واپسی یا پوری قیمت کا مطالبہ کرنا جائز ہے

سوال:- آج سے بیس پچیس سال پہلے اپنی بڑی بہن کو مالی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر بطور ہمدردی کے سترہ تولے کے زیورات اُن کو اس شرط پر دیئے تھے کہ فی الحال ان کو بینک میں رہن رکھ کر اپنی مشکلات دُور کریں، اور جب اُن کے پاس روپیہ ہو تو زیور چُھڑا کر مجھے واپس کردیں۔ اس کا وعدہ بھی مجھ سے اُنہوں نے کیا تھا کہ ایسا ہی کیا جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، جائیداد کا سولہ سترہ ہزار روپے بھی انہیں ملا جو مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا، مگر کسی نہ کسی طرح مجھے اس کا علم ہوگیا، میں نے زیور کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا کہ روپے اُن کے لڑکے نے وصول کئے ہیں، اور اُس سے اُنہوں نے زیور کے چُھڑانے کے لئے کہا بھی کیونکہ زیور اُسی کے نام سے رکھا گیا تھا اور روپیہ بھی اُس کے پاس ہی تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور زیور نیلام ہوگیا اور نہ چھڑا کر دیا اور نہ اُس وقت اُس کی قیمت ادا کی، اب کہتا ہے کہ جس زمانے میں زیور نیلام ہوا ہے اُس وقت کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، میں نے کہا میں نے تو صرف رہن کی اجازت دی تھی، نیلام کروانے کو تو نہیں کہا تھا، اُس کو نیلام نہ ہونے دینے کی ذمہ داری مجھ پر نہ تھی، میں نے سونا دیا تھا اُتنا سونا لوں گی، یہ مطالبہ میرا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی بہن پر واجب ہے کہ جیسا زیور آپ نے ان کو دیا تھا یا تو ویسا ہی بنواکر آپ کو واپس کریں، یا اُس کی جو قیمت واپسی کے دن ہو وہ قیمت ادا کریں، اور آپ کا مطالبہ شرعاً جائز ہے، **لما فی الدر المختار: فان آجر المستعیر أو رھن فھلکت ضمنه المعیر.** (شامی ج:۴ ص:۵۰۳)۔[1] **وفیه: اِلّا اذا استعارھا لیرھنھا فتکون کالإجارۃ وقال الشامی تحته:**

---

(۱) الدّر المختار کتابُ العاریة ج:۵ ص:۶۷۹ (طبع سعید).
وفی درر الحکام شرح غرر الأحکام کتاب العاریة ج:۷ ص:۱۳۴ فان آجر أو رھن المستعیر فھلکت العاریة ضمّنه المعیر أی ضمن المعیر المستعیر.
وکذا فی الھندیة الباب الخامس فی تضییع العاریة وما یضمنه المستعیر وما لا یضمن ج:۴ ص:۳۶۷ (طبع رشیدیه کوئٹه).

لأن هٰذه اعارة فیها منفعة لصاحبها فانها تصیر مضمونة فی ید المرتهن وللمعیر أن یرجع علی المستعیر بقیمته. (شامی ج:۴ ص:۵۰۵)۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۵۴۴/۲۸ ب)

گھڑی ساز کے پاس عرصہ دراز سے رکھی ہوئی گھڑیوں کا حکم

سوال:- زید گھڑی سازی کی دُکان کرتا ہے، بعض صاحب گھڑیاں مرمت کے لئے دے کر واپس لینے نہیں آتے، اور نہ اُمید ہے کہ وہ کبھی واپس آکر لے جائیں گے، اور پڑے ہوئے تقریباً دو تین سال تک ہوچکے ہیں، باوجود حفاظت سے ہونے کے زنگ آلود ہوکر خراب ہونے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ کیا زید ان کے بدلے میں رقم خیرات کرکے اپنی ملک بناسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مذکورہ میں زید کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ گھڑیوں کی قیمت خیرات کرکے اپنی ملک بنالے، بلکہ تمام عمر ممکن حد تک ان کی حفاظت کرنی چاہئے، تاوقتیکہ اصل مالک اُسے لے جائے یا اس کی طرف سے کوئی ہدایت موصول ہو، یا اس کی موت کا علم ہوجائے، تو اس کے ورثہ کے سپرد کردیا جائے، کیونکہ یہ گھڑیاں زید کے پاس بطورِ اَمانت ہیں، اور اَمانت کو لقطہ کی طرح صدقہ نہیں کیا جاسکتا۔

دلیل الصغریٰ فی قول الهندیة وحکم الأجیر المشترک أن ما هلک فی یدهٖ من غیر صنعهٖ فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفةؒ. (عالمگیریة ج:۴ ص:۵۱۸)۔ (۲) ودلیل الکبریٰ فی قوله غاب المودِع ولا یدری حیاتهٗ ولا مماتهٗ یحفظها أبدًا حتّٰی یعلم بموتهٖ وورثتهٖ کذا فی الوجیز للکردری ولا یتصدق بها بخلاف اللقطة کذا فی الفتاویٰ العتابیة. (عالمگیریة ج:۴ ص:۳۵۶)۔ (۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۳۲۵/۱۹ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

---

(۱) الدّر المختار مع ردّ المحتار کتاب العاریة ج:۵ ص:۶۸۲ (طبع سعید).

(۲) الهندیة ج:۴ ص:۵۰۰ باب:۸ (طبع مکتبه رشیدیه) وفی المحیط البُرهانی کتاب الاجارة الفصل الثامن والعشرون فی بیان حکم الأجیر الخاص والمشترک ج:۱۲ ص:۳۹ (طبع ادارة القرآن کراچی) ومن حکم الأجیر المشترک ان ما هلک فی یده من غیر صنعة فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفة وهو قول زفر والحسن رحمهما الله، وانّه قیاسٌ....الخ.

(۳) الهندیة باب:۷ ج:۴ ص:۳۵۴ (طبع مکتبه رشیدیه) وفی الشامیة کتاب الایداع ج:۵ ص:۶۷۶ (قبیل کتاب العاریة) (طبع سعید) غاب ربّ الودیعة ولا یدری أهو حیّ أم میّت یمسکها حتّٰی یعلم موته ولا یتصدق بها بخلاف اللّقطة ....الخ.

وفی المحیط البرهانی کتاب الودیعة الفصل العاشر فی المتفرّقات ج:۸ ص:۳۱۷.

(۱۰۳۴۱) فی فتاویٰ أبی اللّیث رجل استودع رجلًا ألف درهم ثم غاب ربّ الودیعة لا یدری أحیّ هو أم میّت فعلیه أن یمسکها حتّٰی یعلم موته ولا یتصدق بها بخلاف اللّقطة.

﴿کتاب اللّقطة﴾

(گری پڑی ہوئی چیزوں کا بیان)

سیلاب میں ملنے والی مختلف اشیاء کا حکم

سوال:- میں شٹرنگ کا کام کرتا ہوں، یعنی چھتوں کی ڈھلائی کے وقت تختے بچھا کر اس کو دُرست کردیتا ہوں تاکہ ڈھلائی کرنے والے اُس پر ڈھلائی کرسکیں۔ تختہ میرا ذاتی ہوتا ہے، میں اُس کی اُجرت وصول کرتا ہوں، اس سیلاب میں ہمارے یہ تختے بہہ گئے، بہت سے دُوسرے لوگوں نے بھی اُٹھالئے، اور کچھ تختے کسی جگہ پر پڑے ہوئے ہیں، لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ تختے میرے ہیں یا نہیں؟ کیا ایسی حالت میں یہ تختے میں اُٹھا سکتا ہوں؟

جواب:- اگر علامات وقرائن سے گمان غالب اس بات کا ہوجائے کہ یہ تختے آپ ہی کے ہیں، تو آپ ان کو اُٹھا کر لے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی دُوسرا ان کا دعوے دار نہ ہو، اور اگر گمان غالب نہیں ہے یعنی دونوں احتمال برابر ہیں تو پھر اس پر لقطہ کا حکم جاری ہوگا۔ یعنی پہلے تو ان کے مالک کو تلاش کریں،[1] اگر مالک کے ملنے سے مایوسی ہوجائے،[2] تو اگر خود مستحقِ زکوٰۃ ہوں تو اپنے استعمال میں لے آئیں، ورنہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو صدقہ کردیں،[3] **وغالب الظنّ عندهم ملحق باليقين وهو الذی**

(۱، ۲، ۳) وفی الهندية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۲۸۹ و ص:۲۹۰ (طبع رشيديه) اذا رفع اللّقطة يعرفها ..... وفی هٰذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرفها حتّى يوصلها الىٰ صاحبها.

وفيها أيضًا ج:۲ ص:۲۸۹ ويعرف الملتقط اللّقطة فی الأسواق والشوارع مدّة يغلب علىٰ ظنّه ان صاحبها لا يطلبها بعد ذٰلک هو الصحيح ..... ثم بعد تعريف المدّة المذكورة الملتقط مخيّر بين أن يحفظها حسبة وبين أن يتصدق بها .....الخ.

وفی الدّر المختار كتاب اللقطة ج:۴ ص:۲۷۸ (طبع سعيد) وعرّف أی نادىٰ عليها حيث وجدها وفی المجامع الىٰ أن علم أن صاحبها لا يطلبها.

وفی الشامية تحته (قوله الىٰ ان علم ان صاحبها لا يطلبها) لم يجعل للتّعريف مدّة اتباعًا للسرخسی فانه بنى الحكم علىٰ غالب الرّأی فيعرّف القليل والكثير الىٰ أن يغلب علىٰ رأيه ان صاحبهٗ لا يطلبه وصحّحه فی الهداية وفی المضمرات والجوهرة وعليه الفتوىٰ .....الخ.

وفی الفتاوىٰ التاتارخانية كتاب اللقطة ج:۵ ص:۵۸۵ (طبع ادارة القرآن) .....وفی هٰذا الوجه لهٗ أن يأخذها ويحفظها ويعرّفها حتّى يوصلها الىٰ صاحبها.

وفی بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فی بيان ما يصنع باللّقطة ج:۸ ص:۳۳۳ ثم اذا عرّفها ولم يحضر صاحبها مدّة التّعريف فهو بالخيار ان شاء أمسكها الىٰ أن يحضر صاحبها وان شاء تصدّق بها على الفقراء.

وفی الشامية، كتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۷۹ (طبع سعيد) أی فينتفع الرّافع بها لو فقيرًا والّا تصدق أی من رفعها من الأرض.

وفی بدائع الصنائع، كتاب اللّقطة، فصل فی بيان ما يصنع باللّقطة ج:۸ ص:۳۳۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وان كان فقيرًا فان شاء تصدق بها على الفقراء وان شاء أنفقها علىٰ نفسه.

وفی البحر الرّائق، كتاب اللقطة ج:۵ ص:۱۵۷ (طبع سعيد) قوله وينتفع بها لو فقيرًا والّا تصدق علىٰ أجنبی ولأبويه وزوجتهٖ وولدهٖ لو فقيرًا أی ينتفع الملتقط باللقطة بان يتملكها بشرط كونه فقيراً نظراً من الجانبين.

وكذا فی الهداية كتاب اللّقطة ج:۲ ص:۶۱۸ (طبع شركت علميه ملتان)

تبتنی علیه الأحکام، یعرف ذٰلک من تصفح کلامهم فی الأبواب، صرحوا فی نواقض الوضوء بأن الغالب کالمتحقق. (الاشباہ والنظائر ج:۱ ص:۹۴، قاعدہ:۳)۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۸/۲۹ھ
(فتویٰ نمبر ۸۸۷/۲۸ ج)

مسافر سامان رکھ کر چلا گیا ہو تو اُس کے سامان کا حکم

سوال:- ایک آدمی ہمارے ساتھ سفر میں تھا، راستے میں وہ کہیں اُتر گیا اور اُس کا سامان ہمارے پاس رہ گیا، اور اس شخص کو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، تقریباً سات سال ہونے والے ہیں، اب اس سامان کو کیا کیا جائے؟

جواب:- اگر وہ شخص زندہ ہو اور اس کا پتہ معلوم ہو تو اس کو سامان پہنچائے،[۲] اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس کے ورثاء کو پہنچا دے،[۳] اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو تو اُسے اس وقت تک تلاش کیجئے جب تک یہ خیال ہو کہ وہ شخص سامان کی تلاش میں ہوگا، اور جب ملنے سے مایوسی ہو جائے تو اُسے صدقہ کر دیجئے۔[۴]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۹/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۹۰۴/۲۸ ج)

---

(۱) الاشباہ والنظائر ج:۱ ص:۳۷ فائدۃ:۲ قاعدۃ:۳ (طبع سعید).
(۲و۴) حوالہ جات اور تفصیلی عبارات کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔
(۳) کیونکہ زندہ نہ ہونے اور اُس کے ورثاء کا بھی پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں ایک مخصوص مقدار کی حد تک یہ مال لقطہ شمار ہوگا۔
وفی الدّر المختار، کتاب اللّقطة ج:۴ ص:۲۸۴ (طبع سعید) وفی الحاوی: غریب مات فی بیت انسان ولم یعرف وارثهٗ فترکتهٗ کلقطة ما لم یکن کثیرًا فلبیت المال بعد الفحص عن ورثته سنین فان لم یجدهم فله لو مصرفًا.
وفی المحیط البُرهانی، کتاب اللّقطة، الفصل الثانی فی تعریف اللّقطة وما یصنع بها بعد التعریف ج:۸ ص:۱۷۳ (طبع ادارة القرآن کراتشی) ۹۸۷۹ فی ودیعة أهل سمرقند غریب مات فی دار رجل ولیس له وارث معروف وخلف من المال ما یساوی خسمة دراهم وصاحب الدّار فقیر فأراد أن ینفقها علیٰ نفسه فله ذٰلک لأنّه فی معنی اللّقطة.
وفی البحر الرّائق، کتاب اللّقطة ج:۵ ص:۱۵۸ قبیل کتاب الاباق (طبع سعید) وفی الولوالجیة هی لو مات غریبٌ فی دار رجل ومعه قدر خسمة دراهم فأراد صاحب البیت أن یتصدّق علیٰ نفسه ان کان فقیرًا فله ذٰلک کاللّقطة ولم یصرّحا بما زاد علی الخمسة وفی الحاوی القدسی واذا مات الغریب فی بیت انسان ولیس لهٗ وارث معروف کان حکم ترکته کحکم اللّقطة اِلّا اذا کان مالًا کثیرًا یکون لبیت المال بعد البحث والفحص عن ورثتهٖ سنین. وفی الخانیة رجل غریب مات فی دار رجل ولیس لهٗ وارث معروف وخلف ما یساوی خسمة دراهم وصاحب الدّار فقیر لیس لهٗ أن یتصدّق بهٰذا المال علیٰ نفسه لأنّه لیس بمنزلة اللّقطة وهو مخالف لما ذکرنا والأوّل أثبت وصرّح به فی المحیط.
وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر الانتفاع باللّقطة.
وفی الاختیار رجلٌ غریب مات فی دار رجل لیس لهٗ وارث معروف وخلّف مالًا وصاحب المنزل فقیرٌ فله الانتفاع به بمنزلة اللّقطة وفی الخانیة خلافهٗ.
نیز دیکھئے: امداد الأحکام، کتاب الودیعة والعاریة ج:۳ ص:۶۰۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

﴿کتاب الغصب والضمان﴾
(غصب اور ضمان کے مسائل کا بیان)

مسجد کی دُکان پر ناجائز قبضہ کرنے اور کرایہ ادا نہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک تعمیر شدہ مسجد سے ملحقہ قطعہ زمین پر مسجدِ مذکور کے مجوّزہ توسیعی نقشے کے مطابق ایک دِینی مدرسہ، وضوء خانہ، اور مسجد و مدرسہ کے مستقل اِخراجات کو پورا کرنے کے لئے پختہ دُکانیں تعمیر کی گئیں، تعمیر سے قبل اس قطعہ زمین واقع شمالی کنارے پر تین کیبن رکھے ہوئے تھے، جن میں سے دو کیبن والے پابندی سے مسجد کو کرایہ ادا کر رہے تھے، مگر درمیان کے کیبن والا اپنے اثر و رُسوخ کی بناء پر جبراً قابض تھا، اور کرایہ نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنی علالت کے باعث اُس نے وہ کیبن کرایہ پر دیا، اور کرایہ دار سے کرایہ وہ خود وصول کرتا رہا، اس درمیان میں وہ شخص فوت ہوا اور اس کے بعد اس کی بیوی اس پر قابض تھی، جب وہاں پر پختہ دُکانیں بننی شروع ہوئیں تو ان کو یہ نوٹس دیا گیا کہ تم اپنا کیبن اُٹھالو، جب دُکانیں پختہ تعمیر ہوگئیں تو متوفی کی بیوی نے پختہ دُکان کا مطالبہ کیا، مسجد کمیٹی کے ایک ممبر نے جو متوفی کی بیوی کا رشتہ دار ہے، اس کو دِلوانے کی کوشش کی اور اپنی ضمانت پر دُکان دینے کی درخواست کی، ہرچند کہ متوفی نے مسجد کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، بیوہ جان کر دُکان کو ان کے قبضے میں اسی شرط پر دیا گیا کہ کرایہ سے دس روپیہ ماہوار مسجد میں داخل کرتی رہے، مگر اب وہ دُکان کا پچاس روپے کرایہ وصول کرتی ہے مگر مسجد کا وہ دس روپیہ نہیں دیتی، اب صورتِ مذکورہ میں متوفی کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا اور کیا اَز رُوئے شریعت بیوہ کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جائیں گے؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں تو متوفی کی بیوہ کا کوئی مالکانہ حق دُکان پر نہیں ہے، ان پر واجب ہے کہ وہ مسجد کی دُکان کا مقرّرہ کرایہ ادا کریں، اور اگر اَدا نہیں کرتیں تو مسجد کی دُکان خالی کردیں، یوں تو کسی بھی مسلمان کے حق پر ناجائز قبضہ کرنا سخت حرام ہے،[1] اور ناجائز

---

(۱) وفی المشکوٰۃ، باب الغصب والعاریۃ ص:۲۵۵ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحلّ مال امرئ مسلم الّا بطیب نفسٍ منہٗ. نیز دیکھئے ص:۴۸۰ کا حاشیہ نمبر۳۔

ہے، لیکن خاص طور سے مسجد کے کسی حق کو دبالینا اور زیادہ وبال کا موجب ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳/۱۹ الف)

مال برآمد کرنے کی صورت میں اگر مال راستے میں ہلاک ہوجائے تو جہاز کمپنی یا انشورنس کمپنی سے ضمان لینے کا حکم

سوال:- جہاز میں جو مال آتا ہے وہ راستے میں نقصان کا شکار یا ضائع ہوجاتا ہے، اس نقصان کا بدلہ انشورنس والے اداء کرتے ہیں، شاید یہ جائز نہیں، دُوسری صورت میں یہ جہازراں کمپنی والے اس نقصان کی رقم ادا کرتے ہیں جو نقصان کے مال کے برابر یا اس سے کچھ کم ہوتا ہے، کیا جہازراں کمپنی سے اس نقصان کا بدلہ لینا جائز ہے؟

تنقیح

پہلے چند اُمور کی وضاحت کریں، وضاحت پر کچھ بتایا جاسکے گا۔

۱:- کیا جہازراں کمپنی کو کرایہ کے علاوہ کچھ رقم پیشگی دینی پڑتی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر صرف انشورنس کرادیا جائے تو کیا تب بھی جہازراں کمپنی سے نقصان وصول کیا جاسکتا ہے؟ اگر وصول کیا جاسکتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

۳:- اگر دونوں سے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا جائے تو کیا جب بھی کسی ایک ہی سے وصول کرنا ہوگا یا دونوں سے؟ اگر نہیں تو کیا وجہ؟

۴:- اگر انشورنس نہ کرایا جائے اور جہازراں کمپنی کو بھی پیشگی کچھ رقم نہ دی جائے تو کیا اس کے باوجود جہازراں کمپنی نقصان دیتی ہے؟

جوابِ تنقیح

۱:- نہیں، جہازراں کمپنی صرف کرایہ وصول کرتی ہے، اور اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں لیتی۔

۲:- جی ہاں، وصول کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اصل بنیادی ذمہ داری جہاز کمپنی کی ہے کہ مال معاہدے کے مطابق پورا پورا جگہ پر پہنچائے، اس کی مزید وضاحت کردُوں کہ اس کی مثال تقریباً

ایسی ہے کہ زید کے ذمہ آپ کوئی کام کرتے ہیں اور اس کا ضامن بکر بن جاتا ہے کہ اگر زید نے یہ کام پورا نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں، لہٰذا دراصل اصلی ذمہ داری تو زید کی ہے جو مثل جہاز کمپنی کے ہے، اور بکر مثل انشورنس کمپنی کے۔

دراصل لوگ عام طور پر اپنے نقصان ایسی صورت میں انشورنس کمپنی سے لیتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ انشورنس پالیسی اصل لاگت سے کچھ بڑھ کر کرواتے ہیں، اس کے برعکس جہاز راں کمپنی سے وصول یابی میں دو چار ماہ لگ جاتے ہیں اور صرف نقصان وہی ملتا ہے جو مال کی اصل لاگت ہوتی ہے، اور کچھ زیادہ نہیں ملتا۔

بہرحال اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ نقصان کی رقم صرف ایک ذریعے ہی سے وصول ہوسکتی ہے، یعنی یا تو جہاز کمپنی سے یا انشورنس کمپنی سے، اس کی مزید وضاحت کردوں۔

الف:- انشورنس ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں جہاز کمپنی ذمہ دار ہے کہ نقصان کی اصل لاگت اداء کرے، کیونکہ جیسا اُوپر عرض کیا کہ اصل ذمہ داری تو جہاز کمپنی کی ہے کہ وہ مال پورے کا پورا صحیح طور پر مقام پر جس سے کرایہ وصول کیا ہے اس کو پہنچائے، جہاز راں کمپنیاں پوری دُنیا میں ہیں، اور سب کا قانون یکساں ہے، دُنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں انشورنس کا نظام نہیں ہے، اگر ہے بھی تو حکومت کی طرف سے انشورنس کرانا لازمی نہیں ہے۔

ب:- اگر انشورنس ہے تو نقصان وصول کرنے کے لئے دو راستے ہیں، (اے) جہاز کمپنی، (بی) انشورنس کمپنی۔ اور دونوں راستوں کی وضاحت یہ ہے:-

الف:- جہاز کمپنی سے اس صورت میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں، اور کئی قانونی پیچیدگیاں دُور کرنی پڑتی ہیں، اور رقم صرف اتنی ملتی ہے جتنی مال کی اصل لاگت ہے، اور بعض اوقات بعض جہاز کمپنی باہر ملکوں کی ہوتی ہیں لہٰذا ان کے پاس پیسہ باہر ملکوں سے آتا ہے جس کی وجہ سے مزید وقت لگتا ہے، بہرحال رقم وصول ہونے کے بعد جہاز راں کمپنی کو ایک رسید دینی پڑتی ہے کہ پیسہ پورے کا پورا وصول پایا، اب ہمارا کوئی مزید دعویٰ نہیں۔

ب:- انشورنس کمپنی:- اس صورت میں نقصان کی ادائیگی جلد ہوجاتی ہے، بعض اوقات اصل رقم سے کچھ زیادہ وصول ہوتا ہے، انشورنس کمپنی جب رقم ادا کرتی ہے اُس وقت آپ کو ایک خط انشورنس کمپنی کو دینا پڑتا ہے کہ فلاں فلاں جہاز سے جو ہمارا نقصان فلاں فلاں ہوا ہے اس کی رقم ہم نے اِن سے وصول کرلی، انشورنس والے اگرچہ رقم ہم کو دے دیتے ہیں پھر یہ جہاز کمپنی سے وصول کرتے ہیں،

ان کو کب ملتا ہے یہ پتہ نہیں، بہرحال دیر ہو یا سویر انشورنس والوں کو جہاز کمپنی ادا ضرور کردیتی ہے، انشورنس والوں کو نقصان یہ ہوتا ہے کہ اوّل ادائیگی کرنا پڑتی ہے جبکہ ان کو دیر سے ملتا ہے، دُوسری بات یہ ہے کہ جہاز کمپنی بھی انشورنس والوں کو کم ہی ادا کرتی ہے جبکہ انشورنس والے زیادہ ادا کرتے ہیں، یہ ان لوگوں کا معمول ہے اور وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔

۳:- آپ کے اس سوال کا جواب شاید اُوپر آگیا ہے، بہرحال رقم کی وصولی کا معاملہ جہازراں کمپنی اور انشورنس کمپنی کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے، وصول یابی ظاہر ہے جس سے معاملہ کیا جائے گا اس سے ہی ہوگی، ہاں انشورنس کمپنی سے وصول یابی کی صورت میں انشورنس کمپنی خود جہازراں کمپنی سے مال کی قیمت وصول کرے گی، کیونکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاسکتا ہے کہ مال برداری کی اصل ذمہ داری جہازراں کمپنی پر ہے۔

۴:- جی ہاں، وہ ایسا کرنے کے پابند ہیں، اس کا تفصیلی جواب اُوپر گزر چکا ہے، بہرحال آپ نے ایک لفظ لکھا ہے کہ ’’پیشگی کچھ رقم‘‘ اس سے شاید آپ کی مراد کرایہ ہے جو جہاز کمپنی مال برداری کے لئے لیتی ہے، تو کرایہ کی صورت یہ ہے کہ عموماً تو جہاز والے کرایہ پیشگی لیتے ہیں اور ہمارے معاملے میں ایسا ہی ہے، مگر بعض صورتوں میں اگر مال فروخت کرنے والا یا خریدنے والا چاہے تو کرایہ بعد میں بھی ادا کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر ہم نے مال جدہ شریف روانہ کیا تو ہم یہ جہاز والوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کرایہ آپ کو جدہ میں خریدار ادا کرے گا۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مال کا نقصان کسی ایسی آفت کی وجہ سے ہوا ہو جس سے بچنا ممکن نہ تھا، مثلاً پورے جہاز میں آگ لگ گئی یا قزاقوں نے حملہ کردیا، تب تو نقصان کی رقم وصول کرنا آپ کے لئے جہاز کمپنی سے بھی جائز نہیں، لیکن اگر اس قسم کی کوئی عمومی آفت نہیں تھی تو جہاز کمپنی سے نقصان وصول کرنے کی گنجائش ہے، **وفی البدائع: لا یضمن (ای الأجیر المشترک) عنده ما هلک بغیر صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة فی یده وهو القیاس، وقالا یضمن اِلّا من حرق غالب أو لصوص مکابرین وهو استحسان اهـ. قال فی الخیریة ..... قول أبی حنیفة قول عطاء وطاؤس وهما من کبار التابعین وقولهما قول عمر وعلیّ، وبه یفتیٰ احتشامًا لعمر وعلیّ وصیانة لأموال الناس، والله اعلم اهـ... لأنه اذا علم أنه لا یضمن ربما یدعی أنه سرق أو ضاع من یده وفی الخانیة والمحیط والتتمة الفتویٰ علیٰ قوله، فقد اختلف الافتاء وقد سمعت**

ما فی الخیریة. (شامی ج:۵ ص:۴۰ و ۴۱)[۱]۔

قلت: وحیث اختلف الافتاء ورجحان الشامی الیٰ قولهما ظاهر فالأولی فی عصرنا الافتاء بقولهما صیانة لأموال الناس وتحرزا عن الوقوع فی فتنة التأمین الذی هو مرکب من الربا والقمار۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۱۷/۲۸ ب)

واقعے کی صحیح صورتِ حال چھپانے کی وجہ سے کسی کا حق ضائع ہونے اور اس کے ضمان کا حکم

سوال:- میرے زندہ بھائی وحیدالدین نے مجھے خود تقریباً پانچ سال ہوئے ذکر کیا کہ بھائی صاحب! پٹواری اللہ بخش نے ایک بات مجھ سے کہی تھی کہ: ''بلیغ الدین کے یونٹوں (جس پر کہ زمین الاٹ اور قبضہ ملتا ہے) کا یہ سرٹیفکیٹ آگیا ہے، (جو پٹواری مذکورہ کے ہاتھ میں تھا اور میرے بھائی نے خود وہ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے) تو اس پر جو زمین مل سکتی ہے نصف آپ یعنی وحیدالدین لے لیں اور آدھی میں (پٹواری) لے لوں۔'' تو میں نے (وحیدالدین نے) پٹواری سے کہا کہ: ''یہ تو معاملہ میرے بھائی کا ہے، ایسا تو میں نہیں کرسکتا، مگر ایسا کرو کہ اس سرٹیفکیٹ کو لاہور واپس بھیج دو۔'' اب پٹواری کو موقع مل گیا، سننے میں وثوق سے آیا ہے کہ پٹواری نے اُس سرٹیفکیٹ سے بالائی بالائی طریقے پر زرعی زمین حاصل کر کے فروخت کردی جس کی مجھ کو خبر ایک زمین دار نے دی، جو خود عینی شاہد ہے، مگر مدد کرنے سے قاصر ہے، اور یہ خبر زمین دار نے سوا سال بعد دی، اور اسی مدّت کے بعد میرے بھائی وحیدالدین نے یہ خبر مجھ کو سنائی، چونکہ محکمۂ بحالیات ختم ہوگیا تو میں لاہور بھی تحقیقات نہیں کرسکا، اس میرے حقیقی بھائی کے اخفا کرنے سے مجھ کو دس ایکڑ زمین کا نقصان ہوا، اُن کو فوراً مجھے خبر کرنا چاہئے تھا تا کہ پٹواری

---

(۱) ردّ المحتار، کتاب الاجارة، باب ضمان الأجیر ج:۶ ص:۶۵ (طبع سعید).
وفی مجمع الضّمانات ج:۱ ص:۲۶۲ ان الأجیر المشترک ضامنٌ عنده ما هلک بغیر صُنعهٖ فاذا کان الثوب فی ضمانهٖ کان الضّمان علیه ما لم یعلم أنّه تخرّق من دقّ صاحب الثوب وروىٰ بشر عن أبی یوسفؒ انّ القصّار یضمن نصف النقصان ویعتبر فیه الأحوال وامّا علیٰ قول أبی حنیفةؒ ینبغی أن لا یجب الضّمان فی فعل القصّار لأنّ عنده الثّوب أمانة عند القصّار ولیس بمضمون.
وفی الهندیة، کتاب الاجارة، الباب الثامن والعشرون فی بیان حکم الأجیر الخاص والمشترک ...الخ ج:۴ ص:۵۰۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) وحکم الأجیر المشترک ان ما هلک فی یده من غیر صنعهٖ فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفةؒ وهو قول زفر والحسن وانّه قیاس ....الخ.

سے سرٹیفکیٹ لے لیتا، یا خود لاہور جاکر اس کی نقل نکالتا، اس پر بھائی نے کہا کہ ''میں نے غلطی کی آپ سے اس واقعے کا ذکر کیا'' اس پر میں نے جواب میں کہا کہ: ''یہ تمہاری اور حماقت ہے'' میں نے کلیم لاہور میں یونٹ بننے کے لئے کردیا تھا، کچھ تو بن کر آگئے تھے، کچھ غلطی سے رہ گئے تھے، تو بعد میں بقایا یونٹ آئے تو پٹواری کے ہاتھ لگ گئے اور اس کا تذکرہ بھائی وحیدالدین نے اُس سے کیا تھا کہ مل بانٹ کر یہ زمین حاصل کرلیں گے، اب میں نے بھائی وحیدالدین کو لکھا ہے کہ اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہوتی ہے لہٰذا آپ اپنی ملکیت والی زمین سے اتنا واپس دیں یا قیامت میں اللہ پاک کی عدالت میں یہ معاملہ پیش ہوگا، میرے حقیقی بھائی وحیدالدین صاحب کہاں تک شرعاً ذمہ دار ہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کے بھائی وحیدالدین صاحب نے آپ کی بدخواہی کرکے گناہ کیا،(۱) جس پر انہیں توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے،(۲) اور آپ سے معافی مانگنی چاہئے، لیکن ان پر اس زمین کا کوئی تاوان واجب نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے پٹواری کو محض مشورہ دیا تھا، زمین کے ضائع کرنے میں اُن کا براہِ راست دخل نہیں۔(۳)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۲۱/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

سرکاری گاڑی بغیر اِجازت دُوسرے کاموں میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- بعض سرکاری ملازم کو گاڑی، ویگن وغیرہ سرکاری کام کے لئے ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ ملازم بعض مواقع پر اپنے رشتہ دار اور واقف کار سواریوں کو بھی بٹھا لیتا ہے، رشتہ داروں کا سامان رکھ کر اِدھر اُدھر پہنچادیتا ہے، بغیر اِجازت ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب:- آپ نے صحیح سمجھا، بغیر اِجازت اس گاڑی کو ذاتی کاموں میں خود اِستعمال کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں۔(۴)

واللہ سبحانہ اعلم
۱۸/۹/۱۳۹۷ھ

✡✡✡

(۱و۲) وفی مسند احمد رقم الحدیث: ۱۹۰۵۳ ج:۱۴ ص:۳۹۷ و ۳۹۸ (طبع دارالحدیث القاهرة) عن جریر رضی الله عنه قال: أتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت: ابایعک علی الإسلام! فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم واشترط علیّ النصح لکل مسلم فبایعتهٗ علیٰ هٰذا ورب هٰذا المسجد انّی لکم لناصح جمیعًا ثم استغفر ونزل.
(۳) فتح القدیر، کتاب الغصب ج:۸ ص:۲۴۳ و ۲۴۴ (طبع رشیدیه) الغصب فی اللغة: أخذ الشیء من الغیر علیٰ سبیل التغلب للاستعمال فیه. وفی الشریعة: أخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجهٍ یزیل یده.
(۴) فی الدرّ ج:۶ ص:۲۰۰ لا یجوز التصرف فی مال غیره بلا اذنه ولا ولایته...اهـ.

کتاب الجہاد

(جہاد اور قتال کے مسائل کا بیان)

مسلم علاقے پر قبضہ کرنے والے کافر حکمران سے مسلمانوں کو طاقت ہونے کی صورت میں جہاد کرنا چاہئے، نیز ایسے حکمران کے ماتحت ملازمت اور حقوق حاصل کرنے کا حکم (فارسی فتویٰ)

سوال۱:- حکمران کافر چند قریٰ و امصار را بتغلب واستیلا از دست مسلمانان سلب کرد و رعایائے مسلمانان کہ مغلوب قوانین او ہستند دران ادیار می باشند وہماں حکمران بعد از سلب دیار با ایشاں حیلے ترحم دارد، وبخششہا می کند، مگر اینکہ ہمیشہ درپئے آنست کہ قوانین اسلامی را از بین ببرد وکفر و زندقہ جاری گرداند مگر بسیاست وتلطف، نہ بزور و زجر مثلاً تعلیم جدید خود وآزادی زنان وافشائے زنا وشراب وسینما وغیرہا ترویج می دہد، وبمدارس دینی و پردہ راضی نیست، آیا با این حکمران و دستگاہان او چون محاربین درترکِ موالات وغیرہ زندگی باید کرد یا کہ نہ؟

سوال۲:- واز ادا رہائے او قافیہ شان مزدور شدہ وحقوق گرفتن و درساز مانہائے جدید دادہ حقوق گرفتن بغرض آنکہ اصلاح بچگان مسلمان بکنند ودیگر مامور ومزدوری نزدشان کردن جائز است یا کہ نہ؟ ودرین پول حقوق کدام قسم حرمت یا کراہت یا شبہ می آید یا نہ؟ وبالخصوص علماء ومقتدیاں یاں را این افعال چگونہ اند۔

سوال۳:- واگر اینہا بہ مسلمانی پول بدھند کہ برائے من حج کن آیا احرام با اینہا یا بہمان پول واحرام بخود بفریب بستن روا است یا نہ؟

سوال۴:- تعلقات با کفار قائم کردن وتعظیم شعائر کفر روا است؟

سوال۵:- واعانت این حکمران را در مدرسۂ اسلامیہ گرفتہ استعمال کردہ روا است یا نہ؟

سوال۶:- واگر مرتکب اُمور مذکورہ کدام اہل علمی یا شیخی باشد، بہ او چہ اعتقاد باید کرد وایا ملامت او وغیبت او وتردید این عمل را چہ حکم دارد۔ بینوا توجروا۔

جواب ا:- اگر مسلماناں را چندے قوت و استطاعت ہست کہ با او محاربہ کردہ حکومتش را زائل نمایند و حکومتِ اسلامی قائم کنند، بر مسلماناں حکومت اسلامی قائم کردن واجب است،(۱) واگر آنہا چنیں استطاعت و قوت نہ دارند، پس آنہا را صبر باید کرد،(۲) تا آنکہ قوت حاصل شود،(۳) واندریں زمانۂ مغلوبیت انتظاماتِ مناسب برائے حفاظتِ دین واجب ہستند، چوں تعمیر مساجد و اقامتِ مدارس دینی و وعظ و تبلیغ، تا کہ مسلماناں بر ایمان سلامت باشند، واگر آں حکمران بر ترکِ احکام دینی جبر و تشدد نماید، واستطاعت مقاومت او نہ باشد پس اندران وقت ہجرت بر مسلمین واجب شود۔(۴)

(۱ تا ۳) وفي بدائع الصنائع، كتاب السير ج:۷ ص:۹۸ وأمّا بيان من يفترض عليه فنقول أنّه لا يفترض الّا على القادر عليه فمن لا قدرة له لا جهاد عليه، لأنّ الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطّاقة بالقتال أو المبالغة في عمل القتال ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع.

وفي الهندية، كتاب السير، الباب الأوّل في تفسيره ج:۲ ص:۱۸۸ (طبع رشيديه) وأمّا شرائط اباحته فشيأن أحدهما امتناع العدوّ عن قبول ما دعى اليه من الدين الحق وعدم الامان والعهد بيننا وبينهم والثّاني ان يرجوا الشوكة والقوّة لأهل الاسلام باجتهاده .... لما فيه من القاء نفسه في التّهلكة وكذا في البحر الرّائق، كتاب السير ج:۵ ص:۷۲ (طبع سعيد).

وفي الدّر المختار، كتاب الجهاد ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعيد) ولا بدّ لفرضيته من قيدٍ آخر هو الاستطاعة .... وشرط لوجوبه القدرة على السلاح لا أمن الطّريق فان علم انّه اذا حارب قتل وان لم يحارب أُسر لم يلزمه القتال ....الخ.

وفي بدائع الصنائع ج:۷ ص:۹۸ فأمّا اذا عمّ النّفير بان هجم العدوّ علىٰ بلدٍ فهو فرض عين يفترض علىٰ كل واحدٍ من آحاد المسلمين ممّن هو قادرٌ عليه ..... الخ.

(۴) وفي تفسير المدارك ج:۱ ص:۳۴۲ (طبع قديمي) والآية (أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا) تدلّ علىٰ أن من لّم يتمكن من اقامة دينه في بلدٍ كما يجب وعلم أنّه يتمكن من اقامته في غيره حقّت عليه المهاجرة.

وفي التفسيرات الأحمدية ص:۳۰۵ (طبع كريمي كتب خانه بمبئى) وفي هٰذا الزّمان ان لم يتمكّن من اقامة دينه بسبب أيدى الظلمة أو الكفرة يفرض عليه الهجرة وهو الحق.

وفي أحكام القرآن للقرطبيّ ج:۵ ص:۳۳۲ (طبع دار الكتاب العربى) الهجرة وهي الخروج من دار الحرب الى دار الاسلام وكانت فرضًا في أيام النبي صلى الله عليه وسلم وهٰذه الهجرة باقية مفروضة الىٰ يوم القيامة.

وكذا في التفسير المظهرى ج:۲ ص:۲۰۷ (طبع حافظ كتب خانه كوئٹه).

وفي تكملة فتح الملهم، كتاب الامارة ج:۳ ص:۳۷۳ (طبع مكتبه دارالعلوم كراچي) .... الأوّل قادر على الهجرة منها لا يمكنه اظهار دينه ولا أداء واجباته فالهجرة منه واجبة .....الخ.

وفي عمدة القارى شرح صحيح البخارى، باب المداراة مع الناس ج:۲۲ ص:۲۶۲ (طبع دار احياء التراث العربى بيروت) المداهنة محرمة والفرق بينهما أنّ المداهنة هي أن يلقى الفاسق المعلن بفسقه فيؤالفهٗ ولا ينكر عليه ولو بقلبه.

وفيها أيضًا باب ما قيل في ذى الوجهين ج:۲۲ ص:۲۰۱ (طبع دار احياء التراث العربى بيروت) المداهنة المحرمة وسمى ذو الوجهين مداهنًا لأنه يظهر لأهل المنكر فيخلطه لكلتا الطّائفتين واظهاره الرّضىٰ بفعلهم استحق اسم المداهنة واستحق الوعيد الشديد أيضًا.

وفي فتح البارى، باب المداراة مع الناس ج:۱۷ ص:۳۱۷ المداهنة محرّمة والفرق أن المداهنة من الدّهان وهو الّذى يظهر على الشيء ويُستتر باطنه وفسرها العلماء بأنّه معاشرة الفاسق واظهار الرّضاء بما هو فيه من غير انكار عليه.

(باقی اگلے صفحے پر)

جواب۲:- زیر حکومتِ آن حکمرانِ کافر ملازمت کردن و پول حقوق گرفتن جائز است بشرطیکہ آن خدمت فی نفسہا حرام و ناجائز نہ باشد و دران اعانتِ معصیت لازم نیاید اندریں پول ہیچ کراہت نیست۔

جواب۳:- سوال واضح نیست حکمرانِ کافر چرا گوید کہ ''برائے من حج کن''۔

جواب۴:- در صورتِ عدم استطاعت محاربہ تعلقات با کفار قائم کردن روا ست البتہ مداہنت وتشبہ بالکفار و تعظیم شعائر کفر بدونِ حالتِ اِضطرار جائز نیست۔

جواب۵:- روا ست۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)..... وفی شرح ابن بطّال، الباب رقم:۸ ج:۱۵ ص:۲۷۰ قال المؤلّف لا ینبغی لمؤمن أن یثنی علیٰ سلطان أو غیرہ فی وجھہ وھو عندہٗ مستحق للذّم ولا یقول بحضرتہ بخلاف ما یقول اذا خرج من عندہ لأنّ ذٰلک نفاق کما قال ابن عمر وقال فیہ صلی اللہ علیہ وسلم: "شر الناس ذو الوجھین" وقال: انہ لا یکون عند اللہ وجیھًا لأنّہ یظھر لأھل الباطل الرّضا عنھم ویظھر لأھل الحق مثل ذٰلک لیرضیٰ کل فریق منھم ویریہ أنّہ منھم وھٰذہ المداھنۃ محرمۃ علی المؤمنین.

وفی مرقاۃ المفاتیح شرح المشکوٰۃ، باب الأمر بالمعروف ج:۹ ص:۳۳۱ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان) المداھنۃ فی الشریعۃ أن یریٰ منکرًا ویقدر علیٰ دفعہ ولم یدفعہ حفظًا لجانب مرتکبہ أو جانب غیرہ لخوف أو طمع أو لاستحیاء منہ أو قلۃ مبالاۃ فی الدین ...الخ.

وفی بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما یعترض من ....الخ ج:۱۵ ص:۳۳۹ انّ ذٰلک مباحٌ فکان اظھار شعائر الکفر فی مکان معدّ لاظھار شعائر الاسلام وھو أمصار المسلمین فیمنعون من ذٰلک وکذا یمنعون من ادخالھا فی أمصار المسلمین ظاھرًا ..... ولا یمکنون من اظھار صلیبھم فی عیدھم لأنّہ اظھار شعائر الکفر فلا یمکنون من ذٰلک فی أمصار المسلمین ..... والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریۃ أو موضع لیس من أمصار المسلمین ولو کان فیہ عدد کثیر من أھل الاسلام وانّما یکرہ ذٰلک فی أمصار المسلمین وھی الّتی یقام فیھا الجمع والأعیاد والحدود لأنّ المنع من اظھار ھٰذہ الأشیاء لکونہ اظھار شعائر الکفر فی مکان اظھار شعائر الاسلام فیختص المنع بالمکان المعدّ لاظھار شعائر ....الخ. وفیہ بعد صفحۃ ..... الممنوع اظھار شعائر الکفر فی مکان اظھار شعائر الاسلام وھو أمصار المسلمین.

وفی البحر الرّائق، بیع العصیر من خمار ج:۸ ص:۲۰۲ و۲۰۳ (طبع سعید) لانھم لا یمکنون من ذٰلک فی الأمصار ولا یمکنون من اظھار بیع الخمر والخنزیر فی الأمصار لظھور شعائر الاسلام فلا یعارض بظھور شعائر الکفر قالوا فی ھٰذا سواد الکوفۃ لأنّ غالب أھلھا أھل ذمّۃ.

وفی تبیین الحقائق شرح الکنز ج:۳ ص:۱۶۳ (طبع سعید) باب العشر والخراج والجزیۃ:لان الأمصار ھی الّتی تقام فیھا شعائر الاسلام فلا یعارض باظھار ما یخالفھا ولھٰذا یمنعون من بیع الخمر والخنازیر وضرب الناقوس خارج الکنیسۃ فی الأمصار لما قُلنا ولا یمنعون من ذٰلک فی قریۃ لا تقام فیھا الجمع والحدود وان کان فیھا عددٌ کثیر لأنّ شعائر الاسلام فیھا غیر ظاھرۃ وقیل یُمنعون فی کل موضع لم تشع فیہ شعائرھم لأنّ فی القریٰ بعض الشعائر فلا تعارض باظھار ما یخالفھا من شعائر الکفر ....الخ.

وفی الفتاویٰ الکبریٰ (من یفعل من المسلمین مثل طعام ....الخ) ..... قد ذھب طائفۃ من العلماء الیٰ کفر من یفعل ھٰذہ الأمور لما فیھا من تعظیم شعائر الکفر .....الخ.

جواب:۶- جواب ایں سوال از اَجوِبہ سابقہ واضح ہست۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

۱۷/۱۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۴/۲۷ و)

(ترجمہ) سوال:- کسی کافر حکمران نے زبردستی مسلمانوں سے چند بستیاں اور شہر چھین لئے، اور مسلمان رعایا جو اُس کے قوانین کے ماتحت ہیں وہ انہی شہروں میں رہتے ہیں اور وہ حکمران علاقے چھین لینے کے بعد ان کے ساتھ بہت نرمی برتتا ہے اور بہت بخشش (یعنی عطایا، حسنِ سلوک) کرتا ہے۔

لیکن وہ ہمیشہ اس بات کے درپے رہتا ہے کہ اسلامی قوانین کو ختم کردے، اور کفر و زِندیقیت کو رواج دے، مگر یہ سب کچھ وہ سیاست اور نرمی سے کرے نہ کہ اپنی طاقت اور سختی کے بل بوتے پر، مثلاً اپنی بنائی ہوئی جدید تعلیم، عورتوں کی آزادی، کھلے عام زنا، شراب کا اِستعمال اور سینما وغیرہ کو ترویج دے اور دِینی مدارس اور پردے پر راضی نہ ہو۔ تو کیا اس حکمران اور اس کے حواریوں کے ساتھ محاربین کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ترکِ موالات کیا جائے یا نہیں؟

۲:- ان کے محکمہ اوقاف کے اِداروں میں مزدوری کرنا اور حقوق حاصل کرنا اور دیگر حقوق لینا اس غرض سے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح کریں، دیگر معاملات اور نوکری کرنا ان کے ہاں جائز ہے یا نہیں؟ اور اس تنخواہ کے پیسوں میں کسی قسم کی حرمت، کراہت یا شبہ آتا ہے یا نہیں؟ بالخصوص علماء اور مقتدیوں کی شان میں یہ افعال کیسے ہیں؟

۳:- اگر ان میں سے کوئی کسی مسلمان کو پیسے دیں اور کہے کہ میری طرف سے حج کرو تو کیا ان کے حج کے اِحرام کو جو اُنہی کے پیسوں سے ہیں اپنے لئے دھوکے کے ساتھ اِحرام باندھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۴:- کفار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- اس حکمران کے مالی تعاون کو لے کر اِسلامی مدارس پر خرچ کیا جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۶:- اگر ان مذکورہ اُمور کا مرتکب کوئی اہلِ علم ہو یا کوئی شیخ ہو تو اس کے بارے میں کیا اِعتقاد رکھنا چاہئے؟ اسی طرح اس کو ملامت کرنا، اس کی غیبت کرنا اور اس کے اس عمل کی تردید کا کیا حکم ہے؟ بینوا وتوجروا۔

(ترجمہ) جواب:- اگر مسلمانوں میں اتنی قوت وطاقت ہو کہ اس کے ساتھ جہاد کرکے اس کی حکومت کو ختم کردیں اور اِسلامی حکومت نافذ کریں، تو مسلمانوں پر اِسلامی حکومت کا قیام واجب ہے۔

لیکن اگر اُن میں اتنی قوت وطاقت نہ ہو کہ اُس کی حکومت کو ختم کرسکیں تو ان کو صبر کرنا چاہئے، یہاں تک کہ ان کو اس کی قوت حاصل ہوجائے، اور اِس مغلوبیت کے دور میں بھی اُن پر حفاظتِ دِین کے لئے مناسب اقدامات کرنا واجب ہے، مثلاً مساجد کی تعمیر، دِینی مدارس کا قیام اور وعظ وتبلیغ وغیرہ تاکہ مسلمان ایمانِ سالم پر ہی رہیں۔

اور اگر وہ کافر حکمران اَحکامِ دِینیہ کے ترک پر جبر وتشدّد کرے اور مسلمانوں میں اُس کے مقابلے کی سکت نہ ہو تو اُس وقت اُن پر ہجرت کرنا واجب ہوجائے گا۔

۲:- اُس کافر حکمران کی ماتحتی میں ملازمت کرنا، اور اپنے حق کی تنخواہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ خدمت و ملازمت بنفسہٖ حرام اور ناجائز نہ ہو، اور اُس ملازمت میں معصیت کی اعانت بھی لازم نہ آئے، اور اس پیسے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

۳:- یہ سوال واضح نہیں، یعنی وہ بادشاہ (کافر حکمران) یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میرے لئے حج کرو۔

۴:- اگر کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی طاقت نہیں، تو اِس صورت میں اُن کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، البتہ یہ بات ہے کہ تشبہ بالکفار، مداہنت اور شعائرِ کفر کی تعظیم کرنا حالتِ اِضطرار کے بغیر جائز نہیں ہے۔

۵:- جائز ہے۔

۶:- اِس سوال کا جواب سابقہ اَجوِبہ سے معلوم ہوچکا۔

عراق میں امریکی افواج کے تعاون کے لئے پاکستانی افواج بھیجنے کا حکم

سوال:- حکومتِ پاکستان، امریکا کی درخواست پر پاکستانی افواج عراق بھیجنے کا ارادہ کر رہی ہے، کیا حکومتِ پاکستان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی افواج عراق بھیج کر امریکا کے ساتھ تعاون کرے؟

جواب:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

موجودہ حالات میں جب کہ عراق پر امریکا نے سراسر ظالمانہ قبضہ کیا ہوا ہے، حکومتِ پاکستان یا کسی بھی مسلمان حکومت کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کے تعاون کے لئے وہاں اپنی فوجیں بھیجے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں:-

۱:- امریکا نے عراق پر حملہ کر کے جس طرح ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دُنیا بھر کے مُسلَّم قانونی اور اَخلاقی ضابطوں کو پامال کرنے کی متکبرانہ جسارت کی ہے، اس کے کہنے پر وہاں فوجیں بھیجنا، اس کے اس سراسر ظالمانہ حملے کی تائید ہے، جس کے حرام ہونے پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲:- امریکا عراق پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد وہاں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے مختلف ملکوں سے اپنی فوجیں بھیجنے کی درخواست کر رہا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کوئی غیر مسلم قوم حملہ کرے، تو ضرورت کے وقت تمام مسلمانوں پر اس کا دِفاع واجب ہے، اور اگر کوئی غیر مسلم قوم مسلمان ملک پر قبضہ کرلے، تو تمام مسلمان حکومتوں پر واجب ہے کہ اس قبضے کو جلد از جلد ختم کرانے کے لئے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں، ظاہر ہے ایسے حالات میں قبضہ ختم کرانے کے بجائے اس ظالمانہ قبضے کو مزید مستحکم کرانے کی کوشش سراسر حرام اور ناجائز ہے۔

۳:- امریکا کے عراق پر فوجی طاقت مسلط کرنے کے باوجود عراق کے مسلمان امریکی قبضے کی مسلسل مزاحمت اور مقاومت کر رہے ہیں، جس کا انہیں پورا حق حاصل ہے، ایسے حالات میں عالمِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ ان عراقی مسلمانوں کی مدد اور حمایت کرے۔ اس صورتِ حال میں اپنی فوجوں کو امریکا کے زیرِ کمان دینے کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ مسلمان فوجوں کو ان عراقی مسلمانوں کے مدِمقابل لا کھڑا

کیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ افواجِ پاکستان کو عراق میں قیامِ امن کے لئے دعوت دی جارہی ہے، خود اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں عراق کے ان مسلمانوں سے ٹکرایا جائے گا، جو امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم غاصبوں کی اِمداد قرآن و سنت کی صریح نصوص کے بالکل خلاف ہے، جس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہوسکتا، قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے:-

یٰٓـاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ. (الممتحنۃ:۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! میرے دُشمن اور اپنے دُشمن کو اپنا ولی نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کے ڈول ڈالنے لگو جب کہ انہوں نے اس حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے۔

یہ آیت جس واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے، اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ ان کے جو اعزّہ اقرباء مکہ مکرّمہ میں مقیم تھے ان کی مصلحت کے پیشِ نظر کفارِ مکہ کو یہ خبر بھیجنی چاہی تھی کہ ان پر حملے کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ (صحیح بخاری)[1]

اگرچہ اس واقعے سے مسلمانوں کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا، لیکن قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیات نے اس اِقدام پر شدید گرفت فرمائی (تفسیر ابنِ کثیر ج:۴ ص:۳۴۵)[2] اور آئندہ کے لئے یہ مستقل قانون بنادیا کہ غیر مسلم طاقتوں سے بے گناہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تعاون اور دوستی کسی صورت جائز نہیں۔ اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

لَا یَنْهٰـكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ. اِنَّمَا یَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیٰرِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (الممتحنۃ:۸،۹)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ جن (کافر) لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم حسنِ سلوک اور اِنصاف کا معاملہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اِنصاف

(۱) الصحیح للبخاری باب غزوۃ الفتح وما بعث حاطب بن ابی بلتعۃ الیٰ أهل مکة یخبرهم بغزو النبی صلی اللہ علیه وسلم رقم الحدیث:۴۲۷۴ ج:۲ ص:۶۱۲ (طبع قدیمی کتب خانه)

(۲) (طبع قدیمی کتب خانه).

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے روکتا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے دِین کے معاملے میں لڑائیاں کیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالے جانے کے لئے ایک دُوسرے کی مدد کی، ایسے لوگوں کے تم معاون بنو، اور جو ان کی معاونت کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

ان آیات میں پوری صراحت کے ساتھ ایسے غیر مسلموں کی ہم نوائی اور اِعانت کو حرام قرار دیا گیا ہے جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور انہیں خانماں برباد کریں، یا اس کام میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔ امریکا نے خود بھی ہزارہا مسلمانوں کو وحشیانہ طریقے پر بربریت کا نشانہ بنایا ہے اور ہزارہا مسلمانوں کو خود بھی بے گھر کیا ہے، اور اِسرائیل کی بھرپور مدد بھی کی ہے جو سالہا سال سے ان جرائم کا مرتکب ہے، لہٰذا وہ اس آیت کے مفہوم میں بلاشک وشبہ داخل ہے، اور اس کی اِعانت پر یہ آیت مکمل طور سے صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف کافروں سے دوستانہ تعاون کی حرمت متعدّد آیات میں مختلف عنوانات سے بیان فرمائی گئی ہے، خاص طور پر مندرجہ ذیل آیاتِ کریمہ مسلمانوں کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں:-

اَلَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا. (النساء:۱۳۹)

ترجمہ:- یہ وہ لوگ ہیں جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست ہم نوا بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزّت تلاش کرتے ہیں؟ تو (یہ سمجھ لیں کہ) عزّت تمام تر اللہ کے قبضے میں ہے۔

یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطَانًا مُّبِیْنًا. (النساء:۱۴۴)

ترجمہ:- اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلاف ایک کھلی حجت دے دو؟

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ، بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ، وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ، اِنَّ اللہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ. (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ:- اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دُوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی انہیں دوست بنائے گا تو وہ انہیں میں شمار ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(المائدة:۵۷)

ترجمہ:- اے ایمان والو! تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی، ان میں سے جنھوں نے تمہارے دِین کو ہنسی کھیل بنایا ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔

۴:- مذکورہ بالا آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات کی روشنی میں فقہائے اُمت نے یہ اُصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مشترک دُشمن کے خلاف بھی غیرمسلموں سے مدد لینا یا ان کی مدد کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ غیرمسلم مسلمانوں کے پرچم تلے جنگ کریں، اور جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کا حکم غالب ہو۔ اِمام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کے تحت فرماتے ہیں:-

وھٰذا یدل علی انه غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علیٰ غیرھم من الکفار اذ کانوا متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب.

(أحکام القرآن ج:۲ ص:۳۵۲)[1]

ترجمہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں دُوسرے کفار سے ایسی حالت میں مدد لیں جب فتح کی صورت میں کفر کا حکم غالب ہو۔

نیز اِمام محمد رحمہ اللہ "السیر الکبیر" میں فرماتے ہیں:-

لا بأس بأن یستعین المسلمون بأھل الشرک علیٰ أھل الشرک اذا کان حکم الاسلام ھو الظاھر علیھم. (شرح السیر الکبیر ج:۳ ص:۱۸۶)[2]

ترجمہ:- مسلمان اگر اہلِ شرک کے مقابلے میں دُوسرے اہلِ شرک سے مدد لیں تو اس میں اس وقت کچھ حرج نہیں ہے جب اسلام کا حکم ان پر غالب ہو۔

دُوسری طرف اگر کوئی غیرمسلم قوم کسی دُوسری غیرمسلم قوم سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو دعوت دیں تب بھی اصل حکم یہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان میں سے کسی بھی فریق کی مدد کرنا جائز

---

(۱) باب استتابة المرتد (تحت آیة) بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (الآیة) ج:۲ ص:۳۶۱ (طبع دارالکتب العلمیة بیروت).

(۲) باب الاستعانة بأھل الشرک واستعانة المشرکین بالمسلمین.

نہیں ہے۔ البتہ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر غیر مسلموں کی یہ دعوت قبول نہ کی گئی تو وہ خود مسلمانوں کو بھی قتل کرڈالیں گے تب ان کی مدد کرنا جائز ہوگا۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

لا ينبغي للمسلمين أن يقاتلوا أهل الشرك مع أهل الشرك .... ولو قال أهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدوّنا من المشركين وهم ..... فاذا كانوا يخافون اولٰئك الآخرين علىٰ أنفسهم فلا بأس بأن يقاتلوهم. [۱]

ترجمہ:- مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہلِ شرک کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر دُوسرے اہلِ شرک سے جنگ کریں اور اگر اہلِ حرب نے مسلمان قیدیوں سے کہا کہ ہمارے مشرک دُشمن سے ہمارے ساتھ لڑو اور وہ خود بھی مشرک ہیں، تو اگر ان قیدیوں کو ان مشرکوں کی طرف سے اپنی جان کا خوف ہو تو ان کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کے دُشمن مشرکوں سے لڑیں۔

(شرح السير الكبير ج:۳ ص: ۲۴۱، ۲۴۲) [۲]

یہ سب کچھ اس وقت ہے جب غیر مسلموں کے ساتھ مل کر دُوسرے غیر مسلموں سے جنگ کی جارہی ہو، لیکن اگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان ہوں اور پھر غیر مسلم اپنے ساتھ مل کر اپنے مدِمقابل مسلمانوں سے لڑنے کی دعوت دیں، تو اس دعوت کا قبول کرنا حالتِ اِضطرار میں بھی جائز نہیں ہے، یعنی اگر مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر ہم نے غیر مسلموں کا یہ مطالبہ نہ مانا کہ ان کے ساتھ مل کر دُوسرے مسلمانوں سے لڑا جائے، تو یہ غیر مسلم خود ہمیں قتل کرڈالیں گے، تب بھی ان کا یہ مطالبہ ماننا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ اسے خود اپنی جان دے دینی پڑے۔ اِمام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وان قالوا لهم قاتلوا معنا المسلمين وإلّا قتلناكم، لم يسعهم القتال مع المسلمين.

ترجمہ:- اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑو ورنہ ہم تمہیں قتل کردیں گے، تب بھی ان کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اِمام سرخسی رحمہ اللہ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لأنّ ذٰلک حرام على المسلمين بعينه فلا يجوز الاقدام عليه بسبب

(۱ و ۲) باب ما يسع من الرجل أن يفعل ايهما شاء.

التهديد بالقتل كما لو قال له: اقتل هٰذا المسلم وإلّا قتلتك.

(شرح السير ج:۳ ص:۲۴۲)[1]

ترجمہ:- اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے دُوسرے مسلمانوں سے جنگ حرام لعینہٖ ہے، لہٰذا قتل کی دھمکی کی صورت میں بھی ایسا اِقدام جائز نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اس شخص کو قتل کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں (کہ اس دھمکی کی وجہ سے دُوسرے کو قتل کرنا جائز نہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کی افواج کو جن کے مقاصدِ وجود اور بنیادی اُصولوں میں ''جہاد'' شامل ہے اور جن کے ملک کے دستور میں عالمِ اسلام کے مسلمانوں سے وفاداری کا عہد شامل ہے، عراق کے ان مسلمانوں کے خلاف صف آراء کردینا جو امریکا کے جبر و اِستبداد اور اس کے ظالمانہ تسلط کے خلاف جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں، قرآن وسنت کی صریح نصوص اور اُمت کے اِجماعی ضمیر کے خلاف تو ہے ہی، خود پاکستان کے دستور اور اَفواجِ پاکستان کے مقاصد کے بھی خلاف ہے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ سراسر ناجائز قدم اُٹھایا گیا تو اَفواجِ پاکستان کی عزّت و وقار اور ان کی نیک نامی پر ایک بدترین دھبّہ لگانے کے مرادف ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد تقی عثمانی
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	۱۴۲۴/۶/۱۲ھ
۱۴۲۴/۶/۱۲ھ	۱۴۲۴/۶/۱۳ھ	(فتویٰ نمبر ۸۶/۶۳۶)

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے جلوسوں میں مرنے والے ''شہید'' ہیں یا نہیں؟

سوال:- آج کل جو مسلمان نظامِ مصطفیٰ کی تحریکوں میں پولیس کی گولی سے مر رہے ہیں، یہ شہید ہیں یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو غسل وکفن دیا جائے گا یا نہیں؟ یا اُنہی کپڑوں میں دفن کیا جائے گا جو وہ پہنے ہوئے ہیں؟

جواب:- جن لوگوں نے کسی عالم کے فتویٰ یا ترغیب کی بناء پر ان جلوسوں میں حصہ لیا اور نیک نیتی سے یہ سمجھ کر حصہ لیا کہ اسلام کے لئے جدوجہد کا یہی راستہ ہے، اور وہ ہلاک ہوگئے اِن شاء اللہ اُخروی اَحکام کے اعتبار سے وہ شہید ہوں گے، البتہ دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے شہید قرار پانے کے

(۱) حوالہ سابقہ۔

لئے شرط یہ ہے کہ گولی لگنے یا زخمی ہونے کے فوراً بعد ان کی موت واقع ہوگئی ہو، اور زخمی ہونے کے بعد انہوں نے کچھ کھایا پیا نہ ہو، نہ کسی سے کوئی طویل بات چیت کی ہو، نہ ایک نماز کا پورا وقت پایا ہو، ایسے لوگوں کو غسل اور کفن کے بغیر نماز پڑھ کر دفن کیا جاسکتا ہے،(۱) اور اگر یہ شرائط نہ پائی گئیں تو پھر غسل وکفن ضروری ہے،(۲) **وھذا لأن الخروج علی الحکومات الیوم أمر مجتهد فیه، وحکمه علی الاجتهاد، کما أن حجر بن عدی رحمه الله خرج علیٰ معاویة رضی الله عنه بعد استقرار خلافته وکان ذٰلک اجتهادًا منه وقد صرّح السرخسی فی المبسوط أنّه دفن فی ثیابه۔**(۳)

واللہ سبحانہ اعلم
۲۴/۷/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۷۷۷/۲۸ ج)

خلیج کی لڑائی کی شرعی حیثیت اور اس میں کس فریق کی جانب سے لڑنا ''جہاد'' تھا؟

سوال:- آپ صاحبان کو علم ہوگا کہ خلیج کے بحران کے بعد اَب عراق اور امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے درمیان جنگ جاری ہے، اور اس جنگ کے حقائق سے آپ صاحبان بخوبی

(۱ و ۲) وفی الدّر المختار، باب الشهید ج:۲ ص:۲۵۰ (طبع سعید) .... فینزع عنه ما لا یصلح للکفن ویزاد ان نقص ما علیه عن کفن السُّنّة وینقص ان زاد لأجل ان یتم کفنه المسنون ویصلی علیه بلا غسل ویدفن بدمه وثیابه لحدیث زملوهم بکلومهم ...الخ.

وفیه أیضًا ص:۲۵۰ الیٰ ۲۵۱ ویغسل من وجد قتیلًا فی مصر ...... أو جرح وارتث وذٰلک بأن اکل أو شرب أو نام أو تداوی ولو قلیلًا أو اویٰ خیمة أو مضیٰ علیه وقت صلوٰة وهو یعقل ..... أو باع أو اشتریٰ أو تکلّم بکلامٍ کثیر .... وکل ذٰلک فی الشهید الکامل والّا فالمرتث شهید الآخرة.

وفی الشامیة تحته ج:۲ ص:۲۵۲ (قوله فی الشهید الکامل) وهو شهید الدُّنیا والآخرة وشهادة الدُّنیا بعدم الغسل اِلّا لنجاسة أصابته غیر دمه کما فی أبی السعود وشهادة الآخرة بنیل الثواب الموعود للشهید .....الخ.

وکذا فی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۳۲۴ (طبع سعید).

وفی المبسوط للسرخسیؒ، باب الشهید ج:۲ ص:۵۱ (طبع مطبع السعادة مصر) وقد ورد الأثر بغسل المرتث ومعناه ..... والأصل فیه أن عمر رضی الله عنه لمّا طعن حمل الیٰ بیته فعاش یومین ثم غسل وکان شهیدًا علی لسان رسول الله صلی الله علیه وسلم وکذٰلک علی رضی الله عنه حمل حیًّا بعد ما طعن ثم غسل وکان شهیدًا فأمّا عثمان رضی الله عنه فاجهز علیه فی مصرعه ولم یغسل فعرفنا بذٰلک ان الشهید الّذی لا یغسل من أجهز علیه فی مصرعه دون من حمل حیًّا .... الخ. وکذا فی البحر الرّائق، باب الشهید ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع سعید).

(۳) وفی المبسوط للسرخسیؒ، باب الشهید ج:۲ ص:۵۰ (طبع مطبع السعادة مصر) قال ویکفن فی ثیابه الّتی هی علیه لقول رسول الله صلی الله علیه وسلم زمّلوهم بدمائهم وکلومهم ...... ولما استشهد عمار بن یاسر بصفین قال: لا تغسلوا عنی دمًا ولا تنزعوا عنّی ثوبًا فانّی التقی ومعاویة بالجادة وهٰکذا نقل عن حجر بن عدی غیر أنّه ینزع عنه السلاح والجلد والفرو والحشو والخف والقلنسوة .....الخ.

واقف ہوں گے، ایک طرف عراق ہے جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے، اور دُوسری طرف مختلف مما لک ہیں جن میں امریکا سرِفہرست ہے، اسی طرح برطانیہ اور فرانس بھی، لیکن ان کے علاوہ ان مما لک میں مسلم مملکتیں بھی عراق کے سامنے صف بستہ ہیں، جن میں سعودی عرب، مصر، ترکی وغیرہ مما لکِ اسلامیہ شامل ہیں، کیا ایک پاکستانی مجاہد ان کی جنگ میں شرکت کرسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی یہ جنگ اس مجاہد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس طرف سے؟ یعنی سعودی عرب کی طرف سے یا عراق کی طرف سے؟ خیال رہے کہ جو مما لک عراق کا ساتھ دے رہے ہیں ان میں غیر مسلم مملکت کوئی نہیں ہے، براہِ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- خلیج کے علاقے میں جو جنگ جاری ہے وہ عالمِ اسلام کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ابتداءً عراق نے کویت پر قبضہ کرکے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا، جس کا شرعاً کوئی جواز نہ تھا، اور سعودی عرب کے لئے ایک مظلوم کی حیثیت سے کویت کی مدد کرنا اور اگر خود اس کے اپنے علاقے کو اسی قسم کے حملے کا خطرہ ہو تو اس کے دِفاع کے لئے لڑنا بھی برحق تھا، بشرطیکہ جنگ کی قیادت خود اس کے یا کسی مسلمان ملک کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ سعودی عرب نے جنگ کی مکمل کمان اور اس کی پالیسی کلی طور پر امریکا کے حوالے کردی، اس لئے اب عراق کی حمایت میں لڑنا تو اس لئے دُرست نہیں کہ اصلاً ظلم کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی، اور اگر وہ اس ظلم کا اِزالہ کرتے ہوئے کویت سے اپنا قبضہ اُٹھالے تو جنگ بند کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور دُوسری طرف اس کے خلاف حملے میں شریک ہونا اس لئے دُرست نہیں کہ اس جنگ کی کمان اب امریکا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنا یہ مقصد واضح کیا ہے کہ صرف کویت کو خالی کرانا مطمحِ نظر نہیں بلکہ عراق کی طاقت کو مکمل طور پر تباہ کرنا پیشِ نظر ہے، جس سے پورے عالمِ اسلام کی کمزوری لازمی ہے۔ اور جس جنگ میں کسی بھی طرف شرکت کرنا محذوراتِ شرعیہ سے خالی نہ ہو اسی کو اِصطلاح میں "فتنہ" کہا جاتا ہے، اور ایسے ہی فتنے کے موقع پر دونوں فریقوں سے علیحدہ رہنے کا حکم ہے۔ البتہ اس موقع پر یہ دُعا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا فرمائے اور ان کی جان و مال اور عزّت و آبرو اور ان کی تنصیبات کی حفاظت فرمائے، اور ان کے دُشمنوں کو تباہ و برباد فرمائے، آمین۔

لقوله تعالیٰ: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا، فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰٓى أَمْرِ اللهِ، فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا، إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ.

(الحجرات:۹)

ولقولہٖ تعالیٰ: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (النساء:۱۴۱)

وفی مشکوٰۃ المصابیح عن أبی سعید قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینہ من الفتن. (رواہ البخاری ص: ۴۶۲)[1]

وعن المقداد بن الأسود قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: ان السعید لمن جنب الفتن، ان السعید لمن جنب الفتن، ان السعید لمن جنب الفتن، ولمن ابتلیٰ فصبر فواھًا. (رواہ ابو داوٗد ص: ۴۶۴)[2]

وعن أبی موسیٰ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال: ان بین یدی الساعۃ فتنًا کقطع اللیل المظلم (الٰی قولہ) ثم قالوا: فما تأمرنا؟ قال: کونوا احلاس بیوتکم. وفی روایۃ الترمذی ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: فی الفتنۃ کسّروا فیھا قسیکم وقطعوا فیھا اوتارکم والزموا فیھا اجواف بیوتکم وکونوا کابن آدم. (ص: ۴۶۴)[3]

وعنہ (حذیفۃ) قال: (الیٰ قولہ) قلت: یا رسول اللّٰہ! صفھم لنا. قال: ھم من جلدتنا ویتکلمون بألسنتنا، قلت: فما تأمرنی ان أدرکنی ذٰلک؟ قال: تلزم جماعۃ المسلمین وامامھم. قلت: فان لم یکن لھم جماعۃ ولا امام؟ قال: فاعتزل تلک الفرق کلھا ولو ان تعض بأصل شجرۃ حتّٰی یدرکک الموت وأنت علیٰ ذٰلک. (متفق علیہ ص: ۴۶۲)[4]

وفی شرح السیر الکبیر: باب الاستعانۃ بأھل الشرک واستعانۃ المشرکین بالمسلمین:- ما نصہ:- ولا بأس بأن یستعین المسلمون بأھل الشرک علی أھل الشرک اذا کان حکم الاسلام ھو الظاھر (الیٰ ان قال) والذی روی أنّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم أُحد رأی کتیبًا حسنا قال: من ھٰؤلاء؟ فقیل: یھود بنی فلان حُلفاء بن ابی فقال: انّا لا نستعین بمن لیس علیٰ دیننا تأویلہ انھم کانوا أھل منعۃ وکانوا لا یقاتلون تحت رأیۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وعندنا اذا کانوا بھٰذہ الصفۃ فانہ یکرہ الاستعانۃ بھم (الٰی قولہ) وانما کرہ ذٰلک لأنہٗ کان معہ سبعماۃ من یھود بنی قینقاع من

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الدین الفرار من الفتن ج:۱ ص:۷ (طبع قدیمی کتب خانہ).
(۲) سنن ابی داوٗد، کتاب الفتن، باب النّھی عن السعی فی الفتنۃ ج:۲ ص:۲۳۰ (طبع سعید).
(۳) سنن ابی داوٗد، کتاب الفتن، باب النّھی عن السعی فی الفتنۃ ج:۲ ص:۲۲۹ (طبع سعید).
(۴) مشکوٰۃ المصابیح ص:۴۶۱.

حلفائه فخشي ان يكونوا على المسلمين ان احسوا بهم زلة قدم فلهٰذا ردهم (وفيه بعد ذٰلک) حديث الزبير حين كان عند النّجاشي فنزل به عدوه فأبلىٰ يومئذٍ مع النّجاشي بلاءً حسنًا (الىٰ قوله) ان النّجاشي كان مسلمًا (وبعد أسطر) قلنا ان ظهر على النّجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النّجاشي يعرف فاخلصنا الدعاء الىٰ ان يمكن الله النّجاشي[1] اهـ ملخصًا.

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	۱۴۱۱/۷/۲۱ھ
		(فتویٰ نمبر ۴۸/۷۲)

ضیاء الحق مرحوم کی موت شہادت ہے یا نہیں؟

سوال:- زید یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک کے مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا سانحہ مسلمانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے، اس واقعے سے ہمیں سبق لینا چاہئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو کہ ہمارے ملک کے شہید صدر اور ان کے رُفقاء پر نازل ہوا، اس طرح صدر ضیاء الحق کی موت شہادت نہیں ہے، بلکہ ہلاکت کی موت کہلائے گی۔ کیا زید کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب:- صدر مرحوم ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہوئے، اگر یہ حادثہ کسی شخص نے جان بوجھ کر انہیں قتل کرنے کے لئے کیا، تب تو وہ دُنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے شہید ہیں۔[2] اور اگر یہ اتفاقی حادثہ تھا تو دُنیا کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے شہید ہیں،[3] کیونکہ اُخروی اَجر کے لحاظ سے جو شخص آگ سے جل کر یا کسی چیز کے گرنے سے ہلاک ہو وہ بھی شہید ہوتا ہے۔[4] اور

---

(۱) شرح السير الكبير، باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين ج:۳ ص:۱۸۶ و ۱۸۷.

(۲) وفي الهندية، فصل في الشهيد ج:۱ ص:۱۶۸ (طبع رشيديه) ولو كان المسلمون في سفينة فرماهم العدوّ بالنّار ...... فاحترقوا فهم كلهم شهداء كذا في الخلاصة.

(۳ و ۴) وفي الشامية، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۴۸ (طبع سعيد) لو مات حتف أنفه أو ابترد أو حرق أو غرق أو هدم لم يكن شهيدًا في حكم الدنيا وان كان شهيد الآخرة.

وفي الدّر المختار، باب الشهيد ج:۲ ص:۲۵۲ وإلّا فالمرتث شهيد الآخرة وكذا الجنب ونحوه ...... الغريق والحريق والغريب والمهدوم عليه ..... الخ.

وفي المبسوط للسرخسيّ، باب الشهيد ج:۲ ص:۵۲ (طبع مطبع السعادة مصر) ومن قتله السبع أو احترق بالنّار أو تردى من جبل أو مات تحت هدم أو غرق غسل كغيره من الموتىٰ ..... الخ.

وفيه أيضًا ج:۲ ص:۵۱ ..... فيغسل وان كان له ثواب الشهداء كالغريق والحريق والمبطون والغريب يغسلون وهم شهداء علىٰ لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم ..... الخ.

کسی شخص کے بارے میں اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرنا کہ اس پر عذاب نازل ہوا ہے،[۱] بڑی جسارت کی بات ہے، جس سے ہر مسلمان کو پرہیز لازم ہے۔[۲]

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۱/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲۴/۴۰ الف)

وسائل نہ ہونے کی صورت میں دعوت و تبلیغ اور وسائل میسر ہونے کی صورت میں جہاد کیا جائے گا اور جہاد کے لئے اِمام مہدیؒ کے انتظار اور تبلیغی جماعت کے نظریے کا حکم

سوال:- مکرمی جناب مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم!

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے، حضرت! میں نے سوچا تھا کہ خود آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دُوں گا، لیکن مقام کی دُوری اور مصروفیات کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا، اس لئے بذریعۂ مکتوب آپ سے رُجوع کیا ہے۔

پہلے اپنا تعارف اور مکتوب کا مقصد بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا تعلق کسی دِینی تحریک یا جماعت سے باضابطہ طور پر نہیں ہے، لیکن آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی زیارت اور صحبت کی نسبت سے دِین حاصل کرنے، اسے پھیلانے، اس کی حفاظت و بقاء اور نفاذ کا شوق دِل میں موجزن ہے۔

حضرت! میں کچھ عرصے سے تذبذب کا شکار ہوں کہ دِین کی کماحقہٗ اشاعت اور حفاظت کا دُرست اور مسنون راستہ کون سا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رہنمائی چاہئے۔

پہلے چند باتیں جو ذہن میں ہیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، آپ جیسے جید علمائے کرام اور بزرگانِ دِین کی صحبت، تصانیف اور قرآن و حدیث کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکے میں دعوتِ دِین کا جو راستہ اور طریقہ اللہ رَبّ العزّت کے حکم سے اختیار کیا، اس کے نتیجے کے طور پر تین سے چار سو کے لگ بھگ لوگ دِین میں داخل ہوئے، لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور صحابہؓ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس حکم کو پورا کیا تو بارہ سال میں مختلف علاقوں کی فتوحات سے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ اسی طرح خلفائے

(۱ و ۲) وفی مرقاۃ المفاتیح ج:۱ ص:۲۶۷ فلا یحکم لأحدٍ بانه من أهل الجنّة ...... ولا یجزم فی حق احدٍ بانّهٗ من أهل النّار والعقوبات ولو صدر منهٗ جمیع السیئات والمظالم والتبعات فان العبر بخواتیم الحالات ولا یطلع علیها غیر عالم الغیب. وفیها ایضًا ج:۱ ص:۲۶۸ فرُبّ کافر متعبد یسلم فی آخر عمره ورُبّ مسلم متعبد یکفر فی نهایة أمره لا یجوز الشهادة لأحدٍ بالجنّة والنّار ..... الخ.

راشدینؓ کے زمانے میں بڑے بڑے ممالک کی فتوحات سے اسلام کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا، اور چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد نظر آتی ہے کہ اسلام کی حفاظت و بقاء کے لئے صرف جہاد یعنی قتال ہی کارآمد ثابت ہوا۔

اسلام کی زیادہ سے زیادہ اور کماحقہٗ اشاعت بھی اسی سے ہوئی، جب کوئی علاقہ یا ملک فتح ہوا تو وہاں مبلغینِ اسلام کو آزادی سے اِشاعتِ دِین کا موقع ملا۔

اب موجودہ دور میں قتال فی سبیل اللہ کے پہلے کی طرح کماحقہٗ اثرات نظر نہیں آرہے، جب کہ علمائے دیوبند سے منسلک تحریک تبلیغی جماعت جو اَسّی (۸۰) سال سے اِشاعتِ دِین کی محنت کر رہی ہے اور جس کی محنت سے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

اسی بات کے پیشِ نظر میں اِشاعتِ دِین اور حفاظتِ دِین کے متعلق مذکورہ بالا اپنی رائے یا دُوسرے الفاظ میں قرآن و حدیث کی چودہ سو سالہ تاریخ اور علمائے اُمت کی اکثریت کے موقف اور تبلیغی جماعت والوں کے موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوں کہ آیا اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور حفاظت نیز اِشاعتِ اِسلام کے لئے کون سا عمل مؤثر اور مفید ہے اور قرآن وسنت کے مطابق ہے؟

تبلیغی جماعت والوں کے موقف اور نظریات کو جو مجھ تک ''تبلیغی بزرگوں'' علماء اور کارکنوں کی زبانی پہنچے ہیں تفصیلاً سلسلہ وار بیان کرتا ہوں:-

۱:- بقول تبلیغیوں کے دِین کی اصل رُوح اور حقیقت ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہے، یہی تمام انبیاء کا کام تھا، اور اس میں اُمت کی نجات اور کامیابی ہے۔ (اس بات پر کماحقہٗ تبلیغی کتنا عمل کرتے ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا)۔

۲:- یہ دور جہاد وقتال کا دور نہیں ہے، بلکہ دعوت باللسان کا دور ہے۔

۳:- جب تک مہدیؓ کا ظہور نہیں ہوتا، اس وقت تک جہاد اور اس سے منسلک تمام سرگرمیوں کو موقوف کر کے تبلیغی جماعت کے نظریے کے مطابق محنت کرنا تمام اُمت کے لئے ضروری ہے۔

۴:- اس دور میں جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینا حکمت کے خلاف ہے، دِین کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

۵:- قرآن و حدیث میں جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی اِصطلاحات دو اَلگ معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

۶:- تبلیغِ دِین اور اِصلاحِ نفس کے مروّجہ طریقے جو اُمت کی اکثریت میں رائج ہیں، مثلاً خانقاہی نظام، دِینی رسائل و اخبارات، اِصلاحی مواعظ، تحریر وتصنیف اور مدارس کا قیام وغیرہ یہ طریق

نبوّت سے مشابہت نہیں رکھتے، اور ''تبلیغی جماعت'' کا طریقِ دعوت نہ صرف دُرست اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے بلکہ طریقِ نبوی سے مماثلت اور مطابقت بھی رکھتا ہے۔

۷:- اگر اُمت میں بدری صحابہؓ کی تعداد کے بقدر لوگ اُن ہی جیسے اعمال، ایمان، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے حامل ہوجائیں تو خود بخود دُنیا کی کایہ ہی پلٹ جائے گی اور تبلیغی جماعت کا مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے۔

۸:- دِین کو نافذ کرنے کا اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا طالبان والا طریقہ حکمت کے خلاف اور دِین کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔

۹:- دِین کا کوئی کام اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوتا جب تک سنتِ رسول کے علاوہ بقول ''تبلیغیوں'' کے وہ عمل صفاتِ نبوی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

۱۰:- اس دور میں دِین کی حفاظت، اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور اِسلام کے نفاذ کے لئے جہادی اور دُوسری تمام سرگرمیاں غیرمؤثر ثابت ہوچکی ہیں، لہٰذا مہدی کی آمد تک انہیں ترک کرکے ''تبلیغی جماعت'' والا کام شروع کیا جائے۔

۱۱:- اُمت ماسوائے ''تبلیغی جماعت'' کے کسی اور پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہوسکتی۔

۱۲:- تبلیغی جماعت مہدی کا لشکر تیار کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا بارہ عام پائے جانے والے ''تبلیغی نظریات'' میں نے گزشتہ چھ سال کے دوران رائے ونڈ اِجتماع اور اپنے علاقے کے شبِ جمعہ کے بیانات اور بہت سے تبلیغی علماء اور کارکنوں سے نقل اور اَخذ کئے ہیں۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ''تبلیغی'' مذکورہ بالا نظریات ''غیرتبلیغیوں'' کے سامنے عموماً بیان نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو اشارۃً یا کنایۃً بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ''غیرتبلیغی'' علماء تبلیغی جماعت کے نظریات کو جان نہیں سکتے۔

آپ حضرات (جو اس پُرآشوب اور پُرفتن دور میں اِستقامت کے ساتھ اِشاعتِ دِین، تعلیمِ دِین اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کام کر رہے ہیں) سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی طرف بھرپور توجہ فرمایئے، اور اس کی اپنی تقاریر، رسائل اور اپنے حلقۂ اَثر میں وضاحت فرمایئے کہ اس دور میں دِین کا کون سا عمل زیادہ مؤثر اور مفید نیز قرآن وسنت کے مطابق ہے جس کے ذریعے اِشاعتِ دِین، حفاظتِ دِین اور نفاذِ دِین کا عمل ہوسکے، اور آیا کہ تبلیغی جماعت کے مذکورہ نظریات اور موقف دُرست ہے؟ دِین کے مطابق ہے یا نہیں؟

ایک جید عالمِ دِین اور بزرگ ہونے کے ناطے آپ کا حلقۂ اَثر بھی زیادہ ہے اور آپ کے دلائل اور بات میں اللہ تعالیٰ نے قوّت اور اَثر رکھا ہے، اس لئے لوگ آپ کی بات کو آسانی سے سمجھتے

اور قبول کرتے ہیں، جب کہ میرے جیسے ناقصِ علم وعمل والوں کی بات کو ایک تو کوئی قبول نہیں کرتا، دُوسرے فتنہ وفساد پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔

ان تمام گزارشات کے علاوہ عرض ہے کہ اپنی مہر اور دستخط کے ساتھ مدلل اور مفصل جواب اِرسال فرماکر میری رہنمائی فرمایئے کہ آیا میری رائے دُرست ہے یا کہ تبلیغی جماعت والوں کی؟ یا ان دونوں سے الگ قرآن و سنت میں کوئی دُوسرا عمل اور طریقہ جس کے ذریعے اُمت کی اِصلاح، مسلمانوں اور اِسلام کی حفاظت اور اِشاعت ونفاذِ دِین کا کام کماحقہٗ ہوسکے، موجود ہے؟ فقط

حافظ سمیع اللہ خان الیاس

جواب:- مختصر بات یہ ہے کہ جب جہاد کے ضروری وسائل مہیا نہ ہوں، دعوت وتبلیغ اور اَفراد سازی کے کام پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے، اس کے ساتھ جہاد کے ضروری وسائل مہیا کرنے کی فکر بھی جاری رکھنی چاہئے،[1] جب وسائل مہیا ہوجائیں تو جہاد کرنا چاہئے۔[2] یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ اِمام مہدی کے آنے تک جہاد موقوف ہے، یہ غلط نظریہ ہے، اور اس کی تردید و اِصلاح کے لئے اکابرِ تبلیغی جماعت سے بات بھی ہوئی ہے۔ جب بھی ضروری وسائل مہیا ہوجائیں، جہاد کرنا چاہئے،[3] چاہے اِمام مہدی ابھی نہ آئے ہوں۔ البتہ ضروری وسائل مہیا کرنے میں آج کے حالات کے مطابق ایک طویل حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جو ایک مختصر خط میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

والسلام

۱۴۲۳/۲/۱۷ھ

(۱ تا ۳) "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ" (الأنفال: ٦٠).

وفی تفسیر القرطبی ج:۸ ص:۳۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) أمر الله سبحانه المؤمنین باعداد القُوّة للأعداء بعد أن أكّد تقدمة التّقوىٰ .... قال ابن عباس: القوّة هاهنا السلاح والقسيّ ......الخ.

وفی تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۳۲۸ (طبع قدیمی کتب خانه) ثم أمر تعالىٰ بإعداد آلات الحرب لمقاتلتهم حسب الطّاقة والامكان والاستطاعة فقال (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ) أى مهما أمكنكم ......الخ.

وفی تفسیر المدارک ج:۱ ص:۵۹۷ (طبع قدیمی کتب خانه) (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) من كل ما يتقوّى بهٖ فی الحرب من عددها .....الخ.

وفی تفسیر أبی السعود ج:۳ ص:۱۰۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) أعدّوا لقتال الّذين نُبذ اليهم العهد وهيّئوا لحرابهم .... ما استطعتم من قُوّة من كل ما يتقوّى بهٖ فی الحرب كائنًا ما كان ......الخ.

وفی الدّر المختار ج:۴ ص:۱۲۷ (طبع سعید) وشرط لوجوبه القدرة على السّلاح لا أمن الطّريق.

وفی الشامیة تحته: أى وعلى القتال وملك الزّاد والرّاحلة كما فی قاضی خان وغيره قهستانی ....الخ.

وفی تفسیر رُوح المعانی ج:۶ ص:۲۴ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ) خطاب لكافة المؤمنين لما أن المأمور به من وظائف الكل أى أعدّوا لقتال الذين نبذ اليهم العهد وهيئوا لحرابهم (مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ) أى من كل ما يتقوّى به فی الحرب كائنًا ما كان وأطلق عليه القوّة مبالغة، وانما ذكر هذا لأنه لم يكن له فی بدر استعداد تام فنبّهوا على أنّ النّصر من غير استعداد لا يتأتى فی كل زمان. وعن ابن عباس رضی الله تعالىٰ عنهما تفسير القوة بأنواع الأسلحة.

وفی التفسیر الکبیر للامام الرازیؒ ج:۵ ص:۴۹۹ (طبع دار الحدیث ملتان) أمرهٗ فی هذه الآية بالاعداد لهؤلاء الكفّار ..... وأن يعدوا للكفّار ما يمكنهم من آلة وعدة وقوّة والمراد بالقوّة ههنا ما يكون سببًا لحصول القوّة وذكروا فيه وجوهًا الأوّل المراد من القوّة أنواع الأسلحة ..... قال أصحاب المعانی الأولىٰ أن يقال هذا عام فی كل ما يتقوّى به علىٰ حرب العدوّ وكل ما هو آلة للغزو والجهاد فهو من جملة القوّة ...... الخ.

(حکومت و اِمارت اور سیاست کے مسائل کا بیان)

دِین میں سیاست و اِقتدار کی حیثیت اور شرعی مقام اور دِین کا اصل مقصد

سوال:- فضائل مآب حضرتِ اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، ناچیز مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے فاضلیت کے علاوہ شعبۂ اِفتاء سے فراغت حاصل کر کے عرصے سے وادیٔ کشمیر کی مشہور شخصیت علامہ کشمیریؒ کے ننھیال رودھوان کپواڑہ میں ایک مدرسے میں تدریس و اِفتاء کا کام انجام دے رہا ہے۔

میں اور میرے دُوسرے رُفقاء جو الحمدللہ دارالعلوم دیوبند سے ہی فراغت حاصل کرچکے ہیں، تدریس و اِفتاء کے علاوہ مختلف مصنّفین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، الحمدللہ آپ کی تمام وہ کتابیں شوق و محبت سے پڑھی ہیں جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں، اور اس کی وجہ سے بربناء محبت دست بوسی ہی نہیں بلکہ قدم بوسی کو دِل چاہتا ہے۔ عرصے سے خط لکھنے کا ارادہ تھا لیکن "عرفت ربّی بفسخ العزائم" کا بار بار تجربہ ہوا، پھر سالِ گزشتہ حضرت تھانویؒ پر سیمینار کے سلسلے میں جناب کی دیوبند تشریف آوری کا چرچا ہوا، لیکن عین وقت پر جناب کے پروگرام کے ملتوی ہونے کی اطلاع ملی، اس لئے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔ دِل تو بہت کچھ لکھنے کو چاہ رہا ہے، لیکن طولِ کلام کو بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے مختصراً اپنا مدّعا عرض کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ حضرتِ والا اپنے بے حد قیمتی وقت کا خون کر کے جواب باصواب بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق پوری کتاب لکھ کر سرگرداں لوگوں کی تشویش اور پریشانی کو دُور فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُمت میں دو بڑے قلم کار صاحبِ طرزِ اِنشاء پرداز کی فکر عوام و خواص میں دو مستقل متضاد ذہن بنائے ہوئے ہے، ایک صاحب نے دِین کی تعبیر میں مقصود کو تقاضا، اور تقاضے کو مقصود بنا کر دِین کو اس انسان کی طرح جس کے پیر اُوپر اور سر نیچا ہو، عوام الناس کے سامنے پیش کیا، اور ایک اچھی خاصی بھیڑ اس نظریے پر جم گئی ہے۔ پھر اسی فکر کے ایک فعال شخص نے اس کے رَدّ میں ایک الگ اور مستقل فکر کی بنیاد ڈالی اور اپنے گمان کے مطابق وہ مقصود اور تقاضے کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور الحمدللہ دونوں حضرات کے لٹریچر کو کافی غور و خوض سے پڑھتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اوّل الذکر فکر کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہمارے اکابر مرحومین اور موجود حضرات نے

بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اصل فکر کے تعلق سے صرف دو حضرات، مولانا منظور نعمانی اور مولانا سیّد ابوالحسن ندوی، نے لکھا ہے۔ اپنے اکابر کی، اس رَدّ میں جتنی کتابیں زیرِ مطالعہ ہیں، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر کی تعبیر سے متفق ہیں بلکہ ثانی الذکر کی ''تعبیر کی غلطی'' کا ذہن ہی ہمارے ناقص خیال کے مطابق ان میں کام کر رہا ہے، یہ بات الگ ہے کہ ثانی الذکر کے دیگر معاملات مسائل وغیرہ میں ہمارے اکابر کا ان سے اختلاف ہے، لیکن دِین کی تعبیر کی حد تک ہمارے اکابر ان سے متفق نظر آرہے جیسا کہ جناب کی تصنیفِ لطیف تکملة فتح الملهم کی یہ عبارت بھی اس پر دال ہے: ''ولکن بعض المسلمین الذین قاموا بالردّ علی العلمانیة فی عصرنا قد أفرطوا فی ذٰلک الخ''۔ (تکملة فتح الملهم ج:۳ ص:۲۷۰)

لیکن معاملہ حل طلب یہ ہے کہ ثانی الذکر نے اپنی فکر کو اپنی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' یا ''الرسالہ'' وغیرہ میں جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے، کیا اُسے مکمل صحیح اور دُرست فکر قرار دیا جاسکتا ہے یا اِفراط میں مبتلا شخص کو دیکھ کر خود یہ صاحب تفریط میں مبتلا ہوگئے ہیں؟ ہم اپنے مطالعے کی حد تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ان میں سے اگر اِفراط کا شکار ہے تو دُوسرا یقیناً تفریط میں مبتلا ہے، لیکن پریشان کُن معاملہ یہ ہے کہ ان دو فکروں کے درمیان راہِ اِعتدال گم ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود نظر نہیں آرہا ہے، کافی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن تشنہ لبی باقی ہے، اور آخرکار تسکینِ خاطر کے لئے جناب کی خدمت میں باہم مشورے سے یہ رُقعہ ارسال کیا جارہا ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب ''دِین کا متوازی تصوّرِ عبادت اور خلافت کی جامعیت'' مصنفہ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی زید مجدہٗ بہت آب و تاب خاص طور پر اپنے اکابر کی تقریظ اور تاثرات کے ساتھ شائع ہوئی تھی، بہت شوق سے اس کو منگایا، بے تابی سے اس کو پڑھا، لیکن راہِ اِعتدال تاہنوز گم ہے۔ بہت سے اہلِ علم سے گفتگو ہوئی، باہمی مذاکرہ بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اُلجھن اپنی جگہ باقی ہے۔

ممکن ہے کہ ہم اپنا مدعا واضح کرنے میں ان مختصر اَلفاظ میں اچھی طرح کامیاب نہ ہوئے ہوں، لیکن جناب جیسے صاحبِ علم سے اُمید قوی ہے کہ مدعا سمجھ گئے ہوں گے، مکرّر عرض ہے کہ ثانی الذکر کے دُوسرے دعاوِی سے اگرچہ اختلاف ہے، لیکن دِین کی ان کی بیان کردہ تعبیر سے ہمارا بلکہ اسلام کا کہاں تک اختلاف ہے؟ اور کہاں تک اتفاق؟ اور ان دو نظریوں کے درمیان راہِ اِعتدال کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہم جناب کی ذاتِ اقدس سے جناب کے حکمت ریز قلم سے ہی چاہتے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ دو فکر اور ان کی ردّ و تصدیق میں جتنی کتابیں شائع ہوکر ہمارے علم میں آچکی ہیں، ان کا مطالعہ ہم کرچکے ہیں لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ ان دو مختلف متضاد

فکروں کا اثر عوام میں کہاں تک پہنچ چکا ہے اور اِعتدال کی راہ کی اگر آج نشاندہی ہوسکی تو آگے شاید کسی ایک کو غلبہ حاصل ہوگا جیسا کہ ثانی الذکر کے اِمکانات ہیں تو پھر یہ غالب نظریہ اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ چھا جائے گا اور راہِ اِعتدال پر پھر ایسے دبیز پردے پڑیں گے، ان کے ہٹانے والے کو (جو یقیناً خدا کی طرف سے آئے گا) کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فقط والسلام

مظفر حسین القاسمی
خادم التدریس والافتاء
دارالعلوم رودھوان، کپواڑہ کشمیر

جواب:- مکرمی جناب مولانا مظفر حسین قاسمی صاحب زید مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا، سفروں کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس پر معذرت خواہ ہوں۔ میں نے وحیدالدین خان صاحب کی کتاب ’’تعبیر کی غلطی‘‘ پوری نہیں پڑھی، البتہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کی کتاب پوری پڑھی ہے، اور احقر کی رائے میں صحیح صورتِ حال وہ ہے جو احقر نے اپنی کتاب ’’حکیم الاُمتؒ کے سیاسی افکار‘‘ میں بیان کی ہے، اور اس کا خلاصہ تکملہ فتح الملہم میں بھی آیا ہے۔ یعنی سیاست و اِقتدار، دِین کا اصل مقصد نہیں[1] بلکہ مقصد کے حصول کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، اور دِین کے اِجتماعی اَحکام کی تنفیذ کے لئے اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار ہے، مگر دِین کے اصل مطمحِ نظر ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک ذریعہ اور دِین کا ایک اہم شعبہ ہونے کی حیثیت سے۔ یہی راہِ اِعتدال ہے جو قرآن وسنت کے متعلقہ اَحکام سے واضح ہوتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو مقصدِ دِین سمجھے تو وہ غلوّ کا شکار ہے، اور اگر کوئی اس کی تردید میں اس کے دِین کا حصہ ہونے ہی سے انکار کردے تو یہ بھی غلط اور دُوسری جانب کا غلوّ ہے۔ والسلام

۱۴۲۰/۱/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۴۸/۳۵۷)

---

(۱) وفي سورة الذّاريات: ’’وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ‘‘.
وفي تفسير القرطبي ج:۱۷ ص:۵۰ (طبع مكتبه حقانيه) .....وقال على رضى الله عنه أى وما خلقت الجن والانس إلّا لأمرهم بالعبادة واعتمد الزّجاج علىٰ هٰذا القول ويدلّ عليه قوله تعالىٰ ’’وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوٓا إِلٰهًا وَّاحِدًا‘‘ (التوبة: ۳۱) ...... الّا ليعرفونى الثعلبى، وهٰذا قول حسن لأنّه لو لم يخلقهم لما عرف وجوده وتوحيدهٗ ...... والعبادة الطاعة والتعبد التنسّك فمعنىٰ (لِيَعْبُدُونِ) ليذلوا ويخضعوا ويعبدوا.
وفي تفسير الكشاف ج:۴ ص:۴۰۸ (طبع قديمى كتب خانه) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ .... الآية) أى وما خلقت الجن والانس الّا لأجل العبادة ولم أرد من جميعهم إلّا اياها.
وفي تفسير ابن كثير ج:۴ ص:۲۳۸ (طبع قديمى كتب خانه) (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) أى انّما خلقتهم لامرهم بعبادتى لا لاحتياجى اليهم .....الخ.
وفي التفسير المنير ج:۱۴ ص:۵۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئته) أى ما خلقت الثقلين الانس والجنّ الّا للعبادة ولمعرفتى لا لاحتياجى اليهم ......الخ.

۱:- ''مغربی جمہوریت'' کی شرعی حیثیت
۲:- عہدہ اَز خود طلب کرنا جائز نہیں
۳:- اکثریت کو فیصلوں کی بنیاد بنانے کا حکم

سوال:- میری اور اس ملک کے سب مکینوں کی زندگی کا ایک مشترک مسئلہ ہے ''اِنتخاب یا جمہوریت'' جس کو اِسلامی رسائل اور کتب بلکہ عام درس و وعظ میں بھی ''دورِ حاضر کا ایک عظیم بت'' قرار دیا جاچکا ہے۔ دریافت طلب اُمور یہ ہیں کہ:-

۱:- کیا واقعی یہ بات صحیح ہے کہ موجودہ طرزِ اِنتخاب (مغربی جمہوریت) دورِ حاضر کا عظیم بت ہے؟

۲:- اگر یہ بات دُرست ہے تو جو لوگ یہاں سجدہ ریز ہیں ان کے لئے شرعی حکم کتاب وسنت میں کیا ہے؟

۳:- جو شخص وقت کی مجبوری کی آڑ میں یہاں جبہہ فرسائی اِسلام کا اہم کام بلکہ عین اسلام قرار دے تو اس کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

مسئلے کا دُوسرا رُخ:-

۱:- اگر فی الحقیقۃ مغربی جمہوریت کو دورِ حاضر کا عظیم بت کہنا دُرست نہیں ہے، تو ایسا کہنے والوں کے لئے اسلام میں کیا حکم ہے؟

۲:- جو لوگ اِنتخاب میں حصہ لینے کے لئے خود اُمیدواری کی درخواست دیں گے اور خود اپنی تشہیر حصولِ اِقتدار کی کریں گے، وہ اپنے قول وفعل سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کہ ''انا واللہ ما نولی علیٰ ھٰذا العمل أحد اسأله ولا أحد أحرص علیه'' اور آپ کا حکم: ''لا تسئل الامارۃ'' کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

۳:- جو لوگ قانونی طور پر حق اور ناحق کی پہچان کے لئے اکثریت کے فیصلے کو وقتی طور پر معیار قبول کرلیں کیا وہ ''اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ'' جیسی قرآن مجید کی صاف اور صریح تعلیم کے خلاف کرنے کے مرتکب ہوں گے یا نہیں؟

قرآن وسنت کے مطابق مکمل اور مدلل جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

السائل: عبدالکریم
جامع مسجد (العنائیہ) جناح
اسٹریٹ گجرات
۱۴؍مئی ۱۹۹۰ء

جواب:- درحقیقت آپ کے سوالات کا مدلل اور مفصل جواب ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتا ہے، جس کا ایک مختصر خط میں احاطہ مشکل ہے، تاہم مختصراً سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مغربی جمہوریت جس کی بنیاد ''عوام کی حکمرانی'' کے تصوّر پر ہے، اسلام کے قطعی خلاف ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد ''اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ'' کے عقیدے پر ہے، جسے قرآنِ کریم نے: ''اِنِ الْحُکْمُ لِلّٰہِ''[۱] کے مختصر جملے میں ارشاد فرمایا ہے۔ لہٰذا مغربی جمہوریت کو اپنے تمام تصوّرات کے ساتھ برحق سمجھنا عہدِ حاضر کی بدترین گمراہیوں میں سے ہے، اور ایسے لوگوں کو شرعی طور پر گمراہ کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس تفصیل کے ساتھ مغربی جمہوریت کو برحق سمجھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآنِ کریم کے کسی صریح حکم کے خلاف نافذ کردے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا، تو ایسا اعتقاد کفر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلوں کو قرآن وسنت کے تابع قرار دے تو اُس کو کفر یا گمراہی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مغربی جمہوریت کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔

۲:- عام اسلامی حکم یہی ہے کہ اَزخود کسی سرکاری عہدے یا منصب کو اپنے لئے طلب کرنا جائز نہیں،[۲] اور ایسا شخص مطلوبہ منصب کا اہل نہیں ہوتا،[۳] لیکن بعض اِستثنائی صورتوں میں جہاں یہ بات واضح ہو کہ اگر کوئی شخص خود اس منصب کو طلب نہیں کرے گا تو نااہل اور ظالم لوگ اس پر قبضہ کرکے لوگوں پر ظلم کریں گے، تو ایسے وقت میں عہدے کو طلب کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا: ''اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ''[۴] کہنا اسی صورت پر محمول ہے۔ اِس شرعی اُصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے موجودہ اِنتخابات کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے کہ طلبِ اِقتدار کی بنیاد پر پورا نظامِ حکومت قائم کرنا اصلاً جائز نہیں ہے، اور اگر منشاء صرف طلبِ اِقتدار ہو، یا دُوسرے اہل لوگ موجود ہوں، یا کسی اور طریقے سے غلط نظام کو بدلنا ممکن ہو تو ایسے نظامِ انتخابات میں اُمیدوار بننا جائز نہیں۔ لیکن اگر موجودہ غلط نظام کو بدلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، تو صالح اور اہل اَفراد اگر طلبِ اِقتدار کے جذبے کے بجائے اصلاحِ حال کی غرض سے اس میں شامل ہوں تو اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مفاسد سب وشتم، غیبت اور دُوسرے محرّمات ومنکرات سے مکمل پرہیز کا اہتمام ہو، جو اس دور میں شاذ ونادر ہے۔

---

(۱) سورۃ یوسف آیت:۴۰۔

(۲ و ۳) وفی صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من سأل الامارۃ وکل الیھا ج:۲ ص:۱۰۵۸ (طبع قدیمی) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''لا تسئل الامارۃ فان اعطیتھا عن مسئلہ وکلت الیھا، وان اعطیتھا من غیر مسئلۃ اعنتَ علیھا۔

وکذا فی صحیح مسلم، باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا. ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع قدیمی).

(۴) سورۃ یوسف آیت:۵۵.

۳:- اکثریت کے فیصلے کو منصوص شرعی معاملات کے تصفیے کے لئے معیار بنانا گمراہی ہے، بلکہ جیسا کہ نمبر ا میں گزرا، بعض حالات میں کفر ہے، لیکن اگر اِنتظامی معاملات میں مباحات کی حد تک، یا مجتہد فیہ اُمور میں کسی ایک جانب کی ترجیح کے لئے اگر اکثریت کو بنیاد بنایا جارہا ہے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کی نامزدگی مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کی بنیاد پر کرنے کا حکم دیا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۲/۱/۱۲ھ

سیاست میں دِین اور ملک وملت کے مفاد کی حامل جماعت کی حمایت کی جائے

سوال:- موجودہ ملکی حالات میں بھٹو کا ساتھ دینا کفر کا ساتھ دینے اور اپوزیشن کا ساتھ دینا اسلام کا ساتھ دینے کے مترادف ہے، یہ آواز مسجدوں اور اکثر علماء کی طرف سے سنائی دے رہی ہے، اس کے بارے میں راہنمائی فرمائی جائے۔

جواب:- شریعت کا حکم تو اتنا ہے کہ نیکی وتقویٰ میں تعاون کیا جائے اور فسق وفجور اور اِثم و عدوان میں تعاون نہ کیا جائے،[2] نیز سیاست میں اس شخص یا جماعت کی حمایت کی جائے جس کی حمایت میں دِین اور ملک وملت کا مفاد زیادہ ہو، اب یہ واقعات اور بصیرت و رائے کا مسئلہ ہے کہ کس کی جماعت میں ملک وملت کا مفاد دِینی اعتبار سے زیادہ ہے، یہ دارالافتاء سے پوچھنے کی بات نہیں، بلکہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق ہر شخص کو اس کا فیصلہ خود کرنا چاہئے، مفتی کا منصب شخصیات سے بحث کرنا نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۲/ ۲۸ ج)

برما میں تمام مسلمانوں یا مخصوص مسلم قبائل کے لئے جدوجہد کرنے والی دو جماعتوں میں سے کس کی حمایت کی جائے؟

سوال:- برما میں مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور حصولِ آزادی کے لئے برمیز مسلم آرگنائزیشن (B.M.O) اور روہنگیا پیٹریوٹیک فرنٹ (R.P.F) یعنی "محبّ رُوہنگیا محاذ" نامی دو

---

(۱) سیرة عمر بن الخطاب ص: ۵۰۹ مصنفه: علی محمّد محمّد الصّلابی.

(۲) لقوله تعالیٰ: "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" الآیة، سورة المائدة: ۲.

جماعتیں کام کر رہی ہیں، اوّل الذکر برما کے تمام مسلمانوں کو شامل کر کے اسلام کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، جبکہ مؤخر الذکر برما میں مسلمانوں کے متعدّد قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ''روہنگیا'' قبیلے یا قومیت کے نام پر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) جدوجہد کر رہی ہے، ہمیں بتائیں کہ شرعی اعتبار سے ہم کس کی حمایت کریں؟

جواب:- جو جماعت اسلام کا نام ہی نہ لیتی ہو بلکہ واقعۃً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتی ہو، اس کے ساتھ تعاون علی التقویٰ کیا جائے، اور جو جماعت قبائلی عصبیت کی دعوت دیتی ہو اس کے ساتھ تعاون دُرست نہیں،[۱] البتہ اگر قبائلی عصبیت کی داعی نہ ہو،[۲] لیکن اس نے اپنی جدوجہد کا دائرہ کسی خاص خطے یا قبیلے کے ساتھ محدود کر رکھا ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور مسلمان اس کے ساتھ بھی تعاون علی التقویٰ کر سکتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۶ھ
(فتویٰ نمبر ۹۵۸/۲۸ ج)

اِنتخابات میں کسی اُمیدوار کے بارے میں ''فلاں کو ووٹ دے کر ہم اللہ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' کے الفاظ کا حکم

سوال:- بعض اِشتہاروں میں جو اِنتخابات کے سلسلے میں جاری ہو چکے ہیں، یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ: ''فلاں اُمیدوار کو ووٹ دے کر ہم روزِ محشر اللہ تعالیٰ کے اِحتساب سے بچ سکتے ہیں'' اور اس کا مقصد یہ ہے کہ نیک اور اچھے آدمی کو ووٹ دینے سے آخرت میں غلط ووٹ کی جواب دہی اور اِحتساب سے آدمی بچ سکتا ہے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں نبوّت کا دعویٰ ہے۔ آپ کا ان الفاظ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب:- مذکورہ مقصد کے تحت یہ الفاظ لکھنے سے نبوّت کا دعویٰ لازم نہیں آتا، اور اگر مقصد وہی ہے جو سوال میں لکھا گیا ہے اور جس آدمی کے حق میں یہ جملہ لکھا گیا ہے، وہ لکھنے والے کے نزدیک واقعۃً حلقے کے دُوسرے تمام اُمیدواروں سے زیادہ نیک اور اہل ہے، تو ان الفاظ کے لکھنے میں

---

(۱) لقولہ تعالیٰ: "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" الآیۃ، سورۃ المائدۃ: ۲.

(۲) فی سنن النسائی ج: ۲ ص: ۱۷۴ و ۱۷۵ (طبع مکتبہ الحسن لاہور) "عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاھلیۃ ..... ومن قاتل تحت رایۃ عمیۃ یدعوا الیٰ عصبیۃ أو یغضب لعصبیۃ فقتل فقتلۃ جاھلیۃ." رقم الحدیث: ۴۰۲۵.

شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ کسی شخص کے بارے میں جزم اور وثوق کے ساتھ اتنا بڑا دعویٰ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۴۰۳/۱۲/۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۵۲۴/۲۲۰)

چہرے کے پردے کی شرعی حیثیت اور خاتون اُمیدوار کا اِنتخابی پوسٹروں میں فوٹو شائع کرنے کا حکم

سوال ۱:- قومی اتحاد کے جلسوں میں بیگم نسیم ولی خان اور بیگم صفیہ شکیل اسٹیج کی زینت بنتی ہیں، اخبارات میں اُن کا فوٹو چھپتا ہے، لوگ اخباروں میں ان کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں اور تقریریں بھی پڑھتے ہیں، سنا ہے کہ غیرمحرَم عورت کی تصویر دیکھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اُس کو دیکھنا، غیرمحرَم عورت کی آواز بھی پردہ ہے، اگر ایسی اُونچی آواز سے تلاوتِ قرآن پاک بھی کرے جس کو کوئی غیرمحرَم مرد سنے تو بھی گناہ ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

۲:- یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا رشتہ دار سے پردہ کرایا ہے؟

۳:- حضرت خالد بن ولیدؓ کی اہلیہ محترمہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی مبارک میدانِ جہاد میں دے کر واپس ہونے لگیں تو انہوں نے فرمایا: اے سوار! تم نے مجھ پر بڑا اِحسانِ عظیم کیا، اپنا نام بتا، اُس وقت پتہ چلا کہ یہ میری بیوی ہے، گویا چہرے کے پردے کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ خاوند کو پتہ نہ لگا کہ میری بیوی ہے؟

۴:- مفتی محمود، بھٹو صاحب کو اِقتدار پر لائے تھے، اور جن لوگوں نے اِن کی مخالفت کی تھی مفتی محمود صاحب نے اُن کی مخالفت کی تھی، اب جو مفتی محمود صاحب کے لگائے ہوئے پودے کو کاٹنا نہیں چاہتے اُن کی مفتی محمود صاحب مخالفت کرتے ہیں، اب بھٹو صاحب کی تائید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵:- جو شخص جمہور اہلِ سنت والجماعت کے سلف صالحین پر تنقید کرے، اس شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- عورت پر پردے کا وجوب ایک اِجماعی اور غیرمختلف فیہ مسئلہ ہے، اور یہ پردہ چہرے کا بھی ہے،[۱] اور اس کا فوٹو شائع کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، ان مسائل میں کسی عالمِ دِین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور اس کے خلاف کسی کا عمل شریعت میں حجت نہیں۔

---

(۱) وفی الدّر المختار، کتاب الصلٰوۃ ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع سعید) وتمنع المرأۃ الشابۃ من کشف الوجہ بین رجال لا لأنّہ عورۃ بل لخوف الفتنۃ.

۴:- اشخاص و ذوات سے متعلق سوالات فتویٰ سے متعلق نہیں۔

۵:- اس مسئلے پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل فتویٰ ''جواہر الفقہ'' میں شائع ہو چکا ہے، اسے ملاحظہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۸/۳/۱۳۹۷ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۲۱/۳/۱۳۹۷ھ

(اِنتخابات میں قرآنی آیات واحادیث کو مخالف اُمیدواروں پر چسپاں کرنے کی مختلف صورتوں کا حکم)

۱:- ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ'' الآیۃ میں ۹ مفسدوں کو قومی اِتحاد کے ۹ لیڈروں پر چسپاں کرنا

۲:- قرآنِ کریم کے لفظ ''هَلْ'' کو سیاسی جماعت کے انتخابی نشان پر چسپاں کرنا

۳:- تلاعب بالقرآن کی مختلف صورتیں اور ایسی مجالس میں شرکت کا حکم

سوال:- گزشتہ انتخابی مہم کے دوران جس طرح سے مخالف جماعتوں نے ایک دُوسرے کے خلاف جائز و ناجائز طوفان برپا کیا، جناب بھی پورے طور پر واقف ہوں گے، بلکہ غلط انداز سے قرآنِ کریم اور اَحادیث شریفہ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی پارٹی کے مقرّرین صاحبان اور اَخبار نے یہ کہا کہ: ''وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ'' الخ، اس آیتِ کریمہ میں مفسد اَفراد کا ذکر ہے، لہٰذا قومی اِتحاد کے چونکہ ۹ لیڈر ہیں اس کی طرف اشارہ تھا۔ دُوسری پارٹی کے ایک مقرّر صاحب نے جلسۂ عام میں نو ستاروں کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی آیت: ''وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ'' اور ''رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ'' وغیرہ سے اِستدلال کیا، نیز ''ہل'' کا نشان منتخب کرنے پر فرمایا کہ ''هَلْ'' کا ذکر قرآن میں چالیس مقام پر آیا ہے، پھر چند آیات پڑھیں جن میں لفظ ''هَلْ'' کا استعمال ہوا ہے۔ جناب سے اِستدعا ہے کہ اس کا شرعی حکم بتائیں۔

۱:- کیا قومی اتحاد کے ۹ لیڈروں پر آیت: "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْاَرْضِ" منطبق کی جاسکتی ہے؟

۲:- اسی طرح لفظ "هَلْ" کا استعمال؟

۳:- کیا اپنے مقصد کے لئے قرآنی آیات کا ذکر مناسب ہے؟

۴:- کیا تلاعب بالقرآن یا تحریفِ قرآن کے زُمرے میں یہ نہیں آتا؟

۵:- ایسے مجمع میں شامل ہونے والے سامعین کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- آیتِ قرآنی: "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ .... الخ" کا واقعہ بالکل دُوسرا ہے، اگر اس آیت کو موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں پر اس نیت سے چسپاں کیا جائے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں ہے تو یہ صریح تحریفِ قرآن ہے، اور اگر یہ مقصد ہو کہ آیت تو دُوسرے واقعے میں اُتری تھی لیکن یہاں بھی صادق آتی ہے تو یہ آیت کا غلط اِستعمال ہے اور سیاسی مخالفت کی بناء پر کسی شخص کو کفار کی صف میں شامل کرنا بدترین غلطی ہے۔ [۱]

۲:- ہرگز نہیں، قرآنِ کریم کے لفظ "هَلْ" کو اِنتخابی نشان پر چسپاں کرنا نری جہالت ہے، اور اگر اس نیت سے ہو کہ قرآن میں لفظ "هَلْ" سے مراد ہی انتخابی نشان ہے تو صریح تحریف ہے۔ [۲]

۳:- ہرگز صحیح نہیں، قرآنِ کریم کی آیات کو اس طرح سیاسی یا انتخابی جنگ میں استعمال کرنا جس سے عوام میں غلط تأثر ہو، انتہائی بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔ [۳]

۴:- ایسی باتوں کے بارے میں قوی خطرہ ہے کہ وہ تلاعب بالقرآن میں داخل ہوں، جو لوگ ایسا کریں وہ سخت غلطی کے مرتکب ہیں، البتہ اُنہیں کسی بُرے لقب سے پکارنے کے بجائے انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ [۴]

۵:- ایسی مجلسوں میں جہاں قرآنی آیات کو اس طرح غلط استعمال کیا جاتا ہو، شرکت نہ کرنا

---

(۱) فی الاشباه والنظائر لابن نجیمؒ "وكذا قولهم بكفره اذا قرأ القرآن في معرض كلام الناس، كما اذا اجتمعوا فقرأ فجمعناهم جمعًا، وكذا وكأسًا دهاقًا، عند روية كاسٍ. رقم:۱۴۸.
قال في شرحه: ذكر في القاموس ان معنى قول الزهرى لا تناظروا بكتاب الله ولا بكلام رسوله لا تجعلوا شيئًا نظيرًا لهما، معناه لا تجعلوهما مثلًا لشيء يعرضه به كقول القائل جئت على قدر يا موسىٰ لمسمّى بموسىٰ جاء في وقت مطلوب.

(۲) حوالہ سابقہ۔

(۳) حوالہ سابقہ۔

(۴) قال الله تعالىٰ في القرآن الكريم: "اُدْعُ اِلىٰ سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ....." الآية:۱۲۵ (سورة النحل) "وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ....." الآية (سورة القصص:۷۷).

چاہئے، اور شرکت ہو جائے تو ایسا کرنے والوں کو اُن کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۷ھ

مرد اُمیدوار کی موجودگی میں عورت کو ''ووٹ'' دینے کا حکم

سوال:- مرد اُمیدوار کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا اسلام کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- مرد اُمیدواروں کی موجودگی میں جو بہتر نمائندگی کر سکتے ہوں، عورت کو سردار تسلیم کرنا اور اُسے ووٹ دینا شرعاً جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۷/۲۸ ج)

پاکستان سے اِلحاق کرنے والے ریاست کے ایک حکمران کو معاہدے کے تحت دی گئی مراعات واپس لینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین ومفتیانِ شرعِ متین اس صورتِ حال کے بارے میں کہ ایک ریاست ''الف'' جو کہ اَز رُوئے قانون آزادیٔ ہند مجریہ ۱۹۴۷ء ۱۴/اگست سلطنتِ برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوگئی اور اس کا حکمران بموجب قانون اس اَمر کا حق دار ہوگیا کہ وہ آزاد مملکت ہندوستان یا نوزائیدہ مملکت پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کرلے یا آزاد رہے۔ چنانچہ ریاست ''الف'' کے حکمران نے مطابق دستاویزِ شمولیت (جس کا اُردو ترجمہ منسلک ہے) پاکستان میں محض جذبۂ اِسلامی وجذباتِ دِینی وملّی کی بناء پر شمولیت اختیار کرلی، جس کے نتیجے میں حکمرانِ مذکور اور اس کے اہلِ خاندان کو ہندوستان کے حملے اور ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، اور اپنی ریاست اور جملہ املاک و جائیداد سے محروم ہونا پڑا، دستاویزِ شمولیت کے مطابق شق نمبر ا میں حکمران مذکور نے اپنی ریاست کا الحاق پاکستان میں کرنے کا عہد کیا ہے، اور اسے پاکستانی مقنّنہ اور سپریم کورٹ کا پابند کیا ہے، بشرطیکہ دستاویز

---

(۱) فی الشامیة ج:۶ ص:۳۴۸ (طبع سعید) لو دعی الیٰ دعوة فالواجب الاجابة ان لم یکن هناک معصیة ولا بدعة والامتناع أسلم فی زماننا اِلّا اذا علم یقیناً أن لا بدعة ولا معصیة اھ۔

(۲) فی صحیح البخاری، کتاب المغازی، کتاب النبی صلی الله علیه وسلم إلٰی کسریٰ وقیصر، رقم:۴۰۷۳ ج:۲ ص:۶۷۳ (طبع قدیمی کتب خانه) "..... لما بلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم أن أهل فارس قد ملکوا علیهم بنت کسریٰ قال: لن یفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة"۔ نیز دیکھئے کفایت المفتی، کتاب السیاسیات ج:۹ ص:۳۴۹ (طبع جدید دارالاشاعت)۔

میں دی گئی شرائط کو ملحوظ رکھا جائے۔

شق نمبر ۶ و ۷ میں آئندہ بنائے جانے والے قوانین و آئین کے ذریعے کوئی تبدیلی یک طرفہ نوعیت کی جس کی منظوری حکمرانِ مذکور سے حاصل نہ کرلی جائے عمل میں نہ لائی جائے۔

اس شمولیت کے تحت حکومتِ پاکستان کی جانب سے تحفظات و مراعات خصوصی نوعیت کی حکمرانِ مذکور کو حاصل تھیں اور جو ۴۷-۹-۲۴ سے رائج تھیں، مگر سابقہ حکومت نے حکمرانِ مذکور کی منظوری کے بغیر یک طرفہ طور پر ان تمام مراعات اور تحفظات کو سلب کرلیا اور حکمرانِ مذکور کو ان سے محروم کردیا۔

۱:- اَز رُوئے شریعتِ محمدی اور قرآن وسنت اسلامی حکومت پاکستان کا یہ یک طرفہ قدم جو کہ دستاویزِ شمولیت کی صریح خلاف ورزی ہے، کیا شرع اور دِینی اِعتبار سے اس کا کوئی جواز ہے؟ اور کیا اَز رُوئے فقہِ اسلامی یہ یک طرفہ تبدیلیٔ معاہدہ جائز ہے یا ناجائز؟

۲:- اگر یہ فعل ناجائز ہے تو کیا ایسی کوئی حکومت جو کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی مدعی اور علی الاعلان دعوے دار ہو سابقہ حکومت کی اس پالیسی اور فیصلے کی پابند ہے جو کہ اس نے دِینی اور اَخلاقی حدود سے تجاوز کرکے کیا ہو؟

۳:- کیا شرعی اعتبار سے حکمرانِ مذکور اس یک طرفہ انحرافِ معاہدہ کی بنا پر کسی ہرجانے اور تاوان کا مستحق ہے؟ اس نقصان اور اذیت کے بدلے میں جو اس بنا پر اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو پہنچا ہو؟

چنانچہ گزارش ہے کہ مذکورہ بالا اُمور میں فتویٰ و فیصلہ قرآن وسنت اور اَحادیثِ نبوی کی روشنی میں صادر فرمایا جائے۔

از طرف

غلام معین الدین

تنقیح

اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز منسلک نہیں ہے، جواب اس دستاویز کے مطالعے پر موقوف ہے، اس لئے اس اِستفتاء کے ساتھ معاہدے کی دستاویز اِرسال کی جائے تو اصل سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

محمد تقی عثمانی

جوابِ تنقیح

سوال کے ساتھ دستاویز منسلک ہے۔

جواب:- حکومتِ پاکستان کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ اس معاہدے کی پابندی کرے،[1] جو کسی ریاست کے اِلحاق کے وقت والیٔ ریاست سے کیا، لیکن منسلکہ دستاویز شمولیت میں والیٔ ریاست کے لئے کسی قسم کی خصوصی مراعات وتحفظات کا ذکر نہیں، البتہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور قانونِ آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں جن کا ذکر دستاویز شمولیت کی دفعہ نمبر ا و ۲ میں ہے، والیٔ ریاست کو کچھ خصوصی مراعات وتحفظات دیئے گئے ہوں تو ان مراعات وتحفظات کی پابندی حکومتِ پاکستان پر اس وقت تک لازم ہے جب تک ریاست کا اِلحاق پاکستان کے ساتھ باقی ہے، اور اگر مذکورہ دو قوانین میں بھی کوئی مراعات وتحفظات موجود نہیں ہیں یا معاہدے کے بعد کسی اور دستاویز کے ذریعے طے پائے ہیں تو ان کی تبدیلی سے معاہدۂ شمولیت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس صورت میں اس دُوسری دستاویز کو دیکھ کر ہی اس کا شرعی حکم بتایا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۰/۴/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶۴/۳۱ ب)

سرکاری ملازمتوں اور املاک واراضی میں ترجیح کی بنیاد علاقائی وجغرافیائی عصبیت ہے یا اہلیت؟

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، واضح ہو کہ مندرجہ ذیل مسئلے پر اپنی علمی رائے اور دلائل سے مطلع فرماویں، ممنون ہوں گا، مطلوبہ جواب فتویٰ تصوّر نہ ہوگا۔

۱:- قرآن مجید، سنتِ نبوی وخلفائے راشدین یا فقہائے عظام کے اِرشادات کی روشنی میں ایک اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں (صوبوں) کے باشندوں کو، دُوسرے علاقوں کے باشندوں کے حق برائے حصول صوبہ جاتی سرکاری ملازمت، املاک واراضی میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے یا مختلف علاقوں کے باشندوں کے ان حقوق کو اس خاص علاقے کے باشندوں تک محدود رکھا گیا ہے؟

۲:- کیا اگر ایک اسلامی مملکت میں ایک علاقے کے باشندوں کو دُوسرے علاقوں میں معاشی حقِ اِنتفاع کے سلسلے میں ایسا یکساں اِستحقاق نہ دیا جائے تو یہ شرعاً دُرست ہوگا؟

۳:- کیا اسلامی نظریۂ عدل کی رُو سے ایسے یکساں معاشی اِستحقاق کی پالیسی بنانا اسلامی حکومت کے لئے شرعاً ضروری اور لازمی ہے؟

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" وفی سورة المائدة: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" الآية.

۴:- جب ایک اسلامی مملکت میں حقوق کے تحفظ کے نام پر علاقائی قومی عصبیت پیدا کی جارہی ہو تو اس وقت اس عصبیت کو روکنے کے لئے مختلف علاقوں (صوبوں) کے درمیان معاشی تحفظ کی وہ کونسی منصفانہ حکمتِ عملی بنانی چاہئے جو اسلامی نظریۂ عدل کے بھی مطابق ہو اور اِسلامی مملکت کی وحدت اور اِستحکام کے لئے بھی مفید ہو؟

اُمید ہے کہ آنجناب اس اہم مسئلے پر ہماری راہنمائی فرمائیں گے، شکریہ۔ آپ کی ذاتی رائے مطلوب ہے نہ کہ دارالافتاء کا فتویٰ۔

والسلام

خاکسار عبدالخالق سہریانی بلوچ

ایم اے ایل ایل بی

جواب:- محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا، آپ نے سرکاری ملازمتوں اور املاک و اراضی میں جغرافیائی اور علاقائی مساوات کے بارے میں جو سوال کیا ہے، اس کا جواب احقر کی رائے میں یہ ہے کہ اسلام نے کسی بھی منصب یا ملازمت کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ اُصول پیشِ نظر رکھا ہے کہ جس شخص کا تقرّر مقصود ہو اس میں اس منصب کی پوری اہلیت پائی جانی ضروری ہے، اور جو شخص جس منصب کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو، وہ اس منصب کا زیادہ اہل ہے، خواہ جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق کسی خطے سے ہو،[1] لہٰذا اس معاملے میں ترجیح کی بنیاد اہلیت ہے، نہ کہ جغرافیائی تعصّبات،[2] یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں ایک خطے کے باشندوں کو بلاتکلف دُوسرے خِطوں میں متعین کیا جاتا رہا ہے۔

لہٰذا یہ بات تو شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی کہ جس شخص میں کسی منصب کی اہلیت نہ ہو، اس کو محض اس لئے کسی منصب پر فائز کردیا جائے کہ وہ کسی خاص علاقے کا باشندہ ہے،[3] البتہ اگر مختلف خِطوں کے لوگ اہلیت کے اعتبار سے مساوی ہوں تو اس صورت میں انتظامی سہولت کی خاطر یہ اُصول مقرّر کرنا جائز ہے کہ ہر علاقے میں اسی علاقے کے اہل اَفراد کو ترجیح دی جائے، کیونکہ وہ اس علاقے کے مسائل اور لوگوں کی نفسیات سے بھی زیادہ واقف ہوگا، اور اس علاقے کے لوگ اس سے مانوس بھی زیادہ ہوں گے۔

اسی طرح اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کسی علاقے کے لوگ باہر کے کسی عہدہ دار کو دِل سے قبول نہیں کریں گے اور اس سے ملک وملت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے تو اس صورت

(۱ تا ۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر "معارف القرآن" ج:۲ ص:۴۴۹ (طبع ادارۃ المعارف کراچی)۔

میں اس بات کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے کہ ملت کو اِنتشار سے بچانے کے لئے کسی ایسے شخص کا تقرّر کردیا جائے جو فی نفسہٖ اہل تو ہو، لیکن دُوسرے علاقے کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا کہ حکمران قریش ہی میں سے ہوں گے،(۱) اس کی حکمت علامہ ابنِ خلدونؒ نے یہی بیان فرمائی ہے کہ اہلِ عرب کا قریش کے سوا کسی اور پر جمع ہونا مشکل تھا۔(۲)

لیکن اس بات کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں کہ لوگوں کے متعصّبانہ خیالات کی وجہ سے نااہل افراد کو ذمہ دارانہ منصب حوالے کردیئے جائیں،(۳) ایسی صورت میں لوگوں کی خواہشات کے اِتباع کے بجائے ان کے خیالات کی اِصلاح ضروری ہے۔(۴)

اُمید ہے کہ اس تفصیل سے آپ کے تمام سوالات کا جواب ہوگیا ہوگا، اگر پھر بھی کوئی اُلجھن باقی ہوتو دوبارہ ارشاد فرماویں، اِن شاء اللہ اپنی بساط کے مطابق جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

والسلام

۱/۷/۱۴۰۵ھ

---

(۱) وفی صحیح البخاری کتاب الأحکام ج:۲ ص:۱۰۵۷ (طبع قدیمی کتب خانه) باب الأمراء من قریش ..... سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول أن هٰذا الأمر فی قریش لا یعادیهم أحدٌ الّا کبّه الله علیٰ وجهه ما أقاموا الدین. وفیه أیضًا عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یزال الأمر فی قریش ما بقی منهم اثنان .....الخ. وکذا فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۱۹ (طبع سعید).

وفی مصنف ابن ابی شیبة رقم الحدیث:۳۳۰۵۵ ج:۱۷ ص:۲۸۵، ۲۸۶ (طبع ادارة القرآن کراتشی) عن أنس رضی الله عنه قال: أتانا رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن فی بیت رجل من الأنصار فأخذ بعضادتی الباب ثم قال: "الأئمّة من قریش."

(۲) وفی تاریخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون فی اختلاف الامّة فی حکم هٰذا المنصب وشروطه ج:۱ ص:۲۰۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولنتکلم الآن فی حکمة اشتراط النسب لیتحقق به الصّواب فی هٰذه المذاهب فنقول ان الأحکام الشرعیة کلها لا بدّ لها من مقاصد وحکم تشتمل علیها ...... وذٰلک ان قریشًا کانوا عصبة مضر وأصلهم وأهل الغلب منهم وکان لهم علیٰ سائر مضر العزّة بالکثرة والعصبیة والشرف فکان سائر العرب یعترف لهم بذٰلک ویستکینون لغلبهم فلو جعل الأمر فی سواهم لتوقع افتراق الکلمة بمخالفتهم وعدم انقیادهم ولا یقدر غیرهم من قبائل مضر أن یردّهم عن الخلاف ولا یحملهم علی الکرّة فتفترق الجماعة وتختلف الکلمة والشارع محذّر من ذٰلک حریصٌ علیٰ اتفاقهم ورفع التنازع والشتات بینهم لتحصل اللحمة والعصبیة وتحسن الحمایة بخلاف ما اذا کان الأمر فی قریش لأنهم قادرون علیٰ سوق الناس بعصا الغلب الیٰ ما یراد منهم فلا یخشیٰ من أحد خلاف علیهم ولا فرقة لأنهم کفیلون حینئذٍ بدفعها ومنع الناس منها فاشترط نسبهم القرشی فی هٰذا المنصب وهم أهل العصبیة القویة لیکون أبلغ فی انتظام الملّة واتفاق الکلمة .....الخ.

(۳) وفی صحیح البخاری کتاب العلم ج:۱ ص:۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) اذا وسد الأمر الیٰ غیر أهله فانتظر الساعة. وفیه أیضًا کتاب الرّقاق ج:۲ ص:۹۶۱ (طبع قدیمی) اذا أسند الأمر الیٰ غیر أهلهٖ فانتظر الساعة.

وراجع للتفصیل الیٰ شرحه فی فتح الباری ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع قدیمی کتب خانه) وعمدة القاری ج:۲ ص:۴ (طبع مکتبه رشیدیه).

(۴) وفی التفسیر الکبیر تحت آیة رقم:۵۸ من سورة النّساء: ویدخل فیه عدل الأمراء مع رعیتهم وعدل العلماء مع العوام بأن لا یحملوهم علی التعصّبات الباطلة بل یرشدونهم الیٰ اعتقادات وأعمال تنفعهم فی دنیاهم وأُخراهم.

کسی سیاست دان کا اِنتخابات کے موقع پر سیاسی جماعت سے کئے ہوئے وعدے کو توڑنے کا حکم

سوال:- حالیہ اِنتخابات کے نتیجے میں رحیم یارخان میں چند کونسلروں نے اپنا ایک گروپ تشکیل دیا، جس میں فلاں فلاں کونسلر شریکِ اجلاس ہوئے، اور تمام گروپ کے کونسلروں نے بالاتفاق حلفاً خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کیا کہ ہم آئندہ اِنتخاب میں بلدیہ رحیم یارخان کا چیئرمین چودھری عبدالحمید گاندھی کو اور وائس چیئرمین ہارون باجوا کو بنائیں گے، لیکن چند روز کے بعد دُوسرا حلف قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کرلیا کہ ہم سب میاں عبدالخالق گروپ میں ہیں اور جس کو میاں عبدالخالق جہاں چاہیں استعمال کریں، لیکن پھر اس کے علاوہ اخبارات اور دُوسرے ذریعے سے یہی اعلان کیا جاتا رہا کہ ہمارا نامزد چیئرمین عبدالحمید گاندھی ہے، لیکن آخری دن جبکہ چیئرمین کا اِنتخاب تھا تو دانستہ ان ممبران نے عبدالخالق کو چیئرمین کا ووٹ دیا، اور عبدالحمید گاندھی کو نظرانداز کیا گیا، جبکہ عبدالحمید گاندھی نے ان ممبران سے کہا کہ تم نے میری چیئرمینی کے لئے حلف دیا ہے، تو اَب مجھ کو چیئرمین بناؤ تو اس پر ممبران نے کہا کہ یہ سیاسی حلف تھا اور ہم نے تمہارا ووٹ صرف اس لئے استعمال کیا کہ ہمیں مزدور اور خاتون کی نشست مل جائے، اب وہ نشستیں ہم نے حاصل کرلیں، اب تمہاری ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اِنتخابات کے ایام ہی میں ان میں سے بعض ممبران نے عوام سے مسجدوں میں بیٹھ کر یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم کامیابی کے بعد اپنا ووٹ عبدالخالق کو نہ دیں گے، لیکن ان لوگوں کے اس واضح متضاد عمل اور حلف شکنی اور جان بوجھ کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر وعدہ خلافی سے جو دِینی اقدار پامال ہوئے اور لوگ اب قرآن پر حلف اُٹھانے کو مزاح سمجھنے لگ گئے ہیں، اس کے لئے علمائے دِین ومفتیانِ کرام فتویٰ صادر فرماویں کہ اگر ان کا یہ عمل دانستہ اور جان بوجھ کر تھا تو شریعتِ مطہرہ کی رُو سے ایسے لوگوں کا کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی معاشرے میں یہ لوگ عوام کے نمائندہ بن سکتے ہیں؟ (مرزا محمد رفیق)

جواب:- پہلا معاہدہ تحریری صورت میں ہوا تھا، اس تحریر کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں حلف یا قسم نہیں تھی، البتہ ایک عہد تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اس عہد میں شامل افراد کے لئے اس عہد کی خلاف ورزی بلاعذر جائز نہیں تھی،[1] البتہ اگر اس عہد کے بعد ان کو دیانت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو منتخب کرنے کا عہد کیا گیا ہے، دُوسرا اس کے مقابلے میں بہتر ہے، تو اس عذر کی وجہ سے ان کے لئے جائز تھا کہ اس عہد کو منسوخ کر کے اس شخص کو منتخب کرتے جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔ صورتِ

(۱) فی القرآن الکریم: "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" سورۃ الاسراء آیۃ: ۳۴.

مسئولہ میں اگر ان لوگوں نے اس قسم کے صحیح عذر کے بغیر عہد شکنی کی تو سخت گناہگار ہوئے اور ایسے لوگ نمائندگی کے اہل نہیں، اور اگر فیصلے کی تبدیلی کسی عذر کی بناء پر تھی تب بھی آخر وقت تک اپنے دِلی اِرادے کے خلاف اعلان کرتے رہنا جھوٹ ہے، اور وہ بھی سخت گناہ ہے، لہٰذا جو لوگ اس جھوٹ کے مرتکب ہوئے وہ بھی سخت گناہگار ہوئے،[۱] اور ایسے لوگ بھی نمائندگی کے اہل نہیں تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے صدقِ دِل کے ساتھ توبہ نہ کریں۔[۲] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

جماعتِ اسلامی، جمہوریت اور جمعیت علمائے اسلام کے بارے میں ایک سوال کا جواب

سوال:- ''تحریکِ جمہوریت'' کے نام سے جو جماعت معرضِ وجود میں آئی ہے، جماعتِ اسلامی بھی جس کی حامی ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مودودی صاحب اسلامی نظام کی آڑ لے کر اس ملک کو امریکا کی گود میں ڈالنا چاہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ جماعتِ اسلامی کا یہ موقف کیا دُرست ہے کہ جمہوریت کی بحالی دراصل اسلامی نظام لانے کی کوشش کا ذریعہ ہے، جس طرح پاکستان حاصل کرنے کا ذریعہ جداگانہ اِنتخاب ہی تھا۔

۲:- دُوسرا مسئلہ جو آج کل ملک میں بڑی شد و مد کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے اور شد و مد کے ساتھ مخالفت بھی کی جارہی ہے، وہ ہے ''سوشلزم'' اس نظام کی داعی نیشنل عوامی پارٹی ہے، لیکن تائید میں جمعیت علمائے اسلام کے بعض ذمے دار حضرات بھی بیان دے رہے ہیں، جماعتِ اسلامی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہے، جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے سوشلزم کا نعرہ کیونکر دُرست اور مطابق عین اسلام ہوگا؟ جمعیت علمائے اسلام اس سلسلے میں جو کچھ کر رہی ہے اس میں آنجناب اور دیگر علماء کس حیثیت سے شامل ہیں؟

جواب:- جہاں تک جماعتِ اسلامی میں شمولیت و عدمِ شمولیت کا تعلق ہے، اس کا جواب اس مطبوعہ ورق میں موجود ہے، جو آپ کو پہلے اِرسال کیا جاچکا ہے۔

رہی تحریکِ جمہوریت کی بات! سو جب متحدہ حزبِ اختلاف نے یہ مہم شروع کی تھی تو حسین شہید سہروردی مرحوم نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کو اس تحریک میں شامل ہونے کی

(۱ و ۲) قال اللہ تعالیٰ: ''اِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا'' الآية:۵۸ سورة النساء.

فی صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۶ (طبع قدیمی کتب خانہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''علیکم بالصدق! فان الصدق یھدی الی البر وان البر یھدی الی الجنّة .... وایاکم والکذب! فان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النّار .....'' الحدیث: ۱۲۷۴.

دعوت دی تھی، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ''ہمارا اصل مطالبہ اسلامی نظام کا قیام ہونا چاہئے، پھر اگر اِسلام میں کسی درجے کے اندر جمہوریت ہے تو وہ خود بخود اس مطالبے کے اندر آجائے گی، لیکن نری جمہوریت کی تحریک میں شمولیت سے معذور ہوں۔'' اس جملے سے آپ تحریکِ جمہوریت کے بارے میں ان کے موقف کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

اب سوشلزم کی بات رہ جاتی ہے، تو اس میں کوئی ایسا مسلمان جو اِسلام اور اِشتراکیت سے واقف ہو، شک نہیں کرسکتا کہ سوشلزم اسلام کے یکسر منافی نظام ہے، اِسلام اپنا الگ معاشی نظام رکھتا ہے جو سرمایہ داری اور اِشتراکیت دونوں سے مختلف ہے، جو شخص اسلام کے بارے میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو وہ سوشلزم کو اِسلام کے مطابق نہیں کہہ سکتا۔ موجودہ جمعیت علمائے اسلام کا بھی کوئی ایسا بیان ہمارے علم میں نہیں ہے جس میں اُس نے سوشلزم کی حمایت کی ہو۔ بلکہ اِس الزام کی بعض تردیدیں نظر سے گزری ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ موجودہ جمعیت علمائے اسلام وہ جمعیت نہیں ہے جس نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی تھی اور جس کی بنیاد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اس جمعیت کا مارشل لاء کے بعد احیاء نہیں کیا گیا، موجودہ جمعیت علمائے اسلام ایک دُوسری جماعت ہے جو قیامِ پاکستان کے بہت بعد قائم ہوئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اس جماعت کے کبھی رُکن نہیں رہے، اور نہ اس کی پالیسی میں حضرت مدظلہم کے مشوروں کا کوئی دخل ہے، لہٰذا اس کے کسی قول وفعل کی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

☆☆☆

کتاب الدّعویٰ

(دعویٰ، گواہی اور فیصلوں کے مسائل کا بیان)

قانون ''میعادِ سماعت'' کی شرعی حیثیت

(قانون ''میعادِ سماعت'' کی حقیقت، تاریخ، شرعی تصوّر، دلائل، پچھلے زمانوں میں اس کی موجودگی، اور اس قانون کی حکمت پر مفصل فتویٰ)

سوال:- بعض جدید ترقی یافتہ ممالک میں "Limitation Act" کے نام سے جو اُصول وقوانین رائج و نافذ ہیں، ان کی تاریخ کیا ہے؟ اور کیا وہ سراسر غیر اِسلامی اُصول ہیں؟ اگر یہ اُصول وقوانین غیر اِسلامی ہیں تو دیوانی و فوجداری مسائل و اُمور میں چارہ جوئی کی میعاد کا عدمِ تعین جو عملی خرابیاں پیدا کرتا ہے اس کا تدارک کیونکر کیا جاسکتا ہے خصوصاً اگر اس عدمِ تعین کو کاٹ کے "Categonical Imperatin" کی حیثیت دی جائے تو جائیداد غیرمنقولہ کے برسوں پُرانے معاملات متأثر ہوتے ہیں، اگر یہ اُصول وقوانین غیر اِسلامی نہیں تو ان کے اِسلامی ہونے کا کیا جواز ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں شفعہ چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے؟

اگر عنقریب قومی اتحاد برسرِ اِقتدار آجائے تو پورا کا پورا اسلام کیونکر نافذ ہوگا اور "Limitation Act" کو کس طرح مشرف بہ اسلام کیا جائے گا؟ یا پھر اُسے کس بناء پر ایک کلمہ گو قانون کی حیثیت حاصل ہوگی؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں، آمین۔

گرامی نامہ باعثِ مسرّت و اِفتخار ہوا، آپ کے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ قانونِ میعادِ سماعت (Limitation Act) سراسر غیر اِسلامی قانون نہیں ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ''اسلام کی تاریخ میں شفعہ کو چھوڑ کر اس نوعیت کے قوانین کبھی نافذ نہیں رہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عدالتیں بھی میعادِ سماعت کا لحاظ کرتی رہی ہیں، خاص طور سے ترکی خلافت کے دور میں عالمِ اسلام کے تمام قاضی خلیفۂ وقت کی مقرّر کردہ میعادِ سماعت پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور فقہائے اسلام نے اُن کے اس عمل کی نہ صرف توثیق وتائید کی ہے بلکہ خلیفۂ وقت کے منشور کے جاری ہونے کے بعد اس کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ ''الاشباہ والنظائر'' کے مشہور شارح علامہ حمویؒ نے اپنے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے سلاطین نے تمام قاضیوں کو یہ حکم دیا ہوا ہے کہ وہ وقف اور وراثت کے سوا کوئی

دعویٰ بناءِ دعویٰ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قابلِ سماعت نہ سمجھیں، اور فتاویٰ حامدیہ میں (جس کی تنقیح علامہ ابنِ عابدین شامیؒ نے کی ہے) اس مسئلے پر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے فقہاء کے فتاویٰ نقل کئے ہیں جو اس بات پر یک زبان ہیں کہ سلطان کی طرف سے اس ممانعت کے اجراء کے بعد پندرہ سال بعد کوئی مقدمہ داخل نہ کیا جائے۔[1] البتہ علامہ خیرالدین رملیؒ نے فتاویٰ خیریہ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس بارے میں ہر خلیفہ کی طرف سے ازسرِنو حکم جاری ہونا میعادِ سماعت کی پابندی کے لئے ضروری ہے۔

البتہ مختلف زمانوں میں مختلف میعادیں مقرّر کی گئی ہیں، فقہِ حنفی کی کتابوں میں بعض مقدمات کے پندرہ سال، بعض کے لئے تینتیس سال اور بعض کے لئے چھتیس سال کی مدتیں مقرّر کی گئی ہیں، مثلاً درمختار میں ہے:[2] **"القضاء مظهر لا مثبت ويتخصص بزمان ومكان وخصومة حتّٰى لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ، قلت: فلا تسمع الآن بعدها الا بأمر."**

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے اس مسئلے پر کافی مفصل بحث کی ہے، اور اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ: **"قال المتأخرون من أهل الفتوىٰ: لا تسمع الدعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعى غائبًا أو صبيًّا[3] ....الخ."**

بلکہ علامہ شامیؒ نے شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: **"اذا ترک الدعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ ثم ادّعى لا تسمع دعواه."** (ردّ المحتار، كتاب القضاء مطلب فی عدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة ج:۲ ص:۳۴۴، مطبوعه ديوبند)۔[4]

(۱و۲) ج:۵ ص:۴۱۹ (طبع سعید) نیز دیکھئے حاشیہ نمبر۴۔

(۳) رد المحتار ج:۵ ۴۲۲ (طبع سعید).

(۴) کتاب القضاء ج:۵ ص:۴۲۲ (طبع سعید).

وفى الفتاوىٰ تنقيح الحامدية، كتابُ الدّعوىٰ ج:۲ ص:۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه) وقال المتأخرون من أهل الفتوىٰ لا تسمع الدّعوىٰ بعد ست وثلاثين سنة الّا أن يكون المدعى غائبًا أو صبيًّا أو مجنونًا أو المدعى عليه أميرًا جائرًا يخاف منه كذا فى الفتاوىٰ العتابيه.

وقال فى البحر عن المبسوط ترک الدّعوىٰ ثلاثًا وثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدّعوىٰ ثم ادعىٰ لا تسمع دعواه لأنّ ترک الدّعوىٰ مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا .... والحاصل من هذه النقول أن الدّعوىٰ بعد مضى ثلاثين سنة أو بعد ثلاثة وثلاثين لا تسمع اذا كان التّرک بلا عذرٍ من الأعذار المارة لأن تركها هذه المدّة مع التمكن يدلّ علىٰ عدم الحق ظاهرًا ....الخ.

وفى الفتاوىٰ الكاملية كتاب الدّعوىٰ ص:۱۱۳.

وفى مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر فصل قضاء المرأة فى غير حد وقود ج:۶ ص:۸۸ لو أمر السلطان بعدم سماع الدعوىٰ بعد خمس عشرة سنة يجب عليه عدم سماعها ولو سمعها وقضى لا ينفذ لأنّه لا يصير قاضيًا بالنّسبة الىٰ تلک الحادثة كما فى المنح.

.................................(باقی اگلے صفحے پر)

شمس الائمہ سرخسیؒ خلافتِ عباسیہ کے دور کے ہیں، جس سے واضح ہوا کہ میعادِ سماعت کا یہ تصوّر خلافتِ عباسیہ میں بھی موجود تھا، افسوس ہے کہ میں اس وقت پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے صاحبِ فراش اور چلنے سے معذور ہوں، اس لئے دُوسری کتابوں کی مراجعت اس وقت ممکن نہیں، ورنہ اس پر شاید اور بھی قدیم حوالے دستیاب ہوجاتے، تاہم صرف علامہ شامیؒ کی مذکورہ تصریحات سے بھی اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ میعادِ سماعت کا تصوّر نہ صرف غیر اِسلامی نہیں، بلکہ اسلامی عدالتیں ہر دور میں اس پر کسی نہ کسی شکل میں عمل پیرا رہی ہیں۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے، اور شاید آپ کو بھی یہی شبہ ہوا ہو کہ محض تأخیر کی بنا پر ایک صاحبِ حق کو حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے؟

موجودہ قوانین میں اس سوال کا جواب نصفت (Equity) کے ان مقولوں کے ذریعے دیا گیا ہے کہ:-

"The Law aids the diligent and not the indolent."

قانون چوکس لوگوں کی مدد کرتا ہے، غافلوں کی نہیں۔

"Ther Should be an end to Litigation"

عدالتی مخاصموں کی کوئی انتہا ہونی چاہئے۔

لیکن یہ مقولے موجود قوانین کے حق میں اس لئے پورے اطمینان بخش نہیں ہوتے کہ وہاں دیانت اور قضاء کی کوئی تعریف کم از کم عملاً نہیں ہے، بلکہ جو حق عدالت سے مسترد ہوگیا، عملاً وہ حق ہی نہیں رہا۔ اس کے بجائے اسلامی فقہ میں دیانت اور قضاء کے اَحکام ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہٰذا اگر عدالت نے کسی حق کا تصفیہ کرنے سے انکار کردیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حق نہیں رہا، بلکہ وہ حق موجود ہے اور جس کے ذمے حق ہے اُس پر دیانۃً فرض ہے کہ وہ اُسے صاحبِ حق تک پہنچائے، خواہ کتنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وفی الفتاویٰ الأنقرویة ج:۲ ص:۵۸ وفی المبسوط رجل ترک الدّعویٰ ثلاثًا وثلاثین سنة ولم یکن لهٗ مانع من الدّعویٰ ثم ادعیٰ لهٗ لا تسمع دعواهٗ لأنّ ترک الدّعویٰ مع التمکن علیه یدلّ علیٰ عدم الحق ظاهرًا۔

وفی درر الحکام المادّة:۱۶۶۰ ج:۴ ص:۲۶۱ (طبع مکتبه علمیه) اذا ادّعیٰ أحد بأنّ العقار کالدّار والکرم الّذی فی تصرّف شخصٍ آخر مدّة خمس عشرة سنة بلا نزاع بأنّه ملکه أو أنّ لهٗ حصة فیه فلا تسمع دعواهٗ اھ۔

(وکذا فی الشامیة ج:۵ ص:۴۲۲ طبع سعید)۔

وفی شرح المجلّة للأتاسیّ رقم المادّة:۱۶۶۳ ج:۵ ص:۱۷۷ قال المتاخرون من أهل الفتویٰ لا تسمع الدّعویٰ بعد ست وثلاثین سنة الّا أن یکون المدعی غائبًا أو صبیًّا أو مجنونًا ولیس لهما ولی أو المدّعی علیه أمیرًا جابرًا۔

وفیها أیضًا رقم المادّة: ۱۶۷۰ ج:۵ ص:۱۸۷ اذا ترک المورث الدّعویٰ مدّة یترکها الوارث أیضًا مدّة وبلغ مجموع المدتین حدّ مرور الزمان فلا تسمع۔

زمانہ بیت چکا ہو، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو عدالت خواہ اُسے کچھ نہ کہے، لیکن وہ گنہگار ہوگا، اسی لئے فقہاءؒ کا یہ مقولہ ''الاشباہ والنظائر'' وغیرہ میں درج ہے کہ: ''الحق لا یسقط بتقادم الزمان''[1] یعنی ''حق زمانہ گزر جانے کی بناء پر ساقط نہیں ہوتا'' اس سے مراد یہی ہے کہ میعادِ سماعت گزر جانے کے باوجود وہ حق موجود ہے جس کا ایک اثر تو اُخروی ہے کہ اس حق کو تلف کرنے والا گنہگار ہے، دُوسرا اثر دُنیوی ہے کہ جس شخص کو بھی اس حق تلفی کا یقینی علم ہوگا وہ اس پر فاسق کے اَحکام جاری کرے گا، جس سے اس کے ساتھ اس کے سارے معاملات متأثر ہوں گے، تیسرا اثر یہ ہے کہ اگرچہ عدالت اس مسئلے کو سننے سے انکار کرچکی، لیکن اگر خلیفہ کے پاس اپیل پہنچے اور وہ محسوس کرے کہ مقدمہ جان دار ہے اور اس میں چال بازی بظاہر نہیں ہے تو فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ وہ اسے کسی قاضی کے پاس بھیج سکتا ہے، اس صورت میں قاضی اس کی سماعت کرے گا (شامی ج:۴ ص:۳۴۳)[2]۔

نیز ایسی صورت میں صاحبِ حق قاضی کو ثالث بنا کر بھی فیصلہ کراسکتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملاً بھی میعادِ سماعت سے حق ساقط

---

(۱) وفی ردّ المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ (طبع سعید) قد استفید من کلام الشارح أن عدم سماع الدّعویٰ بعد ھٰذہ المدّة انّما ھو للنھی عنه من السلطان فیکون القاضی معزولًا عن سماعھا لما علمت من ان القضاء یتخصص فلذا قال الّا بأمر أی فاذا أمر بسماعھا بعد ھٰذہ المدّة تسمع وسبب النھی قطع الحیل والتزویر فلا ینافی ما فی الاشباہ وغیرھا من أن الحق لا یسقط بتقادم الزمان ولذا قال فی الاشباہ أیضًا ویجب علیه سماعھا أی یجب علی السلطان الّذی نھٰی قضاته عن سماع الدّعویٰ بعد ھٰذہ المدّة أن یسمعھا بنفسه أو یأمر بسماعھا کی لا یضیع حق المدّعی والظّاھر أن ھٰذا حیث لم یظھر من المدّعی امارة التزویر ....الخ.

وفی شرح المجلّة رقم المادّة:۱۶۷۴ ص:۹۹۶ لا یسقط الحق بتقادم الزّمان فاذا أقرّ المدعیٰ علیه واعترف صراحة فی حضور الحاکم بأن حق المدعی عندہ فی الحال علی الوجه الّذی یدعیه وکان قد مرّ الزّمان علی الدّعویٰ فلا یعتبر مرور الزّمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۱ ص:۳۳۲ ثم اعلم ان عدم سماعھا لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق حتّی یرد أن ھٰذا قول مھجور لأنّه لیس ذٰلک حکمًا ببطلان الحق، وانّما ھو امتناع عن القضاة عن سماعھا خوفًا من التّزویر ولدلالة الحال کما دل علیه التّعلیل والّا فقد قالوا ان الحق لا یسقط بالتقادم کما فی قضاء الاشباہ فلا تسمع الدّعویٰ فی ھٰذہ المسائل مع بقاء حقّ للآخرة ولذا لو أقرّ به یلزمه کما فی مسئلة عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی خمس عشرة سنة اذا نھی السلطان عن سماعھا کما تقدّم قبیل باب التحکیم فاغتنم ....الخ.

وفی تکملة حاشیة ردّ المحتار ج:۷ ص:۴۸۷ (طبع سعید) ثم اعلم أن عدم سماع الدّعویٰ بعد مضی ثلاثین سنة أو بعد الاطلاع علی التّصرف لیس مبنیًّا علیٰ بطلان الحق ذٰلک وانّما ھو مجرّد منع للقضاة عن سماع الدّعویٰ مع بقاء الحق لصاحبهٖ حتّی لو أقرّ به الخصم یلزمه ولو کان ذٰلک حکمًا ببطلانه لم یلزمهٗ ویدلّ علیٰ ما قلناہٗ تعلیلھم للمنع بقطع التّزویر والحیل کما مرّ فلا یرد ما فی قضاء الاشباہ من أن الحق لا یسقط بتقادم الزّمان ثم رأیت التصریح بما نقلناہٗ فی البحر قبیل فصل دفع الدّعویٰ ......الخ.

(۲) وفی رد المحتار ج:۵ ص:۴۲۰ یجب علی السلطان الذی نھٰی قضاته عن سماع الدعویٰ بعد ھٰذہ المدة ان یسمعھا بنفسه أو یأمر بسماعھا کی لا یضیع حق المدعی والظاھر ان ھٰذا حیث لم یظھر من المدعی امارة التزویر ...الخ.

نہیں ہوتا، میعادِ سماعت مقرّر کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد بھی اگر حقِ سماعت باقی رکھا جائے تو اس سے ایک طرف تو مقدمات میں مکر وفریب اور جھوٹی گواہیوں کا امکان بڑھ جائے گا، کیونکہ مدّتِ دراز گزرنے کے بعد واقعے کے عینی گواہ ملنے مشکل ہوتے ہیں، اور مل بھی جائیں تو واقعے کی پوری تفصیلات ذہن میں نہیں رہتیں، اس لئے اس قسم کے مقدمات عدالتوں میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مقدمات میں غیر ضروری تعویق ہو اور لاینحل مسائل کھڑے ہو جائیں، میعادِ سماعت کی یہی حکمت ہمارے فقہاء نے بھی بیان فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فقہ میں اس کی بنیاد موجود ہے، اور جب کبھی شریعت کی بنیاد پر موجودہ قوانین کی تدوینِ نو کی جائے گی تو اس قانون کو بالکلیہ مسترد یا منسوخ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس پر مذکورہ فقہی بنیادوں پر نظرِ ثانی کی جائے گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں اتنی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی جتنی دُوسرے بہت سے قوانین میں ضرورت پیش آئے گی۔ (۱)　　والسلام

۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۹۸۷/۲۸ ج)

مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے بھی دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا جائز نہیں

سوال:- جنابِ محترم!

دُوسرا اِستفتاء مذکورہ مسجد کے متعلق کچھ اس طرح مطلوب ہے، چونکہ علاقے کے کچھ لوگ اس کو مسجد ہی تسلیم نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ اس علاقے میں مسجد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس پلاٹ پر لائبریری یا اسی قسم کا کوئی سینٹر وغیرہ علاوہ مسجد کے قائم ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں حضرات نے اپنا اثر ورُسوخ استعمال کرکے مسجدِ ھٰذا منہدم کرانے کا حکم جاری کرادیا، اس صورتِ حال کے پیشِ

(۱) ''قانون میعادِ سماعت'' سے متعلق مزید اہم تفصیلات کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' ج:۲ ص:۲۱۹ تا ص:۲۳۶ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کا ایک اہم فیصلہ بعنوان ''غاصبانہ قبضہ اور حقِ ملکیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

نظر اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اس معاملے کو عدالت میں پیش کیا جائے، اور فوری طور سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی عدالت سے لے لیا جائے، چنانچہ مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار نے ایک وکیل صاحب سے مل کر تمام حالات بتائے اور انہیں متعلقہ تمام کاغذات دِکھائے، وکیل صاحب نے اطمینان دِلایا کہ ان شاء اللہ مسجد منہدم نہیں ہوگی۔ عدالت سے میں کوشش کر کے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکم جاری کراؤں گا۔ پھر انہوں نے کئی صفحات پر مشتمل ایک دعویٰ نامہ تیار کر کے اسے ٹائپ کروایا، اس تحریری دعوے کو عدالت میں داخل کرنے سے قبل مسجد کمیٹی کے ایک عہدے دار سے دستخط کروائے اور خود وکیل صاحب نے بھی اس پر دستخط کئے۔

مذکورہ عہدے دار کے دستخط کرنے کے بعد وکیل صاحب نے بتایا کہ میں نے اس تحریر میں ایک پوائنٹ یہ بھی دِکھایا ہے کہ اس پلاٹ پر جس پر اب مسجد قائم ہے اس پر علاقے کے لوگ گزشتہ کئی سالوں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں، جبکہ حقیقۃً ایسا نہیں، لیکن اِستفسار پر وکیل صاحب نے کہا کہ مسجد کو منہدم ہونے سے بچانے کے لئے میں نے ایک قانونی اور عدالتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ پوائنٹ رکھا ہے۔ الحمدللہ وکیل صاحب بھی مسلمان اور پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں، اور پھر وکیل صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ہمارے اس بیان سے قائم شدہ مسجد اِن شاء اللہ اُمید قوی ہے کہ عدالت کی جانب سے مسجد کو منہدم نہ کرنے کا حکمِ امتناعی جاری کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید تقویت دِلائی کہ ہمارے اس بیان سے کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا یا کسی کا حق مارنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے گھر کو شہید ہونے سے بچانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے۔

چونکہ حکامِ بالا کی جانب سے مسجد کو منہدم کرنے کا حکم جاری ہو چکا تھا، ان کا عملہ کسی بھی وقت آ کر اسے منہدم کر سکتا تھا، اب صرف یہی صورت تھی کہ عدالت کا حکم ہی انہیں اس کو منہدم کرنے سے روک سکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہوئے مسجد کمیٹی کے یہ عہدے دار خاموش رہے اور وکیل صاحب نے عدالت میں کاغذات داخل کر دیئے، عدالت نے حکمِ امتناعی جاری کرنے سے انکار کر دیا اور ہمارا پیش کردہ مقدمہ خارج کر دیا۔ اس کے بعد مسجد کو منہدم کرنے کے لئے سرکاری عملہ موقع پر پہنچ گیا، لیکن ان پر کیا ہیبت طاری ہوئی کہ وہ مسجد کو منہدم کئے بغیر واپس چلے گئے، اور ابھی تک اللہ کے فضل سے مسجد قائم و دائم ہے، لوگ باجماعت پنج وقتہ نمازیں ادا کر رہے ہیں۔

جواب:- دعوے میں جھوٹ اور خلافِ واقعہ بات کہنا ہرگز جائز نہیں تھا۔ اس ناجائز کام پر صدقِ دِل سے توبہ ضروری ہے، مسجد کی ہر قیمت پر تعمیر فرض نہیں، جھوٹ سے بچنا فرض ہے۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۹/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۹۶/۳۹ و)

حضرت ولید بن عقبہؓ کے واقعۂ حد میں خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ پر ایک اِشکال کا جواب

سوال:- بخدمتِ اقدس مخدومی المعظم اُستاذی المحترم زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے کہ جنابِ والا بخیر و عافیت ہوں گے، دُعا ہے اللہ تعالیٰ جناب کے سایہ کو دائم قائم

---

(۱) وفی الآیة: "ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" (آل عمران: ۶۱).

وفی مشکوٰة المصابیح ج: ۱ ص: ۱۷ کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق الفصل الأوّل (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی ھریرة رضی اللہ عنہ: آیة المنافق ثلاث، زاد مسلم: وان صام وصلّی وزعم انّہ مسلم ثم اتفقا: اذا حدّث کذب واذا وعد أخلف واذا أؤتمن خان. (متفق علیہ).

وفی مشکوٰة المصابیح ج: ۲ ص: ۴۱۲ (طبع قدیمی) ایاکم والکذب وانّ الکذب یھدی الی الفجور وانّ الفجور یھدی الی النّار، وما یزال الرّجل یکذب ویتحرّی الکذب حتّی یُکتب عند اللہ کذّابًا. (متفق علیہ).

وفی مشکوٰة المصابیح کتاب الامارة والقضاء باب الأقضیة والشھادات، الفصل الأوّل (طبع قدیمی) عن أمّ سلمة رضی اللہ عنھا أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: انّما أنا بشر وانکم تختصمون الیّ ولعلّ بعضکم ان یکون ألحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علیٰ نحو ما أسمع منہٗ فمن قضیت لہ بشیء من حق أخیہ لا یأخذنہ فانّما أقطع لہ قطعة من النار. (متفق علیہ).

وفی الدّر المختار ج: ۶ ص: ۴۲۷ (طبع سعید) الکذب مباح لاحیاء حقہ ودفع الظّلم عن نفسہ والمراد التعریض لأنّ عین الکذب حرام قال وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ"

وفی الشامیة والضابط فیہ کما فی تبیین المحارم وغیرہ عن الأحیاء ان کل مقصود محمود یمکن التوصل الیہ بالصدق والکذب جمیعًا فالکذب فیہ حرام. وفیھا أیضًا بعد أسطر قال علیہ الصلاة والسلام: کل کذب مکتوب لا محالة الّا ثلاثة الرجل مع امرأتہٖ أو ولدہ والرّجل یصلح بین اثنین والحرب فانّ الحرب خدعة. قال الطحاوی وغیرہ وھو محمول علی المعاریض لأنّ عین الکذب حرام قلت وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ" وقال علیہ الصلاة والسلام: الکذب مع الفجور وھما فی النار، ولم یتعیّن عین الکذب للنّجاة وتحصیل المرام .....الخ.

وفی الدّر المختار أیضًا بعدہ ج: ۶ ص: ۴۲۸ (طبع سعید) وللصلح جاز الکذب أو دفع ظالم .....الخ.

وفی خلاصة الفتاویٰ ج: ۴ ص: ۳۴۶ (طبع رشیدیہ کوئٹہ) یجوز الکذب فی ثلاثة مواضع فی الصلح بین النّاس وفی الحرب، ومع امرأتہ ....الخ.

وفی سکب الأنھر کتاب الکراھیة فصل فی المتفرقات ج: ۲ ص: ۵۵۲ (طبع داراحیاء التراث العربی بیروت) والکذب حرام الّا فی الحرب للخدعة وفی الصلح بین اثنین وارضاء الأھل، وفی دفع الظّالم عن الظّلم والمراد التعریض لأنّ عین الکذب حرام، قال فی المجتبیٰ وھو الحق قال تعالیٰ: "قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ".

فرمائے آمین۔ آپ سے اس دور کے اندر اللہ تعالیٰ نے دِین کی حفاظت کا جو کام لیا ہے اور لے رہے ہیں، اس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہ پوری اُمت پر آپ کا احسان ہے، مشکل سے مشکل مسئلے کا حل آپ کی کتب میں ملتا ہے، بہت دِل خوش ہوتا ہے، اللّٰھم زد فزد، آمین۔

اس وقت حدِ شربِ خمر کی بحث میرے زیرِ مطالعہ ہے، جنابِ والا کی عظیم تالیف ''تکملہ'' سے بہت رہنمائی ملی ہے، اس وقت ایک ذہنی اُلجھن پیدا ہوگئی ہے، جس کو حل کرانے کے لئے خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ نادم بھی ہوں کہ آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ جنابِ والا کو اَجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

میری پریشانی یہ ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورِش میں رہ چکے ہیں، ان کے کردار سے واقف ہیں، جب کوفہ کے حاکم بنائے گئے تو ان کے خلاف سازش تیار کی گئی کہ انہوں نے شراب پی ہے، اور وہی سازشی لوگ شراب پینے کی شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ولید بن عقبہؓ کے خلاف دیتے ہیں، اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ولیدؓ کو طلب کرکے اس شہادت کے حوالے سے ان سے جواب طلبی کرتے ہیں، اور وہ جواب دیتے ہیں کہ ''فواللہ انھما لخصمان موتوران'' لیکن اس جواب کو پذیرائی نہیں بخشی گئی اور ان پر حد جاری کی گئی۔

اس پر میرا شبہ ہے جو یقیناً غلط ہوگا، لیکن اپنی غلطی مجھ پر واضح نہیں ہے، اس لئے جناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

شبہ یہ ہے کہ جب مدعا علیہ گواہان کو مجروح اور جرح بھی خصوصاً مجرد نہ ہو بلکہ وجہ بھی بیان کرے کہ گواہان ان کے سخت دُشمن ہیں، تو پھر اِنصاف کا تقاضا یہ ہے کہ صفائی کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان کی دُشمنی کو ثابت کرے، خصوصاً حدود کے اندر احتیاط بہت ضروری ہے جو شبہات سے ٹل جاتی ہے۔

فقہاء نے بھی عدالتی طریقۂ کار میں ملزم کو صفائی کا موقع دینے کا ذکر کیا ہے۔

حضرتِ والا نے تکملہ فتح الملہم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ میں اس واقعے پر تفصیل سے بحث کی ہے، جنابِ والا کا یہی رُجحان ہے کہ محض شہادت کی بناء پر ان پر حد جاری ہوئی ہے، ورنہ وہ اس کردار کے آدمی نہیں تھے، اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء کے اندر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی حد جاری کرنے میں تردّد تھا، بلکہ تکملہ کے پیرا نمبر ۷ ص:۵۰۱ پر لکھا ہے کہ ''أنّ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ لم یزل یشک فی صحّۃ شھادۃ الشھود علی الولید'' اس وضاحت سے میرا شبہ مزید مضبوط ہوجاتا ہے کہ ان کو صفائی کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ گواہان کی دُشمنی کو ثابت کرتے اور حد سے بچ جاتے،

مگر ایسا نہ ہوا۔

مجھے اس شبہ کے اظہار پر بھی تردّد لگتا ہے کہ چونکہ یہ عظیم ہستی کا فعل ہے جو یقیناً صحیح ہوگا، اور میرا شبہ کرنا غلط ہوگا، اس پر توبہ کرتا ہوں، چونکہ ایک عرصہ تک عدالتی کام سے واسطہ رہا ہے، وہاں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۲ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے، اس عادت کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے، جس کا ذکر کردیا ہے، آخر میں دُعا کی درخواست ہے۔

والسلام
جناب کا شاگرد
(قاضی) بشیر احمد عفا اللہ عنہ
باغ، آزاد کشمیر
۲۰۰۵/۳/۱۴ء

جواب:- گرامی قدر مکرّم جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تاریخی روایات سے اس دور کے کسی مقدمے کی مکمل کارروائی اور اس کی تفصیلات کا پورا علم نہیں ہوتا۔ راوی اپنی ترجیحات کے مطابق جو حصہ روایت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو صفائی کا موقع نہ دیا گیا ہو، قاعدے سے اگر انہوں نے گواہوں پر جرح کی تو اُس جرح کا بارِ ثبوت بھی اُن پر ہونا تھا، اور شاید وہ اسے مکمل طور پر ثابت نہ کرسکے ہوں، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے لئے ایک خلیفۂ راشد کے فیصلے کے بارے میں مطمئن ہونے کے لئے یہ احتمال بھی کافی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۶/۲/۲۱ھ

مدعا علیہ کی غیر موجودگی میں مدعی سے رقم لے کر اس کے حق میں فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:- تحصیل مولوی صاحب کے پاس کسی قسم کا تنازعہ آگیا، جناب کے پاس فیصلۂ شریعت کی درخواست کی گئی، مولوی صاحب نے مدعی اور مدعا علیہ کو بلاکر بیان لئے، بیان لے کر ہردو فریقین کو تاریخ دے دی، تاریخ سے قبل مدعی نے جاکر مولوی صاحب کو تھوڑی رقم روپیہ دیا، اور مدعا علیہ

(۱) تفصیل کے لئے تکملۃ فتح الملہم ج:۲ ص:۴۹۸ تا ۵۰۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے کوئی آدمی مخاصم تھے، یعنی دُشمن مخاصمان سے شہادت لے کر عدم موجودگیٔ مدعاعلیہ کے مولوی صاحب نے مدعی کے حق میں فیصلہ لکھ دیا، مدعی نے تاریخ سے قبل مدعاعلیہ کو پڑھ کر سنایا، مدعاعلیہ نے وہ فیصلہ نہ مانا، لہٰذا علاء الدین نے آگے دوبارہ درخواست کی کہ اس مسئلے پر غور فرمائیں چونکہ یہ مسئلہ غور کے قابل ہے، عند شریعت محمدی و مذہب حنفیہ کے مولوی صاحب کا حکم یک طرفہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

(مقامی دارالافتاء کی طرف سے جواب)

الجواب: "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ" الآية، "وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خٰلِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ"۔[1] دُوسری جگہ ہے: ولا تصح ولاية القاضي حتّى يجتمع في المولّى شرائط الشهادة ويكون من أهل الاجتهاد۔[2] دُوسری جگہ ہے: ولو كان القاضي عدلا ففسق بأخذ الرشوة أو غيره كالزنا وشرب الخمر۔[3] تیسری جگہ ہے: وينبغي للمقلد أن يختار من هو الأقدر والاولىٰ لقوله عليه السلام: من قلد انسانًا عملا وفي رعيته من هو اولى منه فقد خان الله ورسوله وجماعة المسلمين، وفي حد الاجتهاد كلام عرف في اصول الفقه حاصله أن يكون صاحب حديث له معرفة بالفقه ليعرف معاني الآثار او صاحب فقه له معرفة بالحديث لئلا يشتغل بالقياس في المنصوص عليه. (الهداية مع الدراية ص:۱۳۲، كتاب ادب القاضي)۔[4]

چوتھی جگہ: قال ولا يقضي القاضي علىٰ غائب الّا ان يحضر من يقوم مقامه وقال الشافعيؒ يجوز لوجود الحجة وهي البينة فظهر الحق ولنا ان العمل بالشهادة لقطع المنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد، ولأنه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم فيشتبه وجه القضاء لأنّ أحكامهما مختلفة. (الهداية مع الدراية ص:۱۴۲، كتاب ادب القاضي)۔[5]

والعدو لا تقبل شهادته علىٰ عدوه اذا كانت دنيوية ولو قضى القاضي بها لا ينفذ ذكره يعقوب باشا فلا يصح قضاؤهٗ عليه۔[6] دُوسری جگہ: اخذ القضاء برشوة للسلطان أو لقومه وهو عالم بها أو بشفاعة، جامع الفصولين وفتاوىٰ ابن نجيم أو ارتشى وهو أو أعوانه بعلمه شرنبلالية وحكم لا ينفذ حكمه. (الدر المختار كتاب القضاء ص:۳۰۶)۔[7]

---

(۱) سورة النساء آية:۱۴.
(۲) الهداية ج:۳ ص:۱۳۹ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانيه).
(۳) حوالہ سابقہ۔
(۴) الهداية ج:۳ ص:۱۴۰ كتاب ادب القاضي (طبع رحمانيه).
(۵) الهداية ج:۳ ص:۱۵۰ (طبع رحمانيه).
(۶) الدر المختار ج:۵ ص:۳۵۶، ۳۵۷ (طبع سعيد).
(۷) الدر المختار ج:۵ ص:۳۶۲، ۳۶۳ (طبع سعيد).

ھٰذا مشتمل علیٰ ثلاثۃ صوَر: ۱-رشوت ستانی، ۲-شہادت دُشمن بردُشمن، ۳-عدم موجودگی مدعاعلیہ، جبکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تین صورتوں میں سے ایک صورت قاضی کے لئے ہوتو قضاءِ قاضی منعدم کی جاتی ہے، لہٰذا تین صورتوں کا اِجراء من القاضی ہوجائے تو اس کی قضاء بطریقِ اَولیٰ نافذ نہیں ہوگی، بحوالہ ہدایہ، درمختار اور تمام کتب الفقہاء اور مع نص کے قضاء رَدّ کی جاتی ہے۔

الجیب مصیب
احقر العباد مظفر الدین عفی عنہ

(جواب از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

جواب:- جوابِ بالا دُرست ہے، بصورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان دُرست ہے تو تین وجوہ سے مولوی صاحب کا فیصلہ شرعاً نافذ نہیں ہے، ایک یہ کہ انہوں نے مدعاعلیہ کی عدم موجودگی میں فیصلہ کیا، وفی الدر المختار: ولا یقضی علیٰ غائب ولا لہ ای لا یصح بل لا ینفذ علی المفتی بہٖ بحر (الشامی ج:۴ ص:۵۲)۔[1] دُوسرے یہ کہ مدعاعلیہ کے دُشمن سے اس کے خلاف گواہی قبول کی گئی، والعدو لا تقبل شھادتہ علیٰ عدوہ اذا کانت دنیویۃ ولو قضٰی القاضی بھا لا ینفذ ذکرہ یعقوب باشا. (درمختار مع الشامی ص:۴۶۵)۔[2] تیسرے یہ کہ رشوت لی گئی، اور اگرچہ قاضی مرتشی کے فیصلوں کے نفاذ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، لیکن جس مقدمے میں رشوت لی گئی ہو اس کے بارے میں اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ اس میں فیصلہ نافذ نہیں ہوتا، خلافًا للبعض ومال الشامی الیٰ ترجیح قول البعض لضرورۃ الزمان. (شامی ج:۴ ص:۴۷۱) ولا ضرورۃ ھنا۔[3]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب
۱۳۹۱/۳/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۳۷ الف)

☆☆☆

---

(۱) الدر المختار ج:۵ ص:۴۰۹ (طبع سعید).
(۲) در مختار ج:۵ ص:۳۵۶ (// //).
(۳) در مختار ج:۵ ص:۳۵۸ (// //).

(حدود کا بیان)

اِقرار کے ذریعے زنا کی شرعی سزا نافذ ہونے کی شرائط

سوال:- کیا ایک مرد اور عورت کا یہ اقرار کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا شدہ بچہ اُن کا ہے، زِنا کا اقرار سمجھا جائے گا۔

۲:- کیا اس مرد اور عورت پر اس جرم میں زِنا کی حد نافذ ہوگی؟

جواب ا،۲:- صرف اتنے اقرار سے حدِ زِنا جاری نہیں ہوسکتی، حدِ زِنا کے لئے ضروری ہے کہ عدالت میں غیر مبہم الفاظ کے ساتھ زِنا کا اقرار کرے، اور اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک مرتبہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں، چار مرتبہ اسی طرح اِقرار کرنا ضروری ہے،(۱) لہٰذا مذکورہ اقرار پر حد جاری نہ ہوگی، البتہ تعزیر ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۷/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳ ۱۷/۳۲ ج)

اقرار اور گواہی میں سے کچھ نہ ہونے کی صورت میں ”زنا“ کا جرم ثابت نہ ہوگا

سوال:- زید نے عمر کو بمعہ اہلیہ کے اپنے گھر پر مدعو کیا، عمر بمعہ اہلیہ کے جب زید کے گھر پہنچا تو زید کے اہل و عیال دُوسرے مہمانوں کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے، اس کے بعد زید اور عمر دونوں نمازِ عصر کے لئے مسجد میں چلے گئے، نماز کے بعد زید نے عمر کو مٹھائی لانے کے لئے پیسے دیئے، عمر مٹھائی لینے کے لئے بازار گیا، مٹھائی لائے بغیر عمر، زید کے گھر پر واپس آگیا، اور عمر نے زید کو گھر پر نہیں پایا، اس کے بعد عمر اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا، اس کے بعد عمر کی بیوی کا الزام ہے کہ زید نے میرے ساتھ بدفعلی کی، مگر زید اس الزام کا انکار کرتا ہے اور اس فعل کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے، عمر کی بیوی حلفیہ کہتی ہے کہ ایسا ہوا ہے، اور زید بھی حلفیہ کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا، تو ایسی صورت میں شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

---

(۱) فی فتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ (طبع رشیدیه کوئٹه) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... وعلیٰ ص:۸ والاقرار أن یقر البالغ العاقل علیٰ نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

فی الجوهرة النیرة کتاب الحدود ج:۲ ص:۲۲۴ (طبع قدیمی کتب خانه) الزنا یثبت بالبینة والاقرار ..... (وبعد أسطر فی المتن) والاقرار أن یقر البالغ العاقل علیٰ نفسه بالزنا أربع مرات فی أربعة مجالس من مجالس المقر.

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب عمر کی بیوی حلفیہ اقرار کر رہی ہے اور ایسے اِکراہ کا بھی ذِکر نہیں کرتی جس سے وہ بالکل مجبور ہوگئی ہو، تو اس کا گناہ تو ثابت ہوگیا، جس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ توبہ و اِستغفار کرے، صدقِ دِل کے ساتھ توبہ کرلے گی تو اِن شاء اللہ گناہ معاف ہوجائے گا[1] لیکن زید چونکہ نہ اقرار کرتا ہے نہ اس کے گناہ پر کوئی گواہ ہے، لہٰذا اس کے خلاف جرم ثابت نہیں ہوا۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۹۷ الف)

صرف ایک گواہی سے زنا کی شرعی سزا جاری نہیں ہوسکتی، البتہ گواہ کے معتبر ہونے کی صورت میں تعزیری سزا جاری کی جاسکتی ہے

سوال:- اگر کوئی شخص کسی مجاہد یا علاقے کے کمانڈر کو یہ اطلاع دیدے کہ فلاں پرانے گھر میں ایک جوان اور لڑکی کو زنا کرتے ہوئے دیکھا اور اس خبر کی ایک شخص تائید بھی کرے، تو یہ مجاہد اور کمانڈر وہاں جاکر دیکھے تو وہ جوان وہاں سے نکل رہا ہو اور پرانے گھر میں لڑکی موجود ہو اور جو بھی ان سے سوال کرے جواب نہ دے، تو وہ مجاہد اور کمانڈر اس جوان کو بے تحاشا بڑی بے دردی بڑی بے عزتی کے ساتھ مارے لیکن وہ جوان اس مار سے مرا بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی عضو ٹوٹا، تو کیا اس مجاہد اور کمانڈر پر شرعی طور پر کچھ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی فتح الباری ج:۱۲ ص:۱۶۹ (طبع مکتبة الرشد) ..... وقد یتمسک به من قال أنه اذا جاء تائبًا سقط عنه الحد .... وقوّاه بأن الحسنة التی جاء بها من اعترافه طوعًا بخشیة الله وحدهٗ تقاوم السیّئة الّتی عملها لأنّ حکمة الحدود الرّدع عن العود وصنیعه ذٰلک دالّ علیٰ ارتداعهٖ فناسب رفع الحدّ عنه لذٰلک .....الخ.

وفی ردّ المحتار مطلب التوبة تسقط الحد قبل ثبوته ج:۴ ص:۴ (طبع سعید) الظاهر أن المراد انّها لا تسقط الحد الثابت عند الحاکم بعد الرّفع الیه امّا قبله فیسقط الحد بالتّوبة .... (وبعد أسطر) رجل أتیٰ بفاحشة ثم تاب وأناب الی الله تعالیٰ فانه لا یعلم القاضی بفاحشته لاقامة الحد علیه لأنّ الستر مندوب الیه وفی شرح الاشباه للبیری عن الجوهر رجل شرب الخمر وزنی ثم تاب ولم یحد فی الدنیا هل یحد له فی الآخرة؟ قال الحدود حقوق الله تعالیٰ الا انّه تعلق بها حق الناس وهو الانزجار فاذا تاب توبة نصوحًا أرجو أن لا یحد فی الآخرة فانّه لا یکون أکثر من الکفر والرّدة وانّه یزول بالاسلام والتّوبة.

(۲) وفی الدّر المختار کتاب الحدود ج:۴ ص:۷ و ۸ (طبع سعید) (ویثبت بشهادة أربعة) رجال فی مجلس واحد ...... بلفظ الزنا .... ویثبت أیضًا باقراره صریحًا صاحیًا ولم یکذبه الآخر .....الخ.

وکذا فی البحر الرّائق کتاب الحدود ج:۵ ص:۷ و ۱۲ (طبع رشیدیه).

وفتح القدیر کتاب الحدود ج:۵ ص:۴ و ۸ (طبع رشیدیه کوئٹه).

جواب:- صرف ایک شخص کی گواہی سے زنا کی حدِ شرعی (سو کوڑے یا سنگساری) تو کسی حال نہیں دی جاسکتی،(۱) البتہ اگر ایک معتبر شخص کی گواہی اور دُوسرے معتبر قرائن سے یہ غالب گمان ہوجائے کہ مرد و عورت مشتبہ حالت میں پائے گئے ہیں، تو ان کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے،(۲) لیکن اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مجاہدین کی متعینہ حکومت کی طرف سے اس کمانڈر کو ایسے معاملات کی سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے تو وہ خود سزا دے سکتا ہے، ورنہ خود سزا دینے کے بجائے اپنے اس افسر کے سپرد کردے جسے سزا دینے کا اختیار حاصل ہو۔

واللہ اعلم
۱۴۰۹/۱/۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۴۰ الف)

حدود ترمیمی بل میں زنا بالجبر کی سزا سے متعلق سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۳ سے اِستدلال کی وضاحت

سوال:- محترم مفتی تقی عثمانی صاحب السلام علیکم

حدود قوانین کے بارے میں جو بحث اِس وقت ملک میں جاری ہے، اُس کے حوالے سے آپ کا تفصیلی نقطۂ نظر "جنگ" کے کالموں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اِس ضمن میں میں آپ سے چند باتوں کی وضاحت چاہتا ہوں، اُمید ہے آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے زنا بالجبر موجب حد جس کے لئے حدود قوانین میں چار گواہ پیش کرنے کی شرط تھی، کیا پچھلے ۲۷ سال میں کسی مجرم کو دی جاسکی ہے؟ جب یہ ممکن ہی نہیں تو پھر اگر اِس کو بل میں سے نکال دیا گیا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ جب ایک بات بعید از عقل ہے تو پھر اُس کے لئے اِصرار کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک غیر شادی شدہ شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے کیا سزا دی جائے گی؟ اگر اُس کی سزا بھی سو کوڑے ہے تو پھر یہ سزا تو اُس غیر شادی شدہ کے لئے بھی ہے جو زنا بالرضا کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ آپ لکھتے ہیں: "یہ عقلِ عام کی بات ہے کہ زنا بالجبر کا جرم رضامندی سے کئے ہوئے زنا سے زیادہ سنگین جرم ہے، لہٰذا اگر رضامندی کی صورت میں یہ حد عائد ہو رہی ہے تو جبر کی صورت میں اس کا اِطلاق اور زیادہ قوت کے ساتھ ہوگا" (جنگ مؤرخہ ۲۳ر نومبر ۲۰۰۶ء) کیسے؟

---

(۱) حوالہ کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۵۳۸ کا حاشیہ نمبر۲۔
(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۶۲ و ۶۳ (طبع سعید)۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ سورۂ نور کی جس آیت کو آپ نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی خاتون کی بریت کے حوالے سے بطورِ دلیل پیش کیا ہے اُس کا اِس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ آیت تو اُن لونڈیوں کے بارے میں ہے جن سے اُن کے مالک زبردستی پیشہ کرواتے تھے، اُن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ چونکہ اُنہیں اِس فعلِ بد پر مجبور کیا جارہا ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف فرمادے گا۔ اگر آیت کو سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو دُوسرا کوئی معنی لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہمارے ہاں قرآن پاک کی آیات کو سیاق وسباق میں رکھ کر مطالعہ کرنے کا رُجحان بہت کم ہے، دُوسری کوئی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی ہے۔

موجودہ حکومت نے حدود قوانین میں جو ترمیمات کی ہیں وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہیں، یہ بھی ایک اِنسانی کام ہے جس میں بہتری کی گنجائش موجود رہے گی۔ اسی طرح حدود آرڈی نینس مجریہ ۱۹۷۹ء بھی ایک انسانی کام تھا جس کے اندر بنیادی خامیاں موجود تھیں، میں تو حیران ہوتا ہوں کہ مجھ جیسا ایک عام طالبِ علم بھی سمجھتا ہے کہ اُن قوانین میں بنیادی نوعیت کی خامیاں تھیں اور انہیں بہت جلد دُور ہوجانا چاہئے تھا، لیکن ہمارے مذہبی حلقے اُسے حدود اللہ میں مداخلت کا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جذبات وتعصّبات سے بالاتر ہوکر سوچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں مقلدانہ اندازِ فکر سے آزاد ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

والسلام علیکم
ناصر مصطفیٰ

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سفروں کی وجہ سے آپ کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔

سورۂ نور آیت ۳۳ کے بارے میں عرض ہے کہ جن لونڈیوں سے زبردستی پیشہ کرایا جارہا ہے، اُن سے زبردستی زنا کرنے والے، خواہ پیسے دے کر کرتے ہوں، زنا بالجبر ہی کے مرتکب تو ہیں۔[1] اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی تو مغفرت کا اِعلان فرمادیا، لیکن جن لوگوں نے ان سے زنا بالجبر کیا، اُن کی معافی کا تو کوئی اِعلان نہیں،[2] لہٰذا سورۂ نور کی آیت نمبر۲ میں بیان کی ہوئی سزا اُن پر بھی عائد ہوگی۔ میرے اِستدلال کی یہ وجہ تھی۔

والسلام
۱۴۲۸/۴/۷ھ

(۱ و ۲) وفی أضواء البیان سورة النور ج:۵ ص:۵۳۲ (طبع دار الفکر بیروت) فإن الله من بعد إكراههن (لهن) غفور رحيم، ذكره عنه القرطبی، وذكره الزمخشری عن ابن عباس رضی الله عنهم جميعا.

فزيادة لفظة لهن فی قراءة من ذكرنا استشهاد بقراءة شاذة لبيان بقراءة غير شاذة أن الموعود بالمغفرة والرّحمة، هو المعذور بالإكراه دون المكره؛ لأنه غير معذور فی فعله القبيح. ....

(باقی اگلے صفحے پر)

صرف توبہ اور ستر سے حد ساقط ہو سکنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خاتون نے اِقرارِ زِنا کیوں کیا؟ نیز زانی کے لئے ستر افضل ہے یا اِقرار؟

سوال:- مکرمی ومحترمی تقی عثمانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف القرآن'' سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۳۳ کے مسائل کے مطالعے کے دوران ذہن میں ایک اِشکال نے جنم لیا، جوعرض کرتا ہوں۔ محترم مولانا شفیع صاحب دامت برکاتہم نے شرعی سزاؤں کے ضمن میں پانچ حدود ذِکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ ان سزاؤں کی صورت میں توبہ کرنے سے اُخروی حساب معاف ہوجاتا ہے لیکن دُنیوی سزا نہیں۔ اس سے یہ بات ذہن میں پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک زانی عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اِعترافِ جرم (خود حاضر ہوکر، حالانکہ آپؐ کو علم نہیں تھا) کرکے سزا چاہی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر وہ عورت مخلصانہ توبہ کرلیتی اور اپنے گناہ کو پوشیدہ رکھتی تو نہ صرف اُخروی عذاب سے بچ جاتی بلکہ دُنیاوی ذِلت ورُسوائی اور سزا سے بھی۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اس مسئلے سے لاعلم تھی؟ کیا وہ ضمیر کے ہاتھوں تنگ آکر جذباتی رو میں بہہ کر سزا چاہنے لگی تاکہ اس کے دِل کا بوجھ ہلکا ہوجائے؟ اگر نہیں تو سزا سے پہلے حضور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)..........

وفی الدر المنثور ج:۷ ص:۳۹۷ باب:۳۳ (طبع موقع التفاسیر) (فإن اللہ من بعد إکراههن غفور رحیم) قال: للمکرهات علی الزنا.

وأخرج عبد بن حمید عن قتادة (فإن اللہ من بعد إکراههن غفور رحیم) قال: لهن ولیست لهم.

وفی اللباب (ج ۱۴/ ۳۷۷، طبع دارلکتب العلمیة بیروت) (ومن یکرههن فإن اللہ من بعد إکراههن غفور رحیم) ای غفور رحیم للمکرهات والوزر علی المکره، وکان الحسن إذا قرأ هٰذه الآیة قال: لهنّ واللہ.

وفی کتاب الأم ج:۵ ص:۱۷۴ (طبع بیروت) (فإن اللہ من بعد إکراههن غفور رحیم) نزلت فی الإماء المکرهات أنه مغفور لهن بما أکرهن علیه وقیل غفور أی هو أغفر وأرحم من أن یؤاخذهن بما أکرهن علیه وفی هٰذا کالدلالة علٰی إبطال الحد عنهن إذا أکرهن علی الزنیٰ.

وفی تفسیر ابن أبی حاتم سورة النور ج:۱۰ ص:۱۲۷ عن ابن عباسؓ رقم:۱۵۳۲۰ أن جاریة لعبداللہ بن ابی کانت تزنی فی الجاهلیة فولدت أولادًا من الزنا فقال لها مالک لا تزنین قالت: لا واللہ لا أزنی فضربها فأنزل اللہ تعالٰی ولا تکرهوا فتیاتکم. وکذا فی تفسیر ابن کثیر باب:۳۲ ج:۶ ص:۵۵ (طبع مجمع الملک فهد) وکذا فی تفسیر الآلوسی باب:۳۳ ج:۱۳ ص:۴۲۷.

وفی التفسیر الکبیر ج:۱۱ ص:۳۲۳ (طبع موقع التفاسیر) فإن اللہ غفور رحیم بهن لأن الإکراه أزال الإثم والعقوبة لأن الإکراه عذر للمکرهة أما المکره فلا عذر لهٗ فیما فعل الثانی.

وفی تفسیر الشعراوی باب:۳۳ ج:۱ ص:۶۳۲۷ لا تکرهوا الإماء علی البغاء وقد کن یبکین ویرفضن هٰذا الفعل وکن یؤذین ویتعرضن للغمز واللّمز ویتجرأ علیهن الناس.

وفی تفسیر روح البیان، سورة النور ج:۶ ص:۱۰۸ (طبع دار النشر) غفور رحیم أی لهن وفیه دلالة علٰی أن المکرهین محرومون منهما بالکلیة. نیز دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۱۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو یہ مسئلہ بتایا نہیں؟ کہ اس طرح تم بچ سکتی تھیں، یا پھر اس میں کوئی شرعی حکمت ہے؟

جواب:- مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ دُرست ہے کہ اگر کسی شخص سے اس قسم کا گناہ خدانخواستہ سرزد ہوجائے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسے چھپائے،(۱) اور توبہ کرے۔(۲) لیکن جب ایسا شخص قاضی کے پاس آجائے اور اِعتراف کرلے تو قاضی اُسے صراحۃً چھپانے کا مشورہ نہیں دے سکتا،(۳) البتہ سنت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اِقرار کرنے پر قاضی منہ موڑ لے،(۴) جو ایک خفیف سا اِشارہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ،(۵) لیکن تین بار(۶) منہ موڑنے کے بعد جب چوتھی بار وہ اِقرار کرے تو پھر سزا جاری کی جائے گی۔(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔(۸) بحیثیتِ قاضی آپؐ اس سے صراحۃً یہ نہیں فرماسکتے تھے کہ تمہارے اِقرار کرنے سے چھپانا بہتر ہے۔ اُس خاتون کے قلب پر آخرت کا خوف اس درجہ طاری تھا کہ وہ ان خفیف اِشاروں کو نہ سمجھی، اور سزا جاری کرنے پر اِصرار کیا۔(۹) اور تکوینی طور پر اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت تھی کہ اُس کے ذریعے دِین کے ایک اہم حکم کا عملی نفاذ کرا کے ہمیشہ کے لئے قانون اور سنت کو محفوظ کرنا تھا۔(۱۰)

واللہ اعلم
۱۴۲۲/۱/۷ھ

(۱ و ۲) وفی فتح الباری، باب لا یرجم المجنون والمجنونة ج:۱۲ ص:۱۵۸ (طبع مکتبة الرّشد، مکة المکرّمة) ویؤخذ من قضیته أنه یستحب لمن وقع فی مثل قضیته أن یتوب إلى الله تعالیٰ ویستر نفسه ولا یذکر ذٰلک لأحد کما أشار به أبوبکر وعمر علیٰ ماعز وان من اطلع علیٰ ذٰلک یستر علیه بما ذکر ولا یفضحهٗ ولا یرفعه إلى الإمام کما قال صلی الله علیه وسلم فی هٰذه القصة لو سترته بثوبک لکان خیرًا لک وبهٰذا جزم الشافعیؒ فقال أحب لمن أصاب ذنبًا فستره الله علیه أن یستر علیٰ نفسهٖ ویتوب.

وفیه أیضًا ج:۱۲ ص:۱۵۹ وفیه أنه یستحب لمن وقع فی معصیة وندم أن یبادر إلى التوبة منها ولا یخبر بها أحدًا ویستتر بستر الله وان اتفق انه یخبر أحدًا فیستحب أن یأمره بالتوبة وستر ذٰلک عن الناس کما جریٰ لماعز مع أبی بکر ثم عمر وقد أخرج قصته معهما فی المؤطا .... وفی القصّة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال لهزال لو سترتهٗ بثوبک لکان خیرًا لک .... قال الباجی المعنیٰ خیرًا لک ممّا أمرتهٗ بهٖ من إظهار أمرهٖ وکان ستره بأن یأمرهٗ بالتوبة والکتمان کما أمرهٗ أبوبکر وعمر وذکر الثوب مبالغة أی لو لم تجد السبیل إلیٰ ستره إلّا بردائک ممن علم أمرهٗ کان أفضل مما أشرت بهٖ علیه من الإظهار ...الخ.

وراجع أیضًا إلیٰ شرحح البخاری لإبن بطّال ج:۸ ص:۴۴۳ (طبع دار النشر مکتبة الرشد).

وفی عمدة القاری (باب من أصاب ذنبًا دون الحد فأخبر الإمام فلا عقوبة علیه بعد التوبة إذا جاء مستفتیًا) ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) إذا تاب قبل أن یقام علیه الحد سقط عنه.

(۳ و ۷) وفی عمدة القاری ج:۲۳ ص:۴۴۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ولا یجوز للإمام العفو عنه إذا بلغهٗ.

وفی الهندیة ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشیدیه) فإذا بین ذٰلک وظهر زناهٗ سألهٗ عن الإحصان .... فإن وصفه بشرائطه حکم برجمه کذا فی التبیین.

(۴ و ۶) وفی صحیح المسلم رقم الحدیث:۴۲۸۴ عن أبی هریرةؓ قال: أتی رجل من المسلمین رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی المسجد فناداهٗ فقال: یا رسول الله! انی زنیتُ، فأعرض عنه..... حتّٰی ثنّیٰ ذٰلک علیه أربع مرات فلما شهد علیٰ نفسه أربع شهادات دعاه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: أبک جنون؟ قال: لا، ......

(باقی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قال: فهل أحصنت؟ قال: نعم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذهبوا به فارجموهُ.
نیز مزید احادیث کے لئے دیکھئے حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تکملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۳۷ تا ص:۴۶۳۔
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وينبغي للإمام أن يزجر المقر عن الإقرار ويظهر الكراهة ويأمر بتنحيته كذا في المحيط.
وفي فتح الباري، كتاب الحدود ج:۱۲ ص:۱۵۶ (طبع مكتبة الرشد) ان رجلًا من أسلم قال لأبي بكر الصديق ان الآخر زنٰى قال: فتب إلى الله واستتر بستر الله، ثم أتى عمر كذٰلك، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأعرض عنه ثلاث مرار حتى إذا أكثر عليه بعث إلى أهله.
(۵) وفي عمدة القاري ج:۲۴ ص:۶ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) يقول الإمام للمقر لعلّك لمست المرأة أو غمزتها بعينيك أو بيديك وفي بعض النسخ بعد هذا أو نظرت ...الخ.
وفي فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) وفيه التثبت في ازهاق نفس المسلم والمبالغة في صيانته لما وقع في هٰذه القصة من ترديده والايماء اليه بالرجوع والإشارة إلى قبول دعواه ان ادعىٰ اكراهًا واخطاءً في معنى الزنا أو مباشرة دون الفرج مثلًا أو غير ذٰلك.
وفي عمدة القاري ج:۲۳ ص:۴۴۰ (طبع دار إحياء التراث) وقال عياض فائدة سؤاله أبك جنون استقراء لحاله واستبعاد أن يلح عاقل بالإعتراف بما يقتضي اهلاكهٗ أو لعله يرجع عن قوله.
وفي الهندية ج:۲ ص:۱۴۴ (طبع رشيديه) وندب تلقينه لعلك قبلت أو لمست أو وطئت بشبهة وقال في الأصل لعلك تزوجتها أو وطئتها بشبهة والمقصود أن يلقنه ما يكون دارئًا كائنًا ما كان.
(۸) وفي حديث المسلم رقم:۴۴۹۴ .... ثم جائته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله! طهّرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفري الله وتوبي إليه (الحديث). (راجع للتفصيل إلى تكملة فتح الملهم ج:۲ ص:۴۴۸ طبع دار العلوم كراچي).
(۹ و ۱۰) نیز اس اصل حکمت کے علاوہ اس خاتون کی طرف سے ستر کے بجائے اِقرار کو اِختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات ستر اُس وقت افضل ہوتا ہے جب کہ کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے جو ستر کے مخالف ومتضاد ہو، اور اُس متضاد امر کے پائے جانے کی وجہ سے ستر مشکل ہو۔ جیسا کہ غیر منکوحہ کا حاملہ ہونا۔ ایسی صورت میں بعض حضرات نے فرمایا کہ ستر کے بجائے اِقرار اور مرافعہ افضل ہے چنانچہ فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۵۸ و ۱۵۹ (طبع مكتبة الرشد) میں ہے:
أنّ الغامدية كان ظهر بها الحبل مع كونها غير ذات زوج فتعذر الإستتار للإطلاع على ما يشعر بالفاحشة ومن ثم قيد بعضهم ترجيح الإستتار حيث لا يكون هناك ما يشعر بضده وان وجد فالرّفع إلى الإمام ليقيم عليه الحد أفضل.
اور چونکہ یہ خاتون حاملہ ہوچکی تھیں لہٰذا انہوں نے اقرار کو افضل سمجھا، اسی لئے اس واقعے کی کئی احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اشارۃً لوٹ جانے اور توبہ واستغفار کرنے کا فرمایا تو خاتون نے عرض کیا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ نے جس طرح حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو تعریض وغیرہ کے ذریعے ردّ فرمانا چاہا تھا تو شاید مجھے بھی اسی طرح تعریض فرما رہے ہیں، جب کہ میرا معاملہ ماعز سے یوں مختلف ہے کہ ان کے پاس تو صرف اِقرار تھا اور اُن کے لئے آپؐ کی تعریض کی بناء پر اِقرار سے رُجوع ممکن تھا مگر میرے معاملے میں واضح قرینہ موجود ہے کہ میں تو باقاعدہ حاملہ ہوچکی ہوں لہٰذا مجھے پاک فرمادیجئے۔
خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انہیں توبہ واستغفار کرنے، لوٹنے اور تعریض وتردید کے کئی اِشارے پائے جانے کے باوجود اس خاتون نے مذکورہ اسباب (جس کا حاصل خوفِ آخرت ہی ہے جیسا کہ حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا) کی بناء پر حد پر اِصرار فرمایا۔
وفي حديث صحيح المسلم رقم الحديث:۴۴۹۴ ...... ثم جاءته إمرأة من غامد من الأزد فقالت: يا رسول الله طهّرني، فقال: ويحك ارجعي فاستغفري الله وتوبي إليه، فقالت: أراك تريد أن ترددني كما رددت ماعز بن مالك، قال: وما ذاك؟ قالت: انها حبلى من الزنا، فقال: آنت؟ قالت: نعم، فقال لها: حتّى تضعي ما في بطنك. (الحديث)
وفي فتح الباري ج:۱۲ ص:۱۶۰ (طبع مكتبة الرشد)
وأما قول الغامدية تريد أن ترددني كما رددت ماعزًا فيمكن التمسك به لٰكن أجاب الطيبي بأن قولها انها حبلى من الزنا فيه إشارة إلى أن حالها مغايرة لحال ماعز لأنهما وان اشتركا في الزنا لٰكن العلة غير جامعة لأن ماعزًا كان متمكنًا من الرجوع عن إقراره بخلافها فكانها قالت أنا غير متمكنة من الإنكار بعد الإقرار لظهور الحمل بها بخلافه ...الخ.
وفي شرح سنن أبي داوٗد ج:۲۵ ص:۴۰۶ فالتر... نسبة لها قد حصل ولٰكنها طلبتِ منه ألا يفعل كما فعل بماعز ...الخ.

﴿فصل فی القصاص والدّیات﴾

(قصاص اور دیت کے مسائل کا بیان)

گاڑی کی ٹکر سے کسی کے مرجانے پر قصاص و دیت کا حکم

سوال:- گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کوئی مرجائے تو کیا ڈرائیور سے قصاص لیا جائے گا یا اس پر دیت واجب ہوگی؟

جواب:- اگر ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے، ارادہ مارنے کا نہیں تھا تب تو قصاص نہیں، صرف عاقلہ پر دیت آئے گی اور کفارہ واجب ہوگا[1]، اور اگر قتل کرنے ہی کا ارادہ تھا تو قصاص ہوگا۔

واللہ اعلم
۱۴۲۴/۳/۲۲ھ

ایکسیڈینٹ میں موت واقع ہونے کی صورت میں ذمہ دار ڈرائیور کی انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی رقم ''دیت'' میں شمار کرکے وصول کرنے کا حکم

سوال:- امریکا میں پھوپھی کی بیٹی کو راستہ پار کرتے ہوئے ایک ٹرک کی خاتون ڈرائیور نے سگنل توڑتے ہوئے بچی کو ماردیا، جس سے وہ انتقال کرگئی، ٹرک انشورڈ کی ہوئی تھی، اب انشورنس کمپنی سے بچی کے والدین کو ہرجانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ ہرجانہ دیت ہے یا نہیں؟ کیا دیت کی رقم سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنس کمپنی سے ملنے کی صورت میں حلال ہے یا نہیں؟

بندہ محمد عامر عفی عنہ
خادم جامعۃ الرشید، احسن آباد

جواب:- اصل ہرجانہ ٹرک ڈرائیور کے ذمے لازم تھا، جس کے بقدرِ دیت مطالبے کا حق

---

(۱) فی الدر ج:۶ ص:۵۲۷ (طبع سعید) الـ[illegible] .. عمد، وهو أن يتعمد ضربه أى ضرب الآدمى فى أىّ موضع من جسده ..... وموجبه القود عينا .... والثالث [illegible] .. وموجبه ...... الكفارة والدّية على العاقلة والاثم دون اثم القتل .....اهـ.

تھا، اس سے زائد مطالبے کا حق نہیں، لیکن قاتلِ خطا خود زائد دے تو لینا جائز ہے۔ رہا انشورنس کمپنی سے وصول کرنا، تو انشورنس کرانے والے نے اب تک کسی بھی مد میں جتنا پریمیم جمع کرایا ہو اس حد تک تو وصول کرنا بے غبار طور پر جائز ہے، اس سے زائد میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ انشورنس کمپنی اس کی عاقلہ کے قائم مقام سمجھی جائے[1]، اس کو عاقلہ بنانے کے لئے جو عقدِ ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے، جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، لیکن جب عرفاً و قانوناً وہ عاقلہ کے قائم مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگرچہ انشورنس کمپنی کا مال اکثر عقودِ فاسدہ کی وجہ سے حرام ہونے کا گمان غالب ہے، لیکن کفار اہلِ حرب کے مخاطب بالفروع نہ ہونے کی بنا پر گنجائش معلوم ہوتی ہے[2]، مگر اس پر پورا جزم نہیں، غور کرلیا جائے، اور دُوسرے علماء سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔ والسلام

۱۴۲۵/۱۲/۲۹ھ

۱:- موجودہ دور میں قتلِ شبہ عمد کی صاحبینؒ کی بیان کردہ تعریف اِختیار کرنے کا حکم

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد میں تین سال کی مہلت ضروری نہیں

سوال:- اِمام ابوحنیفہؒ نے قتلِ شبہ عمد کی تعریف یہ کی ہے کہ ''عمداً ایسی چیز سے قتل کیا جائے جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کے قائم مقام ہو۔'' (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰، کتاب الجنایات)۔

صاحبینؒ نے یہ تعریف کی ہے: ''شبه العمد ان یتعمد ضربه بمالا یقتل به غالبًا'' (ہدایہ ج:۴ ص:۵۶۰)۔ اِمام شافعیؒ بھی صاحبینؒ کی تائید فرماتے ہیں لہٰذا بڑے پتھر اور بڑی لاٹھی سے قتل یا زیادہ پانی میں غرق کرکے یا پہاڑی سے گرا کر غرضیکہ ہر اس چیز سے جو اَجزاء کو جدا نہ کرسکے، اِمام صاحبؒ کے نزدیک یہ قتلِ شبہ عمد ہوگا اور صاحبین کے نزدیک قتلِ عمد ہوگا۔

اِمام صاحبؒ نے آلۂ قتل ''سلاح'' کو نیتِ قتل کا مظہر قرار دیا ہے، لہٰذا ''سلاح'' سے قتل عمداً قتل ہوگا، اور ''بما لیس بسلاح ولا اجری مجرح السلاح'' سے قتلِ شبہ عمد ہوگا، اور صاحبینؒ کے نزدیک آلۂ قتل ''ما یقتل به غالبًا'' سے قتلِ عمد ہوگا اور ''بما لا یقتل به غالبًا'' سے شبہ عمد ہوگا۔

---

(۱) وفی الهدایة ج:۴ ص:۲۲۸ و ص:۲۲۹ کتاب المعاقل (طبع مکتبه رحمانیه) والأصل فی وجوبها علی العاقلة قوله علیه السلام فی حدیث حمل بن مالک رضی الله عنه للأولیاء قوموا فدوه ....وانما خصّوا بالضم لأنه انما قصر لقوة فیه وتلک بأنصاره وهم العاقلة فکانوا هم المقصرین فی ترکهم مراقبته فخصوا به .... لأن العقل کان علٰی أهل النصرة وقد کانت بأنواع بالقرابة والحلف والولاء والعد. وفی عهد عمر رضی الله عنه قد صارت بالدیوان فجعلها علٰی أهله اتباعًا للمعنٰی ولهٰذا قالوا: لو کان الیوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة ...الخ.

(۲) دیکھئے الدر المختار مع رد المحتار ج:۴ ص:۱۲۸ و ۱۲۹ (طبع سعید).

۱- اب قابلِ اِستفسار بات یہ ہے کہ اس دور میں قتل بالمثقل کے واقعات بکثرت ہیں، اسی طرح آلہ غیر جارحہ سے بھی قتل روزمرہ کا معمول ہے، اِمام صاحبؒ کی تعریف کو اگر ملکی قانون کا درجہ دیا جائے تو ڈر یہ ہے کہ قتل کے واقعات میں اضافہ ہوجائے گا، کیونکہ شبہِ عمد کی سزا دیت ہے، آج کل لوگوں کے پاس روپیہ عام ہے، پھر روپیہ ادا کرنے میں بھی سہولت ہے کہ اوّل تو عاقلہ دیت ادا کرے گی، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ تین سال تک ادا کرنے کی مہلت بھی ہے، اس کے مقابلے میں صاحبینؒ کی تعریف اس دور کے مناسب ہے اور عقود رسم المفتی کی عبارت سے واضح ہے کہ قضاء کے معاملات میں اِمام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ وفی القنیة من باب المفتی الفتویٰ علیٰ قول أبی یوسفؒ فیما یتعلق بالقضاء لزیادة تجربته کذا فی البزازیة من القضاء. (ص:۲۹، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)۔ اور اس بات کی اس کتاب میں تصریح ہے کہ صاحبینؒ کا قول درحقیقت اِمام صاحبؒ ہی کی کسی بنیاد کی فرع ہوتا ہے (ص:۱۷) اور خود اِمام صاحب بھی شبہِ عمد ہونے کی شرط لگاتے ہیں کہ مارنے والے کا ''قصد تادیب کا ہو اِتلافِ نفس کا نہ ہو'' جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر قصد اِتلافِ نفس کا ہو تو ان کے نزدیک بھی قتل بالمثقل سے قتلِ عمد ہوگا، عبارت یہ ہے: ''یشترط عند أبی حنیفةؒ أی فی شبه العمد ان یقصد التأدیب دون اتلاف'' (الدر المختار ج:۵ ص:۳۵۱ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه بولاق مصر)۔[1]

اعلاء السنن جز:۱۸ میں بھی قتل بالمثقل بشرط القصد سے قصاص واجب ہونے کا ذکر موجود ہے۔[2]

اس پس منظر کے پیشِ نظر گزارش یہ ہے کہ کیا اس دور میں صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر جواب اِثبات میں ہو تو اِمام صاحبؒ کے مستدل کا جواب کیا ہوگا؟ ان کی ایک دلیل یہ حدیث ہے: ''قتیل السوط والعصا شبه العمد'' نیز ''الا اِنّ قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا والحجر فیه الدیة مغلظة مأة من الابل منها أربعون خلفة فی بطونها اولادها'' (بحواله احکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۲۲۹، ۲۳۰، باب شبه العمد، مطبوعه بیروت)۔ ان روایات میں آلۂ غیر سے قتل کو شبہِ عمد میں شمار کیا گیا ہے۔

۲:- دُوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قاضی دیتِ قتل کی مہلت نہ دے تو کیا اس کی کوئی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ شبہ یہ ہے کہ ایک تو ایک شخص کا قریبی قتل ہوا، یہ الگ اس کو صدمہ ہوگا، پھر تین سال

---

(۱) رد المحتار ج:۶ ص:۵۳۰ (طبع سعید).

(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة).

وفی کنز العمال: لا عمد الا بالسّیف ج:۱۵ ص:۱۱ کتاب القصاص حدیث:۳۹۸۴۲.

وفی اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن) لیس معناه ان آلة القود لیس الا السیف کما توهمه الطحاوی.

تک وہ دیت کا انتظار کرے گا، اس سے اس کی تسلی نہ ہوگی۔ راقم کو باوجود تلاش کے مہلت ختم کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ المستفتی

بندہ بشیر احمد
قاضی عدالت باغ، آزاد کشمیر

جواب ا:- موجودہ حالات میں قتلِ شبہ العمد کی وہ تعریف اختیار کی جائے جو صاحبینؒ نے اختیار فرمائی ہے، تو وہ مناسب اور مستساغ ہے،[1] آپ نے اس کے جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ کافی ہیں، اور شاید اس سے قبل میں نے انہی دلائل کی بناء پر آپ سے اپنی رائے ظاہر کردی تھی۔

۲:- صلح عن دم العمد یا دیتِ عمد جو خود قاتل پر ہوتی ہے، اس میں تو تین سال کی مہلت ضروری نہیں، بلکہ باہمی اتفاق سے جو مدّت بھی مقرّر ہوجائے وہ دُرست ہے، صرّح بہ فی البدائع،[2] بلکہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مہلت دینا جائز نہیں، لیکن شبہ العمد اور خطاء کی دیت چونکہ عاقلہ ادا کرتی ہے، اس لئے اس میں مہلت دینا عین موافقِ حکمت ہے اور اس کے خلاف فقہاء کا کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، اور شبہ العمد میں صاحبینؒ کا قول اختیار کرنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰/۱۷۱/۳۰ د)

قتلِ شبہ عمد میں اِمام ابوحنیفہؒ کا مسلک اور اُن کے دلائل کی تحقیق اور موجودہ دور میں شبہ عمد میں صاحبینؒ کی تعریف اختیار کرنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دِین درج ذیل مسئلے میں:-

ا:- احناف کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہے، بشرطیکہ دھاری دار نہ ہو، دلیل میں حدیث "لا قود الا بالسیف" پیش فرماتے ہیں۔

۲:- پھر استیفاء قصاص میں بھی اسی حدیث کو اپنا مستدل بناکر فرماتے ہیں کہ قصاص مثل فصل دم میں نہ ہوگا بلکہ بہرحالت میں سیف سے ہوگا۔

حدیثِ بالا کا محمل موجبِ قصاص ہے (یعنی قصاص کن حالات کن آلات کی ضرب سے واجب ہوتا ہے) یا استیفاء قصاص ہے؟

---

(۱) تفصیل کے لئے اگلا فتویٰ اور اس کے حوالے ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۷ ص:۲۴۷ (طبع سعید)۔

جواب ا:- تمام ائمہ احناف نہیں بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتل بالمثقل موجبِ قصاص نہیں ہوتا، صاحبینؒ اس سے اختلاف فرماتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ صرف اس صورت میں قتل بالمثقل کو غیرموجبِ قصاص کہتے ہیں جبکہ قاتل کا مقصد قتل کرنا نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:-

بل مذهبه ان القتل بالمثقل غير موجب للقود إذا لم يكن القتل مقصودًا للقاتل كما نص عليه فى المجتبىٰ ونقل عن العينى فى البناية. (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۵).[1]

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل میں عموماً حدیث: "**لا قود الا بالسيف**" پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس بارے میں متعدد صریح دلائل بھی ہیں، مثلاً:-

ا:- مسندِ احمد میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: "**ولا عمد الا بالسيف**" (كنز العمال ج:۷ ص:۲۸۴ حديث:۳۱۳۲ كتاب القصاص).[2]

۲:- طبرانی اور بیہقی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوعاً مروی ہے: "**كل شىء خطاء الا الحديد والسيف**" اور عبدالرزاق کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "**كل شىء سوى الحديد خطاء ولكل خطا أرش.**" (حوالہ بالا)۔[3]

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے اس ارشاد کی تائید میں مرفوعاتِ صریحہ موجود ہیں، البتہ زمانۂ حاضر میں جب کہ قتلِ نفس ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، اور قتل کی وارداتیں بے حد بڑھ گئی ہیں، اور قتل کے نت نئے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں، احقر کا طبعی رُجحان یہ ہے کہ ملکی قانون بناتے وقت امام شافعیؒ یا کم از کم صاحبینؒ کا قول اختیار کیا جائے تو بہتر ہے، احقر نے اس کا تذکرہ کراچی کے بعض اہلِ فتویٰ علماء سے کیا تو انہوں نے اس سے اتفاق فرمایا، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ زہر سے ہلاک کرنے کی صورت میں علامہ حمویؒ وغیرہ نے قصاص واجب ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور علامہ رافعیؒ نے علامہ سمرقندیؒ سے نقل کیا ہے کہ **العمل علىٰ هٰذه الرواية فى زماننا لأنه شاع فى الأرض بالفساد فيقتل دفعا لشره** (التحرير المختار ج:۲ ص:۳۲۳)۔ تاہم دُوسرے اہلِ فتویٰ علماء سے بھی استصواب مناسب ہے۔[4]

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۷ (طبع ادارة القرآن).

(۲و ۳) كنز العمال ج:۱۵ ص:۱۱ كتاب القصاص حديث:۳۹۸۴۲.

(۴) اب چونکہ پاکستان میں قصاص کا قانون جمہور کے مسلک کے مطابق بنایا گیا ہے، اس لئے اس پر عمل متعین ہے، لأن حكم الحاكم رافع للخلاف۔ (حاشیہ از حضرتِ والا دامت برکاتہم العالیہ)

۲:- "لا قود الّا بالسّیف" کے جملے میں دونوں معنی کا احتمال ہے، یہ بھی کہ قصاص اس صورت کے سوا واجب نہیں ہوتا جبکہ تلوار سے قتل کیا گیا ہو، اور یہ بھی کہ قصاص کا استیفا سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نہ ہونا چاہئے، اعلاء السنن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں: "لیس معناہ أن آلة القود لیس الّا السّیف کما توھمه الطحاوی" (اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۷۰)۔[1]

لیکن علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ: "فالظاھر انھما حدیثان احدھما فی ایجاب القود انه لا یجب الا بالسیف والثانی فی استیفائه أنه لایستوفی الا بالسیف والمراد به السلاح." (ایضاً ج:۱۸ ص:۷۹)۔[2]

بہرحال! حدیث میں دونوں معنوں کا احتمال ہے، اور اس کے معنی متبادر یہی ہیں کہ استیفاءِ قصاص صرف تلوار سے ہونا چاہئے، اور قتل بالمثقل کے موجبِ قصاص نہ ہونے پر اس حدیث سے اِستدلال صریح نہیں ہے اور دُوسری احادیث کی موجودگی میں اس حدیث سے اِستدلال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ هٰذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۴/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۳۵/۲۹ الف)

قتلِ خطأ میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟
(مختلف عبارات کی تحقیق)

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ لاہور کے ایک دارالافتاء میں بطور معاون دارالافتاء کام کرتا ہے، ہمارے دارالافتاء میں قتلِ خطأ سے متعلق ایک مرتبہ ایک سوال آیا جس کے جواب میں من جملہ قتلِ خطأ کے دیگر اَحکام کے یہ حکم بھی لکھا گیا کہ قاتل اس قتل کی وجہ سے گناہگار بھی ہوا ہے، لہٰذا توبہ واستغفار کرے، اگرچہ یہ گناہ قتلِ عمد کے گناہ جیسا نہیں جیسا کہ کتبِ فقہ میں یہ مسئلہ واضح طور سے موجود ہے۔

اس موقع پر بندے کے خیال میں حدیث: "ان اللہ تجاوز عن امتی الخطأ الخ" کی وجہ سے اِشکال پیدا ہوا، وجہ اِشکال یہ تھی کہ حدیث میں خطا کے مرفوع ہونے سے مراد حکمِ اُخروی کا مرفوع ہونا ہے، جو کہ عقاب ہے۔

جب حدیث کی رُو سے خاطی سے حکمِ اُخروی یعنی عقاب مرفوع ہے تو قتلِ خطأ کی صورت میں

---

(۱) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۸۱ (طبع ادارة القرآن).
(۲) اعلاء السنن ج:۱۸ ص:۹۲ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة).

قاتل پر گناہ کیوں؟ اور اس سے حکمِ اُخروی مرفوع کیوں نہیں؟

اس اِشکال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بندے نے اپنی سی بساط کے مطابق کتبِ فقہ وفتاویٰ اور کتبِ تفسیر وشروحِ حدیث کو دیکھا لیکن جو توجیہات ان حضرات نے قتلِ خطأ میں قاتل کو گناہگار قرار دینے کی اِختیار فرمائی ہیں، ان میں سے کسی توجیہ سے تسلی نہیں ہوئی بلکہ بعض عبارات سے قاتل کے گناہگار نہ ہونے کے خیال کو مزید تقویت پہنچی، چنانچہ اَحکام القرآن للجصاص میں ہے:

لیست هٰذه الكفارة مستحقة بالمأثم فيعتبر عظم الاثم فيها لأن المخطی غير آثم فاعتبار الاثم فيه ساقط.

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

والمعنی أنه عفا عن الاثم المستوجب عليه بالنسبة الٰی مأثر الاثم وإلا فالمواخذة المالية كما فی قتل النفس خطأً وإتلاف مال الغير ثابتة شرعًا ولذا قال علماءنا فی أصول الفقه: الخطأ عذر صالح لسقوط حق الله اذا حصل من اجتهاد ولم يجعل عذرًا فی حقوق العباد حتی وجب عليه ضمان العدوان. (ج:۱۰ ص:۲۶۳ طبع کوئٹہ)

حاشیہ مشکوٰۃ میں لمعات سے منقول ہے:

ولعل المراد بالتجاوز عدم الاثم فيها لا عدم المواخذة عليهما مطلقًا لأنه يثبت الدية والكفارة فی قتل الخطأ ومع ذٰلک الاثم مرفوع فی الكل وهو المراد بالتجاوز. (مشکوٰۃ ج:۲ ص:۵۸۴ طبع قدیمی کتب خانہ)

ہدایہ میں ہے:

والخطأ علٰی نوعين .... وموجب ذٰلک الكفارة والدية علی العاقلة .... ولا اثم فيه. (ج:۴ ص:۵۶۱)

اگرچہ صاحبِ ہدایہ نے "لا اثم فیہ" سے قتل کا گناہ مراد لیا ہے، باقی ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت کا گناہ مرفوع نہیں ہوگا۔

لیکن اِشکال تو یہی ہے کہ خطأ میں ترکِ عزیمت اور ترکِ مبالغہ فی التثبت تو ہوتا ہی ہے اس کے باوجود شارع نے اس سے گناہ کو رفع فرمایا ہے۔

نیز بعض حضرات نے کفارہ کی مشروعیت کو بھی گناہ کی دلیل بنایا ہے، لیکن اس کا جواب اَحکام القرآن للجصاص کی عبارت سے ہوجاتا ہے کہ یہ کفارہ گناہ کی وجہ سے نہیں۔

بندے کو فقہائے کرام پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان حضرات کی بات سمجھنے میں اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے۔

اس لئے بندہ بڑوں کی بات کو بڑوں سے سمجھنے کی غرض سے تکلیف دہی پر انتہائی معذرت خواہی کے ساتھ آنجناب سے راہنمائی کا متمنی ہے۔ وللأرض من كاس الكرام نصيب۔

فقط والسلام
عرض کنندہ
محمد رفیق
معاون دارالافتاء والتحقیق
چوبرجی پارک لاہور

جواب:- قتلِ خطأ میں قاتل پر گناہ ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں گناہ ہے، اگرچہ قتلِ عمد کے گناہ سے کم ہے، اور کفارہ اسی کے اِزالے کے لئے مشروع ہوا ہے، چنانچہ درمختار میں فرمایا گیا ہے:

والاثم دون اثم القتل اذ الكفارة تؤذن بالاثم لترك العزيمة.

اس کے تحت علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ:

قوله لترك العزيمة، وهي هنا المبالغة في التثبت. قال في الكفاية: وهذا الإثم إثم القتل، لأن نفس ترك المبالغة في التثبت ليس بإثم، وانما يصير به آثما اذا اتصل به القتل، فتصير الكفارة لذنب القتل، و إن لم يكن فيه اثم قصد القتل اهـ تأمل. (رد المحتار ج:۶ ص:۵۳۱)[1]

اور بعض فقہائے کرامؒ نے گناہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت آپ نے خود نقل کی ہے، اور امام طحاویؒ کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ان الكفارات قد تجب في الأشياء التي لا آثام فيها علىٰ من كانت منه، من ذٰلك قوله تعالىٰ في كتابه: "ومن قتل مؤمنًا خطأً" الآية.

(مشكل الآثار ج:۱ ص:۳۹۲)[2]

اور بعض فقہاء نے گناہ کے ذِکر سے سکوت فرمایا ہے۔

لیکن درحقیقت دونوں قسم کے اقوال میں یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ جنہوں نے گناہ کی نفی کی ہے،

---

(۱) طبع سعيد.

(۲) مشكل الآثار للطحاويؒ باب من اقتطع مال امرئ مسلم بيمين كاذبة. ج:۱ ص:۴۵۰ رقم:۳۸۴.

اس سے مراد قتل کے گناہ کی نفی ہے، اور جنہوں نے اِثبات کیا ہے اس سے مراد عدمِ تثبت کے گناہ کا اِثبات ہے، اور اِختلاف کو حقیقی بھی مانا جائے تو یہ محض نظریاتی اِختلاف ہے، جس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے کہ:

۱- اس بات پر سب کا اِتفاق ہے کہ کفارہ واجب ہے۔
۲- اس بات پر کسی کا اِختلاف نہیں کہ کفارہ نہ دیا جائے تو گناہ ہوگا۔
۳- اس بات پر بھی سب کا اِتفاق ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی اُخروی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ان تمام عملی نتائج پر متفق ہونے کے بعد تعبیر میں یہ اختلاف ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ تھا، مگر کفارے سے ختم ہوگیا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہ ہی نہ تھا، اور کفارہ ایک اَمرِ تعبدی کے طور پر واجب ہوا۔

البتہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ تھا، مگر کفارہ سے معاف ہوگیا، اس لئے کہ قرآنِ کریم نے کفارہ کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: "توبةً من الله" (النساء:۹۲)۔

اس آیت کا ترجمہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اس طرح فرمایا ہے:

"(یہ آزاد کرنا، اور وہ نہ ہوسکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرّر ہے۔"

اس آیتِ کریمہ میں صراحت ہے کہ کفارہ بطور توبہ کے مشروع ہوا ہے، اور ظاہر یہی ہے کہ توبہ کسی گناہ پر ہوتی ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اِرشاد فرمایا ہے کہ کفارہ سے توبہ ہوجائے گی، اس لئے الگ سے توبہ واستغفار کی ضرورت نہ رہی۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ قتلِ خطأ پر گناہ کا ہونا حدیث "رفع عن أمتی الخطأ والنسیان"[۱] کے معارض معلوم ہوتا ہے، اس کے دو جواب ممکن ہیں:

ایک یہ کہ اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اُس فعل کا اصل گناہ خطا کی صورت میں مرفوع ہے، چنانچہ قتل کی صورت میں اصل گناہ قتلِ عمد کا گناہ تھا جو خطا کی وجہ سے مرفوع ہوگیا، لیکن کسی اور جہت سے گناہ ہونا، اس کے معارض نہیں، مثلاً قلّتِ تثبت کا گناہ پھر بھی ہوسکتا ہے جو ایک جان کی ہلاکت کا سبب بنا۔

---

(۱) وفی جامع الأحادیث حرف الرّاء ۱۲۷۶۳ رفع عن أمتی الخطاء والنّسیان.
وکذا فی الجامع الکبیر للسیوطیؒ ۱۲۹۱۱ أخرجه الطبرانی ج:۲ ص:۹۷ رقم:۱۴۳۰.

دُوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قتلِ خطا اس کلیہ سے بنصِ قرآن مستثنیٰ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کسی معصوم جان کا ہلاک ہوجانا اِنتہائی سخت معاملہ ہے۔ اور اس میں بلاقصد تسبّب بھی موجبِ گناہ ہے۔ اور ترکِ مبالغہ فی التحرز والتثبت دُوسرے معاملات میں چاہے موجبِ گناہ نہ ہو، لیکن اس سنگین معاملے میں موجبِ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ البتہ عدمِ قصد کے عذر کی وجہ سے معافی کے لئے صرف کفارہ کو توبہ کے قائم مقام قرار دے دیا گیا ہے، الگ سے توبہ کی ضرورت نہیں قرار دی گئی۔

هٰذا ما ظهر لی
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۱۰ر شعبان ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۸۶/۳۴)

✡✡✡

﴿فصل فی التّعزیر﴾

(تعزیر اور سزا دینے کے مسائل کا بیان)

بہتان اور اِلزام تراشی پر تعزیری سزا کا اِختیار صرف عدالت کو ہے، عوام کو نہیں

سوال:- زید اور بکر ایک تنظیم کے ذیلی ادارے کے عہدے داران تھے، زید بکر کے ماتحت کام کرتا تھا، بکر نے زید کے خلاف کچھ باتیں کیں اور زید نے بکر پر اِلزامات لگائے، انتظامی کمیٹی نے بکر کے خلاف الزامات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور فیصلہ کردیا کہ چونکہ زید اور بکر کے درمیان اختلافات کی وجہ سے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہی، اس لئے ماتحت ملازم زید کو اِدارے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد زید اپنا چارج چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد بکر نے ایک پریس ریلیز جاری کرکے اخبارات میں شائع کروایا اور مختلف ذمہ داروں کو دیا، اور بھجوایا کہ میں نے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے زید کو مالیات میں خورد بُرد کرنے، قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرنے اور نظم کی پابندی نہ کرنے، غلط بیانی اور ڈائری میں فرضی اندراج کرنے کی بناء پر برطرف کردیا ہے۔ زید نے جب رسائل و اخبارات میں پڑھا تو اس نے ان بہتانات کے خلاف تنظیم کے مجاز سربراہ کے پاس تحریری شکایت اپیل کی، مجاز سربراہ نے اپنا نمائندہ انکوائری کے لئے مقرّر کیا، انکوائری اور تحقیقات کے دوران بکر زید پر لگائے گئے بہتانات ثابت نہ کرسکا، اور انکوائری آفیسر کے متنبہ کرنے اور کہنے کے باوجود بکر نے اس صریح ظلم پر زید سے معافی مانگنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ زید اگر چاہے تو عدالت میں میرے خلاف دعویٰ کردے، میں خود بھگت لوں گا۔ اور کہا کہ ''اس شخص سے تو معذرت نہیں کروں گا'' اس پر انکوائری آفیسر نے اپنی رپورٹ میں شدید دُکھ کا اظہار کیا ہے، اور مزید لکھا ہے کہ مجلسِ عاملہ کے فیصلے میں جو اِلزامات درج نہیں وہ بھی پریس ریلیز میں بلاوجہ اور بغیر کسی معقول ثبوت کے اپنے غصّے کی

وجہ سے اور اپنی توہین کا انتقام لینے کی غرض سے شامل کردیئے گئے۔ انہوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انکوائری آفیسر نے بدیں وجوہ بکر کے خلاف تادیبی کارروائی کی سفارش کی ہے۔ بکر نے پریس ریلیز میں مزید دروغ گوئی یہ کی کہ اس نے زید کو برطرف کیا ہے، مزید یہ کہ انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کیا ہے۔

زید کا کہنا ہے کہ جب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بکر نے اس پر بہتانات (قذف) لگائے ہیں، نیز خلافِ واقعہ دروغ گوئی کرکے زید کو خود برطرف کرنے انتظامی کمیٹی کے مشورے سے برطرف کرنے اور اَخبارات وغیرہ کے ذریعے مشتہر کرکے صریح ظلم کرکے اُسے چاردانگِ عالم میں رُسوا کیا ہے، جس سے اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے، اور مزید یہ کہ بکر نے تنظیم کے سربراہ کے نمائندے کی عدم اطاعت کی ہے، تو ان جرائم کی وجہ سے جو کہ قابلِ تعزیر ہیں بکر مردود الشہادت اور ساقط الاعتبار اور منصب کے لئے نااہل ہوگیا ہے، اس لئے تادیب کے طور پر بکر کی بنیادی رُکنیتِ تنظیم ختم کی جانی چاہئے، اور اِدارے کے عہدے سے برطرف کیا جانا چاہئے، اور تعزیر کے طور پر سزا دی جانی چاہئے۔

براہِ کرم شرعی نقطۂ نگاہ سے صراحت فرمائیں کہ زید کا یہ مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہے؟

جواب:- اگر واقعاتِ مندرجہ دُرست ہیں اور زید اُن اِلزامات سے واقعۃً بَری ہے جو بکر نے اس پر لگائے ہیں، تو بکر نے بہتان طرازی کا ارتکاب کرکے سخت گناہ کا ارتکاب کیا ہے،(۱) اگر وہ اپنے اس گناہ سے تائب نہ ہو اور زید سے معافی نہ مانگے،(۲) تو کسی ایسے عہدے کا مستحق نہیں ہے جس

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داوٗد ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع مکتبہ رحمانیہ) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل المسلم علی المسلم حرامٌ ماله وعرضه ودمهٗ حسب امریٔ من الشر أن یحقر أخاہ المسلم.

وفی سنن أبی داوٗد کتاب الأدب باب من ردّ عن مسلم غیبة ج:۲ ص:۳۲۷ (طبع رحمانیہ) عن سھل بن معاذ بن أنس الجھنی عن أبیه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من حمیٰ مؤمنًا من منافق أراہٗ قال بعث الله ملکًا یحمی لحمه یوم القیامة من نار جھنّم، ومن رمیٰ مسلمًا بشیءٍ یرید شینه بهٖ حبسه الله علیٰ جسر جھنّم حتّی یخرج ممّا قال.

وکذا فی مسند أحمد حدیث معاذ بن أنس الجھنی رقم الحدیث: ۱۵۵۸۶ ج:۱۲ ص:۲۵۸ (طبع دارالحدیث القاھرۃ) ومشکوٰۃ المصابیح ج:۵ ص:۴۲۴ (طبع قدیمی) وفی مرقاۃ المفاتیح ج:۹ ص: ۲۳۸ (طبع امدادیه ملتان) أی قذف مسلمًا ...... بشیءٍ أی من العیوب یرید به شینه أی عیبه حبسه الله أی وقفهٗ علیٰ جسر جھنّم وھو صراط ممدود ...... حتّی یخرج ممّا قال أی من عھدته والمعنی حتّی ینقی من ذنبه ذٰلک بارضاء خصمه أو بشفاعة أو بتعذیبه بقدر ذنبه وکذا فی بذل المجھود ج:۵ ص:۲۵۵ (طبع معھد الخلیل کراچی).

وفی شرح الفقه الأکبر مسئلة فی التوبة وشرائطھا ص:۱۵۹ و ۱۶۰ (طبع قدیمی) امّا اذا قال بھتانًا بأن لم یکن ذٰلک فیه فانه یحتاج الی التوبة ...... فلیس شیء من العصیان أعظم من البھتان ......الخ.

سے ماتحتوں کے حقوق وابستہ ہوں۔ ایک اسلامی عدالت اس بہتان طرازی پر اُسے تعزیری سزا بھی دے سکتی ہے، لیکن یہ تعزیری سزا عام لوگوں کو دینے کا اختیار نہیں ہے، صرف عدالت کے ذریعے دِلوائی جاسکتی ہے۔ [۱]

واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۰۲۵/۳۹ د)

مجلسِ گناہ میں شرکت نہ کرنے کا وعدہ توڑنے پر شرعاً کوئی تعزیر مقرّر نہیں، نیز تعزیری سزائیں جاری کرنے کا اختیار صرف قاضیٔ شرعی کو ہے

سوال:- برادری نے ایک ماتم کے موقع پر فیصلہ کیا کہ آئندہ شادیوں میں ڈھول بجانے اور لاؤڈ اسپیکر میں گانوں پر پابندی کی جائے، اور جو نہ مانے اس کا بائیکاٹ کیا جائے، تمام برادری اس پر متفق ہوگئی، اس موقع پر اِمامِ مسجد نے بھی بطورِ دھمکی وتنبیہ کہا کہ جو یہ حرکت کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا۔ کچھ دن بعد برادری میں ایک شادی ہوئی جس میں ڈھول کا بجانا اور لاؤڈ اسپیکر پر گانے شروع ہوگئے، اِمامِ مسجد نے لوگوں کو بتایا کہ وعدہ خلافی ہو رہی ہے، اِمام نے ذمے دار لوگوں کو بھیجا کہ ان کو عدہ خلافی سے منع کریں، لیکن اہلِ تقریب نہ رُکے، ڈھول بجاتے رہے، اس کے بعد جب موقع نکاح کا آیا تو یہاں سوشلسٹ آدمی جو اپنے نظریے میں سوشلزم کو دِین سمجھتا ہے، وہ اِمام کو کہتا ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ کیونکہ تم نے کہا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کا نکاح نہیں پڑھایا جائے گا، اِمام نے کہا کہ میں نے یہ بطورِ دھمکی کہا ہے، حقیقت میں یہ کام مانعِ نکاح نہیں ہے، نکاح کے جواز کی شرائط اور ہیں، اِمام نے نکاح پڑھایا اور نکاح کے وقت ڈھول بند کردیا گیا۔ اب وہ اِشتراکی لیڈر یہ افواہ پھیلا رہا ہے کہ اِمام نے چونکہ وعدہ خلافی کی، اس وجہ سے اس کو تعزیر دے دی جائے۔ اِمامِ مسجد فرما رہا ہے کہ میں سرکاری نکاح رجسٹرار ہوں، مجبوری کی وجہ سے میں نے نکاح پڑھایا ہے، اس کے علاوہ اگر نکاح نہ پڑھاتا تو فساد کا خطرہ تھا، کیونکہ ساری برادری نکاح میں شرکت کرچکی تھی، اور اِمامِ محلّہ بھی ہے نہ پڑھانے کی صورت میں اِمامت سے نکالنے کا بھی خطرہ تھا، تو کیا اس صورت میں اِمام کے لئے تعزیر شرعی ہے؟

جواب:- پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اِمام نے لوگوں کے سامنے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی نکاح

---

(۱) وفی الهندية كتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشيديه) وركنهٔ اقامة الامام أو نائبه فی الاقامة.

وفی بدائع الصنائع كتاب الحدود ج:۷ ص:۵۷ (طبع سعيد) .... امّا الّذی يعم الحدود كلها فهو الامامة وهو أن يكون المقيم للحد هو الامام او من ولاه الامام وهٰذا عندنا.

نہیں پڑھائے گا جس کی تقریب میں ڈھول باجا، یا گانا بجانا ہو، تو اَب کسی ایسی مجلسِ نکاح میں جاکر نکاح پڑھانا اس کے لئے دو وجہ سے ناجائز تھا، ایک اس وجہ سے کہ جس مجلس میں یہ لہو ولعب ہو رہے ہوں اس میں جان بوجھ کر شرکت کرنا ناجائز ہے،(۱) دُوسرے اس وجہ سے کہ یہ وعدہ خلافی ہے، جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے وہ تو صورتِ مسئولہ میں محقق نہیں ہوئی کہ جس وقت اِمام صاحب نکاح پڑھانے گئے اس وقت ڈھول باجا موقوف کردیا گیا تھا۔ اب دُوسری وجہ رہ جاتی ہے، سو درحقیقت اِمام صاحب کا یہ وعدہ پوری برادری کے ساتھ ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا تھا، جب پوری برادری نے یہ معاہدہ پہلے توڑ دیا تو اَب اِمام صاحب کے لئے بھی بحیثیتِ معاہدہ اس کی خلاف ورزی کی گنجائش تو نکل آئی، لیکن اگر اِمام صاحب کا اعلان برادری کے ساتھ معاہدے پر موقوف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے ذاتی طور پر لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا تو انہیں اس وعدہ خلافی پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اس قسم کے معاملات میں شریعت کی طرف سے کوئی تعزیر مقرّر نہیں ہے، اور نہ قاضیٔ شرعی کے سوا کسی اور کو تعزیر جاری کرنے کا اختیار ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۰/۱۱/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۱۲/۲۱ الف)

---

(۱) وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوٰة ج:٦ ص:۲۵۴ و۲۵۵ (طبع امدادیه ملتان) عن سفینة انّ رجلًا ضاف علیّ بن أبی طالب رضی الله عنه فصنع لهٗ طعامًا فقالت فاطمة: لو دعونا رسول الله صلی الله علیه وسلم فأکل معنا، فدعوهٗ فجاء فوضع یدیه علیٰ عضادتی الباب فرأی القرام قد ضرب فی ناحیة البیت فرجع قالت فاطمة رضی الله عنها فتبعتهٗ فقلت: یا رسول الله! ما ردّک؟ قال: انّه لیس لی – أو – لنبی أن یدخل بیتًا مزوقًا. رواه أحمد وابن ماجة. قال المُلّا علی القاری رحمه الله وفیه تصریح بأنّه لا یُجاب دعوة فیها منکر وفیه انّه لو کان منکرًا لأنکر علیها ولٰکن نبه بالرّجوع الیٰ انّه ترک الاولیٰ فانّه من زینة الدنیا وهی موجبة لنقصان الاُخریٰ.

وفی تبیین الحقائق کتاب الکراهیة فصل فی الأکل والشرب ج:۷ ص:۲۹ و ۳۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وان کان هناک لعب وغنا قبل أن یحضرها فلا یحضرها لأنّه لا یلزمه اجابة الدّعوة اذا کان هناک منکر.

وفی الهندیة کتاب الکراهیة الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات ج:۵ ص:۳۴۲ و ۳۴۳ (طبع رشیدیه).
ومن دعی الیٰ ولیمة فوجد ثمة لعبًا أو غناء فلا بأس ان یقعد ویأکل فان قدر علی المنع یمنعهم وان لم یقدر یصبر وهٰذا اذا لم یکن مقتدیٰ به امّا اذا کان ولم یقدر علیٰ منعهم فانّه یخرج ولا یقعد ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی أن یقعد وان لم یکن مقتدیٰ به وهٰذا کلّه بعد الحضور وامّا اذا علم قبل الحضور فلا یحضر ....الخ.

وفی الهدایة کتاب الکراهیة ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع شرکت علمیه) هٰذا اذا لم یکن مقتدیٰ فان کان ولم یقدر علیٰ منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین. (وفی طبع رحمانیه ص:۴۵۳ و۴۵۴)

وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۵۴ (طبع مکتبه رحمانیه) ومن دعی الیٰ ولیمة أو طعام فوجد ثمه لعبًا أو غناءً فلا بأس بأن یقعد ویأکل .... وهٰذا اذا لم یکن مقتدیٰ فان کان ولم یقدر علیٰ منعهم یخرج ولا یقعد لأنّ فی ذٰلک شین الدین وفتح باب المعصیة علی المسلمین والمحکی عن أبی حنیفة فی الکتاب کان قبل أن یصیر مقتدی ولو کان ذٰلک علی المائدة لا ینبغی ان یقعد وان لم یکن مقتدیٰ لقوله تعالیٰ: "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ" وهٰذا کله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا یحضر لأنّه لم یلزمه حق الدعوة.

وفی الفتاویٰ البزازیة علی الهندیة ج:٦ ص:۳۵۹ (طبع رشیدیه) استماع صوت الملاهی کالضرب بالقضیب ونحوه حرام قال علیه السلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسق والتلذذ بها کفر أی بالنعمة.

لواطت کی شرعی سزا جاری کرنے کا اختیار حکومت کو ہے

سوال:- ایک صاحب کا ابتلاء باللواطت بمعہ تعیین مقام ومسجد وبیان اس کا کہ یہ عالم صاحب اِمامِ مسجد اور مکتبِ مسجد کے استاذ تھے۔ آخر پکڑے گئے، اور نکال دیئے گئے، اور رُوپوش ہوکر کہیں دُور دراز مقام میں ملازمت کرلی۔ سائل اس اِمام صاحب کے تعاقب میں ہے، اور شرعی سزا معلوم کرکے اُس پر جاری کرنا چاہتا ہے ....الخ۔

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اور جب تک وہ اس عمل سے صدقِ دِل سے توبہ نہ کرے، اس کو اِمام بنانا جائز نہیں۔ البتہ شرعی سزائیں جاری کرنے کا حق صرف اسلامی حکومت کو ہوتا ہے،[1] اور موجودہ قوانین میں چونکہ شرعی حدود نافذ نہیں ہیں اس لئے اس عمل کی سزا معلوم کرنا بے کار ہے۔

نوٹ:- اس قسم کے سوالات میں کسی معین شخص کا نام و نشان اِستفتاء میں ذکر نہ کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۰/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۱۸/ ۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

۱۳۸۷/۱/۲۷ھ

☆☆☆

---

(۱) وفي الهندية كتاب الحدود ج:۲ ص:۱۴۳ (طبع رشيديه) وركنه اقامة الامام أو نائبه في الاقامة.

وكذا في بدائع الصنائع ج:۷ ص:۵۷ كتاب الحدود ومثله في كتاب الفقه على المذاهب الأربعة ج:۵ ص:۲۴۹ كتاب الحدود.

﴿فصل فی القسامة﴾

(قسامت یعنی کسی جگہ پائے جانے والے مقتول پر اہلِ محلّہ سے قسم لینے کا بیان)

کسی بستی کی طرف منسوب اُس کی مخصوص شارعِ عام میں پائی جانے والی لاش کی قسامت اُس بستی والوں پر ہوگی

سوال:- ایک لاش ایک بستی کے قریب اُس کی سڑک پر ملی، وہ سڑک ایسی ہے کہ اُسے اسی بستی کی طرف ہی مکمل طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس سڑک پر اگر لاش ملے تو اس بستی والوں پر قسامت آئے گی یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس سڑک سے اس بستی کا کچھ فاصلہ بھی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے، نیز یہ سڑک اسی بستی کے لئے تقریباً مخصوص ہے، پہلے ایک فتویٰ دیا گیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ اس بستی والوں پر قسامت نہیں آئے گی، صحیح شرعی صورتِ حال سے برائے کرم آگاہ فرمائیں۔

جواب:- مخدوم گرامی قدر و مکرّم جناب مولانا تاج محمد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نہایت شرمندہ ہوں کہ آنجناب نے جو اِستفتاء دستی طور پر احقر کو دیا تھا، اس کے جواب میں بہت تاخیر ہوئی، اس سے آنجناب کو جو تکلیف پہنچی، اس پر معذرت کے لئے احقر کے پاس الفاظ نہیں، اُمید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ اب آنجناب نے دوبارہ سوال و جواب متعلقہ عبارتوں کے ساتھ ارسال فرمائے تو مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا، دونوں سوال و جواب اور متعلقہ عبارتیں دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ دونوں فتووں میں اصل حکم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں۔ یہ مسئلہ غیر مختلف فیہ ہے کہ اگر شارعِ عام پر ایسی جگہ لاش ملے جو کسی بستی سے اتنی قریب ہو کہ وہاں تک مقتول کی آواز پہنچ سکتی ہو تو اس بستی والوں پر قسامت ہوگی، لیکن اگر وہ جگہ بستی سے اتنی دُور ہے کہ مقتول کی آواز بستی تک نہیں پہنچ سکتی تو اس صورت میں بستی والوں پر قسامت نہیں، چنانچہ متعلقہ تمام مسائل کو نہایت جامع انداز میں علامہ رافعیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وظهر منه انه كما لا يناسب العمل بإطلاق المتون لا يناسب الإفتاء بوجوب القسامة والدّية على أهل ادنى الحال مطلقًا، والحاصل أن القتيل إن وجد في الشارع الأعظم ونحوه فان وقع عند الازدحام فلا قسامة، وديته علىٰ بيت المال، وإن وقع في موضع لو صيح فيه يسمعه أهل العمران فالقسامة والدّية على أدنى المحال، وفي موضع بعيد منتفع به بين المسلمين فهي علىٰ بيت المال، وإلا فهدر اهـ."

(تقريرات الرافعي ج:٦ ص:٣٣٩)(طبع جديد، ط سعيد)

لہٰذا اس عبارت میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ جس اِستفتاء کے جواب میں ابتداءً فتویٰ جاری ہوا، اس میں یہ صراحت تھی کہ جس جگہ مقتول پایا گیا وہ بستی سے ۵۰۰ میٹر دُور تھی، اور اس جگہ اور بستی کے درمیان کھیت اور کنویں بھی حائل تھے، لہٰذا جواب دینے والے صاحب نے سمجھا کہ ۵۰۰ میٹر یعنی نصف کلومیٹر کے فاصلے سے عام طور پر آواز نہیں پہنچتی، بالخصوص جبکہ درمیان میں کھیت اور کنویں بھی حائل ہوں، البتہ مناسب یہ تھا کہ وہ جواب میں یہ صراحت کردیتے کہ یہ جواب اس صورت میں ہے جب واقعۃً فاصلہ اتنا ہو کہ آواز نہ پہنچے۔

دراصل حکم کا مبنیٰ یہ ہے کہ شارعِ عام اگر بستی والوں کی طرف اس طرح منسوب کی جاسکتی ہو کہ اس کی حفاظت اور اس کی نگہداشت کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہو، تو شارعِ عام کے اس حصے پر پائے جانے والے مقتول کے سلسلے میں قسامت ان پر عائد ہوگی، اس بات کی علامت کے طور پر فقہائے کرام نے چیخ کی آواز پہنچنے کو ذکر فرمایا ہے۔

لہٰذا نفسِ مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سارا مدار صورتِ مسئولہ کے صحیح صحیح تعین پر ہے، ظاہر ہے کہ آپ وہاں سے قریب ہیں، اور آپ تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر فیصلہ فرماسکتے ہیں، اگر وہ جگہ واقعۃً ایسی ہے کہ اسے آواز پہنچنے کی وجہ سے بستی سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو بے شک قسامت ہوگی، ورنہ نہیں۔ یہ بات آپ خاص طور پر ملاحظہ فرمالیں کہ اگر واقعۃً فاصلہ ۵۰۰ میٹر کا ہے، اور بیچ میں کھیت وغیرہ حائل ہیں تو بظاہر آواز کا پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ جو سوال سب سے پہلے آیا تھا، اس میں غیر واضح انداز میں یہ بھی تذکرہ تھا کہ دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اور اس جگہ پر کوئی خون بھی نہیں پایا گیا، ان پہلوؤں پر بھی تحقیق اور غور کی ضرورت ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: عبداللہ میمن

۱۴۱۴/۱۲/۲۳ھ

﴿کتاب الجنایات﴾
(جنایت کے مسائل کا بیان)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کے باڑے میں کسی کا اپنا اُونٹ لے جانا اور اس جانور کا دُوسرے جانوروں کو ہلاک کرنے کا حکم

سوال:- زید کا ایک اُونٹ ہے، اور عمرو کا اُونٹوں کا ایک گلہ، ایک دن زید نے چاہا کہ وہ اپنا اُونٹ عمرو کے اُونٹوں کے گلے کے ساتھ کردے، لیکن عمرو نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہارا (یعنی زید کا) اُونٹ بہت بدمعاش ہے اور خطرہ ہے کہ وہ میرے اُونٹوں کو ہلاک نہ کردے منع کردیا، مگر زید نے عمرو کے منع کرنے کے باوجود اپنا اُونٹ عمرو کے گلے میں چھوڑ دیا، دُوسری صبح عمرو کے اُونٹوں میں سے دو اُونٹ مُردہ پائے گئے اور زید کا اُونٹ ان کے ساتھ پایا گیا، (واضح رہے کہ زید کے اُونٹ کے ساتھ عمرو کا صرف ایک ہی اُونٹ برابر ہے باقی سب چھوٹے ہیں) مردہ اُونٹوں کے جسموں کے مختلف مقامات پر اُونٹ کے دانتوں کے نشانات اور کف پایا گیا، اس کے علاوہ اُونٹوں کے رگیدنے کے نشانات بھی پائے گئے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے جو مندرجہ ذیل شک کو یقین میں بدلنے کے موجب ہیں۔

۱:- زید کا اُونٹ بدمعاشی اور نقصان رسانی میں مشہور ہے، اور علاقے کے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

۲:- بقول بکر (جس سے زید نے یہ اُونٹ خریدا تھا) اُس نے اپنا یہ اُونٹ اسی لئے بیچا تھا کہ اس کی عادات بدتھیں اور خطرہ تھا کہ کہیں کسی انسان کو ہلاک یا زخمی نہ کردے۔

۳:- اس وقوعہ سے چند دن قبل علاقے کے نمبردار نے ایک ایسی پنچائت میں جس میں زید بھی حاضر تھا اُونٹوں کی نگرانی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے زید کا نام بطورِ خاص لیا اور صریح الفاظ میں اُس کو تنبیہ کی کہ وہ اپنے اُونٹ کی خطرناکی کے پیشِ نظر کسی بھی متوقع حادثے سے بچنے کے لئے اپنے اُونٹ کی نگرانی کرے۔

۴:- معزّزینِ قوم نے مردہ اُونٹوں کا موقع پر معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ زید کے اُونٹ نے ہلاک کیا ہے۔

الف:- شرع کی رُو سے زید پر عمرو کے اُونٹوں کا ضمان آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کس شرعی اُصول کی رُو سے؟

ب:- اُونٹ کی ہلاکت کے عینی شاہد نہیں ہیں، کیا زید کے اُونٹ کا بدمعاش مشہور ہونا ثبوت کے لئے کافی ہے یا کوئی اور ثبوت دینا ہوگا؟

ج:- کیا بکر کا بیان اور نمبر۳ میں نمبردار کی تنبیہ زید کے اُونٹ کا عمرو کے اُونٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے؟

جواب:- اگر سوال میں مندرجہ تمام واقعات دُرست ہیں، اور زید نے واقعۃً عمرو کی اجازت اور اِطلاع کے بغیر اپنے شریر اُونٹ کو عمرو کے اُونٹوں کے باڑے میں چھوڑا تھا تو صورتِ مسئولہ میں زید پر عمرو کے ہلاک شدہ اُونٹوں کا ضمان واجب ہے، بشرطیکہ سوال میں مندرج قرائن اس قدر واضح ہوں کہ بستی کے تجربہ کار لوگوں کو اس بات کا گمان غالب ہوجائے کہ عمرو کے اُونٹوں کو زید کے اُونٹ ہی نے ہلاک کیا ہے، اس مسئلے میں فقہائے کرامؒ کی متعلقہ تصریحات حسبِ ذیل ہیں:-

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:"فی داره أبعرة أدخل عليها آخر بعيرًا مغتلما أو غير مغتلم بإذن صاحبها فقتل الداخل ذٰلک الابل لا يضمن، وإن بلا اذنه يضمن." (بزازية علیٰ هامش الهندية ج:۶ ص:۴۰۳)(۱)۔

---

(۱) هامش الهندية (الرابع في الجناية علىٰ غير بني آدم ...الخ) (طبع رشيديه كوئٹه).
وفي ردّ المحتار، كتاب الجنايات، باب جناية البهيمة والجناية عليها ج:۶ ص:۶۱۲ (قبيل باب جناية المملوک والجناية عليه) (طبع سعيد) اذا كان في داره بعير فادخل عليه آخر بعيرًا مغتلمًا أو لا فقتل بعيرهٗ ان بلا اذن صاحبها يضمن كما في البزازية أقول ويظهر أرجحية هٰذا القول لموافقته لما مرّ أوّل الباب من أنّهٗ يضمن ما أحدثته الدّابة مطلقًا اذا أدخلها في ملک غيره بلا اذنه لتعديه .....الخ.
وفي مجمع الضّمانات الفصل الخامس في جناية البهيمة ج:۴ ص:۴ وان أدخل بعيرًا مغتلمًا في دار رجل وفي الدّار بعير صاحب الدّار فوقع عليه المغتلم اختلفوا فيه قال بعضهم لا يضمن صاحب المغتلم وقال الفقيه أبو اللّيث ان أدخله باذن صاحب الدّار لا يضمن وان أدخله بغير اذنه ضمن وعليه الفتویٰ لأنّ صاحب المغتلم وان كان مسببا فاذا أدخله باذنه لم يكن متعدّيا وان أدخل بغير اذنه كان متعدّيا فيضمن كمن ألقیٰ حيّة علیٰ انسان فقتلهٗ كان ضامنًا.
وفي الهندية، كتاب الجنايات، الباب الثاني عشر في جناية البهائم والجناية عليها ج:۶ ص:۵۲ (طبع رشيديه كوئٹه) رجل أدخل بعيرًا مغتلمًا في دار رجل وفي الدّار بعير صاحبها فوقع عليه المغتلم فقتله اختلف المشائخ رحمهم الله فيه منهم من قال لا ضمان علیٰ صاحب المغتلم وقال بعضهم ان أدخل صاحب المغتلم بغير اذن صاحب الدّار فعليه الضّمان وان كان أدخله بأذنِه فلا ضمان وبه أخذ الفقيه أبو اللّيث رحمه الله تعالیٰ وعليه الفتویٰ كذا في المحيط.
وفي الهندية، كتاب الغصب، الباب الرّابع عشر في المتفرّقات ج:۵ ص:۱۵۲ (طبع رشيديه كوئٹه) وان أدخل في دار رجل بعيرًا مغتلمًا وفي الدّار بعير صاحب الدّار فوقع عليه المغتلم اختلفوا فيه قال الفقيه أبو اللّيث ان أدخله باذن صاحب الدّار لا يضمن وان أدخله بغير اذنه يضمن وعليه الفتویٰ .....الخ.

ربط حمارہ فی ساریة فجاء آخر بحمارہ وربطہ، فعضّ أحدهما الآخر وهلک إن فی موضع لهما ولایة الربط لا یضمن، وإلّا ضمن، بأن لم یکن ذٰلک الموضع طریقا ولا ملکا لأحد لا یضمن اذا کان فی المکان سعة، وفی الطریق یضمن لأن الربط ثمه جنایة. (حوالہ مذکورہ[1] و شامی ج:۴ ص:۳۹۲)[2]۔

اور ایسے مواقع پر ایسے قرائن کی بنیاد پر ضمان عائد کیا جاسکتا ہے جن کی موجودگی میں ظنِ غالب قائم ہوجائے، چنانچہ معین الحکام میں ہے: "علی الناظر أن یلحظ الأمارات والعلامات إذا تعارضت، فما ترجح منها قضی بجانب الترجیح وهو قوة التهمة، ولا خلاف فی الحکم بها وقد جاء العمل بها فی مسائل اتفق علیها الطوائف الأربع من الفقهاء." (معین الحکام ص:۲۰۳، باب: ۵۱، فی القضاء بما یظهر من قرائن الأحوال والامارات). هذا ما عندی

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۶/۷ھ
(فتویٰ نمبر ۵۷۰/۲۸ ب)

☆☆☆

(۱) البزازیة علیٰ هامش الهندیة، کتاب الجنایات (الرّابع فی الجنایة علیٰ غیر بنی آدم ....الخ) ج:۶ ص:۴۰۳ (طبع رشیدیه کوئٹه).

(۲) وفی الشامیة، باب جنایة البهیمة والجنایة علیها قبیل باب جنایة المملوک والجنایة علیه ج:۶ ص:۶۱۲ (طبع سعید) ربط حمارهٗ فی ساریة فربط آخر حماره، فعض حمار الأوّل ان فی موضع لهما ولایة الرّبط لا یضمن والّا ضمن ملخّصًا والله تعالیٰ أعلم.

﴿کتاب الصلح﴾

(صلح کے مسائل کا بیان)

کلیم کے ذریعے حاصل کی گئی جائیداد سے بدلِ صلح لے کر دستبردار ہونے والے کو دوبارہ مطالبے کا اختیار نہیں

سوال:- الف:- محمد اسماعیل ولد حاجی اللہ دیا، ساکن سرگودھا (داماد)

ب:- ملک دین محمد، ساکن کراچی (سسر)۔

ج:- اصل دُکان دار جس سے پگڑی پر ''الف'' نے عارضی طور پر دُکان خریدی۔

''الف'' نے ''ج'' سے تقریباً تین ہزار روپے میں پگڑی پر دُکان خریدی، (تحقیق معلوم نہیں) یہ صرف ''الف'' کی زبانی ہے، یہ سرکاری طور پر بیع نہیں ہوسکتی تھی لیکن ایک شرط پر کہ مہاجر کو متروکہ جائیداد کے بدلے پاکستان کی متروکہ جائیداد مل سکتی ہے، چونکہ ''الف'' کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی، بدیں وجہ ''الف'' نے ''ب'' کی متروکہ جائیداد کا کلیم حاصل کیا، جو کہ پانچ ہزار کا تھا۔ ''ب'' نے اس شرط پر کلیم دیا کہ آدھی دُکان ''الف'' کی ہوگی اور آدھی ''ب'' کی ہوگی، یہ سب زبانی اقرار ہوا جس کو ''الف'' نے بخوشی قبول کیا۔

لیکن سرکاری طور پر یہ دُکان بہ قیمت پانچ ہزار میں مل جانے پر ''الف'' نے بدعہدی کی، اور پانچ ہزار کے کلیم کا آدھا حصہ دینا چاہا، لیکن ''الف'' کے والد کے ڈانٹنے پر کلیم یعنی پانچ ہزار نقد ادا کردیا (بذریعہ اَقساط) چونکہ ''ب'' کی مالی حالت اچھی نہ تھی دُوسرے رشتہ داری کا معاملہ، تیسرے بوجہ مجبوری کلیم کی رقم وصول کرلی، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا ''ب'' کا آدھا حصہ برقرار ہے (بشرطیکہ پورے خرچ کا آدھا حصہ ادا کردے) یا کہ نہیں؟

کیا ''الف'' اَز رُوئے شرع بدعہدی کا گنہگار ہے یا کہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچنے کے لئے آدھی دُکان دیدے، اس دُکان سے برسوں سے تین سو، چار سو، پانچ سو ماہوار

کرایہ کھا رہا ہے، اب مرتے وقت مسجد کے نام اللہ کے نام پر دُکان دے رہا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- کلیم کے ذریعے حکومت جو جائیداد کسی کو دیتی ہے وہ حکومت کی طرف سے اُس کو عطیۂ ابتدائی ہوتا ہے، اور اُس کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے کلیم پر وہ جائیداد عطا کی گئی، لہٰذا کلیم میں حاصل ہونے والی اس دُکان کا اصل مستحق ''ب'' تھا، لیکن اس نے ''الف'' کو آدھی دُکان دینے کا جو معاہدہ کرلیا، یہ درحقیقت کلیم حاصل کرنے کی اُجرت تھی (جو جعالہ یا سمسرہ کے اُصول پر دُرست ہوسکتی ہے)، لہٰذا ''الف'' پر واجب تھا کہ وہ دُکان کا آدھا حصہ خود رکھے، اور آدھا حصہ ''ب'' کو دے، اُس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرکے بدعہدی کا گناہ کیا، لیکن جب اس نے پانچ ہزار روپے کی رقم ''ب'' کو دے دی اور ''ب'' نے وہ رقم بغیر کسی اعتراض کے رکھ لی اور اس وقت دُکان کے نصف حصے کا مطالبہ نہیں کیا، تو فقہی اعتبار سے وہ بدلِ صلح لے کر دُکان سے دستبردار ہوگیا،[1] اب پوری دُکان ''الف'' کی ہوگئی،[2] ''الف'' کو چاہئے کہ اس نے شروع میں جو بدعہدی کی تھی اُس پر توبہ و اِستغفار کرے، اور ''ب'' سے بھی اس پر معافی مانگے، لیکن بدلِ صلح وصول کرنے کے بعد ''ب'' اس دُکان سے دستبردار ہوچکا ہے، لہٰذا اب دُکان ''الف'' ہی کی ہے،[3] اب اس پر اس کا نصف حصہ ''ب'' کو دینا واجب نہیں۔[4]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۰/۲۷ و)

(۱ تا ۴) وفی الدّر المختار، کتاب الصُّلح ج:۵ ص:۶۲۹ (طبع سعید) وحکمه وقوع البراۃ عن الدّعویٰ ووقوع الملک فی مصالح علیه وعنه لو مقرًّا أو هو صحیح مع اقرار أو سکوت أو انکار فالأوّل حکمه کبیع ان وقع عن مال بمال وحینئذٍ فتجری فیه أحکام البیع. وفی الشامیة تحته (قوله کبیع) أی فتجری فیه أحکام البیع فینظر ان وقع علیٰ خلاف جنس المدعی فهو بیع وشراء کما ذکر هنا وان وقع علیٰ جنسه فان کان بأقل من المدعی فهو حط وابراء .... اعتبر بیعًا ان کان علیٰ خلاف الجنس ......الخ.

﴿کتاب الو کالة﴾
(وکالت کے مسائل کا بیان)

عقدِ وکالت میں مضاربت کے طور پر اُدھار چیز فروخت کرنے اور وکیل سے فوری ثمن کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حکم

سوال:- فضيلة القاضى محمد تقى العثمانى المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تنوى شركة تيباستى لتجارة السيّارات شراء سيّارات من شركة تويوتا اليابانية بطريقة الدفع المؤجل بعد ١٨٠ يومًا من تاريخ استلام البضاعة وترغب المضاربة الاسلامية الدخول فى هٰذه الصفقة حسب الخطوات التالية:-

١- تقوم شركة تويوتا بتعيين المضاربة الإسلامية وكيلة لها فيما يتعلق بتداول ومعالجة جميع وثائق إتمام العملية بما فى ذٰلك سندات الدفع والضمانات والأمور الأخرىٰ المتعلقة بها.

٢- تقوم المضاربة الاسلامية بإبلاغ شركة تيباستى بأمر تعيين المضاربة وكيلة لتويوتا لهٰذه العملية وتحصل علىٰ قبولها بذٰلك.

٣- تقوم المضاربة بدفع قيمة السيّارات إلىٰ شركة تويوتا فور تسلم شركة تيباستى لهٰذه السيّارات وذٰلك بعد خصم نسبة مئوية من هٰذه القيمة كعمولة للمضاربة بصفتها وكيلة للشركة البائعة.

٤- تقوم المضاربة بتحصيل كامل قيمة السيّارات لحسابها من شركة تيباستى بعد ١٨٠ يومًا من تاريخ استلامهم لهٰذه السيّارات.

أرجو من فضيلتكم التكرم بابداء رأيكم بصحة هٰذه العملية من الوجهة الشرعية ليسنى اعتمادها أو تعديلها بما هو مناسب وذٰلك قبل الشروع بها.

زياد على صبرى

مدير برج المؤسسة العربية المصرفية المنطقية المنامة دولة البحرين

جواب:-

الیٰ سیادة الأخ زیاد علی صبری

مدیر المضاربة الاسلامیة فی المؤسسة العربیة

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

استلمت رسالتکم الّتی سئلتم فیها عن شرعیة عقد الوکالة مع شرکة تویوتا ونظرت فی شرط هٰذا العقد، فتبین لی أن هٰذا العقد یمکن بطریقتین، أحدهما جائز، والآخر غیر جائز.

الأوّل أن تلتزم المضاربة الاسلامیة فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا (وهی البائعة) أنها ستقوم بدفع الثمن إلیها من قبل شرکة تیباستی (وهی المشتریة) فور استلامها للسیّارات. وباستلام الثمن منها عند حلول أجل ۱۸۰ یومًا فهٰذا الشرط فی عقد الوکالة شرط فاسد لا یجوز شرعًا، وذٰلک لأن مقتضی هٰذا الشرط من قبل الموکل أنه توکیل ببیع السیّارات بثمن مؤجل علیٰ أن یدفع الوکیل الثمن إلی المؤکل حالًا. وهٰذا مناقض لعقد الوکالة.[۱]

والطریق الثانی: أن لا یشترط ذٰلک فی عقد الوکالة مع شرکة تویوتا بل توکل شرکة تویوتا المضاربة الاسلامیة ببیع السیارات بیعًا حالًا وتعقد المضاربة الاسلامیة البیع الحال مع شرکة تیباستی، کوکیل عن شرکة تویوتا، ثم تستقرض شرکة تیباستی مبلغ الثمن من المضاربة الاسلامیة بعقد منفصل من عقد البیع، وحینئذٍ تدفع المضاربة الاسلامیة ثمن السیّارات إلیٰ شرکة تویوتا بعد خصم أجرة الوکالة منه ثم تدفع شرکة تیباستی المبلغ المستقرض من المضاربة بکامله.

وهٰذا الطریق جائز شرعًا ما دام کلّ من عقد الوکالة وعقد البیع وعقد الاستقراض منفصلًا عن الآخر.[۲]

والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

۱۴۰۸/۱۱/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۳۹۳ ح)

⁂

(۱) فی الدر ج:۵ ص:۵۲۲ (طبع سعید) وصح بالنسیئة ان التوکیل بالبیع للتجارة وان کان للحاجة لا یجوز ...... لٰکنه لا یطالب الا بعد الأجل کما فی تنویر الأبصار.

(۲) فی مسند أحمد بن حنبلؒ رقم:۳۷۸۳ ج:۴ ص:۳۰ (طبع دارالحدیث القاهرة) نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن صفقتین فی صفقة واحدة. نیز دیکھئے ص:۸۷ کا حاشیہ نمبر۱ وص:۵۷ کا حاشیہ نمبر۱و۲۔

﴿کتاب القسمة﴾
(تقسیم کے مسائل کا بیان)

چار بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر تنازعے کا حل

سوال:- حاجی علی محمد صاحب ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے، ان کے چار بیٹے محمد علی، محمد شریف، محمد عارف اور انور علی تھے، ۹۲، ایکڑ رقبہ بذریعہ ثالثان چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے قرعہ اندازی سے خانگی تقسیم کی گئی، محکمہ مال میں مشترکہ کھاتہ رہا، محمد علی اپنے قرعے کے مطابق اپنے حصے کا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، باقی تین بھائی دو سال اِکٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک بھائی محمد عارف بھی قرعہ والا رقبہ لے کر جدا ہوگیا، رقبے میں کوئی فرق تاحال نہ آیا تھا، اس کے بعد پتہ چلا کہ محمد شریف کے حصے والے رقبے میں ۱۵، ایکٹر کا پانی نہیں ہے جو کہ بارانی قسم کا ہے، باقی تین بھائیوں کے حصے میں تمام نہری قسم کا رقبہ ہے، محمد شریف نے پنچایت کی کہ بارانی قسم والا رقبہ حصہ رسدی تقسیم ہونا چاہئے جو کہ لاعلمی کی وجہ سے اکیلے محمد شریف کے حصے میں ان کی قدر رقبہ یعنی بارانی قسم کا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ تین بھائیوں کے حصے میں پندرہ پندرہ ایکڑوں میں کہیں کہیں کلر والا رقبہ تھا، محمد شریف کے حصے میں (پندرہ ایکڑ میں) بھی کہیں کہیں ٹیلہ تھا، پنچایت نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ تقسیم کرلی جائے، لیکن دو بھائی محمد علی اور محمد عارف نے کہا کہ اب ہم دوبارہ تقسیم نہیں کرتے، اور نہ ہی خرچہ ان کی مد کا ادا کرتے ہیں، لہٰذا محمد شریف اور انور علی دو بھائی اِکٹھے رہ رہے تھے اور ان کے قبضے کے رقبات بھی اِکٹھے تھے، ان دونوں نے مل کر محکمہ انہار میں دعویٰ کردیا، دونوں بھائیوں نے اپنے خرچے سے ان ٹیلوں کو آباد کیا، محکمہ انہار میں ۱۵ سال دعویٰ دائر رہا، فیصلہ ہوا کہ بارانی قسم کی بری قسم میں منظور کیا جاتا ہے۔ دونوں بھائی اتفاق و محبت سے کئی سال تک اِکٹھے رہے اب جھگڑا پڑ گیا ہے، محمد شریف کہتا ہے کہ میں وہی رقبہ جو کہ آج سے پچیس سال پہلے میرا حصہ تھا وہی لے کر جدا ہوں گا، انور علی کہتا ہے کہ ہم دونوں بھائیوں والا حصہ ازسرِنو تقسیم ہو، کیونکہ رقبے میں کافی فرق آچکا ہے، محمد شریف کے سوا تمام ۲۳، ایکڑ اراضی اچھی حالت میں ہیں، انور علی کے پندرہ ایکڑ کلر ہوچکے ہیں، شرعاً کیا فیصلہ ہے کہ چاروں بھائی ازسرِنو تقسیم کریں یا صرف ہم شریف اور انور علی کی زمین ہی ازسرِنو تقسیم ہو، یا بالکل نہ ہو؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں محمد شریف اور انور علی کو صرف اپنے اپنے حصوں کی تقسیم ازسرِنو کرنی چاہئے، دراصل جب چاروں بھائیوں کے درمیان زمین تقسیم ہوئی اُس وقت یہ غلطی رہ گئی کہ

لاعلمی کی وجہ سے ایک حصے میں پندرہ ایکڑ رقبہ بارانی آ گیا، جبکہ باقی تمام حصوں میں رقبہ نہری تھا، اُس وقت محمد شریف نے تقسیم پر جو اِعتراض کیا وہ دُرست تھا، اور چاروں بھائیوں کو چاہئے تھا کہ تقسیم ازسرِنو کرتے (کما یفهم من العبارة الأولیٰ)۔ لیکن جب دُوسرے بھائیوں نے ازسرِنو تقسیم کرنے سے انکار کیا تو محمد شریف زمین کو نہری قرار دینے کی درخواست دے کر اور انور علی کے ساتھ شرکت کر کے عملاً دوبارہ تقسیم کے حق سے دستبردار ہوگیا، اب انور علی کے ساتھ شرکت قائم کرنے سے ان دونوں کے درمیان جو تقسیم ہوئی تھی وہ فسخ ہوگئی، اور محمد شریف اور انور علی کے حصوں کی زمین ان دونوں کے درمیان پھر سے مشترک ہوگئی، (کما یفهم من العبارة الثانیة)۔ اب جبکہ یہ دونوں الگ ہونا چاہتے ہیں انہیں ازسرِنو تقسیم کر کے الگ ہونا چاہئے، اس سلسلے میں عباراتِ فقہیہ درج ذیل ہیں:-

العبارة الأُولیٰ:- ”اذا اقتسما دارًا فلما وقعت الحدود بینهما اذا أحدهما لا طریق له فإن کان یقدر علیٰ أن یفتح لنصیبه فی حیزه طریقًا آخر فالقسمة جائزة وإن کان لا یقدر علیٰ أن یفتح لنصیبه طریقًا إن علم وقت القسمة أن لا طریق له فالقسمة جائزةٌ وان لم یعلم فالقسمة فاسدة.“ (عالمگیریة ج:۵ ص:۲۱۱، کتاب القسمة، باب:۳)۔[1]

العبارة الثانیة:- ”القسمة تقبل النقض، فلو اقتسموا وأخذوا حصتهم ثم تراضوا علی الاشتراک بینهم صح) وعادت الشرکة فی عقار أو غیره لأن قسمة التراضی مبادلة ویصح فسخها ومبادلتها بالتراضی“ (درمختار مع شامی ج:۵ ص:۱۷۰، کتاب القسمة)۔[2]

هٰذا ما ظهر لی   واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۲۳/۲۷ و)

---

(۱) وفی الهدایة ج:۴ ص:۴۱۷، کتاب القسمة (طبع شرکت علمیه).
وفی البحر الرّائق، کتاب القسمة (طلب بعض الشرکاء القسمة) ج:۸ ص:۱۵۳ (طبع سعید) ولو أقسموا دارًا فاذا لا طریق لأحدهم وقدر علیٰ أن یفتح فی نصیبه طریقًا یمرّ فیه الرّجل دون الحمولة جازت القسمة لأنّها لم تتضمن تفویت منفعة وان لم یقدر ینظر ان لم یعلم أنّه لا طریق لهٗ فالقسمة فاسدة وان علم انه لا طریق لهٗ جازت القسمة لأنّه رضی بهٰذه القسمة.
وفی المحیط البُرهانی، کتاب القسمة، فصل فی بیان ما یقسم وما لا یقسم ...الخ ج:۱۱ ص:۱۵۰ (طبع ادارة القرآن) واذا اقتسم الرّجلان دارًا فلمّا وقعت الحدود بینهما فاذا أحدهما لا طریق لهٗ فان کان یقدر علیٰ أن یفتح فی حیّزه طریقًا فی القسم جائز وان کان لا یقدر أن یفتح لنصیبهٖ طریقًا فان لم یعلم وقت القسم أن لا طریق لهٗ فالقسمة فاسدة لأنها تضمنت تفویت منفعة علیٰ بعض الشرکاء بغیر رضاهٗ وان علم وقت القسمة أن لا طریق لهٗ فالقسمة جائزة .....الخ.
(۲) الدّر المختار ج:۶ ص:۲۶۸ (طبع سعید)
وفی بدائع الصّنائع، کتاب القسمة، فصل وامّا صفات القسمة ....الخ ج:۷ ص:۲۸ (طبع سعید)
وأمّا فی قسمة التّراضی فیجوز الرّجوع لأنّ قسمة التّراضی لا تتمّ الّا بعد خروج السهام کلّها وکل عاقد بسبیل من الرّجوع عن العقد قبل تمامهٖ کما فی البیع نحوه.
وفیه أیضًا ج:۷ ص:۲۶ (طبع سعید) ان قسمة الجمع فی الدّور بالتّراضی جائزة بلا خلاف ومعنی المبادلة وان کان لازمًا فی نوعی القسمة لٰکن هٰذا النوع بالمبادلات أشبهُ واذا تحققت المبادلة صح البناء .....الخ.

کتاب الإسترِقاق

(غلام اور باندی بنانے کے مسائل)

آج کل کسی کوغلام اور باندی کے طور پر خریدنے اور رکھنے کا حکم

سوال:- اس وقت شرعاً غلاموں کی خرید وفروخت جائز ہے یانہیں؟ اور باندیاں رکھنا جائز ہے یانہیں؟

جواب:- ہمارے زمانے میں شرعی غلام اور باندیاں کہیں نہیں پائی جاتیں، لہٰذا آج کل کسی کوغلام یا باندی کے طور پر رکھنا جائز نہیں۔[1]

سوال:- معلوم ہوا ہے کہ عرب لوگ ابھی تک عجمی ملکوں سے باندیاں خرید کر کے اپنے پاس رکھتے ہیں جن کی تعداد پچاس یا سوتک پہنچ جاتی ہے، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

جواب:- ہمیں اس کی تحقیق نہیں ہے کہ وہ کس قسم کے غلام اور باندیاں ہیں؟ اور وہ کس مقصد سے انہیں رکھتے ہیں؟

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفااللہ عنہ

۸۸/۲/۲۵ھ

موجودہ زمانہ میں غلام اور باندی کا تصور اور باندی کی شرعی تعریف اور اس کے صحبت واولاد کا حکم

سوال:- لونڈی سے بغیر نکاح کے صحبت کرنا جائز ہے؟ اور لونڈی کی کیا تعریف ہے؟ اگر کوئی کہے کہ یہ اولاد حرام کی ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- آج کل شرعی لونڈیوں اور غلاموں کا کہیں وجود نہیں ہے، پہلے زمانے میں جب اسلامی حکومت جہاد کرتی تھی اور جہاد میں دشمن کی عورتیں قید ہوکر آتی تھیں[2] تو اسلامی حکومت کو ایسی لونڈی سے صحبت بھی جائز تھی، بشرطیکہ وہ یا مسلمان ہوگئی ہو یا اہلِ کتاب میں سے ہو۔[3] اس کی اولاد

---

(۱) تفصیل کیلئے اگلے فتاویٰ اوران کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲و۳) وفی التفسیر المظهری سورة النساء ج: ۲ الجزء الثانی ص: ۶۴ (طبع رشیدیه) والمحصنٰت من النساء إلا ما ملکت أیمانکم .... والصحیح ما روی مسلم وأبو داؤد والترمذی = (باقی آئندہ صفحہ پر)

کو حرام اولاد کہنا بالکل غلط ہے۔(۱)

البتہ آج کل چونکہ لونڈیوں کا وجود نہیں ہے، اس لئے کسی عورت کو غلط طور پر لونڈی قرار دیکر اس سے صحبت کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم
۹۷/۹/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۹۲۱ / ۲۸ ج)

بین الاقوامی معاہدہ کی وجہ سے کسی کو غلام بنانا جائز نہیں

سوال:- استرقاق یعنی کسی کو غلام بنانا درست ہے یا نہیں؟ آپ نے جو بات تحریر فرمائی ہے کیا اُس سے استرقاق یعنی غلام بنانے کا مطلقاً عدمِ جواز سمجھنا درست ہے؟ براہِ کرم اس کے بارے میں اصل شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔ (محمد سردار)

جواب:- عزیز گرامی قدر جناب مولانا محمد سردار صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج ہی ایک طالب علم نے آپ کا یہ خط احقر کو دیا، پہلے میں اس کو نہ دیکھ سکا تھا، کیونکہ کسی

(گذشتہ سے پیوستہ) = والنسائی عن أبی سعید الخدری قال أصبنا سبایا من سبی أوطاس لهن أزواج فكرهنا أن نقع علیهن ولهن أزواج فسألنا النبی صلی الله علیه وسلم فنزلت والمحصنٰت من النساء إلا ما ملكت أیمانكم یقول الا ما أفاء الله علیكم فاستحللتم بها فروجهن۔

وقال الله تعالیٰ: وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء: ۲۵)

وفی الهندیة (۱/ ۵۳۶) كتاب الطلاق، الباب الخامس عشر فی ثبوت النسب۔ (رشیدیه)

أم الولد والحكم فیها أن یثبت النسب من غیر دعوة و ینتفی بمجرد النفی كذا فی الظهیریة، ....

قالوا: وإنما یثبت نسب ولد أم الولد بدون الدّعوة إن كان یحل للمولیٰ وطؤها۔ اهـ

وفی الدر المختار (۵۰/۵، ۵۲) باب البیع الفاسد (طبع سعید) بطل بیع ما لیس بمال كالدم والمیتة والحر۔

وفی الهدایة ، باب الغنائم وقسمتها ج: ۲ ص: ۵۵۱ و ۵۵۲ (طبع مكتبه رحمانیه) وإذا فتح الإمام بلدة عنوة أی قهرا......... وهو فی الأساری بالخیار إن شاء قتلهم لأنه علیه الصلاة والسلام قد قتل ولأن فیه حسم مادة الفساد وإن شاء استرقهم لأن فیه دفع شرهم مع وفور المنفعة لأهل الإسلام وإن شاء تركهم أحرارا ذمة للمسلمین۔ الخ

(۱) دیکھئے سابقہ حاشیہ

طالب علم کے پاس عام استفتاء سمجھ کر چلا گیا تھا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، معاف فرمایئے گا۔

(۱)...احقر نے غلامی کے بارے میں جو بات عرض کی تھی وہ یہ تھی کہ ''استرقاق'' تو اب بھی جائز ہے، لیکن چونکہ بحالاتِ موجودہ اکثر اسلامی ممالک نے اس بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کئے ہوئے ہیں کہ کوئی ملک اپنے جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنائے گا، اس لئے جب تک یہ معاہدہ باقی ہے، اس وقت تک مسلمان ملکوں کیلئے اپنے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز نہیں، البتہ اگر کسی وقت یہ معاہدہ ختم ہو جائے تو پھر اصل حکم (اباحتِ استرقاق) لوٹ آئیگا۔ البتہ شریعت نے جس طرح غلاموں کو آزاد کرنے کے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں اور اس کی جو فضیلتیں بیان فرمائی ہیں انکے پیشِ نظر ایسے معاہدے کو باقی رکھنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۴/۶/۱۴ھ

كتَابُ الذبَائِح

(ذبیحہ کے مسائل کا بیان)
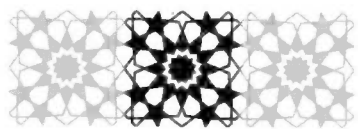
فصل فی شرائط الذبح وأحکامہ وآدابہ

(ذبح کی شرائط، احکام اور آداب کا بیان)

مرغ کی چار رگوں میں سے ایک رگ کٹنے سے رہ گئی تو اس ذبیحہ کا حکم

سوال:- زید نے بکر کے پاس اپنا ایک مرغا ذبح کیلئے بیٹے کے ہاتھ بھیجا، بکر چونکہ مولوی بھی ہے مگر ذبح کرتے وقت مرغ کی ہوا والی رگ کٹ جانے سے رہ گئی جس پر زید ناراض ہوگیا کہ میرا مرغا حرام ہوگیا اور بکر سے زبردستی بطورِ تاوان ایک مرغی لے گیا، بکر یقین دلاتا رہا کہ حرام نہیں ہوا، پکاؤ تم بھی کھاؤ، میں بھی کھاؤں گا، مگر زید نہ مانا۔

(۱)... کیا صورتِ مذکورہ میں بکر پر اَز روئے شرع تاوان لازم ہے؟

(۲)... کیا یہ ایک رگ رہ جانے سے مرغا حرام ہوا یا حلال؟

(۳)... کیا بجبر تاوان لینا زید کیلئے حلال ہوا یا حرام؟

اب زید اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اگر حرام نہیں ہوا تھا تو بکر نے پکا کر کیوں نہیں کھایا؟ بکر کہتا ہے کہ عوام الناس کی طعن و تشنیع سے بچنے کیلئے نہیں کھایا۔ گاؤں میں شیعہ حضرات بھی ہیں، وہ اس طرح فتوی دے رہے ہیں کہ ایک رگ رہ جانے سے مرغا اور تمام جانور حرام ہوجاتے ہیں، زید اسی سے متاثر ہے۔

جواب:- اگر صرف ایک رگ کٹنے سے رہ گئی تھی اور باقی تینوں رگیں یعنی کھانے کی نالی اور خون کی دونالیاں کٹ گئی تھیں تو مرغ حلال تھا،[۱] زید کا دعوی اور تاوان کا مطالبہ درست نہیں، کیونکہ چار رگوں میں سے اکثر کٹ جانے سے ذبح درست ہوجاتا ہے۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۳/۷/۱۳۹۷ھ

(۱و۲) وفی الهداية كتاب الذبائح ج:۴ ص: ۴۳۴ (طبع مكتبة رحمانية) والعروق التی تقطع فی الذكاة أربعة: الحلقوم، والمریء، والودجان .... وعندنا إن قطعها حل الأكل،= (باقی آئندہ صفحہ پر)

مشینی ذبیحہ کا حکم

سوال:- حضرت مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاجِ گرامی!

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ یہاں نیوزی لینڈ میں مرغیوں کو مشین کے ذریعے ذبح کیا جاتا ہے، اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ مرغیوں کو قطار کی شکل میں اُلٹا لٹکا دیا جاتا ہے، پھر اِن کا گزر ایک پانی کے برتن سے ہوتا ہے، جس میں بجلی کا ہلکا کرنٹ ہوتا ہے جو اِن کو تھوڑی دیر کیلئے بے ہوش کر دیتا ہے، پھر اس طریقے سے یہ مشینی چاقو کے پاس پہنچتی ہیں جو اِن کی گردن کاٹ دیتا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی ایک کمپنی نے جو بڑے پیمانے پر مرغیاں ذبح کرتی ہے، ہمارے اسلامک آرگنائزیشن سے رابطہ کیا ہے اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم ان کیلئے حلال سرٹیفائی کریں۔ بہت سے مسلم ممالک جیسے ملیشیا، انڈونیشیا اور غیر مسلم ممالک جیسے امریکا اور آسٹریلیا وغیرہ میں مشینی ذبیحہ کا یہ عمل جاری ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ذباح مشین کے بٹن کو

(گذشتہ سے پیوستہ) = وإن قطع أكثرها فكذلك عند أبي حنيفة رحمه الله .... والحاصل: أن عند أبي حنيفةؒ إذا قطع الثلاث أى ثلاث كان يحل۔

وفى الدر المختار ج: ۶ ص: ۲۹۴ و عروقه الحلقوم و المرى والودجان۔ وفيه أيضاً ج: ۶ ص: ۲۹۵ (طبع سعيد): وحل مذبوح بقطع أى ثلاث منها۔

وفى الفتاوى الهندية ج: ۵ ص: ۲۸۵ (طبع رشيدية) والعروق التى تقطع فى الذكاة أربعة: الحلقوم وهو مجرى النفس، والمرىء وهو مجرى الطعام، والودجان وهما عرقان فى جانبى الرقبة يجرى فيهما الدم، فإن قطع كل الأربعة حلت الذبيحة، وإن قطع أكثرها فكذلك عند أبى حنيفة -رحمه الله تعالى- وقالا: لا بد من قطع الحلقوم والمرىء وأحد الودجين، والصحيح قول أبى حنيفة -رحمه الله تعالى- لما أن للأكثر حكم الكل۔

وكذا فى البحر الرائق ج: ۱۷ ص: ۱۰۷ (طبع دارالكتب العلمية بيروت) والمبسوط للسرخسيؒ ج: ۵ ص: ۳ (طبع دار المعرفة بيروت) ومجمع الأنهر كتاب الذبائح ج: ۴ ص۱۵۸) (طبع دارالكتب العلمية بيروت) و تبيين الحقائق كتاب الذبائح ج: ۶ ص: ۷۵۷ (طبع سعيد)

"بسم الله ،الله اکبر" کہہ کر دبا تا ہے اور وہ مشین چلنے لگتی ہے اور وہ وہاں بیٹھ کر دیکھتا رہتا ہے اور مرغیاں زنجیروں میں منہ کے بل لٹکی ہوئی کٹنے لگتی ہیں اور ایک منٹ میں سو(۱۰۰) سے زیادہ مرغیاں ذبح ہوتی ہیں، اور جو مرغیاں چھوٹ جاتی ہیں یا صحیح طرح سے ذبح نہیں ہو پاتیں ،انہیں با قاعدہ ہاتھ کے ذریعہ تسمیہ کے ساتھ ذبح کیا جاتا ہے،اب اگر مشین کو کسی وجہ سے بند کر دیا گیا، پھر دوبارہ شروع کرنا ہوا تو پھر "بسم الله ،الله اکبر" کہہ کر بٹن دبایا جاتا ہے اور پھر مشین کاٹنے لگتی ہے۔

مشینی ذبیحہ کے ذریعے پروڈکشن زیادہ ہوتی ہے اور بازار میں کم قیمت میں مرغیاں فروخت ہوتی ہیں، جبکہ ہاتھ سے ذبح کرنے میں پروڈکشن کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے بازار میں اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں اس طرح سے مرغیوں کا ذبح کیا جانا حلال ہوگا یا نہیں؟ جلد از جلد جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، چونکہ تھوڑی عجلت ہے،اس لئے ہماری مؤدبانہ درخواست ہے کہ جواب فیکس کے ذریعے ارسال فرمائیں۔ والسلام

أخوكم محمد عامر فیض الرحمٰن

المستشار الديني لاتحاد الجمعيات
الإسلامية النيوزيلندية
۲۰۰۵/۳/۷ء

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد عامر فیض الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مرغیوں کے ذبح کی جو صورت آپ نے لکھی ہے، وہ بندہ نے مختلف مقامات پر دیکھی ہے، اس طریقۂ کار میں اور باتیں تو قابلِ گوارا ہوسکتی ہیں،لیکن ایک مرتبہ "بسم الله" پڑھ کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرغیوں کا ذبح ہو جانا ایسا امر ہے جو شرعی ذبیحہ کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔فقہاءِ کرامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ ایک ہی حرکت میں متعدد جانور ذبح ہوں تو ہر ایک پر تسمیہ

الگ ہونا ضروری ہے،[1] لہٰذا ہم نے جنوبی افریقہ، ری یونین اور بعض دوسرے مقامات پر یہ طریقہ تجویز کیا اور اس پر عمل بھی ہوا کہ مشینی چاقو نکال کر اس جگہ چار آدمی کھڑے کر دیئے جو ہر مرغی پر "بسم اللہ" پڑھ کر ہاتھ سے ذبح کرتے رہتے ہیں، باقی تمام کام مشین انجام دیتی رہتی ہے، اس پر وہاں کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔

اس موضوع پر بندہ نے ایک مفصل رسالہ "احکام الذبائح" کے نام سے تالیف کیا ہے جس میں تمام پہلوؤں پر مفصل بحث ہے، وہ میں آج ہی ہوائی ڈاک سے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ مولانا خلیل احمد صاحب سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ رسالہ ان کو بھیجوں گا، یاد فرمائی کیلئے ممنون ہوں۔

والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی
۵ رصفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵/۷۷۳)

کافر حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے مسلمان قصائی کے ذبیحہ کا حکم

سوال:- حکومتِ برما کافر حکومت ہے، حکومت نے مسلمانوں کو ملازم رکھ کر قصائی کر دُکان ڈالی ہے، جانور مسلمان ذبح کرتے ہیں، البتہ حکم کافر کا ہے، یعنی جس دن جتنے جانور ذبح کرنے کی اجازت ہوگی اتنے جانور ذبح کئے جائیں گے، ان گوشتوں سے ایصالِ ثواب کی نیت سے کھانا کھلا سکتے ہیں؟

جواب:- اگر ذبح کرنے والا مسلمان ہے اور اس نے شرعی قاعدے سے "بسم اللہ" پڑھ

---

(۱) وفي البحر الرائق ج: ۷ ص: ۹۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولو ذبح شاتين فسمى على الأولىٰ دون الثانية تحل الأولىٰ دون الثانية.

وفي الفتاوى الهندية كتاب الذبائح ج: ۵ ص: ۲۸۶ (طبع رشيديه) فمنها تعيين المحل بالتسمية في الذكاة الاختيارية، وعلى هذا يخرج ما إذا ذبح وسمى، ثم ذبح أخرى يظن أن التسمية الأولى تجزء عنهما لم تؤكل فلا بد أن يجدد لكل ذبيحة تسمية على حدة.

کر ذبح کیا ہے تو جانور کا گوشت حلال ہے، اسے خود بھی کھا سکتے ہیں۔[۱] واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱/۲۴ھ

(فتوی نمبر ۲۸۲۶/۲۷ د)

کسی اسلامی حکومت کا حلال جانور کے ذبح پر پابندی لگانے کا حکم

سوال:- حکومت حلال جانوروں کو جن میں گائے، بھینس، بکری، بھیڑ (نر اور مادہ) شامل ہیں اور جن کی عمر ایک سال سے کم ہے، کیا اپنے کسی حکم کے ذریعے ان کا ذبح کرنا شرعاً و قانوناً ممنوع قرار دے سکتی ہے؟

جواب:- اگر کوئی اسلامی حکومت حلال جانوروں کے شرعاً حلال ہونے کا انکار نہ کرے، بلکہ ان کی حلت کا اقرار کرتے ہوئے کسی صحیح وقتی ضرورت[۲] کے تحت وقتی طور پر ان کے ذبح یا استعمال کرنے پر پابندی عائد کردے تو اس کی اجازت ہے،[۳] لیکن حلال کو حرام یا ابدی طور پر ناجائز قرار دینا کسی کے اختیار میں نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۷/۸ھ

(فتوی نمبر ۱۲۰۰/۲۰ ج)

---

(۱) قال الله تعالى فى كلامه المجيد: "وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ " الآية، وفى مقام آخر: "فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ"

وفى الدر المختار ج: ۲ ص: ۲۹۶ (طبع سعيد) وشرط كون الذابح مسلما حلالا خارج الحرم إن كان صيدا .....أو كتابياً ذميا أو حربيا إلا إذا سمع منه عند الذبح ذكر المسيح.

تفصیلی حوالہ جات کیلئے آگے ص: ۴۷ کا فتوی اور اس کا حاشیہ نمبر ۱ تا ۳ و ۵ اور ۷ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ و ۳) تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة. (الأشباه والنظائر ج: ۱ ص: ۱۲۱ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

وفى الدر المختار مع الشامية ج: ۴ ص: ۲۶۴ (طبع سعيد) وفيها طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض (قوله افترض عليه إجابته) والأصل فيه قوله تعالى: "وأُولِى الأَمرِ مِنكُم" وقال صلى الله عليه وسلم: اسمعوا و أطيعوا ولو أمر عليكم عبد حبشي أجدع و روى مجدع ، و عن ابن عمر رضى الله عنهما أنه عليه السلام قال: عليكم بالسمع والطاعة لكل من يؤمر عليكم ما لم يأمركم بمنكر.

وفى البحر الرائق ج: ۱۱ ص: ۳۸۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض.

اہلِ کتاب کے مشینی ذبیحہ کا حکم اور اس سلسلے میں امریکی یونیورسٹیوں کے عرب طلبہ کے خیالات کا شرعی جائزہ

سوال:- یہاں امریکہ میں بہت سے عرب طلباء کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کا مشینوں سے کاٹا ہوا گوشت مسلمانوں کیلئے کھانا جائز ہے اور اس کے لئے وہ مندرجہ ذیل وجوہ بتاتے ہیں:

(الف) قرآن میں آیا ہے کہ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے، اس طرح عیسائیوں اور یہودیوں کا مشینوں سے کاٹا ہوا گوشت کھانا جائز ہوا۔

(ب) بحالتِ مجبوری یعنی اس وجہ سے کہ یہاں کوئی اور گوشت نہیں ملتا، عیسائیوں کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانا جائز ہے۔

(ت) قرآن میں ہے کہ جو چیزیں خدا نے تمہارے لئے جائز کی ہیں، انہیں اپنے لئے حرام نہ کرو اور چونکہ گائے حلال جانور ہے، اس لئے اپنے اُوپر حرام نہیں کرنی چاہئے۔

(ث) بہت سے حکم قرآن میں آہستہ آہستہ وقفہ سے آئے ہیں جیسے شراب کو ایک دم منع نہیں کیا گیا، بلکہ شروع میں شاید نماز پڑھتے وقت شراب منع کی گئی اور پھر بعد میں شراب بالکل حرام کی گئی، اس طرح مسلمانوں پر قرآن کا وہ حکم لاگو ہوا جس میں قرآن نے شراب حرام کی ہے اور پچھلے حکم ختم ہو گئے۔

سورۂ انعام کی آیت ۱۱۸ میں ہے کہ وہ (گوشت) کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، مگر آخری سورت جو نازل ہوئی وہ سورۂ مائدہ ہے جس کی آیت نمبر ۴ میں ہے کہ تم پر حرام ہے مرے ہوئے جانور کا گوشت، خون، سور کا گوشت اور اُس جانور کا گوشت جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور یہاں پر اللہ نے اُس گوشت کو حرام نہیں کیا ہے جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو (بشرطیکہ غیر اللہ کا نام بھی نہ لیا گیا ہو۔)

اور چونکہ یہ آیت اس سورت میں ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی، اس لئے سورۂ انعام کا حکم (یعنی جس گوشت پر اللہ کا نام لینا ضروری ہے) لاگو نہیں ہوتا۔

(ج) سورۂ مائدہ کی چوتھی آیت میں جو چیزیں منع کی گئی ہیں وہ یہ ہیں: مرے ہوئے جانوروں کا گوشت، خون، سور کا گوشت یا جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر گوشت کو منع کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس آیت میں اضافہ کرتے کہ وہ گوشت بھی حرام ہے جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو، مگر ایسا نہیں کیا گیا، اس لئے ہم مشینوں سے کاٹا ہوا گوشت کھا سکتے ہیں۔

(د) عرب طلبہ کے کہنے کے مطابق الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر کے علماء، امریکہ میں مشینوں سے کاٹا ہوا گوشت کھانا جائز سمجھتے ہیں، کیا فقہ شافعی، مالکی وغیرہ میں اس کی اجازت ہے؟

جواب:- عیسائی یا یہودی[۱] اگر جانور پر اللہ کا نام لیکر ذبح کریں[۲] اور اس طرح ذبح کریں کہ اس سے جانور کی گردن کی چاروں رگیں یا کم از کم تین رگیں کٹ جائیں تو یہ ذبیحہ مسلمانوں کیلئے حلال ہے[۳] اور "وطعام الذين أوتوا الكتب حل لكم"[۴] کا یہی مطلب ہے۔

لہٰذا اس بات کی تحقیق کی جائے کہ عیسائی ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں لیتے تو جانور حلال نہیں۔[۵]

اگر لیتے ہیں تو یہ دیکھا جائے کہ وہ جس مشین سے ذبح کرتے ہیں، اُس میں چاروں رگیں کٹ جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کٹتیں تو بھی حلال نہیں۔[۶] اور اگر کٹ جاتی ہیں تو حلال ہے،[۷] بشرطیکہ کاٹتے وقت اللہ کا نام لیا ہو۔

---

(۱) قال الله تعالى: وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ الآية. (سورة المائدة: ۵)

(۲و۳ و۵ تا ۷) قال الله تعالى: وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ الآية. (سورة الأنعام: ۱۱۹)

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ الآية (سورة الأنعام: ۱۲۱)

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ الآية. (سورة الحج: ۳۶)

وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ـ الآية، (سورة الأنعام: ۱۳۸)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ. الآية (سورة الحج: ۳۴)

وفى الصحيح للبخارىؒ باب التسمية عند الذبح ، رقم الحديث: ۵۴۹۸: عن رافع بن خديجؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أنهر الدم و ذكر اسم الله فكل۔

اس مسئلے پر تمام شبہات کا مفصل جواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''اسلامی ذبیحہ'' میں موجود ہے جو الگ بھی شائع ہو چکا ہے اور جواہر الفقہ جلد دوم میں بھی شائع ہوا ہے، مختصراً آپ کے سوالات کا جواب یہاں ذکر کرتا ہوں۔

(گذشتہ سے پیوستہ) علی اسم الله. (الحديث)

وفی تفسير القرطبی ج: ٦ ص: ٧٦ (طبع دار إحياء التراث بيروت) و طعام الذين أوتوا الكتب حل لكم يعنی ذبيحة اليهودی والنصرانی.

وفی تفسير الطبری ج: ٤ ص: ٤٤٠ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ذبائح أهل الكتاب من اليهود والنصارى.

وفی أحكام القرآن للجصاص ج: ٢ ص: ٣٢٢ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) فقال أبو حنيفة وأبو يوسف ومحمد وزفر من كان يهوديا أو نصرانيا من العرب والعجم فذبيحته مزكاة إذا سمى الله عليها. الخ

وفی البدائع ج: ٥ ص: ٤٦ (طبع) ثم إنما تؤكل ذبيحة الكتابی إذا لم يشهد ذبحه ولم يسمع منه شیء أو سمع و شهد منه تسمية الله تعالى وحده لأنه إذا لم يسمع منه شيئا يحمل على أنه قد سمى الله تبارک و تعالى و جرّد التسمية تحسينا للظن به كما بالمسلم.

و فی المبسوط للسرخسیؒ ج: ٢٨ ص: ٦٩ (طبع دار المعرفة بيروت) تحل ذبيحة الكتابی إذا ذكر اسم الله تعالى.

وفی بدائع الصنائع ج:٧ ص: ١٣٠ (طبع مكتبة حبيبة كانسی روڈ كوئٹه) و منها أن يكون مسلما أو كتابيا فلا تؤكل ذبيحة أهل الشرک والمجوسی والوثنی الخ

وفی الاختيار لتعليل المختار كتاب الجنايات ج: ١ ص: ٥١ (طبع) وشرطها التسمية و كون الذابح مسلما أو كتابيا الخ

وفی الدر المختار: وشرط كون الذابح مسلما حلالا ....أو كتابيا ذميا أو حربيا الخ

وفی درر الحكام شرح غرر الأحكام كتاب الذبائح ج: ٣ ص: ٢٩٨: وقال فی العناية ذبيحة الكتابی حلال إذا أتى به مذبوحا، وأما إذا ذبح بالحضور فلا بد أن لا يذكر غير اسم الله اهـ فإن سمى النصرانی المسيح وسمعه المسلم لا يأكل منه......

وكذا قال فی الهداية ذبيحة المسلم والكتابی حلال وتحل إذا كان يعقل التسمية والذبيحة ويضبط وإن كان صبيا أو مجنونا أو امرأة اهـ (قوله: أی يعلم أن حل الذبيحة يتعلق بذكر اسم الله عليها) هذا أحد ما فسر به عقل التسمية فإنه قال فی العناية قيل يعنی يعقل لفظ التسمية، وقيل يعقل إن حل الذبيحة بالتسمية ....والضبط هو أن يعلم شرائط الذبح من فری الأوداج والتسمية اهـ.

وقال فی الذخيرة ذبيحة الصبی حلال إذا كان يعقل ويضبط معنى قوله ويضبط أنه يضبط شرائط الذبح من فری الأوداج. وقوله: يعقل تكلموا فی معناه قال بعض مشايخنا معناه يعقل التسمية. وقال بعضهم معناه أن يعلم أن حل الذبيحة بالتسمية.

(جاری ہے)

(گذشتہ سے پیوستہ) = وقال بعضهم أن يعلم أن الحل بقطع الحلقوم والأوداج اهـ.
وفى المغنى لابن قدامة ج: ١١ ص: ٥٦ .فالتسمية مشترطة فى كل ذابح مع العمد، سواء كان مسلما أو كتابيا، فإن ترك الكتابى التسمية عن عمد، أو ذكر اسم غير الله، لم تحل ذبيحته. روى ذلك عن على.وبه قال النخعى، والشافعى، وحماد، وإسحاق، وأصحاب الرأى.
وفى البحر المحيط ج: ۴ ص: ۴۳۱ أن الكتابى إذا لم يذكر الله على الذبيحة و ذكر غير الله لم تؤكل و به قال أبوالدّرداء و عبادة بن الصامت و جماعة من الصحابة و به قال أبوحنيفة و أبويوسف ومحمد و زفر و مالك و كره النخعى والثورى أكل ما ذبح و أهل به لغير الله الخ
وفى التفسير المظهرى ج: ۳ ص: ۳۹ (طبع مكتبة رشيدية) والصحيح المختار عندنا هو القول الاول يعنى ذبائح الكتابى تاركا للتسمية عامدا او على غير اسم الله تعالى لا يؤكل ان علم ذلك يقينا او كان غالب حالهم ذلك الخ.
وفى الهداية كتاب الذبائح ج:۴ ص: ۴۳۳ (طبع مكتبة رحمانية) وذبيحة المسلم والكتابى حلال لما تلونا ولقوله تعالى: "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ" ويحل إذا كان يعقل التسمية والذبحة ويضبط وإن كان صبيا أو مجنونا أو امرأة، أما إذا كان لا يضبط ولا يعقل التسمية والذبيحة لا تحل لأن التسمية على الذبيحة شرط بالنص وذلك بالقصد. وصحة القصد و بما ذكرنا .... وإن ترك الذابح التسمية عمدًا فالذبيحة ميتة لاتؤكل......... والمسلم والكتابى فى التسمية سواء.
وفى الهداية ج:۴ ص: ۴ (طبع مكتبة رحمانية) والعروق التى تقطع فى الذكاة أربعة: الحلقوم، والمرىء ، والودجان لقوله عليه الصلاة والسلام: أفر الأوداج بما شئت ....وإن قطع أكثرها فكذلك عند أبى حنيفةؒ .... ولأبى حنيفةؒ أن الأكثر يقوم مقام الكل فى كثير من الأحكام و أى ثلاث قطعها فقد قطع الأكثر منها و ما هو المقصود يحصل بها الخ.
وفى الدر المختار كتاب الذبائح: وعروقه الحلقوم .... (والمرى) هو مجرى الطعام والشراب (والودجان) مجرى الدم (وحل) المذبوح (بقطع أى ثلاث منها) إذ للأكثر حكم الكل الخ.
وفى البحر الرائق ج: ١٧ ص: ١٠٧ و ١٠٨ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) (والمذبح المرىء والحلقوم والودجان) .... (وقطع الثلاث كاف) والاكتفاء بالثلاث مطلقا هو قول الإمام وقول أبى يوسفؒ أولا .... وأبو حنيفة يقول: الأكثر يقوم مقام الكل.
وفى المحيط البرهانى: ثم فى حالة القدرة إذا قطع الحلقوم والمرى والودجين فقد أتم الذكاة، وإن قطع الأكثر من ذلك حل أكله، واختلفت الروايات فى تفسير ذلك؛ روى الحسن عن أبى حنيفة، وهو قول أبى يوسف الأول :أنه إذا قطع الثلاث من الأربعة أى ثلث ما قطع فقد قطع الأكثر.
وفى بدائع الصنائع ج: ۷ ص: ١١٨ (طبع مكتبة حبيبيه كوئٹه) ثم الأوداج أربعة: الحلقوم، والمرىء ، والعرقان اللذان بينهما الحلقوم والمرىء ، فإذا فرى ذلك كله فقد أتى بالذكاة بكمالها وسننها وإن فرى البعض دون البعض فعند أبى حنيفة -رضى الله عنه -إذا قطع أكثر الأوداج وهو ثلاثة منها أى ثلاثة كانت وترك واحدا يحل. الخ

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الاختیار لتعلیل المختار ج: ۱ ص: ۵۱ والعروق التی تقطع فی الزکاۃ الحلقوم والمری والودجان فإن قطعها حل الأکل وکذلک إذا قطع ثلثة منها الخ

وفی درر الحکام شرح غرر الأحکام کتاب الذبائح ج:۳ ص: ۲۹۷ و ص: ۲۹۸۔ وشرط فی حل المذبوح کون الذابح مسلما حلالا خارج الحرم إن کان صیدا أو کتابیا لأنه یدعی التوحید والأصل فیه قوله تعالی "إلا ما ذکیتم" وقوله تعالی "وطعام الذین أوتوا الکتب حل لکم" ....(ذمیا أو حربیا)... (یعقل التسمیة) أی یعلم أن حل الذبیحة یتعلق بذکر اسم الله تعالی علیها (والذبح) أی یعلم شرائط الذبح من فری الأوداج ونحوه (ویقدر) علی فری الأوداج ویحسن القیام به .....وقال فی العنایة ذبیحة الکتابی حلال إذا أتی به مذبوحا، وأما إذا ذبح بالحضور فلا بد أن لا یذکر غیر اسم الله اهـ فإن سمی النصرانی المسیح وسمعه المسلم لا یأکل منه ....(قوله: یعقل) الضمیر فیه راجع للذابح فی قوله وشرط کون الذابح، وکذا قال فی الهدایة ذبیحة المسلم والکتابی حلال وتحل إذا کان یعقل التسمیة والذبیحة ویضبط ....(قوله: أی یعلم أن حل الذبیحة یتعلق بذکر اسم الله علیها) هذا أحد ما فسر به عقل التسمیة فإنه قال فی العنایة قیل یعنی یعقل لفظ التسمیة، وقیل یعقل إن حل الذبیحة بالتسمیة. ....والضبط هو أن یعلم شرائط الذبح من فری الأوداج والتسمیة اهـ۔

وفی فتح القدیر کتاب الذبائح: (وذبیحة المسلم والکتابی حلال) لما تلونا۔ ولقوله تعالی"وطعام الذین أوتوا الکتٰب حل لکم" ویحل إذا کان یعقل التسمیة والذبیحة ویضبط وإن کان صبیا أو مجنونا أو امرأة، أما إذا کان لا یضبط ولا یعقل التسمیة والذبیحة لا تحل لأن التسمیة علی الذبیحة شرط بالنص وذلک بالقصد۔

وفی الجوهرة النیرة کتاب الصّید والذّبائح: (وذبیحة المسلم، والکتابی حلال) ..... ومن شرطه أن یکون الذابح صاحب ملة التوحید إما اعتقادا کالمسلم أو دعوی کالکتابی وأن یکون حلالا خارج الحرم وهذا الشرط فی حق الصید لا فی حق الأنعام وإطلاق ذبیحة المسلم، والکتابی یرید به إذا کان الذابح یعقل التسمیة ویضبطها ذکرا کان أو أنثی صغیرا کان أو کبیرا وإن کان لا یقدر علی الذبح ولا یضبط التسمیة فذبیحته میتة لا تؤکل۔ الخ

(۴)وفی أحکام القرآن للجصاصؒ ج: ۱ ص: ۱۵۵ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ولأن إباحة طعام أهل الکتاب معقودة بشریطة أن لا یهلوا لغیر الله ;إذ کان الواجب علینا استعمال الآیتین بمجموعهما، فکأنه قال: وطعام الذین أوتوا الکتاب حل لکم ما لم یهلوا به لغیر الله۔

فإن قال قائل: إن النصرانی إذا سمی الله فإنما یرید به المسیح علیه السلام، فإذا کان إرادته کذلک ولم تمنع صحة ذبیحته وهو مع ذلک مهل به لغیر الله، کذلک ینبغی أن یکون حکمه إذا أظهر ما یضمره عند ذکر الله تعالی فی إرادته المسیح۔ قیل له: لا یجب ذلک ;لأن الله تعالی إنما کلفنا حکم الظاهر; لأن الإهلال هو إظهار القول، فإذا أظهر اسم غیر الله لم تحل ذبیحته لقوله: (وما أهل به لغیر الله) وإذا أظهر اسم الله فغیر جائز لنا حمله علی اسم المسیح عنده لأن حکم الأسماء أن تکون محمولة علی حقائقها ولاتحمل علی ما لا یقع الاسم علیه عندنا۔

(جاری ہے)

(i) اہلِ کتاب کے کھانے سے مراد وہی کھانا ہے جس میں نمبر(۱) میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں۔[۱] اہلِ کتاب کے کھانے کو اسی لئے جائز قرار دیا گیا تھا کہ وہ ان شرائط کا لحاظ رکھا کرتے تھے، [۲] ورنہ دوسرے کافروں کا ذبیحہ بھی جائز ہوتا۔

(ii) گوشت ہی کھانے کی کیا مجبوری ہے؟ اور بھی بہت سی غذائیں ہیں، اور جہاں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں آباد ہوں، وہاں وہ حرام گوشت کو حلال کرنے کی فکر میں پڑنے کی بجائے اپنے لئے الگ گوشت کا انتظام کیوں نہ کریں؟ لندن وغیرہ میں مسلمانوں نے یہی کیا اور کامیاب رہے۔

(iii) جو چیزیں جائز کی ہیں، انہیں حرام کرنا منع ہے لیکن حرام کو حلال کرنا کہاں لکھا ہے کہ جائز ہے؟ ورنہ تو مردار گائے کھانے پر بھی یہ کہا جائے گا کہ حلال کو حرام کر دیا۔

(iv) یہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے، شروع میں بیشک شراب حلال تھی، لیکن جب حرام ہوئی تو ہمیشہ کیلئے حرام ہوگئی، اب اس کو کسی وقت جائز نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح جب ذبیحہ کے احکام آگئے تو اب ان کی پابندی ضروری ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی تفسیر ابن کثیر ج: ۳ ص: ۴۰ (طبع دار طیبه للنشر والتوزیع مجمع الملک فهد) وفی طبع لاهور ج: ۲ ص: ۱۹) وطعام الذین أوتواالکتب حل لکم قال ابن عباس و أبوأمامة و مجاهد و سعید بن جبیر وعکرمة و عطاء والحسن ومکحول و إبراهیم النخعی والسدی و مقاتل بن حیان یعنی ذبائحهم و هذا أمر مجمع علیه بین العلماء أن ذبائحهم حلال للمسلمین لأنهم یعتقدون تحریم الذبح لغیر الله ولا یذکرون علی ذبائحهم إلا اسم الله و إن اعتقدوا فیه تعالیٰ ما هو منزه عن قولهم تعالیٰ و تقدس۔ الخ

و کذا فی الجامع لأحکام القرآن للقرطبیؒ سورة المائدة ج: ٦ ص: ۷٦ (طبع دار عالم الکتب ریاض)

وفی التفسیر المیسر ج:۲ ص: ۱۷۹ (طبع مجمع الملک فهد) وطعام الذین أوتواالکتب حل لکم (الأیة) ومن تمام نعمة الله علیکم الیوم أیها المؤمنون أن أحل لکم الحلال الطیب، و ذبائح الیهود والنصاری إن ذکوها حسب شرعهم حلال لکم۔

وکذافی التفسیر الکبیر للرازیؒ ج: ۳ ص: ۲۴۹ (طبع ...)

(۱ و۲) وفی الفقه الإسلامی و أدلته کتاب الذبائح والصید المبحث الأول ج: ۳ ص: ۷۴٦ (طبع دار الفکر) لأن المراد بحل ذبائحهم ما ذبحوه بشرطه کالمسلم۔

نیز دیکھئے سابقہ حواشی خصوصاً پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۴۔

(v) یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں کسی ایک حرام چیز کا ذکر آئے تو اسی جگہ تمام دوسری حرام اشیاء کا بھی لازماً ذکر ہو، جب ایک جگہ یہ حکم آ گیا کہ ''جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، وہ مت کھاؤ''[۱]، تو اب یہ حکم واجب التعمیل ہے، ہر جگہ اس حکم کو تلاش کرنا کیا ضروری ہے؟ پھر تو یہ بھی کہئے کہ جہاں سُور کو حرام کیا ہے، وہاں کتّے کا ذکر نہیں ہے، لہٰذا کتا حلال ہے۔

(vi) شافعی، مالکی، حنبلی، حنفی ہر مذہب میں ذبیحے کی شرائط وہی ہیں جو اُوپر بیان کی گئیں[۲]، آج کل تو بہت سے لوگ سود، قمار، شراب، ہر چیز کو حلال کرنے کی فکر میں ہیں، ایسے ہی لوگوں نے یہ بھی کہا ہے، ان کا قول دین میں حجت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۶/۲۸ھ
(فتویٰ نمبر ۶۶۵/ ۲۸ ب)

بسم اللہ پڑھتے ہوئے مُرغی کو چھُری پر پھیر کر ذبح کرنے کا حکم

(وضاحتِ سوال از مرتب)

اُستاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ آسٹریلیا کے سفر پر تشریف لے گئے تو حضرت مولانا ڈاکٹر شبیر احمد صاحب مدظلہ حضرت والا دامت برکاتہم کو سڈنی کے ایک مذبح خانہ کا دورہ کرانے کیلئے لے گئے جس میں مرغیوں کو اس طرح ذبح کئے جانے کا مسئلہ درپیش تھا کہ اگر کوئی مسلمان بسم اللہ پڑھ کر چھُری کو مرغی پر چلانے کے بجائے مرغی کو چھُری کی طرف دھکا دیدے اور مرغی کو چھری پر پھیر کر ذبح کرے تو شرعاً یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اور کیا تسمیہ کی شرائط اس طرح پوری ہو جائیں گی یا نہیں؟

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے سفر سے واپس آکر اس مسئلہ کی تحقیق فرمائی اور بندہ کو اس مسئلہ سے متعلق عبارات جمع کرنے کا حکم فرمایا، جس کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے حضرت

---

(۱) وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ الآية (سورة الأنعام: ۱۲۱)

(۲) یعنی جانور کے حلال ہونے کیلئے ذبح کرنے والے کا مسلمان یا کتابی ہونا، جانور کی رگوں کا کاٹنا، اور ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاروں ائمہ کے نزدیک متفقہ ہے، تاہم جانور کی اُن رگوں کے تعین میں ائمہ اربعہؒ کے مسالک اور تسمیہ کے سلسلے میں امام شافعیؒ کے مسلک میں کچھ تفصیل ہے جس کیلئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''جواہر الفقہ'' میں حضرت رحمہ اللہ کا رسالہ ''اسلامی ذبیحہ'' اور حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''احکام الذبائح'' ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہم کو ذیل کا جواب تحریر فرمایا۔ (مرتب)

جواب:- گرامی قدر و مکرم جناب مولانا....

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوں گے اور اپنے دینی اور دعوتی کاموں میں مشغول ہوں گے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔

آپ نے سڈنی میں مجھے مرغیوں کے جس مذبح کا دورہ کرایا تھا، اس میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اگر کوئی مسلمان ''بسم اللہ'' پڑھ کر مرغی کو مشینی چھری کی طرف دھکا دیدے تو ''بسم اللہ'' کی شرط پوری ہو جائے گی یا نہیں؟ میں نے اس وقت عارضی رائے یہ ذکر کی تھی کہ ایسا کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن خیال تھا کہ اس مسئلہ کی باقاعدہ تحقیق کروں گا، اب اس مسئلے کی کچھ عبارتیں جمع کی ہیں، ان میں مالکی مذہب کی معروف کتاب ''فتح العلی المالک'' کی یہ عبارت خاص ذبح سے متعلق ہے اور میرے خیال میں وہ مذکورہ صورت کے جواز پر دلالت کرتی ہے، باقی عبارتیں شکار اور ذبحِ اضطراری سے متعلق ہیں، اس لئے براہِ راست تو اس مسئلے کے بارے میں صریح نہیں ہیں لیکن ان عبارات سے استیناس کیا جاسکتا ہے، یہ عبارتیں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اگرچہ مذکورہ عبارت مالکی مذہب کی ہے:

فی فتح العلی المالک فی الفتوی علی مذهب الإمام مالک مسائل الزکوٰة، ج ١/ص ١٨٦ (طبع دارالبازمكة المكرمة):

(ما قولكم) فی رجل أضجع المذبوح الأرض وضربه بآلة الذبح ضربة واحدة فی محل التذكية ناويا بها الذكاة مسميا فحصل بها قطع الحلقوم، والودجين أو وضع آلة الذبح بالأرض، وأمر عليها رقبة المذبوح حتى أتم ذكاتها فهل الضربة فی الأولى، وإمرار رقبة المذبوح فی الثانية ذكاة شرعية تبنى عليها أحكامها أفيدوا الجواب؟ فأجبت بما نصه: الحمد لله ربّ العٰلمين والصلاة،

والسلام علی سیدنا محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

نعم ذلک ذکاة شرعية تبنى عليه أحكامها؛ لأن الذبح الشرعى قطع مميز مسلم أو كتابى جميع الحلقوم، والودجين بنية من المقدم، ولا شک أن القطع يشمل الصورتين المذكورتين، وأولاهما مفهوم قولهم فى التفريع على شرط النية ولو ضرب الحيوان غير ناو ذكاته فقطع حلقومه، وودجيه فلا يؤكل لعدم نية ذكاته، وثانيتهما جرت بهما عادة النساء فى تقطيع اللحم إذا لم يجدن من يمسكه لهن نعم الكيفيتان المذكورتان مكروهتان بمخالفتهما لسنة الذبح والله أعلم

(عباراتِ مزیدہ از مرتب)

اگر جانور کے ذبح کا قصد نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس مقصد کیلئے کوئی آلۂ جارحہ زمین میں گاڑا گیا اور خود جانور چھری پر آیا اور اس کے ودجین وغیرہ کٹ گئے تو جانور حلال نہیں ہوگا، جیسا کہ ان عبارات سے پتہ چلتا ہے:

فى البناية شرح الهداية، كتاب الصيد ج۱۲، ص ۴۱۵ (طبع دارالكتب العلمية، بيروت)

والذبح لا يحصل بمجرد الآلة والذبيح الا بالاستعمال اى باستعمالهما للذبح و لهذا قال: لو انقلب الصيد أو الشاة على السكين و أصاب مذبحها لا يحل لأن الاستعمال لم يوجد.

(وكذا فى غاية البيان على الهداية، ص ۵۰۴ (طبع رحمانية)

اسی طرح اگر کسی نے خود یہ مذکورہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ جانور خود بخود تلوار یا چھری وغیرہ سے لگ کر ذبح ہوگیا تو حلال نہیں۔

وكذلک لو مرّت شاة أو صيدٌ فاحتكّت بسيفٍ فاتی علی مذبحهما لم يحل أكلها لأنّها قاتلة نفسها لا قاتلها غيرها ممن له الذبح والصيد۔ (كتاب الأم، كتاب الصيد والذبائح، ج۳، ص ۱۷۹ (طبع دار إحياء التراث)

وفی المبدع فی شرح المقنع (فقه حنبلی) كتاب الصيد، آلة الصيد ج۹ ، ص۲۴۵ (طبع المكتب الإسلامی)

الثالث إرسال الألة قاصداً للصيد فعلى هذا لو سقط سيف من يده عليه فعقره أو احتكت شاة بشفرة فی يده لم تحلّ۔

وفی نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، كتاب الصيد والذبائح، ج ۸، ص ۱۱۶ (طبع دار إحياء التراث العربی)

ولو كان بيده سكين فسقط وانجرح به صيد أو احتكت به شاة وهو فی يده فانقطع حلقومها ومرئيها أو استرسل كلب (مثلا) بنفسه فقتل لم يحل لأن الذبح يعتبر فيه القصد ولم يوجد فی الأولى والثانية۔

ان عبارات میں قصداور استعمال نہ ہونے کی بناء پر جانور کے حرام ہونے کا حکم ہے،قصد کا ضروری ہونا دیگر عبارات کے علاوہ اس عبارت سے بھی واضح ہوتا ہے۔

فی حواشی الشراوانی ، كتاب الصيد والذبائح، فصل فی بعض شروط الآلة والذبح والصيد، ص ۳۳۲)

فلا بد فيهما أی الذبح والعقر من قصده لعين و إن أخطاء فی الظن أو الجنس و إن أخطاء فی الإصابة .... أنه لو قصد قطع ثوب أو إصابة جدا فأصاب مذبح شاة اتفاقاً فقطعه لم تحل إذ لم يقصد عينها و لا جنسها ......

....فدل على أنه لو انتفى القصد إليها لم تحل و لما قال فى العباب و لا بد فيهما أى الذبح والعقر من قصد الفعل و حبس الحيوان أى عينه ... واشتراط القصد فى الذبح هو ما ذكروه قال ابن الرفعة: و ينبغى أيضاً أن يقطع القطع فيما قصد قطعه فلو ضرب جداراً بسيفٍ فأصاب عنق شاة لم تحل .... و هو صريح اشتراط قصد جنس الحيوان أو عينه فليتأمل۔

لہٰذا اگر کسی نے جانور کو ذبح کرنے کے قصد کے ساتھ زمین پر آلہ گاڑا اور جانور وہاں آ گیا یا خود جانور کو چھری پر رگڑ کر یا جانور کو لٹا کر ذبح کیا تو ذبیحہ حلال ہوگا، جیسا کہ ان عبارات سے پتہ چلتا ہے۔

وفى الشامية ، كتاب الصيد، ج٦، ص ٤٦٩ (طبع سعيد)

ولو نصب شبكة أحبولة و سمى و وقع بها صيد و مات مجروحاً لا يحل و لو كان بها آلة جارحة كمنجل و سمى عليه و جرحه ، حل عندنا كما لو رماه بها۔

وفى الشرح الكبير على المغنى لابن قدامةؒ ، كتاب الصيد، ج ١١، ص ١٥ (طبع دار الكتاب العربى)

و إن نصب مناجل أو سكاكين و سمى عند نصبها فقتلت صيداً أبيح فإن بان منه عضو و حكمه حكم البائن بضربة الصائد على ما نذكر۔ و روى نحو هذا عن ابن عمر وهو قول الحسن وقتادة و قال الشافعىؒ: لا يباح بحال لأنه لم يزكه أحد و إنما قتلت المناجل بنفسها ولم يوجد من الصائد إلا السبب فجرى ذلك مجرى من نصب سكينا، فذبحت شاة و لأنه لو رمى سهما و هو لايرى صيداً فقتل صيداً لم يحل فذا أولىٰ۔

ولنا قول النبی صلی الله علیه وسلم کل ما ردّت علیک یدک و لأنه قصد قتل الصید بما له حد جرت العادة بالصید به أشبه ما ذکرنا والتسبب یجری مجری المباشرة فی الضمان فکذلک فی إباحة الصید، و فارق ما إذا نصب سکیناً فإن العادة لم تجر بالصید بها و إذا رمی سهما ولم یرم صیداً فلیس ذلک بمعتاد والظاهر أنه لا یصیب صیداً فلم یصح قصده بخلاف هذا۔

اس عبارت میں مسئلہ کے اندر جواز لکھا گیا ہے، مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بناء پر عدمِ جواز لکھا ہے کہ کسی اور شخص نے جانور کو ذبح نہیں کیا، لیکن اگر کوئی اور شخص یہ طریقہ اختیار کر کے ذبح کرے تو اس عبارت سے اور پہلی عبارت ”وکذلک لومرّت شاة أو صید فاحتکت بسیفٍ فاتی علیٰ مذبحهما لم یحّل أکلها لأنها قاتلة نفسها لا قاتلها غیرها ممّن له الذبح والصید“ (کتاب الأم) سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔ جانور نے خود اس طریقے سے اپنے آپ کو ذبح کیا ہے اور وہ خود قاتلِ نفس ہے، لہٰذا نا جائز ہے، لیکن کوئی اور شخص اگر اس طریقے سے ذبح کرے تو ان عبارتوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جائز ہوگا۔

وفی الخانیة علی الهندیة، کتاب الصید والذبائح (ط۔ رشیدیه) ج۳، ص ۳۵۹)

ثم الاصطیاد قد یکون بالرمی و إرسال الجوارح المعلِمة کالکلب و الفهد والبازی والباشق والصقر۔

حضرت امام شافعیؒ کا مسلک:

و فی المجموع شرح المهذب للنوویؒ، کتاب الأطعمة، ج ۱۰، ص ۱۳۷ (طبع دارالکتب العلمیة، بیروت)

و إن نصب أحبولة وفیها حدیدة فوقع فیها صید فقتلته الحدیدة لم یحل لانه مات بغیر فعل من جهة أحد فلم یحل۔

(الشرح) قال الشافعی رحمه الله ولا یؤکل ما قتلته الأحبولة کان فیها سلاح أو لم یکن قال أصحابنا الأحبولة -بفتح الهمزة- هو ما ینصب للصید فیعلق به من حبل أو شبکة أو شرک ....فإذا وقع فی الأحبولة صید فمات لم یحل أکله بلا خلاف لأنه لم یذکه أحد وإنما مات بفعل نفسه ولم یوجد من الصائد إلا سبب فهو کمن نصب سکینا فربضت علیها شاة فقطعت حلقها فإنها حرام قطعا.....

(فرع) هذا الذی ذکرناه من تحریم صید الأحبولة ونحوها إذا لم یدرک ذکاته هو مذهبنا ومذهب العلماء کافة إلا ما حکاه ابن المنذر عن الحسن البصری أنه یحل إن کان سمی وقت نصبها۔

وفی فقه الکتاب والسنة، ضوابط الذبح، ج۳، ص ۱۸۷۵ (طبع دارالسلام بیروت)

لم یبح أکله لأنه لم یقصد برمیه عیناً فکان کمن نصب سکیناً فانذبحت بها شاة۔

وفیه أیضاً: ضوابط الذبح: الضابط الثانی: القصد: وهو أن یکون الحیوان مقصودا بالتزکیة و ذلک أن یقصد المزکی أصل الفعل الجارح لحصول التزکیة ، فلو کان فی یده سکین فسقط وانجرح به حیوان أو صید و مات أو نصب سکینا أو کانت السکین فی یده فاحتکت بها شاة وانقطع حلقومها أو وقعت علی حلق شاة و قطعته فلا یحل أکلها۔ (ج۳، ص۱۸۷۵)

پیر کو کھلانے کی نیت سے یا غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے کا حکم

سوال:- پیر کے کھلانے کی نیت سے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرنے سے ذبیحہ شرعاً حلال ہوگا؟ اسی طرح بسم اللہ اللہ اکبر کی جگہ داماد کے نام پر ذبح کرنے سے ذبیحہ درست ہوگا یا نہیں؟ جیسے (بسم فلان)

جواب:- اگر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ لیا ہے تو خواہ کسی کو کھلانے کی نیت ہو، جانور حلال ہوگیا،[1] لیکن اگر بسم اللہ کے بدلے کسی آدمی کا نام لیکر ذبح کیا تو ذبیحہ حرام ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۱۹/۲۱ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) تفصیلی حوالہ جات کے لیئے دیکھیئے ص: ۳۷ کا فتویٰ اور اس کے حواشی

(۲) وفی تفسیر جامع البیان فی تأویل القرآن ج: ۳ ص: ۳۲۱ (طبع مجمع الملک فهد)عن ابن وهب، قال: قال ابن زید، وسألته عن قول الله "وما أهل به لغیر الله" قال ما یذبح لآلهتهم الأنصاب التی یعبدونها، أو یسمون أسماء ها علیها۔ قال: یقولون باسم فلان، کما تقول أنت باسم الله۔ قال: فذلک قوله "وما أهل به لغیر الله"۔

وکذا فی تفسیر جامع البیان لابن جریر الطبری ج: ۱۴ ص: ۱۵۷ (طبع دار الفکر بیروت)

وفی أحکام القرآن للجصاصؒ باب تحریم ما أهل به لغیر الله ج: ۱ ص: ۱۵۴ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) وظاهر قوله تعالیٰ "وما أهل به لغیر الله" یوجب تحریمها إذا سمی علیها باسم غیر الله لأن الإهلال به لغیر الله هو إظهار غیر اسم الله، ولم یفرّق فی الآیة بین تسمیة المسیح وبین تسمیة غیره بعد أن یکون الإهلال به لغیر الله۔

وفی الدر المنثور للسیوطیؒ ج: ۱ ص: ۴۰۷ (طبع دار الفکر بیروت) وأخرج ابن أبی حاتم عن أبی العالیة وما أهل به لغیر الله یقول ما ذکر علیه اسم غیر الله۔

وفی بحر العلوم للسمرقندیؒ ج: ۱ ص: ۱۴۰ (طبع دار الفکر بیروت) و ما أهل به لغیر الله یعنی ما ذبح لغیر اسم الله تعالیٰ و الإهلال فی اللغة هو رفع الصوت فکان أهل الجاهلیة إذا ذبحوا رفعوا الصوت بذکر آلهتهم فحرم الله تعالیٰ علی المؤمنین أکل ما ذبح لغیر اسم الله تعالیٰ وفی الأیة دلیل أنه إذا ترک التسمیة عمدا لا یؤکل لأنه قد ذبح بغیر اسم الله تعالیٰ۔

وفی تفسیر ابن کثیر ج: ۳ ص: ۱۹ (طبع دار المعرفة بیروت) وما أهل لغیر الله به أی: (باقی آئندہ صفحہ پر)

فصل فى الصيد وما يجوز أكله وما لا يجوز من الحيوان

(شکار اور حلال وحرام جانوروں کا بیان)

کوے کی حلّت پر مفصل تحقیق

(وضاحت از مرتب)

آج سے تقریباً ۵۶؍سال قبل ۱۳۸۰ھ میں شکارپور سندھ کے ایک عالم نے کوے کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا، جس پر وہاں کے کچھ دیگر علماء کے تصدیقی دستخط بھی تھے، یہ فتویٰ اور اس کی صحت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا گیا، حضرت رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے یہ فتویٰ اور اس سے متعلقہ استفتاء حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے سپرد فرمایا۔ حضرت والا نے اس

(گذشتہ سے پیوستہ) ما ذبح فذكر عليه اسم غير الله، فهو حرام؛ لأن الله أوجب أن تذبح مخلوقاته على اسمه العظيم، فمتى عدل بها عن ذلك وذكر عليها اسم غيره من صنم أو طاغوت أو وثن أو غير ذلك، من سائر المخلوقات، فإنها حرام بالإجماع.

وفى الدر المختار ج: ٢ ص: ٤٣٩ (طبع سعيد) واعلم أن النذر الذى يقع للأموات من أكثر العوام وما يؤخذ من الدراهم والشمع والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربا إليهم فهو بالإجماع باطل وحرام ما لم يقصدوا صرفها لفقراء الأنام وقد ابتلى الناس بذلك، ولا سيما فى هذه الأعصار.

وكذا فى البحر الرائق كتاب الصوم، ج: ٢ ص: ٣٢٠ (طبع بيروت) والطحطاوى على المراقى ج: ١ ص: ٤٥٦ (طبع مطبعة كبرى مصر)

وفى الدر المختار ج: ٦ ص: ٣٠٩ (طبع سعيد) (ذبح لقدوم الأمير) ونحوه كواحد من العظماء (يحرم) لأنه أهل به لغير الله (ولو) وصلية (ذكر اسم الله تعالىٰ) (ولو) ذبح (للضيف) (لا) يحرم لأنه سنة الخليل وإكرام الضيف إكرام الله تعالىٰ. والفارق أنه إن قدمها ليأكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف أو للوليمة أو للربح، وإن لم يقدمها ليأكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم. الخ

اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرنے اور تقرب لغیر اللہ کی مختلف صورتوں کی تفصیل اور ان کے احکام کیلئے دیکھئے "امداد المفتین ص: ۹۳۶ تا ص: ۹۴۱ (طبع دارالاشاعت) وتفسیر معارف القرآن ج: ۳ ص: ۲۹ (طبع ادارۃ المعارف، وکفایۃ المفتی ج: ۸ ص: ۲۹۹ تا ص: ۲۳۶ (طبع دارالاشاعت) نیز دیکھئے ص: ۳۷ کا فتویٰ اور اس کے حواشی۔

کا مفصل جواب تحریر فرمایا جس پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تائیدی نوٹ کے ساتھ تصدیق وتحسین فرمائی، جس کے بعد یہ دونوں تحریریں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ حضرت نوراللہ مرقدہ نے کلماتِ تحسین کے ساتھ اس فتوی کی تصدیق فرمائی۔

ذیل میں اوّلاً اندرونِ سندھ سے آیا ہوا استفتاء اور شکار پور کے عالم کا فتوی شائع کیا جارہا ہے، یہ فتوی چونکہ فارسی زبان میں تھا، اس لئے اس اصل فارسی فتوی کے بعد اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا جارہا ہے، اس کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا مفصل فتوی اور اس پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تائیدی تحریر اور آخر میں حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تصدیقی کلمات پیشِ خدمت ہیں۔ (محمد زبیر)

(استفتاء)

شکار پور سندھ کے علماء نے کوے کی حرمت پر ایک تحریر لکھی ہے جو ارسالِ خدمت ہے، یہ تحریر چونکہ جمہور علماء کے مسلک کے خلاف ہے، اس لئے اس سے متعلق بعجلتِ ممکنہ تحقیق فرما کر ممنون فرمائیں۔ اس تحریر کے سوال وجواب حسبِ ذیل ہیں:

سوال:- غرابِ ملکی حلال است یا حرام؟ بینوا توجروا۔

جواب:- غرابِ ملکی حرام است از جملہ فواسق وموذیات است در حدیث شریف

فی المؤطا امام مالکؒ : عن نافع عن عبداللہ ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلھن جناح الغراب والحداۃ والعقرب والفارۃ والکلب العقور۔

ودر حاشیہ مصفی علی المؤطا:

قال البغوی: اتفق أهل العلم علی أنه یجوز للمحرم قتل هذه الأعیان و لا شیء علیه فی قتلها فی الإحرام و الحرم لأن الحدیث یشتمل علی أعیان بعضها سباع و بعضها هوام و بعضها لا یدخل

فی معنی السباع و لا ھی من جملة الھوام و إنما ھو حیوان مستخبث اللحم و تحریم الأکل یجمع الکل۔ وقالت الحنفیة : لا جزاء بقتل ما ورد فی الحدیث وقاسوا علیه الذئب وقالوا فی غیرھا من الفھد والنمر والخنزیر و جمیع ما لا یؤکل لحمه علیه الجزاء بقتلھا إلا أن یبتدیه شیء فیدفعه عن نفسه فیقتله فلا شیء علیه وفی البحر معنی الفسق فیھن خبثھن و کثرة الغرر فیھن۔

در ہدایہ می آرد

والمراد الغراب الذی یأکل الجیف و یخلط لأنه یبتدی بالأذی و فی بعض النسخ أو یخلط کما نقل عبارتھا فی البحر یخلط الحب بالجنس معناہ یأکل الحب تارة والنجس تارة ، کذا فی الحاشیة للسید الشامی علی البحر نقلا عن النھر عن البدائع، قال أبویوسف: الغراب المذکور فی الحدیث الذی یأکل الجیف أو یخلط لأن ھذا النوع ھو الذی یبتدی بالأذی۔

در مسکین شرح کنز تحت قوله "ولاشیء بقتل الغراب" می آرد۔

والمراد به الأبقع الذی یأکل الجیف و یخلط النجس مع الطاھر فی التناول۔

ودرحاشیۂ علامہ ابی السعود می نویسد:

الواو بمعنی أو إذ لا حاجة بضم الخلط إلی أکلھا (أی أکل ما خالفه) کما ذکرہ الحموی۔ انتھی۔

وفقہاءِ کرام دونوع غراب راازغراب کہ درحدیث شریف مذکوراست، استثنی ساختہ اند، یکے غراب الزرع ودیگر عقعق کمافی عامۃ الکتب، بقتل ایں ہردونوع برمحرم جزاواجب است۔

دررد المحتار درتعریف غراب الزرع می نویسد:

و هو الذى يلتقط الحب ولا يأكل الجيف ولا يأتى فى القرى والأمصار۔

درتعریف عقعق می آرد:

هو طائر نحو الحمامة طويل الذنب فيه بياض و سواد وهو نوع من الغربان يتشاءَ م به و يعقعق بصوت يشبه العين والقاف ۔

پس این ہردونوع حلال اندوازیں جاست کہ فقہاءِ کرام درکتاب "ما يحل أكله وما لايحل" ہمیں دونوع غراب راحلال نوشتہ اندودرتنویرالابصارمی نویسد:

و حل غراب الزرع الذى يأكل الحب والأرنب و العقعق وهو غراب يجمع بين أكل جيف و حب ولا شك أن غراب ديارنا غير العقعق و غير غراب الزرع فيكون داخلا فى الغراب المذكور فى الحديث فيكون فاسقا حراما كسائر نظائره۔

وآنچہ بعض فضلاء ایں غراب ملکی راحلال دانستہ وتمسک گرفتہ بآنچہ بعبارات فقہاء واقع شدہ:

نوع يأكل الحب مرة والأخرى جيفة غير مكروه عند الإمام الأعظم فإنه يتوهمه منه فى بادى الرائ أن الغراب المعروف فى ديارنا غير مكروه عند الإمام لأنه يخلط بين الحب والنجاسة۔

فنقول: إن الفقهاء الكرام حصروا هذا النوع فى العقعق قال فى العناية شرح الهداية: أما الغراب الأسود والأبقع فهو أنواع ثلاثة: نوع يلتقط الحب ولا يأكل الجيف و ليس بمكروه و نوع لا يأكل إلا الجيف و إنه مكروه و نوع يخلط بأكل الحب مرة و الجيف أخرى و هو غير مكروه عند الإمام و مكروه عند أبى يوسف۔

وفى الحاشية السعدية للحلبى: أقول قال الزيلعى: و نوع يختلط

بینها وهو یؤکل عند أبی حنیفةؒ وهو العقعق، کما فی المنح و سیأتی۔

وفی حاشیة شرح الوقایة: نوع یجمع بین الحب والجیف وهو حلال عند أبی حنیفةؒ وهو العقعق الذی یقال له بالفارسیة عکه۔

وفی تکملة البحر للعلامة الطرطوسی فی شرح قوله "الأبقع والغراب ثلاثة أنواع" إلی قوله " ونوع یخلط بینهما وهو أیضا یؤکل عند الإمام و هو العقعق۔

پس ظاہر شدکہ ایں نوع کہ جامع است درمیان حب وجیفۃ وآں نزدامام حلال است منحصراست درعقعق واوموذی نیست وآنچہ درہدایہ وشرح مسکین آوردہ ویخلط مرادازاں آں است کہ اوموذی باشدوآں حرام است، پس غراب کہ جامع باشددرمیان حب وجیفۃ دوصنف است یکے صنف کہ اوموذی نیست وآں حلال است منحصراست درعقعق اورصنف دیگراوموذی است، حرام است۔

درتیسیر القاری شرح صحیح البخاری می آرد: فاسق بودن غراب ازانست کہ پشت مجروح دواب راوچشم شتررامی کند۔انتہی۔بزبانِ سندھی مشہوراست کہ "کانوکرکی گڈھ کنی" یعنی وقتیکہ غراب آوازدہدحیوانے کہ ریش داردمی لرزددرمقصداق آں دردیارماہمیں غراب معروف است، چنانچہ دراوصاف ذمیمہ اوظاہراست ودرردالمحتارمی آردتحت قوله "ولاشیء لقتل غراب الا العقعق" لأن الغراب دائما تقع علی دبر الدابة کما فی غایة البیان۔

ازایں عبارات واضح گردیدکہ ایں غراب کہ دردیارمااست موذی است ریش دابہ رامی کندودربردابہ می افتدوچشم شتررامی کند، حرام است وعقعق غیرآنست۔عقعق رادرسندھی متاہ گویند۔

واللہ اعلم بالصواب

المحرر فقیرعبدالحکیم

صدرمدرس مدرسہ اشرفیہ شکارپور

اسماءِ گرامی مصدقین باالالفاظ المذکورۃ فی الاصل۔محمدفضل اللہ مہتمم مدرسہ اشرفیہ شکارپور۔

عبدالقادر ثانی مدرس۔ الفقیر عبدالفتاح۔ مولوی عبدالحق۔ مولوی غلام مصطفیٰ۔ مولوی عبدالمالک۔ مولوی تاج محمد۔ مولوی مظفردین سومرو۔ مولوی عزیزاللہ۔ الفقیر محمد عظیم۔ عبدالحی جتوئی۔ عبدالکریم چشتی۔ محمد عارف چشموی۔ امید علی جیکب آباد۔ محمد اسمعیل عوددی ثم الشکارفوری۔ انا عبدالعزیز الباندوی۔ العبد عبدالغنی۔ حامداللہ بلوچستانی اجمیری۔ عطاء اللہ انقلابی۔ مولوی مظہرالدین مدرسہ ہاشمیہ عبدالعزیز جتوئی۔

العبارات والروايات المزيدة

(عالمگیری اردو صفحہ ۴۴۰): جو پرندے نجس و مردار خوار ہیں جیسے دیسی کوا، اس کو طبیعت پاکیزہ پلید وخبیث جانتی ہے۔ انتہی

عن هشام عن عروة عن أبيه أنه سئل عن أكل الغراب فقال: ومن يأكله بعد ما سماه رسول الله صلى الله عليه وسلم فاسقا، يريد به الحديث المعروف خمس فواسق يقتلن فى الحل والحرم۔

و فى الموعد: الأبقع هو الذى فى صدره بياض، قال فى المحكم: غراب أبقع يخالط فيه سواد و بياض وهو أخبثها۔

ردالمحتار از عنایہ نقل کردہ:

نوع لا يأكل إلا الجيف و هو الذى سماه المصنف الأبقع و إنه مكروه الخ۔

حقیقت ہمیں است کہ یک نوع غراب ابقع سوائے جیف نمی خورد مراد عنایہ ہمیں نوع است مگر در حدیث از غراب ابقع ہماں مراد است کہ ہردو خلط می کند، كمافى تبيين الحقائق، والمراد بالأبقع ما يأكل الجيف و يخلط، كذا فى الهداية۔

(مذکورہ فارسی فتویٰ کا اُردو ترجمہ از مرتب عفی عنہ)

سوال:- ملکی کوا حلال ہے یا حرام؟ بینوا توجروا۔

جواب:- ملکی کوا گندگی اور موذیات میں سے ہے، حدیث شریف میں ہے:

فی المؤطاامام مالکؒ : عن نافع عن عبدالله ابن عمر ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلهن جناح الغراب والحداة والعقرب والفارة والکلب العقور۔

حاشیہ مصفیٰ علی المؤطا میں ہے:

قال البغوی: اتفق أهل العلم علی أنه یجوزللمحرم قتل هذا الأعیان و لا شیء علیه فی قتلها فی الإحرام و الحرم لأن الحدیث یشتمل علی أعیان بعضها سباع و بعضها هوام و بعضها لا یدخل فی معنی السباع و لا هی من جملة الهوام و إنما هو حیوان مستخبث اللحم و تحریم الأکل یجمع الکل۔ وقالت الحنفیة : لا جزاء بقتل ما ورد فی الحدیث وقاسوا علیه الذئب وقالوا فی غیرها من الفهد والنمر والخنزیر و جمیع ما لا یؤکل لحمه علیه الجزاء بقتلها إلا أن یبتدیه شیء فیدفعه عن نفسه فیقتله فلا شیء علیه۔

وفی البحر معنی الفسق فیهن خبثهن و کثرة الغرر فیهن۔

ہدایہ میں آتا ہے:

والمراد الغراب الذی یأکل الجیف و یخلط لأنه یبتدی بالأذی و فی بعض النسخ أو یخلط کما نقل عبارتها فی البحر یخلط الحب بالجنس معناه یأکل الحب تارة والنجس تارة۔

کذا فی الحاشیة للسید الشامی علی البحر نقلا عن النهر عن البدائع، قال أبویوسف: الغراب المذکور فی الحدیث الذی یأکل الجیف أو یخلط لأن هذا النوع هو الذی یبتدی بالأذی۔

کنز کی شرح مسکین میں" قوله:ولاشيء بقتل الغراب" کے تحت فرماتے ہیں:

والمراد به الأبقع الذى يأكل الجيف و يخلط النجس مع الطاهر فى التناول۔

اورحاشیہ علامہ ابوالسعو دمیں لکھتے ہیں:

الواو بمعنى أو إذ لا حاجة بضم الخلط إلى أكلها (أى أكل ما خالفه) كما ذكره الحموى. انتهى۔

فقہاءِ کرام نے حدیث شریف میں مذکورکوے سے دوقسم کے کوّوں کومستثنٰی کیاہے، ایک کھیتی کا کوا، دوسرا عقعق ،کمافی عامۃ الکتب۔ ان دوقسموں کے مارنے کی وجہ سے محرم پر جزاواجب ہوگی۔

کھیتی کےکوے کی تعریف کے متعلق ردالمحتار میں لکھتے ہیں:

و هو الذى يلتقط الحب ولا يأكل الجيف ولا يأتى فى القرى والأمصار۔

اورعقعق کی تعریف میں فرماتے ہیں:

هو طائر نحو الحمامة طويل الذنب فيه بياض و سواد وهو نوع من الغربان يتشاءَ م به و يعقعق بصوت يشبه العين والقاف ۔

پس یہ دوقسم حلال ہیں اوراسی سےفقہاءِ کرام نے کتاب "ما يحل أكله وما لايحل" میں کوے کی ان دوقسموں کوحلال لکھاہے۔

اورتنویرالابصارمیں لکھاہے:

و حل غراب الزرع الذى يأكل الحب والأرنب و العقعق وهو غراب يجمع بين أكل جيف و حب ولا شك أن غراب ديارنا غير العقعق و غير غراب الزرع فيكون داخلا فى الغراب المذكور فى

الحديث فيكون فاسقا حراما كسائر نظائره۔

اوروہ جو بعض فضلاء نے ملکی کوے کو حلال جانا ہے اور فقہاء کی وارد کردہ عبارت سے استدلال کیا ہے:

نوع يأكل الحب مرة والأخرى جيفة غير مكروه عند الإمام الأعظم فإنه يتوهمه منه فى بادى الرائ أن الغراب المعروف فى ديارنا غير مكروه عند الإمام لأنه يخلط بين الحب والنجاسة۔

فنقول: إن الفقهاء الكرام حصروا هذا النوع فى العقعق قال فى العناية شرح الهداية: أما الغراب الأسود والأبقع فهو أنواع ثلاثة: نوع يلتقط الحب ولا يأكل الجيف و ليس بمكروه و نوع لا يأكل إلا الجيف و إنه مكروه و نوع يخلط بأكل الحب مرة و الجيف أخرى و هو غير مكروه عند الإمام و مكروه عند أبى يوسف۔

وفى الحاشية السعدية للحلبى: أقول قال الزيلعى: و نوع يختلط بينها وهو يؤكل عند أبى حنيفةؒ وهو العقعق، كما فى المنح و سيأتى۔

وفى حاشية شرح الوقاية: نوع يجمع بين الحب والجيف وهو حلال عند أبى حنيفةؒ وهو العقعق الذى يقال له بالفارسية عكه۔

وفى تكملة البحر للعلامة الطرطوسى فى شرح قوله "الأبقع والغراب ثلاثة أنواع" إلى قوله " ونوع يخلط بينهما وهو أيضا يؤكل عند الإمام و هو العقعق۔

پس معلوم ہوا کہ یہ قسم کہ جو دانہ اور مردار دونوں کھاتا ہو اور وہ جو امام صاحبؒ کے ہاں حلال ہے، یہ عقعق ہی ہے جو کہ موذی نہیں ہے، اور وہ جو ہدایہ اور شرح مسکین میں لکھا ہے "ویخلط" اس سے مراد وہ کوا ہے جو موذی ہو، وہ حرام ہے۔ پس وہ کوا کہ جو دانہ اور مردار دونوں کھاتا ہو، وہ دو قسم

پر ہے: ایک وہ جو موذی نہیں ہے اور وہ حلال ہے، وہ عقعق میں منحصر ہے یعنی وہ عقعق ہی ہے۔ اور دوسرا وہ جو اس کے علاوہ ہے، وہ موذی اور حرام ہے۔

تیسیر القاری شرح صحیح البخاری میں لکھتے ہیں کہ کوے کا فاسق ہونا یہ ہے کہ وہ جانوروں کی زخمی پیٹھ پر یا اُونٹوں کی آنکھ میں ٹھونگیں مارتا ہو جیسے سندھی میں مشہور ہے کہ ''کانو کرکی گڈہ کنی''، یعنی جب بھی کوا آواز نکالے تو پھوڑے والے جانور کانپ اُٹھیں، اس کا مصداق ہمارے ہاں یہی معروف کوّا ہے، جیسا کہ اس کے اوصافِ ذمیمہ یعنی عاداتِ بد سے ظاہر ہے۔

اور ردالمحتار میں ہے:

ولا شيء بقتل غراب إلا العقعق لأن الغراب دائما تقع على دبر الدابة كما في غاية البيان۔

مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوگیا کہ ہمارے ہاں جو مشہور و معروف کوا ہے وہ موذی ہے، جانوروں کے پھوڑوں پر ٹھونگیں مارتا ہے، ان کی سرین پر بیٹھتا ہے اور اُونٹوں کی آنکھوں پر ٹھونگیں مارتا ہے، یہ حرام ہے اور عقعق اس کے علاوہ ہے جس کو سندھی میں ''متاہ'' بولتے ہیں۔

(آگے مصدقین کے نام درج ہیں جو سابق فارسی فتوے میں آچکے ہیں، اس کے بعد روایات مزیدہ کی عبارات کے عنوان سے کچھ عبارات لکھنے کے بعد آخر میں لکھا ہے) (محمد زبیر)

حقیقت یہ ہے کہ ابقع کوے کی ایک قسم صرف مردار ہی کھاتا ہے، عنایہ میں یہی قسم مراد ہے، مگر حدیث شریف میں جو غراب ابقع ہے اس سے مراد وہ ہے جو دونوں میں خلط کرتا ہو، کما في تبيين الحقائق ، والمراد بالأبقع ما يأكل الجيف و يخلط ، كذا في الهداية۔

جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ

أقول و بالله أستعين۔ فاضل مجیب نے ملکی کوے کے حرام ہونے پر جو استدلال کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء نے کوے کی جو ایک یہ قسم بیان فرمائی ہے کہ وہ نجاست وغیرہ میں خلط کرتا ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) عقعق، جو موذی نہیں۔ (۲) وہ کوا جو خلط کرتا ہے اور موذی

ہے۔ ان میں سے پہلی قسم تو حلال ہے لیکن دوسری قسم حرام ہے اور چونکہ ملکی کوا دوسری قسم میں داخل ہے، اس لئے وہ حرام ہوگا۔

موذی ہونے یا نہ ہونے کی تفصیل پر انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جس جگہ فقہاءِ کرامؒ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ حالتِ احرام میں کوے کا قتل کرنا جائز ہے اور اس پر کوئی جزا نہیں، اس کے تحت اس کوے کو ابقع اور اس قسم کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں جو نجاست اور زرع میں خلط کرنے کا عادی ہو اور اس کے بعد عقعق کو اس سے مستثنیٰ کر لیتے ہیں۔ ان کے اس فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلط کرنے والے کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو موذی ہے، اس کو قتل کرنے سے جزا واجب نہیں، دوسری قسم عقعق کہ وہ بھی خلط کرتا ہے مگر چونکہ موذی نہیں، اس لئے اس کے قتل پر جزا واجب ہے۔

موذی کوے کے حرام ہونے پر فاضل مجیب نے دلیل یہ پیش کی ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مسوی میں لکھا ہے کہ جن پانچ چیزوں کو حدیث میں عام حکم سے مستثنیٰ کر کے یہ کہا گیا ہے کہ ان کے قتل سے کوئی حرج نہیں، وہ سب کی سب حرام ہیں، ان کا کھانا ناجائز ہے اور جب فقہاء کی عبارتوں سے یہ معلوم ہو چکا کہ ان چیزوں میں وہ موذی کوا بھی داخل ہے جو خلط کرتا ہو تو مسوی کی اس عبارت سے اس کوے کا حرام ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

خلاصہ کے طور پر استدلال ان مقدمات پر موقوف ہے:

(۱) خلط کرنے والے کی دو قسمیں ہیں: موذی اور عقعق جو موذی نہیں۔

(۲) موذی کوے کو قتل کرنے سے محرم پر جزا واجب نہیں اور غیر موذی کے قتل پر جزا آتی ہے۔

(۳) مسوی کی عبارت میں ہے کہ تمام "**فواسق خمس**" جن کے قتل سے محرم پر جزا نہیں آتی، وہ حرام ہیں۔

اس استدلال کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار چونکہ ان مقدمات پر ہے، اس لئے ہم ان میں سے ہر ایک مقدمہ پر بحث کریں گے۔

پہلا مقدمہ

ان میں سے پہلا مقدمہ علی الاطلاق صحیح نہیں، کیونکہ عقعق بھی کبھی ایذاء پہنچاتا ہے۔

صاحبِ ہدایہؒ کے قول " المراد بالغراب الذی یأکل الجیف أو یخلط لأنه یبتدئ بالأذی أما العقعق غیر مستثنیٰ لأنه لا یسمی غرابا ولا یبتدئ بالأذی۔ الخ"[1] کے تحت علامہ اکمل الدین بابرتیؒ لکھتے ہیں:

قیل فعلی هذا یکون فی قوله فی العقعق ولا یبتدئ بالأذی لأنه یقع علی دبر الدابة، انظر۔ (عنایه علی هامش الفتح، ج ۲، ص ۲۶۷)[2]

اورمولانا عبدالحی صاحبؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "إنه دائما یقع علی دبر الدابة" (حاشیۂ ہدایہ ج:۱ص:۲۶۱)[3]

اسی طرح علامہ زین الدین بن نجیم نے بھی ہدایہ کی اس عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیه نظر لأنه دائما یقع علی دبر الدابة کما فی غایة البیان والبحر الرائق۔ (ص ۳۶، ج ۳)[4]

اگرچہ علامہ شامیؒ نے بحر کے حاشیہ پر اور ردالمحتار میں صاحبِ بحر کے اس اعتراض کو رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

أشار فی المعراج إلی دفع ما فی غایة البیان بأنه لا یفعل ذلک غالبا۔[5]

لیکن اس سے بھی عقعق کے اصلاً موذی نہ ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ صاحبِ معراج نے غالبًا کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کبھی کبھی ایذاء پہنچاتا ہے۔ دوسرے

(۱و۳) هدایه کتاب الحج ج: ۱ص: ۳۰۲ (طبع المیزان اردو بازار لاهور)

(۲) عنایة علی فتح القدیر کتاب الحج ج: ۳ ص: ۷۵ (طبع مکتبة رشیدیه کوئٹه)

(۴ و ۵) البحر الرائق کتاب الحج فصل إن قتل محرم صیدا ج: ۳ ص: ۶۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

یہ کہ خود علامہ شامیؒ نے آگے چل کر لکھا ہے:

ثم رأيته في الظهيرية قال: وفي العقعق روايتان والظاهر أنه من الصيود ــ وبه ظهر أن ما في الهداية هو ظاهر الرواية. (منح على البحر (ص: ۳٦ ج: ۳)[1]

علامہ عثمانیؒ نے بھی فتح الملہم میں ظہیریہ کا قول نقل کیا ہے (ص:۱۳۱ ج:۳) جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرجوح روایت عقعق کے بارے میں بھی یہ ہے کہ اس کے قتل سے محرم پر جزا نہیں، ظاہر ہے کہ اس روایت کی بناء یہی ہے کہ عقعق موذی ہوتا ہے، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک خمس فواسق کے قتل پر جزانہ ہونے کی علت مشترکہ ایذاء ہے، جیسا کہ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد ص:۲۷۰ ج:۱ میں نقل فرمایا ہے، (وسیاتی نصہ ص ۳٦)

پس ثابت ہوا کہ عقعق بھی کسی درجہ میں موذی ہے، اگر آپ کے قول کی بناء پر موذی ''کوا'' حرام ہے تو عقعق بھی حرام ہونا چاہئے۔ (وذلک خلف)

بہر حال! مقدمہ اولیٰ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں بعض حضرات کی رائے مختلف ہے اور جو حضرات اسے موذی نہیں کہتے وہ بھی کبھی کبھی اس کی ایذاء رسانی کے قائل ہیں۔

مقدمۂ ثانیہ

یہ مقدمہ راجح قول کی بناء پر صحیح ہے، اگرچہ علامہ ابن نجیمؒ اس سلسلہ میں تمام لوگوں میں متفرد ہیں اور انہوں نے لکھا ہے:

و أطلق في الغراب فشمل الغراب بأنواعه الثلاثة[2]

صاحبِ نہر، علامہ حصکفیؒ، علامہ شامیؒ اور مولانا عثمانیؒ نے رد کیا ہے۔ (شامی، ص۳۰، ج۲[3] فتح الملہم ص۲۳۱، ج۳)

---

(۱) البحر الرائق كتاب الحج فصل إن قتل محرم صيدا ج: ۳ ص: ٦٠ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۲) البحر الرائق كتاب الحج فصل إن قتل محرم صيدا ج: ۳ ص: ۵۹ و ٦٠ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۳) رد المحتار ج: ٦ ص: ۳۰۵ (طبع سعيد)

تیسرا مقدمہ

یہ مقدمہ ہرگز صحیح نہیں اوراس کی عدمِ صحت مسوی کی اصل عبارت دیکھتے ہی واضح ہوجاتی ہے، یہ امر بہت افسوسناک اورحیرت انگیز ہے کہ فاضل مجیب نے مسوی کی عبارت نقل کرنے میں مجرمانہ قطع وبرید سے کام لیاہے جوعلماء کی شان سے ازبس بعیداور بہت گھناؤنااقدام ہے، ہمارے ذہن نے اس فعل کی تاویل تلاش کرنے میں بہت قلابازیاں کھائیں، مگرکوئی راہ دکھائی نہ دی، ذرامسوی کی اصل عبارت پرایک نظرڈال لی جائے۔

قال البغوی: اتفق أهل العلم علی أنه یجوز للمحرم قتل هذه الأعیان المذکورة فی الخبر ولا شیء علیه فی قتلها وقاس الشافعیؒ علیها کل حیوان لا یؤکل لحمه فقال: لا فدیة علی من قتلها فی الإحرام والحرم لأن الحدیث یشتمل علی أعیان بعضها سباع ضاریة و بعضها هوام و بعضها لا یدخل فی معنی السباع ولا هی من جملة الهوام وإنما هو حیوان مستخبث اللحم و تحریم الأکل یجمع الکل فاعتبر وقالت الحنفیة لا جزاء بقتل ما ورد فی الحدیث و قاسوا علیه الذئب وقالوا فی غیرها من الفهد والنمر والخنزیر وجمیع ما لا یؤکل لحمه علیه الجزاء بقتلها إلا أن یبتدیه شیء منها فیدفعه عن نفسه. الخ (مسوی مع مصفی، ص ۲۹۳، ج ا)[1]

خط کشیدہ جملے فاضل مجیب نے نقل نہیں فرمائے جس سے یہ متبادرہوتاہے کہ "تحریم الأکل یجمع الکل" کاحکم حنفیہؒ نے دیاہے، حالانکہ اصل عبارت دیکھنے سے ہرکس وناکس سمجھ سکتاہے کہ یہ سب کچھ امام شافعیؒ کے قیاس کے مطابق بیان ہورہاہے۔

ہم ذاتیات پرحملہ کرنے کے عادی نہیں، مگراتناعرض کردیناضروری سمجھتے ہیں کہ یوں توہر

---

(۱) طبع کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد دہلی

مسلمان کا فرض ہے کہ ہر وقت اپنی عاقبت کو سامنے رکھے، لیکن فتوی جیسے نازک مقام پر یہ فرض زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے۔ ایسی بزدلی کا مظاہرہ فتوی میں ایک اور جگہ بھی ہوا ہے کہ فاضل مجیب نے بحر کی عبارت کا ایک ٹکڑا (ومعنى الفسق فيهن خبثهن و كثرة الغرر فيهن)[۱] نقل فرمایا اور اس سے کچھ آگے سے صاحبِ ہدایہ کا مذکورہ بالا قول بھی، تاکہ صاحبِ بحر بظاہر ہمنوا معلوم ہوں، حالانکہ یہ اتنی مضحکہ خیز اور افسوسناک حرکت ہے کہ ناگفتہ بہ، کیونکہ خود صاحبِ بحر کے پورے کلام سے فاضل مجیب کے ایک مزعومہ کی تردید ہو رہی ہے۔ صاحبِ بحر نے لکھا ہے

و أطلق فی الغراب فشمل الغراب بأنواعه الثلاثة[۲]

اور اس کے بعد صاحبِ ہدایہؒ پر بھی اعتراض کر دیا ہے کہ إنه دائما يقع علی دبر الدابة (كما مر آنفا[۳]) جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صاحبِ بحر کے نزدیک تمام اقسامِ غراب کا حکم ایک ہی ہے اور یہ بھی کہ ان کے نزدیک عقعق بھی موذی ہے۔ لہٰذا اگر ایذاء ہی علتِ حرمت ہوتی تو عقعق بھی ان کے نزدیک حرام ہو جاتا۔ حالانکہ عقعق کی حلت پر تمام فقہاء حنفیہؒ کا اجماع ہے (إلا أبايوسف)

اس کے باوجود فاضل مجیب نے ان کو بھی اپنا ہم خیال ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ سبحان الله "هو بهتان عظيم" نہ جانے "واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى"[۴] کا ارشاد کون سے لوگوں کیلئے ہے۔

بہرکیف: مسوی کی جس عبارت سے فاضل مجیب نے استدلال فرمایا تھا وہ تو امام شافعیؒ کا مسلک ثابت ہوا، اب ذرا اس بارے میں حنفیہ کا مسلک دیکھ لیجئے، حنفیہؒ کے نزدیک ان پانچ فواسق کو قتل کرنے کی علت ابتداء بالاذی ہے، اکلِ نجاست یا خلط نہیں ہے اور نہ حلت وحرمت سے اس کا کوئی تعلق ہے جیسا کہ خود مسوی کی مذکورہ عبارت کے آخری جملوں سے مستفاد ہوتا ہے:

وقالوا فی غيرها من الفهد والنمر والخنزير وجميع ما لا يؤكل

(۱ تا ۳) البحر الرائق ج: ۳ ص: ۵۹ و ۶۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۴) سورة الأنعام آيت: ۱۵۲

لحمه عليه الجزاء بقتلها إلا أن يبتديه شيء فيدفعه عن نفسه فيقتله فلا شيء عليه "[1]

یعنی اگر کوئی جانور ابتداء بالاذی کرے اور دفاع میں اسے قتل کردے تو کوئی جزا واجب نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابتداء بالاذی علت ہے، اور علامہ ابن رشدؒ نے بھی حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک یہی نقل فرمایا ہے:

وقال (في المسألة الثالثة) وهى اختلافهم فى الحيوان المأمور بقتله فى الحرم، وهى الخمس المنصوص عليها: الغراب، و الحدأة، والفأرة، والعقرب، والكلب العقور - فإن قوما فهموا من الأمر بالقتل لها مع النهى عن قتل البهائم المباحة الأكل أن العلة فى ذلك هوكونها محرمة، وهو مذهب الشافعي. وقوما فهموا من ذلك معنى التعدى، لامعنى التحريم، وهو مذهب مالك وأبى حنيفة وجمهور أصحابهما. (بداية المجتهد، ص: ۴۷۰ ج: ۱)[2]

اس عبارت میں وضاحت کے ساتھ حنفیہ کا یہ مذہب تحریر کیا گیا ہے کہ حدیث میں مباح القتل فرمانے کی علت ابتداء بالاذی ہے اور اس حدیث سے کسی خاص شے کی حرمت پر دلیل قائم نہیں کی جاسکتی، اس کے علاوہ تمام فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ کسی خاص جانور کو قتل کرنے سے جزا واجب ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ابتداء بالاذی کو مدار ٹھہراتے ہیں، كما فى الهداية والبحر والعناية وغيرها.

جب یہ ثابت ہوگیا تو ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کوے کے حلال یا حرام ہونے کا مسئلہ ہمیں کتاب الحج میں نہیں ڈھونڈنا چاہئے، بلکہ اس کا صحیح مقام کتاب الذبائح کی وہ جگہ ہے جہاں فقہاء غراب کی انواع واقسام پر بحث کرتے ہیں، یہی بنیادی غلطی ہے کہ ایک مسئلہ کو اس کے صحیح

---

(۱) مسوّیٰ، ج: ۱، ص: ۲۹۳، طبع: کتب خانہ رحیمیہ

(۲) طبع مطبع مصطفى بابى مصر و موقع مكتبة المدينة الرقمية.

مقام سے ہٹا کر دوسری غیر متعلق جگہ پر تلاش کیا جارہا ہے، حالانکہ کتاب الذبائح میں فقہاء کی عبارات واضح ہیں اوران سے ملکی کوے کی حلت ثابت ہوتی ہے۔

(۱)... ملک العلماء کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

والغراب الذی یأکل الحب والزرع والعقعق ونحوها حلال بالإجماع۔ (بدائع، ص: ۳۹ ج: ۵)[۱]

(۲)... شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

خمس فواسق یقتلهم المحرم فی الحل والحرم .... والمراد به ما یأکل الجیف، وأما الغراب الزرعی الذی یلتقط الحب فهو طیب مباح؛ لأنه غیر مستخبث طبعا، وقد یألف الآدمی کالحمام فهو والعقعق سواء ، ولا بأس بأکل العقعق، فإن کان الغراب بحیث یخلط فیأکل الجیف تارة والحب تارة فقد روی عن أبی یوسف رحمه الله تعالیٰ أنه یکره؛ .... وعن أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ أنه لا بأس بأکله، وهو الصحیح علی قیاس الدجاجة، فإنه لا بأس بأکلها، وقد أکلها رسول الله صلی الله علیه وسلم وهی قد تخلط أیضا، وهذا لأن ما یأکل الجیف فلحمه ینبت من الحرام فیکون خبیثا عادة، وهذا لا یوجد فیما یخلط۔

(مبسوط سرخسی، ص ۲۲۶، ج ۱۱)[۲]

(۳) عالمگیریہ میں فتاوی قاضی خان سے نقل کیا ہے:

وعن أبی یوسفؒ قال: سئلت أباحنیفةؒ عن العقعق فقال: لا بأس

(۱) ج: ۷ ص: ۱۱۳ طبع مکتبة حبیبة کانسی روڈ کوئٹه و فی طبع مکتبة دار الکتب العلمیة بیروت ج: ۱۱ ص: ۱۱۱۔

(۲) ج: ۱۱ ص: ۴۰۸ (طبع دار الفکر بیروت)

به فقلت: إنه يأكل النجاسات فقال: إنه يخلط النجاسة بشيء آخر ثم يأكل فكان الأصل عنده أن ما يخلط كالدجاج لا بأس.

(عالمگیریه، کتاب الذبائح، ص ۳۲۱، ج ۵)[۱]

خط کشیدہ جملوں پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے، رہا یہ اعتراض کہ فقہاء رحمہم اللہ نے خلط کرنے والے کوے کے بارے میں جو حکم دیا ہے کہ وہ حلال ہے، اس کو پھر عقعق کے ساتھ محصور کردیا ہے، سو اس کی بناء صحیح نہیں، کیونکہ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ فقہاء خلط کرنے والے کوے کی نوع بتاکر آگے فرمادیتے ہیں کہ "وھو العقعق" اور یہ دلیل چند وجوہ سے باطل ہے۔

(۱)... "وھو العقعق" کے الفاظ حصر کے ہرگز نہیں، اگر محصور کرنا مقصود ہوتا تو بصراحت کہا جاتا کہ " ھذاالنوع محصور فی العقعق "کیونکہ حلت وحرمت کا اہم مسئلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء نے ایسا نہیں کیا کہ آخر میں عقعق کی تصریح کردی ہو، جیسے کہ عنایہ، مبسوط اور بدائع وغیرہ میں ہے، معلوم ہوا کہ یہ قید اتفاقی ہے، احترازی نہیں۔

(۲)... اس کے برخلاف مبسوط، بدائع اور عالمگیریہ کی عبارات عقعق اور غیر عقعق میں تفصیل نہ ہونے پر واضح ہیں، اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے خواہ عقعق ہو یا نہ ہو۔

(۳).... دراصل عقعق کے کوا ہونے میں اختلاف ہے، بعض لوگ اسے غراب میں داخل مانتے ہیں اور بعض نہیں، جیسا کہ لوبس معلوف یسوعی نے اپنی لغت کی مشہور کتاب میں لکھا ہے:

العقعق طائر على شكل الغراب أو هو الغراب. (منجد، ص ۵۴۴)[۲]

چنانچہ صاحبِ ہدایہؒ کے نزدیک عقعق غراب نہیں، جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے

---

(۱) الباب الثانی فی بیان ما یؤکل من الحیوان وما لا یؤکل ج: ۵ ص: ۲۹۰ (طبع رشیدیه کوئٹه)

(۲) ص ۵۱۷، ماده: عقب، طبع دار المشرق بیروت۔

أما العقعق غير مستثنى لأنه لا يسمى غرابا

(هدایه مجتبائی، ص: ۲۶۲ ج: ۱)[1]

اور دوسرے بعض فقہاءؒ کی عبارات سے اس کا غراب ہونا معلوم ہوتا ہے، تو اب جن لوگوں نے عقعق کو غراب میں داخل نہیں مانا، وہ حضرات غراب کی انواع بیان کر کے گزر جاتے ہیں اور ''وهو العقعق'' نہیں کہتے، بلکہ یا تو سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے یا و کذا العقعق وغیرہ کہتے ہیں اور جنہوں نے عقعق کو غراب میں شامل کیا، ان حضرات نے خلط کرنے والے کوے کا نام ہی عقعق رکھ دیا، اس لئے اس سلسلہ میں فقہاء کی عبارتوں میں کچھ تفاوت نظر آتا ہے۔

بہرکیف! معلوم ہوگیا کہ ''وهو العقعق'' کہنے سے خلط کرنے والی نوع کا حصر عقعق میں نہیں کیا گیا۔

العبارات المزیدۃ کا جواب

فتوی کے آخر میں جو ''عبارات مزیدہ'' پیش کی گئی ہیں، ان میں سے کتاب المختص للاندلسی سے جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ مندرجہ بالا بحث کے بعد قابلِ اعتناء نہیں رہتی، کما لا یخفی، البتہ چند روایات نقل کرنے کے بعد فاضل مجیب نے جو تحقیق فرمائی ہے وہ بڑی عجیب ہے کہ ابقع کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک خلط کرنے والا اور ایک صرف نجاست کھانے والا، کیونکہ تبیین الحقائق میں ہے:

والمراد بالغراب الأبقع الذى يأكل الجيف او يخلط۔[2]

اور پھر وہی دلیل پیش کی کہ ابقع حرام ہے، کیونکہ حدیث میں غراب سے مراد ابقع ہے اور عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

و من يأكله بعد ما سمّاه رسول الله صلى الله عليه وسلم فاسقاً[3]

---

(۱) هدایه کتاب الحج ج: ۱ ص: ۳۰۲ (طبع میزان اردو بازار لاهور)

(۲) تبیین الحقائق فصل الصید فی الحرم۔ کتاب الحج باب الجنایات ج: ۲ ص: ۳۸۳، طبع ایچ ایم سعید

(۳) سنن ابن ماجه رقم الحدیث: ۳۲۴۸ ج: ۲ ص: ۱۰۸۲ (طبع دار الفکر بیروت) سنن الکبری للبیهقی ج: ۹ ص: ۳۱۷ (طبع مکتبة دار الباز مکة المکرمة)

(جاری ہے)

اس کا جواب یہ ہے کہ ابقع لغۃً اس کوے کو کہا جاتا ہے کہ جس میں سیاہی اور سفیدی دونوں موجود ہوں، لہٰذا اس کا اطلاق کووں کی تینوں قسموں پر ہو جاتا ہے، صرف دانہ کھانے والے کوے کو بھی ابقع کہہ سکتے ہیں، خلط کرنے والے کو بھی اور صرف نجاست کھانے والے کو بھی۔

چنانچہ علامہ شامیؒ غراب الزرع کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال القهستاني: و أريد به غراب لم يأكل إلا الحب سواء كان أبقع أو أسود أو زاغا و تمامه في الذخيرة۔ (شامی، ص: ۲۶۸ ج: ۵)[۱]

دوسرے یہ کہ اگر واقعۃً ایسا ہوتا تو تمام فقہاء اس کو بصراحت تامہ تحریر فرماتے کیونکہ معاملہ اہم ہے۔ خصوصیت سے کتاب الذبائح میں تو پوری تفصیل سے مذکور ہونا چاہئے تھا، حالانکہ فقہاءؒ ابقع کو عام طور سے صرف نجاست کھانے والے میں خاص کرتے ہیں، مثال کے طور پر عالمگیریہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

هو الغراب الأبقع و هو ما يأكل الجيف

(عالمگیریہ، ص: ۲۶۸ ج: ۱)[۲]

رہا حضرت عروہؓ کا قول، تو اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ شمس الائمہ سرخسی نے جو کچھ کوے کے بارے میں لکھا ہے وہ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، ان کی پوری عبارت اس طرح ہے:

و عن هشام بن عروة عن أبيه أنه سئل عن أكل الغراب فقال: ومن يأكله بعد ما سماه رسول الله -صلى الله عليه وسلم -فاسقا يريد

(گذشتہ سے پیوستہ) و مجمع الزوائد باب في الغراب ج: ۴ ص: ۵۸ (طبع دار الفكر بيروت)

(۱) رد المحتار كتاب الذبائح ج: ۶ ص: ۳۰۸ (طبع سعيد)

(۲) ج: ۵ ص: ۲۹۰، كتاب الذبائح، الباب الثاني، في بيان ما يؤكل من الحيوان وما لا يؤكل، (ط رشيديه) عن ابراهيم قال: كانوا يكرهون كل ذي مخلب من الطير وما أكل الجيف وبه نأخذ، فان ما يأكل الجيف كالغداف والغراب الأبقع مستخبث طبعا۔

به الحديث المعروف خمس فواسق يقتلهم المحرم فى الحل والحرم وذكر الغراب من جملتها، والمراد به ما يأكل الجيف، وأما الغراب الزرعى الذى يلتقط الحب الخ۔ (مبسوط سرخسى، ص ۲۲۶، ج ۱۱)[1]

اس لئے اب اس میں کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی، البتہ عالمگیری اُردو کی جو عبارت پیش کی گئی ہے، وہ زیرِ بحث مسئلہ میں صریح ہوسکتی تھی، مگر افسوس کہ عالمگیری اُردو ہمارے پاس نہیں، اور عربی کی اصل عالمگیری میں تتبع کے باوجود اس مطلب کی کوئی عبارت نہیں ملی، بلکہ اس کے خلاف ایک صراحت ملی ہے جسے ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے، جب تک اصل عبارت ہمیں نہ ملے، اس وقت تک ہم کوئی فیصلہ قطعی اس عبارت کے بارے میں نہیں کرسکتے۔ لا سیما إذا جربنا ما جربنا۔

اور اگر یہ عبارت بالفرض صحیح بھی ہو تو جتنی صراحتیں ہم نے پیش کی ہیں، اس کے بعد اس کی کوئی معتد بہ حیثیت نہیں رہتی، جبکہ اس کے خلاف خود عالمگیری ہی میں اس قدر صریح نص موجود ہے۔[2]

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ فاضل مستدل نے تمام استدلال کی بنیاد کتاب الحج کی عبارات کو بنایا ہے، حالانکہ

---

(۱) ج: ۱۱ ص: ۴۰۸ (طبع دار الفكر بيروت)

(۲) بعد میں عالمگیری کے اردو ترجمہ کی طرف رجوع کیا گیا تو اس میں مندرجہ ذیل عبارت ہے:

"......کیونکہ جو پرند نجس اور مردار خوار ہے جیسے دیسی کالا کوا اور جنگلی کوا اسکو طبیعتِ پاکیزہ پلید وخبیث جانتی تھی ہاں جو کوا کہ جنگل میں کھیتی اور دانہ چن چن کر کھاتا ہے وہ مباح اور پاک ہے۔۔۔الخ"

(عالمگیری ص: ۴۴۰، ج: ۸، ط: دار الاشاعت)

اور عالمگیری کی اصل عربی عبارت یہ ہے:

"فان ما يأكل الجيف كالغداف والغراب الأبقع مستخبث طبعاً۔ فأما الغراب الزرعى الذى يلتقط الحب مباح طيب"(عالمگيرى ج: ۵، ص: ۲۹۰)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

یہ بنیادی غلطی ہے، کیونکہ حرم یا حالتِ احرام میں قتل کی اباحت کی علت ایذاء ہے، (کما صرح به ابن رشد و يستفاد من سائر کتب الفقه) حرمت یا اکلِ نجاست وخلط نہیں ہے، بخلاف کوے کی حرمت وحلت کے کہ وہاں علت صرف نجاست کھانا یا خلط کرنا ہے (کما صرّح به فی الهندية و المبسوط) اس لئے ایک کا جوڑ دوسرے سے ملا کر کوئی حکم لگا دینا کسی طرح سے صحیح نہیں ہوسکتا۔

بلکہ کوے کی حلت وحرمت کا فیصلہ معلوم کرنے کیلئے کتاب الذبائح میں وہ جگہ دیکھنی چاہئے جہاں فقہاءؒ نے اس مسئلہ کا ذکر کرکے مختلف انواعِ غراب اوران کے احکام ذکر فرمائے ہیں، اوران سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے خواہ وہ موذی ہو یا نہ ہو اور یہی فیصلہ ہمارے اکابر مثلاً حضرت گنگوہیؒ وغیرہ سے منقول ہے۔

هذا ما بدا لی بعد تحقيق وفوق كل ذی علم عليم

احقر محمد تقی عثمانی غفراللہ لہ
۴؍ربیع الاول ۱۳۸۰ھ
دارالعلوم کراچی

(گذشتہ سے پیوستہ) اس عبارت میں "کالغداف" کا ترجمہ دیسی کالا کوا کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ترجمہ صحیح نہیں، قاموس میں غداف کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

"الغداف: غراب القيظ، والنسر الكثير الريش"

یعنی "غداف" سخت گرمی کا کوا، اور وہ کرگس جس کے پر بہت زیادہ ہوں، اس لفظ کا ترجمہ "دیسی کوا" کرنا بالکل غلط ہے بالخصوص جبکہ خود عالمگیریہ کی اسی عبارت میں آگے یہ موجود ہے کہ: "وان كان الغراب بحيث يخلط فيأكل الجيف تارة والحب أخرىٰ فقد روى عن أبی يوسف رحمه الله تعالىٰ أنه يكره، وعن أبی حنيفة رحمه الله تعالىٰ أنه لا بأس بأكله، وهو الصحيح علىٰ قياس الدجاجة كذا فی المبسوط (عالمگیریہ ج:۵، ص: ۲۹۰)" اور دیسی کوا چونکہ خلط کرتا ہے، اس لئے وہ اس آخری قسم میں شامل ہے، نہ کہ "غداف" کی قسم میں۔ (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

تحریر وتصدیق

از حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حامدا و مصلیا اما بعد!

قال فی العنایة و أما الغراب الأسود والأبقع فهو أنواع ثلاثة نوع یلتقط الحب و لا یأکل الجیف و لیس بمکروه و نوع منه لا یأکل إلا الجیف و هو الذی سماه المصنف الأبقع الذی یأکل الجیف و إنه مکروه و نوع یخلط یأکل الحب مرة و الجیف أخری ولم یذکره فی الکتاب و هو غیر مکروه عند أبی حنیفةؒ مکروهٌ عند أبی یوسفؒ۔ (العنایة علی هامش الفتح، ص ۶۲، ج ۸)[1]

نوع منه لا یأکل إلا الجیف اوراس کی تفسیر "وهو الذی سماه الخ" سے ثابت ہوا کہ صرف وہ ابقع حرام ہے جو محض نجاست کھاتا ہو۔ نیز "ونوع یخلط (الی قوله) ولم یذکره فی الکتاب" سے معلوم ہوا کہ ہر خلط کرنے والا کوا حلال ہے، اس میں عقعق کی کوئی تخصیص نہیں۔

یہ عبارت نہ صرف یہ کہ عقعق کی تخصیص سے ساکت ہے بلکہ عدمِ تخصیص پر ناطق ہے، اس لئے کہ عقعق کا ذکر تو ہدایہ میں اسی موقع پر موجود ہے، پس "لم یذکره فی الکتاب" نص صریح ہے کہ نوع یخلط سے مراد عقعق نہیں، مبسوط اور بدائع کی عبارت سے بھی یہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ مخدوم عبدالواحد سیوستانیؒ نے بھی غرابِ اہلی کی حلت کی تصریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو:

س: ما حکم خرء الغراب الذی یطیر فی الأمصار و القری و یخلط بین التقاط الحب و العذرات و ما حکم سوره؟

الجواب: الظاهر أن الغراب الأبقع الذی فیه سواد و بیاض و هو

---

(۱) عنایه علی فتح القدیر کتاب الذبائح ج: ۹ ص: ۵۱۲ (طبع مکتبة رشیدیه کوئٹه)

مکروه عند الصاحبین وغیر مکروه عند الإمام کما فی السراجیة و الأبقع الأسود إن کان یخلط فیأکل الجیف و یأکل الحب قال أبوحنیفة: لا یکره و قال صاحباه: یکره۔انتهی ، فیکون مأکول اللحم (إلی أن قال) و إن لم یکن لخرئه رائحة کریهیة یکون طاهرا لکون خرئه خرء مأکول اللحم من الطیور التی ترزق فی الهواء الخ
(فتاوی واحدیه، ص ۹۴)[1]

عباراتِ بالا کے علاوہ مندرجہ ذیل نصوص میں بھی اس کی تصریح ہے کہ حلت وحرمت کامدار خوراک پر ہے۔

(۱) و أصل ذلک أن یأکل الجیف فلحمه نبت من الحرام فیکون خبیثا عادة و ما یأکل الحب لم یوجد ذلک فیه وما خلط کالدجاج والعقعق فلا بأس بأکله عند أبی حنیفةؒ و هو الأصح لأن النبی صلی الله علیه وسلم أکل الدجاجة و هی مما یخلط۔
(العنایة مع الفتح ص: ۶۲ ج:۸)[2]

(۲) فکان الأصل عنده أن ما یخلط کالدجاج لا بأس۔
(عالمگیریه، ص: ۳۲۱ ج:۵)[3]

آخر میں ابوحنیفۂ عصر، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا فیصلہ بھی تذکرۃ الرشید سے نقل کیا جاتا ہے:

جب یہ فیصلہ خود کتبِ فقہ میں مذکور ہے کہ مدار اس کی خوراک پر ہے، پس یہ کوا جواُن بستیوں میں پایا جاتا ہے، اگر یہ عقعق نہ ہوتو بھی اس کی حلت میں شبہ نہیں

(۱) ص: ۴۹، (طبع: دار الاشاعة العربیة قندهار)
(۲) فتح القدیر کتاب الذبائح ج: ۹ ص: ۵۱۲ (طبع مکتبة رشیدیة کوئٹه)
(۳) الفتاویٰ الهندیة، ج:۵، ص: ۲۹۰ (طبع: رشیدیة کوئٹه)

ہے۔ اس لئے کہ جب وہ بھی خلط کرتا ہے اور نجاست وغلہ ودانہ سب کچھ کھاتا ہے تو اس کی حلت بھی مثل عقعق کے معلوم ہوگئی، خواہ اس کو عقعق کہا جاوے یا نہ کہا جاوے۔ فقط واللہ اعلم، رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

عبارتِ مذکورہ کے حاشیہ پر ہے:

جب مخالفین کا اس مسئلہ پر غوغا زیادہ ہوا تو ستر سے زائد علماء کا مواہیر سے ایک رسالہ بنام ''فصل الخطاب'' شائع کیا، نیز ایک حاجی نے علماءِ حرمین سے اس کی حلت کا فتویٰ لیا، وھو ہذہ:

الحمد لله وحده، رب زدني علما، الغراب المذكور حلال من غير كراهة عند أبي حنيفةؒ وهو الأصح و هو المسمى بالعقعق بتصريح فقهائنا رحمهم الله و أصاب من أفتى بحله و جواز أكله و كيف يلام الحنفي على أكل ما هو حلال عند إمامه من غير كراهة والأصل في حل الغراب و حرمته الغذاء و كونه ذا مخلب لا بصورة و لونه كما يدل عليه تصريحات فقهائنا في غالب معتبرات المذهب كما في البحر الرائق و الدر المختار و العناية و غيرها و فيما نصه جامع الرموز إشعار بأنه لو أكل كل من الثلاثة الجيف و الحب جميعا حل و لم يكره وقالا: يكره والأول أصح، فثبت مما صرح به علمائنا أن الغراب بأنواعه سواء كان عقعقا أوغيره إذا كان يجمع بين جيف و حب يجوز أكله عند إمامنا الأعظم، والله أعلم. (قاله بفمه و أمر برقمه عبدالله بن عباس بن صديق مفتي مكة المشرفة)

اسی مضمون کا علماءِ مدینہ منورہ کا بھی فتویٰ موجود ہے (تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۱۷۸)

اس تحریر کے بعد مسئلہ ایسا واضح ہو گیا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

فبأی حدیث بعده یؤمنون۔

فقط واللّٰہ الهادی إلی سبیل الرشاد

رشید احمد عفی عنہ
دار العلوم کراچی
۱۵ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

لله در المجیب الأوّل وإرشاد الرشید الثانی حیث أوضحوا الحق والصواب بحیث لایبقی منه ریب مرتاب۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دار العلوم کراچی
۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

کوّے کی مختلف اقسام اور ہمارے ملک میں پائے جانے والے کوّے کا حکم

سوال:- ۱۶ اگست ۱۹۷۶ء کو نوائے وقت دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس میں ایک خبر تھی جس کا عنوان تھا ''کوّے کا گوشت کھالیا گیا'' نیچے لکھا تھا کہ بعض علماءِ کرام کے کوّے کو حلال قرار دینے سے ایک شخص دیوبندی عقیدہ رکھنے والے چودھری نے کوّے کا گوشت کھالیا، بریلویوں نے اس کو خوب مشتہر کیا، بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کسی تصنیف میں حلال لکھا ہے، یہ کہاں تک سچ ہے؟

جواب:- کوے کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے بعض حرام ہیں اور بعض حلال، ہمارے ملک میں جو کوا پایا جاتا ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ حلال ہے، اس مسئلے پر احقر کا ایک مفصل رسالہ ہے جو ''احسن الفتاوی''[1] مؤلفہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب میں شائع ہو چکا ہے، مسئلے کی پوری تحقیق اس

(۱) اس رسالہ سے مراد سابقہ تفصیلی فتوی ہے جو ''احسن الفتاوی'' کتاب الصید والذبائح ج: ۷ ص: ۴۳۹ (طبع سعید) میں بھی چھپ چکا ہے۔

میں دیکھی جاسکتی ہے، لیکن حلال ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا کھانا واجب ہے، لہٰذا اگر کسی نے کھالیا تو وہ مستحقِ ملامت نہیں اور کوئی اپنی طبعی کراہت کی بناء پر نہ کھائے تو اسے خوامخواہ کھانے کی دعوت دینا بھی درست نہیں، خلاصہ یہ کہ اس مسئلے کو نزاع وجدال اور انتشار وافتراق کا ذریعہ بنانا کسی طرح درست نہیں ہے، امتِ مسلمہ کو بہت سے ضروری مسائل درپیش ہیں، ان سے توجہ ہٹا کر اس مسئلے پر سر پھٹول اور جھگڑے کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ نزاع سے پرہیز کریں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۵؍شوال المکرّم ۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۵/۱۵ ۲۷ھ)

کوّے کی حلت پر تحقیق

سوال:- فتاویٰ دارالعلوم میں آپ نے کوّا حلال فرمایا ہے اور جس جگہ لوگ طعن کرتے ہوں، وہاں کھانے کو ثواب فرمایا ہے، ایک مولوی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن میں "ویحرم علیھم الخبٰئث" آیا ہے اور صحیح بخاری میں "الغراب خبیث" ہے، اس لئے اس کو نہ کھانا چاہئے، اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب:- ہمارے ملک میں جو کوّا پایا جاتا ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ حلال ہے، کیونکہ وہ خالص مردار نہیں کھاتا، بلکہ خلط کرتا ہے،

وفي العالمگيريه: وعن أبي يوسفؒ قال: سئلت أباحنيفةؒ عن العقعق، فقال: لا بأس به فقلت: إنه يأكل النجاسات، فقال: إنه يخلط النجاسة بشيء آخر ثم يأكل فكان الأصل عنده أن ما يخلط

كالدجاج لا بأس. (عالمگيريه، ج ۵، ص ۳۲۱)[۱]

و فى المبسوط للسرخسىؒ: فإن كان الغراب بحيث يخلط فيأكل الجيف تارة و الحب تارة فقد روى عن أبى يوسف رحمه الله أنه يكره لأنه اجتمع فيه الموجب للحل والموجب للحرمة، وعن أبى حنيفةؒ أنه لا بأس بأكله وهو الصحيح على قياس الدجاجة فإنه لا بأس بأكلها وقد أكلها رسول الله صلى الله عليه وسلم و هى قد تخلط أيضاً و هذا لأن ما يأكل الجيف فلحمه ينبت من الحرام فيكون خبيثا عادة و هذا لايوجد فيما يخلط(۱۱/۲۲۶)[۲]

یہ عبارات غرابِ اہلی کی حلت پر صریح ہیں اورحدیث میں غراب کو جوخبیث کہا گیا ہے،اس کا منشاء یہ ہے کہ چونکہ وہ موذی ہے،اس لئے حالتِ احرام میں اس کا مارنا جائز ہے۔[۳]

اس کا تعلق اباحت وحرمت سے نہیں ہے، اس مسئلے کی مفصل تحقیق احقر نے ایک مقالے میں لکھ دی ہے جو"احسن الفتاوی" ص:۵۲۸[۴] پر چھپا ہے اوراس پر مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصدیق بھی ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتوی نمبر ۲۵۱۹/۲۷ھ)

پاکستان میں پائے جانے والے کوّے کی حلت وحرمت کا حکم

سوال:- فتاوی رشیدیہ کامل ص: ۴۹۳ پر سوال ہے کہ جس جگہ زاغ معروفہ کوا اکثر حرام

(۱) الهندية ج: ۵ ص: ۲۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) و كذا فى البدائع ج: ۳ ص: ۱۹۷ (طبع سعيد)
وفى البحر ج: ۸ ص: ۱۷۲ (طبع سعيد)
(۲) المبسوط ج: ۱۱ ص: ۴۰۸ (طبع دار الفكر بيروت)
(۳) وفى صحيح المسلم كتاب الحج باب ما يندب للمحرم و غيره قتله من الدواب فى الحل والحرم ج: ۱ ص: ۳۸۱ (طبع سعيد) عن عائشةؓ قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس فواسق يقتلن فى الحرم العقرب والفارة والحديا والغراب والكلب العقور۔
(۴) احسن الفتاوی ج: ۷ ص: ۴۴۰ (طبع سعید) اس سے مراد وہ سابقہ فتویٰ ہے جو اسی فصل میں ص: ۵۰ سے ص: ۵۷ تک موجود ہے۔

جانتے ہوں اور کھانے والے کو برا کہتے ہوں تو ایسی جگہ اس کوّے کے کھانے والے کو کچھ ثواب ہوگا یا نہیں؟

جواب:- ثواب ہوگا۔

اس زاغِ معروفہ سے کون سا کوّا مراد ہے؟ کیا یہ ابلق کوّا جو گندگی کھاتا ہے، یہ مراد ہے؟

جواب:- ہمارے یہاں جو کوّا معروف ہے، وہ حلال ہے اور اس سلسلے میں عالمگیریہ[1] وغیرہ کتبِ فقہ میں یہ اُصول مصرّح ہے کہ جو کوّا مردار کے سوا کچھ نہ کھاتا ہو، وہ تو حرام ہے،[2] لیکن جو کوّا دانہ بھی کھاتا ہو اور گندگی بھی تو وہ حلال ہے،[3] ہمارے یہاں جو کوا پایا جاتا ہے وہ اسی قسم میں داخل ہے، چنانچہ حلال ہے،[4] لیکن اس مسئلے پر فتنہ وفساد برپا کرنا یا نزاع وجدال میں مبتلا ہونا کسی طرح درست نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰ /۲۸ الف)

سیہی حرام ہے

سوال:- ایک جانور جو زمین کے اندر غاروں میں رہتا ہے، جس کو ہماری زبان میں سہ اور

(۱ تا ۴) وفی الهندية كتاب الذبائح الباب الثانی فی بيان ما يؤكل من الحيوان وما لا يؤكل ۵ / ۲۹۰ (طبع رشيديه كوئٹه) و عن أبی يوسف قال سألت أباحنيفة رحمه الله تعالیٰ عن العقعق فقال لا بأس به فقلت إنه يأكل النجاسات فقال إنه يخلط النجاسة بشیء آخر ثم ياكل فكان الاصل عنده ان ما يخلط كالدجاج لا بأس به وقال أبويوسف: يكره العقعق كما تكره الدجاجة و بعد أسطر: فإن ما يأكل الجيف كالغداف والغراب الأبقع مستخبث طبعاً الخ۔

وفی بدائع الصنائع ج: ۲ ص: ۱۹۷ (طبع سعيد) أمر رسول الله -صلى الله عليه وسلم- بقتل خمس فواسق فی الحل والحرم: الحدأة، والفأرة، والغراب، والعقرب، والكلب العقور....قال أبو يوسف: الغراب المذكور فی الحديث هو الغراب الذی يأكل الجيف، أو يخلط مع الجيف إذا هذا النوع هو الذی يبتدئ بالأذى والعقعق ليس فی معناه؛ لأنه لا يأكل الجيف ولا يبتدئ بالأذى. (كتاب الحج فصل فی أنواع الصيد) وكذا فی الجوهرة النيرة ج: ۲ ص: ۲۶۵ (طبع قديمی كتب خانه)

وكذا فی البحر الرائق ج: ۸ ص: ۱۷۲ (طبع سعيد وفی الهندية ج: ۵ ص: ۲۹۰ (طبع رشيديه)

نیز دیکھئے فتاوی رشیدیہ ص: ۵۹۷۔

غالبًا فارسی والے اس کو خارپشت اور عربی میں ضدب کہتے ہیں، وہ حلال ہے یا نہیں؟

جواب:- سیہی جس کو عربی میں قنفذ کہتے ہیں، حلال نہیں ہے۔

قال فی الدر: و لا الحشرات و قال الشامیؒ: کالفارة والوزعة و سام أبرص والقنفذ والحیة۔ (شامی، ص: ۲۶۵ ج: ۵)[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ
(فتوی نمبر ۳۲۲/۳/۱۹الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۵ھ

(۱) الدر المختار مع رد المحتار کتاب الذبائح ج ۶ ص: ۳۰۴ (طبع سعید)
وفی سنن أبی داؤد رقم الحدیث: ۳۸۰۱ باب فی أکل حشرات الأرض ج:۳ص:۴۱۷(طبع دار الکتب العلمیة بیروت) عن عیسی بن نمیلة، عن أبیه، قال: کنت عند ابن عمر فسئل عن أکل القنفذ، فتلا (قل لا أجد فیما أوحی إلی محرما) الآیة، قال: قال شیخ عنده: سمعت أبا هریرة یقول: ذکر عند النبی صلی الله علیه وسلم فقال خبیثة من الخبائث فقال ابن عمر: إن کان قال رسول الله صلی الله علیه وسلم هذا فهو کما قال ما لم ندر.
وکذا فی سنن الکبری للبیهقی باب ما روی فی القنفذ وحشرات الأرض، رقم الحدیث: ۱۹۹۱۳ ج:۲ ص:۳۴۷ (طبع مجلس دائرة المعارف حیدرآباد هند) و مسند أحمد ۸۹۴۱ ومسند أبی هریرة ج:۲ ص:۳۸۱ (طبع مؤسسة قرطبة القاهرة)
وفی مجمع الأنهر کتاب الذبائح ج:۴ ص:۱۶۱ (طبع دار الکتب العملیة بیروت)(و) یحرم أکل (الحمر الأهلیة) ... (والحشرات) الصغار من الدواب جمع الحشرة کالفارة والوزغة و سام أبرص والقنفذ والحیة ... لأنها من الخبائث وقد قال الله تعالی "ویحرم علیهم الخبٰئث"
وفی بدائع الصنائع ج: ۱۱ ص: ۴۲۲(طبع دار الکتب العلمیة بیروت)ولا ینعقد بیع الحیة والعقرب و جمیع هوام الأرض کالوزغة والضب والسلحفاة والقنفذ و نحو ذلک لأنها محرمة الانتفاع بها شرعاً لکونها من الخبائث.
وفی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کتاب الذبائح فصل فیما یحل وما لا یحل ج:۶ ص:۴۶۷(طبع سعید) والقنفذ مما یکون سکناه الأرض والجدر مکروه أکله لأن الهوام مستخبثة وقد قال تعالی" ویحرم علیهم الخبٰئث" (الأعراف:۱۵۷)
وفی شرح الوقایة:(ولا یحل الحشرات) والهوام والزنابیر والیربوع والقنفذ وغیرها لأنها من الخبائث وقال الله تعالی"ویحرم علیهم الخبٰئث" ولأن الطباع السلیمة تستخبثها.
وفی المحیط البرهانی ج:۵ ص: ۲۲۲ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت)وکرهوا أیضاً جمیع الهوام الذی سکناها فی الأرض نحو الفارة والوزغ والقنفذ الخ.
وفی المبسوط للسرخسیؒ ج: ۱۱ ص: ۴۶۲(طبع دار الفکر بیروت) وذکر فی جملة ما لا یؤکل الیربوع والقنفذ وما أشبههما من الهوام لأن الطباع السلیمة تستخبثها فیدخل تحت قولی تعالی "ویحرم علیهم الخبٰئث"
وفی الهندیة کتاب الذبائح الباب الثانی ج:۵ ص: ۲۸۹ (طبع رشیدیه) وجمیع الحشرات وهوام الأرض من الفار والقنافذ والیربوع والزنبور والذباب والعنکبوت والعقرب ونحوها لا خلاف فی حرمة هذه الأشیاء.

منگرا مچھلی کا حکم

سوال:- مادریں مسئلہ سرگرداں ہستیم اُو آنکہ بعضے مولوی می گویند کہ منگرا کہ در بلوچی پشّیک نام دارد، حلال است اور بعضے می گویند کہ حرام واگر حلال است ہم بہ تفصیل وحوالہ کتب را نوشتہ شرح دہید۔

وبعضے می گویند کہ علامت ِ ماہی سہ است: (۱)... شگاف در گردن (۲)... استخوان کوچک کہ پولک ہم ماہی باید داشتہ باشد۔ بعضے می گویند کہ در کتاب ورسا نوشتہ است حلال است۔

جواب:- مارا بہ حقیقت ِ منگرا واقفیت نیست، بس مدارِ حلّت بران است کہ در ماہی ہست یا نہ؟ اگر قسمے از اقسام ماہی است جائز است [۱] ورنہ نہ۔

واللہ سبحانہ اعلم
۸۷/۶/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۰۳ ب)

مذکورہ فارسی فتویٰ کا اُردو ترجمہ

سوال:- میں اس مسئلہ میں پریشان ہوں کہ بعض مولوی حضرات کہتے ہیں کہ منگر جسے بلوچی زبان میں پشیک کہتے ہیں، حلال ہے، بعض کہتے ہیں کہ حرام ہے، اگر حلال ہے تو کتب کے حوالے سے تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مچھلی کی علامات یہ ہیں: (۱)... کہ گردن میں سوراخ ہونا۔ (۲)... چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کا ہونا۔ (۳)... پولک

---

(۱) بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ ''منگرا'' مچھلی ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس کا کھانا جائز ہے۔

وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۰۷ ولا یحل (حیوان إلا السمک) .... (و إلا (الحریث) سمک أسود (والمار ماهی) سمک فی صورة الحیة و أفرد هما بالذکر للخفاء و خلاف محمدؒ. (رجسٹر نقل فتاوی دار العلوم کراچی، (۱۸۰/۵۵ے و ۳۱/ ۲۲۳ ۴)

وفی البحر الرائق ج: ۸ ص: ۱۷۲ (طبع سعید) "ولا یؤکل مائی إلا السمک غیر طاف وقال مالک رحمه الله تعالی: یؤکل جمیع حیوان الماء .... الخ

جواب:- مجھے منگرا کی حقیقت سے واقفیت نہیں ہے، پس اس کی حلّت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یہ مچھلی ہے یا نہیں؟ اگر یہ مچھلی کی اقسام میں سے ہے تو جائز ہے(۱)، ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم

(۱) دیکھئے سابقہ صفحے کا حاشیہ نمبر(۱)

كِتَابُ الأُضحِيَة

(قربانی کے مسائل کا بیان)
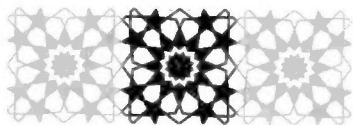
فصل فی من تجب علیہ ومن لا تجب

(قربانی کس پر واجب ہے کس پر نہیں)

۱: پورے گھرانے کی طرف سے ایک قربانی کافی ہے یا ہرایک کی الگ الگ قربانی ضروری ہے؟

۲: کیا والدین کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟

سوال:- (خلاصۂ سوال) ہم پانچ بھائی ہیں، سب شادی شدہ ہیں، والدین بھی زندہ ہیں، ہم سب کی آمدنی الگ ہے، رہتے سب بمع والدین ایک مکان میں ہیں، تو کیا ہم سب پر الگ الگ قربانی واجب ہے یا کہ ایک قربانی سب کے لئے کافی ہے؟ سب بھائیوں کے پاس مجموعی طور پر ساڑھے سات تولے سونا اور باون تولے چاندی ہے۔

۲: کیا والدین کی طرف سے ایک بھائی قربانی دے سکتا ہے جب کہ نان ونفقہ ہم سب دیتے ہیں؟

جواب۱:- قربانی ایک عبادت ہے جو ہر عاقل وبالغ صاحبِ نصاب پر الگ الگ فرض ہوتی ہے، (۱) لہٰذا جس طرح خاندان میں سے ایک شخص کے نماز پڑھنے سے تمام افراد کی نماز اَدا نہیں ہوتی، اسی طرح ایک قربانی بھی سب کی طرف سے کافی نہیں، ہر مالکِ نصاب کو الگ الگ قربانی کرنی چاہئے، (۲) البتہ ایک گائے میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں۔ (۳)

(۱و۲) دیکھئے اگلے صفحہ کا حاشیہ نمبر۲۔ نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۸ص:۱۸۱

(۳) وفی مشکوۃ المصابیح باب فی الأضحیة ص: ۱۲۷ (طبع قدیمی کتب خانه) عن جابر رضی الله عنه أن النبی صلی الله علیه وسلم قال: البقرة عن سبعة الجزور عن سبعة، رواہ مسلم وأبوداؤد واللفظ له۔

و فیها أیضا باب فی الأضحیة ص: ۱۲۸ (طبع قدیمی کتب خانه) و عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: کنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی سفر فحضر الأضحی ..... (باقی اگلے صفحہ پر)

۲:- جی ہاں! والدین کی طرف سے قربانی بلاشبہ کی جاسکتی ہے، اگران پر واجب نہیں ہے توان کی طرف سے نفلی قربانی کی جاسکتی ہے، ثواب ان کو بھی ملے گا اور کرنے والوں کو بھی، لیکن ان کی طرف سے قربانی کرنے پر اپنی طرف سے جو قربانی کرنا واجب ہے وہ ساقط نہ ہوگا۔[۱]

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۷/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۳۹۵/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلند شہری

اپنی کل رقم کسی کو قرض دے دینے والے پر قربانی کے حکم میں تفصیل

سوال:- ہندہ نے زید کو کل رقم وزیور جو کہ نصاب کو پہنچتا تھا، بطورِ قرض چھ ماہ کے لئے دیا تھا، لیکن ایک سال سے تجاوز ہوگیا، ہنوز زید نے واپس نہیں کیا، ہندہ کے پاس مذکورہ رقم وزیور کے علاوہ اور کچھ نہیں، ہندہ اور زید کا تعلق ماں بیٹے کا ہے، لیکن کشیدگی رہتی ہے، صورتِ ہذا میں کیا ہندہ پر قربانی اور زکوٰۃ واجب ہے؟ براہِ کرم آگاہ فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر ہندہ کے پاس اتنی رقم ہے کہ وہ اُس سے قربانی کا جانور خرید سکے یا گائے میں حصہ لے سکے تو اُس پر قربانی واجب ہے،[۲] اور اگر اتنی رقم موجود نہیں ہے تو اُس

(گذشتہ سے پیوستہ) = فاشتركنا في البقرة سبعة و في البعير عشرة، رواه الترمذى والنسائى وابن ماجه وقال الترمذى: هذا حديث غريب ، وراجع إلى سنن الترمذى أبواب الأضاحى ج:٢ ص: ٢٧٦ (طبع سعيد)

(١) وفى الشامية ج: ٦ ص: ٣٣٥ (طبع سعيد)لو ضحى عن ميت وارثه بأمره ألزمه بالتصدق بها وعدم الأكل منها، وإن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت، ولهذا لو كان على الذابح واحدة سقطت عنه أضحيته كما فى الأجناس .قال الشرنبلالى :لكن فى سقوط الأضحية عنه تأمل اهـ .أقول :صرح فى فتح القدير فى الحج عن الغير بلا أمر أنه يقع عن الفاعل فيسقط به الفرض عنه وللآخر الثواب فراجعه.

نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۸ ص:۲۰۵ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت کراچی)

(٢)وفى الدر المختار ج: ٦ ص: ٣١٢ كتاب الأضحية (طبع سعيد) وشرائطها :الإسلام والإقامة واليسار (وفى الشامية: واليسار إلخ) بأن ملك مائتى درهم أو عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس أو متاع يحتاجه) الذى يتعلق به وجوب صدقة الفطر.

وفى الشامية أيضاً بعد أسطر: له مال كثير غائب فى يد مضاربه أو شريكه ومعه من الحجرين أو متاع البيت ما يضحى به تلزم.

پر واجب ہے کہ زید سے کم از کم اتنی رقم کا مطالبہ کرے جس سے قربانی کی جاسکے، اگر وہ ادا کرنے پر راضی نہ ہو اور اس کے پاس قربانی کے آخری دن تک قربانی کی رقم بغیر قرض مانگے مہیا نہ ہوسکے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے، "قال فی البزازیة: "له دین حال علی مقر ملیء ولیس عنده ما یشتریها به لایلزمه الاستقراض ولاقیمة الأضحیة إذا وصل الدین إلیه ولکن یلزمه أن یسأل منه ثمن الأضحیة إذا غلب علی ظنه أنه یعطیه" (بزازیه علی هامش الهندیة ج: ٦ ص: ٢٨٧)[1]

اور زکوٰۃ کا مسئلہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں اس پر ہر سال زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی، لیکن اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب قرض یا اس کا کچھ حصہ وصول ہوجائے، یعنی جتنا جتنا وصول ہوتا جائے، اتنے پیسوں کی زکوٰۃ پچھلے سالوں کی بھی ادا کرتی جائے،[2] اور اگر قرض وصول ہونے کا انتظار نہ کرے بلکہ ہر سال زکوٰۃ ادا کرتی رہے تو بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۷۷ د)

---

(۱) فی الهندیة ج:۵ ص: ۲۹۲ کتاب الأضحیة الفصل الثانی (طبع رشیدیه کوئٹه) ولو کان علیه دین بحیث لو صرف فیه نقص نصابه لا تجب، و کذا لو کان له مال غائب لا یصل إلیه فی أیامه.

وفی الجوهرة النیرة ج: ۱ ص: ۳۰۵ (قوله والغارم من لزمه دین) أی یحیط بماله أو لا یملک نصابا فاضلا عن دینه وکذا إذا کان له دین علی غیره لم یکن به غنیا سواء کان نصابا أو أکثر لأنه لم یکن بذلک غنیا.

نیز دیکھئے: احسن الفتاوی ج: ۷ ص: ۵۱۲۔

(۲) وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۲۶۶ و ۲۶۷ (طبع سعید) ولو کان الدین علی مقر ملیء أو معسر ..... فوصل إلی ملکه لزم زکوة ما مضی و سنفصل الدین فی زکاة المال.

وفیه أیضًا ج: ۲ ص: ۳۰۵ و اعلم أن الدیون عند الإمام ثلاثة :قوی، ومتوسط، وضعیف؛ فتجب زکاتها إذا تم نصابا وحال الحول، لکن لا فورا بل عند قبض أربعین درهما من الدین القوی کقرض (وبدل مال تجارة) فکلما قبض أربعین درهما یلزمه درهم.

نابالغ مال دار پر زکوٰۃ، قربانی واجب ہے یا نہیں؟
بہشتی زیور اور ہدایہ کی بظاہر متضاد عبارات کی تحقیق

سوال:- نابالغ مال دار پر قربانی، زکوٰۃ اور فطرہ ہے یا نہیں؟ بہشتی زیور میں ہے کہ اس سے قربانی کرنا ہرگز درست نہیں ہے، لیکن ہدایہ میں اصح قول قربانی دینے پر ہے، فتویٰ کس پر ہے؟

جواب:- فتویٰ بہشتی زیور ہی کے مسئلے کے مطابق ہے، صاحبِ ہدایہؒ نے اگرچہ بظاہر اصح اس کو قرار دیا ہے کہ نابالغ مال دار کے مال سے زکوٰۃ ادا کی جائے لیکن دوسرے فقہاءؒ نے فتویٰ قربانی کے عدمِ وجوب پر دیا ہے۔ قال فی الدر المختار: (ویضحی عن ولده الصغیر من ماله صححه فی الهدایة (وقیل لا) صححه فی الکافی .قال :ولیس للأب أن یفعله من مال طفله، ورجحه ابن الشحنة. قلت :وهو المعتمد لما فی متن مواهب الرحمن من أنه أصح ما یفتی به .وعلله فی البرهان بأنه إن کان المقصود الإتلاف فالأب لا یملکه فی مال ولده کالعتق أو التصدق باللحم فمال الصبی لا یحتمل صدقة التطوع، وعزاه المبسوط فلیحفظ. (شامی)[1]۔

پھر صاحبِ ہدایہ کے کلام پر غور کرنے سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ درحقیقت امام ابوحنیفہؒ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک حسن بن زیاد سے مروی ہے کہ ان کے نزدیک والد اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی قربانی کرے گا جیسے کہ صدقۃ الفطر میں ان کی طرف سے صدقہ دیتا ہے، اور دوسری روایت جو ظاہر الروایۃ ہے، یہ ہے کہ اولاد کی طرف سے قربانی واجب نہیں، چونکہ صاحبِ ہدایہ نے اسی کو ظاہر الروایۃ فرمایا ہے، اس لئے ان کی صنیع سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ آگے حسن بن زیاد کی روایت کی مزید تفصیل یوں فرمائی ہے کہ جب والد پر نابالغ بیٹے کی طرف سے قربانی کرنا واجب ہوا تو آیا وہ اپنے مال سے کرے گا یا بیٹے کے مال سے؟

(۱) ردّ المحتار ج: ۶ ص: ۳۱۶ (طبع سعید)

وفی الشامیة أیضاً ج: ۲ ص: ۲۵۸ قوله: عقل وبلوغ .... الخ فلا تجب علی مجنون و صبی لأنها عبادة محضة و لیسا مخاطبین بها .... الخ۔

نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۸ ص:۱۷۹ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)

اس میں اصح اس کو قرار دیا گیا ہے کہ بیٹے کے مال سے کرے گا۔ ان کی عبارت یہ ہے:

وإن كان للصغير مال يضحى عنه أبوه أو وصيه من ماله عند أبى حنيفة وأبى يوسف رحمهما الله. وقال محمد وزفر و الشافعى - رحمهم الله :- يضحى من مال نفسه لا من مال الصغير، فالخلاف فى هذا كالخلاف فى صدقة الفطر .وقيل لا تجوز التضحية من مال الصغير، فى قولهم جميعا، لأن هذه القربة تتأدى بالإراقة والصدقة بعدها تطوع، ولا يجوز ذلك من مال الصغير، ولا يمكنه أن يأكل كله .والأصح أن يضحى من ماله ويأكل منه ما أمكنه ويبتاع بما بقى ما ينتفع بعينه. (فتح القدير ج: ٨ ص: ٧٠)[1]

اور بظاہر یہ ساری عبارت حضرت حسن بن زیادؒ کی روایت پر مبنی ہے۔ هذا ما ظهر لی۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۳ھ

(فتوی نمبر ۲۳۳۲ /۲۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غیر صاحبِ نصاب تین بھائیوں کا انفرادی یا اجتماعی طور پر قربانی کرنے کا حکم

سوال ۱:- (خلاصۂ سوال) تین بھائی ہم طعام ہیں اور ان کو اپنے باپ کی میراث جو ملی ہے، اس میں تینوں بھائی اجمالی تصرف سے زندگی بسر کر رہے ہیں، اور ان تینوں کا مجموعہ مال اور کمائی اتنا ہے کہ جس پر قربانی واجب ہے، اور علیحدہ علیحدہ کر لیا جائے تو قربانی واجب نہیں ہوتی، اگر یہ تینوں میں سے کسی ایک کے نام پر یا تینوں اپنے ماں یا باپ کے نام پر قربانی کریں تو ان کی یہ قربانی جائز ہوگی یا نہیں؟ اور اگر تینوں مل کر ایک کے نام پر قربانی کریں تو کیا ان کے یا دوسرے لڑکے کی

(۱) ج:۸ ص:۴۲۹ (طبع رشیدیہ کوئٹہ)

قربانی میں کوئی خرابی ہوگی یا نہیں؟

۲:۔ اگر ان تینوں کے مجموعہ مال پر قربانی واجب نہ ہو اور پھر یہ تینوں میں سے ایک کے نام پر یا دوسرے کسی کے نام پر قربانی کریں تو ان کی یا ساتھیوں کی قربانی میں کوئی نقصان ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱ و ۲:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ تینوں بھائیوں کا الگ الگ حصہ اتنا نہیں جس پر قربانی واجب ہو، اس لئے ان میں سے کسی پر قربانی واجب نہیں ہے، البتہ یہ تینوں آپس کی رضامندی کے ساتھ مجموعی مال سے نفلی طور پر اپنے میں سے کسی ایک کے لئے قربانی کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، پھر وہ چاہے تو اس کا ثواب والدین کو پہنچا دے، یہ قربانی جائز ہوگی اور اگر گائے وغیرہ میں حصہ لیں گے تو بقیہ شرکاء کی قربانی بھی درست ہو جائے گی، اس کا کھانا بھی جائز ہوگا۔ البتہ یہاں ایک مسئلہ سمجھ لیجئے کہ باپ کے ترکے کو تقسیم کئے بغیر استعمال کرتے رہنا مناسب نہیں ہے، ترکے کو تقسیم کر کے پھر ہر ایک کی ملکیت علیحدہ کر دینی چاہئے، اس کے بعد اگر تینوں بھائی چاہیں تو دوبارہ اپنی ملکیتیں ملا کر شرکت کر لیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۷/۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

عالمِ دین کے لئے حج وقربانی کے قابل جمع کی گئی تنخواہ پر یہ فرائض ادا کرنا لازم ہیں

سوال:۔ ایک عالمِ دین نے مدرسہ سے تنخواہ لے کر جمع کی ہے، تنخواہ اتنی جمع ہے کہ وہ حج وقربانی وزکوٰۃ کے فرائض ادا کر سکتا ہے، کیا ان صاحب پر یہ فرائض لازم ہیں یا نہیں؟

جواب:۔ زکوٰۃ، حج اور قربانی کے فرائض تمام مسلمانوں کے لئے ہیں، لہٰذا اگر مذکورہ عالمِ دین کے پاس اتنی رقم جمع ہے کہ وہ حج کر سکیں تو ان پر حج وقربانی فرض ہے،[1] اور اگر مقدارِ نصاب رقم

---

(۱) وفي سنن ابن ماجه أبواب الأضاحي ج: ۱ ص: ۲۲۶ (طبع قديمي) عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان له سعة و لم يضح فلا يقربن مصلانا۔

نیز دیکھئے ص: ۸۶ کا حاشیہ ۲

پر ایک سال گزر گیا ہو تو زکوٰۃ بھی فرض ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶ /۱۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مقروض پر قربانی کے حکم کی تفصیل

سوال:- میں نے بینک سے کچھ قرضہ لے کر مکان خریدا، اب کرایہ پر دیا ہوا ہے، ماہوار کرایہ مبلغ ۱۴۵ روپے ہے، ٹیکسز بھی اس میں سے ادا ہوتے ہیں، تاکہ ماہوار قسط بینک کو دی جائے، اس میں سہولت ہے، کیونکہ صرف تنخواہ سے قسط کی ادائیگی غیر ممکن ہے۔ میں آٹھ ہزار کا مقروض ہوں، جس کی ادائیگی پندرہ سال میں ہوگی اور تقریباً ایک ہزار چار سو روپے عزیزوں کا بھی مقروض ہوں، نیز میری مِلک میں ایک جھونپڑی نما مکان بھی ہے، جس میں میں خود رہتا ہوں، تاکہ کم آمدنی سے ادائیگی قرض میں آسانی رہے، ایک ہزار دو سو روپے کے زیورات شادی میں بیوی کو چڑھائے، اور ۲۵۰/روپے کا زیور بیوی اپنے میکے سے بھی لائی ہے۔ میں نے مبلغ چار سو چالیس روپے کے حصص دوملوں کے خریدے، ان کی قیمت گھٹ کر اب کوئی تقریباً ساڑھے تین سو روپے ہے، عید کے دیگر مصارف میں بھی تقریباً ڈیڑھ سو روپے خرچ ہوئے، کیا اس صورت میں بندے پر قربانی واجب ہے؟

جواب:- اگر آپ کی موجودہ نقد مالیت بشمول زیورات موجودہ قرض سے فاضل نہیں، یا فاضل ہے مگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم ہے تو آپ پر قربانی واجب نہیں،[۲] لیکن اگر ضرورت سے زائد اتنا سامان موجود ہے کہ موجودہ رقم میں اس کی قیمت ملا کر قرض ادا ہونے کے بعد ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت بچ رہے تو قربانی واجب ہوگی۔[۳] واضح رہے کہ بینک سے سود پر

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الزکوۃ ج: ۲ ص: ۲۵۹ (طبع سعید) وشرط افتراضها عقل وبلوغ وإسلام وحرية و سببه ملک نصاب حولی فارغ عن دَین له مطالب من جهة العبادة فارغ عن حاجته الأصلية۔

(۲و۳) وفی بدائع الصنائع ج: ۵ ص: ۶۴ (طبع سعید) ولو كان عليه دَين بحيث لو صرف إليه بعض نصابه لا ينقص نصابه لا تجب لأن الدين يمنع وجوب الزكوة فلأن يمنع وجوب الأضحية أولى، لأن الزكوة فرض والأضحية واجبة والفرض فوق الواجب۔

وفی الهندية كتاب الأضحية ج: ۵ ص: ۲۹۲ (طبع رشيديه) ولو كان عليه دَين بحيث لو صرف فيه نقص نصابه لا تجب۔

قرض لینا حرام ہے، اور قرض کو اپنی مالیت سے منہا کرتے وقت اصل قرض کو منہا کریں، سود کو نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶ /۱۸ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

فصل فی وقت الأضحیۃ

(قربانی کے وقت کا بیان)

جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے، اُس کے ملک میں ایّامِ قربانی ختم نہ ہونے کا لحاظ رکھنا لازم ہے

(فتاوی رحیمیہ اور دارالعلوم لندن کے فتاوی کا جائزہ)

سوال:- محترمی ومکرمی جناب حضرت مولانا مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم، مدظلہم العالی

بعد سلام مسنون، اُمید ودعا ہے کہ حضرت خیریت و عافیت سے ہوں گے، بندہ ویسے حضرت کو تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتا لیکن ہمارے بزرگ دارالعلوم لندن کے شیخ الحدیث مولانا مفتی فاروق ڈیسائی صاحب مدظلہ نے یہ درخواست کی کہ اس مسئلہ کی صراحت کرنی ہے، اس لئے اگر ہوسکے تو حضرت مفتی صاحب کے پاس سے اس کی صراحت کی جائے، اس لئے بندہ نے یہ خط حضرت والا کی خدمت اقدس میں ارسال کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قربانی کے سوال میں مفتی گجرات حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی ہے اور مفتی فاروق صاحب کا فتوی بظاہر حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتوی سے الگ ہے، مفتی فاروق صاحب کی درخواست ہے، حضرت مفتی صاحب سے کہ مفتی فاروق صاحب کا جواب صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہوتو حضرت مفتی صاحب اس کی تصحیح اور تصدیق فرمادیں، کیونکہ قربانی کا موسم بہت قریب ہے، اس لئے اگر ممکن ہو اور حضرت والا کرم فرمائیں تو بہت مہربانی ہے، بندہ بہت شرمندہ ہے کہ حضرت کو تکلیف دی اور گستاخی پر معافی کا طالب اور آپ کی توجہات ودعاؤں کا محتاج۔ فقط والسلام

(دارالعلوم لندن کے مفتی عمر فاروق ڈیسائی صاحب کا فتویٰ)

Bismillahirrahmanirrahim

7the Zil-Qadah 1425

Dear Respected mufti sahib

Hoping that you are in the best of health and imaan. We have a maslah were in we need your attention and opinion.

Below is the question which was asked and there is my answer. After some time the questioner sent the maslah which is written in fattwa Rahimiyah page 314/315 volume 9 Darul isha' at Karachi (refer to page 4) which is contradicting the answer I had originally given.

Question Date 14-01-2004

What do the muslims say about the following question?

The time defference between Barbados and India is 9 1/2 hours (i.e Barbados is 9 1/2 behind India time). A resident in Barbados has his/her qurbani done in india, due to the time difference the qurbani in india is done ahead of qurbani time in Barbados. The qurbani in india is done before the Eid namaaz is offered in Barbados. Is this qurbani valid or not? Sometimes the Eid is one day behind in india and the time of qurbani has finished in Barbados. i.e the 3 days of qurbani are over and there after if the qurbaniis done in india, will it be accepted?

From Latif Pandor

The answer that I gave.

Bismillahirrahmanirrahim

A fundamental maslah is this, that if a rich person was to do his wajib qurbani through a representative (wakeel), it is important that the qurbani has become wajib on this particular rich person. The qurbani on a rich person becomes wajib on the 10th Zil Hijjah after suba sadiq.

Now if where the rich person livs the time of qurbani has not yet begun i.e subah sadiq of 10th Zil Hijjah, but where ever the representative (wakeel) lives the 10th Zil Hijjah begun, it is not correct to perform the wajib qurbani for that rich person by the representative(wakeel).

According to the above maslah Barbados time is 9 ½ hours behind india time now if a Barbados resident wants to do his/her qurbani in India, when the 10th Zil Hijjah subah sadiq begins in Barbados, there after the Barbados residents qurbani should be done in India, then only qurbani will be valid.

If subah sadiq of 10th Zil Hijjah has not begun Barbados but the qurnahi has been performed on behalf of the person in Barbados, the qurbani in this situation will be counted as been done before becoming wajib. Therefore the wajib qurani of the resident of Barbados will not be valid, so the wajib qurbani has to be performed again after the time has begun i.e after the subah sadiq in Barbados.

The second maslah is that, once the qurbani has

become wajib on a rich person now.........to be valid and acceptable the qurbani animal has to be in such places were the quabani time has begun and remains i.e the days of qurbani have not yet finished. Regardless of the time finishing in the rich persons country of residence.

According to the above maslah if Eid in India is 1 day after Barbados and the time of qurbani has finished in Barbados and the qurbani is performed in India on the third day of Eid the wajib qurbani will be valid and acceptable for the person in Barbados. Hence the qurbani will be accepted, because the qurbani has become wajib on the person in Barbados after subah sadiq 10th zil Hijjah. In order for the qurbani to be valid it was important that the days of qurbani have begun in India and the days of qurbani are not yet finished in India. When the Eid in India is one day behind the third day of Eid is indeed the third day of qurbani so the qurbani from the rich person in Barbados is valid regardless of the 3 days of qurbani finishing in Barbados.

Allah nows best.
Yours sincerely
Umar Farooqi Desai
Date 29/11/1424

According to the maslah on page 4 which is of fattawa rahimaya my answer is contradicting that.

I say that the fatwa in fattawa Rahimiya is wrong (mubni bar tasamuh) the quotations that Hadrat Mufti Abdur Rahim sahib R.A (mufti azam of Gujrat) has put

forward as proof i.e Hidaya Aakirain page 430 Ad durul Mukhtaar was shami page 278 are according to when the nafse wujoob has come upon a person i.e once the nafse wujoob come upon a person the qurbani animals place would be considered and the place of the person for whom the qurbani is been done would not be considered.

(فتاوی رحیمیہ میں موجود فتوی)

ذبح قربانی میں قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس کا اعتبار ہوتا ہے

سوال:- (۲۵۲۳) بھائی عبدالرشید نے مدراس سے یہاں (حیدرآباد) میں قربانی کرنے کو لکھا ہے، وہاں عید پیر کو ہے اور یہاں اتوار کو، ان کی قربانی ہم یہاں اتوار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا پیر کو کرنا ہوگی؟ بینوا توجروا۔

جواب:- قربانی کا جانور جس جگہ ہو، اس جگہ کا اعتبار ہوتا ہے، قربانی کرنے والے کی جگہ کا اعتبار نہیں ہوتا، چنانچہ اگر قربانی والا شہر میں ہو اور وہ اپنا قربانی کا جانور ایسے گاؤں میں بھیج دے جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی اور وہاں صبح صادق کے بعد اس کی قربانی کا جانور ذبح کر دیا جائے تو اس شہر والے کی قربانی صحیح ہو جائے گی۔

ہدایہ اخیرین میں ہے:

والمعتبر فی ذلک مکان الأضحية، حتى لو كانت في السواد والمضحى في المصر يجوز كما انشق الفجر، ولو كان على العكس لا يجوز إلا بعد الصلاة .وحيلة المصرى إذا أراد التعجيل أن يبعث بها إلى خارج المصر فيضحى بها كما طلع الفجر. (ص: ۲۳۰)[1]

درمختار میں ہے:

والمعتبر مكان الأضحية لا مكان من عليه، فحيلة مصرى أراد

(۱) هداية كتاب الأضحية ج: ۴ ص: ۴۴۴ (طبع مكتبة رحمانيه)

التعجیل أن یخرجها لخارج المصر، فیضحی بها إذا طلع الفجر مجتبی.[۲]

(قوله والمعتبر مکان الأضحیة إلخ) فلو کانت فی السواد والمضحی فی المصر جازت قبل الصلاۃ، وفی العکس لم تجز قهستانی.

(درمختار و شامی ص: ۲۷۸ ج: ۵ کتاب الأضحیة)[۳]

صورتِ مسئولہ میں عبدالرشید بھائی نے مدراس سے آپ کو حیدرآباد میں اپنی قربانی کرنے کے لئے لکھا ہے اور مدراس میں پیر کو عیدالاضحیٰ ہے اور آپ کے یہاں اتوار کو، تو آپ بلاتکلف ان کی قربانی اتوار کو کرسکتے ہیں، ان کی قربانی صحیح ہوجائے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم

مکرمی مولانا اسمٰعیل گنگات صاحب، زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قربانی کے بارے میں مولانا مفتی فاروق ڈیسائی صاحب کا فتویٰ موصول ہوا، بندے کو اس سے اتفاق ہے، اور ان کے دلائل قوی ہیں اور فتاویٰ رحیمیہ میں تسامح ہے، کیونکہ انہوں نے جو عبارت نقل کی ہے اس میں قربانی بعدالوجوب ہے، جبکہ زیر بحث مسئلہ میں قربانی قبل سبب الوجوب واقع ہورہی ہے، نیز احتیاط اس میں ہے کہ جب قربانی کسی ملک میں کی جائے تو جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے، اس کے ملک میں بھی ابھی ایامِ اضحیہ ختم نہ ہوئے ہوں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۵/۱۱/۱۶ھ

وفی فتح القدیر ۸/ ۴۳۱[۳]

إذا کان تقدیم الصلاۃ علیه شرطا فی حق أهل الأمصار کان أول

(۱ و ۲) الدر المختار مع رد المحتار کتاب الأضحیة ج: ۶ ص: ۳۱۸ و ص: ۳۱۹ (طبع سعید)

(۳) کتاب الأضحیة (طبع رشیدیه)

وقت أدائها فى حقهم بعد الصلاة، وإن كان أول وقت وجوبها بعد طلوع الفجر من يوم النحر ويؤيده جدا عبارة الإمام قاضى خان فى فتاواه حيث قال :ووقت الأداء لمن كان فى المصر بعد فراغ الإمام عن صلاة العيد.

وفى الهداية مع الفتح: ٨/ ٤٣١[١]

ثم المعتبر فى ذلک مكان الأضحية، حتى لو كانت فى السواد والمضحى فى المصر يجوز كما انشق الفجر، ولو كان على العكس لا يجوز إلا بعد الصلاة .

وفى الدر المختار ٦/ ٣١٨[٢]

والمعتبر مكان الأضحية لا مكان من عليه، فحيلة مصرى أراد التعجيل أن يخرجها لخارج المصر، فيضحى بها إذا طلع الفجر مجتبى۔

وفى رد المحتار (قوله: والمعتبر مكان الأضحية الخ) فلو كانت فى السواد و المضحى فى المصر جازت قبل الصلوة و فى العكس لم تجز قهستانى۔

وفى الشامية ٦/ ٣١٨[٣]

(قوله وأول وقتها بعد الصلاة إلخ) فيه تسامح إذ التضحية لا يختلف وقتها بالمصرى وغيره بل شرطها، فأول وقتها فى حق المصرى والقروى طلوع الفجر إلا أنه شرط للمصرى تقديم الصلاة عليها فعدم الجواز لفقد الشرط لا لعدم الوقت كما فى

---

(١) كتاب الأضحية (طبع رشيديه)

(٢ و ٣) كتاب الأضحية (طبع سعيد)

المبسوط وأشير إليه فى الهداية وغيرها۔ الخ

وفى البحر الرائق ۸/۱۷۵ [1]

لأن وقتها من طلوع الفجر و إنما أخرت فى حق المصر لما ذكرنا ولأنها تشبه الزكوة فيعتبر فى الأداء مكان المحل و هو المال لا مكان الفاعل الخ

وفى بدائع الصنائع ۵/۶۵ [2]

وأما وقت الوجوب فأيام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت؛ لأن الواجبات المؤقتة لا تجب قبل أوقاتها كالصلاة والصوم ونحوهما، وأيام النحر ثلاثة :يوم الأضحى وهو اليوم العاشر من ذى الحجة والحادى عشر، والثانى عشر وذلک بعد طلوع الفجر من اليوم الأول إلى غروب الشمس من الثانى عشر ....فإذا طلع الفجر من اليوم الأوّل فقد دخل وقت الوجوب.

---

(۱) كتاب الأضحية (طبع سعيد)

(۲) كتاب الأضحية فصل وأما شرائط الوجوب الخ (طبع سعيد)

فصل فی مایکون عیباً فی الأضحیۃ وما لایکون

(قربانی میں عیب کا بیان)

لنگڑے جانور کی قربانی کا حکم

سوال:- ایک جانور جو دوسرے مویشیوں کے ساتھ جنگل میں چَرنے کو جا سکتا ہے، مثلاً ایک اُونٹ یا بیل ہے جو بار اُٹھانے اور ہل چلانے کے قابل ہے مگر کچھ لنگڑا پن بھی اس میں ہے، تو یہ جانور قربانی کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر وہ تھوڑے سے لنگڑے پن کے باوجود چلنے پھرنے کے قابل ہے تو اس کی قربانی جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

....

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۲۳ (والعرجاء التی لا تمشی إلی المنسک) وفی الشامیة تحته: (قوله والعرجاء) أی التی لا یمکنها المشی برجلها العرجاء إنما تمشی بثلاث قوائم، حتی لو کانت تضع الرابعة علی الأرض وتستعین بها جاز عنایة.

وفی الهدایة ج: ۴ ص: ۴۴۵ (طبع رحمانیه) ولا یضحی بالعمیاء والعوراء والعرجاء الّتی لا تمشی إلی المنسک .... والعرجاء البیّن عرجها.

وفی حاشیته: هی أن لا یمکنها المشی برجلها العرجاء و إنما تمشی بثلاث قوائم حتی لو کانت تضع الرابعة علی الأرض وضعاً خفیفاً یجوز.

فصل فیما یتعلق بالشرکۃ فی الضحایا والتضحیۃ عن الغیر

(قربانی میں متعدد حصوں اور دوسرے کی طرف سے قربانی کا بیان)

والدہ مرحومہ کی نیت سے ذبح کیا گیا جانور کس کی طرف سے ادا ہوا؟

سوال:- ایک شخص عبداللہ نے قربانی کا جانور، خریدنے سے قبل بھی اور خریدنے کے بعد بھی اپنی والدہ مرحومہ کی نیت سے خریدا، اور زبان سے بھی کہتا رہا کہ یہ والدہ مرحومہ کے لئے ہے، لیکن ذبح کے وقت اس نے ذبح کرنے والے کی نیت کو اپنی نیت کے لئے کافی سمجھا اور اس کو یہ زبانی نہ کہا کہ یہ والدہ مرحومہ کی طرف سے ہے، اس بناء پر اس ذبح کرنے والے نے ذبح کے بعد عبداللہ کی طرف سے یہ دُعا پڑھی کہ اے اللہ! یہ قربانی عبداللہ کی طرف سے قبول فرما! اس صورت میں یہ قربانی کس کی طرف سے ہوگی؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں قربانی عبداللہ کی طرف سے ہوگئی،[۱] اب اس کو اختیار ہے، اگر چاہے تو اس کا ثواب اپنی والدہ مرحومہ کے لئے بخش دے،[۲] اور میت کی طرف سے جو اس کی وصیت کے بغیر قربانی کی جائے، اس کا مطلب ایصالِ ثواب ہی ہوتا ہے، قربانی کرنے والا کوئی زندہ شخص ہی ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۲/۷/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۴۸/۱۸ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

(۱ و ۲) وفی الشامیة کتاب الأضحیة ج: ٦ ص: ٣٣٥ (طبع سعید) لو ضحی عن میت وارثه بأمره ألزمه بالتصدق بها وعدم الأکل منها، وإن تبرع بها عنه له الأکل لأنه یقع علی ملک الذابح والثواب للمیت، ولهذا لو کان علی الذابح واحدة سقطت عنه أضحیته کما فی الأجناس .قال الشرنبلالی :لکن فی سقوط الأضحیة عنه تأمل اهـ .أقول :صرح فی فتح القدیر فی الحج عن الغیر بلا أمر أنه یقع عن الفاعل فیسقط به الفرض عنه وللآخر الثواب

۱: بڑے جانور میں قربانی کے حصوں کی مختلف صورتیں اوران کا شرعی حکم

۲: چھ افراد کا اپنی واجب قربانی کے علاوہ ساتواں حصہ مشترک طور پر کسی کے ایصالِ ثواب کے لئے کرنے کا تفصیلی حکم اور مختلف فتاوی کا جائزہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں کہ علماء ہذاالزمان ومفتیانِ ہذاالفن رحمکم الله ذوالمنن، ان مسئلوں میں:

۱: کہ زیدوبکراور خالد تینوں نے مل کر قربانی دینے کیلئے ایک گائے خریدی، ان میں سے زید نے نصف قیمت ادا کی اور بکر وخالد دونوں نے نصف قیمت ادا کی اور گوشت کی تقسیم بھی نصف اور نصف النصف کر کے ہوئی، یعنی ادائے قیمت کے مطابق گوشت کی تقسیم ہوئی۔

۲: چھ اشخاص نے آپس میں مل کر قربانی دینے کے لئے ایک گائے خریدی، اس میں سے چار اشخاص نے ایک ایک حصہ کر کے چار حصے دئے اور دو شخص بقیہ تین حصے میں ڈیڑھ ڈیڑھ حصہ کر کے شریک ہوئے۔

۳: چھ شخص نے قربانی کی ایک گائے خریدی، ہر ایک نے ایک ایک حصہ دیا اور ایک حصہ کو وہی چھ شخص مل کر حضور ﷺ کے نام پر دیتے ہیں۔

مذکورہ مسائل میں ہمارے ملک میں بین العلماء اختلاف ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ قربانی صحیح نہیں ہوگی اور بعض کہتے ہیں کہ صحیح ہوگی اور صحت کے قائلین اپنے دعوی کا ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ ”اللؤلؤ والمرجان“ نامی رسالہ (جس کی تقریظ بنگلہ دیش کے چار بڑے مفتیوں نے کی ہے) کی یہ عبارت:

مسئلہ:

بیل، (ا) بھینس، اُونٹ میں سات شخص شریک ہونا جائز ہے اور بکری میں صرف ایک حصہ ہے، اس سے زائد شریک ہونا جائز نہیں اور ایک حصہ پورا رکھنے کے بعد اگر

کسر ہو تو کوئی خرابی نہیں، کیونکہ اس کسر کو کل کا تابع قرار دینا ممکن ہے، مثلاً ایک بیل میں دو تین، چار پانچ چھ شخص شریک ہونے سے جو کسر لازم آتا ہے، اس میں پورا ایک حصہ صحیح سالم رہتا ہے، زائد میں کسر ہے، لہٰذا یہ جائز ہوگا، اب ایک بیل یا اُونٹ میں مثلاً چھ آدمی چھ حصہ لیکر باقی ماندہ حصہ کو سب مل کر حضور ﷺ یا پیر کے لئے دینا چاہیں تو دے سکیں گے۔

حاشیة: (۱) فی البدائع : ولا شک فی جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترک اثنان أو ثلاثة أو أربعة أو خمسة أو ستة فی بدنة أو بقرة؛ لأنه لما جازالسبع فالزیادة أولی، وسواء اتفقت الأنصباء فی القدر أواختلفت؛ بأن یکون لأحدهم النصف وللآخر الثلث وللآخر السدس بعد أن لا ینقص عن السبع۔ (ج: ۵ ص: ۷۱)

وفی الهدایة: ولوکانت البدنة بین اثنین نصفین تجوز فی الأصح لأنه لما جاز ثلاثة الأسباع جاز نصف السبع تبعاً له۔ (ج: ۴ص: ۴۲۵)

اور امداد الفتاوی ج:۳ص:۵۳۳ کے اس سوال اور جواب سے اپنے دعوی کا ثبوت پیش کرتے ہیں:

س: متوفی کی طرف سے قربانی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آیا اپنی طرف سے ایک حصہ قربانی کر کے اس متوفی کو ثواب پہنچادے یا مثل دیگر شرکاءِ چندہ کے اس کا نام حصہ پر قرار دیکر قربانی کرلے۔ فقط۔

الجواب: دونوں طرح درست ہے۔

اور ناجائز کہنے والے حضرات، مولانا محمد شفیع مفتیٔ اعظم پاکستان کے اس قلمی فتوی سے استدلال پیش کرتے ہیں جس کو ہم استفتاء مع الجواب بطور استشہاد اس ایک ہی لفافہ میں استفتاء ہذا کے ساتھ ارسال کررہے ہیں۔

اب طلب امر یہ ہے کہ صحیح مسئلہ کو ہمارے سامنے پیش کریں، تاکہ ہم مطمئن ہوجائیں اور (اس کا نام حصہ پر قرار دیکر قربانی کرلیں) امداد الفتاوی کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے، کیا میت کو مالک بنادینا ہے؟ ورنہ اتنے آدمیوں کی طرف سے ایک حصہ قربانی کیسے صحیح ہوگا، اگر مالک بنانا مقصود ہوتو میت کیسے مالک ہوگا؟

بینوا بالدلائل النقلیة والعقلیة

المستفتی احقر شفیق اللہ ومحمد جعفر احمد غفر لهما الله

خادم جامعہ اسلامیہ ٹیکناف

چاٹگام بنگلہ دیش

مذکورہ مسئلہ سے متعلق مستفتی کی طرف سے مرسلہ

مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتوی

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع مبین کہ لوگ ایک سال کے لئے مزدور رکھتے ہیں، اس کی اجرت کے اندر ایک سال کا کھانا بھی داخل ہے، کیا اس مزدور کو اپنی قربانی کے گوشت سے کھانا کھلانا جائز ہوگا یا نہیں؟ یعنی اس کی اجرت میں جو کھانا دیا جاتا ہے، اس کھانا کو اپنی قربانی کے گوشت سے کھلا سکتے ہیں یا نہ؟

۲: دیگر یہ ہے کہ محلّہ میں بیس یا تیس گھر والوں پر ایک ایک سردار ہوتے ہیں جس کو ہمارے اصطلاح میں شماز کہتے ہیں، اب قربانی کرنے والے لوگ اپنی قربانی کے گوشت کو تین حصہ کرتے ہیں، ایک حصہ خود رکھتے ہیں اور دو حصہ ان شمازیوں کو دیتے ہیں اور اپنی قربانی کو چھیلنا اور کوٹنا وغیرہ یعنی قصائی کا کام شمازیوں سے لیتے ہیں اور اگر کوئی شخص کام کرنے کے لئے حاضر نہ ہوتو ان کو سردار صاحب بہت برا بھلا کہتے ہیں، کبھی کبھی ان کو گوشت کے حصہ سے محروم کیا جاتا ہے اور جو لوگ کام کرنے کے لئے حاضر ہوتے ہیں، وہ بھی محض گوشت کے خیال سے آتے ہیں، کیونکہ ان کو گوشت نہ ملے تو ہرگز کام کرنے کے لئے نہیں آئیں گے تو خلاصہ یہ ہے کہ شمازیوں سے قصائی کا کام لیکر ان کو

قربانی کے گوشت دینا جائز ہوگا یا نہ؟

۳: یہ ہے کہ چھ آدمی مل کر ایک بیل قربانی کے لئے خریدتے ہیں، اب چھ آدمی چھ حصہ کو ازطرف خود اور ساتواں حصہ کو چھ آدمی مل کر حضور علیہ ﷺ کے لئے قربانی دیتے ہیں، اب یہ ساتواں حصہ قربانی ہوگی یا نہ اور نہ ہونے کی صورت پر باقی چھ حصۂ قربانی میں فتور آئے گا یا نہ؟ بینوا توجروا عند اللہ الجلیل۔

جواب ا:- بہتر یہ ہے کہ قربانی کے ایام میں اس کے کھانے میں کچھ زیادتی کردی جائے تاکہ قربانی کا گوشت معاوضۂ ملازمت سے زائد ہوجائے۔

۲: ظاہر ہے کہ قربانی کا گوشت کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا حرام ہے اور جو کسی نے دیا ہے، اس کی قیمت لگا کر اس قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

۳: ساتویں حصہ میں کئی آدمیوں کی شرکت کی وجہ سے یہ قربانی ناجائز ہوگئی۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی
۲۱ رصفر ۱۳۷۸ھ

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

۱۔۲:- گائے، بھینس اور اونٹ کی قربانی میں تین صورتیں بن سکتی ہیں:

(الف) پہلی صورت یہ ہے کہ سات آدمی شریک ہو کر قربانی کریں اور ہر ایک کا حصہ برابر ہو۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ سات آدمی کے بجائے آٹھ آدمی شریک ہوں اور ہر ایک کا حصہ ساتواں حصہ سے کم ہو۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ سات آدمی کے بجائے چھ، پانچ، چار، تین یا دو آدمی شریک ہوں اور ہر شریک کا حصہ کم از کم ساتواں حصہ ہو اور زائد حصہ میں کسر ہو۔

تو ان تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت بالاتفاق جائز ہے اور دوسری صورت بالاتفاق

ناجائز ہے اور تیسری صورت میں اختلاف ہے، لیکن اصح اور مختار یہی ہے کہ اس طرح قربانی کرنا بھی درست ہے، اس لئے کہ اگرچہ مستقل طور پر کسر کی قربانی درست نہیں ہے، لیکن جب اس کسر کو اضحیہ کے کسی ایک مکمل حصہ کے تابع قرار دیا جائے تو اس وقت اس کسر کی قربانی بھی درست ہو جائے گی اور وہ مکمل حصہ اور یہ کسر مل کر ایک شخص کی طرف سے قربانی ہوگی۔

جس کی مثال یوں لیجئے کہ کسی نے بکری کی قربانی دی اور بکری کے پیٹ سے زندہ جنین نکلا تو اس وقت شرعی حکم کے لحاظ سے اس پر واجب ہے کہ اس جنین کو بھی اس بکری کے تابع کر کے ذبح کر دے، حالانکہ مستقلاً اگر اس قسم کے جنین کی قربانی دی جاتی تو یہ جائز نہ ہوتی، لیکن اب جب اس جنین کو بکری کے تابع کر کے ذبح کیا جا رہا ہے تو یہ بھی قربت میں شامل ہو جائے گا۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ سوال میں بیان کی ہوئی پہلی دونوں صورتوں میں کسر کے باوجود بھی قربانی صحیح ہو جائے گی اور جن علماء نے اس کے صحیح ہونے پر ”بدائع الصنائع“ کی عبارت سے استدلال کیا ہے، وہ صحیح ہے۔

والدليل على ما قلت في الهداية: ولو كانت البدنة بين اثنين نصفين تجوز في الأصح، لأنه لما جاز ثلاثة الأسباع جاز نصف السبع تبعا.....قال الإمام اللكنوی رحمه الله نقلاً عن الكفاية تحت قوله ”في الأصح“ هذا احتراز عن قول المشايخ فإنهم قالوا: لا يجزيهما لأن لكل واحد منهما ثلاثة أسباع و نصف سبع، ونصف السبع لا يجوز في الأضحية، فإذا لم يجز البعض لم يجز الباقي، وقال بعضهم: يجوز وبه أخذ الفقيه أبو الليث رحمه الله والصدر الشهيد رحمه الله لأنه لما جاز ثلاثة الأسباع جاز نصف السبع تبعاً، ووجه ذلك أن نصف السبع و إن لم يكن أضحية فهي قربة تبعاً للأضحية كما إذا ضحى شاة فخرج من بطنها جنين حيي فإنه يجب عليه أن يضحيه و إن لم يجز

تضحیته ابتداءً۔ (الهدایة ۴/۴۴۵)[1]

ومثله فی العنایة (۸/ ۱۷)[2]

وفی الهندیة: ولو کانت البدنة أوالبقرة بین اثنین فضحیا بها اختلف المشایخ فیه، والمختار أنه یجوز، ونصف السبع تبع فلا یصیر لحما قال الصدر الشهید -رحمه الله تعالیٰ :-وهذا اختیار الإمام الوالد وهو اختیار الفقیه أبی اللیث -رحمه الله تعالیٰ -کذا فی الخلاصة. وإن دفع أحدهم ثلاثة دنانیر ونصفا، والآخر دینارین ونصفا، والآخر دینارا جازت عنهم؛ لأن أقل النصیب هو السبع، وکذلک لو اشترک خمسة ودفع أحدهم دینارین والثانی دینارین ونصفا والثالث ثلاثة دنانیر والرابع کذلک والخامس ثلاثة دنانیر ونصفا جازت عنهم؛ لأن أقل النصیب هو السبع، کذا فی محیط السرخسی. (۵/۳۰۵)[3]

ومثله فی البدائع (۵/ ۱۷)[4]

(۱) هدایة مع الحاشیة کتاب الأضحیة ج: ۴ ص: ۴۴۵ (طبع مکتبة رحمانیه)

(۲) عنایة علی الهدایة کتاب الأضحیة ج: ۴ ص: ۴۴۳ (طبع رحمانیه)

(۳) کتاب الأضحیة الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا (طبع مکتبة رشیدیه کوئٹه)

(۴) کتاب التضحیة (طبع سعید) وفی طبع دار الکتب العلمیة بیروت ج: ۱۱ ص: ۲۰۲

وفی البحر الرائق کتاب الأضحیة: الأضحیة من الإبل والبقر والغنم، ولو کانت البقرة أو البدنة بین اثنین فضحیا بها اختلف المشایخ قال بعضهم: یجوز و به أخذ الفقیه أبو اللیث والصدر الشهید۔ الخ

وفی تبیین الحقائق (من تجب علیه الأضحیة) ولوکانت البدنة بین اثنین نصفان یجوز فی الأصح لأن نصف السبع یکون تبعاً لثلاثة الأسباع الخ.

وکذافی مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر کتاب الأضحیة ج: ۴ ص: ۱۶۸ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

وفی المحیط البرهانی الفصل الثامن فیما یتعلق بالشرکة الخ ج: ۵ ص: ۶۷۷ (طبع دار إحیاء التراث)

وإن کانت بقرة أو بدنة بین اثنین فضحیا بها اختلف المشایخ فیه، قال بعضم :لا یجزئهما؛ لأن لکل واحد منهما ثلاثة أسباع، ونصف سبع لا یجوز فی الأضحیة، فإذا لم یجز البعض لم یجز الثانی، وقال بعضهم :یجوز، وبه أخذ الفقیه أبو اللیث، والصدر الشهید برهان الأئمة رحمهم الله، وهکذا ذکر محمد الجومسی فی مسائله.

۳: چھ آدمی مشترک طور پر گائے خریدیں اور ہر ایک شخص نے ایک ایک حصہ مکمل طور پر رکھا اور باقی ایک حصہ میں وہی چھ آدمی مل کر اپنے بجائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا چاہیں تو اس صورت کے بارے میں کوئی صریح جزئیہ تو کتبِ فقہ میں تلاش کے باوجود نہیں مل سکا، البتہ قواعد کا مقتضاء یہ ہے کہ ان کی اصل قربانی درست ہوجائے گی، لیکن ایک حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنے کی جو نیت ہے وہ درست نہیں ہوگی، یعنی ہر ایک کی طرف سے الخ

اس کی دلیل یہ ہے کہ اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ جو شخص کسی جانور میں ایک حصہ اپنی واجب قربانی کے طور پر کررہا ہو، وہ اسی جانور میں دوسرا حصہ نفلی قربانی یا کسی اور جہت کے لئے لے سکتا ہے یا نہیں؟

بعض حضرات مثلاً حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی رائے یہ ہے[1] کہ وہ دوسرا حصہ کسی اور جہت کے لئے نہیں لے سکتا، اور اگر وہ ایسی نیت کرے گا تو اس کی نیت کالعدم ہوگی اور دونوں حصوں سے واجب ہی ادا ہوگا، مثلاً کوئی شخص ایک پوری گائے کی قربانی کرے اور اس میں ایک حصہ اپنی واجب قربانی کا رکھے اور باقی چھ حصے مختلف لوگوں کے ایصالِ ثواب کے لئے رکھے تو اس قول کے مطابق باقی چھ حصوں میں ایصالِ ثواب کی نیت معتبر نہ ہوگی، بلکہ پوری گائے سے واجب قربانی ہی ادا ہوگی۔

لیکن دوسرے علماء کا کہنا ہے کہ واجب قربانی کے ساتھ ایک شخص ایک ہی جانور میں متعدد حصے متعدد جہات کے لئے رکھ سکتا ہے، ان دونوں اقوال کے مطابق صورتِ مسئولہ میں واجب قربانی ادا ہوگی، اور ایک حصہ میں ایصالِ ثواب کی نیت معتبر نہ ہوگی۔

پہلے قول کے مطابق تو ظاہر ہے کہ جب ایک شخص ایک جانور میں متعدد جہات کی نیت نہیں کرسکتا تو صورتِ مسئولہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنے کی جو نیت کی گئی وہ معتبر نہ ہوئی اور پورے جانور سے واجب قربانی ہی ادا ہوئی۔

البتہ دوسرے قول پر اشکال ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص ایک ہی جانور میں متعدد جہات

---

(۱) احسن الفتاوی کتاب الأضحیۃ والعقیقۃ ج: ۷ ص: ۵۴۴ تا ص: ۵۵۰ (طبع سعید)

کے لئے حصہ لے سکتا ہے تو صورتِ مسئولہ میں چھٹے حصے کے اندر تمام افراد کی نیت معتبر قرار پائی اور چونکہ ایک حصہ میں چھ افراد شریک ہوئے جو خلافِ مشروع ہے، لہٰذا یہ چھٹا حصہ لحم بن گیا اور جب ایک حصہ لحم بن گیا تو کسی بھی حصہ کی قربانی درست نہ ہوئی۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کے مطابق بھی مذکورہ چھ افراد کی اصل واجب قربانی ادا ہو جائیگی، اس کی دلیل دو مقدمہ پر موقوف ہے:

ا: پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی قربانی کسی دوسرے شخص کی طرف سے اس کے امر کے بغیر کرتا ہے تو درحقیقت وہ قربانی ذبح کرنے والے کی طرف سے ہوتی ہے، البتہ اس کا ثواب اس شخص کو پہونچتا ہے جس کی طرف سے قربانی کرنے کی اس نے نیت کی۔

قال العلامة الشامیؒ تحت قول الدر المختار "وعن میت" أی لو ضحی عن میت وارثه بأمره ألزمه بالتصدق بها وعدم الأكل منها، و إن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت۔ (رد المحتار ۲۱۳/۵)[۱]

(۱) الدر المختار مع ردّ المحتار كتاب الأضحية ج: ٦ ص: ۳۳۵ (طبع سعيد)
وفى العرف الشذى للكشميریؒ ج:۳ ص: ۱۹۱ قال ابن وهبان فى منظومته:
وعن ميت بالأمر الزم تصدقاً
و إلا فكل منها و هذا المحرر۔
وفى التيسير بشرح الجامع الصغير للمناویؒ ج:۱ ص: ۲۲۴ (طبع مكتبة الشافعى رياض) (حرف الهمزة) (إذا ضحى أحدكم فليأكل) ندبا مؤكدا (من أضحيته) ومن كبدها أولى قال تعالى فكلوا منها وأطعموا البائس الفقير لكن إن ضحى عن غيره بإذنه كميت أو صبى ليس له ولا لغيره من الأغنياء الأكل الخ
وفى الفيض القدير للمناویؒ ج: ۱ ص: ۳۹۲ (طبع المكتبة التجارية الكبرىٰ مصر) ويستحب إذا أكل وأهدى وتصدق أن لا يزيد على كله على الثلث ولا تنقص صدقته عنه هذا كله فى التطوع أما الأضحية الواجبة بنحو نذر أو بقوله جعلتها أضحية فيحرم أكله منها ولو ضحى عن غيره بإذنه كميت أوصى فليس له ولا لغيره من الأغنياء الأكل۔
وفى ردّ المحتار ج: ٦ ص: ۳۲٦ (طبع سعيد) (فرع) من ضحى عن الميت يصنع كما يصنع فى أضحية نفسه من التصدق والأكل والأجر للميت والملك للذابح .قال الصدر: والمختار أنه إن بأمر الميت لا يأكل منها وإلا يأكل بزازية۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

۲: دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جانور میں ساتویں حصے کی کوئی کسر (مثلاً نصف السبع یا ثلث السبع یا سدس السبع) تنہا لے تو وہ شرعاً قربانی نہیں ہوتی بلکہ لحم بن جاتی ہے، البتہ جس شخص نے کسی جانور میں کوئی سبع کامل لیا ہو تو اس کے ساتھ اگر وہ سبع کی کسر بھی لے لے تو وہ کسر بھی اصل کے تابع بن کر قربانی شمار ہوتی ہے، اس کی وجہ سے جانور لحم نہیں بنتا، یہ بات سوال ۲ کے جواب میں مفصل گزر چکی ہے۔ تاہم اطمینان کے لئے مندرجہ ذیل عبارتیں دوبارہ ملاحظہ ہوں:

(۱) ولا شک فی جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترک اثنان أو ثلاثة أو أربعة أو خمسة أو ستة فی بدنة أو بقرة؛ لأنه لما جاز السبع فالزيادة أولى، وسواء اتفقت الأنصباء فی القدر أو اختلفت؛ بأن يكون لأحدهم النصف وللآخر الثلث ولآخر السدس بعد أن لا ينقص عن السبع. (بدائع الصنائع للكاسانیؒ ۵/ ۷۱)[۱]

(۲) ولو كانت البدنة بين اثنين نصفين تجوز فی الأصح، لأنه لما جاز ثلاثة الأسباع جاز نصف السبع تبعا له كذا فی الهداية ، وقال فی الكفاية تحت قوله "فی الأصح" هذا احتراز عن قول بعض المشايخ فإنهم قالوا: لا يجوز لأن لكل واحد منهما ثلاثة أسباع و نصف سبع ، ونصف السبع لا يجوز فی الأضحية ، فإذا لم يجز

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الفتاوی الکبریٰ الفقهية على مذهب الإمام الشافعیؒ ج: ۹ ص: ۴۸۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) فلو ضحّى عن غيره بإذنه كميت أوصٰى بذلک ليس له ولا لغيره من الأغنياء الأكل منه و به صرّح القفال فی الميت و علّله بأن الأضحية وقعت عنه أی الميت فلا يحلّ له أن المضحّی الأكل منها إلا بإذنه أی الميت وقد تعذّر فيجب التصدق عنه بجميعها.

(۱) كتاب التضحية فصل أما محل إقامة الوجوب (طبع سعيد) وفی طبع دار الكتب العلمية بيروت ج: ۱۱ ص: ۲۰۲

البعض لم يجز الباقى، وقال بعضهم: يجوز وبه أخذ الفقيه أبو الليث ؒ والصدر الشهيد ؒ لأنه لما جاز ثلاثة الأسباع جاز نصف السبع تبعاً، ووجه ذلك أن نصف السبع و إن لم يكن أضحية فهى قربة تبعاً للأضحية كما إذا ضحى شاة فخرج من بطنها جنين حيى فإنه يجب عليه أن يضحيه و إلّا لم يجز تضحيته ابتداءً. (حاشية الهداية للإمام اللكنوى ؒ (۴۴۵/۴)[1]

(۳) ومثله فى العناية (۷۱/۸)[2] و الهندية (۷۱/۸)[3]

ان دومقدمات کی روشنی میں جب زیرِ بحث صورت کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ مذکورہ چھ آدمیوں نے ایک حصہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنے کی جونیت کی ہے بحکمِ مقدمہ اُولیٰ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ قربانی انہیں کی طرف سے ہوگی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایصالِ ثواب ہوگا اور جب قربانی انہیں کی طرف سے ہوئی تو اگر ان کا کوئی کامل حصہ اس جانور میں نہ ہوتا تو یہ حصہ لحم بن جاتا، کیونکہ کسر کی قربانی مستقلاً مشروع نہیں، لیکن چونکہ انہیں چھ آدمیوں کے اسی جانور میں کامل حصے موجود ہیں، اس لئے چھٹے حصے کی کسر دوسرے مقدمے کے مطابق کامل حصے کے تابع ہوکر درست ہوجائے گی، اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے یہ چھ آدمی جانور میں ایک ایک کامل حصہ لینے کے بعد ساتویں حصہ کے بارے میں یہ طے کرتے کہ یہ ہم سب کی طرف سے مشترک ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس ساتویں حصہ کا ایک ایک سدس ہر شخص کا ہوگا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ساتویں حصہ کی کسر کی وجہ سے بحکمِ مقدمہ ثانیہ ان کی قربانی باطل نہ ہوئی، بلکہ یہ کسر بھی اصل کے تابع ہوکر درست ہوجاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح صورتِ مسئولہ میں بھی یہ اصل قربانی درست ہوجائے گی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنے کا مطلب بحکم

(۱) كتاب الأضحية ج: ۴ ص: ۴۴۳ (طبع مكتبة رحمانيه)

(۲) كتاب الأضحية ج: ۸ ص: ۴۳۰ (طبع رشيديه)

(۳) كتاب الأضحية الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا (طبع رشيديه كوئٹه)

مقدمہ اُولیٰ اپنی طرف سے قربانی کرنا ہے، وقد مر جوازہ۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو ایصالِ ثواب کیا ہے، آیا یہ ایصالِ ثواب درست ہوگا یا نہیں؟

اوّل تو اس مسئلے کا تعلق آخرت کے ثواب سے ہے، جس کے بارے میں نص کی غیر موجودگی میں کوئی یقینی حکم لگانا مشکل ہے، لیکن قواعد سے یہ ایصالِ ثواب درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ ساتویں حصہ میں جو کسر واقع ہوئی وہ قربت تو ہے لیکن قربتِ مستقلہ نہیں، بلکہ واجب قربانی کے تابع ہے، لہٰذا صرف اس قربتِ تابعہ کا ایصالِ ثواب ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے اپنی فرض نماز میں جو مستحبات انجام دئے ہیں صرف ان مستحبات کا ثواب فلاں کو پہونچاتا ہوں، اور ایسے ایصالِ ثواب کی کوئی نظیر شریعت میں نظر سے نہیں گزری۔

بالخصوص یہاں قربتِ تابعہ بھی ایسی ہے کہ اگر مہدی لہ خود اس کو انجام دیتا تو کسی کی بھی قربانی درست نہ ہوتی، اس لئے اس کا ایصالِ ثواب اور زیادہ مخدوش ہے، اس کے علاوہ صرف ایک قربتِ ضمنیہ کا ثواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کرنا، جبکہ قربتِ اصلیہ اپنی طرف سے ہو ذوقاً موہمِ سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو مکمل حصہ کی قربانی کرنی چاہئے۔

مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کا جو فتوی سوال کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے وہ بظاہر نظر مذکورہ بالا تحریر کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن اس فتوی میں کافی اجمال ہے اور اس میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

''ساتویں حصہ میں کئی آدمیوں کی شرکت کی وجہ سے یہ قربانی ناجائز ہوگی۔''

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف ساتواں حصہ میں ایصالِ ثواب کی نیت سے قربانی باطل ہوگی، نہ کہ اصلِ قربانی، اس صورت میں اس فتوی کا حاصل بھی وہی ہوگا جو اُوپر ذکر کیا گیا۔

دوسرے اگراس فتوی کی مرادیہی ہوکہ پوری قربانی باطل ہوگی، تو یہ احتمال بھی ہے کہ حضرتؒ کے پیشِ نظر وہ صورت ہوجبکہ ساتویں حصہ میں دوسرے کئی آدمیوں کی شرکت ہوگئی ہو، نہ کہ ان آدمیوں کی جن کے کامل حصے اس جانور میں موجود ہیں۔ اور پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس صورت میں پوری قربانی باطل ہوجاتی ہے۔ اوراگر بالفرض فتوی کی مرادصورتِ مسئولہ میں پوری قربانی کا باطل ہوجانا ہے تو حضرتؒ نے اس مسئلے کے دلائل سے تعرض نہیں فرمایا، اوراگرحضرت قدس سرہ کی خدمت میں وہ اُمور پیش کئے جاتے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا تو شاید ان کی رائے بھی قربانی کے جواز کی ہوتی۔ ان احتمالات کی موجودگی میں یہ محتمل فتوی مذکورہ بالا دلائل کو یکسر نظرانداز کرنے کے لئے کافی معلوم نہیں ہوتا۔

اسی فتوی کے مختلف پہلوؤں پرغور کرنے کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، کیونکہ حضرت قدس سرہ کا محتمل فتوی بھی ہم جیسوں کی مفصل تحقیق پرفوقیت رکھتا ہے۔

لیکن بار بار اصول وقواعد پرنظر کرنے اور کتبِ فقہ کی مراجعت کے بعد جورائے فیما بیننا وبین اللہ قائم ہوئی، اہلِ علم کے سامنے اس کا اظہار بھی ضروری ہوا، اس بناء پر یہ تحریر لکھی گئی، تاہم چونکہ یہ تحریر قواعد کی بنیاد پر لکھی گئی ہے اور حضرتؒ کے فتوی کا ظاہر اس کے خلاف ہے، اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ یہ ناچیز کے سوءِ فہم پر مبنی ہو، اس لئے اس بارے میں دوسرے علماء اہلِ فتوی سے بھی مراجعت کرلی جائے۔ ھذا ما منح لی فی ھذا الباب۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

(فتوی نمبر ۳۵/۲۰۰۷ ھ)

غیر کی طرف سے قربانی میں تعدد کی تحقیق

(اہم وضاحت از مرتب)

ادارہ غفران راولپنڈی کے مفتی محمد رضوان صاحب مدظلہم نے "تضحیۃ عن الغیر" یعنی غیر کی طرف سے قربانی سے متعلق اپنی ایک مفصل تحقیق حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لئے بھیجی، جس میں غیر کی طرف سے قربانی سے متعلق کئی اُمور کی

تحقیق کی گئی تھی، حضرت والا دامت برکاتہم نے اس کا مطالعہ فرمانے کے بعد اس پر اپنی رائے تحریر فرمائی، نیز ان کی اس تحقیق میں اس قابلِ اصلاح امر کی بھی نشاندہی فرمائی کہ سات سے کم افراد اپنی واجب قربانی کے ساتھ ساتویں حصہ میں مشترکہ طور پر کسی کے ایصالِ ثواب کی نیت کریں تو مفتی محمد رضوان صاحب کی تحریر سے اس کا جواز معلوم ہورہا تھا جبکہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی تحقیق وہ ہے جو حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے سابقہ فتوی میں مفصل تحریر فرمائی ہے، لہٰذا حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس معاملہ کی نشاندہی فرمائی۔ جس کے بعد مفتی رضوان صاحب نے اس مسئلہ کی وضاحت کر کے تحقیق دوبارہ حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال فرمائی، جس کی حضرت والا دامت برکاتہم نے تائید وتصویب فرمائی۔

یہ تحریرات چونکہ کافی طویل ہیں اور سائل کی طرف سے الگ رسالوں کی شکل میں شایع بھی ہوچکی ہیں اسلئے یہاں طوالت اور تکرار سے بچنے کیلئے ان تحریرات کا صرف وہ حصہ شائع کیا جارہا ہے جنکی اصلاح کی طرف حضرت والا دامت برکاتہم نے نشاندہی فرمائی۔ اور پھر جسکی اصلاح کی گئی۔ (محمد زبیر)

خط بنام حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مکرمی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ ''التبلیغ''، کا علمی وتحقیقی سلسلہ نمبر (۱۷) ارسالِ خدمت ہے، جس میں ''غیر کی طرف سے قربانی کی تحقیق''، پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس مضمون سے متعلق آنجناب کی تنقیح وتحقیق اور تصدیق درکار ہے۔

اُمید ہے کہ اپنی رائے عالی سے ترجیحی بنیادوں پر آگاہ فرمائیں گے۔ جوابی لفافہ ساتھ منسلک ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

والسلام

محمد رضوان

۳۰/شوال/۱۴۳۰ھ

20/اکتوبر/2009

(تحریر کا متعلقہ حصہ)

............شاۃِ واحدہ (یا سبع بقرہ) کی ملکیت میں اس طرح کا اشتراک کہ جس میں قربانی ایک سے زیادہ کی طرف سے واقع ہو، ناجائز ہونا قرار دیا گیا ہے اوراس کی وجہ حنفیہ کے نزدیک مشہور ہے کہ شاۃِ واحدہ (یا سبع بقرۃ) میں تعدد جائز نہیں۔

پس قواعد کی رُو سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے (زندہ ومردہ) کو ایصالِ ثواب کئے جانے والی قربانی میں بھی اشتراک جائز نہ ہو، اور احتیاط بھی اسی میں ہے، بالخصوص جبکہ ایصالِ ثواب کوئی فرض وواجب عمل بھی نہیں، لہٰذا اگر کسی کو کامل قربانی کی استطاعت نہ ہو تو وہ اس رقم سے صدقہ وخیرات وغیرہ کر کے بھی ایصالِ ثواب کی سعادت حاصل کرسکتا ہے۔

جہاں اُس جزئیہ کا تعلق ہے، جس میں سات افراد سے کم ہونے کی صورت میں سبعِ بقرۃ میں اشتراک کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس کے جواز کی توجیہ میں فقہاء نے تابع ہونے کی تصریح فرمائی ہے اور جب سبع بقرۃ میں ایصالِ ثواب کی نیت ہوگی تو یہ ایک مستقل جداگانہ نیت سمجھی جائے گی اور وہ تابع ہونے والی توجیہ پوری طرح متحقق نہ ہوگی، اس لئے اس صورت میں سبع بقرۃ میں تعدد جائز نہ ہونا چاہئے۔

البتہ اگر متعدد افراد ایصالِ ثواب ہی کی نیت سے بقرہ کی قربانی کریں تو پھر سبعِ بقرۃ میں اشتراک مضر نہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہاں تابع ہونے کی توجیہ پوری طرح متحقق ہوگی۔

اور اس صورت میں ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سبعِ بقرۃ میں اراقۃِ دم سے ایصالِ ثواب کی نیت نہ کرے اور جب قربانی ہوجائے تو اس کے بعد اس گوشت کو ایصالِ ثواب کی غرض سے صدقہ کردے، جیسا کہ مندرجہ ذیل جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے:

فی فتاوی أبی اللیث: وسئل أبو نصر عمن ضحی وتصدق بلحمه عن أبویه قال یجوز لأنّ اللحم ملکه فقط تصدّق بملکهٖ عنأبویه فیجوز. (المحیط البرهانی ج:۸ ص: ۴۷۴)(۱)

واللہ تعالیٰ اعلم

۲۹ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ، 25 مئی 2009ء بروز پیر

ادارہ غفران، راولپنڈی

---

(۱) کتاب الأضحیة الفصل السابع فی التضحیة عن الغیر، وفی التضحیة بشاة الغیر عن نفسه)

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مکرم بندہ زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کے کئی مقالے میرے پاس جمع ہوگئے ہیں، علالت اور اسفار واشغال نے مہلت نہ دی، اب تضحیۃ عن الغیر کا مقالہ دیکھنے کی نوبت آئی، الحمدللہ! کافی وافی پایا، تقبل اللّٰہ تعالیٰ منکم وجزاکم خیرا، البتہ یہ عبارت صفحہ ۱۰ پر مبہم سی ہے کہ:

''اگر متعدد افراد ایصالِ ثواب ہی کی نیت سے ..... مضر نہ ہونا چاہئے۔

اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ چھ افراد مثلاً واجب قربانی کررہے ہیں تو ساتویں حصے کو مشترک طور پر کسی کے ایصالِ ثواب کی غرض سے قربانی کی نیت کرسکتے ہیں تو یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔

اور اگر مقصد کچھ اور ہے تو اسے واضح کرنا چاہئے، البتہ گوشت صدقہ کرنے میں ایصالِ ثواب کی نیت جو آگے لکھی ہے، بے غبار ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
بندہ محمد تقی عثمانی
۲۶/۳/۱۴۳۲ھ
(فتوی نمبر ۱۲/۱۳۳۹)

وضاحت:۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے مذکورہ جواب کے بعد سائل موصوف نے دوبارہ تحقیق کے بعد مذکورہ حصہ کی اصلاح کرکے جو تحریر بھیجی اسکا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

نئی تحقیق کے بعد طبع کئے گئے رسالہ کا آخری حصہ

......اس تفصیل کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے رسالہ ''ذوالحجہ وقربانی کے فضائل واحکام'' (طباعتِ چہارم: ذوالقعدہ ۱۴۲۸ھ نومبر 2007ء) کے صفحہ ۱۲۹ پر مسئلہ نمبر ۹ کو آئندہ اصلاح کرکے مندرجہ ذیل طریقہ پر شائع کیا جائے:

ایصالِ ثواب کے لئے نفلی قربانی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی استاذ یا والدین یا کسی بھی فوت شدہ یا زندہ رشتہ دار وا جنبی مسلمان کی طرف سے ان کو ثواب پہنچانے کے لئے

کرنا درست ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ ایک شخص پورے ایک چھوٹے جانور کا ثواب ایک یا کئی لوگوں کو پہنچائے، اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک بڑے جانور کے ساتویں حصے کی قربانی کا ثواب ایک یا کئی لوگوں کو پہنچائے۔

البتہ ایک چھوٹے جانور یا ایک بڑے جانور کے ساتویں حصہ میں ایک سے زیادہ افراد شریک ہوکر ایصالِ ثواب کریں تو یہ جائز نہیں، اور اگر بڑے جانور میں سات سے کم افراد شریک ہوں، اور کسی شریک کا بھی حصہ ساتویں حصہ سے کم نہ ہو تو باقی ماندہ ساتویں حصہ میں سب یا بعض شرکاء کا ایصالِ ثواب کی نیت کرنا خلافِ احتیاط ہے، جس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا جواب

اس تصحیح کے بعد حضرت والا نے ذیل کا جواب تحریر فرمایا۔ (مرتب)

مکرم بندہ زید مجدکم

آج ''تضحیہ عن الغیر'' کے بارے میں ترمیم شدہ عبارت دیکھنے کا موقع ملا۔ الحمدللہ! وہ اجمال دور ہوگیا۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء و وفقکم لأمثال أمثالہ

والسلام

بندہ محمد تقی

۳۲/۶/۱ھ

فصل فی نذر الأضحیۃ

(قربانی کی نذر ماننے کا بیان)

”بکری کا ایک بچہ آئندہ عیدالاضحیٰ میں قربانی دُوں گا“ الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- زید کے پاس ایک بکری ہے، جس نے پچھلے سال عید کے دن دو نر بچے دیئے، زید نے اپنے والد صاحب خالد سے کہا کہ ”ایک بچہ آئندہ عیدالاضحیٰ میں قربان کروں گا“ دوسرا آپ کے لئے ہے، اتفاق سے چند دن بعد زید کا لڑکا پیدا ہوا، اب باپ بیٹے دونوں اس پر متفق ہیں کہ ان دونوں کو عقیقے میں ذبح کردیں، قربانی کے لئے اور جانور خرید لیں گے، چونکہ عقیقے کا دن ۱۱/۷/ ۱۹۷۶ء مقرر ہو چکا ہے، فوراً جواب تحریر فرمائیں۔

جواب:- زید نے الفاظ کہے کہ ”ایک بچہ آئندہ عیدالاضحیٰ میں قربانی دوں گا“ یہ الفاظ نذر کے نہیں ہیں، بلکہ اظہارِ نیت کے ہیں، لہٰذا ان الفاظ سے وہ جانور قربانی کے لئے متعین نہیں ہوا، اور زید کے لئے اس جانور کو عقیقے میں استعمال کرکے قربانی کے لئے کسی دوسرے جانور کو خرید لینا درست ہے۔

لما فی العالمگیریة : ولو ملک إنسان شاة فنوی أن یضحی بها أو اشتری شاة ولم ینو الأضحیة وقت الشراء ثم نوی بعد ذٰلک أن یضحی بها لا تجب علیه سواء کان غنیاً أو فقیرا۔ (عالمگیریة ج: ۵ ص: ۲۹۱، کتاب الأضحیة، باب: ۱)[۱]

اورجو بچہ والدصاحب کودے دیا تھا،اس کے بارے میں والدصاحب اگر واپس زید کو ہبہ کریں تو اس کو بھی عقیقے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۵۳۷/۲۷ و)

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ

وفی بدائع الصنائع ج: ۱۱ ص: ۱۷۸ (طبع مکتبہ رشیدیہ) ولو کان فی ملک إنسان شاة فنوی أن یضحی بها أو اشتری شاة ولم ینو الأضحیة وقت الشراء ثم نوی بعد ذلک أن یضحی بها لا یجب علیه سواء کان غنیا أو فقیرا۔

وفی رد المحتار کتاب الأضحیة ج: ۶ ص: ۳۲۱(طبع سعید) فلو کانت فی ملکه فنوی أن یضحی بها أو اشتراها ولم ینو الأضحیة وقت الشراء ثم نوی بعد ذلک لا یجب۔ الخ

وکذا فی المحیط البرهانی الفصل الثانی فی وجوب الأضحیة بالنذر ج: ۵ ص: ۲۵۹ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت)

نیز ''اس بکری کو ایامِ نحر میں ذبح کروں گا'' کے قول سے نذر نہ ہونے سے متعلق مزید دیکھئے ''کفایة المفتی'' ج:۸ص:۲۰۰۔

فصل فی جلود الأضحیۃ

(قربانی کی کھالوں کا بیان)

سوال:- قربانی کی کھال اگر مدرسے کے ارکان میں سے ایک رکن کے ہاتھ پر فروخت کردی جائے مناسب قیمت پر، اور وہ رکن ان چمڑوں کو فروخت کرے منافع کے ساتھ تو وہ منافع مدرسے کی تعمیر وترقی یا مدرّسین کی تنخواہوں میں دینا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ مدرسہ ہٰذا نہایت افلاس کے دور سے دوچار ہوا ہے۔

جواب:- اگر قربانی کی کھال مدرسے میں دی گئی ہے تو اس کی رقم کو مستحقینِ زکوٰۃ پر ہی صرف کرنا ضروری ہوگا،[۱] البتہ جس رکن کو اس کی شخصی حیثیت میں بیچی گئی ہے، وہ اگر برضا ورغبت کھال کو آگے بیچ کر اس کا نفع مدرسے کو عمومی چندے کے طور پر دیدے تو اس چندے کو مہتمم مدرسے کے جس کام میں چاہے، خرچ کرسکتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲۷/۱۹ الف)

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفی الهداية ج: ۵ ص: ۴۴۹ (طبع رحمانية) ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله.

وفی حاشيته: انتقلت القربة إلى بدله فوجب التصدق.

وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۲۸ (طبع سعيد) فإن بيع اللحم أو الجلد به أی بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه.

وفی البدائع: من باع جلد أضحية فلا أضحية له ...... فإن باع شيئا من ذلک نفذ بيعه عند أبی حنيفةؒ و محمدؒ و عند أبی يوسفؒ لا ينفذ لما ذكرنا فيما قبل الذبح و يتصدق بثمنه لأن القربة ذهبت عنه فيتصدق به.

وفی الخلاصة: ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدقها و ليس له أن يبيعه بالدراهم لينفقها على نفسه ولو فعل ذلک يتصدق بثمنه.

وفی البحر ج: ۸ ص: ۱۷۸ (طبع سعيد) ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز لأنه قربة كالتصدق بالجلد واللحم .... الخ

تفصیل کے لئے دیکھئے: جواہر الفقہ ج:۱ص: ۴۵۳ تا ۴۵۷ (محمد زبیر)

صاحبِ نصاب امام کو قربانی کی کھال دینے کا حکم

(فتاوی عثمانی کے ایک مسئلہ کی وضاحت)

عالی قدر وسامی منزلت، شیخ الاسلام حضرت العلام، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، أدام اللہ فیوضکم وبرکاتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اس وقت آنجناب سے شرفِ مکاتبت اس سلسلہ میں حاصل ہورہا ہے کہ اس ہیچمدان طالب علم کو "فتاوی عثمانی" سے استفادہ کے دوران بعض مقامات سمجھنے میں خلجان پیدا ہوا، باوجود غور وفکر خود اُس کو حل نہ کرسکا، اس لئے آنجناب کی خدمت اقدس میں عریضہ ارسال کرنے کی جرأت کی کہ اگر یہ خلجان مبنی بر جہل ہے تو إنما شفاء العی السوال پر عمل ہو۔ اور اگر اس میں کچھ واقعیت ہے تو الدین النصیحۃ پر عمل کا ثواب ملے۔

(۱)....فتاوی عثمانی جلد سوم صفحہ ۳۸۹، ۳۹۰ پر صاحبِ نصاب امام کو قربانی کی کھال لینا ناجائز لکھا ہے، حالانکہ عباراتِ فقہاء سے معلوم ہوتا ہے کہ چرمِ قربانی گوشت کے حکم میں صدقاتِ نافلہ میں سے ہے، اس لئے جس طرح گوشت کسی بھی غنی وفقیر، سید وغیر سید، مسلمان وکافر، رشتہ دار وغیر رشتہ دار کو کھلائی جاسکتی ہے، اسی طرح چرمِ قربانی بھی غنی وفقیر ہر دو کو دی جاسکتی ہے اور وہ اُسے وصول کرسکتے ہیں۔ ہاں! قربانی کی کھال کی قیمت چونکہ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے، اس لئے صرف اُس شخص کو دی جاسکتی ہے جو مصرفِ زکوۃ ہو۔

فی الهندية: ويطعم الغني والفقير جميعا كذا في البدائع. ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي كذا في الغياثية.

(الفتاوى الهندية: كتاب الأضحية، الباب الخامس)

واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح (الهندية، الباب السادس).

جواب: گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا جس میں ''فتاوی عثمانی'' کے چند مقامات کے بارے میں کچھ استفسارات تھے، ان کے بارے میں اپنی معروضات ذیل میں درج کرتا ہوں:

(۱) فتاوی عثمانی ج:۳ ص: ۳۸۹ و ۳۹۰ پر صاحبِ نصاب امام کو قربانی کی کھال لینا ناجائز لکھا ہے۔ اس جواب میں واقعۃً اجمال رہ گیا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر بعینہٖ کھال دی جائے تو اس میں غنی اور فقیر برابر ہیں، یعنی بعینہٖ کھال صاحبِ نصاب کو بھی دی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر کھال قربانی کرنے والے نے فروخت کردی تو وہ پیسے صرف مستحقِ زکوٰۃ کو دئے جاسکتے ہیں، غیر صاحبِ نصاب کو نہیں دئے جاسکتے۔ شاید سوال اس سیاق میں کیا گیا ہو کہ کھال کو فروخت کرکے اس کے پیسے دینا مقصود ہو، اس لئے اس کو ناجائز لکھا گیا، اگرچہ سوال کے الفاظ میں یہ بات موجود نہیں ہے، چنانچہ اس فتوے سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اب بندہ نے فتاوی عثمانی کے جواب میں ترمیم کرکے اسے اس طرح کردیا ہے:

> ''اگر پیش امام صاحبِ نصاب نہیں ہے تو اسے فطرہ اور قربانی کی کھال کے پیسے وصول کرنا جائز ہے اور اگر وہ صاحبِ نصاب ہو تو وصول کرنا جائز نہیں۔[۱] البتہ اگر کھال ہی اس کو مالک بنا کر دیدی جائے تو دونوں صورتوں میں جائز ہے، پھر وہ جس طرح چاہے، استعمال کرے۔[۲] بشرطیکہ یہ اس کی امامت کی اُجرت میں نہ ہو۔[۳]

اللہ تعالیٰ آپ کو جزاءِ خیر اور ترقیاتِ ظاہرہ وباطنہ سے نوازیں کہ آپ نے اس طرف متوجہ فرمایا۔

واللہ اعلم

۱۴۳۴/۱/۶ھ

(فتوی نمبر ۱۵۰۳/۹)

---

(۱) وفی الدر المختار، کتاب الأضحیة ج: ۶ ص: ۳۲۸ (طبع سعید) فان بیع اللحم أو الجلد أی بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه وفی مجمع الأنهر، کتاب الأضحیة ج: ۴ ص: ۱۷۴ (طبع غفاریه کوئٹه) فان بدل اللحم أو الجلد به یتصدق به

(۲) وفی مجمع الأنهر، کتاب الأضحیة ج: ۴ ص: ۷۴ (طبع غفاریه) واللحم بمنزلة الجلد، (باقی آئندہ صفحہ پر)

فصل فی متفرقات الأضحیۃ

(قربانی کے مختلف مسائل کا بیان)

قربانی کے لئے خریدا گیا جانور اگر بیمار ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- زید نے قربانی کے لئے کئی ماہ پہلے بکرا خریدا، اب یہ بکرا بیمار ہو گیا، زید نے ذبح کر دیا تو اس کو قصاب کے ہاتھ فروخت کر کے اور رقم ملا کر قربانی کا جانور خرید لیا جائے یا نہیں؟ یا اس کا گوشت فقراء پر صدقہ کرنا ضروری ہے؟ اور کیا اس کا گوشت زید کو بھی کھانا جائز ہے؟

جواب:- اگر زید پر قربانی پہلے سے واجب تھی تو وہ اس بیمار بکرے کو ذبح کر کے فروخت کر سکتا ہے، اور اس کی جگہ دوسرا خرید کر قربان کر سکتا ہے، لیکن اگر زید پر قربانی پہلے سے واجب نہ تھی اور اُس نے نفلی قربانی کرنے کی غرض سے بکرا خرید لیا تھا تو اب اس بکرے کو صدقہ کرنا واجب ہے[1]، اور اس کی جگہ کوئی دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنا ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۶/۱۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۸ و)

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الفتاویٰ البزازیة علیٰ الهندیة ج: ٦ ص: ۲۹۴ (طبع رشیدیة) أن الجلد کاللحم لیس له بیعه،
وفی البحر الرائق، کتاب الأضحیة ج: ۸ ص: ۳۲٦ (طبع رشیدیة) واللحم بمنزلة الجلد
وفی تبیین الحقائق، کتاب الأضحیة ج:٦ ص ۴۸۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ویأکل من لحم الأضحیة ویؤکل غنی و یدخر....ولأنه لما جاز له أن یأکل منه وهو غنی فأولیٰ أن یجوز له اطعام غیره وان کان غنیا،
وفی الهندیة ج:۲ ص: ۴۷۳ (طبع رشیدیه) فان أراد الحیلة فالحیلةأن یتصدق به المتولی علیٰ الفقراء یدفعونه الیٰ المتولی ثم المتولی یصرف الیٰ ذلک الخ

(۳) وفی الهندیة ج: ۱ ص: ۱۹۰ (طبع رشیدیة) ولو نوی الزکوة بما یدفع المعلم الیٰ الخلیفة ولم یستأجره ان کان الخلیفة بحال لو لم یدفعه یعلم الصبیان أیضا أجزأه والا فلا وکذا فی الدرالمختار ج: ۲ ص: ۳۵٦ (طبع سعید)

(۱) وفی الشامیة ج: ٦ ص: ۳۲۰ .... أن الفقیر إذا اشتراها له یلزمه التصدق بعینها بلا نذر بخلاف الغنی ... الخ
وفی الدر ج: ٦ ص: ۳۲۱ (ولو ترکت التضحیة ومضت أیامها تصدق بها حیة ناذر) (فاعل تصدق لمعینة) .... (وفقیر) عطف علیه (شراها لها) لوجوبها علیه بذلک حتی یمتنع علیه بیعها. (جاری ہے)

قربانی کے لئے تیسرا جانور خریدنے کے بعد پہلے ذبح نہ کئے گئے دو جانوروں کا حکم

سوال:- زید نے ایک گائے قربانی کی نیت سے خریدی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی عمر کم ہے، یعنی دوسال سے کم ہے، اُس نے دوسری گائے خریدی، وہ بھی گابھن نکلی، لوگوں نے کہا کہ گابھن گائے کی قربانی نہیں ہوتی، پھر اس نے تیسری گائے خریدی، اور اس کی قربانی کی، اب سوال یہ ہے کہ دوسری گائے جو گابھن نکلی، اس کا کیا کرنا چاہئے؟۔

جواب:- اگر زید پر قربانی واجب تھی تو اس کا واجب تیسری گائے سے ادا ہوگیا، اب پہلی اور دوسری گائیں اس کی ملکیت ہیں، ان کا جو چاہے کرے، اور اگر اس پر قربانی واجب نہیں تھی، بلکہ نفلی قربانی کی نیت سے گائے خریدی تھی تو دوسرے گائے جو گابھن ہے، اس کی بھی قربانی لازم ہے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۴ الف)

(گذشتہ سے پیوستہ) (فاعل تصدق لمعينة) .... (وفقير) عطف عليه (شراها لها) لوجوبها عليه بذلك حتى يمتنع عليه بيعها.

وفي الشامية تحته (قوله: لوجوبها عليه بذلك) أى بالشراء و هذا ظاهر الرواية لأن شراء ه لها يجرى مجرى الإيجاب و هو النذر بالتضحية عرفاً كما في البدائع.

وفي الهداية ج: ۴ ص: ۴۴۵ (طبع رحمانيه) ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر إن كان أوجب على نفسه أو كان فقيرا وقد اشترى الأضحية تصدق بها حية وإن كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتر "لأنها واجبة على الغنى .وتجب على الفقير بالشراء بنية التضحية عندنا ....الخ

وفي المحيط البرهاني الفصل الخامس ج۵ ص ۲۲۲ (طبع داراحياء التراث العربي بيروت) واذا مضى ايام النحر فقد فاته الذبح لان الاراقة انما عرفت في زمان مخصوص ولكن يلزمه التصدق بقيمة الاضحيةاذا كان ممن يجب عليه الاضحيةفان كان اوجب شاة بعينها او اشترى ليضحى بها فلم يفعل حتى مضت ايام النحر تصدق بها حية لانه تعذر اقامة القربة من حيث الذبح لفوات الوقت.

(۱) دیکھئے سابقہ حاشیہ

بہو کا سسر کی طرف سے بھیجے جانے والے بکرے سے قربانی کا حکم

سوال:- میں نے اپنے لڑکے کی منگنی پانچ سال سے کر رکھی ہے، میں اپنی بہو کو بقرعید پر قربانی کا بکرا اپنے لڑکے کی طرف سے بھیجتا رہا ہوں، جو قربانی بھیجی جاتی ہے، آیا وہ کنوارہ پن کی وجہ سے بہو کو بھیجنا مناسب ہے؟ وہ خدا کے یہاں مقبول ہوگی یا نہیں؟ یا بغیر نکاح ہوئے وہ خدا کے یہاں قربانی شمار نہیں ہوگی؟ اس لڑکی کی قربانی میرے لڑکے پر واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ سابقہ قربانیاں خدا کے یہاں کس مد میں شمار ہوں گی؟

جواب:- قربانی ہر شخص پر اپنی واجب ہوتی ہے، شوہر پر بیوی کی طرف سے قربانی واجب نہیں ہے، بلکہ اگر بیوی صاحبِ نصاب ہے تو اس پر اپنے مال میں سے قربانی کرنا واجب ہے۔ (۱) اگر شوہر اس کے لئے بکرا خریدے تو یہ بکرا اپنی بیوی کو ہبہ کردے، پھر وہ اپنی طرف سے قربانی کردے تو درست ہے، (۲) اور جب نکاح کے بعد یہ حکم ہے تو نکاح سے پہلے تو بطریقِ اولیٰ یہی حکم ہوگا، لہٰذا آپ اب تک جو بکرا اپنی ہونے والی بہو کے پاس بھیجتے رہے ہیں، وہ آپ کی طرف سے اس کو ہدیہ ہے اور اس کی قربانی اس سے ادا ہوگئی، آئندہ آپ پر بھیجنا واجب نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹۴/۲۷ و)

---

(۱) وفي الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۱۵ (طبع سعید) تجب علی حر مسلم مقیم موسر بیسار الفطرة عن نفسه.

(۲) وفي خلاصة الفتاوی ج: ۴ ص: ۳۱۷ ولو وهب رجل من رجل شاة فضحی بها ثم أراد أن یرجع فی هبته فعند أبی یوسف لیس له ذلک و لا یجب علی المضحی أن یتصدق بشیء. و فی الهندیة ج: ۵ ص: ۳۰۳. (طبع رشیدیه)

رجل وهب لرجل شاة فضحی بها الموهوب له او ذبحهالمتعة او جزاء صید ثم رجع الواهب فی الهبة صح الرجوع وجازت الاضحیة والمتعة وعن ابی یوسف انه لا یصح الرجوع فی الهبة ولیس علی الموهوب له فی الاضحیة والمتعة ان یتصدق بشی.

ذبح کرنے کی اُجرت لینے کا حکم اور یہ اُجرت کس کے ذمے ہے؟

سوال:- اگر کوئی دوست یا رشتہ دار عید کو بکرا ذبح کروائے تو ذبح کرنے کا پیسہ لینا چاہئے یا نہیں؟ اور یہ اُجرت کس پر ہے؟

جواب:- ذبح کرانے کی اُجرت اسی کے ذمے ہے جس کی طرف سے ذبح کیا جارہا ہے، لہٰذا یہ اُجرت لینا درست ہے۔[۱]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۷/۱۵ھ

(فتوی نمبر ۲۸/۱۰۸ الف)

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ

سوال:- قربانی کے گوشت کو تقسیم کرنے کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور کیا سارا گوشت خود کھالینا جائز ہے؟

جواب:- قربانی کے بارے میں مستحب یہ ہے کہ اس کے تین حصے کئے جائیں، ایک حصہ اپنا، ایک غریبوں کا اور ایک رشتہ داروں کا، لیکن اگر کسی جگہ غرباء دستیاب نہ ہوں تو سارا گوشت خود کھانا یا رشتہ دار کو کھلا دینا بھی جائز ہے۔[۲]

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۱۱/۶ھ

---

(۱) ویجوز الاستئجار علی الذکاۃ (أی الذبح) لأن المقصود منها قطع الأوداج دون إماتۃ الروح و ذلک یقدر علیه، کذا فی السراج والوھاج (الفتاوی الھندیة ج: ۴ ص: ۴۵۴، (طبع ماجدیه کوئٹه) فی الجوھرۃ النیرۃ ج: ۱ ص: ۳۱۸ (طبعی قدیمی کتب خانه) ویجوز الاستئجار علی الذکاۃ؛ لأن المقصود منها قطع الأوداج دون إماتۃ الروح اھ (کتاب الإجارۃ فصل فی الأجیر المشترک و الخاص)

نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج: ۸ ص: ۲۴۳ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت کراچی)

(۲) وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۲۸ (طبع سعید) وندب أن لا ینقص التصدق عن الثلث۔ وندب ترکه لذی عیال توسعة علیھم۔ وفی الشامیة تحته (قوله وندب إلخ) قال فی البدائع :والأفضل أن یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لأقربائه وأصدقائه ویدخر الثلث ویستحب أن یأکل منھا، ولو حبس الکل لنفسه جاز لأن القربة فی الإراقة والتصدق باللحم تطوع۔

نیز دیکھئے: احکام وتاریخِ قربانی ص: ۳۹ مصنفہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

فصل فی العقیقۃ

(عقیقے کے مسائل)

عقیقے کی شرعی حیثیت اورلڑکے کے لئے دوبکروں کی استطاعت نہ ہوتو کیا حکم ہے؟

سوال:- کیاعقیقہ کرنالازم ہے؟اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اورلڑکے کی طرف سے کیادوبکرے کرنالازم ہے؟ اگرایک بکراذبح کیاجائے توکیسا ہے؟

جواب:- عقیقہ کوئی فرض یاواجب نہیں،سنتِ مستحبہ ہے، اگرنہ کیاجائے توگناہ نہیں،[1] لیکن مسنون یہی ہے کہ لڑکے کی طرف سے دوبکرے یاگائے کے دوحصے کئے جائیں۔[2] اتنی قدرت نہ ہوتوایک بکرایاایک حصہ کرنے سے وہ سنت توادانہ ہوگی،مگرنہ کرنے سے بہتر ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۰۴ ج)

عقیقے کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ

سوال:- عقیقہ کرنے کے بارے میں بتلایاجائے کہ شریعت کے مطابق ذبح کرنے، گوشت تقسیم کرنے کاکیاحکم ہے؟ نیزماں باپ گوشت کھاسکتے ہیں یانہیں؟

---

(۱) فی الھندیة ج: ۵ ص: ۳۶۲ کتاب الکراھیة (طبع رشیدیه) العقیقة عن الغلام و عن الجاریة وھی ذبح شاة ..... وذکر محمد رحمه الله فی العقیقة فمن شاء فعل ومن شاء لم یفعل، وھذا یشیر إلی الإباحة ....الخ

وکذا فی الشامیة ج: ٦ ص: ۳٦۲ (طبع سعید کراچی)

(۲) حوالہ جات کے لئے اگلے صفحہ نمبر۱۳۰ کاحاشیہ نمبر۱و۲ملاحظہ فرمائیں۔

جواب:- عقیقے کا گوشت ماں باپ بھی کھا سکتے ہیں اور رشتہ داروں کو بھی کھلا سکتے ہیں، بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک تہائی گوشت غریبوں میں تقسیم کردیں، ایک تہائی اپنے رشتہ داروں کو دے دیں، اور ایک تہائی گھر کے استعمال میں لائیں،(۱) لیکن اس کے خلاف کرنا بھی جائز ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
۱۳۹۷/۹/۱۲ھ
(فتوی نمبر ۲۸/۹۳۲ ج)

گائے کے ذریعہ عقیقہ کا حکم

لڑکے کے عقیقہ کے لئے دو اور لڑکی کے لئے ایک حصہ کرنے کا حکم

سوال:- گائے میں عقیقہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اور میں نے بچوں کے عقیقہ کے لئے ایک گائے خریدی ہے، اس میں کس حساب سے عقیقہ کرسکتا ہوں؟ لڑکے اور لڑکی کے لئے تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- گائے میں عقیقہ ہوجاتا ہے،(۲) دو حصے لڑکے کی طرف سے اور ایک حصہ لڑکی کی

(۱) وفی الدر المختار ج: ۲ ص: ۳۲۷ و ۳۲۸ (طبع سعید) و یأکل من لحم الأضحیة و یؤکل غنیا و یدّخر و ندب أن لا ینقص التصدق عن الثلث.

وفی الشامیة: قوله: ندب، قال فی البدائع: والأفضل أن یتصدق بالثلث و یتخذ الثلث ضیافة لأقربائه و أصدقائه و یدّخر الثلث و یستحب أن یأکل منها.

و کذا فی الهندیة ج: ۵ ص: ۳۰۰ (طبع رشیدیه)

و کذا فی کفایت المفتی ج: ۸ ص: ۲۳۹ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت کراچی)

(۲) وفی المعجم الصغیر للطبرانی رقم الحدیث ۲۲۹ ج: ۱ ص: ۸۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) عن أنس بن مالک قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم: من ولد له غلام فلیعق عنه من الإبل أو البقر أو الغنم.

و کذا فی مجمع الزوائد للهیثمیؒ ج: ۹ ص: ۱۰۷ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

طرف سے کیا جائے،[۱] اس طرح مذکورہ گائے میں تین لڑکوں اور ایک لڑکی کا عقیقہ ہو جائے گا۔[۲]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۲/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۷۳/۲۷ و)

(۱ و ۲) وفی سنن أبی داؤد رقم الحديث ۲۸۳۶ باب فی العقيقة ج: ۳ ص: ۲۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) عن أم كرز الكعبية، قالت :سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول :عن الغلام شاتان مكافئتان، وعن الجارية شاة.

وكذا فی سنن الترمذی رقم الحديث ۱۵۱۳ ج: ۴ ص: ۹۲ (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت) و سنن ابن ماجه باب العقيقة رقم الحديث ۳۱۶۲ ج:۲ ص: ۱۰۵۶ (طبع دار الفكربيروت)

وفی نيل الأوطار للشوكانیؒ كتاب العقيقة وسنة الولادة ج: ۵ ص: ۱۹۸ (طبع إدارة الطباعة المنيرية) والجمهور على إجزاء البقر والغنم .ويدل عليه ما عند الطبرانی وأبی الشيخ من حديث أنس مرفوعا بلفظ :يعق عنه من الإبل والبقر والغنم ونص أحمد على أنها تشترط بدنة أو بقرة كاملة. وذكر الرافعی أنه يجوز اشتراك سبعة فی الإبل والبقر كما فی الأضحية.

وفی بذل المجهود ج: ۴ ص: ۸۷ (طبع معهد الخليل) فليس فی الحديث ما يرد به الأحاديث المتواردة فی التنصيص على التثنية فی الغلام بل غايته أن يدل على جواز الاقتصار وهو كذلک فإن العدد ليس شرطاً بل مستحب.

وفی إعلاء السنن كتاب الذبائح ج: ۱۷ ص: ۱۱۷ (طبع إدارة القرآن) "من ولد له غلام فليعق عنه من الإبل أو البقر أو الغنم" دليل على جواز العقيقة ببقرة كاملة أو ببدنة كذلک و نص أحمد على اشتراط كاملة كما فی فتح الباری و ذكر الرافعی بحثاً أنها تتادّى بالسبع كما فی الأضحية وسيأتی. وبالجملة فهی كالأضحية فی أكثر الأحكام عندهم فيجوز الزيادة على الشاتين فی الذكر و على شاة فی الأنثى ويستحب أن يجعل للذكر مثل حظ الانثيين الخ

وفيها أيضا ج: ۱۷ ص: ۱۱۹ (طبع إدارة القرآن) ولو ذبح بدنة أو بقرة عن سبعة أولاد أواشترک فيها جماعة جاز سواء أراد كلهم العقيقة أو أراد بعضهم العقيقة و بعضهم اللحم كما فی الأضحية. (شرح المهذب)

وفی فتح الباری ج: ۹ ص: ۵۹۳ (طبع دار نشر الكتب الإسلامية لاهور) والجمهور على إجزاء الإبل والبقر أيضا وفيه حديث عند الطبرانی وأبی الشيخ عن أنس رفعه يعق عنه من الإبل والبقر والغنم ونص أحمد على اشتراط كاملة وذكر الرافعی بحثا أنها تتأدى بالسبع كما فی الأضحية والله أعلم.

وكذا فی أوجز المسالک ج:۹ ص: ۲۶۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

وفی المجموع شرح المهذب باب العقيقة ج: ۹ ص: ۳۴۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولو ذبح بقرة أو بدنة عن سبعة أولاد أو اشترک فيها جماعة جاز سواء أرادوا كلهم العقيقة أو أراد بعضهم العقيقة وبعضهم اللحم.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

عقیقہ کی گائے میں لڑکے اور لڑکی کے حصوں کی تفصیل

سوال:- کیا گائے میں عقیقہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ عام دنوں میں بھی یا صرف بقرعید میں؟

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی حاشیة الجمل علی فتح الوهاب شرح منهج الطلاب : (وسن لذكر شاتان وغيره) من أنثى وخنثى (شاة) إن أريد العق بالشياه للأمر بذلك فى غير الخنثى رواه الترمذى، وقال حسن صحيح وقيس بالأنثى الخنثى، وإنما كانا على النصف من الذكر؛ لأن الغرض من العقيقة استبقاء النفس فأشبهت الدية؛ لأن كلا منهما فداء للنفس.

وفى حاشية الجمل على المنهج كتاب الأضحية ج: ١٠ ص: ٤٢١ (طبع دار الفكر بيروت) (قوله وسن لذكر شاتان) أى ذلك هو أدنى الكمال وإلا فتكفى واحدة فى سقوط الطلب اهـ ع ش. وعبارة شرح م ر وآثر الشاة تبركا بلفظ الوارد وإلا فالأفضل هنا نظير ما مر من سبع شياه ثم الإبل ثم البقر ثم الضأن ثم المعز ثم شرك فى بدنة ثم بقرة، ولو ذبح بدنة أو بقرة عن سبعة أولاد جاز وكذا لو اشترك فيها جماعة سواء أرادوا كلهم العقيقة أو بعضهم ذلك وبعضهم اللحم انتهت.

وفى رد المحتار كتاب الأضحية ج: ٦ ص: ٣٢٦ (طبع سعيد) وشمل ما لو كانت القربة واجبة على الكل أو البعض اتفقت جهاتها أولا :كأضحية وإحصار وجزاء صيد وحلق ومتعة وقران خلافا لزفر، لأن المقصود من الكل القربة، وكذا لو أراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد له من قبل لأن ذلك جهة التقرب بالشكر على نعمة الولد ذكره محمد.

وقال الشيخ ظفر أحمد العثمانى رحمه الله بعد ذكر هذه العبارة فى إمداد الأحكام كتاب الصيد والذبائح ج: ٤ ص: ٢٢٨ (طبع مكتبه دار العلوم)

قلت: ولما جاز الاشتراك بالعقيقة فى بقرة الأضحية فجواز اشتراك السبعة فى بقرة العقيقة أولىٰ لاتحاد الجهة.

وفى بدائع الصنائع ج: ٧ ص: ٢٠٩ (طبع مكتبه حبيبيه كانسى روڈ كوئٹه) وفى طبع سعيد ج: ٥ ص: ٧٢ ....ولنا أن الجهات وإن اختلفت صورة فهى فى المعنى واحد؛ لأن المقصود من الكل التقرب إلى الله عزّ شانه. و كذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل لأنّ ذلك جهة التقرّب إلى الله تعالىٰ الخ

وكذا فى تبيين الحقائق كتاب الأضحية ج: ٦ ص: ٤٨٤ و ص: ٤٨٥ (طبع إدارة القرآن)

نیز دیکھئے: الفقہ الإسلامی وأدلتہ ج: ۴ص: ۲۷۴ طبع دارالفکر۔ وامدادالاحکام، کتاب الصید والذبائح ج: ۴ص: ۲۲۸ وص: ۲۳۳ وص: ۲۳۴ وص: ۲۶۶۔ وامدادالمفتین ص: ۹۶۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) وکفایت المفتی ج: ۸ص: ۲۴۰ (طبع جدیددارالاشاعت)
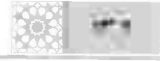
جواب:- گائے کے ذریعہ عقیقہ ہوسکتا ہے،[1] گائے کے سات حصے ہوسکتے ہیں، لڑکی کے عقیقہ میں ایک حصہ اور لڑکے کے عقیقے میں دو حصے کئے جاسکتے ہیں،[2] اور اس میں بقرعید کے زمانے کی کوئی قید نہیں، ہر زمانے میں جائز ہے، کذا فی کتب الفقہ۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴/۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۳/۲۵ الف)

گائے میں عقیقہ کرنے کا حکم

ایک گائے میں پانچ بچوں کے عقیقہ کا حکم

سوال:- عقیقہ گائے میں ہوسکتا ہے؟ اور اگر پانچ بچوں کا عقیقہ کرنا ہو تو ایک گائے میں ہوسکتا ہے؟

جواب:- عقیقہ میں گائے کے حصے بھی کئے جاسکتے ہیں،[3] لڑکی کے عقیقے میں گائے کا ایک حصہ اور ایک لڑکے کے عقیقے میں دو حصے کئے جائیں،[4] اس طرح ایک گائے میں سات لڑکیوں کا عقیقہ ہوسکتا ہے یا تین لڑکوں اور ایک لڑکی کا عقیقہ بھی ممکن ہے۔[5]

واللہ اعلم

۲۴/۷/۱۳۹۸ھ

عقیقہ میں گائے اور بھینس کرنے کا حکم

سوال:- کیا عقیقہ میں تین لڑکیوں اور دو لڑکے کا عقیقہ ایک گائے سے ہوسکتا ہے؟ کیا بھینس بھی عقیقہ میں کرسکتے ہیں؟ اور جیسا کہ قربانی میں سات آدمی شریک ہوتے ہیں۔

---

(۱) حوالہ کیلئے دیکھئے سابقہ ص: ۱۲۹ کا حاشیہ نمبر ۲

(۲) حوالہ کیلئے دیکھئے سابقہ ص: ۱۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲

(۳) دیکھئے اگلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۱

(۴ و ۵) دیکھئے سابقہ ص: ۱۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱ و ۲

جواب:- عقیقے میں گائے، بھینس بھی کرسکتے ہیں،[1] لڑکے کی طرف سے دو حصے اور لڑکی کی طرف سے ایک حصہ، اس حساب سے کرلیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۷/۲۸ھ
(فتوی نمبر ۲۹/۸۹۴ب)

---

(۱) وفی المعجم الصغیر للطبرانی رقم الحدیث ۲۲۹ ج: ۱ ص: ۸۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) عن أنس بن مالک قال :قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم :من ولد له غلام فليعق عنه من الإبل أو البقر أو الغنم۔

وكذا فی مجمع الزوائد للهيثمیؒ ج: ۹ ص: ۱۰۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

وفی الهندية الباب الخامس ج: ۵ ص: ۲۹۷ (طبع رشيديه كوئٹه) (أما جنسه) فهو أن يكون من الأجناس الثلاثة الغنم أو الإبل أو البقر و يدخل فی كل جنس نوعه والذكر والأنثى منه ..... والجاموس نوع من البقر الخ۔

وفی العناية شرح الهداية كتاب الأضحية : و يدخل فی البقر الجاموس لأنه من جنسه۔

وفی فتح القدير كتاب الأضحية ج: ص: ، و يدخل فی البقر الجاموس لأنه من جنسه۔

وفی بداية المجتهد لابن رشدؒ ج: ۱ ص ۳۳۹ (طبع مكتبه علميه لاهور) جمهور العلماء على أنه لا يجوز فی العقيقة إلا ما يجوز فی الضحايا من الأزواج الثمانية۔

و كذا فی أوجز المسالک ج: ۹ ص: ۲۶۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

وفی تبيين الحقائق كتاب الأضحية قال رحمه الله (والأضحية من الإبل والبقر والغنم) لأن جواز التضحية بهذه الأشياء عرف شرعاً بالنص على خلاف القياس فيقتصر عليها و يجوز بالجاموس لأنه نوع من البقر ۔ (قوله: ويجوز بالجاموس) وقال فی خلاصة الفتاوى والجاموس يجوز فی الضحايا والهدايا استحساناً اهـ۔

وفی الفقه الإسلامی وأدلته ج: ۴ ص: ۲۷۱۹ (طبع دار الفكر بيروت) اتفق العلماء على أن الأضحية لا تصح إلا من نعم إبل و بقر (ومنها الجاموس) و غنم الخ

(۲) حوالہ جات کے لئے دیکھئے سابقہ ص:۱۳۰ کا حاشیہ نمبر ۱و۲

كتاب إحياء الموات وما يتعلق بالركاز والأراضي الشاملات وغيرها

(بنجر اور غیر آباد زمینوں کی آبادکاری
خزانوں، دفینوں اور اراضی شاملات سے
متعلق مسائل)
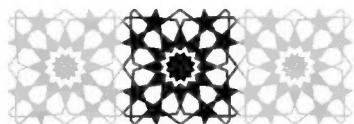
صوبہ خیبر پختونخواہ کے پہاڑی جنگلات کی شرعی حیثیت

خلاصۂ سوال از خط جناب مولانا سردار صاحب مدظلہم بنام حضرت والا دامت برکاتہم۔

صوبہ سرحد میں پہاڑی جنگلات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہاں کے کئی افراد اُسے شخصی ملکیت قرار دیتے ہیں اوراس میں میراث جاری کرتے ہیں جبکہ ان لوگوں نے اس کا باقاعدہ ''احیاء'' نہیں کیا ہوا تھا۔

کیا حکم ہے کہ یہ مباح زمین کے حکم میں ہوں گے یا متعلقہ افراد کی ذاتی ملکیت؟ براہِ کرام اس مسئلے سے آگاہ فرمائیں۔ (مولانا) محمد سردار (صاحب)

جواب:- عزیز گرامی قدر جناب مولانا محمد سردار صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی نامہ ملا، آپ نے جس طرح اظہارِ محبت فرمایاہے، اللہ تعالیٰ اس کا بہترین صلہ دنیاوآخرت میں عطافرمائیں، آمین۔

صوبہ سرحد میں پہاڑی جنگلات کوجس طرح شخصی ملکیت سمجھا جاتاہے، اس کے بارے میں جتنی تحقیق احقرنے جاننے والوں سے کی ہے، اس کے مطابق اب تک ان کا کوئی شرعی سببِ ملک دریافت نہیں ہوا، اورآپ کا یہ فرمانا درست ہے کہ انہوں نے اس کا احیاء نہیں کیا ہوا تھا، لہٰذا اب تک احقر یہی جواب لکھتا رہا ہے کہ ان کو شرعاً مملوک تصور کرنا اوراس بنیاد پران کی تقسیم شرعاً درست نہیں۔[۱]

اور چونکہ مملوک نہیں، اس لئے عشر بھی نہیں،[۲] البتہ وہ اراضی مباحہ کے حکم میں ہیں،[۳] جو شخص جتنا کاٹ لے گا، مالک ہوجائے گا۔[۴]

والسلام

۴-۸-۱۴۰۴ھ

(۱ تا ۴) وفی رد المحتار باب العشر ج: ۲ ص: ۳۲۵ (طبع سعید) وما ليست بعشرية ولا خراجية كالجبل، والمفازة لكن قدمنا عن الخانية، وغيرها أن الجبل عشرى وقدمنا أيضا أن المراد أنه لو استعمل فهو عشرى و بعد أسطر .... فإن ثمر الجبال مباح لا يجوز منع المسلمين عنه وقال أبو يوسفؒ لا شيء فيما يوجد فى الجبال؛ لأن الأرض ليست مملوكة ولهما أن المقصود من ملكها النماء وقد حصل۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

حواشی واضافہ از مستفتی جناب مولانا محمد سردار صاحب مدظلہم

مزید تائید از فتاوی رشیدیہ: اگر بینڈ اور پودا خود رَو ہے تو اس میں عشر بھی نہیں ہے اور وہ ملک بھی نہیں ہے اور اگر پرورش کیا ہے اور لگایا ہے تو اس میں عشر بھی ہے اور وہ ملک بھی ہے، غیر شخص کو اس کا کاٹنا درست نہیں

وفی بدائع الصنائع ج: ۲ ص: ۱۸۱ (طبع مکتبة حبیبه کوئٹه) وما یوجد فی الجبال من العسل والفواکه فقد روی محمد عن أبی حنیفة أن فیه العشر، وروی أصحاب الإملاء عن أبی یوسف أنه لا شیء فیه. وجه قول أبی یوسف أن هذا مباح غیر مملوک فلا یجب فیه العشر کالحطب والحشیش۔

وفی البحر الرائق فصل فی الشرکة الفاسدة ج: ۱۲ ص: ۱۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) (کتاب الشرکة ج: ۵ ص: ۱۸۳ ط۔ سعید) ولا تصح شرکة فی احتطاب واصطیاد واستقاء .... أشار بالثلاثة إلی أن أخذ کل شیء مباح کالاحتشاش واجتناء الثمار من الجبال الخ

وفی کتاب الخراج لأبی یوسفؒ (فصل الکلاء والمروج) ج: ۱ ص: ۱۰۴ (طبع بولاق) وإذا کان الحطب فی المروج وهی ملک إنسان؛ فلیس لأحد أن یحتطب منها إلا بإذنه؛ فإن احتطب منها ضمن قیمة ذلک لصاحبه؛ فإن لم یکن فی تلک لأحد ملک فلا بأس أن یحتطب منه جمیع الناس، ولا بأس أن یحتطب ما لم یعلم أن له مالکا، وکذلک الثمار فی الجبال والمروج والأودیة من الشجر ما لم یغرسه الناس، ولا بأس أن یأکل من ثمارها ویتزود ما لم یعلم أن ذلک فی ملک إنسان، وکذلک العسل یوجد فی الجبال مما یکون فی ملک إنسان من قبل أن الذی یتخذه للناس یکون فی الکوارت فما لم یحرز منها فهو مباح الخ

وفی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق فصل فی الشرکة الفاسدة ج:۲۵۵/۲۵۴/۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولا تصح شرکة فی احتطاب واصطیاد واستقاء وکذا فی أخذ کل مباح کالاحتشاش واجتناء الثمار من الجبال .... ولأن المباح لمن أخذه الخ

وفی فتح القدیر فصل فی الشرکة الفاسدة ج: ۵ ص: ۴۰۹ (ط۔ رشیدیه) وما اصطاده کل واحد منهما أو احتطبه أو أصابه من التکدی فهو له دون صاحبه، وعلی هذا الاشتراک فی کل مباح کأخذ الحطب والثمار من الجبال الخ

وفی مجمع الأنهر فی شرح الملتقی ج: ۲ ص: ۵۶۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولا تجوز الشرکة فیما لا تصح الوکالة به کالاحتطاب والاحتشاش والاصطیاد والاستقاء وکذا فی أخذ کل مباح کاجتناء الثمار من الجبال والبراری الخ

ہے۔ قبیل کتاب الصوم۔ اسی طرح تحفۃ الفقہاء کتاب احیاء الموات میں لکھا ہے کہ جو موات گاؤں کے قریب ہو تو وہ انکا ہے کوئی اسے آباد نہیں کریگا بلکہ مشترک سے کل فائدہ حاصل کرے گا، لیکن دوسرے گاؤں والے اسے منع نہیں کرینگے سو اس میں بھی نسبت ہے مگر ملکیت کی نہیں۔

دوسری جگہ ص: ۲۶۴۔ جنگل، پہاڑ کی اشیاء مباح ملکِ عامہ ہیں، اس پر محصول لگانا حاکم کا ظلم ہے حرام،

و الحطب إن كان في غير ملك فلا بأس به، ولا يضر نسبته إلى قرية أو جماعة ما لم يعلم أن ذلك ملك لهم۔ (ردالمحتار) فتاوی رشیدیه بالا۔

فإن ثمر الجبال مباح لا يجوز منع المسلمين عنه وقال أبو يوسف لا شيء فيما يوجد في الجبال؛ لأن الأرض ليست مملوكة ولهما أن المقصود من ملكها النماء وقد حصل. (فوجب الزكاة)

رد المحتار ص: ۵۳ ابتداء كتاب الزكاة۔

کیونکہ نسبت، خوامخواہ ملک پر دلالت نہیں کرتا، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:۔

اتى سباطة قوم (ترمذی ج: ۱ ص: ۹)

اس کے حاشیہ پر قوت المغتذی لکھتا ہے:۔

وأضاف إلى القوم للتخصيص لا للملك۔ سردار احمد

خودرَو جنگلات کا شرعی حکم اور متعلقہ تحقیق کا فقہی جائزہ

(سوال و خط از مستفتی)

سوال:۔ محترم المقام قابلِ صد احترام جناب مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاج شریف! بندہ نے بنوری ٹاؤن سے سندِ فراغت حاصل کی ہے اور علماءِ دیوبند کا

شیدائی ہے، آپ سے خصوصی لگاؤ میری متاعِ حیات ہے، اس مختصر تعارف کے بعد آپ کی خدمت میں اپنی تالیف کردہ ایک چھوٹی سی کتاب ''جنگلات اور رائلٹی کا مسئلہ'' ارسال کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو درحقیقت ایک استفتاء کی وضاحت ہے، اس سلسلے میں اپنے پاس موجود چند ہی کتب سے استفادہ ممکن ہوا، ان میں تکملہ فتح الملہم بھی شامل ہے، چونکہ جنگلات اور رائلٹی کے مختلف پہلو صوبہ سرحد کے شمالی علاقہ جات، چترال، سوات، دیر، ملاکنڈ، ہزارہ وغیرہ میں زیرِ بحث آتے ہیں، جن کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، اور قیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ ان کے حل پیش کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

براہِ کرام آپ ان جملہ پہلوؤں پر غور فرما کر تائید یا تردید کی صورت میں اپنا فتویٰ ارسال فرمائیں یا ''البلاغ'' میں شائع فرمائیں، تاکہ یہاں کے عوام اس اہم مسئلے پر مطمئن ہوسکیں اور علماء کے لئے آپ کی تحریر چراغِ راہ ثابت ہوگی۔ پراُمید ہوں کہ ضرور ہماری راہنمائی فرمائیں گے۔

والسلام محتاجِ دعا

محمد نقیب اللہ رازی (چترال)

مستفتی کی جانب سے بھیجی گئی متعلقہ تحقیق
(جنگلات اور رائلٹی کا مسئلہ)

نظامِ معیشت

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لئے پیدا فرمایا ہے، خاص کر زمین میں انسان کے انتفاع اور حصولِ فوائد کی خاطر تمام چیزوں کو وجود بخشا، قرآن کریم کی مختلف آیات میں اس کی صراحت موجود ہے۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (حم سجدہ : ۱۰)

''اورزمین میں بوجھل پہاڑ رکھے، اوراس کے اندر برکت رکھی، اورچار دن کے اندراُن کی خوراکیں اس میں اندازے سے رکھیں، جوحاجت مندوں کے لئے برابر ہیں۔''

هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَكُم مَّا فِی الْأَرْضِ جَمِیعًا (البقرة: ۲۹)

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا، جو کچھ زمین میں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے معاشی لحاظ سے سب کو مساوی نہیں ٹھہرایا، بلکہ بعض کو بعض پر فوقیت دی اور ذرائعِ معیشت کو لوگوں میں تقسیم فرما کر حصولِ انتفاع کے لحاظ سے ہر شخص کی حیثیت جدا رکھی اور اس کی حکمت بھی بیان فرمائی۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُم مَّعِیشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِیًّا (الزخرف: ۳۲)

''ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی روزی بانٹ دی ہے اور بعض کو بعض پر بلند کیا تا کہ ایک دوسرے کو نوکر ٹھہرائیں۔''

پھر اسلام نے منفعت کی چیزوں کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا: (۱) بیت المال کی ملک (۲) ذاتی اور انفرادی ملکیت (۳) عام انتفاع کے لئے مشترک اشیاء۔ شریعت میں تینوں کے احکام جدا جدا ہیں، اوّل الذکر دونوں کے بارے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ جو چیزیں حصولِ منفعت کے لحاظ سے تمام لوگوں میں مشترک ہیں، ان کے متعلق بسا اوقات عوام کو مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کسی صورت میں بھی قابلِ احراز نہیں اور ہر ایک کو منفعت کا وہی حق حاصل ہوگا جو دوسرے کو حاصل ہے، مثلاً پانی، گھاس وغیرہ مباح الاصل چیزیں ہیں تو جنگلات بھی خودرو ہونے کی وجہ سے مباح الاصل اشیاء کے حکم میں شامل ہو کر عام مشترک ہوں گے، ان میں تمام لوگوں کو حقِ منفعت حاصل ہوگا، پھر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جب حصولِ منفعت میں جنگلات یکساں ہیں تو رائلٹی میں بھی تمام لوگوں کا حق ثابت ہوا۔

اس لئے ہم آنے والی سطور میں اس کے متعلق وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

رائلٹی کا مفہوم

رائلٹی ایک قدیم اصطلاح ہے، کسی کی کتاب کو چھاپ کر ناشر جو معاوضہ مصنف کو دیتا ہے یا کان کنی کا ٹھیکیدار اصل مالکِ زمین کو جو معاوضہ دیتا ہے، اسے اصطلاح میں رائلٹی (Royalty) کہا جاتا ہے، یہ اصطلاح اب عام ہوکر ہر اس معاوضے پر اس کا اطلاق ہونے لگا کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو ٹھیکیدار یا حکومت تجارت میں لگا کر منافع کا ایک مخصوص حصہ اصل مالک کو دیتی ہے۔

اس میں معدنیات اور پٹرولیم کے منافع کا معاوضہ بھی شامل ہے، موجودہ وقت میں حکومت کی طرف سے جنگلات کے منافع کا جو معاوضہ ملتا ہے، اسے بھی رائلٹی کہا جاتا ہے۔

رائلٹی کی صورت

جنگلات کی رائلٹی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کسی بستی والوں کے جنگلات کی کٹائی کر کے فروخت کرتی ہے اور اس کی قیمت میں سے چالیس فیصد خود لیتی ہے اور ساٹھ فیصد بستی والوں کو دیتی ہے، یہ معاوضہ جنگلات کی ان لکڑیوں کا ہوتا ہے جو عمارتی اور فرنیچر کے کام آتی ہیں اور حکومت کی نگرانی میں کٹائی گئی ہوں اور حکومت نے خود انہیں فروخت کی ہو۔ اس عمل میں بستی والوں کا اشتراک بھی شرط نہیں، حکومت یہ معاوضہ بستی والوں کو ان کے مالکانہ حقوق کی وجہ سے دیتی ہے۔

جب سے رائلٹی کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو دو اہم مسئلے پیش آئے ہیں، پہلا یہ کہ ان جنگلات کا اصل مالک کون ہے؟ حکومت (بیت المال) یا عوام؟ دوسرا یہ کہ رائلٹی کا حقدار کون ہے؟ اور اس کی تقسیمِ کار کیا ہونا چاہئے؟

یہ دو مسئلے علماء اور عوام کے مابین لاینحل صورت اختیار کر گئے ہیں، علماء کے لئے کسی خاص نتیجے پر پہنچنا اس لئے مشکل ہے کہ مذکورہ دونوں مسئلے کئی صورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جس سے ہر مسئلہ پیچیدہ در پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ جنگلات پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں پائے

جاتے ہیں، خاص کر صوبہ سرحد کے شمالی علاقہ جات دیر، سوات اور چترال کے علاوہ ہزارہ ڈویژن وغیرہ سرفہرست ہیں۔

جنگلات کا مسئلہ

درختوں کے لحاظ سے جنگلات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جنگلات ہیں جن کے درختوں اور پودوں سے سوختہ لکڑی اور مویشیوں کے لئے چارے وصول کئے جاتے ہیں، ایسے جنگلات شاہ بلوط اور دوسری قسم کے درختوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ایسے درختوں پر مشتمل تمام جنگلات اور ان کے تحت واقع زمینیں بالاتفاق تقسیم شدہ موروثہ اور مملوکہ ہوتی ہے۔

دوسری قسم کے وہ جنگلات ہیں جن کی لکڑی سے تعمیراتی کام لیا جاتا ہے اور فرنیچر وغیرہ بنایا جاتا ہے، اس قسم کے جنگلات میں دیار، چیڑ، صنوبر وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں، ایسے جنگلات کے درخت حکومت کی زیرنگرانی ہوتے ہیں، اس قسم کے جنگلات پر حکومت وہاں کے بستی والوں کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود لیتی ہے، اور حکومت کی حیثیت محافظ کی سی ہوتی ہے، اسی لئے ایک مستقل محکمہ ''محکمۂ جنگلات'' کے نام سے تشکیل دیا گیا ہے، جس کا عملہ اس قسم کے جنگلات کی حفاظت پر مامور ہے اور ایسے درختوں کی کٹائی کرنے اور انہیں تعمیری استعمال میں لانے کے لئے موجودہ محکمے سے اجازت نامہ (PERMIT) حاصل کیا جاتا ہے، لیکن جہاں یہ درخت موجود ہیں وہاں کی زمینیں حکومت کے اختیار میں نہیں ہوتیں، بلکہ وہاں کے مقامی باشندوں کی ملکیت ہوتی ہیں اور ان کو مالکانہ تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، وہ چاہیں تو درخت کاٹ کر اپنے لئے مکان تعمیر کر سکتے ہیں، زمین آباد کر سکتے ہیں اور وہاں سے خشک و تر گھاس اور سوختہ لکڑی حاصل کر سکتے ہیں، اس کے لئے حکومت یا محکمے سے نہ اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ حکومت کو منع کرنے کا اختیار حاصل ہے، کیونکہ اس حدود میں موجود تمام جنگلات اور زمینیں اہلِ بستی کی مشترکہ ملکیت میں شامل ہیں، جبکہ اجتماعی اور قومی مفاد کے پیشِ نظر نقصانات کا خدشہ ہو، تو اہلِ بستی ''محکمۂ جنگلات'' سے منظور شدہ پرمٹ کو مسترد کرنے کے بھی مجاز ہیں۔

ان جنگلات کی شرعی حیثیت

اب ایسے جنگلات کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ از روئے شرع تین چیزیں تمام لوگوں میں مشترک ہیں تو ان چیزوں (گھاس، پانی اور آگ) کی طرح جنگلات بھی عام مشترک ہونا چاہئے، جبکہ بعض کے نزدیک یہ جنگلات ''ارضِ موات'' کے حکم میں ہوکر عام مشترک ہوں گے، ان دونوں دلیلوں کے پیشِ نظر ان کا خیال ہے کہ جنگلات میں انفرادی ملکیت یا مخصوص اہلِ بستی کی مشترکہ ملکیت کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا جنگلات کی رائلٹی کے حقدار تمام ملک کے مسلمان ہوں گے۔

مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلائل کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں، اس لئے کہ یہ جنگلات قیامِ پاکستان سے قبل تقسیم شدہ ہیں، اس وقت کی حکومت نے علاقوں کی حد بندی کے ساتھ جنگلات کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ جس بستی کے قریب جو جنگل واقع ہے وہ اس بستی والوں کے درمیان عام مشترک ہے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یا بستی والا اس تقسیم شدہ جنگل میں حقدار نہیں ہوسکتا، پھر ایسے تمام جنگلات کی حد بندی کی گئی ہے، ان کی سندات آج بھی حکومت کے پاس محفوظ ہیں، حکومت کے نزدیک اور محکمۂ جنگلات کے قوانین کے مطابق رائلٹی کے حقدار وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس بستی میں مستقل رہائش پذیر ہیں یا جن کی زمینیں اس بستی میں موجود ہیں، لہٰذا:

(۱)... یہ جنگلات تقسیم شدہ ہیں اور حکومت نے بھی اس حکم کو تسلیم کر کے برقرار رکھا ہے۔

(۲)... قدیم زمانے سے اہلِ بستی اپنی حدود کے جنگلات پر مالکانہ تصرف رکھتے ہیں۔

(۳)... عام قسم کے درخت والے جنگلات تمام علاقوں میں موجود ہیں، جو عام مشترک ہونے کے باوجود مخصوص اہلِ قریہ کے سوا کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو ان سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی، لہٰذا صرف تعمیراتی لکڑی والے جنگلات کو عام مشترک قرار دے کر مستثنیٰ کرنا خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ نقل بھی۔

(۴)... کسی بھی زمانے میں ملکیت کے ثابت ہونے سے ''ارضِ موات'' کے حکم سے خارج

ہوجاتے ہیں۔

(۵)...مباح اشیاء میں اشتراک کا مطلب یہ نہیں کہ تمام دنیا کے لوگوں میں حقِ لازم کی طرح مشترک ہوں، بلکہ اشتراک بقدرِ ضرورت اور بمطابق حصولِ منفعت مراد ہے۔ (دلائل آگے آرہے ہیں۔)

البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض علاقوں کے جنگلات میں ایسے درخت نہیں ہوتے جن پر رائلٹی کی منفعت حاصل ہوتو رائلٹی میں ایسے علاقوں کے لوگوں کا حق ہوسکتا ہے کہ نہیں؟ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے مشترکہ جنگلات موجود ہیں، جن سے وہ سوختہ وغیرہ حاصل کرتے ہیں، بقدرِ ضرورت عمارتی لکڑی بھی حاصل کرتے ہیں اوران کی ذاتی چراگاہیں بھی ہیں، جن میں وہ اپنے مال مویشی چراتے ہیں اور وہاں سے گھاس حاصل کرتے ہیں تو دوسرے تقسیم شدہ جنگلات کی منفعت کے بھی حقدار نہیں ہوسکتے، کیونکہ رائلٹی کے سوا دیگر مراعات میں تمام علاقے برابر ہیں۔

مباح اشیاء کی تقسیم

اب رہا یہ مسئلہ کہ کیا مباح اشیاء کی تقسیم یا مخصوص مشترکہ ملکیت کی صورت میں تقسیم درست ہے کہ نہیں؟ تو عرض یہ ہے کہ مباح اشیاء کی تقسیم از روئے شرع ممنوع نہیں، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (الزخرف: ۳۲)

''ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کردی ہے۔''

معاشی اُمور میں تقسیم کے ساتھ عام مباح اشیاء میں پانی بھی ہے، چنانچہ اس کی تقسیم کا ثبوت بھی قرآن میں موجود ہے۔

وَنَبِّئۡهُمۡ اَنَّ الۡمَآءَ قِسۡمَةٌ بَيۡنَهُمۡ كُلُّ شِرۡبٍ مُّحۡتَضَرٌ (القمر: ۲۹)

''اور انہیں خبر دے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم شدہ ہے، پس ہر ایک کو اپنی باری پر حاضر ہونا چاہئے۔''

ان آیات میں نص کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مباح اشیاء کی تقسیم درست ہے، مباح الاصل اشیاء

میں اشتراک کا مطلب بھی یہی ہے کہ بقدرِ ضرورت کوئی ان سے فائدہ اُٹھائے، اسی فائدے کے پیشِ نظر ان کی تقسیم اور تہایؤ جائز ہے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اپنی نہر کے پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اِسۡقِ یَا زُبَیۡرُ ثُمَّ اَرۡسِلۡهُ اِلٰی جَارِکَ

اے زبیرؓ! پہلے تم اپنی زمین سیراب کرو، پھر اپنے پڑوسی کے لئے پانی چھوڑ دو۔

اور یہ بھی فرمایا:

اِحۡبِسۡ حَتّٰی یَرۡجِعَ اِلَی الۡجُدُرِ

پانی کو روکے رکھو، یہاں تک کہ دیواروں تک پہنچ جائے۔

راوی کہتا ہے کہ اس کی حد پنڈلیوں تک تھی۔ (بخاری ۱/۳۱۷)[۱]

اسی طرح حقِ منفعت کے بارے میں سعید بن المسیبؒ کی ایک مرسل روایت ہے:

قَضٰی رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ أَنۡ یَّسۡقِیَ الۡأَعۡلٰی ثُمَّ الۡأَسۡفَلَ۔ (فتح الباری ۵/۳۸)[۲]

آنحضرت ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ پہلے اُوپر والے اپنی زمینوں کو سیراب کریں، پھر نیچے والے۔

ان توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباح اشیاء کی تقسیم خاص منفعت کے پیشِ نظر جائز ہے، ورنہ پانی کی نسبت کسی کی طرف ہونا، اپنی ضرورت پوری ہونے تک پانی روکے رکھنا، پانی والے کا پہلے اپنی زمینوں کو سیراب کرنا اور پانی کے قریب واقع زمین والے کا حق مقدم ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

تاہم جنگلات کا حکم اگرچہ گھاس، پانی اور آگ کی طرح نہیں ہے، مگر معاشی

---

(۱) کتاب المساقاة باب سکر الأنهار (طبع قدیمی کتب خانه)

(۲) فقضی رسول الله ﷺ للأعلی فالأعلی۔ فتح الباری کتاب المساقاة باب سکر الأنهار ج: ۵ ص: ۴۹ (طبع مکتبة الرشد)

امور میں جنگلات کی اہمیت اورافادیت کے پیشِ نظر بعض لوگ قیاس مع الفارق پر تلے ہوئے ہیں، موجودہ زمانے میں ایسے علاقوں میں ''ارضِ موات'' کا سلسلہ ہی ختم ہواہے، اورزمینیں، جنگلات، صحراءاور دیگر اشیاء یاتو حکومت کی ملکیت میں ہیں اوریاعوام کی۔

جبکہ زیر بحث مسئلہ عوام کی ملکیت والے جنگلات سے متعلق ہے، یہ جنگلات عوام کے قبضے اورملکیت میں چلے آرہے ہیں، اس لئے اہلِ بستی کی اجازت کے بغیران جنگلات سے نہ کوئی شخص تعمیراتی کام کی اورسوختہ لکڑی لے جاسکتاہے اورنہ ان جنگلات کی حدود میں کوئی مکان تعمیر کرسکتا ہے، جبکہ ہراہلِ قریہ کواپنی حدود کے جنگلات میں اس قسم کاتصرف حاصل ہے، لہٰذا ''**خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا**''[۱] کا مطلب یہ ہرگزنہیں کہ مباح اشیاء نہ تقسیم ہوسکتی ہیں اورنہ کسی بھی صورت میں کسی کی ملکیت میں آسکتی ہیں، بلکہ حسبِ استعداد انتفاع مراد ہے اورملک انتفاع کے لئے مانع بھی نہیں، جبکہ مباح اشیاء قبضے میں آنے کے بعد مباح نہیں رہتی ہیں، بلکہ محفوظ ہوجاتی ہیں جیسے سوختنی لکڑی مباح الاصل ہے، مگر قبضے میں آنے کے بعدان پرملکیت ثابت ہوتی ہے، مالک اسے فروخت کرسکتاہے، چنانچہ اسی آیت کے تحت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''پس چیزے کہ متعین بحقِ غیرشدہ وبسببے ازاسبابِ ملک کسی گشتہ، انتفاع بآن بغیراجازتِ صاحبِ حق روانہ باشد'' (تفسیر فتح العزیز، ص:۱۴۹)[۲]
>
> ''یعنی جوچیزکسی کے حق میں متعین ہوگئی اوراسبابِ ملکیت میں سے کسی سبب کی بناپرکسی کی ہوگئی، تومالک کی اجازت کے بغیرفائدہ اُٹھاناجائزنہیں ہوگا۔''

اس سے بھی واضح ہوتاہے کہ مباح اشیاء کی تملیک اورتقسیم جائزہے، کیونکہ ملک حقِ تصرّف کامقتضی ہے، لہٰذایہ بات درست نہیں کہ مباح اشیاء کی تملیک اورتقسیم جائزنہ ہو، جیساکہ بعض کاخیال ہے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۹)

(۲) ج: ۱، ص: ۱۹۰ (طبع: مطبع حیدری)

ارضِ موات

کتبِ فقہیہ میں موات کی مختلف تعریفیں آئی ہیں، لیکن سب کا ماحصل ایک ہی ہے، یعنی

"ما لا یعرف لها مالکٌ و هو الصحیح" (خلاصة الفتاوی: ۲/۴۰۰)[1]

ارضِ موات وہ زمین ہے جس کا کوئی مالک معلوم نہ ہو۔

یہی تعریف تقریباً ہدایہ، شرحِ وقایہ، ردالمحتار، عالمگیری وغیرہ میں موجود ہے، موات کا مطلب مردہ یعنی غیر آباد زمین ہے، موات کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ زمانۂ جاہلیت اور یا زمانۂ اسلام میں کسی کی ملک نہ ہو اور ایسی خراب ہو کہ عام زمین کی طرح اس سے انتفاع ممکن نہ ہو، اور نہ کسی بستی کے قریب ہو، ورنہ ایسی زمین اہلِ قریہ کی ضروریات میں سے ہو کر "موات" کے حکم سے خارج ہوجائے گی۔

لأن أهل القرية يحتاجون إلى ذلک الموضع لرعی المواشی أو غیره (شرح الیاس ص: ۲۵۸، طبع قدیم)[2]

اس لئے کہ اہلِ قریہ اپنے مویشی چرانے اور دوسری ضروریات کے سلسلے میں اس جگہ کے محتاج ہیں۔"

پھر اگر زمینیں تقسیم شدہ ہیں، چاہے مشترکہ ملکیت کی صورت میں بھی ہوں تو ایسی زمینوں اور مقامات کو "موات" نہیں کہتے ہیں، اور نہ ایسی زمینوں میں غیروں کا حق ہوسکتا ہے۔

وفی الکافی لو کانت مملوکة لمسلم أو ذمی لایکون مواتاً لأنه عرف مالکه (خلاصة الفتاوی ۲/۴۰۰)[3]

اور کافی میں ہے کہ اگر وہ زمین کسی مسلمان یا ذمی کی ملک ہو تو موات میں داخل نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس کا مالک موجود اور معلوم ہے۔

---

(۱) کتاب الشرکة الفصل الرابع فی الأرض الموات و إحیائها ج: ۴ ص: ۲۰۳ (طبع رشیدیه)

(۲) الموسوعة الفقهیة الکویتیة: ۲/۲۴۰، طبع وزارة الأوقاف والشؤن الاسلامیة، کویت۔

(۳) کتاب الشرکة الفصل الرابع فی الأرض الموات و إحیائها ج: ۴ ص: ۲۰۳ (طبع رشیدیه)

موجودہ زمانے کی زمینیں جنہیں بنجر جدید (FALLOWLAND) کہا جاتا ہے، وہ بھی موات سے خارج ہیں، کیونکہ ایسی زمینوں سے سال میں ایک فصل حاصل کی جاتی ہے، چاہے وہ مشترکہ ملکیت والی زمین کیوں نہ ہو، اس قسم کی زمینیں عام طور پر جنگلات کے درمیان ہی ہوتی ہیں، جبکہ پہاڑی علاقوں میں آج کل ''موات'' کا وہ قدیم دستور موجود نہیں رہا ہے، تمام علاقے، زمینیں اور جنگلات تقسیم ہو کر مِلک میں آچکے ہیں، آبادیوں کی کثرت کے سبب لوگ جنگلات اور پہاڑوں کے درمیان آباد ہوئے ہیں اور مسلسل منتقل ہوتے جارہے ہیں۔

ایسے حالات میں ان لوگوں کو جنگلات کی ملکیت سے محروم قرار دیکر ان کی منفعت (رائلٹی) کو بھی تمام دنیا کے مسلمانوں کے مابین مشترک قرار دینا کوئی شرعی تقاضا نہیں، بلکہ کسی کو اپنے گھر سے محروم کرنے کے مترادف ہے، یہ جنگلات اپنی تمام تر منفعت کے ساتھ صرف انہی لوگوں کے ملک ہوں گے جو اِن جنگلات والے علاقوں میں بستے ہیں، قریہ کے قریب بلکہ متصل واقع ہونے کی بناء پر حکومت یا کسی دوسرے شخص کو ایسے جنگلات میں مداخلت کرنا یا تصرف کرنا شرعاً بھی درست نہیں، صاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں:

ولا يجوز إحياء ما قرب من العامر، و يترك مرعى لأهل القرية و مطرحاً لحصائدهم لتحقق حاجتهم إليها حقيقتها أو دليلها. (هداية، ۴/ ۴۸۲)[۱]

علاقے کے قریب کی زمینیں آباد کرنا جائز نہیں، یہ زمینیں اہلِ قریہ کی چراگاہ کے طور پر اوران کے سوختہ حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دی جائیں گی، کیونکہ ان چیزوں کی طرف اہلِ قریہ کی ضروریات ثابت ہیں۔

اس عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مباح اشیاء میں اشتراک کا مطلب یہ ہے کہ اسی علاقے کے لوگوں کے درمیان عام مشترک ہوں، یہ نہیں کہ ہر علاقے والے دوسرے علاقے کے

(۱) ۴/ ۴۸۴ كتاب إحياء الموات (طبع مكتبة رحمانية)

باشندوں کے ساتھ تمام مباحات میں مشترک ہوکر حقدار ہوجائیں۔

اقطاعِ امام

ہمارے ہاں کی بعض زمینیں اور جنگلات ریاست کے دور میں تقسیم شدہ بھی ہیں، جبکہ بیشتر جنگلات قدیم الایام سے اہلِ بستی کی ملکیت ہوکر آپہنچے ہیں، پھر اسلامی ادوار میں بھی انہی علاقوں کے زیر اثر رہے ہیں، تاہم ریاست کے دور کے بعد بھی جدید حدود بندی کے ذریعے ہر علاقے کے جنگلات، چراگاہیں اور زمینیں تقسیم ہوچکی ہیں، ریاست کے دور میں ایک حد تک شرعی نظام بھی رائج تھا اور حکمران متشرع بھی گزرے ہیں، انہوں نے ہر بستی سے ملحقہ جنگلات کو اسی بستی والوں کے درمیان مشترک قرار دے کر انہیں ہر قسم کے تصرفات کا حق دیا۔ اور بعض جنگلات کو بشمول زمین بطور جاگیر بھی دئے ہیں۔

اب اگر غیر آباد اراضی اسلامی حکومت کی ملکیت بھی تسلیم کی جائے تب بھی شریعت میں یہ جائز ہے کہ امام المسلمین (حکمران) کسی غیر آباد زمین میں سے (جو اس کے پاس موجود ہو کسی کی ملک نہ ہو) کسی شخص یا قبیلے کو اس کا مالک بنادے، فقہی اصطلاح میں اسے ''اقطاع امام'' کہتے ہیں، یعنی حکومت کی طرف سے عطا کردہ جاگیر، عام ہے کہ چاہے وہ مخصوص ملکیت ہو، یا اہلِ قریہ کے درمیان عام اشتراک کے طور پر دی گئی ہو، ایسی صورت میں مالک کو مکمل تصرف کا اختیار ہوگا۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ اس کی یوں تشریح فرماتے ہیں:

> **والمراد به ما يخص به الإمام بعض الرعية من الأرض الموات فيختص به و يصير أولى بإحيائه ممن لم يسبق إلى إحيائه۔ (فتح الباری ۵/۴۷)**[1]
>
> اقطاعِ امام سے مراد وہ غیر آباد زمین ہے، جسے امام اپنی رعایا میں سے کسی کو عطا کرے، وہ اسی کے ساتھ مخصوص رہے گی، اور جن لوگوں نے ابھی تک اس کی آبادکاری نہیں کی، وہ ان سے زیادہ اس کے آباد کرنے کے حقدار ہونگے۔

---

(۱) ج: ۵ ص: ٦۵ كتاب المساقاة باب القطائع (طبع مكتبة الرشد)

شریعت میں ایسی جاگیریں دینے کا امام کو حق حاصل ہے، جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے:

ویملک الإمام إقطاع الموات (عالمگیری ۵/۳۸۶)[۱]

امام کو اختیار ہے کہ وہ غیر آباد زمین میں سے کسی کی ملکیت میں کوئی حصہ دے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

وللإمام أن يقطع كل موات و كل ما كان ليس لأحد فيه ملك و ليس في يد أحد و يعمل في ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين و أعم نفعاً۔

(رد المحتار ۳/۲۶۶)[۲] كتاب الخراج لأبي يوسفؒ ص ۶۶[۳])

امام کو چاہئے کہ وہ بنجر اور غیر مملوکہ زمینوں کو بطور جاگیر کسی کی ملک میں دیدے، اور اس معاملے میں وہ طریقہ اپنائے جس میں مسلمانوں کی بھلائی ہو اور سب کو فائدہ ہو۔

اس سے آگے جا کر مزید لکھتے ہیں:

ایسی تمام غیر آباد زمینیں بشمول میدانی، پتھریلی اور پہاڑی وغیرہ اقسام کی زمینیں، جن میں امام کو اقطاع (جاگیر دینے) کا اختیار حاصل ہو اور خلفاءِ راشدین میں سے کسی نے بطور جاگیر کسی کی ملکیت میں دی ہو تو بعد کے کسی خلیفہ یا حاکم کو اس حکم کے مسترد کرنے کا حق نہیں، اور وہ مالک کے قبضے سے نہیں لے سکتا، چاہے وہ اصل مالک کے وارث کے قبضے میں ہو یا اس سے کسی نے خریدی ہو۔ دونوں صورتوں میں صاحبِ ید مالک ہوگا۔ **(فلايحل لمن يأتي بعدهم من الخلفاء أن يردّ ذلك ولا يخرجه من يد من هو في يده وارث أو مشتر) (رد المحتار**

---

(۱) كتاب إحياء الموات الباب الأوّل في تفسير الموات (طبع رشيدية)

(۲) ۱۹۳/۴ كتاب الجهاد باب العشر والخراج والجزية ، مطلب في أحكام الإقطاع من بيت المال (طبع سعيد)

(۳) ص: ۱۴۱ "في موات الأرض في الصلح والعنوة "،(من احيا ارضا مواتا فهي له)(طبع دار الصلح)

(۱) ۳/۳۶۶ باب العشر والخراج)

صوبہ سرحد کے بیشتر جنگلات کا حکم بھی یہی ہے، کیونکہ قیامِ پاکستان سے قبل علاقے کے لوگوں میں حدود کے تعین کے ساتھ تقسیم کر کے ان کو مالک بنایا گیا ہے، اور یہ تقسیم اُس وقت کی حکومت کے حکم اور مرضی سے ہوئی ہے، لہٰذا اقطاع امام کا حکم ان پر صادق آتا ہے، اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی آج تک یہ حکم برقرار ہے، لہٰذا محض رائلٹی کی خاطر قدیم الایام سے قبضہ شدہ ملکیت کو باطل نہیں ٹھہرایا جا سکتا، فقہاءِ کرام نے یہ اُصول مقرر کیا ہے:

الأصل بقاء ما كان على ما كان (الأشباه والنظائر)[۲]

جو چیز قدیم زمانے سے جیسی تھی، اُسی طرح رہنے دی جائے گی۔

زمانۂ جاہلیت کی تقسیم

جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں کی کئی زمینیں اور جنگلات دورِ جاہلیت سے تقسیم شدہ ہیں، اگرچہ اُس وقت کی جغرافیائی وسعت اور موجودہ حدود بندی میں فرق بھی پایا جاتا ہے، مگر ہر علاقے سے ملحقہ جنگلات تب بھی علاقے کی حدود میں شامل تھے، اور اب بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ یہ جنگلات زیرِ بحث مسئلے میں شامل ہونے کی بناء پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "الإسلام يهدم ما كان قبله"[۳] کے مطابق دورِ جاہلیت کی تقسیم معتبر نہیں ہونی چاہئے۔

لیکن یہ دلیل اس لئے درست نہیں ہے کہ اس حدیث کا تعلق مباحات سے نہیں، بلکہ عقائد اور رسوماتِ باطلہ سے ہے، اس کے مقابلے میں حضور ﷺ کی صریح حدیث موجود ہے:

و كل ما قُسم في الجاهلية أو حازه إنسان في الجاهلية بوجهٍ من الوجوه

---

(۱) رد المحتار ۱۹۴/۴ كتاب الجهاد باب العشر والخراج والجزية، مطلب في أحكام الإقطاع من بيت المال (طبع سعيد)

(۲) شرح الحموی على الأشباه والنظائر ۱۸۷/۱، الفن الأوّل في القواعد الكلية، النوع الأوّل القاعدة الثالثة: اليقين لا يزول بالشك۔ (ط۔ نشاط)

(۳) مشكوٰة كتاب الإيمان الفصل الأوّل ص: ۱۴ (ط۔ قديمی)

فهو علیٰ ما کان لا ینقص۔ (حجة الله البالغة (اردو) ص: ۱۸۰)[1]۔

اور جو شے زمانۂ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی یا وہ کسی نہ کسی طرح کسی شخص کے قبضے میں آ گئی ہو، وہ بدستور اپنے حال پر باقی رہے گی، اسے ختم نہیں کیا جائے گا۔

نیز فقہاء کا یہ اصول بھی مدنظر رہے:

القدیم یترک علی قدمه[2]

جب جنگلات کا حکم ازروئے شرع باقی رہا تو جنگلات کے منافع بھی ملکیت کے ساتھ باقی رہیں گے۔

ضروریاتِ اہل بلد

قدیم زمانے میں جنگلات بستی سے کچھ فاصلے پر بھی ہوتے تھے، مگر آج کل آبادی کی کثرت کے باعث دیہات کے لوگ پہاڑوں پر اور جنگلات کے وسط میں گھر بسائے ہوئے ہیں، ایسی صورت میں ''احیاء موات'' کا حکم بھی اس پر صادق آتا ہے، تاہم ضروریاتِ اہلِ بلد ایک مستقل دلیل ہے کہ جس بستی میں لوگ رہتے ہیں، وہاں ان کے قریب کا علاقہ چاہے غیر آباد ہو یا جنگل، ان کی ضروریات میں شامل ہوگا، ازروئے شرع نہ حکومت کو اس پر تصرف کا حق ہے اور نہ کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو اس حدود کے اندر مداخلت کی اجازت ہے، اس کے فقہی دو حوالے پہلے گزر چکے ہیں۔ (دیکھئے: ہدایہ ۴/۴۸۰)[3] وشرح الیاس ص: ۲۵۸[4]۔

علماء کا فتوی بھی اسی پر ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے:

و کذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لأهلها و مرعی لهم لا یکون مواتاً، حتی لا یملک الإمام إقطاعها۔ (عالمگیری

---

(۱) حجة الله البالغة(عربی) ۱/۲۴۳ باب اقامة الارتفاقات و اصلاح الرسوم(طبع قدیمی)

(۲) الدر المختار ج: ۲ ص: ۴۴۴ (طبع سعید)

(۳) هدایة: کتاب احیاء الموات، ۴/۴۸۴، طبع مکتبة رحمانیة۔

(۴) الموسوعة الفقهیة الکویتیة: ۲/۲۴۰، طبع وزارة الأوقاف والشؤون الاسلامیة، کویت۔

۳۸۶/۵)[1]

اسی طرح بستی سے باہروہ علاقے جن سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، وہ بستی والوں کے سوختہ حاصل کرنے کی جگہ اور چراگاہیں ہیں، ارضِ موات (بنجر زمینوں) میں داخل نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ امام (حکمران) کو بھی اس میں سے کسی کو جاگیر دینے کا اختیار نہیں۔

کیونکہ موات کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ کسی کی ملک نہ ہو اور اس سے فائدہ نہ اُٹھایا جاتا ہو، ورنہ موات کا حکم سرے سے ہوگا ہی نہیں۔ (فإن الموات اسم لما لا ينتفع به[2]) جب حکومت کو ہی حقِ تصرف حاصل نہیں تو دوسرے لوگوں کو کیونکر یہ حق پہنچے گا؟

خودرَو درختوں کا حکم

ایک اہم نکتہ معترضین کی طرف سے یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ جنگلات کے درخت خودرَو ہیں، انہیں کسی نے لگایا نہیں، لہٰذا یہ کسی کی ملک میں نہیں آسکتے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جنگلات بستی سے متصل ہونے کی بناء پر اہلِ بستی کی ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں، بستی والے وہاں سے سوختہ لکڑی حاصل کرتے ہیں، مویشی چراتے ہیں اور گھاس وغیرہ حاصل کرتے ہیں، لہٰذا ایسے جنگلات یقیناً بستی والوں کے درمیان مشترک ہوں گے، لیکن پوری دنیا کے مسلمانوں کا اشتراک تو ثابت نہیں ہوتا، علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

وقال ابن بطال إباحة الاحتطاب في المباحات والاختلاء من نبات الأرض متفق عليه حتى يقع ذلك في أرض مملوكة فترتفع الإباحة ووجهه أنه إذا ملك بالاحتطاب والاحتشاش فلأن يملك

---

(۱) كتاب إحياء الموات الباب الأوّل في تفسير الموات (طبع رشيدية)

(۲) بدائع الصنائع ج:۱۴/ص: ۷۲(طبع دار الكتب العلمية بيروت)

وكذا في الفتاویٰ الهندية كتاب احياء الموات الباب الاول ج: ۵ ص: ۳۸۶ (طبع رشيدية)

بالإحياء له أولٰی۔ (فتح الباری ۵/۴۷۔)[1]

ابنِ بطالؒ فرماتے ہیں کہ مباحات میں سے سوختہ لکڑی حاصل کرنے اور زمین کی نباتات سے شربت اور میٹھا میوہ حاصل کرنے کا جواز متفق علیہ ہے، جب یہ چیزیں کسی کی ذاتی زمین میں ہوں تو جواز کا حکم اُٹھ جائے گا (اور بلا اذنِ مالک انتفاع جائز نہیں ہوگا)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص سوختہ لکڑی حاصل کرنے اور گھاس لینے کا مالک ہوا تو وہ اس زمین کے آباد کرنے کا بدرجۂ اولیٰ حقدار ہوگا۔

دوسری صورت میں مصالحِ عامہ کی خاطر ایسے پہاڑی علاقوں کو حکومت کسی کی ملک میں دے سکتی ہے جو غیر آباد ہوں اور ان میں خودرَو درخت موجود ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری اہلِ بستی پر بھی عائد ہوگی کہ وہ شب وروز وہاں قیام کرتے ہیں، ایسے جنگلوں کی حفاظت بہتر طریقے سے کرسکیں گے، چنانچہ علامہ ابوبکر جابر الجزائری لکھتے ہیں:

يلحق بالقياس ما تحميه الدولة من بعض الجبال لتنمية الأشجار فى الغابات فينظر فى ذلک فإذا كان يحقق مصلحة راجحة للمسلمين أقرت الحكومة على ذلک۔ (منهاج المسلم ص: ۳۵۲)[2]

احیاءِ موات (آبادکاری) کے حکم میں قیاس کے لحاظ سے وہ پہاڑیاں بھی شامل ہوں گی جنہیں ریاست حفاظت کے پیشِ نظر کسی کو دیتی ہے، تاکہ جنگل کے درخت نشوونما پاسکیں، اس بارے میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر اس میں عام مسلمانوں کے لئے کوئی واضح مصلحت متحقق ہوتی ہو تو یہ حکم برقرار رہے گا۔

ظاہر ہے کہ مصلحت اسی میں ہے کہ جنگلات بستی والوں کی ذمہ داری کے تحت ہوں، اگر بالفرض جنگلات حکومت کے قبضے میں ''موات'' کی صورت میں ہوں تو انہیں عام مسلمانوں میں مشترک کرنے سے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا مالک ہوگا۔اس طرح بہت ہی قلیل عرصے

---

(۱) كتاب المساقاة باب بيع الحطب والكلاء جـ۵ ص: ۶۵ (ط۔ مكتبة الرشد)

(۲) ص: ۴۳۳ طبع دار زاهد القدسى

میں جنگلات کا صفایا ہوگا جیسا کہ ہمارے ہاں کے بعض ایسے جنگلات کا یہی حشر ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں مخصوص اہلِ قریہ کے درمیان مشترک قرار دینے سے بستی والے اپنے مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔

تاہم یہ ایسی صورت میں ہے کہ جنگلات ''ارضِ موات'' کی صورت میں حکومت کے پاس موجود ہوں، ورنہ زیر بحث جنگلات عوام کے قبضے اور ملک میں ہیں، بلکہ کسی بھی علاقے میں آج کل بیت المال یا سرکار کے ذاتی جنگلات اس قسم کے موجود نہیں رہے ہیں۔ بستی والے جس طرح سوختہ وغیرہ حاصل کرتے ہیں اور وہاں مکان بناتے ہیں اور حکومت بھی اس مالکانہ تصرف کو تسلیم کرتی ہے تو ایسے جنگلات کے خودرَو درخت مملوکہ زمین کے ہوئے، ان درختوں کے مالک اسی بستی والے ہوں گے۔ زمین کی ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ اہلِ قریہ خود وہاں مکان وغیرہ تعمیر کرسکتے ہیں، جہاں یہ خودرَو درخت پائے جاتے ہیں، لیکن دوسرے علاقے کے لوگوں کو وہاں سے سوختہ لکڑی بلا اجازت لے جانے اور کسی بھی نوعیت کا مکان تعمیر کرنے کی کوئی اجازت نہیں اور نہ حکومت وہاں کوئی سرکاری مکان بلا رضامندیٔ اہلِ قریہ تعمیر کرسکتی ہے، لہٰذا جب درختوں کے نیچے زمین اہلِ قریہ کی ملک ہوئی تو درخت کس کی ملک ہوں گے؟ اور یہ اصول ہے کہ

من ملك شيئا ملك ما هو من ضروریاته [۱]

جو شخص کسی چیز کا مالک ہوا، وہ اس کے لوازمات کا بھی مالک ہوگا۔

نیز یہ کہ:

إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه [۲]

جب ایک چیز ثابت ہوجائے، تو وہ اپنے لوازمات کے ساتھ ثابت ہوگی۔

لہٰذا بستی کی ملکیت اور درختوں کے نیچے زمین کی ملکیت تقاضا کرتی ہے کہ خودرَو درخت بھی

---

(۱) قواعد الفقه للبركتي، الرسالة الثالثة القواعد الفقهية ج: ۱ ص: ۲۶۔(طبع دار النشر) (طبع الصدف پبلشرز)

(۲) فإن الشيء إذا ثبت ثبت بلوازمه، العناية شرح الهداية فصل فى قضاء المرأة ج: ۱۰ ص: ۲۹۰ (الصدف پبلشرز)

ملکیت میں داخل ہوں، کیونکہ زمین کی ملکیت مقدم ہے اورخودرَو درخت ملک کے اندر پیدا ہوئے ہیں، اس لئے ایسے درخت تقریباً پچیس سال کے عرصے میں قابلِ قطع ہوتے ہیں۔

علامہ محمد خالد عطّاسؒ فرماتے ہیں:

الأشجار النابتة بلا غرس فی ملک واحد هی ملکه لیس للآخر أن یحتطب منها إلا بإذنه فإن یفعل یکن ضامنا۔ (شرح المجلة ۱۸۲/۴ مادة ۱۲۴۴)[۱]

بغیر پودا لگائے جو درخت کسی کی مملوکہ زمین میں پیدا ہوتے ہیں، وہ اس شخص کی ملک شمار ہوں گے۔ کوئی دوسرا شخص اس مالک کی اجازت کے بغیر وہاں سے سوختی لکڑی حاصل نہیں کرسکتا۔ اگر اس نے بلا اجازت ایسا کیا تو ضامن ہوگا۔

خودرَو درختوں کے متعلق یہ عبارت نہایت تسلی بخش ہے۔

اسبابِ ملکیت

اب مباح اشیاء کی ملکیت کی صورتوں سے متعلق وضاحت ضروری ہے، یہ اس لحاظ سے کہ اگر تمام چیزوں کو مباح الاصل تسلیم کیا جائے تاکہ اس دلیل کہ "الأصل فی الأشیاء الإباحة"[۲] کی وضاحت ہوسکے۔

اس ضمن میں پہلی بات یہ ذہن میں رہے کہ مذکورہ بالا اصول کے ساتھ فقہاء کا یہ اصول بھی مدنظر رہے "الأصل فی الأشیاء الإحراز"[۳] دونوں کے تقابل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عام چیزیں من وجہٍ مباح ہیں اور من وجہٍ محفوظ ہیں، کتبِ فقہ اور فتاوی میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں،

---

(۱) الباب الرابع فی بیان شرکة الإباحة الفصل الأول (ط۔حبیبیه کوئٹه)

(۲) شرح الحموی علی الأشباه والنظائر ۲۰۹/۱ ، الفن الأوّل فی القواعد الکلیة ، النوع الأوّل القاعدة الثالثة : الیقین لا یزول بالشک۔ (ط۔ نشاط) وکذا فی الشامیة کتاب الجهاد باب استیلاء الکفار ۱۶۱/۴ (ط۔ سعید)

(۳) سائر الأشیاء المباحة لا تکون مالا متقوما قبل الاحراز وبعد الاحراز تصیر مالا متقوما الخ المحیط البرهانیج: ۴ص: ۴۳۷(طبع دار احیاء التراث بیروت)

اسی بناء پر علماء نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ مباح اشیاء کی تملیک کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں اور کیا نہیں؟ بالخصوص مرقاۃ اور عالمگیری میں اس کی کئی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

اس لئے مباح اشیاء مسلمانوں میں مشترک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں یکساں مشترک ہوں، مثلاً عرب ممالک میں اگر پٹرولیم کی رائلٹی ملتی ہو تو یہ لازم نہیں کہ وہ رائلٹی دوسرے ممالک کے مسلمانوں میں بھی مشترک قرار پائے۔ اور سارے مسلمان رائلٹی کا مطالبہ کرنے لگیں، بلکہ مباحات میں اشتراک کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ملک میں نہ ہو، تو بقدرِ ضرورت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ اگر وہ اس کا اہل ہو، ورنہ یہ رعایت بھی ہر کسی کے لئے نہیں ہے۔

تاہم یہ بات بھی یاد رہے کہ جنگلات اگر بالفرض مباح بھی ہوں تو رائلٹی کیونکر مباح ہوسکتی ہے؟ کہ یہ اصل چیز نہیں بلکہ منفعت اور عوض ہے اور شریعت میں جو شخص مباح چیز فروخت کر کے عوض حاصل کرے وہ اس کی ملک ہوگی، پھر بھی جنگلات کی رائلٹی پٹرولیم کی طرح مستقل چیز نہیں، اور نہ ہمیشہ رائلٹی حاصل کی جاسکتی ہے، بلکہ پچیس سال میں ایک دفعہ اس غرض سے جنگل کی کٹائی ہوتی ہے اور اتنی مدت تک بستی والے تو اپنے مالکانہ تصرف کے ذریعے جنگل سے رائلٹی کے سوا دیگر تمام فوائد حاصل کرتے ہیں، لیکن اس دوران کوئی غیر شخص نہ اس میں تصرف کرسکتا ہے اور نہ بلا اجازت لکڑی وغیرہ حاصل کرسکتا ہے، اس لئے کہ ہر بستی والوں کے ایسے الگ الگ محفوظ جنگلات ان ہی میں عام مشترک ہوکر موجود ہیں، جن سے وہ رائلٹی کے علاوہ دوسری مراعات حاصل کرتے ہیں۔

اگر ایسے تمام جنگلات کو ''ارضِ موات'' کے حکم میں شامل سمجھا جائے، تب بھی از روئے شرع اگر آباد کئے جائیں تو ملکیت میں داخل ہوتے ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من أحيا أرضاً ميتة فهي له (بخاری ۱/۳۱۴)[۱]

جس نے غیر آباد زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہوگی۔

زمین کی آبادکاری کی مختلف صورتیں ہیں، اس کی آبادکاری بھی اسی کے مناسب ہوگی، مثلاً نہر نکالنا، ہل چلانے کے قابل بنانا، دیوار وغیرہ کے ذریعے سے گھیر لینا، کوئی عمارت تعمیر کرنا، پودے

(۱) أبواب الحرث المزارعة باب من أحيا أرضا مواتاً (طبع قديمی)

لگاناوغیرہ۔ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے:

من أحاط حائطا على الأرض فهو له. (ص: ۲۵۹)[1]

جس نے بنجر زمین کے گرد احاطہ کیا، وہ اسی کی ہوگی۔

وتفسير الإحياء أن يبنى عليها أو يغرس أو يكريها أو يسقيها

(مجموعه الفتاوی ۲/ ۴۰۱)

آباد کرنے کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں کوئی مکان بنایا، یا کوئی درخت لگایایا کھیتی باڑی کی، اور یا نہر نکالی۔

اسی طرح جو زمینیں پتھریلی اور پہاڑی ہوں، ایسی زمینیں قابلِ کاشت نہیں ہوتیں، ان کا احیاء بھی انہی کے مناسب ہوگا، مثلاً عمارت بنا کر، حدود مقرر کر کے اور فضول درختوں اور پودوں کو کاٹ کر آباد کیا جاسکتا ہے۔اس سے بھی ملکیت ثابت ہوگی۔

ولو كان أجمة أو غيضة قطع قصبها أو أشجاره فسواها فهو إحياء، كذا في الغياثية. (عالمگیری ۳۸۷/۵)[2]

اگر جنگل کے درخت گھنے ہوں، یا بہت گنجان ہوں توان کی شاخ تراشی کی، یا درختوں کو کاٹا اور درست کیا تو یہ آباد کرنے کے مترادف ہوگا۔

ملاعلی قاریؒ تملیکِ موات پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیتے ہیں:

قال الطيبي رحمه الله: كفى به بياناً قوله: أحاط فإنه يدل على أنه بنى حائطا مانعاً محيطاً بما يتوسطه من الأشياء نحو أن يبنى حائطا لحظيرة غنمٍ أو زريبة للدواب. (مرقاة ۶/ ۱۴۳)[3]

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا قول "أحاط حائطا"[4] کہنا ہی

(۱ و ۴) سنن ابی داؤد باب إحياء الموات والشرب ج: ۱ ص: ۲۵۹ (طبع قديمی)

(۲) كتاب إحياء الموات، الباب الأول فی تفسير الموات (ط. رشيديه)

(۳) كتاب البيوع، باب احياء الموات والشرب، الفصل الثانی، ۱۷۲/۶، (طبع عثمانیۃ)

تملیک کی وضاحت کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ احاطہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے اس حدود کے اندر موجود تمام اشیاء کو اس طرح محفوظ کیا کہ وہ اشیاء مکمل طور پر احاطے میں داخل ہوگئیں اور احاطے کی دیوار دوسروں کی مداخلت سے مانع اور محیط بن گئی، مثلاً بکریوں کے باڑے کے لئے دیوار کھڑی کی، یا چوپایوں اور مویشیوں کے لئے باڑا بنایا۔

اسبابِ تملیک اور احیاء کی یہ تمام صورتیں زیر بحث جنگلات میں پائی جاتی ہیں کہ ان میں مال مویشیوں کے لئے باڑے بھی موجود ہیں، حدود کے بیان کے ساتھ ان کی تقسیم کے سندات موجود ہیں، وہاں کے لوگ جنگلات میں دیگر مالکانہ تصرف رکھتے ہیں۔

علامہ نواب صدیق حسن خانؒ ذرا تفصیل سے بیان فرماتے ہیں کہ:

"اگر کسی قبیلے والوں کی ملک میں ارضِ موات ہو اور وہ اس کے بارے میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوں اور اس میں کوئی اختلاف نہ ہو اور ان لوگوں کے پاس ملکِ ید (قبضہ) کے سوا کوئی ثبوت موجود نہ ہو تو ان کے دعویٰ کی تصدیق کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ کیا وہ جاگیر گذشتہ ادوار میں بھی ان کے قبضے میں تھی، یا کسی قوم سے خریدی گئی ہے یا تملیک کے انواع میں سے کسی دوسری نوعیت کی ہے۔

فإن كان الأول فلا شك أن دعوى الملك صحيحة واليد الحكمية يثبت بها الأصل والظاهر فلا تُقبل من الغير دعوى تخالف ذلك إلا ببرهان شرعي (ظفر القاضي بما يجب في القضاء على القاضي ص: ١٢٦)[١]

اگر پہلی صورت ہے (یعنی قبیلے کے قبضے میں ہمیشہ سے رہی ہو) تو بلاشبہ ان کا دعویٰ درست ہے اور قبضے میں ہونے سے بنیادی اور ظاہری ملکیت ثابت ہوگی۔ پس بلادلیلِ شرعی مخالف کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔

---

(١) ص: ٢٦٩ و ٢٧٠ (طبع دار ابن حزم بيروت)

اسبابِ ملک کی ان توضیحات کے پیشِ نظر جنگلات کا مسئلہ واضح ہوتا ہے، لہٰذا قدیم ملک کو اسی حال میں رہنے دی جائے گی، کیونکہ فقہاء کا یہ اُصول ہے:

ما ثبت بزمان یحکم ببقائه ما لم یوجد دلیل علی خلافه[1]

جو چیز کسی زمانے میں ثابت ہو تو اس کی بقاء کا حکم لگایا جائے گا، جب تک کوئی دلیل اس کے خلاف موجود نہ ہو۔

ذاتی جنگلات

اسلام نے اگرچہ اکتناز اور احتکار (ذخیرہ اندوزی) سے منع فرمایا ہے، لیکن ذاتی اور شخصی ملکیت کو سرے سے ختم نہیں کیا ہے، تاہم انفرادی ملکیت کو اجتماعی مفاد کے زیر اثر رکھ کر محدود فرمایا اور از روئے حدیث "لا ضرر و لا ضرار"[2]
(نہ خود نقصان اُٹھانا اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچانا) کے اُصول کے تحت عمومی مصلحت اور مفادِ عامہ کی خاطر شخصی ملکیت کو اجتماعی مفاد کے لئے ممد و معاون قرار دیا۔ پھر انفاق اور تعاون کے فضائل بیان کر کے قومی معیشت کا توازن برقرار رکھنے کا اہم ذریعہ بنایا۔

اگر جنگلات اور دیگر مباحات میں مصلحت کا کوئی پہلو نمایاں نہ ہوتا تو اسلام ایسے معاملات میں شخصی ملکیت کو کبھی تسلیم نہیں کرتا، اور نہ کوئی حکومت اس فیصلے کو برقرار رکھتی۔

ہمارے ہاں ذاتی جنگلات کی دو صورتیں ہیں، ایک وہ جنگلات جو کسی خاص بستی والوں کے درمیان جغرافیائی حد بندی کے ذریعے تقسیم شدہ ہیں، یہ جنگلات انہی اہلِ قریہ کے درمیان عام مشترک ہونے کے ساتھ ان کی ذاتی ملکیت میں شامل ہیں اور عرفِ عام میں بھی یہ جنگلات انہی بستی والوں کی طرف منسوب ہیں کہ فلاں بستی والوں یا فلاں بستی کے جنگلات۔

دوسری صورت میں وہ جنگلات ہیں جن میں اکثر تعمیراتی کام آنے والی لکڑیوں کے

---

(۱) شرح القواعد الفقهية ج: ۱ ص: ۱۲۱ (طبع دار القلم دمشق) و قواعد الفقه للبركتي ج: ۱ ص: ۲۳ (طبع صدف پبلشرز)

(۲) عن أبي سعيد سعد بن سنان الخدريؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا ضرر و لا ضرار، حديث حسن رواه ابن ماجه والدار قطني وغيرهما مسندًا و رواه مالك في المؤطأ مرسلاً الخ.

درخت نہیں ہوتے، بلکہ چوپایوں اور مویشیوں کے کھانے کے قابل پودے، درخت اور گھاس وغیرہ ہوتی ہیں، ایسے جنگلات سے سوختہ لکڑی بھی حاصل کی جاتی ہے، اس قسم کے بیشتر جنگلات ذاتی ملکیت میں شامل ہوتے ہیں، یعنی کسی خاص خاندان کے افراد کی موروثی ملکیت ہوتے ہیں، اس حدود کے اندر اگر کوئی قیمتی پتھر یا کوئی معدن نکل آئے، وہ اسی شخص کی ذاتی ملکیت شمار ہوکر اسے مالکانہ تصرف کا حق پہنچتا ہے اور حکومت اس سے صرف برآمد کرنے کی صورت میں ٹیکس لیتی ہے۔

شریعت نے ایسی شخصی ملکیت کی اجازت دی ہے، چنانچہ مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی دلائل کے ساتھ اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا قول باطل لا عهد به للمسلمين منذ عهد الصحابةؓ إلى عصرنا الحاضر — وأن مجرّد خلوّ القرآن والسنة عن هذه الأحكام لدليل قاطع على أن الإسلام لم يأمر بإلغاء الملكية الشخصية أبدا۔ (تكملة فتح الملهم ۱/۴۴۵)[۱]

(شخصی ملکیت نہ ہونے کا نظریہ) بالکل غلط ہے، مسلمانوں کے نزدیک عہدِ صحابہؓ سے موجودہ دور تک اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ (آگے جاکر فرماتے ہیں) قرآن وحدیث کا ان احکامات کے بیان سے خالی ہونا ہی اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کے باطل ہونے کا کبھی بھی حکم نہیں دیا ہے۔

جب شخصی ملکیت اسلام میں تسلیم کی گئی ہے تو مِلک کے اندر جو کچھ بھی ہو، سب کا مالک بھی وہی ہوگا، چاہے وہ جنگلات ہوں یا کان وغیرہ۔ نیز فرماتے ہیں:

و إن مالك الأرض يملكها بجميع ما في بطنها من حجارة أو معادن و غير ذلك۔ (تكملة فتح الملهم، ج: ۱ ص: ۶۷۵)[۲]

زمین کا مالک ان تمام چیزوں کا بھی مالک ہوگا جو اس زمین کے اندر موجود ہوں،

---

(۱) كتاب البيوع مسئلة ملكية الأرض (طبع مكتبة دار العلوم كراچی)

(۲) كتاب المساقاة باب تحريم الظلم وغصب الأرض (طبع مكتبة دار العلوم كراچی)

مثلاً قیمتی پتھر اور کانیں وغیرہ۔

خود آنحضرت ﷺ نے بعض کانوں کو بطور جاگیر بھی کسی کی ملکیت میں دی ہے۔ اور بسا اوقات منفعتِ عامہ کی خاطر واپس لے کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ تاہم بلالؓ بن الحارث المزنی کو جو کان بطور جاگیر دی گئی تھی، اس کے متعلق راوی کہتا ہے کہ:

فتلک المعادن لا یؤخذ منها إلا الزکوة إلی الیوم

(أبو داؤد، ۲/۷۹)[۱]

ان کانوں سے سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ زکوٰۃ لینے کی صورت میں وہ معدن کسی کی ملکیت میں ہونا ضروری ہے، ورنہ زکوٰۃ کے بجائے ٹیکس وغیرہ کا حکم ہوتا، وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملک شرط ہے۔

چراگاہیں

جنگلات کے ساتھ چراگاہوں کا ذکر بھی اس حیثیت سے ضروری ہے کہ اکثر جنگلات چراگاہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، چراگاہ کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اسلام سے پہلے بھی چراگاہوں کا ثبوت ملتا ہے اور بعدِ اسلام بھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ذاتی چراگاہ مقرر کرنے سے منع فرمایا:

لا حمی إلا لله ولرسوله (بخاری، ۱/۳۱۹)[۲]

چراگاہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں۔

اس حدیث پر دو پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ آپ ﷺ نے چراگاہ مخصوص کرنے سے کیوں منع فرمایا؟ دوسرا یہ کہ چراگاہ آپ ﷺ کے دور میں کس ضرورت کے تحت حکومت کی ملکیت میں ہوتی تھی، اگر اسلام سے پہلے کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت کے امراء اور سردار اپنے اپنے لئے شاداب اور زرخیز علاقوں کو ناجائز طور پر مخصوص کر کے چراگاہ

---

(۱) کتاب الخراج والفیء والأمارة، باب فی إقطاع الأرضین ج: ۲ ص: ۷۹ (طبع سعید)

(۲) کتاب المساقاة باب لا حمی إلا لله (طبع قدیمی)

بناتے تھے، اوراُن میں صرف اپنے ذاتی مویشیوں کو چراتے تھے۔ دوسرے لوگوں کے مویشیوں کو وہاں نہیں چھوڑتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں کے مفاد کے پیشِ نظر اس ظالمانہ دستور کو ختم کرنے کا حکم دیا، اور چراگاہ لینے کے حق کو اللہ اور رسول کے ساتھ مختص فرمایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت جہاد میں گھوڑے، اُونٹ، خچر وغیرہ کام آتے تھے، بیت المال کے ایسے تمام جانوروں اور مویشیوں اور مجاہدین کے جہادی مویشیوں کے پالنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اسلام میں ایسے تمام معاملات میں خرچہ بیت المال سے ہی ادا کیا جاتا ہے، اسی ضرورت کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چراگاہوں کو اپنے قبضے میں لے کر بیت المال کے چوپایوں کے لئے مخصوص فرمایا۔

بایں ہمہ بعض مالدار لوگوں کی چراگاہیں ہوتی تھیں، اور بعض کے باغات اور افتادہ زمینوں سے ان کی یہ ضرورت پوری ہوتی تھی، پھر بھی جن کی ضرورت اپنی جاگیروں سے پوری نہیں ہوتی، تو بیت المال کی چراگاہوں میں مال مویشی چَرانے کی اجازت ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے دورِ خلافت میں اپنے آزادشدہ غلام ''ہنی'' کو سرکاری چراگاہ پر نگران بنایا تو فرمانے لگے: اے ہنی! خبردار! اپنے بازوؤں کو لوگوں سے سمیٹے رکھ۔ اور مظلوم کی بددعا سے پرہیز کر۔ اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے۔ تو میری اس قائم کردہ چراگاہ میں بکریوں اور دیگر چوپایوں کے ریوڑ والوں کو اجازت دے کہ وہ چراگاہ میں چرا سکیں۔ اور عثمان بن عفانؓ اور ابن عوفؓ کے چوپایوں کی پروانہ کر۔ اس لئے کہ اگر ان کے چوپائے ہلاک بھی ہوجائیں تو وہ مدینہ میں اپنے کھجوروں کے باغ اور زمین کی کاشت سے فائدہ اٹھالیں گے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام ص: ۲۰۹، بحوالہ کتاب الخراج ص: ۱۰۵)[1]

لیکن موجودہ دور میں وہ مصالح ہی باقی نہیں رہے جن کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چراگاہ لینے سے منع فرمایا تھا، آج کل وہ ضروریات عام طور پر گاڑیوں، جہازوں اور ٹینک وغیرہ سے پوری ہوتی ہیں، اگرچہ پہاڑی علاقوں میں حکومت فوجی ضرورت کے پیشِ نظر چوپائے رکھتی ہے، مگر ان کی

---

(۱) طبع دار الاشاعت کراچی۔

ضرورت کے بقدر جنگلات اور چراگاہیں حکومت کے پاس ضرور ہوتی ہیں، باقی چراگاہوں کو عوام کی ضرورت کی خاطر حلقہ بندی کے ذریعے اپنی رضامندی کے ساتھ تقسیم کی ہے، بلکہ قیامِ پاکستان سے قبل کی حکومت نے اس طرح حلقہ بندی کی ہے، اب حکومت اور عوام اپنی اپنی چراگاہوں کے مالک ہیں اور عوام اپنے اپنے حلقوں کی چراگاہوں کے شریک مالک ہیں۔ اور وہاں دوسرے حلقے کے لوگوں کو بلا اجازت اپنے چوپائے چرانے سے منع کرنے کے مجاز تصور کئے جاتے ہیں۔

ذاتی چراگاہیں

چترال میں بعض شخصی چراگاہیں بھی ہیں، جو بعض مخصوص لوگوں کی ملکیت میں قیامِ پاکستان سے قبل رہتی آئی ہیں، ان میں بہترین قسم کی سبزہ زار اور شاداب چراگاہیں اور تعمیراتی ضروریات کے درختوں کے جنگلات بھی شامل ہیں، جن پر بلاشرکت غیرے وہ قابض ہیں اور کسی دوسرے کو وہاں سے انتفاع کی اجازت نہیں ہوتی۔ نیز رائلٹی کے حقدار بھی وہی مخصوص طبقہ ہوتا ہے۔ یہ غالباً ایسی چراگاہیں ہیں جن سے اسلام نے منع فرمایا، چنانچہ محدثین فرماتے ہیں:

> كانت رؤساء الأحياء في الجاهلية يحمون المكان الخصيب لخيلهم وإبلهم وسائر مواشيهم فأبطله -صلى الله عليه وسلم- ومنعه أن يحمي إلا الله ورسوله۔ (مرقاة المفاتيح ۱۴۰/۶)[۱]
>
> دورِ جاہلیت میں عرب کے سردار لوگ اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور دیگر مویشیوں کے لئے زرخیز زمین کو گھیر کر چراگاہ بناتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو ختم کیا اور اس (طرح خاص کرنے) سے منع فرمایا کہ چراگاہ کی حد بندی کا حق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔

اسی طرح کے ایک اور ظالمانہ دستور کا پتہ چلتا ہے، جس کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی چراگاہ مخصوص کرنے کا سدّ باب کیا، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''النہایۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

(۱) کتاب البیوع، باب احیاء الموات والشرب: ۱۶۸/۶، الفصل الاول (طبع عثمانیہ)

کہ دورِ جاہلیت میں جب امیر لوگ کسی شاداب مقام پر اُترتے تھے تو وہاں کتّے سے بھونکواتے تھے، پھر اس مقام کو ''حمی مدعوالکلب'' (وہ چراگاہ جس پر کتے نے بھونکا ہے) کہتے تھے۔ اور اس چراگاہ میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے تھے، جبکہ وہ خود قوم کے ساتھ ان کی چراگاہوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی ذاتی چراگاہوں سے منع فرمایا۔ (مرقاۃ ۱۴۰/۶)[1] فتح الباری ۴۴/۵[2]۔

اسلام اس قسم کی چراگاہوں اور جاگیروں کو ذاتی مفاد کے لئے حد بندی کرنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ یہ مسلمانوں کی عام منفعت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کی قبضہ شدہ املاک کے بارے میں حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کی تحقیق کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

سلطنتِ اسلامیہ کے ضعف کے وقت میں بعض ظالم وغاصب لوگوں نے اصل مالکانِ اراضی کو جبراً ان کی زمینوں سے نکال کر خود قبضہ کرلیا، جیسے علاقۂ تھانیسر میں چوہان اور تودرانہ قوموں نے دوسری قوموں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا، ظاہر ہے کہ یہ اراضی بھی ان غاصبین کی مِلک قرار نہیں پاسکتی۔ (اسلام کا نظامِ اراضی ص: ۱۰۷)[3]

اسی طرح جو چراگاہیں اس قسم کی ناانصافی پر مبنی ہوں، وہ یقیناً غیر شرعی قرار پائیں گی اور مفادِ عامہ کے اصولوں کے خلاف ہونے کی بناء پر ممنوع ہوں گی۔

مشترکہ چراگاہیں

البتہ ایسی چراگاہیں ہمارے ہاں بکثرت موجود ہیں، جو قیامِ پاکستان سے قبل یہاں کے مسلمان حکمرانوں کی رضامندی سے ہر علاقے کے لوگوں کے لئے الگ الگ اور مشترک ہونے کی

---

(۱) کتاب البیوع، باب احیاء الموات والشرب، ۱۶۸/۶، الفصل الاول (طبع عثمانیہ)

(۲) کتاب المساقاۃ باب لا حمی إلا لله ولرسوله صلى الله عليه وسلم ج: ۵ ص: ۶۱ (طبع مکتبة الرشد)

(۳) طبع دار الاشاعت کراچی

حیثیت سے حدود بندی کی گئی ہیں، جبکہ اس وقت کے حکمرانوں کی اپنی مخصوص چراگاہ بھی موجود ہیں، یہ چراگاہ عام طور پر جنگلات اور پہاڑوں کے بالائی شاداب مقامات پر ہوتی ہیں، تاہم یہ عام روزمرہ کی چراگاہوں سے مختلف ہوتی ہیں، اور اُردو میں تقریباً'' رکھا '' کے ہم معنی ہیں، اس لئے کہ عام چراگاہوں میں صرف ایک ہی بستی والے اپنے مویشی چراتے ہیں جو اسی بستی کے قریب ہوتی ہے، مگر یہ مشترکہ چراگاہ بستی سے بہت دور ہوتی ہیں، بعض بستی اور اس کی چراگاہ کے درمیان ایک دن رات کی مسافت تک بھی فاصلہ ہوتا ہے، یہ چراگاہیں عام طور پر سال میں ایک دفعہ موسم گرما کے آغاز سے خزاں کے اختتام تک استعمال ہوتی ہیں، اکثر چراگاہوں کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے کہ بستی نمبر ایک کی چراگاہ بستی نمبر دس کی پہاڑی کے اُوپر ہے، اور نمبر دس کی چراگاہ بستی نمبر آٹھ کی پہاڑی کے بالائی حصے پر ہوتی ہے۔

گورنمنٹ کے قوانین کے مطابق جس بستی کی چراگاہ میں درخت یا معدن وغیرہ ہوں، ان سب کی مالک اسی بستی والے ہوں گے اور چراگاہ میں شریک اگر کئی بستیوں کے لوگ ہوں تو تمام بستی والے ان کے مشترک مالک قرار پائیں گے، کیونکہ جو چراگاہیں جن جن بستیوں کے مابین مشترک ہوگی، تو اس کے منافع وغیرہ بھی تمام بستیوں کے درمیان مشترک ہوں گے، درحقیقت ''حمی'' کی تعریف بھی اس پر صادق آتی ہے۔

> والحمی هو المکان المحمی وهو خلاف المباح ومعناه أن یمنع من الإحیاء من ذلک الموات لیتوفر فیه الکلأ فترعاه مواش مخصوصة ویمنع غیرها۔ (فتح الباری ۵/۴۴)[1]

حمی (چراگاہ) اس مقام کو کہتے ہیں جسے حدود بندی کے ذریعے محفوظ کیا گیا ہو، جو مباح کی ضد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مخصوص غیر آباد جگہ کو آباد کرنے سے اس لئے منع کرنا، تاکہ وہاں گھاس اور نباتات کی روئیدگی ہو سکے، پھر مخصوص (بستی کے) مویشیوں کو وہاں چرایا جائے اور دوسرے لوگوں کے مویشیوں کو منع کیا جائے۔

---

(۱) کتاب المساقاة باب لا حمی إلا لله ولرسوله ﷺ ج: ۵ ص: ۶۱۔ (طبع مکتبة الرشد)

تاہم چند بستیوں کے درمیان ایسی مشترک چراگاہیں تقریباً ہرعلاقے میں پائی جاتی ہیں، البتہ ٹیکس لے کر دوسرے حلقے کے لوگوں کو کسی دوسری چراگاہ میں مویشی لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، اس طرح کے ٹیکس کو مقامی زبان میں ''قلانگ'' کہتے ہیں، اگر بستی والے ٹیکس لئے بغیر مفت ہی اجازت دیں تو تب بھی اختیار ہوتا ہے، لیکن دوسرے منافع (رائلٹی، معادن وغیرہ) میں ان مخصوص بستیوں کے باشندوں کے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ قدیم الایام سے عصرِ حاضر تک ان چراگاہوں کی یہی صورت رہتی آئی ہے۔ اور مسلمانوں نے کبھی اس کے خلاف آواز بھی نہیں اُٹھائی، بلکہ بخوشی اسے قبول کرتے آئے ہیں۔

لہٰذا ''ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن''[۱] (مسلمان جسے اچھا سمجھیں، وہ عنداللہ بھی اچھا ہوگا) کے اصول کے تحت اسے شرعاً تسلیم کرنے میں کوئی قباحت ان شاء اللہ نہیں ہوگی۔

اہلِ قریہ کی غیرآباداملاک

ان مخصوص چراگاہوں کے علاوہ بعض ایسی چراگاہیں بھی بستی کے قریب ہوتی ہیں، جن میں صرف اسی بستی کے مویشی چرتے ہیں، عام چراگاہوں کو مقامی زبان میں ''غاری'' کہتے ہیں، وہاں سال میں ایک مرتبہ مویشی لے جاتے ہیں، لیکن قریب کی چراگاہوں پر پورا سال چراتے رہتے ہیں، ایسی چراگاہوں میں مختلف قسم کے درخت بھی ہوتے ہیں اور گھاس وغیرہ بھی۔

ایسی عام چراگاہیں شخصی املاک اور اہلِ قریہ کی غیرآباداملاک کے سواقریبی جنگلات میں بھی ہوتی ہیں، لہٰذا اس قسم کے جنگلات اور چراگاہیں اسی بستی کے ساتھ مخصوص رہیں گی، کیونکہ یہ اہلِ قریہ کی چراگاہ ہونے کے ساتھ احتطاب اور احتشاش کی ضروریات کے لئے عام ہوگی۔ جیسا کہ

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی ج: ۹ ص: ۱۱۲ (طبع مکتبة العلوم والحکم (الموصل)
و کذا فی کنز العمال ۳۵۵۹۰. و مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۳۶۱ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

"ضروریاتِ اہلِ بلد" کے عنوان کے ذیل میں اس کا بیان ہو چکا ہے، فقہاء فرماتے ہیں:

ما یقرب من الشیء یأخذ حکمه (قدوری، ص: ۲۵۴)[۱]

جو شے کسی دوسری چیز کے قریب ہو، وہ اسی کے حکم میں ہوگی۔

ایسی تمام املاک اہلِ قریہ کی ذاتی ملکیت رہیں گی، فقہاء نے تصریح کی ہے:

وقال أبویوسف رحمه الله تعالیٰ: و لو أن أهل القریة لهم مروج یرعون فیها و یحتطبون منها قد عرف أنها لهم فهی لهم علی حالها یتبایعونها و یتوارثونها و یحدّثون فیها ما یحدّث الرجل فی ملکه۔

(اسلام کااقتصادی نظام ص: ۲۱۱ بحواله کتاب الخراج ص: ۱۰۲، شامی ۳۸۸/۵)[۲]

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی اہلِ بستی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کی چراگاہیں کہ جن میں وہ اپنے مویشیوں کو چراتے اور سوختہ حاصل کرتے ہیں، ان کی ذاتی مِلک ہیں، تو وہ ذاتی ملک ہی رہیں گی اور ان کو اس کے فروخت کرنے، خریدنے اور ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق ہے، اور اس میں ان کی وراثت بھی جاری رہے گی، جس طرح کسی شخص کو اپنی ذاتی مِلک میں ترمیم و تنسیخ کا حق ہے۔

البتہ دوسرے علاقے کے لوگوں کو گھاس، پانی کی شدید ضرورت ہو تو وہ عام چراگاہ کو تبرعاً استعمال کر سکتے ہیں، اس کے باوجود مالکانہ تصرفات کی وہ مراعات انہیں حاصل نہیں ہوں گی، یہ رعایت صرف مویشی چرانے تک محدود ہوگی۔

مباح اشیاء اور اہلِ قریہ

بستی کے اردگرد جو مباح اشیاء ہیں وہ اگرچہ کسی کی ذاتی ملک نہیں ہوتیں، تاہم ضرورتِ

(۱) الهدایة، کتاب الصلاة، باب سجود السهو: ۱۶۶/۱ (طبع مکتبہ رحمانیہ)

(۲) ص: ۳۹۴ (طبع شیخ الہند اکیڈمی لاہور)

اہل بلد میں داخل ہوکر صرف اُسی بستی کے ساتھ مخصوص رہیں گی، یعنی ان کا حق دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ حکومت کو بھی ایسے مقامات کو اپنے قبضہ میں لینے کا حق شرعاً نہیں پہنچتا۔ایسی تمام مباح اشیاء جہاں بھی پائی جاتی ہوں، قبضے میں لینے سے ملک میں داخل ہوکر محفوظ ہوں گی۔

"المباح يملک بالإحراز"[1]

مباح اشیاء کو محفوظ کرلینے سے ملک میں آجاتی ہیں، خاص کر حکومت کی طرف سے اس کی اجازت ہوتو ملکیت میں داخل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا، ابوداؤد میں حضرت اسمر بن نفرسؓ کی روایت ہے:

أتيت النبی صلی الله عليه وسلم فبايعته فقال: من سبق إلى ماء لم يسبقه إليه مسلم فهو له فخرج الناس يتعادون و يتخاطون۔

(أبو داؤد ج ۲، باب فی إقطاع الأرضين)[2]

میں حضور ﷺ کے پاس آیا اور بیعت کی، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی پانی پر سب سے پہلے قبضہ کرے کہ اس پر اُس سے پہلے کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے، وہ اسی کا حق ہے (راوی کہتا ہے) کہ پھر لوگ دوڑتے ہوئے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے نکلے (تاکہ علامت کے ذریعے جگہ گھیر لیں۔)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "الی ماء" سے مراد صرف پانی ہی نہیں، بلکہ ہر مباح چیز ہے۔

و كذا غيره من المباحات كالكلاء والحطب وغيرهما۔ (مرقاۃ، ۱۴۵/۶)[3]

اسی طرح دوسری تمام مباح چیزیں بھی اس میں شامل ہیں، مثلاً گھاس، سوختہ لکڑی وغیرہ۔

اسی وجہ سے کہ بعض راوی نے "إلي ماء" کے الفاظ سے بھی روایت کی ہے،اس سے بھی

(۱) المبسوط للسرخسیؒ ج: ۱۰ ص: ۲۵۸ (طبع دار المعرفة بيروت)
(۲) ۲/ ۸۱ كتاب الخراج والفیء والإمارة باب إقطاع الأرضين (ط۔سعيد)
(۳) كتاب البيوع، باب احياء الموات والشرب، الفصل الثانی، ۱۷۵/۶ (طبع عثمانیہ)

یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر مملوکہ زمین جو کسی بستی کے قریب ہو، وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ بستی والوں کی ملک ہوگی، کیونکہ دوسرے مسلمانوں سے پہلے انہوں نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔

اسی بناء پر فقہاء فرماتے ہیں کہ بستی کے قریب ایسی زمین کا احیاء (آباد کرنا) جائز نہیں، جس سے بستی کے مصالح اور ضروریات متعلق ہوں، چنانچہ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

> کہ غیر مملوکہ اراضی جنہیں ''ارضِ مباحہ'' کہا جاتا ہے، ان پر حکومت کا تصرف بھی جائز نہیں، وہ ہمیشہ بستی والوں کی مشترک اور عام ضروریات کے لئے وقف کی طرح محفوظ رہیں گی۔ البتہ حکومت اپنی نگرانی میں ان کا انتظام کرسکتی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام کا نظامِ اراضی)[۱]

خلاصۂ بحث

گذشتہ اوراق میں جنگلات کے جن مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی، ان پر غور کرنے سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱)... ہر بستی کے جنگلات اہلِ بستی کے درمیان عام مشترک ہوکر ان کی ملک ہیں۔

(۲)... ضرورتمند حضرات محکمۂ جنگلات سے اجازت نامہ (پرمٹ) وصول کرکے کسی بھی بستی کے جنگلات سے تعمیراتی لکڑی حاصل کرسکتے ہیں۔

(۳)... مفادِ عامہ اور تحفظ جنگلات کے پیشِ نظر اہلِ بستی محکمۂ جنگلات کی طرف سے جاری کردہ پرمٹ کو مسترد کرنے کے مجاز ہیں۔

(۴)... پرمٹ یا بلا پرمٹ کے جو لکڑی مشترک جنگلات میں سے فروخت ہوجائے، اس کی قیمت کی رقوم تمام شرکاء میں تقسیم ہوگی، یا ایسے ہی مفادِ عامہ اور عام رفاہی و اجتماعی امور میں صرف ہوگی۔

---

(۱) طبع دار الاشاعت کراچی۔

(۵)...ایسے تمام جنگلات اہلِ بستی کی موروثہ ملک ہوں گے۔

رائلٹی کا استحقاق

جنگلات میں اشتراک کا مسئلہ اس وقت رونما ہوا جب سے حکومت نے اپنی نگرانی میں تعمیراتی لکڑی فروخت کر کے اس کی رائلٹی اہلِ بستی کو دینا شروع کیا، تب تک اشتراک کے دعویداروں کے ذہن میں بھی یہ مسئلہ نہیں آیا تھا، تاہم شرعاً اور قانوناً ان کے دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے، اس لئے کہ جنگلات کے قوانین کے مطابق رائلٹی کے حقدار صرف وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کی بستی کے ساتھ یہ جنگلات متصل ہیں، وہاں ان کی دیگر املاک بھی موجود ہیں، اور یہ جنگلات اپنی حدود بندی کے ذریعے قانوناً انہی اہلِ بستی کی ملک سے موسوم ہیں، اسی طرح سرکاری قوانین کے مطابق وہ لوگ بھی رائلٹی کے حقدار ہیں جو خود اگرچہ کسی دوسری بستی میں رہائش پذیر ہیں، لیکن ان کی کوئی زمین مذکورہ جنگلات والی بستی کی حدود کے اندر موجود ہے، یہ دونوں قسم کے لوگ قانون کے مطابق رائلٹی کے حقدار ہوتے ہیں، اور حق تلفی ہونے کی صورت میں استحقاقِ نالش کے مجاز ہیں۔

تقسیم کی نوعیت

رائلٹی کی تقسیم مختلف طریقے سے کی جاتی ہے، مگر کسی بھی دو بستی والوں کے تقسیمِ کار میں مکمل اتفاقِ رائے نہ ہونے کی وجہ سے شدید اختلافات درپیش ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی اُصول مقرر نہیں ہوا ہے، اور شرعاً یہ ایک نیا مسئلہ ہونے کی بناء پر تا ہنوز تحقیق طلب ہے، ہر مسئلہ اس کے متعلق اپنے اندر ایک نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے، اور محققین علماءِ کرام کے سامنے اس مسئلے کی مکمل نوعیت واضح نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ دینے کے بجائے مقامی علماء پر چھوڑ دیا۔ اس لئے رائلٹی کی تقسیم کا مسئلہ اب وقت کی اہم ضرورت ہونے کے ساتھ پیچیدگی اختیار کرتا جا رہا ہے، مثلاً درجہ ذیل نکات اہمیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں۔

(۱)...ایک ہی جنگل دو یا زیادہ بستی والوں کے درمیان مشترک ہے، ایک بستی جنگل کے

بالکل وسط میں ہے اور دوسری بستی کچھ فاصلے پر واقع ہے، اب دونوں بستیوں کے درمیان رائلٹی مساوی تقسیم ہوگی یا کچھ فرق کے ساتھ؟

(۲)...بستی میں جن کی ذاتی جاگیریں زیادہ ہیں کہ جن سے عام لوگ بھی بقدرِ ضرورت فائدہ اُٹھاتے ہیں، اور بعض کی ایسی کوئی املاک نہیں ہیں، یا بہت کم ہیں، ان دونوں میں تقسیم مساوی ہوگی یا مع الامتیاز؟

(۳)...بعض وہ مستحقین جن کی زمین کا کچھ حصہ اس بستی میں موجود ہے، مگر وہ خود کسی دوسری بستی کے باشندے ہوتے ہیں، ان کا بود و باش اور اہل و عیال دوسری بستی میں ہیں، مردم شماری میں بھی دوسری بستی کی فہرست میں ہیں، ایسے مستحقین کو کتنا حصہ ملنا چاہئے؟ یہ سب حل طلب مسائل ہیں:

عام تقسیمِ کار

اب تک جنگلات کی رائلٹی کا تقسیمِ کار مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے، تاہم اکثر علاقوں میں تین طرح سے تقسیم ہوتی رہی ہے۔

(ا)...میراث پر قیاس کرتے ہوئے ہر مرد کو پورا حصہ اور ہر عورت کو مرد کا نصف حصہ دیا جاتا ہے، مگر اس تقسیم میں یہ خامیاں ہیں کہ

(ا)...میراث پر قیاس سرے سے قیاس مع الفارق ہے، پاکستان کے جیّد جیّد علماء نے اس کی تردید کی ہے۔

(۲)...اصل مالکوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے، اس لئے کہ جن کی صرف بیٹیاں ہی ہوں، اور کسی خانہ بدوش کے بیٹے ہوں تو وہ اصل مالک سے کئی گنا زیادہ حصہ لیتا ہے، جیسا کہ ہمارے سامنے ایسا ہی ہوا ہے۔

(ب) تقسیم بلحاظ گھرانہ: ہر ہر کنبے کو مخصوص رقم مساوی مساوی دی جاتی ہے، اس تقسیم کی خامیاں یہ ہیں:

(ا)...جس گھر میں کئی افراد رہتے ہوں، ان کی مجموعی رقم اور صرف میاں بیوی والے

گھر کے دو افراد کی رقم مساوی ہوتی ہے جو عقلاً بھی مناسب نہیں ہے۔

(۲)...اس صورت میں ہر دو افراد حیلہ سازی سے الگ گھرانہ آباد کرتے ہیں۔

(۳)...وہ مستحقین جن کی مستقل رہائش دوسرے علاقے میں ہو، وہ بھی بلحاظ گھرانہ اہلِ بستی کے بقدر رائلٹی وصول کریں گے۔

(ج) تقسیم بلحاظِ افراد: ہر فرد (مرد و زن) کو مساوی مساوی حصہ ملے، ایسی صورت میں بھی اصل مالکوں کے افراد کم اور باقی کے افراد زیادہ ہونے کی بناء پر ناانصافی کا خدشہ ہے، جبکہ بسا اوقات اصل مالکوں سے بیرونی مستحقین زیادہ حصص لیتے ہیں، یہ تمام صورتیں پیش آمدہ ہونے کی بناء پر تمدّنی اور معاشرتی مساوات کے اُصولوں کے خلاف واقع ہوئی ہیں۔

علت کا تعین

فقہاء کو جب کسی معاملے میں قیاس کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پہلے علت کا تعین کرتے ہیں، اس لئے اس مسئلے کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرنے سے پہلے رائلٹی کے متعلق یہ وضاحت کروں گا کہ رائلٹی درحقیقت کون لیتا ہے؟ اور کیوں لیتا ہے؟

گذشتہ ابواب میں یہ معلوم ہوا کہ جنگلات اہلِ قریہ کی ملک ہیں، ان کو مالکانہ تصرف کا حق پہنچتا ہے، اس کے باوجود کہ یہ جنگلات کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ بستی کے مقامی باشندوں کی مشترک ملک ہے، اور جنگلات بھی اسی بستی کے نام سے موسوم ہوتے ہیں کہ فلاں بستی کے جنگلات وغیرہ، لٰہذا رائلٹی کے بنیادی حقوق وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اُسی بستی کے مقامی باشندے ہوں، اور بیرونی وہ مستحقین جن کی فقط ایک جریب زمین یا اس سے بھی کم موجودہ بستی میں ہے، ان کا حق ثانوی حیثیت رکھے گا، اسی لئے ایسے مستحقین جنگلات کے قوانین کے مطابق اس بستی سے کسی قسم کی لکڑی بلا اجازت نہیں لے جاسکتے۔ اور اجازت بھی ملی تو اُس کی قیمت ادا کر کے ہی لے ہیں، یہ قانون شرعاً بھی درست اور معقول ہے، کیونکہ ہر بستی کے ساتھ ملحق ایسے جنگلات موجود ہیں، جن سے وہاں کے باشندے اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں، اگر انہیں دوسری بستی کے

جنگلات سے بھی وہی منافع حاصل کرنے کی عام اجازت ہوئی تو اس سے دوسری بستی والوں کو بہت نقصان ہوگا۔ مفادِ عامہ اور تحفظِ جنگلات کے پیشِ نظر اپنے اپنے حلقے کے جنگلات سے ہی مراعات حاصل کرنا بہتر ہوگا۔

جب بیرونی مستحقین بلا اجازت اور قیمت ادا کئے بغیر کسی قسم کی لکڑی قانوناً اور شرعاً نہیں لے جاسکتے، تو جنگلات کے منافع (رائلٹی) کے بھی حقدار نہیں ہونا چاہئے۔ تاہم تبرعاً ان لوگوں کو بھی رائلٹی ملتی ہے جن کی کچھ زمین جنگلات والی بستی کی حدود میں موجود ہو۔ لہٰذا ان کی حیثیت استحقاق کے لحاظ سے ثانوی ہوکر رہے گی۔

دوسری وہ بستی جو جنگلات سے بالکل متصل ہے، رائلٹی کے استحقاق میں ترجیحی بنیاد پر زیادہ حقدار پائے گی اور مباحات کے معاملے میں "الأعلیٰ ثم الأسفل"[1] (پہلے اُوپر والے کا حق ہے، پھر نیچے والے کا) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے دونوں بستیوں میں رائلٹی کی تقسیم کچھ فرق کے ساتھ ہوگی۔

تجاویز برائے تقسیمِ کار

اس وضاحت کے بعد چند تجاویز پیش کرنے کی سعی کروں گا، تاکہ علماءِ کرام کے لئے کسی مثبت نتیجے تک پہنچنے میں مدد مل سکے، کتبِ فقہ میں تقسیم کے دو طریقے مشہور ہیں، جو یہاں شاید کارآمد ثابت ہوں گے، ایک طریقہ تقسیم بقدر الرؤس، دوسرا تقسیم بقدرِ املاک۔

(۱)... تقسیم بقدر الرؤس

اس طرح کہ ہر مرد و زن کو مساوی مساوی حصہ ملے، فقہ میں اس کی مثال موجود ہے کہ غیر موروثہ گھر کی تقسیم شرکاء کے درمیان بلحاظِ افراد ہوگی۔ (عالمگیری ۲۰۵/۵)[2]

رائلٹی کی تقسیم اگر اس طرح کی جائے تو کم افراد والے لوگوں کو نقصان ہوسکتا ہے، جس کی

---

(۱) فتح الباری کتاب المساقاۃ باب سکر الأنهار ج: ۵ ص: ۴۹ (طبع مکتبة الرشد)

(۲) کتاب القسمة الباب الثانی بیان کیفیة القسمة (طبع رشیدیہ)

تلافی ممکن نہیں۔

(۲)... تقسیم بقدرِ املاک

اس کی صورت یہ ہوگی کہ رائلٹی کے استحقاق کی علت (املاک) کو مدار بنا کر اس کے بقدر تقسیم کی جائے، جس کی مجموعی ملکیت اس بستی کے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت جتنا زیادہ ہے، وہ گویا قوی علت کے ساتھ جنگلات میں حق رکھتا ہے، اور اس کے برعکس دوسرے لوگ اپنے اپنے حصص کے بقدر درجہ بدرجہ حصہ پائیں گے، یہ طریقۂ تقسیم اس لئے معقول ہے کہ جنگلات میں شرکت کے لئے علتِ صوری (وجودِ ملک) کی ضرورت ہے، اور علتِ تامہ معلول کے اثبات کے لئے علتِ ناقصہ سے قوی ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بیرونی مستحقین کے حصص کا تعین آسانی سے ہو سکے گا، کتبِ فقہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں:

الأموال المشتركة شركة الملک تقسم حاصلاتها بين أصحابها علیٰ قدر حصصهم۔ (شرح المجلة، ۱۴/۴ مادة: ۱۰۷۳)[1]

مِلک کے لحاظ سے مشترک اموال کے منافع کی تقسیم شرکاء کے درمیان ان کے حصص کے بقدر ہوگی۔

چونکہ رائلٹی بھی اصل ملک نہیں، بلکہ مشترک ملک کے منافع ہے، یعنی اصل ملک کا معاوضہ ہے، لہٰذا معاوضہ اصل علت کی رعایت سے بقدرِ ملک ملے گا۔ چنانچہ فقہاء نے یہ اصول بیان کیا ہے:

مؤنة الملک تتقدّر بقدر الملک[2]

ملک کا نفقہ اور بدلہ بقدرِ ملک ہوگا۔

نیز جنگلات کی حیثیت اہلِ قریہ کے درمیان ملکِ مشترک ہوکر ''مباح'' کی طرح ہے، عات کے احراز میں شرکت کا معاوضہ بقدرِ ملک ہوگا، کیونکہ اہلِ قریہ جنگلات کی حفاظت کرتے

(۱) کتاب الشركة (طبع مكتبة حبيبة كوئٹه)

(۲) لأنها مؤنة الملک فتتقدر بقدر الملک، هنديه: ۲۰۷/۵ کتاب القسمة۔ (طبع رشیدیہ)

ہیں، اورحکومت اپنی خوشی سے اس کا معاوضہ انہیں دیتی ہے، اس صورت میں ذیل کے اصول پر قیاس کیا جاسکتا ہے:

والشركة فی إحراز المباح تقتضی أن تكون النفقة علی قدر الملک۔ (عالمگیری، ۳۸۸/۵)[۱]

احرازِ مباح میں شرکت بقدرِ ملک معاوضہ کا متقاضی ہے۔

اسی طرح رائلٹی میں شرکت بھی شرکت کے عام اصولوں کے مطابق نہ ہونے کی بناء پر اسے ''شرکتِ فاسدہ'' کی اقسام میں اگر شامل خیال کیا جائے تو بھی بقدرِ ملک تقسیم معقول ہے۔

والربح فی الشركة الفاسدة علی قدر المال۔

(شرح وقایہ، ۳۶۴/۲)[۲]

شرکتِ فاسدہ میں منفعت بقدرِ مال تقسیم ہوگی۔

اس لئے کہ جنگلات میں اہلِ قریہ اور دیگر مستحقین کی شرکت ناقص اور کامل علتوں کے ساتھ مختلف نوعیت رکھتی ہے، جبکہ مستحقین عینِ ملک میں بلاواسطہ شریک نہیں، بلکہ بواسطۂ لوازمِ ملک شریک ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس بستی کی حدود میں موجود اپنی زمین فروخت کردے، تو وہ شخص قانون کے مطابق محض جنگلات میں شریک نہیں ہوسکتا، اور نہ رائلٹی کا حقدار ٹھہرتا ہے، شرعاً بھی یہی حکم ہے۔

''ما ثبت بعذر بطل بزواله[۳] ''

جو چیز کسی عذر کی بناء پر ثابت ہو، عذر کے ختم ہونے سے وہ چیز بھی باطل ہوگی۔

ایک قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ اگر یہ جنگلات بستی والوں کے درمیان تقسیم ہوں گے تو اس صورت میں بھی مجموعی ملکیت کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ جنگلات موروثہ جاگیروں کی طرح نسل در نسل منتقل ہوکر آپہنچے ہیں، اب بعض کی اولاد کم ہونے یا نرینہ اولاد نہ ہونے کی بناء پر ان کے حصے کی

(۱) كتاب إحياء الموات الباب الأول فی تفسير الموات (طبع رشيدية)
(۲) ۴۰۴/۲ كتاب الشركة (ط. دار الحديث ملتان)
(۳) ما جاز بعذر بطل بزواله، شرح الحموی علی الأشباه والنظائر الفن الأول فی القواعد الكلية، النوع الأول، القاعدة الخامسة، الضرر يزال: ۲۵۳/۱ (طبع نشاط)

زمینیں بھی دوسروں کے قبضے اورملک میں منتقل ہوئی ہیں، اب جنگلات اگراصل بنیادی ملکیت کی حیثیت سے تقسیم کرلی جائیں تو ملکِ قدیم کالحاظ رکھتے ہوئے بقدرِملک ہی تقسیم ہوں گے۔

اس کی نظیر یہ موجود ہے:

أرض بين جماعة مشتركةٌ لأحدهم عشرة أسهم وللآخر خمسة ولآخر سهم وأرادوا قسمتها قسمت على قدر سهامهم ، عشرة و خمسة و واحدٌ. (عالمگیری، ۲۰۶/۵) کتاب القسمة الباب الثانی بيان كيفية القسمة.[1]

ایک جماعت کے درمیان کوئی زمین مشترک ہے، ان میں سے ایک شخص کے دس حصے ہیں، دوسرے کے پانچ حصے اورتیسرے شخص کا صرف ایک حصہ ہے، جب وہ آپس میں تقسیم کاارادہ کریں توزمین ان کے درمیان بقدرِحصص تقسیم ہوگی، یعنی دس حصے، پانچ حصے، اورایک حصہ۔

اگرجنگلات کاٹ کرزمین تقسیم کی جاتی توشایدیہی صورت ہوتی، اس وقت بیرونی مستحقین کااس تقسیم شدہ نئی زمین میں کوئی حصہ نہیں ہوتا،لہٰذامنافع کی تقسیم کی یہ صورت ایک حدتک معقول ہے۔

تاہم رائلٹی کی تقسیم کے بارے میں یہ صرف تجاویز ہیں، اگرارباب حل وعقد جنگلات سے متعلق گذشتہ ابواب کے پہلوؤں کا شرعی نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرما کراپنے فیصلے سے ہمیں بھی آگاہ فرمائیں تو رائلٹی کی تقسیم کا مسئلہ عوام کے لئے آسان ہوگا۔واللہ اعلم بالصواب۔

جواب:- ازحضرت والادامت برکاتہم العالیہ

مکرمی ومحترمی جناب مولانا نقیب اللہ رازی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اورآپ کا مقالہ ’’جنگلات اوررائلٹی کا مسئلہ‘‘ موصول ہوا، آپ نے ایک

---

(۱) (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اہم مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے، میں نے اس مسئلے پر ایک مستقل مقالہ ''اراضی شاملات کی شرعی حیثیت'' کے عنوان سے لکھا تھا جو البلاغ میں شائع ہوا ہے، اس کی کاپی اس عریضے کے ساتھ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ براہِ کرام اس پر غور فرمالیں، میں نے آپ کے مقالے سے استفادہ کیا، البتہ اس سلسلے میں جو کچھ میں اب تک سمجھا ہوں، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱)...خودرَو جنگلات ''موات'' کی تعریف میں شامل ہیں،[۱] لہٰذا جب تک کوئی ان کا احیاء نہ کرے، وہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں آسکتے۔[۲] بلکہ مباحِ عام ہیں۔[۳]

(۲)...مباحِ عام ہونے کا اصل تقاضا تو یہ تھا کہ تمام دنیا کے لوگ اس سے مفت فائدہ اُٹھاسکتے،[۴] لیکن حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان سے انتفاع کو ضوابط کا پابند بنا کر یہ قاعدہ

(۱، ۲، ۳ و ۴) وفی سنن أبی داؤد ج: ۳ ص: ۲۸۹ (طبع دار الفکر) و ج:۲ ص: ۱۳۶ (طبع مکتبة إمدادیه ملتان) قال رسول الله ﷺ: المسلمون شرکاء فی ثلاث: فی الکلاء، والماء، والنار۔

وکذا فی سنن ابن ماجه باب المسلمون شرکاء فی ثلاث ج: ۳ ص: ۱۰۶ (طبع دار الفکر)

وفیه أیضاً ص: ۱۷۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: ثلاث لا یمنعن الماء والکلاء والنار۔

وفی إتحاف الخیرة المهرة کتاب الزکوة رقم الحدیث: ۲۸۹۰/۱ کتاب الشرکة ۳۵۳/۴ (طبع دار الوطن) الناس شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار، و کذا فی بغیة الباحث للهیثمیؒ ج: ۱ ص: ۱۶۵ (طبع دار الطلائع) و تحفة الأحوذی ج: ۲ ص: ۳۰۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) و کذا فی سبل السلام باب اشتراک الناس فی الماء والنار والکلاء ۹۳۲/۳، رقم الحدیث: ۸۷ (طبع مکتبہ اثریہ)

وفیض القدیر ج: ۷ ص: ۲۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) و مسند الحارث ج: ۱ ص: ۵۰۸ (طبع مرکز خدمة السنة المدینة المنورة و نصب الرایة ج: ۲ ص: ۴۲۲ (طبع دار الحدیث القاهرة)

وفی عمدة القاری باب بیع الحطب والکلاء ج: ۱۲ ص: ۲۱۷ کتاب المساقاة (ط رشیدیة)....اشتراک الماء والحطب والکلأ فی جواز الإنتفاع بها لأنها من المباحات، فلا یختص بها أحد دون أحد، فمن سبقت یده إلی شیء من ذلک فقد ملکه .وقال ابن بطال: إباحة الاحتطاب فی المباحات والاختلاء من نبات الأرض متفق علیه، حتی یقع ذلک فی أرض مملوکة فترتفع الإباحة.

وفی فتح الباری ج: ۵ ص: ۴۷ (طبع دار المعرفة بیروت)(کتاب المساقاة ج: ۵ص: ۶۵ (ط مکتبة الرشد) إذا ملک بالاحتطاب والاحتشاش فلأن یملک بالإحیاء له أولیٰ۔

وفی شرح سنن أبی داؤد (عبدالمحسن عباد) ج: ۱ ص: ۲۔(الناس شرکاء فی ثلاث: الکلأ والماء والنار)، أی: إذا کان فی فلاة ولیس فی الأرض إنسان، أما إذا کان الکلأ فی أرضه وفی ملکه فهو له، ولا أحد یدخل فی ملکه من أجل أن یرعی، وإنما یرعی فی الفلاة التی لیست ملکا لأحد، فالمقصود بالأرض الفلاة التی لیست خاصة ولا ملکا لأحد؛ فإن الناس شرکاء فیها، ولا یختص أحد بالکلأ دون أحد، بل هو مبذول لکل من احتاج إلیه.

(باقی اگلے صفحے پر)

مقرر کردے کہ ہر جنگل سے اس کے قریب والی بستی کے لوگ فائدہ اُٹھائیں، نیز فائدہ اُٹھانے کے لئے ہر شخص کو کاٹنے کی اجازت دینے کے بجائے خود اپنی نگرانی میں درخت کٹوا کر اس کی قیمت قریبی بستی کے لوگوں میں تقسیم کرے۔[۱]

(۳)...لیکن بعض علاقوں میں جو رواج ہے کہ ان جنگلات کا مالک صرف وہ سردار سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے ابتداء میں گاؤں آباد کیا، یہ رواج خلافِ شریعت ہے۔[۲] اس کے بجائے گاؤں کے تمام افراد ان جنگلات کی آمدنی میں شریک ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ آپ کے بیان کردہ نتائج شاید قریب قریب وہی ہیں جو احقر نے اخذ کئے ہیں،

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی المبسوط للسرخسیؒ کتاب الشرب ج: ۲۷ ص: ۵ وعلی هذا حکم الشرکة فی الکلإ فی المواضع التی لا حق لأحد فیها بین الناس فیه شرکة عامة، فلا یکون لأحد أن یمنع أحدا من الانتفاع به. فأما ما نبت من الکلإ فی أرضه مما لم ینبته أحد فهو مشترک بین الناس أیضا حتی لو أخذه إنسان فلیس لصاحب الأرض أن یسترده منه.

وفی بدائع الصنائع ج: ۱۱ ص: ۴۲۸ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) (ومنها) أن یکون مملوکا. لأن البیع تملیک فلا ینعقد فیما لیس بمملوک کمن باع الکلأ فی أرض مملوکة، والماء الذی فی نهره أو فی بئره؛ لأن الکلأ وإن کان فی أرض مملوکة فهو مباح، وکذلک الماء ما لم یوجد الإحراز قال النبی -صلی الله علیه وسلم -الناس شرکاء فی ثلاث والشرکة العامة هی الإباحة، وسواء خرج الکلأ بماء السماء من غیر مؤنة أو ساق الماء إلی أرض ولحقه مؤنة؛ لأن سوق الماء إلیه لیس بإحراز فلم یوجد سبب الملک فیه فبقی مباحا کما کان، وکذا بیع الکمأة، وبیع صید لم یوجد فی أرضه لا ینعقد؛ لأنه مباح غیر مملوک لانعدام سبب الملک فیه، وکذا بیع الحطب والحشیش والصیود التی فی البراری.الخ

وفی ردالمحتار فصل الشرب کتاب احیاء الموات: ۶/۴۴۰،(طبع سعید): والحطب فی ملک رجل لیس لأحد أن یحتطبه بغیر إذنه، وإن کان غیر ملک فلا بأس به، ولا یضر نسبته إلی قریة أو جماعة ما لم یعلم أن ذلک ملک لهم. الخ

وفی الهدایة ج: ۴ ص: ۴۸۹ (طبع مکتبة رحمانیة) الناس شرکاء فی ثلاث: الماء، والکلاء، والنار.

وفی حاشیته: قوله: والکلاء أما الشرکة فی الکلاء فعلیٰ أوجه بعضها أعم من بعض فالأعم منها أن یکون الحشیش فی أراضی لا تکون مملوکة لأحد یکون الناس فی ذلک شرکاء فی الرعی والاحتشاش لیس لأحد أن یمنع إنساناً من ذلک و هی کالشرکة فی ماء البحار و شرکة أخری أخص من هذه هو أن یکون الکلاء فی أرض مملوکة نبت بنفسه لا بإنبات صاحب الأرض فلا یملک صاحبه بکونه فی أرضه بل للناس فیه شرکة الخ۔

وفیها أیضا علی حاشیته (۸) : قوله: والکلاء قال الخطابی: معناه الکلاء الذی نبت فی موات الأرض یرعاه الناس لیس لأحد أن یختص به دون أحد الخ۔

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' جلد دوم (مطبوعہ ادارۂ اسلامیات لاہور) میں حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فیصلہ بعنوان ''اراضیٔ شاملات کی شرعی حیثیت'' ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

(۲) دیکھئے: گذشتہ دو حواشی۔

البتہ ان کی فقہی تخریج وتکییف میں اختلاف ہے، آپ جنگلات کو گاؤں والوں کی ملکیت قرار دیتے ہیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں، وہ ملکیت نہیں، مشترک حق ہے، اور حکومت اسے قواعد کا پابند بنانے کے لئے قریبی بستی کے ساتھ مخصوص کرسکتی ہے۔[۱]

احقر کے مقالے کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر آپ اس میں کوئی بات قابلِ اصلاح پائیں تو مطلع فرمادیں۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

شب ۲۴ رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۰۰ء

ارضِ کوہاٹ کی ملکیت سے متعلق فتاوی پر حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے اور ''انعام الباری'' میں انگریزوں کی طرف سے عطاءِ جاگیر سے متعلق ایک مسئلہ کی وضاحت

(وضاحت از مرتب)

ضلع کوہاٹ کی تحصیل ٹیری کی زمینوں کے شرعی اعتبار سے مالک وہاں کے خوانین ہیں یا دخیل کار لوگ؟ اس سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں مفتی محمد رضوان صاحب نے ایک فتوی تحریر فرمایا اور اُسے نظرِ ثانی کے لئے اوّلا جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مد ظلہم کے پاس بھیجا، پھر یہ فتوی اور ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مد ظلہم کا جواب حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں بغرضِ اصلاح و نظرثانی بھیجا۔

نیز اسی مسئلہ کے ضمن میں حضرت والا دامت برکاتہم کی شرح بخاری ''انعام الباری'' میں ذکر کردہ ایک مسئلہ کی مزید وضاحت سے متعلق بھی مفتی محمد رضوان

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب ''عدالتی فیصلے'' جلد دوم (مطبوعہ ادارۂ اسلامیات لاہور) میں حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فیصلہ بعنوان ''اراضیٔ شاملات کی شرعی حیثیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

صاحب نے سوال بھیجا۔

ذیل میں اوّلاً مفتی محمد رضوان صاحب کا خط، اس کے بعد ارضِ کوہاٹ سے متعلق استفتاء اور مفتی رضوان صاحب کا جواب، پھر مولانا ڈاکٹر عبد الواحد صاحب کے جواب کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے اور فتویٰ پیشِ خدمت ہے۔

(محمد زبیر)

(انعام الباری کے مسئلہ کی وضاحت سے متعلق خط اور استفتاء از مفتی محمد رضوان صاحب)

محترمی ومکرمی حضرت والا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۱)...عطائے جاگیر سے متعلق ایک استفتاء کا تفصیلی جواب تحریر کیا تھا، جو بعد میں مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد زید مجدہم کی خدمت میں بھی نظرِ ثانی کے لئے ارسال کیا تھا، ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوا، اس کی نقل اور مذکورہ تفصیلی جواب برائے نظرِ ثانی واصلاح آپ والا کی خدمت میں ارسال ہے، اُمید ہے کہ اصلاحی اُمور کی نشاندہی فرمائیں گے۔

(۲)... انعام الباری دروسِ بخاری میں مسئلہ مذکورہ کی تحقیق کے دوران یہ مسئلہ نظر سے گزرا کہ:

"انگریز کے زمانے میں لوگوں کو بہت سی ایسی جاگیریں عطا کی گئیں، جو اسلام میں پہلی قسم کی ہیں، یعنی بنجر زمین کے مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئیں، اس کے دو پہلو ہیں، بعض مرتبہ وہ اراضی بطور رشوت دی گئیں، (الیٰ قولہ) اس طرح غداری کے عوض جو زمینیں یا جاگیریں دی گئیں، شرعاً ان کا جاگیرداروں کو اپنے پاس رکھنا جائز ہی نہیں، اس لئے کہ معقود علیہ غداری ہے، اس لئے اس کی اُجرت میں جو کچھ ملا وہ بھی حرام ہے۔ الخ (ج: ۷ص: ۶۵۵ وص: ۶۵۶)

اس میں بندہ کو شبہ یہ ہے کہ اراضی موات تو کسی حاکم کے ساتھ جائز عقد سے بھی ملکیت میں نہیں آتیں، کیونکہ ان کی خود حکومت بھی مالک نہیں ہوتی، اور احیاء کے بعد وہ ملکیت میں آجاتی ہیں، اب اگر حکومتِ انگریز نے کسی کو جائز یا ناجائز عقد سے اراضی موات عطا کیں تو اس کی وجہ سے ملکیت میں نہ آئیں گی اور اگر ناجائز عقد مثلاً رشوت کے طور پر جاگیر عطا کی، لیکن اس میں معطی لہ نے احیاء کرلیا تو کیا پھر بھی وہ اس وجہ سے مالک نہ ہوگا کہ معقود علیہ ناجائز ہے، جبکہ بندہ کے خیال میں معقود علیہ کو اراضی موات میں تو دخل نہ ہونا چاہئے، البتہ اراضی سلطانیہ میں یہ بحث مؤثر ہونی چاہئے، اُمید ہے کہ اس شبہ کا ازالہ فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ تعالٰی خیر الجزاء فقط والسلام

محمد رضوان

۱۴۲۷/۴/۱۴ھ

(استفتاء)

تحصیل ٹیری ضلع کوہاٹ کے جاگیردارانہ نظام کی شرعی حیثیت

تحصیل ٹیری ضلع کوہاٹ کے اراضی کی قانونی نوعیت یہ ہے کہ جو قبیلے کے بڑے اور خوانین لوگ ہیں، ان کو تو سرکاری کاغذات میں ''مالک'' کے لفظ کے ساتھ لکھتے ہیں اور جو لوگ موقع پر باپ دادے کے زمانے سے قابض اور متصرف ہیں، ان کو ''دخیل کار دفعہ ۵(ا) الف 1886'' کے الفاظ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تحصیل کی اراضی کے شرعی مالک خوانین بنتے ہیں یا دخیل کار لوگ؟

یہ فیصلہ کرنے کے لئے خوانین کے مالک کا عنوان حاصل کرنے کے ابتدائی واقعات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ فریقین میں سے ہر فریق کے حقیقی شرعی مالک ہونے کا مدار پٹواری کے کاغذات پر نہیں ہے، بلکہ خوانین کو ابتداء میں مالک لکھنے کے وجوہات اور دخیل کار کو مالک نہ لکھنے کے وجوہات معلوم ہونے پر ہے کہ خوانین کے اجداد کس نوعیت کے ساتھ مالک

لکھنے شروع ہو گئے ہیں اور دخیل کاروں کے اجداد کن وجوہات کی بناء پر دخیل کار لکھنے شروع ہو گئے ہیں، ان دو باتوں کو معلوم کرنے کے لئے دو کاموں کی ضرورت تھی، ایک کام تو یہ کہ نوابوں کے زمینوں پر ابتداء میں مسلط ہونے کے تاریخی واقعات کا مطالعہ اور دوسرا کام ٹیننسی ایکٹ دفعہ ۵ کی تشریح۔

تاریخی مطالعہ

(۱) تاریخ کوہاٹ (۲) اسلام کا نظامِ اراضی مصنفہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ (۳) کوہاٹ تاریخ کے آئینہ میں۔

مندرجہ بالا کتابوں کو دیکھنے سے (۴) ثقہ لوگوں کی روایات سننے سے (۵) اور تحصیل ٹیری کی زمینوں کے ظاہری معاملات جو خوانین اور زمینداروں کے درمیان چلے آرہے ہیں اور علاقے کے رِواجات کی روشنی میں کچھ پتہ چلتا ہے کہ خوانین کس طرح مالک ہو گئے؟

خوانین کو قانونی طور پر مالک کا عنوان حاصل ہونے کی وجوہات

ان پانچ باتوں میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ خوانین کے اجداد نے کسی بھی زمانے میں اس علاقے کی بنجر زمینوں کو آباد نہیں کیا اور نہ کسی سے یہ زمینیں خریدی ہیں پھر کس طرح مالک ہو گئے؟

جب انگریز آیا تو سکھوں سے مقابلے کے لئے دو بڑے قبیلے بنگش اور خٹک کے سرداروں کو اپنے ساتھ لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، انگریز کے پاس افراد والی قوت بالکل نہ تھی، یہی قبیلے کے سردار لوگ انگریزوں کی پولیس بھی تھے اور فوج بھی، خٹک قبیلے کے بہادروں نے سکھوں کے مقابلے میں انگریز حکومت کو مستحکم بنایا۔

اب اس خدمت کو انجام دینے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی، ایک تو قبیلے کے سرداروں کے پاس ظاہری شان وشوکت اور قوت ہونا چاہئے۔ دوسرے ان خدمات کے لئے اخراجات مہیا ہونے چاہئیں۔ یہ دونوں ضرورتیں انہی مقامی لوگوں سے پورا کرنے کی ضرورت تھی، تو بوجہ خدمتِ انگریز اور سرکار کی خوشنودی کے قبیلے کے سرداروں کو انگریزوں کی حکومت کی طرف سے

نوابی کا خطاب حاصل ہوا، اور کاغذی کارروائی میں یہاں کے اراضی کا بہ بناءِ ساکت حقوق، صرف اعزازی طور پر قبیلے کے سرداروں کو اراضی بطورِ جاگیر دی، اس کے بعد ان زمینوں کا مالک قرار دیا گیا، خواہ وہ بنجر زمین یا پہاڑ ہوں یا کسی کے زیر کاشت اور اس کی ملکیتی زمین ہو۔

انگریز حکومت اور نوابی ایک ملی جلی قوت بن گئی، غریب طبقہ ان کا دست نگر تھا، مہتممینِ بندوبست پٹواری، تحصیلدار وغیرہ ان ہی کے ماتحت تھے، واجب العرض، مسل حقیت جمعبندی وغیرہ کے دستاویز سب ان ہی کے منشاء کے مطابق تیار ہوتے تھے۔

جاگیرداری نظام کے ذریعے زمینوں کے سابق قابض اور متصرف لوگوں کے ذمہ زمین سے حاصل شدہ فصل کا پانچواں حصہ جاگیرداروں کو اس وجہ سے دیا جانا قرار پایا تھا کہ حکومت کو منظورِ نظر اور بالادست طبقہ کسی محنت کے بغیر معاوضہ حاصل کرتا رہے اور انگریز سرکار کی بالادستی کے لئے حکومت کے سپرد کردہ کام آسانی کے ساتھ ادا کرتا رہے۔

چنانچہ یہ طبقہ سرکاری مالیہ اور لگان زمینداروں سے اپنے زور بازو کے ساتھ وصول کرتا تھا، وصول کرنے والوں کو نمبردار، فوطی دار اور یافتی وغیرہ کے عہدے اب بھی پٹواری کے کاغذوں میں موجود ہیں، انگریزوں نے ٹیری تحصیل نواب کو ۱۸ ہزار روپے سالانہ اجارہ پر دے رکھی تھی۔ (تاریخِ کوہاٹ ص: ۵۵)

1886ء سے قبل زمینوں کے کاشتکاری اور ملکیت وغیرہ کا نوابی نظام چل رہا تھا، 1886ء میں اس کو یکسر منسوخ قرار دے کر تلف اور ضائع کر دیا گیا، چنانچہ اس کا اب نام ونشان بھی نہیں ملتا، 1886ء سے ان ہی سرداروں کی نگرانی میں انگریزی حکومت میں نئے بندوبست کی ابتداء ہوئی۔

اس بندوبست میں زمینوں کی پیمائش خسروں، کھتونی کی تقسیم میں خوانین کے نام باقاعدہ ملکیت کے خانہ میں لکھنا شروع ہوئے اور قابضین کا کاشتکاری کے خانے میں دخیل کار کے لفظ سے اندراج ہوا (ملاحظہ ہو واجب العرض 1886ء موضع چنڈہ خورم دفعہ نمبر ۴) یہ ہوئی خوانین کو مالک کا عنوان حاصل ہونے کی وجوہات۔

اب قابضین ومتصرفین کے دخیل کار ہونے کی وجوہات

اب اس علاقے کے سابق قابض اور متصرف لوگ جن کا نام کاشتکار کے خانے میں لکھا جاتا تھا، ان کے بولتے ہوئے حقوق کو خانہ ملکیت میں لکھے ہوئے مالکوں کی ملکیت بننے سے حفاظت کے لئے ایک قانون نافذ کیا گیا، اس کا نام ہے "ٹیننسی ایکٹ دفعہ ۵ (ا) ضمن الف 1886ء اور ان کے لئے دخیل کار کی اصطلاح وضع ہوئی، اب کاشتکاری کی تو کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم دفعہ ۵ بھی ہے، اور دفعہ ۶ وغیرہ بھی۔

دخیل کار دفعہ ۵ کی شرح

تحصیل ٹیری کے قابضین جو آباء واجداد سے زمینوں میں متصرف رہے، خوانین کے مقابلے میں ان کے لئے انگریزی قانون میں دخیل کار کی اصطلاح وضع ہوئی، دخیل کار کے قبضے کی یہی نوعیت پٹواری کے کاغذات میں ابتدائی بندوبست 1886ء سے 1952ء تک برابر چلی آرہی ہے۔

اس دفعہ ۵ کی شرح یہ ہے کہ جو آدمی سابق قابض بندوبست کے وقت میں دو پشتوں سے قابض ومتصرف تھا، یا وہ اپنی زمین پر ۳۰ سال سے قابض ومتصرف تھا، وہ دخیل کار ہے، ایسے کاشتکار قابض کو وہ سب حقوق حاصل ہیں جو ایک مالک کو ہو سکتے ہیں، جیسے بیع، ہبہ، وراثت۔

1886ء کا بندوبست 1952ء تک اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا، 1952ء میں صوبائی حکومت قیوم خان نے دخیل کار کو مالک قرار دیا اور خوانین کو پیداوار میں سے پانچویں حصے کی بجائے زمین کے پانچویں حصے کا مالک قرار دیا، اب دخیل کار کا نام خانۂ ملکیت میں لکھنا شروع ہوا، اس پر خوانین کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا، اب خوانین اپنی جگہ خوش ہیں اور زمیندار اپنی جگہ پر خوش ہیں، یہ بات واضح ہے کہ مذکورہ اراضی کو خوانین نے کسی بھی زمانے میں کاشت نہیں کیا۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ 1952ء سے قبل جب دخیل کاری کا نظام تھا، اس میں زمینوں کے حقیقی اور شرعی مالک خوانین تھے یا زمیندار و دخیل کار لوگ؟ مفصل ومدلل جواب درکار ہے، کیونکہ اس سلسلے میں علماء کی آراء مختلف ہو رہی ہیں۔ (المستفتی دوست محمد کوہاٹ)

جواب از مفتی محمد رضوان صاحب

سوال کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب اور خوانین کو حکومت انگریز کی طرف سے پورے علاقے کی مجموعہ اراضی کا مالک قرار دیا گیا ہے اور اعطاءِ جاگیر کی مذکورہ صورت علاقے کی زمینوں کی مالیہ اور لگان وصول کرنے کا مالک بنانا ہے۔

جب 1886ء میں بندوبست شروع ہوگیا تو چونکہ مالیہ اور لگان وصول کرنے کا جو اس وقت نقشہ شروع سے بنا ہوا تھا، وہ ایسا تھا جیسا کہ خوانین صرف لگان کے مالک نہیں بلکہ زمینوں کے بھی مالک ہیں اور مہتممینِ بندوبست سرداروں کے نوکروں کی طرح ماتحت تھے اور شرعی طریقے اور اُصول بھی سامنے نہ تھے، اس لئے ان کے نام کے ساتھ سابق قابضین کی زمینوں کا مالک لکھ دیا اور قابض کو بجائے مالک لکھنے کے دخیل کار کی اصطلاح مقرر کر کے کاشتکار کے خانے میں لکھ دیا، لیکن یہ ایسے کاشتکار نہیں تھے جن کا خوانین کے ساتھ عقدِ مزارعت ہوا ہو، اس لئے ان کو قانونی کاشتکار قرار دیا اور ان کے کاشتکار ہونے کی نوعیت کو دخیل کاری کے ایکٹ دفعہ ۵ میں واضح کر دیا، جس سے ان کا مالک ہونا ثابت ہوتا ہے، اب یہ ٹیننسی قانون کے دفعہ ۵ والے کاشتکار ہیں نہ کہ عقدِ مزارعت والے اور دفعہ ۵ کی شرح یہ ہے:

> ”1886ء کے بندوبست کے وقت جو قابض ومتصرف دو پشتوں سے اس زمین پر قابض ہے یا ۳۰ سال سے وہ زمین اس کے زیر تصرف ہے، وہ اس زمین کا دخیل کار دفعہ ۵ (ا) الف ہے۔انتہی، یہ موروثی کاشتکار ہے۔ (قانونِ مزارعین ص: ۲۵)

دفعہ ۵ کی تشریح سے موروثی کاشتکار کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ زمین موجودہ کاشتکار کو باپ کے ورثے سے ملی ہے اور اس کے باپ کو اس کے دادا سے وراثت میں ملی ہے، اتنی بات تو ایکٹ دفعہ ۵ سے ثابت ہوئی، اب دو پشتوں سے اوپر والوں کو مالک ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے لئے استصحابِ حال شاہد ہے کہ اس زمین کے ابتداء احیاء موات کرنے والے دخیل کار کے اجداد ہیں نہ کہ جاگیردار وخوانین، بلکہ خوانین کا دخیل کاروں کی مقبوضہ زمینوں میں کسی قسم کا تصرف

کسی زمانے میں بھی ثابت نہیں ہوا ہے، 1886ء سے لے کر 1952ء تک خوانین کی کاشتکاری نہ پٹواری کے کاغذات میں ثابت ہے اور نہ ہی عملاً ثابت ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسا کاشتکار شرعی اور حقیقی مالک ہے اور خوانین اعزازی مالک ہیں، یعنی ان کی ملکیت صرف لگان کے پورے اختیارات کے مالک ہونے تک محدود ہے (ملاحظہ ہو واجب العرض 1886ء چنڈہ خورم دفعہ نمبرا ضمن شق نمبر۲) زمین کے عین کے مالک ہونے تک متجاوز نہیں ہے، اس اعتبار سے ان کے لئے مالک کا لفظ استعمال کرنا رواجی اور مجازی ہے، پس یہ لوگ اصل میں جاگیردار ہیں اور جاگیردار کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جو دخیل کار کے مقابلے میں ہوتا ہے "والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ"

چنانچہ قانون کی دفعہ ۵ میں جہاں دخیل کار کی تشریح لکھی ہے، اسی طرح قانون دفعہ ۱۴ میں جاگیردار کی بھی تشریح لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ:

> ماسوائے سرکاری ملازم کے ہر وہ شخص جس کو کسی بھی زمین کا مالیہ حکومت کی طرف سے کاملاً یا جزواً تفویض کیا گیا ہو، ایسے شخص کو جاگیردار کہا جاتا ہے، ایک اعلیٰ نمبردار اور معافی دار بھی جاگیردار کے زمرے میں آتا ہے۔ (قانونِ مزارعین ص:۱۹)

اور تواریخ میں ہے کہ حکومت انگریز نے ٹیری کے نواب کو ٹیری کی تحصیل ۱۸ر ہزار سالانہ اجارہ پر دے رکھی تھی۔ (تاریخِ کوہاٹ ص:۵۵)

اب ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا جاگیردار شرعی مالک نہیں ہے اور اس نوعیت کا کاشتکار شرعی مالک ہے "والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ" دخیل کار کی زمینوں کے خوانین کو مالک قرار دینے کے لئے اسبابِ ملکیت میں سے کوئی سبب موجود نہیں ہے اور دخیل کار کے شرعی مالک ہونے کے لئے اسبابِ ملکیت میں سے سببِ ملکیت موجود ہے اور وہ ٹیننسی ایکٹ دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۱ و ۲ کے مطابق وراثت ہے۔

1952ء میں جو دخیل کاری ختم ہوگئی ہے، اس سے حکومت کی زمینیں اور شخصی ذاتی زمینیں

مستثنٰی ہیں۔(ملاحظہ فرمائیں: قانونِ مزارعین ص:۲۰۹ پرٹیننسی ایکٹ دفعہ ۱۱۴، ذیلی دفعہ (۱) الف اور دفعہ ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ دخیل کار دفعہ ۵ کی زمین کے خوانین ذاتی مالک نہیں ورنہ ان کی دخیل کاری بھی مستثنی ہوتی، بلکہ ان کا مالک ہونا صرف اعزازی طور پر ہے، ایسا مالک شرعی مالک نہیں ہوتا بلکہ قانونی مالک ہوتا ہے اور یہ قانون زمانۂ جاہلیت کا ہے اور زمانۂ جاہلیت سے ہماری مراد انگریزوں کا زمانہ ہے، پس دخیل کاری بھی اشتراکیت کا تصور ہے، جس میں عین اور منافع دونوں کے دائمی مالک الگ الگ افراد تصور کئے جاتے ہیں، یہی جاہلیت کا قانون ہے اور اسلام کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی کسی عین کے جملہ منافع کا دائمی مالک ہو جیسے دخیل کار ۵، وہی اس عین کا بھی مالک ہوتا ہے نہ کہ کوئی دوسرا۔

اب جو 1952ء میں دخیل کاری کو ختم کر دیا گیا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ خوانین کی زمین دخیل کار کو دی گئی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دخیل کار کا ایک حق تھا وہ یہ کہ جیسے وہ حقیقی مالک ہے، اسی طرح اس کا نام کاشتکار کے خانے میں لکھنے کے بجائے ملکیت کے خانے میں لکھا جائے، تو 1952ء میں دخیل کار کو یہ حق لوٹا دیا گیا۔

باقی جو زمینیں حکومت کی ہیں، ان کی دخیل کاری اب بھی بحال ہے وہ ختم نہیں ہوئی ہے، پس خوانین کی مذکورہ زمینوں کا حقیقی مالک 1952ء سے قبل بھی دخیل کار تھا اور 1952ء کے بعد بھی دخیل کار ہی ہے، لہٰذا دخیل کار کے زیر قبضہ زمین اس کے مرنے کے بعد دخیل کار کا ورثہ اور ترکہ ہے نہ کہ خوانین کا۔ واللہ اعلم۔

اور کیونکہ اس قسم کے سوالات ملک کے مختلف اطراف میں پیش آتے رہتے ہیں، اور اس سلسلے میں اہلِ علم حضرات کو بھی کچھ اشکالات رہتے ہیں، اس لئے اصولی انداز میں جاگیرداری کے مسئلہ کو منقح کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ اُن اصولوں کی روشنی میں کسی بھی جاگیرداری کے مسئلہ کا سمجھنا آسان ہو، اس ضرورت کے لئے ذیل میں چند اصول وقواعد تحریر کئے جا رہے ہیں۔

اصل نمبر (۱)

انگریزوں کی طرف سے کسی سردار کو جو کسی علاقے مثلاً تحصیل، ضلع وغیرہ کا جاگیردار

بنایا جاتا تھا، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ پورا علاقہ اُس جاگیردار کی ملک کردیا گیا، کیونکہ اس طرح مخلوط علاقے عموماً اراضیٔ شخصیہ (یعنی لوگوں کی ذاتی ملکیت والی زمینوں) اور اراضیٔ موقوفہ (یعنی وقف شدہ زمینوں) اور اراضیٔ مباحہ (یعنی ایسی زمینوں جن سے بستی کے مشترکہ حقوق متعلق ہوں مثلاً چراگاہ) اور اراضیٔ موات (یعنی بنجر زمینوں) پر مشتمل ہوتے تھے اور مذکورہ چاروں قسم کی اراضی شرعاً خود حکومت ہی کی ملک نہیں ہوتیں، پھر حکومت کا کسی کو اس قسم کی اراضی کا مالک بنانا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اراضیٔ موات کی ملکیت کی بنیاد بھی احیاء ہے نہ کہ کسی کی طرف ملکیت کی نسبتِ محض (تفصیل اصل نمبر۴ میں ملاحظہ فرمائیں) اور اگرچہ اراضی سلطانیہ (یعنی بیت المال کی ملکیت والی زمینیں) حکومت کو شرعی اصول وقواعد کے مطابق کسی کی ملکیت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، لیکن چونکہ انگریزی دورِ حکومت میں کسی سردار کو پورے علاقے کا سوال میں مذکورہ طریقے پر جاگیردار بنانے کا مطلب اس کو پورے علاقے کا حقیقی مالک بنانا نہیں ہوتا تھا، بلکہ صرف اس علاقے کے لوگوں کی زمینوں کا لگان اور خراج لینے کا حق اس جاگیردار کو تفویض کیا جاتا تھا، اس لئے اس قسم کے جاگیرداروں کو اراضیٔ سلطانیہ سمیت مندرجہ بالا کسی قسم کی اراضی کا شرعاً حقیقی مالک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (البتہ اگر کسی کے حق میں حکومت کی طرف سے کسی اراضی سلطانیہ کا حقیقی مالک قرار دینا ثابت ہوجائے اور وہ شرعی اصول وقواعد کے مطابق بھی ہو تو ایسا شخص اس اراضیٔ سلطانیہ کا شرعی مالک قرار دیا جاسکتا ہے) (ملاحظہ ہو عبارات نمبر۱) (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام کا نظامِ اراضی ص: ۱۹ تا ۳۲ و ص: ۱۲۳۔ انعام الباری ج: ۶ ص: ۵۷۸ و ۵۷۹ و ج: ۷ ص: ۶۵۱۔ تقریر ترمذی ج:۱ ص: ۳۴۴)

اصل نمبر۲

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ ”والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ“ یعنی عقود اور معاملات میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے نہ کہ ظاہری الفاظ کا، اس قاعدہ پر فقہاءِ کرام نے کئی مسائل متفرع فرمائے ہیں۔ (ملاحظہ ہو عبارات نمبر۲)

اس قاعدے کے پیشِ نظر ظاہراً کاغذوں میں کسی کے نام کے ساتھ صرف مالک کے الفاظ لکھنے سے شرعاً اس کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور حقیقی مالک وہی لوگ شمار ہوتے ہیں جو پہلے سے ان اراضی پر قابض ومتصرف تھے اور ان کو مالکانہ حقوق مثلاً خرید وفروخت، ہبہ، میراث وغیرہ کے حقوق حاصل ہیں۔

اصل نمبر ۳

شریعت میں کسی مال کی ملکیت قائم ہونے کا سبب یا تو ملکیت کا کسی کی طرف سے انتقال ہے جیسے بیع، ہبہ یا خلافت اور جانشینی ہونا ہے جیسے ورثہ یا ملکیت کی ابتداء ہے جیسے اصطیاد اور احیاء اموات (جس کی تفصیل نمبر ۴ کے ضمن میں آرہی ہے) لہٰذا اگر کسی کے حق میں ان میں سے کوئی سبب بھی نہ پایا جائے تو پھر اس کی ملکیت شرعاً معتبر نہیں اور وہ ملکیت شرعاً کالعدم ہے۔ (ملاحظہ ہو عبارات نمبر ۳)

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انعام الباری ج:۶ ص:۵۸۲)

مندرجہ بالا قاعدہ کی روشنی میں واضح ہوا کہ انگریزی دور حکومت میں جن لوگوں کو جاگیردار قرار دیا گیا، اگر ان کے حق میں مذکورہ اسبابِ ملکیت میں سے کوئی سبب بھی نہ پایا گیا ہو تو ایسے جاگیردار اُن اراضی کے شرعاً مالک نہیں ہیں اور ان جاگیرداروں کے مقابلے میں جن لوگوں کے حق میں مندرجہ بالا کوئی سبب بھی پایا گیا ہو تو وہی لوگ ان اراضی کے شرعاً مالک ہوں گے۔

اصل نمبر ۴

اگر کسی شخص کو حکومت کی طرف سے بنجر زمین دی جائے تو وہ شخص اس وقت تک مالک نہیں ہوتا، جب تک اس زمین کو تین سال کے اندر اندر آباد نہ کرے، خود یا مزدوروں کے ذریعہ، اگر اس نے ۳ر سال کے اندر اندر ایسا کرلیا تو وہ مالک ہے، اور اگر اس زمین کو ویسے ہی پڑے رہنے دیا، اگرچہ اس نے تحجیر اور توڑ پھوڑ بھی کرلی ہو تو وہ اس کا مالک نہیں ہوگا، اور اگر اس نے اس عرصہ میں خود کاشت کاری کرنے یا مزدوروں کے ذریعہ اجرت پر کاشت کرانے کے بجائے بنجر حالت میں وہ زمین

کسی کاشتکار کو مزارعت یا بٹائی پر دے دی یا کسی دوسرے نے بطور خود کاشت کرلی تو کاشتکاری کرنے والا ہی اس زمین کا شرعاً مالک ہوجائے گا۔ (ملاحظہ ہو عبارات نمبر۴) (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انعام الباری ج:۶ص:۶۵۴)

مندرجہ بالا قاعدے کے پیشِ نظر جن جاگیرداروں نے بنجر زمینوں کو خود آباد کیا، وہ اتنی زمین کے تو مالک ہوگئے اور جنہوں نے بنجر زمینوں کو مذکورہ تفصیل کے مطابق آباد نہیں کیا، اگرچہ حکومت نے ان کو وہ بنجر زمینیں مالکانہ طور پر ہی کیوں نہ دی ہوں، تب بھی وہ ان اراضی کے شرعاً مالک نہیں بنے، بلکہ شرعاً وہی لوگ مالک ہیں جنہوں نے ان بنجر زمینوں کو آباد کیا، اور جو زمینیں اب تک بنجر حالت میں غیر آباد پڑی ہیں وہ شرعاً کسی کی ملکیت نہیں۔

اصل نمبر۵

جس فرد یا حکومت نے کسی دوسرے کی مملوکہ زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا ہو یا اپنے آپ کو ناجائز طریقہ پر مالک تصور کرلیا ہو وہ مالک کی مرضی کے بغیر کسی بھی صورت میں جائز قرار نہیں پاسکتا اور اس کو حقیقی ملکیت کا تقدس کبھی حاصل نہیں ہوسکتا، خواہ اس پر کتنی طویل مدت کیوں نہ گذری ہو۔ (ملاحظہ ہو عبارات نمبر۵) (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عدالتی فیصلے ج:۲ص:۲۲۷)

لہٰذا حکومت یا جاگیرداروں کو دوسروں کی مملوکہ اراضی پر حقِ ملکیت حاصل نہیں ہے اور حکومت یا جاگیرداروں کو دوسروں کی مملوکہ اراضی کا اپنے کو مالک سمجھنا یا قرار دینا یا اپنی طرف ملکیت کی نسبت کرنا درست نہیں ہے۔

اصل نمبر۶

فقہاء کرام کے نزدیک جو شخص عرصۂ دراز سے کسی زمین پر قابض ومتصرف ہو اور وہ اس زمین کو مالکانہ طریقے پر استعمال کررہا ہو، بلکہ میراث درمیراث وہ آگے منتقل ہورہی ہو، غرضیکہ کلی مالکانہ حقوق حاصل ہوں تو ایسی صورت میں اگر کسی دوسرے شخص کی طرف سے اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ ہو تو ملکیت کا ثبوت اس مدعی کی ذمہ داری ہے، قابض ومتصرف کی نہیں۔ (ملاحظہ ہو عبارات

نمبر۶) (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عدالتی فیصلے ج:۲ص:۲۲۹)

فقہاء کرامؒ نے یہاں تک تحریرفرمایاہے کہ اس طرح عرصۂ دراز گذر جانے کے بعد کسی دوسرے ایسے شخص کا ملکیتی دعوی قانوناً قابلِ سماعت ہی نہیں رہتا جس کو قابض کے ان تصرفات کا علم بھی ہو اور وہ بغیر معقول عذر کے عرصۂ دراز تک خاموش رہے۔ (ملاحظہ ہو عبارات نمبر۶) (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عدالتی فیصلے ج:۲ص:۲۲۴)

اس قاعدے کے پیشِ نظر جو لوگ اپنی زیرقبضہ اراضی پر عرصۂ دراز سے متصرف تھے اور جاگیرداروں کو جو کسی بھی لقب سے موسوم ہوں، اس کا علم ہونے کے باوجود ان لوگوں کے قبضے و تصرفات پر نہ صرف یہ کہ کوئی اعتراض نہیں تھا، بلکہ وہ جاگیردار اصحابِ قبضہ کے ان تصرفات پر قولاً و فعلاً راضی بلکہ ان کے شریکِ کار تھے، ایسی صورت میں جاگیرداروں کی طرف سے اپنی ملکیت کا دعوی کرنا قانوناً قابلِ سماعت نہیں رہتا۔

(ا) الکلام فی موضعین فی بیان أنواع الأراضی وفی بیان حکم کل نوع منها. (أما) الأول: فالأراضی فی الأصل نوعان: أرض مملوکة، وأرض مباحة غیر مملوکة، والمملوکة نوعان: عامرة وخراب، والمباحة نوعان أیضا: نوع هو من مرافق البلدة محتطبا لهم ومرعی لمواشیهم ونوع لیس من مرافقها وهو المسمی بالموات.

(أما) بیان حکم کل نوع منها. (أما) الأراضی المملوکة العامرة: فلیس لأحد أن یتصرف فیها من غیر إذن صاحبها؛ لأن عصمة الملک تمنع من ذلک، وکذلک الأرض الخراب الذی انقطع ماؤها ومضی علی ذلک سنون لأن الملک فیها قائم وإن طال الزمان حتی یجوز بیعها وهبتها وإجارتها وتصیر میراثا إذا مات

صاحبها۔ (بدائع الصنائع، ج: ٦ ص: ۱۹۳، أنواع الأراضی و بیان حکم کل منها)[1]

(۲) ...(الف) ... (قوله: والعبرة) أی فی العقود للمعانی ولهذا کانت الکفالة بشرط براء ة الأصیل حوالة ، والحوالة بشرط عدم براء ة الأصیل کفالة، إتقانی۔ (رد المحتار ج: ٦ ص: ۴۹۷، کتاب الرهن ، باب ما یجوز ارتهانه وما لایجوز)[2]

(ب) ... والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ ألا تری أنه لو قال ملکتک هذا العبد بکذا کان بیعا وإن لم یصرح بلفظ البیع۔ (المبسوط للسرخسیؒ ج: ۴، الجزء السابع ص: ۱۴۹، کتاب العتق باب العتق علی المال)[3]

(ج) والعبرة فی العقود للمعانی لا للألفاظ۔ (بدائع الصنائع ج: ۳ ص: ۱۵۲، و أما حکم الخلع، کتاب الطلاق)[4]

(د) ....والعبرة للمعانی دون الألفاظ ألا تری أن من قال لغیره جعلتک وکیلا بعد موتی یکون وصیة ولو قال جعلتک وصیا فی حیاتی یکون وکیلا، وکذا لو أعطی المال مضاربة بشرط أن یکون کل الربح للمضارب یکون قرضا ولو شرط لرب المال یکون بضاعة۔ (تبیین الحقائق ج: ۲ ص: ۱۱۵، کتاب النکاح، فصل فی المحرمات، النکاح المؤقت)[5]

---

(۱) ج: ٦ ص: ۱۹۲، ۱۹۳ (طبع سعید)

(۲) (طبع سعید)

(۳) المبسوط للسرخسی، ج: ۲۸ ص: ۲۸۹ (طبع دار المعرفة بیروت)

(۴) (طبع سعید)

(۵) ۲/۴۹۰(طبع سعید)

(۳) ....(الف)....فالأسباب ثلاثة مثبت للملک وهو الاستیلاء و ناقل للملک وهو البیع و نحوه و خلافة وهو المیراث۔ (البحر الرائق ج: ۵ ص: ۲۵۸، کتاب البیوع)[۱]

(ب) ....وأسباب الملک ثلاثة مثبت للملک من أصله وهو الاستیلاء علی المباح۔ وناقل بالبیع والهبة ونحوهما، وخلافة کملک الوارث، فالأول شرطه خلو المحل عن الملک، فلو استولی علی حطب جمعه غیره من المفازة لم یملکه۔ (الأشباه والنظائر ج:۲ص: ۴۵۵)[۲]

(ج)...(وفی شرح الحموی) قوله أسباب الملک ثلاثة الخ أقول: یزاد علی ذلک إحیاء الموات فإنه سبب للملک لحدیث من أحیا أرضا مواتا فهی له۔ (ج: ۲ ص: ۴۵۵، کتاب الصید والذبائح والأضحیة)[۳]

(د)....فالأسباب ثلاثة یثبت للملک وهو الاستیلاء وناقل للملک وهو البیع و نحوه و خلافة وهو المیراث والوصیة وما أرید لأجله حکم التصرف حکمة و ثمرة۔ (الأشباه مع شرح الحموی ج: ۳ ص: ۱۳۳، أحکام الإشارة الأولی أسباب التملک)[۴]

(ہ)...اعلم أن أسباب الملک ثلاثة ناقل کبیع و هبة ، و خلافة کإرث و إصالة وهوالاستیلاء حقیقة بوضع الید أو حکما بالتهیئة

---

(۱)(طبع سعید)

(۲) (طبع منشورات نشاط العربی، بیروت)

(۳) أیضا

(۴) أیضا

كنصب شبكة الصيد. (در مختار وفى الشامية :) (قوله: وهو الاستيلاء حقيقة) شمل إحياء الموات فلا حاجة إلى عده قسما رابعا كما فعل الحموى. (رد المحتار ج: ٦ ص: ٤٦٣، كتاب الصيد)[١]

(۴)...(الف)....وعن عمر رضى الله عنه قال: من أحيا أرضا ميتة فهى له، وليس بعد ثلاث سنين حق والمراد بالمحجر المعلم بعلامة فى موضع، واشتقاق الكلمة من الحجر، وهو المنع فإن من أعلم فى موضع من الموات علامة فكأنه منع الغير من إحياء ذلک الموضع فسمى فعله تحجيرا. وبيان ذلک أن الرجل إذا مر بموضع من الموات فقصد إحياء ذلک الموضع، فوضع حول ذلک الموضع أحجارا أو حصد ما فيها من الحشيش، والشوک، وجعلها حول ذلک فمنع الداخل من الدخول فيها فهذا تحجير، ولا يكون إحياء إنما الإحياء أن يجعلها صالحة للزراعة بأن كربها أو ضرب عليها المسناة أو شق لها نهرا ثم بعد التحجير له من المدة ثلاث سنين كما أشار إليه عمر -رضى الله عنه. (المبسوط للسرخى ج: ١٢، الجزء الثالث والعشرون ص: ١٦٠،كتاب الشرب، بعدكتاب المزارعة، قبل كتاب الأشربة)[٢]

(ب) .....وفى الغياثية: لو أقطع الإمام رجلا أرضا فتركها ثلاث سنين لا يعمر فيها بطل الإنتفاع. (البحر الرائق ج: ٨ ص: ٢١١

---

(١) (طبع سعيد)

(٢) ج: ٢٣ ص: ٢٩٦ (طبع دارالفكر بيروت)

كتاب إحياء الموات)[1]

(ج) ...... ولو حجر الأرض الموات لا يملكها بالإجماع؛ لأن الموات يملك بالإحياء ؛ لأنه عبارة عن وضع أحجار أو خط حولها يريد أن يحجر غيره عن الاستيلاء عليها، وشيء من ذلك ليس بإحياء فلا يملكها ولكن صار أحق بها من غيره ..... وإذا صار أحق بها فلا يقطعها الإمام غيره إلا إذا عطلها المتحجر ثلاث سنين ولم يعمرها. (بدائع الصنائع ج: ٦ص: ١٩٥، كتاب الأراضي ، أنواع الأرض و بيان حكم كل نوع منها)[2]

(د)... ولو أقطع الإمام الموات إنسانا فتركه ولم يعمره لا يتعرض له إلى ثلاث سنين فإذا مضى ثلاث سنين فقد عاد مواتا كما كان وله أن يقطعه غيره لقوله عليه الصلاة والسلام ليس لمحتجر بعد ثلاث سنين حق. (بدائع الصنائع ج: ٦ ص: ١٩٤ أنواع الأراضي وبيان حكم كل نوع منها)[3]

(٥).... لأن الإحياء جعلها صالحة للزراعة والتحجّر الإعلام مشتق من الحجر، وهو منع الغير بوضع علامة من حجر أو بحصاد ما فيها من الحشيش والشوك ونفيه عنها وجعله حولها أو بإحراق ما فيها من الشوك وغيره وكل ذلك لا يفيد الملك فبقيت مباحة على حالها لكنه هو أولى بها، ولا تؤخذ منه إلى ثلاث سنين فإذا لم يعمرها فيها أخذها الإمام منه ودفعها إلى غيره. (تبيين الحقائق، كتاب إحياء الموات)[4]

---

(١)(طبع سعيد)
(٢) أيضا
(٣) أيضا
(٤)أيضا

(و)۔۔۔۔ والتحجير الإعلام، سمى به لأنهم كانوا يعلمونه بوضع الأحجار حوله أو يعلمونه لحجر غيرهم عن إحيائه فبقى غير مملوک كما كان هو الصحيح. (فتح القدير ج۹ ص۶ کتاب إحياء الموات)[1]

(ز)۔۔۔۔ فإذا تركها هذا القدر فالظاهر أنه قصد إتلافها وموتها فوجب على الإمام إزالة يده عنها، وهذا كله ديانة، أما إذا أحياها غيره قبل مضى هذه المدة ملكها، وإنما هذا للاستيام فيكره، ولو فعله جاز العقد. (الجوهرة النيرة ج: ۲ ص: ۵۵، كتاب إحياء الموات)[2]

(ح) ۔۔۔ قالوا: و هذا كله ديانة، فأما إذا أحياها غيره قبل مضى هذه المدة ملكها لتحقق الإحياء منه دون الأول وصار كالاستيام فإنه يكره، ولو فعل يجوز. (فتح القدير ج: ۹ ص: ۲،كتاب إحياء الموات)[3]

(۵) ۔۔۔۔ (الف)۔۔۔۔ الحق لا يسقط بتقادم الزمان۔(الأشباه والنظائر ج:۲ص:۱۹۳)[4]

(ب) ۔۔۔۔ وقال رسول الله ﷺ: لا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه۔ (مجمع الزوائد ج:۴ ص: ۱۷۱[5] بحواله مسند أحمد)

---

(۱)(طبع رشیدیه کوئٹه)

(۲) (طبع رشیدیه کوئٹه)

(۳) (طبع رشیدیه کوئٹه)

(۴) (طبع رشیدیه کوئٹه)

(۵) مجمع الزوائد كتاب البيوع باب الغصب وحرمة مال المسلم ج:۴ ص: ۳۰۵ (طبع دار الفكر بيروت)

(ج) .... وقال رسول الله ﷺ: من أحيا أرضا ميتة فهى له و ليس لعرق ظالم حق. (ترمذى ج: ١ ص: ١٦٥ و ١٦٦، أبواب الأحكام)[١]

(٢)...(الف) ... والحاصل من هذه النقول أن الدعوى بعد مضى ثلاثين سنة أو بعد ثلاثة وثلاثين لا تسمع إذا كان الترك بلا عذر من الأعذار المارة لأن تركها هذه المدة مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهرا كما مر عن المبسوط وإذا كان المدعى ناظرا أو مطلعا على تصرف المدعى عليه إلى أن مات المدعى عليه لا تسمع الدعوى على ورثته كما مر عن الخلاصة. وكذا لو مات المدعى لا تسمع دعوى ورثته كما مر عن الولوالجية والظاهر أن الموت ليس بقيد وأنه لا تقدير بمدة مع الاطلاع على التصرف. (فتاوى تنقيح حامدية ج: ٢ ص: ٣، كتاب الدعوى)[٢]

(ب) .... لو أمر السلطان بعد سماع الدعوى بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ينفذ. (در مختار) وفى الشامية: أن السلاطين الآن يأمرون قضاتهم فى جميع ولاتهم أن لا يسمعوا دعوى بعد مضى خمس عشرة سنة سوى الوقف والإرث. (رد المحتار ج:٥ص: ٤١٩، كتاب القضاء،مطلب فى عدم سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة)[٣]

(د) .... ثم اعلم أن عدم سماعها ليس مبنيا على بطلان الحق

---

(١) ج ١ ص ٢٥٦ (طبع قديمى كتب خانه)

(٢) (طبع مكتبة حبيبية كانسى روڈ كوئٹه)

(٣) (طبع سعيد)

حتى يرد أن هذا قول مهجور، لأنه ليس ذلك حكما ببطلان الحق، وإنما هو امتناع من القضاة عن سماعها خوفا من التزوير ولدلالة الحال كما دل عليه التعليل، وإلا فقد قالوا إن الحق لا يسقط بالتقادم كما في قضاء الأشباه. (رد المحتار ج: ٦ ص: ٧٤٣، كتاب الخنثى، مسائل شتى)[۱]

لأن البينة على خلاف المشهور المتواتر لا تسمع و لا تقبل. (فتاوى تنقيح حامدية ج: ٢ ص: ٤١ و ٤٢، كتاب الدعوى)[۲]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد رضوان ۲۰/۳/۱۴۲۷ھ

دارالافتاء ادارہ غفران راولپنڈی

مذکورہ جواب پر ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب کی رائے

محترم مفتی رضوان صاحب سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کوہاٹ کی زمینوں سے متعلق آپ کا فتویٰ موصول ہوا، حسبِ ارشاد کچھ لکھتا ہوں۔

آپ کا جواب تو صحیح ہے لیکن استدلال محلِ نظر ہے۔ جواب صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قابضین جو کہ حقیقی مالک تھے، ان کے قبضہ اور انتفاع کے ہوتے ہوئے انگریزوں کا استیلاء ان کی زمینوں پر نہیں ہوا، ایسی حالت میں انگریزوں کا خوانین کو مالکانہ بنیادوں پر جاگیر دینا باطل ہوا، ہاں اگر انگریز سابقہ مالکان اور قابضین کو بے دخل کر دیتے کہ ان کے لئے ان اراضی سے انتفاع ممکن نہ ہوتا تو البتہ انگریزوں کا استیلاء تام ہوتا اور خوانین کو جاگیر دینا بھی صحیح ہوتا۔

---

(۱) (طبع سعيد)

(۲) (طبع مكتبة حبيبية كانسى روڈ كوئٹه)

لکنها (أی العصمة) ثبتت لضرورة تمکن المالک من الانتفاع، فإذا زالت الملکة بالاستیلاء وتباین الدارین ....

(رد المحتار ص: ۲٦۸ ج: ۳)[1]

استدلال کے محلِ نظر ہونے کی وجوہات یہ ہیں:

(۱)... زیر کاشت زمین کے علاوہ بنجر زمینوں اور پہاڑوں پر بھی خوانین کو مالک بنایا گیا، وہاں تو فصل کا مسئلہ نہیں تھا۔

(۲)... ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جو جاگیردار انگریزوں نے بنائے، وہ تو حقیقی مالک ہی ہیں۔

(۳)... انگریزوں کا قانون بھی مالک اور ٹننسنٹ (مزارع خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف) کے درمیان فرق کو سمجھتا تھا، اور حقیقی اور مجازی کے فرق کو بھی سمجھتا تھا۔

(۴)... 1952ء میں قیوم خان نے خوانین کی زمین میں ۱/۵ ملکیت قائم کردی تو یہ تو قابضین کے لئے جو آپ کے خیال میں حقیقی مالک تھے، بڑا دھچکا ہوتا، وہ اس پر مطمئن کیوں ہوئے؟ صرف فصل میں ۱/۵ حصہ کا حق ہونا تو زمین میں ۱/۵ حصہ میں ملکیت سے بہت اہون تھا۔

ہاں خوانین کے لئے ۱/۵ زمین پر مطمئن ہوجانا اس وجہ سے تھا کہ یہ تو غداری کا صلہ تھا جو اُن کو ملتا تھا اور کوئی باغیرت آزاد حکومت ایسی جاگیروں کو باقی نہیں رکھتی۔ پھر ۱/۵ حصہ تو زیر کاشت زمینوں میں ہے، رہے پہاڑ اور بنجر زمینیں تو ان میں بظاہر ان کی ملکیت باقی رکھی گئی۔

یہ چند ایک نکات لکھ دئے ہیں، غور فرمالیجئے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

عبدالواحد غفرلہ

۲۲/ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

---

(۱) (طبع سعید)

جواب وفتوی از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مکرمی جناب مولانا مفتی محمد رضوان صاحب، سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بندہ نے آپ کے فتوی بسلسلہ ارضِ کوہاٹ کا مطالعہ کیا، ماشاء اللہ جواب صحیح اور مناسب ہے، **زادکم اللہ تعالیٰ علمًا و توفیقًا۔**

انعام الباری میں انگریزوں کی دی ہوئی جاگیروں کے بارے میں جو لکھا گیا ہے، اس میں قدرے اجمال رہ گیا ہے، تفصیل یہ ہونی چاہئے کہ جو سرکاری زمینیں یا شخصی زمینیں (بعد انقضاء الحرب) ضبط کر کے دی گئیں، ان میں جاگیردار مالک نہیں بنے۔[1] اور جو زمینیں بنجر تھیں، اور کاشتکاروں سے آباد کرائیں، ان میں بھی ان کی ملکیت نہیں آئی،[2] البتہ جو بنجر زمینیں انہوں نے خود کاشت کرلیں، ان کا معاملہ مشتبہ ہے اور بندہ کا رجحان اس طرف ہے کہ چونکہ انہیں حکومت نے رشوت کے طور پر یہ اجازت دی تھی، اس لئے یہ اجازت معتبر نہیں ہے اور ان کے حق میں اس اجازت پر عمل کرنا جائز بھی نہیں تھا، لہٰذا یہ احیاء بغیر اذن الحکومۃ ہوا اور اسی بارے میں یہ بحث معروف ہے کہ احیاء بغیر الاذن سے ملکیت آتی ہے یا نہیں؟ اس بحث کی روشنی میں دونوں احتمال ہیں۔[3]

ان شاء اللہ انعام الباری کے آئندہ ایڈیشن میں یہ تفصیل درج کردی جائیگی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔ پے در پے کئی سفروں کی وجہ سے اس خط کے جواب میں تاخیر ہوگئی۔

والسلام

۲۲/۶/۱۴۲۷ھ

(۱ تا ۳) ان مسائل کی تفصیل کے لئے معروف کتبِ فقہ کے علاوہ اس موضوع پر خاص طور پر تالیف کی گئی درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: ''اسلام کا نظامِ اراضی'' مصنفہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ ''عدالتی فیصلے'' ج: ۲ میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا فیصلہ ''غاصبانہ قبضہ اور حقِ ملکیت'' اور ''اراضی شاملات کی شرعی حیثیت'' تقریر ترمذی ج: ۱ ص: ۳۳۹ تا ص: ۳۴۹۔ انعام الباری ج: ۷ ص: ۶۵۵ و ۶۵۶۔

(۱) ذاتی، سرکاری یا مباحِ عام زمین میں ملنے والے دفینہ کا حکم اور نشاندہی کرنے والے کے حصہ کی تفصیل

(۲) کیا حکومت سے پوشیدہ سرکاری خیانت شدہ رقم کی دریافت بھی ''دفینۂ زمین'' کا حکم رکھتی ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں کہ علماءِ دین ومفتیانِ متین، ان مسائل میں کہ:

(۱)... اگر زید کو دفینہ نظر آیا اور اس کی نشاندہی پر افرادِ حکومت نے دفینہ برآمد کیا تو نشاندہی کرنے والے یعنی زید کو دفینہ کا کون سا حصہ از روئے شریعت ملنا چاہئے، جبکہ زمین کاری ہو اور جبکہ زمین اس کی زرخرید ہو۔

(۲)... تغلب وتصرف (خیانت) کا ایک ایسا واقعہ جو سالہا سال سے چھپا ہوا ہو بالفاظِ دیگر دفن ہو چکا ہو اور سوائے مرتکبین کے یا مخبر زید کے اس کا علم کسی اور کو نہ ہو، زید کی مخبری پر تغلب وتصرف کی جو رقم حکومت برآمد کرے، اس برآمد شدہ رقم کا کون سا حصہ مخبر کو از روئے شریعت ملنا چاہئے؟ اور کیا یہ تغلب وتصرف کا کیس دفینہ کی تعریف میں نہیں آ سکتا؟ یہ ظاہر ہے، معاملہ بھی دفینہ جیسا معلوم ہوتا ہے کہ سالہا سال سے وہ ایک سربستہ راز تھا اور کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔

جواب:- (۱)... پہلے یہ سمجھئے کہ زمین تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ زمین جو حکومت کی ملکیت ہو اور حکومت نے انہیں آباد کیا ہو۔ دوسرے وہ زمینیں جو کسی فرد یا معین افراد کی ذاتی ملکیت میں ہوں، اور تیسرے وہ زمینیں جنہیں نہ تو حکومت نے آباد کر کے اپنی ملکیت میں لیا ہو اور نہ وہ کسی معین فرد یا افراد کی ملکیت ہوں جیسے بنجر صحراء، جنگل، پہاڑ وغیرہ۔

ان تمام اقسام میں جو دفینہ برآمد ہو، اگر اس کے بارے میں علامات سے گمان غالب یہ ہو کہ یہ کسی مسلمان کی ملکیت تھا اور اس نے دفن کیا تھا تو اس کا حکم لقطے کا ہوگا، یعنی اس کے مالک یا اس کے ورثاء کی مناسب مدت تک تلاش کی جائے، اگر وہ مل جائیں تو ان کے حوالے کیا جائے،

اور اگر نہ مل سکیں تو اسے فقراء ومساکین پر صدقہ کردیا جائے اور اگر گمان غالب یہ ہو کہ مسلمانوں کے اس خطے کو فتح کرنے سے پہلے جو کافر یہاں آباد تھے، یہ خزانہ انہوں نے دفن کیا تھا، یا علامات سے دفن کرنے والے کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے تو اگر زمین پہلی قسم کی ہے یعنی حکومت کی ملکیت ہے تو پورا دفینہ حکومت کا ہوگا، البتہ حکومت دریافت کرنے والے کو کچھ انعام دینا چاہے تو دے سکتی ہے، جس کی کچھ مقدار مقرر نہیں، البتہ دوسری اور تیسری قسم کی زمین میں دفینہ برآمد ہو تو اس کا پانچواں حصہ حکومت کو دیا جائے گا اور باقی تمام دفینہ اس شخص کا ہوگا جس نے دفینہ دریافت کیا۔

فی الدر المختار: و ما علیه سمة الإسلام من الكنوز فلقطة و ما عليه سمة الكفر خمس (فی رد المحتار تحته) وقال أبويوسف: الباقي للواجد كما فی أرض غير مملوكة و عليه الفتوى اهـ

قلت: وهو حسن فی زماننا لعدم انتظام بيت المال) و إن خلا عنها أی العلامة أو اشتبه الضرب فهو جاهلی على ظاهر المذهب۔ (شامی ص: ٦٣ و ٦٤ ج: ٢)[١]

وفی رد المحتار: قيل ذلک و أما الثانی وهو مملوكة لغير معين فلم أر حكمه والذی يظهر لی أن الكل لبيت المال الخ۔ (شامی ص: ٦٠ ج: ٢)[٢]

---

(١) الدر المختار مع رد المحتار كتاب الزكاة باب الركاز ج:٢ ص: ٣٢٢ و ص: ٣٢٣(طبع سعيد)۔
وفی الهندية ج: ١ ص: ١٨٥ (طبع رشيدية كوئٹه) ومن وجد كنزا فی دار الإسلام فی أرض غير مملوكة كالفلاة فإن كان على ضرب أهل الإسلام كالمكتوب عليه كلمة الشهادة فهو بمنزلة اللقطة، وإن كان على ضرب أهل الجاهلية كالدراهم المنقوش عليها الصليب والصنم ففيه الخمس، وأربعة أخماس للواجد ..... ولو اشتبه الضرب بأن لم يكن فيه شیء من العلامات يجعل جاهليا فی ظاهر المذهب..... وإن وجد فی أرض مملوكة اتفقوا جميعا على وجوب الخمس فيه۔
وفی مجمع الأنهر ج: ١ ص: ٣١٤، ٣١٥۔(طبع دار الكتب العلمية بيروت) وإن وجد كنزا فيه علامة الإسلام فهو كاللقطة و ما فيه علامة الكفر خمس و باقيه له إن كانت أرضه غير مملوكة و إن مملوكة فكذلک عند أبی يوسف و عندهما باقيه لمن ملكها أول الفتح ..... و ما اشتبه ضربه يجعل كافريا فی ظاهر المذهب۔
(٢) باب الركاز ج:٢ ص:٣١٩ (طبع سعيد)

(۲) ...جی نہیں! اس صورت کا شرعاً دفینے کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس پر وہ احکام عائد ہوتے ہیں، ایسے شخص کو حکومت جو انعام دینا مناسب سمجھے، دے سکتی ہے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸/۱۷۳۰ د)

دو زمینوں کے باہمی تبادلہ کے پینتیس سال بعد کسی زمین میں کمی بیشی ظاہر ہونے کی ایک مخصوص صورت کا حکم

(خط از مستفتی)

بخدمت جناب حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مؤدبانہ گذارش ہے کہ زمین کا ایک مسئلہ پیش آیا (جو کہ درخواست کے ساتھ لف ہے) لیکن اس میں فریقین نے مسئلہ مذکورہ مختلف جگہوں سے پوچھا، جس میں ایک ہی استفتاء کے دو مختلف جواب سامنے آئے ہیں، ہر دو فریق مصر تھے کہ ان کا پوچھا ہوا استفتاء کا جواب مانا جائے، لیکن بالآخر باہم اس بات پر صلح ہوئی کہ دونوں فتاوی حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کردئے جائیں، وہ جس کی تصویب فرمائیں گے، اسی پر دونوں فریق راضی ہیں۔

لہٰذا آنجناب کی خدمت میں استفتاء اور دونوں فتاوی پیش ہیں، آنجناب سے گزارش ہے کہ آپ دونوں فتاوی پر نظر فرما کر صحیح مسئلہ کی طرف راہنمائی فرمائیں۔

العارض
قاری محمد ابراہیم
(مدرسہ عربیہ کوثر ضلع بونیر)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ دینِ متین کہ ایک شخص مسمی محمد اکرم

نے دوسرے شخص مسمی یوسف خان سے 1980ء سے پہلے زمین کا تبادلہ کیا تھا، لیکن پٹوار میں انتقال رہ گیا تھا۔ اب 2010ء کے آخر میں جب پٹوار خانہ میں پٹواری کے پاس گئے، تاکہ پٹوار میں بھی انتقال ہو جائے تو پٹواری نے کہا کہ محمد اکرم کے زمین میں زیادتی ہے، تو اب یوسف خان اور بھتیجوں نے کہا کہ پہلے زیادتی کا عوض ادا کرو، پھر پٹوار میں انتقال کا معاملہ ختم کریں گے، حالانکہ پٹوار کے پاس جانے سے پہلے یوسف خان کے بھتیجوں کا اصرار تھا کہ انتقال کا معاملہ ختم ہو جائے اور محمد اکرم یہ بات مانتا ہے کہ زیادتی ہے، لیکن پٹوار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اور یہ معاملہ بہت پہلے زمین کے تبادلہ کے ساتھ ہو چکا ہے، صرف انتقال کے حد تک سرکار میں معاملہ باقی تھا۔ محمد اکرم بالکل یقینی طور پر بھی یہ نہیں کہہ رہا کہ اس زیادتی کا عوض میں ادا کر چکا ہوں بوجہ عرصہ دراز گزرنے کے۔ یوسف خان اور اس کے بھتیجے یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے اس زیادتی کا عوض ادا کرو، پھر انتقال کا معاملہ ہوگا، اگر واقعۃً اس زیادتی کا عوض پہلے ادا نہیں کیا گیا تھا تو اتنا عرصہ تقریباً 35 سال کے دوران کیوں ذکر نہیں کیا گیا اور اتنا طویل عرصہ حاصلات کا مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا؟ حالانکہ طرفین 35 سال موجود رہے ہیں، نہ سفر پر تھے، نہ بے خبر تھے، بلکہ ایک دوسرے کی زمین سے بھی باخبر ہے، یہاں تک کہ پٹواری کے پاس جانے سے پہلے اور اس زیادتی کا ذکر کرنے سے پہلے دونوں طرفین سرکار میں انتقال پر راضی ہو چکے تھے۔

اب انتقال صرف اس وجہ سے رہ گیا کہ محمد اکرم کے پاس صرف انتقال کے خرچہ کی استطاعت تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زیادتی کے عوض کی استطاعت نہیں، جس عوض کے یوسف خان اور بھتیجے طالب ہیں۔

اب یوسف خان اور بھتیجوں کا انتقال سے رُوگردانی کس وجہ سے ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ مدعی کون ہے اور مدعی علیہ کون ہے؟ اور اگر بالفرض محمد اکرم پر یہ ثابت ہو جائے کہ زیادتی کا عوض پہلے ادا نہیں کیا گیا تو اب 35 سال قبل کی قیمت ادا کرے گا یا موجودہ نرخ کی قیمت ادا کریگا اور اگر یوسف خان بغیر ثبوت یہ کہے کہ اُس زیادتی میں سے نصف زمین یا اس کی قیمت دے دو بطور صلح کے

تو یہ صلح جائز ہے یا نہیں؟

جواب از جامعہ اسلامیہ تیمرگرہ

الحمدللہ رب العلمین، الجواب باسم ملہم الصواب

محمد اکرم کی جانب جو زیادتی آئی ہے، وہ اس کا حق ہوگا، محمد یوسف یا اس کے بھتیجے کا دعوی درست نہیں، یہ بیع اور مبادلہ ہے، جب وقتِ مبادلہ حدود معلوم کئے گئے ہوں تو جس طرف کو بھی زیادتی ہو وہ اس کا حقدار ہوگا، زیادتی کے واپس کرنے یا اس کے عوض لینے کا حق نہیں ہوگا۔

و هذا لأن الأرض من المزروعات وليست من المكيلات و الموزونات فيكون الزرع فيها وصفا لا أصلا۔

ومن اشترى ثوبا على أنه عشرة أذرع بعشرة دراهم أو أرضا على أنها مائة ذراع بمائة فوجدها أقل فالمشترى بالخيار، إن شاء أخذها بجملة الثمن، وإن شاء ترک"؛ لأن الذراع وصف فى الثوب ......وإن وجدها أكثر من الذراع الذى سماه فهو للمشترى ولا خيار للبائع"؛ لأنه صفة، فكان بمنزلة ما إذا باعه معيبا، فإذا هو سليم۔ (الهداية ج: ۵ ص: ۱۴)[۱]

الجواب صحیح
بندہ مجیب الرحمٰن

المتعلم محمد اسحاق
بجامعۃ العلوم الاسلامیۃ تیمرگرہ

(وضاحت از مرتب)

حضرت والا دامت برکاتہم نے سوال اور دونوں جوابات کا مطالعہ فرمانے کے بعد اصل استفتاء کے بارے میں چند تنقیحات ضروری سمجھیں اور سائل سے درج ذیل تنقیحات طلب فرمائیں۔ (مرتب)

---

(۱) هدايه ج: ۳ ص: ۲۴ (طبع رحمانية)

تنقیح از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مندرجہ ذیل اُمور کی وضاحت استفتاء کے ساتھ کی جائے، اس کے بعد ان شاء اللہ جواب دیا جائے گا:

(۱)...زمین کا تبادلہ زمین سے ہوا تھا یا نقد قیمت کے ذریعے؟

(۲)... تبادلے کے وقت پیمائش کی گئی تھی یا نہیں؟ اگر کی گئی تھی تو اس وقت یہ زیادتی معلوم تھی یا نہیں؟

(۳)...اگر پیمائش نہیں کی گئی تھی تو زمین کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا؟

(۴)...اب جو زیادتی نکلی ہے، وہ کتنی ہے؟

ان سوالات کا جواب دونوں فتووں کی کاپی کے ساتھ بھیجا جائے۔

والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی
۳۲/۵/۲۶ھ

تنقیحات کا جواب از مستفتی

(۱)...زمین کا تبادلہ زمین سے ہوا تھا نہ کہ نقد قیمت کے ذریعے۔

(۲)... یوسف خان نے محمد اکرم سے کہا تھا کہ تو اپنی زمین مجھے دیدو اور میں اپنی زمین تجھے دوں گا، اب عرصہ دراز کے گزرنے کے سبب یہ یاد نہیں کہ زمین کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا تھا، پیمائش کے ذریعے یا اٹکل سے اور نہ یہ یاد ہے کہ زیادتی اس وقت معلوم تھی یا نہیں؟

(۳)...اب جو زیادتی نکلی ہے وہ تقریباً ڈیڑھ کنال ہے۔

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

تنقیح کے جواب سے معلوم ہوا کہ زمین کا تبادلہ زمین سے ہوا تھا، اور یوسف خان نے محمد اکرم سے کہا تھا کہ "تم اپنی زمین مجھے دیدو اور میں اپنی زمین تمہیں دیدوں گا" اس سے معلوم ہوا

کہ دونوں کی زمینیں آپس میں معروف اور متعین تھیں، پیمائش معلوم ہو یا نہ ہو، ایسی صورت میں شرعاً تبادلہ درست ہوگیا۔[۱] کیونکہ پیمائش کے بغیر بھی جب دونوں زمینوں کی حدود متعین ہوں، تبادلہ درست ہوجاتا ہے۔ اور اگر ایک زمین کی پیمائش دوسری سے زیادہ بھی ہو، تب بھی تبادلہ شرعاً درست ہے۔[۲] اور بعض اوقات محلِ وقوع یا دوسرے اسباب کی بناء پر کم وبیش زمینوں کے تبادلے پر فریقین راضی ہوجاتے ہیں، لہٰذا اگر 35 سال کے بعد پیمائش کرنے پر ایک زمین زیادہ نکلی ہے تو سابق بیع پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور اب یوسف خان کو اس زیادتی کی قیمت کے مطالبے کا حق نہیں ہے۔[۳] اور اسے چاہئے کہ وہ زمین کے سرکاری کاغذات میں انتقال کے لئے یہ شرط نہ لگائے کہ اس زائد زمین کی قیمت ادا کرو، شرعاً اُسے یہ حق نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۳۲/۶/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۵۶/۷۴)

تحدیدِ ملکیت کا شرعی تصور اور تحدید کی شرعی حیثیت سے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف

سوال:- تحدیدِ ملکیت کا شرعاً کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ جناب اسد گیلانی امیر جماعت سے پوچھا گیا کہ تمہارے منشور میں تحدیدِ ملکیت ہے، اس کا شرعاً کیا ثبوت ہے؟ تو اس نے کہا کہ حضرت مفتی صاحب کی بھی یہی رائے ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:- اسلام میں نظام ایسا بنایا گیا ہے کہ اس میں ایک شخص کی ملکیت اس طرح بڑھنے نہیں پاتی کہ وہ دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو، بلکہ خود بخود ملکیت میں تحدید ہوتی رہتی ہے، لیکن ملکیت کی کوئی خاص حد خارج سے اسلام میں مقرر نہیں کی گئی۔ ایسی تحدید شرعاً جائز نہیں۔[۴] حضرت

(۱، ۲، ۳) وفی الشامیة: ج: ۴ ص: ۵۲۹ و معرفة الحدود تغنی فی معرفة المقدار ففی البزازیة باعه أرضا و ذکر حدودها لا زرعها طولا و عرضاً جاز.
وفی البحر الرائق ج: ۱۲ ص: ۲۵۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولأنه مع الإشارة إذا کان لا یحتاج إلی معرفة المقدار لا یحتاج إلی معرفة الوصف بالأولیٰ.

(۴) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تکملہ فتح الملہم "مسئلہ ملکیة الأرض" ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی) اور "تحدیدِ ملکیت کی شرعی حیثیت" ملاحظہ فرمائیں۔

مفتی صاحب مدظلہم کا فتوی یہی ہے، اس کے خلاف جو بات بھی کسی نے ان کی طرف منسوب کی ہو، وہ غلط ہے، یہ بھی درست نہیں ہے کہ کسی سیاسی جماعت نے حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے مشورہ سے اپنے منشور میں تحدیدِ ملکیت کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ تحدیدِ ملکیت کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا موقف پہلے بھی شائع ہو چکا ہے، اور ماہِ صفر کے البلاغ سے بھی معلوم ہو سکے گا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۰/۱/۱۷ھ

(فتوی نمبر ۴۰/۲۱۸)

كِتَابُ الأَشْرِبَةِ

﴿ شرابؒ اور الکوحل ملی اشیاء وغیرہ کا بیانؒ ﴾
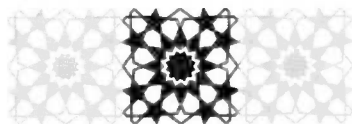
فصل فی أحکام الکحول

(الکوہل کے احکام)

الکوہل ملی ہوئی دوا کے استعمال کا حکم

سوال: (۱)... جس دوا میں الکحول شامل ہو، اس کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جس دوا میں الکوحل کا ہونا معلوم ہو، اسے شدید ضرورت کے بغیر پینا جائز نہیں[۱]۔ اور شدید ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی طبیب یا ڈاکٹر یہ کہے کہ اس کے بغیر شفاء کی اُمید نہیں ہے[۲]۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸۸/۶/۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

---

(۱) یہ اُس الکوہل کا حکم ہے جو انگور یا کھجور سے کشید کیا گیا ہو، کیونکہ اگر الکحل انگور اور کھجور سے کشید کیا گیا نہ ہو تو اس کے خارجی استعمال کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تکملہ فتح الملہم کی درج ذیل عبارت اور اپنے اگلے فتویٰ میں تحریر فرمایا ہے البتہ کھانے میں اس سے بغیر ضرورت کے پرہیز کرنا چاہئے۔

وفی تکملة فتح الملهم كتاب الأشربة حكم الكحول المسكرة ج: ۳ ص: ۶۰۸ (طبع مكتبة دار العلوم كراتشی) و بهذا يتبين حكم الكحول المسكرة(COHALS)التی عمت بها البلوى اليوم فإنها تستعمل فی كثير من الأدوية والعطور والمركبات الأخرىٰ فإنها إن اتخذت من العنب أو التمر فلا سبيل إلى حلتها أو طهارتها وإن اتخذت من غيرهما فالأمر فيها سهل على مذهب أبی حنيفة ولا يحرم استعمالها للتداوی أو لأغراض مباحة أخرىٰ ما لم تبلغ حد الإسكار لأنها إنما تستعمل مركبة مع المواد الأخرى و لا يحكم بنجاستها أخذا بقول أبی حنيفة و إن معظم الكحول التی تستعمل اليوم فی الأدوية والعطور وغيرهما لا يتخذ من العنب أو التمر إنما تتخذ من الحبوب أو القشور أو البترول وغيره كما ذكرنا فی باب بيع الخمر من كتاب البيع و حينئذ هناک فسحة فی الأخذ بقول أبی حنيفة عند عموم البلوى.

و راجع أيضاإلى بحوث فی قضايا فقهية معاصرة ج: ۱ ص: ۳۴۰ و ۳۴۱.

(۲) وفی البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۲۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وقد وقع الاختلاف بين مشايخنا فی التداوی بالمحرم

(جاری ہے)

الکوہل ملی ہوئی خوشبو کے حکم میں تفصیل

سوال: ہم جو کپڑوں پر خوشبو (Cologne) لگاتے ہیں وہ زیادہ الکوہل میں حل کئے ہوتے ہیں، کیا اُس کا استعمال جائز ہے؟

جواب: خوشبو کا حکم یہ ہے کہ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ اس خوشبو میں الکوہل استعمال ہوا ہے اور الکوہل بھی انگور یا کھجور سے کشید کیا ہوا تھا تو وہ خوشبو نجس ہوگی اور اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، لیکن اگر الکوہل کے علاوہ کسی اور چیز سے کشید کیا گیا ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔ کذا فی امداد الفتاوی ج:۱ص:۲۲[(۱)] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۸ھ

(فتوی نمبر ۲۶۵/۲۸ ب)

الکوہل ملی ہوئی خوشبو کا حکم

سوال: (خط میں سے متعلقہ حصہ) کیا دیسی خوشبو کے علاوہ ایسی خوشبو جس میں الکوہل ملی ہوئی ہوتی ہے، وہ استعمال کر سکتے ہیں، کیونکہ الکوہل کے بارے میں ناپاک ہونے کا سنا ہے، براہِ کرام ان کے حکم کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔ (طلعت محمود راولپنڈی)

(گذشتہ سے پیوستہ) ففی النهاية عن الذخيرة الاستشفاء بالحرام يجوز إذا علم أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر۔

وفی تبيين الحقائق فصل فی البيع ج: ۱۶ ص: ۴۴۷ طبع....وقال فی النهاية يجوز التداوی بالمحرم كالخمر والبول إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء ، ولم يجد غيره من المباح ما يقوم مقامه والحرمة ترتفع للضرورة فلم يكن متداويا بالحرام۔

وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقى الأبحر فصل فی البيع أی فی بيع العذرة الخ ج: ۴ ص: ۲۲۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) قيل يجوز التداوی بالمحرم كالخمر والبول إن أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء والحرمة ترتفع بالضرورة فلم يكن متداويا بالحرام فلم يتناوله حديث النهی، الخ

(۱) تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتب، تکملہ فتح الملہم ج: ۳ ص: ۶۰۸ (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی) اور بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرۃ ج:۱ ص: ۳۴۰ و ۳۴۱ ملاحظہ فرمائیں۔

جواب: برادرِ عزیز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا خط ملا، الحمدللہ! ہم سب خیریت سے ہیں، خدا کرے آپ بھی بعافیت ہوں، بہتر تو یہ ہے خوشبو دیسی استعمال کی جائے، جس میں الکوہل کی آمیزش کا اندیشہ نہ ہو، لیکن جو اسپرے بازار میں ملتے ہیں، ان میں استعمال ہونے والے الکوہل ناپاک نہیں ہوتے، لہٰذا ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔[1]

والسلام

۱۴۲۸/۴/۱۴ھ

(۱) دیکھئے سابقہ ص: ۲۱۳ و ۲۱۴ کے فتاویٰ اور انکے حواشی۔

کتاب الطب والتداوی وتلقیح الدم والاعضاء والاحبال بالألات وضبطِ الولادۃ وغیرِھا

(علاج معالجہ، اعضاء کی پیوند کاری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور ضبط ولادت وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)
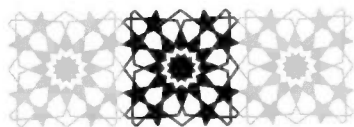
تنفس برقرار رکھنے کیلئے مصنوعی مشینوں کے استعمال کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ میرا بھائی انیس الرحمٰن کافی دنوں سے بیمار ہے، گردن سے نیچے کا سارا جسم مفلوج ہے، سانس لینے کا نظام بھی ختم ہو چکا ہے، اب ہسپتال میں مصنوعی سانس کے لئے مشین لگا رکھی ہے، اب آئندہ وہ مشین کے بغیر سانس نہیں لے سکے گا، کیا اس صورتِ حال میں مصنوعی مشین کو سانس کے لئے لگائے رکھنا ضروری ہے یا اس کو ہٹانا جائز ہے؟

جواب:- تنفس باقی رکھنے کے لئے مصنوعی مشینوں کا استعمال شرعاً کوئی ضروری نہیں ہے، بالخصوص جب کہ مشین کے بغیر زندہ رہنے کا امکان نظر نہ آتا ہو اور مشینوں کے اخراجات برداشت کرنا مشکل ہو، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مشین ہٹا لینا جائز ہے۔ (۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۵/۸/۱۴۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹۱/۴۸)

مختلف اعضاء کے ٹرانسپلانٹ کا حکم

خلاصۂ سوال:- ٹرانسپلانٹ کے طریقے سے دل، پھیپھڑوں اور لبلبہ اور جگر کا ٹرانسپلانٹ ممکن ہے، اس بارے میں ایک کتاب آپ کو بھیج رہا ہوں، جو میرے مطالعے کے لحاظ سے سب سے زیادہ Comprehensive مجموعہ ہے اور تمام مکاتب کی بات اس میں ڈسکس کی گئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اعضاء کی تجارت کو روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ CADAVERIC ٹرانسپلانٹ شروع کیا جائے، گو کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے اپنی بحث

---

(۱) و یستانس عما فی الفتاوی السراجیة کتاب الحظر و الإباحة ص۷ (طبع سعید) رجل استطلق بطنه أو رمدت عیناه فلم یعالج حتّی أضعفه ومات لا إثم علیه، رجل قال له الطبیب: قد غلب علیک الدم فأخرجه و إلا لیقتلک فلم یخرجه حتی مات لم یأثم، کذا فی العالمگیریه کتاب الکراهیة الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات ج۵ ص۳۵۵ (طبع رشیدیه)

کے بعد جائز قرار دیا، علماء کا ایک بڑا طبقہ اور ڈاکٹر حضرات بھی اسے صحیح طرح نہیں سمجھتے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید سیمینار اس موضوع پر کئے جائیں تاکہ Concept کو واضح کیا جاسکے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے حضرات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذمہ داری ہے کہ اس چیز کو خود سمجھ کر کوئی واضح رائے قائم کریں اور پھر لوگوں تک اسے پہنچائیں، امید ہے اس بارے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

والسلام

ڈاکٹر سعید اختر

جواب:- گرامی قدر مکرم جناب ڈاکٹر سعید اختر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ ٹرانسپلانٹ سے متعلق کتابچہ موصول ہوا، ایک مہینہ سے زائد ہوگیا، مصروفیات اور سفروں کی وجہ سے آپ کو خط نہ لکھ سکا، بہرحال اس عنایت پر تہہ دل سے شکرگزار ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان کے علماء کی اکثریت سرے سے ٹرانسپلانٹ کو جائز نہیں سمجھتی[1] خواہ اعضاء زندہ آدمی سے لئے جائیں یا مردہ سے یا قریب الموت سے، تاہم اس موضوع پر جو نئی تحقیقات آرہی ہیں، ان کے پیشِ نظر اس مسئلے پر ازسرِ نو غور کی بلاشبہ ضرورت ہے۔[2] اس غرض کے لئے آپ کا یہ مکتوب اور مرسلہ کتاب ان شاء اللہ معاون ثابت ہوگی، میں نے

(۱ و ۲): اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے مصدقہ فتویٰ سے ماخوذ دار الافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کا درج ذیل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا ٹرانسپلانٹیشن کرانا جائز ہے؟

جواب: ٹرانسپلانٹیشن کی موجودہ دور میں مختلف صورتیں ہیں:

(۱)... کسی انسانی عضو کی جگہ کسی غیر ذی روح چیز مثلاً لوہے یا پیتل وغیرہ کا عضو لگایا جائے۔

(۲)... انسانی عضو کی جگہ کسی حلال جانور مثلاً بکری وغیرہ کا عضو لگایا جائے۔

(۳)... انسانی عضو کی جگہ کسی حرام جانور مثلاً کتا یا خنزیر وغیرہ کا عضو لگایا جائے۔

(۴)... انسان کے اپنے جسم کا کوئی حصہ ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگایا جائے۔

(۵)... کسی تندرست انسان کا کوئی عضو نکال کر مریض انسان کے جسم میں پیوند کر دیا جائے۔ ...(باقی آئندہ صفحہ پر)

اپنی چھوٹی سی مجلسِ تحقیق میں اس موضوع کو شامل کرنے کے لئے عرض کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس

(گذشتہ سے پیوستہ) ان میں پہلی، دوسری اور چوتھی صورت جائز ہے اور تیسری صورت میں تفصیل ہے کہ اگر اضطرار کی حالت ہو تو خنزیر کے علاوہ حرام جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے، خنزیر نجس العین ہے نیز اس کا بدل دوسرے جانور بھی موجود ہیں، اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔ پانچویں صورت میں اختلاف ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اکثر علماء اس کو ناجائز اور ہندوستان کے بعض علماء اور عرب علماء چند شرائط کے ساتھ جائز کہتے ہیں، بہرحال انسانی زندگی کو بچانے اور ابتلائے عام کے پیشِ نظر ان علماء کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ اس صورت کے جواز کی گنجائش ہے، لیکن پھر بھی خرید و فروخت سے بچنا ضروری ہے کیونکہ انسانی اعضاء کی بیع جائز نہیں، نیز اگر آپ بعض علماء کے قول پر عمل کر کے جواز پر عمل کرتے ہیں تو آپ پر توبہ استغفار اور صدقہ خیرات کرنا لازم ہے۔

وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)... حتی الامکان کوشش کی جائے کہ مسلمان کا عضو کسی مسلمان میں لگایا جائے۔

(۲)... کسی انسان کا ایسا عضو نہ نکالا جائے جس پر حیات موقوف ہو، جیسے دِل وغیرہ۔

(۳)... کسی ایسے عضو کی منتقلی حرام ہے جس کے جدا کرنے سے انسان کسی اساسی وظیفہ سے محروم ہو جائے، جیسے آنکھیں وغیرہ۔

(۴)... معتمد اور ماہر اطباء بتائیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا علاج ممکن نہیں۔

(۵)... جس کا عضو نکالا جا رہا ہے اس کی طرف سے اجازت ہو یا اگر قریب الموت یا مردہ ہو تو اس کے ورثاء کی طرف سے اجازت ہو۔

(۶)... زندہ جسم سے وہ عضو لیا جائے جس کے بارے میں ڈاکٹروں نے کہا ہو کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

(۷)... عضو کی منتقلی کے بعد جسم میں کوئی بدنما تبدیلی واقع نہ ہو جو مثلی کے مشابہ ہو۔

(۸)... کسی مسلمان کا عضو کسی کافر کو ہرگز نہ دیا جائے۔

(۹)... اگر کوئی لاوارث میت ہو تو اس کے عضو کا انتقال جائز نہیں۔

(۱۰)... جس انسان کو عضو دیا جائے اس کے بارے میں تشفی ہو کہ اس عضو کے انتقال سے شفا ہو جائے گی۔ (ماخوذ از تبویب: ۸۷/۳۱۱)

لقوله تعالی: (سورة القرة: آیت ۱۷۲)

"إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ"

فی مشکوٰة المصابیح: (۳۷۹/۲)

"عن عَرفجةَ بن سعد قُطِعَ أَنفُهُ يَوْمَ الْكُلَابِ فَاتَّخَذَ أَنفًا مِن وَرِقٍ فَأَنْتَنَ عَلَيْهِ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَتَّخِذَ أَنفًا مِنْ ذَهَبٍ"

فی الهندية ج۵ ص۳۵۴ (طبع رشيديه)

قال محمد: لا بأس بالتداوی بالعظم إذا كان عظم شاة أو بقرة أو بعير أو فرس أو غيره من الدّواب الأعظم الخنزير والآدمی فإنه يكره التداوی بهما.

نتیجے تک پہنچائے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو۔

والسلام
۱۴۲۴/۳/۲۹ھ

(میڈیکل کی مخلوط تعلیم، نامحرم کے علاج، خواتین کے علاج و آپریشن میں پردہ کے احکام اور مریض و ڈاکٹر سے متعلق ایک لیڈی ڈاکٹر کے اہم سوالات اور ان کے جوابات)

(۱)...مریض یا اس کے رشتہ داروں کو اصل مرض کے بارے میں مطلع کرنے کا حکم

(۲)...بچے کی پیدائش کے وقت زچہ کے پردہ کا حکم

(۳)...کسبِ معاش کیلئے عورت کا گھر سے باہر نکلنا

(۴)...لیڈی ڈاکٹر کی دینی ذمہ داریاں

(۵)...ڈاکٹر کے لئے اسلام کی تعلیمات

(۶)...سڑک پر ایکسیڈنٹ کی صورت میں ڈاکٹر یا عام مسلمانوں کو مدد کرنی چاہئے یا گذر جانا چاہئے

(۷)...خواتین کے لئے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا شرعی حکم

فی الشامیة: (۳۷۳/۶)
"إنما الرخصة فی غیر شعر بنی آدم تتخذه المرأة لتزید فی قرونها، وهو مروی عن أبی یوسف، وفی الخانیة: لا بأس للمرأة أن تجعل فی قرونها وذوائبها شیئا من الوبر"

والله اعلم
محمد نعمان خالد
یکم ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: ۱۳۴۰/۱۷)

الجواب صحیح
عبدالرؤف سکھروی

الجواب صحیح
حسین احمد

الجواب صحیح
اصغر علی ربانی

(۸)...میڈیکل تعلیم میں مخلوط نظام کا حکم

(۹)...آپریشن کے دوران پردہ کے شرعی احکام میں کوتاہیوں کا حکم

محترم مولانا صاحب! السلام علیکم!

سب تعریفیں اس ذاتِ پاک کے لئے ہیں جس نے اس کائنات کو اور انسان کو بنایا اور اپنے مقررہ وقت پر اس نظام کو ختم کردے گا، شکر ہے اس ذات کا جس نے آپ کو اس قابل بنایا کہ دین کا علم دیا اور مجھ جیسے لوگوں کو دین کا علم سیکھنے کا شوق عطا فرمایا۔

میں اپنا تعارف کرواتی ہوں کہ میرا تعلق ایک میڈیکل کالج سے ہے، اپنا یہ تعلق اس لئے بیان کیا ہے کہ تمام سوالات اور مسائل اسی سے تعلق رکھتے ہیں، اُمید ہے کہ آپ ان کا جواب دے کر میری مشکل آسان کریں گے۔

(۱)...ہسپتال میں جب میرا واسطہ ایسے مریضوں سے پڑتا ہے جن کی زندگی کے چند دن یا چند مہینے باقی ہوں، یعنی وہ خود تو نہیں جانتے لیکن ہمارے علم میں وہ بیماری آجاتی ہے، مثلاً کینسر اور اسی قسم کی موذی بیماری جو اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے کہ موت متوقع ہوتی ہے، اور مریض اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ میرے فلاں درد یا فلاں تکلیف کی وجہ یہ ہے، یعنی وہ جیسے اپنے آپ سے چھپاتا ہے یا یہ جان بوجھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کی بیماری کیا ہے؟ تو میں مشکل میں پڑ جاتی ہوں کہ ایک انسان جس کا اس دنیا میں وقت ختم ہونے کو ہے اور نئی دنیا میں جانے کا وقت آگیا ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں تو ایسے وقت میں دین مجھ پر کیا ذمہ داری عائد کرتا ہے؟ کیا میں اسے بتا سکتی ہوں کہ اسے کیا بیماری ہے؟ اور کس طرح میں اس کو یہ بتاؤں کہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو اور اپنی آخرت کی فکر کرو، چاہے چند دن سہی، تاکہ بخشش ہو جائے، یا میں اسے کوئی دعا بتادوں یا اس کو بیماری کے فضائل بتادوں یا اس کے رشتہ داروں کو کوئی بات بتاؤں، مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان جس نے ساری زندگی اپنے طریقے سے گزاری اور موت کی فکر نہیں کی اس کو کونسی ایسی بات اور کس طرح سے بتائی جائے کہ وہ مایوس بھی نہ ہو، اس کی اُمید (یعنی بخشش

کی) بھی بندھی رہے اور وہ معافی مانگ لے۔

(۲)... بچے کی پیدائش کے وقت زچہ کا کس حد تک پردہ رکھنا جائز ہے؟ کیونکہ وہ حالت ایسی ہے کہ اس وقت اس کی ٹانگوں اور پیدائش کی جگہ کا پردہ نہیں ہوتا، ٹانگوں کا پردہ رکھا جاسکتا ہے جو عام طور پر نہیں رکھا جاتا، جب کہ دوسری جگہ کو بار بار دیکھنا اور ہاتھ لگانا ہوتا ہے جس کے بغیر بچے کی Delivery ایک ڈاکٹر نہیں کرسکتی، اس میں کوئی گناہ والی بات ہے تو کونسی؟ اور اس سے کیسے بچا جائے؟

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اسلام عورت کو گھر کے اندر رہنے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ یہ ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے کہ عورت معاشرتی برائیوں کو کم کرنے (یعنی ایسے جو پردے میں رہ کر کر سکے) کی کوشش کرے، مجھے بتائیں کہ عورت پر کس قسم کی ذمہ داریاں ہیں؟ جو معاشرہ عائد کرتا ہے، اور جنہیں وہ اپنے گھر، خاوند اور بچوں کے بعد نبھا سکے۔

(۴)... ایک ڈاکٹر عورت پر اپنے پیشے کے علاوہ کس قسم کی ذمہ داریاں ہیں، جن کے متعلق اس کو دھیان رکھنا ہے؟ (اپنے گھر کے علاوہ) یعنی معاشرہ میں۔ ہمارے آج کل کے دور کے متعلق کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے وہ جدوجہد کرے؟ جب کہ وہ اس قابل ہے کہ پڑھی لکھی ہے اور اس کا اپنا ذریعہ معاش بھی ہے اور اس میں صلاحیت بھی ہے۔

(۵)... اسلام ایک طبیب کے بارے میں کیا کہتا ہے، اس کو کیسا ہونا چاہئے؟

(۶)... کسی جگہ کوئی Accident (ایکسیڈنٹ) ہو جائے اور ایک عورت یعنی میں وہاں سے گزروں یا موجود ہوں تو کیا دین مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہاں رُکوں اور دیکھوں کہ کسی کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ یا کسی مرتے ہوئے کی جان بچائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ وہاں سے گزر جانا بہتر ہے؟ جیسا کہ آج کل کیا جاتا ہے۔

(۷)... مولانا صاحب! میرا تعلق ایسے گھرانہ سے ہے کہ پورے خاندان میں والد صاحب شروع سے ہی دینی تھے، جس کی وجہ سے نماز کی پابندی تھی ہی، لیکن یہ صرف اس لئے کہ نماز پڑھنی ہے، کیونکہ سب گھر میں پڑھتے تھے، تقریباً تین سال پہلے تک یہ بھی علم نہ تھا کہ نماز کیوں

پڑھنی ہے؟ یا یوں کہہ لیں کہ دین کا علم پختہ نہ تھا،شکر ہے اس پاک ذات کا جس نے ہم جیسوں کو ہدایت سے نوازا، ہوسٹل میں آئی تو یہاں فضائلِ اعمال سے تعلیم ہوتی تھی، پھر ایسی تبدیلی پیدا ہوئی کہ عقل آ گئی، اور میرا ایک سہ روزہ بھی لگ گیا، اس کے بعد تو میری حالت عجیب ہوگئی، میں پوری دنیا سے کٹ گئی، ذہن پر آخرت کا خوف اس طرح سوار ہوا کہ راتوں کی نیند اُڑ گئی، کسی کام میں جی نہ لگتا، کھانا پینا چھوٹ گیا، ہر وقت فکر اور پریشانی میں میرا وزن بھی کم ہو گیا اور پڑھائی میں دل نہ لگتا، ذہن میں آخرت اور قبر کا خوف، لیکن ایک چیز میں نے نوٹ کی کہ پہلے میں جس خشوع سے نماز پڑھتی تھی وہ نہیں رہا اور ذہن میں اللہ اور اسلام کے متعلق وسوسے بھی بہت آتے تھے، کافی عرصہ یہ سب کچھ جاری رہا، پھر تقریباً کچھ عرصے کے بعد ہمارے جاننے والے ایک عالم آئے تو میں نے اپنے والد سے کہا تھا کہ میں نے کچھ سوال پوچھنے ہیں، انہوں نے کہا کہ: بیٹی! پڑوسیوں کے دادا عالم ہیں، آئے ہیں، تم ان سے پوچھ لو، اب میں کچھ سوال لے کر ان کے پاس گئی، ان کو پڑھنے دیئے (وہ سوال میں آپ کو ابھی لکھوں گی، اس لئے پوری کہانی سنا رہی ہوں کہ آپ ان کا جواب ایسا دیں کہ میں مطمئن ہو جاؤں) انہوں نے سوال پڑھے اور غصے میں آ گئے، اور کہا کہ: گھر بیٹھ جاؤ! کوئی ضرورت نہیں ہے، اور ایسا علم اور تعلیم فرض نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں ڈر گئی اور چونکہ یہ میری تعلیم اور یہاں ہمارے ملک میں جو مروج نظامِ تعلیم ہے اس سے متعلق تھے، گھر آ کر ابو کو کہا کہ میں پڑھائی چھوڑنا چاہتی ہوں، والد صاحب چپ رہے، پھر وہ دادا سے ملے اور ان سے پوری بات کی اور مجھے انہوں نے یہ کہا بیٹی! ایک سال باقی ہے، آخرت تو ہر وقت ساتھ ہی ساتھ ہے، اگر یہ حرام یا ناجائز ہوتا تو فتویٰ لگ جاتا، جب کہ اچھے اچھے نیک گھروں اور عالموں اور مفتی کی اولادیں ڈاکٹر ہیں اور بن رہی ہیں، میں نے اپنے آپ کو تسلی تو دی، لیکن وہ تمام سوال میرے ذہن میں ابھی بھی ہیں، ان کے لکھنے سے پہلے اتنا کہوں گی کہ انہیں ذرا غور سے پڑھیں اور سوچ کر جواب دیں کہ میں گناہوں سے بچتی ہوئی اس راہ سے گزر جاؤں نہ کہ بدگمان رہوں یا ہو جاؤں۔

تمام سوالات اس قسم کے ہیں کہ عورتوں کا مردوں کا اکٹھا نظامِ تعلیم ہے، میں سوالات کے

بجائے تمام حالات آپ کو بتاتی ہوں کہ ہسپتالوں میں آپریشن تھیٹر میں جب مریض بے ہوش ہوتا ہے، جو عورت بھی ہوتی ہے اور مرد بھی، آپریشن کرنے سے پہلے اس کے آپریشن کی جگہ اور اس کے اِردگرد کی جگہ پر مختلف قسم کے ایسے مواد کو لگانا ہوتا ہے جو جراثیم کش ہے اور اگر وہ نہ لگائیں تو آپریشن کے بعد مریض جراثیم سے پھیلنے والی بیماریوں سے مختلف نئی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے، اس کام کے لئے عموماً اگر جسم کے اُوپری حصہ کا آپریشن ہو تو قمیض اُتار دی جاتی ہے، چاہے مریض عورت ہے یا مرد، اگر پیٹ کا آپریشن ہے تو قمیض نہیں بلکہ شلوار ہٹادی جاتی ہے، کیونکہ پیشاب کی نالی بھی ڈالنی ہوتی ہے، جراثیم کش دوائی کے بعد آپریشن والے تولیے اُوپر ڈال دیئے جاتے ہیں اور cover کر دیتے ہیں، صرف آپریشن والی جگہ سامنے رکھی جاتی ہے، آپریشن کے بعد مریض کو کپڑے آپریشن تھیٹر کا نچلا اسٹاف یعنی سامان لاکر دینے والے پہناتے ہیں، اس تمام کارروائی کے دوران ڈاکٹرز، تمام male اور female میڈیکل students کے علاوہ تقریباً ۱۰ کے قریب نچلا اسٹاف جو عورتیں، نرس، بے ہوش کرنے والے، سامان دینے والے، صفائی کرنے والے ہوتے ہیں، مریض کی یہ حالت دیکھ کر انتہائی عجیب محسوس ہوتا ہے اور اللہ سے ڈر لگتا ہے کہ یہ بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے! وارڈ یا آپریشن تھیٹر میں خاص طور پر پردے کا خیال نہیں رکھا جاتا اور خاص طور پر جن عورتوں کے آپریشن سے بچے پیدا ہوتے ہیں یا ان کو زنانہ بیماری ہے جس کا علاج آپریشن سے ہوتا ہو تو وہاں مرد بھی سارے موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت شرم محسوس ہوتی ہے اور تمام بڑے شہروں میں مرد ڈاکٹر بچے پیدا کرواتے ہیں جو اور بھی شرم والی بات ہے۔

ان تمام معاملات میں میرا خیال ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا نظام یا قانون بنایا جائے کہ مرد حضرات چاہے ڈاکٹر ہوں مگر اِن کی ضرورت نہیں، وہاں نہ ہوں، صرف عورتیں ہی علاج کریں، اور اگر ایسا مسئلہ ہے کہ جس کا علاج عورت نہیں کرسکتی اور مرد ڈاکٹر کو کرنا پڑتا ہے تو میرا خیال ہے کہ پردہ قائم رکھتے ہوئے جائز ہے اور اسلام اجازت دیتا ہے، اس کے لئے قدم اُٹھانا ہے، کس نے؟ ظاہر ہے کہ علماء نے، کیونکہ کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی یا بیٹی

اس طرح علاج کروائیں، یقیناً جو خاکروب بھی وہاں ہیں وہ بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ سپریم کورٹ ایسے قانون بنائے کہ:

(۱)... لیبر روم میں مرد ڈاکٹرز کا جانا منع کرے۔

(۲)... C-Section یعنی بچے کی Delivery کے وقت آپریشن تھیٹر میں مرد جو Anesthensia دینے کے لئے ہوتے ہیں اور صفائی کیلئے اور عورتوں کو اسٹریچر پر ڈال کر لانے، لے جانے والے، تو ان کی جگہ ایسی جگہوں پر عورتوں کو بھرتی کیا جائے۔

(۳)... عورت کے باقی آپریشن کے وقت عورت نرس اور عورت سرجن اس کے کپڑے change کرے، اس کو جراثیم کش دوائی لگائے اور Properly ڈھانپنے کے بعد ڈاکٹر آکر آپریشن کرے، اس کے بعد عورت نرس اس کو کپڑے پہنائے اور اسٹریچر پر ڈال کر روم میں چھوڑ کر آئے مرد ڈاکٹرز اور خاکروب اور ضروری نچلا اسٹاف صرف تب آئے جب عورت coverd ہو اور اس کے پردے کا خیال کیا جائے۔

(۴)... عورت کو پیشاب کی نالی عورت ڈاکٹر یا نرس ڈالے اور مردوں کو مرد۔

(۵)... ہسپتال میں عورتوں کے حصے علیحدہ اور ڈاکٹرز (Female) علیحدہ ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ تمام قانون نافذ ہو جائیں جیسا کہ آج میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ آئندہ سے عورت کا پوسٹ مارٹم عورت ڈاکٹر کرے گی تو دل کو تسلی ہوئی اور ہمت بھی ہوئی کہ باقی تمام غلاظتیں بھی دور کرنی ہیں، اور ان شاء اللہ دور ہوں گی، تو پھر علماء اس بات پر متفق ہو جائیں گے کہ عورت کے ڈاکٹر بننے میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ پردہ کا خیال رکھا جائے گا۔

اگر ساری عورتیں گھر بیٹھ جائیں تو پھر عورتوں کا علاج بھی مرد ہی کریں گے اور دوسری بات یہ کہ جو خرابیاں ہم میں آچکی ہیں ان کو دور کرنا ہے، جب عورت ہر کام کے لئے گھر سے باہر نکل آئی ہے تو کیا پردے میں رہ کر وہ اس نیت سے نہیں نکل سکتی کہ جب میرے بس میں ہو اور میرے پاس اتھارٹی ہو گی تو میں نے یہ سب کچھ ختم کرنا ہے۔

سوال:(۱)... جو کچھ میں نے اپنی سوچ کے حوالے سے لکھا ہے کیا وہ درست ہے یا گھر بیٹھ جانا بہتر ہے؟

(۲)...ان تمام حالات میں، میں یا کوئی بھی اپنی نظر کی حفاظت کیسے کرے؟ جب کہ اکثر مرد ہمارے مریض ہوتے ہیں، اور جو کچھ صورتِ حال ہے وہ میں نے آپ کو لکھ دی ہے۔

(۳)... یہ سب کچھ پڑھائی کے دوران کرنا پڑتا ہے، سیکھنے کے دوران ہمارے ہاں ہر طرح کا مریض ہوتا ہے اور سکھانے والے بھی مرد ہی ہوتے ہیں، ہاں عورتیں اس Level تک کم ہیں، اگر ہیں بھی تو صرف ماہرِ امراضِ نسواں، جب کہ باقی تمام شعبے جیسے سرجری، آنکھ، ناک، کان، امراضِ مخصوصہ، میڈیکل، امراضِ ہڈی و جوڑ، بچوں کے امراض کے لئے مرد حضرات ہی ڈاکٹرز ہیں، جو کہ اس وقت پوری دنیا میں ایسا ہی ہے، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایسا نظام ہو کہ عورت یہی پڑھائے اور عورت ہی پر سیکھا جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم لوگوں میں سے عورتیں ان تمام شعبوں میں ضرورت کے مطابق موجود ہوں تاکہ ان کو نئی لڑکیوں کو سکھانے کے لئے بھرتی کیا جائے اور عورتوں کو آگے بڑھنا پڑے گا، اور پھر اس نظام میں ہی آگے بڑھنا ہے، اگر آج ہم یہ سوچ کر گھر بیٹھ جائیں تو کل ہم عورتوں کو پھر مردوں کے پاس جانا پڑے گا اور نئے لوگوں کو مردوں سے سیکھنا پڑے گا، اب یہ بتائیں کہ عورت کو ان حالات میں کیا اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھے جب کہ آگے بڑھنے کے لئے یعنی مزید تعلیم اور نوکری مردوں کے ساتھ پڑھنا اور کام کرنا پڑتا ہے (میں خدانخواستہ عورتوں کی وکالت نہیں کر رہی، صرف وہ لکھ رہی ہوں جو میرے ذہن میں آتا ہے، علم آپ کے پاس ہے، آپ نے دین کو سامنے رکھ کر ان تمام سوالات کا جواب دینا ہے، جس سے مجھے کوئی اختلاف نہیں ہوگا)۔

(۴)... میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ میں اب فائنل ائیر میں ہوں اور ایک سال ہاؤس جاب کرنا ہے، اس کے بعد ان شاء اللہ اپنے گھر میں ہی کلینک کھولوں گی اور مردوں کے ساتھ کام نہیں کروں گی، لیکن دوسری طرف کچھ عورتوں کو مرد ڈاکٹرز سے علاج کرواتے ہوئے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ ان مردوں کی بجائے ہمیں ان عورتوں کا علاج کرنا چاہئے اور ہسپتال کے اندر گڑبڑ اور بے

ایمانی دیکھ کر بھی سوچتی ہوں کہ یہ مریضوں کے ساتھ ہونے والی بے ایمانی اور زیادتی اور زیادہ فیسوں کا ظلم کون ختم کرے گا؟ مجھے بتائیں کون سی بات ٹھیک ہے؟ ایسی صورت میں مجھے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے جب کہ اسلام اشد ضرورت کے بغیر عورت کے باہر نکلنے کو حرام قرار دیتا ہے۔

ضروری تاکید ہے کہ جوابی لفافے میں یہ خط اپنے جوابوں سمیت ارسال کریں، مہربانی ہوگی۔

جواب:- محترم بہن، سلامِ مسنون!

آپ کا مفصل خط ملا، آپ کے سوالات دیکھ کر خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو دین کی مزید فکر اور اپنے فن میں ترقی عطا فرمائے اور آپ سے اُمت کی فلاح کا کام لے، آمین۔ آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں:

(۱)... مریض کے رشتہ داروں کو تو بیماری کی بالکل صحیح نوعیت و کیفیت بتا دینا انتہائی ضروری ہے، تاکہ وہ کسی دھوکے میں نہ رہیں، البتہ مریض کے بارے میں یہ دیکھنا چاہئے کہ تشویش ناک بیماری کے بارے میں سن کر وہ مایوسی اور بددلی کی وجہ سے قوتِ مدافعت بالکل کھو تو نہیں بیٹھے گا، اس بارے میں اس کے رشتہ داروں سے بھی مشورہ کر لینا چاہئے، اور بتانا ہو تو ایسے انداز میں بتانا چاہئے کہ اسے ناگہانی صدمہ نہ پہنچے، اور ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ وہ اپنی صحیح حالت کا اندازہ بھی کرلے، فکرِ آخرت اور توبہ واستغفار کی تلقین تو ہر حال میں مناسب ہے۔

(۲)... اُصول یہ ہے کہ علاج کی ضرورت کے لئے جسم کا جتنا حصہ کھولنا ضروری ہے،[۱] اتنا ہی کھولا جائے، جو جائز ہے،[۲] لیکن ضرورت کی مقدار سے زائد نہ کھولا جائے،[۳] جتنا حصہ کھولنا یا اس کو چھونا ضروری ہے اسے کھولنے یا چھونے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔[۴]

(۱ تا ۴)... و فی البحر الرائق، کتاب الکراھیة ج ۸، ص ۳۵۲، طبع دار الکتب العلمیة بیروت:
و ینظر الطبیب الیٰ موضع مرضها.... والطبیب إنما یجوز له ذلک إذا لم یوجد امرأة طبیبة فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر لأن نظر الجنس إلی الجنس أخف وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة إن أمکن وإن لم یمکن ستر کل عضو منها سوی موضع الوجع ثم ینظر ویغض ببصره عن غیر ذلک الموضع إن استطاع لأن ما ثبت للضرورة یتقدر بقدرها.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(۳)... یہ درست ہے کہ اسلام نے عورت کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حتی الامکان گھر میں رہے،[1] لیکن بوقتِ ضرورت پردے کے ساتھ نکلنا بھی جائز ہے،[2] دینی تعلیم کا حصول یا مثلاً بوقتِ ضرورت طبی تعلیم کا حصول بھی ضرورت میں داخل ہے،[3] لیکن گھر میں رہنے کے حکم کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ اسلام نے کسبِ معاش کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی، شادی سے پہلے یہ ذمہ داری اس کے باپ کی ہے[4] اور شادی کے بعد شوہر کی،[5] لہٰذا وہ تلاشِ روزگار کے لئے عام حالات میں باہر جانے

(گذشتہ سے پیوستہ) و فی ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل فی النظر: ج ۴، ص ۱۹۹ (طبع غفارية): ويحرم النظر إلى العورة إلا عند الضرورة كالطبيب.

و كذا فی تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل فی النظر واللمس: ج ۷ ص ۳۸ (طبع دارالكتب العلمية بيروت) و كذا فی الفتاوى السراجية، كتاب الكراهية، باب النظر واللمس: ص ۷۳ (طبع سعيد).

و فی الدر المختار: ج ۶ ص ۳۷۰ (طبع سعيد):

ينظر) الطبيب إلى موضع مرضها بقدر الضرورة إذ الضرورات تتقدر بقدرها وكذا نظر قابلة وختان و ينبغی أن يعلم امرأة تداويها لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف.

و فی الشامية تحته: فی الجوهرة: إذا كان المرض فی سائر بدنها غير الفرج يجوز النظر إليه عند الدواء لأنه موضع ضرورة وإن كان فی موضع الفرج، فينبغی أن يعلم امرأة تداويها فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلك أو يصيبها وجع لا تحتمله يستروا منها كل شیء إلا موضع العلة ثم يداويها الرجل ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح.

(۱،۲)... تفصیلی حوالہ جات کے لئے اسی جلد میں فصل فی الحجاب کے فتاوی اور ص ۳۹۵ کا حاشیہ نمبر ۱ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳)... تفصیل کے لئے فتاوی عثمانی جلد اول ص ۱۴۳ کا فتوی اور ص ۱۴۴ پر اس کا حاشیہ اور ص ۱۶۹ تا ص ۱۷۰ کے فتاوی اور ان کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۴)... قال الله تعالى: (وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ و كسوتهن بالمعروف) (الآية) البقرة ۲۳۳.

و فی احكام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۰۳ (طبع داراحياء التراث العربی بيروت)

ولا خلاف فی وجوب هذا الرزق والكسوة... الخ. و كذا فی تفسير القرطبی ج ۳ ص ۱۶۳ (طبع بيروت)

و فی احكام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۱۰۵ (طبع داراحياء التراث العربی بيروت):

...اختصاص الأب بالزام النفقة دون غيره كذلك حكمه فی سائر ما يلزمه من نفقة الأولاد الصغار والكبار الزمنى يختص هو بايجابه عليه دون مشاركة غيره فيه لدلالة الآية عليه... الخ.

و فی الهداية، كتاب الطلاق باب النفقة: ج ۲ ص ۴۴۴ (طبع شركت علميه ملتان):

ونفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كما لا يشاركه فی نفقة الزوجة لقوله تعالى: (وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ) والمولود له هو الأب.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کی بجائے اپنے گھر کے انتظام، بچوں کی تربیت اور خاندانی نظم وضبط کو برقرار رکھنے کا فریضہ انجام دے اور معاشرے کی یہ عظیم خدمت بجالائے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) و فی الدر المختارباب النفقة، ج ۳ ص ۶۱۲ (طبع سعید):
و تجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله الفقير الحر وفى الشامية اى ان لم يبلغ حد الكسب۔
و فى البحر الرائق، ج ۹ ص ۸۱ (طبع دارالكتب العلمية بيروت):
(وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وكسوتهن بالمعروف) فهى عبارة فى ايجاب نفقة المنكوحات اشارة الى أن نفقة الاولاد على الأب۔
و كذا فى مجمع الأنهر، باب الحضانة، ج ۲ ص ۱۹۲ (طبع دارالكتب بيروت)
وفى المحيط البرهانى الفصل الثالث فى نفقة ذوى الأرحام ج: ۴ص: ۲۶۸ (طبع دار إحياء التراث بيروت) يجب النفقة على الأب لأن الله تعالى أوجب النفقة على الوالد مطلقاً .قال الله تعالى :(وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن) (البقرة:۲۳۳) إلا أنه خصّ عن هذا النص من كان له أو من كان قادراً على الكسب، فبقى ما عداه على ظاهر النص ....وكذلك الإناث من الأولاد نفقتهن بعد البلوغ على الأب ما لم يُزوجن إذا لم يكن لهن مال لأن بهن عجز ظاهر عن الاكتساب فتكن بمنزلة الزمنى من الذكور۔الخ
وفى اللباب فى شرح الكتاب (الجزء الثانى ص: ۲۱۵) (طبع دار الكتاب العربى بيروت)
(ونفقة الأولاد الصغار) .... (على الأب لا يشاركه فيها أحد) مؤسراً كان الأب أو معسرا الخ
وكذا فى مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر باب الحضانة ج: ۲ ص: ۲۰۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)
(۵) وفى الهداية كتاب الطلاق باب النفقة ج: ۲ ص: ۴۳۷ (طبع مكتبة شركة علمية ملتان)
النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أوكافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها و كسوتها و سكناها۔
وفى البحر الرائق ج: ۸ ص: ۴۹۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) تجب النفقة للزوجة على زوجها والكسوة بقدر حالهما أى الطعام والشراب بقرينة عطف الكسوة والسكنى عليها والأصل فى ذلك قوله تعالى (لينفق ذو سعة من سعته) (الطلاق:۷) وقوله تعالى (وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف) (الأية)
وفى الدر المختار كتاب الطلاق باب النفقة ج:۳ ص: ۵۷۲ (طبع سعيد) ونفقة الغير تجب على الغير بأسباب ثلاثة، زوجة وقرابة وملك، فتجب للزوجة بنكاحٍ صحيح على زوجها۔
وفى مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر باب الحضانة ج:۲ ص: ۱۷۳ (طبع دار الكتب العملية بيروت) تجب النفقة والكسوة .... للزوجة على زوجها۔

تاہم اگر کسی عورت کو باپ یا شوہر کی نعمت حاصل نہ ہو اور اسے کسب معاش کے لئے نکلنا پڑے تو بوقتِ ضرورت اس کی بھی اجازت ہے۔[1]

(۴)... ڈاکٹر کی حیثیت سے تو مریضوں کی خدمت اور تیمارداروں کی تشفی اس کا بنیادی کام ہے اور نیت خدمت کی ہو تو یہ بہت بڑی عبادت ہے، اس کے علاوہ اپنے گھر والوں اور زیرِ علاج مریضوں کو حکمت اور شفقت کے ساتھ دین واخلاق کی تلقین کرتے رہنا بھی ایک مسلمان ڈاکٹر کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔[2]

(۵)... طبیب کو رحمدل، جذبۂ خدمت رکھنے والا اور ایثار کا خوگر ہونا چاہئے۔[3]

(۶)... بیشک، یہ تو صرف ڈاکٹر ہی کا نہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایسے موقع پر مصیبت زدہ شخص کو مدد پہنچانے کی کوشش کرے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ اُسے بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔''[4]

جہاں تک خواتین کے طبی تعلیم حاصل کرنے کا تعلق ہے، وہ شرعاً نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔[5]

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب خروج النساء لحوائجهن ج: ۵ ص: ۲۰۰۶ (طبع دار ابن کثیر بیروت) رقم الحدیث: ۴۹۳۹، قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن.
نیز دیکھئے، اسی جلد کی فصل فی الحجاب کا ص: ۳۹۵ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر:۱۔

(۲و۳) اس موضوع پر تفصیل کے لئے امام ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "أخلاق الطبيب" ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) وفی صحیح البخاری باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه رقم الحدیث: ۲۳۱۰ ج: ۲ ص: ۸۶۲ (طبع دار ابن کثیر بیروت) عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما، أخبره: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه، ومن كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة، فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة.
وكذا فى صحيح المسلم رقم: ۶۷۴۳ باب تحريم الظلم ج: ۸ ص: ۱۸ (طبع دار الجيل بيروت)

(۵) وفى سنن أبى داؤد باب ما جاء فى الرقى ج:۲ ص: ۱۸۶ (طبع سعيد) عن الشفاء بنت عبدالله قالت: دخل على النبى صلى الله عليه وسلم و أنا عند حفصة فقال لى: ألا تعلمين هذه رقية النملة كما علمتها الكتابة.
وفى بذل المجهود ج: ۵ ص: ۱۸ (طبع معهد الخليل) فيه دليل على جواز كتابة النساء الخ.
وفى رد المحتار مطلب فى فرض الكفاية و فرض العين ج: ۱ ص: ۴۲ (طبع سعيد) و أما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغنى عنه فى قوام أمور الدنيا كالطب والحساب الخ
وفى الأشباه والنظائر: من فرض الكفاية .... والطب والحساب المحتاج إليه فى المعاملات الخ

کیونکہ اصل حکم یہ ہے کہ خواتین مریضوں کا علاج خواتین ہی کو کرنا چاہئے۔[1] اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کچھ خواتین طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کریں، البتہ جو خواتین طب کی تعلیم حاصل کریں، اُن پر واجب ہے کہ وہ خود حجاب کے شرعی احکام کی رعایت رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کریں، اور ماحول کی آزادی سے مرعوب نہ ہوں۔

آپریشن وغیرہ کے وقت جو بے احتیاطیاں کی جاتی ہیں، اُن پر آپ نے بڑی حد تک صحیح تبصرہ کیا ہے، شرعی اُصول میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ علاج کے لئے جسم کا جتنا حصہ کھولنا ضروری ہے، اتنا ہی کھولنا چاہئے، اس سے زیادہ نہیں۔[2] اور اس میں بھی یہ رعایت شرعاً ضروری ہے کہ یہ کام ہم جنس کے سامنے ہو۔[3] یعنی مرد کا جسم مرد کھولے اور عورت کا عورت۔[4] اِلَّا یہ کہ کوئی ایمرجنسی پیش آجائے اور اس اُصول کی رعایت بالکل ممکن نہ رہے۔

اب آپ کے آخری سوالات کا جواب:

(۱)... آپ نے اپنے جو حالات لکھے ہیں، اُن میں آپ کے لئے میرا مشورہ یہی ہوگا کہ آپ اپنی تعلیم مکمل کریں، اور شرعی احکام کی حتی الامکان رعایت کا اہتمام رکھیں۔

(۲)... علاج کی ضرورت کے لئے جو کارروائی کرنی پڑے، اس کی گنجائش ہے، البتہ اپنے خیالات اور دل کی حفاظت کریں، اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتی رہیں۔

(۳)... موجودہ حالات، جن میں مرد ڈاکٹروں سے سابقہ پڑتا ہے، مجبوری کے سے حالات ہیں، اس لئے خود پردے کا اہتمام کرکے ان سے تعلیم حاصل کرلیں، ساتھ ہی استغفار بھی کرتی رہیں۔

(۴)... یہ رائے بہت مناسب ہے کہ آپ اپنا کلینک خود کھولیں، اور خواتین کے علاج کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں، اللہ تعالیٰ آپ کی ہر طرح حفاظت فرمائیں، اور آپ کو خدمتِ خلق کی توفیقِ کامل عطا فرمائیں۔ آمین۔ واللہ اعلم

۱۸ر ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ

---

(۱) وفی البحر الرائق کتاب الکراهیة ج: ۸ ص: ۳۵۲ (طبع دار الکتب العملیة بیروت) والطبیب إنما یجوز له ذلک إذا لم یوجد امرأة طبیبة فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر لأن نظر الجنس إلی الجنس أخف وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة إن أمکن الخ.

وکذا فی الهندیة ج: ۵ ص: ۳۳۰، والبدائع ج: ۵ ص: ۱۲۴.

(۲ تا ۴) دیکھئے سابقہ ص:۲۲۹ کا حاشیہ:۱ تا ۴۔

مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا شرعی حکم

راولپنڈی کے مفتی محمد رضوان صاحب نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں ایک مفصل تحریر مرتب فرمائی، جسے انہوں نے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں بھیجا، وہ مفصل تحریر اور حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب درج ذیل ہے۔ (مرتب)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں! مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت مدلل انداز میں بتلادی جائے اور اگر کوئی اختلاف ہو تو اس کی بھی نشاندہی اور اس کے طریقہ کار پر روشنی ڈال دی جائے؟

(جواب از مفتی محمد رضوان صاحب)

اصل مسئلہ کے جواب اور اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں ایک ضروری تمہید ملاحظہ کرلی جائے۔

ضروری تمہید

وہی اولاد نعمت ہے جو شرعی طریقہ کے مطابق حاصل ہو، اور جو غیر شرعی طریقہ پر حاصل ہو، اس کو نعمت نہیں قرار دیا جاسکتا، نیز عفت اور نسب کی حفاظت کا اسلام میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اسی وجہ سے زنا ناجائز وحرام ہے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا بچہ زانی سے ثابت النسب نہیں ہوتا، اور زانی کا بچہ نہیں کہلاتا۔

مزید یہ کہ اگر کسی کی منکوحہ سے کوئی شخص زنا کرے اور بعد میں کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ زانی کا نہیں کہلائے گا، اس بچہ کا نسب منکوحہ کے شوہر سے ثابت ہوگا۔

ایک انسان کا پانی (یعنی منی) دوسرے انسان کے پانی سے مخلوط نہ ہو، بلکہ صرف ایک ہی انسان اور اس کی شرعی منکوحہ کے پانی سے بچہ کی پیدائش ہو، اس چیز کا شریعت میں بہت خیال رکھا گیا ہے، اسی لئے شریعتِ مطہرہ نے یہ مسائل بیان کئے ہیں کہ مطلقہ حاملہ عورت کی عدت بچہ کی پیدائش ہے، حمل کی پیدائش سے پہلے اس کا نکاح جائز نہیں۔

اگر کوئی عورت مسلمان ہوکر مسلمانوں کے ملک میں ہجرت کرکے آجائے تو اس کا نکاح سابق کافر شوہر سے ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے لئے عدت نہیں ہوتی، لیکن اگر وہ حاملہ ہو تو حمل کی پیدائش تک اس سے نکاح جائز نہیں، تاکہ ایک انسان کے پانی کے ساتھ دوسرے انسان کا پانی نہ ملے۔

نیز ایک شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر بے نکاحی عورت زنا کی وجہ سے حاملہ ہوجائے، اور اس سے زانی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح کرے، تو اس شخص کے لئے جائز نہیں کہ اس حاملہ منکوحہ سے حمل کی پیدائش تک جماع کرے۔

کسی دوسرے کے بیٹے یا بیٹی کو اپنی طرف منسوب کرنا اور اپنے آپ کو ان کا باپ کہنا جائز نہیں ہے، اسی بنا پر لے پالک بیٹے کے نسب، وراثت اور نکاح وغیرہ کے احکام میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت کی رُو سے افزائشِ نسل کا ہر ایک ذریعہ خواہ کسی بھی طریقے سے ہو، محمود نہیں، بلکہ یہ عمل تو جانوروں میں رائج ہے کہ ایک ہی جنس کے جانوروں کی تلقیح کے ساتھ ساتھ مختلف جانوروں کی تلقیح کی جاتی ہے اور نئے قسم کے جانور وجود میں آتے ہیں، جانور چونکہ شریعت کے احکامات کے مکلّف نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے نسب کی حفاظت کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے ماں باپ کو پہچانا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ستر پوشی کا حکم بھی نہیں ہے، بس قدرت نے فطری اور خلقی طور پر ان کے لئے جو ستر پوشی کردی ہے، وہی ان کے لئے کافی ہے۔

لیکن انسان اشرف المخلوقات ہے، ہر مذہب میں نسب وخاندان کی حفاظت، ستر پوشی اور شرم وحیاء کے احکامات موجود ہیں، صحیح عقل اور انسانی فطرت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عملِ تولید کے سلسلے میں انسان اور جانور میں واضح فرق ہو اور انسان اپنی اولاد کے سلسلے میں یہ کہہ سکے کہ یہ خالص میری اولاد ہے اور والد کی فطری صفات اس کی اولاد میں منتقل ہوں والدین کے دل میں اولاد کے لئے محبت وشفقت کے جذبات موجود ہوں اور اولاد کے دل میں والدین سے وفاداری اور اطاعت کے جذبات موجود ہوں، اور اولاد اپنے والدین کی طرف منسوب ہونے میں اور ان کی صفات پر فخر کرسکے۔

یہ بات اسی وقت ممکن ہے، جبکہ انسانوں میں توالد اور تناسل کا سلسلہ اسی طرز پر باقی رکھا جائے، جس کی شریعت اور مذہب نے اجازت دی ہے، اس کے خلاف کرنے میں اگر ہر ممکن طریقہ پر عمل کیا جائے گا اور مصنوعی تولید کی ہر صورت کو رائج کیا جائے گا تو انسانوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہے گا، خاندانی نظام ختم ہوجائے گا، ستر پوشی اور شرم وحیاء پامال ہوجائے گی، اور والدین اور اولاد کے تعلق اور تقدس ومحبت کے رشتے ختم ہوجائیں گے۔

یورپ وامریکہ وغیرہ کے اندر مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے طریقوں کو تجارتی مقاصد اور نوعِ بشری کی خوبصورتی کے نام سے پھیلایا جارہا ہے، نیز مختلف اغراض کے لئے انسانی نطفوں کے بینک بھی قائم ہوچکے ہیں، جہاں ٹیکنیکل طریقہ پر مَردوں کے نطفوں کو محفوظ رکھا جاتا ہے اور ایک طویل مدت تک بارآور رہتا ہے، یہ نطفے معین یا غیر معین اشخاص سے رضا کارانہ طور پر یا بالعوض حاصل کئے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بے شمار مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام ان چیزوں کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا طریقہ کوئی فطری طریقہ نہیں اور اسی وجہ سے بعض حضرات نے اس کو ہر حال میں ناجائز قرار دیا ہے، لیکن ممانعت کی یہ کوئی معقول اور قوی دلیل نہیں ہے، کسی معقول ضرورت اور تقاضا کے وقت ہر غیر فطری صورت اختیار کرنے کو ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا، جبکہ شرعی حدود وقیود کا لحاظ کرلیا جائے، اور یورپ وامریکہ وغیرہ میں رائج غیر شرعی اُمور سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

اس لئے بہرحال مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے عام رواج سے تو بچنے کی ضرورت ہے، البتہ ایسی مجبوری کی صورت میں جبکہ اولاد کی ضرورت ہو اور اس کے بغیر کوئی شخص پریشان ہو اور اس طریقہ کے بغیر ’’مثلاً ماہرین کی رائے میں دوسری ممکنہ تدابیر غیر مؤثر ہوں‘‘ اولاد کا حصول نہ ہو رہا ہو، شرائط کے ساتھ مخصوص صورتوں میں محدود اجازت دی جاسکتی ہے۔

چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے ایک فیصلہ میں تحریر کیا:

''مصنوعی بارآوری میں عام طور پرحتی کہ اس کی جائز شکلوں میں بھی دوسرے اُمور وابستہ ہوتے ہیں، نطفوں یا بارآورحصوں کے ٹیسٹ ٹیوب میں اختلاط کے امکانات ہوتے ہیں، بالخصوص جب کہ یہ کام کثرت سے اور عام ہوجائے۔اس لئے اکیڈمی دین کا جذبہ رکھنے والوں کو نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس طریقۂ کار کو اختیار نہ کریں، اِلّا یہ کہ انتہائی سخت ضرورت ہو اور آخری درجہ احتیاط اور نطفوں یا بارآور حصوں کے اختلاط سے مکمل تحفظ کے ساتھ اختیار کیا جائے۔

(رابطہ عالم اسلامی کی اسلامک فقہ اکیڈمی کے اہم فقہی فیصلے، بحوالہ عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل ص: ۱۵۳ وص: ۱۶۶، ترتیب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب)

(عربی عبارات آخر میں شق نمبر''الف وب'' کے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔)

مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے طریقے اور ان کا شرعی حکم

اس وقت مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے عموماً سات طریقے رائج ہیں۔حلت وحرمت اور شرعی حکم کے اعتبار سے مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بارے میں ''اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ'' نے نہایت غور وخوض اور تفصیلی بحث کے بعد اپنی قرارداد نمبر (۳/۴/۱۶) اس طرح منظور کی ہے:

''اس دور میں مصنوعی تولید کے مندرجہ ذیل سات طریقے معروف ہیں:

(۱)... نطفہ شوہر کا ہو اور کسی ایسی عورت کا بیضہ لیا جائے جو اس کی بیوی نہ ہو اور پھر تلقیح کا عمل کرنے کے بعد اسی شوہر کی بیوی کے رحم میں رکھا جائے۔

(۲)... کسی شخص کی بیوی کا بیضہ لے کر اس کے شوہر کے سوا کسی اور شخص کے نطفے سے تلقیح کا عمل کرکے اس کو اسی بیوی کے رحم میں رکھا جائے (جس سے بیضہ لیا گیا تھا۔)

(۳)... شوہر کا نطفہ اور بیوی کا بیضہ لے کر بیرونی طور پر ان کی تلقیح کی جائے اور پھر اس کو دوسری عورت کے رحم میں رکھا جائے، جس نے حمل کے لئے اپنی خدمات

رضا کارانہ طور پر پیش کی ہوں۔

(۴)... کسی اجنبی شخص کے نطفے اور اجنبی عورت کے بیضے کے درمیان بیرونی طور پر تلقیح کی جائے اور لقیحہ بیوی کے رحم میں رکھا جائے۔

(۵).... شوہر کا نطفہ اور بیوی کا بیضہ لے کر بیرونی تلقیح کی جائے اور اس کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں رکھا جائے۔

(۶)... نطفہ شوہر کا ہو اور بیضہ اس کی بیوی کا ہو، ان کی تلقیح بیرونی طور پر کی جائے اور پھر اسی بیوی کے رحم میں رکھا جائے۔

(۷)... شوہر کا نطفہ لے کر اسی کی بیوی کے مہبل یا رحم میں کسی مناسب جگہ پر بطور اندرونی تلقیح رکھا جائے۔ (قراردادیں اور سفارشات ص: ۴۵)

ان سات صورتوں کو سامنے رکھ کر جدہ فقہ اکیڈمی نے مندرجہ ذیل قرار منظور کی:

ان سات صورتوں میں سے پہلی پانچ صورتیں قطعاً حرام ہیں، یہ سارے عمل ذاتی طور پر بھی حرام ہیں اور ان مفاسد کی وجہ سے بھی حرام ہیں جو اِن پر مرتب ہوتے ہیں، جس میں نسب کا اختلاط وخاندان اور نسل کا ضیاع اور دوسرے شرعی محظورات شامل ہیں، البتہ چھٹی اور ساتویں صورت کے بارے میں اکیڈمی کی رائے یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ان طریقوں کے استعمال کی گنجائش ہے، بشرطیکہ تمام ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کرلی گئی ہوں۔ واللہ اعلم (قراردادیں اور سفارشات ص: ۴۵)

اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی اپنے فیصلہ میں ان دوصورتوں کا جواز طے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ''عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل ص: ۱۶۰، آٹھویں اجلاس کا دوسرا فیصلہ)[1]

---

(۱) حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

ٹیسٹ ٹیوب طریقے کا جواز صرف اسی صورت میں ہے جب میاں بیوی کے نطفوں میں اختلاط کیا گیا ہو اور بیوی کے رحم ہی میں جنین نے بعد میں پرورش پائی ہو، اس کے علاوہ باقی تمام صورتیں اختیار کرنا ناجائز ہیں۔

(مریض ومعالج کے اسلامی احکام، باب بیالیس (ٹیسٹ ٹیوب بارآوری) ص: ۲۸۵، (ا: ط: مجلس نشریاتِ اسلام) تاریخِ اشاعت 2006ء) (حاشیہ از محمد رضوان)

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ میں دنیا بھر کے سرکردہ علماء شامل ہیں، انہوں نے اوراسی طرح رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی مصنوعی تولیداورٹیسٹ ٹیوب بے بی کے دوطریقوں کی اجازت دی ہے، اور جواز کی یہ دونوں صورتیں زوجین اوران کے نطفوں کے اختلاط کے ساتھ خاص ہیں، اس لئے دونوں اکیڈمیوں کی قراردادیں اورفیصلے بہت اہمیت کے حامل ہیں، اور بوقتِ ضرورت حاجت مندوں کواحتیاطی تدابیر کے ساتھ ان پرعمل کرنے کی گنجائش ہے۔

(عربی عبارات آخر میں شق نمبر''الف وب'' کے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔)

زوجین کومصنوعی تولید کا طریقۂ کار اختیار کرنے کی وجوہات

ماہرین کے مطابق مصنوعی تولیداورٹیسٹ ٹیوب بے بی کوزوجین کے لئے مندرجہ ذیل صورتوں میں اپنایا جاتا ہے:

(۱)...شوہر کے مادہ منویہ میں جرثوموں کی مقدارتھوڑی ہو۔

شوہر کے جرثوموں کوجمع کرکے اس کی بیوی کے رحم تک پہنچایا جائے۔

(۲)... بیوی کے مہبل کی تیزابیت مادہ منویہ کے جرثوموں کو ماردے۔

(۳)...شوہراور بیوی کے جرثوموں میں تضادہو، جس کی وجہ سے ان جرثوموں کی موت واقع ہوجاتی ہو۔

(۴)... بیوی کے رحم کا منہ تنگ ہو، مرد کے مادہ منویہ کواندرداخل ہونے سے روکے۔

(۵)... جرثومے موجودہونے کے باوجودشوہر کے اندرکوئی ایسی بیماری وکمزوری ہوکہ وہ اپنا مادہ منویہ مباشرت کے دوران عورت کے مناسب مقام تک نہ پہنچاسکے۔

(عموم البلوی ص: ۴۷۷ تالیف سلم بن محمد ماجد الدسری بحوالہ اخلاقیات التلقیح الاصطناعی ص۴۵ وأطفال الأنابيب بين العلم والشريعة ص: ۳۷،۳۸)

مذکورہ وجوہات میں اکثرصورتیں بیماری میں داخل ہیں اور بیماری کاعلاج شرعاًایک جائز مقصد ہے، جبکہ مذکورہ جائزصورتوں کا ہی انتخاب کیا جائے۔

ملحوظ رہے کہ یورپ وغیرہ میں زوجین کے علاوہ دوسرے اجنبی مرد وعورت کے مادوں میں بھی اختلاط کیا جاتا ہے جو کہ شرعاً جائز نہیں۔

ضرورت سے زائد غیر تلقیح شدہ بیضات

اس سلسلہ میں جدہ فقہ اکیڈمی کی جنرل کونسل نے اپنے چھٹے اجلاس منعقدہ جدہ سعودی عرب، مورخہ ۱۷۔۲۳ شعبان ۱۴۱۰ھ بمطابق ۱۴۔۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء میں جو قرارداد منظور کی، وہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱)... اس علمی تحقیق کی روشنی میں کہ غیر تلقیح شدہ نسوانی بیضوں کو آئندہ استعمال کے لئے محفوظ رکھنا ممکن ہے، بیضوں کی مصنوعی بارآوری کے وقت یہ ضروری ہے کہ ہر مرتبہ بیضوں کی صرف اس مقدار پر اکتفاء کیا جائے جتنی فوری پیوندکاری کے لئے ضروری ہو، تاکہ زائد بیضوں کی موجودگی کا امکان ختم کردیا جائے۔

(۲)... اگر تلقیح شدہ بیضوں میں سے کوئی کسی بھی طریقے سے زائد حاصل ہوجائے تو اس کو طبی توجہ کے بغیر ویسے ہی چھوڑ دیا جائے، حتیٰ کہ اس زائد بیضہ کی زندگی طبعی طور پر پوری ہوجائے۔

(۳)... ایک عورت کے بیضے کی تلقیح دوسری عورت میں کرنا حرام ہے، اس سلسلے میں ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا لازم ہے جن کے تحت کسی عورت کا تلقیح شدہ بیضہ کسی غیر شرعی حمل میں استعمال نہ ہوسکے۔ واللہ اعلم۔ (قراردادیں اور سفارشات ص: ۱۴۲، ۱۴۳)

زوجین کے تلقیح شدہ بیضات کو سوکن کے رحم میں داخل کرنا

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شوہر و بیوی کے بیضوں کی تلقیح کرکے سوکن کے رحم میں داخل کرنا جائز نہیں۔

یاد رہے کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے ساتویں سیمینار منعقدہ مؤرخہ ۱۱ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ کے اپنے پانچویں فیصلہ میں مذکورہ پانچویں صورت کو (جس

میں میاں بیوی کے نطفوں کو بارآور کر کے اسی میاں کی دوسری بیوی کے رحم میں داخل کیا جائے) جائز قرار دیا تھا، چنانچہ تحریر کیا تھا:

''ساتواں طریقہ (جس میں شوہر و بیوی کے نطفہ وانڈے کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرنے کے بعد اسی شوہر کی اس دوسری بیوی کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے جو رحم سے محروم اپنی سوکن کی طرف سے حمل کا بار اُٹھانے کے لئے رضا کارانہ طور پر خود کو پیش کرتی ہے) اکیڈمی کے اجلاس کے خیال میں ضرورت کے وقت اور مذکورہ عمومی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جائز ہے۔ مذکورہ تینوں جائز طریقوں میں اکیڈمی طے کرتی ہے کہ نومولود کا نسب نطفہ وانڈا دینے والے زوجین سے ثابت ہوگا، میراث اور دیگر حقوق ثبوتِ نسب کے تابع ہوتے ہیں، لہٰذا بچہ کا نسب جس مرد و عورت سے ثابت ہوگا، وراثت اور دیگر احکام بھی بچہ اور ان کے درمیان جاری ہوں گے جن کے ساتھ بچہ کا نسب ثابت ہوا ہے، سوکن کی طرف سے حمل کے لئے رضا کارانہ تیار ہونے والی زوجہ جو ساتویں طریقہ میں مذکور ہے) بچہ کے لئے رضاعی ماں کے درجہ میں ہوگی، کیونکہ بچہ نے اس کے جسم وعضو سے استفادہ اس سے کہیں زیادہ کیا ہے جتنا ایک شیر خوار بچہ مدتِ رضاعت (جس کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے ہوتے ہیں) کے اندر دودھ پلانے والی خاتون سے کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو''عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل'' ص:۱۵۲ و ص: ۱۵۳)[1]

لیکن اس کے بعد اپنے آٹھویں اجلاس میں اس صورت کے جواز سے رجوع کر لیا اور اس سلسلہ میں مستقل قرارداد منظور کی، اس قرارداد کا مضمون یہ تھا:

اکیڈمی کے آٹھویں اجلاس میں وہ اختلافی تبصرے پیش ہوئے جو اس موضوع پر اکیڈمی کے ساتویں اجلاس کی قرارداد کی مندرجہ ذیل دفعہ (۴) کی بابت بعض

(۱) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زید مجدہ نے بھی اس صورت کو جائز قرار دیا ہے جس میں زن وشوہر کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس آمیزش کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو: جدید فقہی مسائل'' ج: ۵ ص: ۱۴۳) (اس مسئلے کی مزید تفصیل اور چند شبہات کا ازالہ رسالہ ہذا کے آخر میں درج ہے۔) (حاشیہ از محمد رضوان)

ارکان اکیڈمی کی جانب سے آئے تھے، اس دفعہ کی عبارت یہ تھی:

''ساتواں طریقہ (جس میں شوہر و بیوی کے نطفہ وانڈے کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرنے کے بعد اسی شوہر کی اس دوسری بیوی کے رحم میں داخل کردیا جاتا ہے جو رحم سے محروم اپنی سوکن کی طرف سے حمل کا بار اُٹھانے کے لئے رضا کارانہ طور پر خود کو پیش کرتی ہے) اکیڈمی کے اجلاس کے خیال میں ضرورت کے وقت اور مذکورہ عمومی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جائز ہے۔)

اس فیصلہ پر آنے والے تبصروں کا خلاصہ یہ ہے:

''دوسری زوجہ جس کے اندر پہلی زوجہ کا بارآور انڈا ڈالا گیا ہے، یہ ممکن ہے کہ اس انڈے پر رحم کے بند ہونے سے پہلے اپنے شوہر کے ساتھ قریبی مدت کے اندر مباشرت کے نتیجہ میں وہ زوجہ دوبارہ حاملہ ہوجائے، پھر جڑواں بچے پیدا ہوں اور یہ معلوم نہ ہوسکے کہ انڈے سے ہونے والا بچہ کون ہے؟ اور شوہر سے مباشرت کے نتیجہ میں کون بچہ ہوا ہے؟ اسی طرح یہ معلوم نہیں ہوسکے گا کہ اس انڈے والے بچہ کی ماں کون ہے اور شوہر کے ساتھ ہمبستری کے بچہ کی ماں کون ہے؟ اسی طرح بسا اوقات علقہ یا مضغہ کی صورت میں کسی ایک حمل کی موت ہوجائے اور دوسرے حمل کی ولادت کے ساتھ ہی وہ ساقط ہو تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ انڈے کا بچہ ہے یا شوہر کی مباشرت کے حمل کا بچہ ہے، یہ صورتحال حقیقی ماں کے تعلق سے دونوں حملوں کے درمیان اختلاطِ نسب پیدا کرے گی اور اس پر مرتب ہونے والے احکام میں التباس ہوگا، یہ ساری باتیں ضروری قرار دیتی ہیں کہ مذکورہ طریقہ کی بابت اکیڈمی اپنا فیصلہ نہ دے۔ اکیڈمی نے حمل وولادت کے ماہرین اطباء کی آراء بھی پیشِ نظر رکھیں جو اَنڈے کی حاملہ عورت کے لئے شوہر سے مباشرت کے نتیجہ میں دوبارہ حاملہ ہوجانے کے امکان کی تائید کرتی ہیں اور مذکورہ تبصرہ کے مطابق اختلاطِ نسب کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔

اس پر بحث ومناقشہ کے بعد اجلاس طے کرتا ہے کہ اکیڈمی کے ساتویں اجلاس

منعقدہ ۱۴۰۴ھ کی اس بابت قرارداد میں مذکورہ جواز کی تیسری حالت جو بارآوری کا ساتواں طریقہ ہے، کا فیصلہ واپس لیا جاتا ہے۔ (أیضا،ص:۱۶۰ وص:۱۶۱)

اس سے معلوم ہوا کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ زوجین کے نطفوں کی تلقیح سوکن کے رحم میں جائز نہیں۔

مصنوعی تولید کی جائز صورتوں میں پیش آمدہ اختلافی اُمور

بعض حضرات نے مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے کسی ایسے طریقۂ کار کو بھی اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی، جس میں نامحرم کے سامنے کشفِ عورت اور بے پردگی لازم آتی ہو، یا بیوی کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے جلق کر کے منی حاصل کی جائے، جبکہ دیگر حضرات بوجہ مجبوری و علاج ان اُمور کے ارتکاب کی اجازت دیتے ہیں۔ اس لئے اب ان اُمور پر ہر دو نقطہائے نظر کی روشنی میں الگ الگ بحث کی جاتی ہے۔

(۱)....بے پردگی اور کشفِ عورت کا مسئلہ

اگر اس عمل کے دوران بے پردگی اور کشفِ عورت وغیرہ کی خرابی لازم نہ آتی ہو مثلاً نامحرم کے سامنے ستر کھولے بغیر میاں بیوی خود ہی اس عمل کو انجام دیں تو اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں، لیکن بعض حضرات نے حاجت کی وجہ سے احتیاطی تدابیر کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے۔

ناجائز قرار دینے والے چند اہلِ علم حضرات کی تصریحات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱)...مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب فرماتے ہیں:

”اب رہی وہ صورت کہ جس میں صرف زن وشوہر کے بیضہ یا مادہ کو اکٹھا کیا جائے (خواہ ٹیسٹ ٹیوب کے اندر شوہر و بیوی کا مادہ یا بیضہ رکھا جائے یا شوہر کا مادہ کسی طرح نکال کر اسے کسی ذریعہ سے بیوی کے رحم میں داخل کیا جائے) تو اگر زوجین کے علاوہ کسی اور کے سامنے دونوں یا ان میں سے ایک کی بھی شرمگاہ نہ کھلے اور مادہ کے اخراج، نیز رحم میں اسے داخل کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جانا اگر ممکن

ہو کہ جس میں شرعی قباحتیں نہ ہوں تو اُصولاً یہ عمل حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے حرام ہونے کی کوئی مضبوط وجہ نظر نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ خلافِ سنت اور متوارث طریقہ سے مخالف ہونے کی وجہ سے اسے مکروہ قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اولاد کا ہونا اگر صرف اسی طریقہ پر موقوف ہو تو واحد ذریعہ ہونے کی وجہ سے یہاں کراہت کا دفع ہو جانا بھی مستبعد نہیں۔ اسی سے یہ ثابت ہوا کہ نلکی زادہ کا حکم جاننے کے لئے پہلے یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ اس صورت میں مادہ تولید کے اخراج کا کیا طریقہ عموماً اختیار کیا جاتا ہے؟ اور پھر عورت کے رحم میں اسے داخل کس طرح کیا جاتا ہے؟ اگر شوہر عزل کے طریقے سے اپنا مادہ اکٹھا کر کے اور پھر وہ خود ہی کسی نلکی (یا انجکشن سے) اپنی بیوی کے رحم میں داخل کردے تو یہ شکل جائز ہوگی۔ (جدید مسائل کا شرعی حل ص:۲۱۲، ۲۱۳)

(۲)... حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے طریقِ کار میں کسی ایسے مرض کا علاج نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے کسی جسمانی تکلیف میں ابتلاء ہو، یہ دفعِ مضرت بدنیہ نہیں، بلکہ جلب منفعت ہے، اس لئے یہ عمل لیڈی ڈاکٹر سے بھی کروانا جائز نہیں، مرد ڈاکٹر سے کروانا انتہائی بے دینی کے علاوہ ایسی بے غیرتی و بے شرمی بھی ہے جس کے تصور سے بھی انسانیت کوسوں دور بھاگتی ہے، اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے جو اولاد حاصل کی گئی، وہ وبال ہی بنے گی۔ (احسن الفتاوی ج:۸ ص:۲۱۵)[۱]

(۳)... حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر سے ایسا عمل کرانا قطعی حرام ہے، سترِ عورت فرض ہے، عورت کی شرمگاہ (جائے پیشاب) عورتِ غلیظہ ہے، شرم گاہ کے بالائی حصہ کو بلا وجہ شرعی دوسروں کے لئے دیکھنا جائز نہیں ہے تو اندرونی حصہ کو دیکھنا اور شرم گاہ کو چھونا کس طرح جائز ہوسکتا

(۱) احسن الفتاوی ۲۱۵/۸ کتاب الحظر والإباحۃ، متفرقات الحظر والإباحۃ، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم ط۔ سعید۔

ہے؟ میاں بیوی سخت گنہگار ہوں گے اور شوہر از روئے حدیث دیوث بنے گا اور جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا، لہٰذا اس عمل سے قطعاً احتراز کیا جائے۔ (فتاوی رحیمیہ ج:۱۰ص:۱۷۹)(۱)

(۴).....جواہر الفتاوی مصنفہ ''حضرت مولانا مفتی محمد عبدالسلام چاٹگامی صاحب مدظلہم میں ہے:

''شوہر اور بیوی کے جرثومے کو غیر فطری طریقہ سے نکالنے اور عورت کے رحم میں داخل کرنے میں اگر تیسرے مرد یا عورت کا عمل دخل ہوتا ہے اور اجنبی مرد یا عورت کے سامنے شرمگاہ دیکھنے یا دِکھانے اور مس کرنے یا کرانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس طرح بے حیائی اور بے پردگی کے ساتھ بچہ پیدا کرنے کی خواہش پوری کرنے کی اجازت شرعاً نہ ہوگی، کیونکہ بچہ پیدا کرنا کوئی فرض یا واجب امر نہیں ہے، نہ ہی بچہ پیدا نہ ہونے سے انسان کو جان یا کسی عضو کی ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے تو گویا کہ کوئی شرعی ضرورت واضطراری کیفیت نہیں پائی جاتی جس سے بدن کے مستور حصے خصوصاً شرمگاہ کو اجنبی مرد یا عورت ڈاکٹر کے سامنے کھولنے کی اجازت ہو۔

لہٰذا ٹیسٹ ٹیوب کے دوسرے طریقہ کو اگر کسی اجنبی مرد یا اجنبی عورت ڈاکٹر کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے تو جائز نہیں ہے، یعنی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوگا، تاہم بچہ کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا، اس کو باپ سے وراثت ملے گی، صحیح اولاد کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔ (جواہر الفتاوی ج:اص: ۲۲۶و۲۲۷ مطبوعہ: اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی)(۲)

لیکن اس کے برعکس اس غرض کے لئے کشفِ عورت کو جائز قرار دینے والوں کا کہنا ہے کہ:

☆.....اولاد کا نہ ہونا عموماً کسی بیماری ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، یا تو عورت کے

(۱) فتاوی رحیمیہ ۱۰/۱۷۹، کتاب الحظر والإباحة، فعل جائز وناجائز، بذریعہ انجکشن رحم میں مادہ منویہ پہنچانا۔ ط۔ دار الاشاعت۔

(۲) جواہر الفتاوی: ۱/۱۶۱، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت، ط۔ اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی، اشاعت: اگست ۲۰۱۱ء۔

اندر کوئی نقص ہوتا ہے یا مرد میں کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اولاد کے حصول پر قادر نہیں ہوتے۔

چنانچہ مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی مذکورہ جائز دو صورتیں بھی اسی سے متعلق ہیں، جن میں مرد یا عورت میں کوئی بیماری، نقص ہو جس کی وجہ سے اولاد کا حصول ممکن نہ ہو، جیسا کہ پیچھے گذرا۔ اور بیماری کا علاج کرانا جائز ہے، جس کی خاطر کشفِ عورت کی بھی گنجائش ہے۔

☆..... شادی شدہ عورت اور اس کے شوہر کے لئے اولاد کے حصول کی ضرورت ایک جائز اور حلال مقصد ہے۔

☆..... فقہائے کرام نے ولد کی حاجت کو حاجتِ اصلیہ میں شمار کیا ہے۔

☆..... بلکہ اولاد کا حصول نکاح کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

☆..... اور فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق لوگ عادۃً نکاح پر اقدام ہی توالد کی غرض سے کرتے ہیں اور وطی سے مقصود بھی تقاضۂ شہوت کی تکمیل کے ساتھ حصولِ ولد ہوتا ہے۔

(عربی عبارات آخر میں شق نمبر ''ج'' کے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔)

☆..... اولاد کے حصول کے بغیر بعض اوقات زوجین کو مشقت اور تنگی لاحق ہوتی ہے اور ایک دوسرے پر الزم تراشی اور باہم جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے، اسی وجہ سے اولاد نہ ہونے کی صورت میں عامۃ الناس پریشانی کا شکار ہوتے ہیں اور در بدر اس کے علاج ومعالجہ کے لئے پھرتے ہیں۔

☆..... اولاد نہ ہونے کی وجہ سے آج کل عام طور پر میاں بیوی میں طلاق کی نوبت آجاتی ہے اور طلاق سخت ناپسندیدہ چیز ہے، جس سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنے کی شریعت تعلیم دیتی ہے۔

☆..... بعض اوقات اولاد نہ ہونے کی صورت میں دوسری شادی کی نوبت آتی ہے اور آج کل طبائع میں مساوات اور عدل کی کمی ہے، پھر اس کے نتیجہ میں اختلاف

ونزاع پیدا ہوتا ہے۔

☆..... پھر بعض اوقات طلاق یا نکاحِ ثانی کی صورت میں دوخاندانوں میں تنازع طول پکڑ جاتا ہے جس کے نتیجے میں قتل وغارتگری تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

☆.....اس کے علاوہ اولاد کے حصول کے لئے ولادت کے موقع پر اور اس سے پہلے حمل کے دوران بغرضِ تشخیص ستر کھولنے کی شرعاً اجازت ہے، جس سے اولاد کے ابتداءً حصول کے لئے بھی فی الجملہ ستر کھولنے کی گنجائش ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ بہت سی چیزوں کے بقاء اور ابتداء کا ایک ہی حکم ہے۔

☆.....اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ شریعت کے مقاصدِ خمسہ میں حفظِ دین، حفظِ نفس، حفظِ عقل اور حفظِ مال کے علاوہ حفظِ نسل اور مقاصدِ خمسہ کے حصول اور بقاء کی تدابیر ضرورت وحاجت میں شامل ہیں۔ (ملاحظہ ہو: اسلامی فقہ اکیڈمی ہند کے اہم فقہی فیصلے ص: ۷۰)

اور مجموعی طور پر یہ تمام اُمور اور ان میں سے بعض اُمور مستقلاً ''شرعی حاجت'' کا درجہ رکھتے ہیں، اور ''تلقیح'' دراصل حفظِ نسل کے حصول کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی ایک تدبیر اور طریقہ وذریعہ ہے۔

اور ''اسبابِ رخصت'' و''اسبابِ تخفیف'' میں فقہائے کرام نے مرض، عُسر اور نقص کو بھی شمار کیا ہے، جن کی وجہ سے حاجت کے وقت بہت سے احکام میں سہولت حاصل ہوجاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: اسلامی فقہ اکیڈمی ہند کے اہم فقہی فیصلے، صفحہ ۷۵)[۱]

(۱) المصالح الضرورية هي التي يتوقف عليها حياة الناس الدينية والدنيوية بحيث إذا فقدت اختلت الحياة فى الدنيا و شاع الفساد و ضاع النعيم الأبدى و حل العقاب فى الآخرة و هذه الضروريات خمس و هى الدين والنفس والعقل والنسل والمال وهى أقوى مراتب المصالح.......
و قد حفظ الشرع هذه الضروريات من ناحيتين ناحية إيجادها وتحقيقها وناحية بقائها الأولىٰ إيجابية تتعلق بمراعاتها من جانب الوجود والثانية سلبية تتعلق بمراعاتها من جانب العدم كما قال الشاطبى.
(أصول الفقه الإسلامى لدكتور وهبة الزحيلى جلد ۲ صفحه ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، الباب السادس، مقاصد الشريعة العامة (۱)

(۱) ثالثا: أنواع المصالح باعتبار آثارها فى المجتمع ، الضروريات، ط. رشيديه.

اوراولاد نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ تینوں اسباب مختلف نوعیّتوں سے جمع ہوجاتے ہیں (جیسا کہ اُوپر گزرا)

اوران وجوہات کے پیشِ نظراس کودفعِ مضرت کا درجہ حاصل ہوگا، لہٰذا بوقتِ ضرورت مصنوعی تولید اورٹیسٹ ٹیوب بے بی کا مجوزہ طریقۂ کار اپنانا درست ہے۔

یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ حاجت کے وقت ممنوع فعل کی اجازت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ اوراگر ہوتی ہے توکس قسم کے ممنوع فعل کی اجازت ہوتی ہے؟

اس سلسلہ میں اہلِ علم حضرات کا اختلاف ہے اوراس میں کئی آراء پائی جاتی ہیں، ان میں اگرچہ بعض اہلِ علم حضرات کا کہنا یہ ہے کہ حاجت کے وقت کسی بھی قسم کی حرام چیز حلال نہیں ہوتی یا جس چیز کی ممانعت عمومی قواعدِ شرعیہ یا قیاس پرمبنی نہ ہو، بلکہ منصوص ہو، وہ حاجت کے وقت جائز نہیں ہوتی۔

لیکن بعض اہلِ علم حضرات کی ایک رائے یہ ہے کہ جس چیز کی حرمت قطعی نہ ہو، بلکہ ظنی یامکروہِ تحریمی ہو، وہاں ''حاجت'' کی بنیاد پرگنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: ملکیتِ زمین اوراس کی تحدید ص: ۱۱۳ تا ۱۱۵[۱]، نظرية الضرورة الشرعية لأبى زهره صفحه ۲۷۴[۲]، المدخل إلى الفقه الإسلامي ج: ۲[۳] ص: ۹۹۸[۴] لشيخ زرقاء)

(۱ تا ۳) مذکورہ حوالہ جات کے لیئے دیکھئے ملکیتِ زمین اوراس کی تحدید ص ۱۱۳ (طبع مکتبہ دارالعلوم)

(۴) يتضح من ذلک و من بقية الأمثلة التى يوردها الفقهاء عن الضرورة والحاجة أنهما يختلفان فى الحكم من ناحيتين. (الف) إن الضرورة تبيح المحظور سواء كان الاضطرار حاصلا للفرد أم للجماعة بخلاف الحاجة فإنها لا يوجب التدابير الاستثنائية من الأحكام العامة إلا إذا كانت حاجة الإجتماعية وذلک لأن لكل فرد حاجات متجددة و مختلفة عن غيره ولا يمكن لكل فرد تشريع خاص به بخلاف الضرورة فإنها نادرة و قاسرة.

(ب) إن الحكم الاستثنائى الذى يتوقف على الضرورة هو إباحة موقتة لمحظور ممنوع بنص الشريعة تنتهى الإباحة بزوال الاضطرار تتقيد بالشخص المضطر.

أما الأحكام التى ثبت على بناء الحاجة فهى لا تصادم نصا ولكنها تخالف القواعد والقياس وهى تثبت بصورة دائمة يستفيد منها المحتاج وغيره (المدخل إلى الفقه الإسلامى ج:۲ ص: ۹۹۸، ۹۹۹)

(ازمحمد رضوان)

اور ایک رائے یہ ہے کہ حاجت کے وقت حرام لغیرہ کی اجازت ہوتی ہے، حرام لعینہ کی اجازت نہیں ہوتی، اسلامی فقہ اکیڈمی ہند کی تجویز یہی ہے، چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی ہند نے ضرورت وحاجت کے متعلق جو متفقہ تجاویز منظور کی ہیں، ان میں پہلی تجویز کی چوتھی شق یہ ہے:

''ضرورت وحاجت کے احکام میں بھی فقہاء نے فرق کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت کے ذریعہ ایسے منصوص احکام سے بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے جن کی ممانعت قطعی ہو اور جو بذاتِ خود ممنوع ہوں، حاجت اگر عمومی نوعیت کی نہ ہو تو اس کے ذریعہ ان ہی احکام میں استثناء کی گنجائش پیدا ہوتی ہے جن کی ممانعت بذاتِ خود مقصود نہ ہو، بلکہ دوسرے محرمات کے سدِّ باب کے لئے ان سے منع کیا جاتا ہے۔''
(اہم فقہی فیصلے ص:۱۷)[1] [2]

معلوم ہوا کہ حاجت کے وقت بعض اہلِ علم حضرات کے نزدیک مکروہِ تحریمی کے ارتکاب کی گنجائش ہوجاتی ہے اور بعض حضرات کے نزدیک محظور لغیرہ اور منہی لغیرہ کی اجازت ہوتی ہے۔[3]

---

(۱) (طبع ادارۃ القرآن کراچی)

(۲) إن المحرم لذاته لا يباح إلا للضرورة و ذلک لأن سبب تحريمه ذاتی فهو يمس ضروريا فلا يزيل تحريمه إلا ضروری مثله فإذا كان التحريم بسبب الاعتداء على العقل كشرب الخمر فإنها لا تباح الخمر إلا إذا خيف الموت عطشا لأن الضرورات هی التی تزيل المحظورات التی حرمت لأنها مست ضروريا، أما المحرم لغيره فإنه يباح للحاجة لا للضرورة و ذلک لأنه لا يمس ضروريا و لذا أبيحت رؤية عورة المرأة عند العلاج إذا كانت الرؤية لازمة للعلاج۔ (أصول الفقه لشيخ أبی زهرة ص: ۴۰)
كما وقع الاتفاق بينهم على أن المحرمات نوعان: محرمات لذاتها و محرمات لغيرها فالأولی لا يرخص فيها عادة إلا من أجل المحافظة على مصلحة ضرورية والثانية يرخص فيها حتى من أجل المحافظة على مصلحة حاجية على أنه لا مانع من إن تعامل هذه معاملة الأولى ولو فی بعض الحالات و على هذا الأساس و ما قبله جاء ت القاعدة الفقهية الحاجة تنزل منزلة الضرورة وقد خرج الفقهاء اعتماداً عليها جزئيات متفرقة يمكن أن تكون أصولا يلحق بها ما يماثلها من نظائرها۔ (الموسوعة الفقهية جلد ۲۲ مادة رخصة) (محمد رضوان)

(۳) ان آراء کا ذکر ہم نے اپنے الگ مستقل مضمون بعنوان ''اصطلاحی ضرورت وحاجت اور محتاج کے لئے استقراض بالربح کی تحقیق'' میں کر دیا ہے (محمد رضوان)

اب دیکھنا یہ ہے کہ کشفِ عورت مکروہِ تحریمی ہے یا حرام قطعی؟ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکروہِ تحریمی ہے، کیونکہ کشفِ عورت کی ممانعت دلیلِ ظنی سے ثابت ہے اور اس کے لئے کتبِ فقہ میں جو لفظِ حرام یا تحریم استعمال ہوتا ہے، اس سے مراد کراہتِ تحریمی ہے۔ (ضرورت وحاجت ص:۳۷۹)[1]

اسی طرح کشفِ عورت بعض حضرات کی تصریح کے مطابق منہی لغیرہ ہے، کیونکہ اس کی حرمت "سداً لباب الزنا" ہے اور اس سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور "ما حرم سدًا للذريعة يباح للمحتاج" ایک فقہی اُصول ہے۔ (ملاحظہ ہو: ضرورت وحاجت" ص ۱۵ وص ۵۰، ۱۸۰)[2]

اس لئے حاجت کے وقت مکروہِ تحریمی یا حرمت لغیرہ کے جواز کے قائلین کی آراء کے مطابق تلفیق کی غرض سے کشفِ عورت جائز ہوا۔

اس کے علاوہ فقہائے کرام نے حاجت ہی کی وجہ سے تحملِ شہادت کی غرض سے زنا کے وقت سترِ غلیظ کو دیکھنے کی اجازت دی ہے، حالانکہ دیکھنے سے پہلے گواہی ضروری نہیں اور گواہی دینے کے لئے پہلے سے دیکھنے کی اجازت دی جارہی ہے جو ظاہر ہے کہ کوئی ضرورت اور اضطرار والی حالت نہیں۔

اور فقہائے کرام نے حاجت کے وقت بیماری کے علاج کے لئے کشفِ عورت کی اجازت دی ہے:

"والطبيب إنما ينظر من العورة بقدر الحاجة"[1]

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"سترِ عورت بے شک فرض ہے مگر جمیع احوال میں نہیں، بلکہ ان میں سے ضرورت

(۱) ضرورت وحاجت کا احکامِ شرعیہ میں اعتبار: ص: ۳۷۸، ۳۷۹۔ مسئلہ ضرورت وحاجت از مولانا شبیر احمد قاسمی صاحب، حاجت کی مثالیں اور مواقعِ استعمال، ط۔ ادارۃ القرآن۔

(۲) أیضا: ص: ۱۵ وص: ۵۰ وص: ۱۸۰

(۳) الأشباه والنظائر مع شرحه للحموى: ۲۵۳/۱، الفن الأوّل فى القواعد الكلية، النوع الأوّل القاعدة الخامسة: الضرر يزال ط، إدارة القرآن۔

کی حالت مستثنیٰ ہے اور یہ ضرورتِ شرعیہ نہیں بمعنی "التأثیر بترکہ" بلکہ طبعی و عادی ہے، جس کا شریعتِ مقدسہ نے مکلفین کے ضعف کے سبب اعتبار کیا ہے، اور طبعی وعادی ہونا اس کا بمعنی "موقوف علیه الصحة عادةً غالبةً" ہونا ظاہر ہے، پس اس طرح سے ضرورۃ من حیث العادۃ وعدمِ ضرورت من حیث الشرع میں کچھ تنافی نہیں، اور متاخرین نے تداوی بالحرام کو بھی جائز کہہ دیا ہے اور اس پر عمل کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ (امداد الفتاوی ج:۴ص:۲۱۱، احکام متعلقہ علاج و دوا وغیرہ)[۱]

جیسے مرض کا ازالہ ایک طبعی ضرورت ہے، اسی طرح تحصیلِ اولاد بھی ایک طبعی ضرورت ہے، اگر یہ بات تسلیم نہ کی جائے تو لازم آئے گا کہ عقم (INFRETILITY) کی تشخیص وعلاج میں بھی کسی کے سامنے شرمگاہ کھولنے کی اجازت نہ ہو، کیونکہ اس میں بھی کوئی تکلیف اور اذیت نہیں ہوتی۔ (مریض ومعالج کے اسلامی احکام صفحہ ۲۸۳ بتغیر)[۲] [۳]

(۱) امداد الفتاوی: ۴/۲۱۱، کتاب الحظر والإباحۃ، احکام متعلقہ علاج و دوا وغیرہ، مرض فتق کے علاج کے جواز پر شبہ اور اس کا جواب۔ ط۔ دار العلوم کراچی۔

(۲) علامہ شاطبیؒ نے تو سترِ عورت کو تحسینات میں شمار کیا ہے اور تحسینات کا درجہ ضرورت وحاجت کے بعد بیان کیا ہے۔ وأما التحسينات فمعناها الأخذ بما يليق من محاسن العادات وتجنب الأحوال المدنسات التى تأنفها العقول الراجحات ويجمع ذلك قسم مكارم الأخلاق، وهى جارية فيما جرت فيه الأوليان ففى العبادات كإزالة النجاسة وبالجملة الطهارات كلها وستر العورة وأخذ الزينة والتقرب بنوافل الخيرات من الصدقات والقربات وأشباه ذلك وفى العادات كآداب الأكل والشرب ومجانبة المآكل النجاسات والمشارب المستخبثات والإسراف والاقتار فى المتناولات وفى المعاملات كالمنع من بيع النجاسات وفضل الماء والكلأ وسلب العبد منصب الشهادة والإمامة وسلب المرأة منصب الإمامة وإنكاح نفسها وطلب العتق وتوابعه من الكتابة والتدبير وما أشبهها وفى الجنايات كمنع قتل الحر بالعبد أو قتل النساء والصبيان والرهبان فى الجهاد، وقليل الأمثلة يدل على ما سواها مما هو فى معناها فهذه الأمور راجعة إلى محاسن زائدة على أصل المصالح الضرورية والحاجية إذ ليس فقدانها بمخل بأمر ضرورى ولا حاجى وإنما جرت مجرى التحسين والتزيين. (الموافقات فى أصول الشريعة ص: ۲۰۳ تا ۲۰۴)

اور دکتور وہبۃ الزحیلی نے بھی أصول الفقہ الاسلامی میں سترِ عورت کو تحسینات میں شمار کیا ہے اور ضرورت وحاجت کے وقت اس کی اجازت دی ہے:

ويترتب عليه أنه لا يراعى حكم تحسينى إذا أدت رعايته إلى أبطال حكم حاجى أو ضرورى فيباح مثلاً كشف العورة عند الضرورة أو الحاجة لإجراء عملية أو جراحية أو تشخيص مرض أو علاج لأن المحافظة على النفس ضرورى وأما أدى إلى ذلك فهو ضرورى ....

(باقی آئندہ صفحہ پر)

اسی طرح فقہائے کرام نے ”ختان بعدالبلوغ“ کا جواز بیان فرمایا ہے، جس میں کشف عورتِ غلیظ ہوتا ہے۔ (کمافی امداد المفتین ص: ۹۷۰، محمودیہ ج:۱۲ ص: ۳۹۵، فتاوی حقانیہ ج:۲ ص: ۴۶۶ بحوالہ بدائع وبزازیہ وشامی)[۱]

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”فرض ستر ضرورت میں ساقط ہوجاتا ہے، اور سنت کی ضرورت مباح کی ضرورت سے بڑھ کر ہے اور تداوی محض مباح ہے (جب) اس کے لئے نظر اور لمس جائز ہے تو ختنہ کے لئے بالاولیٰ۔ (امداد الفتاوی ج:۴ ص:۲۳۹)[۲]

جبکہ ختنہ سنت ہے اور ستر کا چھپانا فرض ہے، (اسی وجہ سے فتاوی رحیمیہ ج:۱۰ ص:۱۳۴ پر ختان بعدالبلوغ کا عدمِ جواز مذکور ہے۔)

لیکن علامہ ظفر عثمانی رحمہ اللہ نے اس شبہ کا ایک محققانہ وفقیہانہ جواب تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”وما تضمنه كلام السائل من أن الحرام لا يباح إلا لأمر واجب غير مسلم ، فإن الفطر فى رمضان حرام و مع ذلک يباح لأمر جائز كسفر، كذا فى فتح البارى ج: ۱ ص: ۲۹۱، قلت: والأصل فيه ما

(گذشتہ سے پیوستہ) و ستر العورة من التحسينات فلا يلتفت إليه أمام الضرورة أو الحاجة۔(أصول الفقه الإسلامى جلد ۲ صفحه ۱۰۲۷، الباب السادس، مقاصد الشريعة العامة)
اگر یہ بات درست مان لی جائے تو اس سے بدرجۂ اولیٰ تلقیح کے لئے مجبوری کے وقت کشفِ عورت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔
لكن فيه تأمل۔ محمد رضوان
(۳) مریض ومعالج کے اسلامی احکام ص: ۲۸۳ باب: ۴۱، مصنوعی تخم ریزی، ط۔ مجلس نظریاتِ اسلام۔
(حاشیہ صفحہ ہذا)
(۱) فتاوى محموديه: ۱۹/۴۶۶، كتاب الحظر والإباحة ، باب خصال الفطرة ، الفصل الخامس فى الختان، بالغ کا ختنہ ط۔ إدارة الفاروق۔ حقانيه: ۲/۴۶۶، كتاب الكراهية والإباحة، باب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر ، ط۔ حقانیہ اکوڑہ خٹک۔
(۲) ج:۴،ص:۲۳۹ (طبع: مکتبہ دارالعلوم کراچی)

قاله فقهائنا قد يفتقر ضمناً ما لا يفتقر قصداً۔ (الأشباه ص: ۹۶)

(امدادالأحکام ج: ۴ ص: ۴۲۹)[۱]

اس اُصول کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو تلقیح کے مسئلہ میں کشفِ عورت اور ستر کا دیکھنا علاج یا ایک حاجت پوری کرنے کی غرض سے ضمناً لازم آتا ہے، بذاتِ خود اور اصلاً وقصداً کشفِ عورت اور ستر پر نظر کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس سلسلہ میں یہ قرارداد منظور کی:

''شادی شدہ عورت جو حاملہ نہیں ہوسکتی ہے، اسے اور اس کے شوہر کے لئے بچہ کی ضرورت ایک جائز مقصد ہے، جس کے لئے مصنوعی بارآوری کا جائز طریقہ اپنا کر علاج کرانا درست ہے۔ (رابطہ عالم اسلامی کی اسلامک فقہ اکیڈمی کے اہم فقہی فیصلے، بحوالہ عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل، ص: ۱۵۲ وص: ۱۶۵، ترتیب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اول تو صاحبِ اولاد ہونے کا جذبہ ایک غیر معمولی جذبہ ہوتا ہے، بالخصوص عورتوں کے معاملے میں ولادت سے محرومی اکثر اوقات عورت کو مختلف نسوانی، دماغی، قلبی اور جسمانی امراض کا شکار بنادیتی ہے، بسا اوقات یہ چیز زوجین کے درمیان سخت نفور اور کشیدگی کا باعث بھی بن جاتی ہے اور بعض اوقات عفت وعصمت پر بھی بن آتی ہے، اس لئے یہ فقہی اصطلاح کے مطابق ہر عورت کے لئے ممکن ہے ''ضرورت'' نہ ہو، لیکن بعض خواتین کے لئے ''حاجت'' کا درجہ اختیار کرلیتی ہے، جس کو بعض مواقع میں ''ضرورت'' ہی کے حکم میں رکھا جاتا ہے۔

اب جب ہم فقہی تصریحات دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسی

(۱) امدادالأحکام، ۴/۴۲۹، کتاب اللباس والزینۃ، مسائل متفرقۃ بالغ کے ختنہ کا حکم ط۔ دارالعلوم کراچی۔

صورتوں میں بھی بے ستری کو گوارا کیا گیا ہے جو بجائے خود کوئی شدید مرض نہیں، لیکن امکانی طور پر شدید امراض کا باعث بن سکتا ہے، جیسا کہ اولاد سے محرومی بعض شدید امراض کا سبب بن جاتی ہے۔ (جدید فقہی مسائل جلد ۵ ص: ۱۴۵، مطبوعہ: زمزم پبلشرز کراچی، تاریخِ اشاعت جون 2005ء)[1]

ٹیسٹ ٹیوب کی مدد لاولد افراد کے لئے دراصل ایک ذریعۂ علاج ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ فقہاء نے انسانی مسائل کو تین خانوں ،ضرورت، حاجت اور تحسین میں تقسیم کیا ہے، اور ممنوعات کو صرف اس وقت جائز رکھا ہے جبکہ ضرورت یا حاجت اس کی اجازت کا تقاضا کرے، لیکن فقہی جزئیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج ومعالجہ کے باب میں فقہاء نے ایک گونہ زیادہ وسعت سے کام لیا ہے، اور یُسر وسہولت کو راہ دی ہے۔ (ایضا صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)[2]

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں:

''ٹیسٹ ٹیوب بارآوری کے چار مراحل ہیں: (۱)..شوہر کی منی حاصل کرنا (۲)...بیوی کا نطفہ (Ovum) حاصل کرنا (۳)...ٹیسٹ ٹیوب میں بیوی کے نطفہ کو شوہر کے نطفہ سے بارآور کرنا (۴)... بارآور شدہ نطفہ (جواَب علقہ ہے) کو بیوی کے رحم میں منتقل کرنا۔ یہ تمام مراحل علاجِ عقم کے طور پر جائز ہیں، لہٰذا اگر بعض عوارض کی بناء پر کوئی جوڑا اس طریقہ کو اختیار کر کے اولاد کے حصول کی کوشش کرتا ہے تو جائز ہے۔ (مریض ومعالج کے اسلامی احکام، باب بیالیس صفحہ ۲۸۵، تاریخِ اشاعت 2006ء)[3]

---

(۱) جدید فقہی مسائل: ۱۰۲/۵، ٹیسٹ ٹیوب سے تولید اور اس سے متعلق احکام، زن وشوہر کے مادے کا اختلاط، ط۔ زمزم پبلشرز، اشاعت 2012

(۲) جدید فقہی مسائل: ۱۰۳/۵، ٹیسٹ ٹیوب سے تولید اور اس سے متعلق احکام، زن وشوہر کے مادے کا اختلاط، ط۔ زمزم پبلشرز، اشاعت 2012

(۳) مریض ومعالج کے اسلامی احکام، ص: ۲۸۵، باب: ۴۲، ٹیسٹ ٹیوب بارآوری، ط۔ مجلس نشریاتِ اسلام، اشاعت 2006ء)

فائدہ: ہمارے ناقص خیال میں اس سلسلہ میں مجوزین کا مؤقف راجح ہے اوراولاد کے حصول کی خاطر تلقیح کے لئے اگرخوداپنے طور پر یا زوجین کا ایک دوسرے کی مدد کر کے تدبیر اختیار کرنا ممکن وکارآمد نہ ہواور ڈاکٹر کے سامنے ستر کھولنا ضروری ہوتو اس کی علاج معالجہ کی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے شرعاً اجازت ہے۔

خاتون کے ستر والے حصہ میں علاج معالجہ کی شرائط

مصنوعی تولیداور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے جن دوطریقوں کی اجازت دی گئی ہے، ان میں اگر عورت کودوسرے کے سامنے ستر کھولنا ضروری ہواور ستر غلیظ کا غیر کے سامنے کھولنا لازم آتا ہوتو عورت کے علاج کے سلسلہ میں ستر کھولنے کے جو اُصول ہیں، ان کی رعایت یہاں بھی ضروری ہوگی، کیونکہ اس کی اجازت حاجت اور علاج معالجہ کے اُصول پر ہی مبنی ہے اوراس سلسلہ میں فقہاء نے جو اُصول بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

> ''علاج کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ مریض خاتون کے لئے اگر ستر کھولے بغیر علاج ممکن ہوتو پھر ستر کھولنا جائز نہیں، دوسرے یہ کہ اگرکوئی مسلمان خاتون معالج میسر ہوتو مریضہ کے جسم کے کسی حصہ کو کھولنے کے لئے اسی کی خدمات حاصل کرنی ضروری ہیں، اگر مسلمان خاتون ڈاکٹر میسر نہ ہوتو پھر کسی بااعتماد غیر مسلم خاتون ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے اوراگر وہ بھی میسر نہ ہوتو پھر کسی مسلمان مرد ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت ہے، اگر مسلمان مرد ڈاکٹر بھی میسر نہ ہوتو اس صورت میں غیر مسلم مرد ڈاکٹر سے علاج کرایا جاسکتا ہے، لیکن مرد سے علاج کرانے میں یہ شرط ہے کہ وہ مریضہ کے جسم کا صرف اتنا حصہ دیکھے جو مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے ناگزیر ہو۔ اس سے آگے نہ بڑھے، نیز بقدرِ استطاعات غضِ بصر سے کام لے اور علاج کے دوران مریضہ کا شوہر یا محرم یا کوئی قابلِ اعتماد خاتون بھی موجود رہے، تاکہ خلوت لازم نہ آئے۔ (ملاحظہ ہو: اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کی قرارداد اور سفارشات نمبر ۸۵/۱۲/۸۰۰، عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل، ص: ۱۵۱ وص:

۱۵۲، ۱۶۴، ۱۶۵، بہشتی زیور حصہ ۳ ص: ۶۳ وطبی جوہر ضمیمہ بہشتی زیور حصہ ۹ ص: ۱۱۱)[1]

يقوم بهذا التلقيح امرأة طبيبة مسلمة ثقة فإن لم يتيسر فطبيبة غير مسلمة ثقة، فإن لم يتيسر فطبيب مسلم ثقة فإن لم يتيسر فطبيب ثقة غير مسلم. (عموم البلوىٰ صفحه ۴۸۱)

فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق مرد کے علاج میں بھی پہلے مرد کے سامنے اور پھر دوسرے درجہ میں عورت کے سامنے ستر کھولنے کی اجازت ہوگی۔ "**كماقال الفقهاء إن نظر الجنس إلى الجنس أخف من النظر إلى غير الجنس**"......

(عربی عبارات آخر میں شق نمبر "ج" کے ذیل میں ملاحظہ ہوں)[2]

(۲)... مادۂ منویہ کے حصول کا مسئلہ

مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے اس طریقۂ کار کو اپنانے کے لئے مادۂ منویہ (منی) کا حصول بھی ایک بدیہی بات ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد اس طریقۂ کار کو اپنانے کے لئے مادۂ تولید کیسے حاصل کرے؟ تو اگر شوہر بیوی کے ساتھ عزل کے طریقہ سے یا بیوی کے ذریعہ استمناء بالید وغیرہ کے ذریعہ سے اپنا مادۂ منویہ حاصل کرے تو یہ شکل بلاشبہ جائز ہے، کیونکہ یہاں ممانعت کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔

فقہائے کرام نے اپنی بیوی کے جسم سے استمتاع واستمناء کی اجازت دی ہے اور استمناء بیدالزوجہ کو تقبیل وتفخیذ کا درجہ دیا ہے۔

اور اگر یہ صورت اختیار کرنا ممکن نہ ہو تو کیا پھر بیوی کے علاوہ کسی اور طریقہ سے منی خارج کرنے کی اجازت ہوگی؟

---

(۱) بہشتی زیور: ۱۸۶/۳، لباس اور پردے کا بیان (ط۔خواجہ محمد اسلام)

(۲) بعض اہلِ علم حضرات نے مصنوعی تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے طریقے میں عورت کو صرف عورت کے سامنے ستر کھولنے کی اجازت دی ہے، مرد کے سامنے نہیں دی، لیکن جب اس کو حاجت اور علاج کے زمرے میں شامل مان لیا گیا تو پھر اس کے لئے علاج کے بارے میں مندرجہ بالا قاعدے کے مطابق عمل کرنا جائز ہونا چاہئے۔

کیونکہ اپنے ہاتھ وغیرہ یا بیوی باندی کے علاوہ کسی اور طریقے سے منی خارج کی جائے تو اس کو عام حالات میں فقہائے کرام نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔

اور ممنوع جلق کی ممانعت ایک تو "ناکح الیدملعون" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ والی روایت سے ثابت ہے۔[۱]

دوسرے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے:

إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ (٦)
فَمَنِ ابْتَغَى وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ۔ (٧)[۲]

چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "یعنی منکوحہ بیوی یا شرعی قاعدہ سے حاصل شدہ لونڈی کے ساتھ شرعی قاعدے کے مطابق قضاءِ شہوت کے علاوہ اور کوئی بھی صورت شہوت پورا کرنے کی حلال نہیں، اس میں زنا بھی داخل ہے اور جو عورت شرعاً اس پر حرام ہے، اس سے نکاح بھی بحکمِ زنا ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے حیض ونفاس کی حالت میں یا غیر فطری طور پر جماع کرنا بھی اس میں داخل ہے۔
>
> یعنی کسی مرد یا لڑکے سے یا کسی جانور سے شہوت پوری کرنا بھی اور جمہور کے نزدیک استمناء بالیدیعنی اپنے ہاتھ سے منی خارج کرلینا بھی اس میں داخل ہے۔
>
> (معارف القرآن ج: ۶ص: ۲۹۸ (۳) بحوالہ بیان القرآن وقرطبی وبحرمحیط وغیرہ)
>
> (کذافی تفسیر الجلالین)[۳]

---

(۱) الدر الختار ۲/ ۳۹۹، باب ما یفسد الصوم ط۔سعید، وفی تقریرات الرافعی ۲/ ۱۴۷ ،باب ما یفسد الصوم، طبع سعید: قول الشارح لحدیث ناکح الید ملعون، ھذا الحدیث موضوع کما نقله السندی عن ملا علی قاری

(۲) سورة المؤمنون: رقم الآية: ۶، ۷۔

(۳) معارف القرآن: ۶/ ۲۹۶، سورۃ المؤمنون، آیت ۶، ۷، طبع ادارۃ المعارف

اسی وجہ سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مصنوعی تولید اورٹیسٹ ٹیوب بے بی کے عمل میں بیوی کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے جلق کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب فرماتے ہیں:

''کیا ہاتھ سے مادہ کے اخراج یعنی جلق کے طریقہ سے اخراج کی تسکین شہوت پر قیاس کرتے ہوئے اجازت ہوگی؟ احقر کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ محض اولاد کی خواہش اور اس کی موہوم اُمید میں متفق علیہ طور پر ممنوع فعل کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ والعلم عنداللہ (جدید مسائل کا شرعی حل، ص: ۲۱۳)

لیکن مجوزین کا کہنا یہ ہے کہ ممنوع جلق اور تلقیح کے مسئلہ میں کئی اعتبار سے فرق ظاہر ہوتا ہے:

(۱)...تلقیح کی مذکورہ جائز صورتوں میں بیوی ہی کے ذریعہ سے حصولِ ولد مقصود ہوتا ہے، اس لئے مآلاً یہ ''ورآء ذلک'' کے مفہوم میں داخل نہیں، بلکہ ''إلا علی أزواجھم الخ'' میں داخل ہے، جس پر ''ھم العادون'' کے بجائے ''فإنھم غیر ملومین'' کا حکم لاگو ہوگا اور تلقیح کی غرض سے بیوی کے علاوہ کسی اور طریقہ پر استمناء مندرجہ بالا وعید میں داخل نہیں ہوگا۔

(۲)... عام جلق زیادہ سے زیادہ مکروہِ تحریمی ہے.....استمناء بالکف وإن کرہ تحریمًا (درمختار کتاب الصوم، باب ما یفسد الصوم)[(۱)]

(اس سلسلہ میں مستدل حدیث کو تو محدثین نے نہایت درجہ ضعیف کہا ہے اور بشرطِ صحت بھی زیادہ سے زیادہ خبر واحد ہے جس سے دلیلِ ظنی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور سورۂ مؤمنون کی مذکورہ آیتِ غیر مفسرہ سے یہ حکم ثابت ہوتا ہے جو کہ خود ظنی کا درجہ رکھتا ہے)[(۲)]

(۱) الدر المختار: ۲/۳۹۹، کتاب الصوم، باب ما یفسد الصوم وما لا یفسد. مطلب: فی حکم الاستمناء بالکف. ط. سعید.

(۲) مولانا مفتی شبیر احمد صاحب دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد یوپی ہندوستان اپنے مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:
''اگر کسی امر کی ممانعت دلیلِ قطعی یعنی آیتِ مفسرہ اور آیتِ محکمہ یا خبرِ متواتر سے ہوتی ہے تو اس سے حرمت قطعی مراد ہوتی ہے اور جب کسی امر کی ممانعت دلیلِ قطعی سے ثابت نہ ہو بلکہ دلیلِ ظنی یعنی آیتِ غیر مفسرہ اور غیر محکمہ یا حدیث سے ثابت ہوتی ہو تو اس سے مراد حرام نہیں ہوتا ہے، بلکہ کراہتِ تحریمی مراد ہوتی ہے، اگرچہ اس کو حضرات فقہاء نے لفظِ حرام یا تحریم سے ہی تعبیر کیوں نہ فرمایا ہو الخ ''(ضرورت وحاجت کا احکامِ شرعیہ میں اعتبار'' ۳۶۹، ترتیب: حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمہ اللہ، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی) (محمد رضوان)

اورحاجت کے وقت بعض فقہائے کرام کے نزدیک کراہتِ تحریمی رفع ہوجاتی ہے‘‘ کما مرّ‘‘ اسی وجہ سے غلبۂ شہوت اورزناء میں مبتلا ہونے کے ظن کے وقت ’’أھون البلیتین‘‘ پرعمل کرتے ہوئے استمناء بالید کی اجازت دی گئی ہے جوظاہر ہے کہ ضرورت واضطراروالی حالت نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ حاجت میں داخل ہے۔

(۳)... ممنوع جلق میں شہوت کواُبھارنااورلذت حاصل کرنامقصود ہوتا ہے،لیکن تلقیح میں یہ مقصود پیشِ نظرنہیں ہوتا۔

(۴)... ممنوع جلق میں منی کی اضاعت لازم آتی ہے،لیکن تلقیح میں اضاعت کے بجائے منی کوکارآمد بنانامقصود ہوتا ہے۔

(۵)... ممنوع جلق میں جلبِ منفعت پیشِ نظرہوتی ہے،لیکن تلقیح میں دفعِ مضرت پیشِ نظرہوتی ہے۔

(۶)... ممنوع جلق میں نکاح کے کسی مقصدکاحصول پیشِ نظرنہیں ہوتا،لیکن تلقیح میں نکاح کا اہم مقصدیعنی حصولِ ولدمقصود ہوتا ہے۔

(۷)... ممنوع جلق میں کسی بیماری کاعلاج نہیں ہوتا،لیکن تلقیح میں مرض کاعلاج مقصود ہوتا ہے،لہٰذاتلقیح کے لئے اگرعورت کے ہاتھ کے علاوہ کسی اورطریقے سے منی حاصل کی جائے تواس کی شرعاً اجازت ہے، جہاں تک اس شبہ کاتعلق ہے کہ اولادکی موہوم اُمیدکی خاطرممنوع فعل کی اجازت نہیں دی جاسکتی، تواس کاجواب یہ ہے کہ تلقیح کے ذریعہ اولادکاحصول موہوم اُمیدکے درجہ میں نہیں ہے، بلکہ تلقیح کامسئلہ باربارکے تجربات سے عموماً کامیاب ہوناثابت ہواہے، اورجس طرح سے دوسرے علاج معالجہ کے طریقے اورتدابیرتجربات کی روشنی میں ہی تجویزکی جاتی ہیں، کیونکہ طبیات کا زیادہ ترداروملارتجربات پرہی ہے، یہی معاملہ تلقیح کابھی ہے۔

جوکچھ اس سلسلہ میں ہماری طرف سے عرض کیاگیا،اس کی تائیدمندرجہ ذیل حوالہ جات سے ہوتی ہے۔

(۱)... مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب نے اپنی کتاب ''جدید مسائل کا شرعی حل'' کے حاشیہ میں اس کی وضاحت اس طرح کردی ہے کہ:

''لیکن اگر اس کے ذریعہ بچہ کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہو تو جائز ہوگا اور جلق کی ممانعت کی وجہ (ضیاعِ نطفہ) بھی مرتفع ہوجائے گی۔ کیونکہ یہاں نطفہ کا ضیاع نہیں بلکہ اسے کارآمد بنانا ہے، اس غرض کے لئے جلق ممنوع نہ ہوگا۔ (جدید مسائل کا شرعی حل ص:۲۱۴)[1]

(۲)....حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی صاحب رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ:

''زید کو اولاد نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے اس کو اپنی منی ٹیسٹ کروانا ہے اور منی کی جانچ استمناء بالید کے بغیر نہیں ہوسکتی تو کیا ایسی صورت میں استمناء بالید جائز ہے یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''علاج کے دوسرے طریقے بھی ہیں، تاہم اگر بغیر اس طریقہ کے علاج نہ ہوسکے تو گنجائش ہے۔ (فتاوی محمودیہ ج:۱۵ ص:۳۹۴، باب الحظر والاباحۃ)[2]

(۳)... مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہم لکھتے ہیں:

''طبی نقطۂ نظر سے استمناء بالید کی ضرورت مندرجہ ذیل صورت میں پیش آتی ہے:

(۱)... اولاد نہ ہونے کی صورت میں مرد کے مادۂ منویہ کی صلاحیت جاننے کے لئے برائے تجزیہ، چونکہ اس صورت میں لذت حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا جبکہ گناہ اس وقت ہوتا ہے، جب مقصد شہوت کو اُبھارنا اور لذت حاصل کرنا ہو، لہٰذا ان مواقع میں حدیث میں مذکورہ وعید تو نہیں آتی لیکن اگر کوشش کی جائے کہ ان مواقع میں بھی بیوی کے ہاتھ سے رگڑ کر منی حاصل کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ (مریض ومعالج کے

---

(۱) (طبع ادارۂ اسلامیات لاہور)

(۲) (طبع کتب خانہ مظہری)

اسلامی احکام ص: ۲۷۸، اشاعت: 2006ء)[1]

فائدہ: اولاد پیدا ہونے کی خاطر صرف منی کی تشخیص کرانے کی غرض سے استمناء بالید کی اگر اجازت ہے، جس میں منی کی اضاعت یقینی ہے تو خود اس مرض کے علاج اور اولاد کے حصول کی خاطر، جس میں منی کی اضاعت بھی لازم نہیں آتی، استمناء بالید کی بدرجہ اولیٰ اجازت ہونی چاہئے۔

(۴)...مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اوّل تو صاحبِ اولاد ہونے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے ....بسا اوقات یہ جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ عفت وعصمت کے نقطۂ نظر سے ''ضرورت'' کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، دوسرے فقہاء نے بعض ان اُمور کو بھی مباح رکھا ہے جو مآل کے اعتبار سے بالکل جلق کی طرح ہیں، مثلاً عزل یعنی بیوی سے اس طرح جماع کرنا کہ انزال کے وقت عضو مخصوص باہر نکال لیا جائے، اور عورت کے رحم میں انزال سے بچا جائے، احناف کے یہاں یہ صورت جائز ہے....اور ٹھیک جس طرح جلق میں تسکینِ شہوت کی جاتی ہے اور مادۂ منویہ کو ضائع کر دیا جاتا ہے، اسی طرح عزل میں بھی تسکینِ شہوت کی جاتی ہے اور مادۂ منویہ کو ضائع کیا جاتا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ تسکینِ شہوت کے لئے عورت کے جسم سے تلذذ کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے لذت اندوز ہوا جاتا ہے، تیسرے جلق کی ممانعت کی اصل حکمت یہ ہے کہ اس طرح انسان ''مادۂ حیات'' کو نسلِ انسانی کی افزائش کی بجائے بے مقصد استعمال کرتا اور ضائع کر دیتا ہے، اب غور کیجئے کہ اگر اس کو مصنوعی تولید کے لئے جلق کیا جائے تو جلق کا مقصود ہی بدل جاتا ہے، یہاں جلق جوہرِ حیات کو ضائع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کارگر اور ثمر آور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے، اس لئے یہ صورت جلق کی ممنوع کی صورتوں کے ذیل میں آنی نہیں چاہئے۔ (جدید فقہی مسائل جلد۵، ص: ۱۴۴، ۱۴۵ مطبوعہ: زمزم پبلشرز کراچی)[2]

(۱) مریض ومعالج کے اسلامی احکام، ص: ۲۷۸، باب ۴۰ مشت زنی (استمناء بالید) ط۔ مجلس نشریاتِ اسلام)

(۲) جدید فقہی مسائل: ۱۰۲/۵، ٹیسٹ ٹیوب سے تولید اور اس سے متعلق احکام، زن وشوہر کے مادے کا اختلاط، ط۔ زمزم پبلشرز، اشاعت: 2012ء

فائدہ: ہمارے ناقص خیال میں اس سلسلے میں مجوّزین کا موقف ہی راجح ہے لہٰذا جب شوہر کی بیوی موجود ہو اور اسی کے جسم میں مصنوعی عملِ تولید کیا جاتا ہے تو جب تک ممکن ہو مادۂ منویہ کا حصول اسی بیوی کے ذریعے سے کیا جانا ضروری ہے۔ اور دوسرے طریقے سے استخراجِ منی کا جواز کسی شدید طبی ضرورت تک محدود ہے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور یہ مکتوب آگے درج ہے)

خاتون کے مادۂ منویہ کے حصول کا مسئلہ

جس طرح مرد کے حق میں تلقیح کے لئے استمناء کی اجازت ہے، اسی طرح مرد کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے عورت کے حق میں بھی منی کے استخراج کی اجازت ہوگی، کیونکہ دونوں جگہ ضرورت یکساں ہے، البتہ عورت کے ستر والے حصہ میں علاج معالجے کی شرائط کا لحاظ یہاں بھی ضروری ہوگا۔

(عربی عبارات آخر میں شق نمبر ''د'' کے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔)

{......عربی عبارات......}

{الف و ب}

(۱) قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :الوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الحَجَرُ. (بخاری [۱]، أبو داؤد [۲])

(۲) عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ الْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ. (مسلم [۳]، ترمذی [۴]، نسائی [۵]، ابن ماجه [۶])

---

(۱) الصحیح للبخاری کتاب المحاربین ج: ۲ ص: ۱۰۰۷ (طبع قدیمی کتب خانه)

(۲) سنن ابی داؤد کتاب الطلاق، باب الولد للفراش ج: ۱، ص: ۳۱۷ (طبع امدادیه)

(۳) رقم ۳۶۸۸ ج: ۴ ص: ۱۷۱ (طبع دار الجیل بیروت)

(جاری ہے)

(۳) عَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ : قَامَ فِينَا خَطِيبًا، قَالَ:أَمَا أَنِّى لَا أَقُولُ لَكُمْ إِلَّا مَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ :قَامَ فِينَا يَوْمَ حُنَيْنٍ، قَالَ " :لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ -يَعْنِى إِتْيَانَ الْحَبَالَى وَلَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَقَعَ عَلَى امْرَأَةٍ مِنَ السَّبْيِ حَتَّى يَسْتَبْرِئَهَا وَلَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَبِيعَ مَغْنَمًا حَتَّى يُقْسَمَ۔ أبوداؤد بابٌ فى وطءِ السبايا۔ (مسند أحمد)[۱]

(۴) عَنْ سَعْدٍ رَضِىَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ :مَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ، وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيهِ، فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ، فَذَكَرْتُهُ لِأَبِى بَكْرَةَ، فَقَالَ :وَأَنَا سَمِعَتْهُ أُذُنَاىَ وَوَعَاهُ قَلْبِى مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (بخارى)[۲]

(۵) عَنْ أَبِى عُثْمَانَ، عَنْ سَعْدٍ، وَأَبِى بَكْرَةَ كِلَاهُمَا، يَقُولُ :سَمِعَتْهُ أُذُنَاىَ، وَوَعَاهُ قَلْبِى مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ :مَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ، وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ۔ (مسلم،[۳] باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم)

(٦) وفى المنتقى عن أبى حنيفة رحمه الله : وإذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج وأنزل، فأخذت الجارية ماء ه فى شىء واستدخلته فرجها فى حدثان ذلک، فعلقت الجارية وولدت ولداً، فإن الولد ولد الرجل والجارية تصير أم ولده. (المحيط البرهانى،

(گذشتہ سے پیوستہ)(۴)رقم ۱۱۵۷ ج:۳ ص:۴٦۳(طبع دار احياء التراث بيروت)

(۵) نسائى كتا ب الطلاق باب الحاق الولد بالفراش ج:۲ ص:۱۱۰ (طبع امداديه)

(٦) كتاب النكاح، باب الولد للفراش ص:۱۴۴(طبع قديمى)

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل ۲۲۸/۱۳، رقم الحديث: ۱٦۹۳۴، مسند الشاميين، (جارى ہے)

الفصل الثامن والعشرون،فی دعوی النسب، النوع الأول: فی بیان مراتب النسب)[۱]

(۷) محمد بن (سماعة) عن أبی حنیفة: إذا عالج الرجل جاریته فیما دون الفرج فأنزل، فأخذت الجاریة ماء ہ فی شیء واستدخلته فرجها فی حرمان ذلک، فعلقت الجاریة وولدت ولداً، فإن الولد ولد الرجل وتصیر الجاریة أم ولد له. (المحیط البرهانی)[۲]

(۸) وَأَطْلَقَ فِی الْوِلَادَةِ مِنَ السَّیِّدِ فَشَمِلَ مَا إذَا کَانَ بِجِمَاعٍ مِنْهُ أَوْ بِغَیْرِهِ لِمَا فِی الْمُحِیطِ عَنْ أَبِی حَنِیفَةَ إذَا عَالَجَ الرَّجُلُ جَارِیَتَهُ فِیمَا دُونَ الْفَرْجِ فَأَنْزَلَ فَأَخَذَتْ الْجَارِیَةُ مَاءَهُ فِی شَیْءٍ فَاسْتَدْخَلَتْهُ فَرْجَهَا فِی حِدْثَانِ ذَلِکَ فَعَلِقَتْ الْجَارِیَةُ وَوَلَدَتْ فَالْوَلَدُ وَلَدُهُ وَالْجَارِیَةُ أُمُّ وَلَدٍ لَهُ اهـ. وَأَفَادَ بِالْوِلَادَةِ مِنَ السَّیِّدِ أَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ ثُبُوتِ النَّسَبِ مِنْهُ أَوَّلًا لِتَصِیرَ أُمَّ وَلَدٍ لَهُ فَإِنَّهُ السَّبَبُ عِنْدَنَا. (البحر الرائق، کتاب العتق، باب الاستیلاد)[۳]

(۹) أَقُولُ :سَنَذْکُرُ فِی الِاسْتِیلَادِ عَنْ الْبَحْرِ عَنْ الْمُحِیطِ مَا نَصُّهُ: إذَا عَالَجَ الرَّجُلُ جَارِیَتَهُ فِیمَا دُونَ الْفَرْجِ فَأَنْزَلَ فَأَخَذَتْ الْجَارِیَةُ مَاءَهُ فِی شَیْءٍ فَاسْتَدْخَلَتْهُ فِی فَرْجِهَا فِی حِدْثَانِ ذَلِکَ فَعَلِقَتْ الْجَارِیَةُ وَوَلَدَتْ فَالْوَلَدُ وَلَدُهُ، وَالْجَارِیَةُ أُمُّ وَلَدٍ لَهُ اهـ فَهَذَا الْفَرْعُ یُؤَیِّدُ بَحْثَ صَاحِبِ الْبَحْرِ. (رد المحتار، باب العدة، فروع) أدخلت فی فرجها

(گذشتہ سے پیوستہ)حدیث رویفع بن ثابت الأنصاری،ط. دار الحدیث، القاهرة.

(۲) کتاب المغازی ج:۲ ص: ۶۱۹ (طبع قدیمی)

(۳) مسلم، کتاب الإیمان، ج: ۱ ص: ۵۷، ط. قدیمی)

(۱) ج: ۱۰ ص: ۳۹۳، ط. دار إحیاء التراث العربی بیروت.

(جاری ہے)

هل تعتد)[۱]

(۱۰) ومن هاجرت إلينا مسلمة أو ذمية حاملاً بانت بلا عدة فيحصل تزوجها، أما الحامل فحتى تضع على الأظهر لا للعدة بل لشغل الرحم بحق الغير۔ (الدر المختار ج:۳ ص: ۱۹۳)[۲]

(۱۱) (قوله على الأظهر) مقابله رواية الحسن أنه يصح نكاحها قبل الوضع، لكن لا يقربها زوجها حتى تضع كالحبلى من الزنا و رجحها الأقطع، لكن الأولى ظاهر الرواية نهر، وصححها الشارحون و عليها الأكثر بحر۔ (رد المحتار ج: ۳ ص: ۱۹۳)[۳]

(۱۲) الإقرار بالولد الذى ليس منه حرام كالسكوت لاستلحاق نسب من ليس منه بحر .وفيه متى سقط اللعان بوجه ما، أو ثبت النسب بالإقرار أو بطريق الحكم لم ينتف نسبه أبدا۔ (الدر المختار ج: ۳ ص: ۴۹۳)[۴]

(۱۳) التلقيح الصناعى مما يضطر إليه الزوجان المحتاجان إليه بحيث يعسر استغنائهما عن العمل به حتى عمت بذالک البلوى، فهذه المسئلة تندرج تحت السبب السابع من الأسباب العامة لعموم البلوى و هو الضرورة والعموم هنا آت من شمول وقوع الحادثة للزوجين فى عموم أحوالهما بحيث يلزم من القول بعدم الجواز إلحاق المشقة العامة بهما ..... وقبل البحث فى هذه العلاقة لا بد من الإشارة إلى طرق التلقيح الصناعى المعروفة هذه

(گذشتہ سے پیوستہ)(۲) حوالہ سابقہ۔

(۳) البحر الرائق كتاب العتق، باب الاستيلاد ج: ۴ ص: ۴۵۲ ۔ ط۔ دار الكتب العلمية بيروت.

(۱) رد المحتار: ۵۲۸/۳، كتاب الطلاق، باب العدة ، قبيل مطلب فى المنعى إليها زوجها۔ط۔ سعيد۔ (جاری ہے)

الأيام لتتضح العلاقة بعد ذلک و هذه الطرق سبع وهی:

الطريقة الأولىٰ: أن يجرى تلقيح بين نطفة مأخوذة من زوج و بيضة مأخوذة من امرأة ليست زوجته ، ثم تزرع اللقيحة فی رحم زوجته۔

الطريقة الثانية: أن يجرى التلقيح بين نطفة رجل غير الزوج و بيضة الزوجة ، ثم تزرع تلک اللقيحة فی رحم الزوجة۔

الطريقة الثالثة: أن يجرى تلقيح خارجی بين بذرتی زوجين ثم تزرع اللقيحة فی رحم امرأة متطوعة لحملها۔

الطريقة الرابعة: أن يجرى تلقيح خارجی بين بذرتی رجل أجنبی و بيضة امرأة أجنبية و تزرع اللقيحة فی رحم الزوجة۔

الطريقة الخامسة: أن يجرى تلقيح خارجی بين بذرتی زوجين ثم تزرع اللقيحة فی رحم الزوجة الأخرىٰ۔

الطريقة السادسة: أن تؤخذ نطفة من زوج، و بيضة من زوجته، و يتم التلقيح خارجيا ثم تزرع اللقيحة فی رحم الزوجة۔

الطريقة السابعة: أن تؤخذ بذرة الزوج، وتحقن فی الموضع المناسب من مهبل زوجته، أو رحمها تلقيحاً داخلياً۔

إذا تقررت هذه الطرق فإن العلاقة بين هذه المسألة والمسائل الأصولية أو القواعد الفقهية تبرز فی جهتين:

الجهة الأولىٰ: علاقتها بصلة عموم البلوی بالمسائل الأصولية

(گذشتہ سے پیوستہ)(۲) الدر المختار: باب نكاح الكافر ج: ۳ ص: ۱۹۳۔ط۔ سعيد كراچی۔

(۳) رد المحتار باب نكاح الكافر ج: ۳ ص: ۱۹۳ (ط، سعيد)

(۴) الدرالمختار، باب اللعان ج: ۳ص: ۴۹۳ (ط، سعيد کراچی)

وتتمثل هذه العلاقة فى صلة عموم البلوى بسد الذرائع و فتحها، حيث أن عموم البلوى و التيسير عنده غير معتبر فى الطرق الخمس الأول للتلقيح الصناعى، لكونها محرمة لذاتها، أو لما يترتب عليها من مفاسد عظيمة كاختلاط الأنساب، و ضياع الأمومة و غيرها فيكون فى عدم اعتبار التيسير فى حال عموم البلوى سد للذريعة.

و أما الطريقتان السادسة والسابعة : فإن اعتبار عموم البلوى فيهما ، والتيسير عنده لا يترتب عليه محذور شرعى إذا أخذت الاحتياطات اللازمة عند إجراء التلقيح و بعده فيكون فى اعتبار التيسير فى حال عموم البلوى حينئذ فتح للذريعة.

الجهة الثانية: علاقتها بصلة عموم البلوى بالقواعد الفقهية و تتمثل هذه العلاقة فى صلة عموم البلوى بقاعدة المشقة تجلب التيسر وقاعدة لا ضرر ولا ضرار ، حيث أن التلقيح الصناعى فى الطرق الخمس الأول لا يعتبر من قبيل عموم البلوى المعتبر سببا فى التيسير، لفقده شرطا من شروط اعتبار عموم البلوى سببا فى التيسير و هو أن لا يكون العمل بعموم البلوى معصية، والعمل فى غالب هذه الطرق الخمس عمل بمعصية إن لم يكن فيها جميعا والاضطرار فيه غير معتبر حتى يقال بالاستثناء.

إضافة إلى أن العمل بالتلقيح الصناعى فى تلك الطريق الخمس الأول قد فقد شرط اعتبار عموم البلوى من قبيل الضرر الذى تلزم إزالته إذ أنه يترتب على التيسير بالقول بالجواز دفعاً للضرر عن الزوجين مثلا إلحاق ضرر أعظم من اختلاط الأنساب، و ضياع الأمومة و غير ذلك فلا يعتبر استعمال التلقيح الصناعى هنا من

قبيل عموم البلوى المعتبر من قبيل الضرر الذى تلزم إزالته و حينئذ فهذا الحكم هنا داخل تحت الضابط المتعلق بعموم البلوى إذا كان التكليف به من قبيل الضرر المنطوى تحت قاعدة إذا تعارض مفسدتان روعى أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما أو " الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" و نحو ذلك.

و أما الطريقتان السادسة والسابعة من الطرق المذكورة للتلقيح الصناعى.[١]

فإن اعتبار عموم البلوى فيهما ظاهر حيث أن القول بعدم الجواز حينئذ بناء على أنها ليست من الطرق المعروفة شرعاً للانجاب، ولاحتمال التلاعب حينئذ عند الاحتفاظ بالنطف فى ثلاجات و نحوها، أو لاحتمال اختلاط النطف، أو غير ذلك من المفاسد يؤدى هذا القول إلى عسر استغناء الزوجين عن هذا الإجراء فتعم بلواهما به فتلحقهما المشقة والضرر، فيكون فى القول بجواز استعمال هاتين الطريقتين للتلقيح الصناعى تيسير على الزوجين ودفع للضرر عنهما مما هو داخل تحت قاعدة "المشقة تجلب التيسير" وقاعدة " لا ضرر و لا ضرار " خاصة و قد تحققت شروط اعتبار عموم البلوى فى هذه القضية ، و ذلك باعتباره سببا فى التيسير أو باعتبار التكليف عنده من قبيل الضرر الذى تلزم إزالته.

---

(١) (أى أن تؤخذ نطفة من زوج و بيضة من زوجته و تم التلقيح خارجيا ثم تزرع اللقيحة فى رحم الزوجة أو أن تؤخذ بذرة الزوج و تحقن فى المواضع المناسب من مهبل زوجته أو رحمها تلقيحا داخليا (محمد رضوان)

(عموم البلوى ص: ٤٧٨ تا ٤٨١، تاليف: مسلم بن محمد بن ماجد الدوسرى مطبوعة مكتبة الرشد، الرياض،بحواله: قرارات مجلس المجمع الفقهى الإسلامى لرابطة العالم الإسلامى، من دورته الأولى لعام ١٣٩٨ھ، حتى الدورة الثامنة عام ١٤٠٥ھ ص: ١٥٢، ١٥٦۔ و قرارات و توصيات مجمع الفقه الإسلامى ١٤٠٦ھ ١٤٠٩ھ ص: ٣٢، ٣٣۔ فتاوى على الطنطاوى ص: ١٠٢)

(١٤) و أما ما ذكر مما يمكن أن يترتب عليهما من مفاسد فيمكن تلافى هذه المفاسد إذا اتخذت الاحتياطات الآتية:

(١)...أن يتم التلقيح بين زوجين فى حال قيام الزوجية أما إذا انتهى العقد بموت أو طلاق فلا يحل ذلك۔

(٢) ... أن يقوم بهذا التلقيح امرأة طبيبة مسلمة ثقة فإن لم يتيسر فطبيبة غير مسلمة ثقة، فإن لم يتيسر فطبيب مسلم ثقة فإن لم يتيسر فطبيب ثقة غير مسلم۔

(٣)... اتخاذ كافة الاحتياطات اللازمة لعدم اختلاط النطف و عدم الاحتفاظ بالمنى فى الثلاجات بل إجراء التلقيح فور أخذه من الزوج و وضعه فى الزوجة ...

كما أن هذه المفاسد محتملة والمصالح متحققة ولا تترك المصلحة المتحققة لمفسدة محتملة و لذلك صرح كثير من العلماء والباحثين المتأخرين بذلك التفصيل السابق فى موضوع استعمال التلقيح الصناعى و ما تضمنه من قيود واحتياطات .... وينبغى فى كل ذلك ملاحظة تحقق عموم البلوى ممثلا فى الضرورة لا أن يكون متوهما فاستعمال التلقيح الصناعى لأغراض

تجارية أو لأجل تحسين النوع البشرى أو لتلبية رغبة الأمومة لدى نساء غير متزوجات و نحو ذلك لا يعتبر من قبيل الضرورة المعتبرة شرعاً. ولذا فإن عموم البلوى فيها غير معتبر، لعدم تحققه فهو هنا أمر متوهم.

(عموم البلوى ص: ۴۸۲، ۴۸۱[1] بحواله الفتاوى للشيخ محمود شلتوت ص: ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، وبحوث فى الشريعة الإسلامية والقانون فى الطب الإسلامى ص: ۱۲۰، ۱۲۱، قرارات مجلس المجمع الفقهى الإسلامى لرابطة العالم الإسلامى، من دورته الأولى لعام ۱۳۹۸ھ حتى الدورة الثامنة عام ۱۴۰۵ھ ص: ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۶، وقرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامى ۱۴۰۶ھ، ۱۴۰۹ص ۳۲، ۳۳. و أخلاقيات التلقيح الصناعى ص ۴۵، ۴۶، مجلة الوعى الإسلامى العدد العاشر ص ۸۷ والعدد السادس والستون ص ۱۰۳، ۱۰۴، مجلة رسالة الإسلام العدد الثانى والعشرون ص ۸، مجلة الفكر الإسلامى العدد العاشر ص ۱۲۱،۱۲۲)

(۱۵) التلقيح الصناعى مما يضطر إليه الزوجان المحتاجان إليه بحيث يعسر استغناؤهما عن العمل به حتى عملت بذلك البلوى.

(عموم البلوى ص: ۴۷۸)[2]

(۱۶) و يستخدم التلقيح الصناعى فى الحالات التالية:

ا... إذا كان عدد الحيوانات المنوية لدى الزوج قليلا فتجمع

(۱) طبع مكتبة الرشد

(۲) ايضا

ثم تدخل إلی رحم زوجته۔

۲... إذا کانت حموضة المهبل تقتل الحیوانات المنویة بصورة غیر اعتیادیة۔

۳... إذا کان هناک تضاد بین خلایا المهبل والحیوانات المنویة مما یؤدی إلی موتها۔

۴... إذا کانت إفرازات عنق الرحم تعیق ولوج الحیوانات المنویة۔

۵... إذا أصیب الزوج بمرض أدی إلی إصابته بالعنة و هی عدم القدرة علی الإیلاج مع قدرته علی إفراز حیوانات منویة سلیمة۔

(عموم البلوی ص ۴۷۷ تألیف مسلم بن محمد بن ماجد الدوسری، مکتبة الرشد الریاض بحواله اخلاقیات التلقیح والاصطناعی ص ۴۵، أطفال الأنابیب بین العلم والشریعة ص۳۷، ۳۸)

{ج}

(۱۷)... وقد ظهر التلقیح الصناعی فی العصر الحدیث تلبیة للحاجة إلی الولد لما واجهت الإنسان مشکلة العقم، فکانت البحوث والاکتشافات العلمیة فی مجال المرض والطب متجهة لحل هذه المعضلة. (عموم البلوی ص ۴۷۶،[۱] بحواله أطفال الأنابیب بین العلم والشریعة ص ۵۵، ۵۶)

(۱۸)... ولأن مصالح النکاح أکثر، فإنه یشتمل علی تحصین الدین، وإحرازه، وتحصین المرأة وحفظها، والقیام بها، وإیجاد

(۱) طبع مکتبة الرشد، الریاض

النسل، وتكثير الأمة، وتحقيق مباهاة النبى -صلى الله عليه وسلم- وغير ذلك من المصالح الراجح أحدها على نفل العبادة. (المغنى لابن قدامة، كتاب النكاح فصل الناس فى النكاح على ثلاثة أضرب)[1]

(١٩) ....عقد النكاح يوجب الفراش بنفسه لكونه عقدا موضوعا لحصول الولد شرعا قال النبى -عليه الصلاة والسلام- تناكحوا توالدوا تكثروا فإنى أباهى بكم الأمم يوم القيامة ولو بالسقط وكذا الناس يقدمون على النكاح لغرض التوالد عادة فكان النكاح سببا مفضيا إلى حصول الولد. (بدائع الصناع، بيان ما يثبت النسب)[2]

(٢٠) ... ولهما أن المقصود من الوطء فى الأصل حصول الولد لا اقتضاء الشهوة، وما ركب فيها من الشهوة حامل لها على تحصيل الولد. (تبيين الحقائق، باب العنين وغيره)[3]

(٢١)... لأن الحاجة إلى الولد أصلية لأن الإنسان يحتاج إلى إبقاء نسله كما أنه يحتاج إلى ابقاء نفسه. (العناية شرح الهداية، باب الاستيلاد، كتاب العتاق)[4]

(٢٢)... (لأن الحاجة إلى الولد أصلية) كحاجته إلى الأكل :أى وحاجته إلى أمه مساوية لحاجته إلى الولد ولهذا جاز استيلاده جارية ابنه بغير إذنه؛ لحاجته إلى وجود نسله كما جاز له أكل ماله

---

(١) ج:٧ ص:٣٣٤(طبع دار الفكر بيروت)

(٢) بدائع الصنائع، كتاب الدعوى، فصل وأما حكم تعارض الدعوتين مع تعارض البينتين. ط....

(٣) تبيين الحقائق: ٣/٢٣، كتاب الطلاق، باب العنين وغيره. ط. دار الكتب الإسلامى.

(٤) ج:٢ ص: ٤٧٣(طبع مكتبه رحمانيه)

للحاجة وحاجته الأصلية مقدمة على الدين۔ (فتح القدير، باب الاستيلاد)[۱]

(۲۳) ... إن الحاجة إلى الولد أصلية فتقدم على حق الورثة الخ (البحر الرائق، باب الاستيلاد) (كذا فى مجمع الأنهر)[۲]

(۲۴)... فلا بأس بالنظر إلى العورة لأجل الضرورة فمن ذلك أن الخاتن ينظر ذلك الموضع والخافضة كذلك تنظر لأن الختان سنة وهو من جملة الفطرة فى حق الرجال لا يمكن تركه وهو مكرمة فى حق النساء أيضا ومن ذلك عند الولادة المرأة تنظر إلى موضع الفرج وغيره من المرأة لأنه لا بد من قابلة تقبل الولد وبدونها يخاف على الولد ....وكذلك ينظر الرجل إلى موضع الاحتقان عند الحاجة أما عند المرض فلأن الضرورة قد تحققت والاحتقان من المداواة .... وقد روى عن أبى يوسف -رحمه الله تعالى -أنه إذا كان به هزال فاحش وقيل له :إن الحقنة تزيل ما بك من الهزال فلا بأس بأن يبدى ذلك الموضع للمحتقن وهذا صحيح فإن الهزال الفاحش نوع مرض يكون آخره الدق والسل .... وكشف العورة من غير ضرورة لمعنى الشهوة لا يجوز وإذا أصاب امرأة قرحة فى موضع لا يحل للرجل أن ينظر إليه لا ينظر إليه ولكن يعلم امرأة دواء ها لتداويها لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف۔ ألا ترى أن المرأة تغسل المرأة بعد موتها دون الرجل وكذلك فى امرأة العنين ينظر إليها النساء فإن قلن :هى بكر فرق القاضى بينهما وإن قلن :هى ثيب فالقول قول

(۵) ج: ۴ ص: ۳۳۴ (طبع رشديه كوئٹه)

(۱) كتاب العتق باب الاستيلاد ج: ۴ ص: ۴۵۶ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

الزوج مع يمينه ..... وكذلك لو اشترى جارية على أنها بكر فقبضها وقال :وجدتها ثيبا فإن النساء ينظرن إليها للحاجة إلى فصل الخصومة بينهما۔ (المبسوط للسرخی، كتاب الاستحسان، النظر إلى الأجنبيات)[1]

(۲۵).... إذا كان المرض فی سائر بدنها غير الفرج يجوز النظر إليه عند الدواء ، لأنه موضع ضرورة، وإن كان فی موضع الفرج، فينبغی أن يعلم امرأة تداويها فإن لم توجد وخافوا عليها أن تهلک أو يصيبها وجع لا تحتمله يستروا منها كل شیء إلا موضع العلة ثم يداويها الرجل ويغض بصره ما استطاع إلا عن موضع الجرح اھ فتأمل والظاهر أن " ينبغی" هنا للوجوب. (ج: ۵ص: ۲۳۷،بحواله احسن الفتاوی ج: ۸ ص:۲۱۵)[2]

(۲۶)... الضرورة والحاجة محققة فی النظر إلى العورة الغليظة عند التحمل بالنسبة لإرادة إقامة الحد وإن لم تكن الضرورة والحاجة محققة بالنظر إلى الستر فالإباحة بالنظر إلى الأول .....والطبيب إنما يجوز له ذلک إذا لم يوجد امرأة طبيبة فلو وجدت فلا يجوز له أن ينظر لأن نظر الجنس إلى الجنس أخف وينبغی للطبيب أن يعلم امرأة إن أمكن وإن لم يمكن ستر كل عضو منها سوى موضع الوجع ثم ينظر ويغض ببصره عن غير ذلک الموضع إن استطاع لأن ما ثبت للضرورة يتقدر بقدرها وإذا أراد أن يتزوج امرأة فلا بأس أن ينظر إليها وإن خاف أن يشتهی .....

---

(۱) المبسوط للسرخی: ۱۰/۲۶۸، ۲۶۹، كتاب الاستحسان، النظر إلى الأجنبيات.ط۔ دار الفكر بيروت۔

(۲) طبع سعيد

ولا یجوز له أن یمس وجهها ولا کفها وإن أمن الشهوة لوجود المحرم ولانعدام الضرورة۔ (البحر الرائق، کتاب الکراهیة فصل فی النظر والمس)[1]

{ د }

(۲۷) ... ناکح الید ملعون لا أصل له کما صرح به الرهاوی فی حاشیته علی المنار۔ (الموضوعات الکبیر لملاعلی قاری ص: ۱۳۴)[2]

(۲۸) ... ناکح الید ملعون قال الرهاوی فی حاشیة المنار: لا أصل له۔ (کشف الخفاء للعجلونی حرف النون ج: ۲ ص: ۴۳۱)[3]

(۲۹)... قول الشارح لحدیث ناکح الید ملعون هذا الحدیث موضوع کما نقله السندی عن ملا علی قاری۔ (تقریرات الرافعی ص: ۱۴۷ مع الشامی ج:۲)[4]

(۳۰) ... ملعون من نکح یده .... الأزدی فی الضعفاء وابن الجوزی من طریق الحسن بن عرفة فی جزئه المشهور من حدیث أنس بلفظ سبعة لا ینظر الله إلیهم فذکر منهم "الناکح یده" وإسناده ضعیف ولأبی الشیخ فی کتاب الترهیب من طریق أبی عبد الرحمن الحبلی وکذلک رواه جعفر الفریابی من حدیث عبد الله

---

(۱) ج: ۸ ص: ۳۵۲و۳۵۳ (طبع: دار الکتب العلمیة بیروت)

(۲) ص: ۲۵۷ (طبع قدیمی کتب خانه)

(۳) طبع: مکتبة دار التراث العربی قاهرة

(۴) باب ما یفسد الصوم (طبع سعید)

بن عمرو وفیه ابن لهیعة وهو ضعیف. (التلخیص الحبیر، کتاب النکاح فصل الإتیان فی الدبر ج:۳ ص:۱۸۸)[1]

(۳۱) ... ویجوز أن یستمنی بید زوجته وخادمته اهـ وسیذکر الشارح فی الحدود عن الجوهرة أنه یکره ولعل المراد به کراهة التنزیه فلا ینافی قول المعراج یجوز تأمل وفی السراج إن أراد بذلک تسکین الشهوة المفرطة الشاغلة للقلب وکان عزبا لا زوجة له ولا أمة أو کان إلا أنه لا یقدر علی الوصول إلیها لعذر قال أبو اللیث أرجو أن لا وبال علیه وأما إذا فعله لاستجلاب الشهوة فهو آثم اهـ. بقی هنا شیء وهو أن علة الإثم هل هی کون ذلک استمتاعا بالجزء کما یفیده الحدیث وتقییدهم کونه بالکف ویلحق به ما لو أدخل ذکره بین فخذیه مثلا حتی أمنی، أم هی سفح الماء وتهییج الشهوة فی غیر محلها بغیر عذر کما یفیده قوله وأما إذا فعله لاستجلاب الشهوة إلخ؟ لم أر من صرح بشیء من ذلک والظاهر الأخیر؛ لأن فعله بید زوجته ونحوها فیه سفح الماء لکن بالاستمتاع بجزء مباح کما لو أنزل بتفخیذ أو تبطین بخلاف ما إذا کان بکفه ونحوه وعلی هذا فلو أدخل ذکره فی حائط أو نحوه حتی أمنی أو استمنی بکفه بحائل یمنع الحرارة یأثم أیضا ویدل أیضا علی ما قلنا ما فی الزیلعی حیث استدل علی عدم حله بالکف بقوله تعالی "والذین هم لفروجهم حفظون" (المؤمنون:۵) الآیة وقال فلم یبح الاستمتاع إلا بهما أی بالزوجة والأمة اهـ فأفاد عدم

---

(۱) التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الکبیر: ۳۹۹/۳، ۴۰۰، کتاب النکاح، الفصل الخامس، الإتیان فی الدبر، ط: دار الکتب العلمیة.

حل الاستمتاع أی قضاء الشهوة بغیرهما هذا ما ظهر لی والله سبحانه أعلم. (شامی ج: ۲ ص: ۳۹۹، باب ما یفسد الصوم وما لا یفسده) (۱)

(۳۲)... (فرع) فی الجوهرة: الاستمناء حرام و فیه التعزیر ولو مکن امرأته أو أمته من العبث بذکره فأنزل کره و لاشیء علیه. (الدر المختار)

(وفی الشامیة) (قوله: الاستمناء حرام) أی بالکف إذا کان لاستجلاب الشهوة أما إذا غلبته الشهوة و لیس له زوجة و لا أمة ففعل ذلک لتسکینها فالرجاء أنه لا وبال علیه کما قاله أبو اللیث، و یجب لو خاف الزنا (قوله کره) الظاهر أنها کراهة تنزیه؛ لأن ذلک بمنزلة ما لو أنزل بتفخیذ أو تبطین تأمل وقدمنا عن المعراج فی باب مفسدات الصوم :یجوز أن یستمنی بید زوجته أو خادمته، وانظر ما کتبناه هناک (قوله ولا شیء علیه) أی من حد وتعزیر، وکذا من إثم علی ما قلناه. (شامی ج: ۴ ص: ۲۷، کتاب الحدود، باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه)[۲]

(۳۳)... وهل یحل الاستمناء بالکف خارج رمضان إن أراد الشهوة لا یحل لقوله علیه السلام : ناکح الید ملعون ، وإن أراد تسکین الشهوة یرجی أن لا یکون علیه وبال کذا فی الولوالجیة. (البحر الرائق باب ما یفسد الصوم وما لا یفسده)[۳]

---

(۱) طبع سعید

(۲) طبع سعید

(جاری ہے)

(وفی حاشیته) (قوله: وإن أراد تسكين الشهوة) أی الشهوة المفرطة الشاغلة للقلب، وكان عزبا لا زوجة له، ولا أمة أو كان إلا أنه لا يقدر على الوصول إليها لعذر كذا فی السراج الوهاج۔ (منحة الخالق باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد) (كذا فی العناية شرح الهداية باب ما يوجب القضاء والكفارة ، وكذا فی فتح القدير)[۱]

(۳۴)... (وله أن يستمنی بيد زوجته و جاريته) المباحة له لأنه كتقبيلها۔ (كشاف القناع عن متن الإقناع للفقه الحنبلی، كتاب الحدود، باب التعزير)[۲]

(۳۵)... (وله أن يستمنی بيد زوجته و جاريته) المباحة له لأنه كتقبيلها۔ (مطالب أولی النهی فی شرح غاية المنتهی للفقه الحنبلی، كتاب الحدود، باب التعزير)[۳]

(۳۶)... ويجوز أن يستمنی بيد زوجته و جاريته كما يستمتع بسائر جسدها ذكره المتولی۔ (تحفة الحبيب على شرح الخطيب، للفقه الشافعی، أحكام الحيض، كتاب الطهارة)[۴]

(۳۷)... ويجوز أن يستمنی بيد زوجته و جاريته كما يستمتع بسائر جسدها ذكره المتولی۔ (حاشية البجيرمی على الخطيب للفقه الشافعی، كتاب الطهارة)[۵]

(گذشتہ سے پیوستہ) (۳) البحر الرائق ۲/۴۷۵، ۴۷۶، كتاب الصوم ،باب ما يفسد الصوم و ما لا يفسده، ط۔ دار الكتب العلمية۔

(۱) منحة الخالق على البحر، ۲/۴۷۵، ۴۷۶، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط۔ دار الكتب العلمية۔

(۲) كشف القناع عن متن القناع للبهوتیؒ : ۶/۱۲۵، كتاب الحدود، باب التعزير، ط۔ عالم الكتب بيروت۔

(۳) مطالب أولی النهی فی شرح غاية المنتهی: ۱۸/ ۲۳۲، كتاب الحدود، باب التعزير۔ (جاری ہے)

(۳۸).... هل يجوز له أن يستمني بيدها؟ قال ابن غازی :لم نقف على نص فى المذهب ونص على جوازه فى الإحياء انتهى. ذكره فى باب الحيض، وإطلاقات المذهب والأحاديث تقتضى جواز ذلک والله أعلم. (مواهب الجليل فی شرح مختصر الخليل للفقه المالكی، كتاب الجهاد، فرع النظر للشائبة الأجنبية الحرة فی ثلاثة مواضع)(۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد رضوان

۲۰/۷/۱۴۲۵ھ

نظرثانی واصلاح:۲۱/جمادی الاولیٰ/۱۴۲۸ھ 07جون 2007ء
ادارہ غفران، راولپنڈی

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مکرم بندہ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مصنوعی تولید کے بارے میں آپ کی تحریر مطبوعہ ''التبلیغ'' سلسلہ نمبر۹ بندہ نے ہجومِ مشاغل کے باوجود پوری پڑھی، الحمدللہ بحیثیتِ مجموعی بہت مناسب ہے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

دلائل کی تفصیل میں بعض جزوی اُمور کو چھوڑ کر اس تحقیق کے نتائج سے بندہ متفق ہے۔

البتہ یہ تصریح ضروری ہے کہ چونکہ صورتِ مسئلہ میں مرد کی بیوی موجود ہے، اور اسی کے جسم میں مصنوعی عملِ تولید کیا جانا ہے تو اس بات کا پورا اہتمام کیا جائے کہ مادۂ منویہ کا حصول اسی کے ذریعے ہو، اور دوسری گنجائش سے فائدہ کسی شدید طبی ضرورت کے بغیر نہ اُٹھایا جائے۔

(گذشتہ سے پیوستہ)(۴) تحفة الحبيب شرح الخطيب ج:٦ ص: ١٦٩

(٥) حاشية البجيرمی على الخطيب: ۲۸۳/۳، كتاب الطهارة ، أحكام الحيض ،ط....

(۱) ج:۵ ص: ۲۴(طبع دار عالم الكتب)

اور اصل مسئلے میں فقہائے کرام رحمہم اللہ کے بیان کردہ اس جزئیہ سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے:

إذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج فأنزل، فأخذت الجارية ماء ه في شيء فاستدخلته فرجها في حدثان ذلک، فعلقت الجارية و ولدت، فالولد ولده والجارية أم ولد له. (ردالمحتار، باب العدة، ص: ۶۱۵ ج:۱۲، وأيضاً طحطاوي ج: ۲ ص: ۲۲۷)[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ۔والسلام
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۸/۷/۱۴ھ

ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق چند جزئیات اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی میں نطفہ والے مرد اور عورت سے ثبوتِ نسب کا حکم

(وضاحت از مرتب)

خلاصۂ سوال: مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق اپنی چند تحقیقات حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجیں، جن میں انہوں نے یہ مؤقف اختیار فرمایا کہ نطفہ والے مرد اور عورت دونوں سے بچے کا نسب ثابت ہوگا، یعنی اگر میاں بیوی کا مخلوط نطفہ کسی اور عورت کے رحم

(۱) رد المحتار على الدر ج:۳ ص:۵۲۸ (طبع سعيد) وفي البحر الرائق ج: ۴ ص: ۴۵۲ كتاب العتق باب الاستيلاد (طبع سعيد) وفي طبع دار الكتب العلمية بيروت ج:۹ ص:۲۷۵ إذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج وأنزل، فأخذت الجارية ماء ه في شيء فاستدخلته فرجها في حدثان ذلک، فعلقت الجارية وولدت فالولد ولده والجارية أم ولدله.

وفي المحيط البرهاني الفصل الثامن والعشرون في دعوى النسب ج:۱۰ ص: ۳۹۳ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) وفي المنتقى عن أبي حنيفةؒ: وإذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج وأنزل، فأخذت الجارية ماء ه في شيء واستدخلته فرجها في جريان ذلک، فعلقت الجارية وولدت ولداً، فإن الولد ولد الرجل والجارية تصير أم ولده.

وكذا في مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر ج: ۲ ص: ۲۵۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

میں رکھا جائے تو نطفہ والا مرد اس بچے کا باپ اور نطفہ والی عورت اور جس عورت کے رحم میں وہ نطفہ رکھا گیا، وہ دونوں اس کی مائیں ہوں گی۔

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کو ان کے اس مؤقف سے اختلاف ہے، جس کی تفصیل حضرت والا دامت برکاتہم کے درج ذیل جوابات میں موجود ہے، مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم اور حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے درمیان ایک عرصہ تک اس موضوع پر خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہ تحریرات، سوالات اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جوابات ترتیب وار پیشِ خدمت ہیں۔ (محمد زبیر)

(سوال و تحقیق از مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق چند جزئیات اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی میں نطفہ والے مرد اور عورت سے ثبوتِ نسب کا حکم

مصنوعی تخم ریزی (ARTIFICIAL INSEMINATION)

اس میں چند شقیں ہیں:

(۱)... منی اپنے زندہ شوہر کی ہو۔

i۔ اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ شوہر کا ہوگا۔

ii۔ شوہر کے ساتھ مجامعت یا خلوت کی نوبت تو نہیں آئی تھی لیکن شوہر کی منی اپنی فرج میں داخل کی یا کرائی، اس کے بعد شوہر نے طلاق دیدی تو عورت کو عدت گزارنا پڑے گی۔

(۲)... منی غیر شوہر کی ہو لیکن اس کو شوہر کی منی سمجھ کر داخل کیا۔

i۔ اس صورت میں عورت کو عدت گزارنا پڑے گی اور جب تک عدت ختم نہ ہو چکے تب تک اس کا شوہر اس سے صحبت نہیں کر سکتا ورنہ گناہ ہوگا۔

ii۔ اور اگر اس سے حمل ٹھہر گیا تو وضعِ حمل تک عدت ہوگی۔ اور یہ بچہ اس شخص کا ہوگا جس

کی منی عورت نے غلطی سے اپنی فرج میں داخل کی۔

(۳)... منی غیر شوہر کی ہو لیکن اس کی رضامندی کے بغیر دھوکے سے عورت نے اس کی منی اپنی فرج میں داخل کی ہو۔

i۔ایسا کرنا عورت کے حق میں حرام اور سخت گناہ ہے۔اور عورت تعزیر کی مستحق ہوگی۔

ii۔عدت اور نسب کے مسائل وہی ہیں جو (۲) میں گزرے۔

(۴)... منی غیر شوہر کی ہو لیکن اس کی رضامندی سے عورت نے وہ منی اپنی فرج میں داخل کی ہو۔

i۔ایسا کرنا حرام اور زنا کے مشابہ ہے۔اگرچہ اس پر زنا کی وہ تعریف صادق نہیں آتی جس پر زنا کی حد لگتی ہے۔

ii۔چونکہ یہ زنا کی مثل ہے لہٰذا زنا کی طرح اس میں عدت بھی نہیں ہوگی۔

iii۔اگر اس سے حمل ٹھہر گیا تو بچہ منی والے کا نہیں بلکہ شوہر کا ہوگا اِلَّا یہ کہ شوہر بچے کے اپنے سے ہونے کی نفی کرے اور لعان ہو۔

تنبیہات

(الف) شوہر وفات پا گیا جبکہ اس کا مادہ منویہ محفوظ کیا ہوا ہو تو بیوہ کیلئے اس مادہ کا استعمال جائز نہیں۔اور موت کی وجہ سے نکاح ختم ہوجانے کے باعث اب وہ مادہ غیر شوہر کا ہو گیا ہے۔

(ب) جب عورت نے خود منی داخل نہ کی ہو بلکہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے داخل کروائی ہو اور ڈاکٹر نے غلطی سے غیر شوہر کی منی داخل کی ہو تب تو وہی احکام ہیں جو عورت کے غلطی کرنے کی صورت میں ہیں۔ البتہ اگر ڈاکٹر نے جانتے بوجھتے غیر شوہر کی منی داخل کی، خواہ عورت کی رضامندی اور مطالبہ سے ایسا کیا ہو یا اس کے مطالبہ کے بغیر ایسا کیا تو لیڈی ڈاکٹر بھی گناہ گار ہوگی اور تعزیر کی مستحق ہوگی۔

(ج) مصنوعی تخم ریزی سے عورت پر غسل واجب نہیں ہوگا۔

مصنوعی تخم ریزی سے متعلقہ مسائل درمختار اور ردالمحتار وغیرہ میں دیے گئے ان جزئیات سے حاصل کئے گئے ہیں:

(۱)... أما النكاح الفاسد فلا تجب فيه العدة إلا بالوطء... قلت ومما جرى مجراه ما لو استدخلت منيه في فرجها كما بحثه في البحر[۱]

(۲)... إذا أدخلت منياً فرجها ظنته مني زوج أو سيد عليها العدة كالموطوء ة بشبهة قال في البحر ولم أره لأصحابنا والقواعد لا تأباه لأن وجوبها لتعرف براء ة الرحم۔[۲]

(۳)... أدخلت منيه في فرجها هل تعتد في البحر بحثا نعم لاحتياجها لتعرف براء ة الرحم۔[۳]

(قوله :في البحر بحثا نعم) حيث قال :ولم أر حكم ما إذا وطئها في دبرها، أو أدخلت منيه في فرجها ثم طلقها من غير إيلاج في قبلها۔وفي تحرير الشافعية وجوبها فيهما، ولا بد أن يحكم على أهل المذهب به في الثاني لأن إدخال المني يحتاج إلى تعرف براء ة الرحم أكثر من مجرد الإيلاج اهـ يعني وأما في الأول فلا ،لأن الوطئ في الدبر إن كان في الخلوة فالعدة تجب بالخلوة، وإن كان بغير خلوة فلا حاجة إلى تعرف البراء ة لأنه سفح الماء في غير محل الحرث فلا يكون مظنة العلوق۔[۴]

(۴)...إذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج فأنزل فأخذت

---

(۱)رد المحتار باب العدة ج:۳ ص ۵۰۴(طبع سعيد)

(۲) رد المحتار على الدر ج:۳ ص:۵۱۷(طبع سعيد)

(۳و ۴)الدر المختار مع الرد ج:۳ ص: ۵۲۸(طبع سعيد)

الجارية ماء ه في شيء فاستدخلته في فرجها في حدثان ذلك فعلقت الجارية وولدت فالولد ولده، والجارية أم ولد له ۔ (۱)

ٹیسٹ ٹیوب بارآوری

(TEST TUBE FERTILISATION)

مصنوعی تخم ریزی کے مسائل سے چند اُصولی باتیں معلوم ہوئی تھیں جو یہ ہیں:

(۱)...نسب کے ثابت ہونے میں جس مرد کا نطفہ ہو اس کا اعتبار کیا جاتا ہے بشرطیکہ زنا یا اس کے مشابہ کے طور پر نہ ہو (جس کی تفصیل (۲) میں ہے۔

(۲)...جس عورت کے نطفہ کے ساتھ مرد کے نطفہ کا اختلاط ہوا ہے، وہ یا تو اس مرد کی زوجہ ہوگی یا غیر زوجہ ہوگی، لیکن یہ اختلاط شبہ و غلطی کیوجہ سے ہوگیا ہو۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو نطفہ والے مرد سے نسب ثابت نہیں ہوگا لہٰذا ٹیسٹ ٹیوب بارآوری کی مختلف صورتیں میں احکام یوں ہیں۔

i۔شوہر و بیوی کے نطفوں میں اختلاط کیا گیا ہو، بعد ازاں اس کو بیوی کے رحم میں ٹھہرا دیا گیا ہو، اس صورت میں بچہ شوہر کا ہوگا، بیوی بچہ کی ماں ہوگی۔

ii۔شوہر و بیوی کے نطفوں میں اختلاط کیا گیا ہو۔ بعد ازاں اس کو بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کے رحم میں ٹھہرا دیا گیا ہو۔ اس صورت میں بچہ نطفہ والے کا ہوگا اور جس عورت کے رحم میں بارآور نطفہ ٹھہرایا گیا تھا، وہ اگر شوہر والی ہو تب بھی بچہ اس کے شوہر کا نہیں ہوگا، کیونکہ بچہ کی ترکیب میں اس عورت کا نطفہ شامل نہیں ہے اور نسب کا تعلق نطفوں سے ہوتا ہے رحم سے نہیں۔ (اس صورت میں بیوی جس کا بیضہ ہے اور دوسری عورت جس کے رحم میں بچہ نے پرورش پائی، دونوں ماں شمار ہونگی۔ ایک بچے کے دو باپ ہونے کی نظیر موجود ہے باب دعوی النسب ۔ کنز)

---

(۱) الدر المختار مع الرد ج:۳ ص: ۵۲۸ (طبع سعید)

iii۔ بیوی اور غیر شوہر کے نطفوں میں اختلاط کیا گیا ہو۔ بعد ازاں اس کو بیوی کے رحم میں ٹھہرادیا گیا ہو۔

(الف) اگر اختلاط شبہ و غلطی سے ہوا ہو تو بچہ نطفہ والے کا ہوگا اور عورت کو وضعِ حمل تک عدت گزارنا ہوگی، جس میں شوہر بیوی سے صحبت نہیں کرسکتا۔

(ب) اگر اختلاط عمداً کیا گیا ہو تو بچہ شوہر کا ہوگا اِلّا یہ کہ شوہر بچے کا اپنے سے ہونے کا انکار کرے۔ اور ان دونوں صورتوں میں عورت بچے کی ماں شمار ہوگی۔

اس موقع پر چند باتیں قابل غور ہیں۔

(۱)... شبہ سے نطفوں کے اختلاط ہونے کی صورت میں بچے کا نسب نطفہ والے سے ثابت ہوتا ہے جبکہ زنا یا عمداً غیر شوہر کے نطفہ سے اختلاط کی صورت میں نسب ثابت نہیں ہوگا، ایسا کیوں ہے؟

(۲)... مصنوعی تخم ریزی اور ٹیسٹ بارآوری دونوں صورتوں میں استمناء بالید (MASTURBATION) کی ضرورت پیش آتی ہے تو کیا یہ جائز ہے؟

(۳)... کیا اولاد کے حصول کیلئے ان مصنوعی طریقوں کو اختیار کرنا جائز ہے؟

بحثِ اوّل

شرعی قانون میں مرد کے نطفہ اور اس سے بننے والے بچے کا پورا پورا اِکرام کیا گیا ہے کہ اس میں کسی اور کا خلط نہ ہو، اس کی انفرادیت قائم رہے۔ لیکن یہ اکرام صرف اس وقت ہے جب مرد نے بھی اس نطفہ کو شریعت کے جائز قرار دیئے ہوئے محل میں ڈالا ہو۔ اور اگر مرد نے ایسا نہ کیا ہو تو شریعت کی نظر میں اس کے نطفہ کی انفرادیت و احترام باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا جو درحقیقت مرد کے نطفہ اور نتیجتاً خود اس مرد کی بطورِ سزا تذلیل ہے۔ البتہ اگر شبہ اور غلطی سے کسی غیر عورت سے اپنی بیوی سمجھتے ہوئے صحبت کرلی تو چونکہ اس صورت میں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے سرکشی کا قصد نہیں تھا بلکہ ایسا شبہ سے ہوا ہے، لہٰذا شریعت ایسے شخص کی تذلیل

نہیں کرتی، بلکہ اس شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے اس کا اور اس کے نطفہ کا احترام برقرار رکھتی ہے، لہٰذا اس سے نسب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر یہ شوہر والی ہو تو شوہر کو بھی روک دیا جاتا ہے کہ جب تک عورت کے رحم کی فراغت معلوم نہ ہو جائے (یعنی عورت جب تک عدت نہ گزار لے) تب تک صحبت نہ کرے، تاکہ اگر حمل ہو تو وہ اس حمل کو اپنے نطفہ سے ملوث نہ کرے۔

بحثِ دوم: استمناء بالید (مشت زنی)

وہ استمناء جو اپنے ہاتھ سے ہو یا اپنے ہی جسم کے کسی حصہ کے ذریعے سے ہو اور محض لذّت کیلئے ہو، حرام ہے اور قابلِ تعزیر ہے، اس پر سخت وعید حدیث میں بھی آئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: [۱] سات (قسم کے) آدمی ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان کی طرف نظرِ رحمت فرمائیں گے اور نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک وصاف کریں گے اور نہ ہی اہلِ جہاں کے ساتھ اِن کو اِکٹھا کریں گے، بلکہ ان کو جہنم میں اوّل داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل فرمائیں گے، اِلّا یہ کہ یہ لوگ توبہ کرلیں، اِلّا یہ کہ یہ لوگ توبہ کرلیں، اِلّا یہ کہ یہ لوگ توبہ کرلیں اور (قاعدہ ہے کہ) جو کوئی توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ (ان سات اقسام میں سے ایک) مشت زنی کرنے والے ہیں. [۲] ......الخ

لیکن اگر کسی شخص پر شہوت کا بے انتہاء غلبہ ہو جائے اور اس کی بیوی نہ ہو یا بیوی پاس نہ ہو مثلاً یہ شخص سفر یا جہاد میں ہو تو شہوت کو دَبانے اور تسکین دینے کیلئے استمناء بالید کی گنجائش ہے۔

اور اگر شہوت کا غلبہ اتنا شدید ہو جائے کہ زنا میں مبتلا ہونے کا خوف ہو تو استمناء بالید واجب ہو جاتا ہے۔ غلبۂ شہوت کی حالت میں بیوی تو پاس ہے لیکن حیض ونفاس یا کسی اور بیماری کی بنا پر اس سے مجامعت ممکن نہ تو بیوی کے ہاتھ سے رگڑ کر یا اس کی رانوں کے درمیان رگڑ کر منی خارج کردے۔

(۱و۲) شعب الایمان للبیهقی ج:۴ ص: ۳۷۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) والجامع الكبير للسيوطی ج:۱ ص:۱۳۲۳۷ رقم:۱۳۰۵۷ وكنز العمال ج:۱۶ ص:۱۲۹ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت)

ضرورت کے وقت بیوی کے ہاتھ سے رگڑ کر منی خارج کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ البتہ بلا ضرورت محض لذّت کیلئے ایسا کرنا مکروہِ تنزیہی ہے۔

(نوٹ: یاد رہے کہ حیض ونفاس کے دوران ناف سے گھٹنے تک بیوی کے اعضاء کو دیکھنا اور چھونا ناجائز ہے۔)

طبی نقطہ نظر سے استمناء بالید کی ضرورت مندرجہ ذیل صورتوں میں پیش آتی ہے۔

(۱)...اولاد نہ ہونے کی صورت میں مرد کے مادۂ منویہ کی صلاحیت جاننے کیلئے برائے تجزیہ۔

(۲)...مصنوعی تخم ریزی

(۳)...ٹیسٹ ٹیوب بار آوری

اگرچہ ان صورتوں میں لذّت حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا جب کہ اپنے ہاتھ سے رگڑ کر منی خارج کرنے میں گناہ کا سبب شہوت کو اُبھارنا اور لذّت حاصل کرنا ہے۔لہٰذا ان مواقع میں حدیث میں مذکور وعید تو نہیں آتی لیکن اگر کوشش کی جائے کہ ان مواقع میں بھی بیوی کے ہاتھ سے رگڑ کر منی حاصل کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔اور شریعت کے حکم کو پورا کرنے میں مانعِ شرم کا کیا اعتبار؟

بحث سوم

(۱)...مصنوعی تخم ریزی کے دو مراحل ہیں: ایک منی حاصل کرنا۔ دوسرا اس کو بیوی کے رحم میں داخل کرنا۔ پہلے مرحلے کے بارے میں بحث اُوپر ہو چکی ہے اور دوسرا مرحلہ بھی جائز ہے۔ لہٰذا ضرورت کے تحت (علاجِ عقم کے طور پر) اس طریقے سے اولاد حاصل کرنے کی کوشش کرنا جائز ہے۔

(۲)...ٹیسٹ ٹیوب بار آوری کے چار مراحل ہیں: منی حاصل کرنا بیوی کا نطفہ (OVUM) حاصل کرنا۔ دونوں نطفوں کو خلط کرنا اور بار آوری کے بعد علقہ کو بیوی کے رحم میں منتقل کرنا۔ یہ تمام مراحل بھی علاجِ عقم کے طور پر جائز ہیں۔ لہٰذا بعض عوارض کی بنا پر اگر کوئی جوڑا اس طریقہ کو اختیار کر کے اولاد کے حصول کی کوشش کرتا ہے تو جائز ہے۔ لیکن یہ جواز صرف ٹیسٹ ٹیوب کی پہلی شکل میں ہے، باقی کی دو شکلیں ناجائز وحرام ہیں۔

(تنبیہ: یہ بات بہت ضروری ہے کہ ان طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے پردے اور حجاب کا

پورا لحاظ رکھا جائے اور عورت سے متعلق مراحل، اگر ممکن ہو، کوئی لیڈی ڈاکٹر کرے۔)

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

گرامی قدر مکرم جناب مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی نامہ باعثِ افتخار ہوا۔ مصنوعی تخم ریزی اور ٹیسٹ ٹیوب بارآوری کے بارے میں آپ نے جو جزئیات لکھے ہیں، پہلی نظر میں احقر کو ان سے بحیثیتِ مجموعی اتفاق معلوم ہوتا ہے، البتہ (borrowed womb) کی جو صورت آپ نے لکھی ہے، اس کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ ایسا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یعنی کیا میاں بیوی کا مخلوط نطفہ کسی اور عورت کے رحم میں رکھنا درست ہے یا نہیں؟ اس میں احقر کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ ہرگز جائز نہیں ہے، کیونکہ غیر شوہر کا نطفہ کسی عورت کیلئے اپنے رحم میں داخل کرنا حرام ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کسی نے اس حرام کام کا ارتکاب کرلیا تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ صاحبِ نطفہ باپ ہے اور صاحبۃ النطفۃ اور صاحبۃ الرحم دونوں مائیں ہیں، یہ امر محلِ نظر ہے۔ اگر صرف مرد کا نطفہ غیر بیوی کے رحم میں جاتا تو بچہ غیر ثابت النسب ہوتا۔ اگر مرد کے ساتھ اس کی بیوی کا نطفہ بھی غیر بیوی کے رحم میں چلا گیا تو وہ ثابت النسب کیسے ہوسکتا ہے؟ بالخصوص جب کہ اس طریق کا حرام ہونا اُوپر عرض کیا گیا ہے۔ اس ایک صورت کے سوا باقی جتنے احکام آپ نے لکھے ہیں۔ ابتدائی غور میں ان میں سے کسی پر احقر کو کوئی قوی اشکال نہیں ہوا۔

والسلام

(سوال وتحقیقِ مزید از مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ)

(حضرت والا کے مذکورہ جواب کے بعد مفتی عبدالواحد صاحب نے اس موضوع پر مزید تحقیق فرما کر درج ذیل تحریر بھیجی) (مرتب)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔عنایت نامہ ملا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جناب کی شفقتیں ہمارے حال پر اسی طرح قائم ودائم رہیں۔

borrowed womb کے بارے میں مزید تفصیل و وضاحت پیشِ خدمت ہے جو شاید جناب کے پیشِ نظر نہ ہو، اگرچہ پہلے میرا خیال تھا کہ جناب کو اس کا کچھ علم ہوگا۔اپنے مضمون کے آخر میں میں نے لکھا تھا کہ ٹیسٹ ٹیوب بارآوری کے چار مراحل ہیں:

(۱)...شوہر سے منی حاصل کرنا۔

(۲)... بیوی کا نطفہ(OVA) حاصل کرنا۔

(۳)...ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں نطفوں کا اختلاط (اور مادہ نطفہ کی بارآوری)

(۴)... بارآور مادہ نطفہ کو رحم میں داخل کرنا اور وہاں اس کی پرورش۔

جہاں تک اس عمل کا تعلق ہے کہ بارآور نطفے کو بیوی کے رحم کے بجائے کسی دوسری عورت کے رحم میں پرورش کیلئے منتقل کیا جائے ،خواہ باجرت ہو یا بلا اُجرت ہو، اس کی حرمت میں تو اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مضمون کے آخری حصے میں اس کی تصریح بھی کردی تھی، البتہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو اس صورت میں نسب کا کیا حکم ہوگا؟

سب سے پہلے بارآوری کے عمل کو لیجئے۔عورت کے رحم کے قریب ہی اس کے دائیں اور بائیں OVARY نام کا عضو ہوتا ہے جس میں بہت سے ذرّات ہوتے ہیں،ان ذرّات میں سے ہر ماہ ایک نشونما پاکر بیضہ اُنثی کے نام کے ساتھ رحم میں داخل ہوتا ہے۔اور عام طور پر بارہ سے چوبیس گھنٹوں تک بارآوری نہ ہونے کی صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ اس دوران اگر مرد کا نطفہ(جو کہ ایک وقت میں لاکھوں جرثوموں پر مشتمل ہوتا ہے) اگر رحم میں داخل ہوجائے تو بیضہ انثی (OVUM) عام طور پر بارآور (Fertilisation) ہوجاتا ہے۔یہ بارآوری ایک جرثومہ (spermalozoon) سے ہوتی ہے باقی جرثومے ہلاک ہوجاتے ہیں۔
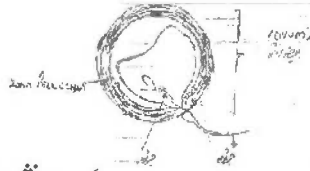
جونہی ایک جرثومہ(spermalozoon)بیضہ انثی (ovum) جو کہ ایک خلیہ ہوتا ہے کی دیوار(ZONA PELLUCIDA)کے ساتھ مس کرتا ہے تو مضبوطی سے اس کے ساتھ چپک جاتا ہے اور خلیہ (بیضہ انثی کے) میں تیزی سے داخل ہوتا ہے جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔
عام طور پر ایک جرثومہ کے داخلہ کے بعد ایسی تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں کہ پھر مزید کوئی جرثومہ اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔

The spermalozoon meanwhile moves forward until it lies in close proximity to the female pronucleas. the nucleus becomes swollen and forms the male pronucleus while the tail is detached and dagenerates
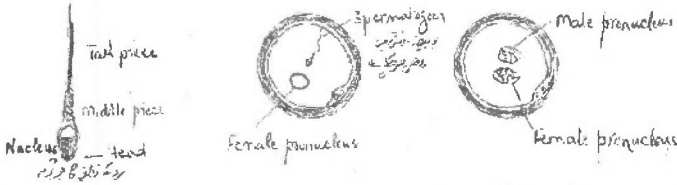
اس کے بعد تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔اور یک خلیاتی مرحلہ کثیر الخلیاتی مرحلہ تک پہنچتا ہے۔
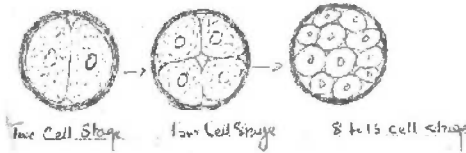
یہی develpmental process آگے چل کر بچے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

اس موقع پر دو باتوں پر تاکید مناسب ہے۔

(۱)...مرد وعورت کے نطفوں کے اختلاط کے نتیجے میں بارآور ہونے والے بیضۂ انثی (FERTILISED OVUM) آگے بننے والے بچے کا سب سے ابتدائی مرحلہ ہے۔

(۲)...اس FERTILISED OVUM پر کسی اور عورت کے نطفہ کو عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔ اور تقسیم در تقسیم کا مرحلہ شروع ہو چکنے کے بعد کسی اور مرد کے نطفہ کے بچے کی اصل تخلیق میں حصہ دار بننے کا امکان بھی معدوم ہے۔

بارآور بیضۂ انثی کی رحم میں منتقلی

بارآور بیضہ انثی (FERTILISED OVUM) جب آٹھ یا اس سے کچھ زائد خلیاتی مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے، تو ٹیسٹ ٹیوب بارآوری کی صورت میں اب اسے رحم میں منتقل کر دیتے ہیں جہاں تخلیق کے اگلے مراحل واقع ہوتے ہیں۔ اس تمام عمل (PROCESS) پر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بچے کا تخلیقی عمل شروع ہو چکا ہے۔ مرد کا نطفہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا بلکہ متلاشی ہو چکا (عورت کے بیضہ انثی یعنی نطفہ میں داخل ہو کر) لہٰذا ٹیسٹ ٹیوب سے یہ منتقلی بیوی کے رحم کی طرف ہو یا کسی دوسری عورت کے رحم کی طرف، یہ کہنا ممکن نہیں کہ رحم میں اب داخل ہونے والی شی مرد کا نطفہ ہے۔

دوسری طرف جس عورت کے رحم میں منتقل کرتے ہیں اس کو ادویات کے ذریعے اس درجے تک پہنچا دیتے ہیں کہ حاملہ کی طرح اس کے رحم میں مزید بیضہ انثی (OVUM) داخل نہیں ہوتا اور اگر داخلہ فرض بھی کر لیں تب بھی مضر نہیں کہ وہ بے کار ہے۔

اب اگر کل کلاں کو ایسے حالات بن جائیں کہ ٹیسٹ ٹیوب میں حاصل شدہ اس کثیر الخلیاتی FERTILISED OVUM کی مزید DEVELOPMENT رحم سے باہر مصنوعی طریقے کے پر کسی INCUBATOR میں ہو سکے اور رحم سے باہر باہر ہی بچہ حاصل ہو جائے تو ثبوتِ نسب کی اہمیت کے پیشِ نظر جب نکاحِ صحیح سے میاں بیوی کے نطفوں کا اختلاط اور بارآوری کی گئی ہے تو یہی کہنا پڑے گا کہ بچہ ان ہی کا ہے۔ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ زبانی گفتگو میں جناب نے اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ واللہ اعلم

اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ٹیسٹ ٹیوب ہی میں ثبوتِ نسب کی بنیادیں پڑ گئی ہیں

لہٰذا کسی غیر عورت کے رحم میں داخل کرنے سے ثابت النسب غیر ثابت النسب نہیں بن جائے گا جبکہ اس عورت کے رحم میں کسی بھی مرد کا نطفہ نہیں گیا اور نہ ہی اس عورت کے نطفہ کا اس میں کچھ عمل دخل ہے بلکہ اس نے تو محض محل اور غذا مہیا کی ہے جو کہ ممکن ہے آئندہ مصنوعی طور پر مہیا کیا جاسکے۔

اس کے برعکس ولد الزنا میں عورت کے رحم میں غیر مرد کا نطفہ داخل ہوتا ہے اور عورت کے نطفہ کے بغیر بچہ بن نہیں سکتا۔ مرد کے نطفہ کا بلاشبہ حرام محل میں داخل ہونے کی وجہ سے اعتبار و احترام ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا مرد سے بچے کا نسب ثابت نہیں ہوتا۔

حاصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے نطفوں کی ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری اور تقسیم در تقسیم کے عمل کے بعد کسی غیر عورت کے رحم میں پرورش کے باوجود میاں بیوی حاصل ہونے والے بچے کے ماں باپ ہوتے ہیں، اس پر یہ حدیث بھی دلیل ہے۔

فبم يشبهها ولدها...وفي رواية أن ماء الرجل غليظ أبيض وماء المرأة رقيق أصفر فمن أيهما علا أو سبق يكون منه الشبه۔[1]

ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وهو استدلال على أن لها منيا كما للرجل والولد مخلوق منهما إذ لو لم يكن لها ماء وخلق من مائه فقط لم يشبهها۔ (مرقات ص ۳۲ ج ۲[2])

جہاں تک ایک حدیث میں وارد یہ مضمون ہے کہ چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس دن تک علقہ تو ضروری نہیں ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ مرد کا نطفہ اپنی ابتدائی حالت ہی میں چالیس دن رہتا ہو اور مشاہدہ بھی یہ بتاتا ہے کہ چالیس دن میں تو سر آنکھیں اور بازو اور ٹانگیں تک بن چکی ہوتی ہیں، لہٰذا ہم یہ کہیں گے کہ ایک مسلسل عمل کو مختلف مراحل میں تقسیم کیا جس میں کوئی حکمت ہوگی

---

(۱) الصحيح للامام مسلمؒ ج: ۱ ص: ۱۴۹ (طبع مكتبه رحمانية)

(۲) مرقاة المفاتيح باب الغسل ج: ۲ ص: ۳۵۵

اور اوّل مرحلے کی تمام شکلوں کو نطفہ نام دیا۔ اب اتنی بات بحث طلب رہ جاتی ہے کہ صاحبۃ الرحم یعنی مستعار رحم والی عورت کو کیا حیثیت دی جائے؟ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ بظاہر ماں بننے کیلئے تین مراحل ہوتے ہیں۔

(۱)...عورت کے نطفے کی مرد کے نطفے سے بارآوری (خواہ وہ مرد اسکا شوہر ہو یا غیر ہو کما سیأتی)

(۲)...اس بارآور نطفہ کا رحم میں قرار ونشونما۔

(۳)...وضعِ حمل۔

پہلا مرحلہ جو کہ اثباتِ نسب میں اصل ہے، اس کے بارے میں تفصیلی بحث اُوپر گزر چکی ہے کہ وہ تو بیوی میں ہوا۔ اگلے دو مراحل (جو کہ اگرچہ پہلے مرحلے کے تابع ہیں لیکن پھر بھی) ایسے ہیں کہ ان میں:

(۱)...جنین کی بناءِ اصلیہ (BASIC STRUCTURAL FORMATION) میں اس صاحبۃ الرحم سے مواد حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مرضعہ سے بہت زیادہ درجے پر ہے اور ماں کا شبہ اس میں قوی ہے۔

(۲)...حمل و وضعِ حمل کی صعوبتیں کہ جن کو برداشت کرنے کی بنا پر ماں کو اس کی عظمت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ عورت برداشت کرتی ہے۔

(۳)... پھر وضعِ حمل ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے از روئے لغت وضعِ حمل کرنے والی والدہ کہلاتی ہے۔ لہٰذا ان (مذکورہ بالا) اُمور کی بنا پر اس صاحبۃ الرحم کو سرے سے اُمومیت سے خارج کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ اشکال ہو کہ ایک ناجائز عمل سے اُمومیت کیسی؟ تو اس بارے میں یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

قال رحمه الله(ويرث ولد الزنا واللعان من جهة الأم فقط)لأن نسبه من جهة الأب منقطع فلايرث به ومن جهة الأم ثابت فيرث به امه و أخته من الأم بالفرض لا غير وكذا ترثه أمه و أخته من أمه

فرضا لاغیر۔(البحر الرائق ص ۵۰۳ ج ۸)[۱]

وفی تبیین: بدل أختہ من الأم۔ إخوتہ من الأم۔

فلو مات شخص عن بنت وأم وأخ توأم من الزنا أو اللعان فالمال للبنت والأم أرباعا فرضا وردا ولا شیء للتوأم لأنہ أخوہ لأمہ فلا یرث مع البنت شیئا .اھ (حاشیة شلبی علی تبیین الحقائق)[۲]

زنا سے پیدا ہونے والے بچے کیلئے مزنیہ جوکہ اس کو جننے والی بھی ہے، کو اس کی ماں قرار دیا حالانکہ زنا فعل حرام ہے تو ایسے ہی اگر زیرِ بحث مسئلے میں مذکورہ شدہ اُمور کی بناپر اس صاحبۃ الرحم میں بھی اُمومیت کو تسلیم کرلیا جائے تو گنجائش نظر آتی ہے۔اور چونکہ اس صاحبۃ الرحم کو رحمی رشتے میں شبہ کی بناپر اُمومیت حاصل ہورہی ہے، لہٰذا میری رائے میں یہ صاحبۃ النطفۃ کے ساتھ میراث میں ماں کے حصہ میں شریک ہوگی اور بچہ بھی دونوں کا وارث ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُصل اُمومیت نہ ہونے کی بناپر اِن کے مابین وراثت جاری ہونے کا قول نہ کیا جائے، لیکن بہرحال! یہ ثبوتِ حرمت کے تو منافی نہیں۔فقط، ھذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

گرامی قدر مکرم جناب مولانا مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بارے میں مزید تفصیلات کافی عرصہ پہلے احقر کو موصول ہوگئیں تھیں، لیکن مسئلہ چونکہ عمیق غور کا متقاضی تھا، اس لئے یہ تحریر فرصت کے انتظار میں رکھی رہی۔اب چندروز قبل احقر کو آپ کی تحریر غور سے پڑھنے کا موقع ملا، اور آپ نے بارآوری کی

---

(۱) ج: ۹ ص: ۱ ۳۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

(۲) تبیین الحقائق العصبات فی المیراث

جو تفصیلات تحریر فرمائی ہیں، ان سے احقر کی معلومات میں اضافہ ہوا، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

لیکن اس تشریح کے بعد بھی آپ کے اس مؤقف سے احقر کو اتفاق نہیں ہو سکا کہ اگر میاں بیوی کا مخلوط نطفہ کسی اور عورت کے رحم میں رکھ دیا جائے اور اس کے رحم سے ولادت ہو تو صاحب نطفہ باپ ہے اور صاحبۃ النطفہ اور صاحبۃ الرحم دونوں مائیں ہیں، جہاں تک صاحبۃ الرحم کے ماں ہونے کا تعلق ہے، اس میں کلام نہیں، لیکن صاحب النطفہ اور صاحبۃ النطفہ سے بچے کے نسب ثابت ہونے میں شدید اشکال ہے، قرآنِ کریم کے ارشاد ''إن أمهٰتهم إلا اللائی ولدنهم'' (سورۃ المجادلۃ آیت نمبر۲) سے اس بارے میں صریح معلوم ہوتا ہے کہ اُمومیت اسی عورت میں منحصر ہے جس کے رحم سے بچہ پیدا ہوا ہو، اسی طرح ''حملته أمه كرها ووضعته كرها'' (سورۃ الاحقاف آیت نمبر۱۵) کا مقتضیٰ بھی یہی ہے، لہٰذا جس عورت کے رحم سے بچہ پیدا نہیں ہوا، مذکورہ آیاتِ قرآنی کی رُو سے اس کو شرعاً ماں قرار دینا ممکن نظر نہیں آتا۔

رہی یہ بات کہ اصل نطفہ اسی عورت کا ہے، سو مجرد اتنی بات سے اس کی اُمومیت ثابت ہونی مشکل ہے، اوّلاً تو اس لئے کہ خود آپ کے ارشاد کے مطابق جنین کی بناءِ اصلی میں صاحبۃ الرحم سے مواد حاصل ہوتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ محض نطفہ بچے کی تخلیق کے لئے کافی نہیں، جب تک وہ ایک عرصہ رحم میں رہ کر صاحبۃ الرحم کا مواد حاصل نہ کر لے، لہٰذا جس عورت کے بیضہ انثیٰ میں نطفہ کا جرثومہ داخل ہوا، وہ ولادت کے لئے سببِ کافی نہیں۔

دوسرے اس لئے کہ اگر کوئی نطفہ عمداً کسی غیر مشروع طریقے سے کسی دوسرے رحم میں داخل کیا جائے تو خواہ عملاً بچہ کی ولادت کا سبب وہی بنا ہو، لیکن شرعاً بچے کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا اور بچے کا نسب اس سے ثابت نہیں ہوگا۔

''الولد للفراش و للعاهر الحجر''(۱) کا تقاضا بھی یہی ہے، اس حدیث میں

---

(۱) الصحیح للبخاری کتاب المحاربین ج:۲، ص:۱۰۰۷ (طبع قدیمی کتب خانہ)

"وللعاهر الحجر" کا جملہ بتارہا ہے کہ حالات ایسے ہیں جن میں ظاہراً بچہ زانی کا معلوم ہوتا ہے، اور طبی نقطۂ نظر سے یہ بات یقینی بھی ہوسکتی ہے کہ بچہ زانی کے نطفہ سے پیدا ہوا، اس کے باوجود بچے کو زانی کی طرف شرعاً منسوب نہیں کیا گیا، اس سے یہ اُصول معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کسی جگہ طبی طور پر یہ ثابت بھی ہوجائے اور یقینی طور پر ثابت ہوجائے کہ اس بچہ کی اصل فلاں شخص کا نطفہ ہے، لیکن وہ نطفہ ایک ایسے رحم میں داخل کیا گیا ہو، جو صاحبِ نطفہ کے لئے حلال نہیں تو مذکورہ طبی یقین کے باوجود بچے کا نسب صاحبِ نطفہ سے ثابت نہیں ہوگا۔ زیرِ بحث صورت میں یہ بات طے شدہ ہے کہ مرد وعورت کا یہ مخلوط نطفہ جس محل میں داخل کیا گیا، وہ اس کے لئے حرام تھا اور یہ داخل کرنا بھی حرام تھا، جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں، لہٰذا اگر وہ مخلوط نطفہ بالفرض ولادت کا سبب کافی بھی ہوتا، تب بھی مذکورہ اُصول کے مطابق نہ تو صاحبۃ النطفہ سے بچے کا نسب ثابت ہوتا، اور نہ صاحب النطفہ سے۔ اب جب کہ یہ ولادت کا سببِ کافی بھی نہیں ہے تو بطریقِ اولیٰ نطفہ والے میاں بیوی سے اس کا نسب ثابت نہ ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں آنجناب نے یہ جو تحریر فرمایا ہے کہ مرد کا نطفہ جب بیضہ انثی میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ متلاشی ہوچکا ہوتا ہے، لہٰذا یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اب رحم میں داخل ہونے والی شے مرد کا نطفہ ہے، احقر کو اس سے بھی اتفاق نہیں، واقعہ یہ ہے کہ مرد کا نطفہ متلاشی نہیں ہوتا، بلکہ منقلب ہوجاتا ہے، اور دوسری صورت اختیار کرلیتا ہے، اس کا وجود ختم نہیں ہوتا، اگر وجود ختم ہوجاتا تو بچے کو اس نطفہ کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا مرد کا نطفہ ایک حرام عورت کے رحم میں، خواہ اپنی اصلی صورت میں جائے یا کسی اور صورت میں تبدیل ہوکر پہنچے، دونوں صورتوں میں شرعاً کوئی فرق نہیں۔

دوسری بات آپ نے یہ لکھی ہے کہ ثبوتِ نسب کی بنیادیں ٹیسٹ ٹیوب ہی میں پڑ گئی ہیں، لہٰذا کسی غیر عورت کے رحم میں داخل کرنے سے ثابت النسب، غیر ثابت النسب نہیں بن جائے گا، احقر کو اس میں بھی تامل ہے، ثبوتِ نسب کے لئے صرف نطفوں کا انعقاد، استقرار اور اختلاط کافی نہیں، بلکہ حلال رحم میں مدتِ معہودہ تک استقرار یا حلال رحم سے ولادت بھی ضروری ہے، اس کے

بغیر ثبوتِ نسب نہیں ہوسکتا۔

جو کچھ اُوپر عرض کیا گیا، یہ تو مسئلہ کی نفس الامری تحقیق سے متعلق ہے، لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر غیر عورت کے رحم سے پیدا ہونے والے بچے کو نطفہ والے میاں بیوی سے ثابت النسب قرار دیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقے کو حرام کہنے کے باوجود اس کا عملی چلن روکنا ممکن نہیں رہے گا اور اس منکر کا شیوع اتنا ہوگا کہ اس کے تصور ہی سے دل لرزتا ہے۔

هذا ما ظهر لي والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: محمد عبداللہ میمن

۵ شوال ۱۴۱۱ھ

محض حمل پر ثبوتِ نسب کا حکم

(حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کے مذکورہ جواب کے بعد مفتی عبدالواحد صاحب نے اپنے مؤقف کی تائید میں ذیل کا مفصل جوابی خط ارسال فرمایا۔)

(سوال و مزید تحقیق از مفتی عبدالواحد صاحب)

بسم اللہ حامدا ومصلیا

بخدمت جناب حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جناب کا عنایت نامہ مؤرخہ ۵ رشوال ۱۴۱۱ھ، ایک مہینے کی تاخیر سے موصول ہوا، انتہائی ممنون ہوں، چند مزید گزارشات پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں، اگرچہ ساتھ ساتھ اس کا ڈر بھی رہتا ہے کہ کہیں جناب ان گزارشات سے ملول خاطر نہ ہوجائیں، جناب کی مصروفیات کا بھی احساس ہے، لیکن اپنی مجبوری بھی اور حضرات کے عدم التفات کے باعث جناب ہی کی طرف بار بار نظر اُٹھانے پر آمادہ کرہی دیتی ہے۔

(۱)...اپنے سابقہ عریضہ میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ:

''اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ٹیسٹ ٹیوب ہی میں ثبوتِ نسب کی بنیادیں پڑگئی ہیں، لہٰذا کسی غیر عورت کے رحم میں داخل کرنے سے ثابت النسب، غیر ثابت النسب نہیں بن جائے گا۔''

اس پر جناب نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ:

''ثبوتِ نسب کے لئے صرف نطفوں کا انعقاد، استقرار اور اختلاط کافی نہیں، بلکہ حلال رحم میں مدتِ معہودہ تک استقرار یا حلال رحم سے ولادت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ثبوتِ نسب نہیں ہوسکتا۔''

مدتِ معہودہ سے بظاہر حمل کی اقل مدت یعنی چھ ماہ سمجھ میں آتی ہے۔ واللہ اعلم

جناب کے تبصرہ پر مجھے یہ اشکال ہے کہ ہمارے فقہاء حمل کے لئے بھی ثبوتِ نسب کا قول کرتے ہیں، قطعِ نظر اس سے کہ حمل کو کتنی مدت گزری ہو، بدائع میں ہے:

ولو قال لامرأته وهي حامل :ليس هذا الحمل مني لم يجب اللعان في قول أبي حنيفة؛ لعدم القذف بنفي الولد، وقال أبو يوسف ومحمد :إن جاء ت بولد لأقل من ستة أشهر من وقت القذف وجب اللعان وإن جاء ت به لأكثر من ستة أشهر لم يجب.

وجه قولهما أنها إذا جاء ت به لأقل من ستة أشهر من وقت القذف فقد تيقنا بوجوده في البطن وقت القذف ولهذا لو أوصى لحمل امرأته فجاء ت به لأقل من ستة أشهر استحق الوصية، وإذا تيقنا بوجوده وقت النفي كان محتملا للنفي إذ الحمل تتعلق به الأحكام، فإن الجارية ترد على بائعها ويجب للمعتدة النفقة لأجل حملها فإذا نفاه يلاعن فإذا جاء ت به لأكثر من ستة أشهر فلم تتيقن

بوجوده عند القذف لاحتمال أنه حادث ولهذا لا تستحق الوصية ولأبى حنيفة أن القذف بالحمل لو صح إما أن يصح باعتبار الحال أو باعتبار الثانى لا وجه للأول؛ لأنه لا يعلم وجوده للحال لجواز أنه ريح لا حمل ولا سبيل إلى الثانى؛ لأنه يصير فى معنى التعليق بالشرط............ولا يقطع نسب الحمل قبل الولادة بلا خلاف بين أصحابنا أما عند أبى حنيفة فظاهر؛ لأنه لا يلاعن وقطع النسب من أحكام اللعان.

وأما عندهما فلأن الأحكام إنما تثبت للولد لا للحمل وإنما يستحق اسم الولد بالانفصال ولهذا لا يستحق الميراث والوصية إلا بعد الانفصال، وعند الشافعى يلاعن ويقطع نسب الحمل واحتج بما روى أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -لاعن بين هلال بن أمية وبين امرأته وهى حامل وألحق الولد بها فدل أن القذف بالحمل يوجب اللعان وقطع نسب الحمل ولا حجة له فيه؛ لأن هلالا لم يقذفها بالحمل بل بصريح الزنا وذكر الحمل وبه نقول أن من قال لزوجته :زنيت وأنت حامل يلاعن؛ لأنه لم يعلق القذف بالشرط وأما قطع النسب فلأن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -علم من طريق الوحى أن هناك ولدا.

ألا ترى أنه قال -صلى الله عليه وسلم :-إن جاء ت به على صفة كذا فهو لكذا وإن جاء ت به على صفة كذا فهو لكذا ولا يعلم ذلك إلا بالوحى ولا طريق لنا إلى معرفة ذلك فلا ينفى الولد والله الموفق. (ج: ٣ ص: ٢٤٠)[١]

---

(١)بدائع الصنائع ج:٣ص: ٢٤٠(طبع سعيد)وفى طبع مكتبة دارالكتب العلمية بيروت ج:٨ص:٢١٦

اگرچہ ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے قصہ میں نفیِ ولد پر اعتراض کیا گیا ہے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے کہ:

ولكن لم يذكر فيه أنه صلى الله عليه وسلم نفاه قبل الوضع كما اقتضاه كلام الشارح تبعا للنهر، وإنما فيه قوله: صلى الله عليه وسلم -انظروها، فإن جاء ت به كذا فهو لهلال، أو جاء ت به كذا فهو لشريك وأنها ولدت فألحق الولد بالمرأة وجاء ت به أشبه الناس بشريك۔[1]

لیکن جوبات ہمارے لئے مفید ہے وہ بلااعتراض واقع ہوئی ہے، یعنی یہ کہ حمل ثابت النسب ہے، اگر مدتِ معہودہ یا وضعِ حمل تک نسب ثابت نہ ہوتا تو صاحبینؒ کے قول "فإذا نفاه يلاعن" کا جواب تو یوں دیا جاسکتا تھا کہ ابھی تو حمل اس سے ثابت النسب ہی نہیں ہوا، وہ نفی کس چیز کی کر رہا ہے؟ جب اس کا نسب ثابت ہوگا، اس وقت نفی کرے۔

علاوہ ازیں یہ کہنا کہ "ولايقطع نسب الحمل قبل الولادة" اس وقت ہی صحیح ہوسکتا ہے جب وہ پہلے ثابت النسب ہو، ورنہ قطعِ نسب بے معنی بات ہوگی۔

جب حمل کے لئے بھی نسب کا ثبوت ہوسکتا ہے اور یہ کوئی قید موجود نہیں ہے کہ کتنی مدت کا حمل ہو تو اطلاق کی وجہ سے مضغہ اور علقہ کے مراحل بھی اس میں شامل ہوں گے۔

حلال نطفوں یعنی میاں بیوی کے نطفوں سے مل کر بننے والے علقہ کے لئے ثبوتِ نسب کیا اسی وقت ہوگا جب نطفوں کا اختلاط بیوی کے رحم میں ہوا ہو، یا رحم سے باہر بھی اختلاط ہوکر علقہ حاصل ہونے کی صورت میں یعنی ٹیسٹ ٹیوب میں بھی نسب ثابت ہوگا؟ چونکہ دونوں میں فرق کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے، لہٰذا ٹیسٹ ٹیوب میں حلال نطفوں کے اختلاط کے نتیجے میں حاصل ہونے والا علقہ ثابت النسب ہوگا۔

پچھلے عریضے میں جو میں نے ذکر کیا تھا کہ ٹیسٹ ٹیوب میں کثیر الخلیاتی (MULTICELLULAR)

---

(۱) رد المحتار علی الدر مطلب الحمل يحتم كونه نفخا ج:۳ ص: ۴۹۱ (طبع سعيد)

مرحلہ حاصل ہونے پراس کورحم میں منتقل کردیتے ہیں تواس سے مرادعلقہ ہی کی ابتدائی STAGE ہے۔

حمل کے ثابت النسب ہونے کے بارے میں ایک اورحوالہ

وتلخيص هذا الوجه أنه قياس زوجة الصغير الحامل وقت موته بغير ثابت النسب على زوجة الكبير الحامل وقت موته بثابت النسب في حكم هو الاعتداد بوضع الحمل بجامع أنه لقضاء حق النكاح إظهارا لخطره متعرضا فيه لإلغاء الفارق وهو وصف ثبوت نسب الحمل وعدمه۔ (فتح القدير ج: ۴ ص: ۳۲۴)[۱]

جہاں تک ان آیات کاتعلق ہے جن کاذکرجناب نے کیاہے، یعنی "إن أمهتهم إلا اللائی ولدنهم"[۲] اور"حملته أمه كرها و وضعته كرها"[۳] توان کے بارے میں (مذکورہ بالاحوالہ جات کی روشنی میں) میری رائے یہ ہے کہ یہ ذکرعلی سبیل العادہ ہے اورعادۃً ماں بننے کے تین مراحل ہوتے ہیں۔(ان مراحل کاذکرمیں نے سابقہ عریضہ میں بھی کیاتھا) یعنی:

(۱)...عورت کے نطفے کی مرد کے نطفے سے بارآوری۔

(۲)...اس بارآور نطفے کارحم میں قرارونشوونما۔

(۳)...مدت پوری ہونے پروضعِ حمل۔

تیسرامرحلہ جس کاذکرپہلی آیت میں ہے، عادۃً پہلے دومراحل کومستلزم ہے، یہ نہیں کہ عورت کانطفہ تو ولدکی تخلیق میں شریک نہ ہواورمحض وضعِ حمل کاوجوداس کی امومیتِ اصلیہ کے لئے کافی ہو، اسی طرح حمل اوروضعِ حمل یعنی دوسرے اورتیسرے مراحل جن کاذکردوسری آیت میں ہے، عادۃً پہلے مرحلے کومستلزم ہیں، کیونکہ عادۃً بچہ ماں کے نطفے کے بغیرپیدانہیں ہوتا، ملاعلی قاری رحمہ اللہ کی

---

(۱) باب العدۃ۔ج:۴ص: ۲۹۱ (طبع مکتبہ رشیدیہ)

(۲) سورۃ المجادلۃ آیت نمبر ۲

(۳) سورۃ الأحقاف، آیت نمبر۱۵

عبارت میں نے نقل کی تھی کہ:

وهو استدلال على أن لها منيا كما للرجل والولد مخلوق منهما إذ لو لم يكن لها ماء و خلق من مائه فقط لم يشبهها"[1]

لیکن کیا پہلا مرحلہ بھی ثبوتِ نسب کے لئے اگلے دو مراحل کا محتاج ہے، مذکورہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں یہ احتیاج باقی نہیں رہتی۔ اسی بناء پر اگر آئندہ ایسے حالات بن جائیں کہ مصنوعی طور پر غذا فراہم کر کے جنین کی نشو و نما مشینوں کے ذریعے ہو تو بچہ ثابت النسب ہوگا۔

(۲)... میری ایک اور عبارت جس پر جناب نے گرفت فرمائی ہے، یوں ہے:

''اس تمام عمل پر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بچے کی تخلیق کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ مرد کا نطفہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا، بلکہ متلاشی ہو چکا ہے (عورت کے بیضۃ انثی یعنی نطفہ میں داخل ہو کر۔)

اس پر جناب نے یہ گرفت فرمائی ہے کہ:

''مرد کا نطفہ متلاشی نہیں ہوتا، بلکہ منقلب ہو جاتا ہے اور دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے، اس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ اگر وجود ختم ہو جاتا تو بچے کو اس نطفہ کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا مرد کا نطفہ ایک حرام عورت کے رحم میں خواہ اپنی اصلی صورت میں جائے یا کسی اور صورت میں تبدیل ہو کر پہنچے، دونوں صورتوں میں شرعاً کوئی فرق نہیں۔

اپنے سابقہ عریضہ میں ذکر کیا تھا کہ مرد اور بیوی کے نطفے یکجان ہو کر تقسیم کے مراحل سے گزرتے ہیں اور پہلے جو یکخلیاتی مرحلہ ہوتا ہے وہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر کثیر الخلیاتی مرحلے تک پہنچتا ہے، یہی علقہ کا مرحلہ ہے، چونکہ اس وقت انقلابِ ماہیت ہو چکی ہے، لہٰذا اسی بناء پر میں نے اس کو متلاشی ہونے سے تعبیر کیا تھا۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ تقسیم در تقسیم کے باوجود مردانہ جرثومہ

---

(۱) مرقاة المفاتيح شرح المشكوة باب الغسل ج: ۲ ص: ۳۲ (طبع مكتبه امداديه ملتان)

کے اجزاء تو باقی ہیں، لہٰذا مردانہ جرثومے کی صرف شکل تبدیل ہوئی ہے جو متعین طور پر کسی لڑکے یا لڑکی کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ اس کی جنس متعین ہو چکی ہے جبکہ بار آوری سے پہلے مردانہ وزنانہ نطفوں کا حال ایسا نہیں ہوتا۔[1] مندرجہ ذیل حوالہ ملاحظہ ہو:

When the spermatozoon meets the ovum it penetrates the Oolemma by means of its head-cap. The tail becomes absorbed but the head and body pass in and the head forms the male-pronucleus which fuses with the nucleus of the ovum (female pronucleus) to form the segmentation nucleus. In this way the fertilized ovum is furnished with the characteristic number of chromosomes, each element, the male and the female, contributing the half. The body of the spermatozoon furnishes the apparatus necessary for the first division of the ovum, and thus initiates segmentation, which thereafter goes on rapidly by the ordinary process of mitosis.

It may be well to recall at this point the chromosome mechanism which is now generally accepted as the basis of sex determination. The original spermatocyte cell contains 44 somatic chromosomes and 2 sex chromosomes which may be called X and Y. from this

(۱) انقلاب کی تو نفی نہیں کی گئی، متلاشی کی نفی کی گئی ہے (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

cell four spermatozoa arise by the maturation divisions, each containing 22 somatic chromosomes and one sex chromosomes either X or Y. The oocyte contains 44 somatic chromosomes and 2 sex chromosome, both X, so that after maturation the ovum is left with 22 somatic chromosomes and one sex chromosome X. The union of the ovum with a spermatozoon with an X chromosome X. The union of the ovum with a spermatozoon with an X chromosome will reproduce the full female complement of 44 somatic and 2X sex chromosomes, making a total of 46 which is characteristic of the human species. The union of the ovum with a spermatozoon with a Y sex chromosome will reproduce the male pattern of 44 somatic chromosomes and 2 sex chromosomes, X & Y.

(A text-Bookof Midwifery
by Johnstone).

علاوہ ازیں جو بات قابلِ غور ہے اور جس کی طرف توجہ میں نے سابقہ عریضوں میں بھی دلائی تھی، یہ ہے کہ مستعار رحم میں منتقل کرنے کے بعد سرے سے اس کا امکان نہیں ہوتا[1] کہ مستعار رحم والی عورت کا نطفہ اس کے ساتھ مختلط ہو سکے اور اس کے نطفے کی شمولیت کے بغیر اس کو کامل و اصل ماں ماننا کیونکر متصور ہو سکتا ہے؟

---

(۱) یعنی عادی بہ تحقیقِ اطباء، اور یہ تحقیق تبدیل بھی ہو سکتی ہے (حاشیہ از حضرت والا دامت برکاتہم)

The main results of fertilization are (l) restoration of the diploid number of chromosomes and (2) determination of the sex of the new individual.

(Medical Embryology by Langman)

(۳)...میری سابقہ تحریر کا ایک جملہ یہ تھا کہ:

''جنین کی بناءِ اصلیہ BASIC STRUCTURAL FORMATION میں اس صاحبۃ الرحم سے مواد حاصل ہوتا ہے۔

مواد سے میری مراد غذا ہے جو جنین کو خون کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے، اس کو میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، یعنی یہ کہ مستعار رحم والی صرف مکان اور غذا فراہم کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مخصوص طریقے پر غذا کی فراہمی بچے کی خلق وتخلیق کی ماہیت میں شامل نہیں، وہ ایک خارجی امر ہے، جس کے لئے عقلاً اور ذرائع بھی ممکن ہیں۔

یہ وضاحت اس لئے کی ہے کہ جناب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ میرے اس جملے کے:

معنی یہ ہیں کہ محض نطفہ بچے کی تخلیق کے لئے کافی نہیں، جب تک وہ ایک عرصے رحم میں رہ کر صاحبۃ الرحم کا مواد حاصل نہ کرے، لہٰذا جس عورت کے بیضۂ انثیٰ میں نطفہ کا جرثومہ داخل ہوا، وہ ولادت کے لئے سببِ کافی نہیں۔''

(۴)...جناب نے بیوی کو (جس کا نطفہ شوہر کے نطفہ کے ساتھ مختلط ہو کر علقہ میں تبدیل ہوا ہے) ماں قرار دئے جانے کے خلاف یہ دلیل بھی دی ہے کہ:

''دوسرے اس لئے کہ اگر کوئی نطفہ عمداً کسی غیر مشروع طریقے سے کسی دوسرے رحم میں داخل کیا جائے تو خواہ عملاً بچہ کی ولادت کا سبب وہی بنا ہو، لیکن شرعاً بچے کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا.........الخ

یہ اصل مسئلہ جو جناب نے تحریر فرمایا ہے، مسلم ہے، لیکن اس میں مذکورہ نطفہ سے مراد مرد کا نطفہ ہے جو کہ اپنی اصلی حالت میں (خواہ اس کے ساتھ اس کی اپنی بیوی کا نطفہ سرے سے نہ ہو یا ہو تو اپنی اصلی حالت میں ہو) کسی حرام رحم میں داخل کیا گیا ہو، جبکہ ہمارے زیر بحث جو صورت ہے، اس میں مرد کا نطفہ اپنی بیوی کے نطفے سے مختلط ہو کر علقہ میں تبدیل ہونے کے بعد حرام رحم میں داخل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں صورتوں میں ایک اور فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ جناب کی تحریر کردہ صورت میں صاحبۃ الرحم کا اپنا نطفہ بھی بچے کی تخلیق میں شریک ہوتا ہے اور اس کے بغیر تخلیق عادۃً محال ہے جبکہ زیر بحث صورت میں بچے کی تخلیق میں بیوی کا نطفہ شریک ہوا ہے، صاحبۃ الرحم کا نطفہ سرے سے شریک نہیں ہوتا۔

(۵)... اپنی اس تحریر میں میں نے علقہ کا لفظ استعمال کیا ہے جبکہ سابقہ تحریر میں اس کا استعمال نہیں کیا تھا، اس کا بیان یہ ہے کہ سابقہ تحریر میں میں نے ٹیسٹ ٹیوب بارآوری (T.T FERTILIZATION) کے تمام مراحل کو اور پھر رحم میں منتقل کرنے کے مرحلے کو تفصیل سے بیان کیا تھا اور خیال تھا کہ اپنی جانب سے کسی مرحلے کا متعین نام دیے بغیر پوری بات سامنے رکھ دی جائے، لیکن اب خیال یہ ہوا کہ شاید جناب پر حقیقتِ حال واضح نہ ہوئی ہو، اس لئے اب اس لفظ کے استعمال سے مدد لی ہے۔

(۶)... اب تک کی میری معروضات اس بات پر تاکید ہیں کہ بیوی یعنی صاحبۃ النطفہ کو اصل ماں قرار دیا جائے، اس کے بعد اب فقط اتنا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ صاحبۃ الرحم کو کیا قرار دیا جائے؟ اپنی سابقہ تحریر میں میں نے عرض کیا تھا کہ:

(i)... جنین کی بناء اصلیہ میں صاحبۃ الرحم سے مواد (یعنی غذا) حاصل ہوتا ہے۔

(ii)... حمل و وضعِ حمل کی صعوبتیں کہ جن کو (عادۃً) برداشت کرنے کی بناء پر ہر ماں کو اس کی عظمت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ صاحبۃ الرحم برداشت کرتی ہے۔

(iii)... پھر وضعِ حمل ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے از روئے لغت وضعِ حمل کرنے والی والدہ

کہلاتی ہے، لہٰذا ان (مذکورہ بالا) اُمور کی بناء پر اس صاحبۃ الرحم کو سرے سے امومیت سے خارج کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن پھر بعد میں میری رائے بدل گئی، جس کی مندرجہ وجوہ ہیں:

(۱)... جب میاں بیوی سے نسب ثابت ہو چکا ہے تو اب بچے میں نسب کے ثبوت کی مزید ضرورت نہیں رہی۔

(۲)... بیوی کے ماں ثابت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ شوہر سے نسب ثابت ہو جبکہ صاحبۃ الرحم سے نسب ثابت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ شوہر سے نسب ثابت نہ ہو۔ دونوں کو ماں قرار دینے سے یہ تضاد لازم آتا ہے، چونکہ صاحبۃ الرحم کو ماں قرار دئے جانے کے لئے کوئی ثبوتِ نسب کی ضرورت موجود نہیں ہے، لہٰذا اس تضاد سے بچنے کے لئے صاحبۃ الرحم کو ماں نہ کہیں گے۔

رہے وہ مذکورہ بالا اُمور جو اس کی امومیت کا تقاضا کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ کامل و حقیقی تقاضا عادۃً اس وقت متحقق ہوتا ہے جب ان کے ساتھ صاحبۃ الرحم کا نطفہ بھی تخلیق میں شریک رہا ہو۔ چونکہ وہ شرکت مفقود ہے، لہٰذا کامل و حقیقی تقاضا بھی مفقود ہے۔

البتہ رضاعت پر قیاس کر کے اس کو ہم رضاعی ماں کی مثل قرار دے سکتے ہیں، اگر چہ اس میں رضاعت کے مقابلے میں زائد معنی پایا جاتا ہے، اس سے وہ غیر کامل تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے۔

(۷)... رہا جناب کا یہ فرمانا کہ:

> ”لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر غیر عورت کے رحم سے پیدا ہونے والے بچے کو نطفہ والے میاں بیوی سے ثابت النسب قرار دیا گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقے کو حرام کہنے کے باوجود اس کا عملی چلن روکنا ممکن نہیں رہے گا اور اس منکر کا شیوع اتنا ہوگا کہ اس کے تصور ہی سے دل لرزتا ہے۔“

تو اس بارے میں عرض ہے کہ میں نے شروع میں وضاحت کی تھی کہ مغرب کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ ایسے اقدامات کر بیٹھتے ہیں، اور اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر نسب کس سے ثابت ہوگا؟ یہ سوال لامحالہ پیدا ہوگا، جہاں یہ اندیشہ اہم ہے، وہاں بچے کا نسب بھی اہم ہے، اس

خطرے کے سدِ باب کے لئے حکومت کے ذریعے قانون بنوایا جاسکتا ہے۔

(نوٹ: حکومت سے صرف ہمارے ملک کی موجودہ حکومتیں ہی نہیں ہیں، بلکہ تمام اسلامی ممالک کی حکومتیں اور آئندہ بننے والی ذمہ دار حکومتیں بھی ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے کی کہ کسی جگہ پر کسی وقت نااہل حکومت کو دیکھ کر مکمل طور پر مایوس نہیں ہوا جاسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

طالبِ دعا

عبدالواحد غفرلہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ

جامعہ مدنیہ، کریم پارک راوی روڈ لاہور

حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا جواب

گرامی قدر مکرم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، اور ''ٹیسٹ ٹیوب بے بی'' کے سلسلے میں آپ کی رائے مکرر استفادہ کیا، یہ تو ایک علمی تحقیق ہے، اس لئے ملولِ خاطر ہونے کا سوال ہی نہیں۔ اس قسم کے نئے مسائل میں چونکہ صریح حکم کتابوں میں موجود نہیں، اس لئے آپ کی تحریروں کو بنیتِ استفادہ ہی پڑھتا ہوں، لیکن کھلے ذہن کے ساتھ پڑھنے کے باوجود احقر ابھی تک آپ کی رائے سے متفق نہیں ہوسکا، مفصل تبصرہ کی مہلت تو احقر کو نہیں ملی، البتہ چند نکات آپ کے مکرر غور کے لئے ارسالِ خدمت ہیں:

(۱)... آپ نے حمل کے ثبوتِ نسب کے سلسلے میں بدائع کی جو عبارت نقل فرمائی ہے[1] اور اس سے جو استدلال فرمایا ہے کہ حمل اپنے بالکل ابتدائی مراحل میں بھی ثابت النسب ہوسکتا ہے، وہ احقر کو کوئی وجوہ سے مخدوش معلوم ہوتا ہے:

(۱) بدائع الصنائع ج: ۸ ص: ۲۱۶ (طبع دار الکتب) وفی طبع سعید ج: ۳ ص: ۲۴۰

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہماری گفتگو نطفہ کے اس مرحلے سے متعلق ہو رہی ہے جو آپ کی نئی تحقیق کے مطابق ابھی صرف ''علقہ'' ہے، اس مرحلے میں اس پر حمل کے ان احکام کا اطلاق نہیں ہوتا جو آپ نے ذکر فرمائے ہیں، وہ ابھی تک ثبوتِ نسب یا قطعِ نسب کا محل ہی نہیں ہے، چنانچہ جب تک اس کے کچھ اعضاء ظاہر نہ ہو جائیں، اس وقت تک اس کے اتلاف پر جنین کی دیت بھی عائد نہیں ہوتی، بلکہ شامی میں یہاں تک ہے کہ اگر ''مضغہ'' بن چکا ہو، لیکن ''استبانۂ خلق'' نہ ہوا ہو، تب بھی اس میں ''غرہ'' واجب نہیں ہوتا:

ولو ألقت مضغة ولم يتبين شيء من خلقه فشهدت ثقات من القوابل أنه مبدأ خلق آدمي ولو بقي لتصور فلا غرة فيه وتجب فيه عندنا حكومة۔[1]

''غرہ'' کا عدمِ وجوب اسی وجہ سے ہے کہ اس کو ابھی جنین بھی تسلیم نہیں کیا گیا اور جہاں تک وجوبِ حکومت کا تعلق ہے، وہ ہر قسم کے ضرر پر ہوتی ہے، اور وہ یہاں بھی ہے۔

(۲)...حمل کو اس وقت وارث قرار دیا جاتا ہے جب وہ زندہ پیدا ہوا ہو، مردہ پیدا ہونے کی صورت میں وہ وارث نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی جنایت سے حمل گرایا گیا ہو تو خواہ وہ مردہ پیدا ہو، تب بھی اس کو وارث قرار دیا جاتا ہے، جیسا کہ تمام کتبِ فقہ میں تصریح ہے۔(ملاحظہ ہو: عالمگیریہ: ۴۵۶/۶)[2]

لیکن جب تک وہ مضغہ کی شکل میں ہے، اگر جنایت کے تحت بھی گرا دیا جائے، تب بھی وہ وارث نہیں ہوتا، حالانکہ اگر وہ ثبوتِ نسب کا محل ہوتا ہے تو جس طرح جنین مستبین الخلق جنایت کی صورت میں وارث ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی وارث ہوتا۔

---

(۱) رد المحتار على الدر فصل فی الجنين۔ج:٦ ص:٥٩٠(طبع سعيد)

(۲)وان ولد ميتا لا حكم له ولا ارث....ومتى انفصل الحمل ميتا انما لا يرث اذا انفصل بنفسه فاما اذا فصل فهو من جملة الورثة وبيانه انه اذا ضرب انسان بطنها فالقت جنينا ميتا فهذا الجنين من جملة الورثة، الفتاویٰ الهندية،كتاب الفرائض،الباب السابع فی ميراث الحمل، ج:٦ص:٤٥٦(طبع رشيدية)

(۳)...آپ نے یہ عبارت نقل کی ہے، اس میں صاحبینؒ کا مؤقف بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

وأما عندهما فلأن الأحكام إنما تثبت للولد لا للحمل وإنما يستحق اسم الولد بالانفصال ولهذا لا يستحق الميراث والوصية إلا بعد الانفصال۔[1]

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک حمل کا جب تک انفصال نہ ہو، اس وقت تک نہ قطعِ نسب ممکن ہے نہ اثباتِ نسب، کیونکہ انہوں نے تمام احکام کے ثبوت کی نفی کی ہے۔

(۴)... اگر بالفرض فقہاءِ کرام کی کسی عبارت میں حمل کو ثابت النسب کہا گیا ہو اور اس وقت کہا گیا ہو جب وہ غیر مستبین الخلق ہو، تو وہ یقیناً باعتبار مایؤل ہوگا اور فقہاء کے کلام میں یہ تاویل اہون ہے بنسبت آیتِ کریمہ "إن أمهتهم إلا اللائی ولدنهم"[2] میں تاویل کرنے سے، کیونکہ فقہاءِ کرام یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کسی زمانے میں استقرارِ حمل کا محل ولادت کے محل سے جدا ہو سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں اور یہ آیت اس علم کے ساتھ نازل ہوئی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب استقرار اور ولادت کے محل جدا ہو سکیں گے، لہٰذا آیت میں تاویل کرنے کے بجائے فقہاءِ کرام کی عبارتوں میں تاویل کرنا اولیٰ ہوگا۔

(۵)...احقر نے مرد کے نطفے کے انقلاب کی نفی نہیں کی تھی، وجود ختم ہونے کی نفی کی تھی، لہٰذا میرا استدلال اب بھی باقی ہے کہ مرد کا نطفہ خواہ اپنی اصل صورت میں کسی عورت کے رحم میں جائے، یا منقلب ہو کر جائے، دونوں صورتوں میں شرعاً کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ آپ نے تحریر

---

(۲) بدائع الصنائع ج: ۸ ص: ۲۱۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وفی طبع سعید ج: ۳، ص: ۲۴۰

(۳) سورة المجادلة آیت نمبر ۲۔

فرمایا ہے کہ:

''مستعار رحم میں منتقل کرنے کے بعد سرے سے اس کا امکان نہیں ہوتا کہ مستعار رحم والی عورت کا نطفہ اس کے ساتھ مختلط ہو سکے۔''

اس سلسلے میں احقر کی گزارش یہ ہے کہ یہ تمام عدمِ امکان عقلی یا عادی ہے، اگر عقلی ہو تو استحالہ کی کوئی دلیل ہونی چاہئے، اور اگر عادی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ موجودہ طبی تحقیق پر مبنی ہوگا، جس کے بدلنے کا ہر وقت امکان ہے، اور بہر صورت عورت کے نطفے کے مختلط ہونے کا امکانِ عقلی باقی ہے اور ایسے امکانِ عقلی کا شرعاً معتبر ہونا بھی بعض احکامِ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً ''لا یسقین ماء أحدكم زرع غيره''[1]

نیز حاملہ من الزنا سے نکاح صحیح ہونے کے باوجود وطی کا حرام ہونا وغیرہ، لہٰذا محض اس وجہ سے صاحبۃ الرحم کی اُمومیت کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی محتاجِ دلیل ہے کہ عورت کی امومیت کیلئے اسکے نطفے کی اختلاط ضروری ہے، اس کے رحم سے بچہ کا تغذیہ اور رحم سے پیدا ہونا ثبوتِ امومیت کے لئے کافی نہیں۔

(۶)...اس نکتہ کی طرف دوبارہ توجہ دِلانا چاہتا ہوں کہ آپ کی ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ ''نفس الامر'' میں نطفہ جس مرد وعورت کا ہے، بچہ کا نسب انہی سے ثابت ہونا چاہئے، حالانکہ شریعت نے اس معاملے میں ''نفس الامر'' پر مدار نہیں ٹھہرایا، بلکہ اگر ولادت ایک ایسے محل سے ہوئی ہو جو حرام بلاشبہ ہے تو بچے کو ثابت النسب قرار نہیں دیا گیا، خواہ نفس الامر میں نطفہ کسی کا بھی ہو اور آپ نے اس پر صاحبۃ الرحم کے نطفے کے اختلاط کے ناممکن ہونے سے جو استدلال فرمایا تھا، اس کے بارے میں اپنی گزارش پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔

(۷)...اصطلاحِ شرع میں اور خود قرآنِ کریم میں بھی ''ام'' اور ''والدہ'' کو ہم معنی قرار دیا

---

(۱) وفی سنن أبی داؤد ج: ۲ ص: ۲۰۴ (طبع دار الفكر بيروت) لا يحل لامرىء يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقى ماءه زرع غيره، و كذا فی السنن الكبرى للبيهقی رقم الحديث: ۵۳۶۶، طبع مكتبة دار الباز مكة المكرمة و مصنف ابن أبی شيبة ۱۷۴۶۰ ج: ۴ ص: ۲۸ (طبع مكتبة الرشد رياض)

گیا ہے، اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''ولادت'' ''امومیت'' کے لئے لازمی شرط ہے، اگر بالفرض آپ کے قول کے مطابق ولادت کا کوئی مشینی طریقہ ایجاد ہو جائے تو اس وقت یہ بات قابلِ غور ہو سکتی ہے کہ ''ولادت'' کے مفہوم میں اختلاطِ نطفہ کو بھی شامل کرلیا جائے، کیونکہ جب ولادت کے حقیقی معنی متعذر ہوئے تو مجاز کی طرف رجوع ممکن ہے، لیکن جہاں ایک ایسی عورت کا رحم موجود ہے جس سے بچے کی ولادت ہوئی تو ''والدہ'' اور ''ولدنهم'' کے الفاظ کا حقیقی مصداق موجود ہے، ایسی صورت میں رجوع الی المجاز کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں ماں اسی کو قرار دینا ہوگا جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو۔

(۸)... آج سے تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے، میں نے امریکی رسالے "Time" میں ایک مضمون پڑھا تھا کہ امریکی عدالتوں میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ قانوناً ماں ''صاحبۃ الرحم'' کو کہا جائے یا ''صاحبۃ النطفہ'' کو۔ صاحبۃ الرحم نے بچہ اپنا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ مقدمہ جیت گئی تھی۔ اگر یہ لادینی عدالتیں جن کے فیصلوں کا دارو مدار صرف طبی اور عقلی تحقیق پر ہے، شرعی اُصولوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں، وہ ''صاحبۃ الرحم'' کو ماں قرار دے تو ''اصحاب النصوص الشرعیۃ'' کو بطریقِ اولیٰ یہی کرنا چاہئے۔ بالخصوص جبکہ اس میں شدید فتنوں کا سنگین خطرہ ہے، جیسا کہ احقر پہلے عرض کر چکا ہے۔

بے شک بچے کا اثباتِ نسب ایک اہم مسئلہ ہے، لیکن جہاں اس کی شرعی حدود میں گنجائش نہ ہو، وہاں کھینچ تان کر ایک کھلے امر غیر مشروع کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو ثابت النسب کہنا احقر کو بہت سنگین معلوم ہوتا ہے۔

تاہم چونکہ مسئلہ نیا ہے، اور اس کا صریح حکم فقہ کی کتابوں میں ملنے کی اُمید بھی نہیں ہے، اس لئے ایسے معاملات میں احقر کو اپنی رائے پر بہت زیادہ جزم نہیں ہوتا، جو گزارشات سمجھ میں آسکیں وہ عرض کریں، اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی اور احقر کی تحریریں دوسرے صاحبِ نظر علماء کی خدمت میں بھیج کر ان کی آراء حاصل کرلیں، میری رائے میں حضرت مولانا مفتی

عبدالشکور ترمذی صاحب ساہیوال ضلع سرگودھا، جناب مفتی عبدالستار صاحب مدرسہ خیرالمدارس ملتان، مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، جامعہ اشرفیہ لاہور اور مفتی رشید احمد صاحب دارالافتاء والارشاد ناظم آباد نمبر ۴ کراچی۔ سے اس مسئلے میں استصواب بہتر ہوگا۔ اگر کوئی نئی دلیل سامنے آئی تو ان شاء اللہ اس پر غور کرلیا جائے گا اور اگر رائے ہو تو اس مسئلے سے متعلق میری اور آپ کی یہ خط وکتابت ''البلاغ'' میں شائع کردیں، تاکہ کوئی دوسرے اہلِ نظر علماء کوئی رائے پیش کرسکیں تو یہ ہم دونوں کے لئے باعثِ راہنمائی ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔

والسلام

(حضرت مولانا) محمد تقی عثمانی (مدظلہم)

بقلم: محمد عبداللہ میمن

یکم صفر ۱۴۱۲ھ

جوابی خط از مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم

بخدمت گرامی حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جناب کا ارسال کردہ عنایت نامہ موصول ہوا تھا، اور جناب کی تجویز پر بھی غور کیا، خیال ہوا کہ آخری مرتبہ مزید میری گزارشات ملاحظہ فرمالیں۔ اگر اب بھی جناب میری رائے کو خطا پر سمجھیں تو شاید جناب کی جانب سے کوئی اور دلیل اپنی خطا پر حاصل ہوجائے، ورنہ پھر جناب کے حسبِ ارشاد جناب کے دلائل اور اپنی گزارشات دیگر اصحاب کی خدمت میں پیش کردوں گا۔ اگرچہ جناب کے ذکر کئے ہوئے بعض حضرات کی خدمت میں پہلے بھی عریضہ ارسال کیا تھا، لیکن ان کے التفات کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا، اور یوں سرے سے جواب سے محروم رہا۔

بہرحال! اگر ان کی رائے حاصل ہوسکی اور پھر سب کی رائے میرے خلاف ہوئی تو ان شاء اللہ اپنی رائے کو ترک کردوں گا، خواہ اطمینان ہو یا نہ ہو کہ اسی میں عافیت نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی

عافیت میں رکھیں اور نفس وشیطان کے وساوس سے حفاظت فرمائیں۔

روزے سے متعلق اپنے مضمون کو جناب کے حسبِ ارشاد مقالہ کی صورت میں لکھ کر ایک عرصہ ہوا، البلاغ کو بھیجا تھا، لیکن ابھی تک کچھ سننے میں نہیں آیا کہ چھپا یا نہیں؟ واللہ تعالیٰ اعلم

اپنی ایک تصنیف ''ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات وافکار تنقید کے میزان میں'' کا ایک نسخہ جناب کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اگر موصول نہ ہوا ہو تو مطلع فرمادیں، دوبارہ ارسال کردوں گا۔

وإذا استبان بعض خلقه غسل وحشر هو المختار (وأدرج فی خرقة ودفن ولم يصل عليه) وكذا لا يرث إن انفصل بنفسه. (درمختار[۱])

(قوله وحشر) المناسب تأخيره عن قوله هو المختار لأن الذی فی الظهيرية والمختار أنه يغسل .وهل يحشر؟ عن أبی جعفر الكبير أنه إن نفخ فيه الروح حشر، وإلا لا .والذی يقتضيه مذهب أصحابنا أنه إن استبان بعض خلقه فإنه يحشر، وهو قول الشعبی وابن سيرين .اهـ .ووجهه أن تسميته تقتضی حشره؛ إذ لا فائدة لها إلا فی ندائه فی المحشر باسمه .وذكر العلقمی فی حديث سموا أسقاطكم فإنهم فرطكم الحديث

فقال :فائدة سأل بعضهم هل يكون السقط شافعا، ومتى يكون شافعا، هل هو من مصيره علقة أم من ظهور الحمل، أم بعد مضی أربعة أشهر، أم من نفخ الروح؟ والجواب أن العبرة إنما هو بظهور خلقه وعدم ظهوره كما حرره شيخنا زكريا. (رد المحتار ج ا ص ٦٥٥[۲])

(۱) باب صلوٰة الجنازة ج:۲ ص:۲۲۸ (طبع سعيد)

(جاری ہے)

(قوله :ولم يصل عليه) أى سواء كان تام الخلق أم لا۔

(قوله إن انفصل بنفسه) أما إذا أفصل كما إذا ضرب بطنها فألقت جنينا ميتا فإنه يرث ويورث لأن الشارع لما أوجب الغرة على الضارب فقد حكم بحياته نهر :أى يرث إذا مات أبوه مثلا قبل انفصاله۔ (أيضا)[۱]

اس عبارت سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:

(۱)...بعض اعضاء یعنی ایک عضو کے بننے پر بھی نسب ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس کی شفاعت اپنے والدین کے لئے ہوگی۔

(الف) وإن السقط المحبنطأ عند باب الجنة حتى يجيء أبواه. لرزين۔[۲]

(ب) (على) رفعه: إن السقط ليراغم ربه إذا أدخل أبويه النار فيقال :أيها السقط المراغم ربه أدخل أبويک الجنة فيجرهما بسرره حتى يدخلهما الجنة۔[۳] للقزوينى بضعف (كلاهما من جمع الفوائد)

(۲)... علقمی نے جس سوال کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مذکورہ مراحل میں سے شفاعت کس مرحلہ میں ہوگی؟ ان مراحل میں علقہ کا بھی ذکر ہے، چونکہ حدیث میں والدین کے لئے شفاعت کا ذکر ہے، لہٰذا اگر ثبوتِ نسب علقہ کے مرحلہ میں حاصل نہ ہوتو سوال میں اس مرحلہ کا ذکر بے معنی تھا اور مجیب کو بھی مناسب تھا کہ سوال میں اس غلط شق کے ایراد کورد کرتے۔

(گذشتہ سے پیوستہ)(۲)الدر المختار مع رد المحتار: ۲ ص: ۲۲۸ (طبع سعيد)

(۱)الدر المختار مع رد المحتار: ۲ ص: ۲۲۸ (طبع سعيد)

(۲)جامع الاصول فى احاديث الرسول ج: ۹ ص: ۵۸۸ (طبع مكتبة دار البيان ومكتبة الحلوانى)

(۳)شعب الايمان للبيهقى ج: ۷ ص: ۱۳۹ (طبع دارالكتب العلمية بيروت)

(۳)...عالمگیریہ کی اس عبارت کو بھی سامنے رکھا جائے:

ومتی انفصل الحمل میتا إنما لا یرث إذا انفصل بنفسه، فأما إذا فصل فهو من جملة الورثة .وبیانه أنه إذا ضرب إنسان بطنها فألقت جنینا میتا فهذا الجنین من جملة الورثة؛ لأن الشرع أوجب علی الضارب الغرة ووجوب الضمان بالجنایة علی الحی دون المیت فإذا حکمنا بحیاته کان له المیراث ویورث عنه نصیبه کما یورث عنه بدل نفسه وهو الغرة۔ (ج٦ ص ۴۵٦)[1]

علاوہ ازیں البحرالرائق کی یہ عبارات:

لأن انفصاله حیا من البطن شرط لإرثه۔ (ج۸ ص۵۰۳)[2]

وإن انفصل میتا لم یرثه لأنا شککنا فی حیاته وقت موت الأب بجواز أنه کان میتا لم تنفخ فیه الروح ویجوز أنه کان حیا فلا یرثه بالشک۔ (أیضاً)[3]

ردالمحتار اور عالمگیریہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ حیات قبل الانفصال کا حکم لگایا گیا ہے، کیونکہ اگر حیات بعدالانفصال کا حکم لگایا جائے تو دیت لازم آنی چاہئے، جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب ضرب کے بعد بچہ زندہ پیدا ہوا اور پھر مرجائے (ضرب کے سبب سے)۔حاصل یہ ہوا کہ ضرب کے وقت بچے کو زندہ سمجھا گیا ہے اور اس ضرب کی وجہ سے موت قبل الانفصال واقع ہوئی ہے۔

اگر ثبوت نسب کیلئے انفصال عن الرحم کو شرط مانیں تو لازم آئے گا کہ ضرب کی وجہ سے جس جنین کی موت قبل الانفصال واقع ہوئی ہو، وہ نہ تو وارث بنے اور نہ ہی موروث، کیونکہ جس وقت

---

(۱)الفتاویٰ الهندیة ج:٦ ص:۴۵٦(طبع رشیدیة)

(۲)البحر الرائق ط ج:۹ ص:۳۹۱(طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

(۳)البحر الرائق ج:۹ ص:۳۹۲(طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

جنایت واقع ہوئی ہے،اس وقت اس کا نسب ثابت نہیں اور جس وقت نسب ثابت ہوسکتا ہے،اس وقت وہ زندہ نہیں ہے،اور چونکہ لازم باطل ہے فالملزوم مثلہ۔

پھر بحر رائق کی عبارات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے،وارث بننے کے لئے انفصال من البطن حیاً شرط ہے،سبب وعلت نہیں جو کہ نسب ہے،اور نسب کے انفصال سے پیشتر ثبوت کی دلیل ہے کہ حمل کیلئے میراث میں حصہ موقوف رکھتے ہیں، اگر انفصال سے پیشتر ثبوتِ نسب نہ ہوتو شوہر کے دورانِ حمل وفات پانے کی صورت میں حمل کے لئے حصہ موقوف رکھنے کی کوئی بنیاد نہ ہوگی۔

اور یہ شرط بھی اس وجہ سے ہے کہ میراث ووصیت وغیرہ کے احکام کا تعلق احیاء سے ہوتا ہے، اموات سے نہیں اور اس صورت میں جبکہ موجودہ دور کے انتہائی SOPHISTICATED آلات نہ ہوں، زندہ ہونے کا قطعی علم بچے کے زندہ پیدا ہونے سے ہوتا ہے، اسی کو صاحبین رحمہما اللہ کی طرف یوں منسوب کیا ہے:

أما عندهما فإن الأحكام إنما تثبت للولد لا للحمل و إنما يستحق اسم الولد بالانفصال ولهذا لا يستحق الميراث والوصية إلا بعد الانفصال[1]

اور یہی وجہ ہے کہ جب شریعت نے غرہ کا ایجاب کیا تو اس کے لئے فقہاء نے زندہ ہونے کا حکم لگایا، کیونکہ شریعت کی جانب سے یہ ایجاب جنین کے زندہ ہونے پر دلیل بنتا ہے۔

رہا ثبوتِ نسب کا حکم تو وہ علیحدہ ہے،سقط سے متعلق روایات وعبارات اس پر دلیل ہیں۔

رہی جناب کی یہ عبارت کہ:

''اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک حمل کا جب تک انفصال نہ ہو،اس وقت تک نہ قطعِ نسب ممکن ہے، نہ اثباتِ نسب، کیونکہ انہوں نے

(۱)بدائع الصنائع ج:۳ص:۲۴۰(طبع سعید)وفی دار الکتب العلمیة بیروت ج:۸ص:۲۱۶

تمام احکام کے ثبوت کی نفی کی ہے تو مندرجہ بالا اُمور کی روشنی میں مجھے اس سے کلی اتفاق نہ ہوسکا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

علاوہ ازیں حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے، اگر ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری کے تین چار دن بعد حاصل شدہ علقہ کو رحم میں منتقل کریں تو امکان ہے کہ رحم میں چھ ماہ سے اتنے دن کم میں بچہ پیدا ہو جائے۔ اس صورت میں انفصال اگرچہ موجود ہے، لیکن مستعار رحم والی عورت کے ساتھ نسب ثابت کرنا ممکن نہ ہوگا اور یہ خرق عادت بھی نہیں ہے۔

مزید بریں کوئی دلیل ایسی بھی موجود نہیں، جس کی بناء پر ایک عضو کے ظاہر ہونے اور علقہ ومضغہ کے درمیان ثبوتِ نسب میں فرق کیا جاسکے۔ اطلاق والے حوالے پچھلے عریضہ میں پیش کئے تھے۔ (مزید وضاحت آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ثبوتِ نسب کے لئے نہ تو انفصال من الرحم شرط ہے اور نہ ہی استبانۂ خلق شرط ہے، آیات سے متعلق پچھلے عریضہ میں ذکر کی ہوئی بات کو اگر قبول نہ کیا جائے تو عرض ہے کہ:

جہاں تک آیت "إن أمهاتهم إلا اللائی ولدنهم"[1] کا تعلق ہے تو اس میں غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ امہات کی اضافت مسلمان مظاہرین کی طرف ہے، کیونکہ اس سے پیشتر یوں ہے "الذین یظاهرون منکم من نسائهم ماهن أمهاتهم"[2] اور منکم میں دونوں ہی احتمال ہیں کہ مخاطبین اول مراد ہوں یا جمیع اہلِ اسلام مراد ہوں، احتمال اول کی صورت میں تو کوئی اشکال نہیں ہوگا، کیونکہ اس وقت ظہار کرنے والوں کو جنہوں نے جنا تھا، بلاریب ان کے نطفے بھی تخلیق میں شریک تھے، اور احتمال ثانی کی صورت میں یہ آئندہ قیامت تک کیلئے پیش گوئی بھی ہوگئی کہ مسلمانوں میں سے ظہار کرنے والوں کی حقیقی مائیں وہی ہوں گی، جنہوں نے

(۱ و ۲) سورۃ المجادلۃ: ۲)

ان کو جنا بھی ہوگا۔(اور پہلے اور آگے ذکر کئے ہوئے دلائل کی بناء چونکہ نطفہ ثبوتِ نسب کے لئے علت ہے، لہذا اس بات کا اضافہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کا نطفہ تخلیق میں شریک بھی رہا ہو۔)

غیر مظاہرین کی مائیں کون ہیں؟ یہ نص اس سے ساکت ہے، مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ان کی ماؤں کے لئے یہ تو ضروری ہوگا کہ ان کے نطفے ان (یعنی غیر مظاہرین) کی تخلیق میں شریک ہوں۔ رہا یہ کہ انہوں نے ان کو جنا بھی ہو تو یہ اس آیت سے قیاس سے ثابت ہوگا اور قیاس سے ثابت شدہ میں تاویل مشکل نہیں ہے۔

رہی یہ آیت "ووصینا الإنسان بوالدیه إحسانا حملته أمه کرها ووضعته کرها"[1] تو اس بارے میں عرض ہے کہ اول تو علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

نزلت کما أخرج ابن عساکر من طریق الکلبی عن أبی صالح عن ابن عباس فی أبی بکر الصدیق رضی الله تعالی عنه إلی قوله تعالی: (وعد الصدق الذی کانوا یوعدون)[2]

تو ایک احتمال تو یہی ہے کہ لام عہد کا ہو، اس صورت میں تو اس آیت سے استدلال صحیح نہیں رہتا۔

اور اگر عموم پر بھی نظر کریں، تب بھی عرض ہے کہ اس آیت سے یہ استدلال کیونکر ہو سکے گا کہ حمل اور وضعِ حمل ثبوتِ نسب کے لئے علت یا شرط ہیں، بلکہ ان کا ذکر تو محض مزید احسان کے استحقاق کے سبب کے طور پر ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔ اس نفس احسان میں ماں اور باپ دونوں ہی شریک ہیں، پھر والدہ کے زیادہ مستحق احسان ہونے کا سبب ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت کا تقاضا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں اور باپ (یعنی

---

(۱) سورۃ الاحقاف: ۱۵

(۲) روح المعانی ج: ۱۳، الجزء السادس والعشرون ص ۱۶ و ۱۷ (طبع مکتبه امدادیة ملتان)

میاں بیوی) دونوں سے ثبوتِ نسب کی علت ایک ہو، جب ہی تو نفس احسان میں دونوں کو شریک کیا، اور وہ علت ہے تخلیق ولد میں نطفے کا اشتراک۔ پھر مذکورہ بالا دلائل کی بناء پر حمل اور وضعِ حمل کو شرط بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اور ماں کے ساتھ حمل اور وضعِ حمل کا ذکر عام عادت کے مطابق ہے، کیونکہ جو صورت زیرِ بحث ہے وہ انتہائی نادر ہے اور مزید بریں اسکا عدم جواز اس کی ندرت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

میری یہ عبارت:

"مستعار رحم میں منتقل کرنے کے بعد سرے سے اس کا امکان نہیں ہوتا کہ مستعار رحم والی عورت کا نطفہ اس کے ساتھ مختلط ہو سکے۔"

اس پر جناب نے یہ فرمایا ہے کہ:

"یہ تمام عدمِ امکان عقلی یا عادی ہے، اگر عقلی ہو تو استحالہ کی کوئی دلیل ہونی چاہئے، اور اگر عادی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ موجودہ طبی تحقیق پر مبنی ہوگا، جس کے بدلنے کا ہر وقت امکان ہے، اور بہر صورت عورت کے نطفے کے مختلط ہونے کا امکانِ عقلی باقی ہے اور ایسے امکانِ عقلی کا شرعاً معتبر ہونا بھی بعض احکامِ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً "لا یسقین ماء أحدکم زرع غیرہ"[1]"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ امورِ عادیہ میں سے ہے اور امورِ عادیہ میں دیگر احتمالاتِ عقلیہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ ان کا اعتبار تو خرقِ عادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت ہماری بحث سے خارج ہے۔ لایسقین ماء أحدکم زرع غیرہ الحدیث، میں بھی ذکر ہے کہ کھیتی دوسرے کی ہے اور حمل کے دوران اول تو رحم کا منہ بالکل بند ہوتا ہے کہ کچھ اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ ثانیاً جنین کے گرد پردے ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے یہ ممکن نہیں کہ دورانِ حمل کسی مرد کا نطفہ جنین کے ساتھ مختلط ہو سکے۔ لہٰذا اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ نطفے کے قرب کی وجہ سے جنین پر اسکے

---

(۱) سنن ابی داؤد ج: ۲ ص: ۲۰۴ (طبع دار الفکر بیروت)
والسنن الکبریٰ للبیہقی رقم ۵۳۶۲ (طبع دار الباز مکۃ المکرمۃ)

کچھ اثرات پڑتے ہیں اور مثلاً جنین کے بالوں کی نشو ونما پر اثر پڑتا ہے، جیسا کہ شارحین ذکر کرتے ہیں، لیکن اتنی بات سے نسب مشتبہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح عورت کے نطفے کا مرد کے نطفے کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے اور بارآوری ہوتی ہے، اس کا پورا عمل جناب کی خدمت میں پیش کیا جاچکا ہے۔ یہ اختلاط اور بارآوری فقط مرد کے نطفے کے ساتھ ہوتی ہے، علقہ ومضغہ وغیرہ کے ساتھ نہیں، علاوہ ازیں حمل کے دوران عورت کے نطفے کا خروج اور حیض موقوف ہوجاتا ہے۔ مہینے میں ایک مرتبہ عورت کے نطفے یعنی ایک بیضۂ انثی کا خروج ہوتا ہے۔ اسی دوران حمل ٹھہر جانے کی صورت کا مقابلہ کرنے کے لئے رحم کی اندرونی تہوں میں تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ اگر حمل ٹھہر جائے تو پھر سلسلہ آگے چلتا ہے، ورنہ رحم کی اندرونی تہہ جھڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے خون رَسنا شروع ہوجاتا ہے، یہی حیض کا خون ہوتا ہے اور اسی میں وہ بیضۂ انثی بھی خارج ہوجاتا ہے۔ ایک دفعہ حمل ٹھہر جائے تو جسم میں تغیرات کی بناء پر مزید بیضۂ انثی کا خروج بند ہوجاتا ہے اور اس طرح حیض آنے بھی بند ہوجاتے ہیں۔ مستعار رحم کو بھی پہلے ادویہ کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے اور اس کو اس مرحلے تک پہنچادیا جاتا ہے کہ وہ علقہ کو قبول کرسکے۔ اب ظاہر ہے کہ عادت کے مطابق بیضۂ انثی کا خروج نہ ہوگا اور بالفرض ہو بھی تو وہ بے کار محض ہوگا، موجود علقہ یا مضغہ کے ساتھ اس کا اختلاط نہیں ہوسکتا۔ یہ تمام امور مشاہدہ وتجربہ پر مبنی ہیں، محض قیاسات پر نہیں۔

رہا جناب کا یہ فرمانا کہ:

> ''اس کے علاوہ یہ بات بھی محتاجِ دلیل ہے کہ عورت کی امومیت کے لئے اس کے نطفے کا اختلاط ضروری ہے، اس کے رحم سے بچہ کا تغذیہ اور رحم سے پیدا ہونا ثبوتِ امومیت کے لئے کافی نہیں۔

اس بارے میں اوپر بہت کچھ عرض کیا جاچکا ہے، مزید جو بات پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مرد سے ثبوتِ نسب کی بنیاد فقط اس کا نطفہ ہے، اسی طرح چونکہ عورت میں بھی نطفہ پایا جاتا ہے اور بچے کی اصل تخلیق کی بنیاد دونوں کے نطفے ہیں اور اصل خلقت میں محض ان ہی کی وجہ سے جزئیت

حاصل ہوتی ہے، لہٰذا عورت سے ثبوتِ نسب کی بنیاد بھی اس کا نطفہ ہونا چاہئے۔

نمبر(۶) کے تحت جناب نے جس نکتہ کی طرف دوبارہ توجہ دِلائی ہے، اس بارے میں عرض ہے کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نفس الامر میں نطفے جن میاں بیوی (مرد و عورت نہیں) کے ہوں گے، بچے کا نسب انہی سے ثابت ہونا چاہئے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ غیر شادی شدہ مزنیہ کی اولاد مرد سے ثابت النسب نہیں ہوتی[۱]۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

طالبِ دعا

عبدالواحد غفرلہ

جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ لاہور

خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کی شرعی حیثیت اور اس سلسلے میں قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کا مؤقف

سوال:- تقریباً دو ہفتے ہوئے کہ دیوبند کے مدرسہ کے مہتمم صاحب ریڈیو پر انٹرویو دے رہے تھے کہ منصوبہ بندی بالکل صحیح اور درست ہے، اس کی وضاحت فرمادیں کہ یہ منصوبہ بندی کا عمل کیا جائز ہے؟

جواب:- خاندانی منصوبہ بندی کی جو تحریک آج کل چل رہی ہے، وہ خلافِ شریعت ہے، کسی انفرادی عذر کی بناء پر ضبطِ تولید کا عمل شرعاً جائز ہوسکتا ہے، لیکن عام مفلسی کے خوف سے ضبطِ ولادت کی تحریک چلانا درست نہیں۔

---

(۱) اسکے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی طرف سے کوئی مزید جواب ریکارڈ پر نہیں ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم سے زبانی پوچھا تو ارشاد فرمایا کہ غالباً مزید جواب اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ ان کی رائے حضرت مفتی عبدالواحد صاحب مد ظلہم کی مذکورہ بالا تحریر کے بعد بھی تبدیل نہیں ہوئی۔ اور انکا موقف یہی رہا کہ بچے کا نسب صرف صاحبۃ الرحم کے علاوہ کسی اور سے ثابت نہیں ہوسکتا لیکن ایک ہی قسم کے دلائل کے تکرار کی بجائے انہوں نے یہ تجویز پہلے ہی پیش فرمادی تھی کہ دونوں طرف کی تحریریں دوسرے اہلِ افتاء کی خدمت میں بھیج دی جائیں۔ اب بھی یہ تحریریں اس غرض سے شائع کی جارہی ہیں کہ دوسرے اہلِ علم بھی اس پر غور فرمائیں۔ (مرتب)

عزل کی اجازت بھی انہی انفرادی اعذار کی بنا پر ہے۔[1] مفلسی کے خوف سے عزل کرنے کو کسی نے جائز نہیں کہا۔ مفلسی کی پوری تفصیل احقر کے رسالے ''ضبطِ ولادت'' میں موجود ہے، جو مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴ سے مل جائے گا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے پورے الفاظ ہمارے سامنے نہیں ہیں، انہوں نے غالباً انفرادی اعذار کی بناء پر ضبطِ تولید کو جائز کہا ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۲/۱۲/۷ھ

ایسی نس بندی کا حکم جس سے تولید کی صلاحیت ختم ہوجائے

سوال:- اگر کسی کی زبردستی نس بندی کی جائے، جس کی وجہ سے انسان اولاد کے قابل نہیں رہتا، اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایسی نس بندی شرعاً بالکل ناجائز ہے اور کسی شخص کو زبردستی اس عمل پر مجبور کرنا اور بھی زیادہ گناہ ہے، تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''ضبطِ ولادت'' ملاحظہ فرمایئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۹۷/۴/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۹ ۳۷/۲۸)

آنکھیں عطیہ کرنے کی وصیت کا حکم

سوال (۱):- کیا کسی شخص کو اپنے مرنے سے پہلے اپنی آنکھیں وصیت کرکے عطیہ کے طور پر دے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) وفی رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی البیع ۶/۴۲۹: (ویکرہ أن تسقی لإسقاط الحمل وجاز لعذر) کالمرضعة إذا ظہر بہا الحمل وانقطع لبنہا ولیس لأبی الصبی ما یستأجر بہ الظئر ویخاف ہلاک الولد قالوا یباح لہا أن تعالج فی استنزال الدم ما دام الحمل مضغة أو علقة ولم یخلق لہ عضو وقدروا تلک المدة بمائة وعشرین یوما۔

وفی الفتاوی التتارخانیة: شرب الدواء لأجل إسقاط الحمل قبل أن یصیر صورة یجوز عند الضرورة والکف عن ھذا خیر و أولیٰ. (تتارخانیة کتاب النکاح ۳/۲۱۶ الفصل السادس والعشرون)

وکذا فی الطحطاوی علی الدر المختار، کتاب الحظر والإباحة ۴/۲۱۴۔

(۲)... مرنے کے بعد آنکھیں نکال لی جاتی ہیں تو نکالنے والے یا نکلوانے والے پر کوئی گناہ تو نہیں؟ ازراہِ کرم فتوی صادر فرمائیں۔

جواب (۱و۲):- آنکھیں نکالنے کی وصیت کرنا یا کسی کے مرنے کے بعد اس کی آنکھیں نکال کر کسی دوسرے کے لگانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کی تفصیل کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''اعضاءِ انسانی کی پیوندکاری'' ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۷ھ

آنکھوں کے عطیہ کی شرعی حیثیت

سوال:- آج کل آنکھوں کا عطیہ دینے کی روایت چل پڑی ہے، میرے خیال میں یہ ایک واقعی انسانی اور عظیم ملّی خدمت ہے، کیا یہ مذہبِ اسلام میں جائز ہے؟

جواب:- شریعت کی رُو سے ایک انسان کا عضو دوسرے انسان کے لگانے کی اجازت نہیں ہے۔[1] خواہ یہ فریقین کی رضامندی سے ہو۔

اس مسئلے کی نقلی و عقلی تشریح اور مفصل دلائل مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

---

(۱) لا يجوز الانتفاع به بحال ما .والآدمي محترم بعد موته على ما كان عليه في حياته .فكما يحرم التداوي بشيء من الآدمي الحي إكراما له فكذلك لا يجوز التداوي بعظم الميت. (شرح كتاب السير الكبير، باب دواء الجراحة ۱۲۸/۱)

نیز بدائع الصنائع میں ہے:

ولو سقط سنه يكره أن يأخذ سن الميت فيشدها مكان الأولىٰ بالإجماع. (بدائع الصنائع، كتاب الاستحسان ۱۳۲/۵)

(و كذا في الهندية ج: ۵ ص: ۳۵۴ الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات)

و عن عائشة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: كسر عظم الميت ككسره حياً. (سنن أبي داؤد ۱۰۱/۲ باب الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''اعضاءِ انسانی کی پیوندکاری'' میں موجود ہیں۔ضرورت ہوتو اس رسالے کا مطالعہ فرمائیں۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۲/۱۰/۹۷ھ

(۱) نیز مزید تفصیل کیلئے جامعہ دارالعلوم کراچی کا مفصل فتویٰ سابقہ ص ۲۲۰ کے حاشیہ نمبر۱و۲ میں ملاحظہ فرمائیں

كتابُ الْحَظْرِ وَالْإِبَاحَة

﴿ حلال وحرام، جائز وناجائز کا بیان ﴾
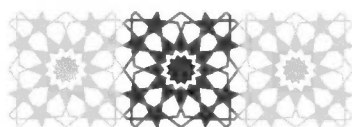
فصل فی الأکل والشرب

(کھانے پینے کے مسائل کا بیان)

ایسنس اور الکحل ملی ہوئی اشیاء کھانے کا حکم
انزائم ملے ہوئے پنیر کے استعمال کا حکم

سوال: (۱) کھانے کی میٹھی چیزوں مثلاً کیک، پیسٹری کسٹرڈ وغیرہ میں جو ایسنس (Essence) خوشبو کے لئے ڈالے جاتے ہیں، وہ عام طور سے پھل یا پھول کے بیجوں سے الکوحل (Alcohal) میں حل کر کے نکالا جاتا ہے، جب کیک، کسٹرڈ وغیرہ کو، 200، 300 درجۂ حرارت پر Bake کیا جاتا ہے تو الکوحل ہوا میں اُڑ جاتا ہے اور صرف پھل پھول کی خوشبو رہ باقی رہ جاتی ہے، کیا میٹھی چیزوں میں خوشبو ڈالنے کے لئے ایسنس کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: (۲)...امریکہ میں پنیر بنانے کے لئے ایک Enzyme کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ جو کہ غیر ذبیحہ گائے یا سور کی آنتوں میں سے Extract کیا جاتا ہے، کیا ایسا پنیر کھانا جائز ہے؟

جواب: (۱)...کھانے کی چیزوں میں الکوحل کے استعمال سے شدید ضرورت کے بغیر پرہیز ہی کرنا چاہئے، البتہ اگر الکوہل واقعی ہوا میں اڑ جاتا ہو تو جہاں ابتلاءِ عام ہو اور دوسری چیزیں کھانے کی نہ ملتی ہوں، وہاں ایسے کیک کے استعمال کی گنجائش ہے:

لکون المستطیر من عصارة الخمر مستحیلا، وقال الشامی:
ومقتضاه عدم اختصاص ذلک الحکم بالصابون، فیدخل فیه کل

ما كان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوى عامة، فيقال: كذلك فى الدبس المطبوخ إذا كان زبيبه متنجسا .... و كذا درديّ خمرا صار طرطيرا و عذرة صارت رمادا أو حماة. (شامی ج: ۱ ص: ۲۱۰)[1]

جواب: (۲) اگر یہ انزائم انفحہ (رینٹ) ہے تو چاہے غیر مذبوح جانور سے لیا گیا ہو اس پنیر کا استعمال جائز ہے اور اگر یہ کوئی اور چیز ہے تو اس پنیر کا حکم بھی یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے انزائم کی اگر کیمیاوی عمل سے حقیقت بدل جاتی ہے، تب تو اس کا استعمال جائز ہے، ورنہ ناجائز۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۸/۶/۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۶۵/۲۸ ب)

جیلٹین کو انفحہ پر قیاس کرنے کا حکم
(پنیر اور جیلٹین سے متعلق اہم تحقیق)

سوال: جلٹین بھی جانور کا جز ہے، اگر رینٹ امام صاحبؒ کے نزدیک حلال ہے، باوجود اس کے کہ جانور شرعی طریقہ پر ذبح نہیں ہوا تو جیلٹین بھی جانور کا جز ہے اور جانور کے غیر شرعی طریقہ پر ذبح کئے جانے کے باوجود بھی رینیٹ پر قیاس کرتے ہوئے گنجائش ہونی چاہئے، دونوں میں اُصولاً

(۱ و ۲) رد المحتار كتاب الطهارة باب الأنجاس ج: ۱ ص: ۳۱۶ (طبع سعيد)

وفى البحر الرائق كتاب الطهارة باب الأنجاس ج: ۱ ص: ۳۹۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) والسابع انقلاب العين فإن كان فى الخمر فلا خلاف فى الطهارة، وإن كان فى غيره كالخنزير والميتة تقع فى المملحة فتصير ملحا يؤكل ......و على قول محمد فرعوا الحكم بطهارة صابون صنع من زيت نجس۔

وفى الهندية كتاب الطهارة الباب السابع فى النجاسة الفصل الأول فى تطهير الأنجاس ج: ۱ ص: ۴۵ (طبع رشيديه) ومنها الاستحالة ...... الحمار أو الخنزير إذا وقع فى المملحة فصار ملحا أو بئر البالوعة إذا صار طينا يطهر عندهما خلافا لأبى يوسفؒ الخ۔

کوئی فرق نظرنہیں آرہاہے، سوائے اس کے کہ پنیر میں نص ہے اور اسمیں نص نہیں ہے اور یہ کوئی خاص فرق نہیں ہے، خصوصاً جبکہ عامۃ نصوص معلول ہوا کرتے ہیں۔ براہِ کرام راہنمائی فرمائیں۔
ابراہیم دیسائی۔

جواب:

گرامی قدر مکرم جناب مولانا ابراہیم ڈیسائی صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا ایک خط فیکس کے ذریعے مؤرخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو میرے پاس بھیجا گیا تھا، میں نے اُسے جواب طلب ڈاک میں اس خیال سے رکھ لیا تھا کہ اطمینان سے جواب دوں گا، لیکن اس کے بعد پے در پے اتنے سفر پیش آئے کہ ڈاک جمع ہوتی چلی گئی اور جواب کا موقع نہ مل سکا، اب کسی طرح پرانی ڈاک نمٹانے کا مرحلہ آیا ہے تو یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے غیر مذبوح جانور کے رینیٹ (Rennet) یعنی انفحہ کو طاہر قرار دیا ہے، اسی طرح اگر جیلٹین (GELATINE) کو بھی اس پر قیاس کر کے جائز کہا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جیلٹین کو انفحہ پر قیاس کرنا من کل الوجوہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ رینیٹ یا انفحہ کو طاہر قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ انفحہ جانور کے اُن اجزاء میں داخل ہے جو "ما لا تحله الحياة" کہلاتے ہیں، جیسے بال، سینگ، ہڈی وغیرہ۔ اور مردار جانور کے یہ اجزاء حنفیہ کے نزدیک پاک ہیں۔ لیکن جو اجزاء "ما تحله الحياة" میں داخل ہیں جیسے گوشت، چربی، کھال وغیرہ، وہ بغیر ذکاۃِ شرعیہ کے پاک نہیں ہوتے۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

وأما الذى له دم سائل فلا خلاف فى الأجزاء التى فيها دم من اللحم والشحم والجلد ونحوها أنها نجسة؛ لاحتباس الدم النجس

فيها، وهو الدم المسفوح. وأما الأجزاء التى لا دم فيها فإن كانت صلبة كالقرن والعظم والسن والحافر، والخف والظلف والشعر والصوف، والعصب والإنفحة الصلبة، فليست بنجسة عند أصحابنا. (بدائع الصنائع ص: ٦٣ ج: ١)[۱]

اسی طرح درمختار میں انفحہ کی طہارت بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ ہیں کہ:

"وكذاكل مالاتحله الحياة حتى الأنفحة واللبن على الراجح ....طاهر۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج: ١ ص: ٢٠٦)[۲]

اس سے بھی معلوم ہوا کہ انفحہ کی طہارت کی علت اس کا "ما لا تحله الحياة" میں سے ہونا ہے، نیز اس کی طہارت اور جوازِ اکل پر نصوص بھی ہیں، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ويدل على ذلک أيضا ما رواه شريک عن جابر عن عكرمة عن ابن عباس قال :أتى النبى صلى الله عليه وسلم فى غزوة الطائف بجبنة، فجعلوا يقرعونها بالعصا، فقال" :أين يصنع هذا؟ "فقالوا: بأرض فارس، فقال" :اذكروا اسم الله عليه وكلوا ."ومعلوم أن ذبائح المجوس ميتة، وقد أباح عليه السلام أكلها مع العلم بأنها من صنعة أهل فارس وأنهم كانوا ;إذ ذاک مجوسا، ولا ينعقد الجبن إلا بإنفحة، فثبت بذلک أن إنفحة الميتة طاهرة۔ (أحكام القرآن للجصاص ص: ١٢٠ ج: ١ باب أنفحة الميتة ولبنها)[۳]

---

(١) فصل فى الطهارة الحقيقية ط۔سعيد۔

(٢) كتاب الطهارة باب المياه ۔ ط۔ سعيد

(٣) (طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

اب جیلٹین کی صورتِ حال یہ ہے کہ میری معلومات کی حدتک وہ اکثر و بیشتر جانوروں کی کھال سے بنائی جاتی ہے، البتہ کبھی ہڈیوں سے بھی بناتے ہیں، اگر وہ خنزیر کے علاوہ کسی حلال جانور کی ہڈی سے بنائی جائے، تب تو اسے ''انفحہ'' پر قیاس کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہڈی بھی ''ما لا تحلّه الحیاة'' میں داخل ہے، لیکن اگر وہ کھال سے بنائی جائے تو انفحہ پر قیاس درست نہیں، کیونکہ کھال ''ما تحلّه الحیاة ''میں داخل ہے، جبکہ انفحہ کی طہارت کی علت اس کا ''ما لا تحله الحیاة'' میں سے ہونا ہے۔

البتہ کھال سے بنی ہوئی جیلٹین میں گنجائش کا ایک اور پہلو معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر چہ اس بارے میں علماءِ عصر کی آراء مختلف ہیں کہ کھال سے جیلٹین حاصل کرنے کے عمل میں انقلاب ِماہیت ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن ایک بات تقریباً یقینی ہے کہ جیلٹین دراصل کولاجین (Collagen) سے حاصل کی جاتی ہے، اور اس کام کے لئے کھال کو دھونے، چونا لگانے، پکانے اور مختلف کیمیاوی مراحل سے گذارنے کے نتیجے میں اس کی دباغت ضرور ہو جاتی ہے، کیونکہ دباغت کی حقیقت یہ ہے کہ کھال میں خون کے جو اثرات اور جو رطوبتیں پائی جاتی ہیں، وہ دور ہو جائیں، چنانچہ علامہ کاسانیؒ دباغت کو طریقۂ تطہیر قرار دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ولأن نجاسة المیتات لما فیها من الرطوبات والدماء السائلة و إنها تزول بالدباغ فتطهر کالثوب النجس إذا غسل۔[۱] (بدائع ص: ۸۵ ج: ۱)

کھال سے جیلٹین حاصل کرنے کے لئے اُسے جس طویل عمل سے گزارا جاتا ہے، اُس سے دباغت کا یہ مقصد یقیناً حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ کھال کو پہلے سادہ پانی سے دھویا جاتا ہے، پھر چونے کے پانی اور مختلف تیزابوں سے دھویا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں کھال سے خون، بالوں اور دوسرے Non-Collagenous اجزاء صاف ہو جاتے ہیں، اس سارے عمل میں تین سے لیکر آٹھ ہفتے تک لگ جاتے ہیں، پھر کولاجین (Collagen) کو جیلٹین میں تبدیل کرنے کے لئے

(۱) کتاب الطهارة فصل و أما بیان ما یقع به التطهیر۔ ط۔ سعید

اسے آگ پر تقریباً چھ ہفتے پکایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک محلول تیار ہوتا ہے، اس محلول کو بار بار فلٹر کر کے اس کے جراثیم مارے جاتے ہیں اور رطوبتیں دور کی جاتی ہیں، بعد میں اسے ٹھنڈا کر کے جیلٹین تیار ہوتی ہے۔

یہ تمام عمل دباغت کے لئے بلاشبہ کافی ہے، اور دباغت سے مردار کی کھال بھی چونکہ پاک ہو جاتی ہے، اس لئے جیلٹین اگر غیر مذبوح جانور کی کھال سے لی گئی ہو، تب بھی اُس کے پاک ہونے میں شبہ نہ ہونا چاہئے۔

البتہ خنزیر چونکہ نجس العین ہے، اس لئے اس کی کھال نہ دباغت سے پاک ہو سکتی ہے، نہ ہڈی کو "ما لا تحله الحياة" ہونے کی وجہ سے پاک کہا جا سکتا ہے، لہٰذا جو جیلٹین خنزیر کی کھال یا ہڈی سے بنائی گئی ہو، اس کا حکم اس بات پر موقوف ہے کہ جیلٹین بنانے کے عمل سے انقلابِ ماہیت ہوتا ہے یا نہیں؟[۱] اور اس مسئلے میں ہنوز احقر کو تردّد ہے۔ ولعل الله يحدث بعد ذلك أمرا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴ رشوال ۱۴۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۴۷/۲۵۵)

سونے چاندی کے برتن میں کھانے کا حکم

سوال: چاندی سونے کے برتن میں کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟

جواب: ہرگز جائز نہیں۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

---

(۱) وفی الدر المختار ۳۱۵/۱ (ط۔ سعید) ويطهر زيت تنجس بجعله صابوناً به يفتي للبلوى۔ وفی الشامية: ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذى عليه الفتوى واختاره أكثر المشايخ خلافاً لأبى يوسف كما فى شرح المنية والفتح وغيرهما۔

(۲) وفی الهداية ج: ۴ ص: ۴۵۳ (طبع رحمانية) ولا يجوز الأكل والشرب والادهان والتطيب فى انية الذهب والفضة للرجال والنساء۔

وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۴۱ (طبع سعيد) وكره الأكل والشرب والادهان والتطيب من إناء ذهب وفضة للرجل والمرأة۔ وفی الهندية كتاب الكراهية ج: ۵ ص: ۳۳۴ (طبع رشيديه) يكره الأكل والشرب

(جاری ہے)

تیجے کی رسم میں پکائے جانے والے کھانے کا حکم

(وضاحت از مرتب)

(تیجہ، شبِ برأت اور گیارہویں کے مسائل کا تعلق اگرچہ "سنت و بدعت" کی فصل سے ہے اسی لیئے فتاویٰ عثمانی جلدِ اول میں صفحہ نمبر:۱۰۱و۱۰۲و۱۰۷و۱۲۵و۱۲۶ پر ان موضوعات پر حضرت والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ موجود ہیں تاہم یہاں اس مقام "فصل فی الأکل والشرب" میں درجِ ذیل دو فتاویٰ اس لئے شامل کیئے گئے ہیں کہ ان فتاویٰ میں ان رسومات کی سنت و بدعت کی حیثیت پر کلام سے زیادہ خاص طور پر ان مواقع پر پکائے جانے والے "کھانوں" سے متعلق تفصیلی حکم بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ان سوالوں اور ان کے جوابات سے واضح ہے)

سوال: تیجے میں جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اسکا تفصیلی حکم بتا دیں۔ کیونکہ کئی دفعہ وہ کھانا گھر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تو تیجے کی تقریب تو اپنی جگہ مگر خاص طور پر اسکے کھانے کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: تیجے وغیرہ کی جو تقریبات ہوتی ہیں، ان میں شریک ہونا اور اس میں کھانا کھانا ناجائز ہے، لیکن وہ کھانا بذاتِ خود حرام نہیں، اگر حرمت کی کوئی اور وجہ نہیں ہے تو کھانا اس کی وجہ سے حرام نہیں ہوتا، ہاں! اس میں بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وارثوں کی اجازت کے بغیر میت کے ترکہ سے کھانا پکایا جاتا ہے بعض اوقات وارثوں میں نابالغ بچے بھی ہوتے ہیں یا ایسی اولاد ہے جس کی اجازت شرعاً معتبر نہیں، یا اتنا پیسہ خرچ کرنے پر سب وارث راضی نہیں ہیں، تو اگر اس قسم کی کوئی وجہ ناجائز ہونے کی ہو تو وہ کھانا بھی ناجائز ہوگا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی شخص نے اپنے پیسے سے تیجہ کیا ہے، صدقہ کا پیسہ یا میراث کا پیسہ اس میں شامل نہیں کیا، تو وہ کھانا بذاتِ خود حرام نہیں ہے، اس تقریب میں شرکت ناجائز ہے، اب اگر فرض کیجئے کہ وہ کھانا کسی نے آپ کے گھر بھیج دیا ہے تو اس کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں، باقی کھانا بھیجنے والوں پر واضح کر دینا چاہیئے کہ ہم ان چیزوں کے قائل نہیں ہیں اور یہ درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم

شبِ براءت کا حلوہ اور گیارہویں کے کھانے کا حکم

سوال: شبِ برات کے حلوے اور گیارہویں کے کھانے کا شرعی حکم کا ہے؟ خاص ان مواقع کے کھانوں کے بارے میں سوال ہے کیا یہ کھانے (شب برات کے حلوے، گیارہویں کے

(گذشتہ سے پیوستہ) والأدهان والتطيب في آنية الذهب والفضة للرجال والصبيان والنساء كذا في السراجية.

کھانے) استعمال کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ان سب کے احکام الگ الگ ہیں، شبِ براءت کا حلوہ تو لوگ محض ایک عادت کے طور پر پکاتے ہیں، اس کے اندر کسی اور کا نام نہیں لیتے، پکانے کو ضروری سمجھنا یا سنت سمجھنا تو بدعت ہے، لیکن وہ حلوہ حرام نہیں ہے۔

اگر کہیں سے حلوہ آ گیا اور اس کو کھا لیا تو ان شاء اللہ گناہ نہ ہوگا، باقی یہ جو گیارہوں کا کھانا پکاتے ہیں، اس میں نہ جانے کیا کیا خرافات کرتے ہیں، بعض اوقات جو غالی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ ذبح تک غیر اللہ کے نام پر کر دیتے ہیں، اس لئے اس سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہئے، اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا تو اس کا کھانا بالکل حرام ہے اور اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا گیا، لیکن نذر مانی ہے اور نذر میں غیر اللہ کو راضی کرنے کے لئے وہ فعل کیا گیا ہے، اگرچہ اس میں اس طرح کی حرمت تو نہیں آتی ہے، لیکن یہ فعل بذاتِ خود حرام ہے، اب یہ پتہ لگانا کہ کس نے کس طرح کیا ہے، یہ بڑا مشکل ہے، اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

﴿فصل فی اللباس و الزینة﴾

(لباس اور زینت کے مسائل)

ممنوع ریشم کی تعریف اور مَردوں کے لئے اصل اور مصنوعی ریشم کے استعمال کا حکم

سوال: ریشمی کپڑا جس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کے لئے پہننا حرام فرمایا ہے، اس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ سمر، ٹرولہ کیرالئیں، بوسکی، لیڈی نڈٹن، ساٹن شنیل میں سے کون سے ریشمی کپڑے ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ مرد کے لئے جو ریشم حرام ہے وہ صرف کیڑوں سے نکلا ہوا ریشم ہوتا

ہے، اس کے علاوہ آج کل مولوی صاحبان جو ریشمی قسم کا رومال (ڈبی والا، چیک دار یا مکہ مدینہ سے آیا ہوا سفید قسم کا) سر پر باندھتے ہیں یا کندھے پر رکھتے ہیں، اصلی ریشم کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں؟ اور اس کا پہننا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: حدیث میں ''حریر'' کی ممانعت آئی ہے۔[1]

اس کی تعریف تمام اہلِ لغت نے ''الإبریسم المطبوخ'' کی ہے (دیکھئے: المغرب)[2] لہٰذا صرف وہ کپڑے مردوں کے لئے ممنوع ہوں گے جو کیڑوں سے نکالے ہوئے ریشم کے ہوں۔[3]

ان میں بھی یہ تفصیل ہے کہ اگر تانا ریشم اور بانا کسی اور چیز کا ہو تو وہ مردوں کے لئے ممنوع نہیں۔[4] ہاں! مکمل ریشم ہو یا بانا ریشم کا اور تانا کسی اور چیز کا ہو تو وہ ممنوع ہے۔[5] اب جتنے کپڑے عہدِ حاضر میں مروّج ہیں، انہیں اس اُصول پر دیکھ لیا جائے کہ وہ شرعاً ریشمی کپڑے کہلائیں گے یا نہیں؟ آج کل زیادہ تر کپڑے میکانکی طور پر بنائے جاتے ہیں، کیڑوں کے ریشم سے نہیں، اس لئے ان کا پہننا ریشم پہننے کے حکم میں نہیں ہے، نائیلن، ٹڑوں وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ہاں! بوسکی کے بارے میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وہ خالص ریشم سے بنتی ہے، اس لئے اس کا پہننا مردوں کے لئے جائز نہ ہوگا۔[6]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۸۶ / ۲۲ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

---

(۱) وفی سنن الترمذی أبواب اللباس باب ما جاء فی الحریر والذهب للرجال ج: ۱ ص: ۳۰۲ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أبی موسی الأشعری، أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: حرم لباس الحریر والذهب علی ذکور أمتی وأحل لإناثهم.

(۲تا۶) المغرب ''فصل الحاء مع الراء'' ج: ۱ ص: ۱۹۴ (طبع مکتبة أسامة بن زید حلب)

وفی المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر کتاب الحاء ج: ۱ ص: ۱۲۹ (طبع المکتبة العلمیة بیروت)

وفی رد المحتار فصل فی اللبس ج: ۶ ص: ۳۵۱ (طبع سعید) قال فی المغرب: الحریر الإبریسم المطبوخ و سمی الثوب المتخذ منه حریرا.

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بغیر پگڑی کے صرف ٹوپی پہننے کا حکم

محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے مکتوبات، ملفوظات وخطبات کا خلاصہ (حضرت ہی کے الفاظ میں) ''دوائے دل'' کے نام سے مرتب کیا ہے، جس کے صفحہ ۵۷ پر ملفوظات کمالات اشرفیہ کے حوالے سے درج ذیل ملفوظ موجود ہے:

> ''تواضع اہم ہے، کسی نے اپنا حال لکھا تھا کہ عمامہ باندھنا خصوصاً جمعہ وعیدین میں بوجہ حیاو خجلت ترک کیا جاوے یا نہیں؟ ترکِ سنت کی وجہ سے حیا کو ترجیح دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جواب میں فرمایا کہ یہ سننِ مقصودہ نہیں، پھر دوسری طرف تواضع بھی مسنون ہے جس کے بعض افراد واجب بھی ہیں تو مقصودیت کی شان تواضع میں زیادہ ہے بہ نسبت عمامہ کے۔''

آنجناب سے گذارش ہے کہ درج بالا ملفوظ پر کچھ تشریحی کلمات تحریر فرمادیں، کیونکہ عمامہ کے بارے میں نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں میں کافی اصرار والتزام پایا جاتا ہے۔

آپ کی تحریر سے شرعی مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ حضرتؒ کے ذوق کی بھی وضاحت ہوجائے گی۔

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی تنویر الأبصار مع الدر المختار فصل فی اللبس ج: ۶ ص: ۳۵۶ (طبع سعید) (و) یحل (لبس ما سداہ إبریسم ولحمتہ غیرہ) ککتان وقطن وخز لأن الثوب إنما یصیر ثوبا بالنسج والنسج باللحمة فكانت هی المعتبرة دون السدی.

وفی الهندیة کتاب الحظر والإباحة الباب التاسع فی اللبس ما یکرہ من ذلک وما لا یکرہ، ج: ۵ ص: ۳۳۰ و ۳۳۱ (طبع مکتبة رشدیه کوئٹه) یجب أن یعلم أن لبس الحریر، وهو ما کانت لحمته حریرا وسداہ حریرا حرام علی الرجال فی جمیع الأحوال الخ

نیز مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب تقریر ترمذی ج: ۲ ص: ۳۲۹ وص: ۳۳۰ (طبع میمن اسلامک پبلشرز) وامداد الفتاویٰ احکام متعلقہ لباس ج: ۴ ص: ۱۲۶ و ۱۲۷ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) وامداد الاحکام ج: ۴ ص: ۳۳۳۔

افادۂ عام کے لئے آپ کی تحریر کو اپنے ماہنامہ ''محاسنِ اسلام'' میں بھی شائع کردیا جائے گا۔ اُمید قوی ہے کہ ''محاسنِ اسلام'' بھی آپ کی نظر مبارک سے گزرا ہوگا۔ تاہم اس کے چند شمارے نئی کتب ''دوائے دل'' کے ساتھ آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔

احقر محمد اسحٰق عفی عنہ (ملتان)

جواب:

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم و على آله وأصحابه أجمعين وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے عمامہ کے بارے میں جو کچھ اس ملفوظ میں ارشاد فرمایا ہے، وہی صحیح اور معتدل مؤقف ہے، یقیناً حضورِ نبیٔ کریم ﷺ سے عمامہ باندھنا ثابت ہے، لہٰذا اس سنت کی اتباع میں عمامہ باندھنا باعثِ اجر اور خیر و برکت کا سبب ہے، لیکن جیسا کہ حضرتؒ نے فرمایا: یہ سننِ مقصودہ میں سے نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ سے ٹوپی پہننا بھی متعدد روایات سے ثابت ہے اور بعض حضرات نے جو کہا ہے کہ عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی پہننا مشرکین کا طریقہ ہونے کی بناء پر مکروہ ہے۔ (كما نقله العلى القارى عن بعض العلماء فى مرقاة المفاتيح ج: ۸ ص: ۱۴۷، كتاب اللباس) اس کی بنیاد حضرت رکانہؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''فرق ما بيننا و بين المشركين العمائم على القلانس''

ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپیوں پر عماموں سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب ان بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ مشرکین صرف ٹوپیاں پہنتے ہیں اور مسلمان ٹوپیوں پر عمامہ بھی پہنتے ہیں۔[۲] لیکن اوّل تو یہ حدیث ضعیف ہے، امام ترمذیؒ نے اس کو

---

(۱) الفصل الثانى رقم الحديث ۴۳۴۰ (طبع رشيدية)

(۲) وفى مرقاة المفاتيح ۴۳۴۰ (طبع رشيدية) ... أى نحن نتعمم على القلانس وهم يكتفون بالعمائم الخ

روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے:

"هذا حديث حسن غريب، و إسناده ليس بالقائم"[1]

اورامام ابوداؤدؒ نے بھی یہ حدیث ذکر کی ہے۔[2] لیکن وہ بھی انہی ابوالحسن عسقلانی اور ابوجعفر بن محمد ابن رکانہ سے مروی ہے۔[3] جن سے امام ترمذیؒ نے یہ حدیث روایت کی ہے، اور یہ دونوں راوی مجہول ہیں، اور حافظ منذریؒ نے اسی لئے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے امام ترمذیؒ کے تبصرے پر اعتماد کیا ہے۔ (تلخیص المنذری ص: ۴۵ ج:۶)[4]

دوسرے اس حدیث کا مطلب علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا ہے کہ مشرکین عماموں کے نیچے ٹوپی نہیں پہنتے اور مسلمان عماموں کے نیچے ٹوپی پہنتے ہیں۔

أي الفارق بيننا أنا نحن نتعمم على القلانس و هم يكتفون بالعمائم"

یعنی ہمارے اوران کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامے پہنتے ہیں، اور وہ صرف عماموں پر اکتفاء کرتے ہیں۔ (الکاشف عن حقائق السنن للطیبیؒ ص: ۲۱۶ ج: ۸)[5]

نیز ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن الملکؒ اور بعض دوسرے شراحِ حدیث سے بھی حدیث کی یہی تشریح نقل فرمائی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح ص: ۱۴۷ ج: ۸ کتاب اللباس) اس کے برعکس یہ تشریح کہ مشرکین عمامہ نہیں پہنتے صرف ٹوپی پہنتے ہیں، ملاعلی قاریؒ نے جزری کے حوالے سے بعض نامعلوم علماء سے نقل کی ہے۔[7] اور معلوم علماء میں سے صرف میرکؒ کا حوالہ دیا ہے، اور غور کرنے سے یہ تشریح صحیح معلوم نہیں ہوتی۔[8] کیونکہ اوّل تو مشرکینِ عرب میں عمامے کا رواج تھا، بلکہ یہ ان کا شعار سمجھا جاتا تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام لجواد علی ص: ۴۸ تا ۵۲، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

---

(۱) سنن الترمذی أبواب اللباس ج: ۱ ص: ۳۰۸ (طبع قدیمی کتب خانه)
(۲ و ۳) سنن أبی داؤد كتاب اللباس باب فی العمائم ج: ۲ ص: ۲۰۷ و ۲۰۸ (طبع سعید)
(۴) (طبع المكتبة العصرية)
(۵) (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية)
(۶) مرقاة المفاتيح رقم الحديث ۴۳۴۰ (طبع رشيدية)
(۷ و ۸) مرقاة المفاتيح رقم الحديث ۴۳۴۰ (طبع رشيدية كوئٹه)

"والعمامة هی فخرهم و عزهم و أفخر ملبس يضعونه على رؤسهم"[1]

اور آخر میں لکھتے ہیں:

"وجعلوا العمامة شعارا للعرب و رمزا لهم إذا زال زالت عروبتهم"[2]

تیسرے اس تشریح سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عمامہ کے بغیر ٹوپی پہننے میں مشرکین سے مشابہت ہے اوراس لئے وہ مکروہ ہے، یہ اس لئے درست نہیں کہ متعدد روایات میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا صرف ٹوپی پہننا بھی مروی ہے، مثلاً:

(۱)... صحیح بخاریؒ میں حضرت حسن بصری کا یہ قول تعلیقاً نقل کیا گیا ہے کہ:

إن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا يسجدون و أيديهم فی ثيابهم و يسجد الرجل منهم على قلنسوته و عمامته۔" (صحیح بخاری، کتاب الصلاة، باب السجود على الثوب ص: ۵۶ ج: ۱)[3]

مصنف عبدالرزاق میں یہ اثر موصولاً تقریباً انہی الفاظ سے مروی ہے۔ (فتح الباری ص: ۴۹۳ ج:۱)[4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ عماموں پر بھی سجدہ کر لیتے تھے اور ٹوپیوں پر بھی، ظاہر ہے کہ ٹوپی پر سجدہ کرنا اسی وقت متصور ہے جب اس کے ساتھ عمامہ نہ ہو، اگر ٹوپی عمامے کے نیچے ہو تو وہ عمامہ میں چھپ جاتی ہے، اس لئے اس پر سجدہ نہیں ہوسکتا۔

(۲)... متعدد محدثین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شہید ہونے والوں کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں، اور پہلی قسم کا تذکرہ کرتے

(۱ و ۲) باب اللباس ج: ۹ ص: ۴۸ تا ۵۲ طبع دار الساقی، موقع مکتبة المدينة الرقمية۔

(۳) باب السجود على الثوب فی شدة الحر وقال الحسن: كان القوم يسجدون على العمامة والقلنسوة و يداه فی كمه ج: ۱ ص: ۸۶ (طبع دار طوق النجاة، وفی طبع دار ابن كثير يمامه بيروت ج: ۱ ص: ۱۵۰۔

(۴) ج: ۲ ص: ۳۲۸ (طبع دار المعرفة بيروت)

ہوئے فرمایا کہ ان کا درجہ اتنا اونچا ہوگا کہ لوگ ان کی طرف اس طرح سر اُٹھا کر دیکھیں گے یہ کہہ کر آپ نے سر اتنا بلند کیا کہ آپ کی ٹوپی گرگئی۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے اس میں شک ہے کہ ٹوپی آنحضرت ﷺ کی گری یا حضرت عمرؓ نے یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سر اُٹھایا اور ان کی ٹوپی گری۔ (جامع ترمذیؒ ص: ۲۹۳ ج:۱[۱] و مسند احمدؒ ص:۲۲ ج:۱[۲])

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے معجم طبرانی میں مروی ہے:

"أن رسول الله ﷺ كان يلبس قلنسوة بيضاء" (مجمع الزوائد ص: ۲۱۱ ج: ۵، حديث: ۸۵۰۵[۳])

اس پر علامہ ہیثمیؒ نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

" فيه عبدالله بن خراش وثقه ابن حبان، وقال: و ربما أخطأ و ضعفه جمهور الأئمة و بقية رجاله ثقات.[۴]

اس کے بعد انہوں نے یہی حدیث ایک اور ضعیف سند سے نقل کی ہے جو عبداللہ بن خراش کی متابعت کرتی ہے۔[۵]

(۴) علامہ عراقیؒ نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے:

أجود إسناد فى القلانس ما رواه أبو الشيخ عن عائشة: كان يلبس القلانس فى السفر ذوات الآذان و فى الحضر المضمرة يعنى الشامية.

ٹوپیوں کے بارے میں سب سے اچھی سند کی روایت وہ ہے جو ابوالشیخ رحمہ اللہ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ آپ سفر میں کانوں والی ٹوپیاں پہنتے تھے اور حضر

(۱) سنن الترمذى فضل الشهداء عند الله ج: ۴ ص: ۱۷۷ (طبع دار إحياء التراث العربى بيروت) وفى طبع دار الفكر بيروت ج: ۳ ص: ۹۸.

(۲) مسند أحمد، الجزء الأول ج: ۱ ص: ۲۹۳ طبع مؤسسة الرسالة بيروت، وفى طبع مكتبة مؤسسة قرطبة قاهرة ج: ۱ ص: ۲۲.

(۳ تا ۵) باب فى القلنسوة ج: ۵ ص: ۲۱۱ و ۲۱۲ (طبع دار الفكر بيروت)

میں (بغیر کانوں کی) شامی ٹوپیاں۔ (اتحاف السادۃ المتقین ص: ۱۲۹ ج: ۷)[1]

ظاہر یہی ہے کہ ان روایات میں آپ کے ٹوپی پہننے کا جو ذکر ہے وہ بغیر عمامے کے ہے، چنانچہ امام غزالیؒ اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"و کان یلبسھا تحتھا القلنسوۃ و کان یلبس القلنسوۃ بغیر عمامۃ۔"

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ پہنتے تھے اور اس کے نیچے ٹوپی پہنتے تھے اور عمامہ کے بغیر بھی ٹوپی پہنتے تھے۔ (إحیاء العلوم مع شرح الزبیدی ص: ۱۲۹ ج: ۷)[2] وزاد المعاد ص: ۱۳۵ ج: ا فصل فی ملابسہ صلی اللہ علیہ وسلم)[3]

اس کے علاوہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے صرف ٹوپی پہننا بہت سی روایات میں بدرجۂ استفاضہ مروی ہے، جن میں حضرت وابصہ بن معبدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت علی بن حسینؒ، حضرت ضحاکؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ داخل ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سننِ ابی داؤد، باب الصلاۃ علی عصاص: ۱۰۷ ج: ا[4] ومصنف ابنِ ابی شیبۃ ص: ۲۱۲ ج: ۸ فی لبس القلانس[5] وطبقات ابنِ سعد ص: ۱۶۱ ج: ۵)[6]

اگر بغیر عمامے کے صرف ٹوپی پہننا مشرکین کا لباس ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوتا تو یہ حضرات اس سے بچنے کا اہتمام کرتے، بلکہ یہ کراہت مشہور و معروف ہونی چاہئے تھی، حالانکہ صحابہؓ و تابعین سے ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے۔

لہٰذا صرف ٹوپی پہننے کو مکروہ سمجھنا درست نہیں ہے اور یہ حکم خارجِ نماز اور داخلِ نماز یکساں ہے، بعض حضرات اس سلسلے میں ایک فقرہ حدیث کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ:

(۱) ج: ۸ ص: ۲۵۵ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

(۲) اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء العلوم ج: ۸ ص: ۲۵۴ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) واحیاء العلوم مع تخریج الحافظ العراقی ج: ۳ ص: ۴۴۴ (طبع بیروت)

(۳) ج: ۱ ص: ۸۸ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

(۴) ج: ۱ ص: ۳۵۷ (طبع دار الکتاب العربی بیروت)

(۵) طبع دار السلفیۃ الہندیۃ و طبع دار القبلۃ

(۶) ج: ۵ ص: ۲۱۸ (طبع دار صادر بیروت)

صلاۃ بعمامۃ تعدل خمسا وعشرین صلاۃ بلا عمامۃ و جمعۃ بعمامۃ تعدل سبعین جمعۃ بلا عمامۃ والصلاۃ فی العمامۃ بعشرۃ آلاف حسنۃ۔

یعنی عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا عمامہ کے بغیر پچیس نمازوں کے برابر ہے اور عمامہ کے ساتھ جمعہ بغیر عمامہ کے ستر جمعوں کے برابر ہے اور عمامہ میں نماز پڑھنا دس ہزار نیکیوں کے برابر ہے۔

لیکن یہ حدیث موضوع ہے، اور متعدد محدثین نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے، حافظ سخاویؒ نے المقاصد الحسنۃ (ص: ۲۶۳ نمبر ۶۲۴)[1] میں، ملا علی قاریؒ نے الموضوعات الصغریٰ (ص: ۸۷ نمبر ۱۷۷)[2] میں اور علامہ شوکانیؒ نے الفوائد المجموعۃ (ص: ۱۸۷ کتاب اللباس والتختم نمبر ۳)[3] میں اسے موضوع قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمامہ پہننا حضور نبی کریم ﷺ کی سنتِ عادیہ ہے اور اس سنت کی اتباع کی نیت سے عمامہ پہننا باعثِ اجر وفضیلت ہے، لیکن اسے واجب سمجھنا یا اس کے بغیر صرف ٹوپی میں نماز پڑھنے یا پڑھانے کو مکروہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، البتہ جو شخص عمامہ کے بغیر باہر نکلنے یا مجمع میں جانے سے پرہیز کرتا ہو، اس کے لئے بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا بیشک مکروہ ہے۔ اور یہی مؤقف ہمارے تمام بزرگوں کا رہا ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہ نے فتاوی رشیدیہ میں بھی یہی مؤقف اختیار فرمایا ہے۔[4] حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے امداد الفتاوی (ص: ۲۵۶ ج: ۱)[5] میں کئی سوالات کے جوابات میں یہی فرمایا، حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے فتاوی دار العلوم دیوبند (ص: ۹۷ وص:

---

(۱) ج: ۱ ص: ۴۲۳ و ج: ۱ ص: ۴۶۲ (طبع دار الکتاب العربی بیروت)
(۲) (طبع مکتب المطبوعات الاسلامیۃ حلب)
(۳) (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)
(۴) فتاوی رشیدیۃ ص: ۳۳۹ (طبع سعید)
(۵) طبع مکتبۂ دار العلوم کراچی

۱۲۰ ج:۴)[۱] اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے امداد الاحکام (ص:۵۲۲ ج:۱)[۲] اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے کفایۃ المفتی (ص:۱۱۵ ج:۳)[۳] میں بھی کم وبیش یہی احکام بیان فرمائے ہیں۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت، خواہ وہ مقصودہ ہو یا غیر مقصودہ، ایک محبّ کے لئے قابلِ اتباع اور باعثِ خیر وبرکت ہے، اس لئے بہت سے علماء اور اہل اللہ عمامہ کا اہتمام کرتے آئے ہیں، حضرات مشائخِ نقشبندیہ کا اہتمام بھی اسی بناء پر ہے اور یہ اہتمام یقیناً بہت مبارک ہے، اپنے عمل میں ایسی سنتوں کا اہتمام اور اپنے متوسلین کو ترغیب دینا چنداں قابلِ اعتراض نہیں، لیکن چونکہ بہت سے لوگوں کا انداز ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ اس سنتِ عادیہ کو واجب کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں، بالخصوص نماز میں اس کو بہت ضروری سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ بغیر عمامے کے نماز کو مکروہ قرار دیتے ہیں، اور ہمارے بلاد میں یہ غلط فہمی بہت زیادہ عام ہوگئی ہے، اس لئے ہمارے متعدد بزرگوں نے اس غلط خیال کی تردید کے لئے عمامہ کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کا جو ارشاد آپ نے اپنے خط میں نقل کیا ہے، اس میں حضرتؒ نے اپنے ایک مسترشد کو جواب دیا ہے، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شیخ اپنے مسترشد کو جو مشورے دیتا ہے، اس میں اس کے باطنی حالات اور دوسرے بہت سے عوامل پیشِ نظر ہوتے ہیں اور ضروری نہیں کہ جو مشورہ ایک شخص کو دیا گیا ہو وہ ہر شخص کے لئے قابلِ عمل ہو۔ اُن صاحب کے حق میں آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ تواضع چونکہ سنتِ مقصودہ اور بعض حالات میں واجب ہے، اور عمامہ سنتِ غیر مقصودہ، اور ان کے حق میں دونوں میں تعارض ہو رہا تھا، اس لئے آپ نے تواضع کو ترجیح دی اور شاید ان صاحب کو یہ غلط فہمی بھی تھی کہ عمامہ سنتِ مؤکدہ ہے اور اس کے ترک میں کراہت ہے، اس سے ان کی یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔ البتہ جہاں عمامہ

---

(۱) دار الاشاعت کراچی۔
(۲) طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی۔
(۳) طبع دار الاشاعت کراچی۔

اور تواضع میں کوئی تعارض نہ ہو، وہاں یقیناً اتباعِ سنت کی نیت سے عمامہ پہننا افضل ہوگا، بشرطیکہ اس کے استحباب کو اسی درجہ میں رکھا جائے جس میں وہ واقعۃً ہے، اس سے آگے نہ بڑھایا جائے، کیونکہ ہمارے دین میں ہر چیز کا ایک مقام ہے، اور اسی مقام کا تحفظ تفقہ فی الدین ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد تقی عثمانی
۱۴۲۶/۵/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۸۰۴/۵)

ٹوپی کی شرعی حیثیت

(وضاحت از مرتب)

راولپنڈی کے مفتی محمد رضوان صاحب نے ''ٹوپی'' سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں تفصیلی فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجا، جس میں ٹوپی کا ثبوت، ٹوپی کے اوپر رومال پہننے، عمامہ کے بغیر ٹوپی کا حکم، اور ننگے سر نماز پڑھنے سے متعلق احکام کا جائزہ لیا گیا تھا، حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اس مسودہ کا مطالعہ فرمانے کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی۔

یہ فتویٰ نہایت طویل ہے، نیز یہ ''ٹوپی کی شرعی حیثیت'' کے نام سے مفتی محمد رضوان صاحب کی طرف سے علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہاں طوالت سے بچنے کے لئے اس فتویٰ کا صرف اصل ابتدائی حصہ اور فتویٰ سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کی رائے شائع کی جارہی ہے۔ (مرتب)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین درج ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱)... کیا ٹوپی پہننا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہے؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ٹوپی کا عمامہ کے بغیر پہننا اور عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی میں نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ بلکہ خیر القرون کے دَور میں سب مرد حضرات ہمیشہ عمامہ پہنا کرتے تھے اور عمامہ پہن کر ہی ہمیشہ نماز پڑھا کرتے تھے اور

حضور علیہ وسلم یا صحابۂ کرامؓ سے ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

(۲)... آج کل دنیا بھر کے بہت سے علماء اور نیک لوگ ٹوپی کے اوپر مخصوص رومال اوڑھتے ہیں، اس بارے میں سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سنت سے ثبوت ہے؟

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بعد کی پیداوار ہے اور اس کا سنت سے کوئی ثبوت نہیں اور اس کو ثواب سمجھنا بدعت ہے۔

(۳)... بعض حضرات ترمذی شریف کی حدیث پیش کر کے کہتے ہیں کہ اس حدیث سے عمامہ کے بغیر ٹوپی پہننا مشرکوں کا عمل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۴)... آج کل اکثر مسلمان ننگے سر رہنے سہنے اور بازاروں ومحفلوں میں آنے جانے کے عادی ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹوپی کی کوئی ضرورت نہیں، اگر ضرورت بھی ہے تو صرف نماز کے لئے ہے؟

(۵)... آج کل لوگوں میں کیونکہ ٹوپی پہننے کا رِواج نہیں، اس لئے بہت سے لوگ ننگے سر نماز پڑھتے ہیں، اور جب ان کو ننگے سر نماز پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ٹوپی پہننے کا کوئی ثبوت نہیں؟

شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ ان سوالات کے مدلّل ومفصل جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ فقط

جواب (از مفتی محمد رضوان)

سرڈھانپنا حضور علیہ وسلم ودیگر انبیاءِ کرام اور صحابۂ کرام وتابعین اور تبعِ تابعین اور تمام اولیاء وصلحاء کی سنت وعادت رہی ہے اور اس کی بنیاد حیاء وغیرتِ انسانی پر ہے اور سرڈھانکنے میں جس طرح اللہ تعالیٰ سے حیاوغیرت کرنا پایا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے انسانوں سے بھی حیاوغیرت کرنا پایا جاتا ہے، اور سر کا حصہ تمام قوموں میں دوسری قوموں سے ممتاز ہونے کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے، اور سر کو جسم کے دوسرے حصوں پر انتہائی فضیلت حاصل ہے، اور حضور علیہ وسلم انبیاءِ کرام اور صحابہؓ وتابعینؒ سے سر پر عمامہ پہننا اور صرف ٹوپی پہننا دونوں ثابت ہیں، حضور علیہ وسلم اور صحابۂ کرام وتابعینِ

عظام ٹوپی کے اُوپر عمامہ بھی پہنتے تھے اور بعض اوقات عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی پہنا کرتے تھے، اس لئے جس طرح ٹوپی کے اُوپر عمامہ پہننا سنت اور سلفِ صالحین کا طریقہ ہے، اسی طرح بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی پہننا بھی سنت سے ثابت اور سلفِ صالحین کا طریقہ اور صلحاءِ امت میں ہر دور میں (قرناً بعد قرنٍ) چلا آرہا ہے، اور ٹوپی کے اُوپر علماء وصلحاء کا مخصوص رومال پہننا بھی سنت سے ثابت ہے اور بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی پہننے کو غلط یا خلافِ سنت کہنا یا ٹوپی کے اُوپر عمامہ پہننے کو ضروری یا لازم سمجھ لینا درست نہیں۔ حضور ﷺ اور صحابۂ کرامؓ وتابعینؒ سے مختلف قسم کی ٹوپیاں پہننا ثابت ہے، سر کے ساتھ چمٹی ہوئی ٹوپی بھی اور لمبی ٹوپی بھی اور کانوں والی ٹوپی بھی اور سادہ کپڑے کی ٹوپی بھی اور اُونی اور گرم ٹوپی بھی اور ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا بھی ثابت ہے، لیکن آج کل کی طرح ننگے سر رہنا سہنا اور پھرنا اور اسی حال میں نماز پڑھ لینا حضور ﷺ اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت نہیں، بلکہ یہ طریقہ مکروہ اور سنت کے خلاف ہے، اور مسلمانوں میں پہلے اس کا رواج نہ تھا، بلکہ بہت بعد میں یہ طریقہ مسلمانوں میں کافروں سے آیا ہے۔ لہٰذا حیاء وغیرت کا لحاظ کرتے ہوئے اور مسلمانوں کو اپنی شان وشوکت ظاہر کرنے اور دوسروں سے ممتاز کرنے کے لئے سر پر اسلامی طریقہ پر ٹوپی یا عمامہ پہننا چاہئے اور ننگے سر پھرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کیونکہ ننگے سر پھرنا اسلامی شان نہیں، بلکہ اسلامی شان کے خلاف اور بری عادت ہے۔

(اس کے بعد تفصیلی دلائل اور دیگر احکام مذکور ہیں، من شاء التفصیل فلیراجع إلیه)

جواب: از حضرت والا دامت برکاتہم

گرامی قدر مکرم زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

منسلک مسودہ الحمدللہ سرسری دیکھ سکا، شروع میں حاشیہ پر کچھ مشورے لکھدئے۔ ماشاء اللہ اس موضوع پر جس کی آج کل ضرورت تھی، بڑا اچھا مواد آپ نے جمع فرمادیا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

صرف اتنی بات یہ ہے کہ جتنی احادیث وروایات ہیں، سب کی اسنادی تحقیق ائمہ کے حکم

علی الحدیث کے ساتھ ہو جائے تو بہتر ہے۔

پھر اس کا عربی ترجمہ بھی مناسب ہے، کیونکہ عرب ممالک میں یہ وباء عام ہے، وہاں کے لئے بطورِ خاص اسنادی تحقیق کی ضرورت ہے۔

والسلام

۱۴۳۰/۴/۹ھ

فصل فی التصاویر والتلفزیون

(تصویر، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر سی ڈی کے احکام)

تصویر کھینچنے اور کھینچوانے کا حکم

سوال:- تصویر کھینچوانے کا کیا حکم ہے؟ آپ کی بھی تصویر آتی ہے، کیا معاملہ ہے؟

جواب:- تصویر کھینچنا اور کھینچوانا ناجائز ہے۔[1] بے خبری میں کوئی تصویر کھینچ لے تو مجبوری ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی

ٹی وی دیکھنے کا حکم

سوال:- ٹیلیویژن دیکھنا گناہ ہے یا نہیں؟ کیا عورتیں ٹیلیویژن دیکھ سکتی ہیں؟

جواب:- موجودہ حالات میں ٹیلیویژن دیکھنا کئی گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس سے مردوں اور عورتوں دونوں کو پرہیز کرنا لازم ہے۔

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۶/۲/۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۰۹ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

ٹی وی گھر پر رکھنے کا حکم

سوال:- ہمارے بچے ضد کرتے ہیں کہ ٹی وی خریدیں اور ہم نہیں خریدتے تو ہمارے بچے

---

(۱) تفصیلی دلائل اور حوالہ جات کے لئے "تصویر کی شرعی حیثیت" مصنفہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملاحظہ فرمائیں۔

شام کے وقت اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے ہیں، ٹی وی میں بعض پروگرام اچھے ہوتے ہیں اور بعض فضول۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ہم خریدیں یا نہیں؟

یہ گناہ صغیر ہے یا کبیرہ؟ اور ٹی وی سے خبریں دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- بحالاتِ موجودہ ٹیلی ویژن بہت سے منکرات کا مجموعہ ہے اور اس کے گھر میں رہنے سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا اسے خرید کر گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں، بچوں کو مناسب طریقے سے فہمائش کرنی چاہئے اور رفتہ رفتہ اُن کے ذہن کو اس معاملے میں بنانا چاہئے۔

واللہ اعلم
۱۳۹۸/۲/۹ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۵ الف)

ٹی وی اور ریڈیو سے متعلق قدیم فتویٰ

(وضاحت از مرتب)

ٹی وی پروگراموں اور اس پر علماء کے آنے سے متعلق پہلے دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا درج ذیل فتویٰ جاری ہوتا تھا، بعد میں نئے حالات ومسائل کی بناء پر نیز ڈیجیٹل کیمرے کی تصویر کی فنی ٹیکنیک کی بناء پر حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحقیق فرمائی، جس پر مجلسِ تحقیق میں تفصیلی غور وخوض کیا گیا۔ اس جدید تحقیق کے مطابق اب دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے حضرت والا دامت برکاتہم کا جو فتویٰ جاری ہوتا ہے وہ آگے ص: پر آرہا ہے، لہٰذا اُسی فتویٰ کو حتمی سمجھا جائے۔ (محمد زبیر)

(۱)...ٹی وی فلم اور براہِ راست پروگرام کا حکم

(۲)...تبلیغی اُمور پر مبنی ویڈیو کیسٹ کا حکم

(۳)...ٹی وی، ریڈیو کی مرمت کا حکم

(۴) مذکورہ اُمور پر فقہ اکیڈمی کی رائے

(۵)...ٹی وی پر علماء کے آنے کا حکم

(۶)...ٹی وی کے ادارے میں ملازمت کا حکم

سوال:- عرض اینکہ پاکستان کے بعض مذہبی حلقوں میں یہ بات سننے میں آئی ہے کہ ٹیلیویژن کلی طور پر ناجائز ہے، جبکہ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حرمین شریفین میں ٹی وی کیمرے نصب ہیں، جس سے باقاعدگی سے اذانیں اور نمازیں نشر کی جاتی ہیں، یہ امر ٹی وی کے جائز ہونے کا تاثر دیتا ہے، عوام الناس کی راہنمائی کے لئے آپ سے درج ذیل سوالوں کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱)...کیا ٹی وی کی فلم تصویر کے احکام میں داخل ہے یا نہیں؟

(۲)...کیا ٹی وی فی نفسہٖ غیر شرعی اور ناجائز ہے یا اس کا انحصار اچھی و بری فلم کے ہونے پر ہے۔

(۳)...کیا تبلیغی اُمور پر مبنی ویڈیو کیسٹ بنوانا اور دیکھنا بھی ناجائز ہے؟

(۴)...کیا ٹی وی، ریڈیو اور دوسرے الیکٹرونک آلات کی مرمت کی دوکان کی آمدنی جائز ہے؟

(۵)...کیا فقہ اکیڈمی نے ان اُمور پر کوئی فیصلہ کیا ہے؟

(۶)...کیا ٹی وی پروگرام میں جو اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہو، حصہ لینا ناجائز ہے؟

(۷)...کیا ٹی وی کے ادارے میں ملازمت ناجائز ہے؟

جواب:- موجودہ حالات میں ٹیلیویژن جن بہت سے منکرات ومحرمات اور فواحش پر مشتمل ہے، جن کے بغیر کسی وقت ٹی وی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، ان کی بناء پر یہ بات طے شدہ ہے کہ ٹی وی کا گھر میں رکھنا اور اس کا استعمال ناجائز ہے۔

موجودہ حالات کے پیشِ نظر چونکہ ٹی وی کا غالب استعمال حرام کاموں میں ہے، اس لئے یہ بحث خالص نظریاتی اور علمی نوعیت کی ہے کہ جو پروگرام فی نفسہٖ جائز ہوں، صرف ان کے دیکھنے اور دکھانے کے لئے ٹی وی کا کیا حکم ہے؟ اس لئے جب ٹی وی کے بارے میں سوال آتا ہے تو اس بحث میں جائے بغیر عدمِ جواز کا حکم لکھا جاتا ہے، کیونکہ اگر علمی اور نظری بحث لکھی جائے تو چونکہ عملی

دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے اس غلط فہمی اور لوگوں کی طرف سے اس کے ناجائز استعمال کا اندیشہ ہے، لیکن چونکہ آپ نے مسئلہ کی علمی توضیح چاہی ہے، اس لئے عرض ہے کہ جو فلم کسی کاغذ یا کسی اور مادے پر اس طرح ثبت ہو کہ اُسے معمولی آنکھ سے بھی دیکھا جاسکے، اس کے تصویر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لہٰذا اس کو دیکھنا جائز نہیں۔ خواہ اس تصویر میں بذاتہ کوئی خرابی نہ ہو اور جس طرح اس کو سادہ آنکھ سے دیکھنا ناجائز ہے، اسی طرح اس کو ٹی وی سیٹ پر یا کسی اسکرین پر بڑا کر کے دیکھنا بھی جائز نہیں۔ ایسی فلمیں خواہ بظاہر کسی تبلیغی پروگرام پر مشتمل ہوں، ان کا دیکھنا جائز نہیں، کیونکہ وہ تصویریں ہیں۔

البتہ اگر کوئی پروگرام براہِ راست ٹی وی پر نشر ہو رہا ہو جس میں کسی فلم کا واسطہ نہ ہو یا کسی ایسے ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ نشر ہو رہا ہو، جس میں بذاتہٖ کوئی تصویر پائیدار شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ ایسی لہریں محفوظ ہوتی ہیں، جن کو بوقتِ ضرورت ایک خاص ترتیب سے ٹی وی پر سیٹ کر کے دیکھا جاسکتا ہو تو اس کا تصویر ہونا محلِ تامل ہے، کیونکہ تصویر اس نقش کو کہا جاتا ہے جو پائیدار ہو، لہٰذا اگر بالفرض ان دونوں ذریعوں سے کوئی ایسا پروگرام نشر کیا جائے جو محرمات و منکرات سے خالی ہو تو محض تصویر ہونے کی بناء پر اُسے دیکھنے کا عدمِ جواز مشکوک ہے، لیکن موجودہ دور میں چونکہ ہر ملک میں ان ذرائع سے بھی ناجائز پروگرام بھی اکثر نشر ہوتے ہیں، اس لئے ٹی وی کا رکھنا جائز نہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب نمبروار درج ذیل ہے:

(۱ و ۲)... فلم بلاشبہ تصویر کے حکم میں داخل ہے، البتہ براہِ راست پروگرام یا ویڈیو کیسٹ کا تصویر ہونا مشکوک ہے، جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے۔

(۳)... ویڈیو کیسٹ کا غالب استعمال چونکہ حرام کاموں میں ہو رہا ہے اور تبلیغی اُمور میں اس کے استعمال سے ویڈیو کیسٹ کے ناجائز استعمالات کی حوصلہ افزائی بہرحال ہوتی ہے، اس لئے تبلیغی اُمور میں بھی ویڈیو کیسٹ کو ذریعہ بنانا درست نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے تصویر ہونے کا اگر یقین نہ ہو، تب بھی شبہ سے خالی نہیں۔

(۴)... ریڈیو اور دوسرے جائز الیکٹرونک آلات کی مرمت کی آمدنی میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ٹی وی کی مرمت میں چونکہ مذکورہ بالا مفاسد موجود ہیں، اس لئے اس سے احتراز لازم ہے، تاہم اگر کسی نے مرمت کے ذریعہ کوئی آمدنی حاصل کی ہے تو چونکہ ٹی وی کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، جیسا کہ ہوائی اڈوں وغیرہ میں غیر ذی روح کے ساتھ اعلانات ہوتے ہیں، اس لئے اس آمدنی کو بالکلیہ حرام بھی نہیں کہا جاسکتا، احتیاط بہرصورت اس میں ہے کہ ایسی آمدنی صدقہ کردی جائے۔

(۵)... فقہ اکاڈمی میں ابھی تک یہ مسئلہ زیرِ غور نہیں آیا۔

(۶)... اُوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ تبلیغ کے کام میں بھی ٹی وی اور ریڈیو کیسٹ کا استعمال درست نہیں۔ خاص طور پر اگر علماء ٹی وی پر جاکر تبلیغ کریں تو اس سے ٹی وی کے مذکورہ بالا مفاسد کی اہمیت ذہنوں سے ختم ہوجائے گی۔ اس لئے اس کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔

(۷)... ٹی وی کے ادارے میں کوئی ایسا کام کرنا جس سے ٹی وی کے ناجائز پروگراموں میں معاونت لازم آتی ہو، جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۸/۸/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۳۲ / ۹۳۹ و)

مووی بنانے کا حکم

سوال:- جناب مولانا صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ سے ایک مسئلہ کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ آیا مووی (فلم) بنانا جائز ہے یا حرام؟

کیونکہ میرا اور میرے دوست کا اس بات میں جھگڑا ہوا ہے، میں نے کہا کہ مووی بنانا حرام ہے، کیونکہ مووی کی کیسٹ میں تصویر موجود ہوتی ہے، آپ جب چاہیں، اُسے ٹیلی ویژن پر دیکھ سکتے ہیں، جبکہ زید کہتا ہے کہ مووی (فلم) بنانا جائز ہے، کیونکہ مووی کی رِیل میں تصویر موجود نہیں ہوتی، کیونکہ اگر آپ رِیل کو روشنی میں دیکھو تو آپ کو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا، جس طرح فوٹو کی نیگیٹو کو اگر

آپ روشنی میں دیکھوتو آپ کو باقاعدہ تصویر نظر آئے گی اور زید یہ بھی کہتا ہے کہ مفتی تقی عثمانی صاحب نے صرف مردوں کی مووی اور عورتوں کی مووی جس کو غیر محرم نہ دیکھے، جائز کہا ہے۔

لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ مسئلہ کا جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کل مووی بنانے میں مفاسد اتنے زیادہ ہیں کہ اس سے روکنا ہی مناسب ہے، بالخصوص شادی بیاہ کی تقریبات وغیرہ میں۔ اور یہ بات تو واضح ہی ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے گھر میں ٹی وی رکھنا پڑے گا جو آج کل بہت سے منکرات کا مجموعہ ہے۔ میں نے جو بات کہی تھی، وہ ایک نظریاتی بات ہے کہ ویڈیو کیسٹ کے ذریعے جو صورت اسکرین پر نظر آتی ہے، وہ تصویر کے حکم میں ہے یا نہیں؟ لیکن یہ مشورہ کبھی نہیں دیا کہ لوگ مووی بنائیں، مفاسدِ مذکورہ کی وجہ سے اس سے روکنا ہی چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۶/۳ھ

(فتوی نمبر ۶۸/۴۹۰)

علماء کے ٹی وی پر آنے اور ڈیجیٹل تصویر کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم کا حتمی فتوی

سوال:- جناب مفتی صاحب جامعہ دار العلوم کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل ٹی وی پر جو علماء آتے ہیں، ان کے ٹی وی پر آنے کا کیا حکم ہے اور ان کے دینی پروگرام دیکھنے کا کیا حکم ہے؟ اور ڈیجیٹل تصویر شرعاً تصویر محرم میں داخل ہے یا نہیں؟ اور آپ کے نزدیک راجح کیا ہے؟

جواب:- الیکٹرانک میڈیا جیسے ٹیلی ویژن وغیرہ کے بارے میں اتنی بات تو واضح ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس پر آنے والے پروگرام معاشرے میں بداخلاقی، بے حیائی، فحاشی، جرائم اور

دہشت گردی کو فروغ دے رہے ہیں، اور ایسے پروگرام اوّل تو مشکل ہی سے ملتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی شرعی برائی موجود نہ ہو۔ دوسرے اگر کوئی شخص ٹیلی ویژن اپنے گھر میں رکھے تو یہ بات تقریباً ناممکن جیسی ہے کہ وہ ان منکرات سے محفوظ رہے، لہٰذا ٹیلی ویژن گھر میں رکھنے سے بحالت مذکورہ اجتناب ہی کرنا چاہئے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ٹیلی ویژن یا ڈیجیٹل کیمروں کے ذریعے جو شکلیں نظر آتی ہیں وہ شرعاً تصویر کے حکم میں ہیں یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان شکلوں کا پرنٹ لے لیا جائے یا انہیں پائیدار طریقے سے کسی چیز پر نقش کر لیا جائے تو ان پر شرعاً تصویر کے احکام جاری ہوں گے۔[۱]

البتہ جب تک ان کا پرنٹ نہ لیا گیا ہو، یا انہیں پائیدار طریقے سے کسی چیز پر نقش نہ کیا گیا ہو، ان کے بارے میں علماءِ عصر کی آراء مختلف ہیں۔

(۱)... بعض علماء انہیں بھی تصویر کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔

(۲)... بعض علماء کے نزدیک ان پر تصویر کے احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۳)... بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ ان کی رائے میں تصویر تو ہیں، لیکن چونکہ ان کے بحکمِ تصویر ہونے یا نہ ہونے میں ایک سے زائد فقہی آراء موجود ہیں، اس لئے مجتہد فیہ ہونے کی بناء پر بوقتِ حاجتِ شرعیہ مثلاً جہاد وغیرہ کے موقع پر ان کے استعمال کی گنجائش ہے۔

ہمارے نزدیک اگرچہ دوسری رائے راجح ہے کہ جب تک وہ پائیدار طور پر کسی چیز پر نقش نہ ہوں، ان پر تصویر کے احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔[۲] لیکن ایک لحاظ سے احتیاط پہلی رائے میں ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور دوسرے لحاظ سے ہمیں احتیاط دوسری اور تیسری رائے میں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ دینِ اسلام پر دشمنانِ اسلام کی جو یلغار الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے منظّم طریقہ سے ہو رہی ہے، اس سے دفاع کرنا بھی امت کی ذمہ داری ہے، جس سے حتی الامکان عہدہ برآ ہونے کے لئے الیکٹرانک میڈیا یا ٹیلی ویژن کے ایسے استعمال کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے جو فواحش و منکرات

(۱و۲) تفصیل کے لیئے تکملہ فتح الملہم ج:۴ ص:۱۶۲ و ۱۶۳ اور اگلے صفحے کا مفصل حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

سے پاک ہو۔

لہٰذا جو حضرات علماءِ کرام مذکورہ بالا تین آراء[۱] میں سے کسی سے متفق ہوں اور اس پر عمل کریں، وہ سب قابلِ احترام ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ہمارے نزدیک مستحقِ ملامت نہیں۔[۲]

واللہ اعلم بالصواب

محمد تقی عثمانی

۲۲۔۴۔۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۲۲/۴/۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہ

۲۲/۴/۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

بندہ عبد الرؤف سکھروی

۲۲/۴/۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد عبد اللہ عفی عنہ

۲۲/۴/۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح

محمد عبد المنان عفی عنہ

۲۳/۴/۱۴۲۷ھ

(۱و۲) ان تینوں آراء اور ڈیجیٹل کیمرے کی تصویر سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے مؤقف کی مزید تفصیلی وضاحت کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کا مصدقہ درج ذیل فتوی ملاحظہ فرمائیں۔

سوال:۔ جناب مفتی صاحب دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنابِ عالی!

بعد سلام عرض یہ ہے کہ جاندار کی تصویر کی حرمت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، لیکن اس دور میں ڈیجیٹل نظام کے تحت جو مناظر کمپیوٹر اسکرین یا ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہوتے ہیں، کیا شرعی نقطۂ نگاہ سے وہ بھی تصاویر کے حکم میں ہیں اور حرام ہیں؟ خیال رہے کہ بعض اہلِ علم حضرات ان مناظر کو عکس قرار دیتے ہیں یا عکس کے مشابہ فرماتے ہیں اور تصویر ہونے کا انکار کرتے ہیں، جبکہ بعض اہلِ علم انہیں تصاویر قرار دیتے ہیں، نیز ٹی وی چینل میں علماءِ کرام کے آنے اور دینی مسائل یا دین کی تبلیغ کرنے کے بارے میں بھی علماءِ کرام کی متضاد آراء سامنے آرہی ہیں، اس لئے آپ حضرات سے گزارش یہ ہے کہ ہمیں ان مسائل کے بارے میں یہ بتائیں کہ راجح کیا ہے؟ اور جامعہ دار العلوم کراچی کا مؤقف کیا ہے؟ (جاری ہے......)

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل مناظراورٹی وی کے بارے میں جامعہ دارالعلوم کراچی کے مؤقف سے ہمیں تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ وقاراحمد

جواب:۔الحمدلله رب العلمين والصلاة والسلام على سيدناوشفيعنامحمد وآله وصحبه أجمعين أما بعد!

درج ذیل تین عنوانات پرشرعی نقطۂ نگاہ سے مفصل کلام کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل مناظراورٹیلی ویژن کی شرعی حیثیت کے بارے میں جامعہ دارالعلوم کراچی کا مؤقف اور مفصل فتویٰ

(۱)...جاندار کی تصویر کے بارے میں فقہاءِ کرام کی آراء۔

(۲)...ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ ڈسک یا سی ڈی میں حاصل شدہ مناظر کی حقیقت

(۳)...دورِ حاضر میں ٹی وی کے استعمال کا شرعی حکم۔

(۱)...جاندار کی تصویر کے بارے میں فقہاءِ کرام رحمہم اللہ کی آراء

جاندار کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا حرام ہے، یہ حکم بہت سی احادیثِ صحیحہ، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال اوران کے عمل سے ثابت ہے، اس لئے بلاضرورتِ شدیدہ جاندار کی تصویر کے حرام ہونے پر چاروں اماموں سمیت فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کا اتفاق ہے، کسی کو اس سے اختلاف نہیں۔ ہاں آگے چل کر چند تفصیلات میں فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

فقہاءِ کرامؒ کی آراء کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر تصویر مجسموں کی شکل میں ہواوراس کے وہ تمام اعضاء موجود ہوں جن پر زندگی کا انحصار ہوتا ہے، نیز وہ تصویر بہت چھوٹی بھی نہ ہواور گڑیوں کی قسم سے بھی نہ ہوتو اس کے حرام ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے، یعنی اس کا بنانا اور استعمال کرنا بالاتفاق حرام اور ناجائز ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

لیکن اگر تصویر مجسموں کی شکل میں نہ ہو بلکہ وہ کاغذ یا کپڑے وغیرہ پر اس طرح بنی ہوئی ہو کہ اس کا سایہ نہ پڑتا ہوتو اس کے بارے میں ائمۂ کرامؒ کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے، جمہور فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کا مؤقف اس میں بھی یہی ہے کہ یہ بھی ناجائز ہے، البتہ امام مالک رحمہ اللہ سے ایسی تصویر کے جائز اور ناجائز ہونے کی دونوں روایتیں منقول ہیں، اس لئے علماءِ مالکیہ کے ہاں اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

مالکی مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مالکیہ کے اکثر علماء ان تصاویر کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں، اوراگر یہ تصویر موضعِ امتہان میں ہو یعنی ایسی جگہ ہو جس سے اس کی توہین ہورہی ہوتو اس کا استعمال مکروہِ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے، جبکہ بعض مالکیہ ایسی تصویر کو بغیر کسی کراہت کے مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں، خواہ وہ موضعِ امتہان میں ہو یا نہ ہو۔ مالکیہ میں سے جو حضرات ان تصاویر کے جائز ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں، ان میں بہت سے بڑے بڑے محققین علماء بھی شامل ہیں، مثلاً علامہ ابن القاسم مالکی رحمہ اللہ، علامہ دردیر مالکی رحمہ اللہ، علامہ ابی مالکی رحمہ اللہ، علامہ ابوعبداللہ مواق رحمہ اللہ اور علامہ محمد العلیش المالکی رحمہ اللہ وغیرہ جلیل القدر محققین قابلِ ذکر ہیں۔ (جاری ہے......)

حنابلہ کے ہاں بھی کپڑے یا پردے پر بنی ہوئی تصویر کے جائز اور ناجائز ہونے کی دونوں روایتیں موجود ہیں، مذہبِ حنابلہ کے جلیل القدر ترجمان علامہ ابن قدامہ الحنبلی رحمہ اللہ نے ''المغنی'' میں اور علامہ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں حنابلہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے ہاں کپڑے پر بنی ہوئی تصویر حرام نہیں، علامہ ابوالحسن علی بن سلیمان المرداوی رحمہ اللہ اور علامہ شیخ ابن عقیل وغیرہ علماءِ حنابلہ کی روایت کے مطابق بھی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک دیوار اور پردے پر بنی ہوئی تصویر حرام نہیں ہے، علامہ ابن حمدان حنبلی رحمہ اللہ کا فتوی بھی ایسی تصویر کے جواز ہی کا ہے۔ نیز مالکی و حنبلی مذہب کے علاوہ بھی بعض سلف مثلاً حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (جن کا شمار فقہاءِ مدینہ میں سے ہوتا ہے) سمیت بعض صحابہؓ و تابعینؒ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ حضرات بھی سایہ والی اور غیر سایہ والی تصویر میں فرق کرتے ہیں، سایہ دار تصاویر کو ناجائز اور غیر سایہ دار تصاویر کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی لئے علامہ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے علامہ نووی رحمہ اللہ کی اس بات کو محلِ نظر قرار دیا ہے جس میں انہوں نے اس مسلک کو نقل کرکے اسے مذہبِ باطل قرار دیا تھا۔

"قلت: المذهب المذكور نقله ابن أبى شيبة عن القاسم بن محمد بسند صحيح و لفظه عن ابن عون قال: دخلت على القاسم و هو بأعلى مكة فى بيته فرأيت فى بيته حجلة فيها تصاوير القندس والعنقاء ففى إطلاق كونه مذهبا باطلا نظر)

(درج بالا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں:

﴿۱﴾ المدونة الكبرى (۱/۹۰) دار الفكر بيروت ﴿۲﴾ الشرح الكبير للدردير مع حاشية الدسوقى (۲۰۱/۳) و (۳۳۷/۲) ﴿۳﴾ الشرح الصغير للدردير مع حاشية الصاوى (۴۰۴/۱) و (۵۰۱/۲) ﴿۴﴾ شرح الخرشى على مختصر العلامة خليل (۳۰۲/۳) باب الوليمة. ﴿۵﴾ شرح منح الجليل على مختصر العلامة خليل (۱۶۷/۲) ﴿۶﴾ شرح الزرقانى على مختصر العلامة خليل (۵۳/۲) ﴿۷﴾ المغنى لابن قدامة (۲۱۵/۷) و (۲۰۱/۱۰) ﴿۸﴾ كشاف القناع للبهوتى (۱۱۹/۵) ﴿۹﴾ نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج (۳۶۹/۶) ﴿۱۰﴾ حاشية البجيرمى على الخطيب (۳۹۰/۳) ﴿۱۱﴾ فتح الجواد لابن حجر (۱۲۷/۲) ﴿۱۲﴾ حاشية القليوبى (۲۹۷/۳) ﴿۱۳﴾ شرح مسلم لأبى (۳۹۴/۵) ﴿۱۴﴾ شرح الزرقانى على المؤطا (۳۶۷/۴) ﴿۱۵﴾ فتح البارى لابن حجر (۳۸۸/۱۰) و (۳۸۳/۱۰) ﴿۱۶﴾الإنصاف للمرداوى (۱/۴۷۴) ﴿۱۷﴾ التمهيد لابن عبدالبر (۱/۳۰۱) ﴿۱۸﴾ التاج والإكليل للمواق بهامش مواهب الجليل (۴/۴) ﴿۱۹﴾ جواهر الإكليل للابى (۱/۳۲۴) فضل الوليمة ﴿۲۰﴾المبدع (۱/۳۷۷) ﴿۲۱﴾ الموسوعة الفقهية (۱۲/۱۰۱) اصلاح تصوير.)

(جاری ہے......)

فوٹوگرافی کی تصویر

خیال رہے کہ تصویر کی ایک تیسری قسم فوٹوگرافی (صورِ شمسیۃ) کی تصویر بھی ہے جو درج بالا دونوں صورتوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ ہاتھ سے نہیں، بلکہ کیمرہ سے بنائی جاتی ہے اور بعینہٖ اصل کے مطابق ہوتی ہے، اس فرق کی وجہ سے دورِ حاضر کے بہت سے حضرات فوٹوگرافی کی تصویر کو یا تو تصویر ہی نہیں مانتے، یا ایسی تصویر کو جائز سمجھتے ہیں، عرب علماء میں سے بعض اہم علماء نے بھی فوٹوگرافی کی تصویر کو تصویر کے حکم سے خارج قرار دیا ہے، اس مؤقف میں الشیخ العلامہ محمد بن صالح العثیمن، شیخ سالوس، شیخ احمد الخطیب، استاذ احمد محمد جمال، فضیلۃ الامام المرحوم محمد الخضر حسین شیخ الازہر، الشیخ حسنین محمد مخلوف مفتی مصر، شیخ محمد نجیب المطیعی، شیخ محمد متولی الشعراوی اور شیخ سید سابق وغیرہم شامل ہیں۔

چنانچہ شیخ سید اپنی کتاب ''فقہ السنۃ'' جلد۲ صفحہ ۵۸ میں لکھتے ہیں کہ وہ تصاویر جن کا سایہ نہیں ہوتا جیسے دیوار اور کرسی پر نقش تصاویر اور وہ تصویریں جو ملبوسات اور پردوں میں پائی جاتی ہیں اور فوٹوگرافی کی تصویریں، تو یہ سب جائز ہیں۔

کل ما سبق ذکرہ خاص بالصور المجسدة التی لها ظل أما الصور التی لا ظل لها کالنقوش فی الحوائط و علی الورق والصور التی توجد فی الملابس والستور والصور الفوتو غرافیة فهذه کلها جائزة"

انہی حضرات میں علامہ شیخ محمد بخیت مفتی مصر رحمہ اللہ ہیں جنہوں نے اس موضوع پر "الجواب الشافی فی إباحة التصویر الفوتو غرافی" کے نام سے ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا ہے، ان کا مؤقف یہ ہے کہ فوٹوگرافی درحقیقت تصویر سازی میں داخل ہی نہیں ہے، بلکہ یہ محض اصل کے عکس کو محفوظ کرنا ہے جو کہ اس تصویر کے حکم میں داخل نہیں ہے جو شرعاً حرام ہے۔

اسی طرح دکتور یوسف القرضاوی حفظہ اللہ تعالیٰ بھی فوٹوگرافی کی تصویر کو حرام تصویر سے خارج سمجھتے ہیں، چنانچہ موصوف اپنی مشہور و معروف کتاب "الحلال والحرام فی الإسلام" صفحہ ۱۱۴ پر اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ فوٹوگرافی کی تصویر کا مباح ہونا ہی روحِ شریعت کے زیادہ قریب ہے یا زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ ہے۔

"أما تصویر اللوحات و تصویر الفوتوغرافی فقد قدمنا أن الأقرب إلی روح الشریعة فیهما هو الإباحة الخ)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں: ﴿۱﴾ الجواب الشافی فی إباحة التصویر الفوتو غرافی (ص: ۲۰) ﴿۲﴾ الحلال والحرام للشیخ القرضاوی (ص: ۱۱۲) ﴿۳﴾ حکم الإسلام فی الصور والتصویر (ص: ۴۹) ﴿۴﴾ أحکام التصویر فی الفقه الإسلامی لمحمد بن أحمد علی واصل (ص: ۳۲۸ تا ۳۳۶)

لیکن محققین علماء کی اکثریت نے فوٹوگرافی کی تصویر کو بھی اس تصویر کے حکم میں داخل کیا ہے جو شرعاً حرام ہے، برصغیر کے تقریباً تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ فوٹوگرافی کی تصویر اور ہاتھ سے بنائی جانے والی تصاویر کے ناجائز ہونے میں کوئی فرق نہیں، برصغیر کے تقریباً تمام دارالافتاء یہی فتوی دے رہے ہیں کہ بلاضرورتِ شدیدہ یا حاجتِ عامہ کے مواقع کے علاوہ جاندار کی تصویر ناجائز ہے،

(جاری ہے......)

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سمیت تمام دارالافتاؤں کا مؤقف اب بھی یہی ہے کہ تصویر بنانا صرف یہی نہیں ہے کہ تصویر قلم، پینٹ یا رنگ وروغن سے کاغذ، کپڑے، دھات یا دیوار وغیرہ پر ہاتھوں سے بنائی جائے یا مجسموں کی صورت میں پتھر وغیرہ کا بت تراشا جائے، بلکہ وہ تمام صورتیں تصویر بنانے میں داخل ہیں، جن کے ذریعہ کسی جاندار کی واضح اور بالکل ظاہر شکل وصورت کو کاغذ، دھات یا کپڑے یا اس جیسی کسی دوسری چیز پر اس طرح بنا دیا جائے (خواہ یہ شکل وصورت اس چیز پر تھوڑی سی دیر کے لئے ہی بنادی جائے) کہ یہ شکل وصورت اس چیز پر قائم اور منقش ہوجائے، خواہ پرانے آلات کے ذریعے سے یہ کام انجام دیا جائے یا نئے آلات کے ذریعہ، بلکہ کسی جاندار کے اصل عکس یا سائے کو بھی اگر جاندار کی واضح اور بالکل ظاہر شکل وصورت میں کسی نئے سے نئے آلے کی مدد سے یا کسی کیمیکل وغیرہ سے کسی چیز پر قائم کر دیا جائے تو وہ بھی حرام تصویر ہے، اور اس کا بنانا بھی تصویر بنانا ہے، مثلاً سادہ کیمرے کے نیگیٹیو پر بنائی گئی تصویر یا فوٹو گرافی کی تصویر، اس لئے ہمارے نزدیک فوٹو گرافی کو تصویر سازی سے الگ سمجھنا یا فوٹو گرافی کے ذریعہ حاصل شدہ تصاویر کو تصویر قرار نہ دینا درست نہیں۔ (ملاحظہ ہو: تکملہ فتح الملہم: ۴/۱۶۲،۱۶۳)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تصویر کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''تصویر کے شرعی احکام'' تصنیف فرمایا، جس میں حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے شرعی دلائل سے واضح فرمایا کہ تصویر چاہے ہاتھ سے بنائی جائے یا جدید آلات سے، وہ تصویر ہی ہے، آلات کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

فوٹو گرافی کی تصویر اور ڈیجیٹل منظر میں فرق

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر فوٹو گرافی کی تصویر کو بھی حقیقی تصویر قرار دیتے ہیں، کیونکہ تصویر حقیقت میں کسی چیز کا پائیدار اور قائم نقش ہوتا ہے، یعنی وہ کسی چیز پر اس طرح پائیدار اور قائم ہوتی ہے کہ وہاں اسے قرار وثبات حاصل ہوتا ہے، یہی پائیداری یا قیام ایک حقیقی تصویر کی بنیادی خصوصیت اور تصویر وعدم تصویر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ یعنی تصویر کی یہی خصوصیت حقیقی تصویر اور مجازی تصویر (مثلاً عکس، سایہ یا خیالی تصویر) میں نشانِ امتیاز ہے کہ اگر جاندار کی شکل وصورت کسی چیز پر پائیدار وقائم (Paint) ہوگئی ہو تو حقیقی تصویر ہے اور حرام تصویر کے حکم میں ہے، لیکن اگر اس کی شکل وصورت وہاں قائم وپائیدار نہیں ہوئی تو شرعی نقطہ نگاہ سے وہ حقیقی تصویر یا حرام تصویر کے حکم میں نہیں ہے، کیونکہ حقیقی تصویر کی بنیادی شرط قیام واستقرار اس میں مفقود ہے، ہاں اگر کوئی مجازاً اس پر تصویر کا اطلاق کرے تو اس کی وجہ سے اس کو حرام تصویر میں داخل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ عکس یا خیالی تصویر وغیرہ پر مجازاً تصویر کا اطلاق کرلیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود شرعاً ان پر حرام تصویر کا حکم نہیں لگایا جاتا ہے۔

فوٹو گرافی کی تصویر میں چونکہ حقیقی تصویر کی بنیادی خصوصیت (یعنی کسی سطح پر قائم وپائیدار ہونا) موجود ہوتی ہے، اس لئے سادہ کیمرہ (Non-digital camera) سے جاندار کی جو تصاویر بنائی جاتی ہیں، وہ حرام تصویر کے حکم میں ہیں، کیونکہ سادہ کیمرہ سے بنائی جانے والی تصاویر خواہ نیگیٹو میں ہوں یا کسی کاغذ وغیرہ پر،

(جاری ہے......)

بہرصورت وہ ان جاندار کی شکل وصورت میں وہاں برقرار اور قائم ہوتی ہیں۔اس کے برخلاف ڈیجیٹل کیمرے سے حاصل شدہ منظر جب تک کاغذ وغیرہ پر اس کا پرنٹ نہ لیا جائے تو اسکرین کی حد تک وہ کہیں بھی تصویر کی شکل میں منقش اور قائم نہیں ہوتی، کیونکہ ڈیجیٹل مناظر جب سی ڈی یا چپ میں محفوظ ہوتے ہیں تو چند شعاعی اعداد و شمار کی شکل میں اس طرح محفوظ ہوتے ہیں کہ نہ کھلی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی خوردبین وغیرہ کے ذریعے ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ وہ تصویر کی شکل میں وہاں موجود ہی نہیں ہوتے، پھر جب سی ڈی وغیرہ سے انہیں اسکرین یا پردہ پر ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ بھی روشنی کے ناپائیدار شعاعی ذرات (Pixels) ناپائیدار شکل میں اسکرین پر ظاہر ہو کر فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ذرات اسکرین وغیرہ پر قائم وثابت نہیں ہوتے۔(جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) اس لئے تصویر کی بنیادی شرط (استقرار اور قیام) یہاں مفقود ہے، لہٰذا سادہ کیمرہ کی تصویر بلاشبہ حرام تصویر کے حکم میں ہے اور ڈیجیٹل کیمرہ کا منظر حرام تصویر کے حکم میں نہیں ہے، ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ اسکرین پر نمودار ہونے والی شکل وصورت اور سادہ کیمرہ کے ذریعہ ریل میں حاصل شدہ فلم یا کاغذ وغیرہ پر پرنٹ شدہ تصویر کے درمیان پائے جانے والے اس فرق کو ماہرینِ فن نے بھی اپنی اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، یہاں بطورِ نمونہ دو مثالیں ملاحظہ ہوں: کمپیوٹر کی دنیا کا ایک معروف مصنف مارشل برین نے اپنی کتاب "HOW STUFF WORKS" میں سادہ کیمرہ اور ڈیجیٹل کیمرہ کے ذریعہ حاصل کردہ عکس کے درمیان کے فرق کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا:

Marshal Brain Writes:

HOW DIGITAL CAMERAS WORK ?

A digital camera, a camcorder and a webcam, all work about the same way. they turn light into electrical signal and record it. In a digital camera, the signals are recorded in flash memory or on a disk. in a camcorder, the signals are recorded on video tape at 30 frames per second. In a webcam, they are recorded in a file for a web page.

At it's most basic level a digital camera is a device that measures light bouncing off objects and converts this information into a digital file in some standard format. Most digital cameras produced JPEG or TIFF files by taking the following steps:

(1) Focus the light from the scence onto a sensor.

(2) Convert the measured light on the sensor into an electrical charge.

(3) Convert this analog information into a digital form.

(4) Save the digital information in the proper file format.

(جاری ہے......)

Light capture:

A digital camera focuses light the same way a film camera does with a series of lenses.

But whereas a film camera uses chemically treated celluloid to capture an image, a digital camera focuses light onto an electronic image sensor instead.

The standard sensor technology for most digital cameras is a charge coupled-device (CCD). the CCD is a collection of tiny light sensitive diodes (called photosites), which convert photons (that is, light), into electrons. Each photosite is sensitive to light the brighter that hits a single photosite, the greater the electrical charge that accumulates at that site. The number of photosite on a CCD determines its maximum resolution.

ترجمہ: ڈیجیٹل کیمرے کس طرح کام کرتے ہیں:

ایک ڈیجیٹل کیمرا، کیمکارڈر یا ویب کیم سب ایک ہی طرح سے کام کرتے ہیں، یہ روشنی کو برقی سگنلز (ذرات) میں تبدیل کر کے ان کو ریکارڈ کرتے ہیں، ایک ڈیجیٹل کیمرا میں برقی ذرات "Flash memory" (فوری یادداشت) یا ڈسک (یعنی سی ڈی، فلاپی یا ہارڈ ڈسک وغیرہ) پر ریکارڈ ہوتے ہیں، کیمکارڈر میں برقی ذرات کو ۳۰ فریم فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کیا جاتا ہے، جبکہ ایک ویب کیم میں وہ ایک فائل میں ویب پیج کے واسطے ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم بہت ہی بنیادی سطح پر جا کر دیکھیں تو ڈیجیٹل کیمرا ایک ایسا آلہ ہے جو اشیاء سے منعکس ہو کر آنے والی روشنی کو ماپتا ہے اور ان معلومات کو ایک طے شدہ اسلوب (یعنی معیاری برقی اعداد و شمار کی شکل) میں تبدیل کر کے ایک ڈیجیٹل فائل میں منتقل کرتا ہے۔ زیادہ تر ڈیجیٹل کیمرے JPEG یا TIFF فائلز کو درج ذیل مدارج سے گزرتے ہوئے بناتے ہیں:

(۱)...روشنی کو کسی منظر سے حساس چپ (Sensor) پر مرکوز کرنا۔

(۲)...حساس چپ (sensor) پر مرکوز اور پیمائش شدہ روشنی کو برقی اشاروں میں تبدیل کرنا۔

(۳)... متسلسل معلومات (analog information) کو ڈیجیٹل معلومات (شعاعی اعداد و شمار کی شکل) میں تبدیل کرنا۔

(۴)...حاصل شدہ ڈیجیٹل معلومات کو شعاعی اعداد و شمار کی شکل میں مناسب طور پر ذخیرہ کرنا۔

روشنی کا احاطہ

ایک ڈیجیٹل کیمرا روشنی کو اس طرح مرکوز کرتا ہے جس طرح ایک فلم کیمرا کرتا ہے یعنی بہت سے لگاتار عدسوں کی مدد سے، لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک فلم کیمرا عکس کو پکڑنے اور گھیرنے کے لئے کیمیکل طریق کار کو استعمال کرتا ہے اور کیمیائی طور پر تیار شدہ فلم (سیلولائڈ) پر عکس کو پکڑ لیتا ہے، (جاری ہے......)

جبکہ ڈیجیٹل کیمرا (جس میں فلم نہیں ہوتی ہے اور نہ نفسِ عکس کسی چپ وغیرہ میں مقید ومحفوظ ہوسکتا ہے، اس لئے ڈیجیٹل کیمرا عکس کو گھیر کر پکڑنے کے بجائے) روشنی کو ایک حساس آلہ (Sensor) پر مرکوز کرتا ہے، (عکس کو سینس کرنے والا یہ آلہ عکس کی تفصیل کو پڑھتا ہے اور اس کے مطابق معلومات کو شعاعی اعداوشار "۱،۰" کی شکل میں سی ڈی وغیرہ میں ریکارڈ کرتا ہے) زیادہ تر ڈیجیٹل کیمروں میں (عکس بندی کے لئے) معیاری حساس ٹیکنالوجی (CCD) یعنی charge coupled-device استعمال کی جاتی ہے، (CCD) روشنی سے متاثر ہونے والے انتہائی چھوٹے چھوٹے حساس ذرات (Diodes) کا مجموعہ ہوتا ہے جو روشنی کو برقی رو میں تبدیل کرتا ہے، ہر ذرہ (Diode) روشنی کے معاملہ میں انتہائی حساس ہوتا ہے اور جتنی زیادہ تیز روشنی کسی ذرہ پر پڑتی ہے اتنا ہی زیادہ برقی چارج اس پر جمع ہوتا ہے، CCD پر (Diodes) کی تعداد سے اس جگہ کے روشن ہونے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے، اور اسی سے اس کے زیادہ سے زیادہ ریزولیشن (Resolution) کا تعین ہوتا ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مارشل برین (Marshal Brain) کی کتاب HOW STUFF WORKS صفحہ نمبر ۱۸۲)

نیز "Wikipedia encyclopedia" میں ہے:

When you work with bitma p images like digital photographs, you work with pixels. A pixel (short for "picture element") is the smallest unit in a computer image or display. Every image on your computer is made up of a colored grid of pixels.

Your digital camera records pixels, your scanner converts physical images into pixels, your photo editing software manipulates pixels, your computer monitor displays pixels, and your printer paints pixels onto paper.

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: "وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا" عنوان (Understanding resolution)

ترجمہ: جب آپ ڈیجیٹل عکس پر کام کرتے ہیں مثلاً ڈیجیٹل فوٹوگرافی پر تو آپ دراصل پکسل (Pixels) کے ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں، پکسل (یا "Picture element") کسی کمپیوٹر کے مناظر یا عکس کی انتہائی چھوٹی اکائی ہے، آپ کے کمپیوٹر اسکرین پر جو بھی عکس نظر آتا ہے وہ پکسل کے رنگین برقی رو کا مجموعہ ہے، آپ کا ڈیجیٹل کیمرا پکسلز (Pixels) کو محفوظ (Record) کرتا ہے، آپ کا Scanner (اسکینر) کسی چیز پر طبعی طور پر قائم وپائیدار عکس کو پکسل میں منتقل کرتا ہے، آپ کا photo editing software (فوٹو کو قطع وبرید کر کے ترتیب دینے والا سافٹ ویئر) پکسل کو سلیقے سے ترتیب دیتا ہے، آپ کا computer monitor (کمپیوٹر اسکرین) پکسلز کو کمپیوٹر اسکرین پر رونما اور ظاہر کرتا ہے، جبکہ آپ کا printer (پرنٹر) ان پکسلز کو کاغذ پر paint (رنگ وروغن سے پائیدار) کر کے تصویر بنا دیتا ہے۔

(جاری ہے......)

(۲)...ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ ڈسک یاسی ڈی میں حاصل شدہ مناظر کی حقیقت

یہ بات کافی عرصہ سے زیر بحث ہے کہ ڈیجیٹل سسٹم کے طریق کار کے ذریعہ جو شکل وصورت اور مناظر کمپیوٹر ڈسک/سی ڈی، ویڈیو کیسٹ اور ڈیجیٹل کیمرہ میں ضبط (محفوظ) کر کے کیمرہ اسکرین، مانیٹر اور ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعہ نشر کئے جاتے ہیں اور اسکرین پر نظر آتے ہیں، آیا وہ بھی ناجائز تصویر کے حکم میں داخل ہیں یا نہیں؟

آج سے تقریباً چودہ/پندرہ سال پہلے "صحیح مسلم" کی شرح "تکملہ فتح الملہم" میں یہ تحریر کیا گیا تھا کہ ڈیجیٹل سسٹم کے یہ مناظر کسی کاغذ وغیرہ میں پرنٹ ہونے سے پہلے تصویر کی شکل میں کہیں بھی موجود اور ثابت نہیں ہوتے، اس لئے ان کو ناجائز تصویر کہنا بہت مشکل ہے، اور محلِ نظر ہے، اس لئے کتاب میں اہلِ علم حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ اس معاملہ کی مزید تحقیق کی جائے، تاکہ شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کا حکم شرعی واضح طور پر متعین کیا جا سکے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی میں چونکہ اس بارے میں بہت زیادہ سوالات آتے رہے، اس لئے اس مسئلہ پر غور کا سلسلہ جاری رہا، اس مقصد کے لئے شرعی دلائل کی تحقیق کے علاوہ ماہرینِ فن سے بھی معلومات حاصل کی گئیں، اور ان کی باتوں کو شرعی دلائل پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

اس سلسلہ میں تقریباً تین چار سال پہلے "مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی" کے مشہور مدارس کے مفتیانِ کرام کا اجتماع ہوا، جس کا پہلا اجلاس ۲۳/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ کو جامعہ دارالعلوم کراچی میں ہوا اور دوسری نشست جامعہ ہی میں ۱۶/صفر ۱۴۲۵ھ کو ہوئی، پھر اسی مجلس نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی، جس کے ایک سے زائد اجلاس منعقد ہوئے اور کمیٹی کے حضرات کی طرف سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر دس سے زیادہ تحقیقی مضامین اور مقالے پیش کئے گئے جو اس موضوع پر جمع کئے جانے والے دوسرے فقہی مقالات ومضامین کے علاوہ تھے۔

مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی کے اراکین اور ذیلی کمیٹی کے شرکاء مفتیانِ کرام کی طرف سے جاری شدہ قرارداد کی رو سے حضرات مفتیانِ کرام کا اس بات پر تقریباً اتفاق رہا کہ ڈیجیٹل طریقِ کار کے تحت دورِ حاضر کے وسائلِ نشر واشاعت کو دشمنانِ اسلام کے غیر معمولی اور مسلسل حملوں کے دفاع کے لئے استعمال کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اس کی اجازت ہونی چاہئے، مگر فقہی طور پر اس کو کس چیز میں داخل سمجھا جائے، اس بارے میں ان حضرات کی آراء مختلف تھیں، جیسا کہ "مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی" کی قرارداد "متعلقہ مسئلہ ڈیجیٹل تصویر" کی تمہید میں ہے:

"مجلسِ تحقیق کے اراکین اور ذیلی کمیٹی کے شرکاء مفتیانِ کرام کا اس بات پر تقریباً اتفاق رہا کہ ڈیجیٹل طریق کار کے تحت دورِ حاضر کے وسائل نشر واشاعت کو دشمنانِ اسلام کے غیر معمولی اور پیہم حملوں کے دفاع کے لئے استعمال کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اس کی اجازت ہونی چاہئے، مگر فقہی تکییف میں ان حضرات کی آراء مختلف تھیں، یہ آراء ان کے اہم مقالات میں بحمد اللہ منضبط طور پر موجود ہیں۔"

(جاری ہے......)

اسی سلسلے کا ایک اہم اجتماع ۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ مطابق یکم مئی ۲۰۰۶ء کو دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی میں ہوا، جس میں اس موضوع پر اب تک ہونے والے کام کا جائزہ لیا گیا۔

اس اجتماع میں مجلسِ تحقیق مسائلِ حاضرہ کراچی کے اراکین کے علاوہ بھی کچھ دوسرے اہلِ علم حضرات شریک ہوئے، تقریباً پینتیس (۳۵) اہلِ فتویٰ حضرات علماءِ کرام نے اس اجتماع میں شرکت فرمائی، جن میں چند حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

نمبر شمار	اسماءِ گرامی	ادارہ
۱	حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ	رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی
۲	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ	نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی
۳	حضرت مولانا مفتی عبدالمجید دین پوری مدظلہم	جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
۴	حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب مدظلہم	جامعہ اشرفیہ لاہور
۵	حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب مدظلہم	جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
۶	حضرت مولانا مفتی منظور احمد مینگل صاحب مدظلہم	جامعہ فاروقیہ کراچی
۷	حضرت مولانا مفتی محمد صاحب مدظلہم	دارالافتاء والارشاد کراچی
۸	حضرت مولانا مفتی عبدالحمید صاحب مدظلہم	جامعہ اشرف المدارس کراچی

اجتماع میں شریک ہونے والے حضرات مفتیانِ کرام کو غور و فکر کے بعد یہ بات طے کرنی تھی کہ الیکٹرونک میڈیا پر آنے والی شکلیں یعنی ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ کمپیوٹر اسکرین، ڈیجیٹل کیمرہ اسکرین یا ٹیلی ویژن اسکرین پر جو شکلیں یا مناظر نظر آتے ہیں وہ شرعاً تصویر کے حکم میں ہیں یا نہیں؟

چونکہ مسئلہ اجتہادی تھا جو اِسی دور میں پیدا ہوا ہے اور اس کا کوئی حتمی اور قطعی حکم قرآن وحدیث میں نہیں ملتا، اس لئے اس کے بارے میں اجلاس میں شریک مفتیانِ کرام کسی ایک رائے پر متفق نہ ہوسکے، بلکہ ان کے درمیان تین مختلف رائیں سامنے آئیں، چنانچہ اس اجلاس کے اختتام پر جو قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی، اس کے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

(۱)...اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ڈیجیٹل الیکٹرونک میڈیا میں منظر کے تصویر ہونے یا نہ ہونے میں سے کوئی ایک پہلو قطعی نہیں ہے بلکہ مجتہد فیہ ہے اور اس میں علماءِ عصر کا اختلاف ہے۔

(۲)...اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹی وی بے شمار مفاسد پر مبنی ہے، اس لئے موجودہ حالات میں اس کو گھر میں رکھنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

(۳)...الیکٹرانک میڈیا پر آنے والی شکل کے بارے میں تین طرح کی آراء سامنے ہیں:

(۱)...مطلق ممانعت، یعنی الیکٹرانک میڈیا کا استعمال ضرورتِ شرعیہ کے علاوہ جائز نہیں۔ (جاری ہے......)

(۲)...الیکٹرونک میڈیا میں نظر آنے والی شکل تصویر کے حکم میں داخل نہیں، اس لئے اس کے استعمال کا جواز ہے، بشرطیکہ کوئی اور محظورِ شرعی نہ ہو۔

(۳)...صرف جنگی و جہادی ضروریات میں اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں: ''قراردادیں مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ، متعلقہ مسئلہ ڈیجیٹل تصویر'' ۲/ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ مطابق یکم مئی ۲۰۰۶ء)

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کا مؤقف

ہمارے نزدیک دوسری رائے راجح ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ اسکرین پر نظر آنے والے جاندار مناظر نہ تو بعینہ تصاویر ہیں اور نہ ہی بعینہ عکس اور سایہ، سایہ نہ ہونا تو تقریباً متفق علیہ ہے اور واضح بات ہے، اس لئے یہاں تصاویر یا عکس نہ ہونے کی مختصر وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

(۱)...تصاویر اس لئے نہیں کہ کسی شبیہ وصورت پر حقیقی معنی میں تصویر کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ کسی چیز پر پائیدار شکل میں نقش ہو، جبکہ ویڈیو کیسٹ، سی ڈی، فلاپی ڈسک، USB، کمپیوٹر ہارڈ ڈسک وغیرہ میں جو کچھ ڈیٹا (DATA) محفوظ ہوتا ہے، وہ ڈیجیٹل کیمرہ میں نصب آلات (C.C.D یا C.MOS chip) اور (Analog-to-Digital converter) یعنی (A.D.C) کی مدد سے کسی عکس کی شعاعوں سے حاصل شدہ کچھ انفارمیشن اور معلومات ہوتی ہیں اور یہ معلومات بھی تصویر کی شکل میں وہاں محفوظ نہیں ہوتیں، بلکہ ڈیجیٹل اعداد و شمار (۰۱) کی شکل میں اس طرح محفوظ ہیں کہ نہ ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ کسی خوردبین سے بھی ان کو دیکھا نہیں جاسکتا، بلکہ اگر کسی آلہ کی مدد سے یہ اعداد نظر بھی آجائیں تو یہ سمجھنا ممکن نہیں ہوتا کہ یہ اعداد کس چیز کی نمائندگی کر رہے ہیں، لہٰذا ویڈیو کیسٹ یا سی ڈی وغیرہ میں محفوظ شدہ اعداد و شمار کا تصویر نہ ہونا تو بالکل واضح ہے اور ویڈیو کیسٹ یا سی ڈی وغیرہ کو چلانے کے بعد اسکرین وغیرہ پر جو کچھ نظر آرہا ہے وہ بھی تصویر اس لئے نہیں ہے کہ وہ درحقیقت روشنی کی شعاعیں (ریڈیائی سگنلز، Electron Beam/Electrical signals) ہیں جو ڈیجیٹل کیمرہ یا ڈیجیٹل مشین میں موجود ایک مخصوص آلہ (Device) یا مخصوص چپ (Analog converter to Digital) یعنی (A.D.C) کی مدد سے دیوار یا اسکرین وغیرہ پر ناپائیدار شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور فوراً فنا ہو جاتی ہیں، یعنی نقطوں کی شکل میں شعاعیں کیمرہ میں نصب آلہ (Device) سے نکل کر اسی وقت اسکرین وغیرہ پر ظاہر ہو رہی ہیں اور اسی لمحہ فوراً فنا بھی ہو رہی ہیں، یہ شعاعیں ایک لمحہ کے لئے بھی اسکرین یا پردہ وغیرہ پر برقرار نہیں رہتیں، بلکہ کمپیوٹر، ڈیجیٹل کیمرہ یا ڈیجیٹل مشین میں سے نکل کر ناپائیدار شکل میں اسکرین پر تیزی سے ظاہر ہو رہی اور اسی لمحہ فنا ہو رہی ہوتی ہیں، یہ مناظر کاغذ وغیرہ پر پرنٹ ہونے سے پہلے اسکرین کی حد تک پائیدار شکل میں کہیں بھی منقش اور ثابت نہیں ہوتے اور نہ انہیں کسی جگہ پر تصویر کی شکل میں قرار و ثبات حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ مناظر تصویر کے حکم میں نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو: مارشل برین کی کتاب سے ایک اقتباس:

(جاری ہے......)

....

The standard sensor technology for most digital cameras is a charge coupled-device (CCD). the CCD is a collection of tiny light sensitive diodes (called photosites), which convert photons (that is, light), into electrons. Each photosite is sensitive to light the brighter that hits a single photosite, the greater the electrical charge that accumulates at that site. The number of photosites on a CCD determines its maximum resolution. The next step is to read the value (that is the accumulated charge) of each cell in the image. In a CCD, the charge is actually transported across the chip and read at one comer of array. An analog to digital converter (ADC) turns each pixels value into a digital value. The ADC is a sophisticated piece of equipment, but the basic concept is very simple. Think of each photositeon the CCD as a bucket. Now think of the photons of light as raindrops. As the raindrops fall into the bucket, water accumulates (In reality, electrical charge accumulates). Some buckets have more water then others, representing brighter and darker section of images. The ADC measures the depth of water in each bucket one by one. Then it records this information as a binary value. Even the simplest digital images contain thousands of buckets, and the best digital camera has millions of photosite on CCD.

ترجمہ: زیادہ تر ڈیجیٹل کیمروں میں (عکس بندی کیلئے) معیاری حساس ٹیکنالوجی (CCD) یعنی charge coupled-device استعمال کی جاتی ہے، (CCD) روشنی سے متاثر ہونے والے انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات (Diodes) کا مجموعہ ہوتا ہے، جو روشنی کو برقی رَو میں تبدیل کرتا ہے، ہر ذرہ (Diode) روشنی کے معاملہ میں انتہائی حساس ہوتا ہے اور جتنی زیادہ تیز روشنی کسی ذرہ پر پڑتی ہے، اتنا ہی زیادہ برقی چارج اس پر جمع ہوتا ہے، CCD پر (Diodes) کی تعداد سے اس جگہ کے روشن ہونے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے، اور اسی سے اس کے زیادہ سے زیادہ ریزولیشن (RESOLUTION) کا تعین ہوتا ہے۔

اس سے اگلا مرحلہ عکس میں موجود ہر ہر cell (برقی ذرہ) کی قدر کو پڑھنے کا ہوتا ہے یعنی جمع شدہ برقی ذرات کی مقدار کے تعین کا ہوتا ہے، CCD میں تمام چارج کو ایک چپ سے گزار کر اس کے دوسرے سرے پر جمع کیا جاتا ہے اور اس گوشہ میں موجود چارج کی مقدار کا تعین کیا جاتا ہے، (یہاں پر analog (متسلسل) کرنٹ کو digital (عددی) کرنٹ میں تبدیل کرنے کا آلہ (Converter) بھی نصب ہوتا ہے۔) analog-to- digital converter یعنی متسلسل کرنٹ کو عددی کرنٹ میں تبدیل کرنے والا آلہ (ADC) تمام Pixels (شعاعی ذرات) کی قدر کو ڈیجیٹل قدر میں تبدیل کرتا ہے۔

(جاری ہے.....)

ADCایک مصنوعی اورپیچیدہ پرزہ ہے، لیکن اس کا بنیادی تصور بہت سادہ ہے، CCDپر روشنی کو برقی سگنلز(اشاروں)میں تبدیل کرنے والے ڈایوڈزکوآپ ایک بالٹی سے تشبیہ دے سکتے ہیں اوراس پر پڑنے والی روشنی کی مقدارکوبارش کے قطروں سے، جونہی بارش ہوتی ہے مختلف جگہوں پررکھی گئی بالٹیاں بلحاظ بارش پانی جمع کرلیتی ہیں، کچھ بالٹیوں میں دوسروں کی نسبت زیادہ پانی ہوتاہے،اسی طرح CCDمیں روشنی کی مقدارکم وزیادہ ہوتی ہے، جوعکس کے زیادہ روشن اورتاریک منظرکی عکاسی کرتاہے۔ADCیکے بعددیگرے ہر بالٹی میں موجودپانی کی مقدارکوماپتاہے، پھرمعلومات کو شعاعی اعدادوشمار(0.1) کی شکل میں ریکارڈکرلیتاہے، سادہ ترین ڈیجیٹل عکس(منظر)بھی اس قسم کی ہزاروں بالٹیوں پر مشتمل ہوتاہے، جبکہ بہترین ڈیجیٹل کیمرہ وہ ہے جس میں CCDپرلاکھوں کی تعدادمیں ڈایوڈزہوں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مارشل برین (Marshal Brain) کی کتاب:How Stuff Works صفحہ نمبر۱۸۲ تا ۱۸۴)

شعاعی منظرکی معلومات سی ڈی یا چپس وغیرہ میں اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح آڈیوکیسٹ میں مقناطیسی فیتے پرآوازوں کی صوتی لہریں محفوظ ہوتی ہیں، جنہیں ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہیں، تاہم بوقتِ ضرورت جب کسی ٹیپ ریکارڈریا آڈیو مشین میں رکھ کرکیسٹ کو چلایاجاتاہے تو خاص آلہ کی مدد سے صوتی لہریں نکل رہی ہوتی ہیں اورریڈیویاٹیپ ریکارڈرمیں موجودخاص آلہ سے ٹکراکرسننے کے قابل ہوجاتی ہیں، لیکن ریڈیویاٹیپ ریکارڈرمیں کہیں بھی قائم اورثابت نہیں ہوتیں، بلکہ آلہ یاٹیپ ریکارڈروغیرہ بندہوتے ہی جب لہروں کایہ سلسلہ منقطع ہوجاتاہے توفوراً آوازبھی بندہوجاتی ہے، جو کچھ ٹیپ ریکارڈرمیں ہوتاہے وہی کچھ یہاں بھی ہوتاہے، فرق صرف اتناہے کہ وہاں سنائی دینے والی آوازیں صوتی لہروں سے پیداہوتی ہیں جوآڈیومشین میں نصب آلہ کی مدد سے آڈیوکیسٹ سے اورٹیپ ریکارڈروغیرہ میں نصب خاص آلہ سے ٹکرانے سے پیداہوتی ہیں اوریہاں اسکرین پرنظرآنے والی شعاعیں بصری شعاعیں ہیں جوہارڈڈسک، سی ڈی یا چپس میں محفوظ معلومات کی مدد سے ڈیجیٹل کیمرہ یاڈیجیٹل مشین میں نصب آلہ کی مدد سے شعاعی لہروں کی شکل میں نکل کرایک لاکھ چھیاسی ہزارمیل(تقریباً تین لاکھ کلومیٹر)فی سیکنڈکی رفتارسے سفرکرتی ہوئی اسکرین پرظاہرہورہی ہیں اورساتھ ساتھ فوراًہی فناہوتی جارہی ہیں اور پیچھے سے اسی رفتارسے آنے والی نئی شعاعیں ان کی جگہ لیتی جارہی ہیں اوراسی طرح فنابھی ہوتی جارہی ہیں، حتی کہ ان شعاعوں کاکوئی ایک ذرہ کسی ایک لمحہ کے لئے بھی اسکرین پرپائیداریاقائم نہیں ہوتاہے، اسکرین پر شعاعیں پڑنے اورفناہونے کایہ عمل اس قدرتیزی کے ساتھ مسلسل ہورہاہوتاہے کہ 720 ×1280pixels(ذرات) پر مشتمل منظرایک درمیانہ ریزولیشن والے مانیٹر(کمپیوٹراسکرین) پرفی سیکنڈایک کروڑترانوے لاکھ نوے ہزاربائٹ (19390000)کے ساتھ (60)فریم بنتے اورٹوٹتے ہیں (19.39Mbps)جواسکرین پرنمودارہونے والے اور فناہونے والے انہی شعاعی ذرات کے اربہانقطوں پرمشتمل ہوتے ہیں، اسی تیزرفتاری کی وجہ سے مناظراورشکلیں اسکرین پرحرکت کرتی ہوئی نظرآتی ہیں۔ (جاری ہے......)

....

1-,,Light speed of 300,000 kilometers per second (186,000 miles per second),, (Britannica: V: 3P1)

2-The screen is refreshing at 60 frames per second. (How Stuff Works :page no .136)

3-480p-The picture is 704 ×480 pixels, sent at 60 complete frames per second.

720p-The picture is 1280 ×720 pixels,sent at 60 complete frames per second.

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مارشل برین کی کتاب How Stuff Works صفحہ نمبر 136، 195)

الغرض! ان شعاعی ذرات کے ظاہر ہونے اور فوراً ختم ہونے کو آنکھوں کے ذریعہ دیکھنا ہرگز ممکن نہ ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ اور فضل وعنایت سے قوتِ باصرہ میں قرارِ نظر (Persisttence of vision) کی طاقت نہ رکھتے، یہ تو رب کریم کا احسان ہے کہ اس نے آنکھوں میں یہ طاقت رکھ دی ہے کہ جب ہم کسی منظر کو ایک لمحہ کے لئے بھی دیکھتے ہیں تو اس کے مٹ جانے کے بعد بھی اس کا عکس ایک سیکنڈ کے سولہویں (۱/۱۶) حصے تک ہماری آنکھ میں باقی رہتا ہے اور منظر آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ اسکرین پر نظر آنے والی شکل میں تصویر کی بنیادی شرط ''استقرار وقائم ہونا'' موجود نہیں ہے، اس لئے یہ مناظر شرعاً تصویر میں داخل نہیں ہیں۔

ہمارے بہت سے اکابر رحمہم اللہ نے تصویر کی حقیقت اور تصویر وعکس کے درمیان فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے قیام اور پائیداری کو حدِ فاصل اور معیار کے طور پر ذکر فرمایا۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ''تصویر کے شرعی احکام'' ص:۵۱ میں تحریر فرماتے ہیں:

'' واقعہ یہ ہے کہ ظل اور سایہ قائم و پائیدار نہیں ہوتا، بلکہ صاحبِ ظل کے تابع ہوتا ہے، جب تک وہ آئینہ کے مقابل کھڑا ہے تو یہ ظل بھی کھڑا ہے، جب وہ یہاں سے الگ ہوا تو یہ ظل بھی غائب اور فنا ہوگیا، فوٹو کے آئینہ پر جو کسی انسان کا عکس آیا، اس کو عکس اسی وقت تک کہا جاسکتا ہے جب تک اس کو رنگ وروغن اور مسالہ کے ذریعہ قائم اور پائیدار نہ بنادیا جائے اور جس وقت اس عکس کو قائم اور پائیدار بنادیا، اسی وقت یہ عکس تصویر بن گئی۔'' (تصویر کے شرعی احکام ص:۵۱)

نیز امداد الاحکام جلد ۴ ص ۳۸۴ پر تصویر اور فوٹو کے متعلق ایک سوال کے جواب کے ضمن میں تصویر اور عکس کا فرق بیان کرتے ہوئے صاحبِ اعلاء السنن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے بڑا فرق تو دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے، پس وہ اسی وقت تک عکس ہے جب تک مسالہ سے اسے قائم نہ کیا جائے اور جب اس کو کسی طریقہ سے قائم اور پائیدار کرلیا جائے، وہی تصویر بن جاتا ہے۔''

(جاری ہے......)

اورحضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ احسن الفتاوی جلد۸ صفحہ۳۰۲ پر عکس اور تصویر میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''تصویر وعکس دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں، تصویر کسی چیز کا پائیدار اور محفوظ نقش ہوتا ہے، عکس ناپائیدار اور وقتی نقش ہوتا ہے، اصل کے غائب ہوتے ہی اس کا عکس بھی غائب ہوجاتا ہے۔''

حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ جامعہ اشرفیہ لاہور ''ٹی وی اسکرین'' پر براہِ راست آنے والی شکل کے متعلق ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:
''تصویر عکسِ دائم کو کہتے ہیں، اسی لئے پانی میں اور شیشہ میں جو عکس نظر آئے، وہ تصویر نہیں اور یہاں جب تک مقرر بول رہا ہے، اس کا عکس سامنے ہے، جب وہ ہٹ جائے، یہ بھی ہٹ گیا، اس لئے تصویر ہی نہیں، ہاں ممکن ہے کہ بعض جگہ پہلے سے تصویریں لے کر رکھ لی گئی ہوں، وہ دکھائی جارہی ہوں تو تصویر ہوں گی۔ (الاشرف جلد۴ ش۱۲ شعبان ۱۴۰۹ھ صفحہ۶۱)

(۲)... یہ مناظر بعینہ عکس اس لئے نہیں کہ عکس درحقیقت ذوالعکس (یعنی جس کا عکس ہے اس) سے ٹکرا کر صیقل (چکنی) سطح سے منعکس ہونے والی روشنی کا نام ہے، جبکہ یہاں اسکرین پر نظر آنے والی شعاعیں بعینہ وہ نہیں ہیں جو ذوالعکس سے ٹکرا کر منعکس ہوئی تھیں، لہٰذا یہ بعینہ عکس نہیں ہیں، البتہ ان کی مشابہت تصویر کے بہ نسبت عکس سے زیادہ ہے، کیونکہ ویڈیو کیسٹ، سی ڈی یا چپس میں محفوظ معلومات کے مطابق ڈیٹا کو پڑھنے والے آلہ کی مدد سے اسکرین پر ایک خاص تسلسل کے ساتھ ٹکرانے والی شعاعیں اسی طرح ہمیں اسکرین پر نظر آرہی ہوتی ہیں جس طرح آئینہ میں عکس نظر آتا ہے، اس لئے کہ عکس میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب تک آئینے وغیرہ میں پیچھے سے شعاعیں آتی رہیں گی، اس وقت تک ہمیں عکس نظر آئے گا اور جب آئینہ پر شعاعیں پڑنا بند ہوجائیں گی تو اس میں عکس بھی نہیں بنے گا، خواہ آدمی اب بھی آئینہ کے سامنے ہو، مثلاً ظلمت اور اندھیریاں طاری ہوجائیں اور شعاعیں پیدا نہ ہوں تو آدمی اگرچہ آئینہ کے سامنے کھڑا ہے، لیکن اس کا عکس نہیں بنے گا، ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ اسکرین پر نظر آنے والے مناظر میں بھی یہی بات ہے کہ اسکرین پر جو کچھ نظر آرہا ہے، وہ خالصۃً روشنی کی شعاعیں ہیں جو ڈیجیٹل کیمرہ یا ڈیجیٹل مشین سے نکل کر اسکرین سے ٹکرا رہی ہوتی ہیں اور مسلسل فنا ہورہی ہیں اور جب تک یہ شعاعیں نکل کر اسکرین پر پڑنے اور اسی لمحہ فنا ہونے کا یہ عمل جاری ہے تو منظر اسکرین پر نظر آئے گا، لیکن جوں ہی شعاعیں نکلنا بند ہوجائیں گی، خواہ آلہ اور مشین بند ہونے کی وجہ سے یا بجلی منقطع ہونے کی وجہ سے، بہرحال! منظر بھی فوراً غائب ہوجائے گا، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ہے کہ بجلی کے بند ہونے کے بعد آخری منظر اسکرین پر چپکا رہ جائے، کیونکہ اسکرین پر نظر آنے والا منظر روشنی کی شعاعوں کے رحم وکرم پر تھا، اس لئے روشنی ختم تو منظر بھی غائب۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر اگر غور کیا جائے تو یہ مناظر عکس کے قریب تر اور اس کے بہت مشابہ ہیں، پیچھے یہ بات وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ اکابر علماءِ کرامؒ کی تحریرات کی رُو سے کسی چیز کو تصویر اسی وقت کہا جائے گا جب اس کی واضح شکل وصورت کسی چیز پر قائم اور منقش ہوجائے،

(جاری ہے......)

یا اس طرح تراشی گئی ہو کہ اس کی شکل وصورت کسی چیز پر ثبت وقائم ہو جائے، جبکہ یہاں یہ شعاعی ذرات وبرقی اشارے کسی چیز پر منقش وقائم نہیں، اب اس منظر کا جب حقیقی تصویر سے موازنہ کیا جاتا ہے تو ان میں زیرِ بحث مناظر کی مشابہت تصویر کے ساتھ صرف اس قدر ہے کہ جس طرح حقیقی تصویر کی شکل وصورت اصل شے کی طرح ہے، اسی طرح یہ مناظر بھی دیکھنے میں اصل شے کی طرح ہوتے ہیں، نیز جس طرح حقیقی تصویر میں انسان کے صنع (عمل) کا دخل ہے، اسی طرح اس میں بھی انسان کے صنع کا دخل ہوتا ہے، لیکن حقیقی تصویر کے ساتھ اتنی مشابہت آئینہ میں نظر آنے والے عکس کو بھی ہے کہ دیکھنے میں اصل کی طرح نظر آتا ہے اور اس میں بھی انسان کے صنع کا دخل ہے کہ وہ باقاعدہ آئینہ کے سامنے آتا ہے یا باقاعدہ آئینہ لگا کر کسی جانب کے عکس کو دیکھا جاتا ہے، بلکہ آئینہ بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس میں عکس نظر آئے، جبکہ اس کے برعکس حقیقی تصویر کا بنیادی وصف یعنی قیام واستقرار اس میں موجود نہیں ہے، بلکہ بالکلیہ مفقود ہے، کیونکہ حقیقی تصویر کو اپنی ذات میں بقاء ہوتا ہے، جب تک کسی عمل کے ذریعے اس کو مٹا نہ دیا جائے، وہ باقی رہتی ہے، عکس اور حقیقی تصویر میں یہی چیز ما بہ الفرق ہے، یعنی یہی پائیداری اور بقاء کا فرق عکس اور حقیقی تصویر کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔

(ڈیجیٹل مناظر کی حقیقت کی تفصیل اور اس بارے میں مفصل فنی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: مارشل برین (Marshal Brain) کی کتاب: HOW STUFF WORKS صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۳، جو آسٹریلیا کے معروف ادارہ Wiley publishing pty Ltd کی شائع کردہ ہے۔)

ڈیجیٹل مناظر کی اسی حقیقت کے پیشِ نظر دورِ حاضر کے مسائل ووسائل پر گہری نظر رکھنے والے بہت سے محقق علماءِ کرام ڈیجیٹل مناظر کو تصویر کے بجائے عکس میں داخل کرتے ہیں، یعنی ڈیجیٹل نظام میں اسکرین پر نمودار ہونے والے یا ٹیلی ویژن میں نشر ہونے والے مناظر ان کے نزدیک اشبہ بالعکس (عکس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھنے والے) یا زیادہ سے زیادہ عکس ہیں نہ کہ تصاویر۔

مثلاً: جدید مسائل ووسائل پر گہری نظر رکھنے والی برصغیر کی معروف علمی شخصیت حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب مدظلہم اپنی کتاب "جدید مسائل کا شرعی حل" صفحہ ۱۵۷ میں لکھتے ہیں:

"ٹیلی ویژن پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ دراصل بجلی اور مشین کے ذریعے لے کر دکھایا جانے والا عکس یا ظل (سایہ) ہے، لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا، جو اِن مناظر کا ہے جو ٹیلی ویژن پر پیش کئے گئے ہیں...... اگر ٹیلی ویژن پر براہِ راست ایسے مناظر اور پروگرام پیش کئے جائیں جن کا بغیر ٹیلی ویژن کے بھی دیکھنا وسننا جائز ہے تو ایسے پروگراموں اور مناظر کا ٹیلی ویژن پر دیکھنا سننا بھی جائز ہوگا الخ۔

ہندوستان کے ایک محقق عالم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اپنی کتاب "جدید فقہی مسائل" صفحہ ۱۸۱ پر لکھتے ہیں:

(جاری ہے......)

"ٹی وی پر ذی روح کی تصویر اگر نیگیٹیو لینے کے بعد اس کے ذریعے نشر کی جائیں، تب تو اس کا حکم تصویر کا ہے اور اگر براہِ راست اس طرح ٹیلی کاسٹ کیا جائے کہ فلم بنائی ہی نہ جائے تو یہ عکس ہے اور اس وقت درست ہے، جب کسی خاتون کو سامنے نہ لایا جائے اور نہ غیر اخلاقی مقاصد کے لئے اس کا استعمال کیا جائے۔ ہذا ما عندی، واللہ اعلم۔

حضرت مولانا مفتی عبداللہ معروفی صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند "ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا دینی مقاصد کے لئے استعمال" کے اہم موضوع پر اپنے مقالہ میں ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والی شکل کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ٹیلی ویژن پر جو صورت نظر آتی ہے وہ تصویر کے حکم میں نہیں، بلکہ وہ عکس ہے، لہٰذا اس پر تصویر کی حرمت والی روایتوں سے استدلال صحیح نہیں ہوگا۔"

حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب مدظلہم جامعہ اسلامیہ فیصل آباد "اشرف التوضیح" جلد سوم صفحہ ۵۸۵ پر "ڈیجیٹل مناظر" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ویڈیو کیسٹ میں جو کچھ بھرا ہوا ہے، وہ تصویر نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں اعضاء متمیز نہیں اور اس کو چلا کر اسکرین پر جو کچھ نظر آرہا ہے، وہ بھی تصویر نہیں، اس لئے کہ وہ شعاعوں کے ماتحت ہے، بلکہ ہے ہی وہ شعاعیں جو اس میں سے نکل کر اس پر پڑ رہی ہیں، لہٰذا اس کو دیکھنا تصویر کو دیکھنا نہیں کہلائے گا، بظاہر یہ نقطۂ نظر اس وجہ سے جو میں نے ذکر کی ہے، راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ نہ کیسٹ تصویر ہے اور نہ ہی اسکرین پر نظر آنے والا منظر تصویر ہے.......... (الیٰ قولہ) حاصل یہ نکلا کہ ویڈیو کیسٹ میں جو کچھ بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ بھی تصویر نہیں اور اس کو چلاتے وقت جو کچھ اسکرین پر آتا ہے، وہ بھی تصویر نہیں۔

اب رہ گیا ٹی وی کا حکم، وہ تصویر ہے یا نہیں؟ تو بظاہر اسے بھی تصویر کہنا مشکل ہے، اس لئے کہ ٹی وی کے پروگرام عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو براہِ راست پروگرام ہوتے ہیں، یعنی لائیو براڈ کاسٹ ہوتی ہے اور دوسرے وہ پروگرام ہوتے ہیں جن کو ویڈیو کیمرے کے ذریعے پہلے محفوظ کیا جاتا ہے، پھر اسے دِکھایا جاتا ہے، پہلی قسم کے پروگرام تو یقیناً عکس ہیں، اسلئے کہ ساتھ ساتھ اِدھر وہ کام ہو رہا ہوتا ہے یا کوئی مقرر بول رہا ہے اور ساتھ ساتھ ہی اس کی تصویر دور دور تک پہنچ رہی ہے، اگر وہ کیمرے کے سامنے سے ہٹ جائے تو اس کی تصویر بھی ہٹ جائے گی، اور جو دوسری قسم کے پروگرام ہیں، ان کا حکم ظاہر ہے، ویڈیو والا ہوگا اور ویڈیو کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ تصویر نہیں۔ البتہ ایک تیسری صورت ہوسکتی ہے، لیکن وہ آج کل عموماً استعمال نہیں ہوتی، لیکن اگر ہو تو وہ تصویر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ فلم ہو، ویڈیو کی بجائے پرانے زمانے کی، جس طرح فلم ہوتی تھی کہ ایک لمبی سی ریل سی ہوتی تھی، اس پر چھوٹی چھوٹی تصویریں ہوتی ہیں اور اسی کو چلایا جاتا ہے تو ایک تسلسل کے ساتھ وہ تصویریں بڑی ہو کر سامنے آجاتی ہیں اور وہ چونکہ چل رہی ہوتی ہیں ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر اور دوسری تصویر کے بعد تیسری اور تسلسل کے ساتھ چل رہی ہوتی ہیں، اس لئے اسکرین پر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آدمی حرکت کر رہا ہے، وہ اگرچہ بہت چھوٹی ہوتی ہے، لیکن ہوتی وہ تصویر ہے، اس کو جب بڑا کیا جائے یا کسی خوردبین وغیرہ کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ تصویر واضح طور پر نظر آئے گی

(جاری ہے......)

اوراس میں اعضاء کوالگ الگ طور پر متمیز کیا جاسکتا ہے، وہ تصویر ہے، اگرچہ اصل کے اعتبار سے وہ چھوٹی ہے، لیکن اسکرین پر دِکھاتے وقت اس کو بڑا کرلیا جاتا ہے، وہ تصویر کے حکم میں ہے، لیکن وہ آج کل مروج نہیں ہے، خاص طور سے ٹی وی پر پروگرام اس کی بنیاد پر نہیں آتے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''اشرف التوضیح'' جلدسوم صفحہ ۵۷۲ تا ۵۸۵)

بہرحال! ڈیجیٹل کیمرہ کے ذریعہ جاندار کی منظر کشی پر تصویر محرم کا اطلاق اہلِ علم کے ایک بڑے طبقے کے ہاں درست نہیں، یا کم ازکم محلِ نظر ہے۔ جیسا کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے شیخ الحدیث ومفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی رحمہ اللہ کی طرف سے ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی'' کی تیسری نشست متعلقہ ''ڈیجیٹل کیمرہ'' کے موقع پر جومقالہ پیش کیا گیا تھا، اس کے صفحہ ۴ پر حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''ڈیجیٹل کیمرہ کے ذریعہ ذی روح کی منظر کشی پر تصویر محرم کا اطلاق اہلِ علم کے ایک معتد بہ طبقہ کے ہاں محلِ نظر ہے، جن میں عرب علماء کی اکثریت اور مقامی علماء کی ایک جماعت شامل ہے، جیسا کہ پچھلی نشستوں کی کارروائی سے یہ بات سامنے آچکی ہے۔''

نیز حضرت مولانا مفتی نظام شامزئی رحمہ اللہ کی طرف سے ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی'' متعلقہ ''ڈیجیٹل کیمرہ'' کے دوسرے اجلاس میں جومقالہ پیش کیا گیا تھا، اس کے صفحہ نمبر ۶ پر حضرت مفتی صاحب ''ڈیجیٹل مناظر'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری ناقص رائے کے مطابق دشمن کے لئے میدان بالکل کھلا چھوڑ دینے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے بسی کا اظہار کرتے رہنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے دفاع کرنے اور صفائی وبے گناہی بیان کرنے میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کرلیں، مذکورہ بالا نصوص سے مجھے یہی گنجائش محسوس ہورہی ہے، بلکہ اسے دینی ودنیاوی ضرورتِ شدیدہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا، نیز جیسا کہ گذشتہ اجلاس میں اکثریتی رائے سے یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ ڈیجیٹل کیمرہ کے ذریعہ براہِ راست منظر کشی ممنوع تصویر سازی کے حکم میں نہیں ہے، اسی طرح جب اسے محفوظ کرکے اسکرین پر دِکھایا جائے تو اس پر بھی تصویر محرم کا بالکلیہ اطلاق مشکل اور دُشوار ہے، بلکہ اسے اشبہ بالعکس قرار دیا گیا ہے، اس بناء پر میرا رجحان یہ ہے کہ موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں اسلام کے خلاف دشمن کے پروپیگنڈہ کم کرنے کے لئے (اسلحہ سازی اور اقتصادی کدوکاوش کی طرح) ''میڈیا'' کو استعمال کرلیا جائے تو تصویری محظور کے باوجود بھی گنجائش ہوسکتی ہے۔''

جامعہ فاروقیہ کراچی کے رئیس وشیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی نے بھی بخاری شریف کی تقریر ''کشف الباری'' (کتاب اللباس صفحہ ۳۰۸) میں ''ٹی وی، ویڈیو اور کمپیوٹر'' اسکرین پر نظر آنے والی شکلوں کے تصویر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اہلِ فتویٰ علماء کرام کا اختلاف بیان فرمایا، جس میں بعض علماء کرام کی رائے یہی بیان کی گئی کہ ان کے نزدیک ''ٹی وی، ویڈیو اور کمپیوٹر'' اسکرین پر نظر آنے والی شکلیں تصویر کے حکم میں نہیں، اوراس پر تصویر کی وعیدیں جاری نہیں ہوں گی۔ ملاحظہ ہو: ''کشف الباری'' کی اصل عبارت: (جاری ہے......)

''اب رہ جاتی ہے بات ٹیلیویژن، ویڈیواورکمپیوٹر کی تصویر کی، اس کے بارے میں جمہوراہل فتاوی کا فتوی عدمِ جواز کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ٹی وی پر آنے والی تصویر کا وہی حکم ہے جو دوسری عام تصاویر کا ہے۔ البتہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ تصویر کے حکم میں نہیں، بلکہ یہ عکس ہے جو شعاعوں اورلہروں کے ذریعے جدید تکنیک سے محفوظ کردیا جاتا ہے، لہٰذا اس پر تصویر کی وعیدیں جاری نہیں ہوگی، یہ اختلاف اس صورت میں ہے، جب ٹی وی، ویڈیواورکمپیوٹر، سی ڈیز میں آنے والی اورمحفوظ کی جانے والی تصویر میں کوئی اورشرعی قباحت نہ ہوالخ۔

ڈیجیٹل مناظر کا عکس کے زیادہ مشابہ ہونے کی وجوہات

سطورِ بالا میں بیان کردہ تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ باعتبارِ حقیقت اسکرین پر نظر آنے والے مناظر کو بنیادی وصف میں حقیقی تصویر کے ساتھ مشابہت نہیں ہے، بلکہ مغایرت ہے، نیز یہ مناظر بعینہٖ عکس بھی نہیں، لیکن ان مناظر کو اپنی ماہیت کے اعتبار سے اور دیگر کئی بنیادی اوصاف کے اعتبار سے عکس کے ساتھ زیادہ مشابہت حاصل ہے، مثلاً

(الف)... عکس اپنی ماہیت کے اعتبار سے روشنی کی شعاعیں اوراس کی کرنیں ہیں اوراسکرین پر نمودار ہونے والے مناظر بھی روشنی ہی کی شعاعیں ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح عکس میں جب تک کسی منظر سے شعاعیں ٹکرا کر کسی صیقل (چکنی) سطح پر پڑتی رہیں گی، اس سے شعاعیں منعکس ہوکر عکس بنتا رہے گا اور جب شعاعیں اس پر پڑنا بند ہوجائیں گی تو منظر اگر برسوں اس کے سامنے رہے، اس کا عکس اس میں نہیں بنے گا، اسی طرح یہاں اسکرین، پردہ یا دیواروغیرہ پر بھی یہی صورت ہے کہ جب تک ان پر شعاعیں پڑتی رہیں گی (یعنی کیمرے میں محفوظ شعاعی معلومات کی مدد سے برقی ذرات، مخصوص عمل (Process) کے ذریعہ کیمرے میں نصب آلہ سے نکل کر اسکرین، پردہ یا دیواروغیرہ کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے) اوراسی اصل ترتیب ومقدار سے اسکرین وغیرہ پر ظاہر ہوتے رہیں گے تو منظر نظر آتا رہے گا، اورجب ان میں شعاعیں پڑنا بند ہوجائیں گی (خواہ کیمرہ یا بجلی بند ہوجانے کے سبب یا کیمرہ کے عمل میں کسی خارجی رکاوٹ کے سبب) تو منظر بھی غائب ہوجائے گا، اوراس کا ایک ذرہ بھی اسکرین، پردہ یا دیوار پر باقی نہیں رہے گا، اسی لئے اب اگر کوئی شخص خوردبین لگا کر اسکرین کو دیکھے گا تو بھی اسے منظر کا کوئی نشان تک نظر نہیں آئے گا، کیونکہ یہ روشنی اورشعاعوں سے بننے والا ویسا ہی عکس تھا جو کسی آئینہ وغیرہ پر روشنی کے انعکاسی عمل سے بنتا ہے اور جو روشنی غائب ہوجانے سے ختم ہوگیا، اسی لئے جس طرح آئینہ میں روشنی پڑنا بند ہوجانے کے سبب جب عکس غائب ہوتا ہے تو آئینہ میں اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا ہے، اسی طرح یہاں بھی جب اسکرین وغیرہ پر کیمرہ سے نکلنے والے برقی ذرات منتقل ہونا بند ہوجاتے ہیں تو اسکرین سے منظر بھی غائب ہوجاتا ہے اور منظر کا کوئی اثر اسکرین پر باقی نہیں رہتا ہے۔

(ب)... آئینہ میں منظر کا عکس شعاعوں کے انعکاسی عمل سے وجود میں آتا ہے جو آئینہ میں ناپائیدار حالت میں صرف نمود وظہور کی حد تک رونما ہوتا ہے، اس طرح آئینہ میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ ناپائیدار حالت میں ظاہر ہونے والی روشنی اوراس کی شعاعیں ہیں۔ (جاری ہے......)

اسی طرح ڈیجیٹل نظام کے ذریعے اسکرین اور پردہ وغیرہ پر نمودار ہونے والا منظر بھی سراسر شعاعی ذرات پر مشتمل ہے اور ٹھیک اسی طرح ناپائیدار حالت میں صرف نمود وظہور کی حد تک اسکرین پر رونما ہوتا ہے، جس طرح ''عکس'' کسی صیقل (چکنی) سطح پر رونما ہوتا ہے۔

(ج)... جس طرح آئینہ وغیرہ پر روشنی کے ذرات پر مشتمل عکس آئینہ وغیرہ میں صرف ظاہر ہوتا ہے، اس میں منقش وقائم نہیں ہوتا ہے، اسی طرح پردہ، دیوار یا اسکرین وغیرہ پر روشنی کے ذرات پر مشتمل منظر بھی اسکرین وغیرہ پر منقش و قائم نہیں ہوتا۔

(د)... جس طرح آئینہ کے عکس میں موجود روشنی کی شعاعیں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ مسلسل سفر کررہی ہوتی ہیں، کہیں ٹھہری ہوئی نہیں ہوتیں، اسی طرح کیمرہ وغیرہ سے پردہ، دیوار یا اسکرین وغیرہ پر ظاہر ہونے والا منظر کے شعاعی ذرات بھی کیمرے وغیرہ سے، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ان مظاہر کی طرف انتہائی تیزی سے، اپنی اصلی اور خاص ترتیب سے منتقل ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں اور یہ عمل انتہائی تیزی کے ساتھ مسلسل ہوتا ہے، اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی وقفہ یا استقرار نہیں آتا، اگرچہ انتہائی تیزی کی وجہ سے بظاہر منظر اسکرین پر چپکا ہوا محسوس ہوتا ہے، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

(ہ)... ایک مشابہت اس اعتبار سے بھی ہے کہ جس طرح عکس ایک عرض قائم بالغیر ہے (یعنی ایسی چیز ہے جو کہ کسی اور چیز کے ذریعے قائم ہو، خود سے قائم نہ ہو) اسی طرح اسکرین پر نمودار ہونے والا منظر بھی قائم بالغیر ہے، بلکہ اسکرین کا منظر عرضیت میں عکس سے بھی بڑھ کر ہے، اس لئے کہ عکس میں اصل تو کم از کم جوہر ہے، جبکہ یہاں اس منظر کا اصل بھی (شعاعی اعداد وشمار کی غیر مرئی شکل میں) عرض قائم بالغیر ہے۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

(الف)... یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات جو ایک ہی منظر دیر تک اسکرین پر نظر آتا ہے یا کوئی منظر اسکرین پر رُکا ہوا نظر آتا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ منظر اسکرین پر ٹک گیا یا قائم ہوگیا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاص بٹن دبا کر ہیڈ کو چلنے سے روک دیا گیا، جس کی وجہ سے اسی ایک ہی منظر کے برقی ذرات آلہ (Device) سے اسکرین کی طرف مسلسل منتقل ہو رہے ہوتے ہیں اور مذکورہ بالا طریقہ سے اسکرین کو روشن کرتے ہوئے زائل وفنا بھی ہوتے جارہے ہیں، یہ نہیں ہے کہ یہ منظر اسکرین پر منقش وقائم ہوگیا، بلکہ روشنی کے ذرات ابھی بھی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے مسلسل اسکرین سے ٹکرا رہے ہیں اور فنا ہو رہے ہیں۔ اور یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کوئی چیز دیر تک آئینہ کے سامنے پڑی رہے یا کوئی آدمی دیر تک اس کے سامنے کھڑا ہوجائے تو جب تک روشنی موجود ہوگی، عملِ انعکاس سے اس چیز یا آدمی کا عکس آئینہ میں نظر آتا رہے گا، لیکن آئینہ میں یہ شعاعیں منقش اور قائم نہیں ہوں گی، کیونکہ روشنی اسی رفتار سے مسلسل سفر کررہی ہے، کہیں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹکتی، ہمیں سورج سے نکلنے والی شعاعیں بظاہر اپنی جگہ رُکی ہوئی اور کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور شعاعیں مسلسل سفر کررہی ہیں،

(جاری ہے......)

....

سورج زمین سے نوکروڑتیس لاکھ میل دور ہے، اس کے باوجود سورج کی روشنی ہم تک صرف تقریباً آٹھ منٹ میں پہنچ جاتی ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر سورج کسی وجہ سے ایک دم بجھ جائے تو بھی آٹھ منٹ تک ہم اس کی روشنی دیکھتے رہیں گے۔

جناب اسٹیفن W ہاکنگ جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس وٹیکنالوجی کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں، اپنی کتاب "A BRIEF HISTORY OF TIME"(یعنی وقت کی مختصر تاریخ) میں لکھتے ہیں:

''اگر سورج پر کوئی تباہی آتی ہے یا سورج کسی حادثہ سے یکدم ختم ہوجاتا ہے تو زمین پر اس کا ادراک فوراً نہیں ہوسکتا، کیونکہ زمین پر اس کی روشنی آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، چنانچہ آٹھ منٹ بعد زمین پر سورج میں ہونے والی تبدیلی کا پتہ چلے گا۔

پھر آگے مزید لکھتے ہیں:

''کہکشائیں زمین سے کھربوں میل کے فاصلے پر ہیں اوران سے نکلنے والی روشنی لاکھوں سال میں ہم تک پہنچتی ہے ....سورج کے بعد زمین سے قریب ترین جوستارہ ہے، اس کا نام ''پراکسیما سینٹورائی (Prxima centauri) ہے، وہ زمین سے چار لائٹ سال کے فاصلے پر ہے، اس سے نکلنے والی روشنی ہم تک چار سال میں پہنچتی ہے یا تقریباً تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔الخ

درج بالا تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں درج ذیل عبارات:

1.'We would know about it only after eight minutes, the time it takes light to reach us from the sun. Only then would events on earth lie in the future light cone of the event at which the sun went out. Similarly, we do not know what is happening at the moment farther away in the universe: The light that we see from distant galaxies left them millions of years ago, and in the case of the most distant object that we have seen, the light left some eight thousand millions years ago. Thus, when we look at the universe, we are seeing as it was in the past.

If one neglects gravitational effects, as Einstein and poincare did in 1905, one has what it called the special theory of relativity. For every event in space - time we may construct a light cone (the set of all possible paths of tight in space - time emitted at that event), and since the speed of light is the same direction. The theory also tells us that nothing can travel faster than light. This means that the path of any object through space and time must be represented by line that lies with in the light cone at each event on it. BY STEPHEN W HAWKING PAGE 30 LINE 17.

(جاری ......)

AND ON PAGE NO: 37
The nearest star, called Proxima Centauri, is found to be about four light-years away (the light from it takes about four years to reach earth), or about twenty-three million million miles. Most of the other stars that are visible to the naked eye lie within a few hundred light-years of us Our sun, for comparison, is a mere eight light-minutes away!. The visible stars appear spread all over the night sky, but are particularly concentrated in one band, which we call the milky way.
2To obtain some indication of the relative distances involved, we can consider the speed of light. Light travel at 10 million million kilometers a year. It takes 1.26 seconds for light to travel from the noon to the earth, and 8 minutes 17 seconds for it to travel from the sun to the earth. It takes about a day for light to travel a cross the solar system and 27700 years for it to reach the earth from the centre of the Milky Way. Light from the furthest known galaxies has taken more than 10000 million years to reach the Earth.
(THE NEW OXFORD ATLAS (1998 RO 2002) UNDER THE HEADING THE SOLAR SYSTEM)

(تفصیل کے واسطے ملاحظہ ہوں: (APPLIED PHYSICS Third Edition)، PaulETippens.) chapter: 26 page: 466 to 471 نیز ملاحظہ ہو جان ڈی کٹنل کی کتاب: فزکس صفحہ: ۷۹۵ اور ۷۹۶)

(ب)... ڈیجیٹل مناظر کو اشبہ بالعکس قرار دینے پر بعض حضرات کی طرف سے ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عوام اِن مناظر کو تصویر ہی سمجھتے ہیں اور عرفِ عام میں اسکرین پر نظر آنے والے ڈیجیٹل منظر کو تصویر کہا ہے اور سمجھا جاتا ہے، لہٰذا شرعاً بھی تصویر ہی ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر شرعی نقطۂ نگاہ سے کوئی چیز تصویر نہ ہو یا تصویر کے حکم میں نہ ہو تو محض عوام کے سمجھنے کی وجہ سے شرعاً وہ چیز تصویر نہیں ہوگی، چونکہ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ڈیجیٹل مناظر شرعی نقطۂ نگاہ سے تصاویر نہیں ہیں، اس لئے عام لوگوں کا ان مناظر کو تصویر سمجھنا اسی طرح کا مغالطہ ہے جس طرح عام لوگوں کے عرف میں نیگیٹیو پر بنی ہوئی تصویر کو عکس بولا اور سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ شرعی نقطۂ نگاہ سے تصویر ہے، کیونکہ وہ تصویر کی شکل میں وہاں قائم و مستقر ہے، لہٰذا عام لوگوں کے غلط فہمی پر مبنی کسی عرف کی وجہ سے حکمِ شرعی نہیں بدلے گا، جیسا کہ ہمارے اکابرؒ نے سرکاری ملازمین کے جی پی فنڈ پر ملنے والی اضافی رقم لینے کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ لوگوں کے عرف میں اسے سود لکھا اور سمجھا جاتا ہے، اسی طرح رائج الوقت انعامی بانڈز پر ملنے والی اضافی رقم کو عرف میں نہ صرف انعام سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے انعام لکھا اور بولا بھی جاتا ہے، لیکن چونکہ عرف میں اسے انعام سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہے اور شرعی ضابطے کے اعتبار سے اس پر ملنے والی اضافی رقم سود ہے، اس لئے اس عرف کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ سود ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہوگا۔

(جاری ہے......)

(ج)... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دنیا بھر کے تمام ماہرین اسکرین کے منظر کو تصویر لکھتے اور کہتے ہیں، لہٰذا یہ تصویر ہے اور دلیل یہ بیان فرماتے ہیں کہ ماہرین اس پر لفظِ "Picture" کا اطلاق کرتے ہیں، جس کے معنی تصویر کے ہیں، جبکہ عکس کو انگریزی میں "Image" کہا جاتا ہے، جیسا کہ ایک مقالہ نگار نے اسکرین کے منظر کے متعلق اپنے مقالہ میں لکھا ہے:

''پھر شریعت میں بے شمار مسائل میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے، اور یہاں پوری دنیا کے لوگ چھوٹے، بڑے، مرد و عورت، بوڑھے، جوان، کمزور نظر کے چشمائی، غیر چشمائی سب کہہ رہے ہیں، تصویر ہے سوائے چند معدودے پاکستانی سائنسدانوں کے جو اِن چیزوں کے اصل موجد بھی نہیں۔ الخ''

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اوّلاً یہ دعویٰ ہی درست نہیں کہ تمام ماہرین یا تمام دنیا کے لوگ اسکرین کے منظر کو تصویر "Picture" لکھتے اور کہتے ہیں، بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور عام طور پر لوگ ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی شکل وصورت کو تصویر کی بجائے اصل کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً یوں کہتے ہیں ''آج فلاں صاحب ٹی وی پر آرہے تھے، آج ٹی وی پر فلاں شہر دِکھایا گیا'' وغیرہ۔ نیز محققین (ان کا تعلق کسی بھی خطۂ زمین سے ہو) عام طور پر اسے تصویر "Picture" کے بجائے عکس "Image" ہی کا نام دیتے ہیں اور ڈیجیٹل کیمرہ سے منظر محفوظ کرنے کو عکس بندی کہتے ہیں، انگریزی کی مستند ترین ڈکشنری "OXFORD Advanced Learners DICTIONARY" میں ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے منظر کو عکس "Image" ہی کہا گیا "An image on a television screen" ماہرینِ فن کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں، یہاں بطورِ نمونہ ایک معروف مغربی سائنسداں ''مارشل برین'' کی کتاب "HOW STUFF WORKS" سے ٹی وی اسکرین اور کمپیوٹر کے مانیٹر میں نظر آنے والے مناظر کے بارے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے جن میں موصوف نے واضح طور پر ان مناظر کو عکس "Image" کا نام دیا ہے، جیسا کہ موصوف لکھتے ہیں:

"Digital TV makes TV images larger and much clearer and moves us. ,,Computer monitors are so important that, without a monitor a typical desktop computer is useless. The monitor provides you with instant feedback by showing text and graphic images as you work on or play with your computer,,.

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مارشل برین (Marshal Brain) کی کتاب HOW STUFF WORKS صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۷، جو آسٹریلیا کے معروف ادارہ Wiley publishing pty Ltd کی شائع کردہ ہے۔)

دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح اُردو میں لفظِ ''تصویر'' کا اطلاق حقیقی اور مجازی دونوں طرح کی تصاویر پر کیا جاتا ہے (دیکھئے: فیروز اللغات: مادہ ''تصویر'') یا عربی زبان میں لفظِ ''صورۃ'' کا اطلاق تصویر، عکس اور صورِ خیالیہ وغیرہ سب پر کیا جاتا ہے، (جاری ہے......)

(کمافی المصباح المنیرفی غریب شرح الکبیر ج:۵ص:۲۸۲) (ص ور) الصُّورَةُ التِّمْثَالُ وَجَمْعُهَا صُوَرٌ مِثْلُ غُرْفَةٍ وَغُرَفٍ وَتَصَوَّرْتُ الشَّيْءَ مَثَّلْتُ صُورَتَهُ وَشَكْلَهُ فِي الذِّهْنِ فَتَصَوَّرَ هُوَ وَقَدْ تُطْلَقُ الصُّورَةُ وَيُرَادُ بِهَا الصِّفَةُ كَقَوْلِهِمْ صُورَةُ الْأَمْرِ كَذَا أَىْ صِفَتُهُ وَمِنْهُ قَوْلُهُمْ صُورَةُ الْمَسْأَلَةِ كَذَا أَىْ صِفَتُهَا). اسی طرح انگریزی زبان میں بھی لفظِ "Picture" کا اطلاق حقیقی اور مجازی دونوں قسم کی تصاویر پر ہونا عام اور معروف ہے، چنانچہ انگریزی زبان سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ لفظِ "Picture" کے درج ذیل معانی بالکل عام ہیں: تصویر، عکس، منظر، شبیہ، روشن توضیح، ذہنی عکس، خیالی تصویر، کسی چیز کا تصور کرنا یا لفظوں میں تصویر کھینچنا، کسی صورتِ حال یا واقعہ کا مجموعی تاثر، چپ نظارہ، کامل نمونہ، مثنّٰی یا کسی چیز کی نمائندہ مثال وغیرہ۔ حوالہ کے لئے دیکھئے: ''قومی انگریزی اُردو لغت "Edited by Dr Jameel Jalibi" (یا کوئی بھی مستند انگریزی ڈکشنری) نیز ماہرینِ فن کی کتابوں میں بھی اس کی بے شمار مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(د)... ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ شریعت کا اُصول یہ ہے کہ جب مبیح اور محرم میں تعارض ہو یا مسئلہ حرام و حلال میں دائر ہو تو محرم و حرام کو ترجیح ہوتی ہے، چونکہ یہاں بھی تصویر اور عدمِ تصویر میں تعارض ہے، اس لئے تصویر ہونے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اُصول کا اطلاق اس صورت میں ہوتا ہے جب حرمت اور حلت کے دلائل (مساوی طور پر) متعارض ہوں، اور قوتِ دلیل سے کسی ایک جانب کی ترجیح ممکن نہ ہو، لہٰذا اس اُصول پر عمل کے واسطے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ دلائل واقعۃً اس طرح متعارض ہوں کہ دونوں جانب کی دلیلیں مساوی ہوں، لیکن اگر جانبین کی دلیلیں مساوی نہ ہوں تو وہاں یہ اُصول نہیں چلے گا اور نہ یہ کہا جائے گا کہ آنکھ بند کرکے حرمت کا قول اختیار کرنے والوں کا قول لے لیا جائے، اگر ایسا ہوتا تو احناف اس اُصول پر عمل کرتے ہوئے مزارعت کے مطلقاً ناجائز ہونے کا فتویٰ دیتے (کیونکہ مزارعت کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مطلقاً ناجائز کہتے ہیں اور صاحبینؒ جائز کہتے ہیں) حالانکہ مفتی بہ جواز ہے۔ اس طرح جہاں کہیں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا یا فقہاء کرام کا آپس میں کسی مسئلہ میں حرمت و اباحت کا اختلاف ہو، ان سب جگہوں میں حرمت کا قول لے لیا جائے تو مسائلِ متعارضہ میں ترجیح کا آسان اُصول ہاتھ آجائے گا، اور قوتِ دلیل کی پہچان کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ حالانکہ یہ اُصول اس طرح نہیں ہے جس طرح عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے، بلکہ شرعاً اصل اعتبار قوتِ دلیل کا ہے۔

قال فی الدر المختار: (ج:۳ ص: ۲۱۰) والأصح أن العبرة لقوة الدليل عندالخلاف فی التحريم.

وفی البحر الرائق: (ج: ۳ ص: ۲۳۹) قال فی آخر الحاوی القدسی فإن خالفاه قال بعضهم يؤخذ بقوله وقال بعضهم يؤخذ بقولهما وقيل يخير المفتی والأصح أن العبرة لقوة الدليل. أهـ

(جاری ہے......)

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله في عقود رسم المفتي: وقيل بالتخيير في فتواه إن خالف الإمام صاحباه و قيل من دليل أقوى رجح وذا لمفت ذي اجتهاد أصح. ومعنى تخييره أنه ينظر في الدليل فيفتي بما يظهر له ولا يتعين عليه قول الإمام و هذا الذي صححه في الحاوي أيضاً بقوله : والأصح أن العبرة لقوة الدليل الخ.

زیرِ بحث مسئلہ میں بھی مبیح اورمحرم کا تعارض متحقق نہیں، تعارض اس وقت متصور ہوتا جب دونوں پہلو دلائل کی رُو سے یکساں ہوتے، جبکہ یہاں حقیقت یہ ہے کہ مبحوث عنہ کا عکس کے مشابہ ہونا اُوپر بیان کردہ حقائق ووجوہات کی بناء پر قریب بہ یقین کے درجہ میں ہے، اس کے برخلاف تصویر کے ساتھ مشابہ ہونا صرف شبہ کے درجے میں ہے۔

(ہ)...ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام احکامِ شرعیہ میں فطری طریقے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لئے احکامِ شرعیہ کی بنیاد فنی باریکیوں اور سائنسی تحقیقات پر رکھنا مزاجِ شریعت کے سراسر خلاف ہے، جبکہ اسکرین کے منظر کو غیر تصویر قرار دینے کے لئے فنی باریکیوں کو دیکھنا پڑتا ہے، اس لئے مزاجِ شریعت کی رعایت کرتے ہوئے ظاہر پر حکم لگانا چاہئے اور اسکرین کے منظر کو تصویر قرار دینا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات سے ہمیں مکمل اتفاق ہے کہ اسلام تمام اُمور میں عموماً اور احکامِ شرعیہ میں خصوصاً فطری طریقے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لئے احکامِ شرعیہ کی بنیاد فنی باریکیوں اور سائنسی تحقیقات پر رکھنا یا حکمِ شرعی کا مدار سائنسی تحقیق پر رکھنا بلاشبہ مزاجِ شریعت کے خلاف ہے، لیکن کسی حکمِ شرعی کی بنیاد کسی سائنسی تحقیق پر رکھنا اور بات ہے، اور کسی سائنسی ایجاد کے بارے میں اس کے ماہرین سے اس ایجاد کی حقیقت معلوم کر کے اس کا حکمِ شرعی معلوم کرنا اور بات ہے، اگر شبہ کا مقصد پہلی صورت ہے تو اس سے ہمیں انکار نہیں اور اگر دوسری صورت ہے تو یہ ہمیں تسلیم نہیں، کیونکہ شریعت میں ماہرینِ فن یا تجربہ کار لوگوں کی تحقیق سے استفادہ کرنا یا ماہرین سے کسی سائنسی ایجاد کی حقیقت معلوم کر کے شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کا جائزہ لینا اور اس بارے میں حکمِ شرعی معلوم کرنا ہرگز مزاجِ شریعت کے خلاف نہیں، جس کی تائید بعض روایتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے، تأبیر النخل (کھجور کے نر اور مادہ درختوں کی ایک دوسرے کے ساتھ پیوندکاری) والی روایت اس کی نظیر ہے، نیز آنحضرت ﷺ کی طرف سے غیلہ (حالتِ حمل میں بیوی سے ہمبستر ہونے) سے ممانعت کا ارادہ کر لینے (بلکہ بعض روایت کی رُو سے منع کر دینے) کے بعد یہ تحقیق ہوجانے پر کہ اہلِ فارس اور اہلِ روم کے ہاں غیلہ کا رواج ہے اور ان کی اولاد کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا، آنحضرت ﷺ کا ممانعت نہ کرنا (یا اس کی اجازت مرحمت فرمانا) بھی اس کی نظیر ہے۔

في مجمع الزوائد ج: ۴ ص: ۲۹۸ وعن ابن عباس أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -نهى عن الاغتيال، ثم قال " :لو ضر أحدا لضر فارس والروم ." قال ابن بكير :والاغتيال أن يطأ الرجل امرأته وهي ترضع. رواه الطبراني، والبزار، ورجاله رجال الصحيح. (راجع: كتاب النكاح باب في المغل وغيره)

(جاری ہے......)

وفی صحیح مسلم ج: ۲ ص: ۲۶۴ عن هشام بن عروة، عن أبیه، عن عائشة، وعن ثابت، عن أنس، أن النبی صلی الله علیه وسلم مر بقوم یلقحون، فقال :لو لم تفعلوا لصلح قال :فخرج شیصا، فمر بهم فقال :ما لنخلکم؟ قالوا :قلت کذا وکذا، قال :أنتم أعلم بأمر دنیاکم.(راجع کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ماقاله شرعاً دون ما ذکره من معایش الدنیا علیٰ سبیل الرّای)

ہمارے زمانے میں اس کی واضح نظیر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ نماز پڑھانے کے بارے میں اہلِ فتویٰ علماءِ کرام کا ماہرین سے رجوع کرنا، پھران کی طرف سے فراہم کردہ معلومات اور فنی باریکیوں کا شرعی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا، اور یہ دیکھنا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز بعینہٖ امام کی آواز ہے یا اس آواز کی بازگشت ہے، وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ کسی نو ایجاد چیز یا کسی بھی نئی سائنسی ایجاد کے بارے میں اس کے ماہرین سے اس ایجاد کی حقیقت معلوم کر کے شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کا جائزہ لینے کو سائنسی تحقیق پر حکمِ شرعی کا مدار رکھنا نہیں کہلاتا ہے، لہٰذا کسی چیز کی حقیقت جاننے کے لئے ماہرین سے رجوع کر کے اس کی فنی باریکیوں کا شرعی جائزہ لینے کو مزاجِ شریعت کے خلاف سمجھنا ہرگز درست نہیں۔

(و)... ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ تصویر کے حرام ہونے کی علت اور وجہ مضاہات لخلق اللہ (پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشابہت) ہے اور اسکرین پر جو منظر دِکھایا جاتا ہے، اس میں چونکہ دِکھانے والے اور نشر کرنے والے کا عمل دخل موجود ہے، اس لئے اس میں استقرار ہو یا نہ ہو، بہرصورت علتِ مضاہات پائی جاتی ہے، لہٰذا یہ منظر تصویر ہے اور حرام ہے، بخلاف عکس کے کہ اس میں یہ علت موجود نہیں، کیونکہ عکس آئینہ میں خود بخود بنتا ہے، لہٰذا اگرچہ عکس اور اسکرین کا منظر باعتبار ماہیت ایک ہیں کہ دونوں روشنی کی شعاعیں ہیں، لیکن چونکہ ایک میں حرمت کی علت ہے اور ایک میں نہیں، اس لئے یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، یعنی اسکرین کا منظر تصویر ہے اور عکس تصویر نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّلاً تو یہ تفریق خود سمجھ سے بالاتر اور محلِ نظر ہے کہ جب دونوں کی ماہیت ایک ہے تو یہ فرق کیسے ہوگیا کہ ایک تصویر ہے اور دوسرا تصویر نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس تحریر میں تصویر کے حرام ہونے کی علت مضاہات ومشابہت کو قرار دیا تو جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ اسکرین کا منظر تصویر ہے، اس وقت تک اس پر تصویر کی حرمت کی علت کیسے چسپاں ہوسکتی ہے؟ اور اس پر حرام ہونے کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے؟ حالانکہ پیچھے بیان کردہ حقائق سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اسکرین کا منظر کاغذ وغیرہ پر پرنٹ ہونے سے پہلے تصویر نہیں ہے، بلکہ بعینہٖ عکس بھی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ منظر اشبہ بالعکس ہے، معلوم ہوا کہ اسکرین کے منظر پر مضاہات لخلق اللہ کا اطلاق بھی اسی صورت میں ہوگا، جب وہ اسکرین پر قائم ومستقر ہو کر تصویر کے حکم میں داخل ہوجائے، کیونکہ جو چیز سرے سے تصویر ہی نہ ہو، اسے اپنے قصد وعمل سے بنانا مضاہات لخلق اللہ ہونے کا قائل کوئی بھی نہیں۔ اگر محض قصد وارادہ یا عمل دخل مضاہات لخلق اللہ کی بنیاد ہو تو اس طرح کا عمل دخل آئینہ کے عکس میں بھی پایا جاتا ہے (جس کی کچھ تفصیل پیچھے گزری ہے) کم از کم عکس کی یہ صورت کہ جب کوئی شخص قصداً وارادۃً آئینہ میں کسی کا عکس حاصل کرے یا دِکھائے، (جاری ہے.....)

یعنی آئینہ لگا کر اس میں عکس حاصل کرے یا آئینہ لگا کر کسی جانب کے عکس کا نظارہ کرے یا کرائے تو عکس کا نظارہ کرنے یا دِکھانے میں بندے کا عمل دخل پائے جانے کی وجہ سے مضاہات لخلق اللہ میں شامل ہو کر حرام ہوتا، حالانکہ اس میں اگر کوئی دوسرا محظورِ شرعی کا ارتکاب نہ ہو تو محض آئینہ میں عکس حاصل کرنا یا آئینہ لگا کر عکس کا نظارہ کرنا شرعاً نہ مضاہاۃ لخلق اللہ ہے اور نہ ہی حرام ہے، اس لئے اسکرین کے منظر کو دیکھنے یا دِکھانے کی حد تک محض بندے کا صنع کا عمل دخل شامل ہونے کی وجہ سے مضاہات لخلق اللہ میں داخل کر کے حرام تصویر قرار دینا شرعی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں۔

(ز)... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کیمرہ کے ذریعہ کوڈز محفوظ کرنا اگرچہ تصویر بنانا نہیں، لیکن حرام اورنا جائز پھر بھی ہے، کیونکہ یہ تصویر کا مادہ جمع کرنا ہے اور محفوظ کرنا ہے اور یہ مادہ صرف تصویر کے کام میں آتا ہے، جو حرام ہے، پھر یہ حضرات اپنی تائید میں ''امداد الفتاوی'' کے حوالہ سے ایک سوال وجواب بھی نقل کرتے ہیں جو درج ذیل ہے:

''سوال: انگریزی دوا سے ایک ٹکلی تیار کی جاتی ہے، اس کو جب ماچس سے جلایا جاتا ہے تو جل جل کر مثل زرد سانپ کے نکلنا شروع ہوتا ہے اور دیکھنے میں وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بل سے سانپ نکلتا آرہا ہے، حالانکہ وہ جلی ہوئی راکھ ہوتی ہے، ایسی ٹکلیاں بنا کر فروخت کرنا کیسا ہے؟

الجواب: کیا یہ ٹکلی بجز سانپ بنانے کے اور کسی کام میں آسکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے، آگے تصویر بنانے کے کام میں لانا یہ فاعل مختار کا فعل ہے، سبب کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی، اگرچہ خلافِ تقوی اس صورت میں بھی ہے، اور اگر صرف اسی کام میں آتی ہے تو اعانت علی المعصیۃ کی وجہ سے فروخت کرنا حرام ہے، اور وہ معصیت سانپ کی تصویر بنانا ہے، اور تصویر کا سامان کرنا بحکمِ تصویر ہی ہے، جیسا کہ فوٹو سے تصویر بنانے کا حکم ہے کہ تصویر خود اُتر آتی ہے، مگر سامان مہیا کرتا ہے فوٹو گرافر۔'' (امداد الفتاوی جلد۳ صفحہ ۱۱۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ سی ڈی وغیرہ میں محفوظ کوڈز کو مادۂ تصویر اسی صورت میں کہا جائے گا کہ جب اسکرین پر نمودار ہونے والا منظر خود تصویر ہو، جبکہ پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کردہ حقائق کی رُو سے اسکرین کا منظر نہ صرف تصویر میں داخل نہیں، بلکہ بعینہٖ عکس بھی نہیں ہے، لہٰذا ان کوڈز کو تصویر کا براہِ راست مادہ قرار دے کر حرام قرار دینا یا یہ کہنا کہ یہ مادہ صرف تصویر کے کام میں آتا ہے، درست نہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ سی ڈی میں محفوظ مادہ سے براہِ راست کاغذ وغیرہ پر بھی تصویر پرنٹ کی جاسکتی ہے، لہٰذا اس کو براہِ راست تصویر کا مادہ قرار دینا کیسے غلط ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں فاعلِ مختار کا فعل حائل ہوگیا، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سی ڈی میں محفوظ کوڈز تصویر (مثلاً کاغذ میں پرنٹ لینا) اور غیر تصویر (مثلاً اسکرین میں لانا) دونوں میں استعمال ہوسکتا ہے اور جو چیز حلال وحرام دونوں کاموں میں استعمال ہوسکتی ہو، وہ شرعاً حرام کا سببِ قریب یا براہِ راست سبب نہیں ہے، اسی بات کو حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے فتوی میں ان الفاظ میں بیان فرمایا:

''کیا یہ ٹکلی بجز سانپ بنانے کے اور کسی کام میں آسکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے، آگے تصویر بنانے کے کام میں لانا یہ فاعلِ مختار کا فعل ہے، سبب کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی، (جاری ہے......)

اگر چہ خلافِ تقویٰ اس صورت میں بھی ہے۔''

خیال رہے کہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے فتویٰ میں جو یہ فرمایا کہ اگر یہ ٹکلی صرف سانپ بنانے کے کام آتی ہے تو اعانت علی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے فروخت کرنا حرام ہے اور وہ معصیت سانپ کی تصویر بنانا ہے اور تصویر کا سامان کرنا بحکم تصویر ہی ہے۔ اس میں سانپ کی تصویر راکھ سے بنتی ہے، یعنی ٹکلی جل کر راکھ بنتی ہے اور اس راکھ کی شکل زرد سانپ کی سی ہوتی ہے، اس کے عدمِ جواز میں شبہ نہیں، کیونکہ راکھ سے بنی ہوئی جاندار کی صورت مجسم (جسم دار) تصویر میں داخل ہے، جس کی حرمت پر اجماع ہے، لہٰذا اس کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ زیر بحث مسئلہ میں اسکرین کا منظر کوئی مجسم چیز نہیں بلکہ روشنی کی شعاعیں ہیں، جس طرح عکس روشنی کی شعاعیں ہوتا ہے۔

(ح)... اسکرین کے منظر کو اشبہ بالعکس قرار دینے والوں کے مؤقف کے بارے میں بعض حضرات کو ایک مغالطہ یہ بھی ہوا کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ اسکرین کے منظر کو اس لئے تصویر قرار نہیں دیتے کہ اس کا جو اصل محفظ (سی ڈی یا ہارڈ ڈسک وغیرہ) ہے، اس میں جو کچھ ہے وہ تصویر نہیں، چنانچہ ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''بعض حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ TV اور کمپیوٹر کی اسکرین پر جو نقش نظر آتا ہے، وہ تصویر نہیں، بلکہ شعاع ہے .... ان کا استدلال یہ ہے کہ CD میں کوئی تصویر نہیں ہوتی، تو اسکرین پر تصویر کہاں سے آئی؟۔''

''اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ بظاہر غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ اسکرین کے منظر کو تصویر قرار نہ دینے والے حضرات کا استدلال یہ ہرگز نہیں ہے جو مقالہ نگار نے بیان فرمایا، بلکہ ''سی ڈی'' اور ''اسکرین'' کے منظر کو تصویر قرار نہ دینے والے حضرات دونوں میں تصویر نہ ہونے کی وجہ الگ الگ بیان فرماتے ہیں، یعنی وہ یہ فرماتے ہیں کہ سی ڈی یا چپ وغیرہ میں محفوظ ڈیٹا "DATA" تصویر نہیں ہے، کیونکہ سی ڈی وغیرہ میں منظر کی نہ شکل صورت مقید ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا عکس بعینہٖ محفوظ ہوتا ہے، بلکہ عکس کی تفصیل کے مطابق معلومات شعاعی اعداد و شمار (۱۰) کی شکل میں محفوظ ہوتے ہیں، لہٰذا سی ڈی میں تصویر نہ ہونا بالکل واضح اور ظاہر ہے، پھر جب سی ڈی وغیرہ سے انہیں اسکرین یا پردہ پر ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ بھی چونکہ روشنی کے ناپائیدار شعاعی ذرات ناپائیدار شکل میں اسکرین پر ظاہر ہو کر فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ذرات اسکرین وغیرہ پر قائم و ثابت نہیں ہوتے، اس لئے تصویر کی بنیادی شرط (استقرار اور قیام) مفقود ہونے کی وجہ سے اسکرین کا منظر بھی تصویر نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کا اسکرین کے منظر کو تصویر قرار نہ دینا اس لئے نہیں کہ سی ڈی میں جو کچھ ڈیٹا موجود ہے، وہ تصویر نہیں، بلکہ وہ اسکرین کے منظر کو تصویر کے بنیادی وصف (یعنی قیام و استقرار) مفقود ہونے کی وجہ سے تصویر کے حکم سے خارج قرار دیتے ہیں۔

(ت)... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اسکرین کا منظر حقیقت کے اعتبار سے تصویر ہے، کیونکہ تصویر کے بنیادی اوصاف اس میں موجود ہیں، جیسا کہ اسکرین کے منظر کے بارے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا: (جاری ہے.....)

''شریعت کے احکام ظاہر پر مبنی ہوتے ہیں اور بظاہر تصویر ہی ہے، بلکہ درحقیقت بھی تصویر ہے، کیونکہ تصویر کی بنیادی اشیاء اس میں موجود ہیں، یعنی روشنی کے رنگ اور مصوّر جسم پیش کرنا اور وہ مکمل ہونا اور غایۃ کو پہنچنا۔''

ایک اور مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''تصویر اس کو کہا جاتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی چیز تصور میں آجائے اور وہ کسی چیز کا پورا مثل بنے اور پوری حکایت اور ترجمانی کرے۔''

اس کا تحقیقی جواب مفصل طور پر اُوپر آچکا ہے کہ حقیقت اور نفس الامر میں یہ منظر تصویر نہیں ہے، اس لئے محض ظاہری طور پر تصویر کی طرح نظر آنے کی وجہ سے شرعاً یہ مناظر حرام نہیں ہوں گے، کیونکہ اگر کوئی حقیقت کسی دوسری حقیقت سے مختلف ہو تو محض ظاہری مشابہت کی وجہ سے ایک پر دوسرے کا حکم نہیں لگایا جاتا ہے، بلکہ شے پر حکم اس کی اصل حقیقت کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے، محض صورۃً مشابہت یا صورۃً اس سے بڑھ کر ہونے کی بنیاد پر نہیں۔ مثال کے طور پر بیع مؤجل (اُدھار بیع کی صورت) میں مبیع کی قیمت بازاری قیمت سے زائد مقرر کرنا باتفاقِ ائمہ اربعہؒ جائز ہے، حالانکہ بظاہر یہاں قیمت میں جو زیادتی ہے وہ اجل (خریدار کو ادائیگی میں دی گئی مہلت) کے مقابلہ میں ہے، بلکہ بیع مؤجل میں چیز کی قیمت اُدھار کی مدت کو دیکھ کر ہی طے کی جاتی ہے اور اسی حساب سے نقد کی بہ نسبت اس میں قیمت میں زیادتی کو متعین کیا جاتا ہے۔ اس ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ چونکہ یہ صورت بظاہر سود کی طرح ہے کہ جس طرح سود میں قرض پر اضافی رقم اجل کے مقابلہ میں ہے، اسی طرح یہاں بھی مبیع کی بازاری قیمت سے جو زائد رقم مقرر کی گئی ہے وہ بھی اجل کے مقابلہ میں ہے، اس لئے سود کی طرح یہ بھی بالاتفاق حرام ہو، لیکن چونکہ دونوں معاملہ حقیقت اور نفس الامر کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایک میں زر (Money) کا معاملہ زر سے ہے اور دوسرے میں غیر زر (Commodity) کا معاملہ زر سے ہے، اس لئے احکام بھی ان پر الگ الگ جاری ہوئے کہ بیع مؤجل میں زیادہ قیمت مقرر کرنا بالاتفاق جائز اور سود بالاتفاق ناجائز ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں سرکاری ملازمین بوقتِ ریٹائرمنٹ حکومت کے ساتھ پنشن بیچنے کا جو معاملہ کرتے ہیں، وہ بھی ظاہر کے اعتبار سے تو بیع ہی ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ناجائز ہو، لیکن چونکہ خود حکومت سے اس کی بیع کرنا حقیقت کے اعتبار سے بیع نہیں، صرف نام اور صورت بیع کی ہے، اس لئے علماءِ کرام نے اسے جائز قرار دیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: احسن الفتاویٰ ج:۶ ص:۵۲۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ تصویر کی مذکورہ تعریفیں عکس پر بھی سو فیصد صادق آرہی ہیں، کیونکہ آئینہ وغیرہ کے عکس میں بھی یہ تمام اوصاف موجود ہیں کہ وہ سراسر روشنی کے رنگ پر مشتمل مکمل شکل وصورت ہے، اس کو دیکھ کر ذوالعکس (جس کا عکس ہے وہ) تصور میں آجاتا ہے، نیز آئینہ کا عکس ذوالعکس کا پوری مثل اور اس کی پوری حکایت وترجمانی کرتا ہے، لہٰذا اس تعریف کو تصویرِ محرم (حرام تصویر) کی تعریف قرار دینا ہی درست نہیں۔ ورنہ عکس بھی تصویر میں داخل ہو کر حرام ہوجائے گا اور آئینہ کے سامنے آنا یا آئینہ دیکھنا شرعاً ناجائز ہونا لازم آئے گا جو کہ ہرگز درست نہیں، کیونکہ عکس میں یہ تمام اوصاف مکمل طور پر موجود ہونے کے باوجود شریعت اسے تصویر قرار نہیں دیتی، (جاری ہے……)

اور نہ ہی اس پر حرام ہونے کا حکم لگاتی ہے، وجہ اس کی بظاہر یہی سمجھ آتی ہے کہ آئینہ میں (مذکورہ اوصاف سے متصف) جو شکل بنی ہے، وہ آئینہ میں قائم و مستقر نہیں، بلکہ درحقیقت روشنی کی شعاعیں ہیں جو آئینہ میں اسی طرح مسلسل پڑ رہی ہیں اور فوراً ہی فنا بھی ہو رہی ہیں جس طرح اسکرین پر نظر آنے والی شکل وصورت ہر دم اور ہر آن فنا ہوتی اور بنتی رہتی ہے، لہٰذا اس تعریف کو تصویرِ محرم کی تعریف قرار دیکر اسکرین کے منظر کو حرام قرار دینا ہمارے نزدیک درست رائے نہیں، بلکہ درست رائے یہ ہے کہ نہ آئینہ کا عکس شرعاً تصویر ہے اور نہ ہی اسکرین کا منظر۔

(ی)...ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ہوا یا پانی پر یہ لکھتا ہے کہ ''میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں'' تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، جبکہ اس کے برخلاف اگر کمپیوٹر یا موبائل پر لکھتا ہے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ اسکرین پر ظاہر ہونے والی تحریر معتبر ہے اور جب تحریر معتبر ہے تو اسکرین پر ظاہر ہونے والا منظر بھی تصویر ہے۔ ورنہ دونوں میں فرق کی وجہ کیا ہے کہ کمپیوٹر، موبائل اور ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی تحریر تو تحریر ہے مگر کمپیوٹر، موبائل یا ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والا منظر تصویر نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ درحقیقت تحریری طلاق (طلاق بالکتابۃ) کے شرعاً معتبر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق فقہاءِ کرام رحمہم اللہ کی عائد کردہ شرائط ''مستبین، غیر مستبین، مرسوم اور غیر مرسوم وغیرہ کے درمیان فرق کو ملحوظ نہ رکھنے اور دو الگ الگ حقیقتوں کو ایک سمجھ کران میں گڈمڈ کر دینے کی وجہ سے ہوا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے بذریعہ تحریر اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں شرعاً ''تحریر'' معتبر ہونے کے واسطے یہ شرط عائد فرمائی کہ الفاظِ طلاق مستبین ہوں یعنی کسی سطح پر اس طرح ظاہر ہوں کہ ان کو پڑھا اور سمجھا جا سکے، خواہ وہ الفاظ اس سطح پر قائم و پائیدار ہوں یا نہ ہوں، یعنی مستبین کی شرط پوری ہونے کے لئے شرعاً یہ شرط نہیں ہے کہ الفاظِ طلاق کو رنگ وروغن یا روشنائی سے کاغذ وغیرہ پر لکھی جانے والی تحریر کی طرح کسی سطح پر لکھا جائے، بلکہ طلاق واقع ہونے کے لئے شرعاً اس قدر بات بھی کافی ہے کہ الفاظِ طلاق عکس کی صورت میں یا عکس کی طرح کسی آئینہ، شیشہ یا اسکرین وغیرہ پر محض اس طرح ظاہر ہو جائے کہ ان الفاظ کو پڑھا اور سمجھا جا سکے۔

(الشرط فی الکتابة المقبولة التی هی فی حکم الخطاب أن تکون مستبينة و معنونة شرح المجلة (فالمستبينة ما يكتب على الصحيفة والحائط والأرض على وجه يمكن فهمه وقراء ته .وغير المستبينة ما يكتب على الهواء والماء وشيء لا يمكن فهمه وقراء ته . شامي-)

چونکہ ہوا اور پانی پر لکھی جانے والی تحریر ''غیر مستبین'' ہے یعنی اس میں ''مستبین'' کی شرط موجود نہیں ہے، اس لئے ہوا اور پانی پر لکھی جانے والی تحریر سے طلاق واقع نہیں ہوتی، جبکہ آئینہ، شیشہ یا اسکرین پر ظاہر ہونے والا عکس یا روشنی کے ذرات (Pixels) اگرچہ ان میں قائم و پائیدار نہیں ہوتے، مگر پھر بھی مستبین ہیں، کیونکہ آئینہ، شیشہ اور اسکرین پر انہیں پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے جو مستبین ہونے کے لئے کافی ہے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں: آنے والی عباراتِ فقہیہ) (جاری ہے......)

رہی یہ بات کہ ان دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے کمپیوٹر، موبائل اورٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی تحریر تو تحریر ہے مگر کمپیوٹر، موبائل یا ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والا منظر تصویر نہیں؟ تو دونوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ تحریری طلاق (طلاق بالکتابۃ) میں تو محض اتنی بات ہی کافی ہے کہ الفاظِ طلاق کسی سطح پر اس طرح ظاہر ہو جائیں کہ ان کو پڑھا اور سمجھا جا سکے، مگر تصویر ہونے کے لئے منظر کا کسی سطح پر محض ظاہر اور مستبین ہو جانا کافی نہیں، بلکہ اس کا اس سطح پر قائم اور پائیدار ہونا شرط ہے، ورنہ عکس کو بھی تصویر کہنا پڑے گا، کیونکہ وہ بھی شیشہ وغیرہ چکنی سطح پر ظاہر اور مستبین ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آئینہ، شیشہ یا اسکرین پر ظاہر ہونے والا عکس یا روشنی کے ذرات (Pixels) پر مشتمل منظر اگرچہ آئینہ، شیشہ یا اسکرین پر ظاہر اور مستبین ہوتا ہے مگر ان میں قائم و پائیدار نہیں ہوتا اس لئے اسکرین پر ظاہر ہونے والا منظر شرعاً تصویر کے حکم میں نہیں ہے، اور پیچھے اکابر کرام کی تحریرات کے حوالے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عکس وغیرہ جب تک کسی سطح پر قائم و پائیدار نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ عکس ہی کے حکم میں ہے، شرعاً تصویر کے حکم میں نہیں، جیسا کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

''فوٹو کے آئینہ پر جو کسی انسان کا عکس آیا، اس کو عکس اسی وقت تک کہا جا سکتا ہے جب تک اس کو رنگ وروغن اور مسالہ کے ذریعہ قائم اور پائیدار نہ بنا دیا جائے اور جس وقت اس عکس کو قائم اور پائیدار بنا دیا، اسی وقت یہ عکس تصویر بن گئی۔ (تصویر کے شرعی احکام ص:۵۱)

امداد الاحکام جلد ۴ ص ۳۸۴ پر ہے:

''سب سے بڑا فرق تو دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کر لیا جاتا ہے۔''

حضرت مولانا مفتی رشید احمد رحمہ اللہ احسن الفتاوی جلد ۸ صفحہ ۳۰۲ پر لکھتے ہیں:

''تصویر و عکس دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں، تصویر کسی چیز کا پائیدار اور محفوظ نقش ہوتا ہے، عکس ناپائیدار اور وقتی نقش ہوتا ہے۔''

فی الفتاوی الهندية كتاب الطلاق الباب الثانی فی ایقاع الطلاق، (ج ۱/ص ۳۷۸) (الفصل السادس فی الطلاق بالكتابة) الكتابة على نوعين مرسومة وغير مرسومة ونعنى بالمرسومة أن يكون مصدرا ومعنونا مثل ما يكتب إلى الغائب وغير موسومة أن لا يكون مصدرا ومعنونا وهو على وجهين مستبينة وغير مستبينة فالمستبينة ما يكتب على الصحيفة والحائط والأرض على وجه يمكن فهمه وقراء ته وغير المستبينة ما يكتب على الهواء والماء وشیء لا يمكن فهمه وقراء ته ففی غير المستبينة لا يقع الطلاق وإن نوى وإن كانت مستبينة لكنها غير مرسومة إن نوى الطلاق يقع وإلا فلا وإن كانت مرسومة يقع الطلاق نوى أو لم ينو ثم المرسومة لا تخلو أما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة......

(جاری ہے......)

وإن كتب إذا جاء ک كتابی هذا فأنت طالق فكتب بعد ذلک حوائج فجاء ها الكتاب فقرأت الكتاب أو لم تقرأ يقع الطلاق كذا فی الخلاصة.راجع أيضا حاشيه ابن عابدين ج۳ص ۲۴۶

وفی حاشية ابن عابدين ج: ٦ ص: ٧٣٧ ثم اعلم أن هذا فی كتابة غير مرسومة أی غير معتادة، لما فی التبيين وغيره أن الكتاب على ثلاث مراتب :مستبين مرسوم وهو أن يكون معنونا :أی مصدرا بالعنوان، وهو أن يكتب فی صدره من فلان إلى فلان على ما جرت به العادة فهذا كالنطق فلزم حجة .ومستبين غير مرسوم كالكتابة على الجدران وأوراق الأشجار أو على الكاغد لا على الوجه المعتاد فلا يكون حجة إلا بانضمام شیء آخر إليه كالنية والإشهاد عليه والإملاء على الغير حتى يكتبه لأن الكتابة قد تكون للتجربة ونحوها، وبهذه الأشياء تتعين الجهة وقيل الإملاء بلا إشهاد لا يكون حجة والأول أظهر. وغير مستبين كالكتابة على الهواء أو الماء وهو بمنزلة كلام غير مسموع ولا يثبت به شیء من الأحكام وإن نوى اهـ. والحاصل أن الأول صريح والثانی كناية والثالث لغو .وبقی صورة رابعة عقلية لا وجود لها وهی مرسوم غير مستبين وهذا كله فی الناطق ففی غيره بالأولى، لكن فی الدر المنتقى عن الأشباه أنه فی حق الأخرس يشترط أن يكون معنونا وإن لم يكن لغائب اهـ .وظاهره أن المعنون من الناطق الحاضر غير معتبر.راجع أيضا شرح المجلّه ج ا ص ۱۹۷

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل سسٹم کے تحت حاصل شدہ مناظر اسکرین میں نظر آنے کی حدتک نہ تو بعینہٖ حقیقی تصاویر ہیں اور نہ بعینہٖ عکس اور سایہ ہیں، بلکہ اشبہ بالعکس ہیں (یعنی ان مناظر کی مشابہت عکس کے ساتھ زیادہ ہے) ہمارے نزدیک یہی رائے راجح ہے اور ہمارے نزدیک اسی رائے کو اختیار کرنے میں احتیاط ہے کہ اسکرین کا منظر شرعاً تصویر نہیں ہے۔ تاہم ہمیں ایک اعتبار سے احتیاط اسکرین کے منظر کو تصویر قرار دینے والے حضرات کی رائے میں اور دوسرے لحاظ سے بوقت ضرورت ان مناظر کو استعمال کرنے کی شرعاً گنجائش سمجھنے والے حضرات کی رائے میں معلوم ہوتی ہے، اس لئے جو حضرات ان آراء میں سے کسی بھی رائے سے متفق ہوں اور عمل کریں تو اس کی گنجائش ہے، کوئی بھی ہمارے نزدیک مستحقِ ملامت نہیں۔

(۳)...دورِ حاضر میں ٹی وی کے استعمال کا شرعی حکم

ٹیلی ویژن اپنی ذات کی حدتک دور تک معلومات فراہم کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے، جس کا جائز اور ناجائز دونوں طرح کا استعمال ممکن ہے، جیسے ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور کمپیوٹر وغیرہ یا انٹرنیٹ سروس کے مختلف آلات ہیں، لہٰذا ٹی وی کو محض ایک آلہ ہونے کی حیثیت سے شرعاً ناجائز نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کا جائز استعمال جائز اور ناجائز استعمال ناجائز ہوگا۔

(جاری ہے......)

لیکن اس وقت یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں ٹیلی ویژن کا غالب استعمال ناجائز مقاصد میں ہو رہا ہے، اگرچہ اس کا کچھ جائز اور مفید استعمال بھی موجود ہے جہاں اس کو مفاسد ومنکرات کے بغیر استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً ہوائی اڈوں اور اسٹیشنوں پر مختلف اعلانات، مختلف فلائٹوں اور ریلوں کے اوقات سمیت دیگر معلومات فراہم کرنے کی غرض سے استعمال کرنا، مختلف پلانٹ وغیرہ کی نگرانی کے واسطے کلوز سرکٹ ٹی وی کا استعمال وغیرہ، نیز قابلِ اعتماد ذرائع کے مطابق اس وقت سعودی عرب وغیرہ میں کچھ ٹی وی چینلز ایسے بھی موجود ہیں، جہاں مفاسد ومنکرات (شرعی خرابیوں) کے بغیر دینی پروگرام اور جائز تدریسی مقاصد کے لئے ٹی وی کو استعمال کیا جا رہا ہے، تاہم چونکہ اس وقت عام ٹی وی کا غالب اور زیادہ تر استعمال بے حیائی اور گناہ کے کاموں میں ہو رہا ہے اور اس کی نشریات بے شمار حرام، ناجائز اور اخلاقی ومعاشرتی برائیوں پر مشتمل ہیں، اس لئے سدّ اًللذ رائع (یعنی اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ یہ مباح اور جائز چیز کسی ناجائز اور حرام کام کا ذریعہ نہ بن جائے) دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کا فتوی آج تک یہ رہا ہے کہ موجودہ حالات میں ٹی وی گھر پر رکھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ جب گھر پر ٹی وی موجود ہوگا تو بیوی بچوں سے یہ توقع مشکل ہے کہ وہ صرف ایسے چینلوں کو دیکھیں جو منکرات سے پاک ہیں، جبکہ ایسے چینلز پاکستان میں فی الحال غالباً موجود بھی نہیں۔ اور دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے اس مؤقف میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، البتہ اکابر جامعہ دارالعلوم کراچی کی نظر میں ٹی وی کے ناجائز ہونے کی وجہ تصویر نہیں۔ (کیونکہ ٹی وی اسکرین پر جو شکلیں نظر آتی ہیں، وہ شرعاً تصویر کے حکم میں نہیں ہیں، جس کی تفصیل پیچھے آچکی ہے۔) بلکہ وہ مفاسد ومنکرات (یعنی ناجائز کام ہیں) جن پر موجودہ حالات میں ایک عام ٹی وی کی نشریات مشتمل ہیں، چنانچہ اگر کوئی ٹی وی چینل ان مفاسد ومنکرات سے پاک ہو یا کوئی عالمِ دین ممکنہ احتیاطوں کے ساتھ، مفاسد سے احتراز کرتے ہوئے، دینی ضرورت سے متعلق اُمور بیان کرنے کے لئے ٹی وی چینلز پر آئے یا ٹی وی پروگرام میں کوئی وعظ ونصیحت کی بات کرے، دعوت وتبلیغ کا کام انجام دے یا جائز تدریسی مقاصد کے لئے اسے استعمال کرے تو ان کے اس کام کو تصویر کی بنیاد پر ناجائز نہیں کہا جائے گا اور اس مبلغ کے بیان کو سننا اور دیکھنا تصویر کی وجہ سے ناجائز بھی نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہ یہ رائے صرف دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کے اکابر اور مفتیانِ کرام ہی کی نہیں، بلکہ دورِ حاضر کے بہت سے دوسرے اکابر اور محققین کی رائے بھی یہی ہے یا اسی جیسی ہے، بطورِ نمونہ چند رائیں ذیل میں پیشِ خدمت ہیں:

''ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا دینی مقاصد کے لئے استعمال کے اہم موضوع پر ''ادارہ مباحث فقہیہ جمعیت علماء ہند'' کا آٹھواں فقہی اجتماع ''مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ ہال'' بنگلور میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ / مطابق ۲۷، ۲۸، ۲۹ اپریل ۲۰۰۵ء کو منعقد ہوا، اس سہ روزہ فقہی اجتماع کا آغاز حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں ہوا، جس میں پورے ملک سے ایک سو پچاس (۱۵۰) سے زائد اصحابِ افتاء، اربابِ علم ودانش اور علماء کرام نے شرکت کی، اور موضوع کے بارے میں قیمتی مقالات اور آراء پیش ہوئیں، (جاری ہے.....)

اس موقع پر جب ٹیلی ویژن کے متعلق مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی نے اپنے مقالہ میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروگرام چاہے براہِ راست نشر ہو یا بالواسطہ دونوں صورتیں تصویر کشی کے ذیل وتعریف میں آتی ہیں، لہٰذا ٹیلی ویژن کا استعمال کسی طرح جائز نہیں، وہ ناجائز اور حرام ہے، تو مقالہ نگار کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:

''اتنی شدت مناسب نہیں ہے، ہر چیز کو قطعی حرام قرار دینے سے کام نہیں چلے گا، علماء کو امت کو انتشار سے نکالنے کی صورت پر توجہ دینی چاہئے، لوگ ٹیلی ویژن پر قادیانیوں، عیسائیوں کی طرف سے نشر ہونے والے پروگراموں کو دیکھ کر مرتد ہو رہے ہیں، کیا لوگوں کو ارتداد سے بچانے اور ان تک صحیح معلومات پہنچانے کے لئے ایسی صورت نہیں نکالی جاسکتی ہے جیسی کہ شناختی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ کے لئے تصویر کے سلسلے میں نکالی گئی ہے؟ (پھر فرمایا کہ) کیا نفلی حج، عمرہ یا اسفار کے لئے تصویر کھینچے کھنچوانے کی ضرورت کو تسلیم نہیں کر لیا گیا ہے؟ کیا یہ ضرورت، ضرورتِ اضطراری کے ذیل میں آتی ہے؟.........

مذکورہ بالا سہ روزہ فقہی اجتماع کی دوسری نشست کا آغاز حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند کی صدارت میں ہوا، اس موقع پر صدرِ اجلاس حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم نے اپنے صدارتی کلمات میں بدلتے ہوئے حالات میں نئی ایجادات سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کے استعمال کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

''اسلام ایک عالمی مذہب ہے، اسے تمام انسانوں تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن جائز طریقہ وذریعہ اختیار کیا جائے (مزید فرمایا کہ) مسئلے کا مدار پروگرام پر ہے، جس کو دیکھنا سننا جائز ہے، اس کا نشر بھی جائز ہے، جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلے کا حل نکالنا اصحابِ علم وافتاء کی ذمہ داری ہے۔''

اس کے بعد حضرت مولانا سالم قاسمی دامت برکاتہم ٹیلی ویژن کے متعلق اپنی رائے یوں پیش فرماتے ہیں:

''ٹیلی ویژن وغیرہ فی نفسہٖ آلۂ اشاعت ومعلومات ہے، اس سے شر کی بھی اشاعت ہوتی ہے اور خیر کی بھی، اسے مطلقاً ناجائز قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس لئے جو باہر جائز ہے وہ آلہ کے اندر بھی جائز ہوگا۔ الیکٹرانک میڈیا کی اثر انگیزی اور وسعت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس پر باطل کی تردید کے ساتھ اسلام کی تعلیمات کو اس قوت سے پیش کریں کہ دشمنانِ اسلام دفاعی پوزیشن میں آجائیں۔''

حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ جامعہ اشرفیہ لاہور ''ٹی وی'' کے متعلق ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ٹی وی، وی سی آر ان آلات میں سے نہیں ہیں، جو صرف لہو ولعب یا گانے بجانے اور کسی گناہ کے کام کے لئے بنائے گئے ہیں، بلکہ ریڈیو، ٹیلیفون، تار کی طرح آواز صورت کو دور تک پہنچانے کے لئے ہیں، خواہ ان سے اچھے کاموں میں یہ کام لیا جائے یا برے کاموں میں۔ جائز میں یا ناجائز میں،

(جاری ہے......)

ان کا حکم آلاتِ لہو ولعب اور گانے کے آلات کا نہیں ہوسکتا کہ جن پر نیک کاموں کی بے حرمتی بنتی ہو، ان میں ہر مباح کام بھی جائز اور نیک کام بھی جائز ہے، قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ جس کے استعمالات بعض حلال بعض حرام ہوں یا کچھ حلال اور بہت کچھ حرام بھی ہوں تو حلال صورت کی وجہ سے اس کا رکھنا، مرمت کرنا، خریدنا، فروخت کرنا سب جائز ہیں۔ (الاشرف جلد۴ ش۱۲ شعبان ۱۴۰۹ھ صفحہ ۶۳)

حضرت مفتی صاحب موصوف رحمہ اللہ اپنے اسی فتوی میں مزید لکھتے ہیں:

''مختصر حکم اس کا یہی ہے کہ جو جو کام باہر حرام یا مکروہ تحریمی بلکہ کفر وشرک تھے، وہ اس میں بھی حرام، مکروہ اور کفر وشرک ہوں گے، اور جو کام باہر جائز تھے، اس میں بھی جائز رہیں گے، کیونکہ خود یہ آلہ حرام کا آلہ نہیں ہے، بلکہ جیسے ٹیلیفون کہ آواز کو دور تک اور لاؤڈ اسپیکر بھی دور تک اور بلند کر کے پہنچانے کا آلہ ہیں اور ان کا استعمال حلال میں حلال، حرام میں حرام، مکروہ میں مکروہ، کفر وشرک میں کفر وشرک ہے، ایسے ہی اس کا حال ہے، یہ بھی آواز اور تمام چیزوں کی شکلوں اور آوازوں کو دور تک پہنچانے کا آلہ ہے، حلال میں حلال، حرام میں حرام، مکروہ میں مکروہ، جائز میں جائز اور ثواب میں ثواب ہے۔ (الاشرف جلد۴ ش۱۲ شعبان ۱۴۰۹ھ صفحہ ۵۸)

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے شیخ الحدیث ومفتی حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی رحمہ اللہ کی طرف سے ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ کراچی'' کی تیسری نشست کے موقع پر جو مقالہ پیش کیا گیا تھا، اس کے صفحہ نمبر ۵ پر حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

'' حاصل یہ کہ ان تفصیلات کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ہم ہر محاذ پر اسلام اور اہلِ اسلام کے تحفظ ودفاع کے لئے کردار ادا کریں، بالخصوص الیکٹرانک میڈیا سے شریعت واخلاق کے دائرے میں رہ کر استفادہ کرتے ہوئے دشمن کے خلاف اسی کا آزمودہ ہتھیار استعمال کرلیا جائے تو اس کی شرعاً گنجائش ہے۔''

خیال رہے کہ حضرت مفتی شامزئی صاحب رحمہ اللہ موجودہ حالات میں الیکٹرانک میڈیا (مثلاً ٹی وی وغیرہ) سے شریعت واخلاق کے دائرے میں رہ کر استفادہ کرنے کو جائز اور مباح سمجھتے تھے، لیکن اس اباحت اور گنجائش کو فتوی کی صورت میں بیان کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے، جبکہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ وغیرہ سمیت بہت سے دوسرے اکابر اس اباحت اور گنجائش کو فتوی کی صورت میں بیان کرنے کی بھی نہ صرف گنجائش سمجھتے ہیں بلکہ اس کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہیں اور عملی طور پر انہوں نے اس مؤقف کی اشاعت بھی فرمائی۔

واللہ اعلم بالصواب
احقر شاہ تفضّل علی
دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی
۱۴۲۹/۹/۱۹ھ
(فتوی نمبر ۱/۱۰۹۸)

(جاری ہے......)

شریعت کی خلاف ورزی کر کے دین کی خدمت کرنے اور ٹی وی پر علماء کے آنے کی شرعی حیثیت

خلاصۂ سوال:- ٹی وی پر علماء آنے لگے ہیں حالانکہ ناجائز طریقے سے اسلام کی تبلیغ کرنا کیسے جائز ہے؟ دینی احکام کی خلاف ورزی کر کے دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کرنا کیا شرعاً درست ہے؟ برائے کرم اس کے بارے میں بتائیں کیونکہ آپ کا بھی انٹرویو آیا تھا، اس کے بارے میں تفصیلی حکم سے آگاہ فرمائیں (محمد آفتاب)

جواب:- مکرم بندہ جناب آفتاب احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا گرامی نامہ باعثِ مسرت ہوا، آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ شریعت اور دین کی

الجواب صحیح
بندہ محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۹/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۲۹/۱۰/۵ھ

الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ
۱۴۲۹/۹/۲۲ھ

الجواب صحیح
بندہ عبدالرؤف سکھروی
۱۴۲۹/۹/۲۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عبداللہ عفی عنہ
۱۴۲۹/۹/۲۲ھ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ
۱۴۲۹/۹/۲۱ھ

الجواب صحیح
اصغر علی ربانی
۲۴ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح
عزیز الرحمٰن
۱۴۲۹/۹/۲۲ھ

کوئی خدمت شریعت کی خلاف ورزی کر کے نہیں کی جاسکتی نہ ہم اس کے مکلّف ہیں کہ شریعت کے خلاف کام کر کے بزعمِ خود دین کی کوئی خدمت کریں، لیکن ٹی وی کا معاملہ یہ ہے کہ میرے نزدیک وہ تصویر کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے ناجائز پروگراموں کی وجہ سے ناجائز ہے، میں تقریباً بیس سال پہلے تحقیق کے بعد صحیح مسلم کی شرح میں بھی یہ لکھ چکا تھا[۱] اور بعد میں مزید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جب تک کوئی تصویر پائیدار طریقے سے کسی کاغذ وغیرہ پر چھاپ نہ لی جائے وہ تصویر کے حکم میں نہیں آتی، اس سلسلے میں علماء کے ایک اجتماع میں بھی مفصل تحقیق کی گئی جس کے بعد ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس کی نقل منسلک ہے۔[۲]

اگرچہ میں ٹی وی پر کسی جائز تقریر وغیرہ کے لیئے آنے کو جائز سمجھتا تھا، لیکن سالہا سال تک اس لیئے نہیں آیا کہ احتیاط کا پہلو یہی تھا، لیکن اب جس طرح اس کو خلافِ اسلام پروپیگنڈے کے لیئے استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے پیشِ نظر وقتی ضرورت کے تحت میں نے ٹی وی پر انٹرویو دینے کو منظور کر لیا۔

آپ نے جس محبت سے بندے کو متوجہ فرمایا، اس پر میں آپ کا شکر گذار ہوں، جزاکم اللہ تعالیٰ، لیکن صحیح صورت کی وضاحت کے لیئے یہ تحریر ارسال کر رہا ہوں۔

والسلام

۲۶/۱۱/۱۴۲۷ھ

---

(۱) دیکھئے تکملہ فتح الملہم ج:۴ ص:۱۶۲ و ۱۶۳

(۲) اس سے حضرت والا دامت برکاتہم کا سابقہ فتویٰ مراد ہے۔

فصل فی الحِجَاب

(پردہ کے احکام)

عورت کے لئے چہرہ کے پردہ کی شرعی حیثیت

سوال:- میری بیوی پردہ کی پابند ہے، وہ یہاں پر اس ملک کی خواتین اور دوسرے عرب ممالک کی خواتین کو بھی دیکھتی رہتی ہے، جو کہ پردہ کرتی ہیں، لیکن چہرہ کو نہیں ڈھانپتیں، اس لئے وہ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی رہتی ہے کہ کیا پردہ کے لئے چہرہ کا ڈھانپنا ضروری ہے؟

جواب:- اصل حکم یہی ہے کہ پردہ کے لئے چہرہ کو ڈھانکنا ضروری ہے،[1] البتہ جہاں عورت کو شدید ضرورت لاحق ہو، مثلاً ہجوم زیادہ ہو، اور گرنے کا اندیشہ ہو، یا کوئی ضروری کام انجام دینے کے لئے چہرہ کھولنا ضروری ہو، مثلاً ڈاکٹر کے سامنے تو وہاں چہرہ کھولنے کی اجازت ہے۔[2] اور یہ بات

---

(۱) قال الله تعالیٰ: يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِىُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ۔ (الأحزاب: ۵۹)
وقال تعالیٰ: وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ۔ (النور: ۳۱)
قال تعالیٰ: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔(ألأحزاب ۳۳)

وفی صحیح البخاری باب قوله وليضربن بخمرهن (الآية) ج: ۲ ص: ۷۰۰ (طبع:قديمی كتب خانه) لما نزلت هذه الآية (وليضربن بخمرهن على جيوبهن) أخذن أزرهن فشققنها من قبل الحواشي فاختمرن بها۔

وفی جامع الترمذی ۱۱۷۳، ج:۳ ص: ۴۷۶ (طبع دار إحياء التراث بيروت) عن ابن مسعودؓ، عن النبی صلی الله عليه وسلم، قال :المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان.

وفی مشكاة المصابيح كتاب النكاح باب النظر إلى المخطوبة الفصل الثانی ص: ۲۶۹ (طبع قديمی كتب خانه) وعن أم سلمة :أنها كانت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وميمونة إذا أقبل ابن مكتوم فدخل عليه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :احتجبا منه فقلت يا رسول الله أليس هو أعمى لا يبصرنا؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :أفعمياوان أنتما؟ ألستما تبصرانه؟۔

وفی أحكام القرآن للجصاصؒ ج: ۳ ص: ۵۴۶ (طبع قديمی كتب خانه) وقال الله تعالیٰ: (يدنين عليهن من جلابيبهن) ....قال أبو بكر :فی هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبيين وإظهار الستر والعفاف عند الخروج لئلا يطمع أهل الريب فيهن۔ (باقی آئندہ صفحہ پر)

ہمیشہ یادرکھنی چاہئے کہ کسی فرد کا عمل دین میں حجت نہیں ہوتا۔ والسلام

۱۴۱۴/۱۱/۲۲ھ

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی مختصر تفسیر ابن کثیرؒ ج: ۳ ص: ۱۴۱ (طبع دارالقران الکریم بیروت) أمر الله نساء المؤمنین إذا خرجن من بیوتهن فی حاجة أن یغطین وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابیب ویبدین عیناً واحدة

وفی التفسیر المظهری ج: ۷ ص: ۴۱۹ قال ابن عباس وأبوعبیدة أمر نساء المؤمنین أن یغطین رؤوسهن و وجوههن بالجلابیب إلا عیناً واحدًا۔ الخ

وفیها أیضاً ج: ۷ ص: ۳۸۴ (یأیها النبی قل لأزواجک وبنٰتک ونسآء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن) قلت: یعنی أذن لکن أن تخرجن متجلّبات۔

وفی الدر المختار مع الرد ج: ۱ ص: ۴۰۶ (طبع سعید) وتمنع المرأة الشابة (من کشف الوجه بین رجال) لا لأنه عورة بل (لخوف الفتنة) والمعنی تمنع من الکشف لخوف أن یری الرجال وجهها فتقع الفتنة۔

وفیه أیضاً ج: ۶ ص: ۳۶۷ (طبع سعید) ومن محرمه إلی الرأس والوجه والصدر والساق والعضد۔

وفی الشامیة: وأصله قوله تعالی: ولا یبدین زینتهن إلا لبعولتهن .... وتلک المذکورات مواضع الزینة۔

وفی تکملة فتح الملهم کتاب السلام مسئلة حجاب المرأة و حدوده ج: ۴ ص: ۲۶۸ (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی) وبالنظر إلی هذه المذاهب الأربعة یتضح أنها کلها متفقة علی تحریم النظر إلی وجه المرأة بقصد التلذذ أو عند خوف الفتنة .... و إنما أجازه الحنفیة والمالکیة بشرط الأمن من الفتنة و قصد التلذذ و إن وجود هذا الشرط عسیر جدًا لا سیما فی زماننا الذی کثر فیه الفساد حتی أصبح شرطاً .... فلذلک منعه المتأخرون من الحنفیة مطلقاً و جاء فی کراهیة الدر المختار (ج: ۶ص: ۳۷۰ طبع سعید) فإن خاف الشهوة أو شک امتنع نظره إلی وجهها فحل النظر مقید بعدم الشهوة وإلا فحرام الخ۔ نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: امدادالفتاوی ج: ۴ص: ۱۷۷ تا ۱۹۹

وفیه "إلقاء السکینة فی تحقیق إبداء الزینة (امدادالفتاوی ج: ۴ ص: ۱۸۱ تا ۱۹۴) (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی)

و تفسیر معارف القرآن ج: ۶ ص: ۴۰۱ (طبع ادارة المعارف کراچی)

(۲) وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۳۷۰ (طبع سعید) .... (إلا) النظر لا المس (لحاجة) کقاض وشاهد یحکم و یشهد علیها ...... ومداواتها ینظر) الطبیب (إلی موضع مرضها بقدر الضرورة) إذ الضرورات تتقدر بقدرها وکذا نظر قابلة وختان وینبغی أن یعلم امرأة تداویها لأن نظر الجنس إلی الجنس أخف.

وفی الشامیة تحته (قوله: وینبغی) کذا أطلقه فی الهدایة والخانیة .وقال فی الجوهرة :إذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر إلیه عند الدواء ، لأنه موضع ضرورة الخ (باقی آئندہ صفحہ پر)

پہلے شوہر کے رشتہ داروں کا بیوہ سے پردہ کرنے کا حکم

سوال:- ایک بیوہ عورت کافی عرصہ تک اپنی زندگی گزارتی رہی، مگر تنگدستی کی وجہ سے اُس کے اعزّ ہ نے اُس کا نکاحِ ثانی کروادیا، پہلے شوہر کے رشتہ دار اس عورت کو اب بھی پرانے نسبت سے چچی، پھوپھی اور ممانی وغیرہ کہہ کر پکارتے ہیں، کیا اُن کا اس عورت کو پرانے رشتہ کے القاب سے پکارنا شرعاً جائز ہے؟ اور ان سے پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- سابقہ رشتے کی بناء پر چچی، مومانی وغیرہ کہہ کر پکارنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں،

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی المحیط البرهانی الفصل التاسع فیما یحل للرجل النظر ج: ۵ ص: ۱۲۷ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ...... ولأنها تحتاج إلی إبداء وجهها فی المعاملات لتحل الشهادة علیها، وتحتاج إلی إبداء کفها عند الأخذ والإعطاء . وروی الحسن عن أبی حنیفة رضی الله عنهما :أنه یجوز النظر إلی قدمها أیضاً؛ لأنها تحتاج إلی إبداء قدمها إذا مشت حافیة أو متنعلة، فإنها لا تجد الخف فی کل وقت، وفی روایة أخری عنه قال :لا یجوز النظر إلی قدمها. وفی جامع البرامکة عن أبی یوسف: أنه یجوز النظر إلی ذراعیها أیضاً؛ لأنها تصیر مبتلیاً بإبداء ذراعیها عند الغسل والطبخ، قیل :فکذلک یباح النظر إلی ثنایاها؛ لأن ذلک یبدوا منها عند التحدث مع الرجال فی المعاملات، وذلک کله إذا لم یکن النظر عن شهوة، فإن کان یعلم أنه لو نظر اشتهی، أو کان أکثر رأیه ذلک، فلیجتنب بجهده ولا یحل له أن یمس وجهها ولا کفها، وإن کان یأمن الشهوة بخلاف النظر؛ وهذا لأن حکم المس أغلظ من حکم النظر، والضرورة فی المس قاصرة فلا یلحق المس بالنظر؛ هذا إذا کانت شابة تشتهی الخ

وفی الهدایه ج۴ص۴۵۹،کتاب الکراهیة فصل فی الوطء والنظر واللمس ج: ۱ ص:(طبع مکتبه رحمانیة)(ویجوز للطبیب أن ینظر إلی موضع المرض منها) للضرورة (وینبغی أن یعلم امرأة مداواتها) لأن نظر الجنس إلی الجنس أسهل (فإن لم یقدروا یستر کل عضو منها سوی موضع المرض) ثم ینظر ویغض بصره ما استطاع؛ لأن ما ثبت بالضرورة یتقدر بقدرها وصار کنظر الخافضة والختان.

وکذا فی اللباب فی شرح الکتاب کتاب الحظر والإباحة ج: ۱ ص: ۴۱۱ (طبع دار الکتاب العربی.

نیز امدادالفتاوی ج:۴ص:۱۸۱ میں ہے ”البتہ جہاں ضرورتِ شدیدہ ہو یا بسبب کبرسن کے مطلق احتمال فتنہ واشتہاء کا باقی نہیں، وہاں وجہ وکفین کا کشف جائز ہے۔......... اور ضرورت میں برقعہ اوڑھ کر نکلے، البتہ جہاں ضیق ہو یا معمر زیادہ ہو، وہاں جائز ہے۔ نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ کا رسالہ ”إلقاء السکینة فی تحقیق إبداء الزینة“ امدادالفتاوی ج:۴ص:۱۸۱ تا ۱۹۸ (طبع مکتبۃ دارالعلوم کراچی)

البتہ اس سے پردہ ہر حالت میں واجب ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۹۲/۱۰/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۴۴/۲۷ ھ)

عورتوں کو دیکھنے اور بے پردہ عورتوں کے ساتھ کام کرنے میں نظر کی حفاظت کا حکم

سوال:- بے پردہ عورتوں کے ساتھ کام کرتے وقت اپنی نگاہیں نیچی رکھنا اس زمانے میں کسی ولی اللہ ہی کا کام ہوسکتا ہے، یہی مشکل ان بازاروں میں بھی پیش آتی ہے، جہاں سینکڑوں

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب لا یخلون رجل بامرأة إلا ذومحرم والدخول علی المغیبة ج: ۲ ص: ۷۸۷ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن عقبة بن عامرؓ :أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال :إیاکم والدخول علی النساء فقال رجل من الأنصار :یا رسول الله، أفرأیت الحمو؟ قال :الحمو الموت.

وکذا فی جامع الترمذی ج: ۱ ص: ۲۲۰ (طبع قدیمی کتب خانہ) (وبعد هذا الحدیث) عن ابن عباسؓ، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال :لا یخلون رجل بامرأة إلا مع ذی رحم محرم۔(الحدیث)

وفی حاشیة الترمذی: وحمو کأبو وحم کأب وهو اسم لأقارب المرأة من جانب الزوج والمراد هنا غیر آبائه و أبنائه إلا أن یحمل علی المبالغة وقوله: الحمو الموت، هذا کلمة یقولها العرب للتشبیه والشدة والفظاعة فیقال الأسد الموت والسلطان النار والمراد تحذیر المرأة منهم کما یحذر من الموت.لأن الخوف منهم أوقع لتمکنهم من الوصول والخلوة من غیر نکیر لمعات

وفی المنهاج شرح النووی علی المسلم باب تحریم الخلوة بالأجنبیة والدخول ج: ۱۴ ص: ۱۵۴ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) اتفق أهل اللغة علی أن الاحماء أقارب زوج المرأة کأبیه وعمه وأخیه وابن أخیه وابن عمه ونحوهم والأختان أقارب زوجة الرجل والأصهار یقع علی النوعین وأما قوله صلی الله علیه وسلم الحمو الموت فمعناه أن الخوف منه أکثر من غیره والشر یتوقع منه والفتنة أکثر لتمکنه من الوصول إلی المرأة والخلوة من غیر أن ینکر علیه بخلاف الأجنبی۔

وکذا فی شرح صحیح البخاری لابن بطال ج: ۷ ص: ۳۵۷ (طبع دار الرشد) وفتح الباری باب لا یخلون رجل بامرأة الخ ج: ۹ ص: ۳۳۱ (طبع دار المعرفة بیروت) وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة ج: ۶ ص: ۲۷۸ (طبع رشیدیه) وفی طبع مطبع بمبئی هند ج: ۳ ص: ۴۱۰، إیاکم والدخول علی النساء أی غیر المحرمات علی طریق التخلیة أو علی وجه التکشف.

عیسائی عورتیں گھومتی پھرتی ہیں، کیا ایسی عورتیں مندرجہ ذیل حوالے کی رُو سے مرد کی جنس میں ہی تصور نہیں ہوں گی:

''باپردہ مسلمان عورتوں کو بے پردہ عورتوں سے بھی اسی طرح پردہ کرنا چاہئے،

جس طرح غیر محرم مردوں سے۔''

(غالباً حضرت حکیم الامت کا فتوی ہے۔)

جواب:- قصد کرکے بلاضرورت دیکھنا تو جائز نہیں[1]، کاروبار اور لین دین، گفت وشنید کے ضمن میں جو نظر پڑتی ہے، اگر دل میں کوئی فساد نہ ہو تو وہ معاف ہے، اور دل میں خیالات خراب ہوں تو وہ بھی جائز نہیں، بہرحال مجبوری کی حالت میں اپنا کام کریں اور جہاں تک ممکن ہو، غیر محرم عورتوں کی طرف دیکھنے سے اجتناب کریں۔ واللہ اعلم

---

(۱) قال الله تعالى: قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ۔ (سورة النور: ۳۰)

وفي أحكام القرآن للجصاصؒ ج: ۸ ص: ۲۷۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) أنه أمر بغض البصر عما حرم علينا النظر إليه ....عن عليؓ قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" :يا علي إن لك كنزا في الجنة وإنك ذو وفر منها فلا تتبع النظرة النظرة فإن لك الأولى وليست لك الثانية ."وروى الربيع بن صبيح عن الحسن عن أنسؓ قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" :ابن آدم لك أول نظرة وإياك والثانية ."وروى أبو زرعة عن جرير :أنه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نظرة الفجاء ة فأمرني أن أصرف بصري .قال أبو بكر :إنما أراد صلى الله عليه وسلم بقوله" :لك النظرة الأولى "إذا لم تكن عن قصد، فأما إذا كانت عن قصد فهي والثانية سواء ، وهو على ما سأل عنه جرير من نظرة الفجاء ة، وهو مثل قوله :(إن السمع والبصر والفؤاد كل أولئك كان عنه مسؤولا۔

وكذا في تفسير القرطبي ج: ۱۲ ص: ۲۲۲ (طبع دار عالم الكتب رياض)

وفي تفسير ابن كثير ج: ۳ ص: ۲۹۰ (طبع قديمي كتب خانه) قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم (الآية) هذا أمر من الله تعالى لعباده المؤمنين أن يغضوا من أبصارهم عما حرم عليهم، فلا ينظروا إلا إلى ما أباح لهم النظر إليه، وأن يغضوا أبصارهم عن المحارم، فإن اتفق أن وقع البصر على محرم من غير قصد، فليصرف بصره عنه سريعا، كما رواه مسلم في صحيحه .... عن جرير البجليؓ

(باقی آئندہ صفحہ پر)

فصل فی الجماع وما یتعلق بالزوجین

(جماع اور زوجین کے تعلقات کا بیان)

شوہر اور بیوی کے حقوق زوجیت ادا کرنے کے کچھ احکام

سوال: (وضاحت:۔)

۔ ایک طویل سوال میں پوچھا گیا تھا کہ اپنا عضو تناسل بیوی کے ہاتھ میں پکڑا دینا اور اس

(گذشتہ سے پیوستہ) قال :سألت النبی صلی الله علیه وسلم عن نظرة الفجأة، فأمرنی أن أصرف بصری۔ .... وفی روایة لبعضهم فقال أطرق بصرک یعنی انظر إلی الأرض، والصرف أعم، فإنه قد یکون إلی الأرض وإلی جهة أخری، .... ولما کان النظر داعیة إلی فساد القلب، کما قال بعض السلف :النظر سهم سم إلی القلب الخ۔

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج: ۱۰ ص: ۲۶۲ (طبع دار الفکر بیروت) .... (فقالت فاطمةؓ) خیر ما للرجال من النساء أن لا یراهن وخیر ما للنساء من الرجال أن لا یرینهن فلما أخبر رسول الله -صلی الله علیه وسلم بذلک قال هی بضعة منی فدل أنه لا یباح النظر إلی شیء من بدنها ولأن حرمة النظر لخوف الفتنة وعامة محاسنها فی وجهها فخوف الفتنة فی النظر إلی وجهها أکثر منه إلی سائر الأعضاء الخ۔

وفی تکملة فتح الملهم کتاب الأدب ج: ۴ ص: ۲۴۰ (طبع دار العلوم کراچی) عن جریر بن عبدالله قال: سألت رسول اللهﷺ عن نظرة الفجأة، فأمرنی أن أصرف بصری۔ قوله: عن نظر الفجاء ة .... أن یقع بصره علی الأجنبیة من غیر قصد فلا اثم علیه فی أوّل ذلک و یجب أن یصرف بصره فی الحال فإن صرف فی الحال فلا إثم علیه و إن استدام النظر أثم لهذا الحدیث فإنه صلی الله علیه وسلم أمره بأن یصرف بصره مع قوله تعالیٰ: قل للمؤمنین یغضوا من أبصارهم قال النوویؒ: قال القاضی: قال العلماء......... ویجب علی الرجال غض البصر عنها فی جمیع الأحوال إلا لغرض صحیح شرعی و هو حالة الشهادة والمداواة واردة خطبتها أو شراء الجاریة أو المعاملة بالبیع والشراء وغیرهما و نحو ذلک و إنما یباح فی جمیع هذا قدر الحاجة دون ما زاد۔ والله أعلم

نیز دیکھئے حوالہ جات سابقہ ص:۳۹۴ کا حاشیہ نمبر:۱

سے مسلوانا، نیز عضو تناسل بیوی کے منہ میں دینا جائز ہے یا نہیں اگر مادہ خارج نہ ہو اور عضو تناسل منہ میں جا کر چھپ جائے تو غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

جواب:- پہلا عمل بلا کراہت جائز ہے۔[1] اور دوسرے عمل کی بھی گنجائش ہے، لیکن بعض فقہاء نے اس کو مکروہ کہا ہے۔[2] (فی العالم گیریة من الحظر والإباحة) اس لئے اس کا ترک بہتر ہے اور دونوں صورتوں میں بغیر انزال غسل واجب نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

(فتوی نمبر ۹۸۵/۲۸ ج)

بیوی کے منہ میں عضوِ تناسل داخل کرنا مکروہِ تحریمی ہے یا تنزیہی؟

سوال:- مرد کا اپنی بیوی کے فم میں ذکر کا داخل کرنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر مکروہ ہے تو تحریمی یا تنزیہی؟ اس بارے میں عالمگیریہ میں درج ذیل عبارت ہے:

فی النوازل: إذا أدخل الرجل ذكره فی فم امرأته قد قيل: يكره و قد قيل بخلافه، كذا فی الذخيرة. (الهندية ج: ۵ ص: ۳۷۲ كتاب

---

(۱) وفی الهندية كتاب الكراهية ج: ۵ ص: ۳۲۸ (طبع رشيديه) قال أبويوسف رحمه الله: سألت أباحنيفة رحمه الله تعالى عن رجل يمس فرج امرأته و هی تمس فرجه لتحرّك آلته هل ترى بذلك بأساً قال: لا، وأرجو أن يعطى الأجر، كذا فی الخلاصة.

وكذا فی رد المحتار فصل فی النظر والمس ج: ۶ ص: ۳۶۷ (طبع سعيد) والبحر الرائق ج: ۱۷ ص: ۲۰۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) والمحيط البرهانی ج: ۵ ص: ۱۷۱ (طبع دار إحياء التراث بيروت)

(۲) وفی الهندية (۳۷۳/۵) كتاب الكراهية الباب الثلاثون فی المتفرقات فی النوازل: إذا أدخل الرجل ذكره فی فم امرأته قد قيل: يكره و قد قيل بخلافه، كذا فی الذخيرة.

وفی المحيط البرهانی الفصل الثانی والثلاثون فی المتفرقات ج: ۵ ص: ۲۹۷ (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت) إذا أدخل الرجل ذكره فی فم امرأته فقد قيل يكره لأنه موضع قراء ة القرآن فلا يليق به إدخال الذكر فيه وقد قيل بخلافه الخ.

الکراھیۃ الباب الثلاثون فی المتفرقات) (طبع مکتبہ رشیدیہ)

مولانا محمد عامر

جامعۃ الرشید کراچی

جواب:- کراہت مطلق بولا جائے تو عموماً تحریمی مراد ہوتی ہے، البتہ مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے تنزیہی مراد ہونے کا بھی احتمال ہے، اور ناجائز ہونے کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ کوئی نجاست منہ میں جائے، ایسے میں یقیناً ناجائز ہوگا، ورنہ کوئی عدمِ جواز کا سبب نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہی دونوں اقوال میں وجہِ تطبیق بھی ہو۔ واللہ اعلم

۱۴۲۴/۳/۲۴ھ

(۱)...حقوق زوجیت کی ادائیگی کے دوران ملاعبت کا حکم

(۲)...دورانِ صحبت گفتگو کرنے کا حکم

(۳)...ایامِ حیض کے بعد غسل سے پہلے صحبت کرنے اور دوبارہ خون آنے کا حکم

(۴)...ایامِ حمل میں صحبت کا حکم

(۵)...وضعِ حمل کے کتنے دن بعد صحبت جائز ہے؟

(۶)...قریب البلوغ بیوی سے صحبت کا حکم

(۷)...رخصتی سے قبل صحبت کا حکم

(۸)...کسی کے سامنے صحبت کرنے کا حکم

سوال:- (۱)...کیا خاوند اپنی بیوی کی شرمگاہ میں بلاضرورت اُنگلی داخل کرسکتا ہے؟

(۲)...کیا خاوند صحبت کے وقت بیوی کی شرم گاہ دیکھ سکتا ہے اور ایسی حالت میں گفتگو کرنا جائز ہے؟

(۳)...عورت نے حیض کے ایام مکمل کرلئے، خون بند ہے، لیکن ابھی غسل نہیں ہوا اور چھ سات گھنٹے خون بند ہوئے گزر گئے، پھر خاوند نے مباشرت کی، مباشرت کے بعد پھر خون آیا، کیا وہ حیض ہے؟ اور ایسی حالت میں دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے یا وہ کسی زخم کا خون ہوسکتا ہے؟ اور اگر غسل کے بعد مباشرت کی اور پھر خون آیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۴)...ایامِ حمل میں شریعت کے لحاظ سے کس مدت تک صحبت کرنے کی اجازت ہے؟ یا وضعِ حمل تک مباشرت کی شرعاً اجازت ہے؟

(۵)...وضعِ حمل کے بعد کتنے عرصہ تک مباشرت ناجائز ہے؟ کیا نفاس بند ہونے کے بعد فوراً جائز ہے؟

(۶)...لڑکا بالغ ہے اور لڑکی نابالغ مگر مراہق ہے تو ایسی لڑکی سے مباشرت جائز ہے؟

(۷)...نکاح ہوچکا، مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی، رخصتی سے قبل میاں بیوی صحبت کرسکتے ہیں؟

(۸)...حیا ایمان کا حصہ ہے، اگر میاں بیوی کسی عورت یا مرد کے سامنے مباشرت کریں تو اُن کا ایمان رہے گا؟

جواب:- (۱)...کرسکتا ہے۔[1]

(۲)...دیکھ سکتا ہے[2] اور گفتگو ایسی حالت میں جائز تو ہے مگر بہتر نہیں۔[3]

(۳)...اگر "حیض کے ایام مکمل کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ خون دس دن پورے ہونے کے بعد بند ہوا تھا، تب تو مباشرت بھی جائز ہوئی۔[4] اور جو خون بعد میں آیا وہ حیض کے حکم میں نہیں، البتہ غسل سے پہلے مباشرت کرنا خلافِ اولیٰ ہے۔[5] اور اگر دس دن پورے ہونے سے پہلے خون بند ہوگیا تھا تو مسئلہ دوبارہ پوچھ لیں اور اس میں یہ وضاحت فرمائیں کہ کتنے دن حیض آنے کی عادت ہے؟ اور خون عادت کے مطابق کس وقت بند ہوا؟ اور مباشرت کس وقت کی؟ اور بعد میں جو خون

(۱) وفی رد المحتار فصل فی النظر والمس ج: ۶ ص: ۳۶۷ (طبع سعید) وعن أبی یوسف سألت أبا حنیفة عن الرجل یمس فرج امرأته، وهی تمس فرجه لیتحرک علیها هل تری بذلک بأسا قال :لا وأرجو أن یعظم الأجر۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

آیا وہ تھوڑا سا آکر بند ہوگیا یا بعد میں بھی جاری رہا؟ جاری رہا تو کب تک؟ نیز یہ کہ اُس کا رنگ کیسا تھا؟

(۴)...شرعاً حالتِ حمل میں مباشرت کی کوئی مدت مقرر نہیں۔ البتہ طبی لحاظ سے اگر بچے

(گذشتہ سے پیوستہ) وکذا فی الفتاوی الهندیة کتاب الکراهیة ج: ۵ص: ۳۲۸ (طبع رشیدیة) والبحر الرائق ج: ۱۷ ص: ۲۰۲ طبع دار الکتب العلمیة بیروت۔ والمحیط البرهانی الفصل التاسع فیما یحل للرجل النظر الخ ج: ۵ص: ۱۷۱ (طبع دار إحیاء التراث)

(۲) وفی الدر المختار فصل فی النظر والمس ج: ۶ ص: ۳۶۴ و ۳۶۶ (طبع سعید) و ینظر الرجل .... (و من عرسه وأمته الحلال) (إلی فرجها) بشهوة وغیرها والأولی ترکه۔

وفی الشامیة تحته ص: ۳۶۶ (قوله: ومن عرسه وأمته) فینظر الرجل منهما وبالعکس إلی جمیع البدن من الفرق إلی القدم ولو عن شهوة، لأن النظر دون الوطء الحلال قهستانی۔

وفیها أیضاً ج: ۶ص: ۳۶۷ (طبع سعید) وکان ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما یقول: الأولیٰ أن ینظر لیکون أبلغ فی تحصیل معنی اللذّة الخ

وفی البحر الرائق ج:۱۷ ص: ۲۰۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولأنه یجوز له المس والغشیان فالنظر أولی إلا أن الأولی أن لا ینظر کل منهما إلی عورة صاحبه لقوله -علیه الصلاة والسلام -إذا أتی أحدکم زوجته فلیستتر ما استطاع ولا یتجردان تجرد البعیر ؛ لأن النظر إلی العورة یورث النسیان وکان ابن عمر یقول الأولی النظر إلی عورة زوجته عند الجماع لیکون أبلغ فی تحصیل معنی اللذة۔

وفی المحیط البرهانی الفصل التاسع ج:۵ ص: ۱۷۱ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) أما نظر الرجل إلی زوجته ومملوکته :فهو حلال من فرجها إلی قدمها، عن شهوة وبغیر شهوة، وهذا ظاهر؛ إلا أن الأولی أن لا ینظر کل واحد منهما إلیٰ عورة صاحبهالخ

وفی الهندیة الباب الثامن ج:۵ص: ۳۲۷ و ۳۲۸ (طبع رشیدیه) أما النظر إلی زوجته ومملوکته فهو حلال من قرنها إلی قدمها عن شهوة وغیر شهوة وهذا ظاهر إلا أن الأولی أن لا ینظر کل واحد منهما إلی عورة صاحبه .... وکان ابن عمر -رضی الله تعالی عنهما -یقول :الأولی أن ینظر إلی فرج امرأته وقت الوقاع لیکون أبلغ فی تحصیل معنی اللذة کذا التبیین الخ

(۳) وفی التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج: ۱ ص: ۱۷۶ (طبع دار النشر ریاض) (ولا یکثر الکلام حالة الجماع فإنه أی إکثاره حینئذ یورث الخرس فی المتکلم أو الولد علی ما سبق تقریره فیکره الکلام حال الجماع تنزیهاً۔

وفی تحفة الأحوذی ج: ۹ ص: ۲۳۰ (طبع دار الکتب العملیة بیروت) و کذلک لا یأتی بشیء من هذه الأذکار فی حال الجماع الخ و کذا فی شرح النووی علی مسلم ج:۴ص: ۶۵ (طبع دار إحیاء التراث بیروت)

وفی حاشیة الجمل علی المنهج باب الوضوء ج: ۱ ص: ۳۵۹ (طبع دار الفکر بیروت) الکلام حال الجماع أشد کراهة من الکلام فی الخلاء الخ

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کونقصان پہنچنے کا غالب گمان ہوتو نا جائز ہوگی۔[۱]

(۵)...نفاس بند ہونے کے بعد جب عورت غسل کرلے تو مباشرت جائز ہے۔[۲]

(۶)...جائز ہے بشرطیکہ مراہقہ اسکا تحمل کرسکتی ہو۔[۳]

(۷)...کرسکتے ہیں۔

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الدر المختار کتاب الحظر والإباحة ج:۶ ص: ۴۱۸ (طبع سعید) یکره الكلام فی المسجد .... و فی حالة الجماع.

(۴ و ۵) وفی شرح البخاری لابن بطّال کتاب الحیض ج: ۱ ص: ۴۰۸ (طبع مکتبة الرشد ریاض) وقال أبو حنیفةؒ وأصحابه إن انقطع دمها بعد عشرة أیام الذی هو عنده أکثر الحیض جاز له أن یطأها قبل الغسل.

وکذا فی التمهید لما فی المؤطّأ لابن عبدالبر ج،۳ ص:۱۷۸ (طبع مغرب) والاستذکار للمزی ج: ۱ ص: ۳۲۳ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

وفی البحر الرائق ج: ۲ ص: ۶۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ففیما إذا انقطع لتمام العشرة یحل وطؤها بمجرّد الانقطاع و یستحب له أن یطأها حتّٰی تغتسل الخ.

وفی مجمع الأنهر فی شرح ملتقی الأبحر ج: ۱ ص: ۸۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وإن انقطع الحیض لتمام العشرة حل وطؤها قبل الغسل لأن الحیض لا یزید علی العشرة فلا یحتمل عود الدم بعده لکن یستحب أن لا یطأها حتی تغتسل.

وفی الفتاوی الهندیة کتاب الطهارة الفصل الرابع فی أحکام الحیض ج: ۱ ص: ۳۹ (طبع رشیدیه) إذا مضٰی أکثر مدة الحیض وهو العشرة یحلّ وطؤها قبل الغسل مبتدأة کانت أو معتادة و یستحب له أن لا یطأها حتّٰی تغتسل، هکذا فی المحیط.

(۱) وفی عمدة القاری کتاب الغسل باب إذا جامع ثم عاد و من دار علٰی نسائه ج: ۳ص: ۳۱۸ (طبع دار الکتب العلمیه بیروت) وفیه عدم کراهة کثرة الجماع عند الطاقة الخ

وفی شرح أبی داؤد للعینی ج: ۱ ص: ۴۹۴ (طبع مکتبة الرشد ریاض) عدم کراهة کثرة الجماع عند الطاقة.

وفی الدر المختار ج:۳ ص: ۲۰۳ (طبع سعید) ولو تضررت من کثرة جماعه لم تجز الزیادة علٰی قدر طاقتها.

(۲) اگر نفاس کے چالیس دن پورے ہوگئے تو بغیر غسل کے بھی صُحبت جائز ہے اور اگر چالیس روز سے پہلے خون منقطع ہوگیا تو صُحبت جائز ہونے کے لئے دو میں سے ایک شرط کا پایا جانا ضروری ہے، یا تو عورت غسل کرلے، غسل کے بعد مباشرت جائز ہے، جیسا کہ حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا یا خون منقطع ہونے کے بعد کم از کم ایک نماز کا وقت گزر جائے۔ ان دو میں سے ایک شرط پائے جانے کی صورت میں جماع جائز ہوگا۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(۸)... کسی کے سامنے مباشرت کرنا سخت حرام ہے،[1] لیکن اس سے کفر لازم نہیں آتا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۹۷۷/۸/۸ء

(گزشتہ سے پیوستہ) وفی البحر الرائق ج: ۲ ص: ۶۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وکذا النفاس إذا انقطع لما دون الأربعین لتمام عادتها فإن اغتسلت أو مضی الوقت حلّ و إلا لا۔

وفی شرح الوقایة: (وحل وط ء من انقطع دمُها لأکثر الحیض أو النفاس قبل الغسل) ظرفٌ للوطء (دون) أی لا (من انقطع دمها لأقلّ) أی أقل من أکثر الحیض أو النفاس یعنی أن الحائض التی انقطع حیضها لأکثر الحیض والنفساء التی انقطع نفاسها لأکثر النفاس ، یحل وطؤ کل واحدة منهما و إن لم تغتسل، والحائض التی انقطع حیضها لأقل من أکثر الحیض، والنفساء التی انقطع نفاسها لأقل من أکثر النفاس لا یحل وطؤها (إلا إذا) اغتسلت بلا خلاف أو تیمّمت فی السفر أو الحضر عند العجز عن الماء وصلت باتفاق .... أو إذا مضی وقت یسع الغسل والتحریمة الخ

وفی الهندیة ج: ۱ ص: ۳۸ و ۳۹۔ الأحکام التی یشترک فیها الحیض والنفاس ثمانیة .... وإذا انقطع دم الحیض لأقل من عشرة أیام لم یجز وطؤها حتی تغتسل أو یمضی علیها آخر وقت الصلاة الذی یسع الاغتسال والتحریمة۔

وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۲۹۴ (طبع سعید) (ویحل وطؤها إذا انقطع حیضها لأکثره) بلا غسل وجوباً بل ندباً (وإن) انقطع .... لأقله .... لا یحل (حتی تغتسل) أو تتیم بشرطه (أو یمضی علیها زمن یسع الغسل) و لبس الثیاب (والتحریمة) الخ۔

وفی الشامیة تحته (قوله: وإذا انقطع حیضها لأکثره) مثله النفاس الخ

وفی الهدایة باب الحیض: وإذا انقطع دم الحیض لأقل من عشرة أیام لم یحل وطؤها حتی تغتسل "لأن الدم یدر تارة وینقطع أخری فلا بد من الاغتسال لیترجح جانب الانقطاع "ولو لم تغتسل ومضی علیها أدنی وقت الصلاة بقدر۔

(۳) وفی إکمال المعلم شرح المسلم، باب تزویج الأب البکر الصغیرة الخ ج: ۴ ص: ۲۹۵ قال أبوحنیفةؒ : حد ذلک إطاقة الرجال دون لم تبلغ التسع الخ

وفی المحیط البرهانی ج: ۲ ص: ۳۲۰ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) الجاریة المراهقة بمنزلة البالغ لأن المراهق والمراهقة کل واحد منهما مشتهی کالبالغ والبالغة الخ

وفی الشامیة ج: ۶ ص: ۳۶۹ (طبع سعید) إذا کانت تشتهی و یجامع مثلها فهی کالبالغة الخ

وفی الهندیة کتاب النکاح باب الأولیاء ج: ۱ ص: ۲۸۷ (طبع رشیدیه) واختلفوا فی وقت الدخول بالصغیرة فقیل لا یدخل بها ما لم تبلغ وقیل یدخل بها إذا بلغت تسع سنین، کذا فی البحر الرائق .وأکثر المشایخ علی أنه لا عبرة للسن فی هذا الباب وإنما العبرة للطاقة إن کانت ضخمة سمینة تطیق الرجال ولا یخاف علیها المرض من ذلک؛ کان للزوج أن یدخل بها، وإن لم تبلغ تسع سنین، الخ

وفی المحیط البرهانی الفصل العاشر فی نکاح الصغار والصغائر ج:۳ ص: ۱۳۹ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) وأکثر المشایخ علی أنه لا عبرة للسن فی هذا الباب، وإنما العبرة للطاقة إن کانت صحة سمینة تطیق الرجال ولا یخاف علیها المرض من ذلک؛ کان للزوج أن یدخل بها وإن لم تبلغ تسع سنین الخ

وفی البحر الرائق ج: ۶ ص: ۳۰۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وأکثر المشایخ علی أنه لا اعتبار للسن فیهما، وإنما المعتبر الطاقة۔

وفیه أیضاً ج: ۲ ص: ۴۵۳ واختلفوا فی حد المشتهاة وصحح الشارح وغیره أنه لا اعتبار بالسن من السبع علی ما قیل أو التسع علی ما قیل وإنما المعتبر أن تصلح للجماع بأن تکون ضخمة عبلة والعبلة المرأة التامة الخلق وأطلقها فشملت الأجنبیة والزوجة والمحرم والمشتهاة حالا أو ماضیا مراهقة أو بالغة۔

(۱) وفی شرح المسلم للنووی ج: ۱۳ ص: ۳۷ (طبع دار الکتاب العربی بیروت) یجوز کشف العورة فی موضع الحاجة فی الخلوة

(باقی آئندہ صفحے پر)

فصل فی الهدایة والضیافات

(ہدیہ اور دعوت کے احکام)

بدعتی کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال:- کیا بدعتی شخص کی دعوت قبول کرنی چاہئے یا نہیں؟ اس بارے میں شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

جواب:- اگر بدعتی شخص کی کمائی حرام نہیں ہے تو اس کے یہاں کا کھانا جائز ہے،[۱] البتہ دعوت قبول کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر معلوم ہو کہ اس دعوت میں کسی بدعت یا گناہ کا ارتکاب کیا جائیگا تو دعوت مطلقاً قبول نہیں کرنی چاہئے،[۲] اور اگر کسی ارتکابِ بدعت کا اندیشہ نہ ہو تو قبولِ دعوت میں مضائقہ نہیں۔[۳]

والله اعلم
۱۳۹۱/۳/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۳ الف)

(گذشتہ سے پیوستہ) وذلک كحالة الاغتسال وحال البول ومباشرة الزوجة ونحو ذلک فهذا كله جائز فيه التكشف فی الخلوة وأما بحضرة الناس فيحرم كشف العورة فی كل ذلک الخ

وفی الهندية كتاب الكراهية الباب الثامن فيما يحل للرجل النظر إليه وما لا الخ ج: ۵ ص: ۳۲۸ (طبع رشيديه) كره وطئ زوجته بحضرة ضرتها أو أمته الخ۔

وفی البحر الرائق ج: ٦ ص: ۳۹۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) و شمل الثالث زوجته الأخرىٰ وهو المذهب بناء على كراهة وطئها بحضرة ضرتها۔

وفی الشامية: ودخل فيه الزوجة الأخرى وهو المذهب، بناء على كراهة وطئها بحضرة ضرتها بحر. قلت :وفی البزازية من الحظر والإباحة .ولا بأس بأن يجامع زوجته وأمته بحضرة النائمين إذا كانوا لا يعلمون به، فإن علموه كره اهـ۔

(۱تا۳) وفی مجمع الأنهر كتاب الكراهية ج: ۲ ص: ۵۲۹ (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت) وفی البزازية غالب مال المهدى إن حلالا لا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام؛ لأن أموال الناس لا يخلو عن حرام فيعتبر الغالب وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال إنه حلال۔

وفی عمدة القاری شرح البخاری باب هل يرجع إذا رأى منكراً فی الدعوة۔ ....فإن قدر على المنع منعهم، يعنی :إذا كان صاحب شوكة أو كان ذا جاه أو كان عالما مقتدى مسموع الكلمة فإنه يجب عليه المنع، وإن لم يقدر يصبر ولا يخرج لما قلنا، وإن كان المنكرعلى المائدة لا يقعد وإن لم يكن مقتدى، وهذا كله بعد الحضور، ولو علم قبل الحضور لا يحضر لأن إجابة الدعوة إنما تلزم إذا كانت على وجه السنة. الخ و كذا فی شرح البخاری لابن بطال ج: ۷ ص: ۲۹۱ (طبع مكتبة الرشد)

(باقی آئندہ صفحے پر)

سودی کاروبار کرنے والے کی دعوت کا حکم

سوال:- سودی کاروبار کرنے والوں کے ہاں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر اس کی آمدنی کا اکثر حصہ سود یا دیگر حرام اشیاء پر مشتمل نہیں ہے تو اس کے یہاں کھانے کی گنجائش ہے۔[1] لیکن بچنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

۱۲/۵/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح

(فتویٰ نمبر ۴۱۲/۱۸ الف)

محمد عاشق الٰہی

فصل فی تسمیۃ الأولاد والمواضع وغیرہا

(اولاد اور جگہوں وغیرہ کے مختلف ناموں کا بیان)

بچی کا نام ''شہلا'' رکھنے کا حکم

سوال:- گزارش ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کیا فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پوتی کا نام شہلا رکھا ہے، برائے کرام پوری تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور اس کے معنی بھی تحریر فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی رد المحتار کتاب الحظر والاباحۃ ج۶ ص۳۴۷ وص۳۴۸ (طبع سعید)
وفی التتارخانیۃ عن الینابیع، لو دعی إلی دعوۃٍ فالواجب الإجابۃ إن لم یکن هناک معصیۃ ولا بدعۃ والامتناع أسلم فی زماننا إلا إذا علم یقیناً أن لا بدعۃ ولا معصیۃ الخ۔

وفی فتح القدیر فصل فی الأکل والشرب۔ج۸ص۴۴۹ کتاب الکراهیۃ(طبع رشیدیه) ...... لأن فرض المسألۃ فی دعوۃ اقترنت بلهو، وفیها لا تسن الإجابۃ ابتداء کما سیجیء، فإذا عرف المدعو ذلک قبل الإجابۃ لا یجب علیه الإجابۃ أصلا۔

وفی شرح الوقایۃ: وروی عن علی رضی الله عنه أنه قال: صنعت طعاماً فدعوته علیه الصلوۃ والسلام فجاء فرأی فی البیت تصاویر فرجع رواه ابن ماجه لأنّ إجابۃ الدعوۃ سنۃ ورؤیۃ المنکر بدعۃ۔

(۱) وفی الهندیۃ کتاب الکراهیۃ الباب الثانی عشر فی الهدایا والضیافات ج: ۵ ص: ۳۴۲ (طبع رشیدیه) أهدی إلی رجل شیئا أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن یعلم بأنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لا یقبل الهدیۃ، ولا یأکل الطعام۔ (باقی آئندہ صفحے پر)

جواب:- ''شہلا'' نرگس کے پھول کی ایک خاص قسم ہے، یہ عجمی قسم کا نام ہے، رکھنے میں شرعاً کوئی کراہت تو نہیں، لیکن عربی نام اور خاص طور پر صحابیات میں سے کسی کے نام پر رکھنا بہتر ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۹۶/۳۰ د)

مکان کا نام ''بیت الرسول'' رکھنے کا حکم

سوال:- یہاں پر ایک شخص نے مکان تعمیر کیا ہے، جس کا نام ''بیت الرسول'' رکھا ہے، کیا یہ نام شرعاً درست ہے؟

جواب:- اس نام میں بے ادبی اور گستاخی ہے، لہٰذا یہ نام بدل دینا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

(فتویٰ ۱۹/۷۸ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(گذشتہ سے پیوستہ) وفي مجمع الأنهر كتاب الكراهية ج:٢ ص: ٥٢٩ (طبع دار إحياء التراث بيروت) وفي البزازية غالب مال المهدى إن حلالا لا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام؛ لأن أموال الناس لا يخلو عن حرام فيعتبر الغالب وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال إنه حلال.

وفي شرح الحموى على الأشباه والنظائر ج ا ص ٣٠٩ الفن الأول طبع نشاط: إذا كان غالب مال المهدى حلالاً لا بأس بقبول هديته و أكل ماله ما لم يتبيّن أنه من حرام و إن كان غالب ماله الحرام لا يقبلها و لا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال الخ.

وفي المحيط البرهاني الفصل السابع عشر في الهدايا والضيافات ج:٥ ص: ٢٣٠ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) وفي عيون المسائل :رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لا ينبغي أن يقبل ويأكل من طعامه ما لم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه، وإن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل ما لم يتبين له أن ذلك من الحرام؛ وهذا لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام وتخلو عن كثيره، فيعتبر الغالب ويبنى الحكم عليه.

چوک کا نام ''ختم نبوت چوک'' رکھنے کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ ہمارے شہر کے جلیل القدر علماء کرام اور شرفائے شہر نے ارادہ کیا ہے کہ شہر کے مرکزی چوک (جس کا نام چوک فوارہ ہے) کا نام چوک ختم نبوت رکھ دیا جائے، تاکہ عقیدۂ ختم نبوت کا اظہار ہمیشہ کے لئے ہوتا رہے، مگر چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس چوک کا نام ختم نبوت رکھنے سے توہین سید دو عالم ﷺ ہوتی ہے، ازراہِ کرام ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب:- چوک کا نام ''چوک ختم نبوت'' رکھنے سے مقصود چونکہ عقیدۂ ختم نبوت کی طرف اشارہ اور اس کا استحضار ہے، اس لئے اس میں سرورِ دو عالم ﷺ کی معاذ اللہ توہین کا کوئی پہلو نہیں ہے، ختمِ نبوت ایک عقیدے کے طور پر اتنا معروف ہو چکا ہے کہ اس لفظ سے کسی اور معنی کی طرف ذہن کا تبادر نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم

۲۴-۱۰-۱۴۰۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲ ۳۸/۱۷ د)

مولانا۔۔۔۔۔۔مرحوم کو دین کا ''قبلہ وکعبہ'' کہنے کا حکم

سوال:- ایک شخص یہ کہتا ہے کہ......... ہمارے دین اور ہمارے ایمان کا قبلہ وکعبہ ہیں، شرعاً ایسا کہنے والے کا کیا حکم ہے؟

جواب:- اس کا جملہ گستاخی کا موہم ہے، ایسے کلمات سے احتراز کرنا چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۹۸/۷/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۸۴۹ ب)

---

(۱) کسی کو قبلہ وکعبہ کہنے سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاوی ج:۴ ص:۲۷۴ و ۲۷۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

فصل فی الکذب والخیانۃ والتوریۃ
(جھوٹ، خیانت اور توریہ سے متعلق مسائل کا بیان)

توریہ کی مخصوص صورت کا حکم
اور مظلوم کا دفعِ ظلم کے لئے توریہ کرنے کا حکم

سوال:- مجھ پر میرے مالکِ جائیداد نے اپنے ملازم کے ذریعہ ایک قطعی جھوٹے الزام کے ساتھ بیدخلی جائیداد کا مقدمہ قائم کر رکھا ہے، نیز مقدمہ سے قبل اور بعد بھی مالکِ جائیداد اور اس کا ملازم میرے ساتھ خاموش شرارتیں اور اشتعال انگیزیاں کرتا رہا ہے، جس سے مشتعل ہو کر میں نے مالک کے ملازم کو ایک تھپڑ اور ایک جوتا مارا۔ مالکِ جائیداد نے اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد مجھ پر ایک فوجداری مقدمہ اور کر دیا، جس میں اس نے مجھ پر نہایت شرمناک اور بے ہودہ الزامات لگائے، مجھے صفائی کے لئے کورٹ میں حاضر ہونا پڑا، جس وقت مجسٹریٹ نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ کیا اس واقعہ سے پہلے بھی تم نے ان کے ملازم کو مارا ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں نے نہیں مارا، بالکل جھوٹ ہے یہ! اس سے میری مراد یہ تھی کہ میرا یہ قول کہ میں نے نہیں مارا، بالکل جھوٹ ہے، یہ توریہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ یہ توریہ اس لئے کیا کہ یہاں عدالت میں کسی سوال کا جواب تفصیل اور پس منظر کے ساتھ نہیں دیا جاتا، بلکہ صرف ہاں یا ناں میں دینا پڑتا ہے الخ

جواب:- اگر سوال میں درج کئے ہوئے تمام واقعات درست ہیں تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ اس توریہ پر عذاب نہ ہوگا۔[1] تاہم اس پر بھی توبہ واستغفار کی ضرورت ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

---

(۱) وفی الإکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطیؒ "بل فعله کبیرهم" أصلٌ فی استعمال المعاریض، ص: ۱۷۹ (سورة الأنبیاء: ۶۳) و کذا فی التفسیر المظهری مشروعیة التوریة خشیة القول بالکذب (ص: ۱۱۶ ج: ۳) بلوچستان مکتبة

(باقی آئندہ صفحہ پر)

اصل ضابطہ یہ ہے کہ مظلوم رفعِ ظلم کے لئے توریہ کرے تو جائز ہے۔[1] مگر آپ کے معاملہ میں مالکِ جائیداد کی مرضی کے خلاف اس پر قابض رہنا اصل سبب ہے، جس کی وجہ سے مالکِ جائیداد کے ملازم نے آپ سے برا معاملہ کیا تو "البادی أظلم"[2] کے قاعدہ سے آپ بے قصور نہیں، اس کو مارنے کا آپ کو حق نہیں تھا، اور جب مارنے کا حق نہیں تھا تو توریہ کر کے انکار کرنے کا بھی حق نہیں۔ البتہ دوسرے جھوٹے الزامات سے بچنے کے لئے کوئی توریہ کیا جاتا تو جائز ہوتا۔ اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طمانچہ مارنے کا اقرار کرنے سے سارے جھوٹے الزامات بھی ثابت ہو جاتے۔ اس لئے ظاہر یہی ہے کہ ایسا توریہ کرنا گناہ سے خالی نہیں۔ توبہ واستغفار اور مظلوم سے طلبِ معافی ضروری ہے۔ واللہ اعلم

بندہ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

غبن کردہ مال کی اطلاع مالکِ کمپنی کو کرنا ضروری ہے

سوال:- دو آدمیوں نے ایک کمپنی میں کام کیا، اور وہاں کچھ روپیہ غبن کیا، لیکن غبن کا روپیہ ایک ہی آدمی کے پاس رہا، کچھ دنوں کے بعد کمپنی کے مالک نے مالی مشکلات کے سبب کمپنی بند کر دی، کمپنی کے بند ہونے کے بعد دوسرے شخص نے جس کے پاس روپیہ نہیں تھا اور نہ ابھی تک

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن ص: ۵۰ ج: ۲، وأیسر التفاسیر تحت هداية الآيات (۴) فی الكشاف (۶۲/۳) (طبع قدیمی) قال بل فعله كبيرهم ..... سورة الأنبياء آیت: ۶۳، هذا من معاريض الكلام. فی حاشية الجمل على الجلالين (۱۳۴/۳) (طبع قديمی) (قوله: بل فعله كبيرهم) هذا على طريقة الكناية للعرضية.

(۱) وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۲۷، ۴۲۸ (طبع سعيد) الكذب مباح لاحياء حقه ودفع الظم عن نفسه والمراد التعريض لان عين الكذب حرام قال وهو الحق، قال الله تعالى: ﴿قتل الخراصون﴾ الكل من المجتبى، وفی الوهبانية قال: وللصلح جاز الكذب أو دفع ظالم الخ.

(۲) فتح القدير باب التحالف ج: ۷، ص: ۱۹۴ (طبع رشيديه كوئٹه)

غبن روپے میں سے اپنا حصہ لیا اور نہ ہی اب اس کو اُس کا حق ملنے کی اُمید ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ اس غبن کی رقم میں اس کو اس کا حصہ ملنا مشکل ہے تو یہ فرمائیں کہ اس مسئلہ میں آخرت کے عذاب سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ اور کیا مالک کمپنی کو بتانا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- مالکِ کمپنی کو بتا دینے سے اگر مالکِ کمپنی کو وہ رقم مل گئی یا اگرچہ نہ ملی، مگر اِس بات پر خوش ہو کر آپ کا قصور معاف کر دے تو آخرت کے عذاب سے آپ بچ سکتے ہیں، مگر مالک کمپنی کو بتا دینا بہرحال آپ کے ذمہ واجب ہے، اور جو کچھ گناہ ہوا، اس سے توبہ اور استغفار بھی کریں۔

واللہ اعلم بالصواب
محمد تقی عثمانی
۱۳۹۱/۵/۳ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۵۷ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

انگریز کے دور میں اکابرِ دیوبند کی تحریروں میں توریہ کا استعمال

(تذکرۃ الرشید کی ایک عبارت پر اشکال کا جواب)

سوال:- بخدمت جناب حضرۃ العلامہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہے دل و دماغ میں کشمکش مجھے سوچنا بھی محال ہے

کئی روز سے پریشانی ہے کہ ہمارے اکابرین تمام عمر انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے رہے اور ان کی تمام تر زندگی انگریز کی مخالفت کرتے گزری، لیکن کتاب ''تذکرۃ الرشید'' تالیف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل عبارت سے معاملہ برعکس دِکھائی دیتا ہے:

''ہر چند کہ یہ حضرات حقیقۃً بے گناہ تھے، مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور مجرم سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا، اس لئے گرفتاری کی تلاش تھی، مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی، اس لئے کوئی آنچ نہ آئی، اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے، تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے...... الخ''

(تذکرۃ الرشید ص:۷۹ ج:۱ ط ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور)

مہربانی فرما کر بندہ کی پریشانی دور فرمائیں۔ان الله مع المحسنين، والسلام

محمد شفیق جلوی

امام وخطیب جامع مسجد اللہ والی

محلّہ قاضیاں والا اندرون پاک گیٹ ملتان

جواب:- محترمی! اُس زمانے کی بیشتر تحریروں میں اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں، جس دور میں یہ تحریریں لکھی گئی ہیں، اُس وقت صحیح صورتِ حال واضح الفاظ میں لکھنا موت کو دعوت دینے کے مرادف تھا، اس لئے ان حضرات نے توریہ کا طریقہ اختیار کیا ہے، جو عبارت آپ نے لکھی ہے، اس میں بھی توریہ ہے کہ ''دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور مجرم سرکاری خطا وار ٹھہرا رکھا تھا'' اس میں دشمنوں سے مراد خود انگریز اور اس کے حامی ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان حضرات کو مفسد یا مجرم کہنا ان کی یاوہ گوئی تھی اور اپنی مہربان سرکار کے دِلی خیر خواہ ہونے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہونا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۸/۶/۱۴۲۴ھ

خیانت کے مرتکب افراد کی بدعنوانی کی شکایت افسرانِ بالا کو کرنے کا حکم

سوال:- زید ایک ایماندار شخص ہے اور اس کے پیشِ نظر (اکلِ حلال وصدق حلال) ہے بدقسمتی سے وہ ایک ایسے ادارہ سے منسلک ہے جہاں تغلب وتصرف، خیانت ورشوت کے مواقع موجود ہیں، اس کے ساتھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، یعنی (خیانت کا ارتکاب کھلے بندوں کرتے ہیں) وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت ہوشیار ہیں اور نا قابلِ گرفت ہیں، ان کو ان کے متعلقہ افسروں کی تائید بھی حاصل ہے، زید کے تفویض ایسا کام ہے کہ وہ ان کا پول کھول سکتا ہے، لیکن زید اس خیال سے ایک عرصہ دراز سے خاموش ہے کہ اس کے انکشاف سے ان کی ملازمتیں ختم ہوجائیں گی، جس کے باعث ان کے زیرِ پرورش افراد بھی بری طرح متاثر ہوں گے، بوجوہ مذکورہ کیا زید کی یہ خاموشی مذہبی نقطۂ نظر سے درست ہوسکتی ہے؟ یا ان کی خیانت کا

انکشاف کردینا مناسب ہے؟ زید کے لئے ان ہر دو میں سے کون سا فعل مستحسن اور قرینِ شریعت متصور ہوگا؟ از راہِ کرام ان مذکورہ فقرات کا صاف اور واضح جواب مندرجہ ذیل پتہ پر قرآن وسنت کی روشنی میں مرحمت فرمایا جائے تو احسن ہے۔

جواب:- اگر زید کے فرائضِ منصبی میں ان افسران کے طرزِ عمل کی نگرانی بھی شامل ہے تو اس پر ان لوگوں کی شکایت کرنا واجب ہے، اور اگر فرائضِ منصبی میں شامل نہیں، لیکن اسے ان بدعنوانیوں کا یقینی طور پر علم ہے اور اس سے قومی املاک کو نقصان پہنچ رہا ہے، تب بھی اس کے ذمے شکایت کرنا واجب ہے، اور ان کی ملازمتوں کے خوف سے اس فریضے میں کوتاہی کرنا درست نہیں، البتہ اگر محض شبہ ہو یا ان کے اس عمل سے قومی املاک یا عوام کے مفادات کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو شکایت واجب نہیں، صرف جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۹/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۳۸ د)

سرکاری دورہ میں کسی عزیز یا دوست کے گھر رہنے کی صورت میں ہوٹل کا رہائشی خرچ حکومت سے لینے کا حکم

سوال:- عرض خدمت ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ان لوگوں کے لئے جو دورہ پر جاتے ہیں، یہ قانون بنایا ہے کہ ان کے بھتہ کے علاوہ رہائش کی ذمہ داری بھی گورنمنٹ لے رہی ہے، یہاں تک کہ گورنمنٹ مخصوص شہروں میں بھتہ سے تین گنا زیادہ رقم دیتی ہے، شرط یہ لگادی کہ معیاری ہوٹل کی رسید پیش کی جاوے، کچھ حضرات معیاری ہوٹل میں اس لئے رہنا پسند نہیں کرتے کہ وہاں ضرورت سے زیادہ خرافات اور ایمان سوز ماحول ہوتا ہے، دوسرے وہاں کھانے کا خرچ اصل بھتہ سے کہیں زیادہ ہوجاتا ہے، ایک آدمی کسی دوست یا عزیز کے گھر رہ کر ہوٹل سے زیادہ راحت اور مراعات محسوس کرے اور پھر ایسی جگہ رہنے پر لازماً اسے کچھ کافی اخراجات کرنے پڑتے ہیں لیکن راحت، سکون اور سازگار ماحول محسوس کرتا ہے، کیونکہ گورنمنٹ نے اس شہر کی رہائش کے لئے قانونی

ذمہ داری لی ہے، فتوی طلب ہے، کیا وہ ہوٹل کے علاوہ جگہ رہنے پر مراعات رہائش کا حق دار بنتا ہے۔

جواب:- جو شخص سرکاری دورے میں اپنے کسی عزیز یا دوست کے یہاں ٹھہرے، اگر سرکاری ضوابط کے تحت وہ رہائش کے خرچ کا مستحق ہوتا ہے تو اس سے لینا جائز ہے، لیکن اگر مستحق نہیں ہوتا تو ہوٹل کی جھوٹی رسیدیں پیش کر کے رہائش کے اخراجات وصول کرنا جائز نہیں، البتہ روزانہ الاؤنس جو مصارف رہائش کے علاوہ حکومت سے دیا جاتا ہے، وہ لے سکتا ہے، اس سے اپنے مصارف پورے کر لے۔ واللہ اعلم

۱/۱۰/۱۳۹۹ھ

فصل فی اللحیۃِ وأحکامِ الشعرِ وحلقِ الرأس والعانۃِ وقصِ الشوارب وغیرِہا

(داڑھی اور جسم کے مختلف بالوں کے کاٹنے اور مونڈنے وغیرہ کے احکام)

داڑھی کی شرعی حیثیت

(وضاحت از مرتب)

داڑھی کی شرعی حیثیت، داڑھی مونڈنے یا ایک مشت سے کم کرنے اور ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی امامت سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے کئی فتاوی ''فتاوی عثمانی'' جلد اوّل ''فصل فی الإمامة و الجماعة'' میں موجود ہیں، تفصیل کے لئے ان فتاوٰی کا مطالعہ کیا جائے۔ زیرِ نظر فتوی راولپنڈی کے مفتی محمد رضوان صاحب کا ہے، جس میں اُنہوں نے ایک استفتاء کے جواب میں داڑھی کی اہمیت وشرعی حیثیت سے متعلق کئی اُمور کا تفصیلی جائزہ لیا اور ایک مفصل فتوی تحریر کرنے کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں بھیجا، یہ فتوی کافی طویل ہے، نیز صاحبِ فتوی کی جانب سے یہ فتوی ''داڑھی کی شرعی حیثیت'' کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے، یہاں طوالت سے بچنے کے لئے اس فتوی کا اصل ابتدائی حصہ اور اس کے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

سوال:- لوگوں سے سنا جاتا ہے کہ ڈاڑھی سنت ہے، اگر رکھیں تو ثواب ہے اور نہ رکھیں تو کوئی گناہ نہیں، اور لوگوں سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ڈاڑھی کی کوئی خاص مقدار نہیں ہے، جتنی چاہیں رکھ لیں، اس سے شریعت کا حکم پورا ہو جاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ڈاڑھی کو کسی حال میں بھی کاٹنا جائز نہیں، چاہے وہ ایک مٹھی سے بھی زائد کیوں نہ ہو جائے؟

اس سلسلہ میں صحیح نقطۂ نظر کی دلائل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- مَردوں کے لئے ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کی مقدار ایک مٹھی (یعنی چار انگشت) ہے۔ ڈاڑھی تمام انبیاء کا متفقہ عمل اور مستقل معمول اور خود ہمارے آخری نبی آنحضرت ﷺ کا دائمی عمل ہے، ڈاڑھی اسلامی اور قومی شعار ہے، شرافت اور بزرگی کی علامت ہے، چھوٹے اور بڑے میں، اور مرد و عورت میں امتیاز و فرق کرنے والی ہے، اسی سے مردانہ شکل کی تکمیل اور صورت نورانی ہوتی ہے۔

اور حضور ﷺ نے اسے فطرت کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اور آپ ﷺ نے اپنی اُمت کو ڈاڑھی رکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے، لہٰذا ڈاڑھی بڑے احترام کی چیز ہے، اور اس کا رکھنا واجب اور ضروری ہے، اور اس کو منڈانا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے اور اس پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔

ڈاڑھی کے بارے میں شریعت کی طرف سے اہمیت و تاکید کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اہلِ علم حضرات نے اسے اسلامی شعار میں داخل کیا ہے، پھر ڈاڑھی کی ایک مقدار شریعت کی طرف سے متعین ہے، اس سے کم کرنا جائز نہیں، اور وہ ایک مٹھی کی مقدار ہے، اس لئے ڈاڑھی کو منڈادینا یا ایک مٹھی سے کم کرانا گناہ ہے، بلکہ اس میں اور بھی کئی گناہ شامل ہیں۔

بلکہ یہ گناہ عام گناہوں سے زیادہ بڑا ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ یہ گناہ ہر وقت جاری رہتا ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ یہ گناہ ہر وقت لوگوں کے سامنے رہتا ہے۔

جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ

مکرم بندہ زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کی تالیف ''ڈاڑھی کا شرعی حکم'' مدت سے میز پر رکھی ہے کہ مہلت ملنے پر کم از کم سرسری نظر ہی سے دیکھ سکوں، لیکن اب آکر اس کا موقع ملا، ماشاء اللہ جستہ جستہ دیکھنے پر مفید اور مناسب معلوم ہوئی، اللہ تبارک وتعالیٰ نافع ومقبول بنائیں۔ آمین۔

البتہ ایک شافعی عالم کا ایک مقالہ نظر سے گزرا تھا، جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ شافعیہ کے یہاں ''قطع ما دون القبضۃ'' مکروہ ہے،[1] اور شافعیہ کے یہاں مکروہ مطلقاً بولا جائے، تو تنزیہ پر دلالت کرتا ہے، اگر اس کی بھی کچھ تحقیق آسکے تو اچھا ہے۔ ورنہ موجودہ شکل میں بھی اشاعت ان شاء اللہ مفید ہوگی۔ والسلام

۱۴۳۰/۹/۴ھ

کافر کی ڈاڑھی مونڈنا جائز نہیں

سوال:- از تذکرۃ الرشید حصہ اوّل ص: ۱۹۵۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس بارہ میں کہ مسلمان حجام کو کسی ہندو کی ڈاڑھی مونڈنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان یا کافر کی ڈاڑھی مونڈنی درست نہیں اور نہ اس کی اُجرت لینی درست ہے۔ فقط

ایک مفتی صاحب نے فتوی میں یہ بات لکھی ہے کہ ہندوؤں کی ڈاڑھی مونڈنا درست ہے، کیونکہ ان کے مذہب میں ڈاڑھی کا منڈانا درست ہے، اس لئے اُجرت بھی لینی درست ہے اور مسلمان کی ڈاڑھی مونڈنا بھی درست ہے، لیکن پہلے نصیحت کر دینی چاہئے، فقط۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کا فتوی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہے، آپ صحیح جواب سے مستفید فرمائیں۔ بینوا وتوجروا۔

جواب:- فی الدر المختار: و جاز تعمیر کنیسۃ و حمل خمر ذمی بنفسہ أو دابتہ بأجر لا عصرھا لقیام المعصیۃ بعینہ.[2] (شامی ص: ۳۴۵ ج: ۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا کسی کافر کے لئے شراب نچوڑنا اور اس پر اُجرت لینا درست

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے "المجموع شرح المھذب" ج:۲ ص:۲۲۹ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت) وھامش فتاویٰ ابن حجر ج:۴ ص:۶۹ (طبع بیروت) وشرح مسلم للقاضی عیاضؒ ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع بیروت) نیز اس موضوع پر تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ عبدالعزیز صدیق الغماری کا رسالہ "افادۃ ذوی الأفھام بأن حلق اللحیۃ مکروہ ولیس بحرام"

(۲) تنویر الأبصار مع الدر المختار کتاب الحظر والإباحۃ فصل فی البیع ج: ۶ ص: ۳۹۱ (طبع سعید)

نہیں، البتہ شراب کو اُٹھا کر لیجانا اور اس پر اُجرت لینا جائز ہے۔[۱] کیونکہ پہلی صورت میں اُجرت اس فعل پر لی جارہی ہے جو بعینہٖ معصیت سے متعلق ہے اور دوسری صورت میں ایسا نہیں۔[۲] اور فقہاء رحمہم اللہ نے یہ اُصول بیان فرمایا ہے کہ پہلی قسم کے فعل پر اُجرت لینا وغیرہ ناجائز اور دوسری قسم پر جائز ہے۔[۳]

اگر ہمارے زیرِ بحث مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ اُجرت لینا پہلی قسم پر ہوگا، کیونکہ ڈاڑھی مونڈنا بعینہٖ معصیت ہے اور اس میں کافر و مسلم کی تفریق بھی اسی طرح نہیں ہوگی جیسا کہ شراب کے مسئلہ میں نہیں ہے، چنانچہ ڈاڑھی مونڈنا اور اس پر اُجرت لینا بہرصورت ناجائز ہے، خواہ کافر کی ڈاڑھی مونڈی جائے یا مسلم کی۔

اور یہ کہنا کہ کیونکہ یہ فعل کفار کے مذہب میں جائز ہے، اس لئے اس کی اعانت اور اس پر اُجرت لینا جائز ہوگا، بایں وجہ صحیح نہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو شراب نچوڑنا اور اس پر اُجرت لینا بھی جائز ہونا چاہئے، جب وہ جائز نہیں ہے تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

اور یہ کہنا تو بالکل ہی بے اصل و بنیاد اور غلط ہے کہ مسلمان کی ڈاڑھی مونڈنا بھی جائز ہے، اس لئے کہ تمام فقہاء نے استیجار علی المعاصی اور اُجرت علی المعصیۃ کو ناجائز لکھا ہے، مثال کے طور پر درمختار کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

" لا تصح الإجارة لعسب التيس ولا لأجل المعاصي مثل الغناء

(۱ تا ۳) وفى البحر الرائق كتاب الكراهية فصل فى البيع ج: ۸ص: ۳۷۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) (وحمل خمر الذمى بأجر) يعنى جاز ذلك وهذا عند الإمام وقالا يكره لأنه -عليه الصلاة والسلام -لعن فى الخمر عشرة وعد منها حاملها وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية وإنما المعصية بفعل فاعل مختار فصار كمن استأجره لعصره خمر العنب وقطفه، والحديث يحمل على الحمل المقرون بقصد المعصية وعلى هذا الخلاف إذا أجر دابة ليحمل عليها الخمر أو نفسه ليرعى له الخنازير فإنه يطيب له الأجرة عنده وعندهما يكره وفى التتارخانية :ولو أجر المسلم نفسه لذمى ليعمل فى الكنيسة فلا بأس به.

وفى تبيين الحقائق كتاب الكراهية فصل فى البيع: ج ۷ ص ۲۴ (طبع سعيد) (باقی آئندہ صفحہ پر)

والنوح والملاهی الخ (ص: ۴۰۱ ج: ۵)[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمد تقی عثمانی
۱۳۷۸/۱۰/۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(زیرناف بالوں کی صفائی کے احکام)

زیرناف بالوں اور ایّامِ صفائی کی حدود کا تعین

بغل کے بالوں کی صفائی کا حکم

سوال:- حدیث میں زیرناف بال صاف کرنے کا حکم ہے تو اس کی حد کیا ہے؟ کیا ناف

(گذشتہ سے پیوستہ) (وحمل خمر لذمی بأجر) أی جاز ذلک أیضا، وهذا عند أبی حنیفة -رحمه الله-، وقالا هو مکروه؛ لأنه -علیه الصلاة والسلام- لعن فی الخمر عشرة، وعد منها حاملها، وله أن الإجارة علی الحمل، وهو لیس بمعصیة، ولا تسبب لها، وإنما تحصل المعصیة بفعل فاعل مختار، ولیس الشرب من ضرورات الحمل؛ لأن حملها قد یکون للإراقة أو التخلیل فصار کما لو استأجره لعصر العنب أو قطفه، والحدیث محمول علی الحمل المقرون بقصد المعصیة، وعلی هذا الخلاف إذا آجره دابة لینقل علیها الخمر أو آجره نفسه لیرعی له الخنازیر فإنه یطیب له الأجر عند أبی حنیفة -رحمه الله-، وعندهما یکره.

وکذا فی الهندیة ج: ۴ ص: ۴۵۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) وفتاوی قاضیخان علی الهندیة ۳۲۴/۲ والفقه الإسلامی و أدلّته ج: ۴ص: ۲۳۴ (طبع دار الفکر دمشق)

(۱) الدر المختار کتاب الإجارة باب الإجارة الفاسدة ج: ۶ص: ۵۵ (طبع سعید)

وفی المبسوط للسرخسیؒ ج: ۱۶ ص:۷۸ (طبع دار الفکر بیروت) وإذا استأجر فحلا لینزیه لم یجز للأثر الذی جاء به النهی عن رسول الله -صلی الله علیه وسلم- عن التیس .... ولا تجوز الإجارة علی تعلیم الغناء والنوح لأنّ ذلک معصیة.

وفی الهندیة ج: ۴ ص: ۴۴۹ (طبع رشیدیه) ولا تجوز الإجارة علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر والطبل وشیء من اللهو الخ

ہی سے شروع کرلیں یا نیچے کہیں سے؟ اور کتنے دنوں بعد؟ اسی طرح بغلوں کے بالوں کا بھی مسئلہ بتادیں۔

جواب:- یہ بات تو کتبِ فقہ میں ہے کہ زیرناف کے بالوں کو کاٹنے کی ابتدائی حد ناف کے متصل نیچے ہے:

قال فی الهندية: ويبتدئ من تحت السرة (شامی ج:۵ ص: ۲۶۱)[1]

لیکن انتہائی حد کا ذکر ہمیں فقہ کی کتابوں میں نہیں ملا، البتہ حدیث میں اس کے لئے حلق العانۃ کا لفظ آیا ہے[2]۔ علامہ زبیدیؒ اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

" قال أبو الهيثم: العانة منبت الشعر فوق القبل من المرأة وفوق الذكر من الرجل والشعر النابت عليهما يقال له الأسب قال الأزهری: وهذا هو الصواب. (تاج العروس ص: ۲۸۵ ج:۹)[3]

اور علامہ مطرزیؒ لکھتے ہیں:

" هی الشعر النابت فوق الفرج" المغرب، ص: ۶۴ ج۲)[4]

اس سے معلوم ہوا کہ عانۃ کا اطلاق ان بالوں پر ہوتا ہے جو شرمگاہ سے اُوپر اُوپر ہوں، لہٰذا اس کی آخری حد شرمگاہ ہے۔[5] البتہ ایک قول یہ بھی ہے کہ الشعر النابت علی قبل المرأة (تاج العروس ص: ۲۸۵ ج:۹)[6] اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ شرمگاہ کے اُوپر کے بال بھی صاف کئے جائیں اور خود شرمگاہ پر اُگے ہوئے بال بھی۔[7] البتہ پشت کے بال صاف کرنا اس حکم میں داخل نہیں۔

---

(۱) رد المحتار كتاب الحظر والإباحة فصل فی البيع ج: ۶ ص: ۴۰۶ (طبع سعيد)

(۲) وفی صحيح البخاری باب تقليم الأظفار ج: ۲ ص: ۸۷۵ (طبع قديمی كتب خانه) عن ابن عمرؓ أن رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: من الفطرة حلق العانة وتقليم الأظفار وقصّ الشارب.

(۳ و ۶) تاج العروس للزبيدی فصل العنين ج: ۱ ص: ۸۱۱۶ طبع موقع الوراق.

(۴) المغرب فی ترتيب المعرب، العين مع الواؤ ج: ۲ ص: ۹۰ (طبع مكتبة أسامة بن زيد حلب)

(۵ و ۷) وفی مرقاة المفاتيح كتاب اللباس باب الترجل ج: ۸ ص: ۲۰۹ (طبع رشيديه) فی حلق العانة ذی الشعر الذی حوالی ذكر الرجل وفرج المرأة .زاد ابن شريح :وحلقة الدبر، فجعل العانة منبت الشعر مطلقا، والمشهور الأول،

(باقی آئندہ صفحے پر)

یہ صفائی ہر ہفتے جمعہ کے دن کرنا افضل اور مستحب ہے۔اور چالیس دن سے زیادہ بغیر صفائی

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی فتح الباری باب قص الشارب ج: ١٠ ص: ٣٤٣ (طبع دار المعرفة بيروت) قال النووی المراد بالعانة الشعر الذی فوق ذكر الرجل وحواليه وكذا الشعر الذی حوالی فرج المرأة ونقل عن أبی العباس بن سريج أنه الشعر النابت حول حلقة الدبر فتحصل من مجموع هذا استحباب حلق جميع ما علی القبل والدبر وحولهما .... وقال أبو شامة العانة الشعر النابت علی الركب بفتح الراء والكاف وهو ما انحدر من البطن فكان تحت الثنية وفوق الفرج وقيل لكل فخذ ركب وقيل ظاهر الفرج وقيل الفرج بنفسه سواء كان من رجل أو امرأة قال ويستحب إماطة الشعر عن القبل والدبر بل هو من الدبر أولى خوفا من أن يعلق شیء من الغائط فلا يزيله المستنجی إلا بالماء ولا يتمكن من إزالته بالاستجمار۔

وفی فيض القدير للمناویؒ حرف العين ج: ٤ ص: ٣١٦ (طبع مكتبة تجارية مصر) (وحلق العانة) الشعر الذی حول ذكر الرجل و فرج المرأة الخ

وكذا فی التيسير شرح الجامع الصغير حرف العين ج: ٢ ص: ٢٥٨ (طبع مكتبة الإمام الشافعی رياض)

وفی شرح النووی كتاب الطهارة باب خصال الفطرة ١٢٨/١،ط. قديمی: والمراد بالعانة الشعر الذی فوق ذكر الرجل وحواليه وكذالک الشعر الذی حوالی فرج المرأة ونقل عن أبی العباس بن سريج أنه الشعر النابت حول حلقة الدبر فيحصل من جميع هذا استحباب حلق جميع ما علی القبل والدبر وحولهما۔

وفی العرف الشذی علی جامع الترمذی، أبواب الآداب، باب ما جاء فی تقليم الأظفار، ١٠٤/٢.(ط. قديمی) الاستحداد هو حلق العانة بالحديد والمراد إزالته كيف ما كان من العانة و ما فوقها و حواليه و حوالی فرجها وقيل: شعر حلقة الدبر، مجمع البحار .... هو الشعر علی الفرج أو منبته قيل: يستحب حلق ما علی القبل والدبر و ما حولها۔

وكذا فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص: ٢٨٤: ثم العانة هی الشعر الذی فوق الذكر وحواليه وحوالی فرجها ويستحب إزالة شعر الدبر خوفا من أن يعلق به شیء من النجاسة الخارجة فلا يتمكن من إزالته بالاستجمار۔

وفی البحر الرائق ج: ١ص: ١٤٩ (ط. دار الكتب العلمية بيروت) والمراد بالعانة الشعر فوق ذكر الرجل و حواليه إلی السرة۔

وفی مجمع الأنهر شرح الملتقی ج: ١ ص: ٤٨٢ (ط. دار الكتب العلمية بيروت) العانة وهی منابت الشعر وقيل: إلی الشق۔

وفی الشامية فصل فی الإحرام ٤٨١/٢ (ط. سعيد) والعانة الشعر القريب من فرج الرجل والمرأة ومثلها شعر الدبر بل هو أولی بالإزالة لئلا يتعلق به شیء من الخارج عند الاستنجاء بالحجر۔

کے گزاردینا مکروہِ تحریمی ہے۔ کذا فی الدر المختار مع الشامی ج: ۵ ص: ۲۶۱[۱] بغل کے بالوں کوصاف کرنے میں بھی یہی تفصیل ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۳۹۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۸۶ ب)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

عورت کا چہرہ سے بال صاف کرنے کا حکم اور متعلقہ حدیث کی تحقیق

(فارسی فتویٰ)

سوال:- چہ می فرمایند علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ در بعض مواضع زنان عادت دارند کہ بذریعہ رِشتہ یا موکش یا پوڈر، الغرض بہرآلہ کہ مناسب باشد موہائے چہرہ خود را خارج کردہ صاف می نمایند تا کہ درپیش شوہران خود زیادہ زینت دارد ومحبوب باشند وایں رسم ورواج را ازایامِ جاہلیت تاہنوز جائز ومباح دانستہ عمل میکنند، مگر فی الحال بعض حضرات ممانعت فرمودہ انداز

---

(۱) ج: ۶ ص: ۴۰۶ (طبع سعید) وفی التیسیر بشرح الجامع الصغیر حرف القاف ج: ۲ ص: ۳۸۵ (ط. مکتبة إمام شافعی ریاض) وجاء فی بعض الأخبار أنه یفعل کل أربعین وفی بعضها کل أسبوع ولا تعارض لأن الأربعین أکثر المدة والأسبوع أقلها۔

وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة باب الترجل ۱۳/۱۶۳ (ط۔) فالأسبوع أفضل والخمسة عشر هو الأوسط والأربعون هو الأبعد ولا عذر فیما وراء الأربعین و یستحق الوعید عندنا الخ

وفی الهندیة الباب السابع عشر فی الختان ۳۵۷/۵ (ط.رشیدیه) ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل أسبوع مرة فإن لم یفعل ففی کل خمسة عشر یوما ولا یعذر فی ترکه وراء الأربعین فالأسبوع هو الأفضل والخمسة عشر الأوسط والأربعون الأبعد ولا عذر فیما وراء الأربعین ویستحق الوعید کذا فی القنیة.

وفی مجمع الأنهر شرح الملتقی فصل فی البیع ج: ۴ ص: ۲۲۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) و السنة نتف الإبط وحلق العانة والشارب، وفی القنیة ویستحب حلق عانته وتنظیف بدنه بالاغتسال فی کل أسبوع مرة فإن لم یفعل ففی خمسة عشر یوما مرة ولا عذر فی ترکه وراء أربعین۔ الخ

وفی الفقه الإسلامی وأدلته ج: ۱ ص: ۴۰۸ (طبع دار الفکر بیروت) ویکره ترک التقلیم والحلق لشعر الرأس والعانة والنتف فوق أربعین یوماً الخ

روۓ ایں حدیث شریف "قدلعن النبی صلی الله علیه وسلم النامصة والمتنمصة والواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوشمة والواشرة والمستوشرة .
..........التنمص هو نتف شعور الوجه يقال تنمصت المرأة إذا تزينت بنتف شعر وجهها، كذا فی تفسیرروح البیان درتفسیر آیۃ وَلَآمُرَنَّهُمْ الخ مستدعی است کہ براہِ کرام ایں حدیث راتوضیح فرمایندکہ صحیح حدیث است یاغیرصحیح؟ بعدہ بمطابق قانون شرعی حکم فرمایند۔ بینوا وتوجروا۔

مذکورہ فارسی سوال کا اردو ترجمہ (از مرتب)

بعض جگہوں پرعورتوں کی یہ عادت ہے کہ بذریعہ..................یاپوڈر، الغرض جوآلہ بھی اس مقصد کے لئے مناسب معلوم ہو، سے اپنے چہرہ کے بال صاف کرتی ہیں، تاکہ اپنے شوہروں کے سامنے زیادہ زیب وزینت کااہتمام کرسکیں اور یہ رسم ورواج زمانۂ جاہلیت سے اب تک جائزومباح سمجھے جاتے تھے، مگراب بعض حضرات اس حدیث شریف کی رُوسے اس فعل کی ممانعت کرتے ہیں، حدیث یہ ہے: "قد لعن النبی صلی الله علیه وسلم النامصة و المتنمصة و الواصلة و المستوصلة و الواشمة و المستوشمة و الواشرة و المستوشرة. .... التنمص هو نتف شعور الوجه يقال تنمصت المرأة إذا تزينت بنتف شعر وجهها، كذا فی تفسیرروح البیان درتفسیر آیۃ وَلَآمُرَنَّهُمْ الخ .

گذارش یہ ہے کہ برائے کرام اس حدیث کی وضاحت فرمائیں، آیایہ صحیح ہے یاغیرصحیح؟ اس وضاحت کے بعدشرعی قانون کے مطابق حکم سے آگاہ فرمائیں۔ (ملاداد محمد سندھ)

جواب:- یہ حدیث توصحیح ہے، صحیح بخاری ومسلم دونوں میں متعددطرق سے مذکور ہے۔ (بخاری جلد:۲ص:۸۷۶)[۱] (ومسلم ج:۲ص:۲۰۴)[۲]

---

(۱) كتاب اللباس باب المتنمّصات (طبع قديمی كتب خانه)

(۲) كتاب اللباس باب تحريم فعل الواصلة والمستوصلة (طبع نعمانيه)

لیکن علامہ ابن عابدینؒ نے ردالمحتار میں اس کو اس صورت پر محمول کیا ہے جبکہ تزین اغیار کے لئے ہو، اپنے شوہر کے لئے تزین چونکہ نصوصِ شرعیہ سے مستحب ومطلوب ہے، اس لئے اس پر محمول کرنے کو بعید قرار دیا ہے:

"قال فی رد المحتار: ولعله محمول على ما إذا فعلته لتتزين للأجانب، وإلا فلو كان فی وجهها شعر ينفر زوجها عنها بسببه، ففی تحريم إزالته بعد، لأن الزينة للنساء مطلوبة للتحسين، إلا أن يحمل على ما لا ضرورة إليه لما فی نتفه بالمنماص من الإيذاء."

(رد المحتار ص: ۳۲۸ ج: ۵)[1]

البتہ اتنی بات پر تو عامہ فقہاء وشراحِ حدیث متفق نظر آتے ہیں کہ اگر کسی عورت کے ڈاڑھی یا مونچھ کے بال نکل آئیں تو ان کو صاف کر لینا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔[2] جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم تو عام ہے، تزین للاجانب کے لئے ہو یا تزین للازواج کے لئے، بہرصورت چہرے کے بال نوچنا حرام وناجائز ہے، مگر ڈاڑھی ومونچھ کے بال اس سے مستثنیٰ سمجھے گئے۔[3] وجہ استثناء کی یہ ہوسکتی ہے کہ ڈاڑھی اور مونچھ کے بال عادۃً زیادہ ہوتے ہیں، اگر یہ بال بڑھ گئے

---

(۱) كتاب الحظر والإباحة فصل فی النظر والمس ج: ۶ ص: ۳۷۳ (طبع سعيد)

(۲) وفی التيسير بشرح الجامع الصغير حرف اللام ج: ۲ ص: ۵۷۱ (طبع مكتبة الإمام الشافعی رياض) أن ذلك حرام بل عده بعضهم من الكبائر للوعيد عليه باللعن نعم ان نبت للمرأة لحية لم تحرم ازالتها بل تندب.

وفی شرح النووی على مسلم باب خصال الفطرة ج: ۳ ص: ۱۴۹ (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت) الثانية عشر حلقها إلا إذا نبت للمرأة لحية فيستحب لها حلقها، والله أعلم.

وكذا فی نيل الأوطار للشوكانیؒ ج: ۱ ص: ۱۴۱ (طبع إدارة الطباعة المنيرية)

وفی شرح سنن أبی داؤد للعينیؒ باب السواك من الفطرة ج: ۱ ص: ۱۶۴ (طبع مكتبة الرشد رياض) الثانية عشر حلقها، إذا نبتت للمرأة لحية يستحب حلقها.

(۳) وفی عمدة القاری قبل باب إعفاء اللحی ج: ۲۲ ص: ۴۷ (طبع مكتبة رشيديه كوئٹه) وقال النووی: يستثنى من الأمر بإعفاء اللحی ما لو نبت للمرأة لحية فإنه يستحب لها حلقها، و كذا لو نبت لها شارب أو عنفقة.

وفی فتح الباری قبل باب إعفاء اللحی ج: ۱۰ ص: ۳۴۹ (طبع مكتبة الرشد رياض) وقال النووی يستثنى من الأمر بإعفاء اللحی ما لو نبتت للمرأة لحية فإنه يستحب لها حلقها وكذا لو نبت لها شارب أو عنفقة.

وفی تحفة الأحوذی باب ما جاء فی المتشبهات بالرجال الخ ج: ۸ ص: ۵۶ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وقال النووی: يستثنى من النماص ما إذا نبت للمرأة لحية أو شارب أو عنفقة فلا يحرم عليها إزالتها بل يستحب الخ

توعورت کی زینت بالکل ختم ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ مردوں کے ساتھ مشابہت پوری ہوگی، اور امتیاز مشکل ہوجائے گا، بہرحال! خواہ علامہ شامیؒ کی تحقیق کولیا جائے کہ حدیث کو تزین للأجانب پر محمول کریں یا عامۃ فقہاء وشراحِ حدیث کی کہ مفہومِ حدیث عام ہے، بہرصورت ڈاڑھی اور مونچھ کے بال صاف کرنا عورت کے لئے جائز بلکہ مستحب ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ آگے چل کر خود فرماتے ہیں:

"وفی تبیین المحارم إزالة الشعر من الوجه حرام إلا إذا نبت للمرأة لحية أو شوارب فلا تحرم إزالته بل تستحب." (شامی ج۵ ص ۳۲۸)[۱] اور امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں: وهذا الفعل الحرم الا اذا انبتت المرأة لحية او شوارب فلا تحرم ازالتها بل تستحب (صحيح مسلم مطبوعه أصح المطابع ص: ۲۰۵ ج: ۲)[۲]

وهكذا فی القسطلانی فی شرح البخاری (حاشية الشيخ احمد علي علی البخاری ص: ۸۷۸ ج: ۲)[۳]

والله سبحانه وتعالىٰ أعلم وعلمه أتم و أحكم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴-۹-۱۳۷۸ھ
(فتوی نمبر ۶۸۶ / ۲۲ ب)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) كتاب الحظر والإباحة فصل فی النظر والمس ج: ۶ ص: ۳۷۳ (طبع سعيد)

(۲) شرح النووی علی صحيح مسلم، كتاب اللباس باب تحريم الواصلة ج:۲ ص: ۲۰۵ (طبع قديمی كتب خانه)

(۳) صحيح البخاری ج:۲ ص: ۸۷۸ (طبع قديمی كتب خانه)

فصل فی السلام

(سلام سے متعلق مسائل کا بیان)

مشرک کے سلام کا جواب کس طرح دیا جائے؟

سوال:- مشرک کو سلام کرنے کا حکم کیا ہے ؟اور مشرک کے سلام کا جواب کس طرح دیا جائے؟

جواب:- مشرک کو سلام کرنا جائز نہیں۔(۱) لہٰذا بضرورتِ شدیدہ اس کے لئے آداب

---

(۱) اس مسئلہ کی مفصل تحقیق حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے اپنی کتاب تکملہ فتح الملہم ج۴ص ۲۵۵ میں تحریر فرمائی ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث لاتبدئوا الیہود ولا النصاری بالسلام الحدیث کی بناء پر جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کیلئے غیر مسلم کو سلام کی ابتداء کرنا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے تاہم بعض علماء کے نزدیک جائز ہے اور جواز کی یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ،حضرت ابوامامہ اور حضرت ابن ابی محیریز رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے بھی اسے بیان کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی بیان فرمایا کہ السلام علیکم یعنی جمع کے صیغے کے بجائے السلام علیک کہا جائے۔

جواز کے قائلین ،سلام سے متعلق احادیث کے عموم اور سلام پھیلانے کے حکم سے استدلال کرتے ہیں مگر علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس دلیل پر فرمایا ''یہ دلیل باطل ہے کیونکہ سلام کا حکم عام ہے جس سے مذکورہ حدیث مسلم کی بناء پر غیر مسلموں کو خاص کرلیا گیا ہے۔علامہ نووی رحمہ اللہ نے مزید فرمایا کہ بعض شوافع حضرات کا کہنا یہ ہے کہ غیر مسلموں کو ابتداءً سلام کرنا مکروہ تو ہے مگر حرام نہیں تاہم یہ بات بھی ضعیف ہے اس لئے کہ حدیث میں جو ممانعت آئی ہے وہ حرمت کیلئے ہے لہٰذا درست یہی ہے کہ انہیں سلام کی ابتداء کرنا حرام ہے البتہ قاضیؒ نے علماء کی ایک جماعت کا یہ قول نقل کیا ہے کہ غیر مسلم کو ضرورت وحاجت یا کسی سبب کی بناء پر سلام کی ابتداء کرنا جائز ہے یہی قول علامہ نخعی اور حضرت علقمہ سے مروی ہے۔امام اوزاعی سے مروی ہے کہ اگر تم غیر مسلموں کو سلام کرو تو صلحاء نے سلام کیا ہے اور اگر تم سلام کو ترک کرو تو یہ بھی صلحاء کا طریقہ ہے،یعنی سلف صالحین سے دونوں طریقے مروی ہیں۔

اور فتاوی ھندیہ میں ہے ذمیوں کو سلام کرنے میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے فرمایا کہ ذمیوں کو سلام کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں جبکہ بعض حضرات نے منع کیا ہے تاہم یہ اختلاف اس وقت ہے جبکہ ذمی کو سلام کرنے کی حاجت نہ ہو اگر مسلمان کو ذمی سے کوئی غرض وحاجت ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تیرا گذر کسی ایسی قوم کی طرف ہو جسمیں کفار بھی ہوں تو تجھے اختیار ہے چاہے تو مسلمانوں کی نیت کرکے انہیں السلام علیکم کہے اور چاہے تو یہ کہہ السلام علی من اتبع الھدی۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

وغیرہ کے الفاظ استعمال کر لئے جائیں۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۸۷/۱۳/۳۰ھ

(فتوی نمبر ۳ /۱۹ الف)

غیر محرم کو سلام کرنے کا حکم

دیور کا بھابھی کو سلام کرنے کا حکم

کھانے کے دوران سلام کرنے کا حکم

سوال:- (۱)...غیر محرم عورت کو سلام کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور غیر محرم عورت اگر مرد کو سلام

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الصحیح للإمام مسلمؒ ج: ۷ ص: ۵ (طبع دار الفکر بیروت) عن أبی هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تبدؤا اليهود ولا النصارى بالسلام، فإذا لقيتم أحدهم فی طريق، فاضطروه إلى أضيقه۔

وفی التيسير بشرح الجامع الصغير للمناویؒ ج: ۲ ص: ۴۹۴ (طبع دار النشر رياض) (لا تبدؤا اليهود ولا النصارى بالسلام) لأن السلام إعزاز ولا يجوز إعزازهم فيحرم ابتداؤهم به على الأصح عند الشافعية الخ۔

وفی عمدة القاری: ثم هذا العموم مخصوص بالمسلمين فلا يسلم ابتداء على كافر لقوله: لا تبدؤا اليهود ولا النصارى بالسلام۔ (الحديث)

وفی فتح الباری باب التسليم فی مجلس فيه أخلاط الخ ج: ۱۱ ص: ۳۹ (طبع دار المعرفة بيروت) ....
وهو مفرع على منع ابتداء الكافر بالسلام وقد ورد النهی عنه صريحا فيما أخرجه مسلم والبخاری فی الأدب المفرد من طريق سهل بن أبی صالح عن أبيه عن أبی هريرة رفعه لا تبدءوا اليهود والنصارى بالسلام الخ۔

وفی فيض القدير للمناویؒ ج: ۶ ص: ۳۸۶ (طبع المكتبة التجارية مصر) لاتبدؤا اليهود ولا النصارى لأن السلام إعزاز وإكرام ولا يجوز إعزازهم ولا إكرامهم بل اللائق بهم الإعراض عنهم وترک الالتفات إليهم تصغيرا لهم وتحقيرا لشأنهم فيحرم ابتداؤهم به على الأصح الخ

وكذا فی مرقاة المفاتيح ج: ۹ ص: ۵۰ (طبع مكتبة إمداديه ملتان)

وفی الهندية (۳۲۵/۵) كتاب الكراهية الباب السابع فی السلام (ط۔ رشيديه) وأما التسليم على أهل الذمة فقد اختلفوا فيه قال بعضهم: لا بأس بأن يسلم عليهم، وقال بعضهم: لا يسلم عليهم، وهذا إذا لم يكن للمسلم حاجة إلى الذمی، وإذا كان له حاجة فلا بأس بالتسليم عليه۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کرے تو ماننا چاہیے یا نہیں؟

(۲)... دیور کا بھابھی سے سلام لینا جائز ہے یا بھابھی دیور کو سلام کرے، دونوں صورتوں میں جواب تحریر فرمائیں۔

(۳)...روٹی کھاتے ہوئے اگر کوئی سلام کرے تو ماننا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- (۱)... غیر محرم عورت اگر جوان ہو تو اُسے سلام کرنا مکروہ ہے [۱]، اسی طرح عورت کے لئے غیر محرم مرد کو سلام کرنا مکروہ ہے [۲] اور اگر کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا واجب نہیں، لیکن جائز ہے [۳]، کذا یفہم من الدر المختار و رد المحتار (ص: ۴۱۴ وص: ۴۱۵ ج:۱) [۴]

(گذشتہ سے پیوستہ)وفی الدر المختار(۶/ ۴۱۲)فصل فی البیع(فرع)کتاب الحظر والإباحة (ط۔ سعید)وفی شرح البخاری للعینی فی حدیث أی الإسلام خیر؟ قال:تطعم الطعام وتقرأ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف قال وهذا التعمیم مخصوص بالمسلمین، فلا یسلم ابتداء علی کافر لحدیث لا تبدء وا الیهود والنصاری بالسلام الخ

(۱ تا ۴) غیر محرم مرد کیلئے عورت کو اور عورت کیلئے غیر محرم مرد کو سلام کرنے کے شرعی حکم کے بارے میں حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تکملہ فتح الملہم ج ۵ ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ میں جو بحث تحریر فرمائی ہے یہاں اسکا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے:۔ صحیح مسلم کی حدیث ”عن عائشه رضی الله عنها ان النبی ﷺ قال لها ان جبرئیل یقراء علیک السلام قالت فقلت وعلیه السلام ورحمة الله، نقل کرنے کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا قوله ان جبرئیل یقرء علیک السلام یعنی آپ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمانا کہ ”جبرئیل آپ کو سلام کہہ رہے ہیں،، اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مرد کیلئے اجنبی عورت کو سلام کرنا جائز ہے کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام مرد کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سھل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ بعض صحابہ کرام جمعہ کے دن ایک بوڑھی عورت کے پاس جایا کرتے تھے جو انکے لئے کھجور اور جو کا کھانا تیار کیا کرتی تھیں تو صحابہ انہیں سلام کیا کرتے تھے۔ اسی طرح امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنھا کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ ہم عورتوں پر آپ ﷺ کا گذر ہوا تو آپ ﷺ نے ہمیں سلام فرمایا نیز صحیح مسلم میں حضرت ام ھانی رضی اللہ عنھا سے مروی ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس آئی آپ ﷺ غسل فرما رہے تھے تو میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں مردوں کا عورتوں کو اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا جائز ہے بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو۔ حضرات مالکیہ نے سد ذریعہ کے طور پر جوان اور بوڑھی عورت کے درمیان فرق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جوان عورت کو سلام کرنا ممنوع جبکہ بوڑھی کو سلام کرنا جائز ہے۔ جبکہ علامہ ربیعہ رحمہ اللہ نے مطلقاً منع فرمایا ہے اور علماء کوفہ نے فرمایا عورتوں کیلئے مردوں کو سلام کرنے میں ابتداء کرنا جائز نہیں کیونکہ عورتوں کو تو اذان، اقامت، اور اونچی آواز سے تلاوت سے بھی منع کیا گیا ہے تاہم محرم اس حکم سے مستثنی ہے لہذا عورت کیلئے محرم مرد کو سلام کرنا جائز ہے بعض حضرات نے خوبصورت اور غیر خوبصورت کے درمیان فرق کیا ہے۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(۲)...صریح جزئیہ نہیں ملا، البتہ دیور بھابھی کے لئے چونکہ غیرمحرم ہے،اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ سلام کے معاملے میں فقہاء نے اجنبیات فتیات کا جو حکم لکھا ہے[۱] ، وہی اس پر بھی جاری ہو اور سلام کرنا مکروہ ہو۔[۲]

(۳)...جس وقت کھانا کھانے والے کے منہ میں لقمہ ہو اور جواب دینے سے اسے تکلیف ہو، اس وقت اسے سلام کرنا مکروہ ہے اور جواب میں تکلیف نہ ہو تو جائز ہے:

"إن الکراھة إنما ھی فی حالة وضع اللقمة فی الفم کما یظھر مما فی حظر المجتبیٰ۔ (شامی ص: ۴۱۵ ج: ۱)[۳]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۹۶ و)

وأما غیره فیکره له أن یسلم علی المرأة الأجنبیة إلا أن تکون عجوزة بعیدة عن مظنة الفتنةاس تفصیل کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا کوئی ایسی حدیث ہمارے علم میں نہیں ہے جسمیں عورت کو سلام سے منع کیا گیا ہو جس نے بھی منع کیا ہے اس نے فتنہ کے خوف کی وجہ سے ہی منع کیا لہذا مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کراہت کو خوف فتنہ کی قید کے ساتھ مقید کیا جائے ورنہ احادیث کا ظاہر اس کے جواز پر ہی دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم

وفی مرقاة المفاتیح شرح المشکوة باب السلام ج: ۹ ص: ۵۶ (طبع مکتبة إمدادیه ملتان)

وأما غیره فیکره له أن یسلم علی المرأة الأجنبیة إلا أن تکون عجوزة بعیدة عن مظنة الفتنة .قیل :وکثیر من العلماء لم یکرھوا تسلیم کل منھما علی الآخر اھ .ومھما قیل بالکراھة علی ما ھو الصحیح، فلم یثبت استحقاق الجواب۔

وفی شرح الزرقانی علی المؤطأ قبیل ما جاء فی السلام علی الیھود والنصرانی ج: ۴ ص: ۴۵۸ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

(۱و۲) دیکھئے سابقہ تفصیلی حاشیہ

(۳) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۶۱۶ (طبع سعید) مطلب المواضع التی یکره فیھا السلام، سلامک مکروهٌ علی من ستسمع .... و دع اکلاً إذا کنت جائعاً۔

وفی رد المحتار تحت قوله (إلا إذا کنت جائعاً الخ) انظر ما وجه ذلک؟ مع أن الکراھة إنما ھی فی حالة وضع اللقمة فی الفم، کما یظھر مما فی حظر المجتبی :یکره السلام علی العاجز عن الجواب حقیقة کالمشغول بالأکل أو الاستفراغ۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

فَصْلٌ فِی أَحْکَامِ الْجَوَّال

موبائل فون سے متعلق مسائل کا بیان

دورانِ نماز موبائل کی گھنٹی بجنے کے مسئلہ کو ''حالتِ حقن'' پر قیاس کر کے فسادِ نماز کا حکم

سوال:-

معظم و محترم حضرت والا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گزشتہ دنوں نماز میں موبائل فون بند کرنے کے حوالہ سے ایک مضمون آنجناب کی خدمت میں اصلاح ونظرِ ثانی کے لئے پیش کیا تھا، جس کے جواب میں حضرت والا نے تحریر فرمایا تھا کہ:

''موبائل بند کرنے کے مسئلہ کو احتقان کے مسئلہ پر قیاس کرنے میں احقر کو بھی اشکال ہے، عام طور سے گھنٹی جلد ہی بند ہوجاتی ہے اور اس سے وہ اضطراب پیدا نہیں

(گزشتہ سے پیوستہ).وفی عمدة القاری باب إفشاء السلام: اختلف فی مشروعیة السلام علی الفاسق وعلی الصبی، وفی سلام الرجل علی المرأة وعکسه وقال النووی :ویستثنی من العموم بابتداء السلام من کان مشتغلا بأکل أو شرب أو جماع، أو کان فی الخلاء أو نائما أو ناعسا أو مصلیا أو مؤذنا ما دام ملتبسا بشیء مما ذکر، فلو لم تکن اللقمة فی فم الآکل مثلا شرع السلام علیه.

وفی فتح الباری باب إفشاء السلام ج: ۱۱ ص: ۱۹ (طبع دار المعرفة بیروت) وقال النووی یستثنی من العموم بابتداء السلام من کان مشتغلا بأکل أو شرب .... ما دام متلبسا بشیء مما ذکر فلو لم تکن اللقمة فی فم الآکل مثلا شرع السلام علیه.

وفی الأذکار النوویة للإمام النوویؒ: ومن ذلک إذا کان یأکل واللقمة فی فمه، فإن سلم علیه فی هذه الأحوال لم یستحق جوابا. أما إذا کان علی الأکل ولیست اللقمة فی فمه، فلا بأس بالسلام، ویجب الجواب.

وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۴۱۵ (طبع سعید) یکره علی عاجز عن الرد حقیقةً کآکل.

وفی الشامیة تحته (قوله: کآکل) ظاهره أن ذلک مخصوص بحال وضع اللقمة فی الفم والمضغ و أمّا قبل وبعد فلایکره لعدم العجز الخ.

ہوتا جو ھقن کی صورت میں ہوتا ہے۔‘‘

اُصولی درجہ میں بندہ کو آپ والا کی اس بات سے اتفاق ہے اور کوئی شبہ نہیں، اصل قابلِ اشتباہ صورت یہ ہے کہ اگر مسجد میں باجماعت نماز کی شکل میں کسی کا فون مسلسل بج رہا ہو اور گھنٹی کی آواز بھی بلند ہو اور اس سے بڑھ کر موسیقی پر مشتمل ہو اور عملِ قلیل کے ذریعہ سے فون بند کرنا ممکن نہ ہو، کیا اس صورت میں بھی عملِ کثیر کے ذریعہ سے فسادِ صلاۃ کا حکم نہیں کیا جائے گا؟

مذکورہ صورت میں تشویش کے زیادہ یا کم ہونے اور اضطراب کے زیادہ یا کم ہونے میں اختلاف کا امکان موجود ہے، لیکن بندہ کا اپنی اور دوسروں کی ذات کے حوالہ سے مشاہدہ اور پھر متواتر لوگوں کے ذریعہ سے معلومات ہونے پر جو اطمینان ہے، وہ اس پر ہے کہ تشویش واضطراب کم نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات میں امام صاحب کو اپنی قراءت کے تسلسل کے جاری رکھنے میں خلل واقع ہوتا ہے، نماز کسی طرح سے مکمل ہونے کے بعد سب لوگوں کو اس کی جستجو ہوتی ہے کہ کس کا فون بجتا رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اضطراب نماز کی حالت میں ہی پیدا ہوتا ہے، مگر دورانِ نماز دوسرے کو متنبہ کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس لئے نماز کے اختتام پر بعض اوقات معاملہ جستجو تک نہیں رہتا، بلکہ تنبیہ کی نوبت بھی آجاتی ہے۔

اس کے علاوہ جب امام کی قراءت کے دوران مسلسل بآوازِ بلند فون کی گھنٹی بجتی رہے گی تو فاستمعوا له کے حکم کی تعمیل میں بھی خلل واقع ہوتا ہے اور موسیقی کی آواز کی وجہ سے مسجد کی بے احترامی بھی لازم آتی ہے، اور بندہ کے خیال بلکہ مشاہدہ کے مطابق فون کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ فون کی گھنٹیاں بجنے میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے، بالفرض تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے ایک شخص کا موبائل متعدد مرتبہ بجایا متعدد حضرات کا فون بجا تو مجموعی اعتبار سے اس صورتِ حال کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تشویش واضطراب کو کم کہنا محلِ نظر ہوگا۔

اس سلسلہ میں مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب سے بھی مضمون کی ترتیب سے پہلے بندہ کی کچھ مراسلت ومکاتبت ہوئی تھی، آخری مرتبہ مولانا موصوف نے موسیقی والی صورت میں نماز

توڑ دینے کا اس لئے حکم فرمایا تھا کہ موسیقی خود بھی ناجائز ہے اور پھر مسجد اور وہ بھی باجماعت نماز کے وقت، ان دونوں کے احترام کے صریح منافی ہے اور یہ دونوں شعائر اللہ ہیں۔

لیکن عام گھنٹی کے بجنے کی صورت میں نماز نہ توڑنے کا حکم فرمایا تھا، کیونکہ اس صورت میں عادت ہونے کی وجہ سے تشویش اور شغلِ قلب کم ہوتا ہے۔ لیکن ایک تو اپنی ذات کی تشویش و شغلِ قلب کا معاملہ ہے اور دوسرے اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کی تشویش کا معاملہ ہے، بندہ کے خیال میں دوسروں کی تشویش زیادہ ہوتی ہے، اور جب اجتماعی تشویش ہو تو مجموعی طور پر اسے تشویشِ کبیر و شدید کہنا مناسب ہوگا نہ کہ صغیر یا ضعیف۔ جس کی نظیریں شریعت میں کم ہیں مثلاً صغیرہ و کبیرہ گناہ کا معاملہ۔

بندہ نے احتقان کے مسئلہ میں تشویش و اضطراب کے کم یا زیادہ ہونے پر مدار رکھا ہے، نہ کہ براہِ راست احتقان پر اور پھر مبحوث فیہ صورت بعض جہات سے احتقان سے بھی زیادہ شدید معلوم ہوتی ہے۔

ان اُمور کی اجمالی وضاحت بندہ نے اپنے مضمون میں بھی کی ہے، جس کی سرخ قلم سے نشاندہی کر کے دوبارہ مضمون ارسال ہے، ان معروضات پر اُمید ہے کہ دوبارہ غور فرما کر رائے عالی سے آگاہ فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

فقط والسلام

محمد رضوان

۱۶/۴/۱۴۲۷ھ

جواب:- موبائل فون کے بارے میں عرض یہ ہے کہ نماز شروع کرنے کے بعد اصل یہ ہے کہ اسکو قطع کرنا ناجائز ہے، فقہاءِ کرام کا بیان کردہ یہ اُصول معروف ہے کہ "و لا یجوز قطع الصلاة إلا لضرورة"[۱] لہٰذا جب تک ضرورت کا تحقق بدرجۂ یقین نہ ہو، قطعِ صلاۃ جائز نہیں، محض شک کا ہونا کافی نہیں۔ دوسری طرف جس حقن کی حالت میں قطع کی اجازت ہے وہ معمولی حقن نہیں، شدّتِ حقن ہے۔[۲]

---

(۱) وفی البحر الرائق باب إدراک الفریضة ج: ۲ ص: ۱۲۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) قطع الصلاة لا یجوز إلا لضرورة۔

(۲) وفی بذل المجهود کتاب الطهارة باب أیصلی الرجل وهو حاقنٌ ج: ۱ ص: ۵۸ (طبع معهد الخلیل) عن أبی هریرةؓ عن النبی ﷺ قال: لایحل لرجل یؤمن بالله والیوم الآخر أن یصلی وهو حقن حتی یتخفف (قوله: لا یصلی و هو حقن) أی حابس بوله أو غائطه

وفی الدر المختار (ج ۱ ص ۶۴۱ طبع سعید) وکره سدل ثوبه...وصلوته مع مدافعة الاخبثین وفی الشامیةفان شغل قطعهاان لم یخف فوت الوقت وان اتمها اثم لماروا ه أبو داؤد: لایحل لاحد یؤمن بالله والیوم الأخر ان یصلی وهو حاقن حتی یتخفف الخ

چنانچہ بعض روایات میں حاقن کے ساتھ حاقنٌ جدًّا وارد ہوا ہے۔[1] اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے غالباً مؤطا امام مالکؒ میں اس کی یہ تفسیر منقول ہے کہ "و هو ضامّ بين وركيه" یا "ضامّ بين فخذيه من شدة حقنه" لہٰذا یہ وہ حالت ہے جب انسان کی توجہ بالکل نماز کی طرف نہ رہے، نماز میں معمولی تشویش ہونا کافی نہیں۔

احادیث[2] میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد معروف ہے کہ میں نماز کے دوران بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں "مخافة أن تفتن أمه"[3] آپ ﷺ نے تخفیف بھی فرمائی اور پھر "جنبوا صبيانكم"[4] بھی فرمایا، لیکن کہیں منقول نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے ماں کو قطعِ صلاۃ کا حکم دیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ محض توجہ کا بٹ جانا مبیح قطع صلاۃ نہیں، بلکہ ضامّ بين وركيه جیسی کیفیت ہو جس سے نماز کی طرف توجہ بالکل مفقود ہو جائے، تب قطع کا حکم آتا ہے، اب اگر ایسی کوئی صورت موبائل میں پیدا ہو جائے تو وہاں بھی اس کو حقن پر قیاس کرنے کی گنجائش ہوگی، لیکن یہ ایک واقعے کا سوال ہے کہ ایسی حالت ہوئی یا نہیں؟ بندہ کو اس میں تامل ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ اگر سب لوگ یہ مسئلہ جانتے ہوں کہ عملِ قلیل سے فون بند کیا جا سکتا ہے اور

---

(۱) و فی مشکاۃ المصابیح مع شرحہ مرقاۃ المفاتیح ج: ۳ ص: ۱۰۴۶ (طبع) و ما روی مرفوعاً لا يحل لمؤمن أن يصلي وهو حاقن جدًا۔

وفی الاستذكار لأبی عمر المزی باب النهی عن الصلوة والإنسان يريد حاجته ج: ۲ ص:۲۹۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) عن ثوبانؓ عن النبی صلى الله عليه وسلم أنه قال: لا يحل لمؤمن أن يصلی وهو حاقن جدًا۔

وكذا فی شرح ابن ماجه لمغلطائی باب ما جاء فی النهی للحاقن أن يصلی ج:۱ ص: ۸۳۱ وشرح الزرقانی علی مؤطأ ج: ۳ ص: ۲۲۱۔

(۲) وفی الصحيح للبخاری ج: ۱ ص:۹۸ (طبع سعيد)عن عبد الله بن أبی قتادة، عن أبيه أبی قتادة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال :إنی لأقوم فیالصلاة أريد أن أطول فيها، فأسمع بكاء الصبی فأتجوز فی صلوتی كراهية أن أشق علی أمه۔

(۳ وفی الصحيح للبخاری ج: ۱ ص:۹۸ (طبع سعيدُ): عن أنس بن مالک يقول ما صليت وراء امام قط أخف صلاة ولا أتم من النبی صلی الله عليه وسلم وان كان ليسمع بكاء الصبی فيخفف مخافة أن تفتن أمه

(۴) راجع الی سنن ابن ماجة ۱ ص:۲۴۶ (طبع دار الفكر بيروت)ومجمع الزوائد ۲ص:۱۴۰ (طبع دار الفكر بيروت) وسنن الكبرىٰ للبيهقی رقم:۲۰۷۶۵ ج:۲ص:۳۴۰(طبع مجلس دائرة المعارف)

اس پر عمل کریں تو ایسی حالت پیدا نہیں ہوسکتی، اور اگر کہیں ہو تو وہ ایک شاذ سی صورت ہوگی، جس کے بارے میں عموم کے ساتھ فتویٰ دینے پر دل مطمئن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کو استثناء کے درجے میں ذکر کیا جاسکتا ہے، مگر اُنہی قیود کے ساتھ جن کا اُوپر ذکر ہوا، اور اس تصریح کے ساتھ یہ صورت نادر الوقوع ہے۔ **هذا ما ظهر لي والله سبحانه وتعالىٰ أعلم**

اس وقت ایک سفر کے لئے پا بہ رکاب ہوں، جلدی میں یہ سطور تحریر کی ہیں، دعاؤں کا محتاج بھی ہوں، اور آپ کے لئے دعاگو بھی۔ والسلام
۲۱/۴/۱۴۲۷ھ

مساجد میں موبائل جیمر زنصب کرنے کا مسئلہ

سوال:- محترم جناب مفتی تقی عثمانی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ایک انتہائی اہم مسئلے کے بارے میں آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے، آج کل مساجد میں موبائل فون کی گھنٹی بجنے سے نماز میں بہت خلل واقع ہو رہا ہے، خصوصاً باجماعت نماز کے دوران، بعض لوگوں نے موبائل فون کی گھنٹی کے لئے مختلف قسم کی موسیقی کی دُھنیں اور فحش گانے لگائے ہوتے ہیں، عوام الناس کو بہت زیادہ سمجھانے کے باوجود ایسے واقعات مشاہدے میں آرہے ہیں، جس سے نہ صرف نماز میں یکسوئی متاثر ہوتی ہے، بلکہ کبھی کبھار تو نوبت لڑائی، جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس صورتحال سے بچنے کے لئے کچھ مساجد نے موبائل فون جیمر نصب کئے ہیں، جن کے استعمال سے موبائل فون ''جیم'' یعنی بند ہوجاتے ہیں، اور نماز میں خلل واقع نہیں ہوتا، مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن مساجد میں جیمر لگے ہوتے ہیں، تکنیکی وجوہات کی بناء پر ان کے قرب و جوار کی آبادی میں موبائل فون سروس متاثر ہوتی ہے اور اگر کسی گھر میں اچانک کوئی بیمار پڑ جائے یا کوئی ڈاکہ زنی کی واردات ہوجائے اور اس کے گھر کے باشندے کوئی ایمرجنسی کال کرنا چاہیں تو موبائل فون

سروس مہیا نہ ہونے کی وجہ سے ان کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے

ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ حکومتِ پاکستان نے کسی بھی مقام خصوصاً مساجد میں جیمر لگانا ممنوع قرار دیا ہے، جس کے لئے عوام الناس کو بذریعہ اخبار آگاہ بھی کیا گیا ہے۔ (اخبار کے تراشے ساتھ منسلک ہیں۔)

ایک طرف نماز اور مسجد کے تقدس کو پامال ہونے سے بچانے کی فکر ہے، جبکہ دوسری طرف نہ صرف عوام الناس کو عمومی/ہنگامی صورتحال میں رابطے سے محروم رکھنے بلکہ حکومت کے قوانین کی صریحاً خلاف ورزی کرنے کا بھی اندیشہ ہے۔

مسئلہ کی حساسیت کے پیشِ نظر اگر آنجناب کے دستخط سے فتویٰ مِل سکے تو عین نوازش ہوگی۔

والسلام

عبداللہ

چکلالہ سکیم 3 راولپنڈی

روزنامہ جنگ 23 اگست 2011ء

حکومتِ پاکستان

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی

ہیڈکوارٹرز F-5/1، اسلام آباد www.pta.gov.pk

انتباہ!

برائے موبائل جیمرز کے فراہم کنندگان/نصب کنندگان/استعمال کنندگان

سیلولر موبائل فون کے سگنل کو جام کرنے کے آلات کی غیرقانونی/بلااجازت تنصیب اور استعمال کے باعث عوام کو تکلیف کا سامنا ہے۔ خاص طور پر مساجد میں اس کا غیرقانونی استعمال روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ اس ضمن میں عوام الناس اور اداروں کو مطلع/آگاہ کیا جاتا ہے کہ حکومتِ پاکستان نے قومی سلامتی کے پیشِ نظر ایک ''جیمر پالیسی'' کا اجراء کیا ہے، جس کے تحت افراد/ادارے صرف پی ٹی اے/

وزارت آئی ٹی اینڈ ٹیلی کام (ایم او آئی ٹی) اسلام آباد سے این او سی/اجازت ملنے کے بعد ہی جیمر ز لگا سکتے ہیں۔

لہٰذا تمام متعلقہ افراد/اداروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ!

☆ جام کرنے والے تمام آلات (جیمر ز) کی تنصیب/استعمال کے لئے پی ٹی اے/وزارتِ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے پیشگی کلیرنس لازمی ہے۔

☆ جیمر ز کے تمام فروخت کنندگان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ عام افراد/اداروں کو جیمر ز فروخت نہ کریں، ماسوائے ان کے جنہوں نے پی ٹی اے/وزارتِ انفارمیشن ٹیکنالوجی سے این او سی/اجازت نامہ حاصل کیا ہو۔

☆ تمام متعلقہ افراد کو ان کے اپنے مفاد میں تمام مقامات بشمول مساجد سے جیمر ز کو فوری طور پر ہٹانے/رکھنے کی تنبیہ کی جاتی ہے۔

ایسے غیر قانونی اور بلا اجازت نصب شدہ جیمر ز پائے جانے کی صورت میں خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن (ری۔آرگنائزیشن) ایکٹ 1996ء کے تحت اور وزارتِ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی جانب سے وقتاً فوقتاً جاری کردہ ہدایات اور راہنمائی کے مطابق سخت قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

ڈائریکٹر جنرل (انفورسمنٹ)

جواب:-

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جہاں jammer لگانا قانوناً منع ہو، وہاں تو jammer لگانا اس وجہ سے بھی جائز نہیں کہ جو قانون کسی معصیت پر مجبور نہ کرے، اس کی اطاعت ضروری ہے، البتہ جہاں قانوناً ممانعت نہ ہو، وہاں ایسے jammer لگا دینا جائز بلکہ مناسب ہے، جس کا دائرۂ اثر مسجد تک محدود رہے، لیکن اگر اس کا دائرۂ اثر مسجد سے باہر کے لوگوں تک پہنچتا ہو تو ایسا کرنا درست نہیں اور نمازیوں کو اس بات کی تربیت دینے کی ضرورت ہے کہ وہ مسجد میں آئیں تو موبائل بند کر کے آئیں، جس کے لئے امام صاحب نماز سے پہلے اگر یاد دہانی کرا دیا کریں تو اچھا ہے، نیز یہ مسئلہ بھی لوگوں کو بتانے کی ضرورت ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی میں کوئی music لگانا بالکل ناجائز ہے اور یہ کہ اگر نماز کے دوران گھنٹی بجے

تو ٹیلیفون کو ایک ہاتھ سے بند کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔

والله سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

۱۴۳۲/۹/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۵/۶)

الجواب صحیح

احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ

۱۴۳۲/۱۰/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عبد المنان

۱۴۳۲/۱۰/۵ھ
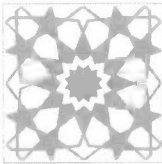
فصل فی الرؤیا والکشفِ والأدعیۃِ وزیارۃِ المقابرِ ومسائلِ التصوفِ وغیرِہا
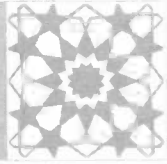
(خوابوں، کشف، مختلف دعاؤں، زیارتِ قبور اور دیگر مسائل تصوف کا بیان)

(۱)... کشفِ قبور کی شرعی حیثیت

(۲)... موت اور اعمال کے مراقبہ کا ثبوت

سوال:-(۱)... کیا کشف قبور ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے؟ اگر کوئی اسکا قائل ہو تو کیا اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے؟

(۲)... موت اور اپنے اعمال کا مراقبہ شرعاً ثابت ہے؟ اور اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟

جواب:- (۱)... کشف قبور کوئی امر محال نہیں [۱] بعض اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے یہ ملکہ دیدیا جاتا ہے [۲] اگر کوئی اس کا قائل ہو تو مضائقہ نہیں البتہ کشف قبور کے ذریعے کسی خلاف شریعت بات پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں۔ [۳] جو شخص کشف قبور کے ذریعے کسی ناجائز بات پر

(۱ تا ۳) اس موضوع پر تفصیل کے لیئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب شریعت وطریقت کا تلازم ص ۱۹۰ تا ۲۰۱ (طبع مکتبۃ الشیخ) اور ملفوظات حکیم الامت: ۱۷ص: ۲۹۷ وج: ۲۳ص: ۱۰۴ وج: ۳۴ص: ۱۸۵ (طبع ادارۃ تالیفات اشرفیہ ملتان) ملاحظہ فرمائیں

استدلال کرے وہ مرتکب بدعت ہے۔اوراس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم (ا) میں گذر چکا ہے۔[1]

(۲)...مراقبۂ موت[2] اور اپنے اعمال کا مراقبہ سنت سے ثابت ہے[3]۔ اس کا قائل ہر مسلمان کو ہونا چاہیے۔اوراس پر عمل کرنا موجب خیر و برکت ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتوی نمبر ۲۲/۲۱۹ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(ا) دیکھئے فتاویٰ عثمانی ج:اص:۴۱۰و۴۱۱

(۲)وفی سنن الترمذی ذکر الموت ج: ۴ ص: ۵۵۳ (۲۳۰۷) عن أبی هريرة، قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :أكثروا ذكر هاذم اللذات يعنى الموت۔

وکذا فی مصنف ابن أبی شیبة ج: ۷ ص: ۷۸ طبع مکتبة الرشد رياض۔ ومسند أحمد ۷۹۱۲ ج: ۲ ص: ۲۹۲ طبع موسسه قرطبه قاهرة۔ ومجمع الزوائد ج: ۱۱ ص: ۲۲۴ (طبع دار الفكر بيروت)

وفی شعب الإيمان للبيهقیؒ ج: ۱ ص: ۴۹۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) عن أنس، عن النبی صلى الله عليه وسلم "مر بقوم يضحكون ويمزحون فقال :أكثروا ذكر هاذم اللذات. وفيه بعد: عن أبی سعيد الخدری قال :دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم المسجد فرأى ناسا يكشرون فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم " :لو أكثرتم ذكر هاذم اللذات فإنه يشغلكم عن ما أرى وأكثروا ذكر هاذم اللذات الموت فإنه لم يأت على القبر يوم إلا وهو يقول :أنا بيت الوحدة والغربة أنا بيت التراب أنا بيت الدود۔ وفيه بعد:عن يوسف بن يوسف الباهلی يقول :سمعت عبد الله بن ثعلبة يقول " :تضحک ولعل كفنک قد خرج من عند القصار وأنت لا تدری۔

(۳) وفی مصنف ابن أبی شيبة ج: ۹ص: ۲۹۸ (طبع دار الفكر بيروت) عن عمر بن الخطاب، أنه قال فی خطبته :حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا وزنوا أنفسكم قبل أن توزنوا وتزينوا للعرض الأكبر ,يوم تعرضون لا تخفى منكم خافية۔

وفی سنن الترمذی ج: ۴ ص: ۵۴ (طبع دار الفكر بيروت) عن شداد بن أوس، عن النبی صلى الله عليه وسلم، قال :الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت، والعاجز من أتبع نفسه هواها وتمنى على الله هذا حديث حسن . ومعنى قوله :من دان نفسه يقول يحاسب نفسه فی الدنيا قبل أن يحاسب يوم القيامة "ويروى عن عمر بن الخطاب، قال " :حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا، وتزينوا للعرض الأكبر، وإنما يخف الحساب يوم القيامة على من حاسب نفسه فی الدنيا ويروى عن ميمون بن مهران، قال :لا يكون العبد تقيا حتى يحاسب نفسه كما يحاسب شريكه من أين مطعمه وملبسه

وفی شعب الإيمان للبيهقی ج: ۵ ص: ۴۵۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ۷۲۸۱، (جاری ہے)

یہ کہنا کہ ''تصوف کا دور ختم ہوگیا، اب اصلاح صرف تبلیغ سے ہوگی'' کیسا ہے؟

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرت جی! ہمارے ہاں رائیونڈ کے ایک بڑے عالم وقتاً فوقتاً یہ بات کرتے رہتے ہیں کہ اب تصوّف کا دور ختم ہوگیا، اب اصلاح صرف تبلیغ کے راستے سے ہی ممکن ہے، اسی سال رائیونڈ اجتماع میں بھی دو بڑے حضرات نے پورے مجمع کے سامنے یہ بیان فرمایا کہ آپ ﷺ کے زمانے میں جو بھی ایمان لاتا تو آپ ﷺ اُسے تسبیح ہاتھ میں نہ پکڑاتے، بلکہ لوگوں کو دعوت دینے کے لئے بھیج دیتے۔ لہٰذا اپنی اصلاح اور اسلام پھیلنے کا صرف یہی ذریعہ ہے۔

حضرت! اِن باتوں سے ذہن میں کچھ خلجان سا میرے اور میرے احباب کے دِلوں میں پیدا ہوگیا ہے، لہٰذا حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اس مسئلے کو واضح فرمائیں۔

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جو بات آپ نے لکھی ہے، وہ سراسر غلط ہے، جن صاحب نے بھی ایسا کہا ہے، غلط کہا ہے، تصوف اور تبلیغ میں نہ کوئی تعارض ہے، نہ یہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں، دونوں کام ضروری ہیں۔

والسلام

۱۴۲۸/۳/۲۹ھ

(گذشتہ سے پیوستہ) عن الحسن قال " :أيسر الناس حسابا يوم القيامة الذين حاسبوا أنفسهم فى الدنيا، فوقفوا عند هومهم وأعمالهم، فإن كان الذى هموا لهم مضوا، وإن كان عليهم أمسكوا قال :وإنما يثقل الأمر يوم القيامة على الذين جازفوافى الأمر فى الدنيا، أخذوها من غير محاسبة فوجدوا الله قد أحصى عليهم مثاقيل الذر، وقرأ (ما لهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة إلا أحصاها).

وفى فيض القدير للمناویؒ ج: ۱۲ ص: ۴۸۴ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ....ولا تصح جلوة إلا بعد خلوة (ويذكر ذنوبه) أى يستحضرها فى ذهنه (فيستغفر الله منها) أى يطلب الرضى وغفرها أى سترها فإن من حاسب نفسه فى الرخاء قبل حساب الشدة عاد أمره إلى الرضى والغبطة .... وقال الحسن :إنما يخف الحساب غدا على قوم حاسبوا أنفسهم فى الدنيا الخ.

استخارہ کا اصل شرعی تصوّر اور مسنون طریقہ

قابلِ احترام جناب جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب!

السلام علیکم! خدا آپ کو سلامت رکھے!

ان دنوں میں انتہائی تذبذب اور ذہنی اذیت کا شکار ہوں، جس میں مجھے آپ کی مدد اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ ان دنوں میں اپنے کنوارے بیٹے کی شادی کے لئے کسی موزوں رشتے کی تلاش میں ہوں۔ کافی رشتے دیکھنے کے بعد ایک لڑکی پسند آئی، بیوی کے اصرار پر دو جگہوں سے (یعنی دو مختلف نیک بندوں سے) استخارہ کروایا تو دونوں جگہوں سے جواب ملا کہ رشتہ موافق نہیں ہے، لہٰذا رشتہ طے نہ کیا، پھر ایک اور لڑکی مناسب لگی تو اُس کے بارے میں بھی پھر دو جگہوں سے استخارہ کروایا، پھر جواب ملا کہ یہ رشتہ موافق نہیں ہے، لہٰذا پھر یہ رشتہ بھی ترک کر دیا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ استخارہ کیا ہے؟ شادی کے لئے، رشتہ تلاش کرنے میں استخارہ کس حد تک حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے سمجھ لے اور یہ ادراک حاصل کر لے کہ مجوزہ جوڑے کی اِزدواجی زندگی کیسے گزرے گی اور شادی کامیاب ہوگی یا ناکام؟ کیا یہ علم "علم الغیب" نہیں ہے، کیا اللہ تعالیٰ جو صرف عالم الغیب ہے، اپنے نیک بندوں کو علم الغیب عطا کرتا ہے، خاص کر شادی بیاہ کے معاملے میں.....؟

اور کہیں یہ یقین اور اعتقاد شرک کے زمرہ میں تو نہیں آتا؟ کیا ہمیں ایسا کرنا چاہئے؟ کیا ہم کسی نیک عالم کے استخارہ کے نتیجہ پر عمل کر کے درست اقدام کر رہے ہیں؟ اور قرآن وسنت کی روشنی میں کیا یہ جائز و درست ہے؟ کیا یہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے؟

جواب کا منتظر ہوں۔

طالبِ دعا

عزیز احمد سابقہ ڈپٹی رجسٹرار

سپریم کورٹ، اسلام آباد۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

استخارے کا مطلب آج کل لوگ غلط سمجھنے لگے ہیں، یہ نہ کوئی علمِ غیب ہے، نہ اس میں کوئی حتمی جواب کہیں سے ملتا ہے، استخارہ کا مطلب صرف یہ دعا ہے کہ یااللہ! جوصورت ہمارے سامنے ہے، اگر وہ ہمارے لئے دنیا وآخرت کے لحاظ سے بہتر ہے تو اس کے اسباب مہیا فرمادیجئے، اور اگر وہ ہمارے لئے بہتر نہیں ہے تو اس کو ہم سے ہٹا کر وہ صورت پیدا فرمادیجئے جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔[۱]

یہ استخارہ صاحبِ معاملہ کو خود کرنا چاہئے، دوسروں سے کرانے کی ضرورت نہیں، اور اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو رکعتیں[۲] استخارے کی نیت سے نفل پڑھ کر استخارے کی وہ دعا کی جائے جو حدیث میں آئی ہے[۳] اور "بہشتی زیور"[۴] اور "اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم"[۵] میں بھی درج ہے۔

یہ عمل تین سے سات دن تک کرلیا جائے تو زیادہ بہتر ہے،[۶] اس کے بعد کسی کی طرف سے کوئی خواب آنا ضروری نہیں، اور آ بھی جائے تو وہ شرعی حجت نہیں ہے، البتہ اس کے بعد کرنا یہ

---

(۱) کیونکہ یہی دعا استخارہ کی "ماثور ومسنون دعاء" میں منقول ہے جو اگلے حاشیہ میں آرہی ہے۔

(۲و۳) وفی الصحیح للبخاریؒ باب الدعاءِ عند الاستخارة ج: ۵ ص: ۲۳۴۵ (طبع دار ابن کثیر یمامه بیروت) إذا هم أحدکم بالأمر، فلیرکع رکعتین، ثم یقول :اللهم إنی أستخیرک بعلمک وأستقدرک بقدرتک، وأسألک من فضلک العظیم، فإنک تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علام الغیوب، اللهم إن کنت تعلم أن هذا الأمر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة أمری -أو قال فی عاجل أمری وآجله -فاقدره لی وإن کنت تعلم أن هذا الأمر شر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة أمری -أو قال فی عاجل أمری وآجله -فاصرفه عنی واصرفنی عنه، واقدر لی الخیر حیث کان، ثم أرضنی به ویسمی حاجته۔

(۴) دوسرا حصہ "استخارہ کی نماز کا بیان" ۲/۳۳ ۔(ط۔ میر محمد کتب خانہ۔)

(۵) صلوٰۃ التسبیح اور دیگر نمازیں، ۳۲۲ (طبع الطاف سنز)

(۶) وفی الأذکار النوویة للنوویؒ ج:۱ ص: ۲۶۰ (طبع دار الفکر بیروت) و کنز العمال ج: ۷ ص: ۱۳۹۶ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) و روینا فی کتاب ابن السنی عن أنس رضی الله عنه قال :قال رسول الله صلی الله علیه وسلم:یا أنس، إذا هممت بأمر فاستخر ربک فیه سبع مرات، ثم انظر إلی الذی سبق إلی قلبک، فإن الخیر فیه۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

چاہئے کہ جس معاملے کے لئے استخارہ کیا گیا ہے، اس پر غور وفکر بھی کریں، مشورہ اور تحقیق بھی کریں، پھر جس طرف دل کا رُجحان ہوجائے، اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اس پر عمل کرلیں۔ ان شاء اللہ خیر ہوگی۔

والسلام

۱۴۲۷/۶/۲۱ھ

مزاراتِ اولیاء کی زیارت کا مفصل شرعی حکم

سوال:- (وضاحت از مرتب)

حضرت والا دامت برکاتہم نے بغداد کا سفر فرمایا اور ماہنامہ ''البلاغ'' میں اس سفر کی روئیداد تحریر فرمائی، یہ سفرنامہ حضرت والا دامت برکاتہم کی کتاب ''جہانِ دیدہ'' میں موجود ہے۔ اس سفرنامہ میں کئی بزرگانِ دین کے مزارات کی زیارت کا تذکرہ بھی تھا، ایک صاحب نے حضرت والا دامت برکاتہم کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں اُنہوں نے مزاراتِ اولیاء کی زیارت کو ''بدعت'' قرار دیا، حضرت والا دامت برکاتہم نے ان کے خط کے جواب میں درج ذیل تفصیلی فتوی تحریر فرمایا۔ ریکارڈ میں سائل کا خط موجود نہیں ہے، تاہم حضرت والا دامت برکاتہم کے جواب سے سائل کا مکمل مؤقف واضح ہوجاتا ہے، جس کا تفصیلی جائزہ لیکر حضرت والا دامت برکاتہم نے درج ذیل حکم تحریر فرمایا۔ (محمد زبیر)

جواب:-

گرامی قدر مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ کافی عرصہ قبل ملا تھا، لیکن میں اپنے اسفار اور اشغال کی وجہ سے اس کا

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی عمدة القاری باب ما جاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ ج:۱۱ ص:۳۸۶ (طبع ملتقی أهل الحدیث) یستحب تکرار الصلاة والدعاء لذلک، وقد ورد فی حدیث تکرار الاستخارة سبعا فی عمل الیوم واللیلة لابن السنی۔

وکذافی فتح الباری ج:۱۱ ص:۱۸۷ (طبع دار المعرفة بیروت) و نیل الأوطار للشوکانیؒ ج:۵ ص:۱۲۷ (طبع)۔

وفی الشامیة باب الوتر والنوافل مطلب فی رکعتی الاستخارة ج: ۲ ص: ۲۶ و ۲۷ (طبع سعید) وینبغی أن یکررها سبعا، لما روی ابن السنی یا أنس إذا هممت بأمر فاستخر ربک فیه سبع مرات، ثم انظر إلی الذی سبق إلی قلبک فإن الخیر فیه۔

جواب نہ دے سکا، معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے ''البلاغ'' کے مجموعی طرزِ عمل اور خاص طور پر احقر کے سفرنامہ بغداد سے متعلق جو شکایات فرمائی ہیں، وہ ''البلاغ'' اور اس ناچیز کے ساتھ آپ کے گہرے تعلق کی دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ البتہ اس سلسلے میں ایک اُصولی گزارش آپ سے کرنا چاہتا ہوں، اُمید ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

ہمارے حضرات علمائے دیوبند نے کتاب وسنت اور بزرگانِ دین کے قول وفعل کی روشنی میں جو مسلک اور طرزِ عمل اختیار فرمایا ہے، وہ نہایت معتدل اور افراط وتفریط سے مبرّا ہے، بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری کے سلسلہ میں بھی ہمارے حضرات کا طرزِ عمل نہایت معتدل رہا ہے، ایک طرف مزار پر جاکر صاحبِ مزار سے مرادیں مانگنا اور خلافِ سنت طریقہ پر مزار کی تعظیم وتکریم کا عمل ہے جو بدعت اور بعض اوقات شرک کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور دوسری طرف علامہ ابن عبدالوہاب رحمہم اللہ کے متبعین کا طریقہ ہے جو مزار کی نفسِ حاضری ہی کو بدعت اور قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں، حضرات علمائے دیوبند کا طریقۂ کار ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، علمائے دیوبند کی احتیاط کا عالم تو یہ ہے کہ اگرچہ مزارات پر ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن چونکہ شرعاً ایسا کرنا واجب نہیں، اس لئے وہ اس خیال سے عام طور پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے کہ عُبّادِ قبور کے ساتھ تشبیہ نہ ہوجائے، لیکن دوسری طرف مزاراتِ بزرگانِ دین سے ایسا اجتناب جس کی تلقین آپ نے فرمائی ہے، کبھی علمائے دیوبند کا شیوہ نہیں رہا، اور ایسا کرنا قرآن وسنت کی کسی دلیل کی رُو سے ممنوع یا مکروہ بھی نہیں۔ جہاں تک ''لا تشدّ الرحال'' والی حدیث[1] کا تعلق ہے، اس

---

(۱) وفی صحیح البخاری باب فضل الصلوة فی مسجد مکة الخ ج: ۱ ص: ۳۹۸ (طبع دار ابن کثیر یمامه بیروت) (۱۱۳۲) عن أبی هریرة رضی الله عنه، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال" :لا تشد الرحال إلا إلی ثلاثة مساجد :المسجد الحرام، ومسجد الرسول صلی الله علیه وسلم، ومسجد الأقصی.
وکذا فی صحیح مسلم باب لا تشد الرحال إلا إلی ثلاثة مساجد مسجدی هذا و مسجد الحرام و مسجد الأقصیٰ ج: ۲ ص: ۱۰۱۴ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت)

سے استدلال ہرگز درست نہیں۔[1] علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ردالمحتار[2] میں تفصیلی بحث کی ہے اور صحیح اس کو قرار دیا ہے کہ بزرگوں کے مزارات پر دور سے جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے متعدد صحیح احادیث سے استدلال کیا ہے اور اس کی تائید میں بڑے بڑے علماء وفقہاء کے اقوال پیش کئے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو ردالمحتار کی جلد اوّل کے آخری صفحات میں یہ بحث ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ احقر نے ''درسِ ترمذی'' میں ''لا تشدّ الرحال'' والی حدیث پر مفصل[3] بحث کی ہے، جس میں علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اور دوسرے علماء کے مؤقف کو واضح کیا ہے۔ جہاں تک کسی خاص مزار پر قبولیتِ دعا کا تعلق ہے، اس میں کوئی شرعی یا عقلی دلیل مانع نہیں، اور اس تصور کو شرک وبدعت قرار دینا حدود سے تجاوز ہے۔[4] اصل بات یہ ہے کہ جس مقام پر اللہ تعالیٰ کا کوئی محبوب بندہ مدفون ہو، اگر اللہ تعالیٰ اس مقام پر خصوصی رحمت نازل فرمائیں تو اس میں کوئی شرعی یا عقلی استحالہ نہیں، ہاں! چونکہ یہ بات کہ فلاں مزار پر دعا قبول ہوتی ہے، کسی نص سے ثابت نہیں ہوسکتی، اس لئے اس بات کو منصوص کی طرح یقینی سمجھنا بھی ناجائز اور حدود سے تجاوز ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص اپنا تجربہ بیان کرے کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے تو اس میں بھی کوئی بات خلافِ شرع نہیں۔ اور اس تجربہ کے صحیح ہونے کے احتمال پر اگر کوئی شخص وہاں جاکر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا اہتمام کرے تو کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس میں بھی مانع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ اسلام کے تقریباً ہر دور میں بڑے بڑے علماء وفقہاء جس کثرت کے ساتھ اس پر عمل کرتے رہے ہیں، وہ تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے،[5] ان سب حضرات کو مشرک اور مبتدع قرار دے کر صرف علامہ محمد بن

---

(۱) تفصیل کے لیئے اگلے تین صفحات کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) (۲/۲۴۲) باب صلاۃ الجنائز مطلب فی زیارۃ القبور (ط سعید)

(۳) درسِ ترمذی ۲/۱۱۲ (طبع مکتبۃ دارالعلوم کراچی) باب ما جاء فی أی المساجد أفضل، زیارتِ قبور کے لئے سفر کی شرعی حیثیت۔

(۴و۵) وفی فتح الباری باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ ج:۳ ص:۶۲ (طبع دارالمعرفۃ بیروت) أصل الزیارۃ فإنها من أفضل الأعمال وأجل القربات الموصلۃ إلی ذی الجلال و إن مشروعیتها محل إجماع بلانزاع والله الهادی إلی الصواب،

(باقی آئندہ صفحہ پر)

عبدالوہاب رحمہ اللہ اوران کے متبعین کوموحد سمجھنا انتہاء درجہ کے غلو کی بات ہے، چنانچہ میں نے اپنے مضمون میں متعدد فقہاء ومجتہدین کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، اوراگر ایسے اقوال جمع کئے جائیں تو پوری کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ یہ روایات اسرائیلیات سے بھری ہوئی ہیں، اوررطب ویابس سے بھری ہوئی ہیں اورمیں نے صحاحِ ستہ کی کوئی حدیث پیش نہیں کی۔

اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ صحاحِ ستہ میں منحصر نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جن بزرگان کے اقوال میں نے نقل کئے ہیں، ان کے صحاحِ ستہ میں مروی ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔اورتیسری بات یہ ہے کہ علمائے دین کے مزاروں پرجانے اوروہاں پراللہ تعالیٰ سے دعامانگنے کے واقعات اتنے بے شمار ہیں کہ ان سب کو بیک جنبشِ قلم من گھڑت قرار دینا ناممکن ہے۔

اورجب یہ بات ہے کہ حدودِشرعیہ میں رہ کر بزرگانِ دین اوراولیاء کرام کے مزار پر

(گذشتہ سے پیوستہ) قال بعض المحققين: قوله: إلا إلى ثلثة مساجد المستثنى منه محذوف فأما أن يقدر عاماً فيصير لا تشد الرحال إلى مكان فى أىّ أمر كان إلا إلى الثلاثة أو أخص من ذلك لا سبيل إلى الأوّل لإفضائه إلى سد بابِ السفر للتجارة و صلة الرحم و طلب العلم وغيرها فتعيّن الثانى والأولى أن يقدر ما هو أكثر مناسبة و هو لا تشد الرحال إلى مسجد للصلوة فيه إلا إلى الثلثة فيبطل بذلك قول من منع شد الرحال إلى زيارة القبر الشريف وغيره من قبور الصالحين والله أعلم. وقال السبكى الكبير: ليس فى الأرض بقعة لها فضل لذاتها حتى تشد الرحال إليها غير البلاد الثلثة و مرادى بالفضل ما شهد الشرع باعتباره و رتب عليه حكماً شرعياً وأما غيرها من البلاد فلا تشد إليها لذاتها بل لزيارة أو جهاد أو علم أو نحو ذلك من المندوبات أو المباحات قال: وقد التبس ذلك على بعضهم فزعم أن شد الرحال إلى الزيارة لمن فى غير الثلاثة داخل فى المنع و هو خطأ لأن الاستثناء إنما يكون من جنس المستثنى منه فمعنى الحديث لا تشد الرحال إلى مسجد من المساجد أو إلى مكان من الأمكنة لأجل ذلك المكان إلا إلى الثلثة المذكورة و شد الرحال إلى زيارة أو طلب علم ليس إلى المكان بل إلى من فى ذلك المكان.

وفى فيض البارى للكشميرىؒ ج۳ ص: ۴۶ (طبع) وأحسن الأجوبة عندى أن الحديث لم يرد فى مسألة القبور لما فى المسند لأحمد رحمه الله تعالىٰ: لا تشد الرحال إلى مسجد ليصلى فيه إلا إلىٰ ثلثة مساجد فدلّ على أن نهى شد الرحال يقتصر على المساجد فقط ولا تعلق له بمسألة زيارة القبور الخ

وفى مرقاة المفاتيح شرح المشكوٰة باب المساجد و مواضع الصلوة ج: ۳ ص: ۱۷۱ والحديث إنما ورد نهيا عن الشد لغير الثلاثة من المساجد لتماثلها، بل لا بُدّ إلا وفيها مسجد، فلا معنى للرحلة إلى مسجد آخر، وأما المشاهد فلا تساوى بل بركة زيارتها على قدر درجاتهم عند الله. الخ (باقی آئندہ صفحہ پر)

حاضری شرعاً جائز اور علمائے اہلِ حق کا معمول رہی ہے تو اس پر اعتراض یا اس سے اجتناب کی تلقین ایک طرف تو حدِ اعتدال سے خروج ہے، اور دوسری طرف اس سے ان مبتدعین کے اس پروپیگنڈے کی بھی تائید ہوتی ہے جو وہ اہلِ حق کے خلاف دیا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے یہاں اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی کوئی توقیر نہیں۔ اگر حدودِ شرعیہ میں رہتے ہوئے اپنے بزرگوں کے طریقہ پر عمل کیا جائے تو اس سے اس پروپیگنڈے کی بھی عملی تردید ہوسکتی ہے جن کے ذریعہ وہ ناواقف مسلمانوں کو اپنا شکار بناتے رہتے ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ احقر کے ان معروضات کو ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اس کے بعد ان شاء اللہ اس سلسلے میں ''البلاغ'' کی کوئی بات حدود سے متجاوز نظر نہیں آئے گی۔

دعاؤں میں یاد رکھنے کی درخواست ہے۔ والسلام

مزارات کی زیارت کے معتدل شرعی مؤقف پر اعتراضات کی حیثیت

محترمی ومکرمی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حق تعالیٰ شانہ سے قوی اُمید ہے کہ آپ عافیت کے ساتھ دینِ عالی کی محنت میں کوشاں

(گذشتہ سے پیوستہ) وکذا فی العرف الشذی للکشمیریؒ ج: ۱ ص: ۳۸۲

وفی شرح سنن ابن ماجه للسیوطی باب ما جاء فی التقلیس الخ ج: ۱ ص: ۱۰۲ (طبع قدیمی کتب خانه) واختلف فی شدها إلى قبور الصالحين وإلى المواضع الفاضلة فمحرم ومبيح .... والصحيح عند إمام الحرمين وغيره من الشافعية أنه لا يحرم وأجابوا عن الحديث بأجوبة منها أن المراد أن الفضيلة التامة فی شد الرحال إلى هذه المساجد بخلاف غيره فإنه جائز ومنها أن المراد أنه لا تشد الرحال إلى مسجد من المساجد للصلاة فيه غير هذه وأما قصد زيارة قبر صالح ونحوها فلا يدخل تحت النهی الخ

نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۸۰ تا ۸۲ (طبع مکتبۃ دار العلوم کراچی)

وفی العرف الشذی للشکمیریؒ ج: ۲ ص: ۴۴۲ و رفع اليدين عند الدعاء على القبر جائز كما فی جزء رفع اليدين للبخاری و صحيح مسلم أنه دخل جنّة البقيع و دعا رافعاً يديه.

وسائی ہوں گے۔حق تعالیٰ شانہ آپ کی مساعی جمیلہ اور جلیلہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔آمین۔

جناب کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں، سفرنامہ ''دُنیا میرے آگے'' کے مطالعہ سے مزید شوق اُبھرا تو ''جہانِ دیدہ'' کا مطالعہ شروع کیا، بہت ہی مفید اور علم میں اضافے کا باعث رہا، آج کل ملکِ شام کی سیر ہو رہی ہے، مگر چند دنوں سے ایک دُشواری لاحق ہے، میرے دوستوں میں بریلوی اور اہلِ حدیث بھی ہیں، اکثر بریلوی حضرات کو مزاروں اور زیارتوں پر جانے سے منع کیا جاتا ہے اس لئے کہ وہاں خرافات اور غیر شرعی اعمال کا ارتکاب کیا جاتا ہے، مگر وہ دلیل کے طور پر جناب کا سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' کو پیش کرتے ہیں کہ عالمِ اسلام کے سرمایہ اور مایہ ناز فقہی عالمِ دین، محقق اور دیوبندی جماعت کے عظیم رہنما تو کوئی زیارت اور مزار ایسا نہیں جہاں کی زیارت کو باعث اجر وسعادت نہ سمجھ رہے ہوں اور جس کے لئے حرمین شریفین کے قیام کے دوران پروگرام طے کیا جاتا ہے تو پھر عبداللہ شاہ غازیؒ اور علی ہجویریؒ اور ایسے ہی دیگر مزارات کی زیارت کے سفر کو کیوں منع کیا جاتا ہے؟ جبکہ غیر مقلد اسی کتاب کے حوالہ سے دیوبندی مکتبِ فکر کو بدعت کے احیاء کا سبب قرار دیتے ہیں، مؤدبانہ گزارش ہے کہ مندرجہ بالا اشکالات کی قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

والسلام

دعاؤں کا طالب

محمد سعید رانا اسلام آباد

جواب:- مکرم بندہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بزرگوں کے مزارات پر جاکر سلام عرض کرنا علماءِ دیوبند کے نزدیک ناجائز نہیں ہے،[1] البتہ وہاں شرک وبدعت کے اعمال ہیں جن سے سختی سے منع کیا جاتا ہے، کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کے لئے سفر کرنے میں بھی دو رائیں ہیں:

علامہ شامیؒ کا رجحان جواز کی طرف معلوم ہوتا ہے۔[2] لیکن میرا کوئی سفر بذاتِ خود کسی مزار کے لئے نہیں ہوا، بلکہ سفر کے مختلف مقاصد تھے، اور جب کسی شہر میں پہنچ گیا تو وہاں کے بزرگوں

(۱و۲) دیکھئے آئندہ صفحہ کا حاشیہ (۱)

کے مزارات پر حاضر ہوا، اور اسے سعادت سمجھا۔ یہی طریقہ علمائے دیوبند کا رہا ہے، جو افراط وتفریط دونوں کے درمیان معتدل راہ ہے، اور معتدل راہ پر افراط وتفریط کرنے والے اعتراض کیا ہی کرتے ہیں، اس کی وجہ سے راہِ اعتدال کو چھوڑنا درست نہیں۔[۱]

والسلام

۱۴۳۱/۱۰/۲۸ھ

اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں میں آنے کی دعا کا حکم

سوال:- عزت مآب جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اس مسئلہ کے کہ کیا اللہ جل شانہ کے حضور اس طرح دعا وفریاد کرنی جائز ہے؟

"اے اللہ! مجھے میرے ماں باپ، بہن بھائیوں کو اپنے اور اپنے پیارے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحمتوں میں ڈھانپ لیجئے"۔ اور قبروں میں بھی میرے والدین، بہنوں، بھائیوں، بچوں اور مجھے اپنے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں میں ڈھانپئے اور روزِ محشر بھی ہم پر اسی طرح احسانِ عظیم فرماتے ہوئے اپنے اور اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحمتوں میں ڈھانپئے گا اور کرم فرمایئے گا۔

والسلام

محمد امان اللہ نعمانی حنفی عفی اللہ عنہ

---

(۱)وفی رد المحتار باب صلاة الجنائز،مطلب فی زیارة القبور ج:۲ص:۲۴۲(طبع سعید)قلت:استفیدمنه ندب الزیارة وإن بعد محلها وهل تندب الرحلة لها کما اعتید من الرحلة إلی زیارة خلیل الرحمن وأهله وأولاده، وزیارة السید البدوی وغیره من الأکابر الکرام؟ لم أرمن صرح به من أئمتنا،ومنع منه بعض أئمة الشافعیة إلا لزیارته -صلی الله علیه وسلم -قیاسا علی منع الرحلة لغیر المساجد الثلاثة .ورده الغزالی بوضوح الفرق،فإن ما عدا تلک المساجد الثلاثة مستویة فی الفضل،فلا فائدة فی الرحلة إلیها .وأما الأولیاء فإنهم متفاوتون فی القرب من الله تعالی، ونفع الزائرین بحسب معارفهم وأسرارهم .قال ابن حجر فی فتاویه :ولا تترک لما یحصل عندها من منکرات ومفاسد ....لأن القربات لا تترک لمثل ذلک، بل علی الإنسان فعلها وإنکار البدع، بل وإزالتها إن أمکن .نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ اور اس کے حواشی۔

جواب:-

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اگر پیارے حبیب ﷺ کی رحمتوں سے دنیا میں آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل اور قبر وآخرت میں اس عمل کے انوار وبرکات مراد ہوں تو یہ دعا کرنا جائز ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم، والسلام

۱۲/۱/۱۴۲۷ھ

سفر کی مسنون دعا اور پی آئی اے میں بوقتِ پرواز پڑھی جانے والی دعا کی حیثیت اور اس میں اِعرابی غلطی کی اصلاح

سوال:-

محترم جناب مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہماری قومی ائیرلائن پی آئی اے میں روانگی کے وقت جو دعاء سفر مسافروں کے سامنے پڑھی جاتی ہے، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیّیۡنَ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡن وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ۔

---

(۱) وفی الدر (۳۹۷/۶) کتاب الحظر والإباحة فصل فی البیع (ط۔ سعید) و کرہ قولہ بحق رسلک وأنبیائک وأولیائک أو بحق البیت لأنہ لا حق للخلق علی الخالق الخ

وفی الشامیة : (قولہ لأنہ لا حق للخلق علی الخالق) قد یقال إنہ لا حق لہم وجوبا علی اللہ تعالی، لکن اللہ سبحانہ وتعالی جعل لہم حقا من فضلہ أو یراد بالحق الحرمة والعظمة، فیکون من باب الوسیلة .... وفی الیعقوبیة یحتمل أن یکون الحق مصدرا لا صفة مشبهة فالمعنی بحقیة رسلک فلا منع فلیتأمل اهـ أی المعنی بکونہم حقا لا بکونہم مستحقین۔

اب اس دعاء کے بارے میں ہمارے دوسوال ہیں:

(۱)... کیااس مذکورہ دعاء کے اعراب وغیرہ میں کوئی غلطی پائی جاتی ہے یانہیں؟ اگر پائی جاتی ہے تو معنی کی خرابی کے ساتھ وضاحت فرمادیں۔

(۲)... کیادعاءِ سفر کے اعتبار سے یہ دعاء مسنون ہے؟ اوراس کومزید برقرار رکھنا درست ہے یانہیں؟

براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ والسلام

محمد جواد

فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی/سابق مؤذن

۲۲/ربیع الاوّل ۱۴۳۲ھ۔۲۶/فروری ۲۰۱۱ء

جواب:-

مکرمی جناب مولانا محمد جواد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

پی آئی اے کے طیاروں میں جو دعا پڑھی جاتی ہے،اس میں "خاتَم النبیین" پڑھتے ہوئے میم پر زبر پڑھا جاتا ہے جو غلط ہے،میم پر زیر پڑھنا چاہئے اور مسنون دعاءِ سفر یہ ہے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَ إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔[1]

ترجمہ: اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے،اللہ سب سے بڑا ہے، پاک ہے وہ ذات جس نے یہ سواری ہمارے لئے مسخر کردی، اورہم اس کو قابو میں لانے والے نہ تھے،اورہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اورحضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی ثابت ہے:

(۱) صحيح مسلم (۱/۴۳۴) (طبع سعيد) كتاب الحج باب استحباب الذكر إذا ركب دابة و كذا فى المشكوة ۲۱۳، كتاب الدعوات باب الدعوات فى الأوقات۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُکَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى، وَ مِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا، وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِکَ مِنْ وَعْثَآءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ(صحیح مسلم ، کتاب الحج حدیث: ۳۲۷۵)[1]

ترجمہ: اے اللہ! ہم آپ سے اپنے اس سفر میں نیکی اورتقوی کی توفیق مانگتے ہیں اورایسے عمل کی جس سے آپ راضی ہوں۔ اے اللہ!ہمارے لئے اس سفرکو آسان کردیجئے اوراس کی دُوری کوہمارے لئے لپیٹ دیجئے، اے اللہ! آپ ہی ہمارے سفرمیں ہمارے ساتھی ہیں،اورآپ ہی ہمارے پیچھے ہمارے گھروالوں کے محافظ ہیں۔اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتاہوں سفرکی مشقت سے،اورغم میں ڈالنے والے منظرسے،اوربری حالت میں مال اورگھروالوں کے پاس واپس لوٹنے سے۔

والسلام

۱۱/۴/۱۴۳۲ھ

(فتوی نمبر۳۲/۱۳۴۴)

(۱)...تبلیغی جماعت کاغیرمسلموں کودعوتِ اسلام نہ دینے کاحکم

(۲)... یورپی ممالک میں دعوت وتبلیغ کی نیت سے جانے کے باوجود تبلیغی جماعت کاحصولِ ویزہ کی خاطروزٹ اورسیاحت کاارادہ ظاہرکرنا

سوال:- شیخ الاسلام حضرت اقدس حضرت مولانامفتی محمدتقی عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

دورِحاضرمیں آپ حضرات کے علم میں ہے کہ دعوت وتبلیغ کی نسبت سے کام ہورہاہے،

(۱)صحیح مسلم (۱/۴۳۴) کتاب الحج باب استحباب الذکر إذا رکب دابة (طبع سعید)و کذا فی المشکوٰة ص: ۲۱۳ کتاب الدعوات باب الدعوات فی الأوقات۔

اندرونِ ملک و بیرونِ ملک جماعتوں کی شکل میں رائیونڈ مدرسہ (پاکستان) اور بستی نظام الدین (انڈیا) سے اکابر کے مشورہ سے ہر سال غیر مسلم ممالک کو سال و سات ماہ کم و بیش اوقات کے لئے احباب تشریف لے جاتے ہیں، صورتِ مذکورہ میں:

(۱)... جماعتوں کی رخصتی کے وقت تبلیغی جماعت کے ذمہ دار حضرات ہدایات فرماتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک میں پہنچ کر وہاں پر مقیم، دین سے دور بگڑے ہوئے مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش و فکر کی جائے۔ اُن سے ملاقاتیں کر کے اُنہیں صوم و صلوٰۃ اور مکمل دین کا پابند اور دعوت والے عظیم کام کے لئے تیار کیا جاوے۔ غیر مسلموں کو دینِ اسلام کی دعوت دینے سے روکا جاتا ہے، خدشہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غیر مسلموں کے اسلام میں داخل ہونے پر اُن کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے وہ دوبارہ مرتد ہو جاتے ہیں، کیا خدشۂ مذکورہ درست ہے؟

(۲)... دعوت و تبلیغ میں لگے ہوئے احباب کا ہدف یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کے سارے اُمتی جہنم سے بچ کر جنت میں جانے والے بن جائیں۔ صحیح راہنمائی نہ ہونے اور غافل مسلمانوں کی اصلاح میں لگنے کی وجہ سے غیر مسلموں کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت نہ دینا اور تاخیر کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۳)... ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اگر غیر مسلموں کو اُن کے ممالک میں داخلہ بند کر دیا جاوے گا، کیا اس اندیشہ سے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت نہ دینا شرعاً جائز ہے؟

(۴)... یورپی ممالک و دنیا کے دیگر غیر مسلم ممالک جانے کے لئے ویزے کی ضرورت پڑتی ہے، جماعت والوں سے جس ملک کے لئے اُنہیں بھیجا جاتا ہے، سفارت خانے والے اُس ملک کو جانے کی وجہ دریافت کرتے ہیں، جس پر جماعت کے ساتھی بڑوں کے مشورہ سے یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم آپ کے ملک سیر و سیاحت کے لئے جا رہے ہیں، حالانکہ اُن کا مقصد وہاں پر مقیم غافل مسلمانوں سے ملنا ہوتا ہے، اپنے کام اور غرض کے خلاف سفارت خانے والوں کو جواب دینا شرعاً کیسا ہے؟

حضرت والا شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی عظیم رائے ضرور شامل فرماویں۔آپ حضرات کا عظیم احسان ہوگا۔

والسلام

محمد ابراہیم کوہاٹ

جواب:-

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۱)... غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینے سے کلی طور پر روکنا یا رُکنے کا اہتمام کرنا بندہ کی رائے میں درست نہیں ہے، البتہ ہر جماعت کا اپنا دائرۂ کار ہوتا ہے، تبلیغی جماعت نے اپنا دائرہ مسلمانوں کی حد تک رکھا ہے، اس حد تک کچھ حرج نہیں ہے، لیکن یہ عذر صحیح نہیں ہے کہ کوئی مسلمان ہوگا تو اس کی راہنمائی صحیح نہ ہوسکے گی، کیونکہ تنہا کفر سے بچ جانا ہی بڑی نعمت ہے، چاہے عمل میں کوتاہی رہے۔

(۲)... اس میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ غیر مسلم ممالک میں گھومنا تو پڑتا ہی ہے اور گھومنا Tourism کی وسیع تعریف میں شامل ہوسکتا ہے۔

والسلام

۱۴۲۹/۳/۵ھ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے وعظ میں بیان کردہ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کی ایک حکایت پر اشکال اور اس کا جواب

سوال:-

مکرمی ومخدومی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۱)... بندۂ جناب مشفقی ومربی مولانا محمد شفیعؒ کے ہاتھ پر بیعت ہے۔

(۲)... دورانِ مطالعہ بندہ کی نظر سے جناب حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کی ایک

ایسی تحریر گزری ہے جو سخت خلجان کا باعث بنی ہوئی ہے، مذکورہ تحریر کی نقل منسلکِ خدمت ہے۔

(۳)... زیرِ غور تحریر سے بدعات کے بارے میں یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے یہ دین میں کوئی ناقابلِ التفات چیز ہے، حالانکہ ہم تک یہ واضح حکم پہنچا ہے کہ:

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

جس کی وضاحت کی اشد ضرورت ہے، تاکہ خلجان رفع ہو۔

(۴)... اسی طرح زیرِ غور تحریر میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ:

''بدعتی اس لئے فرمایا کہ ان سے بعض باتیں بصورتِ بدعت صادر ہوتی تھیں، اگرچہ واقع میں وہ بدعت نہ تھیں۔

برائے مہربانی! اس صورت حال کی کسی مثال سے وضاحت فرمادیں، جو صورۃً بدعت ہو، لیکن اصلاً بدعت نہ ہو۔ بصورتِ دیگر مذکورہ الفاظ میں اہلِ بدعت حضرات کو اپنے عقائد کی تائید میں وافر مواد موجود ہے۔ ازراہِ کرام واضح مثال سے آگاہ فرما کر بندہ کی راہنمائی فرمائیں۔ (جزاکم اللہ جزاء الخیر)

(۵)... اس ضمن میں سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اگر مذکورہ تحریر کا بنظرِ دقیق مطالعہ کیا جائے تو بات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تک پہنچ جاتی ہے، جس کے تصور کے بھی ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

ازراہِ کرم بندہ کی تسلی و تشفی کے لئے اپنے قیمتی وقت سے کچھ اوقات نکال کر مندرجہ بالا نکات کی مناسب وضاحت و تطبیق سے آگاہ فرمائیں، تاکہ خلجان و وسواس رفع ہوں۔ فقط والسلام

احقر العباد
محمد عاقل

''وعظ النور'' کا متعلقہ حصہ

''حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید حج کو گئے، انہوں نے

فرمایا کہ جب مدینہ جاؤ تو روضۂ اقدس ﷺ پر میرا بھی سلام عرض کرنا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا، وہاں سے ارشاد ہوا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہنا۔ بدعتی اس لئے فرمایا کہ اُن سے بعض باتیں بصورتِ بدعت صادر ہوتی تھیں، اگرچہ واقع میں وہ بدعت نہ تھی، یعنی کسی معذوری کی وجہ سے اُن سے بعض افعال ظاہر سنت کے خلاف صادر ہوجاتے تھے تو یہ جب واپس آئے تو حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب نے پوچھا کہ ہمارا سلام بھی کہا تھا، انہوں نے عرض کیا کہ میں نے عرض کردیا تھا۔ حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے پیر سے ہمارا سلام کہہ دینا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہی لفظ کہو جو وہاں سے ارشاد ہوا ہے، مرید نے عرض کیا کہ حضرت! جب آپ کو وہ لفظ معلوم ہے تو پھر میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ نیز میں وہ لفظ کیسے عرض کروں؟ آپ نے فرمایا کہ گو معلوم ہے، مگر سننے میں اور ہی مزا ہے، اورمیاں تم خود تو نہیں کہتے، وہ تو حضور ﷺ کا ارشاد ہے تو گویا وہ حضور ﷺ ہی کی زبان سے ادا ہوگا۔ آخرانہوں نے وہی لفظ ادا کردیا۔ بس ان کی یہ حالت ہوئی کہ وجد میں کھڑے ہوگئے اور بیساختہ یہ شعر زبان پر جاری تھا کہ ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعلِ شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا، مگر میں خوش ہوں، تیرے لبِ لعل کے لئے جوابِ تلخ ہی اچھا ہے۔)

وجد کرتے تھے اور اس شعر کو پڑھتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ محبت وہ چیز ہے جس کے آثار کی نسبت میں نے پہلے کہا کہ ؎

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ　　ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اسی لئے اگر حضور ﷺ ناخوش بھی ہوتے تھے تو صحابۂ کرامؓ اس کا بھی ذکر لذت لے کر فرماتے تھے"

جواب:-

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرتؒ کی بیان کردہ حکایت کا حاصل یہ ہے کہ شاہ ابوالمعالیؒ کسی عذر کی بناء پر بعض ایسے اُمور انجام دیتے تھے جو حقیقۃً بدعت نہ تھے، مگر صورۃً کوئی شخص انہیں بدعت سمجھ سکتا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو پیار میں ''بدعتی پیر'' فرمایا گیا۔

اب اس تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اُمور کیا تھے؟ بعض اوقات محبت کے غلبۂ حال میں ایسے اُمور صادر ہوجاتے ہیں جو خلافِ سنت ہوتے ہیں، مگر ان کا فاعل غلبۂ حال کی وجہ سے معذور ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص غلبۂ حال کی حالت میں ''یارسول اللہ!'' کہہ کر پکارے، اس کا عقیدہ حاضر و ناظر کا نہ ہو تو یہ صورۃً بدعت ہے، حقیقۃً غلبۂ حال کی وجہ سے معذور ہے۔ والسلام

۱۴۲۱/۳/۹ھ

کلیاتِ امدادیہ، قصائدِ قاسمی، نشر الطیب اور امداد المشتاق میں مذکور چند اشعار پر اشکال اور اس کا جواب

سوال:- بخدمت جناب عزت مآب استاذی المکرّم شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا والا نامہ موصول ہوا، کئی دن تک اس کی برکات وفوائد محسوس کی، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم پر تادیر قائم دائم رکھے۔

اُستاذ محترم! دارالعلوم میں رہ کر ہم نے بہت کچھ سیکھا، خصوصاً حقوق العباد کے بارے

میں، جس کی وجہ سے اس عاجز کو اپنی چند کوتاہیاں بھی نمایاں ہوئیں، پھر اس کی اصلاح کی فکر دامن گیر رہی، اللہ اصلاح فرمائے۔

دوسری جو اہم بات میرے خیال کے مطابق سب سے زیادہ جو میرے لئے مفید رہی وہ راہِ اعتدال کا درس ہے، اب حال یہ ہے کہ ہر موقع پر خواہ جذباتی موقع ہو یا کوئی سنجیدہ موقع ہو، الحمدللہ! اعتدال ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں، آپ سے دعا کی درخواست ہے، پھر ہر گھڑی آپ کے لئے دعا گو رہتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی برکت سے ہے۔

اُستاذِ محترم! ہمارے تحصیل حضرو کا حال یہ ہے کہ یہاں متعصب غیر مقلدین اور متعصب بریلوی سکونت پذیر ہیں اور اپنا کام کرتے جارہے ہیں، خصوصاً دیوبند "کثر اللّٰہ سوادھم" کے اکابرین پر وہی "حسام الحرمین" والے فتوے لگائے جارہے ہیں، اب حال ہی میں غیر مقلدین کے رسالہ میں اکابرینِ دیوبند کے خلاف فتوؤں کی بارش کی گئی ہے اور چند اشعار شائع کئے ہیں اور پھر اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ دیوبندی غیر اللہ کو مشکل کشا سمجھتے ہیں، العیاذ باللہ! دوستوں سے مشورہ کے بعد آپ سے رجوع کا فیصلہ ہوا، آپ کی مصروفیات کا علم ہے، لیکن از راہِ مشورہ عرض کرتا ہوں، اللہ سوءِ ادبی سے بچائے کہ ان جیسے حالات میں ہم (خدام) کے لئے کیا مشورہ ہوگا، ہم ان حالات میں کیسا رویہ رکھیں؟

دوسری بات ان اشعار کی مناسب تاویل جو آپ کو اچھی لگی، کون سی ہوگی؟ وقت ضائع کرنے کے اُوپر معذرت خواہ ہوں، وہ اشعار درج ذیل ہیں ؎

یا رسولِ کبریا فریاد ہے یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
آپ کی امداد ہو میرا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم حال ابتر ہوا فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

(کلیاتِ امدادیہ ص: ۹۰ بحوالہ الحدیث ص: ۴۸)

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا
بنے گا کون ہمارا تیرے سوا غمخوار
(قصائدِ قاسمی ص: ۸ بحوالہ: ماہنامہ الحدیث ص: ۴۳)
رجاء وخوف خون کی موجوں میں ہے اُمید کی ناؤ
جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہو وے بیڑا پار
(قصائدِ قاسمی ص: ۹)

اسی طرح **نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب** اور **إمداد المشتاق** نامی کتابوں کے چند اشعار ہیں، یقیناً کتبِ دیوبندیہ "کثر اللہ جماعتهم" میں دربارۂ استمدادِ غیر اللہ، اس کا خلاف مصرح ہے، لیکن ان اشعار کی کوئی مناسب تاویل معلوم نہیں ہے، جس کی وجہ سے اربابِ فتاوی کے فتاوی جات سے بظاہر موافقت ہو جائے۔

اُستاذِ محترم! آپ کی مصروفیت تو زیادہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں، تاکہ ایسے ماحول میں آپ کے اس خادم کو آپ کی طرف سے کچھ راہنمائی ہو، یقیناً آپ کی باتیں حرزِ جان سمجھتا ہوں، اور آپ سے حد درجہ محبت ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر دیں، مزید وقت آپ کا نہیں لیتا، بصد ادب عرض ہے کہ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

اگر کوئی نامناسب بات لکھ چکا ہوں تو ہزار بار معافی کا خواستگار۔ والسلام

آپ کا ادنیٰ خادم وشاگرد
محمد ادریس قاسمی بن ہدایت الرحمٰن
تحصیل حضرو ضلع اٹک بہبودی

---

(۱) ج:۱ ص ۵۵ (طبع مکتبہ معارف القرآن)

جواب:- برادرِ عزیز وگرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محبت نامہ باعثِ مسرت ہوا، درحقیقت شاعری میں شاعرانہ تخیلات اورمجاز و استعارہ کا استعمال معروف ہے، شاعر بسا اوقات دریاؤں، پہاڑوں اور عمارتوں کو بھی خطاب کرتا ہے، اُن سے باتیں کرتا ہے، اور اُن سے مطالبات بھی کرتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عقیدے کی رُو سے انہیں زندہ یا مشکل کشا سمجھتا ہے، بلکہ یہ ایک تخیل ہوتا ہے، لہٰذا جس شخص کا یہ عقیدہ معروف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مرادیں مانگنا، دعائیں کرنا جائز نہیں، اگر اُس کے اشعار میں ایسی کوئی بات آجائے تو وہ یقیناً مجاز و استعارہ پر محمول کی جائے گی۔ اور جو اشعار آپ نے لکھے ہیں، اُن میں درحقیقت آنحضرت ﷺ کی سنت پر عمل کی خواہش اور آپ ﷺ کی شفاعت کا حصول مراد ہے کہ وہی چیز بندہ کے لئے ذریعۂ نجات ہوسکتی ہے، اس موضوع پر بندہ کا ایک قدرے مفصل فتویٰ ''فتاویٰ عثمانی جلد اوّل''[1] میں بھی شائع ہوا ہے، ضرورت ہو تو اس کا بھی مطالعہ فرمالیں۔

والسلام

۱۳/۳/۱۴۲۷ھ

(۱)... ذکرِ جہری کا شرعی حکم اور ثبوت

(۲)... اجتماعی طور پر جہراً تلاوتِ قرآن کا حکم

(۳)... ختمِ خواجگان کی شرعی حیثیت اور حکم

سوال:-إلی شیخنا و أستاذنا و مولانا العلامة محمد تقی العثمانی نفع الله تعالیٰ به خلقه۔

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته!

الرجاء أن تکونوا بکمال الصحة والعافیة، و نحن هنا فی بلدة نرتهامتن

(۱) ص: ۵۵و۵۶و۵۸و۵۹ (طبع: مکتبہ دارالعلوم کراچی)

بخیر۔ والحمدلله على ذلك۔

أرى من المناسب أن أعرِّف نفسى عند سماحتكم قبل الدخول فى مقصدى۔ أنا عبد حقير من عباد الله تعالىٰ، ولدت فى بنغلاديش و نشأت فى بريطانية۔ أكرمنى الله سبحانه و تعالىٰ بأن هدانى بتراجم كتب شيخ مشايخنا مولانا الإمام محمد زكريا رحمه الله باللغة الإنكليزية و بحركة الجماعة التبليغية۔ ثم بعد ذلك لم ينته شآبيب فضله وكرمه علَى ـ وفقنى الله تعالىٰ للرحلة إلى طلب علم دينه من العلماء والمشايخ ببلاد بنغلاديش و بدار علومكم فى كراتشى (عام 2000م إلى 2003م)

الآن أعمل فى حكومية محلّية و أجتهد مهما أتاحت لى الفرصة فى مجال الدعوة ـ فلله سبحانه والحمد والمنة۔

منذ سنتين بدأت أحضر مجلس فضيلة الشيخ مولانا محمد سليم دهورات (والشيخ مرشد جماعتنا الدعوية فى بلدتنا)۔ و قد وفقنى الله تعالىٰ للشركة فى بعض الأعمال الإصلاحية التى تنعقد عند الشيخ بهيئة إجتماعية و لكن أجد فى نفسى إشكالات (علمية) تضطرّنى فرأيت من المناسب أن أكتب إلى سماحتكم ليشرح الله سبحانه صدرى بعلومكم و فيوضكم الروحانية۔ والإشكالات هى التالى:

ا ۔ الشيخ ـ حفظه الله ـ ومن يجتمع حوله من السالكين يجلسون مجتمعا يذكرون الله تعالىٰ بشىء من الجهر ـ أظنّ فى بعض الأفراد أنهم يجهرون بذكرهم جهرا مفرطا حسبما قرأت فى كتب سادتنا الحنفية رحمهم الله مثل العلامة عبد الحى اللكنوى و شيخنا الحبيب العلامة سرفراز خان صفدر۔ أ ليس هذا الإجتماع و هذا الجهر ببدعة؟ هل كان شيخ مشايخنا مولانا الإمام محمد زكريا رحمه الله يوصى مريديه بالذكر بهذه الهيئة؟ و قد رأيت مثل هذا عند ما

حضرت مجلس الشيخ الكبير مولانا يوسف متالا فی دار العلوم (برى).

۲۔ من عادة السالكين عند الشيخ أنهم يتلون القرآن الكريم مجتمعا فی المسجد أو فی غرفة من الغرفات۔ أليست التلاوة جهرا حيث لا يمكن الإستماع لمن يصل إليه صوت التالى للقرآن من المحظورات (كما صرح به فی كتب الفقه الحنفى وغيرها) ؟

۳۔ و من معمولات الشيخ عمل إجتماعى يسمّى " ختم خواجكان" سمعت أن هذا العمل كان من أعمال شيخ مشايخنا مولانا الإمام محمد زكريا رحمه الله۔ لو كان كذلک كيف يجاب لمن يدّعى أن هذا العمل وما شابهه من أعمال بعض مشايخنا الكرام من المنكرات والمبتدعات فی الدين ؟ أليس لنا غنية و كفية فی ما سنّ لنا سيّدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم؟

أمر آخر فی غير موضوع ما سبق:

أرسل إلى سماحتكم ترجمة إنكليزية لمقالتكم المفيدة حول حياة الشيخ المحدّث عبدالفتاح أبو غده رحمه الله تعالى۔قد نقلها إلى الإنكليزية صديقان لى وقد منّ الله علىّ بأن وفّقنى لتعليقات تلميذية فی نهاية المقالة لا أدرى هل تكون مفيدة للقرّاء أم لا۔ لو أكرمتم علينا بالنظر فی ترجمة مقالتكم و مشورتكم و إذنكم فی طبعها و نشرها كی ينتفع بها المسلمون فی هذه البلاد البعيدة عن الأكابر من العلماء والمشايخ۔

أكتفى بهذه الكليمات خشية تضييع وقتكم المعمور بالخير والإفادة وبالتماس الدعاء من سماحتكم لى ولوالدىّ ولأهلى و مشايخنا الكرام۔

وأنا عبدكم و أحقر تلاميذكم
بدر الإسلام بن مصدّر على

جواب:-

إلى الأخ الكريم الشيخ بدر الإسلام حفظه الله تعالىٰ

السلام عليكم و رحمة الله وبركاته!

فأعتذر إليكم للتأخير في الجواب على رسالتكم الكريمة، ولم يكن ذلك إلا لازدحام أشغالي و تتابع أسفاري، فأرجو أن تعذروني في ذلك.

و لقد سرّني ما ذكرتم من أشغالكم العلمية والدعوية، تقبل الله منكم و وفقكم لما فيه رضاه. و إليكم الجواب عن أسئتكم:

١ ـ الذكر بالجهر جائز عند الفقهاء و ثابت بالسنة ما لم يكن جهرا مفرطا لحديث "اربعوا على أنفسكم" غير أن الذكر الخفيّ أفضل منه، ولكن اختار بعض المشايخ الذكر بالجهر، لا سيما للمبتدئين لكونه أوقع في النفس، و أدعى للخشوع[1]. فلو فعله أحد علاجا،[2] وليس باعتقاد أفضليته فلا بأس بذلك. و هذا هو

---

(١) وفي الشامية: أقول :اضطرب كلام البزازية فنقل أولا عن فتاوى القاضي أنه حرام لما صح عن ابن مسعود أنه أخرج جماعة من المسجد يهللون ويصلون على النبي -صلى الله عليه وسلم -جهرا وقال لهم "ما أراكم إلا مبتدعين "ثم قال البزازي وما روي في الصحيح أنه -عليه الصلاة والسلام -قال لرافعي أصواتهم بالتكبير اربعوا على أنفسكم إنكم لن تدعوا أصم ولا غائبا إنكم تدعون سميعا بصيرا قريبا إنه معكم الحديث -يحتمل أنه لم يكن للرفع مصلحة فقد روي أنه كان في غزاة ولعل رفع الصوت يجر بلاء والحرب خدعة ولهذا نهي عن الجرس في المغازي، وأما رفع الصوت بالذكر فجائز كما في الأذان والخطبة والجمعة والحج اهـ وقد حرر المسألة في الخيرية وحمل ما في فتاوى القاضي على الجهر المضر وقال :إن هناك أحاديث اقتضت طلب الجهر، وأحاديث طلب الإسرار والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال، فالإسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذى المصلين أو النيام والجهر أفضل حيث خلا مما ذكر، لأنه أكثر عملا ولتعدى فائدته إلى السامعين، ويوقظ قلب الذاكر فيجمع همه إلى الفكر، ويصرف سمعه إليه، ويطرد النوم ويزيد النشاط اهـ ملخصا. (رد المحتار كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع ٣٩٨/٦ (ط. سعيد)

وفيه أيضاً: فقال بعض أهل العلم إن الجهر أفضل .... وفي حاشية الحموي عن الإمام الشعراني: أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قارئ إلخ (رد المحتار مطلب في رفع الصوت بالذكر (٦٦٠/١) (ط. سعيد)

(٢) وفي البزازية على هامش الهندية الحادي عشر في القراءة ٤٢/٤ (ط. رشيديه) واعظ يدعو كل أسبوع بدعاء مسنون جهراً لتعليم القوم و يخافته القوم، إذا تعلم القوم خافت هو أيضاً. (باقی آئندہ صفحہ پر)

المعمول به فی طریق بعض مشایخنا الذین ذکرتم أسماء هم۔

۲۔ إن کان جمیع الحاضرین یتلون القرآن جهرا، فلا بأس بذلک، أمّا ما ذکره الفقهاء من عدم الجهر عند الآخرین فمحمله الحاضرون المشتغلون بغیر قراء ة القرآن الکریم۔[۱]

۳۔ "ختم خواجگان" ذکر من الأذکار و لیس سنة بهذه الهیئة فمن اعتقد سنیته بهذه الهیئة فهو ابتداع فی الدین، أما إذا لم یعتقد سنیته فلا بأس لأنه ذکر من الأذکار ولأنه لا یخلو من ذکر ثابت من رسول الله صلی الله علیه وسلم أو من تلاوة القرآن أو من الصلاة علی النبی الکریم صلی الله علیه وسلم و کل واحد منها مشروع فی حد ذاته۔ أما هذه المجموعة بهذه المقادیر فلیست سنة، ولکنها من معمولات المشایخ الچشتیة الذین لم یفعلوها باعتقاد السنیة ، وإنما ثبتت فائدتها بالتجربة ، ولیس کل ما لم یکن سنة غیر جائز۔ نعم! إذا اعتقد الإنسان سنیة ما لیس سنة، فإنه بدعة۔

۴۔ سرّحت النظر فی ترجمة مقالی فی العلامة الشیخ عبدالفتاح أبو غدّة رحمه الله تعالی وما علّقتم علیه، فوجدته مناسبا غیر أن بعض أحبابی کتب فی حواشیه بعض الاقتراحات فی تعدیل الترجمة تختارون ما تشائون وأرجو أن لا تنسونی فی

(گذشتہ سے پیوستہ)وفی عمدة القاری کتاب الأذان باب الذکر بعد الصلاة ۱۸۱/۶ (ط۔ دار الکتب العلمیة بیروت) قال :واختار للإمام والمأموم أن یذکر الله بعد الفراغ من الصلاة، ویخفیان ذلک، إلا أن یقصدا التعلیم فیعلما ثم یسرا۔

(۱) وفی رد المحتار کتاب الصلاة ۵۴۶/۱ (ط۔ سعید) وفی الفتح عن الخلاصة :رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرأ القرآن فلا یمکنه استماع القرآن فالإثم علی القاری وعلی هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم اهـ أی لأنه یکون سببا لإعراضهم عن استماعه، أو لأنه یؤذیهم بإیقاظهم تأمل .... یجب علی القاری احترامه بأن لا یقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فإذا قرأه فیها کان هو المضیع لحرمته، فیکون الإثم علیه دون أهل الاشتغال دفعا للحرج۔

أدعيتكم الصالحة، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

۷/رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۹/۱۱۹۱)

(۱)...سالک کا یہ سوچنا کہ ''مرشد کے توسط سے دِلی سرور حاصل ہوا'' کیسا ہے؟

(۲)...محبت کی بناء پر ''تصورِ شیخ'' کا حکم

سوال:- محترم ومعظم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید ہے بخیر وعافیت ہوں گے، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائیں، آمین۔ نومبر کے ''البلاغ'' میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور انکا مشن'' آپ کی برطانیہ میں کی گئی تقریر'' میں نے تین مرتبہ پڑھی، ذاتی طور پر مجھے بہت فائدہ ہوا، مجھے حضرت علی میاںؒ سے بہت محبت اور لگاؤ تھا اور مجھے تو اُن سے بیعت کا تعلق بھی تھا۔

محترم ومعظم مدظلہ! سوال:- (۱)...کسی بزرگِ کامل سے بیعت ہوجانے کے بعد اور اپنے مرشد کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے بعد جو حالات وواقعات یا عبادات ذکرواذکار کے مرحلوں سے گذرتے ہوئے ایک انمول خوشی اور سرور حاصل ہونا یقینی ہوتا ہے، ایسے میں یہ بات ذہن میں رکھنا کہ جو کچھ مجھے حاصل ہوا یا ہو رہا ہے، اپنے مرشد کے توسط سے سب کچھ ملا، آیا درست ہے؟

جواب:- بے شک درست ہے۔

سوال:- (۲)... مرشدِ کامل دور ہو تو تصورِ مرشد یعنی مرشد کو اپنے دِل ودماغ میں لے آیا جائے، ایسا صحبت اور اُنس لگاؤ کے درجے سے ہو اس طرح سے دل کو سکون وراحت حاصل ہو کوئی حرج تو نہیں۔ یا ایسا منع ہے؟ (طلعت محمود راولپنڈی)

جواب:- (۲)...کچھ حرج نہیں بلکہ مفید ہے۔ والسلام

حسد، صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ؟
(حسد کی مختلف اقسام اور صورتوں کی تفصیل اور شرعی حکم)

سوال:- فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حسد، کبر اور عجب کو صغائر میں شمار کیا ہے۔ (رسائل ابنِ نجیم ص:۲۵۲) علامہ ابنِ نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس میں درج ذیل تفصیل ذکر کی ہے:

الخامس عشر: عد أبو الليث السمرقندى رحمه الله تعالىٰ فعل القلب المذموم من الصغائر كالحسد و سكت عنه كثير من الفقهاء فى كتاب الشهادات، والمعتمد عندنا أنه لا مؤاخذة عليه بمجرده إلا إن صمم و عزم عليه فصغيرة أو تعدى منه إصرار الغير بقول أو فعل فكبيرة۔ (حواله بالا ص: ۲۶۱)

کیا یہ تفصیل درست ہے؟

محمد عامر
خادم جامعۃ الرشید/احسن آباد
یکم صفر ۱۴۲۴ھ

جواب:- رسائل ابنِ نجیم اس وقت سامنے نہیں، مگر علماء اور اہلِ تصوف کے کلام سے بندہ جو سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ غیر اختیاری طور پر حسد کا خیال آنا صغائر میں بھی داخل نہیں، البتہ اختیاری طور پر ایسے خیالات دل میں لانا کم از کم صغیرہ ضرور ہے، اور عزم ایذاء تک پہنچ جائے تو اختلاف ہے، اور اگر عمل تک پہنچ جائے تو کبیرہ ہے، اس سے تمام عبارات میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۴/۳/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۶۲۲/۱۳)

شیخ کس کو بنایا جائے؟
شیخ کی مجلس میں گناہوں کا ارتکاب

سوال:- اگر کسی شخص کے ہاں صریح ناجائز کاموں کا ارتکاب ہوتا ہو اور بدعات کا ارتکاب ہوتا ہو تو کیا اسے شیخ بنانا جائز ہے؟

جواب:- جس شیخ کے ہاں واضح اور صریح بدعات کا ارتکاب ہو رہا ہو، مثلاً ہارمونیم پر ہونے والی قوالی جو واضح طور پر ناجائز کام ہے، تو اس شیخ کے صحیح ہونے کا کوئی احتمال نہیں، یعنی یہ کہ ان کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے فائدہ ہوگا یا اپنی اصلاح ہوگی، اس کا کوئی احتمال نہیں، یعنی جو شیخ ناجائز کام کو جائز سمجھتے ہوں، بدعت کو درست سمجھتے ہوں، شیخ معصوم نہیں ہوتا، غلطی اور گناہ اس سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن یہ کہ وہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس کے بعد توبہ کی توفیق ہو تو وہ شیخ ٹھیک ہے، اگر کبھی کسی نے شیخ کو غلط کام کرتے دیکھا تو اس کا یہ سمجھنا کہ اب یہ شیخ بننے کا اہل نہیں ہے، یہ نتیجہ نکالنا ہر معاملے میں درست نہیں۔ لیکن جو شیخ کسی گناہ کو جائز سمجھے، کسی بدعت کو درست سمجھے، اس کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم

ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہئے جس سے دوسرے کی تذلیل ہو

سوال:- اگر کوئی اصلاحی اعمال اختیار کرنے والا شخص کوئی ایسا کام کرے جو جائز ہے مگر دوسرے کی بے عزتی ہوتی ہو تو کیا وہ کام کرنا جائز ہے؟

جواب:- ایسا کام نہیں کرنا چاہئے، جس سے دوسرے کی تذلیل ہو، جس سے وہ سبکی محسوس کرے، اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، یہ بڑا نازک کام ہے، ہر بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، یک باگ ہو کر جب آدمی چلتا ہے تو پھر وہ گڑبڑ کرتا ہے، ساری باتوں کا لحاظ رکھ کر چلنا پڑتا ہے۔ واللہ اعلم

جس کے عملیات مفید ہوں اسے شیخ بنایا جاسکتا ہے؟

سوال:- اگر کسی کے عملیات بلکل درست ہوں اور بہت ہی مفید اور مجرب ہوں تو کیا اسے شیخ بنانا درست ہے؟

جواب:- یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی قرآنی عملیات ہی کرے اور وہ صحیح اور جائز ہوں اوران کے ذریعے کسی کوشفاء ہوجائے، اور کسی کوفائدہ پہنچ جائے لیکن اس سے یہ کہاں پتہ چلا کہ وہ شخص دین کے بارے میں مقتداء بننے کے لائق ہے، اوراس سے دین کی باتیں معلوم کرنی چاہئیں؟ عملیات توایک علاج ہے، اب اگرایک شخص کسی علاج کرنے میں اچھاماہر ہوگیاتواس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دین کا بھی ماہر ہوگیااور عملیات میں بھی ضرورت پڑتی ہے یہ معلوم کرنے کی کہ کون سے عملیات جائز ہیں اورکون سے عملیات ناجائز ہیں؟ بعض عملیات ایسے بھی ہوتے ہیں جوناجائز ہوتے ہیں، اب اگرکسی شخص کودین اورشریعت کااتناعلم ہوکہ وہ یہ جانے کہ کون سے جائز ہیں،کون سے ناجائز ہیں؟ یہ جوناجائز عملیات ہوتی ہیں، ان سے بھی فائدہ ہوجاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ ناجائز عملیات سے فائدہ نہیں ہوتا، جولوگ سفلی عمل کرتے ہیں، اس سے بھی وہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے، جس مقصد کے لئے وہ کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ بہت سی دوائیں ایسی ہیں کہ ان کااستعمال ناجائز ہے، لیکن ان سے فائدہ ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم

"مشیت" اور "مرضی" میں فرق

سوال:- مشیت اور مرضی میں کیا فرق ہوتا ہے تفصیل سے بیان فرمائیں؟

جواب:- ایک ہوتی ہے مشیت، اورایک ہوتی ہے مرضی، دونوں میں فرق ہے، دنیامیں کوئی آدمی اللہ کی مشیت کے خلاف توکچھ نہیں کرسکتا، اوراللہ کی مرضی کے خلاف بہت کام ہورہے ہیں، سارے کام مرضی کے خلاف ہورہے ہیں، یہ جوکفر ہورہا ہے، یہ سارامرضی کے خلاف ہورہا ہے، ظلم جتناہورہا ہے، یہ سارامرضی کے خلاف ہورہا ہے، تواللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف توبہت سے کام

ہورہے ہیں، لیکن مشیت کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اور مشیت کے معنی ہیں ''اللہ تعالیٰ کا ارادہ'' اللہ تعالیٰ کا اُصول ہے کہ جو آدمی جو کام کرنا چاہتا ہے، چاہے وہ کام صحیح ہو یا غلط، جب اس نے اپنے اختیار سے ایک راستہ اختیار کرلیا تو پھر اس کو اس کی توفیق دیدیتے ہیں، اسی کا نام مشیت ہے۔ واللہ اعلم

اجتماعی ذکر کی مجالس کا شرعی حکم

(وضاحت از مرتب)

اجتماعی ذکر کی مجلسوں کی شرعی حیثیت سے متعلق مفتی محمد رضوان صاحب نے ایک استفتاء کے جواب میں تفصیلی فتوی حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجا، یہ فتوی کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے، یہاں طوالت سے بچنے کے لئے فتوی کا صرف اصل ابتدائی حصہ اور اس مجموعی فتوی سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی رائے شائع کی جارہی ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بعض حضرات جو گدی نشینی اور تصوف اور پیری مریدی کی لائن میں زیادہ مشہور ہیں، وہ جگہ جگہ مساجد یا لوگوں کے گھروں میں اجتماعی ذکر کی مجالس قائم کرتے ہیں، جہاں پیر صاحب یا ان کے کوئی نمائندے ذکر کرانے کے لئے تشریف لاتے ہیں اور لوگ جمع ہوتے ہیں اور بآوازِ بلند اجتماعی ذکر کرتے ہیں، جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ پیر صاحب یا ان کے مقرر کردہ نمائندہ کے ساتھ حلقہ بنا کر سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں اور مقررہ پیر صاحب یا ان کے نمائندہ کے ساتھ آواز ملا کر بلند آواز سے سب لوگ ذکر کرتے ہیں، جب ایک خاص ذکر مثلاً درود شریف ختم ہوجاتا ہے تو دوسرا ذکر شروع کرایا جاتا ہے اور اس طرح ایک مخصوص تعداد میں ذکر مکمل کیا جاتا ہے، ساتھ ہی اس مجلس میں شریک حضرات زور زور سے دائیں بائیں طرف ذکر کے ساتھ ہلتے بھی ہیں اور اس کو ضرب لگانا کہتے ہیں، بعض شرکاء کو ذکر کے دوران جوش اور مستی بھی سوار ہوجاتی ہے اور آواز غیر معمولی بلند ہوجاتی ہے، ایسے شخص کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ بہت پہنچا ہوا اور اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ ہے اور اس کو وجد کا نام دیا جاتا ہے، اجتماعی ذکر کی مجالس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے، ان لوگوں کی طرف سے مجلسِ ذکر کی

لوگوں کودعوت دی جاتی ہے، اشتہارات بھی چھاپے جاتے ہیں اورمختلف طریقوں سے زبانی وتحریری طور پراس کے اعلانات کیئے جاتے ہیں اوراس خاص طریقہ پراجتماعی انداز میں ذکرکرنے کواصلاح کاذریعہ سمجھاجاتاہےاوربعض جگہ بجلی بندکرکے اندھیرے میں ذکرکرایاجاتاہے،بعض لوگوں کی طرف سے اس طرح ذکرکرنے کوصوفیائے کرام کاطریقہ بتلایاجاتاہےاوراس کافائدہ یہ ذکرکیاجاتاہے کہ اس طرح ذکرکرنے سے دل نرم ہوتاہےاورلذت محسوس ہوتی ہے، یہ سلسلہ بعض اہلِ بدعت میں تورائج تھاہی،جس کے لئے انہوں نےمختلف مقامات پرباقاعدہ ذکرومراقبہ ہال مقررومختص کررکھے ہیں،مگراب بعض اہلِ سنت میں بھی شروع ہوگیاہے،ایک مرتبہ جب اہلِ سنت کےبعض لوگوں سے اس کے بارے میں ثبوت طلب کیاگیاتوانہوں نے بتلایاکہ احادیث میں مجالسِ ذکر''ریاض الجنۃ'' یعنی جنت کےٹکڑے قراردیاگیاہےاورانہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمدزکریاصاحب رحمہ اللہ کے رسالہ''فضائلِ ذکر'' کاحوالہ دیااوربتلایاکہ اس رسالہ میں مجلسِ ذکر کے بارے میں کافی حدیثیں اورموادموجودہے،اس کامطالعہ کرو، اس سےتمہارے شبہات دور ہوجائیں گے، اسی کے ساتھ انہوں نے ایک رسالہ بھی دیا،جس کانام ہے''مساجدمیں مجالسِ ذکرِجہری کااستحباب'' (شرعی دلائل کےساتھ اکابرکامعمول اوران کےارشاداتِ مبارکہ)

یہ رسالہ مولانا ....صاحب نےلکھاہے،جس پرتاریخِ اشاعت ۱۹۹۹۔۲۰۰۰ء درج ہےاوریہ رسالہ تقریباًسوصفحات پرمشتمل ہے۔

اس رسالہ میں انہوں نےمساجدمیں ذکربالجہرکی مجلسیں مستحب ہونےپرمختلف ثبوت پیش کیے ہیں اورفرمایاہے کہ مسجدمیں ذکربالجہرکی مجلسیں منعقدکرنے پرہمارے اکابرکے یہاں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ اُن سب کامتفقہ فیصلہ ان کے جائزاورمستحب ہونے پرہے،اورجوکوئی اس کے خلاف رائے رکھتاہو،وہ اس کی اپنی ذاتی رائے ہے، اس کواکابرکی رائے سمجھناغلط ہے، ان مجالسِ ذکرکےخلاف فتاوی تحریرکرنےوالوں کوانہوں نے ذکرکامنکراورذکرکامخالف قراردیاہے،اس رسالہ

میں انہوں نے مجالسِ ذکر کے جگہ جگہ قائم کرنے اور پھیلانے کی لوگوں کو ترغیب دی ہے اور حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ کی ایک تحریر بھی دلیل میں پیش کیا ہے، اس کے علاوہ کئی بزرگوں کے حوالے سے ان کے یہاں مجالسِ ذکر قائم ہونے کا ذکر کیا ہے۔

یہ رسالہ استفتاء کے ساتھ منسلک ہے۔

وضاحت طلب مسئلہ یہ ہے کہ علمائے حق کا اس بارے میں کیا مؤقف ہے؟ مدلل انداز میں واضح کیا جائے اور ساتھ ہی منسلکہ رسالہ میں درج شدہ باتوں پر بھی روشنی ڈالی جائے، تاکہ دوسروں کے لئے بھی تسلی واطمینان کا باعث ہو۔

الجواب (از مفتی محمد رضوان)

فضیلتِ ذکر

اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت اہم عبادت ہے، خواہ تلاوت کی شکل میں ہو یا تسبیح پڑھ کر یا درود شریف وغیرہ پڑھ کر، جس طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی توفیق ہوجائے، بہت بڑی سعادت ہے، قرآن مجید اور احادیث میں ذکر کی ترغیب دی گئی ہے اور ذکر کے مختلف فضائل وفوائد بیان کئے گئے ہیں۔

قولی وفعلی ذکر

لیکن یاد رہے کہ ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ایک تو زبان وقول سے ہوتا ہے اور ایک اپنے عمل وفعل سے، اسی لئے محققین فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر ایک تو زبانی وقولی طریقہ پر ہوتا ہے، دوسرے عملی وفعلی طریقہ پر۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ذکر صرف زبانی ذکر کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ عملی وفعلی ذکر یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے حلال وحرام اور جائز وناجائز وغیرہ احکام کی اتباع کرنا بھی ذکر الٰہی میں داخل ہے۔

اور بعض احادیث میں اس کو بھی ذکر اور اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاکرہ اور تعلیم وتعلم میں مشغول حضرات کو اہلِ ذکر اور ان کی مجالس کو مجالسِ ذکر کہا گیا ہے، اور اسی لئے جو

شخص صرف زبانی ذکر پر اکتفاء کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی نہ کرے، وہ حقیقی ذکر کرنے والوں میں شامل نہیں۔

پس اوّل تو قولی و فعلی ذکر کے مذکورہ عام مفہوم کو نظر انداز کر کے ذکر کو صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں سمجھنا چاہئے، دوسرے زبانی ذکر (جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے) اس کے لئے بھی کسی خاص ایسی ہیئت کو مخصوص کر لینا جو شریعت سے ثابت نہ ہو، درست نہیں، کیونکہ یہ ذکر عبادتِ مطلقہ ہے اور عبادتِ مطلقہ کو عبادتِ مقیدہ کا درجہ دے دینا غلط ہے۔

صحابۂ کرامؓ اور اسلاف کا طریقۂ ذکر

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین دونوں قسم کے (یعنی قولی و فعلی) ذکر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فعلی و عملی ذکر سے تو ان کی پوری زندگی بھری ہوئی ہے، ان کا ہر ہر عمل شریعت کی ترجمانی کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی تمام مجالس اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سنتوں کے تذکرے سے منور ہوتی تھیں، جو کہ مجالسِ ذکر کا مصداق تھیں، اس کے علاوہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا گھر اور مساجد میں زبانی ذکر و تسبیح کرنا روایات سے ثابت ہے، لیکن ان کے یہاں نہ کسی خاص ذکر کی پابندی تھی اور نہ ہی کوئی کسی دوسرے کے ذکر کا پابند تھا، اور نہ خاص اس غرض کے لئے مجلس و محفل قائم کر کے ایک دوسرے کو مدعو کیا جاتا تھا، بلکہ یہ حضرات مسجد اور گھر میں اپنے اپنے طور پر تلاوت و استغفار سے لے کر تسبیح و تحمید تک مختلف قسم کے اذکار و کلمات حسبِ منشاء کیا کرتے تھے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کوئی وقت وغیرہ کی قید نہیں، کسی خاص ہیئت اور حالت کی یا دوسرے کے ساتھ ذکر کرنے کی پابندی نہیں، اور ایک مقام پر جمع ہونے کی شرط نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہونے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد پر اُبھارا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ

(سورة آل عمران، آیت نمبر ۱۹۱)

ترجمہ: وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی۔

اس طرح بغیر کسی قید وشرط کے ذکر کرنے اور کثرت سے ذکر کرنے میں نہ کوئی کلام ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔

چنانچہ صحابۂ کرام اور سلفِ صالحین مساجد میں بھی زبانی ذکر وتسبیح کے ماہانہ یا ہفتہ وار پروگرام کے بجائے یومیہ نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر مختلف اذکار واَوراد میں مشغول ہوتے تھے، اگر کچھ لوگوں نے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس میں مشغولی اختیار کرنی ہوتی تو وہ ایک طرف ہوجاتے اور جن حضرات نے اپنے ذکر واذکار کے معمولات پورے کرنے ہوتے وہ الگ ہوجاتے، تاکہ ایک کی وجہ سے دوسرے کو خلل نہ ہو اور ہر ایک اپنے اپنے معمول کو سہولت کے ساتھ پورا کرسکے۔ کوئی تلاوت میں مشغول ہوتا، کوئی تکبیر (یعنی اللہ اکبر) میں، کوئی تسبیح (یعنی سبحان اللہ) میں، کوئی تہلیل (یعنی لا الہ الا اللہ) میں، اور کوئی تحمید (یعنی الحمد للہ) میں اور کوئی درود شریف میں اور کوئی توبہ واستغفار اور دعا و نوافل میں۔

غرضیکہ کوئی دوسرے کے ذکر کا پابند نہیں تھا، ہر ایک اپنی سہولت وفرصت اور موقع کی مناسبت سے ذکر کیا کرتا تھا، اور جب جس کا ذکر پورا ہوجاتا تو فارغ ہوکر اپنی دیگر ضروریات میں مشغول ہوجاتا، اس طرح کسی پابندی والتزام کے بغیر مساجد میں ذکر کی مجالس قائم ہوتی تھیں، جو حضرات اذکار واَوراد میں مشغول ہوتے، نہ تو وہ خاص ذکر کی مجلس کے عنوان سے جمع کئے جاتے تھے اور نہ ہی وہ کسی کو مقتداء بنا کر بیک زبان ایک ہی ذکر کرنے کے پابند تھے۔

اور مساجد کے علاوہ گھروں میں بھی ہفتہ وار یا ماہانہ پروگرام کے بغیر ذکر کا ماحول ہوتا، مثلاً صبح فجر سے پہلے، یا فجر کے بعد نماز سے فارغ ہوکر گھر کے افراد اپنے اپنے طور پر ذکر وتلاوت میں مشغول ہوجاتے اور ہر ایک اپنی حسبِ استعداد ذکر وتلاوت وعبادت کیا کرتا تھا اور گھروں میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

اور اس طرح گھروں میں بھی کسی پابندی و التزام کے بغیر ذکر وتسبیح کی مجالس قائم ہوجاتیں۔ یہاں بھی خاص ذکر وتسبیح کرنے کے لئے گھر سے باہر کے لوگوں کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا، اور

نہ ہی وہ کسی کو مقتداء بنا کر بیک زبان ایک ہی ذکر کرنے کے پابند تھے۔

اسی طرح صوفیائے کرام کے قائم کردہ خانقاہوں میں بھی مذکورہ قیود و تخصیص کے بغیر ذکر کا معمول تھا، ان خانقاہوں میں مختلف اطراف سے لوگ اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوتے، جہاں ان کی اصلاح وتزکیۂ نفس سے متعلق وعظ کی مجلسیں قائم ہوتیں اور بہت سے مشائخ وصوفیاء کی یہ وعظ کی مجلسیں ''مجالس'' کے عنوان سے آج بھی شائع شدہ اور مطبوع شکل میں موجود ہیں۔

اسی کے ساتھ مشائخ کی طرف سے مریدین کو حسبِ استعداد مختلف اذکار واَوراد تجویز کئے جاتے اور وہ خانقاہ میں مقیم ہونے کے دوران اپنے اپنے اذکار کے معمولات کو پورا کرتے۔

بعض اوقات وعظ کی مجلسوں کی طرح خانقاہی معمولات میں ذکر کے لئے بھی وقت مقرر ہوتا، جس میں خانقاہ میں موجود سب حضرات اپنے شیخ کی طرف سے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنے حجروں میں یا خانقاہ کی مسجد میں بیٹھ کر ذکر کرتے (خواہ سرًا ہو یا جہرًا) لیکن ہر ایک اپنے شیخ کی طرف سے تجویز کیا ہوا ذکر انفرادی طریقے کے مطابق کیا کرتا تھا، خواہ تلاوت کی شکل میں ہو یا تسبیح وتہلیل وغیرہ کی شکل میں۔

اور جب جس کا معمول پورا ہو جاتا وہ اپنے دیگر معمولات میں مشغول ہو جاتا۔ پھر بعض اوقات کسی مصلحت سے اس نشست میں شیخ بھی موجود ہوتے۔ لیکن یہ بات قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی تھی کہ مریدین کو خاص ذکر کے لئے یہاں جمع نہیں کیا جاتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی اعلان و اشتہار ہوتا تھا، اور نہ مخصوص ذکر کا سب کے لئے التزام ہوتا تھا، اور نہ ہی کوئی ایک شخص ذکر کرانے کے لئے متعین ہوتا تھا۔

غرضیکہ مذکورہ تمام صورتوں میں ایک وقت اور ایک جگہ کی حد تک تو اتفاقی اجتماع ہو جاتا تھا، لیکن موجودہ دور کی مروجہ ذکر کی مجلسوں میں پائی جانے والی قیود (مثلاً خاص ذکر کے لئے تداعی اور سب کے لئے مخصوص ذکر کا التزام جیسی تخصیصات) نہیں تھیں۔

مروّجہ اجتماعی ذکر کے مکروہ وممنوع ہونے کا ثبوت

لیکن سوال میں مخصوص اجتماعی ذکر کی مجالس کے بارے میں جو سوال کیا گیا ہے (جن میں

ذکر کے لئے تداعی ہوتی ہے اور ایک ہی ذکر کا التزام ہوتا ہے اور اس جیسی دوسری قیودات ہوتی ہیں، اور ہمارے زیرِ بحث اسی قسم کی اجتماعی ذکر کی مجالس ہیں) تو اس قسم کی مجالس قرآن وحدیث، صحابۂ کرام، فقہائے عظام اور سلفِ صالحین سے ثابت نہیں، بلکہ فقہائے کرام واکابرِ عظام کی تصریحات کے مطابق مکروہ وممنوع ہے۔

کیونکہ اوّلاً تو جس عمل کی کوئی خاص ہیئت اور طریقہ خیرالقرون سے ثابت نہ ہو، اس میں اپنی طرف سے کوئی خاص ترکیب وترتیب تجویز کر لینا اور اس طریقہ کو ثواب سمجھ لینا درست نہیں۔[1]

دوسرے ذکر ایک مستحب اور نفلی درجے کا ایسا عمل ہے کہ نہ اس کے لئے جمع ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اس غرض کے لئے لوگوں کو بلانا اور اکٹھا کرنا درست ہے، اس کے لئے لوگوں کو جمع کرنا اور اس غرض کے لئے لوگوں کو تحریری یا زبانی طور پر مدعو کر کے اور دعوت دے کر خاص اس غرض کے لئے مجلسیں ومحفلیں جمانا، فقہائے کرام کی بیان فرمودہ ''تداعی'' کے مفہوم میں داخل ہے، اور تداعی کے ساتھ یہ عمل مکروہ ہے۔

ان مروجہ زیرِ بحث مجالسِ ذکر کے مکروہ وممنوع ہونے کی بنیادی وجوہات تو یہی ہیں اور اس کے علاوہ دیگر وجوہات بھی مروجہ مجالسِ ذکر میں پائی جاتی ہیں، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔[2]

(جواب از حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ)

جواب: مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کے متعدد رسائل اس دوران ملتے رہے، ان میں سے ''وصل'' کے بارے میں

---

(۱) ملاحظہ ہو: تحفۃ المسلمین جلد اول صفحہ: ۶۱، مؤلفہ: مفتی محمد عاشق الٰہی بلندشہری رحمہ اللہ، خلیفۂ اجل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ۔

اور مروّجہ مجالسِ ذکر کے مدعیان وحامیان بذاتِ خود ان مروّجہ مجالسِ ذکر کو سنت ومستحب بلکہ بعض تو اصلاح کے لئے ضروری عمل سمجھتے ہیں، اور ان اُمور کی صراحت ووضاحت ان کی طرف سے متعلقہ رسائل میں جابجا مذکور ہے۔

(۲) ملحوظ رہے کہ مروّجہ مجالسِ ذکر کے ممنوع ہونے کی بنیادی وجہ ذکر کا جہر سے کرنا نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ اس مروّجہ طریقہ اور کیفیت کا محدَث ومکروہ ہونا ہے۔ (حاشیہ از محمد رضوان)

پڑھنے کا موقع ملا۔ الحمدللہ! مناسب ہے، تکملہ میں آپ نے جس اضافے کی تجویز دی ہے، مناسب ہے، اگر چہ سیاق سے وہ بات سمجھی جاسکتی ہے، مگر تصریح بہتر ہے، اس لئے ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کردوں گا۔

''ذکر کی مجالس'' والا رسالہ بھی بڑی حد تک پڑھ لیا، بات تو صحیح ہے، لیکن چونکہ ہمارے بزرگوں میں سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ نے اپنے متوسلین میں یہ سلسلہ جاری کیا تھا اور اس دور میں ہمارے دوسرے بزرگوں نے بھی اس پر زیادہ نکیر نہیں فرمائی، اس لئے لب ولہجہ نرم سے نرم ہونا چاہئے۔

بلکہ بہتر یہ ہوتا کہ حضرت رحمہ اللہ کے بعض اجل خلفاء کو کتاب شائع کرنے سے پہلے ایک ہمدردانہ مشورے کے طور پر ایک خط لکھ دیا جاتا کہ اب حالات بدل رہے ہیں، اس لئے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اس کے بعد کتاب شائع کی جاتی۔

لیکن بہر حال! ایک مرتبہ شائع ہوگئی ہے اور اس میں حذف واضافہ بھی ہوا ہے، اس لئے اس نقطۂ نظر سے کتاب پر نظر ثانی کرلی جائے کہ لب ولہجہ نرم ہو۔

مثلاً صفحہ ۹ پر (یہ عبارت ہے.................) یہ پورا صفحہ قابلِ ترمیم ہے۔

اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے اصلاح کے بجائے دفاع کا جذبہ پیدا ہوگا، اور ایک نئی بحث کا دروازہ کھلے گا۔ ان باتوں کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ والسلام

۱۴۳۰/۱۲/۲۴ھ

نماز کے بعد ذکر وتسبیحات سے فارغ ہوکر دعا کے وقت ہاتھ اُٹھانے سے متعلق نور الایضاح کی ایک عبارت کا مطلب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ کتاب ''نور الایضاح'' فصل کیفیۃ

ترکیب الصلاۃ میں ص:۲۰ پر ہے:

ولا يسن رفع اليدين إلا عند افتتاح كل صلاة وعند التسبيح عقيب الصلوات. و إذا فرغ

اس عبارت کا کیا مطلب ہے "وإذافرغ" کی جزاء بظاہر "قرأ تشهد ابن مسعود" معلوم ہوتی ہے، لیکن "و عند التسبيح عقب الصلوات" کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اس لئے مستفسر ہوا ہوں۔ بینواوتوجروا۔

جواب:- نورالایضاح کی پوری عبارت دراصل یہ ہے، اس کو ملا کر پڑھئے اور مطلب صاف ہے:

ولا يسن رفع اليدين إلا عند افتتاح كل صلاة و عند تكبير القنوت فى الوتر وتكبيرات الزوائد فى العيدين .... و عند دعائه بعد فراغه من التسبيح عقب الصلوات وإذا فرغ الرجل من سجدتى الركعة الثانية افترش رجله اليسرى وجلس عليها۔[1]

خط کشیدہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز کے بعد کی تسبیح وتحمید وغیرہ سے فارغ ہو اور دعا مانگنی شروع کرے، اس وقت ہاتھ اُٹھانا مسنون ہے، اس کے بعد مصنفؒ نے "إذافرغ" سے جو عبارت شروع کی ہے، وہ جملۂ مستانفہ ہے اور "وإذافرغ" کی جزا "افترش رجله

(۱) نور الإيضاح كتاب الصلوٰة فصل فى كيفية تركيب الصلوٰة ص: ۴۷ (طبع قديمى كتب خانه)

الیسری " ہے، جس پر "وجلس علیھا" وغیرہ مع "و قرأ تشھّد ابن مسعودؓ "، معطوف ہیں، یعنی جب دوسری رکعت کے دونوں سجدوں سے فارغ ہوتو بایاں پاؤں بچھائے، اس پر بیٹھے اور ابن مسعودؓ کا تشہد پڑھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۸/۱۰/۹ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کعبہ شریف کو دیکھتے وقت دعا کا حکم

سوال:- یہ بات مشہور ہے کہ جو مسلمان پہلی بار حج یا عمرہ کو جاتا ہے، وہ خانۂ کعبہ کو دیکھ کر جو دعا بھی کرتا ہے، وہ قبول ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے؟ اور کیا اسکے بارے میں قرآن پاک میں کوئی آیت موجود ہے، یا حدیث پاک میں کوئی ہدایت ہے؟ نیز پہلی نگاہ کا مطلب آیا زندگی میں اول بار وہاں جانے کے وقت پہلی نگاہ پڑنا ہے، یا ہم جب بھی وہاں جائیں، اور پہلی نگاہ ڈالیں، وہ پہلی ہی مانی جائیگی؟

جواب:- مسجد حرام میں داخلے اور بیت اللہ شریف کو دیکھنے کے وقت تین مرتبہ تکبیر کہنا اور تین مرتبہ "لا إلہ إلّا اللہ" کہنا باتفاق حنفیہ مستحب ہے۔ البتہ اسکے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں فقہاء حنفیہ کے اقوال مختلف ہیں۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین سے نقل فرمایا ہے کہ انکے نزدیک ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے۔ اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسکی تائید فرمائی ہے (نخب الأفکار فی شرح معانی الآثار ج: ۹ ص: ۳۴۸)۔[1]

بعض حضرات حنفیہ نے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس نقل کی بنا پر یہ فرمایا ہے کہ بیت اللہ شریف کو دیکھ کر ہاتھ نہ اٹھائے جائیں، اور ایسا کرنا مکروہ ہے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے (حیات

(۱) ج:٦، ص: ۲۸۵، ط: شیخ الاسلام اکیڈمی

القلوب ص: ۱۱۲)[1] اور حضرت مولانا شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے (عمدۃ المناسک ص: ۱۱۰)[2]۔

البتہ حنفیہ ہی میں سے بعض محققین نے اسکو ترجیح دی ہے کہ بیت اللہ کو دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب ہے۔ چنانچہ علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وإذا عاين البيت كبر وهلل ثلاثاً، ويدعو بما بداله..فإنّ الدّعاء مستجابٌ عند رؤية البيت".(فتح القدير ج :۲ ص: ۳۵۲)[3]

اسی طرح حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اگرچہ ارشاد الساری (ص: ۱۲۸)[4] میں ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کرنے کی طرف معلوم ہوتا ہے، لیکن مشکوۃ شریف کی شرح "مرقاۃ المفاتیح" میں انہوں نے قدرے تفصیل سے اس موضوع پر بحث فرمائی ہے، اور مختلف روایات کو سامنے رکھ کر ترجیح اسکو دی ہے کہ پہلی بار کعبہ شریف کو دیکھ کر رفع یدین کے ساتھ دعا کرنا مستحب ہے (مرقاۃ المفاتیح ، باب دخول مكة والطواف حديث :۲۵۷۴ ج: ۵ ص: ۴۶۷ و ۴۶۸)[5]۔

غالباً اسی وجہ سے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اور وقت مشاہدۂ بیت اللہ شریف کے ہاتھ اٹھانے بعض روایات حدیث سے ثابت ہیں، چنانچہ فتح القدیر میں منقول ہے۔ پس چاہئے کہ رفع یدین یہاں بھی سنت ہو۔" (زبدۃ المناسک ص: ۱۰۹)[6]

---

(۱) ص: ۱۳۸، ط: دار الكتب النعمانية

(۲) طبع: ایچ ایم سعید

(۳) باب الاحرام، ج

(۴) ارشاد الساری الیٰ مناسک الملا علی قاری ص: ۱۸۱ (طبع: المكتبة الامدادية مكة المكرمة)

(۵) طبع: رشيدية

(۶) طبع: ایچ ایم سعید

نیز حضرت علامہ محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی (جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں) مناسک پر اپنی مشہور کتاب میں یہی موقف اختیار فرمایا ہے(غنیة الناسک فی بغیة المناسک، ص: ۹۷)۔[۱]

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی تحقیق کو اختیار فرمایا ہے(معلم الحجاج، ص:۱۱۸ و ۱۱۹)۔[۲]

اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "احکام حج" میں بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا کا ذکر فرمایا ہے، اگرچہ ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں فرمایا (جواهر الفقه ج: ۴ص: ۱۱۸)۔[۳]

دراصل متعلقہ روایات اور فقہاء کرام کے اقوال کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دو مسئلے الگ الگ ہیں، اور دونوں کا حکم جدا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب انسان حج یا عمرے کیلئے جائے، اور پہلی بار بیت اللہ شریف کو دیکھے تو اُس وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرے یا نہیں؟ اس مسئلے میں راجح یہ ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بعض حضرات ہر بار بیت اللہ شریف کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے تھے، (جیسے استلام کا اشارہ کیا جاتا ہے) انکا استدلال حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے تھا جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الأم میں روایت کی ہے، اور اسکے الفاظ یہ ہیں:

"عن ابن جريج قال: حُدّثت عن مقسم مولى عبدالله بن الحارث، عن ابن عبّاس، عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم أنه قال :تُرفع الأيدى فى الصلوة، وإذا رأى البيت، وعلى الصّفا والمروة، وعشيّة عرفة،

---

(۱) طبع ادار القرآن والعلوم الاسلامية

(۲) ج:۶،ص:۱۲۴(طبع: مکتبہ تھانوی)

(۳) طبع مکتبه دار العلوم کراچی

وبجمع، وعند الجمرتين، وعلى الميّت". (كتاب الامّ للشّافعيّ ج : ۵ص : ۲۳۵ حديث : ۲۰۶۵)[۱]

دوسری طرف حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ حدیث جسکو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کراہت کی بنیاد بنایا ہے، وہ بھی اس دوسرے عمل سے متعلق ہے۔ یہ حدیث سنن ابوداود وغیرہ میں بھی مروی ہے۔ اسکے الفاظ یہ ہیں:

"عن المهاجر المكّي، قال :سُئل جابر بن عبدالله عن الرجل يرى البيت يرفع يديه؟ فقال :ماكنتُ أرى أحداً يفعل هذا إلاّ اليهود .قد حججنا مع رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فلم يكن يفعله". (سنن أبى داود، أول كتاب المناسک، حديث : ۱۸۶۵)[۲]

اگرچہ اس روایت میں مہاجر مکی کو مجہول قرار دیا گیا ہے۔ حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے تلخیص ابوداود ج: ۲ ص : ۵۷ میں علامہ خطابیؒ کے حوالے سے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو سفیان ثوری، عبد اللہ بن المبارک، امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ مہاجر مکی مجہول ہیں، تاہم امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سند کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے مقابلے میں بہتر قرار دیا ہے جس میں بیت اللہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔

لیکن اس روایت میں دعا کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ بیت اللہ کو دیکھ کر مطلق ہاتھ اٹھانے پر حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ کی نکیر مذکور ہے۔ اور حافظ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا ایک ایسا طریق روایت کیا ہے جس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اسکا تعلق پہلی نظر پڑتے وقت دعا سے نہیں ہے۔ وہ طریق یہ ہے:

---

(۱) ج: ۱۰، ص: ۳۹۹، رقم الحديث: ۵۹۱، طبع: دار احياً التراث العربی.

(۲) كتاب المناسک، باب رفع اليد اذا رأى البيت، حديث: ۱۷۸۹، ۲/۳۷۲، ۳۷۳، طبع: الأثرية

"حدثنا محمدبن يحيى، ثنا مسلم بن إبراهيم، ثنا قزعة، حدثني أبي سويدبن حجير، ثنا المهاجربن عكرمة، قال :قال :سألنا جابر بن عبدالله عن الرجل يقضي صلاته وطوافه ثمّ يخرج من المسجد فيستقبل البيت، فقال: ما كنت أرى يفعل هذا إلاّ اليهود".

حافظ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اوپر والی روایت کیلئے مفسر قرار دیکر اس پر یہ باب قائم کیا ہے:

"باب ذكر الخبر المفسّر للفظة المجملة التي ذكرتها، والدليل على أنّ جابر بن عبد الله إنّما أراد بقوله :لم يكن يفعل هذا، أي لم نكن نرفع أيدينا عند الخروج من المسجد بعد الفراغ من الطواف والصلاة لم نكن نستقبل البيت فنرفع أيدينا بعد ذلك، لا أنّا لم نكن نرفع أيدينا عند رؤية البيت أوّل ما نراه ".(صحيح ابن خزيمه، ج: ۴ ص: ۲۱۰ باب : ۶۱۴ حديث : ۲۷۰۵)[1]

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح معانی الآ ثار میں جو بحث فرمائی ہے، اس کو بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس رفع یدین کو مکروہ قرار دے رہے ہیں، اس سے دعا کیلئے رفع یدین نہیں، بلکہ تعظیم بیت اللہ کیلئے رفع یدین مراد ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

"فرأينا الذين ذهبوا إلى ذلك ذهبوا أنه لالعلة الإحرام، ولكن لتعظيم البيت"(شرح معاني الآثار ج: ۱ ص: ۸۹)[2]

لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ انکی تمام تر بحث اُس رفع یدین سے متعلق ہے جو تعظیم بیت اللہ کے خیال سے ہر مرتبہ نظر پڑنے کے وقت کیا جائے ، اور آگے انہوں نے حضرت امام ابو حنیفہ اور

(۱) المكتب الاسلامی

(۲) ۳۹۱/۱/۱،طبع مجتبائی

صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ سے جو کراہت نقل فرمائی ہے، وہ اسی رفع یدین سے متعلق ہے۔ پہلی نظر کے وقت دعا کرنے سے اسکا تعلق نہیں ہے۔ اور حافظ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا جو محمل بیان فرمایا ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ نیز حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی رفع یدین کے اثبات اور نفی کی روایات کے درمیان یہی تطبیق بیان فرمائی ہے کہ جن روایات میں رفع یدین کا اثبات ہے، ان میں پہلی بار دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مراد ہے، اور جن روایات میں رفع یدین کی نفی ہے، ان میں ہر بار بیت اللہ شریف کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا مراد ہے۔ چنانچہ دونوں قسم کی روایات کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

"الأولی الجمع بينهما بأن يُحمل الإثبات على أوّل رؤية، والنّفي على كلّ مرّة".(مرقاة المفاتيح، كتاب المناسك، باب دخول مكة والطواف، الفصل الثاني ج : ۵ ص : ۴۶۸)[1]

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جن حضرات نے پہلی بار کعبہ شریف کو دیکھ کر رفع یدین کے ساتھ دعا کرنے کو مستحب کہا ہے، ظاہر یہ ہے کہ ان کا یہ قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ حضرت امام صاحبؒ نے جس رفع یدین کو مکروہ کہا ہے، وہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد پر مبنی ہے جسکی تشریح اوپر گذر چکی کہ وہ بیت اللہ کی تعظیم کیلئے ہر بار اُسے دیکھ کر ہاتھ اٹھانے سے متعلق ہے۔

اب ہم ان روایات کی تحقیق کرتے ہیں جن میں حج یا عمرے کیلئے حاضر ہونے اور بیت اللہ شریف کو پہلی بار دیکھنے کے وقت دعا کرنا اور ہاتھ اٹھانا بھی منقول ہے۔ یہ روایات مندرجۂ ذیل ہیں :

(۱) حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الأم میں حضرت ابن جریج رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ روایت مرسلاً ذکر فرمائی ہے :

---

(۱) تحت حدیث رقم: ۲۵۷۴، ط: رشیدیة

"أنّ النبيّ صلّى الله عليه وسلّم كان إذا رأى البيت رفع يديه، وقال :اللّهمّ زد هذا البيت تشريفاً وتعظيماً وتكريماً ومهابة، وزد من شرّفه وكرّمه ممّن حجّه أو اعتمره تشريفاً وتكريماً وتعظيماً وبرّاً". (كتاب الأمّ للشّافعی، كتاب الحج، باب القول عند رؤية البيت، حديث : ۲۰۶۴)[1]

یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے، لیکن حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الأم میں یہ حدیث نقل کر کے جو حکم ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے:

"فأستحبّ للرّجل إذا رأى البيت أن يقول ما حكيتُ .وما قال من حسنٍ أجزأه إن شاء الله" (حوالہ بالا)[2]

ترجمہ:" لہٰذا میں اس بات کو مستحب سمجھتا ہوں کہ جب انسان بیت اللہ کو دیکھے تو وہ الفاظ کہے جو میں نے نقل کئے ہیں، اور جو کوئی اچھے کلمات کہہ لے، اس کیلئے انشاء اللہ کافی ہے۔"

البتہ یہ روایت امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "سنن کبریٰ" امام شافعیؒ ہی کی سند سے نقل فرمائی ہے، اور اسکے بعد فرمایا ہے کہ:" هذا منقطع".(السنن الكبرى للبيهقی، باب القول عند رؤية البيت، :۷۳:۵)[3] اور "معرفة السنن والآثار"میں امام شافعیؒ کا یہ قول ابوسعید کی كتاب الإملاء سے نقل کیا ہے کہ :

"وليس فی رفع اليدين شیءٌ أكرهه ولا أستحبّه عند رؤية البيت، وهو عندی حسن".

ترجمہ: "بیت اللہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے میں نہ کوئی ایسی بات ہے جسے میں

(۱) ۳۹۹/۱۰، حديث: ۴۲، طبع: دار احياء التراث العربی، وكذا فی ۹۴۲/۲، طبع: دار احياء التراث العربی

(۲) ۵۶۳/۲، حديث: ۹۴۲، طبع: دار احياء التراث العربی

(۳) ۱۱۸/۵، رقم الحديث: ۹۲۱۳، طبع: دار الكتب العلمية بيروت

مکروہ کہوں، اور نہ میں اسے مستحب کہتا ہوں، البتہ وہ میرے نزدیک اچھی بات ہے۔ "(معرفة السنن والآثار للبيهقي ج : ٧ ص: ٢٠١ فقره : ٩٨٠٢)[1]

غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رفع یدین کو اچھا کہنے کے باوجود اسے اصطلاحاً مستحب کہنے سے اس لئے گریز فرمایا ہے کہ ابن جریجؒ کی یہ حدیث مرسل ہے، اور مرسل امام شافعیؒ کے نزدیک حجت نہیں ہے، لیکن کتاب الأم میں دعا کے کلمات کہنے کو اس لئے مستحب فرمایا ہے کہ وہیں انہوں نے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عن محمد بن سعيد بن المسيّب عن أبيه أنّه كان حين ينظر إلى البيت يقول: اللّهمّ أنت السّلام، ومنک السّلام، فحيّنا ربّنا بالسّلام". (کتاب الأم، حوالہ بالا)[2]

اس میں دعا کا ذکر ہے، رفع یدین کا نہیں ہے۔ لہٰذا نفس دعا کی حد تک حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے عمل سے ابن جریج کی حدیث مرسل کی تائید ہوگئی ہے۔

لیکن اگر حنفیہ کے اصول پر دیکھا جائے تو حنفیہ کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے، خواہ وہ معضل ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ حنفیہ کے نزدیک قرون ثلاثہ میں انقطاع صحت حدیث کیلئے مضر نہیں ہے (ملاحظہ ہو: قواعد فی علوم الحدیث للعلامة ظفر احمد العثمانی بتحقيق الشيخ عبد الفتاح أبو غدّة، فصل:۵ص: ۱۳۸ ومابعدہ)[3]۔

لہٰذا حنفیہ کے اصول پر ابن جریجؒ کی حدیث قابل استدلال ہونی چاہئے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ اسکی تائید حضرت سعید بن المسیبؒ کے مذکورہ بالا عمل سے بھی ہورہی ہے، اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل بھی اسی کے مطابق روایت فرمایا ہے۔

---

(۱) کتاب المناسک، باب القول عند رؤية البيت، تحت رقم: ۲۹۱۰، ۴/۴۸، طبع: عباس احمد الباز

(۲) ۱۰/۳۹۹، حدیث: ۷۹۲، طبع دار احیاء التراث العربی

(۳) اعلاء السنن، ۱/۸۵، طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة

وہ اپنی سند سے نقل کرتے ہیں :

"عن حمید بن یعقوب، سمع سعید بن المسیّب یقول :سمعت من عمر رضی الله عنه کلمةً ما بقی أحد من النّاس سمعها غیری. سمعتُه یقول إذا رأی البیت :اللّهمّ أنت السّلام ومنک السّلام، فحیّنا ربّنا بالسّلام".(السنن الکبری للبیهقی ج :۵ ص :۷۳)[۱]

(۲) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ روایت کے شاہد کے طور پر حضرت مکحولؒ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے :

"عن مکحول قال کان النبیّ صلّی الله علیه وسلّم إذا دخل مکة فرأی البیت رفع یدیه وکبّر وقال :اللّهم أنت السلام ومنک السلام فحیّنا ربّنا بالسلام .اللهمّ زد هذا البیت تشریفا وتعظیما ومهابة، وزد مَن حجّه أو اعتمره تکریماً وتشریفاً وتعظیماً وبرّا".(السنن الکبری ج: ۵ص :۷۳)[۲]

یہی روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی مذکور ہے (کتاب المناسک، حدیث : ۱۵۹۹۹[۳] وکتاب الدعاء ، حدیث : ۳۰۲۴۰)۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اسکی سند میں ابوسعید کے نام سے جو راوی ہے، وہ محمد بن سعید مصلوب ہے، اور وہ کذاب ہے (التلخیص الحبیر ج : ۲ص : ۵۲۶)[۴]۔

(۳) امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم اوسط میں حضرت حذیفہ بن اُسید ابو سریحہ غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے :

"أنّ النّبیّ صلّی الله علیه وسلّم کان إذا نظر إلی البیت قال :اللّهمّ

(۱و۲) ۵/۱۱۸ ، حدیث: ۹۲۱۳ ، طبع: دار الکتب العلمیة بیروت

(۳) الرجل اذا دخل المسجد الحرام ما یقول، ج: ۴، ص: ۹۷ ، طبع دار السلفیة الهندیة

(۴) کتاب الحج، باب دخول مکة وبقیة أعمال الحج الی آخرہا،۸۶۴/۳، حدیث:۱۰۰۶، ط: مصطفیٰ بزار

زد بیتک هذا تشریفاً وتعظیماً وتکریماً وبرّاً ومهابةً، وزد من شرّفه وعظّمه ممّن حجّه أو اعتمره تعظیماً وتشریفاً وتکریماً وبرّاً ومهابة".(المعجم الأوسط للطبرانیّ ج : ٦ ص : ۱۸۳، حدیث : ۶۱۳۲)[۱]

لیکن اسکی سند میں ایک راوی عاصم بن سلیمان الکوزی ہیں جنکے بارے میں علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ متروک ہیں۔(مجمع الزوائد ج:۳ ص : ۵۳۵، حدیث : ۵۴۶۲)[۲]

(۴) واقدی نے مغازی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

"عن ابن عباس رضی الله تعالی عنه أنّ رسول الله صلّی الله علیه وسلّم دخل مکّة نهاراً من کُدیً علی راحلته القصواء إلی الأبطح، حتّی دخل من أعلی مکّة حتّی انتهی إلی الباب الّذی یُقال له باب بنی شیبة .فلمّا رأی البیت رفع یدیه، فوقع زمام ناقته فأخذه بشماله .قالوا :ثمّ قال حین رأی البیت :اللّهمّ زد هذا البیت تشریفاً وتعظیماً وتکریماً ومهابةً وبرّاً" .(مغازی الواقدیّ ج: ۳ص : ۱۰۹۷)[۳]

لیکن واقدی خود متکلم فیہ راوی ہیں ، اور خاص طور پر احکام میں انکی روایات کو معتبر نہیں مانا گیا۔

(۵) امام طبرانیؒ ہی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے حضور اقدس

---

(۱) ۳۲۸/۴، حدیث: ۶۱۳۲، طبع: دار الکتب العلمیة بیروت

(۲) ۴۰۲/۴، حدیث: ۵۴۶۲، طبع: دار الکتب العلمیة بیروت

(۳) طبع مؤسسة الأعلمی للمطبوعات

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

"تُفتح أبواب السّماء ويُستجاب الدّعاء في أربعة مواطن :عند التقاء الصفوف في سبيل الله، وعند نزول الغيث، وعند إقامة الصلوة، وعند رؤية الكعبة".(المعجم الكبير للطبراني ج: ۸ص: ۱۶۹ حديث : ۷۷۱۳)[۱]

یہ حدیث امام بیہقیؒ کی السنن الکبریٰ (ج:۳ص:۵۰۲ حدیث:۶۴۶۰)[۲] میں، اور مسند ابویعلیٰ میں بھی مروی ہے، لیکن محدثین نے اسے عفیر بن معدان کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"رواه أبويعلى والبيهقيّ بسند ضعيف لضعف عفير بن معدان وتدليس الوليد بن مسلم "(اتحاف المهرة ج: ۲ص: ۵۰۲حديث ۶۴۶۰)[۳]

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث کتاب الاستسقاء میں مرسلاً روایت فرمائی ہے، لیکن اُس میں "عند رؤية البيت "کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

لیکن اس سے ملتی جلتی حدیث امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے:

"حدّثنا محمد بن عثمان بن أبي شيبة، ثنا محمد بن عمران بن أبي ليلى، حدثني أبي، ثنا ابن أبي ليلى، عن الحكم، عن مقسم، عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما عن النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم، قال :لاتُرفع الأيدى إلاّ في سبع مواطن :حين يفتتح الصّلوة، وحين

(۱) ۱۷۳/۱۰، حديث: ۱۷۲۵۳، طبع: دار الكتب العلمية بيروت
(۲) ۵۰۲/۳، حديث: ۶۴۶۰، طبع: دار الكتب العلمية
(۳) ج:۲،ص:۳۴۴ (طبع: دارالوطن)

يدخل المسجد الحرام فينظر إلى البيت، وحين يقوم على الصّفا، وحين يقوم على المروة، وحين يقف مع النّاس عشيّة عرفة، وبجمع، والمقامين حين يرمی الجمرة".(المعجم الكبير للطّبرانی ج: ۱۱ص: ۳۸۵حديث : ۱۲۴۶۱)[۱]

اس حدیث میں مسجد حرام میں داخلے کے وقت رفع یدین کا تذکرہ ہے، اور اگر اسکو حضرت ابن جریج کی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو اسکا تعلق پہلی نظر پڑنے ہی سے معلوم ہوتا ہے۔اس حدیث کی سند متصل ہے، (جبکہ امام شافعیؒ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہی حدیث جو بحث کے شروع میں نقل کی گئی ہے وہ منقطع تھی) لیکن اس کی سند میں محمد بن ابی لیلیٰ ہیں جنکے حافظے کے بارے میں کلام ہوا ہے،لیکن انکی روایات کو بہت سے محدثین نے حسن قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا ہے :

"رواه الطبرانی فی الكبير والأوسط، وفی الإسناد الأوّل محمد بن أبی ليلی، وهو سیّء الحفظ، وحديثه حسن إن شاء الله"(مجمع الزوائد ج: ۳ص: ۵۳۴ حديث: ۵۴۶۱)[۲]

یہی حدیث الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ امام طحاویؒ نے محمد بن ابی لیلیٰ ہی کے طریق سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں سے روایت کی ہے،اور حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اسے نقل کر کے فرماتے ہیں:

"رجاله ثقات، غير ما فی محمدبن أبی ليلی من المقال، ولكنّه حسن الحديث كما مرّ غير مرّة".(إعلاء السنن،ج : ۱۰ص: ۶۷)[۳]

---

(۱) ج: ۱۱، ص: ۳۸۵، طبع مكتبه دار العلوم والحكم، الموصل

(۲) ۳/۴۰۱، حديث: ۵۴۶۱، طبع: دار الكتب العلمية بيروت

(۳) كتاب الحج، باب رفع اليدين عند استلام الحجر تحت رقم الحديث: ۲۶۳۵،۱۰/۶۷، طبع: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا متعدد روایات میں مذکور ہے۔ ان میں سے اکثر روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن دو حدیثیں حنفیہ کے اصول پر قابل استدلال بھی ہیں، ایک ابن جریجؒ کی مرسل حدیث اور دوسرے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ آخری حدیث جو "حسن" کے درجے تک پہنچتی ہے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ثابت ہے کہ وہ کعبہ شریف کو دیکھ کر دعا کیا کرتے تھے۔ اس لئے پہلی نظر کیوقت دعا کرنا مستحب ہے، البتہ جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہر بار نظر پڑنے پر ہاتھ اٹھانا یا دعا کرنے کا ثبوت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۱ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ

۷ اکتوبر ۲۰۱۴ء

فصل فی متفرقات الحظر والإباحۃ

(جائز وناجائز کے متفرق مسائل)

کھڑے ہوکر ایک ہی سانس میں پانی پینے کا حکم

سوال:- سبیل پر کھڑے ہوکر ایک ہی سانس میں پانی پینے کی اجازت ہے؟

جواب:- کھڑے ہوکر پانی پینا بھی مکروہ ہے[1] اور ایک ہی سانس میں پی جانا بھی خلاف سنت ہے،[2] لہٰذا اس طریقے میں دو کراہتیں جمع ہوگئیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۰۰۱ ج)

---

(۱) وفی صحیح المسلم باب کراهیة الشرب قائماً ج: ۲ ص: ۱۱۰ (طبع دار الجیل بیروت) عن أنسؓ أن النبی صلی الله علیه وسلم زجر عن الشرب قائماً.

وفیه أیضاً بعده (۵۳۹۲) عن أبی سعید الخدریؓ أن النبی صلی الله علیه وسلم زجر عن الشرب قائما.

و راجع أیضاً تکملة فتح الملهم کتاب الأطعمة باب کراهیة الشرب قائماً ج:۴ ص: ۹ (طبع دار العلوم کراچی)

وفی الدر المختار کتاب الطهارة مطلب فی مباحث الشرب قائماً ج: ۱ ص: ۱۲۹ (طبع سعید) وأن یشرب بعده من فضل وضوئه کماء زمزم مستقبل القبلة قائما أو قاعدا، وفیما عداهما یکره قائما تنزیها.

وفی الشامیة تحته (قوله :أو قاعدا) أفاد أنه مخیر فی هذین الموضوعین، وأنه لا کراهة فیهما فی الشرب قائما بخلاف غیرهما.

(۲) وفی صحیح البخاری کتاب الأشربة باب النهی عن التنفس فی الإناء ج: ۲ ص: ۸۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه)قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :إذا شرب أحدکم فلا یتنفس فی الإناء ، وإذا بال أحدکم فلا یمس ذکره بیمینه،وذا تمسح احد کم فلا یتمسح بیمینه.

باب الشرب بنفسین أو ثلاثة .... کان أنس، یتنفس فی الإناء مرتین أو ثلاثا، وزعم أن النبی صلی الله علیه وسلم کان یتنفس ثلاثا. الخ

وفی تکملة فتح الملهم کتاب الأطعمة باب کراهة التنفس فی نفس الإناء و استحباب التنفس ثلاثاً خارج الإناء (طبع دار العلوم کراچی) قال المأذری أی یقطع شربه بأن یبین القدح عن فیه لا أنه یتنفس فی الإناء ثلاثاً لأنه صحت الأحادیث بالنهی عن ذلک.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

مردار کی چربی سے بنائے گئے صابن اور گلیسرین کا حکم

سوال:- امریکہ میں صابن اور گلیسرین عام طور پر جانوروں کی چربی سے بنائے جاتے ہیں، اس میں غیرذبیحہ گائے کی چربی یا سور کی چربی استعمال ہوتی ہے، کیا یہ صابن استعمال کرنا جائز ہے؟ گلیسرین کچھ کھانے کی چیزوں میں بذاتِ خود بھی ملائی جاتی ہے اور اس سے کچھ کیمیائی مرکب بھی بنائے جاتے ہیں جو کھانے کی چیزوں میں پڑتے ہیں، اس طرح کی چیزیں کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب:- جو صابن یا گلیسرین مردار کی چربی سے بنائے گئے ہوں، اگر اُن کو بناتے وقت کیمیاوی عمل کے ذریعے چربی کی حقیقت بدل کر کچھ اور ہو جائے اور ظاہر یہی ہے کہ صابن بن جانے سے چربی کی حقیقت بدل جاتی ہے تو یہ صابن اور گلیسرین پاک ہے۔

قال الشامی: وعبارة المجتبیٰ جعل الدهن النجس فی الصابون یفتی بطهارته لأنه تغیر والتغیر یطهر عند محمد و یفتیٰ به للبلوی اھ وظاهره أن دهن المیتة کذلک لتعبیره بالنجس دون المتنجس ...... وعلیه یتفرع ما لو وقع إنسان أو کلب فی قدر الصابون فصار صابوناً یکون طاهرا لتبدّل الحقیقة. (شامی ص: ۲۱۰ باب الأنجاس)[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۶۵ ب)

(گذشتہ سے پیوستہ) و راجع أیضاً إلی زاد المعاد فصل فی هدیه صلی الله علیه وسلم فی الشراب ج: ۴ ص: ۲۲۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

(۱) رد المحتار کتاب الطهارة باب الأنجاس ج: ۱ ص: ۳۱۶ (طبع سعید)

وفی الفتاوی الهندیة کتاب الطهارة الباب السابع فی النجاسة الفصل الأوّل فی تطهیر الأنجاس ج: ۱ ص: ۴۵ (طبع رشیدیه) جعل الدهن النجس فی الصابون یفتی بطهارته؛ لأنه تغیر. کذا فی الزاهدی.

(جاری ہے)

دینی ذہن سازی کی نیت سے اسکول پڑھانے کے دوران چند منکرات

سوال:- راقم اسکول میں اس نیت سے پڑھاتا ہے کہ بچوں کا دماغ اسلامی ہوجائے، لیکن سرکاری ملازمت میں چند ایسے اُمور بجالانے پڑتے ہیں جو طبیعت کو ناگوار ہوتے ہیں، مثلاً قومی ترانہ کے وقت اساتذہ اور بچوں کو کھڑا ہونا پڑتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اسکول میں اس نیت سے پڑھانا کہ بچوں کا دماغ اسلام کی طرف مائل ہو، موجبِ اجروثواب ہے، البتہ وہاں جو منکرات پیش آئیں، اُن سے حتی الامکان پرہیز کی کوشش کریں، مجبوری سے مبتلا ہوجائیں تو استغفار کرتے رہیں۔ واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷و)

مسجد میں استعمال شدہ پتھر خریدنے کے بعد گھر میں لگانے کا حکم

سوال:- مدنی مسجد کے پتھروں کو منتظمین مسجد سے ایک نمازی نے خریدا ہے اور وہ ان پتھروں کو گھر کے استعمال میں لانا چاہتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک عرصہ سے ان پتھروں پر سجدہ ہورہا ہے، اس لئے ان کا استعمال گھر میں جائز نہیں ہے، کیا وہ نمازی ان پتھروں کو گھر میں مستعمل کرسکتا ہے؟

جواب:- پتھر خریدنے کے بعد خریدنے والا مصلی انہیں اپنے گھر کے استعمال میں لاسکتا ہے، البتہ اگر انہیں ایسی جگہ استعمال نہ کرے تو بہتر ہے، جہاں واضح بے حرمتی ہوتی ہو، مثلاً پاخانہ

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی المحیط البرهانی الفصل السابع فی النجاسات و أحکامها ج: ۱ ص: ۲۴۵ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) وقد وقع عند بعض الناس أن الصابون نجس؛ لأنه یتخذ من دهن الکتان، ودهن الکتان نجس لأن أوعیته تکون مفتوحة الرأس.............. ولکنا لا نفتی بنجاسة الصابون لأنا لا نفتی بنجاسة الدهن؛ لأن الأصل الطهارة، والنجاسة یعارض أمراً نادراً وقع، إنما نفتی بنجاسة الدهن، ولا نفتی بنجاسة الصابون؛ لأن الدهن قد تغیر وصار شیئاً آخر، وقد ذکرنا أن من مذهب محمد رحمه الله أن النجس یصیر طاهراً بالتغییر، یفتی فیه بقول محمد رحمه الله لمکان عموم البلوی

وغیرہ میں۔[1]

والله اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۹۶ الف)

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ

"عید مبارک" کہنے کا حکم

سوال:- عید کے دن مبارک بادی دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- عید مبارک کہنے میں کچھ حرج نہیں[2] بشرطیکہ اسے سنت یا واجب نہ سمجھ لیا جائے۔

۱۳۹۲/۱۲/۵

(فتویٰ نمبر ۸/۲۷۸ ۲۷و)

---

(۱) وفی الدر المختار ص: ۱۷۸ ج: ۱ قبیل باب المیاه، ولا ترمی برایة القلم المستعمل لاحترامه کحشیش المسجد و کناسته لا یلقی فی موضع یخلّ بالتعظیم.

وفی البحر الرائق ج: ۲ ص: ۶۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) یجوز رمی برایة القلم الجدید ولا یرمی برایة القلم المستعمل لاحترامه کحشیش المسجد وکناسته لا تلقی فی موضع یخل بالتعظیم اهـ. ذکره فی الکراهیة.

وفی الهندیة کتاب الکراهیةالباب الخامس فی آداب المسجد والقبلة ج: ۵ ص: ۳۲۴ (طبع رشیدیه) ویجوز رمي برایة القلم الجدید، ولا ترمی برایة المستعمل لاحترامه، کحشیش المسجد وکناسته لا یلقی فی موضع یخل بالتعظیم، کذا فی القنیة. الخ

(۲) وفی السنن الکبری للبیهقی کتاب صلاة العیدین، باب ما روی فی قول الناس یوم العید بعضهم لبعض :تقبل الله منا ومنک ج: ۳ ص: ۳۱۹ (طبع مجلس دائرة المعارف نظامیه حیدرآباد)وج وج ۳ ص ۴۴۶(طبع دار الکتب العلمیه بیروت) عن خالد بن معدان قال :لقیت واثلة بن الأسقع فی یوم عید , فقلت :تقبل الله منا ومنک ,فقال " :نعم، تقبل الله منا ومنک , "قال واثلة " :لقیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم عید فقلت :تقبل الله منا ومنک ,قال " :نعم ,تقبل الله منا ومنک.

وفیه أیضاً بعد هذا الحدیث: عن خالد بن معدان، عن واثلة قال :لقیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم عید، فقلت :تقبل الله منا ومنک ,قال " :نعم ,تقبل الله منا ومنک.

وفی فتح الباری ج: ۱۲ ص: ۲۳۹ (طبع دار المعرفة بیروت) عن واثلة أنه لقی رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم عید فقال تقبل الله منا ومنک فقال نعم تقبل الله منا ومنک

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ)وفی إسناده محمد بن إبراهيم الشامي وهو ضعيف وقد تفرد به مرفوعا وخولف فيه
وفى خلاصة الأحكام فى مهمات السنن وقواعد الإسلام للنووی ج: ۲ ص: ۸۴۹ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) باب لا بأس بقول الإنسان يوم العيد لغيره :تقبل الله منا ومنک "، ونحو هذا من الدعاء وجاء فى استحبابه وكراهته حديثان ضعيفان جدا، رواهما البيهقى، وبين ضعفهما.
وفى مجمع الزوائد للهيثمی ابواب العيدين، ج: ۵ ص: ۳۷۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) (باب التهنئة بالعيد) عن حبيب بن عمر الأنصارى قال :حدثنى أبى قال :لقيت واثلة يوم عيد فقلت :تقبل الله منا ومنک فقال :(نعم) تقبل الله منا ومنک رواه الطبرانى فى الكبير وحبيب قال الذهبى :مجهول، وقد ذكره ابن حبان فى الثقات، وأبوه لم أعرفه.
وفى تمام المنة للألبانى ج: ۱ ص: ۳۷۰ (طبع دار الراية للنشر والتوزيع اردن) وفى استحباب التهنئة بالعيد قوله" :عن جبير بن نفير قال :كان أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم إذا التقوا يوم العيد يقول بعضهم لبعض :تقبل الله منا ومنک .قال الحافظ :إسناده حسن." قلت :المراد بـ "الحافظ "عند الإطلاق ابن حجر العسقلانى ولم أقف على هذا التحسين فى شىء من كتبه وإنما وجدته للحافظ السيوطى فى رسالته" :وصول الأمانى فى أصول التهانى ".
وفى البحر الرائق ج: ۴ ص: ۴۴۴ (طبع دار إحياء التراث العربى بيروت) والتهنئة بقوله تقبل الله منا ومنكم لا تنكر.
وفى المبدع شرح المقنع ج:۲ ص: ۱۷۶ (طبع دار عالم الكتب رياض) لا بأس قوله لغيره تقبل الله منا و منک الخ
وفى الدر المختار ج: ۲ ص: ۱۶۹ (طبع سعيد) والتهنئة بتقبيل الله منا و منكم لا تنكر.
وفى الشامية تحته (قوله لا تنكر) خبر قوله والتهنئة وإنما قال كذلک لأنه لم يحفظ فيها شىء عن أبى حنيفة وأصحابه، وذكر فى القنية أنه لم ينقل عن أصحابنا كراهة وعن مالک أنه كرهها، وعن الأوزاعى أنها بدعة، وقال المحقق ابن أمير الحاج :بل الأشبه أنها جائزة مستحبة فى الجملة ثم ساق آثارا بأسانيد صحيحة عن الصحابة فى فعل ذلک ثم قال :والمتعامل فى البلاد الشامية والمصرية "عيد مبارک عليک" ونحوه وقال يمكن أن يلحق بذلک فى المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم فإن من قبلت طاعته فى زمان كان ذلک الزمان عليه مباركا على أنه قد ورد الدعاء بالبركة فى أمور شتى فيؤخذ منه استحباب الدعاء بها هنا أيضا .اهـ

لے پالک کے شرعی احکام

(لے پالک سے متعلق نسب، پردہ، میراث، ولدیت کے نام وغیرہ کے شرعی احکام)

سوال:- میری کوئی اولاد نہیں ہے، میری شادی کو تقریباً ۱۵ سال ہو چکے ہیں، کیا دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد بنانا جائز ہے، اگر جائز ہے تو کیا میرے مرنے کے بعد اس کا حق شرعاً میری جائیداد اور روپیہ میں ہوگا اور اس کی ولدیت میں اپنا نام لکھ سکتا ہوں۔

اگر کسی بچے کی ولدیت معلوم نہ ہو جیسے ولد الزنا بچہ، اس صورت میں ولدیت میں کس کا نام لکھا جائے؟

جواب:- آپ کسی کے بچے کو لیکر اس کی پرورش کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، لیکن شرعاً وہ آپ کا حقیقی بیٹا نہ ہوگا[1] نہ جائیداد میں آپ کا وارث ہوگا[2] ہاں! اگر آپ اس کے لئے اپنے کل ترکے کے ایک تہائی حصہ[3] کی حد تک کوئی وصیت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔[4] اس صورت میں اُسے آپ کی وصیت کے مطابق جائیداد میں سے حصہ ملے گا۔[5] البتہ اس کی ولدیت میں آپ کا نام لکھنا جائز نہ ہوگا۔[6] اور اس کے بالغ ہو جانے کے بعد آپ کی بیوی پر اس سے پردہ بھی واجب ہوگا۔[7]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۷۰/۳۲ ج)

(۱ و ۲ و ۶) قال الله تعالى: وما جعل أدعيا ئكم أبنائكم (الأحزاب: ۴) أدعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله (الأحزاب: ۵)

وفي تفسير ابن كثير ج: ۲ ص: ۲۵۳ (طبع دار طيبه للنشر والتوزيع)قوله وحلائل أبنائكم الذين من اصلابكم، أى وحرمت عليكم زوجات أبنائكم الذين ولدتموهم من أصلابكم، يحترز بذلك عن الأدعياء الذين كانوا يتبنونهم في الجاهلية.

وفيه أيضاً ج: ۶ ص: ۳۷۷ (طبع دار طيبه للنشر والتوزيع) أدعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله هذا أمر ناسخ

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) لما كان فى ابتداء الإسلام من جواز ادعاء الأبناء الأجانب وهم الأدعياء ، فأمر الله تعالى برد نسبهم إلى آبائهم فى الحقيقة، وأن هذا هو العدل والقسط.

وفى روائع البيان تفسير آيات الأحكام ج: ۲ ص: ۲۵۴ (طبع مكتبة الغزالى دمشق) أدعيائكم جمع دعى وهو الذى يدعى ابناً وليس بابن وهو التبنى الذى كان فى الجاهلية و أبطله الإسلام.

وفى جامع البيان لأبى جعفر الطبرى ج: ۱۶ ص: ۱۸۰. دعاؤكم إياهم لآبائهم هو أعدل عند الله، وأصدق وأصوب من دعائكم إياهم لغير آبائهم ونسبتكموهم إلى من تبنَّاهم وادّعاهم وليسوا له بنين .... فهم إخوانكم فى الدين، إن كانوا من أهل ملّتكم، ومواليكم إن كانوا محرّريكم وليسوا ببنيكم.

وفى تفسير ابن كثيرج ۳ص ۶۱۰ط حقانيه: ذلكم قولكم بأفواهكم (الأحزاب: ۴) يعنى تبنيكم لهم قول لا يقتضى أن يكون ابنا حقيقيا، فإنه مخلوق من صلب رجل آخر، فما يمكن أن يكون له أبوان كما لا يمكن أن يكون للبشر الواحد قلبان.

وفى أحكام القرآن للجصاصؒ ج: ۳ ص: ۳۵۴ (طبع دار الكتاب العربى بيروت) (ذلكم قولكم بأفواهكم) يعنى أنه لا حكم له وإنما قول لا معنى له ولا حقيقة.

وفى تفسير أبى السعود ج: ۴ ص: ۴۰۰ (مكتبة الرياض) (قولكم بأفواهكم) فقط من غير أن يكون له مصداق وحقيقة فى الأعيان فإذن هو بمعزل من استتباع أحكام البنوة كما زعمتم.

وفى أيسر التفاسير ج: ۱ ص: ۳۴۱۸. لا يصير الدعى ابنا لمن تبناه، بمجرد ادعاء الرجل المتبنى أن الولد المتبنى (الدعى) ابنه بالتبنى .وقول الرجل لزوجته :أنت على كظهر أمى، ودعوة الرجل الولد المتبنى أنه ابنه، إنما هو قول هؤلاء القائلين بأفواههم، ولا حقيقة له فى الواقع ولا حكم، فلا تصير الزوجة أما لزوجها، ولا يثبت بدعوى البنوة نسب الولد المتبنى لمن تبناه .والله يقول الحق والصدق .... أدعيائكم -من تتبنونهم من أبناء غيركم .... ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله (الآية) ينسخ الله تعالى فى هذه الآية حكم التبنى الذى كان معمولا به فى الجاهلية، فقد كان التبنى جائزا وظل حكم التبنى ساريا فى ابتداء أمر الإسلام، فكان الرجل يتبنى ولد غيره، فيصبح حكمه حكم الولد من الصلب، فى أمور النسب والميراث ولكن الله تعالى نسخ حكم التبنى فى هذه الآية .وأمر المؤمنين برد نسبة الأدعياء (الأولاد بالتبنى) إلى آبائهم الحقيقيين، لأن هذا هو العدل والقسط والبر الخ.

وفى أحكام القرآن للتهانوى ج: ۳ ص: ۲۹۱ (طبع إدارة القرآن) الثانى أن الدعى والمتبنّىٰ لا يلحق فى الأحكام بالابن فلا يستحق الميراث ولا يرث عنه المدعى الخ.

وفى تنوير الأبصار كتاب الفرائض ج: ۶ ص: ۷۶۲ (طبع سعيد) ويستحق الإرث برحم و نكاح وولاء.

وفى مجمع الأنهر شرح الملتقى ج: ۴ ص: ۴۹۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) و يستحق الإرث بنسب و نكاح و ولاءِ الخ

(جاری ہے)

پرانی قبر پر وضو کا پانی بہانے کا حکم

سوال:- (۱)... پرانی قبر کے اُوپر وضو کا پانی گرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- قال ابن عابدین فی رد المحتار: قلت :وتقدم أنه إذا

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی تفسیر ابن کثیر ج: ۳ ص: ۴۶۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) كانوا يعاملونهم معاملة الأبناء من كل وجه فی الخلوة بالمحارم وغير ذلک، ولهذا قالت سهلة بنت سهيل امرأة أبی حذيفة رضی الله عنهما :يا رسول الله إنا كنا ندعو سالما ابنا، وإن الله قد أنزل ما أنزل، وإنه كان يدخل علی وإنی أجد فی نفس أبی حذيفة من ذلک شيئا، فقال صلی الله عليه وسلم أرضعيه تحرمی عليه.

(۳) وفی صحيح البخاری ج: ۲ ص: ۸۲ (طبع دار الفكر بيروت) عن ابن شهاب، عن عامر بن سعد بن أبی وقاص، عن أبيه رضی الله عنه، قال :كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يعودنی عام حجة الوداع من وجع اشتد بی، فقلت :إنی قد بلغ بی من الوجع وأنا ذو مال، ولا يرثنی إلا ابنة، أفأتصدق بثلثی مالی؟ قال :لا فقلت :بالشطر؟ فقال :لا ثم قال :الثلث والثلث كبير -أو كثير. (الحديث)

وفی البحر الرائق ج: ۲ ص: ۲۲۲ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما يبقی بعد الكفن والدين.

وفی السراجی ص: ۳ (طبع سعيد) ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقی بعد الدين.

وكذا فی المبسوط للسرخسیؒ ج: ۲۲ ص: ۷۳ (طبع دار المعرفة بيروت) و مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر ج: ۴ ص: ۴۹۵ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۴ و ۵) وفی الدر المختار ج: ۶ ص: ۶۴۹ (طبع سعيد) وشرائطها .... كون الموصٰی له .... غير وارث .... و تجوز بالثلث للأجنبی.

وفی البحر الرائق ج: ۱۹ ص: ۴۱۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) أن الوصية بالثلث للأجنبی جائزة.

وفی تبيين الحقائق كتاب الوصايا ج ۷ ص۳۷۵ (طبع سعيد): ثم تصح الوصية للأجنبی بالثلث من غير إجازة الوارث ولا تجوز بما زاد علی الثلث الخ.

نیز دیکھئے سابقہ حاشیہ

(۷) وفی تفسير ابن كثير ج: ۳ ص: ۴۶۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) وقد كانوا يعاملونهم معاملة الأبناء من كل وجه فی الخلوة بالمحارم وغير ذلک، ولهذا قالت سهلة بنت سهيل امرأة أبی حذيفة رضی الله عنهما :يا رسول الله إنا كنا ندعو سالما ابنا، وإن الله قد أنزل ما أنزل، وإنه كان يدخل علی وإنی أجد فی نفس أبی حذيفة من ذلک شيئا، فقال صلی الله عليه وسلم أرضعيه تحرمی عليه.

نیز دیکھئے سابقہ ص: ۴۹۶ کا حاشیہ نمبر ۱و۲و۶۔

بلى الميت، وصار ترابا يجوز زرعه، والبناء عليه، ومقتضاه جواز المشي فوقه .ثم رأيت العينیؒ فی شرحه على صحيح البخاری ذكر كلام الطحاوی المار، ثم قال :فعلى هذا ما ذكره أصحابنا فی كتبهم من أن وطء القبور حرام وكذا النوم عليها ليس كما ينبغی، فإن الطحاوی هو أعلم الناس بمذاهب العلماء ولا سيما بمذهب أبی حنيفة انتهی. قلت :لكن قد علمت أن الواقع فی كلامهم التعبير بالكراهة لا بلفظ الحرمة، وحينئذ فقد يوفق بأن ما عزاه الإمام الطحاوی إلى أئمتنا الثلاثة من حمل النهی على الجلوس لقضاء الحاجة يراد به نهی التحريم، وما ذكره غيره من كراهة الوطء والقعود إلخ يراد به كراهة التنزيه فی غير قضاء الحاجة.(رد المحتار ص: ۸۴۲ ج: ۱)[۱]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبر پر چلنا اور بیٹھنا جبکہ وہ قضاءِ حاجت کے لئے نہ ہو، مکروہِ تنزیہی ہے۔[۲] اور اگر میت پرانی اور مٹی بن چکی ہو تو اس پر کھیتی کرنا یا عمارت بنانا بھی بالکل جائز ہے۔[۳]

---

(۱) رد المحتار باب صلوٰة الجنائز ج: ۲ ص: ۲۴۵ (طبع سعید)

(۲) وفی شرح معانی الآثار باب الجلوس على القبر ج: ۲ ص: ۴۰۵. قال أبو جعفر :فذهب قوم إلى هذه الآثار فقلدوها ,وكرهوا من أجلها الجلوس على القبور وخالفهم فی ذلک آخرون ,فقالوا :لم ينه عن ذلک لكراهة الجلوس على القبر ,ولكنه أريد به الجلوس للغائط أو البول الخ

وفی شرح البخاری لابن بطالؒ ج: ۵ ص: ۳۸۲ . وعن أبی بكرة وابن مسعودؓ لأن أطأ على جمرة نار حتى تطفأ أحبّ إلی من أن أطأ على قبر، و أخذ النخعی و مكحول والحسن وابن سيرين بهذه الأحاديث و جعلوها على العموم، و كرهوا المشی على القبور والقعود عليها و أجاز مالک والكوفيون الجلوس على القبور وقالوا: إنما نهی عن القعود عليها للمذاهب فيما نرٰى، والله أعلم، يريد حاجة الإنسان و احتج بعضهم بأنّ على ابن أبی طالب كان يتوسد القبور ويضطجع عليها و روى أبوأمامة بن سهل بن حنيف أن زيد بن ثابت قال: هلم يا ابن أختی ! أخبرک أنما نهی رسول الله ﷺ عن الجلوس على القبر لحدث بول أو غائط الخ.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) وکذا فی الاستذکار لأبی عمر المزی ج: ۳ ص: ۶۳ و ۶۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)
وفی شرح أبی داؤد للعینی باب کراھیة القعود علی القبر ج: ۶ ص: ۱۸۴ و۱۸۶ (طبع مکتبة الرشد ریاض) ویستفاد من الحدیث مسألتان الأولیٰ کراھة الجلوس علی القبر والثانیة کراھة الصلوة إلیھا الخ
وکذا فی فتح الباری ج: ۱۰ ص: ۳۰۹ (طبع دار المعرفة بیروت)
وفی العرف الشذی للکشمیری ج: ۲ ص: ۴۳۹ (طبع مؤسسة ضحی للنشر والتوزیع) "باب کراھیة الوطئ علی القبر والجلوس علیه" یکره الوطء أی المشی علی القبر، واختار الطحاوی الکراھة، واختار الشیخ الکمال الکراھة تنزیھا، والجلوس علی القبر .قیل :معناه قضاء الحاجة من البول والغائط علی القبر، وقیل :الجلوس المعروف، وھذا أیضا مکروه. الخ
وفی تحفة الأحوذی باب ما جاء فی کراھیة الوطئ علی القبور) والجلوس علیھا والصّلوة علیھا وفی بعض النسخ باب فی کراھیة المشی علی القبور .... (لا تجلسوا علی القبور) فیه دلیل علی تحریم الجلوس علی القبر وإلیه ذھب الجمھور قاله الشوکانی قال ا بن الھمام وکره الجلوس علی القبر ووطؤه وحینئذ فما یصنعه الناس ممن دفنت أقاربه ثم دفنت حوالیه خلق من وطأ تلک القبور إلی أن یصل إلی قبر قریبه مکروه ویکره النوم عند القبر وقضاء الحاجة بل أولی الخ.
وفی البحر الرائق ج: ۵ ص: ۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وفی المجتبی ویکره أن یطأ القبر أو یجلس أو ینام علیه أو یقضی علیه حاجة من بول أو غائط أو یصلی علیه أو إلیه ثم المشی علیه یکره، وعلی التابوت یجوز عند بعضھم .... وفی فتح القدیر ویکره الجلوس علی القبر ووطؤه الخ
وکذا فی الشامیة مطلب فی زیارة القبور ج: ۲ ص: ۲۴۵ (طبع سعید) و مجمع الأنھر ج: ۱ ص: ۲۷۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)
وفی بدائع الصنائع ج: ۲ ص: ۴۸۷ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وکره أبو حنیفة أن یوطأ علی قبر، أو یجلس علیه، أو ینام علیه أو تقضی علیه حاجة من بول أو غائط لما روی عن النبی -صلی الله علیه وسلم -أنه نھی عن الجلوس علی القبور.
وفی تبیین الحقائق شرح الکنز (کیفیة صلوٰة الجنازة) ج: ص: ویکره أن یبنی علی القبر أو یقعد علیه أو ینام علیه أو یوطأ علیه أو یقضی علیه حاجة الإنسان من بول أو غائط أو یعلم بعلامة .... وحمل الطحاوی الجلوس المنھی عنه علی الجلوس لقضاء الحاجة الخ
(۳) وفی البحر الرائق ج: ۵ ص: ۲ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ولو بلی المیت و صار تراباً جاز دفن غیره فی قبره و زرعه والبناء علیه الخ
وفی الشامیة ج: ۱ ص ۲۳۳ (طبع سعید) . وقال الزیلعی ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیره فی قبره و زرعه والبناء علیه .

(جاری ہے)

وضوکا مستعمل پانی گرانا ان کاموں سے زیادہ موجب توہین یا خلاف تعظیم نہیں ہے، کیونکہ مستعمل پانی صحیح قول کی بناء پر پاک ہے، اگرچہ دوسری چیز کو پاک نہیں کرسکتا، جیسے کہ تنویر الابصار میں ہے: و هو طاهر ليس بطهور (شامی ص:۱۸۵ و ۱۸۶ ج:۱)[۱]

اس لئے یہ فعل زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی اور خلافِ اولیٰ ہے، ناجائز نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ احتیاط نہ کرنے میں ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ

یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ وضوکا مستعمل پانی بعض ائمہ کے نزدیک نجس ہے۔[۲] بعض کے نزدیک طاہر غیر مطہر۔[۳] دونوں حالتوں میں وضوکا مستعمل پانی کسی چیز پر ڈالنا اس کے احترام کے خلاف ہے اور قبور کا احترام احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔[۴] اس لئے جو قبریں سالم اور آباد موجود ہیں، ان پر وضوکا مستعمل پانی گرانا کراہت سے خالی نہیں۔[۵] اور اگر قبر پرانی ہوکر مندرس ہوچکی اور اس حالت میں پہنچ گئی کہ بغلبۂ ظن اس کی میت مٹی ہوگئی ہے اور قبر بے نشان ہوگئی ہے تو اب یہ جگہ عام زمین کے حکم میں ہے، قبر کے احکام ختم ہوگئے۔ اگر زمین کسی کی مملوک ہے تو اس کی اجازت سے اس میں ہر طرح کا تصرف جائز ہے، بدوں اس کی اجازت کے

(گذشتہ سے پیوستہ) وفي تبيين الحقائق، كيفية صلوٰة الجنازة ج: ١ ص: ٥٨٩ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) ولو بلى الميت و صار تراباً جاز دفن غيره في قبره و زرعه والبناء عليه.

وفي الفتاوى الهندية الفصل السادس في القبر والدفن الخ ج ١ ص ١٦٧ (طبع رشيدية) الباب الحادى وعشرون في الجنائز، ولو بلى الميت و صار تراباً جاز دفن غيره في قبره و زرعه والبناء عليه. كذا في التبيين.

(١) تنوير الأبصار كتاب الطهارة باب المياه (١/ ٢٠٠) (ط. سعيد)

وفي المحيط البرهاني ج: ١ ص: ١٢٩ (طبع دار إحياء التراث العربي بيروت) اتفق أصحابنا أن الماء المستعمل ليس بطهور حتى لا يجوز التوضؤ به، ولا يجوز غسل شيء من النجاسات به. واختلفوا في طهارته، قال محمد رحمه الله: هو طاهر، وهو رواية أبي حنيفة رحمه الله وعليه الفتوى.

نیز تفصیلی حوالہ جات وعبارات اگلے حاشیہ نمبر ۲ و ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ و ۳) وفي المحيط البرهاني الفصل الرابع في المياه الخ (باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) ج: ۱ ص: ۱۳۰ (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت) واختلفوا فی طهارته، قال محمد رحمه الله :هو طاهر، وهو رواية أبی حنيفة رحمه الله وعليه الفتوى .وقال أبو يوسف رحمه الله: هو نجس نجاسة خفيفة، وهو رواية عن أبی حنيفة .وقال الحسن بن زياد :نجس نجاسة غليظة، كالبول والدم، وهو رواية عن أبی حنيفة وعند زفر :هو طاهر طهور .وقال الشافعی :إن كان المستعمِل محدثاً فهو كما قال محمد طاهر غير طهور، وإن كان المستعمِل طاهراً فهو كما قال زفر طاهر وطهور.

وفی الهداية ج: ۱ ص: ۳۷ و ۳۸ (طبع مكتبة رحمانيه) الماء المستعمل لا يطهر الأحداث خلافاً للمالك والشافعیؒ هما يقولان إن الطهور ما يطهر غيره مرّة بعد أخرى كالقطوع وقال زفر وهو أحد قولی الشافعیؒ إن كان المستعمل متوضياً فهو طهور و إن كان محدثا فهو طاهر غير طهور .... وقال محمدؒ وهو رواية عن أبی حنيفةؒ هو طاهر غير طهور .... وقال أبوحنيفةؒ و أبويوسفؒ: هو نجس .... ثم فی رواية الحسن عن أبی حنيفةؒ نجاسة غليظة اعتباراً بالمستعمل فی الحقيقة و فی رواية أبی يوسفؒ عنه و هو قوله نجاسة خفيفة لمكان الاختلاف.

وكذا فی المبسوط للسرخسی ج: ۱ ص: ۸۲ (طبع دار الفكر بيروت) واللباب فی الجمع بين السنة والكتاب كتاب الطهارة ج: ۱ ص: ۴۸ (دار القلم دمشق)

وفی بدائع الصنائع ج: ۱ ص: ۱۹۴ (طبع مكتبة حبيبه كوئٹه) وروى محمد عن أبی حنيفة أنه طاهر غير طهور وبه أخذ الشافعی، وهو أظهر أقوال الشافعی، وروى أبو يوسف والحسن بن زياد عنه أنه نجس، غير أن الحسن روى عنه أنه نجس نجاسة غليظة يقدر فيه بالدرهم وبه أخذ وأبو يوسف روى عنه أنه نجس نجاسة خفيفة يقدر فيه بالكثير الفاحش وبه أخذ وقال زفر :إن كان المستعمل متوضئا فالماء المستعمل طاهر وطهور، وإن كان محدثا فهو طاهر غير طهور وهو أحد أقاويل الشافعی، وفی قول له أنه طاهر وطهور بكل حال، وهو قول مالك، ثم مشايخ بلخ حققوا الخلاف فقالوا :الماء المستعمل نجس عند أبی حنيفة وأبی يوسف. وعند محمد طاهر غير طهور، ومشايخ العراق لم يحققوا الخلاف فقالوا :إنه طاهر غير طهور عند أصحابنا.

وفی مجمع الأنهر شرح الملتقى ج: ۱ ص: ۴۸ و ۴۹ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) الماء المستعمل طاهر غير مطهر و هو ظاهر الرواية عن الإمام و عليه الفتوى لعموم البلوىٰ، وقال مالك طاهر و مطهر .... وللشافعی ثلٰثة أقوال أقوال وأظهرها كقول محمد.وفی قول :طاهر ومطهر كقول مالك، وفی آخر أن المستعمل إن كان محدثا فهو طاهر غير مطهر وإن كان متوضئا فهو طاهر ومطهر، وهو قول زفر. (وعن الإمام أنه نجس مغلظ) فی رواية الحسن عنه وهو رواية شاذة غير مأخوذ بها. وعن أبی يوسف مخفف للاختلاف.

(۴ و ۵) وفی سنن أبی داؤد كتاب الجنائز باب فی كراهية القعود على القبر ج: ۲ ص: ۱۰۴ (طبع مكتبة إمدادية) عن أبی هريرة ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لأن يجلس أحدكم على جمرة فتحرق ثيابه، حتى تخلص إلى جلده، خير له من أن يجلس على قبر.

و جاء بعد هذا .... قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تجلسوا على القبور ولا تصلّوا إليها.

وفی سنن النسائی: عن عمرو بن حزم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تقعدوا على القبور.

وفی المستدرک على الصحيحين ج: ۳ ص: ۶۸۱ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) رقم الحديث ۶۵۰۲، عن عمارة بن حزم، قال :رآنی رسول الله صلى الله عليه وسلم جالسا على قبر، قال :انزل من القبر لا تؤذ صاحب القبر ولا يؤذيك.

وكذا فی كنز العمال ج: ۱۵ ص: ۱۰۲۱ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) و مجمع الزوائد للهيثمی ج: ۷ ص: ۱۲۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

جائز نہیں۔[1] اوراگر وقف ہے تو شرائطِ وقف کے مطابق اس میں تصرف درست[2] اوراس کے خلاف

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی جامع الترمذی أبواب الجنائز باب ما جاء فی کراھیة تجصص القبور والکتابة علیھا ج: ۱ ص: ۲۰۳ (طبع سعید) عن جابر رضی اللہ عنہ قال: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن تجصص القبور و أن یکتب علیھا و أن یبنی علیھا و أن تؤطأ.

وفی الشامیة باب صلوٰة الجنازة ج: ۲ ص: ۲۴۵ (طبع سعید) ویکرہ الجلوس علی القبر و وطؤہ.

وفی البحر الرائق باب صلوٰة الجنازة ج: ۲ ص: ۳۴۱ (طبع رشیدیہ) و یکرہ أن یطأ القبر أو یجلس أو ینام علیہ.

وکذا فی الفتاوی الھندیة کتاب الصلوٰة الباب الحادی والعشرون فی الجنائز الفصل السادس فی الدفن والنقل ج: ۱ ص: ۱۶۶ (طبع رشیدیہ)

(۱) وفی المشکوة ج: ۱ ص: ۲۵۵ (طبع سعید) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :ألالا تظلموا ألا لا یحل مال امرء مسلم إلا بطیب نفس رواہ البیھقی فی شعب الإیمان وفی حاشیتہ أی بالإذن أو بالأمر.

(۲) وفی البحر الرائق ج: ۱۴ ص: ۳۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعہ.

وفی الدر المختار ج۴ ص۴۳۳(طبع سعید): شرط الواقف کنص الشارع أی فی المفھوم و إلا الدلالة و وجوب العمل بہ الخ

وکذا فی حاشیة الطحطاوی علی المراقی ج: ۱ ص: ۲۰۱ (طبع مطبعة کبریٰ مصر)

و فی مجمع الأنھر ج: ۳ ص: ۵۱۳ و ۵۱۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وفی الوقف یتبع شرط الواقف لأنہ کنص الشارع فی وجوب الاتباع الخ.

مذکورہ مسئلہ سے متعلق چند مزید عبارات درج ذیل ہیں۔

(وفی عمدة القاری باب استعمال فضل وضوء الناس کتاب الوضوء ج۳ ص۱۰۸،الماء المستعمل واختلف الفقھاء فیہ فعن أبی حنیفة ثلاث روایات......وعند مالک طاھر وطھور......وعند الشافعی طاھرغیر طھور،الخ(طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

وفی شرح البخاری لابن بطال کتاب الوضوء ج ۱ص۲۳۱(طبع مکتبة الرشد ریاض)أن الماء المستعمل فی الوضوء طاھر مطھر وھو قول مالک والثوری.

وفیہ ایضاً:ج۱ ص۲۹۰ فأجاز النخعی والحسن البصری والزھری الوضوء بالماء الذی قد توضی بہ وھو قول مالک والثوری وقال محمد بن الحسن والشافعی ھو طاھر غیر مطھر وقال أبو حنیفةؒ و أبویوسف ھو نجس واحتجوا بأنہ ماء الذنوب وکذا فی فتح الباری ج ۱ص ۲۹۲(طبع دار المعرفة بیروت) وشرح المسلم للنووی ج۳ص ۵۹(طبع دار الکتاب العربی بیروت)

ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۷/۱۱/۱۳۷۹ھ

علاقہ میں خوردنی اجناس کی کمی کے باوجود تمباکو کی کاشت کرنے کا حکم

سوال:- ایک چودھری خان اپنی زمین میں تمباکو کی کاشت کرتا ہے، تاکہ اُسے بیچ کر زرکثیر کمائے، جبکہ اُس علاقہ میں خوردنی اجناس کی کمی ہے اور زیادہ تر غلہ باہر سے منگایا جاتا ہے، ایسی حالت میں اس کی کاشت کیسی ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں تمباکو کی کاشت حرام تو نہیں ہے، لیکن جب علاقے میں عام خوردنی کی کمی ہے تو خان صاحب کے لئے افضل یہ ہے کہ وہ ان کی کاشت کریں[2] اور عام لوگوں کی سہولت کی نیت سے ایسا کریں گے تو انہیں ان شاء اللہ اس کا ثواب بھی ملے گا[3]۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲/۷/۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۹۲/۲۸ ب)

---

(۱) دیکھئے گذشتہ صفحہ کا حاشیہ نمبر (۲)

(۲و۳) دیکھئے "اخلاقی پابندیاں" کے تحت اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص:۴۲و۴۳ (طبع مکتبہ معارف القرآن)

كتابُ المتفرّقات

(متفرّق مسائل کا بیان)
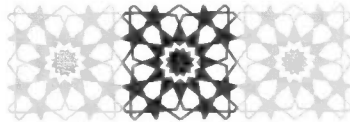
اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ''شخص'' استعمال کرنے کا تفصیلی حکم اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن

سوال:- محترم مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ وزید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ ایک سوال موصول ہوا، جس میں یہ پوچھا گیا ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمۂ قرآن میں سورۂ رعد کی آیت ''الله الذی رفع السمٰوٰت ''[1] کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ وہ شخص ہے جس نے بلند کیا آسمانوں کو'' اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ ''پاکی ہے اس شخص کو''[2] تو کیا اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ''شخص'' کا استعمال درست ہے؟

جواب:- اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمے میں ''شخص'' کا لفظ ''ذات'' کے معنی میں استعمال کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں اردو میں یہ لفظ ''ذات'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہوگا۔ لیکن ہمارے عرف میں ''شخص'' کا لفظ عام طور سے ''انسان'' کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے اب اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے درست نہیں

---

(۱) سورۃ الرعد آیۃ ۲ پارہ ۱۳ ص: ۴۰۹ (طبع تاج کمپنی)

(۲) سورۃ بنی إسرائیل آیت: ۱ پارہ: ۱۵ ص: ۲۸۳ (طبع مذکور)

اور اس مقام کے علاوہ بھی کئی آیاتِ قرآنیہ کے ترجمہ میں حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے لئے (اپنے عرف کے مطابق، جیسا کہ حضرت دامت برکاتہم العالیہ نے تحریر فرمایا) لفظ شخص استعمال فرمایا ہے، اُن مقامات میں سے چند یہ ہیں:

☆ سورۃ السجدۃ آیت: ۴ و آیت: ۷ پارہ: ۲۱۔ ☆ سورۃ الروم آیت: ۴۸ پارہ: ۲۱۔ ☆ سورۃ المؤمن آیت: ۶۱ و ۶۴ و ۷۹ پارہ: ۲۴۔ ☆ سورۃ الشوریٰ آیت: ۱۷ پارہ: ۲۵۔ ☆ سورۃ حم السجدۃ آیت: ۹ پارہ: ۲۴۔ ☆ سورۃ الجاثیۃ آیت: ۱۲ پارہ: ۲۵۔ سورۃ فاطر آیت: ۹ پارہ: ۲۲

عربی زبان کے لحاظ سے بھی یہ مسئلہ متقدمین کے یہاں زیر بحث آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ''شخص'' استعمال ہوسکتا ہے یا نہیں؟ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التوحید میں ایک مستقل باب اس مقصد کے لئے قائم کیا ہے اوراس کے عنوان میں وہ حدیث ذکر کی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے ''لاشخص أغیر من اللّٰہ تعالیٰ''[1] حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب بطور احتمال قائم فرمایا ہے کہ لفظ ''شخص'' کو ''اَحد'' کے معنی میں استعمال کرکے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کردیا جائے، حافظ ابنِ حجرؒ کے الفاظ یہ ہیں:

لم يفصح المصنف بإطلاق الشخص على الله بل أورد ذلك على طريق الاحتمال. (فتح الباری ص: ۴۰۲ ج: ۱۳)[2]

اوراس حدیث کی یہ تاویل فرمائی ہے کہ شخص یہاں پرأحد کے معنی میں ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ نے اسی احتمال کی بنیاد پراپنے زمانے کے عرف واستعمال کے لحاظ سے یہ لفظ ''ذات'' کے معنی میں استعمال کرلیا ہے۔[3] لیکن حافظ ابنِ حجرؒ اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے دوسرے شراح[4] نے صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ لفظ ''شخص'' جسم والی چیزوں کے لئے وضع ہوا ہے۔

(۱) صحيح البخاری باب قول النبی صلى الله عليه وسلم لا شخص أغير من الله ج: ٦ ص: ٢٦٩٧ (طبع دار ابن كثير بيروت)

(۲) فتح الباری كتاب التوحيد باب قول النبی صلى الله عليه وسلم لا شخص أغير من الله تعالىٰ ج: ۱۳ ص: ۵۰۸ (طبع مكتبة الرشد بيروت)

(۳) جیسا کہ بعض حضرات نے بھی لکھا ہے کہ لفظ ''شخص'' کبھی ذات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ تفسیر کبیر ج:۱ص: ۷۴ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: المسألة الخامسة :فی لفظ الشخص، عن سعد بن عبادة عن النبی صلى الله عليه وسلم قال :لا شخص أغير من الله.........

واعلم أنه لا يمكن أن يكون المراد من الشخص الجسم الذی له تشخص وحجمية، بل المراد منه الذات المخصوصة والحقية المعينة فی نفسها تعينا باعتباره يمتاز عن غيره.

(۴) مثلاً علامہ ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح بخاری کتاب التعبیرج: ۱۰ ص: ۴۴۲ (طبع مکتبة الرشدریاض) میں فرمایا: وأجمعت الأمة على أن الله لا يجوز أن يوصف بأنه شخص لأن التوقيف لم يرد به وقد منعت المجسمة من إطلاق الشخص عليه.

اوراللہ تعالیٰ جسم سے منزہ ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

قال ابن فورک: وإنما منعنا من إطلاق لفظ الشخص لأمور: أحدها: أن اللفظ لم يثبت بطريق السمع والثانی: الإجماع علی المنع منه والثالث: أن معناه الجسم المؤلف المركب .... قال القرطبی: الشخص يعنی فی اللغة لجرم الإنسان و جسمه .... وهذا المعنی محال علی الله تعالیٰ. (فتح الباری ص: ۴۰۱ و ۴۰۲ ج: ۱۳)[1]

علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقال الخطابی:إطلاق الشخص فی صفات الله تعالی غير جائز لأن الشخص إنما يكون جسما مؤلفا. (عمدة القاری ص: ۱۶۴ ج: ۲۵)[2]

علامہ قرطبیؒ صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں:

أصل وضع الشخص لجرم الإنسان و جسمه .... وهذا المعنی علی الله تعالی محال بالعقل والنقل علی ما قدمناه فی غير موضع فتعين تأويله هنا. (المفهم للقرطبی ص: ۳۰۵ ج: ۴)[3]

اسی سے ملتی جلتی بات علامہ کرمانیؒ نے شرح بخاری (ص: ۱۲۷ ج:۲۵)[4] میں، علامہ قسطلانیؒ نے ارشادالساری (ص: ۳۸۳ ج: ۱۵)[5] میں، حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ نے

(۱) كتاب التوحيد باب قول النبی صلی الله عليه وسلم لا شخص أغير من الله تعالی ج: ۱۳ ص:۵۰۶) (طبع مكتبة الرشد بيروت)

(۲) كتاب التوحيد باب قول النبی صلی الله عليه وسلم لا شخص أغير من الله تعالی ج: ۱۳ ص:۵۰۶) (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

(۳) كتاب الطلاق باب ما تتبع اللعان إذا كمل من الأحكام (طبع دار ابن كثير بيروت)

(۴) (طبع دار إحياء التراث العربی بيروت)

(۵) (طبع دار الكتب العلمية بيروت)

لامع الدراری (ص: ۴۴۰ ج: ۳)[۱] میں فرمائی ہے۔ ان سب تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علماءِ اُمت نے حقیقی معنی میں ''شخص'' کے لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لئے جائز قرار نہیں دیا۔

اور جہاں کہیں ایسا آیا ہے، اس کو مجاز پر محمول کرکے اس کی تاویل کی ہے۔[۲] لہٰذا یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے جلیل القدر عالم گزرے ہیں، انہوں نے شاید اپنے زمانے کے اُردو محاورے کے مطابق اسے ذات کے معنی میں لے کر استعمال کرلیا ہے، چونکہ اصل عربی کے لحاظ سے بھی اور موجودہ اُردو محاورے کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اطلاق درست نہیں ہے، اس لئے اب اس ترجمے سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور اس کے ازالے کا راستہ یہ ہے کہ جب کوئی ناشر یہ ترجمہ شائع کرے تو اس پر یہ حاشیہ دے کہ:

> ''یہاں شخص سے مراد ذات ہے اور چونکہ ہمارے موجودہ محاورے میں شخص سے عموماً انسان مراد ہوتا ہے، اس لئے کسی کو اب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

هذا ما ظهر لی　　　والله سبحانه أعلم وعلمه أتم وأحكم

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

دوسرے سیاروں میں مخلوق کا وجود اور اس میں علیحدہ سلسلۂ نبوت چلائے جانے کا تصور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال:- بمطابق جدید سائنس اس کائنات میں بہت سی دوسری دنیاؤں کا سراغ لگایا گیا

---

(۱) كتاب الرد على الجهمية

(۲) مثل ما جاء فی فیض الباری شرح صحیح البخاری باب قول النبی صلی الله علیه وسلم " لا شخص أغیر من الله تعالی. (ج۵ ص۴۱۷، طبع) فیه إطلاق الشخص علی ذاته تعالیٰ مع عدم صلوحه لغةً فهو أیضاً مبنی علی التجرید والانسلاخ عن معناه الأصلی الخ

ہے، اس کے علاوہ خلائی مخلوق بھی ہے، اس سے سوال پیدا ہوتا ہے (بلکہ سینکڑوں سوال پیدا ہوتے ہیں) کبھی یہ وسوسہ کہ اس طرح اکثر سیاروں پر خلیات کے ملاپ سے زندگی وجود میں آئی اور ایک دن ختم ہو جائے گی that's all، آخرت کا تصور ناپید سا لگتا ہے، اگر نہیں تو دوسری دنیاؤں کے انسانوں کی بھی اس دنیا کے انسانوں کی طرح دنیا اور آخرت ہوگی اور آخرت کی زندگی کا دارومدار کس نبی ہے، چونکہ آپ ﷺ ساری کائنات کے نبی ہیں، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ساری زندگی اس سیارے پر گزاری تو دوسری دنیاؤں کو کیسے پتہ چلا ہوگا؟ ہدایت کیسے پہنچی ہوگی؟ یا پھر نعوذ باللہ! العیاذ باللہ! اسلام کا ضابطۂ حیات انسانوں کا خودساختہ ہے؟ کسی نبی کے نہ پہنچنے کی صورت میں ان کی نجات کا دارومدار ''عقیدۂ توحید پر ایمان'' پر ہے، کیا وہ بھی جنت وجہنم کے ویسے ہی مستحق ہوں گے جیسے ہم۔

آپ عالمِ اسلام میں شیخ الاسلام ہیں، آپ کو علم ہونا چاہئے کہ اگر سائنسدانوں کی برسہا برس کی اس مضبوط تحقیق پر کہ خلائی مخلوق ہم سے بھی زیادہ Civlized ہے، یقین کرلیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلائی مخلوق کی ہدایت کا سورج کون سا ہے؟ ان کو آخرت کی خبر دینے والا کون ہے؟ یا پھر وہ کبھی فنا نہیں ہوں گی، کیونکہ سائنس کے ادارے ناسا کے مطابق انہیں ایک ایسا سگنل موصول ہوا ہے جو اسّی ہزار قبل کسی دور دراز سیارے سے بھیجا گیا تھا، مطلب یہ ہوا کہ لاکھوں، کروڑوں سالوں سے اس کائنات میں زندگی موجود ہے، جبکہ قرآن پاک میں صرف دنیا کی ہر چیز (فانی) ہونے کا ذکر ہے، تو ممکن ہے کہ سوائے دنیا کے کائنات کی باقی تمام مخلوقات زندہ اور قائم رہیں اور ممکنہ طور پر مشیتِ ایزدی کے مطابق ان میں شر موجود نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شر موجود نہیں ہے (کیونکہ شر موجود ہونے پر انجام لازم آتا ہے) تو بمطابق سائنسی تحقیق مریخ پر ایک میل لمبا اور دو ہزار فٹ اُونچا انسانی چہرہ پتھر پر تراشا ہوا دریافت ہوا ہے، اس صورت میں وہ لوگ شرک پرستی یعنی برائی کی طرف مائل تھے کیوں؟ اس کے علاوہ بھی بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً اگر خلائی مخلوق زمین پر موجود انسانوں سے زیادہ Civilized ہے تو یقیناً ان کے پاس

دماغ ہے، دماغ کا ہونا نفی اور مثبت دونوں فطرتوں کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ فرشتوں کے پاس عدم موجودگی دماغ کی پاداش میں الف سے ی تک فطرۃً نیکی کے مادے سے بنے ہیں، اور دماغ دینے کا مقصد (اللہ کا) یہی ہے کہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے۔

مختصراً ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں دونوں خصوصیات ہیں تو پھر ان کے فنا ہونے کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا؟ اگر تذکرہ ملتا ہے تو کیا ان کے ساتھ ہم جیسا ہی سلوک ہوگا؟ ہم جیسے سلوک کے لئے ان کے پاس اسلام ہونا ضروری ہے، جس کے لئے نبی کا ہونا ضروری ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ نے بیک وقت بہت سی دنیائیں تخلیق کردی ہوں اور ہر ایک دنیا میں Individually نبی بھیجے ہوں، اس طرح کہ ایک دنیا دوسری دنیا سے بالکل بے خبر ہو۔ اور اسی طرح ہر دنیا کے لئے جنت وجہنم بھی بالکل الگ الگ ہوں، اگر ایسا ہے تو اس کی خبر آپ ﷺ نے ہمیں کیوں نہیں دی؟

اور بھی سینکڑوں سوال پیدا ہوتے ہیں، خیر! اگر ان سوالات کے شافی جوابات مل جاتے ہیں تو باقی سوالات کو میں ان شاء اللہ خود ہی مطمئن کرلوں گا۔

(۲)... بقول حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی صاحب دامت برکاتہم، شمائلِ ترمذی باب مہر نبوت، حدیث نمبر۱۔ کے فائدہ میں راقم ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے فضلات بھی پاک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ ﷺ فضلات کو پانی میں بہا کر نالوں کے گندے پانی میں کیوں بہاتے تھے؟ یا پھر اس جگہ فضلات سے مراد صرف پسینہ مبارک ہے؟ فضلات پاک ہونے کی برائے مہربانی وضاحت فرمادیں۔

(۳)... اللہ آپ کے درجات بلند فرمائے! آمین۔ میں آپ کے کتابچے ''راحت کس طرح حاصل ہو؟'' میں آپ کا سبق آموز واقعہ پڑھ رہا تھا کہ آپ کی شان میں مشورہ دینے کی گستاخی کی جسارت کو واجب سمجھا۔

جواب:- (۱)... ابھی تک دوسرے سیاروں کے بارے میں سائنس اس بات کا کوئی یقینی

ثبوت فراہم نہیں کرسکی کہ وہاں دوسری مخلوق آباد ہے، ابھی تک محض قیاسات ہیں، لیکن اگر وہاں کوئی دوسری مخلوق ہو[۱] تو عقلاً یہ احتمال بھی ہے کہ وہ انسان کی طرح مکلّف نہ ہو[۲] بلکہ جانوروں کی طرح غیر مکلّف ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مکلّف ہواور اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے نبوت و رسالت کا الگ سلسلہ جاری فرمایا ہو۔ اس دوسرے احتمال کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اُس اثر سے ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے علاوہ چھ مزید زمینیں پیدا فرمائی ہیں، اوران میں سے ہرایک میں نبوت کا الگ سلسلہ جاری فرمایا ہے۔[۳] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اثر کے بارے میں ''تحذیر الناس'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

(۱ و ۲) وفی تفسیر روح المعانی (تفسیر الآلوسی) ج: ۲ ص: ۸۲ (طبع) وفی کل أرض سکان من خلق الله عز وجل لا یعلم حقیقتهم إلا الله تعالی، وعن ابن عباس أنهم إما ملائکة أو جن الخ

وفی تفسیر البحر المحیط (للأندلسی) ج: ۸ ص: ۲۱۵ (طبع دار النشر، و دار الفکر بیروت) و رب الأرضین السبع و ما أقللن فقیل سبع طباق من غیر فتوق و قیل بین کل طبقة و طبقة مسافة قیل و فیها سکان من خلق الله قیل ملائکة و جن.

وفی تفسیر حقی ج: ۱۵ ص: ۴۰۵ . حکی الکلبی عن أبی صالح عن ابن عباسؓ أنها سبع أرضین متفرّقة بالبحار یعنی الحائل بین کل أرض و أرض بحار لا یمکن قطعها والا الوصول إلی الأرض الأخری ولا تصل الدعوة إلیهم و تظل الجمیع السماء قال الماوردی وعلیٰ هذا أی وعلی أنها سبع أرضین و فی کل أرض سکان من خلق الله تختص دعوة الإسلام بأهل الأرض العلیاء دون من عداهم و إن کان فیهن من یعقل من خلق.

وکذا فی تفسیر روح البیان سورة التغابن ج: ۱۰ ص: ۳۳ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) والجامع لأحکام القرآن ج: ۱ ص: ۲۶۰ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت)

(۳) وفی المستدرک للحاکمؒ رقم الحدیث: ۳۸۲۲ ج: ۲ ص: ۵۳۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) عن ابن عباس رضی الله عنهما، أنه قال "الله الذی خلق سبع سمٰوٰت ومن الأرض مثلهن (الطلاق: ۱۲)قال :سبع أرضین فی کل أرض نبی کنبیکم وآدم کآدم، ونوح کنوح، وإبراهیم کإبراهیم، وعیسی کعیسی هذا حدیث صحیح الإسناد ولم یخرجاه.

وفی نیل الأوطار للشوکانیؒ ج: ۳ ص: ۳۰۳ . وقال القاضی أبو الطیب :لأنا لا ننتفع من الأرضین إلا بالطبقة الأولی، بخلاف السماء فإن الشمس والقمر والکواکب موزعة علیها .وقیل لأن الأرض السبع لها سکن أخرج البیهقی عن أبی الضحی عن ابن عباس أنه قال قوله :

(باقی آئندہ صفحہ پر)

(۲)...اس سلسلے میں علماءِ سلف کی آراء مختلف ہیں، بعض علماء کے نزدیک پاک ہیں۔[۱] اور بعض حضرات اس کے قائل نہیں ہیں۔ دونوں کے پاس دلائل ہیں۔[۲] لیکن چونکہ اب اس مسئلے سے کوئی علمی فائدہ متصور نہیں، اس لئے اس کی مفصل تحقیق کی حاجت نہیں۔

(گذشتہ سے پیوستہ) (ومن الأرض مثلهن) (الطلاق: ۱۲) قال: سبع أرضين في كل أرض نبى كنبيكم و آدم كآدمكم ونوح كنوحكم وإبراهيم كإبراهيمكم وعيسى كعيساكم.

و كذا فى فتح البارى باب ما جاء فى سبع أرضين أو فى بيان وضعها ج: ۶ ص: ۲۹۳ (طبع دار المعرفة بيروت) وعمدة القارى ج: ۲۲ ص: ۴۱۹

(۱) وفى فتح البارى (باب الماء) ج: ۱ ص: ۲۷۲ (طبع دار المعرفة بيروت) وقد تكاثرت الأدلة على طهارة فضلاته و عد الأئمة ذلك فى خصائصه.

و فى عمدة القارى ج: ۴ ص: ۳۹۷ . فأبوحنيفةؒ .... يقول بطهارة بوله و سائر فضلاته.

وفى مرقاة المفاتيح شرح المشكوة باب أحكام المياه ج: ۲ ص: ۳۹۷. السائل من أعضائه شرفها لا ينجس و من ثم اختار كثيرون من أصحابنا طهارة فضلاته عليه الصلوٰة والسلام.

وفى رد المحتار ج: ۱ ص: ۳۱۸ (طبع سعيد) مطلب فى طهارة بوله صلى الله عليه وسلم. صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله -صلى الله عليه وسلم -وسائر فضلاته، وبه قال أبو حنيفة كما نقله فى المواهب اللدنية عن شرح البخارى للعينى .... ونقل بعضهم عن شرح المشكاة لمنلا على القارى أنه قال :اختاره كثير من أصحابنا، وأطال فى تحقيقه فى شرحه على الشمائل فى باب ما جاء فى تعطره -عليه الصلاة والسلام .

(۲) اس بحث کی تفصیل کے لئے حاشیہ نمبر۱ میں مذکور کتب کے علاوہ درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں۔

☆ تفسيرروح البيان سورة النحل ج:۵ص: ۵ (طبع دار احياء التراث بيروت). ☆ المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم ج: ۴ ص:۲۶. ☆ شرح الشفاء للقاضى عياض ج: ۱ ص: ۱۷۱ .(طبع دار الكتب العلمية بيروت) ☆ جمع الوسائل فى شرح الشمائل ج: ۲ ص: ۲ و۳ ، باب ما جاء فى تعطر رسول الله صلى الله عليه وسلم (طبع إدارۂ تاليفات اشرفيه) ☆ المواهب اللدنية مع شرح الزرقانى ج: ۵ ص: ۵۴۸ و ۵۵۳ (طبع عباس أحمد باز مكة المكرمة) ☆ الخصائص الكبرى للسيوطىؒ ج: ۱ ص: ۱۲۲ (طبع مكتبة حقانية پشاور) ☆ فيض البارى شرح صحيح البخارى ج: ۱ ص: ۳۹۵. ☆ الفصول فى سيرة الرسول (ابنِ كثير) ج: ۱ ص: ۱۴۳ (طبع صيدالفوائد). ☆ سبل الهدى والرشاد فى سيرة خير العباد.

نیز دیکھئے: امداد الفتاوی ج:۱ص:۸۰ تا ۸۲ وفتاوی عثمانی ج:۱ص:۳۰۹۔

مردہ کو زندہ کرنے سے متعلق قرآن میں مذکور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مطالبہ پر اشکال اور اس کا جواب

سوال:- مخدومی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امابعد! عرض کہ ابراہیم علیہ السلام کا عرض کرنا "رب ارنی کیف تحیی الموتی — ولکن لیطمئن قلبی" الخ پر اشکال ہے کہ ہم جیسے لوگوں کو "احیاء الموتی" میں کسی بھی قسم کا اشتباہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر ہر طرح سے قادر مطلق ہیں، اگر مانا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنا تھا تو پھر مردہ پرندوں کو زندہ کرنے سے ابراہیم علیہ السلام کو اعلیٰ درجہ کا اطمینان حاصل ہوا، پہلے ابراہیم علیہ السلام کو اتنا بھی اطمینان نہیں تھا کیا؟ یہ تو بچوں کی سی چھوٹی بات ہے جو مقامِ خلۃ کے منافی نظر آتی ہے، آپ تسلی بخش جواب عنایت کریں۔ فجزاکم اللہ خیراً

فقط بندہ شبیر احمد

جواب:- مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ ایمان میں کوئی کمی نہیں تھی۔[1] البتہ بشری فطرت ہے کہ آنکھ سے دیکھ کر اطمینان زیادہ ہوتا ہے۔[2] نیز اگرچہ یہ ایمان کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ احیاء موتی پر قادر ہیں، لیکن اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ معلوم نہیں تھی، اس کا علم حاصل کرنا مقصود تھا۔[3] اس لئے کوئی اشکال کی بات نہیں۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۸/۹/۱۳ھ

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۶۰

(۲) وفی الجامع لأحکام القرآن للقرطبیؒ ج: ۳ ص: ۲۹۷ (طبع دارعالم الکتب ریاض) وإذ قال إبراهیم رب أرنی (الآیة) اختلف الناس فی هذا السؤال هل صدر من إبراهیم (باقی آئندہ صفحہ پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) عن شک أم لا؟ فقالالجمهور :لم یکن إبراهیم علیه السلام شاکا فی إحیاء الله الموتی قط وإنما طلب المعاینة،وذلک أن النفوس مستشرقة إلی رؤیة ما أخبرت به، ولهذا قال علیه السلام :(لیس الخبر کالمعاینة) رواه ابن عباس ولم یروه غیره، قاله أبو عمر .قال الأخفش :لم یرد رؤیة القلب وإنما أراد رؤیة العین .وقال الحسن وقتادة وسعید بن جبیر والربیع :سأل لیزداد یقینا إلی یقینه الخ

وفیه أیضاً ج: ۳ ص: ۳۰۰ (طبع دار عالم الکتب) سألتک لیطمئن قلبی بحصول الفرق بین المعلوم برهاناً والمعلوم عیاناً.

وفی البحر المدید ج ۱ ص ۳۳۸ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) ..... وَلکِنْ سألتک لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِی إذ لیس الخبر کالعیان، ولیس علم الیقین کعین الیقین، أراد أن یضم الشهود والعیان إلی الوحی والبرهان.

وفی الکشف والبیان للنیسابوریؒ ج: ۲ ص: ۲۵۱ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) لیس الخبر کالمعاینة فذلک قوله :وَلکِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِی أی یسکن قلبی إلی المعاینة والمشاهدة. فعلی هذا القول أراد إبراهیم علیه السّلام أن یصیر له علم الیقین عین الیقین، کما أن الإنسان یعلم الشیء ویتیقنه ولکن یحب أن یراه من غیر شک له فیه، کما أن المؤمنین یحبّون رؤیة النبیّ صلّی الله علیه وسلّم ورؤیة الجنّة ورؤیة الله تعالی مع الإیمان بذلک وزوال الشک فیه الخ

وفی تفسیر ابن کثیر ج: ۳ ص: ۲۴۶. ذکروا لسؤال إبراهیم علیه السلام، أسبابا منها أنه لما قال لنمرود ربی الذی یحیی ویمیت أحب أن یترقی من علم الیقین بذلک، إلی عین الیقین، وأن یری ذلک مشاهدة.

وفی تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل ج: ۱ ص: ۳۳۷ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) ولکن لیطمئن قلبی لیزید سکونا وطمأنینة بمضامة علم الضرورة علم الاستدلال وتظاهر الأدلة أسکن للقلوب وأزید للبصیرة والیقین، ولأن علم الاستدلال یجوز معه التشکیک بخلاف العلم الضروری، فأراد بطمأنینة القلب العلم الذی لا مجال فیه للتشکیک الخ

وفی تفسیر الماوردی الکنت والعیون لأبی الحسن علی البصری ج: ۱ ص: ۳۳۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) أنه لم یرد رؤیة القلب و إنما أراد رؤیة العین.

وفی تفسیر النیسابوری ج: ۱ ص: ۱۹۳ . (لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِی) أراد به أن یؤکد علم الیقین بعین الیقین فلیس الخبر کالمعاینة.

وفی تفسیر أبی السعود ج: ۱ ص: ۲۵۶ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) لیطمئن قلبی بمضامة العیان إلی الإیمان والإیقان وأزداد بصیرة بمشاهدته علی کیفیة معینة. (جاری ہے)

وفى تفسير جامع البيان للطبرىؒ ج: ۵ ص: ۵۸۷ (طبع مؤسسة الرسالة و مجمع الملك فهد) أنّ مسألة إبراهيم ربّه أن يريه كيف يحيي الموتىٰ كانت ليرى عيناً ما كان عنده من علم ذلك خبرًا.
وكذا فى التحرير والتنوير ج: ۳ ص: ۳۸ (طبع دار سحنون) و تفسير البحر المحيط ج: ۲ ص: ۲۲۴ (طبع دار الفكر بيروت) و تفسير الخازن ج: ۱ ص: ۲۸۰ (طبع دار الفكر بيروت)
(۳) وفى الجامع لأحكام القرآن للقرطبى ج: ۳ ص: ۳۰۰ (طبع دار عالم الكتب رياض) وقال الحسن: رأى جيفة نصفها فى البر توزعها السباع ونصفها فى البحر توزعها دواب البحر، فلما رأى تفرقها أحب أن يرى انضمامها فسأل ليطمئن قلبه برؤية كيفية الجمع كما رأى كيفية التفريق.
وفى روح المعانى ج: ۲ ص: ۳۴۰ . ثم الاستفهام -بكيف -إنما هو سؤال عن شيء متقرر الوجود عند السائل والمسئول، فالاستفهام هنا عن هيئة الإحياء المتقرر عند السائل أى -بصرنى كيفية إحيائك للموتى -وإنما سأله عليه السلام لينتقل من مرتبة علم اليقين إلى عين اليقين، وفى الخبر ليس الخبر كالمعاينة وكان ذلك حين رأى جيفة تمزقها سباع البر والبحر والهواء قاله الحسن، والضحاك، وقتادةؒ الخ
وفى تفسير روح البيان ج: ۴ ص: ۲۴۵ (طبع دار إحياء التراث العربى بيروت) ولكن ليطمئن قلبى بإراء تك إياى كيفية إحياء الموتى إذا تتجلى لقلبى بصفة محييك فأكون بك محيي الموتى ولهذا إذا تجلى الله لقلب العبد يطمئن به فينعكس نور الاطمئنان من مرآة قلبه إلى نفسه فتصير النفس مطمئنة به أيضا الخ
وفى البحر المديد ج: ۱ ص: ۳۳۸ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) رب أرنى كيف تحى الموتى أى: أبصرنى كيفية إحياء الموتى، حتى أرى ذلك عيانا، أراد عليه السلام أن ينتقل من علم اليقين إلى عين اليقين الخ
وفى تفسير البحر المحيط ج: ۲ ص: ۲۲۴ (طبع دار الفكر بيروت) قال (فخذ أربعة من الطير) لما سأل رؤية كيفية إحياء الموتى أجابه تعالى لذلك، وعلمه كيف يصنع أولا، فأمره أن يأخذ أربعة من الطير الخ
وفى تفسير جامع البيان للطبرىؒ ج: ۵ ص: ۴۸۵ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) واختلف أهل التأويل فى سبب مسألة إبراهيم ربه أن يريه كيف يحيي الموتى .فقال بعضهم :كانت مسألته ذلك ربه، أنه رأى دابة قد تقسمتها السباع والطير، فسأل ربه أن يريه كيفية إحيائه إياها، مع تفرق لحومها فى بطون طير الهواء وسباع الأرض ليرى ذلك عيانا، فيزداد يقينا برؤيته ذلك عيانا إلى علمه به خبرا الخ
وفى تفسير فتح القدير ج: ۱ ص: ۲۸۲ (طبع دار الفكر بيروت) وإنما سأل أن يشاهد كيفية جمع أجزاء الموتى بعد تفريقها، واتصال الأعصاب والجلود بعد تمزيقها، فأراد أن يرقى من علم اليقين إلى عين اليقين.

منصوص احکام میں ترمیم وتغییر کا کسی کو اختیار نہیں

سوال:- مکرمی ومحترمی جناب مفتی اعظم تقی عثمانی صاحب!

دارالعلوم کورنگی کراچی

السلام علیکم! گزارش ہے، میرا ایک سوال ہے کہ کیا کوئی ایسی قرآنی آیت یا حدیث ہے، جس سے ثابت ہوتا ہو کہ علماء کرام وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے حالات وواقعات دیکھتے ہوئے قرآن اور صحیح حدیث کے احکام تبدیل کر سکتے ہیں؟ یا ان کے احکام کو وقتی مصلحت کے تحت روک سکتے ہیں؟ کیا ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھ سکتے ہیں؟

شکریہ

خاکسار: ثناء اللہ بھٹہ

جواب:- محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قرآن وسنت کے صریح احکام کو بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، البتہ بعض احکام کسی علّت سے مربوط ہوتے ہیں، اگر وہ علّت کسی وقت نہ پائی جائے تو حکم بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے متعلق تفصیلی ضوابط اُصولِ فقہ میں مدوّن کردئے گئے ہیں۔

والسلام

۳۱/۱۰/۲۸ھ

(گذشتہ سے پیوستہ) وفی الدر المصون فی علم الکتاب المکنون ج: ۳ ص: ۲۷۴ ولکن سألتک کیفیة الإحیاء للاطمئنان الخ

وفی تفسیر أبی السعود ج: ۱ ص: ۲۵۶ (طبع دار إحیاء التراث بیروت) فالاستفهام ھھنا عن ھیئة الإحیاء المتقرر عند السائل أی بصرنی کیفیة إحیائک للموتی وإنما سأله علیه السلام لیتأید إیقانه بالعیان ویزداد قلبه اطمئنانا علی اطمئنان.

لائبریری کی کتب وقف کئے بغیر اصل مالکوں کی ملکیت سے نکال دینے کا طریقہ

سوال :- بخدمت جناب مفتیانِ دارالعلوم کراچی

ہم نے اپنے علاقے میں دینی کتابوں کے لئے ایک دارالمطالعہ (لائبریری) کھولی ہے، جہاں اہلِ علاقہ کے لئے مفت میں کتابوں کو لے جا کر پڑھنے کی سہولت ہے، اس کے علاوہ اس لائبریری کے تحت جہاد کا کام بھی ہوتا ہے، مساجد کے باہر اصلاحی اور جہادی کتب وکیسٹوں کے اسٹال لگتے ہیں، مختلف طریقوں سے جہاد کے لئے چندہ وصول کرنے کا بھی انتظام ہے، وغیرہ۔

ان کاموں کے لئے جتنے مالی مصارف کی ضرورت ہوتی ہے، اکثر بندہ ہی ادا کرتا ہے، البتہ کچھ تعاون (بصورتِ نقد اور کبھی بصورتِ ضرورت کی اشیاء) کے کچھ احباب بھی تعاون کرتے رہتے ہیں۔

اب تک تو یہ اہتمام رکھا گیا ہے کہ کسی چیز کو وقف نہیں کیا گیا، بلکہ جس نے جو تعاون کیا ہے، اس کو اسی کی ملکیت میں رکھا گیا ہے، مگر کام زیادہ ہونے کی وجہ سے اس اہتمام میں کچھ مشکلات درپیش ہو رہی ہیں، ہر ایک ملکیت کو ممتاز کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے، لیکن دوسری طرف ان سب کو وقف کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی، کیونکہ شاید ردوبدل کرنا پڑ جائے، نیز لائبریری کے لئے جگہ بھی کرایہ پر ہے، شاید یہاں سے منتقل ہونا پڑ جائے، وغیرہ۔

تو کیا ایسی صورت ممکن ہے کہ یہ سب چیزیں معطین کی ملکیت سے نکل کر لائبریری اور اس سے متعلقہ کاموں کے لئے مخصوص ہو جائے، اور ان چیزوں کو وقف بھی نہ کرنا پڑے، تاکہ حسبِ منشاء ان میں ردوبدل کا بھی مکمل اختیار رہے۔

اس لئے درخواست ہے کہ اس کا شرعی طریقۂ کار تحریر فرما کر اس کی مکمل تفصیل اور احکام تحریر فرمائیں، نیز درخواست ہے کہ اس سے متعلقہ فقہی عبارات بھی تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

العبد محمد عامر عفی عنہ

۴۳۷ بلاک سی آدم جی نگر کراچی

جواب:- مکرم بندہ جناب مولانا محمد عامر صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا خط لائبریری کی کتابیں وقف کرنے کے سلسلے میں موصول ہوا، واقعۃً جو جواب یہاں سے گیا، اس میں غفلت ہوئی، جس پر متعلقہ افراد کو تنبیہ کردی گئی۔

اصل مسئلے کا جواب یہ ہے کہ کتابوں کو وقف نہ کرتے ہوئے بھی اصل مالکوں کی ملکیت سے نکال دینے کا بے غبار طریقہ یہ ہے کہ لائبریری کی کوئی چیز، مثلاً عمارت، وقف کردی جائے، پھر جو شخص کتابیں بطور عطیہ دے، وہ اس وقف کو عطیہ دے، یا اگر اس غرض کے لئے چندہ دے اور چندے سے کتابیں خریدی جائیں تو خرید کر اس وقف کی ملکیت ہوجائیں گی۔ اس صورت میں کتابیں وقف نہیں ہوں گی، بلکہ وقف کی ملکیت ہوں گی اور اصل مالکان کی ملکیت سے بھی نکل جائیں گی۔

کتبِ فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ وقف چندے اور عطیات کا مالک ہوسکتا ہے:

متولی المسجد إذا اشتری بمال المسجد حانوتا أو دارا ثم باعها جاز إذا کانت له ولایة الشراء، هذه المسألة بناء علی مسألة أخری إن متولی المسجد إذا اشتری من غلة المسجد دارا أو حانوتا فهذه الدار وهذا الحانوت هل تلتحق بالحوانیت الموقوفة علی المسجد؟ ومعناه أنه هل تصیر وقفا؟ اختلف المشایخ رحمهم الله تعالی قال الصدر الشهید: المختار أنه لا تلتحق ولکن تصیر مستغلا

للمسجد. (عالمگیریه ص: ۴۱۷ و ۴۱۸ ج: ۲ وقف باب:۵)[(۱)]

نیز چندے کے مملوکِ وقف ہونے کے لئے مزید ملاحظہ ہو "کفایۃ المفتی ص: ۷۷ ج: ۷[(۲)] واعلاء السنن ص: ۱۹۸ ج: ۱۳[(۳)] وعالمگیریہ ص: ۴۶۰ ج: ۳[(۴)]

اگرایک مرتبہ کوئی غیرمنقول یا منقول جائیداد وقف کردی گئی، تب تو یہ حکم واضح ہے، البتہ بندہ کے ذہن میں ایک اور بات بھی آتی ہے، جس پر ابھی فتوی نہیں دیا، لیکن اہلِ علم سے مشورے کے انتظار میں ہوں، اور وہ یہ کہ ہمارے قانونی عرف میں کارپوریٹ ادارے عرف اور قانون کی نگاہ میں ایک مستقل وجود رکھتے ہیں، جنہیں "شخصِ قانونی" کہا جاتا ہے، جب اس طرح کا کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے تو اس کی ملکیت تمام شخصی ملکیتوں سے ممتاز ہوتی ہے، اور اس ادارے کو اگر کوئی شخص عطیہ دے تو وہ کبھی معطی کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اسی ادارے کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ بندہ کا میلان اس طرف ہے کہ اگر وقف نہ بھی ہو اور اس طرح کا کوئی ادارہ قائم کرلیا جائے تو اس کو دئے جانے والے عطیات اس کی ملکیت ہوکر معطین کی ملک سے نکل جانے چاہئیں، جیسے کوئی شخص بیت المال کو چندہ دیدے۔[(۵)]

---

(۱) الباب الخامس فی ولایة الوقف، کتاب الوقف ط. سعید.

وفی المحیط البرهانی الفصل الحادی والعشرون ج: ۶ ص: ۱۱۲ (طبع دار إحیاء التراث العربی بیروت) متولی المسجد إذا اشتری بمال المسجد حانوتاً أو داراً ثم باعها جاز إذا کان له ولایة الشراء، وهذه المسألة بناء علی مسألة أخری أن متولی المسجد إذا اشتری من غلة المسجد داراً أو حانوتاً فهذه الدار وهذه الحانوت یلتحق بالحوانیت الموقوفة علی المسجد؛ ومعناه أنه هل یصیر وقفاً؟ اختلف المشایخ فیه قال الصدر الشهید :المختار أن یلتحق ولکن یصیر مستغلاً للمسجد.

(۲) کتاب الوقف ،(طبع مکتبة حقانیة ملتان)

(۳) (طبع إدارة القرآن)

(۴) وفی العالمگیریة (۲/۴۶۰) کتاب الوقف، الباب الحادی عشر، الفصل الثانی (ط: رشیدیه) رجل أعطی درهما فی عمارة المسجد أو مصالح المسجد صح؛ لأنه وإن کان لا یمکن تصحیحه تملیکا بالهبة للمسجد فإثبات الملک للمسجد علی هذا الوجه صحیح فیتم بالقبض .... ولو قال :وهبت داری للمسجد أو أعطیتها له، صح ویکون تملیکا فیشترط التسلیم، کما لو قال :وقفت هذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیک إذا سلمه للقیم.

(۵) اسکی مزید تفصیل کے لئے حضرت والا دامت برکاتہم العالیہ کی کتاب "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" ملاحظہ فرمائیں۔

اگر یہ نقطۂ نظر مقبول ہو تو صورتِ مسئولہ کی طرح کی بہت سی صورتوں میں عملی دُشواری ختم ہوسکتی ہے، تاہم اس پر مزید غور، تحقیق اور مشورے کی ضرورت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
والسلام
محمد تقی عثمانی
۱۴۲۲/۸/۱۳ھ

مصیبت سے نجات کے لئے ''قنوتِ نازلہ'' پڑھنے کا تصور اور حکم

سوال:- آج کل جو قنوتِ نازلہ پڑھائی جارہی ہے، وہ درست ہے، لیکن ایک عالم دین کہتا ہے کہ آج کل قنوتِ نازلہ پڑھنا صحیح نہیں ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قنوتِ نازلہ پڑھی تھی وہ کفار پر بددعاء کے لئے کی، یہاں یہ بات نہیں ہے، لہٰذا قنوتِ نازلہ درست نہیں، کیا اس عالم دین کا کہنا صحیح ہے؟

جواب:- قنوتِ نازلہ جو پچھلے دنوں پڑھی جاتی رہی ہے، اس کا مقصد کسی مسلمان پر بددعاء کرنا نہیں تھا، بلکہ مسلمان جس عام مصیبت کا شکار تھے، اس مصیبت سے نجات کی دعا کرنا تھا[1]، چنانچہ

---

(۱) وفی سنن الترمذی، باب ما جاء فی القنوت فی صلاة الفجر ج۱ ص۲۴۸ (طبع دارالفکر بیروت) عن البراء بن عازب، أن النبی صلی الله علیه وسلم کان یقنت فی صلاة الصبح والمغرب .... لا یقنت فی الفجر إلا عند نازلة تنزل بالمسلمین، فإذا نزلت نازلة فللإمام أن یدعو لجیوش المسلمین الخ
وفی المعجم الأوسط للطبرانی ج: ۵ ص: ۳۰۵ (طبع دار الحرمین قاهرة) عن أبی هریرة، أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان إذا أراد أن یدعو لقوم أو علی قوم قنت الخ
وفی تحفة الأحوذی ج: ۵ ص: ۱۰ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) عن أنس أن النبی صلی الله علیه وسلم لم یقنت إلا إذا دعا لقوم .... إن القنوت مختص بالنوازل وأنه ینبغی عند نزول النازلة أن لا تخص به صلاة دون صلاة.
وفی عمدة القاری ج: ۹ ص: ۲۸۱ و ۲۸۲ (طبع) فالدعاء هو عین القنوت.
وفی نصب الرایة للزیلعیؒ ج: ۳ ص: ۱۶۷ (طبع دار الحدیث قاهرة) قال صاحب التنقیح و سند هذین الحدیثین صحیح و هما نص فی أن القنوت مختص بالنازلة.
وفی سبل السلام شرح بلوغ المرام کتاب الصلوٰة. یسن القنوت فی النوازل، فیدعو بما یناسب الحادثة.
وإذا عرفت هذا فالقول بأنه یسن فی النوازل قول حسن الخ
وفی الأشباه والنظائر فی الدعاء لرفع الطاعون. إذا نزل بالمسلمین نازلة.

(باقی آئندہ صفحہ پر)

علماء نے قنوتِ نازلہ کے لئے جو الفاظ تحریر کئے تھے، وہ بددعا نہیں بلکہ دعا پر مشتمل تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۵/۷/۱۳۹۷ھ

(فتوی نمبر ۷۷/۲۸ج)

(گذشتہ سے پیوستہ) قنت الإمام فی صلاة الجهر، وهو قول الثوری وأحمد، وقال جمهور أهل الحديث: القنوت عند النوازل مشروع فی الصلوات كلها (انتهى) وفی فتح القدير أن مشروعية القنوت للنازلة مستمر لم ينسخ الخ

وفی البحر الرائق ج: ۴ ص: ۱۱۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وإن نزل بالمسلمين نازلة قنت الإمام فی صلاة الجهر وهو قول الثوری وأحمد وقال جمهور أهل الحديث القنوت عند النوازل مشروع فی الصلوات كلها اهـ. (قوله ويتبع المؤتم قانت الوتر) وقال محمد لا يأتی به المأموم بل يؤمن لأن للقنوت شبهة القرآن لاختلاف الصحابة فی قوله اللهم إنا نستعينک أنه من القرآن أو لا .... لأنه دعاء حقيقة كسائر الأدعية والثناء والتشهد والتسبيحات.

وفی حاشية الطحطاوی علی المراقی ص: ۲۵۲ (طبع مطبعة كبریٰ مصر) ولا يباح الدعاء علی أحد من المسلمين بالموت بالطاعون ولا بشیء من الأمراض ولو كان فی ضمنه الشهادة ويجوز الدعاء بطول العمر الخ

وفی رد المحتار كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب فی القنوت للنازلة ۲/۱۱. ط. سعيد شرعية القنوت فی النوازل مستمرة، وهو محمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته -عليه الصلاة والسلام -، وهو مذهبنا وعليه. الجمهور .وقال الحافظ أبو جعفر الطحاوی :إنما لا يقنت عندنا فی صلاة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية فلا بأس به، فعله رسول الله -صلی الله عليه وسلم.

وفيه أيضاً: قال فی الصحاح: النازلة الشديدة من شدائد الدهر، ولا شک أن الطاعون من أشد النوازل. (شامی ۲/۱۱. ط.سعيد)

مسند امام اعظم رحمہ اللہ کے چند راویوں پر بحث

سوال:۔ استاذ العلماء حضرت مولانا عثمانی صاحب دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمہ اللہ

مزاج گرامی!

تسلیمات مسنونہ کے بعد گزارش ہے کہ امید ہے کہ آنجناب خیر وعافیت سے ہونگے۔

ایام ہذا تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے جناب کیلئے اہم ہیں، محسوس نہ فرماویں۔

بعض دفعہ اشکالات پیش آتے ہیں انکے حل کیلئے جناب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، از راہ شفقت جواب سے مطلع فرمادیں تو عین نوازش ہوگی۔ جناب سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے مسانید بروایۃ حصکفی وبروایۃ ابی نعیم اصفہانی وغیرہ میں امام صاحبؒ کی روایات میں مجروح راوی پائے جاتے ہیں مثلاً محمد بن السائب الکلبی، عطیہ عوفی، جابر بن یزید الجعفی وغیرہ۔

حضرت امام صاحب نے ان سے روایات نقل کی ہیں، گویا کہ امام صاحب کے اساتذہ میں انکا شمار ہے۔

اور علماء رجال کی طرف سے ان رواۃ پر مفصل جرح پائی جاتی ہے۔

معترضین کی طرف سے اعتراض یہ ہے کہ اس طریقہ سے امام صاحبؒ کی روایات صحیح نہیں ہیں اور قابل اعتبار نہیں ان پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے؟؟

والسلام بصد احترام

ناچیز

محمد نافع عفا اللہ عنہ

از محمدی شریف ضلع چنیوٹ

۲۸ر جمادی الاخری ۱۴۳۲ھ (یکم جون ۲۰۱۱ء)

جواب:۔ مخدوم گرامی قدر ومکرم حضرت مولانا محمد نافع صاحب نفعنا اللہ بعلومہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ نظر نواز ہوا، یہ آنجناب کی تواضع کریمانہ ہے کہ اس جیسے مسائل میں اس نا کارہ کوخدمت کا موقع عنایت فرمایا، حالانکہ آنجناب کے علم وفضل کواسکی ضرورت نہ تھی ،اگرچہ آگے جوکچھ عرض کروں گا وہ یقیناً آنجناب کے علم میں پہلے ہی ہوگا لیکن تحصیل سعادت اور تکمیل حکم کے طور پر چند نکات عرض کرتا ہوں:

(۱) یہ بات مسلم ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی مسانید ہیں ،وہ خود حضرت امام اعظمؒ کی تالیف نہیں ہیں بلکہ بعد کے حضرات نے ان روایات کوجمع کردیا ہے جوان تک حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے واسطے سے پہنچی ہیں ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جوخود حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں جیسے امام ابویوسفؒ ،امام محمدؒ،حسن بن زیادؒ،حماد بن ابی حنیفہ رحمہم اللہ تعالی اور کچھ وہ ہیں جوحضرت امام ابوحنیفہؒ کے صدیوں بعد آئے ہیں جیسے حافظ ابن عدیؒ اور حافظ ابونعیم اصفہانیؒ ان حضرات نے اپنی اپنی سندوں سے وہ روایات جمع کی ہیں جوانہیں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہنچی ہیں ان روایات کی امام ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت اسی وقت صحیح ہوگی جب جامع مسند سے لیکر امام ابوحنیفہؒ تک کی سند قابل قبول ہواور درمیان میں کوئی ضعیف یا نا قابل اعتبار راوی نہ ہولہذا ان مسانید کی ہرروایت کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعۃ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے بلکہ ہرروایت کی سند کی تحقیق ضروری ہے۔

(۲) ان مسانید میں مروی جس روایت کے بارے میں ثابت ہوجائے کہ وہ واقعۃ حضرت امامؒ سے مروی ہے اسکا حاصل بھی صرف یہ ہے کہ حضرتؒ کے پاس یہ روایت موجود تھی اور آپنے اپنے کسی شاگرد کے سامنے اسے روایت فرمایا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ نے اس روایت کوصحیح یا قابل استدلال بھی قرار دیا ہے کیونکہ جب کئی امام کوئی حدیث بحیثیت محدث (نہ کہ بطور فقیہ) روایت کرتا ہے تو وہ ہر قسم کی احادیث روایت کرتا ہے چاہے وہ اسکے نزدیک صحیح

ہو یا ضعیف، چنانچہ صحیحین کے علاوہ تمام احادیث کی کتابیں ایسی روایات سے بھری ہوئی ہیں، جن میں کوئی راوی ضعیف ہے پھر بعض محدثین انکے ضعف پر متنبہ بھی فرمادیتے ہیں، جیسے امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ اور بعض مرتبہ تنبیہ بھی نہیں فرماتے کیونکہ مقصد روایت کرنا ہوتا ہے، استنباط احکام نہیں، لہذا امام ابوحنیفہؒ نے بھی کسی ضعیف راوی کی حدیث روایت کی ہو تو بحیثیت محدث روایت فرمائی ہے جیسا کہ تمام محدثین روایت کرتے رہے ہیں کسی بھی محدث پر اس وجہ سے کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ اس نے فلاں ضعیف راوی سے حدیث کیوں لی ہے؟ اور اسے استاذ کیوں بنایا؟ کیونکہ محدثین کسی راوی کی روایات کو جاننے اور پرکھنے کیلئے بھی روایات لیتے رہے ہیں۔

(۳) جن راویوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ان میں جہاں تک جابر بن زید جعفی کا تعلق ہے اسکی ایک حدیث طلحہ بن محمد کی مسند میں آئی ہے:

عن نافع عن ابن عمران رسول اللہ ﷺ کان یجعل وترہ آخر صلاتہ ویقنت فیہ (جامع المسانید ج ا ص ۴۰۳)[1] دوسری طرف جابر جعفی کے بارے میں خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مشہور ہے جو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے کہ:

مالقیت فیمن لقیت اکذب من جابرالجعفی، ماأتیتہ بشئی من رائیی، الاجاء فیہ باثر (تہذیب التہذیب ص ۴۸ ج ۲)[2]

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ جابر جعفی کی احادیث کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ وتر کے سلسلے میں جو حدیث امام ابوحنیفہؒ سے بروایت جعفی مروی ہے وہ اس طرح ہے:

عن القاسم بن اسماعیل والقاسم بن معن قالا: سمعنااباحنیفة یقول: ماسالت جابر الجعفی عن مسئلة قط الا اورد فیها حدیثاً ولقد

---

(۱) طبع: المکتبة الاسلامیة سمندری

(۲) طبع: دائرة المعارف النظامیة هند

سالته عن وتر رسول الله ﷺ فقال :حدثنی نافع عن ابن عمر (جامع المسانیدص ۳۰۵ ج ۲)[1]

جس سے واضح ہے کہ اس حدیث کوامام ابوحنیفہؒ نے اس سیاق میں روایت فرمایاہے کہ جابر جعفی ہرسوال کاجواب کسی حدیث سے دیدیا کرتا تھا،جسکی وجہ سے وہ مجروح ہے۔

(۴)جہاں تک محمد بن السائب کلبی کاتعلق ہے توامام ابوحنیفہؒ سے اسکی ایک روایت بندہ کومسند حصکفی میں مل سکی ہے مگر وہ ایک تاریخی روایت ہے جووحشی رضی اللہ عنہ کے اسلام سے متعلق ہے ،اور امام ابوحنیفہؒ تک اسکی سند صحیح ہوتو نکتہ نمبر۲ میں جوبات عرض کی گئی ہے اسکے پیش نظر قابل اعتراض نہیں۔

(۵)عطیہ عوفی سے بیشک امام ابوحنیفہؒ کی بہت سی روایتیں مسانید امام اعظم میں مروی ہیں لیکن وہ ایک مختلف فیہ راوی ہیں، یحیی بن معین نے انہیں ''صالح'' کہاہے امام بخاریؒ نے ''الادب المفرد''میں انکی روایت نقل کی ہے ،ابوداؤداور ترمذی نے بھی انکی روایت کوثقہ کہا ہے ،انکی خرابی یہ ہے کہ وہ بعض اوقات عن ابی سعید کہہ کر روایت کرتے ہیں ،جس سے سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کررہے ہیں لیکن درحقیقت وہ کلبی سے روایت کررہے ہوتے ہیں ،اور کلبی کوابوسعید کی کنیت سے یاد کرتے ہیں ،جیسا کہ بندہ نے تفصیل کے ساتھ تکملة فتح الملہم ،کتاب الجہاد ،(ص۵۹ ج۳ طبع دمشق)[2] میں بیان کیاہے ،لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ سے انکی جوروایتیں منقول ہیں ،ان میں عن ابی سعید کے ساتھ الخذری کی صراحت موجود ہے ،اسلئے ان میں تلبیس کااحتمال نہیں ہے ،اور یہ ممکن ہے حضرت امام ابوحنیفہ رحمة اللہ علیہ کی رائے عطیہ العوفی کے بارے میں وہ ہو جویحیی بن معین رحمة اللہ علیہ سے منقول ہے ،اور جسکی وجہ سے امام بخاریؒ نے بھی ''الادب المفرد''میں انکی روایت لی ہے ،اور اکثر محدثین کا یہ مسلک رہاہے کہ جو'صاحب

---

(۱)ج:۱،ص:۳۰۵ طبع المکتبة الاسلامیة سمندری

(۲)وفی طبع مکتبة دارالعلوم کراتشی ج:۳،ص:۹۹و۱۰۰

بدعۃ'' اپنی بدعت کا داعی نہ ہو اسکی وہ روایات وابل قبول ہوسکتی ہیں جن سے اسکی بدعت کو تقویت نہ ہوتی ہو۔

اسکے ساتھ وہ بات بھی ذہن میں رہے جو نکتہ نمبر۲ میں اوپر بیان کی گئی ہے، تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر عطیہ عوفی سے روایت کرنے کی وجہ سے طعن کرنا قطعاً بے محل ہے۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ نکات اس معاملے کی وضاحت کیلئے کافی ہونگے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

والسلام مع الاکرام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/رجب ۱۴۳۲ھ

صحیح بخاری کی روایات کے بارے میں چند نکات کی وضاحت

سوال: معلیٰ القاب حضرت مدظلہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت والا گزارش ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث الامام الھمام حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے متعلق جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا مبارک جملہ محدثین علماء ارشاد فرماتے ہیں، تو یہ حکم بخاری شریف کی احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے یا بخاری شریف میں موجود ان واقعات کے متعلق بھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش آئے اور حضرت امام بخاریؒ نے انہیں کسی حدیث مبارک کے ذیل میں درج فرمایا مثلاً واقعہ مطالبہ فدک میں مذکورہ جملے جن پر وعموما فریق مخالف معترض رہتا ہے۔

(۲) وہ جلیل القدر حضرات محدثین جن سے حضرت امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری شریف میں روایت لیتے ہیں ان کے ثقہ ہونے کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ صحیح بخاری شریف کے راوی ہیں اور بزرگوں نے فرمایا

" کان ابو الحسن المقدسی یقول فی الرجل الذی یخرج عنہ فی

الصحیح هذا جاز القنطرة یعنی لا یلتفت الی ماقال فیه "(ارشاد الساری جلد ۱ صفحه ۳۹)

مگر گزارش ہے کہ بخاری شریف میں آجانے کے سبب ان کی ثقاہت صرف علم حدیث کے متعلق ہوگی یا دیگر علوم مثلاً تاریخ میں یہ عظمت مسلم ہوگی۔

آنجناب سے دست بستہ گزارش ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر بندے کو جواب سے سرفراز فرمادیں نوازش ہوگی۔

محمد عمر قریشی
(جامعہ فرقانیہ دارالمبلغین کوٹ ادو)

جواب:۔گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد عمر قریشی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ جو صحیح بخاری کے بارے میں ایک سوال پر مشتمل ہے موصول ہوا چونکہ یہ ایک اہم سوال ہے جس کے بارے میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے اس لئے خیال ہوا کہ اسکا جواب قدر تفصیل سے عرض کیا جائے اور اسکے لئے فرصت نکالنے میں وقت لگا اور جواب میں قدر تاخیر ہوگئی اس پر معذرت خواہ ہوں۔

دراصل اس مسئلے میں دو نکتے بطور خاص قابل توجہ ہیں:۔

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "جمیع مافی الصحیح صحیح "یعنی صحیح بخاری میں جو روایت بھی ہے وہ صحیح ہے اس میں پہلی وضاحت تو یہ ضروری ہے کہ یہ جملہ صحیح بخاری کی صرف مسند احادیث کے بارے میں ہے اس میں جو تعلیقات آئی ہیں ان کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے وضاحت فرمائی ہے کہ ان میں بعض تعلیقات سنداً حسن بھی ہیں بعض ضعیف بھی ہیں۔(ہدی الساری الفصل الرابع ص۱۷)[1]

---

(۱) ج۱ص۲۶ طبع مکتبہ صید الفرائد

دوسری وضاحت یہ ضروری ہے کہ اس جملے میں ''صحیح'' سے اس کے اصطلاحی معنی مراد ہیں یعنی مراد یہ ہے کہ بخاریؒ کی تمام احادیث مسندہ سند کے اعتبار سے اس تعریف پر پوری اترتی ہے کہ '' **رواہ العادل التام الضبط من غیر انقطاع ولا علۃ ولا شذوذ** ''[۱]

لیکن ہر روایت جو اس تعریف پر پوری اترتی ہو اس کے بارے میں گمان غالب تو بے شک یہی ہوتا ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح یا درست ہوگی لیکن ساتھ ہی اس میں یہ احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ راوی کے قابل اعتماد ہونے کے باوجود اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو جسے حضرات محدثین ''وہم'' سے تعبیر کرتے ہیں چونکہ گمان غالب یہی ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح ہوگی اس لئے وہ مخالف احتمال کے باوجود حجت ہے اس لئے کہ دنیا و دین کے سارے کاروبار گمان غالب کی بنیاد پر ہی چلتے ہیں اور ہر جگہ قطعی یقین کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا لیکن چونکہ دوسرا احتمال بھی موجود ہے اس لئے اگر خارجی دلائل سے وہ احتمال بذات خود یقین یا گمان غالب کے درجے کو پہنچ جائے تو اس صورت میں حضرات فقہاء و محدثین اس کی بنیاد پر یہ فرمادیتے ہیں کہ حدیث کے بے حیثیت سند'' صحیح'' کے معیار پر پورا اترنے کے باوجود اس کے فلاں حصے میں راوی سے ''وہم'' ہوگیا ہے اور وہ حصہ نفس الامر کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں بھی موجود ہیں یعنی حدیث کے بحیثیت سند اصطلاحی مفہوم میں ''صحیح'' ہونے کے باوجود محدثین نے فرمایا ہے کہ اس کے کسی حصے میں راوی سے وہم ہوا ہے اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الذکوۃ "**باب فضل صدقۃ الصحیح الشحیح**"[۲] کے تحت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث منقول ہے[۳] جس میں حضور اقدس ﷺ نے ازواج مطہرات کے اس سوال کے جواب میں کہ '' ہم میں سے کون آپ سے (وفات کے

---

(۱) دیکھئے شرح نخبۃ الفکر صہ ۴۲ (طبع قدیمی کتب خانہ) و مقدمہ ابن الصلاح ج ۱ صہ ۱۰۱ (طبع دار الکتب العلمیہ بیروت) و معجم المصطلحات الحدیثۃ د۔ محمود الطحان حرف الحاء ج ۱ صہ ۱۸ و نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر ج ۱ صہ ۸ (طبع مکتبہ مشکوۃ)

(۲ و ۳) ج ۱، صہ ۱۹۱ (طبع قدیمی کتب خانہ) (۶) ج ۳ صہ ۲۸۷ (طبع دار المعرفہ بیروت)

بعد) جلدی آکر ملے گی'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اطولکن یدا'' یعنی ''جن کے ہاتھ تم میں سب سے زیادہ لمبے ہیں'' اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد منقول ہے کہ ''فکانت سودة اطولهن يدا فعلمنا بعد انما كانت طول يدها الصدقة وكانت اسرعنالحوقا به، وكانت تجب الصدقة''[1]

اس روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ '' اطولهن يداً'' سے مراد حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں اور ان کے ہاتھ لمبے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدقہ بہت کرتی تھیں انہوں نے ہی آپ ﷺ کے بعد سب سے پہلے وفات پائی۔

لیکن دوسرے واضح دلائل کی روشنی میں یہ بات طے ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال حضرت زینب بنت جحشؓ کا ہوا چنانچہ علامہ ابن جوزیؒ نے فرمایا

''هذا الحديث غلط من بعض الرواة ....وكل ذلک وهم، وانما هي زينب ،فانها كانت اطولهن يدا بالعطاء كما رواه مسلم''(فتح الباری ص ۲۸۶،۲۸۷ ج۳)[2]

اور حافظ ابن حجر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ وہم ابوعوانہؒ سے ہوا۔

(۲) صحیح بخاری کتاب التوحید ''باب ان رحمة الله قريب من المحسنين''[3] میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث جنت وجہنم کے بارے میں مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہے

''فاماالجنة فان الله لا يظلم من خلقه احد،وانه ينشئى للنار من يشاء''[4]

جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کو بھرنے کے لئے جو مخلوق چاہے گا پیدا کرے گا

---

(۱) دیکھئے گذشتہ صفحہ کا حاشیہ (۱)

(۲) طبع: دارالمعرفة بيروت

(۳و۴) صحیح البخاری ج۲ص۱۱۱۰ (طبع قدیمی کتب خانہ)

حالانکہ یہاں راوی سے جہنم کا ذکر کرنے میں وہم ہوا ہے صحیح روایت وہ ہے جو خود امام بخاریؒ نے سورۃ القاف کی تفسیر میں نقل فرمائی ہے کہ

"واما الجنة فان الله عزوجل ينشئى لها خلقا" (حديث نمبر ۴۸۵۰)[۱]

چنانچہ علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں،

"وقيل هذا وهم من الراوى الخ (عمدة القارى كتاب التوحيد ج ۲۵ ص ۲۰۶)[۲]

(۳) صحیح بخاری کی کتاب التوحید ہی میں قاضی شریکؒ کی سند سے معراج کا جو واقعہ مروی ہے (حدیث نمبر ۷۵۱۷)[۳] اس کے بارے میں معروف ہے کہ اس میں راوی سے سے اوہام ہو رہے ہیں، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بارہ معاملات میں دوسری مشہور روایات کی مخالفت کی ہے (فتح الباری (۱۳/۴۸۵)[۴] اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ نے لامع الدراری میں اس پر مزید اوہام کا اضافہ کیا ہے۔

(۴) صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب اذا اشترط البائع ظہر الدابۃ (حدیث ۲۷۱۸)[۵] میں حضرت جابرؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹ بیچنے کا واقعہ مختلف روایات سے بیان ہوا اس میں داؤد بن قیس سے امام بخاریؒ یہ الفاظ تعلیقاً نقل کئے ہیں "اشتراہ بطریق تبوک" یعنی یہ خریداری تبوک کے راستے میں ہوئی تھی۔ یہ تعلیق سنداً صحیح ہے، لیکن اس میں تبوک کے ذکر کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس واقعے کا تبوک کے بجائے غزوۂ ذات الرقاع میں پیش آنا زیادہ ظاہر ہے (فتح الباری)[۶]

---

(۱) ج ۲ ص ۷۱۹ (طبع قدیمی کتب خانہ)

(۲) ج ۲۵، ص ۱۳۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

(۳) صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۱۲۰ (طبع قدیمی کتب خانہ)

(۴) ج ۱۳ ص ۶۱۵ (طبع مکتبہ الرشید)

(۵) ج ۱ ص ۳۷۵ (طبع قدیمی کتب خانہ)

(۶) جلد ۵ ص ۴۱۵ (طبع مکتبۃ الرشید)

(۵) صحیح مسلمؒ کتاب الرضاع "باب جواز هبتهانوبتهالضرتها"[۱] میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حضرت عطاءؒ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ" ماتت بالمدينة " یہ یقیناً وہم ہے کیونکہ حضرت میمونہؓ کی وفات سرف میں ہوئی، اور خود صحیح مسلم کی دوسری روایت میں اس کی صراحت موجود ہے۔

نیز اسی باب میں حضرت عطاءؒ کی یہ روایت بھی منقول ہے کہ"التی لايقسم لها صفية بنت حيبى " حالانکہ علامہ نوویؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا"هذا وهم من ابن جريج الرواى عن عطاء وانما الصواب سودة كما فى الاحاديث"[۲]

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو روایات "صحیح" کی اصطلاحی تعریف پر پوری اترتی ہیں ان میں بھی یہ احتمال ہوتا ہے کہ ان کی کوئی بات نفس الامر کے اعتبار سے واقعے کے مطابق نہ ہو۔لیکن اگر کوئی شخص اس قسم کی باتوں کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ ان احتمالات کی وجہ سے پوری حدیث ہی مشکوک ہوگئی، یا جو احادیث "صحیح" کی اصطلاحی تعریف پر پوری اترتی ہیں وہ بھی قابل اعتماد نہ رہیں۔اور ان کی بنیاد پر احکام کا استنباط بھی صحیح نہ رہا، تو یہ بات بھی بالکل غلط ہوگی ،اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اوہام "صحیح" احادیث میں بہت کم ہوتے ہیں، جنہیں احادیث صحیحہ کے مجموعی ذخیرے کے مقابلے میں شاذ و نادر کہا جائے تو بیجا نہیں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عموماً اس قسم کے اوہام کسی حدیث یا واقعے کی جزوی اور ضمنی تفصیلات میں واقع ہوئے ہیں جن سے روایت کے

مرکزی مفہوم پر اثر نہیں پڑتا اور ثقہ راوی کسی روایت کے مرکزی مفہوم کو تو بڑے اہتمام سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسی جزوی تفصیلات جو مرکزی مفہوم کے لحاظ سے ضمنی نوعیت کی ہوتی ہیں، ان کے ضبط میں بعض اوقات اتنا اہتمام نہیں کرتے، اسی بات کو حضرت شاہ ولی

(۱) جلد ا ص ۴۷۳ (طبع فاروقی کتب خانہ)
(۲) جلد ا ص ۱۰۷ (طبع دارالعلوم کراچی)

اللہؒ صاحب محدث دہلویؒ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے کہ "وجمهور الرواة كانوا يعتنون برئوس المعاني لا بحواشيها" (حجة الله البالغه باب القضاء في الاحاديث المختلفة ج ۱ ص ۲۴۱)[1]

لہذا وہ ضمنی انداز کی باتیں جنہیں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے "حواشی" سے تعبیر فرمایا ہے اگر ان میں کسی راوی سے کوئی وہم ہوجائے تو اس کی بنیاد پر اس کی پوری حدیث کو رد نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ایک ایسی ہی روایت کے وہم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "لايلزم من وهم الراوى فى لفظة من الحديث ان يطرح حديثه كله" فتح الباری، کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ تحت حدیث ۵۱۹۱۔[2]

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرات محدثین اور ناقدین روایات نے اس معاملے میں انتہائی حقیقت پسندی اور اعتدال وتوازن سے کام لیا ہے، ایک طرف وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ اور اسکے معترف ہیں کہ انسان خواہ کتنا ثقہ اور قابل اعتماد ہو بہرحال انسان ہے اور اس سے بشری بھول چوک ممکن ہے یہاں تک کہ حضرت یحیی بن معینؒ نے جو اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں فرمادیا کہ "من لم يخطئى فى الحديث فهو كذاب "(تاريخ يحيى بن معين ج۳ص ۵۴۹ وج ۳ص ۲۷۴)[3] یعنی جو شخص یہ دعوی کرے کہ حدیث میں اس سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، وہ جھوٹا ہے۔

اور دوسری طرف وہ اس حقیقت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم نے "ماآتاکم الرسول فخذوه " کا جو حکم دیا وہ قیامت تک کیلئے واجب العمل ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیتا جس پر عمل ممکن نہ ہو اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی احادیث کی حفاظت کیلئے وہ انتظام فرمایا ہے جس کی نظیر کسی بھی مذہب وملت میں موجود نہیں ہے، لہذا ان

(۱) جلد ۱ ص ۱۴۰ (طبع نور محمد کارخانہ تجارت کتب)
(۲) ج ۹ ص ۲۸۶ (طبع دار المعرفہ بیروت)
(۳) ج ۱ ص ۱۲۰ موقع الوراق

جزوی اوہام کی وجہ سے حضرات محدثین کی ان بے نظیر کاوشوں پر پانی نہیں پھیرا جاسکتا جو انہوں نے حفاظت حدیث کے خدا ساز انتظام کے تحت فرمائی ہیں۔ چنانچہ نقد احادیث کے وسیع وعریض علم نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صحیح بخاری کو جو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی احادیث مسندہ بحیثیت مجموعی سند کے اعتبار سے ہر دوسری کتاب سے زیادہ صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی ہر ہر حدیث پر یہ بات صادق آتی ہے۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ صحیح بخاری میں ایک حدیث جس سند کے ساتھ آئی ہے، کسی دوسری کتاب میں وہی حدیث زیادہ بہتر سند کے ساتھ آئی ہو، امام ابن ماجہ کی سنن کو صحاح ستہ میں سب سے آخری درجہ دیا جاتا ہے، لیکن اس کی بعض روایتوں کی سند صحیح بخاری کی سند سے زیادہ صحیح ہے، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ علیہ نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ (دیکھئے امام ابن ماجہ اور علم حدیث از حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ ص ۲۴۳)

''صحیح'' اور ''اصح'' کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ نے جو پوچھا ہے کہ ''اصح الکتب بعد کتاب الله'' کا مبارک جملہ...... بخاری شریف کی احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے یا بخاری شریف میں موجود ان واقعات کے متعلق بھی ہے جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش آئے'' اس کا جواب یہ ہے کہ ''صحیح'' اور ''اصح'' کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد یہ جملہ دونوں ہی سے متعلق ہے جہاں تک مطالبہ فدک والے حصے کا تعلق ہے، اس کی حقیقت اگلے نکتے سے واضح ہوگی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی کسی روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ سند کے اعتبار سے وہ صحیح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس راوی کی طرف وہ منسوب ہے، اس راوی تک اسکی سند صحیح ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک راوی کسی واقعے یا حدیث کی روایت کے بعد اس پر اپنی طرف سے کسی تشریح یا تبصرے کا اضافہ کرتا ہے جسے محدثین کی اصطلاح میں ''مدرج'' کہا جاتا ہے۔

بعض اوقات تو اس راوی کا شاگرد واضح کردیتا ہے کہ یہ جملہ حدیث کا حصہ نہیں بلکہ میرے استاذ کا تبصرہ ہے لیکن بعض اوقات یہ ''مدرج'' حصہ اس کی اصل روایت سے ممتاز نظر نہیں آتا بلکہ اسی روایت کے دوسرے طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راوی کا ادراج ہے، اس کی بہت سی مثالیں آپ کے علم میں یقیناً ہونگی، فدک کے مطالبے والی حدیث امام بخاری نے امام ظہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے اور وہ اسے حضرت عائشہؓ سے روایت فرماتے ہیں لیکن حضرت عائشہؓ کی حدیث اس جملے پر ختم ہوگئی ہے کہ **فقال ابوبكر ان رسول الله ﷺ قال لا نورث ماتركنا صدقة انما ياكل آل محمد ﷺ في هذا المال واني والله لا اغير شيئا من صدقة رسول الله ﷺ عن حالها التي كانت عليها في عهد رسول الله ﷺ ولا عملن فيها بما عمل به رسول الله ﷺ فابى ابوبكر ان يدفع الى فاطمة شيئا''**[1]

جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی، آپ ﷺ نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ وقف ہے اور جس طرح اس سے آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں آنحضرت ﷺ کے اہل وعیال پر خرچ کیا جاتا ہے اسی طرح میں بھی خرچ کرتا رہوں گا، اس بناء پر انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو یہ جائیداد مالک بنا کر دینے سے انکار کردیا۔

اس کے بعد جو عبارت ہے کہ حضرت فاطمہؓ صدیق اکبرؓ پر ناراض ہوئی اور بات چیت نہیں کی[2]، یہ حضرت عائشہؓ کی روایت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ امام ظہریؒ کا ادراج ہے، یہ بات اسی روایت کے دوسرے طرق سے بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ساری عبارت امام زہریؒ کی ہے، حضرت عائشہؓ کی نہیں جیسا کہ بیہقی کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے اور اس کے مزید دلائل بندے نے تفصیل کے ساتھ تکملہ فتح الملہم، کتاب الجہاد والسیر، باب قول النبی ﷺ: لانورث میں بیان کئے ہیں۔ تکملہ فتح الملہم ج ۳ ص ۵۵ طبع دمشق) اور حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہم نے

(۱و۲) صحیح البخاری ج۲ص ۶۰۹ (طبع قدیمی کتب خانہ)

اپنی کتاب ”رحماء بینھم“ میں اس پر نہایت فاضلانہ بحث فرمائی ہے، بندے نے بھی اس سے استفادہ اور اقتباس کیا ہے۔

اب یہ روایت امام زہری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہوئی، اور امام زہری رحمہ اللہ کی طرف اس کی نسبت صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہے، یعنی امام زہریؒ سے یہ قول صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے لیکن خود امام زہریؒ یہ بات کس بنیاد پر کہی اس کا علم نہیں چونکہ وہ خود اس واقعے کے وقت موجود نہ تھے، اس لئے انہیں اس کا براہ راست علم حاصل ہونا ممکن نہ تھا بظاہر یہ انہوں نے کچھ لوگوں سے سن کر ہی کہا ہوگا، اور جن لوگوں سے سنا ان کا حال معلوم نہیں اور اس کے خلاف دوسری بہت سی مستند روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاطمہؓ کے تعلقات خوشگوار ہوگئے تھے، ان روایات کی تفصیل حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہم نے بھی بیان فرمائی ہے، اور ان کا خلاصہ بندے نے تکملہ فتح الملہم میں بھی لکھ دیا ہے اس طرح بخاری کی یہ روایت اس حد تک صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہے کہ امام زہریؒ تک اس کی نسبت صحیح سند سے ثابت ہے، لیکن خود امام زہریؒ کو بظاہر اس معاملے میں کوئی مغالطہ ہوا ہے۔

(۲) آپ نے دوسرا سوال صحیح بخاری کے راویوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ کیا ان کی حدیث کا صحیح بخاری میں آجانا ہی ان کے ثقہ ہونے کیلئے کافی ہے؟ اور ان کا ثقہ ہونا علم حدیث سے متعلق ہے یا دیگر علوم مثلاً تاریخ میں بھی اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ آپ نے علامہ قسطلانیؒ کے حوالے سے ابوالحسن مقدسی کا قول بھی نقل کیا ہے کہ **ھذا جاز القنطرۃ**[۱]۔

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ بے شک مجموعی اعتبار سے یہ بات درست ہے کہ صحیح بخاری کے رجال میں سے ہونا راوی کا ایک اعزاز ہے، اور اکثر و بیشتر یہ کہنا درست ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے جن راویوں کی احادیث اپنی صحیح میں روایت کی ہیں وہ ثقہ ہیں لیکن ابوالحسن مقدسی رحمہ اللہ کے قول کو ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر سمجھنا بھی محققین کے نزدیک درست نہیں ہے صحیح بخاری میں بہت

(۱) ھدی الساری مقدمہ فتح الباری ج۲ ص ۲۵۶ (مکتبۃ صید الفوائد)

سے راوی ایسے ہیں جن پر کلام ہوا ہے اوران کی بعض روایات جوصحیح بخاری سے باہر کہ ہیں، رد کی گئی ہیں ۔ بلکہ کسی حدیث کو ''علی شرط البخاری'' قرار دینے میں بعض اوقات لوگوں کو اس بناء پر بھی مغالطہ لگا ہے کہ انہوں نے کسی ایسے راوی کی حدیث دیکھی جن سے امام بخاریؒ نے صحیح میں روایت لی ہے ،پھر اسی راوی کی کوئی اور حدیث کہیں دوسری جگہ نظر آئی تو کہہ دیا کہ یہ ''علی شرط البخاری'' ہے حالانکہ بعض اوقات کسی ثقہ راوی کے بارے میں کلام ہوتا ہے ،لیکن امام بخاریؒ اس کی صرف وہ حدیث لاتے ہیں جس کے بارے میں خارجی دلائل سے ان کو ثابت ہوجاتا ہے کہ اس راوی نے یہ حدیث صحیح روایت کی ہے ،لیکن ضروری نہیں کہ اس کی ہر روایت بخاری کے معیار پر پوری اترتی ہو ،امام حاکم نے مستدرک میں اسی قسم کی روایت کو ''علی شرط البخاری'' کہہ دیا ہے جس پر دوسروں نے تنقید کی ہے ،اور انہیں متساہل قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے ،اس موضوع پر علامہ جمال الدین زیلعی رحمہ اللہ نے جہر بسملہ کی بحث میں بڑی مفصل اور فاضلانہ بحث فرمائی ہے ،انہوں نے مثال دی ہے کہ امام بخاری نے خالد بن مخلد قطوانی کی متعدد احادیث نقل کی ہیں لیکن ان کی وہی احادیث لائے ہیں جو انہوں نے سلیمان بن بلال وغیرہ سے روایت کی ہیں ،لیکن ان کی وہ روایات نہیں لیں جو وہ عبد اللہ بن مثنیٰ سے روایت کرتے ہیں ، کیونکہ وہ روایات صحت کے اعلیٰ معیار پر نہیں اترتیں ،اسی طرح عکرمہؒ کی حضرت ابن عباسؓ سے امام بخاریؒ نے بہت کم روایات لی ہیں جن کے بارے میں ان کو اطمینان ہوگیا کہ یہ صحیح ہیں لیکن ان کی بہت سی روایات ترک کردیں ۔

چنانچہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : **لایلزم من کون الرواى محتجا به فى الصحيح انه اذا وجد فى اى حديث،كان ذلك الحديث على شرطه (نصب الراية ج ١ ص ٣٤١ بحث جهر بسمله** [١]

لہذا یہ بات کسی راوی کی تمام روایات کے مقبول ہونے کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس کا نام صحیح بخاریؒ یا صحیح مسلم میں آ گیا ہے، بلکہ اس کے لئے محدثانہ چھان پھٹک کی ضرورت ہے ،البتہ

(١) ج١ص٢٦٢ (طبع دار الحديث مصر)

یہ کہنا بڑی حدتک درست ہے کہ امام بخاریؒ نے ان کی جو حدیث لی ہے، وہ صحیح کے معیار پر پوری اترتی ہے، اور اس میں علم حدیث یا علم تاریخ کا کوئی فرق نہیں، بشرطیکہ ''صحیح'' کو اس کے اصطلاحی معنی میں سمجھا جائے اور جو وہ نکتے پہلے سوال کے جواب میں عرض کئے گئے ہیں، انہیں ملحوظ رکھا جائے۔

والسلام

یکم ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ

بدعتی کی روایت کا حکم

اور بعض اصطلاحات شرعیہ کی وضاحت

سوال:۔ بخدمت گرامی حضرت شیخنا المکرّم زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اللہ جل شانہ کی ذات سے امید ہے کہ آنجناب خیریت سے ہونگے۔ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی۔

راقم نے آنجناب سے اپنے ایک رسالہ پر دعائیہ کلمات کیلئے عرض کیا تھا، آنجناب نے ذرہ نوازی فرمائی تھی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

رسالہ طبع ہوگیا ہے اور تین نسخے پیش خدمت ہیں۔

حضرت الشیخ! رسالہ کے مقدمہ کی تیاری میں راقم نے الحمدللہ! تہذیب، تقریب، تذکرہ اور میزان کو استیعاباً، لفظاً لفظاً پڑھا ہے۔ فللہ المنۃ۔

انکے مطالعہ سے ایک سوال ایسا پیش آیا ہے کہ حل نہیں ہو رہا آپ سے رہنمائی کی گذارش ہے۔

سوال یہ ہے: کبار اکابر ایسے ہیں جن پر مؤرخین نے بدعتی ہونے کا قول اختیار کیا ہے،

محققین مثلاً امام ذہبیؒ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی انکے بدعتی ہونے کو تسلیم کیا ہے، آنجناب کی نگاہ یقیناً ہدی الساری اور تدریب الراوی کی ان فصول پر پڑی ہوگی جن میں ان بدعتی ''اعلام'' کے نام ضبط ہیں۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ مسلمات میں یہ ہے کہ عملی بدعتی کی شناعت اتنی نہیں، جتنی اعتقادی بدعتی کی ہے، اس اصول پر ان بدعتی ''اعلام'' کا ہمارے دور کے بعض اہل بدعت سے زیادہ معذب ہونے کا شبہ گذرتا ہے، حالانکہ اسکا فساد بالکل ظاہر ہے تو پھر عملی بدعت اور اسکے حاملین اور اعتقادی بدعت اور اسکے معتقدین اکابر اہل علم کا تقابل کس طرح کیا جاسکتا ہے، اور ان اعلام کے بارے میں کس اصول کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انکی اعتقادی لغزشیں بدعتیں انکے حق میں مضر نہیں۔

ایک اور مختصر سوال یہ ہے کہ ''خلاف سنت'' کا لفظ ''سنت مؤکدہ'' کی مخالفت میں استعمال ہوتا ہے یا ''غیر مؤکدہ'' کی مخالفت میں بھی۔

کیا بعض سنتیں زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے تبدیل ہوجاتی ہیں؟ مثلاً دائیں طرف چلنا (اب بائیں طرف چلنا پڑتا ہے) درمیان سر سے مانگ نکالنا (اب ''غیر شرعی'' لوگ بھی نکالتے ہیں) امید ہے کہ شفقت فرمائیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد سفیان عطا

۹/۷/۱۴۳۲ھ

جواب:۔ گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد سفیان عطا صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپکا گرامی نامہ اور آپکی تالیف ''بخاری شریف کی صحت پر کئے گئے اعتراضات کا جائزہ'' موصول ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپکی اس خدمت کو نافع اور مقبول بنائیں۔ آمین۔

(۱) آپ نے اہل بدعت کے بارے میں جوبات پوچھی ہے، اسکے بارے میں عرض یہ ہے کہ بدعت اگر کفر کی حد تک پہنچی ہوئی ہو تو نہ اسکے قائل کی روایت معتبر ہے، اور نہ محدثین اہل حق نے ان میں سے کسی کی روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، اور اگر کسی نے دی ہے تو اس روایت کو معتبر قرار نہیں دیا گیا۔

البتہ ایسی بدعات اعتقادیہ جو کفر کی حد تک نہیں پہنچتیں، ان کو فسق اعتقادی قرار دینے کے باوجود بعض شرائط کے ساتھ انکے قائلین کی روایت کو مقبول قرار دیا گیا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ راوی اپنی بدعت کا داعی (مبلغ) نہ ہو، اور دوسرے یہ کہ اسکی روایت سے اسکی بدعت کو تقویت نہ پہنچتی ہو، اور تیسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں وہ کذب وغیرہ سے پرہیز کرتا ہو، رہا یہ سوال کہ حکم بالفسق کے بعد اس کو روایت میں عادل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ تو حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا ہے:

"فلقائل ان یقول :کیف ساغ توثیق مبتدع ،وحد الثقة العداالة والاتقان؟فکیف یکون عدلاًمن هوصاحب بدعة،وجوابه ان البدعةعلی ضربین ،فبدعة صغری،کغلوالتشیع،اوکالتشیع بلاغلوولاتحرف ،فهذا کثیر فی التابعین وتابعیهم مع الدین والورع والصدق،فلورد حدیث هؤلاء لذهب جملة من الآثارالنبویة،وهذه مفسدة بینة،ثم بدعة اخری،کالرفض الکامل والغلو فیه والحط علی ابی بکر وعمررضی الله عنهما،والدعا الی ذلک،فهذاالنوع لایحتج بهم ولاکرامة.وایضاًفمااستحضرالآن فی هذا الضرب،رجلاًصادقاً،ولاماموناً،بل الکذب شعارهم والتقیة والنفاق دثارهم،فکیف یقبل نقل من هذا حاله؟حاشاوکلا!فالشیعی الغالی فی زمان السلف وعرفهم هومن تکلم فی عثمان

والزبیروطلحۃومعاویۃوطائفۃ ممن حارب علیاًرضی اللہ عنہ وتعرض لسبھم“.

والغالی فی زماننا وعرفنا ھوالذی یکفر ھؤلاء السادۃ،ویتبرأمن الشیخین ایضاً،فھوضال مفتر.(میزان الاعتدال ترجمۃ ابان بن تغلب ج ۱ / ص ۵،۶)[۱]

اسکا حاصل یہ ہے کہ جس قسم کو حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بدعۃ صغریٰ کہا ہے، اگرچہ وہ نظری اعتبار سے فسق میں داخل ہو، لیکن ایسی اعتقادی کجی، اخلاص کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اور یہ ممکن ہے کہ اس زیغ اعتقادی کے باوجود کوئی شخص عملی زندگی میں صادق اور گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو، اسلئے اسکی روایت کو قبول کرلیا گیا ہے، کیونکہ فاسق عملی کی روایت رد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اسے حلال وحرام کی فکر نہیں ہے تو وہ کذب فی الروایۃ کا ارتکاب بھی کرسکتا ہے، لیکن نظریاتی کجی کیلئے یہ لازم نہیں کہ وہ جھوٹ بھی بولے، اسلئے اس قسم کے فسق اعتقادی کو روایت حدیث کی حد تک بشرائط گوارا کرلیا گیا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ بدعت نظریہ اور بدعت عملیہ میں معذب ہونے کے لحاظ سے کون زیادہ ہے؟ سو اسکا فیصلہ ہم نہیں کرسکتے، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء اور نہ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہمارا کوئی عملی مسئلہ اس پر موقوف نہیں ہے سوائے اسکے کے بدعت اعتقادیہ کو غلط سمجھنا ضروری ہے۔

(۲) دوسرا سوال آپ نے یہ کیا ہے کہ ”خلاف سنت“ کا لفظ ”سنن مؤکدہ“ کی مخالفت میں استعمال ہوتا ہے؟ یا غیر مؤکدہ کی مخالفت میں بھی۔

اسکے جواب میں عرض ہے کہ ہمارے عرف مین ”خلاف سنت“ ایسے عمل کو کہا جاتا ہے جو ”خلاف سنت“ ہونے کی بناء پر قابل نکیر ہو، اور اس معنی میں ”خلاف سنت“ اسی عمل کو کہا جائے گا

---

(۱) طبع: دارالمعرفۃ بیروت

جو''سنت مؤکدہ'' کے ترک پر مشتمل ہو،واضح رہے کہ سنت مؤکدہ کوفقہاء کرام سنن الہدی سے تعبیرفرماتے ہیں ،اور سنت غیر مؤکدہ جواگر عبادت سے متعلق ہوں تونفل بھی کہلاتی ہیں اور عام عادات سے متعلق ہون تو سنن عادیہ یاسنن الزوائدبھی کہلاتی ہیں انکاترک قابل نکیرنہیں ہوتا،لہذااسے اس معنی میں'' خلاف سنت''نہیں کہا جاسکتا،کہ وہ قابل نیر ہے،البتہ ایسے عمل کوخلاف سنت کہنے کے بجائے یہ کہنا چاہئے کہ یہ سنت نہیں ہے۔مثلاً عمامہ یا تہبند پہننا،سنن عادیہ میں سے ہے،اگرکوئی شخص اسکے بجائے صرف ٹوپی یاشلوار پہنتیواس کو یہ تو کہا جائے گا کہ یہ عمل سنت نہیں ہے،لیکن اس معنی میں خلاف سنت نہیں کہا جائے گا کہ وہ قابل نکیر ہو۔ہمارے فقہاء حنفیہ نے اس بارے میں جواصول ذکرفرمایاہے وہ یہ ہے:

والسنة نوعان :سنة الهدى،وتركها يوجب اساء ةوكراهية كالجماعة والاذان والاقامةونحوها،وسنة الزوائد،وتركها لايوجب ذلك كسيرالنبى عليه الصلاة والسلام فى لباسه، وقيامه،وقعوده،والنفل.ومنه المندوب.يثاب فاعله ولايسئى تاركه ،قيل :وهو دون سنن الزوائد.(ردالمحتار،كتاب الطهارة ،سنن الوضوء،مطلب في السنة وتعريفها ج ا/ص ۱۰۴)[۱]

اس سے یہ بات واضح ہے کہ سنن الزوائدیاسنن غیر مؤکدہ یانفل کے ترک پرکوئی نکیرنہیں ہے،لہذااسے''خلاف سنت''اس معنی میں نہیں کہنا چاہئے کہ اس پرنکیر کی جائے۔

شایداس بات کواس انداز سے کہنا بھی درست ہوکہ جن سنتوں کی حضور نبی کریم ﷺ نے تاکیدفرمائی ہے،یااہتمام کے ساتھ انکی ترغیب دی ہے یاانکی مخالفت پرنکیرفرمائی ہے،انہیں معروف معنی میں''خلاف سنت'' کہاجائے گا ،اور جن سنتوں پر عادۃً عمل فرمایاہے،مگر انکی تاکیدوترغیب منقول نہیں ،انکے بجائے کوئی اور مباح طریقہ اختیار کرنے کوخلاف سنت نہ کہنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا

(۱)طبع ایچ ایم سعید

چاہئے کہ وہ سنت نہیں ہے، کیونکہ کلاف سنت کا مفہوم ہمارے عرف میں قابل نکیر عمل ہوتا ہے۔

(۳) ''سنت رسول اللہ ﷺ'' یا ''سنت خلفاء راشدین'' زمانے کے اختلاف سے نہیں بدلتی، البتہ اگر وہ ایسی سنت ہے جسکا ترک موجب اساءت نہیں، تو وہ ہر دور میں مباح ہوتی ہے۔

جہاں تک سڑک پر چلنے کا تعلق ہے، بندہ کو کوئی ایسی حدیث معلوم نہیں جس میں یہ منقول ہو کہ حضور سرور دوعالم ﷺ ہمیشہ راستہ کے دائیں جانب چلتے ہوں، البتہ ہر معاملے میں آپ چونکہ تیامن کو پسند فرماتے تھے، اسلئے گمان یہ ہوتا ہے کہ آپ چلنے میں بھی اس کو پسند فرماتے ہونگے، لیکن سڑک کے بائیں جانب چلنا کوئی قابل نکیر عمل نہیں ہے، اور اگر ٹریفک کے قواعد کے لحاظ سے بائیں چلنا پڑے تو شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ قانون بنانے والے اگر دائیں طرف چلنے کا قانون بنائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ اس سے تیامن کی برکات حاصل ہوں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

والسلام مع الاکرام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۲/ ذوقعدہ ۱۴۳۲ھ